(سوانح، تصنیفات وغیرہ)

مرتب

محمد اکرام چغتائی

شاہ ولی اللہ

(سوانح، تصنیفات وغیرہ)

مرتب

محمد اکرام چغتائی

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

فہرستِ مندرجات

شاہ ولی اللہ (سوانح، تصنیفات)

سوانح

1) شاہ ولی اللہ کا نسب نامہ 7

2) فہرست تصانیف شاہ ولی اللہ دہلوی 8

3) شاہ ولی اللہ کے تلامذہ، مریدین اور خلفاء 14

4) فرزندانِ شاہ ولی اللہ 16

5) الجزء اللطیف فی ترجمۃ الضعیف (شاہ ولی اللہ کی خودنوشت سوانح عمری)......مترجم: محمد ایوب قادری 32

6) شاہ ولی اللہ کی ایک خودنوشت تحریر: ایک جائزہ 39

7) ''القول الجلی فی ذکر آثار الولی'' شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے مکمل سوانح حیات کا
بنیادی ماخذ.....مسعود انور علوی کاکوروی 40

8) شاہ ولی اللہ کے سوانح حیات ''القول الجلی و اسرار الخفی'' کا نسخہ خدا بخش ایک تعارف......فضیل احمد قادری 47

9) شاہ ولی اللہ کے حالات، شاہ عبدالعزیز کی زبانی......حکیم محمود برکاتی 58

10) تذکرہ شاہ ولی اللہ از ''الروض الممطور''......محمد عبدالحلیم چشتی 68

11) خانوادہ شاہ ولی اللہ دہلوی کا تذکرہ مولوی کریم انیس پانی پتی کے قلم سے......محمد ایوب قادری 79

12) تذکرہ خانوادۂ ولی اللہی از ''یادگارِ ولی''......محمد عبدالحلیم چشتی 93

13) شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کے مختصر حالات......نسیم احمد آفریدی 100

14) شاہ ولی اللہ کا اصل نام اور ضمیمہ تصانیف......ڈاکٹر محمد یاسین مظہر صدیقی 110

15) شاہ ولی اللہ کے اجدادِ گرامی.....نور الحسن راشد کاندھلوی 122

16) حیات ولی.....مولانا محمد رحیم بخش دہلوی	152
17) حکیم الامت شاہ ولی اللہ.....ڈاکٹر شیخ محمد اکرام	247
18) شاہ ولی اللہ اور اُن کے کام کا مختصر تعارف.....محمد منظور نعمانی	286
19) شاہ ولی اللہ، سوانح حیات اور ماحول.....بشیر احمد ڈار/ مترجم: ڈاکٹر خالد مسعود	309
20) شاہ ولی اللہ، ایک اجمالی تعارف.....مولانا عبید اللہ سندھی	340
21) امام شاہ ولی اللہ محدث.....عطاء الرحمٰن قاسمی	352

تصنیفات

1) حجۃ اللہ البالغہ (تعارف)	382
2) حجۃ اللہ البالغہ (انتخاب و ترجمہ).....محمد سرور	387
3) حجۃ اللہ البالغہ (مخطوطات، طباعت، تشریح، حواشی، تراجم).....نور الحسن راشد کاندھلوی	521
4) شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات.....مترجم: خلیق احمد نظامی	545
5) شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات.....ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی	565
6) مکتوبات کا تحلیلی مطالعہ.....نسیم احمد فریدی	581
7) مشاہدات و معارف (بحوالہ ''فیض الحرمین'').....محمد سرور	584
8) انفاس العارفین.....سید محمد فاروق قادری	617
9) مسلک مروارید (ترجمہ ''عقد الجید فی الاحکام الاجتہاد والتقلید'').....مترجم: عبد الشکور فاروقی لکھنوی	638
10) شاہ ولی اللہ کی ''فتح الرحمٰن'' کا ایک نادر قلمی نسخہ.....احمد خان	676
11) ''فتح الرحمٰن'' کا ایک تجزیاتی مطالعہ.....ڈاکٹر محمد یاسین مظہر صدیقی	680
12) تاویل الاحادیث.....مترجم: محمد سرور	700
13) امداد فی مآثر الاجداد.....مترجم: محمد ایوب قادری	761
14) چہل حدیث.....مترجم: محمد عبد الحلیم چشتی	777
15) حضرت شاہ ولی اللہ کا مجموعہ مسلسلات (الفضل المبین، الدر الثمین اور النوادر) تعارف اور چند متعلقات.....نور الحسن راشد کاندھلوی	782
16) شاہ ولی اللہ کا مکتوب مدنی.....مترجم: محمد حنیف ندوی	807
17) لمحات.....مترجم: ڈاکٹر پیر محمد حسن	821

18) ''خیر کثیر'' (ترجمہ)......امارات مولانا عبید اللہ سندھی 860
19) ''سطعات'' (تمہید)......ایضاً 869
20) رسالۂ دانشمندی......مترجم: محمد سرور 873
21) میرا عقیدہ 878
22) قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین......مترجم: یوسف سلیم چشتی 883
23) مسئلہ اجتہاد......مترجم: مولانا سید حامد علی 902
24) اسلامی قانون کا احیاء اور اخلاقی مسائل......مترجم: صدر الدین اصلاحی 912
25) وصیت نامہ......محمد ایوب قادری (تعارف و ترجمہ) 928
26) شاہ ولی اللہ کی تصنیفات کے قلمی نسخے (پاکستان کے کتب خانوں میں)......سفیر اختر 984
27) شاہ ولی اللہ کی تصانیف کے خدا بخش لائبریری میں محفوظ قلمی نسخے......ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری 1000
28) کتب خانہ دار العلوم دیوبند' مظاہر علوم سہارنپور اور ہمارے ذاتی ذخیرہ میں موجود
حضرت شاہ ولی اللہ کی تصانیف و تالیفات کے قلمی نسخوں کا تعارف......نور الحسن راشد کاندھلوی 1012
29) رام پور رضا لائبریری میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تصنیفات کے قلمی نسخے......ڈاکٹر ابو سعد اصلاحی 1023
30) شاہ ولی اللہ کی تالیفات پر ایک نظر......غلام مصطفیٰ قاسمی 1028

شاہ ولی اللہ دہلوی کا نسب نامہ

1- شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بن
2- شاہ عبدالرحیم فاروقی بن
3- شاہ وجیہہ الدین شہید بن
4- شیخ محمد معظم بن
5- شیخ منصور بن
6- شیخ احمد بن
7- شیخ محمود بن
8- شیخ قوام الدین عرف قاضی قادن بن
9- شیخ قاضی قاسم بن
10- شیخ قاضی کبیر عرف قاضی بڈھا بن
11- شیخ عبدالملک بن
12- شیخ قطب الدین بن
13- شیخ کمال الدین بن
14- شیخ شمس الدین مفتی عرف قاضی پراں بن (1)
15- شیخ شیر ملک بن
16- شیخ عطا ملک بن
17- شیخ ابوالفتح ملک بن
18- شیخ عمر الحاکم ملک بن
19- شیخ عادل بن
20- شیخ فاروق بن
21- شیخ جرجیس بن
22- شیخ احمد بن
23- شیخ محمد شہریار بن
24- شیخ عثمان بن
25- شیخ ماہان بن
26- شیخ ہمایوں بن
27- شیخ قریش بن
28- شیخ سلیمان بن
29- شیخ عفان بن
30- شیخ عبداللہ بن
31- شیخ محمد بن
32- شیخ عبداللہ بن
33- امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب فاروق اعظمؓ

(1) شاہ صاحب نے خود لکھا ہے کہ ان کے مورث اعلیٰ شمس الدین مفتی سب سے پہلے ہندوستان میں وارد ہوئے اور رہتک (ہریانہ) میں سکونت اختیار کی۔
اس شجرے میں بعض واسطوں کے ساقط ہو جانے کا احتمال ہے، اس پر تفصیلی بحث کے لئے ملاحظہ ہو "شاہ ولی اللہ کے اجداد گرامی" از نور الحسن راشد۔ فکر و نظر (اسلام آباد) جولائی۔ ستمبر 1987ء

فہرستِ تصانیفِ شاہ ولی اللہ دہلوی

نمبر	نام کتاب	موضوع	زبان	قلمی نسخے	مطبوعہ نسخے
1	اتحاف النبلاء (الانتباہ کے باقی دو ابواب)	-	فارسی	-	مکتبہ سلفیہ لاہور 1969ء
2	الارشاد الی مهمات علم الاسناد	اصول حدیث	عربی	-	مطبع احمدی، دہلی 1307ھ
3	ازالۃ الخفاعن خلافۃ الخلفاء	مسئلہ خلافت	عربی	-	مطبع صدیقی، بریلی 1869ء
4	اسرار فقہ	فقہ			اس کا ذکر سید محمد نعمان رائے بریلوی نے اپنے ایک مکتوب میں کیا ہے۔ (نسیم احمد فریدی "الفرقان" صفر 1385ھ۔ برکاتی ص 50)
5	الطاف القدس	تصوف	فارسی		مطبع احمدی دہلی، 1307ھ (بعض الہامات و مکشوفات)
6	الامداد فی مآثر الأجداد	تذکرہ	فارسی	-	شامل "انفاس العارفین" و "مجموعہ خمسہ رسائل" و مطبع احمدی دہلی۔ اپنے اسلاف کا حال و شجرۂ نسب
7	الانتباہ فی سلاسل اولیاء الله	تصوف	فارسی	دیوبند 59/2	مطبع احمدی دہلی، 1311ھ
8	انسان العین فی مشائخ الحرمین	تذکرہ	فارسی	-	مطبع احمدی دہلی (شامل "انفاس العارفین")
9	الانصاف فی بیان سبب الاختلاف (تقلید اور عمل بالحدیث کے موضوع پر عالمانہ جائزہ، اختلاف مسلک کی عادلانہ توجیہہ)	فقہ الحدیث	عربی	مخطوطہ جامع ملیہ، دہلی	مجتبائی دہلی، 1308ھ، 1891ء، شعبہ مطبوعات، محکمہ اوقاف، لاہور 1971ء۔ اس کا اردو ترجمہ "کشاف" کے نام سے ہوا۔
-10	انفاس العارفین مع الجزاء اللطیف	تذکرہ	فارسی	مخطوطہ دیوبند فہرست 91/2 تصوف فارسی 31- مکتوبہ 1239ھ اوراق 158	عمدۃ المطابع لکھنؤ 1910ء اس کے ایک حصہ میں والد ماجد شاہ عبدالرحیم کے حالات و ملفوظات دوسرے میں شیخ ابوالرضا کے حالات مطبع مجتبائی دہلی 1335ھ اردو ترجمہ محمد اصغر فاروقی لاہور 1977ء نیز ترجمہ از ڈاکٹر محمد ایوب قادری

11	البدور البازغه	کلام	فارسی	دیوبند 22/2 مکتوبہ محمد یوسف بن عبدالصمد بڈھانوی، جامعہ ملیہ اسلامیہ (عربی 235) 2 نسخے	مجلس علمی ڈابھیل (گجرات) 1354ھ (ٹونک تصوف 14 نمبر 27 نسخہ مصنف سے نقل)
12	البلاغ المبین	تصوف	فارسی	-	مطبع مجتبائی دہلی
13	بوارق الولایه	تصوف	فارسی	-	شامل "انفاس العارفین"
14	تاویل الاحادیث فی رموز قصص الأنبیاء	فن حدیث	عربی	-	قرآن میں مذکورہ انبیاء کا حال، ترجمہ اردو 1899ء مطبع احمدی دہلی، شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد سندھ
15	الجزء اللطیف فی ترجمة العبد الضعیف	خودنوشت سوانح	فارسی		متعدد بار شائع ہوئی۔ "انفاس العارفین" میں شامل
16	چهل حدیث (اربعین) بسنده المتصل الی علی بن ابی طالبؓ	حدیث	عربی	مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لاہور	چالیس احادیث کا انتخاب جو مدار ایمان ہیں۔ مطبع احمدی ہگلی 1838ء، انوار محمدی لکھنؤ 1319ھ، سید عبداللہ نے مطبع احمدی ہگلی سے 1254ھ میں اردو ترجمہ شائع کیا، نیز ترجمہ از عبدالماجد دریابادی 1967ء
17	حجة الله البالغه	فقہ الحدیث	عربی	اختلاف فقہاء محدثین میں	تعلیق مطبع بولاق، مصر 1296ھ مطبع صدیقی بریلی 1286ھ اردو ترجمہ نعمۃ اللہ السابغہ عبدالحق حقانی، مطبع احمدی پٹنہ 1312ھ اس کا غالباً انگریزی ترجمہ بھی ہوا۔ (مظاہری 86)
18	حسن العقیده	عقائد	عربی	انڈیا آفس رقم 12 (د) اوراق 4	شامل خمسہ رسائل مطبع احمدی دہلی، اردو ترجمہ بھی ہوا۔ مطبع روزانہ اخبار
19	خاصیت تراجم ابواب صحیح بخاری	فن حدیث	عربی		صحیح البخاری کے تراجم ابواب کی شرح اور ان کی حکمت کا بیان۔ سہارن پور 1292ھ/1888ء
20	الخیر الکثیر (قاموس 272)	تصوف	عربی	ٹونک تصوف 27 شامل نمبر 27 مع مقدمہ شاہ محمد عاشق	مجلس علمی ڈابھیل 1354ھ اردو ترجمہ: غلام محمد سورتی
21	الدر الثمین فی مبشرات النبی الأمین	عربی	دیوبند فہرست	مخطوطات 96/1۔ نیز 110/1 کاتب بڈھانوی 1298ھ انڈیا آفس لندن ص 379، اوراق 9 رقم 281 (ج) نیز رقم 280 (ب) اوراق 9۔ تیسرا نسخہ مکتوبہ 1251ھ رقم 271	مشاہدات و مبشرات۔ اس میں اپنے والد اور چچا کے بھی کچھ حالات بیان کیے ہیں۔ سہارنپور 1875ء۔ اردو ترجمہ مطبع مجتبائی دہلی 1899ء
22	رسالۂ دانشمندی	اصول تعلیم	فارسی		مطبع احمدی دہلی 1899ء اردو ترجمہ: محمد سرور 1964ء عربی ترجمہ: محمد اکرام ندوی 1403ھ
23	رسائل تفهیمات الهیه 2 جلدیں	تصوف	عربی	پنجاب یونیورسٹی لاہور، کاتب محمد عاشق پھلتی 1146ھ اوراق 47، ٹونک تصوف 7 شامل نمبر 27	مشاہدات وواردات۔ مجلس علمی ڈابھیل 1936ء
24	زهراوین	تفسیر بعض اجزا القرآن	فارسی	مخطوطہ	عبدالحئی 170

25	سرور المحزون فی سیر الأمین المامون	سیرۃ	فارسی	مخطوطہ دیو بند 98/2 مکتوبہ 1236ھ نیز سالار جنگ 55/1	مظہر جانجاناں کی فرمائش سے ابن سید الناس کے رسالہ "نور العیون" کا ترجمہ، مطبوعہ 1256ھ دارالاشاعت کراچی 1358ھ، اردو ترجمہ "کنز المکنون" مولا بخش چشتی مطبع ستارۂ ہند دہلی 1315ھ۔ "الذکر المیمون" از عاشق الٰہی دہلی۔ "قرۃ العیون" مطبع محمدی ٹونک 1271ھ
26	سطعات	تصوف	فارسی		اصطلاحات صوفیہ، مطبع احمدی 1307ھ کراچی، 1939ء اردو ترجمہ سید محمد متین ہاشمی لاہور 1976ء نیز غلام مصطفیٰ قاسمی حیدر آباد، سندھ، 1964ء
27	شرح تراجم بعض ابواب بخاری	فن حدیث	عربی	دائرۃ المعارف حیدر آباد 1363ھ۔	اصح المطابع، دہلی
28	شفا القلوب		فارسی	مخطوطہ	مطبع مجتبائی دہلی نے اشاعت کا اعلان کیا تھا (عبدالحئی 196) مطبع محمدی لاہور 1293ھ
29	صرف میر (منظوم)	قواعد	-	-	مطبع محمدی لاہور 1293ھ
30	عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید (عبدالحئی 127)	اصول فقہ	عربی	مخطوطہ جامعہ	اجتہاد و تقلید کے موضوع پر ملیہ اسلامیہ رقم 236۔ عالمانہ بحث۔ عوام کے لئے تقلید میں تحفظ ہے، عالم کے لئے عدم تقلید گناہ نہیں، مطبع صدیقی بریلی 1309ھ۔ اس کا اردو ترجمہ عبدالشکور فاروقی لکھنوی نے کیا۔ نیز سلک مروارید ترجمہ عقد الجید مطبع مجتبائی دہلی 1310ھ
31	فتح الخبیر (الفوز الکبیر کا باب پنجم)	تفسیر	عربی	مخطوطہ انڈیا آفس اوراق 32 مکتوبہ 1254ھ	مطبع احمدی ہگلی 1249ھ/1834ء قرآن کے بعض غریب الفاظ کی تشریح
32	فتح الرحمن فی ترجمۃ القرآن (تالیف 1151ھ)	تفسیر	فارسی	نسخہ مکتوبہ 27 ربیع الاول 1240ھ جامعہ ملیہ رقم 237 دار المصنفین اعظم گڑھ مکتوبہ 23 شوال 1358ھ انڈیا آفس رقم 19 (ت) نسخہ 2 مکتوبہ 1240ھ	مطبع ہاشمی میرٹھ 1285ھ/1869ء مطبع فاروقی 1294ھ دیوبند
33	فتح السلام	-	-	مخطوطہ	(حوالہ: مقالات طریقت)
34	الفضل المبین فی المسلسل من الحدیث النبوی الأمین	فن حدیث	عربی	انڈیا آفس لندن 380 رقم 281 (د)، دوسرا نسخہ رقم 280	یہی رسالہ "مسلسلات" کے نام سے بھی معروف ہے۔ اس کا ذکر شاہ صاحب نے اپنی ایک سند مرقومہ 1159ھ بنام شیخ محمد بن پیر محمد بن شیخ ابو الفتح میں کیا ہے جو کتب خانہ خدا بخش پٹنہ میں صحیح بخاری کے ایک نسخے پر مرقوم ہے اور جس کا عکس "الخیر الکثیر" مطبوعہ ڈابھیل کے آغاز میں ہے (برکاتی 49)

35	الفوزالکبیر شرح فتح الکبیر (عبدالحیٔ 173 قاموس 69/1)	اصول تفسیر	فارسی	مخطوطہ دیوبند 648' جامعہ ملیہ رقم 386' انڈیا آفس رقم 279	اس کا عربی ترجمہ ایک مصری عالم نے کیا تھا نیز مطبع احمدی رقم 386 انڈیا بنگلی 1249ھ/1834ء مطبع مجتبائی 1898ء اردو ترجمہ 1914ء مکتبہ برہان دہلی 1941ء
36	فیض عام	متفرقات	فارسی		
37	فیوض الحرمین	تصوف	عربی	مشاہدات وواردات	مطبع احمدی دہلی 1308ھ اردو ترجمہ محمد سرور' سندھ ساگر اکیڈمی لاہور 1967ء
38	قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین	عقائد	عربی	دیوبند 258/1	مطبع مجتبائی دہلی 1310ھ مطبع روزانہ اخبار دہلی 1899ء
39	القول الجمیل فی بیان سواء السبیل	تصوف	عربی	کتب خانہ ندوۃ العلما میں دو خطی نسخے ہیں (عبدالحیٔ 199)	مطبع نظامی کانپور 1292ھ اور 1307ھ نیز مطبع الجمیلہ مصر 1290ھ اردو ترجمہ 1260ھ میں خرم علی بلہوری نے "شفا العلیل" کے نام سے کیا۔ مطبع درخشانی
40	کشف الغین عن شرح رباعیتین	تصوف	فارسی	مخطوطہ نیشنل میوزیم کراچی نمبر 253 کاتب محمد ہاشم ٹھٹھوی 1150ھ	خواجہ باقی باللہ کی دو رباعیوں کی تشریح' مطبع مجتبائی' دہلی 1310ھ منقول از نسخہ مصنف ش 3 مجموعہ 96-137
41	لطائف القدس فی معرفۃ لطائف النفس	تصوف	-	مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ	کتب عبدالحیٔ 196
42	لمعات	تصوف	فارسی	عبدالحیٔ 691	شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد سندھ' سنہ ندارد
43	مجموعہ مکاتیب (جلد اول دوحصے)	-	فارسی	مخطوطہ ذخیرہ مرتضیٰ حسن چاندپوری جواب دارالعلوم دیوبند میں محفوظ ہے	حصہ اول مرتبہ حافظ شاہ عبدالرحمٰن بن شیخ محمد عاشق پھلتی
44	مجموعہ مکاتب	-	فارسی	مخطوطہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد	ایک مجموعہ دیوبند 210/2 اوراق 95' اس میں شاہ ولی اللہ' شاہ اہل اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے مکتوبات ہیں۔
45	المسوی شرح الموطا (عبدالحیٔ 150)	حدیث	عربی	انڈیا آفس رقم 78 اوراق 306	مطبع مرتضوی دہلی 1293ھ اور 1347ھ نیز طبع مکہ معظمہ
46	المصفی شرح الموطا (عبدالحیٔ 150)	حدیث	فارسی		مطبع فاروقی دہلی 1293ھ/1876ء جلد 2 مطبع مرتضوی 1293ھ
47	المقالۃ الوضیۃ فی النصیحۃ والوصیۃ المعروف بہ وصیت نامہ	وصیت نامہ	عربی	مخطوطہ گورنمنٹ اورینٹل لائبریری مدراس (اخلاق فارسی) کیٹلاگ مطبوعہ 1963ء	قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اس پر حاشیہ لکھا' مطبع مطبع الرحمٰن دہلی سے 1268ھ میں چھپا
48	المقدمۃ فی قوانین الترجمۃ	-	فارسی	ٹونک میں تین نسخے' ایک نسخہ مکتوبہ 1227ھ نوشتہ سید محمد علی (شاہ صاحب کے بھانجے)' دوسرا نسخہ حافظ محمد امین نے 1271ھ کو لکھا	"فتح الرحمٰن" کے آغاز میں شامل ہے

49	مکتوبات مع مناقب امام بخاری و امام تیمیه	-	فارسی	-	مطبع احمدی دہلی 1308ھ نیز مطبع مجتبائی دہلی "کلمات طیبات" سے دو خط لے کر رسالے کی شکل دے دی ہے۔
50	مکتوب مدنی	تصوف	فارسی	دیوبند 59/2 رامپور رضا	اردو ترجمہ محمد حنیف ندوی' ادارۂ ثقافت اسلامیہ' لاہور 1969ء نیز "تفهیمات الٰهیه" میں شامل
51	النبذة الابريزية في الطبقة العزيزيه	تذکرہ	فارسی	اپنے نانا شیخ عبدالعزیز دہلوی کا حال شامل "مجموعہ خمسہ رسائل" مطبوعہ	مطبع احمدی نیز "انفاس العارفین"۔
52	النخبة في سلسلة الصحبه	-	-	شاہ صاحب نے 1373ھ میں شیخ جاراللہ کو سند اجازت دی تھی اس میں اس تصنیف کا ذکر کیا ہے۔ (برکاتی 49)	
53	النوادر من حديث سيدالأوائل والأواخر	حدیث	عربی	انڈیا آفس لندن رقم 281 (ب)	سہارنپور 1875ء ("مسلسلات" کے ساتھ طبع ہوا) شاہ ولی اللہ اکیڈمی' حیدر آباد' سندھ' سنہ ندارد
54	وصايا أربعه	-	فارسی	-	-
55	وصیت نامه	-	فارسی	انڈیا آفس لندن رقم 65 (1) اوراق 5	اس کا اردو ترجمہ "رسالہ دانشمندی" کے ساتھ مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوا۔
56	همعات	تصوف	فارسی	لاہور 1941ء ڈاکٹر غلام مصطفیٰ' حیدر آباد سندھ 1964ء	-
57	هوامع شرح حزب البحر	تصوف	فارسی	-	مطبع احمدی دہلی' 1307ھ

اضافات اور تحقیق طلب

58	رسالة بسيطة بالفارسية في الاسانيد	فن حدیث	فارسی	عبدالحئی 160	مخطوطہ انڈیا آفس رقم 19 (ت) دوسرا نسخہ مکتوبہ 1240ھ
59	حاشیه ترجمه فتح الرحمن	تفسیر	فارسی	-	-
60	ترجمه و تفسیر سورة المزمل و المدثر	تفسیر	فارسی	-	بیت الحکمہ لاہور 1945ء قاموس 61/1
61	معدن الجواهر (حدیث اربعین)	حدیث	عربی	-	اردو ترجمہ' نواب قطب الدین دہلوی مطبوعہ 1880ء قاموس 167/1

شاہ صاحب سے منسوب کتابیں

(کچھ کتابوں کے بارے میں حضرت شاہ صاحب کے تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ وہ ان سے غلط منسوب کردی گئی ہیں۔ بعض کے صرف فرضی نام کمزور عقیدے والوں کو گمراہ کرنے کے لئے گھڑ لئے ہیں۔ ایسی چند کتابوں کی فہرست یہ ہے)۔

1	تحفة الموحدين	عدم تقلید	فارسی	افضل المطابع دہلی اردو ترجمہ رحیم بخش لاہور 1962ء۔ اس کے بارے میں محمد ایوب قادری مرحوم کا خیال ہے کہ رسالہ شیخ محمد سعید کا لکھا ہوا ہے۔	
2	البلاغ المبين	ردِّ تقلید	فارسی	محمد ایوب قادری مرحوم نے اسے شاہ صاحب کے کسی شاگرد کی تصنیف قرار دیا ہے، مولانا سلیمان ندوی بھی اس کتاب کو جعلی سمجھتے تھے۔	
3	قول سديد	-	-	یہ کتاب بھی غلط منسوب کر دی گئی ہے۔ حکیم محمود احمد برکاتی اور حکیم موسیٰ امرتسری اسے جعلی سمجھتے ہیں۔	
4	قرة العينين في ابطال شهادة الحسين	تاریخ	فارسی	فرضی	ان دونوں کتابوں کے نام مرزا علی لطف نے اپنے طور پر گھڑ کر ''تذکرۂ گلشن ہند'' میں لکھے ہیں۔
5	رسالة اوائل	-	-	-	محمد ایوب قادری مرحوم کی تحقیق کے مطابق یہ شیخ محمد سعید بن شیخ محمد سنبل کی تالیف ہے
6	فيما يجب حفظة الناظر	-	عربی	-	محمد ایوب قادری مرحوم اسے بھی شاہ صاحب کے کسی شاگرد کی تصنیف بتاتے ہیں۔
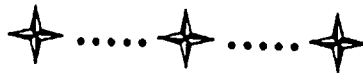
شاہ ولی اللہ دہلوی کے تلامذہ' مریدین اور خلفاء

1- آفندی ابراہیم، شیخ	2- امین اللہ نگرنہوی
3- اہل اللہ (شاہ) پھلتی (وفات 1187ھ)	4- بدرالحق پھلتی، شیخ
5- ثناءاللہ پانی پتی' قاضی (وفات 1225ھ/1810ء)	6- جاراللہ بن عبدالرحیم لاہوری
7 - جمال الدین (سید) رامپوری (خلیفہ مولانا فخرالدین نظامی) (وفات 1825ء)	8- چراغ محمد (مولانا)
9- حسنی شاہ ابوسعید رائے بریلوی	10- خیرالدین سورتی (مولانا) (وفات 19 ستمبر 1779ء) مدفن رائے بریلی
11- داؤد (میاں)	12- رستم علی بیگ (مرزا)' شاہ صاحب کے مرید
13- رفیع الدین (شاہ) شاہ صاحب کے فرزند	14- شرف الدین محمد (سید)
15- شیخ محمد بن پیر محمد بن ابی الفتح	16- عبدالرحمٰن ٹھٹھوی (حافظ)
17- شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (وفات 1824ء)	18- عبداللہ خاں رامپوری
19- عبدالنبی (حافظ) عرف عبدالرحمٰن	20 - عبدالہادی (شیخ) بن عبداللہ ساکن سودھرہ (1162ھ) آپ نے شاہ صاحب سے ''الفوزالکبیر'' پڑھی
21- نواب رفیع الدین خاں مرادآبادی (م 1808ء)	22- فضل اللہ کشمیری (بابا)
23- محمد امین (مخدوم) والد محمد معین ٹھٹھوی	24- محمد امین (خواجہ) ولی اللہی کشمیری (م 1773ء)
25- محمد بن ابی الفتح بلگرامی (شیخ)	26- محمد سعید (شیخ) بن محمد ظریف دہلوی
27- محمد سعید خاں رامپوری (وفات قبل 1188ھ)	28- محمد شریف بن خیرالدین بن عبدالغنی
29- محمد عابد علاالدین پھلتی	30- محمد عاشق (شاہ) پھلتی
31- محمد عثمان کشمیری (بابا)	32- محمد معین ٹھٹھوی (مخدوم)

33- محمد معین رائے بریلوی (شاہ)	34- محمد نعمان (شاہ) رائے بریلوی عم سید احمد شہیدؒ (وفات 19 جون 1779ء)
35- محمد واضح رائے بریلوی (شاہ)	36- مرتضیٰ زبیدی بلگرامی (سید)، صاحب ''تاج العروس''
37- منت، قمر الدین سونی پتی (وفات 94-1793ء) اردو کے مشہور شاعر	38- نثار علی (شاہ) الہ آبادی
39- نور اللہ (شیخ) بن معین الدین پھلتی	

فرزندانِ شاہ ولی اللہ

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی

شاہ ولی اللہ دہلوی کی دوسری زوجہ کے بطن سے سب سے بڑے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز دہلوی 25/ رمضان 1159ھ (12/اکتوبر 1746ء) کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ غلام حلیم آپ کا تاریخی نام ہے۔ بچپن میں پیار کا نام ''مسیحا'' بھی تھا۔

آپ نے تیرہ برس کی عمر تک اپنے والد سے بہت سی درسی کتابیں پڑھ لی تھیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، منطق، فلسفہ، کلام، عقائد، نحو، ہندسہ، ہیئت وغیرہ علوم میں دستگاہ حاصل کر لی تھی۔ آپ کی عمر 17 برس کی تھی کہ والد ماجد کا انتقال ہو گیا اور آپ نے اتنی کمسنی میں مسند درس وارشاد سنبھال لی۔ نہ صرف مدرسۂ رحیمیہ میں تشنگان علوم کو سیراب کرنے لگے تھے بلکہ اپنے چھوٹے بھائیوں کی تعلیم وتربیت پر بھی خاص توجہ کی۔

آپ کے زمانے میں خاندان ولی اللہی کی شہرت وعظمت بام ثریا تک پہنچ چکی تھی۔ یہاں سے فارغ ہو کر جانے والوں نے سارے ہندوستان میں دینی مدارس کا جال بچھا دیا تھا۔

شاہ عبدالعزیز ایک بلند پایہ عالم اور بہترین معلم ہی نہیں تھے، اعلیٰ پائے کے مصنف بھی تھے۔ آپ کی تصانیف آج تک اپنے موضوع پر حجت سمجھی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ شیوا بیان واعظ اور نہایت ذہین دقیقہ شناس نکتہ رس مفتی بھی تھے۔ آپ کا مسلک حنفی تھا مگر نواب صدیق حسن خاں نے لکھا کہ ''علم حدیث کی جیسی خدمت اس خاندان سے وجود میں آئی، ایسی اس ملک میں اور کسی سے معلوم نہیں۔''

شاہ صاحب کی جتنی گہری نظر علوم نقلیہ پر تھی اتنا ہی عبور معقولات پر بھی تھا۔ آپ کے گھر اور مدرسے میں ہمہ وقت طالبان علم کا ہجوم رہتا تھا اور دن رات وعظ ودرس وارشاد کی صدائیں گونجتی رہتی تھیں۔ آپ روزانہ قرآن کریم کی تفسیر بھی بیان فرماتے تھے۔ ایک سال 13/رجب 1213ھ (20/دسمبر 1798ء) کو درس قرآن کریم مکمل کیا تو خود ہی اس کی تاریخ کہی: ''آج کلام اللہ ختم ہوا۔''

شاہ صاحب شاعر بھی تھے۔ عربی میں آپ کا منظوم کلام ملتا ہے۔ عربی وفارسی کے بہترین انشا پرداز تھے۔ خوابوں کی تعبیر دینے میں اپنے عہد کے ابن سیرین اور قوت حافظہ میں امام شعبی کی نظیر سمجھے جاتے تھے۔ ایسے علوم کے رموز ودقائق بھی انہیں مستحضر رہتے تھے جن سے بظاہر برسوں آپ کا سابقہ نہ پڑتا تھا۔ اس کے ساتھ تصوف وسلوک، ارشاد و

ہدایت، ورع وتقویٰ، اتباع سنت اور عمل بالحدیث میں بھی امتیازی شان رکھتے تھے۔ اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی حالات اور عصری تقاضوں سے بھی باخبر تھے اور اپنے والد ماجد کی طرح نہایت دردمندی و دلسوزی کے ساتھ ان مسائل میں غور وفکر کرتے تھے۔

ہفتے میں دو دن منگل اور جمعہ کو آپ کا وعظ کوچہ چیلان میں ہوا کرتا تھا جس سے فیض یاب ہونے کے لئے دور دور سے لوگ آتے تھے۔ ان محفلوں میں کوئی اختلاف انگیز بات نہ کرتے تھے۔

شاہ عبدالعزیز کی شادی مسماۃ حبیبہ بنت شاہ نوراللہ بڈھانوی سے ہوئی تھی۔

شاہ صاحب کی اولاد نرینہ زندہ نہ رہی۔ صاحبزادیوں اور تین چھوٹے بھائیوں کا انتقال بھی آپ کے سامنے ہی ہو گیا تھا۔ پس ماندگان میں دو نواسے مولانا محمد اسحٰق دہلوی اور مولانا محمد یعقوب تھے جو 1285ھ۔1842ء میں مکہ معظمہ کو ہجرت کر گئے تھے۔

حکیم سید عبدالحی حسنی رائے بریلوی نے ''نزہتہ الخواطر'' میں آپ کا حلیہ اس طرح بیان کیا ہے: ''آپ کا قد لمبا، بدن نحیف، رنگ گندم گوں تھا۔ آنکھیں کشادہ اور داڑھی گھنی تھی''۔ سید احمد ولی اللہی نے شاہ صاحب کا لباس بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اکثر چغہ، اس کے نیچے انگرکھا اور پائجامہ شرعی، دستار کشمشی، کلاہ پنبہ دار، رومال بینی پاک کرنے کا نیلا اور پاپوش زری اور ہاتھ میں عصائے سبز رکھتے تھے۔''

شاہ صاحب نے 7/شوال المکرم 1239ھ (6/جون 1824ء) اتوار کے دن سفر آخرت اختیار کیا۔ اپنے آبائی قبرستان (مہندیان دہلی) میں مدفون ہوئے۔ نماز جنازہ کوٹلہ فیروز شاہ کے میدان میں 54 بار پڑھی گئی تھی۔

تصانیف

شاہ عبدالعزیز کی متعدد تصانیف ہیں، فارسی میں زیادہ عربی میں کم۔ ان میں سے کچھ شائع ہو چکی ہیں، مگر اب وہ بھی بازار میں دستیاب نہیں۔ کچھ کبھی نہیں چھپیں اور صرف بعض کتب خانوں کی زینت ہیں۔ بعض کتابوں کے بارے میں شبہ ہوتا ہے کہ ان سے غلط منسوب کر دی گئی ہیں یا التباس اسمی کی وجہ سے کسی اور عبدالعزیز کی تالیف کو شاہ عبدالعزیز دہلوی کی کتابوں میں شمار کر لیا گیا ہے۔

یہاں شاہ صاحب کی کتابوں کی ایک فہرست درج کی جارہی ہے۔ جو کتابیں اس فہرست میں شامل ہیں، ان کے علاوہ درج ذیل رسائل کا انتساب بھی شاہ صاحب سے کیا گیا ہے:

(1) رسالہ خلت (؟) (پٹنہ، دیوبند)

(3) رسالہ دفع اعتراضات (دیوبند)

(3) کرامات الاولیاء (علی گڑھ، رامپور)

(4) مجموعۂ تقاریر شاہ عبدالعزیز در وحدت وجود و شہود (رامپور)

(5) رسالہ رد الرسالہ فی کلمتہ التوحید (رامپور)

(6) رسالہ فی تفسیر ''ماأھل به الغیر الله'' (اس کا رد عبدالحکیم پنجابی نے لکھا۔ نیز دیکھئے اولاد حسن قنوجی، نوائے ادب، بمبئی۔ اپریل 1953ء)

(7) قصائد عربی (عبدالحئی 53)

(8) حاشیہ علی شرح ہدایہ الحکمہ للصدر اشیرازی

(9) بشارت احمدی (ترجمہ) 1303ھ (آصفیہ 382/3۔ قاموس 750/1، ایک بشارت احمدی منظوم حصہ اول 1309ھ میں لکھنؤ سے چھپی تھی۔ وہ عبدالعزیز محدث لکھنوی کی تالیف ہے۔)

(10) ہدایت المومنین (برحاشیہ سوالات عشرۂ محرم) اردو۔ سید المطابع دہلی

(11) احسن الحسنات ترجمہ اردو رسالہ وسیلہ النجات، مطبع مجتبائی دہلی 1905ء

(12) راہ نجات (قلمی) آصفیہ 1134/2 نیز مخطوط مکتوبہ 1200ھ سالار جنگ۔ مطبوعہ پریس بدایوں 1284ھ

(13) فیصلہ شاہ صاحب دہلوی (در مسئلہ وحدت الوجود) شائع کردہ مولانا انوار اللہ خاں فضیلت جنگ۔ محمود پریس، حیدر آباد۔ نور محمدی جوڑوی (منکر) اور شاہ محمد رمضان مہمی شہید (قائل) کے درمیان بحث کا فیصلہ۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی تصانیف

شمار	نام کتاب	موضوع	زبان	کیفیت
1	بستان المحدثین	تذکرہ محدثین	عربی	اردو ترجمہ: عبدالسمیع دیوبندی، مطبع مجتبائی دہلی ترجمہ 1295ھ
2	تحفۂ اثناعشریہ	عقائد	فارسی	1204ھ میں لکھی، عربی ترجمہ مولوی اسلمی مدراسی نے کیا۔
3	تفسیر پارۂ تبارک الذی (1)	تفسیر	فارسی	ٹونک اوراق 187
4	تفسیر عزیزی تفسیر پارۂ عم	تفسیر تفسیر	فارسی فارسی	ملاحظہ ہو فتح العزیز ٹونک اوراق 352 (3 نسخے) کاتب سراج الدین در اجمیر
5	حاشیہ علی شرح الشمسیہ للرازی	-	-	عبدالحئی 652

6	حواشی بر شرح عقائد	-	-	غیر مطبوعہ
7	حواشی بر کتب فلسفہ و منطق	-	عربی	غیر مطبوعہ
8	رسالہ در اسئلہ واجوبہ (2)	عقائد	فارسی	فہرست مخطوطات دار العلوم دیوبند 59/2
9	رسالہ فی الانساب	انساب	-	ندوۃ العلماء لکھنؤ نمبر 209
10	رسالہ فی الرؤیا	تعبیر خواب	عربی	اردو ترجمہ، مطبع احمدی دہلی
11	سر الشہادتین	-	عربی	اس کی شرح از سلامت اللہ کشفی بُدایونی۔ ترجمہ مرزا حسن علی۔ نول کشور لکھنؤ 1873ء نیز کتب خانہ انجمن اردو پاکستان۔
12	عجالہ نافعہ (3)	اصول حدیث	-	اردو ترجمہ۔ مطبع دہلی
13	عزیز الاقتباس فی فضائل اخیار الناس	عقائد	فارسی	خلفائے راشدین کے فضائل میں، مطبع احمدی دہلی 1322ھ مع اردو ترجمہ از حسن علی محدث لکھنوی۔
14	فتاویٰ عزیزیہ (2 جلدیں)	فقہ	فارسی	مطبع میرٹھ (عبدالحئی 109)
15	فتح العزیز	تفسیر	فارسی	آخری زمانے میں املا کر کے لکھوائی، صرف دو جلدیں موجود ہیں باقی ہنوز نایاب۔ ٹونک میں ایک نسخہ ہے اوراق 464۔ مدراس میں اس کے دو قلمی نسخے ہیں۔
16	فی اسئلہ واجوبہ (اسی کا نام "افادات عزیزیہ" بھی بتایا گیا ہے)	تفسیر	عربی و فارسی	مرتبہ نواب رفیع الدین فاروقی مراد آبادی۔ قلمی نسخے لکھنؤ، علی گڑھ، سہارن پور، رامپور
17	کرامات عزیزی	عملیات و تعویذات	اردو	تین حصوں میں یہ کتاب مطبع احمدی دہلی سے شائع ہوئی۔
18	ملفوظات عزیزی (4)	-	فارسی	17 رجب 1233ھ سے شوال 1233ھ تک صرف تین ماہ کے ملفوظات۔

19	مختصر فی المعراج	-	عربی	جامع نامعلوم۔
20	میزان البلاغہ	بلاغت	فارسی	مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندی کے حاشیے کے ساتھ مطبع مجتبائی میرٹھ سے شائع ہوئی سنہ ندارد۔اس کی شرح قاضی ارتضٰی علی خاں گوپاموی اور عبدالقادر بن محمد اکرام رامپوری نے لکھی۔
21	میزان العقائد	عقائد	عربی	شاہ صاحب نے خود اس کی شرح لکھی' مطبع احمدی دہلی نے شائع کیا۔
22	میزان الکلام	کلام	فارسی	عبدالحئی 239

شاہ عبدالعزیز دہلوی کے چند ممتاز تلامذہ

شاہ عبدالعزیز دہلوی کے تلامذہ بے مبالغہ ہزاروں کی تعداد میں تھے،ان میں سے چند نمایاں شخصیات کا یہاں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

شمار	نام	سنہ وفات	کیفیت
1	آزردہ' مفتی صدرالدین	24 ربیع الاول 1285ھ/6 فروری 1869ء	
2	آل حسن قنوجی، سید	-	نواب صدیق حسین خاں کے والد
3	آل رسول قادر مارہروی	-	-
4	ابوسعید مجددی شاہ	یکم شوال 1250ھ/ 31 جنوری 1835ھ	
5	احمد سعید مجددی شاہ	2 ربیع الاول 1277ھ/ 17 ستمبر 1860ھ	مدفن: مدینہ منورہ
6	احمد علی بجنوری، سید	7-الٰہی بخش کاندھلوی، مفتی	
8	ثناء اللہ احمد بدایونی	9-جلال الدین برہان پوری، سید	
10	حسن علی صغیر محدث لکھنوی	11- حسین احمد محدث ملیح آبادی	
12	حیدر علی رامپوری	6 ذی قعدہ 1272ھ/9 جولائی 1856ء	مدفن: ٹونک
13	حیدر علی فیض آبادی		''منتہی الکلام'' اور ''ازالۃ الغین'' وغیرہ کے مصنف

14	رافت رؤف احمد مجددی	1249ھ/34-1833ء	
15	رحمٰن بخش (شاہ) امروہوی	18 محرم 1280ھ/4 جولائی 1863ء	ابن شاہ عبدالباری چشتی وسجادہ نشین دوم خواجہ شاہ عبدالہادی امروہوی
16	رشید الدین دہلوی	1243ھ/28-1827ء	
17	رفعت' غلام جیلانی رامپوری	27 ذی الحجہ 1234ھ/16 اکتوبر 1819ء	مدفن: رامپور
18	رفیع الدین (شاہ)	5 شوال 1233ھ/7 اگست 1818ء	شاہ عبدالعزیز کے برادر خرد
19	رمضان علی امروہوی، سید	20- ساحر غلام بینا علوی کاکوروی	
21	سلامت اللہ کشفی بدایونی	13 رجب 1281ھ/5 ستمبر 1819ء	
22	ظہور الحق قادری پھلواری	16 ذی قعدہ 1234ھ/5 ستمبر 1819ء	
23	عبدالحئی بڈھانوی	24- عبدالخالق دہلوی	
25	عبدالعزیز اخوند قادری	10 محرم 1296ھ/3 جنوری 1879ء	مدفن: درگاہ خواجہ باقی اللہ
26	عبدالغنی (شاہ)		محمد اسماعیل شہید کے والد
27	عبدالقادر (شاہ)	ف 1230ھ	شاہ عبدالعزیز کے برخوردار
28	غلام علی چریاکوٹی، حافظ		
29	غلام علی نقشبندی (شاہ)	22 صفر 1240ھ/15 اکتوبر 1824ء	
30	غلام محی الدین بگوئی		
31	فضل الحق خیر آبادی	1278ھ/1861ھ	مدفن: انڈومان
32	فضل الرحمان گنج مراد آبادی	22 ربیع الاول 1313ھ/11 ستمبر 1895ء	
33	قطب الہدیٰ رائے بریلوی، سید		

34	کرم اللہ محدث دہلوی	1252ھ/1836-37ء	
35	کریم الدین دہلوی		
36	محبوب علی جعفری، میر	10 ذی الحجہ 1280ھ/16 مئی 1864ء	
37	محمد اسحاق رائے بریلوی، سید		
38	محمد اسحاق دہلوی (شاہ)	1262ھ/1845ء	
39	محمد اسماعیل شہید	14 ذی قعدہ 1246ھ/64-1865ء	
40	محمد رمضان شہید	28 جمادی الاولیٰ 1240ھ/18 جنوری 1825ء	شہادت مندسور، مدفن: مہم ہریانہ
41	محمد شکور مچھلی شہری		
42	محمد یعقوب دہلوی (شاہ)	28 ذی قعدہ 1282ھ/13 اپریل 1866ء	
43	مخصوص اللہ	13 ذی الحجہ 1271ھ/26 اگست 1855ء	شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے
44	قمر الدین سونی پتی	1208ھ/94-1793ء	
45	نجابت حسین بریلوی		

اولاد

شاہ عبدالعزیز کا نکاح شاہ نوراللہ بڈھانوی کی صاحبزادی حبیبہ سے ہوا تھا، ان کے بطن سے تین فرزند پیدا ہوئے، ان سب کا بچپن ہی میں انتقال ہوگیا۔ تین صاحبزادیاں تھیں، ان کی وفات بھی شاہ صاحب کی زندگی ہی میں ہوگئی تھی۔

1- دختر یہ شاہ رفیع الدین کے فرزند محمد عیسیٰ سے منسوب ہوئیں۔

2- عائشہ ان کے شوہر محمد افضل فاروقی تھے، جن سے دو صاحبزادے ہوئے۔

شاہ محمد اسحٰق، ولادت: 1197ھ۔1783ء، وفات: 1262ھ۔1846ء

شاہ محمد یعقوب، ولادت: 1200ھ۔1846ء، وفات: 1282ھ۔1865ء

3- تیسری صاحبزادی کا عقد شاہ عبدالحئی بڈھانوی سے ہوا جو شاہ صاحب کی اہلیہ کے حقیقی بھتیجے تھے۔ ان سے کوئی

اولاد نہ ہوئی۔

مولانا عبدالقیوم بڑھانوی (ف 1299ھ) جو شاہ محمد اسحٰق کے داماد تھے، مولانا عبدالحیٔ بڑھانوی کی دوسری زوجہ کے بطن سے تھے۔

شاہ عبدالعزیز کے دونوں نواسوں (شاہ محمد اسحٰق اور شاہ محمد یعقوب نے) 1258ھ۔1842ء میں مکہ معظمہ کو ہجرت کی تھی۔ وہاں ان کا حلقہ درس جاری ہوا اور سینکڑوں علما کو ان سے سند حدیث ملی۔ وہیں دونوں کا انتقال ہوا اور جنت المعلیٰ (مکہ مکرمہ) میں ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مزار مبارک کے نزدیک مدفون ہوئے۔

[دہلی کالج (دہلی) کے پہلے سیکرٹری جے۔ایچ۔ ٹیلر نے دہلی میں علوم شرقیہ کی صورتِ حال کے بارے میں کمیٹی برائے پبلک انسٹرکسن کے کرتا دھرتا اور معروف سنسکرت دان ایچ۔ایچ۔ولسن کو جو مفصل رپورٹ پیش کی (1824ء) اُس میں یہ مذکورہ ہے کہ اگلے سال قائم ہونے والے دہلی کے شعبۂ علوم اسلامیہ کے پہلے صدر کی حیثیت سے مولانا عبدالعزیز کو دعوت دی گئی' کیونکہ وہ جدید نظامِ تعلیم کے حامی تھے۔انہوں نے یہ عہدہ قبول کرنے سے معذرت کرلی اور پھر اُسی سال اُن کا انتقال ہوگیا۔دہلی کالج قائم ہونے پر اس شعبہ کا سربراہ انہی کے شاگرد مولوی رشید الدین خاں کو مقرر کیا گیا۔

تفصیل کے لئے دیکھئے راقم کا مقالہ: Beginning of Oriental Learning in British India در: مجلّہ ''بنیاد'' (لمز) شمارہ (2016ء)]

شاہ رفیع الدین دہلوی

شاہ ولی اللہ دہلوی (کی زوجہ ثانیہ سے) دوسرے فرزند شاہ رفیع الدین 9 ذی الحجہ 1163ھ۔10 /نومبر 1750ء بروز شنبہ پیدا ہوئے۔ یہ 12-13 سال کے تھے کہ شاہ صاحب کا انتقال ہوگیا۔ان کی تعلیم و تربیت شاہ عبدالعزیز دہلوی کی نگرانی میں ہوئی جوان سے عمر میں چار سال بڑے تھے۔انہوں نے اپنے ماموں شاہ محمد عاشق پھلتی سے بھی پڑھا اور سولہ سال کی عمر میں تحصیل علوم سے فارغ ہوگئے تھے۔شاہ عبدالعزیز نے جب اپنے ضعف اور بیماری کی وجہ سے طلبہ کو درس دینا بند کردیا تھا تو تدریس کی ذمہ داری شاہ رفیع الدین ہی کو سونپی گئی تھی۔یہ علوم منقول و معقول دونوں پر حاوی تھے۔ شاہ عبدالعزیز نے اپنے ملفوظات میں متعدد بار بیان کیا ہے کہ شاہ رفیع الدین ریاضی میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے۔

''مولوی رفیع الدین در ریاضیات چنداں ترقی کردہ کہ شاید موجد آں محمد علی ہم بودہ باشد''(5)

(مولوی رفیع الدین نے ریاضی میں اتنی ترقی کرلی تھی کہ شاید اس علم کے موجد محمد علی ہی نے کی ہوگی۔)

شاہ رفیع الدین نے اپنے ماموں شاہ محمد عاشق پھلتیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ان کی متعدد تصانیف بھی ہیں۔ چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

-1 اردو ترجمہ کلام اللہ۔یہ تقریباً 1205ھ-91-1790ء میں مکمل ہوا۔مگر بعض حضرات کا خیال ہے کہ آپ نے ترجمہ شروع کیا تھا، بعد میں دوسروں نے مکمل کیا اور آپ کے نام سے مشہور کردیا۔(6)

-2 راہ نجات۔یہ رسالہ بھی آپ سے منسوب ہے۔پہلی بار مطبع مصطفائی لکھنؤ سے 1260ھ۔1844ء میں چھپا

تھا، مگر یہ دراصل مولانا محمد علی پانی پتی کا لکھا ہوا ہے۔

3- تفسیر رفیعی۔ سورۂ بقرہ کی اردو تفسیر۔ شاہ رفیع الدین کے درس قرآن کی تقریر ان کے مرید سید نجف علی عرف فوجدار خاں قلمبند کرلیا کرتے تھے، اس کا مسودہ انہوں نے شاہ صاحب کو دکھا بھی لیا تھا۔
سید نجف علی کے بیٹے سید عبدالرزاق نے 1272ھ۔ 1856ء میں اسے مطبع نقشبندی دہلی سے شائع کر دیا تھا۔(7) یہ تفسیر اور ترجمہ دونوں سید نجف علی نے لکھے ہیں۔ مفہوم شاہ رفیع الدین کا بیان کردہ ہے۔ الفاظ لازماً ان کے ہیں۔

4- رسالہ اذان ونماز (فارسی) محرم 1220ھ۔ اپریل 1805ء میں لکھا۔

5- رسالہ فوائد نماز (فارسی)

6- حملۃ العرش (فارسی) اس کی عبارت شاہ عبدالعزیز نے اپنی تفسیر ''فتح العزیز'' میں نقل کی ہے۔

7- شرح رباعیات (فارسی)

8- رسالہ در بیعت (فارسی)

9- شرح چہل کاف (فارسی) صفر 1220ھ۔ مئی 1805ء میں لکھی۔

10- رسالہ برہان العاشقین و رسالہ معما۔ تالیف 13/ جمادی الآخر 1220ھ۔ 7/ستمبر 1805ء

11- رسالہ نذور بزرگاں

12- جوابات سوالات اثنا عشر

ان میں سے نو (9) رسالے ''مجموعہ رسائل تسعہ'' کے نام سے سید ظہیر الدین ولی اللہی نے مطبع احمدی دہلی سے شائع کیے تھے۔ پھر سنہ 1381ھ۔ 1963ء میں مولانا عبدالحمید سواتی نے مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ (پاکستان) سے شائع کیے ہیں۔(8)

13- مجموعہ فتاویٰ شاہ رفیع الدین۔ مطبع مجتبائی دہلی 1904ء، مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ 1963ء۔

14- آثار القیامۃ (قیامت نامہ)

15- تنبیہ الغافلین۔ مطبع احمدی کلکتہ

16- رسالہ سمت قبلہ

17- رسالہ تعدیلات الخمسۃ المتحیرہ

عربی میں

1- اسرار المحبہ، نصرت العلوم گوجرانوالہ 1965ء

2- تفسیر آیہ نور، نصرت العلوم گوجرانوالہ 1964ء

3- تکمیل الاذہان۔ تالیف 1230ھ۔ 1815ء، گوجرانوالہ 1964ء

4- دمغ الباطل۔ مولوی غلام یحییٰ بہاری (ف 1767ء) نے شاہ ولی اللہ کے ''مکتوب مدنی'' کے رد میں رسالہ ''کلمۃ الحق'' لکھا تھا۔ اس کا جواب شاہ رفیع الدین نے دیا اور ''دمغ الباطل'' نام رکھا۔ (مخطوطات سالار جنگ، حیدرآباد، رضا رامپور، حبیب گنج علی گڑھ)

5- رسالہ فی اثبات شق القمر و ابطال براہین الحکمہ۔

6- رسالہ فی تحقیق الالوان

7- رسالہ فی الحجاب

8- رسالہ فی برھان التمانع

9- رسالہ فی عقد الانامل (ریاضی)

10- حاشیہ بر میر زاہد

11- الدرر الدراری

12- رسالہ فی المنطق

13- رسالہ فی الامور العامہ

14- رسالہ فی التاریخ

15- تکمیل الصناعۃ

شاہ رفیع الدین شعر بھی کہتے تھے۔ شیخ الرئیس بوعلی سینا نے ایک قصیدہ لکھا تھا جس میں بتایا گیا ہے کہ ''نفس'' کیا ہے؟ شاہ ولی اللہ نے اس ''قصیدہ عینیہ'' کا جواب لکھا۔ اسے شاہ رفیع الدین نے مخمس کیا۔ اس قصیدے کے آٹھ بند ''حیات ولی'' میں نقل ہوئے ہیں۔[9] آپ کا ایک عربی قصیدہ معراج نبوی کے بیان میں ہے، اس کے بھی 27 شعر ''حیات ولی'' میں درج ہوئے ہیں۔

وفات: 1233ھ۔ 1818ء میں دہلی میں طاعون کی وبا پھیلی تھی۔ شاہ رفیع الدین اس کی زد میں آ گئے اور 5/شوال 1233ھ۔ 7/اگست 1818ء کو انتقال کیا۔ اپنے خاندانی قبرستان (مہندیان) میں اپنے والد شاہ ولی اللہ کے پائین میں مدفون ہیں۔

اولاد: شاہ رفیع الدین نے تین نکاح ہوئے۔ پہلا عارفہ بنت شاہ صدر عالم سے ہوا، دوسری کا علم نہیں، تیسری زوجہ کلو تھیں۔ اولاد میں چھ صاحبزادے اور ایک دختر تھیں۔[10]

(1) محمد عیسیٰ

(2) محمد مصطفیٰ[11]

(3) مولوی مخصوص اللہ[12] (ف 26/اگست 1855ء)

(4) محمد حسین

(5) محمد موسیٰ (ف 7/اگست 1843ء)

(6) محمد حسین

(7) دختر امتہ اللہ

محمد عیسیٰ سے شاہ عبدالعزیز کی بڑی صاحبزادی منسوب ہوئیں۔ محمد مصطفےٰ کا عقد زینب دختر شاہ عبدالقادر سے ہوا اور ایک بیٹی کلثوم پیدا ہوئیں، جو شاہ محمد اسمٰعیل شہید کو بیاہی گئیں۔ ان کے فرزند شاہ محمد عمر تھے۔

شاہ رفیع الدین کی صاحبزادی امتہ اللہ کا عقد نجم الدین سونی پتی سے ہوا۔

مولوی سید نصیر الدین سے شاہ محمد اسحٰق دہلوی کی صاحبزادی منسوب تھیں۔(13) ان کے دو بیٹوں کے نام معلوم ہیں:

(1) سید عبداللہ (2) سید عبدالحکیم۔ یہ دونوں اپنے نانا کے ساتھ 1256ھ۔1840ء میں مکہ معظمہ کو ہجرت کر گئے تھے۔

شاہ رفیع الدین کے فرزند مولوی محمد موسیٰ (ف 1259ھ۔1843ء) سے بھی دو رسالے یادگار ہیں، مگر دونوں غیر مطبوعہ رہے۔ ''حجتہ العمل فی ابطال الجہل'' (فارسی) 60 اوراق پر مشتمل ہے۔ اس کے اختتام کی تاریخ 17 ربیع الاول 1242ھ۔18 اکتوبر 1826ء بتائی گئی ہے۔ یہ رسالہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم نے دیکھا تھا۔ دوسرا رسالہ ''در تحقیق استغاثت'' بھی فارسی میں تھا اور فی الحال ناپید ہے۔

شاہ عبدالقادر دہلوی (1167ھ۔1230ھ)

شاہ عبدالقادر، شاہ ولی اللہ کے تیسرے بیٹے اور شاہ عبدالعزیز شاہ رفیع الدین سے چھوٹے تھے۔ آپ کی ولادت (1167ھ۔54-1753ء) میں ہوئی۔ اپنے برادر بزرگ شاہ عبدالعزیز اور شاہ محمد عاشق پھلتی سے درسیات کی تکمیل کی۔ شاہ عبدالعدل دہلوی سے باطنی نسبت حاصل کی۔

شاہ عبدالقادر نے عمر کا بیشتر حصہ مسجد اکبر آبادی کے ایک حجرے میں بسر کیا۔ توکل اور استغنا میں آپ نہایت ثابت قدم تھے۔ آپ کے علمی کارنامے تعداد میں زیادہ نہیں مگر اردو ترجمہ قرآن کو من جانب اللہ وہ مقبولیت حاصل ہوئی جو کسی دوسرے ترجمے کے حصے میں نہیں آئی۔ یہ ترجمہ ٹھیٹھ اردو میں ہے اور اس قدر عمدہ ہے کہ اسے بس شاہ صاحب کی کرامت ہی کہا جا سکتا ہے۔ ترجمہ قرآن کی خوبی یہ ہے کہ کوئی لفظ زائد استعمال نہیں کیا، جتنے الفاظ آیت قرآنی کے ہیں عموماً اتنے ہی لفظوں میں اس کا مفہوم ادا کر دیا ہے۔ اسلوب کے اعتبار سے بھی یہ ترجمہ ایسا ہے کہ عربی میں جس لفظ پر زور دیا گیا، ترجمہ میں بھی وہی آہنگ پیدا ہو گیا ہے۔ زبان ایسی سادہ اور دلنشین ہے کہ عوام اور خواص دونوں اسے سمجھ سکتے ہیں اور اس کی لطافت محسوس کر سکتے ہیں۔ شاہ صاحب نے محاورہ بندی کی کوشش نہیں کی، نہ اپنی انشا پردازی کا کمال دکھایا ہے، نہایت سادگی سے مفہوم کو پورا پورا ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ ہندی کے الفاظ بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ صرف چند مثالیں اس ترجمہ قرآن کی خوبی کو سمجھنے کے لئے کافی ہوں گی۔

آیت	حوالہ
وکلمة الله هی العلیا.	التوبہ 40
اور بول اللہ ہی کا بالا	

لست علیھم بمصیطر. الغاشیہ 22
تو نہیں ہے ان پر داروغہ
لترکبن طبقا عن طبق. الانشاق 19
تم کو چڑھنا ہے کھنڈ پر کھنڈ
ابصارھا خاشعہ. النازعات 9
ان کے تیور نوے ہیں
ائذا کنا عظا مانخرہ. النازعات 11
کیا جب ہم ہو چکے ہڈیاں کھوکھری
والوانھا غرابیب سود. الملائکہ 28
ان کے رنگ اور بھجنگ کالے
ومن النخل من طلعھا قنوان دانیہ. الانعام 99
کھجور کے گابھے میں سے گچھے لٹکتے ہیں
کل یعمل علے شاکلتہ. الاسرا 84
ہر کوئی کام کرتا ہے اپنے ڈول پر
اللہ الصمد. الاخلاص 2
اللہ نرادھار ہے
ولا نضیع اجراء المحسنین. یوسف 54
اور ہم ضائع نہیں کرتے نیگ بھلائی والوں کا
ان الابرار یشربون من کاس کان مزاجھا کافورا. الانسان 5
البتہ نیک لوگ پیتے ہیں پیالہ جس کی ملونی ہے کافور
فازلھما الشیطن. البقرہ 36
پس ڈگایا ان کو شیطان نے
واذ فرقنا بکم البحر. البقرہ 50
اور جب ہم نے چیرا تمہارے پیٹنے کے واسطے دریا
لاتجھرو الہ بالقول. الحجرات 2
اس سنے نہ بولو گہک کر
پہلی ہی مثال میں دیکھیے: و. کلمۃ. اللہ ھی. العلیا.
اور بول اللہ کا ہی بالا

عربی میں ضمیر ہی تاکید کے لئے استعمال ہوئی ہے، اردو میں وہی خاصیت ''ہی'' پیدا کر رہا ہے۔ یہاں کلمہ کے لئے ''بول'' سے اچھا، العلیا کے لئے ''بالا'' سے اونچا اور کوئی لفظ نہیں کھپ سکتا۔

اسی طرح فرماتے ہیں: اللہ الصمد اللہ نرادھار ہے۔ مفسروں نے صمد کا ترجمہ طرح طرح سے کیا ہے، عموماً بے نیاز کہتے ہیں، مگر صمد کا مفہوم بے نیاز سے قطعاً جداگانہ ہے۔ شاہ صاحب نے اس لفظ کا مفہوم بیان کرنے کے لئے ہندی کا نہایت مناسب مترادف استعمال کیا ہے۔

شاہ صاحب کی زبان نہایت مستند کھڑی بولی ہے اور یہ وہ زبان اور لہجہ ہے آج بھی مغربی یوپی میں جس کا چلن ہے۔ سہار، چوکس، سنوار، چنگا، گچھے، نیگ، ڈول، ڈھور، ناڑ، ڈھیٹ، جون سا، رجھانا، نبڑنا، رلنا، جھوجھل، گہکنا، جھنکنا، بکسنا، ریجھنا، کھدیڑنا۔

یہ ان ہزاروں الفاظ میں سے چند مثالیں ہیں جو عام گھروں کی روزمرہ بول چال کا حصہ ہیں۔ اس ترجمہ قرآن کی خوبیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے:

> ''مختلف مثالوں سے یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ شاہ صاحب کو عربی زبان و ادب کا جیسا صحیح ذوق اور قرآنی الفاظ کی روح اور طاقت اور منشا کے مطابق اردو کے الفاظ کے انتخاب میں جو کامیابی ہوئی ہے، اس کی نظیر کم سے کم ہندوستان میں نہیں ہے اور بعض مقامات پر وہ علامہ زمخشری اور راغب اصفہانی جیسے علمائے بلاغت و ائمہ لغت سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔ تائید الٰہی، اعلیٰ درجے کے اخلاص اور وہبی ادبی اور لسانی صحیح ذوق کے سوا کسی چیز سے اس کی توجیہ نہیں کی جاسکتی۔''
>
> (تاریخ دعوت و عزیمت۔ حصہ پنجم، ص386، حاشیہ)

اس ترجمہ کا نام عموماً ''موضح القرآن'' لکھا جاتا ہے مگر صحیح ''موضح قرآن'' (بدون الف لام) ہے۔ اس لئے کہ یہ نام تاریخی ہے۔ اس سے 1205ھ برآمد ہوتے ہیں جو تکمیل ترجمہ کا سال ہے۔(14)

یہ پہلی بار 1254ھ۔ 1838ء میں مطبع احمدی ہگلی سے شائع ہوا تھا۔ اب تک ''موضح قرآن'' کے بے شمار ایڈیشن نکل چکے ہیں اور یہ عام طور سے دستیاب ہیں۔

شاہ عبدالقادر کی ایک کتاب الصلوٰۃ (اردو) کا حوالہ حکیم سید عبدالحی رائے بریلوی نے اپنی کتاب ''الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند'' (طبع دمشق) میں دیا ہے۔

ممتاز تلامذہ

شاہ صاحب کے ممتاز تلامذہ میں شیخ عبدالحی بڈھانوی، شاہ محمد اسمٰعیل شہید، محمد رمضان مبمی شہید، مولانا فضل حق خیرآبادی، شاہ محمد اسحٰق دہلوی اور مفتی صدرالدین آزردہ جیسے جید علما ہوئے ہیں۔

شاہ صاحب مسجد اکبرآبادی میں عبادت اور ارشاد و ہدایت میں مشغول رہتے تھے۔ آپ کے لباس اور طعام کی کفالت شاہ عبدالعزیز کرتے تھے۔ انہیں چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر سے گہرا قلبی تعلق تھا، ان کی وفات کے بعد بھی بڑے

اہتمام سے ایصال ثواب کرتے تھے۔ ''ملفوظات عزیزی'' میں لکھا ہے:

''ایک دن شاہ صاحب اپنے بھائی مولوی عبدالقادر مرحوم کے عرس پر تشریف لے گئے اور باوجود مسافت بعیدہ کے پاپیادہ تشریف لے گئے اور واپسی میں سواری پر تشریف لائے اور پیروں کی قبروں کو ہاتھ سے بوسہ دیا، جن میں آپ کے والد ماجد اور جد امجد کی قبریں بھی شامل تھیں اور قرآن شریف اور فاتحہ سے فارغ ہو کر ایک خوش الحان سے فرمایا کہ مولانا روم کی مثنوی سے کچھ سناؤ۔ اس نے صدر جہاں کا قصہ سنایا۔ ایک مرید کو وجد آ گیا اور دوسرے مرید اور خلفا بھی اس سے متاثر ہوئے۔ اس مرید نے ایک نعرہ لگایا اور قریب تھا کہ گر جائے، حضرت نے اپنے پاس بلا کر توجہ دی۔ وہ مرید اپنا سر حضرت کے زانو پر رکھے ہوئے روتا رہا۔ اس مرید کے سر اور تاج (کلاہ) پر آپ کے قطران اشک اور لعاب دہن ٹپک گیا، اس مرید نے اس کلاہ کو تبرکاً محفوظ رکھ لیا۔ اس کے بعد مرید نے کہا حضرت اس وقت بندے کے لئے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو اپنے پیر کی محبت بہ درجہ احسن نصیب فرمائے اور جو کچھ ہے اس میں ترقی عطا فرمائے۔ آپ نے دعا فرمائی کہ مجھ کو اور تجھ کو خدا کی محبت زیادہ نصیب ہو۔''(15)

اولاد

شاہ عبدالعزیز کی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ ایک صاحبزادی زینب تھیں، جن کا عقد آپ کے بھتیجے شاہ مصطفیٰ فرزند شاہ رفیع الدین سے ہوا تھا۔ ان کے بطن سے صرف ایک صاحبزادی کلثوم پیدا ہوئیں جو مولانا محمد اسمٰعیل شہید کی زوجہ تھیں، ان کے فرزند محمد عمر (متوفی 1268ھ) تھے۔

آپ اپنی بیٹی اور برادر بزرگ شاہ عبدالعزیز سے ملنے کے لئے ہفتہ میں صرف ایک بار بدھ کے دن مسجد اکبر آبادی سے اپنے گھر جایا کرتے تھے۔

شاہ عبدالقادر کا انتقال 63 سال کی عمر میں چہارشنبہ 19 رجب 1230ھ (28 جون 1815ء) کو ہوا۔ اپنے خاندانی قبرستان (واقع مہندیان، دہلی) میں مدفون ہوئے۔

شاہ عبدالغنی دہلوی

شاہ ولی اللہ دہلوی کے (زوجہ ثانیہ سے) چوتھے اور سب سے چھوٹے صاحبزادے شاہ عبدالغنی تھے۔ یہ (1171ھ-58-1757ء) میں پیدا ہوئے۔ اپنے برادر بزرگ شاہ عبدالعزیز دہلوی اور شاہ رفیع الدین سے تعلیم حاصل کی، پھر مدرسۂ رحیمیہ میں درس دیتے رہے۔ سادہ مزاج، قانع اور متوکل تھے۔ شکل اور لباس میں اپنے والد بزرگوار سے بہت مشابہ تھے۔ فقہ وحدیث میں اچھی نظر رکھتے تھے۔ سب بھائیوں کا انتقال عکسی ترتیب سے ہوا یعنی سب سے چھوٹے (شاہ عبدالغنی) پہلے فوت ہوئے اور سب سے بڑے (شاہ عبدالعزیز) نے آخر میں وفات پائی۔

شاہ عبدالغنی کا عقد شیخ علاالدین پھلتی کی صاحبزادی فاطمہ سے ہوا تھا۔ شاہ محمد اسمٰعیل شہید بالاکوٹ (ولادت: 1193ھ۔1779ء، شہادت: 1246ھ۔1831ء) آپ کے فرزند تھے۔ ایک صاحبزادی رقیہ شاہ محمد اسمٰعیل سے بڑی تھیں۔ دوسری صاحبزادی ام کلثوم شاہ صاحب سے چھوٹی تھیں۔ بی بی رقیہ کا عقد شیخ علاالدین پھلتی کے پوتے شیخ کمال الدین سے ہوا تھا۔ ان کا انتقال ہو گیا تو شاہ محمد اسمٰعیل نے نکاح بیوگان کی تحریک کے دوران ان کا دوسرا عقد مولوی عبدالحیٰ بڈھانوی سے کر دیا تھا۔ (16)

دوسری صاحبزادی ام کلثوم صاحب اولاد تھیں اور 1311ھ۔1893ء تک ان کی صاحبزادیوں کے بہ قید حیات ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ (17) شاہ اسمٰعیل شہید کی اہلیہ بھی ام کلثوم تھیں، وہ شاہ رفیع الدین کی پوتی اور شاہ عبدالقادر کی نواسی تھیں۔ حضرت شاہ محمد اسمٰعیل کی والدہ نے 1822ء میں سفر حج کے دوران وفات پائی۔

شاہ عبدالغنی نے عین عالم شباب میں 16 / رجب 1203ھ (12 / اپریل 1789ء) کو دہلی (18) میں انتقال کیا اور اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے۔

✦ ..... ✦ ..... ✦
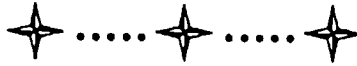
حواشی

(1) تفسیر سورۂ فاتحہ کا ایک مخطوطہ (اوراق 18 مسطر 24 کاتب سراج الدین اجمیر) ٹونک مین ہے۔

(2) نعیم الدین ساکن پردلی پرگنہ ڈھاگا جلال پور نے لکھا ہے: ''1229ھ میں خاکسار مرزا پور (بنارس) سے شاہ جہاں آباد دہلی حاضر ہوا اور حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہو کر شرف بیعت حاصل کیا اور چند ضروری سوالات جو عرصے سے قلب میں تھے، حضرت کی خدمت میں پیش کر کے جواب حاصل کیے.....'' یہ رسائل 1258ھ میں الطاف علی کاتب نے نقل کیے ہیں۔

(3) دیکھیے، عبدالحیٰ: الثقافتہ الاسلامیہ 159۔ قاموس الکتب 174

(4) ملفوظات کا ایک قلمی نسخہ جس کی نقل 29 / جمادی الثانیہ 1294ھ۔11 / جولائی 1877ء کو محمد عطا علی نے تمام کی جواہر میوزیم اٹاوہ کے ذخیرۂ مخطوطات میں ہے جو اب مولانا آزاد لائبریری (علی گڑھ) میں محفوظ ہے۔ مولانا فریدی مرحوم نے ملفوظات کے مطبوعہ نسخے سے اس کا مقابلہ ایک چوتھائی حصے کے بقدر کیا ہے تو ان کا بیان ہے کہ مطبوعہ نسخے میں بہت سی غلطیاں پائی گئی ہیں۔ اس کا اعتراف قاضی بشیر الدین میرٹھی مرحوم نے مقدمہ ملفوظات میں کیا بھی ہے۔ اردو ترجمہ کراچی سے شائع ہوا۔ وہ کہیں غلط در غلط اور بعض مواقع پر مضحکہ خیز ہو گیا ہے۔

(5) ملفوظات شاہ عبدالعزیز (فارسی) ص 40 (مطبع مجتبائی میرٹھ 1334ھ)

(6) محمود احمد برکاتی: شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان، ص 158 (لاہور 1974ء)

(7) برکاتی: 159

(8) برکاتی: 160

(9) رحیم بخش: حیات ولی، ص 346

کتب خانہ قاضی بدر الدولہ مدراس میں ایک ''رسالہ در بیان قیامت'' (ورق 40، رقم 373) شاہ رفیع الدین کے نام سے ملتا ہے، اس کا دوسرا نسخہ (رقم 376) 14 ربیع الاول 1247ھ کا مکتوبہ ہے، اس میں 112 ورق ہیں۔

اسی طرح ''شرح الصدر فی شرح حال الموتی والقبر'' للسیوطی کا اردو ترجمہ ''قصر الآمال بذکر حال المآل'' (ورق 179) 1214ھ کا مکتوبہ بھی شاہ رفیع الدین سے منسوب ہے، اس کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں بھی ہے۔ (کلام فارسی 175) آصفیہ میں ایک رسالہ ''تطبیق التواریخ'' رفیع الدین دہلوی کے نام سے موجود ہے (منطق فارسی 11) (تصوف فارسی 887) میں ایک مخطوطہ ''رسائل شاہ رفیع الدین'' بھی قابل ذکر ہے۔

(10) مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے لکھا ہے: ''شاہ رفیع الدین کے چار لڑکے مولوی موسیٰ، مولوی عیسیٰ، مولوی مخصوص اللہ، مولوی حسن جان ہوئے۔'' انہوں نے محمد مصطفیٰ اور محمد حسین کا نام نہیں لیا۔ مولوی حسن جان غالباً مولوی محمد حسن کو لکھا ہے۔ (تذکرہ شاہ ولی اللہ۔ ص 300، کراچی 1968ء)۔ ''حیات ولی'' ص 348 میں بھی یہی بات آئی ہے۔ مولانا گیلانی کا ماخذ یہی کتاب ہے مگر صحیح کیا ہے یہ ہم نے خاندان کے انساب کی تحقیق کرتے ہوئے شروع میں ہی ظاہر کر دیا ہے۔

(11) یہ صاحبزادے اردو کے شاعر بھی تھے۔ تحیر تخلص تھا۔ شاعری میں حکیم ثناء اللہ فراق سے مشورہ کرتے تھے۔ (خویشگی: تذکرہ ہمیشہ بہار صفحہ 94) قطب الدین باطن نے ان کا نام غلام مصطفیٰ لکھا ہے۔ (نغمۂ عندلیب۔ ص 53) غالباً ان کا نام عبدالرحمٰن بھی تھا۔ یہ شاہ عبدالقادر کے داماد اور شاہ محمد اسمٰعیل کے خسر تھے۔

(12) سید احمد ولی اللٰہی نے ''یادگار دہلی'' (مطبع احمد دہلی 1905ء) میں لکھا ہے کہ مولوی مخصوص اللہ کی نشست اکثر مسجد روشن الدولہ (دریا گنج) میں رہتی تھی۔ (روشن الدولہ ظفر خاں)

شاہ بھیکھ (1131ھ۔1719ء) کا مرید تھا، اس کی قبر درگاہ خواجہ باقی اللہ میں ہے۔

(13) حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (ف 1317ھ۔ 1899ء) نے ابتدائے حال میں ان سے طریق نقشبندیہ میں بیعت کی تھی، مگر زیادہ استفادہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ یہ خود شاہ محمد آفاق مجددی کے خلیفہ اور مرید اور شاہ رفیع الدین کے نواسے تھے۔ ان کے مکتوبات کا ایک مجموعہ ٹونک میں محفوظ ہے۔

شاہ عبدالعدل نقشبندی (ولادت 1120ھ۔9-1708ء) خواجہ محمد ناصر اور خواجہ محمد زبیر مجددی (ولادت: 5 نومبر 1682ء۔ وفات: 12 فروری 1739ء) سے فیض یافتہ تھے۔ خواجہ محمد ناصر کو شاہ سعد اللہ المعروف بہ شاہ گلن قدس سرہ سے بیعت تھی۔ شاہ عبدالقادر کو خواجہ میر درد دہلوی (ف 1199ھ۔ 1784ء) سے بھی فیض ملا تھا۔ شاہ عبدالعدل کی وفات 1204ھ۔ 1789-90ء میں ہوئی۔ درگاہ خواجہ باقی باللہ میں مزار ہے۔ (احمد سعید: تاریخ اولیائے دہلی 1354ھ۔ صوفی محمد حسین: انوار العارفین۔ مطبع نولکشور لکھنؤ سنہ ندارد)

(14) حکیم محمود احمد برکاتی کا بیان ہے: ''مولوی سید شاہجہاں داماد میاں نذیر حسین نے 1307ھ میں اس میں اضافات کر کے شائع کیا۔ چنانچہ مولوی ظہیر الدین احمد ولی اللٰہی نے ''انفاس العارفین'' کے آخر میں اس خاندان کی جن جعلی کتابوں کی نشاندہی کی ہے ان میں ''تحفۃ الموحدین''، ''البلاغ المبین'' اور ''تفسیر مولانا شاہ عبدالقادر المعروف بہ موضح القرآن'' بھی ہے۔''
(شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان ص 125-124۔ نیز دیکھئے مقدمہ ''القول الجلی'' از شاہ ابوالحسن زید فاروقی۔ ص 9)

✦ ..... ✦ ..... ✦
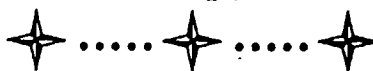
ڈاکٹر محمد ایوب قادری

الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف

(شاہ ولی اللہ دہلوی کی خود نوشت سوانح عمری)

(شاہ ولی اللہ بن شاہ عبدالرحیم دہلوی نے اپنے حالات میں ایک مختصر سا رسالہ ''الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف'' فارسی زبان میں لکھا ہے۔ یہ رسالہ شاہ صاحب کی کتاب ''انفاس العارفین'' کے آخر میں شامل ہے جو شاہ صاحب کے بزرگوں، اساتذہ اور مشائخ کے حالات کا ایک مفصل تذکرہ ہے۔ ''انفاس العارفین'' میں مندرجہ ذیل سات رسالے شامل ہیں:

1- بوارق الولایت (حالات شاہ عبدالرحیم دہلوی، والد)
2- شوارق المعرفت (حالات شاہ ابوالرضاء دہلوی، تایا)
3- امداد فی مآثر الاجداد (حالات شیخ وجیہہ الدین، دادا)
4- النبذہ الابریزیہ فی اللطیفتہ العزیزیہ (حالات شیخ عبدالعزیز دہلوی، شاہ عبدالرحیم کے پرنانا)
5- العطیتہ الصمدیہ فی الانفاس المحمدیہ (حالات شیخ محمد پھلتی، نانا)
6- انسان العین فی مشائخ الحرمین (حالات مشائخ حرمین)
7- الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف (خود نوشت حالات)

الجزء اللطیف، دوسرے مجموعۂ رسائل کے ساتھ بھی مطبع احمدی دہلی سے طبع ہوا ہے۔ اس رسالہ کا انگریزی ترجمہ مولوی محمد ہدایت حسین نے اپنے ایک مضمون

Persian autograply of Shah Wali-Ullah to Abdur-Rahim Dehlave-its English Translation and a list of his works.

کے عنوان سے ''جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) (جلد ہشتم 1912ء) میں شائع کیا ہے اور 'الجزء اللطیف' کا عربی ترجمہ مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب نے کیا ہے جو شاہ صاحب کی تالیف 'الفوز الکبیر فی اصول التفسیر' کے ساتھ بطور ضمیمہ شائع ہوا ہے۔ اس پر مولانا عطاء اللہ صاحب نے مختصر مفید حواشی لکھے ہیں۔ 'الجزء اللطیف' کا اردو خلاصہ مولانا محمد منظور نعمانی نے

اپنے ایک مضمون ''حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے کام کا مختصر تعارف'' میں شامل کیا ہے جو ''الفرقان'' (بریلی 1940ء) کے شاہ ولی اللہ نمبر میں شائع ہوا ہے (1)۔ ''الجزاللطیف فی ترجمۃ العبدالضعیف'' کا مکمل اردو ترجمہ مع ضروری حواشی شائع کیا جا رہا ہے۔ مترجم)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ الذی بدابالنعم قبل استحقا قھا و خص من شاء بمعرفۃ الاسماء واذ واقھا والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد المتحلیٰ بتیجان الکرامات و اطواقھا المکرم بضوف العطیات واطباقما و علیٰ الہ واصحابہ الذین بھم قیام الملۃ و رواج اسواقھا. امابعد

(اللہ تعالیٰ کے واسطے تعریف کہ جس نے استحقاق سے قبل نعمتیں شروع کیں اور جس کو چاہا اپنے ناموں کی معرفت اور ان کے ذوق سے مخصوص کر دیا اور صلوٰۃ والسلام سیدنا محمد (ﷺ) پر جو کرامات کے تاجوں اور اس کے ہاروں سے آراستہ کیے گئے اور ان کو مختلف عطیات اور درجات سے معزز کیا۔ اور (صلوٰۃ وسلام) ان کی اولاد اور اصحاب پر ہو کہ جن سے ملت کا قیام اور اس کے طریقوں کا رواج ہے۔)

اس کے بعد فقیر (2) ولی اللہ بن عبدالرحیم (3) غفراللہ لہ، ولوالدیہ واحسن الیھما والیہ (اللہ اس کو اور اس کے والدین کو بخشے اور ان دونوں (والدین) اور اس کی طرف اچھائی کرے) کہتا ہے کہ یہ چند کلمے ہیں کہ جن کا نام ''الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبدالضعیف'' رکھا، جاننا چاہیے کہ اس فقیر کی ولادت بدھ کے دن، سورج نکلنے کے وقت 14 رشوال 1114ھ (4) کو ہوئی۔ (5)

بعض منجمین نے علم نجوم کی بنا پر حکم لگایا کہ میری پیدائش کے وقت حوت کا درجہ دوم، طالع میں تھا اور شمس بھی اس درجہ میں تھا اور مشتری پندرہویں درجے میں اور وہ سال علوئین کے قران کا سال تھا اور وہ (قران) درجہ اول میں تھا اور مریخ اس سے دوسرے درجہ میں اور راس سرطان تھا، واللہ اعلم بالصواب۔ (6)

بعض دوستوں نے تاریخ (پیدائش) ''عظیم الدین'' سے نکالی ہے (7) ماں باپ، قدس اللہ تعالیٰ سرہما (اللہ تعالیٰ ان دونوں کی خاک کو مقدس رکھے) اور صالحین کی ایک جماعت نے اس فقیر سے متعلق پیدائش سے پہلے اور اس کے بعد بعض بشارتیں پائیں (8) چنانچہ ایک عزیز ترین بھائی اور خاص دوست نے ان واقعات کی تفصیل دوسرے واقعات کے ساتھ ایک رسالہ میں قلم بند کی ہے اور اس رسالہ کا نام ''قول جلی'' رکھا ہے۔ (9)

جزاہ اللہ خیر الجزاء و احسن الیہ والی اسلافہ و اعقابہ وادخلہ الی مایتمناہ من دینہ و دنیاہ.

(اللہ اسے اچھا بدلہ دے اور اس کے، اس کے اسلاف اور اس کی پیروی کرنے والوں کے ساتھ نیکی کرے اور دین و دنیا میں سے اس چیز میں داخل کرے جس کی وہ تمنا کرے۔)

جب پانچواں سال ہوا تو میں مکتب میں بیٹھا(10) اور ساتویں سال میں والد بزرگوار نے نماز شروع کرائی اور روزہ رکھنے کا حکم دیا اور اسی سال ختنہ ہوا اور میرے خیال میں ایسا ہے کہ اس سال کے آخر میں مَیں نے قرآن عظیم ختم کیا۔ فارسی کتابیں اور ابتدائی عربی کتابیں پڑھنی شروع کیں اور دسویں سال میں شرح مُلا پڑھتا تھا اور ایک حد تک مطالعہ کی راہ کھل گئی۔

چودھویں سال میں شادی ہوگئی اور اس سلسلہ میں والد بزرگوار کو بہت جلدی تھی۔ جب سسرال والوں نے اسباب کے مہیا نہ ہونے کا عذر کیا تو والد بزرگوار نے ان لوگوں کو لکھا کہ (اس) عجلت میں ایک راز ہے اور وہ راز بعد کو ظاہر ہوگیا کہ شادی کے بعد جلد ہی میری بیوی(11) کی والدہ فوت ہوگئیں اور اس کے بعد جلد ہی میری بیوی کے نانا اور اس کے بعد جلد ہی شیخ فخر العالم ابوالرضا(12) کے صاحبزادے فوت ہوگئے اور اس کے بعد ہی اس فقیر کے بڑے بھائی شیخ صلاح الدین کی والدہ انتقال کرگئیں۔(13)

اس کے بعد ہی والد بزرگوار بہت ضعیف ہوگئے اور مختلف بیماریوں نے ان پر غلبہ کرلیا اور اس کے بعد ان کی وفات کا واقعہ پیش آیا۔ غرض کہ بزرگوں کی یہ جماعت منتشر ہوگئی اور خاص و عام کو معلوم ہوگیا کہ اگر اس زمانے میں شادی نہ ہوتی تو اس کے بعد کئی سال تک امکان نہ ہوتا کہ یہ بات (شادی) ہوتی۔

میں پندرہ سال کا تھا کہ والد بزرگوار سے بیعت کی اور صوفیہ کے اشغال، خاص طور سے نقشبندیہ مشائخ کے اشغال میں مشغول ہوا۔ ان کی توجہ، تلقین اور آداب طریقت کی تعلیم اور خرقہ صوفیہ پہن کر میں نے اپنی نسبت درست کی۔

اسی سال بیضاوی کا ایک حصہ پڑھا۔ والد بزرگوار نے کھانے کا بہت اہتمام کیا اور خاص و عام کی ضیافت کی اور (اس موقعہ پر) درس کی اجازت دی۔ غرض کہ اس ملک کے رواج کے مطابق فنون متعارفہ سے پندرہ سال میں فراغ حاصل کیا۔

علم حدیث میں مشکوٰۃ کو پورا پڑھا لیکن کتاب البیع سے کتاب الآداب تک چھوڑ دی اور اس سب کی اجازت مل گئی۔ صحیح بخاری کا ایک حصہ کتاب الطہارت تک پڑھا۔ تمام شمائل النبی والد بزرگوار سے سماع کی۔ کم و بیش اس کو پڑھا۔ علم تفسیر میں کچھ حصہ تفسیر بیضاوی کا اور کچھ حصہ تفسیر مدارک کا پڑھا۔

اس ضعیف پر سب سے بڑا احسان (اللہ تعالیٰ) کا یہ تھا کہ میں نے چند مرتبہ مدرسہ میں والد بزرگوار کی خدمت میں قرآن عظیم، معانی اور شان نزول کو سمجھتے ہوئے اور تفاسیر کی کتابوں کی طرف رجوع کرتے ہوئے پڑھا اور یہ طریقہ فتح عظیم کا سبب ہوا، والحمدللہ۔

علم فقہ میں شرح وقایہ اور ہدایہ دونوں کتابیں تھوڑے حصہ کے سوا پوری پڑھیں۔ اصول فقہ میں حامی اور توضیح تلویح کا کسی قدر حصہ پڑھا اور منطق میں مکمل شرح شمسیہ، شرح مطالع کا کچھ حصہ، کلام میں شرح عقائد اور خیالی کا کچھ حصہ اور شرح مواقف کا کچھ حصہ اور سلوک میں عوارف کا کچھ حصہ اور کچھ رسائل نقشبندیہ (14) وغیرہ، حقائق میں شرح رباعیات مولانا جامی دلوائح۔ مقدمہ شرح لمعات، مقدمہ نقد النصوص، خواص اسماء و آیات میں والد بزرگوار کا خاص مجموعہ، جس کی انہوں نے چند مرتبہ اجازت دی، طب میں موجز القانون، حکمت میں شرح ہدایۃ الحکمۃ وغیرہ، نحو میں کافیہ و شرح ملا، معانی

میں مطول کا بڑا حصہ، مختصر معانی اس قدر پڑھی جس پر ملا زادہ کا حاشیہ ہے۔ ہندسہ وحساب میں بعض مختصر رسالے پڑھے اور اس عرصہ میں ہر فن کے متعلق خاص خاص نکتے ذہن میں آتے تھے اور جتنی کوشش کی جاتی تھی اس سے زیادہ مقصد حاصل ہوجاتا تھا۔

فقیر سترہویں سال میں تھا کہ والد بزرگوار بیمار ہوگئے اور اس مرض میں ان کا انتقال ہوگیا(15) اور مرض موت میں انہوں نے (مجھے) اجازت بیعت وارشاد دی اور کلمہ ''یدہ کیدی'' (اس کا ہاتھ میرے ہاتھ کی طرح ہے) مکرر فرمایا۔

سب سے بڑی نعمت جو سمجھنی چاہیے، وہ یہ ہے کہ والد بزرگوار اس فقیر سے بہت رضامند رہے اور نہایت رضامندی میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی توجہ اس فقیر پر ایسی تھی کہ باپوں کو بیٹوں پر ایسی توجہ نہیں ہوتی ہے اور میں نے کسی باپ، کسی استاد اور کسی مرشد کو نہیں دیکھا کہ وہ بیٹے اور شاگرد کے ساتھ ایسی خاص شفقت برتے جیسی کہ والد بزرگوار نے مجھ فقیر کے ساتھ برتی۔

اللھم اغفرلی ولوالدی وارحمھا کما ربیانی صغیرا وجاز ھما بکل شفقتہ و رحمتہ و نعمتہ مھیماً علی مائۃ الف اضعا فھا انک قریب مجیب.

(اے پروردگار! میری اور میرے والدین کی مغفرت فرما۔ اور ان پر رحم فرما، جیسے کہ انہوں نے مجھے بچپن میں پالا اور ان کی ہر شفقت، رحمت اور نعمت کا انہیں ہزار دو ہزار گنا اجر عطا کرے۔ بے شک تو نزدیک اور دعا قبول کرنے والا ہے۔)

والد بزرگوار کے انتقال کے بعد کم وبیش بارہ برس کتب دینیہ وعقلیہ کے درس میں مستقل مشغول رہا اور ہر علم میں مہارت حاصل ہوگئی۔ جب میں (والد بزرگوار کی) قبر مبارک پر توجہ کرتا تھا اس زمانے میں توحید کے راز کھل جاتے تھے۔ جذب کا راستہ کشادہ ہوتا اور سلوک کا ایک بڑا حصہ میسر آتا اور علوم وجدانیہ خوب خوب حاصل ہوتے تھے۔

مذاہب اربعہ اور اصول فقہ کی کتابوں اور وہ احادیث جو اس سلسلہ میں مددگار ہیں، ان کے ملاحظہ کے بعد غیبی روشنی کی مدد سے فقہائے محدثین کی روش مجھے پسند آئی اور ان بارہ سال کے بعد مجھے حرمین کی زیارت کا شوق ہوا اور 1143ھ کے آخر میں حج سے مشرف ہوا۔ 1144ھ میں مکہ معظمہ میں قیام، مدینہ منورہ کی زیارت اور شیخ ابوطاہر قدس سرہ(16) وغیرہ مشائخ حرمین محترمین سے روایت حدیث کی سعادت حاصل کی۔(17)(18)

اسی دوران میں حضرت سید البشر علیہ افضل الصلوٰۃ واتم التحیات کے روضہ منورہ کی طرف متوجہ ہوا اور بہت فیوض حاصل کیے اور حرمین کے رہنے والے علماء وغیرہ سے مختلف صحبتیں رہتی تھیں اور شیخ ابوطاہر سے جامع خرقہ پہنا جو صوفیوں کے تمام سلاسل کے خرقوں کا جامع تھا۔ اس سال کے آخر میں حج ادا کیا۔ 1145ھ کے شروع میں وطن کے لئے روانہ ہوا۔ بروز جمعہ 14/رجب 1145ھ کو صحت وسلامتی کے ساتھ وطن پہنچا۔

واما بنعمۃ ربک فحدث.

(اور اپنے رب کی نعمت کا شکر ادا کر۔)

سب سے بڑی نعمت فقیر پر یہ ہے کہ اس کو خلعت فاتحیہ عطا فرمائی اور اس آخری زمانے کی کشود کار میرے سپرد

کردی اور رہنمائی کو فقہ میں جو پسندیدہ ہے‘ اس کو جمع کر کے فقہ حدیث کی از سر نو بنیاد رکھی جائے۔ حدیث کے اسرار، احکام کی مصلحتیں، ترغیبات اور جو کچھ حضرت پیغامبر ﷺ خدا تعالیٰ سے لائے تھے‘ اس کی تعلیم دی جائے۔ وہ ایک ایسا فن ہے کہ اس فقیر سے پہلے فقیر سے زیادہ مرتب طریقہ پر کسی نے اس کو قلم بند نہیں کیا۔ حالانکہ وہ ایک جلیل القدر فن تھا اور اگر کسی کو اس بات میں شک ہو تو اس سے کہو کہ وہ کتاب ''قواعد کبریٰ'' کو دیکھے کہ شیخ عزالدین نے اس میں کس قدر کوشش کی ہے اور پھر بھی اس فن کے عشر عشیر سے بھی عہدہ برآ نہ ہو سکے۔

طریقۂ سلوک جو حق تعالیٰ کا پسندیدہ ہے اور اس زمانے میں اس کا نفاذ ہونا چاہیے، وہ (مجھے) الہام فرمایا۔ اس کو میں نے دو رسالوں میں مرتب کیا ہے۔ ان رسالوں کا ''لمعات'' اور ''الطاف القدس'' نام رکھا ہے[19] اور قدمائے اہل سنت کے عقائد کو دلائل اور حجت سے ثابت کیا ہے اور ان کو معقولیوں کے شبہات کے خس و خاشاک سے پاک کیا اور اس طرح ثابت کر دیا کہ اب بحث کا موقعہ نہیں رہا۔

علم کمالات۔ جس میں چار لفظ، ابداع، خلق، تدبیر اور تدلی کے معنی دیئے ہیں اور جو اس دنیا کے عرض و طول میں پائے جاتے ہیں اور انسانوں کے نفوذ کی استعداد کا علم کہ وہ کیونکر کامل ہوتا ہے اور اس کا انجام کیا ہوتا ہے، فقیر پر واضح کر دیا ہے اور یہ دونوں علم (علم کمالات و علم استعداد) بہت اہم ہیں کہ فقیر سے پہلے کوئی ان علوم تک نہیں پہنچا ہے۔

حکمت عملی کہ جس کے ذریعہ سے اس زمانے کی درستی ہو سکتی ہے، پوری وسعت کے ساتھ مجھے بخشی گئی ہے اور اس کو مضبوط کرنے کی توفیق، قرآن، سنت اور آثار صحابہ سے مجھے دی گئی اور رسول اللہ ﷺ سے جو علم دین منقول ہے اور جو اس میں داخل کر دیا گیا ہے یا اس میں تحریف کر دی گئی ہے اور جو کچھ سنت یا بدعت ہے اس کی شناخت مجھے بخشی گئی ہے[20]۔

ولوان لی فی کل منسبت شعرة لسانا لما استوفیت واجب حمده والحمدللہ رب العالمین.

(اور اگر اللہ میرا ہر بُنِ مُو زبان بن جائے تو بھی میں خدا کی حمد اس کے حق کے بموجب نہ کر سکتا اور تمام تعریف اللہ ہی کے لئے ہے، جو دونوں جہانوں کا پالنے والا ہے۔)

(الرحیم (حیدر آباد سندھ) اکتوبر 1964ء، ص 18-26، نیز رک: ''انفاس العارفین'' ترجمہ سید محمد فاروق القادری)

✦ ..... ✦ ..... ✦

حواشی

(1) پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ''شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات'' میں اردو خلاصہ کو نقل کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو ''شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات'' مرتبہ خلیق احمد نظامی۔ ص 179 تا 185 'علی گڑھ 1950ء

(2) شاہ صاحب کے ''ولی اللہ'' نام کی بجائے ''قطب الدین احمد'' نام بھی تھا کیونکہ شاہ عبدالرحیم کو خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے ان کے تولد کی بشارت دی تھی۔ ملاحظہ ہو انفاس العارفین (بوارق الولایت) ص 44-45 (مطبع مجتبائی دہلی 1335ھ) و تفہیمات الٰہیہ جلد دوم ص 1542 (مجلس علمی ڈابھیل 1355ھ اور شاہ صاحب نے اپنی اکثر تالیفات میں اپنا نام ''احمد'' بھی لکھا ہے۔

(3) شاہ عبدالرحیم دہلوی کی پیدائش 1054ھ۔1644ء اور وفات: 12رصفر 1131ھ۔1718ء کو ہوئی۔ شاہ عبدالرحیم کے حالات میں شاہ ولی اللہ نے ایک فارسی رسالہ ''بوارق الولایت'' لکھا ہے جو ''انفاس العارفین'' میں شامل ہے۔ نیز دیکھیے تذکرہ علمائے ہند (رحمان علی) مرتبہ ومترجمہ محمد ایوب قادری۔ ص 296 (پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی 1961ء)

(4) 4رشوال 1114ھ مطابق 10رفروری 1703ء (ملاحظہ ہو تقویم عیسوی وہجری مرتبہ ابوالنصر خالدی ص 562 (انجمن ترقی اردو کراچی 1954ء)

(5) شاہ ولی اللہ کی پیدائش ان کی ننھیال موضع پھلت ضلع مظفر نگر، یوپی (انڈیا) میں ہوئی۔

(6) اس بیان کی روشنی میں شاہ ولی اللہ دہلوی کا زائچہ مرتب ہوا ہے۔ یہ زائچہ پروفیسر حبیب اللہ خان غضنفر صاحب نے مرتب فرمایا ہے۔

(7) عظیم الدین سے ''1115ھ'' برآمد ہوتے ہیں۔

(8) شاہ ولی اللہ دہلوی کی پیدائش سے متعلق بعض بشارات ''بوارق الولایت'' میں موجود ہیں۔ ملاحظہ ہو 44-45 وغیرہ۔

(9) شاہ ولی اللہ دہلوی کے حالات کے متعلق یہ اہم دستاویز ہے جسے شیخ محمد عاشق پھلتی نے مرتب کیا ہے۔ افسوس کہ یہ کتاب کہیں دستیاب نہیں ہے۔ ''حیات ولی'' کے مؤلف حافظ رحیم بخش دہلوی کو بھی نہ مل سکی البتہ ''تذکرۂ علمائے ہند'' کے مؤلف مولوی رحمان علی کے پیش نظر تھی اور انہوں نے اپنے مآخذ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ (تذکرۂ علمائے ہند، ص 556)

(10) پانچویں سال میں مروجہ رسم کے مطابق تسمیہ خوانی ہوتی ہے۔

(11) شاہ ولی اللہ کا عقد شیخ عبیداللہ بن محمد پھلتی کی صاحبزادی کے ساتھ ہوا تھا جو شاہ صاحب کے ماموں تھے۔ شیخ محمد پھلتی کے حالات میں شاہ ولی اللہ دہلوی نے ایک رسالہ ''العطیۃ الصمدیہ فی الانفاس المحمدیہ'' لکھا ہے جو ''انفاس العارفین'' میں شامل ہے اور علیحدہ بھی ''خمسہ رسائل'' کے ساتھ طبع ہو چکا ہے۔

(12) شیخ ابوالرضا، شاہ ولی اللہ دہلوی کے تایا تھے جن کا 17رمحرم 1101ھ کو انتقال ہوا۔ ان کے حالات میں شاہ ولی اللہ نے ایک رسالہ

''شوارق المعرفت'' لکھا ہے جو''انفاس العارفین'' میں شامل ہے۔

(13) شیخ صلاح الدین، شاہ عبدالرحیم کی پہلی بیوی سے تھے۔ دوسری بیوی سے شاہ ولی اللہ اور شاہ اہل اللہ دہلوی پیدا ہوئے۔

(14) ان رسائل نقشبندیہ کے نام نہیں بتائے۔ القلۃ الوضیہ فی النصیحہ والوحیہ میں بھی رسائل نقشبندیہ ہی لکھا ہے۔ حضرات کبرائے نقشبندیہ کا ایک مجموعہ چھپتا رہا ہے جس میں چھ رسالے شامل ہیں۔ ممکن ہے یہ مجموعہ ہو۔ اس مجموعہ میں مندرجہ ذیل چھ رسالے شامل ہیں:

(i) رسالہ انفاس نفیسہ از خواجہ عبیداللہ احرار۔ (ii) رسالہ خواجہ عزیزاں۔ (iii) رسالہ انسیہ از مولانا یعقوب چرخی۔ (iv) رسالہ قدسیہ از حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندیہ نوشتہ خواجہ محمد پارسا۔ (v) رسالہ نور وحدت از خواجہ عبیداللہ معروف بہ خواجہ خرد فرزند خواجہ باقی باللہ۔ (vi) رسالہ پرتو عشق از خواجہ خرد۔ ہمارے پیش نظر یہ مجموعہ مطبع مجتبائی دہلی 1934ء کا مطبوعہ ہے۔

(15) شاہ عبدالرحیم کا انتقال 12/صفر 1131ھ بروز بدھ ہوا۔ (بوارق الولایت' ص 85)

(16) شیخ ابو طاہر المتوفی رمضان 1145ھ۔ حالات کے لئے ملاحظہ ہو''انسان العین فی مشائخ الحرمین'' ص 14 (مجموعہ خمسہ رسائل شاہ ولی اللہ دہلوی مطبع احمدی دہلی، سال طباعت نامعلوم)

(17)(18) شاہ ولی اللہ دہلوی نے حرمین شریفین میں ان مشائخ ومحدثین سے استفادہ فرمایا اور اجازت وسند حاصل کی۔ ان کے حالات ایک رسالہ''انسان العین فی مشائخ الحرمین'' میں لکھے۔ یہ رسالہ''انفاس العارفین'' میں شامل ہے اور''مجموعہ خمسہ رسائل شاہ ولی اللہ دہلوی'' میں طبع ہوا ہے۔ اس رسالہ میں شیخ احمد شناوی، شیخ احمد قشاشی، سید محمد بن علوی، شمس الدین محمد بن العلاء البابلی، شیخ عیسیٰ الجعفری المغربی، محمد بن محمد بن سلیمان، شیخ حسن عجمی، شیخ احمد نخلی، شیخ عبداللہ بن سالم البصری، شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم الکردی اور شیخ تاج الدین قلعی حنفی کے حالات شامل ہیں۔

(19) شاہ ولی اللہ دہلوی کے دونوں مشہور ومعروف رسالے ہیں۔ متعدد مرتبہ چھپ چکے ہیں۔''لمعات'' کو شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد نے مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کے مقدمہ وتصحیح کے ساتھ ابھی حال میں شائع کیا ہے۔

(20) شاہ ولی اللہ دہلوی کا وصال 29/محرم 1176ھ (20/اگست 1762ء) بروز جمعہ دہلی میں ہوا اور آپ مہندیوں کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

شاہ ولی اللہ کی ایک خودنوشت تحریر: ایک جائزہ

اپنے شاگرد شیخ پیر بلگرامی کے سلسلہ میں

اطلاعاً عرض ہے کہ بخاری شریف کا مطلوبہ نسخہ خدا بخش لائبریری (پٹنہ) میں موجود ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنے شاگرد اور کاتب نسخہ محمد بن شیخ پیر بلگرامی کے لئے اپنے ہاتھ سے سند اجازت تحریر فرمائی (ورق ب 375 تا الف 379)۔ عبارت طویل ہے اس لئے خاص خاص جگہوں سے نقل کی جارہی ہے:

"الحمد لله الذی بنعمة تتم الصالحات ...... الشیخ محمد بن شیخ پیر ...... قرا علی الجامع الصحیح ...... وقرا علی ایضا اطرافاً من سائر الکتب السته ...... فاجزت له ان یروی عنی هذه الکتب کلها ...... کتبه بیده الفقیر الی رحمة الله الکریم الودود الله احمد بن عبدالرحیم ...... العمری نسبا الدهلوی وطنا الاشعری عقیده والصوفی طریقه الحنفی عملا والحنفی والشافعی تدریسا ...... وکان ذلك یوم الثلاث والثالث والعشرون من الشوال سنه 1159."

شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے کی یہ تحریر اس کے بعد موجود ہے:

"این خط والد بزرگوار است بے شبہ کتبہ الفقیر محمد رفیع الدین۔"

اس مخطوطے میں محمد ناصح کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف نے شاہ عالم کے حکم سے 1184ھ میں اس خطی نسخے کی تصحیح کی اور اعراب لگائے۔

(بحوالہ خدا بخش لائبریری جرنل (پٹنہ)، شمارہ 102 ص 408، 1995ء)
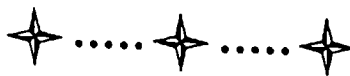
✦ ..... ✦ ..... ✦

مسعود انور علوی کاکوروی

القول الجلی فی ذکر آثار الولی

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے مستند و مکمل سوانح کا بنیادی ماخذ

حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے مستند و مکمل سوانح ان کے خاندان و اہل خاندان خلفاء مجاز وغیرہ کے حالات، ان کے ارشادات، افادات، واردات اور مکاشفات کا سب سے بنیادی اور اہم، جامع و دقیع ماخذ ''القول الجلی'' ہے، جس کو ان کے حکم سے ان کے محبوب خلیفہ اور ماموں زاد بھائی، ان کے صاحب زادگان کے مربی و استاد، ان کی اکثر و بیشتر تصانیف کے کاتب مولانا شاہ محمد عاشق صدیقی پھلتی (1) بن شیخ عبید اللہ صدیقی نے 11 رشعبان 1144ھ کو مقام رابغ میں ان کے حکم سے مرتب کرنا شروع کیا تھا۔ شاہ صاحب وقتاً فوقتاً بنظر اصلاح اُسے ملاحظہ فرماتے اور اس میں ترمیم و تنسیخ اور اضافہ فرماتے رہے، چنانچہ جامع ملفوظ نے سبب تالیف کے بعد جو خاص بات لکھی ہے، وہ یہ ہے کہ

> ''میں نے اس کتاب میں کوئی چیز ایسی نہیں لکھی جو آنجناب سے مکرر عرض نہ کر دی ہو اور وہ شرف اصلاح سے مشرف نہ ہو گئی ہو۔ اسی طرح تیسری قسم میں جو جو حالات و واقعات جن جن حضرات کے تحریر کیے وہ پہلے آنجناب سے عرض کیے پھر تحریر کیے۔ ہر واقعہ کو لفظ افادہ سے معنون کیا اور اس کا نام ''القول الجلی فی ذکر آثار الولی رکھا۔''
>
> (القول الجلی۔ کتب خانہ انوریہ خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کاکوری۔ ص 2)

حضرت شاہ صاحب نے جہاں کہیں (''الجزء اللطیف'' وغیرہ میں) اپنے بارے میں کچھ تحریر فرمایا ہے، تو اسی ملفوظ کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ میرے حالات و واردات اور مکاشفات وغیرہ کے بارے میں کسی کو بھی معلوم کرنا ہو وہ ''القول الجلی'' کا مطالعہ کرے۔ آنجناب کے اس جملہ سے ملفوظ کی اہمیت و افادیت اور سند متحقق ہو جاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ اہم اور نادر ملفوظ ایک عرصہ سے نایاب تھا۔ حد یہ ہے کہ ''حیات ولی'' کے مؤلف مولوی رحیم بخش دہلوی اور مولانا عبید اللہ سندھی جو حضرت شاہ صاحب کی فکر و تعلیمات کے بڑے عالم کہے جاتے ہیں، ان کو بھی باوجود تلاش بسیار کے اس کا کوئی مکمل و نامکمل نسخہ کہیں نہ دستیاب ہو سکا تھا۔

''تذکرہ علمائے ہند'' کے مؤلف نے بھی اپنے تذکرہ کی فہرست مآخذ میں ''القول الجلی'' کا نام دیا ہے، جس

سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ ان کی نظر سے یہ ملفوظ گزرا ہوگا۔ نواب صدیق حسن خاں قنوجی کے کتب خانہ میں اس کا نسخہ رہا ہوگا، کیونکہ شاہ محمد اسحٰق و شاہ محمد یعقوب کے سلسلہ میں شاہ صاحب کی ایک بشارت کا ذکر کرنے کے بعد اظہار حیرت کیا ہے۔ نواب صاحب موصوف نے ''القول الجلی'' کی جو عبارت درج کی ہے وہ بے کم وکاست کتب خانہ انوریہ کاکوری کے نسخہ میں موجود ہے۔

''در قول جلی از کلام ایشان آوردہ کہ فرمودند آگاہی آمد این فرزندان کہ لطف الٰہی ایشاں را بما عطا کردہ است ہمہ سعداء اند نوعی از ملکیت در ایشاں ظہور خواہد کرد لیکن تدبیر غیب تقاضا می کند کہ دو شخص دیگر پیدا شدند کہ در مکہ و مدینہ سالہا احیای علوم دین نمایند و ہماں جا وطن اختیار کنند از طرف مادر نسب ایشاں بما متمکن باشد زیرا کہ آدمی زادہ بوطن مادر میلان طبعی دارد انتقال جماعہ کہ وطن والدہ ایشان متمکن باشند بسر زمینے بالطبع مستحیل ست مگر بقسر قاسر، انتہی بلفظہ۔''(2)

محترم مولانا حافظ شاہ مجتبٰی حیدر قلندر صاحب مدظلہ، خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کے ارشاد کے مطابق کہ ''مولوی نور الحسن صاحب راشد کاندھلوی کی تحریر کی رو سے 1947ء تک ان کے کتب خانہ میں قول جلی کا ایک نسخہ موجود تھا'' اور پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی کے لکھنے کے مطابق ایک ناقص نسخہ ان کے پاس بھی موجود ہے۔ پروفیسر موصوف کا نسخہ کس قدر ناقص ہے اور کس سنہ کا لکھا ہوا ہے، اس کا علم راقم الحروف کو نہیں ہو سکا۔

ایک اور ناقص نسخہ خدا بخش لائبریری میں ہے، جس پر ہمارے فاضل محترم جناب فضیل احمد صاحب قادری نے ماہ جون 1987ء کے ''معارف'' میں ایک مبسوط تعارفی مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے۔ موصوف نے راقم احقر کو پٹنہ کے دوران قیام وہ نسخہ دکھایا تھا۔ اس نے مخطوطہ کے مختلف اوراق کے عکس بھی لئے تھے اور جیسا کہ فضیل صاحب نے تحریر فرمایا یہ بھی عرض کیا تھا کہ چونکہ کتب خانہ انوریہ میں موجود اس مکمل نسخہ کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے، اس کی بنیاد پر وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ کتب خانہ مذکورہ کے قسم ثانی و ثالث اور نسخہ خدا بخش میں کہیں کہیں بجز بہت معمولی سی کتابت کے فرق کے اور کوئی فرق نہیں۔ گویا ایک ہی کتاب کے دو نسخے ہیں، مگر اس کی وہ اہمیت و افادیت نہیں ہے، اس لئے کہ اس کا بڑا حصہ (قسم اول) جو گویا اصل ''القول الجلی فی ذکر آثار الولی'' ہے، اس سے غائب ہے اور شاہ صاحب کے حالات زندگی سے متعلق افسوس کہ ایک سطر بھی نہیں ہے، لیکن اس ناقص نسخہ سے کتب خانہ انوریہ کے نسخہ کی پوری سند مل جاتی ہے۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے اصل و مکمل سوانح سوا نسخہ کاکوری کے اب تک کہیں کسی جگہ دستیاب نہیں ہیں۔

قسم ثانی و ثالث یقیناً اہم ہیں اور اس میں موجود مواد کہیں اور دستیاب نہیں ہوتا ہے، مگر بقول مولانا شاہ ابوالحسن علی ندوی قبلہ کے ''عوام تو عوام اکثر خواص کے بس کا نہیں کہ شاہ صاحب کے بعض دقیق مشاہدات و مکاشفات کی پوری تشریح و توضیح کر سکیں۔'' البتہ شاہ صاحب کے سوانح ضرور ایسے ہیں کہ ان کو پڑھ کر ایک عام انسان بھی ان کی فکر اور مسلک و مؤقف کا صحیح اندازہ کر سکتا ہے۔ قسم اول کے مطالعہ سے اس دور کی سماجی، سیاسی اور معاشی حالت کا بخوبی پتہ چلتا ہے، ''القول الجلی'' شاہ صاحب پر کام کرنے والوں کے لئے ایک سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے۔

ذیل میں نسخہ کاکوری جو دنیا میں واحد معلوم و مکمل نسخہ ہے، اس کا ایک تعارف درج ہے۔

اس مخطوطہ میں کل 497 صفحات ہیں۔ ہر صفحہ میں 19 سطریں ہیں۔ خط درمیانی ہے، خوشخط نہیں ہے۔ سنہ کتابت 1229ھ ہے، گویا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی وفات سے بھی دس سال قبل۔ ابتدائی صفحہ پر سعید الدولہ شریف الملک سید علی محمد خان بہادر انتظام جنگ الحسینی الموسوی البجاری کی مہر ہے۔ مہر پر 1261ھ درج ہے۔

ابتدا اس طرح ہے:

الحمد للہ الذی اصطفیٰ نوع الانسان علی سائرا الخلایق و فضلھم تفضیلا و خص الکمل منھم بمعر فۃ اسمائہ وصفاتہ و بمحیۃ کنہ ذاتہ اجمالاً وتفصیلاً فاولئك من الانسان کالعین اوالانسان من العین تشریفاً وتنویلا۔ الخ

(تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے بنی نوع انسان کو تمام مخلوقات میں افضل بنا کر منتخب و برگزیدہ فرمایا اور ان میں سے کاملین کو اپنے اسماء وصفات کی معرفت نیز حقیقت ذات کی محبت کے لئے مختصر و مفصل طور پر مخصوص فرمایا۔ وہ حضرات انسانوں میں ان کی آنکھ کے مثل شرف و بزرگی میں اہم ہیں) الخ

جامع ملفوظ سبب تالیف کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

''11 رشعبان 1144ھ کی شب کو مدینہ طیبہ سے مکہ معظمہ لوٹتے وقت رابغ کے مقام پر حضرت نے ارشاد فرمایا کہ ''اگر کوئی (میرے ان بیان کردہ) ان حقائق و معارف کو جسے لوگ سمجھ سکیں قلم بند کرے تو وہ اس کے ضمن میں اسرار کو مندرج پائے گا اور بڑے فوائد مشاہدہ کرے گا۔'' اس خاکسار نے اس حکم کے مطابق کہ تمہارے اوقات میں تمہارے پروردگار کے انفاس مبارکہ ہیں، تمہارے لئے اس کی تلاش وجستجو ضروری ہے، اس نفحۂ الٰہیہ کی تلاش کو ضروری سمجھا اور اس نفس روحانی کو عظیم جانا۔ اس ضمن میں اس خاکسار پر ہر نفحہ وہاب منعام علمی مفتوح ہوا، چنانچہ اسی وقت اس میں سے قدرے مقدمہ لکھا، جو اس جلیل القدر کام کے لئے عزم صمم اور تمہید ہو گیا اور پندرہویں تاریخ ماہ مذکور مکہ معظمہ میں اس کام کی ابتدا ہوئی۔''

حاشیہ کتاب پر بعض مطالب کی نشاندہی سرخ روشنائی سے کی گئی ہے۔ قیاس یہ ہے کہ بعد میں کسی صاحب نے اپنی سہولت کے خیال سے ایسا کیا ہوگا، ورنہ ان مطالب کے علاوہ بھی بکثرت مطالب ہیں، جن سے شاہ صاحب کے سلسلہ میں بڑی اہم ومفید اور عجیب وغریب دلچسپ معلومات فراہم ہوتی ہیں۔

چند مطالب جن کی نشاندہی حاشیہ پر ہے، وہ درج ذیل ہیں:

(1) تاریخ مؤلف، (2) نام کتاب، (3) خواب والد شاہ ولی اللہ مخبر از لیاقت نبوت، (4) ذکر قوت کاشفہ شاہ ولی اللہ بہ عالم صبا، (5) ظہور خرق عادت بہ ایام صبا، (6) مشاہدہ جنت بہ ایام صبا، (7) از اینجا مستفادست کہ شاہ صاحب و اسلاف ایشاں شافعی بودہ اند، (8) جواب عجیب، (9) وحدت وجود، (10) بخواب دیدن جناب امیر خیبر گیر، (11) رد قضا از دعا، (12) عزیمت دوبارہ بسفر حجاز، (13) ذکر مخالفت شیخ عبدالقادر جیلانی با ابوحنیفہ کوفی، (14) بخواب دیدن جناب حسنین را، (15) زیارت جناب رسالت مآب ﷺ بچشم ظاہر، (16) فضیلت اباذر غفاریؓ، (17) برابر بودن مذاہب اربعہ ائمہ اہلسنت نزد صاحب الشریعت، (18) زیارت آنحضرت ﷺ بچشم سر، (19) مشاہدہ صراط، (20) اتحاد ذاتی با آن حضرت ﷺ،

(21) نزول جبریلؑ و مکالمہ، (22) ظہور ملائکہ، (23) مشاہدہ آنحضرتؐ بدون خواب، (24) دیدن آنحضرتؐ بہ عالم رویا و بیعت بہ طرز فقرا، (25) ذکر ایام عاشورا و حضوری ارواح شہدا و دعوت طلب کردن شان (فاتحہ)، (26) مشاہدۂ ملائکہ و ارواح، (27) ذکر نادر شاہ و آفات دیگر، (28) ذکر شیعہ و امام، (29) ذکر جناب امیرؓ، (30) ادعائے بقائے نسل، (31) مذہب اثنا عشریہ، (32) بیان حقیقت تجلی واجب تعالیٰ شانہ، (33) ذکر نقشبندیہ، (34) ذکر جنت ارضی در بلاد جنوبی از جزائر ہندوستان، (35) بیان مقصود بالذات، (36) دعائے شب قدر، (37) بیان فرزندانِ شاہ ولی اللہ، (38) تاریخ وصال، (39) رباعیات خواجہ محمد امین، (40) بیان نسبت پنجگانہ، (41) افادہ در مقدمہ پیر را با مریداں و مریداں با پیران چہ تواند کرد، (42) فصل وصیت نامہ خواجہ محمد امین، (43) ذکر اعتقاد با صحابہ بضمن آن ذکر مذہب شیعہ اثنا عشریہ، (44) افادہ در مقدمہ توحید وجودی و شہودی، (45) ذکر قلیل از احوال فضائل اشتمال، (46) ذکر بعضے احوال کرامت اشتمال و کلمات معرفت سمات، (47) ذکر پارہ از فضائل بعضے اصحاب، (48) ذکر قدرے از فضائل و جلائل۔

نمبر (46) بعضے احوال کرامت الخ قسم ثانی میں ہے۔ قسم ثانی کی ابتدا اس طرح ہے: قسم ثانی در پارہ کلمات ارشاد سمات، باید دانست کہ کلمات قدسیہ الخ۔ قارئین مندرجۂ بالا فہرست مطالب سے قسم اول کی اہمیت و افادیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

اسی ملفوظ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی والدہ ماجدہ کا نام نامی فخر النساء تھا۔ مؤلف نے ان کی ولادت سے قبل ان کی والدہ محترمہ کو ہونے والی مختلف بشارات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''وہ بروز چہار شنبہ 4/ شوال 1114ھ بہ وقت طلوع آفتاب متولد ہوئے۔ منجموں اور ستارہ شناسوں نے علم نجوم کی رو سے یہ کہا ہے کہ آپ کی ولادت کے وقت حوت کا درجہ دوم طالع میں تھا اور شمس بھی اسی درجہ میں تھا۔ زہرہ آٹھویں، عطارد اکیسویں، زحل دسویں اور حمل و مشتری پندرہویں درجہ میں تھے اور وہ سال علویین کے قران کا سال تھا اور وہ درجہ اولیٰ میں تھا۔ مریخ اس سے دوسرے درجہ میں تھا اور راس سرطان میں تھا۔'' (یہاں تک کی عبارت حضرت شاہ صاحب کے رسالہ ''الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف'' میں من وعن درج ہے) منجملہ کرامات کے یہ بھی ہے کہ اہل تنجیم کی رو سے جس سیارۂ فلکی میں ان کی ولادت ہوئی، اسی میں حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت با سعادت ہوئی کہ شمس و عطارد برج حوت میں تھے اور یقیناً یہی وجہ ہے کہ آپ وارث کمال نبوت ہوئے۔''

جامع ملفوظ نے ان کے بچپن کے بہت سے ایسے واقعات و مبشرات درج کیے ہیں، جن سے ان کی ولایت و ملکوتی صفات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کی ذہانت و عبقریت کے سلسلہ میں بچپن کا ایک چھوٹا سا واقعہ درج ہے، ''ایک مرتبہ حضرت شیخ بزرگ قدس سرہ، (شاہ عبد الرحیم) کی مجلس میں مشہور رباعی۔

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن
دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن
سوئے زلفش نگہ کردن درویش دیدن
گاہ کافر شدن و گاہ مسلماں بودن

...... پڑھی جارہی تھی اور اس کے معانی پر غور ہو رہا تھا کہ انہوں نے فرمایا کہ مصرع اول کے معنی یہ ہیں کہ اسلام وجہ عبادت حقیقی ہے اور اپنے کو بغیر کسی لطیفہ وجہت کی مخالفت کے اللہ تعالیٰ کے لئے صرف کر دینا ہے اور مصرع دوم میں حضرت حق تعالیٰ کے ساتھ دوام توجہ کا اشارہ ہے جو آداب طریقت کا مغز ہے اور مصرع سوم میں یہ مطلب ہے کہ جلال و جمال کی تجلیات کا مشاہدہ بھی نہ ہو یعنی تنزیہہ محض اور چہارم میں اس کی تاثیر کا لطیفہ انسانیہ میں مؤثر ہو جانا مراد ہے۔" جب انہوں نے یہ بیان فرمایا تو سامعین ششدر رہ گئے۔

جامع ملفوظ نے ان کے پہلے سفر حج کا بھی مفصل و ایمان افروز حال لکھا ہے، حالانکہ ان کے تمام سوانح نگار اس سلسلہ میں بالکل خاموش ہیں۔ یہ سفر انہوں نے 1134ھ میں شروع کیا تھا، مگر کھمبایت سے حسب ارشاد نبویؐ واپس تشریف لے آئے۔ حضرت شاہ صاحب نے اپنے اس ارادہ کو اتنا مخفی رکھا تھا کہ قریبی اعزہ تو اعزہ گھر والے بھی واقف نہ تھے مگر جامع ملفوظ اس تمام سفر میں بھی ہمراہ و ہمرکاب رہے، چنانچہ ان کے چشم دید بیانات پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

ملفوظ کے مطالعہ سے ان کی بے پناہ سیاسی بصیرت اور سیاسی جدوجہد کی حقیقی نوعیت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے۔ سیاسی حالات سے متعلق بھی ان کی تمام پیشین گوئیاں سچ ثابت ہوئیں۔

مثلاً صرف دو واقعات درج ہیں۔ ایک روز ارشاد فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آگ کا ایک دریا امنڈتا آرہا ہے۔ بڑے بڑے حادثات پیش آنے کے آثار نظر آرہے ہیں اور

"آباد بستیاں مثل دیہات وقصبات برباد وتباہ ہو جائیں گی دیہات وقصبات وغیرہ ویران جنگلوں کی طرح ہو جائیں گے اور ایسے مصائب رونما ہوں گے کہ ارکان سلطنت بھی ان کا ازالہ نہ کر سکیں گے۔ ان کا ازالہ صرف صاحب دلوں کی ہمت پر ہوگا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ شہر دہلی جو پایہ تخت ہے، وہاں ہر جگہ سے زیادہ آفت ومصیبت ہے۔"

1148ھ شروع ہوتے ہی فرمانے لگے کہ "مصائب کا وقت آ ہی چکا ہے۔" اسی زمانہ میں اتنی شدید بارش ہوئی کہ "قصور مشیدہ" بھی ڈھ گئے۔ غنیم دکھنی نے اسی زمانہ میں حملہ کیا، حالانکہ شاہی افواج موجود تھیں، مگر وہ دہلی کے پاس پہنچ گیا اور اس کو تاراج کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ دریا کے کنارے دونوں افواج کا مقابلہ ہوا۔ طرفین کے بہت سے آدمی مقتول ہوئے اور بڑی تباہی کے بعد اس آفت سے چھٹکارہ ملا۔ بعض مخصوصین نے عرض کیا کہ جس آفت کا خطرہ تھا وہ گزر گئی؟ فرمایا "وہ آفت تو آنے والی ہے۔" اسی زمانہ میں ایک روز ان کے خلیفہ شاہ نور اللہ بڈھانوی شاہ جہان آباد (دہلی) کے سوق سلطانی میں کچھ خریدنے کے لئے گئے۔ واپسی پر شاہ صاحب نے استفسار فرمایا۔ بازار والوں کا کیا حال دیکھا۔

انہوں نے عرض کیا کہ بالفعل وہ سب محفوظ ہیں۔ لیکن ایک وحشت سی نظر آتی ہے۔ یہ سن کر فرمایا:

"یہ بازار بزبان حال کہہ رہے ہیں کہ یہاں خون کی نہریں بہیں گی۔"

یہ خبر وحشت اثر سن کر ایک عام اضطراب وبے چینی پیدا ہو گئی۔ پیشین گوئی پوری ہونا تھی، تقریباً سال بھر بعد ہی نادر شاہ نے حملہ کیا اور دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ وہ قصبوں اور شہروں کو تباہ کرتا ہوا کرنال پہنچا۔ وہاں محمد شاہ نے مقابلہ کیا۔ اس تمام عرصہ میں حضرت شاہ صاحب لوگوں کے عرض کرنے پر یہی فرماتے رہے کہ محمد شاہ اپنی جگہ پر ہی رہے

گا۔ دہلی میں داخلہ کے تیسرے روز ہی نادر شاہ نے قتل عام کا حکم دے دیا۔ اس کے سپاہیوں کا یہ عالم تھا کہ بقول جامع ملفوظ۔

''جس جاندار کو خواہ وہ انسان ہو یا حیوان، پاتے قتل کر دیتے، یہاں تک کہ کتے بلی تک کو بھی نہ چھوڑا اور شہر کے بازاروں اور مکانوں کو آگ لگا دی۔ مقتولین کے پشتے پر پشتے لگ گئے۔''

اور وہی ہوا جس کی پیشین گوئی شاہ صاحب فرما چکے تھے کہ

''بازاروں میں خاص طور پر سوق سلطانی جو چاندنی چوک کہلاتا ہے، خون کی ندیاں بہہ گئیں۔''

اس قتل وغارت گری کے اندوہناک وروح فرسا کھیل کے بعد کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اب کبھی دہلی کے تخت پر کوئی تیموری حکمراں بیٹھ سکے گا لیکن تاریخ شاہد ہے کہ حضرت شاہ صاحب کا ارشاد صحیح ثابت ہوا اور حملہ آور ''تمام خزائن ودفائن جدیدہ وقدیمہ'' اور زر وجوہر لے کر واپس چلا گیا اور محمد شاہ کو تخت پر بٹھا گیا۔

جامع ملفوظ نے احمد شاہ ابدالی کے حملوں کا بھی ذکر کیا ہے اور اس سلسلہ میں حضرت شاہ صاحب کے مؤقف کو لکھا ہے، معرکۂ بالاکوٹ جو شاہ صاحب کے وصال کے ایک طویل عرصہ بعد ہوا۔ اس کے متعلق بھی واضح ارشادات ''قول جلی'' میں مذکور ہیں، شاہ صاحب کے سیاسی مکتوبات کی تصدیق بھی اس ملفوظ سے پوری طرح ہو جاتی ہے۔

جامع ملفوظ نے شاہ صاحب کے وصال کا بھی محیرالعقول واقعہ درج فرمایا ہے۔ اس کے علاوہ بکثرت تاریخیں اور آپ کے مخلص خلفاء ومریدین کے دردانگیز حزینہ اشعار اور مراثی درج ہیں۔ ایک عرصہ تک شاہ صاحب کے سنہ وفات میں اختلاف رہا تھا۔ ''حیات ولی'' کے مؤلف کو ایک مصرع ''او بود امام اعظم دین'' (1187ھ) مل سکا تھا، جسے وہ اور ان کے بعد کے تمام سوانح نگار نقل کرتے چلے آئے۔ ''القول الجلی'' کے مذکورہ نسخہ میں بکثرت مادہ ہائے تاریخ آفتاب دین شد۔ زیر زمیں او بود امام اعظم دین، آن ولی نقشبند ثانی بود، جنید عصر برفت از جہان ندا فرمودہ'' وغیرہ ہیں۔

مؤلف کتاب نے ان کے واقعۂ وصال کے ضمن میں حضرت مرزا مظہر جان جاناں کا مع احباب خاص عیادت کے لئے آنا، ان کی آمد پر تخلیہ کرنے اور دونوں صاحبان اور چند مخصوصین کے مراقب ہونے کا حال بھی لکھا ہے۔ اس بیان سے دونوں کے باہم روابط پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

''(سنیچر 29 محرم 1176ھ کو جب کہ حضرت اقدس کی عمر شریف کا باسٹھواں سال شروع ہوا تھا) حضرت مرزا مظہر جان جاناں جو سلسلۂ نقشبندیہ احمدیہ کے مشہور مشائخ میں سے ہیں، مع اپنے احباب کے عیادت کو آئے۔ ان کی آمد پر تخلیہ کرایا گیا۔ اور بجز چند مخصوصین یہ غلام (جامع ملفوظ) بھی تھا، کوئی اور نہ رہا، پھر حلقۂ مراقبہ ہوا اور نصف گھنٹہ صحبت گرم رہی۔ جب مجلس مراقبہ ختم ہوئی اور مرزا صاحب نے رخصت چاہی تو اُسی وقت مزاج شریف متغیر ہو گیا اور آناً فاناً آثار وصال ظاہر ہوئے اور اسی روز وقت ظہر طائر روح پاک نے عالم قدس کی جانب پرواز کی اور رفیق اعلیٰ سے واصل ہو گیا۔''(3)

حواشی

(1) شاہ محمد عاشق پھلتی کے تفصیلی سوانح کے سلسلہ میں راقم احقر کا مقالہ ماہنامہ ''برہان'' اپریل 1983ء دہلی میں ملاحظہ فرمائیں۔

(2) اتحاف النبلاء۔ نواب صدیق حسن خاں۔ مطبع نظامی۔ کانپور، ص 431، 1288ھ

(3) القول الجلی۔ ص 263 (در: معارف، ستمبر 1987ء، ص 222-232)
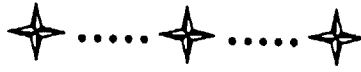
فضیل احمد قادری

شاہ ولی اللہ دہلوی کی سوانح حیات

''القول الجلی واسرار الخفی'' کا نسخۂ خدا بخش۔ایک تعارف

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں شیخ محمد عاشق پھلتی کی نوشتہ حیات ولی اللہ دہلوی (62-1703ء) کا ایک قدیم مگر ناقص مخطوطہ موجود ہے (1)۔ مگر مخطوطے پر اس کتاب کا نام ''افادات شاہ ولی اللہ'' تحریر ہے۔ راقم الحروف جب خدا بخش لائبریری آیا تو اس کے ذمہ تصوف اور صوفیاء کے تذکروں کی کیٹلاگ سازی کا کام تفویض ہوا۔ دوران مطالعہ اس کتاب کے اندرونی صفحات پر دو جگہ ''القول الجلی'' لکھا ہوا ملا۔ میں نے اس کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور استاد محترم پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب کی کتاب ''شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات'' (2) کے ضمیمے سے استاد محترم کے مضمون ''مولانا محمد عاشق پھلتی کی نوشتہ حیات شاہ ولی اللہ المعروف بہ قول الجلی واسرار الخفی کا تعارف'' سے اس کا مقابلہ کیا۔ نسخہ ہٰذا کے مندرجات مل گئے اور راقم الحروف کی خوشی کی انتہا نہ رہی (3)۔ پھر جب 12 / دسمبر 1974ء کو استاد محترم پٹنہ تشریف لائے تو انہیں یہ نسخہ دکھایا گیا۔ انہوں نے اپنی تشفی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ غنیمت ہے۔ محب مکرم جناب مسعود انور علوی لکچرر شعبۂ عربی علی گڑھ۔ مسلم یونیورسٹی جن کا تعلق خانوادہ کاکوری سے ہے اور جن کے ہاں ''القول الجلی'' کا مکمل نسخہ موجود ہے، انہیں بھی میں نے یہ نسخہ دکھایا۔ ان کی رائے ہے کہ گرچہ نسخہ خدا بخش ناقص الاول ہے مگر بقیہ حصص پورے ہیں اور نسخۂ کاکوری سے پوری مطابقت ہے۔

''شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات'' میں استاد محترم پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب ''القول الجلی واسرار الخفی'' کا تعارف کراتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''مولانا محمد عاشق پھلتی نے شاہ صاحب کے حالات، سوانح اور ملفوظات کو ایک کتاب قول الجلی و اسرار الخفی، میں قلمبند کیا تھا۔ شاہ صاحب نے اس کتاب کو خود ملاحظہ فرمایا تھا، لیکن اس کتاب میں اضافہ کا سلسلہ جاری رہا اور مصنف نے شاہ صاحب کی وفات پر اس میں مزید ایک باب کا اضافہ کیا ہے۔'' (4)

''القول الجلی'' کا نسخۂ خدا بخش نہایت خوش خط ہے اور خط نستعلیق میں لکھا گیا ہے۔ اس کا سائز 9 انچ x 5 انچ ہے۔ تعداد اوراق 65 ہیں اور اگر اوراق کو صفحات میں تبدیل کیا جائے تو کل 130 صفحات ہوتے ہیں۔ ہر ورق پر 29

سطریں ہیں اور ہر سطر میں 30 سے 35 تک الفاظ ہیں۔ موجودہ نسخے میں صرف قسم ثانی اور قسم ثالث موجود ہے۔ قسم ثانی میں شاہ صاحب کے ملفوظات ہیں اور ہر ملفوظ، افادہ، کے عنوان سے تحریر ہے۔ لفظ افادہ ہر جگہ سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ قسم ثالث میں شاہ صاحب کے بزرگوں، اعزہ، خلفاء اور احباب کا ذکر ہے اور اس کے عنوانات بھی سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ کتاب میں کوئی ترقیمہ نہیں ہے۔ اختتام پر صرف:

والحمد لله تعالیٰ اولاً و آخراً و ظاهراً و باطناً

تحریر ہے اور اس کے دائیں اور بائیں طرف کسی نے بعد میں:

اللهم ارحم علی محمد عمر مرید حبیبك صلعم کا اضافہ کر دیا ہے۔

طرز تحریر، کاغذ اور روشنائی سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نسخہ اٹھارہویں صدی کا معاصر نسخہ ہے۔ کتاب کے شروع میں کوئی نام تحریر نہیں ہے۔ ورق 25 الف پر ''القول الجلی'' سرخ روشنائی سے حاشیہ پر تحریر ہے اور قسم ثالث کے شروع میں حاشیہ پر ہی ''قسم ثالث القول الجلی'' تحریر ہے۔ پورے نسخے میں پانچ جگہ مہر ثبت ہے۔ مگر چار جگہ اس قدر مدہم ہے کہ پڑھا نہیں جاتا۔ ورق 41ب پر قدرے صاف اور غور سے پڑھنے پر معلوم ہوتا ہے۔ مہر اس طرح ہے:

العبد المذنب ولایت علی

1269 ہجری

یہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ نسخۂ خدا بخش ناقص الاول ہے اور موجودہ نسخے میں صرف قسم ثانی اور قسم ثالث ہے۔ قسم ثانی کی شروعات اس طرح ہے:

> ''قسم ثانی در پارہ از کلمات ارشاد سمات۔ باید دانست کہ کلمات قدسیہ حضرت ایشاں کہ در بیان غوامض اسرار از حقایق لاہوتیہ و جبروتیہ و معارف لطائف کہ دست فہم و ادراک ہر اہل ذوق و وجدان بدامن آں برسد۔ پس ایراد آنہا دریں رسالہ کہ بنا بر آں بر تعمیم افادہ کافہ خصوص و عموم است سودی ندارد و اگر صاحب استعدادی بر شوق اطلاع آں دقایق دارد باید کہ از کتاب تفہیمات الٰہی و حجۃ بالغہ و خیر کثیر و لمعات و ہمعات و الطاف القدس و فیوض الحرمین وغیرہ از مصنفات کرامت آیات طلب نماید۔ اما بعض انفاس نفیسہ متضمن دقایق و ادب مبدا سلوک و وسط و انتہاء آں کہ در ارشاد مستفیضان جناب ولایت تحریراً یا تقریراً صدور یافتہ بودند تحریراً آنہا روایۃً بالفظ او نقلاً بالمعنی ایں رسالہ را متجلی و مزین میسازد و اللہ تعالیٰ ہو الولی و الموفق۔''(5)

اس کے بعد شاہ صاحب کی ہر تقریر یا ملفوظ 'افادہ' کے عنوان سے تحریر ہے اور افادات کی تعداد 108 ہے:

1- افادہ بعد صوری در بیان مرشد و مسترشد...

2- افادہ باید دانست کہ مردم در جبلت یکساں نیستند...

3- افادہ اکثر اشخاص کہ رغبت راہ خدا دارند...

4- افادہ جہد تمام از سینہ می باید بر آورد...

5-افادہ بسوئ امر منزہ متوجہ می باید شد...

6-افادہ بسا می بود کہ حضور مجرد حاصل می شود...

7-افادہ یقین باید کرد کہ آدمی فی الحقیقت عبارت از صورت شخصیہ اوست...

8-افادہ غوث العظم شیخ عبدالقادر رضی اللہ عنہ ازیں حالت بفنا ارادہ تعبیر می فرمایند...

9-افادہ قلت طعام ودوام صیام...

10-افادہ سالک چوں عزلت اختیار کند...

11-افادہ کسی را کہ توحید منکشف شد...

12-افادہ کسی را بسا اتفاق می افتد کہ سالک...

13-افادہ فنا نفس وصفاء نفس...

14-افادہ ما نیک تامل کردیم...

15-افادہ باید دانست کسے کہ مالوف باحساس است...

16-افادہ سالک را گاہے تشویش روی دہد...

17-افادہ حضرت سید امیر کلال قدس سرہ...

18-افادہ مدرک حق سبحانہ بادرا کی کہ...

19-افادہ باید دانست کہ احوال بنی آدم...

20-افادہ چوں بدانستی کہ ظل کیستی...

21-افادہ قیام لیل وبسبق باطن...

22-افادہ شجاع را در حرب تواں دانست...

23-افادہ کشف وکرامات علوم...

24-افادہ اعلم از اصل السعادت...

25-افادہ حضرت ایشان فرمودند کہ سالک سبیل حقیقت...

26-افادہ بعد وصول بذات...

27-افادہ سالک را از وظائف ظاہرہ...

28-افادہ در ہمہ حال در توجہ بحضرت...

29-افادہ رباعی...

30-افادہ کیفیتی کہ حاصل می شود...

31-افادہ حضرت ایشاں رباعی چند در بیان بعض قواعد سلوک نظم فرمودند...

32-افادہ اگر خواہم کہ لطیفہ قلب کسی را...

33-افادہ حضرت ایشاں ارشاد فرمودند کہ تکمیل حجر بہت...

34-افادہ حضرت ایشاں فرمودند کہ نقطۂ لاہوت...

35-افادہ حضرت ایشاں فرمودند کہ اگر وجود کمل...

36-افادہ حضرت ایشاں فرمودند کہ ارواح مردمان...

37-افادہ خواجہ محمد امین بفقیر راقم ارقام نمودند...

38-افادہ نیز خواجہ موصوف نگارش نمودند...

39-افادہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم...

40-افادہ بجناب حضرت ایشاں سائلی...

41-افادہ ارشاد فرمودند کہ چوں تجلی اعظم...

42-افادہ ارشاد فرمودند کہ تحقق عصمتُ انبیاء...

43-افادہ ارشاد فرمودند کہ توجہ ملائکہ...

44-افادہ روزی سخن در غیرت ارواح...

45-افادہ نفس ناطقہ کہ باروح...

46-افادہ فرمودند کہ حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر...

47-افادہ فرمودند کہ علم بردونوع است...

48-افادہ معروض داشتم کہ مبتدیان...

49-افادہ صوفی بیگ خاں مروی...

50-افادہ معروض داشتم کہ درحدیث...

51-افادہ بتقریب تقریر معنی حدیث...

52-افادہ ارشاد فرمودند کہ نسبت...

53-افادہ فرمودند سعادت دنیوی منقسم...

54-افادہ انبعاث پہلی بسوی حقیقۃ الحقایق...

55-افادہ ارشاد فرمودند کہ طبقات پاس...

56-افادہ فرمودند حق سبحانہ وتعالیٰ قسطی از علوم...

57-افادہ ارشاد فرمودند کہ حکمت در شفاعت انبیاء...

58-افادہ ارشاد فرمودند کہ کمل الولیاء را ہم حیرت می باشد...

59-افادہ ارشاد فرمودند کہ حضرت والد بزرگوار وعم گرامی قدر...

60-افادہ روزی یکے از حاضران ایں بیت ہندی کہ منصوب است بجناب حضرت محبوب صمدیت سیدنا الشیخ

ابوالرضا قدس سرہ...(6)
61-افادہ فرمودند کہ حصول نسبت...
62-افادہ ارشاد فرمودند کہ رسالہ حضرت شیخ تاج الدین سنبھلی...
63-افادہ ارشاد فرمودند کہ نسبت اویسیہ...
64-افادہ بتقریب تمثیل تاثیر صحبت فرمودند...
65-افادہ ارشاد فرمودند کہ ہنگام زیارت کعبہ...
66-افادہ سخن در ذکر بعض رجال معمرین...
67-افادہ ارشاد فرمودند کہ شیخ عبدالرحمٰن انبہتی...
68-افادہ ارشاد فرمودند کہ طایفہ از مجذوبین...
69-افادہ در ضمن تقریر استعدادات نفوس...
70-افادہ ارشاد فرمودند کہ حکمت در سکوت...
71-افادہ دراثنای تقریر بر معنی ایں حدیث...
72-افادہ فرمودند سعادت ہر ذکی و غبی دریں راہ...
73-افادہ فرمودند میراث انبیاء علیہم السلام...
74-افادہ ارشاد فرمودند کہ طایفہ از مقربین...
75-افادہ ارشاد فرمودند کہ خرابی آدمی از خطرات نفس اوست...
76-افادہ خوف سیفی است از سیوف الٰہی...
77-افادہ در معنی حدیث الدنیا سجن المومنین...
78-افادہ ارشاد فرمودند کہ بعض بندگان الٰہی...
79-افادہ ارشاد فرمودند کہ توجہ الی اللہ...
80-افادہ در علاج ازالہ زلایل باطن...
81-افادہ فرمودند عقلاء زمان مقرر دارند...
82-افادہ فرمودند از غیر تہا مشائخ روزگار...
83-افادہ فرمودند از درویشی اکبر میل سلطنت...
84-افادہ فرمودند تفضیل عالم بر عابد...
85-افادہ عزیزے بخدمت ایشاں ذکر کرد کہ...
86-افادہ در شرح حکمت مشروعیہ...
87-افادہ ارشاد فرمودند آدمی قبل انکشاف...

88-افادہ ارشاد فرمودند کہ کشف بعض معارف...

89-افادہ ارشاد فرمودند کہ حق تعالی با محابیت...

90-افادہ در تفسیر آیت کریمہ یدبر الامر من السماء...

91-افادہ التماس نمودم از معنی ایں قول...

92-افادہ روزی عرض کردہ بودم کہ مشاہدۂ صورت...

93-افادہ معنی حدیث شریف کہ نسائی روایت کردہ...

94-افادہ در تخصیص عشرۂ مبشرۃ...

95-افادہ وصیت ایں فقیر...

96-افادہ فی تمیز الملتبسین...

97-افادہ در حدیث متواتر آمدہ است...

98-افادہ خذو جوامع العلم عنی...

99-افادہ اویسیہ ارواح مکمل...

100-افادہ نورع وا تقا شبہات اصلی است...

101-افادہ چوں علمی از مبداء فیاض...

102-افادہ در قواعد طب ثابت شدہ...

103-افادہ وگاہی طبیعت کلیہ کہ بمنزلہ فرس قطوف...

104-افادہ احوال نفسانیہ مثل وجد و زہد...

105-افادہ دعاہای بنی آدم بہ حظیرۃ القدس...

106-افادہ ہر خرق عادتی و ہر واقعہ عجیبہ...

107-افادہ شخصی از مستحلان مزامیر بمن گفت...

108-افادہ بعض صفات محمودہ با صفات غیر محمودہ...

قسم ثالث دس بزرگوں کے احوال پر مشتمل ہے جن میں شاہ صاحب کے قرابت مند بزرگ، برادران گرامی، احباب اور اجلہ خلفاء شامل ہیں۔ اخیر میں مؤلف نے بطور ضمیمہ اپنے حالات قلمبند کیے ہیں (7)۔ قسم ثالث کے شروع کی عبارت درج ذیل ہیں:

''قسم ثالث در ذکر احوال و اقوال بزرگانی کہ بحضرت ایشاں نسبتی و قرابتی دارند۔ دریں قسم اولاً بذکر شیخین جلیلین کہ خال کبیر و خال صغیر حضرت ایشانند شروع رفتہ۔ اگرچہ قصد بندۂ کاتب الحروف آنست کہ اگر توفیق الٰہی رفیق شود در ذکر ماثر ہر دو جناب مع ذکر بعض اصحاب رسالہ مستقلہ ترتیب دہد۔ اما دریں رسالہ ہم کہ مبتنی است بر ذکر بزرگان ایں خاندان عالیشان کہ ایں بندہ بشرف

ادراک سعادت بخدمت شاں مشرف گشت بذکر پارہ از حالات کرامت آیات وکلمات معرفت سمات ذخیرہ اندوز سعادت دو جہانی گشت تا اگر ثانیاً حال بتائید الہی با مضائے آں عزیمت موفق گردد بمصداق ہوالمسک ما کررۃ یتضوع خواہد بود والا نہ بحکم مالا یدرک کلہ لا تبرک کلہ لاتبرک کلہ بالکلیۃ ازاں دولت محروم نماند و چوں ایں قسم موضوع برای ذکر بزرگانی است کہ بحضرت ایشاں نسبتی و قربتی دارند قاعدہ الاقرب کالاقرب میخواست کہ ذکر احوال کرامت اشتمال ہر دو برادر آنجناب تقدیم باید لیکن امتثالاً لامر ولی لا امر کہ خالی از حکمت و سری نیست ذکر شیخین مقدم کردہ شد۔''

مؤلف نے ان بزرگوں کے ملفوظات کا انتخاب بھی 'افادہ' کے ذیلی عنوان سے ہر ایک کے ذکر کے ساتھ دیا ہے:

(1) شیخ عبیداللہ خال کبیر حضرت ایشاں (8)

(2) شیخ حبیب اللہ خال صغیر حضرت ایشاں (9)

(3) شیخ صلاح الدین برادر علاتی (10)

(4) شیخ اہل اللہ برادر خورد (11)

(5) شاہ نوراللہ خلیفہ و از قدماء اصحاب و کملاء احباب

(6) حافظ عبدالنبی المخاطب بہ عبدالرحمٰن از خلفاء معتبر

(7) خواجہ محمد امین ولی اللہی اجلۂ احباب

(8) میں محمد شریف خلیفہ حضرت ایشاں

(9) مولوی شرف الدین محمد از خواص تلامذہ

(10) تذئیل در حکایت حال عبد ذلیل بندہ مولف ایں رسالہ

حالات مؤلف

شیخ محمد عاشق، شیخ عبیداللہ کے صاحبزادے اور شیخ محمد کے پوتے تھے یعنی آپ شاہ ولی اللہ کے ماموں زاد بھائی تھے۔ شیخ محمد عاشق کی ولادت بمقام پھلت ضلع مظفر نگر 10 رمضان 1110ھ (مطابق 2 مارچ 1699ء) کو ہوئی۔ محمد غازی سے تاریخ ولادت نکلتی ہے (12) جب قرآن کے چند سیپارے تمام کر چکے تو ان کے نانا شیخ عبدالوہاب (13) نے قرآن مکمل کرایا اور خط نسخ اور نصاب صبیان کی تعلیم دی۔ بعد ازاں ''میزان صرف'' اور ''بوستان سعدی'' اپنے دادا شیخ محمد سے تمام کی اور کتب تحصیلہ اپنے والد بزرگوار سے پڑھیں۔ ''کافیہ''، ''قدوری'' اور ''شرح مُلاّ'' اپنے چچا شیخ حبیب اللہ سے مکمل کرنے کے بعد اپنے والد بزرگوار سے باطنی تعلیم حاصل کی (14)۔

شیخ محمد عاشق اوائل عمری سے شاہ عبدالرحیم کی مجلسوں میں شریک ہوتے رہے۔ لڑکپن سے شاہ ولی اللہ سے ایک خاص انسیت تھی۔ ان کی محبت اور فدائیت سے شاہ عبدالرحیم بہت متاثر تھے۔ ایک موقعہ پر انہوں نے فرمایا:

''فیما بین ایں ہر دو اخلاص بسیار است و ما بسیار خوش و راضی ہستیم'' (15)۔

شیخ محمد عاشق اپنے لڑکپن کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک شب جب شاہ عبدالرحیم وضو کے لئے بیٹھے تو میں ان کے سامنے سے گزرا۔ انہوں نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ تم ان کے (شاہ ولی اللہ) کے شرح ہدایہ حکمت کے درس میں شریک نہیں ہوتے تو میں نے لڑکپن کی شرارت میں عرض کر دیا کہ وہ مجھ پر توجہ ہی نہیں فرماتے۔ اتنے میں وہ (شاہ ولی اللہ) ادھر سے گزرے تو شاہ عبدالرحیم نے ان کا دامن پکڑ کر مجھ سے فرمایا اسے تھام لو''(16)۔

پھر تو یہ دامن ایسا ہاتھ میں آیا کہ تادم واپسیں نہ چھوٹا۔ شیخ محمد عاشق خلوت وجلوت، سفر وحضر اور تصنیف وتالیف سب میں شاہ ولی اللہ کے رفیق رہے۔ شاہ صاحب سے انہوں نے ''شرح تجرید'' مع حاشیہ قدیم، ''شمس بازغہ''، ''محکم الاصول''، ''افق المبین'' اور ''صحیح مسلم'' پڑھی(17)۔

1143ھ میں شاہ صاحب سفر حجاز پر روانہ ہوئے تو شیخ محمد عاشق ان کے رفیق سفر تھے۔ دوران قیام حجاز انہوں نے شاہ صاحب سے ''تفسیر بیضاوی'' سے سورۂ فاتحہ کی تفسیر پڑھی اور شیخ ابوطاہر کردی مدنی سے ''صحیح بخاری'' اور ''دارمی'' کے سبق میں شاہ صاحب کے ہم سبق رہے اور بقول خود شاہ صاحب کے طفیل میں اس کی اجازت بھی حاصل ہوئی(18)۔

دوران قیام حجاز شیخ محمد عاشق برابر شغل طریقت میں منہمک رہے اور ہر قدم پر انہیں شاہ صاحب کی رہنمائی حاصل رہی۔ معارف حرمین کی سعادت خطاب سب سے پہلے انہیں حاصل ہوئی۔ وہ خود لکھتے ہیں:

''در ہمہ معارف حرمین مستعد بسعادت خطاب بلکہ رسالہ فیوض الحرمین بالتماس ایں عبد ضعیف مؤلف گردید وبسعادت تبلیغ ایں خاکسار مستعد گشت''(19)۔

شاہ صاحب نے اپنی معرکۃ الآراء تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' ان کے نام معنون کی:

''کتاب حجۃ اللہ البالغہ کہ از عمدہ تصانیف آنجناب در علم خاص اسرار شریعت است معنون بنام کمترین فدویان است''(20)۔

شاہ صاحب نے اپنی تصنیف ''الخیر الکثیر'' انہیں سبقاً سبقاً پڑھائی اور اس کے دقایق حل فرمائے(21)۔ قیام حجاز کے زمانہ میں جب شاہ صاحب کو رسول اکرمؐ کی زیارت نصیب ہوئی تو سب سے پہلے شیخ محمد عاشق ہی ان سے مستفید ہوئے۔ فرماتے ہیں:

''وبعد سلوک جدید حضرت ایشاں بطریق اویسی از روح کریمہ حضرت خاتم الرسل صلوت اللہ وسلامہ علیہ اول کسے کہ بشرف بیعت آنجناب مشرف شد ایں بندہ است وہذہ بیعۃ ثانیہ (22) وایں بیعت در شب قدر فی ثلث الاخیر در حجر کعبہ تحت میزاب الرحمۃ بود فالحمد للہ علی ذلک''(23)۔

ایک دوسرے موقعہ پر کچھ اسی قسم کی نعمت سے شاہ صاحب نے آپ کو دوبارہ سرفراز فرمایا:

''وچوں بعد مراجعت ازاں سفر کرامت اثر حضرت ایشاں در واقعہ بجناب حضرت خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم بیعت نمودند واز آنجناب بافاضۂ رحمت خاص ختمیہ ممتاز شدند، اول شخصی کہ بعد ایں واقعہ مبارکہ بخدمت کرامت منقبت حضرت ایشاں بآں حیثیت شرف بیعت حاصل نمود ایں

عبودیت نہاد بود وتلکہ بیعتہ ثالثہ۔ واین عبدضعیف آنچہ ذخیرہ شرف وسعادت ہر دو جہاں میدارد ہمیں بعینہا سہ گانہ است وبس الحمد علی ذالک حمداً کثیراً طیباً مبارکہً فیہ''(24)۔

شیخ محمد عاشق، شاہ صاحب کے مونس وغمخوار، رفیق، شاگرد، مرید اور عزیز ترین قرابت مند تھے۔ شاہ صاحب کو ان سے والہانہ لگاؤ تھا اور علم وفضل کی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ شاہ صاحب نے ان کے لئے ''بدیع النادر'' اور ''سجادہ نشین اسلاف'' جیسے کلمات استعمال کیے ہیں۔ شاہ صاحب کی محبت ومرحمت کا اندازہ درج ذیل عبارت سے ہوتا ہے جو شیخ محمد عاشق کے لئے لکھے گئے مختصر حالات کا ایک ٹکڑا ہے جو شاہ صاحب نے ''القول الجلی'' کے لئے خود لکھ کر دیا تھا:

''...... وبالجملہ فاشھد للہ باللہ انہ فی خلقہ وجحۃ اللہ فی ارضہ وانہ سر الاسرار و نور الانوار وانہ مھب النفحات و معدن البرکات وانہ سابق السباق والبدیع النادر فی الآفاق وانہ صاحب لسان الصدق وجنان حق وانہ فی الاولیاء الکریم ابن الکریم ابن الکریم ابن الکریم، کما کان یوسف الصدیق بشھادۃ نبینا صلوت اللہ علیھما فی الانبیاء الکریم ابن الکریم ابن الکریم ابن الکریم. وھو معدن اسراری و حامل انواری. قلبی معہ ابداً و نظری الیہ سرمداً. یدہ کیدی و صحبتہ کصحبتی و قولہ کقولی وفعلہ کفعلی ورضائہ ھو بعینہ رضائی کشفہ و جدانہ ھو بعینہ کشفی و وجدانی.

آنی کہ تو از نام تو می بارد عشق
از نامہ و پیغام تو می بارد عشق
عاشق شود آنکس کہ بکویت گذرد
آنی ز در و بام تو می بارد عشق'' (25)

شیخ محمد عاشق کا انتقال بمقام پھلت ضلع مظفر نگر (88-1187ھ۔1774ء) میں ہوا اور شاہ صاحب کا یہ رفیق ومونس اور ان کے علوم واسرار کا محرم راز ہمیشہ کے لئے عالم جوانی میں ان سے جاملا۔ شاہ صاحب نے ایک بار انہیں بشارت دی تھی:

''امیدواری از فضل حضرت باری آنست کہ چوں عکوس مراپای تجلی اعظم باحقیقت تجلی اعظم پیوندد واشعۂ گرد عکوس جمع گردد ماوشما آسودہ الی الابد الآباد بہم قرین یکدیگر باشیم وصالاً لافراق بعدہ و انبساطاً لاانقباض بعدہ''(26)۔

شیخ محمد عاشق اس کے بعد ہندی کا یہ شعر نقل کرتے ہیں۔

میرے من نت بسے جس دیکھے مجھ چین
گلی گلی اب کیوں پھرے کون کو کے دن رین (27)

حواشی

(1) فارسی مخطوطات، جلد 4، ہینڈلسٹ نمبر 1489۔ یہ نسخہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار دہلی سے 21/مارچ 1977ء کو خریدا گیا۔

(2) مطبوعہ ندوۃ المصنفین، دہلی 1969ء۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے مکتوبات بھی شیخ محمد عاشق پھلتی نے ہی جمع کیے تھے گرچہ اس کی ابتدا ان کے صاحبزادے شیخ عبدالرحمٰن نے کی تھی۔ مگر ان کی بے وقت موت کے بعد اس کی تکمیل شیخ محمد عاشق نے کی۔ سیاسی مکتوبات، ص 58-57۔

(3) ''القول الجلی واسرار الخفی'' کا تعارف سب سے پہلے استاد محترم پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے نسخۂ کاکوری (جو واحد مکمل نسخہ ہے) کی بنیاد پر ''شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات'' کے ضمیمے میں پیش کیا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ دوسرا نامکمل نسخہ متعارف کرانے کی سعادت استاد محترم کے ایک ادنیٰ شاگرد کے حصے میں آئی۔

(4) شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات، ضمیمہ۔ 3، ص 210۔ شیخ محمد عاشق نے ''القول الجلی'' کے علاوہ دو اور تصانیف ''سبیل الرشاد'' اور ''شرح دعاء الاعتصام'' یادگار چھوڑی ہیں، ص 6۔

(5) القول الجلی ورق، 1 الف۔

(6) شیخ ابوالرضا کا ہندی بیت یہ ہے:

دنا اندھیری چاندنی رانا

بنکی بوجیہو پیتم ماتا

''شیخ ابوالرضا الہندی (م 1690ء) شاہ ولی اللہ کے بڑے چچا تھے۔ علوم ظاہری کی تکمیل حافظ بصیر سے کی اور خواجہ خورد خلف الصدق خواجہ باقی باللہ سے تصوف کی تعلیمات حاصل کیں۔ شروع میں دربار شاہی سے وابستہ رہے مگر جلد ہی اس سے کنارہ کش ہو کر مسجد فیروز آباد کے قریب ایک حجرے میں رہنے لگے۔ شیخ ابوالرضا اپنے عہد کے جید عالم تھے۔ درس و تدریس کا بھی شوق تھا۔ آخری زمانے میں صرف مشکوٰۃ اور تفسیر بیضاوی کا درس دینا پسند کرتے تھے۔ وعظ میں بڑی تاثیر تھی۔ نماز جمعہ کے بعد ہمیشہ وعظ کہتے تھے۔ احادیث کا فارسی اور ہندی میں ترجمہ بیان کرتے تھے۔ ملاحظہ ہو انفاس العارفین، ص 90، استاد محترم پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب کا خیال ہے کہ ''مذہبی کتب کو عوامی زبان میں منتقل کرنے کی اہمیت کو سب سے پہلے انہوں نے ہی محسوس کیا تھا۔'' تاریخ مشائخ چشت جلد 5، ص 90۔

(7) مؤلف تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب نے باصرار تمام فرمایا کہ تم اپنے حالات بھی قلمبند کرو۔ میرے تامل کرنے پر انہوں نے خود مختصراً میرے حالات لکھے۔ مؤلف نے شاہ صاحب کے تحریر کردہ حالات کو تبرکاً ورق 59 ب سے 60 ب تک نقل فرمایا ہے پھر تفصیل بیان کی ہے۔

(8) مؤلف کے والد بزرگوار۔

(9) مؤلف کے عم محترم۔

(10) شیخ صلاح الدین شاہ عبدالرحیم کی محل اولیٰ سے تھے جو خواجہ یوسف قتال کی اولاد میں سے تھے۔ شیخ صلاح الدین طبیب حاذق

تھے اور فن سپہ گری کے ماہر۔

(11) وفات 1187ھ۔1764ء۔

(12) القول الجلی، ورق 60 ب۔ شیخ محمد عاشق عمر میں شاہ ولی اللہ سے تقریباً پانچ سال بڑے تھے۔

(13) ایضاً۔ شیخ عبدالوہاب، شاہ عبدالرحیم کے ہم عصر بزرگ تھے اور سلوک و احسان میں ممتاز تھے۔

(14) ایضاً

(15) ایضاً ورق 61 الف۔

(16) ایضاً

(17) ایضاً

(18) ایضاً ورق 63 الف۔

(19) ایضاً۔ ورق 61 ب۔ شیخ محمد عاشق حضرت شاہ صاحب کا ایک عربی شعر لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ حضرت بار بار مجھے یہ لکھا کرتے تھے:

وانی وان خاطبت لف مخاطب

فانت الذی اعنی وانت المخاطب

(میں ہزار لوگوں سے مخاطب ہوا لیکن میرا مدعا تُو ہے اور تُو ہی میرا مخاطب ہے)

(20) ایضاً

(21) ایضاً

(22) ایضاً۔ یہ امر تعجب ہے کہ شیخ محمد عاشق نے اپنی بیعت اول کا حال کہیں بیان نہیں کیا ہے۔

(23) ایضاً۔ ورق 61 ب۔

(24) ایضاً۔ ورق 63 الف۔ (25) ایضاً۔ ورق 60 الف و ب۔

(26) ایضاً۔ ورق 63 ب۔ (27) ایضاً

(فکر و نظر (اسلام آباد)، اپریل تا جون 1987ء، ص 87-102)

✦ ..... ✦ ..... ✦
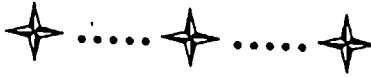
حکیم محمود احمد برکاتی

شاہ ولی اللہ کے حالات

شاہ عبدالعزیز کی زبانی

شاہ ولی اللہ دہلوی کی ایک جامع و مبسوط سوانح حیات محققانہ اور جدید اسلوب پر ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔
''حیات ولی'' کے اولیں مآخذ تو خود شاہ صاحب ہی کی تحریریں ہوں گی۔''انفاس العارفین''،''فیوض الحرمین''،''الدرالثمین''
اور''الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ'' و''اسانید وارثی رسول اللہ'' میں بہت سا مواد مل جائے گا۔''الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد
الضعیف'' کے نام سے تو ایک رسالہ ہی شاہ صاحب نے اپنے احوال و سوانح کے طور پر تحریر فرمایا تھا۔اس کے بعد سب سے
زیادہ اہمیت''القول الجلی فی مناقب الولی'' کی ہے جو شاہ صاحب کی حیات ہی میں ان کے نسبتی بھائی، دوست، ہم درس،
شاگرد اور خلیفہ شاہ محمد عاشق پھلتی نے تحریر فرمایا تھا۔خود شاہ صاحب نے''الجزء اللطیف'' میں اس کا ذکر فرمایا ہے(مطبع احمدی،
دہلی،ص194)۔یہ رسالہ انیسویں صدی کے اواخر تک تو دستیاب تھا،نواب صدیق حسن خاں اور مولوی رحمان علی نے
اپنی کتابوں میں اس سے اقتباس و استفادہ کیا تھا،مگر اب عرصے سے نایاب ہے۔''حیات ولی'' کے مؤلف رحیم بخش دہلوی
کو بھی نہیں ملا تھا(''حیات ولی'' طبع لاہور،ص392)۔یہ رسالہ اگر کہیں سے دریافت کر لیا جائے تو ایک معتبر و معتمد اور نسبتاً
بسیط تذکرہ ہوگا۔شاہ محمد عاشق ہی کی ایک تحریر''الخیر الکثیر''(طبع ڈابھیل) کے آغاز میں ہے۔وہ بھی مفید و بکار آمد ہے۔

اس کے بعد میرے خیال میں بڑی اہمیت شاہ عبدالعزیز کے ان اقوال و بیانات کی ہے جو ان کے''ملفوظات''
میں پائے جاتے ہیں۔

شاہ عبدالعزیز کے آخری چند سالوں کے ملفوظات ان کے ایک حاضر باش مسترشد (1) نے 1233ھ میں مرتب
کیے تھے اور ایک ارادت کیش قاضی بشیر الدین میرٹھی نے 1314ھ میں پہلی بار مطبع مجتبائی (میرٹھ) سے شائع کیے تھے۔

جامع کا نام معلوم نہ ہونے کے باوجود ہماری رائے میں ان ملفوظات کی نسبت شاہ صاحب کی طرف بالعموم صحیح
ہے کیونکہ اولاً تو مطبوعہ نسخے کے علاوہ ایک قریب العہد مخطوطہ بھی پیش نظر ہے اور ہم نے دونوں کا زیادہ تر مقامات سے
مقابلہ کر لیا ہے۔ثانیاً ملفوظات کے اکثر مشتملات کی دوسرے مآخذ سے بھی تصدیق و تصدیب ہوتی ہے جیسا کہ ہم نے
حواشی میں حسبِ ضرورت اس کی صراحت کر دی ہے۔

مؤلف کی دیانت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ جب بھی کسی ملفوظ کو بروقت قلم بند نہیں کر سکے ہیں انہوں نے اس کا

اظہار کر دیا ہے، مثلاً ایک مقام پر نصف ملفوظ نقل کر کے بقیہ نصف نقل کرنے سے پہلے لکھتے ہیں:

از ین جا این قصہ بعد سہ ماہ بموجب یاد خود کہ باعتماد آن سفیدی گذاشتہ بودم، نوشتہ ام (ص 108)

یہاں سے اس قصے کو تین ماہ کے بعد لکھتا ہوں اپنے حافظہ کے بھروسے پر۔ میں نے یہاں جگہ چھوڑ دی تھی۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ ہر ملفوظ کو بروقت لکھ لیا کرتے تھے۔

ایک مقام پر شاہ صاحب کی ایک تاریخی تحقیق کا صرف خلاصہ نقل کیا ہے:

این وقت بسبب ضیق فرصت بقلم نمی آید مگر یاد است ان شاء اللہ العزیز بشرط فرصت و یاد خواہم نگاشت (ص 97)۔

اس وقت فرصت نہ ہونے کی وجہ سے (پوری گفتگو) نہیں لکھ رہا ہوں مگر گفتگو یاد ہے۔ اللہ نے چاہا تو بشرط فرصت و یاد لکھ دوں گا۔[2]

اس سے بھی اس قیاس کو تقویت ہوتی ہے کہ جامع دن کے دن ہر بات لکھ لینے کا اہتمام کرتے تھے۔

یہ ضرور ہے کہ ملفوظات کے اندازِ بیان سے جامع کے صاحب علم ہونے کا اظہار نہیں ہوتا۔ انداز بیان علمی وادبی نہیں ہے۔ زبان (فارسی) مقامی اور غیر معیاری تو ہے ہی مگر اغلاط سے بھی خالی نہیں ہے۔

علمی ذوق کے فقدان ہی کے نتیجے میں زیادہ تر اشعار، لطیفے اور قصص و حکایات نقل کیے ہیں۔ علمی موضوعات پر جن تقاریر کو نگاہیں ڈھونڈتی ہیں وہ نہیں ملتیں، حالانکہ شاہ صاحب کی مجلس میں زیادہ دینی و علمی موضوعات معرض کلام میں آتے ہوں گے اور شاہ صاحب ان پر داد تحقیق دیتے ہوں گے۔ جامع کو اگر علمی ذوق ہوتا تو وہ ان تقریروں کو محفوظ کر لیتے اور آج ہمارے لئے یہ سرمایہ منفعت بخش ہوتا۔

بعض ملفوظات کی صحت نسبت کو تسلیم کرنے کی اجازت ہماری عقیدت کسی طرح نہیں دیتی، مثلاً صفحہ 62 کا مکالمہ اور صفحہ 66 کا شعر اور صفحہ 55 کی حکایت۔ شاہ صاحب کے وقار و ثقاہت اور ان کی بزم کے تقدس و شائستگی سے اس قسم کے فحش لطائف اور عامیانہ اشعار کا کوئی میل نہیں ملتا۔

بہر حال شاہ ولی اللہ کی سوانح کے لئے یہ کتاب ایک اہم مآخذ ہے۔ کتاب میں جہاں جہاں شاہ ولی اللہ کا ذکر ہے، ہم نے انہیں ایک ترتیب سے جمع کر لیا ہے۔

تاریخ ولادت و وفات: تاریخ تولد[3] شاہ ولی اللہ چہارم شوال و چہار شنبہ 1114ھ بود۔ تاریخ وفات ''او بود امام اعظم دین''، دیگر ''ہائے ولی روزگار رفت'' بست نہم محرم وقت ظہر (ص 40)

شاہ صاحب کی تاریخ ولادت چہار شنبہ 4 شوال 1114ھ ہے اور تاریخ وفات ''او بود امام اعظم دین'' اور ''ہائے ولی روزگار رفت'' سے نکلتی ہے۔ وقت ظہر 29 محرم (1176ھ)۔

شاہ صاحب کا حافظہ: مثل والد ماجد حافظہ ندیدہ ام (ص 11)

والد ماجد کی طرح میں نے کسی کا حافظہ نہیں دیکھا۔

شاہ صاحب راجپوتانے میں: ہنگام سفر مکہ معظمہ حضرت والد ماجد را در ملک راجپوتانہ ثبوت پیوست کہ یک کھٹل مثل کچھوہ خورد بود از جہت زہر رنگ سبز بنظر می آید ہر کہ نیش می زد می مرد (ص 73)۔

مکہ معظمہ کے سفر کے دوران والد ماجد کو راجپوتانے میں اس بات کی تحقیق ہوئی کہ ایک کھٹل چھوٹے کچھوے کے برابر ہوتا ہے، زہریلا ہونے کی وجہ سے وہ ہرا نظر آتا ہے اور جس کسی کو ڈنک مار دیتا ہے وہ مر جاتا ہے۔

سیدنا حسن کا قلم: چون والد ماجد بمکۂ معظمہ رسید حضرت امام حسن را بخواب دید کہ چادرے برسر انداختند و قلم عنایت کردند و فرمودند این قلم جد من است۔ بعد ازاں فرمود باش کہ امام حسین ہم بیاید۔ چون آمدند قلم تراشیدہ بادست والد ماجد دادند۔ در آن وقت حال نسبت و علم و تقریر دگر گون شد۔ چنانچہ مستفیضان سابق ہرگز احساس۔ نسبت سابق نمی کردند(4) (ص 82، 83)

جب والد ماجد مکہ پہنچے تو حضرت امام حسن کو خواب میں دیکھا۔ انہوں نے (شاہ صاحب کے) سر پر ایک چادر ڈالی اور ایک قلم عنایت کیا اور فرمایا یہ میرے نانا (صلی اللہ علیہ وسلم) کا قلم ہے۔ اس کے بعد فرمایا ٹھہرو امام حسین تشریف لا رہے ہیں۔ جب وہ تشریف لائے تو انہوں نے قلم کو تراش کر والد ماجد کے ہاتھ میں دیا۔ اسی وقت سے نسبت باطن علم اور تقریر کا رنگ اتنا بدل گیا کہ جن لوگوں نے پہلے استفادہ کیا تھا وہ سابقہ نسبت کا احساس تک نہیں کرتے تھے۔

جو پڑھا لکھا تھا......: پدر من وقت رخصت از مدینہ از استاد خود عرض کرد و او خوش شد کہ ہر چہ خواندہ بودم فراموش کردم الا علم دین یعنی حدیث(5) (ص 93)۔

میرے والد صاحب نے مدینۂ منورہ سے رخصت ہوتے وقت اپنے استاد سے عرض کیا جس سے وہ خوش ہوئے کہ میں نے جو کچھ پڑھا لکھا تھا علم دین یعنی حدیث کے علاوہ سب بھلا دیا۔

سند حدیث: چہاردہ (6) ماہ در حرمین بودہ و سند کردہ۔ بعض جا استاد می فرمود معنی این حدیث تو بفرما و در سند اجازت نوشتہ، سند از من کرد اگرچہ بہ از من است (ص 93)۔

والد ماجد چودہ مہینے حرمین میں رہے اور سند حاصل کی۔ بعض مقام پر استاد فرماتے تھے اس حدیث کے معنی تم بیان کرو اور سند میں لکھا کہ انہوں نے مجھ سے سند حاصل کی ہے اگرچہ یہ مجھ سے بہتر ہیں۔

تقسیم کار: حضرت والد ماجد از ہر یک فن شخصے تیار کردہ بودند۔ طالب ہر فن باوے می سپردند و خود مشغول معارف نویسی و گوئی می بودند و حدیث می خواندند بعد مراقبہ ہر چہ بکشف می رسید می نگاشتند مریض ہم کم می شدند۔ عمر شریف شصت و یک سال و چہار ماہ شد (ص 40)

حضرت والد ماجد نے ہر فن کے لئے ایک شخص (شاگرد) تیار کر دیا تھا اور ہر فن کے طالب علم کو اس کے فاضل کے سپرد کر دیتے تھے اور حقائق و معارف بیان کرنے اور تحریر کرنے میں مشغول رہتے تھے حدیث پڑھتے تھے اور مراقبہ کے بعد جو کچھ کشف کے ذریعے معلوم ہوتا تھا لکھ لیتے تھے۔ بیمار بھی کم ہوتے تھے۔ آپ کی عمر اکسٹھ سال چار ماہ ہوئی۔

ضبط اوقات: مثل والد ماجد شخصے کم بنظر آمد سوائے علوم و کمالات دیگر در ضبط اوقات۔ چنانچہ بعد اشراق کہ می نشست تا دوپہر زانو بدل نمی کرد و خارش نمی نمود و آب دہن نمی انداخت (ص 43)

دیگر علوم و کمالات کے علاوہ ضبط اوقات میں بھی والد ماجد کی طرح کم ہی کوئی آدمی نظر آیا۔ اشراق کے بعد جو بیٹھتے تھے تو پہلو بھی نہیں بدلتے تھے نہ کھجاتے تھے نہ تھوکتے تھے۔

شاہ عبدالعزیز کی ولادت: بندہ را عورات ''مسیتا'' (7) می گفتند وجہش آن کہ در شب بست وپنجم رمضان وقت سحر تولد شدہ بودم۔ چون والدین را کودک (8) بسیار مردہ بودند مگر برائے من آرزوئے کمال بود۔ در آن ہنگام بزرگان بسیار اولیاء بسیار از یاران والد ماجد مثل شاہ محمد عاشق ومولوی نور محمد (9) وغیرہ معتکف مسجد ہٰذا می بودند۔ پس مارا غسل دادہ در محراب (10) انداختند گویا نذر خدا کردند۔ پس بزرگان مارا قبول کردہ از طرف خدا انعام کردند (ص 109)۔

بندہ [شاہ عبدالعزیز] کو عورتیں مسیتا کہتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں 25 رمضان کی شب میں پچھلے پہر پیدا ہوا ہوں۔ چونکہ والدین کے بچے بچتے نہیں تھے اس لئے میری بڑی آرزو تھی۔ (میری ولادت کے وقت) بہت سے بزرگ اور خدا رسیدہ حضرات مثلاً شاہ محمد عاشق اور مولوی نور محمد وغیرہ اسی مسجد میں معتکف تھے۔ (ولادت کے بعد) مجھے غسل دے کر مسجد کے محراب میں ڈال دیا گیا گویا خدا کی نذر کر دیا گیا۔ پھر ان بزرگوں نے مجھے قبول کر کے خدا کی طرف سے انعام (میں واپس) عطا کیا۔

شفقت پدری: والد ماجد بے بندہ طعام نمی خوردند (ص 3)

والد ماجد میرے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے۔

چشتیت: در ابتداء والد ماجد ہم ہمون (نسبت چشتیت) غالب بود۔ بعد از ان انقلاب شد (ص 82)

ابتدا میں (جد امجد کی طرح) والد ماجد پر بھی نسبت چشتیت غالب تھی۔ بعد میں انقلاب ہوا۔

گمان تشیع: شخصے از والد ماجد مسئلۂ تکفیر شیعی پرسید۔ آن حضرت اختلاف حنفیہ درین باب کہ ہست بیان کردند۔ چون مکرر پرسید ہمان شنید۔ شنیدم کہ می گفت کہ این شیعی است (ص 32)

ایک شخص (متعصب روہیلہ) نے والد ماجد سے شیعی کے کفر کے متعلق سوال کیا۔ آپ نے (اس کی مرضی کے خلاف) اس باب میں احناف کا اختلاف بیان کیا (یعنی اس فرقے کے کفر پر اتفاق آراء نہیں ہے)۔ اس نے دوبارہ دریافت کیا اور یہی جواب پایا تو میں نے سنا ہے کہ کہنے لگا کہ یہ (خود) شیعی ہیں۔

شیعوں سے قرابت: بعضے (11) از اقرباء قریبۂ ما شیعۂ غالی اند (ص 37)

ہمارے بعض قریبی اعزہ غالی شیعی ہیں۔

کرامت: در وقت طفلی بیمار بودم۔ حکیمے تداوی می کرد۔ بہ شدم۔ والد ماجد آن را حکم فرمودند کہ مارا خوش ساختی بگو در حق تو دعائے کنم۔ ہر چند خلاف وضع شریف بود لیکن فرمودند۔ عرض کرد کہ نوکر شوم۔ در ہمون ہنگام بلکہ شب صد روپیہ را مع سواری تعیناتی نوکر شد۔ چون آمدہ عرض کرد۔ آن حضرت از زبان مبارک فرمود: ہمت شما قاصر بود کہ بر دنیا آن ہم حقیر اکتفا کردید (ص 43-44)۔

میں لڑکپن میں بیمار تھا۔ ایک حکیم صاحب نے علاج کیا۔ میں صحت یاب ہو گیا۔ والد ماجد نے اپنی عادت کے برخلاف ان سے کہا آپ نے میرا دل خوش کر دیا، بتائیے آپ کے حق میں کیا دعا کروں؟ حکیم صاحب نے کہا (یہ دعا کیجیے کہ) میں نوکر ہو جاؤں۔ اس زمانے میں بلکہ اسی رات سو روپیہ تنخواہ (مع سواری) پر نوکر ہو گئے۔ جب حکیم صاحب نے آ کر بتایا تو حضرت نے زبان مبارک سے فرمایا آپ کا حوصلہ ہی پست تھا کہ دنیا اور وہ بھی اس کے حقیر حصے پر کفایت کی۔

طب: حکمت، ہم درخاندان مامعمول بود۔ چنانچہ جد[12] بزرگوار وعم [13] فقیر دوا می کردند۔ والد ماجد و بندہ موقوف ساختہ (ص22)

ہمارے خاندان میں طب کا بھی مشغلہ تھا۔ چنانچہ جد بزرگوار [شاہ اہل اللہ] مطب کیا کرتے تھے۔ والد ماجد اور میں نے یہ سلسلہ موقوف کیا۔

ہر چند کہ والد ماجد مارا بنا بر دوا و طبابت بحسب مصلحت دیگر منع فرمودہ بودند لیکن خوب چیز ست بلکہ گویا جان بخشی است (ص43)

اگرچہ والد ماجد نے کسی مصلحت سے علاج اور طب کرنے سے ہمیں منع کر دیا تھا لیکن (یہ طب) ہے خوب چیز بلکہ (بعض حالات میں تو) گویا جاں بخشی ہے۔

وصیت نامہ[14]: ارشاد شد کہ وصیت نامۂ والد ماجد نقل کردہ بگیرند، بسیار نافع ست (ص75)

فرمایا: والد ماجد کا رسالہ ''وصیت نامہ'' نقل کر کے رکھیں، بہت مفید چیز ہے۔

مسلک فقہی: درین مقدمہ اختیار حضرت والد ماجد خوب است یعنی اگر یکے از مجتہدان بآن عمل کردہ باشد ترجیح حدیث است عمل کنند والا ترک دہد چرا کہ خالی از سبب سکوت ہمہ بانیست و این چنین شاید چہار حدیث خواہد بود (ص91)

اس (تقلید کے) مسئلے میں والد بزرگوار کا مسلک خوب ہے کہ اگر ائمۂ مجتہدین میں سے کسی ایک نے بھی اس حدیث پر عمل کیا ہے تو ترجیح حدیث کو دی جائے گی ورنہ حدیث کے بجائے قول مجتہد پر عمل کیا جائے گا، اس لئے کہ تمام ائمۂ مجتہدین کا سکوت بے سبب نہیں ہو سکتا اور اس قسم کی احادیث (جن پر کسی ایک امام کا بھی عمل نہ ہو) شاید تعداد میں چار ہوں گی۔

ایک فتویٰ: آن حضرت فرمود کہ ابی داؤد حدیث نقل می کنند کہ آن حضرت جامۂ خون آلود حیضی زنے را برائے صفائی از نمک شستن فرمودہ بود۔ چون نمک ہم چیز محترم است و طعام ہم محترم پس درست شد کہ از آرد وغیرہ اگرچہ آرد گندم باشد درست باید شست۔ لیکن چیزہائے دیگر سوائے طعام کہ درین مادہ بکار می برند بہتر ست والا آرد ہم جائز باشد (ص90)

(اس سوال پر کہ کھانے کے بعد آٹے سے ہاتھ دھونے کا کیا حکم ہے؟) آپ نے فرمایا ابوداؤد نے حدیث بیان کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت خون حیض سے آلودہ کپڑوں کو نمک سے دھو کر صاف کرنے کا حکم دیا تھا اور چونکہ نمک بھی محترم چیز ہے اور کھانا بھی، اس لئے آٹے وغیرہ سے چاہے وہ گیہوں کا آٹا ہی کیوں نہ ہو ہاتھ دھونا درست ہے لیکن کھانے کی چیزوں کے علاوہ جو اس کام میں لائی بھی جاتی ہیں ہاتھ دھونا بہتر ہے ورنہ آٹا بھی جائز ہے۔

ایک جزیرہ: شخصے از قبلہ گاہی عرض می کرد کہ در جزیرہ رفتہ بودم۔ آن جا سوائے نارجیل و ماہی از قسم طعام نمی شود مگر این کہ از ملک دیگر برند۔ چنانچہ آن کس را ہشتاد و دو طعام از ترکیب ہمیں دو پزیدن می دانم [15] (؟) (ص118)

ایک شخص نے حضرت قبلہ گاہی سے عرض کیا کہ میں ایک جزیرے میں گیا تھا۔ وہاں کھوپرے اور مچھلی کے علاوہ کھانے کی اور کوئی چیز دست یاب نہیں ہوتی تھی الا یہ کہ کسی دوسرے مقام سے لے آئیں۔ چنانچہ اس شخص کو بیاسی کھانے انہیں دو چیزوں سے پکانا آتے تھے۔

چین میں بلی: در ملک چین گربہ کم تر می شود و موش ہا بسیار جری شخصے از والد ماجد نقل می کرد کہ ہمراہ من گربہ بود تا جائے کہ در چین می روند رفتم دیدم کہ گلولہ بازاں در وقت طعام راجہ برائے دفع موشاں می استادند۔ من گفتم جانورے در ہند بہ پان صد روپیہ می آید۔ از آوازش موشاں می رمند۔ چنانچہ فروختم۔ از آوازش بالکل موشاں رمیدند (ص 71)

چین میں بلی بہت کم ہوتی ہے اور چوہے بڑے دلیر ہوتے ہیں۔ ایک شخص نے والد ماجد سے بیان کیا کہ میرے ساتھ (سفر میں) ایک بلی تھی اور چین میں جہاں تک جا سکتے ہیں میں گیا۔ میں نے دیکھا کہ (چوہوں کی کثرت کی وجہ سے) راجہ کے کھانے کے وقت گلولہ باز چوہوں کو بھگانے کے لئے کھڑے رہتے ہیں۔ میں نے کہا ہندوستان میں ایک جانور پانچ سو روپے میں آتا ہے۔ اس کی آواز سے چوہے بھاگ جاتے ہیں۔ چنانچہ میں نے بلی وہیں فروخت کر دی اور اس کی آواز سے چوہے بھاگ گئے۔

عذاب قبر: قصۂ عجب است۔ پیش حضرت والد بقسم غلیظ می گفت یعنی کشمیرے بطرف ملک دکن رفتہ پیش راجہ در فرقۂ باورچیاں نوکر شد۔ بعد مردنش موافق دستور آن جا من جملۂ جماعتہ خدام خاص این کس را ہم در سردابہ نہادند۔ چہ می بیند وقت شب دو فرشتہ مہیب چنانچہ در حدیث آمدہ است آمدند۔ از خوف آنہا بگوشہ رفتم۔ معلوم نیست مارا کہ چہ سوال و جواب شد۔ آخرش اورا می زدند۔ اعضائش ریزہ ریزہ شدند۔ ما ہمہ بے ہوش شدیم و بعضے مردند۔ من کلمہ می خواندم و فرشتہا جانب من دیدند و مارا بعد از گفتن کہ چرا آمدہ بودی۔ در کشمیر رسانیدند۔ پارچہ از اعضایش کہ بر بدن من ریزہ شدہ رسیدہ بود۔ سوزش آن نمی رفت ہر چند معالجہ کردم بہ نمی شد در دہلی آرم پیش بزرگان و اطباء رجوع کردم ہیچ فائدہ نہ شد۔ مگر عم شا ابو رضا محمد درود فرمودند تا حینیکہ بر دست کف زدہ بر آن جا می مالم تسکین می نماید سخت تنگ ہستم (ص 68-69)۔

عجیب قصہ ہے۔ ایک شخص کشمیری حضرت قبلہ کے سامنے قسمیں کھا کھا کر کہتا تھا کہ میں جنوبی ہند میں ایک راجہ کے یہاں باورچیوں کے زمرہ میں ملازم ہو گیا تھا۔ راجہ کے مرنے کے بعد وہاں کے دستور کے مطابق راجہ کی لاش کو اس کے خدام کے ساتھ جن میں میں بھی شامل تھا ایک محفوظ کمرہ میں بند کر دیا گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ رات کو دو مہیب فرشتے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے، آئے۔ میں ان کے خوف سے ایک کونے میں دبک گیا۔ مجھے نہیں معلوم راجہ سے کیا سوال و جواب ہوئے۔ آخر فرشتوں نے اس کو مارنا شروع کیا اور اتنا مارا کہ اس کے اعضا ریزہ ریزہ ہو گئے۔ ہم لوگ دہشت سے بے ہوش ہو گئے بلکہ بعض تو مر گئے۔ میں کلمہ پڑھ رہا تھا۔ فرشتوں نے میری طرف دیکھا اور یہ کہہ کر کہ یہاں کیوں آ گیا تھا مجھے کشمیر پہنچا دیا۔ فرشتوں کی مار سے راجہ کی لاش کے جو ریزے میرے بدن پر اچھٹ کر لگ گئے تھے ان کی سوزش محسوس ہوتی تھی۔ بہت علاج کیے مگر فائدہ نہیں ہوتا تھا۔ میں نے دہلی آ کر اطبا اور بزرگوں سے رجوع کیا مگر سوزش نہیں گئی۔ ہاں تمہارے

چچا ابوالرضا محمد (16) نے درود پڑھ کر میرے ہاتھ پر دم کر دیا تھا۔ جب تک ہاتھ متاثر حصے پر پھیرتا رہتا ہوں، سکون رہتا ہے۔ بہت تنگ ہوں۔

شاہ صاحب کی ایک رباعی (ص 103):

در محبت اہل دل رسیدیم بسے — بس درویزہ کنان زما کسے یک نفسے
از چشمۂ آب زندگانی قدحے — وز آتش وادی مقدس قبسے

مدار بخش نامی قوال کی درخواست پر شاہ عبدالعزیز نے والد ماجد کی ایک غزل عنایت فرمائی (ص 10):

من ندانم بادہ ام یا بادہ را پیمانہ ام — عاشق شوریدہ ام یا عشق با جانانہ ام
مبتلائے حیرتم جان گویمت یا جان جان — اصلاح شوق بسیار است و من دیوانہ ام
میل ہر عنصر بود سوئے مقر اصلیش — جذبۂ اصل است سر شورش مستانہ ام
شوق (17) موسیٰ در ظہور آورد نار طور را — در نہاد طبع آتش می زند پروانہ ام
اے امین بر ستیم نام تجدد تہمت است — در ازل پیش از زمان تعمیر شد میخانہ ام

ایک اور غزل:

گر بگلشن بگذری گل بر رخت مفتون شود — ور نمائی قامت خود سرورا، موزون شود
کار بامعنی ست دانا را نہ با نام و نشان — جذبۂ لیلیٰ ندارد (18) بید اگر مجنون شود
مرد مفلس را جہان یکسر محل آفت است — شیشہ گر خالی ست گرباد ش رسد واژون شود

رباعی:

در صحبت اہل دل رسیدیم بسے — بس درویزہ کنان زما کسے یک نفسے
از چشمۂ آب زندگانی قدحے — و ز آتش وادی مقدس قبسے

ایک قطعہ: در تشریف بردن والد ماجد خود و بد گفتن صاحب زادہ در حق شیخ آدم بنوری (19) و ناراضی شان" (ص 103) — اپنے والد ماجد [شاہ ولی اللہ] کے کہیں تشریف لے جانے اور وہاں ایک لڑکے کی شیخ آدم بنوری کی شان میں گستاخی کرنے اور اس سے والد ماجد کی ناخوشی (کا ذکر کر کے ان کا یہ قطعہ پڑھا):

شخصے بخوردہ گیری ما عاجزان فتاد — زان زو کہ در طریقۂ مخدوم آدمیم
گفتم کہ حرف راست بگویم ز ما رنج — تو آدمی بنوری و ما آدمی شدیم

(اقبال ریویو، جنوری 1967ء، ص 131-143)

حواشی

(1) افسوس ہے کہ مسترشد کے نام کا پتہ نہیں چلتا۔ ناشر کا بیان ہے کہ نسخے کی بوسیدگی اور کرم خوردگی کی وجہ سے جامع ملفوظات کا نام پڑھا نہ جاسکا۔ مگر ہمارے سامنے ملفوظات کا ایک اور مخطوطہ بھی ہے۔ اس میں بھی نہ جامع کا نام ہے نہ کاتب کا، البتہ سن کتابت 1250ھ درج ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ نسخہ شاہ عبدالعزیز کے وصال (1239ھ) کے صرف گیارہ سال بعد کا مکتوبہ ہے۔ یہ نسخہ مولانا سید نذر علی درد کاکوروی (مقیم کراچی) کی ملک ہے۔

(2) مگر معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں یاد نہیں رہا یا فرصت نہیں ملی کیونکہ بعد میں بھی یہ اصل ملفوظ کتاب نہیں ملتا۔

(3) ملاحظہ ہو ''الجزء اللطیف'' مطبع احمدی، دہلی، ص 193۔

(4) ''فیوض الحرمین'' مطبع احمدی، دہلی، ص 21:

''میں نے 10 رصفر 1144ھ کی رات میں خواب دیکھا کہ گویا حسن وحسین رضی اللہ عنہما میرے گھر تشریف لائے ہیں اور حضرت امام حسنؓ کے ہاتھ میں ایک قلم ہے جس کی نوک ٹوٹ گئی ہے۔ آپ نے مجھے بخشنے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور فرمایا یہ ہمارے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قلم ہے۔ پھر فرمایا ٹھہر و تاکہ حسینؓ اسے ٹھیک کردیں، یہ قلم ویسا نہیں ہے جیسا حسینؓ نے اسے بنایا تھا۔ پھر حسینؓ نے لیا اور بنا دیا اور مجھے عنایت فرمایا جس سے میں خوش ہوا اور ایک چادر جس پر ایک سفید دھاری تھی اور ایک سبز ان دونوں کے سامنے لاکر رکھی گئی۔ حضرت حسینؓ نے وہ چادر اٹھائی اور فرمایا یہ میرے نانا صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر ہے اور مجھے اڑھا دی۔ میں نے اسے سر پر رکھ لیا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور پھر میں خواب میں بیدار ہوگیا۔'' ترجمہ۔

(5) ''انسان العین فی مشائخ الحرمین'' مطبع احمدی، دہلی، ص 192:

ایں فقیر برائے وداع نزدیک شیخ ابوطاہر رفت ایں بیت برخواند:

نسیت کل طریق کنت اعرفه   الا طریقاً یو دینی الٰهی ربعکم

[ترجمہ: میں اب تک جتنے بھی راستوں سے واقف تھا انہیں بھلا چکا ہوں، صرف وہ راستہ یاد ہے جو تمہارے تک مجھے پہنچاتا ہے۔]

بمجرد شنیدن آن بکا بر شیخ غالب آمد وبغایت متاثر شد۔''

شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم بن حسن کردی مدنی (1081-1145ھ) شاہ صاحب نے مدینہ منورہ میں زیادہ تر استفادہ اور استفاضہ انہی سے کیا تھا۔ ''انسان العین'' میں شاہ صاحب نے ان کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔

(6) شاہ صاحب 8 ربیع الثانی 1143ھ کو دہلی سے روانہ ہوئے تھے (سید احمد ولی اللہ، ''تاویل الاحادیث'' ص 87) اور 9 رجب 1145ھ کو واپس دہلی پہنچے (''الجزء اللطیف'' ص 193)۔ اس طرح کل اٹھائیس مہینے سفر میں گزرے۔ ان میں سے تقریباً سات مہینے آمد ورفت میں گزرے اور چودہ مہینے حرمین میں حاضری رہی۔

(7) مہتا یعنی مسجد والا۔ مسجد کا عوامی تلفظ میت ہے۔ اسی کی نسبت مہتا ہے۔

(8) یہ شاہ ولی اللہ کی زوجۂ اولیٰ کی اولاد کا ذکر ہے۔ شاہ صاحب کا عقد ثانی 1157ھ میں ہوا اور دوسال بعد 1159ھ میں شاہ

عبدالعزیز تولد ہوئے۔

(9) غالباً یہ نام نور محمد نہیں نور اللہ ہے۔ مولوی نور اللہ بڈھانوی شاہ ولی اللہ کے شاگرد اور شاہ عبدالعزیز کے خسر تھے۔ 1187ھ میں وصال فرمایا۔

(10) اولاد کے شوق اور محبت میں کیسے کیسے بزرگ بھی کمزوریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اولاد کو قرآن نے ''فتنہ'' جو کہا ہے!

(11) یہ اشارہ غالباً میر قمر الدین منت کی طرف ہے۔ یہ نہ صرف شاہ صاحب کے عزیز بلکہ شاگرد بھی تھے۔ شاہ صاحب نے ''عجالۂ نافعہ'' نامی رسالہ انہی کے لئے لکھا تھا لیکن مولانا فخر الدین دہلوی سے ارادت اور اودھ کے امرا کے روابط کے نتیجے میں اثنا عشری ہو گئے تھے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ''فضائل صحابہ و اہل بیت'' پاک اکیڈمی، کراچی، مقدمہ پروفیسر محمد ایوب قادری، ایم۔ اے۔ (ص 64)

(12) شاہ ولی اللہ ''بوارق الولایت'' مطبع احمدی، دہلی، ص 84: ''در طب حدس ایشان بغایت سلیم ورسا بود۔''

(13) شاہ اہل اللہ دہلوی علوم دینیہ کے فاضل اور صاحب تصانیف ہونے کے علاوہ باقاعدہ مطب بھی کرتے تھے۔ ''تکملۂ ہندی'' اور ''تکملۂ یونانی'' دو رسالے بھی طب میں تالیف کیے تھے۔ زندگی کا بڑا حصہ اپنے ننہال (پھلت ضلع مظفر گڑھ یو۔ پی، بھارت) میں بسر کیا۔ وہیں مزار بھی ہے۔ وفات 1187ھ

(14) اصل نام ''المقالۃ الوضیۃ فی النصیحۃ والوصیۃ'' ہے۔ فارسی میں ایک مختصر سا رسالہ ہے۔ پہلے ہوگلی سے عبداللہ بہادر علی نے، پھر مولوی سید احمد نے مطبع احمدی (دہلی) سے اور اب (1964ء) شاہ ولی اللہ اکادمی حیدر آباد نے شائع کیا ہے اور پروفیسر محمد ایوب قادری نے اسی خانوادے کے تین مزید وصیت ناموں کے ساتھ اسے مدون کیا ہے۔

(15) یہ تین واقعات جہاں لازماً لغو و بے اصل نہیں کہے جا سکتے وہاں ان کی صحت کا تیقن بھی مشکل ہے۔ ہم صرف اس لئے نقل کر رہے ہیں کہ یہ قصے شاہ ولی اللہ کی مجلس میں بیان کیے گئے تھے۔ ہمارے ان بزرگوں کی مجالس نری ''خشک'' اور صرف علمی موضوعات کے لئے ہمہ وقت وقف نہیں ہوتی تھیں بلکہ ان میں مطائبات اور دلچسپ گفتگوؤں کی بھی گنجائش ہوتی تھی۔ ذرا تصور کیجیے ابلاغ و دعوت کی خاطر، ربط عوام میں ان بزرگوں کو کس درجہ ریاض کرنا پڑتا ہوگا۔ شاہ ولی اللہ کے سامنے ایک سیاح اپنی ''سفر بیتی'' سنا رہا ہے اور وہ بڑی ''سنجیدگی'' سے اسے سن رہے ہیں!

(16) شیخ ابوالرضا محمد بن شیخ وجیہہ الدین شاہ ولی اللہ کے چچا اور شاہ عبدالرحیم کے بڑے بھائی اور استاد و مربی تھے۔ شاہ ولی اللہ نے ''انفاس العارفین'' کا باب دوم (ص 86-156) ''شوارق المعرفت'' کے نام سے آپ کے حالات میں تحریر فرمایا ہے۔ حالات اور تصرفات و کرامات کے ساتھ آپ کے فاضلانہ اور عارفانہ ملفوظات اور دو رسالوں (''تفسیر بسم اللہ'' اور اصول الولایۃ'') کے اقتباسات بھی دیے ہیں جن سے علوم دینیہ میں آپ کے فضل و کمال کا اندازہ ہوتا ہے۔ نبیرۂ حضرت مجدد شیخ عبدالاحد گل وحدت سے آپ کے مراسم اخلاص تھے۔ شاہ صاحب نے ''شوارق'' میں دونوں بزرگوں کے کئی مکاتیب نقل فرمائے ہیں۔ ان مکاتیب میں تاریخ ادب اردو کے طلبا کے لئے دلچسپی کا سامان وہ دوہرے ہیں جو طرفین کے نتائج فکر ہیں۔ ان دوہروں کی اہمیت یہ ہے کہ حضرت عبدالاحد وحدت (ف 1126ھ)، ولی دکنی (یا گجراتی) کے استاد گلشن کے استاد تھے۔ شیخ عبدالاحد پر ایک مفصل مضمون زیر قلم ہے۔ اس میں یہ دوہرے نقل کیے جائیں گے۔

(17) ''حیات ولی'' (ص506) میں یہ شعر غزل میں نہیں ہے، مگر دو مزید شعر ہیں:

با جمال ذاتیش حسن دگر درکار شد چشم او را سرمہ ام یا زلف او را شانہ ام

غافل از خود ماند از صورت چو برشد آئینہ تا ترا بشناختم جانان زخود بیگانہ ام

(18) بید مجنون پر شاہ عبدالعزیز نے بھی (ص43) طبع آزمائی فرمائی ہے:

زنازک طبع غیر از خود نمائی ہا نمی آید

درخت بید را دیدم کہ دائم بے ثمر باشد

مگر ''حیات ولی'' میں اس شعر کو شاہ ولی اللہ سے منسوب کیا گیا ہے (ص511)

(19) شیخ آدم بن اسماعیل بنوری، حضرت امام ربانی کے خلفا میں سے تھے۔ 1053ھ میں وفات پائی۔

✧.....✧.....✧

محمد عبدالحلیم چشتی

تذکرہ شاہ ولی اللہ از "الروض الممطور"

مولانا ذوالفقار احمد نقوی بھوپالی مرحوم نے علامہ جلال الدین سیوطی (المتوفی 911ھ) کی کتاب "شرح الصدور فی احوال الموتی والقبور" کی اردو میں شرح لکھی ہے، جو "طے الفراسخ فی منازل البرازخ" کے نام سے تین جلدوں میں مطبع مفید عام آگرہ سے 1304ھ میں شائع ہوئی تھی۔ اب نہیں ملتی ہے۔ یہ کتاب عالم برزخ اور احوال آخرت کے موضوع پر اردو زبان میں سب سے زیادہ مبسوط، جامع اور مفید کتاب ہے۔ اس کتاب میں جن بزرگوں کے نام دوران شرح آئے ہیں، مولانا ذوالفقار احمد نقوی نے ان کا مختصر تذکرہ "الروض الممطور فی رجال شرح الصدور" کے نام سے اردو میں کیا ہے جو "طے الفراسخ" کے ساتھ شائع ہو گیا ہے۔ اس میں منجملہ اور ناموں کے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا نام بھی آیا ہے۔ اس لئے موصوف نے اس میں شاہ صاحب کا بھی تذکرہ نقل کیا ہے۔

مولانا ذوالفقار احمد نقوی کی عربی تحریر جیسی رواں اور شگفتہ ہوتی ہے اردو تحریر ایسی نہیں۔ اس میں عربی کے بعض بوجھل الفاظ بھی آجاتے ہیں۔ پھر انداز نگارش بھی ان کا یکسر پرانا ہے۔ تاہم ان کا یہ تذکرہ اردو میں اس حیثیت سے بہت ممتاز ہے کہ اس میں انہوں نے ان اصولوں کی نشاندہی بھی کی ہے جو شاہ عبدالرحیم دہلوی نے شاہ ولی اللہ کی تربیت میں ملحوظ رکھے ہیں اور جن پر تا زندگی کاربند رہنے کی ان کو تاکید کی تھی اور اس پر شاہ صاحب تمام عمر کاربند رہے ہیں۔ اس سے شاہ صاحب کی شخصیت کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ کیونکہ سیرت کی تعمیر میں اصول تربیت خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

مولانا ذوالفقار علی نقوی نے ان اصولوں کو "انفاس العارفین" سے نقل کر کے ان کے حالات میں نقل کر دیا ہے۔ افسوس ہے کہ شاہ ولی اللہ کے تذکرہ نگاروں نے ان اصولوں سے یا تو بحث ہی نہیں کی ہے یا پورا اعتناء نہیں کیا ہے۔ اس لئے مولانا ذوالفقار احمد نقوی کا تذکرہ خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔

ہم نے شاہ صاحب کا تذکرہ "الروض الممطور" سے بجنسہ نقل کر دیا ہے اور اس میں ذیلی سرخیوں

کے علاوہ کسی قسم کا تصرف نہیں کیا ہے۔ (چشتی)

نام ونسب

ولی اللہ قطب الدین احمد بن الرحیم بن وجیہہ الدین الشہید بن معظم بن منصور بن احمد بن محمود بن قوام الدین عرف قواذن بن قاضی قاسم بن قاضی کبیر عرف قاضی برہان بن عبدالملک بن قطب الدن بن کمال الدین بن شمس الدین المفتی بن شیر ملک بن عطا ملک بن ابوالفتح ملک بن عمر الحاکم ملک بن عادل ملک بن قارون بن جرجیس بن احمد بن محمد شہریار بن عثمان بن ہامان بن ہمایوں بن قریش بن سلیمان بن عفان بن عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہکذاذکرہ فی الامداد فی مآثر الاجداد۔

پس نسب آپ کا طرف خلیفہ ثانی حضرت حضرت رضی اللہ عنہ کے تیس واسطے سے پہنچتا ہے۔ خود آپ نے اپنا حال برکت اشتمال ''جزءلطیف'' نامی رسالے میں لکھا ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ

ولادت

ولادت آپ کی روز چہار شنبہ شوال مقارن طلوع شمس سنہ چودہ میں بارہویں قرن ہجری کے واقع ہوئی۔ یعنی 1114ھ میں بعض دوستوں نے عظیم الدین تاریخ پائی اور حضرت والدین وایک جماعت صلحاء نے مبشرات بسیار حق میں اس فقیر کے قبل ولادت و بعد ولادت کے دیکھے چنانچہ بعض اخوان اعزہ وخلان اجلہ نے تفصیل اون وقائع کی مع اور واقعات کے ایک رسالہ میں ضبط کی اور اس کا نام ''القول الجلی'' رکھا ہے۔

تعلیم کا آغاز

جب پانچویں برس آئی تو مکتب میں بیٹھا۔ ساتویں برس پدر بزرگوار نے نماز پر کھڑا کیا اور روزہ رکھنے کو فرمایا اور ختنہ بھی اسی برس میں واقع ہوئی اور دل میں ایسا آرہا ہے کہ اسی سال کے آخر میں قرآن عظیم ختم کیا اور کتب فارسیہ ومختصرات پڑھنی شروع کر دیئے۔ دسویں برس میں شرح ملا پڑھتا تھا۔ مطالعہ کی راہ فی الجملہ کھل گئی۔

شادی

چودہویں برس بیاہ کی صورت ہوئی۔

بیعت

پندرہویں برس والد سے بیعت کی اور اشغال صوفیہ خصوصاً نقشبندیہ میں مشغول ہوا اور اسی سال کچھ بیضاوی پڑھی۔ والد نے بہت سا کھانا تیار کیا اور خاص وعام کی دعوت کی اور فاتحۂ اجازت درس پڑھی۔ فنون متعارفہ سے حسب رسم

اس دیار کے تکمیل علوم پندرہویں برس فراغ حاصل ہوا۔

مختلف علوم وفنون کی جن کتابوں کو سبقاً سبقاً پڑھا، ان کے نام

علم حدیث شریف سے ساری مشکوۃ پڑھی گئی اور صحیح بخاری سے کتاب الطہارت تک اور شمائل النبیؐ تمام اور کچھ بیضاوی و مدارک اور چند بار مدارست قرآن کریم میں ساتھ تدبر معانی اور شان نزول تفاسیر کی طرف رجوع کر کے خدمت میں والد کے حاضر ہوا۔ یہ معنی فتح عظیم کا سبب ہوا۔

اور فقہ سے شرح وقایہ وہدایہ بتمامہا مگر کچھ ذرا سا دونوں سے

اور اصول سے حسامی اور کچھ توضیح وتلویح سے

اور منطق سے شرح شمسیہ اور کچھ شرح مطالع

اور کلام سے پورا شرح عقائد مع بعض خیالی کے اور شرح مواقف سلوک سے کچھ عوارف اور ایک پارہ رسائل نقشبندیہ وغیرہ سے

اور حقائق سے شرح رباعیات مولوی جامی اور مقدمہ شرح لمعات

اور مقدمہ نقد النصوص

اور خواص اسماء وآیات سے مجموعہ خاص والد کا اور مأتہ فوائد

اور طب سے موجز القانون

اور حکمت سے شرح ہدایۃ الحکمۃ

اور نحو سے کافیہ وشرح ملا

اور معانی سے مطول ومختصر

اور ہیئت وحساب سے بعض رسائل مختصرہ

اور اس درمیان میں بلند باتیں ہر فن کی دل پر گزرتی تھیں۔

شاہ عبدالرحیم کا انتقال اور بیعت اور شادی کی اجازت

سترہویں برس والد بیمار ہو کر انتقال فرما گئے اور بیعت وارشاد کی اجازت دے دی اور مکرر یدہ کیدی کلمہ فرمایا۔ سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ والد نے نہایت رضامندی میں فقیر سے انتقال فرمایا اور ان کی توجہ فقیر کے اوس توجہ کی مانند نہیں ہے جو آباء کو ابناء کے ساتھ ہوتی ہے۔

بارہ برس کتب درسیہ کی تعلیم دینا

اون کی وفات کے بعد بارہ سال کم وبیش کتب دینیہ وعقلیہ کے درس کے ساتھ مواظبت کی۔

فقہاء محدثین کی روش کا حاصل ہو جانا

بعد ملاحظۂ کتب مذاہب اربعہ اوران کے اصول اوراون حدیثوں کے جواون کا متمسک ہیں بمدد فور غیبی روش فقہائے محدثین قرارداد خاطر ہوئے۔

سفر حجاز

بعد اس کے 1143ھ میں مشرف بہ حج ہوا۔ اورایک سال مجاورت حرمین وروایت حدیث شیخ ابوطاہر مدنی وغیرہ مشائخ سے موفق ہوااور ہمراہ متوطنان حرمین علماء وغیرہم کی رنگین صحبتوں کا اتفاق ہوا۔

شیخ ابوطاہر سے خرقہ جامعہ کا ملنا

اور خرقۂ ابوطاہر کا پہنا کہ جس کو جمیع خرقہ ہائے صوفیہ کا حاوی کہہ سکتے ہیں۔
اس سال کے آخر میں حج ادا کر کے اوائل 1145ھ میں متوجہ وطن کا ہوا۔ روز جمعہ چودہویں رجب کو صحیح وسالم وطن میں پہنچا۔

نعمت عظمیٰ

نعمت عظمیٰ اس صفت پر وہ ہے کہ اس کو فاتحیت کا خلعت دیااور دورۂ بازپسیں کا فتح اوس کے ہاتھ پر کیااور ارشاد فرمایا کہ

اسرار ومصالح احکام کی تدوین

مرضی فقہ میں کیا ہے اوس کو جمع کر کے فقہ حدیث کی سرے سے بنیاد کی اور اسرار حدیث ومصالح ومصالح احکام و ترغیبات اوراس سب کو جو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے لائے ہیں۔
اور یہ وہ فن ہے کہ اس فقیر سے پہلے اس فقیر کی بات سے مضبوط تربات اس کو کسی نے ادا نہیں کیا ہے باوجود جلالت اس فن کے، اگر کسی کو اس حرف میں شبہ ہو تو اس سے کہہ کہ قواعد کبریٰ کو دیکھ کر شیخ عزالدین نے اوس جگہ کیا کچھ جہد کیا ہے۔ اس فن کے عشر عشیر کو نہیں پہنچے۔

طریقہ سلوک کا الہام کیا جانا

اور طریقہ سلوک کا الہام فرمایا جو اس زمانے میں مرضی حق ہے اور اس دورے میں فائز ہوتا ہے۔ اس کو ''ہمعات''، ''الطاف القدس'' میں ضبط کیا ہے اور قدمائے اہل سنت کے عقائد کا دلائل وحجتوں سے اثبات کیا اور اس کو

معقولیوں کے خس وخاشاک سے پاک کیا اور ایسے طور پر مقرر کیا کہ بحث کا محل نہ رہا۔

علم کمالات اربعہ اور علم کمالات

بعد یعنی ابداع وخلق وتدبیر وتدلی کا باوجود اس عرض وطول کے اور علم استعدادات نفوس انسانیہ کا اور کمال ومآل ہر شخص کا افاضہ فرمایا اور یہ دو علم جلیل ہیں اس فقیر سے پہلے کوئی اس کے گرد نہیں پھرا ہے۔

حکمت عملی کا افادہ

اور حکمت عملی کہ جس میں اس دورے کی صلاح ہے بوسعت تمام افادہ کی اور توفیق اس کے مضبوط کرنے کے ساتھ کتاب وسنت وآثار صحابہ کردی۔

اور علم دین کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے اور جو محرف و مدخول ہے اور جو سنت ہے اور جو کچھ ہر فرقے نے بدعت نکالی ہے اس سب کی تمیز پر افادہ کیا۔

ولو ان لی فی کل منبت شعرة
لسانا لما استوفیت واجب حمده

انتھی کلامہ

تصنیفات

آپ کی تصانیف بہت ہیں اور سب کے سب نافع اور مفید اور بعض ان میں سے اپنے باب میں عدیم النظیر غیر مسبوق تھا۔

1- حجۃ اللہ البالغہ
2- ازالۃ الخفاء یہ دونوں 1285ھ میں بصرف ہمت منشی محمد جمال الدین خاں مرحوم مدار المہام بھوپال طبع ہو چکی ہیں۔
3- مصفی شرح فارسی موطا
4- مسوی شرح عربی موطا
5- فیوض الحرمین
6- انسان العین فی مشائخ الحرمین
7- فوز الکبیر فی اصول التفسیر
8- قول الجمیل
9- ہمعات

10- الطاف القدس
11- تاویل الاحادیث
12- مقالہ وضیۃ النصیحۃ والوصیۃ
13- عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید
14- انصاف فی بیان سبب الاختلاف
15- سرور المحزون
16- لمعات
17- سطعات
18- المقدمۃ السنیہ فی انتصار الفرقۃ السنیہ
19- فتح الرحمٰن ترجمہ فارسی قرآن
20- انفاس العارفین
21- خیر کثیر
22- شفاء القلوب
23- فتح الخبیر
24- قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین
25- البدور البازغہ
26- الزہراوین

ان کے سوا ایک کتاب ''تفہیمات'' ہے۔ اوس میں دوسو رسالوں سے زیادہ بلکہ کئی سو ہیں(1)۔ الی غیر ذلک بلکہ ''تفہیمات'' میں فرمایا ہے۔

و من نعم الله علی ولافخر ان جعلنی الله ناطق هذا الدورة و حکیمها وقائد هذه الطبقة وزغیمها فنطق علی لسانی و نفث فی نفسی فان نطقت یاذکار القوم واشغالهم نطقت بجوا معها واتیت علی مذاهبم جمعیها وان تکلمت علی نسب القوم فیما بینهم وبین و بهم زدیت لی منا کبها وبسطت فی جوانبها و وافیت ذروة سنامها وقبضت علی مجامع خطا مها. وان خطبت باسرار اللطائف الانسانیة تفوصت قامو سها وتلمت ناعوسها و قبضت علی جلابیبها و اخذت بتلا بیبها وان تمیطت ظهر علم النفوس ومبالغها فانا ابوعذر تها آتینهم بعجائب لا تحصی و غرائب لاتکتنسه ولا اکتنا هما یرجی، وان بحثت عن علم الشرائع والنبوات فانالیث عرینها وحافظ جرینها ووارث خزائنها وباعث مغابنها

وکم لله من لطف خفی
یدق خفاه عن فهم الزکی (2)۔

شرف الدین صاحب کتاب ''وسیلۃ الی اللہ'' کا بیان

شیخ اکمل شرف الدین محمد نے اپنی کتاب مسمیٰ بوسیلۃ الی اللہ میں کہا ہے:

ومن كان له لطف قريحه وطالع مصبنفامة الشريفة و تحقق لقوانينها وقواعد هالم بتق له ربية فى تصديق هذالمطلب الاهنىٰ والمقصد الاقصىٰ قل الحق من ربكم فمن شاء فليؤ من و من شاء فليكفر خصوصاً كتاب حجة البالغه واللمحات والطاف القدس و الهمعات والمكتوب المرسل الى المدينة والمسوى وغير ذلك انتهىٰ.

''تفہیمات'' میں فرمایا ہے:

لما تحت بى وورة الحكمة البينى الله خلعة المجددية فعلمت علم الجمع بين المختلفات انتهىٰ.

انصاف کی بات

انصاف یہ ہے کہ اگر ان کا وجود صدر اول اور زمانۂ ماضی میں ہوتا تو امام الائمہ و تاج المجتہدین میں شمار کیے جاتے۔ ثنائے علمائے عصر و مشائخ دہر کی ادنیٰ پر اس قدر ہے کہ یہ مختصر اس کے نقل کی طاقت نہیں رکھتا۔

اولاد

ایک جمع بے شمار نے ان کے حاشیۂ بساط علوم ظاہر و باطن میں تبحر حاصل کیا اور اعلائے مدارج کمالات صوری و معنوی کو فائز ہو گئے خصوصاً ان کی اولاد امجاد کہ ان میں سے ہر ایک بے نظیر وقت و فرید دہر و وحید عصر علم و عمل و عقل و فہم و قوت تقریر و فصاحت تحریر و تقویٰ و دیانت و امانت و مراتب ولایت میں تھا اور اسی طرح ان کی اولاد کی اولاد ہے۔

ایں خانہ تمام آفتاب ست
ایں سلسلہ از طلائے ناب سب

شاہ صاحب کی پیشینگوئی اور اس کا مصداق

'قول جلی' میں ان کے کلام فیض نظام سے ذکر کیا ہے کہ فرمایا یہ لڑکے کہ لطف الٰہی نے ہم کو عطا کیے ہیں سب سعداء ہیں۔ ایک نوع کی ملکیت ان میں ظہور کرے گی لیکن تدبیر غیب تقاضا کرتی ہے کہ دو شخص اور پیدا ہوں کہ مکہ و مدینہ میں سالہا احیائے علوم دین کریں اور اسی جگہ وطن اختیار کریں۔ ماں کی طرف سے ان کا نسب ہماری طرف متمکن ہو کیونکہ آدمی زادہ ماں کے وطن کی طرف میلان طبعی رکھتا ہے۔ انتقال ایک جماعت کا جو اپنی والدہ کے وطن میں متمکن ہوں۔ کسی اور سرزمین کی طرف بالطبع مستحیل ہے مگر بقسر قاسر انتھی بلفظہ

محرر سطور کہتا ہے کہ مصداق اس آگاہی کا وجود ہر دو نواسہ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہ کا ہے۔ مولوی محمد اسحاق اور مولوی محمد یعقوب کی دہلی سے ہجرت کر کے مکۂ مکرمہ میں اقامت فرمائی اور سالہا باحیائے روایت حدیث شریف با اہل عرب و عجم مشغول رہے۔ واللہ اعلم

ولیکن اس وقت میں یہ خاندان علم و کمال کا بتما مہا منقرض ہو گیا اور کوئی ایک اون میں سے باقی نہ رہا۔ یفعل اللہ مایشاء ویحکم مایرید۔

نمونہ کلام عربی وفارسی

میل طبیعت کبھی طرف نظم عربی وفارسی کے بھی فرماتے تھے۔ منجملہ ان کے منظومات کا ایک قصیدہ طویل الذیل ہے۔ نعت نبوی میں اول اس کا یہ ہے۔

کان نجوماً او مضت فی الغیاهب
عیون الافاعی اورؤس العقارب

الی آخر القصیدۃ اور اشعار فارسی سے یہ اشعار ہیں۔

علمے کہ نہ ماخوذ ز مشکواۃ نبی ست — واللہ کہ سیرابی ازاں تشنہ لبی ست
جائے کہ بود جلوۂ حق حاکم وقت — تابع شدن حکم خرد بولہبی ست

کہ بادر دارد ایں حرف از فقیر خاکسار من
کہ ظلم عالم قدس ست انکار قبول او
ندارد باطنش از خویش آئینہ صفت رنگے
طلسم حیرت آمد دست تمکین و فضول او
شعاع آفتاب از راہ ایں روزن ہمی ریزد
بجز ایں نکتہ نتواں بست مضمونِ وصول او

نخستین بادہ کاندر جام کردند — مزاجش عکس آن گلفام کردند
شراب وحدت از خمخانہ غیب — مرا صبح ازل در کام کردند
چو غلطیدم ز مستیہا بہر سو — حریفاں مستی از من دام کردند

دلے دارم ز خود حبابش میتواں گفتن — در و کیفیت جوش شرابش میتواں گفتن
سویدائے دل ما یابی اندر پیچ و تاب او — نفوس عالم ام الکتابش میتواں گفتن

تا بکے محنت مہجوری و دوری بکشم
نازنینِ وطنم سوئے وطن باز روم

تا بکے باخس و خاشاک بود صحبت من
صدر بزم چمنم سوئے چمن باز روم
تا بکے ہمدمے سنگ شود شیوۂ من
گوہرے از عدنم سوئے عدن باز روم

وفات

1176ھ میں وفات پائی۔ تاریخ وفات یہ مصرع ہے:

او بود امام اعظم دیں

رضی اللہ عنہ وارضاہ آمین کذا فی الاتحاف

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے کتاب ''انفاس العارفین'' خاص ذکر والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم رضی اللہ عنہ اور عم بزرگوار شاہ ابوالرضا محمد رضی اللہ عنہ میں تالیف فرمائی۔ اس میں ان کے احوال و مقامات و ملفوظات ذکر کیے ہیں۔ چونکہ اس کے حصہ اول کے آخر میں چند کلمات سودمند ہیں ان کا لکھنا یہاں مناسب معلوم ہوا، فرماتے ہیں کہ

اس فقیر نے بعض یاروں سے سنا تھا کہ نام ان کا عالم ملکوت میں ابوالفیض ہے۔ میں نے تنہائی میں اس کا استفسار کیا۔ تبسم فرمایا اور کہا اسی طرح ہے اور تیرا نام ابوالفیاض ہے۔

شاہ عبدالرحیم کی نصیحتیں

ایک دن متصل نماز ظہر کے طرف متوجہ ہوئے اور فی البدیہہ یہ دو بیتیں فرمائیں:

گر تو اراہِ بخواہی اے پسر　　خاطر کس را مرنجاں الحذر
در طریقت رکن اعظم رحمت ست　　ایں چنیں فرمودآں خیر البشر

اس وقت فرمایا کہ دوات و قلم حاضر کرو اور اس کو لکھو۔ حضرت حق سبحانہ نے ناگاہ دل میں القا فرمایا ہے تاکہ تجھ کو اس کی وصیت کروں۔ اس وقت ارشاد فرمایا کہ یہ ایک عظیم نعمت ہے۔ شکر اوس کا لازم ہے۔ انفاس نفیسۂ ایشاں سے دو بیت ہیں۔

اے کہ نعمت ہائے تو از عد فزوں
شکر نعمت ہائے تو از حد بروں
عجز از شکرِ تو باشد شکر ما
گر بود فضلِ تو ما را رہنموں

اس فقیر کو مجلس صحبت میں حکمت عملی اور آداب معاملہ بہت سکھاتے تھے۔ منجملہ ان کے جو کچھ حافظہ میں رہا ہے یہ ہے کہ فرماتے تھے کہ

مجلس میں برائی مت کر کہ اہل پورب میں ایسے ہیں اور اہلِ پنجاب ایسے ہیں اور افغان ایسے ہیں اور مغل ایسے

ہیں۔ شاید درمیان ان کے کوئی آدمی اوس قوم کا اہل حمیت اس قوم سے ہو تو اس کو برا لگے اور صحبت منغض ہو جائے۔

فرماتے تھے کہ کوئی بات مخالف جمہور کے عام مجلس میں ہرگز زبان پر مت لا۔ گو وہ بات نفس الامر میں صحیح ہی کیوں نہ ہو کہ وہ اس پر انکار کریں اور صحبت منغض ہو جائے۔ فرماتے تھے اگر تجھ کو کسی سے کوئی حاجت ہو تو اس کے واسطے ایک تمہید شائستہ کر اور اس حاجت کی طلب میں تدریج کر۔ ایسا نہ چاہیے کہ بات کو پتھر کی طرح ڈال دے۔ فرماتے تھے مجلس عام میں ہرگز کسی پر رد صریح مت کر۔

فرماتے تھے کہ آدمی کا لباس وزی ایسا ہونا چاہیے کہ اس کی صنعت و کمال پر شعر ہو مثلاً جو آدمی دانشمند ہے اسے چاہیے کہ دانشمندوں کا لباس پہنے اور انہیں کے آئین کے ساتھ زندگانی کرے اور جو فقیر ہے اس کو چاہیے کہ فقیروں کا لباس پہنے اور انہیں کے آئین سے زندگانی کرے۔

فرماتے تھے کہ بزرگوں کے مخاطبہ میں سخن مغلق و موجز و آہستہ روا نہیں ہے۔ فرماتے تھے کہ اگر تجھ سے شجاعت یا سخاوت یا فتوت ظہور میں آئے تو چاہیے کہ ابنائے روزگار اس کو تجھ سے دیکھیں۔

عیادت کے مقصود اعظم اس سے رضامندی مریض کی ہے نہ محض اطلاع اوس کی کیفیت مزاج پر اور اسی طرح تعزیت اور ایسے سفارش اور مثل ان کے پس جو شخص یہ سب کام بجالائے اور صاحب معاملہ کو محنت پر مطلع نہ کیا تو اپنی محنت کو ضائع کر دیا اور اسی طرح ہر وہ چیز جس سے مقصود اقامت مصلحت موافقت و تالیف میان جمہور مردم کے ہو۔

محل تو دیع یاراں میں اور ان کی وصیت میں یہ بیت بہت پڑھتے تھے۔

آسائشِ دو گیتی تفسیر ایں دو حرف ست
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

فرماتے تھے جن لوگوں کا مرتبہ تیرے مرتبے سے فروتر ہے اگر وہ ابتدا بالسلام کریں تو اس کو ایک نعمت الٰہی سے جان اور شکر اس کا بجالا اور اون کے روبرو منبسط ہو اور اون کے حال کا تفقد کر۔ بہت ہوتا ہے کہ ادنیٰ التفات جو تیرے نزدیک کچھ قدر نہیں رکھتا ہے وہ اون کی آنکھ میں عظیم دکھائی دیتا ہے اور وہ اس کے ساتھ پورا اعتنا کرتے ہیں اور اگر اس کو نہیں پاتے ہیں تو غمگین ہوتے ہیں۔

صد ملک دل بہ نیم نگہ می تواں خرید
خوباں دریں معاملہ تقصیر می کنند

فرماتے تھے احمقوں کی خصلت سے ہے کہ ساتھ کسی لباس و عادت کے نشانمند ہوتے ہیں یا تکیہ کلام مقرر کرتے ہیں یا کوئی کھانا مقرر کر لیتے ہیں کہ اس سے متنفر ہوتے ہیں اور لوگ اوس کے سبب سے مسخرا پن کرتے ہیں۔

فرماتے تھے بعض آشنا محبت ذاتی رکھتے ہیں کہ اگر محبت بتدریج ان کے دل میں جگہ پکڑتی ہے۔ بعد اس کے کسی حالت میں اون کے دل میں سے باہر نہیں جاتی ہے۔ نہ سرائیں نہ ضرائیں۔ اس بار کو غنیمت شمار کرنا چاہیے اور فرزند سے بہتر رکھنا چاہیے۔

اور بعض آشناؤں کی آشنائی کا سبب ظہور کسی فضیلت کا ہے۔ تجھ سے ارتباط کسی حاجت کا ساتھ تیرے۔

قدر ہر آدمی کی پہچاننا چاہیے اور سب کو ایک منزلت و رتبے میں نہ رکھنا چاہیے اور کسی آدمی پر زیادہ اس سے جو اس کا مرتبہ ہے اعتماد نہ کرنا چاہیے۔

فرماتے تھے عاقلوں حکیموں کا یہ کام ہے کہ فقط استیفاء لذت مقصود نہ ہو بلکہ یوں چاہیے کہ وہ ضمن میں کسی دفع حاجت یا کسی فضیلت کے اقامت یا کسی سنت کی ادائی میں واقع ہو۔

فرماتے تھے بات کہنے، رستہ چلنے، بیٹھنے اٹھنے میں اقویا کی رسم و عادت پر کام کر اگرچہ تو ضعیف ہی کیوں نہ ہو اور اگر کوئی عیب یا جبن یا بخل ناگاہ تجھ سے صادر ہو جائے تو اس کے کتمان و اخفاء میں کوشش کرنا چاہیے اور اس سے شرمگیں ہونا چاہیے اور خود کو بتکلف صفتِ مقابل ظاہر کرنا چاہیے تاکہ نفس اس آداب کے ساتھ خوگر ہو جائے۔

جب بات چیت سفر کے حال میں ہوتی تو چوروں اوچکوں سے بچاؤ کرنے میں غلو کرتے اور اس باب میں اپنے وقائع جو کہ سفر اکبر آباد میں دیکھے تھے، بیان فرماتے۔
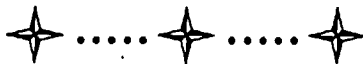
حواشی

(1) ان کا یہ بیان مبالغہ سے خالی نہیں۔ ''کتاب التفہیمات'' دو جلدوں میں مجلس علمی ڈابھیل نے شائع کر دی ہے۔ اس میں تفہیمات سب آ گئی ہیں۔

(2) تفہیمات۔ ج1، ص125۔ 1355ھ

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

خانوادہ شاہ ولی اللہ دہلوی کا تذکرہ

مولوی کریم الدین پانی پتی کے قلم سے

ابتدائیہ

مولوی کریم الدین پانی پتی (ف 1869ء) دہلی کالج (دہلی) کے نامور مدرس، مصنف اور صحافی تھے۔ انہوں نے اردو زبان میں بہت سی کتابیں لکھیں اور شائع کیں۔ کون ایسا پڑھا لکھا شخص ہے کہ ان کی مختصر مگر مشہور و معروف اردو لغت ''کریم اللغات'' سے واقف نہ ہو۔ انہوں نے عربی اور اردو شعراء کے دو تذکرے بھی لکھے ہیں۔ اردو شعراء کا تذکرہ ''طبقات الشعراء ہند (1)'' (طبع دہلی 1848ء) تو کہیں کہیں مل بھی جاتا ہے مگر عربی شعراء کا تذکرہ ''فرائد الدہر'' تو بالکل ناپید ہی ہے۔ اتفاق سے مولوی سید محمد بیدری (2) کے نادر ذخیرۂ علمیہ میں یہ نایاب تذکرہ ہمیں دیکھنے کو ملا۔ اس میں تین سو ستانوے (397) عربی شعراء کے حالات درج ہیں جن میں (17) برصغیر پاک و ہند کے شاعر ہیں۔

مولوی کریم الدین نے بحیثیت عربی شعراء تذکرہ ''فرائد الدہر'' (3) میں شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین اور ان کے خاندان کے نامور تلامذہ میں مفتی الٰہی بخش کاندھلوی، مولوی رشید الدین خاں دہلوی، مفتی صدر الدین خاں آزردہ، مولوی حسین احمد لکھنوی، مولانا مملوک العلی نانوتوی اور مولانا فضل حق خیر آبادی کے حالات لکھے ہیں (4) اور مولوی کریم الدین نے اپنے دوسرے تذکرے ''طبقات الشعراء ہند'' میں اس خاندان کے اردو شعراء کی حیثیت سے شاہ اسمٰعیل شہید اور مولانا مملوک العلی اور مفتی صدر الدین آزردہ کا ذکر کیا ہے۔

مولوی کریم الدین شاہ ولی اللہ دہلوی کے صاحبزادگان سے قریب العہد اور بعض دوسرے حضرات کے ہم عصر ہیں (5) اور اس خاندان سے بالواسطہ تلمذ کا تعلق بھی رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان کے لکھے ہوئے حالات بہت قابل قدر ہیں۔ اگرچہ شاہ ولی اللہ کو بحیثیت اردو شاعر المتخلص بہ اشتیاق پیش کرنے میں مولوی کریم الدین کو سخت مغالطہ ہوا ہے۔ اسی طرح انہوں نے اپنے اساتذہ مولانا مملوک العلی

نانوتوی اور مفتی صدر الدین آزردہ کے حالات عقیدہ کی زبان میں لکھے ہیں۔ مصنف کی زبان پرانی بلکہ بعض جگہ تو بے ربط اور اکھڑی اکھڑی ہے۔

ہم نے ان دونوں تذکروں سے خانوادہ ولی اللہی کے حالات اقتباس کر کے (6) ضروری حواشی و تعلیقات کا اضافہ کر دیا ہے اور بعض حضرات کے حالات حاشیے میں لکھ دیئے ہیں۔

(محمد ایوب قادری)

شاہ ولی اللہ دہلوی

شیخ احمد ولی اللہ بن شیخ عبدالرحیم دہلوی، اوس شیخ اور استاد کامل اور عالم اجل پر اللہ تعالیٰ کی بڑی عنایت اور نوازش تھی کیونکہ اوس کو فیض علوم کثیرہ اور فنون جدیدہ کا ایسا ہوا اور ایسا بابرکت وہ شخص تھا کہ آج کے دن تک بسبب تصانیف، تفاسیر اور کتب حدیث اور اوراد و وظیفہ وغیرہ کے تمام ہندوستان میں فیض عام اوس سے ہوا (7)۔ اوس فاضل کی تصنیفات سے اور فاضلوں کی رہنمائی ہوئی۔ اوس کو اگر امام ائمہ منقول کہوں تو بجا ہے اور اگر فضلاء معقول کہوں تو سزا ہے۔

انہوں نے درمیان شاہ جہاں آباد کے پیدائش پائی (8)۔ اصل اون کی سرہند ہے۔ شیخ ظہور الدین حاتم جو کہ ایک شاعر اردو گوگزرا ہے وہ ان کا ہم عصر تھا، یہ شخص مرد متوکل، پارسا، عالم، عامل مشغول بحق تھے۔ چونکہ طبیعت موزوں اور سلیم رکھتے تھے اس لئے اکثر قصائد عربی اور عبارت عربیہ نثر اور نظم اور کبھی کبھی اشعار اردو بھی کہتے تھے۔ اشعار اردو میں اشتیاق ان کا تخلص ہے۔ (9)

آج کے زمانہ تک بسبب علم تفسیر اور حدیث اور فضیلت کے ان کے نام کی ہند میں رونق ہوئی ہے۔ احمد عربی (10) اپنی کتاب (11) میں لکھتا ہے کہ شیخ ولی اللہ کی تصنیف سے ایک کتاب ''قرۃ العین فی ابطال شہادۃ حسین'' ہے۔ دوسری ''جنت العالیہ فی مناقب معاویہ''، مگر مجھ کو یقین نہیں آتا کہ ایسے فاضل زبردست نے یہ کتابیں اس طور کی تصنیف کی ہوں۔ گرچہ دیکھنے میں نہیں آتیں مگر چند لوگوں نے یہ حال لکھا ہے اور زبانی بھی اکثر عوام و خواص کے سننے میں آیا۔ چنانچہ لطف نے بھی اپنے تذکرہ میں یہی لکھا ہے (12)۔ واللہ اعلم

ایک ترجمہ قرآن شریف کا فارسی بہت اچھا ان کی تصنیف سے ہے۔ محمد شاہ بادشاہ کی عمل داری انہوں نے دیکھی تھی (13)۔ یہی جناب مولوی شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہ کے والد ماجد ہیں اور کتابیں بھی ان کی تصنیف سے دہلی میں موجود ہیں۔ یہ قصیدہ مدح نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں انہوں نے لکھا ہے۔ اس قصیدہ کا چھپنا بسبب ضرورت کے بہت مناسب ہے لہٰذا تمام لکھا جاتا ہے (14)۔ (تذکرہ فرائد الدہر، ص 376)

اشتیاق تخلص شاہ ولی اللہ نام، کہتے ہیں کہ وہ پیرزادہ رہنے والا سرہند کا تھا، صاحب مجدد الف ثانی کی نسل سے شاہ محمد کے پوتے ہیں۔ شیخ ظہور الدین حاتم کے معاصرین میں سے تھے۔ مرد متوکل مشغول بحق عالم کامل فاضل بے بدل تھے۔ چونکہ طبیعت موزوں رکھتے تھے اس لئے گاہ گاہ فکر ریختہ بھی کیا کرتے تھے۔ (15)

علم تفسیر اور حدیث کا بہت شوق تھا۔ آج تک درمیان ہندوستان کے ان کے عالم بے بدل ہونے کا شہرہ ہے۔

لطف کہتا ہے کہ ''قرۃ العین فی ابطال شہادت حسین'' اس فاضل کی تصنیف سے ہے اور ایک کتاب ''جنت العالیہ فی مناقب المعاویہ'' انہوں نے تصنیف کی ہے (16)۔ مگر بعضے ثقہ کی زبانی یہ سننے میں آیا ہے کہ یہ صرف ان پر بہتان ہے۔ انہوں نے یہ دونوں تصنیف نہیں کی ہیں اور نہ ان کے خاندان میں یہ کتابیں موجود ہیں۔

ایک ترجمہ قرآن شریف کا فارسی زبان میں انہوں نے بہت اچھا تصنیف کیا ہے۔ اکثر نکات مشکلہ اور رکیکہ اس میں موجود ہیں۔ یہ صاحب مولوی شاہ عبدالعزیز کے والد مرحوم ہیں۔ (طبقات الشعراء ہند، ص 154)

شاہ عبدالعزیز دہلوی

شیخ عبدالعزیز احمد ولی اللہ دہلوی، سلطان اقلیم معانی کا اور مالک ازمنۂ بیان کا اور بدیع ثانی، اس فاضل بزرگ کی تعریف میں جتنا کچھ لکھوں بہت کم ہے۔ اگر یہ کہوں کہ وہ سب ذکیوں اور عالموں کا بادشاہ تھا تو بجا ہے۔ اگر یہ کہوں کہ عابد اور متقی اور پارسا اور نیک اس کے دروازے کی چوکھٹ چومنے والے جاتے تھے تو بجا ہے۔ تصنیفات اس فاضل بے نظیر کی تعداد سے باہر ہیں۔ ایک دیوان عربی اس فاضل کا موجود ہے۔ (17) اکثر لوگوں کے پاس شاہجہان آباد میں ہے۔ رسالے اس کے بے انتہا مشہور ہیں۔ نظم و نثر کا ٹھکانا نہیں کہ کتنے کچھ مسودات پڑے ہوئے ہیں۔ ایک کتاب ''تحفۂ ردِّ روافض'' میں اس فاضل کی تالیف سے ہے۔ (18) اس کتاب کو فارسی زبان میں اور کتب عربیہ وغیرہ اور اپنی یادداشت سے تصنیف کر کے لکھی ہے جس کا جواب شیعہ لوگ آج تک لکھ رہے ہیں۔ (19)

جس کا ارادہ اس کتاب کو دیکھنے کا ہو مطالعہ کرے۔ بالفعل کلکتہ میں چھپ بھی گئی ہے۔ (20)

ہر ہفتہ میں دو دفعہ یعنی منگل اور جمعہ کو درمیان دہلی کے کوچہ چیلوں میں پرانے مدرسہ میں وعظ و نصیحت کیا کرتے ہیں۔ بہت فاضل دہلی کے داخل درس ہوتے اور اشارے اور نکات قرآن عظیم کے سن کر فائدہ اٹھاتے۔ بہت کتابیں انہوں نے درباب مذہب امام ابوحنیفہ کے تصنیف کی ہیں۔ انشاء عربی بھی ان کی بہت اچھی ہے۔ ایک خط سید علامہ حسین کو جولندن میں رہتا تھا، اس فاضل بے عدیل نے درمیان 1228ھ کے لکھا تھا۔ وہ داخل کتاب عجب العجاب ہے۔ (21) جس کا جی چاہے دیکھ لے۔ اس کے اول کے یہ شعر ہیں۔ چونکہ ان کے شعر بہت ہیں اس لئے بہت لکھنے کی کچھ ضرورت نہیں۔ (تذکرہ فرائد الدہر، ص 390)

شاہ رفیع الدین

مولوی رفیع الدین فرزند ارجمند شاہ ولی اللہ دہلوی (22) بھائی مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب۔ یہ شخص بہت ذہن رسا اور طاقت عربیہ اور ادب میں بے انتہا رکھتا تھا۔ بڑا عالم گزرا ہے۔ انہوں نے اکثر قصیدہ، خمسہ اور مسدس عربی میں لکھے ہیں۔ ایک ترجمہ قرآن شریف کا بھی ان کا ہے۔ فائدہ اس کے بہت مشہور ہیں، اس فاضل نے اپنے اوقات اکثر کاروبار دنیا میں اور عبادت اور درس و تدریس میں تقسیم کر رکھے تھے۔ تمام ہمسایہ ان فاضل کے بہت شکر گزار اس کے تھے۔ علم بھی اس کو بہت تھا۔

اکثر قصائد شاہ ولی اللہ (23) کے جمع اس فاضل نے کیے ہیں۔ چنانچہ یہ ایک خمسہ اسی فاضل کا کیا ہوا ہے۔ اس قصیدہ پر جو شاہ ولی اللہ نے شیخ بوعلی سینا کے قصیدہ کے جواب میں لکھا ہے۔ شیخ بوعلی سینا نے ایک قصیدہ اس باب میں لکھا کہ نفس کیا شے ہے اس کی حقیقت کیا ہے۔ اس فاضل نے اس کا جواب دیا ہے (24)۔ مولوی رفیع الدین صاحب نے اس کا خمسہ کیا ہے۔ وہ خمسہ یہ ہے۔ (25) قریب اٹھارہ انیس برس ہوئے کہ اس جہان سے کوچ فرما کر جنت الماویٰ کو تشریف لے گئے۔ (26) (تذکرہ فرائد الدہر، ص 410)

شاہ محمد اسمٰعیل دہلوی

مولوی محمد اسمٰعیل، یہ صاحب عالم اور بہت دیندار اور سید احمد جو اس فرقہ کا بانی ہے، اس کے بہت سرگرم مریدوں میں سے وہی ایک تھا۔ اس فرقہ کا نام طریقہ محمدیہ ہے۔ اس فاضل زبردست نے ایک رسالہ ''تقویۃ الایمان'' اس فرقہ کی ہدایت کے لئے وہابیت کے طور پر لکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مطلب اس مصنف کا مسلمانوں کے دلوں سے پرستش ولیوں اور بزرگوں کی دور کرنی، بدعت اور روضہ کا طواف رد کرنا ارادہ تھا اور ایک خدا کو ماننا اور اس کا شرک کرنا مسائل بیان کیے ہوئے اسمٰعیل کے درست اور اسلام کے ہیں۔ اکثر لوگ مسائل کو مروجہ سے جو غلط ہیں تمیز کافی نہیں کرتے۔
اس کی تصنیف سے ایک ''صراط المستقیم'' بھی ہے۔ مجھ کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب کسی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ وہ بھتیجا شاہ عبدالعزیز صاحب کا تھا جو کہ سید احمد کا استاد ہے۔ اکثر لوگ اس کو بہت مستعد اور عالم جانتے تھے۔ اسمٰعیل اور مولوی عبدالحئی کے ہمراہ (27) سید احمد دہلی سے کلکتہ کو واسطے ادائے مناسک حج کے آیا تھا۔ اسمٰعیل اور یہ مولوی مکہ کو گئے ہمراہ سید احمد صاحب کے درمیان شروع 1822ء میں کلکتہ سے سمندر میں سوار ہوا اور اس سال کے اکتوبر کے مہینے میں مراجعت کی۔ بیس برس کا عرصہ ہوا کہ سکھوں سے جہاد کر کے شہید ہوئے۔ (28) (طبقات الشعراء ہند، ص 295)

مفتی الٰہی بخش کاندھلوی

بڑا فاضل متبحر شاعر اور پرگو واعظ اور ادیب اور نیک بخت گزرا ہے۔ اپنے سب اقران اور اتراب سے فوقیت رکھتا تھا۔ نثر بھی بہت اچھی لکھتا تھا۔ ایک خط عربی زبان میں قاضی القضاۃ محمد نجم الدین (29) خاں کو اس نے لکھا تھا جس کے ان کے دو شعر اس کے لکھے ہوئے تھے۔

صبا بلغ ریاحین السلام بذل و ابتهال و التحامی
الی من فاق جم الخلق فضلا الی نجم الهدیٰ بدر الظلام

وہ قصبہ کاندھلہ میں سکونت پذیر تھا۔ بہت کتابیں اور چھوٹے چھوٹے رسالے اردو زبان کے، فارسی اور عربیہ میں بھی ترویج مذہب امام ابوحنیفہ میں اس کے مشہور ہیں (30)۔ میں نے اپنے استاد عالم خفی وجلی جناب مولانا مملوک العلی مدظلہ سے یہ سنا ہے کہ مولوی الٰہی بخش مذکور 1250ھ کے اسی حدود میں فوت ہوئے۔ (31) (تذکرہ فرائد الدہر، ص 387)

مولوی رشید الدین خاں دہلوی

مولوی محمد رشید الدین خاں فاضل کامل اور عامل باعمل گزرے ہیں۔ وہ مدرس اول مدرسہ دہلی عربی کے تھے۔ انہوں نے مولوی شاہ عبدالعزیز قدس سرہ سے تعلیم پائی اور ہر ایک علم پر بہت قادر تھے خصوصاً علم ریاضی میں بڑی دست قدرت تھی اور معقولات کے امام تھے۔ ان کی تالیفات سے کئی کتابیں ہیں۔ ازاں جملہ ایک شرح ''تشریح الافلاح'' کی علم ہیئت میں انہوں نے لکھی ہے۔ بندہ نے خوب سیر اس کی کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شرح خلاصہ شرح مولوی عظمت سہارنپوری کا ہے جو بہت بڑی ایک شرح ہے۔ بعد تطبیق عبارت سے معلوم ہوا کہ یہ شرح عصمت سے اس فاضل نے مختصر کی ہے اور ایک ردّ روافض علم کلام میں مولوی دلدار علی کے اور لکھنؤ والوں کے جواب میں انہوں نے لکھی ہے جو تحفہ کے جواب میں اہل شیعہ نے جواب لکھے ہیں۔ اس کتاب میں اصل متن تحفہ کا مع اس کے اعتراضات کے لکھ کر اپنے جوابات ثبت کیے ہیں۔ ایک ردِّ متعہ میں کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام صولۃ الضیغم رکھا ہے۔ یہ کتاب مولوی مملوک العلی مدرس اول حال مدرسہ دہلی کے پاس خاطر سے تصنیف کی تھی اور مسودات ان کے بہت ہیں اور ان کے ہاتھ کی کتابیں بھی بہت لکھی ہوئی ہیں۔ اس جائے آدمی کی عقل حیران ہے کہ باوجود اس کثرت علم اور شغل درس اور تدریس اور تصنیف و تالیف کے کتابیں بھی انہوں نے لکھی ہیں۔

مدت سے دل میں وہ ارادہ حج کعبۃ اللہ کا رکھتے تھے مگر افسوس کہ نصیب نہ ہوا۔ جب جانے گئے، ان کو بیماری مہلک عارض ہوئی۔ ڈیڑھ مہینے تقریباً بیمار رہے۔ بیس برس کا عرصہ گزرتا ہے کہ اس جہان فانی سے رحلت کی درمیان 1827ء کے، ان کی تصنیف سے ایک خط عربی زبان کا میرے ہاتھ آیا ہے جو کہ انہوں نے مفتی صدر الدین خاں بہادر صدر الصدور دہلی کو لکھا تھا۔ (32) (تذکرہ فرائد الدہر، ص 400)

مفتی صدر الدین خاں آزردہ

شیخنا واستاذنا و ہادینا و مرشدنا و حاکمنا مفتی محمد صدر الدین خاں بہادر بقاہ اللہ الی یوم الدین، گنجینۂ علم وکان حلم و بحر سخا مخزن لطف و جود عطا لبید (33) دوراں، حسان (34) ہندوستان، عالم کامل، فاضل اجل، فقیہہ بے مثل، حاکم دہر مصداق ایں۔

شیخ جہاں پناہ کہ ازروئے مکرمت   برسروران عالم تحقیق سرور است
دارائے ملک لطف و کرم ہادی امم   کاوصاف ذات پاکش از اندیشہ برتر است

اس باعمل اور فاضل اجل کی مدح میں جو کچھ لکھوں سو کم ہے کیونکہ وہ ایسا ہی عالم ہے۔ سحبان (35) اور حسان اور لبید اور متنبی (36) اور امراء القیس (37) یہ نام بہت کتابوں میں مثل لفظ عنقاء لکھے ہوئے دیکھے۔ پر آج تک کوئی مصداق ان الفاظ کا نہ پایا۔ جب بہت تجسس کیا تو اس ذات گرامی کو کئی مرتبہ ان سے بڑھا ہوا پایا۔ بنیندگان تذکرہ ہٰذا کے واسطے اس فاضل بے بدل کے کوئی تمثیل دے کر سمجھانا چاہیے مگر افسوس کہ نظیر اس کا معدوم ہے۔ اب مناسب یوں ہے کہ یہ کہوں کہ

کوئی فاضل ہمارے زمانہ میں اس ذات گرامی کے سامنے ذکاء اور ذہن اور عالی طبیعت اور فکر اور تبحر میں رتبہ نہیں رکھتا۔ یہ سب سے بہتر ہے۔

آنکہ راشد در شرف اوصاف ذات کا ملش
برتر از درک خرد بالا تر از وہم و گماں
نفحہ اخلاق او را اروح قدسی در پناہ
جوہر انفاس اور باعقل کلی تو اماں

بالفعل ہمارے زمانہ میں کہ 1847ء میں عہدہ صدر الصدوری شاہجہاں آباد نیک بنیاد پر مامور ہیں۔ باوجودیکہ کارسرکار سے ان کو فرصت بہت کم ہوتی ہے مگر پھر بھی سبب اس کے کہ طبیعت فیض رساں اشاعت علم کی خواہاں رکھتے ہیں اس لئے اس کم فرصتی میں بھی طلباء اطراف واقطار کو جوان کے گھر میں پڑے رہتے ہیں پڑھاتے ہیں۔ بہت فاضل میرے زمانہ میں ان کے شاگردوں میں ہیں۔

کوئی علم یا ہنر ایسا نہیں ہے کہ اس کے موجد سے زیادہ نہ جانتے ہوں۔ کتابیں ان کے پاس ہر طرح کی اور ہر فن کی موجود ہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ یہ حضرت میاں عبدالقادر برادر کلاں مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کے شاگردوں میں دربیان علوم نقلیہ کے ہیں جن کا ایک ترجمہ اردو قرآن شریف کا کئی دفعہ چھپ چکا ہے اور ہندوستان میں مشہور ہے۔ شاہ عبدالعزیز سے بھی انہوں نے علم تحصیل کیا ہے جو کہ علامہ زماں گزرے ہیں۔ مولوی فضل امام صاحب سے علوم نقلیہ مثل منطق وفلسفہ کے انہوں نے تحصیل کیے ہیں۔

مقدمہ کو ایسا کھولتے ہیں کہ حقیقت حال اس کی آئینہ دار کھول لیتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اس عہدہ نے ان سے زینت پائی اور وہ بھی اس عہدہ کے لائق تھے۔ شاہجہاں آباد میں جو کان فضلاء کی ہے، ایسا ہی عالم لائق اس عہدہ صدر الصدوری کے تھا۔ اس امر میں کچھ مبالغہ نہیں۔ میں درست اور کما حقہ' بیان کرتا ہوں کہ یہ عہدہ اس شخص کے ہی واسطے زیبا تھا اور واقع میں ہر ایک مقصد کی وہ ایسی تحقیق کرتے ہیں کہ یقیناً کوئی فیصلہ ان کا خالی حق سے نہیں ہوتا۔ حق دار کو حق پہنچاتے ہیں اس لئے اب میں یہ کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ تا قیام قیامت اس شخص کو اس عہدہ پر قائم رکھے تا کہ ظلم جہاں سے یک قلم موقوف ہو۔

ان کی تصنیفات سے ایک حاشیہ قاضی مبارک کا ہے مگر وہ ایام طالب علمی کی شاید تصنیف سے ہے کیونکہ ایسا ہی ان کی زبان سے سننے میں آیا ہے اور اکثر رسالے اور فتوے ان کی تصنیف سے ہیں اور ہر روز جو مسائل لکھے جاتے ہیں ان کا کچھ شمار نہیں۔ ایک کتاب صنائع اور بدائع میں انہوں نے تصنیف کرنی شروع کی تھی مگر معلوم نہیں کہ تمام ہوئی یا نہیں۔ اگر یہ کتاب تمام ہو کر چھپ جائیں گی تو تمام خاص اور عام کو فائدہ کثیر حاصل ہوگا۔

فارسی میں وہ شعر کہتے ہیں کہ سعدی کی کچھ حقیقت نہیں اردو میں مندرج کیے ہیں۔ عربی میں عبارت نثر اور نظم ایسی لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں دوسرے سے ویسی ہونی معدوم، غرض کہ بہمہ صفات موصوف ہیں۔ بندہ نے بھی کتاب صدرا علم فلسفہ میں ان سے پڑھا تھا، لیکن ان کے تبحر کے سامنے سب بھول جاتا تھا۔ جو کچھ میں دیکھ کر جاتا تھا وہ سب بیان

کر دیتے تھے اور ردوقدح ان پر کر کے سب حاشیوں کو مخدوش کر ڈالتے تھے۔ اس وقت اپنے آپ تقریر صاف مثل سلسلہ موتیوں کے تشفی فرماتے تھے۔ میر زاہد امور عامہ بھی میں ان سے پڑھا ہے یہی حال کتاب میں بھی پایا۔ ایسی ایسی کتابیں جو انتہائی فضیلت کی ہیں، ان کے سامنے ایسی ہیں جیسے آمد نامہ یا خالق باری ایک بڑے فاضل کے سامنے ہوں، ہر چند کہ اوصاف اس فاضل بے بدل کے بہت ہیں اور یہ کتاب مختصر متحمل اس کی نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا اب یہ مناسب ہے کہ کچھ کلام یا عبارت اس فاضل اجل کی لکھ کر مردوں کے تنوں میں جان ڈال دوں۔ (تذکرہ فرائدالدہر، ص392)

آزردہ تخلص، مفتی صدر الدین صدر الصدور شاہجہان آباد۔ گنجینۂ علم و کان علم و بحر سخا، مخزن لطف و جود و عطا، لبید دوراں، حسان ہندوستان، عالم کامل اجل، فقیہہ بے مثل، عالم باعمل، مدح میں ان کی جو لکھوں سو کم ہے کیونکہ وہ ایسا ہی عالم ہے۔ صدہا شاگرد اُن کے علوم وفنون درسیہ کے ہیں اور بہت فاضل ان کی شاگردی میں داخل ہیں۔ ہر چند کہ مناسب نہیں کہ اس تذکرہ شعراء اردو میں جو کہ ان کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتا، ان کا نام لکھوں مگر اتنا میں جانتا ہوں کہ بدون نام نامی ان کے یہ کتاب رونق نہ پاوے گی اور پسند احباب نہ ہوگی کیونکہ اس زمانے کے شعراء اردو گویوں میں وہ مثل شاہنشاہ کے ہیں۔ گرچہ اشعار عربی اور استعداد فارسی کی اتنی کچھ رکھتے ہیں کہ اچھے اچھے مصنفوں کی حقیقت ان کے سامنے کچھ نہیں مگر پھر بھی بہ سبب اس امر کے کہ جہہ داں ہیں اشعار اردو بھی فرماتے ہیں۔ یہ چند شعر ان کے اس جائے پر لکھتا ہوں تا کہ یادگار زمانہ رہیں۔ 1847ء میں قریب پچاس برس کے ان کی عمر ہوگی۔[38]

(تذکرہ طبقات الشعراء ہند، ص445-446)

مولانا حسین احمد لکھنوی

علوم متداولہ اور فنون درسیہ ادبیہ پر اس شخص کی اچھی نظر ہے۔ نظم اور نثر وہ سب سے بہتر جانتا تھا۔ علم منطق اس کو اچھی آتی تھی۔ احمد عرب کی مدح میں اس نے بروقت خبر پانے تصنیف ''نفحۃ الیمن'' کے جب کہ احمد عرب نے کعبۃ اللہ کا ارادہ کیا تھا کی ہے۔ وہ شعر یہ ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ 1250ھ میں یہ شخص موجود تھا۔[39]

(تذکرہ فرائدالدہر، ص388)

مولانا مملوک العلی نانوتوی

مولانا واولانا واستاذ ناوہادینا وشیخنا جناب مولوی مملوک العلی الخفی والجلی مدرس اوّل مدرسہ دہلی رہنے والے نانوتہ (40) کے۔ قدوۃ المتاخرین امام متبحرین متقدمین اس ذات حمیدہ صفات کا شمہ سا یہ حال ہے کہ ایسا فاضل کامل وزاہد و عابد پابند شرع شریف مصطفوی بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ نظیر اس کا خطۂ ہند میں بھی مفقود، ہر فن وعلم کا سامان اس کے پاس ہر وقت موجود۔ اس کے فیض عام یہی عقل فیاض زار ہا۔ جس نے اس کے مشعل تعلیم سے روشنی نہیں پائی وہ عقل وبصیرت سے نابینا۔ گھر اس کا محط الرجال، طلباء مدرسہ اس کا مجمع، علماء وفضلاء، صدہا شاگرد اس ذات بابرکت سے فیض اٹھا کر اطراف واقطار ہندوستان میں فاضل ہوکر گئے۔ درمیان اکثر بلاد افغانستان کے اور ہندوستان کے اپنا نام پیدا کر گئے۔

بالفعل عہدۂ مدرس اوّل عربی پر مدرسہ دہلی میں مامور ہیں۔ سوا درس دہی طلباء مدرسہ کے اپنے گھر پر بھی لوگوں کو ہر ایک علم کی کتابیں پڑھاتے ہیں۔ تمام علوم درسیہ متاخرین و متقدمین پر وہ عبور ہے کہ عقل اول بھی ان کی فیض رسانی کے مقابلے میں مجبور ہے۔ تمام اوقات گرامی ان کے تعلیم طلباء میں نصف شب تک منقسم ہے۔
حلیہ ان کا یہ ہے کہ ہنستی پیشانی، خندہ رو، سفید ریش صورت نورانی عالموں ربانی کے ہمارے زمانے میں ان کی ذات سے ہندوستان میں علم نے ترقی اور رفعت پائی۔ سچ ہے اس قول کاشفی کا مصداق وہی ہے۔

آں فاضل زمانہ کہ از یمن درس اوست
ہم عقل در ترفع ہم علم در کمال

متواضع اور حلیم اور بردبار اور رصاف منکسر اور مدبر اور دانش مند ہیں غرض کہ جتنی تعریف اور جتنے اوصاف اخلاق کے بتلاش تمام پیدا کیے ہیں اس میں سب موجود ہیں۔
معارض کو چاہیے کہ دو چار گھڑی ان کی خدمت میں بیٹھ کر ان اوصاف کو ملاحظہ کرے۔ اس وقت میرے قول کی تصدیق بحلف کرے گا اور کہے گا کہ سچ ہے یا مبالغہ اور قطع نظر تعریف کے امر واقعی اس شخص نے بیان کیا ہے۔ تمام عمر میں باوجود اس کثرت علم اور فضل کے وعظ عام نہیں کیا اور تصانیف کتب پر مائل نہیں ہوئے۔ باعث اس کا یہ ہے کہ چونکہ ان کی فہرست میں صدہا طالب علم اطراف و جوانب سے واسطے تعلیم پانے علوم کے حاضر ہوتے ہیں اور ان کے حسن اخلاق سے یہ بعید ہے کہ کسی طالب علم کی خاطر رنجیدہ کریں، پھر اس صورت میں فرصت واسطے تصانیف کے معلوم لہٰذا اپنا ہرج گوارا کیا۔ دل شکنی کسی کی منظور نہیں کی۔ مگر ہاں ایک کتاب تحریر اقلیدس جو عربی زبان تھی بموجب حکم پرنسپل مدرسہ دہلی کے 1844ء میں ترجمہ اور اردو زبان میں کر کے پانی کر دیا اور بہت اچھی طرح بھی ہر ایک شکل کو حل کیا ہے۔ یہ ترجمہ 1844ء میں دو مرتبہ چھپ چکا ہے۔ یہی باعث مذکورہ بالا نہ منظوم کرنے افکارات شعریہ کا ہے مگر ایک مسودہ عربی خط کا جو مسمی فیروز پاشا زادے کو انہوں نے ایام طالب علمی میں بے نقط لکھا تھا، ڈھونڈ لایا ہوں۔ تیمناً تبرکاً اپنی کتاب میں لکھتا ہوں۔ (41)
(تذکرۂ فرائد الدہر، ص 402)

مدرس اول مدرسہ دہلی مولوی مملوک العلی مدظلہ عالم بے بدل اور متقی بے مثل اور فاضل کامل ہیں۔ عہدہ میر مولوی بمشاہرہ سو روپیہ ماہوار مدرسہ میں مقرر ہیں۔ حق یہ ہے کہ اس فاضل کی جیسی قدر چاہیے ویسی نہیں کیونکہ عمدہ فاضل بے بدل بہت کم ہوتے ہیں اور واقع میں بناء مدرسہ عربی ان کی ذات سے مستحکم ہے۔ فارسی، اردو اور عربی تینوں زبانوں میں کمال رکھتے ہیں۔ ہر ایک علم اور فن سے جو ان زبانوں میں ہیں، مہارت تامہ ان کو حاصل ہے اور جس فن کی کتاب اردو زبان میں انگریزی سے ترجمہ ہوتی ہے اس کے اصل اصول سے بہت جلد ان کا ذہن چسپاں ہو جاتا ہے گویا اس فن کو اول ہی سے جانتے تھے اور جس کار پر مامور ہیں اس میں کبھی کسی طرح کا حتی الوسع ان سے قصور نہیں ہوا۔ مدرسہ میں ان کے ذات بابرکات سے اتنا فیض ہوا ہے کہ شاید کسی زمانے میں کسی استاد سے ایسا ہوا ہو۔ بندہ کے زعم میں یہ ہے کہ کبھی ایسا فائدہ لوگوں نے کسی فاضل سے نہ اٹھایا ہوگا۔ اگر ان کو کان علم اور مخزن اسرار کہوں تو بجا ہے کیونکہ وہ فاضل ایسا ہی ہے۔ کوئی کتاب کسی فن کی مشکل اس کے پاس لے جاؤ حفظ پڑھا دیں گے گویا حفظ کر رکھی ہے۔ اس لئے رات دن سوا مدرسہ کے ان

کے گھر پر طلباء پڑے رہتے ہیں، ہر وقت ان کو گھیرے رہتے ہیں اور وہ خلیق اس طرح کے ہیں کہ یہ کسی سے انکار نہیں کر سکتے۔ سب کو پڑھاتے ہیں تمام شب اور دن میں شاید دو پہر رات کو آرام کرنا ان کو نصیب ہوتا ہوگا۔ والا نہ رات دن درس دہی طلبا میں گزرتا ہے اور باوجود اس کثرت درس فیض رسانی کے پابند شرع شریف کے ایسے ہیں کہ اس طرح کے آدمی کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ غرض کہ جتنا ان کی تعریف میں لکھوں بجا ہے۔ اگر کوئی امر بطور مبالغہ لکھوں وہ بھی امر واقعی ان کی ذات میں پاتا ہوں۔ بہت بے نظیر فاضل ہے۔ ان کے ثانی کوئی فاضل ایسا نہیں ہے جس سے اس طرح کا فیض عام اور تشفی خاص و عام حاصل ہو۔ عمر ان کی 1847ء میں قریب ساٹھ برس کے ہوگی۔ بہت خندہ پیشانی اور عقل مند، ذکی، ذہین، تیز فہم، محقق اور مدقق ہیں۔ تحریر اقلیدس کا ترجمہ زبان اردو میں چار مقالہ اول کا اور دو مقالوں آخر گیارہویں بارہویں کا کیا ہے۔ حق یہ ہے کہ علم ہندسہ کو پانی کی طرح بہا دیا ہے۔ اصل وطن ان کا نانوتہ ہے۔ مدت سے شاہجہان آباد میں رہتے ہیں۔[42] (طبقات شعراء ہند، ص 464)

مولانا فضل حق خیر آبادی

مولوی فضل حق فرزند ارجمند مولوی فضل امام صاحب کے جن کی تصنیف سے چند رسالہ اور حاشیہ علم منطق میں مشہور و معروف داخل تحصیل ہیں۔

مولانا فضل امام بڑے فاضل کامل اور محقق و مدقق گزرے ہیں۔ ان کی تصانیف انہیں کے نام سے مشہور ہیں چنانچہ ایک حاشیہ میر زاہد رسالہ پر بنام حاشیہ مولوی فضل امام دوسرا میر زاہد جلالی پر بھی اس نام سے مشہور ہے۔ اول میں وہ صدر الصدور شاہجہاں آباد کے تھے جن کی جاء پر مولوی صدر الدین خان بہادر بالفعل رونق افروز ہیں۔ ان کے اشعار اور عبارات عربی بہت ہیں اور بڑے فاضل تھے۔ انہوں نے درمیان 1244ھ کے وفات پائی جن کی تاریخ میں مرزا نوشہ غالب نے یہ چند شعر کہے ہیں۔[43]

اے دریغا قدوۂ ارباب فضل   کرد سوئے جنت الماویٰ خرام
کار آگاہی ز پرکار اوفتاد   گشت دارالملک معنی بے نظام
چوں ارادت ازپئے کسب شرف   جست سال فوت آں عالی مقام
چہرۂ ہستی خردشیدم نخست   تابنائی تخرجہ گردد تمام
گفتم اندر "سایۂ لطف نبی"   یاد آرامشگۂ "فضل امام"
1244ھ

چونکہ کلام اس فاضل کے میرے ہاتھ نہیں آئے لہٰذا ان کا ذکر چھوڑ کر ان کے فرزند دل بند مولوی فضل حق صاحب کا بیان کرتا ہوں۔ واضح ہو کہ یہ فاضل اجل بڑا عالم ہندوستان میں ہے۔ اس سے صدہا لوگوں کو فیض ہوا اور صدہا فاضل اس کے شاگردوں میں ہیں۔ علوم عربیہ میں اس شخص کو بڑا رتبہ حاصل ہے خصوصاً علم منطق اور فلسفہ اس کے خدمت گاروں کو یاد ہے پھر ان کا کیا لکھنا، میری زبان میں کہاں طاقت اور قلم میں طاقت کہ اس کی تعریف لکھوں یا کچھ لکھوں۔ وہ

شاگردرشید اپنے والد کے ہیں اور ہمراہ مولوی صدرالدین خاں بہادر جن سے کمال ربط اتحاد رکھتے ہیں مولوی عبدالقادر صاحب وشاہ عبدالعزیز صاحب سے پڑھا ہے۔قصائد ان کے زبان عربی (44) اور فارسی کے مشہور ومعروف ہیں۔نثر عبارت اس طرح کی لکھتے ہیں کہ آج عرب کو ان کے مقابلہ کی طاقت نہیں۔ان کی تصنیف سے ایک حاشیہ قاضی مبارک کا ہے۔یہ حاشیہ میں نے مولوی نورالحق صاحب کے پاس دیکھا تھا۔بہت اچھا ہے۔تفصیل اور تطویل بہت ہے۔باعث اس کا تبحر اور ملکہ اور استعداد مصنف مذکور کا ہے۔یہ ایک رقعہ ان کا میرے ہاتھ آیا ہے جو مفتی محمد صدرالدین خاں بہادر کو لکھا تھا۔(45)

(تذکرہ فراالدہر،ص406)

✦ ..... ✦ ..... ✦

حواشی

(1) تذکرہ طبقات الشعراء ہند، مطبع العلوم مدرسہ دہلی سے 1848ء میں شائع ہوا ہے۔اس میں شریک مصنف کی حیثیت سے ''ایف فیلن'' کا نام بھی شامل ہے۔

(2) مولوی سید محمد بیدری (مورخ دکن) بیدر (دکن) کے قدیم رہنے والے ہیں۔تمام عمر دولت آصفیہ حیدرآباد (دکن) کے سررشتہ تعلیم میں گزری۔1962ء میں کراچی آئے۔ایک بیش قیمت کتب خانہ کے مالک ہیں جس میں نہایت اہم اور نادر مطبوعات و مخطوطات کا ذخیرہ ہے۔اس کے علاوہ شاہی فرامین،سندات،سکہ جات،تصاویر اور اخبارات ورسائل کے پرانے فائل موجود ہیں۔بیدری صاحب کا یہ ذخیرہ بڑا قابل قدر ہے۔بیدری صاحب بہت خلیق،متواضع اور علم دوست بزرگ ہیں۔

(3) تذکرہ فرائدالدہر،مطبع العلوم مدرسہ دہلی میں 1847ء میں شائع ہوا۔

(4) ان نوحضرات کے علاوہ ہندوستانی شعراء میں سراج الدین علی خاں آرزو،علی حزیں،اوحدالدین بلگرامی (کریم الدین نے وحید الدین نام لکھا ہے جو غلط ہے) انشااللہ خاں انشاء،مولوی اکبر شاہ کابلی،مفتی امراللہ خاں،غلام علی آزاد بلگرامی،احمد عرب شروانی کے حالات لکھے ہیں۔

(5) مولوی کریم الدین بن شیخ سراج الدین،پانی پت میں 1237ھ مطابق 1821ء میں پیدا ہوئے (طبقات الشعراء ہند از مولوی کریم الدین وایف فیلن ص473،مطبع العلوم مدرسہ دہلی 1848ء)۔

(6) عربی کے اشعار قصائد جو کریم الدین پانی پتی نے جو بطور نمونہ نقل کیے تھے،وہ طوالت کی وجہ سے ہم نے ان حالات میں شامل نہیں کیے ہیں۔

(7) شاہ ولی اللہ کی تصانیف کی تفصیلی فہرست کے لئے ملاحظہ ہو مجموعہ وصایا اربعہ مرتبہ محمد ایوب قادری،ص20 تا22،مطبوعہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی،حیدرآباد۔

(8) شاہ ولی اللہ کی پیدائش ان کی نانہال قصبہ پھلت ضلع مظفر نگر،یوپی انڈیا میں 4 شوال 1114ھ۔1703ء کو ہوئی۔

(9) مولوی کریم الدین کو اس سلسلہ میں سخت مغالطہ ہوا ہے کہ انہوں نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بن عبدالرحیم کو ولی اللہ المتخلص بہ

اشتیاق سرہندی سمجھ لیا ہے، اوران کو یہ دھوکا مرزا علی لطف کے ''تذکرہ گلشن ہند'' کی وجہ سے ہوا کیونکہ سب سے پہلے یہ مغالطہ لطف کو ہوا اوراس کے بعد مولوی کریم الدین نیز دوسرے تذکرہ نویسوں نے اس کا اعادہ کیا۔ ورنہ میر تقی میر نے ''نکات الشعراء'' (مطبوعہ اورنگ آباد دکن 1935ء) فتح علی گردیزی نے ''تذکرہ ریختہ گویاں''، ص 8 (مطبوعہ اورنگ آباد 1933ء) اور قائم چاند پوری نے ''مخزن نکات'' 8 (مطبوعہ اورنگ آباد 1929ء) اور میر حسن نے ''تذکرہ شعرائے اردو''، ص 8 (مطبوعہ اورنگ آباد 1940ء) میں صاف صاف ولی اللہ اشتیاق سرہندی کے حالات لکھے ہیں۔ قائم کے تذکرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اشتیاق سرہندی کا انتقال 1161ھ۔1748ء میں ہوا اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا انتقال 1176ھ۔1762ء میں ہوا ہے لہٰذا دونوں الگ الگ شخصیتیں ہیں اور اشتیاق تخلص حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (ف 1176ھ۔1762ء) کا نہیں ہے۔

(10) شیخ احمد عرب یمنی شروانی 1200ھ میں پیدا ہوئے۔ تحصیل علم محسن نخعی، بہاء الدین عاملی، علی زبیری، ابراہیم صنعائی وغیرہ سے کی۔ مذہبا شیعہ اور عربی کے ادیب شہیر تھے۔ برصغیر پاک و ہند کے بڑے بڑے شہروں کی سیاحت کی۔ اکثر کلکتہ میں رہتے تھے اور انگریزوں کو عربی پڑھاتے تھے۔ ان کی تصنیفات عجب العجاب، حدیقۃ الافراح، جوہر الوقاد اور نفحۃ الیمن، مدارس میں داخل نصاب ہوئیں۔ آخر الذکر کتاب تو آج تک عربی مدارس میں داخل نصاب ہے۔ گورنر جنرل کے ایماء پر وہ غازی الدین حیدر کے مصاحب ہوئے اوران کی تعریف میں ایک کتاب ''مناقب حیدریہ'' لکھی۔ انہوں نے لکھنؤ میں سید اسمٰعیل خاں مرشد آبادی کی لڑکی سے نکاح کیا۔ غازی الدین حیدر کے انتقال کے بعد وہ بنارس میں رہے اور پھر انگریزوں کے مشورہ سے نواب جہانگیر محمد خاں والی بھوپال کے اتالیق مقرر ہوئے اور ایک کتاب ''شمس الاقبال فی مناقب ملک بھوپال'' لکھی۔ احمد شروانی کا انتقال پونا میں 19 ربیع الاول 1256ھ (21 مئی 1840ء) کو ہوا۔ مذکورہ بالا تصانیف کے علاوہ منہج البیان، الشافی اور بحر النفائس بھی ان کی تصانیف ہیں۔ محمد عباس شروانی (ف 1315ھ۔8-1897ء) ان کے نامور اور صاحب تصانیف فرزند تھے (ملاحظہ ہو تاریخ آل امجاز از محمد عباس شروانی ص 18-119 مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی 1325ھ)۔

(11) مولوی کریم الدین نے کتاب کی نشان دہی نہیں کی کہ احمد شروانی نے اپنی کس کتاب میں یہ بات لکھی ہے۔

(12) مرزا علی لطف مؤلف تذکرہ گلشن ہند۔

(13) شاہ ولی اللہ دہلوی اورنگ زیب عالمگیر (ف 1707ء) کے عہد میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے معز الدین جہاندار شاہ، فرخ سیر، رفیع الدرجات، رفیع الدولہ، محمد شاہ، احمد شاہ کا زمانہ دیکھا۔ عالمگیر ثانی کے عہد میں شاہ ولی اللہ کا انتقال 29 محرم 1176ھ۔ 1764ء میں ہوا۔

(14) اس قصیدہ بائیہ کا نام ''اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم'' ہے۔ یہ قصیدہ متعدد بار چھپ چکا ہے۔ ہمارے پیش نظر مطبع مجتبائی دہلی 1308ھ کا مطبوعہ ہے۔ اس کے ساتھ شاہ صاحب کے دوسرے ہمزیہ، تائیہ اور لامیہ قصیدے بھی شامل ہیں۔

(15) یہ عبارت طبقات الشعراء ہند مؤلفہ کریم الدین اور ایف فیلن سے ماخوذ ہے۔ اس کی تردید پیچھے کی جا چکی ہے۔

(16) مولوی کریم الدین نے ''تذکرہ فرائد الدہر'' میں ان کتابوں کی معلومات کا مآخذ شیخ احمد عرب کی کتاب کو قرار دیا ہے اور یہاں مرزا علی لطف، مؤلف تذکرہ گلشن ہند بتایا ہے۔ پھر یہاں مولوی کریم الدین نے پُر زور تردید بھی کی ہے۔ اس بات کی تردید مولانا شبلی نعمانی (ف 1914ء) اور بابائے اردو مولوی عبدالحق (ف 1961ء) نے کی ہے۔ ملاحظہ ہو تذکرہ گلشن ہند از مرزا علی

لطف، تصحیح وحاشیہ شمس العلماء شبلی نعمانی (مقدمہ از مولوی عبدالحق ص 24-25، حیدرآباد دکن 1906ء)

(17) شاہ عبدالعزیز دہلوی کی فہرست تصانیف فتح العزیز، فتاویٰ عزیزی، تحفۂ اثناعشریہ، بستان المحدثین، عجالہ نافعہ، رسالہ فیما یجب حفظ المناظر، میزان البلاغت، میزان الکلام، اسرار الجلیل فی مسئلۃ التفضیل، سرّ الشہادتین، رسالہ انساب، رسالہ تحقیق الرویاء، حاشیہ میر زاہد و ملا جلال، حاشیہ میر زاہد شرح مواقف، حاشیہ عزیزیہ بر حاشیہ ملا کوکجی، حاشیہ شرح ہدایت الحکمۃ، شرح ارجوزہ اصمعی، مجموعہ مکاتیب، تخمیس بر قصائد شاہ ولی اللہ (بائیہ وہمزیہ)..................(نزہتہ الخواطر۔ جلد ہفتم، ص 73-274) عزۃ الراشدین (نجوم السماء ص 359) سنگیت شاستر (معارف دسمبر 1964ء) کے نام ملتے ہیں۔ شاہ عبدالعزیز کے تین رسالے، السرا الجلیل فی مسئلۃ التفضیل، عزیز الاقتباس فی فضائل اخیار الناس اور رسالہ وسیلۃ النجات ایک مجموعہ کی شکل میں فضائل صحابہ و اہل بیت کے نام سے (پاک اکیڈمی ص 141 وحیدرآباد کراچی نمبر 18) نے شائع کیا ہے۔ اس مجموعہ میں شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کے مکاتیب بھی شامل ہیں۔

(18) تحفۂ اثناعشریہ 1204ھ میں تصنیف ہوئی (ملفوظات شاہ عبدالعزیز ص 70۔ پاکستان ایجوکیشنل پبلیشرز کراچی 1960ء)

(19) تحفۂ اثناعشریہ 1789-90ء کے رد میں شاہ صاحب کے ایک معاصر حکیم مرزا محمد دہلوی (ف 1235ء) نے سب سے پہلے نزہت اثناعشریہ 1206ھ۔ 1791-92ء میں لکھی جس کا جواب شاہ عبدالعزیز نے عزۃ الراشدین سے دیا۔ عزۃ الراشدین کا جواب حکیم باقر علی خاں اور دوسرے شیعہ علما نے لکھا۔ سید دلدار علی (ف 1235ھ۔ 1820ء) نے تحفہ کے رد میں چھ کتابیں۔ 1۔ صوارم الٰہیات۔ 2۔ حسام الاسلام۔ 3۔ احیاء السنہ۔ 4۔ رسالہ ذوالفقار۔ 5۔ کتاب صوارم اور 6۔ رسالہ غیبت لکھیں اور ان کے فرزند سید محمد (ف 1867ء) نے تحفہ کے رد میں دو رسالے ''البوارق فی بحثۃ الامامۃ'' و ''طعن ارباح فی بحث فدک والقرطاس'' لکھے اور ان کے تلمیذ مفتی سید محمد قلی خاں کنتوری نے (ف 1260ھ) تحفہ کے پہلے باب کے رد میں سیف ناصری، دوسرے باب کے رد میں تقلیب المکائد، ساتویں باب کے رد میں برہان السعادت اور آٹھویں باب کے رد میں تشئید المطاعن و کشف الضغائن اور گیارہویں باب کے رد میں مصارع الافہام لکھیں۔ مفتی کنتوری کے فرزند مفتی حامد حسین (ف 1306ھ۔ 1889ء) نے اپنی تمام عمر تحفہ کے رد میں صرف کردی۔ حکیم عبدالحیٔ لکھتے ہیں ''فانہ صرف عمرہ فی الرد علی التحفہ'' (ملاحظہ ہو فضائل صحابہ واہل بیت از شاہ عبدالعزیز دہلوی (مقدمہ از محمد ایوب قادری ص 81-84، پاک اکیڈمی کراچی 1965ء)

(20) تحفۂ اثناعشریہ سب سے پہلی مرتبہ ٹائپ میں کلکتہ میں 1215ھ میں طبع ہوئی۔

(21) عجب العجاب، احمد شروانی کے عربی مکتوبات کا مجموعہ اس میں کوئی خط علامہ حسین لندن کے نام نہیں ہے البتہ شاہ عبدالعزیز کا خط خود احمد شروانی کے نام شامل کتاب ہے۔ ملاحظہ ہو عجب العجاب ص 65-72 (مطبوعہ مطبع محمدی 1281ھ)

(22) اصل مطبوعہ نسخہ تذکرہ فرائد الدہر میں شاہ ولی اللہ کی بجائے شاہ عبدالرحیم لکھا ہے جو غلط ہے۔

(23) مؤلف مولوی کریم الدین پانی پتی نے غلطی سے یہاں شاہ ولی اللہ کی بجائے والد شیخ عبدالرحیم کا نام لکھ دیا ہے۔

(24) شاہ ولی اللہ نے شیخ بوعلی سینا کے قصیدہ کا جواب لکھا ہے۔ مولوی کریم الدین نے یہاں بھی غلطی سے شیخ عبدالرحیم لکھ دیا ہے۔

(25) یہ خمسہ ابھی حال میں شاہ رفیع الدین کی کتاب ''اسرار المحبۃ'' میں شائع ہو گیا ہے جسے مولوی عبدالمجید سواتی نے اپنے مقدمہ اور تصحیح کے ساتھ شائع کیا ہے (دیکھیے اسرار المحبۃ از شاہ رفیع الدین (مقدمہ وتصحیح) از مولوی عبدالمجید سواتی، ص 47-148 (مدرسہ نصرۃ

العلوم گوجرانوالہ 1382ھ)

(26) شاہ رفیع الدین 1163ھ۔1749ء میں پیدا ہوئے اور ان کا انتقال 1233ھ۔1817ء میں ہوا۔ ان کی تصانیف میں مقدمۃ العلم، رسالہ عروض، کتاب التکمیل، قیامت نامہ، فتاویٰ شاہ رفیع الدین، مجموعہ رسائل اتسعہ، دفع الباطل، اسرار المحبت اور تفسیر آیۃ النور مشہور ہیں۔ آخر الذکر چاروں کتابیں مولانا عبدالحمید سواتی کے زیر اہتمام گوجرانوالہ سے شائع ہوئی ہیں۔

(27) مولوی عبدالحی بن شیخ ہبتہ اللہ بڈھانہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے۔ عبدالعزیز دہلوی کے داماد تھے۔ علم و فضل کے اعتبار سے وہ ہندوستان کے نامور علماء میں شمار ہوتے تھے۔ سید احمد شہید کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے بعد ان ہی کے رنگ میں رنگ گئے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں نہایت چست و مستعد رہتے تھے۔ انہوں نے سید احمد شہید کی تحریک جہاد میں بہت سرگرمی سے حصہ لیا۔ حجاز میں اہل عرب کے لئے انہوں نے ''صراط مستقیم'' کا فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا۔ شعبان 1243ھ۔1828ء کو عارضہ بواسیر میں انتقال ہوا۔

ملاحظہ ہو تذکرہ علمائے ہند (رحمان علی) مرتبہ و مترجمہ محمد ایوب قادری ص 67-268۔ کراچی 1961ء

(28) شاہ اسمٰعیل شہید کا حال صیغۂ واحد غائب میں تحریر کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ طبقات الشعراء ہند (از کریم الدین وایف۔ فیلن) کا اصل ماخذ، گارساں وتاسی کی تاریخ ادب اردو (جلد اول) ہے۔ گارساں وتاسی نے جس انداز میں شاہ اسمٰعیل شہید کا حال لکھا ہے وہی یہاں نقل کر دیا گیا ہے۔

شاہ اسماعیل شہید 24/ذی قعدہ 1246ھ۔1831ء کو میدان جہاد (بالاکوٹ) میں شہید ہوئے۔

(29) نجم الدین خاں کاکوروی بن مولوی حمید الدین کلکتہ کی عدالت کے قاضی القضاۃ رہے۔ تدریس و تعلیم کا مشغلہ بھی جاری رہا۔ کئی بلند پایہ کتابوں کے مصنف ہیں جن میں ''انموذ جی'' مشہور ہے۔ 23/ربیع الاول 1229ھ۔1813ء میں ان کا انتقال ہوا۔

(تذکرہ علمائے ہند ص 9-5-12-5)

(30) مفتی الٰہی بخش کاندھلوی صاحب تصانیف کثیرہ تھے۔ مؤلف ''حالات مشائخ کاندھلہ'' نے ان کی 34 تصانیف کا تعارف اپنی کتاب میں کرایا ہے۔ مفتی صاحب نے 17 درسی کتابوں پر حواشی لکھے ہیں۔ ملاحظہ ہو ''حالات مشائخ کاندھلہ'' از احتشام الحسن ص 125-130 (ادارہ اشاعت دینیات، دہلی 1383ھ)

(31) مفتی الٰہی بخش کا انتقال 15/جمادی الاخر 1245ھ کو ہوا۔ (حالات کاندھلہ ص 112)

(32) مولوی رشید الدین خاں بن امین الدین، مفتی صدر الدین خاں آزردہ کے رشتہ دار تھے۔ مسئلۂ متعہ کے متعلق لکھنؤ کے شیعہ علماء کے جواب میں ایک کتاب ''الصولۃ الغضنفریہ'' تحریر فرمائی۔ ان کی دوسری مشہور کتاب ''خوات عمیہ'' ہے کہ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ مسلم یونیورسٹی لائبریری (شیفتہ کلیکشن) میں موجود ہے۔ ان کے علاوہ ایضاح لطافۃ المقال، تفصیل الاصحاب اور اعانۃ لاموحدین واہانۃ الملحدین (راجا رام موہن رائے کے رسالہ کا رد) بھی ان سے یادگار ہیں۔ بقول صاحب نزہتہ الخواطر (جلد ہفتم ص 178) 1243ھ۔1827ء میں انتقال ہوا۔

(33) عہد جاہلیہ کے مشہور شاعر جن کا قصیدہ سبعہ معلقات میں شامل ہے۔ بعثت کے بعد اسلام سے مشرف ہوئے اور پھر ایک شعر بھی نہیں لکھا۔

(34) حسان بن ثابت، مشہور مداح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، ان کا دیوان طبع ہو چکا ہے۔

(35) قبیلہ وائل کے مشہور شاعر ہیں۔

(36) عربی زبان کے مشہور شاعر ہیں اس نے دعویٰ کیا اسی لئے متنبی مشہوا ہوا۔

(37) عہد جاہلیہ کا مشہور شاعر، سبعہ معلقات میں اس کا سب سے پہلا قصیدہ ہے۔

(38) مفتی صدر الدین بن شیخ لطف اللہ کشمیری 1204ھ۔ 1789ء میں پیدا ہوئے۔ 24 ربیع الاول 1285ھ۔ 1868ء کو فوت ہوئے۔ ان کے دو رسالے منتہی المقال فی شرح حدیث لا تشد الرحال اور در المنصور فی حکم مراۃ المفقود طبع ہو چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو تذکرہ علمائے ہند ص 47-248

(39) مولوی حسین احمد بن علی احمد 25 صفر 1201ھ کو ملیح آباد میں پیدا ہوئے۔ مولوی ظہور اللہ لکھنوی، مولوی عبدالرحیم کلکوی، مرزا حسن علی صغیر محدث، مولوی مخدوم لکھنوی، مولوی نور الحق لکھنوی، شاہ عبدالعزیز دہلوی، شیخ عمر محدث مکی، حکیم محمد صادق فیض آبادی اور مولوی حیدر علی سندیلوی سے علوم مروجہ تحصیل کیے۔ رسالہ جواز قرأت فاتحہ خلف امام، رسالہ در بیان بیعت، شرح رسالہ مولوی رفیع الدین دہلوی در بیان وجود، حلیہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور تصوف میں کچھ رسالے ان سے یادگار ہیں۔ 4 رمضان 1275ھ۔ 1859ء کو انتقال ہوا اور اپنے والد کے قریب موضع دودھیا (ملیح آباد) میں دفن ہوئے۔ (تذکرہ علمائے ہند ص 1672)

(40) نانوتہ ضلع سہارن پور (یوپی۔ بھارت)

(41) شہزادہ فیروز شاہ جس نے جنگ آزادی 1857ء میں بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں۔

(42) مولانا مملوک العلی بن مولوی احمد علی کا انتقال 11 ذی الحجہ 1267ھ۔ 1851ء کو دہلی میں ہوا اور خاندان شاہ ولی اللہی مہندیوں میں دفن ہوئے۔

(43) مولانا فضل امام بن شیخ محمد ارشد ہرگامی، خیر آباد وطن تھا۔ فراغ علم کے بعد دہلی پہنچے، انگریزی حکومت کی طرف سے پہلے دہلی کے مفتی پھر صدر الصدور مقرر ہوئے۔ شاہ صلاح الدین صفوی سے بیعت تھے۔ فرائض ملازمت کے ساتھ مشغلۂ تدریس و تصنیف بھی جاری تھا۔ کچھ مدت پٹیالہ میں بھی رہے۔ 5 ذی قعدہ 1244ھ۔ 1829ء کو فوت ہوئے۔ (تذکرہ علمائے ہند ص 377-76)

(44) مولانا فضل حق کے عربی قصائد اور رسالۂ ثورۃ الہندیہ، مولانا عبدالشاہد خاں نے ایک طویل مقدمہ اور ترجمہ کے ساتھ ''باغی ہندوستان'' کے نام شائع کر دیئے ہیں۔ مولانا کا کچھ نمونہ عربی کلام ''انتخاب یادگار'' (از امیر مینائی) میں بھی شامل ہے۔

(45) مولانا فضل حق 1212ھ۔ 1797ء میں خیر آباد میں پیدا ہوئے۔ الجنس الغالی فی شرح الجواہر العالی، حاشیہ شرح سلم قاضی مبارک، حاشیہ الافق المبین، حاشیہ تلخیص الشفاء، الہدیۃ السعیدیہ، رسالہ تحقیق العلم والمعلوم اور الروض المجود، ان سے یادگار ہیں۔ مولانا فضل حق خیر آبادی علوم معقول کے امام تھے۔ کمشنر دہلی کے دفتر میں پیش کار رہے۔ مولانا فضل حق اور شاہ اسماعیل شہید میں بعض مسائل پر اختلاف ہوئے۔ طرفین سے رسالے لکھے گئے۔ مرزا غالب سے مولانا کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ مولانا فضل حق ایک عرصہ تک رئیس جھجر، راجا الور، نواب ٹونک اور نواب رام پور کے یہاں ملازم رہے۔ آخر میں واجد علی شاہ کے زمانے میں لکھنؤ میں رہے۔ جنگ آزادی 1857ء میں انہوں نے عملی حصہ لیا۔ گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا اور بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی اور وہیں 12 صفر 1278ھ۔ 1861ء کو فوت ہوئے۔ (تذکرہ علمائے ہند ص 82-383)

ایک تصحیح: اس مضمون کی پہلی قسط میں (جو اپریل 1965ء کے شمارے میں چھپی ہے) ''ابتدائیہ'' کی پہلی سطر یوں پڑھی جائے:
مولوی کریم الدین پانی پتی (ف 1879ء) اردو کے مدرس، مصنف اور صحافی تھے۔ (قادری)

(الرحیم (حیدر آباد سندھ)، مارچ و اپریل 1965ء)

✦ ..... ✦ ..... ✦

محمد عبدالحلیم چشتی

تذکرۂ خانوادۂ ولی اللّٰہی از ''یادگارِ دلّی''

سید احمد ولی اللّٰہی خانوادۂ ولی اللّٰہی کے وہ فرد فرید ہیں، جن کی مساعی جمیلہ سے دہلی میں مطبع احمدی قائم ہوا، جس سے شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین رحمہم اللہ کے عربی اور فارسی کے مختصر و نادر رسالے اور ان کے اردو ترجمے شائع ہوئے۔

سید احمد نے مدرسہ عزیزیہ کو جو 1856ء سے ویران ہو گیا تھا، پھر سے آباد کیا تھا۔ موصوف ہی نے شاہ ولی اللہ اور ان کے نیک نام فرزندوں کے مزارات کا احاطہ جو غدر کے بعد مسمار ہو چکا تھا، دوبارہ کھچوایا تھا۔ بلاشبہ ان کی یہ خدمات تاریخ میں بڑی اہمیت کی حامل ہیں اور مستقل مقالہ کی محتاج ہیں۔ ہم انشاءاللہ کسی اگلی فرصت میں اس پر روشنی ڈالیں گے۔

سید احمد ولی اللّٰہی نے دتی کی مختصر و جامع تاریخ بھی اردو زبان میں لکھی ہے، جو دہلی سے ''یادگار دلی'' کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ اب نہیں ملتی ہے۔ اس کتاب میں مشاہیر اہل دلی کے مزارات کے سلسلہ میں دلی کی جن نامور شخصیتوں کا تذکرہ کیا ہے، ان میں خانوادۂ ولی اللّٰہی کا تذکرہ بھی آ گیا ہے اور شاہ عبدالرحیم سے شاہ عبدالغنی تک سب ہی بزرگوں کا ذکر اس میں کیا گیا ہے۔ ان کا تذکرہ اگرچہ مختصر ہے تاہم خانوادہ دلی کے ایک اہل علم کی باقیات صالحات سے ہونے کی بناء پر بڑی اہمیت کا حامل ہے، اسی وجہ سے اس کو مذکورۂ بالا کتاب سے نقل کر کے ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔

مہندیان

یہ ایک عمارت ہے جو کسی زمانہ میں عجیب و غریب ہو گی۔ نیچے مکانات جیسے در بنے تھے اور چار کونوں پر چار برجیاں تھیں۔ ایک برجی بیچ میں قائم تھی۔

مہندیان کی وجہ تسمیہ

کہتے ہیں کہ ایک نواب صاحب کو حضرت غوث الاعظمؒ کی جناب میں نہایت عقیدت تھی اور ہندوستان میں رسم ہے کہ ہر برس حضرت غوث الاعظمؒ کی مہندیاں بھرا کرتی ہیں یعنی کھپچیوں کی ایک برجی اونچی سی بنا کر کاغذ سے منڈھ کر اس کو روشن کرتے ہیں۔ ان نواب صاحب کے یہاں بھی مہندی کی روشنی ہوا کرتی تھی۔ جب وہ نواب ہوئے تو انہوں نے یہ

عمارت مہندی کی صورت کی بنادی اور ہر برس اس میں روشنی کرنے لگے اور یہ مقام مہندیان مشہور ہوا۔ اب بالکل کھنڈر پڑا ہے۔ دیکھنے سے ہرگز نہیں معلوم ہوسکتا کہ کیا عمارت تھی اور کس وضع پر بنی تھی۔

اس جگہ پر میدان میں دو آستانے نہایت متبرک ہیں، اول مولانا شیخ عبدالعزیز شکر بار علیہ الرحمہ کا مزار ہے۔ دوسرا اکرم محترم آستانہ جس کے انوار تمام ہندوستان کو محیط ہو رہے ہیں، حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمہ کی درگاہ ہے۔ پختہ احاطہ بنا ہے۔ احاطہ کے اندر مسجد ہے۔ مسجد کے جنوب میں چبوترہ پر چوبی کٹہرہ لگا ہے۔ کٹہرے کے اندر ان حضرات کے مزار ہیں:

حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب علیہ الرحمہ

حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمہ

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب علیہ الرحمہ

حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب علیہ الرحمہ

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب علیہ الرحمہ

حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب علیہ الرحمہ والد ماجد حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید صاحب علیہ الرحمہ۔

ان کے علاوہ دیگر اہل وعیال کی قبریں ہیں۔ صفحہ 100 پر نقشہ سے پوری کیفیت معلوم ہوگی۔

شاہ ولی اللہ کے جدّ اعلیٰ شمس الدین کی حجاز سے آمد اور رہتک میں قیام، شیخ وجیہ الدین کی دلّی میں سکونت

یہ سب حضرات فاروقی نسب ہیں۔ حضرت امیر المومنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی اولاد ہیں۔ سب سے پہلے حضرت مفتی شمس الدین صاحب فاروقی عرب سے تشریف لائے اور رہتک میں مقیم ہوئے۔ جس وقت شاہجہان بادشاہ کا زمانہ ہوا تو مفتی صاحب کی اولاد میں مولانا شیخ وجیہہ الدین علیہ الرحمہ موجود تھے۔ آپ دلی میں تشریف لائے اور اسی جگہ اقامت کی جس جگہ اب ان حضرات کے مزارات ہیں۔ اس وقت یہ مقام چھتہ خوش نہ در کے نام سے مشہور تھا اور پرانی دلی کی آبادی اسی جگہ تھی۔ چنانچہ جابجا مکانوں اور مسجدوں کے کھنڈر دکھائی دیتے ہیں۔

مدرسہ رحیمیہ کا قیام

مولانا وجیہہ الدین علیہ الرحمہ کی شہادت کے بعد ان کے صاحبزادہ مولانا شاہ عبدالرحیم علیہ الرحمہ نے درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا اور مدرسہ رحیمیہ قائم کیا۔ تمام دن قرآن وحدیث کا درس دیتے۔ رات کو طالبانِ خدا کی توجہ دہی اور سلوک طے کرانے میں مشغول رہتے۔ ظاہری وباطنی دونوں علموں کی تعلیم دیتے۔ دور دور کے لوگ حلقۂ درس میں آتے عرب وعجم کے طلبہ فیض اٹھاتے۔

نسبت کا اثر

نسبت اس قدر قوی تھی کہ ہزاروں آدمیوں پر یکساں اثر پڑتا۔

اخلاص کی کیفیت

اخلاص اور قرب کی یہ کیفیت تھی کہ سرور کائنات علیہ التحیات کی مجلس میں شامل ہوتے۔ جلوت وخلوت میں رہتے۔

ولادت

آپ 1054ھ شاہجہان بادشاہ کے وقت میں پیدا ہوئے۔

علوم وفنون کی تحصیل

شرح عقائد نسفی، خیالی وغیرہ اپنے بڑے بھائی مولانا شیخ الرضا محمد سے پڑھی۔ باقی معقول، منقول کی تمام کتابیں مولانا میر زاہد ہروی ابن قاضی اسلم سے پڑھیں۔

تصوف کی تحصیل وتکمیل

علمِ تصوف مولانا خواجہ خورد ابن حضرت خواجہ باقی باللہ علیہ الرحمہ سے حاصل کیا۔ علم سے فارغ ہوئے تو 'اللہ اللہ' کا شوق ہوا۔ بہت سے مشائخ سے فیض صحبت حاصل کیا۔

تین بزرگوں سے خرقۂ خلافت پہنا۔

اول حضرت خواجہ خورد علیہ الرحمہ سے جو حضرت خواجہ باقی باللہ علیہ الرحمہ کے فرزند اور خلیفہ تھے،

دوسرے حضرت قاری حافظ سید عبداللہ صاحب علیہ الرحمہ سے جو شیخ آدم بنوری کی صحبت میں رہے تھے،

تیسرے حضرت خلیفہ ابوالقاسم اکبرآبادی علیہ الرحمہ سے جو ملا ولی محمد صاحب خلیفہ حضرت امیر ابوالعلی صاحب اکبرآبادی کی صحبت میں رہے۔

وفات ومدفن

بادشاہ فرخ سیر کے عہد میں 12 رصفر روز چہارشنبہ 1131ھ ستر برس کی عمر میں آپ کا وصال ہوا اور اسی جگہ اپنے ذکر وشغل کے حجرے میں مدفون ہوئے۔ آپ کے بعد آپ کے فرزند ارجمند، مولانا شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمہ خلیفہ اور جانشین ہوئے۔ والد بزرگوار کے قدم بقدم رہے۔

ولادت و تعلیم و تربیت

1115ھ میں پیدا ہوئے۔ درسی کتابیں اپنے والد مرحوم سے سبقاً سبقاً پڑھیں، پھر قرآن شریف کا ترجمہ اخذ کیا۔ 16 برس کی عمر تھی کہ شاہ عبدالرحیم صاحب نے انتقال کیا، آپ سجادہ نشین ہوئے اور طالبانِ ہدایت کو سیدھے رستہ لگانا شروع کیا۔ تدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ جوق در جوق لوگ آنے شروع ہوئے۔ سینکڑوں طالب علم مستفیض ہونے لگے۔ عجیب عجیب کتابیں تصنیف کیں۔ طبیعت میں اجتہادی قوت ازل سے ودیعت رکھی گئی تھی۔ نئے نئے نکات نکالے، زمانہ میں شہرت حاصل کی۔ مسلم الثبوت استاذ مانے گئے۔ مانے ہوئے بزرگ مشہور ہوئے۔ حتیٰ کہ موافق و مخالف سب آپ کے اقوال سے سند پکڑنے لگے۔

مشائخ حرمین سے روایتِ حدیث کی اجازت

1143ھ میں خانہ کعبہ کی زیارت کو تشریف لے گئے، بڑے بڑے نامی علماء و مشائخ سے صحبتیں رہیں۔ حضرت شیخ ابوطاہر مدنی قدس سرہ اور دیگر مشہور مشائخ عرب سے صحاح ستہ اور دیگر حدیث کی کتابوں کی سندیں اور روایت کی اجازت حاصل کی۔

بہت سے بزرگوں سے خرقۂ خلافت پہنا اور 14/رجب 1145ھ میں دلی واپس تشریف لائے اور اپنے قدیمی مکان میں اقامت کی۔ مدرسہ رحیمیہ کو رونق دی۔

حدیث و تفسیر کا درس دینا شروع کیا گویا شیخ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ کے بعد اس زمانہ میں آپ نے حدیث شریف کو فروغ بخشا۔ اطراف ہندوستان میں آپ کی حدیث دانی کی شہرت ہوئی۔ طالب علموں کے پرے کے پرے آنے شروع ہوئے۔ پرانی دلی دارالحدیث بن گئی۔

روشن اختر محمد شاہ بادشاہ کا زمانہ تھا۔ اس نے چاہا کہ مولانا کے دم سے شاہجہان آباد کو عزت ہو تو کیا کہنا ہے۔ لہٰذا مولانا کو یہاں بلایا اور ایک عالیشان مکان رہنے کے لئے عنایت فرمایا جس کا تفصیلی ذکر مدرسہ کے متعلق گزر چکا ہے۔ آپ مع اہل و عیال شہر میں آرہے اور قدیم جگہ غیر آباد پڑی رہی۔

وفات

7/شوال روز یکشنبہ 1239ھ میں صبح کے وقت آپ کا وصال ہوا اور اپنے والد مرحوم کے پاس مدفون ہوئے۔
مومن خان دہلوی نے آپ کی تاریخ لکھی ہے:

انتخابِ نسخۂ دیں مولوی عبدالعزیز — بیعدیل و بینظیر و بیمثال و بیشل
جانبِ ملکِ عدم تشریف فرما کیوں ہوئے — آ گیا تھا کیا کہیں مُردوں کے ایمان میں خلل
ہے ستم اے چرخ تو کس کو یہاں سے لے گیا — کیا کیا یہ ظلم تو نے بے کسوں پر اے اجل

جب اٹھائی نعش اک عالم تہ و بالا ہوا لوٹتا تھا خاک پر ہر قدسی گردوں محل

کیا کس و ناکس پہ تھا صدمہ کیا جس وقت دفن ڈالتا تھا خاک سر پر ہر عزیز و مبتذل

مجلس درد آفرینِ تعزیہ میں، میں بھی تھا جب پڑھی تاریخ مومن نے یہ آ کر بے بدل

دست بیداد اجل سے بے سروپا ہو گئے فخر و دین فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمہ کے دوسرے بیٹے شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ سے چھوٹے مولانا شاہ رفیع الدین صاحب علیہ الرحمہ، یکتائے زمانہ تھے، ہر علم میں یگانہ تھے۔

تکمیلِ علوم

حدیث، تفسیر کی سند اپنے والدِ بزرگوار اور ان کے خلیفہ اعظم شاہ محمد عاشق علیہ الرحمہ سے حاصل کی تھی۔ فنونِ ادبیہ میں مرجع خلائق تھے۔ علوم عقلیہ میں مجتہدانہ طبیعت رکھتے تھے۔

درس و تدریس

جس وقت مولانا شاہ عبدالعزیز ضعیف ہو گئے تو تدریس کا سلسلہ آپ ہی سے قائم رہا۔ رات دن پڑھاتے، بڑے بڑے جید علماء استفادہ کی غرض سے آتے اور بامراد جاتے۔

تصنیفات

اکثر رسائل آپ کی تصنیف سے موجود ہیں، کچھ طبع ہو گئے ہیں، کچھ قلمی رکھی ہوئی ہیں۔ ترجمۂ اردو قرآن شریف آپ کا یادگار ہے۔ آخر عمر تک درس تدریس کے شیدائی رہے۔

وفات

1233ھ میں ستر برس کی عمر میں وفات پائی اور اپنے والد کے پائینتی مدفون ہوئے۔

تیسرے بیٹے مولانا شاہ عبدالقادر علیہ الرحمہ، عالم، فاضل، متوکل، مستغنی المراج تھے۔ دنیا سے نفرت کرتے۔ مجامع محافل سے کنارہ کرتے۔ تحصیل علوم سے فراغت پا کر اکبری مسجد کے ایک حجرہ میں تمام عمر بسر کر دی۔ رات دن ذکر اللہ میں مشغول رہتے؟ اہل دنیا کی طرف مطلق التفات نہ کرتے، اس لئے تصنیف و تالیف وغیرہ کی بھی چنداں توجہ نہ ہوئی۔

ترجمہ و تفسیر

ترجمہ قرآن شریف اور موضح القرآن (1)۔ یہ دو نایاب چیزیں آپ کی یادگار ہیں، جن پر سے بلا مبالغہ ہزار

کتابیں شمار ہیں۔

ظاہر میں سیدھا سادھا اللفظ ترجمہ معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں جواہر کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں۔ بڑی بڑی صنعتیں قائم کی ہیں۔ اس کا لطف وہی علماء جانتے ہیں جن کو علم تفسیر اور عربی اردو محاورات میں مہارت ہے۔ عام لوگ کیا سمجھ سکتے ہیں۔

آپ کو شاہ عبدالعدل صاحب علیہ الرحمہ سے شرف بیعت حاصل تھا اور ان کو خواجہ ناصر اور خواجہ محمد زبیر رحمتہ اللہ علیہما سے اور خواجہ ناصر علیہ الرحمہ کو شاہ سعد اللہ صاحب المعروف بہ شاہ گلشن قدس سرہ ہے۔

نیز شاہ عبدالقادر صاحب کو خواجہ میر درد علیہ الرحمہ سے فیضِ صحبت حاصل تھا۔ بہت سے لوگ آپ سے مرید تھے، متعدد خلیفہ ہوئے۔

ولادت ووفات

آپ 1167 ہجری میں پیدا ہوئے اور 1230ھ 63 سال کی عمر میں وفات پائی اور اپنے جدامجد شاہ عبدالرحیم کے پائین مدفون ہوئے۔

شاہ ولی اللہ صاحب کے چوتھے صاحبزادہ مولانا شاہ عبدالغنی صاحب علیہ الرحمہ' اتباع شریعت میں بے نظیر تھے۔ باوجود اہل وعیال کے اہل دنیا سے نفرت تھی۔ وضع، لباس، خلق تمام باتیں اپنے والدِ بزرگوار سے ملتی جلتی تھیں۔

تحصیل وتکمیل علوم

حدیث تفسیر کی تحصیل اپنے دونوں بڑے بھائی مولانا شاہ رفیع الدین صاحب اور حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب علیہ الرحمہ سے حاصل کی۔

وفات

1227ھ 57 برس کی عمر میں وفات پائی اور مولانا شاہ عبدالقادر صاحب علیہ الرحمہ کے متصل مدفون ہوئے۔

اس کٹہرے کے اندر حسب ذیل بزرگ اور مدفون ہیں:

مولانا مخصوص اللہ صاحب

مولانا محمد موسیٰ صاحب

مولانا محمد عمر صاحب خلف مولانا اسمٰعیل صاحب شہید

والدہ ماجدہ شاہ عبدالعزیز صاحب

والدہ ماجدہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب

مولانا شاہ عبدالقادر و مولانا شاہ رفیع الدین و مولانا شاہ عبدالغنی صاحب کی صاحبزادیاں۔

احقر کی والدہ یعنی مولوی محمد موسیٰ صاحب کی صاحبزادی، مولوی مخصوص اللہ صاحب کی زوجہ، کٹہرہ کے باہر احاطہ کے اندر دیگر اہل وعیال حضرت واخوند برہان صاحب علیہ الرحمہ شاگرد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب، صاحبزادے مولانا شیخ محمد صاحب محدث تھانوی علیہ الرحمہ، مولوی عنایت الرحمٰن خان صاحب رئیس دلی ومنشی اموجان صاحب ودیگر معتقدین ومتوسلین خاندان وقاضی محمد زبیر صاحب چشتی نظامی علیہ الرحمہ، مولوی حافظ سید محمد مرحوم امام جامع مسجد اور کٹہرے کے غربی جانب احاطہ سے باہر مومن خان دہلوی علیہ الرحمہ کی قبر ہے جو دلی کے مشہور زبان داں، سخن فہم، فصیح بلیغ شاعر گزرے ہیں۔

یہ جگہ جہاں ان حضرات کے مزارات ہیں غدر کے بعد سے بالکل خراب ہوگئی تھی، احاطہ تک مسمار ہوگیا تھا اور تمام دن چرواہے مویشی چراتے تھے اور جانور قبروں پر بول و براز کرتے تھے، جس سے تمام مسجد کا صحن اور مقابر نجس رہتے تھے۔ اس کے علاوہ میونسپل کمیٹی نے اس موقعہ کو نزول میں داخل کرلیا تھا اور یہ زمین ٹھیکہ پر دی جاتی تھی اور چاند ماری کے حدود میں آجانے سے اس زمانہ میں رستہ تک چلنا محال ہوتا ہے۔

ہر چند طبیعت کو پریشانی ہوتی تھی مگر بیکسی کے ہاتھوں گرفتار تھا۔ کس سے کہتا اور کون سنتا، مگر خدا کا شکر ہے کہ تھوڑا سا ٹکڑا قبرستان کا نزول سے نکل گیا اور 1213ھ میں اس قبر کا احقر نے احاطہ بنوادیا اور بزرگوں کے مزارات جو غرقی میں آگئے تھے، ایک چبوترہ پران کا نشان قائم کرکے چوبی کٹہرہ لگادیا اور دو آدمی خدمتگار مقرر کردیئے تاکہ پوری حفاظت ہو جائے اور بول و براز یا دیگر اور امور جن سے مقابر کی توہین ہوتی ہونہ ہونے پائیں۔ مگر ابھی تمام قبرستان کی زمین اور قبور نزول میں آئی ہوئی ہیں خدا کرے بہت جلد کوئی سامان ہوجائے جس سے یہ مکرم قبرستان نزول سے نکل جائے اور اہل اسلام کے برگزیدہ لوگوں کی اور ان حضرات کے اہل وعیال کی قبریں پیشاب پاخانہ وغیرہ کی نجاست سے محفوظ ہوجائیں۔

مزارات کی حفاظت اور مطبع کے اجراء سے اپنا مطلب صرف یہ ہے کہ بزرگوں کے نشانات قائم رہیں اور ان حضرات کا فیض جاری وساری رہے۔

حاشیہ

(1) موضح قرآن اس کا تاریخی نام ہے۔ چشتی

(الرحیم) حیدرآباد سندھ) مارچ 1968ء)

نسیم احمد آفریدی

شاہ ولی اللہ دہلوی

اور ان کے خاندان کے مختصر حالات

شاہ ولی اللہ دہلوی کا جو شجرۂ نسب کتابوں میں ملتا ہے اس کی رو سے حضرت امیر المومنین عمر بن الخطابؓ تک 32 واسطے ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے آپ کے مورث اعلیٰ شیخ شمس الدین فاروقی ملک یمن سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔ پھر یہ خاندان کسی وقت رہتک (ہریانہ) میں منتقل ہوا اور اس شہر کا منصب قضا وافتا تقریباً چار سو برس تک اس خاندان میں رہا۔

شاہ ولی اللہ نے اپنے بزرگوں کے کچھ حالات "الامداد فی مآثر الاجداد" **العطية الصمديه فی انفاس المحمدیه، انفاس العارفین** میں بیان کیے ہیں۔

شیخ شمس الدین کی اولاد میں ایک بزرگ شیخ وجیہہ الدین اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت (1069ھ۔ 1659ء تا 1118ھ۔ 1707ء) کسی وقت شاہجہان آباد (دہلی) میں آ کر بس گئے تھے۔ رحیم بخش کا بیان ہے کہ 1069ھ میں کھجوہ کے مقام پر اورنگ زیب اور شاہ شجاع کے درمیان جو معرکہ ہوا تھا اس میں شیخ وجیہہ الدین عالمگیر کے لشکر میں شامل تھے (1)۔ ان کا نکاح شیخ عبدالعزیز(2) کے پوتے شیخ رفیع الدین بن قطب العالم کی صاحبزادی سے ہوا تھا۔ شیخ رفیع الدین خواجہ باقی باللہ نقشبندی (ف 25/ جمادی الثانی 1012ھ) سے فیض یافتہ تھے اور انہوں نے اپنے والد شیخ قطب العالم سے بھی علوم ظاہری و باطنی حاصل کیے تھے۔

شیخ رفیع الدین نے زوجہ اولیٰ کی وفات کے بعد شیخ عارف ابن شیخ عبدالغفور اعظم پوری کی دختر سے نکاح ثانی کیا تھا۔ اس محفل عقد میں خواجہ باقی باللہ بھی اعظم پور باسٹہ (نزد بچھرایوں) تشریف لے گئے تھے۔ شاہ ولی اللہ کی دادی اسی شیخ محمد عارف کی صاحبزادی تھیں۔(3)

شیخ وجیہہ الدین صوبہ مالوہ میں ہنڈیا نامی قصبے میں ڈاکوؤں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے اور وہیں مدفون ہیں۔ ان کے تین فرزند تھے۔

1- شیخ ابوالرضا محمد: ان کا انتقال 17 / محرم 1101ھ (21 / اکتوبر 1290ء) کو ہونا بتایا گیا(4) ہے اور مادۂ تاریخ "آفتاب حقیقت" ہے۔ ان کے ایک فرزند کا نام فخر عالم ملتا ہے، جن کا انتقال 1128ھ۔ 1716ء میں ہوا(5)

دوسرے فرزند رضا حسین کی شادی شیخ مفیض اللہ کی دختر نعمت سے ہوئی تھی۔ شیخ رضا حسین نے لاہور میں وفات پائی اور ان کی نسل منقطع ہوگئی۔

2- شیخ عبدالحکیم: یہ لاولد فوت ہوئے۔ شیخ ابوالرضا محمد اور شیخ عبدالحکیم کی قبریں دہلی کے اس علاقے میں تھیں جو نو محلہ کہلاتا تھا۔ یہ پرانی دہلی میں موضع فیروز پور کے متصل تھا۔

3- شیخ عبدالرحیم: یہ شاہ ولی اللہ کے والد ماجد ہیں۔ ان کی ولادت غالباً 1054ھ۔ 45-1244ء میں ہوئی۔ رحیم بخش نے لکھا ہے کہ ''اس وقت اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ سریر آرائے سلطنت تھا'' مگر یہ صحیح نہیں، وہ زمانہ شاہجہان کا تھا۔

شیخ عبدالرحیم کی تعلیم کا ابتدائی زمانہ آگرے میں بسر ہوا، جہاں انہوں نے میرزا محمد زاہد ہروی سے شرح مواقف وغیرہ کتب کلامیہ کا درس لیا، بعض کتابیں اپنے برادر بزرگ شیخ ابوالرضا محمد سے پڑھیں۔ ان کے علاوہ خواجہ خرد، سید عبداللہ اور خواجہ ابوالقاسم سے بھی فیض حاصل کیا۔

شاہ عبدالرحیم کا پہلا نکاح ان کے ننھیالی خاندان میں ہوا تھا، اس سے شیخ صلاح الدین پیدا ہوئے۔ اس زوجہ کا انتقال 1128ھ۔ 1716ء کے بعد کسی سال ہوا۔

دوسرا عقد باون (52) برس کی عمر میں فخر النسا بنت شیخ محمد پھلتی سے ہوا جو ان مکتوبات کے جامع شاہ محمد عاشق پھلتی کے دادا ہیں۔ زوجہ ثانیہ کے بطن سے دو صاحبزادے ہوئے۔

1- شاہ ولی اللہ: ولادت 4 رشوال 1114ھ۔ 21 رفروری 1703ء، چہار شنبہ۔

2- شاہ اہل اللہ (6): وفات 1187ھ۔ 74-1773ء

شاہ اہل اللہ کے ایک فرزند شاہ مقرب اللہ تھے ان کا عرفی نام ''میاں مھکوجیو'' تھا۔ دوسرے بیٹے معظم اللہ عرفی مولوی محمد تھے، ان کا نکاح مسماہ فاطمہ بنت شیخ محمد فائق ابن شاہ محمد عاشق پھلتی سے ہوا تھا۔ ان سے دو بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئے۔

(1) محمد مکرم

(2) محمد محتشم

(3) امۃ العزیز (دختر)

شاہ ولی اللہ کی پہلی شادی ان کے ننھیالی خاندان (صدیقی) میں اپنے ماموں شاہ عبیداللہ کی صاحبزادی امۃ الرحیم سے موضع پھلت ضلع مظفر نگر میں 1118ھ۔ 07-1706ء میں ہوئی۔ ان کے بطن سے شاہ صاحب کے بڑے بیٹے شیخ محمد محدث پیدا ہوئے، انہیں مولوی نور اللہ بڈھانوی کی دختر صبیحہ منسوب ہوئیں، کوئی اولاد نہیں ہوئی (7)۔ شیخ محمد نے قصبہ بڈھانہ (ضلع مظفر نگر) میں 1208ھ۔ 94-1793ء میں انتقال کیا۔ وہیں مسجد کلاں میں مدفون ہیں۔ 'دخل فی الجنۃ' سے تاریخ وفات ملتی ہے۔

شاہ ولی اللہ کا عقد ثانی سونی پت میں مسماہ بی بی ارادت بنت سید ثناء اللہ سے ہوا۔ یہ خاتون سادات حسینی سے

تھیں۔ان کے بطن سے (9) اولادیں ہوئیں جن کی تفصیل شجرۂ خاندان میں دیکھی جائے۔ان میں یہ چار فرزند چار دانگ عالم میں مشہور ومعروف ہوئے۔

1- شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی: ولادت 25/رمضان المبارک 1159ھ۔ 13/اکتوبر 1746ء شب جمعہ کو ہوئی، اس لئے شاہ عبدالعزیز ہر سال 25/رمضان المبارک کی شب میں ختم قرآن شریف کراتے تھے۔اس کے بعد ریوڑیاں بطور تبرک تقسیم فرماتے تھے۔ان کی اہلیہ حبیبہ دختر شاہ نوراللہ بڈھانوی تھیں۔
آپ کی وفات یک شنبہ 7/شوال 1239ھ بعد نماز فجر (6/جون 1824ء) کو ہوئی۔

2- شاہ رفیع الدین عبدالوہاب: وفات یک شنبہ 6/شوال 1233ھ مطابق 9/اگست 1818ء۔

3- شاہ عبدالقادر: وفات 19/رجب 1230ھ۔ 28/جون 1815ء۔ ان کا ترجمہ قرآن ''موضح قرآن'' (1205ھ) مشہور عالم ہے۔

4- شاہ عبدالغنی: ان کا عقد مسماہ فضیلت بنت مولوی علاء الدین پھلتی سے ہوا جن کے بطن سے ایک فرزند شاہ محمد اسمٰعیل شہید بالاکوٹ اور دو بیٹیاں تھیں، پہلی بیٹی رقیہ لاولد رہیں۔دوسری کلثوم بی بی شاہ رفیع الدین کے فرزند محمد موسیٰ کو بیاہی گئیں۔

مولوی محمد اسمٰعیل شہید اپنی دونوں بہنوں سے چھوٹے تھے۔ان کے ایک فرزند محمد عمر تھے جن کا نکاح مولانا عبدالحی بڈھانوی کی لڑکی فاطمہ سے ہوا۔اولاد نہیں ہوئی۔محمد عمر کا انتقال 1268ھ۔52-1851ء میں ہوا۔''داغ جگرم'' سے تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے۔

شاہ عبدالقادر کی ایک بیٹی مسماہ زینب تھیں جن کا ایک نواسہ محمد عمر نام تھا۔محمد عمر کی والدہ کا نام جمیلہ تھا جو محمد مصطفیٰ بن شاہ رفیع الدین کی زوجہ تھیں۔یہ اپنے والدین کی زندگی ہی میں فوت ہوگئی تھیں۔

شاہ رفیع الدین کے تین نکاح ہوئے۔پہلی زوجہ مسماہ عارفہ ان کے ماموں کی بیٹی تھیں، یہ سونی پت کے خاندان سادات سے تھیں۔ان کے بطن سے پانچ بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئی:

(1) محمد عیسیٰ

(2) مخصوص اللہ

(3) محمد مصطفیٰ

(4) محمد حسین

(5) محمد موسیٰ

(6) امتہ اللہ (دختر) (8)

امتہ اللہ کی شادی سادات سونی پت میں ہوئی۔ان کے دو فرزند سید ناصر الدین اور سید نصیر الدین تھے۔ آخر الذکر شاہ محمد اسحٰق دہلوی کے داماد ہیں۔سید ناصر الدین کے بیٹے سید معز الدین تھے جن کے فرزند سید ظہیر الدین ولی اللہی ہوئے جنہوں نے شاہ ولی اللہ کے مدرسۂ رحیمیہ کا احیا کیا اور ان کی بعض تصانیف شائع بھی کیں۔

شاہ رفیع الدین کی دوسری زوجہ سے تین بیٹیاں ہوئیں۔ دو کا انتقال باپ کے سامنے ہی ہو گیا تھا۔

تیسری زوجہ مسماہ کلو تھیں۔ ان سے ایک فرزند محمد حسن تھے۔

شاہ رفیع الدین کے فرزند مولوی محمد عیسیٰ اپنے والدین کے سامنے ہی فوت ہو گئے تھے۔ ان کی شادی مسماہ زیب النساء دختر شاہ عبدالعزیز محدث سے ہوئی تھی۔

محمد حسین نے لاولد رہ کر انتقال کیا۔ ان کا عقد مسماہ رقیہ خواہر شاہ محمد اسمٰعیل شہید سے ہوا تھا۔ مولوی محمد مصطفیٰ فرزند شاہ رفیع الدین کا نکاح بی بی زینب (دختر شاہ عبدالقادر) سے ہوا اور ان کے بطن سے مولوی محمد یحییٰ پیدا ہوئے۔

مولوی محمد موسیٰ کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلا نکاح کلثوم بی بی (ہمشیرہ شاہ محمد اسمٰعیل شہید) سے ہوا اور ایک بیٹی فاضلہ یادگار رہی۔

شاہ عبدالعزیز محدث کی شادی مسماہ حبیبہ بنت شاہ نور اللہ بڈھانوی سے ہوئی۔ ان کی سب اولاد ان کے سامنے ہی فوت ہو گئی تھی، پس ماندگان میں دو نواسے تھے:

1- شاہ محمد اسحٰق (ف 27/رجب 1262ھ۔ مطابق 1846ء)

2- شاہ محمد یعقوب (ف 28/ذی قعدہ 1282ھ۔ مطابق 13/اپریل 1866ء جمعہ)

مولوی محمد یعقوب نے اپنی برادری سے باہر کئی نکاح کیے۔ ان کی پہلی بیوی سکینہ مرزا جان سوداگر کی بیٹی تھیں۔ دوسری مسماہ ظہورن کلو خاکروب کی دختر تھیں۔ کلو مسلمان ہو گیا تھا۔

شاہ محمد اسحٰق کی زوجہ لاڈلی بیگم بنت نذر علی عباسی سے چند اولادیں ہوئیں، اکثر ان کے سامنے ہی فوت ہو گئیں، تین بیٹیاں باقی رہیں۔

شاہ محمد اسحٰق کے دو بیٹے ہوئے (1) سلیمان، 8 سال کی عمر میں مر گئے۔ (2) محمد یوسف نے چار سال کی عمر میں انتقال کیا۔

شاہ صاحب کا ایک نکاح مسماہ سعیدہ بیگم سے بھی ہوا تھا، یہ قوم کی برہمن تھیں، ان کے باپ کی رضا سے انہیں مسلمان کیا تھا اور ان سے ایک بیٹی سکینہ پیدا ہوئی، جو شیر خوارگی ہی میں مر گئی تھی۔

شاہ محمد اسحٰق کی اہلیہ سعیدہ سفر حج سے واپس آتے ہوئے اندور میں فوت ہوئیں۔ ان کی قبر چھاؤنی نواب غفور خاں (اندور) میں تھی۔

مولانا نور اللہ بڈھانوی، جو شاہ ولی اللہ کے مکتوب الیہم میں سے ہیں، کے مورث اعلیٰ مولوی معین الدین کے دو (2) فرزند اور ایک دختر تھیں:

(1) شاہ نور اللہ

(2) حافظ فقیر اللہ

(3) عائشہ

عائشہ کا نکاح شیخ علیم الدین سے ہوا۔ شاہ نور اللہ کی شادی زمیرہ دختر شمس الحق سے ہوئی، یہ پھلت کے

باشندے تھے لیکن انہوں نے بڈھانہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

ان کی اہلیہ ان کی زندگی میں فوت ہو گئی تھیں۔ چار بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔

مولوی نور اللہ بڈھانوی کی دختر ملیحہ کا عقد مولوی علا الدین بن علم الدین سے ہوا۔ ان کی دوسری دختر صبیحہ شاہ ولی اللہ کے بڑے فرزند شیخ محمد سے منسوب ہوئیں۔ تیسری بیٹی حبیبہ کا نکاح شاہ عبدالعزیز دہلوی سے ہوا۔

یہ شاہ ولی اللہ کے خاندان کا اجمالی خاکہ ہے۔ اب ہم پہلے شاہ ولی اللہ کے والد بزرگوار عبدالرحیم فاروقی کے کچھ حالات لکھیں گے، پھر شاہ ولی اللہ دہلوی کا ایک سوانحی خاکہ اور ان کے چاروں فرزندان گرامی کے تراجم درج کریں گے۔

شاہ عبدالرحیم دہلوی

(مولانا نسیم احمد فریدی نے لکھا ہے۔ ''حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ذہن وفکر کا اندازہ اس وقت تک پوری طرح نہیں ہو سکتا جب تک ان کے ماحول، خاندان، خصوصاً ان کے والد ماجد کی سیرت ساز شخصیت سے اچھی طرح واقفیت نہ ہو۔'')(10)

خود شاہ ولی اللہ نے ان کے حالات وملفوظات میں رسالہ ''بوارق الولایہ'' لکھا جو ''انفاس العارفین'' میں شامل ہے۔ ان کے والد شیخ وجیہہ الدین فاروقی سپاہی پیشہ تھے، ملازمت سے استعفاد ے دیا تھا مگر ایک بار انہیں شہیدوں کے درجات دکھائے گئے تو انہوں نے شہادت کی آرزو میں پھر فوجی ملازمت اختیار کر لی اور دکن کی طرف روانہ ہوئے۔ برہان پور تک پہنچے تو یہ الہام ہوا کہ شہادت گاہ پیچھے رہ گئی، وہاں سے واپس ہوئے اور قصبہ ہنڈیا کے قریب تاجروں کے ایک قافلے کو بچانے کے لئے ڈاکوؤں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

شیخ عبدالعزیز شکر بار کے پوتے شیخ رفیع الدین محمد آپ کے نانا تھے۔ مؤخر الذکر کے والد شیخ قطب العالم تھے۔ خواجہ باقی باللہ نے ابتدائے سلوک میں ان کی خانقاہ میں رہ کر تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کے اشارے پر ہی باقی باللہؒ نے بخارا جا کر خواجہ ملنگی سے نسبت طریقۂ نقشبندیہ حاصل کی۔ شیخ رفیع الدین خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں رہے اور ان کے مخصوص رفیقوں میں سے تھے۔

شیخ رفیع الدین کا دوسرا نکاح شیخ محمد عارف فرزند شیخ عبدالغفور اعظم پوری (خلیفہ شیخ عبدالقدوس گنگوہی) کی صاحبزادی سے ہوا، اس میں شرکت کے لئے خواجہ باقی باللہ بھی اعظم پور باسٹہ تشریف لے گئے تھے۔ یہ موضع بھچرایوں (ضلع امروہہ) کے نزدیک واقع ہے۔ یہاں دور دور سے لوگ خواجہ سے ملاقات کرنے آ گئے تھے۔ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

''اس نواح کے صوفیہ نے جب خواجہ کی تشریف آوری کے متعلق سنا تو تمام جمع ہو گئے اور اس نواح کے سو مربع کوس میں کم ہی کوئی صوفی ہو گا جو وہاں حاضر نہ ہوا ہو اور ایسی عجیب محفل برپا ہوئی کہ ایسی کبھی سنی نہ گئی تھی۔''

شاہ عبدالرحیم کی نانی شیخ محمد عارف کی یہی دختر تھیں۔

شاہ عبدالرحیم تقریباً (1054ھ۔45-1644ء) میں پیدا ہوئے۔ ''عربی کے ابتدائی رسائل سے لے کر شرح عقائد اور حاشیہ خیالی تک اپنے بھائی شیخ ابوالرضا محمد سے پڑھا اور چند دیگر کتب میرزاہد ہروی سے پڑھیں۔ (11)'' آپ نے چند اسباق خواجہ خرد (فرزند خواجہ باقی اللہ) سے بھی پڑھے۔

خواجہ خرد کے اشارے پر آپ نے حافظ سید عبداللہ اکبرآبادی (خلیفہ شیخ آدم بنوری) کے ہاتھ پر طریق نقشبندیہ مجددیہ میں بیعت کی۔ خلافت و اجازت سے بھی سرفراز کیے گئے۔ سید عبداللہ نے آگرے میں انتقال کیا اور وہیں گورغریباں میں دفن ہوئے۔ قبر کا نشان اسی زمانے میں مٹ گیا تھا۔ آگرے میں کچھ عرصہ تک خلیفہ ابوالقاسم ابوالعلائی (ف رمضان 1089ھ۔ اکتوبر 1678ء) کی خدمت میں بھی رہے۔ ان سے بھی خلافت و اجازت ملی تھی۔ آگرے سے آنے کے بعد دہلی میں شاہ عبدالرحیم نے خواجہ خرد کی صحبت سے بہت فیض اٹھایا۔

آگرے کے زمانہ قیام میں شاہ عبدالرحیم نے ''فتاویٰ عالمگیری'' کی تالیف اور نظر ثانی کا کچھ کام بھی شروع کیا۔ مگر خلیفہ ابوالقاسم نے ان سے کہا کہ یہ وظیفہ ترک کردو۔ انہوں نے عرض کیا کہ میں ترک کردوں تو والدہ صاحبہ ناخوش ہوں گی، آپ ایسی دعا فرمائیں کہ یہ خود ہی بند ہو جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جس کی تفصیل شاہ صاحب نے ''انفاس العارفین'' میں بیان کی ہے۔

شاہ عبدالرحیم کی پہلی زوجہ سے ایک فرزند صلاح الدین ہوئے۔ اہلیہ کے انتقال کے بعد آپ نے باون سال کی عمر میں دوسرا نکاح حضرت شیخ محمد پھلتی کی صاحبزادی فخر النسا سے کیا۔ ان کے بطن سے شاہ ولی اللہ اور شاہ اہل اللہ پیدا ہوئے۔

شاہ عبدالرحیم کے خلفا اور مریدین کی خاصی تعداد تھی، جن میں سے چند یہ ہیں:

1- شیخ محمد پھلتی (وفات 8/جمادی الاولیٰ 1125ھ۔ 2/جون 1713ء) یہ شاہ ولی اللہ کے نانا اور جامع مکتوبات شیخ محمد عاشق پھلتی کے دادا ہیں۔ ان کے حالات میں شاہ ولی اللہ نے ایک رسالہ **العطیة الصمدیه فی انفاس المحمدیه** بھی لکھا تھا۔ آپ کا مزار پھلت میں ہے۔

2- شاہ ولی اللہ دہلوی

3- شاہ زین العابدین بن شیخ یحییٰ بن شیخ احمد سرہندی (وفات 1715ء)

4- شیخ حسام الدین انصاری بایزید بن شیخ بدیع الدین سہارن پوری۔ آپ نے ردشیعیت میں ایک رسالہ لکھا، اس کا قلمی نسخہ مدرسۂ مظاہر العلوم، سہارنپور کی لائبریری میں ہے۔

5- شاہ عبید اللہ پھلتی

6- شاہ حبیب اللہ پھلتی

(یہ دونوں شاہ ولی اللہ کے ماموں ہیں، پھلت ہی میں مزار ہے۔)

7- شیخ عبدالوہاب پھلتی (شاہ محمد عاشق کے نانا اور شاہ محمد پھلتی کے چچازاد بھائی)

8- شیخ محمد معظم پھلتی

9- شیخ بدرالحق پھلتی، انہوں نے شاہ عبدالرحیم کے ملفوظات بھی جمع کیے۔

10- شیخ فیض اللہ

11- دلدار بیگ

شاہ عبدالرحیم کی تصانیف

شاہ عبدالرحیم تصنیف وتالیف کی طرف زیادہ توجہ نہیں فرماتے تھے، آپ کا مشغلہ درس وتدریس تھا۔ کبھی کبھی مخلصین کی درخواست پر وعظ بھی فرماتے تھے۔ ایک خط میں شیخ محمد پھلتی کو لکھتے ہیں: ''تم نے لکھا تھا کہ میں کوئی کتاب لکھوں۔ مخدوما چونکہ فرصت کم ہے، لکھنا میسر نہیں ہوتا۔ پھر بھی جو کچھ تم دریافت کرو گے اس کا جواب مفصل ومشرح لکھا جائے گا، بے سوال کیے کچھ نہیں لکھا جاتا۔'' (12) پھر بھی ان کے چند خطوط کا ایک مجموعہ ''انفاس رحیمیہ'' ہے جسے شاہ اہل اللہ نے جمع کیا تھا۔ ''ارشاد رحیمیہ'' ایک مختصر رسالہ فن سلوک میں ہے۔ (13)

انہوں نے شیخ تاج الدین سنبھلی کے ایک رسالے کا فارسی ترجمہ بھی کیا تھا جو تصوف کے موضوع پر عربی زبان میں تھا۔ آپ کبھی کبھار شعر بھی کہتے تھے۔ ''انفاس العارفین'' میں آپ کی دو رباعیاں درج ہوئی ہیں، ہندی کے کبت بھی برمحل پڑھتے تھے۔

وفات

شاہ عبدالرحیم شوال 1130ھ۔ 1718ء اگست میں سخت بیمار ہوئے، مگر تندرست ہو گئے۔ پھر مرض کا اعادہ ہوا۔ 12/صفر 1131ھ۔ 4/جنوری 1719ء بدھ کے دن نماز فجر کے بعد انتقال فرمایا۔ آپ کی عمر 77 سال ہوئی۔ انتقال کے قوت ان کے بڑے صاحبزادے شاہ ولی اللہ کی عمر 16 یا 17 سال تھی۔ شاہ عبدالرحیم کا فقہی مسلک حنفی تھا، مگر کبھی ضرورت ہوتی تو کسی مسئلہ میں دوسرے مسلک فقہ پر بھی عمل کر لیتے تھے۔ مسلک طریقت میں نقشبندی نسبت غالب تھی، وحدت الوجود کے قائل تھے اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کی بے حد تعظیم کرتے تھے مگر ان مسائل کو عوام کے سامنے بیان کرنا خلاف مصلحت جانتے تھے۔

آپ کی اولاد کا حال شجرۂ خاندان میں دیکھا جائے۔

شاہ اہل اللہ پھلتی آپ کے دوسرے صاحبزادے اور شاہ ولی اللہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ یہ 1119ھ۔ 1708ء کو پھلت ہی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی کتابیں اپنے والد سے اور پھر بڑے بھائی سے پڑھیں۔ والد سے 12 سال کی عمر میں ہی بیعت کر لی تھی۔ اشغال طریقہ بعد کو بھائی سے حاصل کیے۔ جب 1143ھ کو شاہ ولی اللہ حج کے لئے جانے لگے تو دستار خلافت ان کے سر پر باندھی اور خانقاہ رحیمیہ کا سجادہ نشین بنا کر گئے تھے۔

شاہ اہل اللہ علوم معقول ومنقول کے فاضل تھے، طب بھی پڑھی تھی اور مطب کرتے تھے۔ ان کی حذاقت کے بعض واقعات شاہ ولی اللہ نے ''انفاس العارفین'' میں لکھے ہیں۔ آپ ہندوستانی طب (آیوروید) میں دستگاہ رکھتے تھے اور اس فن سے بھی مریضوں کا کامیاب علاج کرتے تھے۔ شاہ اہل اللہ کی بھی متعدد تالیفات ہیں جن میں

سے بعض شائع ہو چکی ہیں، دوسری ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔ان کا حال اور تصانیف کی کیفیت حکیم محمود احمد برکاتی نے اپنی کتاب میں درج کی ہے۔

شاہ اہل اللہ پھلت ہی میں رہتے تھے۔ وہیں 1186ھ۔ 73-1772ء میں انتقال ہوا۔ احاطہ درگاہ میں مدفون ہیں۔ وہیں شاہ محمد عاشق، شاہ محمد فائق، شاہ عبدالرحمٰن وغیرہ کے مزارات ہیں۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کے مختصر سوانح

شاہ ولی اللہ دہلوی نسباً فاروقی ہیں۔ان کی والدہ خاندان سادات سے تھیں۔ان کی ولادت (4رشوال 1114ھ۔21رفروری 1703ء) کو بدھ کے دن عہد اورنگ زیب کے آخری زمانے میں اپنی ننھیال موضع پھلت (ضلع مظفرنگر) میں ہوئی۔جس کمرے میں آپ کی ولادت ہوئی تھی، وہ اس تحریر کے وقت تک محفوظ ہے اور اسی طرح کچھ تبرکات بھی ان کی ننھیال کے لوگوں کے پاس موجود ہیں۔

آپ نے اپنے والد ماجد سے علوم ظاہری کے علاوہ باطنی فیض بھی حاصل کیا۔آپ 17 برس کے تھے جب آپ کے والد محترم شاہ عبدالرحیم نے سفر آخرت اختیار کیا (1131ھ۔1718ء)۔شاہ ولی اللہ نے والد کے مدرسۂ رحیمیہ میں ان کی جگہ بیٹھ کر درس دینے کا آغاز کیا۔آپ نے اپنے بچپن ہی میں قرآن کریم حفظ کر لیا تھا اور فقہ وحدیث سے متعلق علوم میں مہارت پیدا کر لی تھی۔اس کے علاوہ دوسرے معاون علوم صرف ونحو، منطق وکلام وغیرہ میں بھی دست گاہ بہم پہنچائی۔تصوف وسلوک میں بھی آپ کی تربیت حضرت شاہ عبدالرحیم کی نگرانی میں ہوئی۔''عوارف المعارف'' (شیخ شہاب الدین سہروردی) لوائح (جامی) وغیرہ کتب تصوف کا باقاعدہ درس حاصل کیا۔شاہ صاحب نے مختلف علوم کی جن کتابوں کا مطالعہ کیا ان کا بیان اپنے رسالہ ''الجزء اللطیف'' میں کیا ہے۔

آپ کی پہلی شادی (1128ھ۔1716ء) میں اپنے ماموں شیخ عبیداللہ پھلتی کی صاحبزادی سے ہوئی۔اس وقت شاہ صاحب کی عمر صرف 14 برس کی تھی۔ان سے ایک فرزند شیخ محمد پیدا ہوئے۔ایک صاحبزادی امتہ العزیز بھی ان کے بطن سے تھیں۔1129ھ میں شاہ عبدالرحیم نے آپ کو بیعت کیا اور نقشبندیہ سلسلے کے اذکار کی تعلیم دی اور سر پر دستار فضیلت باندھ کر اجازت عامہ عطا فرمائی۔

شاہ صاحب نے 1154ھ میں شیخ محمد فاضل سندھی سے پورا قرآن کریم حفص بن عاصم کی روایت سے پڑھا۔ والد کے انتقال کے بعد آپ مسلسل بارہ سال تک مدرسہ میں درس دیتے رہے، اور اس مدت میں ہر فن کے باکمال تیار کر دیئے۔خود اپنے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز دہلوی کی تعلیم وتربیت کی جانب بھی گہری توجہ فرمائی۔اسی زمانے میں مختلف اسلامی فرقوں اور مسلکوں کے لٹریچر کا بھی وسیع مطالعہ کیا اور ہندوستان جن نازک سیاسی حالات سے گزر رہا تھا، ان کا مشاہدہ بھی کرتے رہے۔(1145ھ۔1733ء) میں آپ سفر حرمین سے واپس آئے اور پھر زیادہ تر وقت غور وفکر، بحث وتحقیق اور تصنیف وتالیف میں گزارا۔حجاز مقدس میں شاہ صاحب نے شیخ وفد اللہ بن سلیمان مغربی، شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی اور شیخ تاج الدین حنفی جیسے ممتاز علمائے عصر سے فیض حاصل کیا۔موطا امام مالک کی سند آپ نے شیخ وفد اللہ مغربی سے

حاصل کی۔ان کے علاوہ شیخ احمد مغربی سے عربی زبان کے قواعد اور شیخ علی مصری سے فقہ شافعی کا درس لیا۔ان حضرات کے علاوہ شیخ حسن عجمی، شیخ احمد نخلی، شیخ عبداللہ مصری، شیخ عبداللہ لاہوری اور شیخ سعید کوئی کے نام بھی آپ کے اساتذہ کی فہرست میں نظر آتے ہیں۔

شاہ صاحب نہایت ذہین، کم گو، دقیقہ رس، منکسر المزاج اور رقیق القلب انسان تھے۔آپ کے اوقات کا بیشتر حصہ عبادت و ریاضت، مطالعہ و تفکر اور تصنیف و تالیف میں بسر ہوتا تھا۔

حجاز میں چودہ مہینے قیام کرنے کے بعد آپ (14/رجب 1145ھ۔ 31/دسمبر 1732ء) کو دہلی واپس آئے، دہلی کے محلہ کلاں محل کوچہ فولاد خان میں مدرسۂ رحیمیہ منتقل ہو چکا تھا۔شاہ صاحب کے صاحبزادے خصوصاً شاہ عبدالعزیز اس کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھے۔اس مدرسہ میں رہ کر شاہ صاحب نے اپنی متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن کی ترتیب و تسوید کا کام ان کے ماموں زاد بھائی اور اس مجموعہ مکتوبات کے جامع شیخ محمد عاشق پھلتی انجام دیتے تھے۔

آپ کے مرض الموت کا آغاز بڈھانہ (ضلع مظفر نگر) سے ہوا۔9/ذی الحجہ 1175ھ۔یکم جولائی 1762ء کو آپ علاج کے لئے دہلی تشریف لائے اور اپنے مرید و شاگرد بابا فضل اللہ کشمیری کے مکان میں قیام کیا۔یہ چاندنی چوک میں روشن الدولہ کے احاطے میں واقع تھا۔اب یہ گوردوارہ سیس گنج کا ایک حصہ بن چکا ہے۔

29/محرم 1174ھ۔20/اگست 1762ء جمعہ کے دن ظہر کے وقت آپ کا انتقال ہوا۔مہندیان کے قبرستان میں اپنے والد ماجد کے پہلو میں دفن کیے گئے۔انا لِلّٰہ و انا الیہ راجعون۔

آپ کی اولاد معنوی یعنی تصانیف اور اولاد جسمانی کا تفصیلی حال ہم نے علیحدہ بیان کر دیا ہے۔

(نادر مکتوبات شاہ ولی اللہ دہلوی (اردو ترجمہ)۔تحقیق و ترجمہ مولانا نسیم احمد فریدی، لاہور 1999ء، ص45-57)

حواشی

(1) رحیم بخش، حیات ولی ص49

(2) شیخ عبدالعزیز چشتی کو اکثر تذکرہ نگاروں نے شیخ عبدالعزیز شکر بار لکھا ہے۔یہ شیخ عبدالعزیز کشکی بھی کہلاتے ہیں۔بعض تذکرہ نویس کہتے ہیں کہ یہ شیخ عبدالعزیز شکر بار سے مختلف شخصیت ہیں۔ان کا وصال 6/جمادی الثانیہ 976ھ (یا 975ھ) میں ہوا۔(حیات ولی 86)۔''یادگار اہل چشت'' سے تاریخ 975ھ اور ''ذرہ ناچیز'' سے 976ھ اور ''ذرہ ناچیز'' سے 976ھ برآمد ہوتی ہے۔''ذرہ ناچیز'' کا پس منظر یہ ہے کہ شیخ اپنے خطوط میں اکثر یہ لکھا کرتے تھے۔''از ذرۂ ناچیز عبدالعزیز''۔

(3) حیات ولی، ص69

(4) حیات ولی، ص207

(5) حیات ولی، ص223

(6) عربی وفارسی ریسرچ انسٹیٹیوٹ راجستھان (ٹونک) کے ذخیرے میں ایک تفسیر القرآن ہے (اوراق 126 سطر 17) جسے شاہ اہل اللہ دہلوی کی تالیف بتایا گیا ہے۔ ان کے علاوہ مختصر هدایه الفقه للمر غینانی، مختصر فی الفقه والعقائد (فارسی) اور مختصر فی الطب بھی ان کی تالیفات ہیں جن کے نسخے ٹونک میں ہیں۔ (خزینۃ المخطوطات ٹونک۔ 223-224)۔ شاہ اہل اللہ کی ایک اور تالیف ''احسن المسائل'' فاروقی پریس دہلی سے 1345ھ میں چھپی تھی (صفحات 382) یہ ''کنز الدقائق'' کا ترجمہ ہے۔ ایک اور تالیف مجموعہ رسائل تسعہ میں ''نصائح ووظائف'' کے نام سے شامل ہے۔ (قاموس الکتب جلد 1، 1065)

(7) عبدالقیوم مظاہری نے الامام شاہ ولی اللہ، ص 109 میں لکھا ہے کہ ''بڈھانہ کی جامع مسجد میں دفن ہوئے اور وہیں آپ کے دو صاحبزادوں کے مزار بھی ہیں۔'' اس کو مقالات طریقت، ص 14 کے حوالے سے لکھا ہے۔

(8) مولانا محمد ثانی حسنی مرحوم کی مملوکہ ایک بیاض میں یوں لکھا ہے: ''حضرت شاہ رفیع الدین شش فرزند داشتند مولوی مخصوص اللہ و مولوی موسیٰ وغیرہ وازیشاں عقبی نیست۔'' مگر چھٹے بیٹے کا نام معلوم نہ ہوسکا۔ (اضافہ از یادداشت حضرت مولانا نسیم احمد فریدی۔ مرقومہ 29/جنوری 1928ء در لکھنؤ)

(9) شاہ محمد اسحٰق 8/ذی الحجہ 1296ھ۔ 14/نومبر 1782ء کو پیدا ہوئے تھے۔ دونوں بھائیوں نے 1258ھ۔ 43-1842ء میں مکہ معظمہ کو ہجرت کی اور وہاں جوار حرم شریف میں درس حدیث کا فیضان جاری رکھا۔ 27/رجب 1262ھ۔ 20/جولائی 1846ء یوم دوشنبہ بہ حالت صوم ہیضہ وبائی میں مبتلا ہو کر انتقال کیا۔ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے مزار کے قریب مدفون ہوئے۔

شاہ محمد یعقوب 28/ذی الحجہ 1200ھ۔ 22/اکتوبر 1876ء کو پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی 1286ھ میں مکہ مکرمہ میں انتقال کیا۔ شاہ عبدالحی بڈھانوی نے اپنی زوجہ مریم دختر شاہ عبدالعزیز کی وفات کے بعد مبارک بیگم دختر محمد افضل (شاہ محمد اسحٰق کی بہن) سے نکاح ثانی کیا تھا، مسماۃ مبارک شادی کے دو سال بعد ہی 1243ھ۔ 28-1827ء میں فوت ہوگئیں۔ کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔

(10) انفاس العارفین (اردو) 259

(11) انفاس العارفین (اردو)۔ نیز مولانا فریدی تذکرۂ حضرت شاہ عبدالرحیم، ص 65۔ میر زاہد ہروی اورنگ زیب عالمگیر کے لشکر میں محتسب تھے۔ آگرہ میں رہتے تھے۔ شاہ عبدالرحیم بھی اسی زمانے میں اپنے والد کے ساتھ آگرے میں تھے۔ انہوں نے میر زاہد سے معقولات اور علم الکلام کا درس لیا۔ شرح مواقف بھی ان سے پڑھی تھی۔ میر زاہد نے 1101ھ۔ 1690ء میں کابل میں انتقال کیا۔

(12) انفاس رحیمیہ بہ حوالہ تذکرہ، ص 39

(13) یہ مختصر مجموعہ مطبع احمدی دہلی اور مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہو چکا ہے، مولانا فریدی نے اس کا ایک قلمی نسخہ بھی دیکھا تھا اور اس کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ مطبوعہ نسخے میں بہت کچھ خلط مبحث ہوا ہے اور غلطیاں بھی رہ گئی ہیں۔ (تذکرہ شاہ عبدالرحیم، 132)

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

شاہ ولی اللہ کا اصل نام

اور ضمیمہ تصانیف

حضرت والا کا مشہور و متداول نام ''ولی اللہ'' ہے۔ وطنی نسبت سے دہلوی کہلاتے ہیں جبکہ مولد و منشا کے اعتبار سے پھلتی تھے لیکن اس نسبت سے معروف نہیں۔ حضرت شاہ صاحب کا اصل نام ''قطب الدین احمد'' بتایا جاتا ہے۔ بیشتر سوانح نگاروں نے اسی نام کو اصل قرار دیا ہے۔ اکثر نے اصل نام کی بجائے معروف ترین لقب ''ولی اللہ'' ہی کو اصل نام کی طرح اپنی تحریروں میں استعمال کیا ہے۔ متعدد اہل تحقیق شاہ صاحب کے اصل نام نامی کا سراغ پا گئے ہیں اور انہوں نے اس کا اظہار اپنی نگارشات میں کیا ہے۔ لیکن ''قطب الدین احمد'' کے اصل نام ہونے کی شہرت اتنی زیادہ ہو گئی ہے کہ بڑے بڑے اہل علم بھی اسی کو اصل سمجھنے لگے۔ اتنی معروف و عظیم شخصیت کے اسم گرامی کے بارے میں یہ عجیب صورت کیسے پیدا ہو گئی ہے؟

اس کی بنیادی وجہ مشرقی روایت پرستی ہے جو بقول ابن خلدون (عبدالرحمٰن بن محمد، م 804ھ۔1404ء) تاریخ سوانح نگاری میں ''غلط نگاری'' اور ''اوہام نویسی'' کی سات بڑی وجوہ میں سے ایک ہے۔ شاہ ولی اللہ کے بنیادی سوانحی مآخذ میں کئی روایات اس باب میں پائی جاتی ہیں مگر ان میں سے صرف ایک نوع کی روایت پر پورا انحصار کر لیا گیا اور باقی روایات کو نظر انداز کر دیا گیا اور ان کی تنقید و تحلیل نہیں کی گئی۔ متعدد اہل تحقیق نے اصل نام نامی کی جو صراحت کی اس کو قبول عام نہیں ملا۔ اس کی بڑی وجہ یہ رہی کہ ''قطب الدین احمد'' نام کے ساتھ جو تقدس بھری روایت، پاکیزہ توجیہہ اور سحر آگیں وجہ تسمیہ لگی تھی اس نے اصل کی طرف نگاہ ڈالنے کا موقع ہی نہ دیا۔ فکر ولی اللٰہی کے ماہرین نے اس موضوع خاص پر کوئی تحقیقی کام بھی نہیں کیا اور ''حیات ولی'' میں اس بنا پر ایک علمی خلا پیدا ہو گیا۔ موجودہ مقالہ اسی خلا کو پُر کرنے اور شاہ صاحب کے اصل نام، لقب، خطاب اور ان سے متعلق تاریخی پس منظر کو اجاگر کرنے کی ایک طالب علمانہ کوشش ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کی حیات و سوانح کا بنیادی ماخذ ان کی اپنی تحریریں ہیں۔ ان میں سب سے اہم ان کی مختصر خودنوشت ہے جو ''الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف'' کا عنوان رکھتی ہے۔ وہ ان کی ایک بڑی کتاب ''انفاس العارفین'' کا آخری جز ہے۔ شاہ صاحب کی عادت ثانیہ ہے کہ حمد و صلوٰۃ کے بعد اپنے اصل نام یا معروف و متداول لقب سے موضوع کا آغاز کرتے ہیں۔ خودنوشت میں انہوں نے ''ولی اللہ بن عبدالرحیم'' لکھا اور بعض احباب کا تجویز کردہ تاریخی

نام ''عظیم الدین'' بھی لکھا ہے۔ ان کے علاوہ کسی اور نام، لقب، خطاب کی نہ تصریح کی ہے اور نہ وجہ تسمیہ اور نہ اس کی تاریخی یا تقدیسی روایت لکھی ہے (انفاس العارفین، اردو ترجمہ 4-403)

البتہ ''انفاس العارفین'' میں شامل سات رسائل میں اولین رسالہ ''بوارق الولایہ'' میں انہوں نے وہ روایت نقل کی ہے جو بعد میں شہرتِ عام اختیار کر گئی۔ یہ رسالہ ان کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم (م 1719ء۔1131ھ) کے حالات، کرامات اور ملفوظات پر مشتمل ہے۔ شاہ عبدالرحیم کا بیان یوں نقل کیا ہے کہ ''ایک دفعہ میں انہی (حضرت شیخ قطب الدین) کے مزار مبارک کی زیارت کے لئے گیا۔ آپ کی روح مبارک ظاہر ہوئی اور مجھے فرمایا کہ تمہیں ایک فرزند پیدا ہوگا۔ اس کا نام قطب احمد رکھنا...... میری پیدائش کے وقت والد ماجد کے ذہن سے یہ واقعہ اتر گیا۔ اس لئے انہوں نے ولی اللہ نام رکھ دیا۔ کچھ عرصہ بعد جب انہیں یہ واقعہ یاد آیا تو انہوں نے میرا دوسرا نام قطب الدین احمد رکھا۔''
(انفاس العارفین، 110)

شاہ عبدالرحیم کی بیان کردہ بشارت اور شاہ ولی اللہ کی وضاحت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت والا کا اصل نام ''ولی اللہ'' تھا جو پیدائش کے بعد رکھا گیا۔ بشارت وہدایت کے یاد آنے کے بعد دوسرا نام ''قطب الدین احمد'' رکھا گیا۔ یہ دلچسپ بات بھی ہے اور اہم بھی کہ حضرت شاہ صاحب کے اولین نام کو کوئی بھی اصل نام نہیں مانتا اور ان کے دوسرے نام کو سب ہی نے تقریباً اصل نام مان لیا ہے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ شاہ ولی اللہ کی صرف دو روایتوں یا صراحتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی تائید کرنے کے لئے صرف یہ ایک نوع کی روایات کو بیان کرتی ہیں۔ شاہ صاحب کی اپنی تحریروں میں دوسری روایات وتصریحات بھی ملتی ہیں۔

ولی اللہی وضاحتوں کے علاوہ دوسرا اہم ترین معاصر ماخذ شیخ محمد عاشق (م 1773ء۔1187ھ) کا تحریر کردہ حیات نامہ ہے جو ''القول الجلی فی ذکر آثار الولی'' کا عنوان رکھتا ہے۔ اس کتاب کے مستند ہونے کا سب سے بڑا ثبوت خود شاہ ولی اللہ کا حوالہ ہے جو انہوں نے اپنی خودنوشت میں دیا ہے (انفاس العارفین، 404) ''القول الجلی'' کے فارسی متن میں شاہ صاحب کا نام لکھا ہے: ''الشیخ ولی اللہ علما'' و ''قطب الدین احمد اسما'' (مطبوعہ شاہ ابوالخیر اکاڈمی، دہلی غیر مورخہ 3) اس کا اردو ترجمہ یوں کیا گیا ہے: ''ولی اللہ علم کے اعتبار سے اور قطب الدین احمد اسم کے اعتبار سے۔'' (تقی انور علوی، لکھنؤ 1988ء، 10-9) ''القول الجلی'' کے مؤلف گرامی نے ''بوارق الولایہ'' کی روایت کو تقریباً جوں کا توں نقل کر دیا ہے فرق یہ ہے کہ ''حضرت خواجہ قطب الدین کاکی قدس سرہ'' کے نام کی صراحت کر دی ہے اور لکھا ہے کہ ''قطب الدین احمد'' بھی نام رکھا......''

بعد کے سوانح نگاروں نے ''بوارق الولایہ'' اور ''القول الجلی'' کی بیان کردہ روایت کو پوری طرح سے اپنا لیا۔ بلکہ بعض بعض نے اپنی طرف سے اس میں گل بوٹے بھی ٹانک دیئے۔ ناموں کی ترتیب الٹ دی یا اپنی جانب سے اضافے کر دیئے۔ محمد رحیم بخش نے ولی اللہ کے نام سے شہرت پانے، اس کی توجیہہ کرنے اور ''قطب الدین احمد'' کے دوسرے نام کی صراحت کی ہے (حیات ولی، 395) ''نزہتہ الخواطر'' کے مولف عبدالحی حسنی نے ''...... قطب الدین احمد ولی اللہ بن عبدالرحیم......'' میں دونوں کو جمع کرنے کے علاوہ ان کی ترتیب الٹ دی (جلد ششم 398) ان کے فرزند گرامی

قدر سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے اصل روایات ''بوارق الولایہ'' اور ''القول الجلی'' کو اپنے انداز سے نقل کر دیا (تاریخ دعوت و عزیمت، پنجم 98-97) ''اردو دائرہ معارف اسلامیہ'' کے دو فاضل مقالہ نگاروں محمد عطاء اللہ حنیف اور عبدالقیوم نے ''انفاس العارفین'' (45) کے حوالے سے اس بات کو یوں پیش کیا: ''شاہ عبدالرحیم (والد) کو اشارہ ہوا تھا کہ مولود کا نام قطب الدین احمد رکھنا۔ ولادت پر والد نے قطب الدین احمد کے علاوہ ولی اللہ کو بھی نام کا جز بنایا۔'' (مقالہ شاہ ولی اللہ دہلوی، جلد 23، 40-39) اس بیان میں دونوں ناموں کی تقدیم و تاخیر کے علاوہ ان کے زمانہ تسمیہ کی مدت کا فرق ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ جب کہ اوپر نام و نسب یوں بیان کیا ہے: ''ولی اللہ ابوالفیاض قطب الدین احمد بن ابوالفیض شاہ عبدالرحیم بن شاہ وجیہہ الدین بن معظم العمری الدہلوی......''

غلام حسین جلبانی نے ''قطب الدین احمد ولد عبدالرحیم عرف شاہ ولی اللہ'' لکھا ہے (شاہ ولی اللہ کی تعلیم، 19) اور انگریزی میں بھی اسی کا ترجمہ کر دیا Qutb-ud-Din Ahamd b. Abdur-Rahim, generally known as Waliyullah (لائف آف شاہ ولی اللہ، 1) ان کے پیش لفظ میں جو تصریح ہے اس کا ذکر بعد میں آتا ہے۔ جے، ایم، ایس، بلجان (بالیوں) (J.M.S.Baljon) نے شاہ صاحب کی ''بوارق الولایہ'' کی روایت نقل کی ہے لیکن ''تفہیمات'' دوم 154 کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''قطب الدین بختیار کا کی (م 1236ء) نے نومولود کو قطب الدین کہنے کی ہدایت دی لیکن آسمان واقعات نے یہ اشارہ دیا تھا کہ میں اللہ تعالیٰ کی مسلسل عنایات کا مورد (متولیٰ) رہوں گا......'' (ریلجن اینڈ تھاٹ آف شاہ ولی اللہ دہلوی، مقدمہ، 1) بلجان (بالیوں) کے بیان میں قطب الدین تو موجود ہے لیکن اس کا آخری جز احمد نہیں مذکور ہے جو ''بوارق الولایہ'' ''القول الجلی'' اور دوسرے ہمنوا تذکرہ نگاروں کے ہاں پایا جاتا ہے۔ ''التفہیمات الالٰہیہ'' کے مرتب گرامی نے سرورقِ کتاب پر ''قطب الدین احمد المدعو بالشاہ ولی اللہ المحدث الدہلوی'' لکھ کر ترتیب ہی الٹ دی ہے (المجلس العلمی، ڈابھیل، 1936ء)

شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی سماجی افکار پر جدید ترین تحقیقی کتاب کے مؤلف محمد الغزالی نے جلبانی کا انگریزی انداز اپنایا ہے: Qutb-Al-Din Ahmad ibn Abdal-Rahim, popularly- known as Shah Waliy Allah (مقدمہ، 3) اگرچہ ان کے ہاں روایت مشہورہ کا حوالہ نہیں شاید اس بنا پر کہ ان کی تالیف سوانحی نہیں ہے، فکرِ ولی اللہی کے ایک پہلو سے بحث کرتی ہے۔ البتہ جن اہل قلم نے سوانح ولی لکھی ہے یا سوانح ولی سے اپنی کسی تالیف میں تعرض کیا ہے انہوں نے قطب الدین احمد ہی کو اصل نام سمجھا، مانا اور گردانا ہے۔ ''انفاس العارفین'' کے اردو مترجم سید محمد فاروق قادری کی صراحت ہے کہ ''آپ کا نام نامی قطب الدین احمد ہے۔ لیکن ولی اللہ کے نام سے زیادہ معروف ہوئے۔'' (تقدیم، 1) پیر محمد کرم شاہ ازہری نے لکھا ہے کہ ''......حضرت بختیار کا کی نے لڑکے کی بشارت دی اور فرمایا اس کا نام قطب الدین رکھنا۔ میں پیدا ہوا تو والد ماجد یہ نام رکھنا بھول گئے۔ بعد میں یاد آنے پر قطب الدین نام رکھا۔'' (مقدمہ قصیدہ اطیب النغم، 7) بلجان (بالیوں) کی طرح اس بیان میں بھی احمد اس نام کا جز نہیں ہے۔

سید محمد متین ہاشمی نے ''انفاس العارفین'' کے حوالے سے ''بوارق الولایہ'' کی روایت پوری نقل کر دی ہے (مقدمہ سطعات، 4-3) اے، ڈی، مضطر اور فضل محمود نے اپنی اپنی انگریزی کتابوں میں اس روایت کی پوری پیروی

کرتے ہوئے قطب الدین احمد ہی کو دوسرا مگر اصل نام مانا ہے (36-37 اور چار و مابعد بالترتیب) متعدد دوسری سوانحی کتب اور تذکروں میں یہ نام بالعموم ملتا ہے۔ مثلاً محمد مظہر بقا انہیں میں سے ایک ہیں جنہوں نے قطب الدین کو ایک نام بتایا ہے۔ ان کے ہاں البتہ یہ مزید صراحت ملتی ہے کہ ''ولی اللہ کے علاوہ شاہ صاحب کے نام قطب الدین احمد اور عبداللہ بھی ہیں اور کنیت ابوالفیاض ہے۔'' مشہور روایت کے لئے ''انفاس'' 45-44، اور ''تفہیمات'' ج2، ص154 کا حوالہ دیا ہے۔ شاہ صاحب نے خود اپنا نام عبداللہ رکھا ہے۔ یہ ''مسلسلات'' ص43 کے حوالے سے ہے (126)

بعض جدید سوانح نگاروں نے اپنے قیاس سے کام لیا ہے اور اصل روایت میں یہ اضافہ کر دیا ہے کہ خواجہ قطب الدین کاکی نے اپنی ہدایت میں کہا تھا کہ نومولود کا نام ''میرے نام پر'' قطب الدین احمد رکھنا۔ حالانکہ یہ اضافہ غلط ہے (سید ابوالحسن علی ندوی، 98: فرمایا کہ اس کا نام میرے نام پر قطب الدین رکھنا) کیونکہ شیخ کاکی کا اصل نام بختیار تھا اور قطب الدین لقب، جس طرح ان کے شیخ اجمیری کا نام نامی حسن تھا اور معین الدین لقب۔ شیخ کاکی کے خلیفہ خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کے لقب و خطاب سے معروف ہیں جب کہ ان کا اصل نام مسعود ہے اور شیخ نظام الدین اولیاءؒ کا اصل نام محمد ہے۔ اسی طرح ان کے خلیفہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کا نام گرامی محمود ہے۔ یہ تمام شیوخ صوفیہ اپنے اپنے القاب و خطابات سے زیادہ معروف ہوئے اور غلطی سے ان کو اسمائے معرفہ سمجھ لیا گیا اور القاب کی شہرت کے سبب اصل نام تقریباً فراموش ہو گئے یا پس پردہ چلے گئے (مقالہ چشتیہ، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہور)

دراصل قرون وسطٰی میں جب تہذیبی تکلفات کا دور دورہ ہوا تو صوفیہ، علماء، سلاطین اور دوسرے تمام اکابر کے لئے القاب و آداب اور خطابات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ عباسی خلفاء نے تخت نشینی کے بعد اپنے اصل نام کے ساتھ لاحقے لگانے کا آغاز کیا اور ابوالعباس کو السفاح سے، ابوجعفر کو المنصور سے، محمد کو المہدی سے، ہارون کو الرشید سے اور عبداللہ کو المامون سے پکارا گیا۔ پھر ''لاحقوں'' کے ساتھ ''سابقوں'' کا رواج پڑ گیا اور علماء صوفیہ میں بھی اس نے اپنی پکی جگہ بنالی کہ نام یاد رہے نہ رہے لقب و خطاب بلکہ ان کے طول طویل سلسلے ضرور آگے پیچھے لگائے جائیں۔ ہندی سلاطین میں ایبک کا قطب الدین، التتمش کا شمس الدین، بلبن کا غیاث الدین اور مغل حکمرانوں میں محمد بابر کا ظہیر الدین، محمد ہمایوں کا نصیر الدین، محمد اکبر کا جلال الدین، محمد سلیم کا نور الدین، محمد شاہجہان کا شہاب الدین اور محمد اورنگ زیب کا محب الدین سرکاری لقب بن گیا اور ان کے بغیر نام ادھورا سمجھا گیا۔ جوں جوں زوال و انحطاط کا زمانہ اور دھارا تیز ہوتا گیا سابقہ کے ساتھ لاحقہ بھی لگنے لگا۔ شہاب الدین محمد شاہجہان صاحب قران ثانی بن گئے تو محی الدین محمد اورنگ نے عالمگیر کا لاحقہ بڑھا لیا۔ علمائے کرام کسی سے کیوں پیچھے رہتے۔ انہوں نے بھی سابقہ اور لاحقہ نام سے ملانا شروع کر دیا، یا ان کے پیروؤں نے عقیدت مندی میں یا مرتبہ علماء بڑھانے کے لئے لگا دیا۔ چنانچہ امام احمد بن عبدالحلیم کا لقب تقی الدین ہے اور وہ معروف ابن تیمیہ کی نسبت سے ہیں۔ ابن الجوزی کا نام عبدالرحمٰن بن علی ہے اور لقب جمال الدین۔ حافظ ابن حجر کا نام احمد بن علی ہے مگر لقب شہاب الدین ہے۔ یہ علماء وائمہ تو لقب سے زیادہ دوسری نسبتوں سے معروف ہیں۔ بعض کیا بہت سے علمائے کرام اور محدثین عظام کے اصل ناموں پر ان کے القاب و آداب بلکہ سابقے لاحقے اتنے غالب آگئے ہیں کہ اصل نام فراموش ہو گیا یا محض زینت کتاب بن کر رہ گیا۔ مشہور مصلح جمال الدین افغانی کو سب جانتے ہیں، ان کا اصل نام

سید محمد بن صفدر کون جانتا ہے؟ ''طبقات الشافعیہ'' کے مولف گرامی کو تاج الدین سبکی کے لقب سے جانا جاتا ہے مگر ان کے اصل نام عبدالوہاب کا پتہ کتنے لوگوں کو ہے۔ مشہور عالم سیوطی کا لقب جلال الدین ہے اور اسم گرامی عبدالرحمٰن بن ابوبکر۔ ایسے اکابر کی فہرست تیار کی جائے تو ایک عمدہ دلچسپ اور تحقیقی مطالعہ ہوگا اور ساتھ ہی انتہائی عبرت انگیز و نصیحت آمیز۔ ہزارہا علماء، صوفیہ، سلاطین اور اکابر ایسے ہیں جن کا نام نامی القاب و آداب اور خطابات اور سابقے لاحقے کے پردوں میں چھپا دیا گیا۔ تذکرہ و تراجم اور سوانح کی کتابوں میں ان کا بیان کثرت سے ملتا ہے اور ان سے متعلق بعض تفصیلات خاصی دلچسپ اور بسا اوقات عبرت انگیز ہیں۔ القاب و خطابات کا طومار دور جدید میں برابر جاری ساری ہے بالخصوص ہمارے برصغیر پاک و ہند میں جہاں ان گنت حکیم الاسلام، حکیم الامت، مفکر اسلام، متکلم اسلام، قدوۃ العلماء، زبدۃ الحکماء اور ایسے ہزارہا ہیں اور بظاہر ان میں اضافہ ہی کا یقین ہے، کمی کا ذرا بھی امکان نہیں کہ ہمارا مشرقی ذہن تقدیس و تکریم کی مبالغہ آرائی کا عادی ہے۔ وہ نام سے کم، لقب و خطاب سے زیادہ متاثر و مرعوب ہوتا ہے۔

لہٰذا یہ عین فطری تھا کہ حضرت احمد بن عبدالرحیم قطب الدین کے لقب اور ولی اللہ کے خطاب اور شاہ کے سابقہ سے دنیائے علم پر حکمرانی کرتے۔ حضرت موصوف کو شاہ کے لقب اول سے غالباً اسی لئے موصوف موسوم کیا گیا کہ وہ جہاں علم کے حکمران ہیں اور علم و فضل کے ساتھ قلب و روح پر حکومت کرتے ہیں۔ شاہ اصلاً دنیاوی حکمرانوں کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ وہ جہان فقر کے فرمانرواؤں کے لئے بھی استعمال ہونے لگا اور صوفیہ کے نام کا جزء بن گیا (مقالہ ''شاہ'' اردو دائرہ معارف اسلامیہ) مقالہ نگار موصوف نے دنیاوی شاہوں کے لئے اس کے استعمال کا ذکر تو کیا ہے مگر جہان قلب کے فرمانرواؤں پر اس کے اطلاق سے بحث نہیں کی ہے۔ حضرت ولی اللہ دہلوی کے لئے یہ لقب جزء لاینفک بن گیا ہے کہ اب حضرت موصوف شاہ ولی اللہ یا شاہ صاحب کے لقب سے بھی زیادہ جانے جاتے ہیں۔ ان کی علمی و روحانی شاہی کا باب ابھی تحقیق طلب ہے۔

ولی اللہ لقب کی توجیہہ کا ایک حوالہ اور پر بلجان (بالیوں) کے ایک بیان میں آیا ہے اور جو خود شاہ صاحب کے اپنے وضاحتی تسمیہ پر مبنی ہے۔ ان کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم کو بعض غیبی اشارات اور آسمانی واقعات نے یقین دلایا تھا کہ نومولود اللہ تعالیٰ کی مسلسل عنایات اور متواتر توجہات کا مورد و مرکز ہوگا۔ وہ متولی ہوگا لہٰذا والد ماجد نے ان کو ''ولی اللہ'' کہہ کر پکارا اور ان کی ولادت کے بعد اسی نام و لقب سے شہرت دی۔ وہ ایسا زبان زد عام و خاص ہوا کہ اصل نام اس کے پردوں میں چھپ گیا۔ ''انفاس العارفین'' میں شامل ''بوارق الولایہ'' کی ایک روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ عبدالرحیم نے اپنے فرزند گرامی قدر کو ''ولی اللہ'' کا لقب ان کی ولادت سے قبل ہی دیا تھا جس طرح ان کے برادر خورد کو ''اہل اللہ'' کے لقب سے پکارا تھا جب کہ وہ ابھی شکم مادر ہی میں نہ آئے تھے (انفاس العارفین، 145) یہ لقب دیا گیا تھا جب کہ شاہ ولی اللہ شکم مادر میں تھے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے بعد ہی یا اس سے پہلے ولی اللہ لقب دیا گیا ہو۔ بہر حال دلچسپ اور حیرت انگیز امر ہے کہ شاہ اہل اللہ کا اصل نام بالکل معلوم نہیں وہ ابھی تک تحقیق طلب ہے۔ دونوں بھائیوں کے القاب میں اللہ کے دوست ہونے کی نشانیاں دیکھی گئی ہوں، جیسا کہ جلبانی کا خیال ہے، یا انعامات الٰہی اور فیوض ربانی کی ان کے وجود ہائے مسعود پر بارش پائی گئی ہو۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کم از کم ان کے مورد و مرکز اور مصداق ضرور تھے۔

شاہ ولی اللہ کی ایک عادت یہ ہے کہ وہ اکثر و بیشتر اپنی تصانیف میں ولی اللہ بن عبدالرحیم یا فقط ولی اللہ کے نام سے بحث و مباحثہ اور موضوع کا آغاز کرتے ہیں۔ ان کی دوسری عادت یہ بھی ہے کہ وہ ولی اللہ سے قبل ''فقیر'' کا سابقہ بھی زیادہ تر لگاتے ہیں۔ غالباً وہ ''شاہ'' کے خطاب عام کے ردعمل اور اپنے ذاتی و نجی انکسار کے سبب شاہ ولی اللہ کی بجائے ''فقیر ولی اللہ'' اپنے آپ کو کہتے ہیں۔

''انفاس العارفین'' کے ساتوں رسالوں میں حضرت مؤلف نے حمد و صلوٰۃ کے بعد آغاز کلام ''فقیر ولی اللہ'' ہی سے کیا ہے، بلکہ دوسرے رسالہ ''شوارق المعرفۃ'' میں جوان کے عم مکرم شیخ ابوالرضا محمد (م 1690ء۔ 1101ھ) کے حالات کرامات و ملفوظات میں ہے اپنے آپ کو ''فقیر کثیر التقصیر ولی اللہ'' گردانا ہے (انفاس العارفین، 35، 192، 331، 347، 358، 374، 403) دوسری تصانیف میں بھی ''فقیر ولی اللہ'' یا ''ولی اللہ بن عبدالرحیم'' کے نام سے موضوع کا آغاز کیا ہے۔ ''کشاف'' ترجمہ ''انصاف'' میں ''الفقیر الی رحمۃ اللہ ولی اللہ بن عبدالرحیم'' ہے (متن مع اردو ترجمہ، 3) ''فیوض الحرمین''، ''عقد الجید''، ''فتح الخبیر'' اور ''ہمعات'' میں ولی اللہ بن عبدالرحیم ہے۔ جب کہ ''الطاف القدس'' میں العمری الدہلوی کی خاندانی و وطنی نسبتوں کا ذکر بھی ہے (3-2، 6-2، 1، 2 بالترتیب) ''مصفّٰی'' میں ''ولی اللہ بن عبدالرحیم العمری نسباً الدہلوی وطناً'' کی صراحت کر دی ہے (جلد اول، 3) ''ازالۃ الخفاء''، ''ہوامع'' وغیرہ میں ''فقیر ولی اللہ'' یا ''فقیر حقیر ولی اللہ'' کا حوالہ دیا ہے۔ (ہوامع 2، ازلۃ 1 بالترتیب) کہیں کہیں شاہ صاحب نے ''ولی اللہ'' سے قبل تصریحی کلمہ ''المدعو'' بھی لکھا ہے جیسے ''وہ البدور البازغہ'' میں ''المدعو بولی اللہ بن عبدالرحیم'' ہے۔ (بجنور 1354ھ، 9) ان کی بعض دوسری تحریروں میں بھی ''الفقیر ولی اللہ'' کا نام آیا ہے جیسے ''رسالہ فوز الکبیر'' کے ترقیمہ میں لکھا گیا ہے (مقدمہ نثار احمد فاروقی، نادر مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، 98) شاہ صاحب اپنے ''اجازہ ناموں'' میں بھی زیادہ تر ''فقیر ولی اللہ'' ہی لکھتے ہیں۔ جیسے شیخ عبدالہادی سودھروی نے اس رسالہ کی سماعت کی تو اس کے اجازت نامے میں یہی نام لکھا (نادر مکتوبات 99-98) صحیح بخاری کے ایک نسخہ کے آخر میں شیخ محمد کے لئے جو اجازت نامہ لکھا اس میں ''الفقیر ولی اللہ'' تحریر ہے۔ (ایضاً 97) بہت سے جدید اہل علم اور سوانح نگاروں نے بھی ''شاہ ولی اللہ'' نام لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔

شاہ ولی اللہ کا اصل نام ''احمد'' تھا جو بقول مظہر بقا ان کے والد ماجد شیخ عبدالرحیم کا رکھا ہوا ہے۔ اگرچہ انہوں نے والد ماجد کے تسمیہ کے لئے کوئی ثبوت نہیں فراہم کیا ہے کیونکہ انہوں نے اس کے لئے معاصر و قوی شہادت نہیں رقم کی۔ غلام حسین جلبانی کا یہ تبصرہ کہ ''شاہ صاحب اپنی تصانیف میں خود کو ہمیشہ احمد کے نام ہی سے لکھتے ہیں'' جزوی طور سے صحیح ہے۔ گذشتہ سطور میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ بہت سی تصانیف میں انہوں نے ولی اللہ، فقیر ولی اللہ بھی لکھا ہے۔ لیکن یہ اہم بات ہے کہ انہوں نے کہیں بھی اپنا نام بطور مصنف ''قطب الدین احمد'' نہیں لکھا۔ اس کی وجہ صاف ہے کہ ان کا نام قطب الدین تھا ہی نہیں، اصل نام ''احمد'' تھا اور ''ولی اللہ'' معروف و متداول لقب تھا اس لئے ان دونوں کو استعمال کیا۔

بطور مصنف و مؤلف شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنا نام ''احمد'' ایک خاص انداز سے لکھا اور برتا ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ مختلف انداز سے استعمال کیا ہے۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ وہ ''احمد المدعو بولی اللہ بن عبدالرحیم'' احمد جو ولی اللہ بن عبدالرحیم کے نام سے پکارا جاتا ہے (تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء، 3) بعض تصانیف میں ''احمد المعروف بولی اللہ بن

اسی معروف طریقہ میں کبھی خاندانی نسبت وطنی نسبت
عبدالرحیم الدہلوی" تحریر فرمایا ہے (الارشاد الیٰ مہمات الاسناد، 20)
"الدرالثمین فی مبشرات النبی الامین، 2) (الدرالثمین فی مبشرات النبی الامین، 2)"
سے پہلے لے آئے ہیں: "احمد المعروف بولی اللہ بن عبدالرحیم العمری الدہلوی" (الدرالثمین فی مبشرات النبی الامین، 2)
اپنی شاہکار تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" میں "احمد المدعو بولی اللہ بن عبدالرحیم" لکھا ہے (دہلی طبع اول 1373ھ، 2) المکتبۃ
السلفیہ لاہور، غیر مورخہ، نیز متعدد طباعتیں، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی۔ شخصیت وحکمت کا ایک تعارف "العقیدہ الحسنۃ"
کے اردو ترجمہ میں مترجم سعادت علی خاں نے لکھا ہے: "احمد جس کو ولی اللہ بن عبدالرحیم کہتے ہیں" (مطبع انسٹی ٹیوٹ علی
گڑھ، 3) تلاش وتفحص سے ان کی دوسری تصانیف میں بھی "احمد" نام کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ بہر حال موجودہ شواہد کی
روشنی میں یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ ان کا لقب خاص ومتداول ہے۔ جب کہ ان کا اصل نام نامی "احمد"
ہے۔ قطب الدین دوسرا لقب تھا لیکن وہ ان کی حیات بابرکات ہی میں زیادہ معروف نہ ہو سکا۔
متعدد سوانح نگاروں اور فکر ولی اللہی کے ماہروں نے شاہ موصوف کے اس نام نامی "احمد" کا پتہ لگا لیا۔ لہٰذا وہ
اپنی تحریروں میں اسی کو اصل نام قرار دیتے ہیں اور ہر ورق کتاب پر بعض مرتبین نے یہی نام نامی شاہ صاحب کے طریقہ
معروف کے مطابق بھی لکھا ہے۔ "حجۃ البالغہ" کے مرتبین گرامی قدر نے "امام شیخ احمد المعروف بہ شاہ ولی اللہ بن عبدالرحیم
المحدث الدہلوی" تحریر کیا ہے۔ "**الارشاد الیٰ مہمات علم الاسناد**" کے مصحح ومرتب محمد عبدہ الفلاح الفیروزآبادی
نے "ابو محمد احمد بن عبدالرحیم العمری المدعو بشاہ ولی اللہ الدہلوی رحمۃ اللہ" لکھا ہے اور شاہ صاحب کی کنیت "ابو محمد" کی
وضاحت حاشیہ نگار نے یوں کی ہے کہ وہ ابو محمد اس لئے ہیں کہ مولانا عبدالعزیز سے پہلے ایک فرزند پیدا ہوئے تھے جن کا
نام محمد تھا، لہٰذا شاہ صاحب کی کنیت ابو محمد ہے (سجاد پبلشرز لاہور، 1960ء، 20) "ہمعات" کی ایک طباعت کے سرورق
پر مرتب یا ناشر نے شاہ صاحب کا نام بطور مصنف یوں لکھا ہے: "ابوالفیاض قطب الدین احمد ولی اللہ المحدث العمری
الدہلوی" (اسلامی پریس تحفہ محمدیہ، 1) "ابوالفیاض" شاہ صاحب کی وہ کنیت ہے جو عالم ملکوت میں ہے اور جو کشف کے
ذریعہ ان کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم کو بتائی گئی تھی اور خود ان کی عالم ملکوتی کنیت ابوالفیض ہے جیسا کہ "انفاس العارفین"
میں تصریح کی گئی ہے (اردو ترجمہ، 185) بعض دوسری تصانیف شاہ کے سرورق پر مصنف گرامی کا نام "احمد" ہی لکھا
گیا ہے۔

عہد جدید کے کئی مؤرخوں اور سوانح نگاروں نے انہیں شواہد کی بنا پر شاہ صاحب کا اصل نام "احمد" ہی لکھا ہے
اور قطب الدین اور ولی اللہ کو خطاب اول ودوم یا القاب معروف ومشہور سے زیادہ اہمیت نہیں دی ہے۔ ان میں صدیق
حسن خاں نے "ابجد العلوم" (بھوپال 1295ھ، 912) اطہر عباس رضوی نے اپنی انگریزی کتاب میں (213) غلام
حسین جلبانی نے اپنی انگریزی سوانح حیات کے پیش لفظ میں (iii) احمد ہی نام کو اصل سمجھا ہے۔ ان تمام شہادتوں، تصریحوں
اور وضاحتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کا ایک لقب قطب الدین بھی تھا مگر وہ ولی اللہ سے معروف ہوئے اور شاہ ولی
اللہ کے لقب سے مشہور وزبان زد خاص وعام ہوئے۔ حقیقت میں ان کا اصل نام "احمد" تھا، جو ان کے والد ماجد شیخ عبدالرحیم
نے غالباً رکھا تھا اور شاید شیخ احمد سرہندی کے نام نامی پر جن سے وہ بہت متاثر تھے۔ مگر یہ ابھی تحقیق طلب بات ہے۔

آخر میں یہ ضمیمہ پیش ہے جس میں شاہ صاحب کی تصانیف کے تعلق سے کچھ معلومات درج ہیں۔

(الف) زیارتِ حرمین سے قبل (32-1703ء)

یہ کہنا مشکل ہے کہ اول اول شاہ صاحب نے مطالعہ و تدریس کے بعد کب قلم پکڑا لیکن یہ طے ہے کہ تدریس و تعلیم کے دور اول (32-1720ء) میں جب دوران مطالعہ و تعلیم ان پر علوم حظیرۃ القدس کا فیضان شروع ہوا اور بقول ان کے ذہن و دماغ اور قلب میں نئے نئے نکات آنے لگے تو لکھنے کا داعیہ پیدا ہوا اور ایسا ان کے بارہ سالہ دور تعلیم کے غالبًا اواخر میں ہوا۔ اس دور کی صرف دو تین کتابوں کا ذکر کیا گیا:

1- القصیدۃ اللامیۃ (عربی) جو "فیوض الحرمین" کے گیارہویں مشاہدہ کے ختم پر منقول ہے۔

2- القول الجمیل فی بیان سواء السبیل (عربی) اشغال و اعمال تصوف و سلاسل پر جس کا "فیوض الحرمین" کے چھتیسویں مشاہدہ میں حوالہ آیا ہے (طباعتیں: مطبعۃ الجمالیہ مصر 1290ھ، مطبع نظامی کانپور 1291ھ، 1307ھ۔ اردو تراجم: از خرم علی بلہوری، بمبئی غیر مورخہ بعنوان "شفاء العلیل" دہلی غیر مورخہ، محمد سرور، لاہور 1946ء۔ 1998ء بعنوان "تصوف کے آداب و اشغال اور ان کا فلسفہ۔")

3- آغاز ترجمہ فارسی قرآن کریم بعنوان "فتح الرحمٰن"۔ یہ قرائن سے ثابت ہے کہ اس ترجمہ کا آغاز سفر حرمین سے قبل ہو چکا تھا۔ وہ متعدد مراحل میں کیا گیا اور بعد میں تکمیل پذیر ہوا۔ اس کا اولین محرک متن قرآن کے طلبہ کا تدریسی تقاضا تھا۔

(ب) قیام حرمین شریفین کا عہد (32-1731ء)

4- (المقدمۃ السنیۃ فی الانتصار لفرق السنیۃ (عربی) مجدد الف ثانی کے فارسی رسالہ "ردِ روافض" کا ترجمہ جو شاہ صاحب نے اپنے مدنی استاد حدیث ابو طاہر کردی کی فرمائش پر کیا۔ مترجم علام نے توضیحی حواشی، تنقیدی تعلیقات دینے کے علاوہ مؤلف گرامی کی بعض مسامحات کا بھی ذکر کیا ہے۔ (طباعت: ابوالخیر اکیڈمی دہلی۔ غیر مورخہ)

(ج) حرمین سے واپسی کے معا بعد کا دورہ (39-1732ء)

5- الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین (عربی) رویاء میں فیضان احادیث (طباعت: سہارنپور 1292ھ۔ 1875ء، اردو ترجمہ مطبع مجتبائی دہلی 1899ء)

6- النوادر من احادیث سید الاوائل والاواخر (عربی) احادیث بروایت شیخ ابو طاہر (طباعت: سہارنپور 1292ھ۔ 1875ء، "مسلسلات" کے ساتھ طبع ہوا۔)

7- المسلسلات من حدیث النبی (عربی) اسانید حدیث پر مجموعہ مروی از مشائخ حرمین (مذکورہ بالا)

8- اربعون حدیثاً مسلسلات بالاشراف فی غالب سندھا (عربی) مجموعہ اربعین بروایت ابو طاہر کردی (مذکورہ بالا)

9- الارشاد الی مہمات علم الاسناد (عربی) اسانید حدیث کی اہمیت پر (طباعتیں: مطبع احمدی دہلی 1307ھ۔

1889ء، سجاد پبلشرز لاہور 1960ء)

10- شرح تراجم ابواب صحیح البخاری (عربی) بقول قاسمی مؤلفہ در 6-1145ھ۔ 3-1732ء (طباعتیں: حیدرآباد دکن 1949ء، اصح المطابع دہلی غیر مورخہ اور مطبع نورانوار، آرہ، بہار۔ غیر مورخہ)

11- الطاف القدس فی معارف لطائف النفس (فارسی) لطائف کی بحث اور تصوف کا فلسفہ (طباعتیں: مطبع احمدی دہلی 1307ھ مع اردو ترجمہ از عبدالحمید سواتی، گوجرانوالہ 1964ء، انگریزی ترجمہ جلباتی وڈی پنڈل بری (D.Pendelberry) لندن 1984ء، بعنوان ''The Sacred Knowledge'')

12- فیوض الحرمین (عربی) فلسفہ تصوف پر رسالہ جس میں روضہ نبوی پر مراقبہ کے دوران ہونے والے مبشرات و اکتشافات و مشاہدات کا بیان ہے۔ سفر حرمین کے معاً بعد کی تصنیف (طباعتیں: مطبع احمدی دہلی 1308ھ، تراجم اردو: محمد سرور لاہور 1967ء، نومبر 1996ء بعنوان ''مشاہدات و معارف'')

13-19- انفاس العارفین (فارسی، عربی) سات رسائل کا مجموعہ: (1) بوارق الولایہ: شیخ عبدالرحیم کے حالات و کمالات۔ (2) شوارق المعرفۃ: شیخ ابوالرضا محمد کے حالات وکمالات وملفوظات۔ (3) الامداد فی مآثر الاجداد: آباؤ اجداد شاہ کا تذکرہ۔ (4) النبذات الابریزیۃ فی اللطائف العزیزیۃ: شیخ عبدالعزیز اور ان کے خاندان کے سوانح و اوصاف۔ (5) العطیۃ الصمدیۃ فی انفاس الحمیدیۃ: شیخ محمد پھلتی کا تذکرہ۔ (6) انسان العین فی مشائخ الحرمین: شیوخ و اساتذۂ حرمین کا تذکرہ۔ (7) الجزء اللطیف فی ترجمۃ الضعیف: خودنوشت سوانح عمری (طباعتیں: مطبع مجتبائی دہلی 1335ھ، کراچی 1358ھ، اردو تراجم: از محمد فاروق قادری لاہور 1974ء، 1998ء مکتبہ الفلاح دیوبند غیر مورخہ، از محمد اصغر فاروقی لاہور 1977ء، محمد ایوب قادری وغیرہ)

20- حجۃ اللہ البالغہ (عربی) عظیم ترین تصنیف، علم اسرار دین کا شاہکار، بے مثال علمی کارنامہ (مؤلفہ در 51-1145ھ۔ 39-1732ء) طباعتیں: مطبع صدیقی بریلی 1286ھ، بولاق مصر (1296ھ۔ 1877ء)، ادارۃ الطبعۃ المنیریہ قاہرہ (1352ھ۔ 1833ء)، ملتزم الطبع والنشر، دارالکتب الحدیثہ قاہرہ 53-1952ء، کتاب خانہ رشیدیہ دہلی 1953ء وغیرہ۔ اردو تراجم: ابومحمد عبدالحق حقانی، اصح المطابع کراچی غیر مورخہ بعنوان ''نعمۃ اللہ السابغۃ''، خالد احمد اسرائیلی، کتاب خانہ اسلام لاہور غیر مورخہ بعنوان: ''آیات اللہ الکاملۃ''، عبدالرحیم، احسن برادرز لاہور غیر مورخہ وغیرہ: انگریزی ترجمہ مارسیا کے ہرمینسن The Conclusive Marcia K.Hermansen-Argument from God ای، جے، برل، لائیڈن 1996ء (جلد اول)

21- ہمعات (فارسی) مؤلفہ در جمادی الثانیہ 1148ھ۔ اکتوبر۔ نومبر 1735ء۔ تصوف کے ارتقاء و تاریخ و مقاصد سلاسل پر (طباعتیں: لاہور 1941ء، مرتبہ قاسمی، حیدرآباد سندھ 1964ء اردو تراجم: محمد سرور، لاہور 1964ء، 1999ء بعنوان: ''تصوف کی حقیقت اور اس کا فلسفہ تاریخ'' مکتبہ رحمانیہ دیوبند 1969ء)

22- الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ و اسانید وارثی رسول اللہ (فارسی) اور ادو اشغالِ سلاسل تصوف، مؤلفہ درمیان اکتوبر۔ نومبر 1735ء اور 4/ اکتوبر 1747ء (طباعتیں: مطبع احمدی دہلی 1311ھ، مکتبہ سلفیہ 1969ء (دو

ابواب کی تلخیص بعنوان ''اتحاف النبیہ'')

-23 تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء (عربی) قرآن مجید میں مذکور قصص الانبیاء کے اسرار و حکم (طباعتیں: مرتبہ قاسمی، حیدرآباد سندھ 1966ء تراجم اردو، مطبع احمدی دہلی، 1899ء الرحیم جلد 3، شمارہ 12، مئی 1966ء انگریزی، جلبانی، حیدرآباد، سندھ 1976ء بلجان، بعنوان۔ A Mystical Interpretation of Prophetic Tales by an Indian Muslims Shah Wali Allah of Dehli`s, Tawil-al-Ahadith. ای، جے، برل، لائیڈن 1973ء)

-24 فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن (فارسی) عظیم ترجمہ اور شاندار تفسیر قرآن کریم، آغاز دور اول میں تکمیل کی تاریخ ہے: عیدالاضحیٰ 1150ھ۔ 1869ء، مطبع فاروقی دہلی 1294ھ، لکھنؤ 1902ء، نور محمد کارخانہ تجارت کراچی غیر مورخہ، تاج کمپنی لاہور 1986ء وغیرہ)

(د) تالیف کا آخری دور (76-1740ء)

-25 اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم (عربی) نعت نبوی میں قصیدۂ بائیہ مع قصیدۂ ہمزیہ۔ دونوں کی فارسی شرح شاہ موصوف مؤلفہ در (24/ ربیع الثانی 1156ھ۔ 17/ جون 1843ء)۔ طباعتیں: مطبع مجتبائی دہلی 1308ھ وغیرہ، مع اردو ترجمہ از پیر محمد کرم شاہ ازہری، لاہور 1985ء)

-26 القصیدۃ الھمزیۃ فی المدیح النبویہ (عربی) دوسرا رسالہ نعت مؤلفہ در (اواخر 1147ھ۔ اوائل 1745ء) مع فارسی شرح مؤلفہ در 1762ء، مع اردو ترجمہ مذکورہ بالا۔

-27 مقدمہ در فن ترجمہ قرآن (فارسی) ''المقدمہ فی قوانین الترجمۃ'' دوسرا عنوان ''فتح الرحمٰن'' میں شامل ہے۔ دوسرا نسخہ زیادہ مفصل ہے جو مخطوطات کی شکل میں ہے۔ اردو ترجمہ بھی ہوئے ہیں۔

-28 ہوامع (فارسی) امام شاذلی کی ''حزب البحر'' کی شرح مع متن (طباعتیں: مطبع احمدی دہلی 1307ھ، مطبع روزانہ اخبار دہلی غیر مورخہ وغیرہ)

-29 سطعات (فارسی) فلسفہ تصوف (طباعتیں: مطبع احمدی دہلی 1307ھ، کراچی 1939ء قاسمی حیدرآباد سندھ 1964ء، تراجم اردو: قاسمی حیدرآباد سندھ 1964ء، محمد متین ہاشمی، لاہور 1986ء انگریزی: جلبانی حیدرآباد سندھ 1970ء، کتاب بھون دہلی 1981ء)

-30 المسوّیٰ من احادیث الموطاء (عربی) موطاء امام مالک کی شرح مع ترتیب احادیث وفقہی استنباطات (طباعتیں: مطبع مرتضوی دہلی 1293ھ۔ 1347ھ، مکہ مکرمہ غیر مورخہ حیدرآباد سندھ وغیرہ، تراجم اردو: الرحیم جلد 1، شمارہ 5، اکتوبر 1963ء، شمارہ 6، نومبر 1963ء)

-31 الخیر الکثیر (عربی) فلسفہ تصوف، مرتبہ شاہ محمد عاشق پھلتی در 1161ھ۔ 1748ء (طباعتیں: مدینہ برقی پریس بجنور 1352ھ، مجلس علمی ڈابھیل 1354ھ، القاہرہ 1974ء، انگریزی: جلبانی، حیدرآباد سندھ 1974ء)

32- الفوز الکبیر فی اصول التفسیر (فارسی) اصول تفسیر پر عظیم رسالہ (طباعتیں: مطبع احمدی ہگلی 1249ھ۔1834ء، مطبع مجتبائی دہلی 1898ء، مکتبہ سلفیہ لاہور 1951ء، قدیمی کتب خانہ کراچی غیر مورخہ، تراجم اردو: رشید احمد انصاری، دہلی 1963ء، محمد سالم عبداللہ کراچی غیر مورخہ۔ لاہور عربی: محمد اعزاز علی دیوبند، سلمان حسینی ندوی، لکھنؤ، ابوسفیان مفتاحی، مئو وغیرہ، انگریزی: جلبانی بعنوان The Principles of Quran Commentary اسلام آباد 1985ء)

33- فتح الخبیر بمالابد من حفظ علم التفسیر (عربی) احادیث حضرت ابن عباس کی روشنی میں مشکل مقامات قرآن کی تفسیر (طباعتیں بالعموم بطور باب آخر الفوز الکبیر، مطبع احمدی ہگلی (1249ھ۔1834ء)، نولکشور لکھنؤ 1314ء وغیرہ)

34- قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین (فارسی) فضائل حضرت ابوبکر صدیقؓ و عمر فاروقؓ (طباعتیں: مطبع مجتبائی دہلی 1320ھ، مطبع روزانہ اخبار دہلی 1899ء، مکتبہ سلفیہ 1976ء، تراجم اردو: احمد علی، علوی پریس لکھنؤ 1296ھ، مفید عام پریس آگرہ 1295ھ)

35- صرف میر (منظوم) (فارسی) فرزند شاہ عبدالعزیز مولود در (1159ھ۔1746ء) کی تعلیم صرف کے لئے جرجانی (م 1413ء) کا فارسی منظوم ترجمہ، مؤلفہ در (1165ھ۔52-1751ء)، (طباعت: مطبع محمدی لاہور 1293ھ)

36- المقالۃ الوصیۃ فی النصیحۃ (فارسی) وصیت نامہ کے عنوان سے معروف نصائح برائے شاگردان و متعلقین (طباعتیں: مطبع مطیع الرحمٰن دہلی 1268ھ، مطبع مسیحی کانپور 1273ھ)

37- الانصاف فی بیان اسباب الانقلاف (عربی) فقہاء کے مسلکی اختلاف پر رسالہ (طباعتیں: مطبع مجتبائی دہلی 1308ھ۔1891ء، مطبع صدیقی بریلی 1307ھ، مرتبہ رشید احمد جالندھری لاہور 1971ء، مرتبہ محی الدین خطیب قاہرہ 1960ء، مرتبہ عبدالفتاح ابوغدہ، بیروت 8-1977، تراجم اردو: محمد عبداللہ بلیاوی بعنوان ''کشاف'' لکھنؤ 1886ء، محمد عبدالشکور فاروقی بعنوان ''وصاف'' لکھنؤ 1910ء، صدرالدین اصلاحی ''اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ'' رامپور 1952ء، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی 1973ء)

38- عقد الجید فی بیان احکام الاجتہاد والتقلید (عربی) اجتہاد و تقلید کے امور پر رسالہ مؤلفہ قبل 4/ستمبر 1759ء (طباعتیں: مطبع صدیقی بریلی 1309ھ، مکتبہ سلفیہ لاہور 1965ء، مطبع مجتبائی دہلی 1344ھ۔1925ء مع اردو ترجمہ، تراجم: بعنوان ''سلک مروارید'' 1310ھ، محمد عبدالشکور فاروقی لکھنؤ غیر مورخہ ساجد الرحمٰن صدیقی کراچی 1379ھ، انگریزی: محمد داود رہبر (تلخیص) ''مسلم ورلڈ'' لنڈن، جلد 55 شمارہ 4/اکتوبر 1955ء)

39- لمعات (عربی) فلسفہ تصوف (طباعتیں: مرتبہ قاسمی حیدرآباد سندھ بعنوان Sufism and the Islamic Tradition. Lamaat and Sataat of Shah Wali Allah of Dehli.

40- البدور البازغۃ (عربی) فلسفہ دین و تصوف کا قاموسی شاہکار، ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا توام (طباعتیں: مجلس علمی ڈابھیل 1354، حیدرآباد سندھ 1970ء، تراجم اردو قاضی مجیب الرحمٰن، لاہور 2000ء، انگریزی: جلبانی، اسلام آباد 1985ء)

-41 التفہیمات الالٰہیۃ (عربی، فارسی) فلسفہ دین وتصوف پر ''تفہیم'' کے عنوان سے چھوٹے چھوٹے خطبات
(طباعتیں: مجلس علمی ڈابھیل 1355ھ، مدینہ پریس بجنور 1936ء، حیدرآباد سندھ 1973ء)

-42 ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء (فارسی) اسلامی خلافت پر اصولی اور تاریخی مباحث، نامکمل تصنیف شاہ
(طباعتیں: مطبع صدیقی بریلی 1286ھ-1869ء، سہیل اکیڈمی، لاہور 1976ء، قدیمی کتب خانہ غیر مورخہ
جدید ترین طباعت مع تراجم اردو: محمد عبدالشکور فاروقی، انشاء اللہ، حامد الرحمٰن فاورقی، اشتیاق احمد دیوبندی، کراچی غیر مورخہ)

-43 المصفّیٰ (فارسی) المسوّیٰ کی توام فارسی شرح موطا، مرتبہ شائع کردہ شاہ محمد عاشق پھلتی بعد وفات مولف علام
(طباعتیں: مطبع فاروقی دہلی 1293ھ-1876ء، مطبع مرتضوی دہلی 1293ھ، محمد علی کارخانہ اسلامی کتب 1980ء تراجم اردو: الرحیم جلد 1، شمارہ 5، اکتوبر 1963ء (نامکمل) سید عبداللہ مطبع احمدی کلکتہ 1294ھ)

اہم ثانوی کتابیں:

ابوالحسن علی حسنی ندوی: تاریخ دعوت وعزیمت، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ 1974ء جلد پنجم۔
اسمٰعیل گودھروی: شاہ ولی اللہ دہلوی، لاہور 1968ء
اظہر عباس رضوی: شاہ ولی اللہ اینڈ ہز ٹائمز (انگریزی) کینبرا 1980ء
بقا مظہر: اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ، اسلام آباد 1979ء
بلجان، جے، ایم، ایس: ریلجن اینڈ تھاٹ آف شاہ ولی اللہ دہلوی (انگریزی) لائیڈن 1976ء
جلبانی، غلام حسین: لائف آف شاہ ولی اللہ (انگریزی)، لاہور 1978ء
ایضاً: شاہ ولی اللہ کی تعلیم، لاہور 1999ء
سندھی، عبیداللہ مولانا: شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ، لاہور 1998ء
ایضاً: شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، لاہور 1970ء
ایضاً: شاہ ولی اللہ اور قرآن وحدیث، دہلی، غیر مورخہ
گیلانی، مناظر احسن مولانا: تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ، نفیس اکیڈمی، حیدرآباد 1948ء
محمد رحیم بخش دہلوی: حیات ولی، مکتبہ طیبہ، لاہور 1976ء
مضطر، اے، ڈی: شاہ ولی اللہ: اے سینٹ اسکالر آف مسلم انڈیا، اسلام آباد، 1979ء
مظاہری، عبدالقیوم: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، کانپور 1967ء

(معارف، اکتوبر 2001ء، ص 287-308)

نورالحسن راشد کاندھلوی

شاہ ولی اللہ کے اجداد گرامی

(تحقیقی معلومات)

حضرت شاہ ولی اللہ احمد بن عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیفات میں اپنے فاروقی النسل ہونے کی صراحت فرمائی ہے (1) اور ''الامداد فی مآثر اجداد'' (2) میں اپنے والد ماجد سے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک اپنا مفصل شجرہ نسب بھی درج کیا ہے جس میں حضرت فاروق اعظم تک درج ذیل کل بتیس (32) واسطے بیان فرمائے ہیں:

''فقیر ولی اللہ، بن شیخ عبدالرحیم، بن الشہید وجیہ الدین بن معظم، بن منصور، بن احمد، بن محمود، بن قوام الدین عرف قاضی قاذن، بن قاضی قاسم، بن قاضی کبیر عرف قاضی بدھ، بن عبدالملک، بن قطب الدین، بن کمال الدین، بن شمس الدین مفتی، بن شیر ملک، بن عطا ملک، بن ابوالفتح ملک، بن عمر حاکم ملک، بن عادل ملک، بن فاروق، بن جرجیس، بن احمد، بن محمد شہریار، بن عثمان، بن ماہان، بن ہمایوں، بن قریش، بن سلیمان بن عفان، بن عبداللہ، بن محمد، بن عبداللہ، بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (3)''۔

''الامداد'' کے مطبوعہ ایک نسخہ میں عفان کے بعد دو واسطے محمد بن عبداللہ درج نہیں (4) مگر یہ سہو کتابت ہے، صحیح اور معروف روایت وہی ہے جو اوپر گزری ہے۔ ''الامداد'' کے ایک قلمی نسخہ (5) اور ایسے تمام مآخذ میں جو ''الامداد'' کی طباعت سے پہلے شائع ہوئے اور ان کی اساس ''الامداد'' کے خطی نسخوں پر ہے (6)، محمد بن عبداللہ کا واسطہ درج ہے۔

فروگذاشتیں اور صحیح نسب نامہ کی جستجو

نسب نامہ ولی اللہی میں محمد بن عبداللہ کے اضافہ کے باوجود اس نسب نامہ کے آخری وسائط کی ترتیب محل نظر (7) ہے، کیونکہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارہ (12) صاحبزادگان میں سے کسی کا نام عفان یا محمد نہیں یا ان بارہ صاحبزادوں کے اخلاف میں محمد نامی کوئی فرد صاحب اولاد نہیں۔ کئی نسلوں کے بعد حضرت عبداللہ بن عمر کے ایک پوتے کا نام محمد ہے اور ان کا سلسلہ نسب اس طرح ہے:

''محمد بن عبدالعزیز بن عبداللہ بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما'' (8)۔ محمد بن عبدالعزیز کے تین بیٹے

ہوئے ابراہیم، عبداللہ اور عیسیٰ۔

اگر چہ کوئی تحریری شہادت میسر نہیں مگر وجدان چاہتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کا شجرہ نسب اخلاف حضرت ابن عمر کی اسی شاخ سے وابستہ و ملحق ہو، ممکن ہے سہو کتابت یا مرور ایام سے اس میں عفان بن عبداللہ بن محمد اور حضرت ابن عمر کے درمیان عبدالعزیز کا واسطہ ترک ہو گیا ہو۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو حضرت شاہ صاحب کے نسب نامہ کے آخری وسائط اس طرح ہونے چاہئیں۔

''عفان بن عبداللہ بن محمد بن عبدالعزیز بن عبداللہ بن عبداللہ بن عمر بن الخطابؓ ''یعنی عفان سے حضرت عمرؓ تک چھ واسطے جس میں تین شخصوں کا نام عبداللہ ہے...... اس موقع پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ مذکورہ بالا سہو و ترک نسب نامہ ولی اللہی کی واحد فرو گذاشت نہیں، خاندان ولی اللہی کے نسب نامہ میں عفان بن عبداللہ کے زیریں سلسلے میں بھی بعض وسائط کے فقدان اور انقطاع کا اندیشہ ہے جو عرب خاندانوں میں باہم مشابہ ناموں کے تکرار و تسلسل اور نسب نامہ کی نقل در نقل کی وجہ سے محل تعجب ہے نہ کہ نسب نامہ کے مشکوک اور غیر معتبر ہونے کی دلیل۔

نسب نامہ ولی اللہی کے تحت سلسلے میں انقطاع کا ایک قرینہ

''الامداد فی مآثر الاجداد'' میں منقول نسب نامہ میں حضرت ابن عمر تک جملہ وسائط کی تعداد علم الانساب کی رو سے گیارہ صدیوں میں مطلوب وسائط کی تعداد سے خاصی کم ہے۔ مذکورہ نسب نامہ میں حضرت ابن عمر تک صرف تیس واسطے درج ہیں، اگر اس میں محمد اور عبداللہ بن عمرؓ کے درمیان عبدالعزیز بن عبداللہ کا نام درج ہو تو کل بتیس واسطے ہو جائیں گے، حالانکہ علم الانساب کے معروف اصول کے مطابق ایک صدی میں کم سے کم تین نسلیں ضروری ہیں۔ اگر چہ بعض خاص حالات اور نا قابل تردید دلائل کی موجودگی میں دو صدیوں میں پانچ واسطے بھی قابل قبول ہیں۔ اس اصول کی رو سے نسب نامہ ولی اللہی کی صداقت کے لئے حضرت شاہ صاحب سے حضرت ابن عمر تک کم سے کم تینتیس (33) واسطے ضروری ہیں اور چونکہ بعض اوقات ایک صدی میں چار پانچ نسلیں بھی گذر جاتی ہیں اس لئے نسب نامہ ولی اللہی کے معلوم وسائط کی تعداد میں کچھ اور اضافہ ناگزیر ہے، گویا شاہ صاحب سے حضرت ابن عمر تک پینتیس واسطے مطلوب ہیں۔ نسب نامہ ولی اللہی کی موجودہ ترتیب کی تحقیق و تصدیق یا نامعلوم وسائط کی دریافت و توثیق ہونے تک نسب نامہ کی موجودہ روایت کے متعلق شک و شبہ اور بحث و گفتگو کی خاصی گنجائش ہے۔ نسب نامہ میں کہاں کس قدر وسائط ترک ہوئے، نسب نامہ کی مکمل اور صحیح ترتیب کیا ہے کچھ معلوم نہیں۔

اس نسب نامہ کی حیثیت خود شاہ ولی اللہ کی نظر میں

نسب نامہ ولی اللہی کے مطالعہ اور تحقیق کے وقت یہ فراموش نہیں ہونا چاہیے کہ ''الامداد فی مآثر الاجداد'' میں درج شجرہ نسب حضرت شاہ عبدالرحیم (9) اور شاہ ولی اللہ کو اپنے بزرگوں سے اسی طرح ملا تھا، جس کو شاہ صاحب نے جوں کا توں نقل کر دیا ہے، ضروری نہیں کہ یہ دونوں حضرات نسب نامہ کی اس روایت کو من و عن صحیح اور بہمہ جہت لائق استناد سمجھتے

ہوں۔ شاہ ولی اللہ کی ایک عبارت سے جھلکتا ہے کہ شاہ صاحب کو نسب نامہ کی موجودہ روایت و ترتیب پر بہت اعتماد نہیں تھا۔ حضرت شاہ صاحب کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

''در نسب نامہائے قدیم کہ در رہتک و در قبیلہ شاہ ارزانی بدایونی کہ نسب وے بسالار حسام الدین ابن شیر ملک میر سد، موجود ند چنیں یافتہ شد...... وملک در زمان قدیم لفظ تعظیم بودہ است مثل خان درزمان ما واللہ اعلم درزمان بحقیقۃ الحال۔''(10)

یعنی حضرت شاہ صاحبان اس نسب نامہ کے صرف ناقل و راوی ہیں، اس کے سہو و انقطاع اور فروگذاشتوں کے لئے ذمہ دار نہیں۔

(2)

حضرت شاہ ولی اللہ کے اجداد کے ایران وافغانستان سے روابط

اگر چہ اس خاندان کے عرب علاقے سے ترک وطن کے عہد اور ایران وافغانستان میں ان کے زمانہ قیام اور محل اقامت کے متعلق کچھ کہنا آسان نہیں مگر بعض آثار و قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ عفان بن محمد یا ان کے اخلاف دوسری صدی کے اواخر یا تیسری صدی ہجری کے شروع میں اپنا آبائی وطن چھوڑ کر ایران آئے اور وہیں سے بعد میں افغانستان منتقل ہوئے۔ ایران میں آذربائیجان اور ماوراء النہر کے علاقے اور افغانستان میں کابل اور اس کے اطراف ان کی جائے قیام تھی، بعض غیر مستند روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاندان ماوراء النہر اور نواح کابل میں حکمراں اور صاحب اقتدار بھی رہا ہے۔ جناب عبدالشاہد خاں شروانی کی اطلاع ہے کہ

''علامہ (فضل حق خیر آبادی اور حضرت شاہ ولی اللہ) کے مورث اعلیٰ شیر الملک بن شاہ عطاء الملک ایران (کذا؟) کے مورثان ایک قطعہ ملک ایران پر قابض و حکمران تھے۔''(11)

مولانا سید محبوب علی جعفری (12) کا بھی یہی خیال ہے، وہ لکھتے ہیں:

''لكن الثابت عندى على الظن القوى ''ان اولاد قريش بن سليمان بن عفان بن عبدالله العمرى المتوطن بماوراء النهر كانوا من ملوك اطرافها و كان ذالك الملك فيهم الى ان مات ابو اسحاق والى البخارئ و تملك الاتراك القابضون بالنيابة قبل (كذا) و ذالك سنة سبع و تسين و ثلثائة''. (13)

اگر یہ اطلاعات درست ہیں تو اس خاندان کے حکومت و اقتدار کا نفاذ حدود افغانستان میں ہونا چاہیے کیونکہ افغانستان میں تیسری چوتھی صدی ہجری فاروقی خانوادوں کے عمل دخل اور سیاسی اثر و نفوذ کے قرائن دستیاب ہیں (14)۔ لیکن مولانا محبوب علی جعفری کی اس رائے سے اتفاق مشکل ہے کہ شیر ملک کے جد ماہان بن ہمایوں اور امیر بلخ موسیٰ بن ہامان ہم جد، اور ایک خاندان کے رکن ہیں۔ مولانا جعفری نے لکھا ہے:

"ونقلنا ایضاً اسم رجل من امراء بلغ من اقران ابراهیم و شقیق و هو علی بن موسی بن هامان امیر البلخ، فیحتمل ان یکون ماهان بن همایون بن قریش مع الاحتمال یکون ماهان تصحیف هامان." (15)

نسب نامہ خاندان ولی اللہی میں ماہان بلاشبہ ایک اہم اور توجہ طلب نام ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ شاہ صاحب کے جد عثمان کے والد اور امیر بلخ کے دادا کا نام ایک جیسا ہے مگر ہم عصر افراد میں ناموں کی اس قدر یکسانیت و ہم رنگی عام ہے اور اس طرح کی یکسانیت کبھی بھی ان کے ہم جد اور ہم خاندان ہونے کی دلیل نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں مولانا جعفری کو امیر بلخ کے صحیح نام میں سہو ہوا۔ صحیح نام علی بن حسین بن ماہان ہے (16)۔ نیز اس تاویل و توجیہ کی اس لئے بھی ضرورت نہیں کہ امیر بلخ ماہان فاروقی ہیں نہ عرب، بلکہ فارسی الاصل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ماہان آذربائیجان اور ماوراء النہر میں ایک خاص معروف اور چلا ہوا نام تھا، کتب رجال و طبقات میں اس نام و نسبت کے متعدد افراد کا تذکرہ محفوظ ہے (17) اور ماہان نامی ایک شخص ایک بڑے خاندان کے مورث اعلیٰ بھی تھے، ان کی وجہ سے ان کی تمام اولاد ابن ماہان کہلاتی ہے (18)۔

نسب نامہ ولی اللہی میں ملک، خطاب یافتہ افراد کے عہد کی تعیین

شاہ صاحب کی اطلاع کے بموجب ان کے خاندان کے پانچ بزرگوں شیر ملک، بن عطا ملک، بن ابوالفتح ملک، بن عمر حاکم ملک بن عادل ملک، کے نام کے ساتھ ملک کا لاحقہ ثبت ہے جو اس خاندان کے شاندار اور پُر وقار ماضی اور سرکار دربار میں عزت و مقبولیت کا مظہر ہے۔ شاہ صاحب کا ارشاد ہے:

"وملک درزمان قدیم لفظ تعظیم بودہ است مثل خان درزمان ما" (19)

تاریخ حضرت شاہ صاحب کے اس قول کی تو تصدیق کرتی ہے (20) مگر وہ اس سلسلہ میں ہماری مدد اور رہنمائی نہیں کرتی کہ اس خاندان کے افراد کے لئے ملک کا استعمال اس حکومت کی یادگار اور باقیات کے طور پر ہوتا تھا جس کی طرف مولانا جعفری اور شروانی نے اشارہ کیا ہے یا یہ لاحقہ ایران و افغانستان کے بادشاہوں سے قربت و اختصاص کا ثمر ہے؟

اگرچہ ملک کا خطاب و مرتبہ شاہان تغلق کے زمانے تک ہندوستان میں بھی ایک لائق فخر اور باوقعت منصب رہا، لیکن خاندان ولی اللہی کے نسب نامہ میں مذکور جن اشخاص کے ساتھ اس کا استعمال ہوا ہے ان کا زمانہ قطب الدین ایبک سے پہلے کا معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے خیال آتا ہے کہ یہ لاحقہ اس خاندان کے زمانہ قیام افغانستان کی یادگار ہے اور ہندوستان کی حکومتوں اور اہل دربار و مناصب سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس خیال کی اس سے تائید ہوتی ہے کہ اس عہد کے نامور مؤرخین منہاج سراج، ضیاء الدین برنی، شمس سراج عفیف اور یحییٰ بن احمد سرہندی نے اپنی کتابوں میں ملک خطاب یافتہ بے شمار افراد کا مختلف موقعوں پر ذکر کیا ہے اور اس میں شیر ملک، عطا ملک اور ابوالفتح نام افراد بھی شامل ہیں، مگر اس طویل فہرست میں کوئی ایسا شخص نہیں جس کو خانوادہ شیر ملک سے وابستہ و منسلک قرار دیا جا سکے۔ اگر شیر ملک اور ان کے اجداد دربار دہلی سے وابستہ رہے ہوتے تو ان کا مذکورہ بالا مآخذ میں تذکرہ ہونا چاہیے تھا۔

(3)

خاندان ولی اللٰہی کے بزرگوں کا ہندوستان میں ورود اور اس کا زمانہ

خاندان ولی اللٰہی کے اجداد میں کون بزرگ کس زمانہ میں ہندوستان آئے، اس کے متعلق کوئی واضح اطلاع دستیاب نہیں۔ حضرت شاہ صاحب کی تحریر سے بھی صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خاندان کے جدامجد شیخ شمس الدین مفتی رہتک میں خاندان قریش کے پہلے فرد تھے (21)۔ مگر رہتک آنے سے پہلے شیخ شمس الدین یا ان کے آباؤ اجداد ہندوستان کے کسی اور علاقہ میں مقیم تھے یا براہ راست اسی وقت افغانستان سے رہتک آئے تھے کچھ معلوم نہیں۔ اگر اس خاندان کے ہندوستان آنے والے اولین بزرگ شیر ملک کے فرزندان سالار حسام الدین اور شمس الدین مفتی ہوں تو ان کا عہد محمد غوری اور ایبک کا زمانہ ہونا چاہیے۔ یہ دونوں شخص ہندوستان ساتھ آئے ہوں گے، یہاں پہنچ کر سالار حسام الدین نے بدایوں میں اقامت اختیار کی اور شمس الدین مفتی نے رہتک میں رخت سفر کھولا۔ حسام الدین حرب وضرب کے ماہر اور سیف وسنان کے اداشناس ہوں گے اس لئے سالار کے لقب سے نوازے گئے اور شیخ شمس الدین نے علم وفضل میں کمال حاصل کیا اور مفتی کے لقب سے معزز گردانے گئے۔

بدایوں میں محلہ سوتھ کی ایک پرانی مسجد جو بدایوں میں اسلامی عہد کے ابتدائی دور کی یادگار ہے، کے سب سے پہلے بانی حسام الدین کوئی بزرگ تھے۔ مؤلف ''کنز التاریخ'' نے لکھا ہے:

''اس مسجد میں ایک کتبہ لگا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد بھی ایک معبد قدیم، شروع آمد اسلام کی ہے اور مشہور ہے کہ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی نے اس مسجد میں بیٹھ کر زمانہ طالب علمی میں مطالعہ فرمایا ہے۔ کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ اول بانی مسجد حسام الدین تھے' بعد ازاں حضرت نظام الدین اولیاء نے تعمیر کرائی۔ اس کے بعد مرتبہ سوم 1120ھ میں محمد منیر نے تعمیر کی۔ کتبہ یہ ہے:

بود از قدیم بانی مسجد حساس دین
چوں کہنہ گشت ریختہ افتاد بر زمین
زاں پس نظام دین بنا کرد از جدید
تامدتے مدید فرو ماند ہم چنیں
بعد از وفات او چو محمد منیر ساخت
بیت العتیق خانہ اسلام شد ببیں
تاریخ سال او زخرد خواستم بگفت
آرند صوفیان سر سجدہ بر زمیں'' (22)

اگر اس مسجد کے بانی سالار حسام الدین بن شیر ملک تھے جو عین ممکن اور قرین قیاس 1120ھ ہے، (23) تو اس

سے شیر ملک کے بیٹوں کے ہندوستان آنے کا عہد تقریباً متعین ہو جاتا ہے۔ اوپر گزر گیا ہے کہ یہ مسجد بدایوں میں مسلمانوں کے بالکل ابتدائی دور کی یادگار ہے۔ بدایوں، قطب الدین ایبک نے 599ھ میں فتح کیا(24)، لیکن مسلمانوں کی ایک قابل ذکر آبادی اور ان کی مذہبی عمارتیں وہاں اس سے پہلے موجود تھیں(25)، اگر یہ مسجد اسی ابتدائی زمانہ کی یادگار ہے تو ممکن ہے اس کی تاسیس چھٹی صدی ہجری کے نصف آخر میں کسی وقت ہوئی ہو، اور اگر یہ مسجد ایبک کی فتوحات کے بعد تعمیر ہوئی تو اس کا زمانہ تعمیر ساتویں صدی ہجری کے ابتدائی سال ہیں۔ دونوں صورتوں میں اس کے بانی حسام الدین (اگر وہ شیر ملک کے بیٹے ہیں) اور ان کے بھائی شیخ شمس الدین مفتی کا عہد متعین ہو جاتا ہے۔ ایک اور قرینہ سے بھی تقریباً اسی عہد کی تعیین ہوتی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے:

''واول کسے کہ از نژاد قریش دراں بلدہ درآمد و بسبب وے شعائر اسلام ظہور نمودہ وطغیان کفر منطفی شد، وے (شمس الدین مفتی) بود(26)۔''

اور سب سے پہلے بنو قریش میں سے جو شخص اس شہر (رہتک) میں آئے اور ان کی کوشش سے وہاں شعائر اسلام ظاہر ہوئے اور کفر کی ظلمت کافور ہوئی وہ شیخ شمس الدین مفتی تھے۔

افسوس کہ اس عہد کی تاریخیں خصوصاً تاریخ رہتک شیخ شمس الدین مفتی کے تذکرہ سے بالکل خاموش ہے، لیکن اگر حضرت شاہ صاحب کی یہ اطلاع درست ہے تو شیخ شمس الدین، مفتی شیخ قوام الدین جھجیری (جو صدیقیان مہم ورہتک کے جد امجد ہیں) سے پہلے رہتک تشریف لائے اور قاضی قوام الدین ساتویں صدی میں رہتک نزول فرما ہوئے تھے، (27) گویا جب قاضی قوام الدین رہتک آئے تو اس وقت شیخ شمس الدین مفتی کی کوششوں سے رہتک گہوارہ اسلام بن چکا تھا اور وہاں خود شمس الدین یا ان کے اخلاف اقامت پذیر تھے۔ شیخ شمس الدین کے تذکرہ میں حضرت شاہ صاحب کے درج ذیل الفاظ:

''بعد انقضائے ایام حیوۃ ایں بزرگ گزیں ترین اولادش کمال الدین مفتی بر طریقہ وے مصدر ایں امور گشت و بعد از وے پسر وے قطب الدین، و بعد از وے پسر وے عبدالملک ہمیں وضع ایام حیوۃ بآخر رسانیدند، و بعد از زمان ایں عزیزاں نصب قضات دریں بلاد دستور شد۔''(28)

بھی اسی خیال کی تائید کرتے ہیں کہ شیخ شمس الدین کا عہد چھٹی صدی ہجری کا ہے، اس وقت تک اس نواح میں اسلامی حکومت کی عملداری پوری طرح قائم و مستحکم نہیں ہوئی تھی، کچھ وقت گزرنے کے بعد جب اسلامی نظم حکومت استوار ہوا تو شیخ شمس الدین مفتی کے اعقاب و اخلاف اپنے جد و پدر کی علمی دینی مناصب و خدمات کے صحیح وارث و امین قرار پائے اور معاصر حکمرانوں کی جانب سے منصب قضا کے لئے نامزد و متعین کیے گئے، اور بقول حضرت شاہ ولی اللہ ان کے خاندان میں رہتک کی دینی امارت و قیادت اور عہدہ قضا کا تسلسل کئی نسلوں تک قائم رہا۔

شیخ شمس الدین مفتی کا مدفن

اگر چہ شیخ شمس الدین مفتی کے تفصیلی حالات اور ان کا سنہ وفات معلوم نہیں، لیکن ''الامداد'' میں حضرت شاہ صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ مفتی کا جنازہ ان کے خلوت کدے سے غائب ہو گیا تھا جہاں وہ نماز جنازہ کے بعد

ان کی حسب وصیت رکھ دیا گیا تھا۔ واقعہ کی صحیح صورت کیا تھی اور جنازہ کس طرح غائب ہوا اس کی تحقیق و تصدیق کا کوئی ذریعہ ہمدست نہیں، مگر ایک قدیم یادداشت (29) سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ شمس الدین مفتی، پرانی دلی میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار کے قریب جنگل میں دفن ہوئے اور ان کی قبر ''مزار جنازہ پراں'' کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ مولانا جعفری بھی اس طلاع کی تصدیق کرتے ہیں۔ ان کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ مفتی کی وفات کسی اور مقام پر ہوئی تھی، جنازہ مہرولی میں ملا اور وہیں دفن کیا گیا۔ مولانا لکھتے ہیں:

''و یذکر فی اھل مرھولی (کذا) جوار مزار خواجه قطب الدین ان جنازه اقت قریب المصلی فی الدفن القدیم فدفنوه، فقیل لصاحب ذالك القبر پیر جنازه پران قدس سره، فقبره یزار و یتبرك به.'' (30)

یہ مزارات آج تک موجود اور زیارت گاہ خلائق ہیں، اگرچہ سر سید احمد نے ان کا ذکر نہیں کیا، لیکن دلی کی تاریخ آثار و عمارات کے ایک اور محقق و مؤرخ مولوی بشیر الدین احمد نے ان کا جائے وقوع مہرولی میں عیدگاہ التمش کے عقب میں دیوار عیدگاہ سے ملحق بتایا ہے اور لکھا ہے:

''عیدگاہ کی پچھیت کی دیوار سے ملے ہوئے چند مزار ہیں، جن میں سے دو کے نام لوگ بتاتے ہیں جنازہ پراں، اور شیخ جلال الدین تبریزی اور تین قبریں بے نام ہیں۔'' (31)

مولوی بشیر الدین نے دو مزارات کا ذکر کیا ہے مگر دراصل یہ پانچ الگ الگ قبریں ہیں، مگر ان میں سے کسی پر بھی کتبہ نصب نہیں تاہم یہ معلوم و معروف ہے کہ ان میں ایک قبر شیخ جلال الدین تبریزی کی اور ایک شیخ شمس الدین جنازہ پراں کی ہے (32)۔ یہ قبریں عیدگاہ التمش کی غربی دیوار سے بالکل ملحق اور مزار شیخ اوحد الدین کرمانی سے کسی قدر فاصلے پر ہیں۔ (33)

شیخ شمس الدین کے اعقاب و اخلاف کی رہائش گاہ

دسویں صدی ہجری کے اواخر تک یہ تمام خاندان قلعہ رہتک کے متصل اس عمارت میں رہائش پذیر تھا جو قلعہ خورد کہی جاتی تھی اور بعد میں چشتیاں کے نام سے مشہور ہوئی (34)۔ دسویں صدی کے اواخر میں شیخ احمد بن محمود نے شیخ عبدالغنی سونی پتی (م 1016ھ) (35) کی دختر سے شادی کی اور سونی پت سے رہتک واپسی کے بعد اپنے اور اپنے اہل خاندان کے رہنے کے لئے قلعہ نما ایک وسیع عمارت تعمیر کرائی۔ حضرت شاہ ولی اللہ تحریر فرماتے ہیں:

''شیخ احمد در صغر سن از رہتک برآمد و با شیخ عبدالغنی ابن شیخ عبدالحکیم نشو و نما یافت، مشارالیہ او را با جگر پارہ خود از دواج دادہ مدتے ترتیب فرمود، بعد ازاں در رہتک باز آمدہ بیرون قلعہ عمارتے ساختہ اعوان و موالی خود را با خود جا داد۔'' (36)

یہ عمارت اولاً قلعہ شیخ احمد کے نام سے پھر سرائے شیخ احمد اور آخر میں محلہ سرائے کے نام سے مشہور ہوئی۔ 1947ء تک خانوادہ شیخ احمد اور شیخ ابوالرضا محمد کے بچے کچھے افراد اسی محلہ میں رہتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ سب

پاکستان جا کر اِدھر اُدھر مختلف شہروں میں منتشر ہو گئے اور حویلی کے آثار نیست و نابود ہو کر اغیار کے مکانات بن گئے۔ سدا نام رہے اللہ کا۔

شیخ احمد نے 1023ھ میں وفات پائی (37)۔ ان کے پڑپوتے شاہ وجیہہ الدین سیوا جی مرہٹہ کے عہد میں ڈاکوؤں کے ایک گروہ کے ساتھ دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے اور بھوپال کے قریب دفن ہوئے۔ اس نواح میں شاہ وجیہہ الدین کنگن ولی کے نام سے مشہور ہیں (38)، اگرچہ ''الامداد'' میں شاہ وجیہہ الدین کے سنہ وفات کا ذکر نہیں مگر یہ امر یقینی ہے کہ وہ ربیع الاول 1091ھ اپریل 1680ء میں سیوا جی مرہٹہ کی موت سے پہلے رحلت کر گئے تھے۔

(4)

زوجاتِ محترمات

شاہ ولی اللہ کے دو نکاح ہوئے۔ پہلا مسماۃ امت بنت شاہ عبید اللہ پھلتی سے 1128ھ۔ 1716ء میں اس وقت ہوا جب شاہ عبد الرحیم حیات تھے اور شاہ ولی اللہ کی عمر صرف چودہ سال تھی۔ خود شاہ صاحب کا ارشاد ہے: ''و سال چہاردہم صورت تزوج گرفت'' (39) مگر شاہ صاحب نے اس کی صراحت نہیں کی کہ اس وقت صرف نکاح ہوا تھا یا شادی کے تمام مراسم سرانجام ہو گئے تھے، لیکن قرین قیاس ہے کہ اسی وقت رخصتی بھی ہو گئی ہو گی۔

امت الرحیم شاہ ولی اللہ کے ماموں، شاہ عبید اللہ کی دختر اور شاہ محمد عاشق پھلتی کی ہمشیر تھیں۔ انہوں نے شادی کے بعد اکیس سال حضرت شاہ ولی اللہ کی معیت و رفاقت میں بسر کیے اور تقریباً 1149ھ۔ 37-1736ء میں تین بچے ایک بیٹا اور دو بیٹیاں چھوڑ کر وفات پا گئیں۔ ان کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے حضرت شاہ صاحب نے میر معین الدین ٹھٹوی کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

> ''از عجائب اتفاقات آنکہ قبل ورود نامہ گرامی بچند روز اہلیہ ایں فقیر کہ بنت...... وہم بمعیت بست و یک سالہ می شد بمرض اسہال ازیں جہاں واژگون انتقال کرد۔'' (40)

مسماۃ امت الرحیم (41) کی وفات کے بعد شاہ صاحب نے سونی پت کے خانوادہ سادات (42) میں جس کے شاہ صاحب اور ان کے تمام اہل خاندان سے کئی نسلوں سے مراسم اور قرابت و ازدواج کے تعلقات تھے (43)، مولوی حامد سونی پتی (44) (الف) کی دختر بی بی ارادت سے دوسرا نکاح کیا، (44) (ب) ان دونوں خاندانوں کے باہمی قدیم رشتوں کے علاوہ مولوی حامد کی دختر سے نکاح کا ایک اور محرک یہ تعلق رہا ہو گا کہ مولوی حامد، شاہ عبد الرحیم کے رفیق درس (45) اور شاہ فخر العالم خلف شاہ ابو الرضا محمد کے داماد اور خلیفہ مجاز تھے (46)۔ اگرچہ بی بی ارادت سے نکاح کی صحیح تاریخ معلوم نہیں لیکن اس قول کی صداقت مشتبہ ہے کہ ''شاہ صاحب کی دوسری شادی 1157ھ میں ہوئی تھی'' (47) قرائن و شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی بیوی کی وفات کے بعد جلد ہی بی بی ارادت سے نکاح ہو گیا تھا۔ اگر دونوں واقعات میں کسی قدر وقفہ بھی ہوا ہو تب بھی نکاح ثانی 1157ھ سے بہت پہلے ہوا ہو گا۔ حضرت شاہ عبد العزیز کا ایک ملفوظ اس خیال کا مؤید ہے، شاہ صاحب

نے ایک مجلس میں فرمایا:

''در شب بست و پنجم رمضان وقت سحر تولد شدہ بودم چوں والدین را کودک بستیار مردہ بودند مگر برائے من کمال بود۔''(48)

یعنی شاہ عبدالعزیز کی ولادت سے پہلے حضرت شاہ صاحب کے والدین (شاہ ولی اللہ اور بی بی ارادت) کے کئی بچے ضائع ہو چکے تھے۔ زوجہ ثانیہ کی پہلی اولاد جو حیات رہی شاہ عبدالعزیز تھے۔ اگر نکاح ثانی کا سنہ 1157ھ تسلیم کیا جائے تو اس وقت سے شاہ عبدالعزیز کی ولادت 1159ھ تک صرف ایک بچے یا حمل کے ضائع ہو جانے کا وقفہ رہتا ہے، اس میں کودک بسیار کی گنجائش کہاں؟

ایک بزرگ مصنف و محقق نے اس ملفوظ کی تصحیح فرمائی اور والدین کی جگہ والدمن کو درست قرار دیا ہے(49)، مگر اس رائے سے بھی اتفاق مشکل ہے کیونکہ زوجہ اول محترمہ امت الرحیم کی وفات کے وقت تین بچے حیات تھے، جن میں ایک بچی جو زوجہ اول کی آخری اولاد تھی صرف چھ مہینے کی تھی اس لئے زوجہ اول کے بچوں کے حیات نہ رہنے کا شکوہ صحیح اور برمحل ہے؟ لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ تمام حوادث و آلام دوسری بیوی کو پیش آئے اور اسی میں کئی سال گزر گئے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا بچے کی آرزو تمنا میں اضافہ ہوتا رہا، طویل وقفے اور بڑی امیدوں کے بعد زوجہ ثانیہ بی بی ارادت کے بطن سے ایک فرزند تولد ہوا جو حیات رہا۔ فرزند کے تولد اور صحت و عافیت کی خبر سے پورے خاندان میں مسرت و شادمانی کی لہر دوڑ گئی۔ اور یہ بھی قرین قیاس ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ نے مرحوم زوجہ کے کمسن بچوں کی نگہداشت و پرورش کی ضرورت کے پیش نظر دوسرے نکاح میں عجلت فرمائی ہو، اس کا اشارہ خود شاہ صاحب کے مکتوبات میں بھی ملتا ہے۔ تحریر ہے:

''واز کسے متکفلات اولاد نماند، تشویشے لاحق شد''(50)

محترمہ بی بی ارادت نے خاصی طویل عمر پائی۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے سب سے چھوٹے فرزند شاہ عبدالغنی کی وفات 1203ھ تک حیات تھیں(51)۔ تاریخ وفات معلوم نہیں۔

(5)

اولاد

دونوں بیویوں سے حضرت شاہ صاحب کی متعدد اولاد ہوئیں، جس میں سے نو کے متعلق معلومات دستیاب ہیں اور نو میں سے سات شاہ صاحب کی وفات (29 محرم 1176ھ۔ یوم شنبہ 21 اگست 1762ء) کے وقت حیات تھیں۔ تفصیلات اس طرح ہیں۔

زوجہ اول سے تین، ایک فرزند مولانا شاہ محمد۔ دو لڑکیاں محترمہ صالحہ اور امت العزیز۔ زوجہ ثانیہ سے چھ، چار فرزند (حضرت شاہ) امام الدین عبدالعزیز، رفیع الدین عبدالوہاب، معین الدین عبدالقادر، رضی الدین عبدالغنی اور دو بیٹیاں فاطمہ اور فرخ بی بی۔ آئندہ سطور میں اولاً بیٹیوں کا ذکر آئے گا پھر صاحبزادگان کا مختصر احوال جس میں ان کے صحیح

سنین ولادت ووفات متعین کرنے کی کوشش ہوگی۔

محترمہ صالحہ بنت حضرت شاہ ولی اللہ

حضرت شاہ صاحب کی زوجہ اول سے جو اولاد حیات رہی ان میں سب سے بڑی محترمہ صالحہ ہیں۔ شاہ صاحب نے زوجہ اول کی وفات پر میر معین الدین ٹھٹوی کو جو خط لکھا تھا اس کا ایک اقتباس گزر گیا ہے۔ دو سطریں اور پڑھ لیجیے:

''وسہ یکے دختر شش سالہ دومی فرزند سہ سالہ وسیم دختر شش ماہہ گذاشت واز کسے متکفلات اولاد نماند..... تشویشے لاحق شد۔''(52)

اس اقتباس کی روشنی میں جو ایک اہم اور مستند ترین ذریعہ معلومات ہے، محترمہ صالحہ کا سنہ ولادت 1143ھ۔ 1730-31ء تقریباً متعین ہے۔ ان کے سنہ ولادت کے علاوہ کوئی اور اطلاع راقم سطور کو نہیں ملی مگر مولانا مجتبیٰ حیدر صاحب کاکوروی نے مطلع فرمایا ہے کہ

''ان کی شاہ ولی اللہ کی حیات میں شادی ہوگئی تھی مگر کوئی اولاد نہیں ہوئی، شاہ صاحب کے سامنے ہی لاولد انتقال کر گئیں۔ اس عالم میں جو اس کا بدل ان کو عطا ہوا اس کی تفصیل شاہ صاحب نے عرصہ بعد بیان فرمائی۔''(53)

محترمہ امۃ العزیز بنت شاہ ولی اللہ

امۃ العزیز عرف مسیتی زوجہ اولی کی آخری یادگار تھیں۔ تقریباً (49-1148ھ۔ 39-1738ء) میں ولادت ہوئی۔ چھ مہینہ کی تھیں کہ والدہ وفات پا گئیں۔ ازدواج ونکاح کے متعلق مستند معلومات دریافت نہیں، لیکن مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''جن کا نکاح شاہ ولی اللہ نے اپنے ماموں زاد بھائی اور خلیفہ اکبر شاہ محمد عاشق کے صاحبزادے سے کیا۔''(54)

اگرچہ مولانا میرٹھی نے شاہ محمد عاشق کے صاحبزادے کا نام نہیں لکھا جو امت العزیز کے شوہر تھے مگر دیگر مآخذ و قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ امت العزیز شاہ محمد عاشق کے بڑے صاحبزادے شاہ محمد عبدالرحمٰن (مرتب مکتوبات شاہ ولی اللہ) کے نکاح میں آئیں اور اس ضمن میں عبدالرحیم ضیاء کی یہ اطلاع درست نہیں کہ

''ایک دختر مسماۃ بی بی امت العزیز۔ دختر مذکورہ کی مولوی محمد فائق بن مولوی محمد عاشق سے شادی کردی۔''(55)

کیونکہ شاہ محمد فائق، شاہ صاحب کی سب سے چھوٹی صاحبزادی بی بی فرخ کے شوہر تھے اور ان کا نکاح شاہ صاحب کی حیات میں ہونا اس لئے قرین قیاس نہیں کہ وہ اپنے والد ماجد شاہ ولی کی وفات 1176ھ کے وقت شیر خوار دو

ڈھائی سال کی تھیں، لیکن شاہ عبدالرحمٰن کا نکاح شاہ ولی اللہ کی حیات میں ہو گیا تھا اور 1168ھ-55-1754ء میں انتقال کر گئے تھے۔ شاہ ولی اللہ کے متعدد خطوط میں شاہ عبدالرحمٰن اور ان کی اولاد کا ذکر ہے۔ ایک خط میں تحریر ہے:

"وقد وصل الولد العزیز عبدالرحمٰن مع اولاد بالخیر والعافیہ۔"(56)

عزیزم عبدالرحمٰن اپنی اولاد کے ساتھ خیر و عافیت سے (یہاں) پہنچے۔

اہل پھلت کے نسب ناموں سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عبدالرحمٰن کے دو صاحبزادے ہوئے ابوالفضل اور ثناء اللہ۔ ثناء اللہ کے بھی دو بیٹے ہوئے محمد عثمان، محمد یوسف اور یہ وہی محمد یوسف ہیں جو تحریک جہاد سید احمد شہید کے سرگرم رکن تھے اور جن کو حضرت سید احمد شہید کے تمام تذکرہ گار نبیرۂ شاہ اہل اللہ محمد یوسف بن عمر بن شاہ اہل اللہ لکھتے ہیں(57) حالانکہ اس وقت تک کسی ذریعہ سے محمد عمر نام شاہ اہل اللہ کے کسی بیٹے کے وجود کی تصدیق نہیں ہو سکی اور خانوادہ ولی اللہی کے نسب ناموں میں بھی ان کا ذکر نہیں۔

محترمہ فاطمہ بنت شاہ ولی اللہ

شاہ عبدالرحمٰن خلف شاہ محمد عاشق کی وفات (1168ھ) کے بعد تولد ہوئیں۔ ان کی ولادت کا تذکرہ کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ نے ایک خط میں لکھا ہے:

"از نعم الٰہی دریں ایام آنست کہ صبیہ متولد شد چوں خانہ ما از اسم فاطمہ خالی شدہ بود ہمیشہ در خاطر ایں..... میگذشت، ایں صبیہ را فاطمہ نام کردہ شد۔"(58)

افسوس بی بی فاطمہ کی حیات، کل عمر اور نکاح و ازدواج کے متعلق کوئی اور اطلاع راقم سطور کو نہیں ملی۔ چونکہ اس خط کے علاوہ کسی اور ماخذ و مکتوب میں ان کا ذکر نہیں ملا اس لئے خیال ہے کہ شاید وہ کمسنی میں وفات پا گئی ہوں؟

محترمہ فرخ بی بی بنت شاہ ولی اللہ

حضرت شاہ صاحب کی دوسری زوجہ سے یہ آخری اولاد ہیں۔ صحیح سنہ ولادت معلوم نہیں مگر حضرت شاہ عبدالعزیز اور ان کے برادران گرامی کے سنین ولادت کی ترتیب کے پیش نظر فرخ بی بی کا سنہ ولادت تقریباً 1174ھ-61-1760ء متعین کیا جا سکتا ہے۔ فرخ بی بی شاہ محمد فائق خلف شاہ محمد عاشق کے نکاح میں آئیں۔ خانوادہ ولی اللہی پر قلمی یادداشت کی اطلاع ہے:

"واین ہر چہار بزرگان معہ یک خواہر کہ در عقد نکاح شاہ محمد فائق پھلتی پسر حضرت شاہ محمد عاشق مذکور قدس سرہ بقید حیات موجود است و صاحب اولاد است۔"(59)

اور مولانا جعفری نے شاہ عبدالعزیز کے ماموں شاہ کبیر بن صدر العام کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

"وکانت زوجہ فخر العالم من السادۃ القطبیۃ الزکویہ اولاد الامیر قطب الدین الکبرٰی. فولدت لہ صدر العالم وھو ابی و فاخرۃ النساء وھی ام والدۃ الشیخ

امام الدین عبدالعزیز، والشیخ رفیع الدین عبدالوهاب والشیخ معین الدین عبدالقادر، والشیخ رضی الدین عبدالغنی، والد العالم الفاضل اسمٰعیل الشهید رحمه الله و فرخ بی بی وهی زوجة الشیخ محمد الفایق بن الشیخ محمد العاشق. "الخ (60)

بی بی فرخ کے متعدد اولادیں ہوئیں۔ نسب نامہ اہل پھلت میں محمد معصوم، محمد صادق اور عبدالسلام کا ذکر ہے۔ اول الذکر دونوں لاولد تھے۔ فاطمہ کا نکاح مولوی معظم اللہ خلف شاہ اہل اللہ سے ہوا۔ نسل چلی اور عبدالسلام کا سلسلہ بھی خاصا پھلا پھولا اور اس وقت تک برگ وبار لا رہا ہے۔

نسب نامہ اہل پھلت میں بی بی فرخ کی ان ہی مذکورہ چار اولادوں کا ذکر ہے لیکن حضرت شاہ عبدالعزیز کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ بی بی فرخ کی ایک دختر اور بھی تھیں جو اپنے والدین کی حیات میں انتقال کر گئی تھیں۔ محولہ بالا خط میں اسی حادثہ کی تعزیت ہے، آخر میں لکھتے ہیں:

"...... يبلغوا مثل هذه التسلية الى اختى... الله سرها و حفظها من كل سوء و بارك فيها و فى اولادها. آمين. "الخ (61)

مولانا شاہ محمد خلف اکبر حضرت شاہ ولی اللہ

حضرت شاہ صاحب کے میر معین الدین ٹھٹوی کے نام محولہ بالا مکتوب کی رو سے جس کے اقتباسات گزر چکے ہیں شاہ محمد کا سنہ ولادت (1146ھ-34-1733ء) معلوم و متعین ہے، شاہ محمد کی تعلیم وارشاد کی تفصیلات دریافت نہیں تاہم اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ ابتدائی کتابوں سے منتہانہ نصاب تعلیم تک اکثر کتابوں میں والد ماجد سے تلمذ و استفادہ کا موقع ملا ہوگا۔ شاہ محمد کی تعلیم کے ابتدائی ایام میں حضرت شاہ صاحب نے ان کے لئے ایک رسالہ "ضوابط املاء کلمات وقواعد کتابت" مرتب کیا تھا (62) اس کے شروع میں لکھا ہے:

"برخوردار سعادت اطوار فرزندم محمد سلمہ اللہ تعالیٰ بداند کہ در نوشتن دو قاعدہ متحضر باید ساخت، یکے آنکہ ہر کلمہ راجدا باید نوشت خواہ اسم باشد یا فعل یا حرف۔" الخ

مولانا عبدالحی حسنی نے شاہ عبدالعزیز کے ایک رسالہ کے حوالہ سے شاہ محمد کو شمائل ترمذی اور حصن حصین کے درس میں شاہ عبدالعزیز کا رفیق وہمدرس لکھا ہے۔ مولانا حسنی کا قول ہے:

"و (اخذ) الحصن الحصين و شمائل الترمذى سماعا عليه بقراء ة اخيه الشيخ محمد." الخ (63)

لیکن راقم سطور کو اس اطلاع کی تصدیق میں تامل ہے، معلوم نہیں مولانا حسنی نے یہ اطلاع کہاں سے اخذ کی، اگر شاہ عبدالعزیز اس کا ذکر فرماتے تو اس اطلاع کا صحیح محل شاہ صاحب کی تالیف رسالہ "عجالۂ نافعہ" تھی، اس میں شاہ صاحب نے شیخ محمد کے ساتھ اشتراک سماعت وقراۃ کا کوئی ذکر نہیں فرمایا بلکہ یہ لکھا ہے کہ

''ایں فقیر ایں علم و جمیع علوم را محض از خدمت والد ماجد خود اخذ کردہ است، و بعضے کتب ایں علم را مثل مصابیح و مشکوۃ و سوی شرح موطا کہ از تصانیف ایشانست و حصن حصین و شمائل ترمذی از خدمت ایشان قراۃ و سماعا بہ تحقیق و تفتیش اخذ نمودہ۔''(64)

تاہم اگر شاہ محمد کی شاہ عبدالعزیز کے ساتھ رفاقت و درس کی اطلاع درست ہے تو یہ اشتراک وہم سبقی بلا شبہ تیمنا وتبرکا ہوئی ہوگی کیونکہ جس وقت شاہ عبدالعزیز نے (تقریباً 1175ھ میں) شاہ ولی اللہ سے شمائل ترمذی اور حصن حصین پڑھی اس وقت شاہ محمد کی عمر 28-29 سال ہوگی اور اس عمر تک تدریس و تعلیم میں مشغول رہنا خانوادہ ولی اللہی کی روایات کے خلاف اور نا قابل یقین ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے مرض الوفات میں شاہ عبدالغنی کے علاوہ اپنے چاروں صاحبزادوں کی نسبت مع اللہ کی کیفیت کا اور ان کی متوقع روحانی ترقیات کا حضرت شاہ عبدالعزیز سے ذکر کیا تھا۔ اس میں شاہ محمد کا تذکرہ بھی ہے، فرمایا:

''و شیخ محمد را نسبت مع اللہ مانند نسبت شاہ حسین خواہد شد۔''(65)

شاہ محمد کی زندگی کا بڑا حصہ بھائیوں کے ساتھ دہلی میں گزرا۔ شاہ عبدالعزیز کے متعدد مکتوبات میں مکتوب الیہم کو شاہ محمد کا سلام لکھا ہے جو اس کی واضح شہادت ہے کہ شاہ محمد، شاہ عبدالعزیز کے ساتھ ہیں(66)، نیز شاہ عبدالعزیز کے خطوط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاہ محمد کا افضل خاں کی چھاؤنی لکھنؤ میں بھی کچھ عرصہ قیام رہا ہے (67)، لیکن سید احمد ولی اللہی کے اس قول میں کچھ صداقت نہیں کہ شاہ محمد ہمیشہ پھلت میں رہے (68)۔ شاہ محمد اپنے والد ماجد اور بھائیوں کی طرح بڈھانہ (ضلع مظفر نگر) بھی آتے جاتے رہتے تھے اور یہیں کے زمانہ قیام میں 1208ھ۔ 1793-94ء میں وفات ہوئی اور جامع مسجد کے صحن میں دفن کیے گئے۔ منشی فرحت اللہ پھلتی نے لکھا ہے:

''ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی لاولد مر گئے اور قبر ان کی قصبہ بڈھانہ مسجد کلاں میں ہے، تاریخ وفات دخل الجنۃ ہے۔''(69)

منشی فرحت اللہ کے نقل کیے ہوئے فقرہ تاریخ میں سہو کاتب سے لفظ فی ترک ہو گیا ہے۔ موجودہ صورت میں اس کے اعداد گیارہ سو آٹھ ہیں جو اس خاندان کی کسی معروف شخصیت کی تاریخ ولادت ہے نہ تاریخ وفات، اگر فقرہ تاریخ دخل فی الجنۃ ہو تو اس کے اعداد بارہ سو آٹھ ہو جاتے ہیں جو مولانا شاہ محمد کا سنہ وفات ہے، یہی سنہ مولانا عبدالحی حسنی نے بھی لکھا ہے۔(70)

مولانا شاہ محمد کی قبر جامع مسجد بڈھانہ (71) کے شمال مشرقی کونے میں حوض اور وضو خانہ کے درمیان میں واقع ہے۔ اس جگہ کل تین قبریں ہیں۔ کون سی قبر کس کی ہے متعین طور پر معلوم نہیں، تاہم اس میں ایک قبر بے شک و شبہ شاہ محمد کی ہے۔ ایک اور قبر کے متعلق بعض اہل بڈھانہ کا قول ہے کہ وہ شاہ نور اللہ بڈھانوی کی ہے، تیسری کا حال معلوم نہیں۔

شاہ محمد کا شاہ نور اللہ کی دختر صبیحہ سے نکاح ہوا اور لا ولد ہوئے مگر عبدالرحیم ضیاء کے بیان سے شبہ ہوتا ہے کہ مولانا شاہ محمد کے دو بیٹے تھے جو شاہ محمد کے برابر آسودہ خاک ہیں (72) لیکن یہ قول صحیح نہیں۔ عبدالرحیم ضیاء کے علاوہ کوئی اور تذکرہ نگار ان کی اولاد کا ذکر نہیں کرتا، اگر شاہ محمد صاحب اولاد ہوتے تو خانوادہ ولی اللہی پر قدیم یادداشت اور مولانا

جعفری کی کتاب سے اس کا کوئی اشارہ وتذکرہ ملتا مگر یہ دونوں اس تذکرہ سے خاموش ہیں۔ نیز منشی فرحت اللہ پھلتی (73) اور مولانا عاشق الٰہی میرٹھی (74) نے مولانا محمد کو صراحتاً لاولد لکھا ہے اور نسب نامہ اہل پھلت بھی اسی مؤخر الذکر روایت کا مؤید ہے۔

سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز

(25 رمضان المبارک سنہ 1159ھ۔ 12 اکتوبر 1776ء) کو ولادت ہوئی۔ خود شاہ عبدالعزیز کا ارشاد ہے:

''در شب بست و پنجم رمضان وقت سحر تولد شدہ بودم۔'' (75)

غلام حلیم (اعداد: 1159) تاریخی نام ہے (76) والد ماجد اور شاہ محمد عاشق نیز شاہ نور اللہ بڈھانوی سے تعلیم حاصل کی۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے شاہ عبدالعزیز کو مبادیات صرف کی تعلیم وتفہیم کے لئے ایک منظوم رسالہ فارسی میں تحریر فرمایا تھا اس کے کلمۂ افتتاح میں لکھتے ہیں:

''وبعد...... فقیر ولی اللہ عفی عنہ چوں فرزندار جمند عبدالعزیز...... تعالی وفقہ لما یحب ویرضی...... مشغول شد مناسب نمود کہ قواعد منورہ ایں فن را در رشتہ...... الخ...... باسہل وجہ ضبط آں میسر آید، بہ نسخہ صرف مولانا نور الدین جامی قدس سرہ توجہ افتادہ دیدہ شد کہ قلیلے ازاں قواعد منظور فرمودہ بعضے آخر...... گذاشتہ، ظاہراً آں استاد نامدار بعد تسوید نسخہ مذکورہ بنظر ثانی اصلاح نفرمودہ وتوجہ آں نگاشتہ، لاجرم بعضے ابیات تیمناً وتبرکاً بعینہا آوردہ شد، ودر بعضے تصرفے بحسب امکان کردہ آمد، و بعضے آخر بر بیان اسلوب ووزن زیادہ گردہ شد۔'' (77)

حضرت شاہ ولی اللہ کی وفات کے بعد ان کے تمام مناصب اور ذمہ داریوں کا بوجھ شاہ عبدالعزیز کے کاندھوں پر آ گیا تھا اور شاہ عبدالعزیز نے اپنی کمسنی کے باوجود یہی نہیں کہ اس کا شایان شان حق ادا کیا بلکہ ہر لحاظ سے اس کو چار چاند لگا دیئے۔ اپنے چھوٹے بھائیوں کی ایسی رہنمائی اور تعلیم وتربیت فرمائی کہ باید وشاید۔ حالانکہ شاہ ولی اللہ کی وفات کے وقت شاہ عبدالعزیز کی عمر صرف سولہ سال چند مہینے تھی اور اس وقت شاہ رفیع الدین تیرہ سال کے، شاہ عبدالقادر نو سال کے اور شاہ عبدالغنی پانچ سال کے تھے۔ اگر شاہ عبدالعزیز اپنے بھائیوں کی ایسی اعلیٰ تعلیم وتربیت کے علاوہ زندگی بھر اور کوئی علمی دینی خدمت سرانجام نہ دیتے تو بھی ان کا یہی ایک کارنامہ رہتی دنیا تک ان کے کلاہ عزت وافتخار میں نگینہ کی طرح چمکتا رہتا اور ہمیشہ ان کی یاد تازہ رکھتا، مگر شاہ عبدالعزیز کی خدمات کا دائرہ اس سے بہت وسیع، بہت عمیق، بہت متنوع اور نہایت کثیر الجہت ہے۔

شاہ عبدالعزیز کے حلقۂ تعلیم وتربیت سے بے شمار ایسے بلند قامت انسان اٹھے کہ ان کا طرہ فضل وکمال غزالی و رازی سے آنکھیں ملاتا تھا اور جن کی مجالس درس اپنی وسعت اور اثر ونفوذ میں علمائے متقدمین کی یاد تازہ کراتی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک فضل وکمال کا منبع اور علم وارشاد کا سرچشمہ تھا۔ ان کا وجود ہندی ملت اسلامیہ کے لئے سرمایہ فخر ومباہات اور

وجہ نازش وافتخار تھا۔ پچھلے دو سو برس کی تاریخ میں اور آج بھی برصغیر ہندو پاکستان اور بنگلہ دیش کا کون مسلمان ہے جو ایمان وعقاید کی اصلاح اور طریقہ ہدایت وسنت کی دریافت اور پیروی میں ان بزرگوں کے خوان علم کا خوشہ چیں اور ممنون کرم نہیں اور اس برصغیر کے کسی ادارہ اور تحریک کے اصلاحی، تعلیمی نظریات کا رشتہ شاہ عبدالعزیز یا ان کے حلقہ تلامذہ سے وابستہ نہیں۔ بلاشبہ اس براعظم کی گذشتہ دو سو برس کی دینی، علمی، اصلاحی، تصنیفی اور فکری تاریخ شاہ عبدالعزیز کی خدمات واثرات کی تاریخ ہے اور ہندی ملت اسلامیہ کا ہر ادارہ تعلیم وتبلیغ کا ہر مرکز اور ارشاد وتلقین کا ہر اک حلقہ جا ہے اس کو اس وقت کچھ بھی رنگ اور نام دے دیا گیا ہو، وہ فیضان عزیزی کا ایک ثمر ہے۔

شاہ عبدالعزیز ہندوستان کی ملت اسلامیہ کا وہ مہر منیر، وہ نیر تاباں اور وہ گوہر شب تاب ہے جس کے دم قدم سے ہندوستان میں اسلام کا ٹمٹماتا چراغ روشن، توحید کا غلغلہ بلند اور اتباع سنت کا ولولہ تازہ ہوا۔ ان کی کاوشوں کا عکس آج بھی دل فروز اور ملت کے لئے مینارہ نور ہے اور بے شک وشبہ کہا جا سکتا ہے کہ اس برصغیر کے بیشتر تعلیمی وتبلیغی سلسلے انہیں کے سوز دروں کی بازگشت اور انہیں کی کاوشوں کا پرتو ہیں جس کے اثرات سے ہندو پاکستان اور بنگلہ دیش کا خطہ خطہ منور اور ذرہ ذرہ درخشاں ہے:

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجامی نگری انجمنے ساختہ اند

شاہ عبدالعزیز کا صحیح سنہ وفات

شاہ عبدالعزیز نے اکیاسی سال کی عمر میں (7/شوال 1230ھ۔ 6/جون 1824ء) کو رحلت کی۔ احمد علی بجنوری نے جو اس الیہ کا عینی شاہد ہے، اپنی ایک تحریر میں اس وقت کی دیدہ وشنیدہ تفصیلات قلم بند کی ہیں۔ اس میں یہی سنہ وفات درج ہے۔ مولانا محبوب علی جعفری نیز اکثر شعراء اور تذکرہ نگاروں نے بھی یہ سنہ وفات بیان کیا ہے۔ مولانا جعفری لکھتے ہیں:

"مات الشیخ عبدالعزیز فی السابع من شوال سنة تسع و ثلاثین و ماتین و الف" (78)

مومن کا لکھا ہوا قطعہ تاریخ فرط شہرت سے محتاج تعارف نہیں، یہاں اس کا صرف آخری شعر پڑھ لیجیے:

دست بے داد اجل سے بے سروپا ہو گئے
فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل (79)

مولانا ابوالحسن حسن کاندھلوی نے بطریق تخرجہ تاریخ کہی:

حجۃ اللہ ناطق و گویا شاہ عبدالعزیز فخر زمن
مہر نصف النہار در عرفان مثل بدر منیر در ہمہ فن
روز یکشنبہ ہفتم شوال درمیان بہشت ساخت وطن
از سر لطف و حلم تاریخش رضی اللہ عنہ گفت حسن (80)

لیکن مذکورہ بالا تصریحات اور کثیر شواہد کو نظر انداز کر کے بعض شعراء اور تذکرہ نگاروں نے شاہ صاحب کا سنہ وفات 1238ھ۔ 1240ھ اور بعض نے 1248ھ بھی نقل کیا ہے، مگر یہ تینوں اور شاہ صاحب کے سنہ وفات کی 1239ھ کے علاوہ اگر کوئی اور روایت ہو تو وہ بھی یکسر غلط اور قطعاً بے اصل ہے۔ 1238ھ اور 1240ھ کی سب سے پہلی روایت سعادت یار خاں رنگین سے منقول ہے، رنگین نے قطعۂ تاریخ کہا:

بہر اوج حضرت عبدالعزیز اس کی یہ تاریخ رنگین نے لکھی
منظر خد بریں کا قصر تھا شبلی ہند اور جنید عصر تھا (81)

شاہ صاحب کے لوح مزار پر اول یہی سنہ وفات کندہ تھا(82)، جب قدیم کتبات تبدیل کیے گئے اس وقت صحیح سنہ وفات درج ہوا۔ رنگین نے ایک اور فقرہ تاریخ بھی لکھا ہے ''ہے مرا آج امام اعظم عہد'' مگر یہ بھی صحیح نہیں۔ 1248ھ کی روایت سرسید احمد نے ''آثار الصنادید'' میں ذکر کی ہے، سرسید کے الفاظ یہ ہیں:

''1248ھ (بارہ سو اڑتالیس ہجری) میں اس جہان فانی سے سفر آخرت کو اختیار کیا(83)''

مولوی رحیم بخش نے ''حیات ولی'' میں بھی یہ سنہ لکھا ہے (84)، مگر دونوں سے یہ غلطی سخت حیرت انگیز ہے، کیونکہ دونوں نے اپنی ان تحریرات کے بعد جو قطعات تاریخ نقل کیے ہیں، ان سے صحیح سنہ وفات 1239ھ صاف عیاں ہے خصوصاً مولوی رحیم بخش کا بیان محل تعجب ہے وہ ''حیات ولی'' کی تالیف سے پہلے اپنی کتاب ''حیات عزیزی'' میں صحیح سنہ وفات لکھ چکے (85) تھے اور لطف یہ ہے کہ ''حیات عزیزی'' میں دو قطعات تاریخ ہیں اور ''حیات ولی'' میں تین اور ان میں سے ہر ایک قطعہ تاریخ سے صحیح سنہ وفات 1239ھ برآمد ہوتا ہے (86)، نیز ''حیات عزیزی'' میں ایک قطعہ تاریخ کے نیچے صحیح اعداد درج ہیں، لیکن ''حیات ولی'' میں مولانا ابوالحسن حسن کے قطعہ تاریخ کے نیچے اس کے اعداد 1248ھ لکھ دیئے جو بالکل غلط ہیں۔

شاہ عبدالعزیز کی تاریخ ولادت، عمر اور سنہ وفات تینوں ایک ہی فقرہ سے معلوم ہو جاتے ہیں، غلام حلیم (اعداد: 1159ھ) تاریخ پیدائش ہے، لفظ عطاء (اعداد: 81) سے کل عمر معلوم ہوتی ہے اور عطاء غلام حلیم (اعداد: 1239ھ) سنہ وفات کا مظہر ہے۔ (87)

ازدواج اور اولاد

شاہ عبدالعزیز کا شاہ نور اللہ بڈھانوی کی دختر حبیبہ سے نکاح ہوا نکاح وازدواج کا سنہ معلوم نہیں مگر حضرت شاہ ولی اللہ کی حیات میں اس رشتہ کی بناڈال دی گئی تھی۔ اس رشتہ کے سلسلہ میں شاہ صاحب نے شاہ نور اللہ کو جو خط لکھا تھا وہ مجموعہ مکتوبات شاہ ولی اللہ میں شامل ہے۔

شاہ ولی اللہ تحریر فرماتے ہیں:

''بالجملہ ایں علاقہ کہ بابت نسبت برخوردار محمد متجدد شد با علاقہ اولیٰ بابت نسبت عبدالعزیز چہ قدر بہجت خاطر دارد'' الخ۔ (88)

محترمہ حبیبہ سے شاہ صاحب کی متعدد اولادیں ہوئیں، ہمیں چھ بچوں کا علم ہو سکا ہے، تین بیٹے، تین بیٹیاں۔ تینوں بیٹے کمسنی میں وفات پا گئے تھے، لڑکیوں کے نکاح ہوئے، اولاد ہوئی اور پھر یکے بعد دیگرے تینوں صاحبزادیاں اپنے والد کی حیات میں رحلت کر گئیں۔ اسی حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے فرحت اللہ پھلتی نے لکھا ہے: ''ان (شاہ عبدالعزیز) کی اولاد ان کے روبرو مر گئی۔''(89)

شاہ عبدالعزیز کے متعلق سید احمد ولی اللہی کی یہ اطلاع صحیح نہیں کہ ''آپ سے کوئی فرزند نرینہ نہیں ہوا''(90)۔ شاہ صاحب کے تین صاحبزادے تھے، قطب الدین، زین الدین اور احمد۔ قطب الدین نے بارہ تیرہ سال کی عمر میں وفات پائی، زین الدین نے بھی اسی عمر میں تقریباً 1234ھ میں انتقال کیا، احمد کی عمر اور سنہ وفات معلوم نہیں۔ مگر شاہ صاحب کی ایک تحریر کی وجہ سے خیال ہوتا ہے کہ احمد اور ان کی والدہ محترمہ دونوں کا شاید ایک ہی زمانہ میں انتقال ہوا شاہ صاحب نے لکھا ہے:

''وان سالتم عنا فنحن ایضاً بحمداللہ بعافیة ورفاهیة غیر ان ماجری فینا من تقدیرات اللہ تعالیٰ (رحلة) الولد العزیز احمد و اختلال الانتظام المنزلی اوجب لنا الذهول عن اکثر ماتهم به و من ثم وقع نبذ من التاخیر فی ارسائل الرسائل.'' (91)

شاہ صاحب کی دختران کی تفصیل اس طرح ہے: عائشہ، رحمت النساء اور مریم۔(92)

عائشہ: شیخ محمد افضل رہتکی کے نکاح میں آئیں۔ شیخ محمد افضل شاہ ولی اللہ کے ہم جد تھے۔ ان کا نسب چار واسطوں کے نسب نامہ ولی اللہی سے مل جاتا ہے۔ عائشہ کے دو فرزند تھے حضرت شاہ محمد اسحٰق اور شاہ محمد یعقوب۔ اور ایک دختر مسماۃ مبارک۔ ان کا شاہ عبدالحئی بڈھانوی کی زوجہ اولیٰ مریم کی وفات کے بعد شاہ عبدالحئی سے نکاح ہوا۔ منشی فرحت اللہ پھلتی کا بیان ہے کہ

''مسماۃ مبارک کی شادی ہوئی مولانا عبدالحئی صاحب سے بعد فوت ہو جانے مریم کے اور بعد دو سال کے روبرو شوہر و نانا خود لاولد مر گئیں۔''(93)

رحمت النساء: دختر اوسط، شاہ رفیع الدین کے فرزند مولوی محمد عیسیٰ سے منسوب ہوئیں اور اپنے شوہر کی وفات کے بعد 1236ھ۔ 21-1820ء میں لاولد انتقال کر گئیں۔ مولانا ابوالحسن حسن کاندھلوی نے تاریخ کہی:

مخدومہ خلق حیف صد حیف سن
چوں رخت ازیں جہان فانی بربست
تاریخ وفات اور بگفتا ہاتف
بی بی رحمت ''برحمت حق پیوست'' (94)

مریم: سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ شاہ عبدالحئی بڈھانوی کے نکاح میں آئیں 1236ھ اور لاولد انتقال کر گئیں۔

حضرت شاہ عبدالوہاب رفیع الدین

19رذی الحجہ 1163ھ۔19رنومبر 1750ء کو منگل کے دن پیدا ہوئے۔حضرت شاہ ولی اللہ نے اس مبارک و مسعود ولادت کا اپنے ایک خط میں تفصیل سے ذکر کیا ہے اور نومولود کی وجہ تسمیہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔فرماتے ہیں:

''یوم الثلا ثاء تاسع عشر ذی الحجہ وقت الضحوۃ الکبری فرزندے عطا فرمود، چوں پیش از حمل آں والدہ اش مریض بود وتوقع وتوقع شفا بحسب عادت منقطع شدہ میاں نوراللہ درواقعہ شفا مشارالیہا وتولد فرزند مبشر شدہ بودند، و درآں واقعہ بخاطر ایشاں نشستہ بود کہ نام مولود رفیع الدین باشد، مانند جدے لام حضرت ماقدس اللہ اسرارہما۔

ونیز یک روز در ضمن تلاوت اسم وہاب بعض نعم الٰہی را کہ درحق ایں مسکین مقدر شدہ مشاہدہ شود از آنجملہ ایں ولد نیز مشتمل شد، بملا حظہ ادب ہر دو واقعہ رفیع الدین عبدالوہاب نام ایں مقرر کردہ شد، خدائے تعالیٰ اورا تربیت فرماید بوجہے کہ مرضی او تعالیٰ شود و شائستہ حمل امانت گرددانہ قریب مجیب۔''(95)

شاہ ولی اللہ کی وفات کے وقت شاہ رفیع الدین کی عمر تیرہ سال تھی اور وہ شرح جامی وغیرہ پڑھتے تھے۔ابتدائی کتابوں کی تعلیم کا صحیح حال معلوم نہیں مگر والد ماجد کی وفات کے بعد تمام درسیات شاہ عبدالعزیز سے اخذ کیں اور سلوک و معرفت میں شاہ محمد عاشق پھلتی سے استفادہ کیا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز کے بعد مکتوبات میں شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی کی تعلیم کا کچھ حال درج ہے۔نیز ان خطوط سے ان بزرگوں کی تعلیمی کیفیت اور ان کی صلاحیت واستعداد کی روز افزوں ترقی کے علاوہ اس عہد کے طریقہ تعلیم خصوصاً ولی اللہی طریق درس کے مختلف مراتب ومراحل کی ایسی عمیق اور ہمہ جہت تصویر سامنے آتی ہے جو ہمارے حلقہائے درس میں ایک زمانہ سے مفقود ہے۔اگرچہ ان خطوط کے متعلقہ اقتباسات خاصے طویل ہیں مگر بتمام وکمال لائق مطالعہ ہیں۔شاہ صاحب لکھتے ہیں:

ان اخی رفیع الدین کان مشغولا بالفوائد الضیائیہ و تعلیقات الکافیہ اذھجمت ھذہ الواقعہ التی اطارت الالباب واسطالت علی القلوب و الاکباد، فوفقنی اللہ تعالی بضبطھم و رعیتھم الی ھذا الشان وحثھم علی تحصیل العلم واخذہ بکل لسان. فاثر ذالک فیھم والشتغلو بقراءۃ الکتب وسماعھا علی ھذا الفقیر فجاء وا الحمدللہ کما تشتھیہ القلوب وتلذہ العین.

''میرے بھائی رفیع الدین اللہ ان کو سلامت رکھے فوائد ضیائیہ (شرح جامی) اور تعلیقات کافیہ پڑھ رہے تھے کہ والد ماجد کی وفات کا جانکاہ اور ہوش ربا واقعہ پیش آ گیا۔اللہ تعالیٰ نے مجھے توفیق دی کہ میں نے سب بھائیوں کو تحصیل علم اور ہر رائج الوقت زبان سیکھنے کی

ترغیب دی چنانچہ ان پر میری ترغیب کا اثر ہوا اور وہ اس فقیر کے پاس کتابوں کے پڑھنے اور سننے میں مشغول رہے تا آنکہ الحمدللہ حسب دل خواہ ایسی استعداد پیدا کی جس سے آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔"

اما رفیع الدین فقط حفظ القرآن کله وفرغ بحمدالله من تحصیل العلوم کلها لاسیما الادبیة والفلسفیة والاصلین من العلم الدینیة بل اخذ من العلوم الغریبة کالهیئة والنجوم والحساب و الهندسة ومایجری مجراها من الرمل و الجفر و التاریخ و علم الفرائض و الشعر و رسائل التصوف بحظ فرار، و بقی له العبور علی الصحاح السته و غیرها من کتب الحدیث و عسی ان یوفقه الله تعالیٰ لذالك ایضاً، و هو بحمدالله مشغول بتفسیر البیضاوی و مشغوف بالتدریس و له تعلیقات و تدقیقات تقربها العین و یسربها الصدر. فالحمدلله علی ذالك.

"بہرحال رفیع الدین نے قرآن شریف حفظ کرلیا ہے اور وہ بحمداللہ تمام علوم کی تحصیل سے فارغ ہو چکے ہیں خاص طور پر علوم ادبیہ اور فلسفہ اور علوم دینیہ کی دونوں اصلوں (قرآن وحدیث) میں ان کو تخصص حاصل ہے بلکہ انہوں نے علوم غربیہ بھی حاصل کیے ہیں جیسے ہیئت نجوم اور حساب ہندسہ اور جو ان کے ملحق و متصل ہیں جیسے رمل، جفر، تاریخ، فرائض، شعر، نیز رسائل تصوف بھی پڑھے ہیں اور ان کو ان علوم میں پورا پورا حصہ ملا ہے۔ اور ابھی ان کی صحاح ستہ وغیرہا پر عبور یعنی دورہ حدیث باقی ہے۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ عنقریب اس کی بھی توفیق عطا فرمائے گا۔ اللہ کے فضل وکرم سے وہ اس وقت تفسیر بیضاوی پڑھ رہے ہیں اور درس و تدریس کا بھی شغف رکھتے ہیں اور ان کے قلم سے بعض کتابوں اور علوم ومباحث پر تعلیقات وتحقیقات بھی ہیں جن سے آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سرور ہوتا ہے۔ والحمدللہ علی ذالک۔"

واما عبدالقادر، فهو ایضاً فرخ بحمد الله من حفظ القرآن کله واسمع فی التراویح مراتٍ وهو الان مشغول بالقطبی و حواشی السید علیه.

و اما عبدالغنی فقد حفظ نصف القرآن الکریم وهو مشغول به." (96)

"اور عبدالقادر وہ اللہ کے فضل وکرم سے قرآن حفظ کر چکے ہیں اور کئی مرتبہ تراویح میں سنا چکے ہیں۔ اس وقت وہ قطبی اور اس پر سید شریف کا حاشیہ پڑھ رہے ہیں۔

اور عبدالغنی نے آدھا قرآن شریف حفظ کرلیا ہے، اور وہ ابھی اسی میں مشغول ہیں۔"

اگرچہ شاہ صاحب کے اس مذکورہ بالا خط پر سنہ کتابت درج نہیں مگر اس کے مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کی وفات کے ڈیڑھ دو سال بعد لکھا گیا ہے۔ اس خط کی تحریر کے کچھ عرصہ بعد ایک اور خط میں تینوں بھائیوں کی تعلیمی مصروفیات پر کچھ اور روشنی ڈالی ہے۔ ان بزرگوں کی تعلیم و تدریس کے وقت اس خط کو نظر انداز کیا جانا

قرین انصاف نہیں۔ شاہ صاحب اس خط میں لکھتے ہیں:

"رفیع الدین بفضل الٰہی از تحصیل علوم فارغ شدہ، درمجلس عرس کہ مجمع علماء وفقراء بود، دستار تبرک بستہ اجازت درس دادہ شد، الحمدللہ مردم بسیارے از وے مستفید اند۔

وعبدالقادر را اکثر کتب تحصیل را خواندہ است بمرتبہ فضیلت رسیدہ ان شاءاللہ بہ برکت ارواح طیبہ عن قریب فارغ التحصیل خواہد شد۔

عبدالغنی قرآن را ختم نمودہ در رمضان مبارک گذشتہ درمحراب استادہ شد، باہتمام تمام درحفظ قرآن شریف اہتمام نمود، الحال کتب فارسی شروع کردہ است، بعد ماہ مبارک آئندہ قصد ہست کہ شروع درصرف ونحو کنانیدہ خواہد شد۔" (97)

"رفیع الدین خدا کے فضل سے تعلیم سے فارغ ہو گئے ہیں۔ ایک یادگار مجلس میں جس میں علماء اور درویشوں کا ہجوم تھا، دستار تبرک باندھ کر ان کو درس کی اجازت دے دی گئی ہے، خدا کا شکر ہے بہت سے افراد ان کے علم اور تعلیم سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

اور عبدالقادر نے بھی درسی کتابوں کا اکثر حصہ پڑھ لیا ہے اور فضیلت تک پہنچ گئے ہیں۔ خدا نے چاہا تو وہ بھی ارواح طیبہ کی برکت سے عنقریب رسمی تعلیم سے فارغ ہو جائیں گے۔

عبدالغنی نے قرآن شریف ختم کیا ہے۔ پچھلے رمضان المبارک میں پہلی محراب سنائی اور قرآن شریف حفظ کرنے میں خوب کوشش کی ہے۔ اب انہوں نے فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھنی شروع کی ہیں۔ اگلے رمضان کے بعد ارادہ ہے کہ ان کو نحو وصرف شروع کرا دی جائے۔"

سنہ وفات

شاہ رفیع الدین کی ستر سال کی عمر میں، طاعون کے مرض میں (3/شوال 1233ھ۔ 9/اگست 1818ء) کو وفات ہوئی، مولانا محبوب علی جعفری لکھتے ہیں:

"مات (الشیخ رفیع الدین) فی السادس من شوال سنۃ تسع و ثلاثین و مائتین و الف فی الوباء" (98)

عنبر خاں عنبر رامپوری نے تاریخ کہی:

سپہر معرفت مہر طریقت	مہہ اوج ہوا صندید باقی
نمایاں کوکب برج شریعت	فروزاں اختر امید باقی
بچرخ شرع حق نجم ہدایت	بشمس ورع نور دید باقی
بگردون طریقت طرفہ کوکب	بچرخ اتقا ناہید باقی
بافلاک علوم و دین و ملت	مضئی سیارہ تائید باقی

درخشاں آفتاب زہد و تقوی | رفیع الدین کہ شد جاوید باقی
جو از دور فلک زیر زمین شد | بود تاریخ او "خورشید باقی" (99)

چشمہ فیض (اعداد:1233) سے بھی سنہ وفات معلوم ہوتا ہے۔

ملفوظات شاہ عبدالعزیز کا مرتب جو رجب 1233ھ سے شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر تھا اور شاہ صاحب کے ملفوظات کی جمع و ترتیب میں مشغول تھا، وہ شاہ رفیع الدین کے مرض الموت، وفات اور تدفین اور اس حادثہ پر حضرت شاہ عبدالعزیز کے تاثرات کی دیدہ و شنیدہ تفصیلات ذکر کرتا ہے، (100) اس لئے مذکورہ بالا سنہ وفات بلا شک و شبہ صحیح ہے۔ اس سنہ کے علاوہ شاہ رفیع الدین کے سنہ وفات کی جو روایتیں نقل کی گئی ہیں مولوی فقیر محمد جہلمی اور رکن الدین نظامی نے 1238ھ لکھا ہے (101)، ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی 1249ھ کہتے ہیں (102) مگر یہ تمام روایات بے اصل اور بے پایہ اعتبار سے ساقط ہیں۔

ازدواج و نکاح

شاہ رفیع الدین کے تین نکاح ہوئے، پہلا اپنی ماموں زاد عارفہ بنت شاہ صدر العالم سے، زوجہ ثانیہ کا نام و نسب معلوم نہیں، تیسری بیوی کا نام کلو تھا مگر ان کا بھی نسب اور تفصیلات مفقود ہیں۔ شاہ صاحب کثیر الاولاد تھے۔ اہل پھلت کے نسب نامہ میں دس اولادوں کا ذکر ہے جو جوان اور صاحب اولاد تھیں۔ یہاں سب کا تذکرہ غیر ضروری ہے مگر دو بیٹوں اور ان کی اولاد سے صرف نظر کرنا غلط ہوگا۔ یہ فرزند مولوی محمد موسیٰ اور مولوی محمد حسین تھے۔ ان دونوں کے ذریعہ سے شاہ ولی اللہ کی پسری اولاد کا سلسلہ جاری رہا اور اس وقت تک اسی طرح پُر بہار و ثمر بار ہے۔

مولوی موسیٰ (از بطن زوجہ اولیٰ) نے دو نکاح کیے، پہلا کلثوم بنت شاہ عبدالغنی سے، ان سے ایک دختر فاضلہ پیدا ہوئیں، دوسرا سادات سونی پت میں امت السلام سے ہوا۔ ایک فرزند عبدالسلام، زوجہ ثانیہ سے تولد ہوئے جو 1293ھ تک حیات تھے۔ (103)

مولوی موسیٰ کی ایک دختر جو عبدالسلام کی ہمشیر تھیں، سید معز الدین سونی پتی سے منسوب ہوئیں، ان کے دو بیٹے تھے، سید معین الدین احمد اور سید ظہیر الدین احمد ولی اللہی (ناظر تصنیفات خانوادہ ولی اللہی و مؤسس مطبع احمدی دہلی) (104) دونوں اولاد نرینہ سے محروم تھے۔ اول الذکر کی ایک بیٹی امت العائشہ تھیں جو سید عبدالغنی سجادہ نشین درگاہ حضرت شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی کی والدہ ماجدہ تھیں۔ عبدالسلام کی اولاد کا سلسلہ خاصا وسیع اور 1947ء تک رواں دواں تھا مگر اس کے بعد سے ان کا حال معلوم نہیں کہ وہ سونی پت سے کب اور کہاں منتقل ہو گئے۔

مولوی محمد حسن کا نکاح پھلت میں ہوا۔ وہ اور ان کی اولاد پھلت میں مقیم رہے۔ ان کے فرزند مولوی احمد حسن بھی صاحب اولاد تھے۔ اخلاف شاہ کی یہ شاخ بھی ثمر دبار آور رہی اور اب تک شاداب پُر بہار ہے۔ مولوی احمد حسن کے پوتے پڑپوتے 1947ء کے بعد پاکستان چلے گئے تھے اور راولپنڈی میں مقیم ہیں (105)۔ راقم سطور کی معلومات کے مطابق مولوی احمد حسن کے اخلاف خاندان شاہ وجیہہ الدین کی واحد شاخ ہے جو اس وقت تک موجود ہے اور اس کا سلسلہ

نسب بیٹوں کے ذریعہ شاہ صاحب سے منسلک ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر

شاہ عبدالقادر کے سنہ ولادت کا معاصر تحریرات شاہ صاحب کے تلامذہ یا قریب العہد تذکرہ نگاروں نے کوئی ذکر نہیں کیا، غالباً اس ضمن میں اولین اطلاع سید احمد ولی اللہی کا یہ قول ہے کہ ’’آپ 1167ھ میں پیدا ہوئے‘‘(106) متاخر تمام تذکرہ نگار اسی روایت کے ناقل ہیں۔اوپر گزر گیا ہے کہ شاہ ولی اللہ کی وفات کے وقت شاہ عبدالقادر کی عمر نو سال تھی اور وہ قرآن شریف پڑھ رہے تھے۔تعلیم کی تفصیلات گزر چکی ہیں۔شاہ عبدالقادر نے درسیات شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین سے اخذ کیں، سلوک و معرفت میں خواجہ میر درد سے استفادہ کیا،(107) شاہ عبدالعدل(108) سے بیعت ہوئے اور اجازت وخلافت سے نوازے گئے۔(109)

شاہ عبدالقادر نے تریسٹھ سال کی عمر میں 19/رجب 1230ھ۔28/جون 1815ء کو بدھ کے دن ظہر کے اس دار فانی سے رحلت کی۔خانوادہ ولی اللہی پر قدیم یادداشت کا بیان ہے:

’’وفات شریف حضرت شیخ عبدالقادر قدس سرہ، نوزدہم رجب وقت ظہر روز چہارشنبہ 1230ھ۔‘‘(110)

مولانا محبوب علی جعفری نے بھی متعدد موقعوں پر شاہ صاحب کا سنہ وفات ذکر کیا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

”والشیخ عبدالقادر مات فی التاسع عشر من رجب سنة ثلاثین و مأتین و الف“(111)
(19/رجب 1230ھ)

’’آفتاب دیں برفت‘‘ سے سنہ وفات برآمد ہوتا ہے(112) بعض اور فقرات تاریخ بھی نقل کیے گئے ہیں مگر ان کے اعداد سنہ وفات سے مطابقت نہیں کرتے۔شاہ عبدالقادر کے سن وفات کی چند اور روایتیں بھی نقل کی جاتی ہیں۔جناب غلام رسول مہر نے 1228ھ سنہ وفات لکھا ہے(113)۔مفتی غلام سرور لاہوری اور مولوی ابو یحییٰ امام خاں نے 1242ھ بیان کیا ہے(114) اور مولوی ابو یحییٰ کی ایک اور تحریر سے اگر وہ سہو کتابت نہیں 1243ھ معلوم ہوتا ہے(115)، لیکن مستند معاصر تحریرات و مآخذ کی موجودگی میں ان روایات کی چنداں اہمیت نہیں۔

ازدواج و نکاح

شاہ عبدالقادر کی اہلیہ محترمہ کا نام معلوم نہیں ہوا۔شاہ صاحب کی واحد اولاد ایک صاحبزادی زینب یا زینت تھیں جو شاہ رفیع الدین کے صاحبزادے مولوی محمد مصطفیٰ تحیر سے منسوب ہوئیں(116)، ان کی بیٹی جمیلہ شاہ محمد اسمٰعیل شہید کے نکاح میں آئی۔(117)

حضرت شاہ عبدالغنی

معروف روایات کے مطابق (1171ھ-58-1757ء) میں پیدا ہوئے۔حضرت شاہ ولی اللہ کی وفات کے

وقت پانچ سال عمر تھی۔ اگرچہ درسیات کی تمام کتابیں بھائیوں سے پڑھیں مگر حدیث مسلسل باالاولیۃ کی اجازت اور سند خود حضرت شاہ ولی اللہ سے حاصل کی تھی، (117) (ب) حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی نے جو شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے رفیق و ہم سبق تھے، شاہ عبدالغنی سے مسلسل باالاولیۃ کی اجازت حاصل کی۔ مفتی صاحب کی بیاض میں یادداشت تحریر ہے:

حدیث مسلسل بالاولیه: وهو اول ما سمعته من الحدیث، حدثنا الشیخ عبدالغنی رحمه الله عن ابیه الشاه ولی الله المحدث وهو اول ما سمعة منه، وهویروی (عن) السید عمر بن بنت الشیخ عبدالله البصری المکی" (118)

مفتی الٰہی بخش کے ذریعہ اس سلسلہ سند کا فیضان عام ہوا، مفتی صاحب سے مولانا محمد حسن رامپوری کو اجازت و سند ملی، مولانا محمد حسن سے مولانا شیخ محمد تھانوی کو پہنچی۔ مولانا شیخ محمد نے لکھا ہے:

"الحدیث المسلسل بالاولیة من الاساتذہ رحمهم الله هو اول حدیث سمعته من افضل الزمن الفاضل الکامل شیخنا و استاذنا مولانا محمد حسن انصاری رامغوری، وهو اول ماسمعه من شیخه الفاضل البارع الکامل الداعی الی طریق رب العرش مولانا مفی الهی بخش الجهنجهانوی ثم الکاندهلوی، قال حدثنی الشیخ عبدالغنی ولد المحدث الدهلوی الحافظ الحاکم مولانا احمد المعروف بشاه ولی الله. الخ "(119)

شاہ عبدالغنی کا سنۂ وفات

شاہ عبدالغنی جو اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے، سب سے کم عمر پائی۔ نوجوانی میں تینتیس سال کی عمر میں وفات پا گئے تھے۔ شاہ صاحبان کی قریب العہد تحریرات شاہ عبدالغنی کے سنہ وفات کے تذکرہ سے خاموش ہیں۔ خانوادہ ولی اللٰہی ہر قدیم یادداشت میں شاہ عبدالغنی کے مدفن کا ذکر ہے مگر اس میں بھی تاریخ درج نہیں۔

تاریخ وفات ایشاں کے بعد بیاض چھوٹی ہوئی ہے، (120) اور مولانا جعفری نے بھی جو شاہ اسمٰعیل شہید کے رفیق سبق تھے۔ شاہ عبدالغنی کا سنہ وفات ذکر نہیں کیا، یہ کہہ کر گزر گئے کہ "وہ اپنی والدہ ماجدہ اور بھائیوں کی زندگی میں انتقال کر گئے تھے۔" (121)

"تاریخ الائمہ" کی تالیف کے بعد ایک طویل عرصہ تک کسی مؤرخ و تذکرہ نگار نے ان کے سنہ کا ذکر نہیں کیا نہ ان کے لوح مزار پر سنہ وفات کندہ ہوا۔

مولوی شاہ محمد اکبر ابوالعلائی داناپوری (رجب 1311ھ۔ جنوری 1894ء) میں دہلی گئے تھے۔ اس وقت قبرستان مہندیاں میں خاندان شاہ ولی اللہ کے جن مزارات پر کتبات نصب تھے ان میں شاہ عبدالغنی کا نام شامل نہیں، (122) مولوی داناپوری کے سفر کے ایک سال بعد رجب 1312ھ۔ جنوری 1895ء میں مولانا عبدالحئ حسنی مؤلف "نزہۃ

الخواطر'' مہندیاں پہنچے۔ مولانا حسنی نے بھی ان بزرگوں کے مزارات پر تحریر (کتبہ) ہونے کی اطلاع دی ہے[123] مگر اس فہرست میں بھی شاہ عبدالغنی کے لوح مزار کا ذکر نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت تک شاہ عبدالغنی کا سنہ وفات نامعلوم تھا ورنہ ممکن نہیں تھا کہ دوسرے بزرگوں کے ساتھ ان کے مزار پر کتبہ نصب نہ کیا جاتا۔

شاہ عبدالغنی کے سنہ وفات کی روایات میں سب سے پہلی اطلاع سید احمد ولی اللہی کا یہ قول ہے کہ

''1227ھ میں 57 برس کی عمر میں وفات پائی، اور شاہ عبدالقادر کے متصل مدفون ہوئے''[124]

اکثر تذکرہ نگاروں نے اسی پر اعتماد کیا ہے[124] (ب) مگر یہ روایت پایہ اعتبار سے ساقط اور خلاف تحقیق ہے کیونکہ خود ولی اللہی چند ہی سطر پہلے شاہ عبدالقادر کا سنہ وفات 1230ھ لکھ چکے ہیں[125] لہٰذا یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ شاہ عبدالغنی، شاہ عبدالقادر کی وفات سے تین سال پیشتر ان کے متصل دفن کیے گئے ہوں۔ دستیاب شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ کی وفات (1176ھ) کے بعد ان کے صاحبزادگان میں سے سب پہلے سب سے چھوٹے فرزند شاہ عبدالغنی کی صحیح تاریخ وفات میں اختلاف ہوسکتا ہے مگر سید احمد ولی اللہی کا مذکورہ بالا قول کہ ان کی وفات 1227ھ میں ہوئی کسی طرح قابل قبول اور لائق اعتماد نہیں، کیونکہ خانوادہ ولی اللہی کے قدیم و جدید تقریباً تمام تذکرہ نگاروں کا اس پر اتفاق ہے کہ جس وقت شاہ عبدالغنی کی وفات ہوئی تو ان کے بیٹے شاہ محمد اسمٰعیل کم سن تھے۔ والد کی وفات کے بعد چچا یعنی حضرت شاہ عبدالقادر نے شاہ اسمٰعیل کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی۔ اس سلسلہ کی غالباً سب سے پہلی اطلاع مولانا محبوب علی جعفری کا (جو شاہ اسمٰعیل کے بچپن سے ہم جولی اور ہم سبق تھے) یہ بیان ہے کہ:

''و (للشیخ عبدالغنی) ابن اسمہ اسمٰعیل و بنتین رقیہ و ام کلثوم و وصی بھم اخاہ عبدالقادر فرباھم کاولادہ''[126]

اگر شاہ عبدالغنی کی وفات 1227ھ میں ہوئی ہوتی تو اس وقت اس وصیت کی ضرورت تھی نہ موقع، کیونکہ تذکرہ نگاروں کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ شاہ اسمٰعیل 1193ھ میں پیدا ہوئے[127]، گویا 1227ھ میں ان کی عمر چونتیس سال تھی، اور وہ اس وقت درس و تدریس اور وعظ و تذکیر کے ذریعہ اپنی ذہانت و ذکاوت، حسن تقریر اور خوش نوائی کا جادو جگائے ہوئے تھے اور ان کی شہرت و قابلیت کا چرچا دور دور تک پھیل چکا تھا، لہٰذا معلوم ہوا کہ ولی اللہی کی شاہ عبدالغنی کے سنہ وفات کے متعلق اطلاع کمزور اور بے اصل ہے۔ اور یہ روایت اس لئے بھی قرین صحت نہیں کہ مولانا جعفری نے جو شاہ صاحبان کی خدمت میں ہر وقت حاضر باش اور شاہ عبدالقادر کے خاص ارادت مند تھے۔ 1227ھ میں دہلی میں مقیم تھے اور مولانا جعفری نے اس سال کے بعض وقائع کا ذکر کیا ہے اور ایک موقع پر یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا اسمٰعیل شہید 1227ھ میں حضرت سید احمد شہید سے بیعت ہوئے،[128] اگر شاہ عبدالغنی کی وفات 1227ھ میں ہوئی ہوتی تو مولانا جعفری اس سے ہرگز ناواقف نہ ہوتے اور اپنی کتاب میں اس کا ذکر ضرور کرتے۔ مولانا جعفری کے تذکرہ نہ کرنے سے یہ سمجھنا غلط نہ ہوگا کہ شاہ عبدالغنی کی وفات کا واقعہ مولانا جعفری کی شاہ عبدالعزیز اور ان کے برادران کی خدمت میں حاضری سے بہت پہلے کا ہے، کم از کم اس وقت کا نہیں ہے جو سید احمد ولی اللہی بیان کرتے ہیں۔

ولی اللہی کے بیان کا ایک کمزور پہلو یہ ہے کہ وہ گویا ''یادگار دہلی'' کی تالیف کے زمانہ میں اپنی ایک اور کتاب

''احوال وکمالات عزیزی'' میں یہ لکھ چکے تھے کہ شاہ عبدالغنی کا حال اچھی طرح معلوم نہیں، (129) اور ساتھ ہی ''یادگار دہلی'' میں تفصیلات بھی درج کرر ہے ہیں۔ ایسا اندازہ ہے کہ اس اطلاع کے لئے خود ولی اللہی کے پاس بھی کوئی قابل اعتماد بنیاد نہیں تھی، اور یہی وجہ ہے کہ ''حیات ولی'' کے مؤلف رحیم بخش نے شاہ عبدالغنی کے تذکرہ میں یہ الفاظ لکھے:

''مجھے افسوس ہے کہ جناب شاہ عبدالغنی کے حالات زندگی کسی ایسے وسیلے سے دستیاب نہیں ہوئے جنہیں میں بے کم وکاست یقین کرسکتا، یہی وجہ ہے کہ میں ان واقعات کو بالکل قلم انداز کرتا ہوں۔''

حالانکہ مولوی رحیم بخش دہلی میں سید احمد ولی اللہ کے پڑوس میں رہتے تھے، وہ ولی اللہی اور ان کی تصنیفات سے ناواقف نہ ہوں گے۔

اس تعارف کے باوجود اس قسم کے الفاظ کا لکھنا بتا رہا ہے کہ مؤلف ''حیات ولی'' کو اس سلسلہ میں ولی اللہی کے بیانات وروایات پر اعتماد نہیں۔

شاہ عبدالغنی کے سنہ وفات کی ایک اور روایت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کا یہ قول ہے کہ:

''شاہ عبدالغنی بن شاہ ولی اللہ 28 برس کی عمر میں اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔''(130)

یعنی تقریباً (1198ھ۔84-1783ء) میں۔ ممکن ہے یہ روایت صحیح ہو مگر کسی اور ذریعہ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔

شاہ صاحب کے سنہ وفات کی تیسری روایت جناب غلام رسول مہر (131) اور مولانا نسیم احمد فریدی (132) کا یہ انکشاف ہے کہ شاہ صاحب کی 16/رجب 1203ھ۔12/اپریل 1789ء کو رحلت ہوئی۔ مہر صاحب کا ماخذ ہمیں معلوم نہیں، مگر مولانا فریدی نے یہ اطلاع ایک پرانی تحریر سے اخذ کی ہے جو مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کے نجی ذخیرہ نوادر میں محفوظ ہے۔ تاہم یہ عنوان مزید تحقیق وجستجو کا منتظر ہے، مگر فیصلہ کن مآخذ کی دریافت تک اسی مؤخر الذکر روایت پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

ازادوج ونکاح

مولوی علاء الدین پھلتی کی دختر بی بی فضیلت شاہ عبدالغنی سے منسوب ہوئی، دو لڑکیاں رقیہ اور ام کلثوم، اور ایک با اقبال وفخر روزگار فرزند حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید جسمانی یادگار تھے۔ شاہ محمد اسماعیل کا مولوی محمد مصطفیٰ کی دختر جمیلہ سے نکاح ہوا جو شاہ عبدالقادر کی نواسی تھیں۔ ایک فرزند مولوی محمد عمر تھے جو 1268ھ میں لاولد فوت ہوئے۔

حواشی

(1) شاہ ولی اللہ، مقدمہ مصفی شرح مؤطا، ص 17، ج 1 (بیروت: 1403ھ) نیز دیکھیے الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ ص 2، (مطبع احمدی دہلی: 1311ھ)۔

(2) الامداد فی مآثر الاجداد۔ غالباً حضرت شاہ ولی اللہ کے سفر حج سے پہلے مرتب ہوئی۔ ''انفاس العارفین'' میں شامل ہے، مگر اس رسالہ کو ایک تاریخی دستاویز کے بجائے خاندانی روایات و یادداشت کے طور پر دیکھنا چاہیے۔ ''انفاس العارفین'' میں شامل اور علیحدہ بھی متعدد خطی نسخے دستیاب ہیں، کئی بار شائع ہو چکا ہے۔ صحیح ترین نسخہ مطبع احمدی دہلی کا وہ ایڈیشن ہے جو شاہ ولی اللہ کے رسائل کے مجموعہ میں شامل ہے اور ''انفاس العارفین'' مطبوعہ مجتبائی دہلی 1335ھ کثیر الغلط ہے۔ ''الامداد'' کے متعدد ترجمہ بھی ہوئے ہیں۔ راقم سطور کی معلومات میں ایوب قادری صاحب کا ترجمہ سب سے بہتر ہے مگر تعجب ہے کہ قادری صاحب نے مجتبائی نسخہ کو اساس بنایا ہے۔ راقم سطور نے ''الامداد'' کے متعدد نسخوں سے استفادہ کیا ہے۔

(3) الامداد فی مآثر الاجداد (مشمولہ رسائل خمسہ شاہ ولی اللہ) (احمدی دہلی: بلاسنہ)۔ نیز دیکھیے الامداد مشمولہ انفاس العارفین ص 152 (احمدی دہلی: بلاسنہ) خاندان ولی اللہی کا یہی نسب نامہ ''مرأة الانساب'' میں بھی شامل ہے مگر اس میں کئی غلطیاں ہوگئی ہیں۔ ماہان کی جگہ ہامان لکھا ہے۔ محمد شہریار بن عثمان کو محمد بن شہریار بن عثمان دکھایا ہے۔ اس ترتیب سے ایک واسطہ زیادہ ہو گیا ہے اور عمر حاکم ملک اور فاروق کے درمیان عادل ملک کا واسطہ ترک ہوا۔ اس طرح یہ نسب نامہ مشکوک ہو گیا ہے۔ دیکھیے مرأة الانساب، تالیف ضیاء الدین علوی۔ ص 38-39 (جے پور: 1335ھ)

(4) الامداد فی مآثر لاجداد۔ مشمولہ انفاس العارفین (مجتبائی دہلی: 1335ھ)

(5) الامداد مشمولہ انفاس العارفین۔ مکتوبہ سنہ 1239ھ ص 122 (مخزونہ دار العلوم، دیوبند)۔

(6) دیکھیے تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الامہ، مولانا سید محبوب علی جعفری دہلوی۔ نسخہ مؤلف مکتوبہ و مؤلفہ سنہ 1251ھ، (مخزومہ ہمدرد اسلامک انسٹی ٹیوٹ دہلی۔ فوٹو اسٹیٹ کاپی مملوکہ راقم سطور) ص 589، 607۔ صفحات کی یہ ترتیب ہمارے نسخہ کے مطابق ہے۔

(7) جناب محمود احمد عباسی نے اس نسب نامہ کو جوں کا توں نقل کر دیا ہے۔ تحقیق الانساب حاشیہ ص 284 (دہلی: 1952ء)

(8) ابن حزم ظاہری، جمہرة الانساب، ص 153 (بیروت: 1403ھ)

(9) مولانا جعفری کا بیان ہے کہ شاہ عبدالرحیم سے منسوب ایک خط میں بھی نسب نامہ کے آخری وسائط اسی طرح لکھے ہیں جس طرح ''الامداد'' میں ہیں۔ تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الامہ۔

(10) شاہ ولی اللہ، امداد مشمولہ خمسہ ص 2۔

(11) شروانی، عبدالشاہد: باغی ہندوستان۔ ص 66 (لاہور: 1978ء)۔ نیز دیکھیے: العلامہ فضل حق خیر آبادی حیاتہ و مآثر مع تحقیق کتابہ الثورة الہندیہ۔ ڈاکٹر قمر النساء ص 32-33 (لاہور: 1976ء)۔ لیکن مولوی عبدالشاہد کی اکثر اطلاعات زبانی روایات پر مبنی ہیں، ان کی تاریخی استنادی حیثیت خاصی مشتبہ ہے۔ ضرورت ہے کہ ان تمام روایات کا مفصل تنقیدی جائزہ لے کر خانوادہ خطیر الملک اور خاندان شیر ملک کے باہمی رشتوں کی تحقیق و جستجو کی جائے اور دونوں خاندانوں کے اسلاف کی خدمات اور تاریخ کو اور زیادہ واضح اور نمایاں کیا جائے مگر افسوس کہ حضرت علامہ خیر آبادی اور ان کے باکمال اہل خاندان پر اس وقت تک جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سب عبدالشاہد خاں کی صدائے بازگشت اور ''باغی ہندوستان'' کی ناقص معلومات کی تکرار ہے۔ کاش اس خاندان میں ان کے شایان شان کچھ کام ہوا ہوتا۔

(12) مولانا سید محبوب علی بن مصاحب علی جعفری دہلوی۔ ریواڑی (میوات) کے قدیم باشندے اور سادات کے اس قدیم خاندان کے چشم و چراغ تھے جن کا سلسلہ روابط میوات سے دہلی اور سونی پت تک پھیلا ہوا تھا۔ 27 محرم 1201ھ کو تولد ہوئے (تاریخ الائمہ ص 743) شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر سے تعلیم حاصل کی۔ شاہ محمد اسماعیل شہید کے رفیق و ہم سبق تھے۔ سلوک و

معرفت میں شاہ عبدالقادر سے استفادہ کیا۔ شاہ عبدالعزیز سے اجازت وخلافت پائی۔ اولاً سید احمد شہید کے پُر جوش معاون تھے۔ جہاد میں شرکت کے لئے شعبان 1242ھ صوبہ سرحد کے لئے روانہ ہوئے، وہاں قیام کا کچھ زیادہ موقع نہیں ملا تھا کہ بعض مسائل پر سید احمد شہید سے اختلاف ہوا اور شروع سنہ 1243ھ میں دہلی واپس آ گئے۔ اختلاف کی تفصیل کا یہ موقع نہیں مگر یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس کی بنیاد ذاتی وجوہات تھیں۔ مولانا جعفری کے خلاف مزاج بعض واقعات کی وجہ سے اس میں تیزی آئی اور یہ واپسی کا سبب ہوئی، اگرچہ مولانا نے دہلی آ کر جہاد کی برملا مخالفت کی مگر شاہ اسمٰعیل شہید کی دعوت اصلاح وتجدید اور رد بدعات کے آخر وقت تک مناد ومبلغ رہے۔ اس موضوع پر کئی کتابیں لکھیں۔ ''تقویۃ الایمان'' کا حاشیہ تصنیف کیا، مولانا شہید پر کیے گئے اعتراضات کے جواب دیئے اور تفسیر وفقہ کے موضوعات پر متعدد تصنیفات یادگار چھوڑیں۔

مولانا کا سب سے اہم مہتم بالشان کارنامہ ''تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الامہ'' کی تالیف وتدوین ہے۔ اس کتاب میں پہلی صدی ہجری سے مصنف کے زمانہ تک کے علماء، صلحاء اور سلاطین کے مختصر حالات قلم بند کیے گئے ہیں۔ خاندان شاہ ولی اللہ کے متعلق بعض نادر معلومات اور انساب کے بعض مباحث اس کتاب کا خاص حصہ ہیں۔ یہ کتاب عربی میں 932 صفحات پر مشتمل ہے۔ رمضان سنہ 1251ھ جنوری۔1836ء میں اس کی تصنیف وکتابت مکمل ہوئی اور اس کا واحد معلوم نسخہ جو مؤلف کے قلم سے ہے، ہمدرد اسلامک انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے مچھلی شہر کلکشن میں محفوظ ہے اور اس کا مکمل فوٹو اسٹیٹ ہمارے ذخیرہ میں شامل ہے۔ مولانا جعفری کی (10/ذی الحجہ 1280ھ۔17/مئی 1864ء) کو دہلی میں وفات ہوئی۔ یادگار دہلی، سید احمد ولی اللہی ص 92 اور نزہۃ الخواطر، مولانا سید عبدالحی حسنی رائے بریلوی ص 406، ج7 (حیدر آباد: 1378ھ) میں مولانا کا مختصر تذکرہ ملتا ہے۔

(13) میر محبوب علی جعفری دہلوی: تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الامہ، ص 608۔ فاروقیان خیر آباد میں معروف اس روایت سے مولانا جعفری کی تائید ہوتی ہے کہ ''خطیر الملک بلخی از بلخ بہ بدایوں تشریف آوردند'' (مستفاد از مکتوب مولانا نجم الحسن خیر آبادی، بنام راقم سطور محررہ 18/دسمبر 1986ء)

(14) شیخ شہاب الدین فرخ شاہ کابلی کے لئے جو فاروقیان ہند کے ایک وسیع اور لائق احترام سلسلہ کے جداعلیٰ ہیں، کہا جاتا ہے کہ وہ کابل میں سریرآرائے حکومت تھے۔ مگر بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی: ''تاریخ اس فرخ شاہ پر کوئی روشنی نہیں ڈالتی لہٰذا اس کا مقام اور حیثیت ایک افسانہ بن کر رہ گیا ہے۔'' احوال وآثار شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر۔ ترجمہ قاضی محمد حفیظ اللہ ص 44 (لاہور: 1430ھ)

(15) تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الامہ ص 608

(16) آقائی عبدالحی حبیبی، افغانستان بعد از اسلام۔ جلد اول (کابل: 1345ھ) آقائی حبیبی نے لکھا ہے: والی سیستان وخراسان وہرات از دربار ہارون، در سنہ 180ھ۔ ص 413، ج1۔ نیز کہتے ہیں ''سکہ ہم دارد''۔ ص 414

(17) مثلاً: ابراہیم بن ہامان بن بہمن بن نسک (م سنہ 188ھ) یعقوب سیرافی ابن ماہان۔ ابومحمد عبداللہ بن حامد بن محمد ماہان اصبہانی (م سنہ 389ھ)۔ ابوالحسین محمد بن حسین بن محمد بن ماہیان (م۔334ھ) نیز ابوجعفر عیسیٰ بن ماہان رازی (م۔160ھ) ان کا بیٹا علی (م سنہ 195ھ) اور پوتا حسین (م196ھ) سب ابن ماہان کی کنیت سے متعارف ہیں۔ ان کے علاوہ بھی متعدد مشاہیر اسی کنیت سے مشہور ہیں۔

(18) ''هذه النسبة الى ماهان وهم اسم لبعض اجداد المنتسب اليه وهم جماعة''۔ الانساب، سمعانی ص 61، ج12 (حیدر آباد: 1401ھ)

(19) الامداد فی مآثر الاجداد (مشمولہ رسائل خمسہ) ص2

(20) ''امراء کے طبقوں میں خان کا مرتبہ سب سے زیادہ، اس سے کم ملک اور اس سے کم امیر کا سمجھا جاتا تھا۔ صاحب ''مسالک الابصار'' کی تحقیق کے مطابق خان کو زیادہ سے زیادہ نو جھنڈے اور امیر کو کم از کم تین جھنڈے ساتھ رکھنے کا حق تھا۔ فوج کی تقسیم میں امیر کے تحت سو سوار ہوتے تھے۔ ملک کے تحت ایک ہزار اور خان کے تحت دس ہزار۔'' تاریخ فیروز شاہی برنی اردو ترجمہ ڈاکٹر معین الحق۔ حاشیہ ص72 و ص112 (لاہور: 1983ء)

(21) الامداد ص2

(22) مولوی رضی الدین بسمل بدایونی، کنز التاریخ (تاریخ بدایوں)۔ ص53

مگر مولوی رضی الدین نے اولیائے بدایوں پر اپنی کتاب ''تذکرۃ الواصلین'' (بدایوں: 1945ء) میں شیخ حسام الدین کا قطعاً کوئی ذکر نہیں کیا۔

(23) اگرچہ ساتویں صدی ہجری کے اواخر میں بدایوں میں حسام الدین نامی دو اور شخصوں کا ذکر ملتا ہے: شیخ جمال حسام الدین ملتانی متوفی سن 687ھ۔ 1288ء۔ سیر العارفین شیخ جمالی، ترجمہ پروفیسر محمد ایوب قادری ص194 (لاہور: 1976ء) اور ضیاء الدین برنی کے نانا حسام جو بدایوں میں مقیم رہے اور برنی (ولادت تقریباً 684ھ) کے سن شعور تک حیات رہے۔ برنی ان کے حوالہ سے بعض روایات نقل کرتا ہے، مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کی تعمیر کا عہد ان لوگوں سے پہلے کا ہے اس لئے کم سے کم یہ دونوں اس مسجد کے بانی نہیں ہو سکتے۔

(24) محمد قاسم، فرشتہ، تاریخ فرشتہ، اردو ترجمہ ص97، ج1 (نولکشور لکھنؤ: 1933ء)

(25) پروفیسر خلیق احمد نظامی، تاریخی مقالات، ص40-41 (دہلی: 1385ھ)

(26) الامداد فی مآثر الاجداد، ص2

(27) پروفیسر منظور الحق صدیقی، ہادی ہریانہ (احوال و سوانح شاہ محمد رمضان مہمی)، ص10، (لاہور: 1963ء)

(28) الامداد، ص6

(29) یہ یادداشت خانوادہ ولی اللہی کے متعلق معلومات پر مشتمل ہے اور سنہ 1230۔ 1233ھ کے درمیان کسی وقت مرتب ہوئی۔ اگرچہ اس کے مرتب کا نام معلوم نہیں مگر وہ اس خاندان سے وابستہ یا اس کے قریب ترین واقفین میں سے ہے۔ اس یادداشت کے دو نسخے راقم سطور کی نظر سے گزرے ہیں۔ ایک کتب خانہ مظاہر علوم سہارن پور میں اور ایک ہمدرد انسٹی ٹیوٹ لائبریری دہلی میں۔ اول الذکر نسخہ ''مجموعہ فتاویٰ و تحریرات حضرت شاہ عبدالعزیز وغیرہ اخلاف شاہ ولی اللہ''۔ مرتبہ کریم اللہ بن خلیل اللہ ڈار۔ مؤلفہ سنہ 1240ھ میں شامل ہے۔ زیر تعارف نسخہ فلسکیپ سائز کے پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے اور میرا خیال ہے کہ خود مؤلف کے قلم سے ہے۔ اس کتاب کے بعض مشتملات کا فوٹو اسٹیٹ جس میں مذکورہ یادداشت بھی شامل ہے، ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے۔ نسخہ ثانی ''مجموعہ فتاویٰ شاہ عبدالعزیز''۔ مکتوبہ مولانا محمد مچھلی شہری (م سنہ 1320ھ) میں شامل ہے۔ ورق 47-48۔ زیر نظر صفحات ترتیب میں اول الذکر نسخہ سے استفادہ ہوا ہے اور صفحات کی ترتیب مخطوطہ کے صفحات کی مسلسل ترتیب کے مطابق ہے۔

(30) تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الامہ ص589

(31) واقعات دار الحکومت دہلی۔ مولوی بشیر الدین احمد ص323، ج3۔ (آگرہ: 1337ھ)۔ مولوی بشیر الدین احمد نے جلال تبریزی نامی جس بزرگ کا ذکر کیا ہے وہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے خلیفہ شیخ جلال تبریزی کے علاوہ کوئی گمنام بزرگ تھے،

مؤخر الذکر اگرچہ دہلی اور بدایوں میں قیام فرمار ہے مگر ان کی وفات کامروپ (آسام) میں ہوئی۔ ابن بطوطہ اپنے سفر کے دوران کامروپ میں ان سے ملا تھا۔ سفرنامہ ابن بطوطہ مع حواشی و تعلیقات خان بہادر محمد حسین ص 83-386 (اسلام آباد: 1983ء)

(32) احمد علی خیر آبادی کا قول ہے کہ اس جگہ ایک قبر مولانا علاء الدین کرمانی سرسوی کی ہے۔ قصر عارفاں، موتبہ ڈاکٹر محمد باقر ص 386، اورینٹل کالج میگزین۔ لاہور 66-1965ء

(33) محمد ادریس خاں بریلوی، مہرولی گائیڈ، ص 255 (بریلی: بلاسنہ)

(34) ہادی ہریانہ، پروفیسر منظور الحق صدیقی، ص 19-20، (لاہور: 1963ء)۔ صدیقی صاحب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شاہ صاحب کا خاندان آخری دور میں رہتک میں بھوانی بس اڈہ کے پاس گلی مسجد عاشق الٰہی میں رہا کرتا تھا۔

(35) تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الامہ ص 588

(36) الامداد فی مآثر الاجداد، ص 2-3

(37) تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الامہ، ص 589

(38) ترجمہ الامداد فی مآثر الاجداد بحواشی و توضیحات پروفیسر محمد ایوب قادری۔ ماہنامہ الرحیم۔ حیدر آباد سندھ، ص 15 (جون: 1967ء)

(39) اکبر شاہ خان نجیب آبادی، الجزء اللطیف بحوالہ مرقاۃ الیقین فی حیاۃ نور الدین، ص 80، مشمولہ انفاس العارفین، ص 202، (مجتبائی: 1335ھ)

(40) شاہ عبدالرحمٰن خلف شاہ محمد عاشق پھلتی، مرتبہ مجموعہ مکتوب شاہ ولی اللہ۔ مکتوب نمبر 167۔ مخزونہ کتب خانہ دارالعلوم۔ دیوبند، (فوٹو اسٹیٹ کاپی مملوکہ راقم سطور)۔ یہ مجموعہ مکتوبات دو جلدوں میں ہے۔ جلد اول شاہ عبدالرحمٰن کی مرتبہ و مؤلفہ ہے جلد دوم شاہ محمد عاشق کی تالیف ہے۔ جلد اول 281 مکتوبات پر مشتمل ہے۔ دوسری جلد میں ستتر خطوط آئے ہیں۔

(41) حکیم احمد صاحب برکاتی نے لکھا ہے: ''شیخ عبید اللہ کی ایک صاحبزادی فاطمہ اور ایک صاحبزادہ شاہ محمد عاشق تھے۔ فاطمہ سے شاہ ولی اللہ کی شادی ہوئی اور ان سے صرف ایک صاحبزادہ شیخ محمد پیدا ہوا'' شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان، ص 20 (لاہور: 1976ء) مگر یہ اطلاع درست نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ شاہ صاحب کی زوجہ اولیٰ کا نام امت الرحیم اور ایک صاحبزادی کا نام فاطمہ تھا۔ منشی فرحت اللہ پھلتی نے بھی یہی لکھا ہے اور اہل پھلت کے قلمی نسب ناموں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے اور اس کی جزوی تصدیق خود شاہ صاحب کے مکتوبات سے ہو رہی ہے۔

(42) یہ خاندان سادات حسینی کی ایک شاخ اور سید ناصر الدین سونی پتی کی اولاد میں ہے، مگر خود سید ناصر الدین کا عہد اور ان کے حضرت حسین کے درمیان وسائط معلوم نہیں۔ احمد علی خیر آبادی نے سید ناصر الدین کے متعلق ایک طویل داستان لکھی ہے اور ان کو حضرت باقر بن زین العابدین کا بلا واسطہ فرزند قرار دیا ہے اور ان کا سنہ وفات سنہ 146ھ لکھا ہے۔ قصر عارفاں ص 279، 292۔ نیز دیکھیے میخانہ درد، سید ناصر نذیر فراق دہلوی ص 214-225 (دہلی: 1344ھ) مگر خیر آبادی کی یہ روایت مسلمہ تاریخی شہادتوں اور اہل سیر کی تصریحات کے خلاف ہے۔ ملاحظہ ہو: تاریخ دعوت و عزیمت: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ص 6-107، (لکھنؤ: 1404ھ)

(43) خاندان شیر ملک اور سادات سونی پت نکاح و ازدواج کے سلسلہ سے مربوط تھے۔ ان کی ابتدا کب ہوئی صحیح معلوم نہیں مگر دسویں صدی ہجری میں شیخ احمد بن محمود کا شاہ عبدالغنی سونی پتی کی دختر سے نکاح ہوا اور اس کے بعد خاندان ولی اللہی کے آخری معلوم عہد

تک دونوں خاندانوں میں قرابت اور ازدواج و نکاح کے روابط تھے۔

(44) الف شاہ صاحب نے "تفہیمات الٰہیہ" میں شاہ نور اللہ کو ایک ضرورت سے سونی پت بھیجنے کا ذکر کیا ہے ص 152، ج 2 (بجنور 1355ھ) ممکن ہے اس معاملہ سے اسی رشتہ کی سلسلہ جنبانی مراد ہو۔

(44) ب عبدالرحیم ضیا نے "مقالات طریقت" میں (مضمون جناب عضد الدین خاں۔ الفرقان لکھنؤ ص 16، رجب 1985ء) اور مولانا عبدالحی حسنی نے سید احمد ولی اللہی کے حوالہ سے بی بی ارادت کے والد ماجد کا نام سید ثناء اللہ لکھا ہے۔ دلی اور اس کے اطراف ص 68 (دہلی: 1958ء) مگر یہ روایات صحیح نہیں۔ خانوادہ ولی اللہی ص 68 پر قدیم یادداشت میں شاہ صاحب کی زوجہ ثانیہ کو دختر سید حامد لکھا ہے اور سید احمد ولی اللہی نے بھی بقول حکیم محمود احمد صاحب برکاتی (شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان ص 149) یہی لکھا ہے۔

(45) شاہ ولی اللہ نے شاہ عبدالرحیم کے حوالہ سے شرح جامی کی ایک بحث کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "و بشیخ حامد تقریر کردم" انفاس العارفین ص 30 (مجتبائی)

(46) شاہ فخر العالم صاحب علم و ارشاد بزرگ تھے۔ انہوں نے اپنے والد ماجد کے مکتوبات کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے "شوارق المعرفۃ" میں شاہ ابوالرضا محمد کے جو مکتوبات نقل کیے ہیں وہ اس مجموعہ سے ماخوذ ہیں۔ اس مجموعہ مکتوبات کا واحد معلوم نسخہ شاہ محمد عاشق کے موئے قلم کی یادگار ہے اور اس کا فوٹو اسٹیٹ ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے۔

(47) حکیم محمود احمد برکاتی، شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان، ص 126، 146

(48) ملفوظات شاہ عبدالعزیز: ص 109 (میرٹھ: 1314ھ) سید احمد ولی اللہی نے ملفوظات شاہ عبدالعزیز احمد خانوادہ ولی اللہی سے منسوب بعض تصنیفات کو جعلی قرار دیا ہے۔ (انفاس العارفین۔ مطبع احمد، دہلی)، گذشتہ چند سال میں ولی اللہی کے اس بیان کی خاص شہرت ہوئی۔ بعض اہل قلم نے اس اشتہاری تحریر کو غیر معمولی اہمیت سے نوازا اور اس کے حوالہ سے عجیب و غریب انکشافات کا سلسلہ شروع کیا ہوا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ولی اللہی کی یہ تحریر صرف معاصرانہ رقابت اور تجارتی چشمک پر مبنی ہے اور اس کی کوئی حقیقی علمی بنیاد موجود نہیں۔ تفصیلات ایک مستقل مقالہ کی متقاضی ہیں۔ زیر نظر سطور اس کا محل نہیں۔

(49) مضمون۔ مولانا نسیم احمد صاحب فریدی۔ الفرقان لکھنؤ

(50) عبدالرحمٰن، مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ، مکتوب نمبر 167

(51) تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الامہ ص 747

(52) مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ۔ مکتوب 167

(53) مکتوب بنام راقم سطور۔ محررہ 7 صفر سنہ 1407ھ۔ بحوالہ القول الجلی۔ "القول الجلی فی مناقب الولی" کا مکمل نسخہ مکتوبہ 1229ھ خانقاہ کاظمیہ قلندریہ میں موجود ہے۔ اس نسخہ کے تعارف کے لئے دیکھیے مضمون: جناب ندیم حیدر کاکوروی۔ ماہنامہ قاری، دہلی فروری: 1986ء اور ایک ناقص نسخہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں ہے۔ مفصل تعارف کے لئے مطالعہ کریں۔ مضمون: جناب فضیل احمد قادری، ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ۔ (شوال۔ جون 1407ھ۔ 1987ء)

(54) تذکرۃ الرشید (سوانح حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی) حاشیہ ص 30، ج 1 (سہارنپور 1977ء)

(55) مضمون جناب عضد الدین خاں۔ الفرقان لکھنؤ ص 16 (رجب 1385ھ)

(56) مکتوب شاہ ولی اللہ بنام شاہ محمد عاشق۔ بیاض مولانا رشید الدین دہلوی۔ ورق 9 ب (مخزونہ دارالعلوم دیوبند۔ فوٹو اسٹیٹ کاپی مملوکہ راقم سطور) نیز دیکھیے: حیات ولی، مولوی رحیم بخش دہلوی ص 290 (دہلی: 1319ھ)

(57) غلام رسول مہر، سید احمد شہید، ص 115، ج 1۔ (لاہور طبع اول۔ بلاسنہ) نیز سیرت حضرت سید احمد شہید، مولانا سید ابوالحسن علی

ندوی، ص156، ج1 (لکھنؤ:1397ھ)

(58) شاہ محمد عاشق، مکتوبات شاہ ولی اللہ حصہ دوم، مکتوب نمبر 12 ورق نمبر 6 (نسخہ مولف، مخزونہ دار العلوم دیوبند۔ فوٹو اسٹیٹ کاپی مملوکہ راقم سطور)۔

(59) یادداشت، مشمولہ مجموعہ تحریرات وفتاویٰ خانوادہ ولی اللہی، ص472

(60) تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الامہ، ص551 و591

(61) مکتوب بنام شاہ محمد فایق۔ بیاض مولانا رشید الدین دہلوی۔ ورق 13، الف۔

(62) اس رسالہ کا شاہ صاحب کے تذکرہ نگاروں نے ذکر نہیں کیا۔ اس کا ایک نسخہ حبیب گلکشن مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں اور ایک ناقص نسخہ شاہ محمد عاشق کے نقل کردہ مجموعہ میں شامل ہے۔ مؤخر الذکر کا فوٹو اسٹیٹ ہمارے ذخیرہ کتب میں شامل ہے۔

(63) عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ص267، ج7

(64) عجالہ نافعہ ص24 (مطبع مصطفائی لکھنؤ:1255ھ) نسخہ ذاتی۔

(65) مکتوب مولانا مجتبیٰ حیدر کاکوروی۔ بنام راقم سطور۔ بحوالہ القول الجلی۔

(66) دیکھیے: مکتوب شاہ ابوسعید بنام برادران خمسہ شاہ عبدالعزیز، و مکتوب شاہ عبدالعزیز بنام شاہ ابوسعید رائے بریلوی زیر عنوان شاہ ابو سعید حسنی کے روابط شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان سے۔ مرتبہ مولانا نسیم احمد فریدی۔ (ماہنامہ الفرقان۔ لکھنؤ صفر 1385ھ)

(67) شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان ص148

(68) سید عبدالحی حسنی، دہلی اور اس کے اطراف، ص68

(69) خانوادہ ولی اللہی کی زیریں شاخیں اور ان کے نسبی سلسلے۔ ماہنامہ برہان دہلی، ص30 (جنوری 1982ء)

(70) نزہۃ الخواطر، ص422، ج7

(71) بڈھانہ ضلع مظفر نگر (یوپی) کی وسیع اور کشادہ مسجد سن 1108ھ میں تعمیر ہوئی۔ مقامی روایات کے مطابق شاہ نور اللہ اور ان کے اہل خاندان اس کے اطراف میں آباد تھے مگر اب وہاں اس خاندان کا کوئی فرد باقی نہیں۔

(72) مضمون جناب عضد الدین خاں (الفرقان: رجب 1385ھ)۔

(73) خانوادہ ولی اللہی کی زیریں شاخیں اور ان کے نسبی سلسلے۔ برہان دہلی، ص30

(74) عاشق الٰہی میرٹھی، تذکرۃ الرشید، ص30، ج1

(75) ملفوظات شاہ عبدالعزیز ص109

(76) ملفوظات شاہ عبدالعزیز۔ تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الامہ ص747، شاہ صاحب نے تحفہ اثنا عشریہ کے کلمہ افتتاح میں یہی نام استعمال فرمایا ہے۔

(77) رسالہ صرف، فارسی منظوم۔ مخزونہ کتب خانہ مظاہر علوم سہارنپور۔ اس نسخہ پر کتاب کا نام اور سنہ کتابت درج نہیں مگر اس سے ملحق بعض رسائل و تحریرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا کاتب شاہ محمد اسحٰق کا شاگرد ہے۔

(78) تاریخ الامہ فی ذکر خلفاء الامہ ص847 نیز دیکھیے خاتمۃ الطبع تفسیر عزیزی پارہ تبارک 29، ص259 (کلکتہ 1248ھ)

(79) ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، مومن۔ شخصیت اور فن، ص17-318، (دہلی:1972ء)

(80) بیاض مولانا ابوالحسن حسن کاندھلوی (متوفی سن 1269ھ۔ 1853ھ) ورق 134، الف۔ یہ قطعہ تاریخ سب سے پہلے غالباً "آثار الصنادید" میں درج ہوا، اور اس کے حوالے سے متاخر تذکروں میں نقل ہوتا رہا۔ مگر کسی بھی تذکرہ نگار نے مولانا ابوالحسن کا

نام نہیں لکھا۔ مولوی ابویحیٰ امام خاں سے اس کی نقل میں ایک دلچسپ غلطی ہوئی ہے۔ دیکھیے تراجم علمائے اہل حدیث ہند، ص 85 (لاہور: 1391ھ)

(81) اوراق خودنوشت رنگیں، مملوکہ راقم سطور۔ نیز یہ فقرات تاریخ ''مجموعہ رنگین'' میں بھی شامل ہیں۔ دیکھیے: سعادت یار خاں رنگین۔ ڈاکٹر صابر علی خاں ص 34-435 (کراچی: 1956ء)

(82) یہ کتبات مولوی ممتاز علی میرٹھی نے نصب کرائے تھے اور رجب سنہ 1311ھ میں مزارات پر موجود تھے۔ سیر دہلی ص 73۔ مولوی محمد اکبر ابوالعلائی داناپوری (آگرہ: 1311ھ) مگر سید احمد ولی اللہی کا قول ہے کہ: ''یہ تمام قبرستان نزول میں آ گیا تھا۔ میں نے سنہ 1313ھ میں اس کی مرمت اور حد بندی کرائی'' یادگار دہلی ص 105۔

(83) سر سید احمد خان، آثار الصنادید۔ باب چہارم، ص 41، (لکھنؤ: 1900ء)

(84) رحیم بخش دہلوی، حیات ولی، سنہ 1901ء، ص 342 (دہلی: 1319ھ)

(85) رحیم بخش دہلوی، حیات عزیزی، سنہ 1899ء، ص 63-64 (دہلی: طبع اول بلا سنہ) نیز دیکھیے مجموعہ احوال و کمالات عزیزی سید احمد ولی اللہی ص 40 (کراچی: 1973ء)

(86) چند اور فقرات و قطعات تواریخ کے لئے دیکھیے: گنج تواریخ، عبدالغفور نساخ ص 27 (لکھنؤ: 1290ھ)۔ ریاض النور مولوی نصیر الدین سلہٹی ص 32 (کان پور: 1299ھ)

(87) تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الامہ ص 747

(88) شاہ محمد عاشق، مکتوبات شاہ ولی اللہ، مکتوب نمبر 16

(89) ماہنامہ برہان۔ دہلی ص 33 (جنوری: 1983ء)

(90) سید احمد ولی اللہی، مجموعہ احوال و کمالات عزیزی، ص 41

(91) بیاض مولانا رشید الدین دہلوی۔ ورق 29 الف۔ اس کا ایک اقتباس مولانا نسیم احمد فریدی کے مضمون ''سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز'' میں شامل ہے۔ الفرقان، لکھنؤ ص 50 (صفر 1388ھ)

(92) یہ منشی فرحت اللہ پھلتی اور اہل پھلت کے نسب ناموں کے مطابق ہے۔ مگر سید احمد ولی اللہی نے زوجہ مولوی محمد عیسیٰ کو دختر اول اور زوجہ محمد افضل کو دختر دوم لکھا ہے۔ مجموعہ احوال و کمالات عزیزی، ص 41

(93) ماہنامہ برہان ص 33 (جنوری: 1982ء) زیر عنوان ''خانوادہ ولی اللہی کی زیریں شاخیں اور ان کے نسبی سلسلے''۔ مرتبہ نورالحسن راشد کاندھلوی۔ یہ مضمون خاندان حضرت شاہ ولی اللہ کی شاخ در شاخ تفصیلات پر مبنی ایک یادداشت ہے، جو منشی فرحت اللہ بن سلیم اللہ پھلتی نے مولانا شاہ عبدالقیوم بڑھانوی کی ایماء پر سنہ 1283ھ میں مرتب کرائی۔ مولانا عبدالقیوم نے اس کو دیکھا اور اس کی تحسین فرمائی۔ پھلت (ضلع مظفر نگر) میں اس کے متعدد خطی نسخے موجود ہیں۔ راقم سطور نے اس کو دو نسخوں کی مدد سے مرتب کیا جو ماہنامہ برہان، دہلی کی جنوری، فروری 1982ء کے شماروں میں شائع ہوا۔ فرحت اللہ پھلتی کا اس تحریر میں بار بار ذکر آئے گا اس سے یہی یادداشت اور مضمون مراد ہوگا۔

(94) بیاض مولانا ابوالحسن کاندھلوی۔ ورق 133، الف

(95) شاہ عبدالرحمٰن، مکتوبات شاہ ولی اللہ، مکتوب نمبر 172

(96) مضمون مولانا نسیم احمد فریدی۔ الفرقان لکھنؤ، ص 25-26 (ربیع الاول 1338ھ) اس خط کے مکمل متن کے لئے ملاحظہ فرمایئے بیاض مولانا رشید الدین دہلوی۔ ورق 40 الف

(97) مکتوب بنام شاہ ابوسعید رائے بریلوی۔ ماہنامہ الفرقان لکھنؤ (صفر: 1985ء) جناب حکیم محمود احمد برکاتی نے اس خط کا ایک اقتباس نقل کرنے کے بعد اس کا سنہ کتابت 1179ھ لکھا ہے اور ''مکتوب المعارف'' کا حوالہ دیا ہے مگر یہ دونوں اطلاعیں صحیح نہیں۔ اس خط میں سنہ تحریر درج نہیں اور ایسا کوئی قرینہ بھی نہیں جس کی بنا پر اس کا سنہ کتابت متعین کیا جا سکے۔ نیز اس خط کا ''مکتوب المعارف'' سے کوئی تعلق نہیں۔ ''مکتوب المعارف'' شاہ ولی اللہ اور شاہ ابوسعید رائے بریلوی کے مراسلات کا ایک مختصر سا مجموعہ جس کو مولانا ابوالقاسم ہنسوی نے مرتب کیا اور وہ سنہ 1304ھ میں مطبع الانوار سہانپور سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں شاہ عبدالعزیز کا کوئی خط شامل نہیں۔ شاہ صاحب کا محولہ بالا خط حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کے ذاتی ذخیرہ نوادرات کی زینت ہے۔

(98) تاریخ الامہ فی ذکر خلفاء الامہ ص 747، 888

(99) فہرست اردو مخطوطات رضا لائبریری رام پور۔ مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی ص 2 (رام پور: 1967ء) بحوالہ دیوان عنبر قلمی مخزونہ رضا لائبریری۔

(100) ملفوظات شاہ عبدالعزیز ص 83، 84، 92

(101) مولوی فقیر محمد جہلمی: حدائق الحنفیہ، مع حواشی و تکملہ خورشید احمد خاں ص 487 (لاہور: طبع الاول بلاسنہ) جہلمی نے فقرہ تاریخ چشمہ فیض صحیح نقل کیا ہے مگر سن غلط لکھا ہے۔ نیز دیکھیے: تاریخ اولیائے صوبہ دہلی۔ رکن الدین نظامی ص 201 (دہلی: 1354ھ)

(102) تراجم علمائے اہل حدیث ہند ص 88۔ نیز ملاحظہ ہو: ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات، ابویحیٰ امام خاں ص 33۔ یادگار دہلی میں سہو کتابت کے سن 1233ھ کا سنہ 1733ھ ہو گیا، ص 103

(103) ماہنامہ برہان دہلی، ص 31 (جنوری: 1982ء)

(104) دہلی میں مطبع احمدی کے نام سے متعدد پریس قائم ہوئے جن میں مولانا احمد علی محدث سہارنپوری اور راموجان کے مطابع کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ بعض مطابع کے تعارف کے لئے دیکھیے راقم سطور کا مضمون باقیات آزردہ مجلہ غالب نامہ نئی دہلی، جنوری 1983 حاشیہ ص 210، 211 مگر ولی اللہی کا مطبع ان مطابع میں شامل نہیں، وہ نسبتاً چھوٹا اور متاخر مطبع تھا جو سید احمد ولی اللہی کی حیات میں ختم ہو گیا ہے تاہم اس مطبع نے حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے صاحبزادگان کی کتابوں کی نشر و اشاعت میں ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ زیر نظر سطور میں مطبع احمدی سے اسی مطبع کی مطبوعات کی جانب اشارہ ہوا ہے۔

(105) ان معلومات کے لئے مولوی حکیم اختر الحق بن عبدالحی خلف منشی فرحت اللہ پھلتی کا شکریہ واجب ہے۔ موصوف اسی خانوادہ کے ایک فرد ہیں۔ ان کی دادی صاحبہ منشی فرحت اللہ کی اہلیہ مولوی محمد حسن کی دختر تھیں اس لئے ان معلومات کی بے حد اہمیت ہے اور اس میں شک و شبہ کا امکان کم سے کم ہے۔

(106) یادگار دہلی ص 104

(107) تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الامہ ص 754۔ یادگار دہلی ص 103۔ نیز میخانہ درد ص 163-164

(108) شاہ ابوالعدل یا عبدالعدل قرشی دہلوی، حضرت خواجہ محمد زبیر مجددی کے خلیفہ اعظم اور جانشین تھے، ولادت سنہ 1120ھ۔ وفات 1204ھ۔ چراغ سے سن وفات معلوم ہوتا ہے۔ خانقاہ حضرت خواجہ باقی باللہ میں دفن ہوئے۔ راقم سطور کی حقیر معلومات میں مولانا جعفری واحد تذکرہ نگار ہیں جو ان کے سنین ولادت و وفات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ (تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الامہ ص 754) مزید معلومات کے لئے دیکھیے باب پنجم ''نور القلوب احوال و ملفوظات میاں شاہ آبادانی سیالکوٹی''۔ تالیف امجد علی رضوی مؤلفہ سنہ 1226ھ ''نور القلوب'' کا ایک نہایت عمدہ خوش قلم نسخہ مکتوبہ سنہ 1281ھ پروفیسر نثار احمد فاروقی صدر شعبہ عربی دلی

یونیورسٹی دہلی کے ذاتی ذخیرہ کتب میں محفوظ ہے۔اس نسخہ کے استفادہ کے لئے فاروقی صاحب کا ممنون ہوں۔

(109) مولانا جعفری نے شاہ عبدالقادر کو شاہ ابوالعدل کا خلیفہ اعظم (جانشین) لکھا ہے۔(تاریخ الائمہ ص 752) مگر اکبر شاہ ثانی کا بڑا بھائی شہزادہ منعم بخت، اپنے پیرو مرشد مولانا شاہ کمال الدین کاندھلوی (برادر خورد مفتی الٰہی بخش) کو ''سجادہ نشین حضرت شاہ محمد عبدالعدل'' کہتا ہے۔ ملاحظہ ہو انوار القلوب (جو مغلیہ عہد خصوصاً شاہ عالم کے دور کی مفصل تاریخ ہے) مولفہ سنہ 1255ھ مکتوبہ بعہد بہادر شاہ ظفر۔یہ ہمارے خاندانی کتب خانہ کا مخطوطہ ہے اور اس وقت دار العلوم، دیوبند میں محفوظ ہے۔

(110) یادداشت ملحق ومجلد مع تحریرات وفتاویٰ خانوادہ شاہ ولی اللہ ورق 111۔

(111) تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الامہ ص 759۔اگرچہ مولانا جعفری نے ایک موقع پر شاہ صاحب کی تاریخ وفات 14/رجب بھی لکھی ہے (ص 747)۔مگر قدیم یادداشت اور خود مولانا جعفری کی تصریحات کی رو سے اول الذکر کو ترجیح حاصل ہے۔

(112) غلام رسول مہر، سید احمد شہید، ص 116، ج 1

(113) غلام سرور لاہوری: خزینۃ الاصفیاء ص 389، ج 2 (مطبع ہند لکھنؤ: 1290ھ) وحدیقۃ الاولیاء ص 117 (نولکشور کانپور: 1294ھ) حدیقۃ الاولیاء تحقیق وتعلیق جناب محمد اقبال مجددی ص 215 (لاہور: 1396ھ) نیز دیکھیے: تراجم علمائے اہل حدیث ص 87۔شاہ عبدالقادر کے مزار پر ایک عرصہ تک یہی سن وفات 1242ھ کندہ تھا۔

(114) ابو یحییٰ امام، ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات، ص 33 (چیچہ وطنی، ساہیوال: 1391ھ)

(115) مولوی مصطفیٰ خانوادہ ولی اللہی کے پہلے اور غالباً واحد شخص ہیں جن کا شعراء کے تذکروں میں ذکر آیا ہے۔مولوی مصطفیٰ اگرچہ علمی کمالات میں خاندانی روایات کے جامع نہیں تھے مگر تذکرہ نگاروں نے ان کے اخلاق اور خاندانی روایات کی حتی الامکان پاسداری برتنے کی تعریف کی ہے، شعر وسخن میں ثناء اللہ فراق سے تلمذ تھا، مزید معلومات کے لئے دیکھیے:

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، گلشن بے خار، ترجمہ احسان الحق فاروقی، ص 137، (کراچی: 1962ء)

مولوی کریم الدین پانی پتی، طبقات شعرائے ہند، ص 360 (دہلی: 1847ء)

گلشن ہمیشہ بہار، مولانا نصر اللہ خاں خویشگی ص 22 (مطبع فتح الاخبار کول (علی گڑھ: 1270ھ)

گلشن ہمیشہ بہار، ڈاکٹر محمد اسلم فرخی ص 94 (کراچی: 1967ء)

گلستان بے خزاں، قادر بخش صابر۔مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی، ص 333، ج 1۔(لاہور: 1966ء)

لالہ سری رام، خمخانہ جاوید، ص 48، ج 2، (دہلی: 1911ء)

بعض تذکرہ نگاروں نے بھی تحیر کا ذکر کیا ہے۔

(116) تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الامہ ص 747 نیز فرحت اللہ پھلتی برہان دہلی ص 30 (جنوری 1982ء)

116(ب) حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی نے ''تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ'' میں شاہ عبدالعزیز کا ایک ملفوظ نقل کیا ہے، جس سے خیال ہوتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنے چاروں صاحبزادوں کے دستار فضیلت باندھ دی تھی ص 310 (حیدرآباد، دکن: 1946ء) مگر یہ خیال صحیح نہیں۔ملفوظ کی عبارت اس کی تردید کر رہی ہے۔''تذکرہ شاہ ولی اللہ'' میں اس ملفوظ کے ابتدائی کلمات: ''ہم چنانکہ بعد انتقال نم'' ترک ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے یہ غلط فہمی ہوئی۔

(117) بیاض حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی (م 1245ھ۔1829ء) ورق 53ب، (ذخیرہ ذاتی)

(118) بیاض مولانا شیخ محمد تھانوی قلمی نسخہ مؤلف مملوکہ جناب ثناء الحق صدیقی کراچی۔راقم سطور اس بیاض سے استفادہ اور اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی کے لئے محترم صدیقی صاحب کا بے حد ممنون ہے۔

(119) یادداشت ملحق ومجلد مع مجموعہ تحریرات وفتاویٰ ص474

(120) تاریخ الائمہ، ص747

(121) ابوالعلائی داناپوری، سیر دہلی، ص73

(122) دہلی اور اس کے اطراف ص35۔ نزہتہ الخواطر میں شاہ عبدالغنی کا تذکرہ شامل نہیں۔

(123) یادگار دہلی ص104۔ مولوی بشیر الدین احمد نے ولی اللہی کے یہی الفاظ واقعات دارالحکومت میں نقل کر دیئے ہیں ص590، ج2

123 (ب) مثلاً: مزارات اولیائے دہلی مولوی محمد عالم شاہ فریدی ص 14 (دہلی 1346ھ)۔ تاریخ اولیائے صوبہ دہلی ص 201 (دہلی: 1354ھ) التمہید بتعریف ائمۃ التجدید، مولانا عبیداللہ سندھی ص100 (جام شورو۔ سندھ: 1396ھ) تراجم علمائے اہل حدیث ہند ص86۔ تاریخ دعوت وعزیمت ص345، ج5

(124) سید احمد ولی اللہی، یادگار دہلی، ص104

(125) تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الامہ ص747

(126) مولوی رحیم بخش نے لکھا ہے کہ ''مولانا شہید کی تاریخ ولادت میں علماء کا باہم اختلاف ہے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ''آپ 12/ ربیع الثانی سنہ 1193ھ کو پیدا ہوئے'' ص353 حیات ولی۔ مگر راقم سطور کو ایسی کوئی شہادت میسر نہیں ہوئی جس میں کسی مؤرخ و تذکرہ نگار نے سنہ 1193ھ کے قول سے کسی معقول بنا پر اختلاف کیا ہو۔ میر شجاعت علی کے حوالے سے شوال سنہ 1196ھ کی ایک روایت مہر صاحب نے نقل کی ہے۔ مگر اس کو مہر صاحب نے خود لکھ دیا ہے ''شایان توجہ نہیں'' جماعت مجاہدین ص117 (غلام علی اینڈ سنز لاہور: بلاسنہ)

(127) تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الامہ ص 747 لیکن حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مولانا کرامت علی جونپوری کے حوالہ سے واقعہ بیعت کی جو تفصیل لکھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا شہید، سید صاحب کی ٹونک سے واپسی کے بعد ان سے بیعت ہوئے تھے۔ سیرت سید احمد شہید ص145، ج1۔

(128) احوال وکمالات عزیزی ص41

(129) حیات ولی ص352

(130) تاریخ اہل حدیث ص419 (دہلی: 1983ء)

(131) غلام رسول مہر، جماعت مجاہدین ص117

(132) نسیم احمد فریدی، تذکرہ شاہ محمد اسماعیل شہید، ص14 (لکھنؤ: 1977)

(در: فکر ونظر (اسلام آباد)، اپریل تا جون 1987ء، ص93-146)

✦ ..... ✦ ..... ✦

مولانا محمد رحیم بخش دہلوی

حیاتِ ولی

[شاہ ولی اللہ] نامور و بلند اقبال اور مشہور شخص ہیں، جنہوں نے اپنے علمی تبحر اور فضل و کمال کی وجہ سے اپنے معزز و بزرگ خاندان کو ساری دنیا میں روشناس کر دیا ہے اور جن کے نام کا امتیازی پھریرا ہندوستان سے لے کر عرب تک بڑے زور و شور سے اڑ رہا ہے۔

شاہ صاحب کے علمی تبحر اور فضل و کمال کی جہاں تک سچی تعریف کی جائے وہ بہت کم ہے کیونکہ اس محترم خاندان میں ایسے حضرات بہت کم گزرے ہیں جن میں وہ تمام کمالات ہوتے جو تنہا آپ کی ذات والا صفات میں پائے جاتے تھے۔ جس شخص نے اپنے خاندان کے گذشتہ لوگوں کے اعزاز و اقتدار قائم رکھے بلکہ ان پر ایک نئی جلا پیدا کر کے اور بھی چمکا دیا اور جس نے اپنی آئندہ نسلوں کی کامیابی کے واسطے ایک ایسا بیج بویا جو بعد ازاں اُن کی اَن تھک کوششوں سے پھلا پھولا اور لہلہایا وہ یہی شاہ صاحب ہیں۔ آپ کی خداداد قابلیت اور حسن لیاقت کا اندازہ صرف اسی سے نہیں ہو سکتا کہ خود بہت بڑے فاضل، عالم اور خواص و عوام کے مقتدا و معتقد علیہ تھے اور پبلک سے اجتہاد و امامت کا معزز خطاب حاصل کر چکے تھے بلکہ اپنی اولاد اور ملک و قوم کو عروج پر پہنچا دیا تھا جو آج تک دونوں کو زندہ کیے ہوئے ہے۔

اس میں ذرا شک نہیں کہ یہ ممتاز خاندان اپنی خاص نوعیت، خاص فضائل اور عام نفع رسانی میں ہندوستان میں لاثانی اور بے نظیر تھا، علم و فضل اور شہرت عام کے لحاظ سے اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ نیز اس کا ہر ایک ممبر آسمان علم کا مہر جہاں تاب تھا لیکن حقیقت میں شاہ ولی اللہ صاحب نے علمی کمالات میں جو اقتدار و اعزاز حاصل کیا وہ اس خاندان کے لئے بہت بڑا ذریعۂ افتخار تھا اور اگر سچ پوچھیے تو اس خاندان کو سب سے زیادہ جس شخص نے تاریخ میں بقائے دوام کا اعزاز بخشا ہے وہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب ہی ہیں بلکہ میرا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس خاندان کو علمی حیثیت سے جو فضیلت و ترجیح دوسرے علمی خاندانوں پر حاصل ہے، وہ آپ ہی کے طفیل سے حاصل ہوئی ہے اور یہ لکھنا واقعہ نفس الامری ہے کہ جناب مولانا شاہ ولی اللہ صاحب بلحاظ شہرت عام اور دیگر فضائل کے الولد سر لابیہ کے پورے فوٹو تھے اور نہ صرف فوٹو ہی تھے بلکہ اُسے جلا اور چمکا دینے والے تھے۔

چونکہ شاہ صاحب کے مراتب علم اور شان کمال کا استحضار کرنا مشکل اور سخت مشکل ہے، اس لئے نہایت مختصر الفاظ میں آپ کی تعریف یہ ہے کہ علم حدیث و تفسیر کی ترویج و اشاعت میں آپ پہلے شخص ہیں، جنہوں نے ہندوستان میں ان مقدس علوم کو رواج دیا اور طالبان علم کو ندائے عام دی۔ اپنے فیضان سے دنیا کو سیراب کیا اور اسلامی علوم کے باریک و دقیق مسائل کو دنیا

والوں کے سامنے پیش کر دیا۔ یہ آپ ہی کا فیض عام ہے، جس سے آج تک حدیث و تفسیر کا چراغ روشن ہے۔

شاہ صاحب کے حالات پر سرسری نظر

قبل اس کے کہ میں جناب خاتم المحدثین، امام المفسرین، فاضل اجل، عالم باعمل، عارف باللہ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ کی تاریخی زندگی کے مفصل حالات و واقعات جدا جدا عنوان سے بیان کروں اور آپ کے اخلاق و عادات پر تفصیل کے ساتھ ریویو کروں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نہایت مختصر اور اجمالی طور پر آپ کے علمی مذاق اور فضل و کمال کا خاکہ کھینچوں اور اس کے ساتھ سرسری طور پر آپ کی اُس خداداد شہرت کا ذکر کروں جو قریب قریب کل ہندوستان اور عرب دونوں میں آج تک پھیلی ہوئی ہے۔

جناب مولانا شاہ ولی اللہ صاحب ایشیائی دنیا بالخصوص دنیائے اسلام کے مشرقی حصوں خاص کر اسلامی قوموں میں ایسے نامور اور باجاہ و جلال اور ذی عظمت و شان بزرگ ہو گزرے ہیں جن کا نام نامی ایسا نہیں ہے جس سے کوئی شخص آگاہ نہ ہو۔ ہندوستان کے عام طبقات میں کوئی شاذ و نادر ہی ایسا اسلامی طبقہ ہوگا جو آپ کے مبارک نام اور آپ کے مقتدر و معزز خاندان سے ناواقف ہوگا۔ خاص دہلی اور اس کے اطراف و اضلاع میں کوئی ایسا گھر نہیں جس کے بچہ بچہ کی زبان پر آپ کا نام نہایت عظمت و وقار اور اعزاز و احترام کے ساتھ جاری نہ ہوگا۔

یہ بات نہ صرف تعجب بلکہ سخت حیرت سے دیکھی جاتی ہے کہ عام طور پر اسلام کی مختلف شاخوں کے تمام موافق و مخالف فرقے حتیٰ کہ مخالفین اسلام بھی اس عزیز الوجود اور خلیق و رحمدل خدا پرست و برگزیدہ ولی کے فضائل و کمالات کے بہ دل معترف ہیں اور سب متفق ہو کر اس امر کی با آواز بلند شہادت دیتے ہیں کہ حقیقت میں یہ پاکباز اور خدا کا پیارا بندہ علمی حیثیت اور مذہبی تقدس کے لحاظ سے اپنے زمانہ کا فرد اور فضل و کمال کے جولانگاہ کا پورا شہسوار ہے۔ قیافہ شناس نظریں آپ کی دلفریب طفلانہ حرکتوں سے پہلے ہی خوب سمجھ گئی تھیں کہ اس شریف و نجیب خاندان کے بانیوں کی ڈالی ہوئی بنیادیں اس مبارک بچے ہی کی اَن تھک کوششوں سے ایک زمانہ میں آسمان سے باتیں کرنے لگیں گی اور آئندہ نسلوں کے عروج و استحکام کا سبب بھی یہی بچہ ہوگا۔

اس مقدس بزرگوار کے علم و فضل کی نسبت علماء اور مؤرخین نے جیسے جیسے وزنی اور قیمتی ریویو کیے ہیں اور اس کی خداداد قابلیت پر متفقہ الفاظ میں قابل وقعت اور پُر زور ریمارک کیے ہیں حقیقت میں وہ اس کے مراتب کمال اور علمی تبحر کے واسطے اعلیٰ درجہ کے سارٹیفکیٹ ہیں جن سے اس کی شان و عظمت اور اعزاز و اقتدار کا کافی ثبوت ملتا ہے جو آج تک علماء کے دل میں باقی ہے اور گو اسے سفر آخرت کیے ہوئے زمانہ دراز گزر چکا ہے، لیکن اس کی عظمت و جبروت اور جاہ و جلال کے آثار ہنوز تازہ ہیں۔

ایک قابل مصنف کا ریویو

''سیر الاخبار'' کے مؤلف نے شاہ صاحب کی لیاقت پر جو ایک مختصر ریمارک کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں کہ:

حضرت مولنا شاہ ولی اللہ صاحب اپنے زمانہ کے تمام علماء پر کھلی اور واضح فضیلت رکھتے تھے۔ دنیا کے اس کونے سے لے کر اُس کونے تک ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو علمی کمالات اور اخلاقی فضائل میں آپ کا دعوے دار ہوتا اور بفرض محال اگر کسی صفت میں کوئی شریک ہو بھی تو یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا جاسکتا ہے کہ باطنی تصرف میں بھی آپ سے افضل ہوا ہو۔ حقیقت میں آپ جامع معقول ومنقول اور حاوی فروع واصول تھے۔ حقائق ومعارف سے پوری آگاہی وواقفیت رکھتے تھے اور تصوفانہ تحقیقات میں بھی آپ کو کمال دستگاہ حاصل تھی۔ مریدوں کی پُرنور اور عقیدت مندانہ بصارت سے لبریز آنکھیں آپ کے جمال کی تابانی ودرخشانی سے ہر وقت روشن ومنور رہتی تھیں اور عقیدت کیش علماء اور سلیم الطبع فضلاء کا جمگھٹا ہمیشہ آپ کے درسگاہ میں لگا رہتا تھا۔ آپ حدیث وتفسیر وفقہ کے علوم کے درس وتدریس میں ہمیشہ مستغرق رہتے تھے اور اس میں نہایت عزت ووقعت کے ساتھ شہرت وناموری پیدا کرلی تھی۔ آپ نہ صرف علم وعمل کے لحاظ سے فرید عصر اور یگانۂ روزگار تھے بلکہ مجتہدین فن اور ماہرین کمال کے زمرہ میں شمار کیے جاتے تھے اور ایک انتہادرجہ کے جید محدث تھے۔ معمولی تعلیم کے بعد آپ کی عالی ہمتی اور بلند حوصلگی نے صرف اپنے وقت کے علماء پر قناعت کرنا پسند نہیں کیا بلکہ ہمت واستقلال کے شاہین بلند پرواز نے سفر کے لئے بال وپر کھولے اور صرف احادیث کی سند حاصل کرنے کے لئے عربستان تشریف لے گئے۔ حرمین محترمین کی زیارت سے مشرف ہوئے اور ایک معتدبہ زمانہ تک وہاں قیام کیا۔ حضرت شیخ ابوطاہر مدنی وغیرہ مشائخ حرمین محترمین سے سند حدیث حاصل کی اور خرقہ صوفیہ زیب تن فرمایا۔ نئے نئے خیالات کے لوگوں سے مباحثے کیے اور مختلف عقائد کے اصول وفروع کے اصلی پہلوؤں پر دقیق اور غور میں ڈوبی ہوئی نظریں دوڑائیں کیونکہ عرب اس وقت مختلف عقائد ومذاہب کا بازیگاہ بنا ہوا تھا۔

جب آپ کو اس صورت سے کچھ دن عرب میں گزر گئے اور دلی مقاصد کی پورے طور پر تکمیل ہوگئی تو اب وہاں سے وطن مالوف کی طرف مراجعت کرنے کا قصد کیا اور دوڈھائی سال کے عرصہ میں ہندوستان کی طرف رجوع ہوئے۔ یہاں آکر پرانی دہلی میں اپنے قدیم مکان میں سکونت اختیار کی اور علمی اشغال میں مصروف ہوئے۔ شہر کے عموماً باشندے خاص کر اطراف وجوانب کے نامی گرامی فضلا خدمت اقدس میں حاضر ہوکر سند حدیث حاصل کرتے اور آپ کے پُراثر وعظ اور عبرت انگیز نصائح کی دولت سے گودیاں لبریز کرکے جاتے۔

اس میں ذرا شک نہیں کہ جناب شیخ عبدالحق محدث دہلوی بڑے پایہ کے شخص تھے۔ اس عہد میں سب سے زیادہ جس چیز نے آپ کو تمام دنیا میں مشہور کردیا تھا وہ آپ کے علمی کارنامے اور حدیث وتفسیر کا درس تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صفحات تواریخ کو آج تک آپ کے نام نامی سے زینت حاصل ہے لیکن انصاف یہ ہے کہ علم حدیث میں جس اولیت کا تمغہ اس زمانہ کے مؤرخوں نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے لئے تجویز کیا ہے اس کے مستحق جناب مولنا شاہ ولی اللہ صاحب ہیں، کیونکہ علم حدیث کی عمارت کے بانی اگرچہ جناب شیخ عبدالحق محدث دہلوی تھے لیکن جنہوں نے اس عمارت کا نقشہ تیار کیا اور پھر اشاعت ورواج کے مرقعوں سے اس کی درودیوار کو سجایا، وہ شاہ ولی اللہ صاحب ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ڈالی ہوئی بنیادیں آپ ہی کی اَن تھک کوششوں سے بلند ہوئیں کہ جناب شاہ ولی اللہ صاحب جیسا محدث، مفسر، فقیہ ہندوستان کو اپنی آغوش میں پالنا بہت کم نصیب ہوا ہوگا بلکہ آپ جیسا طباع، خوش فہم، نکتہ سنج، دقیقہ رس کوئی دوسرا پیدا

ہی نہ ہوا ہوگا۔ چنانچہ علامہ ابوالطیب شاہ صاحب کے حالات پر ریویو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"انصاف کی بات یہ ہے کہ اس مقدس اور پاک نفس (یعنی جناب شاہ ولی اللہ صاحب) کا عزیز وجود اگر گذشتہ زمانہ میں ہوتا تو تمام مجتہدوں کا پیشوا اور مقتدا مانا جاتا۔ بلکہ ان کا سرتاج بنایا جاتا اور امام الائمہ کا وزنی اور قیمتی خطاب پاتا۔

ایک اور فاضل مؤرخ مختصر الفاظ میں یہ پُرزور ریمارک کرتا ہے کہ "اگر میں نہایت راستی اور انصاف سے جناب مولنا شاہ ولی اللہ صاحب کی نسبت اپنی رائے ظاہر کروں تو بلا تامل اس بات کا ضرور اعتراف کروں گا کہ میں نے زمانہ موجود میں تو کیا متقدمین کے زمرہ میں بھی اس رنگ ڈھنگ کا فاضل نہیں دیکھا اور نہ میں کسی کو ایسا متبحر اور دقیق نظر وسیع خیالات پاتا ہوں جو تمام علوم و فنون کا جامع ہو اور ہر علم وفن میں عمدہ طور پر دلچسپی رکھتا اور بحث کرسکتا ہو۔ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ ہر ایک ایک فنی ہوتا ہے اور ایک ہی علم سے وہ اپنی نظر کو وسعت دیتا اور اس میں تبحر حاصل کرتا ہے اور زیادہ سے زیادہ دوفن تک اُس کا شاہین کمال بلند پرواذی کرسکتا ہے، لیکن یہ نہ صرف تعجب بلکہ حیرت سے دیکھا جاتا ہے کہ جناب مولانا شاہ ولی اللہ صاحب ہر فن میں طاق اور بے مثل فاضل تسنیم تھے۔"

اِن کے علاوہ اور بہت سے علماء اور مؤرخین کے ایسے پُرزور اور وزنی ریمارک میری زیر نظر ہیں جن سے شاہ صاحب کا بے نظیر علمی تبحر اور لاثانی جودت طبع اور ذہنی ذکاوت اور شان فضل وکمال کا عروج ثابت ہوتا ہے لیکن میں انہیں تطویل کے خوف سے قلم انداز کرتا ہوں۔ اگر ممکن ہوا تو انشاءاللہ آگے چل کر کسی موقع پر جدا عنوان سے بیان کروں گا۔

شاہ صاحب کی عظمت ووقعت

شاہ صاحب کی علماء وقت کے دلوں میں کس قدر وقعت تھی، یہ ایک ایسا وسیع مضمون ہے جس کی تفصیل و توضیح کا یہ موقع نہیں ہے۔ ناظرین آگے چل کر آپ کے حالات زندگی کا مطالعہ کرکے خود اس کا اندازہ کرلیں گے۔ لیکن مختصر یہ ہے کہ شاہ صاحب نے اپنے زمانہ میں وہ عظمت و بزرگی اور اعزاز و اقتدار پایا تھا جس کی وجہ سے علماء وقت نے آپ کو خاتم المحدثین امام المفسرین کے نہایت معزز و مقتدر اور باوقعت القاب دیئے تھے۔ علاوہ ازیں آپ کا جو مرتبہ وعظمت ان کے دلوں میں موجود تھی وہ ایک ایسے اعلیٰ وارفع درجہ کی تھی جس کا کسی طرح پورا اور کافی اندازہ نہیں ہوسکتا۔ بڑے بڑے علماء، فضلاء جنہوں نے خود امام وقت اور مجتہد فن کا تمغہ پبلک سے حاصل کیا تھا اور جو معتقد علیہ عوام وخواص تسلیم کیے جاتے تھے۔ نہایت عقیدت واخلاص کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ کے خداداد تبحر اور علمی برکتوں سے بہرہ اندوز ہوکر آپ کی ذاتی قابلیتوں اور فطری لیاقتوں اور بلند ہمتی و ذوق علمی کا بدل اعتراف کرتے اور جب خواص کی عقیدت وخلوص کی یہ کیفیت تھی تو عوام اہل اسلام کی عقیدت کا اندازہ اس سے کہیں زیادہ ہوگا۔

منصبی فرائض

شاہ صاحب کی تاریخی زندگی میں جو سب سے زیادہ قابل وقعت اور لائق تقلید بات ہے وہ یہ ہے کہ آپ اپنے منصبی فرائض کو ایسی آزادی اور جوانمردی کے ساتھ ادا کرتے تھے، جس کی نظیر ایشیائی دنیا میں کہیں نہیں مل سکتی۔ آپ قریباً رات دن کے اکثر حصوں میں کتاب وسنت اور علوم دینیہ کے مطالعہ اور درس تدریس میں ڈوبے رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا تمام بیش قیمت وقت حدیث وقرآن کے رواج دینے کے احکام طریقت کے شائع کرنے علمی اشغال کے پھیلانے میں صرف ہوتا تھا۔ شوقین اور جفاکش طلبہ آپ کی علمی فیاضیوں کی بے مثل ولاجواب شہرت سن سن کر دور دراز ملکوں سے سنگلاخ اور دشوار گزار گھاٹیاں طے کر کے جوق در جوق آتے تھے اور علمی برکتوں سے گودیاں بھر بھر کر جاتے تھے۔ رات دن میں کوئی ایسا وقت بمشکل ملتا جس میں در دولت پر علماء فضلا کے حلقوں کی گرم بازاری نہیں ہوتی اور طلبہ کا ہجوم ان کی رونق کو دوبالا نہ کرتا۔ تمام دن اہل علم کا ایک تانتا سا بندھا رہتا اور درسگاہ میں فضلاء کے جمگھٹے لگے رہتے۔ ایک طرف سائلوں اور مستفتیوں کا جم غفیر صف آراء رہتا اور ایک طرف طالب العلموں کی جماعت گردن جھکائے بیٹھی رہتی۔ ادھر آپ طلبہ کو درس دیتے اُدھر سائلوں کی حاجتیں پوری کرتے۔ ہر شخص یکے بعد دیگرے اپنا استفتا پیش کرنا شروع کرتا اور اسی وقت جواب کا طالب ہوتا۔ آپ کا حافظہ اس بلا کا تھا کہ فوراً پیش شدہ مسئلہ کو جانچ لیا کرتے اور بلا تامل جواب شافی دیتے۔ جس تبحر اور لیاقت کے ساتھ آپ ہر مسئلہ میں تقریر کرتے وہ ایسی معمولی تقریر نہیں ہوتی تھی جس سے لوگوں کو استعجاب اور استعجاب کے ساتھ حیرت نہ ہوتی۔

بعض وقت سائلوں کا ہجوم اور طلبہ کی کثرت پھر ان کا بے معنی شور وغل اس درجہ تک پہنچ جاتا کہ ایک نازک دماغ شخص چاہے جس قدر حلیم و بردبار کیوں نہ ہو کبھی ممکن نہیں کہ اس کا تحمل کر سکے۔ لیکن چونکہ شاہ صاحب کا مزاج قدرتاً حلیم اور رحیمانہ واقع ہوا تھا اور انسانی ہمدردی آپ میں کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھی، اس لئے آپ ان کے اس ہجوم اور شور وغل کا تحمل بڑی خوشی کے ساتھ کرتے اور ہر ایک شخص کو خواہ وہ کسی رتبہ کا آدمی ہوتا، نہایت متانت وسنجیدگی اور منکسر المزاجی کے ساتھ جواب دیتے اور شافی جواب دیتے۔

اخلاق وعادات

آپ کے اخلاق وعادات نہایت عام و وسیع تھے۔ اس وجہ سے ہر شخص خواہ وہ کسی درجہ کا ہوتا ہر وقت آپ سے بلا تامل مل سکتا اور اس کے لئے وسیلہ وتعارف عزت وجاہ کی سفارش کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ کی طرز معاشرت میں جو چیز سب سے زیادہ پسندیدہ اور قابل تعریف بات ہے وہ یہ ہے کہ باوجود نفاست پسندی اور نازک مزاجی کے فضول شان وشوکت اور نمائش کا نام نہ تھا۔ جب آپ بازار میں نکلتے تو ایک معمولی حیثیت سے نکلتے۔ آپ جس درجہ اور رتبہ کے آدمی تھے، اس لحاظ سے آپ کی ہمراہی میں کم از کم دو تین خدمتگار ہر وقت ضرور رہنے چاہیے تھے، لیکن چونکہ غرور ونخوت

تکبر و توقع اور کم بینی آپ میں نام کو نہ تھی اس لئے بازار تشریف لے جاتے وقت آپ کے ساتھ ایک آدھ آدمی بھی نہ ہوتا تھا۔ باوجود اس درجے اور عالمانہ تزک و احتشام کے آپ کے مزاج میں انتہا درجہ کا عجز و انکسار تھا۔ عام طرز معاشرت تکلف اور بناوٹ سے بالکل خالی تھی۔

اوقات کی پابندی

آپ کا اکثر وقت تو علوم دینیہ کی درس و تدریس اور فرائض منصبی کی تکمیل و ادائیگی میں صرف ہوتا تھا۔ جیسا کہ میں مختصراً اوپر بیان کر آیا ہوں اور تھوڑا حصہ مراقبہ و مکاشفہ اور احکام طریقت کی تعلیم و تلقین اور علم سلوک کی باریک و غامض مسائل کے حل کرنے میں۔ اس سے زیادہ خوش قسمتی کی اور کیا بات ہوسکتی ہے کہ روز ازل سے جس طرح آپ کو شریعت کا حصہ ملا تھا اسی طرح علم طریقت کا مبارک تاج ہی آپ کے سر پر رکھا گیا۔ جیسا علم حدیث و تفسیر آپ کے آگے پانی تھا ویسا ہی آپ کی ضمیری و روحانی جوہر اپنے میں ممتازیت کی گہری تہہ رکھتے تھے اور ربانی قابلیتوں کا پرتو آپ کے حجلۂ دل میں کامل طور پر پڑ چکا تھا۔ چنانچہ آپ کے باطنی علوم اور روحانی فیوض کا ذکر آپ کے تفصیلی حالات میں کسی قدر بسط و شرح کے ساتھ کروں گا۔

علمی ترقی

یہ آپ ہی کی مقدس و مبارک ذات کا فیض تھا کہ نہ صرف دہلی بلکہ اس کے اطراف و مضافات میں دینی علوم اور رسمی فنون کا ایک عظیم الشان سمندر بڑے زور شور سے لہریں لے رہا تھا اور حدیث و تفسیر کا نہایت چمکدار اور نتھرا ہوا چشمہ انتہا کی پیاری اور دلگیر ادا کے ساتھ ابل کر بہہ رہا تھا جس میں سے صدہا خوشگوار اور تازگی بخش نہریں کٹ کٹ کر دور تک بھی چلی گئی تھیں اور جنہوں نے اپنی انتہا سے زیادہ شادابی و خنکی کے اثر سے ایک عالم کو سرسبز اور لہلہار کھا تھا۔ قریب قریب ہندوستان کا اکثر حصہ علوم و فنون کے ان لہلہاتے درختوں کے خنک اور راحت دہ سائے سے آسائش گزین تھا، جن کے بھینی بھینی اور عطر آمیز جھونکوں نے ایک عالم کے دل و دماغ کو معطر کر دیا تھا۔ جس طرف نظر اٹھتی تھی اور جہاں تک کام کرتی تھی علمی پودے ہی لہلہاتے نظر پڑتے تھے جو دیکھنے والوں کو بڑے وثوق و اعتبار سے امیدیں دلاتے تھے کہ عنقریب ایک وہ تاباں و درخشاں زمانہ آنے والا ہے جس میں ایک عالم اس سرے سے لے کر اُس سرے تک ان ہی نونہال اور ہونہار پودوں کے نشاط انگیز سائے میں بیٹھ کر آسائش و نشاط کا کافی حصہ لے گا اور ان کے پھل پھولوں سے گودیاں بھر بھر کر لے جائے گا۔

شاہ صاحب جیسے فاضل و علامہ تھے، ویسے ہی محنتی اور جفاکش بھی تھے۔ نفس کشی کے لئے محنت و ریاضت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا اور نفس امارہ کو احکام خداوندی کا پورا پورا مطیع اور فرمانبردار بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نیکوکاری، تقویٰ و پرہیزگاری، طاعت الٰہی، خداداد خلق، بے مثل تواضع، نیک نیتی، وفاشعاری، خداترسی یہ سب باتیں بوجہ احسن آپ میں پیدا ہوگئی تھیں۔ گویا قدرت کے پیارے اور نازک ہاتھوں نے اوصاف جمیلہ اور محاسن جلیلہ کی جو قیمتی قبا آپ کے موزوں

قامت کے لئے قطع کی تھی، وہ دوسرے قد پر بمشکل موزوں اور ٹھیک آ سکتی تھی۔ قطع نظر اس کے آپ کے معجز نما کرامات اور روحانی کشف و جذبات کے چرچے تمام دنیا میں پھیلے ہوئے تھے اور ہر خاص و عام کی زبان زد تھے۔ آپ کا ہنس مکھ چہرہ اس حسن اخلاق اور شائستہ عادات کا پتہ دیتا تھا جو پہلے ہی سے فطرت کی بخششوں سے آپ کو عطا ہوئے تھے۔

غرضکہ شاہ صاحب اپنے زمانہ میں ایک ایسے مسلم الثبوت اور فخر روزگار محدث تھے جو تمام مروجہ فنون میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ علم حدیث و تفسیر کے جولانگاہ کے پورے شہسوار تھے اور حنفی فقہ کے دوسرے بازو سمجھے جاتے تھے۔ عوام و خواص کے مرجع اور علماء فضلا کے معتقد علیہ تسلیم کیے جاتے تھے۔ آپ کی جودت طبع، رسائی ذہن، بلند خیالی، دقیق النظری، حوصلہ مندی ایسی ہی بے نظیر تھی۔ قوت اجتہاد، تبلیغ علم، کتاب و سنت کی فہم معانی میں مہارت ایسی ہی وسیع تھی۔ زہد و تقویٰ کے علاوہ جوانمردی، خوش اخلاقی، منکسر المزاجی، تورع، احتیاط بلے درجہ کے تھے۔ غرضکہ جو بات تھی بالکل انوکھی تھی جو وصف تھا نرالا تھا۔ باوجود ان تمام باتوں کے آپ کا حافظہ ایسا بے مثل اور یادداشت اس بلا کی تھی کہ سالہا سال کی سنی سنائی بات اس متانت اور بے تکلفی کے ساتھ بیان فرماتے تھے کہ سننے والے عش عش کرنے لگ جاتے تھے۔

یہ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ شاہ صاحب نے دولت علم کے علاوہ ثروت و تمول کا بھی حصہ لیا تھا اور تمول کے ساتھ وہ زیور بھی تھا جو مال و دولت کے لئے نہ صرف زیب و زینت ہے بلکہ اعلیٰ درجہ کی ترقی و عروج کا ذریعہ ہے یعنی آپ کی طبیعت نہایت سخی اور فیاض واقع ہوئی تھی۔ فقیروں اور مسکینوں کے ساتھ رحیمانہ و فیاضانہ برتاؤ اور سلوک کے علاوہ طلبہ کی معیشت کے سامان ہمیشہ مہیا رکھتے اور خاص رعایت و مہربانی سے پیش آیا کرتے تھے اور جہاں تک ممکن ہوتا ان سے مسلوک ہوتے لیکن یہ تعجب سے دیکھا جاتا ہے کہ باوجود تمول و دولتمندی کے خود ایسے سادے اور معمولی طریقے سے زندگی بسر کرتے کہ ایک خوشحال شخص سے نہایت مشکل اور بعید از قیاس ہے۔ آپ کے خاصے میں اکثر اوقات خشک روٹی اور کبھی کبھی بقولات ہوتے۔

جناب مولٰنا شاہ ولی اللہ صاحب کی ولادت
طفولیت، تعلیم، تربیت، سن رشد وغیرہ

شاہ ولی اللہ کی ولادت پر علماء و عرفاء کے مبشرات

شاہ صاحب کے واقعات ولادت پر ریویو کرنے سے پہلے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ان مبشرات کو مختصراً قلم بند کروں جو آپ کی ولادت سے قبل صلحا و علما کی ایک جماعت نے آپ کی نسبت دیکھے اور جن کی بابت خود جناب شاہ صاحب اپنی ایک تالیف میں یوں ریمارک کرتے ہیں کہ "ہنوز میں پیدا نہیں ہوا تھا کہ حضرات والدین اور عرفا کے ایک گروہ نے میرے حق میں بہت سے مبشرات معلوم کیے چنانچہ بعض اعزہ و اخوان اور اجلہ خلان نے ان واقعات نیز میری

تاریخ زندگی کے پورے حالات کونہایت تفصیل کے ساتھ ایک رسالہ میں ضبط کیا ہے، جس کا نام ''قول جلی'' رکھا ہے۔
جزاہ اللہ خیر الجزاء و احسن الیہ والیٰ اسلافہ و اعقابہ و ادخلہ الی مایتمنا من دینہ و دنیاہ۔

مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ''حیات ولی'' کی تالیف کے زمانہ میں مَیں نے ان تھک کوششیں کیں کہ کسی طرح یہ نسخہ دستیاب ہو جائے اور بعض دوستوں کی خدمت میں خطوط بھی لکھے لیکن بدقسمتی سے ہندوستان کی کسی علمی سوسائٹی میں سراغ نہیں لگا۔ لہٰذا مجبوری و یاس کی حالت میں خود شاہ صاحب کی تالیفات اور دیگر فارسی و عربی کی بسیط کتابیں بنظر انتخاب دیکھنا شروع کیں۔ ان تمام کتابوں میں جہاں کہیں شاہ صاحب کی سوانح عمری کے متعلق کوئی ذکر دیکھا گیا یا کوئی خاص واقعہ نظر پڑ گیا، منتخب کر کے ترتیب کا لباس پہنایا گیا۔

الغرض مجھے اُن مبشرات و واقعات کا تو پتا لگا نہیں جنہیں ''قول جلی'' کے مؤلف نے جمع کیا ہے لیکن رسالہ ''بوارق المعرفۃ'' سے جو جناب شیخ عبدالرحیم صاحب کے حالات و واقعات میں تصنیف کیا گیا ہے، چند مبشرات انتخاب کر کے ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔

جناب شیخ عبدالرحیم صاحب کے حالات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ آپ فرماتے ہیں۔ مجھے ایک دفعہ خواجہ قطب الدین قدس سرہ کے مزار مقدس کی زیارت کرنے کا اتفاق ہوا۔ دفعتاً ان کی روح مبارک نے مجھ پر ظاہر ہو کر فرمایا کہ شیخ عبدالرحیم! عنقریب تمہارے ہاں ایک فرزند رشید پیدا ہوگا۔ تم اس کا نام قطب الدین احمد رکھنا، لیکن چونکہ میری بی بی سن شباب کے تمام مرحلے طے کر کے زمانہ ایاس تک پہنچ چکی تھیں اور اس عمر میں عادتاً ولادت کا تحقق نہیں ہوتا اس لئے مجھے گمان ہوا کہ شاید خواجہ کی مراد یہ ہے کہ جب تمہارے ہاں پوتا پیدا ہوگا تو اس کا قطب الدین احمد نام رکھنا لیکن خواجہ نے میرے اس اندرونی خطرہ پر فوراً مشرف ہو کر فرمایا کہ نہیں میری یہ مراد نہیں ہے بلکہ جس لڑکے کی نسبت میں نے تمہیں بشارت دی ہے وہ تمہارے ہی صلب سے پیدا ہوگا چنانچہ اس واقعہ کے تھوڑے ہی دنوں بعد مجھے نکاح ثانی کا داعیہ پیدا ہوا اور نکاح کے تھوڑے عرصہ کے بعد ولی اللہ پیدا ہوئے۔ اگرچہ اول اول مجھے یہ واقعہ بالکل نسیاً منسیاً ہو گیا اور اسی وجہ سے میں نے انہیں ولی اللہ کے نام سے شہرت دی لیکن جب وہ واقعہ یاد آیا تو میں نے ان کا دوسرا نام قطب الدین احمد رکھا۔

''بوارق المعرفۃ'' میں لکھا ہے کہ جب جناب شیخ عبدالرحیم صاحب زندگی کے ساٹھ مرحلے طے کر چکے تو انہیں الہام ہوا کہ تقدیر الٰہی اس پر جاری ہوئی ہے کہ ایک بلند اقبال اور ہونہار لڑکا اور پیدا ہوگا جس کی شہرت کا ستارہ اوج عروج پر پہنچ کر شہاب ثاقب کی طرح چمکے گا اور جس کے اقبال اور کمال علم کا آفتاب پوری ترقی کر کے نصف النہار کے مرکز پر پہنچ جائے گا۔ اسی اثنا میں آپ کے خاص خاص اصحاب اور بزرگان وقت نے بھی بایں مضمون بشارت دی کہ پیدا ہونے والا لڑکا بڑا صاحب اقبال اور نامور ہوگا۔ اس کی مثال علم اور مراتب کمال کا انحصار ارباب زمانہ کو مشکل ہوگا اور وہ علوم و فنون میں فرزانہ روزگار اور اپنے عہد میں ایک نہایت دانشمند و طباع اور ضرب المثل شخص ہوگا۔ اس کے سامنے وارث تخت و تاج کی گردن جھک جائے گی اور عوام و خواص کا مذہبی پیشوا تسلیم کیا جائے گا۔ چنانچہ ان مبشرات کو سن کر شیخ عبدالرحیم صاحب نے دوسرے نکاح کا ارادہ کیا۔ حضرت شیخ محمد نے جب یہ ماجرا سنا تو اپنی جگر پارہ کو بمنت شیخ کے نکاح میں دے دیا کیونکہ آپ کو اس بارہ میں زیادہ اعتنا تھا بلکہ بیحد حریص و راغب تھے کہ یہ ہونہار اور بلند اقبال لڑکا میری ہی جگر پارہ کے بطن سے پیدا ہو۔

ہنوز شاہ ولی اللہ صاحب پیدا نہیں ہوئے تھے کہ ایک رات جناب شیخ عبدالرحیم کے والد بزرگوار نماز تہجد میں مصروف تھے اور آپ کی والدہ محترمہ بھی اسی جگہ تہجد کی نماز ادا کر رہی تھیں۔ جب شیخ صاحب نماز سے فارغ ہوئے تو آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا میں مشغول ہوئے۔ آپ نہایت عجز وانکساری سے دعا کر رہے تھے اور والدہ مکرمہ پیچھے کھڑی آمین کہہ رہی تھیں۔ اسی اثنا میں ان دونوں حضرات کے درمیان دو ہاتھ ظاہر ہوئے جن کی نسبت محترم شیخ نے فرمایا کہ یہ دونوں ہاتھ ہمارے اس فرزند کے ہیں جو عنقریب عرصۂ وجود میں قدم رکھے گا اور اپنے نور علم سے تمام دنیا کو چمکا دے گا۔ اس وقت وہ بھی ہمارے ساتھ دعا میں شریک ہے اور باعجز وانکسار آمین کہہ رہا ہے۔ خود جناب شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد فقیر پیدا ہوا اور ساتویں سال میں قدم رکھا تھا کہ والدین کے ساتھ نماز تہجد میں شریک ہوا اور اسی وضع سے دونوں ہاتھ حضرات والدین کے درمیان اٹھائے۔ اس پر جناب شیخ عبدالرحیم صاحب نے فرمایا: **هذا تاويل رؤياى من قبل قد جعلها ربى حقا.**

ابھی مولانا شاہ ولی اللہ والدہ محترمہ کے بطن مبارک ہی میں تشریف رکھتے تھے کہ ایک دفعہ جناب شیخ عبدالرحیم صاحب کی موجودگی میں ایک سائلہ آئی۔ آپ نے روٹی کے دو حصہ کر کے ایک اسے دیا اور ایک رکھ دیا لیکن جوں ہی سائلہ دروازہ تک پہنچی شیخ صاحب نے اسے دوبارہ بلایا اور بقیہ بھی عنایت کر دیا اور جب وہ چلنے لگی تو پھر آواز دی اور جس قدر روٹی گھر میں موجود تھی سب دے دی۔ زاں بعد گھر والوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ پیٹ والا بچہ بار بار کہہ رہا ہے کہ جتنی روٹی گھر میں ہے سب اس محتاج و مسکین کو راہ خدا میں دے دو۔

ولادت

الغرض جناب شاہ ولی اللہ صاحب 4 رشوال 1114ھ چہارشنبہ کے دن طلوع آفتاب کے وقت جناب مخدومی شیخ محمد کی عصمت مآب اور محترمہ صاحبزادی کے باجاہ وجلال بطن سے پیدا ہوئے بعض اختر شناسوں نے فوراً اپنی صناعت کا ڈھانچ کھڑا کیا اور اچھی طرح غور کر کے یہ حکم لگایا کہ یہ وہی بلند اقبال اور ہونہار لڑکا ہے جس کی قسمت میں روز ازل سے فاضل عصر اور مجتہد وقت ہونا لکھا تھا اور جس کی فرزندی کا انتساب نہ صرف شیخ عبدالرحیم صاحب کو بلکہ خاندان کے ہر ایک معزز ممبر کو ساری دنیا میں مشہور و روشناس کر دے گا اور جس کے نام کا امتیازی جھنڈا عرب و عجم دونوں میں گڑ جائے گا۔

بعض اسلامی مؤرخوں کا یہ ریمارک نہایت صحیح ہے کہ اگر اس خاندان میں جناب شاہ ولی اللہ صاحب پیدا نہ ہوتے تو یہ خاندان کبھی اس درجہ تاریخی شہرت حاصل نہ کرتا اور کیا عجب کہ گمنامی کے دائرہ میں محدود و مقید رہتا۔ اس جلیل القدر خاندان میں یہ بزرگی و شرف روز ازل سے آپ ہی کے حصہ میں تھا کہ اپنی بے دھڑک جرأت سے نہایت صاف اور واضح طور پر علوم نبویہ کی اشاعت احکام دین کی توسیع اور کھلم کھلا عام لوگوں کو قرآن مجید کی تلقین کریں۔

طفولیت

شاہ صاحب کے بچپن کا زمانہ دراصل آپ کے آئندہ سوانح عمری کا ایک صاف اور مجلی آئینہ تھا۔ آپ کی

فراخ پیشانی ابتدا ہی سے اس عالمانہ تزک و احتشام کا صاف پتہ دیتی تھی جو آپ کو زمانہ آئندہ میں حاصل ہونے والا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس میں ایک خاص قسم کی بزرگانہ متانت کا چکارا ایک ایسی درخشانی دکھاتا تھا جسے مبصرین اور قیافہ شناس لوگ دیکھ کر کہتے تھے کہ عنقریب ایک وہ زمانہ آنے والا ہے جس میں یہ ہلال تمام ملک میں چودھویں رات کا چاند بن کر چمکے گا۔ ہندی کی یہ مثل کہ پوت کے پاؤں پالنے میں پہچانے جاتے ہیں حقیقت میں بہت صحیح ہے۔ آپ کے بچپن کی حرکتیں ہی کچھ ایسی دلکش اور پُر اثر تھیں اور طفلانہ نظروں میں اس بلا کا جذب و کشش تھا جس نے سارے خاندان کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ دیکھنے والے آپ کے جلال خیز نظارہ سے اس بڑے نصیبہ کی فال لیتے جو آنے والے زمانہ میں آپ کو حاصل ہوا۔

واقعی بات یہ ہے کہ شاہ صاحب کے بچپن کا زمانہ کچھ ایسا حیرت افزا زمانہ تھا جس کی نظیر دوسرے ہونہار بچوں میں پائی جانے کی ہرگز امید نہیں ہوسکتی۔ فطرت نے آپ کی بھولی صورت میں وہ دلگیر اور محبوبانہ ادائیں کوٹ کوٹ کر بھر دی تھیں، جنہوں نے جناب شیخ عبدالرحیم صاحب جیسے مستغنی مزاج کو آپ کا فریفتہ و شیدا بنا دیا تھا۔ رحیم الطبع بزرگ شیخ اپنے ہونہار اور بلند اقبال فرزند سے بے حد محبت رکھتے اور اس کی سلامت روی اور خوش آئند حرکات سے محظوظ ہوتے تھے اور ہمیشہ اس کی راحت و آسائش کو اپنے آرام و چین پر ترجیح دیتے تھے۔ جوں جوں شاہ صاحب عمر میں ترقی کرتے جاتے اور زندگی کے مرحلے طے کرتے جاتے تھے جناب شیخ عبدالرحیم صاحب کی آپ پر توجہ زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ چنانچہ ایک موقعہ پر خود شاہ ولی اللہ صاحب اپنے پُر زور قلم سے تحریر فرماتے ہیں کہ ''مجھ پر سب سے بڑی نعمت خداوندی جس کے مقابلہ میں تمام نعمتیں ہیچ ہیں یہ ہے کہ جناب والد بزرگوار اس فقیر سے ہمیشہ راضی رہے۔ بچپن کے زمانہ سے آخر عمر تک جو مہربانیاں مجھ پر مبذول رہیں ہیں ان میں سے کماحقہ' ایک کو بھی بیان نہیں کر سکتا۔ میرے لئے اس سے زیادہ اور کیا فخر کا باعث ہوسکتا ہے کہ جب آپ کا انتقال ہونے لگا تو مجھے سینہ سے لگا کر بیعت و ارشاد کی اجازت عامہ دی اور کلمہ یدہ کیدی مکرر سہ کرر ذکر کیا۔ خاص تحصیل علوم اور لڑکپن کے زمانہ میں جس قدر حضرت کی توجہ خاص مجھ پر مبذول تھی۔ اس قدر توجہ میں کسی باپ میں اپنے فرزند کی نسبت نہیں دیکھتا۔ باایںہمہ میں نے اپنی عمر میں کوئی ایسا باپ اور کوئی استاد کوئی مرشد نہیں پایا جس نے اپنے فرزند و تلمیذ کی نسبت شفقت و مہربانی کے وہ دقائق مرعی رکھے ہوں جو حضرت والد نے اس فقیر کی نسبت رکھے۔

اللهم اغفرلی ولوالدی وارحهما كما ربيانی صغيرا وجازهما بكل شفقة ورحمة ولعمة بهما على مائة الف اضعافها انك قريب نجيب.

شاہ صاحب کا زمانہ طفولیت اور بچپن کی سکوت خیز صورت ایک قیافہ شناس اور تجربہ کار نظر کے لئے ایک عظیم الشان واقعہ کی پیشین گوئی کرتی تھی۔ جو شخص غور میں ڈوبی ہوئی نگاہوں سے آپ کے طفلانہ حرکات کو دیکھتا تھا اسے فطرت کے وہ عجیب و غریب اور حیرت افزا نمونے آپ کی پیشانی میں جلوہ گر نظر آتے تھے جو روز ازل سے آپ کی ذات والا صفات میں ودیعت رکھے گئے تھے اور یہ اسی فطری نور کا سچا پرتو تھا جس نے بہت جلد آپ کے ظاہر و باطن کو تاباں اور چمکدار کر دیا۔ اگرچہ ابھی آپ کی عمر مشکل سے تین چار سال کی ہوگی کہ اخلاقی اور تمدنی ترقی میں سرگرم ہوگئے۔ اسی کم سنی اور نوعمری کے زمانہ میں آپ کو ایک ایسا وحشت آمیز تفکر لاحق رہتا تھا کہ دیکھنے والے حیرت زدہ ہو جاتے تھے۔ مسکینی،

غریبی، کم گوئی، آہستگی سے بات کرنا، گردن جھکا کر جواب دینا اور ہر بات پر بجا و درست کہنا یہ تمام صفتیں جو عموماً بچوں میں بہت کم دیکھی جاتی ہیں محترم و بزرگ شاہ صاحب میں موجود تھیں۔ خلاصہ یہ کہ جناب شاہ ولی اللہ صاحب کی ابتدائی زندگی بالکل غیر معمولی اور ایک ایسی نرالی طرز و ادا کی تھی جو دنیا کے بچوں میں اپنا نظیر نہیں رکھتی تھی۔

تربیت

جس زمانہ میں اس فخر خاندان اور فرید عصر کی ولادت ہوئی اس وقت جناب شیخ عبدالرحیم صاحب گو اعلیٰ درجہ کے دولت مند اور صاحب اقتدار نہ تھے لیکن پھر بھی متوسط درجہ کی حالت رکھتے تھے۔ گورنمنٹ قلعہ کی طرف سے کسی قسم کی امداد تھی نہ بادشاہ وقت کی جانب سے کسی طرح کا کوئی وظیفہ مقرر تھا۔ صرف توکل پر گزران اور ہر وقت خدا پر نظر تھی۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ آپ ہمیشہ خوشحال رہتے اور ضرورت کے وقت غیبی سامان مہیا پاتے چنانچہ اس وقت بھی وہ تمام سامان مہیا تھے جو ایک خوش نصیب بچہ کی پرورش کے واسطے ہونے ضروری ہیں اس لئے شاہ ولی اللہ صاحب کی بڑے اہتمام سے پرورش ہوئی اور عمر کا ابتدائی حصہ اعلیٰ درجہ کی تربیت کے ساتھ جو تعلیم کا دوسرا جزو ہے ختم ہو گیا۔

تعلیم

جب اس فرزانہ روزگار نے عمر کے ابتدائی مرحلے طے کر کے پانچویں سال میں قدم رکھا تو قرآن مجید پڑھنے کے لئے مکتب میں بٹھایا گیا۔ چونکہ آپ فطری طور پر علم سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے اور روز ازل سے آپ کے ضمیری جوہر ربانی قابلیتوں سے آراستہ اور درخشاں ہو چکے تھے۔ لہٰذا آپ نے ساتویں سال قرآن مجید ختم کر لیا اور اسی چھوٹی سی عمر میں مذہبی ارکان و فرائض تدریجاً حاصل کر لئے چنانچہ اسی سال میں جناب شیخ عبدالرحیم صاحب نے آپ کو نماز پر کھڑا کیا اور رمضان کے روزے رکھنے کا حکم فرمایا۔ چونکہ شاہ صاحب میں تہذیب اخلاق کا مادہ نیچرل تھا۔ اس لئے نشست و برخاست کے آداب اور گفتگو کرنے کے طریقے خود بخود اسی کم سنی میں حاصل ہو گئے تھے۔ آپ کا عام قاعدہ تھا کہ جب بڑی عمر والے سے گفتگو کرتے خواہ وہ کسی رتبہ اور درجہ کا آدمی ہوتا ہمیشہ گردن جھکا کے آنکھیں نیچے کر کے کرتے اور جب کوئی بات دریافت کی جاتی تو نہایت متانت و سنجیدگی سے جواب دیتے البتہ ہم عصروں سے دل کھول کر باتیں کرتے لیکن ان کے ساتھ بھی تہذیب و شائستگی کے درجہ سے تجاوز نہ کرتے اور خلاف ادب کبھی کوئی بات نہ کرتے۔ زندگی کے سات مرحلے ہنوز طے نہیں کیے تھے کہ فارسی کی درسی کتابیں پڑھنی شروع کر دیں اور چند ہی روز میں تمام کتابیں نکال لیں کیونکہ یہ علم آپ کے سامنے بالکل پانی تھا۔ چونکہ طبیعت کو علوم سے قدرتی طور پر مناسبت تھی چند ہی روز میں اشاروں پر دوڑنے لگے اور آخر ایک سال کے عرصہ میں اسے عروج پر پہنچا دیا۔ فارسی کی درسی کتابوں سے فارغ ہونے کے بعد صرف و نحو کے مختصر رسالے دیکھنے شروع کیے اور ان پر بھی بہت جلد عبور کر گئے۔ عمر کا دسواں سال شروع تھا کہ آپ شرح ملا پڑھتے تھے گویا دو ڈھائی سال کے عرصہ میں صرف و نحو کی تمام کتابیں نکال لیں تھیں اور دس سال کی عمر میں صرف و نحو پر آپ کو اس درجہ اقتدار ہو گیا تھا کہ بڑے بڑے صرفی و نحوی جو کتاب کے کیڑے کہلائے جاتے تھے اور جنہوں نے ان علوم میں عزت و

وقعت کے ساتھ شہرت و ناموری کے تمغے حاصل کیے تھے آپ سے مسائل صرفیہ ونحویہ میں گفتگو کرتے جھجکتے تھے اور جس وقت آپ ان کی باریکیاں بیان کرتے اور مطالب کے حل کرنے کی طرف متوجہ ہوتے تو وہ آپ کی حذاقت وذہانت پر عش عش کرنے لگتے اور آپ کے زور سمندر کی باگیں ہزاروں کوششوں کے بعد بھی نہ روک سکتے۔

اس کے بعد شاہ صاحب کو معقول کی کتابیں شروع کرائی گئیں۔ یہاں پہلے ہی خداداد طبیعت پائی تھی۔ جودت ذہن اور ذکاوت طبع سے تھوڑے ہی عرصہ میں یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا اور اس قدر جلد کمال حاصل کر لیا کہ اس سے جلد تکمیل پانا ممکن ہی نہ تھا۔ کمال بھی اس درجہ کا کہ علم منطق میں کسی کی مجال نہ تھی کہ آپ کے سامنے زبان کھول سکتا۔ بڑے بڑے تجربہ کار منطقی آپ کے تبحر کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے اور انہیں کسی مسئلہ کے دریافت کرنے کا حوصلہ نہ پڑتا تھا۔ یہ بات تعجب سے دیکھی جاتی ہے کہ جناب شاہ ولی اللہ صاحب ایک ہی زمانہ میں متعدد علوم کی تحصیل کرتے تھے اور ایک علم کا کمال دوسرے کے کمال کو مانع نہ ہوتا تھا اور یہ اس ذہن وحافظہ کی قوت کا اثر تھا جو فطرت کی خاص بخشش وعطیہ تھے۔ غرضکہ تیرہ سال کی عمر میں شاہ صاحب نے ان تمام علوم میں کمال حاصل کر لیا تھا یہی سبب تھا۔ کہ آپ اس چھوٹی سی عمر میں فنون مذکورہ میں ارباب کمال کے زمرہ میں شمار کیے جانے لگے تھے۔

شاہ صاحب کی ازدواج

چودہویں سال میں قدم رکھا تھا کہ آپ کے والد ماجد نے شادی کی سلسلہ جنبانی شروع کر دی اور اس سلسلہ کے پورا کرنے میں نہایت سرگرمی اور مستعدی کے ساتھ عجلت وشتابی کی۔ اگرچہ آپ کے سمدھیانے کے لوگوں نے سامان کے نہ فراہم ہونے کا عذر پیش کیا اور تھوڑے دنوں کی مہلت چاہی لیکن جناب شیخ عبدالرحیم صاحب نے انہیں صاف طور پر لکھ دیا کہ میں جو اس بارہ میں جلدی کرتا ہوں اس کا ایک خاص سبب ہے جو عنقریب آپ لوگوں پر ہویدا ہو جائے گا۔ بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس کار خیر میں ذرا توقف نہ کریں اور جس طرح ممکن ہو صاحبزادی کی شادی میں عجلت سے کام لیں۔ اسباب مہیا نہ ہونے کا قوی عذر نہیں ہے اور وہ بمقابلہ اس مصلحت وحکمت کے جو اس جلدی میں مضمر ومخفی ہے کوئی وقعت نہیں رکھتا چنانچہ وہ اس خط کے پہنچنے کے بعد راضی ہو گئے اور اپنی لڑکی کو جناب شاہ ولی اللہ کے نکاح میں دے دیا۔

شاہ صاحب کا نکاح ہوتے ہی آپ کی خوشدامن نے سفر آخرت قبول کیا اور اتفاق سے چند ہی روز بعد خوشدامن کی والدہ انتقال کر گئیں، جس سے خود شاہ صاحب اور آپ کی محترمہ بی بی کو انتہا درجہ کا ملال ہوا۔ ابھی اس رنج و اندوہ سے فرصت نہ ملی تھی کہ شیخ فخر العالم جناب شیخ ابوالرضا محمد صاحب کے فرزند رشید انتقال کر گئے اور اس کے کچھ عرصہ بعد جناب مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کی والدہ مکرمہ یعنی آپ کے برادر کلاں شیخ صلاح الدین کی حقیقی والدہ فوت ہو گئیں۔ زاں بعد خود جناب شیخ عبدالرحیم صاحب قدس سرہ مختلف بیماریوں میں مبتلا ہوئے اور سخت ضعیف وناتواں ہو گئے۔ انتقال کے وقت آپ کو کوئی ایسا قوی عارضہ نہ تھا لیکن متواتر صدمات اور ضعف وناتوانی نے انہیں بالکل تحلیل کر دیا تھا۔ چنانچہ اس واقعہ کے چند دنوں بعد آپ بھی انتقال کر گئے۔

یہ تھا وہ مخفی بھید جس کی وجہ سے جناب شیخ عبدالرحیم صاحب نے اپنے بلند اقبال صاحبزادے کی شادی میں

عجلت کی تھی۔ آپ کا وہ راز سربستہ اس وقت عام و خاص پر کھلا اور انہوں نے معلوم کر لیا کہ درحقیقت اگر اُس وقت اس شادی کی تقریب انجام کو نہ پہنچتی تو ممکن تھا کہ سالہا سال کے گزر جانے کے بعد بھی قوت سے فعل میں آتی۔ اس دو ڈھائی سال کے اندر اندر جناب شاہ ولی اللہ صاحب کو ایسے جانفرسا حوادثات پیش آئے جن سے آپ بہت ہی مضمحل ہو گئے اور آپ کا تمام اطمینان و جمعیت پریشانی و بے اطمینانی سے بدل گیا۔ اس وقت اگرچہ آپ کی طبیعت کے مخالف دنیاوی تعلقات نے چاروں طرف سے اپنا بھیانک اور خوفناک چہرہ ابھار ابھار کر دکھلایا اور آپ کی جمعیت خاطر میں انتشار ڈالا مگر سچ پوچھیے تو شاہ صاحب نے بڑے ہی استقلال اور جوانمردی سے کام لیا۔ آپ نے کسی بات کا کچھ بھی خیال نہیں کیا اور تمام تعلقات سے منہ موڑ کر اپنی اسی ایک دھن میں محو رہے۔

گو علمی ذوق سے آپ کا دماغ پہلے ہی سے گونج رہا تھا اور اس کی صدائیں بچپن ہی کے زمانہ سے متواتر کانوں میں پہنچ چکی تھیں مگر پھر بھی اس وقت تزوج نیز اس جگر خراش اور جانفرزا حوادث کے وسیع تعلقات کی طول طویل لین ڈوری آگے بڑھی چلی جاتی تھی اور بار بار علمی ترقی کی سدِ راہ بننا چاہتی تھی۔ لیکن اس پر بھی آپ کو یہی کرید چلی جاتی تھی کہ مجھے تحصیل علوم اور اس کی تکمیل میں سرگرم ہونا چاہیے۔ چنانچہ اب آپ کے خیالات سب طرف سے پھر پھرا کر اس طرف رجوع ہوئے کہ جہاں تک بن پڑے تفسیر و حدیث کے علوم میں ترقی کرنا اور انہیں باقاعدہ حاصل کرنا چاہیے کیونکہ آپ بخوبی سمجھتے تھے کہ تاوقتیکہ حدیث میں کمال حاصل نہ ہوگا علوم کی تکمیل ناممکن ہے۔ اسلامی علوم جن میں کمال کی ضرورت تھی وہ بچپن ہی میں حاصل ہو چکے تھے۔ اب خاص خاص علوم کی مشق کا زمانہ تھا۔ چنانچہ اس وقت آپ کی طبیعت تفسیر پر مائل تھی اور اسی علم سے خاص دلچسپی تھی۔

علمِ حدیث

جب آپ نے عمر کے چودہ مرحلے طے کر کے پندرہویں میں قدم رکھا تو علاوہ دیگر علوم کی تکمیل کے تفسیر بیضاوی کا ایک بڑا حصہ والد بزرگوار سے پڑھ لیا اور اب آپ نے ان تمام متعارفہ فنون کو عروج پر پہنچا دیا جو ان شہروں میں رائج اور علماء و فضلا کے درس میں داخل تھے۔ اسی سال میں والد بزرگوار سے بیعت کی اور اشغال صوفیہ بالخصوص مشائخ نقشبندیہ کے معمولی اوراد و وظائف میں مشغول ہوئے اور بحیثیت توجہ و تلقین تعلیم و آداب طریقت، خرقہ صوفیہ میں ارتباط درست کیا۔ علم تصوف دیکھنا شروع کیا یہاں تک کہ اس کے غوامض اور دقیق و باریک مسائل کے حل کرنے کی طرف آپ کی طبیعت متوجہ ہو گئی اور نہایت قلیل مدت میں اس علم میں بھی اچھی خاصی مہارت پیدا کر لی اور ایسے ایسے نکات اور باریکیاں اس خاص فن میں پیدا کیں جس کے سیکھنے کی بڑے بڑے علامہ مشائخ آرزو کرتے تھے۔ بالآخر جناب شاہ ولی اللہ صاحب نے اس فن میں نہایت تبحر کے ساتھ وہ قیمتی اور آبدار موتی تالیف و تصنیف کے سلسلہ میں پروئے جن سے علوم تصوف کی معلومات کی شعاعیں نکل کر دور دور تک پھیل گئی تھیں۔ جیسا کہ معزز ناظرین کو آپ کے تصنیفات کے حالات پڑھ کر اس بات کا خود علم ہو جائے گا جو اسی حصہ میں جدا عنوان سے قلمبند کی جائیں گی۔ جس طرح جناب شیخ عبدالرحیم صاحب نے اپنے والد بزرگوار جناب شیخ وجیہہ الدین شہید کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی تھی اور تعلیم و تربیت حاصل کر

کے باطنی فیض سے معزز ممتاز ہوئے تھے۔ اسی طرح جناب شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے والد ماجد کی آغوش محبت میں پرورش پائی۔ شیخ عبدالرحیم جیسے مجتہد فن اور اہل کمال پانچ برس کی عمر سے آپ کی تعلیم پر مقرر تھے اور عام اخلاق وعادات کی بھی نگرانی کرتے تھے۔ اگرچہ باقاعدہ تعلیم اس وقت سے شروع ہوئی جبکہ آپ نو سال کے تھے۔ لیکن شیخ صاحب کی خاص کر توجہ شاہ صاحب پر زمانہ طفولیت ہی سے تھی۔ یہی وجہ تھی جو علمی کمالات اور باطنی فیوض شاہ ولی اللہ صاحب کو حاصل تھے، ان کی نظیر سے شیخ صلاح الدین (شاہ صاحب کے بڑے علاتی بھائی) اور شاہ اہل اللہ صاحب (آپ کے عینی) خالی تھے۔ بمقابلہ ان دونوں حضرات کے شاہ ولی اللہ صاحب کو جو کچھ حاصل ہوا وہ حقیقت میں شیخ عبدالرحیم صاحب کی آغوش تربیت میں پلنے کا صدقہ اور آپ کی سرپرستی کا بدیہی نتیجہ تھا۔ جس کا ثبوت خود شاہ ولی اللہ صاحب کے حالات ہیں۔ جیسا کہ ہم کچھ تو اوپر بیان کر آئے ہیں اور کچھ آئندہ حسب موقع ذکر کریں گے۔

الغرض جناب شاہ ولی اللہ صاحب چودہ سال کی عمر میں علوم متعارفہ سے فارغ التحصیل ہو گئے اور علم سلوک کا کافی حصہ حاصل کر لیا چنانچہ اسی سال میں آپ کے والد بزرگوار حضرت شیخ عبدالرحیم صاحب نے آپ کے سر پر فضیلت کا عمامہ رکھا اور درس کی عام اجازت دی اور اس مبارک تقریب میں ایک امیرانہ جلسہ قائم کیا۔ عام وخاص کو دعوت دی اور وافر کھانا تیار کیا۔ تمام شہر کے مشائخ، قضاۃ، فقہا حاضر ہوئے اور سب کی موجودگی میں جناب شیخ عبدالرحیم صاحب نے اپنے بلند اقبال اور فخر خاندان وقوم فرزند کو علوم متعارفہ اور سلوک وتصوف کے درس کی اجازت دی اور دستار بندی کی رسم ادا کر کے آپ کی عمر وعلم کی ترقی کی دعا مانگی۔ مجلس میں جس قدر علما وفقہا ومشائخین موجود تھے سب نے متفقہ الفاظ میں اس زور سے شیخ صاحب کو مبارک دی کہ ساری مجلس گونج اٹھی۔ اس وقت شیخ عبدالرحیم صاحب کی خوشی کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ آپ بار بار اپنے لائق اور ہونہار فرزند کے چہرہ کو دیکھتے اور بے انتہا خوش ہوتے تھے۔

حقیقت میں بوڑھے والد کے لئے اس سے زیادہ اور کیا خوشی وفخر کا باعث ہو سکتا ہے کہ اس کی نوجوان اولاد اس کی زندگی میں ایک ایسی قابلیت پیدا کرے جس پر اس زمانہ کے بڑے بڑے علما وفضلاء کو فخر وناز ہو۔ چونکہ جناب شیخ عبدالرحیم صاحب خود مجتہد فن اور باطنی فیض سے مالا مال تھے اس وجہ سے وہ اپنے فرزند رشید کے قدر ومنزلت کو خوب جانتے تھے اور انہیں یقینی طور پر معلوم تھا کہ عنقریب ایک وہ زمانہ آنے والا ہے جس میں اس کے اقبال کا سورج تمام دنیا میں اپنی روشنی پھیلائے گا اور اس کی علمی فیاضیاں اہل دنیا کو مالا مال کر دیں گی۔ اس مقام پر ہم ان کتابوں کی مختصر فہرست دینا چاہتے ہیں جو اس چھوٹی سی عمر میں جناب شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے والد بزرگوار سے سبقاً سبقاً پڑھیں جس سے آپ کی خداداد ذہانت اور حذاقت وطباعی بہت کچھ ثابت ہوتے ہیں اور چونکہ اس فہرست کا ذکر خود شاہ صاحب نے اپنی ایک قیمتی تصنیف میں کیا ہے اس لئے میں اسے آپ ہی کی زبان مبارک سے ادا کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ جب میں نے اپنی زندگی کے چودہ مرحلے طے کر کے پندرہویں میں قدم رکھا تو والد بزرگوار کی انتہا درجہ شفقت ومہربانی کی وجہ سے تمام متعلقہ فنون حاصل کر چکا تھا۔ ہر فن کے ابتدائی مختصرات کے علاوہ جو کتابیں میں نے والد بزرگوار سے سبقاً سبقاً پڑھی ہیں ان کی مختصر فہرست یہ ہے:

(1) علم حدیث میں

مشکوٰۃ شریف تمام وکمال۔ لیکن چند روز کی بیماری اور کسل کی وجہ سے تھوڑا سا حصہ فوت ہو گیا تھا یعنی کتاب البیع سے کتاب الادب تک والد بزرگوار سے نہیں پڑھ سکا۔ صحیح بخاری اول سے کتاب الطہارۃ تک یا اس سے کچھ کم وبیش خود والد بزرگوار سے سماعت کی اور کچھ اپنی زبان میں پڑھی۔

شمائل النبی۔ یہ کتاب اول سے آخر تک طالب العلموں کے ایک بڑے حلقہ میں پڑھی۔ گو اس کتاب میں چند اور فاضل بھی شریک تھے مگر قرأت میری ہی تھی۔

(2) علم تفسیر میں

تفسیر بیضاوی کا ایک بڑا حصہ تو میں نے والد بزرگوار سے سبقاً سبقاً پڑھا اور باقی آپ کے ارشاد کے بموجب خود مطالعہ کیا۔

تفسیر مدارک کا بھی کچھ حصہ آپ کو سنایا اور باقی خود مطالعہ کیا۔

(3) علم فقہ میں

شرح وقایہ بتمامہ۔ ہدایہ کی دونوں جلدیں آپ سے پڑھیں۔ لیکن تھوڑا سا حصہ قصداً چھوڑ دیا گیا۔

(4) اصول فقہ میں

حسامی۔ توضیح وتلویح

(5) علم منطق میں

مختصرات کے علاوہ شرح شمسیہ کامل اور شرح مطالعہ کا ایک بڑا حصہ۔

(6) علم کلام میں

شرح عقائد کامل۔ شرح خیالی کا ایک حصہ شرح۔ مواقف کا ایک حصہ۔

(7) علم سلوک میں

عوارف کا بڑا حصہ اور کچھ رسائل نقشبندیہ وغیرہ۔

(8) علم حقائق میں

شرح رباعیات مولانا جامی۔ لوائح۔ مقدمہ شرح لمعات۔ مقدمہ نقد النصوص۔

(9) خواص اسماء و آیات میں

والد بزرگوار کا ترتیب دیا ہوا مجموعہ وغیرہ۔

(10) علم طب میں

موجز القانون

(11) علم حکمت میں

شرح ہدایہ حکمت وغیرہ۔

(12) علم نحو میں

کافیہ۔ شرح ملا جامی۔

(13) علم معانی میں

مطول کا بہت بڑا حصہ۔ اور مختصر معانی اس مقام تک جہاں تک ملا زادہ حاشیہ ہے۔

(14) علم ہندسہ و حساب میں

بعض مختصر رسائل۔

اس فہرست کے نقل کرنے کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ جب میں یہ کتابیں پڑھ چکا تو اب میرا ذہن اس درجہ فراخ اور نظر ایسی وسیع ہو گئی کہ ہر فن کے دقیق و غامض مسئلے ادنیٰ توجہ کے ساتھ حل ہونے لگے اور علوم کے مقامات مشکلہ بالکل پانی ہو گئے۔ اسی اثنا میں میں چند مرتبے مدرسہ قرآن میں گیا جو خاص والد بزرگوار کی درسگاہ تھا اور جس کی بنیادیں آپ نے اپنے ہاتھوں سے ڈالی تھیں۔ چونکہ آپ کو مجھ سے انتہا درجہ کی محبت تھی، اس لئے چند روز تک آپ نے قرآن مجید کا ترجمہ مجھے پڑھایا اور وہ ربانی اسرار اور الہامی نکات جو قرآن کے لفظ لفظ میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں ان پر تنبیہ کی۔ حقیقت میں یہ اسی فیض کا تھا، جو تمام علوم میں مجھے دفعۃً کمال حاصل ہو گیا۔

الغرض جناب شاہ ولی اللہ صاحب کی لیاقت اور پولیٹیکل قابلیت پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو ایک تعجب اور تعجب کے ساتھ سخت حیرت ہوتی ہے۔ تمام اسلامی علوم اور دینی کتابوں کو اس چھوٹی سی عمر میں پی جانا اگرچہ سرسری نظر میں آپ کی ذکاوت ذہنی اور طباعی و حذاقت کی بہت بڑی دلیل ہے لیکن عمیق نظریں خوب سمجھتی ہیں کہ یہ فطرت کی خاص بخششیں ہیں جو پاک و برتر نفوس کو مرحمت ہوتی ہیں۔ آپ کا ضمیر ہی کچھ ایسا قابل بنا تھا جس پر ربانی قابلیتوں اور خداوندی تجلیات

کا پورا عکس پڑتا تھا اور جو قوت الہامی نکات اور ربانی اسرار کے فہم میں ید طولیٰ رکھتی ہے اس کا جوش آناً فاناً روشن دماغ میں پیدا ہوتا رہتا ہے۔

اس پر بھی علمی ترقی کے سین ہمیشہ شاہ صاحب کے پیش رہتے تھے۔ آپ نے اجازت وسند حاصل کرنے کے بعد بغیر استاد کے کتابوں کا مطالعہ کرنا شروع کیا اور نہایت سخت محنتیں کرنے لگے۔ آپ کتب بینی میں اس درجہ مستغرق تھے کہ رنج وراحت شب وروز مشاغل علمیہ میں بالکل محسوس نہ ہوتے تھے۔ ایک سال کی سخت محنت سے تمام پڑھے ہوئے علوم از سر نو دیکھ ڈالے اور اس محویت اور استغراق کے ساتھ کہ بقدر ضرورت کچھ کھالیتے یا تھوڑا سا آرام فرمالیتے ورنہ رات دن بجز کتب بینی کے دوسرا کام نہ تھا۔ جب مباحث علمیہ میں اس دلچسپی کے ساتھ شاہ صاحب نے تھوڑا زمانہ گزارا اور عمر کے سترہویں سال میں قدم رکھا تو آپ کے والد بزرگوار شیخ عبدالرحیم صاحب قدس سرہ نے سفر آخرت قبول کیا اور یہی زمانہ آپ کے تکمیل علوم کا تھا۔

والد ماجد کے انتقال کے بعد آپ نے کتب دینیہ وعقلیہ کا درس دینا شروع کیا اور اب آپ کا ہر علم میں شہرہ ہو گیا۔ علماً وعملاً مسلم الثبوت استاد مان لئے گئے اور عوام وخواص کے معتقد علیہ تسلیم ہوئے۔ اس عہد کے بڑے بڑے استاد اور ماہرین فن آپ کی شاگردی کو فخر جانتے اور دور دور سے تعلیم کے لئے حاضر ہو کر شاہ صاحب کے فیضان سے مستفیض ہو کر حظ وافر اٹھاتے۔ تقریباً بارہ سال تک علوم کے درس میں مصروف رہے اور علم نبوی کی اس درجہ اشاعت کی کہ اس کا ذوق وشوق سرگرم طبیعتوں میں حد سے زیادہ بڑھ گیا۔ اکثر علمی سوسائٹیوں میں اصول حدیث کا ذکر چھڑ گیا اور طالب العلموں کے ہر ہر حلقے میں زور شور سے بحثیں ہونے لگیں۔ اس زمانہ میں تفسیر وحدیث میں روز افزوں ترقی تھی اور علوم فلسفہ ومنطق کا بازار سرد تھا۔ غرض کہ شاہ صاحب کا یہ زمانہ ہر طرح سے قابل مبارک باد تھا۔ علوم فقہ اور معانی وبلاغت کو جس قابلیت اور دلسوزی سے آپ نے رواج دیا وہ بہرصورت آپ کا فرض سمجھا جاتا ہے لیکن قرآن وحدیث کی اشاعت وتشہیر میں جو آپ نے کوشش کی ہے اس کے احسان سے ہندوستان کبھی سر نہیں اٹھا سکتا۔

ہندوستان میں سب سے پہلے شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے حدیث کی بنیاد ڈالی اور اس وجہ سے اسلامی مؤرخوں نے آپ کے لئے اولیت کا تمغہ تجویز کیا لیکن ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے یہ بات بخوبی ثابت ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں چاروں طرف جہل کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ مسلمانوں نے علم نبوی کو بالکل بھلا دیا تھا اور ان میں اسلام برائے نام باقی رہ گیا تھا۔ جناب شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے حدیث وقرآن کی ترویج واشاعت میں اگرچہ انتہا سے زیادہ کوشش کی لیکن آپ اس خرابی وتاریکی کو دور نہ کر سکے جو صدیوں سے مسلمانوں کے دلوں میں جم گئی تھی اور انجام کار آپ کی تمام کوششیں رائگاں گئیں۔

لیکن چونکہ ہندوستان کی قسمت میں اسلامی علوم سے کچھ نہ کچھ دلچسپی لینی پہلے ہی روز سے لکھی ہوئی تھی اس لئے جناب شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے دنیا سے کوچ کر جانے کے بعد خدا تعالیٰ نے اس عمارت کا ایک اور سرپرست اٹھا کھڑا کیا جس کی بنیادیں جناب شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے ہاتھوں نے ڈالی تھیں یعنی قدرت نے جناب شیخ عبدالرحیم صاحب کو پیدا کیا۔ شیخ صاحب نے پرانی دہلی میں اس مقام پر ایک مدرسہ قائم کیا جو اب مہندیوں کے نام سے مشہور ہے اور

اس کا نام مدرسہ رحیمیہ رکھا جس میں علم نبوی کی تعلیم دینی شروع کی۔ اگرچہ اس تعلیم کا اثر مسلمانوں پر یہ پڑا کہ دور دراز شہروں سے جوق جوق طلبہ حدیث پڑھنے کے لئے آنے لگے اور لوگوں میں ایک طرح کی تحریک بھی پیدا ہوگئی۔ لیکن وہ تحریک ایسی نہ تھی جو ایک عظیم الشان دریا میں تموج پیدا کرتی۔ ہر چند کہ شیخ صاحب نے اس بارہ میں پرلے درجہ کی کوشش کی لیکن چونکہ ابھی ہندوستان کو چند روز اور پستی کی حالت میں رہنا تھا اس لئے شیخ صاحب اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہوسکے اور دل کی آرزو دل ہی میں لے کر عالم بقا کو تشریف لے گئے۔

جب ہندوستان کے اقبال و یاوری کا ستارہ چمکا تو فطرت نے جولانگاہ حدیث کے شہ سوار کو پیدا کیا یعنی جناب شاہ ولی اللہ صاحب اس سرزمین میں ظاہر ہوئے جن کے علم و فضل کی صدائیں ہندوستانی حدود سے نکل کر عرب و عجم میں پہنچیں اور جن کی ربانی مقبولیت تمام بلاد اسلامیہ میں پھیل گئی۔ چونکہ آپ علم و عمل دونوں میں خاص طور پر مشہور تھے اور آپ کا علمی کمال اعلیٰ درجہ کی وقعت کے ساتھ لوگوں کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ لہٰذا اطراف عالم کے لوگ بے اختیارانہ جوش کے ساتھ آپ کی طرف کھنچے چلے آتے تھے اور آپ کی درس و تدریس کا بازار ہر وقت گرم رہتا تھا۔ آپ نے بڑی مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ علم نبوی کی اشاعت میں کوشش کی اور اپنی ان تھک کوششوں سے علم نبوی کو اس قدر رواج دیا کہ اب جناب شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ڈالی ہوئی بنیادیں آسمان سے باتیں کرنے لگ گئیں۔

اس لحاظ سے اگر ہم اس اولیت کے تمغہ کا جو جناب شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے لئے تجویز کیا گیا ہے حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کو مستحق قرار دیں تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ جس قدر حدیث کی اشاعت آپ کے زمانہ میں ہوئی اس کے ننانویں حصہ نے بھی سابق کے زمانہ میں اشاعت نہیں پائی تھی۔

ایک فاضل مؤرخ کا یہ مختصر ریمارک قابل نوٹ ہے کہ جناب مولانا شاہ ولی اللہ صاحب ایک فاضل اجل عالم تھے اور ایسے عالم جن پر ہندوستان ہمیشہ فخر کرے گا اور جن پر تاریخی روشنی ہمیشہ چمکے گی۔ انصاف یہ ہے کہ اگر آپ کا وجود باجود نہ ہوتا تو ہندوستان میں جو علمی فیاضیاں اس وقت چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں ہرگز نظر نہ آتیں بلکہ خاص خاص محدود حلقوں میں دیکھی جاتیں۔ یوں تو آپ ہر فن میں طاق تھے اور ہر قسم کے علوم کا درس دیتے تھے لیکن آپ کا علم حدیث و تفسیر خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ شاہ صاحب زمانہ عروج کے پیشتر علم حدیث کی حالت نہایت پستی اور تاریکی میں تھی۔ خال خال ہی لوگ اس شریف علم سے دلچسپی رکھتے تھے لیکن ہندوستان کی اقبال کی یاوری سے جب آپ کے علم کا چشمہ نمودار ہوا تو خاص اس فن کی بہت بڑی ترقی ہوئی اور تمام ہندوستان حدیث و تفسیر سے بھر گیا۔ علماء کے ہر حلقہ میں حدیث کا چرچا ہونے لگا اور طلبہ کی زبان پر ہر استدلال کے موقع پر حدیث کے مقدس الفاظ آنے لگے۔ حقیقت میں ہندوستان پر شاہ صاحب کا یہ ایسا گرانبار احسان ہے جس سے وہ سر اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتا لیکن اس کے ساتھ ہی بافسوس کہنا پڑتا ہے کہ جس طرح یہ علمی عروج و اقبال شاہ صاحب کے نام سے شروع ہوا اسی طرح اس کا زوال وادبار آپ کی معزز اولاد کے بعد ہندوستان کے نام پر ختم ہوگیا۔ شاہ صاحب کی واجب الاحترام اولاد دنیا سے کیا اٹھی کہ علمی جاہ و جلال کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اب اس جلیل القدر خاندان میں کوئی ایسا با اثر شخص باقی نہیں رہا جس سے اس کا نام زندہ رہتا۔

الغرض جناب شاہ ولی اللہ صاحب نے والد بزرگوار کے انتقال کے بعد مدرسہ رحیمیہ میں جس کی بنیاد جناب

شیخ عبدالرحیم صاحب ڈال گئے تھے۔ طلبہ کو درس دینا شروع کیا اور پورے بارہ سال تک اس میں استغراق و محویت کے ساتھ مصروف رہے، جس کی نظیر کہیں مل نہیں سکتی۔ آپ کی خداداد قابلیت اور محنت کشی کی شہرت نے شوقین طلبہ کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا جو دور دراز ملکوں کی سنگلاخ اور دشوار گزار گھاٹیاں طے کر کے آتے اور آپ کی درسگاہ میں داخل ہونے کو سرمایۂ ناز و فخر سمجھتے تھے۔

شاہ صاحب ہر ایک طالب العلم کے ساتھ خواہ وہ کسی رتبہ کا ہوتا عام اخلاق اور فیاضی سے پیش آتے اور سب کے ساتھ رحیمانہ و شریفانہ برتاؤ کرتے قطع نظر اس کے کہ انہیں نہایت محنت و جفاکشی اور دلسوزی سے تعلیم دیتے۔ ان کے ضروری اور لابدی حوائج کے رفع کرنے میں انتہا سے زیادہ ساعی ہوتے بلکہ بعض محنتی اور قابل طلبہ کو اپنی ذات خاص سے امداد دیتے اور بہت ہی تسلی و دلجوئی سے انہیں خوش رکھتے۔ آپ کے مدرسہ کی شہرت پکڑنے اور درِ دولت پر ہر وقت طلبہ کے جمگھٹے لگے رہنے کی یہ ایک اور بھی وجہ تھی۔

اگرچہ اس بارہ سال کے عرصہ میں آپ کی علمی مشق معراج کمال پر پہنچ گئی تھی اور دینی و عقلی معلومات میں حیرت ناک ترقی پیدا ہو گئی تھی لیکن ابھی تک طبیعت مبارک میں وہی کرید چلی جاتی تھی جو آغاز عمر میں تھی یعنی جہاں تک ممکن ہو علم نبوی کی تحصیل و تکمیل میں ترقی کرنا چاہیے اور اس علم کو ایک ایسے عروج پر پہنچا دینا چاہیے جس سے زیادہ ممکن نہ ہو چنانچہ اس خیال کا سلسلہ آپ کے دل میں روز بروز بڑھتا چلا جاتا تھا اور آپ اپنی آرزو پر کامیاب ہونے کے ہر پہلو کو دیکھ رہے تھے۔ ایک دن آپ نے اس بڑھتے ہوئے تمدن پر غور میں نظر ڈالی اور فتوحات اسلام کی وسیع و فراخ دنیا کے پُر فضا و خوش منظر سین زیر نظر رکھے۔ غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ شاہد مقصود بجز عرب کے اور کسی سرزمین سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ پس اب مجھے عرب میں چلنا اور وہاں کے مشائخ سے روایت حدیث کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی آپ کو حرمین محترمین کی زیارت کا شوق دامنگیر ہوا اور آپ نے دفعتۂ سامان سفر مہیا کر کے اس طرف توجہ مبذول فرمائی۔ آپ کے اس سفر مبارک کی اصلی غرض (1) یہی تھی جو ہم نے بیان کی۔

اگرچہ بعض مؤرخوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب دہلی کے مولویوں کو جناب شاہ ولی اللہ صاحب سے رنجش بڑھ گئی اور آپ کے خون کے پیاسے ہو گئے تو آپ نے ان کے اس رنج و غصہ کی آگ فرو کرنے اور اس رنجش کو دبانے کی غرض سے سفر عرب اختیار کیا۔ لیکن جس مبتدا کی یہ خبر ہے خود شاہ صاحب کے بیان سے بے اصل اور غلط معلوم ہوتی ہے کیونکہ آپ فرماتے ہیں کہ ''جب میرے والد بزرگوار کا انتقال ہوا تو میں تقریباً بارہ سال کتب دینیہ و عقلیہ کے درس میں محو رہا اور ہر علم و عمل کو غور میں ڈوبی ہوئی نگاہ سے دیکھا۔ اس اثنا میں اکثر اوقات جناب والد ماجد کی قبر مبارک پر جا کر متوجہ ہوتا اور رات کی دلفریب چاندنی میں پہروں بیٹھا رہتا۔ ان دنوں میں توحید و جذب کی راہ میں میرے لئے وسیع ہو گئی اور وجدانیہ علوم فوج فوج نازل ہونے لگے۔ ائمہ اربعہ کی مذہبی کتابیں اور ان کے اصول ہمیشہ میرے پیش نظر تھے اور جن حدیثوں سے انہوں نے اپنے مذہبی قواعد کو مستحکم و مضبوط کرنے کے لئے استدلال کیا ہے وہ بھی مجھ سے غائب نہ تھیں انجام کار نور غیبی کی تائید سے مجھے فقہائے محدثین کی روش بھلی معلوم ہوئی اور انہیں کے مسلک کو میں نے اختیار کر لیا۔ ان بارہ سال کے گزر جانے کے بعد دفعتہً حرمین محترمین کی زیارت کا شوق مجھے پیدا ہوا اور مشائخ عرب سے علم

حدیث کی سند لینے کا خیال آیا چنانچہ میں نے فوراً سامان سفر تیار کیا اور جہاں تک جلد ممکن ہو سکا عرب کی طرف متوجہ ہو گیا۔'' اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے دہلی کے جنگجو مولویوں سے جان بچانے اور پیچھا چھڑانے کی غرض سے سفر عرب اختیار نہیں کیا بلکہ صرف حدیث کی تکمیل اور مذہبی فرض سے سبکدوشی حاصل کرنے کی غرض سے اختیار کیا جیسا کہ آپ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔

الغرض جناب شاہ ولی اللہ صاحب نے اخیر 1143ھ میں خانہ کعبہ کی زیارت سے مشرف ہو کر اور کامل ایک سال تک مکہ معظمہ کی مجاورت مدینہ طیبہ کی زیارت سے معزز و ممتاز ہو کر شیخ ابو طاہر قدس سرہ اور دیگر مشہور و نامور مشائخ عرب سے روایت حدیث حاصل کی۔ اسی اثنا میں آپ چند روز تک جناب سید البشر علیہ افضل الصلوات واتم التحیات کے روضہ منورہ کے مجاور رہے اور انتہا سے زیادہ فیض حاصل کیا۔ اکثر اوقات چاندنی راتوں کی دلگیر روشنی میں آپ وہاں مراقب رہے۔ اس دلکش و دلفریب وقت کے اعتبار سے اگرچہ آپ کو کچھ مدد پہنچی ہو گی۔ لیکن زیادہ تر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض نے آپ کے دل کو نہایت مجلے اور صاف کر دیا تھا۔ آپ حرمین شریفین کے بڑے بڑے زبردست علماء و فضلا سے ملے اور نئے نئے مشائخ سے ملاقاتیں کیں اور ہر طبقہ کے مشائخ سے استفادہ لیا۔

شاہ صاحب کے اس مابین سفر میں کوئی خاص واقعہ بجز اس کے قابل تذکرہ نہیں ہے کہ آپ نے کن کن علماء سے استفادہ خاص کیا اور وہ کس قدر و منزلت کے لوگ تھے چنانچہ میں اس مقام پر ان حضرات کے اسماء گرامی قلم بند کرنا چاہتا ہوں جن سے شاہ صاحب نے تکمیل حدیث کے علاوہ خرقہ صوفیہ زیب بدن فرمایا اور ساتھ ہی اسبات کا بھی مختصر طور پر خاکہ کھینچنا چاہتا ہوں کہ کس فاضل سے آپ نے کس چیز کی سند حاصل کی اور وہ آپ کے ساتھ کس وقعت و عظمت سے پیش آیا۔

جناب شاہ ولی اللہ صاحب جب حج مبرور کے ارکان فرضیت کے بار سے سبکدوش ہوئے اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار مبارک سے فیض و شرف حاصل کر چکے تو شیخ محمد وفد اللہ (2) ابن شیخ محمد بن محمد بن سلیمان المغربی کی خدمت میں پہنچے جنہوں نے بڑی مسرت کے ساتھ اپنی جگہ سے چند قدم آگے بڑھ کر آپ کا استقبال کیا اور بہت عزت سے بٹھایا۔ معمولی مزاج پرسی کے بعد آپ کا حال دریافت کیا۔ شاہ صاحب نے شیخ محمد وفد اللہ کی اس مہربانی کا شکریہ ادا کیا اور ساتھ ہی یہ بھی بیان کر دیا کہ آپ سے سند حدیث لینا چاہتا ہوں اور اسی لئے ہندوستان سے یہاں حاضر ہوا ہوں۔ شیخ وفد اللہ نے بخوشی اس بات کو منظور کیا اور ایک خاص وقت آپ کے لئے مقرر کر دیا چنانچہ آپ نے شیخ موصوف کی درسگاہ میں آمد و رفت شروع کی اور مؤطا ابن یحییٰ اول سے آخر تک بہت تھوڑے عرصہ میں سنا دی اور اس کے بعد شیخ محمد بن محمد بن سلیمان مغربی کی تمام مرویات کی اجازت حاصل کی۔

شیخ ابو طاہر

اس کے بعد شاہ صاحب جناب شیخ ابو طاہر (3) محمد بن ابراہیم کردی مدنی کی خدمت میں پہنچے اور احادیث صحاح سنانا شروع کیں۔ ایک دن صحیح بخاری کی اثناء قرأت میں احادیث و فقہ کی متضاد روایات میں بحث

چھڑ گئی اور شاہ صاحب نے بڑی حذاقت و دلیری سے اس اختلاف کا سبب دریافت کیا۔ شیخ ابوطاہر نے جواب دیا کہ احادیث و فقہ کی روایات میں جو کہیں کہیں اختلاف واقع ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت جمعیت کے انتہائی درجہ کو پہنچ گئی تھی اور فرط جمعیت سے یہ صورت اختلاف پیدا ہوگئی تھی۔ ایک اور موقع پر صوفیہ کے حالات میں بحث شروع ہوگئی اور ان باتوں کا سلسلہ یہاں تک بڑھتا چلا گیا کہ شیخ ابوطاہر صاحب کے درس کا وقت فوت ہوگیا۔ آخر کار یہ مسئلہ پیش ہوا کہ بعض حضرات صوفیہ اپنے ہم مشربوں کے کلام کی تردید کرتے ہیں اور یہ تردید ان کے پیروؤں میں نفوذ کر جاتی ہے۔ اس پر شیخ ابوطاہر بولے کہ میں صوفیہ کے انکار سے بے حد خائف رہتا ہوں ہر چند کہ میری بعض اسلاف بھی ایسے ہو گزرے ہیں جنہوں نے اپنے ہم مشربوں کے ساتھ ایسا برتاؤ جائز رکھا لیکن مجھ میں ان کی طعن آمیز تردید نے ذرا بھی اثر نہیں کیا بلکہ ان کے ساتھ ایسا ہی اعتقاد رکھتا ہوں جیسا اپنے اسلاف کے ساتھ اور ان کی طرف سے کسی طرح کی گراں خاطری اپنے میں نہیں پاتا پھر کلیتہً یہ کیونکر تسلیم کر لیا جائے کہ حضرات صوفیہ کی باہمی ردوقدح ان کے پیروؤں میں بھی نفوذ کر جاتی ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس پر شیخ ابوطاہر نے ایک تمثیلی حکایت بیان کرنا شروع کی۔ فرمانے لگے کہ شیخ یحییٰ شاذلی میرے والد بزرگوار کے ساتھ ہمیشہ مباحثہ و مذاکرہ کیا کرتے تھے اور کچھ نہ کچھ چھیڑ چھاڑ چلی جاتی تھی۔ شیخ یحییٰ بعض اوقات ادب کا پہلو چھوڑ کر طعن آمیز کلام سے تردید کر بیٹھتے تھے جس سے سننے والوں کو سخت رنج ہوتا تھا۔ لیکن باوجود اس کے کہ جب انہوں نے دنیا سے کوچ کر کے سفر آخرت قبول کیا اور زمانہ دراز کے بعد ان کی لاش قبر سے نکالی گئی تو بالکل صحیح سالم نکلے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا ابھی ابھی سوئے ہیں۔ اس حکایت کی نقل کرنے سے میری صرف اتنی ہی غرض ہے کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ کسی شخص پر اس وجہ سے طعن کرنا کہ بعض عرفا کا منکر تھا ہرگز جائز نہیں ہے۔

شاہ صاحب کا بیان ہے کہ اس کے بعد جناب شیخ ابوطاہر نے فرمایا کہ اس بارہ میں شیخ محی الدین بن عربی کی ایک عجیب و غریب وصیت ہے جو آپ نے اپنے معتقدوں کے سامنے ایک نہایت ہی بااثر طریقے سے بیان فرمائی۔ زاں بعد آپ نے ''فتوحات'' کا نسخہ کتب خانہ سے طلب کیا جو خاص مصنف کی قلم سے لکھا ہوا تھا اور اس میں سے باب الوصیت کا مبحث پڑھنا شروع کیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ محی الدین بن عربی فرماتے ہیں کہ مجھے ایک شخص کی طرف سے اس لئے عداوت ہوگئی تھی کہ وہ شیخ ابومدین کو ایسی ناگوار اور طعن آمیز باتوں سے یاد کیا کرتا تھا جو ان کی شان کے قابل نہ تھیں اور چونکہ میں ان سے دلی عقیدت مندی رکھتا تھا اس لئے مجھ پر اس کی یہ باتیں اور بھی برا اثر ڈالتی تھیں اور بہت برے خیالات اس کی طرف سے میرے دل میں جم گئے تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ میں نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا گویا آپ فرما رہے ہیں کہ محی الدین! تم فلاں شخص سے کیوں عداوت رکھتے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! وہ ابومدین جیسے معزز و مقتدر شخص کو برا کہتا ہے اور میں ان کا معتقد ہوں۔ فرمایا کہ وہ خدا رسول کو دوست نہیں رکھتا۔ میں نے کہا جی ہاں خدا رسول کو تو دوست رکھتا ہے۔ فرمایا تو تم اس وجہ سے کہ وہ ابومدین سے دشمنی رکھتا ہے اس سے کس لئے عداوت رکھتے ہو اور خدا رسول کی محبت رکھنے کی وجہ سے اسے کیوں نہیں دوست رکھتے۔ چنانچہ جب صبح ہوئی تو میں نے اپنے ان برے خیالات سے توبہ کی اور اس کے مکان پر معذرت کے

لئے گیا اور اپنے ساتھ ایک قیمتی چادر لیتا گیا جسے نہایت فرزانگی اور سلیقہ شعاری سے اس کے سامنے پیش کیا اور راضی کر کے دریافت کیا کہ آپ ابومدین سے اس درجہ بیزار کیوں ہیں۔ میرے اس سوال کا انہوں نے ایک ایسا جواب دیا جس کی بنا پر صرف لاعلمی پر تھی۔ چنانچہ میں نے نہایت پُر اثر لفظوں میں تقریر کی اور ان کے تمام شکوک وشبہات کو بالکل مٹا دیا۔ اس پر انہوں نے شیخ ابومدین کو برا بھلا کہنے سے توبہ کی اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت وفیض کا یہ بدیہی نتیجہ پیدا ہوا کہ وہ بھی میری طرح شیخ کے بدل معتقد ہو گئے۔

الحاصل جناب شاہ ولی اللہ صاحب چند روز تک شیخ ابوطاہر کی خدمت میں رہے اور اسی قسم کے علمی تذکرے بڑے زور سے ہوتے رہے۔ شیخ ابوطاہر جس عزت ووقعت کے ساتھ آپ سے پیش آئے اس کا اظہار صرف اسی سے ہو سکتا ہے کہ جب آپ ان سے رخصت ہو کر وطن کی طرف مراجعت کرنے لگے تو ایک بے اختیارانہ جوش کے ساتھ یہ بیت زبان پر لائے۔

نسیت کل طریق کنت اعرفه

الا طریقا یو دینی لو بعکم

جونہی شاہ صاحب کی زبان مبارک سے رخصتانہ الفاظ نکلے اور اس شعر کی آواز شیخ صاحب کے کانوں میں پہنچی تو آپ کے چہرہ پر حزن وملال کے آثار چھا گئے اور پُرنم آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں بہنے لگیں۔ آپ زار وقطار روتے جاتے تھے اور بطریق مشایعت شاہ صاحب کے ہمراہ آہستہ آہستہ چلے جاتے تھے۔ شیخ ابوطاہر صاحب نے علاوہ سند احادیث کے اپنا خرقہ بھی عنایت فرمایا اور خود دست مبارک سے جناب شاہ ولی اللہ کے زیب جسم کیا جو حقیقت میں تمام صوفیوں کے خرقوں کو جامع وحاوی تھا اور چلتے وقت بہت سے باطنی فیوض تلقین کیے۔ چونکہ شیخ ابوطاہر صاحب علمی کمالات کے جوہری اور قدردان تھے اس لئے آپ نے شاہ صاحب کی قابلیت کا خوب اندازہ کر لیا تھا اور آپ کے ضمیری جوہروں اور ربانی لیاقتوں کو اچھی طرح پرکھ لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ رخصت کے وقت آپ نے ان باطنی رموز واسرار کا آپ پر انکشاف کر دیا جو ابھی تک آپ کے سینہ کے خزانہ میں ایک زمانہ دراز سے محفوظ چلے آتے تھے۔

حقیقت میں جناب شاہ ولی اللہ صاحب جس رتبہ کے شخص تھے اس سے کچھ وہی عمیق وغمیض نظریں واقف تھیں جو روز ازل سے ربانی اسرار سے سرمہ آلود ہو چکی تھیں۔ عام نظریں اس قابل ہرگز نہیں ہو سکتیں کہ وہ اس عظمت وجبروت اور جاہ وجلال کو دیکھ سکیں۔ اگرچہ اس جلیل القدر اور عظیم الشان خاندان میں بہت سے لوگ ایسے قابل ہو گزرے ہیں جو فضل وکمال میں اپنے آپ ہی نظیر تھے۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ شاہ صاحب جیسا صاحب کمال اس خاندان میں دوسرا نہیں ہوا۔ ایک فلسفی اور قومی شاعر کا یہ شعر ہماری تحریر کے حسب حال ہے۔

قیس سا پھر کوئی اٹھا نہ بنی عامر میں

فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

جناب مولانا شاہ ولی اللہ صاحب شیخ تاج الدین قلعی حنفی کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے ہیں اور سند احادیث

حاصل کی ہے چنانچہ آپ اپنی قلم مبارک سے تحریر فرماتے ہیں کہ جس زمانہ میں شیخ (4) تاج الدین کی مجلس درس میں صحیح بخاری کا درس ہوتا تھا میں دو تین روز تک متصل حاضر ہوا اور بخاری شریف کی سماعت کے علاوہ ازیں کتب صحاح ستہ کے بعض بعض مشکل مقامات اور موطا امام مالک اور مسند دارمی اور کتاب الآثار اور امام محمد اور موطا امام محمد کی بھی سماعت کی۔ جس وقت آپ نے ان تمام کتابوں کی اجازت جملہ اہل مجلس کو دی تھی فقیر بھی اس جماعت میں داخل تھا۔ ہر چند کہ اور لوگوں کے زمرہ میں مجھے اجازت حدیث حاصل ہو گئی تھی۔ لیکن مولانا تاج الدین نے مجھے خصوصیت کے ساتھ علیحدہ اجازت دی اور زبانی اجازت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ تحریری اجازت عنایت فرمائی۔ جن ایام میں شیخ موصوف کی خدمت میں حاضر تھا تو آپ ایک عجیب وغریب حکایت بیان فرماتے تھے۔ چونکہ وہ حکایت لطف و دلچسپی سے خالی نہیں ہے اس لئے میں اس مقام پر اس کا درج کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

شیخ تاج الدین صاحب کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ سخت بیمار ہوا اور مرض نے اس قدر طول کھینچا کہ ضعف و ناتوانی تمام اعضا پر غالب ہو گئی اور اب مجھے حس و حرکت کرنے کی بھی تاب وطاقت نہیں رہی۔ اسی اثنا میں میں نے ایک شب کو عجیب وغریب خواب دیکھا۔ میں دیکھتا ہوں کہ ایک شخص دروازہ سے آیا ہے اور کہہ رہا ہے کہ اس بیمار کی شفا کے لئے مرغیاں پکائی جائیں اور ان پر سارا قرآن پڑھا جائے۔ جب یہ مریض ان مرغیوں کو کھائے گا تو اس کا تمام مرض جاتا رہے گا اور بالکل شفا حاصل کرے گا۔ جب میں بیدار ہوا تو میں نے عزم بالجزم کر لیا کہ خواب کے بموجب عمل درآمد کرنا چاہیے لیکن اس پر بھی میں نے اس قدر توقف کیا کہ آج شب کو اور معلوم کر لینا چاہیے اور کل اس کے مطابق تعمیل کرنی مناسب ہے چنانچہ شب آئندہ کو جب میں مرض کی بے چینی میں کروٹیں لیتے لیتے سو گیا تو دیکھتا ہوں کہ گویا امام بخاری علیہ الرحمۃ میرے گھر میں تشریف لائے ہیں اور اپنے دست مبارک سے دیگ درست کر رہے ہیں۔ آپ نے دیگ کے نیچے آگ جلائی اور مرغیوں کا نہایت عمدہ اور صاف گوشت دیگ میں ڈالا۔ صبح سے شام تک برابر سالن پکتا رہا اور جب خوب پک کر تیار ہو گیا تو امام بخاری نے ایک بڑے سے شفاف قاب میں میرے آگے لا کر رکھا اور فرمایا کہ ہم نے اس پر سارا قرآن پڑھا ہے۔ تم اسے کھاؤ خدا کے فضل و کرم سے شفا پاؤ گے۔ چنانچہ میں نے اس میں کچھ تناول کیا۔ کھاتے ہی مرض میں فوری افاقہ محسوس ہوا اور تھوڑی دیر میں اس مرض کا مجھ میں نام ونشان تک باقی نہیں رہا۔ عادت کے موافق جب صبح کو بیدار ہوا تو اپنے تئیں بالکل صحیح وتندرست اور چاق و توانا پایا۔ میں نے اپنے دل میں جو بشاشت وسرور اس واقعہ سے پایا کہ حضرت امام بخاری نے اس فقیر کے حال پر اس درجہ عنایت ومہربانی فرمائی ہے وہ اس سے بہت زیادہ تھا جو ازالۂ مرض اور دفعیہ بیماری سے پایا جاتا تھا۔

جن علماء حرمین سے جناب مولانا شاہ ولی اللہ صاحب نے بالمشافہ اجازت حدیث حاصل کی اور علم حدیث کی مختلف کتابیں سنی سنائیں میں ان کی مختصر فہرست مع اجمالی حالات کے بیان کر چکا۔ اب مجھے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی عنوان کے ذیل میں ان مشائخ صوفیہ اور علماء محدثین کے حالات وواقعات کا بھی سرسری طور پر خاکہ کھینچوں جن کے واسطے سے انہیں اور ان کے ذریعہ سے جناب شاہ صاحب تک خرقہ صوفیہ اور اسناد حدیث کا سلسلہ پہنچتا ہے۔ اگرچہ یہ ایک نہایت وسیع اور طول طویل مضمون ہے۔ جس کی تفصیل کے لئے کئی جزو درکار ہیں۔ مگر چونکہ میں ''حیات ولی'' کو زیادہ طول دینا اور

خارج البحث واقعات درج کر کے بڑھانا نہیں چاہتا اس لئے نہایت اختصار کے ساتھ چند منتخب مشائخ کا حال علیحدہ علیحدہ عنوانوں سے ذکر کرتا ہوں۔

شیخ احمد شناوی

شیخ احمد علی کے فرزند رشید اور عبدالقدوس بن عباس شناوی کے بلند اقبال پوتے ہیں۔ آپ کے آباء بزرگوار اولیاء کبار اور بڑے جاہ وجلال کے لوگ تھے۔ شیخ عبدالوہاب شعراوی نے جو ایک مختصر ریمارک آپ کے علم وفضل کی نسبت کیا ہے وہ حقیقت میں آپ کے لئے ایک اعلیٰ درجہ کا سارٹفیکیٹ ہوسکتا ہے۔ شعراوی لکھتے ہیں کہ شیخ احمد شناوی علم شریعت وحقیقت کو جامع تھے۔ علم حدیث شمس رملی اور اپنے والد بزرگوار سے پڑھا تھا اور سید غضنفر اور شیخ محمد بن ابی الحسن بکری سے حدیثیں روایت کیں اور اپنے والد علی سے خرقہ صوفیہ زیب بند فرمایا۔ اس کے بعد سید صبغۃ اللہ کی صحبت سے ہمیشہ فیض یاب رہے اور آخر کار ان کے دست مبارک سے خرقہ پہنا اور ان کی فیض محبت سے درجات عالیہ پر پہنچے اور ایک ممتاز ومستثنیٰ خلیفہ قرار دیئے گے۔ شیخ احمد کے لئے یہ جملہ ضرب المثل ہو گیا تھا کہ **لو کان الشعراوی حیا ما سوعه الا اتباعی** یعنی اگر شعراوی بھی زندہ ہوتے تو انہیں بھی بجز میری اتباع کے اور کچھ کرتے دھرتے بن نہ پڑتا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن شیخ احمد شناوی اپنے حجرہ میں سوتے تھے۔ دیکھتے ہیں کہ حجرہ کی دیوار پر ایک گرگٹ چلا جاتا ہے۔ شرع کے قانون کے موافق آپ نے اسے مار ڈالنا چاہا لیکن شہود وحدت نے فوراً ہی آپ کے اس ارادہ کو مضمحل کر دیا۔ دوسری مرتبہ آپ نے پھر اس کے مار ڈالنے کا ارادہ کیا لیکن اب بھی شہود وحدت نے آپ کے اس داعیہ کو شکست دی۔ غرضکہ آپ ان دونوں خطروں کے مابین متردد ومتحیر تھے۔ انجام کار امتثال شرع کا ارادہ غالب ہوا اور آپ نے ایک پتھر اٹھا کر گرگٹ کی طرف پھینکا۔ نشانہ نے خطا کی اور گرگٹ پتھر کی زد سے بچ کر بھاگ گیا۔ یہ دیکھ کر آپ بہت خوش ہوئے اور جوش مسرت میں زبان مبارک سے نکلا **الحمد للہ الذی جمع بینا الامرین** یعنی خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے دونوں باتوں پر عمل کرا دیا۔

اس حکایت کے عقب میں شیخ احمد قشاشی نے (جو جناب شیخ احمد شناوی کے فرزند معنوی اور ممتاز خلیفہ ہیں اور جن کے حالات آئندہ بیان ہوں گے) فرمایا کہ اگر میں ایسے مقام پر ہوتا تو ذرا توقف وتردد نہ کرتا اور گرگٹ کے سر کو فوراً پتھر سے کچل ڈالتا۔

شیخ احمد شناوی نے بہت سے پُر مغز اور عاقلانہ مقولے تحریر کیے منجملہ ان کے بطور مشتے نمونہ از خروارے یہ ہیں۔ ''**عهد نا بحفظ و ان لم یحفظ**'' متاخرین اہل حرمین کے عرف میں قبول بیعت کو اخذ عہد سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس بنا پر شیخ احمد شناوی کے اس حکیمانہ مقولے کے یہی معنی ہوئے کہ مشائخ صوفیہ سے جو میری بیعت قبول کرتا ہے اس طریقہ کی تمام مشائخ کی برکت حالت زندگی اور حالت موت میں اس کے شامل حال ہوتی ہے۔ یہ بھی آپ ہی کا پُر مغز فقرہ ہے کہ ''**لایدخل النار من رانی ورای من رانی الی یوم القیامة**'' یعنی جس شخص نے مجھے دیکھا یا میرے دیکھنے والے کو

دیکھا وہ کبھی دوزخ میں داخل نہ ہوگا۔ آپ کا انتقال 1028ھ میں ہوا اور موضع بقیع میں دفن ہوئے۔

شیخ احمد قشاشی

شیخ احمد قشاشی شیخ محمد کے فرزند اور شیخ یونس قشاشی کے پوتے ہیں جو عبدالنبی کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ شیخ یونس کو عبدالنبی کا لقب پبلک نے اس وجہ سے دیا تھا کہ آپ آدمیوں کو اجرت دے کر مسجد میں بٹھاتے اور جناب نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھواتے اور قشاشی کے ساتھ نامزد ہونے کی وجہ یہ تھی کہ آپ نے اپنے تئیں مخفی اور پوشیدہ رکھنے کی غرض سے قشاشہ فروشی کیا کرتے تھے یعنی دوات، پرانی قلمیں اور پرانی جوتیاں وغیرہ کم قیمت چیزیں فروخت کیا کرتے تھے کیونکہ قشاشہ کم قیمت اور پرانے اسباب کو کہتے ہیں۔ شیخ احمد قشاشی علم شریعت اور حقیقت میں امام وقت اور مجتہد عصر تھے۔ جب حقائق سخن میں ذکر چھڑ جاتا تو آپ ہر بات کو آیات قرآنی اور احادیث نبوی سے مدلل و مبرہن کرتے۔ آپ نے بہت سے مشائخ کی صحبت اٹھائی اور اپنے والد بزرگوار سے خرقہ زیب جسم کیا لیکن حقیقت میں آپ کے کمال نے شیخ احمد شناوی کے ہاتھ پر عروج پایا اور یہی وجہ تھی کہ شیخ احمد قشاشی اپنے تئیں شیخ احمد شناوی کی طرف منسوب کرتے اور اس انتساب کو ذریعہ فخر سمجھتے تھے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ شیخ احمد قشاشی نے مشائخ صوفیہ کی تلاش میں دور دراز ملکوں کا سفر کیا اور ایک عرصہ دراز تک سیاحت میں مصروف رہے لیکن لوٹتے وقت جب جدہ میں پہنچے تو انہیں ایک واقعہ میں معلوم کرایا گیا کہ شیخ احمد شناوی تکمیل کے مرتبہ پر پہنچ گئے ہیں۔ ان کے ذاتی کمالات معراج کمال پر ترقی کر گئے ہیں اور باطنی علوم کا ستارہ بڑے جاہ وجلال کے ساتھ چمک رہا ہے۔ لیکن چونکہ کوئی معنوی فرزند نہیں رکھتے ہیں اس لئے تمہیں اپنے فرزندگی کے انتساب سے مشہور کرنا چاہتے ہیں۔ اب تم جاؤ اور ان کی خدمت میں چند روزہ زندگی بسر کرو چنانچہ شیخ احمد قشاشی اُسی وقت جدہ سے روانہ ہوگئے اور بہت جلد شناوی کی خدمت میں پہنچے۔ شناوی نے انہیں دیکھتے ہی ایک نہایت مسرت اور تازگی کے لہجہ میں کہا **مرحبا بمن جاء یقتبس منا علومنا**۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ شیخ احمد قشاشی نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ شیخ محی الدین بن عربی نے اپنے دست مبارک سے ان کے جسم کو خرقہ سے آراستہ کیا ہے اور اپنی ہمشیرہ عزیزہ کو ان کے نکاح میں دیا ہے۔ شیخ احمد قشاشی نے معلوم کر لیا کہ اب میری وحدت وجود کی معرفت درست ہوگئی ہے کیونکہ شیخ محی الدین بن عربی کی ہمشیرہ عزیزہ اسی سے تعبیر ہوسکتی ہے۔ ذیل کی عبارت خاص شیخ قشاشی کی خط مبارک سے لکھی ہوئی ہے جس سے آپ کا علمی تبحر اور لیاقت و قابلیت بہت کچھ ثابت ہوتی ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں۔ **الذی یتحقق وجدانه ان یختمه الخاصة مرتبة الهیئة ینزل بها کل واجد لها حب وقته و زمانه غیر منقطعة ابدالاباد الیٰ ان لایبقی علی وجه الارض من یقول الله الله لعدم خلو المراتب الالهیة عن القائمین بها حتی یصیر القائم بهابصر الحافظ بمرتبة العدد فیما قبله و بعده بانفاسه تتم المصائح و تقتضی الحاجات لوانهم الف الف فی عدید لهم عادوا الی واحد فرد بلا حمد وقد تحققنا بذالك حقا و نزلناه منازلة صدقا فمن تبعنی فانه منی و من عصانی فانك غفور**

رحیم و لمن راته من مشائخی من اهل الختمیة المذکورة سند الاتصال منا الیهم من غیر انقطاع باذن اللہ تعالیٰ خمسة انفس سادسهم کابهم لا رجعماً بالغیب انتهی.

شیخ قشاشی کی مجلس میں جب مقامات کا ذکر چھڑتا تو آپ فرماتے نحن لامقام لنا لانا من اهل یثرب وقال اللہ تعالی یا اهل یثرب لامقام لکم یعنی ہمارے لئے کوئی مقام نہیں ہے۔ کیونکہ ہم باشندۂ یثرب میں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے یثرب کے باشندو! تمہارے واسطے کوئی مقام نہیں ہے گویا آپ اس سے مقام بے نشان کی طرف اشارہ کرتے تھے۔

شیخ ابراہیم کردی روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ قشاشی نے اپنی مجلس میں ذیل کی حدیث کا ذکر کیا کہ ما علی احدکم ان یکون فی بیته محمد و محمد ان ثلثة۔ شیخ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلتے ہی میں سمجھ گیا کہ خدا تعالیٰ مجھے تین فرزند عطا کرے گا جس میں سے ہر ایک کا نام محمد ہوگا لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے خیال ہوا کہ اگر ایسا ہوا تو ایک دوسرے سے کس نوعیت کے ساتھ مستثنیٰ وممتاز ہوگا۔ شیخ قشاشی نے اپنے باطنی اشراق سے فوراً میرا خیال تاڑ لیا اور فرمایا تکنی احدهم ابا سعید والثانی اباالحسن والثانی اباطاهر یعنی تم ایک کی کنیت ابوسعید دوسرے کی ابوالحسن تیسرے کی ابوطاہر رکھنا چنانچہ ایک مدت کے بعد یہی صورت متحقق ہوئی۔

شیخ قشاشی کے عادات واخلاق بالکل سادہ اور بناوٹ سے بری تھے۔ آپ کا طرز معاشرت نہ تو فقہائے زمانہ کے طور پر تھا نہ زاہدان خشک کی وضع پر بلکہ توسط اور بے تکلفی کے طریقہ پر تھا جو عین سنت کا منشا ہے۔ آپ امرا کے مکان پر جانا ہمیشہ معیوب جانتے تھے ہاں اگر وہ خود در دولت پر حاضر ہوتے تو نہایت خوش خوئی اور عام اخلاق سے پیش آتے اور ہر شخص کے ساتھ اس کے قدر و منزلت کے مطابق برتاوا کرتے۔ پھر کریم قوم کا اور بھی خصوصیت کے ساتھ اکرام و اعزاز کرتے اور امر معروف کی تبلیغ نہایت نرمی و دلجوئی کے ساتھ اہتمام کو پہنچاتے جو لوگ آپ کی زیارت کا اعزاز حاصل کرتے انہیں نصیحت سے خالی نہ رکھتے۔

شیخ عیسیٰ مغربی کا قول ہے ما خرجت من عند القشاشی قط الا والدنیا فی عینی احقر من کل حقیر و نفسی اذل من کل ذلیل و لو تکرر دخولی علیه مرات یعنی میں جب قشاشی کی مجلس کو چھوڑ کر باہر آیا تو میری آنکھ میں دنیا ہر حقیر چیز سے زیادہ حقیر معلوم ہوئی اور میں نے اپنے نفس کو ہر ذلیل چیز سے زیادہ ذلیل دیکھا اگرچہ میں ایک دن میں چند مرتبے آپ کی مجلس میں حاضر ہوتا مگر وہاں سے نکلتے وقت میری یہی کیفیت ہوتی۔ شیخ احمد قشاشی نے جس وقت دنیا سے منہ موڑ کر سفر آخرت قبول کیا تو اس وقت 1071ھ ذلحجہ کی انیسویں تاریخ تھی۔

سید عبدالرحمٰن ادریسی مشہور بہ محجوب

آپ کی ولادت موضع کمنالہ میں ہوئی جو بلاد مغرب میں ایک نہایت معمور اور پُر فضا مقام ہے۔ جب یہ زندگی کے ابتدائی مرحلے طے کر چکے تو بلاد مغرب اور مصر و روم وشام میں مدتوں تک سیر و سیاحت اور تعلیم علوم میں زندگی بسر کی

کیونکہ ان دنوں میں پرائیوٹ درسگاہوں کے علاوہ بڑے بڑے مدرسے ان ہی شہروں میں قائم تھے۔ بعدازاں حرمین میں آئے اور سالہا سال تک مجاور رہے لیکن پھر لوگوں کی زبانی یہ جملہ سن کر کہ الیمن ینبت فیه اولیاء کما ینبت فی الارض البقل یعنی ملک یمن میں اولیاء اللہ اس قدر پیدا ہوتے ہیں جس قدر زمین میں گھاس اگتے ہیں۔ اولیا اللہ کی زیارت کے لئے یمن تشریف لے گئے اور وہاں رنگین صحبتیں اور عجیب وغریب وقائع پیش آئے۔ جب ایک مدت تک یمن میں زندگی بسر کر چکے اور مختلف اولیاء اللہ کی صحبتوں سے فیض یاب ہو چکے تو پھر مکہ چلے آئے اور اب سے یہیں رہنا اختیار کیا۔ جمہور اہل مکہ آپ سے مستفید ہوئے اور بہت لوگوں نے خرقہ صوفیہ حاصل کیا۔ اکثر مکہ کے باشندے آپ کی کرامات اور باطنی تصرفات کے بے شمار دلچسپ واقعات بیان کرتے ہیں۔

منجملہ ان کے ایک یہ ہے شیخ زین العابدین شافعی مفتی مدینہ اپنے والد بزرگوار سے نقل کرتے ہیں کہ ایک دفعہ مکہ کے شریف کو کوئی سخت ضرورت پیش آئی چونکہ اس زمانہ میں سید عبدالرحمٰن مجوب کا ستارۂ شہرت اوج عروج پر چمک رہا تا اور اقبال وکمال کا آفتاب پوری ترقی پر پہنچ گیا تھا اس لئے اس نے آپ کی طرف رجوع کی اور ہمت ودعا کی استدعا پیش کی۔ سید نے تھوڑی دیر جیب تفکر میں سر ڈالا۔ ازاں بعد فرمایا کہ مکہ کے محلوں میں سے فلاں مشہور محلہ میں ایک اس قسم کا گھر ہے شریف مکہ وہاں جائے اور بقدر ضرورت مال لے کر باقی نہایت احتیاط سے چھوڑ دے چنانچہ لوگ فی الحال اس محلہ میں پہنچے اور بزرگ سید کے بتائے ہوئے مکان میں داخل ہوئے۔ دیکھتے ہیں کہ اشرفیوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں گویا سارا مکان سونے سے پٹا پڑا ہوا ہے۔ شریف مکہ نے اس میں صرف بیس ہزار اشرفیاں لے لیں اور باقی صندوقوں میں بند کر کے مہر لگا دی۔ سید عبدالرحمٰن نے شریف مکہ کو اجازت دی کہ ان اشرفیوں کو بلا تامل اپنی ضرورتوں میں صرف کرے لیکن اس کے بعد شریف مکہ کی نیت بدل گئی اور اس نے باقی دولت کو بھی تصرف میں لانا چاہا مگر پھر تو نہ اس گھر ہی کا پتہ پایا نہ مال و دولت ہی کا سراغ چلا۔ اس سے خود شریف مکہ اور اس کے اعوان وانصار سخت حیرت زدہ ہوئے اور سید سے دریافت کیا کہ اس میں کیا بھید تھا۔ فرمایا ایرانیوں میں ایک متمول اور صاحب ثروت شخص اپنے شہر میں مر گیا اور اس کا کوئی جائز وارث نہ تھا۔ میں نے تصرف کیا اور اس کا گھر مکہ میں کھینچ لیا۔ اسی میں سے تمہیں بیس ہزار اشرفیاں ہاتھ لگیں اور حاجت رفع ہونے کے بعد وہ مکان پھر اپنی جگہ چلا گیا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ سید عبدالرحمٰن مجوب، سید احمد بن ملوان کی مرقد انور کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے۔ سید احمد نے اپنے خادم کو خواب میں متنبہ کیا کہ سید عبدالرحمٰن میری زیارت کو آتے ہیں تو کل فلاں مقام پر ان کا استقبال کیجیو اور انتہا سے زیادہ تعظیم وتکریم بجا لائیو۔ چنانچہ خادم اپنے آقا کا یہ اشارہ پاتے ہی شہر کے باہر استقبال کے لئے گیا لیکن باوجود تلاش وتحقیق کے سید عبدالرحمٰن مجوب کا کہیں پتا نہیں چلا۔ انجام کار مایوس وناامید ہو کر لوٹ آیا۔ یہاں آ کر دیکھتا ہے کہ محترم سید قبر کے قبہ میں تشریف رکھتے ہیں چونکہ قبہ کے کواڑ بند تھے اور کنجی خادم کے پاس تھی اس لئے اسے تعجب اور تعجب کے ساتھ سخت حیرت ہوئی۔

قطع نظر اس کے سید عبدالرحمٰن مجوب حفظ حدیث اور کثرت روایات میں ماہرین فن کے زمرہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ معرفت رجال، انتخاب اسناد اور حفظ اصول میں اجتہاد کا مرتبہ رکھتے اور نقل اخبار اور ضبط آثار میں انتہا درجہ کی

قابلیت رکھتے تھے پھر صرف حدیث وآثار ہی کے عالم نہ تھے بلکہ علم سیر اور ادب میں بھی کمال مہارت رکھتے تھے۔ فصاحت و بلاغت اور خوش بیانی میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ علماء مصر وشام سے مختلف علوم حاصل کیے تھے اور مکہ کے باشندوں کی گودیاں اپنے فیض سے بھر دی تھیں۔

الغرض جس طرح سید الرحمٰن کمالات باطنہ سے موصوف تھے اسی طرح کمالات ظاہرہ بھی بوجہ کمال رکھتے تھے۔ آپ کی سخاوت وفیاضی تمام عرب میں مشہور تھی۔ صبح سے شام تک آپ کے دستر خوان پر ایک جم غفیر آمد وشد کرتا تھا اور آپ ہر شخص کے ساتھ نہایت خندہ پیشانی اور عام اخلاق سے پیش آتے تھے۔ ممالک اسلام سے نہایت قیمتی اور وزنی ہدایا آتے اور آپ فوراً فقرا پر صرف کرتے۔ تقریباً دو سو غلاموں کے سر پر آزادی کا تاج رکھا اور ہزاروں آدمیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ آپ کی نیک خلقی اور شیریں گفتاری کا یہ بدیہی نتیجہ تھا کہ جو شخص آپ کے پاس نشست کرتا مدت العمر تک مفارقت دوست نہیں رکھتا۔ آپ اس درجہ عاقل اور قوی الفطانتہ تھے کہ جو شخص ایک مرتبہ آپ سے ملاقات کرتا اگر چہ موسم حج ہی میں کرتا اسے جب دیکھتے فوراً پہچان لیتے۔ جو لوگ آپ کی زیارت کے لئے آتے ہر ایک کو اس کی استعداد کے موافق وجوہ خیر کے دلائل پیش کرتے اور درود تلاوت اور استغفار کا حکم فرماتے۔ لیکن جس میں قابلیت واستعداد کا مادہ ملاحظہ کرتے اُسے کلام صوفیہ کا مطالعہ کرنے اور ان سے اعتقاد ظاہر کرنے کا ارشاد فرماتے خاص کر شیخ ابن عربی قدس سرہ کی جانب رغبت دلاتے۔

شمس الدین محمد بن علاء بابلی

یہ بزرگوار حافظ حدیث تھے اور علوم حدیث میں اعلیٰ درجہ کا تبحر رکھتے تھے۔ اپنے زمانہ میں مصر وحرمین کے استاد مشہور تھے اور مشاہیر محدثین میں گنے جاتے تھے۔ ان کے نورانی چہرہ پر عظمت وجلال برستا تھا اور اس شان وشوکت سے چلتے تھے جس سے دیکھنے والوں پر عظمت نماہیبت طاری ہوتی تھی۔ طرز معاشرت نہایت عمدہ اور پاکیزہ تھا۔ جودت فہم، عقل ودانائی، فراست وفطانت، دیانت وصیانت میں عدیم المثال اور تواضع وخوش خلقی میں ضرب المثل تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے ابتدائی عمر میں شب قدر کی برکت حاصل کی اور اس مبارک رات کے بعض عجیب وغریب آثار محسوس کر کے جناب الٰہی میں دعا کی تھی کہ خداوند مجھے حافظ ابن حجر عسقلانی کے ہم پلہ کر دے۔ خدا تعالیٰ نے شمس الدین کی دعا کو سن لیا اور انہیں علمی تبحر میں شیخ ابن حجر کے ہم پلہ کر دیا۔ صحیح بخاری اور موطا اور حدیث کی تمام کتابیں سالم سے پڑھیں اور سنن د حدیث کے پھلے پھولے باغ میں ایک نئی تازگی بخشی۔

شمس الدین بابلی کی طبیعت کو علم حدیث سے ایک خاص مناسبت تھی اس لئے انہیں اس شریف علم میں ایک نئی طرح کی لذت حاصل ہوتی تھی۔ تمام وقت حدیث کی نقل وتحریر میں صرف کر دیتے اور اسناد وحدیث کو ضبط کرتے رہتے تھے۔ حدیث میں اس درجہ محویت واستغراق پیدا ہو گیا تھا کہ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے ایک جز حدیث کا اپنے پاس رکھتے اور ہر وقت اس کے مطالعہ میں غرق رہتے۔ شیخ عیسیٰ مغربی نے آپ کی تمام مرویات اور اسانید کو ایک رسالہ میں ضبط کیا ہے

جس کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ متاخرین کے لئے کوئی اصل اور سند ہے تو بجز اس کے اور کوئی نہیں۔

آپ نے تالیف وتصنیف کی غایت وسبب میں ایک نہایت ہی قیمتی آرٹیکل دیا ہے جسے میں اس مقام پر بجنسہ نقل کرتا ہوں۔فرماتے ہیں۔**لایؤلف احد تالیفا الا فی احد اقسام سبعة اما ان یؤلف فی شئی لم یسبق الیه احد اوشی ناقص یتمه اوشی مغلق یشرحه او طویل یختصره دون ان ینحل من معاینه بشئی اوشی مختلطیرتبه اوشی اخطا فیه مصنف قبله اوشی متفرق یجمعه و الا کان اضاعة الوقت**۔یعنی تالیف کی غایت ذیل کے سات وجوہ واسباب میں سے ایک وجہ اور سبب ہونا چاہیے ورنہ تضیع وقت کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ایک یہ کہ کوئی چیز تالیف وترتیب کے قالب میں ڈھالے جس کی طرف کسی کا ذہن اس سے پیشتر دوڑا نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ کوئی بات ناقص ہو جس کی اسے تکمیل منظور ہو۔تیسرے یہ کہ کوئی شے مغلق ہو اور یہ اس کی تشریح وتوضیح کے درپے ہو۔چوتھے یہ کہ وہ زیادہ طول طویل ہو جسے یہ مختصر پیرایہ میں لانا چاہتا ہو۔لیکن معانی کے حل اور مطالب کی تفسیر کی طرف مائل نہ ہو۔پانچویں یہ کہ کوئی چیز مختلط اور غیر ممتاز ہو اور یہ اسے ترتیب سے آراستہ کرنا چاہتا ہو۔چھٹے یہ کہ اس میں پیشتر سے مصنف نے غلطی کی ہو جس کے اظہار میں اس نے قلم اٹھایا ہو۔ساتویں یہ کہ وہ پریشان وپراگندہ وبیان ہو، جسے یہ ایک جگہ جمع کرنا چاہتا ہو۔شمس الدین بابلی کو خدا تعالیٰ نے وہ عظمت وجلال اور بزرگی وفضیلت عنایت کی تھی کہ سلاطین یورپ اور شرفاء عرب اور امراء مصر وشام کی گردنیں آپ کے آگے جھکتیں تھیں اور وہ کمال اقتدار واعزاز کے ساتھ پیش آتے تھے۔آپ کے در دولت پر حاضر ہونے کو اپنا فخر سمجھتے اور قدمبوسی کو سعادت ابدی خیال کرتے تھے۔پادشاہان عرب اور شرفاء مکہ کو جب کوئی مہم پیش آتی تو آپ سے ہمت ودعا کے طالب ہوتے اور جو کچھ آپ ارشاد فرماتے اس سے سرمو انحراف نہیں کرتے۔

حدیث کی درس اور اشاعت کے علاوہ آپ ہمیشہ تلاوت قرآن میں مصروف رہتے اور تدبر معانی اور نہایت غور وخوض کے ساتھ ایک معین حصہ کی روزانہ قرأت کرتے۔آپ نے 1077ھ میں دنیائے ناپائدار سے سفر کیا اور جنت الفردوس میں خداوندی مہمانی قبول کی۔

شیخ عیسیٰ جعفری مغربی

یہ مشہور فاضل مغرب میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پایا۔قرآن مجید اور علوم متعارفہ کے چند متون یہیں کے علماء وفضلاء سے پڑھے۔جب عمر کے پندرہ مرحلے طے کر چکے تو جزائر میں پہنچے اور سجلماسی کی صحبت میں دس سال سے زیادہ رہے۔اس صحبت میں آپ کو اکثر علوم میں تبحر حاصل ہوگیا اور ہر علم وفن میں تھوڑی تھوڑی شہرت حاصل کر لی۔ازاں بعد علماء قسطنطنیہ اور فضلاء مصر وحرمین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مشاہیر محدثین سے روائتیں کیں۔اس کے بعد آپ نے مکہ میں توطن اختیار کرلیا۔

شیخ عیسیٰ کی تصانیف سے ایک مجم مسے ''بہ مقالید الاسانید'' ہے جو نہایت ہی قیمتی اور وزنی کتاب ہے اور جس کی

نظیر دنیا میں بمشکل مل سکتی ہے۔ اس کتاب کے دیکھنے سے شیخ کی لیاقت و قابلیت بہت کچھ ثابت ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ آپ علم حدیث میں کس درجہ کا پایہ رکھتے تھے اور علم حدیث کو کس عروج پر پہنچا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تمام اہل حرمین نے آپ کو اپنا امام و مقتدا تسلیم کر لیا تھا اور شیخ الوقت کا معزز و وزنی خطاب دیا تھا۔ آپ کی درسگاہ میں عراق و مصر اور شام وغیرہ کے لوگ ہمیشہ حاضر ہوتے اور آپ کے تبحر، وسعت نظر، خداداد حافظہ پر عش عش کرتے۔

سید عمر نے جو شیخ عیسیٰ کی نسبت مختصر الفاظ میں ریمارک کیا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک ایسے درجے کے شخص تھے جن کے فضل و کمال میں کوئی شخص اس وقت برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا چنانچہ وہ لکھتے ہیں من ارادان ینظر الی شخص لایشك فی ولایته فلینظر الی ھذا یعنی جو شخص کسی ایسے آدمی کو دیکھنا چاہے جس کی ولایت میں کسی طرح کا شک و شبہ نہیں ہو سکتا اسے شیخ عیسیٰ کو دیکھنا چاہیے۔ اسی طرح سید محمد بن علوی آپ کی نسبت کہا کرتے تھے کہ ر ردق زمانه.

شیخ عیسیٰ جس طرح علمی فضائل میں ضرب المثل اور مشہور تھے اسی طرح عادات و اخلاق میں بھی بے نظیر تھے۔ آپ میں جس قدر نیکیاں اور خوبیاں جمع تھیں وہ کسی دوسرے شخص کو اس زمانہ میں نصیب نہیں ہوئیں۔ کوئی نماز کبھی قضا نہیں ہوئی اور حضور جماعت پر مداومت و مواظبت رہی۔ کثرت طواف، صیام نہار، قیام شب میں پلے درجہ کے حریص تھے۔ باوجود اس عالمانہ تزک و احتشام کے تکلف و تعصب نام کو نہ تھا۔ اخلاق میں جو وسعت اور عموم تھا آج اس کی نظیر سے تمام علما و فضلا کے حلقے خالی ہیں۔ تمام امور میں متوسط اور درمیانی راہ تھی۔ آپ کو ننگ و ناموس میں اس درجہ مبالغہ تھا نہ تساہل۔ علاوہ ان تمام باتوں کے آپ نے بہت سے مشائخ کبار سے ارتباط پیدا کر لیا تھا۔ لیکن انجام کار طریقہ شاذلیہ اختیار کر لیا اور آخر عمر تک اسی طریقہ کی طرف طبیعت کا میلان رہا۔

شیخ عیسیٰ نے فقہ حنفی کے مطابق ایک مسند بھی تالیف کی تھی، جس میں فقہی روایات کی تائید میں متصل حدیثیں بیان کی ہیں اور جس سے ان لوگوں کے زعم کا بطلان بخوبی واضح ہوتا ہے جو اس بات کے مدعی ہیں کہ حدیث متصل کا سلسلہ آج بالکل منقطع ہو گیا ہے۔ آپ نے 1108ھ میں دنیا سے انتقال کیا اور روضہ رضوان میں تشریف لے گئے۔

شیخ ابراہیم کردی مدنی قدس سرہ

یہ بزرگوار علاوہ مذہبی تقدس کے دنیاوی شان و شوکت بھی بہت کچھ رکھتے تھے۔ بڑے بڑے مشہور فاضل فن حدیث میں آپ کے شاگرد تھے اور فقہ شافعی میں بھی پلے درجہ کا کمال حاصل تھا۔ علما حرمین شریفین میں پیشوائے مذہبی تسلیم کیے گئے تھے اور مصر و شام کے فضلا امام وقت اور مقتدائے عصر کے خطاب سے یاد کرتے تھے۔ علم حدیث و عربیت میں یدطولیٰ رکھتے اور آپ کے فنون رسمیہ معراج کمال پر ترقی کر گئے تھے۔ ہر فن میں بیش قیمت اور وزنی تصانیف رکھتے تھے، اسی لیاقت اور پولٹیکل قابلیت کا یہ بدیہی نتیجہ تھا کہ اس عہد کے بچہ بچہ کی زبان پر نہایت وقعت و عظمت کے ساتھ آپ کا نام جاری تھا اور علما و فضلا کے حلقوں میں آپ کی انتہا سے زیادہ مدح سرائی کی جاتی تھی۔

اپنے والد بزرگوار کے علاوہ اور بہت سے ائمہ وقت کی خدمت میں آپ نے علم کی تحصیل کی اور اپنے ہی بلاد میں تمام علوم سے فراغت کر لی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد حج کے قصد سے سفر اختیار کیا اور دو سال کے قریب شہر بغداد میں سکونت رکھی جو اس وقت مختلف علوم کا مرکز تھا اور جہاں ہر قسم کے اہل کمال اور علماء و فضلا اور مشائخ موجود تھے اور غالباً یہی وجہ تھی کہ شیخ ابراہیم دو سال تک یہاں ٹھہرے۔ کیونکہ اس زمانہ میں بجز اس شہر کے اکتساب کمالات کے لئے کوئی اور موقع اہل علم کے حق میں نہ تھا۔ جس زمانہ تک آپ بغداد میں فروکش رہے اس عہد میں اکثر اوقات سید عبدالقادر قدس سرہ کے مزار اقدس پر متوجہ ہوتے رہے اور یہیں سے آپ کو اس راہ کا ذوق و شوق پیدا ہوا۔

دو سال کے بعد بغداد کو خدا حافظ کہا اور ملک شام میں چار سال تک سکونت پذیر رہے۔ زاں بعد مصر پر گزرتے ہوئے حرمین میں تشریف لاتے اور شیخ احمد قشاشی سے ملاقات کی۔ شیخ ابراہیم کو شیخ قشاشی سے اور قشاشی کو ان سے ایک خصوصیت عجیب پیدا ہو گئی اور شیخ ابراہیم نے بہت تھوڑے عرصہ میں انہیں اپنا گرویدہ بنا لیا۔ خرقہ صوفیہ حاصل کیا اور حدیثیں روایت کیں اور ان کی صحبت میں کمالات علیہ پر ترقی کی۔ عربی اور کردی زبان کے علاوہ فارسی اور ترکی بھی خوب جانتے تھے اور ان زبانوں میں ایسی سہولت اور بے تکلفی کے ساتھ تقریر کرتے تھے جسے سن کر زباندان لوگ حیرت زدہ ہو جاتے تھے۔

شیخ ابراہیم علمی تبحر اور فضل و کمال میں اعلیٰ درجہ کی شہرت رکھتے تھے اور فہم و فراست، زہد و تواضع، صبر و حلم میں ضرب المثل تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جس زمانہ میں آپ ملک شام میں مقیم تھے ایک دن شیخ محی الدین بن عربی کے روضہ متبرکہ کی طرف اس نیت سے متوجہ ہوئے کہ اس وقت سفر کا عزم بہتر ہے کہ نہیں۔ آپ واقعہ میں دیکھتے ہیں کہ جناب شیخ محی الدین ان کے جوتے کی غبار کو جھاڑ رہے ہیں۔ شیخ ابراہیم نے معلوم کر لیا کہ آپ اقامت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔ شیخ ابوطاہر کا بیان ہے کہ دولت عثمانیہ کے وارث تخت و تاج کا اتالیق جسے اس طرف کے لوگ خوجہ کے نام سے پکارتے تھے ایک دفعہ مدینہ طیبہ کی زیارت کو آیا اور بڑے شان و شوکت سے آیا۔ جب شیخ ابراہیم کے عظمت و جبروت کا شہرہ سنا تو علما و مشائخ نیز ارکان دولت عثمانیہ کے جم غفیر کو ہمراہ لے کر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ملاقات کے بعد شیخ سے عرض کیا کہ میں نے ملک شام میں ایک آشکارا بدعت دیکھی جس کے مٹانے اور قلع و قمع کرنے میں انتہا سے زیادہ کوشش کی۔ شیخ نے فرمایا کہ وہ کیا بدعت تھی جواب دیا کہ لوگ مسجدوں میں ذکر جہر کرتے تھے۔ میں نے اس کی ممانعت کر دی۔ شیخ نے نہایت بے خوفی سے ایک بیباکانہ لہجہ میں یہ آیت پڑھی: **ومن اظلم ممن منع مساجد اللہ ان یذکر فیھا اسمہ وسعیٰ فی خرابھا**۔ شیخ کی اس بے دھڑک تقریر نے خوجہ کے چہرہ میں ایک فوری تغیر پیدا کر دیا اور اسے آپ کی اس بے خوف گفتگو سے سخت ملال ہوا۔ فقہ حنفی کی بعض نقلیں اور روایتیں جو فتاویٰ قاضی خاں وغیرہ سے مستنبط کی گئی تھیں۔ جیب میں سے نکال کر شیخ کے ہاتھ میں دے دیں اور کہا انہیں ملاحظہ کیجیے۔ شیخ کی زبان بڑے بڑے مناظروں میں کبھی نہیں رکتی تھی۔ آپ نے برجستہ جواب دیا کہ اگر تم صرف تقلید کی بنا پر گفتگو کرتے ہو تو میرا خطاب تمہاری طرف متوجہ نہیں ہو سکتا کیونکہ میں ایک اور شخص کا مقلد ہوں اور تم کسی اور شخص کے۔ تمہارے استدلال و حجت سے میں ملزم نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر تحقیق کی رو سے اس مسئلہ کی تنقیح و توضیح چاہتے ہو تو بسم اللہ بندہ حاضر ہے۔ شیخ کے اس پُر مغز اور عاقلانہ

جواب سے خوجہ شرمندہ ہو کر چپ ہو رہا اور نہایت منغض و مکدر ہو کر مجلس سے اٹھ کھڑا ہوا۔ شیخ نے اسی زمانہ میں ایک بڑے زور کا رسالہ تحریر کیا جس کا نام ''حافلہ'' رکھا اور جس میں خوجہ کے شبہات و شکوک کے قاطع جواب ذکر فرمائے۔ شیخ کے جن عزیزوں نے خوجہ کے تغیر مزاج کو دیکھا تھا۔ شیخ کی خدمت میں عرض کیا کہ خوجہ دولت عثمانیہ کا ایک معزز و ممتاز شخص ہے اور اس کی دربار عالیہ میں بہت بڑی عزت ہوتی ہے۔ خود شہنشاہ روم اس کو تعظیم دیتا اور کمال قدر دانی سے اپنے برابر تخت پر جگہ دیتا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ قاضی القضاۃ کے درجہ پر ممتاز ہے وارث تخت و تاج کی اتالیقی کا معزز منصب رکھتا ہے ایسی صورت میں اس کے رد میں اس قدر مبالغہ کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ شیخ نے اپنے دوستوں کی یہ دلسوزی سے بھری ہوئی تقریر سن کر فرمایا کہ یہ سب کچھ صحیح ہے مگر میں آزادی اور حق گوئی کا سر رشتہ کبھی ہاتھ سے نہ دوں گا۔ گو اس میں مجھے کسی قسم کا دنیاوی صدمہ ہی کیوں نہ پہنچے۔

مثل مشہور ہے کہ سچ کو آنچ نہیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ **كلمة الحق يعلو ولا يعلى** چونکہ شیخ صاحب کو صرف احقاق حق منظور تھا اور اس کے علاوہ غرض و تعصب پیش نظر نہ تھی خود خوجہ اور اس کے احباب نے اس رسالہ کو دیکھ کر ایک بات بھی منہ سے نہیں نکالی اور شیخ کے زور تحریر علمی تبحر سے حیرت زدہ ہو گئے اور آپ کی خداداد فہم و فراست پر عش عش کرنے لگے۔ اس وقت یہ مشہور قول بالکل صحت کے درجہ کو پہنچ گیا کہ حق کو کسی جگہ زوال نہیں ہوتا گو چند روز کے لئے جھوٹ چمک اٹھتا ہے اور ظاہر بینوں کو نظر پڑتا ہے کہ اس چمک میں سچائی و راستی کی جھلک نمودار ہے لیکن انہیں بعد کو خود بخود معلوم ہو جاتا ہے کہ ناحق کو فنا اور حق کو بقا ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ قرآن مقدس کے ایک مقام پر یوں ارشاد فرماتا ہے کہ **جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقا.**

شیخ ابو طاہر یہ بھی روایت کرتے ہیں کہ شیخ یحییٰ شاذلی ایک دفعہ بڑی شان و شوکت سے حرمین میں آئے اور شیخ ابراہیم صاحب سے بڑے تپاک سے ملاقات کی۔ زاں بعد روم کی جانب روانہ ہوئے شاہ روم کا وزیر السلطنت جو باوجود حکومت کی شان و شوکت کے پیشوائے مذہبی تسلیم کیا جاتا اور حدیث و فقہ میں اعلیٰ درجہ کی قابلیت رکھتا تھا۔ شیخ ابراہیم صاحب کا سخت معتقد تھا۔ یہ جس طرح حدیث و فقہ میں بے نظیر تھا اسی طرح ادب و عقائد میں بھی کمال رکھتا تھا اور اسی قابلیت کا یہ نتیجہ تھا کہ معمولی عہدہ سے وزارت اعظم کے مرتبہ کو پہنچ گیا۔ جب شیخ یحییٰ شاذلی وزیر السلطنۃ سے ملاقات کرنے گئے تو اس نے کہا **كيف وجدت شيخنا ابراهيم** یعنی تو نے ہمارے شیخ ابراہیم کو کیسا پایا۔ بدقسمت یحییٰ نے جواب دیا **وجدته مجسما** یحییٰ کا یہ دل آزار جواب سن کر وزیر السلطنۃ غصہ میں بھڑک اٹھا اور نہایت تحقیر و توہین کے بعد مجلس سے نکال دیا اس واقعہ کے بعد شیخ یحییٰ شاذلی کو جناب شیخ ابراہیم سے رنج بڑھ گیا اور ان کے ایذا کے قصد سے پھر حرمین میں آنا چاہا۔ لوگوں نے یہ قصہ شیخ سے نقل کیا اور کہا کہ وہ آپ کے ہلاکت کے درپے ہے۔ اسی ارادہ سے دوبارہ حرمین میں آتا ہے۔ بزرگ شیخ نے نہایت استقلال کے لہجہ میں فرمایا **بجنسه حابس الفيل** یعنی جس نے اصحاب فیل کو دنیا سے مٹا دیا اور اپنے مقدس گھر میں آنے سے روک دیا وہی اس کی بھی مزاحمت کرے گا۔ چنانچہ جب شیخ یحییٰ شاذلی کے متصل پہنچا تو دفعتہً بیمار پڑ گیا اور چند روز مبتلا رہ کر وفات کر گیا۔

شیخ ابراہیم کے اخلاق نہایت عام اور وسیع تھے اور طرز معاشرت بہت ہی اچھا تھا۔ کھانے اور لباس میں تکلف

اور بناوٹ کو مطلق دخل نہ تھا۔ البتہ بڑے عمامے اور لانبی آستینوں سے نفرت رکھتے تھے۔ نخوت، ترفع، کم بینی نام کو نہ تھی۔ مروت وسخاوت میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ خوش خلقی کی عادت آپ کی طبیعت ثانی ہوگئی تھی۔ عاجز ومستمند شکستہ حال و غریب الدیار لوگوں کے ساتھ سلوک سے پیش آتے تھے۔ خدا پرستی، حلم، تواضع اور بے ریا سخاوت میں اس زمانہ میں آپ کا دعوے دار نہ تھا۔ عفو، ترحم اور خاکساری اعتدال سے بڑھ کر تھی۔ ایک مؤرخ آپ کی فیاضی اور بے ریا سخاوت پر یوں ریمارک کرتا ہے کہ "علما، طلبہ اور ندماء میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو شیخ کی سخاوت عام سے محروم رہا ہو۔ حقیقت میں شیخ ان کے حق میں ابر رحمت تھے۔ جس کی ہمیشہ فیاضی کی بارش ہوا کرتی تھی۔" عبداللہ عیاشی نے مختصر لفظوں میں آپ کی مجلس کی یہ تعریف کی ہے کہ **کان مجلسه روضة من رياض النجة** یعنی شیخ ابراہیم کی مجلس جنت کے باغوں میں سے ایک پھلا پھولا اور تازگی بخش باغ تھا۔

جب آپ مسائل حکمت کی تقریر کرتے تو ان کے تحت میں حقائق صوفیہ بیان کیا کرتے اور کلام صوفیہ کو حکما کی تحقیق پر ترجیح دیتے اور فرماتے۔ **هؤلاء الفلاسفة قار بواعثوراً على الحق ولم يهتدوا اليه.** آپ کا انتقال 1071ھ میں ہوا۔ چنانچہ ایک فرید عصر اور ادیب زمانہ نے آپ کی تاریخ وفات ان جملوں سے نکالی ہے۔ **والله انا على فراتك يا ابراهيم لمحزونون.**

شیخ حسن عجمی

یہ بزرگوار شیخ الحدیث اور جامع فنون تھے۔ جودت فہم، ذہانت وطباعی، فصاحت وبلاغت میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ ایک زمانہ تک شیخ عیسیٰ مغربی سے تحصیل علوم کی اور ان کی صحبت سے فیض اٹھایا۔ شیخ عیسیٰ مغربی کے علاوہ اور بہت سے ماہرین اور ائمہ وقت کی خدمت میں رہے۔ شیخ احمد قشاشی، شیخ محمد بن العلاء بابلی، شیخ زین العابدین ابن عبدالقادر طبری وغیرہ سے حدیثیں روایت کیں اور صحبت سے مستفید ہوئے۔ علم حدیث وفقہ اور مغازی وسیر میں بہت بڑی قابلیت رکھتے تھے۔ آپ کا ذہن وحافظہ ایسا وسیع تھا جس کی تعریف زین العابدین جیسے علامہ اور فرزانہ روزگار نے نہایت وزنی الفاظ میں کیا کرتے تھے جو شافعیہ کے مفتی اور ان کے ایک نہایت معزز ومقتدر امام تھے۔

شیخ ابوطاہر کا بیان ہے کہ شیخ حسن عجمی نے شیخ نعمت اللہ قادری وغیرہ سے ملاقات کی تھی اور دعوت اسما میں انتہا سے زیادہ شہرت رکھتے تھے۔ اگرچہ آپ حنفی المذہب تھے اور تمام باتوں میں فقہ حنفی پر عمل کرتے تھے۔ لیکن سفر کی حالت میں ظہر وعصر اور مغرب وعشا کی نماز جمع کر کے پڑھا کرتے تھے اور اقتدا کی صورت میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھتے تھے آپ ہم لوگوں کو تاکیدی حکم فرمایا کرتے تھے کہ اپنی عورتوں پر تنگی جائز نہ رکھو اور بعض ان رخصتی مسائل کا حکم کرو جن کی اجازت علماء حنفیہ نے دی ہے تاکہ وہ نہایت سہولت وآسانی کے ساتھ نماز ادا کر سکیں۔ شیخ ابوطاہر یہ بھی ذکر کیا کرتے تھے کہ **لم يكن سيدى حسن العجمى بجهيل و كانت فى عينه هة وكان مع ذلك اذاقرأ الحديث رء ى على وجهه الانوار و صار كاجمل من رء ى فى الدنيا ذلك سرقوله صلى الله عليه وسلم نضر الله**

عبداالحدیث یعنی میرے استاد شیخ حسن عجمی کائنات حسن کے لب لباب اور چنداں خوبصورت نہ تھے بلکہ ان کی آنکھ میں ایک عیب بھی تھا لیکن یہ نہ صرف تعجب بلکہ حیرت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے کہ جب آپ حدیث پڑھنا شروع کرتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا چہرہ پرانوار برس رہے ہیں اور اس وقت دنیا بھر سے زیادہ خوبصورت دکھائی دیتے تھے۔ غالباً یہ اس حدیث کا اثر معلوم ہوتا ہے جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لفظوں میں ادا فرمایا کہ **نضر اللہ عبدا سمع مقالتی ودعاء** یعنی خدا تعالیٰ اس بندہ کے چہرہ کو تروتازہ رکھے جو میری حدیث کو سنتا اور یاد رکھتا ہے۔

شیخ حسن عجمی نے ایک رسالہ بھی تالیف کیا ہے جس میں اپنی تمام اسانید کو ضبط کر دیا ہے اور جس سے آپ کے علمی تبحر کی قوت اور خداداد قابلیت بہت کچھ ثابت ہوئی ہے۔ آپ ہر سال رجب کے مہینے میں مدینہ طیبہ کی زیارت کے لئے تشریف لایا کرتے اور مسجد نبوی میں بیٹھ کر صحاح ستہ میں سے ایک کتاب بطریق سرد (5) ختم کرتے تھے۔ اہل مدینہ آپ سے حدیثیں روایت کرتے تھے اور مجلس درس میں شیخ ابوطاہر قاری ہوتے تھے۔ اگر کوئی دوسرا شخص قرأت کرتا تو آپ اس سے خوش نہ ہوتے۔

غرض کہ شیخ حسن عجمی اپنی خداداد قابلیت اور عام اخلاق کی وجہ سے تمام علماء حرمین محترمین میں عزت ووقعت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے اور اہل مکہ ان کی بڑی تعظیم وتوقیر سے پیش آتے تھے۔ دنیاوی اعزاز اور مذہبی تقدس میں اس سے بڑھ کر اور کیا درجہ ہوسکتا تھا کہ ایک مقدس ومتبرک مقام کے متولیوں نے آپ کو اپنا مذہبی پیشوا تسلیم کیا تھا اور امامت کا وزنی وقیمتی تاج آپ کے سر پر رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے شرفاء عرب اور سلاطین عجم کی گردنیں آپ کے سامنے جھک جاتی تھیں۔

شیخ حسن عجمی کی بے مثل تواضع

یہ جاہ وجلال اور عظمت وجبروت کے سین ہمیشہ شیخ حسن عجمی کے پیش نظر تھے لیکن باوجود اس شان وشوکت کے آپ کے مزاج میں غایت درجہ کا عجز وانکسار اور بے نظیر حلم ووقار تھا۔ آپ اپنے مشائخ کی نسبت خصوصیت کے ساتھ انتہا درجہ کی تواضع برتتے تھے اور ان کی مراعات خاطر اور اعزاز واقتدار میں پلے درجہ کی کوشش کرتے تھے۔ جس زمانہ میں آپ کے عروج وترقی کا ستارہ شہاب ثاقب بن کر خوب زور شور سے چمک رہا تھا اس وقت آپ نے اور بھی عجز وخاکساری اختیار کی تھی اور ادنیٰ ادنیٰ آدمیوں سے تواضع اور انکسار کے ساتھ پیش آتے تھے۔

شیخ حسن کا اپنے مشائخ کی نسبت احترام

مشائخ کے اعزاز واحترام کا یہ حال تھا کہ آپ ان کے سامنے گردن جھکائے بیٹھے رہتے تھے اور بجز کسی سخت ضرورت کے گفتگو کرنے کی جرأت نہ کرتے تھے چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ شیخ عیسیٰ مغربی کی خدمت میں تشریف رکھتے تھے۔ اکثر علماء حرمین مجلس میں موجود تھے اور لوگ اپنے شبہات وشکوک نمبروار پیش کر رہے تھے۔ شیخ حسن عجمی نے بھی جسارت کرکے دریافت کیا کہ **یاسیدی اذا کان للانسان شیخ فهل له ان یدخل علی شیخ اخر** یعنی اے

سید جب آدمی کا ایک شیخ ہو تو اسے جائز ہے کہ دوسرے شیخ کا معتقد بن جائے۔ شیخ عیسیٰ مغربی نے جواب دیا کہ الاب واجد و الاعمام شیخ حسن عجمی یہ جواب سن کر دوبارہ دریافت کرنے اور اس جملہ کی تشریح کرانے کی جرأت نہ پڑی اور آپ بڑی خاموشی کے ساتھ سب کی باتیں سنتے رہے۔ حقیقت میں اہل مجلس کے لئے شیخ عیسیٰ مغربی کا یہ جواب ایک پہیلی تھی جس کا بوجھنا سخت مشکل تھا۔ اکثر اہل مجلس نے چاہا کہ اس معمے کو حل کریں لیکن کسی کی اتنی جرأت نہ ہوئی کہ اس طلسم کی پردہ کشائی کرے۔ انجام کار مجلس برخاست ہوئی اور سب لوگ اٹھ اٹھ کر اپنے مقاموں پر واپس جانے لگے۔ اس وقت اکثر مشائخ شیخ حسن عجمی کے پاس آئے اور اس معمے کو حل کرنا چاہا۔ آپ نے بہت ہی مختصر لفظوں میں اس جملہ کی یوں تفسیر کی کہ شیخ اول کی قدر و منزلت جس کی وجہ سے انسان نے بیضہ بشریت سے خروج کر کے ملک اعلیٰ میں قدم رکھا ہے۔ یہ نسبت اور مشائخ کے بہت کرنا چاہیے اور اس کے ساتھ ہمیشہ نیکی و بھلائی سے پیش آنا چاہیے جس طرح اپنے حقیقی والد کے ساتھ پیش آتا ہے اور دوسرے مشائخ کے ساتھ وہ معاملہ برتتے جو اعمام کے ساتھ برتنا چاہیے۔

شیخ حسن عجمی آخر عمر میں مکہ چلے آئے تھے اور یہیں توطن اختیار کر لیا تھا۔ طائف میں ایک مدت تک گوشہ نشین رہے اور اسی مقام پر انتقال فرمایا۔ حضرت ابن عباس کی تربت کے متصل مدفون ہوئے۔ جس وقت آپ نے دنیا سے منہ موڑ کر سفر آخرت قبول کیا ہے اس وقت 1113ھ کا شروع تھا۔

شیخ احمد نخلی

آپ علم ظاہر و باطن دونوں کو جامع تھے اور بہت سے مشائخ طریقت اور علماء شریعت کی صحبت سے فیض یاب تھے۔ شیخ عبدالرحمٰن مجوب، سید محمد رومی، سید عبداللہ سفاف اور میر کلان بن میر محمود بلخی وغیرہ سے خرقہ صوفیہ زیب تن فرمایا۔ محمد بن العلاء البابلی اور شیخ عیسیٰ مغربی کے علاوہ اور بہت سے ائمہ اور فضلاء عصر سے حدیثیں روایت کیں۔ سماع بخاری اور مؤطا میں تسلسل روایت حاصل کیا۔ ابتدا نشو و نما کے زمانہ سے صلاحیت و دیانت اور علم و علما کی محبت اور ان کے التزام صحبت اور مشائخ صوفیہ کے اعتقاد اور ان کے اعمال و اشغال سے متصف تھے۔ اکثر مشائخ حرمین کی صحبت میں زمانہ دراز تک مستفید رہے اور حرمین میں آمد و شد کرنے والوں سے فیض یاب ہوئے۔ غرض کہ یہ بزرگوار مکہ معظمہ کے اعیان دولت اور رؤسا شہر میں ایک نہایت معزز و ممتاز شخص شمار کیے جاتے تھے اور برکت و استجابت دعوات میں مشہور و معروف تھے۔

شیخ عبدالرحمٰن نخلی ولد شیخ احمد نخلی روایت کرتے ہیں کہ یہ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ شیخ احمد نخلی کے والد کے ہاں کوئی فرزند زندہ نہ رہتا تھا جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ اندوہ و رنج میں گرفتار رہتے تھے اور کسی بات میں مزہ نہ آتا تھا لیکن جب شیخ احمد پیدا ہوئے تو انہوں نے اکثر اہل اللہ سے مولود مسعود کی ترقی عمر کی استدعا کی اور استمداد و طلب ہمت میں انتہا سے زیادہ کوشش کی۔ شیخ احمد جب کسی قدر بڑے ہوئے تو ان کے والد بزرگوار ہمیشہ جمعہ کے روز شیخ تاج سنبھلی کی خدمت میں بھیج دیا کرتے۔ شیخ تاج کو شیخ احمد سے دلی محبت پیدا ہو گئی تھی۔ جب شیخ احمد آپ کی خدمت میں پہنچتے تو آپ انہیں اپنی آغوش محبت میں لے کر دست شفقت سر پر بار بار پھیرتے اور اپنے متبرک انفاس سے مالا مال کر کے واپس کرتے۔ اتفاق

سے ایک روز شیخ احمد جوں ہی شیخ تاج کی خدمت میں پہنچے اور آپ کی نظر مبارک ان کے چہرہ پر پڑی تو آپ دریائے تامل میں محو ہو گئے۔ زاں بعد اس غلام سے کہلا بھیجا جو شیخ احمد کے ساتھ ہمراہ ہوتا تھا کہ **هذا الطفل ليس مثلك بل هو افضل و اسعد منك غير انه ليس له من العمر الا الشئى اقليل** یعنی یہ ہونہار اور بلند اقبال لڑکا تم جیسا نہیں ہے بلکہ تم سے افضل اور زیادہ بختاور ہے لیکن مجھے سخت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس کی عمر بہت تھوڑی ہے بلکہ یوں سمجھنا چاہیے کہ اب اس کی عمر طبعی ہو چکی ہے اور عنقریب خزاں کا وقت آیا چاہتا ہے۔ جب غلام شیخ احمد کے والد بزرگوار کے پاس پہنچا اور حقیقت حال کا انکشاف کیا تو انہیں سخت رنج ہوا اور اسی وقت غلام سے فرمایا کہ تو بھی شیخ کی خدمت میں حاضر ہو اور میری طرف سے یہ التماس کر کہ **یا سیدی انی اعطیت عمر هذا الطفل و انی استشفع بك فی هذا الامر** یعنی اے سید! میں اپنی عمر بخوشی اس لڑکے کو دیتا اور آپ کو اس بارہ میں شفیع قرار دیتا ہوں۔ شیخ تاج نے جب یہ پیغام سنا تو مراقبہ میں مشغول ہوئے اور ایک ساعت کے بعد سر اٹھا کر فرمایا کہ جاؤ اپنے آقا سے کہہ دو کہ تمہاری نیت مقبول ہوئی اور خدا تعالیٰ نے میری دعا سن لی۔ اب تمہیں صرف تین مہینے کی مہلت ہے۔ اس مدت میں سفر آخرت کے لئے مستعد تیار ہو جاؤ چنانچہ شیخ احمد کے والد بزرگوار اسی مدت میں عالم فانی سے انتقال کر گئے اور شیخ احمد نے زندگی کے نوے مرحلے طے کر کے سفر آخرت قبول کیا۔

شیخ عبدالرحمٰن ولد شیخ احمد نخلی نقل کرتے ہیں کہ معاملہ بیع و شرا اور داد و ستد میں میں اپنے والد بزرگوار کا وکیل تھا اور تمام دنیاوی معاملات ان کی طرف سے میں ہی کیا کرتا تھا۔ لیکن جب شیخ کی عمر طبعی کا خاتمہ ہونے کو ہوا اور انتہا درجہ کا ضعف غالب آیا تو مجھے اندیشہ ہوا کہ مبادا شیخ کی حیات کا پیمانہ دفعتۂ لبریز ہو کر چھلک پڑے اور آپ کے تمام قرضوں کا بار میری گردن پر رہے اس لئے میں ایک دن شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور قرض خواہوں کے مطالبہ کی شکایت پیش کی اور عرض کیا مجھے خوف ہے کہ اچانک کوئی حادثہ پیدا ہو اور تمام دیون میرے ذمہ باقی رہ جائیں اور میرے عزیز و قریب اس وکالت کا اعتبار نہ کریں۔ شیخ نے ایک نہایت خوش آئندہ تبسم کے ساتھ فرمایا کہ برخوردار من! تم اس خدشہ کو اپنے دل میں راہ نہ دو۔ مجھے کامل امید ہے کہ تاوقتیکہ میں اپنے تمام قرضوں سے سبکدوشی حاصل نہ کر لوں اور میرے سارے دیون ادا نہ ہو جائیں دنیا سے رخصت نہ ہوں۔ میرا خیال ہے کہ جس رات کو کوئی قرضہ میرے ذمہ باقی نہیں رہے گا وہی رات میری زندگی کی اخیر شب ہو گی اور اسی رات میں میرا جام حیات لبریز ہو کر چھلک جائے گا۔ شیخ عبدالرحمٰن کا بیان ہے کہ اس کے بعد جب آپ کی وفات کا زمانہ قریب آیا تو تمام قرضوں کی ادائیگی دفعتۂ کر دی گئی اور جس رات آپ کے ذمہ کسی کا قرض باقی نہیں رہا وہ ہی آپ کی عمر کی آخری شب تھی۔

شیخ احمد نخلی فرماتے ہیں کہ طریقہ خلوتیہ میں میرے شیخ، جناب شیخ عیسیٰ بن کنان خلوتی تھے۔ جب انہوں نے مجھے طریقہ خلوتیہ کی اجازت دی تو مجھے مکہ معظمہ میں علی رؤس الاشہاد اپنا خلیفہ مقرر کیا اور اس طریقہ کے تمام پیرووں سے میرے لئے خلافت کا معزز لقب حاصل کیا تا کہ تمام خلوتی میرے پاس جمع رہیں اور نماز تہجد کے بعد ان اوراد و وظائف میں مشغول رہیں جو اس فرقہ میں رائج ہیں۔ شیخ عیسیٰ کی ان بے اندازہ مہربانیوں اور گرانبہا عنایتوں سے مجھے بے حد خوش ہونا چاہیے تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد میں ہمیشہ متردد رہا اور مجھ پر ایک بیماری غم کا لشکر ٹوٹ پڑا کیونکہ ابتداء سے

میرا امیلان طبع طریقہ نقشبندیہ کی طرف تھا اور اسی طریقہ کو میں دوست رکھتا تھا۔ مجھے اس وقت سب سے بڑی اور سخت مشکل کا سامنا یہ تھا کہ شیخ کی مخالفت نہ کر سکتا تھا اور ان کے خلاف ارشاد کسی کام کرنے کی مجال نہ تھی۔ آخر کار میں نے مجبور ہو کر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب توجہ کی اور اسی سال روضہ مقدس کی زیارت سے مشرف ہوا۔ جمعہ کے روز نماز جمعہ سے پیشتر میں نے جناب نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ گویا آپ خلفا اربعہ کی مختصری جماعت کو ساتھ لئے ہوئے زیارت عثمانیہ میں تشریف لائے ہیں۔ میں یہ دیکھ کر اس طرف دوڑا اور آپ کے نظیر خلفاء کرام کے دست مبارک کو بوسہ دیا اور بالترتیب ہر خلیفہ کی ملاقات سے مشرف ہوا۔ جناب رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا اور ایک جدید سجادہ کی طرف جو آپ کے قبر شریف کے سرہانے اور صف اول کے محاذاۃ میں بچھا ہوا تھا، لائے اور فرمایا هذه سجاد الشيخ تاج اجلس عليها یعنی یہ شیخ تاج کا سجادہ ہے تمہیں اس پر بیٹھنا چاہیے۔ جب میں خواب سے بیدار ہوا تو معلوم کیا کہ اس سے اشارہ طریقہ نقشبندیہ کی طرف ہے گویا آپ اسی طریقہ کی اجازت دیتے ہیں۔

شیخ عبداللہ بن سالم البصری ثمّ المکی

اس فاضل اجل عالم بے بدل نے کتب حدیث کی اشاعت و توسیع میں جس مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ کوشش کی اس کے بار احسان سے علماء دنیا کو سر اٹھانے کی جگہ نہیں ہے۔ سچ یہ ہے کہ علم حدیث کے مردہ قالب میں شیخ عبداللہ ہی نے ایک نئی اور تازہ روح پھونکی ہے۔ مسند امام احمد کا کامل نسخہ دائرہ گمنامی میں روپوش ہو گیا تھا اور قریب تھا کہ سطح زمین پر کوئی کامل نسخہ دستیاب نہ ہو سکے مگر شیخ نے اپنی عالی ہمتی اور فراخ حوصلگی سے مصر و عراق اور شام وغیرہ کے علمی خزانوں سے اس کے متفرق اور پراگندہ اجزاء جمع کیے اور سب کو ملا کر ایک نسخہ مرتب کیا۔ زاں بعد اول سے آخر تک ایک غائر نظر ڈالی اور صحیح کر کے اسے اصل قرار دیا۔ اسی طرح کتب صحاح ستہ کے مختلف اور متعدد نسخے جمع کر کے ایک مجموعہ مرتب کیا اور بڑی محنت و جانفشانی سے صحیح کر کے طالبانِ فن میں شائع کیا۔ نسخہ نبویہ اپنی قلم سے لکھا اور اصل سے بہتر لکھا۔ صحیح بخاری کی ایک نہایت مبسوط اور جامع شرح تصنیف کی اور اس کا نام ''ضیاء الساری'' رکھا اور اس وقت تمام ممالک اسلامیہ میں موجود ہے۔ ایک عرصہ ہوا کہ یہ شرح مطبوع بھی ہو چکی ہے اور اکثر طلبہ کے پاس دیکھی جاتی ہے۔ ''ضیاء الساری'' کے دیکھنے سے شیخ عبداللہ کی لیاقت اور پولیٹیکل قابلیت بہت کچھ ثابت ہوتی ہے۔

میں نے خود اس شرح کو دیکھا ہے اور اکثر مقامات پڑھے ہیں۔ حقیقت میں جو باریکیاں اور نکات اس خاص فن میں آپ نے بیان کیے ہیں ان کی نظیر سے بخاری کی دوسری شروح بالکل خالی ہیں۔ علم حدیث کے غوامض و دقائق کے علاوہ مسائل فقہیہ کی ایسی تنقیح و توضیح کی ہے جس کی نظیر کہیں نہیں مل سکتی۔ جو لوگ کتاب و سنت سے خاص دلچسپی رکھتے اور جن کی معلومات علوم حدیث میں بہت وسیع ہے وہ ''ضیاء الساری'' کو دیکھ کر فوراً یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ حقیقت میں شیخ عبداللہ فن حدیث کا ایسا علامہ ہے جس کی مثال اس عہد میں اور کوئی نہیں پائی جاتی۔ ایک اندازہ کرنے والا دماغ اور جانچنے والی عقل شیخ کی اس تصنیف کو دیکھ کر بلا تامل کہہ سکتی ہے کہ بے شک آپ علم حدیث کے جولانگاہ کے شہسوار ہیں اور اس فن

میں وہ وسعت نظر اور علمی تبحر رکھتے ہیں جو ایک مجتہد اور ماہر فن کے لئے ضروری ہے۔

لیکن نہایت افسوس سے کہا جاتا ہے کہ شیخ اس شرح کو ضعف پیری کی وجہ سے پورا نہ کر سکے اور آپ کی زندگی میں اس کی تکمیل نہیں ہوئی۔ اگر یہ شرح شیخ کی قلم سے پوری اور کامل ہو جاتی تو ایک بے نظیر اور لاثانی شرح ہوتی اور اس کے مقابلہ میں بخاری کی کسی دوسری شرح کی ضرورت نہیں پڑتی۔ خلاصہ یہ کہ آپ نے اپنی تمام عمر روایت کتب حدیث میں صرف کی اور اسی بحث و تنقیح میں ہمیشہ مشغول و مصروف رہے اور واقعی بات یہ ہے کہ اس متاخر زمانہ میں ایک آپ ہی حافظ حدیث اور ضابط (6) روایت تھے۔

آپ بچپن کے زمانہ سے تحصیل علوم کی طرف راغب اور علما و فضلا کی صحبت کو مغتنم سمجھتے تھے۔ اعتقاد و پرہیز گاری اور ورع و صلاح کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے تھے۔ ہر روز قرآن مجید کے دس سیپارے پڑھنا آپ کا دستور تھا اور وہ بھی سرسری طور سے نہیں بلکہ امعان و تدبر سے لیکن جب بڑھاپے کا ضعف آپ کا غالب ہوا تو طاقت کے مطابق تلاوت میں مصروف رہنے لگے۔ غرض کہ کوئی وقت ایسا نہ تھا جس میں آپ درس یا تلاوت یا نماز و عبادت میں مصروف نہ ہوتے ہوں۔

شیخ عبداللہ کے واجب التعظیم والد شیخ سالم اگرچہ شریف کے دربار میں ایک معزز و ممتاز عہدہ پر مامور تھے اور بے شمار دولت و حشمت رکھتے تھے اور اپنے فرزند رشید کی بہت کچھ خدمت کرتے تھے لیکن شیخ عبداللہ ہمیشہ فقیرانہ حالت میں زندگی بسر کیا کرتے اور اسی حالت میں رہنا پسند کرتے تھے۔ آپ نے کعبہ معظمہ کے جوف میں دو مرتبہ صحیح بخاری ختم کی اور ایک دفعہ اس وقت جب لوگ کعبہ کی تعمیر میں مصروف تھے۔ دوسری مرتبہ اس زمانہ میں جب کعبہ کے دروازہ کی تعمیر ہو رہی تھی۔ مسند امام احمد بن حنبل کی تصحیح و جمع کے بعد مسجد نبوی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے سرہانے بیٹھ کر درس دیا اور چھٹے روز ختم کر دی۔ جب آپ حدیث کی قرأت کرتے تو تمام علماء حرمین اور مشائخ صوفیہ مجلس میں موجود ہوتے اور جب تک پڑھتے سب گردنیں جھکائے خاموشی کے ساتھ سنتے۔ حدیث پڑھتے وقت لوگوں کو معلوم ہوتا کہ گویا آپ پر وحی اتر رہی ہے۔

شیخ نے طول طویل عمر پائی اور سب مرضیات الٰہی میں صرف کی۔ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ جب انسان زیادہ ضعیف اور بوڑھا ہو جاتا ہے تو اس کے اعضا و حواس ایک ایک کر کے جواب دیتے جاتے اور دن بدن قویٰ مضمحل ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن بڑی خوشی کی بات ہے کہ جب شیخ عبداللہ صاحب باوجود اس ضعف و بڑھاپے کے بالکل ویسے ہی توانا د تندرست تھے جیسے عالم شباب میں۔ آپ کے عقل و فراست، جودت و ذہن، حفظ و ضبط، صحت و حواس میں سر مو تفاوت نہ آیا تھا البتہ قوت سامعہ میں کچھ فتور پیدا ہو گیا تھا۔ آخر عمر میں شیخ عبداللہ مغربی نے آپ سے صحاح کی چھوؤں کتابیں نہایت تعمق و تدبر کے ساتھ پڑھیں اور اکثر اہل مکہ نے سماع حدیث کی۔ آپ نے رجب کی چوتھی تاریخ 1134ھ میں انتقال کیا اور دنیا میں ایک جیتا جاگتا اثر چھوڑا۔

یہ مشائخ صوفیہ اور علماء محدثین وہ ہیں جن میں کے بعض حضرات سے جناب مولانا شاہ ولی اللہ صاحب نے حرمین محترمین میں بالمشافہ حدیثیں روایت کیں اور سند و اجازت حاصل کی۔ خرقہ صوفیہ زیب بدن فرمایا اور بعض وہ ہیں جن

کے واسطہ سے آپ تک اسناد حدیث اور خرقہ صوفیہ کا سلسلہ پہنچا۔ اس مابین سفر میں شاہ صاحب کا کوئی اور ایسا واقعہ قابل ذکر نہیں ہے جو ناظرین کے سامنے پیش کیا جائے۔ لہٰذا اب میں جناب شاہ صاحب کے اس مقدس و مبارک سفر کے حالات ختم کرتا ہوں کیونکہ تاریخ کے صفحات پر آگے اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ جو چند واقعات قلمبند ہو چکے ہیں، معزز ناظرین ان ہی کو غنیمت جانیں۔ اب آپ کے واپسی سفر کے حالات نہایت مختصر الفاظ میں تحریر کیے جاتے ہیں۔

شاہ صاحب کے واپسی سفر کے واقعات

جب جناب مولانا شاہ ولی اللہ صاحب علماء حرمین محترمین سے اسناد حدیث حاصل کر چکے اور مشائخ صوفیہ سے فیض صحبت اٹھا چکے تو اخیر 1144ھ میں دوبارہ ارکان حج ادا کیے اور ابتدا 1145ھ میں وطن مالوف کی طرف متوجہ ہوئے۔ چنانچہ اسی سنہ کی چودھویں رجب جمعہ کے دن صحت و سلامتی کے ساتھ دہلی میں رونق افروز ہوئے اور اپنے خاص مکان میں سکونت اختیار کی۔ شہر کے عموماً باشندے اور نامی گرامی فضلا خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور آپ نے نہایت خندہ پیشانی اور مراسم تپاک سے سب سے ملاقاتیں کیں۔ عام ملاقاتوں اور سفر کی کسل و کاہلی کے اتر جانے کے بعد آپ نے مدرسہ رحیمیہ میں قدم رکھا اور علم حدیث کے درس میں مشغول ہوئے۔ سینکڑوں طالبان حدیث ایک ایک وقت میں علم حدیث پڑھتے اور اجازت و سند حاصل کر کے واپس جاتے۔

غرضکہ شاہ صاحب اس شان و شوکت سے ایک زمانہ تک علم حدیث کی درس و تدریس کرتے رہے اور اس استغراق و محویت کے ساتھ کہ ہر دن کے بہت تھوڑے حصہ میں وعظ و افتا اور فصل خصومات میں مصروف رہتے اور باقی اوقات درس طلبہ اور تکمیل تلامذہ میں صرف کرتے۔ ملنے جلنے والوں اور باہر سے آمد و رفت کرنے والوں کو رات دن میں کوئی ایسا موقع بہت ہی مشکل سے ملتا جس میں آپ ان باتوں سے خالی نظر آتے۔ اب آپ کے علمی تبحر کا ستارہ اور بھی چمک گیا تھا اور حدیث کے اصل جاہ و جلال کا گھر یہی ایک جلیل القدر خاندان تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس وقت جناب شیخ عبدالرحیم صاحب کی ڈالی ہوئی بنیادیں آسمان تک پہنچ گئی تھیں اور شاہ صاحب کی کوششوں سے یہ بیت العلم عجیب شان و شوکت اور سج دھج سے آراستہ ہو گیا تھا۔ صاحب ''اتحاف'' جناب شاہ ولی اللہ صاحب کے علم و فضل اور اشاعت حدیث کی نہایت باوقعت اور وزنی لفظوں میں تعریف کرتے ہیں اور حقیقت میں وہ ایک اعلیٰ درجہ کا ریویو ہے جسے وہ اس تقریر سے ادا کرتے ہیں کہ ''جناب شاہ صاحب کا علوم متداولہ میں وہ پایہ تھا جس کا شمہ بھی بیان کرنے سے انسانی طاقت محض عاجز ہے۔ آپ فنون عقلیہ میں وہ دستگاہ رکھتے تھے جس کا عشر عشیر بھی دوسروں کو نصیب نہ تھا۔ قطع نظر ان تمام علوم کے حدیث میں اپنے تمام ہمعصروں سے امتیازیہ قوت رکھتے تھے اور اس علم میں مقتدائے وقت اور فرید عصر شمار کیے جاتے تھے۔ آپ کی تقریر میں اس بلا کا جادو تھا کہ موافق و مخالف پر اس کا اثر برابر پڑتا تھا۔ ابتدائی زمانہ سے اگرچہ آپ کے فضل و کمال کے جھنڈے ایک عالم میں گڑ چکے تھے اور آپ کے نام کا امتیازی پھریرا ہندوستان سے لے کر عرب و عجم تک برابر اڑ رہا تھا۔ لیکن جب آپ عرب کے مقدس و مبارک سفر سے واپس تشریف لائے اور علم حدیث کی اور بھی اشاعت دی تو اب آپ

اپنی خاص مقبولیت کے سبب سے واقعی ہر دلعزیز ہو گئے اور اعزاز و اقتدار کا آفتاب پوری تابانی کے ساتھ چمکنے لگا۔ حقیقت میں جناب شاہ ولی اللہ صاحب کی درسگاہ اس وقت علوم حدیث و تفسیر کا مخزن اور حنفی فقہ کا سرچشمہ تھی۔ اس مقدس اور شریف علم کی خدمت جس قدر آپ سے وجود پذیر ہوئی واقعی بات یہ ہے کہ ہندوستان میں کوئی شخص اس کا دعوے دار نہیں بن سکتا۔ عمل بالحدیث کا بیج ہندوستان کی بنجر اور ناقابل زمین میں آپ کے والد بزرگوار جناب شیخ عبدالرحیم صاحب نے ڈالا اور آپ نے اپنی ان تھک کوششوں سے اسے یہاں تک سینچا کہ چند ہی روز میں اس کا پودا اگا اور سرسبز و شاداب ہو کر لہلہانے لگا اور اس کے پھل پھول سے لوگ گودیاں بھر بھر کر لے جانے لگے۔ اسے ہندوستان کی بڑی خوش نصیبی کہنا چاہیے کہ جہاں علم حدیث کا نام و نشان تک زبان پر نہ لایا جاتا تھا آج اس کے گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں علم حدیث کے آوازے نے جاتے ہیں۔"

شاہ صاحب کے عام اخلاق و عادات

جناب مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کے ابتدائی حالات اور زمانہ کم سنی کے واقعات ہم پہلے کسی قدر بسط کے ساتھ بیان کر آئے ہیں یہاں انہیں دوبارہ بیان کر کے اپنے تذکرہ کو طول دینا نہیں چاہتے۔ مختصراً یہ ہے کہ آپ کا بچپن بالکل انوکھا اور نرالا تھا۔ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ نوعمری کے زمانہ میں بچے اپنی ناز بردار والدین سے طرح طرح کی طفلانہ ضدیں اور موقع و بے موقع بیان کیا کرتے ہیں مگر ناظرین کو تعجب ہو گا جب یہ بیان کیا جائے گا کہ شاہ صاحب نے کمسنی کے زمانہ میں کبھی کسی چیز کی ہٹ نہیں کی نہ کبھی کوئی ایسی بات ظاہر ہوئی جس سے اوپر والوں کو آپ کی شکایت کرنے یا گھڑکنے کا موقع ملا۔ آپ کے ادب کا یہ حال تھا کہ اپنے سے بڑی عمر والے شخص سے سر اٹھا کر کبھی بات نہیں کی اور اگر کسی نے کچھ پوچھا تو نہایت متانت و سنجیدگی کے ساتھ نیچی گردن کر کے جواب دیا۔ والد سے کبھی نظریں ملا کر بات نہیں کی۔ سامنے پاؤں پھیلا کر کبھی نہیں بیٹھے۔ بات کی تو خوشامدانہ تبسم کے ساتھ اور کسی چیز کی خواہش ظاہر کی تو عاجزانہ تہذیب کے ساتھ۔ آپ بچپن کے زمانہ میں وہ دانشمندانہ اور بھاری بھرکم پنے کی باتیں کرتے تھے کہ دیکھنے والوں کے دل ایک بے اختیاری کے ساتھ آپ کی طرف مائل ہو جاتے تھے۔

شاہ صاحب کا بچپن

شاہ صاحب کا بچپن معمولی کھلنڈرے بچوں کی طرح نہیں تھا۔ آپ اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ کبھی گھر سے باہر نہیں کھیلے نہ سیر و تفریح میں اپنا وقت ضائع کیا۔ ہمیشہ ایک دہشت آمیز تفکر آپ پر طاری رہتا اور اسی میں صبح سے شام تک مصروف رہتے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ آپ کے عزیز و قریب کسی باغ میں سیر کے لئے گئے اور شاہ صاحب کو بھی ہمراہ لیتے گئے۔ جب آپ وہاں سے واپس آئے تو آپ کے والد بزرگوار نے اپنے پاس بلایا اور دست شفقت سر پر پھیر کر فرمایا فرزند من! تم نے آج رات دن میں کیا چیز حاصل کی۔ دیکھو ہم نے اتنی دیر میں اس قدر درود پڑھے۔ جوں ہی شاہ صاحب نے والد بزرگوار کی زبان مبارک سے یہ لفظ سنے شرمندگی کی وجہ سے پسینہ پسینہ ہو گئے اور سیر و تفرج سے توبہ نصوح کی اور

اس کے بعد پھر کبھی گھر سے باہر نہیں نکلے۔

آپ کے مزاج میں سادگی اس درجہ تھی کہ والدین سے کبھی کسی بات کی خواہش ظاہر نہیں کی جو کھانا ملا نہایت مسرت و خوشی سے کھالیا، جو کپڑا میسر ہوا پہن لیا۔ آپ کے لب کبھی اس جملہ سے آشنا ہی نہیں ہوئے کہ یہ کپڑا مجھے ناپسند ہے اور اس قسم کا کھانا مرغوب نہیں ہے۔ خلاصہ یہ کہ جب ہم شاہ صاحب کے ابتدائی زمانہ کے واقعات پر سرسری نظر ڈالتے اور آپ کی طفلانہ حرکات کا اجمالی خاکہ کھینچتے ہیں تو ہمیں ایک نہایت ہی دلگیر اور جاہ و جلال سے بھرا ہوا سین نظر آتا ہے۔ واقعی بات یہ ہے کہ فطرت جس شخص کو اپنی بانگی اور ہنر کا نمونہ بنانا چاہتی ہے اس کا خمیر پہلے ہی سے کچھ ایسا قابل بنتا ہے جس پر تجلیات ربانی کا بخوبی عکس پڑتا ہے۔ شاہ صاحب اس وقت تک گو کسی شرعی قانون کی پابندی پر مجبور نہ تھے نہ کسی دینی بات کا ہنوز کوئی سبق پڑھا تھا لیکن پھر بھی اس ہونہار بلند اقبال خوش قسمت کی ایک بات قانون شرع کے مخالف نہ تھی۔ حال کے مؤرخوں نے شاہ صاحب کے بچپن کے جو واقعات قلمبند کیے ہیں اگرچہ وہ بظاہر مبالغہ معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں شاہ صاحب کا بچپن نہایت حیرت انگیز تھا۔ جس قدر لوگوں نے آپ کے اوصاف حمیدہ میں لکھا ہے اس میں کچھ بھی مبالغہ اور عبارت آرائی نہیں ہے بلکہ آپ کے نفس الامری اور اصلی واقعات ہیں۔

یہی وہ باتیں تھیں جنہوں نے جناب شیخ عبدالرحیم صاحب جیسے مستغنی المزاج کو اپنا گرویدہ و فریفتہ کر لیا تھا۔ رحیم الطبع شیخ اپنے اس ہونہار اور بلند اقبال فرزند سے نہایت ہی محبت رکھتے اور انتہا سے زیادہ مہربانیوں سے پیش آتے تھے چنانچہ خود جناب شاہ ولی اللہ صاحب اپنے قلم مبارک سے لکھتے ہیں کہ میرے والد بزرگوار اپنی تمام اولاد میں مجھ سے زیادہ محبت رکھتے تھے اور اکثر اوقات خلوت و جلوت میں اس فقیر کی طرف التفات خاص فرماتے تھے۔ جب مجھے دیکھتے بے حد خوش ہوتے اور تلطف آمیز لہجہ میں دلجوئی کرتے ابھی میں صغیر سن ہی تھا کہ آپ مجھے اپنے پاس بٹھا کر فرمایا کرتے تھے کہ فرزند من! میرے دل میں بے اختیار یہ بات پیدا ہوئی ہے کہ ایک ہی دفعہ تمام علوم و فنون تمہارے دل میں ڈال دوں اور اسی کے ساتھ ایک ایسا جوش پیدا ہوتا ہے جسے میں بہت مشکل سے بٹھا سکتا ہوں اس کے بعد جناب شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ بمقابلہ اور بھائیوں کے جو خدا تعالیٰ نے اس فقیر کو علمی کمالات کا زیادہ سرمایہ عطا کیا وہ حقیقت میں جناب والد بزرگوار کے سایہ عاطفت اور آغوش تربیت میں پلنے کا صدقہ اور آپ کے نفس مبارک کا اثر ہے ورنہ اس فقیر نے تحصیل علوم میں چنداں محنت و جانکاہی نہیں کی۔

عالم شباب

شاہ صاحب کے بچپن کا زمانہ جیسا پیارا اور دلفریب تھا ویسا ہی جوانی کا عالم نہایت ہی مبارک اور خوش آئندہ تھا۔ اکثر آدمی عالم شباب کی ترنگ میں کج خلق اور مغلوب الغضب ہو جاتے ہیں لیکن یہ نیک نہاد کریم الطبع نوجوان اس وقت بھی خلق مجسم تھا جس کے عام اخلاق اور ذاتی خوبیوں نے ایک عالم کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا اور جس کی شریفانہ چال اور مہذبانہ طرز و روش نے تمام لوگوں کے دلوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس وقت شاہ صاحب کی فراخ اور نصیبہ ور پیشانی میں خلق عظیم کا قیمتی جوہر اس طرح دہک رہا تھا جیسے فانوس میں شمع یا قمقمہ میں چراغ۔ آپ کی خوش خلقی تکلف اور بناوٹ کے رنگ سے

رنگین نہ تھی جو لوگوں کے دل پر چانے یا امراء رؤسا کے خوش کرنے کے لئے استعمال میں لائی جاتی بلکہ فطری اور قدرتی تھی۔ یہی وجہ تھی یہ حالت اور ہر موقع پر ایک ہی رنگ میں نظر آتی تھی۔

شیخوخت

آپ کی کہولت کا زمانہ عجیب وغریب زمانہ تھا جو بچپن اور جوانی کے دونوں زمانوں سے زیادہ مبارک اور خوش آئندہ تھا جو قوت جودت اور علامت روی اس وقت تھی وہی اب بھی ہے بلکہ تجربہ کی شان وشوکت اور پختہ کاری کی سرپرستی نے اس وقت اسے اور بھی چمکا دیا ہے جو عجز وانکساری اور متواضعانہ اخلاق عالم شباب میں تھی۔ وہی اس بڑھاپے کی حالت میں موجود ہیں جیسی درس وتدریس کی گرم بازاری پہلے تھی وہی اب بھی باقی ہے۔ زہد واتقا خدا پرستی وطاعت گزاری میں جو اس وقت مستعدی وسرگرمی تھی وہی اس کمزوری اور ضعف کے وقت بھی ہے۔ غرضکہ شاہ صاحب کے تینوں زمانہ کے حالات زندگی دنیا سے بالکل اعجوبہ اور جہان سے نرالے تھے اور آپ کا یہ زمانہ ہر طرح سے قابل مبارکباد تھا۔

فضل وکمال

فضل وکمال اور علمی حیثیت سے جناب شاہ صاحب جس قدر ومنزلت کے شخص تھے اگرچہ اس کی نظیر آج باوجود تلاش وتجسس کے کہیں نہیں ملتی لیکن حدیث وفقہ کے لحاظ سے علماء وقت نے آپ کو مجتہدین فن کے دوسرے درجہ میں جگہ دی ہے چنانچہ ایک فاضل مؤرخ آپ کی فضل وکمال کی نسبت اپنی رائے یوں ظاہر کرتا ہے کہ ''جناب مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کی شہرت اگرچہ زیادہ تر تفسیر وادب میں ہے لیکن آپ حدیث وفقہ میں بھی درجہ اجتہاد رکھتے اور مجتہدین فن میں شمار کیے جاتے تھے۔'' حقیقت میں شاہ صاحب کی تاریخی زندگی میں جو چیز سب سے زیادہ قابل فخر اور باعث بقائے دوام ہے وہ آپ کے علمی کارنامے ہیں جو خصوصیت کے ساتھ حال کی تاریخوں میں جستہ جستہ مذکور ہیں۔ اگر ہم آپ کی زندگی کے تمام علمی کارناموں اور واقعات پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ اس کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ اگر فیصدی دو کا بھی انتخاب کیا جائے تو بھی ''حیات ولی'' کی وسعت ان کے لئے کافی نہیں ہوسکتی لہٰذا ہم ان واقعات کو قلم انداز کرتے اور صرف وہ حالات معزز ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہیں جو آپ کی لائف کے مغز اور مختلف آرا کا مختصر انتخاب یا سچا فوٹو ہے۔

علماء مؤرخین نے جناب شاہ صاحب کو علم حدیث وفقہ کے اعتبار سے مجتہدین فن کے بعد دوسرے درجہ میں جگہ دی ہے۔ ورنہ وہ کون سا علم تھا جس میں شاہ صاحب کو تبحر نہ تھا۔ کلام وادب جو عربیت کا بہت بڑا جوہر ہے اس میں آپ کو وہ کمال حاصل تھا جو آج تک ماہرین فن کو تسلیم ہے۔ آپ کے علمی مناظروں کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ متقدمین شعرا کے اشعار بکثرت یاد تھے جو سند کے ہر ہر موقع پر برجستہ پیش کرتے تھے۔ مذہبی اور متداولہ علوم کے انتساب کو اگر الگ کر دیا جائے تو بھی ادیبوں اور متکلمین کی فہرست میں آپ کا نام نہایت روشن اور جلی حرفوں میں نظر آتا ہے۔ غرضکہ شاہ صاحب کی ہمہ دانی نہایت حیرت انگیز ہے۔ حدیث، تفسیر، فقہ، ادب، کلام، سیر، مغازی، معانی وغیرہ میں آپ کا شمار مجتہدین فن میں ہوتا تھا اور اس کے سوا اور بھی بہت سے علوم تھے، جن میں آپ کی نظر نہایت وسیع اور غائر تھی۔ علم

لغت میں آپ سے زیادہ کوئی عالم نہ تھا اور اس فن خاص میں جو درجہ متقدمین میں صاحب ''قاموس'' کو تھا وہی رتبہ متاخرین میں شاہ صاحب کو تھا۔

حدیث وتفسیر اور دیگر مذہبی علوم کی ترقی دینے میں اگرچہ بعض مورخوں نے جناب شاہ صاحب کا نمبر حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے نیچے رکھا ہے لیکن ہم سابق میں لکھ آئے ہیں کہ شاہ صاحب اس قابل ہیں کہ اس فہرست میں آپ کا نام شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے پہلے لکھا جائے کیونکہ جس زمانہ میں علم حدیث وتفسیر کا بیج ہندوستان یں ڈالا گیا اور اصول تفسیر وحدیث کی بنیاد قائم کی گئی اس وقت بجز خال خال لوگوں کے اور سب لوگ ان علوم سے ناآشنا تھے۔ لیکن جناب شاہ ولی اللہ صاحب کی ان تھک کوششوں اور سرگرمیوں سے ان علوم کی اس قدر اشاعت ہوئی کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ڈالی ہوئی بنیادیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں اور پھر یہ شوق ملک میں عام ہوگیا۔ تفسیر وحدیث کا چرچا گھر گھر پھیل گیا اور ہر طبقے کے لوگوں کی زبانوں پر قال اللہ وقال الرسول جاری ہوگیا۔

ایک قابل تاریخ نویس کا ریمارک

چنانچہ ایک تذکرہ نویس فاضل، جناب شاہ ولی اللہ صاحب کے فضل وکمال اور علمی تبحر پر ریمارک کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''ہندوستان میں اس وقت تک فقہ تصوف اور معقولات کا بہت رواج تھا اور قرآن وحدیث کا چرچا کم۔ گیارہویں صدی ہجری میں صرف شیخ عبدالحق محدث دہلوی ایک ایسے بزرگوار شخص تھے جنہوں نے حدیث کی اشاعت درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے ذریعہ سے کی اور ان کی کتابیں بھی ایسی مقبول ہوئیں کہ اب تک نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں مگر ان کے بعد اس سلسلہ میں کچھ ترقی نہیں ہوئی۔ عام وخاص، پیر پرستی اور مادۂ تقلید میں مقید اور صدہا قسم کے توہمات میں گرفتار تھے کہ اس اثنا میں خداتعالیٰ نے شرک اور بدعت کی تردید اور سنت نبوی کی ترویج کے واسطے شاہ ولی اللہ کو اٹھا کھڑا کیا۔ انہوں نے قرآن وحدیث کی اشاعت میں خوب کوشش کی۔ قرآن مجید کے مطالب کا سمجھنا اب تک تفاسیر پر منحصر تھا اور علما اس کو اپنا حصہ سمجھے بیٹھے تھے۔ آپ نے قرآن کا ترجمہ فارسی میں کیا اور لفظوں کی رعایت سے ایسا مطلب خیز ترجمہ کیا کہ عام لوگوں کو کلام الٰہی کا سمجھنا آسان ہوگیا۔ باوجودیکہ اس ترجمہ کی عمر ڈیڑھ سو برس سے زائد ہوگئی ہے اور اشاعت علوم وفنون خصوصاً ترجمہ کا دریا ترقی کی لہریں مار رہا ہے مگر اس ترجمہ پر کسی کو دم مارنے کی طاقت نہیں ہوئی۔ یہ ترجمہ قرآن مجید کے بین السطور میں تحریر ہوکر مرات وکرات ہندوستان کے متعدد مطابع میں چھپ چکا ہے اور ہندوستان سے لے کر کوہ ہمالیہ تک مقبول خلائق ہے۔ علوم خمسہ قرآنیہ اور تاویل قطعات اور رموز قصص انبیا میں فوز الکبیر شرقاً غرباً فتح الخبیر اور تاویل الاحادیث ایسے عمدہ اور مختصر رسالے ہیں جنہوں نے بڑی بڑی تفاسیر کے مطالعہ سے شائقین کو مستغنی کردیا اور مسائل فقہیہ مذاہب اربعہ یعنی حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کی تحقیقات مذاب صحابہ وتابعین اور اقوال جماعہ فقہاء محدثین سے کر کے فقہ وحدیث کی بنیاد از سرِ نو قائم کی اور اسرارِ حدیث ومصالح احکام کو ایسی عمدگی اور خوش اسلوبی سے بیان کیا کہ ان سے پیشتر کے مصنفین کو یہ بات کمتر نصیب ہوئی ہے۔ کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' ان کے اس کمال پر شاہد بین ہے۔ رسالہ ''انصاف فی بیان سبب الاختلاف'' اور ''عقید الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید'' میں اس امر کو نہایت وضاحت سے بیان کیا

ہے کہ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ تامہ کی موجودگی میں اقوال فقہا متقشفین اور استبداد مقلدین کی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔

اسی طرح عقائد تصوف اور سلوک میں محققانہ تقریریں کی ہیں اور خیالات عالیہ کو طلبہ کی سہولت اور مسائل تبیین میں عبارات مختصرہ اور اشارات لطیفہ کے ذریعہ سے اس طرح ادا کیا ہے کہ ان کے زمانہ میں دوسرے مصنف کو کم میسر ہوا۔

ہندوستان میں شرک و بدعت کی تردید اور سنت نبوی کی ترویج میں ان کے پوتے مولوی محمد اسمٰعیل صاحب شہید کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جاتا ہے اور بلاشبہ وہ اس تعریف کے مستحق ہیں۔ لیکن جن لوگوں نے دونوں بزرگوں کی تصانیف کو دیکھا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ ان کے تمام اصول اپنے دادا مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کی تحریرات سے ماخوذ ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے مناسب حال نرم گفتگو کرتے تھے اور سہل گیری سے کام لیتے تھے اور یہ مثل شمشیر برہنہ کے میدان میں نکل کر اپنی چمک دکھاتے تھے۔

علمی اشاعت

الغرض قرآن و حدیث کے علاوہ قریب قریب یہی حال ہر علم و فن کا تھا اور چونکہ جناب شاہ صاحب خود مجتہد فن اور اہل کمال تھے اس وجہ سے علما اور طالبین فن کی حد سے زیادہ قدر کرتے تھے اور اپنی عام فیاضی سے ان کے حوصلے بڑھاتے تھے جس کا بدیہی اثر یہ تھا کہ علمی اشاعت کا ذوق و شوق سرگرم طبیعتوں میں انتہا سے زیادہ بڑھ گیا تھا اور طلبہ مذہبی علوم کی اشاعت میں نہایت استغراق اور محویت کے ساتھ مصروف تھے۔ اس عہد میں ممالک اسلامیہ میں جس قدر علمی فضل و کمال کا رواج تھا وہ صرف شاہ صاحب ہی کی سرپرستی کا نتیجہ تھا۔ اس لحاظ سے اگر ہندوستان اور دیگر بلاد اسلامیہ آپ کے عہد زندگی پر فخر کریں تو نازیبا نہیں ہے۔

علمی فیاضی

جناب شاہ صاحب کی علمی فیاضی بھی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ سینکڑوں طلبہ جو تحصیل علوم کی غرض سے آپ کی درسگاہ میں داخل ہوتے ان کی خورد و نوش اور ضروری حاجات کا انتظام اپنی ذات خاص سے کرتے۔ مدرسہ رحیمیہ جس کی بنیاد جناب شیخ عبدالرحیم صاحب نے ڈالی تھی گو گورنمنٹ قلعہ کی طرف سے اس کی مطلق سرپرستی نہیں کی گئی تھی۔ نہ شاہ صاحب ہی کا کوئی وظیفہ اور امدادی رقم سلاطین وقت سے مقرر تھی لیکن بقول ایک فلسفی شاعر کے۔

"خدا خود میر سامانست ارباب توکل را"

آپ کے پاس وہ غیبی سامان مہیا تھا جس کی وجہ سے کسی امداد اور وظیفہ کی ضرورت نہ تھی۔ آپ کی فیاضی کی شہرت عالمگیر تھی۔ ہندوستان اور عرب و عجم کے اکثر لوگ آپ کے نام سے واقف تھے۔ اکثر طلبہ ریگستان کی کڑی منزلیں اور پہاڑوں کی سنگلاخ اور دشوار گزار گھاٹیاں طے کر کے آتے اور علمی دولت سے گودیاں بھر بھر کر لوٹ جاتے۔ جو مسافر اور مہمان ملاقات کی غرض سے آتے شاہ صاحب اپنی عالی ہمتی اور فراخ حوصلگی سے ان کی مہمان نوازی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے۔ بالخصوص بزرگان دین کے ساتھ قطع نظر ہمدردی اور خدمت کے نہایت ارادت مندی اور جوش محبت سے پیش آتے۔

طباعی

طباعی اور ذہانت میں جناب شاہ ولی اللہ صاحب ضرب المثل تھے جس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ آپ طالب العلمی کی حالت میں متعدد علوم کی تحصیل کرتے تھے چنانچہ ایک فاضل مؤرخ لکھتا ہے کہ ''جناب شاہ ولی اللہ صاحب تفسیر، حدیث، فقہ، مغازی کے حافظ تھے اور ادب و کلام ان کا ادنیٰ سا علم تھا۔ فقہ، حدیث، تفسیر، معانی، بیان، اصول، عقائد، تصوف، منطق، کلام، فلسفہ کی درسی کتابیں اور طب، ہیئت، حساب کے چند مختصر رسالے اپنے والد بزرگوار جناب شیخ عبدالرحیم صاحب سے پڑھتے۔ خدا تعالیٰ نے ذہن و حافظہ ایسا قوی دیا تھا کہ ایک ہی زمانہ میں ان علوم کی تحصیل کرتے تھے۔ آپ کے تحصیل علوم کی سند جناب شیخ عبدالرحیم صاحب کے ذریعہ سے زاہد بن اسلم ہروی کے طریق پر محقق دوانی تک پہنچتی ہے۔ کتب حدیث آپ نے دو مرتبے پڑھیں۔ پہلی دفعہ ہندوستان میں مولانا محمد افضل معروف بحاجی سیالکوٹی سے اور پھر 1143ھ میں مدینہ طیبہ میں پہنچ کر ابو طاہر مدنی سے جو اپنے وقت کے ایک بڑے مشہور محدث تھے۔ تجدید اجازت کی آپ کے طبع سلیم اور ذہن رسا پر شیخ ابو طاہر مدنی فخر کیا کرتے تھے اور اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''ولی اللہ لفظ کی سند مجھ سے لیتا ہے اور میں معنی کی سند اس سے حاصل کرتا ہوں۔''

فہم و فراست

معاملہ فہمی اور ادق مسائل کے حل کرنے میں جناب شاہ ولی اللہ صاحب کا ذہن رسا بڑے بڑے ماہرین فن اور ائمہ وقت کے ہم پایہ تھا۔ اہم مطالب اور دقیق و پیچیدہ مسائل کو گنے ہوئے منٹوں میں حل کر دینا آپ کے نزدیک کوئی بات ہی نہ تھی۔ جو اہم اور پیچیدہ معاملہ کسی دانشمند اور فقیہ سے طے نہ ہوسکتا تھا آپ فوراً اسے پانی کر دیتے تھے۔

شاہ صاحب کی دانشمندی کا ایک حیرت انگیز واقعہ

شاہ صاحب کی فہم و فراست کی بہت سی روائتیں مشہور ہیں لیکن میں اس موقع پر صرف ایک روایت نقل کرتا ہوں جس سے آپ کی معاملہ فہمی اور تصفیہ مقدمات میں مجتہدانہ کمال بہت کچھ ثابت ہوتا ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کہیں سے ایک فتویٰ جناب شیخ عبدالرحیم صاحب کی خدمت میں آیا جسے ہندوستان اور دیگر بلاد کے مشہور و نامور علماء نے واپس کر دیا تھا۔ کیونکہ زیادہ پیچیدگی کے سبب سے اس کا نفس مطلب بالکل کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ شیخ عبدالرحیم صاحب کے طلبہ کے حلقے میں ایک نہایت مستعد اور ذکی طالب علم تھا جو حدیث و فقہ اور دیگر تمام علوم کی کتابیں نکال چکا تھا اور جس کی ذہانت و طباعی تمام لوگوں میں مشہور تھی۔ خود شیخ عبدالرحیم صاحب اس کی طبع سلیم اور ذہن رسا کی تعریف کیا کرتے اور تمام منتہی طلبہ کے حلقے میں ممتاز و مستثنیٰ جانتے تھے۔ الغرض شیخ صاحب نے اس فتویٰ کو اس طالب العلم کے سپرد کیا اور فرمایا کہ یہ فتویٰ تمہارے سپرد کیا جاتا ہے احکام شریعت کے مطابق اس کا فیصلہ کرو اور ایسا فیصلہ لکھو کہ فریقین میں سے کسی کو شکایت کا موقع باقی نہ رہے اور باہمی رضامندی سے یہ معاملہ طے ہو جائے چنانچہ وہ طالب العلم فتویٰ لے گیا اور کامل ایک مہینے تک برابر

اس پر غور کرتا رہا۔ لیکن ہنوز کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ انجام کار بمجبوری شیخ صاحب کو اطلاع دی کہ یہ معاملہ ایسا اہم اور پیچیدہ ہے کہ مجھے امید نہیں پڑتی کہ آپ کے سوا کوئی فقیہہ اسے طے کر سکے۔ جناب شاہ ولی اللہ صاحب اس وقت کل سولہ سال کی عمر رکھتے تھے اور ابھی علوم وفنون کی تکمیل نہ ہوئی تھی۔ جس وقت اس طالب علم نے فتویٰ واپس دیا تو جناب شیخ عبدالرحیم صاحب نے اپنے فرزند رشید جناب شاہ ولی اللہ صاحب کے حوالہ کر کے فرمایا مجھے امید ہے کہ اس کا فیصلہ تمہارے ہاتھ سے ہو جائے گا جہاں تک عقل و دانش سے مدد لی جاسکتی ہے تمہیں اس مقدمہ میں لینا چاہیے۔ شاہ صاحب نے فوراً اس فتویٰ کو اٹھالیا اور گھر جا کر اس کا جواب لکھا اور ایسا جواب شافی لکھا جسے سن کر شیخ عبدالرحیم صاحب اور تمام طلبہ نہایت خوش ہوئے اور جسے تمام علماء نے تسلیم کیا اور کہا انصاف یہ ہے کہ اگر شاہ ولی اللہ چند روز اور علمی مشق میں صرف کریں گے تو تمام ائمہ وقت اور فقہائے زمانہ میں مجتہدانہ کمال حاصل کرلیں گے۔

شیخ عبدالرحیم صاحب آپ کے والد بزرگوار جیسے علوم ظاہری سے باخبر تھے ویسے ہی علوم باطنی کا شرف بھی خدا تعالیٰ نے انہیں عطا فرمایا تھا۔ جب جناب شاہ ولی اللہ صاحب کی عمر مبارک چودہ برس کی تھی تو آپ علوم دینیہ سے بخوبی واقف ہو گئے تھے اور ہر علم میں کمال حاصل ہو گیا تھا۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ پندرہویں سال میں آپ نے قدم رکھا تھا کہ والد بزرگوار نے آپ کو علم باطن کے شرف سے معزز وممتاز کرنا چاہا چنانچہ اسی سن میں آپ نے ان سے بیعت کی اور اشغال صوفیہ خصوصاً طریقہ نقشبندیہ میں اپنا بیش قیمت وقت صرف کرنا شروع کیا۔ والد کے مقدس ومتبرک انفاس اور اپنے تقویٰ وطہارت سے اس کمال میں اس قدر جلد ترقی کی کہ شیخ عبدالرحیم صاحب کی زندگی ہی میں عرفان کے اعلیٰ مدارج طے کرلئے اور اس علم کو عروج کمال پر پہنچا دیا اور جب شیخ صاحب نے آپ کی اس ترقی واستعداد کو ملاحظہ فرمایا تو سترہویں سال بیعت وارشاد کی اجازت دی اور باطنی علوم میں سے جو کچھ تلقین کرنا تھا اس وقت کر دیا۔

الغرض جناب شاہ ولی اللہ صاحب میں تمام لیاقتیں جمع تھیں اور آپ جامع جمیع صفات تھے۔ جیسا دینی علوم اور رسمی فنون میں کمال رکھتے تھے ویسے ہی عزم وثبات میں مضبوط اور استقلال میں راسخ قدم تھے۔ مزاج میں بے حد خلق اور محبت وتواضع تھی۔ اگرچہ آپ عالمانہ تزک واحتشام کے ساتھ ایک قسم کی حاکمانہ شوکت اور تحکم بھی رکھتے تھے۔ لیکن آپ کا متواضعانہ اخلاق اور فطری عجز وانکسار اس پر غالب تھا۔ ہمیں یہ بات کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اس وقت کے تمام مہذب دنیا کی گردنیں آپ کے آگے جھکی ہوئی تھیں اور آپ اس عہد میں ایک مذہبی پیشوا اور مقتدائے عالم تسلیم کیے گئے تھے۔

جناب شیخ عبدالرحیم صاحب کی لائف میں ہم بیان کر آئے ہیں کہ آپ اکثر امور میں تو حنفی ہی مذہب کے مطابق عمل درآمد کیا کرتے تھے لیکن بعض وہ مسئلے جنہیں حدیث یا وجدان کی رو سے مذاہب دیگر یعنی شافعی و مالکی و حنبلی مذہب میں ترجیح حاصل ہے بغیر کھٹکے عمل میں لاتے تھے۔

شاہ صاحب کی مذہبی تاریخ

تفریق مذہب میں یہی حال بجنسہٖ جناب شاہ ولی اللہ صاحب کا تھا۔ آپ کو مذہبی تفریق کے خانہ برانداز

جھگڑوں سے چنداں بحث نہ تھی نہ ان مشہور مذاہب اربعہ میں سے کسی خاص مذہب کے پابند تھے کہ خواہ مخواہ اسی کے مطابق عملدرآمد کریں بلکہ تا بہ امکان مذاہب مشہورہ ہیں جمع کرتے اور اس مسئلہ پر عمل کرتے جسے تمام اہل مذاہب نے صحت کا تمغہ عنایت کیا ہے لیکن جب مذاہب مشہورہ مختلفہ میں جمع کرنا متعذر اور ناممکن ہوتا تو آپ اس مذہب پر عمل کرتے جو دلیل کی رو سے زیادہ قوی اور صریح حدیث کے موافق ہوتا۔ چنانچہ جب خواجہ محمد امین نے سوال کیا کہ آپ مسائل فقہیہ میں کون سے مذہب پر عمل کرتے ہیں تو آپ نے یہی جواب دیا چنانچہ میں اس مقام پر آپ کا وہ جواب بجنسہ نقل کرتا ہوں جو خواجہ محمد امین کے سوال میں آپ نے اپنے قلم مبارک سے تحریر کیا۔

شاہ صاحب کا تعامل

''تمہارا تیسرا سوال کہ فقہیہ مسائل میں کون سے مذہب پر عمل کرتے ہو اس کا جواب یہ ہے کہ میں مذاہب مشہور میں تا بہ امکان جمع کرتا ہوں اور صوم و صلاۃ اور وضو و غسل اور حج کے مسائل اس وضع پر واقع ہوتے ہیں جنہیں تمام اہل مذہب صحیح جانتے ہیں لیکن جب یہ جمع و تطبیق ناممکن ہوتی ہے تو میں اس مذہب پر عمل کیا کرتا ہوں جو دلیل کی رو سے زیادہ قوی اور حدیث صریح کے موافق ہوتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے مجھے اس قدر علم عطا کیا ہے کہ ضعیف و قوی میں اچھی طرح فرق کرسکتا اور فتویٰ کے بارہ میں مستفتی کے حال کی بخوبی رعایت کرسکتا ہوں اور ہر مقلد مذہب کو اس کے مذہب سے جواب دیتا ہوں۔ مجھے خدا تعالیٰ نے مذاہب مشہورہ میں سے ہر مذہب کی معرفت عنایت کی ہے۔''

شاہ صاحب کا تصوفی طریقہ

قریب قریب یہی حال آپ کا ان طرق کی نسبت تھا جو حضرات صوفیہ میں دائر و سائر ہیں۔ تصوفی تحقیقات کا ذوق وشوق خدا نے بچپن سے دیا تھا اور ہر طریقے کے مجتہدوں سے آپ نے جدا جدا اس کمال کی تحصیل کی تھی۔ صوفیائے کرام کے خاص خاص کاملین کی صحبت سے فیض اٹھایا تھا اور عرفان کے اعلیٰ مدارج طے کر لئے تھے اور انجام کار جب 1143ھ میں حجاز تشریف لے گئے اور ایک سال سے زیادہ تک مجاورت حرمین شریفین اور شیخ ابوطاہر مدنی کی روایت حدیث سے مشرف ہوئے تو ان کے خرقے سے آرائش حاصل کی جو تمام صوفیوں کے خرقوں کو حاوی و جامع تھا۔ آپ طرق اربعہ یعنی طریقہ نقشبندیہ جیلانیہ (قادریہ) چشتیہ سہروردیہ کے ساتھ نسبت تساوی رکھتے تھے اور کسی ایک طریقہ کے پیرو اور مقلد تھے جیسا کہ آپ اپنی بعض تالیفات میں بالتصریح فرماتے ہیں۔

''رہا یہ سوال کہ تمہاری نسبت مشہورہ طریق میں سے کون سے طریقہ کی نسبت کے ساتھ زیادہ مشابہ ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اشتقاق طریقت اور اس صحبت کے حاصل کرنے میں جو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہے میرے اتصال کا قوی ذریعہ طریقہ نقشبندیہ ہے اور باطنی نسبت میں میں طریقہ جیلانیہ کا پیرو و مقتدی ہوں کیونکہ خدا تعالیٰ کی صورت ذہنیہ کا تحفظ طریقہ نقشبندیہ کا اصل الاصول اور جڑ ہے اور یہ ظاہر بات ہے کہ ہر انسان کے مدرکہ میں حضرت حق کی طرف ایک اشارہ واقع ہے جو خدا تعالیٰ کی صورت اجمالیہ ذہنیہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے اور جسے اس طریقہ کے پیرو

واسطہ کہتے ہیں تا کہ اس پر مواظبت کریں اور جب چاہیں اس سے انتقال کر کے حقیقۃ الحقائق پر پہنچیں اور طریقہ جیلانیہ کی روح اور سر کی آراستگی پر مبنی ہے۔ تا کہ لوگ مہذب ہو کر جس وقت اس پر حامل ہوں انہیں تجلی اعظم کی معرفت نصیب ہو اور سجادہ وخلافت نیز سلف کی اس بشارت میں جو خلف کے حال سے وابستہ ہے میرے نزدیک طریقہ چشتیہ سب سے زیادہ قوی ہے اور کتاب وسنت کی دلیل کے لحاظ سے میرے نزدیک قوی تر طریقہ سہروردیہ ہے، جو اصول سے زیادہ مشابہ و مناسب ہے۔ گو فقیر کو اور بھی بہت سے طریقوں کے ساتھ مناسبت حاصل ہے لیکن مذکورہ بالا چار چیزیں میں نے اس چار طریقوں سے اخذ کیے ہیں۔ خدا تعالیٰ ان اہل طرق کو ہماری طرف سے بہترین جزا عنایت فرمائے۔ یہاں تک تمہارے سوال کا جواب ہو گیا۔ اب میں جواب سے زائد ایک مختصر فائدہ بیان کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ بعض اوقات مراقبہ میں میرے اجداد عظام کا سلسلہ یہاں سے لے کر حضرت فاروق اعظمؓ تک مجھ پر حاضر کیا گیا۔ جن میں سے ہر ایک کی مہربانی سے میں نے ایک ایسا درخشاں نور پایا جس کی وجہ سے وہ دو سو آدمی یا اس سے کچھ زیادہ جماعت کا رئیس و سردار مقرر کیا گیا ہے اور میں نے اسے ''ابا عن جد'' متوارث پایا اور یہ ہماری اصطلاح میں نقطہ بحث سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر چہ کبھی دنیا کے اعتبار سے ہوتا ہے اور گاہے دیانت وعلم کے لحاظ سے اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ نور بطریق وراثت مجھ تک انتقال کر آیا ہے۔''

شاہ صاحب کی تقریر بالا سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح آپ مذاہب اربعہ مشہورہ میں کسی خاص مذہب کے مقلد و پیرو نہ تھے۔ اسی طرح اہل سلوک کے طرق میں سے کسی ایک طریقہ کے پابند نہ تھے بلکہ جس مذہب و طریقہ میں جو بات کتاب وسنت کے زیادہ موافق اور دلیل کے لحاظ سے زیادہ معتبر ہوتی وہی آپ کا دستور العمل قرار پاتا اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ علوم ظاہری اور باطنی میں جو اقتدار جناب شاہ ولی اللہ صاحب کو حاصل تھا وہ دوسرے کو کبھی میسر نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ کمالات تھے جن کے سبب سے آپ کے نام کا امتیازی پھریرا ہندوستان سے لے کر عرب وعجم تک برابر اڑتا تھا اور انہیں کمالات کا یہ اثر تھا جن کی وجہ سے آپ تمام دنیا میں روشناس تھے۔ دینیات اور رسمی علوم وفنون کو چھوڑ کر اگر شاہ صاحب کے صرف تصوفی علوم ہی کو لیا جائے تو بھی کوئی شخص آپ کی برابری کا ہرگز دعویٰ نہیں کر سکتا اور اگر کرے بھی تو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

انشا پردازی

شاہ ولی اللہ صاحب انشا پردازی کے فن میں بھی بے مثل اور یگانہ روزگار تسلیم کیے گئے ہیں اور آپ کی یہ صفت خاص تمام فاضلوں کو تسلیم ہے کہ بڑے بڑے مضمونوں کو نہایت مختصر اور جامع الفاظ میں اس خوبصورتی سے ادا کرتے تھے کہ مضمون کا اصلی اثر اور زور پورا قائم رہتا تھا۔ آپ نے اس فن میں اس قدر کمال بہم پہنچایا تھا کہ آپ کے عام مسودات بڑے بڑے فصیح وبلیغ اور انشا پرداز نہایت وقعت وقدر کی نگاہ سے دیکھتے اور فن انشا کے شائق جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ آپ کے مکاتیب وخطوط اور خاص خاص مناظروں اور علمی بحثوں میں جا بجا علم انشا کے نمونے لکھے نظر آتے ہیں جن کے ہر ہر فقرے سے شستہ بیان کی شہادت ملتی ہے اور لٹریچر کا کمال بہت کچھ ثابت ہوتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ آپ کی علمی سوسائٹی اور مناظرہ کے حالات جن سے آپ کی زور تحریر اور وسعت نظر کا حال معلوم ہو بہت ہی کمیاب ہیں البتہ آپ کی

انشاپردازی اور تحریر کا زور کسی قدر ان مکاتیب وخطوط سے ظاہر ہوتا ہے جن کی معزز ناظرین آگے چل کر سیر کریں گے۔

زورِ تقریر

آپ کے والد بزرگوار جناب شیخ عبدالرحیم صاحب کی تقریر نہایت شستہ اور منجھی ہوئی تھی اور آپ ہر مضمون کو اس خوبی سے ادا کرتے تھے کہ سننے والے ہونٹ چاٹتے رہ جاتے تھے۔ شیخ صاحب کی طرزِ تقریر اور انداز بیان عام وخاص لوگوں میں شہرت سے تجاوز کر کے ضرب المثل کی حد تک پہنچ گیا تھا اور یہ بات تمام لوگوں میں مشہور تھی کہ شیخ صاحب نے وہ طرز بیان اختیار کی ہے کہ آپ کے مجلس وعظ سے ہر ملت ومذہب کا شخص بشرطیکہ تعصب مذہبی سے خالی ہو بے حد خوش ہو کر اٹھتا ہے لیکن جناب شاہ ولی اللہ صاحب کی تقریر میں اس بلا کا جادو تھا جس کا اثر موافق ومخالفت دونوں پر یکساں پڑتا تھا۔ آپ کی زبان بڑے بڑے مناظروں اور علمی مجلسوں میں کبھی نہیں رکتی تھی اور ہر موقع پر شستہ وبرجستہ جواب دیتے تھے۔ جب آپ کسی مسئلہ پر بحث کرنے لگتے تھے تو کسی زبردست اور متبحر فاضل کو بھی آپ کے مقابلہ میں لم اور لانسلم کے کہنے کی جسارت نہ ہوتی تھی۔ بلکہ ایک محویت اور استغراق طاری ہو جاتا تھا اور نہایت خاموشی سے آپ کی تقریر سنا کرتے تھے۔

خوش تقریری

دنیا میں کوئی شخص کیسا ہی فاضل اور اہل کمال کیوں نہ ہو لیکن یہ ممکن نہیں کہ وہ تمام ملک وقوم کو راضی رکھ سکے۔ جناب شاہ ولی اللہ صاحب کا جب ستارۂ کمال فلکِ اقبال پر پہنچا تو آپ کے اوج وحشم کو دیکھ کر اکثر حاسد اور دشمن پیدا ہو گئے۔ جس زمانہ میں آپ نے قرآن مجید کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا اور اس کی اشاعت ہوئی تو متعصب مولویوں کے حلقوں میں ایک تہلکہ عظیم برپا ہو گیا۔ وہ یہ سمجھ گئے کہ ہماری روزی کی عمارت جڑ بنیاد سے ڈھا دی گئی۔ اب عوام لوگ کبھی قبضہ میں نہ آئیں گے اور بات بات پر گفتگو کرنے کو تیار ہو جائیں گے۔ اس خیال نے ان کے دلوں میں فتنہ وفساد کی ایک آگ بھڑکا دی اور مخالفت سے درگزر کر کے آپ کے جانی دشمن ہو گئے۔ ہر جمعہ کے دن باہم مشورے کر کے اس ارادہ سے گھروں سے نکلتے تھے کہ مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کی مخالفت عین وعظ میں کریں گے اور دس پانچ آدمی مل کر انہیں نرغہ میں کرلیں گے لیکن آپ کی تقریر میں اس بلا کا جادو ہوتا تھا کہ بجز سکوت وخاموشی کے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ سامعین کے تمام حلقوں پر سکوت حکومت کرتا تھا اور اثناء وعظ میں کوئی کسی سے اشارہ تک نہیں کر سکتا تھا۔

فصاحت وبلاغت

یوں تو اس جلیل القدر اور محترم خاندان کے ہر ایک ممبر کی خوش بیانی اور برجستہ گوئی عموماً تمام لوگوں کو تسلیم ہے لیکن جناب شاہ ولی اللہ صاحب کی فصاحت وبلاغت کا ہر شخص کو خصوصیت کے ساتھ اعتراف ہے۔ جب آپ کی علمی مجلس میں کوئی بحث چھیڑ دی جاتی تو ایک عجیب مؤثر طرز سے تقریر کرنی شروع کرتے اور اثنا تقریر میں کسی موقع پر نہ رکتے تھے۔ سلسلۂ کلام میں الفاظ کی تکرار ہوتی تھی۔ نہ معانی کو بار بار بیان کیا جاتا تھا۔ جس فن پر گفتگو کرتے تھے

تاوقتیکہ اس کا سلسلہ پورا طور ختم نہ ہو جاتا تھا، دوسرے کو اختیار نہ کرتے تھے اور اثناء تقریر میں ادب کا پہلو کبھی نہ چھوڑتے تھے اور جب ایک گفتگو کا سلسلہ ختم کر کے دوسری گفتگو شروع کرتے تو پچھلی تقریر پہلی سے زیادہ مؤثر اور دلکش ہوتی تھی۔ مخالفوں کے دلوں پر قبضہ کر لینا آپ کے آگے کوئی بات نہ تھی اور سنگدلوں کو موم دل بنا لینا آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ جناب شاہ عبدالعزیز صاحب آپ کے فرزند رشید کی جو برجستہ گوئی اور شیوا بیانی آج تک دنیا میں ضرب المثل ہے یہ آپ کی فصاحت و بلاغت کا اثر ہے۔

الحاصل جناب عارف باللہ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کے علوم وفنون کے کارنامے اور علمی کمالات کے افسانے کتابوں میں اس کثرت سے پائے جاتے ہیں جن میں سے فیصدی پانچ کا بھی انتخاب ہم نہیں لکھ سکتے کیونکہ ''حیات ولی'' میں اب اس قدر گنجائش باقی نہ رہی ہے تاہم مشتے نمونہ از خروارے آپ کے تمام حالات کے انتخاب سے ہم اپنے تذکرہ کے کسی موقع کو خالی چھوڑنا مناسب نہیں سمجھتے لہٰذا اب اس عنوان کو یہیں ختم کرتے ہیں۔

جناب شاہ صاحب کے کلام کا انتخاب

شاہ صاحب کی شاعری

یہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ جناب شاہ ولی اللہ صاحب کو فضلائے عہد اور علماء وقت نے تفسیر و حدیث اور فقہ کے لحاظ سے مجتہدین فن اور آئمہ مذاہب کے بعد علمی دربار میں دوسرے درجہ میں جگہ دی ہے ورنہ ایسا کون سا علم تھا جس میں آپ کو تبحر اور علو حاصل نہ تھا۔ شاعری جو علم ادب کے لئے ایک گرانمایہ جوہر ہے اور تمام ممالک اور قوموں میں جس کی عزت کی جاتی ہے اس میں اس درجہ کمال تھا کہ لوگوں نے گیارھویں صدی کے شعرا کے زمرہ میں آپ کو جداگانہ شمار کیا ہے اور شاعری کے علاوہ علم وادب میں تمام ماہرین فن کے طبقوں میں آپ مسلم ادیب گنے گئے ہیں۔ جب ہم گیارھویں صدی کے شعرا کی فہرست میں آپ کو ڈھونڈتے ہیں تو نہایت روشن اور جلی حرفوں میں آپ کا نام نام ثبت پاتے ہیں۔ جناب شاہ ولی اللہ صاحب کی ادب اور انشا پردازی کی مثالیں آپ کے ان مکاتیب وخطوط سے ظاہر ہوں گی جنہیں ہم آگے چل کر لکھیں گے۔ یہاں آپ کے کلام میں سے چند اشعار کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ ان اشعار کے نقل کرنے سے علاوہ برجستگی مضامین اور شستگی زبان کے یہ بھی دکھانا منظور ہے کہ جناب شاہ ولی اللہ صاحب کو نظم پر کس درجہ قوت تھی اور آپ کس قدر رد منزلت کے شاعر تھے۔

قصیدہ در بعض معارف غامضہ

الا طال شوق الابرار الی لقائی — و انی لا شد شوقا الیھم منھم

من ندانم بادہ ام یا بادہ را پیمانہ ام — عاشق شوریدہ ام یا عشق با جانانہ ام

مبتلائے حیرتم جاں گویمت یا جان جان — اصطلاح شوق بسیارست و من دیوانہ ام
با جمالِ ذاتیش حسن دگر درکار شد — چشم او را سرمہ ام یا زلف اورا شانہ ام
میل ہر عنصر بود سوئے مقرا ضنیش — جذبہ اصل است ہر ہر شورشِ مستانہ ام
غافل از خود ماند از صورت چو پر شد آئینہ — تا ترا بشنا ختم صبا ناز خود بیگانہ ام
اے امیؔن بر مستیم نام تجدد تہمت ست — در ازل پیش از زمان تعمیر شد میخانہ ام

غزل

دوائے درد من بر جمع اضداد تو مینازم — نمک ریز دلِ مجروح من ہستی و مرہم ہم
جہان و جان فدائے وضع شوخ شہر آشوبت — قیامت می نمائی و دمِ عیسیٰ مرہم ہم
توئی اول توئی آخر توئی ظاہر توئی باطن — توئی مقصود و اہل دل توئی مشتاق و ہمدم ہم
زیک منبع دریخجا مختلف فوارہ می جوشد — مزاج حرصِ قاروں زہد ابراہیم ادہم ہم
بخارے از زمین خیزد بباد جو در آمیزد — گہے باران ریزان است و گاہے برف و شبنم ہم
کدامی طرفۂ نیرنگے کاشانہ سر دادی — کہ عالم پائے کوب از دست عشقت کشت و آدم ہم

در شرح غزلیکہ بر تضمین بیت اوّل غزالی انشا کردند

نخستین بادہ کاندر جام کردند — مزاجش عکس آن گلفام کردند
ہویدا شد در امکان صورتِ حق — بآن صورت جہاں را رام کردند
ہمیں بایست تفصیلی ازان رو — مکارم را بما اتمام کردند
شرابِ وحدت از خمخانۂ غیب — مرا صبح ازل در کام کردند
چو غلطیدم ز مستیہا بہر سو — حریفاں مستی از من وام کردند
حقیقت را کہ مستور از نظر بود — بما مشہود خاص و عام کردند
پس آنگہ موج دریا باز گردید — باتمام فنا اکرام کردند
امیؔن رمزے دقیقے باتو گویم — بخود آغاز و نیز انجام کردند

غزل دیگر

بزلف پیچ در پیچ کسے گم کردہ ام خود را — خروش در دل شبہا نمی کردم چہ می کردم
دلے پر درد جان افگار یار تند خودارم — جہاں را پر زیاریہا نمیکردم چہ میکردم
غم تحصیل و بار شغل و درد غزل می بینم — جنون ترک منصبہا نمیکردم چہ میکردم

کسے بامل ہمی سازد کسے باگل ہے بازو — اگر من یاد آن لبہا نمیکردم چہ میکردم
مئے تحقیق را از خم مشربہا برون دیدم — خروج از قید مشربہا نمیکردم چہ میکردم
حجاب وصل مطلوب اس دل بستن طلبہا — ایٖن گر ترک مطلبہا نمیکردم چہ میکردم

اشعار

ناگزیر تو منم اے بے نظیر — رو مگر داں بعد ازین از ناگزیر
من ترا مشفق ترم از صد پدر — در من آویزد مرا محکم بگیر
غیر من گربا تو بابستہ بود — آن و بالست و عذابست و سعیر
جان من در ہجر یار خود بسوخت — من عذاب الجهر اجرنی یا مجیر
بے قرارم روز و شب بے روئے یار — باز بنما روئے یارم یا قدیر
اندرونم بے حجابش تارشد — کے شود یارب بوصلش مستنیر
اے برادر بعد ازین ہشیار باش — فرق میکن درمیان شیر و شیر

غزل دیگر

ساقی کرے کن کز ہوش خود افتم — من یار خودم خود از دوش خود افتم
مثل مے جو شان کز خم بدرافتد — جو شے زدہ بر خوداز جوش خود افتم
ازہر بن موئم جو شد مئے دیگر — از فرط تمائل ز آغوش خود افتم
زین تیر زبانے آزردہ دلم من — خوش آنکہ زمانے خاموش خود افتم

یہ غزل مزاحقات بحر بسیط سے ہے۔ اس کے ارکان چار بار مستفعلن فعلن ہے جو فارسی میں نہایت کمیاب ہے۔ اکثر شعراء متقدمین کے کلام اس بحر سے خالی ہیں۔

رباعیات در بیان بعض قواعد سلوک

علمے کہ نہ ماخوذ از مشکوٰۃ نبی است — واللہ کہ سیرابی ازاں تشنہ لبی است
جائے کہ بود جلوۂ حق حاکم وقت — تابع شدن حکم خود بولہبی است
وانی کہ چہ بود نہج قدیم اے دلدار — شغل دل تو ظاہر و باطن با یار
این راشوی از درس عوارف عارف — واں فن دگر یار بگیر از احرار
در مذہب ماہست ز اسباب غرور — ذکرے کہ بود عاطل از انوار حضور
در حاشیۂ نفی شو از خلق نفور — در جانب اثبات برد سوئے غفور

مستی و ولہ شرط طریق افتادست — بے مست شدن کار کسی نکشا دست
در ذکر خفی جہر تخیل کردن — شرط ست و ز اوستاد طریقم یادست
خواہی کہ مئے صرف محبت نوشی — باید کہ بتقلیل علائق کوشی
دل راز خیالات جہاں صرف کہنی — چشم از صور جملہ عالم پوشی
در عشق تو از جملہ جہاں بگذشتم — و زہر چہ بجز یاد تو زاں بگذشتم
مقصود من بندہ بجز وصلِ تو نیست — اندر طلبت از دل و جان بگذشتم
دائم دل من پیش تو حاضر باشد — چشم برخِ خوب تو ناظر باشد
در مذہب ما شرک جلی ست و صریح — گو سوئے دگر خطرۂ خاطر باشد
دانی چہ بود سہل کثیر البرکات — در مشرف اہل دل وجود و عدمات
تحصیل عدم بدان یعنے مانع — در نفی خواطر و رسد جہات
خوش آنکہ با نوار وضو رنگین ست — زیرا کہ طہارت ز اصول و بن ست
تنویر دل و نفی خواطر خواہی — قوی ذریعۂ وصولش این ست
تحصیل عدم اگر ندانی کردن — باید نظر اہل فنا را جستن
این داء عضال را دوائے بہ ازین — در حکمت اہل دل نخواہی دیدن
آنا نکہ زاد ناس بہمی رستند — بالمعۂ انوار قدم پیوستند
فیض قدس از ہمت ایشان میجو — دروازۂ فیض قدس ایشان ہستند
آن ذات کہ از قید جہت بیرون است — از حیطۂ اسماء صفت بیرون است
ہر مرتبہ زان ذات نشانے دارد — ہر چند ز تعیین سمت بیرون است
ہر مدرکہ شد مظہر آن یار عجیب — ظاہر شدہ از صورتش آثار عجیب
در لوح دل از ثبت کنی صورتِ او — پیدا شود از لوح دل اسرار عجیب
قومے بکتابت احرف موصوف — جمعے بتلاوت اسماء معروف
شخصے کہ ازین قوم قدم پیش نہاد — گشت است باین صورت ذہنی مشغوف

اشعار

تا بکے محنت مہجوری و دوری بکشم — نازنین وطنم سوئے وطن باز روم
تا بکے ہمدمئے سنگ بود شیوۂ من — گوہرے از عدنم سوئے عدن باز روم
تا بکے بستۂ زنجیر تعلق باشم — آہوئے از ختنم سوئے ختن باز روم
بوئے جان میرسد از بادیمن در دو جہان — شاہ ملک میمنم سوئے یمن باز روم

اشعار

ولے دارم ز خود خالی حبابش میتواں گفتن — در و کیفیت جوش شرابش میتوان گفتن
وجودِ بے نمود معنے نادید نے دارد — درین نیز نگہا بوئے کبابش میتوان گفتن
سویدا دل نامیابی اندر پیچ و تاب او — نقوش عالم ام الکتابش میتوان گفتن
فرو پاشید از ہم کثرت موہوم چون شبنم — ز فیض معنی ما آفتابش میتوان گفتن

اشعار

فراغ یافتم از حج و عمرہ — چوا حرام سر کوئے تو بستم
چو دیدم روئے زیبائے تو جانا — زتشویش وجود خویش رفتم
بیا ساقی بدہ جامے شرابے — کہ مخمورِ صبوحے والستم

محبت نام جوش طبع و میل نفس اگر باشد — سر اہل محبت درد و عالم گاؤ خر باشد
ز نازک طبع غیر از خونمانیہا نمے آید — درخت بید را دیدیم دائم بے ثمر باشد
بوسعت مشربان رنگ تعلق در نمیگیرد — اگر نقشے زنی بر روئے دریا بے اثر باشد
صفائی طبع میخوائی ز صحبت دان اندر کش — کہ آب دو دراز مردم ہمیشہ با صفا باشد

فرد

مزاج صاف طبعان را بجز غربت نمیسازد۔ — مکدر گرد و آب صاف چون یکجا وطن گیرد
صفا باخبث باطن نیز گاہے جمع میگردد — بروہالوعہ را چون در و بنشیند تما شا کن
ہرزہ گردی مانع سوز دل است اے ہوشمند — سیل تابنشست یکجا باطنش صافی نہ شد

شاہ صاحب کے کلام میں سے جن رباعیات اور اشعار کا انتخاب مجھے معزز ناظرین کے سامنے پیش کرنا تھا نقل کر چکا۔ اگر آپ کے کلام کا تجسس نگاہوں سے تتبع کیا جائے تو ایک مختصر دیوان بن سکتا ہے۔ لیکن میں نے بنظر اختصار صرف ان ہی چند رباعیوں اور اشعار پر اکتفا کیا۔ ناظرین کو ان منتخب اشعار سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ محبت اور عشق الٰہی میں محترم شاہ صاحب کس درجہ محو تھے اور انہوں نے اپنا مبارک اور برتر خیال کن پُر اثر اور جو شیلے الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔ اشعار مذکورہ کے پڑھنے اور ہر ہر مصرع پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کا قائل وہی شخص ہے جو عشق الٰہی اور محبت خداوندی میں پاؤں سے سر تک ڈوبا ہوا ہے اور بے خودانہ سرخوش حالت اور عالم وجد میں اس کی زبان مبارک سے یہ وجد میں لانے والے اشعار سرزد ہوئے ہیں۔

انسانی طبیعت اور اس کے سلسلۂ خیالات کا آئینہ ہمیشہ اس کی تحریر و تقریر ہوا کرتی ہے یعنی جو بات آدمی کے دل میں ہوتی ہے وہی اس کے زبان و قلم سے نکلتی ہے۔ غور میں ڈوبی ہوئی نظریں اور بالغ نگاہیں فوراً ہر تحریر و تقریر سے قائل کے دلی خیالات کا کافی اندازہ کر لیتے ہیں اور جھٹ تاڑ جاتی ہیں کہ جو کچھ قائل کہہ رہا ہے آیا اس کی طبیعت کی بھی یہی کیفیت ہے یا اس میں کچھ تکلف و بناوٹ داخل ہے۔ بعض تحریریں ایسی ہوتی ہیں جن کے ہر ہر جملہ اور ہر ہر فقرہ سے کھلم کھلا ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کا قلم دل کے ساتھ موافق نہیں ہے۔ دل کچھ کہتا ہے طبیعت کچھ شہادت دیتی ہے قلم کچھ اور کہہ رہا ہے زبان کچھ اور گواہی دیتی ہے لیکن جناب شاہ ولی اللہ صاحب کی زبان و قلم سے وہی نکلتا تھا جو آپ کے دل میں ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جو اثر اس وقت آپ کی زبان میں تھا آج وہی اثر ہم آپ کی تحریر میں پاتے ہیں۔

ہماری اس رائے کی تائید جناب شاہ عبدالعزیز صاحب آپ کے فرزند رشید کے قول سے بہت کچھ ہوتی ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ''میرے والد بزرگوار کی تقریروں میں ایک خاص صفت یہ ہے کہ اگر اب بھی کوئی شخص ان کی اصلی تقریریں ایک مرتبہ بھی پڑھ لیتا ہے تو وہ اس کی یاد سے کبھی فراموش نہیں ہوتیں۔ جس وقت وہ تقریریں آپ زبان سے فرمایا کرتے تھے تو اس کا اثر سننے والوں کے دلوں پر اس قدر پڑتا تھا کہ کبھی زائل نہیں ہوتا تھا اور لوگ آپ کی تقریر سنتے ہی خلوص دل سے اس پر عمل کرنے کو سرگرم ہو جایا کرتے تھے اور بے اختیارانہ جوش کے ساتھ عمل کرنا شروع کر دیتے تھے۔

شاہ صاحب کے مکاتیب

جناب شاہ ولی اللہ صاحب کے خطوط کا گو میرے پاس ایک بہت بڑا ذخیرہ تھا لیکن میں نے بنظر طوالت ان میں سے صرف ان ہی چند خطوط کا انتخاب کیا ہے جو ناظرین تذکرہ کی دلچسپی کے باعث ہیں اور چونکہ وہ علم ادب کی روح اور ادیبوں کی جان ہیں اس لئے بجنسہٖ درج کرتا ہوں۔

شاہ ولی اللہ صاحب کا پہلا خط شیخ ابراہیم مدنی کے نام

شیخ ولی اللہ العمری کا خط بنام شیخ ابراہیم مدنی۔ ان کے والد شیخ ابوطاہر مدنی قدس اللہ اسرارہم کی تعزیت میں خدا تعالیٰ علم کے آثار اونچے اور اس کی بنیادیں مضبوط کرے۔ دین کے جھنڈے بلند اور اس کے ارکان مستحکم کرے۔ حدیث کے باغ کو سرسبز و شاداب اور اُس کی رونق کو دوبالا کرے۔ اہل حدیث کی تازگی اور اس کے سرپرستوں کو نور بخشے اور دانشمند بزرگ میرے استاد شیخ ابوطاہر مدنی کردی کے فرزند رشید مولنا شیخ ابراہیم کے حدیث کی درس و اشاعت کی وجہ سے علم حدیث کو عروج کمال پر پہنچائے جو پیشوائے مذہبی اور مقتدائے مخلوق ہیں اور اپنے بزرگ اسلاف کے بزرگی و فضیلت کے جائز وارث ہیں۔ اس کے بعد واضح ہو کہ خدا تعالیٰ آپ کا اجر بڑھائے اور ہمارے شیخ رضی اللہ عنہ پر صبر کرنے کا آپ کو الہام کرے۔ مجھے سزاوار ہے میں اپنے شیخ کی تعریف کروں اور دعا صبر میں کوشش کروں۔ خدا کی قسم جب سے شیخ کے انتقال کی جانگزا خبر میرے کان میں پہنچی ہے اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ دنیا سے منہ موڑ کر خداوندی رحمت اور اس کی

جنتوں میں انتقال کر گئے ہیں تو میں ایک ایسے قلق اور اضطراب میں گرفتار ہوں جو جگر کو پاش پاش کیے دیتا ہے اور اس اندوہ ورنج میں مبتلا ہوں جس میں صاحب امر مبتلا ہوتا ہے۔ میرے سر پر ایک ایسا ابر چھایا ہوا ہے جو غم واندوہ کا مینہ برساتا ہے اور میرے نیچے مشتعل آگ کا دریا لہریں لے رہا ہے اور کیوں نہ لے میرے شیخ رضی اللہ عنہ حقیقت میں زمین کے باشندوں کے لئے برکت اور مدینہ طیبہ کے مقتداو پیشوا اور اس کے عمدہ ارکان تھے۔ انہیں مجھ سے اس درجہ محبت تھی جس کی نشانیاں ظاہر اور علامات وآثار واضح تھے اور میری محبت ان کے ساتھ ضرب المثل تھی جس کی حقیقت خدا تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی نہیں جان سکتا۔ میں اس وقت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا کہ جب میرے کوچ کا زمانہ قریب ہوا اور جدائی کی گھڑی سر پر آ کھڑی ہوئی اور رخصتانہ ملاقات کے اثنا میں میں نے ان کی مزاج پرسی کے بعد یہ بیت پڑھی۔

نسیت کل طریق کنت اعرفه
الا طریقا یؤ دینی لو یعکم

یعنی میں بجز اس ایک رستہ کے جو مجھے تمہاری زمین تک پہنچا دے ان تمام رستوں کو بھول گیا جن سے میں اس سے پیشتر واقف تھا تو آپ کی پُر نم آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں بہنے لگیں اور دونوں رخسارے سرخ ہو گئے یہاں تک کہ گریہ کی گرمی سے آپ کا گلا گھٹ گیا۔ زاں بعد آپ نے نہایت خلوص کے ساتھ اس عاجز کے حق میں دعا کی اور میں اس واقعہ کو بھی کبھی بھول نہیں سکتا کہ جب میں نے آپ کی مقدار عمر دریافت کی تو جواب میں فرمایا کہ ساٹھ وستر کے مابین ہے تو اگر میں ان باتوں کو یاد کر کے خون کے آنسو رونا چاہوں تو رو سکتا ہوں لیکن صبر کا میدان زیادہ وسیع ہے اور اسباب گریہ کے ہجوم اور آسمان وزمین کی تنگی کے وقت میرے دل کی تسلی اور میرے بھروسہ کی لاٹھی صرف یہ ہے کہ شیخ رضی اللہ عنہ نے آپ جیسا فرزند اپنی محسوس یادگار چھوڑی ہے۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ شیر کا بچہ شیر کے مشابہ ہوتا ہے اور فرزند سے باپ کی خصلت ظاہر ہوتی ہے۔ اے زمانہ کے ماویٰ وملجا! تیری بقا زمانہ کی بقائے دوام کے ساتھ رہے اور یہ دعا تمام مخلوق کو شامل ہے والسلام۔

دوسرا خط

شاہ ولی اللہ کا دوسرا خط۔ اپنے استاد شیخ المحدثین جمال الدین ابو طاہر کردی مدنی کے نام۔ خدا تعالیٰ ان دونوں کو پاک کرے اور ملاء اعلیٰ میں ان کا ذکر بلند کرے۔

رحمت وبرکات کے مینہ اور عنایت وکرامات کے بادل اس گوشہ زمین پر ہمیشہ برستے رہیں جسے بزرگ نیکوکار فرشتہ گرد وپیش سے احاطہ کیے ہوئے ہیں اور جو فضیلت خاص سے موصوف ہے۔ اس کا سلسلہ کلام میں ذکر کرنا فوق ادب ہے اور اس کی جناب اس سے بہت دور ہے کہ میں صراحتہً اس کا نام لوں یا علامت ونشان کے ساتھ معین کروں۔

بقیت بقاء الدھر یا کھف اھله
و ھذا دعاء للبریه شامل

اس کے بعد واضح ہو کہ آپ کی دلی توجہات کا محتاج اور آپ کی دعاؤں پر بھروسہ کرنے والا۔ تمام باطنی وظاہر

امور میں خدا کی تعریف اور اس کی ان نعمتوں کا شکریہ کرتا ہے جو گنتی میں نہیں آ سکتیں۔ منجملہ ان کے مکہ معظمہ میں رمضان کا روزہ اور مسجد حرام میں عشرہ اخیرہ کا اعتکاف ہے۔ مجھے خانہ کعبہ کے خادم شیخ عمر بیناہ نے خبر دی (خدا تعالیٰ اسے خوش رکھے جیسا اس نے مجھے خوش کیا) کہ آپ حج کے لئے تشریف لاتے ہیں اور وہ آپ کے نزول کے واسطے مکان تیار کر رہا ہے اور قربانی و لبیک کہنے کے زمانہ میں آپ کی تشریف آوری کا انتظار ہے۔

فساغ الیٰ شراب و کنت قبلا

اکا داغص بالماء الفرات

خدا تعالیٰ میری اور اس کی آرزو کو پورا کرے بیشک وہ ہر چیز پر قادر ہے اور دعا قبول کرنے کے لائق اور سزاوار ہے۔ میں آپ سے سفر و حضر کی حالت میں سلامت و خیریت کی دعا چاہتا اور اس عافیت و رحمت کی استدعا کرتا ہوں جس کے بعد کوئی بلا اور جس کے پیچھے کوئی عذاب نہ ہو۔ والسلام والاکرام۔

تیسرا خط

(تیسرا خط شیخ ابو طاہر مدنی کے نام)

ان تحفوں کے ارسال کرنے کے بعد جن سے ہمیشہ اخلاص کی عطر آمیز ہوائیں چل کر دل و دماغ کو معطر کرتی ہیں اور ان دعاؤں کے ہدیہ کرنے کے پیچھے جن سے قبول القبول کی ہوا کے خوش آئندہ جھوکے صبح و شام جدا نہیں ہوتے۔ واضح ہو یہ عریضہ اس ضعیف و خاکسار بندہ کی طرف سے ہے جسے آپ کے لطیف و جمیل اور احسان عظیم نے غلام بنالیا ہے اور عام احسان نے اس کی حالت کو مرہون منت کر دیا ہے۔

اخذ تمونی منی فی ملاطفة

فلست اعرف غیرھا قد عرفتکم

یعنی جب سے تم نے مجھے اپنا سایہ عاطفت میں لیا ہے اور میں نے تمہیں پہچانا ہے اس وقت سے میں نے بجز عنایت و مہربانی کے اور کچھ نہیں دیکھا اور یہ عریضہ اس شخص کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے جس کے وصف کمال سے زبانیں اور تعبیریں قاصر اور نعت و جمال سے اسلوب و تحیرات کا دائرہ تنگ ہے۔ اس کی مدح میں نہایت مبالغہ سے تعریف کرنے والا محض عاجز اور گونگا ہے اور افراط کے ساتھ قدح سرائی میں مشغول ہونے والا تھک جانے والا ہے۔

وعلی تفنن واصفیه بوصفه

یفنی الزمان و فیه مالم یوصف

وہ ہمارے شیخ ہمارے مقتدا ہمارے مخدوم ہمارے مکرم و محترم اور بزرگ مولانا ہیں۔ خدا تعالیٰ ان کے بقائے دوام کی وجہ سے دینی علوم کی زندگی میں مداومت کی روح ڈالے اور ان کی رونق ہمیشہ قائم رکھے اور ان کے زمانہ کی ہمیشگی کے سبب سے معارف حق کو سدا ترو تازہ رکھے اور اس کی تازگی کی رونق کو دوبالا کرے۔ اس کے بعد گزارش ہے کہ آپ کی توجہات عالیہ کا محتاج اور آپ کی مقبول دعاؤں پر بھروسہ کرنے والا تمام خطرناک مواقع سے محفوظ اور ناگوار چیزوں سے صحیح

سالم مکہ معظمہ میں پہنچا۔ خدا اس کی شرف وعظمت کو بڑھائے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس وقت مجھے کسی طرح کا خوف واندیشہ اور رنج واندوہ نہیں ہے۔ لیکن آپ کی مفارقت کا رنج اس درجہ ہے جس پر مجھے کسی طرح صبر نہیں آتا مگر جیسے زنجیر میں بندھے ہوئے جانور کو صبر ہوتا ہے یا مغلوب ومقہور آدمی اپنے دل کو تسلی دیتا ہے۔

والله لو حلف العشاق انهم
قتلیٰ من الحب یوم البین ماحنثوا

یعنی اگر عشاق اس بات پر قسم کھائیں کہ ہم محبت کی وجہ سے مفارقت کے دن قتل کیے گئے ہیں تو واللہ وہ حانث نہ ہوں گے۔ میری شکایت کا علاج خدا کے پاس ہے اور اسی سے مدد چاہتا ہوں۔ وہی باطن اور ظاہر کو جانتا ہے۔ میں آپ سے مقبولہ اوقات میں دعا کا خواستگار اور طالب خیر ہوں۔

چوتھا خط

وہ تحفے جن کی جڑ محبت خالصہ کی زمین میں قائم اور شاخیں آسمان میں ہیں اور وہ دعائیں جن کے ستون رحمۃ خالصہ کے کُرے میں گھرے ہوئے ہیں اور چھتیں غایت رفعت میں ہیں احقر خلائق جو حقیقت میں کوئی چیز نہیں ہے اس گوشہ میں پہنچانا ہے جسے فرشتے گھیرے ہوئے تسبیح وتحمید کا نعرہ بلند کرتے ہیں اور اس بارگاہ عالی میں پیش کرتا ہے جس کا جلیس وہم صحبت بدبخت نہیں ہوتا اگرچہ وہ اس قابل ہے کہ خداوندی رحمت سے دور کردیا جائے اس کی جناب ایک ایسا دائرہ ہے جس کا مرکز مضبوط کڑا ہے۔ جو کہیں ٹوٹ نہیں سکتا جس نے اسے پکڑا سیدھی راہ پر لگ گیا اور اس کی محفل ایک ایسی مستحکم رسی ہے جو کبھی کٹ نہیں سکتی۔ جس نے اسے مضبوطی سے پکڑا اس کو اس نے شارع عام اور سنت کے طریقہ پر پہنچادیا۔

لایدرك العاصف المطری خصائصه
وان یکن سابقاً فی کل ما و صفا

یعنی مبالغہ کرنے والا مداح اس کی خصوصیتوں کو پا نہیں سکتا۔ اگرچہ وہ مدح سرائی میں سابق وممتاز ہی کیوں نہ ہو۔ وہ ہمارے شیخ ہمارے پیشوا ہمارے ممدوح ہمارے محترم ومکرم بزرگ وافضل مولنا ہیں۔ خدا تعالیٰ صبح وشام ان کی بزرگی میں ترقی دے اور اسے دائم وقائم رکھے اور ان کی حفاظت اس شخص کے لئے ہمیشہ رکھے جو ان کی ملازم صحبت رہے اور بھروسہ رکھے۔ اس کے بعد آپ کی توجہات کا محتاج اور آپ کی دعاؤں پر بھروسہ کرنے والا خدا کی ان ظاہری وباطنی نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہے جو شمار میں نہیں آسکتیں اور عوارف کے ان بہتے چشموں پر خدا کی تعریف کرتا ہے جن کا حصر نہیں ہو سکتا۔ اب آپ سے مزید نعمت اور قدیم وجدید منتوں کے ہمیشہ رہنے کی دعا چاہتا ہے۔ والسلام والاکرام۔

پانچواں خط

(شیخ عارف باللہ مولنا ولی اللہ کا خط شیخ ابراہیم مدنی کے نام)

عوارف کے صاف وستھرے ہوئے چشمے خلائق کے حوض یعنی سادات کرام کے فرزند رشید مولنا شیخ ابراہیم پر

ہمیشہ کرتے رہیں جو ائمہ علام کے قائم مقام اور ہمارے مکرم و معزز مولنا شیخ ابو طاہر کے فرزند عارف باللہ حجۃ الاسلام قدوۃ الانام مولنا شیخ ابراہیم کردی مدنی کے پوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ ہمیں ان کے اسرار کی بدولت پاک کرے۔ فقیر ولی اللہ بن عبد الرحیم العمری الدہلوی عفا اللہ عنہ کی طرف سے آپ پر سلام اور خدا کی رحمت و برکت ہو۔ آپ نے جو اپنے محب کی خیریت دریافت کی تھی سو خدا کا شکر ہے کہ وہ خود اور اس کی اہل و اولاد خیریت سے ہیں اور آپ کے آباء کرام کے ذکر سے رطب اللسان ہے۔ ان کی نعمتوں اور علمی اشاعتوں کا شکر ادا کرتا ہے۔ مجھے خدا سے امید ہے کہ وہ ان کی برکات کی وجہ سے مجھے ہمیشہ محفوظ رکھے اور ان بلاد میں ضعیف اور اس کی اولاد و اصحاب کے سبب سے ان کا ذکر زندہ رکھے۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ دیتا ہوں کہ اپنی نیک دعاؤں میں فراموش نہ کریں۔ اگر چہ میں نے اس سے پیشتر بہت سے خطوط آپ کی خدمت میں روانہ کیے لیکن نہ تو آپ نے جواب سے معزز فرمایا نہ سلام کتاب سے ممتاز کیا۔ حالانکہ میرا خیال آپ کی نسبت ایسا نہ تھا۔ اب میں بخلاف سابق کے التماس کرتا ہوں کہ آپ اس رقیمہ کے حامل کی معرفت جواب تحریر کر کے ارسال کریں اور ان محترم مواضع سے ہر آنے والے کے ہاتھ سرفراز نامہ بھیجیں اور اپنی اور اپنی اولاد و اصحاب کی سلامتی سے مطلع کریں والسلام۔

چھٹا خط

(شیخ عارف باللہ مولنا ولی اللہ کا خط شیخ وفد اللہ مالکی مکی کے نام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ خدا کو سب تعریف ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے سردار محمد اور ان کی آل پاک پر رحمت و سلام نازل فرمائے۔ فقیر ولی اللہ بن عبد الرحیم العمری الدہلوی کی طرف سے تم پر سلام اور خدا کی رحمت و برکات کے بعد واضح ہو کہ آپ کے عام اخلاق و بزرگ عادات سے امید ہے کہ ہمارے دین و معیشت اور اولاد و اصحاب کے لئے اپنے اجابت کے اوقات و مواضع میں دعا کریں۔ مجھے آپ کے فرزند رشید شیخ حسین سے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے کم سنی کے زمانہ میں فرید عصر شیخ محمد بن العلا بابلی قدس اللہ سرہ سے ملاقات کی ہے اور انہوں نے آپ کی اپنی تمام مرویات صحیحہ کی اجازت عنایت کی ہے۔ اگر حقیقت میں یہ واقعہ نفس الامری ہے تو وہ ایک نہایت ہی اعلیٰ درجہ کی اسناد ہے۔ مجھے آپ سے امید ہے کہ مجمل و مفصل اجازت سے اس فقیر کو معزز و ممتاز کریں گے اور اپنی اسناد عالیہ اور فوائد منتخبہ اور مسلسلات متصلہ سے اطلاع دیں گے شاید خدا تعالیٰ مجھے اور آپ کو مقام صدق میں اپنے اولیا کے زمرہ اور اپنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے عاملین کے گروہ میں جمع کرے والسلام۔

ساتواں خط

(شیخ عارف باللہ کا خط۔ بنام بعض دوستوں کے)

برادر من! علماء کی ملازمت بہت غنیمت ہے اور عقلا کی ہم نشینی عزم و استقلال کی محرک ہے۔ خدا تعالیٰ کی طاعات پر ہمیشگی بہت کمیاب ہے اور اس کی عبادات کے اہتمام سے اکثر حلقے خالی ہیں۔ واضح کہ کھیل کود میں مصروف رہنا

بجز حسرت کے اور کچھ واجب نہیں کرتا اور زیادہ خوش کلامی سخت دلی پیدا کرتی ہے۔ تم راحت و آسانی اور باطل کاموں میں اپنے اوقات ضائع نہ کرو۔ اپنے تئیں ان مضرت اور ایذا رساں باتوں سے بچاؤ جو انجام کار تمہاری طرف عود کرنے والی ہیں اور جو جو چیزیں فی الحال تمہاری پیش نظر ہیں ان میں زیادہ اہتمام نہ کرو۔ تمام لوگوں میں بہتر وہ شخص ہے جو سن کر یاد رکھے اور اپنے دعویٰ کو ثابت کرے۔ والسلام۔

آٹھواں خط

(شیخ عارف باللہ یک طرف سے بعض دوستوں کو)

زمانہ کا رنگ بالکل بدل گیا ہے اور مذاہب کا چشمہ نہایت مکدر ہو گیا ہے اور ہر پوشش جو مسلمانوں کو زینت و رونق دیتی ہے، حقیقت میں اسلامی نہیں ہے اور ہر وہ چیز جس کی انسان اپنے لئے خواہش کرتا ہے کبھی اس پر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ تم پانچ طرح کے لوگوں سے اپنے تئیں بچاؤ جو حقیقت میں اناس کی منزل میں ہیں۔ ایک بے حیا صوفی سے جو رفع تکلیف کے لئے حیلہ کرتا اور اپنے مجازی امور میں توقف نہیں کرتا۔ دوسرا جھگڑالو معقولی جو شکوک و اوہام کے فتنے پھیلاتا اور خدا کا منقاد و مطیع نہیں ہوتا ہے۔ تیسرا شیخی خور افقیہہ جو مردہ اقوال پر خوش ہوتا اور جس کی نبیؐ نے اپنی امت کے لئے توضیح کی ہے اس کی پیروی نہیں کرتا۔ چوتھا خشک زاہد جو دین میں اس درجہ سختی اور تشدد کرتا ہے کہ گویا اسے کسی بارہ میں اجازت ہی حاصل نہیں۔ پانچواں سرکش مالدار جو تکلف و بناوٹ کے ساتھ عجمیوں کی ہیئت اختیار کرتا اور ان کے ہم نوالہ ہم پیالہ ہونے کو دوست رکھتا ہے۔ والسلام۔

نواں خط

(شیخ عارف جناب شیخ ولی اللہ کی طرف سے شیخ محمد عاشق کو)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اس منعم خدا کو تعریف ہے جو فضل و کرامت کا مالک اور اپنی تمام نعمتوں پر بزرگ ہے۔ منجملہ ان نعمتوں کے ایک آپ کی سلامتی ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کو ہمیشہ عافیت سے رکھے اور تمہاری آرزوئیں اپنے فضل سے بھر لا دے بلکہ ان چیزوں پر کامیاب کرے جن کا خطرہ بھی کسی آدمی کے دل پر نہ ہوتا ہو اور یہ خدا کے نزدیک کچھ مشکل نہیں ہے۔ ایک زمانہ دراز کے بعد آپ کا خط آیا اور اگرچہ بظاہر ہم تم سے دور ہیں لیکن حقیقت میں ہر جگہ تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم ان دنوں میں خدا کی تقدیر سے رسالہ "قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین" ایک ایسے بسط کے ساتھ لکھ رہے ہیں جو اس کے مناسب ہے۔ گو اس کا اندازہ دس جزو کے قریب کیا گیا ہے لیکن اب تک پانچ جزو کی تکمیل ہوئی ہے۔ خدا کا احسان ہے کہ اس نے اس رسالہ کی تحریر پر ہماری ہمت جمع کر دی اور اس کے مناسب علوم الہام کیے۔ ہم خدا تعالیٰ سے التماس کرتے ہیں کہ جس طرز روش سے یہ شروع ہوا ہے اسی پر اس کا خاتمہ ہو اور ہمیں بجز خدا کی مدد کے گناہ و لغزش سے بچنے اور نیک کام کرنے کی قوت نہیں ہے۔ مکرر آنکہ فرزند رشید عبدالرحمٰن مع اولاد کے بخیر و عافیت پہنچے اور ہم نے اس سے بہت اچھی طرح ملاقات کی۔ وہ آج کل ہم سے "الفوز الکبیر" پڑھ رہے ہیں۔ کچھ حصہ تو پڑھ چکے ہیں اور باقی کی نسبت

امید ہے کہ اسی طرز کے ساتھ پڑھ کر ختم کریں۔ انشاء اللہ تعالیٰ والسلام۔

دسواں خط

(شیخ استاد عارف باللہ شیخ ولی اللہ کا خط فاضل علامہ مخدوم معین الدین سندی کے نام)

خدا تعالیٰ ہمارے مکرم و معظم اور ہمارے محترم و بزرگ مخدوم برادر پر نگاہ کرم رکھے جو تمام کمالات کو جامع اور غایات میں سب سے آگے نکل جانے والا ہے اور جیسا کہ اس کا نام ہے سنت و دین کا معین و مددگار اور علم یقین کے خزانوں پر امین مقرر کرے۔ اس کے بعد فقیر ولی اللہ عفا اللہ عنہ تمہیں سلام پہنچاتا اور اوقات مقبولہ میں تمہارے لئے دعا کرتا ہے۔ تم نے جو مجھ سے سورت کے بندر اور پھر وہاں سے کسی اور مقام پر سفر کر جانے کی بابت مشورہ لیا ہے تو گزارش یہ ہے کہ میں حج بیت اللہ اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے قصد سے کبھی باز نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ اگر کسی وجہ سے وطن سے نکلنے کا اتفاق ہو جائے تو پھر ان دونوں متبرک مقامات کے علاوہ اور کہیں کا قصد کرنا لائق نہیں ہے اور تم نے جو قلت خرچ اور کمی زاد کی نسبت لکھا ہے تو خدا پر بھروسہ کرو اور اپنی تمام مہمات کی باگ اس کے ید قدرت میں دے دو اور جملہ کام اسے سونپ دو۔ جو کچھ پاس رکھتے ہو خرچ کر ڈالو اور مال کے تھڑ جانے کا اندیشہ نہ کرو۔ وطن کی طرف مراجعت نہ کرنے پر جو تم نے عزم بالجزم کر لیا اس پر اصرار و ہٹ نہ کرو حتیٰ کہ خدا تعالیٰ تمہارا یا تمہارے لئے کسی اور شخص کا سینہ کھول دے۔ اول و آخر خدا کا شکر ہے۔

شاہ صاحب کے مکاتیب و خطوط کا جس قدر مجھے انتخاب کرنا تھا کر چکا۔ اب میں صرف آپ کا ایک وہ خط اور نقل کرتا ہوں جو آپ نے فاضل اجل مولنا عبدالقادر جونپوری کے جواب میں وحدت وجود کی بحث میں لکھا تھا۔ اس خط کے نقل کرنے سے علاوہ ادب و انشا اور زور تقریر اور شیوا بیانی کے ناظرین کو یہ بھی دکھانا منظور ہے کہ آپ کو تصوفی تحقیقات میں کس درجہ کا اقتدار تھا اور اس خاص علم کو آپ نے کس عروج پر پہنچا دیا تھا۔ اور چونکہ شاہ صاحب کے اس علمی تبحر اور پُر زور تحریر کا اندازہ کرنا بغیر اس کے کہ مولنا عبدالقادر کا خط بجنسہ نقل کیا جائے بہت مشکل ہے لہٰذا میں اول مولنا موصوف کا خط نقل کرتا ہوں اور اس کے بعد شاہ صاحب کا جواب درج کروں گا۔ یہ دونوں خطوط ادبی ہونے کے علاوہ ایک ایسے خاص مسئلہ سے تعلق رکھتے ہیں جس کے مذاق سے بہت کم لوگ واقف ہیں اس لئے ان کا ترجمہ کرنا اول تو تکلف سے خالی نہیں اور اگر ترجمہ کیا بھی جائے تو افسوس ہے کہ پڑھنے والے فائدہ نہیں اٹھا سکتے چنانچہ میں دونوں خطوط بجنسہ نقل کر کے اس عنوان کو ختم کرتا ہوں۔

جامع الفضائل کریم الشمائل مولنا عبدالقادر جونپوری کا خط بنام

عارف باللہ جناب مولنا شاہ ولی اللہ صاحب

من الفقير الفاقر محمد عبدالقادر الى النقى اللقى ولى الله العلى. يامن لعل به سيرا يبلغه.

دارالخلافة بلغ حين تاتيها. منى السلام مازال مبتغيا. من المشوق الى نفس يواليها. الى مقيم بها قد زادها مقرغا. ورفعة حين يدعىٰ من اهاليها. ذلك الولى الرضى العالم العلم. المحيى المكارم باديها و خافيها. اشتاقة اذنى والعين فاقده. لطول اثاره اوكتب داعيها. على بيلغنك والشوق مفترنا. بهمة منك تاتينى دوا عيها. من العبد الدثور الغير المعلوم والمذكور الفقير الفاقر محمد عبدالقادر بعض من خمر من تربته جو نفورماء ها و عمر سبعا و عشرين حجة بمائها وهوائها الى ذلك الامام الهمام الجرالعلام النقى اللقى ولى الله العلى طول الله سبحانه تعالىٰ بقاء ہ و عجل لى لقاء ہ اما بعد الهدية الزكية السلام والتحية والاذاب المرضية فان التواذبين الاحادو التعارف بين الافراد لاينبغى ان يحصر فى المشاهدة بالاعين اوان تقتصر على المكالمة بالالسن كيف وقد حشاء الاحشاوى فى مابين الاعضا ماقد قرع الاسماع منكم من المكارم والمحاسن و بلغ الاذان من محامد الظاهر والباطن حتىٰ احب ان يكون منے قبل ان انال بركة الملاقات و افوز بسعادة المرافات شئى من المكاتبة والمراسلة التے قد تعد نوعا من المواصلة و لعل ذلك قد يكون سببا للانجداب والله سبحانه مسبب الاسباب ثم انه مع كثرة مايشوقنى والى من اها جو اليكم يسوقنى انما يعوق عن ذلك مايذوق المرء من تطاول المنازل وتباعد المراحل و لعلى اذاشاء الله سبحانه وهيا الاسباب اركب غارب مطية الاعراب و اطلب بركة الوصال والصحاب ولا تقصرالان على هذا القدر واتبعه بسوال مالا زال يحالخ الصدرفا قول اماالتوحيد المتعلق بوجود الوجوب بمعنى ان الوجوب بالذات مختص بذات واجد لايمكن ان يكون محمولا على اثنين وان يكون الحقيقة والرجبية مشتركة بين فردين و المتعلق بالفعل والتاثر بمعنى انه الموثر فى الوجود الاعم من ان يكون بغير واسطة اوبها فان ذلك ليس من توحيد المؤثر فى شئى بل بمعنى انه لاموثر فى الوجود الا هو فيتعلق بكل ارادته و قدرته على مرجب علمه و حكمته بيده ازمة الاشياء ولايجرى فى ملكه الامايشاء وانما غيره مماله مدخل فى وجوه الشئے مما ينضم فى سئلك القوابل والشرائط من غيران يقيص منه وجود و يصدرمنه فعل و كذالمتعلق بالذات بمعنى ان ذوات الممكنات بخدا يغرها و ذرات المجعولات بنقيرها و قطميرها هالكة فى شيخ جوهرها باطلة فى حد انفسها فلولا فيض الواجب سبحانه لم يكن هناك ذات ولم يعقل ماهية وانما تقررها و تصدرها وصلوحهاللحكم عليها وبها بالنظر الى تلك الذات الواجبة المنبث فيضها الممتد ظلها الم ترالى ربم كيف مدالظل ولوشآء لجعله ساكنا كل ذال امر معقول مصدق به و مقبول واما مايزمزم به العارفون و يترنم به المكاشفون فهل للعقل اليه سبيل اويمكن ان يدل عليه دليل و هل يقول من قال ان الله تعالىٰ هوالوجود المطلق وانه اظهر الاشياء وهو عينها مفهوم معقول اوانه طور وراء طور العقل ثم ماذا بمعنى قول من يزعم انه طوروراء طور العقل اوليس للعقل احكام صادقة وقضا يا حقة لايمكن ان يتبدل ولا يتصور ولا

ان یتزلزل ام للعقل واحکامه خدمعین اذ جاوزناه فلیس له هنالك حکم سبحان الله کیف یصدق بمثل هذا اذلولا للعقل احکام مضبوطة غیر ممکنة التبدل ولا جائزة التزلزل لماقامت السمٰوٰت والارضون و قدرجع هذا القول الی مثل ما یقول العمی الصم من الوفسطائیة الدون فالمطلوب منك ایها الباقی من اثارالسلف والمرجو من له یك ایها الراقی کا شرف ان توطن نفسی و تسکن قلبی عما هما فیه من هذه المسئلة من القلق البالغ والخفق السائع بالخبر المنقح فی ذلك المحقق لدی بالك فلعلی انتفع و قلبی تنتفع و تجتمع ولعلك توجرو تجزی و عندالله الاخرة والاولیٰ ثم انه ان اکرمتنی بکتابك و بلغتنی الاذن فی جنابك فلعلی اجرأ علی ارسال العرائض والاستفادة من عندك مایفیض الفائض البقیت طویلا واوتیت جزیلا۔"

والسلام۔امام ہمام حبر علامہ مولٰنا شاہ ولی اللہ صاحب کا خط مولٰنا محمد عبدالقادر جونپوری کے جواب میں۔

شاہ ولی اللہ صاحب کا جواب

اهلاً لملفو فذاضحت معا لمها. تهدی الی شئی من نورتا تیها. جرلدهمة علویة قضت. کل المقاصد دانیها و قاصیها. فلا یغادر علما غیر مکتسب.ولا فضائل ا لا وهو حاویها. من جونغور اذهیت ریاح رضی. منها تعطرت الدنیا وما فیها. من الفقیر الی رحمة الله الکریم احمد المدعو بولی الله بن عبدالرحیم الی جامع الفضائل کریم الشمائل مولٰنا عبدالقادر لازال لمطوحاً به فی الباطن والظاهر اما بعد فقد وصل الی مکتوبکم الشریف الدال علی مخبرکم المنیف یعرض علی مسئلة حارت فی بوادیها الافکار و تقاعست دونها الا نظار وکیف لی بجوابها فی ورقة اوحلها فی کلمة لکنی اذکر نکتة قولکم فی تقریر المعنی الثالث للتوحید ان ذوات الممکنات بهذا فیرها و ذرات المجعولات بنقیر و قمطیرها لله فی شیخ جوهرها باطلة فی حد انفسها فلولا فیض الواجب لم یکن هناك ذات ولم بعقل ماهیة وانما نقررها وتصدرها وصلوحها للحکم علیها وبها بالنظر الی تلك الذات المنیث فیضا الممتد ظلهاانتهے هو بعینه معنے وحدة الوجود عندالمحققین من اهل المعرفة و الشهود غیران الناس لهم السنة شتی بعضها من قبیل النجوز والمسامحة و بعضها من قبیل التحقیق والمفاتحة عبارا تناشتی وحسبك واحد وکل الی ذلك الجمال بشیر فهذا الفیض الوصدا فی بالذات المتکثر باعتبار القوابل یسمے بالفیض القدس من جهة صدرالماهیات وبالفیض المقدس من جهة صدور العقلیات ولوازم الوجود الخارجی. اما قولهم هوالوجود المطلق فلا یعلون بالمطلق الامراالمنتزع عن الافراد کما یقرره المتکلم فی الکلیات ولاالموجود فی ضمن الافراد ولا باستقلال کمازعمه الحکیم ولکن امراً هو متحقق فی نفسه متعین بذاته استوت نسبة الی الممکنات باثرها والعقل مقول علی معینین احدهما النفس الناطقة وکل معزقد فانماهے قائمة

بالنفس حاصلة لها وثانيهما قواعد اسسها قوم اشتغلوا بالعلوم العقلية ورب دقيقة فاقت تلك القواعد و بعد فان الحالة الراسية لاكثر من هذا وعسى ان يكون بعد ذلك عودو المرجومن مكارم اخلاقكم ان لا تنسونا من مصالح دعواتكم ولا من لطيف مكاتباتكم. فالمكاتبة نوع من الاستصحاب والعبرة بمناسبة الارواح لابمقارنة التراب احسن الله تعالیٰ اليكم وافاض نعمته عليكم والسلام.

بالغ اور غائر نظریں ان دونوں خطوں کا موزانہ کر کے بخوبی اندازہ کر سکتی ہیں کہ ہمارے مولنا ممدوح کا خط کس درجہ فصاحت و بلاغت سے لبریز ہے اور فصاحت و بلاغت سے قطع نظر کر کے کتنا مطلب خیز ہے۔ باوجود اس اختصار کے ایک ایسا اہم اور پیچیدہ مسئلہ جس کے حل کرنے کے لئے چند اجزا بھی کافی نہیں ہو سکتے تھے آپ نے کس سہولت اور آسانی کے ساتھ پانی کر دیا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس درجہ کا تبحر اور کمال اس فن خاص میں آپ کو حاصل تھا اس کی نظیر کہیں مل نہیں سکتی۔

وحدۃ الوجود کا مسئلہ ایک ایسا دقیق اور پیچیدہ مسئلہ ہے کہ اگر اس پر کوئی اور شخص بحث کرتا تو اسے چند اجزا سیاہ کرنے پڑتے اور پھر بھی شاید صاف طور پر مطلب واضح نہ ہوتا۔ یہ حقیقت میں شاہ صاحب کا اعجاز ہے کہ آپ نے اس طولانی اور غیر محدود مبحث کو چند چھوٹے چھوٹے جملوں میں اس طرح ادا کر دیا کہ گویا کوئی بڑا کام ہی نہ تھا۔ پھر طرفہ یہ کہ جو جملہ آپ کے قلم سے نکل رہا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سانچے میں ڈھل کر نکل رہا ہے۔ ہر ہر فقرہ تصوفی تحقیقات سے بھرا ہوا الفاظ کی بندش اور عبارت کی چستی سے جس قدر عالمانہ پن برستا ہے اسی قدر مطالب کی خوبی سے آپ کی شان ظاہر ہوتی ہے۔

جناب شاہ ولی اللہ صاحب کی بعض تصنیفات

جناب عارف باللہ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کی تصنیفات جو زمانہ کی ضرورتیں رفع کرنے کے لئے نہایت ہی دلچسپ اور عمدہ پیرایہ میں خاص خاص موقعوں پر لکھی گئی ہیں۔ وہ آپ کی بے نظیر اور محسوس یادگاریں ہیں۔ کسی کا یہ قول بہت درست ہے ''ہر کسے را بہر کارے ساختند'' فطرت نے جناب شاہ صاحب کو اسی لئے پیدا کیا تھا کہ آپ زبان و قلم دونوں سے دینی علوم کی اشاعت کریں اور ان بنی نوع کی اصلاح میں نہایت سرگرمی کے ساتھ کوشش کریں جو ایک زمانہ دراز سے شرک و بدعت اور پیر پرستی اور مادہ تقلید کے تیرہ و تاریک گڑھے میں پڑی ہوئی تھی۔ آپ کی لائف بغور دیکھنے والا خوب سمجھ سکتا ہے کہ بچپن سے وقت وفات تک دینی علوم کے رواج دینے اور قرآن و حدیث کے پھیلانے میں جس شخص کی زندگی صرف ہوئی اور جس کی قسمت میں روز ازل سے یہ شرف مقدر ہو چکا تھا وہ شاہ ولی اللہ صاحب جناب شیخ عبدالرحیم صاحب کے فرزند رشید اور مشہور شہید شیخ وجیہہ الدین صاحب کے پوتے تھے۔ ہوش سنبھالتے ہی جس خیال نے آپ کو چاروں طرف سے آ گھیرا تھا اور جس کی دھن میں آپ نے اپنی تمام عمر گزار دی تھی وہ یہ ہی دینی علوم کی اشاعت کا خیال تھا۔ قدرت نے پہلے ہی روز سے ترویج علوم اور تالیف و تصنیف کا مقتدر و معزز منصب آپ کے نامزد کر دیا تھا جسے آپ

نے نہایت قابلیت سے نبھایا اور بڑی دلسوزی کے ساتھ اس کا انجام دیا۔

شاہ صاحب کی تصانیف کثرت سے ہیں اور ان کے مطالب و مقاصد نہایت مفید و دلچسپ ہیں لیکن افسوس اور سخت افسوس یہ ہے کہ باوجود تحقیقات کے چند مشہور کتابوں کے علاوہ اور کسی کا پتہ نہیں چلتا۔ تاہم جو کتابیں اس وقت ہمیں دستیاب (7) ہوئیں جنہوں نے ہندوستان و عرب دونوں میں ایک عجیب مذاق علمی پھیلا رکھا ہے ذیل کے نقشہ میں ہیں جن سے ان کے مقاصد و مطالب کی مختصر کیفیت بھی معلوم ہوتی ہے۔ میں ایک فاضل مؤرخ کا وہ مختصر ریمارک جو اس نے شاہ صاحب کی تصانیف پر کیا ہے، نقل کر کے ان مشہور کتابوں کا نقشہ (8) دیتا ہوں جو اس وقت میری پیش نظر ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ''جناب شاہ ولی اللہ صاحب نے اکثر فنون میں کتابیں تصنیف کی ہیں جو زمانہ کی ضرورت کے لحاظ سے سب کی سب مفید اور منفعت بخش ہیں اور بعض ان میں سے ایسی بے نظیر اور عدیم المثال کتابیں ہیں جن کے وجود سے زمانہ سابق بالکل خالی ہے اور جن کے موجودہ زمانہ میں سخت ضرورت ہے۔''

تفسیر

(1) فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن (فارسی)

یہ قرآن مجید کا ایک نہایت مختصر ترجمہ ہے جو ایک عجیب دلچسپ پیرائے میں لکھا گیا ہے۔ اب تک قرآن مجید کے مطالب کا سمجھنا صرف عربی تفاسیر پر منحصر تھا جسے علما اپنا ہی حصہ سمجھتے تھے اور عوام لوگ کلام الٰہی کا منشاء اور فطرۃ اللہ کا مفہوم سمجھنے سے محض محروم و بے نصیب تھے۔ عموماً مسلمان رمضان میں یا معمولی تلاوتوں میں بالکل طوطے کی طرح سے قرآن پڑھتے تھے اور معنی نہ جاننے کی وجہ سے خداوندی احکام اور آسمانی قوانین سے محض نابلد تھے۔ ایسے وقت میں جناب شاہ صاحب نے قرآن مجید کے ترجمہ کی سخت ضرورت سمجھی اور اس کا ترجمہ فارسی میں کیا اور لفظوں کی رعایت سے ایسا مطلب خیز ترجمہ کیا کہ عام لوگوں کو کلام الٰہی سمجھنا بہت آسان ہوا۔ قطع نظر اس کے مطالب کی توضیح کے لئے جابجا نہایت مختصر فوائد چڑھائے۔

بڑے بڑے معرکۃ الآرا مضامین اور نہایت اہم اور دقیق مطلب چند مختصر اور گنتی کے الفاظ میں اس خوبصورتی اور جامعیت کے ساتھ ادا کیے ہیں۔ انہیں ایسا صاف اور پانی کر دیا ہے جس سے نہ صرف تعجب بلکہ سخت حیرت ہوتی ہے اور زیادہ حیرت یوں ہوتی ہے کہ جب کسی آیت کی تفسیر عربی تفاسیر میں دیکھی جاتی ہے تو باوجودیکہ وہ اس کے متعلق ایک نہایت طولانی بحث کرتے اور صفحات کے صفحات سیاہ کر جاتے ہیں، مگر پھر بھی ویسا صاف مطلب نہیں کھلتا جیسا شاہ صاحب کے معدود لفظوں سے کھلتا ہے۔

باوجودیکہ اس ترجمہ کی عمر ڈیڑھ سو برس سے زیادہ ہوگئی ہے اور زمانہ میں علوم و فنون بالخصوص ترجمے کی اشاعت کا دریا بڑے زور شور سے لہریں مار رہا ہے۔ لیکن اس ترجمہ پر آج تک کبھی کسی کو دم مارنے کی طاقت نہیں ہوئی اور جس

طرح خود قرآن مجید فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک عظیم الشان معجزہ ہے اسی طرح یہ ترجمہ جناب شاہ ولی اللہ صاحب کی ایک بہت بڑی معجز نما کرامت ہے اور جس طرح قرآن مجید جیسی ایک آیت بنالانے کی کوئی شخص طاقت نہیں رکھتا اسی طرح اس ترجمہ کی برابری کا کوئی دعویدار نہیں ہوسکتا اور اگر بفرض محال دعویٰ کرے بھی تو اس کا یہ دعویٰ چل نہیں سکتا۔

ہندوستان میں اس وقت فلسفہ اور معقول کی بڑی گرم بازاری تھی اور قرآن و حدیث کا چرچا نہایت دھیما تھا۔ عام و خاص پیر پرستی کی پیچ در پیچ بھول بھلیوں میں حیران و سرگرداں تھے۔ اسلام شرک میں گھی کھچڑی ہو رہا تھا اور مسلمان صدہا قسم کے توہمات میں گرفتار تھے۔ شرک و بدعت کا ایک عظیم الشان اور طوفان خیز سمندر چاروں طرف بہہ رہا تھا جس کی خوفناک موجیں اور دہشت انگیز لہریں اسلام کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہی تھیں۔ اس وقت خدا کے برگزیدہ اور اسلام کے سرپرست یعنی جناب مولنا شاہ ولی اللہ صاحب نے قرآن کا ترجمہ کر کے شرک و بدعت کی عمارت کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ پھینکا اور قرآن و حدیث کی اشاعت میں اس درجہ کوشش کی کہ ہوا کا رخ ادھر سے اُدھر پلٹ رہا تھا۔

حقیقت میں اگر قرآن مجید کا ترجمہ اس حادثہ زا زمانہ میں نہ ہوتا تو مسلمانوں کی معاشرانہ زندگی میں جو اصلاح ہوئی ہے، کبھی نہ ہوتی اور معلوم نہیں کہ مسلمانوں کو کن کن سختیوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ ان پر مصائب و آفات کے کس قدر لشکر لوٹتے اور کیا کیا غضب الٰہی نازل ہوتے۔ اس وقت ہندوستان میں جہاں سے جہاں تک سچے اسلام کی روشنی نظر آتی ہے اور شرک و بدعت سے صاف اور نتھرا ہوا مذہب دکھائی دیتا ہے سب اسی ترجمہ کا صدقہ ہے۔

این کار از تو آید و مردان چنیں کنند

ہندوستانی مسلمانوں پر شاہ صاحب کا یہ احسان اس قدر گرانبار ہے جس سے وہ گردن اٹھا نہیں سکتے لیکن افسوس اور سخت افسوس سے دیکھا جاتا ہے کہ مسلمانانِ ہند نے اس احسان کا آج تک کوئی مناسب شکریہ ادا نہیں کیا۔ یہ ترجمہ قرآن مجید کے بین السطور میں تحریر ہو کر ہزاروں دفعہ ہندوستان کے مختلف مطابع اور متعدد پریسوں میں چھپ چکا ہے اور اس کی شہرت دریائے جمنا سے فرات تک اور ہندوستان سے لے کر کوہ ہمالیہ اور ہندوکش کے دروں تک برابر پھیلی ہوئی ہے۔ اس وقت تک اس کی اشاعت اسی نوے لاکھ کے قریب ہو چکی ہے اور روز بروز ہوتی جاتی ہے۔ اشاعت کی موجودہ تعداد سے اس کی مقبولیت عام کا پورا پورا اندازہ ہوسکتا اور صاف واضح ہوتا ہے کہ تمام اسلامی دنیا اسے نگاہ قبول سے دیکھ چکی ہے اور موجودہ علماء و فضلاء کی قبولیت کی نظریں برابر پڑ رہی ہیں۔ (9)

(2) الفوز الکبیر فی اصول التفسیر (فارسی)

یہ ایک بہت ہی چھوٹا سا رسالہ ہے جو اصول تفسیر میں لکھا گیا ہے لیکن باوجود اس قلیل الحجم ہونے کے اس درجہ مطالب خیز ہے جس کے دیکھنے سے تعجب اور تعجب کے ساتھ سخت حیرت ہوتی ہے کہ اصول تفسیر کے عمیق اور گہرے دریا کو اس مختصر کوزے میں کس طرح بند کیا گیا ہے۔ اصول تفسیر کے وہ اہم اور پیچیدہ مباحث جو بڑی بڑی کتابوں سے بمشکل حل ہوسکتے تھے شاہ صاحب نے ایسی مختصر اور سہل عبارت میں طے کر دیئے ہیں جس سے کم استعداد طلبہ بھی خاطر خواہ متمتع ہو

سکتے اور معتد بہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ عبارت کی عمدگی اور مطالب کی دلچسپی پر مؤلف کو جتنا بھی ناز ہو کسی طرح نازیبا نہیں ہے۔ جس مقام سے کتاب کو اٹھا کر دیکھا جاتا ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مضامین کا ایک دریا امڈا چلا آتا ہے۔ ہر ہر فقرے سے جس قدر عالمانہ پن برستا ہے اسی قدر مطالب سے مؤلف کی شان ٹپکتی ہے۔ سچ پوچھیے تو اس مختصر رسالے نے بڑی بڑی تفاسیر کے دیکھنے اور برسوں کے مطالعہ کرنے سے شائقین کو مستغنی کر دیا ہے۔ (10)

(3) فتح الخبیر (عربی)

یہ رسالہ عربی زبان میں نہایت لاجواب اور اعلیٰ درجہ کا لکھا گیا ہے۔ قرآن مجید کے مشکل و غریب لغات سہل اور متعارفہ الفاظ میں حل کیے گئے ہیں اور جا بجا قرآنی آیات کی تفسیر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح و مشہور احادیث اور صحابہ کرام کے مستند اقوال سے کی گئی ہے۔ یہ ایک ایسی ضروری کتاب ہے جس سے قرآن مجید کے معانی پڑھنے والے کو انتہا سے زیادہ مدد ملتی ہے اور وہ بآسانی قرآن مجید کے مطالب سمجھنے پر حاوی ہو جاتا ہے۔

حدیث (11) وفقہ الحدیث

(4) مصفٰے شرح مؤطا (فارسی)

مؤطا حدیث کی ایک مختصر مگر نہایت معتبر اور مستند کتاب ہے، جسے امام (12) مالکؒ نے ہجرت کی دوسری صدی میں تصنیف کیا ہے۔ جناب شاہ ولی اللہ صاحب نے اس کی ایسی عمدہ شرح لکھی ہے جس سے اصل کتاب کی رونق دوبالا ہو گئی ہے۔ حدیث کی تحقیقات اس تبحر و لیاقت سے کی ہے جس سے آپ کا مجتہدانہ کمال صاف نمایاں ہوتا ہے۔ جو لوگ اس شرح کو ایک دفعہ بنظر غور اول سے آخر تک پڑھ جاتے ہیں پھر انہیں احادیث کی تحقیقات میں زیادہ محنت کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مصنف کو حدیث و فقہ پر کس درجہ عبور اور استخراج مسائل میں کتنا تبحر تھا۔

(5) عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید (عربی)

یہ بھی ایک چھوٹا سا رسالہ عربی زبان میں لکھا گیا ہے، جس کا نام خود بتا رہا ہے کہ اس میں بھی انصاف کی طرح اجتہاد تقلید کے احکام نہایت تفصیل و توضیح کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ آخر میں اس کا اردو ترجمہ بھی ہو گیا ہے جس کی وجہ سے تھوڑی سی استعداد کا آدمی بھی اس سے ویسا ہی فائدہ اٹھا سکتا ہے جیسا ایک مستعد عربی خوان۔

(6) تاویل الاحادیث (عربی)

اس کتاب میں جناب شاہ صاحب نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے

زمانہ مبارک تک کے ان تمام انبیاء علیہم السلام کے قصص بیان کیے ہیں، جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے اور اس کے ساتھ ہی ان حوادثات کے وجوہ بطریق رموز بیان کیے ہیں جو انہیں پیش آئے۔ بالغ نظریں اس کتاب کو دیکھ کر شاہ صاحب کے تبحر کا پورا پورا اندازہ کر سکتی ہیں۔

(7) چہل حدیث (عربی)

اس چھوٹی سی کتاب میں شاہ صاحب نے وہ حدیثیں جمع کی ہیں جو اسلام کی مدار علیہ ہیں۔ اگر چہ اس نام کی اور نہ صرف نام بلکہ اس مضمون کی چند کتابیں اور علماء نے بھی لکھی ہیں جو آج ہمارے پیش نظر ہیں لیکن جب ان میں اور اس میں صحیح اندازہ اور پورا موازنہ کیا جاتا ہے، تو آسمان وزمین کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ شاہ صاحب نے نہایت مختصر مختصر حدیثیں جو ہر شخص کے لحاظ سے مفید اور سودمند ہیں درج کی ہیں اور تمام مضامین کا احاطہ کر لیا ہے۔ سچ پوچھیے تو آپ نے اہل اسلام کی سچی ہمدردی و خیر اندیشی مدنظر رکھ کر وہ کام کیا ہے جو ایک اعلیٰ درجہ کا مقتدائے قوم اپنی عزیز قوم کے لئے نہایت دلسوزی کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ مضامین سے قطع نظر کر کے اس کی حسن نظمی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

(8) مسویٰ شرح موطا (عربی)

یہ بھی موطا کی شرح عربی میں ہے۔ اس میں مؤلف نے اپنی خداداد قابلیت کا جو کمال دکھایا ہے اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور ہر ہر فقرہ اور جملہ کی اس عمدگی اور سہولت سے توضیح کی ہے جس سے شارح کی خود بخود تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اصل میں مسویٰ کو بجائے خود ایک مستقل کتاب کہنا چاہیے۔ کیونکہ اس میں علاوہ موطا کی حدیثوں کی تفصیل و توضیح کے بہت سے مسائل فقہیہ کی تشریح کی گئی ہے۔ الغرض مسویٰ ایک ایسی بے نظیر اور قابل قدر شرح ہے جو طالب علم کو اس مرتبہ کا بنا دیتی ہے کہ وہ حدیث کے مطالب پر پورا عبور حاصل کرے۔ (13)

(9) حجۃ اللہ البالغہ (عربی)

یہ ایک ضخیم کتاب ہے جس میں تمام عبادات و معاملات نہایت بسط و شرح کے ساتھ محققانہ طرز میں بیان کیے گئے ہیں اور فقہا و محدثین کے اختلاف مذاہب کو نہایت عمدگی اور خوش اسلوبی سے ظاہر کیا گیا ہے۔ مسائل فقہ، مذاہب اربعہ، یعنی حنفی، شافعی، حنبلی، مالکی کی تحقیقات مذاہب صحابہ و تابعین اور اقوال جماعہ فقہا و محدثین سے کر کے فقہ حدیث کی بنیاد از سرنو قائم کی ہے اور اسرار حدیث اور مصالح احکام ایسی خوبی اور سلیقہ شعاری سے بیان کیے ہیں جس کی نظیر سے متقدمین مصنفین کے حلقے خالی ہیں۔

یہ کتاب یوں تو فقہ و حدیث کے متعلق لکھی گئی ہے لیکن حقیقت میں فقہ، حدیث، اخلاق، تصوف، فلسفہ پانچوں مضامین کا مذاق پایا جاتا ہے۔ گویا ان پانچوں علوم کا عطر و مغز اس کتاب میں بھر دیا گیا ہے۔ پہلا وہ باکمال اور مجتہد وقت جس نے علوم دین کے اسرار بیان کرنے میں اپنی خداداد قابلیت اور پولیٹیکل لیاقت کے چمکدار جوہر ظاہر کیے اور مضامین

خمسہ کی عمارت کی بنیاد ڈالی وہ امام غزالی ہیں۔ ''احیاء العلوم'' جو ایک نہایت جامع اور بسیط کتاب ہے اور جو سات سو سال سے لوگوں کے افتخار کا باعث ہو رہی ہے، آپ ہی کی ایک عظیم الشان محسوس یادگار ہے اور دوسرا بزرگوار جس نے ایک زمانہ دراز کے بعد اپنے زمانہ کے حال کے مناسب اور اہل زمانہ کے مذاق کے مطابق اس فن کی تہذیب و آراستگی اور اہل زمانہ کے مذاق کے مطابق اس فن کی تہذیب و آراستگی کی اور امام غزالی کی ڈالی ہوئی بنیادوں کو اپنے علمی تبحر سے بلند کیا اور پھر اس عمارت کو تہذیب و شائستگی کے مرقعوں سے سجایا۔ وہ جناب عارف باللہ حضرت مولٰنا شاہ ولی اللہ صاحب ہیں۔ آپ کی بے نظیر و عدیم المثال کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' اس وقت ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ جس سے ایک فقیر مسائل فقہیہ کو اور محدث مطابقت حدیث کو اور فلسفی دلائل فلسفہ اور براہین عقل کو نکال سکتا ہے اور اسی خوض و غور میں ساتھ کے ساتھ اسے اخلاق و تصوف کا ذائقہ بھی حاصل ہوتا رہتا ہے۔ یہ کتاب اگرچہ بمقابلہ ''احیاء العلوم'' مختصر ہے، لیکن تنقید احادیث میں اس سے بدرجہا بڑھی ہوئی ہے۔ علامہ ابوالطیب نے اس کی نسبت اپنی وزنی رائے اس طرح ظاہر کی ہے۔ ''ایں کتاب اگرچہ در علم حدیث نیست اما شرح احادیث بسیار دراں کردہ و حکم و اسرار آں بیان نمودہ تا آں کہ در فن خود غیر مسبوق علیہ واقع شدہ و مثل آں دریں دوازدہ صد سال ہجرت ہیچ یکی از علمائے عرب و عجم تصنیفے موجود نیامدہ و منجملہ تصانیف مولفش سابق (کذا) بودہ است و فی الواقع بیش ازاں ست۔'' یعنی کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' اگرچہ علم حدیث میں نہیں ہے۔ لیکن اس میں بہت سی حدیثوں کی شرح اور ان کے اسرار و احکام بیان کیے گئے ہیں، حتیٰ کہ اپنے فن میں بے نظیر ثابت ہوئی ہے اور کسی اور کتاب کو کسی طرح اس پر سبقت نہیں ہوئی۔ زمانہ ہجرت سے لے کر اس وقت تک کہ بارہ سو سال ہو چکے ہیں۔ علمائے عرب و عجم میں کسی کی ایسی لاثانی تصنیف موجود نہیں ہے۔ غرض کہ یہ کتاب مولف کی تمام تصانیف میں عمدہ اور بہتر تصنیف ہے اور حقیقت میں اس سے بہت کچھ زیادہ ہے۔

(10) انصاف فی بیان سبب الاختلاف (عربی)

یہ ایک مختصر رسالہ درحقیقت اس بیہودہ شور و شر کو مٹانے کے لئے لکھا گیا ہے، جو صدیوں سے علماء میں تقلید و غیر تقلید کی بابت پڑا ہوا تھا اور اس اختلاف کی یہاں تک نوبت پہنچ گئی تھی کہ ایک گروہ صرف اس فروعی اختلافی مسئلہ کی وجہ سے دوسرے فریق کو کافر کہتا اور اسلام کے دائرہ سے خارج بتاتا تھا۔ جو شخص کسی امام خاص کا مقلد تھا، وہ اس شخص کو جو کسی کی تقلید نہ کرتا تھا کھلم کھلا کافر کہتا اور اسلام سے خارج شمار کرتا تھا۔ اسی طرح غیر مقلد، مقلد کو کافر سمجھتا تھا۔ جناب شاہ ولی اللہ صاحب نے اس طوفان بے تمیزی اور ہولناک غلط فہمی کو چند فقروں میں اڑا دیا اور تقلید و مجتہد کے اقسام بیان کر کے صاف صاف کہہ دیا کہ جو شخص محض امی اور ان پڑھ ہے اس کے لئے تقلید جائز ہے اور جو شخص پڑھا لکھا ہے وہ اگر کسی خاص شخص کی تقلید نہ کرے تو کوئی گناہ نہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی امام کے اجتہادی خطا میں تقلید کرے، تو یہ تقلید محض حرام ہے۔ حقیقت میں تقلید و غیر تقلید کا مسئلہ ایک ایسا فضول اور بے نتیجہ مسئلہ ہے جس میں بجز تضیع اوقات کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کا خاتمہ ائمہ اربعہ یعنی امام اعظم، امام مالک، امام شافعی، امام حنبل پر ہو گیا ہے اور ان میں سے ہر مجتہد بجائے خود وحی کا بازگشت بنا ہوا ہے اور خطا سے بالکل پاک ہے، ان کا یہ خیال ایک مجنونانہ بڑ سے زیادہ

وقعت نہیں رکھتا۔ بھلا وہ کون سا امام اور مجتہد ہے جس کی رائے میں خطا و صواب دونوں کا احتمال نہ ہو۔ یہ خیال کرنا محض لغو فضول ہے کہ فلاں مجتہد نے استنباطی مسائل میں کبھی غلطی ہی نہیں کی بلکہ یہ ایک ایسا بدیہی جھوٹ ہے جس کی کوئی حد نہیں۔

جب ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے میں خطا اور صواب کا احتمال باقی ہو اور آپ صاف لفظوں میں یوں فرماتے ہوں کہ انتم اعلم بامر دینا کم یعنی کہ دنیاوی معاملات میں تم لوگ میری رائے پر مطمئن نہ رہنا بلکہ خود بھی اچھی طرح سمجھ لینا کیونکہ ممکن ہے کہ میری رائے خطا پر ہو اور اس کی وجہ سے تمہیں کچھ نقصان پہنچے البتہ دینی معاملات میں تمہاری رائے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اس بارہ میں مَیں سوائے وحی کے کوئی ناطق حکم نہیں دے سکتا۔ پس جب پیغمبر صاحب کی یہ کیفیت تھی، تو امام اور مجتہد کس شمار میں ہیں۔

الغرض ''انصاف فی بیان سبب الاختلاف'' میں جناب شاہ صاحب نے اس امر کو نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے کہ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ تامہ کی موجودگی میں اقوال فقہا کچھ بھی وقعت و قدر نہیں رکھتے۔ جب کسی کے پاس کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ موجود ہو تو ان کے مقابلہ میں کسی امام یا مجتہد کی تقلید کرنا محض حرام ہے۔

اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی ہو گیا ہے جو کشاف کے نام سے شہرت رکھتا ہے۔ امید ہے کہ اردو خواں بھی اس کتاب کے فوائد سے محروم نہیں رہیں گے۔

(11) ارشاد الیٰ مہمات علم الاسناد (عربی)

(12) تراجم بخاری[14] (عربی)

(13) فیما یجب حفظہ للناظر (عربی)

(14) مسلسلات (عربی)

(15) انتباہ[15] فی اسناد حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (عربی)

متعلق خلافت صحابہؓ

(16) ازالۃ الخفاء عن خلافت الخلفاء (فارسی)

یہ ایک مبسوط کتاب ہے جس میں خلفاء اربعہ کی خلافت کے متعلق محققانہ بحث کی گئی ہے۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فاضل اجل مصنف کو حدیث و تفسیر اور تواریخ پر کس قدر عبور اور استخراج مسائل میں کتنا تبحر تھا۔ یہ کتاب جامعیت روایات کے لحاظ سے ایک عجیب و غریب اور نہایت ہی بے مثال کتاب ہے۔

(17) قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین (فارسی)

یہ دس گیارہ جزو کا رسالہ ہے، جسے جناب قدوہ اہل اللہ شیخ الشیوخ حضرت مولنا شاہ ولی اللہ صاحب

نے عین اس وقت تصنیف کے قالب میں ڈھالا جبکہ مذاہب اہل بدعت کی کثرت ہو گئی تھی اور عقائد باطلہ کے طوفان بے تمیزی کا اندھا دھند جھکڑ چاروں طرف بڑے زور شور سے چل رہا تھا۔ حقیقت میں اس وبائی امراض کے زمانہ میں حکیم امت محمدیہ کا یہ نسخہ لکھنا اور موجودہ لوگوں کو روحانی بیماریوں کے مناسب علاج کی مکمل تشریحات کا تیار کرنا سخت ضرور تھا۔

اس کتاب کے مضامین کا خلاصہ یہ ہے کہ جناب شاہ صاحب نے اول ایک ایسی کلی صفت بیان کی ہے جو افضلیت کا دارومدار علیہ ہے۔ زاں بعد یہ ثابت کیا ہے کہ یہ مخصوص صفت جس پر افضلیت کا دارومدار ہے۔ بہ وجہ کمال صرف حضرت شیخین یعنی جناب صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ ہی تھے۔ ان کے سوا دوسرے صحابہ کرام میں نہیں پائی جاتی تھی۔ پھر اس بحث کو یوں ہی نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ نقلی اور عقلی دلائل سے مدلل کیا ہے۔ اس کے بعد حضرات شیخین کے تاثر بیان کیے گئے ہیں اور جو مطاعن کہ مخالف فرقہ کے لوگ ان حضرات پر کرتے ہیں ان کے الزامی و تحقیقی جوابات بڑی دھوم سے دیئے گئے ہیں۔ پھر جس طرح شیخین کے آثر و مطاعن بیان کیے ہیں۔ ویسے ہی حضرات ختنین یعنی جناب عثمان بن عفانؓ اور علی مرتضیٰؓ کے یہی فضائل و خصائل کا ذکر کیا ہے جو حضرات شیخین کی ذات اقدس میں پائے جاتے تھے اور ان مقامات کو ارباب کشف کرامات کے اقوال سے مثالیں دے کر اس طور پر بیان کیا ہے جسے تھوڑی استعداد والے بھی آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ کتاب کے خاتمے میں شاہ صاحب نے اپنا مکاشفہ بیان فرمایا ہے کہ ہم نے شیخین کی ارواح مبارک کو ایسی حالت میں پایا اور دوسرے صحابہ کرام کی ارواح کو اس کیفیت میں اور جب ہم نے اس کا روحانی سوال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پُرفتوح سے کیا تو ہمارے دل پر القا ہوا کہ یہی بات حق اور درست ہے۔ غرضکہ ایک ایسی لاجواب اور بے مثل کتاب ہے جس کی مثال کتب متقدمین میں کہیں نہیں ملتی۔

تصوف اور اس کے متعلقات

(18) فیوض الحرمین (عربی)

اس کتاب میں شاہ صاحب نے وہ مسائل درج کیے ہیں جو آپ نے قیام حرمین کے زمانے میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک سے حل کیے ہیں۔ یہ کتاب بھی باوجود قلیل الحجم ہونے کے ان گنت مسائل سے لبریز اور مطالب سے پُر ہے اور اس میں علم تصوف کی تحقیقات بہت کچھ کی گئی ہے۔ حال میں اردو ترجمہ بھی ہو گیا ہے جسے ہر اردو خوان دیکھ سکتا اور خاطر خواہ متمتع ہو سکتا ہے۔

(19) الطاف القدس (فارسی)

اس رسالہ میں جناب عارف باللہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے ان تمام الہامات کو ضبط کیا ہے جو اس

زمانہ میں آپ کو وقتاً فوقتاً ہوتے رہے۔ دیکھنے میں گو ایک نہایت مختصر رسالہ ہے لیکن مطالب سے اس درجہ لبریز ہے کہ جس مقام کو دیکھا جاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ مضامین کا دریا لہریں لے رہا ہے۔ یہ حضرت مصنف ہی کا کام تھا کہ ایک ایسے طول طویل بیان کو چند اورق میں محفوظ کر دیا۔

(20) الدرّ الثمین فی المبشرات النبی الکریم (عربی)

اس کتاب میں جناب عارف باللہ مولنا شاہ ولی اللہ صاحب نے خود اپنے عجیب و غریب حالات اور نہایت دلچسپ واقعات ایک عمدہ اور نئی طرز کے ساتھ لکھے ہیں اور ساتھ ہی اپنے والد بزرگوار حضرت شیخ عبدالرحیم صاحب اور واجب الاحترام عم بزرگوار شیخ ابوالرضا محمد کے وہ واقعات قلمبند کیے ہیں جو انہوں نے جناب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک سے حاصل کیے ہیں۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ اپنے فن میں اپنی آپ ہی نظیر ہے۔

(21) شرح رباعتین (فارسی)

یہ ایک نہایت مختصر سا رسالہ ہے جس میں جناب شاہ صاحب نے حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی دو رباعیوں کی شرح نہایت تفصیل سے ساتھ کی ہے اور اس طرز روش کے ساتھ کی ہے کہ دیکھنے والے حیرت زدہ ہو جاتے ہیں۔ اثناء شرح میں ان مصطلح رموز و نکات کو بھی بیان کیا ہے کہ جن پر تصوف کے سمجھنے کا دارومدار ہے اور جن سے مطالعہ کرنے والوں کو اس فن کی تحصیل پر ایک گونہ قدرت حاصل ہوتی ہے۔

(22) سطعات (فارسی)

اس رسالہ میں طلسم الٰہی اور اصطلاحات صوفیہ کا ذکر ہے اور تصوف کے ان رموز و اشارات کی توضیح ہے جنہیں دیکھ کر مبتدی اور فن تصوف سے ناواقف لوگ بہت جلد اس پر عبور کر جاتے اور معلومات کو وسیع کر سکتے ہیں۔ حقیقت میں یہ ایک نہایت ہی مفید اور منفعت بخش کتاب ہے۔ سلوک و تصوف کے جلیل القدر علوم کے ان عریض و طویل مباحث اور مصطلحات کو اس اختصار سے بیان کرنا آپ ہی کا کام تھا۔

(23) انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ (عربی)

اس کتاب کے نام سے خود معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اولیاء اللہ کے حالات و واقعات مذکور ہیں۔ اگر چہ اس مضمون کی اور بھی چند کتابیں دیکھنے میں آئی ہیں اور مختلف لوگوں نے متعدد زبانوں میں لکھی ہیں۔ لیکن اس کتاب کا ڈھنگ سب سے نرالا در رنگ سب سے انوکھا ہے۔ اس سے بہتر اس فن میں دوسری کتاب نہیں لکھی گئی اور جو مضامین اس کتاب میں ملتے ہیں، دوسری میں نہیں ملتے۔

(24) ہوامع شرح حزب البحر (فارسی)

یہ شرح بھی عجیب وغریب پیرایہ میں لکھی گئی ہے۔ دعا حزب البحر کی ایسے بسط سے شرح کی ہے کہ آج تک دیکھنے میں تو کیا سننے میں بھی نہیں آتی۔ زکوٰۃ کا طریقہ اور ہر فقرے کے مطلب کے لئے جدا جدا پڑھنے کا قاعدہ اور اعتصام واختشام پڑھنے کی ممانعت اور ان کی وجہ بیان کی ہے۔ غرض کہ یہ کتاب عاملوں کی روح اور حاجت مندوں کی جان ہے۔

(25) لمعات (فارسی) (26) شفاء القلوب (فارسی)

(27) زہراوین (فارسی) (28) رسائل تفہیمات (فارسی)

(29) عوارف (عربی) (30) القول الجمیل (عربی)

(31) مکتوبات المعارف (فارسی) (32) رسالہ مکتوب مدنی (عربی)

(33) ہمعات (فارسی) (34) فتح الودود لمعرفۃ الجنود (عربی)

تاریخ وسیرت

(35) انفاس العارفین (فارسی)

اس کتاب کے چند حصے (17) ہیں۔ پہلے حصہ میں جناب شاہ صاحب نے اپنے والد بزرگوار حضرت شیخ عبدالرحیم صاحب کے علمی حالات، باطنی تصرفات وکرامات، ملفوظات ومکتوبات غرضکہ ابتدائے زمانہ سے تاریخ وفات تک کے تمام واقعات بطریق اجمال وسرسری ذکر کیے ہیں۔ دوسرے حصہ میں اپنے عم بزرگوار شیخ ابوالرضا محمد کے ابتدائی حالات اور ان کے عام اخلاق وعادات اور تصرفات واشراقات اور ملفوظات معرفت سمات مکتوبات ومسودات اور انتقال وغیرہ کے حالات کسی قدر بسط وشرح کے ساتھ تحریر کیے ہیں۔ تیسرے حصہ میں اپنے اجداد عظام کا ذکر کیا ہے اور کچھ ان علماء حرمین محترمین کا بیان کیا ہے جن سے آپ کو سند سلوک حاصل ہوئی تھی۔ خاتمہ کتاب میں خود اپنے حالات نہایت اختصار کے ساتھ ذکر کیے ہیں۔ حقیقت میں یہ ایک نہایت ہی عجیب وغریب کتاب ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عظیم الشان خاندان کا ہر ایک ممبر ظاہری علوم اور باطنی کمالات میں لاثانی اور بے نظیر تھا اور آسمان علم کا ایک نہایت درخشاں وتاباں آفتاب تھا۔ ''حیات ولی'' کی دوران تالیف میں یہ بیش بہا کتاب میری پیش نظر تھی۔ میں نے اکثر واقعات وروایات اسی کتاب سے ماخوذ کر کے ''حیات ولی'' میں درج کیے ہیں۔ اس بنا پر نہایت بھروسہ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جس قدر حالات وواقعات میں نے اس کتاب میں قلمبند کیے ہیں میری رائے میں غالباً نہایت درست اور نفس الامری ہیں اور میں معزز ناظرین کو پورا پورا اطمینان دلاتا ہوں کہ ''حیات ولی'' میں کوئی روایت وواقعہ ایسا نہیں ہے جس کی مستند شہادت میرے پاس موجود نہ ہو۔

(36) قصیدہ اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم (نظم عربی)

یہ ایک بڑا قصیدہ ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب شاہ صاحب کو علم وادب اور شاعری میں جو علوم عربیہ کے عنصر ہیں، کس درجہ لیاقت تھی اور آپ نے ان علوم کو کس عروج پر پہنچایا تھا۔ قطع نظر ادب اور شاعری کے یہ بھی بدیہی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ آپ کو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہا درجہ کی محبت تھی اور اسی سرخوشانہ حالت میں آپ کے قلم وزبان سے وہی الفاظ نکل رہے ہیں جو آپ کے دل میں تھے۔

(37) سرور المحزون سیر الامین المامون (فارسی)

عقائد

(38) حسن العقیدہ (عربی) (39) خیر کثیر (عربی)

(40) بدور البازغہ (عربی) (41) المقدمہ السنیہ (عربی)

متفرقات

(42) مکتوبات[18] مع فضائل ابوعبداللہ اسمٰعیل البخاری (فارسی)

(43) المقالۃ الوضیۃ فی النصیحۃ والوصیۃ (وصیت نامہ) (فارسی)

(44) فیض عام (فارسی) (45) مکاتیب عربی (عربی)

جناب شاہ ولی اللہ صاحب کے مصنفات کی بابت جو کچھ ہمیں لکھنا تھا لکھ چکے۔ اگرچہ آپ کی تالیفات کے سلسلہ میں بہت سی کتابیں ہیں، جو قدیم کتب خانوں میں موجود ہیں مگر ہم نے صرف انہیں کتابوں کا ذکر کیا ہے جو مطبوع ہو کر شرق سے غرب تک نہایت وقعت کے ساتھ مشہور ہو چکی ہیں اور جو اس بات ہمارے پیش نظر ہیں۔ ان میں سے بعض کتابیں ایسی بھی ہیں جو بلحاظ جامعیت روایات دنیا میں اپنا نظیر نہیں رکھتیں اور جو شاہ صاحب کی خداداد قابلیت اور پولیٹکل لیاقت کا نمونہ سمجھی جاتی ہیں۔ ان ہی بے نظیر تصنیفات کے باعث پچھلے تاریخ نویسوں نے آپ کو ائمہ متقدمین پر ترجیح دی ہے چنانچہ میں اس مقام پر علامہ ابوالطیب کا وہ مختصر ریمارک جو انہوں نے شاہ صاحب کے حالات پر کیا ہے، درج کرتا ہوں جس سے آپ کے علمی تبحر کا ثبوت بہت کچھ ہوتا ہے۔ علامہ موصوف لکھتے ہیں کہ ''اگر وجود او در صدر اول در زمانہ ماضی می بود، امام الائمہ وتاج المجتہدین شمردہ میشد۔'' یعنی اگر اس فرید عصر اور یگانہ روزگار کا وجود باوجود گذشتہ زمانہ کے صدر اول میں ہوتا تو اپنی ان بیش بہا اور عدیم النظیر تصانیف کی وجہ سے اماموں کا سرتاج اور مجتہدوں کا مقتدا تسلیم کیا جاتا۔

چونکہ جناب عارف باللہ حضرت مولنا شاہ ولی اللہ کی تاریخی زندگی میں اب کوئی اور ایسا واقعہ نہیں رہا جو خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہو لہٰذا میں آپ کے حالات وفات اور وہ بھی نہایت اختصار کے ساتھ لکھ کر اس قصہ کو ختم کرتا اور نہایت افسوس کے ساتھ شاہ صاحب سے رخصت ہوتا ہوں۔

شاہ صاحب کی وفات

یہ امر بالکل مسلم ہے کہ جس نے دنیا میں قدم رکھا ہے، اسے ایک ایسا دن ضرور پیش آنے والا ہے جس میں موت کا تلخ اور زہر آلود ساغر منہ سے لگائے گا۔ کون نہیں جانتا کہ دنیا اور اس کی تمام چیزیں ایک دن صفحہ ہستی سے مٹ جانے والی ہیں۔ ہر شخص بخوبی جانتا ہے کہ خود میں اور جو کچھ میں کر رہا ہوں یا آئندہ کروں گا چند ہی روز میں اس کا نام و نشان تک مٹ جائے گا اور پھر صفحہ ہستی پر شمہ برابر بھی باقی نہیں رہنے کا۔ کیونکہ دنیا کے عظیم الشان انقلابات اور حیرت ناک تغیر و تبدل جو ہر وقت اس کے پیش نظر رہتے ہیں وہ ان سے دنیا کی ناپائیداری اور بے ثباتی کا استنباط کرتا ہے اور ساتھ ہی اس بات کا خیال کرتا ہے کہ بڑے بڑے خدا کے پیارے اور برگزیدہ بندے دنیا میں آئے جنہیں صرف چند روز مسافرانہ زندگی بسر کر کے اپنے اصل مرکز کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ ہزاروں عظیم الشان سلاطین اور دنیا کے مشہور و نامور تاجدار جن کی سطوت و جبروت کے پُرشوکت و شاندار جھنڈے دنیا کے چاروں کونوں میں گڑے نظر آتے تھے، دیکھتے دیکھتے اس طرح غائب ہو گئے کہ کوئی بھی نہیں جانتا کہ کہاں تھے اور کہاں چلے گئے۔

اگرچہ دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا الم ناک اور دل بجھا دینے والا خیال برقی قوت بن کر تمام جہان میں دوڑ رہا ہے اور جہاندیدہ و مسن زمانہ اپنے انقلاب کے حیرت ناک نمونے آناً فاناً مشاہدہ کرا کے آئے دن یہ سبق پڑھاتا ہے کہ دنیا حقیقت میں دو دروازوں کا ایک مکان ہے جس میں ایک دروازہ سے داخل ہو کر دوسرے سے نکل جانا پڑتا ہے اور جب یہ ہے تو جینا مرنا ایک معمولی بات ہے۔ اس پر خوش ہونے اور اس پر رنج کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ مگر صاحبو! جب کوئی فخر خاندان و قوم اور ہر دلعزیز شخص دنیا سے اٹھ جاتا ہے، تو پتھر کا دل بھی بے ساختہ دو آنسو ڈال ہی دیتا ہے۔ قلم کا مسافر باوجودیکہ پتھر کا جگر اور لوہے کا سینہ رکھتا ہے لیکن پھر بھی اس المناک اور جانگداز سین پر قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا اور ہر ہر گردش میں خونی آنسو بہاتا ہے۔ حقیقت میں شاہ صاحب کا انتقال کوئی معمولی انتقال نہیں جو لکھنے والے اور سننے والوں کے دلوں پر اپنا ماتمی اثر نہ ڈالے لیکن ہمیں یہ خیال کر کے اپنے دلوں کو تسلی دینا چاہیے کہ گو شاہ صاحب اس وقت ہماری نظروں سے غائب ہیں لیکن حقیقت میں ہمارے دلوں میں موجود ہیں اور ہر دم ان کی محسوس یادگاریں ہمارے پیش نظر رہتی ہیں اور جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے ان کی سچی زندگی میں جان پڑتی جاتی ہے۔ ہمیں افسوس تو صرف اس بات کا ہے کہ آج اپنے قلم سے ایک ایسے قابل و لائق اور فخر روزگار کے دنیا سے غائب ہو جانے کا واقعہ قلم بند کر رہے ہیں جس کی شریف و مقدس ذات سے تمام ہندوستان کو عموماً اور دلی کے باشندوں کو خصوصاً فخر و ناز حاصل تھا۔ یہی ایک فرید عصر اور یگانہ روزگار تھا جس کی بدولت دلی کی چوکھٹ کو بوسہ دیا جاتا اور یہاں کے باشندوں کے نام نہایت قدر و منزلت کے ساتھ لئے جاتے

تھے۔ یہی اس نخلستان علوم کا ایک ثمردار درخت تھا جس کے پھل پھول سے دور دراز کے لوگ گودیاں لبریز کر کے جاتے تھے۔ یہی ان بحارِ فیوض کا ایک نہایت صاف اور نتھرا ہوا چشمہ تھا، جو دنیا کے اس سرے سے لے کر اُس سرے تک پھوٹتی ہوئی کونپلوں کو برابر سیراب کرتا ہوا چلا گیا۔ حیف صد حیف اے دنیائے دوں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون.

الغرض جب جناب شاہ ولی اللہ صاحب عمر کے تریسٹھ مرحلے طے کر چکے تو چند روز کی خفیف سی بیماری میں مبتلا ہو کر 1176ھ میں عازم سفر آخرت ہوئے اور شاہجہان آباد کی جنوبی جانب پرانی دلی میں دفن کیے گئے۔ آپ کی تاریخ وفات اس مصرع سے نکلتی ہے۔

او بود امام اعظم دیں!

جناب شاہ ولی اللہ صاحب کے چار مشہور و نامور فرزند تھے جو آپ کے پیچھے آپ کی محسوس یادگار تھے جیسا کہ ذیل کے شجرہ سے واضح ہوتا ہے۔

(در: حیات ولی (شاہ ولی اللہ اور ان کے آباؤ اجداد اساتذہ کا تذکرہ) از مولانا محمد رحیم بخش دہلوی، لاہور 1955ء، ص378-584)

✦ ..... ✦ ..... ✦

حواشی

(1) ایک فاضل ہمعصر جناب شاہ صاحب کے سفر عرب کا یہ سبب بیان کرتے ہیں کہ جب شاہ صاحب نے فارسی میں قرآن شریف کا ترجمہ کیا اور اس کی اشاعت ہوئی تو ایک تہلکہ عظیم کٹ ملانوں کے گروہ میں برپا ہو گیا اور یہ سمجھ گئے کہ ہماری روزی کی عمارت ڈھا دی گئی، اب جہلا کبھی قبضہ میں نہ آئیں گے اور وہ ہر بات پر بحث کرنے کو تیار ہو جائیں گے۔ اس خیال نے ان کے دل میں ایک آگ بھڑکا دی اور علاوہ کفر کے فتویٰ دینے کے شاہ ولی اللہ صاحب کے جانی دشمن ہو گئے اور اب ان میں مشورے ہونے لگے کہ شاہ صاحب کو کیونکر قتل کیا جاوے۔ ان کٹ ملانوں نے جن کا اثر بہت کچھ شہر کے بدوضع لوگوں، اکھاڑوں پٹے بازوں پر پھیلا ہوا تھا۔ چند بدمعاش جمع کیے اور اب وہ شاہ ولی اللہ صاحب کی تاک میں رہنے لگے۔ ہمارا فاضل ان کے غیر خوش آئندہ مشورے سے بالکل ناواقف تھا۔ اس محب رسول کا خیال مسلمانوں کی اصلاح کی طرف مائل تھا اس لئے اسے چنداں ملانوں کی سازش کی پروا نہ تھی نہ یہ خیال تھا کہ یہ کسی نہ کسی وقت باعث مضرت ہوں گے چنانچہ ایک دن کا ذکر ہے کہ آپ عصر کی نماز فتح پوری میں پڑھ رہے تھے اور آپ گویا محمدیوں کی جماعت کے امام تھے۔ ابھی آپ نے سلام پھیرا ہی تھا کہ دروازوں پر غل و شور کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں اور لوگ کچھ غیر معمولی غپڑ شپڑ کرتے ہوئے معلوم ہوئے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کو کھٹکا ضرور تھا کہ شہر کے ملانے کبھی نہ کبھی آفت برپا کریں گے۔ اب آپ نے اس کا ظہور ہوتے ہوئے دیکھا۔ آناً فاناً میں یہ خبر آپ کے ساتھیوں کو جو آپ کے پاس بیٹھے تھے، پہنچ گئی۔ اب وہ سٹ پٹائے کیونکہ ان کی تعداد بہ نسبت مفسدوں کے بہت کم تھی۔ وہ پانچ چھ سے زیادہ

نہ تھے اور مفسدوں کی تعداد سو سے بھی زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ یہ مفسد گو پورے عزم سے آئے تھے لیکن ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ مسجد میں گھس کے شاہ صاحب کو شہید کر سکتے۔ جب شاہ صاحب کو تحقیق معلوم ہو گیا کہ یہ میرے قتل کے لئے زغہ کر کے آئے ہیں انہوں نے اپنے دوستوں سے کہا کہ تم جان بچا کے چلے جاؤ اور مجھے ان منافقوں کے ہاتھوں شہید ہونے دو لیکن ان کی حمیت اسلامی نے یہ گوارا نہیں کیا اور تلواروں کے قبضوں پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے کہ جب تک جان میں جان باقی ہے آپ پر آنچ نہ آنے دیں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ صاحب جن کے ہاتھ میں صرف ایک پتلی سی لکڑی تھی اللہ اکبر کہہ کر اٹھے اور کھاری باؤلی والے دروازے کی طرف چلے۔ دونوں دروازوں سے سمٹ کے منافقوں نے اس دروازہ کو روک لیا اور بآواز بلند کہا دیکھو ولی اللہ نکل نہ جائے۔ شاہ صاحب نے یہ آواز سن کر نہایت دلیری اور متانت سے یہ سوال کیا کہ میں نے تمہارا کیا گناہ کیا ہے جس سے تم میری جان کے دشمن ہو گئے ہو اور میرے قتل پر آمادہ معلوم ہوئے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ تو نے قرآن کا ترجمہ کر کے بالکل عوام الناس کی نگاہوں میں ہماری وقعت کو کھو دیا۔ دن بدن ہماری روزی میں خلل پڑتا جاتا ہے اور ہمارے معتقد کم ہوتے جاتے ہیں، یہ بہت بڑا صدمہ تو نے نہ صرف ہمیں پہنچایا بلکہ ہماری آئندہ نسلوں کو پہنچایا۔ ہماری اولاد کی آئندہ زمانہ میں اتنی بھی وقعت نہ رہے گی جتنی اب ہماری ہے۔ اس پر شاہ صاحب نے یہ جواب دیا کہ خدا کی نعمت تم خاص کرنا چاہتے تھے میں نے عام کر دی۔ کچھ دیر تک یہ رد و بدل ہوتی رہی۔ آخر شاہ صاحب نے مع ساتھیوں کے جو آپ کو حلقہ کیے ہوئے تھے، دروازہ کی طرف قدم بڑھایا۔ کٹ ملا نے سینہ تان تان کر آ کھڑے ہوئے کہ ہم نہ جانے دیں گے۔ اس پر شاہ صاحب کے ایک ساتھی نے تلوار کا وار کرنا چاہا۔ بدمعاش جو سب ہتھیاروں سے آراستہ تھے، محمدیوں کو آمادہ دیکھ کر جھجکے اور اب ان کے ہوش پران ہوئے۔ وہ بدمعاش اکھاڑے کے پہلوان خانہ جنگیوں میں زیادہ غلو رکھتے تھے۔ بھلا وہ ایسی قلیل جماعت کی برہنہ تلواروں کے آگے کیونکر قائم رہ سکتے تھے جو سچے دل سے اسلام پر جان دینے کو تیار تھے۔ اس وقت شاہ صاحب کو جلال آ گیا تھا اور ابراہیمی مصفا خون آپ کی رگوں میں زور زور سے حرکت کرنے لگا تھا۔ آپ نے اپنے غیر معمولی جوش کی حالت میں اللہ اکبر کا ایک نعرہ مارا اور اس جماعت کو چیرتے پھاڑتے نکلے چلے گئے۔ کل بدمعاش اور منافق کٹ ملا دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے اور کسی کی یہ ہمت نہ پڑی کہ کوئی حملہ شاہ صاحب پر کرتا۔ حقیقت میں یہ بہت صحیح ہے۔ دشمن اگر قوی ست نگہبان قوی تر است۔ جب شاہ عبدالعزیز صاحب نے یہ سنا تو انہیں بہت رنج ہوا۔ رنج کے سوا بیچارے کر ہی کیا سکتے تھے۔ قلعہ میں ان کی اتنی وقعت نہ تھی جتنی کہ ان کے علم و فضل کی ہونی چاہیے۔ جو اثر شاہ ولی اللہ کا مدینہ مکہ اور نجد پر تھا افسوس کہ وہ دہلی میں نہ تھا۔ ہاں کسی ڈوم اور کسی کی سفارش بہت جلد چل جاتی اور بیچارے شاہ صاحب کی کوئی نہ سنتا تھا۔ اسی شب تمام کنبے کے ممبر جمع ہوئے اور انہوں نے مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ یہ صاف معلوم ہو گیا تھا کہ شاہ ولی اللہ صاحب کے کٹ ملا نے جانی دشمن ہو گئے ہیں اور انہیں شیعہ سرداروں نے بھی اکسایا ہے کہ وہ شاہ صاحب کو یا تو شہید کر ڈالیں یا شہر دہلی سے نکال دیں۔ قصہ مختصر یہ کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے سفر عرب اختیار کیا اور منافقانِ اسلام کو دانت پیستا ہوا اور ہاتھ سے ہاتھ ملتے ہوئے چھوڑا۔

(2) جناب شیخ محمد وفد اللہ بن محمد بن سلیمان المغربی ایک بڑے معزز اور ممتاز شخص تھے۔ قطع نظر مجتہد فن اور فرزانہ روزگار ہونے کے اپنے والد بزرگوار کی تعلیم و تربیت کے ایک عمدہ نمونے تھے۔ حرمین محترمین کے بڑے بڑے مشائخ و علماء آپ کی انتہا سے زیادہ عزت کرتے اور آپ کی شاگردی کو سرمایہ فخر و ناز سمجھتے تھے۔ آپ اپنے زمانہ میں ایک ایسے مسلم الثبوت محدث تھے جن کی نظیر

کہیں مل نہ سکتی تھی۔ شیخ محمد وفد اللہ کے والد بزرگوار علم حدیث میں وہ پایہ رکھتے تھے کہ تمام اہل حرمین کے استاد کہلائے جاتے تھے اور شیخ الحدیث کا معزز و مقتدر خطاب پبلک سے حاصل کیا تھا۔ شیخ محمد کی شہرت اگرچہ زیادہ تر حدیث میں تھی اور آپ خصوصیت کے ساتھ علم نبوی میں زیادہ منہمک رہتے تھے۔ لیکن حقیقت میں تمام علوم وفنون کے جامع تھے اور تفسیر وفقہ ادب میں اجتہاد کا درجہ رکھتے تھے۔ اہل حرمین آپ کے فضل وکمال کی بڑی عزت کرتے تھے اور یا حافظ الحدیث یا شیخ الحدیث کہہ کر پکارتے تھے۔ شیخ محمد دولت علم کے علاوہ صاحب ثروت اور مالدار بھی تھے اور چونکہ خود علوم کے جوہری تھے اس لئے اس کی انتہا سے زیادہ قدر کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ اسلام بولی میں تشریف لے گئے اور وہاں ایک شخص کو نسخہ نبونیہ فروخت کرتے دیکھا۔ علم کی قدر شناسی اور حرص نے آپ کو اس پر آمادہ کیا کہ تین ہزار رائج الوقت سکے دے کر اسے خرید لیا اور پھر بھی مفت خیال کیا۔ انتقال کے وقت تک تعویذ بازو بنا کر رکھا اور کبھی علیحدہ نہیں کیا۔ ایک مرتبہ مسجد الحرام میں پانی کا ایسا سیلاب آیا جس سے تمام حرم کے باشندوں پر غرق ہو جانے کا خوف غالب ہوگیا۔ شیخ محمد نے اپنے مال ودولت اور اہل وعیال کی کچھ بھی پرواہ نہیں کی اور اس متبرک نسخہ کو سر پر رکھ کر طواف میں مشغول ہوگئے۔ شاہ ولی اللہ صاحب جس زمانہ میں شیخ محمد وفد اللہ کی علمی مجلس میں تشریف رکھتے اور سند حدیث حاصل کر رہے تھے تو آپ اس نسخہ کی زیارت سے مشرف ہوئے تھے بلکہ اس میں سے کچھ پڑھا بھی تھا۔

شیخ محمد جس طرح علم شریعت کے جامع تھے ویسے ہی طریقت کے رموز واسرار سے بھی بخوبی واقف تھے۔ آپ نے شیخ ابومدین مغربی کی خدمت سے خرقہ حاصل کیا تھا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے۔ کتب حدیث کی تصحیح کی بنیاد حرمین میں آپ ہی نے ڈالی اور شیخ وفد اللہ نے اس بنیاد پر اس قدر عمارت بلند کی کہ چند روز میں آسمان سے باتیں کرنے لگی۔ شیخ تاج الدین قلعی جو اس عہد میں ایک فاضل اجل عالم تسلیم کیے جاتے تھے اور جو تمام اہل عرب کے مقتدا و پیشوا تھے، بیان کرتے ہیں کہ شیخ محمد جس طرح علم روایت میں کمال رکھتے تھے اسی طرح آپ نے صناعات عجیبہ اور علوم غریبہ کو بھی عروج پر پہنچا دیا تھا۔ حدیث وتفسیر کے علاوہ انشا پردازی اور فصاحت وبلاغت میں خاص امتیاز رکھتے تھے۔ علم ادب اور شاعری میں ضرب المثل تھے۔ ثروت ودولت کا کافی حصہ خدا کی طرف سے عنایت ہوا تھا اور اس تمول کے لئے وہ زیور بھی تھا جو مال کے لئے زیب وزینت ہے یعنی آپ اعلیٰ درجہ کے فیاض وسخی تھے۔ غرض کہ دینی ودنیاوی اقتدار کے لئے کوئی ایسی صفت نہ تھی جو فیاض ازل نے آپ سے دریغ رکھی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ خداوندی ارشاد ''زادہ فی العلم والجسم'' کے ایک ایسے صاف وشفاف فوٹو تھے جس میں یہ دونوں تصویریں ہر وقت نظر آتی تھیں۔ چونکہ شیخ محمد جامع علوم وفنون اور ہر صفت کے ساتھ موصوف تھے اس لئے آپ کا ذاتی کمال وطن مالوف سے یہاں کھینچ لایا تھا کیونکہ اس زمانہ میں عرب کے علاوہ اظہار کمالات کے لئے کوئی دوسرا شہر اہل علم کے لئے نہ تھا۔ لیکن جس زمانہ میں شیخ محمد کے علوم معراج کمال پر پہنچے اور شہرت کے سورج نے اپنی روشنی تمام خطہ عرب میں پھیلا دی تو حاسدوں کے کینہ وعداوت کی رگ حرکت میں آئی اور انہوں نے جھوٹی شکایتیں شاہ اسلام کو تحریر کیں۔

(3) جناب شیخ ابوطاہر عمر کے ابتدائی زمانہ سے تحصیل علوم میں راغب تھے اور علمی سوسائٹیوں علماء کی مجلسوں میں ہمیشہ شریک ہوتے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے فراغ کے بعد جب آپ میں علمی قابلیت پیدا ہوگئی اس وقت سے آپ کے والد بزرگوار نے اس گرانبہا جوہر کی قدردانی شروع کردی۔ اپنا خرقہ اس فرزند رشید کے جسم پر آراستہ کیا اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بہت سے بزرگوں سے ان کے لئے اجازت اور خرقہ حاصل کیا جن میں ایک بزرگ شیخ محمد بن سلیمان مغربی ہیں۔ شیخ ابوطاہر نے کتب عربیہ کی تحصیل سید

احمد ادریس مغربی سے کی جو اپنے زمانہ سے سیبویہ کہلائے جاتے تھے اور جو علوم عربیہ میں اجتہاد کا مرتبہ رکھتے تھے۔ حدیث وفقہ اور تفسیر میں بینظیر تھے اور ادب وشاعری میں بے مثل لیاقت رکھتے تھے قطع نظر اس کے اتقاء و پرہیزگاری میں حد سے زیادہ مشہور تھے۔ شیخ ابوطاہر فرماتے تھے کہ ایک دفعہ سید احمد ادریس کے ایک تلمیذ نے مسجد نبوی کی محراب میں سورۂ تبت پڑھی اور جب نماز سے فارغ ہو کر سید کے پاس آیا تو آپ نے اس پر انتہا سے زیادہ عتاب کر کے فرمایالا اراك تقرأبين يدى رسول الله صلى الله عليه وسلم سورة ذكر فيها عمه بما ذكر فان الله يخاطب رسوله بماشاء و ليس ذلك حدنا یعنی میں تجھے اب ہرگز نہ دیکھوں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے کھڑے ہو کر ایسی سورت پڑھے جس میں آپ کے چچا کی نکوہش و مذمت بیان کی گئی ہو۔ خدا تعالیٰ اپنے پیغمبر کو جس چیز کے ساتھ چاہے خطاب کر سکتا ہے۔ لیکن ہمارا یہ مرتبہ نہیں کہ ہم ایسا کریں۔ شیخ ابوطاہر نے فقہ شافعی شیخ علی طوپونی مصری سے پڑھی تھی اور معقول کی کتابیں نجم باشی سے جو روم کے متبحر علما میں مشہور فاضل تھا۔ علم حدیث کی تمام کتابیں اپنے والد سے پڑھی تھیں۔ بعدہ تکمیل علوم اور اجازت وسند کے حاصل کرنے کے لئے اول شیخ حسن عجمی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے بہت کچھ استفادہ حاصل کیا۔ پھر شیخ احمد نخلی اور شیخ عبداللہ بصری کے پاس پہنچے۔ شیخ عبداللہ بصری سے شمائل النبی اول سے آخر تک پڑھی اور امام احمد کی مسند دو مہینے سے کم مدت میں سنی۔ ان حضرات کے علاوہ بہت سے ان فضلا سے بھی سماعت حدیث کی جو حرمین شریفین کی زیارت کے لئے وقتاً فوقتاً تشریف لائے مثلاً شیخ عبداللہ لاہوری و ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کی تمام کتابوں کی روایت شیخ عبداللہ اللبیب سے کرتے ہیں اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تمام کتب اسی واسطہ سے مولانا عبدالحکیم سے روایت کرتے ہیں اور شیخ سعید کوکنی اس فاضل اجل اور علامہ عصر سے شیخ ابوطاہر نے بعض کتب عربیہ اور فتح الباری مصنفہ شیخ ابن حجر عسقلانی کا چوتھا حصہ پڑھا۔ غرض کہ شیخ ابوطاہر علمی فضل وکمال کے علاوہ سلف صالح کی تمام اوصاف کے ساتھ متصف تھے۔ ورع واجتہاد میں نہایت بلند رتبہ رکھتے تھے۔ فصاحت، بلاغت میں ضرب المثل اور نہایت مشہور تھے۔ حدیث وفقہ کی جزئیات اور استنباط مسائل پر آپ کی نظر نہایت غائر تھی اور یہ وجہ تھی کہ عرب کے تمام باشندے آپ کی بہت عزت کرتے اور ہر شخص اپنی آنکھوں پر جگہ دیتا تھا۔ باوجود انہاک علم اور استغراق فن کے جب تک کتب کا تتبع نہ کر لیتے کسی بات کا جواب نہ دیتے تھے۔ رقیق القلب اس درجہ تھے کہ جب احادیث رقاق پڑھتے تو آنکھوں میں آنسو بھر لاتے اور پہروں زار وقطار رویا کرتے۔ اکثر اوقات طاعت الٰہی اور درس علوم میں مشغول رہتے اور بقیہ وقت کشف ومراقبہ میں صرف ہوتا تھا۔ آپ کا عام طرز معاشرت اور لباس وغیرہ تکلف وبناوٹ سے بری تھا۔ انتہا درجہ کا عجز وانکسار تھا۔ اپنے خدام اور تلامذہ کے ساتھ متواضعانہ اخلاق سے پیش آتے اور اگر کسی سے کسی معاملہ میں غلطی ہو جاتی تو نہایت نرمی اور آہستگی سے متنبہ کرتے۔ کبھی کسی پر غصہ نہ کرتے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کا ایک مختصر آرٹیکل اس مقام پر قابل ذکر ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ”میں نے علماء حرمین کے اکثر حضرات سے ملاقات کی ہے اور اکثر فضلاء کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں لیکن میں نے کسی کو نہیں دیکھا ہے کہ مکارم اخلاق کے ساتھ جامع علوم ہو بجز شیخ ابوطاہر بن ابراہیم کردمدنی کے۔ شیخ کی فراست ودرایت حقیقت میں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے جسے میں نے اپنی تالیفات کے بعض مختلف مقامات میں ذکر کیا ہے۔“

الغرض جناب شیخ ابوطاہر قدس سرہ العزیز نے 1145ھ رمضان کے مہینے میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔

(4) شیخ تاج الدین قاضی عبدالمحسن کے فرزند رشید ہیں۔ بہت سے مشائخ کی صحبت میں علم حدیث حاصل کیا اور درسیہ علوم بتمامہا اخذ

کیے اور ہر ایک سے اجازت پائی۔ آپ ہنوز خورد سال ہی تھے کہ آپ کے والد بزرگوار قاضی عبدالمحسن نے شیخ عیسیٰ مغربی سے آپ کے واسطے اجازت حاصل کر لی تھی۔ اہل مکہ ان کی بہت عزت کرتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ آپ نے پبلک سے امامت اور افتاء کا معزز خطاب حاصل کر لیا تھا۔ تمام عربستان میں مفتی مکہ مشہور تھے اور فقہ حنفی کے دوسرے باز دسمجھے جاتے تھے۔ جب شیخ تاج الدین ابتدائی تعلیم و تربیت سے فارغ ہوئے تو شیخ محمد بن محمد بن سلیمان مغربی کی مجلس درس میں حاضر ہوئے۔ اس زمانہ میں محمد بن محمد بن سلیمان مغربی کی درسگاہ میں سنن نسائی کا درس ہورہا تھا۔ جب یہ کتاب ختم ہوئی تو شیخ مغربی نے تمام حاضرین مجلس کو اجازت دی جس میں شیخ تاج الدین بھی شامل تھے لیکن شیخ تاج الدین نے حدیث کی اکثر کتابیں شیخ عبداللہ بن سالم بصری سے پڑھیں اور صحیح بخاری و صحیح مسلم شیخ حسن عجمی سے اور جب ان حضرات سے استفادہ حاصل کر چکے تو اب شیخ صالح زنجانی کی خدمت میں پہنچے اور ایک مدت تک ان کی صحبت میں رہ کر علم کی باریکیاں دریافت کیں۔ علم فقہ میں ان ہی سے حظ کامل اٹھایا اور اس علم خاص میں شیخ تاج الدین کو ان کی شاگردی کا بہت بڑا فخر حاصل ہے۔ شیخ صالح زنجانی کے علاوہ شیخ احمد نخلی اور شیخ احمد قطان بھی ان کے استاد ہیں جن کی صحبت میں سالہا سال تک شیخ تاج الدین فیض یاب رہے ہیں اور اجازت و سند حاصل کی۔ شیخ احمد قطان سے درس کا طریقہ سیکھا اور ان کے انتقال کے بعد کعبہ کے سایہ تلے مالکی مصلیٰ پر بیٹھ کر شیخ احمد کے قائم مقام درس دینا شروع کیا۔ چنانچہ شیخ تاج الدین اس واقعہ کی نسبت خود اپنے قلم سے یوں تحریر فرماتے ہیں کہ "جب میرے استاد شیخ احمد قطان کا انتقال ہو گیا تو میرے اور تمام مشائخ نے جن میں شیخ عبداللہ بصری اور شیخ احمد نخلی بھی تھے، مجھ پر زور ڈالا کہ میں شیخ احمد قطان کی جگہ بیٹھ کر طلبہ کو درس دوں اور شیخ کی عادت کے مطابق قرأۃ حدیث کروں لیکن مجھ سے اس عظیم الشان منصب پر دلیری نہیں ہو سکتی تھی اور باوجود ایسے جلیل القدر اکابر اور مشہور فاضل کے مجھ سے اس خدمت کی ادائیگی بہت ہی دشوار و مشکل معلوم ہوتی تھی لہٰذا میں نے اس خدمت کو قبول نہیں کیا اور اپنے مشائخ بزرگوار کو جواب صاف دے دیا کہ آپ لوگوں کے ہوتے مجھ سے کبھی بن نہ آئے گا کہ اس عظیم القدر امر پر جرأت کروں لیکن ان حضرت نے میری اس التماس کو نگاہ قبول سے نہیں دیکھا اور میرے انکار پر اس قدر اصرار و مبالغہ کیا جس سے میں بالکل مجبور ہو گیا۔ انجام کار میں نے شیخ حسن عجمی کو جو اس زمانہ میں طائف کی سمت میں مقیم تھے، یہ تمام کیفیت لکھ بھیجی جس کے جواب میں انہوں نے مزید تاکید کے ساتھ کہلا بھیجا کہ بہر حال اپنے مشائخ کے فرمان کو رغبت کے کانوں سے سننا اور نگاہ قبول سے دیکھا چاہیے۔ الغرض جب میں سب طرف سے مجبور ہو گیا تو مشائخ مذکورین کے فرمان پر گردن تسلیم خم کر دی اور اپنے عزیزوں کے اشارے کے مطابق شیخ احمد قطان کے مقام پر بیٹھ کر صحیح بخاری پڑھانا شروع کی اور جس مقام تک شیخ نے انتہا کی تھی میں نے اسی جگہ سے بخاری کا آغاز کیا۔ جب بخاری شریف ختم ہوئی تو مجلس میں تمام علماء و مشائخ حاضر تھے۔ سب نے میرے حق میں دعا خیر کی اور میں نے ان کی قدر دانی کا شکریہ ادا کیا۔"

شیخ تاج الدین کے اس واقعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ جامع جمیع صفات کمال اور حاوی جملہ علوم و فنون تھے کیونکہ اگر آپ فی نفسہٖ ایسے نہ ہوتے تو اس قدر مشائخ کبار اور اجلہ اعلام میں درس دینے کی آپ کی جسارت نہ ہوتی۔ نیز ان اولوالعزم اور فرید عصر حضرات کا اس جلیل القدر منصب پر شیخ تاج الدین کو مامور کرنا خود اس پر دلیل ہے کہ وہ ایک ایسے گرانمایہ جوہر تھے جس کی قیمت و قدر سے یہی علم کے جوہری خوب واقف تھے۔ شیخ تاج الدین کو جناب شیخ ابراہیم کردی مدنی کی شاگردی کا بھی فخر حاصل ہے۔ آپ نے حدیث و فقہ کی تمام علوم کی اجازت انہیں دی اور علمی فضیلت کی دستار اپنے ہاتھ سے باندھی۔

الحاصل شیخ تاج الدین بڑے پائے کے شخص تھے اور متعدد علوم میں کمال رکھتے تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، سیر ایام العرب کے حافظ تھے اور ادب ان کا ادنیٰ سا علم تھا۔ خدا تعالیٰ نے ذہن و حافظہ ایسا قوی دیا تھا کہ ایک ہی زمانہ میں مختلف علوم کا درس دیتے تھے۔ علمی ذوق و شوق خدا نے بچپن سے دیا تھا جس کی تکمیل میں آپ ہمیشہ مصروف رہے اور آخر کار اسے کمال عروج پر پہنچا دیا۔ فن ادب میں آپ کو کمال دستگاہ تھی۔ فصاحت و بلاغت کے متعلق آپ بڑے بڑے شعرا کو غلطیاں بتا دیتے تھے کہ یہاں یوں ہونا چاہیے اور وہ فوراً انہیں تسلیم کر لیتے تھے۔

شیخ تاج الدین کی ذات میں وہ تمام خصلتیں اور فضائل مجتمع تھے جو ایک پاکباز اور دیندار عالم میں ہونا چاہئیں۔ عام اخلاق و عادات، عزم و ثبات، بلند حوصلگی، دقیق نظری میں تمام مشائخ و علماء میں ایک مستثنیٰ اور ممتاز عالم تھے۔ عالمانہ تزک و احتشام اور فاضلانہ شان و شوکت اور علم و فضل کی سرپرستی نے شیخ تاج الدین کی شہرت کو اور بھی چمکا دیا تھا۔ آپ کی علمی برکتوں کی ندائے عام نے دلوں میں وہ ذوق و شوق اور حوصلے پیدا کر دیئے تھے کہ زمانہ کے جملہ اہل کمال آپ کے درسی مجلس میں کھنچے چلے آتے تھے۔ جیسے خود قابل طباع فضیلت مآب تھے ویسے ہی آپ کے تلامذہ بھی جودت ذہن اور خداداد قابلیت میں ممتاز تھے۔ پھر باوجود ایسے عالم فاضل ہونے کے تکلف و بناوٹ مزاج میں نام کو نہ تھا۔ مذہبی عقائد میں بڑے مستحکم تھے۔ علاوہ فرض نماز کے سو رکعتیں روزانہ پڑھنے کا دستور تھا اور بجز بیماری یا نہایت قوی عذر کے کبھی جماعت ترک نہیں ہوئی۔ بزرگان دین سے خاص تعلق رکھتے تھے اور اثناء وعظ میں سخت رقت ہوتی تھی۔ صوفیائے کرام اکثر اوقات آپ کے مکان پر تشریف رکھتے تھے اور کبھی کبھی ان کے مکان پر خود جاتے تھے۔ 1114ھ میں آپ نے سفر آخرت قبول کیا اور اپنے انتقال کے بعد دنیا میں ایک نہایت محسوس یادگار چھوڑ گئے۔

(5) واضح ہو کہ علماء حرمین کے نزدیک کتب حدیث کے درس کے تین طریقے ہیں۔ ایک طریق سرد اور وہ یہ ہے کہ شیخ خواہ سامع ہو یا قاری کتاب کی تلاوت اس طرح کرے کہ اثنا قرأت میں نہ تو مباحث لغویہ کا ذکر چھیڑے نہ مسائل فقہیہ کو متفرع کرے۔ اسماء و رجال کی تحقیقات کرے نہ کلمات غریبہ کے حل کرنے کی طرف متوجہ ہووے۔ دوسرا طریق بحث و حل ہے۔ وہ یہ کہ ایک حدیث کی تلاوت کے بعد شیخ ہر لفظ غریب اور مشکل ترکیب اور قبل الورود اسم اور ظاہر الورود سوال اور منصوص علیہا مسائل پر توقف کرے اور ان تمام باتوں کو متوسط تقریر سے حل کرے۔ جب ایک حدیث کے متعلق یہ تمام مراتب طے ہولیں تو آگے بڑھے اور دوسری حدیث پڑھنے کے بعد ان تمام امور کی رعایت کرے وعلیٰ ہذا القیاس۔ تیسرا طریق امعان و تعمق ہے اور وہ یہ ہے کہ شیخ ہر ہر کلمہ کے مناسبات و متعلقات اور مالہا و علیہا کو بڑی بسط و شرح کے ساتھ بیان کرے مثلاً کسی غریب کلمہ اور مشکل ترکیب کے توضیح میں قدم زمانہ کے شعرا کے کلام سے شواہدات پیش کرے، ان کے استعمال کے مواقع و محال عمدہ طور پر ذکر کرے، اسماء رجال کی تحقیق میں اس قوم کے حالات اور اخلاق و عادات بالتفصیل بیان کرے اور مسائل فقہیہ کی منصوص علیہا مسائل پر تفریع کرے اور ہر مسئلہ کی تخریج کی طرف بالتصریح اشارہ کرے اور ادنیٰ مناسبت کی وجہ سے عجیب و غریب قصے اور نادر و عبرت آمیز حکایتیں نقل کرے، علماء حرمین محترمین میں یہ تینوں طریقے رائج ہیں اور محدثین کے گروہ میں یہ تمام مراتب دیکھے جاتے ہیں۔ شیخ حسن عجمی اور شیخ احمد قطان اور شیخ ابو طاہر وغیرہ کا مختار و پسندیدہ طریقہ سرد ہی تھا۔ لیکن نہ مبتدین اور عام لوگوں کے لئے بلکہ خواص تبحرین اور منتہیوں کی نسبت تا کہ سماع حدیث اور سلسلہ روایت جلد حاصل ہو اور باقی مباحث کا شروح حدیث میں مطالعہ کریں کیونکہ آج حدیث کا

ضبط اوراس کا مدار علیہ شروح حدیث ہی ہیں، پھر اس مقام پر یہ بھی جاننا ضروریات سے ہے کہ محدث کے فرائض منصبی کیا ہیں۔ جب کوئی محدث وثوق کے بعد حالات وواقعات کی توضیح کرے پھر مختلف المعنی نیز ان حدیثوں کی تاویل میں مشغول ہو جن میں بلحاظ معنے چند احتمالوں کی گنجائش ہو۔ زاں بعد فروع وتعق سے بعض حدیثوں کو بعض پر ترجیح وغیرہ کا اچھی طرح بیان کرے۔ اس امت مرحومہ کے اوائل علماء اگر چہ ان امور کی طرف مشغول نہیں ہوتے تھے لیکن اب فتحیہ اور متکلمین بہت کچھ خوض وغور کرتے ہیں مگر ان کی یہ بحث اور خوض وفکر بالکل بے سود ہے۔ کیونکہ آج تمام متون کی شرحیں موجود ہیں اور متعلق حدیثوں کے حواشی بڑی آب وتاب کے ساتھ لکھے جاچکے ہیں اور جب یہ ہے تو اب امور مذکورہ بالا کی نہایت چنداں ضرورت نہیں رہی۔ واللہ اعلم۔

(6) ضبط حدیث کے طریقے امت مرحومہ میں تین حال پر گزرے ہیں۔ پہلا حال یہ تھا کہ صحابہ اور تابعین کے عہد مبارک میں لوگ حدیثیں زبانی یاد کرتے تھے اور اس وقت ضبط حدیث صرف جودت ذہن اور قوت حافظہ پر موقوف تھا۔ دوسرا حال یہ تھا کہ تبع تابعین اور اوائل محدثین کے زمانہ سے طبقہ سابعہ اور ثامنہ تک لوگ حدیثوں کو لکھتے تھے۔ اس وقت ضبط حدیث تبیین خط اور نقاط حرکات سکنات تصویر حروف اصول صحیحہ سے مقابلے وغیرہ پر منحصر تھا۔ تیسرا حال یہ تھا کہ حفاظ حدیث نے علم الرجال اور الفاظ مشکلہ وغریبہ کے ضبط میں بڑی بڑی مبسوط اور مشرح کتابیں تصنیف کیں اور مفصل شرحیں لکھیں اور ان میں ان مسائل سے تعرض کیا جو علوم حدیث کے عنصر سمجھے جاتے ہیں۔ بس اب ضبط حدیث کا صرف ایک یہ طریقہ باقی رہ گیا کہ واقف حدیث مبسوط تصانیف وشروح کو پیش نظر رکھ کر ان کے مطابق حدیثیں روایت کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں اہل حدیث نے تساہل اختیار کیا ہے اور قدیم زمانہ میں جس قدر متقدمین تشدد کرتے تھے اسی قدر متاخرین نے تساہل برتا اور حفظ ونقل کو چھوڑ کر صرف خط پر اکتفا کیا گیا اس لئے ان میں اجازت مجروہ وغیرہ کا رواج جاری ہوا۔ بخلاف طبقات سابقہ کے کہ ان میں یہ طریقہ مروج نہ تھا۔ خلاصہ یہ کہ ضبط کا یہ طریقہ شیخ عبداللہ بصری کے نزدیک کمال کی ایک بہت بڑی اور اعلیٰ درجہ کی شاخ تھی اور اس سلسلہ کے باقی رہنے کے آپ ہی باعث تھے۔ شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنی اور بہت سے علماء محترمین نے آپ سے اس طریقہ کو حاصل کیا اور جناب مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کے بدولت یہ طریقہ ہندوستان میں پھیلا۔

(7) عجیب بات ہے کہ مصنف مرحوم نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے ایک رسالہ ''تحفۃ الموحدین'' کا خود ترجمہ کر کے مطبع افضل المطابع میں اس کو طبع کرایا لیکن یہاں ان کی فہرست تالیفات میں اس کا ذکر نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کے وقت ان کو رسالہ ''تحفۃ الموحدین'' دستیاب نہیں ہو سکا۔ یہ رسالہ بڑا جامع اور پُر مغز ہے۔ حال ہی میں ادارہ اشاعۃ السنۃ لاہور نے طبع کیا۔ شاہ صاحب کی ایک اور تصنیف توحید ہی کے مسئلہ میں ''البلاغ المبین فی اتباع خاتم النبیین'' عرصہ ہوا مطبع محمدی لاہور نے طبع کی تھی واللہ اعلم۔ (مرتب)

(8) مصنف مرحوم کے مرتبہ نقشے کو ہم نے بدل کر موجودہ ذوق کے مطابق کر دیا ہے۔ صرف ترتیب بدلی ہے مضمون مصنف ہی کا ہے۔ (مرتب)

(9) حضرت شاہ صاحب نے فتح الرحمان کا ایک مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں ترجمہ کے اصول اور ترجمہ قرآن کی ضرورت واہمیت اور چند دیگر فوائد ذکر فرمائے ہیں۔ بعض ناشرین نے اس کو فتح الرحمٰن کے ساتھ ہی طبع کر دیا ہے۔ (مرتب)

(10) اس کتاب کا عربی میں بھی ترجمہ ہو کر متعدد دفعہ طبع ہو چکا ہے اور اس کا ایڈیشن ''المکتبۃ السلفیۃ'' لاہور نے شائع کیا ہے۔ (مرتب)

(11) علم الحدیث کو علم الروایت والاخبار بھی کہتے ہیں اور علم الآ ثار بھی بولتے ہیں لیکن خبر واثر میں ذرا سا فرق ہے اور وہ یہ کہ خبر کا اطلاق جناب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول پر ہوتا ہے اور اثر کا اطلاق صحابہ اور سلف کے قول پر۔ خبر حجت ہوتی ہے نہ اثر۔ اس علم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال واحوال اور افعال کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اس علم کا موضوع ظاہر ہے۔ رہی غایت تو وہ سعادت دارین پر کامیاب ہوتا ہے۔ پھر یہ علم دو قسم پر منقسم ہے۔ ایک علم بروایت حدیث۔ اس میں یہ بحث کی جاتی ہے کہ بلحاظ احوال رواۃ ضبطاً و علامۃً آنحضرت کے ساتھ اتصال وانقطاع کے اعتبار سے سند کی کیفیت کیا ہے۔ اسی علم کا نام اصول حدیث ہے۔ اس فن میں رسالہ ''منہج الوصول الیٰ اصطلاح احادیث الرسول'' نہایت جامع رسالہ ہے۔ دوسرا علم برارية الحدیث ہے۔ اس علم میں الفاظ حدیث کے مفہوم ومعنی سے بحث ہوتی ہے کہ قواعد عربیت اور ضوابط شریعت کے لحاظ سے ان الفاظ سے کیا چیز مراد ہے اور کیا وہ مراد جناب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس علم کا موضوع احادیث رسول ہیں بحیثیت دلالت علے المعنی خواہ وہ معنی مفہوم ہوں یا مراد اور اس علم کی غایت آداب نبویہ سے آراستہ ہونا اور شرعی مکروہات ومنہیات سے خالی ہونا ہے۔ یہ علم بھی علم تفسیر کی طرح دراز دامن رکھتا ہے اور فضل وشرف میں علم کتاب اللہ کا ہم پہلو ہے۔ قرآن اور حدیث میں غور کرنے سے صرف اسی قدر فرق نکلتا ہے کہ قرآن مجید فرشتہ کے ذریعہ سے آنحضرت پر نازل ہوا ہے اور حدیث بواسطہ قلب آئی ہے لیکن وحی ہونے میں دونوں برابر ہیں جیسا کہ قرآنی نص سے ثابت ہوتا ہے کہ **وما ینطق عن الهوی ان هو الاوحی یوحی**۔ دین اسلام کے اصول صرف یہی دو علوم ہیں اور اجماع اس کی فرع اور فقہ اس کا نتیجہ ہے۔ جس عالم کو کتاب وسنت کا علم بخوبی نہیں ہے اس کا علم وفتویٰ دین میں لائق اعتماد اور قابل بھروسہ نہیں ہے۔ فقہ عرفی کا جو حکم کتاب وسنت کے دلائل کے خلاف ہوتا ہے یا بلا دلیل قرآن وحدیث کے ہوتا ہے وہ رائے مجرد ہے اور تدوین کے لائق ہوئی ہے وہ قابل اخذ و تمکین۔ علم حدیث کی کتابیں بے شمار اور ان گنت ہیں جن میں رطب ویابس سب کچھ ہے لیکن اس فن کی عمدہ کتابیں جو مشہور و مقبول اور متداول ہیں مکمل چھ کتابیں ہیں۔ جناب شاہ ولی صاحب نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں اور ان کے فرزند رشید جناب شاہ عبدالعزیز صاحب نے ''عجالہ نافعہ'' میں کتب حدیث کے طبقات اور ان طبقات کا احوال نہایت اتقان کے ساتھ لکھا ہے جن سے کتب حدیث کے اقسام اور کتب مذکورہ کا قوت وضعف بہت کچھ معلوم ہوسکتا ہے اور یہ بات بخوبی دریافت ہوسکتی ہے کہ کون کتاب اور حدیث لائق قبول اور قابل احتجاج ہے اور کون نہیں ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ صرف صحاح ستہ ہی علم حدیث میں اعلیٰ درجہ کی کتابیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے یہ کتابیں متداول اور متلقی بالقبول ٹھہری ہیں اس وقت سے دیگر حدیث کی کتابوں کا رواج کم بلکہ گم ہوگیا ہے اور بہت سی کتابیں دائرہ گمنامی سے اب تک نہیں نکلی ہیں۔ ان کو انصاف ودیانت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے تو حق بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ حدیث کی یہ چھ کتابیں علم وعمل کے لئے کافی ووافی ہیں بشرطیکہ کمال اتقان اور تمام اذعان سے دیکھی جائیں اور شروح وغریب اللغات پر عبور ہو۔ پھر اکثر اہل علم نے امہات ستہ کے مراتب بھی لکھے ہیں۔ باستثناء قرآن مجید کے صحیحین کو روئے زمین کی تمام کتابوں پر ترجیح وفوقیت دی ہے خصوصاً صحیح بخاری کو۔ یہ کتاب قرآن کریم کے بعد دنیا میں خدائے تعالیٰ کی ایک حجت بالغہ ہے اور قبول وشہرت میں بہ نسبت اور کتابوں کے نہایت اعلیٰ درجہ رکھتی ہے۔ اس کے بعد صحیح مسلم کا درجہ ہے۔ تہذیب وترتیب اور جمع طرق وسیاق متون میں کسی قدر اس سے بہتر ہے بخاری ومسلم کے بعد سنن اربعہ ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابوداؤد کا مرتبہ ہے جن میں سے ہر ایک کتاب اپنے فن اور نفع خاص میں دوسرے سے ممتاز ہے۔ رسالہ

''حطہ'' میں صحاح ستہ کی کیفیت نہایت بسط کے ساتھ شرح لکھی ہے جس سے امہات ستہ کے حالات کے حقائق مع تراجم مؤلفین بخوبی معلوم ہو سکتے ہیں۔ مذاہب اربعہ اہل سنت کا ماخذ یہی کتابیں ہیں گو دوسری معاجم ومسانید وسنن بھی ان میں داخل ہیں لیکن جس قدر جزئیات فقہ ان کتابوں سے مستنبط کی گئی ہیں اس قدر دوسری کتابوں سے مستنبط نہیں ہوئی ہیں اس لئے محدثین میں یہ قاعدہ ٹھہر گیا ہے کہ فقہاء اربعہ میں سے جس کسی کا قول یا فتویٰ یا اجتہاد ایسا ہے جس کی سند کسی صحیح یا حسن حدیث سے نہیں ہے ......وہ محض ضعیف ہوتا ہے اور چونکہ مقلدین مذاہب اعتقاداً وعملاً اس کے خلاف نہیں کرتے لہٰذا فقہا ومحدثین کے مابین اختلاف واقع ہوا اور یہی وجہ باہمی اختلاف کی قائم ہوئی۔ ائمہ اربعہ مجتہدین رضی اللہ عنہم کا مراتب علم حدیث میں تفاوت بھی یہیں سے ظاہر ہوتا ہے۔ امام مالک صاحب مؤطا قدیم زمانہ کے محدث ہیں۔ ان کی ساری کتاب بخاری میں داخل ہے مؤطا میں تین سو حدیثیں علاوہ بلاغیات کے ہیں۔ امام احمد صاحب مسند ہیں۔ ان کی مسند جملہ کتب حدیث کا اصل متند ہے۔ اصحاب ستہ وغیرہم کا سلسلہ تلمذ ان ہی تک پہنچتا ہے۔ امام احمد کا مسند مع زوائدات کے پچاس ہزار حدیثوں کو شامل ہے۔ امام شافعی بھی عالم بالحدیث تھے۔ امام ابوحنیفہؒ کی روایت بحسب تصریح ابن خلدون سترہ اٹھارہ حدیثیں ہیں۔ اہل حجاز روایت حدیث میں ہمیشہ بہ نسبت اہل عراق کے زیادہ تھے۔ بہرحال اہل سنت کے چاروں امام اور حدیث کے چھٹوں امام منجملہ ان لوگوں کے ہیں جو مشہود لہا بالخیر کے قرنوں میں ہیں۔ ائمہ فقہ اور محدثین میں باہمی اختلاف کی ایک یہ بھی وجہ تھی کہ ان کے وقت میں علم حدیث کی تدوین جیسی چاہیے ویسی نہیں ہوئی تھی اس لئے اگر بعض حدیث کی تدوین جیسی چاہیے ویسی نہیں ہوئی تھی اس لئے اگر بعض حدیث پر ان سے عمل نہیں ہوا تو وہ اس میں معذور تھے لیکن جب علم حدیث مدون ہو گیا تو اب متاخرین کے لئے کوئی محل عذر باقی نہیں رہا۔ اس وقت اگر کوئی شخص حدیث صحیح مرفوع غیر منسوخ کے خلاف پر کسی کے قول وفعل پر عمل کرے تو مجرد شقاق اور مخالفت رسول ہے خصوصاً اس وقت میں جبکہ فقہ سنت بھی مدون ہو چکی ہو اور قوی مسائل ضعیف فروع سے علیحدہ اور جدا کر دیئے گئے ہوں۔

(۱۔) امام مالک انس کے صاحبزادے اور مالک بن ابی عامر اصبحی کے پوتے ہیں۔ ابو عامر اصبحی ان کے جدامجد ایک بڑے مشہور وجلیل القدر صحابی ہیں جو جنگ بدر کے علاوہ تمام غزوات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ رہتے۔ امام مالک 93ھ میں پیدا ہوئے اور نو سو شیوخ سے علم حدیث کی تحصیل کی۔ ذہن وحافظہ اور علمی مذاق خدا نے پہلے ہی سے عطا کیا تھا جسے ان کثیر التعداد شیوخ کی صحبت نے اور بھی چمکا دیا تھا۔ باوجود اس فضل وکمال اور قابل تعریف لیاقت کے آپ نے اس وقت تک فتویٰ لکھنے کے لئے قلم نہیں اٹھایا جب تک ستر ائمہ وقت اور مجتہدین عصر نے اس امر کی شہادت نہیں دی کہ وہ افتا کے لائق ہیں۔ آپ نے اپنے ہاتھ سے پوری ایک لاکھ حدیثیں نقل کیں اور سترہ سال کی عمر میں درس حدیث شروع کیا۔ جب آپ حدیث پڑھانے بیٹھتے تو غسل کر کے کپڑوں میں خوشبو ملتے اور نئی پوشاک پہن کر نہایت خشوع وخضوع اور وقار وعظمت سے بیٹھتے۔ سفیان بن عینیہ کہا کرتے تھے کہ خدا تعالیٰ مالک پر رحم کرے جو حدیث کے راویوں کی انتہا سے زیادہ جانچ پڑتال کیا کرتے اور بجز ثقہ اور محتاط لوگوں کے اور کسی سے روایت حدیث نہیں کرتے تھے۔ عبدالرحمٰن بن مہدی کا قول ہے کہ میں صحت حدیث میں امام مالک پر کسی کو مقدم نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ حدیث وسنت کے امام اور علم الرجال کے موجد ہیں۔

امام مالکؒ کے اگر اور فضائل اور خصوصیتوں سے قطع نظر کی جائے تو آپ کی فضیلت کے لئے صرف ایک یہ ہی بات کافی ودوانی

ہے کہ امام شافعی جیسے جلیل القدر مجتہد آپ کی شاگردی پر فخر کیا کرتے تھے اور کہا کرتے امام مالک عالموں کی فہرست میں ایسے ہیں جیسے جھلملاتے ہوئے ستاروں میں چودھویں رات کا چاند، ٹمٹماتے ہوئے چراغوں میں برقی قوت کی مشعل۔ مجھ پر علم کے بارہ میں امام مالک سے بڑھ کر اور کسی کا احسان نہیں ہے۔ امام احمد جو امام شافعی کے شاگرد تھے اسی طرح امام اعظم کے شاگرد رشید جن کا نام احمد تھا یہ بھی امام مالک ہی کے شاگرد تھے۔ سفیان بن عینیہ کہتے ہیں کہ حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ عنقریب لوگ علم کی تلاش و جستجو میں سفر کریں گے اور مدینہ کے ایک عالم سے کسی کو زیادہ جاننے والا نہ پائیں گے اس سے امام مالک ہی مراد ہیں۔ امام اوزاعی جب امام مالک کا ذکر کرتے تو فرمایا کرتے کہ وہ علماء کے عالم اور اہل مدینہ کے فاضل اور حرمین شریفین کے مفتی ہیں۔ ابن عینیہ کو جب امام مالک کے انتقال کی خبر پہنچی تو رو کر فرمایا، افسوس انہوں نے اپنی مثل زمین پر نہیں چھوڑا اور یہ بھی فرمایا کہ امام مالک اپنے زمانہ کی حجت اور امت کے چراغ تھے۔ جس وقت امام مالک نے مؤطا کو مرتب کیا تو اس وقت لوگوں کے پاس بجز قرآن مجید کے اور کوئی کتاب نہ تھی گویا احادیث کی جمع و تالیف کے سلسلہ میں مؤطا کا سب سے پہلا نمبر ہے۔ مؤطا کا یہ نام اس لئے مقرر ہوا کہ امام مالک نے جب اسے مرتب کر کے بڑے بڑے مشہور ستر فقیہوں پر پیش کیا تو سب نے اس کے ساتھ موافقت کی اور کسی کو اختلاف کی گنجائش نہیں رہی۔

مؤطا کی نسبت علماء متقدمین نے جو متفقہ الفاظ میں ریمارک کیے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ ان نیلگون آسمان کے نیچے استثنا کتاب اللہ کوئی کتاب امام مالک کے مؤطا سے زیادہ صحیح نہیں ہے۔ ابن عربی فرماتے ہیں کہ مؤطا اصل اول ہے اور صحیح بخاری اصل ثانی۔ الغرض اس کتاب کو ہزار ہا آدمیوں نے امام مالک سے روایت کیا۔ جو نسخہ کہ اس وقت ہندوستان میں رائج ہے یحیٰی بن یحیٰی مصمودی کی روایت سے ہے۔ جس سال امام مالک کی وفات ہونے والی تھی یحیٰی بن یحیٰی نے اس سال امام مالک سے مؤطا حاصل کی۔ مؤطا کے تمام آثار و احادیث ایک ہزار ستائیس ہیں جس میں چھ سو حدیثیں مسند اور دو سو بائیس مرسل اور چھ سو تیرہ موقوف ہیں جن کے علاوہ دو سو پچاسی صحابہ کے اقوال ہیں۔ امام مالک نے زندگی کے ستاسی مرحلے طے کر کے اتوار کے دن ربیع الاول 179ھ کو انتقال کیا۔ رضی اللہ عنہ وعن اتباعہ وغفر لنا ولہ بفضلہ وکرمہ آمین۔

(13) یہ کتاب مکہ شریف میں بھی طبع ہو چکی ہے۔

(14) تراجم امام بخاری کی شرح میں شاہ صاحب نے دو رسالے لکھے ہیں۔ ایک مختصر جس میں اصولی طور پر ایسے قواعد بیان کیے گئے ہیں جن سے تراجم بخاری کے حل میں مدد مل سکے۔ دوسرا رسالہ مفصل ہے جس میں صحیح بخاری کے اہم تراجم ابواب پر قدرے تفصیلی گفتگو فرمائی ہے۔ دونوں رسالے مطبوع ہیں۔ (مرتب)

(15) اس موضوع پر مجھے ایک شاہ صاحب کا مخطوطہ ملا ہے جس کا نام ہے **اتحاف النبیہ فما یحتاج الیہ المحدث و الفقیہ** جس میں شاہ صاحب نے اصحاب صحاح ستہ تک اپنی سندیں ذکر کی ہیں۔ شروع میں طبقات کتب حدیث پر ایک مقدمہ ہے۔ نیز اس میں اپنی وہ سند حدیث ذکر فرمائی ہے جو شیخ ابو طاہر نے آپ کو دی تھی۔ اس میں اور بھی بڑے نوادر و فوائد حدیث میں اس کتاب کو المکتبۃ السلفیہ مرتب کر رہا ہے، واللہ الموفق لاشاعتہ۔ (ناشر)

(16) علم التصوف اس علم کو کہتے ہیں جس سے ان اہل کمال کی معرفت حاصل ہوتی ہے جو نوع انسان میں سے مدارج سعادت میں ترقی حاصل کرتے ہیں اور اس سے ان امور کا حال معلوم ہوتا ہے، جو ان کے درجات میں بقدر طاقت بشریہ پیش آتے ہیں۔ لیکن ان

مقامات و درجات کا کما حقہٗ بیان کرنا محال نہیں تو قریب قریب دشوار ضرور ہے کیونکہ عبارات و معانی کے لئے وضع کی گئی ہیں۔ پس جو شخص صرف الفاظ تک پہنچتا ہے وہ اہل لغت کے زمرہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ معانی تو ان تک وہی نہیں پہنچ سکتا جو اپنی ذات سے غائب ہو جاتا ہے۔

آمد خبرے ز آمد او　　　　من بعد خبر نماند ما را

اور جب معانی کی یہ کیفیت ہے تو قوائے بدن کا کیا ذکر رہا۔

ذرہ از جلوۂ خورشید چہ اظہار کند　　　　رفتم از خویش ندانم بچہ آئین آمد

اور جب ان معانی کے لئے الفاظ کا وضع کرنا ممکن ہے تو الفاظ کا انہیں اپنی عبارت کا ادا کرنا سخت دشوار و محال ہے۔

شرقني غربني اخرجني عن وطني　　　　فاذا تغيبت بدا وان بدا غيبني

جس طرح معقولات کا ادراک اونام سے اور موہومات کا خیالات سے اور متخیلات کا حواس سے نہیں ہوتا اسی طرح وہ چیز جو عین الیقین سے دریافت نہیں ہو سکتی اسی لئے جو شخص اس علم کی تحصیل کا عازم ہو اس پر واجب ہے کہ وہ وصول بالبیان میں نہایت سرگرمی اور مستعدی کے ساتھ کوشش کرے اور طالب البیان نہ ہو کیونکہ یہ ایک ایسا طور ہے جو طرز عقل کے علاوہ ہے۔ اس علم کی چار شاخیں ہیں عبادات، عادات، مہلکات، منجیات۔ امام غزالی کی ''احیاء العلوم'' تمام انواع و اقسام کو حاوی ہے جس کا خلاصہ کتاب ''کیمیائے سعادت'' ہے اور جسے خود امام غزالی نے تالیف کیا ہے۔ اسلاف امت یعنی صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین سب کے سب ہدایت و حق کے طریقہ پر تھے۔ ان کا اصلی کام خداوندی عبادت اور انقطاع عن الدنیا تھا۔ ان کی طبیعت کا میلان صرف خدا کی طرف تھا اور اس فانی دنیا کے بہت جلد مٹ جانے والے جاہ و جلال اور زخارف و زینت سے متنفر تھے۔ مال و جاہ کی پروا تھی نہ اعزاز و اقتدار کی محبت بلکہ تمام دنیاوی تعلقات سے علیحدہ ہو کر خلوت میں عبادت الٰہی میں ایک خاص استغراق و محویت کے ساتھ مصروف رہتے تھے۔ دوسرے قرن میں جب لوگ خلق کے مخالطت کی طرف مائل ہوئے تو اس وقت جو لوگ عبادت الٰہی میں مشغول رہے ان کا نام صوفیہ مقرر ہوا۔ طریقہ تصوف علم شریعت میں حادث ہوا اور اس کے ضوابط و آداب نے تدوین پائی اور ایک بڑا طول و عرض بہم پہنچایا۔ ابتداء میں یہ لوگ درحقیقت خلاصہ ملت اور صفوۂ امت تھے لیکن پھر جس طرح علم ظاہر کا بدعت کی آمیزش سے رنگ بدل گیا اور علم کلام و قیاس سے خرابی ڈال کر اسے کہیں سے کہیں پہنچا دیا اسی طرح اس باطنی علم میں بھی اہل باطل گھس پڑے اور ایسے عقائد و رسوم ایجاد کیے جو بالکل دین و ایمان کے مخرب تھے مگر اس کے ساتھ ہی خدا تعالیٰ نے ایک ایسی جماعت کو اٹھا کھڑا کیا جو علم و ولایت کو جامع تھی اور جس نے حق کو باطل سے اور کھرے کو کھوٹے سے بالکل علیحدہ اور جدا کر دیا تھا جس سے تصوف سنی تصوف بدعی سے ممتاز و جدا ہو گیا۔ مثلاً شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی اس پچھلے زمانے میں ایک ایسے باوقار صوفی ہوئے جنہوں نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا۔ ان سے پہلے شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ابن القیم ایسے خداشناس اور بے لوث شخص گزرے ہیں جنہوں نے اس علم کے چشمہ کو جو بدعت کی خس و خاشاک سے پٹ گیا تھا بالکل پاک صاف کر دیا۔ ''کتاب الفرقان بین اولیا الرحمٰن و اولیا الشیطان'' باوجود قلیل الحجم ہونے کے اس بات میں بے مثل اور عدیم النظیر کتاب ہے لیکن تصوف کی مفصل و مطول کتابوں میں ''احیاء العلوم'' اور ''عوارف المعارف'' سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے اگرچہ اس فن کی ہزارہا مصنفات موجود ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ان کی بعض حدیثیں اور کچھ تقریریں پایۂ صحت و قوت سے ساقط ہیں۔ اس فن میں

سب سے پہلے رسالہ ''قشیریہ'' تالیف ہوا جو تمام تالیفات فن میں اقدم وافضل ہے۔ متاخرین کی مؤلفات میں جو اعزازی رتبہ کتاب ''منازل السائرین'' اور اس کی شرح ''مدارج السالکین'' کو ہے وہ کسی اور کتاب کو حاصل نہیں۔ ہاں متاخرین کے مختصر رسالوں میں قاضی محمد بن شوکانی نقشبندی کا ''قطر لولی فی شرح حدیث الولی'' نامی رسالہ تمام رسالوں سے افضل و بہتر رسالہ ہے۔ اس فن میں ایک کتاب ''فتوحات مکیہ'' بھی لکھی گئی ہے جس پر فقہانے بہت کچھ اعتراض کیے ہیں اور شعرانی نے ''یواقیت والجواہر'' میں بڑی شد و مد کے ساتھ فقہا کے تمام اعتراضوں کے جواب دیئے ہیں اور جواب شافی دیئے ہیں۔ الغرض کسی مسلمان کا کام نہیں ہے کہ اصل علم تصوف سے انکار کرے کیونکہ یہی ایک ایسا علم ہے، جسے نتیجہ اسلام اور ثمرہ ایمان کہہ سکتے ہیں، احسان کی روح قرار دے سکتے ہیں۔ سنت صحیحہ میں یہی علم احسان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جو اصطلاح متاخرین میں تصوف سلوک باطن مکاشفہ کے نام سے پکارا جاتا ہے ولا مشاحة فی الاصطلاح

عبارا تناشتی وحسنک واحد   وکل الیٰ ذلک الجمال یشیر

ان تمام مذکورہ بالا الفاظ سے مرتبہ احسان کی تحصیل مراد ہے اور ایسی ہی لوگوں کے بارہ میں واللہ یحب المحسنین وارد ہوا ہے۔ خلاصہ یہ کہ انسان کو کثرت جسمانی پر نظر ڈالنا نہ چاہیے بلکہ وحدت معانی کو پیش نظر رکھنا مناسب ہے۔ وللہ در ما قال۔

اینجا فیض پیر مغاں بزم وحدت است   در پردہ دار دیدہ کثرت نمائی را

علم تصوف پر یہ ایک نہایت مختصر ریمارک ہے جسے صاحب ''نسب الذریعہ'' نے نقل کیا ہے لیکن میں اس مقام کو ذرا اور واضح کرنا چاہتا ہوں جس سے ناظرین کو علم تصوف کی حقیقت عمدہ طور پر معلوم ہو جائے۔

ایک فاضل ہمعصر اپنے ایک تالیف کے فٹ نوٹ میں تحریر فرماتے ہیں کہ بزرگتر صوفیوں کے روشن اصول اور مذہبی ضوابط کی بنیاد جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم زمانہ زندگی ہی میں پڑ چکی تھی اور اس مذہب کے بانی جناب امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہ ہوئے ہیں لیکن اسلامی تاریخیں اس امر کی شہادت نہیں دیتیں اور ہمیں ابتدائے زمانہ کی تاریخوں سے کوئی ایسی کافی وجہ ثابت نہیں ہوتی جس سے ہم حضرت علیؓ کو بانی تصوف قرار دیں۔ محققوں کی تحقیقات سے جہاں تک پتہ چلتا ہے کہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ تصوف ایک قدیمی علم ہے جو ہندوؤں کے ویدوں اور کسی قدر مسیحی اصول سے لیا گیا ہے۔ بہر صورت کچھ بھی ہو یہ ظاہر بات ہے کہ اس طریقہ و مذہب میں مقدس اسلام کی ایک نہایت زبردست شان معلوم ہوتی ہے۔

جو لوگ فن تصوف کے بانی حضرت علی کرم اللہ وجہ کو قرار دیتے ہیں ان کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ زندگی میں ذکر کے طرق علیحدہ علیحدہ مذہبی عبادت میں ادا کرنے کے لئے بتائے تھے۔ یہیں سے صوفیوں کے دو گروہ قائم ہو گئے۔ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کے انتقال کا وقت ہوا تو آپ نے بستر مرگ پر حضرت سلمان فارسی کو طرق ذکر میں اپنا جانشین مقرر فرمایا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حسن بصری کو اپنا نائب ٹھہرایا۔ ان دونوں معزز جانشینوں نے اپنے خلفا کے ذکر کے طرق کی پورے طور سے تقلید کی اور اپنے تئیں اسلامی گروہ میں واجب الاحترام اور اعلیٰ درجہ کا زاہد و متقی ثابت کیا۔ اب ان کے بہت لوگ مقلد ہو گئے اور اس جماعت میں روز افزوں ترقی ہونے لگی۔ ان میں سے بعض لوگ خداوندی عبادت کی سرخوشانہ حالت میں ملک بملک گشت لگانے نکلے اور ہزاروں کو اپنا ہم خیال بنالیا۔

شدہ شدہ ان کا لاثانی جوش یہاں تک دل میں ابلا کہ 37ھ میں اویس القرنی نے ایک دن علی روس الاشہاد یہ بیان کیا کہ میں نے

جبرئیل کو خواب میں دیکھا اور اس نے مجھے خدا کا یہ حکم سنایا ''تو دنیا کو خدا کے نام پر ترک کر دے اور سر تا پا یاد خداوندی میں غرق ہو جا'' اس ربانی قاصد نے ذکر کے قواعد بھی تمام وکمال تلقین کئے اور جو کچھ اس پاک باز صوفی کے طرق ذکر آئندہ قرار پائے ان سب کی ہدایت اسی نے کی چنانچہ اس کے دوسرے دن اویس قرنی نے دنیا کو ترک کر دیا اور اس کے سحر آمیز سامانوں پر لات ماری۔ تمام دنیاوی راحتیں اپنے اوپر حرام ٹھہرالیں اور شب و روز یاد الٰہی میں زندگی بسر کرنے لگے۔ آخر کار ترک دنیا اور خداوندی عبادت اور بانی اسلام کی محبت نے یہاں تک طول کھینچا اور نبی کریم کی محبت کا جوش اس قدر ابلا کہ حضرت اویس نے اپنے سامنے کے دو دانت اس لحاظ سے توڑ ڈالے کہ رسول خداؐ کے بھی یہی دو دانت احد کی مشہور جنگ میں شہید ہو گئے تھے۔ واجب الاحترام اور بزرگ اویس نے اگرچہ اپنے مریدوں کی تعداد بڑھانے میں بہت کچھ کوشش کی لیکن وہ اپنے زمانہ زندگی میں زیادہ مرید بہم نہ پہنچا سکے اور انجام کار یمن ہی میں انتقال کر گئے۔

141 ھ میں شیخ الوان نے اول ہی اول فقیری کے مستقل ضوابط کی بنیاد ڈالی اور قواعد کی تدوین کی چنانچہ اس وقت تک آپ کے پیرو بکثرت موجود ہیں، جو الوانیہ کہلاتے ہیں۔ گو اسلام نے نفس پر زیادہ تشدد کرنے اور صومعہ نشینی سے منع فرمایا ہے پھر بھی فقرا نے وہ وہ قواعد تشدد نفس اور خوفناک ریاضتوں کے ضوابط ایجاد کیے جن پر آج بڑے بڑے عالم اور مولوی چلتے ہیں۔

ہر صدی میں فقرا کے نئے نئے پیشوا ہوئے اور پھر سب کے گروہ علیحدہ علیحدہ ہو گئے جو آج تک موجود ہیں۔ ان میں سے تین گروہ بسطامیہ، نقشبندیہ اور بکتشیہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سلسلہ میں اپنے تئیں مشہور کرتے ہیں اور باقی جس قدر فرقے ہیں سب حضرت علیؓ سے نکلے ہیں۔ ہر گروہ ان دو عظیم الشان بانیوں تک اپنا سلسلہ پہنچاتا ہے۔ نقشبندیہ جو خواجہ پیر محمد نقشبند کے معتقد و پیرو ہیں اور جس نے 719 ھ میں نشو و نما پایا۔ مختلف طرق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ اکثر ذکر خفی کرتے ہیں اور بالکل یہی طریقہ ان کے ہاں رائج ہے۔ ان کی خاص عبادت کو ختم خواجگان کہتے ہیں۔ ایک بار استغفار کہتے ہیں۔ سات بار سلامات، سات دفعہ فاتحہ، نو دفعہ سورۂ الم نشرح پڑھتے ہیں اور اس کے بعد سورۂ اخلاص۔ ان عبادتی تقریبات کا نام ذکر ہے۔ اس خاص ذکر کرنے کے لئے وہ ہفتہ میں ایک بار باہم ملتے ہیں۔ معمولی طور پر یہ دن جمعرات کا ہوتا ہے۔ عشا کی نماز کے بعد سے یہ ذکر شروع ہوتا ہے اور تمام شب رہتا ہے۔ ہر شہر اور شہر کے ہر ضلع میں اس کے ممبر مختلف سوسائٹیوں میں منقسم ہیں جہاں وہ سب کے اپنے مرشد کے مکان پر جمع ہوتے ہیں اور نہایت توجہ کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ بعض شہروں میں نقشبندیہ کے خاص خاص وسیع مکان مقرر ہیں جو صرف ذکر ہی کے لئے مخصوص کیے گئے ہیں۔ شیخ اپنے ممتاز عمامہ سے اپنے مریدوں میں پہچانا جاتا ہے۔ فرقہ بکتشیہ کا بانی بخارا کا رہنے والا تھا جس نے جان نثاریوں میں پُر جوش روح پھونک کے بہت بڑی ناموری حاصل کی تھی۔ اس گروہ کے فقیر کی نشانی ایک پٹکا ہے جسے چند فقرے کہہ کر جوان کے ہاں رائج ہیں، اپنی کمر سے باندھ لیتے ہیں۔

مولویہ فرقہ سلطنت ٹرکی میں بکثرت موجود ہے۔ اس گروہ کے بانی مولوی جلال الدین رومی ساکن کنواح تھے جو مشہور مثنوی کے مصنف ہیں اور جنہوں نے 672 ھ میں اس طریقہ میں روح پھونکی۔ یہ فقیر لمبی لمبی گول ٹوپیاں پہنتے ہیں اور ان کا لباس جامہ کے طور پر ہوتا ہے۔ جامہ کی صورت بالکل راجپوتوں کے مشابہ ہوتی ہے جو مسلمان عورتیں پہنتی ہیں۔ یہ لوگ ذکر کرتے کرتے اپنے جامے اتار ڈالتے ہیں اور صرف جاکٹ اور نیچے کوٹ پہنے رہتے ہیں۔ کبھی اچھلتے اور کبھی سر کو گردش دیتے ہیں اور گاہے غیر معمولی جوش میں چکر کھانے لگتے ہیں۔ فرقہ قادریہ کے بانی شیخ عبدالقادر جیلانی باشندہ بغداد ہیں۔ یہ لوگ ذکر جلی اور ذکر خفی دونوں

کرتے ہیں۔ چشتیہ، خواجہ معین الدین ہندوستان کے پیرو ہیں جن کا لقب گیسو دراز ہے۔ آپ کا مزار گلبرگہ میں ہے۔ یہ لوگ ذکر جلی کرتے ہیں اور ساتھ ہی راگ راگنی سے شوق رکھتے ہیں کیونکہ اس گروہ کے بانی کا مقولہ ہے کہ گانا روح کی خوراک ہے۔ گروہ جلالیہ اس کے بانی سید جلال الدین بخاری ہیں۔ یہ فقرا وسط ایشیا میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ سہروردیہ لوگ شیخ شہاب الدین باشندہ سہرورد کے پیرو ہیں۔ قرداریہ پنتھی ان فقرا کا بانی زندہ شاہ مردار شامی ہوا ہے جس کا مزار مکنپور میں ہے۔ ملنگ فقیر اسی گروہ سے نکلے ہیں جو ہندوستان کے بازاروں میں بکثرت دکھائی دیتے ہیں۔ رفعیہ گروہ کے فقرا بھی ہندوستان میں بیشمار ہیں۔ یہ لوگ اپنے نفس پر بہت سختیاں توڑنے اور تکالیف شاقہ جھیلتے ہیں۔ قلندریہ بھی فقرا کا ایک گروہ ہے جس کا بانی قلندر یوسف اندلسی تھا جو اسپین کا باشندہ تھا۔ کچھ زمانہ تک تو یہ بخشیہ رہا لیکن اس گروہ سے علیحدہ کردیا گیا تو اس نے بطور خود ایک مذہب کی بنیاد ڈالی۔ ان کے علاوہ صوفیوں کے اور بھی بہت سے فرقے ہیں جن کے ذکر میں بجز تطویل کے اور کوئی افادہ نہیں البتہ صوفیوں کے مجمل اصول اس مقام پر قابل ذکر ہیں۔ فاضل مذکور اپنی بیش بہا تالیف میں صوفیوں کے اصول یوں بیان کرتا ہے۔

(1) خداوند توانا ہے، وہ ہر چیز میں ہے اور اس میں سب چیزیں موجود ہیں۔

(2) تمام ظاہری اور چھپی ہوئی مخلوق اسی سے نکلی ہے اور ان میں اپنے خالق سے کوئی اصلی فرق نہیں ہے۔

(3) مذاہب اختلافات کے اسباب ہیں مگر وہ نفس الامر کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ بعض اس مطلب کے لئے بہت ہی زیادہ مفید ہیں مثلاً اسلام جس کا سچا فلسفہ تصوف ہے۔

(4) نیک و بد میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ یہ دونوں چیزیں خدا ہی کی ذات سے نکلی ہیں اور خدا انسانی افعال کا سچا خالق ہے۔

(5) یہ خدا ہے جو انسان کی مرضی قائم اور مستحکم کرتا ہے اس لئے انسان اپنے افعال میں آزاد نہیں ہے۔

(6) روح جسم سے پہلے بھی زندہ تھی اور آخر الذکر کے پنجرہ میں بعد ازاں بند کردی جاتی ہے اس لئے موت صوفی کی خواہشات کی خاص دعا ہوتی ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ وہ الوہیت کے سینہ میں چلا جاتا ہے۔

(7) اگر کوئی روح ایک جسم میں اپنی پاکی اور تقدس کے مدارج اعلیٰ طے نہیں کر لیتی تو اسے پھر تناسخ کی رو سے دنیا میں آنا پڑتا ہے اور پھر اپنی حالت درست کر کے وہ خدا کی ذات کے ساتھ مل جاتی ہے۔

(8) خدا کی بغیر توفیق کے جسے صوفی فضل اللہ کہتے ہیں کوئی روح اس کی ذات میں نہیں مل سکتی لیکن پھر بھی روح خدا کی ذات میں سرگرمانہ طور پر اس سے اجازت لے کر مل سکتی ہے۔

(9) صوفی کا اپنی دنیاوی زندگی میں وحدانیت میں استغراق رکھنا فرض ہے۔ خدا کا ذکر کرتا رہے اور طریقت میں برابر ترقی کناں رہے یہاں تک کہ اس سب سے برتر ذات سے وصل نصیب ہو جائے۔

(17) ''انفاس العارفین'' چند کتابوں کا مجموعہ ہے جیسا کہ مصنف مرحوم نے اس کی کچھ تفصیل فرمائی ہے۔ علی الترتیب ہر حصہ کے نام درج ذیل ہیں:

(1) بوارق الولایۃ

(2) شوارق المعرفۃ

(3) امداد فی مآثر الاجداد

(4) النبذۃ البریزیہ فی اللطیفۃ العزیزیہ (شیخ عبدالعزیز کے حالات)

(5) العطیۃ الصمدیہ فی انفاس المحمدیہ (حالات جد ابوام شاہ ولی اللہ)

(6) انسان العین فی مشائخ الحرمین

(7) الجزء اللطیف فی ترجمہ۔ مابعد الضعیف

اگر ان کتابوں کو الگ الگ شمار کر لیا جائے تو تعداد 52 تک پہنچ جائے گی۔

(18) شاہ صاحب کے مکاتیب کا ایک حصہ عرصہ ہوا دہلی میں طبع ہوا تھا۔ اس میں ایک مکتوب شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے فضائل میں ہے۔ چند مکاتیب (فارسی) آپ کے ''کلمات طیبات'' کے مجموعے میں بھی ہیں اور خلیق احمد نظامی نے آپ کے ''سیاسی مکتوبات'' طبع کر کے شائع کیے ہیں۔ (مرتب)

✦ ..... ✦ ..... ✦
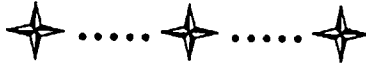
ڈاکٹر شیخ محمد اکرام

حکیم الامت شاہ ولی اللہ

1703ء

اٹھارہویں صدی عیسوی کے تیسرے سال کی ابتدا ہے۔ اسلامی ہندوستان کا آخری جلیل القدر بادشاہ، عالمگیر دکن میں مخالفوں سے برسرپیکار ہے۔ اس کی عمر پچاسی سال کی ہو رہی ہے۔ بڑھاپے کے بوجھ سے کمر جھک گئی ہے، لیکن اس کمزور اور نحیف جسم کے اندر ابھی وہی آہنی دل ہے، جس کے بل بوتے پر عالمگیر چودہ برس کی عمر میں ایک مست ہاتھی کے سامنے یکہ و تنہا ڈٹ گیا تھا۔ اس کی دماغی محنت اور مستعدی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ فوج کی کمان بذات خود کر رہا ہے۔ مختلف مہموں کے نقشے خود سوچتا ہے اور قلعوں پر حملے کے وقت اپنے جرنیلوں کی خود رہنمائی کرتا ہے۔

اسے اپنے مقاصد میں کافی کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ اس نے مرہٹوں کا شیرازہ، اگر اس کا دارومدار کسی ایک شخص یا کسی ایک مرکز پر تھا، منتشر کر دیا ہے، لیکن اس کا دل جانتا ہے کہ وہ اپنے اصل مقصد میں ناکام رہا ہے۔ اس نے مرہٹوں کے بڑے بڑے قلعے فتح کر لیے ہیں، لیکن اب ہر مرہٹے کا گھر قلعہ ہے، جس میں بادشاہ کے خلاف سازشیں ہوتی ہیں۔ بیشک اب سب بڑے بڑے علم برداران بغاوت مٹ گئے ہیں یا مٹا دیئے گئے ہیں، لیکن اس سے دکن میں سناٹا نہیں ہوا۔ اب ہر مرہٹہ کاشتکار سپاہی ہے، جو کبھی شیوا جی کے کسی خرد سال جانشین کی زیر قیادت اور کبھی کسی من چلی رانی کی متابعت میں، مغلوں کے لئے عذاب جان بنا ہوا ہے۔

مولانا شبلی کا بیان ہے کہ اب مرہٹے محض ''اُڑتے ہوئے ذرّے'' رہ گئے تھے۔ یہ تشبیہ گمراہ کن ہے، لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اس وقت مرہٹوں کی مرکزیت تباہ ہو گئی تھی تو سوچنا چاہیے کہ اس کے لئے حکومت دہلی کو کیا قیمت ادا کرنی پڑی۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کی وسیع خود مختار ریاستیں تو ایک ایک سال کے اندر مغلیہ مقبوضات میں داخل ہو گئیں، لیکن مرہٹوں کو سر کرنے میں اورنگ زیب نے پچیس سال صرف کیے اور اس تمام تگ و دو کا نتیجہ یہ تھا کہ جونہی اورنگ زیب کی آنکھیں بند ہوئیں، یہ اُڑتے ہوئے ذرّے بگولے بن گئے اور خیام شاہی کو اپنی تندرفتاری کے ساتھ لے اُڑے۔

واقعہ یہ ہے کہ مرہٹوں کے خلاف اورنگ زیب کو اس کی ذاتی خوبیوں کے باوجود حقیقی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اس کی کئی وجہیں تھیں، لیکن سب سے اہم وجہ (جس میں اسلامی حکومت کے زوال کا راز پنہاں ہے) مغل امرا اور مغل لشکریوں کی عسکری کمزوری تھی۔ بادشاہ کی بیدار مغزی، ہمت، محنت اور استقلال میں کلام نہیں، لیکن اس کے سپہ

سالاروں اور سپاہیوں میں آرام طلبی، غداری، فرض ناشناسی اور خودغرضی جیسی قبیح خصلتیں گھر کر چکی تھیں اور اخلاقی حالت میں وہ اپنے مرہٹے مخالفوں سے پست درجے پر تھے۔ مرہٹوں میں ابھی ابھی پندھر پور کی مذہبی تحریک نے نئی روح پھونک دی تھی۔ وہ اب ایک زندہ قوم بن رہے تھے۔ اس نئی تحریک کے زیر اثر ان کی شخصی اور خاندانی نزاعیں بڑی حد تک دب گئی تھیں اور ان کا ہر فرد مغلوں کے مقابلے میں قلمے، درمے، سخنے جس طرح بھی ہو سکتا تھا، برسرکار تھا۔ دوسری طرف وہ مغل امرا اور لشکری تھے، جنہیں عہد جہانگیری اور عہد شاہجہانی کے عیش وعشرت نے بگاڑ رکھا تھا۔ ان کے لئے اتنی مدت تک شمالی ہندوستان سے دور دکن کی لڑائیوں میں مبتلا رہنا ہی ایک ایسی مصیبت عظمیٰ تھی کہ شاید وہ مرہٹوں کے ہاتھ شکست کھانے کو بھی اس پر ترجیح دیتے۔ ان کے دل میں اس وقت جو گزر رہا تھا، اس کی ترجمانی نعمت خاں عالی کرتا ہے۔

سخن رابود در تقارب قبول! فعولن فعولن فعولن فعولن فعول
الہ است اللہ ورحماں خدا مگر اوکند رحم برفوج شاہ
رحیم است و غفار و آمرزگار ندانم چہ شد حصہ ایں سپاہ

لیکن مغل فوج میں صرف آرام طلبی اور محنت سے جی چرانے کا مرض ہی نہ تھا بلکہ ان میں غدار اور نمک حرام بہت تھے۔ جس کثرت سے مغل سپہ سالار مرہٹوں سے مل جاتے تھے، اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ اور تو اور مغل شہزادے اور اورنگ زیب کے بیٹے اس سے بالاتر نہ تھے۔ جنجی کے محاصرے کے وقت شہزادہ کام بخش نے جو ذوالفقار خاں کے ساتھ فوج کا سپہ سالار تھا، راجارام کے ساتھ اپنے باپ کے خلاف ساز باز کرنا شروع کیا۔ وہ اپنی فوج کے ساتھ مرہٹوں سے ملنے والا ہی تھا کہ ذوالفقار خاں اور اس کے باپ اسد خاں کو پتا لگ گیا اور انہوں نے اسے گرفتار کر کے زیر حراست اورنگ زیب کے پاس بھیج دیا۔ ستارہ میں مرہٹوں نے شہزادہ محمد اعظم کو رشوتیں دے کر یہ طے کر لیا تھا کہ وہ ان کی رسد رسانی میں مخل نہ ہوگا۔ چنانچہ وہ قلعہ جس میں محاصرہ کے وقت فقط دو ماہ کی رسد تھی چھ ماہ تک فتح نہ ہوا!

جو کیفیت سپہ سالاروں کی تھی۔ وہی حالت قلعہ داروں، منصبداروں، محاسبوں اور معمولی سپاہیوں اور امیروں وزیروں کی تھی اور جن قلعوں کی فتح میں مہینے صرف ہوئے تھے، وہ ان کی نالائقی یا نمک حرامی سے دنوں میں دشمن کو بغیر کسی کشت وخون کے واپس مل جاتے۔ جب 1704ء میں اورنگ زیب جنوبی دکن کو چھوڑ کر واکن کھیڑہ کی طرف متوجہ ہوا تو تھوڑے ہی عرصے میں اس طرح ستارہ پرنالہ اور پاؤ گڑھ کے قلعے مغلوں کے ہاتھ سے نکل گئے!

دشمنوں سے ساز باز کرنے اور اپنی نالائقی اور غفلت شعاری سے ان کا ہاتھ بٹانے کے علاوہ مغلوں نے اب ایک نئی بات یہ سیکھی تھی کہ لڑنے سے جی چراتے اور اگر انہیں کہیں خطرات کا سامنا کرنا پڑتا تو بجائے ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے راہ فرار اختیار کرتے اور لطف یہ ہے کہ اس ''فن کثیف'' میں بادشاہ کے بھائی بند تورانی ''بدمذہب'' ایرانیوں سے بڑھے ہوئے تھے۔ ایک دفعہ اورنگ زیب سے ایک تورانی امیر، میر محمد امین نے شکایت کی کہ فوج کے اعلیٰ عہدے ''بدمذہب اور دیوسیرت'' ایرانیوں کو مل رہے ہیں تو بادشاہ نے لکھا:

''جماعت تورانیاں، کہ برادران ہمشہری بزرگان ماانند..... بہ مضمون ولاتلقوا بایدیکم الی التہلکتہ یعنی میندازید خود را بدستہائے خود در ہلاکت، درعین گیرودار، مراجعت رامعیوب نمے دانند۔

اگر درآوردن کسے ایں حالت رودہد۔ چنداں مضایقہ ندارد۔ لیکن درعین کارزار سخت مشکل است۔
اگر عیاذ اًباللہ از ہمراہیان حضور ایں صورت واقعہ شود۔ دریک لحظہ مقدمہ تمام حکایت بانجام برسد۔
اگر درایں امر مجرب وآزمودہ انکارے داشتہ باشد۔ مفصل معروض دارد۔ وجماعت ایرانیاں' خواہ ولایت زا' خواہ ہندوستان زا' کہ بجہل مرکب مشہوراند۔ بصد مرحلہ ازیں حرکت دوراند۔

انصاف بدہ کہ جہل آں مردم زشت
بہتر زہزار عقل روباہ سرشت"

اورنگ زیب اپنے ہمراہیوں کی اخلاقی کمزوریوں سے خوب واقف تھا۔ وہ بار بار اپنے رقعات میں دیانتدار' کاردان ملازموں کی کمی پر آنسو بہاتا ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے۔ "آدم ہوشیار' امانتدار' خداترس' آباداں کار' کمیاب۔

آنچہ برجستیم وکم دیدیم و بسیارست و نیست
نیست جز آدم دریں عالم کہ بساریست و نیست"

ایک اور جگہ لکھتا ہے۔ "حالا یک کس برائے دیوانی بنگالہ کہ بہ حلیہ راستی وکاردانی آراستہ باشد' مے خواہم' یافتہ نے شود۔ ازنایابی آدم کار' آہ۔ آہ۔"

پوچھنے والے پوچھیں گے کہ عجب معاملہ ہے کہ اسلامی ہندوستان کا سب سے زیادہ مذہب پرست بادشاہ برسراقتدار ہے۔ ہر طرف اہل شرع کا بول بالا ہے۔ لیکن وہی انسانی خوبیاں' جن کے لئے مذہب مفید بتایا جاتا ہے، مفقود ہوگئی ہیں اور بادشاہ خود کہتا ہے کہ راستی' خداترسی' امانتداری' کمیاب بلکہ نایاب ہے!! وجہ اس کی یہ ہے کہ شرع اور فقہ کی گرم بازاری سے۔ باطنی برائیوں کا علاج نہیں ہوتا۔ ان کی نظر ظاہر پر ہوتی ہے۔ (محتسب رادرون خانہ چہ کار؟) ان کا کام شعائر اسلامی کی حفاظت ہے۔ قماربازی کا سدباب' شراب کی بندش' جزیے کا نفاذ' نئے بت خانوں کی ممانعت، صغائر و کبائر پر سزا دہی ان پر فقیہ زور دیتے ہیں' لیکن روحانی اور باطنی کوتاہیوں کا ان سے مداوا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ یہ چیزیں ہی فقہا کے حیطہ اختیار سے باہر ہیں۔

سرہند سے بیشک ایک تحریک اٹھی تھی' جس نے کئی مخلص اور سمجھ دار ہستیوں کو متاثر کیا۔ لیکن یہ تحریک تجدیدی تھی۔ اصلاحی نہ تھی۔ اس کی بنیاد اپنی فوقیت کے احساس اور اغیار سے نفرت اور عداوت سے تھی۔ اپنی کوتاہیوں کا ازالہ کرنا اس کا مقصد نہ تھا اور پھر اس تحریک میں مفید ہونے کی جتنی صلاحیت تھی' اس کا راستہ واقعات نے بند کردیا۔ مشائخیت روحانیت پر غالب آ گئی اور تجدیدی تحریک قیومیت کے سراب میں گم ہوگئی۔ جب خواجہ محمد معصوم کی وفات ہوئی تو ان کے وارثوں میں سے ہر ایک نام نہاد قیومیت کا دعویدار تھا۔ سبھی آپس میں لڑ رہے ہیں کہ قیوم میں ہوں اور دنیا میرے سر پر قائم ہے! حضرت خواجہ محمد معصوم نے اپنے بیٹے شیخ سیف الدین کو اورنگ زیب کے پاس امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لئے بھیجا تھا' لیکن جس انداز سے وہ رہتے تھے' اس کا بیان ایک معتقد کی زبان سے سنئے:

حضرت شیخ صاحب کے لئے سرہند میں دیبا کا ایک خیمہ جواہرات اور مروارید سے ٹکا ہوا نصب ہوتا، جس کی چوبوں پر یاقوت جڑے ہوئے تھے۔ اس خیمہ کے اندر ایک جڑاؤ کرسی رکھی جاتی'

جس پر آنجناب جلوہ افروز ہوتے اور جس کے گرد اگر دنقیب اور چوبدار ہاتھوں میں سنہری اور روپہلی عصا لئے ہوئے کھڑے ہوتے۔ بادشاہ، شہزادے اور امرا حاضر خدمت ہوکر کھڑے رہتے۔ جب تک حکم نہ ہوتا۔ نہ بیٹھتے۔(1)

یہ تھے حالات، جب دہلی کے ایک نامور عالم کے گھر اخیر عمر میں ایک فرزند ارجمند تولد ہوا، جس کی قسمت میں لکھا تھا کہ وہ ان حالات کی اصلاح میں ہاتھ پاؤں مارے اور اس اخلاقی اور روحانی انحطاط کا سد باب کرے۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مرد گرامی حالات کی پورے طور پر اصلاح کر سکا اور جس سیلاب کو عالمگیر جیسا دوراندیش اور مستعد منتظم نہ روک سکا، اس کا فوری سد باب ایک مذہبی عالم سے کس طرح ہو سکتا تھا لیکن اس بزرگ کی کوششوں سے اتنا ہوا کہ جب اس سیلاب کے بند ٹوٹے تو جہاں مغلوں کا تخت و تاج اس سیلاب میں بہہ گیا۔ وہاں تسبیح و سجادہ تو سلامت رہے اور سیاسی زوال کے ساتھ، قوم کا دینی انحطاط شروع ہو گیا۔

اس بزرگ نے ایک تو قوم کو قرآن فہمی کی نعمت عظمٰی عطا کی اور دوسرے اس نے اور اس کی اولاد نے ایک ایسا نظام قائم کر دیا جو انیسویں صدی کی مذہبی کشمکش میں ہماری سب سے بڑی ڈھال رہا ہے۔ یہ اس خاندان کا ہی فیض تھا کہ جب ہندوستان میں اسلام پر مشنریوں اور مادہ پرستوں کے حملے ہوئے، تو لوگ مذہب اسلام سے واقف تھے۔ اس میں دلچسپی لیتے تھے اور مخالفوں کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ فرنگی محل اور اضلاع پورب کی دوسری درسگاہوں سے فقہ اور منطق کا جو سیلاب آ رہا تھا، وہ اس مذہبی کشمکش میں مفید نہ تھا۔ اس کے لئے روحانی اور اخلاقی قوت کی ضرورت تھی، جو فقہ اور منطق سے نہیں، بلکہ قرآن اور حدیث سے حاصل ہوتی تھی اور انہیں اس خاندان نے جس طرح عام کیا، اس پر تاریخ گواہ ہے۔

اخلاقی حیثیت سے اس خاندان نے جس طرح قوم میں نئی روح پھونک دی تھی، اس کا اندازہ مولانا سید احمد رائے بریلوی کی تحریک جہاد سے ہوتا ہے۔ مغلوں کی وسیع سلطنت جاتی رہی، لیکن ان راحت طلبوں نے کروٹ نہ لی۔ مرہٹے، روہیلے، انگریز جو کوئی بھی آیا، اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ لیکن ولی اللہی تحریک کا اثر تھا کہ لوگ اپنے گھروں میں سینکڑوں میل دور، بالاکوٹ کی پہاڑیوں میں پروانہ وار اپنی جان پر کھیلتے تھے۔ یہ کوشش ناکام رہی، لیکن کیا ان لوگوں کے ایثار، مذہبی غیرت اور اخلاقی جرأت میں کوئی شک ہے؟

سودا قمار عشق میں خسرو سے کوہکن
بازی اگرچہ پا نہ سکا، سر تو کھو سکا

اس بزرگ نے نہ صرف قوم کو ایک نئی روحانی اور اخلاقی زندگی عطا کی، بلکہ جیسا کہ ہم آگے چل کر تفصیل سے بتائیں گے۔ عقائد و خیالات کا ایک ایسا نظام مرتب کر دیا، جو اسلامی ہندوستان کے خاص حالات کے لحاظ سے سب سے زیادہ موزوں تھا اور فی الحقیقت قوم کی نئی تنظیم کے لئے روحانی اساس ثابت ہوا۔

خاندانی حالات

شاہ ولی اللہ 21 فروری 1703ء کو یعنی اورنگ زیب کی وفات سے چار سال پہلے پیدا ہوئے۔ یہ زمانہ سیاسی

حیثیت سے اسلام کا عہد زوال ہے، لیکن مذہبی اور علمی طور پر اصلاح اور تجدید کا زمانہ بھی یہی تھا۔ چنانچہ جس سال شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے اسی کے قریب اسلام کے دور جدید کا دوسرا بڑا مصلح اور مجدد ریگستان نجد میں ظہور پذیر ہوا۔

شاہ صاحب کا سلسلہ نسب والد کی طرف سے حضرت عمرؓ اور والدہ کی طرف سے امام موسیٰ کاظم تک پہنچتا ہے۔ آپ کے ایک بزرگ شیخ شمس الدین مفتی اسلامی حکومت کے آغاز میں ہندوستان آئے اور بمقام رہتک مقیم ہوئے۔ پہلے آپ کا خاندان علم وفضل میں ممتاز تھا، لیکن ایک بزرگ شیخ محمود نے منصب قضا کو ترک کر کے سپاہیانہ زندگی شروع کر دی۔ اس کے بعد یہ خاندان عرصے تک بہادری اور دلیری کے لئے نامور رہا۔ شاہ صاحب کے دادا شیخ وجیہہ الدین صاحب السیف والقلم تھے۔ چنانچہ شاہ صاحب کے والد نے قرآن مجید انہی سے پڑھا۔ لیکن وجیہہ الدین کی شہرت بطور ایک بہادر تیغ آزما کے ہے اور ان کی بہادری کے قصے شاہ عبدالرحیم اپنے گھر والوں کو سنایا کرتے تھے۔ تا کہ انہیں بھی اخلاق فاضلہ حاصل کرنے کا شوق ہو۔ وہ اورنگ زیب کے لشکر میں سردار تھے اور جب کھجوہ کے مقام پر اورنگ زیب اور شجاع کے درمیان معرکہ ہوا تو ان چند باہمت اور وفادار سرداروں میں سے تھے، جو اس وقت بھی ثابت قدم رہے، جب شجاع کے مست ہاتھیوں نے اودھم مچا رکھا تھا اور تمام لشکر تتر بتر ہو رہا تھا۔ وہ اخیر عمر میں دکن کے سفر کے لئے نکلے تھے۔ جہاں مسلمانوں کو اس وقت بڑی مشکلیں درپیش تھیں۔ لیکن برہان پور کے قریب انہیں بہت سے لٹیروں نے آن گھیرا۔ آپ ان کا بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے اور مالوہ کی خاک میں ہی دفن ہیں۔

شاہ عبدالرحیم

شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم تھے۔ انہوں نے تلوار چھوڑ کر کتاب سنبھالی۔ آپ 1054ھ (1644ء) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کچھ گھر پر پائی۔ کچھ آگرے میں جہاں شاہ وجیہہ الدین بسلسلہ ملازمت مقیم تھے۔ میر محمد زاہد ہروی سے معقولات اور علم کلام کی کتابیں پڑھیں اور پھر کچھ عرصے کے لئے خواجہ باقی اللہ کے صاحبزادے خواجہ خرد سے فیض حاصل کیا جو خواجہ حسام الدین کے خلیفہ اور اس زمانے میں نقشبندیہ باقویہ طریقے کے ترجمان تھے۔

آپ کا خاندان قصبہ پھلت (2) میں مقیم ہو گیا تھا لیکن آپ نے اکبر آباد میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد دہلی میں ''مہندیوں'' کے محلے کے نزدیک مدرسہ رحیمیہ قائم کر کے وہاں درس و تدریس کا شغل اختیار کیا۔ آپ کا شمار اپنے زمانے کے اہل دل علماء میں سے ہوتا تھا۔ آپ عام طور پر عہد عالمگیری کے درباری علماء سے الگ تھلگ رہے۔ اورنگ زیب کی دعوت کے باوجود آپ اس کے دربار میں نہیں گئے اور اس زمانے کا فقہی ماحول اور علماء کا دنیادارانہ رنگ آپ کو ناپسند تھا، لیکن آپ کے تعلقات دارالخلافے کی اکثر علمی شخصیتوں سے تھے۔ شاہ ولی اللہ آپ کے متعلق ایک جگہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک شخص بھی ایسا نہیں دیکھا جو عام علوم میں عموماً اور فقہ وحدیث میں خصوصاً ان کی طرح تبحر رکھتا ہو۔ وفات آپ کی 77 سال کی عمر میں، جب شاہ ولی اللہ ابھی سترہ سال کے تھے، (1131ھ-19-1718ء) میں ہوئی۔

شاہ عبدالرحیم کو وہ شہرت نصیب نہیں ہوئی جو ان کے نامور فرزند کے حصے میں آئی ہے اور فی الحقیقت علمی اور دینی خدمات میں بیٹا باپ سے بازی لے گیا۔ لیکن شاہ عبدالرحیم خود بڑے سمجھدار اور بلند پایہ عالم اور صاحب فہم صوفی تھے

اور شاہ ولی اللہ کی علمی ترقیوں اور طبعی نشو و نما میں ان کی تربیت اور تعلیم کو بڑا دخل تھا۔ ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ شاہ ولی اللہ کی ایک نمایاں خصوصیت ان کی ''جامعیت'' ہے۔ یعنی وہ اخلاقی مسائل میں ایسا رستہ ڈھونڈتے ہیں اور اپنی علمی وسعت اور ذہانت کی مدد سے اکثر ایسا راستہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جس پر فریقین متفق ہو سکیں۔ لیکن ایک حد تک یہ خصوصیت شاہ عبدالرحیم میں بھی موجود تھی۔ مولانا عبیداللہ سندھی ان کی اور ان کے دوسرے فاضل بھائی کی نسبت لکھتے ہیں:

''ہر دو بھائیوں کے خاص نظریات کا ماحصل ایک ایسی شاہراہ بنانے کی سعی ہے۔ جس پر مسلمان فلاسفرین (صوفیہ و متکلمین) اور فقہا ساتھ ساتھ چل سکیں۔''

شاہ عبدالرحیم ایک کامل صوفی تھے۔ انہیں خدا رسیدہ بزرگوں کی تلاش رہتی اور ان کی صحبت میں وہ بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے۔ ابن العربی کے وہ مداح تھے۔ اگرچہ عوام کے سامنے وحدت الوجود کے مسائل اس لئے بیان نہ کرتے تھے کہ مبادا لوگ انہیں صحیح طور پر نہ سمجھیں اور الحاد و زندقہ میں گرفتار ہو جائیں۔ لیکن تصوف سے اس قدر شغف کے ساتھ ساتھ وہ فقہ اور علوم ظاہری سے بھی واقف تھے۔ ''انفاس العارفین'' سے پتا چلتا ہے کہ وہ فقہ کی سب سے مفصل کتاب ''فتاویٰ عالمگیری'' کی تصحیح میں بھی کچھ عرصہ کے لئے شریک رہے اور اس زمانے کے سب مشہور علماء و فقہاء سے ان کے روابط رہے۔ اس جامعیت کا یہ اثر ہوا کہ ان کا فرزند عالی مرتبہ نہ فقہ سے متنفر تھا نہ تصوف کا مخالف بلکہ دونوں کے اختلافات دور کرنے کی طرف مائل تھا۔

اس اعتدال پسندی اور ہمہ گیری کے علاوہ ایک خصوصیت جو شاہ عبدالرحیم اور ان کے خاندان کو دوسرے علماء سے ممتاز کرتی ہے' ان کی عملی سوجھ بوجھ ہے۔ عام علماء کتابوں میں ہر وقت محصور رہتے ہیں اور بالعموم مسائل کے نظری اور خیالی پہلوؤں پر زیادہ توجہ رکھتے ہیں۔ شاہ عبدالرحیم اور شاہ ولی اللہ بھی ارباب عمل نہ تھے۔ اہل علم تھے اور وہ نظر کی پختگی اور حقیقت پسندی جو زمانے کے تھپیڑے کھانے اور اہم امور و معاملات کا انتظام کرنے سے آجاتی ہے' انہیں ہر بات میں حاصل نہ تھی۔ لیکن عام علماء سے وہ اس معاملے میں بدرجہا ممتاز تھے اور انہیں کم از کم اس امر کا قوی احساس تھا کہ مسائل کا ایک عملی پہلو بھی ہے جو نظری پہلوؤں سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ شاہ عبدالرحیم نے اس پر بہت زیادہ زور دیا۔ شاہ ولی اللہ ان کی نسبت لکھتے ہیں:

''حضرت ایشاں با اخلاق سلیمہ مرضیہ از شجاعت و فراست و کفایت و غیرت بوجہ اتم موصوف بودن و عقل معاش مثل عقل معاد کامل و وافر داشتند و در مجلس صحبت حکمت عملی و آداب معاملہ بسیاری آموختند۔''

شاہ ولی اللہ نے اس سلسلے میں ان کی جو نصیحتیں ''انفاس العارفین'' میں نقل کی ہیں' وہ سب عملی سوجھ بوجھ کا نمونہ ہیں اور ان میں دو ایک تو اس طرح دنیاداری سے بھری ہوئی ہیں کہ شاید انہیں بعض لوگ ایک مذہبی عالم اور خدا رسیدہ بزرگ کے شایان شان نہ سمجھیں۔ مثلاً:

''مے فرمودند اگر از تو شجاعتے یا سخاوتے یا فتوتے بظہور آید۔ باید کہ ابنائے روزگار از تو آں را بینند و دانند۔ عیادت مقصود اعظم ازاں رضامندی مریض است نہ محض اطلاع بر کیفیت مزاج

وے۔ ہمچنیں تعزیت وہمچنیں سپارش وامثال آں۔ پس کسے کہ ایں جملہ بجا آورد وصاحب معاملہ رابروقت خود مطلع نہ ساخت' محنت خودرا ضائع ساختۂ۔

ان نصیحتوں میں کئی پتے کی باتیں ہیں۔ ایک دفعہ فرمایا:

''از خصلت احمقان است کہ بہ چیزے از لباس وعادت نشان مند شوند۔ یا تکیہ کلام مقرر کنند۔ یا طعامے مقرر کنند کہ ازاں متنفر شوند ومردم بسبب آں مزاح کنند۔''

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

''درسخن گفتن وراہ رفتن ونشستن وبرخاستن برسم اقویا وعادت ایشاں کار کن اگرچہ ضعیف باشی واگر عیبے یا خبثے یا بخلے بناگاہ از تو صادر شود در۔ کتمان واخفائے آں باید کوشید وازاں مستحی باید بود۔ و خودرا بہ تکلف بصفت مقابل فرا باید نمود تا نفس بداں خلل خونگیرد۔''

یعنی قبول اقبال۔

گرفتم ایں کہ غریبی ورہ شناس نہ
زکوئے دوست بانداز محرمانہ گذر

''انفاس العارفین'' میں شاہ ولی اللہ نے اپنے والد بزرگوار کے جو حالات ہیں۔ ان سے پتا چلتا ہے کہ وہ بڑے دیدہ ور صاحب نظر بزرگ تھے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ امرا کے گھر قطعاً نہ جاتے تھے' لیکن اگر امرا میں سے کوئی آپ کی زیارت کے لئے آتا تو اس کا بہت پاس کرتے اور پیار محبت سے اسے نصیحت کرتے۔ بعض مجذوبوں کی طرح بدخلقی سے پیش نہ آتے۔ آپ اپنی معاشرت اور لباس اور وضع قطع میں معتدل مزاج تھے۔ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں۔ ''در ہر امر توسط دوست میداشتند۔ نہ چنداں درتنسک وتعمق فرو رفتہ بودند کہ بر ہبانیت کشد۔ ونہ چنداں ترک تقید بآداب مترسل بودند کہ بہ بتہاون میل کند۔''

آپ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ شاہ ولی اللہ نے آپ کی ایک رباعی نقل کی ہے' جو آپ نے فی البدیہہ کہی اور اپنے فرزندار جمند کو بطور وصیت کے لکھوائی۔ رباعی

گرتو راہ حق بخواہی اے پسر — خاطر کس رامرنجاں' الحذر
درطریقت رکن اعظم رحمت است — ایں چنیں فرمود آں خیرالبشر

حکیم الامت شاہ ولی اللہ کے خاندان کی نسبت عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ وہ تصوف میں نقشبندی مجددی طریقے پر عامل تھے۔ حضرت حکیم الامت کے طریق کار پر ہم آیندہ صفحات میں روشنی ڈالیں گے' لیکن اس بارے میں شاہ عبدالرحیم کا طریقہ بھی وہی تھا جو ان کے وسیع الخیال فرزند کا۔ یعنی وہ ہر سلسلے سے فیض حاصل کرتے۔ ''القول الجمیل'' میں شاہ ولی اللہ نے اپنے والد کے متعدد مرشدوں کے نام گنائے ہیں۔ ان میں سے ایک سید عظمت اللہ اکبر آبادی تھے جو چشتیہ سلسلے کے بزرگ تھے۔ ایک خلیفہ ابوالقاسم اکبر آبادی جنہیں زیادہ تعلق خاطر قادریہ سلسلہ سے تھا۔ ان کے علاوہ انہوں نے نقشبندیہ سلسلے کے بزرگوں سے فیض حاصل کیا۔ لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ یہ بزرگ مجددی سلسلے کی بڑی شاخ

(یعنی حضرت مجدد الف ثانی کے اپنے خاندان) سے متعلق نہ تھے۔ وہ حضرت مجدد کے ارادت مند تھے، لیکن انہوں نے بیعت حضرت مجدد کے بیٹوں اور پوتوں سے نہیں کی تھی، بلکہ نقشبندیہ سلسلے کے دوسرے بزرگوں سے۔ شاہ عبدالرحیم نے حضرت خواجہ خرد سے ایک مدت تک فیض حاصل کیا۔ ''جو شیخ احمد سرہندی اور شیخ الہ داد اور خواجہ حسام الدین کی صحبت میں رہے اور تینوں خواجہ باقی باللہ کی صحبت میں رہے۔'' جب شاہ صاحب نے حضرت خواجہ خرد سے بیعت کی درخواست کی تو انہوں نے حضرت مجدد کے فرزند ارجمند، خواجہ محمد معصوم کی بیعت کا نہیں، بلکہ شیخ آدم بنوری کے کسی خلیفہ کی بیعت کا مشورہ دیا۔ چنانچہ آپ سید عبداللہ اکبر آبادی کے مرید ہوئے جو شیخ آدم بنوری کے ممتاز خلیفہ تھے۔

واقعہ یہ ہے [اور شاہ ولی اللہ نے اس کی تصریح کر دی ہے] کہ شاہ عبدالرحیم سلسلہ ''نقشبندیہ مجددیہ'' نہیں، بلکہ ''طریقہ نقشبندیہ باقویہ'' کے بزرگ تھے۔ ان کا اصل طریقہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کا نہ تھا، بلکہ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کا تھا۔ وہ حضرت مجدد کے ارادت مند اور معترف تھے۔ لیکن مجددی سلسلے کی کئی باتوں کا ان کے ہاں سراغ نہیں ملتا۔

اس کے علاوہ ان کے خاندان میں ہر سلسلے سے فیض حاصل کرنے کا رواج تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ نقشبندیہ سلسلے سے عقیدت کے باوجود وہ اس سے پوری طرح مطمئن نہ تھے۔ مثلاً شاہ ولی اللہ کے جانشین شاہ عبدالعزیز کی نسبت شاہ غلام علی کے قلمی ملفوظات میں لکھا ہے:

> حضرت ایشاں (شاہ غلام علی) فرمودند کہ روزے حضرت مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب و من در یک مجلس بودیم۔ ناگاہ تذکرہ نقشبندیہ آمد۔ مولوی صاحب فرمودند کہ نسبت ایں طریقہ نقشبندیہ بے نمک است۔

حضرت مجدد الف ثانی کے ایک پوتے شیخ عبدالاحد المعروف شاہ گل متخلص بہ وحدت ایک صاحب علم اور صاحب ذوق بزرگ تھے۔ شاہ عبدالرحیم سے ان کا گہرا یارانہ تھا۔ ان کے ایک دوسرے کے نام کئی خطوط ملتے ہیں اور چونکہ دونوں بزرگ دہلی میں تھے، اس لئے اکثر ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ جن میں علمی اور روحانی مسائل پر باتیں ہوتیں۔ ان ملاقاتوں کی جو روئیداد شاہ ولی اللہ نے لکھی ہے، اس سے اس لطیف لیکن گہرے فرق کا اندازہ ہوتا ہے، جو شاہ ولی اللہ خاندان کو مجددی بزرگوں سے تھا۔ مثلاً ایک مسئلہ یہ ہے کہ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، (امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے کے مسئلہ پر اختلاف کے باوجود) ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ اپنے طریقے کے مطابق نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں۔ اس مسئلے پر۔

> شیخ عبدالاحد قدس سرہ نے اپنے اسلاف کی ایک متواتر نقل بایں مضمون پیش کی کہ نماز جماعت بالکل اس درباری جماعت کے مشابہ ہے جو ایک الوالعزم اور پُر شوکت بادشاہ کے سامنے کھڑے ہو کر عرض احوال کرے اور یہ ظاہر بات ہے کہ بادشاہ کا درباری ادب اسی امر کا متقاضی ہے کہ تمام لوگ ایک زبان ہو کر اپنی حاجتیں عرض کریں نہ یہ کہ کوئی کچھ کہے اور کوئی کچھ کہے۔
>
> شیخ عبدالرحیم صاحب نے فرمایا کہ آپ نے حنفی مذہب کی تائید میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، محض قیاس ہے اور قیاس بھی مع الفارق، کیونکہ حقیقت میں دعا اور خضوع کے ساتھ مناجات کرنا اور نفس کو تہذیب و تزکیہ سے آراستہ کرنا نماز ہے۔ جیسا کہ حدیث نبوی لاصلوٰۃ لمن مایقرام بام

الکتب۔ اس دعویٰ پر صراحت کے ساتھ دلالت کرتی ہے اور یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ خدائے تعالیٰ سمیع ہے۔ اگر تمام دنیا کے لوگ ایک میدان میں صف آرا ہوں اور ہر شخص ایک جدا لغت اور نئے الفاظ میں مناجات کرے تو وہ ہر شخص کی علیحدہ علیحدہ مناجات سن سکتا ہے اور ایک شخص کی مناجات دوسرے کی مناجات میں خلل انداز نہیں ہو سکتی۔

اس اختلافی مسئلے کے حق میں اور اس کے خلاف بہت سی دلائل دی جا سکتی ہیں اور اس کی صحت سے یہاں بحث نہیں، لیکن شیخ عبدالاحد اور شیخ عبدالرحیم نے اس مسئلے پر جس طرح اپنے خیالات پیش کیے، اس میں سمجھنے والوں کے لئے بڑا غور وفکر کا سامان ہے اور اس لطیف فرق کو نمایاں کرتا ہے، جو ہمارے دو ممتاز ترین خانوادوں کے طریق کار میں تھا۔ ایک نماز میں سب سے زیادہ اہمیت تہذیب نفس کو دیتا ہے۔ دوسرا اسے جماعت بندی اور ظاہری آداب کے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ ایک جزوی امور میں انفرادی رنگ کی اجازت دینا فرد کی روحانی نشوونما کے لئے مفید سمجھتا ہے۔ دوسرا جماعت بندی کے اصول سے یہ آزادی نہیں دینا چاہتا۔ ایک باطن پر نظر رکھتا ہے۔ دوسرا ظاہر پر۔ ایک جمع بین الفریقین کے اصول پر چلتا ہے۔ دوسرا ایک طریقے پر اصرار کرتا ہے۔ ایک وحدت الوجودی ہے۔ دوسرا وحدت الشہودی!

شیعہ سنی مسئلے پر بھی شاہ عبدالرحیم کا طریق کار اسی طرح اعتدال اور معاملہ فہم کا تھا، جس طرح دوسرے امور میں وہ غلو اور تعصب سے پرہیز کرتے اور یہ امر قابل ذکر ہے کہ جب وہ ایران وروم سے آئے ہوئے ایک فاضل (عبداللہ چلپی) سے شیعہ سنی مسائل پر مباحثہ کرنے گئے تو انہوں نے اپنا مذہب سنی نہیں بلکہ ''خذ ما صفا ودع ما کدر'' بتایا۔

''روضۃ القیومیہ'' میں شیخ عبدالرحیم اور شیخ محمد رضا کو براہ راست حضرت مجدد الف ثانی کے مشہور خلیفہ شیخ آدم بنوری کا مرید لکھا ہے۔

> ''شیخ عبدالرحیم اور شیخ محمد رضا دونوں شیخ آدم کے معتبر خلفا سے ہیں۔ نہایت مستقیم الاحوال تھے۔ صاحب کرامت وخوارق تھے۔ اپنے وقت کے مشہور مشائخ خیال کیے جاتے تھے۔ حضرت قیوم رابع رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی ان کی تعریف کی ہے۔ اب ان کا سلسلہ بہت جاری ہے۔ ان کے مرید ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ ان کی اولاد کا سلسلہ دو جگہ پر ہے۔ ایک پرانی دلی میں۔ دوسرا شاہجہاں آباد کے قریب پہلت نام قصبہ میں [رکن اول ص 5-354]

جب ''روضۃ القیومیہ'' لکھی گئی، اس وقت شاہ ولی اللہ کا عالم شباب تھا۔ مصنف نے شیخ عبدالرحیم اور شیخ محمد رضا کے ذکر کے ساتھ ان کے متعلق بھی ایک سطر لکھی ہے۔

> ''شیخ ولی اللہ۔ آپ شیخ عبدالرحیم کے فرزند ہیں۔ ظاہری اور باطنی علوم کے جامع اور شریعت اور طریقت کے سخت پابند ہیں۔ عموماً پہلت میں رہتے ہیں۔ [رکن اول ص 355]

شاہ ولی اللہ کی تعلیم وتربیت

شاہ ولی اللہ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پانچ برس کی عمر میں آپ نے مکتب جانا شروع کر دیا۔ دو سال میں کلام

مجید پڑھ لیا اور ساتویں سال سے نماز اور روزہ کی پابندی شروع کی۔ پھر فارسی کتابیں اور عربی رسالے پڑھے۔ دس سال کی عمر میں شرح جامی شروع کی اور پھر معقولات ختم کر کے منقولات تک جا پہنچے۔ فقہ، منطق، حدیث، کلام کے علاوہ آپ نے اپنے والد سے طب، معانی اور ہندسہ وحساب کی کتابیں پڑھیں۔

آپ کے بچپن کے متعلق بہت کم واقعات ملتے ہیں، لیکن آپ کے مکتوبات کا ایک مختصر سا مجموعہ مطبع احمدی دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اس میں ایک واقعہ درج ہے، جس سے آپ کی ذہانت اور رنگ طبیعت پر روشنی پڑتی ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ میں ابھی طفل مکتب تھا کہ شیخ فیروز شاہ جو مشاہیر عصر میں سے تھے اور سلسلہ شیخ آدم بنوری سے پیوند رکھتے تھے۔ میرے والد کی ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ آپ اس دنیا میں انہی آنکھوں سے رویت حق سبحانہ کے قائل تھے اور اس مسئلے پر والد ماجد سے بحث کرنے لگے۔ میں بھی باوجود طفولیت کے بیچ میں بول اٹھا کہ باصرہ اپنی ناتوانی یا کسی اور کمی کے باعث اس چیز کو بھی جو ہمارے پیچھے بلکہ ہمارے سر پر ہو، نہیں دیکھ سکتی۔ اس سے قریب ہمارا نفس ہے۔ اسے نہیں دیکھ سکتی۔ پھر اس کی ان کمزوریوں کے باوجود کس طرح اس سے توقع ہو سکتی ہے کہ وہ ایک ایسی ذات کو جو ہر لطیف سے شے زیادہ لطیف ہے، معائنہ کر سکے گی!

جب میں نے مثالیں دے کر یہ بات واضح کی تو بحث ختم ہو گئی اور سب لوگ میری تعریف کرنے لگے۔

15 سال کی عمر میں شاہ عبدالرحیم نے آپ کو بیعت کیا۔ اس کے دو سال بعد والد کا انتقال ہو گیا تو سترہ سال کی عمر میں آپ کو مسند تدریس سنبھالنی پڑی اور قریباً بارہ برس تک آپ نے اپنے والد ماجد کے مدرسہ میں علوم دینی و عقلی کی تعلیم دی۔ اپنے والد کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ''بعد از وفات حضرت ایشاں دوازدہ سال کما بیش بدرس کتب دینیہ و عقلیہ نمودہ و در ہر علمے خوض واقع شد۔''

سفرِ حرمین

اس کے بعد حرمین محترمین کی زیارت کا شوق پیدا ہوا اور آپ عرب تشریف لے گئے۔ دو مرتبہ فریضہ حج ادا کیا اور حدیث شریف جسے ہندوستان میں آپ نے مولانا محمد افضل سیالکوٹی سے پڑھا تھا اس کی سند شیخ ابو طاہر بن ابراہیم مدنی سے لی۔ شیخ ابو طاہر کے فہم کے بڑے مداح تھے اور کہا کرتے تھے کہ ولی اللہ مجھ سے الفاظ کی سند لیتے ہیں اور میں ان سے معانی کی۔

شاہ صاحب نے ابو طاہر کے جو حالات لکھے ہیں، ان سے خیال ہوتا ہے کہ شیخ اسلامی دنیا کے بہترین اساتذہ میں سے تھے۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں ''بالجملہ متصف بود بصفات سلف صالح از ورع و اجتہاد و طاعت و اشتغال بعلم و انصاف در مذاکرہ۔ در ادنیٰ مراجعت تا تامل وافی نکردے و تتبع کتب نہ نمودے جواب ندادے۔'' اختلافی نظریوں کو تطبیق دینے کا جو اصول شاہ ولی اللہ کے والد نے اختیار کیا، ان پر شیخ بھی عامل تھے۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں۔ ''در اثنائے قراۃ صحیح بخاری، سخن در اختلاف روایات احادیث وفقہ افتاد۔ شیخ ابو طاہر گفتند۔ ہمہ از ان ست کہ حقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم در نہایت جمعیت است و از فرط جمعیت اضداد را راجع میتواند کرد۔''

''انفاس العارفین'' میں شاہ صاحب نے اپنے والد اور چچا کے جو حالات لکھے ہیں، ان سے یہ امر قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان پر وحدت الوجودی رنگ غالب تھا۔ شاید شاہ صاحب بھی اپنے خاندانی رجحانات سے متاثر ہوئے تھے اور ان اثرات کی کسی حد تک اصلاح مدینہ منورہ میں ہوئی۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب اسی زمانے کے قریب مدینہ منورہ میں بطور طالب علم وارد تھے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ شاہ صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی، لیکن یہ امر قرین قیاس ہے کہ کئی ایسے بزرگ ہوں گے، جنہیں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے دونوں رہنما جانتے ہوں گے اور ممکن ہے کہ دونوں کے بعض اساتذہ مشترک ہوں۔

قیام مکہ معظمہ کے زمانے میں حضرت حکیم الامت نے ایک خواب دیکھا جس کے دوران میں خود رسول کریمؐ نے آپ کو اس بشارت سے مفتخر فرمایا کہ (ترجمہ)

> ''تمہارے متعلق ارادہ ہو چکا ہے کہ امت مرحومہ کے جتھوں میں سے کسی جتھے کی تنظیم تمہارے ذریعے کی جائے۔''

جن دنوں آپ مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے، ہندوستان میں مرہٹہ گردی کی وجہ سے لوگوں کی بری حالت تھی اور آپ کو ہندوستان سے اس امر کا مشورہ بھی دیا گیا کہ آپ عرب میں ہی اقامت پذیر ہو جائیں، لیکن جس ہستی سے خدائے تعالیٰ نے اس ملک میں بے شمار خدمتیں لینی تھیں اسے بھلا اپنے آرام و سہولت کے لئے یہ مشورہ کیونکر قبول ہوتا۔ چنانچہ آپ نے مشورہ دینے والوں کو لکھا کہ مجھے ہندوستان واپس آنے سے نہ روکو اور واپس آ گئے۔

جب آپ نے واپسی کی تیاری کی تو آپ شیخ ابو طاہر کے پاس گئے اور رخصتی سلام عرض کیا۔ اس وقت شفیق استاد اور ارادت مند شاگرد کے درمیان جو گزری اس کا ذکر شاہ ولی اللہ نے ایک خط میں کیا ہے۔

> میں اس وقت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا کہ جب میرے کوچ کا زمانہ قریب ہوا اور جدائی کی گھڑی سر پر آ کھڑی ہوئی اور رخصتانہ ملاقات کے دوران میں مزاج پرسی کے بعد میں نے یہ شعر پڑھا:
>
> نسیت کل طریق کنتت اعرفه — الا طریقاً یودینی الی ربعکم
>
> (یعنی میں بجز اس رستے کے جو مجھے تمہاری زمین تک پہنچا دے، ان تمام رستوں کو بھول گیا، جن سے میں اس سے پیشتر واقف تھا) تو شیخ کی پُرنم آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں بہنے لگیں اور دونوں رخسارے سرخ ہو گئے۔ یہاں تک کہ وفور گریہ سے آپ کا گلا بند ہو گیا۔ زاں بعد آپ نے نہایت خلوص کے ساتھ اس عاجز کے حق میں دعا کی۔

ہندوستان کو واپسی

استاد کو الوداع کہہ کر شاہ ولی اللہ نے ہندوستان کا رخ کیا اور 9 جولائی 1732ء کو اپنے وطن مالوف دہلی میں وارد ہوئے۔ لیکن اس وقت وطن پردیس سے بدتر تھا۔ اسلامی حکومت پر زوال و ادبار کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ ہر طرف سے اعدا اور ان سے بدتر دوست نما دشمنوں کا ہجوم تھا۔ مرہٹے، سکھ، سادات بارہہ، نادر شاہ، ملک و مخلوقات الٰہی کے لئے ایک

قہر عظیم بنے ہوئے تھے۔ ان حالات کے ملاحظہ سے شاہ ولی اللہ پر جو گزرتی ہوگی اسے نگاہ تصور بآسانی دیکھ سکتی ہے۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان علما و مشائخ کے اس طبقے کا ہم خیال نہ تھا جو عالمانہ یا صوفیانہ مشاغل میں اس طرح مستغرق ہو جاتے ہیں کہ دنیوی ماحول ان کے لئے کوئی ہستی نہیں رکھتا۔ اس خاندان کو علم و عرفان کی قوی کشش کے باوجود واقعات سے بڑا لگاؤ رہا ہے اور وہ قوم کے دکھ درد میں برابر شریک رہے ہیں۔

اس سے پہلے، جب اورنگ زیب کی وفات کے بعد ابھی زوال حکومت کا آغاز تھا تو شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم کی نگاہ انتخاب نے امرا و اراکین سلطنت کی بھیڑ میں سے اس مرد صاحب نظر کو چنا، جو حکومت اسلامی کی بربادی میں سے جو کچھ بچ سکتا تھا، اسے بچا لینے کا اہل تھا اور اسے نیک کام کی تلقین کی۔ شاہ عبدالرحیم نے آصفیہ خاندان کے بانی نظام الملک آصف جاہ کو اورنگ زیب کی وفات کے دس بارہ سال (3) بعد جو خط لکھا، وہ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔

''وزیرالممالک، آصف جاہ کی طرف جہاد کا شوق دلانے کے لئے لکھا گیا......

اس فقیر کی خاطر عاطر پر یہ منکشف ہوا کہ عالم ملکوت میں یہ امر طے شدہ ہے کہ کفار ذلیل وخوار ہوں اور کچھ زمانے میں باغی رسوا و خراب ہوں۔ اب اگر شوکت مآب (آصف جاہ) ان گمراہوں کی مخالفت میں کمر ہمت باندھیں تو یہ سارے کارنامے ان سے منسوب ہوں گے۔ تمام عالم ان کا مسخر ہوگا اور یہ کام رواج ملت اور ان کی دولت کے استحکام کا باعث ہوگا۔

(اس معاملے میں) سعی قلیل سے بھی فائدہ جلیل ہوگا۔ اور اگر آپ کوشش نہ کریں گے۔ تب بھی کفار حوادث سماوی سے ہلاک اور مضمحل ہو جائیں گے۔ لیکن اس صورت میں کارنامے ان کے گنے نہ جائیں گے۔

کار زلف تست مشک افشانی واما عاشقاں
مصلحت راتہمتے برآہوئے چیں بستہ اند

چونکہ یہ امر پکی طرح معلوم تھا، اس لئے بے اختیار اس عزیز کو لکھا گیا۔ وقت کو غنیمت سمجھیں اور جہاد کے معاملے میں سستی یا دیر نہ کریں۔ تھوڑی دیر کے بعد سب چیزیں واضح ہو جائیں گی۔ چونکہ ایک چیز کا اظہار مطلوب تھا۔ اور دوستی اور خیر خواہی دامن گیر، اس لئے مبالغہ سے پرہیز کیا گیا اور اس سے زیادہ فاش تر لکھا نہیں جا سکتا۔

گوئے توفیق و کرامت درمیاں افگندہ اند
کس بمیداں درنمے آید سواراں راچہ شد!

وہ باتیں جو محرموں سے بھی پردے میں کہی جاتی تھیں، یہاں بے پردہ لکھی گئی ہیں تاکہ کوئی عذر نہ رہے۔''

شاہ ولی اللہ نے بھی اپنے والد کی روش جاری رکھی۔ اسلامی حکومت کی مخالفین سے کشمکش کے دوران میں جو کوئی کارنمایاں کرتا، شاہ صاحب اس کے لئے دعا کرتے اور تحریر و تقریر سے اس کا دل بڑھاتے۔ اس سلسلے میں ان کے دو خطوط

قابل ذکر ہیں۔ ایک پائندہ خاں روہیلہ کے نام ہے۔ ''در ہنگام فتح نواح جبال شرقیہ ہندوستان وکسر کناس کفار ومنصوری اہل اسلام۔''

عزیز القدر۔ رفعت مآب المجاہد فی سبیل اللہ۔ الرافع الکلمہ اللہ پائندہ خاں سلمہ اللہ تعالیٰ ....از فقیر ولی اللہ عفی عنہ سلام محبت التیام مطالعہ فرمائند۔ آنچہ شنیدہ میشود ازسعی ایشاں در جہاد کوہستان موجب فرح وخوشی وسبب دعا بہ مظہر الغیب مے شود۔ **اللھم انصر من نصر دین محمد صلی اللہ علیہ۔**

دوسرا خط (4) سہانپور کے فوجدار خان زمان خاں کے نام ہے:

''خدائے تبارک وتعالیٰ مجدد قانون شجاعت ودلاوری، خان عالی مرتبہ خان زمان خاں جیو کو مدت مدید تک اہل کفر کی مخالفت میں مظفر ومنصور رکھے۔

فقیر ولی اللہ عفی عنہ سے بعد سلام مسنون کے واضح ہو کہ بزرگان پھلت نے خان رفیع القدر کی دلجوئی اور تسکین کے لئے خطوط لکھے......

ان ارباب اللہ نے حقیر کے ساتھ مل کر بڑی عاجزی سے (خان عالی مرتبہ کے لئے) حسن خاتمہ اور کمال آبروئے دینی ودنیوی کی دعا کی۔ خدا تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس دعا کو قبول کرے اور انہیں زیادہ اعمال خیر کی توفیق دے۔ والسلام۔''

شاہ صاحب کے یہ تین خطوط کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کے ایک قلمی مجموعے سے ہمیں ملے تھے اور ہم نے انہیں ''رود کوثر'' کے گذشتہ ایڈیشن میں درج کر دیا۔ اس کے بعد پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ''شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات'' نام کی ایک مستقل کتاب میں ان سے بھی اہم مکاتیب (5) شائع کیے ہیں اور رائے ظاہر کی ہے کہ مرہٹوں کے خلاف احمد شاہ ابدالی کو بلانے اور نجیب الدولہ کو اس کا شریک کرنے میں شاہ صاحب کا ہاتھ تھا۔ ''پانی پت کا میدان کارزار حقیقت میں شاہ ولی اللہ صاحب کا سجایا ہوا تھا۔''

شاہ ولی اللہ ان تمام کوششوں میں دلچسپی لیتے، جو حکومت اسلامی کو تباہی اور خلق خدا کو بربادی سے بچانے کے لئے کی جاتیں۔ شاید کسی وقت انہیں یہ خیال بھی گدگداتا ہو کہ (اپنے معاصر شیخ عبدالوہاب کی طرح؟) وہ مخلص اور اہل دل مجاہدین اسلام کا ایک جتھہ بنا کر زوال حکومت کے روکنے میں مدد دیں۔ لیکن اس کے لئے حالات سازگار نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کوشش ان کے نواسے شاہ اسماعیل کی قسمت میں رکھ دی تھی۔ شاہ صاحب نے ایک عملی اور ہوشمند انسان کی طرح مادی اور عسکری کوششوں کے لئے ان لوگوں کو شوق دلایا، جن کا یہ کام تھا اور اپنے آپ کو اس کام کے لئے وقف کیا، جس کے لئے وہ زیادہ موزوں تھے اور جو اہمیت میں اس سے کسی طرح کم نہ تھا۔

خلافتِ باطنی

آج سیاسیات کی گرم بازاری سے بعض حلقوں میں یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ دینی، مذہبی اور علمی کام کوئی اہمیت

نہیں رکھتے۔ ہماری ذہنی تشکیل میں بڑا ہاتھ ان بزرگوں کا رہا ہے، جن کی زندگیاں بطور جرنلسٹ کے، یا اسی طرح کے کسی دوسرے دنیوی صیغے میں شروع ہوئیں۔ طبیعت کے لگاؤ سے یا کسی مصلحت کی خاطر انہوں نے مذہبی معاملات میں بھی ہاتھ مارا۔ لیکن ان کی اصل دلچسپیاں دنیوی اور مادی تھیں۔ ظاہر ہے کہ انہیں روحانی اور علمی معاملات کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن شاہ ولی اللہ اس معاملے میں بھی نہایت صائب اور جامع نقطہ نظر رکھتے تھے۔ انہیں مادی اور دنیوی چیزوں کی اہمیت کا احساس بھی تھا اور ساتھ ہی مذہبی اور دینی کاموں کی بھی دلی قدر تھی۔ اس بات کو انہوں نے ''فیوض الحرمین'' میں نہایت وسعت سے واضح کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرمؐ کا کام جاری رکھنے والوں کے لئے دو راستے ہیں۔ (خلافت ظاہری اور خلافت باطنی) اور دونوں اپنی اپنی جگہ مفید اور ضروری ہیں۔

''رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زندگی میں امت مرحومہ کے لئے نیک نمونہ ہے۔ مثلاً خلافت ظاہری والوں کے لئے جو شرعی حدود اور جہاد کے ساز و سامان کی تیاری اور سرحدی علاقوں کی ناکہ بندی و حفاظت اور وفود کو اکرام و انعام دینے کی خدمت اور صدقات۔ محصول مالگزاری وغیرہ کی وصولی۔ ارباب استحقاق پر ان کی تقسیم۔ مقدمات کے فیصلوں۔ یتیموں کی نگرانی۔ مسلمانوں کے اوقاف کا انتظام۔ راستوں، سڑکوں اور مساجد وغیرہ کی تعمیر اور اسی قسم کے اور کاموں کے لئے مقرر ہیں۔ مسلمانوں میں جو ان خدمات اور مشاغل میں مصروف ہیں، ان کو میں خلافت ظاہری والوں کے نام سے موسوم کرتا ہوں۔

جو لوگ باطنی خلافت والے ہیں یعنی جو اس کام پر مقرر ہیں کہ شرائع اور قوانین اسلامی، قرآن اور سنن و آثار کی تعلیم دیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں۔ وہ لوگ، جن کے کلام سے دین کی تائید ہوتی ہے خواہ وہ مناظرہ و مباحثہ کی راہ سے جیسا کہ متکلمین اسلام کا حال ہے۔ یا وعظ و پند کے طریقے سے جیسا کہ اسلام کے مقررین اور خطبا جس خدمت کو انجام دیتے ہیں یا وہ لوگ جو اپنی صحبت اور توجہ و ہمت سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرتے ہیں۔ جیسا کہ مشائخ صوفیہ کا حال ہے۔ اسی طرح جو نمازیں قائم کراتے ہیں۔ حج کراتے ہیں اور جو انسان (دوام حضور) کے حصول کی راہ لوگوں کو بتاتے ہیں اور زہد و تقویٰ کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں۔ ان کو ہم خلفاء باطنی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔''

شاہ ولی اللہ نے اپنے تئیں رسول اکرمؐ کی خلافت باطنیہ کی تکمیل کے لئے وقف رکھا۔ خلافت ظاہری کے لئے جو لوگ زیادہ موزوں ہوئے، وہ ان کی ہمت افزائی کرتے اور قوم کی مادی مشکلات کبھی ان کی نظر سے اوجھل نہ ہوئیں لیکن ان کا اپنا راستہ دوسرا تھا۔ انہوں نے نہ صرف کلام مجید کا فارسی ترجمہ اور درس و تالیف کتب حدیث سے کتاب و سنت کی وسیع اشاعت کا سامان کیا اور علوم اسلامی کی ترتیب و تنظیم سے ہمارے لئے ایک بیش بہا علمی خزانہ یادگار چھوڑا بلکہ اختلافی معاملات میں ایک ایسا راستہ اختیار کر کے جس پر صوفی اور ملا، شیعہ اور سنی، حنفی اور حنبلی، مجددی اور وحدت الوجودی، معتزلہ اور اشاعرہ متفق ہو سکیں۔ اسلامی ہندوستان کو ایک ایسا دینی اور علمی نظام عطا کیا جو اس ملک میں شعار قومی کی حیثیت حاصل

کر سکتا تھا اور جس کے مروج و مقبول ہونے کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک متفق علیہ مذہبی نظام کی بنیادوں پر ایک قوم کی تعمیر ہو سکی اور جدید اسلامی ہندوستان کا آغاز ہوا۔

مکہ معظمہ جانے سے پہلے حکیم الامت کا اصل کام درس و تدریس تھا۔ واپسی پر آپ نے یہ شغل کم کر دیا۔ بلکہ ہر ایک فن کے لئے ایک ایک قابل شخص کی تربیت کی اور پھر ان فنون کی تعلیم ان کے سپرد کر دی۔ خود فقط حدیث پڑھاتے اور باقی وقت معارف گوئی اور تصنیف و تالیف میں بسر ہوتا۔ خدائے تعالیٰ نے آپ کو صحت بھی اچھی عطا کی تھی اور آپ کے اعتدال اور باقاعدگی سے حفظ صحت میں آسانی ہوتی ہوگی۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں۔ ''مریض ہم کم مے شد'' اور ''اپنے کام میں اس انہماک سے مشغول ہوتے کہ اشراق کے بعد جو بیٹھ جاتے تو دوپہر تک نہ زانو بدلتے نہ کھجلاتے اور نہ دہن مبارک سے تھوک پھینکتے''۔ ''مقالات طریقت'' کے مصنف لکھتے ہیں۔ ''معمول تھا کہ آپ سبق پڑھاتے وقت روبہ قبلہ دوزانو مؤدب بیٹھتے تھے اور ہر روز عادت تھی کہ صبح کو غسل کر کے نیا یا دھویا ہوا لباس پہنتے تھے۔ نظافت کو بہت دوست رکھتے تھے۔ مزاج میں ضبط اس طور تھا کہ آپ کو مدت تک خارش کی شکایت تھی، لیکن آپ شب کو سونے کے وقت جسم کھجلاتے تھے اور کوئی وقت کسی نے آپ کو کھجلاتے نہیں دیکھا۔'' آپ کا حافظہ بھی غضب کا تھا۔ شاہ عبدالعزیز کا بیان ہے۔ ''مثل والد ماجد حافظہ ندیدہ ام'' اور اس محنت، حسن تدبیر اور ذہنی صلاحیتوں کی بدولت آپ نے چند سالوں میں ہی اتنا کام کر لیا کہ دوسروں سے اس کا عشر عشیر بھی مکمل نہیں ہوتا۔ آپ کی وفات (1176ھ۔ 1762ء) میں بمقام دہلی ہوئی۔ تاریخ وفات ہے۔ او بود امام اعظم دیں۔ 1176ھ۔

مولانا شبلی ''تاریخ علم الکلام'' میں لکھتے ہیں۔ ''ابن تیمیہ اور ابن رشد کے بعد بلکہ خود انہی کے زمانے میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزل شروع ہوا تھا۔ اس کے لحاظ سے یہ امید نہ رہی تھی کہ پھر کوئی صاحب دل و دماغ پیدا ہوگا۔ لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھانا تھا کہ اخیر زمانے میں جبکہ اسلام کا نفس بازپسیں تھا۔ شاہ ولی اللہ جیسا شخص پیدا ہوا۔ جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی، ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے۔''

نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں۔ ''اگر وجود او در صدر اول و در زمانہ ماضی می بود امام الآئمہ و تاج المجتہدین شمردہ مے شد۔'' یعنی آپ پہلے زمانے میں پیدا ہوتے تو آپ کو اماموں کا امام سمجھا جاتا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم شاہ صاحب کو محض اپنی کم ہمتی اور تقلید پسندی سے امام نہیں کہتے۔ ورنہ جہاں تک علمی تبحر، دماغی قابلیت، مجتہدانہ نظر، سلیم الخیالی اور اشاعت کتاب و سنت کے سلسلے میں عظیم الشان قومی اور مذہبی خدمات کا تعلق ہے۔ دنیائے اسلام میں بہت ہی کم بزرگ ہوں گے جن سے آپ پیچھے رہے ہیں۔ آپ نے بیسیوں کتابیں لکھیں۔ تفسیر، حدیث، تصوف، فقہ، تاریخ، علم الکلام۔ غرضیکہ علوم اسلامی کی کوئی شاخ نہیں، جسے آپ نے سیراب نہ کیا ہو اور اللہ کا فضل ایسا شامل حال تھا کہ جس چیز کو ہاتھ لگاتے کندن ہو جاتی۔

قرآن:

آپ کا سب سے اہم کام قرآن اور علوم قرآنی کی اشاعت ہے اور اس سلسلے میں آپ کا بڑا کارنامہ قرآن مجید

کا فارسی ترجمہ ہے۔ ہندوستان میں بہت کم لوگ عربی جانتے تھے۔ دفتری اور تعلیمی زبان فارسی تھی۔ لیکن اس زبان میں قرآن مجید کا کوئی ترجمہ رائج نہ تھا۔(6) چنانچہ عام تعلیم یافتہ مسلمان گلستان، بوستان، سکندر نامہ اور شاہنامہ تو پڑھتے اور سمجھتے، لیکن قرآن مجید سے، جو ہدایات کا سرچشمہ ہے، ناواقف رہتے۔ پرانے علما اور خواص میں سے قرآن مجید اگر کسی نے پڑھا تو ناظرانہ۔ یعنی مفہوم و معانی سمجھنے اور اس کی روح و تعلیمات سے فیضیاب ہونے کے بغیر۔ اکبر کے دربار میں جب مسلمان علما اور پرتگیزی مشنریوں میں مباحثے ہوئے اور مشنریوں نے (جو کلام مجید کے لاطینی ترجمے کی وجہ سے اس کے اندراجات سے خوب واقف تھے) کلام مجید کے بعض حصوں پر اعتراض کیے تو اس وقت پتا چلا کہ جن مسلمانوں نے عربی میں قرآن پڑھا بھی تھا۔ انہیں بھی اس کے مضامین اور اندراجات سے پوری طرح واقفیت نہ تھی۔ بسا اوقات یہ ہوتا کہ پادری کلام مجید کے کسی بیان پر اعتراض کرتے اور مسلمان کہہ دیتے کہ یہ تو قرآن میں ہے ہی نہیں اور پھر جب کلام مجید کھول کے دیکھا جاتا تو وہ حوالے نکلتے۔ شاہ صاحب کو اس بوالعجبی کا احساس ہوا اور حج سے واپس آنے کے پانچ سال بعد 38-1737ء میں آپ نے فارسی زبان میں کلام مجید کا ترجمہ کیا۔ جب علما کو اس کا پتا چلا تو تلواریں کھینچ کر آ گئے کہ یہ کلام مجید کی انتہائی بے ادبی ہے۔ بعض سوانح نگار لکھتے ہیں کہ اس مخالفت کی وجہ سے شاہ صاحب کی جان اس طرح خطرے میں پڑ گئی کہ انہیں کچھ عرصہ کے لئے دہلی سے چلے جانا پڑا۔ لیکن بالآخر شاہ صاحب کی جرأت اور فرض شناسی کامیاب ہوئی۔ انہوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ کلام اللہ اس لئے نہیں آیا کہ اسے ریشمی جزدانوں میں لپیٹ کر طاق پر تبرکاً رکھا جائے یا جس طرح دوسری قومیں منتر پڑھا کرتی ہیں، ہم اسے طوطے کی طرح بغیر سمجھے پڑھ دیں۔ یہ کتاب انسانی زندگی کے متعلق اہم ترین حقائق کو بے نقاب کرتی ہے۔ اس کے نازل ہونے کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اسے پڑھیں اور ان حقائق کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائیں اور اس کے لئے رائج الوقت زبانوں میں اس کا ترجمہ ضروری ہے۔ چنانچہ آہستہ آہستہ معترضین کی مخالفت کم ہوئی اور نہ صرف شاہ صاحب کے ترجمے نے رواج پایا، بلکہ اردو اور دوسری زبانوں کے ترجموں کی راہ پیدا ہو گئی۔

قرآن مجید کا محض ترجمہ کر دینا ہی اس قدر اہم کام تھا کہ اگر شاہ صاحب فقط اسی کار خیر پر اکتفا کرتے اور وہ ابتدائی دشواریاں دور کر دیتے جو عام علما کی فرض ناشناسی اور کورانہ تقلید کی وجہ سے ان کے راستے میں حائل تھیں، تب بھی اسلامی تاریخ میں ان کا نام درخشاں ستارے کی طرح چمکتا، لیکن ان کا ترجمہ بطور خود بلند پایہ اور قابل قدر و عظمت ہے۔ ترجمے کی مخالفت بیشتر تو تقلید اور امور مذہب میں مغز کو چھوڑ کر استخوان کے پیچھے دوڑنے کی وجہ سے تھی، لیکن اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید کے ترجمے میں ہزاروں دقتیں ہیں۔ ترجمے میں لفظی صحت کو برقرار رکھنا اور اس کے ساتھ ساتھ قرآن کے بلیغ معانی اور اس کی ادبی شان کو اس پر قربان نہ ہونے دینا اس قدر مشکل ہے کہ آج، جبکہ ہمیں قرآن مجید کے ترجموں میں دو سو سال کی مشق ہے اور قوم کے بہترین علما و ادبا نے اس قومی خدمت پر توجہ کی ہے، ایک بھی ترجمہ ایسا نہیں، جسے تسلی بخش کہا جا سکے یا جس سے اصل کے زور بیان، فصاحت و بلاغت اور روحانی عظمت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ شاہ ولی اللہ کے ترجمے کے متعلق یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے بہتر ترجمہ نہیں ہو سکتا اور اصل میں ضرورت یہ ہے کہ مستند اور بلند پایہ ترجمے کے لئے علما اور اہل قلم کی ایک پوری جماعت یہ فرض ادا کرے، لیکن اکثر باتوں میں وہ موجودہ اردو ترجموں سے کہیں بہتر ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن مجید کا ترجمہ کرنے والے میں جن خصوصیتوں کی ضرورت ہے، وہ شاہ صاحب سے

بڑھ کر آج تک کسی مترجم میں جمع نہیں ہوئیں۔ مولانا نذیر احمد کہتے ہیں۔ ''فی الحقیقت قرآن کے مترجم ہونے کے لئے جتنی باتیں درکار تھیں، ترجمے سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ سب مولانا شاہ ولی اللہ میں علیٰ وجہ الکمال پائی جاتی تھیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ مولانا صاحب کی نظر تفاسیر اور احادیث اور دین کی کتابوں پر ایسی وسیع ہے کہ بس انہیں کا حصہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک آیت بلکہ ہر ایک لفظ کی نسبت مفسرین کے جتنے اقوال ہیں وہ سب ان کے پیش نظر ہیں اور وہ ان میں جس کو واضح پاتے ہیں اسے اختیار کرتے ہیں۔''

شاہ صاحب نے نہ صرف قرآن مجید کا ترجمہ کیا، بلکہ اس مسئلے کے علمی پہلوؤں پر بھی ایک رسالہ لکھا اور مقدمہ فی ترجمۃ القرآن مجید میں قرآن مجید کے مترجموں کی رہنمائی کے لئے کارآمد ہدایتیں درج کیں۔

شاہ صاحب اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔ ''اس بندۂ ضعیف پر خداوند تعالیٰ کی کئی بے شمار نعمتیں ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ عظیم الشان نعمت یہ ہے کہ اس نے مجھ کو قرآن مجید سمجھنے کی توفیق عطا فرمائی اور حضرت رسالت مآب کے احسانات اس کمترین امت پر بہت ہیں، جن میں سب سے بڑا احسان قرآن مجید کی تبلیغ ہے۔''

قرآن مجید کی تبلیغ شاہ صاحب نے فقط ترجمہ کر کے ہی نہیں کی، بلکہ علم تفسیر کے متعلق کتابیں بھی لکھیں۔ جن میں ''الفوز الکبیر فی اصول التفسیر'' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کتاب کے چار باب ہیں، جن میں علوم قرآنی اور مطالعہ قرآن کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ کیا ہے۔ دوسرے باب میں آپ نے مسئلہ نسخ پر مجتہدانہ انداز سے نظر ڈالی ہے اور وہ آیات منسوخہ جن کی تعداد بعض لوگوں کے نزدیک پانچ سو کے قریب تھی اور جن کی تعداد علامہ جلال الدین سیوطی نے بھی بیس مقرر کی تھی۔ چار سے زیادہ تسلیم نہیں کیں۔

''فوز الکبیر'' کے بعض اندراجات سے خیال ہوتا ہے کہ شہ صاحب قرآنی ارشادات کو وسیع سے وسیع مفہوم دینا چاہتے تھے۔ وہ مختلف آیتوں اور سورتوں کے متعلق اسباب نزول کا خیال رکھتے ہیں، لیکن اس بات کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ اس سے کلام مجید کے اصلی مقصد پر پردہ نہ پڑ جائے۔ چنانچہ باب اول میں لکھتے ہیں۔ (ترجمہ)

> ''عام مفسرین نے ہر ایک آیت کو خواہ مباحثہ کی ہو یا احکام کی، ایک قصے کے ساتھ ربط دیا ہے اور اس قصے کو اس آیت کے لئے سبب نزول مانا ہے، لیکن حق یہ ہے کہ نزول قرآنی سے مقصود اصلی نفوس بشریہ کی تہذیب اور ان کے باطل عقاید اور فاسد اعمال کی تردید ہے۔ اس لئے آیات مناظرہ کے نزول کے لئے متکلمین میں عقاید باطلہ کا وجود اور آیات احکام کے لئے ان میں اعمال فاسدہ اور مظالم کا شیوع اور آیات تذکیر کے نزول کے لئے ان کا بغیر ذکر الاء اللہ و ایام اللہ اور موت و واقعات بعد الموت کے بیدار نہ ہونا، اصلی سبب ہوا۔ خاص واقعات کو جن کے بیان کرنے کی زحمت اٹھائی گئی ہے۔ اسباب نزول میں چنداں دخل نہیں۔ مگر سوائے چند آیات کے جن میں کسی ایسے واقعہ کی جانب اشارہ ہے جو رسول اللہ کے زمانے میں یا اس سے بیشتر واقع ہوا ہو۔''

''فوز الکبیر'' کی دوسری خصوصیت شاہ صاحب کی انصاف پسندی اور اخلاقی جرأت ہے۔ مثلاً عام طور پر مسلمان زمانہ جاہلیت کے عربوں سے فقط برائیاں اور عیب ہی منسوب کرتے ہیں، لیکن شاہ صاحب نے اس معاملے میں

بھی ''انصاف بالائے طاعت'' کے اصول کو ملحوظ رکھا اور تصویر کے دونوں پہلو پیش کیے۔ اسی طرح عام مسلمانوں کا خیال ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی اصل مذہبی کتابوں کو بدل ڈالا ہے، لیکن شاہ ولی اللہ اس کے قائل نہ تھے۔ وہ لکھتے ہیں۔ ''یہودی تحریف لفظی، تورات کے ترجمے وغیرہ میں کیا کرتے تھے نہ کہ اصل کتاب میں کیونکہ فقیر کے نزدیک ایسا ہی محقق ہوا ہے اور ابن عباس کا بھی یہی قول ہے۔''

بعض مفسرین نے اہل کتاب سے قصے لے کر انہیں قرآنی تفاسیر اور علوم اسلامی کا جزو بنا دیا ہے۔ اس کے خلاف شاہ صاحب نے جابجا آواز بلند کی ہے۔ مثلاً ''فوز الکبیر'' میں لکھا ہے ''یہاں پر یہ جان لینا مناسب ہے کہ حضرت انبیاء سابقین کے قصے احادیث میں کم مذکور ہیں اور ان کے وہ لمبے چوڑے تذکرے جن کے بیان کرنے کی تکلیف عام مفسرین بیان کرتے ہیں وہ سب الا ماشاء اللہ علمائے اہل کتاب سے منقول ہیں۔'' اسی کتاب میں آگے چل کر پھر لکھتے ہیں۔ ''اسرائیلی روایات کا نقل کرنا ایک ایسی بلا ہے جو ہمارے دین میں داخل ہو گئی ہے۔ حالانکہ صحیح اصول یہ ہے کہ ان کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب۔'' مفسرین کے بعض قصے جنہیں عوام اسلام کا ضروری جزو سمجھنے لگ گئے ہیں، شاہ صاحب کو بہت ناپسند تھے۔ فرماتے تھے۔ ''اور محمد بن اسحاق واقدی کلبی نے قصہ آفرینی میں جس قدر افراط کی ہے (یعنی وہ ہر ایک آیت کے تحت میں ایک قصہ لائے ہیں) محدثین کے نزدیک ان کا اکثر حصہ صحیح نہیں اور ان کے اسناد میں خامیاں ہیں۔ ان لوگوں کی اس افراط کو علم تفسیر کے لئے شرط سمجھنا صریح غلطی ہے اور اس کے حفظ پر فہم کتاب اللہ کو موقوف کرنا دراصل کتاب اللہ سے اپنا حصہ کھونا ہے۔''

مفسرین کی یہی ژولیدہ نویسی تھی، جس کی وجہ سے شاہ صاحب نے اپنے وصیت نامے میں بھی لکھا کہ قرآن اور اس کا ترجمہ تفسیر کے بغیر ختم کرنا چاہیے۔ اور پھر اس کے بعد تفسیر، اور وہ بھی تفسیر جلالین (بقدر درس) پڑھائی جائے۔ (جو نہایت مختصر ہے اور جس کے الفاظ قرآن کے الفاظ جتنے ہیں) وہ لکھتے ہیں۔ ''قرآن عظیم اس طرح پڑھاویں کہ صرف (قرآن اور) ترجمہ بغیر تفسیر کے (پڑھا جائے) مگر جہاں شاہ نزول یا قاعدۂ نحو مشکل ہو وہاں ٹھہر جائیں اور بحث کریں۔ بعد اس کے تفسیر جلالین بقدر درس پڑھا دیں۔'' (ترجمہ)

حدیث

ملا نظام الدین اور ان کے معاصرین کے حالات سے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں اسلامی مدارس جن باتوں پر زور دیتے تھے، وہ صرف ونحو یا منطق اور فقہ کی کتابیں تھیں۔ اس میں کچھ تو لکھنؤ اور وہاں کے علماء کے مذاق کو دخل تھا اور کچھ یہ وجہ بھی تھی کہ حکومت اسلامی کا زمانہ تھا۔ شرع حکومت کا قانون تھی۔ جس طرح آج کل جج یا منصف یا مجسٹریٹ ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس زمانے میں قاضی اور مفتی اور محتسب ہوتے تھے۔ ان لوگوں کو اپنے فیصلوں کے لئے فقہ کی واقفیت درکار تھی۔ منطق بھی فقہی فیصلوں میں مفید تھی اور صرف ونحو عربی جاننے کے لئے ضروری تھی۔ چنانچہ جب تک اسلامی حکومت کا اقتدار رہا۔ انہی علوم نے فروغ پایا۔ شیخ عبدالحق نے حدیث کی اشاعت شروع کی، لیکن فقہ ومنطق کے فروغ نے حدیث کو چمکنے نہ دیا۔ ان کے جانشینوں نے اس علم پر تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ لیکن شاہجہاں اور عالمگیر کی علم

پروری انہیں قضا اور افتا کی مسندوں پر لے گئی۔ وہ درس حدیث کا سلسلہ پوری طرح جاری نہ رکھ سکے اور ملک میں بہت سے علما ایسے نہ پیدا ہوئے جو طالبین کو درس حدیث دے سکتے۔ اس کی تلافی شاہ ولی اللہ صاحب نے کی۔ ایک تو اورنگ زیب کے بعد مفتیوں اور قاضیوں کی پہلی سی قدر نہ رہی اور فقہ کی کشش کچھ کم ہوگئی۔ دوسرے شیخ عبدالحق محدث کی طرح شاہ ولی اللہ بھی فنافی العلم تھے۔ ''قاضی القضاۃ'' اور ''شیخ الاسلام'' بننے کی خواہش ان کے دل میں نہ تھی۔ انہوں نے اپنی کوشش اس علم کی توسیع کے لئے وقف رکھی، جس کی بادشاہوں کے درباروں میں تو قدر نہ تھی، لیکن جو عام مسلمین کی اخلاقی اور روحانی اصلاح کے لئے ضروری تھا۔ علم الحدیث پر انہوں نے کئی کتابیں لکھیں، لیکن اس سے بڑھ کر یہ کیا کہ ایسے علما کی تربیت کر گئے، جنہوں نے درس حدیث کا سلسلہ ان کے بعد جاری رکھا اور یہ فیض ملک میں عام ہوگیا۔

حدیث میں ان کی کئی کتابیں ہیں۔ امام مالک کے مرتب کردہ اور سب سے قدیمی مجموعہ حدیث' مؤطا کے وہ بڑے مداح تھے۔ چنانچہ وصیت نامے میں لکھتے ہیں۔ ''جب عربی زبان کی قدرت ہوجائے۔ مؤطا بروایت یحییٰ بن یحییٰ صمہودی پڑھادیں۔ اسے ہرگز نہ چھوڑیں کہ علم حدیث کی اصل ہے اور اس کے پڑھنے میں بہت فیض ہیں۔'' علم حدیث میں شاہ صاحب کا یہ اجتہاد سمجھنا چاہیے کہ وہ مؤطا کو صحیح بخاری پر بھی ترجیح دیتے ہیں اور اس سلسلے میں مولانا عبیداللہ سندھی کا یہ بیان بڑا پُر معنی ہے کہ موطاء میں وہ تمام مشکل حدیثیں نہیں پائی جاتیں، جن کا سمجھنا کالجوں کے طلباء کے لئے مشکل ہے۔ شاہ صاحب نے مؤطا کی شرح فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں لکھی۔ عربی شرح کا نام ''المسویٰ'' اور فارسی کا ''المصفیٰ'' ہے۔

یہ کتابیں تو علما کے لئے تھیں، لیکن شاہ صاحب نے عوام کے لئے بھی مختصر احادیث کی کتابیں مرتب کیں۔ ایک کتاب چہل حدیث ہے۔ ''النوادر من الحدیث'' میں عجیب اور غیر معمولی حدیثیں جمع کی ہیں۔ ''الدر الثمین فی مبشرات النبی کریم'' میں ایسی چالیس حدیثیں جمع کی ہیں جو خواب میں انہیں بتائی گئیں۔ ''شرح تراجم ابواب بخاری'' میں صحیح بخاری کے ابواب کی سرخیوں کی تشریح کی ہے۔ اسی طرح اور کئی مختصر رسالے ہیں۔ ''حجتہ اللہ البالغہ'' جو اسرار شریعت میں آپ کی ضخیم اور مشہور کتاب ہے اس کے مضامین بھی بیشتر احادیث پر مبنی ہیں اور اس سے بھی علم حدیث سے آپ کی عمیق واقفیت کا پتا چلتا ہے۔

اصولِ فقہ

شاہ صاحب کو فقہ سے بہت دلچسپی نہ تھی۔ ان کے فتوے یا فقہ کے پیچیدہ مسائل کے متعلق بہت سے رسائل نہیں ملتے، لیکن وہ تمام علوم اسلامی کے ماہر تھے۔ وقتی ضروریات کے متعلق انہوں نے فقہی فتوے بہت نہیں دیئے، لیکن علم فقہ کو صحیح علمی اور ٹھوس بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے انہوں نے بڑی کوشش کی اور ایسی کتابیں لکھیں، جو اہل بصیرت و دانش کو ہدایہ اور فتاویٰ عالمگیری سے اوپر فقہ اور شریعت کے اصلی سرچشمہ تک پہنچا دیتی ہیں اور جن کی وجہ سے ایک مبتدی کے لئے بھی ممکن ہے کہ وہ ان حالات کا اندازہ کرلے، جن کے ماتحت شرع اور فقہ کی تدوین ہوئی۔ اس سلسلے میں ان کی بہترین کتاب ایک مختصر رسالہ ''انصاف فی بیان سبب الاختلاف'' ہے۔ اس کتاب کو اگر تاریخ فقہ و علم الحدیث کہا جائے تو بجا ہے۔ کیونکہ فی الحقیقت یہ کتاب عہد سعادت سے لے کر پانچویں صدی ہجری تک فقہ کی تدوین' کتب احادیث کی فراہمی اور مختلف

مذاہب فقہی کے آغاز کی ایک نہایت دلچسپ منصفانہ اور پُر از معلومات تاریخ ہے۔ اصل کتاب عربی میں ہے۔ اب عربی اصل اور سلیس اردو ترجمہ مولانا محمد احسن نانوتوی نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کو شاہ صاحب کی وسیع معلومات اور ذہنی قوت استخراج کا اعجاز سمجھنا چاہیے۔ عام طور پر مسلمان علماء کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ علمی مسائل کے متعلق تاریخی نقطہ نظر نہیں رکھتے۔ یعنی جو عالم حدیث کا درس دیتے ہیں، وہ جس کتاب کا درس دیں، اس کے مضامین سے تو پوری طرح واقف ہوں گے لیکن حدیث کی تاریخ سے انہیں کامل واقفیت نہ ہوگی اور عہد نبوی سے لے کر اب تک محدثین کے مختلف ادوار، جمع احادیث کے طریقے، احادیث کے متعلق مختلف لوگوں کے خیالات، ان باتوں کے متعلق انہیں مسلسل، صحیح اور نقادانہ واقفیت کم ہوتی ہے۔ اسی طرح فقہا ہیں جو فتویٰ تو دے لیں گے اور جو مسائل انہیں پیش کیے جائیں، ان کے متعلق اپنے اساتذہ یا مشہور مصنفین کی تصانیف دیکھ کر فیصلے تو کر سکیں گے، لیکن علم فقہ کی تدوین، عہد بعہد کی ترقیاں اور تبدیلیاں، مختلف صورتیں جو مسائل نے مختلف زمانوں میں اختیار کیں۔ ان سے انہیں پوری واقفیت نہیں۔ عام ہندوستانی علماء کے متعلق یہ اعتراض بہت حد تک صحیح ہے، لیکن شاہ ولی اللہ کے اس مختصر رسالے کو بھی دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ انہیں اسلام کی علمی تاریخ سے کتنی واقفیت تھی۔ اردو میں یہ رسالہ پچاس صفحے سے زیادہ کا نہیں۔ لیکن اس میں نہایت وضاحت اور انصاف پسندی سے قریباً ان سب اہم بنیادی مسائل کا ذکر آ گیا ہے، جن پر علماء میں اختلافات ہوئے۔ ان اختلافات کی توضیح کی ہے۔ ساتھ ساتھ مذاہب اربعہ یعنی حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی طریقوں کی خصوصیات اور ان کی جداگانہ تشکیل کی نہایت عالمانہ تاریخ لکھی ہے۔ جمع احادیث اور محدثین مثلاً بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی کے مجموعوں کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ اجتہاد اور تقلید کے مسئلے پر روشنی ڈالی ہے اور ان وجوہات کا ذکر کیا ہے، جن کی بنا پر مسلمانوں میں تقلید کا رواج ہو گیا۔ ہم اس کتاب میں سے طویل اندراجات نہیں دینا چاہتے۔ کیونکہ ہمارا خیال ہے کہ ہر شخص، جسے علوم اسلامی کی تاریخ سے ذرا بھی دلچسپی ہے اسے خود پڑھے گا اور حرز جاں بنائے گا۔ لیکن تقلید کے متعلق متاخرین نے جو غلو کیا ہے، اس پر شاہ صاحب کا فیصلہ بہت دلچسپ ہے۔ اسے نقل کرنا بیجا نہ ہوگا۔ کتاب کے اخیر میں لکھتے ہیں:

> ''پھر ان لوگوں کے بعد بہت سے قرن نرے تقلید پر پیدا ہوئے کہ نہ حق کو باطل سے جدا کرتے، نہ جدل کو استنباط سے۔ تو فقیہ اس وقت وہی تھا، جو بہت بکے۔ منہ پھٹ ہو کہ فقہا کے قوی اور ضعیف اقوال کو بدون تمیز کے یاد کرے اور ان کو باچھیں چیر چیر کر بیان کرے اور محدث وہ تھا، جو صحیح اور سقیم حدیثوں کو شمار کر لے اور اپنی کلہ زوری سے ان کو کہانیوں کی طرح بکتا چلا جائے.....اور اس کے بعد جو قرن ہوا وہ فتنے اور تقلید میں اور بھی بڑھ گیا اور لوگوں کے دلوں سے دیانتداری جاتی رہی۔ یہاں تک کہ دین کے معاملے میں غور نہ کرنے پر مطمئن ہو گئے اور یہ کہنے لگے کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک دین پر پایا اور ہم انہی کے قدم کے نشانوں پر ان کی پیروی کرتے ہیں۔''

اجتہاد و تقلید

اس کتاب کے علاوہ آپ نے تقلید اور اجتہاد کے مسئلے پر ایک بڑی مفید کتاب ''عقد الجید فی احکام الاجتہاد

والتقلید'' کے نام سے لکھی ہے۔ اس کتاب کے چار باب ہیں، جن میں اجتہاد کی قسموں اور مجتہد کی خصوصیات کے علاوہ اس قسم کے مسائل پر بحث کی ہے کہ ایک عامی فقہا کے اختلاف کی صورت میں کیا کرے اور آیا ایک عامی مختلف فقہی مذاہب کی مختلف باتیں اختیار کر سکتا ہے؟ انہوں نے جماعت کو دو بڑے گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ مجتہدین اور عامی۔ مجتہدین کے تین مدارج ہیں۔ (ا) مجتہدین مطلق یعنی ائمہ اربعہ، (ب) مجتہد فی المذہب اور (ج) مجتہد فی الفتویٰ۔ اجتہاد کی تعریف انہوں نے یہ کی ہے۔ ''خوب محنت کرنا دریافت کرنے میں، شریعت کے احکام فرعی کو ان کی تفصیلی دلیلوں سے جن کی کلیات کا مآل چار قسم پر ہے۔ یعنی کتاب اور سنت اور اجماع اور قیاس (7) پر۔''

معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب باب اجتہاد کے بند ہونے کے قائل نہ تھے۔ وہ عوام کو حق اجتہاد قطعاً نہیں دیتے۔ مجتہدوں کے بھی انہوں نے مدارج مقرر کیے۔ اجتہاد کے لئے جو مناسب شرطیں درکار ہیں، وہ بیان کیں، لیکن وہ کہیں یہ نہیں کہتے کہ اب اجتہاد کی گنجائش نہیں رہی۔ بلکہ انہوں نے اس خیال کی جابجا تردید کی ہے۔ وہ آغاز کتاب ہی میں فرماتے ہیں:

> ''پھر اب جو گمان کیا جاوے ایسے شخص عالم کے حق میں، جو اکثر مسائل میں اپنے امام کے موافق ہو، لیکن اس کے ساتھ ہی ہر حکم کی دلیل چاہتا ہو کہ وہ مجتہد نہیں ہے تو یہ گمان اس شخص کے حق میں گمان فاسد ہے۔ اور اس طرح پر جو یہ گمان کرے کہ مجتہد اس زمانے میں نہیں پایا جاتا۔ بلحاظ اعتماد کرنے کے گمان اول پر تو یہ گمان بناء بر فاسد بر فاسد ہے۔''

شاہ صاحب نے اس کتاب میں ارشادات نبوی کی ایک نہایت اہم خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے اور لکھا ہے ''اور جو کوئی شارع علیہ السلام کے حکموں اور فتووں کو خوب جستجو کرے گا تو اس کو ایک کلیہ قاعدہ مل جائے گا کہ شارع علیہ السلام نے نیکی کی سب اقسام کو طرح طرح سے ضبط فرمایا۔ پھر بھی ان ارکان وغیرہ کی تعریفوں میں جامع اور مانع سے بہت بحث نہیں کی۔'' چنانچہ کئی مثالیں دے کر جن میں رسول اکرمؐ نے کڑی شرطیں نہیں لگائیں۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں۔ ''تو ان امور کی وجہ یہ تھی کہ آپ نے ایسی باتیں انہی لوگوں کی رائے پر حوالہ کر رکھی تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر فتووں کا حال ایسا ہی ہے، جیسا کہ منصف عاقل پر پوشیدہ نہیں اور ہم نے آپ کے احکام کی تلاش سے یہ سمجھا کہ آپ نے تہہ کی باتیں چھوڑنے اور اقسام ضبط کو زیادہ بیان نہ کرنے میں ایک بڑی مصلحت ملحوظ فرمائی ہے۔'' چنانچہ شاہ صاحب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو دھیان میں رکھ کے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جزئیات کے معاملے میں تشدد نہیں کرنا چاہیے اور معمولی اختلافات سے شارع کا مقصود فوت نہیں ہو جاتا۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں ''تو جو کوئی اس مسئلے کی ماہیئت جوں کی توں جان لے گا۔ اس کو یہ امور معلوم ہو جائیں گے۔ اول یہ کہ اجتہاد کی اکثر صورتوں میں امر حق اختلاف کے دونوں جانب کے اندر دائر رہتا ہے۔ دوم یہ کہ دین کے معاملے میں وسعت ہے، تنگی نہیں۔ سوم یہ کہ ایک چیز پر جم جانا اور مخالفت کی نفی کا یقین کرنا کچھ بات نہیں۔''

فقہ کا ایک بڑا اختلافی مسئلہ تقلید اور عدم تقلید کا ہے۔ اس معاملے میں حنفی، شافعی، حنبلی، مالکی، ہر چہار مکاتب فکر کے متبعین مقلد یعنی تقلید ائمہ کے قائل ہیں۔ اہل حدیث جماعت تقلید کی قائل نہیں۔ دوسرا مسئلہ لزوم مذہب معینہ کا ہے۔

یعنی آیا ایک مسلمان کو جو تقلید کا قائل ہے' فقہ کے چار مذاہب میں سے کسی ایک کی تقلید لازم ہے یا وہ مختلف معاملات میں مختلف مذاہب (شافعی' حنفی' مالکی' حنبلی) کی پیروی کر سکتا ہے۔ اس مسئلے پر علما میں بڑا اختلاف ہے۔ شاہ صاحب نے اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ چونکہ انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار بڑی باریکی سے کیا ہے۔ اس لئے یہ رائے بہت واضح اور یکطرفہ نہیں رہی۔ لیکن ان کی تصانیف کے مطالعہ سے خیال ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ ایک عامی کے لئے ''لزوم مذہب معینہ'' کے قائل ہیں' لیکن علما و مجتہدین کے لئے وہ ایسی پابندی ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب کے صفحہ 72 پر لکھتے ہیں ''اور علماء کو درست ہے کہ ہمارے آئمہ میں سے ایک کا قول کسی مصلحت وقت پر عمل کرنے کی وجہ سے اختیار کریں۔'' اسی طرح انہوں نے کتاب کے اخیر میں لکھا ہے:

''یعنی اگر انسان کسی مجتہد کے' جس کو اجتہاد جائز ہو۔ ایسے قول کی جستجو کرے جو اس کے نفس پر سہل ہو تو ہم کو معلوم نہیں کہ شرع نے اس عمل پر اس کی برائی کی ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جو باتیں آپ کی امت پر سہولت کی ہوں انہی کو دوست رکھتے تھے۔''

اس کے علاوہ ''حیات ولی'' میں مولانا رحیم بخش لکھتے ہیں ''آپ کو مذہبی تفریق کے خانہ برانداز جھگڑوں سے چنداں بحث نہ تھی۔ نہ ان مشہور مذاہب اربعہ میں سے کسی خاص مذہب کے پابند تھے کہ خواہ مخواہ اسی کے مطابق عملدرآمد کریں۔'' چنانچہ اس مسئلے کے متعلق خواجہ محمد امین کے سوال کے جواب میں جو کچھ آپ نے لکھا۔ اس سے آپ کا مسلک پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں ''سوال سوم آنکہ عمل تو در مسائل فقیہ برکدام مذہب است۔ گفتم بقدر امکان جمع مے کنم در مذاہب مشہور مثلاً صوم وصلوٰۃ و وضو و غسل و حج بوضعے واقعہ مے شود کہ ہمہ اہل مذاہب صحیح دانند و عند تعذر الجمع باقوی مذاہب از روئے دلیل و موافقت صریح حدیث عمل می نمائیم۔''

شاہ ولی اللہ عامی کو مجتہدین کا مقلد رکھنے کے حق میں تھے اور ظاہر ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو جس ملک میں شرع رائج ہے۔ اس کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ عامی کی تقلید حقیقتاً قوانین رائج کی تعمیل ہے' جو تمام مہذب ممالک پوری طرح کرواتے ہیں لیکن شاہ صاحب تقلید کو حد سے زیادہ بڑھنے کے مخالف تھے۔ انہوں نے ایک باب تقلید میں اعتدال رکھنے کے بارے میں لکھا ہے اور تقلید کی ایک قسم لکھی ہے' جسے قطعاً حرام قرار دیا ہے۔ یعنی تقلید کی وہ صورت جس میں دانستہ یا غیر دانستہ مقلد صریح احادیث پر بھی مفتیوں اور فقیہوں کے اقوال کو ترجیح دیتے رہے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

''اور تقلید حرام کی یہ صورت ہے کہ کسی فقیہ کو گمان کرے کہ وہ علم میں نہایت کو پہنچ گیا ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ وہ خطا کرے تو ایسے مقلد کو جب کوئی حدیث صحیح اور صریح پہنچتی ہے کہ مخالف اس فقیہ کے قول کے ہو تو اس کے قول کو نہیں چھوڑتا۔''

تصوف

تصوف کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہے۔ ایک تو اسے بعض ریاکاروں نے دنیا طلبی اور ابلہ فریبی کا ذریعہ بنا رکھا ہے' لیکن اگر انہیں یہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے کہ ریاکار لوگ کس مشرب میں نہیں ہوتے؟ تب بھی اسلام کی تاریخ میں ایسے مقدس

مگر وارستہ مزاج کثرت سے ملیں گے جنہیں تصوف نے رہبانیت، شرع سے آزادی اور پریشان روی کا راستہ دکھایا۔ بلکہ ہوتا یہ رہا ہے کہ جس کثرت سے شرع کی قیدیں بڑھیں اور اصولی باتوں کو چھوڑ کر فقیہوں اور محتسبوں نے روزمرہ کی معمولی اور بے ضرر باتوں میں بھی لوگوں کو اپنے خیالات اور اپنی کتابوں کے مطابق جکڑ بند کرنا چاہا۔ اسی قدر اہل تصوف کی وارستگی بڑھ گئی۔

یہی وجہ تھی کہ بعض مذہبی حلقوں میں تصوف کی مروجہ صورتیں شروع سے ہی مشتبہ تھیں۔ آج کچھ وہابی اثرات، کچھ اقبال کی مخالفت اور بڑی حد تک مغربی مادیت کی فتح سے تصوف اور بھی بدنام ہو گیا ہے اور مذہبی اعتراضات سے قطع نظر اسے بعض سہل انگار، قومی زوال کا بڑا سبب قرار دیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ تصوف بالخصوص عجمی تصوف نے بسا اوقات ان زمانوں میں فروغ پایا، جب دنیوی نقطہ نظر سے قوم روبہ زوال تھی۔ لیکن ان زمانوں میں تصوف کی مقبولیت، قومی زوال اور دنیوی پریشاں حالی کا نتیجہ تھی، سبب نہ تھی اور ان دونوں کا باعث قوم اور افراد کی عسکری، اخلاقی اور علمی کمزوریاں تھیں۔

لیکن اگر تصوف میں کئی کوتاہیاں ہوں، تب بھی ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اسے جڑ سے اکھیڑ پھینکنا آسان نہیں۔ ہمارا ادب، فلسفہ، مذہب، تصوف کی گود میں پلا ہے اور اگر ہم تصوف کا قلع قمع کریں تو بہت سی قیمتی چیزوں سے ہاتھ دھونا پڑے گا اور اس کے علاوہ تصوف کی اسلامی صورت یعنی احسان یا اخلاص فی العمل کی ضرورت قوم کو ہمیشہ رہی ہے اور رہے گی۔ شاید بعض نوجوان خیال کرتے ہوں کہ غلام قادر روہیلہ کی خودی اور میر جعفر کی خودغرضی سے قوم کو فائدہ پہنچا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر ان بزرگوں پر تصوف اور مناسب نفی خودی (ایثار) کے چند چھینٹے پڑ جاتے تو غالباً ان کا عمل دوسرا ہوتا!

تصوف کی ضرورت صرف خود پرستوں کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لئے نہیں۔ بلکہ جو لوگ قومی راہ میں انتہائی قربانی کرنا چاہتے ہیں، انہیں بھی یہ عمل مفید پڑتا ہے کہ وہ سیدھی سادی صوفیانہ ریاضتوں اور ذکر و شغل کی مدد سے جن کا شرع سے کوئی تضاد نہیں، بلکہ جو شرعی فرائض کی تکمیل کے بعد شروع ہوتے ہیں، اپنی روحانی اصلاح کریں اور شخصی ہوا و ہوس، حسد، غصہ، خواہش انتقام، اور ان علائق دنیوی کو جو ذاتی قربانیوں کی راہ میں حارج ہوتے ہیں، مٹا دیں اور اس طرح فرشتہ منش انسان بن کر اپنے تئیں بنی نوع آدم کے لئے وقف کریں۔

حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ ان روحانی ضرورتوں کی اہمیت سمجھتے ہوں گے۔ اس کے علاوہ انہوں نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی، وہاں تصوف سے لگاؤ ہو جانا لازمی تھا۔ ان کے والد اور چچا اہل طریقت تھے اور معاصرانہ تذکروں (مثلاً روضۃ القیومیہ) میں ان کا ذکر مشائخ کے ضمن میں ہوا ہے۔ علماء کے ضمن میں نہیں۔ چنانچہ شاہ صاحب کو بھی تصوف سے گہری دلچسپی ہوگئی اور ان کی اصلاحی تحریک اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کی تحریک میں ایک وجہ امتیاز یہ تھی کہ اگرچہ یہ دونوں بزرگ عہد نبوی کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں اور شاہ صاحب بھی تصوف کی اصلاح کے خواہاں ہیں، لیکن وہابی مصلحین کی طرح وہ اس کے مخالف نہیں۔

شاہ صاحب نے علم تصوف میں کئی کتابیں لکھیں۔ ایک کتاب ''لمعات'' ہے، جس کا اردو ترجمہ ''لمحات'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ایک رسالہ ''وحدت الوجود والشہود'' (8) لکھا ہے۔ جس میں شیخ اکبر کے ''نظریہ وحدت الوجود'' کی تاویل کر کے اسے شیخ مجددؒ کے مطابق ثابت کیا ہے۔ ''القول الجمیل'' میں بیعت کے طریقے اور فائدے، قادریہ، چشتیہ،

نقشبندیہ سلسلوں کے اذکار اور صاحب بیعت کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ آخر میں دو نہایت دلچسپ اور کارآمد باب عالم ربانی کے خصائص اور آداب تذکیر و موعظت کے متعلق ہیں۔ ''القول الجمیل'' کا ترجمہ ''شفاء العلیل'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ''تفہیمات الٰہیہ'' جس کا کچھ حصہ عربی میں ہے اور کچھ فارسی میں، بیشتر تصوف کے مسائل سے متعلق ہے۔ ان کے علاوہ ''الطاف القدس''۔ ''خیر کثیر'' وغیرہ میں علم تصوف کا بیان ہے۔ ''انفاس العارفین'' میں بھی تصوف کے بہت سے مسائل ضمناً آگئے ہیں۔

شاہ صاحب کو تصوف سے بڑی دلچسپی تھی، لیکن انہیں متصوفین کی قابل اعتراض باتوں کا پورا احساس تھا۔ ان کی تیسری وصیت ہے۔ ''وصیت دیگر آنست کہ دست در دست مشائخ ایں زماں کہ بانواع بدعت مبتلا ہستند۔ ہرگز نباید داد و بیعت ایشاں نباید کرد۔ و بغلو عام مغرور نباید بود۔ و نہ بکرامات۔ زیرا کہ اکثر غلو عام بسبب رسم است و امور رسمیہ را بحقیقت اعتبارے نیست و کرامات فروشان ایں زمانہ ہمہ الا ماشاء طلسمات و نیرنگیات را کرامات دانستہ اند....''

اس کے علاوہ شاہ صاحب نہ صرف مشائخ کے نقائص پر معترض تھے' بلکہ انتہائی نفی خودی کے مخالف تھے اور اقبال کی طرح اسے ملت اسلامیہ کے لئے سخت مضر سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس مسئلے پر فریقین کے خیالات تفصیل سے لکھ کر آپ فرماتے ہیں۔ ''بالجملہ افراط در مقدمات انسلاخ استہلاک و مشغول شدن ہر کس و ناکس بآں دار عضال (مرض شدید) است در ملت مصطفویہ خدا رحمت کناد کسے را کہ سعی اعمال آنہا کند۔''

ہم شاہ عبدالرحیم کی نسبت لکھ چکے ہیں کہ وہ تصوف میں ہر سلسلے کے بزرگوں سے فیض حاصل کرتے تھے۔ شاہ ولی اللہ بھی اسی طریق کار پر عامل تھے۔ ''جس طرح آپ مذاہب اربعہ مشہورہ میں سے کسی خاص مذہب کے مقلد و پیرو نہ تھے۔ اسی طرح اہل سلوک کے طرق میں سے کسی ایک طریقہ کے پابند نہ تھے''۔ (9) بلکہ ہر مذہب و طریقہ میں جو بات کتاب و سنت کے زیادہ موافق اور انسان کی روحانی اور دنیوی فلاح کے لئے زیادہ مفید دیکھتے' اس کو اختیار کرتے۔

شاہ ولی اللہ کو (اپنے والد شاہ عبدالرحیم کی طرح) اصل تعلق خاطر سلسلہ باقویہ نقشبندیہ سے تھا۔ لیکن وہ دوسرے مشہور صوفی سلسلوں سے بھی منسلک تھے اور تذکروں میں لکھا ہے کہ آپ بیعت کے وقت چاروں خانوادوں (یعنی نقشبندیہ۔ چشتیہ۔ سہروردیہ۔ قادریہ سلسلوں) کے بزرگوں کے نام لیتے۔ تاکہ سب سے فیض حاصل ہو سکے۔ ان سلسلوں میں شطاری سلسلہ نہ تھا' لیکن آپ کی اپنی تصانیف سے پتا چلتا ہے کہ آپ نے اس سلسلے کے بعض اشغال اپنے محترم استاد (شیخ ابوطاہر مدنی) اور لاہور کے ایک مشہور بزرگ حاجی محمد سعید لاہوری (10) سے سیکھے تھے۔ شطاری طور طریقے بعض متقی بزرگوں کو پسند نہیں۔ مثلاً شیخ عبدالحق کے استاد شیخ عبدالوہاب متقی کو ان کے والد نے نصیحت کی کہ شیخ غوث گوالیاری شطاری کی صحبت سے دور رہنا۔ اس سلسلے میں شرع کی پابندی پر اتنا زور نہیں اور کہا جاتا ہے کہ شطاری اشغال میں ہندو یوگ کا اثر بھی آگیا ہے' لیکن شاہ ولی اللہ (اور ان کے استاد) کے اس سلسلے سے انتساب سے نظر آتا ہے کہ اگرچہ ظاہر ہے کہ شطاری سلسلے کا عام طور طریقہ انہوں نے نہ اختیار کیا اور شرع کی پوری پابندی کی' لیکن فیض کے معاملے میں وہ دونوں وسعت اور آزادی کی طرف مائل تھے۔ اس کے علاوہ شاہ صاحب کی ابتدائی صوفیانہ تحریروں میں جو خارق عادت واقعات آجاتے ہیں اور بعض جگہ ایسی غیر معمولی فضا ملتی ہے جو ان جیسے تیز بیں اور صاف بیں بزرگ کی تصانیف میں عجیب معلوم ہوتی

ہے۔ ممکن ہے وہ شطاری نسبت کا نتیجہ ہوا!

حجتہ اللہ البالغہ

شاہ صاحب کی تصانیف میں سب سے زیادہ مشہور کتاب ''حجتہ اللہ البالغہ'' ہے۔ اس کے متعلق نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم لکھتے ہیں:

''ایں کتاب اگر چہ در علم حدیث نیست اما احادیث بسیار دراں (درج) کردہ وحکم اسرار بیان نمودہ تا آنکہ درفن خود مبسوق علیہ واقع شدہ ومثل آں دریں دوازدہ صد سال ہجری ہیچ یکے از علمائے عرب وعجم تصنیفے موجود نیامدہ۔''

مولانا شبلی اس کے متعلق لکھتے ہیں:

''حجتہ اللہ البالغہ جس میں انہوں (شاہ صاحب) نے شریعت کے حقائق واسرار بیان کیے ہیں، درحقیقت علم کلام کی روح رواں ہے۔ علم کلام درحقیقت اس کا نام ہے کہ مذہب اسلام کی نسبت ثابت کیا جائے کہ وہ منزل من اللہ ہے۔ مذہب دو چیزوں سے مرکب ہے۔ عقائد واحکام۔ شاہ صاحب کے زمانے تک جس قدر تصنیفات لکھی جا چکی تھیں، صرف پہلے حصے کے متعلق تھیں۔ دوسرے حصے کو کسی نے مس نہیں کیا تھا۔ شاہ صاحب پہلے شخص ہیں، جنہوں نے اس موضوع پر کتاب لکھی۔''

یہ کتاب جس کا اردو ترجمہ چھ سوبیس صفحوں پر محیط (12) ہے۔ شاہ صاحب نے اپنے ایک بزرگ بھائی اور گرامی دوست مولانا محمد عاشق کے ایما پر لکھی۔ کتاب کے شروع میں شاہ صاحب نے ایک مقدمہ لکھا ہے، جس میں کتاب کی غرض وغایت واضح کی ہے۔ آپ نے یہ کتاب اسرار علم دین کے متعلق لکھی۔ مقدمے میں بتایا ہے کہ محدثین کے مختلف طبقے اور علم حدیث کے مختلف پہلو کون سے ہیں۔ بعض علماء ایسے ہیں، جو احادیث کی صحت، ضعف، شہرت اور غرابت کا مطالعہ کرتے ہیں۔ دوسرے علما کی توجہ غریب احادیث کے معانی اور مشکل احادیث کی شرح پر ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ ایک گروہ فقہا اور محدثین کا ہوا ہے، جو احادیث کے شرعی معنی بیان کرتے ہیں اور ان سے فقہی احکام اخذ کرتے ہیں۔ اس طرح علم حدیث کی اور کئی قسمیں ہیں، لیکن شاہ صاحب کے نزدیک ''علوم حدیث میں سب سے زیادہ دقیق فن، جس کی جڑ نہایت عمیق ہے اور جس کا معیار نہایت بلند ہے۔'' اور جو ان کی نظر میں تمام علوم شرعیہ سے زیادہ بلند مرتبہ اور عالی قدر ہے، وہ اسرار دین کا علم ہے، جس میں تمام احکام دین کی حکمت اور لم اور ایک ایک عمل کے راز اور نکات بیان کیے ہیں۔ ''حجتہ اللہ البالغہ'' علم اسرار دین کی کتاب ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ مذہب اسلام کے جو عقائد یا احکام ہیں، ان میں کیا مصلحتیں ہیں۔ شاہ صاحب خود اسی سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:

''بعض لوگ خیال کیا کرتے ہیں کہ شریعت کے احکام میں کوئی مصلحت نہیں ہوا کرتی اور اعمال اور ان کی جزا میں جو منجانب اللہ مقرر ہے کوئی مناسبت نہیں ہے اور احکام شریعت سے تکلیف کرنا بعینہ

ایسا ہے، جیسے کوئی آقا اپنے ملازم کی فرمانبرداری کی آزمائش کرنے کو کسی پتھر کے اٹھانے یا کسی درخت کے چھونے کا حکم دے۔ جس میں بجز آزمائش کے اور کوئی فائدہ نہیں۔ پس اگر اس کی اطاعت کرے جزا پاوے اور سرکشی کرے تو سزا دی جاوے۔'' ''یہ گمان بالکل فاسد ہے۔ حدیث اور ان زمانوں کے اجماع جن کی خوبی اور برکت پر خود شرع نے شہادت دی ہے۔ اس خیال کی تکذیب کرتے ہیں۔''

اس کے بعد تفصیل سے ارکان اسلام مثلاً نماز، حج، زکوٰۃ اور روزہ کی مصلحتیں بیان کی ہیں۔ شاہ صاحب نے کتاب کے دو حصے کیے ہیں۔ پہلا حصہ جو اردو ترجمے میں مقدمے کے بعد 247 صفحوں پر مشتمل ہے۔ ان عام اصولوں اور کلیہ قاعدوں کے متعلق ہے، جن پر شریعتوں اور مذہبوں کی مصلحتوں کا مدار ہے۔

دوسرے حصے میں پہلے حصے کے قاعدوں اور اصولوں کی کسوٹی پر مذہب اسلام کے مختلف فروعی احکام کو پرکھا ہے۔ ایک تو احادیث کے مطابق ان احکام کی توضیح کی ہے۔ دوسرے ان احکام کی مصلحتیں بیان کی ہیں۔ اس حصے میں طہارت، عبادت اور ارکان اسلامی کے علاوہ ذیل کے مسئلوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(1) ابواب احسان (2) ابواب معاملات (3) ابواب تربیت منزل (4) ابواب سیاست مدن (5) ابواب معیشت (6) چند ابواب مختلف۔

شارع نے شریعت اسلام کو مرتب کرتے وقت جن مقاصد کو پیش نظر رکھا، وہ شاہ صاحب کے نزدیک تین ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

''جس مصلحت پر شارع نے مستند کیا ہے اور جس خرابی سے باز رکھا ہے۔ اس کی انتہا تین اصولوں میں سے ایک نہ ایک پر ہوتی ہے:

(1) ان چار اوصاف میں سے جو معاد میں مفید ہیں یا ان تمام خصلتوں میں سے جو دنیا میں سود مند ہیں، کوئی نہ کوئی وصف نفس میں پیدا کرنا اور ان کو شائستہ اور مہذب بنانا ہے۔ (2) کلمہ الٰہی اور سچے مذہب کو غالب کرنا۔ شرائع کو خوب مستحکم کرنا، ان کی اشاعت میں کوشش کرنا ہوتا ہے۔ (3) عامہ خلائق کی حالت کو منتظم کرنا، ان کے امور نافع اور تدابیر مفیدہ کی درستی کرنا اور ان کی رسموں کو مہذب صورت میں ملانا۔

''حجۃ اللہ البالغہ'' کی اہمیت کا صحیح اندازہ اس کے مطالعہ سے ہی ہوسکتا ہے، لیکن مندرجہ بالا اقتباسات سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ شاہ صاحب کا نقطہ نظر عقل اور سمجھ کے کس قدر قریب تھا۔ ان کی ساری کتاب کی غرض وغایت ہی اس خیال کی تائید تھی کہ جو لوگ ڈرا دھمکا کر احکام شرعی کی تعمیل کراتے ہیں، وہ دین کو صحیح طور پر نہیں سمجھتے۔ اسلام کے تمام احکام کسی نہ کسی دنیوی یا روحانی مصلحت پر مبنی ہیں۔ چونکہ ان مصلحتوں کی توضیح ہی اسلام کی حقانیت اور صداقت کے حق میں بہترین دلیل وحجت ہے۔ اس لئے اس کتاب کا نام انہوں نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' رکھا۔

شاہ صاحب کی کتاب پر تبصرہ ختم کرنے سے پہلے ہم ضمناً ایک مسئلے کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ بعض حلقوں

میں کہا جاتا ہے کہ زمانہ روز بروز خراب آ رہا ہے اور ماضی کی نسبت حال اور مستقبل دونوں زمانے برے ہیں۔ یہ نقطۂ نظر جس نے قوم میں ایک بے ہمتی اور مایوسی پیدا کر رکھی ہے، فی الحقیقت مواعید قرآنی اور ارشادات نبوی کے صریحاً خلاف ہے اور اسے وہی لوگ اختیار کرتے ہیں، جو ماضی کی ہر ایک بات کو خوش اعتقادی کی عینک سے اور حال کی ہر ایک چیز کو شک اور وہم اور خوف کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب ازمنہ ماضیہ کی خوبیوں اور خامیوں سے پوری طرح واقف تھے اور سنت الٰہیہ پر بھی ان کی پوری نظر تھی۔ انہوں نے ''حجتہ اللہ البالغہ'' کے اخیر میں عہد سعادت کی اہمیت اور خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے عام نقطۂ نظر کی پوری طرح تردید کی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چند اہم احادیث نقل کی ہیں۔ مثلاً آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا ہے: (ترجمہ) کہ میری امت کی صفت بارش کی سی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ پہلا مینہ اچھا ہے یا اخیر کا''۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ (ترجمہ) تم میرے صحابہ ہو اور میرے بھائی وہ ہیں جو میرے بعد آئیں گے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ مختلف اعتبارات اور مختلف وجہیں ہر زمانے میں موجود ہوا کرتی ہیں۔''

اس کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں ''اور یہ بھی ممکن نہیں کہ عمدہ اور بزرگ زمانے کے ہر شخص کو دوسرے مفضول زمانے پر فوقیت اور فضیلت ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جو قرون بالاتفاق عمدہ اور بزرگ تھے۔ ان میں بعض لوگ فاسق اور منافق بھی تھے۔ انہی زمانوں میں حجاج، یزید بن معاویہ مختار ہیں۔''

دیگر تصانیف

شاہ صاحب بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ جن کتابوں کا ہم ذکر کر چکے ہیں، ان کے علاوہ ان کی کئی اور کتابیں ملتی ہیں۔ ان میں ایک کتاب ''الجزء الطیف'' آپ کی نہایت مختصر سوانح عمری ہے، جس کا ترجمہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے جرنل بابت 1912ء میں شائع ہو چکا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے حالات میں ایک رسالہ لکھا ہے۔ ''انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ'' جو اردو ترجمے کے ساتھ شائع ہو چکی ہے، تصوف کے متعلق ہے۔ اسی طرح ایک کتاب قصص الانبیا جس کا اردو ترجمہ بھی ہو گیا ہے، آپ سے منسوب کی جاتی ہے۔ آپ کے ایک سوانح نگار نے آپ کی سینتیس تصنیفات کے نام لکھے ہیں، جن میں اکثر شائع ہو چکی ہیں۔ اگرچہ بہت سی اب کمیاب ہیں۔ آپ کی ایک نہایت دلچسپ کتاب ''المقدمتہ السنیہ'' ہے، جس میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ایک کمیاب فارسی رسالے کا ترجمہ کیا ہے۔ ان کی سوانح عمری لکھی ہے اور انہوں نے شریعت اور تصوف کی تطبیق کی جو کوشش کی تھی، اس کا حال لکھا ہے۔ اس کے علاوہ اکبری دور کے عقائد کا ذکر کر کے اس زمانے کے الحاد پر نکتہ چینی کی ہے۔ اگرچہ مذہبی نقطۂ نظر سے شاہ صاحب اس زمانے کے خیالات کو پسند کرتے تھے، لیکن وہ اس بات کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں، کہ اس زمانے میں علما و صلحا کی کوئی کمی نہ تھی۔ چنانچہ ان کی فہرست بھی دی ہے۔

اصلاحِ معاشرت

اس کتاب کی گنجائش کے مطابق ہم نے شاہ صاحب کی تصانیف کا ذکر تفصیل سے کر دیا ہے، لیکن وہ اس زمانے

کے باقی علما کی طرح فقط کتابیں پڑھنا اور پڑھانا ہی اپنا فرض نہ سمجھتے تھے۔قوم کی معاشرتی بیماریوں پر بھی آپ کی نظر تھی اور اپنی تصنیفات میں انہوں نے ان خرابیوں کو جا بجا بے نقاب کیا۔اس موضوع پر ان کا بہترین اظہار خیال "تفہیمات الٰہیہ" کے ایک باب میں ہے جو سارے کا سارا پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے، لیکن آپ کے مختصر وصیت نامے سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرتی اصلاح کا جو درخت مولانا سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید کے ہاتھوں پھلا پھولا، اس کا بیج آپ ہی نے بویا تھا۔وصیت نامہ میں آپ نے ہدایت کی ہے۔"بقدر امکان عادات و رسوم عرب اول کہ منشاء آنحضرت است صلی اللہ علیہ وسلم، از دست ندہیم۔ور سوم عجم و عادات ہنود را از درمیان خود بگزاریم۔" اس کے بعد حضرت عمرؓ کے ان احکام کا ذکر کیا ہے، جو انہوں نے عربوں کو عجمی عیش و عشرت سے بچانے کے لئے نافذ کیے تھے۔"یعنی چوں عرب برائے جہاد باطراف عجم منتشر شدند۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ ترسیدند کہ رسم عجم را اختیار کنندہ و رسم عرب را ترک نمایند۔پس بدیشاں نامہ نوشتند کہ ازار بندید و چادر پوشید و نعل پوشید و بگزارید موز ہا و بگزارید شلوار ہا و لازم گیرید لباس پدر خود اسمٰعیل را و خود را دور دارید از تنعم وہیئت عجم و لازم گیرید نشستن در آفتاب۔ہر آئینہ آفتاب حمام عرب است و برسم قوم معد باشید و درشت لباس باشید و سخت گزران باشید و کہنہ پوشی خو کنید۔"

اس کے بعد ان معاشرتی خرابیوں کا ذکر کیا ہے جو ہندوؤں کی وجہ سے مسلمانوں میں آ گئی ہیں اور جن کی اصلاح کی کوشش آج ہندو قوم خود کر رہی ہے۔سب سے پہلے نکاح بیوگان کا ذکر کیا ہے۔

(1) "یکے از عادت شنیعہ ہنود نست کہ چوں شوہر زنے بمیرد۔نگذارند کہ آں زن شوہر دیگر کند و ایں عادت اصلاً در عرب نبود۔" اس کی مذمت کی ہے اور کہا ہے کہ "خدائے تعالیٰ رحمت کناد برآں کس کہ ایں عادت شنیعہ را متلاشی (برطرف) سازد۔"

(2) دوسری بری رسم بڑے بڑے مہر باندھنا ہے جو سنت نبوی کے خلاف اور خانہ بربادیوں کا سبب ہے۔

(3) تیسری عادت شنیعہ خوشی غمی کے موقعے پر اسراف کی ہے۔جس کی وجہ سے قوم غریب ہو رہی ہے (دیگر از عادات شنیعہ ما مردم اسراف است در ماتمہا و رسوم چہلم و ششماہی و فاتحہ سالینہ و ایں ہمہ را در عرب اول وجود نبود)

یہی چار بڑی خرابیاں ہیں، جن کی اصلاح کے لئے مولانا سید احمد بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید کو کوشش کرنی پڑی اور جن کی اصلاح آج بھی مختلف صورتوں میں قوم کے لئے ضروری ہے۔شاہ ولی اللہ کی سمجھ اور قابلیت قابل داد ہے کہ انہوں نے سات صفحے کے ایک مختصر سے وصیت نامے میں اپنے تجربے کا نچوڑ دے دیا۔قوم کے فائدے کی تمام اہم باتوں کا ذکر کر دیا اور ان ضروری معاشرتی اصلاحوں پر نظر کر کے، جن کی طرف نہ قاضی کی نظر جاتی تھی نہ فقیہ کی وہ بیج بو دیا، جسے شاہ عبدالعزیز اور شاہ اسمٰعیل شہید کے زمانے میں پھولنا پھلنا تھا۔

اشعار اور مکاتیب

شاہ ولی اللہ صاحب کی زندگی اور تصانیف کے مختلف پہلوؤں پر ہم نے تبصرہ کر دیا ہے، لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ شاہ صاحب شاعر بھی تھے اور فارسی غزلوں اور رباعیوں کا ایک معقول ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں۔آپ امین تخلص کیا

کرتے تھے۔ آپ کی اکثر غزلوں اور رباعیوں میں تصوف اور معرفت کے مضامین ادا ہوئے ہیں، لیکن اشعار میں رسمی عاشقانہ خیالات بھی ہیں۔ ہم آپ کے کلام میں سے دو فارسی رباعیات اور ایک فارسی غزل کے چند اشعار کا انتخاب تبرکاً درج کرتے ہیں۔

رباعیات

علمے کہ نہ ماخوذ ز مشکوٰۃ نبی است　　واللہ کہ سیرابی ازاں تشنہ لبی است
جائے کہ بود جلوۂ حق حاکم وقت　　تابع شدن حکم خرد بوالہبی است

قومے بکتابت احرف موصوف　　جمعے بتلاوت اسما معروف
شخصے کہ ازیں قوم قدم بیش نہاد　　گشت است بایں صورت ذہنی مشغوف

ابیات

تا بکے محنت مہجوری و دوری بکشم　　نازنین و طنم سوئے وطن باز روم
تا بکے ہمدمی سنگ بود شیوۂ من　　گوہرے از عدنم سوئے عدن باز روم
تا بکے بستہ زنجیر تعلق باشم　　آہوئے از ختنم سوئے ختن باز روم
بوئے جاں میرسد از باد یمن در دو جہاں　　شاہ ملک یمنم سوئے یمن باز روم

شاہ صاحب نے مستقل تصانیف کے علاوہ عربی اور فارسی خطوط کا ایک معقول ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ ان کا مطالعہ بہت دلچسپ ہے۔ بعض خطوط ذاتی اور نجی ہیں۔ لیکن کئی خطوں میں مختلف علمی مسائل کی توضیح ہے۔ ان خطوط میں بھی شاہ صاحب کی علمی وسعت، مجتہدانہ نظر اور انصاف پسندی پوری طرح نمایاں ہے۔ ایک عربی خط کا ترجمہ ہم نمونے کے طور پر درج کرتے ہیں، جسے انہوں نے بعض دوستوں کے نام لکھا۔ فرماتے ہیں:

> "زمانے کا رنگ بالکل بدل گیا ہے اور مذہب کا چشمہ نہایت مکدر ہو گیا ہے اور ہر پوشش جو مسلمانوں کو ظاہراً رونق دے رہی ہے، حقیقت میں اسلامی نہیں ہے... تم پانچ طرح کے لوگوں سے اپنے تئیں بچاؤ، جو حقیقت میں اناس کے منزلہ میں ہیں۔ ایک بے حیا صوفی سے جو رفع تکلیف کے لئے حیلہ کرتا ہے اور اپنے مجازی امور میں توقف نہیں کرتا۔
>
> دوسرا۔ جھگڑالو معقولی جو شکوک و اوہام کے فتنے پھیلاتا ہے اور خدا کا منقاد و مطیع نہیں ہوتا۔
>
> تیسرا: شیخی خور فقیہ جو مردہ اقوال پر خوش ہوتا ہے اور نبی صلعم نے اپنی امت کے لئے جن باتوں کی توضیح کی ہے ان کی پیروی نہیں کرتا۔
>
> چوتھا: خشک زاہد جو دین میں اس درجہ سختی اور تشدد کرتا ہے کہ گویا اسے کسی بارے میں اجازت ہی

حاصل نہیں۔

پانچواں: سرکش مالدار جو تکلف اور بناوٹ کے ساتھ عجمیوں کی ہیئت اختیار کرتا اور ان کے ہم نوالہ و ہم پیالہ ہونے کو دوست رکھتا ہے۔ والسلام۔"

حکیم الامت کون ہے؟

اسلامی ہندوستان کی مذہبی زندگی میں شاہ ولی اللہ کی عظمت اور اہمیت زیادہ تر تو ان کی علمی اور دینی خدمات کی وجہ سے ہے، لیکن اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ علما یا متصوفین کے کسی خاص گروہ کی ترجمانی نہیں کرتے، بلکہ اپنے وسیع علم اور تیز قوت ادراک کی مدد سے مختلف فریقین کے نقطہ نظر کو سمجھ کر ان کو باہم تطبیق دیتے ہیں اور ہندوستان میں اشاعت کے حالات کچھ ایسے تھے کہ یہاں اس کی بڑی ضرورت ہے۔

شیعہ سنّی خیالات کی تطبیق

ہندوستان کے مسلمان بیشتر سنّی ہیں، لیکن ان پر شیعہ اثرات بھی کثرت سے کارفرما ہے۔ اسلامی ہندوستان کی دفتری اور ادبی زبان فارسی رہی ہے اور ایران میں شیعہ مذہب اختیار ہونے کے بعد وہاں سے متعدد شیعہ علما، شعرا، فلسفی ہندوستان آتے رہے اور بعد میں خود ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ جن کا اثر ان کی تعداد کے تناسب سے بہت زیادہ ہے۔ اب اگر شیعہ سنّی مسئلے میں کوئی عالم اسی طرح غلو کرے، جس طرح نجد یا ماوراء النہر میں کیا جاتا ہے اور دوسرے فریق کا نقطہ نظر سمجھے بغیر ایک فریق کے خیالات پر شدت سے مصر ہو تو وہ قوم میں اختلافات بڑھائے گا اور ہندوستان میں اسلام کی نشوونما، تاریخی اتفاقات کی وجہ سے جن اصولوں پر ہوئی ہے، ان کے سمجھنے سے قاصر رہے گا۔ خوش قسمتی سے شاہ ولی اللہ نے اس معاملے میں ایک احسن طریق عمل اختیار کیا، جو دونوں طبقوں کے نقطہ نظر اور اس بحث پر تمام تاریخی مواد اور نبوی احکام مطالعہ کرنے کے بعد مدون ہوا ہے اور جس کو خواہ دونوں فرقوں کے غالی طرفدار پسند نہ کریں، لیکن اہل انصاف اس کی ضرور قدر کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ نے ان مسائل پر جن کی وجہ سے شیعہ سنّی اختلافات پیدا ہوئے، کئی سیر حاصل کتابیں لکھیں۔ "ازالۃ الخفا" میں انہوں نے بالتفصیل مختلف خلفاء کے خصائل اور ان کے حق خلافت پر تبصرہ کیا اور اپنی رائے یہ ظاہر کی کہ رسول کریمؐ کے قطعی اشاروں کے مطابق خلفا کی ترتیب وہی ہونی چاہیے تھی جو فی الواقع ہوئی۔ لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہ کے فضائل گننے میں آپ کسی شیعہ سے پیچھے نہیں رہے بلکہ "فیوض الحرمین میں" کہتے ہیں (ترجمہ) "میری طبیعت اور میرے فکر کو جب اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو دونوں حضرت علی کرم اللہ وجہ کو فضیلت دیں اور دونوں کو حضرت سے شدید محبت ہے۔" اسی کتاب میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ تفضیل شیخین (یعنی حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ فاروق کی خلافت کے معاملے میں اولیت) کا عقیدہ "ایک ایسی چیز ہے کہ میرے ذاتی میلانات کے خلاف مجھے اس کے ماننے کا حکم ہوا۔ افسوس

ہے کہ مجھ میں اس طرح کی متناقض اور متضاد باتیں ہیں' لیکن مجھ میں جو شدید جامعیت (یعنی تمام باتوں کو دھیان میں رکھنے کی خاصیت) ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے۔''

''جامعیت'' کے علاوہ شاہ صاحب کے معتدلانہ نقطہ نظر کا باعث ان کا متوازن دل و دماغ ہے' جس کی وجہ سے قوم کے ذہنی نظام میں انہیں مرکزیت حاصل ہے۔ اس معاملے میں جس دوسرے بزرگ کا نام لیا جاسکتا ہے' وہ سرکار سرہند حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ ہیں' جن کے احسانات سے اسلامی ہندوستان کبھی عہدہ برا نہیں ہوسکتا اور جن کا مرتبہ' کئی اہم امور میں' شاہ صاحب سے بہت بلند تھا' لیکن وقت وقت کے تقاضے ہوتے ہیں۔ ایک نے کشت ملت کو دشمنوں کے تغلب سے بچایا۔ دینی اور ملی تحفظ کے لئے تیغ و تفنگ کا کام دیا۔ دوسرے نے کشت ملت میں ہل چلایا اور تخم ریزی کی۔ دونوں کے حالات اور مزاج مختلف تھے۔ اس لئے ان کے طریق کار اور انداز خیال میں بھی فرق تھا۔ حضرت مجدد کی امتیازی خصوصیت ان کی ''رگ فاروقیم'' یعنی شدید اسلامی احساس ہے۔ وہ بار بار اپنے مکتوبات میں اس ترکیب کو دہراتے ہیں۔ سامانہ کے خطیب نے خلفائے راشدین کا نام خطبہ میں نہ لیا تو حضرت کی رگ فاروقی حرکت میں آئی اور انہوں نے اکابر شہر کو لکھا کہ آپ لوگ کیوں اس خطیب کے ساتھ ''شدت و غلظت'' کے ساتھ پیش نہ آئے۔ اس طرح کے اور موقعے کئی تھے۔ یہ رگ فاروقی ایک بڑی خوبی ہے اور جس وقت فی الحقیقت اسلام خطرے میں ہو' اس سے بڑھ کر کوئی خوبی نہیں۔ جب حضرت مجدد الف ثانی کے زمانے میں ہندو احیائیت نے اسلام کے لئے زبردست خطرہ پیدا کر دیا تو انہوں نے اس کا ترکی بہ ترکی جواب دے کر اور احیائے اسلام کی تحریک چلا کر برصغیر میں اسلام کو ایک نئی زندگی و توانائی دی۔ لیکن شدت احساس میں واقعات کو صاف اور ان کی صحیح صورت میں دیکھنا مشکل ہوتا ہے اور غیر معمولی حالات میں جو طریق کار ضروری ہو' عام حالات میں اس پر عمل پیرا ہونے سے بسا اوقات دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً شیعوں کی نسبت حضرت مجدد کی رائے (علمائے ماوراء النہر کی طرح) انتہا پسندانہ تھی۔ وہ انہیں کافر سمجھتے تھے اور ان کے صاحبزادے خواجہ محمد معصوم نے تو اورنگ زیب کے نام ایک خط میں شیعوں کو واجب القتل ٹھہرایا ہے۔(13)

حضرت مجدد الف ثانی کے علم و عرفان' خلوص و جرأت اور عظیم احسانات میں شک نہیں۔ جن حالات سے انہیں سابقہ پڑا انہیں دھیان میں رکھتے ہوئے ان کا نقطہ نظر آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔(14) لیکن ظاہر ہے کہ کئی اہم باتوں میں اسے قومی پالیسی کی اساس نہیں بنایا جاسکتا اور اگر آج شیعوں کو قابل گردن زدنی قرار دیا جائے تو پتا نہیں قوم کو کتنے ممتاز اہل قلم' خادمان قوم اور قائدان اعظم سے ہاتھ دھونا پڑے!!

شاہ صاحب کی سب سے نمایاں خوبی ''عدل'' و اعتدال ہے۔ جو کوئی ان کے فلسفہ اور رجحانات پر تبصرہ کرتا ہے۔ اسے ''متوازن دل و دماغ''' ''معتدل مزاج''' ''ہمہ گیر فطرت''' ''جامعیت''' ''توازن صادق''' ''اعتدال صحیح'' یا اس طرح کے الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں۔

حضرت حکیم الامت ہر امر میں طبعی توازن (Balance) برقرار رکھنے کی ضرورت خوب سمجھتے تھے۔ انہوں نے اس صفت کو عدل یا عدالت کا نام دیا ہے اور ''حجۃ اللہ البالغہ''' ''ہمعات'' اور دوسری تصانیف میں اس پر بڑا زور دیا ہے۔ اجتماعی نظام برقرار رکھنے کے لئے انہوں نے اسے ''اصل'' یا ''معیار'' مانا ہے اور اس کی بہت سی شاخیں گنائی ہیں۔

''ہمعات'' میں اس کے متعلق لکھتے ہیں:

''خصلت چہارم عدالت است وآں خصلت ہست کہ صدور اقامت نظام عادل وسیاست کلی ازوے باشد۔ ووے راشعب بسیار است۔ مثل ادب وکفایت وحریت وسیاست مدنیہ وحسن معاشرت وبالجملہ ایں ہمہ یک اصل دارند۔''

ایک اور جگہ اس کی توضیح کی ہے۔ (ترجمہ)

عدالت ہی ایک ایسی اساس ہے کہ جب انسانی اطوار زندگی مثلاً نشست و برخاست، خواب و بیداری، رفتار وگفتگو اور شکل ولباس وغیرہ میں اسکا لحاظ کیا جائے تو اس کو آداب کہتے ہیں اور جب مالی حیثیت یعنی جمع خرچ سے متعلق امور میں اس کو پیش نظر رکھا جائے تو اس کا نام کفایت ہے اور اگر تدبیر منزل میں اس کا صحیح استعمال کیا جائے تو وہ آزادی کہلاتی ہے اور اگر تدبیر مملکت میں اس کو بنیاد بنایا جائے تو اس کو سیاست کہتے ہیں اور اگر اس کو باہمی اخوت ومحبت اور تعلقات میں اساس بنایا جائے تو اس عدل کو حسن معاشرت کا نام دیا جاتا ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ۔ جلد 2، ص 29)

شیعہ سنی مسئلے پر اہل سنت کے نقطہ نظر کی وضاحت اور تائید کے لئے شاہ صاحب نے بہت کچھ لکھا، لیکن اس معاملے میں بھی ان کی رائے اس طرح انتہا پسندی سے دور تھی کہ جب ایک انتہا پسند سنی نے آپ سے پوچھا کہ کیا شیعوں کو کافر سمجھا جائے تو آپ نے یہ نہ مانا اور کہا کہ اس معاملے میں حنفی علما میں اختلاف ہے۔ وہ برہم ہوگیا اور کہنے لگا کہ یہ تو شیعہ ہے۔ یہ روایت خود شاہ عبدالعزیز کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ''شخصے از والد ماجد مسئلہ تکفیر شیعی پرسید۔ آنحضرت اختلاف حنفیہ کہ دریں باب است بیان کردند۔ چوں مکرر پرسید، ہماں شنید۔ شنیدم کہ مے گفت شیعہ است۔'' یہ واقعہ تو شاہ ولی اللہ کے ساتھ ہوا۔ شاہ عبدالعزیز نے دوسری باتوں کی طرح اس معاملے میں بھی اپنے والد کی پیروی کی تھی۔ ان کے ساتھ بھی اس طرح کا واقعہ ہوا۔ ان کا ایک پٹھان شاگرد تھا۔ حافظ آفتاب نام۔ ہمیشہ حاضر درس ہوتا تھا۔ ایک دن حضرت علی کرم اللہ وجہ کا ذکر ہورہا تھا اور شاہ صاحب نے ان کے ''بجان ودل فضائل ومناقب بیان'' کیے تو وہ اتنا بگڑا کہ شاہ صاحب کو شیعہ سمجھا اور ان کے درس میں شریک ہونا بند کردیا۔

مولانا مناظر احسن گیلانی اس مسئلے پر شاہ صاحب کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں پہلے تورانی سنی، پھر ایرانی شیعہ اور آخر میں متشدد سنی، روہیلوں کی شکل میں داخل ہوئے۔ ان تینوں عناصر کے امتزاج سے تسنن وتشیع کے سلسلے میں بھی بڑا کام کیا۔ بڑی محنت سے ہزار ہا ہزار صفحات کو پڑھ کر آپ نے چاروں خلفا کے واقعی حالات ''ازالۃ الخفاء'' میں ایسے دل نشین طریقے سے مرتب فرمائے کہ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد اگر شیعوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے تو اسی کے ساتھ ان غالی سنیوں کی شدت وتیزی میں بھی کمی پیدا ہوتی ہے، جو محض اس لئے کہ شاہ عبدالعزیز نے تنہا حضرت علی کرم اللہ وجہ کے مناقب کیوں بیان کیے۔ یا شاہ ولی اللہ نے شیعوں کی تکفیر میں فقہا حنفیہ کے اختلاف کو کیوں بیان کیا۔ ان پر بھی شیعیت کا فتویٰ صادر کردیتے ہیں اور اس کے لئے بجائے مناظرے اور مجادلے کے شاہ صاحب نے ایک ایسی راہ دریافت فرمائی جس سے بہت سے فتنوں کا سد باب ہوگیا۔''

شریعت اور طریقت

اسی طرح صوفی اور فقیہ یا صوفی یا ملاّ کے اختلاف کا مسئلہ ہے۔ ہندوستان میں کچھ تو مقامی اثرات سے اور کچھ اس وجہ سے کہ ہندوستان میں اسلام صوفیہ کے ذریعے اشاعت پذیر ہوا اور شاید اس لئے بھی کہ سو میں سے نوے ملاّ اسلام کے اس قدر ظاہری پہلوؤں پر زور دیتے ہیں کہ اصلاح باطن کے لئے بلکہ مذہب حقہ سے کوئی فیض حاصل کرنے کے لئے تصوف کی ضرورت رہ جاتی ہے۔ ہندوستان میں تصوف نے بڑا فروغ حاصل کیا' لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ بعض صوفیہ کئی اسلامی احکام کی پابندی نہیں کرتے یا جیسا کہ خود شاہ ولی اللہ نے یا اب اقبال نے بتایا ہے۔ اصولی باتوں (مثلاً مسئلہ استہلاک یا فنا) میں کبھی کبھی اتنا غلو کرتے ہیں کہ اسلامی نقطہ نظر یا قومی اور انفرادی فلاح کے اصولوں سے دور ہو جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے تصوف اور فقہ کے درمیان اختلاف کا دروازہ کھلا جو اس وقت شروع ہوا۔ جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے نائب دہلی خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور شہر دہلی کے قاضی میں اختلاف بلکہ مخالفت کی نوبت آئی اور اس وقت سے آج تک جاری ہے۔ آج تصوف کے انحطاط اور بعض وقتی اثرات سے تصوف کا پانسہ بہت ہلکا ہو گیا ہے۔ لیکن پچھلی صدی تک کسی ہندوستان مسلمان کو یہ خیال بھی نہ آ سکتا تھا کہ کسی صوفی سلسلے میں منسلک ہوئے سوا اور کسی مرشد کامل کے بغیر اسلام کی روحانی زندگی سے کوئی حصہ لیا جا سکتا ہے۔ شاہ ولی اللہ کے زمانے میں تصوف زوروں پر تھا۔ ضرورت تھی کہ اس کی اصلاح کی جائے اور اس کے ان اجزاء کو جو شرع اور فقہ کے خلاف ہیں' علیحدہ کیا جائے تا کہ عوام وخواص کی روحانی اصلاح کے سلسلے بھی منقطع نہ ہوں اور شرع کی مخالفت بھی جاتی رہے۔ شاہ ولی اللہ اس کام کے لئے بے حد موزوں تھے۔ وہ اسلامی فقہ کی تاریخ سے پوری طرح باخبر اور فقہ کے زبردست عالم تھے۔ اس کے علاوہ وہ باقاعدہ صوفی تھے۔ انہوں نے بیعت کر رکھی تھی اور خود اپنے صوفیانہ مشاہدات اور واقعات کا حال انہوں نے اس طرح لکھا ہے کہ محدود روحانی تجربے والوں کو ان کا یقین بھی نہیں آ سکتا۔ انہوں نے اپنے اس علم اور اپنے ذاتی تجربات کو تصوف اور فقہ کے اختلاف مٹانے کے لئے استعمال کیا۔ ان سے پہلے ان کے والد اور ان کے چچا کا بھی یہی طریقہ تھا۔ مولانا عبیداللہ سندھی ان دونوں بزرگوں کی نسبت لکھتے ہیں۔ ''ہر دو بھائیوں کے نظریوں کا ماحصل ایک ایسی شاہراہ بنانے کی سعی ہے' جس پر مسلمان فلاسفر (صوفیہ اور متکلمین) اور فقہا ساتھ ساتھ چل سکیں۔'' ان کوششوں کو شاہ ولی اللہ نے وسعت دی اور تصوف کے مختلف پہلوؤں پر کئی کتابیں لکھیں۔ جن کے متعلق مولانا مناظر احسن گیلانی کہتے ہیں۔ ''ان کتابوں سے ملاّ اور صوفی کے جھگڑوں کا بشرطیکہ انصاف سے کام لیا جائے' خاتمہ ہو جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے تصوف کے مسائل کو خالص اسلامی تعبیروں میں پیش کر کے مولویوں کی اس بھڑک کو مٹا دیا ہے جو ان بے چاروں میں صوفی وصوفیت کے متعلق پائی جاتی ہے۔'' تصوف اور شرع کے معاملے میں شاہ ولی اللہ کے طرز عمل کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ مدرسہ دیوبند میں جہاں شاہ صاحب کے اصولوں کی تھوڑی بہت پیروی ہو رہی ہے' فقط علوم ظاہری کی تعلیم نہیں ہوتی' بلکہ تلامذہ کی روحانی اصلاح کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ اساتذہ میں سے اکثر صحیح تصوف اور تزکیہ نفس کی ضرورت سمجھتے ہیں اور حال میں مدرسے کے سرپرست مولانا اشرف علی تھانوی نے تصوف کے متعلق جو تفصیلی کتاب لکھی ہے وہ بھی فی الحقیقت شاہ ولی اللہ کے نقطہ نظر کا اظہار ہے۔

شاہ ولی اللہ نے نہ صرف صوفیہ اور فقہا کے اختلافات مٹانے کی کوشش کی، بلکہ صوفیہ کے اپنے درمیان جو اختلافات تھے، انہیں بھی کم کرنے میں ساعی ہوئے۔ اس کی ایک نمایاں مثال ان کا ''مکتوب مدنی'' ہے۔ جس میں انہوں نے ابن العربی کی ''وحدت وجود'' اور امام ربانی کی ''وحدت شہود'' کو ایک دوسرے کے مطابق ثابت کیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے روحانی اختلافات مٹانے کے لئے یہ بھی کیا کہ اگرچہ آپ کو زیادہ تعلق خاطر طریقہ نقشبندیہ باقویہ سے تھا، لیکن بیعت کے وقت آپ چاروں خانوادوں کے نام لیتے۔ ''تذکرۃ الرشید'' میں مولانا رشید احمد گنگوہی کا ارشاد درج ہے۔ ''ہمارے حضرات بیعت کے وقت چاروں مشائخ کا نام لیتے ہیں تاکہ سب سے برابر عقیدت رہے اور سب بزرگوں کے فیض سے مستفیض ہوں اور چاروں خانوادوں کے نام لینے کا طریقہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے زمانے سے نکلا ہے۔''

اختلاف بین المذاہب

اس کے علاوہ فقہی مذاہب یعنی حنفی۔ شافعی۔ مالکی۔ حنبلی طریقوں کے اختلاف کا مسئلہ ہے۔ ہندوستان میں تو اس مسئلے نے بہت سنجیدہ صورت اختیار نہیں کی، لیکن ہندوستان سے باہر اسلامی ممالک میں اس پر سخت اختلافات رونما ہوئے ہیں۔ ہمارے ایک دوست کا بیان ہے کہ چند سال ہوئے وہ اسپین ہوتے ہوئے اسپینی مراکش میں بھی بغرض سیر و سیاحت چلے گئے۔ ایک مسجد میں گئے تو امام نے پوچھا۔ ''کیف مذھبکم'' تمہارا مذہب کیا ہے۔ ان بچاروں نے مذہب کا مطلب ہندوستانی محاورہ کے مطابق دین لیا اور کہا کہ مسلمان ہوں۔ امام صاحب نے پھر اپنا سوال دہرایا اور بالآخر ایک اور ساتھی کو ترجمانی کرنی پڑی۔ انہوں نے اپنا فقہی مذہب حنفی بتایا تو امام صاحب اتنے مایوس ہوئے کہ شاید ان صاحب کے یہودی ہونے سے بھی نہ ہوتے! شاہ ولی اللہ نے اس مسئلے میں بھی انصاف اور اعتدال اور سلیم الطبعی سے کام لیا ہے۔ وہ خواجہ محمد امین کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''سوم سوال آنکہ عمل تو در مسائل فقہیہ بر کدام مذہب است۔ گفتم بقدر امکان جمع می کنم در مذاہب مشہورہ۔'' یعنی مختلف مذاہب کو ایک دوسرے پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم حنفی طریقے پر ہوئی تھی۔ ان کے والد اور چچا دونوں حنفی تھے، لیکن ان کے چہیتے استاد شیخ ابوالطاہر مدنی شافعی تھے۔ شاہ صاحب نے دونوں سے فیض حاصل کیا اور وہ دونوں طریقوں کی خوبیوں اور ان کے اختلاف کی وجہ سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ ان اختلافات کو نمایاں کرنے کی نہ کوئی ضرورت ہے نہ اس میں کوئی مصلحت ہے۔ شاہ صاحب کا بس چلتا تو وہ چار مذاہب فقہی یا کم از کم دو مشہور طریقوں کو ملا کر ایک کر دیتے۔ ''تفہیمات'' میں لکھتے ہیں۔

''میرے دل میں ایک خیال ڈالا گیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے مذہب امت میں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ سب سے زیادہ پیرو بھی ان دو کے پائے جاتے ہیں اور تصنیفات بھی انہی مذاہب کی زیادہ ہیں.... اس وقت جو امر حق ملا اعلیٰ کے علوم سے مطابقت رکھتا ہے، وہ یہ ہے کہ دونوں کو ایک مذہب کی طرح کر دیا جائے۔ دونوں کے مسائل کو حدیث نبوی کے مجموعوں سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے۔ جو کچھ ان کے موافق ہو اس کو رکھا جائے اور جس کی کچھ اصل نہ ہو اس کو ساقط کر دیا جائے۔ پھر جو چیزیں تنقید کے بعد ثابت نکلیں، اگر وہ دونوں میں متفق علیہ ہوں، تو مسئلہ میں دونوں قول تسلیم کیے جائیں۔''

جدید علم الکلام کی ابتدا

یہی حال علم الکلام کے متعلق ہے۔ آپ عام معتزلین اور متکلمین کے مخالف تھے اور کئی جگہ ان کے خلاف زور سے اظہار رائے کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں:

''در علوم شرعیہ پیشنیاں چیز ہا آوردند کہ مقصود و معلوم پیشیناں نہ بود بلکہ در سلف امت ازاں اثرے یافتہ نمے شود۔ جموع کثیرہ فلسفہ و حکمت یونانیاں را باعلم شریعت آمیختند و اصل اصول کتاب راز دست دادہ تا آنکہ ظاہر شریعت بنا بر کثرت ایراد و اصراف و تغلیط چیزے دیگر شد۔ علوم اصول دیں را کہ افضل علوم است۔ بہ بیں کہ متکلمین درآں چہ صنائع آفریدند۔ و در وادی جدل و تعمق تا بکجا رسیدند؟ حالانکہ سلف امت نکیر عظیم داشتند بریں جنس کلام وآں را خارج از شریعت پند اشتند۔''

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایک لحاظ سے آپ اسلامی ہندوستان کے سب سے پہلے متکلم ہیں۔ عباسیہ دور میں علم کلام اس لئے وجود میں آیا کہ اسلامی خیالات کو یونانی فلسفہ کے مطابق ثابت کرے اور دور جدید میں سرسید اور ان کے رفقا کی کوشش تھی کہ وہ اسلامی مذہب و فلسفہ کو جدید سائنس اور نیچر سے ہم آہنگ قرار دیں۔ شاہ صاحب اس قسم کے متکلمین میں سے نہیں، لیکن اسلامی تعلیمات کو انسانی دنیا کے بنیادی واقعات اور اصولوں سے ہم آہنگ ثابت کرنے کی کوشش خاص طور پر نمایاں ہے۔ اس میں انہوں نے اسلامی احکام کی مصلحتیں بیان کر کے ثابت کیا ہے کہ یہ احکام فلاح انسانی کے لئے بے حد مفید ہیں اور ان کی غرض و غایت ہی انسانی اصلاح و تہذیب ہے۔ شاہ صاحب نے اس کتاب اور دوسری تصانیف میں کئی ایسی باتیں کہی ہیں، جن سے متکلمین کی ترجمانی ہوتی ہے۔ تقلید کے خلاف انہوں نے بڑی سختی سے اظہار رائے کیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔ (ترجمہ) ''تقلید سے میری جبلت اور سرشت انکار کرتی ہے اور بالکلیہ اس سے بھڑکتی ہے۔'' ایک اور جگہ، عام علما و مقلدین پر بالواسطہ طنز کرتے ہیں۔ ''جمعے کہ سرمایہ علم ایشاں شرح وقایہ و ہدایہ باشد۔ کجا ادراک ایں سر دقیق توانند کرد۔'' اس کے علاوہ ''حجتہ اللہ البالغہ'' کے دیباچے میں شاہ صاحب کا یہ مشہور فقرہ۔ (ترجمہ)

''مصطفوی شریعت کے لئے وقت آ گیا ہے کہ برہان اور دلیل کے پیراہنوں میں ملبوس کر کے اسے میدان میں لایا جائے۔''

ایک نئے علم الکلام کا پیغام نہیں تو کیا ہے؟

شاہ ولی اللہ کے دیدہ ور معاصرین بھی سمجھتے تھے کہ انہوں نے ایک نئے طریق کار کا آغاز کیا تھا۔ خاتم الاولیا شاہ غلام علی ان کی نسبت کہتے تھے ''ایشاں بسیار بزرگ بودند۔ وطریق نو آوردہ اند'' (ملفوظات)

حکیم الامت کے علمی کارنامے

ان احسانات اور انداز خیال کی خوبیوں کے علاوہ اصل چیز شاہ ولی اللہ کا علمی پایہ ہے۔ وہ نہ صرف ہندوستانی علما

کے صدر نشین ہیں، بلکہ اسلامی دنیا کی اہم ترین ہستیوں مثلاً امام غزالی یا علامہ ابن تیمیہ کے پہلو بہ پہلو بیٹھنے کے مستحق ہیں۔ ان کا ترجمۃ القرآن ہی ایک ایسا کارنامہ ہے کہ اگر وہ اور کچھ نہ کرتے، تب بھی انہیں ہمارے علمی محسنوں کی صف اول میں جگہ ملتی، لیکن انہوں نے اس پر اکتفا نہیں کی۔ انہوں نے علوم اسلامی کی ہر شاخ مثلاً حدیث، تفسیر، تاریخ، فقہ، اسرار دین، تصوف کو لیا اور ان میں بلند پایہ اور بنیادی کتابیں تصنیف کر کے ان علوم کی ایک مستقل لائبریری یادگار چھوڑی۔ مولانا مودودی ایک مضمون میں شاہ ولی اللہ کی نسبت لکھتے ہیں:

> ''انہوں نے اسلام کے پورے فکری، اخلاقی، شرعی اور تمدنی نظام کو مرتب صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ وہ کارنامہ ہے، جس میں وہ اپنے تمام پیشروؤں سے بازی لے گئے ہیں۔ اگرچہ ابتدائی تین چار صدیوں میں بکثرت ایسے آئمہ گزرے ہیں، جن کے کام کو دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذہن میں اسلام کے نظام حیات کا مکمل تصور رکھتے ہیں اور اسی طرح بعد کی صدیوں میں بھی ایسے محققین ملتے ہیں، جن کے متعلق یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس تصور سے خالی تھے، لیکن ان میں سے کسی نے بھی جامعیت اور منطقی ترتیب کے ساتھ اسلامی نظام کو بحیثیت ایک نظام کے مرتب کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ یہ شرف شاہ ولی اللہ ہی کے لئے مقدر ہو چکا تھا کہ اس راہ میں پیش قدمی کریں۔''

مولانا موصوف شاہ صاحب کے مرتب کردہ نظام اسلامی کی تفصیلات دے کر لکھتے ہیں:

> ''پھر وہ نظام شریعت۔ عبادات۔ احکام اور قوانین کو پیش کرتے ہیں اور ہر ایک چیز کی حکمتیں سمجھاتے چلے جاتے ہیں۔ اس خاص مضمون پر جو کام انہوں نے کیا ہے، وہ اسی نوعیت کا ہے جو ان سے پہلے امام غزالیؒ نے کیا تھا اور قدرتی بات ہے کہ وہ اس راہ میں امام موصوف سے آگے بڑھ گئے ہیں۔''

ہماری قومی زندگی میں شاہ ولی اللہ کا مرتبہ

شاہ ولی اللہ قومی زندگی کے ایک بڑے نازک دور میں پیدا ہوئے۔ (15) ان کا ظہور اس زمانے میں ہوا، جب اسلامی حکومت کی بنیادیں اکھڑ رہی تھیں اور اس ملک میں صدیوں جاہ و جلال سے حکومت کرنے کے بعد مسلمان اس قدر آرام طلب اور کمزور ہو گئے تھے کہ وہ مرہٹوں اور سکھوں کے مقابلے میں تساہل اختیار کرتے تھے۔ شاہ صاحب کو اس صورت حالات کا افسوس ہوتا ہوگا، لیکن جو شخص عملی کام کرنا چاہے، اسے اپنا دائرہ عمل محدود اور معین کرنا پڑتا ہے۔ شاہ صاحب اپنے آپ کو اس امر کے لئے موزوں نہیں سمجھتے تھے کہ وہ عملی زندگی میں دخل انداز ہو کر واقعات کی رو کو روکیں لیکن جس کام کے لئے وہ موزوں تھے اور جو کچھ کم ضروری نہ تھا (یعنی رسول اکرمؐ کی خلافت باطنیہ) اس کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی۔ وہ ان عیوب اور کوتاہیوں سے پوری طرح واقف تھے جو مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں گھر کر گئی تھیں اور جن کی وجہ سے انہیں یہ روز بد دیکھنا نصیب ہو رہا تھا۔ شاہ صاحب نے انہیں پوری طرح بے نقاب

کرنے کی کوشش کی تا کہ ان کا ازالہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کے ذہنی اور روحانی اختلافات مٹانا ضروری ہے تا کہ وہ صحیح معنوں میں ایک جماعت بن جائیں اور آنے والی مصیبتوں کا مل کر مقابلہ کر سکیں۔ ان کی تمام کوششیں اس پر منعطف رہی ہیں اور اگر چہ بہ تقاضائے فطرت انسانی تھوڑے بہت اختلافات ہمیشہ رہیں گے، لیکن شاہ صاحب نے قرآن، حدیث، فقہ، تصوف میں سالہا سال کی محنت کے بعد ایک ایسا دستور العمل مرتب کر دیا، جس سے اختلافات کی گنجائش تھوڑی ہے اور جس پر آج ہندوستان کے سمجھنے والے اور سوچنے والے علما، صوفیہ، فقہا اور عام مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد متفق ہے۔

خوش قسمتی سے اسلام میں ملک ملک کے لئے علیحدہ مذہبی نظام (National Church) نہیں ہتا۔ لیکن تاریخی، نسلی، لسانی، اثرات پھر بھی کارفرما رہتے ہیں اور مختلف ممالک میں مختلف طریقے برسر کار آتے ہیں۔ ایران میں شیعیت نے عروج پایا۔ نجد میں وہابیت نے۔ کسی ملک میں شافعی فقہ رائج ہے۔ کسی میں حنفی اور کسی میں حنبلی۔ اگر اس نقطہ نظر سے ہندوستانی مسلمانوں کے عقاید، فقہی روایات اور مذہبی میلانات دیکھے جائیں تو یہ نظر آئے گا کہ جو مذہبی نظام اسلامی ہندوستان میں سب سے زیادہ عام ہے، جسے بنگال میں مولوی کرامت علی جونپوری، بہار میں صادق پوری خاندان، اور شمالی ہندوستان میں شاہ عبدالعزیز، مولانا سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید نے رائج کیا اور جو آج دارالعلوم دیوبند کی بدولت خواص سے گزر کر عوام کو متاثر کر رہا ہے۔ اسے شاہ ولی اللہ نے ترتیب دیا اور اگر کسی کو صحیح معنوں میں امام الہند یعنی اسلامی ہندوستان کے خاص مذہبی نظام کا مرتب کہا جا سکتا ہے تو وہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کی ذات بابرکات ہے۔(16)

حکیم الامت کو بھی اپنے کام کی اہمیت اور علو مرتبہ کا احساس تھا۔ ''الجزء اللطیف'' میں کہتے ہیں۔

کہ باور دارد ایں حرف از فقیر خاکسار من	کہ ظل عالم قدس است انکار و قبول او
ندارد باطنش از خویش آئینہ صفت رنگے	طلسم حیرت آلود است تمکین و فضول او
شعاع آفتاب از راہ ایں روزن ہمی ریزد	بجز ایں نکتہ نتواں بست مضمون وصول او!

حواشی

(1) روضۃ القیومیہ۔ رکن دوم ص 142

(2) پھلت ضلع مظفر نگر میں ایک قصبہ ہے۔ میرٹھ سے تخمیناً بیس کوس شمال کی جانب [مقالات طریقت۔ ص 7]

(3) اس خط پر تاریخ تحریر درج نہیں، لیکن چونکہ اورنگزیب کی وفات کے تیرہ سال بعد شاہ عبدالرحیم انتقال کر گئے، اس لئے یہ خط اس

سے پہلے کسی وقت کا ہے اور غالباً محمد شاہی دور کی ابتدا میں لکھا گیا۔

(4) یہ تینوں خطوط ابھی شائع نہیں ہوئے۔ اور کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کے ایک قلمی مجموعہ میں ہیں۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ کے تمام خطوط کو جمع اور شائع کرنے کی بڑی سخت ضرورت ہے۔

(5) افسوس کہ پروفیسر صاحب نے ان خطوط کے ماخذ کی تصریح نہیں کی۔ خدانخواستہ ان پر شبہ کی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن جب ایک مشہور بزرگ کا، جن کی متعدد تصانیف شائع ہو چکی ہیں، ایک مستقل سوانح عمری آج سے بہت پہلے چھپ چکی ہے۔ ایک ایسا نادر ذخیرہ، جس کا کہیں ذکر نہیں، شائع کیا جائے تو اصول فن کے مطابق جائے حصول کی بھی نشاندہی کرنی چاہیے۔ [پروفیسر صاحب نے زبانی فرمایا کہ اس نادر ذخیرہ میں شاہ صاحب کے پانچ سو کے قریب خطوط ہیں۔ وہ انشاء اللہ باقی کو بھی شائع کریں گے اور اس وقت متعلقہ امور کی وضاحت کریں گے۔]

(6) شیخ سعدی کا ایک ترجمہ بھی اب بازار میں ملتا ہے، لیکن شیخ سعدی سے اس کی نسبت مشتبہ ہے اور یقیناً یہ ترجمہ کبھی بھی رائج نہیں ہوا۔ شاہ صاحب سے پہلے ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے سلاطین جونپور کے زمانے میں ایک تفسیر ''بحر مواج''، لکھی تھی، جس میں ہر آیت کی تشریح و تفسیر سے پہلے اس کا ترجمہ دیا تھا۔ لیکن ظاہر ہے اس ترجمے کی حیثیت محض ضمنی اور جزوی تھی اور اسے کبھی بھی عام مقبولیت نصیب نہیں ہوئی۔

(7) ''عقد الجید'' کا ترجمہ مولانا احسن نانوتوی نے کیا ہے۔ ہمارے اقتباسات اسی سے ہیں۔

(8) اس موضوع پر مولوی غلام یحیٰی نے ''کلمات الحق''، لکھی۔ جس کا جواب شاہ رفیع الدین صاحب نے ''دمغ الباطل'' میں دیا۔ مولوی صاحب نے شاہ ولی اللہ سے اختلاف کیا تھا، لیکن ان کے مرشد مرزا مظہر جانجاناں نے لکھا۔ (ترجمہ) ''لیکن مسئلہ تطبیق سے تعرض کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ یہ توفیق بین المکشوفین اگرچہ تکلف سے خالی نہیں۔ لیکن اس میں ایک عمدہ مصلحت پائی جاتی ہے۔''

(9) حیات ولی۔ ص 272

(10) ایک زبردست عالم، سیاح اور صاحب باطن بزرگ تھے۔ احمد شاہ ابدالی آپ کا بڑا مداح تھا۔ بلکہ آپ کی درخواست پر اس نے اپنے تیسرے حملے میں لاہور کی لوٹ مار بند کر دی۔ (تذکرۃ العلماء و مشائخ از فوق کشمیری)

(11) اس کی عالمگیر شہرت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حکومت سوڈان نے اسے گارڈن کالج خرطوم کے نصاب میں داخل کیا اور سررشتہ تعلیم نے اس کے پڑھانے کی سفارش کی۔ (الندوہ۔ دسمبر 1907ء)

(12) حال میں ایک توضیحی ترجمہ شائع ہوا ہے۔ اس کے پندرہ سو صفحے ہیں۔

(13) رسالہ ''رد روافض'' میں حضرت مجددؒ نے بھی یہی نقطہ نظر اختیار کیا ہے اور علمائے ماوراء النہر کے خیالی بلکہ مہلک نقطہ نظر کے خلاف علمائے مشہد نے جو کچھ لکھا تھا، اس کی بالوضاحت تردید کی ہے۔

(14) حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کو اس بات کا بڑا احساس تھا کہ حالات کے مطابق طریق کار بدل جاتا ہے۔ اور انہوں نے بار بار اس کا اظہار اپنے مکتوبات میں کیا۔ دفتر اول کے مکتوب نمبر 22 میں فرماتے ہیں ''.... ہر چیز را موسمے خاص و وقت آں چیز دراں موسم موزوں و زیبا بے باشد۔ و بموسم دیگر قبیح و صاحب بینش یکے را بر دیگرے قیاس نمے کند۔'' اسی طرح دفتر دوم کے ایک مکتوب

میں ہے "اس وقت متقدمین اور متاخرین کا فتویٰ جاری نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہر وقت کے احکام جدا ہیں"۔ (2/23) اس بنیادی نکتہ کو ان کے سلسلے کے قدیمی بزرگ خوب سمجھتے تھے اور یہ امر محض اتفاقی نہیں کہ جب ہندو احیائیت اور اکبر کی ذہنی مطلق العنانی ختم ہوگئی تو ہندوؤں کے ساتھ مصالحت سے رہنے کا سب سے واضح طریق کار مرزا مظہر جانجاناں مجددی نے بتایا۔

(15) جن زہرہ شکن حالات سے شاہ ولی اللہ کو سابقہ پڑا، ہندوستان میں حکومت اسلامی کے آغاز کے بعد کبھی رونما نہ ہوئے تھے۔ شاہ صاحب پر جو گزرتی ہوگی اس کا تصور کرنا مشکل نہیں۔ لیکن ٹھوس روحانی تربیت اور بلندی حوصلہ اور سلیم الطبعی کا فیض ہے کہ ان حالات کی ایک جھلک ان کی تصانیف میں نہیں۔ کوئی اشکال نہیں، کوئی رونا نہیں، کہ دوسروں کی ہمتیں بھی کمزور ہوں اور واقعہ یہ ہے کہ جن کی صلاحیتیں تمام تر تعمیری ہوں۔ ان کے پاس آنسو بہانے کے لئے وقت کہاں؟ نتیجہ یہ کہ اپنی خاموش محنت سے قوم کے گرد وہ روحانی دیوار تعمیر کر گئے، جس پر زمانے کے تھپیڑوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔

(16) اس بیان سے پروفیسر محمد فرمان نے خیال کیا ہے کہ اس سے شاہ صاحب کی حضرت مجددؒ پر فوقیت متصور ہوتی ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ تمام عالم اسلام کے مجدد الف ثانی کا مرتبہ ایک خطہ کی خاص ضروریات پوری کرنے والے سے بلند ہونا چاہیے۔ ہمارا مقصد شاہ صاحب کے طریق کار اور ان کے خاص مقام کی وضاحت ہے۔ ان کی فوقیت ثابت کرنا نہیں۔

✦ ..... ✦ ..... ✦

محمد منظور نعمانی

حضرت شاہ ولی اللہ
اور
ان کے کام کا مختصر تعارف

اس نمبر کے لئے میں نے جو مقالہ قریباً ڈیڑھ سو صفحہ کا شاہ صاحب کی سوانح حیات اور آپ کے مساعی تجدید و اصلاح کی تفصیلات پر تیار کیا تھا، اس کا تذکرہ اور شائع نہ ہو سکنے کی وجہ بھی ابتدائی صفحات میں عرض کی جا چکی ہے اور آئندہ اس کی اشاعت کے متعلق اب جو خیال ہے وہ بھی وہیں ظاہر کیا جا چکا ہے...... اس وقت تو صرف انگلی کٹا کے "شہیدوں" کی فہرست میں نام لکھوانے کی نیت سے 26 صفحے کی محدود وسعت کو پیش نظر رکھ کر مضمون لکھنے کے لئے قلم ہاتھ میں لیا ہے...... اتنی سی جگہ میں بھی حضرت شاہ صاحب کے کام کے کسی ایک مخصوص اور محدود شعبہ پر کچھ لکھا جا سکتا تھا لیکن اتفاق کی بات ہے کہ کسی اور مقالہ میں بھی آپ کے "سوانح حیات" مرتب اور مستقل طور پر نہیں لکھے گئے، لہٰذا اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ضروری معلوم ہوا کہ ان صفحات میں جب گنجائش اختصار و اجمال کے ساتھ ہی سہی مگر آپ کے "سوانح" ہی لکھے جائیں۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ شاہ صاحب کی جو "سوانح حیات" 26 صفحے میں لکھی جائے گی وہ "سوانح" نہیں ہوگی بلکہ اس کو "سوانح" کے خلاصہ کا خلاصہ بھی مشکل ہی سے کہا جا سکے گا، لیکن اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں۔ البتہ بعض دوسرے مقالات میں (بالخصوص مولانا گیلانی اور مولانا سندھی کے مقالوں میں) متفرق طور پر خود شاہ صاحب کے اور آپ کے والد ماجد نیز اساتذہ و مشائخ اور اولاد و احفاد و تلامذہ و مستفیضین کے جو تذکرے اور ان حضرات کے کاموں کی جو تفصیل گزر چکی ہے اس سب کے ساتھ مل کر یہ خلاصہ بھی انشاء اللہ زیادہ ناقص نہ رہے گا۔

اس مختصر تعارف میں جو چیزیں شاہ صاحب کے حالات سے متعلق ہیں وہ آپ ہی کی تصانیف سے ماخوذ ہیں اور یہ احترام بھی عدم گنجائش ہی کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ (مدیر "الفرقان")

سلسلۂ نسب

حضرت شاہ صاحب کا سلسلۂ نسب والد ماجد کی طرف سے امیر المومنین سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے اور والدہ محترمہ کی جانب سے امام موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ آپ نے "امداد فی مآثر الاجداد" میں اپنا

سلسلہ نسب خود اس طرح بیان فرمایا ہے:

فقیر "ولی اللہ ابن الشیخ عبدالرحیم ابن الشہید وجیہ الدین بن معظم بن منصور بن محمد بن قوام الدین عرف قاضی قازق بن قاضی قاسم، بن قاضی کبیر الدین عرف قاضی بدہ بن عبدالملک، بن قطب الدین بن کمال الدین بن شمس الدین مغنی ابن شیر ملک بن محمد عطاء ملک بن ابوالفتح ملک بن محمد عمر حاکم ملک بن عادل ملک بن فاروق بن برجیس بن احمد بن محمد شہر یار بن عثمان بن ہامان بن ہمایوں، بن قریش بن سلیمان بن عفان، بن عبداللہ، بن محمد بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ وعنہم اجمعین۔"(1)

ٹھیک طور سے تو معلوم نہیں ہوسکا کہ شاہ صاحب کے اجداد نے سرزمین عرب کب اور کیوں چھوڑی لیکن اوپر کے نسب نامے میں ہمایوں، جرجیس، محمد شہر یار جیسے ناموں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ سے پانچ چھ پشتوں کے بعد ہی یہ خاندان غالباً عجم کو اپنا وطن بنا چکا تھا، واللہ اعلم۔

اگرچہ شاہ صاحب کے ان اجداد میں متعدد ہستیاں خاص شہرت کی مالک اور اپنی مستقل تاریخ رکھنے والی ہیں مگر یہاں ہم عدم گنجائش کی وجہ سے صرف آپ کے دادا شاہ وجیہ الدین شہید سے سلسلہ کلام شروع کرتے ہیں۔

آپ کے دادا شاہ وجیہ الدین

شاہ وجیہ الدین شہید سلطان غازی اورنگ زیب عالمگیر کی فوج میں ایک نامور مجاہد تھے اور اپنے مجاہدانہ و شجاعانہ کارناموں ہی کی وجہ سے خاص شرف وامتیاز رکھتے تھے۔ "جنگ برادران" میں سلطان غازی کی طرف سے وہ بڑی بہادری سے لڑے تھے اور مرہٹوں سے جہاد ہی کے لئے وہ دکن جارہے تھے (یا بقول بعض وہاں سے واپس آرہے تھے) کہ راستہ ہی میں ڈاکوؤں کے ایک گروہ سے مقابلہ ہوگیا اور اسی میں شہید ہوگئے..... "حیات ولی" کے مصنف مولوی رحیم بخش صاحب نے آپ کا مفصل تذکرہ لکھا ہے یہاں ہم عدم گنجائش کی وجہ سے ان کے تعارف میں صرف شاہ صاحب ہی کے ایک مختصر مگر بلیغ فقرہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ "انفاس العارفین" میں ارقام فرماتے ہیں:

"شاہ وجیہ الدین بکمال تقویٰ وشجاعت موصوف بودند۔"

والد ماجد شاہ عبدالرحیم

شاہ صاحب کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم کے کسی قدر، بلکہ ایک حد تک کافی حالات مولانا گیلانی اور مولانا سندھی کے مقالات میں گزر چکے ہیں، اب یہاں اس پر کسی خاص اضافہ کی ضرورت نہیں، لہٰذا خود شاہ صاحب ہی کا تذکرہ سنئے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے مختصر حالات خود ان کی زبانی

خود شاہ صاحب نے اپنے حالات وسوانح میں ایک مختصر رسالہ بنام "الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف"

فارسی زبان میں لکھا ہے۔ ذیل میں پہلے اسی کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے..... فرماتے ہیں:

شاہ صاحب کی خودنوشت مختصر سوانح حیات

بتاریخ 14 شوال 1112ھ چہار شنبہ کے دن طلوع آفتاب کے وقت یہ فقیر پیدا ہوا۔ تاریخی نام عظیم الدین[2] نکالا گیا۔ ولادت سے پہلے خود والدین ماجدین اور چند اور صلحاء نے میرے بارہ میں بہت سے بشارتی خواب دیکھے جن کو بعض دوستوں نے مستقل "رسالۃ القول الجلی" میں بھی جمع کر دیا ہے۔ عمر کے پانچویں سال مکتب میں بٹھا دیا گیا۔ ساتویں سال والد ماجد نے نماز روزہ شروع کرایا اور اسی سال "رسم سنت" عمل میں آئی اور جیسا کہ یاد رہ گیا ہے اسی ساتویں سال میں قرآن پاک ختم ہوا اور فارسی تعلیم شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ دسویں سال شرح ملّا جامی پڑھ لی اور مطالعہ کتب کی استعداد پیدا ہو گئی۔ چودہویں ہی برس میں شادی کی صورت پیدا ہو گئی اور والد ماجد نے اس معاملہ میں انتہائی عجلت سے کام لیا اور جب سسرال والوں نے والد ماجد کے تقاضوں کے جواب میں سامان شادی تیار نہ ہونے کا عذر کیا تو آپ نے ان کو لکھ بھیجا کہ میری یہ "جلد بازی" بے وجہ نہیں ہے بلکہ اس میں کوئی راز ہے لہٰذا یہ مبارک کام بلا تاخیر ہی ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ والد بزرگوار کے اصرار سے اسی سال یعنی عمر کے چودہویں ہی برس میں شادی ہو گئی اور وہ راز بعد میں اس طرح ظاہر ہوا کہ نکاح سے تھوڑے ہی دن بعد میری خوش دامن کا انتقال ہو گیا۔ اس سے چند ہی روز بعد میری اہلیہ کے نانا نے وفات پائی، پھر چند ہی دنوں میں عم بزرگوار شیخ ابوالرضا محمد قدس سرہ کے صاحبزادے شیخ فخر عالم نے رحلت فرمائی اور یہ صدمہ ابھی تازہ ہی تھا کہ میرے بڑے بھائی شیخ صلاح الدین کی والدہ ماجدہ نے (گویا آپ کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم کی پہلی بیوی نے) داغ مفارقت دیا۔ ان صدمات کے ساتھ ہی والد ماجد پر ضعف اور مختلف قسم کے امراض کا غلبہ ہوا اور دیکھتے دیکھتے آپ کی وفات کا سانحہ عظیم بھی پیش آ گیا۔ ان حوادث کے پیہم گزر جانے پر معلوم ہوا کہ شادی کے متعلق والد ماجد کی عجلت فرمائی میں کیا راز تھا۔ درحقیقت اگر اس وقت یہ کام اس طرح عجلت سے انجام نہ پایا تو ان حوادث کی وجہ سے پھر مدتوں بھی اس کا موقع نہ آ سکتا تھا!

شادی سے ایک سال بعد پندرہ سال کی عمر میں والد ماجد کے ہاتھ پر میں نے بیعت کی اور مشائخ صوفیہ بالخصوص حضرت نقشبندیہ کے اشغال میں لگ گیا اور توجہ و تلقین اور آداب طریقت کی تعلیم و خرقہ پوشی کی جہت سے میں نے اپنی نسبت کو درست کیا۔ اسی سال بیضاوی کا ایک حصہ پڑھ کر گویا ان دیار کے مروجہ نصاب تعلیم سے فراغت حاصل کی۔ والد ماجد نے اس تقریب میں بڑے پیمانہ پر خواص و عام کی دعوت کی اور مجھے درس کی اجازت دی۔ جن علوم و فنون کا درس اس ملک میں مروج ہے، ان میں ذیل کی کتابیں مین نے سبقاً سبقاً پڑھیں۔ حدیث میں پوری مشکوٰۃ شریف سوائے "کتاب الیسوع سے کتاب الآداب" تک کے تھوڑے سے حصہ کے اور صحیح بخاری، کتاب الطہارہ تک اور شمائل ترمذی کامل اور تفسیر میں، تفسیر بیضاوی اور تفسیر مدارک کا ایک حصہ اور حق تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت مجھ پر یہ ہوئی کہ کامل غور و فکر اور مختلف تفاسیر کے مطالعہ کے ساتھ والد ماجد کے درس قرآن میں مجھے حاضری کی توفیق ملی اور اس طرح کئی بار میں نے حضرت سے متن قرآن پڑھا اور یہی میرے حق میں "فتح عظیم" کا باعث ہوا۔ والحمد للہ علی ذلک۔

اور علم فقہ میں شرح وقایہ اور ہدایہ پوری پڑھیں اور اصول فقہ میں حسامی اور توضیح تلویح کا کافی حصہ اور منطق میں شرح شمسیہ پوری اور شرح مطالعہ کا کچھ حصہ اور کلام میں شرح عقائد مع حاشیہ خیالی اور شرح مواقف کا بھی ایک حصہ......اور سلوک وتصوف میں عوارف اور رسائل نقشبندیہ وغیرہ اور علم الحقائق میں شرح رباعیات مولانا جامی، لوائح، مقدمہ شرح لمعات اور مقدمہ نقد النصوص اور فن خواص اسماء وآیات میں والد ماجد کا خاص مجموعہ اور طب میں موجز اور فلسفہ میں شرح ہدایۃ الحکمۃ وغیرہ اور نحو میں کافیہ اور اس کی شرح از ملا جامی اور علم معانی میں مطول اور مختصر المعانی اس قدر جتنے پہ ملازادہ کا حاشیہ ہے اور ہیئت وحساب میں بھی بعض رسالے پڑھے......اور الحمد للہ کہ اسی تحصیل کے زمانہ میں ہر فن سے خاص مناسبت پیدا ہو گئی اور اس کے خاص مسائل اور اہم مباحث میرے ذہن کی گرفت میں آ گئے۔

میری عمر کے سترہویں سال والد ماجد مریض ہوئے اور اسی مرض میں واصل برحمت حق ہو گئے اور اس مرض وفات ہی میں مجھے بیعت وارشاد کی اجازت مرحمت فرمائی اور اس اجازت میں کلمہ مبارکہ ''یدہ کیدی'' (اس کا ہاتھ گویا میرا ہی ہاتھ ہے) مکرر ارشاد فرمایا۔

خدا تعالیٰ کا ایک بڑا احسان یہ ہے کہ حضرت والد ماجد جب تک رہے اس فقیر سے بے حد راضی رہے اور اسی رضامندی کی حالت میں اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ حضرت والد کو جیسی توجہ میرے حال پر رہی ایسی ہر باپ کو اپنے بیٹوں کے ساتھ نہیں ہوتی۔ میں نے کوئی باپ کوئی استاد اور کوئی مرشد ایسا نہیں دیکھا جو اپنی اولاد یا اپنے کسی شاگرد یا مرید کی طرف اس قدر توجہ اور شفقت رکھتا ہو جو حضرت والد ماجد کو میرے ساتھ تھی۔

اللهم اغفرلی ولوالدی وارحمهما كما ربيانى صغيراً وجازهما بكل شفقه ورحمة و نعمة منهما على مائة الف اضعا فها انك قريب مجيب.

پھر حضرت کی وفات کے بعد بارہ سال تک کتب دینیہ اور معقولات کے درس میں اشتغال رہا اور ہر علم وفن میں غور کرنے کا موقع ملا۔

اور مذاہب اربعہ کی فقہ اور ان کی اصول فقہ کی کتابوں اور ان احادیث کے غائر مطالعہ کے بعد جن سے وہ حضرات اپنے مسائل میں استناد فرماتے ہیں، نور غیبی کی مدد سے ''فقہاء محدثین'' کا طریقہ دلنشین ہوا۔ غرض والد ماجد کی وفات سے 12 برس اس طرح گزرنے کے بعد حرمین شریفین کی زیارت کا شوق پیدا ہوا اور آخر 1143ھ میں یہ فقیر حج سے مشرف ہوا اور 1144ھ میں مکہ معظمہ ومدینہ منورہ کی مجاورت اور شیخ ابو طاہر قدس سرہ ودیگر مشائخ حرمین شریفین سے اخذ روایت حدیث کی سعادت حاصل ہوئی۔ مدینہ منورہ کے دوران قیام میں روضہ مقدسہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم میری توجہ کا خاص مرکز رہا اور الحمد للہ کہ مجھ فقیر پر اس قدسی دربار سے فیوض وبرکات کی بے پایاں بارش ہوئی......نیز اس سفر مبارک میں حرمین شریفین اور عالم اسلامی کے بہت سے علمائے کرام کے ساتھ خوب رنگین صحبتوں کا موقع ملا۔ حضرت شیخ ابو طاہر مدنی قدس سرہ کی طرف سے تمام طرق صوفیہ کا جامع خرقہ بھی اسی بابرکت سفر میں عنایت ہوا......پھر 1144ھ کے آخر میں حج سے مکرر شرف ہو کر اوائل 1145ھ میں وطن کی طرف واپسی ہوئی اور بتاریخ 12 رجب 1145ھ ٹھیک جمعہ کے دن بفضلہ تعالیٰ صحیح وسلامت وطن مالوف دہلی پہنچ گیا......بہ تعمیل ارشاد ''واما بنعمة ربك فحدث'' بعض خاص

الخاص انعامات الٰہیہ کا بھی تذکرہ کرتا ہوں۔

حق تعالیٰ کا عظیم ترین انعام اس ضعیف بندہ پر ہے کہ اس کو "خلعت فاتحیہ" بخشا گیا ہے اور اس آخری دورہ کا افتتاح اس سے کرایا گیا ہے، اس سلسلہ میں جو کام مجھ سے لئے گئے ہیں وہ یہ ہیں کہ فقہ میں جو "مرضی" ہے اس کو جمع کیا گیا اور فقہ حدیث کی از سر نو بنیاد رکھ کر اس فن کی پوری عمارت تیار کی گئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام احکام و ترغیبات بلکہ تمامی تعلیمات کے اسرار و مصالح کو اس طرح منضبط کیا گیا کہ اس فقیر سے پہلے کسی نے یہ کام اس طرح نہیں کیا تھا ......نیز سلوک کا وہ طریقہ جس میں حق تعالیٰ کی مرضی ہے اور جو اس دورہ میں کامیاب ہوسکتا ہے مجھے اس کا الہام فرمایا گیا اور اس نے اس طریق کو اپنے دو رسالوں "ہمعات" اور "الطاف القدس" میں قلم بند کر دیا ہے۔

ایک کام مجھ سے یہ لیا گیا کہ متقدمین اہل سنت کے عقائد کو میں نے دلائل و براہین سے ثابت کیا اور "معقولیین" کے شکوک و شبہات، خس و خاشاک سے ان کو قطعی پاک کر دیا اور ان کی تقریر بحمد للہ ایسی کی جس کے بعد کسی بحث کی گنجائش ہی نہیں رہتی، علاوہ ازیں کمالات اربعہ ابداع، خلق، تدبیر اور تدلی کی حقیقت اور نفوس انسانیہ کی استعدادات کا علم مجھے عطا فرمایا گیا اور یہ دونوں ایسے علم ہیں کہ اس فقیر سے پہلے کسی نے ان کے کوچہ میں قدم بھی نہیں رکھا......اور حکمت عملی (کہ اس دورہ کی صلاح و فلاح اسی سے وابستہ بلکہ اسی میں منحصر ہے) مجھے بھرپور دی گئی اور کتاب و سنت و آثار صحابہ سے اس کی تطبیق و تفصیل کی توفیق بھی نصیب ہوئی......اس سب کے سوا مجھے وہ ملکہ عطا فرمایا گیا جس کے ذریعہ سے میں یہ تمیز کر سکتا ہوں کہ دین کی اصل تعلیم جو فی الحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہے۔ وہ کیا ہے اور وہ کون کون باتیں ہیں جو بعد میں اس میں ٹھونسی گئی ہیں، یا جو کسی بدعت پسند فرقہ کی تحریف کا نتیجہ ہیں۔"

اپنے یہ حالات اور حق تعالیٰ کے یہ انعامات بیان فرمانے کے بعد حضرت شاہ صاحب اپنی اس تحریر کو ان الفاظ پر ختم فرماتے ہیں:

"اگر میرے ہر بال کی جگہ زبان ہو جو ہر وقت مصروف حمد الٰہی رہے تو بھی حق تعالیٰ کی حمد کا جو حق مجھ پر ہے وہ ادا نہیں ہو سکتا۔ والحمد للہ رب العالمین۔"

شاہ صاحب کی تصانیف کا اجمالی تعارف

شاہ صاحب نے اوپر کی سطور میں اپنے جن خاص کاموں کی طرف اشارہ فرمایا ہے اس کی تفصیلی حقیقت آپ کی تصانیف کے مطالعہ سے معلوم ہو جاتی ہے اور فی الحقیقت آپ کے کام اور "مقام" کو سمجھنے کے لئے بلکہ "روح اسلام" اور "منشاء الٰہی" اور انفرادی و اجتماعی "اسلامی دستور العمل" معلوم کرنے کے لئے آپ کی مصنفات ہی بہترین ذریعہ ہیں، مگر ہماری بدقسمتی کہ ان میں سے اکثر قطعاً نایاب ہیں بلکہ بہت سی کتابوں کے تو نام تک معلوم نہیں۔ کافی تعداد میں آپ کی کتابیں ایسی بھی ہیں جو اگرچہ بالکل معدوم نہیں ہوئی ہیں لیکن اب تک ان کی طبع کی نوبت نہیں آئی اور صرف خاص خاص کتب خانوں میں ان کے قلمی نسخوں کا پتہ چلتا ہے۔ تاہم جو چھپ چکی ہیں اور متداول ہیں وہ بھی کافی ہیں اور میرا خیال ہے کہ جس کے پاس شاہ صاحب کی صرف یہ مطبوعہ کتابیں ہی ہوں اور وہ ان سے صحیح استفادہ کر سکے تو پھر بڑے بڑے

''کتب خانوں'' سے وہ مستغنی اور بے نیاز ہوسکتا ہے۔

ذیل میں آپ کی صرف ان تصنیفات کا مختصر تعارف کرایا جاتا ہے جو ہمارے علم میں ہیں کہ فی الحقیقت ہمارے سامنے ہمارے ہاتھوں میں اور ہمارے لئے آپ کا سب سے بڑا کام یہی ہو۔

(1) فتح الرحمٰن۔ یہ فارسی زبان میں قرآن پاک کا وہ ترجمہ ہے۔ جو سب سے پہلے ہندوستان میں ہوا......نہایت مختصر مگر بہت جامع اور معنی خیز ''فوائد'' بھی آپ نے اس کے ساتھ میں لکھے ہیں۔ان ''فوائد'' کی اہمیت کے متعلق مولانا سندھی، مولانا گیلانی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کے مضامین میں کچھ اشارات گزر چکے ہیں۔

(2) الفوز الکبیر۔ فارسی زبان ہی میں اصول تفسیر پر نہایت مفید اور بصیرت افروز رسالہ ہے۔

(3) فتح الخبیر۔ عربی زبان میں قرآن پاک کی تفسیر کا نہایت مختصر مگر بہت جامع نمونہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ سے صحیح طریقہ پر باب تفسیر میں جو کچھ منقول ہوا ہے قریباً وہ سب ہی اس میں لے لیا گیا ہے۔

(4) مصفٰی۔ موطا امام مالک کی فارسی شرح ہے۔

(5) مسوّیٰ۔ یہ بھی موطا ہی کی شرح ہے، لیکن عربی زبان میں۔ شاہ صاحب درس حدیث کا جو طریقہ رائج کرنا چاہتے تھے، یہ دونوں کتابیں گویا اس کا نمونہ ہیں۔ اگر ان کے ساتھ ''حجتہ اللہ البالغہ'' جلد ثانی کے بعض ابواب کو بھی ملا لیا جائے تو شرح حدیث میں شاہ صاحب کا حکیمانہ اور محققانہ طریقہ مکمل طور پر سامنے آ سکتا ہے۔

(6) حجتہ اللہ البالغہ۔ اس کتاب کو پورے ''اسلام'' کی شرح کہا جا سکتا ہے۔ میں اپنی زندگی میں کسی بشر کی کتاب سے اتنا مستفید نہیں ہوا جس قدر کہ اس کتاب سے خدا نے مجھے فائدہ پہنچایا۔ میں نے اسلام کو ایک مکمل اور مرتبط الاجزاء نظام حیات کی حیثیت سے اس کتاب ہی سے جانا ہے۔ دین مقدس کی ایسی بہت سی باتیں جن کو پہلے میں صرف تقلیداً مانتا تھا اس جلیل القدر کتاب کے مطالعہ کے بعد الحمدللہ میں ان پر تحقیقاً اور علی وجہ البصیرت یقین رکھتا ہوں......(یہاں اپنی سرگزشت میں نے صرف اس لئے لکھ دی ہے کہ شاید اسی کو دیکھ کر کسی اور کو بھی اس کتاب سے استفادہ کا شوق پیدا ہو جائے۔)

(7) البدور البازغہ۔ اس کو ''حجتہ اللہ البالغہ'' کے خاص خاص ابواب کا خلاصہ کہا جا سکتا ہے۔ بعض مباحث نئے بھی ہیں۔ اب تک نایاب تھی۔ ہندوستان بھر میں صرف دو تین جگہ اس کے قلمی نسخے معلوم تھے۔ کچھ ہی دنوں پہلے ''مجلس علمی ڈابھیل'' نے چھاپ کر شائع کر دی ہے۔

(8) ازالتہ الخفاء عن خلافتہ الخلفاء۔ اصل موضوع تو خلفاء راشدین کی خلافت کا اثبات ہے لیکن اسلام کے ''اصول عمران'' و ''نظریہ سیاست'' کی پوری تشریح بھی اس میں آ گئی ہے۔ حضرت مولانا عبدالحئی فرنگی محلی جیسے وسیع النظر اور بحر العلوم کی شہادت ہے کہ ''اس موضوع پر پورے اسلامی لٹریچر میں ایسی کوئی کتاب موجود نہیں۔'' اصل زبان فارسی ہے۔ 1286ھ میں پہلی بار مطبع صدیقی بریلی میں چھپی تھی۔ اب عرصہ دراز سے نایاب ہو چکی ہے۔ ابتدائی چہارم حصہ کے قریب حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی نے اپنے ترجمہ کے ساتھ شائع فرمائی تھی۔ وہ ملتی ہے۔ پوری کتاب کا صرف ترجمہ لاہور میں بھی چھپا ہے اور غالباً ملتا ہے لیکن علاوہ کتابت کے ترجمہ میں بھی بڑی فاحش غلطیاں ہیں۔ کاش

مولانا لکھنوی مدظلہ، اپنے ترجمہ کی تکمیل فرما دیں اور اس طرح مع متن کے شائع ہو جائے۔ معلوم ہوا ہے کہ ''مجلس علمی، ڈابھیل'' اب اس کو عربی میں بھی منتقل کرا رہی ہے اور مصر میں اس کے چھپوانے کا ارادہ ہے۔ اگر یہ کام ہو گیا تو ''مجلس علمی'' کی نیکیوں میں بہت بڑی نیکی کا اضافہ ہو گا۔

(9) قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین۔ تفضیل شیخین کے موضوع پر بہترین علمی کتاب ہے۔

(10) انصاف۔ صحابہ وتابعین اور ان کے بعد ائمہ مجتہدین میں دینی مسائل کے بارہ میں جو اختلاف پیدا ہوا اس کا راز اور اس کی تاریخ اس رسالہ میں بیان کی گئی ہے۔ اردو ترجمہ کے ساتھ کئی بار چھپ چکا ہے۔

(11) عقد الجید۔ اجتہاد اور تقلید سے متعلق مباحث پر محققانہ تصنیف ہے۔ یہ بھی اردو ترجمہ کے ساتھ چھپی ہے۔

(12) تحفۃ الموحدین۔ دعوت توحید خالص اور رد شرک میں حضرت شاہ صاحب کا فارسی زبان میں مختصر مگر بہت جامع رسالہ ہے۔ مضامین کے لحاظ سے اس کو شاہ اسمٰعیل شہید کی ''تقویۃ الایمان'' کا متن اور اس کی اساس و بنیاد کہا جا سکتا ہے۔ اب سے قریباً پچاس ساٹھ سال پہلے حکیم اجمل خاں مرحوم کے بڑے بھائی حکیم حافظ عبدالمجید خاں مرحوم (بانی طبیہ کالج دہلی) کے پریس ''اکمل المطابع دہلی'' میں اردو ترجمہ کے ساتھ چھپ کر شائع ہوا تھا۔ اب عرصہ دراز سے بالکل نایاب ہے۔ مجھے اس کا مطبوعہ نسخہ الہ آباد کے ایک دوست سے حاصل ہوا ہے اور میں اس کی دستیابی کو اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت سمجھتا ہوں۔ عنقریب اس کو چھپوانے کا بھی ارادہ ہے۔

(13) شرح تراجم ابواب صحیح بخاری۔ صحیح بخاری کے تراجم ابواب کی تشریح میں یہ عربی رسالہ ہے۔ پہلے 1323ھ میں ''دائرۃ المعارف حیدر آباد'' سے شائع ہوا تھا۔ اب اسی سال ''اصح المطابع دہلی'' نے صحیح بخاری کا جو نسخہ چھاپا ہے تو اس کے شروع میں یہ پورا رسالہ بھی بطور مقدمہ لگا دیا ہے۔

(14) مجموعہ رسائل اربعہ۔ یہ بہت چھوٹے چھوٹے چار رسالے ہیں جن کا تعلق فن حدیث سے ہی ہے۔ (1) ارشاد الٰی مہمات الاسناد (2) رسالہ اوائل (3) تراجم البخاری (یہ مذکورہ بالا رسالہ ''شرح تراجم ابواب بخاری'' کے علاوہ ہے اور صرف ایک ورق پر ہے۔ (4) ما یجب حفظہ للناظر۔

(18) تفہیمات الٰہیہ۔ یہ گویا ''ولی اللہی کشکول'' ہے۔ سلوک وتصوف اور علوم شریعت سے متعلق اس میں آپ کے متفرق افادات ہیں۔ پہلے اس کی صرف ایک جلد چھپی تھی اور عرصہ سے وہ بھی نایاب تھی۔ اب دونوں جلدیں گویا مکمل کتاب ''مجلس علمی، ڈابھیل'' نے شائع کر دی ہے۔ بعض باتیں اس کتاب میں ''عالم بالا'' کی بھی ہیں جن کی حیثیت ہم جیسوں کے حق میں ''متشابہات'' کی ہے۔ بعض تفہیمات فارسی میں ہیں اور بعض عربی میں۔

(19) خیر کثیر۔ تصوف اور ''علم اسرار وحقائق'' میں آپ کی بلند پایہ کتاب ہے۔ اس کی اشاعت کا شرف بھی پہلی مرتبہ مجلس علمی ڈابھیل ہی نے حاصل کیا ہے۔ ورنہ اب تک ہندوستان بھر میں ایک دو ہی جگہ اس کے قلمی نسخے معلوم ہوئے تھے۔

(20) فیوض الحرمین۔ بزمانہ قیام حرمین شریفین حق تعالیٰ کی طرف سے جو الہامات یا روح پُرفتوح سید عالم صلی

اللہ علیہ وسلم کی جانب سے جو افاضات آپ پر ہوئے اور جو خاص تعلیم وتلقین کی گئی آپ نے ان سب کو اس رسالہ میں جمع کر دیا ہے۔ قریباً سوا سو صفحے پر اب سے بہت پہلے اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

(21) الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین۔ آپ کو اور آپ کے بعض نسبی یا روحانی بزرگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو ''مبشرات'' ملے اس میں ان کا بیان ہے۔

(22) انفاس العارفین۔ اس میں شاہ صاحب نے اپنے بزرگوں کے احوال قلمبند فرمائے ہیں۔ آپ کے اکثر سوانح نگاروں کا اس باب میں یہی کتاب ماخذ ہے، چھپ چکی ہے۔ عام طور سے ملتی ہے۔

(23) انفاس العارفین۔ اس میں شاہ صاحب نے اپنے بزرگوں کے احوال قلمبند فرمائے ہیں۔ آپ کے اکثر سوانح نگاروں کا اس باب میں یہی کتاب ماخذ ہے۔ چھپ چکی ہے۔ عام طور سے ملتی ہے۔

(23) انسان العین۔ اس میں شاہ صاحب نے اپنے مشائخ حرمین کا تذکرہ فرمایا ہے۔

(24) القول الجمیل۔ (25) انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ (26) الطاف القدس (27) سطعات (28) ہمعات۔

(29) لمعات...... یہ سب رسائل تصوف سے متعلق ہیں اور مؤخر الذکر چاروں رسالے عام افہام سے بالاتر بھی ہیں..... بلکہ اکثر ''اہل علم'' بھی ان سے کچھ استفادہ نہیں کر سکتے۔ سب چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔

(30) مکتوبات مع مناقب امام بخاری و ابن تیمیہ۔ اس چھوٹے سے مجموعہ میں آپ کے نہایت اہم چند مکاتیب جمع کیے گئے ہیں۔ حال ہی میں ''نذیریہ لائبریری دہلی'' کے مہتمم مولوی سید عبدالرؤف صاحب نے بھی ان مکاتیب کو مع ترجمہ کے شائع کیا ہے۔ لیکن کتابت وطباعت کی غلطیاں اس اڈیشن میں بے حساب ہیں۔

(31) مکتوب المعارف مع مکاتیب ثلاثہ۔ یہ آپ کے بعض خاص مکاتیب کا ایک اور چھوٹا سا مجموعہ ہے۔

(32) سرور المحزون۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ''سیرت مقدسہ'' کے بیان میں ابن سید الناس کے مختصر سے رسالہ ''نور العین'' کا فارسی ترجمہ ہے جو بعض خاص احباب کی درخواست پر خود شاہ صاحب نے کیا تھا۔

(33) الجزء اللطیف۔ حضرت شاہ صاحب کی خودنوشت مختصر سوانح عمری جس کا پورا خلاصہ صفحات ماسبق میں درج ہو چکا ہے۔

(34) المقالۃ الوضیۃ فی الوصیۃ والنصیحۃ۔ یہ شاہ صاحب کا وصیت نامہ ہے۔ چھپ بھی چکا ہے مگر میرے پاس اس کا ایک قلمی نسخہ ہے۔ یہاں تک جن 34 کتابوں کا ذکر کیا گیا یہ سب چھپ کر شائع ہو چکی ہیں اور ''ازالۃ الخفا'' اور تصوف کے چند رسائل کے علاوہ باقی اور سب اب بھی ملتی ہیں اور صرف تین چار چھوٹے رسائل نمبر 23, 28, 29 کو مستثنیٰ کر کے باقی سب کے جزوی یا کلی مطالعہ کا شرف اس عاجز کو بھی حاصل ہوا ہے۔ والحمد للہ علی ذلک۔

ان کے علاوہ آپ کی تصانیف میں کتب ذیل کا اور ذکر کیا جاتا ہے لیکن میں ان کے مطالعہ بلکہ زیارت سے بھی ابھی تک محروم ہوں اگرچہ ان میں سے بھی بعض چھپ چکی ہیں۔

(35) شفاء القلوب، (36) زہراوین، (37) تاویل الاحادیث، (38) ہوامع شرح حزب البحر، (39) العقیدہ الحسنہ، (40) المقدمۃ السنیہ، (41) چہل حدیث، (42) شرح رباعیتین، (43) مآثر الاجداد، (44) العطیۃ الصمدیہ،

(45) فتح الودود فی معرفۃ الجنود، (46) مسلسلات۔

ان کے علاوہ آپ کی اور بھی بہت سی تصانیف تھیں جن کے آج نام بھی ہم کو معلوم نہیں۔ آپ کے علمی سلسلہ کے بعض ثقات آپ کی تصانیف سیکڑوں کے حساب سے بتلاتے ہیں، لیکن جو کتابیں آپ کی معلوم اور متداول ہیں صرف انہی کے مطالعہ سے علوم و مسائل میں آپ کی مجتہدانہ اور خدمت دین و اصلاح و ارشاد میں آپ کی مجددانہ شان کا اندازہ کیا جاسکتا ہے اور پھر علی وجہ البصیرت آپ کے اس دعوے اور ''تحدیث نعمت'' کی کہ...... ''فلاطوں آہ گرمی و یدیونانے کہ من دارم''.... تصدیق کی جاسکتی ہے۔ نیز آپ نے اپنے بارہ میں جو کہیں کہیں اس قسم کی باتیں کہی ہیں کہ

''میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ''قائم الزماں'' ہوں یعنی اللہ تعالیٰ جب خیر کے کسی نظام کا ارادہ فرماتا ہے تو اپنے اس ارادہ کی تکمیل کے لئے وہ مجھے اوزار یا آلہ کار کی طرح بنالیتا ہے۔'' (فیوض الحرمین)

(2) نعمت عظمیٰ بریں فقیر آنست کہ اور اخلعت فاتحیہ وادہ اندو فتح دورۂ بازپسیں بردست دے کردند (الجزء اللطیف)۔

(3) بہ سرم دادند کہ ایں حقیقت بہ مردم بہ رساں کہ امروز وقت تست و زمان زمان تو دائے برکسے کہ زیر لوائے تو نہ باشد'' الخ (تفہیمات)

(4) اور مجھ پر اللہ تعالیٰ کے خاص احسانات میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے مجھے اس دور آخر کا ''ناطق'' اور ''حکیم'' اور قائد و ''زعیم'' بنایا (اور یہ میں فخراً نہیں کہتا ہوں) (تفہیمات)

غرض اس قسم کے دعاوی، جو شاہ صاحب کی تصانیف بالخصوص ''تفہیمات الٰہیہ'' میں بکثرت ملتے ہیں اور جو بڑے بلکہ یقیناً بہت بڑے دعوے ہیں، ان کی حقیقت کا ادراک اور حقیقت کا یقین بھی آپ کی ان تصانیف ہی کے مطالعہ سے انشاء اللہ بڑی حد تک حاصل ہو سکتا ہے۔

شاہ صاحب کے سب سے بڑے شاگرد شاہ محمد عاشق

حضرت شاہ محمد عاشق پھلتی جو حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اور جن کو شاہ عبدالعزیز کی استاذی کا بھی فخر حاصل[3] ہے اور جن کا ذکر خود شاہ صاحب نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے دیباچہ میں نہایت بلند الفاظ میں فرمایا ہے بلکہ اس جلیل القدر کتاب کی تصنیف کا باعث اور محرک انہی کے ''بے پناہ اصرار'' کو بتلایا ہے.....اور ایک موقع پر خود انہی کو مخاطب کر کے ان کے ساتھ اپنی خصوصیت کا اظہار ان بلند کلمات میں فرمایا ہے:

(میرے علمی (افادات کے) اس سلسلہ کا آغاز بھی تم ہی سے ہوا اور تم ہی پر اس کا انجام بھی ہوگا اور رب معبود کی قسم کہ تم ہی ان ''معارف'' کے سب سے زیادہ مستحق اور اہل ہو''

اور ''تفہیمات الٰہیہ'' میں ایک جگہ انہی کے بارہ میں فرماتے ہیں:

وہ سراپا میری نصیحت اور میرے علم کا خزانہ ہیں، میرے اسرار و معارف کی نگہداشت اور میری

کتابوں میں غور و فکر ان کا مشغلہ ہے بلکہ میری اکثر کتابیں انہی کی تحریک سے لکھی گئی ہیں اور انہوں نے ہی ان کی تبیض کی ہے اور مجھے توقع ہے کہ لوگوں میں میرے علوم انہی کے ذریعہ سے محفوظ رہیں گے۔"

اور مولانا شاہ محمد عاشق خود بھی ایک جگہ بڑے جوش کی حالت میں حضرت شاہ صاحب کے علوم و معارف کے ساتھ اپنی خصوصیت نیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

"اگر میں قسم کھا کے یہ دعویٰ کروں کہ حضرت دامت برکاتہم کے جو حقائق و معارف ظاہر ہوئے خصوصاً اب تصوف میں تو ان سب کا ظہور میری ہی وجہ سے ہوا اور میں ہی ان کا مخاطب اول تھا تو انشاء اللہ میں اپنی اس قسم میں جانتا نہ ہوں گا۔"

ظاہر ہے کہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کے علمی و عرفانی مقام کا پہچاننے والا اور آپ کی تصانیف جن علوم و معارف پر حاوی ہیں، ان کی کنہ اور حقیقت کا جاننے والا ان شاہ محمد عاشق سے زیادہ اور کون ہوسکتا ہے۔ انہوں نے صاحب کو جس روشنی میں دیکھا اور آپ کو جو کچھ سمجھا وہ انہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔ شاہ صاحب کی کتاب "خیر کثیر" پر جو مقدمہ انہوں نے فارسی میں لکھا ہے (اور مجلس علمی نے اس کو بھی "خیر کثیر" کے ساتھ شائع کر دیا ہے) اس میں ارقام فرماتے ہیں۔

شاہ صاحب کے علمی مقام کے متعلق شاہ محمد عاشق کا بیان

برمالکان طریقت۔ طالبان حقیقت پوشیدہ نہ ماند کہ چوں حق سبحانہ وتعالیٰ فردے کامل راء برائے مظہریت علوم و اسرار کامنہ خویش اصطفاے فرماید و آنرا لمنز لہ جارحہ خود ساختہ بزبان وے تکلم مے نماید، پس ظہور آں علوم و اسرار از وے نہ برقاعدہ علوم، ہمیہ کسبیہ می باشد کہ عقل آنرا اولا و بحث قاعدہ ضبط نمودہ بعد ازاں مربوط و مضبوط برروئے کار آرد، بلکہ آں اسرار کہ در نفس مقدسہ وے ودیعت نہادہ اند و ظہور آں ارادہ فرمودہ علی حسب الواردات والتقریبات بروز میفرمایند.....(الی ان قال) و دریں زماں بایں مقام اسنی ذات مجمع آیات، مطلع فیض وانوار منبع علوم و اسرار و مخزن کنوز کمالات وراثت محمدیہ، معدن نقود رموز وصایت احمدیہ، مجدد قواعد شریعت، مقنن قوانین طریقت، مبین غواض معرفت، محقق دقائق حقیقت اعظم المحدثین ولی العصر، لسان اللہ، قطب الدین احمد، ابوالفیاض شیخ ولی اللہ است مد اللہ ظلال ارشاد علی العلمین، الی یوم الدین کما ھو ثابت عند اہل المعرفتہ والیقین، و مصداق ایں معنی آن ست کہ جناب خمیتہ علی صاحبہا الصلوات والتسلیمات در بعضے مبشرات ذات کرامت آیات ایشانرا باذات نفحات سمات خویش نسبت وجود ذہنی باوجود خارجی فرمودند و دراں مشہد بخطاب ذکی۔ حکیم ہذہ الامتہ کرامت بخشندند۔ یعنی انچہ از کمالات الہیہ در عین ثابتہ انجناب بفعلیتہ خارجیہ ظہور نمودہ و آنرا و تحقیق آثار خارہ خود ساختہ، ہماں

معانی بما مہا ورمین معانی ایشاں درصورت علوم و معارف جلوہ گر گشتہ، پس علوم و اسرار ایشاں درحقیقت علوم و اسرار آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام اند و محاشت آنہا مورث شمول بشارت نصر اللہ امرأ سمع مقالتی فرماھا کما سمعہا" است" (مقدمہ خیر کثیر۔ ص 14-15)

درحقیقت شاہ صاحب کی تصانیف کی اہمیت کا پورا اندازہ اور آپ کے علمی و عرفانی مقام کا کچھ ادراک شاہ محمد عاشق جیسے ثقہ اور ربانی عالم ہی کے اس بیان کے ذریعہ ہو سکتا ہے جو خود بھی اس سمندر کے شناور ہیں اور اسی واسطے ہم نے یہاں ان کا یہ بیان نقل کیا ہے۔

شاہ صاحب کی جامعیت

افسوس ابھی شاہ صاحب کے متعلق کچھ بھی نہیں لکھا جا سکا اور مقررہ صفحات کا بیشتر حصہ ہو چکا اس لئے اب شاہ صاحب کی جامعیت اور ہر جہتی حیثیت کے متعلق چند اشارات اور کر کے مجبوراً اس سلسلہ کو ختم کیا جاتا ہے۔ میرے نزدیک شاہ صاحب کا سب سے بڑا امتیازی کمال ان کی یہی جامعیت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے جد اعلیٰ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے ان کو میراث ملی ہے۔

ہمارے محترم مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے النبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو سیرت اپنے مخصوص والہانہ انداز میں لکھی ہے اور جس کی اشاعت کا شرف گذشتہ سال ہی کار پردازان "الفرقان" کو حاصل ہوا ہے، اس میں دربار نبوی کی ہر جہتی حیثیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔

عجب دربار

دربار نبوی کی ہر جہتی حیثیت

"سلاطین کہتے ہیں شاہی دربار تھا، کہ فوج تھی، علم تھا، پولیس تھی، جلاد تھے، محتسب تھے، گورنر تھے، کلکٹر تھے، منصف تھے، ضبط تھا، قانون تھا..... مولوی کہتے ہیں مدرسہ تھا کہ درس تھا، وعظ تھا، افتا تھا، قضا تھا، تصنیف تھی، محراب تھی، منبر تھا..... صوفی کہتے ہیں خانقاہ تھی کہ دعا تھی، جھاڑ تھا، پھونک تھا، ورد تھا، وظیفہ تھا، ذکر تھا، شغل تھا، تخت (چلہ) تھا، گریہ تھا، بکا تھا، وجد تھا، حال تھا، کشف تھا، کرامت تھی، فقر تھا، زہد تھا، قناعت تھی، کنکریاں دی جاتی تھیں کہ کھارے کنواں کا پانی میٹھا ہو جائے گا۔ بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرا جاتا ہے جس کو یہ کچھ کہہ دیا جاتا ہے کہ پورا ہوتا ہے...... مگر سچ یہ ہے کہ وہ سب کچھ تھا اس لئے کہ وہ سب کے لئے تھا، آئندہ جس کسی کو چلنا تھا، جہاں کہیں چلنا تھا، جس زمانہ میں چلنا تھا اسی کی روشنی میں چلنا تھا۔" (النبی الخاتم ص 163)

اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی جامعیت کا نقشہ خود حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے "ازالۃ الخفا" میں

بایں الفاظ کھینچا ہے۔

فاروق اعظمؓ کی شان جامعیت شاہ ولی اللہ کی زبانی

"سینہ فاروق اعظم رابمنز لہ خانہ تصور کن کہ درہائے مختلف دارد و در ہر درے صاحب کمالے نشستہ دریکدر مثلاً سکندر ذوالقرنین باں ہمہ سلیقہ ملک گیری و جہاں ستانی و جمع جیوش و برہم زدن جنود اعداء و در دیگر نوشیروانے باآں ہمہ رفق ولین ورشیت پروری و دادگستری اگرچہ ذکر نوشیرواں در مبحث فضائل حضرت فاروق سوراوبست دور دیگر ابوحنیفہ یا امام مالکے باآں ہمہ قیام بعلم فتاوی واحکام و در دیگر مرشدے مثل سیدی عبدالقادر یا خواجہ بہاء الدین قدس سرہ؛ و در دیگر محدثے بروزن ابوہریرہؓ وابن عمرؓ و در دیگر قاریئے ہمسنگ نافع یا عاصم و در دیگر حکیمے مانند مولانا جلال الدین رومی یا شیخ فرید الدین عطار (ازالۃ الخفا، مطبوعہ مطبع صدیقی بریلی۔ جلد دوم، ص 216-217)

اگر غور کیا جائے تو یہی عبارت خود حضرت شاہ صاحب پر معمولی تغیر کے ساتھ منطبق ہو جاتی ہے۔

شاہ ولی اللہ کی جامعیت پر اجمالی نظر

اسلام کے جس فن کے بھی عاظم رجال کی تاریخ لکھی جائے حضرت شاہ صاحب کا تذکرہ اس میں خاص امتیاز کے ساتھ کرنا مصنف کا فرض ہوگا جس میں کوتاہی اس کی ناقابلیت یا تصنیفی بددیانتی سمجھی جائے گی۔

شاہ صاحب بحیثیت مفسر قرآن

مثلاً اگر مفسرین قرآن کی تاریخ لکھی جائے تو اس باب کے شاہ صاحب کے بے نظیر افادات، الفوز الکبیر، فتح الخبیر فوائد فتح الرحمٰن، تاویل الاحادیث، اور ازالۃ الخفا و حجۃ اللہ البالغہ کے خاص تفسیری مباحث کا تقاضا ہوگا کہ ان کے نام نامی کو اس میں نمایاں جگہ دی جائے۔

شاہ صاحب بحیثیت شارح حدیث

علی ہٰذا اگر محدثین اور شارحین حدیث نبوی پر کوئی کتاب تیار کی جائے تو اس فن کے ان کے منتشر اور متنوع افادات مصفیٰ مسویٰ اور حجۃ اللہ جلد اول کے بعض خاص ابواب اور پوری جلد دوم کا تقاضا ہوگا کہ اس کتاب میں بھی ان کا ذکر نمایاں طور پر کیا جائے۔

شاہ صاحب بحیثیت فقیہ امت

اور اگر فقہاء اسلام کی کوئی تاریخ مرتب ہو تو تفقہ میں حضرت شاہ صاحب کو جو ید طولیٰ حاصل ہے جس کا پتہ حجتہ، بدور، انصاف اور عقد الجید سے چلتا ہے۔ اس کی بنا پر زمانہ کے تاخر کے باوجود ان فقہاء و مجتہدین کے ساتھ آپ کا ذکر کرنا

ہوگا جوان سے کم از کم پانچ چھ سو برس پہلے گزر چکے ہیں بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اگر صرف حجتہ کے مبحث سادس وسابع (از صفحہ 65 تا صفحہ 115) ہی کو بامعان نظر دیکھ لیا جائے تو اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فقہ دین میں شاہ صاحب کا پایہ متقدمین میں بھی کس قدر بلند ہے۔ کاش ہمارے زمانے کے اہل علم ان بیش بہا اور نادر الوجود علمی جواہر پاروں کی قدرو قیمت سمجھتے۔

شاہ صاحب بحیثیت متکلم اسلام

اور اگر علم کلام کی تاریخ مدون ہو اور اس فن کے ماہرین کے کارناموں کو کسی کتاب میں جمع کیا جائے تو علامہ سعد تفتازانی، قاضی عضد اور سید سند جیسے مصنفین فن کے زمرہ میں نہیں، بلکہ امام ابوالحسن اشعری اور امام غزالی اور امام ابن تیمیہ حرانی جیسے ممتاز ائمہ کے ساتھ ان کا ذکر کرنا مؤرخ کا فرض ہوگا..... صرف حجتہ اور بدور ہی کے مطالعہ سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ شاہ صاحب نے علم کلام کا ایک مستقل ذیلی اسکول ترتیب دیا ہے اور اس فن میں وہ ایک گونہ استقلالی اور انفرادی شان رکھتے ہیں۔ علامہ شبلی مرحوم نے ''علم الکلام'' میں شاہ صاحب کی اس حیثیت پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔ لیکن چونکہ اس کی حیثیت صرف ایک ضمنی تذکرہ کی ہے اس لئے وہ اصلیت اور ضرورت دونوں سے بہت کم ہے۔ ضرورت ہے کہ اس موضوع پر مستقلاً کچھ لکھا جائے اور پورے بسط وتفصیل سے لکھا جائے۔ ایسی چیز کے تیار ہونے سے پہلے جو حضرت شاہ صاحب کی اس حیثیت کا اندازہ کرنا چاہیں وہ علامہ شبلی کی ''علم الکلام'' (ص 116, 117, 119) دیکھنے کے بعد اور کچھ نہیں تو صرف ''حجتہ اللہ'' کی جلد اول ورنہ کم از کم اس کے چند ابواب ''ایمان بصفات اللہ'' ''ایمان بالقدر'' باب 3 ''الحاجتہ الٰی ہذۃ السبل'' باب 4 ''حقیقۃ النبوۃ وخواصہا'' باب 5 ''التکلیف والمجازات'' باب 6 ''الحاجتہ الٰی دین نسخ الادیان'' ہی ملاحظہ فرمالیں۔ صرف اتنی سی محنت سے بھی شاہ صاحب کے علم کلام کے خاص اصول ذہن میں آ سکتے ہیں اور پھر ان سے اس فن کا پورا کام لیا جا سکتا ہے۔

شاہ صاحب بحیثیت امام سلوک وتصوف

اور اگر صوفیہ صافیہ وائمہ سلوک ومعرفت کی کوئی جامع تاریخ لکھی جائے تو اس باب میں شاہ صاحب کی مستقل تالیفات ''خیر کثیر'' ''القول الجمیل'' ''الطاف القدس'' وغیرہا اور حجتہ وبدور کے ''ابواب احسان'' کی بنا پر امام غزالی وسیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی وامام ربانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی (قدست اسرارہم) کے ساتھ ان کا بھی ذکر کرنا مؤرخ کا فرض ہوگا۔

شاہ صاحب اور علم حقائق واسرار

ایسے ہی اگر امت محمدیہ میں ''حقائق'' و ''اسرار الٰہی'' پر کلام کرنے والوں کی کوئی فہرست تیار کی جائے تو حضرت شیخ شبلی اور شیخ محی الدین اکبر ابن عربی کے ساتھ شاہ صاحب کے اس فن کے رسائل سطعات، لمعات وغیرہ اور ''تفہیمات الٰہیہ'' کی بعض تفہیموں کی بنا پر آپ کا نام نامی بھی اس فہرست میں نمایاں جگہ پر ہوگا۔

شاہ صاحب بحیثیت معلم اخلاق و حکمت عملی

اور اگر اساتذہ اخلاق و معلمین حکمت عملی پر کوئی کتاب لکھی جائے تو حضرت شاہ صاحب کے اس فن کے افادات مندرجہ مکاتیب متفرقہ وانفاس اور بعض ابواب حجتہ اللہ کی بنا پر امام ابو حامد غزالی، شیخ سعدی شیرازی اور محقق جلال دوانی کے ساتھ آپ کا تذکرہ کرنا بھی مؤلف کتاب کا منصبی فرض ہوگا۔

شاہ صاحب بحیثیت ماہر اقتصادیات و معاشیات

اور علیٰ ہٰذا اگر ماہرین اقتصادیات و معاشیات کی کوئی تاریخ لکھی جائے تو اس میں بھی شاہ صاحب کا تذکرہ نہایت نمایاں طور پر ہوگا۔ صرف ''حجتہ اللہ البالغہ'' اور ''بدور البازغہ'' میں ابواب ''ارتفاقات'' کے ذیل میں انہوں نے اقتصادی اور معاشی مسائل پر جو کلام کیا ہے اور جو اصول اس سلسلہ میں مرتب کیے ہیں اگر کوئی حکومت نیک دلی اور دیانت داری کے ساتھ ان کو اپنا ''دستور اساسی'' قرار دے لے تو یقیناً انشاء اللہ اس کی قلمرو میں وہ ہمہ گیر بے چینی اور طبقاتی کشمکش پیدا نہ ہوگی جو اقتصادی اور معاشی الجھنوں ہی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور فی زمانا جس نے قریباً ہر ملک کے باشندوں سے چین واطمینان اور زندگی کا سکون چھین لیا ہے اور بنی آدم کی غالب اکثریت کے حق میں جیتے جی ہی اس دنیا کو دوزخ بنا دیا ہے۔ ہمارے محترم دوست مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے اس باب میں شاہ صاحب کے خاص افادات کا خلاصہ اپنے ایک مستقل مقالہ میں بڑے سلیقہ سے مرتب کر دیا ہے۔ یہ مقالہ اب سے قریباً ایک سال پہلے ان کے رسالہ ''ترجمان القرآن'' میں شائع بھی ہو چکا ہے۔ میں نے اپنے اصل مقالہ میں (جو اس نمبر ہی کے لئے مرتب کیا گیا تھا لیکن عدم گنجائش کی وجہ سے اس میں درج نہیں ہوسکا) مولانا مودودی کے اس پورے مقالہ کو لے لیا تھا اور اس پر شاہ صاحب ہی کی تالیفات سے کچھ اور بھی اضافہ کیا تھا۔ انشاء اللہ ناظرین کرام کبھی ''الفرقان'' ہی کے صفحات پر اس کو ملاحظہ فرمائیں گے اور اسی سے اس خاص باب میں شاہ صاحب کی باریک بینی اور حقیقت رسی کا اندازہ کر سکیں گے۔

شاہ صاحب اور امور سلطنت و حکومت

علیٰ ہٰذا سیاسی حذاقت اور حکومت کے تمام شعبوں کی صحیح تشکیل پر ان کی قدرت کا اندازہ بھی حجتہ و بدور کے انہی ''ابواب ارتفاقات'' سے کیا جاسکتا ہے..... شاہ صاحب نے انہی ابواب میں حکومت کے مالیات، نظام عدل، فوج، پولیس، حتیٰ کہ میونسپلٹی اور ''شہر یاریہ'' تک کی تنظیم کا صحیح طریقہ اور مکمل نقشہ پیش کر دیا ہے، اور ازالتہ الخفا میں تو ''حدیث دیگراں'' کے اندر ہی اندر ''حکومت الٰہیہ'' کا پورا خاکہ ہی دے دیا ہے۔ کاش دیکھنے والے ان چیزوں کو اس نظر سے بھی دیکھیں۔

شاہ صاحب نے حکومت الٰہیہ کے قیام کے لئے کوئی انقلابی قدم کیوں نہیں اٹھایا

رہا یہ سوال کہ پھر شاہ صاحب نے ان ہی خطوط پر ''حکومت الٰہیہ'' قائم کرنے کے لئے کوئی ''انقلابی جدوجہد''

کیوں نہیں کی؟ تو اگرچہ میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ ''مجددین'' اور ''ارباب ارشاد'' کے کاموں میں کوئی کمی نہیں رہ سکتی لیکن واقعہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کی زندگی میں اس قسم کے کسی اقدام کے نہ ملنے سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ ''ان کے کام میں یہ کمی رہ گئی۔'' اپنے ''اصل مقالہ'' میں اس پہلو پر میں نے مفصل بحث کی ہے اور انشاء اللہ ناظرین کرام اسی کو دیکھنے کے بعد اس بارہ میں صحیح رائے قائم کر سکیں گے۔ یہاں تو اس وقت اس کی طرف صرف اتنا ہی اشارہ کیا جا سکتا ہے.... کہ ہر کام کے عمل میں آجانے کے لئے صرف کام کرنے والے کی صلاحیت ہی شرط نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ وقت کے سازگار اور ماحول کی صلاحیت بھی ضروری ہے، اس کے بغیر کوئی قدم اٹھا دینا عاقبت اندیشی اور خام کاری پر محمول ہوتا ہے، نیز یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قسم کے کام اس عالم اسباب میں افراد سے نہیں ہوتے بلکہ جماعتوں سے انجام پاتے ہیں اور شاہ صاحب کے زمانہ میں ''ملت ہندیہ اسلامیہ'' کی حالت اس قدر گر چکی تھی کہ اس میں سے اس ''کار عظیم'' کو انجام دینے والے افراد چھانٹے بھی نہیں جا سکتے تھے تو شاہ صاحب کے لئے پہلا کام اس ''جماعت'' یا ''پارٹی'' کا تیار کرنا تھا جو اس مقصد کی قدر و قیمت جان کر وقت آنے پر اس کے لئے اٹھ سکتی اور اس کام کو صحیح طریقہ پر چلا سکتی۔ ان کی تصانیف سے صاف ظاہر ہے کہ وہ پوری طرح اس کوشش میں ہیں کہ کم از کم قوم کے خواص کے طبقہ میں جو عام قوم کا دل دماغ ہوتا ہے ایسا ذہنی انقلاب پیدا کر دیں جو ان کو اس نصب العین سے قریب کر دے اور اس مقصد اعلیٰ کی سرانجامی کے لائق بنا دے اور بسا اوقات ایسا ہی ہوتا ہے کہ اس قسم کے کاموں کی بنیاد ڈالنے والے صرف بنیاد ڈال کر ہی چلے جاتے ہیں...... ان کے بعد اس عمارت کی تکمیل بعد والوں کا فرض رہ جاتا ہے۔ تو میرے نزدیک شاہ صاحب کو اس باب میں صرف اتنے ہی کام کا وقت ملا کہ اس ''حزب اللہ'' کے پیدا کرنے کے لئے صالح لٹریچر تیار کیا اور اس کام کے لئے پورا لائحہ عمل بھی مرتب فرمایا.... اب کام کو اس سے آگے بڑھانا اور مناسب وقت آنے پر آپ کے معین کردہ خطوط پر کوئی انقلابی تحریک اٹھانا اور اس کو کامیاب بنانے کے لئے مناسب تدابیر اختیار کرنا، یہ کام بعد والوں کا تھا اور بعد والوں نے کیا بھی، چنانچہ آپ ہی کے صلبی پوتے شاہ اسمٰعیل شہید اور دوسرے ایک روحانی پوتے امیر المومنین سید احمد شہید نے مناسب وقت آجانے پر جو تحریک اٹھائی میرے نزدیک وہ شاہ صاحب ہی کی ان کوششوں کا نتیجہ تھا مگر بخت کی نامساعدت اور کام میں کچھ خامیوں کی وجہ سے جن کا کچھ ذکر بعض پہلے مقالات میں بھی آچکا ہے، ناکامیابی پر اس تحریک کا انجام ہوا۔

تنازع للبقاء کی اس دنیا کی تاریخ میں حق پرستوں کی کسی جدوجہد کا اس طرح ناکامیاب ہو جانا کوئی نئی بات نہ تھی، مگر وائے بدبختی بجائے اس کے کہ ہم اس معرکہ میں ''اسباب شکست'' کا کھوج لگاتے اور ان کی تلافی کی کوشش کرتے اس راستہ ہی سے مایوس ہو کر ہم پلٹ پڑے بلکہ اس مقدس نصب العین ہی کو پس پشت ڈال دیا......

خیر بات دور چلی گئی اور دور چلی جا رہی ہے، ورنہ یہاں تو صرف یہ عرض کرنا تھا کہ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی زندگی میں ''حکومت الٰہیہ'' کے قیام کے لئے کوئی ''انقلابی جدوجہد'' نہ دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ ان کے کام میں ''یہ کمی رہی''۔ اصل یہ ہے کہ وہ وقت اس کام کا تھا ہی نہیں ورنہ اگر زمین اس کے لئے تیار ہوتی اور وقت کا یہی تقاضا ہوتا تو شاہ صاحب کے وہ مقالات جن میں آپ نے نظام حکومت کی تشکیل اور عسکری قوت کی تنظیم و تفہیم سے بحث کی ہے ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپ اس قسم کی مہموں کو بھی خوب انجام دے سکتے تھے۔ خود بھی ایک جگہ صاف لفظوں میں لکھ

گئے ہیں:

''اگر بالفرض یہ شخص ایسے زمانہ میں ہوتا کہ اسباب کا اقتضا یہی ہوتا کہ لوگوں کو جنگ اور قتال سے درست کیا جائے اور اس کے دل میں ڈالا جاتا کہ تلوار ہی سے دنیا کے نظام کو درست کرے تو یہ شخص پھر یہی کرتا اور الحمد للہ بڑی خوبی سے اس کام کو انجام دیتا اور دنیا دیکھ لیتی کہ رستم و اسفندیار بھی اس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں بلکہ وہ اس کے طفلی اور شاگرد بننے کے لائق ہیں۔''

رہا یہ کہ شاہ صاحب کے زمانہ میں ''اصلاح کے لئے جنگ وقت کا تقاضا'' کیوں نہ تھا، افسوس ہے کہ یہاں اس کی طرف کوئی مجمل اشارہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ناظرین کرام اس کے لئے میرے ''اصل مقالہ'' کی اشاعت کا انتظار فرمائیں۔ اس میں یہ بحث پورے بسط اور تفصیل سے کی گئی ہے۔

شاہ صاحب اور فلسفہ تشریع

حضرت شاہ صاحب کی ایک اور امتیازی خصوصیت جس کے بیان پر ہم کو یہ سلسلہ ختم کر دینا ہے، وہ ''فلسفہ تشریع'' کی تدوین بلکہ اس کی ایجاد ہے۔ امت محمدیہ میں آپ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے کل نظام شریعت کا فلسفہ مدون فرمایا اور شریعت اسلامیہ کے تمام جزوی و کلی احکام کو باہمد گر اس فلسفہ کے ذریعہ اس طرح مرتبط اور منظم کر دیا کہ دیکھنے والا اب آپ کی رہنمائی میں اسلام کی پوری شریعت کو ٹھیک اس طرح دیکھ سکتا ہے کہ گویا وہ ایک مشین ہے اور ہر ہر حکم اس کا ایک پرزہ ہے اور ان پرزوں کے ساتھ اس مشین کا تعلق ایسا جچا تلا ہے کہ نہ تو وہ کسی ایک پرزہ کی علیحدگی ہی کو قبول کر سکتا ہے اور نہ کسی اجنبی پرزہ کے اضافہ ہی کی اس میں گنجائش ہے..... نئی روشنی کے اس دور میں جبکہ ہر چیز کی حکمت پوچھی جاتی ہے اور ''فلاسفی'' دریافت کیے بغیر روٹی کا لقمہ بھی نہیں توڑا جاتا، شاہ صاحب کی کتابوں ''حجتہ اللہ'' اور ''بدور البازغہ'' کے ذریعہ مذہبی دنیا کے میدان مسابقت میں صرف مسلمان ہی بازی لے جا سکتے ہیں..... شاہ صاحب کا یہ وہ کارنامہ ہے جس کی وجہ سے اسلام کے علمی خادموں میں ان کو بلا شرکت غیرے ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ ''حجتہ اللہ'' کے دیباچہ میں خود بھی فرماتے ہیں:

''اور اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں میں عظیم ترین نعمت مجھ پر یہ ہے کہ اس نے اس علم (اسرار دین یا فلسفہ شریعت) سے مجھے وافر حصہ عطا فرمایا۔''

اور ''الجزء اللطیف'' میں جس کا پورا خلاصہ ہم پہلے درج کر چکے ہیں، اسی فن کے متعلق ارقام فرماتے ہیں:

''و اسرار حدیث و مصالح احکام و ترغیبات و سائر آنچہ حضرت پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم از خدائے تعالیٰ آوردہ اند و تعلیم فرمودہ اند و آں فنے است کہ پیش از فقیر مضبوط تر از سخن ایں فقیر کسے آں را ادا نہ کردہ است باوجود جلالت آں فن''۔ (ص 38)

''حجتہ اللہ البالغہ'' اور ''بدور البازغہ'' اسی فن کی مستقل کتابیں ہیں اور اولاً بالذات ان دونوں کتابوں میں اسی سے بحث کی گئی ہے۔ ''عقائد و ایمانیات'' سے لے کر کتاب الطہارۃ، پھر عبادات، معاملات، معاشرت، سیاست منزلی اور

سیاست مدنی وملکی اوراصول جہانبانی وجہانداری، غرض تمام ابواب شریعت اوراحکام اسلام کے مصالح اوران کا فلسفہ ''حجۃ اللہ'' میں بالاستیعاب اور ''بدور البازغہ'' میں بھی اس کا کافی حصہ آپ نے درج فرمادیا ہے۔

یہاں تک ہم نے شاہ صاحب کے جن کمالات عشرہ کا ذکر کیا ان کا تعلق آپ کی افادی اورارشادی حیثیت سے ہے۔ گویا یہ جو کچھ بھی آپ نے کیا امت کے خواص یا عوام کے لئے تھا، رہا یہ کہ خود آپ کے ''اندر'' کا کیا حال تھا؟ سو اس کا صحیح اندازہ تو ''تفہیمات الٰہیہ'' کی بعض خاص تفہیموں سے ہوتا ہے جہاں کسی خاص حال سے مغلوب ہو کر شاہ صاحب اس بارہ میں کچھ کہہ گزرے ہیں.....مگر افسوس ہے کہ یہاں ان تفہیموں کے مختصر سے مختصر اقتباسات کے لئے بھی گنجائش نہیں، نیز یہ بھی خطرہ ہے کہ بلاتشریح سادہ طور پر ان کا نقل کر دینا ممکن ہے بہت سوں کے لئے موجب فتنہ بن جائے اس لئے یہاں ان کے صرف بعض فارسی اشعار پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ان سے بھی آپ کے اندرونی سوز و گداز کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ شاعری شاہ صاحب کا پیشہ بلکہ کام بھی نہ تھا البتہ کبھی کبھی ''آتش دل'' کے شعلے ''غیر شاعروں'' کی زبان پر بھی شعری شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ میرے نزدیک شاہ صاحب کی ''شاعری'' کی حقیقت بھی بس یہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ باوجود تلاش کے مجھے شاہ صاحب کے یہاں صرف اسی قسم کے شعر ملے جن کو کسی باطنی حال اور اندرونی التہاب ہی کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے۔ انہی میں کے چند شعر ان کے صرف ایک مکتوب سے چن کر یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

شاہ صاحب کے باطنی حال اور قلبی واردات کے چند نمونے

''مکتوب المعارف'' جس کا تذکرہ بذیل ''تصنیفات'' کیا جا چکا ہے، اس کے آخر میں بطور ضمیمہ ایک مکتوب حضرت کا لگا ہوا ہے، جس میں آپ نے اپنے کسی خاص متوسل کے لئے اپنے بعض اشعار اور رباعیات کی خود ہی مختصر شرح کی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ''ما فیہا'' کی طرف کچھ اشارات کیے ہیں، صرف اسی مکتوب سے دو چار شعر یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

ایک غزل کا مطلع ہے۔

ولے دارم زخود خالی حبابش میتواں گفتن　　درد کیفیتے جوش شرابش میتواں گفتن

ایک اور غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

بزلیف پیچ در پیچ کسے گم کردہ ام خودرا　　خردشے دردل شبہائی کردم چہ میکردم
کسے بابل ہمے سازد کسے باگل ہمی بازد　　اگر من یاد آں لبانے کردم چہ میکردم

ایک اور غزل کا ایک شعر ہے۔

جان من درہجر یار خود بسوخت　　من عذاب الہجر اجرنی یا مجیر

ایک اور غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں جن میں ''عالم تجرد'' اور ''رفیق اعلیٰ'' کی طرف اپنے والہانہ شوق و اضطراب کا اظہار فرمایا ہے۔

تا بکے محنت و مہجوری دوری بکشم　　نازنین وطنم سوئے وطن بازروم

تا بکے بستہ زنجیر تعلق باشم آہوئے از ختنم سوئے ختن باز روم

دو رباعیاں بھی آپ کی ملاحظہ ہوں:

(1)

در عشق تو از جملہ جہاں بگذشتم دز ہر چہ بجز یار تو ازاں بگذشتم
مقصود من بندہ بجز وصل تو نیست اندر طلبت از دل و جاں بگذشتم

(2)

دائم دل من پیش تو حاضر باشد چشم برخ خوب تو ناظر باشد
در مذہب ما شرک جلی است و صریح گر ردئے دگر خطرۂ خاطر باشد

انہی چند اشعار سے آپ کے اندرونی حال کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب کے جن کمالات کی طرف ہم نے یہاں تک کچھ اشارات کیے ہیں قارئین کرام غالباً انہی سے شاہ صاحب کی جامعیت اور ہر جہتی حیثیت کا کم از کم اجمالی اندازہ ضرور کر سکے ہوں گے۔ تفصیل کے لئے میرے ''اصل مقالہ'' کی اشاعت کا انتظار فرمایا جائے۔ اس میں مستقل عنوانات کے ماتحت ان تمام کمالات پر مفصل کلام کیا گیا ہے اور ان میں سے ہر باب کے آپ کے افادات کے اقتباسات بھی اس میں پوری تفصیل سے درج کیے گئے ہیں۔ اگر کہہ دیا جائے کہ وہ مقالہ شاہ صاحب کے ہر جہتی علوم و معارف کا پورا خلاصہ ہے تو انشاء اللہ مبالغہ نہ ہوگا..... اور اب نظر ثانی میں اس پر بہت کچھ اضافہ کا بھی ارادہ ہے اس لئے توقع ہے کہ اس کے بعد وہ ڈھائی تین سو صفحہ کی مستقل کتاب ہو جائے گی۔ اور انشاء اللہ ''الفرقان'' کے ایک مستقل نمبر ہی کی حیثیت سے شائع ہو کر ناظرین کرام کی خدمت میں پہنچ جائے گی ......اس مختصر مقالہ کو جو اس وقت آپ کے زیر نظر ہے اور 24 صفحے کی محدود وسعت کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے، اس اصل مقالہ کا خلاصہ کہنا تو صحیح نہیں ہوگا البتہ یہ اس کے اکثر مضامین کی ایک فہرست ضرور ہے۔

اس ''مقالہ'' کے آخر میں حضرت کا پورا وصیت نامہ بھی درج کیا گیا تھا بلکہ وہی اس کا خاتمہ قرار دیا گیا تھا۔ اب یہاں اس کی تو گنجائش نہیں البتہ تبرکاً وصیت نامہ کی سب سے پہلی اور سب سے آخری وصیت یہاں بھی نقل کر کے اس سلسلہ کا ''خاتمہ بالخیر'' کیا جاتا ہے۔

حمد و صلوٰۃ کے بعد اولاً اپنی اولاد کو اور ثانیاً احباب کو مخاطب کر کے پہلی وصیت یہ فرماتے ہیں:

کتاب و سنت کے ساتھ دائمی وابستگی کے متعلق شاہ صاحب کی پہلی وصیت

اس فقیر کی پہلی وصیت یہ ہے کہ اعتقاد اور عمل دونوں میں کتاب و سنت (قرآن و سنت) کو نہایت مضبوطی سے پکڑا جائے اور برابر ان میں تدبر جاری رکھا جائے اور اگر عربی نہ جاننے کی وجہ سے خود نہ پڑھ سکتا ہو تو کسی دوسرے سے کم از کم ایک ورق دونوں کا ترجمہ ہی سن لیا کرے......اور عقائد میں قدماء اہل سنت کا مسلک اختیار کیا جائے اور سلف نے جس چیز کی کھود کرید نہیں کی اس کے پیچھے نہ پڑا جائے اور ''معقولیان خام'' جو شبہات پیدا کرتے ہیں ان کی طرف مطلق توجہ نہ کی

جائے اور فروع فقہ میں ان علماء محدثین کی پیروی کی جائے جو حدیث اور فقہ کے جامع ہوں اور ہمیشہ فقہی تخریجات کو کتاب و سنت پر ضرور پیش کیا جائے پھر جو اس کے موافق ہو اس کو قبول کیا جائے ورنہ کالائے بد بریش خاوند والا معاملہ کیا جائے اور یہ یاد رکھا جائے کہ امت کسی وقت ''مجتہدات فقہا'' کو کتاب وسنت سے جانچنے سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہوسکتی اور ایسے متقشف ''فقیہ'' جو کسی عالم کی بات کو دستاویز بنا کر سنت کے تتبع سے بے پروا ہوگئے ہیں ان کی بات تک نہ سنی جائے اور ان کی طرف کسی قسم کا التفات نہ کیا جائے بلکہ ان سے دور رہ کر خدا کی خوشنودی اور اس کا قرب حاصل کیا جائے۔

شاہ صاحب کا فقہی مسلک

شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی یہ پہلی وصیت ہے اور فی الحقیقت ایک صاحب بصیرت اور خدا ترس عالم ربانی کا یہی دستور العمل ہونا چاہیے۔ اسی وصیت سے شاہ صاحب کا ''فقہی مسلک'' بھی معلم ہو جاتا ہے۔ اس نمبر کے کئی مقالوں میں یہ بحث براہ راست اور ضمناً آئی ہے اور مختلف نقطہ ہائے نگاہ رکھنے والے مضامین نگار حضرات نے اس بارہ میں اپنا اپنا خیال ظاہر فرمایا ہے کہ شاہ صاحب کا فقہی مسلک کیا تھا..... شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی جن کتابوں تک میری رسائی ہوسکی ان سب کو دیکھنے کے بعد اس باب میں جس نتیجہ پر میں پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کی شخصیت اس سے بالاتر ہے کہ تقلید و عدم تقلید کی اس بحث میں ان کو گھسیٹا جائے۔

ملت کی انتہائی بدقسمتی ہے کہ شاہ صاحب کی وہ ذات جس کا صحیح اور عادلانہ فیصلہ ''حاملان تقلید اور مخالفان تقلید'' دونوں گروہوں کو ایک معتدل مسلک پر جمع کرسکتا تھا یا کم از کم دونوں فریقوں میں اعتدال پیدا کر کے اور ان کی باہمی منافرت و بے جا عصبیت کو مٹانے کے ایک دوسرے سے قریب کرسکتا تھا انہی کو بحیثیت فریق اس بحث میں دھر لیا گیا..... ایک طرف سے کوشش شروع ہوئی کہ ان کو ''تقلید'' اور ''حنفیت'' کا پکا دشمن باصلاح حال ''ٹھیٹ غیر مقلد'' ثابت کیا جائے (4)..... اور دوسری طرف سے اس کے جواب میں آپ کو عرفی قسم کا ''پکا حنفی'' اور موجودہ دور کی مروج تقلید کا حامی ثابت کرنے کے لئے زور لگایا گیا۔ نتیجہ ان دونوں کوششوں کا یہ ہوا کہ شاہ صاحب کا جو مقصد تھا وہ کلی طور پر فوت ہوگیا۔

کاش اگر بجائے اس روش اختیار کر لینے کے حضرت شاہ صاحب سے نسبت رکھنے والے احناف اس قسم کے حنفی بننے اور حقیقت کے اس ''طریقہ انیقہ'' کو عملاً رائج کرنے کی کوشش کرتے جو شاہ صاحب کا طریقہ تھا اور جس کو آپ نے ''فیوض الحرمین'' میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلقین کے حوالہ سے بایں الفاظ بیان فرمایا ہے:

وہ طریقہ انیقہ جو تمام طریقوں میں سنت معروفہ سے قریب تر ہے یہ ہے کہ ائمہ ثلاثہ (ابوحنیفہ، ابو یوسف، محمد) میں سے جس کا قول بھی سنت معروفہ (احادیث نبوی) سے قریب تر ہو وہ لیا جائے پھر ان فقہاء حنفیہ کی ترجیحات کی پیروی کی جائے جو فقیہ ہونے کے ساتھ حدیث کے بھی عالم تھے، کیونکہ بہت سے ایسے مسائل ہیں کہ ائمہ ثلاثہ نے اصول میں ان کے متعلق کچھ نہیں کہا اور نفی بھی نہیں کی اور احادیث ان کو بتلا رہی ہیں تو لازمی طور پر اس کو تسلیم کیا جائے گا اور یہ سب حنفی مذہب ہی ہے۔

اور اسی ''فیوض الحرمین'' میں ایک اور جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی باب کے ایک اور ''افاضہ'' کا ذکر

فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

پھر (روح نبوی کی طرف سے) میرے لئے ایک اور طریقے کا انکشاف ہوا جس سے ''سنت نبوی'' کے ساتھ ''فقہ حنفی'' کی تطبیق کی صورت مجھ پر منکشف ہوئی اور وہ یہ ہے کہ ائمہ ثلاثہ (ابوحنیفہ، ابو یوسف، محمد) ان تینوں میں سے کسی ایک کا قول لے لیا جائے (یعنی جس کا قول بھی حدیث کے موافق ہو اسی کو اختیار کیا جائے) اور (حسب ضرورت تطبیق) ان کی عمومات کی تخصیص کی جائے اور ان کے اصل مقاصد (یعنی ان کی اقوال کی اصل روح) کو سمجھ کر ان کی رعایت کی جائے اور احادیث کے اصل الفاظ سے جو مفہوم ہوتا ہو اس پر اقتصار کیا جائے کہ نہ اس میں بعید تاویلیں ہوں اور نہ ایک حدیث کو دوسری حدیث سے ٹکرانا ہو اور نہ کسی امی کے قول کی وجہ سے کسی صحیح حدیث کو چھوڑنا پڑے اور یہ وہ طریقہ ہے کہ خدا نے اگر اس کی تکمیل کرادی تو یہ ''کبریت احمر'' اور ''اکسیر اعظم'' ثابت ہوگا۔

بہر حال اگر ''ولی اللہی حنفی'' حضرات شاہ صاحب کے اس ''طریقہ حنفیت'' کو عملاً قبول کر لینے اور اسی کو رواج دینے کی کوشش کرتے..... اور اسی طرح شاہ صاحب سے تعلق رکھنے والے ''عاملین بالحدیث'' تقلید اور حنفیت کو اس درجہ میں تسلیم کر لیتے جو شاہ صاحب نے صراحتاً ان کو دیا ہے اور شاہ صاحب کی طرح اپنے اختلاف اور اپنی تنقید کا نشانہ صرف ''غیر شرعی تقلید'' اور ''مسخ شدہ حنفیت'' ہی کو بناتے اور صحیح قسم کی تقلید اور اصلی حنفیت یا کم از کم حنفیت میں شاہ صاحب کے پسندیدہ طریقہ ہی کو قبول کر لینے یا برداشت ہی کر سکتے تو شاہ صاحب کا منشا پورا ہو جاتا۔

انہی سطور سے شاہ صاحب کے فقہی مسلک کے متعلق میرا خیال بھی ناظرین کرام کو معلوم ہو گیا ہوگا۔

شاہ صاحب کی حنفیت اور آج کل کے حنفی

اس کے بعد بھی جو حضرات یہ معلوم کرنے کے لئے میری رائے کے منتظر ہوں کہ آجکل کی عام عرفی اصطلاح کی رو سے شاہ صاحب ''حنفی'' تھے یا ''غیر مقلد'' تو افسوس ہے کہ ان دونوں لفظوں نے اب جو خاص معنی اختیار کر لیے ہیں ان کے پیش نظر اس سوال کا جواب میرے نزدیک صرف ''منفی'' ہی ہو سکتا ہے..... اگر حنفیت کے دائرہ کو اتنا وسیع مان لیا جائے جتنی وسعت کہ اس کو ہمارے محترم دوست مولانا محمد یوسف صاحب فاضل بنوری نے اپنے مقالہ میں دی ہے اور ''فیوض الحرمین'' کی مذکورہ صدر عبارت میں شاہ صاحب کے لفظ ''والکل مذهب حنفی'' کہتے ہیں..... لیکن آج ہمارے حنفی حلقوں میں ''حنفیت'' کے جو معنی عموماً سمجھے جاتے ہیں ان کے اعتبار سے شاہ صاحب کو حنفی کہنا یقیناً زبردستی ہے۔ ہماری حنفی دنیا میں آج اس شخص کو کہاں حنفی تسلیم کیا جا سکتا ہے، جس کا اصول ''واتما تفریعات فقیہ را بر کتاب وسنت عرض نمودن'' ہو ..... اور جو ''کتاب وسنت سے فقہ کی تنقید کے اس اصول کو قیامت تک کے لئے امت کا وقار قرار دیتا ہو، اور جس کا تحقیقی مسلک وہ ہو جو ''حجۃ اللہ'' میں ایک مستقل فصل قائم کر کے ''مهاينا سب هذا المقام التنبيه على مسائل ضلت في بواديها الاوهام'' الخ کے زیر عنوان صفحہ 123 سے 129 تک شاہ صاحب نے ارقام فرمایا ہے، بلکہ اسی ''حجۃ اللہ'' میں اور ''بدور'' میں بھی آپ نے دیگر ائمہ کے بعض اقوال کو زیادہ قوی سمجھ کر اختیار بھی فرمایا ہے اور یہ ذکر نادر قسم کے مسائل ہی کا نہیں ہے بلکہ جن مسائل کا آج کل حنفیوں اور غیر حنفیوں میں مابہ الامتیاز سمجھا جاتا ہے بعض ایسے مسائل میں بھی شاہ صاحب نے کسی

دوسرے امام کے قول کو قوت دلائل کی وجہ سے اختیار کیا ہے مثلاً مسئلہ قلتین، رفع یدین، الترجیع فی الاذان والایتار فی الاقامتہ، اقامتہ الجمعتہ فی القرے التی فیہا اربعون رجلاً حراً وغیرہ وغیرہ...... میرا خیال ہے کہ اگر آج کوئی فاضل دیانت داری سے اس روش پر چلے اور شاہ صاحب ہی کی طرح اس کو "حنفیت" کے متناقض نہ سمجھتا ہو بلکہ اس کو بھی حنفیت ہی کا ایک طریقہ سمجھتا ہو اور اسی بنا پر اپنا رشتہ حنفیت سے بھی رکھنا چاہتا ہو تو ہمارے زمانہ کے ٹکسالی قسم کے حنفی حضرات کبھی بھی اس کو حنفی تسلیم نہیں کریں گے...... اور یہ صرف مفروضہ ہی نہیں ہے بلکہ ہمارے علم میں بعض وہ اہل علم ہیں جن کا طریقہ یہی ہے۔ وہ شاہ صاحب کی ہدایت و وصیت کے مطابق "عرض مجتہدات بر کتاب وسنتہ" کے قائل ہیں اور اس سلسلہ میں وہ کہیں کہیں فقہ حنفی کی بعض تفریعات کو اپنے نزدیک کتاب وسنت کے مطابق نہ پا کر چھوڑ بھی دیتے ہیں، لیکن کتاب وسنت کے بعد ان کا دینی مرجع فقہ حنفی ہی ہے اور اسی لئے وہ خود اپنے کو فقہاً حنفی ہی سمجھتے ہیں لیکن ہماری "حنفی بارگاہیں" ان کو حنفی تسلیم نہیں کرتیں...... اور پھر بات اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ میں نے تو یہ بھی دیکھا ہے کہ اگر کوئی صاحب علم فقہ حنفی ہی کے اندر اتباع حدیث کے صادق جذبہ کے ماتحت ائمہ ثلاثہ اور مشائخ حنفیہ کے انہی اقوال کو اختیار کرے جو اس کے نزدیک "اوفق بالحدیث" ہوں اور اس سلسلہ میں اسے بعض ان اقوال کو چھوڑنا پڑے جن کی نسبت فقہ کی کتابوں میں "ظاہر الروایت" کی طرف کی گئی ہے یا جن کو "مفتی بہ" بتلایا گیا ہے تو "کھرے اور پکے حنفیوں" کے نزدیک اتنے ہی سے اس کی حنفیت مخدوش ہو جاتی ہے اس لئے اگر میں یہ کہتا ہوں کہ شاہ صاحب آج کل کی عام اصطلاح کے لحاظ سے "حنفی" نہیں تھے تو غلط نہیں کہتا۔ اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے وہ حنفی ہی تھے۔

شاہ صاحب اور موجودہ جماعت اہل حدیث

ایسے ہی میں پوری بلند آہنگی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں اور کہتا ہوں کہ موجودہ "جماعت اہل حدیث" جس نے زمانہ کے امتداد کے ساتھ اب ایک مستقل پانچویں فقہی مسلک کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور جس کے افراد کی اکثریت میں کم از کم میں نے تقلید اور حنفیت سے عناد کا "سلبی داعیہ عمل بظاہر الحدیث" کے ایجابی رجحان سے زیادہ پایا، اس جماعت کو ہرگز حق نہیں ہے کہ وہ شاہ صاحب کو اپنا مقتدا اور ہندوستان میں اس مسلک کا داعی اول مشہور کرے...... میں نے "اہل حدیث" دوستوں اور بزرگوں میں کسی کو ایسا نہیں پایا جو حضرت شاہ صاحب کی ان تحقیقات کا اقرار اور کھلے دل سے ان سے اتفاق ہی کرتے ہوں کہ

اس وقت تمام امت نے یا کم از کم امت کے اس طبقہ نے جس کا اعتبار کیا جا سکتا ہے ان مذاہب اربعہ (حنفی یا شافعی، مالکی، حنبلی) کی تقلید کے جواز پر اتفاق کیا ہے اور اس تقلید میں بہت سی مصلحتیں ہیں جو مخفی نہیں ہیں خصوصاً آج کل کے اس زمانہ میں الخ۔

(2) اور پھر اگلے صفحہ پر ابن حزم ظاہری کا جواب دیتے ہوئے یہ ثابت فرمانے کے بعد کہ کم علم والوں کا زیادہ علم والوں سے مسائل میں فتویٰ لینا اور ان کا فتویٰ دینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک ہی سے...... مسلمانوں کا عام دستور رہا ہے۔ تقلید شخصی (خالص تقلید شخصی) کی توجیہ اور اس کا جواز اس طرح بیان فرماتے ہیں:

ہمارے نزدیک اس میں کوئی فرق نہیں کہ کوئی شخص ہمیشہ ایک ہی عالم (مجتہد) سے فتویٰ لیا کرے (یعنی تقلید شخصی کرے) یا کیفما اتفق کبھی کسی عالم سے اور کبھی کسی عالم سے۔

(3) اور ''انصاف'' کی یہ عبادت کہ ''وبالجملۃ فالتمذھب للمجتہدین سر الھمہ اللہ تعالیٰ'' جو معہ ترجمہ کے اسی نمبر کے صفحہ (399) پر ناظرین کرام ملاحظہ فرما چکے۔

(4) اور ''خاص ''حنفی مذہب'' کے متعلق آپ نے اپنے جو بلند خیالات ''فیوض الحرمین'' میں ظاہر فرمائے مثلاً یہ کہ مجھے دکھایا گیا کہ حنفی مذہب میں بڑا غامض سر ہے..... یہاں تک کہ میں نے اس کا مشاہدہ کیا کہ فی زمانا ''حنفی مذہب'' کو تمام دوسرے مذاہب پر فوقیت اور برتری حاصل ہے۔'' (فیوض۔ص 103)

(5) اور اسی ''فیوض الحرمین'' میں آپ نے یہ بھی صراحت کے ساتھ فرمادیا کہ ''مذاہب اربعہ'' کی تقلید کے بارہ میں مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص وصیت ہے (ملاحظہ ہو نمبر ہذا کا صفحہ 400)

(6) اور دوسری جگہ فرمایا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ ''تم فروع (یعنی ہندی مسلمانوں کی جو عموماً حنفی المذہب ہی تھے) مخالفت نہ کرو'' پھر آپ فرماتے ہیں کہ سرکار رسالت ہی سے مجھے ''سنت'' کے ساتھ فقہ حنفی کی تطبیق کا طریقہ بھی بتلایا گیا الخ (ملاحظہ ہو نمبر ہذا کا صفحہ 388)

اور پھر ان تمام ''حقائق'' کے اظہار کے ساتھ اپنے دستخط کے ساتھ بھی الحنفی عملاً لکھتے ہیں (ملاحظہ ہو نمبر ہذا ص 248)

بہرحال میں نے ''اہل حدیث'' کہلانے والے دوستوں اور بزرگوں میں جن کو کچھ معتدل اور غیر متعصب بھی پایا ان کو بھی حضرت شاہ صاحب کے اس مسلک سے بہت دور پایا اس لئے میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ حضرات کس بنیاد پر حضرت شاہ صاحب کو اپنا ''پیش رو'' کہتے ہیں..... الحاصل۔

وکل یدعی و صلا بلیلیٰ و لیلیٰ لاتقرلھم بذاک

حضرت شاہ صاحب کے فقہی مسلک کے متعلق یہ بحث تو استطراداً آ گئی ورنہ دراصل آپ کے ''وصیت نامہ'' کی اول و آخر دو وصیتوں پر ہم اس سلسلہ کو ختم کرنا چاہتے تھے پہلی وصیت تو گزر چکی آخری وصیت آپ کی یہ ہے۔

شاہ صاحب کی آخری وصیت

حدیث میں وارد ہوا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو تم میں سے عیسیٰ بن مریم کو پائے تو ان کو میرا اسلام پہنچا دے۔ اس فقیر کی بڑی تمنا ہے کہ اگر حضرت روح اللہ مسیح بن مریم کا زمانہ مجھے میسر ہو تو سب سے پہلا وہ شخص جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام ان کو پہنچائے وہ میں ہوں۔ اور اگر وہ زمانہ میں نے نہ پایا تو پھر میری اولاد اور میرے پیروؤں میں جو بھی حضرت مسیح کی آمد ثانی کو پائے اس کو میری وصیت ہے کہ حضرت کے اس سلامی پیغام کو ان تک سب سے پہلے پہنچانے کی وہ پوری کوشش کرے تاکہ محمدی سفیروں میں آخری سفیر ہونے کا شرف ہم کو حاصل ہو۔ والسلام۔

حضرت شاہ صاحب کی اس وصیت کو ان کے تمام حلقہ بگوشوں تک پہنچاتے ہوئے یہ عاجز بھی اپنے عزیزوں

اور دوستوں سے خاص طور پر درخواست کرتا ہے کہ وہ اس سعادت کو حاصل کرنے کی پُر جوش تمنا اور حریصانہ نیت رکھیں اور یہ حقیر سراپا تقصیر بھی الحمدللہ انتہائی درجہ اس کا آرزومند ہے۔ دیکھئے یہ دولت کس قسمت والے کے ہاتھ آتی ہے۔ واللہ یختص رحمتہ من یشاء۔

حضرت شاہ صاحب کی اس آخری وصیت ہی پر اس سلسلہ کو بھی ختم کیا جاتا ہے۔ حضرت کی وفات اور باقیات صالحات کا ذکر مولانا گیلانی کے مقالہ میں آچکا ہے۔ والحمدللہ اولا واخرا۔

حواشی

(1) اس ''نسب نامہ'' کے بعض ناموں میں کچھ اختلافات بھی ہے لیکن یہاں عدم گنجائش کی وجہ سے اس سے بالقصد کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔

(2) خود شاہ صاحب سے منقول ہے کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کی ایک...... بشارت کی بنا پر آپ کا نام ''قطب الدین'' بھی رکھا گیا تھا (انفاس) لیکن اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ آپ کو اپنے ''ولی'' کے نام سے ہی مشہور کرے چنانچہ آج آپ کے ان ناموں (عظیم الدین اور قطب الدین) کا پتہ صرف کتابوں سے چلتا ہے ورنہ عام اسلامی دنیا آپ کو ''شاہ ولی اللہ'' ہی کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ شاہ عبدالعزیز نے ''تحفہ اثنا عشریہ'' میں چونکہ ایک خاص مصلحت سے اپنا بھی غیر معروف نام ''غلام عبدالحلیم'' لکھا ہے اس لئے ولدیت میں بھی شاہ ولی اللہ کا غیر معروف ہی نام ''قطب الدین'' ذکر کیا ہے۔''

(3) عجالہ نافعہ۔ ص 23

(4) اس نمبر کی ترتیب کے دوران ہی میں دہلی سے ایک صاحب کا خط میرے نام آیا جس میں انہوں نے اپنا پتہ بلکہ نام تک نہیں لکھا ہے کہ میں ان کو خط ہی سے جواب دے سکتا۔ اس خط میں مجھ سے باصرار شدید یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ ''ولی اللہ نمبر'' میں صرف خدا سے ڈرتے ہوئے بے لاگ طور پر میں اس ''حقیقت'' کا اعلان کر دوں کہ ہندوستان میں موجودہ جماعت ''اہلحدیث'' کے بانی و موسس شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ ہی ہیں اور آپ کا مسلک وہی تھا جو موجودہ جماعت اہل حدیث کا ہے اور اس کے ثبوت کے لئے جماعت اہل حدیث کے ایک مشہور بزرگ کے ایک مضمون کا حوالہ دیا گیا ہے جو بہت عرصہ ہوا دہلی ہی کے ایک رسالہ میں بالاقساط شائع ہوا تھا۔ اگر خط میں یہ تہدید بھی فرمائی گئی ہے کہ اگر تم اس حقیقت کا اعلان نہیں کر سکے تو سمجھا جائے گا کہ اپنی جماعت کے خوف سے ایسا نہیں کر سکے اور یہ بات صرف خدا پرستی کے دعوے کے خلاف ہے''......اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تحزب نے لوگوں کے عقل و دماغ کو کس حد تک ماؤف کر دیا ہے۔

بی۔اے۔ڈار

مترجم: خالد مسعود

شاہ ولی اللہ.....سوانح حیات.....اور ماحول

شاہ ولی اللہ بلند پایہ علما اور صوفیا کے خانوادے میں پیدا ہوئے جس کے بعض افراد نے علم و فضل میں نام پیدا کیا اور بعض حرب و ضرب میں مشہور ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب خلیفہ دوم حضرت عمر تک پہنچتا ہے۔[1] آپ کے مورث اعلیٰ میں سے سب سے پہلے جو ہندوستان تشریف لائے، مفتی شمس الدین تھے۔ آپ رہتک میں آ کر قیام پذیر ہوئے۔ رہتک دہلی سے مغرب کی جانب تقریباً تیس میل کے فاصلے پر ایک قصبہ ہے۔ جب سے مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد شروع ہوئی، اسی وقت سے رہتک آباد ترین قصبوں میں شمار ہوتا تھا اور مشہور خاندان وہاں سکونت پذیر تھے۔ غالباً مفتی شمس الدین قریش خاندان کے پہلے فرد تھے جو اس قصبے میں آ کر ٹھہرے۔ وہ خود بہت بڑے عالم اور صوفی تھے۔ آپ نے علوم دینی کی ترویج کے لئے یہاں ایک درس گاہ کی بنیاد رکھی۔ لوگ اس درس گاہ سے استفادہ کے لئے جوق در جوق آنے لگے۔ آپ کو طریقہ چشتیہ سے نسبت تھی۔ آپ اس شہر کے قاضی مقرر ہوئے۔[2] بعد میں نسلاً بعد نسلٍ قضا کا یہ منصب آپ کے خاندان میں رہا۔ اخلاف میں سے شیخ قاضی قادن[3] رئیس بلد بھی مقرر ہوئے۔ قاضی قادن کے صاحبزادے شیخ محمود نے اس آبائی پیشے کو خیر باد کہا اور عسکر شاہی کی ملازمت اختیار کر لی۔ چار پانچ پشت تک خاندان کا لگاؤ عسکری خدمات سے قائم رہا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شیخ محمود کے صاحبزادے شیخ احمد نے شیخ عبدالغنی کی صحبت پائی تھی جو اپنے عہد کے معروف صوفی گزرے ہیں۔ ''زبدۃ المقامات'' کے مصنف خواجہ محمد ہاشم کاشی لکھتے ہیں کہ شیخ عبدالغنی شیخ احمد سرہندی کے والد کے ہم عصر تھے اور جب آپ سرہند آئے تھے تو ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ جس میں تصوف کے بہت سے اہم اسرار و رموز کے بارے میں طویل بات چیت بھی ہوئی تھی۔[4]

شیخ وجیہ الدین، جو شاہ ولی اللہ کے دادا تھے، ایک ممتاز و نمایاں جنگ آزما ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ صوفی بھی تھے۔ شاہ جہاں کے دور حکومت میں مغل سپہ سالار، سید حسین کی زیر قیادت مالوہ کی جنگوں میں انہوں نے بڑا نام پیدا کیا۔ اسی جنگ میں انہوں نے یکے بعد دیگرے تین بھائیوں کو شکست دے کر قتل کیا۔ ان بھائیوں کی بوڑھی والدہ نے آخر میں شیخ وجیہ الدین سے درخواست کی کہ وہ اسے اپنی والدہ کی طرح سمجھیں۔ آپ نے اس عہد کو آخر دم تک پورا کیا۔ شاہ عبدالرحیم ذکر کرتے ہیں کہ انہوں نے اس بڑھیا کو اپنی دادی کی طرح رکھا۔ شیخ وجیہ الدین نے جنگ کھجوہ (1070ھ۔

1659ھ) میں اورنگ زیب کی طرف سے شرکت کی اور شاہ شجاع کو شکست دینے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔لیکن اس کے باوجود جب اس اعلیٰ کارکردگی کے صلے میں انہیں نے ایک بڑے منصب کی پیش کش کی گئی تو انہوں نے معذوری کا اظہار کیا۔اس طرز زندگی کے باوجود شیخ وجیہ الدین اعلیٰ اخلاقی کردار کے مالک تھے۔ساری عمر سفر و حضر میں ہر حالت میں دو پارے روزانہ تلاوت کرتے۔آخر عمر میں نظر کمزور ہوگئی تو انہوں نے قرآن کریم کا جلی حروف کا نسخہ منگوالیا۔آخری ایام میں آپ نے فوج کی ملازمت چھوڑ دی تھی اور سارا وقت عبادت و ریاضت میں گزارنے لگے تھے۔ایک مرتبہ نماز کے دوران انہیں القا ہوا کہ انہیں شہادت نصیب ہوگی۔آپ نے سوچا کہ انہیں شیوا جی کے خلاف جو اپنی حدود سلطنت میں اسلامی اداروں کی بے حرمتی کررہا تھا، جہاد میں شرکت کا حکم ہوا ہے، چنانچہ آپ دکن کی طرف چل پڑے۔لیکن راستے میں ڈاکوؤں نے قافلے پر حملہ کردیا اور اس طرح آپ نے شہادت پائی۔(5)

شیخ وجیہ الدین کی اہلیہ بھی بڑے مشہور و معروف صوفی اور اہل علم خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔یہ خاندان اُچ (ملتان) میں آباد تھا۔اس خاندان میں سے شیخ طاہر علم کی تلاش میں بہار کی طرف آئے اور یہاں جونپور میں سکونت اختیار کرلی۔ان کے صاحب زادے شیخ حسن نے دینی تعلیم و تربیت کے لئے یہاں ایک مدرسہ جاری کیا۔شیخ حسن، مشہور چشتی صاحب طریقت بزرگ سید حیدر راجی شاہ کے مرید تھے۔(6)

بعد میں شیخ سکندر لودھی کی خواہش پر آپ دہلی میں قیام پذیر ہوگئے۔آپ نے 909ھ-1503ء میں وفات پائی۔آپ کے صاحبزادوں میں سے شیخ محمد، جو خیالی کے نام سے معروف ہیں، مشہور صوفی گزرے ہیں۔ان کا قیام کئی سال مدینۃ النبیؐ میں رہا۔شیخ ابن عربی کے عقیدہ وحدت الوجود کے مشہور حامی شیخ امان اللہ پانی پتی شیخ محمد کے خلیفہ تھے۔شیخ حسن کے دوسرے صاحبزادے شیخ عبدالعزیز متوفی 975ھ نے بھی تصوف میں اپنے زمانے میں بلند مقام حاصل کیا۔ان کے ایک مرشد نے ابن عربی کی ''فصوص الحکم'' کے رموز سے انہیں متعارف کرایا اور ان کو سہروردی طریقے میں داخل کیا۔بعد میں آپ سید ابراہیم ارچی سے وابستہ ہوئے جنہوں نے ان کو تمام صوفیانہ طریقوں کی تربیت دی لیکن انہیں خود خصوصی نسبت قادری طریقے سے تھی۔چنانچہ شیخ عبدالعزیز نے بھی اسی طریق کو اختیار کیا۔لیکن انہوں نے درس و تدریس کو کبھی ترک نہیں کیا۔اپنے اسلاف کی طرح آپ بھی اپنے دہلی کے مدرسہ میں برابر پڑھاتے رہے۔آپ کے صاحب زادے شیخ قطب عالم نے بھی بحیثیت ایک عالم دین کے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا اور اسی مدرسے میں تعلیم دیتے رہے۔مشہور صوفی بزرگ خواجہ باقی باللہ جن سے سرزمین ہندوپاک میں نقشبندی طریق کا آغاز ہوا، شیخ قطب عالم کے شاگرد تھے اور انہی کے حکم سے وہ نقشبندی طریق کی تربیت کے لئے خراسان گئے تھے۔آخر عمر میں خود شیخ قطب عالم نے خواجہ باقی باللہ کی بیعت کرلی تھی۔شیخ عبدالعزیز کے صاحبزادے، شیخ رفیع الدین محمد بھی بہت جید عالم اور مشہور صوفی تھے۔شروع میں اگرچہ آپ نے اپنے والد سے چشتی طریقے میں تربیت پائی تھی۔لیکن بعد میں آپ کو خواجہ باقی باللہ سے قربت حاصل ہوئی جو ان کے والد کے اولاً شاگرد اور بعد میں مرشد ہوگئے تھے۔خواجہ صاحب کو آپ سے خصوصی محبت تھی۔اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ پیرانہ سالی اور ضعیف العمری کے باوجود حضرت خواجہ باقی باللہ نے شیخ رفیع الدین کی شادی میں شرکت کے لئے اتنا کٹھن سفر کیا۔ایسے ہی مشہور و معروف صوفیہ کی شرکت کی برکت تھی کہ شیخ کے ہاں وہ لڑکی پیدا ہوئی جو

بعد میں شاہ عبدالرحیم کی والدہ بنیں۔

شاہ عبدالرحیم 1059ھ میں پیدا ہوئے۔(7) آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد شیخ وجیہ الدین اور اپنے بڑے بھائی ابورضا (متوفی 1101ھ) سے پائی۔(8) شاہ ابورضا نے اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شروع میں سرکاری ملازمت اختیار کی۔ آپ نے تمام علوم متداولہ کی تعلیم حاصل کی لیکن اچانک سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر صوفیانہ زندگی اختیار کر لی اور خواجہ باقی باللہ کے فرزند، خواجہ خورد کے مرید ہو گئے۔ آپ ہر جمعہ کو تین حدیثوں پر مبنی وعظ دیا کرتے تھے، پہلے ان حدیثوں کا فارسی میں اس کے بعد حاضرین کے استفادے کے لئے عام ہندوستانی زبان میں اس کا ترجمہ بیان کرتے۔ اوائل حیات میں آپ ہر موضوع پر وعظ فرماتے تھے لیکن بعد میں تفاسیر میں سے بیضاوی اور کتب احادیث میں سے مشکوٰۃ پر وعظ فرمانے لگے۔ آپ عقیدہ وحدت الوجود کے قائل تھے اور اس کی اپنی تعبیر بیان فرماتے تھے۔ ان کو اپنے منتخب حلقے میں کتب صوفیہ کرام کے ادق مسائل پر گفتگو کرنے کی طرف بڑی رغبت تھی۔(9) کہا جاتا ہے کہ شاہ صاحب کے ہم عصر مشہور عالم ملا یعقوب کو وحدت الوجود کے بارے میں کچھ شکوک تھے۔ لیکن ایک مرتبہ جب وہ شاہ صاحب کے خطبے میں آئے تو تمام شکوک دور ہو گئے۔(10) ان کا کہنا تھا کہ وحدت الوجود کو صوفیانہ وجدان اور باطنی مشاہدے کے ذریعہ بآسانی ثابت کیا جاسکتا ہے اور جو لوگ اس پر اعتراضات کرتے ہیں وہ دراصل عقلی استدلال کی وجہ سے اس کی حقیقت کو سمجھنے سے ہی قاصر ہیں۔(11) تطبیق کی روح، جو شاہ ولی اللہ کے نہج فکر میں زیادہ نمایاں ہے، شیخ ابورضا کے عقیدۂ رویت باری تعالیٰ کے مؤقف میں واضح طور پر کارفرما نظر آتی ہے۔ معتزلہ اور شیعہ دونوں رویت باری تعالیٰ کے منکر ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اس سے جہت لازم آتی ہے۔ تاہم ان کے نزدیک تمام پردوں کے اٹھ جانے کا نتیجہ ظہور کامل ہے لیکن اہل السنت والجماعت کے نزدیک صفت اور جہت کے بغیر بھی رویت باری تعالیٰ ممکن ہے اور ان کے نزدیک یہی ظہور کامل ہے۔ چنانچہ ابورضا کے نزدیک اختلاف محض لفظی ہے حقیقی نہیں۔

شاہ عبدالرحیم کی ابتدائی تعلیم شیخ ابورضا کی نگرانی میں شروع ہوئی۔(12) بعد میں آپ کو حضرت میر زاہد ہروی سے شرف تلمذ ہوا(13) ان سے آپ نے شرح مواقف اور کلام اور اصول فقہ کی دوسری کتب پڑھیں۔(14) آپ نے اپنی استعداد کی وجہ سے بہت جلد ان علوم میں درجہ کمال حاصل کر لیا اور اپنے رفقاء کے محسود نظر ہو گئے۔ آپ نے ''فتاویٰ عالمگیری'' کے متن میں کچھ تناقضات کی نشاندہی کی جن کی طرف کسی کی نظر نہیں گئی تھی۔ اس سے آپ کے رفقاء آپ سے ناراض ہو گئے اور کسی تدبیر سے آپ کا نام ''فتاویٰ عالمگیری'' کے مدونین سے نکلوا دیا۔ تصوف میں شاہ عبدالرحیم نے آغاز سے ہی نقشبندی سلسلے میں تربیت پائی۔(15) خواجہ خورد کے کہنے سے(16) آپ شیخ آدم بنوری (متوفی 1050ھ) کے خلیفہ حافظ سید عبداللہ سے وابستہ ہو گئے۔(17) بعد میں خود خواجہ خورد سے وابستہ ہوئے۔

شاہ ولی اللہ نے خود اس سلسلے میں اپنے والد کے مسلک کی وضاحت فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں کہ میرے والد خواجہ باقی باللہ کے نقشبندی سلسلے کو دوسرے سلاسل پر اس لئے ترجیح دیتے ہیں کہ اول تا آخر آپ کی تربیت اس سلسلے میں ہوئی تھی(18) بعد میں ان کو دوسرے سلاسل میں تربیت کا موقع بھی ملا۔ شاہ ولی اللہ نے اپنے والد ماجد کے الفاظ بھی نقل کیے ہیں کہ جو نسبت مجھے شیخ عبدالقادر جیلانی سے حاصل ہے وہ زیادہ خالص اور لطیف ہے اور جو نسبت خواجہ نقشبند سے

حاصل ہوئی وہ زیادہ قوی اور مؤثر ہے۔ جو نسبت خواجہ معین الدین چشتی سے حاصل ہوئی وہ محبت کے زیادہ قریب ہے اور اسمائے حسنیٰ کی تاثیر اور قلب کی طہارت کے لئے زیادہ کارگر ہے۔(19) آپ ابن عربی کا بہت احترام فرماتے تھے۔ کہتے تھے کہ میں ''فصوص الحکم'' میں بیان کردہ عقیدہ وحدت الوجود کی ایسی تعبیر کرسکتا ہوں کہ اس کا قرآن واحادیث سے تناقض دور ہوجائے اور اس سلسلہ میں جتنے بھی شکوک وشبہات ہیں سب کا ازالہ ہوجائے۔ تاہم آپ کا خیال تھا کہ ان مسائل پر بحث وتمحیص جاری رہنا چاہیے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ان کے اکثر ہم عصر ان مسائل کو پوری طرح سمجھ نہیں پاتے اور اس طرح بھٹک جاتے ہیں۔ آپ ایسی کتابوں کے مطالعہ پر بہت زور دیتے تھے جن میں ان مسائل سے بحث کی گئی ہو۔ شاہ ولی اللہ نے ان سے جامی کی ''لوائح'' اور عراقی کی شرح ''لمعات'' سبقاً سبقاً پڑھیں اور ان کے تمام اختلافی مسائل پر پوری طرح بحث وتمحیص کی۔ ''فصوص الحکم'' کی فارسی شرح، جامی کی نقد النصوص، کا شاہ عبدالرحیم نے طلبہ کی ایک جماعت کو باقاعدہ درس دیا۔ شاہ ولی اللہ کو اس میں شرکت کا بھی موقع ملا۔

شاہ ولی اللہ نے خاص طور پر ایک دو مسائل کا ذکر بھی کیا ہے، جن پر شاہ عبدالرحیم خاص طور پر بحث فرماتے تھے۔ ایک مسئلہ تو وحدت وکثرت کے تعلق اور خالق اور مخلوق کا رشتہ ہے۔ صور علمیہ جو ہمیں نظر آتی ہیں، حقیقت خارجیہ کی حامل نہیں۔ ان کی حقیقت کا دراصل ہمارے علم پر انحصار ہے، بالفاظ دیگر یہ ہمارا اپنا علم ہے جو مختلف شکلوں میں متمثل ہوا ہے۔ ہم ان کو علم سے منسوب بھی نہیں کرسکتے کیونکہ علم کا وجود اس وقت بھی تھا جب یہ صور وجود نہیں رکھتی تھیں۔ نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ صور علم سے مختلف اور علیحدہ ہیں۔ کیونکہ ان مختلف اشیاء کے لئے علت (منشا) اور بنا (قیوم) لازمی ہے اور وہ علم ہی ہوسکتا ہے۔ علم صفت اور تعداد سے مبرا ہے۔ یہ تمام کثرت وتعدد علم کی فطرت میں حارج نہیں ہوتی کیونکہ وہ ہر صفت اور کثرت سے پاک ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ ''**هو معكم**'' (4:57) سوال یہ ہے کہ اس معیت کی نوعیت کیسے متعین ہو۔ شاہ عبدالرحیم کے نزدیک یہ معیت علمی ہی نہیں واقعی بھی ہے۔ لیکن یہ اس طرح بھی نہیں جس طرح ایک ہیولیٰ کا تعلق دوسرے ہیولیٰ سے ہوتا ہے۔ یا ایک صفت کا دوسری صفت سے ہے یا ایک ہیولیٰ کا ایک صفت سے۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے معیت اس سے قطعاً الگ چیز ہے۔ اس کا ادراک عقل انسانی سے ممکن نہیں۔ وہ وضاحت کرتے ہیں کہ لوگوں نے اس معیت کی مختلف تعبیریں کی ہیں۔ بعض کا خیال ہے اللہ تعالیٰ اپنے علم، قدرت، سمع اور بصر کے ذریعہ ہر چیز پر محیط ہے۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے۔(20) بعض نے کہا کہ ہر عمل اور ردعمل، حرکت اور صفت جو اس دنیا میں نظر آتی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔(21) جیسا کہ قرآن میں ہے بعض کا خیال ہے کہ ہر چیز جو وجود رکھتی ہے۔ ''وہی'' ہے اور ''اس'' کے سوا کسی کا وجود نہیں، جیسا کہ قرآن نے کہا ہے۔(22)

ان کا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اس کی ذات کی عین ہیں اور دنیا کی ہر چیز بذاتہٖ خیر ہے اور شر محض اضافی ہے۔ مثال کے طور پر تلوار کی دھار کی تیزی اپنے طور پر اچھی چیز ہے اور لوہے کے ٹکڑے کی خوبصورتی ہے لیکن جب بھی تلوار قتل ناحق میں استعمال ہو تو اس کی صفت میں برائی آجاتی ہے۔(23)

مذہبی امور میں بھی شاہ عبدالرحیم وسیع الخیال تھے۔ عمومی طور پر آپ حنفی مسلک پر تھے۔ لیکن بعض امور میں وہ

دوسرے فقہی مکاتب کے فیصلوں کو احادیث کی بنیاد پر یا اپنی رائے اور وجدان کی بنا پر ترجیح دے دیتے تھے۔ متنازعہ فیہ مسائل میں سے مثلاً ایک مسئلہ قرأت الفاتحہ خلف الامام کا تھا کہ مقتدیوں کو نماز میں سورہ فاتحہ پڑھنی چاہیے یا خاموش رہیں کیونکہ امام سورہ فاتحہ تلاوت کر رہا ہے۔ احناف کے نزدیک مقتدیوں کو خاموش رہنا چاہیے۔ شیخ احمد سرہندی کے پوتے شیخ عبدالاحد نے جو حنفی مسلک کے شدید مقلد تھے، شاہ عبدالرحیم سے اس مسئلہ پر بحث کی (اس واقعہ کو علامہ شبلی نے غلطی سے امام ابوحنیفہ سے منسوب کر دیا ہے)[24] شاہ عبدالرحیم کا اصرار تھا کہ نماز کے اصل مقاصد، یعنی تطہیر قلب، اللہ تعالیٰ کے حضور خشوع وخضوع سورہ فاتحہ کی تلاوت کے بغیر پوری طرح حاصل نہیں ہوسکتا۔[25] اسی طرح مسالک طریقت میں بھی بعض امور میں وہ اپنی رائے رکھتے تھے۔ ایک روز شیخ احمد سرہندی کے پوتے خواجہ نقشبند نے کہہ دیا کہ اس زمانے کے صوفیا اگلوں کے محض نقال ہیں، ان کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں۔ شاہ عبدالرحیم نے اس کا جواب دیا کہ آج کے صوفیا ایسی بہت سی باتوں کے حامل ہیں جو اگلوں کو حاصل نہیں تھیں اور اس کے ثبوت میں انہوں نے اپنے مؤقف کی خصوصی وضاحت کی اور قدما کے مؤقف سے اس کا تقابلی مطالعہ پیش کیا۔[26]

اپنے والد کے برعکس شاہ عبدالرحیم نے ساری زندگی خالص صوفیانہ طور پر گزاری اور علائق دنیوی سے قطعاً الگ تھلگ رہے اور بادشاہوں کی حاضری اور صحبت سے ہمیشہ احتراز کرتے رہے۔ ایک مرتبہ اورنگ زیب نے شاہ صاحب سے ملاقات کی خواہش کی لیکن آپ نے صوفیہ کی اعلیٰ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے انکار کر دیا۔[27]

ایک مرتبہ شیخ حمید جو مرزا محمد زاہد کے مدرسے میں آپ کے ہم درس رہے تھے شاہ صاحب کے گھر پر آئے اور درخواست کی کہ روزانہ کے کچھ مشاہرے پر فتاویٰ کی نظر ثانی میں ان کے شریک ہو جائیں لیکن آپ نے سختی سے انکار کر دیا۔ والدہ کو علم ہوا تو انہوں نے کہا کہ گھر کی معاشی حالت کے پیش نظر ہی تمہیں اسے قبول کر لینا چاہیے۔ ان کے شدید اصرار پر آپ نے مجبور ہو کر یہ پیش کش قبول کر لی۔ لیکن آپ کے مرشد حضرت ابوالقاسم کو معلوم ہوا تو انہوں نے اسے رد کرنے کا حکم دیا۔ شاہ صاحب نے عرض کیا کہ والدہ کے اصرار کی وجہ سے مجبور ہوں ورنہ میں خود بھی اسے پسند نہیں کرتا۔ انہوں نے مرشد سے درخواست کی کہ وہ خدا سے دعا کریں کہ یہ مصیبت خود بخود ٹل جائے۔ اسی اثنا میں ان کا نام اس فہرست سے خارج کر دیا گیا اور اس کے عوض انہیں ایک قطعہ اراضی پیش کیا گیا جسے قبول کرنے سے آپ نے انکار کر دیا۔[28] بایں ہمہ ان کی زندگی راہبانہ ہرگز نہیں تھی۔ جیسا کہ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں ان کو اس دنیا اور عقبیٰ دونوں کی عقل وحکمت وافر عطا ہوئی تھی[29] ان کی زندگی ''خیر الامور اوسطھا'' کا نمونہ تھی۔[30] شیعہ اور سنّی تنازعات میں ان کا مؤقف بڑا واضح اور غیر مبہم تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ شیعہ حضرات گم کردہ راہ ہیں۔ لیکن وہ مناظرانہ اور جذباتی رنگ پیدا کر کے فضا کو مکدر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کی ایک شیعہ عبداللہ چلپی سے ملاقات ہوئی جو ایران سے ترک وطن کر کے یہاں آیا ہوا تھا۔ بحث ومباحثہ کے شروع ہونے سے پہلے ہی آپ نے وضاحت فرما دی کہ میرا نقطہ نظر تفرقہ بازی کا نہیں ہوگا۔ میرا طریق بحث بالکل غیر جانبدارانہ طلب صداقت ہوگا۔ جو صحیح ہے اسے تسلیم کروں گا جو غلط ہے اس کی تردید کروں گا۔ انہوں نے بعد میں فرمایا کہ وہ ہمیشہ اس طریق بحث سے ہی شیعہ حضرات کو بغیر کسی کج بحثی کے قائل کرنے میں کامیاب ہوا کرتے تھے۔ آخر میں عبداللہ چلپی آپ کا مرید ہو گیا۔[31] لیکن اس کے باوجود شیعہ فرقہ سے آپ کی

بیزاری برقرار رہی۔[32] شاہ عبدالرحیم نے 1131ھ (1719ء) میں وفات پائی۔

شاہ ولی اللہ 1114ھ میں پیدا ہوئے۔[33] مسلم گھرانوں کے دستور کے مطابق پانچ سال کی عمر میں مدرسے میں داخل ہو گئے۔ سات سال کے ہوئے تو صوم وصلوٰۃ کی تاکید شروع ہو گئی۔ ساتویں سال کے آخر تک آپ قرآن کریم مکمل کر چکے تھے۔ اور فارسی کتابوں اور فارسی قواعد صرف ونحو کی تعلیم شروع کر دی تھی۔ اس کے بعد آپ پر علوم کے دروازے وا ہو گئے اور آپ نے پورا پورا استفادہ اٹھایا۔ شاہ صاحب بیان فرماتے ہیں کہ ان دنوں میں اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک دن سب نے مل کر سیر کا پروگرام بنایا۔ جب وہ واپس ہوئے تو آپ کے والد ماجد نے سخت افسوس کا اظہار کیا کہ تم نے اتنا سارا وقت لایعنی باتوں میں گزار دیا جبکہ میں اس دوران میں کتنی ہی مرتبہ حضور صلعم پر درود پڑھ چکا ہوں۔ اس کے بعد شاہ صاحب نے کبھی ایسی باتوں کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔[34] اور اپنی تعلیم میں اتنے انہاک کا اظہار کیا جو اس عمر کے لڑکے سے قطعاً متوقع نہیں ہوتا۔[35] چودہ سال کی عمر میں آپ کی شادی کر دی گئی۔[36] پندرہ سال کے ہوئے تو والد کے ہاتھ پر بیعت کی اور سلوک کی تربیت حاصل کرنے لگے۔ اب سارا وقت عبادت وریاضت میں گزرتا خصوصاً نقشبندی سلسلے کے اشغال میں زیادہ انہاک تھا۔ انہوں نے مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھیں جس کی تفصیل انہوں نے خود بیان کی ہے۔

علوم حدیث میں آپ نے مشکوٰۃ المصابیح بالاستیعاب پڑھی۔ صحیح بخاری کے کچھ ابواب (آغاز سے ابواب طہارت تک) پڑھے اور والد کی موجودگی میں شمائل النبی کا درس سنا۔

تفسیر میں البیضاوی کا کچھ حصہ اور مدارک کا کچھ حصہ پڑھا۔ لیکن اس سلسلے میں سب سے بڑی نعمت انہیں یہ حاصل ہوئی کہ اپنے والد سے قرآن کا ایک حصہ اس طرح پڑھا کہ قرآن مجید کے مفہوم واہمیت پر خصوصی زور دیا جاتا تھا اور شان نزول کی تفہیم کے لئے تفاسیر سے مدد لی جاتی تھی۔ اس طرح قرآن کے فہم میں آپ کو بے حد مدد ملی۔ فقہ میں آپ نے شرح وقایہ تقریباً مکمل اور ہدایہ بھی چند صفحات کے علاوہ تقریباً ساری پڑھی۔ اسی طرح اصول فقہ اور منطق، کلام، تصوف، طب اور حکمت وغیرہ کی بھی تمام متداولہ کتابیں پڑھیں۔ اوائل طالب علمی میں ہی ان کی تخلیقی صلاحیتیں ابھر آئی تھیں۔ فرماتے ہیں کہ طالب علمی کے دوران میں ہی مجھے ہر شعبہ علم میں نئی نئی باتوں کا القا ہوتا اور تھوڑی سی کوشش سے بڑی تیزی سے استعداد میں اضافہ ہو جاتا۔"[37]

شاہ ولی اللہ تحصیل علم سے پندرہ برس کی عمر میں فارغ ہوئے تو ان کے والد نے بڑے اہتمام سے ایک تقریب کا انتظام کیا جس میں بہت سے لوگوں کو دعوت دی۔ اس تقریب سے جہاں آپ کے تکمیل علوم کا اعلان ہوا وہاں آپ کو اس مدرسہ کے انتظام کی ذمہ داریاں بھی سونپ دی گئیں جو اب تک آپ کے والد کی تھیں۔ مرض وفات میں آپ کے والد نے آپ کو بیعت کی بھی باقاعدہ اجازت دی اور مرید کرتے اور انہیں امداد وظائف کی تلقین کی بھی اجازت مرحمت فرمائی۔

والد کی وفات کے بارہ سال بعد تک (1719ھ سے 1731ھ تک) شاہ ولی اللہ درس وتدریس میں منہمک رہے اور منقولات ومعقولات کی تعلیم دیتے رہے۔ اس دوران میں آپ نے جو کچھ بھی پڑھا تھا اس پر گہرے غور وفکر

کا موقع ملا۔

قدیم طرز تعلیم میں، جہاں استاد اور طالب علم کا تعلق بڑا ذاتی اور قریبی ہوتا ہے اور سوالات پوچھے جاتے اور ان پر بحث و مباحثہ ہوتا ہے، شاہ ولی اللہ جیسی ذہین شخصیت کو موقع مل گیا کہ وہ ہر موضوع فکر پر اپنا نقطہ نظر قائم کریں۔ وہ اکثر اپنے والد کے مزار پر جا کر بیٹھ جاتے اور اس طرح انہیں کثرت سے فیض روحانی حاصل ہوتا جس سے ان کی نظر میں وسعت اور فکر میں گہرائی آتی گئی۔ چاروں مذاہب فقہ کی فقہی مباحث اصول اور ان احادیث کے مطالعہ سے، جن پر فقہی احکام کی بنیاد رکھی جاتی تھی اصولیین اور محدثین کے بنیادی اصولوں کو سمجھنے میں مدد ملی۔ (38)

سولہ سال کی عمر میں آپ اپنے آبائی مدرسہ میں صدر مدرس ہوئے۔ یہ 1131ھ۔1719ء کا واقعہ ہے جب کہ سید برادران نے فرخ سیر کو اندھا کر کے اسے تخت سے محروم کر دیا تھا۔ اس حادثہ نے جیسا کہ شاہ صاحب خود بھی فرماتے ہیں امور سلطنت میں عظیم انتشار اور بدنظمی پیدا کر دی۔ اس سے نو سال پیشتر راجپوت راجاؤں نے (1122ھ۔ 1710ء) میں اجمیر کے قریب ایک اجتماع میں مغل سلطنت سے بغاوت کا اعلان کیا تھا اور مسلمان سلطنت کے خلاف کھلم کھلا جنگ کے مصمم ارادے کا اظہار کیا تھا۔ (40) راجپوتوں کی طرح سکھوں نے بھی بندہ کی سرکردگی میں مسلمانوں کو تباہ کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور وہ جہاں بھی گئے انہوں نے مسلمانوں کے قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ 1122ھ میں سرہند میں چار روز تک غارتگری اور ظلم و ستم کا دور دورہ رہا۔ مسجدیں گرادی گئیں۔ مسلمانوں کے گھر جلائے گئے، عورتوں کی عصمتیں لوٹی گئیں اور مسلمانوں کا خون بہایا گیا۔ (41)

شاہی دربار پر ان لوگوں کا نفوذ تھا، جو سرتاپا بداطوار اور بے ایمان تھے۔ اسد خاں جیسا شخص جو 37 سال تک اورنگ زیب کا وزیر رہا تھا، اب انگریزوں کی طرف سے دربار میں ان کے مفادات کے تحفظ کے لئے باقاعدہ تنخواہ پاتا تھا۔ (42) بہادر شاہ کی وفات کے بعد تخت نشینی کی جنگ میں اسد خاں اور اس کے بیٹے ذوالفقار خاں نے بڑا ہی پُرفریب اور مکارانہ کردار ادا کیا۔ انہوں نے سب سے کمزور شہزادے جہاندار شاہ کی تائید کی لیکن جب فرخ سیر نے جہاندار شاہ کو شکست دے دی تو جہاندار کو انہوں نے امان دی اور بعد کو اسے فرخ سیر کے حوالے کر دیا تاکہ اس طرح ان کی مراعات بحال رہیں۔ (43) یہی حال اکثر امرا کا تھا جو مرکزی حکومت پر چھائے ہوئے تھے۔ دربار میں تورانی اور ایرانی امرا کے درمیان بھی مستقل باہمی آویزش جاری تھی جو بدقسمتی سے شیعہ سنّی تنازعات کی شکل بھی اختیار کیے ہوئے تھی۔ یہ رقابت دراصل مغل خارجہ حکمت عملی کا نتیجہ تھی۔ مغلوں کا معاملہ ایران کے صفوی بادشاہوں سے بھی تھا جو شیعہ تھے اور وسط ایشیا کے ازبکوں سے بھی جو سنّی تھے۔ شروع میں تو مغل بادشاہ ہندوستان میں آ کر آباد ہونے والے ہر ایک شخص سے خواہ وہ ایران سے آیا ہو، یا ترکستان سے یکساں سلوک کرتے تھے لیکن بعد میں جب صفویہ سے تعلقات کشیدہ ہوئے تو ایرانی عناصر کو تورانیوں کے سامنے جھکنا پڑا۔ تورانی حمایت کی یہ حکمت عملی شاہ جہاں کے دور میں زیادہ نمایاں ہوئی کیونکہ اس کی ایران سے جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ اورنگ زیب کے عہد میں بھی یہ کشیدگی جاری رہی۔ (44) بہادر شاہ کی شیعہ دوستی کی افتاد کے بعد سید برادران کے عروج سے ایرانی شیعہ عنصر کو بے حد تقویت ملی۔ اس چپقلش کا سلطنت کے شیرازے کو منتشر کرنے پر کچھ کم اثر نہ پڑا۔ اس ڈر سے کہ کہیں تورانی سنّی دہلی میں اس کے خلاف اٹھ کھڑے نہ ہوں۔ حسین علی

(1132ھ۔1719ء) میں بالاجی وشواناتھ پیشوا کی کمان میں گیارہ ہزار مرہٹہ فوج دہلی میں لے آیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت تک تو مرہٹے بہت کمزور اور بے جان ثابت ہوئے اور بہت بڑی تعداد میں مارے بھی گئے لیکن آئندہ کے لئے ان کے لئے راستہ کھل گیا کہ وہ مغل سلطنت کو نقصان پہنچا کر اس علاقہ میں اپنا اثر و نفوذ بڑھاتے رہیں اور حملے کرتے رہیں۔ 1133ھ میں جب باجی راؤ اپنے باپ کے بعد پیشوا ہوا تو اس نے مقامی ہندو حکمرانوں اور جے پور اور میواڑ کے راجپوت راجاؤں کو مسلمانوں کی دشمنی کی بنیاد پر جو ان کے مشترکہ دھرم پر جبر کرنے والے تھے، اکٹھا کر لیا۔(46) دربار میں تو امرا میں آویزش اور چپقلش موجود ہی تھی، اس سے مرہٹوں کو اور تقویت ملی اور سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ جاٹ آبادی نے بھی سر اٹھایا۔ حکام کی نااہلی سے حوصلہ پا کر جاٹ راستوں میں ڈاکے ڈالنے لگے اور پوری کوششوں کے باوجود ان کی سرکوبی نہ ہو سکی۔ (1135ھ۔1722ء) میں دکن سے نظام الملک کو بلا کر قلمدان وزارت اس کے سپرد کیا گیا اور اس سے درخواست کی گئی کہ وہ سلطنت کا نظم و ضبط سنبھالے اس نے بادشاہ کے حضور مندرجہ ذیل تجاویز پیش کیں:

1- خالصہ اراضی کو ٹھیکے پر دینا بند کر دیا جائے۔

2- حکام کے تقرر پر نذرانوں کے نام سے جو رشوت وصول کی جاتی ہے اسے فی الفور بند کیا جائے۔

3- جاگیریں دینے میں کمی کی جائے اور صرف مستحق اور طاقت ور امرا ہی کو دی جائیں۔

4- شہنشاہ کو افغان سرداروں کی سرکوبی میں شاہ ایران کی مدد کرنی چاہیے ورنہ افغان کسی بھی وقت ہندوستان کا رخ کر سکتے ہیں۔(47)

یہ بات نہایت اہم اور قابل ذکر ہے کہ شاہ ولی اللہ نے اپنے ایک خط میں جو انہوں نے شہنشاہ، وزرا اور امرا کو لکھا، نظم و نسق کی اصلاح کے لئے تقریباً یہی تجاویز پیش کیں۔ دوسرے امور کے علاوہ انہوں نے لکھا:

1- خالصہ اراضی کے رقبہ جات میں توسیع کی جائے۔ دہلی کے گرد و نواح کے تمام علاقے آگرہ حصار اور گنگا تک اور سرہند کی حدود تک اس میں شامل کر لیے جائیں۔ اگر خالصہ زمینیں کم ہوں گی تو لازمی طور پر خزانہ خالی رہے گا اور مرکز کی قوت میں کمزوری آئے گی۔

2- جاگیریں صرف اعلیٰ پایہ کے امرا کو دی جائیں۔ چھوٹے امرا کو نقد کی صورت میں ادائیگی کی جائے کیونکہ وہ جاگیر کی مناسب دیکھ بھال کی قدرت نہیں رکھتے۔

3- خالصہ اراضی کو ٹھیکے پر دینے کا سلسلہ ختم کیا جائے۔ اس نظام سے زمینیں تباہ ہوتی ہیں اور لوگوں کی معاشی حالت کمزور ہوتی ہے۔(48)

لیکن ان عقل مندانہ تجاویز کو کسی نے نہ سنا۔ شہنشاہ اور اس کے درباریوں کی سخت مخالفت کے سامنے نظام الملک کی ایک نہ چلی۔ دار الخلافہ میں دو سال کے بے نتیجہ قیام کے بعد آخر وہ 1723ء کے آخری مہینے میں دکن واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد درباری سازشیں مزید رنگ لائیں اور نظم و نسق بالکل تباہ ہو کر رہ گیا۔ مرہٹوں کے حوصلے اتنے بڑھے کہ انہوں نے دہلی پر حملہ کیا اور اسے لوٹا۔ شہنشاہ نے فرخ آباد کے نواب محمد خاں بنگش کو مالوہ کا انتظام سپرد کیا تا کہ وہ مرہٹوں کے سیلاب کو روک سکے۔ نواب کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی لیکن امیر الامرا نے اس کو نیچا دکھانے کے لئے بادشاہ کو

مشورہ دیا کہ نواب کی جگہ راجہ جے سنگھ کو مالوہ کا حاکم بنا کر بھیجا جائے۔ مالوہ اس لحاظ سے سلطنت کا نہایت ہی اہم علاقہ تھا کہ یہاں مرہٹوں کو بخوبی روکا جا سکتا تھا اور پیچھے ہٹایا جا سکتا تھا لیکن مالوہ اور گجرات جیسے کلیدی علاقوں میں راجپوت راجاؤں کا تصور انتہائی افسوسناک اقدام تھا[49] کیونکہ ان کی اکثریت کی مرہٹوں سے ساز باز تھی۔[50]

یہ تھا وہ اخلاقی انتشار اور سیاسی بدنظمی کا دور جس میں شاہ ولی اللہ دہلی میں کام کر رہے تھے۔ 1143ھ میں محمد شاہ کے عہد میں آپ نے حجاز جانے کا ارادہ کیا۔[51] اس سفر سے ان کا مقصد صرف اعلیٰ تعلیم کا حصول ہی نہیں تھا بلکہ وہ چاہتے تھے کہ وہاں اپنے مستقبل کے لائحہ عمل کے بارے میں بھی روحانی فیض حاصل کر سکیں، جس کا وہ ہندوستان میں رہتے ہوئے تعین نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ برصغیر کے مسلمان اپنی روایات کے منبع (قرآن) سے بالکل کٹ چکے ہیں اور ان میں مذہب کی حرکی روح بیدار کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ انہیں براہ راست یہ آگاہی حاصل ہو کہ قرآن کیا چاہتا ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں چنانچہ اس مقصد کے لئے ان کا خیال تھا کہ قرآن مجید کا اچھا فارسی ترجمہ بے حد ضروری ہے کہ تمام لوگ، علماء اور عوام سب اس سے استفادہ کر سکیں۔ انہوں نے اپنے ترجموں کی تلاش کی۔ لیکن جب نہ ملا تو ان تمام مقتضیات کو سامنے رکھتے ہوئے خود یہ کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ حجاز کے سفر سے پہلے آپ اس کار عظیم کا آغاز کر چکے تھے۔ لیکن یہ حج سے واپس دہلی آنے کے پانچ سال بعد 1150ھ (1737ء) میں مکمل ہوا۔[52]

شاہ صاحب کا سفر حجاز کا عزم بذات خود ایک انقلابی اقدام ثابت ہوا۔ ہندوستانی مسلمانوں کے ایران اور وسط ایشیا کے مسلمانوں سے تو کافی روابط تھے لیکن حجاز کے لوگوں کے ساتھ ان کے گہرے روابط نہیں تھے۔ اکبر کے زمانے میں ملا عبداللہ سلطانپوری نے فتویٰ دے دیا تھا کہ حج اب فرض نہیں رہا کیونکہ بحر ہند میں یورپی قزاقوں کا خطرہ ہے اور خشکی کے راستے یعنی ایران پر صفوی شیعہ مسلط ہیں۔[53] شیخ عبدالحق دہلوی (959ھ۔1052ء) نے کمال جرأت سے اسی دور میں حج بیت اللہ کا عزم کیا۔ آپ کا قیام حجاز نہ صرف شیخ عبدالحق کے لئے بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کے حق میں بے حد مفید ثابت ہوا کیونکہ حجاز کے علما اور صوفیا کی صحبت سے آپ کے فکر پر بہت دوررس اور تشکیلی اثرات ہوئے۔ اسی قیام حجاز کے دوران میں آپ کا شیخ عبدالوہاب متقی سے رابطہ رہا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ شیخ عبدالحق کے ہاں ابن عربی کے عقیدہ وحدت الوجود کے متنازعہ فیہ مسئلہ کے بارے میں متوازن نظریہ ملتا ہے اور اسی قیام کا نتیجہ تھا کہ آپ کو حدیث سے زیادہ شغف پیدا ہوا۔ چھ سال کی محنت شاقہ کے بعد 1025ھ میں (حج سے واپسی کے 26 سال بعد) انہوں نے مشکوٰۃ کی فارسی شرح مکمل کی اور اس کے بعد پوری توجہ کتب حدیث کی اشاعت کی طرف مبذول کر دی۔ کیونکہ ان کے نزدیک اس وقت کی اخلاقی اور ذہنی انتشار کا یہ واحد اور یقینی تریاق تھا۔

شاہ ولی اللہ صاحب کا بھی یہی معاملہ تھا[54] جب آپ حجاز میں تشریف لائے تو ملک میں اخلاقی اور سیاسی شدید انتشار اور بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔[55] لیکن شاہ صاحب کو حسن اتفاق سے یہاں بڑے بڑے علما اور صوفیا سے استفادہ کا موقع ملا۔ ان میں سے سب سے ممتاز شیخ ابو عامر محمد بن ابراہیم کردی (متوفی 1145ھ) کی شخصیت تھی جنہوں نے علمیت اور تقویٰ اپنے والد شیخ ابراہیم (متوفی 1041ھ) سے ورثے میں پائی تھی۔ مؤخر الذکر بہت بڑے عالم اور صوفی گزرے ہیں۔ وہ شافعی فقہی مسلک اور حدیث کے ممتاز عالم تھے۔ مسائل حکمت کے مباحث میں وہ تصوف کے مسلک کو

اختیار کرتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں فلاسفہ محض عقلی استدلالات کی بنا پر حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے۔ ان کے دل میں ابن عربی کا بڑا احترام تھا۔ (56) ابوطاہر نے فقہ اور حدیث دونوں میں امتیاز حاصل کیا۔ آپ نے اپنے والد کے علاوہ اور بہت سے علماء مثلاً شیخ حسن عجمی (متوفی 1113ھ) (57) شیخ احمد نخلی (58) اور شیخ عبداللہ بصری (متوفی 1134ھ) (59) جیسے اساتذہ سے تعلیم پائی۔ ان کو ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اور شیخ عبدالحق دہلوی (متوفی 1052ھ) کی کتابوں کے مطالعہ کا بھی موقع ملا۔ شیخ عبداللہ لاہوری حج بیت اللہ کے لئے گئے۔ انہیں ان کتابوں کے مصنفین سے سند اجازت حاصل تھی۔ انہی کے ذریعے ابوطاہر کو ان کتب تک رسائی ہوئی۔ آپ بزرگان اسلاف کی طرح تقویٰ اور اجتہاد سے متصف تھے اور ہمیشہ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ بحث میں غیر جانب دار رہیں۔ ایک روز بخاری کے درس میں حدیث اور فقہ کے اختلاف پر بحث چل نکلی۔ شیخ ابوطاہر نے جواب دیا کہ ذات نبوی مختلف عناصر کی جامعیت کے رجحان میں ممتاز ہے چنانچہ ایسے اختلافات کی بآسانی تطبیق ہوسکتی ہے۔ (60) علوم حدیث کی تعلیم اور اجازت کے حصول کے علاوہ شاہ صاحب نے تقریباً تمام سلاسل میں ان سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ (61) جیسا کہ شاہ صاحب کی کتاب ''انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ'' میں مذکور ہے، شاہ صاحب نے قادریہ، نقشبندیہ، سہروردیہ، کبرویہ، شاذلیہ اور شطاریہ تمام سلاسل میں ان سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ (61a) شاہ صاحب کی شیخ ابوطاہر سے ارادت کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ 1145ھ میں جب شاہ ولی اللہ نے ہندوستان کی طرف واپسی کا قصد کیا تو ان کے پاس گئے اور یہ شعر پڑھا۔

نسیت کل طریق کنت اعرفہ الاطریقا یودنی الیٰ ربعکم

ترجمہ: میں جتنے بھی راستے جانتا تھا سب بھول گیا، صرف ایک راستہ یاد رہ گیا، وہ جو تمہارے آستاں کی طرف لے جاتا ہے۔

یہ شعر سن کر شیخ ابوطاہر زار و قطار رونے لگے۔ ان کے رخسار وفور جذبات سے سرخ ہوگئے اور گلا رندھ گیا۔ شیخ ابوطاہر کی وفات پر ان کے صاحبزادے ابراہیم مدنی کو شاہ ولی اللہ نے جو تعزیتی خط لکھا اس سے شاہ ولی اللہ کی اپنے مرشد استاد سے عقیدت و ارادت کی گہرائی کا مزید اندازہ ہوتا ہے۔ (62)

دوسرے عالم جن سے شاہ ولی اللہ نے اس قیام کے دوران سماع، قرأت اور اجازہ (63) کے طریقوں سے علوم حدیث کی تحصیل کی، شیخ محمد وفد اللہ تھے جو محمد بن محمد بن سلیمان المغربی کے صاحبزادے تھے۔ موخر الذکر حافظ حدیث تھے اور انہوں نے پہلی مرتبہ حجاز میں کتب حدیث کی تصحیح کا آغاز کیا۔ شیخ محمد وفد اللہ سے شاہ صاحب نے امام مالک کی الموطا مکمل بروایت یحییٰ بن یحییٰ پڑھی (64) دہلی واپس آنے کے بعد اپنے ایک خط میں شاہ صاحب شیخ محمد وفد اللہ کو لکھتے ہیں:

> ''آپ کے صاحبزادے شیخ رشید سے معلوم ہوا کہ اوائل عمر میں آپ کی ملاقات شیخ محمد بن علاء البابلی (متوفی 1077ھ) سے ہوئی تھی (65) جن سے آپ نے تمام احادیث صحیحہ میں اجازت حاصل کی تھی۔ اگر یہ صحیح ہے تو واقعتاً یہ اعلیٰ ترین سند ہے۔ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ مجھے بالاختصار اور بالتفصیل اجازت عطا فرمائیں۔ میں یہ بھی التماس کروں گا کہ آپ براہ کرم اپنی اسناد اور اپنی سلسلات متصلہ (سلسلہ اسناد) کی تفصیل بھی لکھیں۔ (66)

تیسرے استاد جن سے شاہ ولی اللہ نے علوم حدیث کی تحصیل کی، شیخ تاج الدین قلعی حنفی (م۔1144ھ) تھے۔آپ حدیث کے بہت بڑے عالم تھے اور آپ نے کئی معروف اساتذہ خصوصاً شیخ ابراہیم کردی سے تعلیم پائی تھی اور ان سے انہیں باقاعدہ اجازت حاصل تھی۔شاہ ولی اللہ نے بھی ان کے حلقہ درس میں شرکت کی اور بخاری، مؤطا امام مالک کے کچھ حصے، چھ فقہی مجامیع، مسند، دارمی، امام محمد شیبانی کی ''کتاب الآثار'' اور ان کی روایت کردہ مؤطا کی باقاعدہ اجازت حاصل کی۔(67)

شاہ صاحب نے پہلا حج 1143ھ میں کیا۔اس کے بعد غالباً تین ماہ تک مکہ مکرمہ میں رہے۔ربیع الاول 1144ھ میں آپ مولد النبیؐ (مکان جہاں حضورؐ پیدا ہوئے) کی زیارت کے لئے گئے۔(68) صفر کے مہینے میں آپ نے ایک خواب دیکھا جو اس لحاظ سے بے حد اہم تھا کہ اس سے آپ کی زندگی کا قطعاً نیا باب وا ہوا۔جیسا کہ ان کی خودنوشت سوانح عمری سے ظاہر ہوتا ہے۔آپ کے سفر حجاز سے قبل کے بارہ سال معقولات و منقولات کی درس و تدریس اور کلام، فقہ اور تصوف کے مختلف مسائل و مباحث پر غور و خوض میں گزرے(69) لیکن اس عرصے میں غالباً آپ نے کوئی کتاب تصنیف نہیں فرمائی۔صرف ایک بات پایۂ ثبوت کو پہنچ سکی ہے کہ آپ نے قرآن مجید کا فارسی ترجمہ لکھوانا شروع کر دیا تھا جو ابھی مکمل نہیں ہو سکا تھا۔(70) آپ کی تصنیف و تالیف کا دور حجاز سے واپسی کے بعد شروع ہوا۔چنانچہ اسی کی طرف اس خواب میں اشارہ تھا۔جیسا کہ ''فیوض الحرمین'' میں ہے کہ

> ''یہ دس صفر 1144ھ کا ذکر ہے کہ میں نے مکہ مکرمہ میں خواب دیکھا کہ حضرات حسنؓ و حسینؓ میرے مکان پر آئے۔حضرت حسنؓ کے پاس ایک قلم تھا جس کی نوک ٹوٹی ہوئی تھی۔انہوں نے یہ قلم مجھے دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور کہا کہ یہ نانا کا قلم ہے۔لیکن پھر ہاتھ روک لیا اور کہا لیکن ذرا حسینؓ کو ٹھیک کر دینے دو۔یہ اب اتنا اچھا نہیں رہا جتنا اس وقت تھا۔جب حسینؓ نے پہلی مرتبہ اس کی مرمت کی تھی (71) پھر ان کے سامنے ایک چادر جس پر سفید اور سبز دھاریاں تھیں، رکھی گئی۔حضرت حسینؓ نے چادر اٹھالی اور یہ کہتے ہوئے کہ یہ نانا کی ہے اسے میرے اوپر اور گرد لپیٹ لیا۔''(72)

''دُرِ ثمین'' میں اس واقعہ کے ساتھ مندرجہ ذیل الفاظ کا اہم اضافہ کیا گیا ہے۔''اس دن سے مذہبی امور پر کتابوں کی تصنیف کے لئے میرا شرح صدر ہو گیا۔''(73) شاہ عبدالعزیز بیان فرماتے ہیں کہ جو لوگ شاہ صاحب کے درس و تدریس سے سفر حجاز سے قبل مانوس تھے انہوں نے اب آپ میں بہت بڑی تبدیلی محسوس کی۔اب ان کے دروس صورت و معنی ہر اعتبار سے پہلے سے بالکل مختلف تھے (74) انہوں نے اپنے مدرسے سے تعلق قائم رکھا لیکن ان کے کام کی نوعیت قطعاً تبدیل ہو چکی تھی۔انہوں نے بہت سے تلامذہ مختلف شعبہ ہائے علوم میں تیار کر دیئے تھے۔چنانچہ آپ نے درس و تدریس کا کام ان کے سپرد کر دیا اور خود اپنا بیشتر وقت مذہب کے دقیق مسائل کے بارے میں بحث و تصنیف میں صرف کرنے لگے۔(75) آپ علی الصباح بیٹھ جاتے اور دوپہر ڈھلے تک اسی شغل میں مصروف رہتے۔(76)

''فیوض الحرمین'' میں آپ کے سینتالیس روحانی مشاہدات کا حال درج ہے۔ان میں پہلے آٹھ 1144ھ کے

اوائل میں مکہ مکرمہ میں ہوئے۔ باقی پچیس مدینہ منورہ کے قیام کے دوران ہوئے جب کہ آپ مختلف اساتذہ سے تحصیل علوم کررہے تھے۔ ان میں سے کچھ مشاہدات روضہ نبوی پر اور کچھ قبور اہل بیت پر ہوئے۔ آخری چودہ پھر اواخر 1144ھ میں مکہ میں ہوئے۔ جب آپ نے دوسرا حج کیا(77) یہ کتاب کئی لحاظ سے بڑی اہم ہے۔ یہ غالباً سب سے پہلی کتاب ہے جو آپ نے ہندوستان میں واپسی کے بعد لکھی۔ (78) اس کتاب میں ہمیں اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کا ذہن فلسفہ، سیاست، شریعت، فقہ اور تصوف کے موضوعات پر کس طرح سوچ رہا تھا۔ ان روحانی تجربات کی بنا پر آپ کو بہت سے عقائد و تصورات کو ترک کرنا پڑے جن کے آپ پہلے قائل تھے۔ (79) اس کتاب میں شاہ ولی اللہ صاحب ان تمام مذہبی، سماجی اور سیاسی مسائل سے بحث کرتے ہیں جنہوں نے امت کو پارہ پارہ کردیا تھا اور مسلمانوں میں تفرقے، عداوت اور بغض پیدا کردیا تھا۔ وہ ایک دوسرے پر حملے کرتے تھے، ان مسائل نے تاریخ کے اس نازک دور میں جبکہ امت مسلمہ کا خود وجود خطرے میں تھا، مسلمانوں کو کمزور کردیا تھا۔

1- پہلا مسئلہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا تھا۔ ان دنوں یہ بحثیں پورے عروج پر تھیں اور صوفیہ بالعموم دو متحارب گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ شاہ ولی اللہ کے ہمعصر مرزا مظہر جانجاناں، شیخ احمد سرہندی کے عقیدت مند تھے۔ وہ وحدت الشہود کے قائل اور بہت بڑے داعی تھے۔ (80) دوسری طرف شاہ ولی اللہ کے والد اور چچا عقیدۂ وحدت الوجود کے علمبردار تھے۔ (81) شاہ ولی اللہ کے نزدیک ان مباحث کا روح تصوف کو قائم رکھنے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ خصوصاً وحدت الوجود کے (اس عقیدے کو اگرچہ شاہ ولی اللہ خود صحیح بھی سمجھتے تھے) داعیوں نے بعض امور میں اتنے غلو سے کام لیا تھا کہ وہ تصوف کے مقصد و غایت یعنی تزکیہ نفس سے قطعی دور ہوگئے تھے۔ (82)

2- چاروں فقہی مذاہب کا اختلاف بھی وجہ نزاع بنا ہوا تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت حنفی مسلک کی پیروکار تھی جبکہ اکثر علماء جن سے شاہ صاحب کی ملاقات حجاز میں ہوئی، شافعی اور مالکی مسلک سے وابستہ تھے۔ حنفی مسلک سے اپنی وابستگی پر زور دیتے ہوئے (83) شاہ صاحب نے دوسرے مذاہب فقہ کی صحت ثابت کرنے کی بھی کوشش کی(84) بلکہ انہوں نے اس گروہ کو بھی ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی جو ان میں سے کسی فقہی مسلک کا بھی قائل تھا(85)۔ اس کوشش کے پیچھے دراصل یہ روح کارفرما تھی کہ امت مسلمہ کے تنازعات اور اختلافات بحسن و خوبی ختم ہوجائیں۔ (86)

3- اس کتاب میں اول تا آخر تصوف کی روح سرایت کئے ہوئے ہے۔ یہ روح آپ نے والد اور چچا سے ورثے میں پائی تھی۔ جن کی مزید توثیق اور نشوونما قیام حجاز کے دوران میں ہوئی۔ لیکن وہ اپنے دور کی صوفیانہ زندگی کی خامیوں سے واقف تھے۔ انہیں متعدد علمائے حجاز کے تصوف پر اعتراض سننے پڑے اور انہوں نے ان کا جواب دینے کی کوشش کی۔ لیکن رسول اللہ صلعم کی طرف سے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا گیا اور وہ اس ممانعت کے حکم سے یہ سمجھے اور اس حکم کی انہوں نے تعبیر کی کہ صوفیا پر یہ اعتراض کرنے والے زیادہ غلط نہیں ہیں اور شاید یہ زیادہ بہتر طریقے سے امت مسلمہ کی خدمت کررہے ہیں۔ (87) وہ کئی مقامات پر بار بار اس بات پر زور دیتے ہیں کہ علماء کا طریقہ جسے وہ انبیاء کا طریقہ قرار دیتے ہیں، صوفیا کے طریقے سے افضل ہے۔ (88) اس ضمن میں بھی ان کے سامنے بڑا مقصد علماء اور صوفیا کا باہمی نزاع دور کرنا تھا۔ (89) شاہ صاحب کو اس سلسلے میں نبی علیہ السلام کی طرف سے حکم دیا گیا کہ وہ علماء کا طریقہ اختیار

کریں۔ (90) کیونکہ جیسا کہ شاہ صاحب نے بیان کیا ہے، رسول اللہ صلعم کو صوفیہ کا طریقہ پسند نہیں ہے (91) اور اس کے فوراً ہی بعد وہ اس کا اضافہ کرتے ہیں کہ اگر ایک فریق ایک نقطہ نظر سے دوسرے سے افضل ہے تو دوسرے نقطہ نظر سے دونوں یکساں، صحیح اور مفید ہیں۔ اس لحاظ سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ (92)

4۔ ان دنوں شیعہ سنّی بحثیں اتنی شدید تھیں اور ان بحثوں کے نتیجے میں سیاسی و سماجی دونوں کے دونوں نزاعات اس حد کو پہنچ گئے تھے کہ شاہ ولی اللہ ان کو نظرانداز کر سکتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں وہ یہ تجویز کرتے ہیں کہ فقہ کے مذاہب اربعہ کی طرح شیعہ فقہ کو بھی اعلیٰ پیمانے پر جو فقہی امتزاج ہو، اس میں داخل کر لیا جائے۔ (93) ''فیوض الحرمین'' میں وہ شیعہ سنّی بحث کے صرف ایک پہلو یعنی حضرت علیؓ پر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی فضیلت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ذاتی طور پر ان کا رجحان حضرت علیؓ کی باقی دو خلفاء پر فضیلت کی طرف ہے۔ (94) لیکن انہیں رسول اللہ صلعم کی طرف سے حضرت علیؓ کے مقابلے میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو افضل ماننے کا حکم دیا گیا اور وہ اس لئے جیسا کہ شاہ صاحب اس حکم کی تعبیر کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے انبیاء کا طریقہ اختیار کیا۔ (95)

بہرحال یہاں ایک نقطے کی وضاحت ہونی چاہیے۔ ایک جگہ شاہ صاحب اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ کا منشا تمہارے ذریعہ امت کے بکھرے ہوئے اجزا کو متحد کرنا ہے۔'' اس پر وہ یہ اضافہ کرتے ہیں کہ انہیں یہ بھی نصیحت کی گئی ہے کہ اولاً وہ ایسی بحثوں میں نہ پڑیں، جن کی وجہ سے دوسرے ان کے مؤقف کی تردید اور ان کے نقطہ نظر کی مذمت کرنے پر مجبور ہوں اور ثانیاً معمولی مذہبی مسائل (فقہ) میں وہ ایسی راہ اختیار نہ کریں جو امت کے عام مسلک کے خلاف ہو (96)۔ کیا اس نصیحت کا اطلاق شیعوں پر بھی ہوتا ہے۔ یہ بات مشتبہ ہے۔ اسی طرح وہ ایک جگہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم کے نزدیک جیسے کہ میں سمجھتا ہوں، فقہ کے تمام مذاہب یکساں طور سے حق پر ہیں اور اگر کوئی شخص ان فقہی مذاہب میں سے کسی کی بھی متابعت نہ کرے، تو اس سے نبی علیہ السلام ناخوش نہیں ہوتے۔ غرض اس بارے میں ان کے ہاں فیصلہ کن امر ہے کہ کوئی ایسی بات نہ کی جائے جس سے امت میں افتراق ہو اور تنازعات اور بحثوں کو سر اٹھانے کا موقع ملے (97)۔ میرا خیال یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ نے اس نصیحت کے معنی یہی لئے کہ اسے صرف اہل سنت کے مختلف مکاتب فکر پر اطلاق کیا جائے اور کم سے کم فکری سطح پر بھی انہوں نے اعلیٰ امتزاج و ارتباط کے دائرے میں فقہ کے شیعی نقطہ نظر کو شامل کرنے کے لئے کوئی ٹھوس کوشش نہیں کی۔

5۔ ایک اور بڑا اہم مسئلہ اس کتاب میں یقیناً مختصر طور پر ہی زیر بحث لایا گیا ہے، وہ نمایاں تقسیم ہے جو شاہ صاحب علماء اور ارباب سیاست یعنی روحانی اور دنیاوی خلفاء فرائض منصبی کے درمیان کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یقیناً ان دونوں کے لئے رسول اللہ صلعم کی زندگی میں نمونہ موجود ہے۔ ارباب سیاست کے فرائض منصبی یہ بتائے گئے ہیں: شرعی قوانین کا نفاذ۔ جہاد کے انتظامات کرنا۔ سلطنت کی حدود کی حفاظت۔ دوسرے ملکوں میں سفارتیں بھیجنا۔ صدقات اور خراج وصول کرنا اور اس طرح جو مال جمع ہو، اسے مستحق حاجت مندوں پر خرچ کرنا۔ قانون کے ذریعہ مقدمات کا فیصلہ کرنا۔ یتیموں، مسلمانوں کے اوقات، سڑکوں اور مساجد وغیرہ کی نگہداشت۔ علماء کے فرائض منصبی یہ ہیں: قرآن وسنت اور شریعت کی تعلیمات کی نشرواشاعت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ حضرت متکلمین جو بحث و مباحثہ کے ذریعہ دوسرے

مذاہب کے لوگوں سے دین کی حفاظت کرتے ہیں، واعظین جو وعظ و نصیحت سے لوگوں کو صراط مستقیم پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں، صوفی جو اپنے ذاتی ارتباط سے لوگوں کے ایمان و یقین میں پختگی پیدا کرتے ہیں اور وہ نیک حضرات جن کی پاک و صاف زندگی دوسروں میں پاکیزہ زندگی گزارنے کا احساس پیدا کرتی ہے، یہ سب طبقہ علماء میں شامل ہیں۔ اس کے بعد شاہ صاحب یہ بتاتے ہیں کہ علماء کو چاہیے کہ وہ ان فرائض منصبی کو ادا کرنے کے لئے ملک کے مختلف حصوں میں اپنے نائب بھیجیں۔ وہ رسول اللہ صلعم کے اسی قسم کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جب آپ نے عرب کے مختلف قبائل کی طرف ابوموسیٰ اشعری، ابوذر غفاری اور دوسروں کو بھیجا تھا۔ اس ضمن میں شاہ صاحب کہتے ہیں کہ ''نبی علیہ السلام نے خلافت طاہرہ دنیوی خلافت کے دائرہ کار کی کوئی بھی ذمہ داری ان حضرات کو نہیں دی تھی۔ ان کا فرض منصبی صرف لوگوں کو اسلام کی دعوت دینا اور انہیں قرآن و سنت کی تعلیم دینا تھا''۔ [98] ان سطور سے واضح طور پر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شاہ ولی اللہ چاہتے تھے رسول اللہ صلعم کے عمل کی روشنی میں اس تقسیم کار کی پوری طرح پابندی کریں۔

شاہ ولی اللہ کا دعویٰ ہے کہ انہیں خلافت باطنہ سے سرفراز کیا گیا ہے۔ [99] ان کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ وہ مجدد، قطب، وصی اور صاحب طریقہ بھی بنائے گئے۔ [100]

مکہ میں اپنے آخری حج (21 ذی القعدہ 1144ھ۔ 1145ھ) سے ایک ماہ پہلے شاہ ولی اللہ نے ایک اور اہم خواب دیکھا، جو ہندوستان اور شاید دوسرے اسلامی ملکوں میں اس وقت جو معاشرتی و سیاسی انتشار برپا تھا، اس کے ردعمل کی عکاسی کرتا ہے۔ انہوں نے اس خواب میں دیکھا کہ غیر مسلموں کا مسلمانوں پر سیاسی اور فوجی غلبہ ہوگیا ہے، مسلمانوں کی املاک ضبط کرلی گئی ہیں، ان کے بچے غلام بنالئے گئے ہیں اور ان کے مذہب اور قوانین کی جگہ غیر مسلموں کا مذہب اور ان کے قانون نافذ کردیئے گئے ہیں۔ [101] اس صورت حال نے شاہ صاحب کے اندر سخت برہمی اور ناراضگی پیدا کردی اور یہ کیفیت، جیسا کہ شاہ صاحب بتاتے ہیں، ملاء اعلیٰ کی اسی قسم کی کیفیت کا عکس تھی۔ پھر ناراضگی کی یہ کیفیت لوگوں کے ایک گروہ میں منتقل ہوجاتی ہے، جو شاہ صاحب کے اردگرد جمع ہیں۔ یہ لوگ شاہ صاحب سے پوچھتے ہیں کہ اب اس صورتحال میں اللہ تعالیٰ کی کیا مرضی ہے۔ اس کے جواب میں وہ کہتے ہیں: مجموعی اور مکمل انقلاب۔ اس کے بعد لوگ پوچھتے ہیں کہ کب تک؟ شاہ صاحب جواب دیتے ہیں: جب تک کہ میری ناراضگی ختم نہ ہو۔ اس پر زبردست لڑائی اور تباہی شروع ہوتی ہے، جس میں ایک شہر کے بعد دوسرا شہر فتح ہوتا اور تباہ کیا جاتا ہے۔ اجمیر فتح ہوتا ہے، اور کفار کے بادشاہ کو شکست ہوتی ہے اور اسے گرفتار کرلیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے بادشاہ کے حکم سے کفار کا شکست خوردہ بادشاہ قتل کردیا جاتا ہے۔ جب یہ سب کچھ ہوچکتا ہے تو شاہ صاحب کی ناراضگی جاتی رہتی ہے اور وہ لکھتے ہیں کہ ان مسلمانوں کے دلوں پر جنہوں نے اس لڑائی میں حصہ لیا تھا، اطمینان و سکینت نازل ہوتی ہے۔ اس کے بعد ایک آدمی کھڑا ہوتا ہے اور پوچھتا ہے کہ ان مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ جو کفار کے ساتھ مل کر اپنے بھائیوں کے خلاف لڑے؟ اس پر شاہ صاحب خاموش رہتے ہیں اور اس سوال کا جواب دینا پسند نہیں کرتے۔ [102]

یہ خواب بڑی خوبی سے شاہ ولی اللہ کے اس غم و رنج اور پریشانی کی عکاسی کرتا ہے جو ان دنوں ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی و معاشرتی انتشار کی وجہ سے انہیں تھی۔ ایک لحاظ سے اس خواب میں ان واقعات کی پیش گوئی کی گئی

ہے جو پانی پت کی تیسری جنگ کی شکل میں، جس میں احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو شکست دی تھی، شاہ صاحب کی آنکھوں کے سامنے (1175ھ۔1761ء) رونما ہوئے۔(103)

پانی پت کی تیسری جنگ کا یہ واقعہ 1145ھ سے، جبکہ شاہ صاحب حج کر کے واپس دہلی لوٹے، ابھی کافی دور تھا اور ابھی مکمل تباہی و بربادی کے تیس سال گزرنے باقی تھے۔ یہ وہ فیصلہ کن سال تھا جب مرہٹوں کا خطرہ کافی تشویشناک ہو گیا تھا۔ انہوں نے گجرات کے ایک حصے پر قبضہ کر لیا اور بندھیل کھنڈ کو بانٹ لیا تھا اور میواڑ ان کے قدموں میں تھا۔ شاہی افواج ان کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے میں ناکام رہیں اور جلد ہی گوالیار سے لے کر اجمیر تک کے علاقے عملاً ان کے تسلط میں آ گئے۔ 1154ھ میں باجی راؤ پیشوا کو اتنی جرأت ہو گئی کہ وہ دہلی پہنچا اور اس نے دہلی کے نواحی علاقوں کو لوٹا۔ یہ حالات تھے، جب محمد شاہ نے نظام الملک کو دکن سے واپس بلانے کا فیصلہ کیا۔ وہ 1151ھ میں دہلی آیا، جب کہ نادر شاہ کے حملے کے آثار صاف ظاہر تھے۔(104)

امیر الامراء نے راجہ جے سنگھ اور دوسرے راجپوت راجاؤں کو اس نازک وقت میں بادشاہ کی مدد کے لئے کہا، لیکن ان میں سے کسی نے بھی حامی نہ بھری۔ ان امراء کی ذہنیت پر افسوس آتا ہے، جو غیر مسلموں کے خیالات کے نئے رجحان کو سمجھنے سے قاصر تھے، جو تقریباً ہر شخص کے لئے اس وقت ظاہر و باہر تھے۔ شاہ ولی اللہ اپنے مکاتیب میں صاف صاف لکھتے ہیں کہ غیر مسلم کسی حالت میں بھی مسلمانوں کے پہلو بہ پہلو وفاداری کے ساتھ نہیں لڑیں گے۔(105)

ان حالات میں نظام الملک نے نادر شاہ سے کسی نہ کسی طرح کا سمجھوتہ کرنے کی کوشش کی چنانچہ نادر شاہ اس پر راضی ہو گیا کہ اگر اسے پچاس لاکھ روپیہ دیا جائے تو وہ واپس چلا جائے گا۔ اسی گفت و شنید کے دوران خان دوراں کا انتقال ہو گیا اور بادشاہ نے نظام الملک کی خدمات کے پیش نظر اسے امیر الامراء کے منصب پر جس کا وعدہ پہلے سعادت خاں سے کیا گیا تھا، فائز کر دیا۔ مؤخر الذکر نے جب یہ سنا تو سخت ناراض ہوا اور حسد نے اسے اس حد تک اندھا کر دیا کہ وہ نادر شاہ کے پاس پہنچا اور اس کو اپنا مطالبہ اور بڑھانے کا کہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نظام الملک گرفتار کر لیا گیا اور بادشاہ کو مجبور کر کے اس سے روپیہ نکلوایا گیا۔ اس المیہ کا سب سے ہولناک پہلو باشندگان دہلی کا قتل عام ہے، جس کا ذکر ایک ہم عصر مؤرخ نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

> ''ایک عرصے تک دہلی کی گلیاں لاشوں سے پٹی رہیں۔ شہر راکھ کا ڈھیر بن گیا اور وہ یوں دکھائی دیتا تھا، جیسے کوئی میدان ہو، جہاں آگ لگ چکی ہو۔ شہر کے خوبصورت بازار اور اس کی عمارتیں یوں تباہ و برباد ہو گئی تھیں کہ برسوں کی محنت سے ہی اسے اپنی پہلی شاندار حالت پر بحال کیا جا سکتا تھا۔ جب شہر میں امن قائم ہو گیا، تو حملہ آور فوج نے لوگوں سے روپیہ جمع کرنا شروع کر دیا۔ کوئی گھر بھی اس سے محفوظ نہ رہا۔ شہر کے ہر محلے کو روپیہ دینا پڑا۔ یہ روپیہ نہایت ہی بے رحمانہ طریقے سے جمع کیا گیا۔ لوگوں کو سخت اذیتیں دی گئیں۔ بہت سے لوگوں نے تو خودکشی کر لی، شمالی ہندوستان سے تمام دولت نچوڑ لی گئی۔ صنعت اور تجارت مکمل طور پر اس طرح تباہ ہوئیں کہ ایک عرصہ دراز تک ان کی پہلی حالت بحال نہ ہو سکی۔''(106)

نادر شاہ کے حملے کا سب سے بڑا نتیجہ یہ نکلا کہ مرکزی حکومت کا اقتدار نا قابل اصلاح حد تک کمزور ہو گیا۔ علاقوں کے صوبے دار قریب قریب آزاد ہو گئے۔ جب وہ غیر ملکیوں سے معاملات کرتے تو اس کی بھی ضرورت نہ محسوس کی جاتی کہ ان کے بارے میں دہلی کی مرکزی حکومت کی رائے لی جائے۔ مرکزی حکومت کی یہی کمزوری تھی جو آخر کار سبب بنی سرکش سکھوں، جاٹوں اور مرہٹوں اور سب سے بڑھ کر چالاک اور کسی اصول کی پروانہ کرنے والے انگریزوں کی طاقت کے وجود میں آنے اور بڑھنے کا۔ اس بارے میں شاہ ولی اللہ نے بھی اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں "نادر شاہ نے مسلمانوں کی طاقت تو ختم کر دی، لیکن اس نے مرہٹوں اور جاٹوں کی طاقت کو قائم رہنے دیا۔ نادر شاہ کے بعد مسلمان افواج کا شیرازہ بکھر گیا اور مرکزی حکومت بچوں کا کھیل بن کر رہ گئی۔"(107)

نادر شاہ کی واپسی کے بعد ایرانی اور تورانی پارٹیوں کی آویزش نے بڑی خطرناک صورت اختیار کر لی۔ بادشاہ کے تورانی پارٹی سے شکوک بتدریج بڑھتے گئے اور اس کی وجہ سے اس نے ایرانی پارٹی کی سرپرستی شروع کر دی۔ نظام الملک دل برداشتہ ہو کر 1152ھ میں واپس دکن چلا گیا۔ صفدر جنگ جو اودھ کا دوسرا نواب تھا، وہ اب مغل سلطنت کا فی الواقع وزیر بن گیا۔ محمد شاہ کی وفات کے بعد 1161ھ میں احمد شاہ اس کا جانشین ہوا۔ مئی 1748ء میں جب نظام الملک مرا تو صفدر جنگ وزیر اعظم بن گیا۔ اس تقرر سے تورانی ایرانی دوسرے لفظوں میں سنی، شیعہ آویزش اور بھی تیز ہو گئی۔

صفدر جنگ نے اپنی حفاظت کے لئے اپنے دشمن تورانیوں اور روہیلوں کے خلاف مرہٹوں اور جاٹوں سے مدد مانگی۔ اول الذکر گروہ نے اپنی طرف سے اسے نیچا دکھانے کی کوشش کی۔ انہوں نے اس کو مروانے کی سازش کی اور اس طرح اسے مجبور کیا کہ وہ اپنی جان و عزت بچانے کے لئے وہ اقدام کرے، جو اسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ (اور اگر صورتحال معمول پر رہتی، تو وہ شاید یہ اقدام نہ کرتا)(109) پنجاب کے صوبے دار معین الملک کی، جو اتفاق سے سابق وزیر کا بیٹا تھا، بے جا مخالفت کی وجہ سے بدقسمتی سے پنجاب میں بدنظمی اور انتشار پھیلا جس سے سکھوں کو از سر نو شورش مچانے کا اس حد تک موقع مل گیا کہ پھر اس کے بعد مغل اس کو کبھی دبا نہ سکے۔ صفدر جنگ نے افغانوں کو پنجاب اور ملتان سے مرہٹوں کی مدد سے نکالنا اور آخر الذکر کو شمالی مغربی سرحدوں کا بادشاہ کی طرف سے صوبہ دار مقرر کرنا چاہا۔ یہ اسکیم اگر کامیاب ہو جاتی، تو اس سے مرہٹے شمالی ہندوستان کے فی الواقع حکمراں ہو جاتے۔(110) اس قسم کی سازشیں اور جوابی سازشیں اتنی آگے چلی گئیں کہ صفدر جنگ نے بادشاہ کے خلاف بغاوت کر دی اور چھ ماہ تک (1166ھ) میں یہ خانہ جنگی جاری رہی، مغل بادشاہ احمد شاہ(111) کے ساتھ افغانوں کا نیا ابھرتا ہوا سردار نجیب خاں روہیلہ تھا۔ جس نے آگے چل کر سلطنت کی قابل قدر خدمت کی۔ صفدر جنگ نے اپنی مدد کے لئے مرہٹوں اور جاٹوں کو بلا لیا۔ جنہوں نے دہلی شہر کو بڑی بے رحمی سے لوٹا۔ یہ لوٹ مار اتنی وحشیانہ اور ہمہ گیر تھی کہ دہلی کے باشندے انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں تک اسے بھلا نہیں سکے۔(112) شاہ ولی اللہ اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ اس لوٹ مار کا سلسلہ دو ماہ تک چلتا رہا۔ یہ ایک بہت بڑی مصیبت تھی، جس میں مال و متاع لوٹا گیا اور مکانوں کو جلایا گیا، لیکن "خدا نے مجھے میرے خاندان اور میرے گھر کو ان سے محفوظ رکھا۔"(113)

اس افراتفری کا حقیقی سبب یہ تھا کہ صفدر جنگ احمد شاہ ابدالی کی شخصیت میں افغانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو مغل سلطنت کے لئے ایک عظیم خطرہ سمجھتا تھا اور اس کے نزدیک سلطنت کے اندر افغانوں کی آبادیاں، جیسے کہ روہیلے

تھے۔ مغلوں کے تاریخی دشمنوں کی فوجی بیرونی چوکیاں تھیں۔ صفدر جنگ مرہٹوں اور جاٹوں کی مدد سے افغانوں سے لڑنا چاہتا تھا اور اس کی یہ پالیسی اس کے دشمنوں کو ناپسند تھی جو افغانوں کے خلاف ہندوؤں سے مدد لینا نہیں چاہتے تھے۔ ایک طرف مسلمان اور دوسری طرف غیر مسلم، یہ صورتحال اتنی نمایاں اور واضح تھی کہ کوئی شخص بھی ہندوؤں کے حقیقی عزائم سے ناواقف ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا تھا۔ شاہ ولی اللہ اپنے ایک خط میں جو انہوں نے اپریل 1756ء اور جون 1757ء (114) کے درمیانی عرصے میں احمد شاہ ابدالی کو لکھا تھا، بیان کرتے ہیں کہ جہاں بھی غیر مسلموں کے ہاتھ میں کہیں طاقت آئی ہے، انہوں نے ہمیشہ مسلمانوں اور ان کی مساجد کو تباہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں خاص طور پر وہ بتاتے ہیں کہ جب جاٹوں نے بیانہ کے شہر پر جہاں سات سو سال سے علماء اور صوفیا رہ رہے تھے، قبضہ کیا، تو انہوں نے تمام مسلمانوں کو وہاں سے نکال دیا اور جاٹوں کی تمام عمل داری میں کسی کو اذان دینے کی اجازت نہ تھی۔ شاہ صاحب آگے چل کر بتاتے ہیں کہ مسلمان خستہ و تباہ حال ہوگئے ہیں۔ چنانچہ تمام عہدے ہندوؤں کے پاس ہیں، جنہوں نے بڑی دولت جمع کرلی ہے اور مسلمان قلاش ہوگئے ہیں۔ (115) اپنے ایک اور خط میں جو نجیب الدولہ کے نام ہے، شاہ ولی اللہ اسے نہایت واضح الفاظ میں خبردار کرتے ہیں کہ وہ ہندو جو اس کے ہاں ملازم ہیں، وہ ہرگز نہیں چاہتے کہ وہ کوئی ایسا قدم اٹھائے جس سے مسلمانوں کے خلاف ان کے مفاد کو نقصان پہنچے۔ (116) تاج محمد خاں بلوچ کے نام اپنے ایک دوسرے خط میں شاہ ولی اللہ صاف طور پر بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کی طاقت کے کمزور ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ذاتی اغراض کے لئے قومی مفادات سے پہلوتہی کی اور ہندوؤں کو اپنے امور میں مداخلت کرنے اور انہیں اپنے ہاتھ میں لینے کی اجازت دی۔ (117) شاہ صاحب اسی خط میں لکھتے ہیں کہ یہ بات ظاہر ہے کہ ہندو غیر مسلموں کی تباہی و بربادی پر کبھی مطمئن نہیں ہوں گے۔ آخر میں وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وسیع القلب ہونا اچھا ہے لیکن جب غیر مسلم ایک شہر کے بعد دوسرا شہر فتح اور مسلمانوں کو تباہ کررہے ہیں، تو اس مسلک پر چلنا صحیح نہیں۔ (118) قدرتی بات تھی کہ صفدر جنگ کی یہ پالیسی کہ غیر مسلموں سے مدد لے کر مسلمانوں کے خلاف لڑا جائے، عام مسلمانوں کے لئے ناقابل قبول ہوتی۔ اس پالیسی کے خلاف شاہ ولی اللہ جتنی شدید نفرت اور بیزاری محسوس کرتے تھے، اس کا اندازہ ان توہین آمیز الفاظ سے ہوسکتا ہے، جو شاہ صاحب نے اپنے مکاتیب میں صفدر جنگ کے متعلق استعمال کیے ہیں۔ (119) نظام الملک کا پوتا عماد الملک صفدر جنگ کے بعد وزیر سلطنت بنا لیکن وہ اپنے پیش رو سے ذرا بھی بہتر نہ تھا۔ عماد الملک نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے شیعہ سنّی اختلافات کو ہوا دی۔ سنّی راسخ العقیدہ گروہ کی تائید کے نام سے اس نے مغل دربار میں شیعہ اثر و رسوخ ختم کرنے کی کوشش کی اور محرم کے مہینے میں شیعوں کے جلوس بند کردیئے، جن کی کہ فرخ سیر کے زمانے سے اجازت چلی آتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف اس کا مرہٹوں سے اتحاد تھا، جو اب تمام شمالی ہند پر چھاتے جارہے تھے۔ ان کی مدد سے عماد الملک نے 1171ھ میں احمد شاہ کو تخت سے اتار دیا اور جہاندار شاہ کے ایک بیٹے کو عالمگیر ثانی کا لقب دے کر بادشاہ بنایا گیا۔ پانچ سال بعد عماد الملک نے 1173ھ میں بادشاہ کو نجیب الدولہ سے تعاون کرنے کی بنا پر مار ڈالا اور شاہ جہاں سوئم کا لقب دے کر ایک کٹھ پتلی شہزادے کو تخت پر بٹھا دیا۔ جب (1175ھ۔ 1761ء) میں احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو شکست دی تو عماد الملک سورج مل جاٹ کے ہاں پناہ گزیں تھا۔ (120) احمد شاہ ابدالی نے عالمگیر دوم کے بیٹے علی گوہر کو شاہ عالم کا لقب

دے کر تخت پر بٹھایا۔ نجیب الدولہ امیر الامراء بنائے گئے اور وہ دہلی کے نائب السلطنت ہو گئے۔

نجیب الدولہ ایک ممتاز شخصیت کے مالک تھے۔ جادو ناتھ سرکار نے ان کی بڑی تعریف کی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

نجیب الدولہ محض اپنی ذاتی قابلیت اور مضبوط کردار سے سلطنت کے سب سے بلند منصب پر پہنچے اور پورے دس سال تک اعلیٰ نائب السلطنت کی حیثیت سے سلطنت دہلی کی قیادت کرتے رہے۔ اعلیٰ درجے کی فوجی اور انتظامی صلاحیت، دوسروں سے معاملہ کرنے میں حکمت عملی کو بڑی سوجھ بوجھ اور سلیقہ، اور اس پر مستزاد یہ کہ اپنے زمانے کے حقائق سیاسیات کے وجدانی ادراک اور اہم چیزوں کی طرف اپنی پوری توجہ مبذول کرنے کی استعداد، ان سب کو بیک وقت اپنی ذات میں جمع کرنے میں احمد شاہ ابدالی کو چھوڑ کر اس دور میں ان کا کوئی مثیل نہ تھا۔(121) لیکن ان کی زندگی کی اس سے بھی زیادہ اہم بات ان کی اسلام اور ہندوستانی مسلم قوم کے مقاصد سے غیر متزلزل وفاداری تھی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ صفدر جنگ مرہٹوں کے ساتھ مل کر روہیلوں کو تباہ کرنے کی کوششیں کرتا رہا ہے، انہوں نے اس میں کوئی قباحت نہ دیکھی کہ وہ اس کے بیٹے شجاع الدولہ کو احمد شاہ ابدالی کا ساتھ دینے پر، جسے وہ اس سرزمین میں مسلم سیادت کو بحال کرنے کا شاید واحد ذریعہ سمجھتے تھے، آمادہ کریں۔ شجاع الدولہ کو اس کا احساس تھا کہ چونکہ محمد شاہ کے عہد سلطنت میں اس کے باپ آصف الدولہ کی کوششوں سے احمد شاہ ابدالی کو شکست دی گئی تھی۔ اس بنا پر ممکن ہے افغان بادشاہ کے دل میں اس کی طرف سے کچھ کدورت ہو اس لئے وہ اس آنے والی جنگ میں غیر جانب دار رہنا چاہتا تھا، لیکن نجیب الدولہ کی نظر میں یہ جنگ دو شخصوں یا دو گروہوں میں کشمکش سے عبارت نہ تھی، لیکن اس میں تو اس برصغیر میں خود اسلام اور مسلمانوں کے وجود ہی کو چیلنج دیا جا رہا تھا۔ نجیب الدولہ نے ایک راسخ العقیدہ سنّی ہونے کے باوجود شجاع الدولہ سے اپنے فرقہ وارانہ اختلافات کو مرہٹوں کے مقابلے میں ایک متحدہ محاذ کی تشکیل میں جسے وہ اسلام اور کفر کے درمیان تصادم سمجھتے تھے، حائل نہ ہونے دیا۔(122) شجاع الدولہ کے دل کی گہرائیوں میں اتر کر اسے مائل کرنے اور اس کو اپنے ساتھ لانے والے آخری الفاظ جو انہوں نے کہے وہ قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے کہا "اب تم ان دو چیزوں میں سے ایک کرو۔ یا تو ابدالی کی امداد کے لئے آؤ، یا یہ ہے میری تلوار، اور یہ ہے میری گردن۔ اسے خود اپنے ہاتھوں سے قلم کر دو۔"(123) نجیب الدولہ کے یہ اعلیٰ الفاظ اس یقین راسخ کا اظہار کرتے ہیں، جو انہیں اپنے مقصد کے مبنی برحق ہونے کا تھا۔ مسلمان قوم کی حفاظت اور اس کی سالمیت کے لئے ان کا جوش و خروش بڑا موٴثر ثابت ہوا، اور اس طرح دوسرے بلند پایہ نفوس بھی اس مہم میں ان کے ساتھ ہو گئے۔ اسلام سے نجیب الدولہ کی غیر متزلزل وفاداری کا ایک اور واقعہ سے اظہار ہوتا ہے، جب مرہٹوں نے پوری طرح سمجھ لیا کہ ان کی شکست یقینی ہے تو بھاؤ نے صلح کر لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے شجاع الدولہ کو ایک سفید کاغذ بھیجا اور کہلوایا کہ اس پر جو شرطیں چاہو، لکھ دو، میں انہیں منظور کرنے کے لئے تیار ہوں۔ احمد شاہ ابدالی کا وزیر اس پیش کش کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو گیا، اگر بھاؤ رقم کی مقدار اور بڑھا دے۔ جب نجیب الدولہ نے یہ سنا، تو انہوں نے اس کی بہت سخت مخالفت کی اور کہا "میں نے تو خدا کی راہ میں جہاد کرنے کے لئے کمر باندھ رکھی ہے۔" ان کا یہ جرأتمندانہ نقطہ نظر اور قاضی ادریس کے جنہوں نے اس نقطہ نظر کی تائید کی تھی، جرأتمندانہ الفاظ، فیصلہ کن ثابت ہوئے اور صلح کی پیش کش کو مسترد کر دیا گیا۔(124) آخر شاہ ولی اللہ کو نجیب الدولہ سے جو بڑی توقعات تھیں وہ بے سبب نہ تھیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ نجیب الدولہ نے اپنی زندگی میں اسلام کے

ساتھ خلوص وعقیدت کے جس جذبے کا مظاہرہ کیا وہ سارے کا سارا شاہ ولی اللہ کے اثر کا نتیجہ تھا اور شاہ صاحب اپنے خطوط میں نجیب الدولہ کو جو ''مجاہدین فی سبیل اللہ کے قائد'' کے لقب سے مخاطب کرتے ہیں، تو یہ بھی بے سبب نہیں تھا۔(125)

اس میں شک نہیں کہ مرہٹوں کو معرکہ پانی پت (جنوری 1761ء) میں شکست ہوئی اور شاہ ولی اللہ نے نجیب الدولہ کو اسی سرگرمی کے ساتھ جاٹوں اور سکھوں سے نمٹنے کی نصیحت کی۔(126) لیکن ابدالی اور نجیب الدولہ کی کوششیں اور شاہ ولی اللہ کی دعائیں لب بمرگ سلطنت کی رگوں میں نیا خون ڈال نہ سکیں۔ شمالی ہند میں پانی پت کے اس فیصلہ کن واقعہ سے چار سال پہلے برطانیہ فریب اور سازش کے ذریعہ بنگال کے نوجوان اور نا تجربہ کار حاکم(127) کو پلاسی کے معرکہ جنگ میں شکست دے چکا تھا۔ (1171ھ۔1757ء) اور اس طرح ایک لحاظ سے اس نے ہندوستان میں مسلم اقتدار کی قسمت کا فیصلہ کر دیا تھا۔ نیا مغل شہنشاہ شاہ عالم، جسے ابدالی نے تخت پر بٹھایا تھا، اس تخت کے قابل نہ تھا۔ شاہ ولی اللہ کا 29 محرم 1176ھ میں اپنی کوشش کا کوئی واضح نتیجہ دیکھے بغیر انتقال ہو جاتا ہے۔

اپنی بلند پایہ کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے مقدمہ میں اس کتاب کے لکھنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں: ''وقت آ گیا ہے کہ اسلامی شریعت کا ہر پہلو اور اسلام کی ہر تعلیم دنیا کے سامنے معقول رنگ میں پیش ہو۔''(128) بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شاہ صاحب کا یہ بیان ان اثرات کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو ان کے نزدیک اس زمانے میں سرزمین ہندوستان میں یورپیوں کی موجودگی کی وجہ سے شاید شاہ صاحب پر پڑے ہوں۔

یہ صحیح ہے کہ یورپ کے عقلی انقلاب نے علم کے تقریباً تمام شعبوں۔ سائنس، قانون، تعلیمات، ٹیکنالوجی، مذہب اور فلسفہ۔ میں عقلیت اور روشن خیالی کو جنم دیا تھا۔ ڈیکارٹ (1596ء۔1650ء) کپلر (1571ء۔1630ء) نیوٹن (1642ء۔1727ء) والٹیر (1694ء۔1778ء) ہابس (1588ء۔1679ء) لاک (1632ء۔1704ء) سپنوزا (1632ء۔1677ء) اور روسو (1712ء۔1778ء) جیسے اہل علم نے یورپ کا عقلی ماحول بالکل تبدیل کر دیا تھا اور مذہب اور سیاسیات کے میدان میں نئے تصورات پیش کیے جا رہے تھے۔ ان پر تنقیدیں ہوتی تھیں اور ان کا دفاع کیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اٹھارویں صدی کے شروع کے سالوں میں یہ تصورات مشرق تک نہیں پہنچے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ سترہویں صدی کے اواخر اور اٹھارویں صدی کے شروع کے سالوں میں عثمانی ترک اور ایران کے شاہان صفوی پہلے کی طرح سیاسی لحاظ سے اتنے طاقت ور نہیں رہے تھے، لیکن وہ یورپ کے مقابلے میں ابھی اتنے کم تر نہ تھے کہ وہ اس کی طرف، جو وہ پیش کرتا، کچھ سیکھنے کے لئے دیکھنے کی ضرورت محسوس کرتے۔

یورپیوں کا مقامی آبادی کے ساتھ ملنا جلنا ایک لمبے عرصے تک تجارت تک محدود رہا۔ پرتگالیوں کا ایک مشن عیسائیت کی تبلیغ کے لئے اکبر کے دربار میں آیا تھا، لیکن اس کی کوششیں مختصر سی تھیں۔ بعد میں پرتگالیوں کی سمندر اور ساحلی علاقوں میں موجودگی صرف حاجیوں کی آزادانہ آمد و رفت کے لئے ایک پریشان کن عنصر کے طور پر ہی محسوس کی جاتی تھی۔ سر تھامس رو 1024ھ (1615ء) میں اور سر ولیم نورس 1113ھ (1701ء) میں ہندوستان آیا اور جان سر من 1126ھ (1714ء) میں مغل دربار میں پہنچا۔(129) لیکن ان سب کا آنا سیاسی اور تجارتی اغراض کے لئے تھا۔ 1188ھ

(1774ء) سے قبل یورپی اور ہندوستانیوں کے درمیان ثقافتی تعلقات کے کسی قسم کے آثار نہیں ملتے۔ اس ضمن میں شاید برنیر کی (جو فرانسیسی مفکر گیندی کا شاگرد تھا) واحد مثال ہے۔ یہ 1069ھ (1659ء) میں ہندوستان آیا اور دہلی میں پانچ چھ سال تک رہا۔ برنیر لکھتا ہے کہ اورنگ زیب کا ایک درباری نواب دانش مند خاں فلسفہ و حکمت سے بڑی دلچسپی رکھتا تھا۔ برنیر نے ڈیکارٹ اور گیندی کی کتابوں کے فارسی میں ترجمے کیے تھے، چنانچہ وہ اور نواب فلسفہ کے مسائل پر باہم بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ڈیکارٹ نے قرون وسطیٰ کے فلسفے کے مسائل کو ایک نیا نقطہ نظر دیا تھا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ اس معاملے میں امام غزالی کا بہت کچھ رہین منت ہے اور در حقیقت اس کا فکر مسلمانوں کے فکر کا ہی جس کی نمائندگی متکلمین کرتے تھے، ایک تسلسل تھا (131)۔ انیسویں صدی کے پہلے دہائے کے کافی عرصہ بعد نئے علوم کا انداز فکر ہندوستان میں محسوس کیا جانے لگا۔

مزید برآں شاہ ولی اللہ نے 1145ھ میں حج کی واپسی کے بعد دس سال کے اندر ''حجۃ اللہ البالغہ'' لکھی۔ یہ تصور میں نہیں آسکتا کہ اتنے شروع کے دور میں ان تک یورپی اثرات پہنچنے پائے ہوں۔ یقیناً شاہ صاحب سرزمین ہندوستان میں یورپیوں کی موجودگی سے آگاہ تھے۔ جیسا کہ احمد شاہ ابدالی کے نام ان کے ایک خط میں یورپیوں کی طرف اشارے سے ظاہر ہوتا ہے۔ (132) لیکن اس سے ہمارے لئے یہ دعویٰ کرنے کی وجہ جواز پیدا نہیں ہوتی کہ اس وقت ہندوستان کے باشندوں میں یورپی ثقافت کے اثرات کسی حد تک پھیل گئے تھے۔

حقیقی صورتحال سمجھنے کے لئے شاہ صاحب نے ''عقلی استدلال'' کے ضمن میں جو لفظ استعمال کیا ہے ہمیں اس کے صحیح مفہوم کو متعین کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ شاہ صاحب نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں اس کے لئے جو خاص لفظ استعمال کیا ہے وہ ''برہان'' ہے جس کے معنی ایک چیز کی عقلی بنیاد کے ہیں۔ شاہ صاحب کی دوسری کتاب تفہیمات (جلد اول نمبر 3) کے حوالے سے ہم بآسانی اس لفظ ''برہان'' کے مفہوم کو سمجھ سکتے ہیں۔ شاہ صاحب یہاں اپنے آپ کو وصی سے موسوم کرتے ہیں۔ جس کی تعریف وہ یوں کرتے ہیں کہ وہ شخص جو شریعت وغیرہ کے قوانین کے حقیقی اسرار کو سمجھنے کی استعداد رکھتا ہے اور جو مجدد اور ولی کی طرح انبیاء کا وارث ہوتا ہے اور قوانین الٰہی کی ایسی زبان اور ایسے انداز میں وضاحت کر سکتا ہے، جو اس کے زمانے میں مروج ہوتے ہیں۔ جس زمانے میں لوگ فصاحت و بلاغت سے شغف رکھتے ہیں، وصی، مجدد اور ولی فصیح و بلیغ عبارت میں ان سے خطاب کرتا ہے اور جب لوگوں کی توجہ عقلی استدلال کی طرف ہوتی ہے، تو وہ شریعت کے قوانین کی شرح و وضاحت معقولات سے کرے گا۔

اس اصول کی تشریح کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ کہتے ہیں کہ وصی (یعنی شاہ صاحب) اس زمانے میں پیدا ہوئے جس کی تین امتیازی خصوصیات ہیں۔ پہلی خصوصیت ہے برہان۔ یہ یونانی فلسفہ کے اثر اور قدما کے ہاں علم کلام کے میدان میں اس پر ضرورت سے زیادہ جو توجہ دی گئی ہے، اس کی وجہ سے ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ عقائد کے متعلق جو بھی بحثیں ہیں ان میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک استدلالات عقلی سرایت کیے ہوئے ہیں۔ (133) اس سے قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ جب شاہ ولی اللہ مذہب کے مطالعہ کے سلسلے میں عقلی استدلال سے کام لینے کی طرف اشارہ کرتے ہیں، تو اس سے ان کی مراد یورپی فکر میں عقلی استدلال کا جو مفہوم ہے، وہ نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ مفہوم ہوتا ہے جو علم کلام کے بارے میں

قدماء اور ان کے بعد کے مصنفین کے ہاں مروج تھا۔

اس سلسلے کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اِس زمانے میں وجدان پر زور دیا جاتا ہے۔ چنانچہ مشرق اور مغرب کے لوگوں نے صوفیہ کو اپنا مرشد و رہنما قبول کر رکھا ہے اور وہ ان کے اقوال و افعال کو ہر چیز یہاں تک کہ قرآن و حدیث پر بھی ترجیح دیتے ہیں۔ جو شخص کہ صوفیہ کی زبان میں بات نہیں کرتا، اسے سرے سے نیک آدمی ہی نہیں سمجھا جاتا۔ مسجد میں وعظ کرنے والا انہی کے تصورات کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو مسائل انہوں نے چھیڑ رکھے ہیں، ایک عالم انہی پر غور و فکر کرتا ہے، یہاں تک کہ دولت مندوں کی محفلوں میں بھی ان باطنی مشاہدات پر گفتگوئیں ہوتی ہیں جنہیں ان صوفیہ نے مخصوص زبان و اصطلاحات میں جو وہ استعمال کرتے ہیں، پیش کیا ہے۔

اس سلسلے کی تیسری امتیازی خصوصیت علوم نقلیہ سے شغف ہے۔ لیکن اس زمانے میں لوگ عجیب و غریب آزاد روی کا اظہار کرتے اور اپنی آراء پر چلتے ہیں۔ اگرچہ وہ علم میں ماہر نہیں اور مسائل دینیہ سے بالکل ناواقف ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ شریعت کے قوانین کے گہرے مفہوم کو جاننے پر تلے ہوئے ہیں اور قیاس آرائیوں کی طرف اپنے میلان کا اظہار کرتے ہیں۔ ہر شخص نے اپنی ایک رائے قائم کر لی ہے اور وہ اس پر چلتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر جگہ تنازعات اور اختلافات نے سر اٹھا رکھا ہے اور ان میں مفاہمت کی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔

شاہ صاحب کا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے انہیں ایک ایسا طریقہ عطا ہوا ہے جس سے وہ شریعت کے قوانین کی اس طرح تشریح کر سکتے ہیں کہ یہ نزاع دور ہو جائیں۔ شاہ صاحب کا یہ طریقہ مشتمل ہے۔ (1) عقل و برہان (2) وجدان (3) نقل پر۔ وہ اپنے زمانے کے مروجہ علوم پر پوری طرح حاوی تھے۔ اس لئے وہ اپنے خیالات ایسی زبان میں پیش کر سکے جس سے لوگ متاثر ہوئے۔ (134)

حواشی

1- ان معلومات کا ماخذ تمام تر شاہ ولی اللہ کی تصنیف ''انفاس العارفین'' مطبع مجتبائی دہلی 1335ھ ہے۔ یہ کتاب سات مختصر رسالوں پر مشتمل ہے۔ پہلے دو اجزاء میں آپ کے والد اور چچا کے حالات اور مشاغل کا ذکر ہے۔ تیسرے جز میں دیگر اسلاف کا مختصر تذکرہ ہے۔ چوتھے جز میں ننھیال کا ذکر ہے۔ پانچویں جز میں اپنی والدہ کے خاندان کا اور آخری حصے میں حجاز کے اپنے اساتذہ کا تفصیلی تذکرہ ہے۔

حافظ رحیم بخش کی تصنیف ''حیات ولی'' (مطبعہ سلفیہ، لاہور 1955ء) کی معلومات کی بنیاد بھی تمام تر ''انفاس العارفین'' پر ہے۔ اگرچہ کچھ اور مآخذ سے بھی مصنف نے استفادہ کیا ہے۔

2- شاہ صاحب لکھتے ہیں (انفاس العارفین۔ ص 159) جو بھی اہم مسلمان شخصیت بیرون ہند سے ان قصبات میں وارد ہوتی اس سے قصبہ کی سیاسی اور شہری زندگی میں بحیثیت قاضی، محتسب یا مفتی کے اعزازی طور پر حصہ لینے کے لئے کہا جاتا۔

3- شاہ صاحب کا خیال ہے کہ غالباً ''عبدالقادر'' یا ''قوام الدین'' سے بدل کر یہ صورت بن گئی۔ (انفاس۔ ص 159)

-4　انفاس العارفین، صفحات 160-161

-5　ایضاً۔ صفحات 162-167

-6　راجی شاہ، شیخ حسام الدین مانک پوری کے مرید اور خلیفہ تھے اور مؤخر الذکر بنگال کے بزرگ شیخ نور قطب عالم (متوفی 813ھ) کے خلیفہ تھے۔ یہ قطب عالم ان شیخ قطب عالم سے الگ شخصیت ہیں جن کی پوتی شاہ ولی اللہ کی نانی بنیں۔

-7　حیات ولی (ص 303) میں یہ سن 1054ھ بتایا گیا ہے اور سن وفات 1131ھ بیان کیا گیا (کیونکہ عمر 77 برس لکھی گئی ہے)

-8　ایضاً۔ ص 320

-9　ان میں سے بعض نکات پر تفصیلی بحث ''انفاس العارفین'' کے صفحات 99 اور مابعد میں موجود ہے۔

-10　لکھتے ہیں ''بعض اوقات محض لا الہ الا اللہ کے ورد سے یا وجد میں آدمی وحدت الشہود کی حالت میں پہنچ جاتا ہے لیکن اس کا اعتبار نہیں۔'' (انفاس العارفین۔ ص 109)

-11　انفاس العارفین۔ ص 98
ایک اور جگہ (ص 101) لکھتے ہیں کہ شیخ ابو رضا نے ایک مرتبہ ایک منتخب حلقے میں عقیدہ وحدت الوجود پر روشنی ڈالی اور تائید میں متکلمین کے طرز پر استدلال کیا اور احادیث پیش کیں لیکن ساری بحث میں ''وحدت الوجود'' کی متنازعہ فی اصطلاح استعمال نہیں کی۔ چنانچہ ہر شخص نے آپ سے اتفاق کیا۔

-12　ایضاً ص۔ 15

-13　ایضاً۔ ص 14۔ مرزا محمد زاہد شاہجہانی عہد کے بہت بڑے عالم تھے۔ انہوں نے فلسفہ اور کلام کی بہت سی امہات الکتب کی شرح لکھیں۔ تصوف میں آپ کا مسلک نقشبندی تھا۔ آپ کو ملا محمد فاضل بدخشانی اور ملا صادق صلوائی کابلی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ فلسفہ کی تعلیم آپ نے ملا مرزا جان شیرازی سے پائی تھی۔ حکمت میں آپ کے استاد ملا محمد یوسف تھے جو اس فن کے امام تھے (ایضاً ص 33)

-14　ایضاً۔ ص 32

-15　بیان کیا جاتا ہے کہ نقشبندی صوفی خواجہ ہاشم، بخارا سے آئے تو اسی کوچے میں رہنے لگے جہاں شاہ عبدالرحیم رہتے تھے۔ وہ شاہ صاحب سے بہت شفقت سے پیش آتے تھے۔ آپ نے شاہ صاحب کو ایک دعا بھی یاد کرانے کی کوشش کی، جو ان کے نزدیک بڑی مؤثر تھی۔ شاہ عبدالرحیم کی عمر اس وقت نو یا دس سال کی تھی۔ (ایضاً ص 4)

-16　خواجہ باقی باللہ (متوفی 1012ھ) کے چھوٹے صاحبزادے خواجہ خورد۔ والد کی وفات پر آپ نے تصوف وسلوک کی تربیت کا آغاز شیخ احمد سرہندی سے کیا، جن سے آپ کو اجازت حاصل ہوئی۔ بعد میں آپ خواجہ باقی باللہ کے مریدین خواجہ حسام الدین اور شیخ اللہ داد سے وابستہ ہو گئے۔ (ایضاً۔ ص 18) خواجہ حسام الدین (متوفی 1043ھ) خواجہ باقی باللہ کی وفات کے بعد شیخ احمد سرہندی کے حلقہ میں داخل ہو گئے تھے۔ (دیکھئے رود کوثر، مصنفہ شیخ محمد اکرام ص۔ 205)

-17　سید عبداللہ اپنے زمانے میں قرآن کے بہترین قاریوں میں شمار ہوتے تھے۔ آپ نے فن قرأت پنجاب کے ایک صوفی بزرگ سے سیکھا تھا۔

-18　شاہ ولی اللہ کی اس تعبیر سے اتفاق ذرا مشکل ہے۔ خواجہ خورد اور خواجہ حسام الدین دونوں شیخ احمد سرہندی کے مرید تھے۔ حافظ عبداللہ شیخ آدم بنوری کے مرید تھے جو کہ شیخ احمد سرہندی کے اور ان کے خلیفہ تھے۔ اصل وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ شیخ عبدالرحیم کا

رجحان عقیدہ وحدت الوجود کی طرف تھا۔ شیخ احمد سرہندی اور ان کے مرید نے اس عقیدے پر تنقید کی تو قدرتی طور پر شیخ عبدالرحیم نے دوسرے مریدوں کو ترجیح دی۔

-19 انفاس العارفین۔ ص77

-20 مایکون من بخویٰ لثله الاھورابعھم ولا خمسة الاھوساد سبھم واد اونیٰ من ذلك ولا اكثوالا ھو معھم......(58-7)

-21 قل کل من عندالله(4-78)ومابکم من نعمته فمن الله(16-53)

-22 قل کل مالك الاوجھه(28-88)ھوالاول والاخرو والظاھرہ والباطن (57-3)۔ اس بحث کی تفصیل ''انفاس رحیمیہ'' (مطبع احمدیہ، دہلی) ص8-10 میں ملاحظہ ہو۔

-23 انفاس العارفین۔ صفحات 82-83

-24 شبلی، سیرت النعمان (مطبوعہ ثناء اللہ، لاہور) صفحات 112-113

-25 انفاس العارفین۔ ص70

-26 ایضاً۔ ص79-70

-27 ایضاً۔ ص69

آپ نے مشہور چشتی صوفیہ کا یہ قول نقل کیا ''جس کا نام سلاطین کے دربار میں لکھا گیا اس کا نام دربار خداوندی سے خارج کردیا گیا۔''

-28 ایضاً۔ ص24

-29 شاہ ولی اللہ نے شیخ عبدالرحیم کے اقوال ''انفاس العارفین'' میں صفحات 85-86 پر درج کیے ہیں۔

-30 ایضاً۔ ص85

-31 ایضاً۔ ص54

-32 ایضاً۔ ص55

-33 آپ کا دوسرا نام قطب الدین احمد تھا۔ یہ نام ان صوفی بزرگ کے نام پر رکھا گیا تھا۔ جنہوں نے شاہ عبدالرحیم کو ایک بیٹے کی بشارت دی تھی اور کہا تھا کہ میرے نام پر اس کا نام رکھنا۔ آپ کا تاریخی نام ''عظیم الدین'' تھا۔ (ایضاً۔ ص44)

-34 ایضاً۔ ص64

-35 آپ بیان کرتے ہیں کہ میرے والد اکثر کہا کرتے تھے کہ میری تو خواہش ہے کہ اپنا سارا علم تمہارے دل میں اتاردوں۔ شاید یہی وجہ تھی، جیسا کہ شاہ صاحب نے اشارتاً کہا ہے کہ بغیر کسی دقت کے علوم متداولہ کی تکمیل کرلی۔

-36 شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنی شادی کی تعجیل کی وجہ بھی بیان کی ہے۔ آپ کے والد کو القا ہوا تھا اس لئے انہوں نے اصرار کیا کہ جتنی جلد ممکن ہو شادی ہوجائے۔ چنانچہ آپ کی شادی کے فوراً بعد آپ کے بہت سے اقربا جن میں آپ کے چچا ابورضا محمد بھی تھے، وفات پاگئے، چند سال بعد آپ کے والد کا بھی انتقال ہوگیا (انفاس العارفین۔ ص202)

-37 ایضاً۔ ص203

-38 ایضاً۔ صفحات 203-204

-39 ایضاً۔ص87

-40 حفیظ ملک، برصغیر ہندو پاکستان میں مسلم قومیت (انگریزی) ص104

-41 کیمبرج تاریخ ہند (انگریزی) جلد چہارم ص322

-42 شیخ محمد اکرام "مسلم تہذیب کی تاریخ" (انگریزی) صفحات 328-329

-43 کیمبرج تاریخ ہند۔جلد چہارم،ص329

-44 شاہ عباس ثانی نے دکن کے حکمرانوں کو اورنگ زیب کے خلاف بغاوت پر اکسایا تھا۔دیکھئے عزیز احمد "ہندوستانی ماحول میں اسلامی ثقافت کا مطالعہ" (انگریزی) ص43

-45 بہادر شاہ (عہد حکومت 1119ھ۔1125ھ) نے فرمان جاری کیا کہ جمعہ کے خطبات میں حضرت علیؓ کے نام کے ساتھ "وصی" کا لفظ بڑھایا جائے۔یعنی جمہور سنّی عقیدہ کی تردید کی گئی جس کی رو سے خلافت حضرت ابوبکرؓ کا جائز حق ہے۔یہ واقعہ اس وقت ہوا جب بہادر شاہ لاہور میں سکھوں کے خلاف لڑ رہا تھا۔بہادر شاہ کے اس غیر دانشمندانہ اقدام پر لاہور میں اشتعال پیدا ہو گیا اور لوگ بغاوت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے جسے بڑی سختی سے فرو کر دیا گیا۔
شیخ محمد اکرام "مسلم تہذیب کی تاریخ" انگریزی۔ص333
"تحریک آزادی کی تاریخ" انگریزی جلد اول،ص85

-46 حفیظ ملک، مرجع سابق۔ص104

-47 یوسف حسین "نظام اول" (انگریزی) ص128

-48 خلیق احمد نظامی "شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات" صفحات 94-95

-49 شاہ ولی اللہ نے ابدالی کے نام اپنے مشہور مکتوب میں ان صوبوں کی اہمیت پر کافی روشنی ڈالی ہے۔بعد کے کوتاہ اندیش مغل تاجداروں نے ان صوبوں کی ولایت غیر مسلموں کو دے دی۔(ایضاً۔ص99)

-50 محمد خان بنگش کے عہد ولایت میں راجہ جے سنگھ نے کسی نندلال چودھری کو مندرجہ ذیل خط لکھا۔"تم ہزار ہا ہزار ستائشوں کے قابل ہو کہ تم نے اور تمہارے سرداروں نے میرے ایک ہی اشارے پر مغلوں کو مالوہ سے نکال کر ہمارے مذہب کی حفاظت کی...."
یوسف حسین، مرجع سابق۔صفحات 168-169

-51 آپ کے اس سفر میں آپ کے دوست اور رفیق کار محمد عاشق پھلتی بھی شریک تھے۔دیکھئے شاہ عبدالعزیز محدث "عجالۃ النافعہ" (فارسی) ص22 اور فیوض الحرمین اردو ترجمہ پروفیسر سرور۔ص130

-52 مقدمہ تفسیر فتح الرحمٰن۔حیات ولی (ص418، حاشیہ صفحہ ہذا و مابعد) کے مصنف رحیم بخش نے جو کہانی بیان کی ہے کہ قرآن کے فارسی ترجمہ کی وجہ سے اس زمانے کے رجعت پسند ملا آپ کے مخالف ہو گئے اور آپ کے قتل کے درپے ہو گئے، سراسر مصنوعی معلوم ہوتی ہے۔آپ کا سفر حجاز بھی، جیسا کہ کہانی میں بیان کیا گیا ہے۔اس طوفان افترا و بہتان سے فرار کے لئے نہیں تھا۔درحقیقت آپ کا حج کا سفر روحانی سلوک و تربیت کا حصہ تھا۔قرآن کا ترجمہ، جیسا کہ مصنف نے خود بیان کیا ہے، حجاز سے واپسی کے پانچ سال بعد مکمل ہوا۔

-53 رود کوثر۔ص90

-54 فیوض الحرمین۔ص131 میں تحریر فرماتے ہیں کہ کعبہ خدا کی تدلیات کا ایک ظہور ہے لہٰذا تقرب الی اللہ کا ایک وسیلہ ہے۔حج بیت

اللہ تقرب الی اللہ کے سفر کی آخری منزل ہے۔

-55 مکہ کے اس دور کی حالت کے لئے دیکھئے جیرالڈ دوگاری، ''مکہ کے حکمران'' (انگریزی) (لندن 1951ء) صفحات 165 ومابعد۔ عثمانی ترکوں اور شاہان صفویہ کی جنگوں کا اثر حجاز کے لوگوں پر بھی بہت گہرا پڑا تھا۔ دیکھئے ایضاً۔ صفحات 166-167

-56 انفاس العارفین۔ صفحات 191-192

-57 آپ شیخ الحدیث تھے اور آپ کو شیخ نعمت اللہ قادری اور دوسرے صوفیا سے شرف ملاقات حاصل تھا۔ آپ فقہی مسلک کے اعتبار سے حنفی تھے لیکن عملاً اپنی اجتہادی رائے بھی رکھتے تھے۔ سفر کے دوران ہمیشہ ظہر اور عصر اور مغرب اور عشاء کی نمازیں جمع فرماتے تھے۔ اسی طرح امام کے پیچھے فاتحہ پڑھتے تھے حالانکہ دونوں باتیں حنفی فقہ میں ممنوع ہیں (ایضاً۔ ص 193-95)

-58 آپ علوم باطنی وظاہری دونوں کے فاضل تھے۔ علوم حدیث کے جید عالم تھے۔ بخاری اور موطا آپ کا مخصوص موضوع تھے۔ سلاسل طریقت میں نقشبندی طریق کو ترجیح دیتے تھے۔ (ایضاً۔ صفحات 195-97)

-59 آپ نے ساری عمر کتب حدیث خصوصاً امام احمد کی کتب کی حفاظت کے لئے وقف کردی۔ آپ نے حفاظت حدیث کے قدیم طریقے یعنی حفظ یاد کرنے اور اسے شاگردوں کو منتقل کرنے کا احیاء کیا۔

-60 شیخ ابوطاہر کی اسی بصیرت نے شاہ ولی اللہ کو بہت متاثر کیا۔ شاہ صاحب کی پوری زندگی کا کارنامہ اسی بنیادی حقیقت کا عملی مظہر نظر آتا ہے۔

-61 ''انتباہ'' صفحات 16، 29، 101، 119، 126، 134۔137
مزید دیکھئے انفاس العارفین۔ ص 204
ان تمام سلسلوں میں شیخ ابوطاہر کو بیعت وتلقین کی اجازت اپنے والد شیخ ابراہیم سے ملی تھی۔ ان کو شیخ احمد قشاشی (متوفی 1071ھ) اور ان کو شیخ احمد شناوی (متوفی 1028ھ) سے حاصل تھی۔ دونوں حضرات علوم حدیث کے فاضل اور بہت بڑے صوفی تھے اور دونوں ابن عربی کے نظریہ وحدت الوجود کے قائل تھے لیکن اس طرح کہ شریعت کی مخالفت نہ ہونے پائے۔ (انفاس۔ ص 185)

-62 انفاس العارفین، ص 200، ''حیات ولی'' صفحات 513-517 اس میں شاہ ولی اللہ کا شیخ ابراہیم مدنی کے نام مکتوب کا مکمل متن درج ہے۔ اس کے علاوہ مکتوبات میں بھی انہی جذبات کا اظہار ملتا ہے۔ دیکھئے ''حیات ولی'' صفحات 518-26

-63 یہ تعلیم حدیث کی چند صورتیں ہیں۔ ''سماع'' میں شاگرد کسی محدث کے درس میں حاضر ہوتا ہے۔ یہ درس روایت حدیث کی صورت میں بھی ہوسکتا ہے اور املا کی صورت میں بھی۔ طریقہ قرأت میں طالب علم محدث کے سامنے احادیث پڑھتا جاتا ہے جن کی روایت یا املا اس محدث نے کی ہوتی ہے یا یہی روایات کوئی طالب علم استاد کے سامنے پڑھے اور یہ سنے۔ ''الاجازۃ'' اجازت کے حصول کو کہتے ہیں۔ جب کوئی محدث اپنے مجموعے یا املا کی روایت کی کسی کو اجازت دے۔
دیکھئے محمد زبیر صدیقی، ''ادب حدیث'' (انگریزی) (کلکتہ یونیورسٹی، 1961ء) صفحہ 158

-64 انفاس العارفین۔ ص 191

-65 شمس الدین محمد بن البابلی حافظ حدیث تھے۔ موطا اور بخاری میں انہیں متصل اسناد سے اجازت حاصل تھی۔ اس طرح دوسری کتب حدیث میں بھی درجہ فضیلت حاصل تھا۔ (انفاس العارفین۔ صفحات 189-190)

-66 حیات ولی۔ صفحات 328-529

-67 انفاس العارفین۔ صفحات 201-210

-68 فیوض الحرمین۔ صفحات 99، 115

-70 یہ ترجمہ 1150ھ میں، حج بیت اللہ سے واپسی کے تقریباً پانچ سال بعد، پایہ تکمیل کو پہنچا۔ دیکھئے فارسی ترجمہ قرآن کا مقدمہ۔

-71 اپنی دوسری کتاب "الدر الثمین" (عربی) میں، جس میں حضور صلعم سے مبشرات درج کیے ہیں، یہ جملہ اس سے ذرا مختلف انداز میں اس طرح مندرج ہے۔
"حسین کو ٹھیک کر لینے دو کیونکہ کوئی شخص حسین سے زیادہ خوبصورتی سے اسے ٹھیک نہیں کر سکتا۔" دیکھئے رسالہ "الفرقان" (شاہ ولی اللہ نمبر) 1359ھ۔ ص 214

-72 فیوض الحرمین۔ صفحات 99-100
مزید دیکھئے "ملفوظات شاہ عبدالعزیز" ص 158

-73 "الفرقان" محولہ بالا۔ ص 218
"شرح صدر" قرآنی اصطلاح ہے۔ (126:4، 25:20، 1:94)
اس سے مراد ہے کہ (1) حکمت کے ذریعہ دل کی تنویر تا کہ دل میں الہامات ربانی کو قبول کرنے کی استعداد پیدا ہو جائے۔ (2) زندگی میں آئندہ جو مخالفت اور آلام پیش آنے والی ہیں ان کو صبر و استقلال سے برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا ہو۔
دیکھئے رقم 2761 (ص 1187) محمد علی۔ انگریزی ترجمہ قرآن کریم۔ لاہور 1951ء
بارہویں مشبرہ میں شاہ ولی اللہ خود لکھتے ہیں کہ ان کو فقہ اور اصول کی بنیادی روح کی استعدادات کے مطابق حالات اور عوام الناس کی تخریج، تفہیم اور توضیح کا ملکہ عطا ہوا ہے۔ (فیوض الحرمین۔ ص 149)

-74 ملفوظات۔ صفحات 58-59

-75 ایضاً۔ "معارف" سے مراد وہ علم ہے جو کشف سے حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے وضاحت کی ہے کہ شاہ صاحب کو کشف اور مراقبہ میں جو مشاہدہ ہوتا تھا، اسے من و عن لکھ لیتے تھے۔ ایضاً ص 100

-77 یہ تقسیم اکثر مشاہدات کے بارے میں قطعی ہے، جو کسی نہ کسی مقام کی طرف معین اشارے پر مبنی ہے۔ لیکن بعض دوسرے مشاہدات کے متعلق یہ ظن ہے۔

-78 شاہ صاحب کی کتابوں کی تصنیف کی تاریخی ترتیب، داخلی یا خارجی شہادتوں کی بنا پر بہت مشکل ہے۔ ان کی کتابوں میں کہیں کہیں اس سے پہلے لکھی ہوئی کتابوں کے حوالے مل جاتے ہیں مثلاً "فیوض الحرمین" میں صرف ایک کتاب "القول الجمیل" (ص 238) کا ذکر ہے۔ اغلباً قرآن کا فارسی ترجمہ جو حج بیت اللہ سے واپسی کے پانچ سال بعد 1150ھ میں پایہ تکمیل کو پہنچا، ان کتابوں سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔

-79 فیوض الحرمین، ص 226

-80 دیکھئے "کلمات طیبات" (مطبع مجتبائی، دہلی 1309ھ) صفحات 16 و مابعد۔ اس میں مرزا مظہر جانجاناں اور دوسروں کے وہ خطوط ہیں جن میں وحدت الشہود کی عقیدے کی وضاحت کی گئی ہے۔

-81 دیکھیے انفاس العارفین، صفحات 3-157

-82 فیوض الحرمین، صفحات 53-57

-83 ایضاً۔صفحات 175-176-220-337

-84 ایضاً۔صفحات 123-125

-85 ایضاً۔صفحات 124-126

یہ مکتب فکر بعد میں اہلحدیث کہلایا۔

-86 ایضاً۔ص 125

-87 ایضاً۔صفحات 179-180

-88 ایضاً۔صفحات 181-184

-89 ایضاً۔ص 128

-90 ایضاً۔ص 221

-91 ایضاً۔ص 181

-92 ایضاً۔صفحات 81-82

-93 بعض اصحاب نے اکثر یہ دعویٰ کیا ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے ''ایسے خطوط عمل متعین کیے تھے جن سے مذہبی تفرقات کے دور کرنے میں بہت مدد مل سکتی تھی اور جس سے ایک مشترک اور متحد قومیت کی تشکیل کے امکانات پیدا ہوئے تھے۔'' دیکھئے شیخ محمد اکرام کا مقالہ ''شاہ ولی اللہ'' مشمول ''تحریک آزادی کی ایک تحریک'' (انگریزی) جلد اول 499۔ یہ رائے شاہ ولی اللہ کی تصنیفات کے سطحی مطالعہ پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ (ازالتہ الخفا' قرۃ العینین اور کلمات طیبات میں شاہ صاحب کے مکتوبات سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ ولی اللہ شیعوں کو زندیق، نوابط، اور متبدع کہتے ہیں۔ یعنی بے دین اور بدعتی۔ یہی کچھ شیخ احمد سرہندی فرماتے تھے۔ شاہ ولی اللہ نے اس موضوع پر جو کتابیں لکھی ہیں ان میں تمام تر سنّی موقف پیش نظر رکھا ہے جیسا کہ اس سے قبل اشعری اور ابن تیمیہ نے کیا تھا۔ ان کی تصنیفات میں کہیں اس کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا کہ انہوں نے شیعہ اور سنّی کے مابین خلیج کو پُر کرنے کی کوشش کی ہو یا اشاعرہ اور معتزلہ میں تطبیق کی کوشش کی ہو جیسا کہ فاضل محقق شیخ محمد اکرام (رود کوثر ص 516) نے لکھا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ شاہ صاحب کی تصنیفات سے شیعہ سنّی مناظرہ میں اور شدت پیدا ہوئی اور ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز مجبور ہوئے اور انہوں نے ایک اور جامع تر کتاب ''تحفہ اثناء عشریہ'' لکھ کر شاہ صاحب کے مؤقف کی مدافعت کی۔ کیونکہ ان مناظروں میں اب مزید شدت پیدا ہو چکی تھی۔

دیکھئے رود کوثر۔صفحات 567-574۔

[شیعہ سنّی نزاع کے بارے میں شاہ ولی اللہ کا جو مسلک ہے، مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے اس کی ان الفاظ میں وضاحت کی ہے۔

ہندوستان میں پہلے تورانی سنّی، پھر ایرانی شیعہ اور آخر میں متشدد سنّی روہیلوں کی شکل میں داخل ہوئے۔ ان تینوں عناصر کے امتزاج سے تسنن و تشیع کے سلسلے میں عجیب افراط و تفریط کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ شاہ صاحب نے اس سلسلے میں بڑا کام کیا۔ بڑی محنت سے ہزار ہا ہزار صفحات کو پڑھ کر آپ نے چاروں خلفاء کے واقعی حالات ''ازالتہ الخفا'' میں ایسے دل نشین طریقے سے مرتب فرمائے کہ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد اگر شیعوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے تو اسی کے ساتھ ان غالی سنیوں کی شدت و تیزی میں بھی کمی پیدا ہو جاتی ہے جو محض اس لئے کہ شاہ عبدالعزیز نے تنہا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مناقب کیوں بیان کیے۔ یا شاہ ولی اللہ نے شیعوں کی

تکفیر میں فقہائے حنفیہ کے اختلاف کو کیوں بیان کیا، ان پر بھی شیعیت کا فتویٰ صادر کر دیتے ہیں اور اس کے لئے بجائے مناظرے اور مجادلے کے شاہ صاحب نے ایک ایسی راہ دریافت فرمائی جس سے بہت سے فتنوں کا سد باب ہوگیا۔]

-94 فیوض الحرمین (ص 183 و مابعد) میں اور بعد میں ''قرۃ العینین'' میں شاہ صاحب حضرت علی کی شیخین پر فضیلت کے عقیدے کو صوفیا سے منسوب کرتے ہیں۔ دونوں کتابوں میں انہوں نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ راہ سلوک کے اختیار کرنے سے ایک شخص کو دوسرے پر فضیلت حاصل ہو تو یہ محض جزئی ہوگی۔ حقیقی فضیلت انبیاء کے طریقے کو اختیار کرنے میں ہے، جس کے لحاظ سے ابوبکرؓ اور عمرؓ یقیناً حضرت علیؓ سے افضل ہیں۔

-95 فیوض الحرمین، صفحات 183-228

-96 ایضاً۔ ص 220

-97 ایضاً۔ صفحات 124-125

-98 ایضاً۔ صفحات 237-239

-99 ایضاً۔ ص 234

-100 ایضاً۔ صفحات 127، 151، 160، 229

بعض اوقات لفظ قطب تنہا استعمال ہوا ہے (مثلاً صفحات 151، 160) اور اکثر مقامات پر اس کی صفت شاد یہ بیان کی گئی ہے یعنی قطب کا کام لوگوں کو صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرنا ہے۔ (دیکھئے صفحات 127، 229)

اس طرح آپ نے قطب کے تصور کو قطب کے عام تصور سے علیحدہ کر دیا۔ شیخ محمد اکرام صاحب لکھتے ہیں ''آپ کی دعوت میں کسی قسم کا کوئی ذاتی دعویٰ یا اپنی ذات کے لئے غرض نہیں۔ ہندوستان میں اسلام کے بڑے بڑے اور پُر خلوص علماء کے ساتھ بھی یہ بہت بڑی دقت پیش آتی رہی ہے کہ جب وہ احیائے اسلام کے عزم سے اٹھتے تو ان کے اپنے دعاوی ان کی تعلیمات کا حصہ بن جاتے۔ یہ شاہ ولی اللہ کی خصوصیت ہے کہ انہوں نے ان خواہشات پر قابو پایا (تحریک آزادی کی ایک تاریخ بحولہ بالا۔ جلد اول ص 495 نیز ''رود کوثر'' ص 492) مندرجہ بالا تفصیلات سے واضح ہو گیا ہوگا کہ شیخ اکرام صاحب کی یہ رائے کلیتاً غلط ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے نہ صرف اس مقام پر اپنے ''مجدد'' ہونے کا بلکہ دوسری تصنیفات میں اپنے قائم الحکماء (خیر کثیر، ص 129) اور قائم الزماں (فیوض الحرمین۔ ص 297) ہونے کا دعویٰ بھی کیا۔ [یہ دعوے بے شک ہیں اور متصوفانہ ادب میں یہ ایک عام چیز ہے، لیکن بعض دوسرے بزرگوں کی طرح شاہ صاحب کو مجدد بنا کر ان کے نام سے کوئی تحریک اور جماعت قائم نہیں ہوئی۔ ان کا تمام زور فکری تجدید پر ہے ---- مدیر]

-101 اس خواب میں اجمیر مرکز اسلامی کی علامت و رمز کے طور پر استعمال ہوا ہے کیونکہ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ خواجہ معین الدین چشتیؒ کی تبلیغی سرگرمیوں کا آغاز اجمیر سے ہوا اور یہیں سے یہ تحریک برصغیر کے دوسرے حصوں میں پھیلی۔

-102 فیوض الحرمین۔ صفحات 297-299

-103 عام طور پر اس خواب کی تعبیر محض پانی پت کی جنگ سے کی جاتی ہے۔ لیکن اگر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ خواب اپنی تعبیر کے لحاظ سے عالمگیر ہے کیونکہ مرہٹوں کی شکست سے ملک میں امن و امان قائم نہیں ہوا بلکہ اس کے نتیجے میں ہندوستان میں اور دیگر اسلامی دنیا میں برطانوی راج قائم ہوا۔ اور قدرتی طور پر ہر جگہ مسلمان ظلم و ستم کا نشانہ بنے۔ اور ان کا مذہب و شریعت دب کر رہ گیا۔ ہر جگہ مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف لڑے اور یہ صورت آج تک چلی آتی ہے۔

شاہ ولی اللہ کی ہمہ گیر اور کئی انقلاب کی تجویز علی حالہ قائم ہے تاآنکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ ارشاد 'لیظهره علی الدین کله'' پورا نہ ہو۔ القرآن 33:9

-104 اس زمانے کی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دربار کے دونوں فریق، تورانی، جن کی سیادت نظام الملک کر رہا تھا اور ہندوستانی، جن کا سردار خان دوراں تھا۔ ہندوستان میں نادر شاہ کو دعوت دینے کا الزام ایک دوسرے پر دھرتے تھے۔ چند دیگر تاریخوں میں اس کا ذمہ دار سعادت خاں اودھ کے پہلے نواب، کو ٹھہرایا گیا ہے۔

دیکھئے، اشیر بادی لال سری وستوا، ''اودھ کے پہلے دو نواب'' (انگریزی) صفحات 61-62

-105 سیاسی مکتوبات۔ صفحات 121-122، 149

-106 یوسف حسین، مرجع سابق 198

-107 سیاسی مکتوبات۔ محولہ بالا صفحات 52، 156

-108 شاہ ولی اللہ نظام الملک کے متعلق بڑی اچھی رائے رکھتے ہیں۔ انہوں نے نظام الملک کے نام ایک خط لکھا۔ ''ہمیں آپ سے بہت توقعات ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ کی جدوجہد سے ظلم وستم ختم ہو جائے اور نیکی اور عدل کا دور دورہ ہو، برائی کا قلع قمع ہو جائے کیونکہ آپ فطری طور پر مستعد، سنجیدہ اور نیکی کی طرف مائل نظر آتے ہیں''۔ (سیاسی مکتوبات۔ ص 147)

-109 یہ بات اب پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ صفدر جنگ نے جب سیاست میں قدم رکھا اس کی شدید خواہش تھی کہ سلطنت کے بکھرتے ہوئے شیرازے کو روکا جائے۔ ملاحظہ ہو سری وستوا، مرجع سابق، ص 131۔ اور تحریک آزادی کی ایک تاریخ، جلد اول، ص 215

-110 جب صفدر جنگ وعدے کے مطابق مرہٹوں کو رقم نہ دے سکا تو انہوں نے دہلی اور اس کے گردونواح میں لوٹ مار مچادی۔ ''ہر صبح وہ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں اپنے پڑاؤ سے نکلتے اور جہاں تک پہنچ پاتے لوٹ مار کرتے اور شام کو لوٹ کے مال سے لدے پھندے واپس آتے۔ دہلی سے چالیس میل تک کے گردونواح کے سارے دیہات اس لوٹ کا نشانہ بنے۔ دارالخلافہ بھی پوری طرح ان دکنی ڈاکوؤں کے رحم وکرم پر تھا۔''

(سری وستوا، مرجع سابق ص 203)

-111 احمد شاہ ولی اللہ کا بے حد احترام کرتا تھا۔ اپنے دوست اور شاگرد محمد عاشق کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ احمد شاہ اور اس کی والدہ دونوں نماز جمعہ کے بعد ان کے پاس مسجد میں آئے۔ تقریباً چار گھنٹے ٹھہرے اور وہیں کھانا کھایا۔ اور بعض بہبود عامہ کے امور کے سلسلے میں شاہ صاحب سے مشورے لئے (سیاسی مکتوبات۔ صفحات 126-128)

شہنشاہ اور صفدر جنگ میں کشیدگی کی وجہ غالباً شاہ ولی اللہ کے مشورے تھے کیونکہ وہ صفدر جنگ کی پالیسی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ صفدر جنگ افغانوں کے خلاف تھا اور غیر مسلموں سے اس کا بہت میل جول تھا اور اس وجہ سے بھی کہ وہ شیعہ تھا۔ نجیب الدولہ نے اس عرصے میں جو کردار ادا کیا اس کی رہنمائی بھی زیادہ تر شاہ ولی اللہ نے کی جیسا کہ ''سیاسی مکتوبات'' میں درج اس کے نام بہت سے خطوط سے مترشح ہوتا ہے۔

-112 صفدر جنگ کے اکسانے پر جاٹوں نے پرانی دہلی کو تھوڑا تھوڑا کرتے اتنا لوٹا کہ یہاں کچھ بھی باقی نہ رہا۔ یہاں تک کہ صفدر جنگ کے مرشد شاہ باسط کا مکان بھی ان کے ہاتھوں سے بچ نہ سکا۔ پرانی دہلی شہر کی آبادی، جو شاہجہان آباد سے کچھ زیادہ تھی، پوری طرح تباہ ہوگئی یہاں تک کہ ایک چراغ بھی نہ رہا جو روشن ہو (سری وستوا، مرجع سابق۔ صفحات 230-231)

شاہ ولی اللہ ایک خط میں اس ناگفتہ بہ حالت کا تذکرہ کرتے ہیں "صفدر جنگ ایرانی نے بغاوت کی اور سوراج مل جاٹ سے ساز باز کر کے دہلی کو تاخت وتاراج کیا اور پوری آبادی کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔" (سیاسی مکتوبات۔ صفحات 49، 102)

-113 ایضاً۔ صفحات 89، 153

-114 اس خط میں سراج الدولہ کو نوجوان اور ناپختہ کار حکمران بنگالی کہا گیا ہے (سیاسی مکتوبات۔ صفحات 103۔104) سراج الدولہ علی وردی خاں کی وفات پر 10 اپریل 1756ء میں بنگال کا حکمراں ہوا اور جنگ پلاسی میں 22 جون 1757ء میں شہید ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط 1750ء اور 1757ء کے درمیان میں لکھا گیا۔

-115 سیاسی مکتوبات۔ صفحات 102-105

-116 ایضاً۔ صفحات 121، 122، 124

-117 بعض اصحاب شیخ احمد سرہندی کے غیر مسلموں کے ساتھ غیر مصالحانہ رویے پر جز بز ہوتے ہیں دیکھئے شیخ محمد اکرام، "رودکوثر" صفحات 276۔ وما بعد۔ ص 549 پر لکھتے ہیں کہ اس سلسلے میں شاہ ولی اللہ کا رویہ اتنا غیر مصالحانہ نہیں تھا۔ یہ فیصلہ قطعی طور پر شاہ ولی اللہ کی تصنیفات کے سطحی مطالعے کا نتیجہ ہے۔ غیر مسلموں کے بارے میں، جیسا کہ زیر نظر مقالہ سے معلوم ہو رہا ہوگا، شاہ ولی اللہ کا مشورہ شیخ احمد سرہندی سے مختلف نہیں تھا۔ شیخ احمد سرہندی نے شیخ فرید کو ہندوؤں سے آزادانہ میل جول سے منع کیا تو شاہ ولی اللہ نے نجیب الدولہ کو ان لوگوں کی سازشوں سے متنبہ کیا۔

-118 سیاسی مکتوبات۔ ص 149

-119 ایضاً۔ صفحات 102-103

سرکار لکھتے ہیں۔ "صفدر جنگ آسمان دہلی کا منحوس ستارہ تھا۔ سیاسی دوراندیشی حب الوطنی اور تخت سے وفاداری سے بے بہرہ تھا۔ ذاتی ہوس کی پالیسی پر چلتے ہوئے وہ مغل سلطنت کی تباہی پر تلا ہوا تھا۔ درباری امرائیں سے ایرانی فریق نیز دوسری نسلوں کے شیعہ نوواردوں کو ہر جگہ عہدے دینا ضروری تھا۔

(مغل سلطنت کا زوال (انگریزی) جلد اول، ص 234)

ایک اور جگہ سرکار لکھتا ہے۔ "صفدر جنگ نے.....تورانی امرا اور ان کے متعلق کو ہر بااقتدار اور منفعت بخش عہدے سے محروم کرنے کی کوشش کر کے اپنے بے شمار دشمن بنا لیے۔" (ایضاً ص 254)

-120 عماد الملک کی سیرت کی چند جھلکیاں مرزا مظہر جانجاناں کے خطوط میں نظر آتی ہیں۔ مرزا صاحب لکھتے ہیں کہ وہ کلی طور پر غیر معتبر، کمینہ اور عیار تھا، اس کے عہدہ وزارت میں لوگوں کو بہت مصائب سے سامنا کرنا پڑا۔

(کلمات طیبات، صفحات 58-61-66، 60)

-121 سرکار، مرجع سابق، جلد ثانی، ص 305

-122 ایضاً۔ ص 197

-123 تحریک آزادی کی ایک تاریخ محولہ بالا، جلد اول ص 287

سرکار، مرجع سابق، جلد ثانی، ص 198

-124 تحریک آزادی کی ایک تاریخ محولہ بالا، ص 291

سرکار، محولہ بالا، ص 232-233

-125 سیاسی مکتوبات، صفحات 115 و مابعد

-126 ایضاً۔ صفحات 118 و مابعد

-127 ایضاً۔ صفحات 103-104

-128 اردو ترجمہ، ص 120

-129 کیمبرج تاریخ ہند (انگریزی) جلد پنجم، صفحات 104، 105، 111

-130 عبداللہ یوسف علی "برطانوی دور میں ہندوستان کی ثقافتی تاریخ" (انگریزی) (بمبئی، 1940ء) ص 29

-131 پروفیسر ایم۔ ایم۔ شریف، "مسلم فلسفہ اور مغربی فکر" (انگریزی) اقبال 2 جولائی 1959ء) صفحات 1-14

-132 سیاسی مکتوبات۔ ص 47

اولاد نظام الملک مرحوم...... گاہے فرنگیاں را باخود رفیق گرفتہ

یہ خط جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے 1169ھ اور 1170ھ کے درمیان لکھا گیا۔

-133 تفہیمات، کتاب اول، نمبر 31

-134 ۔ایضاً

کتابیات

1۔ شاہ ولی اللہ" "انفاس العارفین" (فارسی) مطبع مجتبائی دہلی، 1335ھ

2۔ "فیوض الحرمین" اردو ترجمہ پروفیسر محمد سرور

3۔ خیر کثیر، اردو ترجمہ (بمبئی)

4۔ "ملفوظات شاہ عبدالعزیز" (اردو ترجمہ) پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز، کراچی، 1960ء

5۔ حافظ رحیم بخش، "حیات ولی" مکتبہ سلفیہ، لاہور، 1955ء

6۔ "الفرقان" شاہ ولی اللہ نمبر، بریلی 1940ء

7۔ "کلمات طیبات" مطبع مجتبائی، دہلی 1309ھ

8۔ خلیق۔ اے نظامی، "ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات" دہلی۔

9۔ شیخ محمد اکرام "رود کوثر" فیروز سنز، لاہور۔

10- A History of Freedom Movement, vol. I, (1707-1831), Pakistan Historical Society.

11- S.M.Ikram, "History of Muslim Civilization in India and Pakistan", ed. Professor S.A.Rashid, Lahore.

12- J.N.Sarkar, Fall of the Mughal Empire", Vols. I and II Calcutta, 1949.

مولانا عبید اللہ سندھی(1)

امام شاہ ولی اللہ...... ایک اجمالی تعارف

امام شاہ ولی اللہ کی ولادت بروز چہار شنبہ 1114ھ اور وفات 1176ھ میں ہوئی اور سلطان مجدد عالمگیر کی وفات بروز جمعہ 28 ذی قعدہ 1118ھ میں ہوئی۔ اس حساب سے شاہ صاحب کی ولادت سلطان عالمگیر کی وفات سے چار سال پہلے ہوئی اور شاہ عالم ثانی نابینا مکحول بادشاہ کے عہد میں آپ کا انتقال ہوا۔ چنانچہ امام شاہ ولی اللہ کو دہلی کے ان دس مغل سلاطین دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اورنگ زیب عالمگیر، بہادر شاہ ظفر اول، معزالدین جہاں دار شاہ، فرخ سیر، رفیع الدرجات، رفیع الدولہ، محمد شاہ، عالمگیر ثانی اور شاہ عالم ثانی، آخرالذکر بادشاہ نے جسے غلام قادر روہیلے نے اندھا کر کے برطرف کر دیا تھا اور پھر مرہٹوں نے سے دوبارہ بادشاہ بنایا تھا۔ شاہ ولی اللہ کی وفات سے تقریباً دو سال بعد الہ آباد کے مقام پر بنگالہ بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کلائیو کے ذریعہ ایسٹ انڈیا کے دورے کر رہی تھی۔

ہندوستان کو مذکورہ بالا سلاطین کے عہد میں کن کن لرزہ خیز واقعات وحوادث سے گزرنا پڑا، تاریخ ہند کا ہر طالب علم جانتا ہے۔ سادات بارہہ کا تسلط، فرخ سیر کا ان کی قید میں بصد بے کسی مرنا۔ تورانی امرا کے ہاتھوں سادات کا زوال، مرہٹوں کی بغاوت اور ان کا عروج، سکھوں کی بغاوت، نادر شاہ کی یلغار اور اس کے حکم سے دہلی میں قتل عام، احمد شاہ ابدالی اور معرکہ پانی پت، سیاست ہند میں روہیلوں کی شرکت، ایرانی اور تورانی امرا کی باہمی چپقلش، ہندوستان پر یورپین اقوام کی للچائی ہوئی نظریں، پھر بنگال اور بہار وغیرہ میں انگریزوں کا عمل دخل یہ اور اس قسم کے اور حوادث شاہ ولی اللہ نے اس تمام عرصے میں اپنی آنکھوں سے دیکھے۔

ہندوستان کی مغل سلطنت جس اضطراب سے گزر رہی تھی، ظاہر ہے شاہ صاحب اسے اچھی طرح جانتے تھے۔ بعد میں آپ حجاز تشریف لے گئے اور تقریباً دو سال وہاں رہے تو اس اثنا میں وہ ترکوں کی عثمانی سلطنت اور دوسری اسلامی حکومتوں کے حالات کا بھی مطالعہ کرتے رہے چنانچہ آپ ایک خط میں لکھتے ہیں۔ ''ہندوستان کے احوال ہم پر مخفی نہیں ہیں کہ وہ فقیر کا مولد ومنشاء ہے۔ ہم نے بلادِ عرب بھی دیکھے ہیں اور ولایت کے لوگوں کے احوال وہاں کے ثقہ افراد سے سنے ہیں۔'' ان واقعات وحوادث سے شاہ صاحب کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ یہ تو ہوا سیاسی ماحول، جس میں شاہ صاحب پیدا ہوئے، جس میں ان کی عمر گزری اور اس میں ہونے والے واقعات وحوادث سے وہ متاثر ہوئے۔

امام ولی شاہ کے افکار دینی اور فنونِ حکمت سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ سیاسی ماحول کے ساتھ ساتھ ان کا علمی پس منظر بھی ہمارے سامنے ہو۔ نیز تعلیم ومطالعہ کے ذریعہ شاہ صاحب نے جو تحصیلی ملکات بہم کیے تھے، ان سے ہم واقف

ہوں اور جن مشائخ اور اساتذہ کے فیض صحبت نے ان کے ذہن کو جلا بخشی ان کا ہمیں اجمالی طور سے علم ہو۔

شاہ صاحب اپنی کتاب ''جزولطیف'' میں اپنے زمانہ طالب علمی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب میری عمر پانچ سال کی ہوئی تو فقیر مکتب میں داخل ہوا۔ ساتویں برس والد بزرگوار نے نماز پڑھوائی اور روزہ رکھنے کی تلقین فرمائی۔ اسی سال ختنہ کی رسم بھی ادا ہوئی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اسی سال کے آخر میں میں نے قرآن عظیم ختم کیا۔ دس سال کی عمر میں شرح ملا جامی پڑھی اور عام مطالعہ کی راہ میرے لئے کھل گئی۔ چودھویں برس میری شادی کر دی گئی اور اس معاملے میں والد بزرگوار نے بڑی عجلت سے کام لیا۔ پندرہ سال کا تھا کہ میں نے اپنے والد کے دست مبارک پر بیعت کی اور تصوف کے اشغال میں لگ گیا اور اس میں خاص طور پر نقشبندی مشائخ کے طریق کو اپنا مقصود بنایا۔ اسی سال تفسیر بیضاوی کا ایک حصہ پڑھا۔ اس سال والد بزرگوار نے وسیع پیمانے پر کھانے کا انتظام کیا اور خواص وعوام کو دعوت دی اور اسی موقع پر مجھے درس دینے کی اجازت دی گئی۔ الغرض اپنی عمر کے پندرہویں سال اپنے ملک کے دستور کے مطابق جو ضروری علوم وفنون تھے، میں ان سے فارغ ہو گیا۔ سترہ سال کا تھا کہ حضرت والد رحمتِ حق سے جاملاقی ہوئے۔ ان کی وفات کے بارہ سال تک علوم دینیہ وعقلیہ کی کتابیں پڑھاتا رہا اور ہر علم میں فکر وغور جاری رکھا۔

امام ولی اللہ کی تربیت کرنے والوں میں سب سے پہلے آپ کے والد شاہ عبدالرحیم متوفی 1128ھ ہیں۔ آپ نے اپنے والد اور ان کے رفقاء سے جو علوم و معارف حاصل کیے ان میں قرآن مجید کا ترجمہ، حکمت عملی اور اشراق کے ذریعہ علمی حقائق کا انکشاف خاص طور سے ان کی توجہ کا مرکز بنے رہے۔

قرآن عظیم کے ترجمے کے سلسلہ میں امام ولی اللہ لکھتے ہیں۔ اس فقیر پر بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ بھی ہے کہ مجھے متعدد بار اپنے والد بزرگوار کے درس قرآن میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ آپ قرآن کے معنی بڑے غور وتدبر سے بیان فرماتے تھے۔ آیات کی شان نزول کی وضاحت کرتے اور حل طلب امور کے لئے تفسیروں کی طرف رجوع کیا جاتا۔ اس کی وجہ سے میرے سامنے فتح وکامیابی کا ایک میدان کھل گیا۔ والد بزرگوار کا یہ دستور تھا کہ اپنے رفقاء کے حلقے میں ہر روز تین رکوع سے کم تعداد میں قرآن کی تلاوت کرتے اور اس کے معنی پر غور وخوض فرماتے۔ شاہ عبدالرحیم قدس سرہ حکمت عملی سکھانے پر خاص طور سے زور دیتے تھے۔ امام ولی اللہ اپنے بزرگوار کے اس رجحان فکر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''حضرت شجاعت، فراست، کفایت، غیرت وغیرہ اخلاق سلیمہ میں درجہ کمال پر تھے۔ نیز دینی اور مابعد الطبیعیاتی علوم میں درک کامل رکھنے کے ساتھ ساتھ آپ عقل معاشی سے بھی جو انسانی زندگی کی معاشی اور اجتماعی ضرورتوں کا ذریعہ ہے، پورے طور سے بہرہ ور تھے۔ آپ اپنی مجلس میں اکثر حکمت عملی اور کاروبارِ زندگی کے معاملات کے آداب کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ شاہ عبدالرحیم کے

ایک استاد میر محمد زاہد ہروی تھے۔ آپ کا حکمت عملی کی طرف رجحان غالباً انہیں کا فیضان ہے۔ میر زاہد شاہ جہاں اور عالمگیر کے عہد میں سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر رہے تھے۔ موصوف کا سلسلہ تلمذ محقق جلال الدین دوانی متوفی 938ھ پر ختم ہوتا ہے۔ ترک سلطان محمد خاں فاتح نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کے بعد جب یورپین اقوام کو اسلام سے آشنا کرنا ضروری سمجھا تو اس نے جن معاصر علماء کو شریعت اسلام اور حکمت و فلسفہ کی تطبیق پر متوجہ کیا۔ ان میں سے ایک محقق دوانی تھے۔ اس زمانے میں اکثر فاضل حکمت عملی کی طرف زیادہ توجہ نہیں کرتے تھے مگر جلال الدین دوانی نے محقق نصیر الدین طوسی متوفی 672ھ کے بعد ''اخلاق جلالی'' نام کی ایک کتاب لکھ کر اس فن کو زندہ کر دیا۔

شاہ عبدالرحیم کے اس رجحان فکر کے برعکس عام متکلمین نے ارسطو کی نظری حکمت کو اپنا مطمح نظر بنا رکھا تھا اور ان کا سارا زور قیاس آرائیوں اور استدلالی بحثوں پر صرف ہوتا تھا۔ وہ عملی زندگی کی ضرورتوں سے بے خبر تھے اور حکمت عملی سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے۔ لازمی طور سے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ''علم کلام'' میں دلچسپی لینے والے فقہا اور متکلمین قومی زندگی کی ضروریات میں تدبر اور تفکر سے محروم ہو گئے۔''

یہ تھی فکری بنیاد جو شاہ ولی اللہ کو اپنے والد سے اس ضمن میں ورثے میں ملی اور اس پر انہوں نے ایک عظیم الشان عمارت کھڑی کر دی۔ شاہ عبدالرحیم جس حکمت عملی کی تعلیم دیتے تھے اس سے مراد مطلق حکمت عملی ہے۔ قرآن عظیم کی حکمت عملی، یہ شاہ ولی اللہ کا اپنا استخراج ہے۔ شاہ صاحب سے بہت پہلے اکبر اعظم کے دور میں ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی میں حکمت عملی کی طرف خاص توجہ کی جانے لگی تھی۔ ابوالفضل نے اسی حکمت عملی کی اساس پر اکبری نظام کی بنا رکھی تھی اور محمد شاہ کے عہد تک سلطنت کے کاروبار کا مرکزی فکر یہی رہا۔ شاہ ولی اللہ اسی حکمت عملی کو قرآن کے تعارف کا ذریعہ بناتے ہیں اور اسے قرآن کے عملی تصورات کے تابع کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ کی شہرۂ آفاق تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' کو اگر غور سے پڑھا جائے تو اس میں ایک امتیازی وصف یہ نظر آتا ہے کہ جہاں وہ رفاہ عامہ کے اداروں یعنی ارتفاقات کا ذکر کرتے ہیں وہاں حکمت عملی کو پیش نظر رکھتے ہوئے تمام احادیث کو انہیں ابواب پر تقسیم کر دیتے ہیں اور پھر خاص خاص موقعوں پر حدیث کے ذیل میں حکمت عملی کا کوئی نہ کوئی نکتہ ذکر کرتے جاتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ اپنے حالات میں جہاں دوسرے انعامات الٰہیہ کا ذکر کرتے ہیں، وہاں یہ بھی لکھتے ہیں:

''حکمت عملی جس پر اس عہد میں خیر و برکت کا انحصار ہے۔ کارساز قدرت نے مجھے اس کا وافر حصہ عطا فرمایا اور اس امر کی توفیق دی کہ میں کتاب و سنت اور صحابہ کے آثار کی روشنی میں حکمت عملی کے اصول و ضوابط کو مدون کروں۔''

قرآن مجید کے ترجمے اور حکمت عملی کے بعد علم کا تیسرا شعبہ جو شاہ ولی اللہ کی خصوصی توجہ کا مرکز رہا وہ اشراق تھا۔ متاخرین صوفیہ میں سے شیخ اکبر محی الدین ابن عربی متوفی 638ھ اس صنف علم کے امام تھے اور شاہ عبدالرحیم ابن عربی

کے اس فلسفہ کے ایک ماہر استاد تھے۔ موصوف اپنے بھائی شاہ ابوالرضا محمد کے شاگرد ہیں اور دونوں بھائی خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادے خواجہ عبداللہ المعروف بہ خواجہ خورد کے صحبت یافتہ تھے۔ خواجہ باقی باللہ دہلوی نظریہ وحدت الوجود کے بہت بڑے امام تھے۔ ان کی امامت اشراقی طرز کی تھی۔ وحدت الوجود کے مقابلے میں امام ربانی مجدد الف ثانی نے جو حضرت خواجہ باقی باللہ کے مرید تھے، وحدت الشہود کا نظریہ پیش کیا تھا۔ خواجہ خورد اور شاہ عبدالرحیم اور شاہ ابوالرضا محمد امام ربانی سے پوری طرح مستفید ہوئے لیکن ان کا میلانِ فکر وحدت الوجود ہی کی طرف رہا۔ اس سلسلے میں امام ولی اللہ نے اپنی کتاب ''انفاس العارفین'' میں والد اور چچا کے مقالات اور مقامات کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ ان سے شرائع الٰہی اور نظریہ وحدت الوجود میں پوری تطبیق ہو جاتی ہے۔ ان دونوں بھائیوں کے مخصوص افکار اور نظریات کا ماحصل اور لب لباب یہ تھا کہ ایک ایسی شاہراہ فکر کی طرح ڈالی جائے جس پر صوفیہ و متکلمین نیز فقہا ساتھ ساتھ چل سکیں۔ کشف یعنی وجدان اور عقل و نقل کو الگ الگ اپنے اپنے لئے مشعل راہ بنانے اور صرف ایک ایک میں خصوصی مہارت پیدا کرنے سے اہل علم جدا جدا فرقوں میں بٹ گئے تھے۔ شاہ صاحب کے والد اور چچا کی کوشش یہ تھی کہ ان فرقوں کا آپس کا افتراق اور اختلاف مٹ جائے اور ان گروہ بندیوں سے اسلامی ذہنیت جو زنگ آلود ہو رہی تھی، وہ پھر نکھر کر اپنے جوہر دکھا سکے۔

امام ولی اللہ اپنے زمانے کی تین چیزوں کا خصوصیت سے ذکر کرتے ہوئے ''تفہیمات'' میں لکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک برہان یعنی عقل ہے۔ حکمت عملی اس کا ایک شعبہ ہے۔ اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ مسلمانوں میں یونانی علوم فلسفہ و منطق کا رواج ہو چکا ہے اور وہ علم کلام سے دلچسپی لیتے ہیں۔ دوسرا وجدان اشراق یا کشف ہے۔ فرماتے ہیں اس زمانے میں لوگ شرقاً غرباً صوفیہ کے علوم قبول کرنے پر متفق ہیں یہاں تک کہ ان کے اقوال اور حالات لوگوں کے لئے کتاب اور سنت سے بھی زیادہ مرغوب خاطر ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس بنا پر وجدان اشراق یا کشف اس زمانے میں ایک ضروری موضوع علم بن گیا ہے۔ تیسری چیز ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول علوم، اور ان میں قرآن عظیم خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ اس کے ساتھ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اہل عصر فقہ کے مختلف اصناف میں بھی اختلاف کر رہے ہیں خصوصاً حنفی اور شافعی اور ان میں سے ہر فرقہ اپنے اساتذہ کی پچ کرتا ہے۔ ان حالات میں طبعی طور سے امام ولی اللہ کو اپنی دعوتِ تجدید کے ضمن میں ان تین امور کی اصلاح کی طرف خاص توجہ کرنی پڑی۔

شاہ ولی اللہ اور ان کے والد کے زمانے میں فقہا، اور مفسرین نے عوام مسلمانوں کی روزمرہ کی زندگی سے قرآنی تعلیمات کو بحیثیت مجموعی خارج کر دیا۔ لہٰذا ضرورت تھی کہ قرآن مجید کو عامۃ المسلمین کے ذہنوں کے قریب لایا جاتا تاکہ ان کی تربیت قرآن کے اصولوں پر ہو سکتی، شاہ صاحب کے زمانے میں ہندوستانی مسلمانوں کی رسمی زبان فارسی تھی۔ آپ نے قرآن کو ہندوستانی مسلمانوں کے لئے قابل فہم بنانے کی خاطر اس کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا اور اس پر تشریحی فوائد لکھے۔

قرآن مجید کی آیات محکمات و متشابہات کے متعلق ایک عرصہ دراز سے جو ذہنی الجھاؤ آ رہا تھا شاہ صاحب نے اسے دور فرمایا۔ یہ واقعہ ہے کہ قرآن حکیم نے اپنی آیات کو محکمات اور متشابہات میں تقسیم کیا اور عام طور سے اہل علم متشابہات میں بحث کرنا نا ممکن سمجھتے ہیں لیکن اس ضمن میں دقت یہ ہے کہ آیات متشابہات کی کوئی ایسی متفقہ علیہ واضح

تعریف نہیں جس کی بناء پر یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ فلاں فلاں آیات محکمات ہیں اور فلاں فلاں متشابہات ہیں جن میں کہ گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ متشابہات کے غیر معین ہونے اور ان میں بحث کو ناممکن سمجھنے کا یہ اثر ہوا کہ ایک تو سارے کا سارا قرآن قابل فہم نہ رہا دوسرے متشابہات میں غور نہ کرنا ایک اصول اور عقیدہ بن گیا۔ ایک کتاب کی نسبت جب یہ عقیدہ ہو جائے کہ اس کے بعض حصے اور طرفہ بات یہ ہے کہ ان بعض حصوں کا تعین بھی نہ ہو، فہم سے بالاتر ہیں تو متوسط عقل رکھنے والوں کے لئے ساری کی ساری کتاب مشتبہ ہو جاتی ہے اور اس کی تعلیمات اور احکام کے بارے میں وہ عزم و یقین پیدا نہیں ہو سکتا جو عمل کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

شاہ صاحب نے اس غلط فکر کی اصلاح کی طرف توجہ فرمائی اور راسخین فی العلم کے لئے آیات متشابہات کے معنی کا تعین ممکن ثابت کیا۔

قرآن کی آیات ہی کے ضمن میں ایک اور مسئلہ ناسخ و منسوخ کا ہے۔ علماء کے نزدیک قرآن کی بعض آیات ہیں جو دوسری آیات کو منسوخ کرتی ہیں۔ اس مسئلے میں مزید الجھن اس بات سے بھی ہوئی کہ اہل علم متفقہ طور پر یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ قرآن مجید کی فلاں فلاں آیت منسوخ ہے۔ ایک عالم ایک آیت کو منسوخ قرار دیتا ہے اور دوسرا ہے کہ اس کی تنسیخ کا قائل نہیں۔

شاہ صاحب نے ناسخ و منسوخ کے اس مسئلہ کو اطمینان بخش طریقے سے حل کیا۔ انہوں نے صرف پانچ آیات کو منسوخ مانا ہے لیکن اس میں بھی ان کی حکمت ہے تا کہ معتزلی ہونے کا الزام نہ لگے ورنہ ان پانچ آیات کا بھی منسوخ نہ ہونا ثابت کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے خیال میں شاہ صاحب کا اصل مقصود یہ ہے کہ قرآن مجید میں سرے سے کوئی آیت منسوخ نہیں۔

قرآن مجید کا خطاب ساری انسانیت کو ہے اور اس کی دعوت میں پوری عمومیت ہے اور گو ائمہ فقہا نے اصول فقہ میں بالاتفاق اس امر کی صراحت کی ہے کہ اگر قرآن عظیم کی کوئی آیت بلفظ عموم نازل ہوئی ہو اور مفسرین اس کی شان نزول کے متعلق کوئی خاص واقعہ ذکر کرتے ہوں، لیکن قرآنی مطالب کی تشریح میں بہر حال عمومیت ہی مد نظر رہے گی اور کسی خاص شخص یا واقعہ سے اس آیت کو مخصوص کر دینا محل اعتبار نہ ہوگا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس قاعدے پر سب کا اتفاق ہے لیکن عملاً قرآن کی آیات کو مخصوص اشخاص اور واقعات سے مختص کر دینے کا دستور ہو گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آپ عام اساتذہ اور طلبا کو انہیں جزئی چیزوں میں غور کرتا ہوا پائیں گے۔ قرآن عظیم کو عملاً آیات احکام تک محدود کر دینے نیز اس کی آیات کو عمومی مطالب کے بجائے جزئی واقعات سے مختص کرنے کا اثر یہ ہوا کہ قرآن بحیثیت مجموعی مسلمانوں کی زندگی میں مؤثر نہ رہا، چاہیے تو یہ تھا کہ وہ ہماری تمام عملی سرگرمیوں میں مشعل راہ بنتا لیکن ہوا یہ کہ وہ محض پڑھنے پڑھانے تک محدود ہو کر رہ گیا۔

شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب ''الفوز الکبیر'' کی ابتدا میں اس غلطی کو نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے۔ چنانچہ آیات احکام کے سلسلہ میں وہ فرماتے ہیں کہ اجتماعی طور پر عام بنی نوع انسان میں جو بد اخلاقیاں اور بد اعمالیاں ظہور پذیر ہوتی رہی ہیں ان آیات کا سبب نزول ان کو سمجھنا چاہیے یہاں کسی زمانے اور قوم کی تخصیص نہیں، عرب ہوں یا عجم، آج کا

زمانہ ہو یا کوئی پہلے کا گزرا ہوا دور، جہاں بھی یہ خرابیاں پیدا ہوں گی قرآن کی ان آیات کا انطباق ان پر ہوگا۔ اس ضمن میں ''الفوز الکبیر'' کی عبارت ملاحظہ ہو۔ ''تحقیق شدہ امر یہ ہے کہ جہاں بھی برے اعمال اور ظلم کا وجود ہوگا۔ وہ ان آیات کا سبب نزول سمجھا جائے گا۔''

قرآن مجید کے مطالب کے احصاء اور ان کی تشریح میں شاہ صاحب کی کتاب 'الفوز الکبیر' ایک غیر معمولی کتاب ہے۔ اس کے مقدمہ میں آپ نے قرآن مجید کے جملہ مطالب اور معانی کو پانچ علوم میں تقسیم کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن کے جملہ مطالب و معانی ان پانچ علوم سے باہر نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک علم احکام ہے۔ اس علم سے اس امر کا تعین ہوتا ہے کہ عبادات عام معاملات گھر کے نظم ونسق اور شہروں کی سیاست اور کارگزاری میں کون سی چیز واجب ہے کون سی مندوب اور مباح ہے اور کون سی مکروہ اور حرام ہے۔ اس علم کی تفصیلات پر بحث کرنا فقیہہ کا کام ہے۔

علوم پنجگانہ قرآن میں سے دوسرا علم بحث و مناظرہ کا ہے۔ اس میں چار گمراہ فرقوں کے ساتھ استدلال کیا گیا ہے۔ یہ چار فرقے یہود، نصاریٰ، مشرکین اور منافقین کے ہیں۔ اس علم پر بحث کرنا علم کلام سے متعلق ہے۔ تیسرا علم تذکیر بآلاء اللہ ہے۔ الآء اللہ کے تحت آسمان وزمین کی تخلیق، بندوں کو ان کی ضروریات کا الہام کرنا اور اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کا بیان آتا ہے۔ چوتھا علم تذکیر بایام اللہ کا ہے۔ ''ایام اللہ'' کا مقصد یہ ہے کہ اب تک جو واقعات ہو چکے ہیں اور اللہ نے اپنے نیکوکار بندوں کو جن نعمتوں سے نوازا ہے اور نافرمانوں پر جو عتاب ہوئے ہیں تذکیر بایام اللہ میں ان کو بیان کیا گیا ہے۔ علوم پنجگانہ میں سے آخری علم تذکیر بالموت و مابعدہ ہے۔ اس علم کے ذیل میں حشر، نشر، حساب، میزان، جنت دوزخ کا بیان آتا ہے۔ ان امور کی تفصیلات پر نگاہ رکھنا اور ان کے مطابق احادیث وآثار کو قلم بند کرنا واعظ اور نصیحت کرنے والے مذکر کا کام ہے۔''

علم احکام کے سلسلہ میں رائج الوقت غلطیوں کی شاہ صاحب نے جس طرح اصلاح کی اس کی طرف اوپر اشارہ ہو چکا ہے۔ آپ نے دوسرے علوم قرآنی، تذکیر بآلاء اللہ، تذکیر بایام اللہ اور تذکیر بالموت و مابعدہ کے اصول پر مرتب فرمائے تاکہ مسلمان قرآن سے کما حقہٗ استفادہ کر سکیں۔

قرآن مجید ہی کے سلسلے میں شاہ صاحب کا ایک بہت بڑا علمی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس سوسائٹی کو جس کے لئے بلاغت کے ذریعہ قرآن کا سمجھنا اور سمجھانا ممکن نہ رہا تھا، بتایا کہ قرآن کا معجزہ ہونا صرف اس کی فصاحت اور بلاغت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ جو نظام حیات وہ پیش کرتا ہے وہ اس کا اعجاز ہے۔ شاہ صاحب نے قرآن مجید کی عملی افادیت کو اس کا معجزہ ہونا ثابت کیا۔ چنانچہ قرآن کے اس نظام حیات سے ہر شخص خواہ عربی ہو یا عجمی، عامی ہو یا عالم، فلسفی ہو یا سادہ مزاج مستفید ہو سکتا ہے اور اس کے اعجاز کو سمجھ سکتا ہے لیکن اگر قرآن کا اعجاز محض عربی زبان کی فصاحت و بلاغت کا پابند ہو جاتا تو اس صورت میں معدودے چند افراد کے سوا دوسرے لوگ اس کی اعجازی خوبیوں سے محروم رہتے۔

امام ولی اللہ نے قرآن عظیم کے مطالب کو اس شکل میں پیش کرنے پر صرف اکتفا ہی نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنے صحبت یافتہ لوگوں میں سے اس طریقے پر سوچنے والی ایک جماعت پیدا کر دی۔

حدیث وفقہ میں تطبیق

شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ اہل عصر فقہ کے مختلف اصناف میں اختلاف کر رہے ہیں، خصوصاً حنفی اور شافعی اور ہر فرقہ اپنے اساتذہ کی پچ کرتا ہے اور اسی وجہ سے ہر فقہی مذہب میں استخراجی مسائل کی کثرت ہو گئی ہے اور حق کا پتہ لگانا مشکل ہو گیا ہے۔ اب امام ولی اللہ نے ایک طرف تو حنفی اور شافعی فقہ میں ہم آہنگی پیدا کی دوسری طرف حدیث وفقہ میں تطبیق دی اور اس کے ساتھ ساتھ وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں جو تضاد بتایا جاتا تھا آپ نے اسے رفع کیا۔ اس ضمن میں شاہ صاحب کو دوران قیام حجاز میں شیخ ابو طاہر مدنی سے علمی استفادہ سے خاص طور پر بڑی مدد ملی۔ شاہ صاحب نے 1143ھ میں حرمین شریفین کا سفر کیا۔ حجاز تشریف لے جانے سے پہلے وہ بارہ سال تک ہندوستان میں اپنے والد کی وفات کے بعد کم وبیش بارہ سال تک دینی اور عقلی علوم کا درس دیتا رہا۔ اس اثنا میں ہر علم میں درک پیدا کیا اور والد مرحوم کے مسلک پر تصوف اور طریقت کی منزلیں طے کیں۔ ''اس زمانے میں مجھ پر توحید اور وحدت کے عقدے کھلے۔ میرے سامنے جذب وکیف کی راہیں واہوئیں۔ سلوک ومعرفت کی متاع گراں مایہ سے ایک بڑا حصہ نصیب ہوا اور مجھ پر وجدانی علوم پے درپے بڑی مقدار میں نازل ہوئے۔''

شاہ ولی اللہ حجاز میں پورے دو برس رہے۔ زمانہ قیام حجاز میں سب سے بڑے استاد جن سے شاہ صاحب کو معنوی مناسبت پیدا ہوئی، شیخ ابو طاہر مدنی متوفی 1145ھ تھے۔ موصوف زیادہ تر اپنے والد شیخ ابراہیم کردی متوفی 1101ھ کے تابع اور انہیں کے علوم ومعارف کے حامل تھے۔ ''ابجد العلوم'' میں لکھا ہے کہ شیخ ابراہیم کردی علوم فقہ و حدیث، ادب عربی، اصول فقہ اور اصول حدیث میں معرفت تامہ رکھتے تھے۔ شیخ عبداللہ عباس کا قول ہے کہ شیخ ابراہیم کردی کی مجلس باغ بہشت کا ایک نمونہ تھی۔ موصوف فلسفیانہ حقائق کے مقابلے میں صوفیہ کے کلام کو مقدم جانتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اہل فلسفہ کے گروہ اصل حقیقت کے قرب وجوار تک پہنچ جاتا ہے لیکن حقیقت کے اصل منبع تک ان کی رسائی نہیں ہو سکتی۔

امام ولی اللہ کی خوش قسمتی تھی کہ شاہ عبدالرحیم اور شیخ ابراہیم کردی دونوں میں کوئی ذہنی بُعد نہ تھا اور اپنے اپنے فکری رجحانات میں دونوں ایک دوسرے سے قریب تھے کیونکہ دونوں کا سلسلہ تلمذ محقق جلال الدین دوانی تک پہنچتا تھا۔ ہم نے شیخ ابراہیم کے بہت سے رسالے دیکھے ہیں۔ موصوف شریعت اسلامیہ کو ابن عربی کے فلسفہ سے حل کرتے ہیں۔

شیخ ابراہیم کے اس رجحان فکر کا اثر ان کے صاحبزادے شیخ ابو طاہر کے ہر قول وفعل میں نمایاں نظر آتا ہے۔ شیخ ابراہیم کردی اور شیخ ابو طاہر مدنی فقہ میں شافعی مذہب رکھتے تھے اور وحدت الوجود کو مانتے تھے۔ دوسری طرف شاہ ولی اللہ کے والد اور چچا حنفی تھے اور اس کے ساتھ ہی وحدت الوجود کو بھی مانتے تھے اس سے شاہ صاحب پر حقیقت واضح ہوئی کہ جہاں تک حقیقت شناسی کا تعلق ہے فقہ حنفی اور فقہ شافعی میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے۔ بے شک شاہ صاحب اپنے ملک اور

اپنی سوسائٹی کے مزاج اور اس کی عام افتاد کے پیش نظر فقہ حنفی کے پابند تھے، مگر ان کی عقلیت فقہ شافعی کی توہین بھی برداشت نہیں کرتی تھی، جیسا کہ عام طور پر فقہ کے باہمی جھگڑے اس طرح کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

حنفی اور شافعی فقہ کی اس ہم آہنگی کو شاہ صاحب اور آگے بڑھاتے ہیں۔ وہ حنفی فقہ کو امام ابوحنیفہ کے شاگرد امام محمد متوفی 189ھ کی کتابوں سے اخذ کرتے ہیں اور شافعی فقہ کو براہ راست امام شافعی کی تصانیف سے لیتے ہیں۔ اب امام محمد اور امام شافعی دونوں امام مالک کے شاگرد ہیں۔ اس بنا پر شاہ ولی اللہ باقاعدہ تجویز کرتے ہیں کہ فقہ کا اصل الاصول درحقیقت امام مالک کو مؤطا ہے اور اسی سے مالکی، حنفی اور شافعی مذاہب فقہ پیدا ہوئے۔ اس قاعدہ کلیہ کے بعد وہ ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں، چنانچہ وہ دیکھتے ہیں کہ مؤطا امام مالک تمام تر اہل مدینہ کی فقہ پر مشتمل ہے اور اہل علم مدینہ کی فقہ کا مرکز حضرت عمر فاروقؓ کو قرار دیتے ہیں یعنی نتیجہ یہ نکلا مالکی، حنفی اور شافعی فقہ کے مذاہب سارے کے سارے شاہ صاحب کے نزدیک حضرت عمر فاروقؓ کے مذہب فقہ کی تشریحیں ہیں۔

مختصراً حضرت عمرؓ کی فقہ اور اہل سنت کے دوسرے مجتہدین کی فقہ میں آپس میں وہی نسبت ہے، جو ایک کتاب کے متن اور بعد میں جو اس کی شرحیں کی جاتی ہیں، ان میں ہوتی ہے۔ اگر ہم فقہ اسلامی کو اس نقطۂ نظر سے دیکھیں تو مسلمانوں کے لئے اس بات کو سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی کہ اصل شریعت تو ایک ہی ہے اور فقہ کے یہ حنفی، شافعی اور مالکی مذاہب اس کے مختلف شعبے ہیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ عوام ہر فقہی مذہب کو ایک مستقل دین اور ایک جداگانہ ملت سمجھنے کی گمراہی میں مبتلا نہ ہوں گے۔ اس طرح ملت اسلامیہ کے مجموعی احکام کے بارے میں ان کے ذہنوں میں شک وشبہ نہ پیدا ہو سکے گا اور باہمی اختلاف فقہ انتشار فکر اور تشویش ذہنی کے باعث نہ ہوگا۔

یہ مسائل اس رنگ میں متقدمین کی کتابوں میں ہمیں کہیں نظر نہیں آئے اور ہماری رائے میں شاہ ولی اللہ کا یہ طرز فکر اور علمی کمال نتیجہ ہے اس تربیت کا، جو انہیں اپنے والد اور چچا کے افکار و تعلیمات سے ہندوستان میں ملی اور بعد میں حجاز میں شیخ ابوطاہر مدنی کے فیض صحبت سے ان کی اس ذہنی تربیت کو نصیب ہوئی۔

وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں تطبیق

شیخ اکبر نے وحدت الوجود کا تصور پیش کیا تھا اور امام ربانی نے وحدت الشہود کی دعوت دی۔ شاہ صاحب کے نزدیک اگر ارباب فکر و عمل کا کوئی گروہ بنیادی طور سے متحد الخیال ہو تو وہ ان کی تعبیرات کے اختلاف میں نہیں جاتے۔ بلکہ ان کے اقوال کو جمع کر کے ان میں باہم مطابقت پیدا کر دیتے ہیں۔ شاہ صاحب کے اس علمی کمال کی ایک مثال وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی تطبیق ہے۔ انہوں نے شیخ اکبر اور امام ربانی دونوں کے ان تصورات توحید میں بظاہر جو تضاد نظر آتا تھا، اسے رفع کیا اور دونوں کو اصلاً ایک ثابت کیا۔ تطبیق کے اس عمل میں وہ تعبیرات کے اختلاف کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ شاہ صاحب نے "مکتوب مدنی" میں اس مسئلے کو بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے۔

"مکتوب مدنی" کے شروع میں لکھتے ہیں۔ "اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہمیں اس زمانے میں یہ سعادت نصیب ہوئی ہے کہ ہمارے سینے میں اس امت کے علماء کے سب علوم جمع ہو گئے ہیں کیا معقولات کیا منقولات اور کیا

کشف و وجدان کے علوم۔ ہمیں خدا نے یہ توفیق دی ہے کہ ایک علم کو دوسرے پر تطبیق دے سکتے ہیں۔ اسی طرح بظاہران میں جو اختلافات ہوتے ہیں، وہ ختم ہو جاتے ہیں اور ہر بات اپنی حد پر ٹھیک بیٹھ جاتی ہے اور ان میں کوئی تناقض نہیں رہتا۔ مختلف اور متعارض اقوال میں ہمارا تطبیق کا یہ اصول علم کے تمام فنون پر حاوی ہے۔ اس کے تحت فقہ بھی آتی ہے، علم کلام بھی آتا ہے اور تصوف کے مسائل بھی۔" شاہ صاحب اسی اصول کے تحت فقہا کے مختلف مذاہب میں تطبیق دیتے ہیں اور پھر صحیح حدیثوں اور فقہاء کے اقوال میں مطابقت ثابت کرتے ہیں۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو قرآن مجید سے مستنبط قرار دیتے ہیں۔ پھر ادیان اور ملتوں میں جو اختلافات ہیں ان کو وہ ایک قاعدے میں لاتے ہیں۔ اسی طرح تصوف میں توحید اور ذات خداوندی کے متعلق وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے جو طرز خیال ہیں "مکتوب مدنی" میں وہ ان کے باہمی اختلاف کو رفع کر کے ان کو ایک نقطے پر جمع کر دیتے ہیں۔

امام ولی اللہ نے اپنے ان افکار و خیالات کی اشاعت کی غرض سے بیسیوں کتابیں لکھیں۔ وہ سب دہلی کی علمی زبان عربی اور عام پڑھے لکھوں کی زبان فارسی میں تھیں۔ ان کتابوں میں انہوں نے اپنی دعوت تجدید کے اصول اور مسائل منضبط کر دیئے اور صرف اسی پر اکتفا نہیں فرمایا۔ بلکہ اس دعوت کو عملی شکل دینے کے لئے پروگرام بھی وضع کیا۔

دعوت کی عمومیت

شاہ صاحب کے پروگرام کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لئے یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ ان کی حیثیت امت محمدیہ میں ایک عظیم الشان صدیق اور حکیم کی ہے۔ اس طرز فکر کے ارباب کمال انبیاء کی تمام انسانیت کو اپنا مخاطب بناتے ہیں گو بظاہر ان کی دعوت اپنی قوم کے لئے ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ امام ولی اللہ کا روئے سخن دراصل تمام انسانیت کی طرف تھا۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب "بدور بازغہ" میں ارتفاقات کے ذیل میں لکھتے ہیں: "ہم نے یہاں ان ارتفاقات (اجتماعی اداروں) کے احکام اور ان سے متعلقہ علوم کے بیان میں بڑی تفصیل سے کام لیا ہے لیکن اس ضمن میں دو باتیں ضرور پیش نظر رہنی چاہئیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ہم ارتفاقات کی وضاحت کے سلسلہ میں عموماً ایک معین مثال کا ذکر کرتے ہیں لیکن اس سے ہمارا مقصد صرف یہی مثال نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ یا اس جیسی کوئی اور یا اسی کے لگ بھگ کوئی دوسری صورت بھی ہو سکتی ہے۔ ہمارا اصل مقصود تو یہ ہے کہ وہ عمومی قواعد جن کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، ان پر ارتفاقات (اجتماعی ادارے) پورے اتریں۔ ظاہر ہے یہ ادارے ہر قوم اور ہر ملک میں ایک سے نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ہر قوم کی اپنی خاص عادتیں اور اپنے مخصوص علوم ہوتے ہیں۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ یہ ادارے عمومی قواعد کے مطابق ہوں۔ خواہ ظاہری شکل و صورت میں ایک دوسرے سے جدا جدا ہی ہوں۔"

اس امر خاص کی اس سے زیادہ تفصیل "بدور بازغہ" کے تیسرے مقالے کے شروع میں ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب فرماتے ہیں: "تمہیں جاننا چاہیے کہ یہ تمام ارتفاقات (اجتماعی ادارے) جن پر انسانی نظام تمدن کی عمارت کھڑی ہے اور کل کے کل اقترابات (قرب الٰہی کے وسائل) جو انسانوں کی فطرت میں ودیعت کیے گئے ہیں مثلاً احسان، عبادت اور برائیوں سے اجتناب وغیرہ وغیرہ، یہ ایسے امور ہیں، جو مختلف شکلوں میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کے قاعدے

کلیے تو ایک ہیں لیکن ان کی صورتیں الگ الگ ہوتی ہیں (شاہ صاحب نے یہاں نکاح کی مثال دی ہے) یہی حال تقرب الی اللہ کا ہے۔ کبھی تو اس منزل تک انسان یوں پہنچتا ہے کہ وہ انسانی خواص کا جامہ اتار کر خدا کی ذات میں اپنے آپ کو گم کر دے اور تقرب الی اللہ کا ایک راستہ یہ ہے کہ اپنے اعضاء و جوارح کی صحیح تربیت کی جائے اور انسانی خواص کے دائرہ میں رہتے ہوئے اللہ سے تقرب چاہا جائے۔ اسی پر ان تمام بڑے بڑے مسائل کا قیاس کرلو، جو ارتفاقات اور اقترابات کے سلسلہ میں ہم نے بیان کیے ہیں اور بتایا ہے کہ ان کی شکلیں اور صورتیں مختلف ہوسکتی ہیں۔''

قدرتی بات تھی کہ اپنے قواعد کلیہ کی تشریح کے ذیل میں شاہ صاحب ملت حنفی ہی کے نقطۂ نظر سے ارتفاقات اور اقترابات کی مثالیں دیتے چنانچہ اس کی وضاحت میں وہ فرماتے ہیں: ''اس سے پہلے ملت حنفی کے نقطۂ نظر سے ہم ارتفاقات اور اقترابات کی بہت سی شکلیں پیش کر آئے ہیں تم کہیں اس کی وجہ سے غلطی میں نہ پڑ جانا۔ ان کا ذکر محض مثال کے طور پر تھا، اس سے زیادہ اس ذکر سے ہمارا اور کوئی مقصد نہ تھا اور پھر یہ بھی نہ سمجھ لینا کہ اصل حقیقت صرف ارتفاقات اور اقترابات کی ان بیان کردہ مشکلوں تک محدود ہے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ جہاں تک اس معاملے میں اصل حقیقت کا تعلق ہے، کوئی ملت یا مذہبی گروہ ایسا نہیں جو اصل حقیقت کا اعتراف نہ کرے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ اس کے احکام کو بجا نہ لائے۔ جھگڑا اصل حقیقت کے معاملے میں نہیں ہوتا۔ نزاع اور اختلافات اس حقیقت کو مختلف شکلوں میں پیش کرنے پر ہوتے ہیں۔''

ان اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ امام ولی اللہ کی تصانیف میں جس قدر قواعد کلیہ مذکور ہیں، وہ دراصل ان کے فلسفہ و حکمت کے اساسی اصول ہیں۔ فی الحقیقت انسانیت عامہ کو اسی کی دعوت دی گئی ہے اور اس ضمن میں جس قدر شریعت کے مسائل بیان کیے گئے ہیں وہ ان قواعد کی مثالیں ہیں۔ ان عمومی قواعد کی ان مخصوص مثالوں میں منحصر نہیں سمجھنا چاہیے انسانیت کی اس اساس فکر پر، جس کی دعوت شاہ صاحب دیتے ہیں۔ متدین اقوام کے عقل مند افراد ایک بین الاقوامی نقطہ وحدت پر جمع ہوسکتے ہیں اور قرآن عظیم کے خصوصی قانون نے اس بین الاقوامی سپرٹ کو صحیح اصول پر محفوظ کر دیا ہے۔

شاہ ولی اللہ جیسے عظیم حکیم اور صدیق دعوت و تبلیغ میں اپنی قوم کی تخصیص محض اس لئے کرتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنی قوم کے تعلیم یافتہ حصے کو دنیا کے سامنے عملی نمونہ بنا سکیں۔ شاہ صاحب کی کتابیں زیادہ غور سے پڑھی جائیں تو یہ محسوس ہوگا کہ وہ اپنی قوم کے ہر فرد کو انسانیت عامہ کی تعلیم کے لئے تیار کر رہے ہیں۔

اصلاحی پروگرام

امام ولی اللہ نے اپنے اصلاحی پروگرام کے دو اصول معین کیے۔

1- قرآن عظیم کی حکمت یعنی انسانوں کی عملی زندگی کے متعلق قرآنی تصورات ہی حقیقت میں ایک معجزہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اساس علمی اصلاح کے لئے تجویز ہوا۔

2- معاشرت، اجتماع، حکومت اور ملت میں تمام اخلاقی اور عملی خرابیوں کا باعث دراصل معاشی اور اقتصادی عدم

توازن ہے۔

عام طور سے تصوف فلسفہ اخلاق سے شروع ہوتا ہے گو حیوانی زندگی کے لئے اقتصادی ضروریات کا اعتراف کیا جاتا ہے لیکن انسانیت کے ساتھ اقتصادیات کا جو تعلق ہے اس پر کسی نے توجہ نہیں کی۔ اس کی وجہ سے ہماری سیاست کھوکھلی ہوگئی۔ ہمارے بڑے بڑے عقلمند اور زیادہ با اخلاق صوفیہ سب کے سب اجتماعی سیاست سے دور رہنا اپنا کمال سمجھتے رہے۔ اس کے برعکس شاہ صاحب نے زندگی کی اس حقیقت کو اس کی صحیح شکل میں پہچانا اور بار بار اپنی کتابوں میں اس کی طرف توجہ دلائی۔ ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں ارشاد ہوتا ہے۔ اگر کسی قوم میں تمدن کی مسلسل ترقی جاری رہے تو اس کی صنعت و حرفت اعلیٰ کمال پر پہنچ جاتی ہے۔ اس کے بعد اگر حکمراں جماعت آرام و آسائش اور زینت و تفاخر کی زندگی کو اپنا شعار بنا لے تو اس کا بوجھ قوم کے کاریگر طبقات پر اتنا بڑھ جائے گا کہ سوسائٹی کا اکثر حصہ حیوانوں جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوگا۔ انسانیت کے اجتماعی اخلاق اس وقت برباد ہو جاتے ہیں جب کہ جبر سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کر دیا جائے۔ اس وقت وہ گدھوں اور بیلوں کی طرح روٹی کمانے کے لئے کام کریں گے۔ جب انسانیت پر ایسی مصیبت نازل ہوتی ہے تو خدا تعالیٰ اسے اس سے نجات دلانے کے لئے کوئی راستہ ضرور الہام کرتا ہے یعنی ضروری ہے کہ قدرت الٰہیہ انقلاب کے سامان پیدا کر کے قوم کے سر سے ناجائز حکومت کا بوجھ اتار دے چنانچہ قیصر و کسریٰ کی حکومت نے یہی وطیرہ اختیار کر رکھا تھا۔ اس مرض کے ازالے کے لئے امیتین (عرب) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کیا گیا، فرعون کی ہلاکت اور قیصر و کسریٰ کی تباہی اسی اصول پر لوازم نبوت سے شمار ہوتی ہے۔

اس ضمن میں شاہ صاحب نے دہلی کے بادشاہوں اور امیروں کی مثالیں دی ہیں اور بتایا ہے کہ ان کی حالت بھی قیصر و کسریٰ کے لگ بھگ جا پہنچتی ہے۔

شاہ صاحب کے نزدیک انسانوں کی اجتماعی زندگی کے لئے اقتصادی توازن ایک ضروری امر ہے اور ہر انسانی جماعت کو ایک ایسے اقتصادی نظام کی ضرورت ہے جو اس کی ضروریات زندگی کا کفیل ہو۔ جب قوموں کو اقتصادی ضرورتوں سے اطمینان نصیب ہوتا ہے تو پھر کہیں وہ اپنے خالی وقت میں، جو ان کے پاس کسب معاش کے بعد بچ رہتا ہے، زندگی کے ان شعبوں کی ترقی اور تہذیب کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں جو انسانیت کا اصل جوہر ہیں لیکن اگر ان کی اقتصادی ضروریات ہی فراہم نہ ہوں، اور ان کی وجہ سے حیوانی زندگی ٹھٹھر کر رہ جائے تو انسانیت کے اعلیٰ مقامات کا کسے ہوش رہے گا۔ اقتصادی نظام کے درست اور متوازن ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس زندگی میں انسانی اجتماع کے اخلاق تکمیل پذیر ہو سکتے ہیں۔ جب انسان کے اخلاق اس دنیا میں سدھر گئے اور تہذیب نفس کے ذریعہ اس نے اپنے اخلاق کی تکمیل کر لی، تو لازمی طور سے موت کے بعد دوسری زندگی میں اس کے لئے قبر اور حشر کی مصیبتیں آسان ہو جائیں گی۔ اخلاق کی یہ تکمیل ہی اسے جنت کا حق دار بنائے گی اور اس کی آخری ارتقائی منزل یہ ہے کہ انسان اپنے رب کی رؤیت سے بہرہ ور ہو۔

اگر انسانی اجتماع کو ترقی کی اس راہ پر چلانا نبوت کا اصل مقصد سمجھ لیا جائے تو نبوت انسانی زندگی کے لئے ایک فطری چیز بن جاتی ہے۔ نیز جہاں نبوت نہ ہو وہاں انبیاء کے اتباع یعنی صدیق اور حکیم یہ کام کریں۔ تو اس طرح انسانیت

کا مجموعی مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک اقتصادی توازن کے یہ معنی ہیں۔

21/ذی قعدہ 1144ھ کو جمعہ کی رات تھی۔ امام ولی اللہ نے مکہ معظمہ میں ایک الہامی خواب دیکھا جس کا حاصل ہمارے الفاظ میں یہ ہے۔

1- انہیں یقین دلایا گیا کہ ان کے ذریعہ موجودہ مفاسد کا تدارک ہوگا۔ یعنی وہ ان خرابیوں کو دور کرنے میں ایک مستقل ذمہ دار حیثیت کے مالک ہوں گے۔

2- انہیں بتایا گیا کہ پہلا نظام توڑ کر اس کی جگہ وہ نیا نظام قائم کرنے کے ذریعہ بنیں گے۔

گویا برسوں کے مطالعہ، مشاہدہ، غور وفکر اور پھر خاص طور سے حرمین شریفین کے فیوض کے بعد شاہ صاحب کی ذات انقلابی قوت عمل کو اپنے اندر پورے کمال بیدار اور متحرک پاتی ہے اور جو کچھ انہیں مستقبل میں پیش آنے والا ہے، شاہ صاحب اسے خواب میں دیکھتے ہیں۔

یہ عزم لے کر شاہ صاحب واپس دہلی آئے اور اجمالی طور سے اپنے پروگرام کی ترویج شروع کر دی۔ محمد شاہ کے دور حکومت میں وہ اپنے مدرسہ کو پرانی دہلی کے ایک چھوٹے سے احاطے سے شاہ جہاں آباد (مغلوں کی نئی دہلی) کے ایک پورے محلے میں منتقل کرتے ہیں اور یہی مدرسہ آگے چل کر ولی اللہی تحریک کا مرکز بنتا ہے۔ امام ولی اللہ، ان کے بعد امام عبدالعزیز اور پھر امام محمد اسحاق نے اسی مدرسہ میں بیٹھ کر اس تحریک کی رہنمائی کی، جس کے پیش نظر ہندوستانی مسلمانوں کی دینی وفکری اور سیاسی واجتماعی ہمہ گیر نشاۃ ثانیہ تھی۔

حاشیہ

(1) یہ مضمون مولانا سندھی مرحوم کے خود اپنے مرتب کرائے ہوئے دو رسالوں سے ماخوذ ہے۔ ان میں سے ایک رسالہ ''امام ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف'' کے نام سے ماہنامہ ''الفرقان'' میں چھپا تھا، جو اس وقت بریلی سے نکلتا تھا۔ اس کے بارے میں مدیر ''الفرقان'' نے لکھا تھا ''چند مقامات میں تعبیر کی غرابت ونکارت اور ایک آدھ جگہ مولانا کی منفردانہ رائے سے قطع نظر، مقالہ شاہ صاحب کی حکمت کا اجمالی تعارف ہی نہیں، فی الحقیقت آپ کے علمی کام (تجدید فی العلوم الشرعیہ) سے واقفیت اور علی وجہ البصیرت واقفیت کے لئے اس میں کافی سامان ہے اور ولی اللہی علوم ومعارف کے لئے بجا طور پر اس مقالے کو بنیادی لٹریچر قرار دیا جا سکتا ہے۔ نیز اس کے مطالعہ کے بعد ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ولی اللہی حکمت پر مولانا کی نظر کس قدر گہری ہے اور شاہ صاحب کے علوم ومعارف کا انہوں نے کس قدر عمیق مطالعہ فرمایا ہے۔'' مولانا سید سلیمان ندوی (مرحوم) نے مولانا سندھی کے اس مقالے کو پڑھ کر مدیر ''الفرقان'' کو لکھا تھا۔ ''مولانا سندھی کے مضمون کو میں نے بغور پڑھا اور اس یقین کے ساتھ ختم کیا کہ بیشک مولانا کی نظر حضرت شاہ صاحب کے فلسفہ نظریات پر نہایت وسیع اور عمیق ہے۔''

عطاء الرحمٰن قاسمی

امام شاہ ولی اللہ محدث

ولادت

شاہ ولی اللہ کی ولادت باسعادت 4 رشوال المکرم 1114ھ بروز بدھ طلوع آفتاب کے وقت دہلی میں ہوئی۔ یہ وہ مبارک ساعت تھی جس میں حضرت شاہ عبدالرحیم کے گھر ایک ماہتاب علم نبوت طلوع ہوا جب کہ شاہ عبدالرحیم کی عمر طبیعی 60 سال سے متجاوز ہو چکی تھی اور آپ کی اہلیہ محترمہ تو سنِ یاس کو پہنچ چکی تھیں مگر خداوند تعالیٰ کی جانب سے شاہ صاحب کو اس نعمت عظمیٰ کی بشارت پہلے دی جا چکی تھی، جس کا واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ شاہ عبدالرحیم صاحب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے۔ اس زیارت کے دوران آپ کو حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ نے بشارت دی کہ عنقریب آپ کے یہاں ایک فرزند ارجمند پیدا ہوگا۔ اس کا نام قطب الدین احمد رکھنا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ شاہ صاحب کی اہلیہ محترمہ عہد یاس کو پہنچ چکی تھیں۔ اس بناء پر شاہ عبدالرحیم صاحب کو گمان ہوا کہ یہ اشارہ غیبی بیٹے کی نہیں پوتے کی طرف ہے۔ لیکن قدرت کو بیٹا دینا منظور تھا۔ لہٰذا ظاہری اسباب میں یہ صورت بنی کہ اس واقعہ کے چند روز بعد یہ اتفاق پیش آیا کہ شاہ صاحب کا عقد شیخ محمد پھلتی کی صاحبزادی فخر النساء سے ہوگیا۔ یہ ایک نیک سیرت خاتون اور بڑی صاحب فضل وکمال خاتون تھیں۔ اسی نامور خاتون کے بطن سے شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے، جن کے بارے میں شیخ محمد عاشق پھلتی لکھتے ہیں۔

والدۂ شریفۂ شان کہ بعلم شریعت از تفسیر وحدیث عالمہ وبآداب طریقت متادبہ وباسرار حقیقت عارفہ و بمصداق اسم خود فخر النساء بودند

آپ کی والدہ ماجدہ تفسیر وحدیث جیسے علوم شرعیہ کی عالمہ، آداب طریقت سے آراستہ پیراستہ، اسرار حقیقت کی معرفت رکھنے والی اور ان وجوہ سے حقیقتاً طبقۂ اناث کے لئے باعث فخر اور اسم بامسمیٰ تھیں۔

(القول الجلی۔ص10)

نام ونسب

اور چونکہ خداوند تعالیٰ اس مادر زاد ولی کو اسم بامسمیٰ ولی اللہ بنانا چاہتا تھا اس لئے شاہ صاحب کی ولادت کے

موقع پر شاہ عبدالرحیم صاحب کو حضرت بختیار کاکیؒ کا بتایا ہوا بشارتی نام یاد نہیں رہا اور آپ نے اپنے صاحبزادے کا نام ولی اللہ تجویز فرمادیا اور اس کے کچھ عرصے بعد جب شاہ صاحب کو وہ بشارت یاد آئی تو قطب الدین احمد نام رکھا۔ مگر ولی اللہ نام نے اس درجہ شہرت پائی کہ نہ صرف آپ بلکہ آپ کی نسبی و علمی و روحانی اولاد سب خاندان ولی اللٰہی کے نام سے آج تک پہنچانی جاتی ہے بلکہ علمی سلسلہ تو مکتب ولی اللٰہی ہی کے نام سے دنیا میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ بہرحال آپ کا القائی نام ولی اللہ اور بشارتی نام قطب الدین اور کنیت ابوالفیاض اور تاریخی نام عظیم الدین ہے اور بعض لوگ آپ کا القائی نام احمد اور ولی اللہ عرفیت اور لقب بتاتے ہیں۔

سلسلۂ نسب

حضرت شاہ ولی محدث دہلوی والد ماجد کی طرف سے ''فاروقی'' اور والدہ محترمہ کی طرف سے ''سید'' ہیں۔ آپ خود فرماتے ہیں۔

''بحضرت عمرؓ شجرہ مامی رسد بحضرت علیؓ از جہات امہات نسل واصل می شود۔''

(انفاس العارفین۔ص38)

اس اعتبار سے شاہ صاحب خالص عربی النسل اور نسباً فاروقی ہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے اپنی بعض تصنیفات میں اپنے والد ماجد سے سیدنا عمر فاروقؓ سے درج ذیل کل بتیس واسطے بیان فرمائے ہیں جو اس طرح ہے:

''شاہ ولی اللہ بن الشیخ عبدالرحیم بن الشہید وجیہہ الدین بن معظم بن منصور بن احمد بن محمود بن قوام الدین عرف قاضی قاذن بن قاضی قاسم بن قاضی کبیر عرف قاضی بدہ بن عبدالملک بن قطب الدین بن کمال الدین بن شمس الدین مفتی بن شیر ملک بن محمد عطا ملک بن ابوالفتح ملک بن عمر حاکم ملک بن عادل ملک بن فاروق بن جرجیس بن احمد بن محمد شہریار بن عثمان ماہان بن ہمایوں بن قریش بن سلیمان بن عفان بن عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب۔''

اس نسب نامہ میں متعدد ناموں کے ساتھ لفظ ''ملک'' آیا ہے۔ جس کے متعلق شاہ صاحب خود تحریر فرماتے ہیں:

یہ زمانہ قدیم میں تعظیمی لقب جانا جاتا تھا جیسے ہمارے زمانہ میں ''خان''۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کے آباؤ اجداد زمانہ قدیم سے ہی دینی و دنیوی وجاہت کے مالک رہے ہیں۔

ایامِ طفولیت

حضرت شاہ صاحب کے اندر نوعمری ہی سے انتہائی سعادت مندی اور غیر معمولی متانت و سنجیدگی پائی جاتی تھی۔ آپ عام بچوں کی طرح کھلنڈرا اور لاابالی نہیں تھے۔ آپ کی سعادت مندی اور اطاعت شعاری کے سلسلے میں یہ

واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ اپنے چند ہم عمر بچوں کے ساتھ سیر و تفریح کے لئے تشریف لے گئے اور جب تفریح سے فارغ ہو کر گھر واپس آئے تو شاہ عبدالرحیم نے فرمایا میاں آج تم نے اس سیر و تفریح سے کون سی ایسی چیز حاصل کی ہے۔ جو تمہیں زندگی میں کام آئے گی۔ میں نے تو یہ پڑھا یہ لکھا اور یہ عبادت کی۔ حضرت شاہ صاحب والد محترم کی زبان سے یہ ناصحانہ کلمات سنتے ہی فرط ندامت سے پسینہ پسینہ ہو گئے اور اس کے بعد آپ پھر کبھی کھیل کود کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ اس واقعہ سے جہاں شاہ صاحب کی سعادت مندی و اطاعت شعاری کا اندازہ ہوتا۔ وہیں والد محترم کی حسن تربیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

تعلیم و تکمیل

حضرت شاہ صاحب جب پانچ برس کے ہوئے تو رواج زمانہ کے مطابق مکتب میں قرآن مجید پڑھنے کے لئے بیٹھائے گئے اور صرف دو سال میں آپ نے قرآن مجید حفظ کر لیا اور اسی سال فارسی کی تعلیمی شروع کی اور ایک ہی سال میں اس کی بھی تکمیل کر لی اور پندرہ سال ہی کی عمر میں شاہ صاحب نے نحو، صرف، فلسفہ، فقہ، تفسیر اور حدیث غرض جملہ کتب متداولہ کی نہ صرف تکمیل کر لی بلکہ ہر فن میں مہارت تامہ اور کامل عبور حاصل کر لیا اور آپ ان تمام فنون پر ایسا استاذانہ کلام کرنے لگے کہ بڑے بڑے صاحب فن آپ کی غیر معمولی بصیرت و مہارت سے ششدر و حیران رہ جاتے تھے۔

عقد

شاہ صاحب کی عمر جب چودہ سال کی ہوئی تو شاہ عبدالرحیم صاحب کو اپنے فرزند ارجمند کے عقد کی فکر ہوئی اور جب رشتہ پکا ہو گیا تو شاہ صاحب نے لڑکی والوں پر زور دیا کہ جلد از جلد اس فرض سے فراغت حاصل کر لی جائے اور جب لڑکی کے اعزہ نے سامان شادی کے تیار نہ ہونے کا عذر کیا تو آپ نے کہلا بھیجا کہ مصلحت جلدی کرنے میں ہے جس کا اظہار اس وقت مناسب نہیں۔ چنانچہ شاہ صاحب کے اصرار پر سسرال کے لوگ رضامند ہو گئے اور اسی سال آپ کی شادی ہو گئی اور شادی ہو جانے کے چند ہی روز بعد شاہ کی خوشدامن کا انتقال ہو گیا۔ پھر تھوڑے ہی دنوں کے بعد خوشدامن کے والد کا وصال ہو گیا۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ شاہ ولی اللہ کے چچا شیخ ابوالرضا محمد کے صاحبزادے شیخ فخر عالم رحلت فرما گئے۔ ان صدمات اور مختلف امراض وضعف کی وجہ سے آپ کے والد صاحب بھی سخت بیمار ہو گئے اور ان پے در پے حادثات پر لوگوں نے سمجھا کہ عجلت پر شاہ صاحب کی مصلحت کیا تھی اور اس وقت شادی نہ ہوئی ہوتی تو شادی میں کتنی تاخیر کرنی پڑتی اور شادی کتنی بے لطف ہوتی۔

بیعت و دستار بندی

پندرہ سال کی عمر میں شاہ صاحب نے اپنے والد بزرگوار کے دست مبارک پر بیعت کی اور ان کی نگرانی میں اشغال صوفیہ میں مشغول ہو گئے خصوصاً سلسلۂ نقشبندیہ کے اذکار کو از اول تا آخر پورا فرمایا۔ چنانچہ شاہ صاحب خود تحریر

فرماتے ہیں:

و پانزدہم سال بود کہ باوالد بزرگوار بیعت کردم و بااشغال صوفیہ خصوصاً نقشبندیہ مشائخ مشغول شدم و ازحیثیت توجہ وتلقین وتعلیم آداب طریقت ولبس خرقۂ صوفیہ ارتباط درست نمودم۔

پندرہواں سال تھا کہ والد بزرگوار سے بیعت ہوا اور اشغال صوفیہ خصوصاً مشائخ نقشبندیہ کے اشغال میں مشغول ہوا اور توجہ تلقین، تعلیم، آداب طریقت اور خرقۂ صوفیہ پہننے کی راہ اپنی نسبت کو درست کیا۔

(الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف۔ص3)

رحلتِ پدرِ بزرگوار

اس طرح گویا شاہ عبدالرحیم صاحب نے اپنے پندرہ سالہ نونہال، نوعمر نوجوان کو تمام علوم ظاہری و باطنی میں کامل کر دیا اور دنیاوی اعتبار سے بھی نہ صرف یہ کہ پال پوس کر بڑا کر دیا بلکہ نکاح وشادی کے فرائض سے بھی سبکدوشی حاصل کر کے سفر آخرت کی تیاری شروع فرمادی اور اس کے بعد ایک ڈیڑھ سال ہی کے عرصہ میں یہ تمام بار امانت اپنے لائق فرزند کے سپرد کر کے اپنے مولائے حقیقی سے جا ملے۔شاہ صاحب کے انتقال کے بعد تمام تلامذہ ومتوسلین نے خلف الرشید شاہ ولی اللہ کو شاہ عبدالرحیم صاحب کا قائم مقام منتخب فرمایا کیونکہ شاہ عبدالرحیم صاحب کے تلامذہ ومنتسبین میں آپ ہی اس مقام اور مسند کے سب سے زیادہ اہل تھے۔

درس وتدریس

لہٰذا شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ اپنے فخر روزگار والد شاہ عبدالرحیم کے وصال کے بعد 1131ھ مطابق 1719ء میں مسند درس وارشاد پر فائز ہو گئے اور درس وتدریس اور دعوت وارشاد کا سلسلہ شروع فرمادیا اور دوران تدریس جملہ علوم نقلیہ وعقلیہ کا انتہائی تفکر و تعمق کے ساتھ مطالعہ فرما کر محدثین وفقہائے مستنبطین کے طریق استدلال واستنباط میں درک حاصل فرمالیا جیسا کہ حضرت شاہ صاحب خود فرماتے ہیں:

> ''والد صاحب کی وفات کے بعد بارہ سال تک کتب دینیہ اور معقولات کے درس میں اشتغال رہا اور ہر علم وفن میں غور کرنے کا موقع ملا..........اور مذاہب اربعہ کی فقہ اوران کی اصول فقہ کی کتابوں اوران احادیث کے غائر مطالعہ کے بعد جن سے وہ حضرات اپنے مسائل میں استنباط فرماتے ہیں۔نور غیبی کی مدد سے ''فقہائے محدثین'' کا طریقہ دلنشیں ہوا۔''
>
> (الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف۔ص6)

شاہ صاحب درس وتدریس کے دوران نہایت ہی استغراق، محویت کے ساتھ مشغول ومصروف رہتے جس کی وجہ سے آپ پر عجیب استغراقی وانہما کی کیفیت طاری رہتی جس کا اثر آپ کے معمولات پر اس درجہ ظاہر ہونے لگا کہ آپ کے کھانے اور آرام فرمانے کی مقدار بھی گھٹ کر نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی اور اس محویت کا اثر یہ ہوا کہ آپ نے محسوس

فرمایا کہ علوم قرآن وحدیث کے بغیر جملہ علوم وفنون بے روح اور بے جان ہیں اور تمام علومِ عقلیہ کی حقیقی روح قرآن و حدیث ہی ہیں۔ لہٰذا انہماک واستغراق کے ساتھ شاہ صاحب 12 سال مسلسل مدرسہ رحیمیہ مہندیان میں درس وتدریس کے ذریعہ تشنگانِ علوم نبوت کو سیراب فرماتے اور انسانی قلوب کو علومِ الٰہی سے منور فرماتے رہے۔

سفرِ حرمین

اس کے بعد خیال آیا کہ علمائے حجاز سے بھی علوم میں استفادہ کرنا چاہیے خصوصاً علم حدیث تو ضرور ان حضرات سے حاصل کرنا چاہیے، لہٰذا طالب علم بن کر بلکہ حقیقی معنی میں مہمان رسولؐ بننے کے لئے 1143ھ مطابق 1731ء میں حجاز مقدس روانہ ہو گئے اور چودہ ماہ کے قریب وہاں مقیم رہ کر شاہ صاحب نے شیخ ابوطاہر جیسے محدث یگانہ کے علاوہ شیخ محمد وفداللہ، سلیمان المغربی، شیخ محمد بن سلیمان المغربی، تاج الدین، قلعی حنفی، مفتی مکہ شیخ سناوی، شیخ احمد قشاشی، سید عبدالرحمٰن ادریسی، شمس الدین، محمد بن علا بابلی، شیخ عیسیٰ جعفری، شیخ حسن عجیمی، شیخ احمد علی اور شیخ عبداللہ بن سالم بصری جیسے فخر روزگار محدثین سے اکتساب فیض کیا۔

شیخ ابوطاہر مدنی کا شمار مدینہ منورہ کے اجلۂ محدثین میں ہوتا تھا۔ ان سے خصوصیت کے ساتھ اکتساب فیض فرمایا۔ اور شیخ مدنی شاہ صاحب کی غیر معمولی ذہانت، فطانت اور جودت طبع سے بے حد متاثر تھے لہٰذا شیخ صاحب نے بھی فیض رسانی میں انتہائی فیاضی کا ثبوت دیا اور جو کچھ خزانہ علوم نبوت اللہ تعالیٰ نے شیخ کو مرحمت فرمایا تھا۔ بے کم وکاست شاہ صاحب کی خدمت میں منتقل فرما دیا۔ شیخ ابوطاہر شاہ صاحب سے اس درجہ متاثر تھے کہ شاہ صاحب کے متعلق فرمایا کرتے تھے:

یسند عنی اللفظ و کنت اصحح منه المعنیٰ

یہ الفاظ کی سند تو مجھ سے لیتے ہیں مگر میں ان سے حدیث کے معانی حاصل کرتا ہوں۔

(الیانع الجنی۔ص 81)

شاہ ولی اللہ صاحب نے مشائخ واساتذہ حرمین کے تعارف وتذکرہ میں ایک رسالہ ''انسان العین فی مشائخ الحرمین'' کے نام سے مرتب فرمایا ہے۔ شاہ صاحب نے اس میں اپنے محبوب ومحسن استاد شیخ ابوطاہر مدنی کا والہانہ انداز سے تعارف کرایا ہے۔ شیخ ابوطاہر مدنی صرف ایک عظیم المرتبت محدث ہی نہیں بلکہ علوم باطن کے بھی امام تھے۔

شیخ ابوطاہر مدنی نے شاہ صاحب کو خرقۂ باطن سے بھی نوازا تھا۔ حاصل یہ کہ استاد شاگرد کے درمیان ایسا قلبی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا کہ جب شاہ صاحب نے حجاز سے ہندوستان واپسی کا ارادہ ظاہر کیا اور شیخ مدنی سے رخصت چاہی تو اس وقت شفیق ومہربان استاذ اور سعادت مند شاگرد دونوں کی جو کیفیت تھی اس کا ذکر شاہ صاحب نے ایک خط میں کیا ہے' جس سے استاذ شاگرد کے والہانہ تعلق کا اندازہ ہوتا ہے۔ شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''میں اس وقت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا کہ جب میرے کوچ کا زمانہ قریب ہوا اور جدائی کی گھڑی سر پر آ کھڑی ہوئی اور رخصتانہ ملاقات کے دوران میں مزاج پرسی کے بعد میں نے یہ شعر پڑھا:

نسیت کل طریق کنت اعرفه
الا طریقاً یو دینی الی ربعکم

''میں بجز اس راستے کے جو مجھے تمہاری زمین تک پہنچا دے ان تمام راستوں کو بھول گیا۔ جن سے میں اس سے پیشتر واقف تھا۔''

''تو شیخ کی پُرنم آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں بہنے لگیں اور دونوں رخسار سرخ ہو گئے۔ یہاں تک کہ وفور گریہ سے آپ کا گلا بند ہو گیا۔ اس کے بعد آپ نے نہایت خلوص کے ساتھ اس عاجز کے حق میں دعا کی۔''

(رودکوثر۔ ص544)

سراج الہند امام شاہ عبدالعزیز دہلوی نے لکھا ہے کہ

''میرے والد صاحب جب مدینہ طیبہ سے رخصت ہونے لگے تو استاذ محترم سے عرض کیا اور وہ یہ سن کر خوش ہوئے میں نے جو کچھ پڑھا تھا سب بھلا دیا۔ سوائے علم دین وحدیث کے۔''

(ملفوظات عزیزی۔ ص43''

ایک یمنی محدث کی شہادت

حضرت شاہ ولی اللہ کی علمی جلالت شان کو مشائخ عرب وعجم نے یکساں طور پر تسلیم کیا ہے۔ حجۃ الاسلام فی الارض مولانا محمد قاسم نانوتوی سے امیر شاہ خاں مرحوم نے ایک یمنی محدث کا بڑا ہی دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے جس کا ذکر یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

امیر شاہ تحریر فرماتے ہیں کہ

''سفر حج میں حضرت (النانوتوی) کا جہاز یمن کے ساحل کے کسی بندرگاہ پر ٹھہر گیا۔ معلوم ہوا کہ چند دن ابھی رکا رہے گا۔ حضرت نانوتوی کو کسی نے خبر دی کہ اس بندرگاہ کے شہر میں ایک کہنہ سال معمر بزرگ محدث رہتے ہیں، ان کی ملاقات کو حضرت تشریف لے گئے، مل کر مولانا نانوتوی ان کے علم سے بہت متاثر ہوئے اور درخواست کی کہ سند اجازت عطا ہو اور اس پر محدث صاحب نے پوچھا تم کس کے شاگرد ہو؟ انہوں نے اپنے استاذ مولانا عبدالغنی مجددی کا نام لیا۔ محدث صاحب ناواقف تھے، پوچھا مولانا عبدالغنی کس کے شاگرد ہیں؟ جواب ملا شاہ اسحاق کے۔ شاہ اسحاق سے بھی وہ ناواقف تھے، پوچھا کہ وہ کس کے شاگرد تھے؟ کہاں شاہ عبدالعزیز صاحب کے، شاہ عبدالعزیز صاحب کا نام سن کر محدث صاحب رکے۔ بولے ان کو میں جانتا ہوں اور اس کے بعد فرمایا۔

شاہ ولی اللہ طوبیٰ کا درخت ہے، جس طرح جہاں جہاں طوبیٰ کی شاخیں ہیں وہاں جنت اور جہاں

اس کی شاخیں نہیں ہیں وہاں جنت نہیں، یونہی جہاں شاہ ولی اللہ کا سلسلہ ہے وہاں جنت ہے اور جہاں ان کا سلسلہ نہیں ہے وہاں جنت نہیں۔"

شاہ ولی اللہ صاحب نے حجاز مقدس سے واپس آنے کے بعد دوبارہ اپنے والد بزرگوار کے مدرسہ رحیمیہ چھتہ شیخ نزور (موجودہ قبرستان مہندیان) میں درس حدیث شروع کر دیا اور تشنگان علوم جو چشمۂ فیض کے منتظر تھے۔ اطراف و اکناف سے کھینچ کھینچ کر پہنچنے لگے اور چند ہی دنوں میں دوبارہ گلزار رحیمی میں قال اللہ، قال الرسول کی صدائیں گونجنے لگیں۔

شاہ صاحب کی سیاسی بصیرت

شاہ ولی اللہ صاحب جہاں بلند پایہ محدث تھے وہیں عظیم مفکر، ممتاز دانشور اور بالغ نظر سیاسی مبصر بھی تھے اور اسی سیاسی بصیرت میں حجاز مقدس کے قیام نے چار چاند لگا دئے کیونکہ آپ کو حجاز میں تحصیل علم کے ساتھ ساتھ مختلف ممالک خصوصاً اسلامی ممالک کے احوال وکوائف سے باخبر ہونے کا پورا موقع ملا اور ان احوال کی روشنی میں ہندوستان کے مسائل کے حل کرنے میں بڑی رہنمائی ملی جیسا کہ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب مرحوم لکھتے ہیں:

"وہاں دو سال قیام کر کے علمی اور روحانی مشاغل کے ساتھ ساتھ بڑا کام یہ کیا کہ یورپ اور ایشیا کے زائرین سے ان ممالک کے متعلق پوری واقفیت حاصل کی۔"

(علمائے ہند کا شاندار ماضی۔ص 5)

لہٰذا شاہ ولی اللہ صاحب خود ایک خط میں لکھتے ہیں۔

احوال ہند بر ما مخفی نیست کہ خود مولد و منشاء فقیر است بلاد عرب نیز دیدم واحوال مردم ولایت از ثقافت اینجا شنیدم۔

ہندوستان کے حالات ہم پر پوشیدہ نہیں ہیں کیونکہ ہندوستان خود اپنا وطن ہے۔ ممالک عرب بھی دیکھ لئے ہیں اور ولایت والوں کے حالات وہاں کے معتمد لوگوں کے ذریعہ معلوم ہوئے ہیں۔

(شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک۔ص 14)

ہندوستان کی حالت زار اور شاہ صاحب کی بے چینی

شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ نے جب آنکھ کھولی تو مغلوں کا طاقتور تاجدار اورنگ زیب عالمگیر دنیائے آب وگل سے رخصت ہو چکا تھا اور شاہ صاحب کا وطن ہندوستان روبزوال تھا جس میں خانہ جنگی، فسادات اور خلفشار وانتشار کے سوا کچھ نہ تھا......

دلی غریب چاروں طرف سے آفات کا ہدف بنی ہوئی تھی، بدامنی اور شورش کے آثار ہر سمت نمایاں تھے۔ مرہٹے، روہیلے، جاٹ، افغان اور سکھ سب ہی ملک گیری کی ہوس میں مبتلا اور فتنہ وفساد پر تلے ہوئے تھے۔ امراء وسلاطین

جن سے کچھ اصلاح کی توقع ہو سکتی تھی ان کی حالت بھی عجیب و غریب تھی۔ کبھی رنگ رلیوں میں مبتلا ہوتے اور کبھی اندرونی و بیرونی فتنوں و شورشوں سے دوچار ہوتے۔

غرض ایک طرف اگر شاہان وقت اپنے اسلاف کی دولت رقص و سرود کی محفلوں اور حسن و جمال کے بازاروں میں لٹا رہے تھے اور دوسری طرف رعایا بدحال، پریشان غربت وافلاس کے ہاتھوں برباد اور ستمگروں کے مظالم سے پامال ہو رہی تھی۔

شاہ ولی اللہ صاحب کے سامنے ایک طرف مغلوں کی کمزور اور بزدل حکومت تھی تو دوسری طرف ملکوں کو بربادی کے دہانے پر لے جانے والی ابھرتی ہوئی قوتیں تھیں۔ شاہ صاحب کے ذہن و دماغ پر ان حالات کا جو اثر ہوا اس کا اندازہ ان کے اس شعر سے ہوتا ہے۔

کان نجوماً اور مضت فی الغیاھب

عیون الافاعی اور روس العقارب

''تاریکیوں میں جو ستارے چمک رہے ہیں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ناگوں کی آنکھیں ہیں یا بچھوؤں کی سر ہیں۔''

لیکن شاہ صاحب جاٹوں، مرہٹوں، سکھوں اور روہیلوں کے حملوں اور شورشوں سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ ایک بیدار مغز مفکر اور جیالے مرد مجاہد کی طرح ملک کی عظمت رفتہ کی بازیابی کے لئے غور و فکر اور جدو جہد شروع کر دی اور شب و روز اسی سوچ بچار میں غلطاں و پیچاں رہتے کیونکہ عالمگیر کے نالائق جانشین حکمرانوں سے مایوس ہو چکے تھے۔ سکھوں اور روہیلوں جیسے شر پسندوں کے مقابلہ کا ان میں دم خم نہیں پاتے تھے اور ملک کو غلط طاقتوں کا تختۂ مشق بننے سے روکنا ضروری تھا۔ لہٰذا ضروری تھا کہ کسی ایک طاقت کا سہارا لیا جائے جو ان شر پسند طاقتوں کو زیر کر سکے اور خود ملک گیری اور وسعت پسندی کے جذبات سے پاک ہو اگرچہ وہ طاقت غیر ملکی ہی ہو۔ لہٰذا اس سلسلہ میں آپ کی سیاسی بصیرت نے احمد شاہ ابدالی کا انتخاب فرمایا، مجبوراً احمد شاہ ابدالی کو آواز دی اور نواب نجیب الدولہ کی معرفت احمد شاہ ابدالی کو قندھار سے بلوایا۔ جس نے سب سے پہلے پانی پت کی لڑائی میں مرہٹوں سے ٹکر لے کر ان کے دانت کھٹے کر دیئے اور اس طرح ان کا زور ٹوٹ گیا۔ لیکن سلطنت دہلی کا نظم و نسق کچھ اس حد تک ناقص ہو چکا تھا کہ وہ اتنی بڑی فتح سے معمولی استفادہ بھی نہ کر سکا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ بعض صوبوں میں نظام کچھ مستحکم ہو گیا۔ شاہ صاحب نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے لئے بڑی دردمندانہ اپیل کی تھی اور اس کام میں ہاتھ بٹانے کے لئے دیگر با اثر امراء سے بھی خط و کتابت کی تھی۔

شاہ صاحب احمد شاہ ابدالی کے نام خط تحریر فرماتے ہیں:

> ''عصر حاضر میں آپ سے زیادہ طاقتور اور پُر شوکت کوئی اور بادشاہ موجود نہیں۔ آپ کو ہندوستان کی جانب توجہ کرنا واجب ہے تا کہ مرہٹوں کی قوت ٹوٹے اور ناتواں مسلمان سکون کی سانس لے سکیں۔''

(27/جون 1969ء، ہفتہ روزہ الجمعیۃ، دہلی)

شاہ صاحب کی فرمائش پر احمد شاہ ابدالی کئی بار ہندوستان پر حملہ آور ہوا چونکہ جنگی حالات سے عوام کا متاثر ہونا لابدی ہے، اس لئے احمد شاہ ابدالی کی فوج سے بھی بے گناہ عوام کو مالی و جانی نقصان برداشت کرنا پڑا۔ لہٰذا جس سے شاہ صاحب جیسے دردمند اور محب وطن کا متاثر ہونا بھی یقینی تھا۔ شاہ صاحب بھی فوج کی ان ناشائستہ حرکتوں سے بہت متاثر ہوئے اور فوراً نجیب الدولہ جو احمد شاہ ابدالی کا رازداں اور شاہ صاحب کا بڑا معتقد تھا، ایک طویل خط تحریر فرمایا جس میں ہدایت فرمائی کہ

''جب افواج شاہی کا گزر دہلی میں ہو تو اس وقت اس بات کا پورا انتظام و اہتمام ہونا چاہیے کہ شہر سابق کی طرح ظلم سے پامال نہ ہو جائے، دہلی والے کئی بار لوٹ مار، ہتک عزت اور بے آبروئی کا تماشہ دیکھ چکے ہیں۔ اسی وجہ سے مطلب برآری اور مقاصد میں تاخیر پیش آ رہی ہے۔ آخر میں مظلوموں کی آہ بھی اثر رکھتی ہے۔ اگر اس بار آپ چاہتے ہیں کہ وہ کام جو تشنۂ تکمیل تھے وہ مکمل ہو جائے تو اس بات کی پوری تاکید و پابندی ہونی چاہیے کہ کوئی فوجی دہلی کے مسلمانوں اور غیر مسلموں سے جو ذمی کی حیثیت رکھتے ہیں، تعرض نہ کرے۔''

(شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات۔ ص 28)

جن حالات میں اور جن مقاصد کے لئے شاہ صاحب نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آنے کی دعوت دی اور اس پر جس طرح کی پابندیاں عائد کیں اب کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ شاہ صاحب پر یہ الزام لگائے یا اعتراض کرے کہ آخر شاہ صاحب نے اپنے ملک پر دوسروں کو حملہ کرنے کی دعوت کیوں نہ دی۔ کیونکہ سابقہ تفصیلات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اندرون ملک اصلاح کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی تھی اور پھر دعوت بھی ایسے شخص کو دی جس کا دماغ ملک گیری یا وسعت پسندی کی ہوس سے پاک تھا۔ یہی وجہ ہے احمد شاہ ابدالی اپنا کام مکمل کر کے واپس چلا گیا، غاصب قوموں کی طرح جم کر نہیں بیٹھا جیسا کہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت شاہ صاحب محب وطن تھے، اور اتنے ہی جتنا کہ اس آریہ ورت کا کوئی چار ہزار برس کا باشندہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر گھر میں آگ لگ رہی ہو اور خود گھر والے اس کو بجھانے اور اس پر قابو پانے پر قادر نہ ہوں تو کیا اس وقت باہر والوں کو امداد کے لئے نہ بلانا گھر سے غداری اور خودکشی نہیں ہے؟ سوچنے کی بات یہ ہے کہ احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کی طاقت کو زیر و زبر کیا اور اب پورے ہندوستان میں کوئی طاقت اس کی حریف نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود نجیب الدولہ کو امیر الامراء بنا کر چلا گیا اور خود اس نے اپنی حکومت قائم نہیں کی۔ ایک مؤرخ یہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ حضرت شاہ صاحب کے اشارے اور ایما پر ہی ہوا ہوگا جنہوں نے اپنے گھر کو درست کرنے کے لئے بیرونی امداد تو لی لیکن اپنے ملک پر بیرونی طاقت کا قبضہ گوارا نہیں کیا۔ رہا امداد کے لئے بلانا تو واقعہ یہ ہے کہ مرہٹوں نے اس ملک میں اس قدر مضبوط اقتدار قائم کر لیا تھا اور ان کی وجہ سے پورے ملک میں عام تباہی و بربادی اس درجہ میں پھیلی ہوئی تھی کہ بیرونی امداد کو طلب

کرنے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں تھا، چنانچہ اس معاملہ میں حضرت شاہ صاحب خود اکیلے نہیں، بلکہ خود نجیب الدولہ، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہندو راجہ مہاراجہ، احمد شاہ ابدالی سے امداد کے خواہاں تھے۔

''سیر المتاخرین'' کے الفاظ ہیں:

نجیب الدولہ وراجہائے ہنداز دست مرہٹہ وعماد الملک بجاں آمدہ زوال دولت وملک خود از دست وبرد مرہٹہ برائے العین مشاہدہ نمودہ عرائض استدعا بخدمت احمد شاہ ابدالی نگاشتہ خواہاں درود شدند۔

نجیب الدولہ اور ہندوستان کے راجہ مہاراجوں نے مرہٹوں اور عماد الملک کے ہاتھوں اپنے ملک و دولت کا زوال بچشم خود دیکھ کر احمد شاہ ابدالی کو درخواستیں بھیجیں اور ہندوستان میں اس کے ورود کے خواہاں ہوئے۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسا کہ مرہٹوں کی تاریخ سے ظاہر ہے اور خود ہندو ارباب قلم نے اس کی تصریح کی ہے یہ لوگ انسانیت اور شرافت کے دشمن تھے اور کوئی ظلم وستم ایسا نہیں تھا جو انہوں نے ہندو، مسلمانوں اور عیسائیوں وغیرہ پر روا نہ رکھا ہو، پس یہ ظاہر ہے کہ شاہ صاحب کا ابدالی کو بلانا وطن کی محبت اور اہل ملک کی خیر خواہی کے جذبہ ہی سے تھا اور اس میں وہ بالکل حق بجانب تھے، اگر شاہ صاحب کے پیش نظر صرف مسلمانوں کی خیریت اور بھلائی ہوتی تو وہ نجیب الدولہ کو دہلی بلاتے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ ''ذمیان'' یعنی غیر مسلموں کی بھی صراحت نہ کرتے اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے لئے بھی امن وامان کی درخواست نہ کرتے۔''

(برہان۔ مارچ 1951ء)

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد

انگریز 1608ء میں ہندوستان میں تجارت کے لئے داخل ہوئے تھے۔ اپنی عیارانہ سازشوں کے تحت 1663ء میں اس قابل ہو گئے کہ ہر قسم کی دست درازیوں اور اشتعال انگیزیوں پر اتر آئے اور حکومت وقت سے جنگ کرنے کے لئے پر تولنے لگے۔ تاہم عالمگیر کے عہد تک انہیں سیاست میں دخل اندازی کا براہ راست موقع نہ ملا۔ اگرچہ در پردہ وہ حکومت کی بعض باغی طاقتوں مثلاً مرہٹوں وغیرہ کو اکساتے رہے اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب مرہٹوں نے شیوا جی کی قیادت میں دفعتاً سورت پر حملہ کر کے وہاں کے باشندوں اور تاجروں کو لوٹا تھا تو انگریز تاجروں کی کوٹھیاں محفوظ چھوڑ دی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا کہ انگریز کے ایماء پر ہی یہ خفیہ چھاپہ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق مرہٹوں نے مارا تھا۔

شاہ صاحب انگریزوں کی خفیہ سازشوں سے خوب واقف تھے اور محسوس کرتے رہتے تھے کہ ہندوستان کے مرہٹے انگریزوں کے آلہ کار بن رہے ہیں۔ اس وجہ سے شاہ صاحب نے احمد شاہ ابدالی کو جنگ کی دعوت دی تھی تا کہ مرہٹوں کے ساتھ ساتھ انگریزوں کی بھی ہمتیں پست ہو جائیں۔

شاہ صاحب کی سیاسی تحریک کے ارکان اول

شاہ صاحب کے مخصوص تلامذہ ومعتقدین اور آزادی وطن کے اولین مجاہدین کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں:

(1) مولانا محمد عاشق پھلتی (2) مولانا نوراللہ بڈھانوی (3) مولانا محمد امین صاحب کشمیری (4) مولانا شاہ ابوسعید صاحب (5) شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (6) مولانا مخدوم صاحب لکھنوی

انحطاط وزوال کے اسباب وعلل

شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دنیائے اسلام کے عظیم مفکر، زیرک دانشور، مخلص مصلح اور مجدد امت تھے۔ انہوں نے سلطنت مغلیہ کے زوال وانحطاط کے بنیادی سبب اقتصادی انحطاط کو قرار دے کر باقی اسباب کو اس کا تابع اور لازمی نتیجہ قرار دیا ہے اور مسلم معاشرہ کے زوال پذیر ہونے کا اصل سبب شعائر اسلامی سے روگردانی اور علوم دینیہ سے غفلت کر بتایا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جب انسان اپنے دین اور علوم دینیہ سے دور ہوتا ہے تو مذہبی پستی میں چلا جاتا ہے اور پھر دنیا کی نظر میں وہ اور اس کا مذہب دونوں بے وقعت ہو جاتے ہیں اور جب انسان اقتصادی اعتبار سے کمزور ہوتا ہے تو اس کو دور کرنے کے لئے چوری، ڈکیتی، رشوت خوری میں مبتلا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض مرتبہ انصاف کی کرسی پر بیٹھ کر انصاف کا خون کرتا ہے اور انتظامی عہدوں پر فائز ہو کر بدنظمی پھیلاتا ہے اور ان تمام مفاسد کی آبیاری عالم نما جاہلوں اور موروثی پیرزادوں اور بے ایمان اور مفاد پرست ارکان دولت اور عیش پسند بادشاہوں اور منافع خور تاجروں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ جیسا کہ پروفیسر خلیق نظامی صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ

> ”مسلم سوسائٹی کے زوال کا سبب ان (شاہ صاحب) کے خیال میں مذہبی شعار سے بے اعتنائی اور علوم دینیہ سے بے تعلقی تھی۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کا سبب انہوں نے اقتصادی انحطاط کو قرار دیا تھا اسی کے باعث تمام سیاسی انتشار اور بدنظمیاں پیدا ہوئی تھیں۔ فرماتے ہیں کہ جس سوسائٹی میں اقتصادی توازن نہ ہو اس میں طرح طرح کے روگ پیدا ہو جاتے ہیں۔ نہ وہاں عدل و انصاف قائم ہو سکتا ہے اور نہ مذہب ہی اپنا اچھا اثر ڈال سکتا ہے۔
>
> (شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات۔ ص 33)

اس لئے شاہ صاحب کو مرد حق آگاہ ونبض شناس زمانہ اور حق گو مرد مجاہد ہونے کی بنا پر حق بات کہنے سے نہ بادشاہوں کی سطوت روک سکتی تھی نہ فوجیوں کی توپ وتفنگ ان کی سدراہ ہو سکتی تھی اور نہ جاہل واعظوں، خشک زاہدوں اور موروثی پیرزادوں کے جاہل معتقدین کی بھیڑ ان کو مرعوب کر سکتی تھی لہٰذا اس مرد مجاہد نے انتہائی جرأت اور بیباکی کے ساتھ بادشاہوں، فوجیوں واعظوں، خشک زاہدوں اور پیرزادوں کی اصل بیماریوں اور خود فریبیوں کی مخلصانہ نشاندہی کی اور ان کی دکھتی ہوئی رگوں پر انگلی رکھی اور جہاں تک معاشی خرابیوں کا تعلق ہے اس میں تقریباً ہر طبقہ کو یکساں گرفتار پاتے ہوئے ایک مخلص قائد، دردمند مصلح اور مرد حق آگاہ کی حیثیت سے تمام ہی طبقوں کو خطاب فرمایا ہے۔

سلاطین اسلام سے خطاب

''اے بادشاہو! ملاء اعلیٰ کی مرضی اس زمانہ میں اس امر پر مستقر ہو چکی ہے کہ تم تلواریں کھینچ لو اور اس وقت تک نیام میں داخل نہ کرو جب تک مسلم مشرک سے بالکلیہ جدا نہ ہو جائے اور اہل کفر و فسق کے سرکش لیڈر کمزوروں کے گروہ میں جا کر شامل نہ ہو جائیں اور یہ کہ ان کے قابو میں پھر کوئی ایسی بات نہ رہ جائے جس کی بدولت وہ آئندہ سر اٹھا سکیں، قاتلو هم حتى لاتكون فتنة و يكون الدين كله لله (یعنی ان سے جنگ کرتے رہو۔ تا آنکہ فتنہ فرد ہو جائے، اور ''دین'' صرف اللہ کے لئے مخصوص ہو جائے) پھر جب کفر و اسلام کے درمیان ایسا کھلا نمایاں امتیاز پیدا ہو جائے، تب تمہیں چاہیے کہ ہر تین یا چار دن کے سفر کی منزلوں پر اپنا ایک ایک حاکم مقرر کرو، ایسا حاکم جو عدل و انصاف کا مجسمہ ہو، قوی ہو، جو ظالم سے مظلوم کا حق وصول کر سکتا ہو اور خدا کے حدود کو قائم کر سکتا ہو اور اس میں سرگرم ہو کر پھر لوگوں میں بغاوت و سرکشی کے جذبات پیدا نہ ہوں، نہ وہ جنگ پر آمادہ ہوں اور نہ دین سے مرتد ہونے کی کسی میں جرأت باقی رہے، نہ کسی گناہ کبیرہ کے ارتکاب کی کسی کو مجال ہو، اسلام کا کھلے بندوں اعلان ہو، اور اس کے شعائر کا اعلانیہ اظہار کیا جائے، ہر شخص اپنے متعلقہ فرائض کو صحیح طور پر ادا کرے، چاہیے کہ ہر شخص کا حاکم اپنے پاس اتنی قوت رکھے جس کے ذریعہ سے اپنی متعلقہ آبادی کی اصلاح کر سکتا ہو۔

مگر اسی کے ساتھ اس کو اتنی قوت فراہم کرنے کا موقع نہ دیا جائے جس کے بل بوتے پر وہ خود ان سے نفع گیر ہونے کی تدبیریں سوچنے لگے اور حکومت کے مقابلہ پر آمادہ ہو جائے۔ چاہیے کہ اپنے متعلقہ مقبوضات کے بڑے علاقہ اور اقلیم پر ایسے امیر مقرر کیے جائیں جو جنگی مہمات کا اختیار رکھتے ہوں۔ ایسے امیر کے ساتھ بارہ ہزار کی جمعیت رکھی جائے، مگر جمعیت ایسے آدمیوں سے بھری ہو جن کے دل میں جہاد کا ولولہ ہو اور خدا کی راہ میں کسی کی ملاقات سے خوفزدہ نہ ہوں۔ ہر سرکش اور متمرد سے جنگ اور مقابلہ کی ان میں صلاحیت ہو۔

اے بادشاہو! جب تم یہ کر لو گے تو اس کے بعد ملاء اعلیٰ کی رضامندی یہ چاہے گی کہ تم لوگوں کی منزل اور عائلی زندگی کی طرف توجہ کرو، ان کے باہمی معاملات کو سلجھاؤ اور ایسا کر دو کہ پھر کوئی معاملہ ایسا نہ ہونے پائے جو شرعی قوانین کے مطابق نہ ہو، اسی کے بعد لوگ امن و امان کی صحیح مسرت سے فائز المرام ہو سکتے ہیں۔''

امراء وارکان دولت سے خطاب

''اے امیرو! دیکھو کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے، دنیا کی فانی لذتوں میں تم ڈوبے جا رہے ہو اور جن

لوگوں کی نگرانی تمہارے سپرد ہوئی ہے، ان کو تم نے چھوڑ دیا ہے تا کہ ان میں بعض بعض کو کھاتے اور نگلتے رہیں۔ کیا تم اعلانیہ شرابیں نہیں پیتے؟ اور پھر اپنے اس فعل کو تم برا بھی نہیں سمجھتے، تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ بہت سے لوگوں نے اونچے اونچے محل اس لئے کھڑے کیے ہیں کہ ان میں زناکاری کی جائے اور شرابیں ڈھالی جائیں، جوا کھیلا جائے، لیکن ان بڑے بڑے شہروں کا جن میں چھ سو سال سے کسی پر حد شرعی نہیں جاری ہوئی جب کوئی کمزور مل جاتا ہے تو اسے پکڑ لیتے ہو اور جب کوئی قوی ہوتا ہے تو چھوڑ دیتے ہو۔ تمہاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لذیذ کھانوں کی قسمیں پکواتے رہو اور نرم گداز جسم والی عورتوں سے لطف اٹھاتے رہو، اچھے کپڑوں اور اونچے مکانات کے سوا تمہاری توجہ اور کسی چیز کی طرف منعطف نہیں ہوتی۔ کیا تم نے اپنے سر کبھی اللہ کے سامنے جھکائے؟ خدا کا نام تمہارے پاس صرف اس لئے رہ گیا ہے کہ اپنے تذکروں اور قصے کہانیوں میں اس نام کو استعمال کرو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے لفظ سے تمہاری مراد زمانہ کا انقلاب ہے کیونکہ تم اکثر بولتے ہو خدا قادر ہے کہ ایسا کر دے یعنی زمانہ کے انقلاب کی یہ تعبیر ہے۔''

اہلِ صنعت و حرفت سے خطاب

''ارباب پیشہ! دیکھو! امانت کا جذبہ تم سے مفقود ہو گیا ہے، تم اپنے رب کی عبادت سے بالکل خالی الذہن ہو چکے ہو اور تم اپنے فرضی بنائے ہوئے معبودوں پر قربانیاں چڑھاتے ہو۔ تم مدار اور سالار کا حج کرتے ہو، تم میں بعض لوگوں نے فال بازی اور ٹوٹکا اور گنڈے وغیرہ کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے۔ یہی ان کی دولت ہے اور یہی ان کا ہنر ہے۔ یہ لوگ خاص قسم کا لباس اور جامہ اختیار کرتے ہیں، خاص طرح سے کھانے کھاتے ہیں، ان میں جن کی آمدنی کم ہوتی ہے وہ اپنی عورتوں اور اپنے بچوں کے حقوق کی پروا نہیں کرتے، تم میں بعض صرف شراب خوری کو پیشہ بنائے ہوئے ہیں اور تم ہی میں کچھ لوگ عورتوں کو کرایہ پر چلا کر پیٹ پالتے ہیں۔ یہ کیسا بد بخت آدمی ہے اپنی دنیا اور آخرت دونوں کو برباد کر رہا ہے۔ حالانکہ حق تعالیٰ نے تمہارے لئے مختلف قسم کے پیشے اور کمانے کھانے کے دروازے کھول رکھے ہیں، جو تمہاری اور تمہارے متعلقین کی ضرورتوں کے لئے کافی ہو سکتے ہیں، بشرطیکہ تم اعتدال کی راہ اپنے خرچ میں اختیار کرو اور محض اتنی روزی پر قناعت کرنے کے لئے آمادہ ہو جاؤ جو تمہیں بآسانی اخروی زندگی کے نتائج تک پہنچا دے، لیکن تم نے خدا کی ناشکری کی اور غلط راہ حصولِ رزق کی اختیار کی۔ کیا تم جہنم کے عذاب سے نہیں ڈرتے، جو بڑا برا بچھونا ہے؟

دیکھو! اپنی صبح و شام کو تم خدا کی یاد میں بسر کیا کرو اور دن کے بڑے حصہ کو اپنے پیشہ میں صرف

کرو اور رات کو اپنی عورتوں کے ساتھ گزارو، اپنے خرچ کو اپنی آمدنی سے ہمیشہ کم رکھا کرو، پھر جو بچ جایا کرے اس سے مسافروں کی، مسکینوں کی مدد کیا کرو اور کچھ اپنے اتفاقی مصائب اور ضرورتوں کے لئے پسماندہ بھی کیا کرو، تم نے اگر اس راہ کو اختیار نہ کیا تو تم غلط راہ پر جا رہے ہو اور تمہاری تدبیر درست نہیں۔''

(تفہیمات۔ص 217)

پھر اسی طرح مشائخ کی اولاد، اس زمانہ کے طلبہ علم اور واعظوں زاہدوں کو بھی آپ نے خصوصیت کے ساتھ پکارا ہے، مثلاً مشائخ کی اولاد کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

مشائخ کی اولاد یعنی پیرزادوں سے خطاب

اے وہ لوگو! جو اپنے آباؤ اجداد کے رسوم کے بغیر کسی حق کے پکڑے ہوئے ہو، یعنی گذشتہ بزرگانِ دین کی اولاد میں ہو، میرا آپ سے سوال ہے کہ آپ کو کیا ہو گیا ہے کہ ٹکڑیوں ٹکڑیوں، ٹولیوں ٹولیوں میں آپ بٹ گئے ہیں، ہر ایک اپنے اپنے راگ اپنی منڈلی میں آلاپ رہا ہے اور جس طریقہ کو اللہ نے اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے نازل فرمایا تھا اور محض اپنے لطف و کرم سے جس راہ کی طرف راہنمائی فرمائی تھی۔ اسے چھوڑ کر ہر ایک تم ایک مستقل پیشوا بنا ہوا ہے اور لوگوں کو اسی کی طرف بلا رہا ہے۔ اپنی جگہ اپنے کو راہ نما ٹھہرائے ہوئے ہے، حالانکہ دراصل وہ خود گم کردۂ راہ اور دوسروں کو بھٹکانے والا ہے، ہم ایسے لوگوں کو قطعاً پسند نہیں کرتے جو محض لوگوں کو اس لئے مرید کرتے ہیں تا کہ ان سے ٹکے وصول کریں، ایک علم شریف کو سیکھ کر دنیا بٹورتے ہیں، کیونکہ جب تک اہل دین کی شکل وشباہت اور طرز وانداز وہ نہ اختیار کریں گے دنیا حاصل نہیں ہو سکتی۔

اور نہ میں ان لوگوں سے راضی ہوں جو سوائے اللہ و رسولؐ کے خود اپنی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں اور اپنی مرضی کی پابندی کا لوگوں کو حکم دیتے ہیں، یہ لوگ بٹ مار اور راہ زن ہیں۔ ان کا شمار دجالوں، کذابوں، فتانوں اور ان لوگوں میں ہے جو خود فتنہ اور آزمائش کے شکار ہیں۔

خبردار! خبردار! ہرگز اس کی پیروی نہ کرنا جو اللہ کی کتاب اور رسولؐ کی سنت کی طرف دعوت نہ دیتا ہو اور اپنی طرف بلاتا ہو، اور چاہیے کہ زبانی جمع خرچ صوفیائے کرام کے اشاروں کے متعلق عام مجلسوں میں نہ کیا جائے کیونکہ مقصد تو (تصوف) سے صرف یہ ہے کہ آدمی کو احسان کا مقام حاصل ہو جائے۔ لوگو! دیکھو! کیا تمہارے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس ارشاد میں کوئی عبرت نہیں ہے؟ ''**وان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ و لاتتبعو السبل فتفرق بکم من سبیلہ**'' یہی میری رہ ہے سیدھی، تو اس پر چل پڑو اور مختلف راہوں کے پیچھے نہ پڑو۔ وہ تمہیں اللہ کی راہ سے بچھڑا دیں گے۔'' (انعام:153)

غلط کار علماء سے خطاب

''ارے بدعقلو! جنہوں نے اپنا نام علماء رکھ چھوڑا ہے، تم یونانیوں کے علوم میں ڈوبے ہوئے اور صرف ونحو ومعانی میں غرق ہو اور سمجھتے ہو کہ یہی علم ہے، یاد رکھو! علم یا تو قرآن کی کسی آیت محکم کا نام ہے یا سنت ثابتہ قائمہ کا۔ چاہیے کہ قرآن سیکھو، پہلے اس کے غریب لغات کو حل کرو، پھر سبب نزول کا پتہ چلاؤ اور اس کے مشکلات کو حل کرو، اسی طرح جو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح ثابت ہو چکی ہے، اسے محفوظ کرو، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کس طرح پڑھتے تھے، وضو کرنے کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا طریقہ تھا؟ اپنی ضرورت کے لئے کس طرح جاتے تھے اور حج کیونکر ادا فرماتے تھے؟ جہاد کا آپ کے کیا قاعدہ تھا؟ گفتگو کا کیا انداز تھا؟ اپنی زبان کی حفاظت کس طرح فرماتے تھے، حضورؐ کے اخلاق کیا تھے؟ چاہیے کہ حضورؐ کی پوری روش کی پیروی کرو اور آپ کی سنت پر عمل کرو مگر اس میں بھی اس کا خیال رہے کہ جو سنت ہے اسے سنت ہی سمجھو، نہ کہ اس کو فرض کا درجہ عطا کرو۔ اس طرح چاہیے کہ جو تم پر فرائض ہیں انہیں سیکھو مثلاً وضو کے ارکان کیا ہیں؟ نماز کے ارکان کیا ہیں؟ زکوٰۃ کا نصاب کیا ہے؟ قدر واجب کیا ہے؟ میت کے حصوں کی مقدار کیا ہے؟ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عام سیرت کا مطالعہ کرو جس سے آخرت کی رغبت پیدا ہو صحابہؓ اور تابعین کے حالات پڑھو، اور یہ چیزیں فرائض سے فاضل اور زیادہ ہیں، لیکن ان دنوں تم جن چیزوں میں الجھے ہوئے ہو اور جس میں سرکھپا رہے رہو، اس کو آخرت کے علم سے کیا واسطہ؟ یہ دنیا کے علوم ہیں۔''

پھر ان ہی طلباء کو فرماتے ہیں:

''جن علوم کی حیثیت صرف ذرائع اور آلات کی ہے (مثلاً صرف ونحو وغیرہ) تو ان کی حیثیت آلہ اور ذریعہ ہی کی رہنے دو، نہ کہ خود انہیں کو مستقل علم بنا بیٹھو، علم کا پڑھنا تو اس لئے واجب ہے کہ اس کو سیکھ کر مسلمانوں کی بستیوں میں اسلامی شعائر کو رواج دو، لیکن تم نے دینی شعار اور اس کے احکام کو تو پھیلایا نہیں اور لوگوں کو زائد از ضرورت باتوں کا مشورہ دے رہے ہو۔

تم نے اپنے حالات سے عام مسلمانوں کو یہ باور کرا دیا ہے کہ علماء کی بڑی کثرت ہو چکی ہے، حالانکہ ابھی کتنے بڑے بڑے علاقے ہیں، جو علماء سے خالی ہیں اور جہاں علماء بھی پائے جاتے ہیں وہاں بھی دینی شعاروں کی غلبہ حاصل نہیں ہے۔'' پھر

آپ نے ان لوگوں کو بھی مخاطب کیا ہے جنہوں نے اپنے وسوسوں کا نام دین رکھ چھوڑا ہے اور ان کے وسواسی معیار پر پورا نہیں اترتا گویا دین سے وہ خارج ہے۔ اس گروہ میں زیادہ تر زہاد، عباد اور وعاظ ہی اس زمانہ میں مبتلا تھے اس لئے عنوان کا آغاز انہیں سے کیا گیا ہے، فرماتے ہیں:

دین میں تنگی پیدا کرنے والے واعظوں اور کنج نشین زاہدوں سے خطاب

''دین میں خشکی اور سختی کی راہ اختیار کرنے والوں سے میں پوچھتا ہوں اور واعظوں اور عابدوں اور ان کنج نشینوں سے سوال ہے جو خانقاہوں میں بیٹھے ہیں کہ بہ جبر اپنے اوپر دین کو عائد کرنے والو! تمہارا کیا حال ہے ہر بری بھلی بات، ہر رطب دیا بس پر تمہارا ایمان ہے، لوگوں کو تم جعلی اور گڑھی ہوئی حدیثوں کا وعظ سناتے ہو، اللہ کی مخلوق پر تم نے زندگی تنگ کر چھوڑی ہے، حالانکہ تم تو (اے امت محمدیہ) اس لئے پیدا ہوئے تھے کہ لوگوں کو آسانیاں بہم پہنچاؤ گے نہ کہ ان کو دشواریوں میں مبتلا کر دو گے، تم ایسے لوگوں کی باتیں دلیل میں پیش کرتے ہوئے جو بیچارے مغلوب الحال تھے اور عشق و محبت الٰہی میں عقل و حواس کھو بیٹھے تھے، حالانکہ اہل عشق کی باتیں وہیں کی وہیں لپیٹ کر رکھ دی جاتی ہیں، نہ کہ ان کا چرچا کیا جاتا ہے، تم نے وسواس کو اپنے لئے گوارا کر لیا ہے اور اس کا نام احتیاط رکھ چھوڑا ہے، حالانکہ تمہیں صرف یہ چاہیے تھا کہ اعتقاداً و عملاً احسان کے مقام کے لئے جن امور کی ضرورت ہے بس اس کو سیکھ لیتے، لیکن جو بیچارے اپنے اپنے خاص حال میں مغلوب تھے، خواہ مخواہ ان کی باتوں کو احسانی، خالص امور میں گڈمڈ کرنے کی حاجت نہ تھی اور نہ ارباب کشف کی چیزوں کو ان میں مخلوط کرنے کی ضرورت تھی، چاہیے کہ مقامِ احسان کی طرف لوگوں کو بلاؤ، پہلے اسے خود سیکھ لو، پھر دوسروں کو دعوت دو، کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ سب سے بڑی رحمت اور سب سے بڑا کرم اللہ کا وہ ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنچایا ہے۔ وہی صرف ہدایت ہے، جو آپ کی ہدایت ہے پھر تم کیا بتا سکتے ہو کہ تم جن افعال کو کرتے ہو وہ رسول اللہؐ اور آپ کے صحابہؓ کرامؓ کیا کرتے تھے۔''

آخر میں ایک عام خطاب عام مسلمانوں کے نام ہے جس میں کسی خاص طبقہ کی تخصیص نہیں ہے۔ فرماتے ہیں:

عام امتِ مسلمہ سے جامع خطاب، امراض کی تشخیص اور علاج کی تجویز

میں مسلمانوں کی عام جماعت کی طرف اب مخاطب ہوں اور کہتا ہوں، اے آدمی کے بچو! دیکھو تمہارے اخلاق سو چکے ہیں۔ تم پر بیجا حرص و آز کا ہوکا سوار ہو گیا ہے، تم پر شیطان نے قابو پالیا ہے۔ عورتیں مردوں کے سر چڑھ گئی ہیں اور مرد عورتوں کے حقوق برباد کر رہے ہیں۔ حرام کو تم نے اپنے لئے خوشگوار بنا لیا ہے اور حلال تمہارے لئے بدمزہ ہو چکا ہے۔ پھر قسم ہے اللہ کی، اللہ نے ہرگز کسی کو اسے بس سے زیادہ تکلیف نہیں دی ہے، چاہیے کہ تم اپنی شہوانی خواہشوں کو نکاح کے ذریعہ پوری کرو، خواہ تمہیں ایک سے زیادہ نکاح ہی کیوں نہ کرنا پڑے اور اپنے مصارف وضع قطع

میں تکلف سے کام نہ لیا کرو۔ اسی قدر خرچ کرو جس کی تم میں سکت ہو، یاد رکھو! ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھاتا اور اپنے اوپر خواہ مخواہ تنگی سے کام نہ لو، اگر تم ایسا کرو گے تو تمہارے نفوس بالآخر فسق کے حدود تک پہنچ جائیں گے، اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتا ہے کہ اس کے بندے اس کی آسانیوں سے نفع اٹھائیں، جیسا کہ یہ بھی اسی کو پسند ہے کہ جو چاہیں وہ اعلیٰ مدارج پر احکام کی پابندی بھی کر سکتے ہیں۔ اپنے شکم کی خواہشوں کی تکمیل چاہیے کہ کھانوں سے کرو اور اتنا کمانے کی کوشش کرو جس سے تمہاری ضرورتیں پوری ہوں، دوسروں کے سینوں کے بوجھ بننے کی کوشش نہ کرو کہ ان سے مانگ مانگ کر کھایا کرو، تم ان سے مانگو اور وہ نہ دیں، اسی طرح بیچارے بادشاہوں اور حکام کے اوپر بھی بوجھ نہ بن جاؤ، تمہارے لئے یہی پسندیدہ ہے کہ تم خود کما کر کھایا کرو، اگر تم ایسا کرو گے تو خدا تمہیں معاش کی بھی راہ سجھائے گا۔ جو تمہارے لئے کافی ہوگی۔

اے آدم کے بچو! جسے خدا نے ایک جائے سکونت دے رکھی ہو جس میں وہ آرام کرے، اتنا پانی جس سے وہ سیراب ہو، اتنا کھانا جس سے بسر ہو جائے، اتنا کپڑا جس سے تن ڈھک جائے ایسی بیوی جو اس کی شرمگاہ کی حفاظت کر سکتی ہو اور اس کو رہن سہن کی جدوجہد میں مدد دے سکتی ہو تو یاد رکھو کہ دنیا کامل طور سے اس شخص کو مل چکی ہے، چاہیے کہ اس پر خدا کا شکر کرے۔

بہرحال کوئی نہ کوئی کمائی کی راہ آدمی ضرور اختیار کرے اور اسی کے ساتھ قناعت کو اپنا دستور زندگی بنائے اور رہنے سہنے میں اعتدال کا جادہ اختیار کرے اور اللہ کی یاد کے لئے جو فرصت ہم دست ہو اسے غنیمت شمار کرے، کم از کم تین وقتوں صبح شام اور پچھلی رات کے ذکر کا خاص طور پر خیال رکھے، حق تعالیٰ کی یاد اس کی تسبیح وتہلیل اور قرآن کی تلاوت کے ذریعہ سے کیا کرے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سنے اور ذکر کے حلقوں میں حاضر ہوا کرے۔

اے آدم کے بچو! تم نے ایسے بگڑے ہوئے رسوم اختیار کر لئے ہیں جن سے دین کی اصلی صورت بگڑ گئی ہے۔ تم عاشورا کے دن جھوٹی باتوں پر اکھٹے ہوتے ہو، اسی طرح شب برأت میں کھیل کود کرتے ہو، اور مردوں کے لئے کھانے پکا پکا کر کھلانے کو اچھا خیال کرتے ہو، اگر تم سچے ہو تو اس کی دلیل پیش کرو۔

اسی طرح اور بھی بری بری رسمیں تم میں جاری ہیں جس نے تم پر تمہاری زندگی تنگ کر دی ہے، مثلاً تقریبات کی دعوتوں میں تم نے حد سے زیادہ تکلف برتنا شروع کر دیا ہے، اسی طرح ایک بری رسم یہ بھی ہے کہ کچھ بھی جائے لیکن طلاق کو گویا تم نے ناجائز ٹھہرا لیا ہے، یونہی بیوہ عورتوں کو نکاح سے روکے رہتے ہو، ان رسموں میں تم اپنی دولت ضائع کرتے ہو، وقت برباد کرتے ہو اور جو صحت بخش روش تھی، اسے چھوڑ بیٹھے ہو۔

تم نے اپنی نمازیں برباد کر رکھی ہیں، تم میں کچھ لوگ ہیں، جو دنیا کمانے میں اور اپنے دھندوں میں

اتنے پھنس گئے ہیں کہ نماز کا انہیں وقت ہی نہیں ملتا، کچھ لوگ ہیں، جو قصہ کہانی سننے میں وقت گنواتے ہیں۔ خیر پھر بھی اگر ایسی مجلسیں لوگ ایسے مقامات پر قائم کیا کرتے جو مسجدوں سے قریب ہوں تو شاید ان کی نمازیں ضائع نہ ہوتیں، تم نے زکوٰۃ کو بھی چھوڑ دیا ہے حالانکہ کوئی ایسا دولت مند نہیں ہے جس کے اقربا واعزہ میں حاجت مند لوگ نہیں ہوتے۔ اگر ان لوگوں کی وہ مدد کیا کریں اور ان کو کھلایا پلایا کریں اور زکوٰۃ کی نیت کرلیا کریں تو یہ بھی ان کے لئے کافی ہوسکتی ہے، تم میں بعضوں نے روزے چھوڑ رکھے ہیں۔ خصوصاً جو فوجی ملازم ہیں کہتے ہیں کہ وہ روزہ رکھنے پر قادر نہیں ہیں، یعنی جو محنت انہیں برداشت کرنی پڑتی ہے اس کے ساتھ وہ روزے نہیں رکھ سکتے، تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ تم نے راہ غلط کردی ہے اور تم حکومت کے سینہ پر بوجھ بن گئے ہو، بادشاہ جب اپنے خزانہ میں اتنی گنجائش نہیں پاتا جس سے تمہاری تنخواہ ادا کرے، تب رعایا پر زندگی کو دشوار کرتا ہے، سپاہیو! یہ تمہاری کیسی بری عادت ہے۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو روزے رکھتے ہیں۔ لیکن سحری نہیں کرتے اور رمضان میں ان سخت کاموں کو نہیں چھوڑتے جن کی وجہ سے روزے ان پر گراں ہوجاتے ہیں۔

ملاءاعلیٰ کی طرف سے اصلاحی مطالبات کا اس زمانہ میں جن جن امور سے متعلق تقاضا ہورہا ہے اس کا ایک طویل باب ہے لیکن کھڑکی سے آدمی بڑی نیکیوں کو جھانک سکتا ہے اور ڈھیر کے لئے اس کا نمونہ کافی ہے۔

(تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ۔ص 100)

اور اقتصادی و معاشی نظام کو تباہ و برباد کرنے والوں کو متنبہ فرمانے کے بعد شاہ صاحب نے اپنی سیاسی مہارت اور روحانی بصیرت سے قرآن وحدیث کی روشنی میں ایک ایسا جامع اور مفید نظام معاشیات مرتب فرمایا کہ اس کی نظیر پیش کرنے سے دنیا عاجز ہے اور شاہ صاحب کے انتقال کے پچاس پچپن سال بعد جو ''نظریہ اقتصادیات'' دنیا کے سامنے پیش کیا گیا، جس کو معاشیات کے حل میں شاہکار کا درجہ دیا جاتا ہے اور کارل مارکس جس کو اقتصادیات کے حل کا داعی اور موسس کہا جاتا ہے اور اس نظریہ کا زبردست حامی اور کارل مارکس کا دست راست اسٹالن وہ بھی شاہ صاحب کے مرتب کردہ اصول وضوابط کو سن کر دنگ رہ گیا۔ جیسا کہ مولانا عبیداللہ سندھی تحریر فرماتے ہیں کہ

''میں نے شاہ صاحب کے فکر کی روشنی میں اسلام کا معاشی فکر اسٹالن کے سامنے پیش کیا تو وہ بہت متاثر ہوا۔''

(شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک۔ص 15)

مگر افسوس یہ ہے کہ پریس اور پروپیگنڈے کی وہ طاقت جو مارکس کے متبعین کو اور انقلابِ فرانس کے داعیان کو حاصل ہوئی وہ حضرت شاہ صاحب کے افکار کی اشاعت کے لئے میسر نہ آسکی۔ ورنہ اہل دنیا ہزار اسلام بیزاری اور مذہب

بیزاری کے ولی اللہی فکر کو گلے لگاتے اور کارل مارکس ......اور اسٹالن کی جانب نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتے۔ ناظرین کو شاہ صاحب کے اصول معاشیات روشناس کرانے کے لئے چند اصول پیش کیے جاتے ہیں۔

ملاحظہ فرمائیں:

شاہ صاحب کے اقتصادی اصول

1- دولت کی اصل بنیاد محنت ہے۔ مزدور کاشتکار قوت کا سبہ ہیں۔ باہمی تعاون مدنیت (شہریت) کی روح رواں ہیں، جب تک کوئی شخص ملک وقوم کے لئے کام نہ کرے ملک کی دولت میں اس کا حصہ نہیں۔

(حجۃ اللہ البالغہ، باب سیاستہ المدنیۃ۔ البدور البازغہ، بحث اتفاق الثابت اور الخیر الکثیر)

2- جوا، سٹہ اور عیاشی کے اڈے ختم کیے جائیں جن کی موجودگی میں تقسیم دولت کا صحیح نظام نہیں ہوسکتا۔

(حجۃ اللہ البالغہ۔ باب ابتغاء الرزق)

3- مزدور کاشتکار اور جو لوگ ملک وقوم کے لئے دماغی کام کریں، دولت کے اصل مستحق ہیں۔ ان کی ترقی وخوش حالی ملک وقوم کی ترقی وخوشحالی ہے۔ جو نظام ان قوتوں کو دبائے وہ ملک کے لئے خطرہ ہے۔

(حجۃ اللہ البالغہ۔ باب ابتغاء الرزق)

4- جو سماج محنت کی صحیح قیمت ادا نہ کرے، مزدوروں اور کاشتکاروں پر بھاری ٹیکس لگائے قوم کا دشمن ہے۔

(حجۃ اللہ البالغہ۔ باب السیاستہ المدنیۃ ایضاً باب السائرہ بین الناس)

5- جو پیداوار اور آمدنی باہمی تعاون کے اصول پر نہ ہو وہ خلاف قانون ہے۔

(حجۃ اللہ البالغہ۔ باب ابتغاء الرزق)

6- کام کے اوقات محدود کیے جائیں، مزدوروں کو اتنا وقت ضرور ملنا چاہیے کہ وہ اخلاقی وروحانی اصلاح کرسکیں اور ان کے اندر مستقبل کے متعلق غور وفکر کی صلاحیت پیدا ہوسکے۔

(حجۃ اللہ البالغہ۔ باب ثانیہ الارتفاقات وباب اصلاح الرسوم وباب ضبط المبہم)

7- تعاون باہمی کا بڑا ذریعہ تجارت ہے۔ لہٰذا اس کو تعاون کے اصول پر ہی جاری رہنا چاہیے پس تاجروں کے لئے جائز نہیں کہ وہ بلیک مارکیٹ یا غلط قسم کے کمیشن لگا کر تجارت کے فروغ وترقی میں رکاوٹ پیدا کریں۔

(حجۃ اللہ البالغہ۔ باب البیوع المنہی عنہا)

8-وہ کاروبار جو دولت کی گردش کو کسی خاص طبقہ میں منحصر کر دے۔ ملک کے لئے تباہ کن ہے۔
(حجۃ اللہ البالغہ۔ باب الاتفاق الرابع و باب البیوع المنہی عنہا)

9-وہ شاہانہ نظام زندگی جس میں چند اشخاص یا چند خاندان کے عیش و عشرت کے سبب سے دولت کی صحیح تقسیم میں خلل واقع ہو اس کا مستحق ہے کہ اس کو جلد از جلد ختم کر کے عوام کی مصیبت ختم کی جائے اور ان کو مساویانہ نظام زندگی کا موقع دیا جائے۔

(حجۃ اللہ البالغہ۔ باب الرسوم السائرۃ بین الناس، باب السیاستہ المدنیۃ و ایضاً باب ابتغاء الرزق و باب البیوع المنہی عنہا)

سیاست اور نظام حکومت کے بنیادی اصول

1-زمین کا حقیقی مالک اللہ ہے۔ باشندگانِ ملک کی حیثیت وہ ہے جو کسی مسافر خانہ میں ٹھہرنے والوں کی۔ ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حق انتفاع میں دوسرے کی دخل اندازی قانوناً ممنوع ہو۔

(حجۃ اللہ البالغہ، باب ابتغاء الرزق)

2-سارے انسان برابر ہیں۔ کسی کو حق نہیں کہ وہ اپنے آپ کو مالک ملک، ملک الناس، مالک قوم یا انسانوں کی گردنوں کا مالک تصور کرے نہ کسی کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی صاحب اقتدار کے لئے ایسے الفاظ استعمال کرے۔

(شاہ اسماعیل شہید۔ منصب امامت۔ ذکر سلطنت ضالۃ)

3-اسٹیٹ کے سربراہ کی وہ حیثیت ہے جو کسی وقف کے متولی کی، وقف کا متولی اگر ضرورت مند ہو تو اتنا وظیفہ لے سکتا ہے کہ تمام باشندۂ ملک کی طرح گزار سکے۔

(ازالۃ الخفاء۔ جلد دوم عہد فاروق اعظم)

بنیادی حقوق

1-روٹی، کپڑا، مکان اور ایسی استطاعت کہ نکاح کر سکے اور بچوں کی تعلیم و تربیت کر سکے، بلالحاظ مذہب و نسل ہر ایک انسان کا پیدائشی حق ہے۔

2-مذہب رنگ و نسل کے تفاوت کے بغیر عام باشندگان کے معاملات میں یکسانیت کے ساتھ عدل و انصاف اور ان کے جان و مال کی حفاظت، ان کی عزت و ناموس، حق ملکیت میں آزادی، حقوق شہریت میں یکسانیت، ہر باشندہ ملک کا بنیادی حق ہے۔

3-زبان اور تہذیب کو زندہ رکھنا ہر فرقہ کا بنیادی حق ہے۔

(حجۃ اللہ البالغہ اور البدور البازغۃ)

بین الاقوامی تحفظات

ان حقوق کو حاصل کرنے کی شکل یہ ہے کہ خودمختار علاقہ بنائے جائیں۔ یہ خودمختار اکائیاں اپنے معاملات میں آزاد ہوں گی۔ ہر ایک یونٹ میں اتنی طاقت ضرور ہونی چاہیے کہ اپنے جیسے یونٹ کا مقابلہ کر سکے۔ یہ تمام اکائیاں ایک ایسے بین الاقوامی نظام (بلاک) میں منسلک ہوں جو فوجی طاقت کے لحاظ سے اقتدار اعلیٰ کا مالک ہو۔ اس کو یہ حق نہیں ہوگا کہ کسی مخصوص مذہب یا مخصوص تہذیب کے کسی یونٹ پر حملہ کر سکے۔

(حجۃ اللہ البالغہ اور البدور البازغۃ)

مذہبیات

1- (الف) دین اور سچائی کی اصل بنیاد ایک ہے، اس کے پیش کرنے والے ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

(ب) داعیان صداقت ہر ملک اور ہر قوم میں گزرے ہیں۔ ان سب کا احترام ضروری ہے۔

(ج) سچائی اور دین کے بنیادی اصول تمام فرقوں میں تقریباً تسلیم شدہ ہیں۔ مثلاً پروردگار کی عبادت اس کے لئے نذر و نیاز، صدقہ و خیرات، روزہ وغیرہ یہ سب کام سب کے نزدیک اچھے ہیں۔ البتہ عملی صورتوں میں اختلاف ہے۔

(د) ساری دنیا کے سماجی اصول اور ان کا منشاء و مقصد ایک ہے مثلاً ہر ایک مذہب اور ہر ایک فرقہ میں جنسی انارکی کو ناپسند اور اخلاقی جرم قرار دیتا ہے۔ ایسے ہی ہر ایک فرقہ مردہ کو نظروں سے غائب کر دینا ضروری سمجھتا ہے۔ اختلاف اس میں ہے کہ زمین میں دفن کر کے نظروں سے اوجھل کیا جائے یا جلا کر۔

حجۃ اللہ البالغہ۔ باب اصل الدین واحد۔ البدور البازغۃ۔ فصل حق الارتفاقات اور مقالہ ثالثہ وغیرہ)

2- جہاد ایک مقدس فرض ہے مگر اس کے معنی یہ ہیں کہ مقدس اصول کے لئے انسان اپنے اندر جذبۂ فدائیت پیدا کرے یہاں تک کہ اپنی ہستی کو ان اصولوں کے لئے فنا کر دے۔

(البدور البازغۃ الافتارقات الثالث۔ حجۃ اللہ البالغہ، مقدمہ تحریک شیخ الہند۔ ج2، ص127)

ترجمہ قرآن مجید

یہ ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے کہ سیاسی زوال کے ساتھ قوموں پر تہذیبی اور علمی زوال بھی آتا ہے۔ شاہ صاحب نے بادشاہوں اور مسلمانوں کے انحطاط و زوال کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اور اس کا سیاسی و معاشی حل پیش کرنے

کے ساتھ علوم قرآنیہ کی ترویج واشاعت کو بنیادی حیثیت دے کر مسلمانوں کا رشتہ براہ راست قرآن پاک سے جوڑنے کی سعی فرمایا اور اس سعی کا سب سے روشن و تابناک کارنامہ فتح الرحمٰن ترجمۃ القرآن ہے۔ جس میں شاہ صاحب نے قرآن مجید کا فارسی ترجمہ اور اس کی تشریحی فوائد لکھ کر مسلمانوں کے ذہن و دماغ کو قرآن مجید سے قریب تر کرنے کی مخلصانہ جدوجہد کی جس پر گندم نما جوفروشوں اور علم کے نام پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے والے مدعیانِ علم جہال کا برافروختہ ہونا لازمی تھا۔ لہٰذا یہ سب طیش میں آ کر شاہ صاحب کے خلاف کمر بستہ ہو گئے اور جب کچھ بس نہ چلا تو شاہ صاحب کے قتل کے درپے ہو گئے مگر اللہ نے خصوصی مدد فرما کر ان کے اس ارادہ میں ان کو ناکام کر دیا اور شاہ صاحب کی تحریک کامیابی کی طرف بڑھتی رہی۔ جیسا کہ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب مرحوم تحریر فرماتے ہیں کہ

> ''حضرت شاہ ولی اللہ نے قرآن مجید کا ترجمہ اس وقت کی دفتری زبان فارسی میں کیا تو مولوی نما جاہ پرست مشتعل ہو گئے ...... اور اسی غضب اور طیش میں انہوں نے حضرت شاہ صاحب پر قاتلانہ حملہ کرایا۔ جس کی مدافعت قدرت کے اس غیبی ہاتھ نے کی جو تاریخ عالم میں عظمت پانے والوں کی حفاظت ہر ایسے موقعہ پر کیا کرتا تھا۔''

(تحریک شیخ الہند۔ ص 48)

شاہ صاحب سے پہلے قرآن مجید کی افہام و تفہیم کا عام رواج نہ تھا۔ اس عہد کے بعض علماء بھی قرآن مجید اور اس کی تعلیمات سے کماحقہ واقف نہ تھے۔ شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ

> ''اکبر کے دربار میں جب مسلمان علماء اور پرتگیز مشنریوں میں مباحثے ہوتے اور مشنریوں نے (جو کلام مجید کے لاطینی ترجمہ کی وجہ سے اس کے اندراجات سے خوب واقف تھے) کلام مجید کے بعض حصوں پر اعتراض کیے تو اس وقت پتا چلا کہ جن مسلمانوں نے عربی میں قرآن پڑھا بھی تھا انہیں بھی اس کے مضامین اور اندراجات سے پوری طرح واقفیت نہ تھی۔ بسا اوقات یہ ہوتا کہ پادری کلام مجید کے کسی بیان پر اعتراض کرتے اور مسلمان کہہ دیتے کہ یہ تو قرآن مجید میں ہے ہی نہیں اور پھر جب کلام مجید کھول کے دیکھا جاتا تو وہ حوالے نکلتے۔''

(رود کوثر۔ ص 556)

شاہ صاحب کو علما سوء کی مجرمانہ غفلت کا خوب احساس تھا۔ انہوں نے علما سوء اور جاہل مشائخ کے علی الرغم قرآن مجید کا فارسی ترجمہ کیا اور عوامی درس قرآن مجید کی بنیاد ڈالی جس کی وجہ سے شاہ صاحب کی خوب مخالفت ہوئی۔ لیکن آپ نے جاہل صوفیوں اور بداندیش مشائخ کی پرواہ نہیں کی اور اپنی منزل مقصود کی طرف تیز گام رہے اور اس کا عام احساس قلوب میں پیدا فرمایا کہ کامیابی کی کنجی قرآن سے رشتہ جوڑنا اور اس رشتہ کو توڑنا تباہی و بربادی کی اساس ہے اور اس احساس کو اتنا پروان چڑھایا اور لوگوں کے قلوب میں اس طرح موجزن کیا کہ صدیوں کے بعد بھی ہر مصلح قوم اس کا اعتراف کرنے پر مجبور نظر آتا ہے۔

لہٰذا شیخ الہند مولانا محمود حسن اسیر مالٹا کے متعلق مفتی محمد شفیع مفتی اعظم پاکستان تحریر فرماتے ہیں:

''مالٹا کی قید سے واپس آنے کے بعد ایک رات بعد عشاء دارالعلوم میں تشریف فرما تھے۔علماء کا بڑا مجمع سامنے تھا۔اس وقت فرمایا کہ ہم نے مالٹا کی زندگی میں دو سبق سیکھے ہیں۔یہ الفاظ سن کر سارا مجمع ہمہ تن گوش ہوگیا کہ اس استاذ العلماء درویش نے اَسّی سال علماء کو درس دینے کے بعد آخر عمر میں جو سبق سیکھے ہیں۔وہ کیا ہیں فرمایا کہ میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔

ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا دوسرے ان کے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی اس لئے میں وہیں سے پُر عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اسی کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔''

(وحدتِ امت۔ص40)

منفرد اسلوب

شیخ الاسلام شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی کی شہرہ آفاق شخصیت ان کے علمی و تحقیقی کارناموں ان کی تجدیدی خدمات کے ساتھ ساتھ ان کا منفرد انداز و یگانہ اسلوب نگارش بھی کسی تعارف و تعریف کا محتاج نہیں۔

شاہ صاحب ایک ایسے منفرد اسلوب کے موجد ہیں جو جامعیت اور خطابت، قوت استدلال اور سادگی و شگفتگی میں نبی عربیؐ کے طرز تکلم سے بڑی حد تک مشابہ ہے جیسا کہ ہندوستان کے نامور عالم دین مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم لکھتے ہیں کہ:

''شاہ صاحب پہلے آدمی ہیں جنہوں نے اپنی عبارتوں میں زیادہ تر 'جوامع الکلم' 'النبی الخاتم' صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز گفتگو کی پیروی کی ہے۔حتی الوسع وہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے مدعا کا اظہار انہی لغات اور ان ہی محاوروں سے کریں جو لسانِ نبوت اور زبانِ رسالت سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔''

شاہ صاحب ہندوستانی ہونے کے باوجود اہل عرب کی طرح فصیح، بلیغ زبان لکھتے تھے، آپ کی زبان کی روانی اور عربیت سے بڑے بڑے ادیب بھی متاثر ہو جاتے تھے اور اس باب میں شاہ صاحب کی شاہکار اور شہرۂ آفاق تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' ہے جس میں شاہ صاحب نے احکام شریعت کی حکمتوں، مصلحتوں اور علتوں کو بڑے محققانہ اور عارفانہ انداز سے بیان کیا ہے۔

شاہ صاحب دنیائے اسلام میں پہلے عالم دین اور محرمِ راز شریعت ہیں جنہوں نے اس عظیم الشان موضوع پر قلم اٹھایا اور بے نظیر کتاب تصنیف فرمادی۔شاہ صاحب سے پہلے امام غزالی، شیخ اکبر، علامہ خطابی اور شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام نے بھی بعض احکام کی حکمتوں اور مصلحتوں کو بیان کیا ہے۔لیکن ان کی کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے۔شاہ صاحب

اس موضوع پر متقدمین کی مختصر کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''متقدمین نے ان مصالح کی نقاب کشائی کی ہے جن کی ابواب شرعی میں رعایت کی گئی ہے۔ بعد کے محققین نے بعض قیمتی نکتے بھی بیان کیے ہیں۔ لیکن اس کی مقدار اتنی ہی ہے کہ اب اس موضوع پر کلام کرنا خرق اجماع نہیں رہا۔ کسی نے اس موضوع پر مستقل تصنیف نہیں کی اور اس کے اصول و فروع کو پورے طور پر مرتب نہیں کیا۔''

(مقدمہ حجۃ اللہ البالغہ۔ ص 3)

مولانا شبلی نعمانی مرحوم لکھتے ہیں:

''حجۃ اللہ البالغہ جس میں شاہ صاحب نے شریعت کے حقائق و اسرار بیان کیے ہیں، درحقیقت علم کلام کی روح رواں ہے۔ علم کلام درحقیقت اس کا نام ہے کہ مذہب اسلام کی نسبت ثابت کیا جائے کہ وہ منزل من السماء ہے۔''

(رود کوثر۔ ص 569)

مشہور و معروف عربی عالم شیخ مصطفیٰ مکی تحریر فرماتے ہیں:

''جب ''حجۃ اللہ البالغہ'' عرب میں پہنچی تو علماء اسے دیکھ کر حیران ہو گئے، مصر میں چونکہ ادب کا مشغلہ زیادہ ہے۔ ان لوگوں نے ادب کے پیرایہ میں بہ تعمق نظر ڈالی اور دیکھ کر حیرت زدہ ہوئے کہ ایک ہندی کی ایسی تحریر کہ عرب کے کملاء بھی نہیں لکھ سکتے۔''

تصنیفات و تالیفات

شاہ صاحب کثیر التصانیف بزرگ ہیں۔ آپ کی تصانیف کی تعداد میں تذکرہ نگاروں کا شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض مؤرخین دو سو سے زائد بیان کرتے ہیں۔ سید محمد نعمان شاگرد شاہ صاحب کے خط میں نوے کی تعداد لکھی ہے۔ مولانا علی میاں صاحب نے ترپن کی تعداد تحریر کی ہے۔ لیکن یہ اختلاف محض اس سبب سے ہے کہ شاہ صاحب کے مختلف رسائل الگ الگ بھی شائع ہوئے ہیں اور کئی کئی رسالے ساتھ بھی چھپے ہیں، بہرحال شاہ صاحب کی بعض تصانیف بہت ضخیم اور بعض بہت مختصر ہیں۔ ان کی تصانیف کی فہرست مختصراً تعارف کے ساتھ ہدیہ ناظرین ہے۔

1-فتح الرحمن فی ترجمته القرآن

شاہ صاحب ہندوستان کے پہلے عالم دین ہیں جنہوں نے قرآن کریم کا فارسی ترجمہ کیا اور ترجمہ بھی نہایت سلیس اور مطلب خیز!

شاہ صاحب کے بعد قرآن مجید کے جو ترجمے ہوئے ہیں ان تمام ترجموں میں شاہ صاحب کا رنگ ہے۔ اس ترجمہ کے ساتھ جابجا ''تشریحی فوائد'' ہیں جو بہت ہی اہم اور مفید ہیں۔ یہ ترجمہ متعدد بار ہند و پاک سے شائع ہو چکا ہے۔ حسن اتفاق سے یہ ترجمہ کتب خانہ جامعہ رحیمیہ مرکز شاہ ولی اللہ میں موجود ہے۔ پاکستانی مطبوعہ ہے۔

2-الفوز الكبير في اصول التفسير

شاہ صاحب نے فارسی زبان میں اصول تفسیر میں نہایت مختصر رسالہ تحریر فرمایا ہے۔ راقم الحروف کے خیال میں یہ مختصر رسالہ علامہ سیوطی کی کتاب ''الاتقان فی تفسیر القرآن'' پر بھی بھاری ہے۔ علماء نے اس رسالہ کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر دینی مدارس کے نصاب میں داخل کیا ہے، یہ فارسی رسالہ اردو اور عربی میں منتقل ہو گیا ہے۔

3-فتح الخبير بمالا بدمن حفظه علم التفسير

یہ عربی رسالہ ہے، جس میں قرآن مجید کے مشکلات اور غرائب کی تشریح وتوضیح کی گئی ہے اور آیات قرآنی کے اسباب نزول پر گاہ بگاہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ ''الفوز الکبیر'' کے ساتھ یہ مجموعہ شائع ہوا ہے۔

4-تاويل الاحاديث في امور قصص الانبياء

رسولوں، نبیوں کے مکذبین پر عذاب الٰہی آئے اور رسول کے ذریعہ جن معجزات کا ظہور ہوا اس کتاب میں ان کو مطابق فطرت ثابت کیا گیا ہے۔ بہر حال یہ شاہ صاحب کا کمال فن ہے۔

5-المسوىٰ من الموطأ

''المسویٰ'' موطا امام مالک کی مبسوط عربی شرح ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسی شرح میں شاہ صاحب کا مجتہدانہ رنگ نمایاں ہوتا ہے، ہندوپاک اور مکہ مکرمہ سے شائع ہو چکی ہے۔

6-المصفىٰ شرح الموطأ

موطاء امام مالک کی فارسی شرح ہے، اس میں آپ نے احادیث اور آثار کو الگ الگ کر دیا ہے اور امام مالکؒ کے اقوال کو مناسب طریقہ سے بیان کیا ہے اور احادیث پر مجتہدانہ انداز سے بحث کی ہے۔

7-شرح تراجم ابواب صحيح البخاری

شاہ صاحب نے امام بخاریؒ کے عنوانات ابواب کی اس طرح توجیہ وتشریح کی ہے کہ ابواب واحادیث میں مناسبت پیدا ہو جاتی ہے، یہ رسالہ عربی میں ہے۔ دائرۃ المعارف حیدر آباد اور اصح المطابع کراچی نے اسے صحیح بخاری کے ساتھ شائع کیا ہے۔

8-حجة الله البالغة

حضرت شاہ ولی اللہ محدث کی شاہکار تصنیف ہے۔ شاہ صاحب نے اسلامی تعلیمات ودینی احکامات کو مطابق فطرت اور مبنی بر عدل ثابت کیا ہے۔ ہر حکم الٰہی اور امرِ شریعت کے اسرار ومصالح نہایت مدلل انداز سے بیان کیا ہے۔

افسوس ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھی اور حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب مرحوم کے بعد یہ کتاب یتیم ہو گئی ہے۔ علمائے ہند نے اس کتاب کو شجر ممنوعہ قرار دے دیا ہے۔ اچھے سے اچھے عالم دین اس کا نام سنتے ہی دہشت زدہ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اس کتاب کی زبان بہت ہی آسان ہے اور معمولی غور وفکر کے بعد مطلب سمجھ میں آ جاتا ہے۔

''حجۃ اللہ البالغہ'' کا مختلف علماء نے مختلف ترجمے کیے ہیں۔

1-آيات الله الكامله ازمولوی خلیل احمد صاحب اسرائیلی، بغری متن عربی۔

2-ترجمہ حجة الله البالغه از محمد شبیر صاحب، بغیر متن عربی۔
3-شموس البالغه از عبدالحق صاحب ہزاروی مطبوعہ لاہور، مع عربی متن
4-ترجمہ حجة الله البالغه از مولانا عبدالرحیم لاہور، بغیر متن عربی
5-نعجة الله السابغه از محمد عبدالحق حقانی، مطبوعہ رحمانی پٹنہ۔ بغیر متن اصح المطابع کراچی عربی متن۔

9-ازالة الخفاء عن خلافة الخلفاء

یہ شاہ صاحب کی دوسری شہرہ آفاق تصنیف ہے۔ اس میں آپ نے خلفائے راشدین کی خلافت آیات و احادیث اور تاریخ سے دلائل و براہین دے کر حق ثابت کی ہے اور شیعہ و سنّی کے باہمی نزاعات و اختلافات کو نہایت عدل و انصاف کے ساتھ حل کیا ہے۔ یہ فارسی زبان میں ہے۔ مطبع صدیقی بریلی سے شائع ہو چکی ہے۔ اب اردو ترجمہ کے ساتھ بھی شائع ہو رہی ہے۔ یہ کتاب کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں موجود ہے۔

10-التفهيمات الالهية

شاہ صاحب سماجی آدمی تھے۔ معاشرے کے دکھ درد سے آشنا تھے۔ آپ نے اس کتاب میں معاشرے کے ہر طبقہ کو مخاطب کر کے اصلاح پر ابھارا ہے اور اس میں تصوف و سلوک کی باتیں بھی ہیں۔ بعض مقالات فارسی میں ہیں اور بعض عربی میں۔ پوری کتاب دو جلدوں میں ہے۔ مجلس علمی ڈابھیل گجرات کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے۔

11-الخير الكثير

تصوف اور علم اسرار وحکم میں ایک معیاری کتاب ہے۔ یہ بھی مجلس علمی ڈابھیل گجرات سے شائع ہوئی ہے۔ اصل کتاب عربی زبان میں ہے اور ترجمہ بھی شائع ہوا ہے۔

12-فيوض الحرمين

قیام حرمین شریفین کے دوران جو فیوض و برکات بصورت خواب و القاء صاحب کو حاصل ہوئے یہ ان ہی کا مجموعہ ہے۔ اصل عربی زبان میں ہے اور ترجمہ کے ساتھ بھی شائع ہوا ہے۔

13-الانصاف فى بيان سبب الاختلاف

اس کتاب میں فقہی اختلافات کے اسباب پر محققانہ بحث کی گئی ہے اور ہر طبقہ کی افراط و تفریط پر تنقید کی گئی ہے۔ نہایت مفید کتاب ہے اور ترجمہ کے ساتھ بھی کئی بار چھپ چکی ہے۔

14-عقد الجيد فى بيان احكام الاجتهاد و التقليد

اس عربی رسالہ میں شاہ صاحب نے اجتہاد و تقلید کے مسائل پر نہایت محققانہ اور منصفانہ بحث کی ہے اور ترجمہ کے ساتھ شائع بھی ہو چکا ہے۔

15-البلاغ المبين

رسالہ رد بدعت و شرک اور دعوت توحید پر مشتمل ہے۔ اردو ترجمہ کے ساتھ بھی شائع ہوا ہے۔

16-قرة العينين فی تفضيل الشيخين

تفضیل شیخین کے متعلق فارسی زبان میں اہم رسالہ ہے۔ شائع ہو گیا ہے۔

17-انسان العين فی مشائخ الحرمين

یہ رسالہ شاہ صاحب کے عربی شیوخ و اساتذہ کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔

18-الدر الثمين فی مبشرات النبی الامين

شاہ نے اس رسالہ میں ان بشارتوں کا ذکر کیا ہے جو آپ کو اور آپ کے نسبی یا روحانی بزرگوں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئیں۔ یہ رسالہ عربی زبان میں ہے۔

19-انفاس العارفين

شاہ صاحب اس کتاب میں اپنے والد بزرگوار اور دوسرے خاندانی بزرگوں کے حالات و واقعات بیان کیے ہیں۔ اصل کتاب فارسی ہے اور ترجمہ بھی دستیاب ہے۔ اس میں بعض ابواب الحاقی ہیں۔

20-القول الجميل

یہ رسالہ وظائف و اذکار اور طریقت کے چاروں سلسلوں کے بیان پر مشتمل ہے۔ اصلاً عربی میں ہے۔ اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

21-الطاف القدس

شاہ صاحب نے اس رسالہ میں تصوف و سلوک کا وہ طریقہ تحریر فرمایا ہے جو آپ کے خیال میں انسب اور زمانہ حاضر میں قابلِ عمل ہے۔ فارسی زبان میں ہے۔

22-همعات

یہ بھی تصوف سے متعلق رسالہ ہے۔

23-سرور المحزون فی ترجمة نور العين

یہ سیرت نبوی پر بہترین کتاب ہے۔ اصلاً فارسی میں ہے۔ اردو ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔

24-مکتوبات مع مناقب امام بخاری و ابن تيمية

شاہ صاحب کے چند مکاتیب اور امام بخاری اور علامہ ابن تیمیہ کے حالات پر دو مختصر رسائل کا مجموعہ ہے۔ اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

25-مکتوبات المعارف مع مکاتيب ثلثة

شاہ صاحب کے متفرق مکاتیب کا مجموعہ ہے۔

26-الجزء اللطيف فی ترجمة العبد الضعيف

شاہ صاحب نے فارسی میں آپ بیتی تحریر فرمائی ہے۔

27-المقالة الوضية فی النصيحة و الوصية

فارسی زبان میں مختصر پند نامہ ہے۔ اپنے صاحبزادوں، دوستوں، شاگردوں اور عقیدت مندوں کو نصیحتیں فرمائی ہیں۔

28-چهل حديث

اس رسالہ میں شاہ صاحب نے وہ احادیث جمع کردی ہیں جو اسلام کے بنیادی اصول سے متعلق ہیں۔ اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

29-اطيب النغم

شاہ صاحب عربی کے بہترین شاعر بھی تھے۔ یہ آپ کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ہے۔ ان کے علاوہ بھی چند رسائل و کتب حسب ذیل ہیں:

30-الزهراوين

31-شفاء القلوب

32-الهواصع شرح حزب البحر

33-لمعات

34-سطعات

35-المسلسلات

36-الذكر الميمون

37-السر المكتوم

38-اعزاب القرآن

39-الفضل المبين فی المسلسل من حديث النبی الامين

40-العقيدة الحسنة

41-المقدمة السنية فی انتصار الفرقة السنية

42-شرح رباعيتين

43-العطية الصمدية

44-فتح الودود فی معرفة الجنود

45-الارشاد الی مهمات الاسناد

46-رسائل اوائل

47-تراجم البخاری

48-مايحب حفظ للناظر

49-مآثر الاجداد

50-رسالہ دانشمندی

51-الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ

52-رسائل تفہیمات

53-النوادر من احادیث سید الاوائل والاواخر

آپ کی زیادہ تر تصانیف امتداد زمانہ کے باعث ضائع ہو چکی ہیں اور بہت سی ایسی تصانیف ہیں جو اگرچہ معلوم نہیں ہوئی ہیں لیکن اب تک کتب خانوں اور لائبریریوں کی زینت ہیں۔

شعر وشاعری

شاہ صاحب اپنے تمام علمی وروحانی کمالات کے ساتھ شعر وشاعری کے میدان کے بھی کامیاب شہسوار تھے اور فارسی اور عربی کے مایہ ناز شاعر تھے۔ آپ نے عربی اور فارسی غزلوں اور رباعیوں کا ایک عظیم ذخیرہ چھوڑا ہے۔
آپ کا تخلص امین تھا۔ آپ کی اکثر غزلوں اور رباعیوں میں تصوف ومعرفت کے مضامین ہوتے ہیں۔
بطور نمونہ چند رباعیاں پیش ہیں۔

بہ زلفِ پیچ در پیچ کسے گم کردہ ام خود را
خروشِ دردِ دل شبہانمی کردم چہ کردم
دلے پر درد، جان فگار، یار تند خودارم
جہاں را پرز یار یہانمی کردم چہ کردم

عربی نظم میں "اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم" کے نام سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح ونعت میں ایک طویل قصیدہ ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

کان نجوماً او مضت فی الغیاھب
عیون الافاعی او روس العقارب

مجددِ امت

شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی حقیقی طور پر بارہویں صدی کے مانے ہوئے مجدد تھے۔ آپ کے اندر مجدد ہونے کی تمام ضروری شرائط بدرجہ اتم موجود تھیں۔ جیسا کہ شاہ صاحب نے "تفہیمات الٰہیہ" میں خود تحریر فرمایا ہے۔

"جب میرا دورہ حکمت یعنی علم اسرار دین پورا ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے خلعت مجددیت پہنائی، پس میں نے مسائل اختلافی میں جمع (وتطبیق) کو معلوم کر لیا۔"

شاہ صاحب نے ایک اور جگہ لکھا ہے کہ:

''مجھے خدا نے یہ شرف بخشا ہے کہ میں اس زمانہ کا مجدد، وصی اور قطب ہوں۔ اگر خدا نے چاہا تو میری کوششوں سے مسلمانوں میں نئی زندگی پیدا ہو جائے گی'' اور ہندوستان میں آج جو اسلامی سرمایہ اپنے صحیح انداز میں موجود ہے وہ بلاشبہ شاہ صاحب جیسے مجددین ہی کی کاوشوں اور کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اگر شاہ صاحب کا وجود نہ ہوتا تو بظاہر اسلامی فلسفہ کو ایرانی اور ہندو فلسفہ نگل گیا ہوتا اور اور صحیح اسلام اور فلسفہ کہیں ڈھونڈے بھی نہ ملتا۔ شاہ صاحب نے اپنے تجدیدی و اصلاحی کام کا جو دائرہ کار متعین فرمایا تھا اس کو ان دس حصوں یا شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ 1- جہاد بالقرآن۔ 2- اشاعت سنت۔ 3- رد بدعت۔ 4- اصلاح عقائد و معاشرت۔ 5- حقیقی اسلامی تصوف کا تعارف۔ 6- اخلاقی تربیت کا مسنون طریقہ کار۔ 7- فقہی اور اجتہادی اختلافات میں اعتدال کی تلقین۔ 8- شریعت اسلامیہ کا بطور ایک مکمل نظام حیات کے عقلی اور استدلالی تعارف۔ 9- اسلامی اجتماعیت اور خلافت کی تشریح۔ 10- اس وقت کی مسلم حکومت کو اخلاقی زوال اور سیاسی انتشار سے بچانے کی منظم جدوجہد۔

جس میں سے ہر شعبہ اپنے اندر اتنی وسعت اور گہرائی رکھتا ہے کہ ہر شعبہ کے لئے ایک مستقل جماعت درکار ہے مگر یہ شاہ صاحب کی تجدیدی صلاحیت ہی تھی کہ ان تمام شعبوں میں تن تنہا کام کر کے اپنے جانشینوں کے لئے راہ عمل تجویز فرما گئے اور ان کے بعد ان کے جانشینوں نے بڑی سے بڑی حد تک کامیابی کی منزل تک پہنچایا۔ یہ ہے بارہویں صدی کے مجدد کا تجدیدی منصوبہ جسے وہ بروئے کار لائے۔

وفات

اس طرح جب شاہ صاحب نے اپنے تجدیدی فرائض کو باحسن وجوہ انجام دیئے اور اپنے پیچھے ایک جماعت بھی کارہائے تجدید سنبھالنے کے لئے تیار کر دی تو داعیٔ اجل کو لبیک کہتے ہوئے 29/محرم 1176ھ۔ 1763ء کو اس دارفانی کو خیر باد کہا اور جان جانِ آفرین کے سپرد فرما دی اور والد بزرگوار حضرت شاہ عبدالرحیم دہلوی کے پہلو میں آرام فرما ہو گئے گویا آپ کو ان کارہائے تجدید کے لئے خداوند نے اس دنیا میں بھیجا تھا۔

اربابِ چمن مجھ کو بہت یاد کریں گے
ہر شاخ پر اپنا ہی نشاں چھوڑ دیا ہے

(الواح الصنادید از عطاء الرحمٰن قاسمی، نئی دہلی 1989ء)

حجتہ اللہ البالغہ

(تعارف)

علومِ نقلیہ و عقلیہ پر قدیم و جدید ادوار میں اصحابِ علم نے بے شمار کتابیں تالیف کی ہیں اور ہر صاحب علم و فکر کی سعی و جہد قابل ستائش ہے۔ قرونِ اولیٰ میں عقلیات کا غلبہ کمتر تھا، اس لئے اسی عہد میں زیادہ تر نقل اقوال ہی راہِ عمل پر گامزن کرنے کے لئے کافی تھا۔ مسلمانانِ عالم عہدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب تھے اور برکاتِ رسالت اور توجہات صحابہ کرام ہزاروں فلسفیوں کی فلسفیانہ موشگافیوں اور عقلی دلائل سے بڑھ کر لوگوں میں باطنی و خارجی انقلاب کر دیتیں مگر جوں جوں اسلام کا دائرہ اثر وسیع ہوتا گیا، بلادِ ہند، ایران اور مغرب کے علاقے فتح ہوئے، مشرق و مغرب کے عقل پرستوں کی شرارتوں سے مسلمانوں میں عملی اضمحلال پیدا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ایسی ایسی مایہ ناز شخصیتوں کو دنیا میں بھیجا جنہوں نے مشرق و مغرب کے گمراہ فلسفیوں کے اعتراضات کے مسکت جواب دیئے۔ یہ لوگ نہ صرف اسلام کے لئے حصار بن گئے بلکہ آگے بڑھ کر انہوں نے اہل فلسفہ کے باطل نظریات کو تار تار کر دیا۔

قرونِ وسطیٰ میں خصوصاً کافروں نے بار بار اسلام پر عقلیاتی علوم کے اسلحہ سے لیس ہو کر حملے کیے مگر ذلت آمیز شکست کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔

وجہ تالیف

ایک وہ دور تھا کہ جب مسلمانوں کے پاس سیاسی و مادی قوت کے ساتھ ساتھ علمی اور تحقیقی شوکت بھی تھی مگر سلطنت عثمانیہ کے زوال کے بعد دنیا بھر کے مسلمان شدید ترین سیاسی، دینی و علمی ابتری کا شکار ہو گئے۔ اس پریشان اور شکست خوردہ قوم کو ختم کرنے کے لئے مشرق و مغرب کی ہر سمت سے کفر و الحاد نے یورش کر دی۔ بالخصوص مغربی اقوام نے مسلمانوں کو سیاسی سطح پر دبانے کے ساتھ ساتھ اسلام کے علم سے محروم کر دینے کا کامل منصوبہ بنایا۔ دینی مدارس کو ختم کر دیا۔ عربی زبان اور اسلامی علوم سے لوگوں کا تعلق ختم کر کے مغربی زبانوں اور مغرب کے فنون سے تعلق قائم کر دیا اور مسلمانوں کی ایک ایسی نسل پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے جو اسلام پر ایمان تو رکھتی ہے مگر اسلام کے تفصیلی احکام سے نہ صرف جاہل بلکہ کئی احکامِ شریعت کا برملا انکار کرتی یا ان سے بے توجہی برتتی ہے۔

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام سے جہالت کے ساتھ ساتھ ہی اسلام کے خلاف تشکیکات کا دور شروع ہو گیا۔ شاہ

ولی اللہ نے مغل سلطنت کے دورِ انحطاط میں اسی ذہنیت کو شکست دینے کے لئے ''حجتہ اللہ البالغہ'' تصنیف فرمائی۔

موضوع کتاب

شاہ صاحب قدس سرہ نے یہ کتاب علم اسرارِ شریعت کے متعلق تحریر کی ہے۔ اس علم پر متقدمین میں سے کسی نے قلم نہیں اٹھایا۔ شاہ صاحب نے اس کے اصول قائم کیے، فروعات بتائیں اور مقدمات و مبادی کی تمہید کے بعد نتائج کی تخریج کی ہے۔ اگر چہ یہ کتاب علم اسرارِ شریعت کے موضوع پر لکھی گئی مگر شاہ صاحب نے اس میں حدیث، فقہ، اخلاق، تصوف اور فلسفہ پانچوں مضامین کا مذاق جمع کر دیا ہے۔ امت میں یہ پہلے علمِ نقل و عقل کے ماہر ہیں کہ جنہوں نے علومِ شریعت کے اسرار بیان کرنے میں منفرد علمی تحقیقات کی بنیاد رکھی ہے۔ کتاب و سنت کے ہر حکم کی ایسی مستحکم علت بیان کی ہے کہ کسی دور کا کوئی فلسفہ اس کو رد نہیں کر سکتا۔ کتاب پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ عقل کے تمام مدارج طے کرنے والا ایک عظیم انسان کلام کر رہا ہے۔ ملاء اعلیٰ سے الہام پا کر مسائل تصوف بیان کر رہا ہے اور ایک مجتہد مطلق ایسی رائے پیش کر رہا ہے جس میں مسالک اربعہ کی احسن ترین تطبیق اور کتاب و سنت کے ظاہر سے کامل ترین توثیق ہوتی ہے۔

صاحب ''حیاتِ ولی'' نے نقل کیا ہے کہ علامہ ابوالطیب نے ''حجتہ اللہ البالغہ'' کے متعلق اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ فرمایا:

> ''ایں کتاب اگر چہ در علم حدیث نیست اما شرح احادیث بسیار دراں کردہ و حِکَم و اسرار آں بیان نمودہ تا آنکہ در فن خود غیر مسبوق علیہ واقع شدہ و مثل آں دریں دوازدہ صد سال ہجرت ہیچ یکے از علمائے عرب و عجم تصنیفے موجودہ نیامدہ و منجملہ تصانیف مؤلفش مرضی بودہ است و فی الواقع بیش ازاں ست۔''

یعنی ''حجتہ اللہ البالغہ'' اگر چہ علم حدیث میں نہیں ہے لیکن اس میں بہت سی حدیثوں کی شرح اور ان کے اسرار و احکام بیان کیے گئے ہیں حتیٰ کہ اپنے فن میں بے نظیر ثابت ہوئی ہے اور کسی اور کتاب کو اس پر سبقت نہیں ہوئی۔ زمانۂ ہجرت سے لے کر اس وقت کہ بارہ سو سال ہو چکے ہیں علمائے عرب و عجم میں کسی کی ایسی لاثانی تصنیف موجود نہیں۔ غرض یہ کتاب مؤلف کی تمام تصانیف میں عمدہ اور بہتر تصنیف ہے اور حقیقت میں اس سے بہت کچھ زیادہ تر ہے۔

شاہ صاحب قدس سرہ نے ''حجتہ اللہ البالغہ'' کو دو مجلدات میں مکمل کیا ہے۔ پہلی جلد کو سات مباحث میں تقسیم کیا اور ہر مبحث کو کئی کئی ابواب میں تقسیم کر دیا۔

جلد اول

سب سے پہلے شاہ صاحب قدس سرہ نے بتایا کہ پہلی جلد میں پہلی قسم کے اندر وہ قواعد کلیہ بیان کیے گئے ہیں کہ شرعی احکام میں ملحوظ مصلحتوں کا ان قواعد کے ذریعہ استنباط و استخراج کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد مبحث اول شروع کیا جس میں یہ بتایا کہ انسان کو کیوں مکلف بنایا گیا ہے اور اس پر جزا و سزا مرتب

ہونے کی وجوہات کیا ہیں۔ اس مبحث میں تیرہ ابواب رکھے ہیں اور پہلا باب ابداع وخلق وتدبیر کا ہے۔ چونکہ تخلیق کائنات سب سے پہلا مسئلہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک جامع معلومات کتاب میں سب سے پہلے یہی مسئلہ زیر بحث آنا چاہیے۔

اور اگر ہم سب سے پہلے نازل ہونے والی آیت پر غور کریں تو سب سے پہلے وہاں بھی یہی حکم نظر آتا ہے کہ:

اقرا باسم ربك الذى خلقo خلق الانسان من علقo

''اس رب کے نام سے پڑھو، جس نے پیدا کیا۔ بستہ خون سے انسان کو پیدا کیا۔'' گویا تخلیق کائنات ہی سب سے پہلا مسئلہ ہے جس کو شاہ صاحب نے سب سے پہلے بیان کر کے ایک قابل ستائش مطابقت حاصل کی ہے۔

ابداع وخلق وتدبیر کو اس کی واقعی ترتیب کے مطابق ہی ذکر کیا۔ اس کے بعد عالم مثال، ملاء اعلیٰ، حقیقت روح اور راز تکلیف کو بیان کرتے ہوئے بتایا کہ تمام لوگوں کو ان کے اعمال کا صلہ ملے گا۔ اگر اعمال اچھے ہیں تو اس کا اچھا اجر ملے گا اور اگر اعمال برے ہیں تو جزا بھی بری۔ اور یہ بھی واضح کیا کہ یہ چار طرح سے ہوگا۔ ایک صورتِ نوعیہ کے لحاظ سے، ایک ملاء اعلیٰ کے اعتبار سے، ایک شریعت کے مقتضا سے جو اس پر لازم ہے اور ایک یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی ہونے والا علم متشخص ومتمثل ہوا اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمت ودعا اور اللہ کے آپ کی مدد کے فیصلے سے مخلط ہو کر موکد ہوا۔

پھر بتایا کہ جزا کی پہلی دو صورتیں فطرت ہیں جن میں تغیر نہیں اور تیسری صورت اختلاف زمان کے ساتھ مختلف ہوتی ہے اور چوتھی بعثت انبیاء کے بعد ہی ہوا کرتی ہے اور آخری باب میں اسبابِ مجازات کو بیان کر کے پہلا مبحث ختم کیا۔

مبحث ثانی میں شاہ صاحب نے زندگی اور موت کے بعد مجازات کی کیفیت بیان کی۔ اس میں چار ابواب رکھے جن میں موت کی حقیقت، مرنے کے بعد کی زندگی کے احکام وحالات اور حشر کے کچھ واقعات بیان کر کے اس مبحث کو ختم کیا۔

مبحث ثالث میں شاہ صاحب نے زندگی کے اہم ترین مسئلہ یعنی ارتفاقات کو بیان کیا کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں کن اصولوں پر گامزن ہو کر ہم دنیا میں عروج حاصل کر سکتے ہیں۔ اپنی زندگی کو خوشگوار بنا سکتے ہیں اور اپنی اجتماعی اور انفرادی زندگی کو ہر کامرانی سے دوچار کر سکتے ہیں۔ اس مبحث کو شاہ صاحب نے گیارہ ابواب میں تقسیم کیا۔ سب سے پہلے باب میں اصولِ ارتفاقات کے استنباط پر بحث کی۔ پھر مختلف ارتفاقات بتائے جن میں تدبیر منزل، معاملات باہمی، سیاست مدنیہ، سیرتِ ملوک اور سیاستِ عساکر کے متعلق ایسی آراء پیش کی ہیں کہ ہر زمانے کا مدبر وفلسفی انگشت بدنداں ہے۔

شاہ صاحب سیرتِ ملوک میں بتاتے ہیں کہ بادشاہ میں عمدہ اخلاق پائے جانے ضروری ہیں۔ بہادر ہو کہ دشمن کا مقابلہ کر سکے۔ رحم دل ہو تا کہ لوگوں کو برباد نہ کر دے۔ دانش ور ہو تا کہ اصلاحی امور پر غور کر سکے۔ عاقل بالغ آزاد اور مرد ہو تا کہ اس کا وقار قائم رہے۔ اعضائے بدن صحت مند ہوں۔ لوگ اس کا شرف تسلیم کرتے ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ

لوگوں پر اس کا جاہ وجلال ہوتا کہ اس کے احکام کی تعمیل کریں۔ سخی ہوتا کہ لوگوں کے دلوں میں اس کی محبت جا گزیں ہو۔ معاف کرنے والا ہو اور عوام کی بھلائی کرتا ہوتا کہ لوگ اس کو خیر خواہ سمجھیں اور ایک چالاک شکاری کی فراست کا مالک ہو اور سب لوگوں کے مقامات کو سمجھتا اور اس پر عمل کرتا ہو۔ باغیوں کو کبھی مہلت نہ دے اور جاں نثاروں پر نوازش میں تاخیر نہ کرے۔ ملک کا دفاع مضبوط کرے۔

شاہ صاحب نے چند الفاظ میں ایک محبوب ترین بادشاہ کی صفات بیان کر دیں اور آخری باب میں عوام کے اندر مروج رسوم پر بحث کر کے ان کی تنقیح بھی کر دی۔

شاہ صاحب نے اس مبحث کو سات ابواب پر تقسیم کیا ہے۔

مبحث خامس میں نیکی و بدی پر بحث کی اور اس کو سترہ ابواب پر تقسیم کیا۔ اس مبحث میں سب سے زیادہ توحید و شرک اور ایمان پر ابحاث ہیں۔ پھر نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور ان کے متعلق احکام کے اسرار بیان کیے اور آخر میں گناہوں کے مراتب، گناہوں کے نقصانات بتائے اور یہ بتایا کہ کس طرح گناہ ایک فرد کو اور ایک قوم کو تباہ کر دیتے ہیں اور نیکیاں فرد واجتماع کو دنیا و آخرت میں کامران کرتی ہیں۔

مبحث سادس میں سیاسیاتِ ملیہ پر بحث کی ہے اور اس کو اکیس ابواب پر منقسم کیا۔ دین اور ملت کے مختلف امور، ہادیان قوم اور ادیانِ سابقہ، اسلام اور دورِ جاہلیت کے مختلف اور پُر قیمتی ابحاث ہیں اور قضا و رخصت اور دوسرے شرعی و سیاسی احکام کے اسرار اور رموز کا بیان ہے۔

مبحث سابع آخری مبحث ہے جس میں گیارہ ابواب ہیں۔ جس میں علوم نبوت، کتبِ حدیث اور صحابہ و تابعین و فقہاء کے اختلافات و قضایا پر پُر مغز مباحث ہیں۔ اس کے بعد کتاب کے آخری حصہ میں شاہ صاحب نے طہارت و نماز کے مسائل بالتفصیل بیان کر کے جلد اول کو ختم کیا ہے۔

جلد دوم

شاہ صاحب نے "حجتہ اللہ البالغہ" کی دوسری جلد میں زیادہ عبادات، باہمی معاملات اور سیاسیات پر بحث کی ہے۔ سب سے پہلے نماز، روزہ اور حج کے ابواب کا ذکر کیا ہے۔

اس جلد کو شاہ صاحب قدس سرہ نے مباحث میں تقسیم نہیں کیا بلکہ ہر بحث پر ایک عنوان لگا دیا ہے۔ عبادت بدنیہ و مالیہ کی ابحاث کے بعد کاروبار کرنے اور روزی کمانے کے آداب و احکام بیان کیے۔ اس لئے کہ ہر عبادت کا مدارِ قبولیت حلال روزی پر ہے۔ اس لئے آدابِ تجارت و حصولِ زر کو اسلام کے ضوابط کے ماتحت کرنا قبولیتِ آداب کی کنجی ہے۔

اس کے بعد تدبیرِ منزل کے مباحث پیش کیے۔ نکاح، طلاق، حقوق زوجیت اور تربیت اولاد وغیرہ ایسے ضروری امور پر مفصل بحث کی ہے اور اس کے بعد ملکی اور قومی امور پر کلام فرمایا۔ خلافت، حدود، قضاء، جہاد اور دوسرے قومی اہمیت کے حامل افکار پر ایسے انداز سے قلم اٹھایا ہے کہ دورِ جدید وقدیم کے علم وفضل کے بڑے بڑے دعویدار ساکت و صامت ہو

کر رہ جاتے ہیں۔

ان مباحث کے بعد شاہ صاحب نے عام زندگی کے آداب، لباس، تہذیب اور دوسرے عام اصول ہائے زندگی پر بحث کر کے آئندہ کے فتنوں اور آخر میں مناقب صحابہ کرام پر کتاب کو مکمل کیا ہے۔

✦.....✦.....✦
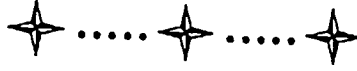
پروفیسر محمد سرور (ترجمہ وانتخاب)

حجۃ اللہ البالغہ

دین اور حکمت

حضرت شاہ ولی اللہ اپنے شہرۂ آفاق تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے پیش لفظ میں فرماتے ہیں کہ فنونِ حدیث میں سب سے دقیق، اصلِ اصیل اور روشن تر اور علوم شرعیہ میں سب سے مقدم اور اعلیٰ و افضل علم، اسرارِ دین کا علم ہے جو شرعی احکام کی حکمتوں، ان کی علتوں، ان کے خواصِ اعمال کے اسرار اور ان کے نکتوں سے بحث کرتا ہے۔ خدا کی قسم یہ علم تمام علوم سے بڑھ کر اس امر کا مستحق ہے کہ جسے استطاعت ہو، وہ اپنا سب سے قیمتی وقت اس میں صرف کرے اور اس پر جو عبادات و طاعات فرض ہیں، ان کے بعد اس علم کو اپنی آخرت کے لئے زادِ راہ بنائے۔ بات یہ ہے کہ اس علم کے ذریعہ انسان کو جن امور کے ساتھ کہ شریعت آئی ہے، ان پر بصیرت حاصل ہو جاتی ہے اور احادیث و اخبار سے اس کا ایسا تعلق ہو جاتا ہے جیسے عروض جاننے والے کا دواوینِ شعر سے یا منطقی کا حکما کی براہین و دلائل سے یا نحوی کا فصحائے عرب کے کلام سے یا اصولِ فقہ کے ماہر کا فقہا کی تفریعات سے۔

حضرت شاہ صاحب کی کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا یہی موضوع ہے۔ چنانچہ وہ کتاب کے مقدمے میں اسی امر پر بحث کرتے ہیں کہ شرعی احکام، مصالح و حکم پر مبنی ہوتے ہیں اور جو ایسا نہیں سمجھتے، وہ غلطی پر ہیں۔

یہاں ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے اس مقدمے کا خلاصہ دیا جاتا ہے۔

احکامِ شرعی اور مصالح و حکم

عام طور پر یہ گمان کیا جاتا ہے کہ احکام شرعی مصالح میں سے کسی مصلحت پر مبنی نہیں اور نہ اعمال میں اور اللہ تعالیٰ نے ان کی جو جزا رکھی ہے، ان کے درمیان باہم کوئی مناسبت ہے اور انسانوں کو جو شرعی احکام کا مکلف بنایا گیا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی آقا اپنے غلام کی فرمانبرداری و اطاعت کا امتحان لینے کے لئے اسے کسی پتھر کو اٹھانے اور کسی درخت کو چھونے کا حکم دے اور ایسا کرنے میں مطلق کوئی فائدہ نہ ہو۔ اس سے سوائے غلام کی فرمانبرداری کا امتحان لینے اور کوئی مقصود نہ ہو۔ پس اگر غلام نے اپنے آقا کے حکم کی اطاعت کی یا اس نے اسے نہ مانا تو اس کا اسی کے مطابق اسے بدلہ دے دیا گیا۔

غرض جو شخص ایسا گمان کرتا ہے، اس کا یہ گمان غلط ہے اور سنت اور قرونِ اولیٰ جن کے با خیر و برکت ہونے کی شہادت دی گئی ہے، اس گمان کی تغلیط کرتے ہیں۔ اس شخص کو علم نے اتنا ہی چھوا ہے جتنا کہ ایک سوئی کو جسے دریا میں ڈبو کر باہر نکال لیا ہو، پانی نے چھوا ہو۔ یہ شخص اس امر کا زیادہ مستحق ہے کہ وہ اپنے آپ پر روئے، نہ کہ اس کی کسی بات پر اعتماد کیا جائے۔ جو اس بات کو جاننے سے عاجز ہے کہ اعمال کا دار و مدار نیتوں اور ان نفسیاتی ہیئتوں پر ہے جن سے کہ اعمال کا صدور ہوتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''اعمال نیتوں پر موقوف ہوتے ہیں۔'' اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''ان (قربانیوں) کا گوشت اور خون اللہ کو نہیں پہنچتا لیکن تمہارا تقویٰ اس تک پہنچتا ہے۔'' نیز یہ کہ نماز پڑھنے کا اللہ کے ذکر و مناجات کے لئے شریعت میں حکم دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے: ''میرے ذکر کے لئے نماز قائم کرو۔'' اور نماز اس لئے بھی فرض کی گئی ہے کہ اس سے آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رویت و مشاہدہ کے حصول میں مدد ملے گی۔ اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''تم عنقریب اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جیسے اس چاند کو دیکھ رہے ہو کہ تمہیں اس کے دیکھنے میں کوئی شک و شبہ لاحق نہیں ہوتا۔ پس اگر تم طلوع آفتاب سے قبل اور اسی طرح غروبِ آفتاب سے قبل کی نمازوں کو ادا کرنے میں کسی سے مغلوب نہ ہو تو ایسا کر گزرو۔''

اسی طرح زکوٰۃ اس لئے فرض ہوئی کہ بخل کی برائی کو دفع کیا جائے اور فقراء کی ضرورتیں پوری کی جائیں۔ چنانچہ زکوٰۃ دینے سے انکار کرنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''جن لوگوں کو خدا نے اپنے فضل و کرم سے دیا ہے، وہ خرچ کرنے میں بخل کرتے ہیں۔ یہ لوگ اس خیال میں نہ رہیں کہ ایسا کرنا ان کے لئے بہتر ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کے حق میں بدتر ہے۔ عنقریب ان کے گلوں میں اس مال کے جس میں وہ بخل کرتے ہیں، طوق بنا کر پہنائے جائیں گے۔'' اسی بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے جس میں آپؐ نے حضرت معاذ بن جبلؓ سے فرمایا کہ ''تم ان (اہل یمن) کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر زکوٰۃ فرض کی ہے۔ وہ تم میں سے جو دولت مند ہیں، ان سے لی جائے گی اور جو تم میں سے فقراء ہیں، ان کی طرف لوٹا دی جائے گی۔''

نیز یہ کہ روزہ نفس کو مقہور کرنے اور اس پر قابو پانے کے لئے فرض کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''تم پر روزے فرض کیے گئے، جیسے کہ تم سے پہلوں پر فرض کیے گئے تا کہ متقی بنو۔'' اور جیسا کہ آپؐ کا ارشاد ہے: ''روزہ شہوت کو دباتا ہے۔''

حج شعائرِ الٰہی یعنی اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کے لئے فرض کیا گیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''لوگوں کی عبادت کے لئے جو سب سے پہلا گھر معین کیا گیا، وہ مکہ میں ہے۔'' نیز ارشاد ہوا: ''صفا اور مروہ شعائرِ الٰہی میں سے ہیں۔''

قصاص، شریعت میں اس لئے فرض کیا گیا کہ وہ قتل و خونریزی کو روکے۔ چنانچہ ارشادِ ربانی ہے: ''اے اہل عقل و خرد! قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے۔'' اسی طرح حدیں اور کفارے گناہوں سے روکنے کے لئے فرض کیے گئے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''تا کہ وہ (جرم کرنے والا) اپنے کیے کی سزا پائے۔''

جہاد، اعلائے کلمۃ اللہ اور ازالۂ فتنہ کے لئے شریعت میں فرض کیا گیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''ان سے اس وقت تک لڑو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور دین سارے کا سارا اللہ کا ہو جائے۔''

نیز یہ کہ معاملات اور شادی بیاہ کے احکام لوگوں کے درمیان قیامِ عدل کے لئے فرض کیے گئے۔ اسی طرح اور بہت سے احکام ہیں جن کے مبنی بہ مصالح وحکم ہونے پر آیات قرآنی اور احادیث نبوی دلالت کرتی ہیں اور ہر عہد میں کثیر التعداد علماء نے ان پر گفتگو کی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مواقع پر (نماز اور روزے کے لیے) اوقات کا تعین کیا ہے۔ اس کے اسرار بیان فرمائے۔ اسی طرح بعض دوسرے احکام کے اسباب ووجوہ کی صراحت کی۔ بعض موقعوں پر آپؐ نے کسی کام کو کرنے سے جوڈرایا گیا ہے اور کسی کام کو کرنے کی جو ترغیب دی گئی ہے، اس ترہیب وترغیب کے اسرار بھی بیان فرمائے۔ یہ بھی ہوتا تھا کہ بعض موقعوں پر صحابہ کو کسی امر پر اشتباہ ہوتا۔ وہ آپؐ کی طرف رجوع کرتے۔ چنانچہ آپؐ ان کا شبہ دور فرمادیتے اور معاملہ اپنی اصل پر لوٹ آتا۔

ان کے علاوہ ایسے اور بھی بہت سے مواقع ہیں جن کا کہ شمار مشکل ہے۔

آپؐ کے بعد صحابہ بھی اسی طرح احکام شرعی کی حکمتیں اور مصلحتیں بتاتے رہے۔ چنانچہ ابن عباسؓ نے جمعہ کے دن غسل کرنا جو شرعاً ضروری قرار دیا گیا ہے، اس کی حکمت بیان کی۔ زید بن ثابتؓ نے طواف کے دوران میں خانہ کعبہ کے صرف دو رُکنوں کے بوسے پر اکتفا کرنے کی وجہ بیان کی۔ اس کے بعد تابعین کا بھی یہی عمل رہا۔ ان کے بعد جو بھی علمائے مجتہدین آئے، وہ شرعی احکام کے مبنی بر مصالح وحکم ہونے پر استدلال کرتے رہے اور اسی بنا پر ان کے معانی سمجھاتے رہے۔ وہ ہر حکم منصوص کی جو کہ بذریعہ نص شرعی ثابت ہے، اس سے مناسبت رکھنے والی علت کی، خواہ وہ علت دفع مضرت کے لئے ہو یا جلبِ منفعت کے لیے، تخریج کرتے اور اسے بیان کرتے۔ یہ سب باتیں ان کی کتابوں اور ان کے مذاہب (کلام) میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔ پھر غزالی، خطابی، ابن عبدالسلام اور ان جیسے اور علمائے مجتہدین نے اللہ ان کی مساعی کو مشکور فرمائے، لطیف نکات اور اعلیٰ تحقیقات پیش کیں۔

حسن وقبح کا شرعی یا عقلی ہونا

لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے کہ جہاں سنتِ نبویؐ نے احکامِ شرعی کے مبنی بر مصالح وحکم ہونے کا اثبات کیا ہے اور امت کا اس پر اجماع ہے، وہاں ان مصالح وحکم سے قطع نظر، احکام میں سے کسی کے واجب اور کسی کے حرام ہونے کا ایک بہت بڑا سبب نازل شدہ شریعت کی طرف سے ان کو واجب اور حرام قرار دینا بھی ہے اور اسی سے ان احکام کو بجالانے والا اجر وثواب کا مستحق اور ان کی خلاف ورزی کرنے والا سزا کا مستوجب ہوگا۔

یہ بات نہیں جیسا کہ عام طور پر گمان کیا جاتا ہے کہ اعمال کا حسن وقبح، ان معنوں میں کہ ان کا کرنے والا ثواب اور عذاب کا مستحق ہوتا ہے، من کل وجہ (ہر حیثیت سے) عقلی ہے اور شریعت کا منصب صرف یہ ہے کہ وہ اعمال کے ان خواص کو بیان کرے جو اصلاً ان میں موجود ہیں نہ کہ وہ بعض احکام کو واجب قرار دے اور بعض کو حرام۔ جیسے کہ ایک طبیب ہو اور وہ دواؤں کی خاصیتیں اور امراض کی قسمیں بیان کردے (اور اسے دواؤں میں خاصیتیں پیدا کرنے میں کوئی دخل نہ ہو) اس طرح کا گمان ایک فاسد گمان ہے۔ بادی النظر ہی میں سنت اسے مسترد کرتی ہے۔ آخر ایسا کیوں نہ ہو جبکہ خود

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تراویح کی نماز کے متعلق فرمایا کہ میں اس لئے اس میں شریک نہ ہوا کہ میں ڈرتا ہوں، کہیں یہ تم فرض نہ ہو جائے۔ اسی طرح آپ کا ایک اور ارشاد ہے: ''مسلمانوں میں سے سب سے بڑا جرم اس مسلمان کا ہے جس نے کسی ایسی چیز کے متعلق سوال کیا جو خدا نے پہلے حرام نہیں کی تھی لیکن اس شخص کے سوال کرنے پر وہ حرام قرار دی گئی۔'' اس کے علاوہ اور بھی اسی طرح کی حدیثیں ہیں۔

اب اگر شریعت میں احکام کا حسن و قبح محض عقلی ہوتا تو مرضان میں اس مقیم کو جسے روزہ رکھنے میں مسافر کی طرح مشقت اور تکلیف ہوتی ہے، روزہ نہ رکھنے کی اجازت دے دی جاتی کیونکہ جس مشقت و تکلیف کی بنا پر روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اس صورت میں وہ مقیم اور مسافر دونوں میں برابر ہے۔ اسی طرح ایک ایسے مسافر کے لئے جسے سفر میں پورا آرام و آسودگی میسر ہو، روزہ نہ رکھنا جائز ہوتا۔ یہی حال باقی سب حدود کا ہے جو کہ شارع علیہ السلام نے مقرر کی ہیں۔

سنت نے یہ بھی واجب قرار دیا ہے کہ جب کوئی حکمِ شرعی صحیح روایت سے ثابت ہو جائے تو اس پر عمل کرنا اس بات پر اٹھا نہ رکھا جائے کہ اس حکم کی مصلحت و حکمت معلوم نہیں کیونکہ بہت سے لوگوں کی عقلیں احکام کی مصلحتیں معلوم کرنے سے عام طور پر قاصر ہوتی ہیں اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہماری عقلوں سے کہیں زیادہ قابل وثوق ہے۔ اسی لئے شرعی احکام کے اسرار کا علم اس کے اہلوں کے سوا دوسروں پر ہمیشہ مخفی رکھا گیا اور اس کے لئے وہی شرطیں رکھی گئیں جو قرآن مجید کی تفسیر کے لئے ہیں۔ اس میں محض رائے سے جس کی سند سنن و آثار سے نہ ملتی ہو، غور و خوض کرنا حرام قرار دیا گیا۔

جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا، اس سے یہ واضح ہو گیا کہ لوگوں کو شرعی احکام کا مکلف بنانے کی مثال یوں ہے کہ ایک آقا ہے جس کے غلام بیمار ہو گئے۔ اس نے اپنے ایک خاص آدمی کو ان پر مسلط کر دیا تا کہ وہ انہیں دوا پلائے۔ اب اگر وہ غلام اس آدمی کی اطاعت کرتے ہیں۔ اس سے ان کا آقا ان سے خوش ہوا اور اس نے انہیں انعام و اکرام دیا۔ اسی طرح ان کو مرض سے بھی نجات ہو گئی۔ اگر ان غلاموں نے اس آدمی کا حکم نہ مانا تو انہوں نے اپنے آقا کی نافرمانی کی اور وہ اس کی ناراضگی کے مستوجب ہوئے۔ اس نے انہیں سخت سے سخت سزا دی اور وہ اپنی اس نافرمانی کی وجہ سے مرض سے ہلاک بھی ہوئے۔

اوپر جو کچھ بیان ہوا، اس سے واضح ہو گیا کہ یہاں معاملہ دو امور کے بین بین ہے اور یہ کہ ایجاب و تحریم یعنی بعض امور کے واجب اور بعض کے حرام ہونے میں اعمال کے خواص اور ان کے متعلق شریعت کی طرف سے حکم کے نزول، دونوں کو دخل ہے اور اسی سے ثواب و عذاب مترتب ہوتا ہے۔

☆☆☆

حقیقتِ نبوت اور اس کے خواص

''حجۃ اللہ البالغہ'' میں ایک باب کا عنوان ''سیاسیاتِ ملیہ'' ہے جس میں حضرت شاہ ولی اللہ نے

صراط مستقیم کی طرف ہدایت دینے والوں اور ملتیں قائم کرنے والوں کی ضرورت پر بحث کی ہے۔
وہ لکھتے ہیں کہ اگرچہ عقلِ سلیم نیکی اور بدی میں تمیز کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے لیکن اکثر لوگوں کی عقلوں پر حجابات پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لئے انہیں اصلاح کے لئے سنت راشدہ کو جاننے والے عالم کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ عالم اپنی جبلی خصوصیات اور اعلیٰ کردار کی وجہ سے اپنی قوم کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ ان ہادیانِ صراطِ مستقیم میں اعلیٰ طبقہ مفہمین کا ہوتا ہے۔ شاہ صاحب کے الفاظ میں ''جب حکمتِ الٰہیہ اس کا تقاضا کرتی ہے کہ مفہمین میں سے کسی ایسے کو مبعوث کرے جو لوگوں کو ضلالت کے اندھیروں سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لائے تو ایسے مفہم کو نبی کہتے ہیں۔''
''سیاساتِ ملیہ'' کے بعد کے باب میں شاہ صاحب نے نبوت اور اس کے خواص سے بحث کی ہے۔ نیچے اس باب میں سے چند اقتباسات دیئے جاتے ہیں۔

☆☆☆

تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ رسولوں کی بعثت کے سلسلے میں حکمت الٰہیہ کے اقتضا کا انحصار نسبتی اور اضافی خیر پر ہوتا ہے اور بعثت کی تدبیر میں اسی کا لحاظ اور اعتبار کیا جاتا ہے۔ اس نسبتی و اضافی خیر کی حقیقت کا علم صرف علام الغیوب کے اور کسی کو نہیں ہوتا۔ البتہ اس قدر ہم قطعی طور پر جانتے ہیں کہ کچھ ایسے اسباب ضرور ہوتے ہیں جن سے کہ کوئی بھی بعثت خالی نہیں ہوتی۔

انبیاء کی سیرت میں سے یہ بھی ہے کہ وہ لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق جن پر ان کی تخلیق ہوتی ہے، نیز ان کے علوم کے مطابق جو انہیں اصلاً اپنی خلقت کے اعتبار سے حاصل ہیں، کلام کریں اور یہ اس لئے کہ نوعِ انسان جہاں بھی وہ پائی جاتی ہے، اس کی اصل خلقت میں ادراک کی ایک حد ہے جو باقی تمام حیوانات کی ادراک سے زیادہ ہوتا ہے۔ ماسوا اس کے کہ کسی کا مادہ ہی ناقص ہو۔

نوعِ انسان میں اس ادراک کے علاوہ کچھ اور علوم بھی ہوتے ہیں، جن تک اس کی رسائی خرقِ عادت یعنی عادت مستمرہ کی مخالفت ہی سے ہوتی ہے۔ جیسے کہ انبیاء اور اولیاء کے نفوسِ قدسیہ کی ان علوم تک رسائی ہوتی ہے یا ان علوم تک سخت ریاضتوں سے رسائی ہوتی ہے جو نفسِ انسانی کو اس چیز کا اہل بنا دیتی ہیں جس کا اسے وہم و گمان بھی نہیں ہوتا یا پھر ان علوم تک رسائی عرصہ دراز تک حکمت و کلام کے قواعد اور اصولِ فقہ وغیرہ کی مشق و مزاولت کرنے سے ہوتی ہے۔ پس انبیاء لوگوں کو ان کی سادہ عقل و ادراک کے مطابق ہی مخاطب کرتے ہیں جو ان کی اصل خلقت میں ودیعت کی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ اپنے خطاب میں ایسے امور کی طرف التفات نہیں کرتے جن کے اسباب نادر و غیر معمولی ہوتے ہیں اور وہ کم ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر انبیاء نے لوگوں کو اس امر کا مکلف نہیں کیا کہ وہ اپنے رب کو تجلیات و مشاہدات اور اسی طرح براہین عقلی اور قیاسات سے جانیں اور نہ اسے ہر جہت سے منزہ ہونے کی حیثیت سے جاننے کا مکلف بنایا کیونکہ جس شخص نے طویل مدت تک ریاضتیں نہ کی ہوں یا وہ معقولیوں کی صحبت میں نہ رہا ہو، اس کے لئے رب کو اس طرح جاننا

محال و ممتنع ہے۔

اور انبیاء کی یہ بھی سیرت ہے کہ وہ امور جن کا تہذیب نفس اور سیاستِ امت سے تعلق نہیں ہوتا، وہ ان میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے۔ مثلاً فضا کے اس طرح کے حوادث کا بیان جیسے بارش، سورج گرہن، چاند گرہن، ہالہ، نباتات و حیوانات کے عجائبات، سورج اور چاند کی گردش کا حساب، روزمرہ کے حوادث کے اسباب اور انبیاء، بادشاہوں اور شہروں کے قصے وغیرہ۔۔ ہاں اس سلسلے میں وہ تھوڑی سی باتیں ضرور کہہ جاتے ہیں جن سے کہ لوگوں کے کان مانوس ہوتے ہیں اور ان کی عقلیں انہیں قبول کر لیتی ہیں۔ یہ باتیں بھی اس لئے کی جاتی ہیں کہ ان سے اللہ کی نعمتوں (آلاء اللہ) اور تاریخی واقعات (ایام اللہ) کو یاد دلا کر ان سے عبرت دلانا مقصود ہوتا ہے۔ پھر ان کا بھی ذکر استطرادًا یعنی بسلسلۂ کلام اور اجمالاً کیا جاتا ہے اور اس میں استعارات اور مجازات لا کر وسعت پیدا کر دی جاتی ہے۔ یہی اصول تھا کہ جب صحابہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے چاند کے گھٹنے بڑھنے کی وجہ دریافت کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیتے ہوئے اصل مسئلے سے اعراض کیا اور مہینوں کے فوائد بیان کر دیئے۔ (یسئلونك عن الاهلة قل هي مواقيت للناس والحج) تم بہت سے لوگوں کو دیکھو گے جن کا مذاق اس قسم کے علوم و فنون اور اس طرح کے دوسرے اسباب سے مانوس ہونے کی وجہ سے بگڑ گیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے رسولوں کے کلام سے ایسے معانی نکالے جو ان سے نہیں نکلتے تھے۔

اصل دین ایک ہے اور شرائع و مناہج مختلف ہیں

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اس نے تمہارے لئے دین کا وہی راستہ مقرر کیا ہے جس کی اس نے نوحؑ کو وصیت کی اور جس کی ہم نے تمہیں وحی کی۔ وہی وحی ہم نے ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ کو کی کہ دین کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو'' حضرت مجاہد کہتے ہیں کہ اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ اے محمدؐ! ہم نے تمہیں اور ان سب کو ایک ہی دین کی وصیت کی ہے۔

ارشادِ ربانی ہے: ''اور یہ تمہاری امت ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں۔ پس تم مجھ سے ڈرو۔ پھر انہوں نے پھوٹ ڈال کر اپنا کام آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر لیا۔ ہر فرقہ جو اس کے پاس ہے، اس پر ریجھ رہا ہے۔'' یعنی ملتِ اسلام جو تمہاری ملت ہے، انہوں نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا یعنی مشرکین، نصاریٰ اور یہود نے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک ایک طریقہ (شرعۃ) اور راستہ (منہاجاً) مقرر کر دیا۔'' ابن عباس کہتے ہیں۔ اس سے مراد سبیل اور سنت ہے۔

ارشاد ربانی ہے: ''ہم نے ہر ایک امت کے لئے عبادت کا ایک طریقہ مقرر کر دیا ہے کہ وہ اس کے مطابق عبادت کرتے ہیں۔'' یعنی ان کے لئے شریعت مقرر کر دی جس پر کہ وہ عمل پیرا ہوں۔

تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ دین کی اصل (اصل الدین) ایک ہے اور تمام انبیاء علیہم السلام اس پر متفق ہیں۔ اختلاف اگر ہے تو شریعتوں (شرائع) اور طریقوں (مناہج) پر ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تمام انبیاء کا اس پر اتفاق ہے کہ ایک اللہ کی عبادت کی جائے۔ اسی سے مدد مانگی جائے۔ اس کی بارگاہِ قدسی کو ان تمام چیزوں سے منزہ اور پاک مانا جائے جو اس کے شایانِ شان نہیں اور اس کے اسماء، صفات میں الحاد و کجروی کو حرام سمجھا جائے۔

اللہ کی طرف سے اس کے بندوں پر یہ حق عائد ہوتا ہے کہ وہ اس کی تعظیم بجالائیں۔ ایسی تعظیم جس میں تفریط و کوتاہی کا مطلق شائبہ نہ ہو۔ وہ اپنے منہ اور دل اللہ کے سامنے جھکائیں اور اس کے شعائر (نشانیوں) کے ذریعہ اس کا تقرب حاصل کریں۔ وہ یہ مانیں کہ اللہ نے تمام حوادث کو پیدا کرنے سے پہلے ان کا اندازہ کرلیا تھا۔ یہ کہ اللہ کے فرشتے ہیں اور جس بات کا انہیں حکم دیا جاتا ہے، وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور جوان کو حکم دیا جاتا ہے، وہ اسے بجالاتے ہیں۔ اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے، کتاب اتارتا ہے اور لوگوں پر اپنی اطاعت فرض کرتا ہے۔ نیز یہ کہ قیامت کا آنا برحق ہے۔ مرنے کے بعد جی اٹھنا حق ہے، جنت حق ہے، دوزخ حق ہے۔

ان امور کی طرح تمام انبیاء علیہم السلام کا ''برّ'' یعنی نیکی کی جملہ انواع پر بھی اتفاق و اجماع ہے۔ جیسے طہارت و پاکیزگی، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج۔ دعا اور ذکر کے ضمن میں نفل عبادات کے ذریعہ اللہ کا تقرب حاصل کرنا اور اللہ کی طرف سے نازل کردہ کتاب کی تلاوت۔ اسی طرح تمام انبیاء کا نکاح کی ضرورت، حرام کاری کی حرمت، لوگوں کے درمیان عدل قائم کرنے، ظلم وستم کو حرام سمجھنے، نافرمانوں اور اہل معاصی پر حدود قائم کرنے اللہ کے دشمنوں کے خلاف جہاد کرنے اور اللہ کے احکام اور اس کے دین کی نشر و اشاعت میں جدوجہد کرنے پر اتفاق ہے۔

یہ ہے دین کی اصل (سب کے ہاں مسلم اور متفق) اسی لئے قرآن مجید نے ان امور کی حقیقت ولمیّت پر بحث نہیں کی اور اگر کی ہے تو شاذ و نادر اور یہ اس لئے کہ یہ امور ان لوگوں کے ہاں جوان کے مخاطب تھے، مسلمہ تھے۔ بس اگر اختلاف تھا تو ان امور کی صورتوں اور شکلوں میں تھا۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں نماز میں بیت المقدس کی طرف منہ کیا جاتا تھا اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں نماز میں کعبہ کی طرف۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں زنا کے لئے صرف رجم وسنگساری کی سزا تھی اور ہماری شریعت میں محصن (شادی شدہ) کے لئے رجم کی سزا رہنے دی گئی اور غیر محصن (غیر شادی شدہ) کے لئے کوڑوں کی سزا تجویز ہوئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں فقط قصاص تھا اور ہماری شریعت آئی اور اس میں قصاص کے ساتھ دیت بھی ہے۔ ایسے ہی انبیاء میں عبادات اور ان کے آداب وارکان کے بارے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ الغرض وہ مخصوص اوضاع واشکال جن سے کہ برّ اور نیکی کی مختلف انواع اور معاشرتی تدابیر نافعہ ترکیب پاتی ہیں، یہ ''شرعۃ'' اور ''منہاج'' ہیں۔[1]

تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ طاعات وعبادات جن کا اللہ تعالیٰ نے تمام ادیان میں حکم دیا ہے، وہ دراصل عبارت ہیں ان اعمال سے جو نفسی کیفیات اور ہیئتوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ آخرت میں نفوس کو انہی اعمال کی جزا اور سزا ملے گی اور انہی سے نفوس کے اندر انقباض وانشراح پیدا ہوتا ہے۔ یہ اعمال انسانوں کے اندر کی نفسی کیفیات وہیئات کی اشباح وتماثیل (ظاہری صورتیں اور شکلیں) ہیں۔ یقیناً ان اعمال کو جانچنے کا معیار (میزان) اور ان کا مدار علیہ وخلاصہ انسانوں کے اندر کی یہی نفسی کیفیات وہیئات ہیں۔ جو شخص ان امور کو نہیں جانتا اسے اعمال کے متعلق کبھی بصیرت حاصل نہیں ہوگی۔ چنانچہ بسا اوقات وہ ایسی چیز پر اکتفا کرے گا جو فی الحقیقت کافی نہیں ہے اور بسا اوقات وہ بلاقرأت اور بلادعا کے نماز پڑھے گا جو اس کے لئے بالکل بے فائدہ ہوگی۔ اس لئے ایک صحیح معنوں میں معرفت کا حق رکھنے والے عارف کی رہنمائی اور تادیب وسیاست کے سوا چارہ نہیں جو مخفی اور مشتبہ امور کو واضح صورتوں میں منضبط کرے اور انہیں ایسی مخصوص

شکل دے کہ قریب اور بعید کے لوگ ان کو تمیز کر سکیں اور اس طرح انہیں ان کے بارے میں کوئی اشتباہ نہ رہے۔ یہ اس لئے کہ ان اعمال کے کرنے یا نہ کرنے کی بنا پر ان کی پرسش کی جا سکے۔ اس پر ان کا مواخذہ ہو سکے اور ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر ایک حجت ہو اور وہ ان اعمال کو اپنی استطاعت کے مطابق بجالائیں۔

ہر زمانے اور ہر قوم میں مخصوص شرائع کے نزول کے اسباب

قرآن مجید میں آیا ہے: ''بنی اسرائیل کے لئے تمام کھانے حرام تھے، سوائے ان کے جو اسرائیل (یعقوب) نے نزولِ تورات سے پہلے اپنے اوپر حرام کر لئے تھے۔ (اے پیغمبر!) کہہ دو۔ تم تورات لاؤ اور اسے پڑھو۔ اگر تم (اپنے دعوے میں) سچے ہو۔'' اس آیت کی تفسیر یہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ ایک دفعہ سخت بیمار ہو گئے۔ انہوں نے یہ نذر مانی کہ اگر اللہ نے انہیں شفا دی تو وہ اپنے اوپر اپنا محبوب ترین کھانا اور مشروب حرام کر لیں گے۔ چنانچہ وہ اچھے ہو گئے تو انہوں نے اپنے اوپر اونٹ کا گوشت اور دودھ حرام کر لیا۔ اس حرمت میں ان کی اولاد نے ان کی پیروی کی۔ اس پر صدیاں گزر گئیں۔ یہاں تک کہ یہود کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اگر اونٹ کا گوشت کھانے اور اس کا دودھ پینے میں انبیاء کی مخالفت کریں گے تو یہ انبیا کی شان میں بے ادبی ہو گی۔ ان حالات میں تورات نازل ہوئی اور اس نے اونٹ کے گوشت اور دودھ کو بنی اسرائیل پر حرام کر دیا۔

جب ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور آپؐ نے فرمایا کہ میں ملت ابراہیم پر ہوں تو یہود نے کہا کہ آپؐ ملت ابراہیم پر کیسے ہو سکتے ہیں جبکہ آپؐ اونٹ کا گوشت کھاتے اور اس کا دودھ پیتے ہیں۔ پس اللہ نے کہا کہ ''کل الطعام کان حلا'' ان کی تردید فرمائی اور کہا کہ اصل میں سارے کھانے حلال ہیں۔ یہود کے لئے اونٹ کے گوشت کی حرمت ایک عارضی سبب کی وجہ سے ہوئی تھی۔ چنانچہ جب بنی اسماعیل میں نبوت کا ظہور ہوا اور چونکہ وہ اس عارضی سبب سے بَری تھے، ان کے لئے اس حرمت کا لحاظ رکھنا ضروری نہ رہا۔ معلوم ہونا چاہیے کہ انبیاء کی شریعتوں میں اختلاف چند اسباب و مصالح کی وجہ سے ہوتا ہے اور یہ یوں کہ ایک ملت میں اللہ کے جو شعائر [2] مقرر ہوتے ہیں تو یہ شعائر اس بنا پر متعین ہوتے ہیں کہ ان سے استعدادیں اور صلاحیتیں نشوونما پاتی ہیں۔ احکام و عبادات کے ضمن میں جو معین مقداریں اور اوقات مقرر کیے جاتے ہیں تو اس میں ان لوگوں کے جن کو ان کا مکلف بنایا جاتا ہے، حالات اور عادات کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ چونکہ حضرت نوحؑ کی قوم کا مزاج انتہائی قوی و شدید تھا، جیسا کہ اللہ نے خبر دی ہے۔ اس لئے ان کی بہیمیت کے زور کو توڑنے کی خاطر انہیں مسلسل روزے رکھنے کا حکم دیا گیا۔ اس کے مقابلے میں اس امت کا مزاج چونکہ ضعیف ہے، اس لئے اسے مسلسل روزے رکھنے سے روکا گیا۔ اس طرح اللہ نے پہلوں کے لئے مالِ غنیمت حلال قرار نہیں دیا تھا لیکن جب اس نے ہماری کمزوری دیکھی تو اسے ہمارے لئے حلال کر دیا۔

دراصل انبیاء علیہم السلام کے سامنے مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں جن ارتفاقات یعنی معاشرتی انتظامات اور تدابیر کا رواج ہے، ان میں ضروری اصلاح کریں۔ اس لئے وہ ان کو یکسر چھوڑ کر ایسی باتوں کی دعوت نہیں دیتے جو ان کی قوم کے لئے بالکل اجنبی و غیر مالوف ہوں۔ اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو شاذ و نادر۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ مصالح کے محل و مواقع

زمانوں اور عادات کے اختلاف کے ساتھ مختلف ہوتے رہتے ہیں۔ اسی لئے شریعتوں میں نسخ کا واقع ہونا صحیح ہے۔

اس کی مثال ایک طبیب کی سی ہے۔ وہ ہر حال میں مریض کے مزاج کو اعتدال میں رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور افراد اور زمانے کے اختلاف کے ساتھ ساتھ مریض کے مزاج کو اعتدال میں رکھنے کے احکام بھی مختلف ہوتے رہتے ہیں۔ اگر مریض جوان ہے تو طبیب اسے ایسی چیزوں کا حکم دے گا جو وہ بوڑھے مریض کو نہیں دے گا۔ اگر گرمی کا موسم ہے تو وہ مریض کو یہ دیکھ کر کہ فضا میں اعتدال کے امکانات ہیں، کھلی ہوا میں سونے کا حکم دے گا۔ اگر سردیوں کا موسم ہے تو وہ یہ دیکھ کر کہ باہر سردی ہے، مریض کو کمرے کے اندر سونے کا حکم دے گا۔

پس جو شخص اصلِ دین اور شرائع و مناہج کے اختلاف سے واقف ہے تو اس کے نزدیک یہ تغیر و تبدل درحقیقت تغیر و تبدل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعتوں کی نسبت ان قوموں کی طرف ہوتی ہے جن میں وہ ہوتی ہیں۔ یہ اس لئے کہ وہ انہی شریعتوں کی مستحق ہوتی ہیں جن کی ان کے اندر استعداد ہوتی ہے اور وہ ان شریعتوں کے لئے زبانِ حال سے باصرار سوال کرتی ہیں۔ اسی وجہ سے ہدفِ ملامت یہی قومیں بنائی جاتی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے: **فتقطعوا امرهم بينهم زبراً كل حزب بما لديهم فرحون**۔ پھر انہوں نے پھوٹ ڈال کر اپنا کام آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر لیا۔ ہر فرقہ جو اس کے پاس ہے، اس پر ریجھ رہا ہے۔

واضح ہو کہ شرائع و مناہج کے ایک مخصوص صورت میں نازل ہونے کے بہت سے اسباب ہوتے ہیں لیکن ان سب کا انحصار دو انواع پر ہے۔ ایک نوع امر طبیعی کی طرح ہے جو موجب بنتی ہے لوگوں کو ان شرعی احکام کا مکلف کرنے کا۔ اب جو تمام افرادِ انسانی کی ایک خاص طبیعت اور ان کے مخصوص احوال سبب بنتے ہیں، انہیں احکام کا مکلف کرنے کا۔ اس کی مثال ایک اندھے کی سمجھیے۔ اس کے خزانۂ خیال میں نہ رنگ ہوتے ہیں نہ صورتیں۔ وہاں صرف الفاظ اور وہ تاثرات وغیرہ ہوتے ہیں جو چیزوں کے چھونے سے اسے حاصل ہوتے ہیں۔ پس جب اس اندھے پر غیب سے یا حادثے وغیرہ کی قبیل سے کوئی چیز وارد ہوتی ہے تو وہ اس کے علم میں وہی صورت اختیار کرتی ہے جو اس کے خزانۂ خیال میں پہلے سے محفوظ ہوتی ہے، دوسری کوئی صورت نہیں۔ اسی طرح ایک عربی کے سامنے جو سوائے عربی زبان کے اور کوئی زبان نہیں جانتا، جب کوئی علم الفاظ میں متمثل ہوگا تو وہ اس کے لئے سوائے عربی زبان کے اور کسی زبان میں متمثل نہیں ہوگا۔

اسی طرح وہ ملک جہاں ہاتھی وغیرہ جیسے کریہہ المنظر جانور پائے جاتے ہیں۔ وہاں کے لوگوں کو جنوں کا چمٹنا، آسیب کا ہونا اور شیاطین کا ڈرانا ایسے ہی کریہہ المنظر جانوروں کی صورت میں نظر آئے گا۔ دوسرے ملکوں میں جہاں یہ جانور نہیں پائے جاتے، ایسا نہیں ہوگا۔ وہ ملک جہاں بعض چیزوں کی عزت و تکریم کی جاتی ہے اور وہاں عمدہ قسم کے بعض کھانے اور لباس ہوتے ہیں۔ ان ملکوں کے رہنے والوں کو نعمتیں اور فرشتوں کی خوشنودی و بشاشت انہی چیزوں اور کھانوں و لباس کی صورتوں میں نظر آئے گی اور جہاں ایسا نہیں ہوگا وہاں یہ صورت بھی نہیں ہوگی۔ اسی طرح ایک عربی جب وہ کسی کام کو کرنے کی طرف متوجہ ہو یا وہ کسی راستے پر جانا چاہتا ہو اور اس حالت میں وہ لفظ ''راشد'' یا ''نجیح'' سنے تو یہ اس کے لئے جس کام کے وہ درپے ہے، اس کے اچھے ہونے کی دلیل ہوگی لیکن جو عربی نہ ہو، اس کے لئے ایسا نہیں ہوگا۔ اس نوع کی بعض باتوں کا ذکر احادیث میں بھی آیا ہے۔

اسی طرح شرائع و مناہج میں ان علوم کا جو قوم کے خزانہ خیال میں جمع ہوتے ہیں اور ان اعتقادات کا جو ان کے ہاں پردۂ خفا میں موجود ہوتے ہیں، لحاظ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ان عادات کا لحاظ کیا جاتا ہے جو ان میں اس طرح جاری و ساری ہوتی ہیں جیسے مثال کے طور پر کتے کے کاٹے کا اثر ایک دوسرے میں جاری و ساری ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اونٹوں کا گوشت اور دودھ بنی اسرائیل پر حرام تھا اور بنی اسماعیل پر حرام نہیں تھا۔ اسی لئے کھانے کی چیزوں میں طیب (اچھے) اور خبیث (برے) کا سوال عربوں میں عادات پر چھوڑ دیا گیا۔ بہن کی لڑکیوں سے نکاح ہمارے ہاں حرام کیا گیا اور یہود کے ہاں یہ حرام نہ تھا کیونکہ یہود بہن کی اولاد کو ان کے باپوں کی قوم میں سے شمار کرتے تھے، ان میں اور بہنوں کی اولاد کے ساتھ نہ تو جلا ملا ہوتا تھا نہ ارتباط اور نہ انہیں وہ ساتھ رکھتے تھے۔ ان کے ہاں بہنوں کی اولاد بالکل اجنبی سمجھی جاتی تھی لیکن عربوں کے ہاں اس کے برخلاف تھا۔

اسی طرح گائے کے بچھڑے کے گوشت کو اس کی ماں کے دودھ میں پکانا یہود کے ہاں حرام تھا اور ہمارے ہاں ایسا نہ تھا کیونکہ یہ علم کہ جس چیز کو اللہ نے بچھڑے کی نشوونما کے لئے بنایا ہے، اس سے اس کے جسم کو توڑنے پھوڑنے اور اس کے مرکب شدہ وجود کو تحلیل کرنے کا کام لیا جارہا ہے اور یہ اللہ کی مخلوق میں تغیر و تبدل کرنا اور اس کی تدابیر سے ٹکرانا ہے۔ یہ علم یہود کے ہاں راسخ ہو چکا تھا۔ اس کے برخلاف عرب اس علم سے اللہ کی تمام مخلوق سے بڑھ کر دور تھے۔ یہاں تک کہ اگر ان کو یہ بتایا جاتا تو وہ اس حکم کا مناسب موضع و محل اور مدار علیہ کبھی نہ سمجھ پاتے۔

علاوہ ازیں، نزول شرائع میں جن امور کا لحاظ کیا جاتا ہے، وہ فقط وہ علوم، حالات اور عقائد نہیں ہوتے جو لوگوں کے سینوں میں پہلے سے محفوظ و متمکن ہوتے ہیں بلکہ اس سلسلے میں سب سے زیادہ اعتبار اور سب سے مقدم خیال ان چیزوں کا ہوتا ہے جن پر ان کی نشوونما ہوئی ہوتی ہے اور جن کی طرف ان کی عقلیں مائل ہوتی ہیں۔ خواہ وہ اسے جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں۔

تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ بہت سی عادات اور علوم مخفیہ ایسے ہیں کہ ان پر عرب، عجم، معتدل آب و ہوا کے ملکوں کے تمام باشندوں اور اخلاق فاضلہ کی قابلیت رکھنے والے مزاج والوں کا اتفاق ہے۔ جیسے اپنی میت پر غم کرنا، اس کے حق میں رفق و نرمی پسند کرنا۔ مثلاً حسب نسب پر فخر کرنا یا ایک چوتھائی، تہائی یا اسی قدر رات گزرے سو جانا اور صبح تڑکے جاگنا یا اس طرح کے اور امور جن کی طرف ہم ارتفاقات کے باب میں اشارہ کر آئے ہیں۔ پس ان عادات اور علوم کا سب سے بڑھ کر لحاظ کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ عادات اور عقائد آتے ہیں جو صرف ان لوگوں کے ساتھ مختص ہوا کرتے ہیں جن میں کہ نبی مبعوث ہوتا ہے۔ ان کا بھی شرائع کی تقرری میں لحاظ کیا جاتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے **وقد جعل الله لکل شئی قدرا** (اللہ نے ہر شے کا اندازہ کر رکھا ہے)

تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ نبوت اکثر کسی نہ کسی ملت کے تحت ہوتی ہے۔ (**تکون من تحت الملت**۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے **ملة ابیکم ابراهیم** (تمہارے باپ ابراہیم کی ملت) یا جیسا کہ اس کا ارشاد ہے **وان من شیعته لابراهیم** (اور نوح ہی کے طریق پر چلنے والوں میں ایک ابراہیم بھی تھے)

اس کا راز یہ ہے کہ عرصہ ہائے دراز تک لوگ ایک دین کی پابندی کرتے اور اس کے شعائر کی تعظیم کرتے چلے

آتے ہیں۔ اس طرح اس دین کے احکام ان میں اس قدر مشہور ہو جاتے ہیں اور ان کے ہاں رواج پا جاتے ہیں کہ ان کا شمار بدیہیات اولیہ میں سے ہونے لگتا ہے جن کا کہ انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پھر ایک دوسری نبوت آتی ہے کہ اس ملت میں جو کجی آ گئی ہے، اسے درست کرے اور اس میں جو فساد پیدا ہو گیا ہے، اس کی اصلاح کرے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ نبی کی روایات کے ساتھ اور چیزیں مخلوط ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ یہ نبوت ان احکام کی جو لوگوں میں مشہور ہوتے ہیں، چھان بین کرتی ہے۔ پس جو ان میں صحیح اور ملی سیاست کے قواعد کے مطابق ہوتا ہے، یہ نبوت اسے تبدیل نہیں کرتی بلکہ اس کی طرف وہ دعوت دیتی اور لوگوں کو اس پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب و تاکید کرتی ہے۔ جس حکم میں سقم ہوتا ہے اور اس میں تحریف ہوئی ہوتی ہے۔ یہ نبوت اس میں تبدیلی کرتی ہے لیکن یہ تبدیلی بقدر ضرورت ہی کی جاتی ہے۔ جن احکام کا اضافہ ضروری ہوتا ہے یہ نبوت لوگوں کے پاس پہلے سے جو کچھ ہوتا ہے، اس میں ان کا اضافہ کر دیتی ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کے ہاں پہلی شریعت میں سے جو کچھ باقی ہوتا ہے، یہ نبی اکثر اوقات اپنے مطالب میں اس سے استدلال کرتا ہے۔

اسی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ نبی فلاں نبی کی ملت یا اس کے گروہ (شیعہ) میں سے ہے اور نبوتوں کا اکثر اختلاف ملتوں کے اختلاف کی وجہ سے جن میں کہ نبوت کا نزول ہوتا ہے، ہوا کرتا ہے۔

شریعتوں کے ایک مخصوص صورتحال میں نازل ہونے کی دوسری قسم بمنزلہ ایک عارضی امر کے ہے اور یہ اس لئے ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ زمان و وقت سے بلند و برتر ہے لیکن کسی نہ کسی وجہ سے (لوجه من الوجوه) اس کا زمانے اور زمانیات سے ارتباط ضرور ہوتا ہے اور اسی قاعدے اور اصول پر سمجھ لینا چاہیے۔ اس زمانے کا وہ عظیم و فخیم حادثہ جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑی پریشانی ہوئی تھی اور وہ تھا حضرت عائشہؓ پر بہتان لگائے جانے کا حادثہ یا کسی سائل کا آپؐ سے بار بار سوال کرنا جس کی وجہ سے آپ کو فکر لاحق ہو جاتی تھی۔ جیسے ظہار [3] کا واقعہ۔ تو اس قسم کے حادثے بھی نزول احکام کا سبب بن جاتے تھے اور اس کے ذریعہ حقیقت حال کا انکشاف کر دیا جاتا تھا۔ اصل رضائے الٰہی اس میں ہے کہ نزول شرائع کے لئے اس قسم کے اسباب کم ہوں کیونکہ اس صورت میں جو احکام نازل ہوتے ہیں، ان میں اس وقت کی خصوصی مصلحت کا حکم غالب ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کی وجہ سے بعد میں آنے والوں کے لئے اکثر اوقات تنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ مسائل پوچھنے کو ناپسند فرماتے تھے۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے جو کچھ میں نے تمہارے لئے چھوڑا ہے، مجھے اسی تک رہنے دو۔ تم سے پہلے لوگ اپنے انبیاء سے کثرت سے سوال کرنے اور ان کے بارے میں باہم اختلاف کرنے کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔ آپؐ نے فرمایا، مسلمانوں میں سب سے بڑا جرم اس مسلمان کا ہے جس نے ایک چیز کے متعلق سوال کیا اور اس کے اس سوال کرنے پر وہ چیز حرام کر دی گئی۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

☆☆☆

ارتفاقات کا قیام اور رسوم کی اصلاح

انسان جبلتوں کی نچلی سطح سے ترقی کر کے کس طرح آدابِ معیشت، تدابیر منزل، قواعد معاملات، سیاست مدن اور آخر میں بین الاقوامی سیاسیات کے اصول و ضوابط ایجاد کرتا ہے۔ شاہ صاحب نے اپنی متعدد تصانیف میں ان امور

پر بحث کی ہے۔ وہ ان ارتقائی مراحل کو ارتفاقات (معاشرتی انتظامات و تدابیر) کا نام دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس سلسلے میں انسانی معاشرہ چار ارتفاقات سے گزرتا ہے۔ مثلاً شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''تمہیں معلوم ہونا چاہیے۔ حضرت آدمؑ سے لے کر یوم قیامت تک آباد خطہ ہائے زمین میں سے کوئی شہر اور اخلاق فاضلہ اور معتدل مزاج رکھنے والی امتوں میں سے کوئی امت ایسی نہیں جو ان ارتفاقات سے خالی ہو اور یہ کہ سب کے نزدیک اور ہر زمانے میں اور ان کے ہر طبقے میں ان کے اصول مُسلم رہے ہیں۔ جو بھی ان کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا تھا، وہ ہمیشہ اسے بہت برا سمجھتے تھے اور کثرتِ شہرت کی وجہ سے یہ اصول ان کے ہاں امورِ بدیہہ بن گئے تھے۔ ان ارتفاقات کی ظاہری صورتوں اور فروع میں باہم جو اختلاف پایا جاتا ہے، اس سے تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔''

اس کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں: ''واضح رہے کہ ارتفاقات میں ''رسوم'' کی وہی حیثیت ہے جو انسان کے جسم میں دل کی ہوتی ہے۔ یہ کہ شرائع کا مقصود اولاً اور بالذات یہی رسوم ہوتی ہیں۔ نوامیسِ الٰہیہ انہی پر بحث کرتی ہیں اور انہی کی طرف اشارات کیے جاتے ہیں......'' معاشرہ کے ان ارتفاقات کو بیان کرنے اور ان میں ''رسوم'' کی جو حیثیت ہے، اس کی نشاندہی کرنے کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''جب تمہیں ان باتوں کا علم ہو گیا تو اب تمہیں جاننا چاہیے کہ اگرچہ انبیاء کی بعثت اولاً اور بالذات عبادات کے طریقوں کی تعلیم کے لئے ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ فاسد و خراب رسوم کی بیخ کنی اور ارتفاقات و معاشرتی امور کے بعض طریقوں پر لوگوں کو آمادہ کرنا بھی ہوتا ہے۔ اسی سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: ''میں معارف و مزامیر یعنی گانے بجانے کے سامان مٹانے کے لئے مبعوث ہوا ہوں۔'' نیز آپ کا قول ہے: ''میں اچھے اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث کیا گیا ہوں۔''

اس باب میں تمام کے تمام انبیا جو چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے ہیں، وہ یہ ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ جس قوم کی طرف وہ مبعوث ہوئے ہیں، ان کے کھانے، پینے، لباس اور تعمیرِ مکان کے کیا طور طریقے ہیں۔ وہ کس طرح آرائش و زینت کرتے ہیں۔ ان کے ہاں نکاح کا کیا طریقہ ہے اور ان کے شادی شدہ لوگ کیسے زندگی گزارتے ہیں۔ نیز ان میں خرید و فروخت کے کیا طریقے ہیں اور گناہوں سے باز رکھنے اور مقدمات وغیرہ کے فیصلے کرنے کے لئے ان کے ہاں کیا قواعد و ضوابط ہیں۔ اگر ان میں سے ضروری امور، رائے کلی سے مناسبت رکھتے ہوں اور اس پر ان کا انطباق ہوتا ہو تو ان امور میں سے کسی چیز کو اس کی حد سے ہٹانے اور اس کی جگہ دوسری چیز لانے کے کوئی معنی نہیں بلکہ اس صورت میں اور بھی ضروری ہوتا ہے کہ قوم کو ان امور پر جو اس کے ہاں پہلے سے ہیں، عمل کرنے پر ابھارا جائے۔ ان کے بارے میں اس کی رائے کو صحیح و درست بتایا جائے اور ان میں جو مصلحتیں اور خوبیاں ہیں، ان کی طرف قوم کی رہنمائی کی جائے۔

اگر وہ امور جو قوم میں پہلے سے ہیں، رائے کلی پر منطبق نہیں ہوتے اور اس بات کی ضرورت پیش آتی ہے کہ ان میں سے کسی چیز کو اس بنا پر اپنی جگہ سے ہٹایا جائے یا اسے بالکل ختم کر دیا جائے کہ اس سے بعض لوگوں کو دوسروں سے اذیت پہنچتی ہے یا اس کی وجہ سے دنیاوی زندگی کی لذتوں میں بہت زیادہ انہماک ہوتا ہے یا اس سے اعمالِ خیر کو خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کرنے میں بے توجہی ہوتی ہے یا یہ امور اس طرح کی تسلی دیتے ہیں جو دنیا و آخرت کے مصالح سے بے پروائی برتنے کا باعث بنتی ہے۔ یا اس طرح کی اور باتیں پیش آتی ہیں اور ان امور میں تبدیلی کرنا لازمی ہو جاتا ہے تو

اس صورت میں ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ لوگوں کو ایسی چیزوں کی طرف لے جایا جائے جو کلی طور پر ان کے مالوفات یعنی جن چیزوں سے انہیں الفت وانس ہے، ان کے مخالف ومتضاد ہوں بلکہ ان امور کو ایسی چیزوں سے بدلنا چاہیے جن کی نظیر و مثال ان کے ہاں پہلے سے موجود ہو یا ایسے نیکو کاروں سے جن کی کہ نیکی کی قوم کے ہاں شہادت دی جاتی ہو، جو باتیں مشہور ہیں ان میں ان چیزوں کی نظیر پائی جاتی ہو۔

حاصل کلام یہ ہے کہ (پہلے کی بری چیزوں کو چھڑانے کے لیے) لوگوں کو ایسی چیزوں کی طرف لے جائے کہ جب وہ ان کے سامنے پیش کی جائیں تو ان کی عقلیں فی الفور انہیں رد نہ کر دیں بلکہ ان کے برحق ہونے کا انہیں اطمینان حاصل ہو۔ اسی بنا پر انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اب جو راسخ فی العلم ہے، وہ جانتا ہے کہ شریعت میں نکاح، طلاق، معاملات، زیب وزینت، لباس، عدل وانصاف، تعزیرات وحدود اور مال غنیمت کی تقسیم کے بارے میں کوئی چیز ایسی نہیں آئی جس کا ان لوگوں کو علم نہ ہو یا جب انہیں ان چیزوں کا مکلف بنایا گیا تو وہ ان کے متعلق تردد میں پڑ گئے ہوں۔

ہاں جس چیز میں کجی تھی، اسے سیدھا کر دیا گیا، جو ناقص تھی اسے درست کر دیا گیا۔ (مثال کے طور پر جب اسلام آیا تو) لوگوں میں ربا کی کثرت تھی۔ انہیں اس سے روک دیا گیا۔ وہ پھلوں کو درختوں پر پکنے سے پہلے بیچ دیا کرتے تھے۔ اس دوران میں اگر وہ موسمی آفات کا شکار ہو جاتے تو اس کی وجہ سے لوگ آپس میں جھگڑتے اور ان میں تو تکار ہوتی۔ چنانچہ پھلوں کو اس طرح بیچنے سے منع کر دیا گیا۔ عبدالمطلب کے زمانے میں قتل کی دیت (خون بہا) دس اونٹ تھی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ لوگ قتل سے باز نہیں آتے تو دیت دس سے بڑھا کر سو اونٹ کر دی۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کو باقی رکھا۔

اسی طرح ''قسامہ (4)'' کا پہلا واقعہ ابوطالب کے فیصلے سے ہوا۔ سردارِ قوم کے لئے مال غنیمت میں چوتھا حصہ ہوتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بجائے پانچواں حصہ مقرر فرمایا۔ ایران کے بادشاہ قباذ اور اس کے بیٹے نوشیروان نے لوگوں پر لگان کے سلسلے میں خراج اور عشر (پیداوار کا دسواں حصہ) عاید کیا تھا۔ شریعت نے بھی اسی کے قریب قریب عائد کیا۔ بنو اسرائیل زانیوں کو سنگسار کرتے تھے، چوروں کے وہ ہاتھ کاٹتے اور قتل کے بدلے میں قتل کرتے تھے۔ قرآن مجید بھی اسی کے مطابق نازل ہوا۔

بلکہ اگر تم صاحب بصیرت ہو اور احکام شرعی کے اطراف وجوانب پر تمہاری پوری نظر ہے تو تمہیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ عبادات کے ضمن میں انبیاء علیہم السلام کوئی ایسی چیز نہیں لائے جو لوگوں میں وہ چیز خود یا اس کی نظیر ومثل موجود نہ ہو۔ البتہ انبیاء نے جاہلیت کی طرف سے کی گئی تحریفات کی نفی کی۔ عبادات واحکام کے اوقات اور ارکان جو مبہم تھے، انہیں منضبط کیا اور جو چیزیں گوشۂ گمنامی میں چلی گئی تھیں، ان کی اشاعت کی۔ واضح ہو کہ ایران اور روم میں سالہا سال تک سلطنت رہنے سے طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ اللہ نے ایک نبی اُمی بھیجا اور اس کی زبان سے عجمیوں کی عادات کی مذمت کرائی اور دنیوی زندگی میں سرتاپا منہمک ہو جانے کی قباحتیں ظاہر کیں۔ اسی طرح عربوں کے ہاں زمانۂ جاہلیت میں ایسے جھگڑے پیدا ہو گئے تھے جن سے تمام لوگ تنگ آ گئے تھے۔ جیسے مقتول کے بدلے میں قتل کرنا۔ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے سے چلے آنے والے اس سلسلۂ قتل کو کالعدم کر دیا۔ ایسے ہی میراث کے معاملے میں روسائے قوم مختلف فیصلے کرتے تھے۔ اسی طرح لوگ غصب ونہب اور سود خواری سے باز نہیں آتے تھے۔ یہ اور ان کے علاوہ اور بہت سی خرابیاں تھیں کہ اگر آپؐ کا وجود اقدس نہ ہوتا تو لوگ انہیں کبھی ترک نہ کرتے۔

نیز تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ بسا اوقات لوگوں کے لئے کوئی رسم اس لئے بھی شروع کر دی جاتی ہے کہ اس کے ذریعہ لوگوں کی کدورتیں دور ہو جاتی ہیں۔

☆☆☆

مذہبی آسانیاں

ارشادِ خداوندی ہے: "یہ اللہ کی رحمت ہے کہ (اے پیغمبر!) تم ان کو نرم دل ملے۔ اگر تم اکھڑ اور سخت دل کے ہوتے تو یہ لوگ تمہارے پاس سے تتر بتر ہو گئے ہوتے۔" نیز اللہ فرماتا ہے: "اللہ تمہارے ساتھ آسانی کرنا چاہتا ہے اور وہ تمہارے ساتھ سختی کرنا نہیں چاہتا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ابوموسیٰ اشعری اور معاذ بن جبل کو یمن کی طرف روانہ کیا تو آپؐ نے ان سے فرمایا: "آسانیاں پیدا کرنا، دشواریاں پیدا نہ کرنا۔ لوگوں کو خوشخبری دینا۔ انہیں متنفر نہ کرنا۔ ایک دوسرے کی رعایت کرنا۔ اختلاف نہ کرنا۔" آپؐ کا ارشاد ہے: "تم آسانیاں دے کر بھیجے گئے ہو، دشواریاں دے کر نہیں بھیجے گئے۔"

یہ آسانیاں ان وجوہ سے حاصل ہوتی ہیں:

ان میں سے ایک یہ ہے کہ کوئی ایسی چیز لوگوں کے لئے اطاعت وعبادت کا رکن یا شرط نہ بنائی جائے جو ان پر شاق ہو۔ اسی بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے: "اگر میں اسے امت پر شاق نہ سمجھتا تو میں انہیں ہر نماز کے لئے مسواک کرنے کا حکم دیتا۔"

اور یہ کہ طاعات وعبادات میں سے بعض کو رسوم کا درجہ دے دیا جائے کہ انہیں ادا کرتے لوگ ایک دوسرے پر فخر کریں اور انہیں یوں ادا کریں گویا وہ اپنی دلی رغبت سے ادا کرتے ہیں جیسے عیدین اور جمعہ۔ (اس سلسلے میں رسول اللہ کا ارشاد ہے) "تا کہ یہود کو علم ہو کہ ہمارے دین میں بڑی وسعت ہے۔" کیونکہ بڑے بڑے اجتماعات میں زیب وزینت کر کے نکلنا اور اس میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرنا لوگوں کی عادت میں داخل ہے۔

ان وجوہ میں سے ایک یہ ہے کہ طاعات وعبادات میں سے لوگوں کے لئے ایسے امور بطور دستور اور طریقہ کار کے معین کر دیئے جائیں کہ لوگوں کی طبیعت بھی انہی کا مطالبہ کرے۔ اسی طرح یہ دونوں رغبتیں (عقل اور طبیعت ہر دو کی) ایک دوسرے کی مددگار ومعاون ہوں۔ اسی وجہ سے مسجدوں کو خوشبودار رکھنا اور ان کی صفائی ولطافت، نیز جمعہ کے دن غسل کرنا اور خوشبو لگانا مسنون قرار دیا گیا۔ ایسے ہی قرآن کو خوش الحانی سے پڑھنا اور اچھی آواز سے اذان دینا مستحب قرار پایا۔

منجملہ ان وجوہ کے ایک یہ ہے کہ جس چیز کو لوگ بار سمجھیں اور اس سے ان کی طبیعتیں نفرتیں کریں، اس سے ان

کی گلوخلاصی کرادی جائے۔ اسی طرح جس چیز کا لوگوں کی اکثریت کی طبیعت تقاضا کرے یا جس کو ترک کرنے میں انہیں لوگوں میں تنگی محسوس ہو، اس چیز کو باقی رکھا جائے۔

ان میں سے ایک یہ ہے کہ جو چیز لوگوں کے لئے شاق اور گراں ہو، اسے ایک ہی بار شرعاً نافذ کرنے کے بجائے درجہ بدرجہ نافذ کیا جائے۔ اسی سلسلہ میں حضرت عائشہؓ کا یہ قول ہے: ''قرآن کی پہلی سورتیں جو نازل ہوئیں، وہ مفصل سورتیں تھیں، جن میں جنت و دوزخ کا ذکر ہے۔ پھر جب اسلام کی طرف لوگ آنے لگے اور اسلام ان کے دلوں میں راسخ ہو گیا تو حلال وحرام کی آیتیں اتریں۔ اگر پہلے ہی ان پر یہ حکم نازل ہوتا کہ شراب نہ پیو تو وہ بے اختیار کہہ اٹھتے کہ ہم شراب پینا کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ اسی طرح اگر یہ نازل ہوتا کہ زنا نہ کرو تو وہ کہتے کہ ہم کبھی زنا ترک نہیں کریں گے۔''

منجملہ ان وجوہ کے ایک یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وہ کام نہ کریں جس سے لوگوں کے دلوں میں تشویش پیدا ہو۔ اس لئے آپؐ نے بعض امور بھی ترک کر دیئے۔ اسی بارے میں آپ کا وہ قول ہے جس میں آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا تھا: ''اگر تمہاری قوم کو کفر سے علیحدہ ہوئے تھوڑا عرصہ نہ ہوا ہوتا تو میں کعبہ کی عمارت کو گراتا اور پھر اسے از سرنو ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بنیادوں پر تعمیر کرتا۔''

ان وجوہ میں سے ایک یہ ہے کہ شارعؑ نے نیکی کی مختلف انواع کے ضمن میں وضو، غسل، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ کا حکم دیا اور ان امور کو لوگوں کی عقلوں پر نہیں چھوڑا بلکہ انہیں ارکان، شرائط، آداب اور اس طرح کی چیزوں میں منضبط کر دیا ہے۔ اس کے بعد ان ارکان، شرائط اور آداب کو زیادہ منضبط نہیں کیا بلکہ ان کو لوگوں کی عقلوں پر نیز وہ خود ان الفاظ کے کیا معنی لیتے ہیں اور اس بارے میں وہ کن چیزوں کے عادی ہیں، ان پر چھوڑ دیا۔ مثلاً شارعؑ نے یہ تو صراحت فرمادی کہ ''بغیر سورۂ فاتحہ کے نماز نہیں ہوتی۔'' لیکن یہ نہیں بتایا کہ فاتحہ کی صحیح قرأت کے سلسلے میں حروف کے مخارج کیا ہیں۔ نیز یہ بیان فرمایا کہ قبلے کی طرف منہ کرنا نماز کی شرط ہے لیکن کوئی ایسا ضابطہ نہیں بتایا جس کے ذریعے ہم قبلے کی طرف منہ کرنا معلوم کر سکیں۔ شارعؑ نے یہ تو بیان فرمایا کہ زکوٰۃ کا نصاب دو سو درہم ہے لیکن درہم کا وزن کیا ہے؟ اس کی وضاحت نہیں کی اور جب اس بارے میں آپؐ سے پوچھا گیا تو اس ضمن میں جو کچھ ان کے پاس اس وقت موجود تھا، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا۔ آپؐ نے ان امور میں کوئی بات نہیں فرمائی جو ان کی عادات میں داخل نہ ہو۔ مثال کے طور پر ہلالِ رمضان کے بارے میں فرمایا: ''جب بادل ہو اور تم کو چاند نظر نہ آئے تو شعبان کے تیس دن پورے کرلو۔'' اسی طرح اس پانی کے متعلق جو کہیں بیابان میں ہو اور وہاں اسے پینے کے لئے درندے اور چوپائے آتے ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: ''اگر پانی بقدر دو قلتین کے ہو تو وہ ناپاک نہیں ہوتا۔'' دراصل آپ کا یہ فرمانا ان لوگوں کی عادات کے لحاظ سے تھا جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔

بات درحقیقت یہ ہے کہ ان امور میں سے کسی امر کی وضاحت ان چیزوں کے بغیر ممکن نہیں جن میں کہ اس امر کی طرح ہی ظہور، خفا اور عدم انضباط نہ ہو اور جب صورتحال یہ ہے تو پھر خود ان چیزوں کی مزید وضاحت کرنا پڑے گی اور یہ سلسلہ برابر چلتا رہے گا۔ یہ ایک بڑی مصیبت ہے کیونکہ اس طرح وضاحت کرتے ہوئے جو نئی شقیں نکلیں گی تو یہ بالجملہ لوگوں کے لئے تنگی کا موجب بنیں گی۔ پس اگر شقوں کی کثرت ہو گئی تو اس سے تنگیاں اور بڑھ جائیں گی۔ اب شریعت کا تو

نزدیک اور دور والوں سب کو مکلّف بنایا گیا ہے۔ چنانچہ اس کی حدود کو اس تفصیل کے ساتھ ضبط کرنا بڑی دقت کا باعث ہوگا۔ علاوہ ازیں ایک بات اور بھی ہے اور وہ یہ کہ جب لوگ نیکیوں کے قواعد وضوابط کی کرید میں بہت زیادہ منہمک ہو جائیں گے تو وہ نیکیوں کے اصل فوائد کو محسوس کرنا چھوڑ دیں گے اور وہ ان کی روح کی طرف توجہ نہیں کریں گے۔ جیسا کہ تم بہت سے تجوید سے قرآن پڑھنے والے قاریوں کو دیکھتے ہو کہ وہ قرآن کے الفاظ کی طرف اپنی ساری توجہ مبذول کرنے کی وجہ سے اس کے معانی میں غور وفکر نہیں کرتے۔ غرض ان حالات میں مصلحت کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہ تھا کہ وضو، غسل، نماز، روزے اور حج وغیرہ کے اصول منضبط کرنے کے بعد باقی امور لوگوں پر چھوڑ دیئے جاتے۔

ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ شارع علیہ السلام نے لوگوں کو ان کی عقل کے معیار کے مطابق مخاطب فرمایا جو کہ ان کی اصل خلقت میں قبل اس کے وہ حکمت وکلام واصول کی باریکیوں سے کام لینے کے قابل ہوتے، ودیعت کی گئی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لئے ایک جہت مقرر کر دی۔ وہ قرآن مجید میں فرماتا ہے: الرحمٰن عرش پر مستوی ہے۔ ایک دفعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سیاہ فام عورت سے کہا، اللہ کہاں ہے؟ اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا، یہ مومنہ ہے۔ اسی طرح قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے اور نماز اور عیدین کے اوقات کی تعین کے لئے لوگوں کو مسائل ہیئت وہندسہ حفظ کرنے کا مکلّف نہیں بنایا۔

☆☆☆

ایک ایسے دین کی ضرورت جو تمام ادیان کا ناسخ ہو

اس باب کی ابتدا میں شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ روئے زمین میں ملتیں وجود میں آئیں۔ ان میں سے ہر ایک ملت کے ہاں اپنے صاحبِ ملت (بانی ملت) کے بارے میں خوش عقیدگی پائی جاتی تھی اور وہ اسے کامل اور عدیم النظیر مانتی تھی۔ ظاہر ہے اس کے ٹھوس اسباب تھے۔ اسی طرح ہر ملت کی اپنی شرائع، حدود اور تعزیرات ہوتی ہیں۔ نیز ہر ملت کا ایک طریقہ اور شریعت ہوتی ہے جسے وہ دل وجان سے عزیز سمجھتی ہے اور اس کی مدافعت میں دوسروں سے لڑتی ہے۔ بعد میں ان ملتوں میں خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہوتی ہے کہ نااہل برسر اقتدار آ جاتے ہیں یا ان میں باہر کی چیزیں خلط ملط ہو جاتی ہیں۔ ان حالات میں ہر ملت دوسری کو ملامت کرتی ہے۔ اس کی باتوں کا انکار کرتی ہے اور اس کے خلاف رزم آرا ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حق مخفی ہو جاتا ہے۔ پھر ضرورت ہوتی ہے ایک امام راشد کی جو تمام ملتوں کے ساتھ ایسا سلوک کرے جو ایک خلیفہ راشد ظالم بادشاہوں کے ساتھ کرتا ہے۔

اس تمہید کے بعد شاہ صاحب امام راشد کے اوصاف بیان فرماتے ہیں:۔

یہ امام جو تمام امتوں کو ایک ملت واحدہ میں جمع کرنا چاہتا ہے، اسے مذکورہ بالا اصولوں کے علاوہ دوسرے اصولوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ان اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ قوم کو سنت راشدہ کی طرف بلاتا ہے۔ وہ ان

لوگوں کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کے احوال کی اصلاح کرتا ہے۔ پھر وہ انہیں جوارح و اعضا کی طرح اپنا یار و مددگار بناتا ہے۔ ان کو ساتھ لے کر وہ دنیا والوں سے جہاد کرتا ہے اور انہیں دنیا کے طول و عرض میں پھیلا دیتا ہے۔ اسی بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''تم بہترین امت ہو جسے لوگوں (کی ہدایت) کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔'' یہ اس لئے ہے کہ یہ امام خود بنفس نفیس تو بے شمار اور غیر محدود امتوں سے جہاد نہیں کرسکتا۔ چنانچہ جب صورتحال یہ ہے تو ضروری ہے کہ اس کی شریعت کا اصل مادہ یا جوہر تو وہ ہو، جو تمام صالح اقلیموں میں بسنے والے لوگوں، ان میں سے عرب و عجم ہر دو کے لئے بمنزلہ مذہب طبیعی کے ہو۔ اس کے بعد امام راشد کی شریعت میں خود اس کی قوم کے علوم اور ارتفاقات (معاشرتی ادارے اور معاشرتی تدابیر نافعہ) بھی ہوں اور اس میں وہ اور قوموں سے زیادہ اپنی قوم کا لحاظ رکھے۔ بعد ازاں وہ تمام لوگوں کو اپنی اس شریعت کے اتباع پر مجبور کرے کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ یہ امام راشد ہر قوم کو اس کی اپنی حالت اور ہر عہد کے آئمہ کو خود ان پر چھوڑ دے گا کیونکہ ایسا کرنے سے شریعت کے نفاذ کا جو اصل مقصود ہوتا ہے، وہ حاصل نہیں ہو سکے گا۔

اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ یہ امام راشد ہر ایک قوم کے پاس جو کچھ ہے، اس پر نظر ڈالے اور تمام قوموں کے احوال کا عملی تجربہ کرے۔ پھر وہ ان میں سے ہر قوم کے لئے الگ الگ شریعت کا تعین کرے کیونکہ تمام قوموں کی عادات کا نیز ان میں مختلف ملکوں میں رہنے اور جدا جدا دین رکھنے کی وجہ سے جو باتیں پیدا ہو گئی ہیں، ان کا احاطہ کرنا محال و ممتنع ہے۔ اب صورت یہ ہے کہ ایک شریعت کی روایت کرنے کے معاملے میں جمہور راوی قاصر رہتے ہیں تو تمہارا کیا خیال ہے کہ کیا یہ راوی مختلف شریعتوں کی روایت کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ عرصہ دراز گزرنے کے بعد ہی دوسرے لوگ شریعت کی اطاعت قبول کرتے ہیں۔ اب حالت یہ ہے کہ اس شریعت کو لے کر جو نبی آتا ہے، اس کی عمر اس قدر لمبی نہیں ہوتی اور موجودہ شریعتوں میں ایسا ہو چکا ہے۔ یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں میں پہلے تھوڑے ہی لوگ ایمان لائے تھے۔ اس کے بعد جا کر ان کو غلبہ و اقتدار حاصل ہوا تھا۔ اس بنا پر اس سے بہتر اور آسان کوئی طریقہ نہیں کہ شعائر دینی، حدود و تعزیرات اور معاشرتی انتظامات و تدابیر نافعہ میں اس قوم کی عادت کا لحاظ رکھا جائے جن میں یہ نبی مبعوث ہوا ہے اور ان لوگوں پر جو اس کے بعد آئیں، ان امور میں زیادہ تنگی و سختی نہ کی جائے۔ البتہ یہ امور بالجملہ ان میں باقی رہیں۔

اب جہاں تک متقدمین کا تعلق ہے، ان کے لئے تو اس شریعت کا قبول کرنا اپنی دلی شہادت اور اپنی (قومی) عادات کی وجہ سے آسان ہو جاتا ہے اور بعد میں آنے والوں کے لئے اس ملت کے آئمہ و خلفاء کی اچھی سیرت کو دیکھ کر اسے بآسانی قبول کرنے کی رغبت ہوتی ہے۔ یہ قدیم و جدید ہر زمانے کی ہر قوم کے لئے گویا ایک فطری و طبیعی بات بن گئی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں وہ سب صالح خطے جو لوگوں میں معتدل مزاج پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، دو بڑے بادشاہوں کے تحت تھے۔ ان میں سے ایک کسریٰ تھا جو عراق، یمن، خراسان اور ان سے متصل علاقوں پر مسلط تھا۔ ماوراء النہر اور ہندوستان کے فرمانروا بھی اس کے تابع تھے اور وہ اسے ہر سال خراج بھیجتے تھے۔ دوسرا بادشاہ قیصر تھا جو شام، روم اور ان سے متصل علاقوں پر مسلط تھا۔ مصر، مغرب اور افریقہ کے فرمانروا بھی اس کے تابع تھے اور اسے خراج

دیتے تھے۔ ان دونوں بادشاہوں کی سلطنت کو ختم کر کے ان کے ملکوں پر قبضہ کرنے کے معنی یہ تھے۔ گویا کہ ساری دنیا پر غلبہ حاصل ہو گیا۔ یہ سب حکمران بڑی عیش وعشرت کی زندگی گزارتے تھے اوران کی یہ عادتیں ان تمام ملکوں میں پھیل گئیں جوان دو بڑے بادشاہوں کے ماتحت تھے۔ ان عادتوں کو بدلنا اور لوگوں کو ان سے ہٹانا اس معاملے میں بالجملہ سب ملکوں کے لئے ایک تنبیہ ہو سکتی تھی۔ اگرچہ بعد میں ان امور نے ایک دوسری شکل اختیار کر لی۔ حضرت عمرؓ نے ہُرمزان سے جب ایران سے جنگوں کے دوران مشورہ لیا تھا تو اس نے ان باتوں کا ذکر کیا تھا۔

جہاں تک مذکورہ بالا خطوں سے دور کے ان علاقوں کا تعلق ہے، جہاں کے لوگوں میں معتدل مزاج پیدا نہیں ہو سکتے تھے تو مصلحت کلیہ کے معاملہ میں ان کا کوئی زیادہ اعتبار نہ تھا۔ اسی معنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: ''ترکوں سے تعرض نہ کرو، جب تک وہ تم سے تعرض نہ کریں اور اہل حبش کو چھوڑے رکھو، جب تک وہ تمہیں چھوڑے رکھیں۔''

الغرض جب اللہ تعالیٰ نے راہِ راست سے بھٹکی ہوئی کج رو ملت کو ٹھیک کرنے کا ارادہ کیا اور چاہا کہ لوگوں کے لئے ایک ایسی امت آگے لائے جو انہیں نیک کاموں کا حکم دے، برے کاموں سے منع کرے اور ان کی خراب و فاسد رسموں کو بدلے تو اس امر کا انحصار اس امر پر تھا کہ ان دونوں سلطنتوں کو زوال ہو اور ان کے حالات سے تعرض کرنے سے ہی اس کام میں آسانی ہو سکتی تھی کیونکہ ان کے حالات کا عمل دخل تمام صالح ملکوں میں بالفعل تھا یا قریب قریب ہو رہا تھا۔ اس بنا پر اللہ نے ان دونوں سلطنتوں کے زوال کا فیصلہ کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ان الفاظ میں خبر دی: ''کسریٰ ہلاک ہوا، اس کے بعد کوئی کسریٰ نہیں ہوگا۔ قیصر ہلاک ہوا، اس کے بعد کوئی قیصر نہیں ہوگا۔'' غرض تمام دنیا کے باطل کا قلع قمع کرنے والا حق اس طرح نازل ہوا کہ پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کے ذریعے عربوں کے باطل کا قلع قمع ہوا۔ پھر ان دو بادشاہوں کے باطل کا قلع قمع عربوں کے ذریعہ ہوا۔ اس کے بعد ان دونوں (یعنی عربوں اور ان بادشاہوں کی رعایا میں سے جو اسلام لائے) کے ذریعہ باقی ملکوں کے باطل کا قلع قمع ہوا۔ وللہ حجۃ اللہ البالغہ (اور اللہ ہی کے لئے کامل و مؤثر حجت ہے)

امام راشد کے اصولوں میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ وہ اپنے اہل ملک اور اپنے رشتہ داروں[4] (عشیرۃ) میں سے ان کو جن کی نشوونما انہیں عادات وسنن پر ہوئی ہوتی ہے، خلفا بناتا ہے۔ ان لوگوں میں حمیت دینی کے ساتھ ساتھ خاندانی حمیت بھی شامل ہوتی ہے اور ان کی سربلندی اور رفعت شان خود صاحب ملت (بانی و مؤسس ملت) کی سربلندی اور رفعت شان بن جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اسی زمرے میں آتا ہے: الائمۃ من قریش (امام و سردار خاندانِ قریش سے ہیں)

ان اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ امام راشد اس دین کو تمام ادیان پر غالب کرے اور کوئی آدمی ایسا نہ چھوڑے جس پر کہ دین غالب نہ آ گیا ہو، خواہ اس میں کسی کی عزت ہو یا ذلت۔ اس صورت میں لوگوں کے تین گروہ ہو جائیں گے۔ ایک ظاہراً و باطناً دین کا فرمانبردار، دوسرا مجبوری سے ظاہراً فرمانبردار کہ وہ اس سے انحراف کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ تیسرا خوار و ذلیل کافر کہ اس سے امام راشد کھیتی کاٹنے اور گاہنے کے اور دوسرے کام لے گا جیسے کہ

مویشیوں سے ہل جوتنے اور بوجھ ڈھونے کے کام لئے جاتے ہیں۔ اس گروہ کے لئے زجر و توبیخ کے قانون کا نفاذ لازمی ہے اور وہ ذلیل ہو کر جزیہ دے گا۔

ایک دین کے دوسرے دینوں پر غلبے کے کئی طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ دوسرے دینوں کے شعائر کے مقابلے میں اس کے شعائر کو سربلند کیا جائے۔ اب دین کے شعائر تو ایک واضح و ظاہر چیز ہوتی ہے جو اس دین کی خصوصیت بن جاتی ہے اور اس کی وجہ سے اس دین والا دوسرے دینوں سے ممتاز ہو جاتا ہے۔ جیسے ختنہ، مساجد کی تعلیم و تکریم، نمازوں کی اذان، جمعہ کی نماز اور جماعتیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کو دوسرے دینوں کے شعائر کے اظہار سے روک دیا جائے۔ ایک اور طریقہ یہ ہے کہ قصاص، دیت (خون بہا ادا کرنے) شادی بیاہ اور حکومت کے اختیارات دینے میں مسلمانوں کو کافروں کے برابر نہ رکھا جائے اور اس طرح انہیں ایمان لانے پر مجبور کیا جائے۔

ان طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ امام راشد لوگوں کو ''بِرّ'' اور ''اِثم'' یعنی نیکی اور بدی کی ظاہری صورتوں کا مکلف بنائے اور انہی چیزوں کو ان پر بڑی سختی سے لازم کرے۔ وہ ان ظاہری صورتوں کی اصل روح پر زیادہ زور نہ دے اور انہیں شرائع سے متعلق کسی چیز میں بھی صاحب اختیار نہ بنائے۔ وہ شرائع کے اسرار و رموز کے علم کو جو تفصیلی احکام کا مصدر و ماخذ ہے، ایک ایسا علم سربستہ و مخفی بنا کر رکھے کہ اسے وہی حاصل کر سکے جس کے قدم اس علم میں راسخ ہوں۔ یہ اس لئے کہ اکثر لوگ جنہیں شرائع کا مکلف بنایا جاتا ہے، وہ ان شرائع کی حکمتیں اور مصالح نہیں جانتے اور وہ اس وقت تک ان کی حکمتیں اور مصالح نہیں جان سکتے جب تک یہ قواعد و ضوابط میں باقاعدہ منضبط نہ ہوں اور اس طرح یہ ایک امر محسوس بن جائیں کہ ہر حاصل کرنے والا انہیں حاصل کر سکے۔ ان حالات میں اگر لوگوں کو ان شرائع میں سے کسی چیز کو چھوڑنے کی اجازت دے دی جائے یا انہیں یہ بتایا جائے کہ شرائع کا اصل مقصد ان ظاہری صورتوں کے علاوہ کچھ اور ہے تو لوگوں کے سامنے غور و فکر کے گھوڑے دوڑانے کے وسیع میدان کھل جائیں گے اور اس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے نازیبا اختلافات کرنے لگیں گے اور ان کے بارے میں اللہ کا جو ارادہ و منشا ہے، وہ حاصل نہیں ہو سکے گا۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

اس امام راشد کے لئے ایک اصول یہ ہے کہ اگر اس کا غلبہ فقط تلوار کے زور سے ہوگا تو لوگوں کے دلوں کے شکوک و شبہات دور نہیں ہو سکیں گے اور یہ احتمال باقی رہے گا کہ وہ کچھ مدت گزرنے کے بعد پھر کفر کی طرف لوٹ جائیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ یہ امام راشد حجت و برہان اور خطابی دلائل کے ذریعہ جو کہ جمہور کے ذہنوں کے لئے مفید و مؤثر ہوں، ان پر یہ ثابت کر دے کہ دوسرے ادیان کا اتباع نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ کسی معصوم شخص سے مروی نہیں اور یہ کہ یہ ملت کے صحیح قوانین پر منطبق نہیں ہوتے یا ان ادیان میں تحریف ہو چکی ہے یا ان کی بعض چیزیں اصل موقع و محل پر نہیں ہیں۔

یہ امام راشد ان امور کی برملا طور پر علیٰ رؤس الاشہاد وضاحت کر دے اور دین حق کی برتری اور اس کے مرجح ہونے کے اسباب بتائے یعنی یہ کہ وہ آسان و سہل اور صاف ستھرا ہے۔ اس کے احکام و حدود واضح ہیں۔ عقل اس کی خوبی و حسن کو جانتی پہچانتی ہے۔ یہ کہ اس کی رات دن کی طرح روشن ہے۔[5] اس کی سنن اور طریقے جمہور کے لئے بہت فائدہ

مند ہیں اور انبیائے سابقین علیہم السلام کی سیرت میں سے جو بچی کھچی چیزیں جمہور میں محفوظ ہیں، ان سے وہ بہت ملتے جلتے ہیں اور اس طرح کی اور باتیں اس میں پائی جاتی ہیں۔

حواشی

(1) قرآن مجید کی آیت لکل جعلنا منکم شرعة ومنهاجا

(2) نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور اس طرح کے دوسرے مابہ الامتیاز مذہبی اعمال و فرائض شاہ

(3) بیوی کو یہ کہنا کہ تمہاری پشت بمنزلہ میری ماں کی پشت کے ہے۔ عہد جاہلیت میں طلاق

(4) قرآن مجید میں ہے: وانذر عشیرتك الاقربین (26-214)

(5) اس کے مشتبہ امور بھی واضح ہیں۔

☆☆☆

علمِ تصوف

شاہ ولی اللہ صاحب ''تفہیمات الٰہیہ'' میں لکھتے ہیں کہ ان کے عہد میں تین چیزوں کی طرف اہل علم کی خصوصی توجہ ہے۔ ایک قرآن مجید اور احادیث نبوی۔ دوسری چیز علوم عقلیہ اور تیسری چیز وجدان و اشراق اور کشف ہے۔ اس ضمن میں شاہ صاحب فرماتے ہیں:

اس زمانے میں لوگ شرقاً غرباً صوفیہ کے علوم قبول کرنے پر متفق ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے اقوال اور حالات لوگوں کے لئے کتاب اور سنت سے بھی زیادہ مرعوب خاطر ہیں بلکہ عامتہ الناس تو صوفیا کے رموز و اشارات کے بغیر کوئی چیز قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ چنانچہ اگر کوئی ان رموز و اشارات کو ماننے سے انکار کرے یا ان سے بے توجہی برتے تو اس کی بات تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتے اور نہ اسے نیکوکاروں میں سمجھتے ہیں۔

خود شاہ صاحب کے والد شاہ عبدالرحیم صاحب ایک صاحب ارشاد صوفی بزرگ تھے۔ شاہ صاحب پندرہ سال کے تھے کہ آپ نے اپنے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی اور اشغالِ صوفیہ بالخصوص مشائخ نقشبندیہ کے اشغال پر عامل ہوئے۔ ان سے توجہ، تلقین اور آدابِ طریقت کی تعلیم حاصل کی۔ خرقہ صوفیہ پہنا اور نسبت تصوف درست کی۔ شاہ عبدالرحیم صاحب نے وفات کے وقت شاہ ولی اللہ صاحب کو بیعت و ارشاد کی اجازت دی۔ چنانچہ وہ عمر بھر علوم دینیہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تصوف و معرفت کی تلقین فرماتے رہے اور مسترشدین سے بیعت بھی لیتے رہے۔

یوں تو شاہ ولی اللہ صاحب کی تمام تصنیفات میں یہاں تک کہ علومِ منقولہ کی تصنیفات میں بھی عقل و برہان اور

تصوف و معرفت کا رنگ ملتا ہے لیکن انہوں نے تصوف پر متعدد مستقل رسالے لکھے ہیں۔ یہاں تصوف کے بعض اہم پہلوؤں کے بارے میں شاہ صاحب کے ان رسائل سے اقتباسات دیئے جاتے ہیں۔ یہ اقتباسات ''ہمعات'' اور ''القول الجمیل'' سے ہیں۔

دین اسلام کی دو حیثیتیں، ظاہری اور باطنی

اللہ تعالیٰ نے رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام کو انسانوں کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا اور دین کے قیام اور اس کی حفاظت کے سلسلے میں آپؐ سے نصرت و مدد کا وعدہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد انا له لحافظون اسی امر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی اس نصرت و مدد کی برکت سے ہی آپ کا دین تمام ادیان پر غالب آیا۔ اس دین کی اشاعت سے دراصل مقصود یہ تھا کہ عرب و عجم کے رہنے والوں کی اصلاح ہو اور ظلم و فساد کا پوری طرح قلع قمع کر دیا جائے۔

مزید برآں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ دین محمدی کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک ظاہری اور دوسری باطنی...... جہاں تک دین کی ظاہری حیثیت کا تعلق ہے، اس کا مقصود مصلحت عامہ کی نگہداشت اور اس کی دیکھ بھال ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ وہ احکام و معاملات جو اس مصلحت عامہ کے لئے بطور ذرائع و اسباب کے ہیں، ان کا قیام عمل میں لایا جائے اور ان کی اشاعت میں کوشش کی جائے۔ جن چیزوں سے مصلحت عامہ پر زد پڑتی ہو اور جن امور کی وجہ سے اس مصلحت عامہ میں تحریف ہوتی ہو، ان کو سختی سے روکا جائے۔ یہ تو ہوئی دین کی ظاہری حیثیت۔ اب رہا اس کی باطنی حیثیت کا معاملہ۔ نیکی و طاعت کے کاموں سے دل پر جو اچھے اثرات مترتب ہوتے ہیں، ان کے احوال و کوائف کی تحصیل دین کی باطنی حیثیت کا مقصود اور نصب العین ہے۔

جب یہ امر واضح ہو گیا کہ دین کی ظاہری اور باطنی دو حیثیتیں ہیں تو لامحالہ ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کی حفاظت کا جو وعدہ کیا گیا تھا، اس کی حفاظت کی بھی لازماً دو حیثیتیں ہوں گی۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو آپؐ سے حفاظتِ دین کا جو وعدہ کیا گیا تھا، آپؐ کی وفات کے بعد اس وعدۂ حفاظت کی دو شکلیں پیدا ہوئیں۔ وہ بزرگ جن کو خدا تعالیٰ کی طرف سے شریعت کی حفاظت کی استعداد ملی تھی، وہ تو دین کی ظاہری حیثیت کے محافظ بنے۔ یہ فقہاء، محدثین، نمازیوں اور قاریوں کی جماعت ہے۔ چنانچہ ہر زمانے میں اہل ہمت کی یہ جماعت مصروفِ عمل نظر آتی ہے۔ دین کی تحریف کی اگر کہیں سے کوشش ہو تو یہ لوگ اس کی تردید میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ تعلیم و ترغیب کے ذریعے یہ بزرگ مسلمانوں کو علوم دین کی تحصیل کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور ان ہی میں سے ہر سو سال کے بعد ایک مجدد پیدا ہوتا ہے جس کے ذریعے دین کی تجدید ہوتی ہے۔ ہمیں یہاں چونکہ اس مسئلے کی تفصیل مقصود نہیں، اس لئے صرف اس اشارے پر اکتفا کرتے ہوئے ہم آگے بڑھتے ہیں۔

دین کے محافظین کا دوسرا گروہ وہ ہے جسے خدا تعالیٰ نے باطنِ دین کی حفاظت کی جس کا کہ دوسرا نام ''احسان'' ہے، استعداد عطا فرمائی۔ ہر زمانے میں اس گروہ کے بزرگ عوام الناس کے مرجع رہے ہیں۔ طاعت و نیکوکاری کے اعمال سے باطن نفس میں جو اچھے اثرات مترتب ہوتے ہیں اور دلوں کو ان سے لذت ملتی ہے، یہ بزرگ لوگوں کو ان امور کی دعوت دیتے ہیں۔ نیز یہ انہیں نیک اخلاق اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ عام طور پر یہ ہوتا آیا ہے کہ ہر زمانے میں اولیاء اللہ

میں سے کوئی نہ کوئی ایسا بزرگ ضرور پیدا ہوتا ہے جس کو عنایت الٰہی سے اس امر کی استعداد ملتی ہے کہ وہ باطن دین کے قیام اور اشاعت کی کوشش کرے۔ باطن دین کہ اس کا مغز اور نچوڑ ہے ''احسان'' یعنی اللہ کی اس یقین کے ساتھ عبادت کرنا کہ گویا عبادت کرنے والا اسے سامنے دیکھ رہا ہے۔ یہ بزرگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس صفت ''احسان'' کا مظہر بنتا ہے اور باطنِ دین کی اشاعت اور اس کی حفاظت کا کام اس طرح اس بزرگ کے ہاتھ سے سرانجام پاتا ہے۔

کارِ زلفِ تست مشک افشانی، اما عاشقاں
مصلحت راتہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

اولیاء اللہ میں جو بزرگ اس صفتِ ''احسان'' کا مظہر بنتا ہے، اس کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ لوگوں میں اس کی رفعتِ شان کا عام چرچا ہوتا ہے۔ خلقت اس کی طرف کھنچی چلی آتی ہے۔ ہر شخص اس بزرگ کی تعریف کرتا ہے۔ نیز جو اذکار اور وظائف ملت اسلامیہ میں پہلے سے موجود ہوتے ہیں، ان میں بعض ایسے ہیں جن سے لوگوں کو فطری مناسبت ہوتی ہے، اس کے دل میں وارد ہوتے ہیں۔ اس بزرگ کی صحبت اور باتوں میں جذب و تاثیر کی غیر معمولی قوت پیدا ہو جاتی ہے اور اس سے ہر طرح کی کرامات ظاہر ہوتی ہیں۔ غرضیکہ یہ بزرگ کشف و اشراف کے ذریعے لوگوں کے دلوں کا حال معلوم کر لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی مدد و قوت سے دنیا کے عام معمولات میں تصرف کرتا ہے۔ اس کی دعائیں بارگاہِ حق میں مقبول ہوتی ہیں اور یہ اور اس قبیل کی اور کرامات اس کی ہمت و برکت سے معرضِ وجود میں آتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مریدوں اور طالبوں کی ایک کثیر جماعت اس بزرگ کے اردگرد جمع ہو جاتی ہے اور یہ بزرگ باطن کی تہذیب اور اس کی اصلاح کے لئے اوراد و اشغال کو نئے سرے سے ترتیب دیتا ہے۔ یہاں سے اس بزرگ کے خانوادۂ طریقت کی بنیاد پڑتی ہے اور یہ لوگ اس کے مسلک پر چلنے لگتے ہیں۔ اس خانوادے کی تاثیر و برکت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ طالب اور مرید بہت جلد اس مسلک کے ذریعے مراد کو پہنچ جاتے ہیں۔

اس خانوادے سے جو شخص خلوص رکھتا ہے اور اس کی تائید کرتا ہے، وہ تو دنیا میں فائز و کامران ہوتا ہے اور جو اس خانوادے کا برا چاہے اور اس سے فریب کرے وہ ناکام و خاسر رہتا ہے۔ عوام تو عوام خواص کے دلوں میں بھی اس خانوادے کے ماننے والوں کی ہیبت چھا جاتی ہے۔ نیز یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں اور اس کی قدرت الہام[1] اور احالہ[2] کے ذریعے نظامِ کائنات کے عام معمولات میں کچھ اس طرح تصرف کرتی ہے کہ لوگ اس خانوادے کے مطیع و منقاد ہو جاتے ہیں۔ یہ صورتحال اور اس خانوادے کی سطوت و برکت ایک عرصے تک رہتی ہے لیکن ایک زمانہ گزرنے کے بعد جب عنایت الٰہی کسی دوسرے شخص کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور اسے اپنے فیوض و برکات کا مرکز بناتی ہے تو یہاں سے ایک نئے خانوادے کی بنیاد پڑتی ہے۔ چنانچہ نیا خانوادہ معرضِ وجود میں آتا ہے تو اس وقت پہلے خانوادے کی حالت ایسی ہو جاتی ہے کہ گویا کہ ایک جسم ہے جس میں کہ روح نہیں رہی اور پہلے خانوادے کا مسلکِ طریقت ایسا ہو جاتا ہے کہ اس میں جذب و تاثیر کا نام تک نہیں رہتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ قطب پیدا ہوں اور وہ اس طرح کہ ہر ملک میں ایک الگ قطب ہو۔

باقی رہا کسی خانوادے میں جذب و تاثیر کا پایا جانا۔ بات یہ ہے کہ اس میں اس خاص خانوادے کی ذاتی

خصوصیت کا دخل نہیں ہوتا۔ جذب وتاثیر تو محض عنایت الٰہی کا نتیجہ ہے۔ جب تک کوئی خانوادہ عنایت الٰہی کا مرکز اور موضوع رہے، جذب وتاثیر اس میں رہتی ہے لیکن جب عنایت الٰہی کا رخ بدل جائے تو پھر اس خانوادے سے جذب و تاثیر بھی غائب ہو جاتی ہے۔ اس کو یوں سمجھیے کہ ایک تالاب ہے جس میں کہ ستاروں کا عکس پڑ رہا ہے۔ آپ تالاب کے پانی کو ہزار بار بدلیے، ظاہر ہے اس سے ستاروں کے عکس پر تو کچھ اثر نہیں پڑے گا۔

دم بدم گر شود لباس بدل
مردِ صاحب لباس راچہ خلل

الغرض جذب وتاثیر کے معاملے میں اصل چیز عنایت الٰہی کی توجہ ہے اور خانوادے تو اپنے اپنے وقت میں صرف اس عنایت الٰہی کی توجہ کے مرکز اور اس کے آلہ کار بنتے ہیں۔ ایک خاص زمانے میں ایک مخصوص خانوادہ عنایت الٰہی کا مظہر ہوتا ہے اور یہی وہ راز ہے جس کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ ہر زمانے میں جو بھی قطب ہوا، خود اس کی زبان سے اور اس کے حواریوں کی زبان سے اکثر ایسی باتیں نکلیں جن سے مراد یہ تھی کہ ان کا خانوادہ سب خانوادوں سے اعلیٰ اور مقدم ہے اور اللہ سے قرب ووصل حاصل کرنے کا صرف یہی ایک مسلک اور راستہ ہے۔ اس ضمن میں ہم اوپر جو کچھ لکھ آئے ہیں اور عنایت الٰہی کے متعلق جو ہم ابھی بتا چکے ہیں کہ کس طرح ایک وقت میں ایک خاص خانوادہ اس کا مرکز اور مظہر بنتا ہے۔ اگر یہ مواد پیش نظر ہوں تو بآسانی یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ یہ بزرگ سب کے سب اپنے ان دعوؤں میں سچے تھے۔

ظاہر دین کی تجدید واصلاح کے ساتھ ساتھ باطن دین کے تزکیہ کے لئے بھی عنایت الٰہی برابر انتظام فرماتی رہی ہے۔ چنانچہ جس طرح شریعت کے مجددین پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اسی طرح طریقت کے بھی اب تک بہت سے خانوادے ہو چکے ہیں۔ بہت سے اس وقت بھی موجود ہیں اور امید ہے کہ بعد میں بھی ان کا سلسلہ برابر جاری رہے گا۔ ان سب خانوادوں کا احاطہ کرنا یہاں مقصود نہیں۔ ان میں سے بعض خانوادے تو ایسے ہیں کہ انہوں نے پرانے خانوادوں کی جو بے نام ونشان ہو چکے تھے، ازسر نو تجدید کر دی اور بعض ایسے ہیں کہ انہوں نے کئی ایک خانوادوں کو یکجا کر کے ایک خانوادے کی شکل دے دی اور بعض نے نئے سرے سے مستقل خانوادوں کی بنیاد رکھی۔ گو خرقہ اور بیعت میں پہلوں سے منسلک رہے۔

اب یہ مسئلہ کہ کل خانوادے کتنے ہیں؟ اس کے بارے میں لوگوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض لوگ چودہ خانوادے بتاتے ہیں جن میں سے سب سے مشہور زیدی، عیاضی، ادھمی، ہبیری، چشتی، جنیدی اور گازرونی ہیں اور بعض کے نزدیک کل خانوادے بارہ ہیں۔ ان میں سے دس تو مقبول ہیں اور باقی دو مردود۔ ان دس میں مشہور جنیدیہ، حکمیہ، محاسبیہ، حقیقیہ، نوریہ اور طیفوریہ وغیرہ ہیں۔ الغرض ایک زمانے تک تو یہی خانوادے رہے۔ اس کے بعد ایک وقت آیا کہ ان کے علاوہ دوسرے خانوادے بھی پیدا ہو گئے۔ مثلاً جامیہ، قادریہ، اکبریہ، سہروردیہ، کبرویہ، اویسیہ اور خانوادۂ خواجگان۔ سرزمین ہند میں چشتی طریقہ کو حضرت معین الدین اجمیری نے ازسر نو زندہ فرمایا اور ان سے خانوادۂ معینیہ چلا۔ خانوادۂ خواجگان سے نقشبندی نکلا اور نقشبندی سلسلے سے آگے چل کر حضرت عبید احرار سے احراری خانوادہ بنا۔ اس کے

بعد جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، نئے نئے خانوادے معرضِ وجود میں آتے گئے۔ جیسے شیخ عبدالقدوس گنگوہی سے قدوسی سلسلہ نکلا۔ شیخ محمد غوث گوالیاری سے غوثیہ طریقہ چلا۔ خانوادہ باقویہ جو خواجہ باقی باللہ سے منسوب ہے۔ احمدیہ خانوادہ جس کے بانی شیخ احمد سرہندی ہیں۔ خانوادہ آدمیہ جو شیخ آدم بنوری کی طرف منسوب ہے اور علائیہ جس کا سلسلہ امیر ابوالعلا سے چلتا ہے۔ ان خانوادوں کے علاوہ اور بھی بہت سے خانوادے معرض وجود میں آئے جن میں سے بعض تو اس وقت تک موجود ہیں اور بعض کا اب کوئی نشان نہیں ملتا۔ (ہمعات)

☆☆☆

تصوّف کے چار دَور

مجھ فقیر کو اس حقیقت سے بھی آگاہ کیا گیا ہے کہ تصوف کے طریقوں میں اب تک چار بڑے بڑے تغیرات ہو چکے ہیں۔

1۔ تصوف کا پہلا دور

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کے زمانے میں چند نسلوں تک اہل کمال کی بیشتر توجہ زیادہ تر شریعت کے ظاہری اعمال کی طرف رہی۔ ان لوگوں کو باطنی زندگی کے جملہ مراتب شرعی احکام کی پابندی کے ذیل ہی میں حاصل ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ان بزرگوں کا ''احسان'' یعنی حاصلِ تصوف یہ تھا کہ وہ نمازیں پڑھتے تھے، ذکر اور تلاوت کرتے ہیں، روزے رکھتے تھے، صدقہ اور زکوٰۃ دیتے تھے اور جہاد کرتے تھے۔ ان میں سے کوئی شخص ایسا نہ ہوتا جو سر نیچے کیے بحرِ تفکرات میں غرق نظر آتا۔ یہ بزرگ خدا تعالیٰ سے قرب و حضوری کی نسبت اعمالِ شریعت اور ذکر و اذکار کے سوا کسی اور ذریعے سے حاصل کرنے کی سعی نہ کرتے۔ بے شک ان ہل کمال بزرگوں میں سے جو محقق ہوتے، ان کو نماز اور ذکر اذکار میں لذت ملتی۔ قرآن مجید کی تلاوت سے وہ متاثر ہوتے۔ مثلاً وہ زکوٰۃ محض اس لئے نہ دیتے کہ خدا کا حکم ہے بلکہ خدا کے حکم کی بجا آوری کے ساتھ ساتھ وہ اپنے آپ کو بخل کے روگ سے بچاتے۔ چنانچہ جب وہ اپنے آپ کو دنیاوی کاموں میں بے حد منہمک پاتے اور انہیں اس کا احساس ہوتا تو وہ دل کو کاروبارِ دنیا سے ہٹانے کے لئے زکوٰۃ دیتے۔ اسی طرح شریعت کے دوسرے احکام بجالانے میں بھی ان کی یہی کیفیت ہوتی تھی۔

الغرض یہ بزرگ محض خدا کا حکم سمجھ کر شرعی احکام ادا نہ کرتے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ شرعی احکام کی بجا آوری سے ان کے باطنی تقاضوں کی تسکین بھی ہوتی تھی۔ ان میں سے کوئی شخص نہ بے ہوش ہوتا اور نہ اسے وجد آتا۔ نہ وہ جوش میں آکر کپڑے پھاڑنے لگتا اور نہ شطح یعنی خلافِ شرع کوئی لفظ اس کی زبان سے نکلتا۔ یہ بزرگ تجلیات استتار اور اس قسم کے دوسرے مسائل پر مطلق گفتگو نہ کرتے تھے۔ یہ بزرگ بہشت کی رغبت و آرزو رکھتے اور دوزخ سے خائف و ہراساں رہتے۔ کشف و کرامات اور خوارق ان سے بہت کم ظاہر ہوتے۔ سرمستی و بے خودی کی کیفیت بھی شاذ و نادر ہی ان پر طاری

ہوتی اور اگر کبھی کبھی یہ باتیں ان سے صادر بھی ہوتیں تو قصداً نہیں بلکہ محض اتفاق سے ایسا ہوتا۔

بات یہ ہے کہ وہ نفسی کیفیات' جن کا نتیجہ کرامات و خوارق اور سرمستی و بے خودی کی قبیل کی چیزیں ہوتی ہیں' یہ کیفیات ان بزرگوں کے اندر اتنی راسخ نہ ہوئی تھیں کہ وہ ملکہ بن جاتیں۔ چنانچہ اس ضمن میں جب کبھی ان سے کوئی ایسی بات ظاہر ہوئی تو یا تو اس کی صورت یہ تھی کہ وہ جس چیز کو از راہ ایمان صمیم قلب سے مانتے تھے' وہ چیز بے اختیار ان کی زبان پر آ جاتی۔ جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے مرض الموت میں اپنے تیمارداروں سے فرمایا تھا کہ "طبیب ہی نے مجھے بیمار کیا ہے" یا یہ ہوتا کہ یہ بزرگ خواب میں بعض چیزوں کو دیکھ لیتے یا فراست سے نامعلوم چیز کو معلوم کر لیتے لیکن یہ چیزیں ایسی نہ ہوتیں کہ عوام کی ان تک رسائی نہ ہو سکتی۔ قصہ مختصر اس دور میں جسے تصوف یا "احسان" کا پہلا دور کہنا چاہیے' اہل کمال کا غالب طور پر یہی حال رہا۔

2- تصوف کا دوسرا دور

حضرت جنیدؒ جو گروہ صوفی کے سرخیل ہیں' ان کے زمانے میں یا ان سے کچھ پہلے تصوف کے ایک اور رنگ کا ظہور ہوتا ہے۔ اس زمانے میں یہ ہوا کہ اہل کمال میں سے عام طبقہ تو اسی طریقہ پر کاربند رہا جس کا ذکر پہلے دور کے ضمن میں آ چکا ہے لیکن ان میں سے جو خواص تھے' انہوں نے بڑی بڑی ریاضتیں کیں۔ دنیا سے بالکل قطع تعلق کر لیا اور مستقل طور پر وہ ذکر و فکر میں لگ گئے۔ اس سے ان کے اندر ایک خاص کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس کیفیت سے مقصود یہ تھا کہ دل کو تعلق باللہ کی نسبت حاصل ہو جائے۔ چنانچہ یہ لوگ اس نسبت کے حصول میں لگ گئے۔ وہ مدتوں مراقبے کرتے اور ان سے تجلی' استتار' انس اور وحشت کے احوال و کوائف ظاہر ہوتے اور وہ اپنے ان احوال کو نکات اور اشارات میں بیان بھی کرتے۔ ان اہل کتاب میں سے سب سے صادق وہ بزرگ تھے' جنہوں نے اپنی زبان سے وہی کہا' جو خود ان پر گزرا تھا۔ یہ لوگ سماع سنتے' سرمستی و بے خودی میں بے ہوش ہو جاتے' کپڑے پھاڑتے اور رقص کرتے۔ یہ کشف و اشراف کے ذریعے دوسروں کے دلوں کی باتیں بھی معلوم کر لیتے تھے۔ انہوں نے دنیا سے اپنا رشتہ توڑ کر پہاڑوں اور صحراؤں میں پناہ لی اور گھاس اور پتوں پر زندگی گزارنے اور گودڑیاں پہننے لگے۔ نفس و شیطان کے مکروں اور دنیا کے فریبوں کو یہ خوب سمجھتے تھے اور ان سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے یہ لوگ مجاہدے بھی کرتے تھے۔ الغرض اس دور کے اہل کمال کا تصوف یہ تھا کہ وہ خدا کی عبادت کا محرک خدا کے ساتھ ان کی محبت کا جذبہ ہوتا۔

لیکن صوف کے اس دور میں "توجہ" کی نسبت اپنے درجہ کمال تک نہیں پہنچی تھی۔ "توجہ" سے یہاں مراد نفس کا پوری طرح حقیقت الحقائق یعنی ذات خداوندی کی طرف متوجہ ہونا ہے اور وہ اس طرح کہ نفس اللہ کے رنگ میں کلیتہً رنگا جائے اور وہ دنیا کی عارضی اور فانی چیزوں پر پوری طرح غالب آ جائے۔ تصوف کے اس دور میں "توجہ" کی نسبت دوسری چیزوں سے ملی جلی تھی۔ چنانچہ اس زمانے میں ان اہل کمال میں سے کوئی شخص ایسا نہ تھا جس نے کہ خاص "توجہ" کو ان معنوں میں اپنا نصب العین بنایا ہو کہ وہ ہمیشہ اسی کی بات کرتا اور اسی طرف اس کا ہر اشارہ ہوتا یا اس زمانے میں یہ صورت ہوتی کہ ان میں سے کسی شخص نے "توجہ" کی نسبت حاصل کرنے کی راہ بتائی ہوتی۔ اصل بات یہ ہے کہ ان بزرگوں پر

طاعت کا رنگ غالب تھا اور طاعت کے انوار سے وہ سرشار تھے۔ بے شک انہیں "توجہ" کی نسبت حاصل ہوتی لیکن گاہے گاہے جیسے کہ بجلی کی چمک کہ ابھی ہے اور ابھی نہیں۔

شب خیالِ طرۂ شوخ بدل پیچید و رفت
ساعتے ہم چوں شب قدر از برم جوشید و رفت

3- تصوف کا تیسرا دور

سلطان الطریقت شیخ ابوسعید بن ابی الخیر اور شیخ ابوالحسن خرقانی کے زمانے میں طریق تصوف میں ایک اور تغیر رونما ہوتا ہے۔ اس دور میں اہل کمال میں سے عوام تو حسب سابق شرعی اوامر و اعمال پر ٹھہرے رہے اور خواص نے باطنی احوال و کیفیات کو اپنا نصب العین بنایا اور جو خواص الخاص تھے، انہوں نے اعمال و حوال سے گزر کر "جذب" تک رسائی حاصل کی۔ اس "جذب" ہی کی وجہ سے ان کے سامنے "توجہ" کی نسبت کا راستہ کھل گیا۔ اسی سے تعینات کے سب پردے ان کے لئے چاک ہو گئے اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ وہی ایک ذات ہے جس پر تمام اشیاء کے وجود کا انحصار ہے۔ وہی ذات سب اشیاء کی قیوم[3] ہے۔ یہ لوگ اس ذات میں گم ہو گئے اور اس کے رنگ میں ان کے نفوس رنگے گئے۔ چنانچہ اس حال میں نہ ان کو اوراد و وظائف کی چنداں ضرورت رہی اور نہ انہیں مجاہدے اور ریاضتیں کرنے اور نفس اور دنیا کے فریبوں کو جاننے کی سدھ بدھ رہی۔ ان کی تمام تر کوشش کا مقصد یہ ٹھہرا کہ جس طرح بھی ہو "توجہ" کی نسبت کی تکمیل کریں۔ "توجہ" کے علاوہ باقی جو نسبتیں ہیں یہ لوگ انہیں نورانی حجاب سمجھتے تھے۔ اس عہد میں توحید وجودی اور توحید شہودی میں فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ درحقیقت ان بزرگوں کی اصل غایت یہ تھی کہ ذاتِ الٰہی میں اپنے وجود کو گم کر کے اس مقام کی کیفیات سے لذت اندوز ہوں۔ چنانچہ وہ اس بحث میں نہیں پڑتے تھے کہ کائنات کا وجودِ الٰہی سے کیا علاقہ ہے؟ انسان خدا کی ذات میں کیسے گم ہوتا ہے؟ اور فنا و بقاء کے کیا حقائق ہیں؟

4- تصوف کا چوتھا دور

آخر میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور ان سے کچھ پہلے کا زمانہ آتا ہے۔ اس عہد میں ان اہل کمال بزرگوں کے ذہنوں میں مزید وسعت پیدا ہوتی ہے اور یہ لوگ کیفیات و احوال کی منزل سے آگے بڑھ کر حقائق تصوف کی بحث و تدقیق کرنے لگتے ہیں۔ ذات واجب الوجود سے یہ کائنات کس طرح صادر ہوئی؟ ان بزرگوں نے ظہورِ وجود کے مدارج اور تنزلات دریافت کیے اور اس امر کی تحقیق کی کہ واجب الوجود سے سب سے پہلے کس چیز کا صدور ہوا اور کس طرح یہ صدور عمل میں آیا۔ الغرض یہ اور اس طرح کے دوسرے مسائل ان لوگوں کے لئے موضوع بحث بن گئے۔

تصوف کے ان چاروں دوروں میں جو بھی اہلِ کمال بزرگ گزرے ہیں، گو وہ اپنے ظاہری اعمال و احوال میں الگ الگ نظر آتے ہیں لیکن جہاں تک ان کی اصل کا تعلق ہے، میرے نزدیک وہ سب ایک ہیں۔ باقی اللہ تعالیٰ ان کے حال کو ہم سب سے بہتر جانتا ہے۔ ان بزرگوں میں سے جب کسی نے اس دنیا سے انتقال فرمایا تو جو باطنی کیفیت اس

بزرگ نے اپنی ہمت اور ریاضت سے دل میں پیدا کر لی تھی' وہ کیفیت موت کے بعد بھی اس بزرگ کے نفس میں جاگزیں رہی۔اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ کوئی آئینہ یا پانی کا حوض ہو اور اس میں آفتاب کا عکس پڑ رہا ہو۔ان بزرگوں کے طفیل مبداءِ اول یعنی خدا تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ قریب ہو گیا اور ان کے فیوض و برکات کے انوار سے عالمِ علوی اور عالمِ سفلی کی فضا منور ہو گئی۔جیسے کہ ہماری اس آسمانی فضا میں جب مرطوب ہوا اور بادل پھیل جاتے ہیں تو اس کا اثر زمین پر بھی پڑتا ہے۔اسی طرح ان نفوسِ قدسی کی کیفیات بھی دنیائے قلوب پر اپنا اثر ڈالتی رہتی ہیں۔

الغرض تصوف کے یہ چاروں طریقے خدا تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہیں اور ملاءِ اعلیٰ میں بھی ان سب کی منزلت مسلم ہے۔اربابِ تصوف پر بحث کرتے وقت ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ان بزرگوں کے ہر طبقے کے اقوال و احوال کو ان کے زمانے کے ذوق کے مطابق جانچا جائے۔اس سلسلے میں یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ہم ایک عہد کے اربابِ تصوف کے اقوال اور احوال کو دوسرے عہد کے معیاروں سے ناپتے پھریں۔

(ہمعات)

حواشی

(1) اس کائنات میں تدبیر الٰہی، قبض، بسط، احالہ اور الہام کے ذریعے مصروف کار رہتی ہے۔قبض کے معنی یہ ہیں کہ ایک چیز کی فطری استعداد کسی مصلحت سے بروئے کار نہیں آتی۔بسط سے مراد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ ایک چیز کی فطری استعداد میں خلاف معمول بہت زیادہ قوت اور اثر پیدا کر دیتا ہے۔

(2) احالہ کا مطلب ہے کہ مثلاً آگ میں جلانے کی خاصیت ہے لیکن خدا تعالیٰ کسی مصلحت سے اس خاصیت کو مسلوب کر لیتا ہے اور الہام کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کے دل میں ایک کام کو نے کی بات ڈال دے۔

(3) یعنی اس کی بدولت سب اشیاء قائم ہیں۔

(شاہ ولی اللہ کی تعلیمات وافکار اور سوانح حیات)

(عربی و فارسی تصنیفات سے انتخاب۔مرتبہ محمد سرور، لاہور۔1971ء)

☆☆☆

مُرشد سے بیعت کی حقیقت

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرمایا ہے: **ان الذین یبایعونك انما یبایعون الله ید الله فوق ایدیهم فمن نکث فانما ینکث علی نفسه ومن او فی بما عهد علیه الله فیو تیه اجراً عظیماo** (اے محمدؐ! بے شک جو لوگ تجھ سے بیعت کرتے ہیں وہ دراصل اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہوتا ہے۔بیعت کرنے کے بعد جس نے عہد شکنی کی تو اس عہد شکنی کا وبال اس کے نفس پر ہوگا اور جس نے اپنے عہد کو جو اس نے اللہ کے ساتھ کیا تھا'

پورا کیا تو اللہ تعالیٰ اس کو عنقریب بہت بڑا بدلہ دے گا۔) نیز مشہور احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ صحابہ آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کیا کرتے تھے۔ کبھی یہ بیعت ہجرت کے لئے ہوتی، کبھی جہاد کی غرض سے۔ بعض اوقات ارکانِ اسلام کو پابندی سے ادا کرنے کے لئے بیعت لی جاتی۔ کبھی میدانِ جنگ میں کفار کے خلاف ثابت قدمی کے ساتھ لڑنے کے لئے بیعت کی صورت میں عہد و اقرار ہوتا اور کبھی سنت و مضبوطی سے پکڑنے، بدعات سے بچنے اور طاعات و عبادات کو زیادہ سے زیادہ شوق و رغبت سے کرنے کے لئے بھی بیعت لی جاتی تھی۔ اسی ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپؐ نے انصار عورتوں سے مُردوں پر نوحہ نہ کرنے کی بیعت لی تھی۔ ابن ماجہ کی روایت ہے کہ آپؐ نے فقرائے مہاجرین میں سے ایک جماعت سے اس امر کی بیعت لی تھی کہ وہ لوگوں سے کسی چیز کا سوال نہیں کریں گے۔ چنانچہ ان کی حالت یہ تھی کہ ان میں سے اگر کسی کے ہاتھ سے کوڑا گر پڑتا تو خود گھوڑے سے اتر کر اسے اٹھاتا لیکن اس کے لئے کسی سے سوال نہ کرتا۔

اس بات میں تو کوئی شک و شبہ نہیں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ایسا فعل ثابت ہو جو آپؐ نے بطور عبادت کے کیا اور آپؐ نے اس کے متعلق خاص اہتمام فرمایا تو وہ فعل سنت سے کم درجہ کا نہیں سمجھا جائے گا۔ اب صورت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ تھے اور اس نے قرآن میں جو کچھ نازل فرمایا، اس کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ نیز آپؐ قرآن و سنت کی تعلیم دیتے تھے اور اپنے پیروؤں کے اخلاق سدھارتے تھے۔ چنانچہ خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے جو کچھ آپؐ نے کیا، وہ بعد میں آپؐ کے خلفاء کے لئے سنت بنا اور بحیثیت قرآن اور حکمت کے معلم ہونے اور امت کے اخلاق سدھارنے کے سلسلہ میں آپؐ نے جو طریقہ اختیار فرمایا، وہ بعد میں علمائے راسخین کے لئے سنت بنا۔

اس تمہید کے بعد ہم اصل مسئلے کی طرف آتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان امور سے بیعت کا تعلق کس سے ہے؟ اس بارے میں بعض لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ بیعت صرف خلافت تک محدود ہے اور صوفیا جو اپنے مریدوں سے بیعت لیتے ہیں، اس کی کوئی اصلیت نہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ان لوگوں کا یہ خیال غلط ہے۔ اس سلسلے میں ہم ابھی بتا چکے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ارکانِ اسلام پابندی سے ادا کرنے کے لئے بیعت لیتے تھے اور کبھی سنت پر مضبوطی سے عمل کرنے کی غرض سے بھی بیعت لی جاتی تھی۔ خود صحیح بخاری کی یہ حدیث اس امر کی شاہد ہے کہ آپؐ نے جریرؓ سے بیعت لی اور بیعت لیتے ہوئے فرمایا: ''تم پر ہر مسلمان کی خیر خواہی لازم ہے۔'' یہ بھی مروی ہے کہ آپؐ نے انصار سے بیعت لی اور ان سے یہ شرط کی کہ وہ خدا کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں اور جہاں بھی ہوں حق بات کہیں۔ چنانچہ ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ امراء اور ملوک کے روبرو برملا طور پر غیر حق کی تردید اور اس کا انکار کرتے۔ یہ بھی ثابت ہے کہ آپؐ نے انصار کی عورتوں سے بیعت لی اور ان سے شرط کی کہ وہ مُردوں پر نوحہ نہیں کریں گی۔ الغرض یہ سب معاملات جن کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت لی، ان کا شمار خلافت میں نہیں ہو سکتا بلکہ ان کا تعلق تزکیہ اخلاق، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے ہے یعنی ان روایات سے صاف ظاہر ہے کہ بیعت محض خلافت تک محدود نہیں۔

بیعت کے معاملے میں اصل حقیقت یہ ہے کہ بیعت کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک بیعتِ خلافت

ہے۔اس کے علاوہ ایک بیعتِ اسلام بھی ہے۔ پھر تقویٰ پر مضبوطی سے قائم رہنے کی بیعت ہے۔ جہاں تک کفر سے اسلام میں داخل ہونے کے وقت بیعت لینے کا تعلق ہے' یہ بیعت خلفاء کے زمانے میں متروک رہی۔ خلفائے راشدین کے عہد میں تو اس لئے اس بیعت کا رواج نہ تھا کہ ان کے زمانے میں زیادہ تر لوگ غلبہ وقہر اور تلوار کی وجہ سے مسلمان ہوتے تھے نہ کہ تالیف اور دلیل و برہان کے ذریعے سے اور نہ وہ اپنی مرضی وشوق سے اسلام میں داخل ہوتے تھے۔ اس لئے ان سے اسلام قبول کرتے وقت بیعت کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ باقی رہا خلفائے راشدین کے بعد کا زمانہ۔ اس میں تو بیشتر خلفاء ظالم اور فاسق ہوئے جن کو سنت کے قیام کا کوئی خیال ہی نہ تھا۔ چنانچہ جس طرح بیعتِ اسلام زمانۂ خلفاء میں متروک رہی' اسی طرح تقویٰ پر مضبوطی سے قائم رہنے کے لئے بیعت لینے کا بھی اس عہد میں رواج نہ تھا۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں بیعتِ تقویٰ اس لئے متروک رہی کہ اس وقت صحابہ کثیر تعداد میں موجود تھے جنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے فیضانِ نور کا اکتساب کیا تھا اور آپؐ کے سامنے تربیت پائی تھی۔ ظاہر ہے انہیں اس امر کی حاجت نہ تھی کہ تقویٰ پر قائم رہنے کے لئے خلفاء سے بیعت کرتے لیکن ان کے بعد جو خلفاء ہوئے' ان کے زمانے میں بیعتِ تقویٰ اس لئے متروک رہی کہ اس سے امت میں انتشار پھیلنے کا خوف تھا کیونکہ بیعتِ تقویٰ پر خلافت کی بیعت کا بھی گمان ہو سکتا تھا اور اس سے فتنے اٹھنے کا امکان تھا۔ اس زمانے میں صوفیا کے ہاں یہ دستور تھا کہ وہ بیعت کے بجائے خرقہ کو اس کا قائم مقام بناتے تھے لیکن ایک وقت آیا جب خلفاء میں بیعتِ خلافت کی رسم ختم ہو گئی تو صوفیا نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ وہ اپنے مریدوں سے بیعت لینے لگے اور انہوں نے اس سنت کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

اب تو پوچھو گے کہ (1) بیعت واجب ہے یا سنت؟ (2) بیعت کے مشروع ہونے میں حکمت کیا ہے؟ (3) بیعت لینے والے کے لئے کیا شرطیں ہیں؟ (4) بیعت کرنے والے کی کیا شرائط ہیں؟ (5) بیعت کرنے والے کے لئے بیعت کو پورا کرنا اور بیعت کو توڑنا کیا ہے؟ (6) کیا ایک یا ایک سے زیادہ عالموں سے ایک شخص کا ایک سے زیادہ بار بیعت کرنا جائز ہے؟ (7) سلف سے بیعت کے کون سے الفاظ منقول ہیں؟

تمہارے پہلے سوال کا جواب کہ بیعت سنت ہے یا واجب' یہ ہے کہ بیعت واجب نہیں' سنت ہے۔ اس لئے کہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی اور اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا تقرب چاہا۔ اس ضمن میں کہیں اس بات کی دلیل نہیں ملتی کہ جس نے آپؐ کی بیعت نہ کی' وہ گنہگار رہا اور نہ کسی امام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت نہ کرنے والے کو برا قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس امر پر سب کا اجماع ہے کہ بیعت واجب نہیں۔

اب رہا دوسرا سوال کہ بیعت کے مشروع ہونے میں حکمت کیا ہے؟ سو تمہیں جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا دنیا میں یہ قانون جاری ہے کہ نفوسِ انسانی کے اندر جو نظر میں نہ آنے والی پوشیدہ کیفیات ہیں' اس نے ان کو ظاہری افعال واقوال کے ذریعہ ضبط میں لانے کا دستور بنایا ہے اور ان ظاہری افعال واقوال ہی کو اندرونی نفسی کیفیات کا قائم مقام مقرر فرمایا ہے۔ مثال کے طور پر خدا' خدا کے رسولؐ اور یومِ آخرت پر ایمان لانا اور ان کی تصدیق کرنا نفس کی ایک نظر نہ آنے والی اندرونی کیفیات ہے۔ اسی طرح دو آدمیوں کا کسی چیز کی خرید وفروخت کے متعلق متفق ہونا ایک مخفی معاملہ ہے لیکن خریدار اور فروخت کرنے والے کا زبان سے ایجاب وقبول کرنا اس کا ظاہر میں قائم مقام بن گیا۔ یہی مثال بیعت کی بھی ہے۔

ایک آدمی توبہ کرتا ہے اور ترکِ معاصی کا عہد کرتا ہے اور تقویٰ پر مضبوطی سے قائم رہنے کا تہیہ کرتا ہے تو یہ ایک نفس کی داخلی کیفیت ہوئی۔ اس نفسی کیفیت کا قائم مقام بیعت کو بنایا گیا ہے۔

تیسرا سوال۔ بیعت لینے والے مرشد کے لئے کیا ضروری شرائط ہیں؟ سو مرشد کے لئے ایک شرط تو یہ ہے کہ وہ قرآن اور سنت کا علم رکھتا ہو۔ قرآن اور سنت کے علم سے میری مراد یہ نہیں وہ اس میں درجۂ کمال پر فائز ہو۔ مرشد کے لئے قرآن کا علم بس اتنا کافی ہے کہ اس نے تفسیر مدارک یا تفسیر جلالین یا ان جیسی کوئی اور تفسیر پڑھی ہو۔ کسی عالم سے قرآن کی تحقیق کی ہو اور اس کے معانی حل کیے ہوں۔ مشکل الفاظ کو سمجھا ہو۔ اسباب نزول کا احاطہ کیا ہو اور اعراف، قصص اور اس سے جو متعلق مسائل ہیں، ان کا عالم ہو۔ مرشد کے سنت کا عالم ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ حدیث کی ''المصابیح'' جیسی کتاب پڑھ چکا ہو۔ اس نے اس میں تحقیق کی ہو۔ اس کے معانی سمجھا ہو۔ اس کے غریب و نامانوس الفاظ کی شرح کی ہو۔ اس کے مشکل اعراب کو حل کیا ہو اور حدیث میں جو دقیق مسئلہ آیا ہو، فقہا میں سے کسی ایک کی رائے کے مطابق اس نے اس کی تاویل و تشریح کی ہو۔ مرشد کے لئے ضروری نہیں کہ وہ قرآن کا حافظ ہی ہو اور نہ یہ لازمی ہے کہ اس نے احادیث کی اسانید میں بڑی کرید کی ہو۔ کیا واقعہ نہیں کہ تابعین اور تبع تابعین منقطع اور مرسل حدیث بھی لے لیتے تھے۔ ہاں اس ضمن میں اصل مقصود صرف اتنا ہے کہ اس امر کا حتی الامکان اسے ظن غالب ہو جائے کہ اس حدیث کا سلسلہ روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جاتا ہے۔

نیز مرشد کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ اصول فقہ، علم کلام، فقہ کی جزئیات اور ان کے فتاویٰ کا عالم ہو۔ ہم نے بیعت لینے والے کے لئے علم کی شرط صرف اس لئے لگائی ہے کہ بیعت سے اصل غرض امر بالمعروف، نہی عن المنکر، تسکین باطن کے حصول کی تلقین اور برائیوں کو دور کرنے اور اچھائیوں کے حاصل کرنے کی ترغیب و ارشاد سے ہے اور چونکہ بیعت کرنے والے مرید کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان تمام باتوں میں اپنے مرشد کی اطاعت کرے۔ اس لئے اگر مرشد عالم نہیں تو اس سے ان امور کو سرانجام دینے کا کیسے تصور کیا جا سکتا ہے؟

تمام مشائخ اس امر میں متفق ہیں کہ جس شخص نے حدیثیں نہ لکھی ہوں اور قرآن نہ پڑھا ہو، وہ کبھی وعظ نہ کہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص ایک مدت تک متقی علماء کی صحبت میں بیٹھا ہو۔ ان سے اس نے تربیت حاصل کی ہو۔ وہ حلال و حرام میں خوب پہچان کرنے والا ہو اور کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ سے اچھی طرح واقف ہو تو البتہ یہ چیزیں وعظ کہنے والے کے لئے کافی ہو سکتی ہیں۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔ مرشد کے لئے دوسری شرط اس کا عادل ہونا اور اس کا تقویٰ ہے۔ مرشد کو چاہیے کہ وہ کبیرہ گناہوں سے بچے۔ صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ کرے اور اس کے لئے تیسری شرط یہ ہے کہ وہ دنیا سے بے نیاز ہو۔ آخرت میں رغبت رکھتا ہو۔ جو اطاعات و عبادات ضروری اور موکد ہیں اور جو ذکر و اذکار صحیح احادیث میں مروی ہیں، ان کا پابند ہو اور اس کا دل برابر اللہ سبحانہ سے تعلق رکھے اور اس کے لئے یادداشت (1) ایک مستقل ملکہ بن جائے۔

مرشد کے لئے چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر عامل ہو۔ اپنی رائے میں پختہ ہو۔ مذبذب خیال کا نہ ہو کہ نہ اس کی اپنی رائے ہو اور نہ اس کا اپنا کوئی فیصلہ۔ نیز مرشد کے لئے ضروری ہے کہ وہ صاحبِ مروت ہو اور عقلِ تام رکھتا ہو تاکہ جس چیز کے کرنے کو وہ کہے اور جس سے وہ منع کرے، اس میں اس پر پورا اعتماد کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ

قرآن مجید میں فرماتا ہے کہ ''گواہی ان کی مقبول ہے جن گواہوں کو تم پسند کرو۔'' جب گواہوں کے معاملے میں یہ حال ہے تو تمہارا کیا خیال ہے کہ بیعت لینے والے مرشد کے لئے یہ ضروری نہیں ہوگا کہ اس میں عدالت اور تقویٰ ہوتا کہ مرید اس پر اعتماد کر سکے۔

مرشد کے لئے پانچویں شرط یہ ہے کہ وہ ایک مدت دراز تک مشائخ کی صحبت میں رہا ہو اور ان سے اس نے تربیت پائی اور نورِ باطن اور تسکینِ قلب اخذ کی ہو۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ایک بندھا ہوا نظام ہے کہ کوئی شخص فلاح نہیں پا سکتا جب تک وہ فلاح پانے والوں کو نہ دیکھے بھالے اور ان سے نہ ملے جلے۔ جس طرح کہ کوئی شخص علم حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ علماء کی صحبت میں نہ رہے۔ یہی دوسرے پیشوں میں بھی ہوتا ہے۔ نیز مرید کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس سے کرامات اور خوارق ہی ظاہر ہوں یا وہ کسبِ معاش کو چھوڑ بیٹھے۔ کرامت اور خوارق تو ثمرہ ہوتے ہیں، محض مجاہدات اور ریاضتوں کا اور یہ چیز شرطِ کمال نہیں ہے۔ اسی طرح کسبِ معاش کو چھوڑ بیٹھنا شریعت کے منافی ہے۔ اس ضمن میں ان لوگوں کے اعمال سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے جو مغلوب الاحوال ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں سلف سے جو طریقہ چلا آتا ہے، وہ یہ ہے کہ جو بھی تھوڑا سا مل جائے اس پر قناعت کر لی جائے اور جو شبہے کی چیزیں ہیں، ان سے بچا جائے۔

باقی رہا یہ سوال کہ بیعت کرنے والے مرید کے لئے کیا کیا شرطیں ہیں تو اس بارے میں تمہیں جاننا چاہیے کہ بیعت کرنے والے مرید کے لئے ضروری ہے کہ وہ بالغ ہو، عاقل ہو، شوق و رغبت رکھنے والا ہو۔ حدیث میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک بچہ پیش کیا گیا کہ وہ آپؐ سے بیعت کرے۔ آپؐ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے لئے برکت کی دعا کی اور اس سے بیعت نہ لی۔ بعض مشائخ تبرک اور نیک فالی کے خیال سے کم عمروں کی بیعت بھی جائز قرار دیتے ہیں۔

اس بحث کا پانچواں مسئلہ کہ بیعت کو توڑنے اور اس کو پورا کرنے سے کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق تمہیں جاننا چاہیے کہ بیعت جو صوفیا میں نسلاً بعد نسلِ چلی آتی ہے، اس کی کئی شکلیں ہیں۔ ایک گناہوں سے توبہ کرنے کی بیعت ہوتی ہے۔ ایک بیعت صالحین کے سلسلے میں تبرک کے طور پر شریک ہونے کی ہے جیسے کہ احادیث کے راویوں میں تبرک کے خیال سے شامل ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ اس میں برکت ہے۔ صوفیا کی بیعت کی تیسری قسم یہ ہے کہ احکام الٰہی کے لئے سب سے کنارہ کش ہونے، جن چیزوں سے اللہ نے منع فرمایا ہے ان کو ظاہراً و باطناً ترک کرنے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے دل کو وابستہ کرنے پر عزم بالجزم کیا جائے، اس کے لئے بیعت ہو۔

بیعت کی پہلی جو دو شکلیں ہیں، ان کو پورا کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ کبیرہ گناہوں سے بچا جائے۔ صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ ہو اور اطاعت و عبادات میں جو واجب ہیں یا جو چیزیں سنتِ موکدہ کا درجہ رکھتی ہیں، ان کی پابندی کی جائے۔ یہ تو ہوا بیعت کا ایفائے عہد۔ باقی رہا اس کا توڑنا سو اور پر کے اعمال بجا نہ لانا، یہ نقضِ بیعت ہوگا۔ اس نوع کی تیسری شکل کا ایفا یہ ہے کہ احکامِ الٰہی کے لئے دنیا سے کنارہ کشی کے عزم اور اللہ تعالیٰ کے منع کیے ہوئے کاموں سے بچنے کی سعی و کوشش پر مرید برابر قائم رہے۔ یہاں تک کہ وہ سکینۂ قلب کے نور سے منور ہو جائے اور یہ نور اس کے اندر بطور ایک عادت، خلق اور طبیعت کے ہو جائے۔ جب مرید اپنے اندر یہ حالت پیدا کر لے تو اس وقت اسے ان چیزوں کے کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے جو شریعت نے مباح قرار دی ہیں۔ وہ دنیاوی لذات سے مستفید ہو سکتا ہے اور اس قسم کے مشاغل جیسے تعلیم دینا اور قضا کا

منصب ہے یا جن میں ایک لمبے عرصے تک مصروف رہنا پڑتا ہے، وہ کر سکتا ہے۔ دنیا سے کنارہ کشی کے عزم اور اللہ تعالیٰ کے منع کیے ہوئے کاموں سے بچنے کی سعی پر برابر قائم نہ رہنا یہ اس بیعت کی خلاف ورزی اور عہد شکنی ہوگی۔

چھٹے سوال کے متعلق کہ کیا ایک یا ایک سے زیادہ عالموں سے ایک شخص کا ایک سے زیادہ بیعت کرنا جائز ہے یا نہیں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ آپؐ نے صحابہ سے بار بار بیعت لی۔ اسی طرح صوفیا کا بھی کئی بار بیعت لینا مذکور ہے۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ ایک سے بیعت کرنے کے بعد پھر دوسرے سے بیعت کی جائے یا نہ کی جائے تو اس کی صورت یہ ہے کہ جس مرشد سے کہ پہلے بیعت کی ہے، اگر اس میں کوئی خلل ظاہر ہو تو دوسرے مرشد سے بیعت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اسی طرح پہلے مرشد کی موت اور اس کے لاپتہ ہونے پر بھی دوسرے مرشد سے بیعت کی جا سکتی ہے لیکن پہلی بیعت کو چھوڑ کر دوسرے مرشد سے بغیر کسی عذر کے بیعت کرنا یہ تو ایک کھیل ہے۔ اس سے یہ ہوگا کہ بیعت میں برکت نہ رہے گی اور مرشدوں کا دل مرید کی خبر گیری سے ہٹ جائے گا۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

اور یہ سوال کہ بیعت کے کون سے الفاظ سلف سے منقول ہیں۔ اس کے متعلق تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ بیعت لیتے وقت مرشد کو چاہیے کہ وہ سب سے پہلے خطبۂ مسنونہ پڑھے اور وہ یہ ہے: **الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيات اعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادى له واشهد ان لا اله الا الله واشد ان محمداً عبده ورسوله صلى الله عليه وسلم واله وصحبه وبارك وسلم.** اس خطبۂ مسنونہ کے بعد مرشد مرید کو ایمان اجمالی کی تلقین کرے اور اس سے یوں کہلوائے۔ ''میں ایمان لایا اللہ پر اور جو اللہ کی طرف سے آیا اللہ کی مراد پر۔ میں ایمان لایا اللہ کے رسول پر اور جو کچھ اللہ کے رسول سے آیا اللہ کے رسول کی مراد پر۔ میں نے تمام مذاہب اور تمام گناہوں سے برأت کی اور اس وقت اور اب اسلام لایا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں۔''

اس کے بعد مرشد مرید سے کہے کہ یوں کہہ ''میں بیعت کرتا ہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آپؐ کے خلفا کے توسط سے ان پانچ چیزوں پر (1) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں۔ (2) نماز کا قیام (3) ادائے زکوٰۃ (4) رمضان کے روزے (5) زادِ راہ کی استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج۔'' پھر مرید سے یوں کہلوائے۔ ''میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آپؐ کے خلفاء کے واسطے سے اس بات پر بیعت کرتا ہوں کہ میں اللہ کے ساتھ شریک نہیں کروں گا۔ نہ چوری کروں گا نہ زنا، نہ کسی پر جھوٹا بہتان لگاؤں گا اور نیک کاموں میں اللہ کی نافرمانی نہیں کروں گا۔'' اس کے بعد مرشد یہ دو آیتیں تلاوت کرے۔ **يا يها الذين امنوا اتقوا الله ابتغوا اليه الوسيلة وجاهد وا فى سبيله لعلكم تفلحون۔ ان الذين يبايعونك انما يبايعون الله يد الله فوق ايديهم فمن نكث فانما ينكث على نفسه ومن او فى بما عاهد عليه الله فسيوتيه اجرا عظيماo** پھر مرشد اپنے لیے مرید کے لئے اور جو حاضرین ہوں ان کے لئے دعائے خیر کرے اور پھر کہے۔ ''اللہ تعالیٰ برکت دے، ہمیں اور تم کو اور نفع دے ہمیں اور تم لوگوں کو۔''

بیعت لیتے وقت اگر مرشد مرید سے یہ کہلوائے کہ ''میں نے نقشبندی طریقہ جو شیخ اعظم قطب افخم خواجہ نقشبندی

کی طرف یا قادری طریقہ جو شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی کی طرف یا چشتی طریقہ جو شیخ معین الدین سنجری کی طرف منسوب ہے، اختیار کیا۔ اے اللہ! ہمیں اس طریقے کی فتوح عطا فرما اور تو اپنی رحمت سے اس طریقے کے زمرۂ اولیاء میں ہمیں شامل کر۔ اے سب سے زیادہ رحمت کرنے والے۔'' تو اس طرح کہلوانے میں کوئی حرج نہیں۔

میرے والد شاہ عبدالرحیم فرماتے ہیں۔ ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ آپؐ کی میں نے بیعت کی اور آپؐ نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ چنانچہ اب میں جب کسی سے بیعت لیتا ہوں تو اسی طرح اس کے ہاتھ کا مصافحہ کرتا ہوں۔'' عورتوں سے بیعت لینے کا طریقہ یہ ہے کہ مرشد کپڑے کا ایک کنارہ پکڑے اور جو عورت بیعت کرنا چاہتی ہو، وہ اس کا دوسرا کنارہ پکڑ لے۔ باقی خدا بہتر جانتا ہے۔

مرید کی تعلیم و تربیت

سالکوں کی تربیت کے مختلف درجے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلی چیز جس کی طرف توجہ کرنی چاہیے، وہ سالک کا عقیدہ ہے۔ جب مرید اللہ کے راستے پر چلنے کی طرف راغب ہو تو مرشد اس کو حکم دے کہ سب سے پہلے وہ سلف صالحین کے مطابق اپنے عقائد کی تصحیح کرے۔ یعنی وہ ذات واجب الوجود کو اس طرح مانے کہ کوئی معبود نہیں اس کے سوا اور حیات علم، قدرت، ارادہ اور اس طرح کی اور جو صفات ہیں، ان سب کا جو درجۂ کمال ہے، وہ ذات واجب الوجود ان سے متصف ہے۔ مرید اللہ کے لئے ان صفاتِ کمال کو اسی طرح مانے جس طرح خود اللہ نے انہیں اپنے لئے اپنی کتاب میں ثابت کیا ہے اور جس طرح صحیح احادیث و روایات سے یہ صفاتِ الٰہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو صحیح خبر دینے والے ہیں اور آپؐ کی آل آپؐ کے اصحاب اور آپؐ کے تابعین سے ثابت ہیں۔ نیز وہ ذات واجب الوجود کو نقص اور زوال کے ان تمام عیوب سے جیسے کہ جسمیت، کسی خاص جگہ میں محدود ہونا، عرض ہونا، کسی خاص طرف کسی خاص رنگ اور کسی خاص شکل سے متصف ہونا وغیرہ ہیں، منزہ مانے۔

صفاتِ الٰہی کے ضمن میں قرآن میں ذاتِ واجب الوجود کے متعلق استوا علی العرش، ضحک یعنی ہنسی اور اثباتِ ید یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہیں۔ اس طرح کی جو چیزیں وارد ہوئی ہیں۔ ہم مجملاً ان سب پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی تفصیل ہم اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں لیکن اس سلسلے میں اتنا ہم یقینی طور پر جانتے ہیں کہ اس ذات کا اپنے آپ کو استوا علی العرش سے متصف کرنا اس طرح نہیں جس طرح کہ ہم کسی کو اس صفت سے متصف کریں کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ خدا کے مثل کوئی چیز نہیں اور وہ سب کچھ سنتا اور سب کچھ دیکھتا ہے۔ جیسے کہ قرآن مجید میں وارد ہوا ہے۔ **لیس کمثلہ شی وھو السمیع العلیم**o پھر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا استوا علی العرش ہونا خود اپنی محکم کتاب میں ثابت کیا ہے۔ اس لئے ہم اس کا استوا علی العرش (2) ہونا مانتے ہیں۔

ذات واجب الوجود کو اس طرح ماننے کے بعد مرید کو چاہیے کہ وہ تمام انبیاء کی نبوت کا بالعموم اور سیدنا و مولانا محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت کا بالخصوص یقین و اثبات کرے۔ آپؐ نے خدا کی طرف سے جو کچھ کرنے کا حکم دیا ہے اور جن چیزوں سے منع کیا ہے، ان سب میں آپ کی اتباع کو واجب سمجھے اور آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی صفات جس طرح بیان فرمائی ہیں اور موت کے

بعد دوسری زندگی میں انسانوں کا جسموں کے ساتھ زندہ ہونا، جنت، دوزخ، حشر، حساب، روایتِ الٰہی، قیامت، عذابِ قبر اور اس طرح کی اور چیزیں جو روایات سے ثابت ہیں اور صحیح احادیث میں ان کا ذکر آیا ہے، مریدان سب باتوں کی تصدیق کرے۔

تصحیح عقائد اور اثباتِ نبوت کے بعد مرید کو کبیرہ گناہوں سے بچنے اور صغیرہ گناہوں کے ارتکاب پر نادم ہونے کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ کبیرہ گناہوں کی حقیقت یہ ہے کہ وہ گناہ جن کے متعلق قرآن اور ان صحیح احادیث میں جو کہ علمائے حدیث کے نزدیک معروف و مشہور ہیں، دوزخ اور سخت عذاب کی وعید دی گئی ہے یا اس کے مرتکب کو کافر بتایا گیا ہے، گناہ کبیرہ ہیں۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے جان بوجھ کر نماز ترک کی، وہ کافر ہوا۔'' یا آپ کا یہ ارشاد کہ ''ہمارے اور مشرکین کے درمیان اگر کوئی فرق کرنے والی چیز ہے تو وہ نماز ہے۔ چنانچہ جس نے نماز کو ترک کیا وہ کافر ہو گیا۔'' نیز وہ گناہ جن کے ارتکاب پر شریعت کی طرف سے حد مقرر ہے۔ جیسے زنا، چوری، رہزنی، شراب پینا یا ان کی طرح کے اور گناہ جن کو عقل صریح طور سے برائی میں مذکورہ بالا گناہوں کے مساوی یا ان سے بڑھا ہوا سمجھے، یہ سب کے سب کبیرہ گناہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں کسی اور کو شریک کرنا اور رزق، شفا اور اس طرح کے اور کاموں میں اللہ کے سوا اوروں سے مدد مانگنا، ان کا شمار بھی کبیرہ گناہوں میں ہوتا ہے۔ چنانچہ سورۂ فاتحہ کی آیت: **ایاك نعبدو ایاك نستعین** میں اسی شرک فی العبادات اور شرک فی الاستعانت سے برأت کا اظہار کیا گیا ہے۔

کبیرہ گناہوں میں سے ایک کاہن کی بات کی تصدیق کرنا بھی ہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن مجید اور فرشتوں کو گالی دینا، ان کا انکار کرنا، ان کا مذاق اڑانا اور ضروریاتِ دین کا انکار کرنا، نیز نماز کو ترک کرنا۔ زکوٰۃ نہ دینا، روزے نہ رکھنا، استطاعت کے باوجود حج نہ کرنا، بغیر وجہِ حق کے کسی کو مار ڈالنا، اولاد کو قتل کرنا، خود اپنی جان لینا، زنا، لواطت، نشے والی چیز پینا، چوری، رہزنی، کسی کا مال غصب کر لینا، خیانت کرنا، جھوٹی شہادت دینا، جھوٹی قسم کھانا، پاکدامن عورت پر بہتان لگانا، یتیم کا مال کھانا، والدین کی نافرمانی کرنا، عزیزوں، رشتہ داروں کے حقوق ادا نہ کرنا، ناپ اور تول میں بے ایمانی کرنا، جہاد میں میدانِ جنگ سے بھاگ جانا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولنا، رشوت لینا، جن سے نکاح حرام ہے ان سے نکاح کرنا، عورتوں اور مردوں کے مابین کٹناپن کرنا، حاکم سے لوگوں کی چغلی کھانا تا کہ وہ انہیں قتل کرے یا ان کا مال لوٹ لے۔ دارالحرب سے ہجرت نہ کرنا، کفار سے موالات کرنا، جوا کھیلنا، جادو کرنا، یہ سب گناہ کبیرہ ہیں۔

صغیرہ گناہ یہ ہیں: اول وہ کام جن سے کہ شریعت نے روک دیا ہے۔ دوسرے ایسے کام جن سے شریعت کے مقرر کیے ہوئے احکام کی مخالفت ہوتی ہو یا پھر ایسے امور کہ ان کے کرنے سے دین کے طریقے بے اثر ہوتے ہیں۔

تصحیح عقائد، اثباتِ نبوت، کبیرہ گناہوں سے اجتناب اور صغیرہ گناہوں پر ندامت کے بعد مرید کو ارکانِ اسلام کی بجا آوری پر نگاہ رکھنی چاہیے۔ چنانچہ اسے چاہیے کہ وہ طہارت، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ادا کرے اور وہ اس طرح کہ ان کے واجبات، آداب، ان کی ہیئات اور اذکار کو ٹھیک طرح سرانجام دے۔ اس کے بعد مرید کو چاہیے کہ زندگی کی معاشی ضروریات یعنی اکل و شرب، بات چیت اور لوگوں سے ملنے جلنے نیز خانگی معاملات یعنی نکاح، غلاموں اور اولاد کے حقوق اور پھر خرید و فروخت، ہبہ اور اجارہ وغیرہ امور پر توجہ کرے اور ان کو بغیر کسی رو رعایت اور کج روی کے سنت کے مطابق ادا کرے۔

معاشی اور گھریلو زندگی کی ضروریات کے بعد مرید کو ان اذکار پر نگاہ رکھنی چاہیے جو صبح و شام اور سونے کے وقت وغیرہ کے لئے مقرر ہیں۔ پھر اسے ریاکاری، غرور، حسد اور کینہ سے اپنے اخلاق پاک کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ نیز اسے تلاوتِ قرآن اور آخرت کے ذکر کو برابر کرتے رہنا چاہیے۔ اسے چاہیے کہ وہ علم کی مجالس، ذکر و اذکار کے حلقوں اور مساجد میں برابر حاضر ہو۔ جب مرید ان اعمال اور آداب میں راسخ ہو جائے تو پھر اس کے لئے باطنی اشغال کرنے کا وقت آتا ہے۔ اس سلسلے میں اسے چاہیے کہ وہ دل کو اللہ کے ساتھ وابستہ کرنے کی کوشش کرے اور اپنے دل کی نظریں برابر اسی کی طرف لگائے رکھے۔ ان تمہیدی امور کو ہم طوالت کے خوف سے یہاں بیان نہیں کرتے اور طالب صادق کے فہم پر اعتماد کرتے ہیں کہ وہ کتاب، سنت، فقہ، تصوف و سلوک کی درمیانی درجے کی کتابوں جیسے "ریاض الصالحین" اور عقائد کی مختصر کتابوں جیسے "عقائد عضدیہ" میں ان کو خود دیکھ لے گا۔ جو شخص خود ان کتابوں کو نہ دیکھ سکے، اسے چاہیے کہ وہ کسی عالم سے ان امور کو دریافت کرے۔

(القول الجمیل)

حواشی

(1) یادداشت مقامات سلوک میں سے ایک مقام ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

(2) استوا علی العرش کے متعلق امام مالک فرماتے ہیں۔ استوا علی العرش معلوم ہے اور اس کی کیفیت مجہول ہے اور اس کے متعلق سوال کرنا بدعت۔

☆☆☆

نسبت

"القول الجمیل" میں شاہ ولی اللہ صاحب نے تصوف کے تین مشہور ترین طریقوں، قادری، چشتی اور نقشبندی کے مشائخ کے اشغال بیان کیے ہیں اور وہ اپنے مریدوں کی جس طرح باطنی تربیت کرتے تھے، ان کی تفصیلات دی ہیں۔ اب تمام طریقوں میں "ذکر" سلوک کی بنیادی شرط ہے لیکن "ذکر" کس طرح کیا جائے۔ مختلف طریقوں میں اس کے مختلف طریقے ہیں۔ کہیں "ذکر جہر" پر زور ہے اور کہیں "ذکر خفی" پر۔ یہ سب لکھنے کے بعد شاہ صاحب ان باطنی ریاضتوں کی جو اصل غرض ہے، وہ بیان فرماتے ہیں:

تصوف کے یہ جتنے طریقے اوپر بیان ہوئے، ان سب کا مقصد یہ ہے کہ طالب کے نفس ناطقہ کے اندر ایک خاص کیفیت پیدا ہو جائے۔ اس کیفیت کو صوفیا نے "نسبت" کا نام دیا ہے۔ اس کو "نسبت" کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ کیفیت عبارت ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ انتساب اور ارتباط سے۔ اس کو "سکینہ" اور "نور" بھی کہتے ہیں۔ یہ کیفیت نفسِ

ناطقہ کے اندر حلول کرتی ہے۔ یہ ملائکہ سے مشابہ ہوتی ہے اور اس کی نگاہ عالم جبروت کے حقائق پر پڑتی ہے۔
اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ طالب جب عبادات' طہارات اور ذکر واذکار پر برابر عامل رہے تو اس کے نفس ناطقہ کے اندر فرشتوں کے مشابہ ایک مستقل صفت اور عالمِ جبروت کی طرف ''توجہ'' کا راسخ ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ فرشتوں کے مشابہ ایک مستقل صفت اور عالمِ جبروت کی ''توجہ'' یہ دو شاخیں ہیں ''نسبت'' کی اور ان میں سے ہر ایک شاخ کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ایک عشق ومحبت کی ''نسبت'' ہے۔ عشق ومحبت کی ''نسبت'' دل کی مستقل صفت ہوتی ہے اور ایک ''نفس شکنی'' اور اس کی لذتوں سے ''برأت کلّی'' کی ''نسبت'' ہے۔ میرے والد بزرگوار اس نسبت کو ''نسبتِ اہل بیت'' کا نام دیا کرتے تھے۔ ایک مشاہدہ کی ''نسبت'' ہے اور اس سے مراد مجرد محض کی توجہ کرنے کے ملکہ سے ہے۔
خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضوری کے بہت سے رنگ ہیں۔ ان میں سے کبھی تو محبت کا رنگ ہوتا ہے اور کبھی ''نفس شکنی'' کا۔ کبھی ان کے علاوہ ''یادداشت'' کا رنگ ہوتا ہے۔ جب کبھی طالب کے نفسِ ناطقہ میں اس رنگ کا مستقل ملکہ پیدا ہو جاتا ہے تو یہ ملکہ ''نسبت'' کہلاتا ہے۔ ''نسبتیں'' بہت سی ہیں اور جو بزرگ ''صاحب سِرّ'' ہیں وہ ان نسبتوں میں سے ایک کو علیحدہ علیحدہ جانتے ہیں۔ طریقت کے اشغال ووظائف سے دراصل مطلب بھی یہی ہے کہ طالب ان ''نسبتوں'' میں سے کسی ایک ''نسبت'' کو حاصل کرے۔ اس پر وہ برابر قائم رہے اور اس ''نسبت'' میں اسے استغراق حاصل ہو جائے۔ یہاں تک کہ یہ ''نسبت'' طالب کے نفسِ ناطقہ کے لئے ایک مستقل ملکہ بن جائے۔
تمہیں کہیں یہ گمان نہ ہو کہ یہ ''نسبتیں'' صرف ان اشغال ووظائف ہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہیں۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ ان ''نسبتوں'' کے حصول کا ایک طریقہ یہ اشغال ووظائف بھی ہیں لیکن اس کے علاوہ ان کے حصول کے اور طریقے بھی ہیں۔ میرے نزدیک اس مسئلے میں رائے غالب یہ ہے کہ صحابہ اور تابعین ان اشغال ووظائف کے علاوہ ''سکینہ کی نسبت'' دوسرے طریقوں سے حاصل کرتے تھے۔ ان میں سے ایک طریقہ یہ تھا کہ وہ خلوت میں پورے خضوع و حضور کے ساتھ نمازیں پڑھتے، ذکر وتسبیح کرتے اور طہارت پر برابر قائم رہتے۔ موت جو دنیاوی لذتوں کو مٹانے والی ہے' اس کو ہر دم یاد کرنے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمانبرداروں کے لئے ثواب اور نافرمان کے لئے جو عذاب مقرر کر رکھا ہے' اس پر دھیان دینے سے مادی لذتوں سے ان کی طبیعت اچاٹ ہو جاتی ہے اور دل ان سے بے تعلق ہو جاتا۔ چنانچہ اس طریق سے ان میں یہ ''نسبت'' پیدا ہو جاتی تھی۔ اس کے حصول کا ایک طریقہ یہ تھا کہ وہ قرآن مجید کی برابر تلاوت کرتے۔ اس کے معانی ومطالب میں غور وتدبر فرماتے۔ نیز وعظ ونصیحت کی باتیں اور دل کو نرم کرنے والی احادیث سنتے۔ الغرض وہ ان چیزوں کو ایک مدت دراز تک باقاعدگی سے کرتے۔ اس سے ان کے اندر ایک مستقل ملکہ اور ایک نفسی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ وہ اس مستقل ملکہ اور اس نفسی کیفیات کی آخری عمر تک برابر حفاظت کرتے۔ یہ ہے وہ کیفیت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے مشائخ ذریعہ وراثۃً چلی آتی ہے۔ اب اس کیفیت کے برحق ہونے میں تو کوئی شک نہیں۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ اس کیفیت کے کئی رنگ ہیں اور اس کے حصول کے بھی متعدد طریقے ہیں۔
میں نے اپنے والد بزرگوار قدس سرہ کو ایک طویل واقعہ بیان کرتے سنا۔ فرماتے تھے کہ میں نے خواب میں حضرات حسن' حسین اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو دیکھا۔ میں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اپنی ''نسبت'' کے متعلق پوچھا

کہ کیا یہ وہی ''نسبت'' ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آپ لوگوں کے ہاں ہوتی تھی۔ اس پر حضرت علیؓ نے مجھے اپنی ''نسبت'' میں استغراق کرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے بھی اس میں پورا غور و تامل کیا۔ پھر فرمایا کہ ہاں ہاں یہ وہی ''نسبت'' ہے بلا کسی فرق کے۔

جو طالب ''نسبتِ سکینہ'' پر برابر قائم رہے۔ اس پر وقتاً فوقتاً بڑے بڑے بلند مرتبہ احوال و کوائف وارد ہوتے رہتے ہیں۔ طالب کو چاہیے کہ وہ ان مواقع کو غنیمت سمجھے اور جان لے کہ یہ احوال اس کی طاعات و عبادات کے قبول ہونے اور باطنِ نفس اور سویدائے دل میں ان کے مؤثر ہونے کی علامات ہیں۔

ان بلند مرتبہ احوال میں سے ایک یہ ہے کہ طالب سب چیزوں پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طاعت و فرمانبرداری کو ترجیح دے اور اللہ تعالیٰ کے لئے اس کے دل میں غیرت کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ اس ضمن میں امام مالکؒ نے موطا میں عبداللہ بن ابوبکرؓ سے روایت کی ہے کہ ایک دن ابوطلحہ انصاریؓ اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک خوش رنگ چڑیا اڑی اور وہ برابر اِدھر اُدھر چکر لگاتی اور باغ کے گھنے درختوں میں سے نکلنے کی جگہ تلاش کرتی رہی۔ ابوطلحہ کو یہ منظر بہت پسند آیا اور انہوں نے نماز ہی میں اس چڑیا کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ ایک بار نظر اٹھاتے۔ اس چڑیا کو دیکھ لیتے پھر نماز میں مصروف ہو جاتے۔ اس دوران وہ بھول گئے کہ انہوں نے کتنی رکعتیں پڑھیں۔ اس پر انہیں تنبہ ہوا کہ نماز میں یہ خلل میرے اس مال یعنی باغ کی دلکشی کی وجہ سے ہوا ہے۔ چنانچہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور باغ میں ان کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تھا وہ آپؐ سے بیان کیا اور کہا کہ یا رسول اللہؐ! میں یہ باغ اللہ کی راہ میں صدقہ دیتا ہوں۔ آپ اسے جہاں چاہیں خرچ کریں۔

قرآن میں حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قصہ جو مذکور ہے، وہ بھی اسی قسم کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ قصہ یوں ہے کہ حضرت سلیمان ایک دفعہ اپنے گھوڑوں کو دیکھنے میں اس قدر مصروف تھے کہ نماز قضا ہو گئی۔ اس پر آپ نے گھوڑوں کی پنڈلیاں اور گردنیں کاٹنے کا حکم دیا۔

ان بلند مرتبہ احوال میں سے ایک حال اللہ کا خوف بھی ہے اور اللہ کا یہ خوف اس طرح ہونا چاہیے کہ اس کا اثر بدن اور جوارح پر ظاہر ہو۔ حفاظ حدیث نے اصول میں یہ حدیث روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سات شخص ہیں جن کو خدا تعالیٰ اپنے سایہ رحمت میں جگہ دے گا۔ حدیث میں ہے کہ آپؐ نے ان اشخاص کا ذکر کرتے کرتے آخر میں فرمایا کہ ان میں سے ایک شخص وہ ہو گا جس نے اکیلے میں خدا کو یاد کیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت عثمانؓ ایک قبر پر کھڑے ہوئے اور اتنا روئے کہ ان کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ نیز احادیث میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو نماز پڑھتے تھے تو آپؐ کے سینہ مبارک سے جوشِ گریہ کی وجہ سے ایسی آواز آتی تھی کہ جیسے آگ کے اوپر دیگ چڑھی ہو۔

ان احوال میں سے ایک رویائے صالحہ بھی ہے۔ اس سلسلے میں حفاظ ایک حدیث روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ایک مردِ صالح کا سچے خواب دیکھنا نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے۔ نیز آپؐ نے فرمایا کہ میرے بعد نبوت تو ختم ہو جائے گی۔ البتہ ''مبشرات'' کا سلسلہ برابر قائم رہے گا۔ صحابہؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ!

''مبشرات'' کیا ہیں۔ فرمایا کہ رویائے صالحہ جو ایک نیکوکار آدمی خود دیکھتا ہے یا کوئی دوسرا اس کے لئے دیکھتا ہے۔ یہ رویائے صالحہ نبوت کے چھیالیسویں حصے میں سے ایک ہے۔ چنانچہ یہی تفسیر ہے قرآن مجید کی اس آیت لھم البشریٰ فی الحیوۃ الدنیا کی یعنی بشارت ہے مومنوں کے لئے اس دنیا کی زندگی میں۔

رویائے صالحہ سے مراد یہ ہے کہ آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یا بہشت و دوزخ کو یا نیکوکاروں اور انبیاء کو یا متبرک مقامات مثلاً خانہ کعبہ، مسجد نبوی یا بیت المقدس کو خواب میں دیکھے یا وہ مستقبل میں ہونے والے واقعات کو خواب میں دیکھے اور وہ بعد میں ویسے ہی رونما ہوں یا وہ گزرے ہوئے واقعات کو بجنسہ اسی شکل میں دیکھے جس شکل میں کہ وہ وقوع پذیر ہو چکے ہیں۔ یا وہ انوار کو خواب میں دیکھے یا پاکیزہ چیزوں کو جیسے دودھ کا پینا اور شہد اور گھی کا کھانا وغیرہ ہیں اور جن کا ذکر کتب احادیث کے ''باب رویا'' میں آ چکا ہے، خواب میں دیکھے یا فرشتوں کو دیکھے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص ایک رات قرآن پڑھتا تھا کہ ایک سائبان ظاہر ہوا جس میں چراغوں کی روشنیاں تھیں.....

ان احوال میں سے سچی فراست اور واقعہ کے مطابق مناسب بات کا سوجھ جانا بھی ہے۔ حدیث میں آیا ہے ''مومن کی فراست سے بچو۔ کیونکہ مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔'' ان احوال میں سے ہی دعا کا قبول ہونا اور طالب اپنی پوری ہمت اور توجہ سے جو کچھ اللہ سے مانگ رہا ہو، اس کا ظاہر ہونا بھی ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اس حدیث کا جس میں آپؐ فرماتے ہیں۔ بعض غبار آلود، پریشان حال اور پھٹے پرانے کپڑوں والے ہوتے ہیں کہ کوئی ان کی پروا نہیں کرتا لیکن وہ اللہ کے بھروسے پر قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ یقینی طور پر ان کی قسم پوری کر دیتا ہے۔ الغرض یہ اور اس سے ملتے جلتے جو اور احوال و واقعات ہیں، یہ سالک کے ایمان کی صحت، اس کی طاعات و عبادات کی قبولیت اور اس کے باطن میں نور کے سرایت کر جانے پر دلالت کرتے ہیں۔ اس لئے طالب کو چاہیے کہ وہ ایسے مواقع کو ہاتھ سے جانے نہ دے اور انہیں غنیمت سمجھے۔

اس ''نسبت'' کے حصول کے بعد اس سے ایک اور بلند تر مقام آتا ہے اور وہ مقام ''فنا و بقا'' یعنی اللہ کے وجود میں فنا ہو کر اس کے وجود کے ساتھ بقا حاصل کرنا ہے۔ میرے نزدیک یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ مقام ''فنا و بقا'' کی کیفیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے مشائخ تک سندِ متصل کے ذریعہ نہیں پہنچی بلکہ یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک دین ہے جس کو وہ چاہتا ہے، اپنے بندوں میں سے بغیر وراثت کے عطا کر دیتا ہے۔ اس بات کی شہادت خود خواجہ نقشبند کے اس قول سے بھی ملتی ہے، جب ان سے ان کے سلسلۂ مشائخ کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ کوئی شخص محض سلسلۂ مشائخ کے ذریعہ اللہ تک نہیں پہنچا بلکہ اس معاملے میں ہوا یوں کہ ایک کشش تھی جو مجھ پر اثر انداز ہوئی اور اس نے مجھے اللہ تک پہنچا دیا۔ ان کے اس بیان کی تصدیق اس قاعدہ کلیہ سے ہوتی ہے جو حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس قسم کی کشش مساوی ہوتی ہے کل جن و انسان کے تمام اعمال کے۔ اسی بنا پر خواجہ نقشبند نے اس امر واقعی کے باوجود کہ آپ کے مشائخ کا سلسلہ بہت مشہور و معروف تھا۔ یہ فرمایا کہ کوئی شخص محض سلسلہ مشائخ کے ذریعہ اللہ تک نہیں پہنچا۔ الغرض جس شخص کو اس بلند تر مقام کی خواہش ہو، اسے چاہیے کہ ہماری باقی کتابوں کی طرف رجوع کرے اور سچ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اپنے بندوں کو صحیح راہ دکھانے والا ہے۔ (القول الجمیل)

☆☆☆

بنی نوع انسان کی فطری استعدادیں

انسان کے اندر جو فطری استعدادیں ودیعت کی گئی ہیں، تصوف کے پیش نظر ان کو تربیت دے کر اور ان کا تزکیہ کر کے روحانی مقاماتِ بلند کا حاصل کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ نفس انسانی کی باطنی صلاحیتوں کا علم اور ان کو کس طرح ترقی دی جاسکتی ہے، تصوف کے لوازمات میں سے ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنی کتاب ''ہمعات'' میں نفسِ انسانی کی ان فطری استعدادوں پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح ان کو ترقی دے کر انسان ولایتِ صغریٰ اور ولایتِ کبریٰ کے مقامات تک پہنچ سکتا ہے۔

اس فقیر کو بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو مختلف استعدادوں پر پیدا کیا ہے اور ہر انسان اپنی فطری استعداد کے مطابق ہی کمال حاصل کر سکتا ہے اور کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ اس میں جتنی استعداد ہے، اس سے زیادہ وہ کچھ حاصل کرے۔ یہ خدائے علیم وعزیز کا اندازہ ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ اگر تم سنو کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل گیا تو اس کو مان لو لیکن اگر کسی شخص کے متعلق سنو کہ اس نے اپنی خصلت چھوڑ دی تو کبھی یقین نہ کرو کیونکہ ہر انسان اپنی فطرت اور جبلت ہی کی طرف ہمیشہ لوٹتا ہے۔ اس حدیث میں مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ دراصل انسانوں کی انہی استعدادوں کی طرف ہے۔

اب ایک شخص ہے جسے ایک خاص روش پر چلنے اور ایک مخصوص طریقے کو اخذ کرنے کی قدرت سے استعداد ملی ہے۔ اگر وہ اس کو چھوڑ کر کوئی دوسری راہ اختیار کرنی چاہے تو خواہ وہ کتنی بھی محنت کرے اور اس میں کس قدر بھی مشقت اٹھائے، وہ کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوگا۔

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی
ایں راہ تو میروی بترکستان است

اسی طرح ایک اور شخص ہے جو ایک چیز میں کمال حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن اس کی فطرت اور جبلت دوسری قسم کے کمال کا تقاضا کرتی ہے۔ اب وہ اس کے لئے خواہ کتنی بھی کوشش کرے، اس کی کوشش ہر حال میں رائیگاں جائے گی:

کسے در صحن کا جی قلیہ جوید
اضاع العمر فی طلب المحال

ان عالی مرتبہ علوم ومعارف میں سے جو اس بندۂ ضعیف کو عطا کیے گئے ہیں، ایک علم بنی آدم کی استعدادوں کی معرفت اور ان کی تعداد نیز ان میں سے ہر ایک کی علامت اور ان کے مبلغ کمال کے جاننے کا ہے۔ اس علم کا فائدہ یہ ہے کہ ایک سمجھدار سالک اپنی استعداد کی حدود معلوم کر کے انہی کے مطابق اپنی راہ تجویز کر سکتا اور اس راہ کو برابر اپنی نظر کے سامنے رکھ سکتا ہے یا اگر سالک خود یہ کام نہ کر سکتا ہو تو اس کے مرشد مشفق کو چاہیے کہ وہ اس علم کی مدد سے سالک کی جبلی استعداد کو دیکھے۔ پھر اس کے مطابق اس کو مناسب راہ پر لگائے۔ الغرض یہ ہم پر اور دوسرے لوگوں پر اللہ کا احسان ہے لیکن اکثر لوگ ہیں کہ اس کا شکر ادا نہیں کرتے۔

بنی آدم کی ان جبلی استعدادوں کے بیان سے پہلے اس ضمن میں چند تمہیدی امور کا جاننا بہت ضروری ہے کیونکہ ان استعدادوں کی معرفت کا انحصار ان تمہیدی امور ہی پر ہے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں دو قوتیں ودیعت کی ہیں۔ ایک قوتِ ملکیہ اور دوسری قوتِ بہیمیہ۔ ان کی تفصیل یہ ہے کہ انسان میں ایک تو نسمہ ہے۔ یہ نسمہ عبارت ہے' روح ہوائی سے اور روح ہوائی کا مطلب یہ ہے کہ یہ روح جسم میں طبعی عناصر کے عمل اور ردعمل سے پیدا ہوتی ہے۔ اس نسمہ یا روح ہوائی سے اوپر انسان میں ایک اور چیز بھی ہے جسے نفسِ ناطقہ کہتے ہیں اور جو نسمہ پر تصرف کرتا ہے۔ نفس ناطقہ اس حالت میں جبکہ وہ نسمہ پر تصرف کر رہا ہوتا ہے، دو رجحان رکھتا ہے۔ ایک رجحان انسان کو بھوک، پیاس، شہوت، غضب، حسد، غصے اور خوشی کے جبلی تقاضوں کی طرف اس طرح مائل کر دیتا ہے کہ انسان انسان نہیں بلکہ حیوان ہو جاتا ہے۔ نفسِ ناطقہ کا دوسرا رجحان انسان کو فرشتوں کی صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔ اس حالت میں وہ حیوانی تقاضوں سے رہائی حاصل کر لیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس مادی عالم سے اوپر جو عالمِ تجرد ہے' وہاں سے اس پر اُنس و سرور کا نزول ہوتا ہے اور ملاء اعلیٰ کے وہ افراد جو اہل دنیا کو فیوض و برکات پہنچانے کا ذریعہ ہیں' یہ شخص ان کی طرف گوش برآواز ہو جاتا ہے۔ اس مقام سے اس پر الہامات کا فیضان ہوتا ہے۔ اب اگر یہ الہامات حقائق قدرت کے انکشافات کے متعلق ہوں تو ان سے دنیا میں علوم طبیعیہ کی بنا پڑتی ہے اور اگر یہ الہام کسی نئے نظام کو شروع کرنے اور اس کو رواج دینے کے متعلق ہوں تو وہ شخص جسے یہ الہامات ہوتے ہیں' وہ ان کاموں کو اس طرح کرتا ہے۔ گویا کہ وہ ان کے لئے اوپر سے مامور ہے اور خود اس کو ان کاموں کی کوئی خواہش نہیں۔

الغرض انسان کا نفسِ ناطقہ جب اس کے نسمہ پر تصرف کرتا ہے تو اس سے انسان کے اندر جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا' دو رجحانات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک رجحان کا رخ اوپر کو ہوتا ہے جو علوی رجحان کہلاتا ہے۔ جب انسان پر سفلی رجحانات کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ سرتاپا حیوانیت اور بہیمیت کا پیکر بن جاتا ہے اور اس میں علویت اور ملکیت کا اثر تک باقی نہیں رہتا۔ جب علوی رجحان اس پر غلبہ پائے تو وہ بالکل فرشتہ بن جاتا ہے اور اس میں بہیمیت سرے سے غائب ہو جاتی ہے۔ انسان کی یہی طبعی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے اسے چند باتوں کے کرنے اور چند باتوں کے نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اسے اس معاملے میں چارپایوں اور فرشتوں کی طرح آزاد نہیں چھوڑا گیا۔ بات یہ ہے کہ چارپایوں میں اگر بہیمیت ہے تو سرتاسر بہیمیت ہی بہیمیت ہے اور وہ طبعی طور پر اسی خالص بہیمیت کے تقاضے پورا کرنے پر مجبور ہیں۔ اسی طرح فرشتے ملکیت ہی ملکیت ہیں اور ان میں بہیمیت کا شائبہ تک نہیں لیکن ان دونوں کے برعکس انسان کا معاملہ ہے۔ وہ بیک وقت فرشتہ بھی ہے اور حیوان بھی۔ اس میں ملکیت کے رجحانات بھی ہیں اور حیوانیت کے تقاضے بھی۔ اس لئے ملکیت کو ابھارنے کے لئے اسے نیک کاموں کا حکم دیا گیا اور اس کے حیوانی تقاضوں کو دبانے کی خاطر برے کاموں سے بچنے کی فہمائش کی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی اس آیت میں **حملها الانسان انه کان ظلوما جهولا**[1] ٥ فطرت انسانی کے اسی راز کو بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ ''ظلوم'' کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی فطرت میں عدل کی صلاحیت تو موجود ہے مگر وہ عدل نہیں کرتا اور جہول سے مراد یہ ہے کہ وہ علم تو حاصل کر سکتا ہے لیکن بالفعل علم سے عاری ہے۔

خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ ملکیت اور بہیمیت' یہ دونوں کی دونوں قوتیں تمام بنی نوع انسان میں پائی جاتی ہیں لیکن

کسی انسان میں بہیمیت کی قوت زیادہ ہوتی ہے اور ملکیت نسبتاً کم اور کسی میں بہیمیت کم پائی جاتی ہے اور ملکیت نسبتاً زیادہ۔ پھر قوتِ ملکیت کے بے شمار مدارج ہیں۔ اسی طرح بہیمیت کے بھی لاتعداد درجات ہیں۔ اب بہیمیت اور ملکیت کا کہیں زیادہ اور کہیں کم پایا جانا اور پھر کسی میں ان کا ایک درجے میں اور کسی میں دوسرے درجے میں موجود ہونا' یہ وہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے ایک انسان میں ایک استعداد ہوتی ہے اور دوسرے میں بالکل دوسری۔ چنانچہ اسی طرح بنی نوع انسان میں الگ الگ استعدادیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ تو استعدادوں کا ایک اجمالی بیان ہوا۔ اب ان کی تفصیل سنیے:

ملائکہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ملاء اعلیٰ کے ملائکہ اور دوسرے ملاء اسفل کے ملائکہ۔ ملاء اعلیٰ کے ملائکہ اسمائے الٰہی کے علوم میں رنگے ہوتے ہیں۔ وجود مطلق سے یہ کائنات جس طرح ظہور پذیر ہوتی ہے۔ یہ ملائکہ اس ظہورِ وجود کے اصول ومبادی سے واقف ہوتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی قدرت' خلق' تدبیر اور تدلّی کے ذریعے اس دنیا میں جس طرح برسرکار ہے، ملاء اعلیٰ کے یہ ملائکہ اس نظامِ الٰہی کے اصول وکلیات اور اس کی حکمت کا علم رکھتے ہیں اور اس سے انہیں بڑی وابستگی اور محبت بھی ہوتی ہے۔ باقی رہے ملاء سافل کے ملائکہ۔ ان کا کام یہ ہے کہ جو کچھ اوپر سے ان پر احکام وارد ہوں' وہ انہیں بجالائیں اور الہام اور احالہ کے ذریعے دنیا کے معاملات میں تصرف کریں۔ ملاء سافل کے فرشتوں کو ان احکام کی جو اصل مصلحت ہوتی ہے، اس کا علم نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ یہ فرشتے ہر اس حادثے کی صورت کو جو دنیا میں ہونے والا ہوتا ہے اور جس کے متعلق حظیرۃ القدس میں فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے، اخذ کر لیتے ہیں۔ ملاء اسفل کا حظیرۃ القدس سے ہونے والے واقعات کی صورت کا اخذ کرنا اس طور پر ہے جیسے کہ آئینے میں ایک چیز کا عکس پڑ رہا ہے اور وہاں سے یہ عکس دوسرے آئینے میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ ان میں سے ہر فرشتہ صرف اسی واقعہ کا ادراک کر سکتا ہے جس کی اس کی فطرت میں مناسبت ہوتی ہے۔

جس طرح ملائکہ کی دو قسمیں ہیں' اسی طرح بہائم کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی قوتِ بہیمیت زبردست ہوتی ہے۔ دوسرے وہ جن کی بہیمیت ضعیف ہے۔ مثال کے طور پر ایک نر کو لیجیے۔ وہ صحیح مزاج لے کر پیدا ہوا۔ پھر مناسب غذا اسے ملتی رہی۔ اسے پینے کو خوب دودھ ملا اور کھانے کو بافراط چارا اور بعد میں اسے کوئی ایسا عارضہ بھی لاحق نہ ہوا جس سے اس کے قویٰ میں خلل آتا۔ یہ نر جب اپنی جوانی کو پہنچے گا تو ظاہر ہے وہ عظیم الجثہ بلند آواز اور زور آور ہو گا۔ اپنے عزم و ارادہ میں بڑا باہمت اور غصے اور ارادے میں بڑا سخت ہو گا اور اسے کبھی یہ گوارا نہ ہو گا کہ کوئی دوسرا نر اس سے بہتر' اس سے زیادہ بہادر اور اس سے بڑھ کر دل والا اور اس پر غالب وقاہر ہو۔ چنانچہ اس کی نظروں میں اپنے سوا اور کوئی دوسرا نر نہیں جچے گا۔ نیز اس میں یہ ہمت ہو گی کہ وہ سخت سے سخت محنت کر سکے لیکن اگر ہم اس نر کو خصی کر دیں یا یہ نر پیدائشی طور پر کمزور اور ناتواں ہو۔ اسے بعد میں مناسب تربیت بھی نہ ملے اور وہ انہی حالات میں جوان ہو تو لامحالہ یہ نر اپنی شکل وشباہت میں جسمانی بناوٹ میں نیز اپنی عادات اور اخلاق میں پہلے نر سے بالکل مختلف ہو گا۔

ان دو نروں کی مثالوں سے صاف ظاہر ہے کہ قوتِ بہیمیہ جب اپنے عروج کو پہنچتی ہے تو اس کے دو مظہر ہوتے ہیں۔ اس کا ایک مظہر تو شدتِ عزم اور ہمت کی تندی ہے۔ دوسرا مظہر خلق یعنی شکل وبناوٹ اور خُلق یعنی عادات واخلاق میں اس کا کامل اور مکمل ہونا ہے۔ بہیمیت کے پہلے مظہر کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بہیمیت روح کے چہرے کے لئے اس طرح کا

حجاب بن جاتی ہے کہ روح اس کے اندر چھپ جاتی ہے۔ گو وہ بہیمیت میں یکسر فنا نہیں ہوتی لیکن جب بہیمیت کا غلبہ کم ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے شدتِ عزم اور ہمت کی تندی میں تبدیلی آ جاتی ہے تو پھر روح کو بھی بقا نصیب ہوتی ہے۔ بہیمیت کے دوسرے مظہر کا اثر یہ ہے کہ اس میں بہیمیت اخلاق و عادات کی تکمیل میں صرف ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے نفس بغیر کسی شدت اور تندی کے مبلغ کمال کو پہنچ جاتا ہے۔

الغرض بہیمیت کی پہلے تو دو قسمیں ہوئیں۔ ایک بہیمیت شدید اور دوسری بہیمیت ضعیف۔ پھر بہیمیت جب کمال پر ہوتی ہے تو اس سے دو اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ ایک عزم و ارادہ میں پختگی اور ہمت میں تندی اور دوسرے جسمانی بناوٹ اور اخلاق و عادات کی تکمیل۔

ملکیت اور بہیمیت کی ان تفصیلات کے بعد اب ہم اصل مقصد کی طرف آتے ہیں۔ اس سے پہلے ہم بیان کر آئے ہیں کہ ہر انسان میں ملکیت اور بہیمیت کی دو قوتیں رکھی گئی ہیں۔ یہ دو قوتیں جب ایک شخص میں جمع ہوتی ہیں تو لامحالہ اس سے دو صورتیں پیدا ہوں گی۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ ملکیت اور بہیمیت میں آپس میں ٹھنی رہے اور دونوں میں برابر رسہ کشی ہوتی رہے۔ اس کو ''تجاذب'' کہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ملکیت اور بہیمیت میں آپس میں ہم آہنگی اور ایک کا دوسری سے کوئی نزاع نہ ہو۔ اس حالت کو ''اصطلاح'' کا نام دیا گیا ہے۔ تجاذب کے معنی یہ ہیں کہ بہیمی قوت اپنے مخصوص مطالبوں کا تقاضا کرے اور ملکیت اپنے فطری رجحانات کی طرف مائل ہو اور ایک کا دوسرے سے بالکل کوئی امتزاج نہ ہو اور ان میں سے ہر وقت اپنی اپنی راہ پر چلنے کی کوشش کرے۔ تجاذب کی حالت میں اگر قوتِ بہیمیت کا غلبہ ہوتا ہے تو انسان دنیاوی لذات میں منہمک ہونا چاہتا ہے۔ اس صورت میں وہ ملکیت کی طرف مطلق کوئی التفات نہیں کرتا۔ اس کے برعکس اگر تجاذب کی حالت میں ملکیت غالب ہو تو انسان بہیمیت کے تمام اعمال و رجحانات سے یکسر کنارہ کش ہو کر ملاءِ اعلیٰ کے ساتھ منسلک ہو جاتا ہے اور عالمِ جبروت کے رنگ میں رنگا جانا چاہتا ہے۔ اس صورت میں وہ ان احکام کی طرف جو بہیمیت اور ملکیت کے درمیان برزخ کا حکم رکھتے ہیں، بالکل توجہ نہیں کرتا۔

''اصطلاح'' سے مراد یہ ہے کہ قوتِ ملکیہ اپنے طبعی تقاضوں اور اس کا جو کمال کا درجہ ہے، اس سے قدرے نیچے اترے۔ قوتِ بہیمیہ اپنی سفلی اور نامناسب خواہشات کو دبا کر ملکیت کی طرف ترقی کرے اور یہ دونوں ایک ایسے مقام پر باہم ملیں کہ اس مقام سے بہیمیت کو بھی مناسبت ہو اور اس کا ملکیت سے بھی لگاؤ ہو۔ اس ضمن میں بدنی عبادتیں، دعا و مناجات، سخاوت، عفتِ نفس، نفع عام کے کام کرنا، ساتھیوں سے اچھی طرح ملنا جلنا، ہر ایک کا حق ادا کرنا، فکر کی صحت و سلامتی، سچے خواب دیکھنا، فراست سے ٹھیک ٹھیک بات معلوم کر لینا اور ہاتف سے سچی باتیں سننا اور اس طرح کے دوسرے اعمال و احوال مفید ہوتے ہیں۔

ہر ہر فرد میں ملکیت اور بہیمیت کی اس طرح کی الگ الگ نوعیت کا خیال کرتے ہوئے انسانوں کو بے شمار اصناف و اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے لیکن ہم انسانوں کی ان تمام اصناف و اقسام کو آٹھ بنیادی صنفوں کے تحت جمع کر سکتے ہیں۔ ان میں سے چار صنفیں اہل اصطلاح کی ہوں گی اور چار اہل تجاذب کی۔

اہل اصطلاح کی چار صنفیں حسب ذیل ہوں گی:

1- ملکی قوت شدید اور بہیمی قوت شدید اور دونوں میں ہم آہنگی اور توازن۔
2- ملکی قوت شدید اور بہیمی قوت ضعیف اور دونوں میں ہم آہنگی اور توازن۔
3- ملکی قوت ضعیف اور بہیمی قوت شدید اور دونوں میں ہم آہنگی اور توازن۔
4- ملکی قوت ضعیف اور بہیمی قوت ضعیف اور دونوں میں ہم آہنگی اور توازن۔

اسی طرح اہلِ تجاذب کی بھی حسب ذیل چار صنفیں ہوں گی:

1- ملکی قوت شدید اور بہیمی قوت شدید اور دونوں میں نزاع اور تصادم۔
2- ملکی قوت شدید اور بہیمی قوت ضعیف اور دونوں میں نزاع اور تصادم۔
3- ملکی قوت ضعیف اور بہیمی قوت شدید اور دونوں میں نزاع اور تصادم۔
4- ملکی قوت ضعیف اور بہیمی قوت ضعیف اور دونوں میں نزاع اور تصادم۔

ان تمہیدی امور کو جان لینے کے بعد اب انسانوں کی آٹھ صنفوں پر غور کرو۔ تم دیکھو گے کہ ان میں سے ہر ہر صنف کے اپنے اپنے احکام ہیں۔ جس شخص میں قوتِ بہیمی بہت شدید ہو' اسے سخت ریاضتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے کمال حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ فاقے کرے۔ راتوں کو جاگے اور عاجزی و مسکنت اختیار کرے۔ شدید بہیمیت والے سے جو بھی آثار و اعمال ظاہر ہوتے ہیں' وہ اپنے اندر بڑی قوت و شوکت رکھتے ہیں۔ اس شخص کی توجہ میں بھی بڑی تاثیر ہوتی ہے اور اس پر اس زور کا وجد طاری ہوتا ہے کہ سرمستی و بے خودی میں اس کے ہوش و حواس گم ہو جاتے ہیں ہیں۔ چنانچہ کئی کئی دن تک اسے دنیا کی کوئی خبر نہیں رہتی۔

جس شخص کی قوتِ بہیمی ضعیف ہو' اسے سخت ریاضتوں کی مطلق ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے سخت ریاضتیں الٹا باعث تشویش خاطر بنتی ہیں۔ اس شخص کو کثرت سے اور بہت عرصے تک ذکر کرنا چاہیے اور اس پر کمال کا دروازہ اسی طرح ہی کھل سکتا ہے۔ ضعیف بہیمیت والے سے جو کرامات ظاہر ہوتی ہیں' وہ اتنی کم اہمیت رکھتی ہیں کہ ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہوتا ہے۔ نیز اس شخص کو وجد اگر آتا ہے تو بہت معمولی اور اس میں اگر کوئی معمولی سی چیز بھی مخل ہو جائے تو وجد کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ گویا کہ وجد ایک درد کی طرح تھا کہ اٹھا اور فوراً غائب ہو گیا یا وہ حیا کے رنگ کی طرح تھا کہ آیا اور پھر ختم ہو گیا۔

جس شخص کی ملکی قوت شدید ہو' وہ بڑے بڑے کمالات مثلاً نبوت' فردیت' فنا و بقاء اور اس طرح کے دوسرے بلند مرتبہ احوال و مقالات کا اہل ہوتا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ "لسانِ قدم" یعنی زبانِ الٰہی کا ترجمان بنتا ہے اور مادی عالم سے ماورا جو عالمِ تجرد ہے' اس کے حالات کی وہ خبر دیتا ہے۔ جس شخص میں ملکی قوت ضعیف ہو' اس کی تمام تر کوشش کا ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے دلوں کی باتیں معلوم کر سکتا ہے اور وہ اپنے سامنے ملکی انوار کو درخشاں دیکھتا ہے۔

الغرض یہ آثار و علامات ہیں۔ (1) شدید قوتِ بہیمی کے (2) ضعیف قوتِ بہیمی کے (3) شدید قوتِ مَلکیہ کے (4) ضعیف قوتِ ملکیہ کے۔ ہم نے ان میں سے ہر ایک قوت کی الگ الگ تاثیر بیان کر دی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اہلِ اصطلاح اور اہلِ تجاذب کے نفوس میں یہ قوتیں کس طرح اثر انداز ہوتی ہیں۔ آئندہ سطور میں ہم اس پر گفتگو کریں گے۔

جو شخص کہ اہلِ اصطلاح میں سے ہوگا' اس کی طبیعت کا عام انداز یہ ہے کہ وہ اعضاو جوارح کے اعمال اور دل و دماغ کے احوال میں بے حد مؤدب ہوتا ہے۔ وہ اپنے اندر حق شناسی کا جوہر رکھتا ہے۔ نیز وہ دین اور دنیا دونوں کے مصالح کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور عام طور پر ایسے لوگوں میں قلق واضطراب کی کیفیت نہیں ہوتی۔

جو شخص کہ اہل تجاذب میں سے ہو' اسے دنیا کے کاموں سے بالکل کنارہ کش ہونے کا عشق ہوتا ہے۔ اس کی بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ مادی دنیا سے تجرد اختیار کرے۔ اس شخص کی طبیعت کا قدرتی میلان اس عالم چار سُو سے الگ ہونے اور اس سے نجات پانے کی طرف ہوتا ہے۔ چنانچہ اس شخص کی مثال اس پرندے کی سی سمجھیے جسے قفس میں بند کردیا ہو۔ اہل تجاذب میں جس کی قوتِ بہیمی ضعیف ہو' وہ اگر کسی چیز کی طرف میلان رکھتا ہے تو اس کے میلان میں بھی بے قراری اور زور نہیں ہوتا اور جس کی قوتِ بہیمی شدید ہوتی ہے' اس کی طبیعت میں بے چینی اور اضطراب زیادہ ہوتا ہے۔

اہل تجاذب میں سے اگر کسی شخص میں بہیمی قوت بہت زیادہ شدید ہو تو وہ بڑے بڑے کاموں پر نظر رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر اس میں ملکی قوت بھی شدید ہو تو وہ انبیاء کرام کی طرح ان جلیل القدر مقامات اور مناصب کو حاصل کرتا ہے جو عمومی اصول و کلیات کا نتیجہ ہوتے ہیں لیکن اگر اس شخص میں صرف قوتِ بہیمی ہی بہت زیادہ شدید صورت میں موجود ہوگی اور اس کے ساتھ شدید قوتِ مللکی نہ ہوگی تو یہ شخص میدانِ جنگ میں' غیرت و حمیت کے معاملات میں اور اسی طرح کے دوسرے کاموں میں غیر معمولی جرأت و بہادری دکھائے گا۔

اہل تجاذب میں سے جس شخص میں قوتِ بہیمی ضعیف ہو' اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں سب لوگوں سے زیادہ بڑے کاموں سے بے رغبتی برتتا ہے لیکن اگر ضعیف بہیمیت کے ساتھ ساتھ اس میں قوتِ ملکی شدید ہے تو اس طبیعت کا شخص خدا تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے دنیا کو ترک کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن اگر بہیمیت کے ساتھ ساتھ اس کی ملکیت میں بھی ضعیف ہو اور یہ شخص اپنی استعداد کے مطابق کمال حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو جائے تو یہ اتنا کرسکتا ہے کہ دنیا کو آخرت کے لئے ترک کردے لیکن اگر حالات سازگار نہ ہوئے اور وہ اپنی استعداد کو حصولِ کمال میں نہ لگا سکا تو اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ سستی' عجز اور ناتوانی کی وجہ سے سب چیزوں سے دستبردار ہو جاتا ہے۔

دنیا میں احکامِ شرع کے سب سے زیادہ فرمانبردار اہل اصطلاح ہوتے ہیں۔ ان میں سے جن لوگوں میں ملکی قوت شدید ہوتی ہے' وہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود اور اس کے دستوروں کے محقق اور ان کی حکمتوں کو جاننے والے ہوتے ہیں لیکن اہلِ اصطلاح میں سے جن میں ملکی قوت ضعیف ہو' وہ محض ان حدود کے مقلد ہوتے ہیں۔ ان کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ ظاہری اعمال کو بجالائیں اور اس ضمن میں بالواسطہ وہ شرعی احکام کی روح سے بھی لذت یاب ہو جاتے ہیں۔

اہلِ تجاذب اگر بہیمیت کے بندھنوں کو توڑنے میں کامیاب ہو جائیں اور اس کے ساتھ ان کی ملکی قوت بھی شدید ہو تو ان کی ہمت اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات اور فنا و بقاء کے مقامات کی معرفت کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے لیکن اگر ان میں ملکی قوت ضعیف ہو تو وہ شریعت میں سے سوائے ریاضتوں اور اوراد و وظائف کے جن سے کہ مقصود محض طبیعت کے بہیمی زور کو توڑنا ہوتا ہے اور کچھ نہیں جانتے۔ اس قسم کی طبیعت والوں کے لئے انتہا درجے کی مسرت یہ ہوتی ہے کہ وہ ملکی انوار کو اپنے سامنے درخشاں دیکھتے ہیں۔ وہ دوسروں کے دلوں کی باتوں کو معلوم کرلیتے ہیں اور وقائع الٰہی کا بھی ان کو علم ہو جاتا

ہے۔ نیز اجابتِ دعا' تاثیرِ توجہ اور اس طرح کے دوسرے کمالات بھی ان کو حاصل ہوتے ہیں۔

مجذوبیت' ظاہری پیر کی تربیت کے بغیر معرفت کا حصول اور اگر پیر موجود بھی ہو تو اس کا زیادہ ممنونِ احسان نہ ہونا۔ یہ سب باتیں اس شخص کی خصوصیات میں سے ہیں جو اہل تجاذب میں سے ہوتا ہے۔ اگر اس میں ملکی قوت شدید ہو اور اس کے ساتھ قوت بہیمی بھی شدید ہو تو بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اس طبیعت والے شخص کو کوئی عجیب سا واقعہ پیش آتا ہے جس کی وجہ سے اس کا دل دنیا سے یکسر سرد ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت اس پر غالب آ جاتی ہے۔ یہ واقعہ خواہ کوئی خطرناک سانحہ ہو یا اس نے کسی واعظ کا وعظ سنا ہو یا اس کی طرف کسی بزرگ نے توجہ فرمائی ہو۔ بہر حال ان میں سے کوئی بھی چیز ہو' اس شخص پر اس واقعہ کا اتنا اثر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے اس کا دل کلیتہً اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ عامتہ الناس اس شخص کی اس تغیر حالت کو خرقِ عادت سمجھنے لگتے ہیں لیکن اہلِ تجاذب میں سے جس شخص میں ملکی قوت تو شدید ہو لیکن قوتِ بہیمی ضعیف ہو تو اس شخص کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ محسوس کرتا ہے گویا کہ وہ مادر زاد ولی ہے اور یہ وصف خود اس کی اصل فطرت میں ودیعت کیا ہوا ہے لیکن جوں جوں وہ جوان ہوتا ہے اور اس میں طاقت آتی ہے تو اس شخص سے اور کمالات بھی ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

منازلِ کمال طے کرنے میں میں اہلِ اصطلاح کا یہ حال ہے کہ وہ اس راہ میں بہت آہستہ آہستہ چیونٹی کی چال چلتے ہیں اور یکبارگی ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی لیکن اہل اصطلاح میں سے جس شخص میں قوتِ بہیمی شدید ہو' اس کا معاملہ دوسرا ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو اہلِ تجاذب میں سے ہیں اور ملکی قوت ان کی ضعیف ہے۔ اگر ان کی قوتِ بہیمی شدید ہے تو جب وہ ریاضتیں کرتے ہیں' یا کوئی قوی التوجہ بزرگ ان پر اپنی تاثیر ڈالتا ہے تو ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ خواب میں اور حالتِ بیداری میں انوار کو اپنے سامنے درخشاں پاتے ہیں۔ سچی خوابیں دیکھتے ہیں۔ ہاتف کی آوازیں سنتے ہیں اور ان پر الہامات ہوتے ہیں اور یہ سب کچھ انہیں اس طرح پیش آتا ہے کہ ان پر ان واقعات کا بہت زیادہ اثر ہوتا ہے اور وہ اس سلسلے میں غیر معمولی استقامت و صدق کا ثبوت دیتے ہیں۔ اگر عام لوگوں کو اس قسم کے افراد کی خبر ہو جائے تو وہ حد درجہ ان کے معتقد ہو جاتے ہیں۔

اہلِ تجاذب میں سے جن میں مَلکی قوت ضعیف ہے اور ان کی بہیمی قوت بھی ضعیف ہے۔ ان پر زیادہ تر معنوی تجلیات اور نکات و حقائق سمجھنے کی کیفیت غالب رہتی ہے۔ اس ضمن میں ان پر جو کچھ وارد ہوتا ہے' اس کا اثر ان کے دل پر کچھ زیادہ قوی نہیں ہوتا بلکہ ان کے ان واردات کی حیثیت ایسی ہوتی ہے گویا ان کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ کبھی کبھی تو ان کو اپنے ان واردات پر شکوک و شبہات ہونے لگتے ہیں۔ اہل تجاذب میں سے اس گروہ کی کیفیت یہ ہے کہ اگر عامتہ الناس ان کی کرامات سے واقف بھی ہو جائیں تو وہ کچھ زیادہ ان کے عقیدت مند نہیں ہوتے۔

اہلِ اصطلاح میں وہ لوگ جن کی ملکی قوت شدید ہے' وہ انبیائے کرام کے علوم حاصل کرنے کی استعداد رکھتے ہیں۔ مثلاً وہ ملاءِ اعلیٰ کے فرشتوں کو دیکھتے ہیں۔ عبادات کے اسرار' اقوام و ملل کی سیاست کے رموز گھربار اور شہروں کے نظم و نسق کے اصولوں اور اخلاق و آداب کے اساسی مقاصد سے وہ واقف ہوتے ہیں اور اس زندگی کے بعد دوسری زندگی میں جو کچھ پیش آئے گا' انہیں اس کا بھی علم ہوتا ہے لیکن اگر ان کی ملکی قوت شدید نہ ہو تو خواہ وہ کتنی ریاضتیں کریں' ان کو کرامات

اور خوارق میں سے کوئی چیز بھی حاصل نہیں ہوتی۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ عبادات کے ضمن میں انہیں دعا و مناجات کی لذت ضرور محسوس ہوتی ہے۔ اہل اصطلاح میں سے اس طبیعت کے لوگ شریعت کے احکام کے پابند ہوتے ہیں۔ ان احکام کو بجالانے سے انہیں اطمینان ملتا ہے اور وہ اسی پر خوش رہتے ہیں۔

قصہ مختصر یہ ہے کہ دنیا میں بہترین لوگ وہ ہیں جن میں ملکی قوت شدید ہوتی ہے۔ اب اگر یہ شدید ملکی قوت والے اہل اصطلاح میں سے ہوں تو یہ قوموں کی قیادت اور امامت کے مستحق ہوتے ہیں۔ اگر یہ اہل تجاذب میں سے ہوں گے تو علم الٰہیات کی شرح و ترجمانی میں ان کی زبان بڑی فصیح ہوگی۔ وہ لوگ جن کی بہیمی قوت شدید ہوتی ہے، وہ لوگوں کے سردار و مقتدا بنتے ہیں اور لوگ بھی ان کے معتقد ہوتے ہیں لیکن جن لوگوں کی قوت بہیمی ضعیف ہوتی ہے، انہیں دنیا میں کوئی نہیں جانتا اور نہ خلق میں زیادہ مشہور ہوتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ شدید ملکی قوت والے تو لوگوں میں خال خال پیدا ہوتے ہیں۔ البتہ جن میں ملکی قوت ضعیف ہوتی ہے، وہ دنیا میں بڑی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اس طرح شدید بہیمیت والے خال خال ہی نظر آتے ہیں اور جن کی بہیمیت ضعیف ہوتی ہے، ان کی بڑی کثرت ہوتی ہے۔

اہل تجاذب میں سے جن کی ملکی قوت شدید ہو اور ان کی قوتِ بہیمیہ بھی شدید ہو، ان کو لوہے کے آئینے کی طرح سمجھیے کہ باوجود سخت ہونے کے اس میں جلا ہوتی ہے اور صیقل کرنے سے اس میں صورت منعکس ہو جاتی ہے لیکن اہل تجاذب میں سے جن کی ملکی قوت تو شدید ہو اور قوتِ بہیمیہ ضعیف ہو تو ان کی مثال روئی کے گالے کی ہوتی ہے کہ اسے پانی میں بھگویا گیا ہو اور اس میں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے ہوں۔

باقی رہے اہلِ تجاذب میں سے وہ لوگ جن کی ملکی قوت ضعیف ہے اور ان کی بہیمی قوت شدید ہے تو ان کی مثال اس آئینے کی سی ہے کہ اس کے اصلی جوہر کے اندر زنگ ہے۔ اب اگر آپ اسے صیقل کرتے ہیں تو وہ تھوڑا تھوڑا چمکتا ہے لیکن کسی طرح بھی اس قابل نہیں ہوتا کہ اس میں صورت منعکس ہو سکے لیکن اگر ان میں ضعیف ملکی قوت کے ساتھ ساتھ بہیمی قوت بھی ضعیف ہے تو ان کی مثال اس بچے کی ہوتی ہے کہ خواہ آپ اسے کتنی بھی تعلیم دیں، وہ کچھ یاد نہیں رکھتا اور نہ کسی چیز کا احاطہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس بچے کو ایک مدت چاہیے کہ جو چیزیں اسے پڑھائی جا رہی ہیں، وہ ان کی صورتوں کو اپنے متخیلہ میں جاگزیں کر سکے۔

جو شخص اہلِ اصطلاح میں سے ہے، اس کے لئے عالمِ تجرد بمنزلہ ایک خوابِ فراموش کے ہوتا ہے۔ اگر وہ شخص ملکی قوت شدید رکھتا ہے تو عالم تجرد کے حقائق مناسب صورتوں میں اس کے لئے متشکل ہوتے ہیں۔ اس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ عالمِ تجرد سے الفاظ کے ذریعے مکالمات کر سکتا ہے۔ اہل اصطلاح میں سے جس کی قوت ضعیف ہوتی ہے، اس کو عالم تجرد کی کوئی چیز بھی متشکل نظر نہیں آتی۔

یہ ہے ایک مختصر سا بیان بنی نوعِ انسان کی بعض استعدادوں کا۔ ان استعدادوں کو جاننے کے بعد یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اہل اللہ کے احوال و مقامات میں اکثر جو اختلافات دیکھنے میں آتے ہیں، دراصل ان کی وجہ ان کی استعدادوں کا یہ اختلاف ہوتا ہے۔ چنانچہ اہل اللہ میں سے بعض بزرگ صاحبِ ارشاد ہوتے ہیں۔ وہ عامۃ الناس کو اپنی

طرف مائل کر لیتے ہیں اور بحث و مناقشہ کے دوران میں یا بطور دعویٰ کے کرامات و خوارق دکھاتے ہیں۔ ان اہل اللہ کی جماعت میں سے بعض ایسے بزرگ بھی ہوتے ہیں جو بالکل گمنام رہتے ہیں۔ نہ کوئی ان کو جانتا ہے اور نہ کوئی انہیں پہچانتا ہے۔ بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے وجد و حال کی کیفیت ان کے علم سے قوی تر ہوتی ہے۔ ان میں سے کسی کا وجد تو بڑے زور کا ہوتا ہے اور بعض کو معمولی سا وجد آتا ہے۔ الغرض اسی پر دوسروں کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

حاشیہ

(1) انسان نے وہ ذمہ داری اٹھالی جو زمین اور آسمانوں نے اٹھانے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ انسان ظلوم اور جہول ہے۔

☆☆☆

ولایتِ صغریٰ اور ولایتِ کبریٰ

فقیر کو بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں چند لطیفے ودیعت فرمائے ہیں اور ان میں سے ہر ہر لطیفہ کی اپنی الگ الگ خاصیت ہے۔ سالک راہ طریقت طے کرتے وقت ایک لطیفہ سے ترقی کر کے دوسرے لطیفہ میں پہنچتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی سلوک کی منزل پوری ہو جاتی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کا نفس ناطقہ جب اس کے نسمہ یعنی روح ہوائی سے پیوست ہوا اور اس نسمے اور اس کی قوتوں کا اثر تمام بدن میں پھیلا تو لامحالہ اس سے چند صورتیں پیدا ہوں گی۔ ان صورتوں میں سے ہر ہر صورت میں نسمہ کا اثر الگ الگ ہوتا ہے۔

نسمہ کے اصلی شعبے تین ہیں۔ ان میں سے ایک قلب ہے۔ قلب نفس کی کیفیت و احوال مثلاً غصے، جرأت، حیا، محبت، خوف، انقباض، انبساط، رضا اور نفرت وغیرہ کا مرکز ہے اور اس کا صدر مقام سینے کے بائیں طرف پستان سے دو انگل نیچے ہے۔ نسمے کے دوسرے شعبے کا نام عقل ہے۔ عقل علوم کی حامل ہوتی ہے۔ اس کی حد وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں حواس کی حد ختم ہوتی ہے۔ عقل کا کام یہ ہے کہ وہ ان چیزوں کا جن تک نہ انسان کی قوتِ احساس کی دسترس ہوتی ہے نہ اس کے وہم کی، تصور کر لیتی ہے اور ان میں سے جس کی اسے تصدیق کرنا ہوتی ہے اس کی تصدیق کرتی ہے۔ انسان کی عقل کا مرکز اس کا دماغ ہوتا ہے۔ نسمے کا تیسرا شعبہ طبیعت ہے۔ وہ چیزیں جن کے بغیر یا جن کی جنس کے بغیر انسان کی زندگی قائم نہیں رہ سکتی جیسے کھانا پینا' نیند اور شہوانیت وغیرہ۔ طبیعت انسان کے ان جبلی تقاضوں کی حامل ہے اور اس کا مرکز جگر ہوتا ہے۔

انسان پر اگر بہیمی قوت کا غلبہ ہو جائے تو اس کا قلب قلب بہیمی بن جاتا ہے اور قلب بہیمی سے مراد یہ ہے کہ انقباض و انبساط اور غصہ و رضا جیسی لطیف کیفیات قلب بہیمی والے کے لئے لطیف نہیں رہتیں بلکہ وہ ٹھوس مادی نفسانی

لذتوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ قلب بہیمی والا کبھی اس سے بھی نیچے اتر آتا ہے۔ اس حالت میں شیطانی وسوسے اس کو اپنا مرکب بنالیتے ہیں اور اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ خارجی اسباب اور بیرونی اثرات کے بغیر ہی اس کے دل سے طرح طرح کے شیطانی وسوسے پیدا ہوتے رہتے ہیں اور ان کی وجہ سے اس کی عقل اس حد تک ماؤف ہو جاتی ہے کہ وہ ہمیشہ نفس کی ادنیٰ خواہشات کی طرف مائل رہتی ہے۔ اب اس شخص میں اگر شہوت کا غلبہ ہوگا تو یقینی طور پر اس کے دماغ میں جماع کے خیالات کثرت سے آئیں گے۔ اگر اسے بھوک ہوگی تو اس کا خیال انواع واقسام کے کھانوں کا تصور کرے گا۔ اسی پر نفس کی دوسری خواہشات کا بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قلب بہیمی والا اس مقام سے بھی نیچے گر جاتا ہے۔ اس حالت میں وہ شیطانی وسوسوں کو کھلے بندوں تسلیم کرتا ہے۔ کبھی اسے اچھے نظام کو توڑنے کی فکر ہوتی ہے اور کبھی یہ اعتقاداتِ حقہ میں شکوک پیدا کرتا ہے۔ غرضیکہ وہ اس طرح کے مفاسد میں اتنا منہمک ہو جاتا ہے کہ اس کی طبیعت سرتاپا نفسِ امارہ بن جاتی ہے۔ پھر جو بھی اس کے جی میں آتا ہے، کرتا ہے اور جس راہ پر چاہتا ہے چل دیتا ہے۔ نہ اس کی عقل اس میں مانع ہوتی ہے اور نہ شرع کی کوئی قید اس کا راستہ روکتی ہے۔

اب ایک شخص ہے جس کی ملکی اور بہیمی قوتوں میں ہم آہنگی ہے اور یہ دونوں قوتیں آپس میں ایک ایسے مقام پر مل گئی ہیں جو ملکیت اور بہیمیت دونوں کے لئے بیچ کی منزل ہے۔ ان دونوں قوتوں کی ہم آہنگی کی وجہ سے اس شخص کے مزاج میں اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کا قلب، قلبِ انسانی کہلاتا ہے۔ اس شخص کی محبت اس کا خوف، اس کی رضامندی اور اس کی ناراضگی۔ یہ سب چیزیں حقانیت پر مبنی ہوتی ہیں۔ یہ شخص دوزخ سے ڈرتا ہے۔ بہشت کی اسے تمنا ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اس طرح کی دوسری باتوں کا قیاس کرلو۔

جس شخص میں قلب انسانی ہوتا ہے، اسے مجاہدہ کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ وہ مجاہدے کے ذریعے دل کو غفلت سے باز رکھ سکے۔ وہ شخص جس کا قلب، قلبِ بہیمی ہے، اس کا نفس، نفس امارہ ہوتا ہے لیکن قلب انسانی والے کا نفس، نفس لوامہ ہوتا ہے۔ اس شخص کے نفس کی مثال یوں سمجھیے جیسے ایک سرکش گھوڑا ہو اور اسے لگام کے ذریعے قابو میں رکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس شخص کی عقل، عقلِ انسانی کہلاتی ہے۔ چنانچہ یہ ہر اس چیز کی تصدیق کرتی ہے، جس کی تصدیق کرنی چاہیے اور تصدیق ہی کی کیفیت اس شخص کے جملہ احوال وکوائف پر غالب رہتی ہے۔

''قلبِ انسانی''، ''نفسِ لوامہ'' اور ''عقلِ انسانی'' کا مقام نیکوکاروں اور علمائے دین کا ہے اور احکامِ شریعت کا عمل دخل اس مقام کے لوازم میں سے ہے۔

جس شخص میں ملکوتی قوت کا زور ہو اور اس کے مقابلے میں اس کی بہیمی قوت اس طرح زیر ہو جائے گویا کہ اس کا کہیں وجود نہ تھا تو اس شخص کا قلب ''روح'' بن جاتا ہے۔ اس مقام میں اسے مجاہدوں اور ریاضتوں سے نجات مل جاتی ہے۔ اسے ''قبض'' کے بغیر ''بسط'' کی کیفیت میسر آتی ہے۔ قلق اور اضطراب کے بغیر وہ الفت ومحبت سے بہرہ یاب ہوتا ہے۔ بے ہوش ہوئے بغیر اسے وجد آتا ہے اور اس طرح اس شخص کی عقل ترقی کر کے ''سِر'' بن جاتی ہے۔

عقل جب ''سِر'' کی منزل میں پہنچتی ہے تو وہ غیب سے بلند مرتبہ علوم ومعارف حاصل کرتی ہے لیکن اس کا ان

علوم کے حصول کا طریقہ وہ نہیں ہوتا جو عام طور پر جاری وساری ہے یعنی یہ کہ فراست سے کوئی بات معلوم کرلی یا کشف سے کسی علم کو حاصل کرلیا یا ہاتف سے کوئی بات سن لی۔ وہ شخص جس کی عقل 'سِر' بن جاتی ہے وہ ''مقام بے نشانی'' کو اپنا نصب العین بناتا ہے۔ اس شخص کا نفس ''نفس مطمئنہ'' ہوتا ہے کہ شرع کی مرضی کے خلاف وہ کسی خواہش کا خیال تک نہیں کرتا اور اس کے دل میں جو خیالات اٹھتے ہیں' وہ بھی صراط مستقیم کے مطابق ہوتے ہیں۔ باقی اس شخص کے اعمال کا تو کیا کہنا' یہی ولایتِ صغریٰ کا مقام ہے۔

ولایتِ صغریٰ کے بعد اگر عنایتِ الٰہی اس شخص کے جس کا نفس ''نفس مطمئنہ'' قلب ''روح'' اور عقل 'سِر'' ہوتی ہے' شاملِ حال رہے تو وہ اس سے آگے اور ترقی کرتا ہے۔ چنانچہ یہاں سے اس کے سامنے دو راہیں کھلتی ہیں۔ ایک ولایتِ کبریٰ کی راہ' دوسری مفہمیت کی راہ..... مفہمیت کو نورِ نبوت اور وراثتِ نبوت کا بھی نام دیا گیا ہے۔

ولایتِ کبریٰ کی حقیقت یہ ہے کہ جب انسان نَسمہ اور اس سے متعلقہ قوتوں کو اپنے آپ سے الگ کردے لیکن اس ضمن میں یہ ملحوظ رہے کہ نسمہ اور اس سے متعلق قوتوں کو اپنے آپ سے جسمانی طور پر الگ کرنا ممکن نہیں ہوتا بلکہ علیحدگی کا یہ عمل صرف بصیرت اور حال وکیفیت ہی کے ذریعے ہوتا ہے۔ الغرض جب انسان نسمہ اور اس سے متعلق قوتوں کو اپنے آپ سے الگ کردے۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ میں غور کرے اور اپنے باطن کی گہرائیوں میں ڈوب جائے تو اس حالت میں نفسِ کلیہ جو کل کائنات کی اصل ہے' اس شخص پر منکشف ہوجاتا ہے لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر نفسِ کلیہ اس شخص پر کیسے منکشف ہوگا!

بات یہ ہے کہ انسان میں جو نفسِ ناطقہ ہے' وہ اصل میں نفس کلیہ کے تنزلات میں سے ایک تنزل اور اس کے ظہورات میں سے ایک ظہور ہے۔ جب انسان کا نفسِ ناطقہ سب چیزوں سے پورا انقطاع کرکے اپنے متعلق غور کرتا ہے اور اپنے آپ کو جاننے اور اپنی اصل تک پہنچنے کے لئے پیچھے کی طرف جاتا ہے جہاں سے کہ اس کے وجود کی نمود ہوئی تھی تو وہ اپنے سامنے نفس کلیہ کو پاتا ہے جو کائنات میں ہر جگہ جاری وساری ہے۔ عام اہل اللہ نے اس نفسِ کلیہ کا نام 'وجود' رکھا ہے۔ کائنات میں اس کے ہر جگہ جاری وساری ہونے کے علم کو وہ ''معرفتِ سریانِ وجود'' کہتے ہیں۔ الغرض انسان کا نفسِ ناطقہ جب نسمہ اور اس سے متعلقہ قوتوں کے اثرات سے پاک اور خالص ہوکر نفس کلیہ کے ساتھ اپنا الحاق قائم کرلیتا ہے تو نفس ناطقہ کو اس خاص حالت میں ''خفی'' کا نام دیا جاتا ہے۔

فقیر کو بتایا گیا ہے کہ ولایتِ کبریٰ کے حصول کا سب سے قوی ذریعہ یہ ہے کہ جب سالک پر ''مقامِ بے نشانی'' منکشف ہوجائے تو پھر وہ ''مراقبہ احاطہ'' یعنی **ان اللّٰہ علی کل شی محیط٥** کا مراقبہ کرے۔ بعد ازاں وہ لا الہ الا اللہ کا ذکر کرے لیکن یہ کرتے وقت وہ لا الہ الا اللہ کے ضمن میں ''لا موجود الا اللہ'' کے مفہوم کو ملحوظِ نظر رکھے۔

مفہمیت کی حقیقت یہ ہے کہ جب نفسِ ناطقہ نسمہ کی غیر لطیف قوتوں سے اعراض کرلیتا ہے تو وہ ملاءِ اعلیٰ سے ملحق ہوجاتا ہے۔ اس حالت میں نفس ناطقہ میں وہ علمی صورتیں منکشف ہوجاتی ہیں جو ملاء اعلیٰ میں موجود ہوتی ہیں۔ اس طرح انسان کا نفسِ ناطقہ اس قابل ہوجاتا ہے کہ وہ واجب الوجود کی معرفت کو ان معنوں میں کہ اس ضمن میں قدرتِ خداوندی کے جملہ کمالات از قسم ابداع' خلق' تدبیر اور تدلّٰی کا علم بھی آجائے، اجمالی طور پر حاصل کرسکتا ہے..... مقامِ

مفہمیت کی ان خصوصیات ہی کا نتیجہ ہے کہ وہ افراد کاملہ جن کو یہ مقام عطا ہوتا ہے، ان کے کلام میں تشبیہات کی بڑی کثرت ہوتی ہے۔ گو تشبیہات کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں ان کے کلام میں تنزیہی پہلو بھی ملے ہوتے ہیں۔ نیز ان لوگوں کو نوامیس الٰہی یعنی اللہ تعالیٰ کے شرائع وقواعد کے احکام کا علم حاصل ہوتا ہے اور حظیرۃ القدس میں نئے نئے حالات کے مطابق جو فیصلے ہوتے ہیں، یہ لوگ ان سے بھی باخبر رہتے ہیں۔

ہم ابھی بیان کر آئے ہیں کہ ولایتِ صغریٰ کے مقام سے سالک جب ترقی کرتا ہے تو اس کے سامنے دو مقام آتے ہیں۔ ایک ولایتِ صغریٰ کا مقام۔ دوسرا مقامِ مفہمیت اور مفہمیت کو نورِ نبوت اور وراثتِ نبوت بھی کہتے ہیں۔ جہاں تک اصل نبوت کا تعلق ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ نبوت دو جانب سے معرضِ وجود میں آتی ہے۔ اس کی ایک جانب تو نبوت قبول کرنے والے کی ہوتی ہے یعنی نبی کے نفسِ ناطقہ کی۔ جب نفسِ ناطقہ مقامِ مفہمیت حاصل کر لیتا ہے تو نبوت کی ایک شرط یا ایک جانب پوری ہو جاتی ہے۔ نبوت کی دوسری جانب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کا مبعوث کیا جانا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ کی تدبیر اس امر کی متقاضی ہوتی ہے کہ وہ کسی قوم کو اس کے اعمالِ بد سے ڈرائے۔ اس کو راہ ہدایت کی طرف بلائے۔ اس میں مفاسد و مظالم کو دور کرنے اور اس قبیل کے دوسرے امور کو سرانجام دینے کے لئے کسی شخص کو مبعوث کرے تو اس طرح نبوت کی دوسری شرط یا دوسری جانب بھی پوری ہو جاتی ہے۔ الغرض نبوت دو امور سے ترکیب پاتی ہے۔ ایک نبی کے نفس ناطقہ کی ذاتی صلاحیت، اسی کا نام مفہمیت ہے.... اس کو نورِ نبوت اور وراثت نبوت کہنے کی بھی یہی وجہ ہے۔ دوسری چیز اللہ تعالیٰ کا کسی شخص کو نبی مبعوث کرنے کا ارادہ ہے۔

ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد گو نبوت ختم ہو گئی لیکن اجزائے نبوت کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اجزائے نبوت سے یہاں مراد مفہمیت سے ہے، جس کا کہ سلسلہ اب تک منقطع نہیں ہوا۔ وہ بزرگ جو مقامِ مفہمیت پر سرفراز ہوتے ہیں، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپؐ کے نائب کی حیثیت سے دین کی تجدید فرماتے ہیں۔ نیز وہ سلوک و طریقت میں ارشاد و ہدایت کے منصب پر فائز ہوتے ہیں اور جو برائیاں لوگوں میں پھیلی ہوتی ہیں، ان کا وہ سدباب کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جو حالات واسباب اس امر کے متقاضی ہوتے ہیں کہ ایک نبی دنیا میں مبعوث ہو بعینہٖ اسی طرح کے حالات واسباب ان افراد مفہمین کے ظہور کا بھی تقاضا کرتے ہیں کہ وہ نبی کے بعد آئیں۔ اس کے دین کی تجدید کریں۔ سلوک وطریقت کی طرف لوگوں کو ہدایت کریں اور مفاسد کا قلع قمع کریں۔

افراد مفہمین کی اس جماعت میں سے جو ذکی ہوتے ہیں وہ تو منصب مفہمیت کے اس ''سر'' کو سمجھ لیتے ہیں اور جو ذکی نہیں ہوتے، ان کو تدبیر الٰہی لکڑی اور پتھر کی طرح ایک حالت سے دوسری حالت میں برابر چکر دیتی اور رد و بدل کرتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ قدرت کو جو کام ان سے لینا مقصود ہوتا ہے وہ اسے سرانجام دے دیتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی ایک صورت عالمِ مثال میں موجود تھی۔ آپؐ جب مبعوث ہو گئے تو نبوت کی یہ مثالی صورت بھی منتشر ہو گئی اور اس طرح نبوت کی حقیقت اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ گو اب اور کوئی نبی نہیں آئے گا لیکن افراد مفہمین پر جن چیزوں کا فیضان ہوتا رہتا ہے۔ وہ سب نبوت ہی کے انوار، اسی کی اشباح اور تمثیلیں ہوتی ہیں۔

یہاں طریقت اور سلوک کے صرف ان پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے، جن کا تعلق سالک کے ارادہ وقصد اور اس

کے مجاہدے اور ریاضت سے ہے۔ اسی لئے ''مقام فردیت'' کے ان کمالات کا بیان کرنا جو سرتاپا وہبی ہیں اور سالک کے قصد وارادہ کا ان میں مطلق دخل نہیں، یہاں کوئی معنی نہیں رکھتا۔

آسودہ شبے باید و خوش ماہتابے
تابا تو حکایت کنم از ہر بابے

خلاصہ مطلب یہ ہے کہ انسانی لطائف یعنی لطیفہ قلب، لطیفہ عقل اور لطیفہ طبیعت کے مدارج ترقی سمجھنے کے لئے اصل اصول یہ ہونا چاہیے کہ راہِ سلوک کے جن مقامات اور احوال کا ہم ابھی ذکر کر آئے ہیں، ان کو پیش نظر رکھا جائے اور پھر اہل اللہ کے وہ معاملات اور واقعات جو ان احوال اور مقامات پر دلالت کرتے ہیں، وہ بھی ملحوظ خاطر رہیں۔ اس ضمن میں انسانی لطائف کو سمجھنے کے لئے کیفیات والوں اور اس قبیل کی اور چیزوں کو جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسا کہ عام طور پر بعد کے صوفیا کہتے ہیں۔

آخر میں ہم اس امر کی بھی وضاحت کر دیتے ہیں کہ اس مسئلے میں کہ ''سرّ'' مقدم ہے ''روح'' سے یا ''روح'' مقدم ہے ''سرّ'' سے۔ اس بارے میں صوفیائے متقدمین میں اختلاف رہا ہے۔ ''سرّ'' اور ''روح'' دونوں کا آپس کا تعلق یوں سمجھئے کہ گھڑ دوڑ میں گھوڑے دوڑ رہے ہوں اور دونوں ہم عناں اور برابر ہوں۔ ان میں سے کبھی ایک اپنی استعداد کی وجہ سے آگے بڑھ جائے اور دوسرا اس کے پیچھے پیچھے آئے اور کبھی دوسرا آگے بڑھ جائے اور پہلا اس کے پیچھے پیچھے آئے۔

عالمِ ربانی کے آداب

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے: ''کیوں نہیں ہوتا کہ ہر ہر گروہ سے چند لوگ ایسے نکلیں جو اچھی طرح سے دین کو سمجھیں اور پھر واپس جا کر اپنی قوم کو سمجھائیں۔ شاید ان کے سمجھانے سے ان کی قوم برائیوں سے بچ جائے۔'' اس فرمودۂ خداوندی کے مطابق عالم ربانی جو انبیا اور مرسلین کا وارث ہوتا ہے، وہ ہے جو حسب ذیل امور کی حفاظت کرتا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ لوگوں کو تعلیم دے اور یہ تعلیم تفسیر، حدیث، فقہ، سلوک، عقائد اور نحو وصرف کی ہو۔ عالمِ ربانی کو علم کلام واصول اور منطق میں مشغول نہیں ہونا چاہیے۔ اسی سلسلے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''وہی ذاتِ خداوندی ہے جس نے ان پڑھوں کی طرف ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اللہ کی آیتیں پڑھتا ہے۔ ان کے اخلاق سدھارتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''

تعلیم وتدریس میں عالم ربانی کو ان باتوں کی مراعات کرنا ضروری ہے۔ اگر کتاب میں کوئی نامانوس لفظ آجائے تو وہ اس کی لغت سے وضاحت کرے۔ اگر کوئی دشوار صیغہ یا مشکل ترکیب ہو تو اس کی صرف ونحو کی مدد سے تشریح کردے۔ مسائل کے بیان میں وہ جزوی مثالیں پیش کرے اور ان کا حاصل مقصود سمجھائے۔ اپنے مطلب کو ذہن نشین کرانے کے لئے اس طرح استدلال کرے کہ دلیل کے مقدمات میں سے ایک مقدمہ کا دوسرے کے ساتھ ملزوم ہو اور ایک دوسرے کے اندر مندرج ہو تا کہ اس کی وجہ سے جو نتیجہ نکالنا مقصود ہے، وہ جلد نظروں کے سامنے آجائے۔ چیزوں کی

تعریف اور قاعدے کلیوں میں جو شرطیں اور قیود عائد کی جاتی ہیں، عالِم کو چاہیے کہ تعلیم دیتے وقت وہ ان شرطوں اور قیود کی تشریح کرتا جائے۔ تقسیمات میں حاصل مقصود کو جس طرح حصر کیا جاتا ہے، اس کے وہ وجوہ بھی بتائے اور مختلف مسلکوں، توجیہوں اور عبارتوں میں جب وہ چیزیں ایک دوسرے سے مشابہ ہوں۔ اس سلسلے میں ظاہر میں جو شبہے ہوتے ہیں، وہ ان کو دور کرے۔ اسی طرح وہ باتیں جن کا ممتنع ہونا لازم ہے۔ جیسے تعریف میں استدراک، خفی تر کا ذکر اور برہان میں کبریٰ کی جزئیت اور صغریٰ کی سالبیت، ان کے متعلق بظاہر جو شبہے ہوں، ان کا رد کرے۔ عالم ربانی جب تک ان امور کو اچھی طرح بیان نہ کرے۔ پھر تعلیم دیتے ہوئے جب تک وہ ان کی طرف برابر شاگردوں کو متنبہ نہ کرتا رہے، اس وقت تک وہ شاگردوں کو پوری طرح مستفید نہیں کر سکتا۔

دوسری چیز جس کی حفاظت عالم ربانی کے ذمے ہے، وہ یہ ہے کہ وہ طریقت کے اشغال کی تلقین کرے۔ اس موضوع کو ہم بڑی تفصیل سے پہلے ذکر کر آئے ہیں۔ عالِم ربانی کو چاہیے کہ وہ اس کام کے لئے ایک وقت مقرر کرے۔ جس میں کہ وہ لوگوں کے پاس بیٹھے۔ ان پر "توجہ" ڈالے اور ان پر "نسبت سکینہ" کا القا کرے۔ بات دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حجت کے اتمام کے لئے ایک تو جتنی ممکن استطاعت ہو، وہ ضروری ہوتی ہے اور اس کے بعد جتنی بھی استطاعت انسان سے میسر آ سکے۔ استطاعت میسرہ میں سے ایک تو صحبت ہے اور دوسرے اشغالِ طریقت پر قولاً و فعلاً اور دل پر اپنا اثر ڈال کے طالب کو آمادہ کرنا ہے۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔ قرآن میں یزکیھم میں اسی طرف اشارہ ہے۔

ان امور میں سے تیسری بات یہ ہے کہ عالم ربانی اپنے متوسلین کو برابر وعظ و نصیحت کرتا رہے۔ اسی ضمن میں اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں اپنے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ "نصیحت کر۔ اگر نصیحت کرنا لوگوں کے لئے مفید ہے۔" عالِم ربانی کو چاہیے کہ وعظ و نصیحت میں وہ قصہ گوئی سے اجتناب کرے۔ کتب حدیث میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد آپ کے صحابہ لوگوں کو برابر وعظ و نصیحت کرتے رہتے تھے۔ سنن ابن ماجہ وغیرہ میں یہ روایت بھی ہے کہ قصہ گوئی کا رواج نہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھا۔ نہ ابوبکرؓ اور عمرؓ کے زمانے میں اور یہ بھی مروی ہے کہ صحابہ قصہ گووؤں کو مساجد سے نکال دیا کرتے تھے۔ غرضیکہ ان احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قصہ گوئی وعظ و نصیحت کے ذیل میں نہیں آتی اور یہ کہ قصہ گوئی مذموم ہے اور وعظ و نصیحت پسندیدہ۔

قصہ گوئی یہ ہے کہ عجیب نادر حکایات بیان کی جائیں اور اعمال اور اس طرح کی دوسری چیزوں کے فضائل میں خلافِ واقعہ مبالغہ کیا جائے۔ ان فضائل کے بیان کرنے سے قصہ گو کا مقصد لوگوں کو بتدریج سنت کی تلقین کرنا اور آہستہ آہستہ ان کو اس کا خوگر بنانا نہ ہو بلکہ وہ محض اپنا زورِ بیان دکھانے، کلام میں جدت پیدا کرنے، لوگوں میں فصاحت کی بنا پر ممتاز ہونے اور طرح طرح کی حکایتوں اور امثال کو اچھی طرح بیان کرنے کی غرض سے اس طرح کا مبالغہ کرے۔ الغرض وعظ و نصیحت اور قصہ گوئی میں فرق کرنا بڑا ضروری ہے۔ آگے چل کر ہم اس مسئلہ پر مستقلاً ایک فصل میں بحث کریں گے۔

وہ امور جن کی حفاظت عالِم ربانی کے ذمے ہے، ان میں سے چوتھا کام وضو اور نماز کے معاملے میں "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" ہے۔ مثلاً وہ ایک شخص کو دیکھتا ہے کہ اس نے وضو کرتے وقت پاؤں اچھی طرح نہیں دھوئے تو اسے چاہیے کہ بلند آواز سے کہے "ایڑیوں کے لئے عذاب ہے دوزخ کا" یا ایک اور شخص ہے کہ وہ نماز کے ارکان پوری

طمانیت سے ادا نہیں کرتا۔ عالمِ ربانی اسے کہے کہ ''دوبارہ نماز پڑھو کیونکہ تمہاری نماز نہیں ہوئی۔'' اسی طرح وہ لباس' گفتگو اور دوسرے معاملات میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر حامل ہو۔ اسی سلسلے میں خدا تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے کہ ''تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے۔ وہ انہیں اچھے کاموں کا حکم دے اور برے کاموں سے ان کو روکے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔'' امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لئے نرمی اور ملائمت ضروری چیز ہے۔ بات یہ ہے کہ ڈانٹ ڈپٹ اور سختی تو امراء اور بادشاہوں ہی کی شان ہو سکتی ہے۔ اس بارے میں ارشادِ خداوندی ہے۔ ''اے پیغمبر! تم مخالفوں سے بحث کرو تو اس طریق سے کرو جو سب سے اچھا ہے۔''

عالمِ ربانی کا پانچواں فریضہ یہ ہے کہ جہاں تک اس کے بس میں ہو وہ فقرا اور طالب علموں کی خبر گیری کرے اور اگر خود اس میں اتنی استطاعت نہ ہو تو اپنے متوسلین اور ہم خیالوں کو ان کی خبر گیری کرنے پر ابھارے اور انہیں اس پر آمادہ کرے۔

اب اگر کسی ایک شخص میں یہ پانچوں صفتیں جمع ہو جائیں تو تمہیں اس میں شک نہیں کرنا چاہیے کہ یہی وہ شخص ہے جو انبیاء اور مرسلین کا وارث ہے۔ بے شک یہ وہی ہے جو عالم ملکوت میں ''عظیم'' کے لقب سے پکارا جائے گا اور اسی کے لئے اللہ کی خلقت ہمیشہ ہمیشہ جب تک جیسا کہ حدیث میں آیا ہے مچھلیاں پانی میں ہیں' دعا مانگتی رہے گی۔ اگر تمہیں کبھی ایسا شخص مل جائے تو اس کی صحبت کو اپنے لئے لازم پکڑنا' اور کبھی ایسا نہ ہو کہ تم اس سے محروم ہو جاؤ کیونکہ ایسا شخص تو ''کبریت احمر'' یعنی اکسیر اعظم ہے۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

اس ضمن میں تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ایک شخص اگر رشد و ہدایت اور دعوت الی اللہ کے منصب پر فائز ہے۔ پھر یہ جو پانچ امور اوپر بیان ہوئے' ان میں سے کسی امر میں وہ پورا نہیں اترتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس معاملے میں اس میں نقص ہے اور جب تک وہ اس کی تلافی نہیں کرے گا' وہ ناقص ہی رہے گا۔

راہِ حق کے طالب کو میں یہاں چند امور کی وصیت کرتا ہوں: ایک یہ کہ وہ دولت مندوں کی صحبت اختیار نہ کرے۔ سوائے اس کے کہ وہ اس ذریعہ سے لوگوں پر جو مظالم ہوتے ہوں' ان کو روکنا چاہے یا دولت مندوں کو وہ اس طرح نیک کاموں پر آمادہ کرنا چاہتا ہو۔ دولت مندوں کی صحبت اختیار کرنے کی ایک وجہ ہو سکتی ہے' جس کی بنا پر ان احادیث میں جو بادشاہوں کی صحبت اختیار کرنے کو برا قرار دیتی ہیں اور اس امر میں کہ بہت سے صالح و نیکوکار علما برابر بادشاہوں کی صحبت اختیار کرتے رہے ہیں' مطابقت ہو سکتی ہے۔

طالبِ راہِ حق کو میری دوسری وصیت یہ ہے کہ وہ جاہل صوفیوں' جاہل عبادت گزاروں' خشک مزاج فقیہوں' ظاہر پرست محدثوں اور حد سے بڑھے ہوئے معقولیوں کی صحبت میں نہ بیٹھے۔ اس کے برعکس وہ صاحبِ علم صوفی اور زاہد ہو۔ ہر دم اللہ کی طرف توجہ کرنے والا ہو۔ معرفت کے احوال کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہو۔ سنت کی طرف راغب ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور صحابہ کے آثار کی تلاش میں رہے۔ وہ محقق فقہا جو قیاس و رائے کے مقابلے میں حدیث کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ وہ علماء جن کے عقائد سنت سے ماخوذ ہیں اور عقلی استدلال کو ایک زائد سی چیز سمجھتے ہیں اور وہ اصحابِ سلوک جو جامع ہیں' علم اور تصوف کے اور بلا وجہ اپنے اوپر سختی نہیں کرتے اور نہ ضرورت سے زیادہ سنت میں دقت پسندی سے کام لیتے ہیں۔ طالب حق کو چاہیے کہ ان فقہا' ان علما اور ان اصحابِ سلوک کی کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کی احادیث اور صحابہ کے آثار کی وضاحت اور تفصیل دیکھے۔

راہِ حق کے طالب کو چاہیے کہ وہ فقہ کے کسی ایک مذہب کو دوسرے مذہب پر ترجیح دینے کے بارے میں گفتگو نہ کرے بلکہ ان سب مذاہب کو وہ ایک ہی درجہ قبولیت پر رکھے۔ ان میں سے اس مذہب پر چلے جو اس کے نزدیک واضح اور مشہور سنت کے مطابق ہے اور اگر کسی مسئلے میں دو قول ہوں اور دونوں کے دونوں سنت سے مستنبط ہوں تو جس قول پر فقہا کی اکثریت ہو اس کو لے لے لیکن اگر دونوں کو ماننے والے برابر برابر ہوں تو پھر طالب کو اختیار ہے کہ جسے چاہے اختیار کرے۔ اسے چاہیے کہ فقہ کے ان سب مذاہب کو یوں سمجھے جیسے کہ ایک مذہب ہے اور اس معاملے میں وہ ہرگز تعصب نہ برتے۔

طالبِ راہِ حق کو میری آخری وصیت یہ ہے کہ وہ تصوف کے ایک طریقے کو دوسرے طریقے پر ترجیح دینے کے متعلق بحث نہ کرے۔ صوفیا میں سے جو لوگ مغلوب الحال ہیں، نہ تو وہ ان کو برا سمجھے اور نہ ان کو جو سماع وغیرہ امور میں تاویل کرنے والے ہیں اور جہاں تک اس کی ذات کا تعلق ہے، وہ سوائے اس راہ کے جو سنت سے ثابت ہے اور اہل علم میں سے محققین اور راسخین کا گروہ اس پر عامل ہے۔ کسی اور پر نہ چلے، باقی توفیق دینے والا اور مدد کرنے والا تو اللہ ہی ہے۔
(القول الجمیل)

حقیقتِ وحدانیت یا وجود

کائنات کی کثرت پر غور کرنے کے بعد عقل اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ ایک نفس کلیہ یا جنس الاجناس ہے جس سے ساری موجودات کا سرچشمہ پھوٹتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک یہ نفس کلیہ بطریق ابداع، نہ کہ بذریعہ خلق، ذاتِ حق سے صادر ہوا۔ ابداع سے مراد ہے مادہ کے بغیر عدم سے وجود کا صدور، اس سے یہ ظاہر ہوا کہ ذاتِ حق اس عالم سے ماورا ہے۔ شاہ صاحب نے اپنی تصنیفات بدور بازغہ، تفہیمات اور الطاف القدس میں اس طریق ابداع پر بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں: مُبدِع یعنی جس سے ابداع کا عمل ادا ہوا اور مبدع جو ابداع کے عمل کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں میں جو نسبت ہے، اس کی مثال عالمِ مادی سے نہیں دی جا سکتی۔ بے شک نفسِ کلیہ اور ذات باری دوسرے لفظوں میں مبدع اور مبدَع میں ایک طرح کی وحدت پائی جاتی ہے مگر وہ وحدت حقیقی نہیں۔ انسانی عقل نفس کلیہ تک تو پہنچ جاتی ہے اور موجودات کی کثرت کو ایک نقطہ پر جمع بھی کر لیتی ہے لیکن اس سے آگے اس کی پرواز نہیں۔ چنانچہ نفسِ کلیہ اور ذاتِ الٰہی کے درمیان جو نسبت ہے اور جسے شاہ صاحب نے ''اِبداع'' سے تعبیر کیا ہے، عقل اس کے احاطے سے یکسر عاجز ہے اور وہ مُبدِع اور مُبدَع کے درمیان کسی امتیاز کو قائم کرنے پر قادر نہیں۔ اس لئے بعض دفعہ مبدِع اور مبدَع یا ذاتِ الٰہی اور نفسِ کلیہ پر مجازاً وحدت یعنی باہم ایک ہونے کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

غرض کائنات کی ہر چیز ایک اعتبار سے نفسِ کلیہ کی عین ہے اور صوفیا اسی کے لئے بحر اور موج کی مثال دیتے ہیں لیکن اس سے اوپر نفسِ کلیہ سے لے کر واجب الوجود تک جو منزل ہے، اس کی

کیفیت معلوم کرنا عقل کے بس کی بات نہیں۔ یہ مقام چونکہ عقل کے احاطے سے خارج ہے' اس لئے اس کی تعبیر میں ہر قسم کے مشتبہ الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔

یہاں شاہ صاحب کی کتاب "ہمعات" سے اس موضوع کے بارے میں اقتباسات پیش ہیں:

یہ تو ایک مسلمہ امر ہے کہ زید' عمرو اور بکر وغیرہ سب کے سب انسان ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ اور ان کے علاوہ باقی تمام افرادِ انسانی اس بات میں کہ یہ سب کے سب انسان ہیں' ایک دوسرے سے مشترک ہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان میں سے ہر ایک فرداً فرداً ایک دوسرے سے جدا جدا بھی ہیں۔ الغرض یہ سب باعتبار انسانیت کے تو آپس میں مشترک ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک اپنی انفرادی خصوصیات کی وجہ سے ایک دوسرے سے ممتاز ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ زید' عمرو اور بکر وغیرہ میں فرداً فرداً جو خصوصیات پائی جاتی ہیں' یہ انفرادی خصوصیات عین انسان نہیں ہیں کیونکہ اگر یہ خصوصیات عین انسان ہوتیں تو زید من حیث الکل مشابہ ہوتا عمرو کے اور عمرو مشابہ ہوتا بکر کے اور اسی طرح ہر انسان کلیتہً دوسرے انسان کی مثل ہوتا اور ان میں فرداً فرداً ایک دوسرے سے کوئی امتیاز نہ پایا جاتا لیکن ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ زید بعینہٖ بکر نہیں اور نہ بکر بعینہٖ عمرو ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس ہر انسان وہ نہیں جو دوسرا ہے۔ اس کے باوجود اگر ہم نوعِ انسانی کے ان افراد کی الگ الگ خصوصیات کو عین انسان قرار دیتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ایک چیز بیک وقت دوسرے کی عین ہے اور اس سے مختلف بھی اور ظاہر ہے یہ بات صریحاً بداہتہً غلط ہے۔

لیکن افراد کی یہ انفرادی خصوصیات ہر حیثیت سے غیر انسان بھی نہیں ہیں کیونکہ جس ذات میں یہ خصوصیات جمع ہوتی ہیں' اس پر انسان کا اطلاق ہوسکتا ہے اور یہ انفرادی خصوصیات اس امر میں بھی مانع نہیں ہیں کہ ان پر انسان کا اسم صادق نہ آسکے۔ الغرض کل انسانیت بحیثیت مجموعی اور افراد کی ان جدا جدا خصوصیات میں ایک خاص نسبت پائی جاتی ہے جسے ظاہریت اور مظہریت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کالا بھی انسان ہے اور یہ سفید رنگ کا بھی انسان ہے۔ پہلی صورت میں یہ ہوا کہ جوہرِ انسانیت کالی شکل سے مرکب ہو کر ایک خاص مظہر میں ظاہر ہوا اور دوسری صورت میں وہی جوہر سفید شکل سے مخلوط ہو کر دوسرے مظہر میں معرضِ وجود میں آیا۔

انسانیت میں بحیثیتِ مجموعی اور افراد کی انفرادی خصوصیات میں جو نسبت ہے' اس نسبت کو کبھی مادہ وصورت کی مثال دے کر بھی واضح کیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک بھبکا ہے جو آگ پر رکھا ہوا ہے۔ اس کے اندر پانی ہے۔ پانی حرارت سے بخارات یعنی ہوا بنا اور ہوا سے پھر عرق یعنی دوبارہ پانی بن گیا۔ اب واقعہ یہ ہے کہ ایک صورتِ جسمیہ ہے جو کہ تمام اجسام میں مشترک ہے۔ یہ صورت جسمیہ پہلے پانی تھی۔ پھر یہ ہوا ہوئی اور اس کے بعد پھر پانی ہوگئی۔ اس حالت میں کوئی نہیں کہتا کہ پانی اور ہوا کوئی الگ چیز تھی' جو صورتِ جسمیہ سے ضم ہوگئی ہے کیونکہ صورتِ جسمیہ تو خود اپنی جگہ متعین ہے اور اس تعین میں نہ وہ پانی کی محتاج ہے اور نہ ہوا کی۔

بے شک یہ صورتِ جسمیہ جب انواع کے مرتبے میں ظہور پذیر ہوتی ہے تو اس کے لئے متشکل اور متلون ہونا ضروری ہوتا ہے اور ظاہر ہے اس صورتِ جسمیہ کا اس حالت میں پانی یا ہوا کے علاوہ کسی اور شکل میں متشکل ہونا ممکن نہیں۔

الغرض جب ہم صورتِ جسمیہ کو صورت جسمیہ کے مرتبے میں دیکھیں گے تو بے شک وہ تمام اجسام میں مشترک

نظر آئے گی لیکن جب صورتِ جسمیہ کو ہم اس اعتبار سے دیکھیں گے کہ مرتبہ انواع میں وہ کیونکر متشکل ہوئی تو اس حالت میں اس صورتِ جسمیہ کا خود پانی یا ہوا ہونا ضروری ہوگا۔ یہ نہیں کہ صورتِ جسمیہ ایک الگ چیز ہے اور پانی اور ہوا الگ اور پانی اور ہوا بعد میں اس سے ضم ہو گئے۔ اگرچہ اپنی جگہ ان کے ضم ہونے کی بھی وجہ ہو سکتی ہے۔

الغرض صورت اور مادے کے درمیان جو خاص نسبت ہے' اس کے لئے ایک نام کی ضرورت ہے جس سے کہ اس نسبت کو تعبیر کیا جائے۔ ہم نے اس نسبت کو ''ظہور'' کا نام دیا ہے اور ''ظہور'' سے مراد یہ ہے کہ ایک چیز اپنی جگہ ایک مُوطن اور مرتبے میں قائم اور محقق ہے اور پھر وہی چیز اس مرتبے سے اتر کر دوسرے مرتبے میں ایک اور وجود کا جامہ پہن لیتی ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک چیز کی ایک نوعی صورت ہے' جو اس نوع کے ہر ہر فرد میں ظہور کرتی ہے یا پھر موم کی مثال لیجیے کہ اس سے مسدس اور مربع شکلیں اور انسان اور گھوڑے کے مجسمے بنائے جا سکتے ہیں۔ اس طرح ان تمام چیزوں میں موم اپنے موی جسم کا اظہار کرتا ہے یا پھر اس کی مثال ملکہ عالم کا اس علمی صورت میں جو ابھی ہمارے ذہن میں نقش پذیر ہوئی' ظہور کرنا ہے۔ اس ضمن میں اس طرح کی اور بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں اور اگر ''حقیقتِ ظہور'' کی مزید توضیح درکار ہو اور اس کی اقسام کا مفصل بیان چاہیے تو اس کے لئے ہماری دوسری تصانیف ملاحظہ کیجیے۔

قصہ مختصر' انسان ہو یا گھوڑا' گائے ہو یا بکری' اونٹ ہو یا گدھا۔ ان میں سے ہر ایک کی صورت اپنے اپنے مرتبہ نوع میں متعین ہے اور وہاں ہر ایک کے اپنے اپنے نوعی احکام و آثار بھی مقرر ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک پر فرداً فرداً جو احکام وارد ہوتے ہیں، ان کے لئے ہر نوع کو افراد کی صورتوں میں لامحالہ ظہور پذیر ہونا پڑتا ہے۔ اس طرح ایک نوعی صورت سے افراد کی الگ الگ صورتیں وجود میں آئیں اور ہر صورت میں اس نوع کے جو انفرادی آثار و خصائص تھے' وہ مترتب ہوئے۔ یہ سب انواع و افراد خواہ وہ از قبیل انسان ہوں یا گھوڑے' گائے' بکری' اونٹ اور گدھے وغیرہ کی قسم سے۔ الغرض یہ سب انواع و مظاہر ہیں جنسِ حیوان کے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ اور آگے بڑھتا ہے' یہاں تک کہ یہ جوہر عرض تک جا پہنچتا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مثلاً زید ایک فرد ہے۔ اس کے اوپر نوعِ انسان ہے اور نوع سے اوپر جنس کا مرتبہ ہے۔ یہ جنس حیوان ہے۔ حیوان کی جنس میں نوعِ انسان بھی داخل ہے اور جملہ حیوانات کی انواع بھی' جنس سے آگے جنسِ عالی کا مرتبہ ہے۔ اس میں حیوانات کے ساتھ ساتھ نباتات بھی شامل ہیں اور اس سے اوپر جسم یعنی عرض کا مرتبہ ہے اور عرض سے اوپر جوہر ہے۔

اس معاملے میں حکما کا یہ حال ہے کہ وہ مظاہر وجود اور اس کے تعینات کی اصل کا سراغ لگاتے لگاتے اس مقام پر پہنچے اور یہاں پہنچ کر نہ صرف یہ کہ وہ رک گئے بلکہ انہوں نے قطعی طور پر یہ سمجھ لیا کہ جوہر و عرض کے درمیان کوئی ایسا علاقہ نہیں جو دونوں کو ایک جنس کے تحت جمع کر دے لیکن اس کے برعکس اہلِ حق نے معلوم کر لیا کہ جوہر و عرض دونوں کو ایک اور اعلیٰ تر حقیقت احاطہ کیے ہوئے ہے لیکن حکما اس حقیقت کا ادراک کرنے سے عاجز رہے کہ اور حقائق کی طرح اس حقیقت کے احکام و آثار متعین نہیں کہ ان کی مدد سے یہ حکما اس حقیقت کا سراغ لگا لیتے جو عرض و جوہر دونوں پر حاوی ہے۔ اس حقیقتِ جامع کا موزوں ترین نام ''حقیقت وحدانیت'' ہے۔ گو کبھی کبھی ہم اس حقیقت کو ''وجود'' بھی کہہ لیتے ہیں۔ یہ

''وحدانیت'' یا ''وجود'' ایک بسیط حقیقت ہے۔ چنانچہ ''وجود'' کے اس مرتبہ بسیط میں اور اس کے بعد کے تعینات میں جن میں یہ ''وجود'' ظہور پذیر ہوتا ہے' الغرض اس کے ان دونوں مراتب میں کوئی تصادم یا تضاد نہیں پایا جاتا۔

اس مسئلے کو ذہن نشین کرنے کے بعد ہم پھر کائنات پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس میں نوع بہ نوع کے قدرتی اور صنعتی مرکبات مثلاً درخت' حیوان' کانیں' تخت' کپڑے اور اس طرح کی دوسری چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔ ان چیزوں میں ایک تو حقائق ہیں جو نفسِ اشیاء سے جن سے کہ آثار واحکام ظاہر ہوتے ہیں' متمیز اور الگ ہیں۔ ان حقائق کو ہم صُور کا نام دیتے ہیں لیکن ان حقائق یا صُور کو وقوع پذیر ہونے کے لئے جسمِ عنصری کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ جسمِ عنصری ان صورتوں کا مادہ ہے۔

ان قدرتی اور صنعتی مرکبات سے اوپر عناصر اور افلاک کا مرتبہ ہے۔ ان عناصر اور افلاک کی بھی ایک خاص صورت ہے۔ ان سب سے اوپر اور ان سب کو جمع کرنے والی اور جو ان سب کا موضوع ہے' صورتِ جسمیہ ہے جسے ''اشراقین'' نے ''مادۂ اُولیٰ'' کہا ہے۔ یہ صورتِ جسمیہ جو اثر پذیر مادہ بھی ہے اور علتِ فاعلیہ بھی۔ یہ صورتِ جسمیہ جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں' وجود کے اصل مرکز کی طرف راجع ہے۔ الغرض انواع کے ایک ایک فرد سے لے کر وجودِ اقصیٰ تک نظامِ کائنات کا یہ سارا سلسلہ نہایت مرتب اور منظم ہے اور نیچے سے اوپر تک اس کی ہر کڑی دوسری کڑی سے ملی ہوئی ہے۔

یہ وجودِ اقصیٰ اور بعد میں جن مظاہر اور تعینات میں اس وجود کا ظہور ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ لکھے ہوئے حروف کے مقابلے میں سیاہ لکیر ہو یعنی ان حروف کی اصل تو سیاہ لکیر ہی ہے۔ گو بعد میں اس لکیر نے حروف کی شکل اختیار کر لی یا جیسے مختلف اعداد کی نسبت اکائی سے ہوتی ہے یعنی اکائی ہی سے تمام اعداد نکلتے ہیں اور ایک ہی وجود میں مظاہر اور تعینات کی اس قدر کثرت کا واقعہ ہونا اس کی مثال دریا کی سمجھیے کہ اس میں لاتعداد اور بے حساب موجیں ہوتی ہیں۔

الغرض اوپر کی اس بحث سے یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا کہ ان مظاہر اور تعینات میں دو چیزیں اصل ہیں۔ ایک وجود اور دوسرے ان چیزوں کی ماہیات۔ اب سوال یہ ہے کہ اس وجود اور ان ماہیات کی آپس میں کیا نسبت ہے؟ اربابِ معقولات نے اس کے متعلق بڑی طول طویل بحثیں کی ہیں لیکن اس مسئلے میں صحیح ترین رائے یہ ہے کہ وجود وہ ہے جو خود اپنی ذات میں قائم ہے اور مرتبہ وجود میں جبکہ کوئی اور چیز اس کے ساتھ ملحق نہیں ہوتی اور وہ خالص وجود ہوتا ہے تو وہ کسی دوسری چیز کا محتاج نہیں ہوتا۔ یہ وجود مختلف ماہیات میں ظہور کرتا ہے۔ چنانچہ یہ ماہیات اس وجود کے لئے قوالب بن جاتی ہیں۔ ان ماہیات میں سے ہر ماہیت کی اپنی ایک حیثیت اور اس کے اپنے احکام ہوتے ہیں۔

مطلب یہ نکلا کہ وجود ماہیات میں ظہور پذیر ہوتا ہے لیکن ماہیات میں وجود کا ظہور ہونا موقوف ہوتا ہے بہت سی چیزوں پر۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ بعض ماہیات میں وجود کے ظہور کے لئے ضروری ہے کہ اس سے پہلے وہ دوسری ماہیت میں ظہور پذیر ہو چکا ہو یعنی وجود کا ایک ظہور مشروط اور مقدم ہوتا ہے اس کے دوسرے ظہور پر۔ چنانچہ یہ بے شمار ماہیات ظہورِ وجود کے اس طرح کے ایک باقاعدہ سلسلے میں جکڑی ہوئی ہیں اور ہر ماہیت اس سلسلۂ ظہور کی ایک کڑی ہے اور یہ ممکن نہیں کہ اس سلسلے میں ایک کڑی اس کی دوسری کڑی سے مقدم یا مؤخر ہو سکے۔ اب اصل وجود کو لیجیے۔ اصل وجود کے دو وصفِ کمال ہیں۔ ایک ظاہری اور دوسرا باطنی۔ ہم یہاں ایک مثال سے اس کی وضاحت کرتے ہیں۔ ایک حساب

کرنے والا ہے۔ وہ حساب کرتے وقت اپنے ذہن میں حساب کے عددوں کو موجود اور حاضر کرتا ہے اور وہ اس طرح کہ پہلے اعداد کی یہ صورتیں اس کے ذہن میں موجود نہ تھیں۔ اب جو وہ حساب کرنے لگا تو یہ عدد اس کے ذہن میں آن موجود ہوئے۔ محاسب یہ تو کر سکتا ہے کہ اعداد جو اس کے ذہن میں موجود نہ تھے، انہیں وجود میں لے آئے لیکن یہ اس کے بس کی بات نہیں کہ دس کے عدد کو وہ طاق بنا دے اور گیارہ کو جفت کر دے یا وہ شمار میں چھ کو پانچ سے مقدم کر دے۔ الغرض گنتی کے جو اعداد ہیں، ان کا ایک مستقل سلسلہ ہے اور اس سلسلے میں ہر عدد کا ایک متعین مقام ہے۔ اس مقام کے مطابق ہر عدد کے اپنے احکام ہیں جن میں حساب کرنے والا کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔

ماہیات کے اس مترتب سلسلے اور مظاہرِ وجود کے اس باقاعدہ نظام کو دیکھ کر عقلِ انسانی لامحالہ اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ ماہیات کے سلسلے کی یہ ترتیب بالضرور کسی نہ کسی موطن میں پہلے ہی سے مقرر اور متعین ہو چکی ہے اور پہلے سے اس مقرر شدہ ترتیب ہی کا نتیجہ ہے کہ ہر ماہیت کے ظہور کے اپنے احکام ہیں جن میں کوئی تغیر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جس طرح محاسب کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذہنی عمل سے اعداد پر تاثیر ڈالتا ہے اور انہیں عدم سے وجود میں لاتا ہے لیکن چونکہ اعداد کی ترتیب پہلے سے کسی موطن میں مقرر ہو چکی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اسی ترتیب سے اعداد کو اپنے ذہن میں مستحضر کرتا ہے اور اس ضمن میں اعداد کو عدم سے وجود میں لاتے وقت وہ ان میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی نہیں کرتا۔ چنانچہ اس دنیا میں یہ ماہیات پہلے کی طے شدہ ترتیب کے مطابق ظاہر ہوتی ہیں۔

وجود کے ایک مرتبے کی تو محاسب کی یہ مثال ہوئی کہ اس نے اپنے ذہن میں اعداد کو غیر موجود سے موجود کر لیا اور نابود سے بود بنا دیا۔ اس مرتبہ وجود کو ہم ظاہر وجود کہتے ہیں لیکن وجود آخر بذاتِ خود بھی تو ایک چیز ہے اور یہی مبداء اور اصل ہے۔ وجود کے ان دو کمالوں یعنی ظاہر اور باطن کا۔

اب یہ سوال باقی رہا کہ یہ جامع حقیقت جو عرض و جوہر کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے، جس کا موزوں ترین نام ہم ''حقیقتِ وحدانیت'' بتا آئے ہیں، جسے ہم کبھی کبھی ''وجود'' بھی کہتے ہیں۔ یہ جامع حقیقت جس کے اندر کائنات کی یہ ساری کثرت داخل ہے اور یہ ساری کی ساری ماہیات اسی کی استعدادیں ہیں۔ اسی حقیقت کے ظہور کو ہم ماہیات کی فعلیت کہتے ہیں اور کلمات ''ہست''، ''خارج'' اور ''عین'' سے اسی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ آخر یہ حقیقت ہے کیا؟ ایک قوم کا کہنا یہ ہے کہ یہ حقیقت عین ذاتِ الٰہی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسی حقیقت کو ''لابشرط بشئی''[1] ذات بحث سمجھا اور اسی کو وہ ''بشرط لاشئی'' احدیت کہتے ہیں اور یہی ان کے نزدیک ''بشرط شئی'' واحدیت ہے۔ ہمارے خیال میں ان لوگوں میں عقل و تدبر کی کمی تھی کہ انہوں نے اس غلط بات پر یقین کر لیا۔ ان کے برعکس فقیر نے اس امر کی تحقیق کی تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ وجود کے جس مرتبے پر جا کر ان لوگوں کی نظر رُکی اور اسے ہی انہوں نے غلطی سے ذات بحت، احدیت اور واحدیت سمجھ لیا، وہ مرتبہ تو ظاہر الوجود کا تھا جس کو ہم نفسِ کلیہ کہتے ہیں اسی کو بعض اہلِ کشف نے وجود منبسط کا نام دیا ہے۔ حقیقت میں اس وجود منبسط کی حیثیت تو محض اصل وجود کی طبیعتوں میں سے ایک طبیعت کی ہے۔ بے شک وجود کی یہ طبیعت سب چیزوں سے زیادہ بسیط ہے اور یہی سب کا مبداء اور اصل بھی ہے۔ بہر حال یہ نفسِ کلیہ یا وجود منبسط یا اسے آپ کوئی اور نام دیجیے، اس کی کیفیت یہ ہے کہ یہ ہر شے میں جاری و ساری اور ہر شے سے قریب ہے اور اس کے

باوجود یہ سب اشیاء سے پاک اوران کی تمام آلائشوں سے منزہ ہے۔

نفس کلیہ کے مقابلے میں جو حیثیت ان اشیاء کی ہے، وہی حیثیت ذاتِ الٰہی کے مقابلے میں اس نفسِ کلیہ کی ہے بلکہ نفسِ کلیہ اشیاء سے باوجود قرب کے جس قدر دور ہے، اس سے سوگنا زیادہ ذاتِ الٰہی نفسِ کلیہ سے دور ہے۔ اسی طرح وہ اس کے تمام تعینات اور تقیدات کی حد بندیوں سے بھی مبرا ہے۔ ہاں اس ضمن میں ایک بات کا ضرور خیال رہے۔ نفسِ کلیہ اوراس سے اوپر وجود کے جو مراتب ہیں ان پر ذاتِ الٰہی از قبیلِ ابداع مؤثر ہوتی ہے، نہ کہ از قسمِ خلق۔ ابداع سے مراد یہ ہے کہ مادہ کے بغیر عدم سے وجود کا صدور ہو اور ایک چیز سے دوسری چیز کا ہونا خلق کہلاتا ہے۔

الغرض نفس کلیہ اور ذات الٰہی میں خلق کی نہیں بلکہ ابداع کی نسبت ہے اور ابداع کی نسبت کی حالت یہ ہے کہ اسے عقلِ انسانی ادراک کرنے سے کلیتہً قاصر ہے۔ اس لئے نفسِ کلیہ اور ذاتِ الٰہی میں فرق مراتب کرنا عقلاً ممکن نہیں۔ اس لئے اگر کوئی شخص تسامح سے یا آسانی کے خیال سے یہ کہہ دے کہ نفس کلیہ ذاتِ الٰہی کا تنزل ہے تو اس کا یہ کہنا اجمالاً ایک وجہ رکھتا ہے۔

اس سلسلے میں فقیر کو بتایا گیا ہے کہ وہ لوگ جن کے دلوں میں کثرت سے وحدت کی دید کا شوق فوارے کی طرح جوش زن ہوتا ہے تو ان کی نظریں جس وحدت تک پہنچتی ہیں، وہ نفس کلیہ کی وحدت کے بجز کوئی دوسری وحدت نہیں ہوتی۔ لیکن جب چشمِ بصیرت ذاتِ الٰہی کو اپنا مطمح نظر بنائے تو یہ ''توحیدِ ذاتی'' کی کیفیت ہے۔ ''توحیدِ ذاتی'' کے معنی یہ ہیں کہ ذاتِ حق کو ہر نسبت اور ہر چیز سے الگ کر کے صرف حق میں دیکھا جائے۔ باقی ذاتِ الٰہی اور نفسِ کلیہ میں جو نسبت ہے، اسے ''ام النسبات'' کا نام دیا گیا ہے اور ان دونوں کے باہمی تعلق کو کسی خاص نسبت سے متعین کرنا ایک طرح کی زیادتی ہے۔

ذاتِ الٰہی اور نفسِ کلیہ کے درمیان جو تعلق ہے، اس کی حقیقت کو سمجھانے کے لئے یہاں ایک مثال دی جاتی ہے۔ ذاتِ الٰہی اور نفس کلیہ میں وہی نسبت ہے جو چار کے عدد اور جوڑے میں ہوتی ہے۔ چنانچہ جب ہم چار کے عدد کو اس کے اصلی مرتبے میں جہاں وہ بحیثیت چار کے بذاتِ خود قائم ہے، دیکھتے ہیں تو سوائے چار کے وہاں اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ لیکن اس کے بعد جب اس کو خالص چار کے عددی مرتبے سے نیچے دیکھا جاتا ہے اور گو اس مرتبے میں باہر سے کوئی اور چیز اس میں ضم نہیں ہوتی تو یہ چار ہمیں دو جوڑے نظر آتے ہیں۔ بہر حال اس طرح چار کے عدد کے دو مرتبے ہوئے۔ ایک خالص چار کا مرتبہ اور دوسرے دو اور دو چار کا مرتبہ۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ''دو اور دو'' نام ہے اس حقیقت کا جو چار ہے تو اس شخص کی یہ بات بے جا نہ ہوگی اور فرض کیا اگر وہ ''دو اور دو'' کو چار کا عنوان بنائے تو یہ چیز بھی ممکن ہے۔

اب اگر اس مرتبے سے ایک درجہ نظر اور نیچے اُترے اور وہ چار کو اس مرتبے میں دیکھے جہاں چار کا خالص عدد چار کے نام سے مخلوط ہے تو بے شک اس نام کو جو کہ چار کے عدد پر دلالت کرتا ہے، ہم چار کی صفت کہیں گے اور اگر نظر اس سے بھی ایک درجہ اور نیچے اترے اور وہ دیکھے کہ کس طرح ''چار ہونا'' یعنی چار کے عدد کی صفت، اپنے وجود کے لئے موصوف یعنی چار کے عدد کی محتاج ہے اور اس موصوف کا صفت سے مقدم ہونا اور پھر اس موصوف کا صرف اپنی صفت ہی کے ذریعے سے قیام پذیر ہونا نظر کے سامنے آ جائے۔ اس وقت ہم چار کے عدد کو ''مبدِع یا جاعِل'' یعنی ابداع کرنے والا، دوسرے لفظوں میں

بنانے والا کہیں گے اور ''دو اور دو'' یعنی جفت کو چار کے عدد کا ''مُبدَع'' اور ''مجعول'' یعنی پیدا کردہ قرار دیں گے۔

اگر ہم چار کے عدد کو عام اور مطلق اور جفت کو خاص اور مقید مانیں اور اس ضمن میں دونوں میں تناقض اور تصادم کا خیال بیچ میں نہ لائیں تو اس صورت میں جفت چار کے عدد کا ایک تعین اور مظہر ہوگا۔ الغرض نفس کلیہ اور ذاتِ الٰہی کے درمیان ایک ایسی نسبت ہے جو بسیط ہونے کی وجہ سے ان تمام القاب اور ناموں سے موسوم ہو سکتی ہے۔ آپ جس جہت سے اس نسبت کو دیکھیں گے اسی اعتبار سے آپ اس کو نام دیں گے۔ چنانچہ ذاتِ الٰہی اور نفس کلیہ میں جو نسبت ہے، اس کو مختلف ناموں اور القاب سے تعبیر کرنے کا باعث دراصل اس نسبت کو مختلف جہتوں سے دیکھنا ہے۔

اب جو لوگ وحدتِ وجود کے قائل ہیں۔ اگر اس سے ان کی مراد نفسِ کلیہ کی وحدت ہے تو ان کی یہ بات درست ہوگی اور جو شروع شروع میں تو یہ ہوتا ہے کہ سالک وجود کے ہر شے میں جاری اور ساری ہونے کا ادراک کرتا ہے لیکن آہستہ آہستہ یہ ادراک ملکہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ سالک اس ملکہ کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ یہ ملکہ جب اپنے کمال کو پہنچتا ہے تو اس کے دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک ظاہری رخ اور دوسرا باطنی رخ۔ وجود کے اس علم کا یہ رنگ اور اس کا یہ ملکہ صرف سالک کے نسمہ میں جاگزیں ہوتا ہے اور اس کا اثر نسمہ سے آگے نہیں بڑھتا تو یہ اس کمال کا ظاہری رخ ہے اور اس کا باطنی کمال یہ ہے کہ سالک کے اندر نسمہ سے پرے جو نقطہ وجود ہے، وہ نہ صرف خود اپنے تمام آثار و احوال کے ساتھ بیدار ہو بلکہ اس کے اس نقطے سے بیداری کے اثرات و احکام بھی رونما ہوں۔ نیز سالک کی نظر سے تعینات کے سب پردے اٹھ جائیں۔ راہِ طریقت کے سالکوں میں سے جو غیر کامل ہوتے ہیں، وہ تو اس ضمن میں صرف ظاہری کمال تک ہی پہنچ پاتے ہیں اور باطنی کمال سے آشنا نہیں ہوتے۔ گویا کہ وہ وجود کے اس علم کی صورت کو تو پا لیتے ہیں لیکن اس کے معنی کو نہیں جان سکتے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک شخص اپنی سوچ بچار سے یا عارفوں کی تقلید میں اس نتیجے پر پہنچا کہ تمام اشیاء ایک وجود میں فنا پذیر ہیں اور یہ وجود سب اشیاء میں جاری و ساری بھی ہے۔ اب وہ بار بار اس نتیجے کو اپنے ذہن میں حاضر کرتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ چیز اس کے اندر ایک ملکہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور وہ اس ملکہ کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ گو اس کا نقطہ وجود بیدار نہیں ہوتا۔ غرضیکہ علم وجود کی یہ ساری کشش اور اس کی دھن میں سالک کی یہ تمام محویت اسے اس مرتبے تک نہ پہنچا سکی جہاں کہ اس علم کا ملکہ سالک کے اصل نفس اور اس کی جڑ میں جاگزیں ہو جاتا۔ اس سالک کی مثال اس تالاب کی سی ہے کہ وہ سیلاب کے پانی سے بھر گیا لیکن اس میں زمین کے مسامات سے پانی نہیں پھوٹا۔ سالک کا اس طرح وجود کو ایک ماننا ''توحیدِ علمی'' کہلاتا ہے اور علمِ وجود کی پہلی شکل جبکہ یہ علم سالک کے نسمہ سے پرے اس کے اندر جو نقطہ وجود ہے، اسے بیدار کر دیتا ہے، ''توحید حالی'' کہلاتی ہے۔

فقیر کو اس حقیقت سے بھی آگاہ کیا گیا ہے کہ بعض لوگوں کے لئے ''توحید علمی'' نفع مند نہیں ہوتی بلکہ اس سے الٹا انہیں نقصان ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ بیکار کی دلیل بازی جسے سوفسطائیت کہتے ہیں اس ''توحیدِ علمی'' سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی ''توحید علمی'' کی وجہ سے لوگ شرعی اور عُرفی احکام و مصالح میں تساہل کے مرتکب ہوتے ہیں۔ باقی رہا ''توحید حالی'' کا معاملہ، تو ''توحید حالی'' تو ایک بہت بڑا کمال ہے کہ زبان اس کے مطالب کو ادا کرنے سے عاجز ہے۔ ذالک

فضل اللہ یوتیہ من یشاء ط

حاشیہ

(1) ذاتِ الٰہی سے کائنات کے تنزل کی صورت یوں بیان کی جاتی ہے۔ ایک مقام تو خود ''ذات'' کا بحیثیت ذات کے ہے۔ اس مقام پر ہر شرط کی نفی کے ساتھ ذات کو اپنی ذات کا ادراک ہوتا ہے۔ یہاں سے تنزلات کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس میں پہلا مرتبہ ''احدیت'' کا ہے اور ''احدیت'' کے بعد ''واحدیت'' کا مرتبہ ہے۔ اس ''واحدیت'' کو ''باطن الوجود'' بھی کہتے ہیں۔ ''باطن الوجود'' سے وجودِ منبسط کا ظہور ہوا جس کا دوسرا نام ''ظاہر الوجود'' بھی ہے۔ اس مرتبہ ظاہر الوجود کو ''نفس کلیہ'' کا نام دیا گیا ہے۔ ''نفس کلیہ'' سے ارواح، امثال اور اجساد ظاہر ہوئے۔

☆☆☆

توحیدِ افعالی۔ توحیدِ صفاتی۔ توحیدِ ذاتی

سلوک کی آخری منزل حقیقتِ توحید کا ایقان ہے۔ تصوف میں توحید کا مسئلہ سب سے نازک سمجھا جاتا ہے اور مسلمان صوفیا کے ہاں یہ مسئلہ صدیوں سے زیرِ بحث رہا ہے۔ سالک راہِ سلوک طے کر کے ایک منزل پر پہنچتا ہے تو اس پر توحید کی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

راہِ طریقت کے ان مراحل کو طے کرنے کے بعد جب سالک اپنے اندر ایک حد تک بے نشانی یا ''بے رنگی'' کی حقیقت پا لے تو اس کے سامنے دو راہیں کھلتی ہیں۔ ایک ''جذب'' کی راہ اور دوسری ''سلوک'' کی راہ۔ اس مقام پر مرشد کو اختیار ہے کہ اگر مناسب سمجھے تو سالک کو ''جذب'' کے راستے پر چلائے اور اگر چاہے تو اسے ''سلوک'' کے راستے پر ڈال دے۔ اس میں شک نہیں کہ تمام اکابر مشائخ کے نزدیک ''صاحبِ جذب'' کو ''صاحبِ سلوک'' پر ترجیح حاصل ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر راہ نوردِ طریقت کو بلا استثنا ''سلوک'' کے بجائے ''جذب'' کی راہ پر چلانا چاہیے۔ بعض سالک ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی طبیعت کو ''راہ سلوک'' سے زیادہ مناسبت ہوتی ہے۔ اس لئے ان کے ''سلوک'' ہی کی راہ قابل ترجیح ہو گی لیکن بعض سالک ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کی طبعی استعداد ''جذب'' کا تقاضا کرتی ہے۔ چنانچہ ان کے لئے ''جذب'' کا طریقہ اچھا رہتا ہے۔

جذب سے یہاں وہ کیفیت مراد نہیں جس سے کہ سالک کا دل عالمِ غیب کی طرف یکسر متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس کے دماغ سے اِدھر اُدھر کے خیالات بالکل نکل جاتے ہیں۔ اس کی عقل اپنا کام کرنا چھوڑ دیتی ہے اور وہ شریعت کے احکام اور معاشرت کے آداب سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ یہاں ''جذب'' سے مراد وہ حالت ہے جس میں کہ وجود کے تعینات کے پردے جن کا سلسلہ اس کائنات سے لے کر ذاتِ باری تک جو حقیقۃ الحقائق ہے، پھیلا ہوا ہے۔ سالک کی نظروں کے

سامنے سے ہٹ جاتے ہیں۔ چنانچہ اس ''جذب'' ہی کے طفیل انسانی ''انا'' میں یہ استعداد پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اس مقام اصلی کی طرف لوٹ جاتا ہے جو اس ''انا''[1] کا مبدائے اول ہے اور جہاں سے کہ اس ''انا'' کا صدور ہوا ہے۔ غرضیکہ ''جذب'' سے سالک کی نظروں میں اجزائے وجود تحلیل ہو جاتے ہیں اور ان کے سامنے سے تعینات وجود کے پردے اٹھ جاتے ہیں۔

باقی رہا ''سلوک''..... سو اس سے مراد خضوع، طہارت اور عشق وغیرہ کی نفسی کیفیات میں سالک کو اپنے آپ کو رنگنا یا ان کیفیات کو اپنے اندر پیش کرنا ہے۔

توحید افعالی

''جذب'' کے حصول کا طریقہ یہ ہے: سالک جب اجمالی طور پر عالمِ غیب سے آشنا ہو جائے تو مرشد کو چاہیے کہ اس سے زبانی یا قلبی ذکر بکثرت کرائے۔ اس دوران سالک اپنی چشمِ بصیرت کو عالمِ غیب کی طرف برابر لگائے رکھے اور وہ اپنے دل کو بھی پوری طرح اِدھر متوجہ کر دے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر چند روز عالمِ غیب کی طرف اس طرح توجہ کرے گا تو یقیناً اس پر ''توحید افعالی'' کی حقیقت منکشف ہو جائے گی اور وہ محض فکر یا خیال سے ''توحید افعالی'' کی حقیقت کا ادراک نہیں کرے گا بلکہ اس پر یہ حالت طاری ہو جائے گی کہ وہ کل عالم اور اس کی تمام حرکت اور نمو کو ایک حقیقت سے بھی بے خبر نہ رہنا چاہیے کہ اصل کی اس ''بے رنگی'' اور بعد میں اس نے مختلف مظاہر میں جو الگ الگ صورتیں اور گونا گوں رنگ اختیار کیے ہیں، ان دونوں حالتوں میں کوئی تضاد نہیں۔ نیز اصل کی یہ ''بے رنگی'' اس امر میں مانع نہیں کہ یہی اصل بعد میں مختلف صورتوں اور مختلف رنگوں میں ظہور پذیر ہو لیکن سالک کو ایک ہی اصل کی یہ ''بے رنگی'' اور ''ہمہ رنگی'' محض غور و فکر کے ذریعے نہیں بلکہ وجدانی طور پر اور بداہتہً مشاہدہ کرنی چاہیے۔

بہر حال ایک ہی اصل کو وجود کے ہر مظہر میں دیکھنا یا تو غور و فکر کے ذریعے ہوتا ہے یا وجدانی طور پر اور بداہتہً اور اصل کے مشاہدے کے یہ دونوں مقام باہم ملے جلے ہیں۔ جہاں ایک ختم ہوتا ہے، وہیں سے دوسرے مقام کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس راہ میں بعض سالک ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ ساری عمر مشاہدہ فکری کے مقام میں رہتے ہیں اور اس سے آگے کبھی ان کو ترقی نصیب نہیں ہوتی لیکن جو سالک قوی المحبت اور ذکی الذہن ہو، وہ ان حالات کے بعد پوری طرح اس ایک اصل کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے جس سے کہ ہر چیز ظہور پذیر ہوتی ہے۔ وہ مختلف صور اور اشکال کی طرف مطلق التفات نہیں کرتا اور وجود کی کثرت اور مظاہر کی بوقلمونی سے اپنی نظر اس طرح پھیر لیتا ہے گویا وہ انہیں بالکل بھول ہی گیا۔

توحید ذاتی

خدا تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کے لئے یہ مقدر ہو چکا ہے کہ وہ اپنے ''انا'' میں جو عبارت ہے ان کی ''ہُویت''[2] سے ''توحید صفاتی'' کا جلوہ دیکھیں یعنی ان کے لئے ان کا یہ ''انا'' آئینہ بنتا ہے۔ اس اصل کا جس نے کہ مختلف مظاہرِ کائنات میں ظہور فرمایا ہے۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ جب سالک اپنے ''انا'' پر نظر کرتا ہے تو اس کی نظر اپنے ''انا''

تک رک نہیں جاتی بلکہ وہ اس ''انا'' کے واسطے سے اصل وجود تک جو سب ''اناؤں'' کا مبدائے اول ہے' پہنچ جاتی ہے۔ جب سالک اس مقام پر پہنچتا ہے تو اس کی نظر میں صرف اصل وجود ہی رہ جاتا ہے اور یہ تمام کے تمام مظاہر واشکال بیچ میں سے غائب ہو جاتے ہیں۔ یہ ''توحید ذاتی'' کا مقام ہے لیکن جہاں کہیں ذوقِ ازلی کے ضمن میں ''توحید ذاتی'' کا نام آتا ہے تو اس سے مراد ایک ایسی کیفیت ہوتی ہے جو اُچک لینے والی بجلی کی طرح چمکتی ہے۔ پھر چشم زدن میں غائب ہو جاتی ہے۔ بہرحال یہاں ہم جس ''توحید ذاتی'' کا ذکر کر رہے ہیں۔ یہ سلوک کے مقامات میں سے ایک مقام ہے جہاں کہ سالک آ کر قرار پذیر ہوتا ہے۔

عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ سالک پہلے ''توحید افعالی'' کی نسبت حاصل کرتا ہے۔ پھر اس سے ''توحید صفاتی'' کے مقام پر پہنچتا ہے اور وہاں سے وہ ''توحید ذاتی'' کا مرتبہ حاصل کرتا ہے لیکن بعض سالک ''توحید افعالی'' سے براہِ راست ایک جست میں ''توحید ذاتی'' تک پہنچ جاتے ہیں اور انہیں اس راہ میں ''توحید صفاتی'' سے گزرنا نہیں پڑتا لیکن یہ چیز بہت کم سالکوں کے حصے میں آتی ہے تو پھر وہ بلا تاخیر ''بے نشانی'' ''یادداشت'' اور ''ذکر خفیہ'' کی نسبت کو پہنچ جاتا ہے۔ اس نسبت کی حقیقت یہ ہے کہ سالک حقیقۃ الحقائق یعنی ذات باری کی طرف کلیتہً ملتفت ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سالک جب اس مقام تک پہنچ جائے تو اسے چاہیے کہ وہ کچھ مدت اس مقام میں ٹھہرے۔ اپنے آپ کو ہر خیال اور ہر جہت سے مجرد کر کے پوری ہمت سے زیادہ سے زیادہ ریاضت اور وظیفہ کرے اور ''نسبت بے نشانی'' کی اصل حقیقت کی طرف اس طرح متوجہ ہو کہ اس پر یہ بات منکشف ہو جائے کہ یہی ایک حقیقت ہے جس سے ایک ''خاص تعین'' نے صادر ہو کر سالک کی ''ہُویت'' یعنی اس کے ''انا'' پر نزول کیا۔ نیز اس کے ''انا'' پر حقیقت ازلی کے اس ''تعین خاص'' کے نزول ہی کا نتیجہ ہے کہ اسے بقا حاصل ہوتی ہے۔ یہ مقام ''راہِ جذب'' کی آخری منزل ہے۔

اس ضمن میں چند نکات کا جاننا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ جب سالک پر اس قسم کی وحدت منکشف ہو جائے تو اسے یقین کر لینا چاہیے کہ اس کی ''جذب'' کی راہ طے ہو چکی۔ خواہ وہ اس مرحلے پر ''توحیدِ وجودی'' کا معتقد ہو یا نہ ہو۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سالک ''توحیدِ افعالی'' سے ''توحید صفاتی'' حاصل کرتا ہے۔ اس منزل سے جب وہ آگے بڑھتا ہے تو ''توحید ذاتی'' میں پہنچتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر وہ اس معاملے کی توجیہ یوں کرتا ہے کہ پہلے میں مغلوبیت کی حالت میں تھا اور میں نے ذاتِ واجب کو جو ہر شے کی قیوم ہے ''ممکن'' کے ساتھ ''اتحاد'' کی نسبت دے دی تھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ کوئی شخص خواب میں درندے کو دیکھتا ہے اور وہاں اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ وہ خواب دیکھنے والے کی اپنی عصبی قوت ہوتی ہے جو اسے درندے کی شکل میں نظر آتی ہے۔ سالک جب اس مقام سے ترقی کرتا ہے تو پھر یہ حقیقت اس کے لئے بالکل منزہ ہو جاتی ہے اور اس وقت وہ سمجھ جاتا ہے کہ ''تشبیہ'' کے مقام سے وہ ''تنزیہ'' کے مقام میں پہنچ گیا ہے اور ''تشبیہ'' سے اس نے خلاصی حاصل کر لی۔ اب ایک اور سالک ہے۔ اس کو بھی یہی کیفیت پیش آتی ہے۔ وہ اس کی توجیہ اس طرح کرتا ہے کہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کائنات کے ہر ذرے میں ذات باری کا جلوہ جاری وساری ہے۔ اب جو میں نے ''ذاتِ واجب'' کو ''ممکن'' کے ساتھ بصورتِ ''اتحاد'' دیکھا تو یہ ایک پردہ ہوا دوسرے پردے کا جسے فقط میری نظر دیکھتی ہے ورنہ جہاں تک اصل کا تعلق ہے' وہ ان سب تشبیہات سے منزہ ہے۔

ان نکات میں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ یہ راہ سب کے نزدیک مسلم ہے اور اولیائے کاملین سے ہر ایک کو اس راہ سے گزرنا پڑتا ہے۔ گو ان مقامات کی تعبیر میں ان میں آپس میں اختلاف ہے۔

عبار اتنا شتی و حسنك واحد
کل الی ذاك الجمال یشیر

لیکن قوی المعرفت اور ذکی الذہن آدمی اگر چاہے تو ان اولیا کے کلام کا حاصل مطلب سمجھ سکتا ہے اور ان کی تعبیرات میں جو اختلافات ہیں' سب کو ایک اصل کی طرف مرکوز بھی کر سکتا ہے۔ مزید برآں اولیا میں آپس میں محض تعبیرات کا اختلاف نہیں ہوتا بلکہ اس راہ کو طے کرنے کے معاملات میں بھی ان میں اختلاف ہوتا ہے۔ بعض ایک مقام پر تھوڑی دیر رکتے ہیں اور بعض کو زیادہ دیر وہاں ٹھہرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح جیسے جیسے ان کی استعداد ہوتی ہے' اسی کے مطابق ان کو مختلف احوال اور واقعات بھی پیش آتے ہیں۔

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ اس فقیر کو بتایا گیا ہے کہ شریعت میں ''سلوک'' کی راہ کی توضاحت کی گئی ہے لیکن ''راہِ جذب'' کو بیان نہیں کیا گیا۔ جس طرح کہ شریعت میں اسم اعظم اور لیلۃ القدر کی تصریح نہیں کی گئی لیکن اس کے باوجود جو لوگ شارع علیہ السلام کے اقوال کو ''راہِ جذب'' پر محمول کرتے ہیں تو ان کی مثال ایسی ہے جیسے کہ کوئی علم النحو کی مشہور کتاب کافیہ ابن حاجب سے تصوف کے قوانین اخذ کرے۔ باقی رہا راہِ سلوک کا معاملہ سو اس کا لب لباب یہ ہے کہ سالک اچھے ملکات میں سے کوئی ملکہ اپنے اندر اس طرح پیدا کرے کہ وہ ملکہ اس کی روح کا پوری طرح احاطہ کرے اور سالک اس کی رنگ میں اس طرح رنگا جائے کہ اس کا جیسا ہو تو اسی حال میں' اور وہ مرے تو اسی حال میں مرے۔

چو میرد مبتلا میرد جو خیزد مبتلا خیزد

اس راہ میں جو کیفیت اور حالت سالک کے نفس میں اس طرح جاگزین ہو جاتی ہے۔ گویا کہ وہ اس کی ذات کے لئے لازمی خصوصیت بن گئی' اسے ''نسبت'' کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے اولیاء کے بہت سے مسلک ہیں۔ اس سلسلے میں فقیر نے باطنی طور پر عالمِ ارواح کی طرف توجہ کی اور تصوف کے ہر طریقے کی جدا جدا نسبت کا ادراک کیا۔ یہ نسبتیں کیسے حاصل ہوں۔ میں نے یہ چیز بھی بذریعۂ الہام معلوم کی۔ (ہمعات)

حواشی

(1) ''انا'' جو فردِ انسانی میں شعورِ ذات کا مظہر ہے۔ یہ انسانی ''انا'' نفسِ کلیہ سے صادر ہوتا ہے اور نفسِ کلیہ کی مثال یوں سمجھیے جیسا کہ فرد کا ایک انسانی ''انا'' ہے۔ اسی طرح نفسِ کلیہ کل کائنات کا ''انا'' ہے۔ نفسِ کلیہ سے اوپر اسمائے الٰہی کے مدارج ہیں اور ان کے اوپر ذاتِ بحت کا درجہ ہے۔ ''انا'' کو نیچے سے اوپر اپنے اصل مقصود کی طرف واپس لے جانا اس ''جذب'' کا مقصود ہے۔

(2) یہ بُو سے مشتق ہے۔ مراد شخصیت

☆☆☆

عقیدۂ وحدت الوجود

شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک عقیدۂ وحدت الوجود علومِ حقہ میں سے ہے لیکن جو اسے مان کر ذاتِ حق کی ماورائیت اور تنزیہہ کامل کو قائم نہ رکھ سکیں' انہیں اس سے بچنا چاہیے۔ اس حقیقت کو شاہ صاحب نے ایک مکاشفہ کے رنگ میں فیض الحرمین میں یوں بیان کیا ہے:

میں نے خواب میں دیکھا کہ اللہ والوں کی ایک بہت بڑی جماعت ہے اور ان میں ایک گروہ ذکر واذکار کرنے والوں اور نسبتِ یادداشت [1] کے حاملوں کا ہے۔ ان کے دلوں پر انوار جلوہ گر ہیں اور ان کے چہروں پر تروتازگی اور حسن و جمال کے آثار نمایاں ہیں اور یہ لوگ عقیدہ وحدت الوجود کے قائل نہیں۔

میں نے دیکھا کہ اللہ والوں کی اس جماعت میں ایک دوسرا گروہ بھی ہے' جو عقیدۂ وحدت الوجود کو مانتا ہے۔ کائنات میں ذاتِ باری کے وجود کے جاری وساری ہونے کے متعلق وہ کسی نہ کسی شکل میں غور وفکر کرنے میں مشغول بھی ہے اور چونکہ اس غور وفکر کے ضمن میں ان سے ذاتِ حق کے بارے میں جو کُل عالم کے انتظام میں بالعموم اور نفوسِ انسانی کی تدبیر میں بالخصوص مصروفِ کار ہے' کچھ تقصیر ہوئی ہے' اس لئے میں نے دیکھا کہ ان لوگوں کے دلوں میں ایک طرح کی ندامت ہے اور ان کے چہرے سیاہ ہیں اور ان پر خاک اڑ رہی ہے۔

میں نے ان دونوں گروہوں کو آپس میں بحث کرتے پایا۔ ذکر واذکار والے کہہ رہے تھے کہ کیا تم ان انوار اور اس حسن وتازگی کو نہیں دیکھتے جن سے ہم بہرہ یاب ہیں اور کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ ہمارا طریقہ تم سے زیادہ ہدایت یافتہ ہے۔ ان کے خلاف عقیدہ وحدت الوجود کے قائل کہہ رہے تھے کہ کیا ذاتِ حق میں کل موجودات کا سما جانا یا گم ہو جانا امرِ واقعہ نہیں۔ اب صورت یہ ہے کہ ہم نے اس راز کو پا لیا جس سے تم بے خبر رہے' ظاہر ہے کہ اس معاملے میں تم پر ہمیں فضیلت حاصل ہے۔

ان دونوں گروہوں میں اس بحث نے جب ایک طویل نزاع کی شکل اختیار کر لی تو انہوں نے مجھے اپنا حاکم بنایا اور اس مسئلہ کو فیصلے کے لئے میرے سامنے پیش کیا۔ میں نے ان کا حاکم بننا منظور کیا اور اس ضمن میں میں نے یوں گفتگو کی:

بات یہ ہے کہ علومِ حقہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ علوم جن سے نفوس کی تہذیب واصلاح ہوتی ہے اور دوسرے وہ علوم جن سے نفوس کی اصلاح نہیں ہوتی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نفوسِ انسانی میں الگ الگ استعدادیں ودیعت فرمائی ہیں اور ان نفوس میں سے ہر ہر نفس اپنی اپنی استعداد کے مطابق علومِ حقہ کا ذوق رکھتا ہے۔ چنانچہ جب کوئی نفس علوم حقہ میں سے ان علوم میں جو خاص اس کے ذوق کے مطابق ہوتے ہیں اور ان سے اس کی طبیعت کو مناسبت ہوتی ہے' پوری طرح مستغرق ہو جاتا ہے تو اس کی وجہ سے اس نفس کی تہذیب واصلاح ہو جاتی ہے۔ بے شک وحدت الوجود کا یہ مسئلہ جو اس وقت ما بہ النزاع ہے' واقعہ یہ ہے کہ علوم حقہ میں سے ہے لیکن بات دراصل یہ ہے کہ تم دونوں کے دونوں گروہ نہ تو اس کے اہل تھے اور نہ یہ چیز تمہارے ذوق اور مشرب کے مطابق تھی۔ اس لئے تمہارا مسلک یہ ہونا

چاہیے کہ جس طرح ملاءِ اعلیٰ کے فرشتے بارگاہِ حق میں تضرع و نیاز مندی کرتے ہیں۔ تم بھی ان کی طرح وجودِ باری کی اس حقیقت کی طرف جو سب کو جامع ہے' یکسر متوجہ ہو جاتے۔

اب رہا ذکر و اذکار والے اصحابِ انوار کا معاملہ.... سو بات یہ ہے کہ گو وہ مسئلہ وحدت الوجود سے تو بے خبر رہے' لیکن علومِ حقہ میں سے وہ علوم جو خود ان کے ذوق اور مشرب کے مطابق تھے' وہ انہیں حاصل کرتے تھے اور ان کی وجہ سے ہی ان کے نفوس کی تہذیب و اصلاح ہو گئی۔ چنانچہ جس درجہ کمال تک پہنچنے کی استعداد لے کر وہ پیدا ہوئے تھے' اسی طرح وہ اس درجہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ باقی رہا وحدت الوجود پر اعتقاد رکھنے والوں کا معاملہ تو گو اس میں اصل حقیقت تک تو ان کی رسائی ہو گئی لیکن علومِ حقہ میں سے وہ علم جن سے ان کی طبیعت کو قدرتی مناسبت تھی' وہ انہیں نصیب نہ ہوئے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب انہوں نے اپنے خیالات کو فکر کی اس وادی میں جہاں کہ یہ سوال درپیش ہوتا ہے کہ موجوداتِ عالم میں وجودِ حق کس طرح جاری و ساری ہے' بے عنان چھوڑا تو اس کے ہاتھ سے ذاتِ حق کی تعظیم' اس سے محبت اور موجودات سے اس کے ماورا اور منزہ ہونے کا سررشتہ چھوٹ گیا اور دراصل یہی وہ سررشتہ ہے جس کے ذریعے ملاءِ اعلیٰ کے فرشتوں نے اپنے رب کو پہچانا اور ان سے افلاک [2] کی قوتوں نے اپنی فطری استعداد کی بنا پر عرفانِ الٰہی کے اس سررشتہ کی وراثت پائی اور پھر آگے چل کر اس عالم کی یہ ساری فضا ان کی معرفت سے بھر گئی۔ اب جو نفوس ذاتِ حق کی تعظیم' اس کے ساتھ محبت اور موجودات سے اسے منزہ ماننے کی اس معرفت کے وارث نہ ہوئے تو اس کی وجہ سے نہ تو ان کی تہذیب و اصلاح ہو سکی اور نہ وہ اپنے مقصدِ حیات ہی کو پا سکے۔

الغرض سے وحدت الوجود کو ماننے والو! اور وجودِ حق کو موجوداتِ عالم میں جاری و ساری جاننے والو! تم میں سے اس گروہ نے اس راز کو زبان سے نکالا جو اس کا اہل نہ تھا اور وہ گروہ جس کے مشرب اور ذوق کے مطابق یہ علم تھا' وہ خاموش رہا۔ اب تم میں بعض ایسے مسخ شدہ لوگ ہیں جو اس راز سے بالکل بے خبر ہیں۔ اس ضمن میں حصول کمال کے لئے عقل و خرد کی صلاحیتوں کی ضرورت ہے اور وہ نتیجہ ہوتی ہے فلکی [3] عناصر کی تاثیرات کا' وہ تم میں سرے سے غائب ہیں۔ ان حالات میں قدرتی بات تھی کہ وحدت الوجود کے اس مسئلے کی وجہ سے تمہارے دلوں میں ندامت اور تمہارے چہروں پر ندامت ہوتی ہے۔ حقیقت میں اس راز کا اہل تو وہ شخص ہے جس میں عقل و خرد کی یہ صلاحیتیں برومند اور تر و تازہ ہوں اور اس عالم میں مظاہر و اشکال کے جو تہ بہ تہ حجابات ہیں۔ ہیں' انہوں نے اس کی ان صلاحیتوں کو بے اثر نہ کر دیا ہو۔

میں نے اتنا کہا تھا کہ وہ اس مسئلے کو سمجھ گئے اور انہوں نے اس کا اعتراف بھی کر لیا۔ پھر میں نے ان کو بتایا کہ یہ وہ اسرار ہیں جو خاص طور پر مجھے رب کی طرف سے عطا فرمائے گئے تا کہ میں اس معاملے میں تمہارے ان اختلافات کو حل کر سکوں۔ باقی تعریف تو ساری کی ساری اللہ ہی کے لئے ہے جو سب جہانوں کا پروردگار ہے۔

حواشی

(1) ''یادداشت'' عبارت ہے ذات واجب الوجود کی طرف خالص توجہ کرنے سے ایسی توجہ جو الفاظ اور تخیلات سے مجرد ہو۔

(2) یونانی فلسفہ میں افلاک کو اس دنیا میں مؤثر مانا جاتا تھا۔ انہیں سے یہ خیال مسلمانوں میں بھی پھیلا۔
(3) قدیم حکمت میں انسانوں کی بعض خصوصیات اور استعدادات کو فلکی عناصر یعنی نجوم و کواکب کی تاثیرات کا نتیجہ مانا جاتا ہے۔

☆☆☆

خلافت و ریاست

شاہ ولی اللہ صاحب اپنی ضخیم کتاب ''ازالۃ الخفاعن خلافۃ الخلفا'' کی وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''اس زمانے میں بدعتِ تشیع[1] آشکار ہوگئی ہے۔ عوام کے دل ان شبہات سے متاثر ہو گئے ہیں اور اس ملک کے اکثر لوگ خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی خلافت کے اثبات میں شک کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ توفیق الٰہی کی روشنی نے اس بندۂ ضعیف کے دل میں ایک علم کو واضح و مبسوط کیا ہے جس سے یقین کے ساتھ یہ معلوم ہوا کہ ان بزرگوں کے ساتھ ساتھ خلافت کا اثبات اصولِ دین میں سے ہے۔ جب تک کہ اس اصول کو مضبوطی سے نہ پکڑا جائے، مسائل شریعت میں سے کوئی مسئلہ مضبوط نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ اکثر احکام جو قرآن عظیم میں مذکور ہیں، مجمل ہیں۔ سلف صالح کی تفسیر کے بدون ان کا حل نہیں ہوسکتا۔ اکثر احادیث خبر واحد ہیں کہ وضاحت کی محتاج ہیں۔ سلف کی ایک جماعت سے ان احادیث کی روایت اور ان سے مجتہدین کے استنباط کے بغیر یہ یا قابل تمسک نہیں ہوسکتیں اور نہ ان بزرگوں کی کوشش کے بغیر متعارض حدیثوں میں تطبیق کی کوئی صورت ہو سکتی ہے۔ اس طرح تمام علوم دینیہ جیسے علم قرأت و تفسیر و علم سلوک ہیں۔ ان بزرگوں کے اقوال کے بغیر پائیدار نہیں ہو سکتے۔ ان امور میں سلف کے لئے قابلِ اتباع تو خلفائے راشدین ہی تھے اور سلف نے انہیں کا دامن پکڑا تھا۔ جمعِ قرآن اور قرأت شاذ سے قرأتِ متواتر کی معرفت خلفا ہی کی کوششوں پر مبنی ہے اور قضا حدود ذا حکام وغیرہ انہی کی تحقیق پر مرتب ہوئے۔ لہٰذا جو شخص اس اصل کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے، وہ درحقیقت تمام دینی علوم کو مٹانا چاہتا ہے۔''

(''توفیق الٰہی کی روشنی نے اس بندۂ ضعیف کے دل میں جس علم کو واضح و مبسوط کیا ہے) اسی سے معلوم ہوا کہ مدبر السمٰوت والارض نے جس طرح ازل الازال میں شریعت کی تمام باتوں کو پہلے کلام نفسی کے مرتبہ میں معین کیا۔ اس کے بعد حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر کبھی اجمالاً اور کبھی تفصیلاً نازل کیا۔ پھر آپؐ نے کبھی صراحتاً اور کبھی اشارتاً ان تمام شرائع کو بیان فرما دیا۔ یہاں تک کہ جو مقصود حق تعالیٰ کا تھا، ظاہر ہوگیا۔ اللہ کی حجت قائم ہوگئی اور ان تمام باتوں پر اعتقاد لانے اور عمل کرنے کے لئے بندوں کا مکلف ہونا واضح ہو گیا۔ اسی طرح خلفائے

راشدین کی خلافت پہلے کلام نفسی میں مقرر ہوئی اور قرآن مجید میں اجمالاً نازل ہوئی اور کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحتاً اور اشارتاً اس کی خبر دے دی۔ یہاں تک کہ ان بزرگوں کی خلافت پر اعتقاد لانے اور عمل کرنے کے لئے بندوں کا مکلف ہونا متحقق ہو گیا۔ برخلاف اس کے متاخرین اشاعرہ کہتے ہیں کہ خلفائے راشدین کی خلافت پر کسی قسم کی نص نہیں ہے (نہ جلی نہ خفی) یا نص (تو ہے مگر) جلی نہیں ہے بلکہ ان کی خلافتیں امرِ اجتہادی ہیں کہ اس زمانے کے لوگوں نے اپنے اجتہاد سے ان پر اتفاق کر لیا۔
اسی کے برخلاف شیعہ خیال کرتے ہیں کہ قرن اول میں ظلم عظیم ہوا۔ لوگوں نے طلبِ دنیا کے لئے خلافت کو مستحق سے غصب کر کے غیر مستحق پر اتفاق کر لیا۔"
غرض شاہ ولی اللہ صاحب کی یہ کتاب گو اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک لحاظ سے نزاعی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے پیش نظر بقول ان کے "بدعتِ تشیع" ہی کا رد ہے لیکن اس ضمن میں انہوں نے شریعت حقہ کے اصول و مبادی کے متعلق بھی ایسے امور بیان فرمائے ہیں جن کی اپنی ایک مستقل حیثیت ہے اور فکر ولی اللہی کی تعیین میں ان سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ ان صفحات میں شاہ صاحب کے ان ارشادات کو فرقہ وارانہ نزاع سے قطع نظر کرتے ہوئے سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔

خلافت کی ضرورت اور شرائط

شاہ صاحب فرماتے ہیں:
"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تمام خلق اللہ کے لئے مبعوث ہوئے تو آپؐ نے ان کے ساتھ معاملات کیے۔ ہر معاملے کے لئے اپنے نائب مقرر کیے اور ہر معاملے کا خاص اہتمام فرمایا۔ جب ہم ان معاملات پر غور کرتے ہیں، جزئیات سے کلیات کی طرف اور کلیات سے کلی واحد کی طرف جو سب کو شامل ہیں، منتقل ہوتے ہیں تو ان سب کی جنس عالی اقامتِ دین ہے جو سب کلیات کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے اور اس کے تحت دوسری اجناس ہیں۔ ان اجناس میں سے ایک علوم دین کا احیا ہے، جیسے قرآن و سنت کی تعلیم اور وعظ کی نصیحت اور دوسری جنس ارکانِ اسلام کا قیام ہے کیونکہ یہ ثابت شدہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ، عیدین اور نماز پنج وقتہ کا اہتمام فرماتے۔ ہر مقام پر امام مقرر کرتے، زکوٰۃ وصول کرتے، اسے صرف کرتے اور ان کاموں کے لئے عامل مقرر فرماتے تھے۔ آپؐ کا جہاد کرنا، سردار مقرر کرنا، لشکر بھیجنا، تنازعات کا فیصلہ کرنا، بلادِ اسلام میں قاضیوں کو مقرر کرنا، اقامت حدود، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایسے امور ہیں جو محتاجِ بیان نہیں۔
"پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رفیقِ اعلیٰ کی طرف انتقال فرمایا تو آپؐ کی وفات کے بعد بھی اسی تفصیل مذکورہ کے ساتھ دین کا قائم رکھنا ضروری ہوا اور اس تفصیل کے ساتھ دین کا قائم رکھنا ایک ایسے شخص کے مقرر ہونے پر موقوف تھا جو اس کام میں اہتمامِ عظیم کرے، ہر ملک میں اپنے نائب بھیجے۔ ان کے حال سے خبردار ہے۔ اس کے

نائب اس کے حکم سے انحراف نہ کریں اور اس کے اشارے پر چلتے رہیں۔ ایسا ہی شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ اور بجمیع الوجوہ آپ کا نائب ہوگا۔

شاہ صاحب نے خلیفہ کی یہ شرائط بتائی ہیں:۔ ریاست عامہ، بالفعل دین قائم رکھنا، خلیفہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب ہوگا، چنانچہ خلیفہ کے مفہوم سے انبیاء علیہم السلام خارج ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے لئے خلیفۃ اللہ کا لقب پسند نہ کیا اور فرمایا کہ مجھے خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا کرو۔

شاہ صاحب کے نزدیک ''مسلمانوں پر ایسے خلیفہ کا مقرر کرنا جو جامع شرائط خلافت ہو، فرض کفایہ ہے اور قیامت تک فرض رہے گا۔ اس کے بہت سے دلائل ہیں.....(ایک) یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاد، امورِ قضا، احیائے علوم دین، اقامت ارکانِ اسلام اور بلادِ اسلام کی کفار سے حفاظت کو فرض کفایہ قرار دیا ہے اور یہ سب باتیں بغیر امام کے تقرر کے عملی جامہ نہیں پہن سکتیں (اور قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ) فرض کفایہ جس چیز پر موقوف ہو، وہ چیز بھی فرض کفایہ ہوتی ہے.....ان سب امور کے علاوہ ایک حدیث مستفیض کی وجہ سے ایک اور شرط بھی بڑھائی گئی ہے یعنی خلیفہ کا قریشی ہونا...شرائط خلافت کی ایک شرط یہ ہے کہ خلیفہ مسلمان ہو.....''

خلافت کی شروط بیان کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ ایک شرط یہ بھی ہے کہ خلیفہ مجتہد ہو۔ اس کے بعد مجتہد ہونے کی کیا شرطیں ہیں، ان کا بیان یوں فرماتے ہیں:۔

دراصل مجتہد وہ شخص ہے جو ایک بڑا حصہ احکام فقہ کا جانتا ہو، مع ان کے دلائل تفصیلیہ یعنی کتاب وسنت واجماع وقیاس کے اور ہر حکم کو اس کی علت کے ساتھ مرتبط جانتا ہو اور اس علت کا ظن قوی رکھتا ہو۔ اب اس زمانے میں مجتہد وہی شخص ہوسکتا ہے جو ان پانچ علموں کا جامع ہو۔ قرآن کی قرأت وتفسیر کا علم، سنت کا اس کی اسناد کے ساتھ علم اور اس میں صحیح و ضعیف کی معرفت، مسائل کے متعلق اقوال سلف کا علم تا کہ اجماع سے تجاوز نہ ہو اور دو قولوں کے اختلاف میں تیسرا قول اختیار نہ کرے۔ علم عربیت یعنی لغت نحو وغیرہ کا علم۔ استنباط کے طریقوں اور دو مختلف چیزوں میں تطبیق کا علم۔ ان پانچ علموں کے حصول کے بعد وہ جزوی مسائل میں غور وفکر کرے اور ہر حکم جس دلیل کے ساتھ وہ مرتبط ہے، اسے جانے اور لازم نہیں کہ وہ ابوحنیفہؒ اور شافعیؒ کی طرح مجتہد مستقل ہو۔''

یہ تو شاہ صاحب کے الفاظ میں ''اب اس زمانے'' کا ذکر ہے۔ ''صحابہ کرامؓ کے زمانے میں'' ان کے نزدیک مجتہد بننے کے لئے مذکورہ علوم میں سے اکثر علوم کی ضرورت نہ تھی۔ صرف علم قرآن وحفظ حدیث کافی تھا۔ عربی خود ان کی زبان تھی، صرف ونحو وغیرہ حاصل کیے بغیر عربی کلام کو سمجھ لیتے تھے اور اس وقت تک ایک دوسرے سے متعارف حدیثیں ظہور پذیر نہیں ہوئی تھیں۔ نہ مسائل میں سلف کا اختلاف تھا۔

خلافت کی ان شرائط کی جزئیات پر مفصل بحث کرنے کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔

''الحاصل جب یہ سب شرطیں کسی شخص میں پائی جائیں تو وہ مستحق خلافت سمجھا جائے گا۔ اگر اس کو اہل حل وعقد خلیفہ بنائیں اور اس کے ہاتھ پر بیعت کریں تو وہ خلیفہ راشد ہوگا۔ اگر کسی ایسے شخص کو لوگ خلیفہ بنائیں جس میں یہ شرائط نہ پائی جاتی ہوں تو اس کی خلافت کے بانی گنہگار ہوں گے لیکن اگر اس کا تسلط ہو جائے تو اس کے وہ تمام احکام جو خلاف شرع

نہ ہوں، نافذ رہیں گے بوجہ ضرورت کے۔ کیونکہ (بعد تسلط) مسندِ خلافت سے اس کو اٹھا دینا اختلاف کا باعث ہوگا اور اس سے فتنہ وفساد برپا ہوگا۔''

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ رعایا پر خلیفہ کی اطاعت واجب ہے۔ اس کی وضاحت وہ یوں کرتے ہیں:۔

مصالح اسلام کے متعلق خلیفہ جو کچھ حکم فرمائے اور یہ حکم شرع کے مخالف نہ ہو (اس کی بجا آوری) مسلمانوں پر لازم ہے، خواہ خلیفہ عادل ہو یا ظالم۔ اگر لوگ مذہب کی فروعات میں مختلف ہوں اور خلیفہ کسی ایسی بات کا حکم دے جو اجتہادی ہے اور قرآن، سنتِ مشہورہ اور اجماع سلف کے مخالف نہیں ہیں۔ نیز اس قیاس جلی کے مخالف نہیں ہے جو واضح الثبوت اصل پر مبنی ہے تو خلیفہ کی اس بات کو سننا اور اس کے حکم کے موافق چلنا لازم ہے۔ اگرچہ (خلیفہ کا یہ حکم) اس شخص کے مذہب کے موافق نہ ہو۔ کسی مسلمان (کی حکومت) پر مسلمانوں کے متفق ہو جانے کے بعد اس سلطان سے بغاوت کرنا حرام ہے۔ اگرچہ وہ سلطان خلافت کی شرطوں کا جامع نہ ہو، مگر اس صورت میں کہ اس سے صریح کفر ظاہر ہو۔

حضرت عمرؓ کے عہد حکومت میں قرآن مجید کے اس حکم ''لا اکراہ فی الدین'' پر کس طرح عمل ہوتا تھا۔ شاہ صاحب اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگرچہ حضرت عمرؓ یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ مسلمانوں کے کام کافروں کے سپرد کیے جائیں لیکن اس کے باوجود وہ کسی غیر مسلم کو اس پر مجبور نہیں کرتے تھے کہ اسلام لے آئے۔ اس ضمن میں وہ شیخ شہاب الدین سہروردی کی کتاب ''عوارف المعارف'' سے مندرجہ ذیل روایت نقل کرتے ہیں۔

''وثیق رومی (نصرانی) کا بیان ہے کہ میں (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) کا غلام تھا۔ وہ مجھ سے فرمایا کرتے تھے کہ اسلام قبول کر لے کیونکہ اگر تو مسلمان ہو جائے گا تو میں تجھ سے مسلمانوں کے کام میں مدد لیا کروں گا۔ اس لئے کہ یہ جائز نہیں ہے کہ میں مسلمانوں کے کام میں اس شخص سے مدد لوں جو مسلمانوں میں سے نہ ہو۔ وثیق رومی کہتے ہیں کہ میں نے اسلام لانے سے انکار کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، دین میں زبردستی نہیں ہے۔ پھر جب حضرت عمرؓ کی وفات کا وقت آیا تو انہوں نے مجھے آزاد کر دیا اور فرمایا کہ جہاں تیرا جی چاہے، چلا جا۔''

رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس منبع فیوض وبرکات تھی اور اس سے ہر صحابی نے اپنی اپنی جبلی استعداد کے مطابق استفادہ کیا۔ اس بارے میں شاہ صاحب لکھتے ہیں:

''جاننا چاہیے کہ صحابہ کی ایک کثیر جماعت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے اپنے اپنے نصیب کے مطابق ان اوصاف سے استفادہ کیا اور یہ آپؐ کی بعض بعض باتوں میں منصب خلافت پر فائز ہوئے۔ مثال کے طور پر قرأت وفقہ میں عبداللہ بن مسعود، قضا میں معاذ بن جبل اور علم فرائض میں زید بن ثابت۔ ان میں سے جو قریش تھے اور حکومت وریاست کا بار اٹھانے کی اہلیت رکھتے تھے، وہ خلافت مطلقہ کے مستحق ہوئے۔ پھر یہ مستحقین خلافت بارگاہ رب العزت میں منتظر کھڑے تھے کہ دیکھیں ان میں سے کس کو فضل الٰہی بالفعل خلافت مطلقہ کا مرتبہ دیتا ہے۔ ذلک فضل اللہ یو تیہ من یشآء واللہ ذو الفضل العظیم''

خلافت کا مفہوم، خلیفہ کی شرائط اور خلافت کے متعلقات پر بحث کرنے کے بعد شاہ صاحب یہ نتیجہ نکالتے ہیں:

''خلفائے اربعہ کے لئے خلافتِ عامہ کا ثابت ہونا واضح ترین بدیہیات میں سے ہے (کیونکہ) جب ہم

خلیفہ کا مفہوم اور اس کی شرطیں ذہن میں لاتے ہیں اور خلفائے اربعہ کے حالات پر جو بہ سند مستفیض معلوم ہوئے ہیں' نظر ڈالتے ہیں تو بدیہی طور پر خلافت کی شرطوں کا ان میں پایا جانا اور خلافت کے مقاصد کا اکمل طور پر ان سے ظاہر ہونا واضح ہو جاتا ہے۔"

آیت لیظھرہ علی الدین کلہ کی تشریح

قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے **ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشر کونo** (وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تا کہ وہ اسے تمام دینوں پر غالب کردے خواہ اس سے مشرک ناخوش ہوں) شاہ صاحب اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں:۔

چونکہ دینِ حق کا غلبہ تمام دینوں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حاصل نہیں ہوا کیونکہ نصاریٰ و مجوس اس وقت تک اپنے طمطراق پر قائم تھے' لہٰذا اکثر مفسرین اس آیت کی تفسیر میں عاجز ہو گئے تھے۔ یہ فقیر کہتا ہے کہ جب کسی آیت کے معنی میں کچھ مشکل پیش آ جائے تو وہاں دو باتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اول یہ کہ ہم الفاظِ قرآنی کو لوگوں کے بیان کیے ہوئے معنی کے ساتھ عقل خالص کی ترازو میں تولیں۔ اگر دونوں میں موافقت ظاہر ہو تو خیر ورنہ اس معنی کو چھوڑ دیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو ہم اپنا پیشوا بنائیں کیونکہ آپؐ قرآن کے مفسر ہیں۔

"اس قاعدہ کے مطابق جب ہم (لوگوں کے بیان کیے ہوئے معنی یعنی) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلبہ کو جو نجران کے نصرانیوں' ہجر کے مجوسیوں اور خیبر کے یہودیوں پر آپ کو حاصل ہوا اور آپؐ نے ان سے جزیہ اور خراج لیا' ایک پلڑے میں رکھتے ہیں اور **لیظھرہ علی الدین کلہ** کو دوسرے پلڑے میں رکھتے ہیں تو دونوں میں باہم کچھ مناسبت نہیں پاتے۔ ایک تھوڑے سے ٹکڑے پر غالب آنا تمام دینوں پر غلبہ نہیں ہو سکتا۔ تمام دینوں پر غلبہ کے معنی تو یہ ہیں کہ تمام دینوں کی جڑ کھد جائے اور ان کے حمایتی درہم برہم ہو جائیں۔ (لہٰذا ہم نے ان معانی کو چھوڑ دیا) باقی رہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث (یہاں شاہ صاحب نے چند احادیث نقل کی ہیں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں)..... ان احادیثِ صحیحہ کا مقتضا یہ ہے کہ پورا غلبہ دین کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوگا۔ اگر لیظھرہ کی ضمیر ہدیٰ اور دین حق کی طرف پھیریں تو مطلب یہ ہوگا کہ رسول کا ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجنا سبب ہو جائے گا۔ اس ہدایت اور دین حق کے تمام دینوں پر غالب ہونے کا۔ اس صورت میں کچھ ضروری نہیں کہ وہ غلبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہو جائے۔ آپ کا مبعوث ہو جانا غلبہ کا سبب ہو گیا گو تتمہ اس غلبہ کا آپؐ کے نائبوں کے ہاتھ پر ہوا۔ اگر لیظھرہ کی ضمیر رسول کی طرف پھیری جائے تب بھی کچھ بعید نہیں ہے کیونکہ دینِ حق کا غلبہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب کے ہاتھ سے ہوا' بلاشبہ وہ آپؐ ہی کا غالب ہونا ہے۔

الحاصل اس وقت تمام ملک دو پُرشوکت بادشاہوں یعنی کسریٰ اور قیصر کے زیرِ حکم تھے۔ یہ دونوں بادشاہ تمام دوسرے مذاہب پر غالب تھے۔ یہ دونوں بادشاہ اباحت[2] کی طرف میلان رکھتے تھے۔ اور عقیدہ ارجاء[3] ان دونوں پر غالب تھا۔ وہ لوگوں کو قولاً و فعلاً ان دونوں مذہبوں کی طرف بلاتے تھے اور ان دونوں مذہبوں کی ترویج کا سبب بنے ہوئے

تھے کیونکہ لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں۔ روم و روس و فرنگ و جرمن اور افریقہ، شام و مصر اور بعض بلادِ مغرب (شمالی افریقہ) وحبش قیصر کی موافقت میں نصرانیت کے مذہب پر تھے اور خراسان، توران، ترکستان، زادلستان اور باختر وغیرہ کے لوگ کسریٰ کی اتباع میں مجوسی تھے۔ باقی مذاہب مثل مذہب یہود، مذہب مشرکین، مذہب ہنود اور مذہب صائبین انہی دونوں بادشاہوں کی شوکت کے تحت پامال اور کمزور ہو رہے تھے اور ان مذاہب کے معتقدین درہم برہم ہو چکے تھے، لہٰذا ارادۂ الٰہی نے سرزمین حجاز میں جو نہ کسریٰ کے تصرف میں تھی، نہ قیصر کے، دونوں اس سے غافل تھے اور بادشاہوں کا سا غلبہ اس سرزمین کے سوا دوسری جگہ ممکن نہ تھا۔ دینِ برحق قائم ہو جانے کے بعد کسریٰ و قیصر کی سلطنتوں کو اپنا آشیانہ بنایا کہ جب یہ دونوں سلطنتیں درہم برہم ہو جائیں گی تو اس کے نتیجے میں یہ سارے مذاہب شوکتِ اسلام سے خودبخود پامال ہو جائیں گے جس طرح اس دونوں سلطنتوں کی وجہ سے پامال تھے۔

''چونکہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ان روحانی نعمتوں کو جو بغیر رفیق اعلیٰ سے ملے، حاصل نہیں ہو سکتی تھیں۔ پسند فرمایا، اس لئے ضروری ہوا کہ دینِ حق کے غلبے کو کامل کرنے اور دشمنانِ خدا کی سرنگونی کو پورا کرنے کے واسطے آپ کسی کو خلیفہ بنائیں تاکہ یہ سب باتیں آپؐ کے صحیفہ اعمال میں درج ہو جائیں اور وہ ارادۂ انتقام جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ضمن میں لپٹا ہوا تھا، اپنا کام پورا کرے۔''

نبوت اور خلافتِ خاصہ

اہلِ حق کے نزدیک نبوت کوئی چیز نہیں ہے کہ نفسی اور بدنی ریاضتوں سے اس کو حاصل کر سکیں۔ نہ پیدائشی چیز ہے کہ قضا و قدر نے نفسِ پیغمبر کو آفرینش کے وقت نفس قدسی بنا دیا ہو جس کی وجہ سے جبلی طور پر پیغمبر سے ایسے ہی افعال صادر ہوں، جو تقدس کے مناسب ہوں بلکہ جب دنیا کی حالت ایسی ہو جائے کہ حکمتِ الٰہیہ اس بات کا تقاضا کرنے لگے کہ خدا تعالیٰ سات آسمانوں کے اوپر سے بنی آدم کی اصلاح اور ان کی کجی ٹھیک کرنے کا اس طرح ارادہ فرمائے کہ جو شخص بنی آدم میں سب سے زیادہ پاکیزہ، عالی ہمت اور راست باز ہو اس کے دل میں ارادہ ڈالے تاکہ وہ ان علوم و اعمال کا حکم دے۔ جن میں بنی آدم کی اصلاح ہو گی اور حجت و برہان سے ان کو قائل کرے۔ اگر وہ لوگ مان جائیں تو خیر ورنہ ان سے زبان یا تلوار سے جہاد کرے۔ یہاں تک کہ سعادت مند لوگ بدنصیبوں سے ممتاز ہو جائیں اور دنیا نورِ ہدایت سے منور ہو جائے۔

جب دنیا کی یہ حالت ہو تو ارادۂ الٰہی کا بروئے کار لانا ضروری ہوتا ہے۔ اس صورت میں قضائے الٰہی سات آسمانوں کے اوپر سے ملاءِ اعلیٰ میں اترتی ہے۔ ملاءِ اعلیٰ اس سے رنگین ہو جاتے ہیں اور اس کی بے حساب برکتیں اس نفس قدسی پر (جسے نبی بنانا منظور ہوتا ہے) نازل ہوتی ہیں۔ ملاءِ اعلیٰ اس نفس کے سامنے مناسب شکلوں میں متمثل ہوتے ہیں اور اس کے اندر شرعی اور احسانی (معرفت کے) علوم القا کرتے ہیں۔

یہ نفس قدسی اس مجرد (غیر مادی) تدبر سے جو سات آسمانوں کے اوپر سے اس طرح زمین پر نازل ہوتی ہے، واقف ہو جاتا ہے اور پھر یہ تدبیر اس وحی متلو یا غیر متلو کے ذریعہ جو عالمِ مجرد سے اس ارادۂ الٰہی (متعلق بہ اصلاح عالم) کے

ساتھ نازل ہوتی ہے، ملاءِ اعلیٰ کے مناسب لباس پہننے کے بعد دوبارہ الفاظ وحروفِ ظاہری کا لباس پہن کر اس پیغمبر کے دل پر اترتی ہے۔ اس وقت شریعت کی زبان میں کہا جائے گا کہ اللہ نے فلاں کو نبی مبعوث کیا۔ اسے تبلیغِ احکام کا حکم دیا اور اس کی طرف وحی کی۔"

شاہ صاحب کہتے ہیں کہ اگرچہ نبوت کسبی اور پیدائشی نہیں ہوتی اور اس کا فیضان سات آسمانوں کے اوپر سے بواسطہ ملاءِ اعلیٰ ارادۂ الٰہی کے تحت ہوتا ہے لیکن جو شخص نبی مبعوث ہوتا ہے' اس کی کچھ اپنی مخصوص صفات ہوتی ہیں۔ شاہ صاحب ان کا ذکر یوں فرماتے ہیں:۔

"لیکن کارکنانِ قضاوقدر یہ دولت اسی شخص کو دیتے ہیں جس کا نفس قدسی ہو۔ اس کی جبلتِ اصلی ملاءِ اعلیٰ میں سے شمار ہوتی ہو۔ اس کے اندر جو قوائے ملکیہ ہیں' وہ حد درجہ ظاہر و غالب ہوں۔ پاکیزگی' صالحیت' سعادت اور اپنے مزاجِ بدنی میں انسانی اعتدال کی انتہا پر ہو۔ وہ حد درجہ کی قوی و زبردست طبیعت رکھتا ہو مگر وہ قلب کی مطیع ہو۔ اس کا قلب مضبوطی اور دلیری میں انتہا پر ہو۔ مگر وہ عقل کا مطیع ہو۔ اس کی عقل جودت واستقامت میں درجہ کمال پر ہو مگر ملاءِ اعلیٰ کی مطیع ہو بلکہ وہ ملاءِ اعلیٰ ہی ایک شق ہو اور ان کے لئے ایک آئینہ کی حیثیت رکھتی ہو۔"

"اس شخص کی قوتِ عاقلہ ملاءِ اعلیٰ کے ادراک سے مشابہت رکھتی ہے۔ اسی لئے وہ وحی کو قبول کرتا ہے۔ اس کی عملی قوت حد درجہ صالح ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ عصمت سے متصف ہوتا ہے۔ یہ امور نبوت کے عظیم لوازم میں سے ہیں۔ اللہ کی سنت اس طرح چلی آتی ہے کہ کارکنانِ قضاوقدر اسی شخص کو نبوت عنایت کرتے ہیں جسے اللہ نے اس طرح پیدا کیا ہوتا ہے۔ بہت سے نفوسِ قدسیہ کے حال ایسے ہوتے ہیں، جن میں ان میں سے بعض اوقات یا اکثر اوصاف ہوتے ہیں لیکن نبوت ان کے نصیب میں نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے **اللہ اعلم حیث یجعل رسالته** (اللہ زیادہ جانتا ہے کہ وہ کہاں اپنی رسالت فائض کرے۔)"

"جس طرح نبوت کسبی اور پیدائشی چیز نہیں ہے۔ اسی طرح پیغمبر کی خلافتِ خاصہ بھی کسبی اور پیدائشی نہیں ہوتی۔ ارادۂ الٰہی جو سات آسمانوں کے اوپر سے ہدایتِ پیغمبر کو لوگوں میں جاری کرنے' اس کے نور کو اتمام کو پہنچانے' اس کے دین کو غالب کرنے اور اس کے بارے میں جو وعدہ ہوتا ہے اسے پورا کرنے کے لئے نازل ہوتا ہے اور خلیفہ کے دل میں ایک داعیہ پیدا کرتا ہے' اگرچہ پیغمبر کے حواری جن کے دل میں پیغمبر کے دین کی نصرت کا غیب سے داعیہ پیدا ہو' ہزاروں ہوں' مگر یہ خلیفہ بمنزلہ دل کے ہوتا ہے اور باقی سب لوگ بمنزلہ جوارح کے۔"

"یہ جو قول ہے **النبی من امر بتبلیغ شریعة اللہ** (نبی وہ ہے جو اللہ کی شریعت کی تبلیغ پر مامور ہو) اس کا ایک ظاہری پہلو ہے اور دوسرا باطنی۔ اس کا ظاہری پہلو ہے شریعت کو لوگوں تک پہنچانا اور اس کا باطنی پہلو ہے دل کے اندر سے ایک زبردست وقوی داعیہ (عزم) کا جوش میں آنا۔"

"اسی طرح یہ جو قول ہے **الخلیفة من یمشی شریعة النبی فی الناس ویظهر علی یدہ موعود اللہ لنبیه** (خلیفہ وہ ہے جو نبی کی شریعت کو جاری کرے اور اس کے ہاتھ پر اللہ کا' اس کے نبی کے ساتھ کیا گیا وعدہ ظاہر ہو) اس کا ایک ظاہری پہلو ہے اور دوسرا باطنی۔ اس کا ظاہری پہلو ہے نبی کی شریعت کا اجرا اور باطنی پہلو وہ زبردست وقوی

داعیہ ہے کہ پیغمبر کے واسطہ سے خلیفہ کے دل میں متمکن ہوتا ہے بلکہ اس کے دل کے جوہر اصلی سے جوش مارتا رہتا ہے۔"

وعظ وافتا خلیفہ کے حکم کے تابع ہے

وعظ وافتا اور پیش آمدہ مسائل کے متعلق فیصلے کرنے میں سلف کا کیا معمول تھا' اس کے بارے میں شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"سلف لوگوں کا فقہی مسائل میں بہت دور جانا اور وہ مسائل جو ابھی وقوع پذیر نہیں ہوئے' انہیں بیان کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح وہ جلدی میں بلا تامل فتوے دینے سے ڈرتے تھے۔ دارمی نے وہب بن عمرو جمحی سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کسی واقعہ کے وقوع پذیر ہونے سے قبل اس میں جلدی نہ کرو کیونکہ اگر تم اس کے واقع ہونے سے قبل اس میں جلدی نہ کرو گے تو جب وہ واقعہ پیش آئے گا تو یقیناً مسلمانوں میں کوئی نہ کوئی ایسا ضرور ہوگا جسے اس کے متعلق مناسب اور صحیح جواب دینے کی توفیق ہوگی اور اگر اس معاملے میں تم جلدی کرو گے تو نفسانی خواہشات تم میں اختلاف کا موجب ہوں گی اور تم اِدھر اُدھر بھٹک جاؤ گے .... ابنِ عمر سے کسی نے کوئی مسئلہ پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھ سے وہ بات نہ پوچھو جو ابھی نہیں ہوئی کیونکہ میں نے عمر بن الخطاب سے سنا ہے وہ اس شخص پر لعنت کرتے تھے جو ایسی بات کے متعلق سوال کرے جو ابھی نہیں ہوئی۔ زید بن ثابت سے کسی امر کے متعلق سوال کیا جاتا تو وہ کہتے تھے کہ کیا یہ امر واقع ہو چکا ہے۔ اگر لوگ کہتے کہ ہاں ہو چکا ہے تو اس کے متعلق جو ان کو معلوم ہوتا' یا ان کی رائے ہوتی' بیان کر دیتے۔ اگر لوگ کہتے کہ نہیں تو فرماتے کہ ابھی اس کو چھوڑ دو' یہاں تک کہ واقع ہو۔ کسی شخص نے حضرت عمار بن یاسر سے کوئی مسئلہ پوچھا۔ انہوں نے کہا' کیا یہ صورت پیش آئی ہے۔ لوگوں نے کہا' نہیں۔ انہوں نے کہا کہ تو (ہم کو ابھی) چھوڑ دو۔ یہاں تک کہ پیش آئے اور جب ایسی صورت ہوگی تو اس وقت ہم تمہیں اس کا جواب تلاش کر دیں گے۔"

اس دور میں وعظ کہنے اور فتوے دینے کے لئے خلفا اور ان کے نائبین کی اجازت ضروری تھی۔ اسی سلسلے کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"عہدِ سابق میں وعظ اور فتویٰ خلیفہ کی رائے پر موقوف تھا اور خلیفہ کے حکم کے بغیر لوگ نہ وعظ کہتے تھے اور نہ فتویٰ دیتے تھے۔ بعد میں خلیفہ کی رائے کے بغیر وہ وعظ کہنے لگے اور فتویٰ دینے لگے لیکن اس وقت فتویٰ دیتے وقت جماعت صالحین سے مشورہ ہوتا تھا۔ ابوداؤد نے عوف بن مالک اشجعی سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وعظ یا تو امیر کہتا ہے یا اس کا مقرر کیا ہوا یا وہ جو متکبر اور ریا کار ہے۔ دارمی نے ابن عوف سے اور انہوں نے محمدؒ سے روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابن مسعود سے فرمایا کہ مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم فتویٰ دیتے ہو۔ حالانکہ تم امیر نہیں ہو۔ اس کی مشقت کا بار اس پر رہنے دو' جو اس کی راحت کا مالک ہے۔ دارمی نے مسیب بن رافع سے روایت کی ہے کہ صحابہ کو جب کوئی واقعہ پیش آتا اور اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث نہ ہوتی تو وہ جمع ہو کر اس کے بارے میں اجماع کرتے۔ پس حق وہی ہے جو انہوں نے فیصلہ کیا۔"

یہ بیان کرنے کے بعد شاہ صاحب اس مسئلے کی مزید وضاحت کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''حضرت عثمانؓ کے زمانے تک مسائل فقہ میں اختلاف واقع نہیں ہوا تھا۔ جب کبھی اختلاف ہوتا تو لوگ خلیفہ کی طرف رجوع کرتے۔ خلیفہ مشورہ کے بعد ایک بات اختیار کر لیتا اور اسی بات پر اجماع ہو جاتا تھا۔ فتنے (4) کے بعد ہر عالم بذاتِ خود فتویٰ دینے لگا اور اسی زمانے میں اختلاف واقع ہوا۔ باقی شہرستانی نے کتاب ''ملل ونحل'' میں یہ جو کہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ساتھ ہی اختلاف پیدا ہو گیا(5) تو یہ غلط ہے۔ اختلاف وہ نہیں کہ مشورے کے دوران مختلف باتیں کہی جائیں اور آخر میں ایک بات واضح ہو جائے اور اسی پر سب کا اجماع ہو جائے بلکہ اختلاف یہ ہوتا ہے کہ ایک معاملے کے متعلق دو مستقل رائیں ہوں اور ہر شخص دوسرے کو اپنی طرف کھینچے اور مخالف کی رائے ختم کرنا چاہے۔''

دورِ فتن کی علامات اور اس کے احکام

خلافتِ خاصہ کے بعد مسلمانوں میں جو فتنے اٹھے اور ان میں آپس میں لڑائیاں شروع ہو گئیں' شاہ صاحب نے کتاب کے ایک باب میں ان کو بیان کیا ہے۔ یہاں اس کا خلاصہ درج ہے۔ اس دورِ فتن کی منجملہ اور بہت سی علامات کے ایک علامت یہ ہے:۔

''عبادات میں تشدد اختیار کرنا اور رخصتِ شرعی سے راضی نہ ہونا۔ مصابیح میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بے شک دین آسان ہے' جو شخص دین میں تشدد کرے گا' دین اس پر غالب آئے گا' لہٰذا تم ٹھیک رہو۔ قریب ہو جاؤ اور بشارت پاؤ۔ صبح وشام اور کچھ رات (کی عبادت) سے مدد چاہو۔ بغوی نے عمیر سے روایت کی ہے' وہ کہتے تھے میں جن صحابہ سے ملا ہوں وہ ستر (70) سے زیادہ تھے۔ میں نے کسی قوم کو سیرت میں آسان اور امورِ دین میں کم تشدد کرنے والا ان سے بڑھ کر نہیں دیکھا۔''

''ابراہیم نخعی کہتے ہیں' جب تم کو اسلام میں دو کام معلوم ہوں تو جو ان میں سے آسان ہو' اسے اختیار کرو کیونکہ جو ان دونوں میں آسان ہے' وہی حق سے قریب تر ہے۔ اس لئے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے **یرید الله بکم الیسر ولا یرید بکم العسر** (اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے اور وہ تمہارے لئے دشواری نہیں چاہتا۔)''

''ان آثارِ (سلف) سے یہ مفہوم واضح ہوتا ہے کہ فقہ کے مذاہب اربعہ میں سے رخصت کے مسائل کو چن چن کر اختیار کر لینا مستحسن ہے۔ اگر نصِ قرآنی' حدیث مشہور' اجماع سلف' قیاس جلی اور صحیح حدیث ان سے نہ روکے مگر فقہائے متاخرین کا اس میں اختلاف ہے بلکہ بعض فقہاء نے اس کو فسق سے منسوب کیا ہے۔''

دورِ فتن کی علامات بیان کرنے کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زمانہ ظہور شر وفساد کے بعض احکام ومصالح جداگانہ بیان فرما دیئے اور اکثر احادیث میں ارشاد فرمایا کہ جب ایسا زمانہ آئے تو تم کو چاہیے اس طرح کرو۔ یہ احکام حسب ذیل ہیں:

1- جب کوئی غیر مستحق شخص خلافت پر مسلط ہو جائے تو اس کے ان احکام میں جو شرع کے مطابق ہوں' تم پر اس کی اطاعت واجب ہے۔ ان احکام میں نہیں جو شرع کے مخالف ہوں۔

2- جب تک اس سے کفر صریح ظاہر نہ ہو اس سے بغاوت نہ کی جائے نہ جنگ کی جائے۔
3- جب کسی شخص کی بیعت ہوگئی اور اس کا تسلط استحکام پذیر ہوگیا تو اس صورت میں جو شخص اس کے خلاف اٹھے اور اس سے لڑے، اسے قتل کرنا چاہیے خواہ وہ پہلے شخص سے افضل ہو یا درجے میں اس کے برابر ہو یا اس سے کمتر درجے میں ہو۔
4- اگر زمانہ فتن میں خلفا نماز میں تاخیر کریں تو تم اپنی نماز اپنے وقت پر پڑھ لیا کرو۔
5- جب فتنے کے زمانے کے سردار زکوٰۃ وصول کرنے میں تعدی کریں تو تم ان کو زکوٰۃ دینے سے انکار نہ کرو۔
6- پہلے زمانے میں عبادت کے لئے خلوت اختیار کرنا منع تھا اور فتنہ کے زمانے میں محبوب ہوگیا۔
7- جس شخص نے مدینہ میں ہجرت کی ہو اور وہاں رہنے کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی ہو، وہ پھر واپس بادیہ میں جا سکتا ہے۔
8- پہلے زمانے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر منجملہ واجباتِ اسلام کے تھا، فتنے کے زمانے میں اس کا وجوب جاتا رہا۔
9- جب قریش ملک وسلطنت کے آپس میں لڑیں تو اس وقت مالِ غنیمت سے حصہ نہ لینا چاہیے۔
10- اول زمانے میں خلفا کی صحبت ایک بڑی سعادت تھی اور فتنے کے زمانے میں بادشاہوں کی صحبت سے پرہیز کرنا لازم ہے۔
11- پہلے زمانے میں خلیفہ کے قول پر عمل کرنا (شرعی) دلیل تھی اور فتنے کے زمانے میں یہ بات نہ رہی۔
12- فتنے سے پہلے جہاد شرعاً فرض تھا اور پھر (جب مسلمان آپس میں لڑنے لگے تو) جہاد ممنوع ہوگیا۔
13- زمانہ فتنہ وفساد میں جو لوگ سنتِ نبوی پر عمل کریں، ان کو دو چند ثواب ملتا۔
14- اس فتنے کے زمانے میں مرجانا زندہ رہنے سے بہتر ہے۔
15- ظالم سلطان کے سامنے حق بات کہنا جہاد سے افضل ہے۔

ہمارے ہاں ہر نئی چیز کو ''بدعت'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اگرچہ اصطلاحاً ''بدعت'' کا تعلق صرف دین سے ہے لیکن بالعموم دین کا دائرہ اتنا وسیع کر دیا گیا ہے کہ اکثر ہر نئی چیز ''بدعت'' کے زمرے میں آجاتی ہے۔ شاہ صاحب ایک جگہ اس پر بھی بحث کرتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

اوضاع واطوار کے دوسری اوضاع واطوار کی صورت میں متغیر ہونے کی کئی قسمیں ہیں اور ہر قسم کا اپنا جداگانہ حکم ہے۔ بعض تغیر اس قبیل کے ہیں کہ ان میں انسانی اختیار کو دخل نہیں ہوتا۔ مثلاً قحط پڑ جانا اور زلزلوں کا آنا۔ عورتوں کی کثرت، مردوں کی قلت، خبیث النفس شریروں کا زیادہ ہو جانا اور معتدل الاخلاق اہل الرائے نیکوں کا کم ہو جانا۔ امام بخاری اور امام مسلم نے یہ روایت ابن عمر سے نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمیوں کی (کثرت ہو مگر ایسے لوگ نایاب ہوں) مثال ایسی ہے جیسے سو اونٹ ہوں مگر ان میں سے ایک بھی سواری کے قابل نہ ہو۔ اس قسم کے تغیر کا یہ حکم ہے کہ چونکہ تکلیف شرعی طور پر موقوف ہے اور مواخذہ اختیاری امور پر ہوتا ہے، لہٰذا اس قسم کے تغیرات میں مواخذہ نہیں ہوتا

اور بعض تغیرات انسان کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ ان کی ایک قسم کا ذکر شاہ صاحب ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

لوگ کسی امر مستحب کی سنت موکدہ کی طرح لازم کر لیں یا اچھے کاموں میں سے کسی ایک کی صورت اور ہیئت کا التزام کر لیں اور اسے دانتوں سے خوب پکڑیں۔ اس قسم کو بدعت حسنہ کہتے ہیں۔ جیسے کے وظائف اور اوراد کی ایجاد ہے۔ اس قسم کے امور پر ثواب مترتب ہوتا ہے۔ البتہ اس کے متعلق تاکید و وجوب کا اعتقاد باطل ہے اور ثواب صرف اسی اصل کا ملے گا جو شرع میں معروف و مسلم ہے۔ ایک اچھے کام کی وہ ہیئت و صورت مباح ہے نہ اس کی تعریف ہو سکتی ہے اور نہ مذمت۔ اس امر کا بھی احتمال ہے کہ اس طرح ایک ہیئت و صورت التزام کر لینے سے اس پر بعض مفاسد مترتب ہوں۔ بعد کے زمانے میں اس سب کو سنت سمجھ لیا جائے اور اس طرح شریعتِ حقہ کی تحریف لازم ہو جائے (یعنی جو چیز شریعت میں نہ تھی، وہ داخل شریعت ہو جائے) لیکن وہ شخص جس نے امر مباح کو لازم کر لیا ہے اور وہ اس سے بعد میں مترتب ہونے والے مفاسد کا شعور نہیں رکھتا، اس میں فی الجملہ اس شخص کی خطا ہے۔

اوضاع و اطوار کی تغیر کی تیسری قسم یہ ہے کہ ہر شخص اس امر مباح کو جسے اس نے اپنا شعار بنا رکھا ہے، اپنے لئے لازم کر لے اور اس طرح ہر زمانے میں ایک اسم اور وضع عام ہو جائے اور یہ سب بذاتہ مباح ہونے پر قائم رہیں۔ اس کی نہ مذمت ہو سکتی ہے نہ مدح۔ سوائے بالعرض کے، یعنی اس معاملے میں اگر تعصب آ جائے اور ایک وضع و رسم کو دوسری وضع و رسم پر ترجیح دی جائے یا یہ کہ بعد کا زمانہ اسے سنت سمجھنے لگ جائے اور اس طرح لوگ تحریف میں مبتلا ہو جائیں (اس صورت میں ان امور مباح کا عامل مستحق ملامت ہوگا) پھر برے افعال کی برائی کبھی نص کتاب اللہ سے ثابت ہوتی ہے۔ کبھی احادیث مشہورہ سے، کبھی قیاس جلی سے اور کبھی اجماع امتِ مرحومہ سے بالخصوص خلافتِ خاصہ کے اجماع سے جو کہ برکاتِ نبوت کی باقی ماندہ برکتوں کا زمانہ ہے۔

یہ سب بیان کرنے کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں:

جب یہ مقدمات واضح ہو گئے تو لازم ہے کہ اوضاع و رسوم کے تغیر اور اس اختلاف امت کے مسئلے کو جو کہ اس زمانے میں پیدا ہو گیا، تم ان سب کو ایک ہی لاٹھی سے نہ ہانکو اور ان کو ایک مرتبے پر نہ رکھو (بلکہ بعض اختلاف میں ایک جانب حق اور دوسری جانب خطا ہوتی ہے اور بعض میں دونوں جانب حق دائر رہتا ہے۔)

ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد

صدقات کے مصارف

حضرت عمرؓ کے ذکر میں شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔

اہلِ کتاب میں سے ایک شخص پر آپ کا گزر ہوا، جو ایک دروازے پر پڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا، مسلمانوں نے مجھے مشقت و مصیبت میں ڈالا، مجھ سے جزیہ لیا اور جب میں نابینا ہو گیا تو اب مجھے کوئی ایک پیسہ دینے کا بھی روادار نہیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اگر تمہارا یہی حال رہا تو ہم نے انصاف ہی کیا کیا۔ آپ نے کہا، یہ بھی ان لوگوں میں سے ہے جن کی نسبت اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے **انما الصدقات للفقراء و المساکین** پھر آپ نے اس کا کچھ وظیفہ مقرر کر دیا۔ حضرت

عمرؓ سے روایت ہے کہ آیت انما الصدقات للفقراء والمساکین میں اہل کتاب بھی داخل ہیں۔

حضرت عمرؓ ہی کا ایک اور واقعہ ہے۔ عبیدہ السلمانی سے روایت ہے کہ عینیہ بن حصین اور اقرع بن حابس حضرت صدیقؓ کے پاس آئے اور عرض کی کہ ہمارے پاس ایک شور زمین ہے، نہ اس میں گھاس ہوتی ہے، نہ کوئی اور شے۔ اگر آپ اسے ہمارے لئے لکھ دیں تو ہم اسے درست کر کے اس میں کچھ بو سکیں۔ شاید اللہ تعالیٰ اس سے نفع دے۔ حضرت صدیقؓ نے یہ قطعہ زمین ان کے نام لکھ دیا۔ بعدازاں یہ دونوں حضرت عمرؓ کے پاس آئے تا کہ آپ کو بھی اس معاملے میں شاہد بنائیں۔ حضرت عمرؓ کے سامنے جب یہ تحریر پڑھی گئی تو انہوں نے ان کے ہاتھوں سے لے کر اس پر تھوکا اور اسے مٹا دیا۔ عینیہ اور اقرع کو یہ بڑا ناگوار گزرا اور انہوں نے حضرت عمرؓ کو برے الفاظ کہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسے وقت میں تمہاری تالیف قلب کرتے تھے جبکہ مسلمانوں کی تعداد قلیل تھی۔ اب تو اللہ نے اسلام کو عزت دی ہے تمہیں چاہیے کہ سعی و کوشش کرو اور مالِ مفت پر نگاہ نہ رکھو ورنہ اللہ تمہیں برکت نہ دے گا۔

اموی خلافت۔ مہدی (عباسی) عجمیوں کی سلطنت

''فتن'' کے بارے میں شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔

یہاں ایک باریک نکتہ ہے۔ اس کو بھی سمجھ لو۔ وہ یہ کہ (بنوامیہ کی) خلافتِ شام کے متعلق مختلف حدیثیں آئی ہیں۔ بعض مذمت پر دلالت کرتی ہیں اور بعض مدح پر۔ اس طرح کی حدیث جو ابن حوالہ سے مروی ہے اور اسے امام احمد اور ابوداؤد نے ابن حوالہ سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ عنقریب انجام کار یہ ہوگا کہ تم لوگ بڑے بڑے لشکر بن جاؤ گے۔ ایک لشکر شام میں ہوگا۔ ایک یمن میں اور ایک عراق میں۔

ابن حوالہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! اگر میں اس زمانے کو پاؤں تو اس صورت میں آپؐ میرے لئے کس لشکر کو پسند کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا، تم شام میں رہنا کیونکہ وہ اللہ کی پسندیدہ زمین ہے۔ وہاں وہ اپنے پسندیدہ بندے رکھتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو اپنے یمن میں رہنا اور اپنے حوضوں کا پانی پینا۔ اللہ عزوجل نے میرے لئے شام اور اہلِ شام کے متعلق ذمہ داری لی ہے۔

خلافتِ شام کی مذمت اور تعریف کی جو اس طرح کی باہم مختلف حدیثیں ہیں، ان کے اس تعارض کا حل یہ ہے کہ گو اہلِ شام اپنے ذاتی اوصاف کے لحاظ سے خلافت کا استحقاق نہ رکھتے تھے لیکن خلافت ان کو ملی اور تشریعی عنایت جہاد کا کام جاری رکھنے اور اس پر مدد کرنے کی طرف متوجہ ہوئی (یعنی عنایتِ الٰہی نے ان سے جہاد کا کام لیا) لہٰذا جہاں کہیں برائی ہے، اس کا مرجع اہلِ شام کی ذات ہے اور جہاں کہیں تعریف ہے وہ امورِ فلکیہ وغیرہ کے سبب سے ہے (جن کا کہ فیضان ان پر ہوا اور انہوں نے جہاد کو جاری رکھا) انہیں اہلِ شام میں ایک عمر بن عبدالعزیز تھے جو خلیفہ راشد تھے، علم و فضل و زُہد سے آراستہ تھے اور ان سے عمدہ آثار دنیا میں باقی رہے جن میں سے ایک علم حدیث کی کتاب اور احادیث کا جمع کرنا ہے اور دوسرا عمدہ اثر اہل بیت کو لعن طعن کرنا روکنا ہے۔ اس حدیث کا مضمون ان پر صادق آیا کہ اللہ ہر صدی کے سرے پر ایک ایسا شخص پیدا کرتا رہے گا جو دین کی تجدید کر دیا کرے گا۔ (اس مضمون کی تین حدیثیں ہیں، جن میں روایت کی گئی

ہے)''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کچھ لوگ مشرق سے آئیں گے اور وہ مہدی کی سلطنت (قائم کرنے) کے لئے لڑیں گے۔ تحقیق ان تینوں حدیثوں کی اس فقیر کے نزدیک یہ ہے کہ مہدی سے مراد خلیفہ بنی عباس ہے نہ کہ امام مہدی جو آخر زمانے میں ظاہر ہوں گے۔''

''یہاں اس خلیفہ کو مہدی اور خلیفتہ اللہ کہنا اور اس کی مدد کی ترغیب دینا محض اس سبب سے ہے کہ اس فریق کی خلافت پردۂ تقدیر میں طے ہو چکی تھی۔ اس میں تغیر و تبدل ہونے والا نہ تھا' لہٰذا وہ مہدی ہوا' یعنی اس تدبیر کی طرف راہ یافتہ جو اس کی خلافت کو مضبوط کر دے۔ نہ دوسرے خارجیوں کی طرح کہ ان کی حصولِ خلافت کی تدبیر رائیگاں گئی اور فتنہ و فساد کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ (مہدی بنی عباس کو) خلیفتہ اللہ اس معنی میں کہا گیا کہ تقدیرِ الٰہی میں اس کی خلافت طے ہو چکی تھی اور (اسی وجہ سے کہا گیا کہ) اس کے ساتھ ہو جانا چاہیے۔ اس کی مخالفت نہ کرنی چاہیے کیونکہ شریعت میں اہم مقصد لڑائی جھگڑے کو ختم کرنا اور فتنہ و فساد کو کم کرنا ہوتا ہے۔ اسی لئے مستحکم خلافت بہتر ہوتی ہے۔''

شاہ صاحب لکھتے ہیں۔ شروع میں خلیفۂ عباسی کا حکم اطرافِ عالم میں نافذ تھا۔ معتصم کے بعد ان کی حکومت کمزور ہو گئی۔ بالآخر خلافتِ عباسی درہم برہم ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی عربی اقتدار ختم ہو گیا اور عجمیوں نے ہر طرف سرداری کے لئے سر اٹھایا۔ اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

''مدینہ کی خلافت اور شام اور عراق کی خلافتیں قریش کی تھیں۔ پانچ سو سال کے بعد قریش کا اقتدار ختم ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی عربی سلطنت درہم برہم ہو گئی اور محفلوں کے رئیس اور عالم کے بادشاہ عجمی بن گئے۔ جب عربی سلطنت ختم ہوئی اور لوگ مختلف شہروں میں پہنچے تو جس نے جو فقہی مذہب یاد کر رکھا تھا' اسی کو اس نے اصل بنایا اور جو مذہب پہلے استنباط کیا ہوا تھا' وہ اب مستحکم سنت بن گیا۔ ان لوگوں کا علم تمام تر ایک مسئلے سے دوسرا مسئلہ تخریج کرنا اور اس سے اور آگے تخریج کرنا اور ایک فروعی مسئلے سے دوسرے فروعی مسئلے کا استخراج تھا۔ ان کی سلطنت بالکل مجوسیوں کی سلطنت کی طرح ہے' فرق یہ ہے کہ یہ لوگ نمازیں ادا کرتے اور کلمہ شہادت پڑھتے ہیں۔ ہم لوگ اسی تغیر کے دور میں پیدا ہوئے ہیں اور نہیں جانتے کہ اس کے بعد خدا کو کیا منظور ہے۔''

بعثتِ نبوی سے قبل اصولِ شرائع کا علم

سورۂ ہود میں آیا ہے **افمن کان علیٰ بینة من ربه ویتلوه شاهد منه ومن قبله کتب موسیٰ اماماً ورحمة ط اولئك یومن به** (بھلا ایک شخص جو ہے صاف دلیل پر اپنے رب کی اور اس کے ساتھ ساتھ ہے۔ ایک گواہ اللہ کی طرف سے اور اس سے پہلے گواہ تھی موسیٰ کی کتاب، رستہ بتلانے والی اور رحمت، یہی لوگ مانتے ہیں قرآن کو)

مفسرین میں **افمن کان علی بینة من ربه** میں جو لفظ **بینة** آیا ہے اس کے معنی کے بارے میں اختلاف ہے لیکن جو امر تحقیق شدہ ہے' وہ یہ ہے:

اس آیت میں غور و فکر کرنے سے اس بات میں کوئی شک نہیں رہتا کہ بعض اہل تحقیق نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے اپنے دل کی شہادت سے شریعتوں کے اصول اخذ کر لئے تھے۔ چنانچہ وہ بتوں کی پرستش کو برا

سمجھتے تھے۔ شراب اور زنا کی قباحت کو از خود اپنے دل میں محسوس کرتے تھے اور اس زمانے میں ایک پیغمبر کی بعثت کا تعین انہیں خوابوں اور فراست سے ہو چکا تھا۔ ان کے نفوس ان کی ان تمام باتوں سے مطمئن تھے اور ان کی عقل نے ان سب کو قبول کر لیا تھا۔ یہی علمِ اجمالی جو ان کے دلوں میں پھونکا گیا تھا' پروردگار تبارک وتعالیٰ کی جانب سے بینة ہے۔ اس کے بعد قرآن نازل ہوا اور اس نے اس علم اجمالی یعنی بینة کی تائید کی۔ علم اجمالی مجمل تھا۔ اسے قرآن نے مفصل بنا دیا۔ وہ ظنی تھا' اسے مثل مشاہدہ کے یقینی بنا دیا۔

غرض افمن کان علی بینة من ربه میں بینة تو یہ علم اجمالی ہوا اور یتلوہ شاھد میں شاھد سے قرآن مراد ہے۔ جس نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کامل صورت میں حق کو ظاہر کیا اور قرآن سے پہلے "شاھد" موسیٰ علیہ السلام کی کتاب تھی جو خدا تعالیٰ کی طرف سے اہل دین کے لئے مقتدا اور رحمت تھی اور اسی قرآن کی مانند شہادتِ (حق) دے رہی تھی۔

صحابہ عظام کی ایک جماعت اس (علمِ اجمالی والے) وصف سے متصف تھی۔ اس میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ' ابوذر غفاری اور دوسرے صحابہ تھے۔ ان سب میں صدیق اکبر کامل تر اور سب سے آگے تھے۔ چنانچہ اسی مناسبت باطنی کی بنا پر انہوں نے آپؐ پر ایمان لانے میں توقف نہیں کیا اور نہ آپؐ سے کوئی معجزہ طلب کیا۔ وہ اسی آیت والوں (کی فہرست) کے سردفتر ہیں بلکہ غالب رائے یہ ہے کہ آیت کا روئے سخن ان کی طرف ہے اور وہ انہی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

خلوت گزینی پہلے ممنوع تھی پھر محبوب ہو گئی

شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:

عہدِ اول میں جب تک کہ مسلمانوں میں آپس میں خانہ جنگیاں شروع نہیں ہوئی تھیں' کسی کا عبادت کے لئے خلوت گزین ہونا ممنوع تھا لیکن جب حضرت عثمانؓ کے آخری زمانے میں ان میں باہم لڑائیاں ہونے لگیں تو اس وقت یہی خلوت گزینی اور مطلوب ہو گئی۔ امام احمد نے ابوامامہ سے روایت کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہم ایک غزوہ میں جہاد کے لئے نکلے۔ ہمارے ساتھیوں میں سے ایک نے ایک غار دیکھا کہ وہاں سبزہ اور پانی ہے۔ ان کے دل میں آیا کہ وہاں وہ رہ پڑیں اور دنیا سے الگ تھلگ ہو کر خدا کی عبادت کریں۔ اس کا ذکر انہوں نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کیا۔ آپؐ نے فرمایا' یہ یہود ونصاریٰ کا طریقہ ہے اور میں شریعتِ ابراہیمی کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں۔ قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ خدا کی راہ میں جہاد کی نیت سے تھوڑا سا بھی سفر کرنا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے اور بے شک تم میں سے کسی ایک کا صفِ مجاہدین میں خدا کی راہ میں قیام کرنا ساٹھ برس کی نماز سے بہتر ہے۔

(اس کے برعکس) بغوی نے حضرت ابوسعید خُدری سے روایت کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ وہ زمانہ قریب ہے جب مسلمانوں کا بہترین مال اس کی بکریاں ہوں گی جنہیں وہ لے کر پہاڑوں کی چوٹیوں اور گھاٹیوں میں رہے اور فتنوں سے دور اپنے دین کو بچائے۔ بغوی نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' عنقریب ایسا فتنہ ہو گا کہ اس میں بیٹھنے والا کھڑے ہونے والے سے بہتر ہو گا۔ اس میں کھڑا ہونے والا چلنے والے سے بہتر ہو گا اور اس میں چلنے والا دوڑنے سے بچاؤ کی جگہ پائے گا۔ اسے چاہیے

کہ وہیں پناہ گزین ہو جائے۔

شریعت اور فطرت

''شریعت کا تعین (تشریع) تتمہ ہے تقدیر کا اور تقدیر کے معنی ہیں اندازہ مقرر کرنا۔ خدا تعالیٰ نے ہر نوع کے لئے ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے اور ہر نوع کی ایک خاص فطرت و صورت ہے۔ اس کے خاص افعال و اخلاق ہیں اور اسے جبلی طور پر الہامات ہوتے ہیں جن کا تعلق اس کی نوعی صورت اور وقتاً فوقتاً جو اسے حاجتیں پیش آتی ہیں، ہر دو سے ہوتا ہے۔[6] یہ قصہ بہت طویل ہے۔''

انواعِ حیوانات میں سے آدمی سب سے افضل نوع ہے۔ عقل و ذکاوت اور نئے نئے طریقوں سے معاشرتی و اجتماعی قواعد و ضوابط اس کا نوعی تقاضا ہے۔ آدمی کے اندر دو قوتیں رکھی گئی ہیں۔ قوتِ ملکیہ اور قوتِ بہیمیہ۔ اگر آدمی اپنے آپ کو قوتِ ملکیہ کے حوالے کر دے گا اور وہ سب کام کرے جو قوتِ ملکیہ کی ترقی کا سبب ہوتے ہیں تو وہ فرشتوں کے زمرے میں شمار ہوگا۔ گویا وہ بھی فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے۔ اگر آدمی اپنے آپ کو قوتِ بہیمیہ کے حوالے کر دے تو وہ بہائم میں شمار ہوگا۔ گویا وہ بہائم میں سے ایک بہیمیہ (حیوان) ہے۔ ایک حالت اعتدال کی ہے کہ آدمی بحیثیت اپنی نوع کے اس کا تقاضا کرتا ہے اور یہ امتزاج ہوتا ہے اس کی دونوں قوتوں یعنی قوتِ ملکیہ اور قوتِ بہیمیہ کا کہ آدمی افعالِ بہیمیہ میں سے وہ افعال کرے جو قوتِ ملکیہ سے تضاد نہ رکھتے ہوں اور افعالِ ملکیہ میں سے وہ افعال کرے کہ قوتِ بہیمیہ سے ان کا ٹکراؤ نہ ہو۔ اس طرح ہر دو قوتوں میں باہمی مصالحت ہو جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کی نوعی صورت دراصل اسی ہیئت اعتدالیہ کا تقاضا کرتی ہے۔ اگر اس میں نافرمانی کا عنصر مانع نہ ہو۔

آیت فطرة الله التی فطر الناس علیها میں اللہ کی فطرت کو جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا، اختیار کیے رہو۔ اسی ہیئت اعتدالیہ کی طرف اشارہ ہے۔ اس ہیئت اعتدالیہ کے اپنے ملکات، احوال اور افعال ہیں اور یہ اس کے کسب و حصول کے ذرائع ہیں۔ اسی طرح ہیئت مذکورہ کے منقصات یعنی اس میں نقص پیدا کرنے والی چیزیں ہیں۔ جن چیزوں سے اس ہیئت اعتدالیہ میں نقص واقع ہوتا ہے، ان کی تلافی کرنے کے بھی ذرائع ہیں، جو ان کے کفارے ہیں۔

اس کی مثال یہ ہے: ایک ماہر طبیب جانتا ہے کہ انسانیت کی ہیئتِ اعتدالیہ کو، جسے صحت کہتے ہیں، قائم رکھنے کے لئے کچھ اسباب ہوتے ہیں اور اس کے کچھ منقصات یعنی نقص پیدا کرنے والے امور ہوتے ہیں۔ وہ اول الذکر کا حکم دیتا ہے اور آخر الذکر یعنی منقصات سے منع کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے جب ازل الآزال میں تمام نوعی تقاضوں کے اندازے مقرر کیے تو اس کے ذیل میں تقاضائے حکمت کے تحت ضروری ہوا کہ نفس کی ہیئتِ اعتدالیہ کو جسے شریعت میں ''فطرة'' کہتے ہیں، نیز اس کے ملکات اور احوال کو جن سے یہ ہیئت وجود میں آتی ہے، اسی طرح اس کے کسب و حصول کے ذرائع اور اس میں نقص پیدا کرنے والے امور کو خدا تعالیٰ معین کر دے۔ اسی کو شریعتِ بنی آدم کہتے ہیں۔

(اس شریعتِ بنی آدم کے ذیل میں) اللہ نے بعض چیزوں کو واجب کیا اور بعض دوسری چیزوں کو مستحب، مباح، مکروہ اور حرام قرار دیا۔ اب یہ جو چیزیں ہیں، انسان کو ان کی تعلیم سوائے اس کے اور کسی طرح نہیں ہوتی کہ ان میں اور

انسان کے جبلی الہامات میں مشابہت ہو۔ نیز کوئی شخص ایسا نہیں جو ان چیزوں کی تعلیم کو بغیر کسی واسطے کے حاصل کرنے کی قابلیت رکھتا ہو، سوائے ایسے آدمی کے جو اپنی قوائے نفس (ملکیہ اور بہیمیہ) کے اعتبار سے اعتدال و توازن کے بڑے اعلیٰ مقام پر ہو۔

(ان معنوں میں) یہ شریعتِ بنی آدم ایک ہی ہے اور اس میں تغیر و تبدل راہ نہیں پاتا لیکن قابل آدمی وہ ہے جو ان احکام (یعنی واجب، مستحب، مباح، مکروہ، حرام) کو خاص موقعوں کے ساتھ مقید کرے جیسا کہ طبیب کسی آدمی کو صحت کے لئے اس کی عمر، موسم اور اس کے خاص شہر کو پیش نظر رکھ کر بہت سے قابلِ احتمال نسخوں میں سے ایک نسخہ تجویز کرتا ہے، اسی کو شرعۃ و منہاج کہا گیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے لکل جعلنا منکم شرعة و منھاجا (تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے خاص شریعت اور خاص طریقہ مقرر کر رکھا ہے۔)

ارسالِ رُسل کی حقیقت

یہ گمان نہ کیجیے کہ ارسالِ رسول کے معنی پیغمبر کو اوپر سے نیچے یا مشرق سے مغرب کو ایک شہر سے دوسرے شہر میں بھیجنا ہے بلکہ اللہ کی طرف سے ارسالِ رسول کے معنی یہ ہیں کہ ارادۂ خداوندی اس امر کا مقتضی ہوا کہ عام بنی آدم شریعت کو جان لیں تا کہ اس کے ذریعے ان کی اصلاح ہو۔ یہ شریعت مشہور ہو اور اس کا ذکر پھیل جائے اور لوگوں کی عقل اور ان کے قویٰ اس علم حق سے بھر جائیں تا کہ یہ بہت سے لوگوں کے لئے نیک کام کرنے کے ارادہ کو حرکت میں لانے اور برے کاموں سے بچنے کا سبب بنے یا یہ کہ بنی آدم میں طرح طرح کا شرک و ظلم پھیل گیا ہے اور وہ ایسے پیغمبر کے بغیر جسے عالمِ قدس کی تائید حاصل ہو، دور نہیں کیا جا سکتا یا ایک مبغوض و مردود قوم کے عذاب یا ہلاکت کا وقت آن پہنچا اور یہ مصلحت نہ ہو کہ آسمان سے پتھر برسا کر یا سخت چیخ سے ہلاک کریں بلکہ مصلحت یہ ہو کہ ایک صاحبِ شوکت رسول بھیجا جائے اور وہ اس جماعتِ ملعونہ کو عذاب دینے کا ذریعہ بن جائے۔

''اس علم اور اس داعیہ کے قابل تمام افراد انسان نہیں ہیں بلکہ ان میں سے وہ فرد ہوتا ہے جو سب سے زیادہ اَعْدَل (یعنی جس کی قوتِ ملکیہ و قوتِ بہیمیہ غایتِ اعتدال پر ہوں) اور سب سے زیادہ ملاءِ اعلیٰ سے مشابہت رکھتا ہو اور پھر امرِ حق کے ظہور کے قابل تمام اوقات نہیں ہوتے بلکہ حکمتِ الٰہی افراد کے وجود میں آنے سے پہلے ہی ایک فرد کو معین کر لیتی ہے اور ایک زمانے کو مشخص کر دیتی ہے۔ جب وہ زمانہ آتا ہے اور وہ فرد د بود میں آ جاتا ہے تو حکمتِ الٰہیہ اس فرد معتدل کے نفس قدسیہ کو اپنے لئے انتخاب فرما لیتی ہے و اصطنعتك لنفسی (اور میں نے تم کو اپنے لئے منتخب کیا) اس شریعت کو اس کے دل میں القا کرتی ہے اور اس فرد معتدل کے تمام عقلی و قلبی قویٰ کو اپنے لئے مسخر کر لیتی ہے۔ وہ اس کے گرد ایک امت کو جمع کر دیتی ہے۔ اس کو ارشاد و تعلیم کا منصب عطا کرتی ہے اور لوگوں کو اس سے علم و رشد حاصل کرنے کی توفیق بخشتی ہے۔''

شاہ صاحب اس کی یہ مثال دیتے ہیں۔ ایک چراغ گھر میں جلا دیا جائے اور اس کا عکس ان آئینوں میں پڑے جو چراغ کے چاروں طرف کھڑے کر دیئے گئے ہیں یعنی ایک تو نفس پیغمبر کا کمال ہے اور اس کی مثال ہے چراغ کی روشنی کی اور دوسرا کمال امة اخرجت للناس (امت جو لوگوں کے لئے وجود میں لائی گئی) کے نفوس کا ہے اور اس کی حیثیت آئینوں کی

ہے۔ جہاں تک شریعت الٰہیہ کا تعلق ہے' اس کی صورت ازل لآ زال میں قائم ہوگئی تھی۔ اس کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں:

''وہ شریعت جس کا تمثل عالم ملکوت میں ہوا تھا' اس تعلیم اور تعلم (سکھانے اور سیکھنے) سے متحقق ہوگئی۔ پس ارسالِ رسل اور انزالِ کتب کے معنی یہ ہیں۔ اس کو اچھی طرح سمجھ لو۔ یہ ایک وجود ہے' دوسرے وجود کے ضمن میں۔ ایک وجود (یعنی پہلا وجود جس کا تمثل عالمِ ملکوت میں ہوا تھا) روح ہے (یعنی روح کے مرتبے میں) اور دوسرا (وجود جو خارج میں مشاہدہ کیا جارہا ہے) جسد۔''

''نبی کی صورت کبھی بادشاہ اور خلیفہ کی ہوتی ہے۔ کبھی ایک فاضل و عالم کی صورت اور کبھی زاہد و مرشد کی اور ہر صورت کے اپنے اسباب ہوتے ہیں۔ ظاہر بینوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو بادشاہی سمجھا اور آیت انا فتحنا لك فتحا مبینا لیغفرلك اللّٰہ ماتقدم من ذنبك وماتاخر (ہم نے تمہیں ایک واضح فتح دی تا کہ اللہ تمہارے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کرے) میں جس فتح کا ذکر ہے' اس کی روح پر نظر نہ کی اور اس طرح ابدی بدبختی میں پڑ گئے۔''

اس بحث سے آخر میں شاہ صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے:۔

''تمام شریعتوں سے افضل شریعت جو افضل البشر پر نازل ہوئی' اس کی صورت چند چیزوں کی مرکب تھی۔ صورتِ خلافت سے بھی' ایک متبحر عالم کی صورت سے بھی اور زاہد و مرشد کی صورت سے بھی۔ خلافت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ ظاہر خلافت کا سلطنت اور فرمانروائی ہے اقامتِ دین کے لئے اور اس کا باطن مشابہت رکھتا ہے پیغمبر کے ان اوصاف سے جو کہ پیغمبری سے تعلق رکھتے ہیں۔''

مطلب یہ ہے کہ نبوت ان سب چیزوں پر جامع ہے۔ ظاہر بینوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو صرف بادشاہت و سلطنت سمجھا اور وہ شقاوتِ ابدی میں مبتلا ہوگئے۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ جب سب سے افضل شریعت سب سے افضل بشر پر نازل ہوئی تو ضروری تھا کہ یہ نبوت اس کی سب صورتوں پر جامع ہو۔ پس آپ کی رسالت، ریاست، خلافت، حبریت (تبحر علم) معلمیت، زاہدیت اور مرشدیت سب پر جامع تھی اور آپ کے فوراً بعد جو خلافت خاصہ کا دور آیا تو ایک لحاظ سے وہ بھی نبوت کا حصہ تھا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

''پس نبوت تو یہ ہے کہ ارادۂ الٰہی عالم کی بھلائی' مفسدین و کفار کی سرکوبی اور پیغمبر کے افعال و اقوال کے ضمن میں شریعت کی ترویج سے متعلق ہو جائے اور خلافت یہ ہے کہ ارادۂ الٰہی پیغمبر کے افعال کی تکمیل اور اس کے اقوال کی تدوین، اس کے نور کی نشر و اشاعت اور اس کی امت میں سے کسی شخص کا اس کا خلیفہ بن کر اس کے دین کو سربلند کرنے سے متعلق ہو۔ (کارکنانِ قضا و قدر) پیغمبر کے دین کو سربلند کرنے کا داعیہ و عزم اس شخص کے دل میں ڈال دیں اور وہاں سے ساری امت میں اس کی عکاسی ہو۔ یہ باعزت شخص قوتِ عاقلہ اور قوتِ عاملہ میں نفس پیغمبر سے نسبت رکھتا ہو۔ چنانچہ وہ محدث ہوگا۔ اس کی فراست وحی کے مطابق ہوگی۔''

مجدد دین کا آنا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی کہ اس امت میں ہر صدی کے سرے پر ایک مجدد پیدا ہوا کرے گا اور ایسا

ہی ہوا اور ہر صدی کے سرے پر کوئی ایسا مجدد ظاہر ہوتا رہا جس نے از سرِ نو دین کا احیا کیا۔ پہلی صدی میں عمر بن عبدالعزیز ہوئے جنہوں نے بادشاہوں کے ظلم کو ختم کیا اور اچھی روایات کی بنیاد ڈالی۔ دوسری صدی میں امام ابوالحسن اشعری ہوئے جنہوں نے اہل سنت کے لئے قواعدِ اعتقادات مستحکم کیے اور اہل بدعت کا مقابلہ کیا۔ چوتھی صدی میں حاکم، بیہقی اور دوسرے حضرات پیدا ہوئے اور انہوں نے علم حدیث کی بنیاد مضبوط کی۔ ابوحامد اور دوسرے علماء نے فقہی فروعات کو واضح کیا۔ پانچویں صدی میں امام غزالی ہوئے جنہوں نے فقہ وتصوف اور علم کلام کو ہم آہنگ کیا جس کی وجہ سے ان علوم کے حقائق ومعارف میں نزاع نہ رہا۔ چھٹی صدی میں امام نووی نے علم فقہ اور امام رازی نے علم کلام کی اشاعت کی۔ اسی طرح اس وقت تک ہر صدی کے سرے پر ایک امام اور مجدد ہوتا رہا ہے۔

سنت اللہ یا لزومِ عقلی

آیت ولقد سبقت کلمتنا لعباد نا المرسلین انهم لهم المنصورون وان جندنا لهم الغٰلبون٥
(اور ہمارے بندوں مرسلین کے لئے ہمارا یہ قول پہلے ہی سے مقرر ہو چکا ہے کہ وہی غالب کیے جائیں گے اور (ہمارا تو قاعدہ عام ہے کہ) ہمارا لشکر غالب رہتا ہے) کے ذیل میں شاہ صاحب نے عقل خالص کے احکام پر بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں۔ ''عقلِ خالص موجودات میں ایک ترتیب کی مقتضی ہوتی ہے اور جتنی بھی شریعتیں آئیں، سب کائنات خارجی کی استعدادوں کے اندازے کے مطابق تھیں۔ نیز یہ کہ حق تعالیٰ کے افعال عالم میں ایک خاص اسلوب پر جاری وساری ہوتے ہیں اور ایسا ہونا بعض دقیق معانی پر دلالت کرتا ہے۔ اگر ہم اس کو 'سنت اللہ' کے حوالے کریں تو بجا ہے اور اگر لزوم عقلی کہیں تو بھی جائز ہے۔ چنانچہ اسی سے متکلمین الٰہیات نے ذاتِ واجب الوجود کا اثبات کیا ہے۔''

اس سے کچھ آگے ارشاد ہوتا ہے:۔

''عقلِ خالص کا قاعدہ یہ ہے کہ ظاہر پر اعتماد کریں۔ بشرطیکہ اگر مضبوط قرائن اس ظاہر پر اعتماد کرنے میں مانع نہ ہوں۔ مثلاً ہم دیکھ رہے ہیں کہ آگ سے شعلے نکل رہے ہیں۔ جب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ اس بارے میں ہماری (دیکھنے کی) حس غلط کار ہے اور وہ ایک اور چیز کو جو آگ سے مشابہت رکھتی ہے، آگ سمجھ رہی ہے۔ ہم یہ یقین رکھیں گے کہ وہ آگ ہی ہے اور صرف اس احتمال سے کہ ممکن ہے وہ کوئی دوسری چیز ہو جو اس کے مشابہ ہوتی ہے۔ اسے آگ نہ سمجھنا اور اس پر کھانا پکانا موقوف کر دینا محض دیوانگی ہے۔''

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ افعال خداوندی کے ایک خاص نہج وطریقہ پر ہونے میں بڑی حکمت ہے۔ چنانچہ عالمِ اسباب کے اس نظامِ محکم کی بنا پر علمائے متکلمین نے ثابت کیا کہ اس کا خالق ذات واجب اور قادر ومختار ہے اور یہ کہ نبی سے معجزے کا ظہور اس کا دعویٰ نبوت کا ثبوت ہے۔ اسی طرح بچے کی ولادت پر اس کی ماں کی چھاتیوں میں دودھ آ جانا، بارش ہونے پر کھیتی کا سرسبز ہونا، مرض سے آدمی کا کمزور ہونا اور چوٹ لگنے سے زخمی ہونا یہ سب اسی سنۃ اللہ کی مثالیں ہیں۔ فرماتے ہیں، اشاعرہ کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے افعال معلل باغراض نہیں ہیں یعنی ان افعال کی علت کوئی اغراض اور مصالح نہیں ہوتے۔ اشاعرہ نے اس مسئلے کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے جس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک انبیاء کی

بعثت، کتب الٰہیہ کی تنزیل، سابقہ شریعتوں کی تنسیخ اور دورِ جاہلیت کی رسوم و عادات کی بیخ کنی میں کوئی مصلحت پیش نظر نہ تھی۔ بس ارادے نے جو دو ممکن چیزوں میں سے ایک کو ترجیح دیتا ہے، اپنا کام کر ڈالا۔ ہم اشاعرہ کے اس قول کو اس شکل میں تسلیم نہیں کرتے۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ اللہ کے افعال ایسی اغراض اور علل سے تو ضرور خالی ہوتے ہیں جن کی نسبت یہ خیال ہو کہ ان سے ذات واجب الوجود کی تکمیل ہوتی ہے لیکن اللہ کے افعال میں مصلحت جس کی بنا لطف و کرم ہوتی ہے، لازماً پائی جاتی ہے۔ فقہائے صحابہ و تابعین و تبع تابعین کا مسلکِ اصلی احکام کی علتوں کی معرفت، ان کی مصالح کی پہچان اور جو مفاسد تھے، ان کی شناخت علیٰ وجہ المناسب تھی۔ مثال کے طور پر جان و مال، عقل و خرد، عزت و آبرو اور جماعت و ملت کی حفاظت ضروری ہے۔ اس کے لئے حدود کا اجرا ہوتا ہے۔ اسی طرح صوم و صلوٰۃ، حج و زکوٰۃ اور تہذیب نفس انسان کو بہیمیت سے نکال کر ملکیت میں لے جانے کے لئے ضروری ہے۔ جب ہم اللہ تعالیٰ کے افعال اور اس کے احکام پر غور کرتے ہیں تو عقلی قطعی طور سے ہمیں اس بات پر ماننے پر مجبور کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے افعال و احکام میں مصلحت مطلوب ہوتی ہے نہ کہ خرابی و فساد..... قرآن اور احادیث میں بہت سے مصالح اور مفاسد کی خبریں صاف طور پر بیان کی گئی ہیں۔ یہ مقدمات اسی طرح شہرت پا چکے ہیں کہ سنت نبوی کا اتباع کرنے والے ان کے ثبوت پر مجبور ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اہلِ سنت کا مذہب نہ تو اشاعرہ کا قول ہے، نہ ماتریدیہ کا بلکہ جو کتاب و حدیث مشہور کے نص اور اجماع و قیاس جلی سے ثابت ہو، وہ مذہب اہلِ سنت ہے اور اس کا قائل سُنّی ہے، خواہ وہ اشعری ہو یا ماتریدی۔ فقیر کا اس معاملے میں ظن غالب یہ ہے کہ ان مسائل میں اشعری کی اصل غرض چند الزامی جوابات ہیں جن سے مخالف مذاہب کے شر کو ان کے ذریعہ ختم کرنا مقصود تھا نہ کہ اس بات کو ثابت کرنا کہ شریعت میں ایسا اور ایسا ہوتا ہے۔

یہ نکتہ تو اجمالی طور پر مذکور ہو چکا۔ اب جاننا چاہیے کہ رسولوں کے بھیجنے، کتابوں کے نازل کرنے اور (لوگوں کو) احکامِ شرع کا مکلف کرنے کا سبب لطفِ الٰہی ہے یعنی افرادِ بنی آدم اپنی نوع کے کمال تک ان چیزوں کے بغیر نہیں پہنچ سکتے۔ چنانچہ اسی رحمت نے جو نوعِ انساں کی تخلیق کا باعث ہوئی تھی، دوبارہ اپنے چہرے سے پردہ ہٹایا اور ایک ایسی شریعت کا فیضان فرمایا جو افرادِ بشر کی تکمیل کر دے اور انہیں ان کے اپنے (نوعی) کمال اور جمال کو پہنچا دے جیسا کہ ایک باغبان پودا لگاتا ہے اور اس کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ باغبان کی اس دیکھ بھال کی تاثیر کا پہلا مرتبہ زمین میں بیج کا قرار پکڑنا ہے۔ پھر بیج کا اپنے اطراف و جوانب سے پانی اور ہوا کو جذب کرنا ہے، دوسرے مرتبے میں باغبان کی یہی دیکھ بھال اس پودے کی شاخوں اور پتوں کے ظہور کا باعث بنتی ہے اور تیسرے مرتبے میں بعینہٖ وہی دیکھ بھال اس سے پھولوں اور پھلوں کو وجود میں لانے کا سبب بنتی ہے۔ غرض پہلے مرتبے میں یہ دیکھ بھال پودے کے اجزاء میں زیادتی کا باعث ہوتی ہے اور دوسرے مرتبے میں بالکل وہی اس کے اجزا کی تازگی اور اس کے پتوں اور پھولوں میں طرح طرح کی لکیروں کو وجود میں لانے کا سبب بنتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ جو آسمانوں اور زمین کا تدبیر کرنے والا ہے، جس غذا کو اولاً بچے کے اجزا کی زیادتی کا سبب بناتا ہے، وہی غذا دوسرے مرتبے میں اس کے جمال و حسن کے ظہور اور اس کی نوع کی جو مخصوص حرکات و سکنات ہیں، انہیں وجود میں لانے کا موجب ہوتی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ شریعت کا تعین (تشریع) تمہ ہے تقدیر (اللہ کے اندازے) کا اور لوگوں کو جو شریعت کا مکلف بنایا جاتا ہے تو یہ تمہ ہوتا ہے نوع کی تکوین (کے تقاضوں کا)

قوتِ عاقلہ اور قوتِ عاملہ کا درجۂ کمال

ایک جگہ شاہ صاحب نے وہ صفات بیان کی ہیں جن کے انبیاء علیہم السلام بحیثیت انبیاء حامل ہوتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ جب اپنے بندوں کو خیر سے نزدیک اور شر سے دور کرنے کا ارادہ کرتا اور ان کے مظالم رفع کرنا چاہتا ہے تو اس کا یہ ارادہ جو سرتاپا لطف و کرم ہوتا ہے، بعثت انبیاء کا باعث بنتا ہے۔ بعثتِ انبیاء کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا' یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے:۔

هو الذی بعث فی الامیین رسولاً منهم يتلو عليهم اياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة

(وہی ہے جس نے اُمیوں میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا' جو ان کے سامنے اس کی آیات تلاوت کرتا' ان کا تزکیہ اخلاق کرتا اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔)

شاہ صاحب فرماتے ہیں' لوازم نبوت میں سے ایک یہ امر بھی ہے کہ جسے نبی مبعوث کیا جارہا ہے' وہ یہ جانے کہ اسے تمام افرادِ بشر میں اس مقصد کے لئے مخصوص کیا جارہا ہے اور یہ کہ وہ نفس ناطقہ کی دونوں قوتوں یعنی قوتِ عاقلہ اور قوتِ عاملہ میں درجہ تکمیل پر فائز ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی آیت **الله اعلم حيث يجعل رسالته** (اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کسے اپنا رسول بنائے) اسی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے بغیر کسی فعل اور عمل کی وساطت سے انبیاء علیہم السلام کو زیادہ سے زیادہ قوتِ عاقلہ عطا فرماتا ہے اور اسی امتیاز خصوصی کی وجہ سے عالمِ غیب سے ان پر وحی نازل ہوتی رہی۔ اسی طرح انبیاء کی قوتِ عاملہ کو بھی خداوندی مدد ملتی ہے۔ اس قوت کی بدولت وہ معاصی سے مجتنب رہے اور آداب' طاعت وعبادات' تدبیر منزل اور سیاستِ مدن کو اس طرح بروئے کار لائے کہ اس سے بہتر کسی غیر نبی سے ممکن نہیں۔ اخلاق' شجاعت' سخاوت' کفایت' عدالت اور استقامت یہ سب اوصاف اسی قوتِ عاملہ سے حاصل ہوتے ہیں۔

شاہ صاحب کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کے بحیثیت ان کے انبیا ہونے کے یہ صفات ہیں۔ اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ اگر ناظرین مقاماتِ نبوت کو پہچاننے کا اس سے بھی آسان طریقہ چاہیں تو وہ یہ ہے: فرض کیجیے کہ مندرجہ ذیل چار شخصیتیں ایک شخصِ واحد میں جمع ہیں اور اسے نبی اور پیغمبر کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

پہلا شخص ایک عادل بادشاہ ہے۔ عام بادشاہوں کی طرح نہیں بلکہ ایسا بادشاہ جس کا مرتبہ بالطبع بادشاہِ عالم کا ہے۔ اس کی پرتوِ ذات سے لوگوں میں حسن انتظام پیدا ہو اور وہ آپس میں مہر ومحبت سے رہیں اور وہ شخص نمونہ ہو حکمت' عدالت' کفایت' شجاعت اور اس طرح کے اعلیٰ اوصاف کا۔ آیت **هو الذى الّف بين قلوبهم لو انفقت مافى الارض جميعا ما الفت بين قلوبهم ولكن الله الف بينهم** (وہی ہے جس نے ان کے دلوں میں الفت پیدا کی۔ اگر تم دنیا بھر کی دولت صرف کرتے' تب بھی ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ کرسکتے لیکن اللہ ہی ہے جس نے ان کے دلوں میں الفت پیدا کردی) بس اسی کی طرف اشارہ ہے۔

دوسرا شخص ایسا حکیم فرض کرو جو حکمت عملیہ میں ممتاز اور علم الاخلاق' تدبیر منزل اور سیاستِ مدن میں مہارتِ تامہ

رکھتا ہو اور یہ صفات اس میں طبعاً پائی جاتی ہوں۔ قرآن مجید کی آیت يؤت الحكمة من يشاء اور من يؤت الحكمة فقد اوتی خیراً کثیرا میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ تیسرا شخص وہ عارف کامل' صوفی کامل اور مرشد کامل ہے جو تہذیب نفس اور تزکیہ نفس کے طریقوں سے خوب واقف ہے۔ اس سے عجیب وغریب کرامات اور خوارق کا صدور ہوتا ہے۔ اس کے رشد و ہدایت اور اس کی صحبت کی تاثیر سے گمراہ راہِ راست پر آئیں۔ اس نے سالہا سال ریاضتیں اور مجاہدے کر کے اپنے نفس کا تزکیہ کیا ہو۔ وہ عبادت گزار اور اطاعت شعار ہو۔ اس عالم اجسام سے اس عالمِ ارواح تک اس کی رسائی ہو اور جیسا کہ صوفیائے کرام کے حالات تھے' وہ شخص عالی مقامات اور بلند احوال و مراتب پر فائز ہو۔ یہی وہ صفت ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے آیت ویزکیھم ويعلمه الكتاب والحكمة میں اشارہ کیا ہے۔ چوتھا شخص جرائیل امین ہے جس کا آسمانوں میں بلند مرتبہ ہے اور وہ مطاع ہے (یعنی اس کی اطاعت کی جاتی ہے) وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے نبیوں کے درمیان واسطہ ہے۔ اس کے ذریعہ وحی اور الہام ہوتا ہے اور وہ علم کا فرشتہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کائنات میں جو تدبیریں بروئے کار لاتا ہے' وہ ان میں ایک جارحہ اور ذریعہ ہے۔ نیز تدبیر و انتظام کرنے والے (مدبرات الامور) فرشتوں کا وہ سربراہ ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔ یہاں جرائیل سے ہماری مراد وہ قوتِ ملکیہ ہے جو ایک ذریعہ اور جارحہ ہے تدبیراتِ الٰہی کا، اور واسطہ ہے علوم خداوندی کے اخذ کا یعنی وہ شخص جس کی اصلی جبلت جبرئیلی ہو' اس کے لئے حظیرۃ القدس کی راہیں کھلی ہوں۔ ملاءِ اعلیٰ سے جو علوم اس کی عقل اور قلب پر القا ہوں' وہ ان کو بسہولت اخذ و جذب کر سکے۔

غرض شاہ صاحب کے نزدیک جس شخص واحد میں مذکورہ بالا ان چار شخصوں کے اوصاف جمع تھے' اسے نبی اور پیغمبر کے نام سے موسوم کیا گیا۔

جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''الکتاب والحکمۃ'' کی تعلیم دی اور اس کے ساتھ ساتھ تزکیہ نفوس بھی کیا۔ اس ضمن میں شاہ صاحب لکھتے ہیں:

جس طرح وضو' غسل، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے مسائل، تلاوتِ قرآن مجید کے آداب و احکام اور دعائیں وغیرہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اخذ کی گئی ہیں۔ اسی طرح نکاح' خرید و فروخت' قیام عدل اور تنازعات طے کرنے کے طریقے بھی آپؐ سے ماخوذ ہیں اور یہ کہ یہ مسائل اور احکام ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بلاواسطہ نہیں بلکہ بالواسطہ اخذ کیے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ واسطہ کون لوگ ہیں۔ ہم یہاں اس مسئلے کو ایک تمثیل سے سمجھاتے ہیں۔ معلوم ہونا چاہیے کہ اس امت کی مثال ایک مضبوط دیوار کی ہے جس کی ہر اینٹ اور پتھر اوپر سے لے کر نیچے تک اپنے نیچے کی اینٹ اور پتھر کے سہارے پر کھڑا ہے۔ یہی صورت ان واسطوں کی ہے۔ ہر بعد کے دور نے اپنے پہلے کے دور سے استفادہ کیا ہے اور اس طرح وہ اس کا ممنون و احسان مند ہے۔ ہر شخص کی نظر سب سے پہلے تو ان مشائخ پر پڑتی ہے جن سے وہ علوم حاصل کرتا ہے۔ پھر ان پر جو ان مشائخ کے سرگروہ تھے' جیسے احناف کے لئے حضرت امام ابوحنیفہ۔ شافعیوں کے لئے حضرت امام شافعی۔ قادریوں کے لئے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی۔ نقشبندیوں کے لئے حضرت خواجہ نقشبند۔ چشتیوں کے لئے حضرت خواجہ معین الدین چشتی۔ پھر ان بزرگانِ تصوف کا سلسلہ حضرت جنید بغدادی اور ان کے ہم عصروں تک پہنچتا ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کی قرأت کا سلسلہ قراء سبعہ پر' علم کلام کے شیخ ابوالحسن اشعری پر' تفسیر قرآن کا

ثعلبی وواحدی اوران کے امثال واقران پراور علم سیرت کا سلسلہ محمد بن اسحٰق پر پہنچتا ہے۔

اس کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ان بزرگوں نے تو علم کو جمع و مدون کیا' لیکن اخذ تو انہوں نے سلف صالحین سے کیا۔اس لئے سلف صالحین کے طبقہ اولیٰ یعنی صحابہ کرام کا امت پر سب سے زیادہ احسان ہے۔

باہم مشورے کا اصول

بغوی' زہری سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی مجلس (قرآن مجید کے) قاریوں سے بھری رہتی تھی۔ان میں نوجوان بھی تھے اور ادھیڑ عمر کے بھی۔آپ ان سے اکثر مشورے کرتے تھے۔وہ فرمایا کرتے تھے' تم میں سے کوئی مشورے میں اپنی رائے دینے میں تامل نہ کرے کیونکہ علم کا دارومدار کسی کے بڑی یا کم عمر ہونے پر نہیں بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے' اسے اس سے بہرہ ور کرتا ہے۔

بغوی روایت کرتے ہیں۔حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا' رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں لوگوں کا مواخذہ وحی کے ذریعہ ہوتا تھا۔وحی کا سلسلہ تو منقطع ہو گیا۔اب ہم تمہارے ان اعمال پر جو ہم پر ظاہر ہوتے ہیں' مواخذہ کریں گے۔ پس جس کے ہم پر اچھے عمل ظاہر ہوئے' وہ ہماری طرف سے محفوظ و مامون ہے۔اسے ہمارا تقرب ہوگا اور اس کی کسی پوشیدہ چیز یا باطن سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔اللہ اس کے پوشیدہ امور کا خود حساب لے گا۔جس کے ہم پر برے اعمال ظاہر ہوئے' ہم اسے امن میں نہیں رہنے دیں گے اور اس کو سچا نہیں سمجھیں گے' خواہ وہ زبان سے کہے کہ میرا باطن اچھا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں علوم کی تمام اقسام میں لوگوں کی نظر آپؐ کی (ذات اقدس کے) جمال پر اور ان کے کان آپؐ کی آواز پر رہتے تھے۔جہاد' صلح' جزیہ کے امور اور فقہی احکام اور زہد و اتقا کے علوم میں سے جو کچھ پیش آتا' سب لوگ آپؐ ہی سے ان کے متعلق استفسار کرتے' گویا وہ اسی دن ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں۔ چنانچہ سید الرسل علیہ افضل الصلوٰت والتسلیمات کی بعثت سے قبل جو بھی رسمی اور تجربی علوم ان کو معلوم تھے' وہ تمام آسمانوں اور زمین کی تدبیر کرنے والی جلیل القدر ذات کی طرف سے نازل ہونے والے فیوض کے غلبہ کی وجہ سے ناپید ہو گئے اور ان کا معمول ہو گیا کہ وہ ہر معاملے میں مخبر صادق کے حکم کا انتظار کرتے۔

(آپؐ کے انتقال کے بعد) جب نوبت شیخین (حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ) کی خلافتِ خاصہ کی آئی تو اکثر مجلسوں میں انہوں نے منصبِ نبوت اور منصبِ خلافت میں تفریق و تمیز کا اظہار کیا اور اس طرح اجتہادی مسائل اور احادیث کی جانچ پڑتال میں باہم مشورت کرنے کا دروازہ کھل گیا لیکن اس کے باوجود جب خلیفہ کی طرف سے کوئی بات طے ہو جاتی تو پھر کسی کو اس سے اختلاف کرنے کی گنجائش نہیں رہتی تھی۔ان سب امور میں نہ وہ اِدھر اُدھر جاتے تھے اور نہ خلیفہ سے رائے لئے بغیر وہ کسی کام کا مصمم ارادہ کرتے تھے۔اس کی وجہ سے مذاہب (فقہ) کا اختلاف اور آرا کا افتراق اس دور میں واقع نہیں ہوا۔سب کے سب ایک مذہب پر متفق اور ایک راستے پر مجتمع تھے اور یہ خلیفہ کا مذہب اور رائے تھی۔ احادیث کی روایت' فتووں' قضا اور وعظ و نصیحت کا معاملہ خلیفہ یا اس کے کسی نائب سے مختص تھا۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔سوائے امیر یا امیر کے کوئی مقرر کردہ یا کوئی متکبر آدمی کے اور کوئی وعظ نہیں کرتا۔حضرت عمرؓ نے فرمایا' فتویٰ اور قضا کا

کام وہی سرانجام دے جو اس کے نفع ونقصان دونوں کو برداشت کر سکتا ہے۔

جب حضرت علیؓ کی خلافت کی نوبت آئی تو تقدیرِ الٰہی کے حکم کے مطابق امت میں افتراق پیدا ہو گیا۔ بہت سے علاقے خلیفہ کی اطاعت سے نکل گئے۔ اس وقت علماء اور فقہا حیرت میں پڑ گئے۔ وہ اس امر کا انتظار کرنے لگے کہ امروز وفردا میں خلافت کا معاملہ ٹھیک ہو جائے گا لیکن بعد میں جب خلافتِ خاصہ کے دن پوری طرح ختم ہو گئے۔ خلافتِ عامہ ظہور میں آئی اور اجتماع وامن کی صورت پیدا ہوئی تو ہر علاقے کے عالم افادۂ علمی میں مقرر ہو گئے۔ ابنِ عباس مکہ میں فتوے دیتے' احادیث کی روایت اور قرآن کی تفسیر کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ اور عبداللہ بن عمر مدینہ میں احادیث کی روایت کرتے تھے۔ ان کے ساتھیوں' اولاد اور اقارب نے ان سے فقہ اخذ کی۔ حضرت ابو ہریرہؓ زیادہ تر روایتِ حدیث میں مصروف رہتے اور فقہائے مدینہ نے ان سے احادیث پیش کیں۔ غرض ہر جگہ کوئی نہ کوئی صحابی یا تابعی افادۂ علمی کی سند پر فائز ہو گیا اور لوگوں نے اس سے علم اخذ کیا کیونکہ پہلے کی طرح اب خلیفہ تمام امور میں آخری مرجع نہ رہا تھا۔ چنانچہ اسی زمانے میں فتاویٰ اختلاف پیدا ہوا۔

حواشی

(1) ہندوستان میں پہلے تورانی سُنی، پھر ایرانی شیعہ اور آخر میں متشدد سُنّی روہیلوں کی شکل میں داخل ہوئے۔ ان تینوں عناصر کے امتزاج سے تسنن وتشیع کے سلسلے میں عجیب افراط وتفریط کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ شاہ صاحب نے اس سلسلے میں بھی بڑا کام کیا ہے۔ بڑی محنت سے ہزارہا ہزار صفحات کو پڑھ کر آپ نے چاروں خلفاء کے واقعی حالات ''ازالۃ الخفاء'' میں ایسے دلنشین طریقہ سے مرتب فرمائے کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اگر شیعوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے تو اسی کے ساتھ غالی سنیوں کی شدت وتیزی میں کمی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو محض اس لئے کہ شاہ عبدالعزیز نے تنہا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مناقب کیوں بیان کیے یا شاہ ولی اللہ نے شیعوں کی تکفیر میں فقہائے حنفیہ کے اختلاف کو کیوں بیان کیا۔ ان پر بھی شیعیت کا فتویٰ صادر کر دیتے ہیں اور اسکے لئے بجائے مناظرے اور مجادلے کے شاہ صاحب نے ایک ایسی راہ دریافت فرمائی جس سے بہت سے فتنوں کا خاتمہ ہو گیا۔

(2) ہر چیز کو جائز وحلال سمجھنا۔

(3) یہ عقیدہ کہ اعمال خواہ برے بھی ہوں' نجات ہو جائے گی۔

(4) فتنے کا آغاز حضرت عثمانؓ کی شہادت سے ہوتا ہے جبکہ خلافتِ راشدہ کی مرکزیت درہم برہم ہو گئی۔

(5) ممکن ہے شہرستانی کا اشارہ بیعتِ حضرت ابوبکرؓ کی طرف ہو۔

(6) ایک نومولود بچہ بغیر کسی کے سکھائے ماں کے پستان کو چوسنے لگتا ہے اور اسی طرح اس سے غذا حاصل کرتا ہے۔ یہ ہے الہام جبلی جو وقتی ضرورت پڑنے پر بچے کو ہوتا ہے۔ یہی صورت جملہ حیوانات کی ہے۔

☆☆☆

سوانحِ حیات

اپنے حالاتِ زندگی

شاہ ولی اللہ صاحب اپنی کتاب ''انفاس العارفین'' کے مقدمہ میں جو خود ان کے' ان کے والد وتایا

شاہ عبدالرحیم اور شیخ ابوالرضا محمد اور ان کے مشائخ واجدادِ کرام کے سوانح حیات پر مشتمل ہے' لکھتے ہیں:۔ اہل بصیر پر مخفی نہیں کہ اس بنا پر کہ مشائخ کی حکایات کہ وہ اللہ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہیں اور مشائخ صوفیہ کے اقوال واحوال کہ وہ ان کی کرامت واستقامت پر مشتمل اور علوم ظاہر و باطن پر جامع ہیں۔ مبتدینِ (سلوک) کو ترغیب دیتے اور شوق دلاتے ہیں اور منتہین کے لئے دستور اور میزان ہوتے ہیں۔ خاص طور سے اولاد واحفاد کو اپنے آباؤ اجداد کے کارنامے سننے سے فائدہ پہنچنے کی توقع ہوتی ہے کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ یہ کارنامے استعداد رکھنے والے میں غیرت پیدا کرتے ہیں اور یہ غیرت اسے ایک مقام پر پہنچا دیتی ہے یا انہیں سن کر ایک منصف مزاج کو اپنی کوتاہی کا احساس ہوتا ہے اور اس سے ایک دانا کے سامنے درِ توبہ کھل جاتا ہے:

''انفاس العارفین'' مجموعہ ہے مختلف رسائل کا' یہاں ان کا ملخص دیا جا رہا ہے:

فقیر ولی اللہ بن عبدالرحیم اللہ اسے اور اس کے والدین کو بخشے اور ان دونوں کو اور اس کو اپنے احسان سے سرفراز فرمائے، کہتا ہے کہ یہ چند کلمے ہیں **الجزء اللطیف فی ترجمة العبد الضعیف** کے نام سے موسوم ہیں۔ معلوم ہونا چاہیے کہ اس فقیر کی ولادت بدھ کے دن سورج نکلنے کا وقت 4 شوال 1114ھ کو ہوئی۔[1]

بعض منجمین نے علومِ نجوم کی بنا پر حکم لگایا کہ میری پیدائش کے وقت حوت کا درجہ دوم طالع میں تھا اور شمس بھی اس درجہ میں تھا۔ زہرہ آٹھ' عطارد اکیس' زحل دس اور مشتری پندرہ درجے میں تھا اور وہ سال علوئین کے قِران کا سال تھا اور یہ قِرِان درجہ اول میں تھا اور مریخ اس سے دوسرے درجہ میں اور راس سرطان تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بعض دوستوں نے تاریخ (پیدائش) ''عظیم الدین'' سے نکالی ہے۔ والدین' قدس اللہ تعالیٰ سرہما اور صالحین کی ایک جماعت کو اس فقیر کے حق میں پیدائش سے پہلے اور اس کے بعد کثرت سے بشارتیں ہوئیں۔ چنانچہ ایک عزیز ترین بھائی اور خاص دوست نے ان واقعات کی تفصیل دوسرے واقعات کے ساتھ ایک رسالہ میں قلمبند کی ہے اور اس رسالہ کا نام ''قول جلی'' رکھا ہے۔

جزاه الله خير الجزاء واحسن اليه والى السلافه واعقابه وادخله الى مايتمناه من دينه ودنياه (اللہ اسے اچھا بدلہ دے اور اس کے' اس کے اسلاف اور اس کی پیروی کرنے والوں کے ساتھ نیکی کرے اور دین د دنیا میں سے اس چیز میں داخل کرے جس کی تمنا وہ کرے۔)

جب پانچواں سال ہوا تو میں مکتب میں بیٹھا اور ساتویں سال میں والد بزرگوار نے نماز شروع کرائی اور روزہ رکھنے کا حکم دیا اور اسی سال میں ختنہ ہوا اور میرے خیال میں ایسا ہے کہ اس سال کے آخر میں میں نے قرآن عظیم ختم کیا۔ فارسی کتابیں اور ابتدائی عربی کتابیں پڑھنی شروع کیں اور دسویں سال میں شرح مُلّا پڑھتا تھا اور ایک حد تک مطالعہ کی راہ کھل گئی۔

چودہویں سال میں شادی ہوگئی اور اس سلسلہ میں والد بزرگوار کو بہت جلدی تھی۔ جب سسرال والوں نے اسباب کے مہیا نہ ہونے کا عذر کیا تو والد بزرگوار نے ان لوگوں کو لکھا کہ (اس) عجلت میں ایک راز ہے اور وہ راز بعد کو ظاہر

ہو گیا کہ شادی کے بعد جلد ہی میری بیوی کی والدہ فوت ہو گئیں اور اس کے بعد جلد ہی میری بیوی کے نانا اور اس کے بعد جلد ہی شیخ فخر العالمؒ فقیر کے عم بزرگوار شیخ ابوالرضا کے بیٹے فوت ہو گئے اور اس کے بعد ہی اس فقیر کے بڑے بھائی شیخ صلاح الدین کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔

اس کے بعد ہی والد بزرگوار بہت ضعیف ہو گئے اور مختلف بیماریوں نے ان پر غلبہ کر لیا اور اس کے بعد ان کی وفات کا واقعہ پیش آیا۔ غرض کہ بزرگوں کی یہ جماعت منتشر ہو گئی اور خاص و عام کو معلوم ہو گیا کہ اگر اس زمانے میں شادی نہ ہوتی تو اس کے کئی سال تک امکان نہ تھا کہ یہ بات (شادی) ہوتی۔

میں پندرہ سال کا تھا کہ والد بزرگوار سے بیعت کی اور صوفیہ کے اشغال خاص طور پر نقشبندیہ مشائخ کے اشغال میں مشغول ہوا۔ ان کی توجہ، تلقین اور آدابِ طریقت کی تعلیم اور خرقۂ صوفیہ پہن کر میں نے اپنی نسبت درست کی۔

اسی سال بیضاوی کا ایک حصہ پڑھا۔ والد بزرگوار نے کھانے کا بہت اہتمام کیا اور خاص و عام کی ضیافت کی اور (اس موقع پر) درس کی اجازت دی۔ غرض کہ اس ملک کے رواج کے مطابق فنونِ متعارفہ سے پندرہ سال میں فراغ حاصل کیا۔

علم حدیث میں مشکوٰۃ کو پورا پڑھا لیکن کتاب البیع سے کتاب الآداب تک چھوڑ دی اور اس سب کی اجازت مل گئی۔ صحیح بخاری کا ایک حصہ کتاب الطہارت تک تمام شمائل النبیؐ والد بزرگوار سے سماع کی۔ سبق کی قرأت بعض ساتھیوں نے کی۔ علمِ تفسیر میں کچھ حصہ تفسیر بیضاوی کا اور کچھ حصہ تفسیر مدارک کا پڑھا۔

اس ضعیف پر سب سے بڑا احسان (اللہ تعالیٰ) کا یہ تھا کہ میں نے چند مرتبہ مدرسہ میں والدِ بزرگوار کی خدمت میں قرآن عظیم، معانی اور شانِ نزول کو سمجھتے ہوئے اور تفاسیر کی کتابوں کی طرف رجوع کرتے ہوئے پڑھا اور یہ طریقہ فتح عظیم کا سبب ہوا۔ والحمدللہ!

علم فقہ میں شرح وقایہ اور ہدایہ دونوں کتابیں تھوڑے حصہ کے سوا پوری پڑھیں۔ اصولِ فقہ میں حسامی اور توضیح تلویح کا کسی قدر حصہ پڑھا اور منطق میں مکمل شرح شمسیہ، شرح مطالع کا کچھ حصہ، کلام میں شرح عقاید، خیالی کا کچھ حصہ اور شرح مواقف کا کچھ حصہ، سلوک میں عوارف کا کچھ حصہ اور کچھ رسائل نقشبندیہ وغیرہ۔ حقائق میں شرح رباعیاتِ مولانا جامی ولوائح۔ مقدمہ شرح لمعات، مقدمہ نقد النصوص، خواص اسماء و آیات میں والد بزرگوار کا خاص مجموعہ، جس کی انہوں نے چند مرتبہ اجازت دی۔ طب میں موجز القانون۔ حکمت میں شرح ہدایۃ الحکمۃ وغیرہ۔ نحو میں کافیہ شرح ملّا۔ معانی میں مطول کا بڑا حصہ اور مختصر معانی اس قدر پڑھی جس پر ملّا زادہ کا حاشیہ ہے۔ ہندسہ و حساب میں بعض مختصر رسالے پڑھے اور اس عرصہ میں ہر فن کے متعلق سخنان بلند (اونچی باتیں) ذہن میں آتے تھے، اور جتنی کوشش کی جاتی تھی اس سے زیادہ مقصد حاصل ہو جاتا تھا۔

فقیر سترہویں سال میں تھا کہ والد بزرگوار بیمار ہو گئے اور اس مرض میں ان کا انتقال ہو گیا اور مرض الموت میں انہوں نے (مجھے) اجازت بیعت وارشاد دی اور کلمہ ''یدہ کیدی'' (اس کا ہاتھ میرے ہاتھ کی طرح ہے) مکرر فرمایا۔

وہ نعمت جسے سب سے بڑی سمجھنی چاہیے، وہ یہ ہے کہ والد بزرگوار اس فقیر سے بہت رضامند رہے اور نہایت

رضامندی میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی توجہ نہیں ہوتی ہے اور میں نے کسی باپ، کسی استاد اور کسی مرشد کو نہیں دیکھا کہ وہ بیٹے اور شاگرد کے ساتھ ایسی خاص شفقت برتتے جیسی کہ والد بزرگوار نے مجھ فقیر کے ساتھ برتی۔

اللھم اغفرلی ولوالدی وارحمھما کما ربیٰنی صغیرا وجازھما بکل شفتقة ورحمة ونعمة مھیماً علیٰ مائة الف اضعا فھا انك قریب مجیب	اے پروردگار! میری اور میرے والدین کی مغفرت فرما۔ اوران پر رحم فرما، جیسے کہ انہوں نے مجھے بچپن میں پالا اوران کی ہر شفقت، رحمت اور نعمت کا انہیں ہزار ہا ہزار گنا اجر عطا کرے بے شک تو نزدیک اور دعا قبول کرنے والا ہے۔

والد بزرگوار کے انتقال کے بعد کم وبیش بارہ برس کتب دینیہ وعقلیہ کے درس میں مشغول رہا اور ہر علم میں مہارت حاصل ہو گئی۔ جب میں (والد بزرگوار کی) قبر مبارک پر توجہ کرتا تھا، اس زمانے میں توحید کے راز کھل جاتے تھے۔ جذب کا راستہ کشادہ ہوتا اور سلوک کا ایک بڑا حصہ میسر آتا، اور علوم وجدانیہ خوب خوب حاصل ہوتے تھے۔

مذاہب اربعہ اوران کی اصولِ فقہ کی کتابوں اور وہ احادیث جن سے یہ تمسک کرتے ہیں، ان کے ملاحظہ کے بعد غیبی روشنی کی مدد سے فقہائے محدثین کی روش مجھے پسند آئی۔ اوران بارہ سال کے بعد مجھے حرمین محترمین کی زیارت کا شوق ہوا۔ اور 1143ھ کے آخر میں حج سے مشرف ہوا۔ 1144ھ میں مکہ معظمہ میں قیام، مدینہ منورہ کی زیارت اور شیخ ابوطاہر قدس سرہ وغیرہ مشائخ حرمین سے روایت حدیث کی سعادت حاصل کی۔

اسی دوران حضرت سید البشر علیہ افضل الصلوٰۃ واتم التحیات کے روضۂ منورہ کی طرف متوجہ ہوا اور بہت فیوض حاصل کیے۔ حرمین کے رہنے والے علما وغیرہ سے دلچسپ صحبتیں رہتی تھیں اور شیخ ابوطاہر سے جامع خرقہ پہنا جو صوفیوں کے تمام سلاسل کے خرقوں کا جامع تھا۔ اس سال کے آخر میں حج ادا کیا۔ 1145ھ کے شروع میں وطن کے لئے روانہ ہوا بروز جمعہ 14/رجب 1145ھ کو صحت وسلامتی کے ساتھ وطن پہنچا۔

واما بنعمة ربك فحدث	اور اپنے رب کی نعمت کا شکرادا کرو

سب سے بڑی نعمت فقیر پر یہ ہے کہ اس کو خلعت فاتحیہ عطا فرمائی اور اس آخری دور کا افتتاح میرے ہاتھ سے کرایا اور رہنمائی کی کہ فقہ میں جو پسندیدہ ہے اس کو جمع کر کے فقہ حدیث کی ازسرنو بنیاد رکھی جائے۔ حدیث کے اسرار، احکام کی مصلحتیں، ترغیبات اور جو کچھ حضرت پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم، خدا تعالیٰ سے لائے تھے، اس کی تعلیم دی جائے۔ وہ ایک ایسا فن ہے کہ اس فقیر سے پہلے فقیر سے زیادہ مرتب طریقہ پر کسی نے اس کو قلمبند نہیں کیا۔ حالانکہ وہ ایک جلیل القدر فن تھا اور اگر کسی کو اس بات میں شک ہو تو اس سے کہو کہ وہ کتاب ''قواعد کبریٰ'' کو دیکھے کہ شیخ عزالدین نے اس میں کس قدر کوشش کی ہے اور پھر بھی اس فن کے عشر عشیر سے بھی عہدہ برآنہ ہو سکے۔

طریقۂ سلوک جو حق تعالیٰ کا پسندیدہ ہے اور اس زمانے میں اسے کامیاب ہونا ہے، وہ (مجھے) الہام فرمایا اس کو میں نے دو رسالوں میں مرتب کیا ہے۔ ان رسالوں کا ''لمحات'' اور ''الطاف القدس'' نام رکھا ہے اور قدمائے اہل سنت کے عقائد کو دلائل اور حجت سے ثابت کیا ہے اوران کو معقولیوں کے شبہات کے خس وخاشاک سے پاک کیا اور اس طرح

ثابت کر دیا کہ اب بحث کا موقع نہیں رہا۔

علم کمالات۔ جس میں چار لفظ ابداع، خلق، تدبیر اور تدلّی کے معنی دیئے ہیں اور جو اس دنیا کے عرض و طول میں پائے جاتے ہیں اور انسانوں کے نفوس کی استعداد کا علم کہ ہر انسان کیونکر کامل ہوتا ہے اور اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ فقیر پر واضح کر دیا ہے اور یہ دونوں علم (علم کمالات و علم استعداد) بہت اہم ہیں کہ فقیر سے پہلے کوئی ان علوم تک نہیں پہنچا ہے۔

حکمتِ عملی کہ جس کے ذریعہ سے اس زمانے کی درستی ہو سکتی ہے، پوری وسعت کے ساتھ مجھے بخشی گئی ہے اور اس کو منضبط کرنے کی توفیق، قرآن و سنت اور آثار صحابہ سے مجھے دی گئی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو علم دین منقول اور جو اس میں داخل کر دیا گیا ہے یا اس میں تحریف کر دی گئی ہے اور جو کچھ سنت یا بدعت ہے، اس کی شناخت مجھے بخشی گئی ہے۔

ولو ان لی فی کل منبت شعرة لسانا لما استوفیت واجب حمده والحمد لله رب العالمین

(اور اگر میرا ہر بنِ مُو زبان بن جائے تو بھی میں خدا کی حمد اس کے حق میں بموجب نہ کر سکتا اور تمام تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جو دونوں جہانوں کا پالنے والا ہے۔)

حاشیہ

(1) اردو ترجمہ پروفیسر محمد ایوب قادری کا ہے۔ (مرتب)

☆☆☆

شاہ عبدالرحیم اور شیخ ابوالرضا محمد

شاہ عبدالرحیم

شیخ رفیع الدین محمد ابن شیخ قطب عالم ابن حضرت شیخ عبدالعزیز شکر بار دہلوی آپ کے نانا تھے۔ شیخ رفیع الدین محمدؒ کے والد ماجد شیخ قطب عالم کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ حضرت خواجہ باقی باللہ نے آغازِ سلوک میں ایک مدت ان کی خانقاہ میں قیام کر کے ان سے تعلیم حاصل کی ہے۔ اسی زمانے میں حضرت شیخ قطب العالم پر ایک رات یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ نصیب خواجہ بخارا میں ہے۔ اسی وقت آپ نے حضرت خواجہ سے فرما دیا تھا کہ تم کو مشائخ بخارا طلب کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ بخارا روانہ ہو گئے اور وہاں حضرت خواجہ امکنگی سے سب کچھ حاصل کیا۔ جب حضرت خواجہ واپس آئے تو خود شیخ قطب العالم نے حضرت خواجہ سے روحانی فیض حاصل کیا۔ شیخ قطب العالم کے صاحبزادوں میں سب سے بڑے صاحبزادے شیخ رفیع الدین محمد تھے۔ انہوں نے طریقہ چشتیہ و قادریہ اپنے والد ماجد سے اخذ کیا تھا اور شیخ

نجم الحق کی صحبت سے بھی مستفیض ہوئے تھے۔ بعدہ اپنے والد محترم کی ترغیب و تاکید سے حضرت باقی باللہ کی صحبت میں بالالتزام رہنے لگے۔ حضرت خواجہ کو شیخ رفیع الدین محمد کی جانب بہت التفات تھا۔ شیخ رفیع الدین محمد جو بات خدمت خواجہ میں عرض کرتے تھے' اس کو شرفِ قبولیت بخشا جاتا تھا۔ فیض یافتگان حضرت خواجہ اسی بنا پر شیخ رفیع الدین محمد کو محبوب خواجہ کہتے تھے۔

شیخ رفیع الدین محمد کا دوسرا نکاح جب شیخ محمد عارف ابن شیخ عبدالغفور اعظم پوری (خلیفۂ قطب عالم حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی) کی صاحبزادی سے ہونا قرار پایا تو مجلس نکاح میں شرکت کے لئے شیخ رفیع الدین محمد نے اپنے پیرو مرشد حضرت خواجہ سے عرض کیا۔ حضرت خواجہ نے اپنے ضعف کا عذر فرمایا۔ اس پر شیخ نے عرض کیا کہ اگر حضرت والا تشریف نہیں لے جائیں گے تو میں بھی نہیں جاؤں گا۔ مجبوراً حضرت خواجہ اعظم پور باسٹہ (ضلع بجنور) نزد بچھرایوں تشریف لے گئے۔ ''انفاس العارفین'' میں لکھا ہے کہ اس طرف کے صوفیائے کرام نے جب حضرت خواجہ کی تشریف آوری کی خبر سنی تو جوق در جوق استقبال کے لئے آئے۔ سوسوکوس سے اہل اللہ' حضرت خواجہ کی ملاقات کے اشتیاق میں کھچا کھچ اعظم پور باسٹہ پہنچ گئے تھے۔ اس طرح ایک چھوٹے سے قصبے میں ایک عجیب روحانی مجلس منعقد ہوئی۔ حضرت شاہ ولی اللہ اس واقعہ کو نقل کر کے تحریر فرماتے ہیں کہ میرے والد ماجد کی والدہ ماجدہ جو کہ شیخ رفیع الدین محمد کی صاحبزادی تھیں انہی اعظم پور کے شیخ محمد عارف کی نواسی تھیں۔

حضرت شاہ عبدالرحیم تقریباً 1056ھ میں پیدا ہوئے۔ جب ہوش سنبھالا تو تحصیلِ علم میں مشغول ہو گئے۔ بچپن ہی سے آثار رشد و صلاحیت آپ کے اطوار سے نمایاں تھے۔ خود بیان فرمایا کرتے تھے کہ میرے ماموں شیخ عبدالحیٔ ایک اونچے درجے کے درویش مزاج' نیک دل انسان اور متقی بزرگ تھے۔ انہوں نے اپنے لڑکوں کی تربیت میں بہت کوشش کی مگر وہ متاثر نہیں ہوتے تھے۔ اس بات سے ان کو بہت غم تھا۔ میرے بچپن کے زمانے میں ایک دن ماموں صاحب نے مجھے دیکھا کہ میں دستار زانو پر رکھے ہوئے دھیان کے ساتھ قاعدے کے مطابق مسنون طرز پر وضو کر رہا ہوں تو بہت خوش ہوئے اور خدا کا شکر ادا کیا اور یوں فرمایا کہ میں اپنی اولاد کے اندر تربیت کا اثر نہ ہونے کی وجہ سے ڈرتا تھا کہ کہیں ہمارے اسلاف کی نسبت منقطع نہ ہو جائے۔ اب معلوم ہوا کہ ہمارے خاندان میں اسلاف کی نسبت و خصوصیت کا حامل موجود ہے۔ اگر اولادِ پسر میں نہیں تو کیا غم ہے۔ اولاد دختری میں تو ہے۔

''انفاس العارفین'' میں ہے کہ آپ نے خود فرمایا کہ میں نے عربی کے ابتدائی رسائل سے لے کر شرح عقائد اور حاشیہ خیالی تک اپنے بھائی شیخ ابوالرضا محمد سے پڑھا ہے اور چند دیگر کتب مرزا زاہد ہروی سے پڑھی ہیں۔

حضرت خواجہ خُرد سے بھی تھوڑی سی تعلیم حاصل کی ہے۔ اس کا واقعہ اس طرح بیان فرمایا کہ جب میں اپنے بھائی سے شرح عقائد اور حاشیۂ خیالی پڑھ رہا تھا تو میں نے ایک مقام پر ایک اعتراض کیا۔ بھائی نے اس کا جواب دیا۔ اس کے بعد برابر سوال و جواب ہوتا رہا اور ایک مناظرے کی سی شکل پیدا ہو گئی جس سے طرفین میں کچھ رنجش سی پیدا ہو گئی۔ میں نے اس کتاب کا پڑھنا موقوف کر دیا۔ ایک دن ہم دونوں بھائی حضرت خواجہ خُرد کی خدمت میں گئے۔

حضرت رحمتہ اللہ علیہ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ خیالی کہاں تک ہو گئی۔ میں نے کہا کہ عرصہ سے میں نے اس

کا پڑھنا موقوف کر دیا ہے۔فرمایا کیوں؟ میں نے عرض کیا کہ احکامِ نماز و روزہ سے تو آگاہی ہوگئی ہے۔اب اس سے زیادہ تعلیم میسر نہیں ہے۔اس بات پر اور زیادہ اہتمام سے وجہ دریافت کی۔آخر کار وجہ معلوم ہوگئی۔فرمایا اچھا ہمارے پاس پڑھو اور اس بات کو بڑی تاکید سے فرمایا۔میں صبح کو کتاب آپ کے پاس لے گیا۔آپ نے درس دیا۔جب میں نے وہ اعتراض آپ کے سامنے پیش کیا تو آپ نے اس کو بہت پسند فرمایا اور قوتِ اعتراض کا اظہار اور اعتراف کیا۔دوسرے اور تیسرے دن بھی درس دیا۔چوتھے دن فرمایا کہ تمہارے نانا شیخ رفیع الدین محمد نے مجھ کو بس تین دن ہی سبق پڑھایا ہے۔ میں بھی تم کو تین دن سے زیادہ درس نہیں دوں گا۔پھر حضرت خواجہ خُرد نے اپنے تین دن کے اسباق کا دلچسپ واقعہ سنایا (جو''انفاس العارفین''میں درج ہے) ساتھ ہی ساتھ حضرت خواجہ خُرد نے شیخ رفیع الدین محمد کی یہ کرامت بھی بیان فرمائی کہ تین درس دینے کے بعد حضرت شیخ نے فرمایا کہ اگر تمہیں فنِ تصوف کی تحقیق مقصود ہے تو مجھ سے کہو' میں تمہارے مکان پر آ کر روزانہ پڑھا جایا کروں گا۔مجھے یہ گوارا نہیں کہ تم یہاں آنے کی زحمت اٹھاؤ۔میں نے عرض کیا کہ میرا یہاں آنا حضرت تجویز نہیں کرتے اور حضرت کی تکلیف مجھے منظور نہیں ہے۔تو اب یہی معلوم ہو رہا ہے آپ سے تعلیم حاصل کرنے کا سلسلہ ختم ہوا۔اس پر خوش ہو کر فرمایا کہ ایک صورت اور بھی ہے۔اس کے بعد میرا ہاتھ پکڑا اور مسجد فیروز شاہی میں تشریف لے گئے اور ایک جگہ متعین کی اور فرمایا تصوف کی کوئی سی بھی مشکل کتاب ہو' تم کو یہاں بیٹھ کر اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔اگر کتاب حل نہ ہو تو میرا ذمہ ہے۔اس کے بعد کسی کتاب میں کوئی مشکل پیش آتی تو میں اس جگہ بیٹھ کر مطالعہ کرتا تھا' مشکل حل ہو جاتی تھی۔اگر ایک بالشت بھی اس جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ بیٹھتا تھا تو وہ دوسرے مواضع کی حیثیت رکھتی تھی۔ جب حضرت خواجہ خرد نے یہاں تک بیان فرمایا تو حضرت شاہ عبدالرحیم نے عرض کیا کہ وہ تین سبق تو اس کرامت تک مقید تھے۔اگر آپ بھی کوئی تصرف فرمائیں تو بہت اچھا ہو۔فرمایا کہ میں تمہارے متعلق یہ کہتا ہوں کہ اب اگر آئندہ تمہیں کسی کتاب کے مطالعہ میں مشکل پیش آ جائے تو میرے بارے میں یہ کہنا کہ فلاں نابکار نے میری راہ لوٹ لی۔حضرت شاہ عبدالرحیم فرمایا کرتے تھے کہ بحمد اللہ اس کے بعد مجھے مطالعہ میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔اگر چہ میں نے تکمیل مرزا زاہد کے پاس کی مگر وہاں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا حاصل کی ہوئی چیز کو حاصل کر رہا ہوں۔بسا اوقات ایسا ہوتا کہ ایک کتاب کا اول حصہ ابھی پڑھ رہا ہوں اور اس کے آخری حصے کو پڑھا دیتا تھا۔

آپ نے مرزا زاہد ہروی سے معقولات اور علمِ کلام کی کتابیں پڑھیں۔جس زمانے میں شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر آگرے میں تھے۔مرزا زاہد ہروی محتسب لشکر کی حیثیت سے وہیں رہتے تھے۔آپ بھی اپنے والد ماجد شیخ وجیہہ الدین شہید کے ہمراہ آگرہ چلے گئے تھے۔

اس زمانہ تعلیم کے بہت سے واقعات ''انفاس العارفین'' میں مختلف مقامات پر لکھے ہوئے ہیں۔''انفاس العارفین'' میں حضرت شیخ عبدالرحیم کی زبانی ایک جگہ لکھا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ شرح مواقف اور تمام کتب کلامیہ واصولیہ میں نے مرزا زاہدی ہروی سے پڑھی ہیں۔وہ میری جانب بہت توجہ فرماتے تھے۔اگر کسی دن میں نے یہ کہہ کر کہ آج میں نے مطالعہ نہیں کیا ہے سبق کا ناغہ کرنا چاہا تو فرماتے تھے میاں سبق کا ناغہ نہیں ہونا چاہیے۔ایک دو سطر ہی پڑھ لو۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ''انفاس العارفین'' میں مرزا زاہد کا مختصر حال اس طرح قلمبند کیا ہے:

مرزا محمد زاہد [1] ہروی قاضی [2] اسلم کے فرزند تھے۔ قاضی اسلم جہانگیر کے زمانے میں ہرات سے ہندوستان آئے تھے۔ جہانگیر نے ان کو قاضی القضاۃ کا عہدہ دیا تھا۔

مرزا محمد زاہد ملا محمد فاضل بدخشانی کے شاگرد تھے۔ ابتدائے جوانی میں کابل پہنچ کر ملا صادق حلوائی سے بھی تلمذ کیا تھا۔ بعد ازاں توران جا کر محمد جان شیرازی کے فیض صحبت سے مستفیض ہوئے اور فنونِ حکمت کو ملا یوسف سے حاصل کیا جو مرزا محمد جان کے ارشد تلامذہ میں سے اور مشہور زمانہ اساتذہ میں سے تھے۔ پھر لاہور وارد ہوئے اور تفسیر واصول کو مُلّا لاہوری سے پڑھا جو کہ عربیت میں یگانہ روزگار تھے۔ آخر میں وہ حاویٔ علوم عقلیہ ونقلیہ ہو گئے۔

آپ نے تیرہ سال کی عمر میں تمام علوم سے فراغت حاصل کر لی تھی۔ جودتِ ذہن اور استقامتِ فہم میں اپنے زمانے کے اندر بے نظیر تھے۔ آپ کی تصانیف میں حسب ذیل کتابیں مشہور اور طالبانِ علم کے درمیان رائج ہیں۔

حاشیہ شرح مواقف' حاشیہ شرح تہذیب' حاشیہ تصور وتصدیق۔ ان کے علاوہ بھی اور تصانیف ہیں۔

غالباً حاشیہ شرح مواقف کا مسودہ میرے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم کے پڑھنے کے زمانہ میں ہوا اور اس کا مبیضہ کابل میں کیا گیا ہے۔ مرزا زاہد نے جب منصبِ احتساب سے استعفیٰ دے دیا تو کابل چلے گئے اور وہیں گوشۂ عزلت اختیار کر لیا۔ مرزا محمد زاہد صوفیہ کے مشرب صافی سے بھی بہرۂ تام رکھتے تھے اور اکابر طریقت میں کسی ایک بزرگ کے صحبت یافتہ بھی تھے۔

والد محترم فرماتے تھے اور ''ارشاد رحیمیہ'' میں تحریر کیا ہے کہ میں نو دس سال کا تھا کہ خواجہ ہاشم نام کے والد بزرگ بخارا سے دہلی آئے اور ہمارے محلے میں آ کر ٹھہرے۔ انہوں نے مجھ کو تختی یا کاغذ پر اللہ اللہ لکھنے کی کچھ تلقین کی۔ کچھ عرصہ کے بعد فرمایا' اب خیال سے دل کے اردگرد اسم ذات کو لکھا کرو۔ اس کی اتنی مشق کم سنی میں ہی ہو گئی تھی کہ میں جب شرح عقائد وحاشیہ خیالی پڑھتا تھا' اس وقت میں نے حاشیہ عبدالحکیم کو نقل کرنے کا ارادہ کیا تو کم وبیش ایک جزو پر اسم ذات ہی لکھتا چلا گیا اور مجھے یہ خیال ہی نہ رہا کہ حاشیہ عبدالحکیم لکھنے کے لئے بیٹھا ہوں۔ فرماتے تھے کہ خواجہ ہاشم نے دو ایک باتوں سے میرا امتحان لیا اور بالآخر یہ فرمایا کہ تمہاری استعداد اونچی ہے۔ تم بہت عالی ہمت ہو' میں چاہتا ہوں کہ تم فی الحال اشغال صوفیہ میں سے کوئی شغل اختیار کر لو۔ چنانچہ انہوں نے شغلِ کتابتِ اسم ذات کی تلقین کی جس کا ذکر ہو چکا۔

فرمایا کرتے تھے کہ میں بارہ تیرہ سال کا تھا کہ حضرت زکریا علیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خواب میں دیکھا۔ انہوں نے ذکر اسم ذات تلقین فرمایا۔ اس سے ایسی کیفیت ظہور پذیر ہوئی کہ اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ فرماتے تھے اس کے بعد میں نے حضرت شیخ عبدالعزیز شکر بار دہلوی کو خواب میں دیکھا وہ فرما رہے ہیں۔ اے فرزند! اس وقت تک کسی کو ہاتھ میں ہاتھ نہ دینا جب تک حضرت خواجہ تم کو قبول نہ فرما لیں۔ اس کے بعد تم کو اختیار ہے۔

فرمایا کرتے تھے کہ اس خواب کے بعد میں حضرت خواجہ خرد کی خدمتِ اقدس میں گیا اور تعبیر دریافت کی اور یہ بھی عرض کیا کہ اس شہر دہلی کے اکابر میں اس وقت آپ کے علاوہ کوئی بھی لقب خواجہ سے ملقب نہیں ہے۔ اس پر حضرت خواجہ خرد نے فرمایا کہ تمہارے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ تم کو خواجۂ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت منامی نصیب ہو گی۔ میں اس قابل کہاں ہوں کہ حضرت شیخ عبدالعزیز شکر بار مجھے خواجہ سے تعبیر فرمائیں۔

فرماتے تھے کہ مجھے اس تعبیر کا انتظار تھا۔ کثرت سے درود شریف پڑھتا تھا۔ ایک رات درود شریف پڑھتے پڑھتے بے ہوش ہو گیا اور ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ اسی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے میری بیعت قبول فرمائی اور نفی اثبات کی تلقین فرمائی۔

اس واقعہ کے چند روز بعد میں نے حضرت خواجہ خرد سے عرض کیا کہ آپ نے جو بات ارشاد فرمائی تھی' وہ تو حاصل ہو گئی۔ اب اس کے بعد میرے بارے میں کیا مشورہ ہے۔ فرمایا کہ ظاہر میں بھی کسی سے بیعت ہو جانا چاہیے۔ میں نے عرض کیا کہ میں آپ سے بیعت ہونا چاہتا ہوں۔ اس پر حضرت خواجہ خرد نے فرمایا کہ میں تم کو بہت عزیز اور دوست رکھتا ہوں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ تمہاری بیعت مجھ سے ہو۔ میں نے کہا' میری سمجھ میں نہیں آتا کہ دوستی بیعت قبول نہ کرنے کا سبب کیسے ہو گئی۔ اس بات پر آپ نے فرمایا کہ بھائی! مجھ سے کبھی کبھی بعض ایسے امور کا ارتکاب ہو جاتا ہے جو حکمِ شرع کے مطابق نہیں ہوتے اور اتباعِ سنت میں بھی قدرے تساہل کر جاتا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ تم پر اس کا اثر پڑے اور تمہارا قدم مجھ سے بیعت ہو جانے کے رشتہ سے جادۂ شرح سے کچھ لغزش کھا جائے۔ ہاں میری صحبت میں رہ سکتے ہو۔ فائدہ پہنچانے میں کوئی کمی نہ کروں گا۔ پھر میں نے عرض کیا' اچھا آپ جس بزرگ سے فرمائیں' میں اس سے متوسل ہو جاؤں۔ فرمایا کہ اگر حضرت شیخ آدم بنوری قدس سرہ کے خلفا میں سے کسی بزرگ کے بیعت ہو جاؤ تو بہت ہی مناسب ہے۔ اس لئے کہ یہ حضرات اتباعِ شریعت' ترک دنیا اور تہذیب نفس میں امتیاز تام رکھتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ہمارے پڑوس میں (محلہ کوشک مزدور دہلی میں) سید عبداللہ خلیفہ حضرت شیخ آدم بنوری مقیم ہیں۔ فرمایا بس وہی غنیمت ہیں۔ ان ہی سے رابطہ پیدا کر لو۔

حضرت شاہ عبدالرحیم نے فرمایا کہ میں نے اس مشورے پر عمل کیا اور حضرت حافظ سید عبداللہ اکبر آبادی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ باوجودیکہ کہ اپنے آپ کو بہت چھپاتے تھے اور ذوقِ گمنامی ان پر غالب تھا مگر پہلی مرتبہ جانے پر بیعت فرما لیا اور اپنے فیوض و برکات سے مستفیض فرمایا۔ بالآخر طریقۂ نقشبندیہ میں اپنا خلیفہ بنایا اور شرفِ اجازت سے سرفراز کیا۔

حضرت عبداللہ حافظ کلام اللہ تو تھے ہی زبردست قاری اور تجوید کے ماہر بھی تھے۔ قرآن مجید اس انداز سے پڑھتے تھے کہ سامعین بے خود ہو جاتے تھے۔ ایک بار قاریانِ داراشکوہ میں نو قاری حضرت سید عبداللہ کی قرأت کا امتحان لینے آئے اور آپ کی قرأت سن کر حیران و ششدر رہ گئے۔

حضرت شاہ عبدالرحیم کا بیان ہے کہ حضرت حافظ رحمتہ اللہ علیہ سے میں نے بارہا یہ الفاظ سنے ہیں۔ "کفش بر سر کشف"' مراد یہ تھی کہ کشف و کرامت کا کوئی اعتبار نہیں۔ اصل چیز استقامت ہے۔ حضرت حافظ پر اخفا و خمول کا غلبہ تھا۔ معمولی حیثیت میں رہتے تھے۔ اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے ممتاز نہیں رکھتے تھے۔ بسا اوقات ضعیفوں کا کام خود جا کر انجام دیتے تھے۔

حضرت سید عبداللہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت شیخ آدم بنوری نے جب عزم حج کیا تو میں نے بھی ہمراہ جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ پیر و مرشد نے فرمایا کہ تمہارا ہندوستان رہنا ضروری ہے اور ایک حکمت کی بنا پر ضروری ہے' جو آگے چل کر

تمہیں معلوم ہوگی۔

فرمایا کہ اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ حکمت تمہاری شاہ عبدالرحیم کی تربیت تھی جو میرے ذریعے انجام پانا تھی۔

حضرت شاہ عبدالرحیم نے فرمایا کہ جس زمانے میں عالمگیر اورنگزیب آگرے میں تھے، میں بغرض تعلیم آگرے میں تھا۔ اس وقت حضرت سید عبداللہ بھی سید عبدالرحمٰن کی رفاقت میں وہیں چلے گئے تھے۔ آگرے ہی میں حضرت حافظ سید عبداللہ کو مرض الموت لاحق ہوا۔ وصیت فرمائی کہ مجھے مقبرۂ غریباں میں دفن کرنا تاکہ کوئی میری قبر کو نہ پہچان سکے۔ ایسا ہی کیا گیا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں پیرومرشد کی وفات کے روز مرض شدید میں مبتلا تھا۔ مجھ میں اتنی طاقت نہ تھی کہ ہمراہ جنازہ جاسکوں۔ جب صحت وقوت بحال ہوگئی تو ایک دوست کو ہمراہ لے کر مرقدِ مبارک کی زیارت کے لئے گیا۔ اس دوست نے ہر چند غور کیا مگر ان کی قبر کو نہ پہچانا۔ اندازے سے ایک قبر کی طرف اشارہ کر دیا کہ شاید یہ قبر ہے۔ میں نے وہاں بیٹھ کر قرآن پڑھا۔ پسِ پشت سے آواز آئی قبرِ فقیر یہ ہے مگر خبردار جو سورۃ شروع کی ہے، اس کو ختم کرکے اور اس کا ثواب اسی قبر والے کو پہنچا کر پھر ادھر کو متوجہ ہونا، جلدی نہ کرنا۔ میں نے سورۃ کو ختم کرنے کے بعد اس دوست سے کہا، بھائی غور کرو۔ حضرت رحمتہ اللہ علیہ کی قبر میری پشت کی جانب تو نہیں۔ اس نے سوچ کر کہا، واقعی میں نے غلطی کی۔ ان کی قبر تمہاری پشت کی جانب ہی ہے۔ میں وہاں جا کر بیٹھ گیا اور قرآن پڑھنا شروع کر دیا۔ چونکہ حزن وملال کی کیفیت میرے اوپر طاری تھی، اس لئے قرآن کی قرأت میں قواعد کو ملحوظ نہ رکھ سکا۔ اندرون قبر سے آواز آئی کہ فلاں فلاں جگہ تم نے غلطی کی ہے۔ قرأت کے معاملے میں احتیاط ضروری ہے۔

حضرت شاہ عبدالرحیم نے فرمایا کہ میں جب حافظ سید عبداللہ سے بیعت ہوگیا تو آپ کے فیضِ صحبت سے مستفیض ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت خواجہ خرد کے فیض صحبت سے بھی مستفیض ہوتا رہتا تھا۔

حضرت حافظ سید عبداللہ کے وصال کے بعد حضرت شاہ عبدالرحیم بہت محزون وغمگین رہنے لگے اور ایسے درویش کی تلاش ہوئی جس کی صحبت سے مستفیض ہوتے رہیں۔ ایک شخص نے حضرت خلیفہ ابوالقاسم کا ذکرِ خیر کیا۔ اسی شخص کے ہمراہ ان کی خدمت میں پہنچے۔ خود بیان فرمایا کرتے تھے کہ پہلے دن ملاقات ہوئی تو حضرت خلیفہ اپنے مکان کی تعمیر میں مشغول تھے۔ معمار کو ہدایات فرما رہے تھے۔ ایک موقع پر گفتگو کے دوران آپ نے ایک شعر پڑھا جس کا پہلا مصرعہ یہ تھا:

ہر کرا ''ذرّۂ وجود'' بود

میں نے اس شعر کو یوں دہرایا۔

ہر کرا ذرّۂ شہود بود
پیش ہر ذرّہ سجود بود

انہوں نے فرمایا، میں نے صحیح نسخوں میں دیکھا وہاں ''ذرّۂ وجود'' ہی مرقوم ہے۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ فقیر نے بھی صحیح نسخے دیکھے ہیں۔ ان میں تو ''ذرّۂ شہود'' لکھا ہوا ہے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے تم علم سے بہرہ یاب ہو۔ میں نے کہا، اگر یہ راہِ حق کے لئے نقصان دہ ہے تو توبہ کرتا ہوں۔ فرمایا سب کے لئے نقصان دہ نہیں اور سب کے

لئے فائدہ مند بھی نہیں۔ پھر یہ شعر پڑھا:

علم را برتن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

یعنی علم کو اگر تن پروری میں استعمال کرو گے تو سانپ بن جائے گا۔ دل کو سنوارنے کے لئے استعمال کرو گے تو یار و مددگار ثابت ہوگا۔

یہ پہلی ملاقات مختصر رہی۔ بس چند باتوں ہی پر مجلس ختم ہوگئی۔ فرماتے تھے کہ دوسرے دن پھر میرے دل میں آیا کہ حضرت خلیفہ کی خدمت میں جانا چاہیے۔ چنانچہ حاضر ہوا۔ بہت ہی بشاشت سے پیش آئے اور فرمایا کہ کل تعمیر کے سلسلہ میں مشغول تھا۔ بات ناتمام رہ گئی۔ اچھا اب یہ بتاؤ کہ ''ذرۂ شہود'' اگر شعر میں ہو تو کیا معنیٰ ہوں گے۔ میں نے اس صورت میں جو معنی بنتے ہیں، وہ بیان کیے۔ پھر فرمایا کہ بعض کتابوں میں ''وجود'' لکھا ہوا ہے، اس کا مطلب کیا ہوگا۔ میں نے اس کا بھی مطلب بتایا۔ بہت ہی خوش ہوئے۔ پھر تو مزاج کی موافقت کی بنا پر صحبتِ اقدس بہت راس آئی۔ محبت و عقیدت کے ساتھ برابر خدمتِ اقدس میں حاضری دیتا رہا اور انہوں نے بھی مجھے التفات ہائے بیکراں سے نوازا حتیٰ کہ بعض قدیم خدام حسد کرنے لگے۔

خود فرمایا کرتے تھے کہ تدوین فتاویٰ عالمگیری کے بعد بحکم حضرت عالمگیر اس پر نظر ثانی کی گئی۔ شیخ حامد (جو مرزا محمد زاہد کے درس میں میرے شریک تھے) فتاویٰ کا کچھ حصہ ان کے سپرد ہوا۔ وہ میرے پاس آئے کہ اس کام میں میری رفاقت کرو۔ ہر روز اتنا وظیفہ تم کو بھی ملا کرے گا۔ میں نے قبول نہیں کیا۔ میری والدہ نے جب سنا تو انہوں نے اصرار کر کے مجھے اس کام پر لگا دیا۔ جب حضرت خلیفہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ اس وظیفہ کو ترک کر دو۔ میں نے عرض کیا کہ والدہ ناخوش ہوں گی۔

فرمایا جب اللہ کے اور بندے کے حق کا مقابلہ ہو تو اللہ کے حق کو ترجیح دی جائے۔ میں نے عرض کیا، دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ کوئی ایسی شکل فرما دے کہ یہ وظیفہ خود بخود موقوف ہو جائے تاکہ والدہ بھی ناخوش نہ ہوں۔ آپ نے دعا فرمائی۔ چند روز نہ گزرے تھے کہ بادشاہ نے اہل وظیفہ کے نام طلب کیے اور ان میں عزل و نصب کے طور پر کچھ تغیر و تبدل کیا۔ جب میرے نام پر پہنچے تو میرا وظیفہ موقوف کیا اور حکم لکھا کہ یہ شخص چاہے تو اس قدر زمین اس کو دی جائے۔ مجھ سے معلوم کیا گیا کہ کیا زمین لینا چاہتے ہو۔ میں نے انکار کر دیا اور وظیفہ موقوف ہونے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ فرماتے تھے کہ میری اس خدمت سے معزولی کا ظاہری سبب یہ ہوا کہ ایک دن نظر ثانی کرتے ہوئے میری نظر سے ایک عبارت گزری جس میں گڑبڑ تھی۔ صورت مسئلہ نہیں بنتی تھی، میں نے ان کتابوں کو دیکھا جو اس مسئلہ کا ماخذ تھیں۔ تحقیق سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ مسئلہ دو کتابوں میں جدا جدا عبارتوں کے ساتھ مذکور ہے۔ مؤلف فتاویٰ نے دونوں عبارتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا جس کی وجہ سے اختلال رونما ہو گیا ہے۔

میں نے حاشیہ پر لکھ دیا **هذا غلط صوابه كذا**۔ یہ عبارت غلط ہے۔ صحیح اس طرح ہے۔ اس زمانہ میں حضرت عالمگیر کو فتاویٰ کی جمع و تدوین کی طرف بہت توجہ تھی۔ روزانہ ملا نظام ایک دو صفحہ بادشاہ کے سامنے پڑھتے تھے۔

جب وہ فتاویٰ سناتے سناتے اس مقام پر پہنچے اتفاقاً میرے حاشیہ کو بھی متن کے ساتھ پڑھ گئے۔ بادشاہ چونک پڑے کہ یہ کیا عبارت ہے۔ مُلا نظام نے اس وقت تو اپنی جان چھڑالی اور کہا کہ میں نے اس کا اچھی طرح مطالعہ نہیں کیا ہے۔ کل کو تفصیل سے عرض کروں گا۔ جب گھر آئے تو مُلا حامد پر ناراض ہوئے کہ فتاویٰ کے ایک حصے کو میں نے تمہارے اعتماد پر چھوڑا تھا۔ تم نے بادشاہ کے سامنے مجھے بہت خفیف کرایا۔ آخر یہ کیا لکھا تھا۔ مُلا حامد نے ان سے تو کچھ نہیں کہا میرے پاس آ کر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ میں نے وہ تمام کتابیں جو اس مسئلے کا ماخذ تھیں پیش کر دیں اور عبارت کے اختلال و انتشار کو واضح کیا۔ بس چپ ہو گئے۔ یہی بات میری موقوفی کا باعث بن گئی۔

فرماتے تھے کہ جب حضرت خلیفہ ابوالقاسم نے چاہا کہ مجھے اجازت ارشاد عطا کریں تو یہ اہتمام فرمایا کہ ایک مخلص خادم کو حکم دیا کہ کھانا تیار کرو۔ بہت سے لوگوں کی دعوت کر دی اور فقیر کو بھی مدعو کیا۔ پھر دستار میرے سر پر باندھی۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! میں اس عظیم نصب کی اہلیت نہیں رکھتا اور اس کے حقوق بھی ادا نہیں کر سکتا۔ فرمایا کہ تم دوسری جگہ سے بھی تو اجازت رکھتے ہو۔ آخر سید عبداللہ کے ساتھ تمہارا معاملہ کیسا تھا۔ میں نے عرض کیا انہوں نے تو اپنے تمام حقوق معاف فرما دیئے تھے۔ فرمایا کہ میں نے بھی اپنے تمام حقوق ظاہری و باطنی معاف کیے۔

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ حضرت خلیفہ فرمایا کرتے تھے۔ ''لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اپنے آرام کے لئے بھی فقیری اختیار نہیں کرتے۔'' یعنی جب دل یکسو ہو گیا اور تما خطرات و وساوس برطرف ہو گئے تو درحقیقت آرام کلی حاصل ہو گیا۔ اگرچہ ظاہر میں کوئی نقصان نظر آئے۔

حضرت شاہ عبدالرحیم نے فرمایا کہ حضرت خلیفہ مجھ سے ہمیشہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ شہر آگرہ کے درویشوں سے ملاقات کرو۔ میں ٹال دیتا تھا۔ اس لئے کہ میری توجہ آپ ہی کی جانب تھی۔ ایک روز اس بات کو تاکید سے فرمایا' جب میری ٹال دیکھی تو ایک خادم کو حکم دیا کہ ان کو سید عظمت [3] اللہ چشتی کے پاس لے جاؤ۔ ان سے میرا اسلام کہنا اور یہ کہنا کہ ایک درویش کو ملاقات کے لئے بھیج رہا ہوں۔ جب میں سید عظمت اللہ کے محلے میں پہنچا تو خادم کو ان کا مکان یاد نہ رہا۔ اتفاقاً وہاں بچے کھیل رہے تھے۔ میری نظر ایک بچے پر پڑی۔ میں نے کہا کہ یہ بچہ بزرگ زادہ معلوم ہوتا ہے۔ اس سے دریافت کرنا چاہیے۔ اتفاق کی بات وہ بچہ سید عظمت اللہ کا تھا۔ وہ مجھ کو اپنے ساتھ مکان لے گیا اور اندر جا کر خلیفہ کا پیغام (جس کا میں نے اس بچے سے ذکر کر دیا تھا) پہنچایا۔ سید صاحب نے اندر سے یہ کہلا کر بھیجا کہ میں صاحب فراش ہوں۔ چلنے کی طاقت نہیں رکھتا (اس لئے باہر نہیں آ سکتا) کنبے کی عورتیں گھر میں آئی ہوئی ہیں۔ اس لئے اس وقت پردہ ہونا مشکل ہے۔ مجھے ملاقات سے معذور رکھا جائے۔ پھر اس کے فوراً بعد دوسرے ایک شخص کو یہ فرما کر اندر سے بھیجا کہ خلیفہ کے مریدوں کو بٹھا دو۔ پھر خادموں سے فرمایا کہ مجھے چارپائی پر اٹھا کر دروازے تک لے جاؤ۔ چنانچہ دروازہ میں تشریف لے آئے اور فرمایا کہ اگرچہ میں مجبور تھا مگر دوبارہ میرے دل میں یہ بات آئی کہ خلیفہ کا کسی کو بھیجنا بے حکمت نہیں ہوگا۔ اس کے بعد انہوں نے میرا نام و نسبت دریافت کیا اور اس سلسلے میں خوب تحقیق فرمائی۔ میں نے شیخ عبدالعزیز شکر بار دہلوی سے اپنا رشتہ چھپا لیا تھا۔ اس کو اس لئے بیان نہیں کیا کہ جانتا تھا کہ ان کا سلسلہ ان تک پہنچتا ہے۔ اس نسبت کی بنا پر وہ ایسے ضعف کے عالم میں بھی تواضع فرمائیں گے جس سے ان کو تکلیف ہو گی لیکن انہوں نے اپنی فراست سے اس رشتہ کو سمجھ لیا۔

بعدازاں آپ نے ایک اشکال کی تقریر فرمائی اور اس کا جواب مجھ سے طلب فرمایا۔ میں نے عرض کیا کہ استفادے کے لئے حاضر خدمت ہوا ہوں نہ کہ افادے کے لیے۔ فرمایا کہ میں اس سوال کے کرنے پر مامور ہوں۔ یہ سن کر میں نے اس وقت جو کچھ میرے ذہن میں تھا' جواب دیا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور چارپائی سے نیچے اتر آئے اور بے حد تواضع فرمائی۔ پھر فرمایا کہ مجھ سے بڑی کوتاہی ہوئی۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ ازاں بعد فرمایا کہ شیخ عبدالعزیز شکر بار قدس سرہ نے ہمارے دادا کو وصیت فرمائی تھی کہ اگر کوئی ہماری اولاد میں سے تمہارے پاس آئے اور اس اشکال کا جواب اس طرح دے دے تو اس کو میری یہ امانت پہنچا دینا۔

یہ امانت اجازتِ طریقہ اور بعض تبرکات ہیں۔ میرے دادا تمام عمر تلاش کرتے رہے مگر ایسے شخص کو نہ پایا۔ آخر میرے والد کو وصیت کر گئے۔ انہوں نے بھی تجسس کیا نہ پایا۔ اب میری نوبت آئی' میں نے بھی تمام عمر جستجو کی نہ پایا اور اب پایا ہے۔ میرا آخری وقت ہے۔ کوئی ایسا فرزند جو اس نسبت کی اہلیت رکھتا ہو نہیں۔ اس وجہ سے افسوس کرتا تھا۔ الحمد للہ! کہ اس وقت آرزو پوری ہوئی۔ یہ فرما کر عمامہ میرے سر پر باندھا اور اجازت دی۔ بہت سی مٹھائی اور نقدی کی ایک مقدار بھی میرے ہمراہ کر دی۔ جب یہ سب چیزیں لے کر حضرت خلیفہ کی خدمت میں واپس آیا تو انتہائی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔ خوب کامل اور مالا مال ہو کر آئے ہو۔ مَیں نے وہ سب چیزیں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رکھ دیں تو فرمایا۔ یہ نقدی اشارہ ہے جمعیت ظاہر کی طرف اور عمامہ اشارہ ہے اجازت اور جمعیتِ باطن کی طرف۔ مَیں ان دونوں چیزوں میں تو شرکت نہیں کر سکتا۔ پھر کچھ مٹھائی قبول فرمالی۔

مولانا نسیم احمد فریدی امروہی نے ''الفرقان'' (لکھنؤ) میں شاہ عبدالرحیم پر مضامین لکھے تھے، جنہیں ''الرحیم'' مطابق اپریل و جون 1966ء (حیدر آباد سندھ) میں نقل کیا گیا۔ یہ مضامین ''انفاس العارفین'' کے بعض ابواب کا اردو خلاصہ ہے۔ یہاں اسی اردو ترجمے کا اختصار دیا گیا ہے۔ (مرتب)

☆☆☆

مخفی نہ رہے کہ حضرت والد بزرگوار اکثر امور میں مذہب حنفی کے مطابق عمل کرتے تھے۔ سوائے بعض چیزوں کے جن میں کہ وہ حدیث نبوی یا وجدان کے مطابق کسی دوسرے فقہی مذہب کو ترجیح دیتے تھے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ نماز باجماعت میں امام کے پیچھے فاتحہ پڑھا کرتے تھے۔ اسی طرح وہ نماز جنازہ میں فاتحہ پڑھتے تھے۔ ایک دن اس مسئلے پر حضرت مجدد الف ثانی کے پوتے عبدالاحد سہرندی نے ان سے بحث کی اور اس بارے میں اپنے اسلاف کا یہ قول نقل کیا کہ نماز باجماعت کی مثال ایسی ہے جیسے ایک جماعت بادشاہ کے سامنے اپنی مصروفیات پیش کرنے کھڑی ہو۔ اس موقع پر ادب کا تقاضا یہ ہے کہ تمام یک زبان ہو کر عرض و معروض کریں، نہ کہ ہر شخص اپنی اپنی بات کہے۔ والد بزرگوار نے فرمایا کہ یہ قیاس ہے اور قیاس بھی مع الفارق۔ کیونکہ نماز میں اصل چیز دعا و خضوع کے ساتھ خدا تعالیٰ سے مناجات کرنا اور نفس کا تزکیہ ہے جیسا کہ حدیث نبوی لاصلوٰۃ لمن لم یقراء بام الکتاب (جس نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی، اس کی نماز نہیں ہوئی) اس امر پر دلالت کرتی ہے۔ نیز خدا تعالیٰ ہر ایک بات کو اس طرح سننے والا ہے کہ اگر تمام دنیا ایک میدان میں کھڑی ہو اور ان میں سے ہر شخص اپنی اپنی زبان میں کوئی بات کہے تو ایک کی مناجات سے دوسرے کی مناجات سننے میں

کوئی خلل واقعہ نہ ہوگا۔

حضرت والد بزرگوار شجاعت، فراست، کفایت اور غیرت کے بڑے اچھے اور پسندیدہ اخلاق سے بدرجۂ اتم متصف تھے اور عقل معاد کی طرح عقل معاش بھی کامل و وافر رکھتے تھے۔ وہ ہر معاملہ میں راہِ وسط پسند کرتے تھے، نہ ترک دنیا اور زہد میں اتنا مبالغہ کرتے کہ رہبانیت تک نوبت پہنچتی اور نہ آداب کی قیود کو اتنا چھوڑتے کہ آزادہ روی کا رجحان ہوتا، وہ لباس میں ہمیشہ شریفانہ وضع اختیار کرتے۔ تکلف سے دور رہتے، سختی یا نرمی جس سے بھی سابقہ پڑتا، اسے یکساں جانتے لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں ہمیشہ آسودگی دی اور اس میں خود ان کا کوئی اختیار نہ تھا۔

فرماتے تھے کہ جب سے کہ مَیں نے ترک دنیا ہے، اس وقت سے لے کر آج تک مَیں نے کبھی لباس نہیں خریدا، نہ عمامہ، نہ جامہ، نہ جوتا۔ حق سبحانہ نے ہر ضرورت پوری کی ہے۔ ایک دن کی بات ہے کہ آپ نے لباس فاخرہ پہن رکھا تھا۔ ایک خشک مزاج صوفی نے بحث شروع کر دی۔ آپ نے فرمایا، اگرچہ میرے لباس کا ایک ایک تار شال کا ہے لیکن وہ محبت الٰہی کی کمند ہے کہ اللہ نے اسے بغیر میری سعی اور ارادہ کے عطا فرمایا ہے اور تمہارے لباس کا ہر تار اگرچہ موٹے سوتی کپڑے کا تار ہے، لیکن وہ اژدہا ہے کیونکہ تو نے اسے اپنے سعی و ارادہ سے فراہم کیا ہے۔

آپ اُمرا کے گھروں میں تشریف نہیں لے جاتے تھے اور اس دروازہ کو انہوں نے کلی طور پر بند کر دیا تھا لیکن اگر وہ لوگ آپ کی زیارت کو آتے تو انہیں بڑی اچھی طرح سے ملتے اور قوم کے بڑے کے ساتھ تو اور بھی اچھی طرح سے ملتے۔ اگر وہ کسی نصیحت کے خواستگار ہوتے تو بڑی نرمی سے انہیں نصیحت کرتے۔ اسی طرح امر بالمعروف ونہی عن المنکر بھی اگر اس کے قابل قبول ہونے کا امکان ہونے کا امکان سمجھتے، نرمی و محبت سے کرتے۔ علم اور علماء کی ہمیشہ تعظیم اور جہالت اور جاہلوں سے نفرت ان کا معمول تھا۔ وہ ہر حال میں آثار نبویہ کا تتبع فرماتے۔ آپ کی استقامت کی ایک دلیل یہ ہے کہ عذر کے بغیر زندگی بھر کبھی جماعت کے ساتھ نماز نہیں چھوڑی۔ بزرگوں نے فرمایا ہے: ''کرامت سے استقامت بہتر ہوتی ہے۔'' نہ کبھی جوانی میں اور نہ بچپن ہی میں ممنوع چیزوں کی طرف میلان ہوا۔ جادۂ محمدی کا اتباع ان کی جبلی عادت بن گئی تھی۔ ضروری امور میں خود خرید وفروخت کرتے۔ عمامہ اور دوسری چیزوں میں نہ خشک مزاج (متقشف) فقہاء کی ہیئت اختیار فرماتے اور نہ آزاد مزاج فقرا کی بلکہ مشائخ صوفیہ کی ہیئت اختیار کرتے۔ فی الجملہ زندگی میں بے تکلفی کی طرف مائل تھے۔ ضروری حاجت کے سوا قرض لینے کو مکروہ سمجھتے۔ اگر کوئی عمدہ کھانا پکانے یا اس طرح کی چیزوں کے لئے قرض لیتا تو اس سے ناخوش ہوتے۔ یہ کوشش کرتے کہ ہر علم کے ایک معتد بہ حصے سے بہرہ ور ہوں اور فنون میں سے کسی فن سے ترکِ مناسبت ان کی طبیعت کو گوارا نہ تھی۔ طب میں ان کی ذہانت بڑی رسا اور صحیح تھی۔ اگر کوئی عذر مانع نہ ہوتا تو قرآن مجید کی تلاوت کرتے۔ وہ انتہائی خوش الحانی اور قواعد کا خیال رکھتے ہوئے تجوید سے تلاوت کرتے تھے اور اس تلاوت کے علاوہ اکثر دوستوں کے حلقے میں ہر روز قرآن کے تین رکوع غور وتدبر کے ساتھ معانی وبیان کو ملحوظ رکھتے ہوئے پڑھتے۔ اپنے برادرِ بزرگ شیخ ابوالرضا کے انتقال کے بعد بعض دوستوں کی درخواست پر انہیں کی طرح وعظ فرمانے لگے۔

آپ نے بڑی عمر پائی۔ آخر عمر میں اشتہا جاتی رہی اور ضعف آ گیا۔ انتقال کے وقت زیرِ لب اسمِ ذات کا ورد جاری تھا کہ آپ نے زندگی کی امانت سپرد کر دی۔ یہ واقعہ چہار شنبہ (بدھ) بارہ صفر 1131ھ کو پیش آیا۔ اس وقت فرخ

سیر کے دورِ حکومت کے آخری دن تھے۔ آپ کی وفات کے تقریباً پچاس روز بعد وہ قید کر دیا گیا۔

شیخ ابوالرضا محمد

شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے تایا شیخ ابوالرضا محمد کے حالات ''انفاس العارفین'' میں اپنے والد بزرگوار کے بعد لکھے ہیں اور سبب یہ بتایا ہے کہ اپنے والد کے حالات تو انہوں نے بلاواسطہ خود دیکھے اور سنے لیکن اپنے تایا کے حالات ان تک اکثر ایک یا دو واسطوں سے پہنچے ہیں۔

آپ نے ابتدائے حال میں علوم ظاہری حافظ بصیر سے جو شاہجہاں کے زمانے کے ممتاز ترین علما میں سے تھے' نیز حضرت خواجہ محمد باقی باللہ کے خلف الصدق خواجہ خرد سے حاصل کیے لیکن فی الحقیقت آپ کے علوم اکتسابی نہیں بلکہ وہبی (عطیۂ خداوندی) تھے۔ ظاہری طور پر اس طرح علوم کی تحصیل سے سنت اللہ کی محافظت ہوتی ہے۔ بعدازاں والدِ ماجد کی اجازت سے ملازمت کے لئے ایک امیر کے ہاں آمد و رفت شروع کی لیکن ناگاہ ان کی فطری استعداد ظہور پذیر ہوئی اور انہوں نے گوشہ نشینی' تجرید تام' توکل کلی اور اتباع سنت کا طریقہ اس طرح اختیار کیا کہ اس سے زیادہ کی کسی بشر کی طاقت میں نہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب انہوں نے سب تعلقات سے ہاتھ کھینچ لیا تو اپنی بیوی سے کہا کہ میں نے تمام سختیوں اور مشکلات کے باوجود اس راہ کو اختیار کیا ہے اور اب اس راہ کو چھوڑنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ تم ان سختیوں کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو تو تم میری رفیق ہو ورنہ تم بااختیار ہو۔ آپ کی بیوی نے ہمت کی' نیلا پیراہن پہن لیا اور سب زیور اور کپڑے الگ کر دیئے۔

اس کے بعد حضرت محترم نے والدین کا گھر چھوڑ دیا۔ مسجد فیروز آباد کے نزدیک ایک حجرہ ٹھیک کر کے اس میں رہنے لگے۔ اس زمانے میں اکثر ایسا ہوتا کہ دو تین فاقے متواتر ہو جاتے اور سدرمق کے لئے کچھ میسر آتا تو چند جَو کی روٹیاں اور چھاچھ ہوتی جو ان کے بعض نیاز مند لے آتے لیکن ان کو بھی وہ فقرا میں برابر تقسیم کر دیتے اور خود بہت کم پر اکتفا کرتے۔ آپ کے گھر میں ہنڈیا' چولہے اور چکی کی قسم کی کوئی چیز نہ تھی۔ اس کے بعد وہ زمانہ آیا کہ اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت دی۔ لوگوں کے دل آپ کی طرف متوجہ کر دیئے اور وسیع حویلی اور کشادگی معاش آپ کو عطا کی۔

دوستوں کی ایک جماعت نے ذکر کیا کہ بادشاہ عالمگیر نے کئی بار درخواست کی کہ اسے حضرت کی زیارت کی اجازت دی جائے لیکن انہوں نے اسے قبول نہ کیا۔ امرا اور اصحابِ ثروت آپ کی نظر میں حقیر تھے اور ان کی طرف آپ التفات نہیں کرتے تھے اور ان کے ہدیئے بالعموم آپ قبول نہ کرتے سوائے اس کے کہ ان کی طرف سے بہت اصرار ہوتا لیکن اخلاص رکھنے والے غریب جیسے موچی' آٹا پیسنے والے اور اس طرح کے دوسرے لوگ اگر چار یا پانچ پیسے بھی بطور ہدیہ پیش کرتے تو انہیں آپ خود اپنے دستِ مبارک سے لیتے۔

ایک مشہور روایت سے معلوم ہوا ہے کہ حضرت محترم قوی العلم' فصیح اللسان بڑے متقی' وسیع المعرفت' خوبصورت چہرے والے' سفید رنگ کے' مختصر داڑھی رکھنے والے اور بڑے نرم گفتار تھے۔ آپ جمعہ کی نماز کے بعد وعظ فرمایا کرتے

تھے۔اس سلسلے میں آپ نہایت خوش الحانی و ترتیل سے تین احادیث پڑھتے اور اس دوران مجلس کی ہر سمت کی طرف پوری توجہ فرماتے۔ بعدازاں ان احادیث کا فارسی میں ترجمہ کرتے اور اس ترجمے کی اچھی طرح وضاحت فرماتے۔ پھر اس کا ہندی میں ترجمہ کرتے۔ان احادیث کے مناسب مضمون پر تقریر فرماتے۔اس میں اعتدال اور میانہ روی ہوتی اور مبالغہ سے بچتے۔

ابتدا میں وہ ہر علم کا درس دیتے اور بہت سے لوگ ان کی اچھی تقریر کی وجہ سے ان کے درس میں آتے تھے۔آخر میں وہ صرف دو سبق دیتے تھے۔ایک تفسیر بیضاوی کا اور دوسرا مشکوٰۃ کا۔اس زمانے میں اکثر ان کی یا تو اللہ کی طرف توجہ (توجہ الی اللہ) رہتی یا اپنے خاص اصحاب سے مسائل معرفت پر گفتگو فرماتے۔آپ وحدت الوجود کے قائل تھے اور اس بارے میں ان کی بڑی تحقیق تھی۔وہ اپنی مجالس میں صوفیہ کے کلام کے مغلق و پیچیدہ مقامات کو اکثر و بیشتر حل کیا کرتے تھے۔

ایک روایت ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ لوگ آپ سے کچھ مسائل کے بارے میں سوال کرتے۔آپ ان کے سوال سن کر آنکھیں بند کر لیتے۔ پھر ان پر غور و فکر کرتے اور کچھ دیر کے بعد ان کا جواب دیتے۔آپ کے اصحاب میں سے کسی نے اس دیر سے جواب دینے کی وجہ دریافت کی۔آپ نے فرمایا کہ جب لوگ سوال کرتے ہیں تو میرے ذہن میں ان کے بے شمار جوابات آتے ہیں۔ چنانچہ میں ان پر غور کرتا ہوں کہ سوال کرنے والے کی عقل و فہم کے مطابق کونسا جواب ٹھیک رہے گا۔

آپ کے احباب کی ایک جماعت کا بیان ہے کہ ہم آپ کی مجلس میں مسائل تصوف کے بارے میں زبان سے سوال نہیں کرتے تھے مگر جیسے ہی دل میں کوئی سوال اٹھتا اور وہ کسی شخص کے اندر شبہ پیدا کرتا تو آپ خود ہی اس کا جواب دے دیتے۔ یہاں تک کہ اس شخص کا دل مطمئن ہو جاتا۔

فرماتے ہیں میں نے علما و عرفا کے ایک بڑے اجتماع میں مسئلہ وحدت الوجود کو ثابت کیا اور اس میں عقائد متکلمین کی عبارتوں سے تمسک کیا اور عقلی و نقلی دلیلیں پیش کیں لیکن اس دوران میں لفظ ''وحدت وجود'' زبان پر نہیں لایا۔ چنانچہ سب نے میری بات قبول کر لی۔غرضیکہ اہل رسوم اکثر و بیشتر الفاظ کے تعصب میں مبتلا ہوتے۔

> شاہ ولی اللہ صاحب نے ''انفاس العارفین'' میں اپنے بزرگ و محترم تایا کے حالاتِ زندگی اور تصرفات و کرامات بیان کرنے کے بعد کوئی پچیس صفحات میں ان کے پُر از معرفت ملفوظات اور چونتیس صفات میں ان کے ''مکتوبات و مسودات'' کے کچھ حصے نقل کیے ہیں۔ یہ زیادہ تر مسئلہ وحدت الوجود پر ہیں۔ شیخ ابوالرضا محمد اس مسئلے میں بڑا استغراق رکھتے تھے۔ان کی حضرت مجدد الف ثانی کے پوتے شیخ عبدالاحد سے اس دقیق مسئلے پر خط و کتابت بھی ہوئی جو ان کے مکتوبات میں شامل ہے۔

دوستوں کی ایک جماعت نے بیان کیا حضرت محترم کی طبیعت کسل مند تھی۔اس دوران میں آپ کا دو تین دن تک کھانے کی طرف میلان نہیں ہوا اور آپ کے دل میں حد درجے کی بے تعلقی پیدا ہو گئی اور کسی چیز کی طرف آپ کا کوئی

التفات نہ رہا۔ عصر کی نماز کا وقت ہوا تو آپ نے مسجد میں جا کر نماز پڑھی۔ واپس آ کر رسالہ ''مقامات حضرت خواجہ نقشبند'' طلب فرمایا اور اس میں سے کچھ پڑھا' اس حالت میں ایک صاحب نے پان پیش کیا' آپ نے اس میں سے ایک دو ٹکڑے لے کر تناول فرمائے اور خنداں وشاداں پہلو میں رکھے ہوئے سرہانے پر تکیہ لگایا۔ اسی گھڑی روح آپ کے بدن سے مفارقت کر گئی۔ یہ واقعہ 1100ھ کی سترہ محرم کا ہے۔

شیخ عبدالاحد حضرت مجددؒ کے پوتے تھے جو وحدت الوجود کے مقابلے میں وحدت شہود کے علمبردار تھے اور ادھر شیخ ابوالرضا وحدت الوجود میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان دونوں بزرگوں کے کافی طویل مکتوبات ایک دوسرے کے نام ہیں جن میں اکثر وحدت الوجود کے دقیق مسائل پر بحث ہے۔ یہ فارسی اور عربی میں ہیں اور ان میں دونوں بزرگوں کے جگہ بہ جگہ ہندی دوہرے بھی لکھے ہیں۔ مثال کے طور پر پہلے مکتوب کے آخر میں جو بہت مختصر سا ہے' شیخ عبدالواحد لکھتے ہیں:۔ عزیزِ من مشفقِ من! جو سخنِ حق ہے' وہ کہنے میں آ سکتا اور جو سخن غیر حق ہے' اسے کہنا ٹھیک نہیں۔ اس لئے سخن کوتاہ چاہیے۔ والسلام۔ اس کے جواب میں شیخ ابوالرضا محمد کا بھی ایک مختصر سا خط ہے جس کے آخر میں ہے: آپ نے جو لکھا ہے کہ سخنِ حق کہنے میں نہیں آ سکتا تو ظاہری طور پر اس سے مراد ہے کہ سننے والوں کے قصور فہم کی وجہ سے یہ کہنے میں نہیں آ سکتا ورنہ اگر سخن لفظ ہے تو وہ بالکل کہنا ہے اور اگر وہ نفس ہے کوئی عین نہیں' جو بیان نہ ہو سکے۔ اس کے بعد کبیر کا ایک دوہرا ہے۔ بعدازاں طرفین میں طویل خطوط کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

(شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں) ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک تحریر میں ہے:

طریقۂ قدسیہ رضائیہ کی بنیاد ان دس کلمات پر ہے۔ تنزیہہ مقصود، تفرید ہمت، تجرید توحید، انفس و آفاق میں مطالعہ جمال، لاہوت میں اطلاق وفنا، ہاہوت میں بقا، ذکر بالاجماع، جمع بین الجہر والاخفاء، حدمع الاصفیاء۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ والسلام فی الابتداء والانتہاء۔

حواشی

(1) مرزا محمد زاہد صاحب حواشی مشہور ہیں۔ ہندوستان میں پیدا ہوئے اور یہیں نشوونما پائی۔ اپنے والد قاضی اسلم اور دیگر فضلائے وقت سے تحصیل علم کی شاہجہان کے زمانہ میں تحریر وقائع کابل کی خدمت پر مامور ہوئے اور عہدِ عالمگیری میں احتساب عسکرِ سلطانی' بعدہ صدارت کابل سے ممتاز ہوئے اور کابل ہی میں 1101ھ میں وفات پائی۔ (ماخوذ از مہر جہانتاب قلمی مؤلف حکیم سید فخرالدین حسنی رائے بریلوی)

(2) حضرت خواجہ کوہی جو سرخیل مشائخ خراسان تھے، آپ کے مورثِ اعلیٰ تھے۔ ہرات میں پیدا ہوئے۔ لاہور کے اکابر علما سے علم حاصل کیا۔ بعد تکمیل آگرہ آئے اور قضائے کابل سے ممتاز ہوئے۔ پھر ان کو قضائے عسکر سلطانی پر مامور کیا گیا۔ جہانگیر کے بعد شاہجہان نے ان کو اسی عہدے پر فائز رکھا۔ 1060ھ میں مستعفی ہو کر لاہور چلے گئے۔ وہیں رحلت فرمائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ (ماخوذ از مہر جہانتاب)

(3) شاہ عظمت اللہ بن بدرالدین بن سید جلال قادری متوکل اکبر آبادی سادات حسینی ترمذی میں سے ہیں۔ سلسلہ قادریہ و چشتیہ و

سہروردیہ وشطاریہ میں مرید کرتے تھے۔ تمام عمر گوشہ قناعت میں بسر کی۔ 72 سال کی عمر ہوئی۔ 4 ربیع الاول 1084ھ کو وفات پائی۔ جس محلے میں رہتے تھے وہیں مدفون ہوئے۔ (انفاس العارفین)

آپ کے مزار کے متعلق بوستان اخیار تذکرہ مشاہیر اکبر آباد کے مولف نے لکھا ہے۔

☆☆☆

اجدادِ کبار اور مشائخ

شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے بزرگوں، اپنے اساتذہ اور خود اپنے والدین کے حالات مختلف رسائل میں قلم بند فرمائے تھے جو ''انفاس العارفین'' کے نام سے ایک مجموعہ میں چھپے ہوئے ملتے ہیں۔ مندرجہ ذیل منتخبات انہی رسائل سے ماخوذ ہیں۔

فقیر ولی اللہ بن شیخ عبدالرحیم کہتا ہے **كان الله تعالىٰ لهما فى الاخرة والا ولى** (اللہ تعالیٰ ان دونوں کے لئے آخرت اور اس دنیا میں ہو جائے) کہ یہ چند ورق اس فقیر کے بعض بزرگوں کے احوال کے بیان میں ہیں۔ اس کا نام **امداد فى ماثر الاجداد** رکھا گیا ہے۔ **حسبنا الله ونعم الو كيل** (اللہ ہمارے لئے ہی کافی ہے اور وہ اچھا وکیل ہے) پوشیدہ نہ رہے کہ اس فقیر کا سلسلۂ نسب امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ تک اس طرح پہنچتا ہے:

فقیر ولی اللہ بن شیخ عبدالرحیم بن شہید وجیہہ الدین بن معظم بن منصور بن احمد بن محمود بن قوام الدین عرف قاضی قادن بن قاضی قاسم بن قاضی کبیر عرف قاضی بدہ بن عبدالملک بن قطب الدین بن کمال الدین بن شمس الدین مفتی بن شیر ملک بن محمد عطا ملک بن ابوالفتح ملک بن عمر حاکم ملک بن عادل ملک بن فاروق بن جرجیس بن احمد بن محمد شہریار بن عثمان بن ماہان بن ہمایوں بن قریش بن سلیمان بن عفان بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ وعنہم اجمعین۔

پرانے نسب ناموں میں جو رہتک میں اور شاہ ارزانی بدایونی کے خاندان میں موجود ہیں جن کا نسب سالار حسام الدین بن شیر ملک سے ملتا ہے۔ (ان میں) ایسا ہی پایا گیا ہے۔ پرانے زمانے میں ''ملک'' تعظیم کے لئے تھا۔ جیسے ہمارے زمانے میں ''خان'' کا لفظ ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال

(یہ بات) پوشیدہ نہ رہے کہ ہمارے بزرگوں میں سب سے پہلے جس نے شہر رہتک میں اقامت اختیار کی، وہ شیخ شمس الدین مفتی ہیں اور یہ رہتک، ہانسی اور دہلی کے درمیان ایک شہر ہے۔ دہلی سے تیں کوس دور قبلہ کی طرف واقع ہے۔

شروع میں جب ہندوستان فتح ہوا تو سادات اور قریش بڑی تعداد میں وہاں قیام پذیر ہوئے۔ اس علاقہ کا کوئی دوسرا شہر اس سے زیادہ آباد اور بارونق نہ تھا اور زمانہ گزرنے کے ساتھ وہ آبادی اور رونق ختم ہو گئی۔

یہ بزرگ (شیخ شمس الدین مفتی) عالم اور عباد شخص تھے اور قریش کی نسل سے پہلا جو شخص اس شہر (رہتک) میں آیا اور جس کی وجہ سے شعائرِ اسلام ظاہر ہوئے اور کفر کی سرکشی ختم ہوئی۔ وہ وہی (شمس الدین مفتی) تھے۔ ان کے عجیب

حالات میں سے ایک بات یہ ہے کہ بعض لوگ ذکر کرتے ہیں واللہ اعلم کہ انہوں (شیخ شمس الدین مفتی) نے وصیت کی کہ نماز کے بعد ان کے جنازہ کو اس مسجد میں رکھ دیں جو ان کی عبادت گاہ اور اعتکاف گاہ تھی اور تھوڑی دیر کے لئے اسے (مسجد کو) خالی چھوڑ دیں۔ اس کے بعد اگر (جنازہ کو) موجود پائیں تو اسے دفن کر دیں ورنہ واپس چلے آئیں۔ چنانچہ ایسا ہی عمل کیا گیا۔ جب ایک گھڑی کے بعد دیکھا تو جنازہ کا نشان موجود نہ تھا۔

جب حضرت والد بزرگوار (شیخ عبدالرحیم) قدس سرہ اس حکایت کو بیان کرتے تھے تو وہ اس کی تائید کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس زمانہ کے سلسلہ چشتیہ کے مشائخ کے حالات کی کتابوں میں اس واقعہ کو میں نے دیکھا ہے۔ اگرچہ اس بزرگ کا نام وہاں متعین نہیں ہے۔

بعض قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں میں جو ذی اقتدار (شخص) اس قسم کے قصبات میں سکونت اختیار کرتا تھا تو قضا، احتساب اور افتا وغیرہ کی قسم کی قصبہ کی ذمہ داری اس کے سپرد ہوتی تھی اور بغیر اس (منصب) کے بھی قاضی، محتسب اس کو پکارتے تھے۔ واللہ اعلم۔

اس بزرگ (شمس الدین مفتی) کے زندگی کے دن پورے ہونے کے بعد ان کی اولاد میں لائق ترین کمال الدین مفتی تھے جو ان کے طریقہ پر ان امور کے ذمہ دار ہوئے اور ان کے بعد ان کے لڑکے قطب الدین اور ان کے بعد ان کے لڑکے عبدالملک نے اسی انداز پر اپنی زندگی کے دن گزارے۔

ان بزرگوں کے گزرنے کے بعد عہدۂ قضا کا منصب ان شہروں میں قائم ہوا۔ قاضی بدہ بن عبدالملک مذکور نے اپنی موروثی ریاست کی حفاظت کی وجہ سے منصب قضا اختیار کیا۔ ان کے بعد ان کے دو لڑکے ہوئے۔ ایک قاضی قاسم کہ جو اپنے باپ کے انتقال کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔ دوسرے لڑکے منکن تھے۔ ان کے بعد ان کے ایک لڑکے ہوئے جن کا نام یونس تھا۔

قاضی قاسم کے دو لڑکے ہوئے۔ ایک قاضی قادن جو کہ اپنے باپ کے جانشین اور شہر کے رئیس تھے۔ بظاہر ان کا نام عبدالقادر یا قوام الدین ہے۔ ہندوؤں کی زبان پر نام بگڑ گیا۔ واللہ اعلم۔ دوسرے لڑکے کمال الدین تھے اور ان (کمال الدین) کا ایک لڑکا تھا کہ جس کا نام نظام الدین تھا۔

قاضی قادن کے دو لڑکے ہوئے۔ شیخ محمود اور شیخ آدم کہ جن کا عرف بھائی خاں تھا۔ ان کی نسل باقی رہی۔ شیخ محمود اپنے خاندان میں بزرگ تھے اور کسی سبب سے انہوں نے عہدۂ قضا اختیار نہ کیا اور سرکاری ملازمت اختیار کر لی اور انہوں نے اس ملازمت میں زمانہ کے سرد و گرم دونوں دیکھے۔ ان کے ظاہری حالات رہتک کے صدیقیوں کی طرح تھے۔ ان کی شادی سونی پت کے سادات کی ایک لڑکی آفریدہ سے ہوئی اور اس شادی کا نتیجہ شیخ احمد تھے۔ شیخ احمد بچپن میں رہتک سے چلے گئے اور شیخ عبدالغنی بن شیخ عبدالحکیم کے ساتھ انہوں نے نشو و نما پائی۔ انہوں (شیخ عبدالغنی) نے اپنی لڑکی کے ساتھ ان کی شادی کر دی اور ایک مدت تک ان (احمد) کی تربیت کی۔ اس کے بعد وہ رہتک واپس آ گئے۔ قلعہ کے باہر ایک عمارت بنا کر اپنے عزیزوں اور متعلقین (رعایا) کو اپنے ساتھ رہنے کو جگہ دی۔

شیخ احمد کے بعد ان کے بیٹوں میں سے دو کی اولاد باقی رہی۔ ایک شیخ منصور تھے جو شجاعت و حلم وغیرہ صفات

ریاست سے متصف تھے۔ انہوں نے پہلے شیخ عبداللہ بن شیخ عبدالغنی مذکور کی لڑکی کے ساتھ شادی کی جوان کے ماموں تھے جس سے شیخ معظم اور شیخ اعظم پیدا ہوئے اور پھر اس کی وفات کے بعد دوسری شادی کی جس سے شیخ عبدالغفور اور اسمٰعیل پیدا ہوئے اور دوسرے شیخ حسن تھے جو منبسط الحال اور صاحب جمعیت تھے۔ ان کے دو لڑکے محمد سلطان اور محمد مراد تھے۔ حضرت والد بزرگوار (شیخ عبدالرحیم) نے محمد مراد کو دیکھا تھا۔

ان (محمد مراد) کی قوت گرفت کا عجیب مشاہدہ کیا گیا۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسی سال کی عمر میں انگوٹھے اور شہادت کی انگلی میں دینار کو لے کر ملتے اور اس کو دوہرا کر دیتے تھے۔

جب انہوں نے حضرت والد ماجد (شیخ عبدالرحیم) کو بچپن میں دیکھا تو کہا کہ اس لڑکے سے میرے دل پر رعب و ہیبت طاری ہوتی ہے۔ جیسا کہ اس کے دادا شیخ معظم کے دیکھنے سے ہیبت آتی تھی۔ اس صفحہ کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ مطالعہ کرنے والا (سلسلہ) نسب کے اس حصہ پر مطلع ہو جائے کہ اس سے صلہ رحم مقصود ہوتا ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

تعلموا من انسابکم ماتصلون به ارحامکم فان صلة الرحیم محبة فی الاهل متراة فی المال منساة فی الاثر (رواہ ترمذی والحاکم)

(اپنے نسب کا علم حاصل کرو جس کے ذریعہ سے رشتہ داریاں قائم ہوتی ہیں۔ بے شک صلہ رحمی محبت کا ذریعہ ہے اس کی بدولت مال بڑھتا ہے اور عمر بڑھتی ہے۔)

اس فقیر (شاہ ولی اللہ) نے شیخ عبدالغنی مذکور کی بعض اولاد سے سنا ہے کہ وہ (شیخ عبدالغنی) اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے، عالم اور صاحب تقویٰ تھے اور جلال الدین اکبر بادشاہ ان کو بزرگ اور ذی عظمت سمجھتا تھا۔ اس کے بعد جب بادشاہ نے بے دینی اور گمراہی اختیار کر لی تو وہ محبت کا تعلق ختم ہو گیا اور دونوں طرف سے پوری پوری نفرت ظہور پذیر ہوئی۔ ایک مدت کے بعد بادشاہ کو چتوڑ کی مہم پیش آئی۔ اس طرف لگاتار فوجیں بھیجی جاتی تھیں اور فتح حاصل نہیں ہوتی تھی۔ اسی زمانے میں ایک رات کو امام ناصرالدین شہید ابن محمد باقر کے مزار (درگاہ) میں بعض اعتکاف کرنے والوں نے بیداری کی حالت میں دیکھا کہ ایک سردار اور اس کی جماعت' آلات جنگ کے ساتھ آئی ہے اور ان کے پاس ایک مشعل تھی۔ وہ اس مزار کے قبہ میں داخل ہو گئے (کسی معتکف نے) خیال کیا کہ مسافر ہیں کہ زیارت کی غرض سے آئے ہیں' وہ آگے بڑھا تو اس نے دیکھا کہ وہ رئیس (جماعت) قبر میں داخل ہوا اور اس جماعت میں سے ہر ایک آدمی ایک قبر میں داخل ہو گیا۔

کسی نے اس سے سوال کیا کہ یہ رئیس کون ہے اور یہ جماعت کیا ہے۔ اس نے کہا کہ حضرت امام ناصرالدین ہیں' شہیدوں کی جماعت کے ساتھ ہیں۔ اس نے پھر سوال کیا کہ کہاں گئے تھے اور کیا کیا؟ اس نے کہا کہ چتوڑ کو فتح کرنے کے لئے گئے تھے اور اس کو اس وقت اس برج کی طرف سے فتح کر لیا۔

شیخ عبدالغنی کو جب یہ واقعہ معلوم ہوا تو انہوں نے فتح کی بشارت اور صورت واقعہ اسی طرح بادشاہ (اکبر) سے عرض کر دی۔ کچھ دنوں کے بعد چتوڑ کی فتح بے کم و کاست اسی طریقہ سے عمل میں آئی۔ بادشاہ (اکبر) نے امام (ناصر الدین) کے مزار کے لئے بارہ گاؤں معاف کیے اور شیخ عبدالغنی کے حوالے کر دیئے۔

خواجہ محمد ہاشم کشمی نے شیخ مجد حضرت شیخ احمد سہرندی قدس سرہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میرے والد بزرگوار (شیخ عبدالاحد) ایک راز معلوم کرنے کی غرض سے ایک مدت تک شیخ عبدالغنی کی ملاقات کے جویاں رہے۔ اس لئے کہ شہر سون پت کے ایک معمر اور بزرگ درویش تھے۔ ان سے ان (شیخ عبدالغنی) کو یہ راز پہنچا تھا اور وہ راز یہ تھا جو انہوں نے بتایا کہ میرے مرشد جو تھے' وہ میرے نانا تھے۔ انہوں نے اپنے انتقال کے وقت مجھے ایک شوریدہ کار درویش کی معیت میں اپنے پاس بلایا تا کہ نسبت القا کریں اور (باطنی فیض) عطا فرمائیں۔ جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے معاملہ' حقیقت کا ایک راز (ہمیں) بتایا۔ اس (راز) کے سنتے ہی وہ درویش تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور میں اسی طرح حیران وسراسیمہ جان اپنی جگہ برقرار رہا۔

حضرت والد (شیخ عبدالاحد) ان (شیخ عبدالغنی) سے اس بات کے سننے کے خواہشمند تھے کہ ان کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اتفاق کی بات کہ شیخ مذکور کو کسی مہم کی وجہ سے سہرند سے گزرنا پڑا۔ جب وہ سہرند میں کارواں سرائے میں ٹھہرے تو ہمارے والد بھی وہاں پہنچے۔ مزاج پرسی اور ملاقات کے بعد تنہائی کی درخواست کی اور اس راز سربستہ کے ظاہر کرنے اور بتانے کی التماس کی۔ شیخ (عبدالغنی) نے اس (راز) کو ان سے بیان کر دیا۔ جب ہمارے والد (شیخ عبدالاحد) شیخ (عبدالغنی) کے پاس سے باہر آئے تو شیخ جمیل الدین نے جو صاحب دل' فاضل اور والد (شیخ عبدالاحد) کے خلفاء میں سے تھے۔ ان (والد) سے پوچھا کہ آپ نے (اس راز) کو معلوم کیا۔ والد صاحب نے فرمایا کہ ہاں کیا۔ (پھر پوچھا) وہ کیا مسئلہ تھا کہ جو انہوں نے بتایا۔ فرمایا وہی مسئلہ تھا جس پر ہم ہیں اور جو ہمارے طریقہ کی جان ہے یعنی یہ سب کچھ (کائنات) جو دکھلائی دیتا ہے' واحد حقیقی ہے کہ جو کثرت کے عنوان میں نمودار ہوتا ہے لیکن چونکہ وہ درویش سادہ لوح تھا اور جیسے ہی یہ وزنی راز اس کے کان میں پڑا تو اس کا حوصلہ اس (راز) کا تحمل نہ کر سکا اور وہ ہلاک ہو گیا اور چونکہ شیخ عبدالغنی' عالم' صاحب تمکین اور راز سے آشنا تھے' اس لئے اپنی جگہ برقرار رہے۔

شیخ معظم بدرجہ اتم شجاعت وغیرہ سے متصف تھے اور اس سلسلہ میں عجیب عجیب واقعات ہیں (جو) حد شمار سے باہر ہیں۔ حضرت والد بزرگوار (شیخ عبدالرحیم) فرماتے تھے کہ شیخ منصور کو کسی راجا سے لڑنا پڑا۔ انہوں نے لشکر کا میمنہ (داہنا حصہ) شیخ معظم کے سپرد کیا اور اس وقت ان کی عمر بارہ سال کی تھی۔ سخت لڑائی ہوئی اور دونوں طرف سے بہت سے لوگ قتل ہوئے۔ اسی دوران میں کہنے والے نے شیخ معظم سے کہا کہ شیخ منصور شہید ہو گئے اور ان کی تمام فوج بھاگ گئی۔ ان (شیخ معظم) کی رگِ غیرت حرکت میں آئی۔ کفار کے رئیس (کے مارنے) کا قصد کیا۔ اس دوران میں جو کوئی ان کو روکتا تھا' وہ اس کو زخمی یا قتل کر کے سامنے سے ہٹا دیتے تھے۔ بہت کوشش کے بعد راجا کے ہاتھی تک پہنچ گئے۔ سرداران کفار میں سے ایک شخص نے مقابلہ کیا۔ انہوں نے تلوار کی ضرب سے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے اور اس کے اعلیٰ جسم کو گھوڑے کے نیچے ڈال دیا۔ (اس کے بعد) بہت سے لوگوں نے اس کو گھیر لیا۔ اس راجا نے سب کو منع کیا اور ڈانٹا اور کہا کہ یہ شخص اتنی کم عمری میں ایسی جوانمردی اور جرأت کرتا ہے۔ یہ بات عجائبِ روزگار میں سے ہے۔

(راجا نے) اسی شیخ معظم کے دونوں ہاتھوں کو چوما اور نہایت احترام کیا اور اس غصہ کا سبب دریافت کیا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے والد شہید ہو گئے۔ میں نے ارادہ کیا کہ میں حملہ کروں اور واپس نہ جاؤں جب تک کہ

یا تو راجہ کو قتل نہ کر دوں یا خود نہ مارا جاؤں۔ راجہ نے کہا کہ اس آدمی نے جھوٹ کہا تھا۔ تمہارے والد زندہ ہیں اور ان کے (لشکر کے) جھنڈے فلاں جگہ نظر آ رہے ہیں۔ اسی وقت شیخ منصور کے پاس آدمی بھیجا کہ ہم نے لڑکے کی وجہ سے صلح کی ہے اور جو کچھ وہ (شیخ منصور) اس راجا سے چاہتے تھے' اس نے قبول کیا اور وہ واپس آ گئے۔

حضرت والد (شیخ عبدالرحیم) نے موضع شکوہ پور کے ایک بوڑھے کسان سے سنا۔ یہ (موضع) شیخ معظم کا تعلقہ تھا کہ ایک مرتبہ تقریباً تیس ڈاکوؤں نے اس گاؤں میں ڈاکہ ڈالا۔ اس وقت شیخ معظم بھی وہاں تھے اور وہاں ان کی اولاد' بھائیوں اور بنی اعمام میں سے کوئی موجود نہ تھا۔ لوگوں نے اس حادثہ کی ان کو خبر کی۔ اس وقت دستر خوان بچھ چکا تھا۔ کھانا آیا۔ انہوں (شیخ معظم) نے کسی عجلت یا جلدی کا مظاہرہ نہیں کیا اور باطمینانِ تمام حسب معمول کھانے سے فارغ ہوئے۔ ہاتھ دھوئے' پھر کہا میرے ہتھیار لاؤ اور میرے گھوڑے کو حاضر کرو۔ جب سوار ہوئے تو دیہاتیوں کا ایک ہتھیار بند گروہ آیا۔ انہوں نے سب کو واپس کر دیا اور فرمایا کہ میں بہت تیزی سے جاؤں گا اور تم میرے گھوڑے کی دوڑ تک نہ پہنچ سکو گے لیکن راوی کو جو گھوڑے کی دوڑ میں برابر ہو سکتا تھا' ساتھ لیا تا کہ وہ اپنی قوم کو اس معرکے سے خبردار کر سکے جو ڈاکوؤں سے واقع ہو۔ پس وہ دوڑے یہاں تک کہ ان ڈاکوؤں کو جا لیا کہ جو اپنے ٹھکانوں پر پہنچ چکے تھے اور غیرت انگیز کلمات کہہ کر (اس) جماعت کو میدان میں لائے۔ اسی وقت ایک تیر سے دو دو آدمیوں کو مارنا شروع کر دیا۔ جب انہوں نے دو یا تین تیر اس انداز سے ملاحظہ کیے تو اس جماعت کے دلوں پر بہت رعب غالب آیا۔ وہ زندگی سے ناامید ہو گئے اور انہوں نے فریاد کرنی شروع کر دی کہ ہم توبہ کرتے ہیں اور ہمیں معاف کیجیے۔ شیخ (معظم) نے فرمایا توبہ یہی ہے کہ خود اپنے ہتھیار اتارو اور ہر ایک دوسرے کے ہاتھ باندھے۔ پھر سواری' ہتھیار' گھوڑے لے کر چلو۔ یہاں تک کہ اس گاؤں تک پہنچو۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور اس طریقہ سے جو ان کے مذہب میں مقرر تھا' قسم موکد کھائی کہ پھر اس قصبہ کے بدخواہ نہ ہوں گے اور شیخ معظم کی صوابدید سے کبھی تجاوز نہ کریں گے۔

اولاد: غرض شیخ معظم کے سید نور الجبار سون پتی کی لڑکی سے جو ایک عالی نسب سید تھے اور ان (نور الجبار سون پتی) کے ذی عزت بزرگ' علم و فضل سے آراستہ تھے۔ تین لڑکے پیدا ہوئے۔ شیخ جمال۔ شیخ فیروز۔ شیخ وجیہہ الدین۔

شیخ وجیہہ الدین شجاعت و تقویٰ سے بدرجہ کمال متصف تھے۔ حضرت والد (شیخ عبدالرحیم) قدس سرہ فرماتے تھے کہ میرے والد رحمتہ اللہ علیہ کا معمول تھا کہ روزانہ دن رات میں قرآن شریف کے دو پارے تلاوت کرتے تھے اور اس (تلاوت) کو سفر' حضر' غم اور خوشی میں ترک نہیں کرتے تھے۔ جب بوڑھے ہو گئے اور قوتِ بینائی کم ہو گئی تو جلی خط میں لکھا ہوا قرآن کریم اپنے پاس رکھتے تھے اور وہ سفر میں بھی ان سے جدا نہیں ہوتا تھا۔ نیز فرماتے تھے کہ وہ کسی کے کھیت میں اپنا گھوڑا نہیں ڈالتے تھے۔ اگرچہ سارا لشکر اس کھیت میں سے گزرتا تھا اور ان کو بعض اوقات متعارف راستہ سے ہٹ کر چلنا پڑتا تھا۔

(شیخ عبدالرحیم) فرماتے تھے کہ کسی لڑائی میں ان (شیخ وجیہہ الدین) کا ساز و سامان گم ہو گیا' کھانے پینے کا سامان بھی مہیا نہ ہوا۔ ان کے ساتھی زبردستی گاؤں کے مویشی لے لیتے تھے اور کھاتے تھے اور انہوں نے ایسی پرہیزگاری کی دو تین فاقے ہو گئے اور قوت بالکل ساقط ہو گئی تو رازقِ حقیقی جل شانہ کی رزاقیت نے اس صورت میں ظہور فرمایا کہ

اتفاق سے وہ چابک سے زمین کرید رہے تھے۔ جیسا کہ فکر کرتے وقت ہوتا ہے۔ وہاں سے ان کی خوراک کے بقدر چنے ملے۔ چونکہ گری پڑی چیز کا کوئی مالک نہیں ہوتا ہے' اس لئے ان چنوں کو دھویا' پاکیزہ کیا' پھر ابالا اور تناول کیا۔

نیز شیخ عبدالرحیم فرماتے تھے کہ میرے والد (شیخ وجیہہ الدین) رحمتہ اللہ علیہ خدام' ملازمین اور گھسیاروں وغیرہ کے ساتھ ایسی شفقت اور انصاف سے پیش آتے تھے کہ اس زمانہ کے متقیوں سے کم ایسا برتاؤ دیکھا گیا ہے۔

نیز فرماتے تھے کہ ایک سفر میں میرے والد (شیخ وجیہہ الدین) رحمتہ اللہ علیہ نے (کسی ولی) کی ولایت کے بعض ایسے شواہد ملاحظہ کیے کہ انہوں نے ان سے بیعت کر لی اور صوفیوں کے اشغال میں مصروف ہو گئے۔ کم گوئی کی عادت ڈالی اور لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا اور اس سلسلہ میں انہوں نے ایسا کمال کیا کہ اس زمانے میں صوفیوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

کاتب حروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ شیخ مظفر رہتکی میرے والد (شیخ عبدالرحیم) اور ابوالرضا محمد (تایا) کے متعلق ان (شیخ وجیہہ الدین) کے ارتباط کو بیان کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں (شیخ عبدالرحیم و شیخ ابوالرضا محمد) ان کی شیرینی (اشغالِ صوفیا) سے سیراب ہوتے ہوں گے اور ان دونوں نے اس منبع زلال سے فیض حاصل کیا ہوگا۔

حضرت والد (شیخ عبدالرحیم) قدس سرہٗ ان (شیخ وجیہہ الدین) کی بہادری کی بہت سی حکایتیں بیان کرتے تھے۔

ان (شیخ وجیہہ الدین) کا یہ بھی واقعہ ہے کہ والد صاحب نے فرمایا' جب عالمگیر بادشاہ ہوا تو اس کے بھائی شاہ شجاع نے بنگالہ کی طرف خروج کیا۔ عالمگیر اس سے لڑنے کے لئے متوجہ ہوا اور (شیخ وجیہہ الدین) بھی عالمگیر کے لشکر میں تھے۔ سخت لڑائی ہو۔ دونوں لشکر تھک کر چُور ہو گئے۔ آخر دو تین مست ہاتھیوں نے شاہ شجاع کی طرف سے عالمگیر کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ ہر ہاتھی کے پیچھے زرہ پوشوں کی ایک جماعت تھی۔ جب یہ صورت ظہور پذیر ہوئی تو عالمگیر کے ہاتھی کے اردگرد تھوڑے سے آدمیوں کے سوا کوئی موجود نہ تھا۔

اس وقت میرے والد (شیخ وجیہہ الدین) علیہ الرحمہ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ ان ہاتھیوں میں سے کسی ایک پر حملہ کر دیں۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہ جان دینے کا وقت ہے۔ ایسے موقع پر استقامت ہر کسی سے ظاہر نہیں ہوتی۔ ہاں جو کوئی علیحدگی چاہتا ہے اسے میری طرف سے اجازت ہے' سوائے چار آدمیوں کے اکثر ساتھیوں نے علیحدگی اختیار کر لی۔

فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے رفیقوں میں سے کوئی ہماری محبت میں شریک ہوگا تو یہی چار آدمی ہوں گے۔ ان چار آدمیوں نے ان کے شکار بند کو مضبوطی سے پکڑا اور آپس میں طے کیا کہ جہاں کہیں وہ (شیخ وجیہہ الدین) ہوں گے' ہم بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔ اس کے بعد اس ہاتھی پر جو زیادہ سرکشی کر رہا تھا' حملہ کر دیا اور توقف کیا۔ یہاں تک کہ ہاتھی نے اپنی سونڈ کو ان کی طرف اٹھایا اور چاہا کہ ان کو گھوڑے سے گرا دے یا اٹھا لے۔ اس وقت انہوں نے تلوار کے ایک حملہ سے اس کی سونڈ کو نیچے کی طرف سے کاٹ ڈالا۔ ہاتھی ایک خوفناک آواز نکال کر بھاگا اور اس کا نقصان اس کی جماعت کو

ہوا۔ یہ پہلی فتح تھی۔ عالمگیر نے اس معاملہ کو اپنی آنکھ سے دیکھا اور فتح کے بعد چاہا کہ ان کے منصب کو زیادہ کر دے۔ انہوں نے استغنا اختیار کیا اور قبول نہ کیا۔

شیخ رفیع الدین محمد بن قطب عالم بن شیخ عبدالعزیز کی لڑکی کے ساتھ ان (شیخ وجیہہ الدین) کی شادی ہوئی تھی (جس سے) تین لڑکے پیدا ہوئے۔

1- مخدومی شیخ ابوالرضا محمد 2- مخدومی شیخ عبدالرحیم 3- مخدومی شیخ عبدالحکیم۔

والد صاحب (شیخ عبدالرحیم) فرمایا کرتے تھے کہ میرے والد ایک رات تہجد کی نماز ادا کر رہے تھے۔ ان کو ایک سجدے میں بہت دیر ہوگئی۔ یہاں تک کہ میں نے خیال کیا کہ ان کی روح ان کے جسم سے نکل گئی۔ جب حالت درست ہوئی تو اس بہت دیر (سجدے) کے بارے میں سوال کیا۔ فرمایا کہ مجھے غیبت واقع ہوئی اور وہاں مجھے ان عزیزوں کے بارے میں اطلاع ملی جو شہید ہو گئے تھے۔ ان کے حالات و واقعات مجھے بہت پسند آئے اور میں نے حضرت حق سبحانہ کی جناب سے شہادت کی درخواست کی اور بہت زیادہ گڑگڑایا یہاں تک کہ مجھ پر قبولیت ظاہر ہوگئی اور دکن کی طرف کا حکم ہوا کہ شہادت کی جگہ وہاں ہے۔

اس واقعہ کے بعد از سر نو سفر کا اسباب مہیا کیا۔ حالانکہ نوکری چھوڑ چکے تھے اور اس کام سے ایک نفرت سی ہوگئی تھی۔ گھوڑا خریدا اور اس طرف (دکن) کو چل دیئے اور ان کو یہ گمان ہوا کہ ’’سیوا‘‘ سے (مقابلہ کا اشارہ) ہوگا کہ جو اس وقت کفار کا سردار [1] تھا۔ جس سے مسلمانوں کے قاضی کی نسبت بہت سخت بے حرمتی ظہور میں آئی تھی۔

جب وہ برہان پور پہنچے تو ان کو منکشف ہوا کہ وہ شہادت کے مقام کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ اسی طرف واپس لوٹے۔ اثنائے راہ میں بعض تاجروں کے ساتھ انہوں نے موافقت کا عہد باندھا۔ جو (تاجر) اصلاح و تقویٰ سے آراستہ تھے اور یہ ارادہ کیا کہ قصبہ ’’ہنڈیا‘‘ کے راستہ سے ہندوستان کو آئیں۔ اسی دوران میں ایک بوڑھا آدمی (ان کے) سامنے آیا کہ جو گرتا پڑتا چلا جا رہا تھا۔ انہوں نے اس کے حال پر رحم کیا اور اس سے مقصد پوچھا۔ اس نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ دہلی چلا جاؤں۔ انہوں (شیخ وجیہہ الدین) نے فرمایا کہ میرے ملازموں سے تین پیسے یومیہ لو۔ وہ بوڑھا کافروں کا جاسوس تھا۔

جب (وہ لوگ) نونبریا کی سرائے میں پہنچے کہ جو دریائے نربدہ سے دو تین منزل ہندوستان کی طرف ہے۔ جاسوس نے اپنے بھائیوں (ساتھیوں) کو خبر کر دی۔ سرائے میں ڈاکوؤں کی ایک جماعت آ گئی اور وہ (شیخ وجیہہ الدین) اس وقت قرآن شریف کی تلاوت میں مشغول تھے۔ اس گروہ میں سے تین آدمی آگے بڑھے (اور پوچھا) کہ وجیہہ الدین کون ہے؟ جب انہوں (ڈاکوؤں) نے پہچان لیا تو کہا کہ ہمیں تم سے کچھ مطلب نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تمہارے پاس کچھ کچھ مال بھی نہیں ہے اور ہماری جماعت میں سے ایک آدمی پر تمہارا حق نمک (واحسان) بھی ہے لیکن یہ تاجر اپنے ساتھ فلاں فلاں مال رکھتے ہیں۔ ہم ان کو نہیں چھوڑیں گے۔

چونکہ اس سفر کا اصلی سبب ان (شیخ وجیہہ الدین) کو معلوم تھا‘ لہٰذا وہ اس رفاقت کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے اور قتل و غارت گری کو روکنے کے لئے آگے بڑھے۔ اسی دوران میں ان کو بائیس زخم آئے اور ایک زخم سے ان کا سر تن سے

جدا ہو گیا۔ اس کے باوجود تکبیر کہتے ہوئے انہوں نے پچاس قدم تک کفار تک تعاقب کیا۔ اس کے بعد ایک عورت یہ حال دیکھ کر بہت متعجب ہوئی۔ اسی وقت وہ گر پڑے اور وہیں وہ دفن ہوئے۔[2]

حضرت والد (شیخ عبدالرحیم) فرماتے تھے کہ ایک دن وہ نظر آئے اور زخموں کے مقامات دکھلائے۔ میں (شیخ عبدالرحیم) نے ان کے ثواب کے لئے کوئی چیز صدقہ دے دی اور (شیخ عبدالرحیم) فرماتے تھے کہ میں چاہتا تھا کہ ان کے جسم کو منتقل کروں کہ ایک اور مرتبہ وہ (شیخ وجیہہ الدین) نظر آئے اور اس بات سے منع کیا۔ ان (شیخ وجیہہ الدین) کے قتل کی خبریں حد سے زیادہ مشہور ہیں۔

> اصل رسالہ مسمی ''الامداد فی مآثر الاجداد'' فارسی میں ہے۔ اس کا اردو ترجمہ پروفیسر محمد ایوب قادری کا ہے جو ''الرحیم'' (حیدر آباد سندھ) مطابق مئی و جون 1967ء میں شائع ہوا۔ یہاں اس اردو ترجمے کا اختصار کیا گیا ہے۔

مشائخ واساتذہ

شاہ ولی اللہ 1143ھ میں حرمین شریفین تشریف لے گئے تھے۔ وطن میں تو انہوں نے جو کچھ پڑھا' اپنے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم صاحب سے پڑھا۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے ایک مختصر سا رسالہ ''انسان العین فی مشائخ الحرمین'' کے نام سے لکھا ہے جو ''انفاس العارفین'' میں شامل ہے۔ اس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ ''اس میں اہل حرمین شریفین کے بعض مشائخ صوفیہ وعلمائے محدثین کا ذکر ہے جن کے واسطے سے اس فقیر تک سلسلہ خرقہ صوفیہ اور اسنادِ حدیث پہنچتی ہیں۔''

یہاں اس رسالے کا خلاصہ دیا جاتا ہے۔

شیخ احمد شناوی

آپ علمِ شریعت وحقیقت ہر دو کے جامع تھے۔ آپ کا ایک قول ہے۔ لایدخل النار من رأنی ورأی من رأی الی یوم القیامۃ (وہ شخص دوزخ میں داخل نہیں ہوگا جس نے مجھے دیکھا اور جس نے اس شخص کو دیکھا جس نے مجھے دیکھا۔ یہ قیامت کے دن تک رہے گا۔) بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن وہ اپنے حجرے میں سو رہے تھے کہ انہوں نے دیکھا کہ حجرے کی دیوار پر گرگٹ جا رہا ہے۔ شرع کے حکم کے مطابق انہوں نے چاہا کہ اسے مار ڈالیں لیکن شہودِ وحدت نے ان کے اس ارادے کو کمزور کر دیا۔ بالجملہ وہ ان دونوں خیالات کے درمیان متذبذب رہے۔ آخر انہوں نے حکمِ شرع کی تعمیل کا عزمِ مصمم کیا اور اسے پتھر مارا' وہ نشانے پر نہ لگا اور گرگٹ بھاگ گیا۔ اس سے وہ بہت خوش ہوئے اور کہا ''تمام تعریف ہے اللہ کی جس نے ہمارے لئے دونوں باتوں کو جمع کر دیا۔'' شیخ احمد شناوی کے مرید شیخ احمد قشاشی نے اس حکایت کے بعد کہا کہ اگر میں وہاں ہوتا تو ذرا بھی تامل نہ کرتا اور گرگٹ کا سر پتھر سے کچل ڈالتا۔

(شاہ ولی اللہ صاحب ان دونوں باتوں میں یوں تطبیق دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں)..... شرع کا حکم اس امر کا متقاضی ہے کہ کائنات کی یہ جو کثرت ہے' اس کے احکام کا نظم وضبط قائم رہے۔ شہود کامل یہ ہے کہ اصل جو وحدت ہے' وہ

کثرت کے احکام میں مزاحم نہ ہو اور اسی طرح کثرت وحدت میں مزاحم نہ رہے۔

چونکہ بے رنگی اسیر رنگ شد
موسوی با عیسوی در جنگ شد

شیخ احمد قشاشی کا انتقال 1028ھ میں ہوا۔

شیخ احمد قشاشی

وہ علم حقیقت و شریعت میں امام تھے۔ جب وہ حقائق معرفت میں گفتگو کرتے تو اسے آیات و احادیث سے مدلل بناتے۔ انہیں بہت سے مشائخ کی صحبت میسر آتی۔ گو انہوں نے خود اپنے والد سے خرقہ پہنا لیکن انہیں اپنے مقصد میں کامیابی شیخ احمد شناوی کی بدولت ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے آپ کو انہیں سے منسوب کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک رات شیخ احمد قشاشی نے خواب میں دیکھا کہ محی الدین ابن عربی نے انہیں خرقہ پہنایا ہے اور اپنی بہن سے ان کا عقد کیا ہے۔ اس سے وہ سمجھے کہ وحدتِ وجود سے ان کی نسبت درست ہو گئی ہے کیونکہ یہی شیخ ابن عربی کی بہن ہے۔

شیخ قشاشی کی وضع و سیرت نہ تو فقہا کی طرز پر تھی نہ خشک مزاج زاہدوں کی طرز پر بلکہ دونوں کے درمیانی طریقے پر اور بے تکلفانہ تھی اور سنت کا یہی نہج و طریقہ ہے۔ وہ کبھی امرا کے گھروں میں نہیں جاتے تھے۔ البتہ اگر وہ ملاقات کے لئے آتے تو ان سے بڑی خوش خلقی اور بشاشت سے ملتے۔ شیخ عیسیٰ مغربی نے ان کے بارے میں کہا تھا: ''میں جب بھی کبھی قشاشی سے مل کر باہر نکلا تو دنیا میری نظروں میں سب سے زیادہ حقیر اور میرا نفس سب سے زیادہ ذلیل ہوتا تھا۔ خواہ میں کتنی بار بھی ان کے پاس جاتا' میرا یہی تاثر ہوتا تھا۔'' ان کا انتقال 1071ھ کی انیسویں ذی الحج کو ہوا۔

سید عبدالرحمٰن ادریسی مشہور بہ محجوب

آپ مراکش (مغرب) کے شہر مکناسہ میں پیدا ہوئے۔ مغرب' مصر' روم اور شام کی سیاحت کرنے کے بعد حرمین میں آئے اور وہاں کئی برس رہے۔ پھر وہاں سے یمن گئے۔ بعد ازاں مکہ میں آ گئے اور وہاں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ اہل مکہ ان سے بڑے مستفید ہوئے اور ان کی بہت سی کرامات ہیں۔

سید عبدالرحمٰن ادریسی کمالات ظاہری و باطنی ہر دو سے متصف تھے اور بدرجہ کمال فیاض تھے اور ان کے دسترخوان پر صبح و شام کافی لوگ ہوتے۔ حج کے زمانے میں ان کے پاس بہت لوگ آیا کرتے۔ ان میں سے جس میں وہ استعداد دیکھتے' اسے صوفیا کے کلام اور ان کے معتقدات بالخصوص شیخ اکبر ابن عربی کے مطالعہ کا شوق دلاتے۔

شمس الدین محمد بن العلاء البابلی

آپ حافظِ حدیث تھے اور اپنے زمانے میں مصر اور حرمین کے استادِ حدیث مانے جاتے تھے۔ آپ بڑے پسندیدہ اخلاق جیسے تواضع' تیزیٔ ذہن' مہر و محبت وغیرہ سے متصف تھے۔ انہوں نے صحیح بخاری' موطا اور دوسری کتب

حدیث سالم سے روایت کیں۔ان کے پاس موطا' بخاری اور بعض دوسری کتب کی مسلسل اسناد تھیں۔ان میں شان وعظمت اور بزرگی واحترام کا ایک عجیب انداز تھا۔شریف الشرفاء' پاشے اور وزراان سے برکت کے خواستگار ہوتے اور ان کے قول سے انحراف نہ کر سکتے۔وہ قرآن مجید کی برابر تلاوت کرتے رہتے تھے۔ان کا انتقال 1077ھ میں ہوا۔بابل مصر میں ایک گاؤں ہے جس کی طرف وہ منسوب تھے۔

شیخ عیسیٰ جعفری مغربی

ان کی پیدائش اور نشو ونما مغرب میں ہوئی۔وہاں کچھ مروجہ علوم پڑھے۔پھر الجزائر میں آ گئے اور سجلماسی کے پاس دس سال رہے اور علوم میں تبحر حاصل کیا۔نیز قسطنطنیہ' مصر اور حرمین کے علماء سے روایت کی اور پھر مکہ میں متوطن ہو گئے۔انہوں نے ''مقالید الاسانید'' کے نام سے ایک معجم لکھی۔غرض وہ صاحب کمال علما میں سے تھے اور جمہور اہلِ حرمین کے استاد تھے۔انہوں نے فقہ امام ابوحنیفہ کے مطابق ایک مسند بھی مرتب کی تھی۔

محمد بن محمد بن سلیمان مغربی

آپ حافظِ حدیث تھے اور علم وریاست اور دین ودنیا ہر دو کے فنون کے جامع تھے۔انہیں شیخ ابو مدین مغربی کی طرف سے خرقہ مدینہ ملا ہوا تھا۔شیخ تاج الدین قلعی کہتے ہیں کہ شیخ محمد بن محمد بن سلیمان علم روایت میں درجہ کمال میں تھے۔اسی طرح وہ بہت سے عجیب وغریب فنون وعلوم بھی جانتے تھے اراللہ تعالیٰ کے اس قول کے ''زادہ بسطۃً فی العلم والجسم'' کے مصداق تھے۔ان میں عقل معاش بھی بدرجہ کمال تھی۔

اس فقیر (شاہ ولی اللہ) نے ان کے صاحبزادے محمد وفد اللہ سے ان کے والد شیخ محمد بن محمد کی تمام مرویات کی اجازت لی ہے۔محمد وفد اللہ نے اپنے والد سے یہ سب مرویات پڑھی تھیں، سنی تھیں اور ان کی اجازت لی تھی۔نیز میں نے پوری موطا بروایت یحیٰ بن یحیٰ ان کے روبرو پڑھی اور انہوں نے اسے شیخ حسن العجمی وغیرہ مشائخ سے پڑھا تھا۔

شیخ ابراہیم کُردی

آپ عالم وعارف تھے۔مختلف علوم میں جیسے کہ فقہ شافعی وحدیث اور ادب عربی میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ان میں سے ہر علم میں ان کی تصانیف ہیں۔پہلے اپنے وطن میں تحصیل علم کی۔پھر حج کے ارادے سے نکلے اور راستے میں تقریباً دوسال بغداد میں رہے۔پھر شام ومصر میں قیام کرتے ہوئے حرمین میں آئے۔وہاں شیخ قشاشی سے ملاقات کی اور دونوں کے درمیان بڑے عجیب خصوصی تعلقات پیدا ہو گئے۔شیخ ابراہیم نے شیخ قشاشی سے حدیث روایت کی۔ان سے خرقہ پہنا اور ان کی صحبت میں اعلیٰ کمالات تک ترقی کی وہ فارسی، ترکی، کُردی اور عربی سب زبانیں جانتے تھے اور تیزیٔ ذہن' تبحر علم' زُہد' تواضع' صبر اور حلم سے متصف تھے۔

شیخ ابراہیم ادعا کرنے والے فقیہوں اور صوفیوں کے مخصوص لباس سے بیزار تھے اور وہ لباس پہنتے تھے جو اہل حجاز عام طور پر پہنا کرتے تھے۔ مجلس میں نمایاں جگہ پر بیٹھنا، دوسرے سے پہلے کلام کرنا اور اسی طرح کی باتوں کے ذریعہ کبھی اظہارِ ذات نہیں کرتے تھے۔ جب وہ مسائل حکمت پر گفتگو فرماتے تو ان کے ضمن میں حقائق تصوف بیان کرتے۔ اس سلسلے میں وہ حکماء کی تحقیقات پر صوفیا کے کلام کو ترجیح دیتے اور فرماتے۔ ''یہ فلاسفہ گرتے پڑتے حق کے قریب تو پہنچ گئے لیکن اس تک ان کی رسائی نہیں ہوئی۔'' ان کے عہد کے ایک خطیب نے ان کی تاریخِ وفات اس جملے سے ''واللہ انا علی فراقك يا ابراهيم لمحزونون'' نکالی ہے۔

شیخ حسن عجمی

آپ شیخ حدیث، مختلف علوم کے جامع اور فصاحت، قوت حافظہ اور جودتِ فہم میں فائق تھے۔ ان کی صحبت وہم جلیسی زیادہ تر شیخ عیسیٰ مغربی اور دوسرے بہت سے شیوخ جیسے شیخ قشاشی اور شیخ بابلی وغیرہ سے رہی اور انہی سے انہوں نے علمی استفادہ کیا۔ شیخ ابو طاہر بن ابراہیم کُردی ذکر کرتے تھے کہ شیخ عجمی نے شیخ نعمت اللہ قادری اور دوسرے صوفیہ سے ملاقاتیں کیں۔ نیز وہ دعوتِ اسما جانتے تھے۔

شیخ ابو طاہر کہتے ہیں کہ عجمی حنفی تھے لیکن وہ سفر میں ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کی نمازیں جمع کر لیتے تھے۔ نماز باجماعت میں امام کے پیچھے فاتحہ پڑھتے تھے۔ ہمیں نصیحت کرتے تھے کہ تم اپنی عورتوں کو تنگی میں نہ ڈالا کرو اور حنفی مذہب میں جو رخصتیں ہیں، وہ انہیں بتایا کرو تا کہ وہ نماز پڑھ لیا کریں اور یہ معاملہ نجاست کے مسئلے میں تھا کہ ایک درہم کے برابر نجاست ہو تو یہ مانع نماز نہیں اور ایسے ہی اس طرح کے دوسرے مسائل میں بھی۔

کاتبِ حروف (شاہ ولی اللہ صاحب) کہتا ہے کہ اس سے ان کی غرض یہ تھی کہ باوجود حنفی ہونے کے وہ تمام امور میں ایک معین فقہی مذہب کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے تھے اور ان کے ہاں تلفیق (مختلف مذاہبِ فقہ کے اقوال لے لینا) جائز تھی۔ انہوں نے اپنی اسانید احادیث کو قلمبند کیا تھا۔ اس سے ان کے اس علم میں تبحر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ شیخ حسن عجمی آخر عمر میں مکہ چھوڑ کر طائف چلے گئے تھے اور وہیں 1113ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

شیخ احمد نخلی

آپ علم ظاہر و باطن کے جامع تھے۔ انہوں نے مشائخ طریقت اور علمائے شریعت کی صحبت پائی۔ خرقہ سید عبدالرحمٰن مجوب اور بعض دوسرے صوفیہ سے پہنا اور حدیث شیخ بابلی، شیخ عیسیٰ مغربی اور ان کے طبقے سے روایت کی۔ انہیں بخاری اور موطا کی سماعت میں تسلسل حاصل تھا۔ ان کو مشائخ طریقت کی بہت سی احزاب یاد تھیں۔ وہ علما کی صحبت کا التزام کرنے والے، مشائخ طریقت سے حسن عقیدت رکھنے والے اور ان کے اعمال و اشغال پر مداومت کرنے والے تھے۔ حرمین میں رہنے والے مشائخ اور وہاں جو باہر سے مشائخ آتے تھے، ان سب سے انہیں بھرپور صحبت میسر ہوئی۔ غرض وہ مکہ معظمہ کے اعیان و کبار میں سے تھے اور برکت اور دعاؤں کی قبولیت کی وجہ سے مشہور تھے۔

شیخ عبداللہ بن سالم البصری ثم المکی

آپ نے بہت سی کتبِ حدیث کو نئے سرے سے زندہ (یعنی ان کا احیا) کیا۔ ان میں سے ایک مسند امام احمد بن حنبل تھی۔ نزدیک تھا کہ پوری دنیا میں اس کا کامل نسخہ نہ ملتا۔ آپ نے مصر و عراق و شام کے قدیم کتب خانوں سے اس کے مختلف اجزا جمع کیے۔ ان سے ایک نسخہ لکھ کر تیار کیا۔ اس کی تصحیح کی اور اسے اصل کے مطابق بنایا۔ اسی طرح صحاح ستہ کی تصحیح کی۔ نیز نسخہ نبویہ خود اپنے ہاتھ سے لکھا اور اصل سے بہتر لکھا۔ آپ کی صحیح بخاری پر ''ضیاء الساری'' کے نام سے ایک شرح ہے جسے وہ بڑھاپے کی کمزوری کی وجہ سے مکمل نہ کر سکے۔ وہ تمام عمر کتبِ حدیث کی روایت کرتے رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس آخری زمانے میں وہ حافظِ حدیث تھے اور حدیث کی بحث و تنقیح میں انہوں نے ساری عمر گزار دی۔ انہیں ضبطِ حدیث میں درجہ کمال حاصل تھا۔ وہ ہر روز قرآن کے دس پارے تلاوت کرتے۔ جب بوڑھے ہوگئے تو حسب استطاعت تلاوت کرتے۔ ان کے وقت کا کوئی حصہ بھی درس، تلاوت، نماز یا ضروری گفتگو سے خالی نہ ہوتا۔ انہوں نے طویل عمر پائی اور اسے رضائے الٰہی میں گزارا۔ آخر عمر میں شیخ عبداللہ مغربی نے ان کے روبرو صحاح ستہ پڑھی اور اہل مکہ کی اکثریت نے ان سے سماعِ حدیث کی تھی۔ ان کا 4 رجب 1134ھ میں انتقال ہوا۔

شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کُردی مدنی

آپ ابتدائے حال سے علم و علما کی طرف رغبت رکھتے تھے۔ خرقہ انہوں نے اپنے والد سے پہنا۔ آپ کے والد بزرگوار نے ان کے خرقہ کے لئے بہت سے بزرگوں سے اجازت لی۔ کتبِ عربیہ انہوں نے سید احمد ادریس مغربی سے پڑھیں جو سیبویہ وقت تھے۔ فقہ شافعی شیخ علی طوبوتی مصری اور علم معقول روم کے متبحر و مشہور عالم منجم باشی سے پڑھا۔ حدیث کا علم اپنے والد سے حاصل کیا۔ پھر شیخ حسن عجمی سے اور آخر الذکر بزرگ سے وہ زیادہ مستفید ہوئے۔ اسی طرح اور بہت سے علماء سے استفادہ کیا۔

مُلّا عبدالحکیم سیالکوٹی کی کتابیں شیخ عبداللہ لاہوری سے روایت کیں جن کا سلسلہ روایت شیخ عبداللہ لبیب سے خود مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی تک جاتا ہے۔ اسی طرح شیخ عبدالحق دہلوی کی کتابیں بھی اسی واسطے سے روایت کیں۔ مولانا سیالکوٹی نے ان سے ان کتابوں کی روایت کی اجازت لی تھی۔ شیخ سعید کوکنی سے بھی انہوں نے بعض کتبِ عربیہ اور فتح الباری کا چوتھا حصہ پڑھا۔

الغرض شیخ ابوطاہر سلف صالح کے اوصاف سے جیسے تقویٰ و ورع، عبادت و طاعت میں پوری کوشش کرنا، علم میں دلچسپی اور بحث و مذاکرہ میں انصاف کرنا متصف تھے۔ جب ان سے کسی مسئلے میں رجوع کیا جاتا تو جب تک پوری طرح غور و تامل اور کتابوں کا خوب تتبع نہ کر لیتے، جواب نہ دیتے۔ وہ بہت رقیق القلب تھے۔ جب حدیثِ رقاق (رقت) کا خوب تتبع نہ کر لیتے، جواب نہ دیتے۔ وہ بہت رقیق القلب تھے۔ جب حدیث رقاق (رقت پیدا کرنے والی احادیث) پڑھتے تو آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ لباس وغیرہ میں کوئی تکلف نہ تھا۔ اپنے خادموں، شاگردوں اور دوسروں سے بھی بڑی

تواضع سے پیش آتے۔

صحیح بخاری کی قرأت (پڑھائی) کے اثنا میں روایاتِ احادیث اور فقہ میں جو اختلاف پایا جاتا ہے، اس پر بات ہوتی تو شیخ ابو طاہر فرماتے کہ یہ سب اس لئے ہے کہ آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت جامعیت و جمعیت ہے اور آپ کی ذاتِ اقدس میں جامعیت و جمعیت کی افراط و فراوانی کی وجہ سے تمام اضداد کو جمع کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے یہ یا اس طرح کی کوئی بات فرمائی تھی۔ اس نکتے میں بڑی گہرائی ہے۔ اس پر غور و تدبر کرنا چاہیے۔

ایک دن صوفیہ کے احوال پر نیز ان میں سے بعض صوفیہ بعض دوسرے صوفیہ پر جو تنقید کرتے ہیں اور یہ تنقید ان کے تابعین کے اندر بھی سرایت کر جاتی ہے۔ اس پر بات شروع ہوگئی۔ شیخ ابو طاہر نے فرمایا کہ میں صوفیہ کے خلاف کچھ کہنے سے بے حد ڈرتا ہوں۔ اگرچہ میرے اسلاف میں سے بعض نے بعض دوسرے صوفیہ پر تنقیدیں کی ہیں لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے، میں ان سے جن پر میرے اسلاف نے تنقیدیں کی ہیں، دل میں بالکل کوئی غبار نہیں رکھتا۔ اس ضمن میں انہوں نے بتایا کہ شیخ محی الدین ابن عربی نے اس باب میں ایک عجیب و غریب وصیت فرمائی ہے۔ اسی وقت انہوں نے شیخ ابن عربی کی تصنیف ''فتوحاتِ مکیہ'' کا جو خود مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی، ''باب الوصیۃ'' کھولا اور اس میں مندرجہ بحث کو پڑھا۔ اس کا حاصل مطلب یہ ہے:۔ شیخ ابن عربی فرماتے ہیں کہ میں ایک شخص سے اس بنا پر عداوت رکھتا تھا کہ وہ شیخ ابو مدین مغربی کو مطعون کرتا تھا اور میں ان کے بزرگوں کے معاملے میں صاحب بصیرت تھا۔ ایک روز میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ وہ فرما رہے ہیں۔ تم فلاں شخص سے کیوں بغض رکھتے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ وہ ابو مدین سے بغض رکھتا ہے اور میں ان کے معاملے میں بصیرت پر ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کیا وہ شخص اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت نہیں کرتا۔ میں نے عرض کیا کہ کرتا ہے۔ فرمایا کہ پھر کیوں تم ابو مدین کے ساتھ اس کے بغض رکھنے سے، اس سے بغض رکھتے ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس کے محبت کرنے سے، اس سے محبت نہیں کرتے۔ شیخ ابن عربی کہتے ہیں کہ میں اللہ کی جناب میں اس بغض سے تائب ہو گیا۔ پھر اس شخص کے گھر گیا۔ اس سے معذرت چاہی اور اس سے یہ قصہ بیان کیا۔ اسے ایک قیمتی کپڑا بطور ہدیہ دیا اور اس کو راضی کیا۔ پھر میں نے اس سے پوچھا کہ اس کے ابو مدین کو مطعون کرنے کا کیا سبب ہے؟ اس نے جو سبب بتایا وہ ایسا نہ تھا کہ اس کی بنا پر انہیں مطعون کیا جاتا۔ چنانچہ جب میں نے اسے حقیقتِ حال سمجھائی تو اس نے اللہ سے توبہ کی اور ابو مدین کے بارے میں جو وہ کہا کرتا تھا اس سے رجوع کر لیا۔ اس طرح رسول اللہ صلعم کی برکت سب میں جاری و ساری ہوگئی۔ **والحمد للہ**

جس دن وطن واپس آتے وقت یہ فقیر (شاہ ولی اللہ صاحب) الوداع کہنے کے لئے شیخ ابو طاہر کے پاس گیا تو اس نے یہ شعر پڑھا ؎

نسیت کل طریق کنت اعرفہ
الا طریقا یودینی لربعکم

(میں وہ سارے راستے بھول گیا، جنہیں پہلے جانتا تھا۔ سوائے اس میں ایک راستے کے جو تمہارے گھر لے جائے۔)

یہ شعر سنتے ہی شیخ ابو طاہر پر گریہ غالب آ گیا اور بہت متاثر ہوئے۔ ہمارے شیخ ابو طاہر کا انتقال رمضان میں

1145ھ کو ہوا۔

شیخ تاج الدین قلعی حنفی

آپ مفتی مکہ تھے۔ آپ کو بہت سے مشائخ حدیث کی صحبت ملی۔ ان سے آپ نے تحصیل علوم کی اور ان میں سے ہر ایک سے اجازت لی۔ علم حدیث کی بیشتر تحصیل انہوں نے شیخ عبداللہ بن سالم سے کی۔ کہتے تھے کہ یہ ساری کتابیں بحث و تنقیح کے ساتھ میں نے ان سے پڑھیں۔ صحیحین شیخ حسن عجمی سے پڑھی۔ شیخ صالح زنجانی سے فقہ کی تحصیل کی اور شیخ احمد نخلی سے روایت کی اجازت لی۔ شیخ احمد قطان بھی ان کے مشائخ میں سے تھے۔ ان کے ساتھ کئی سال ان کی صحبت رہی اور ان سے انہوں نے طریق درس سیکھا۔ شیخ قطان کے انتقال کے بعد اپنے بہت سے مشائخ کے شدید اصرار پر انہوں نے شیخ قطان کی مسندِ درس پر بخاری کا درس دینا شروع کر دیا۔

کاتبِ حروف (شاہ ولی اللہ صاحب) ان دنوں جب بخاری کا درس ہو رہا تھا، دو تین روز مسلسل شیخ تاج الدین کی مجلس میں حاضر ہوا۔ میں نے ان سے صحاح ستہ کے بعض حصے، موطا امام مالک کے کچھ حصے، مسند دارمی، امام محمد کی ''کتاب الآثار'' اور ان کی موطا سنی۔ انہوں نے تمام اہلِ مجلس کو ان سب کتابوں کی اجازت دی۔ اس جماعت میں فقیر بھی شامل تھا۔

حواشی

(1) سیوا جی کا انتقال 4 اپریل 1680ء کو ہوا، لہٰذا اس سے قبل کا یہ واقعہ ہوگا۔

(2) خلیفہ اول جماعت احمدیہ قادیان حکیم نور الدین (ف 1914ء) نے لکھا ہے: ''اسی راستہ (گنہ چھاؤنی سے بھوپال جاتے ہوئے تھوڑے فاصلہ) میں میں نے حضرت شاہ وجیہہ الدین کے جو شیخ المشائخ شاہ ولی اللہ صاحب کے بڑے تھے، گنج شہیداں کو دیکھنے اور عبرت حاصل کرنے میں بہت فائدہ اٹھایا۔ وہاں شاہ صاحب (وجیہہ الدین) کو ''کنگن ولی'' کہتے ہیں۔'' (مراۃ الیقین فی حیوۃ نور الدین، مرتبہ اکبر شاہ نجیب آبادی۔ صفحہ 80 طبع لاہور، احمدیہ انجمن اشاعتِ اسلام، لاہور)

☆☆☆

عقیدہ

حضرت شاہ ولی اللہ کے رسالے ''حسن العقیدہ'' کا یہ اردو ترجمہ ہے۔ اس رسالے میں حضرت شاہ صاحب نے اپنا عقیدہ بیان فرمایا ہے۔

سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے اور درود سلام پہنچے اس کے رسول ہمارے آقا

محمد خاتم النبیین کو اور آپ ؐ کی آل اور آپ ؐ کے تمام صحابہ کو۔ اس کے بعد خدائے کریم کی رحمت کا یہ محتاج احمد المدعو بہ ولی اللہ بن عبدالرحیم' اللہ تعالیٰ ان دونوں پر احسان کرے، کہتا ہے کہ میں گواہ بناتا ہوں اللہ تعالیٰ کو اور فرشتوں جنوں اور انسانوں میں سے جو بھی حاضر ہیں' ان کو کہ میں خلوص دل سے اس پر اعتقاد رکھتا ہوں۔

اس عالم کا ایک صانع ہے جو قدیم ہے' زندہ ہے۔ وہ ہمیشہ رہے گا۔ اپنے وجود میں واجب ہے اور اس کا عدم ممتنع ہے۔ وہ بڑا برتر' کمال کی تمام صفات ے متصف اور نقص وزوال کی سب علامتوں سے پاک ہے۔ وہ ساری مخلوقات کا خالق' تمام معلومات کا عالم' سب ممکنات پر قدرت رکھنے والا اور تمام کائنات کے لئے ارادہ کرنے والا ہے۔ وہ زندہ ہے' سننے والا ہے اور دیکھنے والا ہے۔ نہ اس کے کوئی مشابہ ہے' نہ کوئی اس کے مقابلے کا۔ نہ کوئی اس کی ضد اور اس جیسا ہے اور نہ کوئی وجود میں واجب ہونے' عبادت کا مستحق ہونے اور خلق اور تدبیر میں اس کا شریک ہے۔

عبادت یعنی آخری حد کی تعظیم کا اس کے سوا اور کوئی مستحق نہیں۔ اس کے سوا نہ کوئی مریض کو شفا دیتا ہے نہ کوئی رزق دیتا ہے اور نہ تکلیف دور کرتا ہے اور یہ اس معنی میں کہ جب وہ کسی چیز کو کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے نہ کہ ظاہری و عادی سبب کے معنی میں جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ طبیب نے مریض کو شفا دی اور امیر نے فوج کو رزق دیا۔ چنانچہ یہ اس سے ایک الگ چیز ہے' اگرچہ دونوں کے الفاظ ایک سے ہیں۔ نہ اس کا کوئی مددگار ہے نہ وہ کسی اور میں حلول کرتا ہے اور نہ وہ کسی اور سے متحد ہوتا ہے۔ اس کی ذات کے ساتھ کوئی حادث یعنی زوال پذیر چیز قائم نہیں اور نہ اس کی صفات میں حدوث وزوال ہے۔ البتہ حدوث وزوال اس تعلق میں ہے۔ جو صفات اور ان سے متعلقات میں ہے جس سے کہ افعال کا ظہور ہوتا ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ تعلق بھی حادث نہیں۔ حادث وہ متعلقات ہیں' چنانچہ متعلقات میں تفاوت سے تعلق کے احکام میں تفاوت رونما ہوتا ہے۔

وہ ہر جہت سے حدوث وتجدد سے پاک ہے۔ نہ وہ جوہر ہے' نہ عرض اور نہ جسم۔ وہ کسی مکان میں نہیں اور نہ کسی جہت میں۔ اس کی طرف اشارہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ یہاں ہے یا وہاں۔ نہ اس کی طرف حرکت' نقل وانتقال' اس کی ذات و صفات میں تغیر وتبدل اور جہل وکذب منسوب کرنا ہے۔ وہ عرش کے اوپر ہے۔[1] جیسا کہ خود اس نے اپنے بارے میں بیان کیا ہے لیکن اس کا عرش کے اوپر ہونا کسی مکان یا کسی جہت میں ہونے کے معنی میں نہیں۔ اس کے عرش کے اوپر ہونے یا عرش پر استویٰ کی حقیقت یا کنہ یا تو خود اللہ تعالیٰ جانتا ہے یا وہ راسخین فی العلم جنہیں اس نے اپنے پاس سے علم عطا کیا ہے۔

قیامت کے دن دو اعتبار سے مومنین اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے۔ ایک یہ کہ وہ ان پر یوں پوری طرح منکشف ہو کہ یہ انکشاف اس کو عقلی طور پر تصدیق کرنے سے زیادہ ہو۔ گویا کہ انہوں نے اسے آنکھ سے دیکھ لیا لیکن اس کا یہ دیکھنا اس طرح نہیں کہ وہ برابر میں ہے یا سامنے ہے یا کسی جہت میں ہے یا اس کا کوئی رنگ یا شکل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس طرح کی رؤیت کے معتزلہ اور دوسرے بھی قائل ہیں اور یہ حق ہے۔ البتہ ان کی غلطی یہ ہے کہ اس اعتبار سے جو رؤیت ہوگی' وہ اس کی تاویل کرتے ہیں یا رؤیت باری تعالیٰ کو وہ صرف اسی معنی میں حصر کر دیتے ہیں۔

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کو مومنین دوسرے اعتبار سے یوں دیکھیں گے کہ وہ ان کے سامنے بہت سی صورتوں میں متمثل ہوگا۔ جیسا کہ سنت میں مذکور ہے۔ پس وہ اسے اپنی آنکھوں سے مختلف شکلوں اور رنگوں میں اور اپنے روبرویوں

دیکھیں گے جس طرح حالتِ خواب میں ہوتا ہے۔ اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے۔ جس میں آپؐ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے رب کو بہترین صورت میں دیکھا۔ غرض مومنین دوسری دنیا میں اللہ کو بالمشافہ دیکھیں گے جبکہ وہ اس دنیا میں اسے خواب میں بھی نہیں دیکھتے۔ اللہ تعالیٰ کی رویت کے یہ دو اعتبارات ہیں جنہیں ہم سمجھتے ہیں اور ان پر اعتقادات رکھتے ہیں اور اگر اللہ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک ان کے سوا کوئی اور رویت ہے تو اس سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی جو مراد ہو، ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اگرچہ ہم اس کی حقیقت سے بعینہ واقف نہیں اور یہ اس لئے کہ اللہ جو چاہتا ہے، ہوتا ہے اور جو وہ نہیں چاہتا، وہ ہرگز نہیں ہوگا۔

جہاں تک کفر اور گناہوں کا تعلق ہے تو وہ اس کی تخلیق ہیں اور اس کے ارادے سے ہیں لیکن وہ ان سے راضی نہیں۔ وہ بے نیاز ہے اور نہ اپنی ذات میں اور نہ اپنی صفات میں کسی چیز کا محتاج ہے۔ اس پر کوئی حاکم نہیں اور نہ کسی غیر کی طرف سے اس پر کوئی چیز واجب ہوتی ہے۔ ہاں وہ ایک چیز کا وعدہ کرتا ہے اور پھر اس وعدے کو پورا کرتا ہے جیسے کہ وارد ہوا ہے اور اللہ جو وعدہ کرتا ہے تو یہ وعدہ اللہ کی طرف سے ضمانت ہو جاتا ہے۔

اللہ کے تمام افعال حکمت اور کلی مصلحت کے مقتضی ہیں لیکن وہ حکمت اور کلی مصلحت جس کا کہ اسے علم ہے۔ اس پر واجب نہیں کہ وہ کسی خاص کے ساتھ لازماً جزوی مہربانی کرے یا کسی خاص کو فائدہ پہنچائے۔ اس سے کوئی برائی صادر نہیں ہوتی اور جو کچھ وہ کرتا یا جو وہ حکم دیتا ہے، وہ ظلم اور جور کی طرف منسوب نہیں ہوتا۔ جو کچھ وہ پیدا کرتا اور جو وہ اوامر دیتا ہے۔ اس میں وہ حکمت کو ملحوظ رکھتا ہے۔ وہ اس لئے نہیں پیدا کرتا اور حکم دیتا کہ وہ کسی چیز کے ذریعہ اپنی ذات اور اپنی صفات کی تکمیل کرے اور یہ کہ اس کی کوئی حاجت اور غرض ہے کیونکہ یہ تو کمزوری اور خرابی کی بات ہوئی۔

اللہ کے سوا اور کوئی فیصلہ کرنے والا اور حکم دینے والا نہیں۔ اشیا کے حسن و قبح کے تعین اور افعال کے موجب ثواب و عذاب ہونے کے بارے میں عقل کے ہاتھ میں فیصلہ نہیں۔ درحقیقت اشیاء کا حسن و قبح اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور حکم اور اس کی طرف سے لوگوں کو ان اشیا کا مکلف بنانے پر ہے۔ پس ان میں سے بعض اشیا ایسی ہوتی ہیں کہ عقل ان کے حسن و قبح کی وجہ اور مصلحت اور ان کی ثواب و عذاب سے مناسبت پا لیتی ہے اور بعض ایسی ہوتی ہیں کہ ان کے حسن و قبح اور موجب ثواب و عذاب کا علم پیغمبروں ہی کے ذریعہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے بارے میں خبر دیتے ہیں۔

اللہ کی صفات میں سے ہر صفت اس کی ذات کے ساتھ ایک ہے اور وہ تعلق اور تجدد کے اعتبار سے بے نہایت ہے اور اس کا یہ تعلق ان معنوں میں ہے جو اوپر گزرے۔(2) اللہ تعالیٰ کے لئے فرشتے ہیں۔ بڑے مرتبے والے اور مقرب اور ایسے فرشتے ہیں جن کے ذمے انسانوں کے اعمال کا لکھنا، کسی بندے کو ہلاکتوں سے بچانا اور بھلائی کی طرف دعوت دینا ہے اور یہ فرشتے بندوں کے ساتھ بھلائی کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا ایک معین درجہ ہے اور اللہ کی طرف سے جو انہیں احکام ملتے ہیں، ان میں وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو انہیں حکم دیا جاتا ہے، اسے بجا لاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے شیاطین بھی ہیں اور ان میں سے ابن آدم کو شر پہنچتا ہے۔

قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اسے بذریعہ وحی اتارا (اور جیسا کہ قرآن مجید میں ہے) وما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیا او من وراء حجاب او یرسل رسولا

فیوحی باذنه مایشاء (کسی آدمی کے لئے ممکن کہ خدا اس سے بات کرے مگر الہام (کے ذریعہ) سے یا پردے پیچھے سے یا اس کی طرف رسول بھیجے جو اللہ کے حکم سے جو وہ چاہے اسے وحی پہنچائے)۔ یہ ہے وحی کی حقیقت۔

اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اس کی صفات میں الحاد و جائز نہیں اور شرع نے اسماء و صفات کی جو حدیں مقرر کی ہیں ان پر رک جانا چاہیے۔ موت کے بعد جسم کے ساتھ لوٹنا (معاد جسمانی) حق ہے۔ قیامت کے دن جسم اکٹھے ہوں گے اور ان میں ارواح لوٹائی جائیں گی اور یہ جسم ویسے ہی ہوں گے جیسے شرعاً و عرفاً تھے۔ اگر چہ یہ لمبے یا چھوٹے ہوں گے جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ کافر کا دانت احد پہاڑ کے برابر ہوگا اور اہل جنت کے بیان میں حدیث میں وارد ہوا ہے کہ ان کے جسم زیادہ لطیف ہوں گے۔ ایسے ہی جیسے ایک بچہ وہی بچہ ہوتا ہے خواہ وہ (آگے چل کر) جوان اور بوڑھا ہو جائے اور اس کے جسم میں ہزار تبدیلیاں ہوں۔

جزا و سزا، حساب، صراط اور میزان سب حق ہیں اور جنت و دوزخ حق ہیں اور وہ دونوں آج بھی مخلوق و موجود ہیں۔ البتہ نص شرعی نے ان کی جگہ کا تعین بالصراحت نہیں کیا۔ بہر حال وہ وہیں ہیں جہاں اللہ تعالیٰ انہیں چاہتا ہے اور ظاہر ہے ہم اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور اس کے جہانوں کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

ایک مسلمان خواہ وہ کبیرہ گناہ کا مرتکب ہو ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہے گا۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ **ان تجتنبوا کبائر ماتنهون عنه نکفر عنکم سیاتکم** (اگر تم کبیرہ گناہ سے بچو گے جن سے تمہیں منع کیا گیا ہے تو ہم تمہاری تقصیریں معاف کر دیں گے) اور یہ تقصیروں کی معافی نماز کے ذریعہ ہوتی ہے۔[3]

کبیرہ گناہوں کا کفارہ یعنی وہ اعمال جن سے یہ معاف ہو جائیں جائز ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے افعال دنیا اور آخرت میں دو طرح پر ہوتے ہیں۔ ایک اللہ کی سنت کے موافق اور دوسرے خرق عادت کے طور پر یعنی عادت و معمول کے خلاف اور جو شخص بلا توبہ کے مر جائے اس کے کبیرہ گناہوں کا خرق عادت کے طور پر معاف ہو جانا جائز ہے۔ اسی طرح جس شخص کے ذمے لوگوں کے حقوق ہوں اور وہ بلا توبہ کے مر جائے تو ان حقوق کا خرق عادت کے طور پر معاف ہونا جائز ہے۔ چنانچہ اس طرح (کبیرہ گناہوں کی معافی کے بارے میں) بہ نظر ظاہر نصوص میں جو تعارض پایا جاتا ہے اس میں باہم مطابقت ہو جاتی ہے۔

شفاعت حق ہے اس شخص کے لئے جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے شفاعت کی اجازت دی جائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی امت کے کبیرہ گناہوں والوں کے لئے شفاعت حق ہے اور آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ جہاں شفاعت کی نفی کا ذکر آیا ہے تو اس سے مراد وہ شفاعت ہے جو اللہ تعالیٰ کی اجازت اور اس کی رضامندی کے بغیر ہو۔

فاسق کے لئے عذابِ قبر اور مومن کے لئے قبر کا آرام حق ہے۔ قبر میں مُردے سے منکر و نکیر کا سوال کرنا حق ہے۔ مخلوق کی طرف رسولوں کا مبعوث ہو جانا حق ہے۔ بندوں کو رسولوں کی زبان سے اوامر و نواہی کا مکلف کیا جانا حق ہے۔ یہ رسول بعض امور میں جو ان کے سوا مجموعی طور سے دوسروں میں نہیں پائے جاتے ممتاز ہوتے ہیں اور یہی اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ انبیاء ہیں۔ ان میں سے ایک ان سے خرقِ عادات واقعات کا رونما ہونا ہے اور ایک ان کی سلامتی فطرت اور اخلاق میں کامل ہونا وغیرہ ہے۔ انبیاء کفر جان بوجھ کر کبیرہ گناہوں کے ارتکاب اور چھوٹے گناہوں پر اصرار

کرنے سے معصوم ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ انہیں تین طریقوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ انہیں فطرت کی سلامتی اور اخلاق میں کمال اعتدال پر پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ وہ گناہوں کی طرف رغبت نہیں کرتے بلکہ وہ ان سے متنفر رہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ انہیں وحی سے بتایا جاتا ہے کہ گناہوں پر عذاب ہوگا اور طاعات کا ثواب ملے گا اور یہ چیز ان کے لئے گناہوں سے روکنے والی ہوتی ہے اور تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کے اور گناہوں کے درمیان بعض لطیف غیبی چیزیں حائل کر دیتا ہے جیسے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا اس طور پر ظاہر ہونا کہ وہ گویا اپنی انگلی کاٹ رہے ہیں۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین تھے۔ آپ ؐ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا اور آپ ؐ کی دعوت تمام انس و جن کے لئے عام ہے۔ آپ ؐ اس اعتبار سے اور اسی طرح کے بعض دوسرے اعتبارات سے تمام انبیا سے افضل ہیں۔ اولیا جو اللہ و راس کی صفات پر ایمان لانے والے اور ان کے عارف ہیں اور اپنے ایمان میں درجۂ احسان پر فائز ہیں، ان کی کرامات حق ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کرامات سے جسے چاہتا ہے، سرفراز فرماتا ہے اور اپنی رحمت سے جسے چاہتا ہے مختص کرتا ہے۔ اس نے عشرہ مبشرہ[4]، فاطمہ، خدیجہ، عائشہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کے بارے میں جنت اور نیکی کی شہادت دی۔ ہم ان کی عزت کرتے ہیں اور اسلام میں ان کا جو اونچا مقام ہے، اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ اسی طرح اہل بدر اور اہل بیعتِ رضوان کا بھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر صدیق ؓ امامِ حق ہیں۔ ان کے بعد عمر ؓ، پھر عثمان ؓ اور ان کے بعد علی ؓ۔ پھر خلافت ختم ہوگئی اور اس کے بعد سخت گیر بادشاہی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل ابوبکر ؓ ہیں۔ ان کے بعد عمر ؓ، پھر عثمان ؓ۔ افضلیت سے ہماری مراد تمام جہت سے افضلیت نہیں کہ اس کے تحت نسب، شجاعت، قوت، علم اور اس جیسی اور چیزیں بھی آجائیں۔ بلکہ یہ افضلیت اسلام میں ان کی زیادہ سے زیادہ نفع رسانی کی بنا پر ہے۔ اس امت کے امیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ؐ کے دو وزیر ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما ہیں، باعتبار اشاعت حق میں اپنی عظیم ہمت کے اور یہ اس لئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دو رُخ تھے۔ آپ ؐ کا ایک رُخ اللہ تعالیٰ کی طرف تھا کہ اس سے اخذ (وحی) کرتے تھے اور آپ کا دوسرا رخ خلق کی طرف تھا کہ اسے عطا کرتے تھے۔ اب حضرت ابوبکر ؓ و حضرت عمر ؓ دونوں کا خلق کو عطا کرنے، لوگوں کو مانوس اور ان کو جمع کرنے اور حرب و ضرب کا انتظام کرنے میں بہت زیادہ ہاتھ تھا۔

ہم صحابہ ؓ کا ذکر خیر سے کرتے ہیں۔ وہ ہمارے امام ہیں اور دین میں ہمارے پیشوا ہیں۔ ان کو برا بھلا کہنا حرام اور ان کی تعظیم کرنا واجب ہے۔ ہم اہل قبلہ میں سے کسی کی تکفیر نہیں کرتے۔ سوائے اس کے کہ اس سے کوئی ایسی بات ہو، جس سے اللہ تعالیٰ صانع و مختار اور قادر کی نفی ہوتی ہو، یا غیر اللہ کی عبادت ہو، یا مرنے کے بعد جی اٹھنے (معاد) اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نیز دین کی اور ضروریات کا انکار ہوتا ہو۔

امر بالمعروف یعنی نیک کاموں کا حکم کرنا اور نہی عن المنکر یعنی برے کاموں سے روکنا واجب ہے۔ اس کی شرط یہ ہے کہ یہ فتنے اور گڑبڑ کا موجب نہ ہو اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے وقت گمان یہ ہو کہ یہ قابل قبول ہوگا۔

پس یہ ہے میرا عقیدہ اور میں اس عقیدے کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو ظاہراً و باطناً مانتا ہوں۔

آخر میں سب تعریف اللہ کے لئے ہے اول میں، آخر میں، ظاہر میں اور باطن میں۔ اے رب! مجھے حشر کے دن ان اطاعت گزاروں کے زمرے میں اٹھائیو جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لائے۔ اللہ تعالیٰ کی دعا اور سلامتی ہو آپؐ پر جو سب مخلوقات سے بہتر ہیں، آپ کی آل پر، آپؐ کے صحابہؓ پر، اور ان سب پر جو ان کی متابعت کریں اور اللہ ہی سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

حواشی

(1) اشارہ ہے قرآن مجید کی اس آیت کی طرف الرحمن علی العرش استوی۔

(2) شروع مضمون میں ہے۔ ''نہ اس کی ذات میں اور نہ اس کی صفات میں حدوث و زوال ہے۔ البتہ حدوث و زوال اس تعلق سے ہے جو صفات اور ان سے متعلقات میں ہے جس سے کہ افعال کا ظہور ہوتا ہے۔''

(3) یہ اشارہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی طرف ارایتم لو ان نهرا باب احدكم يغسل فيه كل يوم خمسا هل يبقى من درند شی قالو الایقبی من درنہ شیئی قال فذلك مثل الصلوة الخمس يمحوا الله بهن الخطایا (ترجمہ) حضرت ابوہریرہؓ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم دیکھو کہ تم میں سے کسی کے دروازے کے قریب سے نہر بہہ رہی ہے اور وہ اس میں روزانہ پانچ بار نہاتا ہے تو کیا اس پر کوئی میل رہ جائے گی۔ صحابہ نے کہا کہ اس پر کوئی میل نہیں رہے گی۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس کی مثال پانچ نمازوں کی ہے جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ خطاؤں کو مٹا دیتا ہے۔

(4) عشرہ مبشرہ مندرجہ ذیل دس صحابہ کرام ہیں: حضرت ابوبکر، عمر، عثمان، علی، طلحہ، زبیر، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، سعید بن زید اور ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہم۔

☆☆☆

سلسلۂ طریقت

تصوف میں ہمارا سلسلۂ صحبت اور طریقت و سلوک کے آداب میں، ہمارے اخذ علم کا واسطہ صحیح، مشہور اور متصل روایت کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ملتا ہے۔ گو تصوف کے ان مخصوص آداب اور اشغال کا تعین آپؐ سے ثابت نہیں۔ اس بندۂ ضعیف ولی اللہ نے خدا اسے مغفرت کرے اور اسے اپنے پیش رو صالحین سے ملائے۔ اپنے والد شیخ اجل عبدالرحیم کی صحبت سے اللہ ان سے راضی ہو اور ان کو راضی رکھے، ایک طویل مدت تک فیض حاصل کیا۔ ان سے میں نے ظاہری علوم پڑھے اور طریقت کے آداب سیکھے۔ اس بندۂ ضعیف نے ان کی کرامات دیکھیں۔ ان سے مشکلات کے حل پوچھے اور طریقت و حقیقت اور واقعات و احوال و کرامات کی قبیل میں سے جو کچھ ان پر اور ان کے مشائخ پر گزرا تھا،

ان امور کے بارے میں ان سے بہت کچھ سنا۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ موصوف کو میری طرف سے اور جو دوسرے استفادہ کرنے والے ہیں، ان کی طرف سے جزائے خیر دے۔

بندۂ ضعیف نے اپنے والد شیخ عبدالرحیم کی صحبت پائی اور والد بزرگوار بہت سے مشائخ کی صحبت سے مستفید ہوئے جن میں سے یہ تین بڑے جلیل القدر ہیں۔ اول خواجہ خرد جو شیخ احمد سرہندی، شیخ اللہ داد اور خواجہ حسام الدین کے صحبت یافتہ تھے اور یہ تینوں خواجہ خرد کے والد خواجہ باقی باللہ کے صحبت یافتہ تھے۔ شیخ عبدالرحیم کے مشائخ میں سے دوسرے بزرگ شیخ عبداللہ ہیں جو شیخ آدم بنوری کے صحبت یافتہ ہیں۔ انہیں شیخ احمد سرہندی کی صحبت ملی تھی اور شیخ احمد سرہندی خواجہ محمد باقی باللہ کے صحبت یافتہ تھے۔ شیخ عبدالرحیم کے تیسرے شیخ خلیفہ ابوالقاسم ہیں جنہوں نے ملا ولی محمد کی صحبت پائی اور وہ امیر ابوالعلا کی صحبت میں بیٹھے تھے۔

خواجہ محمد باقی باللہ نے خواجہ محمد امکنگی کی صحبت پائی۔ وہ مولانا محمد درویش سے فیضیاب ہوئے۔ مولانا محمد درویش، مولانا محمد زاہد کی صحبت میں بیٹھے اور مولانا محمد زاہد نے خواجہ عبیداللہ احرار کی صحبت پائی۔

اسی طرح امیر ابوالعلا امیر عبداللہ کی صحبت میں بیٹھے۔ انہوں نے امیر یحییٰ سے فیض پایا۔ امیر یحییٰ نے خواجہ عبدالحق سے فیض حاصل کیا اور وہ خواجہ عبیداللہ احرار کے صحبت یافتہ تھے۔

خواجہ عبیداللہ احرار نے کئی بزرگوں کی صحبت پائی جن میں سے مشہور مولانا یعقوب چرخی اور خواجہ علاؤالدین غجدوانی ہیں۔ یہ دونوں کے دونوں خواجہ نقشبند سے بلاواسطہ مستفید ہوئے۔ اس کے علاوہ مولانا یعقوب چرخی نے خواجہ علاؤالدین عطار کی بھی صحبت پائی۔ اسی طرح خواجہ علاؤالدین غجدوانی محمد پارسا کی صحبت میں بیٹھے اور خواجہ علاؤالدین عطار اور خواجہ محمد پارسا دونوں خواجہ نقشبند کے جلیل القدر اصحاب میں سے تھے۔

خواجہ نقشبند نے بہت سے بزرگوں سے صحبت پائی جن میں سے سب سے زیادہ جلیل القدر خواجہ محمد سماسی اور ان کے خلیفہ امیر سید کلاں ہیں۔ خواجہ محمد سماسی نے خواجہ علی رامتینی سے فیض پایا۔ انہوں نے خواجہ محمود ابوالخیر فغنوی سے۔ انہوں نے خواجہ عارف ریوکری سے۔ وہ خواجہ عبدالخالق غجدوانی کی صحبت میں بیٹھے۔ انہوں نے خواجہ یوسف ہمدانی سے فیض پایا اور وہ فارمدی کے صحبت یافتہ تھے۔

علی فارمدی کے بہت سے مشائخ تھے جن میں سے یہ دو سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ ایک امام ابوالقاسم قشیری جو ابوعلی دقاق کے صحبت یافتہ تھے۔ وہ ابوالقاسم نصر آبادی کے اور ابوالقاسم نصر آبادی ابوالحسنین حضرمی کے صحبت یافتہ تھے۔ ان دونوں نے شبلی کی صحبت پائی اور وہ سید طریقت جنید بغدادی کی صحبت میں بیٹھے۔

علی فارمدی کے دوسرے شیخ خواجہ ابوالقاسم گرگانی ہیں جو ابوعثمان مغربی کی صحبت میں بیٹھے۔ وہ ابوعلی کاتب کے فیض یافتہ تھے اور وہ ابوعلی رودباری کے اور ابوعلی رودباری جنید بغدادی کے۔

سید الطریقت جنید بغدادی نے اپنے ماموں سری سقطی کی صحبت پائی۔ انہوں نے معروف کرخی کی اور معروف کرخی بہت سے مشائخ سے فیض یاب ہوئے جن میں سب سے مشہور ایک تو امام علی بن موسیٰ رضا ہیں جو اپنے والد امام موسیٰ کاظم کے صحبت یافتہ تھے۔ وہ اپنے والد امام جعفر صادق کے۔ وہ اپنے والد محمد باقر کے۔ وہ اپنے والد امام زین العابدین

کے۔وہ اپنے والد امام حسین کے۔وہ اپنے والد امیر المومنین علی بن ابی طالب کے اور آپ نے سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پائی۔

معروف کرخی کے دوسرے مشہور شیخ داؤد طائی ہیں جو فضیل اور حبیب عجمی اور ذوالنون کے صحبت یافتہ تھے۔ان تینوں نے تابعین اور تبع تابعین میں سے بہت سے مشائخ کی صحبت پائی جن میں سے سب سے بڑھ کر جلیل القدر حسن بصری ہیں۔یہ تابعین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی صحبت میں بیٹھے۔ان صحابہ میں سے ایک حضرت انسؓ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم اور آپ کی سنت کے حافظ تھے۔الغرض یہ ہے ہمارے طریقے کا سلسلۂ صحبت جس کی نہ تو صحت میں اور نہ شروع سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک اس کے متصل ہونے میں شک کیا جاسکتا ہے۔اس سلسلے میں امام جعفر صادق کو اپنے نانا قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیق سے بھی انتساب حاصل ہے۔قاسم نے سلمان فارسی سے فیض پایا۔انہوں نے ابوبکر صدیق سے اور ابوبکر صدیق نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔

یہ اوپر تو ہمارے طریقے کے ایک سلسلہ صحبت کا بیان ہوا۔اس کے علاوہ ہمارے اور بھی سلسلے ہیں جن میں سے کسی میں کہیں کہیں تو صحبت کا اتصال ہے اور کہیں بیعت اور خرقہ کا۔چنانچہ بندۂ ضعیف نے اپنے والد شیخ عبدالرحیم سے طریقہ لیا۔انہوں نے شیخ عبداللہ سے۔انہوں نے شیخ احمد سرہندی سے۔انہوں نے اپنے والد شیخ عبدالواحد سے اور انہوں نے شاہ کمال سے۔

شیخ احمد سرہندی کو شیخ سکندر سے بھی طریقہ ملا۔ان کو اپنے دادا شاہ کمال سے جن کا ابھی ذکر ہوا۔ان کو سید فضیل سے۔ان کو سید گدا رحمٰن سے۔ان کو سید شمس الدین عارف سے۔ان کو سید گدا رحمٰن بن ابی الحسن سے۔ان کو شمس الدین صحرائی سے۔ان کو سید عقیل سے۔ان کو سید بہاؤ الدین سے۔ان کو سید عبدالوہاب سے۔ان کو سید شرف الدین قتال سے، ان کو سید عبدالرزاق سے۔ان کو اپنے والد امام طریقہ قادریہ محمد عبدالقادر جیلانی سے۔ان کو ابوسعید مخرمی سے۔ان کو ابوالحسن قرشی سے۔ان کو ابوالفرج طرطوسی سے۔ان کو ابوالفضل عبدالواحد تمیمی سے۔ان کو ابوبکر شبلی سے اور ابوبکر شبلی کو اس سلسلے کے ذریعہ جو اوپر بیان ہوا' جنید بغدادی سے۔اسی طرح ان کو سلسلہ بہ سلسلہ آخر تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ طریقہ ملا۔

اس کے علاوہ شیخ عبدالرحیم نے اپنے نانا شیخ رفیع الدین محمد کی روح سے بھی فیض پایا اور وہ اس طرح کہ آپ کی پیدائش سے ایک عرصہ پہلے شیخ رفیع الدین نے آپ کو مسندِ طریق بطور خرق عادت عطا فرمائی۔شیخ رفیع الدین نے اپنے والد شیخ نجم الحق جائیلدہ سے اور انہوں نے شیخ عبدالعزیز سے یہ فیض پایا۔

مزید برآں شیخ عبدالرحیم کے اور بھی سلسلے ہیں۔آپ کو سید عظمت اللہ اکبر آبادی نے سندِ طریقت مرحمت فرمائی۔ان کو اپنے باپ دادوں سے فیض ملا۔ان کو شیخ عبدالعزیز سے۔ان کو قاضی خاں یوسف ناصحی سے۔ان کو حسن بن طاہر سے۔ان کو سید راجی حامد شاہ سے۔ان کو شیخ حسام الدین مانک پوری سے۔ان کو خواجہ نور قطب عالم سے۔ان کو اپنے والد علاء الحق بن اسعد لاہوری ثم بنگالی سے۔ان کو اخی سراج عثمان اودھی سے۔ان کو شیخ نظام الدین اولیاء سے۔ان کو شیخ فرید الدین گنج شکر سے۔ان کو خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے۔ان کو خواجہ معین الدین سنجری سے۔ان کو خواجہ عثمان

ہارونی سے۔ان کو حاجی شریف زندنی سے۔ان کو خواجہ مودود چشتی سے۔ان کو اپنے والد خواجہ ابو احمد چشتی سے۔ان کو اپنے والد خواجہ ابو اسحاق شامی سے۔ان کو ممشاد علو دینوری سے۔ان کو ابو ہبیرہ بصری سے۔ان کو حذیفہ مرعشی سے۔ان کو ابراہیم بن ادہم سے۔ان کو فضیل بن عیاض سے۔ان کو عبدالواحد بن زید سے۔ان کو حسن بصری سے یہ فیض ملا۔ان کو علی رضی اللہ عنہ سے اور ان کو سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم سے۔

والد بزرگوار نے بطریقہ باطن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی فیض حاصل کیا اور وہ اس طرح کہ والد بزرگوار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موصوف کو نفی و اثبات کے ذکر کی تلقین فرمائی۔نیز والد بزرگوار نے حضرت زکریا علیہ الصلوٰۃ والسلام سے فیض پایا اور آپؑ نے والد کو اسم ذات کی تعلیم دی۔اس کے علاوہ والد بزرگوار نے شیخ ابو محمد عبدالقادر جیلانی' خواجہ بہاء الدین محمد نقشبند اور خواجہ معین الدین ابن حسن چشتی کی ارواح سے بھی کسب فیض کیا۔والد نے ان آئمہ کو خواب میں دیکھا اور ان سے طریقت کی اجازت حاصل کی۔نیز آپ نے ان میں سے ہر ایک کی طریقت میں جو "نسبت" ہے' اس کو علیحدہ علیحدہ جانا اور ان آئمہ کی "نسبتوں" سے آپ کے قلب پر فیضان بھی ہوا۔چنانچہ والد بزرگوار ہم سے ان چیزوں کے بارے میں گفتگو فرمایا کرتے تھے۔

باقی رہا علوم ظاہری کی تحصیل کا معاملہ۔سو میں نے تفسیر' حدیث' فقہ' عقائد' نحو' صرف' کلام' اصول اور منطق وغیرہ علوم کو اپنے والد سے پڑھا۔انہوں نے ان علوم کی چھوٹی کتابیں تو اپنے بھائی ابو الرضا محمد سے پڑھیں اور بڑی کتابیں مرزا زاہد ہروی سے جو مشہور حواشی کے مصنف ہیں۔مرزا زاہد ہروی نے مرزا فاضل سے۔انہوں نے ملا یوسف کوسج سے' انہوں نے مرزا جان وغیرہ سے۔انہوں نے مشہور محقق جلال الدین دوانی سے' انہوں نے اپنے والد اسعد وغیرہ سے اور انہوں نے علامہ تفتازانی اور علامہ شریف جرجانی کے شاگردوں سے۔

حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح' صحیح بخاری اور صحاح ستہ کی دوسری کتابوں کی اجازت ثقہ اور مستند عالم حاجی محمد افضل نے مجھے عطا فرمائی۔انہوں نے شیخ عبدالواحد سے یہ اجازت لی تھی۔انہوں نے اپنے والد شیخ محمد سعید سے اور انہوں نے اپنے دادا شیخ طریقہ مجددیہ شیخ احمد سرہندی سے یہ اجازت لی تھی۔اس سلسلے کی ایک طویل سند ہے جو اپنی جگہ مذکور ہے۔
(القول الجمیل)

وصیت نامہ

"تفہیمات الالہیہ" جزو ثانی میں شاہ ولی اللہ صاحب کا ایک وصیت نامہ درج ہے۔یہاں اس کا اردو ترجمہ دیا جا رہا ہے:(مرتب)

سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو حکمتوں کا الہام کرنے والا اور نعمتوں کا عطا کرنے والا ہے اور صلوٰۃ و سلام ہو عرب و عجم کے سردار اور آپ کی آل اور اہلِ فضل و کرم اصحاب پر۔اس کے بعد فقیر ولی اللہ عفی عنہ کہتا ہے۔یہ چند کلمات ہیں جن کی میں اپنی اولاد و احباب کو وصیت کرتا ہوں۔میں نے ان کا نام "المقالۃ الوضیۃ فی النصیحۃ والوصیۃ"

رکھا ہے۔ ہمارے لئے اللہ کافی ہے۔ وہی سب سے اچھا کارساز ہے اور وہی راہِ راست کی ہدایت دیتا ہے۔

1- اس فقیر کی پہلی وصیت یہ ہے کہ اعتقاد اور عمل دونوں میں کتاب و سنت کو مضبوط پکڑیں اور ہر دو کے اہتمام و تدبیر میں برابر مشغول رہیں۔ روزانہ ان دونوں میں سے کچھ نہ کچھ پڑھا جائے اور اگر اس کے پڑھنے کی استطاعت نہ ہو تو ان کے ایک صفحے کا ترجمہ سنا جائے۔ عقائد میں قدمائے اہل سنت کا مذہب اختیار کریں۔ اس سلسلے میں جن چیزوں کی تفصیل و تفتیش سلف نے نہیں کی، وہ بھی اس کی تفتیش نہ کریں۔ خام و ناپختہ عقل پرستوں سے اعراض کریں اور ان کی تشکیک پیدا کرنے والی باتوں کی طرف ملتفت نہ ہوں۔ فروعی مسائل میں علمائے کبارِ محدثین کی جو کہ فقر و حدیث دونوں کے جامع ہیں، پیروی کریں اور فقہ کی جزئیات و تفریعات کو ہمیشہ کتاب و سنت کے روبرو پیش کریں۔ جو ان کے موافق ہو اسے قبول کریں اور جو نہ ہو اسے مسترد کر دیں۔ امت کے لئے کوئی بھی ایسا زمانہ نہیں جس میں وہ اجتہادی مسائل کو کتاب و سنت پر پیش کرنے سے مستغنی ہو سکے۔ وہ خشک مزاج (متقشفہ) فقہا کی بات جنہوں نے کہ ایک مخصوص عالم کی تقلید اختیار کر کے سنت کا تتبع ترک کر دیا ہو نہ سنیں اور نہ ان کی طرف التفات کریں اور ان سے دور رہ کر خدا تعالیٰ کا قرب چاہیں۔

2- دوسری وصیت یہ ہے کہ امر بالمعروف کی حدود کے متعلق اس فقیر کے دل میں یہ خیال ڈالا گیا ہے کہ فرائض، کبیرہ گناہوں اور شعائرِ اسلام کے بارے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں سختی کرنی چاہیے۔ جو شخص اس معاملے میں تساہل برتتا ہے، اس کی مجلس میں نہ بیٹھنا چاہیے اور اس کا دشمن بننا چاہیے۔ اس کے علاوہ دوسرے امور میں خاص کر وہ امور جن میں سلف اور ان کے بعد آنے والوں میں اختلاف رہا ہے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی حد یہاں تک ہے کہ اس بارے جو حدیث ہے، وہ بتا دی جائے اور اس میں سختی کرنا پسندیدہ نہیں۔

3- تیسری وصیت یہ ہے کہ اس زمانے کے پیروں اور مشائخ کے ہاتھ میں ہرگز اپنا ہاتھ نہ دیں اور نہ ان کی بیعت کریں۔ ان سے عوام کو جو حد سے زیادہ عقیدت ہوتی ہے، نہ اس سے اور نہ ان سے جو کرامات منسوب کی جاتی ہیں، نہ ان سے دھوکا کھانا چاہیے۔ اس لئے کہ عوام کی یہ حد سے زیادہ عقیدت اکثر عام رسم و رواج کے تحت ہوتی ہے اور رسمی اور رواجی امور کا حقیقت میں کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ اس زمانے کے تمام کرامات فروشوں نے سوائے چند مستثنیات کے طلسمات اور نیرنجات کو ہی کرامات سمجھ رکھا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سب سے مشہور خارقِ عادت امر یعنی کرامت دوسروں کے دلوں کے خیالات پر مطلع ہونا (اشراف) اور آنے والے واقعات کا جاننا (انکشاف) ہے اور اس اشراف اور انکشاف کے بہت سے طریقے ہیں۔ ان میں سے ایک علومِ نجوم و رمل کا باب ضمیر ہے۔ تم اس گمان میں نہ رہنا کہ علم نجوم کے فیصلوں کا انحصار خانے بنانے پر ہوتا ہے۔ رمل کے لئے زائچہ ضروری ہے۔ ہم نے تجربہ کر کے دیکھا ہے کہ فنِ نجوم کے ماہر نے جب یہ جان لیا کہ اس وقت دن کی گھڑیوں میں سے کونسی گھڑی ہے تو اس سے اس کا ذہن طالع کی طرف منتقل ہو گیا اور تمام خانے، کواکب کے محل و مواقع اور ان کے احکام اس کے دماغ میں اس طرح صورت پذیر ہو گئے گویا خانوں کا صفحہ اس کے روبرو پڑا ہے۔ ایسے ہی جب فن رمل کا ماہر اپنے دل میں یہ معین کرتا ہے کہ میں نے فلاں انگلی کو لحیان قرار دیا ہے اور فلاں انگلی کی فلاں شکل مقرر کی ہے اور وہ اپنے ذہن میں نقشہ بناتا ہے کہ ان شکلوں سے کیا کیا شکلیں پیدا ہوں گی یہاں تک کہ اس کے سامنے پورا زائچہ آ جاتا ہے۔ انہی فنون میں سے ایک فن اپنی مختلف انواع کے ساتھ کہانت ہے۔ یہ فن بڑا وسیع

ہے۔اس میں کبھی جن حاضر کیے جاتے ہیں اور کبھی بغیران کے عمل کیا جاتا ہے۔انہی فنون میں سے ایک فن طلسم ہے کہ کواکب کی قوتوں کوایک صورت میں مرکوز کرتے ہیں اوراس سے دوسروں کے دلوں کے خیالات معلوم کیے جاتے ہیں۔ اس طرح جوگ کے اعمال ہیں کہ ان میں سے بعض میں دوسروں کے دلوں کے حالات معلوم کرنے اور آنے والے واقعات کو جاننے کی خصوصیت ہوتی ہے جسے اس امر کی مزید تحقیق مطلوب ہو' وہ ان فنون کی کتابوں کی طرف رجوع کرے۔

کسی کام پر ہمت مرکوز کردینا، ہیبت ناک شکل میں ظاہر ہونا' دل کودوسرے کے دل سے باندھ دینااور طالب کی تسخیر کرنا۔یہ سب نیرنجات کےفنون میں سے ہیں۔نیرنجات والےان میں سے بعض پرعمل کرتے ہیں اوراس سے مراد برآجاتی ہے۔ان معاملات میں کسی کی نیکی و بدی' سعادت و بدبختی اوراس کے مقبول یا مردود ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔اسی طرح مجلس میں حاضرلوگوں میں وجدوشوق اورقلق واضطراب کی کیفیت کے جاری وساری ہونے کا باعث بہیمیہ کی حدت وتیزی ہوتی ہے' لہٰذا جس شخص کی قوت بہیمیہ قوی تر ہوگی' اس میں وجدوشوق زیادہ ہوگا۔بے شک بعض صالحین بھی ان اعمال واحوال کونیک نیتی سے بجالاتے ہیں لیکن وہ ان چیزوں کوکرامات میں سے نہیں سمجھتے اور یہ بات کسی پر پوشیدہ نہیں۔میں نے اکثر سادہ لوح افرادکودیکھا ہے جب وہ ان اعمال کوکسی شیخ یا پیر سے ظاہر ہوتے دیکھتے ہیں تو وہ انہیں حقیقی کرامات سمجھ لیتے ہیں۔

اس کا چارۂ کار یہ ہے کہ آدمی کتب حدیث جیسے صحیح بخاری' مسلم' سنن ابوداؤد اور ترمذی اور کتب فقہ حنفیہ و شافعیہ پڑھے اورظاہر سنت پرعمل کرے۔اگراللہ سبحانہ وتعالیٰ اس کے دل میں شوقِ صادق کافیضان فرمائے اورشوق صادق کی راہ کی طالب غالب ہوتو وہ کتاب ''عوارف المعارف'' سے نماز' روزہ' ذکرواذکاراوراوقات کومصروف رکھنے کے آداب اوررسائل نقشبندیہ سے یادداشت کے حصول کے طریقہ کوحاصل کرے۔ان بزرگوں نے ان دونوں امور پراتنا اچھا لکھا ہے کہ اس کے بعد مرشد کی تلقین کی احتیاج نہیں رہتی۔جب نورِعبادت کی کیفیت اورنسبتِ یادداشت حاصل ہوجائے تو وہ اس پر مداومت کرے۔اگراس دوران میں اسے کوئی بزرگ مل جائے جس کی صحبت جذب پیدا کرنے والی ہواوراس کی تاثیرلوگوں کے اندرسماجاتی ہوتو وہ اس بزرگ کی صحبت اس وقت تک لازم پکڑے جب تک اس کی نورِعبادت کی مطلوبہ کیفیت اورنسبتِ یادداشت ایک مستقل ملکہ کی حیثیت اختیار نہ کرلے۔اس کے بعدوہ الگ تھلگ ہوکر گوشے میں بیٹھ جائے اوراپنے اس مستقل ملکہ سے برابرلولگائے رکھے۔اس زمانے میں کوئی بھی ایسانہیں' سوائے بعض مستثنیات کے جو ہرحیثیت میں کمال رکھتا ہو۔اگروہ ایک حیثیت میں کمال رکھتا ہے تو دوسری حیثیت میں کمال سے خالی ہوگا۔اس لئے اسے چاہیے کہ جوکمال وہ رکھتا ہے' اسی میں استحکام پیدا کرے اوردوسری چیزوں کونظرانداز کردے۔اس معاملے میں وہ ''خذما صفا ودع ماکدر'' (جواچھا ہے' وہ لے لو' جوخراب ہے اسے چھوڑ دو) پرعمل کرے۔صوفیہ کی نسبتیں بہت بڑی نعمت ہیں۔باقی رہیں ان کی رسوم' ان کی کوئی قیمت نہیں۔بے شک میری یہ بات بہت سوں کوگراں گزرے گی لیکن میرے ذمے ایک کام کیا گیا ہے' اسی کے مطابق مجھے کہنا ہے اورزید وعمر کے کہے سے سروکار نہیں۔

4۔ چوتھی وصیت یہ ہے کہ ہمارے اوراس زمانے کےلوگوں کے درمیان اختلاف ہے۔صوفی منش لوگ کہتے

ہیں کہ اصل مقصود فنا و بقا، استہلاک (اپنے آپ کو ذاتِ مطلق میں گم کر دینا) اور انسلاخ (تجرد کامل) ہے۔ باقی جہاں تک معاشی معاملات اور بدنی طاعات کا ادا کرنا ہے جن کے بارے میں کہ شرعی احکام وارد ہوئے ہیں، تو یہ ان کے لئے ہے جو اس اصل مقصود کو بجا نہیں لا سکتے۔ جیسا کہ مثل ہے وما لایدرك كلد لایترك كله (جس کا پورے کا پورا ادراک نہ ہو سکے، اسے پورے کا پورا چھوڑنا نہیں چاہیے۔) متکلمین کہتے ہیں کہ ان امور کے ضمن میں جو کچھ شرع میں وارد ہوا ہے، اس کے علاوہ اور کچھ مطلوب نہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ انسان کی صورتِ نوعیہ کے اعتبار سے تو سوائے شرع کے اور کچھ مطلوب نہیں اور مذکورہ بالا اصل مقصود یعنی فنا و بقا اور استہلاک و انسلاخ کا ذکر شارع نے صرف خواص کے لئے کیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نوعِ انسانی کی تخلیق ایک لحاظ سے اس طرح ہوئی ہے کہ وہ جامع ہے قوتِ ملکیہ اور قوتِ بہیمیہ کی۔ چنانچہ اس لحاظ سے اس کی سعادت و خوش بختی قوتِ ملکیہ کی تقویت اور اس کی شقاوت قوتِ بہیمیہ کی تقویت میں ہے۔

غرض نوعِ انسانی کی تخلیق ایک لحاظ سے تو اس طرح ہوئی ہے لیکن ایک لحاظ سے اس طرح بھی ہوئی ہے کہ نفس اعمال و اخلاق کے مختلف رنگ قبول کرتا ہے اور یہ رنگ نفس کی جڑوں میں جذب ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جب انسان مرتا ہے تو یہ رنگ وہ اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ انسان کا بدن غذا سے پیدا ہونے والی کیفیات کو اخذ کرتا ہے جو اس کے ساتھ مل جاتی ہیں اور انہیں وہ ساتھ لے لیتا ہے۔ چنانچہ انہی کیفیات کے نتیجے میں وہ بدہضمی، بخار اور دوسری بیماریوں میں مبتلا ہوتا ہے۔

نوعِ انسانی کی تخلیق ایک لحاظ سے اس طرح بھی ہوئی ہے کہ انسان حظیرۃ القدس سے ملحق ہو کر وہاں سے الہام حاصل کر سکتا ہے۔ اگر (حظیرۃ القدس کے) فرشتوں سے اچھی مناسبت ہے تو الہام کے ذیل میں اسے مسرت و بہجت حاصل ہوتی ہے اور اگر ان سے منافرت ہے تو تنگی اور وحشت کا القا ہو گا۔

غرض انسانوں کی نوع کی اس طرح تخلیق ہوئی ہے کہ اگر انہیں خود ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو اکثر انسانوں کو امراضِ نفسانی دکھ دیں۔ اس کے پیشِ نظر حق سبحانہ و تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے کارسازی فرمائی۔ انسانوں کے لئے راہِ نجات متعین کی اور خود انہی میں سے ان کے لئے ترجمانِ لسانِ غیب، کہ جس سے مراد حضرت پیغمبرؐ ہیں، مبعوث فرمایا تاکہ اتمامِ نعمت ہو اور ربوبیت جس کا مقتضائے اول انسانوں کو عدم سے وجود میں لانا تھا، دوسری بار ان کی دستگیری کرے۔ پس انسانوں کی صورتِ نوعیہ نے زبانِ حال سے مبدائے فیض سے شرع کی درخواست کی۔ اس طرح جو شرع نازل ہوئی تو اس کا حکم نوعِ انسانی کے تمام افراد کے لئے لازمی و ضروری ہوا کیونکہ انسان کی جو صورتِ نوعیہ ہے، اس کا حکم تمام انسانوں میں جاری و ساری ہے اور اس میں افراد کی خصوصیت کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اب جہاں تک فنا و بقا و استہلاک اور اس قبیل کے دوسرے مقامات کا تعلق ہے تو ان کا مقصود و مطلوب ہونا افراد کی خصوصیت کی بنا پر ہے۔ اس لئے کہ بعض افراد کی تخلیق انتہائی بلندی و تجرد پر ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ ان کو مذکورہ بالا راہ کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ یہ چیز نوامیس فطرت میں سے نہیں بلکہ ہوتا یہ ہے کہ ایک فرد اپنی اس خصوصیتِ فردیہ کی حیثیت سے جو اسے حاصل ہوتی ہے، اپنی زبانِ حال سے مقاماتِ فنا و بقا وغیرہ کا تقاضا کرتا ہے۔ شارع کا کلام ان معانی پر ہرگز محمول نہیں ہے، نہ صراحتاً نہ اشارتاً۔

ہاں ایک جماعت نے ان مطالب کو کلام شارع سے سمجھا۔ جیسے کوئی لیلیٰ مجنوں کا قصہ سنے اور اس کی ہر بات کو خود اپنی سرگزشت پر محمول کرے۔ اسے انہوں نے اپنی اصطلاح میں ''اعتبار'' کا نام دیا ہے۔

مختصراً مقامات انسلاخ و استہلاک میں حد سے زیادہ تجاوز کرنا اور ہر کس و ناکس کا اس میں مشغول ہونا ملتِ مصطفویہ میں ایک سخت بیماری ہے۔ خدا اس پر رحمت کرے جو اس بیماری کو فرو کرنے کی کوشش کرے۔ خواہ وہ خود ان مقامات کی تحصیل کے لئے بعض فطری استعداد یں رکھتا ہو۔ ہر چند یہ بات اس زمانے کے بہت سے صوفیہ پر دشوار گزرے گی لیکن میرے ذمے جو کام کیا گیا ہے' میں اس کے مطابق اپنی بات کہوں گا۔ مجھے زید و عمر سے کوئی سروکار نہیں۔

5- پانچویں وصیت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے حق میں نیک اعتقاد رکھنا چاہیے اور زبان پر ان کے مناقب کے سوا اور کوئی ذکر نہیں آنا چاہیے۔ اس مسئلے میں دو گروہوں نے غلطی کی ہے۔ ایک گروہ یہ گمان کرتا ہے کہ صحابہ کے سینے آپس میں صاف تھے اور ان کے درمیان جھگڑے نہیں ہوئے۔ یہ سرتاپا وہم ہے کیونکہ مشہور روایات ان کے باہمی جھگڑوں کی شہادت دیتی ہیں اور ان روایات کا انکار نہیں ہو سکتا۔ دوسرے گروہ نے جب دیکھا کہ یہ سب چیزیں صحابہ سے منسوب ہیں تو ان کے خلاف انہوں نے اپنی زبانِ طعن و لعن کھولی اور اس طرح وہ ہلاکت کی وادی میں جا گرے۔

مجھ فقیر کے دل میں یہ بات ڈالی گئی ہے کہ اگرچہ آپؐ کے صحابہ معصوم نہیں تھے اور ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض عوام صحابہ سے ایسی چیزیں صادر ہوئی ہوں کہ اگر ویسی چیزیں دوسروں سے صادر ہوتیں تو وہ لعن و طعن اور جرح و تنقید کے مستوجب بنتے لیکن ہمیں ان کی لغزشوں کے بارے میں زبان روکنے کا حکم دیا گیا ہے اور ان کی جرح و طعن سے عبادت کے طور پر منع کیا گیا ہے۔ اس میں ایک مصلحت ہے اور وہ مصلحت یہ ہے کہ اگر صحابہ کی جرح و طعن کا دروازہ کھول دیا گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا اور یہ سلسلۂ روایت کے منقطع ہو جانے سے ملت کا شیرازہ درہم برہم ہو جائے گا۔ چونکہ ہر صحابی سے روایت لی گئی ہے اور اسی بنا پر بہت سی احادیث کے ایک سے زیادہ کئی کئی راوی ہیں اور اس طرح امت کو جن احکام کا مکلف بنایا گیا ہے' ان کی تائید میں حجت قائم ہوئی ہے۔ اب اگر اس ضمن میں بعض صحابہ پر جرح بھی ہو گی تو اس سے نقل روایت میں خلل واقع نہ ہو گا۔

اس فقیر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پُر فتوح سے سوال کیا کہ آپؐ شیعہ کے بارے میں جو اہل بیت کی محبت کے مدعی اور صحابہ کو برا کہتے ہیں' کیا فرماتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے از نوعِ کلام روحانی یہ القا فرمایا کہ ان کا مذہب باطل ہے اور ان کے مذہب کا باطل ہونا لفظ امام سے واضح ہوتا ہے۔ جب مجھے اس کیفیت سے افاقہ ہوا تو میں نے لفظ امام میں غور و تامل کیا۔ معلوم ہوا کہ ان کی اصطلاح میں امام معصوم ہوتا ہے۔ اس کی اطاعت فرض ہے اور خلق کے لئے اس کا تعین ہوتا ہے۔ وہ امام کے حق میں وحیِ باطنی بھی تجویز کرتے ہیں۔ چنانچہ اس طرح وہ درحقیقت ختمِ نبوت کا انکار کرتے ہیں۔ گو زبان سے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء ہی کہتے ہیں۔ مزید برآں جیسے آپؐ کے صحابہ کے حق میں اچھا اعتقاد رکھنا چاہیے۔ اسی طرح آپؐ کے اہل بیت کا عقیدت مند ہونا چاہیے اور ان میں سے جو صالح تھے' ان کی اور زیادہ تعظیم کرنی چاہیے۔ بے شک اللہ نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔

اس فقیر کو معلوم ہوا ہے کہ بارہ امام رضی اللہ عنہم نسبتوں میں سے ایک نسبت کے قطب تھے اور تصوف کا رواج ان کے زمانے میں ختم ہونے پر شروع ہوا۔ جہاں تک عقیدہ وشرع کا تعلق ہے تو وہ حدیثِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کسی چیز سے نہیں لیا جا سکتا۔ ان آئمہ کی قطبیت ایک باطنی امر ہے۔ تکلیفِ شرعی سے اس کا کوئی تعلق نہیں (یعنی قطبیت کسی کو کسی شرعی حکم کا مکلف نہیں کر سکتی) ان میں سے ہر ایک کا اپنے بعد والوں کے لئے جو نص واشارہ تھا' وہ اسی قطبیت کی وجہ سے تھا اور جن امورِ امامت کے بارے میں انہوں نے گفتگو کی ہے' وہ بھی اسی کی طرف راجع ہیں۔ وہ یوں کہ اپنے بعض مخلص احباب کو انہوں نے اس سے مطلع کیا۔ پس ایک زمانے کے بعد ایک جماعت نے اس میں غور کیا اور آئمہ کے قول کو دوسرے موقع ومحل پر محمول کر دیا۔ واللہ المستعان۔

6- چھٹی وصیت یہ ہے: تعلیمِ علم کا طریقہ جو تجربے سے پایۂ تحقیق کو پہنچا ہے' یہ ہے۔ سب سے پہلے صرف ونحو کے مختصر رسائل پڑھاتے جائیں۔ ان میں سے ہر ایک کے تین تین یا چار چار رسالے طالب علم کی ذہنی استعداد کے مطابق۔ بعد ازاں تاریخ یا حکمت عملی کی کوئی کتاب جو عربی میں ہو' پڑھائیں۔ اس دوران میں اسے کتبِ لغت سے استفادہ کرنے کا طریقہ اور اس سے مشکل الفاظ کے معنی نکالنا سکھائیں۔ جب عربی زبان پر قدرت حاصل ہو جائے تو اسے یحییٰ بن یحییٰ مصمودی کی روایت کے مطابق موطا امام مالک پڑھائیں۔ اسے ہرگز نہ چھوڑیں کیونکہ اصل تو علم حدیث ہے اور اسے پڑھنے میں بڑے فوائد ہیں۔ ہم تک اس کا سلسلۂ سماعت باقاعدہ پہنچتا ہے۔ اس کے بعد قرآن عظیم کا درس دیں اور یہ درس اس طرح دیں کہ صرف قرآن پڑھائیں بغیر تفسیر کے۔ ساتھ ساتھ ترجمہ کرتے جائیں اور جہاں کوئی نحو یا شانِ نزول کا مشکل مسئلہ آ جائے تو وہاں ٹھہریں اور اس پر بحث کریں۔ درس سے فارغ ہونے کے بعد درس میں جتنا قرآن پڑھا گیا ہو' اس کی مقدار کے مطابق جلالین پڑھائیں۔ اس طرح پڑھنے میں بڑے فائدے ہیں۔ بعد ازاں ایک وقت میں کتبِ حدیث میں سے صحیحین اور دوسری کتابیں، نیز کتب فقہ وعائد وسلوک پڑھائیں اور ایک ہی وقت میں کتبِ دانشمندی جیسے شرح مُلّا اور قطبی وغیرہ پڑھائیں۔ اگر ممکن ہو تو ایک دن مشکوٰۃ اور دوسرے دن اس کی شرح طیبی پڑھائیں۔ پہلے دن جتنی مشکوٰۃ پڑھی ہو اسی مقدار میں دوسرے دن اس کی شرح پڑھائیں تو بہت فائدہ مند ہوگا۔

7- ساتویں وصیت۔ ہم عربی ہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد ہندوستانی شہروں میں مسافروں کی حیثیت سے آئے۔ ہمارے لئے ہمارا عربی النسب اور عربی اللسان ہونا باعث فخر ہے کیونکہ یہ دونوں چیزیں ہمیں سید اولین وآخرین' افضل الانبیاء المرسلین' فخر موجودات علیہ وعلیہ آلہ الصلوٰۃ والتسلیمات سے نزدیک کرتی ہیں۔ اس عظیم نعمت کا شکر یوں ادا کیا جائے کہ ہم بقدرِ امکان عربوں کی عادات ورسوم کو جن میں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے اور آپؐ نے نشوونما پائی' ہاتھ سے نہ جانے دیں اور عجم کی رسوم اور ہنود کی عادات کو اپنے اندر نہ رہنے دیں۔

بغوی نے ابوعثمان الہندی سے روایت کی ہے کہ ہمارے پاس عمرؓ بن خطاب کی طرف سے ایک خط آیا اور ہم اس وقت عتبہ بن مرقد کے ساتھ آذربائیجان میں تھے۔ (خط کے عربی متن کو نقل کرنے کے بعد شاہ صاحب اس کا فارسی ترجمہ کرتے ہیں۔) لکھتے ہیں: یعنی جب عرب جہاد کے لئے سرزمین عجم کی مختلف اطراف میں پھیلے تو حضرت عمرؓ ڈرے کہ عرب کہیں عجمیوں کی رسمیں اختیار نہ کر لیں اور عربوں کی رسمیں نہ چھوڑ دیں۔ اس لئے انہوں نے اپنے خط میں لکھا کہ وہ تہ

بند باندھیں، چادریں اوڑھیں۔ جوتے (نعل) پہنیں، موزے ترک کر دیں، شلواریں چھوڑ دیں۔ اپنے دادا اسماعیلؑ کا لباس اپنے لئے لازم کریں۔ اپنے آپ کو ناز ونعم اور ٹھاٹ باٹ اور عجمیوں کی طرزِ رہائش سے دور رکھیں۔ دھوپ میں بیٹھنا اپنے لئے لازم ٹھہرائیں۔ بے شک دھوب عربوں کے لئے حمام ہے۔ بنو معد[1] کی رسمیں اختیار کریں۔ سخت لباس پہنیں۔ مشقت کی زندگی گزاریں۔ پرانے کپڑے پہننے کی عادت ڈالیں۔ اونٹوں کو پکڑیں اور انہیں رام کریں۔ چھلانگ مار کر گھوڑوں پر سوار ہوں اور نشانوں پر تیراندازی کریں۔

ہنود کی بری عادتوں میں سے ایک عادت یہ ہے کہ جب کسی عورت کا شوہر مر جائے تو وہ اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ عورت کسی اور مرد سے شادی کرے۔ یہ عادت سرے سے عرب میں نہ تھی۔ نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نہ آپؐ کے زمانے میں اور نہ آپؐ کے بعد۔ خدا تعالیٰ اس شخص پر اپنی رحمت نازل کرے جو اس بری عادت کو ختم کرے۔ اگر اس کو تمام لوگوں سے دور کرنا ممکن نہ ہو تو خود اپنی جماعت میں نکاحِ بیوگان کی اس عربوں کی عادت کو رائج کرنا چاہیے۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو بیوگان کا نکاح نہ کرنے کی اس عادت کو برا سمجھے اور دل سے اس کا مخالف ہو کیونکہ نہی عن المنکر کا سب سے ادنیٰ درجہ یہی ہے۔[2]

ہم لوگوں کے ہاں ایک اور بری رسم یہ ہے کہ نکاح میں مہر بہت زیادہ مقرر کرتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن پر کہ دین و دنیا دونوں میں ہمارا اعزو شرف منتہی ہوتا ہے، اپنے اہل بیت کا جو سب سے بہتر تھے، مہر بارہ اوقیہ اور نشی مقرر فرمایا تھا اور یہ سب مل کر پانچ سو درہم ہوتے ہیں۔ دوسری ہماری بری عادت خوشی کے موقعوں پر فضول خرچی اور اس ضمن میں بہت سی رسموں کا جاری کر لینا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خوشی کے موقعوں کے لئے دو چیزیں مقرر فرمائی ہیں، ولیمہ کی دعوت اور عقیقہ۔ ان دونوں کو اختیار کرنا چاہیے اور ان کے علاوہ دوسری چیزوں کو ترک کرنا چاہیے یا ان کا زیادہ اہتمام نہ کرنا چاہیے۔ ہم لوگوں کے ہاں ایک اور بری رسم یہ ہے کہ ماتم کے سلسلے میں سوئم، چہلم، ششماہی اور سالانہ فاتحہ پر بہت اسراف کرتے ہیں۔ ان سب رسموں کا عرب اولین میں بالکل وجود نہ تھا۔ صحیح بات یہ ہے کہ تین دن تک میت کے وارثوں کی تعزیت اور انہیں ایک دن، ایک رات کھانا دینے کے علاوہ اور کوئی رسم نہ کی جائے۔ میت ہو جانے کے تین دن بعد خاندان کی عورتیں جمع ہوں اور مرنے والے کی رشتہ دار عورتوں کو خوشبو لگائیں اور اگر اس کی بیوی ہے تو وہ عدت ختم ہونے کے بعد سوگ ختم کر دے۔

ہم میں سے خوش قسمت وہ ہیں جو عربی زبان کی صرف ونحو اور اس کی کتب ادب سے مناسبت پیدا کرے۔ حدیث اور قرآن میں اسے درک حاصل ہو۔ فارسی و ہندی کتابوں، علم شعر، معقولات، اس سلسلے کی جو دوسری چیزیں پیدا ہو گئی ہیں، ان میں مشغول ہونا اور تاریخ، بادشاہوں کی سرگزشتوں اور صحابہ کے باہمی نزاعات کا مطالعہ کرنا گمراہی در گمراہی ہے۔ اگر رسم زمانہ ان چیزوں میں مشغول ہونے کی مقتضی ہو تو یہ ضروری بات ہے کہ وہ اسے علم دنیوی سمجھیں۔ اس سے متنفر نہ رہیں اور توبہ واستغفار اور اظہارِ ندامت کرتے رہیں۔ ہمارے لئے یہ لازمی ہے کہ حرمین محترمین جائیں اور ان کے آستان پر اپنی پیشانی رگڑیں۔ اس میں ہمارے لئے سعادت ہے اور اس سے پہلوتہی کرنے میں ہمارے لئے شقاوت ہے۔

8- آٹھویں وصیت۔ حدیث شریف میں آیا ہے **من ادرك منكم عيسى بن مريم فليقراء من السلام** (جو تم میں سے عیسیٰ بن مریمؑ کو پائے تو وہ میرا انہیں سلام دے۔) اس فقیر کی یہ پوری آرزو ہے کہ اگر اسے حضرت روح اللہ علیہ السلام کا زمانہ ملے تو سب سے پہلے جو انہیں سلام کہے، وہ میں ہوں۔ اگر میں وہ زمانہ نہ پاؤں تو اس فقیر کی اولاد یا متبعین میں سے جو بھی ان کے مبارک زمانے کو پائے، وہ انہیں سلام پہنچانے کی پوری کوشش کرے تا کہ ہم محمدیؐ لشکروں میں سے آخری لشکر ہوں۔ پس سلام ہو اس پر جو ہدایت کی اتباع کرے۔
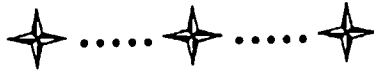
حواشی

(1) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ کے فرزند عدنان تھے۔ بنو عدنان میں سے بعض میں بنو معد کی شاخیں نکلیں۔ بنو معد جزیرہ نمائے عرب کے شمال میں رہتے تھے۔ بنو مضر اور بنو ربیعہ۔ ان ہر دو کے مورثِ اعلیٰ بنو معد تھے۔ یہ زیادہ تر بدو قبائل میں تھے اور بڑی سخت مشقت کی زندگی بسر کرتے تھے۔

(2) ارشاد نبویؐ ہے۔ **من رای منکم منکراً فليغيره بيده فان لم يستطع فبلسانه فان لم يستطع فبقلبه و ذلك اضعف الايمان۔** رواہ المسلم۔ (اگر تم میں سے کوئی شخص بری بات دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے تبدیل کر دے اور اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اسے تبدیل کرنے کا کہے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو دل سے اسے برا سمجھے اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے)۔

(3) اس حدیث کو الحاکم نے اپنی ''المستدرک'' میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

✦ ..... ✦ ..... ✦
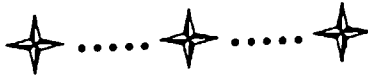
نورالحسن راشد کاندھلوی

حجۃ اللہ البالغہ

(مخطوطات، طباعت، تخریج، حواشی، تراجم)

ایک رائے ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے معتبر قلمی نسخے کم دستیاب ہیں، مگر یہ درست نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی اکثر اہم کتابوں کے معتبر و مستند نسخے ہندو پاکستان کی مختلف لائبریریوں میں موجود ہیں جس میں سے بعض نسخے شاہ صاحب کے صاحبزادگان (حضرت شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر رحمہم اللہ) کے قلم سے ہیں۔ چند نسخے خانوادۂ ولی اللہ کے اور ممتاز علما حضرت شاہ محمد اسحاق وغیرہ کے لکھے ہوئے ہیں اور چند اہم تالیفات کے وہ نسخے بھی اب تک موجود ہیں جن پر حضرت شاہ صاحب کے دستخط ثبت ہیں اور کچھ نسخے ایسے ہیں جنہیں حضرت شاہ صاحب نے اپنے شاگردوں کو پڑھایا ہے اور ان نسخوں پر حضرت شاہ صاحب کے اجازت نامے بھی موجود ہیں۔ چند نسخے مؤلف کی نقل ہیں اور کچھ نسخے ایسے بھی ہیں جو حضرت شاہ صاحب کے بچپن کے دوست، تعلیم کے ساتھی، ممتاز ترین خلیفہ، عزیز ترین مکتوب الیہ اور شاہ صاحب کی متعدد علمی تحریرات و مؤلفات خصوصاً ''حجۃ اللہ البالغہ'' کی تصنیف کے داعی و محرک حضرت شاہ محمد عاشق پھلتی کے قلم سے ہیں جو (ناچیز کے خیال میں) نسخہ مصنف کے قائم مقام ہیں۔ ایسی ہی دستیاب تالیفات میں ''حجۃ اللہ'' بھی شامل ہے۔

چونکہ ''حجۃ اللہ'' حضرت شاہ ولی اللہ اور خانوادہ ولی اللّٰہی کے علماء کے نصاب اور معمولات درس میں شامل رہی ہے اور ہر دور میں اس کی قرأت و اجازت کا ثبوت ملتا ہے۔ اس لئے قرین قیاس ہے کہ اس کے بیسیوں معتبر نسخے اور نقلیں تیار کی گئی ہوں گی جن میں سے متعدد اہم نسخے اگرچہ گمنام و بے نشان اور ضائع ہو چکے ہیں تاہم اس وقت تک بھی ''حجۃ اللہ'' کے متعدد نسخے موجود ہیں جن میں سے تین یا چار بہت ممتاز اور بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ چند نسخے ایسے بھی ہیں کہ اگرچہ ان کی خاص اہمیت اور امتیاز نہیں ہے، تاہم قلمی نسخوں کے تعارف اور متن کی نئی تدوین و تحقیق کے وقت ان سے بھی استفادہ ضروری ہے۔ مندرجہ تمام نسخوں کا کسی قدر تعارف آئندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔

''حجۃ اللہ'' کی اولین اشاعت پر درج مولانا محمد احسن نانوتوی کا حاشیہ (اس وقت تک معلوم) پہلا حاشیہ ہے، مولانا محمد احسن کی ''حجۃ اللہ'' کو شائع کرنے کی کوشش کچھ ایسی مبارک ثابت ہوئی کہ ''حجۃ اللہ'' عرب و عجم بلکہ مغرب میں بھی جا پہنچی اور ہر طرف اس کی خدمت شروع ہوگئی۔ ''حجۃ اللہ البالغہ'' ہندوستان کے بعد سب سے پہلے مصر میں چھپی اور

اس کے بعد ''حجتہ اللہ'' کی تخریج' شروح' ترجموں اور تلخیصات کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا جو اب تک جاری ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ ''حجتہ اللہ'' کے منجملہ شروحات اور ترجموں وغیرہ کے جو چند حاشیے یا ترجمے وغیرہ مجھے معلوم ہیں' ان کا مختصر تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

جب (''حجتہ اللہ البالغہ'' کے سب سے پہلے ناشر اور حاشیہ نگار) مولانا محمد احسن نانوتوی (وفات رمضان المبارک 1312ھ' مارچ 1895ء) نے ''حجتہ اللہ البالغہ'' چھاپنے کا ارادہ کیا اور اس کے نسخوں کی تلاش و جستجو کی' اس وقت مولانا کو چار نسخے ملے تھے۔ مولانا محمد احسن نے ان نسخوں کے مالکان کے نام لکھے ہیں مگر ان نسخوں کا تعارف درج نہیں کیا۔ اگرچہ مولانا احسن کی تحریر سے نہ ان کی خصوصیات و امتیازات کا علم ہوتا ہے' نہ سن کتابت وغیرہ کا مگر یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ چاروں نسخے مل کر بھی ہمہ پہلو مکمل نہ تھے۔ کسی نسخہ میں کچھ کمی تھی۔ دوسرے میں کچھ اور! مولانا احسن نے چاروں نسخوں سے مقابلہ کر کے ''حجتہ اللہ'' کا متن مرتب کیا تھا مگر پھر بھی مولانا کو بعض مقامات پر اطمینان نہیں ہوا تھا جس کی مولانا نے حاشیہ میں صراحت کر دی ہے۔ چونکہ مولانا محمد احسن کی تحریر میں مذکورہ نسخوں کا تعارف درج نہیں' اس لئے یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ اس وقت دریافت نسخوں میں کوئی نسخہ ایسا بھی ہے جو مولانا محمد احسن نانوتوی کا مآخذ اور ''حجتہ اللہ البالغہ'' کی سب سے پہلی اشاعت کی اساس رہا ہو۔

تاہم مولانا محمد احسن کے مآخذ اور طبع اول کی بنیاد جو نسخے تھے' ان سے قطع نظر' ''حجتہ اللہ'' کے آٹھ قلمی نسخے اس وقت تک معلوم اور موجود ہیں' ان میں سے ایک نسخہ (جو خاصا متعارف ہے) حضرت شاہ ولی اللہ کی حیات کا لکھا ہوا ہے۔ (وفات 29 محرم 1176ھ شنبہ 20 اگست 1762ء) ایک اور نسخہ حضرت شاہ صاحب کی وفات کے چند سال بعد 1183ھ میں لکھا گیا تھا۔ ایک اہم نسخہ حضرت شاہ محمد اسحاق کے دستِ مبارک کا ہے' چوتھا نسخہ وہ ہے جو عرصہ تک مولانا عبید اللہ سندھی (جو آخری دور میں فکر ولی اللّٰہی کے سب سے بڑے ماہر اور رمز شناس تھے) کے مطالعہ میں رہا ہے۔ چار نسخے اور ہیں جن میں سے دو پر سنِ کتابت درج ہے اور دو نسخوں پر سنِ کتابت بلکہ کاتب کا نام بھی نہیں' تفصیلات درج ہیں:۔

1۔ نسخہ خالد اسحٰق صاحب کراچی۔ مکتوبہ 1189ھ

جسے شاہ صاحب نے پڑھایا ہے۔ ''حجتہ اللہ'' کا سب سے پرانا اور اہم ترین نسخہ وہ ہے جو حضرت شاہ صاحب کے ایک شاگرد اور مسترشد کریم ؟ نے حضرت شاہ عبدالعزیز کے سنِ ولادت 1159ھ (1746ء) میں نقل کیا تھا' یہ نسخہ اس وجہ سے بھی کہ یہ ''حجتہ اللہ'' کا سب سے پرانا معلوم نسخہ سے کم اہم نہیں تھا مگر اس نسخہ کی ایک اور بڑی خصوصیت جس نے اس کی معنویت اور قدر و قیمت میں بہت اضافہ کر دیا ہے' یہ ہے کہ ناقل نے اس نسخہ میں 1162ھ میں حضرت شاہ صاحب سے پڑھا بھی ہے۔ تعلیم و قرأت کی شعبان 1163ھ (جولائی' اگست 1749ء) میں تکمیل ہوئی تھی' پہلے صفحہ پر اس طرح صراحت ہے:

''پیش حضرت شیخ مصنف' بطریق تعلم شروع نمودہ شد۔ اللہ سبحانہ توفیق اتمام دہد و تحقیق بایں علوم میسر کناد۔''

اور نسخہ کے اختتام پر تحریر ہے:

"تم الکتاب حجۃ اللہ البالغہ بید الفقیر الحقیر کریم"

ہر کہ خواند دعا طمع دارم
زانکہ من بندہ گنہ گارم

درسنہ 1159ھ ہجری المقدس

اسی صفحہ پر دوسری جگہ لکھا ہے:

"تا شعبان 1162ھ تا آخر پیش حضرت مرشد خواندہ شدہ اللہ تعالیٰ تحقق میسر کند۔"

یہ نسخہ عمدہ خط میں 23/8-18 سائز کے دوسو تہتر (273) اوراق پر مشتمل ہے، جس میں پہلے پچھتر ورق نسخ میں ہیں اور ورق چھہتر سے آخر تک نستعلیق میں لکھے گئے ہیں۔ یہ نسخہ حضرت شاہ صاحب کے عہد سے آج تک کہاں کہاں رہا۔ کچھ معلوم نہیں۔ حیرت ہے کہ اس نسخہ پر اور کاتب نسخہ کے علاوہ کسی کے دستخط، مہر یا کوئی ایسی تحریر ثبت نہیں جس سے اس کے پچھلے مالکان یا کسی مالک کے متعلق علم ہو سکے۔ یہ نسخہ گزشتہ تقریباً چالیس سال سے پاکستان کے نامور ماہرِ قانون جناب خالد اسحاق صاحب کی ملکیت اور ان کی ذاتی لائبریری کی زینت ہے۔ اس نسخہ پر جو واحد مہر ثبت ہے، وہ خالد اسحاق لائبریری کی ہے، اس لئے اب اس نسخہ کو نسخۂ خالد اسحاق کراچی کے نام سے یاد کیا جانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

نسخۂ کراچی کے دیکھنے سے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ نسخہ حضرت شاہ صاحب کے ابتدائی مسودہ کی نقل ہے۔ اس میں جگہ جگہ عبارتیں قلم زد کی گئی ہیں۔ ایک آدھ سطر سے چار چھ سطروں تک اور بہت سے مقامات پر آدھا صفحہ پون صفحہ بلکہ پورا یا ڈیڑھ یا پونے دو صفحہ مسلسل قلم زد کیے گئے ہیں، کہیں کہیں عبارتیں بالکل محو کی گئی ہیں، بیشتر مقامات پر قلم زد عبارت پڑھی جا سکتی ہے، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ناقل کریم نے اپنا نسخہ حضرت مصنف کے ابتدائی مسودہ سے نقل کیا تھا مگر درس کے وقت یہ نسخہ حضرت شاہ صاحب کے حضور پڑھا گیا تو حضرت شاہ صاحب نے اس میں کثرت سے ترمیم کرائی۔ جو عبارتیں غیر ضروری یا زائد تھیں، وہ حذف کرا دیں اور چند عبارتوں سے یہ خیال ہوتا ہے اس سلسلہ میں حضرت مصنف کی رائے میں تبدیلی ہو گئی تھی۔ اس لئے پرانے نظریہ پر قلم پھیر دیا۔ اسی شان سے پورے نسخہ کی تعلیم و قرأت مکمل ہوئی اور حضرت شاہ صاحب نے جس متن کو باقی رکھا تھا، "حجۃ اللہ" کے دیگر ناقلین نے اس کو بنیاد بنایا ہے۔

یہ تو بڑی تصحیحات کی کیفیت تھی۔ اس کے علاوہ کلمات یا فقروں کی تصحیح بھی کثرت سے ہے جو کہیں کہیں متن میں اور کثرت سے حاشیوں پر کی گئی ہے، اس تصحیح کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ شاید کوئی صفحہ ان تصحیحات سے خالی ہو۔ نیز چند صفحات دوبارہ یا مکرر بھی نقل ہو گئے ہیں اور وہاں حاشیہ پر مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کے قلم سے اس کی صراحت بھی درج ہے۔

نیز اس نسخہ سے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ "حجۃ اللہ" میں ترمیم و اضافہ کا سلسلہ بعد تک جاری رہا اور کئی ایسے مباحث اور ابواب جو ابتدائی متن میں نہیں تھے، بعد میں وقتاً فوقتاً اضافہ کیے گئے تھے مثلاً زیر تعارف نسخہ (مکتوبہ محمد کریم 1159ھ) میں مبحث اول کا باب "سر التکلیف" موجود نہیں اور مبحث خامس (مبحث البر والاثم) میں باب طبقات الاثم سے آخر تک کے مباحث نہیں، گویا یہ ابواب و مباحث ابتدائی مسودہ میں شامل نہیں تھے، بعد میں اضافہ کیے گئے ہیں اور شاید

اسی وجہ سے ''حجتہ اللہ'' کے کل ابواب کا شمار اس تعداد سے زیادہ ہو گیا ہے جس کا حضرت مصنف نے مقدمہ کتاب میں اظہار فرمایا ہے۔

اس نسخہ کی نقل میں بظاہر تین قلم استعمال ہوئے ہیں۔ پہلے پچھتر ورق نسخ میں ہیں جن کی تحریر عمدہ نہیں ہے۔اس کے بعد سے آخر تک نستعلیق میں ہے، اس میں بھی دو علیحدہ قلم کارفرما محسوس ہوتے ہیں، ایک کی تحریر کمزور اور ہلکی ہے۔ دوسرا قلم رواں اور پختہ ہے، یہی محمد کریم کا قلم ہے۔ حاشیہ پر درج کلمات اور فقروں کی تصحیح میں بھی دو قلم استعمال ہوئے ہیں، جن میں سے ایک محمد کریم کا معلوم ہوتا ہے، دوسرے کی تعین مشکل ہے۔ ممکن ہے یہ حضرت شاہ صاحب کا قلم ہو مگر اس کی صراحت نہیں۔

2- نسخہ پیر جھنڈہ، حیدر آباد، کراچی۔ مکتوبہ 1183ھ

یہ نسخہ شیخ محمود بن محمد سندھی پلیچہ نے نقل کیا ہے۔ اس کی کتابت 9 رجب 1183ھ (نومبر 1769ء) کو مکمل ہوئی۔ یہ نسخہ ایک سو چوالیس (144) اوراق پر مشتمل، عمدہ خط میں صحیح نسخہ ہے۔ ترقیمۂ کاتب درج ذیل ہے:

''وقع الفراغ من تحریر حجة اللّٰہ البالغه بعد العشاء الآخر، لیلة الخمیس، تاسع شهر رجب الفود الحرام، سنة 1183ھ ثلاث و ثمانین و مائة بعد الالف من الهجرة، علی صاحبها افضل الصلوٰت و اشرف التسلیمات

علی ید، احوج العباد الی ربه المعبود، مسکین محمود الملقلب بالطاهر بن محمود، پلیچه کهڈی عفی اللّٰہ عنه ورحمه''

یہ نسخہ مولانا عبیداللہ سندھی کے مطالعہ میں رہا ہے اور سندھ کے نامور عالم اور شیخ مولانا محب اللہ (پیر جھنڈہ) کے شہرہ آفاق کتب میں سے تھا۔[2] اب اس کتب خانہ کا خاصہ حصہ نیشنل میوزیم آف پاکستان، کراچی میں منتقل ہو گیا ہے۔ یہ نسخہ بھی غالباً وہیں ہوگا۔

3- نسخہ حضرت شاہ محمد اسحاق محدث

یہ نسخہ اگرچہ سنِ کتابت کی وجہ سے پیر جھنڈہ کے نسخہ سے مؤخر ہے مگر بلند مرتبہ کاتب کی وجہ سے نسخۂ مصنف کے بعد اور تمام نسخوں سے ممتاز اور فائق ہے۔ یہ نسخہ حضرت شاہ محمد اسحاق کے قلم کا لکھا ہوا ہے اور صحت و تحقیق میں تمام معلوم نسخوں پر فوقیت رکھتا ہے، یہ نسخہ کتب خانہ حرم، مکہ معظمہ میں محفوظ تھا۔

مولانا عبیداللہ سندھی نے مکہ معظمہ قیام کے زمانہ میں اس نسخہ سے خاص استفادہ کیا تھا اور اس سے اپنے نسخہ کی تصحیح کی تھی۔ مولانا سندھی کے کئی مستفدین اور شاگردوں نے مولانا کے حوالہ سے اس نسخہ کا ذکر کیا ہے۔[3] بلکہ یہ شواہد بھی ملتے ہیں کہ مولانا سندھی نے ''حجتہ اللہ البالغہ'' کا ایک نسخہ شاہ محمد اسحاق کے نسخہ کے مطابق مرتب کر کے شائع کرا دیا تھا۔ تفصیل آئندہ صفحات میں موجود ہے۔

4- نسخہ خدا بخش۔ پٹنہ

خدا بخش لائبریری پٹنہ میں بھی ''حجتہ اللہ البالغہ'' کا ایک نسخہ ہے جو حضرت شاہ محمد اسحاق کے نسخہ کا تقریباً معاصر ہے۔ اس نسخہ کی 12 ربیع الاول 1240ھ (4 نومبر 1824ء) کو کتابت مکمل ہوئی جس کی کاتب نے ان الفاظ میں صراحت کی ہے:

> ''تمت تمام شد ایں کتاب بموجب فرمائش جناب منشی محمد حسن دام اقبالہ' بتاریخ دوازدہم ماہ ربیع الثانی سنہ 22 جلوسی' مطابق 1240 ہجری''

یہ نسخہ درمیانہ پیمائش کے دو سو ستاون (257) اوراق پر مشتمل ہے۔ عمدہ پاکیزہ نستعلیق میں لکھا ہوا ہے۔ تمام حاشیوں پر جدول کھینچی ہوئی ہے۔ قلم خوبصورت اور باریک ہے۔ کاتب کا نام درج نہیں مگر یہ صراحت ہے کہ یہ نسخہ منشی محمد حسن کے لئے نقل کیا گیا تھا۔

مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری فرماتے ہیں کہ یہ نہایت صحیح نسخہ ہے۔ اس نسخہ کا مکمل مائیکروفلم اور عکس حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری کے یہاں موجود ہے۔ راقم نے دیکھا ہے۔ (4)

5- نسخہ کاکوری' مکتوبہ 1268ھ

''حجتہ اللہ'' کا ایک نسخہ خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کاکوری (لکھنؤ) میں محفوظ ہے۔ اس نسخہ کا تعارف دستیاب نہیں مگر خانوادۂ کاکوری کی ممتاز شخصیت مولانا شاہ مجتبیٰ حیدر صاحب نے راقم سطور کے خط کے جواب میں لکھا تھا کہ یہ نسخہ 1268ھ (52-1851ء) کا لکھا ہوا ہے۔

6- نسخہ برلن۔ بلا سنہ کتابت

جرمنی کی قومی لائبریری (Deutsche Staatsbibliothek) برلن میں بھی ''حجتہ اللہ'' کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔ یہ نسخہ نستعلیق میں صاف ستھرا لکھا ہوا ہے مگر اس پر کاتب کا نام سنہ کتابت یا کوئی اور ایسی عبارت تحریر نہیں جس سے اس نسخہ کے عہد تحریر اور ہندوستان سے برلن تک اس کے سفر پر کچھ روشنی پڑتی ہو۔ اس نسخہ کے آخری صفحہ پر ایک ناقص سی عبارت صفحہ کے آخر کے کونہ پر لکھی ہوئی ہے۔ برائے مولوی عبد بر مکان میاں قلندر بخش جرأت نقل پانژدہ روپے۔ بظاہر یہ نسخہ اسپرنگر (Aloys Sprenger) کے ذخیرۂ کتب کا ہے جو اسپرنگر کے مملوکہ سینکڑوں مخطوطات کے ساتھ ہندوستان سے برلن منتقل ہوا۔ ممکن ہے کہ یہ نسخہ خود اسپرنگر نے نقل کرایا ہو جس کو کتابیں نقل کرانے اور خریدنے کا خاص شوق تھا۔

یہ نسخہ اگرچہ ''حجتہ اللہ'' کے دونوں حصوں پر مشتمل ہے مگر مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری فرماتے ہیں کہ یہ دونوں حصے ناقص ہیں۔ پہلے حصہ میں کچھ ابواب رہ گئے ہیں اور دوسرے حصہ میں مسائل شتّی کے بعد کے مباحث رہ گئے ہیں۔

نسخہ برلن' فل اسکیپ سائز کے پانچ سو انتالیس (539) صفحات پر مشتمل ہے۔ دو صفحات اس کے بعد لکھے

ہوئے ہیں جن میں سے پہلے صفحہ پر وہ ناتمام عبارت درج ہے جو اوپر نقل کی گئی ہے۔ فی صفحہ پچیس سے ستائیس تک سطریں ہیں۔ پورا نسخہ قلم کی یکسانیت کی وجہ سے لائق تعریف ہے مگر افسوس ہے کہ اغلاط سے محفوظ نہیں۔ اس نسخہ کا مکمل فوٹو اسٹیٹ مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری (دارالعلوم، دیوبند) کے ذخیرہ میں موجود ہے۔[5]

7- نسخہ دہلی، ذخیرہ مولانا فرید ابوالحسن فاروقی، بلا سنہ

''حجۃ اللہ'' کا ایک نسخہ دہلی میں خانقاہ مرزا مظہر جان جاناں کے سجادہ نشین مولانا فرید ابوالحسن فاروقی کے کتب خانہ میں ہے۔ یہ نسخہ (اندازاً) تیرہویں صدی ہجری (19 ویں صدی عیسوی) کا لکھا ہوا ہے۔ اس پر سن کتابت اور کاتب وغیرہ کا نام موجود نہیں۔ یہ نسخہ ایک سو پچھتر اوراق پر مشتمل ہے۔

8- نسخہ مدرسہ صولتیہ مکہ معظّمہ، بلا سنہ

یہ نسخہ اگرچہ دریافت نسخوں میں سب سے بعد کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے مگر اس کی خصوصیت جو اس کو پہلے دو نسخوں (نسخۂ مصححہ حضرت شاہ ولی اللہ اور مکتوبہ حضرت شاہ محمد اسحاق) کے علاوہ اور تمام نسخوں سے ممتاز کرتی ہے، یہ ہے کہ یہ نسخہ برسوں تک مولانا عبیداللہ سندھی کی تحویل اور مطالعہ میں رہا ہے۔

اس نسخہ پر کاتب کا نام اور سنہ کتابت وغیرہ درج نہیں مگر اس کے حاشیوں پر کثرت سے مولانا سندھی کے قلم سے افادات درج ہیں اور اس نسخہ سے ملحق ایک سادہ ورق پر مولانا سندھی کی ایک تحریر بھی موجود ہے جس میں مولانا سندھی نے ''حجۃ اللہ'' کے لئے اپنی سندیں لکھی ہیں، جن میں سے ایک سند شیخ عبدالستار بن شیخ عبدالوہاب دہلوی مکی سے ہے۔ شیخ عبدالستار کو حضرت شاہ محمد اسحاق کی صاحبزادی محترمہ خدیجہ سے ''حجۃ اللہ'' کی اجازت ہے اور خدیجہ کو اپنے والد بزرگوار حضرت شاہ محمد اسحاق سے ہے۔[7]

یہ نسخہ تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل ہے اور اس پر مولانا کے اس طرح دستخط ثبت ہیں:

''عبیداللہ بن الاسلام''
المکتۃ المعظمہ (کذا)

حارۃ الباب۔ 15 رجب 1353ھ (12-13 اکتوبر 1934ء)

یہ نسخہ مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کے ذخیرہ کتب میں موجود ہے۔ راقم نے دیکھا ہے۔

چند اور نسخے

خیال یہ ہے کہ ''حجۃ اللہ'' کے محولہ بالا نسخوں کے علاوہ اور بھی متعدد اہم اور قابل ذکر نسخے مختلف ذاتی اور قومی لائبریریوں، مدرسوں اور خانقاہوں کے کتب خانوں میں موجود ہوں گے جو ہنوز غیر متعارف ہیں مگر ہمارے بہت کم دینی علمی ذخیرہ ایسے ہیں جن کی فہرستیں عموماً مرتب اور دستیاب ہوں، متعدد بڑے کتب خانے اور قابل قدر خزانے ایسے ہیں کہ اگر

ان سے استفادہ کی اجازت ہو اور ان کی فہارس چھپ جائیں تو ان سے ایک دنیا کو فائدہ ہو مگر ان خزانوں سے استفادہ تو دور' اکثر کے دروازے بھی نہیں کھلتے اور متعدد کی قلمی فہرستیں بھی موجود نہیں اور بعض ذخیروں کے مالکان کو خود بھی خبر نہیں کہ ان کی مملوکہ کتابوں میں کیسے کیسے لعل وگہر چھپے ہوئے پڑے ہیں۔ تاہم اگر تلاش کیا جائے تو امید ہے کہ حجۃ اللہ اور حضرت صاحب کی اہم تصانیف کے کئی نسخے ایسے دریافت ہوں گے جو ایک ماخذ اور نادر تحفہ ثابت ہوں گے۔

نسخہ دیوبند

دریافت نسخوں کے تذکرہ کے بعد ایک ایسے نسخے کا ذکر جو چند سال پہلے تک موجود تھا مگر اب اس کا سراغ نہیں ملتا۔ یہ نسخہ کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں موجود تھا اور حضرت شاہ عبدالعزیز کے شاگرد مولانا امیر حیدر حسینی بلگرامی [8] (وفات 1217ھ) کی ملکیت میں رہ چکا تھا اور اس کے پہلے صفحہ پر مولانا امیر حیدر کے قلم سے حضرت شاہ عبدالعزیز کا ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے متعلق ایک گرامی نامہ بھی درج تھا جس میں حضرت شاہ عبدالعزیز نے ''حجۃ اللہ'' کے اسرار دین وشریعت میں بے مثال اور امت میں پہلی مفصل تالیف ہونے کا ذکر فرمایا تھا اور مکتوب الیہ نے اس خط کو اس نسخہ پر نقل کر کے محفوظ کر دیا تھا۔

یہ نسخہ مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی وفات (ربیع الاول 1409ھ۔ 18/اکتوبر 1988ء) نے کتب خانہ دارالعلوم میں دیکھا تھا اور اسی نسخہ کے حوالہ سے شاہ عبدالعزیز کا مذکورہ گرامی نامہ حضرت شاہ صاحب کے تبرکات ومکتوبات میں نقل کیا ہے [9] مگر دارالعلوم دیوبند کی فہرست مخطوطات میں اس نسخہ کا اندراج اور تعارف شامل نہیں۔ [10]

قاہرہ اور رام پور میں ''حجۃ اللہ'' کے قلمی نسخے

''حجۃ اللہ'' کے نسخوں کے تذکرہ میں ڈاکٹر زبید احمد صاحب نے لکھا ہے کہ ''حجۃ اللہ'' کا ایک ایک قلمی نسخہ قاہرہ اور رام پور میں بھی ہے۔ [11] ڈاکٹر زبید احمد کے حوالہ سے مولانا غلام احمد مصطفیٰ قاسمی صاحب [12] اور متعدد اصحاب نے بھی یہی لکھ دیا ہے کہ ''حجۃ اللہ'' کا ایک ایک قلمی نسخہ قاہرہ اور رام پور میں بھی ہے مگر یہ اطلاع صحیح نہیں۔

ڈاکٹر زبید احمد صاحب نے اس کے لئے کتب خانہ خدیوی مصر قاہرہ اور رام پور لائبریری کی قدیم فہرست کا حوالہ دیا ہے مگر اس اطلاع میں کچھ سہو ہوا' کتب خانہ خدیوی [13] اور رام پور کی فہرست مرتبہ حکیم اجمل خاں میں ''حجۃ اللہ'' کی کسی قلمی نسخے کا ذکر اور اندراج نہیں ہے۔ [14] دونوں کتب خانوں کی مذکورہ فہرستوں میں جس نسخہ کا ذکر ہے وہ ''حجۃ اللہ'' کی پہلی اشاعت مطبوعہ مطبع صدیقی بریلی 1286ھ ہے۔ ان فہرستوں میں قلمی نسخوں کا نام ونشان بھی نہیں۔ نیز رضا لائبریری رام پور کے بعد کے اضافوں اور فہرستوں میں بھی ''حجۃ اللہ'' کے قلمی نسخہ کا تذکرہ شامل نہیں' [15] لہٰذا یہ اطلاع صحیح نہیں۔

قلمی نسخوں کے تذکرہ کے بعد حجۃ اللہ کی پہلی طباعت اور بعد کی اشاعتوں کا تعارف مناسب ہوگا۔

''حجۃ اللہ البالغہ'' کی طباعت' شاہ عبدالعزیز کی کوشش

''حجۃ اللہ'' کی دستیاب سب سے پہلی طباعت مطبع صدیقی بریلی کی ہے مگر یہ ''حجۃ اللہ'' شائع کرنے کی پہلی

کوشش نہیں تھی۔ ''حجۃ اللہ'' کی طباعت کی سب سے پہلی تحریک حضرت شاہ عبدالعزیز کی حیات (وفات شوال 1239ھ۔ 6 جون 1824ء) میں ہوئی تھی بلکہ (غالباً) شاہ صاحب کا اشارہ پر اس کا ارادہ کیا گیا تھا۔ اس اشاعت کے لئے ''حجۃ اللہ'' کا نسخہ بھی حضرت شاہ عبدالعزیز نے خود فراہم کیا تھا۔ تمام تفصیلات ہمدست نہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب کلکتہ میں مطابع قائم ہونے کی اطلاعات اور کلکتہ کی چھپی ہوئی کتابیں دہلی پہنچیں اور شاہ صاحب کے ملاحظہ میں آئیں تو حضرت شاہ عبدالعزیز نے اس نئی ایجاد کو پسند فرما کر کتابوں اور علم کے فروغ واشاعت کے لئے اس طریقہ سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ فرما لیا تھا۔

کلکتہ میں شاہ صاحب کے متوسلین کی ایک بڑی جماعت تھی جس میں کئی بڑے تاجر اور مطبع والے بھی شامل تھے۔ شاہ صاحب کا یہ منشاء معلوم ہونے کے بعد شاہ صاحب کے دو ممتاز نیازمندوں منشی امین الدین اور ان کے بھائی منشی نعیم الدین[16] نے (جو غالباً حضرت شاہ ولی اللہ سے بیعت بھی تھے) حضرت شاہ ولی اللہ کی کتابوں کے چھپوانے کا ارادہ کر لیا جس کی حضرت شاہ عبدالعزیز نے تحسین فرمائی اور حضرت شاہ ولی اللہ کی چند تالیفات نقل کرا کر طباعت کے لئے بھجوائیں۔ ان کتابوں کے ملنے کے بعد منشی نعیم الدین نے حضرت شاہ عبدالعزیز سے ''حجۃ اللہ'' بھی طلب کی۔ شاہ صاحب نے لکھا کہ اس کی نقل تیرہ روپے میں تیار ہوگی۔ منشی جی نے فوراً حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں پندرہ روپے بھجوا دیئے اور لکھا کہ اگر یہ نقل میرے وطن جانے سے پہلے مل جائے تو اچھا ہے۔ (طباعت شروع کرنے کا تقاضا ہوگا) منشی جی نے اس وقت جو خط لکھا تھا، اس میں تحریر ہے:

> ''حجۃ اللہ البالغہ'' کہ در اسرار فقہ تصنیف حضرت پیر ومرشد است، گذارش خدمت نمودہ بودم، آں جناب شرف ارقم فرمودہ اند کہ بخرچ سیزدہ روپے کتاب مذکورہ طیار خواہد شد دریں صورت مبلغ پانزدہ روپے ارسال خدمت می نمائم، معرفت مہاجن بخدمت خواہد رسید۔
> امید کہ کتاب مذکورہ طیار کنانیدہ عنایت فرمایند۔ ارادہ است کہ بعرصہ یک دو ماہ بطرف وطن بروم اگر کتاب مطلوبہ وجوابات سوالات من ارقام فرمایند طیار شدہ قبل از رفتن من برسد عین عنایت وکرم خواہد شد'' المرقوم 9 شہر (جمادی الاول 1237ھ۔ فروری 1822ء)[17]

حضرت شاہ عبدالعزیز کو حضرت شاہ ولی اللہ کی کتابوں کی تعلیم وتدریس کے علاوہ ان کی اشاعت کا بھی بہت اہتمام تھا۔ ایک اور گرامی نامہ میں (جس کے مکتوب الیہ کی صراحت نہیں، بظاہر شاہ صاحب کے کوئی شاگرد مقیم کلکتہ ہیں) تحریر فرمایا ہے:

> ''ثم انہ قد طال الزمان ولم یطلع منکم علی خبر ولم یقف علی عین ولا اثر، و عسی ان لایکون المانع لکم من ارسال المکاتیب الا الاشتغال بالدرس والافادۃ فھنیأً لکم ھذہ السعادۃ. غیر ان ھناك امراً تجب علیکم مراعاتہ والاھتمام بشانہ، وھو اشاعت کتب سیدی الوالد قدس سرہ وھو من احسن مناھج الشکر و خیر طرق الاحسان، المشار الیہ فی قولہ تعالی ھل جزاء

الاحسان الا الاحسان''[18]

مگر یہ معلوم نہیں کہ یہ کوشش کس حد تک کامیاب ہوئی۔ بعض اور ذرائع سے صرف یہ اطلاع ملتی ہے کہ منشی نعیم الدین کی کوششوں سے ''الفوز الکبیر'' چھپ گئی تھی (مگر اس اشاعت کا کوئی نسخہ راقم سطور کے علم میں نہیں۔) اس کے علاوہ اس تحریک کے ذریعہ سے حضرت شاہ ولی اللہ کی اور کتابوں کی طباعت کا جو اہتمام کیا گیا تھا، خصوصاً حجۃ اللہ کی اشاعت کا، اس کا کیا ہوا، کچھ سراغ نہیں ملتا۔

پہلی اشاعت اور پہلا مطبوعہ حاشیہ طبع اول بریلی (1286ھ)

مولانا محمد احسن نانوتوی کا مطبع صدیقی جو بریلی میں قائم تھا، ہندوستان کا ایک خاصا بڑا تجارتی اور اشاعتی ادارہ تھا جو اپنی مطبوعات کے موضوعات کے تنوع اور اعلیٰ علمی تصحیح اور معیار کے لئے ممتاز تھا۔ مطبع صدیقی نے حضرت شاہ ولی اللہ اور اس خاندان کے علماء کی کتابوں اور ان کے ترجموں اور شروحات وغیرہ کو بطور خاص اپنے منصوبہ اشاعت میں شامل کر رکھا تھا، اس مطبع کے ذریعہ سے حضرت شاہ ولی اللہ کی متعدد تصانیف کی پہلی مرتبہ اشاعت ہوئی۔ چند کے اعلیٰ درجہ کے ترجے یا شرحیں چھپیں، چند کتابیں جو پہلے بھی چھپ چکی تھیں، نئی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوئیں۔[20]

غالباً مولانا محمد احسن اور ان کے چھاپہ خانہ کی انہی خصوصیات اور اعلیٰ معیار نے مولانا منشی جمال الدین کتانوی[21] کو متاثر کیا اور منشی جی کو حضرت شاہ ولی اللہ کی دو اہم کتابیں ''حجۃ اللہ البالغہ'' اور ''ازالۃ الخفاء'' مولانا محمد احسن کی تصحیح و حواشی کے ساتھ مولانا ہی کے پریس میں چھپوانے کا خیال ہوا۔ منشی جی نے اپنا یہ منصوبہ مولانا کے سامنے رکھا ہوگا۔ اس کے تمام اخراجات کی ذمہ داری لی ہوگی اور ہر ممکن تعاون بہم پہنچانے کا وعدہ کیا ہوگا ورنہ شاید اتنے بڑے اور کثیر اخراجات کے کام کا مولانا محمد احسن ارادہ نہ کرتے۔

بہرحال منشی جی نے مولانا محمد احسن کو حضرت شاہ صاحب کی ''ازالۃ الخفاء'' اور ''حجۃ اللہ'' کی طباعت کے لئے متوجہ کیا۔ مولانا محمد احسن نے بے پناہ مشاغل اور ہمہ وقت مصروفیت کے باوجود اپنے پختہ ارادہ اور سخت محنت کی عادت کی وجہ سے یہ ذمہ داری ایک بڑی خدمت و سعادت سمجھتے ہوئے قبول کر لی اور دونوں کتابوں پر شایانِ شان محنت کی۔ دونوں کے دستیاب نسخوں سے مقابلہ و تصحیح کی۔ پُرمغز حاشیے لکھے، حل مطالب پر توجہ دی اور حسن کتابت کے علاوہ ضروری اعراب کا اور دونوں کتابوں کی اعلیٰ درجہ کی معیاری طباعت کا انتظام کیا۔ اس نسخہ کی تصحیح حاشیہ اور کتابت کی جملہ خدمات مولانا محمد احسن کی نگرانی میں انجام پذیر ہوئیں اور مولانا محمد منیر کے زیر اہتمام طباعت عمل میں آئی تھی۔

مولانا محمد احسن نے ''حجۃ اللہ'' کی طباعت کے لیے (اپنے خاص ذوق اور معمول کے مطابق) سب سے پہلے قلمی نسخوں کی جستجو کی، ان کے فراہم کرنے کا اہتمام کیا۔ مولانا کو تلاش و جستجو کے بعد ''حجۃ اللہ'' کے چار نسخے مہیا ہوئے تھے یہ نسخے:

1- مولانا احمد حسن مراد آبادی (وفات صفر 1288ھ۔ مئی 1871ء)[22]

2- مولانا مفتی سعد اللہ رام پوری مراد آبادی (وفات رمضان 1294ھ۔ ستمبر 1877ء)[23]

3- مولانا مفتی ریاض الدین کاکوری (وفات صفر 1295ھ۔فروری 1878ء)[24]

4- مولانا ارشاد حسین رام پوری مجددی (وفات جمادی الاخرہ 1311ھ۔دسمبر 1893ء)[25]

کے ذخیروں سے ملے تھے' مگر یہ چاروں نسخے مل کر بھی مکمل نہیں تھے۔ چاروں میں کمی اور فروگذاشت کا احساس ہوتا تھا۔

اس لئے مولانا محمد احسن نے ان میں سے کسی ایک نسخہ کو بنیاد نہیں بنایا بلکہ ان چاروں نسخوں کا گہری ناقدانہ نظر سے مطالعہ فرما کر ایک جامع صحیح اور مکمل متن تیار کیا جس میں مولانا نے غالباً چاروں نسخوں کے امتیازات کو محفوظ کر لیا ہے۔ جس نسخہ میں جو باب یا عنوان دوسرے نسخوں سے زائد تھا' اس کو متن میں شامل کر لیا گیا ہے۔ مثلاً: ''باب الفضاء فی الاحادیث المختلفه''[26] کے بعد ایک تتمہ شامل ہے۔ جس کو تتمہ نمبر 2 قرار دیا گیا ہے' اس کا عنوان ہے:

''باب اختلاف الصحابة والتابعين فی الفروع''

یہ باب حضرت شاہ ولی اللہ کی مشہور تالیف ''الانصافِ فی سبب الاختلاف'' ہے جس کو ''حجتہ اللہ'' میں بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ یہ اضافہ یا باب مولانا محمد احسن نانوتوی کے سامنے موجود ''حجتہ اللہ'' کے نسخوں میں سے صرف ایک نسخہ میں شامل تھا اور دیگر نسخے اس اضافہ یا اس کے حوالہ سے خالی تھے مگر مولانا محمد احسن نے اسی ایک نسخہ کی وجہ سے اس کو ''حجتہ اللہ'' میں شامل فرما لیا جس کے حاشیہ میں درج ذیل الفاظ میں صراحت فرمائی ہے:

''هذا التتمة المشتملة على الابواب الاربعة من هنا الى القسم الثانی لم توجد الا فی نسخة واحدة وابقيتها فی المتن مطابقا للنسخة المذكور يكون مضمونها مناسب للكتاب وكلام المصنف فی آخرها ايضا يدل انها ينبغی ان تلحق فی اصل الكتاب''[27]

ایسا ہی ایک حاشیہ یا وضاحت ''حجتہ اللہ'' کی مبحث فی الفتن میں درج ہے۔ مولانا محمد احسن نے وہاں بھی یہی لکھا ہے کہ میں یہاں جو عبارت یا مضمون نقل کر رہا ہوں وہ (پیشِ نظر چار نسخوں میں سے) صرف ایک نسخہ میں موجود ہے۔ جو اگر چہ اپنے بعض مندرجات کی وجہ سے گویا مکرر ہے مگر چونکہ بعض فوائد پر مشتمل ہے' اس لئے یہاں شامل کیا جا رہا ہے:

''هذا العبارة من هنا الى المناقب لم تكن الا فی نسخة واحدة فنقلتها وان كانت كالمكررة لتضمنها بعض الفائدة وكانت النسخة المنقولة عنها متروكة البياض من ثلاثة مواضع''[28]

نیز مولانا احسن نے اپنے سامنے موجود نسخوں کی ایک اور کمی یا فروگذاشت پر بھی توجہ دلائی ہے۔ ''مبحث فی الاحاديث المختلفة'' کے اختتام پر لکھتے ہیں: کہ حضرت مصنف نے ''حجتہ اللہ'' کی پہلی قسم کو سات مباحث اور ستر ابواب پر تقسیم کیا ہے۔ جیسا کہ شاہ صاحب نے آغاز کتاب پر لکھا بھی ہے مگر یہاں (مبحث فی الاحاديث المخلتفه تک) ابواب کا شمارہ اکیاسی (81) تک پہنچ گیا ہے اور میرے (مولانا احسن کے) سامنے موجود تمام نسخوں میں ابواب کی یہی تعداد ہے' اسی لئے کہا جا سکتا ہے کہ زائد ابواب یا تو مصنف نے بعد میں اضافہ کیے ہیں جس طرح اختلاف صحابہ تابعین کی بحث بعد میں بڑھائی ہے یا حضرت مصنف سے مقدمہ کتاب میں سہو ہوا (ابواب کی تعداد صحیح نہیں لکھی گئی) یا بعد میں نسخہ

نقل کرنے والوں کو مغالطہ ہوا۔ انہوں نے بعض ایسے عنوانات کہ جن کو مصنف نے فصل قرار دیا تھا، ابواب لکھ دیا ہے۔[29]

مولانا محمد احسن نے ایک دو مقامات پر حضرت مصنف کی فروگذاشت پر بھی متوجہ کیا ہے اور حضرت مصنف کی رائے سے اختلاف بھی کیا ہے اور اس کے مختصر دلائل بھی ذکر کیے ہیں[30] مگر مولانا محمد احسن کی اس رائے پر حیرت ہے کہ حضرت شاہ صاحب ''حجتہ اللہ'' کی تکمیل اور اس کتاب پر نظر ثانی نہیں فرما سکے تھے، مولانا احسن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''ومن هذا يعلم ان المصنف رحمه الله تعالىٰ لم يتيسر له النظر الثانى فى هذا الكتاب، كما هو مشهور بين الناس''[31]

مگر مولانا محمد احسن کا یہ خیال یا اطلاع صحیح نہیں کیونکہ مولانا محمد احسن خود نقل کر چکے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب نے ''حجتہ اللہ'' کو دو مقاصد پر تقسیم کیا ہے اور مقصد اول میں سات مباحث اور ستتر (77) ابواب ہیں (اور معلوم نسخوں میں اکیاسی ابواب میں چار ابواب کے اضافہ کی وجہ مولانا محمد احسن نقل کر چکے ہیں) جو مولانا محمد احسن کے مذکورہ خیال کی واضح تردید کر رہے ہیں اور مولانا محمد احسن کے اس خیال کی خود حضرت شاہ ولی اللہ کے الفاظ سے بھی تردید ہو رہی ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے اپنے معمول کے مطابق مقصد ثانی کے اختتام پر اپنے یہ خاص الفاظ تحریر فرمائے ہیں جو حضرت شاہ صاحب عموماً اپنی تالیفات کے اختتام پر تحریر فرمایا کرتے ہیں:

''ولكن هذا آخرما اردنا ايراده فى القسم الاول من كتاب (حجة الله البالغه فى علم اسرار الحديث) والحمد لله اولاً وآخراً ويتلوه ان شاء الله تعالىٰ القسم الثانى''[32]

مذکورہ الفاظ کے اختتام پر ''فى بيان اسرار ماجاء عن النبى ﷺ تفصيلا''[33] سے قسم ثانی شروع ہوگئی ہے اور ''مبحث فى احكام النذور والايمان''[34] پر قسم ثانی یعنی اصل کتاب کے بنیادی مباحث بھی اختتام کو پہنچ گئے۔ اس کے آخر میں حضرت شاہ صاحب نے ارقام فرمایا ہے کہ یہاں کتاب کے وہ ابواب اور مباحث تو ختم ہوگئے جن کا میں نے ارادہ کیا تھا اور ان کی تکمیل اپنے اوپر لازم کر لی تھی (یعنی اصل کتاب یہاں مکمل ہوگئی ہے) مگر میں متفرق ابواب کے متعلق چند باتیں یہاں اور ذکر کرتا ہوں اگرچہ:

''وان جميع مايذكر فيها غير وافٍ بواجب حقها ولا كاف بحقيقة شانها، ولكن مالا يدرك كله لا يترك كله ونحن الآن نشتغل بشى من السير والفتن والمناقب على التيسير دون الاستيعاب، والله الموافق والمعين''[35]

اس کے بعد سیرۃ النبیؐ کے چند ابواب اور فتن کی بحث ہے۔

حضرت شاہ صاحب کی مذکورہ دونوں عبارتوں سے صاف واضح ہے کہ حجتہ اللہ کی تالیف مکمل نہ ہونے کا خیال صحیح نہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے اس کتاب میں جن مباحث و مطالب کے درج کرنے کا ارادہ فرمایا تھا، وہ اس کی تکمیل فرما چکے تھے اور اصل مباحث اور کتاب مکمل کرنے کے بعد مزید افادیت کے خیال سے چند ابواب اور شامل فرما دیئے تھے، لہٰذا مولانا محمد احسن کا یہ خیال درست نہیں۔

مولانا محمد احسن کی درج بالا رائے سے قطع نظر اس حقیقت میں کسی کو شبہ نہیں ہوسکتا کہ مولانا محمد احسن کی ''حجتہ اللہ'' کی تصحیح و اشاعت کی خدمت اور اس کا حاشیہ اس کتاب کی تمام خدمات میں ہر پہلو سے امتیاز رکھتا ہے اور مولانا احسن کے اس حاشیہ پر بہت اضافہ اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس حاشیہ اور طباعت کے بعد سے ''حجتہ اللہ'' پر جس قدر بھی کام ہوئے ہیں وہ تمام اسی حاشیہ کے مرہونِ منت ہیں اور اب بھی اس خدمت اور حاشیہ کی اولیت اور علمی مرتبہ مسلم ہے۔

''حجتہ اللہ'' کی پہلی طباعت بڑے سائز کے تین سو چھیانوے (396) صفحات پر مشتمل ہے جس کے آخری دو صفحات پر مولانا محمد احسن کا لکھا ہوا خاتمۃ الطبع ہے جس میں مولانا نے اس کتاب کی طباعت کے لئے منشی جمال الدین کتانوی کی تحریک' تصحیح و مقابلہ کے لئے نسخوں کی فراہمی' نسخوں کے مالکان کے نام اور نسخوں کی تلاش' ان کے باہم مقابلہ اور متن کی تحقیق میں مولانا احمد حسن مراد آبادی کے بھرپور تعاون کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ اسی تحریر میں چھ اشعار کا عربی میں قطعہ تاریخ بھی ہے اور آخر میں یہ صراحت اور اعلان بھی ہے کہ کسی شخص کو مصحح اور محشی کی اجازت کے بغیر اس کتاب کے شائع کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

چند اور حاشیے

مولانا محمد احسن کی ''حجتہ اللہ'' کی اشاعت اور اس کا حاشیہ ایسا مقبول ہوا کہ پہلی طباعت 1286ھ سے عصر حاضر تک ''حجتہ اللہ'' کے جس قدر بھی ایڈیشن ہند یا پاکستان اور عرب ملکوں میں چھپے ہیں' سب میں یہی حاشیہ درج ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض اشاعتوں میں اس کی صراحت ہے کہ یہ حاشیہ پہلی طباعت سے اخذ کیا گیا ہے۔ بعض میں حاشیہ شامل ہے مگر مآخذ کی وضاحت نہیں اور بعض حاشیہ نگاروں نے چوری اور سینہ زوری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس حاشیہ کو اپنے ادارہ یا کسی اور محشی سے منسوب کر دیا ہے مگر حاشیہ یہی ہے۔ صرف ایک نسخہ جو چند سال پہلے بیروت سے چھپا ہے' سنا ہے کہ اس پر نیا حاشیہ ہے مگر یہ نسخہ مجھے دستیاب نہیں ہوا۔ اس لئے اس کی نسبت کچھ عرض کرنا درست نہیں۔

شروح

شرح الشمس البازغہ علیٰ حجتہ اللہ البالغہ

مجھے ''حجتہ اللہ'' کی عربی میں صرف ایک شرح کا علم ہے جس کو مرتب نے ''الشمس البازغہ'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ شرح دراصل مولانا سندھی کے درس ''حجتہ اللہ'' کی افادات یا تشریحی نوٹس ہیں جو مولانا کے غالباً دو شاگردوں نے مولانا کے مکہ مکرمہ اور دہلی میں قلم بند کیے تھے۔ یہ شرح اگرچہ بہت مفصل نہیں مگر معلومات اور تحقیقات کا خزانہ ہے۔

اس شرح کی تعلیم و تحریر کے وقت مولانا عبید اللہ سندھی اور طلبہ کے سامنے حجتہ اللہ کا مطبع منیریہ کا مطبوعہ نسخہ تھا۔ اسی نسخہ کے صفحات کے حوالہ سے ''حجتہ اللہ'' کی عبارت کے اشارات یا مختصر فقرے درج ہیں۔ اس کے بعد مولانا کی تقریر د

توضیح نقل کی گئی ہے۔ اکثر یہ وضاحت مختصر ہے مگر اختصار کے باوجود اس کی معنویت کا عالم یہ ہے کہ ایک ایک فقرہ سے باب معانی کھلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ چند مقامات ایسے بھی ہیں جہاں توضیح مطلب کے لئے مفصل تقریر فرمائی گئی ہے مگر مجھے یہ محسوس ہوا کہ مفصل تقریر سے ایقان واطمینان کی وہ کیفیت حاصل نہیں ہوئی جو مختصر فقروں سے ہو جاتی ہے۔

مذکورہ وضاحتی فقروں یا شرح کے علاوہ اس شرح کا ایک خاص امتیاز اور انفرادیت جس کی وجہ سے اس کی اہمیت بڑھ گئی ہے اور ''حجۃ اللہ'' کی شرح وتفہیم کے لئے اس سے مراجعت ناگزیر معلوم ہوتی ہے، یہ ہے کہ مولانا سندھی نے اپنی توضیحات میں اکثر مقامات پر اس کی نشاندہی فرمائی ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے ''حجۃ اللہ'' کی فلاں فلاں بحث میں جو مضمون بیان فرمایا ہے، وہ علمائے متقدمین میں سے کس کے کلام سے ماخوذ ہے یا کہاں سے لیا گیا ہے۔ چند موقعوں پر ان کتابوں کے حوالے بھی درج ہیں جو حضرت شاہ ولی اللہ کے بعض مباحث کا مآخذ ہیں۔ بعض جگہوں پر حوالے درج نہیں، صرف مرجع کی مجمل رہنمائی کی گئی ہے۔

نیز ''حجۃ اللہ'' میں جو مباحث آئے ہیں، ان کے ضمن میں حضرت شاہ صاحب کی جو خاص تعبیرات واشارات ہیں، ان کی خود شاہ صاحب نے کہاں تفصیل بیان فرمائی ہے اور جو مباحث ''حجۃ اللہ'' میں مجمل ہیں، ان کی وضاحت یا اس نکتہ یا خاص تعبیر اور اصطلاح کی وضاحت شاہ صاحب کی کس تصنیف میں درج ہے، اس کی کثرت سے نشاندہی کی گئی ہے۔ ''حجۃ اللہ'' کے مباحث کی توضیح کے لئے حضرت شاہ ولی اللہ کی تصانیف میں سے ''البدور البازغہ''، ''الخیر الکثیر''، ''ہمعات''، ''التفہیمات''، ''فیوض الحرمین''، ''قرۃ العینین''، ''القول الجمیل'' وغیرہ کی عبارتیں نقل کی گئی ہیں اور بقید صفحہ ان کا حوالہ دیا گیا ہے جس کی وجہ سے ''حجۃ اللہ'' کی تفہیم اور شاہ صاحب کی فکر کو سمجھنے میں بہت رہنمائی ملتی ہے۔

مولانا سندھی نے اس بحث میں صرف شاہ صاحب کی تصانیف سے استفادہ نہیں کیا بلکہ حضرت شاہ عبدالعزیز کی تفسیر ''فتح العزیز''، نیز شاہ عبدالعزیز کی دوسری تالیفات مثلاً ''رسالہ عقائد'' اور حضرت شاہ رفیع الدین کی مؤلفات کے علاوہ حضرت شاہ اسماعیل شہید کی ''عبقات'' کے بھی متعدد حوالے شامل ہیں۔

یہ شرح جیسا کہ ذکر ہوا مولانا سندھی کی دو تقریروں کا مجموعہ ہے۔ پہلی تقریر مولانا کے شاگرد عبداللہ بن نہال (نسب اور وطن وغیرہ درج نہیں) نے اس وقت لکھی تھی جب انہوں نے مکہ مکرمہ میں مولانا سے ''حجۃ اللہ'' پڑھی تھی۔ اس وقت آغاز کتاب سے کتاب الحدود تک درس ہوا تھا، اس کے بعد مولانا سندھی ہندوستان آ گئے تھے۔ مولانا سندھی کی ہندوستان تشریف آوری کے بعد ''حجۃ اللہ'' کے درس کا ایک اور دور 'بیت الحکمت' جامعہ ملیہ دہلی میں ہوا۔ وہ تقریر بھی اسی نسخہ میں ضبط کی گئی ہے۔ یہ تقریر محمد صدیق سہارنپوری نے لکھی ہے۔ (راقم کو دونوں صاحبان کا تعارف نہیں ملا) مذکورہ تقریروں پر بعد میں اضافے بھی ہوئے ہیں اور حاشیے بھی لکھے گئے ہیں۔ اگرچہ اس میں صراحت نہیں مگر بعض اضافات وحواشی کے دیکھنے سے خیال ہوتا ہے کہ یہ اضافہ خود مولانا سندھی کا کیا ہوا ہے۔

مولانا سندھی جو افادات بیان فرماتے تھے، وہ اردو میں ہوتے تھے، ناقل ومرتب نے ان کو عربی میں منتقل کیا ہے۔ یہ نسخہ رواں باریک قلم سے فل اسکیپ کے بڑے کاغذ کے اسی (80) صفحات پر مشتمل ہے۔ فی صفحہ عموماً چھتیس سطریں ہیں۔ اکثر صفحات پر حاشیہ میں دو کالم بنائے گئے ہیں۔ دونوں کالموں میں ''حجۃ اللہ'' اور اس تقریر کے بعض پہلوؤں

کی مزید تنقیح کی گئی ہے۔ یہ شرح ابتداء سے کتاب الحدود تک (سنہ 1353ھ۔1940ء) میں مکہ مکرمہ میں لکھی گئی اور بعد کا حصہ اور ضمائم واضافات (دسمبر سنہ 1940ء۔1352ھ) میں بیت الحکمت دہلی میں قلم بند ہوئے۔

تخریجِ احادیث

النعمۃ السابغۃ تخریج احادیث حجۃ اللہ البالغہ

''حجۃ اللہ البالغہ'' کی کم سے کم ایک تخریج بھی ہوئی تھی۔ یہ تخریج وتالیف نامور عالم اور محدث مولانا محمد مچھلی شہری (وفات رجب 1334ھ۔اکتوبر 1902ء) کی یادگار تھی۔ کہا جاتا ہے متعدد اصحاب نے چاہا کہ اس کتاب کو شائع کر دیں مگر مولانا کے اخلاف نے کتاب دینے سے انکار کر دیا۔ کتاب دکھائی نہ چھپوائی۔ اس لئے اندیشہ ہے کہ یہ محنت ضائع ہوگئی ہے۔[36] اگرچہ تصریح نہیں مگر امید یہ ہے کہ یہ کتاب عربی میں ہوگی۔

''حجۃ اللہ'' کی چند اور اشاعتیں

طبع دوم، بولاق مصر

''حجۃ اللہ'' کی ہندوستان میں عمدہ طباعت کے بعد مولانا منشی جمال الدین کتانوی (کتانہ،ضلع میرٹھ یوپی) مدار المہام ریاست بھوپال کو خیال ہوا کہ اس دولت کا افادہ عام ہونا چاہیے اور ہندوستان کا یہ تحفہ دنیائے اسلام کے علماء کی خدمت میں بھی پہنچنا چاہیے۔ اس لئے منشی جمال الدین نے ''حجۃ اللہ'' کی ہند میں اشاعت کے بعد مصر میں اس کی طباعت کا منصوبہ بنایا جس کے لئے مولانا محمد حسین فقیر (بنتی دہلوی)[37] کا انتخاب ہوا۔ مولانا محمد حسین فقیر منشی جی کے نمائندہ اور سفیر کی حیثیت ترکی ہوتے ہوئے مصر پہنچے تھے اور مصر کے اس زمانہ کے سب سے بڑے اور اہم ترین مطبع بولاق میں ''حجۃ اللہ البالغہ'' کی طباعت کا انتظام کیا۔

مصری طباعت کے لئے متن کی نئی تدوین یا قلمی نسخوں سے مراجعت کا اہتمام نہیں ہوا تھا بلکہ صرف مطبع صدیقی بریلی کی اشاعت کو عربی خط میں شائع کر دیا گیا۔ اس طباعت میں مولانا محمد احسن نانوتوی کا حاشیہ اور تمام ترتیب جوں کی توں شامل ہے۔ بریلی اور بولاق کی طباعتوں میں بظاہر صرف یہ امتیاز ہے کہ بولاق کی طباعت میں جہاں کوئی حدیث شریف آئی ہے وہاں حاشیہ پر رح بنادی گئی ہے تاکہ حدیث ممتاز رہے۔

اس نسخہ کا ایک اور امتیاز یہ ہے کہ اس کی تصحیح مصر اور ترکی کے مطابع کے مصححین کے استاد اور نامور جید فاضل، شیخ ابراہیم عبدالغفار دسوقی (وفات 1300ھ/1883ھ)[38] نے کی تھی جو دقیقہ رس مصحح تھے۔

''حجۃ اللہ'' کی بولاق کی اشاعت دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ جلد اول ہندوستانی اشاعت کی ترتیب کے مطابق

ابواب الصلوٰۃ (کے باب ثیاب المصلی) پر مکمل ہوگئی ہے۔ دوسری جلد ابواب قبلہ سے شروع ہوئی ہے۔ جلد اول ایک سو ترانوے (193) صفحات پر اور جلد ثانی ایک سو اٹھانوے (198) صفحات پر مشتمل ہے۔ متن کی تکمیل کے بعد صفحہ ایک سو اٹھانوے کے اختتام سے دوسو کے آخر تک مولانا محمد احسن نانوتوی کا وہ خاتمۃ الطبع درج ہے جو پہلی طباعت میں شائع ہے اور صفحہ دوسو کی آخری سطور سے صفحہ دوسو دو تک شیخ ابراہیم دسوقی کا حرف اختتام یا خاتمۃ الطبع ہے جس میں تیرہ شعروں کا عربی کا قطعہ تاریخ بھی ہے۔ آخری مصرعہ کے اعداد سے اس طباعت کا سنہ نکلتا ہے جس کے اعداد 1294ھ ہیں مگر چند سطروں کے بعد خاتمۃ الطبع کی آخری سطور میں سنہ طباعت 1284ھ (بارہ سو چوراسی) چھپ گیا ہے جو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہوسکتا۔ اس اشاعت کی تکمیل کا صحیح سنہ اور مہینہ رمضان المبارک 1294ھ (ستمبر، اکتوبر 1877ء) ہے۔

3- خیریہ مصر 23-1322ھ

بولاق کے بعد کی جو طباعتیں مجھے ملیں ان میں دوسری طباعت مطبع خیریہ مصر کی ہے۔ جو 23-1322ھ میں دو جلدوں میں چھپی تھی، جلد اول 1322ھ کے آخر میں اور جلد دوم صفر 1323ھ میں شائع ہوئی۔ یہ بولاق کی طباعت کی جوں کی توں نقل کی ہے۔

4- مطبوعہ منیریہ مصر 1352ھ بتصحیح مولانا عبیداللہ سندھی

یہ نسخہ بھی بولاق اور خیریہ مصر کے نسخوں کی طرح دو جلدوں میں ہے۔ جو 1352ھ (34-1933ء) میں چھپا تھا۔ اس کے سرورق پر یہ مختصر عبارت یا اطلاع چھپی ہوئی ہے۔

"قام بطبعه ونشره للمرة الاولى سنه 1352ھ. جماعة من محى العلم والاصلاح"

اس کے بعد تحریر ہے:

"راجع اصول و صححها و قيد حواشيها بعض فضلاء الهند"

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشاعت مطبع منیریہ کے پروگرام اشاعت کا حصہ نہیں تھی بلکہ علماء اور مصلحین کی ایک جماعت نے اس کی طباعت کا اہتمام کیا تھا۔ دوسری بات جو اس سے معلوم ہوتی ہے کہ اس نسخہ کی اصل نسخہ یا نسخوں سے ہندوستان کے کسی فاضل نے مراجعت و تصحیح کی ہے اور اس کے حواشی کو منضبط کیا ہے مگر یہ صراحت نہیں کہ یہ عالم کون تھے۔ کسی اور نے بھی اس کی صراحت نہیں کی مگر مولانا عبیداللہ سندھی کی شرح ''حجۃ اللہ'' کے ایک ناقل نے اپنے نسخہ میں ایک موقع پر لکھا ہے:

"وفى النسخة المطبوعة هكذا، لانها طبعت بعد ان صححها العلامه امير الائمه سيدنا السندهى"[39]

یہ عبارت مکہ معظمہ میں 1353ھ میں مولانا سندھی کے درس میں لکھی گئی ہے اور یہ محقق ہے کہ اس دوران یعنی

جب مولانا سندھی مکہ مکرمہ میں مقیم تھے (صفر 1345ھ۔اگست ستمبر 1926ء سے اواخر محرم 1353ھ۔فروری 1939ء تک) اس زمانہ میں ہندوستان یا عرب ملکوں میں نسخہ منیریہ کے علاوہ ''حجتہ اللہ'' کا کوئی اور نسخہ نہیں چھپا' اس لئے یہی نسخہ جس پر منیریہ والوں نے بعض فضلاء الہند کی تصحیح و مقابلہ کی صراحت کی ہے' مولانا سندھی کا تصحیح کیا ہوا ہے اور جیسا کہ مولانا کے بعض اور شاگردوں نے بھی لکھا ہے کہ مولانا سندھی نے مکتبہ حرم مکی میں موجود ''حجتہ اللہ'' کے ایک اہم قلمی نسخہ (مکتوبہ بقلم حضرت شاہ محمد اسحاق) سے نسخہ کی تصحیح کی تھی'[40] لہٰذا یہ وہی تصحیح شدہ نسخہ ہے اس لئے ''حجتہ اللہ'' کے نسخہ منیریہ[41] کا متن تصحیح میں اور تمام نسخوں سے فائق ہونا چاہیے۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ بعد میں منیریہ کی طباعت کو ہندوستان میں قبول عام حاصل ہوا اور گزشتہ پچاس برس سے ہند و پاکستان میں ''حجتہ اللہ'' کے جس قدر بھی نسخے چھپ رہے ہیں' ان کی اساس منیریہ کی ہی طباعت ہے۔

یہاں یہ بھی ذکر کر دینا چاہیے کہ دارالعلوم دیوبند کی لائبریری میں منیریہ کی طباعت کا ایک ایسا نسخہ بھی موجود ہے جس میں مولانا عبیداللہ سندھی کے دو شاگردوں (مولانا سید تقویم الحق حلیمی اور مولانا خلیل الرحمٰن صدیقی امروہوی) نے مولانا سندھی سے ''حجتہ اللہ'' پڑھی ہے' اس پر دونوں کے دستخط ہیں۔

چند ہندوستانی طباعتیں

منیریہ کی طباعت کا کتب خانہ رشیدیہ دہلی نے سب سے پہلے (1373ھ۔1953ء) میں عکس (Reprint) شائع کیا تھا۔ اس کے بعد سے یہی طباعت آج تک چھپ رہی ہے۔ بعض مکتبوں نے اسی عکس کا فوٹو شائع کیا ہے۔

دارالسلفیہ لاہور کی اشاعت

برصغیر ہند و پاکستان کی ''حجتہ اللہ'' کی اشاعتوں میں کتب خانہ رشیدیہ دہلی کی اشاعت کے بعد دارالسلفیہ لاہور کا نسخہ سب سے بہتر اشاعت ہے۔ دارالسلفیہ کی اشاعت پر مصحح کا نام اور سنہ اشاعت درج نہیں مگر اس نسخہ میں تصحیح کا مزید اہتمام محسوس ہوتا ہے۔ اس اشاعت کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ ''حجتہ اللہ'' میں جن احادیث و روایات کا اشارہ یا مختصر فقرہ آیا ہے' اس روایت کا مکمل متن حاشیہ میں درج کر دیا ہے۔

بیروت کی چند متاخر اشاعتیں

تقریباً (1390ھ۔1970ء) کے بعد دنیائے اسلام میں ''حجتہ اللہ'' کی مانگ اور اشاعت میں خاصا اضافہ ہوا۔ اس لئے تھوڑے تھوڑے وقفہ سے بیروت کے متعدد اداروں نے ''حجتہ اللہ'' کے کئی ایڈیشن شائع کیے' جن میں بولاق کی پہلی طباعت سے منیریہ (بلکہ دارالسلفیہ) تک تمام اشاعتوں کے عکس شامل ہیں۔ (ان میں سے کئی طباعتیں میں نے دیکھی ہیں) مگر ان میں بظاہر کوئی نئی اور قابل ذکر بات نہیں ہے۔

بحاشیہ شیخ محمد سالم ہاشم، بیروت

چند سال پہلے (1415ھ۔1995ء) میں دارالکتب العلمیہ بیروت سے ''حجۃ اللہ'' کا ایک نسخہ شائع ہوا ہے جس میں ذیلی عنوانات کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس کے بعض عنوانات کے برمحل ہونے میں شبہ ہے۔ اس کے علاوہ معمولی سی ترمیم یہ کی گئی ہے کہ مباحث قبلہ جو تمام نسخوں میں جلد ثانی کے آغاز پر آئے ہیں، اس نسخہ میں جلد اول کے آخر میں شامل کیے گئے ہیں اور جلد ثانی کی ابتداء السترہ سے کی گئی ہے۔ تمام حواشی مولانا احسن نانوتوی والے ہیں جو پہلی طباعت سے چلے آرہے ہیں۔

بیروت کی ایک اور اشاعت

بیروت سے پانچ چھ سال پہلے ''حجۃ اللہ'' کا ایک ایڈیشن اور چھپا ہے، جس پر (سنا ہے کہ) کسی قدر مفصل مقدمہ اور احادیث شریفہ کی جزوی تخریج ہے مگر یہ نسخہ مجھے نہیں ملا، اس لئے اس اطلاع کی تفصیل و تحقیق سے قاصر ہوں۔

حجۃ اللہ (اردو تراجم، شروح، ملخص)

''حجۃ اللہ البالغہ'' (1286ھ۔69-1868ء) میں چھپ کر عام ہو گئی تھی اور اس وقت سے اس کتاب سے استفادہ کا دائرہ وسیع ہونا شروع ہو گیا تھا مگر کتاب کے اعلیٰ مطالب اور مصنف کی بلند پروازی کی وجہ سے اس کا پورے طور پر سمجھ لینا اور مصنف کی مراد تک پہنچ جانا مشکل تھا، اس لئے اہل علم و ذوق اصحاب کا مطالبہ اور تقاضا تھا کہ اس کا ترجمہ ہو اور اس کی مشکلات کے حل ہونے اور مقاصد تک پہنچنے کا راستہ ملے۔ عظیم آباد پٹنہ کے مولوی سید فضل الرحمان صاحب نے نامور عالم اور مفسر و مناظر مولانا ابو محمد عبدالحق حقانی دہلوی سے ''حجۃ اللہ'' کے ترجمہ کی فرمائش کی۔ اس پر مسلسل اصرار کیا جس کی وجہ سے مولانا عبدالحق حقانی نے ''حجۃ اللہ'' کے ترجمہ کا وعدہ اور ارادہ فرما لیا تھا۔ اس وقت تک معلومات کے مطابق یہی ترجمہ ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا سب سے پہلا اردو ترجمہ ہے۔

1- نعمت اللہ السابغہ ترجمہ حجۃ اللہ از مولانا عبدالحق حقانی

مولانا عبدالحق نے ترجمہ کا کب آغاز کیا، اس کا مجھے علم نہیں لیکن اس کی تاریخ اختتام (ربیع الثانی 1302ھ۔ فروری 1885ء) ہے۔ یہ ترجمہ غالباً (1310ھ۔1893ء) میں چھپنا شروع ہوا تھا اور (جمادی الاول 1312ھ۔نومبر 1894ء) میں اس کی اشاعت مکمل ہو گئی تھی۔ اس ترجمہ کا نام ''نعمت اللہ السابغہ'' ہے۔ یہ اشاعت دو جلدوں پر مشتمل ہے مگر اس میں متن شامل نہیں۔ اس اشاعت کا ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں ہے۔

''نعمت اللہ السابغہ'' کی دوسری اشاعت کا اصح المطابع کراچی نے اہتمام کیا اور ترجمہ کی زبان پرانی ہو جانے کی وجہ سے مولانا عبداللطیف اور معراج محمد بارق صاحب سے اس کی معمولی ترمیم اور نظر ثانی کرائی اور اس

ترجمہ کو متن کے ساتھ شائع کیا مگر اس کی جلد اول میں یہ جدت کی گئی ہے کہ ترجمہ کو اصل قرار دے کر متن کے خلاف معمولی بائیں کالم میں رکھا ہے۔ اصح المطابع کا یہ نسخہ خاصے اہتمام سے دو جلدوں میں چھپا ہے، مگر اس پر سنہ طباعت درج نہیں۔

2- آیات اللہ الکاملہ از مولانا خلیل احمد اسرائیلی

''حجتہ اللہ'' کا دوسرا اردو ترجمہ ''آیات اللہ الکاملہ'' ہے۔ یہ ترجمہ مولانا خلیل احمد سنبھلی اسرائیلی مقیم علی گڑھ کی یادگار ہے اور پہلی مرتبہ کتب خانہ اسلامی پنجاب کے زیر اہتمام، مطبع اسلامی لاہور سے 1315ھ (1897ء) میں چھپا تھا۔ یہ بھی صرف ترجمہ ہے۔ اس کی اشاعت میں بھی متن شامل نہیں، یہ ترجمہ چھ سو بیس صفحات کی ایک جلد میں مکمل ہو گیا ہے۔ اس ترجمہ کا دوسرا ایڈیشن حمایت الاسلام پریس لاہور سے 1322ھ میں چھپا تھا۔ مندرجہ بالا دونوں ترجمے بعد میں کئی مرتبہ چھپے ہیں اور چھپتے رہتے ہیں۔ نئے ترجموں کی اشاعت کے باوجود ان کی اپنی اہمیت ہے کیونکہ درحقیقت دونوں ترجمے (نعمت اللہ السابغہ اور آیات اللہ الکاملہ) بعد کے تمام ترجموں کی بنیاد ہیں بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بعد میں شائع اکثر ترجمے ان ہی ترجموں کا چربہ، نقل یا ان کی تزئین و تکمیل ہیں۔

3- شموس اللہ البازغہ از مولانا عبدالحق ہزاروی

تیسرا ترجمہ ''شموس اللہ البازغہ'' کے عنوان سے مولانا عبدالحق ہزاروی کے نام سے شیخ الٰہی بخش محمد جلال الدین تاجران کتب لاہور نے حمایت الاسلام پریس، لاہور میں طبع کرایا تھا۔ یہ ترجمہ پہلی مرتبہ 1351ھ (33-1932ء) میں دو جلدوں میں چھپا تھا، اس میں اوپر متن ہے نیچے ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ بھی کئی بار چھپا ہے۔ مصحح کتاب نے آخری صفحہ پر لکھا ہے کہ مترجم کے سامنے مطبع خیریہ، مصر کا 1323ھ نسخہ رہا ہے لیکن اس ترجمہ کے تذکرہ کے ساتھ یہ وضاحت ضروری ہے کہ ابتدائی صفحات کے ترجمہ میں معمولی ترمیمات کے علاوہ یہ لفظ بلفظ آیات اللہ الکاملہ مولانا خلیل احمد اسرائیلی کے ترجمہ کی نقل ہے۔ اس ترجمہ کی پہلی طباعت کا ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں ہے۔

4- نعمتہ اللہ السابغہ از مولانا عمادالدین شیرکوٹی

یہ ترجمہ (1360ھ-1940ء) کے قریب مولانا عمادالدین انصاری شیرکوٹی (شیرکوٹ ضلع بجنور یوپی) کے نام سے کتب خانہ انصاریہ جالندھر، پنجاب سے دو جلدوں میں چھپا تھا۔ یہ ترجمہ میری نظر سے نہیں گزرا مگر اس کے ابتدائی آٹھ صفحات جو کتب خانہ انصاریہ نے نمونہ کے طور پر چھپوائے تھے، میرے سامنے موجود ہیں۔ تاہم مولانا عمادالدین شیرکوٹی (وفات محرم 1383ھ-جون 1963ء)[42] کے صاحبزادے مولانا سعیدالدین صاحب شیرکوٹی (مقیم حال پشاور، پاکستان) نے راقم کے ایک خط کے جواب میں لکھا ہے کہ یہ مکمل ترجمہ میرے بچپن میں چھپا تھا۔ چونکہ مکمل نسخہ دستیاب نہیں ہوا، اس لئے معلوم نہیں کہ مترجم نے اس کے مقدمہ میں اپنے اس ترجمہ کی نسبت کیا لکھا ہے مگر یہ ترجمہ بھی مولانا خلیل احمد

اسرائیلی کے ترجمہ کی تجدید و تزئین ہے، مستقل ترجمہ نہیں۔

نمونہ کے صفحات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عمادالدین شیرکوٹی نے مولانا خلیل احمد اسرائیلی کے ترجمہ کو نیا اور تازہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اگر پورا ترجمہ ایسا ہی ہو جیسا کہ نمونہ کے ابتدائی آٹھ صفحات سے معلوم ہوتا ہے تو یہ اس وقت تک کے پرانے تمام ترجموں سے بہتر ہوگا، اس کی کتابت بھی کھلی کھلی عمدہ اور نہایت مرتب ہے۔

5- ترجمہ ''حجتہ اللہ'' از مولانا عبدالرحیم پشاوری

مولانا عبدالرحیم (ساکن کلاچی، ضلع ڈیرہ اسماعیل خان) پروفیسر علوم اسلامیہ، اسلامیہ کالج پشاور (وفات 6ذی الحجہ 1369ھ۔19 ستمبر 1950ء) نے بھی ''حجتہ اللہ'' کا ایک عمدہ ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ (8 جمادی الثانی 1366ھ۔30 اپریل 1947ء) کو مکمل ہوا تھا۔ (رجب 1367ھ۔27 مئی 1949ء) کے وسط میں دو جلدوں میں شائع ہوا تھا۔ یہ ''حجتہ اللہ'' کے معروف اور مقبول ترین ترجموں میں سے ہے، اس کا ایک عمدہ ایڈیشن قومی کتب خانہ، لاہور نے (1404ھ۔1984ء) میں شائع کیا تھا جو راقم السطور کے سامنے ہے۔ یہ اشاعت آٹھ آٹھ سو صفحات کی دو جلدوں میں ہے جس میں متن شامل نہیں۔

6- برہان الٰہی ترجمہ ''حجتہ اللہ'' از مولانا ابوالعلاء اسماعیل گودھری

مولانا اسماعیل گودھری نے حضرت شاہ ولی اللہ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ مجھے مولانا ابوالکلام آزاد نے ''حجتہ اللہ'' کے (اردو) ترجمہ کی طرف توجہ دلائی تھی۔ بعد میں مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا محمد منظور نعمانی جیسے علماء نے (جو فکر ولی اللّٰہی کے دیدہ ور عالم اور ''حجتہ اللہ'' کے مطالب و مباحث کے ماہر تھے) بھی مولانا گودھری سے ترجمہ کے لئے اصرار کیا۔ مولانا گودھری نے ان فرمائشوں کی تعمیل میں یہ ترجمہ کیا ہے۔ مولانا اسماعیل نے پرانے ترجموں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''اس کتاب کے اردو ترجمے پہلے بھی ہو چکے ہیں لیکن وہ ترجمے کیا ہیں، ایک چیستان ہیں جن میں مغلق مقامات کو اور بھی زیادہ مغلق کر دیا گیا ہے۔ اکثر الفاظ مفردہ کا ترجمہ الفاظ مفردہ سے کیا گیا ہے۔ اس سے مطلب کی وضاحت تو درکنار الجھاؤ بڑھ گیا ہے۔ ایسے مقامات کو جملوں اور سطروں سے واضح کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تحت اللفظ یا تحت اللفظ جیسا ترجمہ اس کتاب کے شان کے خلاف ہے۔''(43)

مولانا گودھری کا یہ ترجمہ بظاہر (1370ھ۔1950ء) کے بعد مکمل ہوا ہے۔ اس کی پہلی اشاعت جو دو جلدوں پر مشتمل ہے، شیخ غلام نبی اینڈ سنز، لاہور نے شائع کی تھی۔ اس پر سنہ طباعت و تالیف درج نہیں، اس اشاعت کی پہلی جلد 528 صفحات اور جلد ثانی 575 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ بھی صرف ترجمہ ہے، اس میں بھی متن شامل نہیں مگر مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری کی رائے یہ ہے کہ مولانا گودھری کا بعض مقامات کا ترجمہ درست نہیں، اس میں بھی ایسی ہی

فروگذاشتیں ہیں جو اور اردو ترجموں میں ہیں۔

7- ترجمہ از مولانا منظور الوحیدی

''حجتہ اللہ'' کا آخری ترجمہ وہ ہے جو مولانا منظور الوحیدی نے کیا ہے۔ مترجم اس خدمت سے (1391ھ-1971ء) میں فارغ ہوئے تھے۔ یہ ترجمہ بھی دو جلدوں میں ہے۔ اس کے ساتھ متن بھی چھپا ہے اور اس کے متعلق مترجم نے دعویٰ کیا ہے کہ اس نسخہ میں شامل متن کی ''حجتہ اللہ'' کی چار پانچ مطبوعہ نسخوں کی مدد سے تصحیح کی گئی ہے، پھر ترجمہ کیا گیا ہے۔

یہ ترجمہ بھی پہلی مرتبہ شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور نے شائع کیا تھا۔ اس کی اشاعت 1979ء میں ہوئی تھی۔ پہلا ایڈیشن دو جلدوں میں ایک ہزار اٹھارہ (1018) صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ترجمہ ہندوستان میں بھی چھپ گیا ہے۔
8- ایک تازہ ترجمہ مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری کا ہے، اس کا تعارف شروح کے ضمن میں آ رہا ہے۔

ناتمام ترجمے

''حجتہ اللہ'' کے ان ترجموں کا ذکر ہو چکا جو ''حجتہ اللہ'' کے مکمل متن کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ چند ترجمے ایسے بھی ہیں جو کسی وجہ سے مکمل نہ ہو سکے۔ ایسا ایک اہم ترجمہ محمد بشیر صاحب کا ہے، یہ ترجمہ جس میں مختصر تشریحات و حواشی بھی ہیں، کا ذکر مولانا عبدالحق حقانی کے مقدمہ میں معراج محمد بارق صاحب نے کیا ہے۔ [44] نامور عالم مولانا محمد داؤد غزنوی نے ''حجتہ اللہ'' کے باب شرک کی اردو میں شرح لکھی تھی جو ''حقیقت شرک'' کے نام سے طبع ہوئی تھی۔

تلخیص ''حجتہ اللہ''

''حجتہ اللہ'' کا اردو میں ایک خلاصہ بھی چھپا ہے۔ یہ تلخیص سید رضی الدین احمد صاحب فخری نے مرتب فرمائی ہے۔ سید صاحب پاکستان کے ایک شیخ طریقت ہیں، اس تلخیص پر مولانا حبیب اللہ مختار (شہید) کا مقدمہ بھی ہے۔ یہ تلخیص (1416ھ-1996ء) میں کراچی سے چھپی تھی۔ بعد میں اسی اشاعت کا عکس دہلی سے بھی چھپ گیا ہے۔

شروح

1- شرح از مولانا عبید اللہ سندھی

اردو میں تراجم و تلخیصات کے علاوہ ''حجتہ اللہ'' کی کم سے کم دو شرحیں بھی ہیں۔ پہلی شرح جو مختصر ہے، مولانا عبید اللہ سندھی کی یادگار ہے۔ یہ شرح اصل میں مولانا کے ''حجتہ اللہ'' کے متعلق افادات کا ایک مجموعہ ہے جو مولانا کے کسی نیاز مند نے مرتب کیا ہے، مگر اس پر مرتب کا نام موجود نہیں۔

مولانا سندھی کے ''حجتہ اللہ'' کے متعلق افادات متعدد اصحاب نے مختلف اوقات میں جمع اور قلم بند کیے تھے جس میں ایک مجموعہ افادات جس کو عمدہ شرح کہنا چاہیے (تعارف گزر گیا ہے) اسی طرح کا افادات کا ایک اور مجموعہ سندھ یونیورسٹی جام شورو کے شعبہ مخطوطات میں موجود ہے[44] اور اسی سلسلہ کی ایک کڑی یا شاید نسخہ جام شورو کی نقل یہ مجموعہ ہے جس کو شرح کے نام سے شائع کیا گیا ہے مگر اس کو شرح کہنا مشکل ہے۔ اس شرح کا جو نسخہ راقم کے سامنے ہے' اس کو دیکھ کر تو یہ خیال ہوتا ہے کہ غالباً مولانا کے افادات کو ہمارے دور کے کسی فاضل نے (جو مغربی افکار سے خاصے متاثر ہیں) شرح کی صورت میں مرتب کر دیا ہے' اس پر جو حاشیے لکھے گئے ہیں' وہ تو بالکل ہی نئے ہیں اور تازہ معلومات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ دوسرے اس شرح سے اگرچہ حضرت شاہ صاحب کے بعض نظریات اور علوم کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے مگر کامل مفہوم کا ادراک مشکل ہے۔ بہرحال یہ شرح ''حجتہ اللہ'' اردو درمیانی پیمائش 18-20/8 کے سوا دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ نومبر 1996ء میں لاہور سے چھپی ہے۔

2- مولانا سندھی کی ایک اور شرح

مولانا سندھی کے افادات پر مبنی ''حجتہ اللہ'' کی ایک اور شرح سندھ ساگر اکیڈمی' لاہور سے تقریباً 1953ء میں چھپی تھی' یہ نسخہ مجھے نہیں ملا۔ اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ دونوں ایک ہی ہیں یا علیحدہ علیحدہ۔ بظاہر وہ مستقل کتاب ہے کیونکہ اس تازہ اشاعت میں قدیم شاعت کا ذکر بلکہ حوالہ یا اشارہ بھی نہیں۔

3- حجتہ اللہ الواسعہ شرح حجتہ اللہ از مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری

حجتہ اللہ کی ایک مفصل اور جامع شرح دارالعلوم دیوبند کے نامور استاد اور مشہور عالم مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری نے لکھی ہے جس کا نام ''رحمتہ اللہ الواسعہ'' رکھا ہے۔ اس شرح میں سب سے پہلے تصحیح متن کی کوشش کی گئی ہے۔ حل لغات ہے' ضروری نحوی ترکیب اور ضمیروں کے مرجع واضح کیے گئے ہیں' پھر ترجمہ ہے۔ اس کے بعد اس کی مفصل شرح کی گئی ہے۔ مقصد اول کی شرح مکمل ہو گئی ہے جو کمپوز ہو کر بڑے سائز کے پندرہ سو صفحات پر آئی ہے۔ مقصد ثانی کی شرح پر کام ہو رہا ہے جو امید ہے کہ ایک ہزار صفحات میں مکمل ہو گی۔ مولانا کا اس پر سوڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل مفصل مقدمہ لکھنے کا ارادہ ہے۔ انشاء اللہ اس شرح کی جلد اول کا نصف اول جو آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے' اشاعت کے لئے تیار ہے۔ مکمل شرح دو ڈھائی سال میں مکمل ہو کر شائع ہو جائے گی۔

''حجتہ اللہ'' کا فارسی میں بھی غالباً ایک ترجمہ ہوا ہے اور کم سے کم چار ترجمے انگریزی میں کیے گئے جن میں سے دو مکمل ہو گئے تھے۔ ایک ترجمہ وہ جو مولانا عبید اللہ سندھی نے کرایا تھا اور اس کا تقریباً ایک تہائی حصہ شائع بھی ہو گیا تھا۔ دوسرا جو محمود حسن خاں رام پوری نے کیا اور پروفیسر حبیب اللہ غضنفر امروہوی (کراچی نے) ڈاکٹر سید معین الحق کی فرمائش پر اس کی نظر ثانی فرمائی تھی۔ اس کے علاوہ سیاسیات و عمرانیات کے موضوعات سے متعلق مباحث کا ایک نیا ترجمہ ڈاکٹر محمد غزالی نے اپنی کتاب Socio-Political Thought of Shah Waliullah میں شامل کیا ہے جو اسلام آباد'

پاکستان سے چھپا ہے مگران ترجموں کا ذکر ہمارے موضوع سے خارج ہے۔
(فکرونظر.....اسلام آباد۔ اکتوبر تا دسمبر 2001ء، ص 57-90)

✦ ..... ✦ ..... ✦
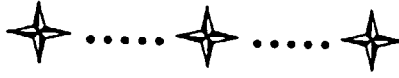
حواشی

(1) اس نسخہ کا مکمل فوٹو اسٹیٹ دارالعلوم دیو بند کے نامور و ممتاز عالم اور محدث و مدرس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری کے نسخہ ذاتی میں ہے جو راقم السطور کو مولانا مدظلہ کی خاص عنایت سے دیکھنے کو ملا۔ یہاں یہ اطلاع ضروری اور مفید ہو گی کہ مولانا پالن پوری ''حجۃ اللہ البالغہ'' کی شرح لکھ رہے ہیں۔ مولانا نے ''حجۃ اللہ'' کے صحیح متن کی تحقیق کے لئے (تقریباً پینتالیس ہزار روپے خرچ کر کے) ''حجۃ اللہ'' کے تین قلمی نسخوں کے مائیکروفلم یا فوٹو اسٹیٹ فراہم کیے ہیں۔ نیز اس نسخہ کا مولانا غلام مصطفیٰ صاحب قاسمی نے مقدمہ ''التفہیمات الالٰہیہ'' میں مختصر تعارف کرایا ہے۔ ''التفہیمات الالٰہیہ'' مقدمہ ص 18-19 'جلد 1 (حیدرآباد' سندھ:1390ھ)

(2) اس نسخہ کی تفصیلات مجھے نہیں ملیں۔ اس کا بھی مولانا غلام مصطفیٰ صاحب قاسمی نے ذکر کیا ہے۔ مقدمہ ''التفہیمات الالٰہیہ'' صفحہ 19۔ جلد 1۔

(3) ''مولانا عبیداللہ سندھی کی خدمت میں چند روز'' مضمون از مولانا زاہد الحسینی صاحب ماہ نامہ الولی' حیدرآباد (سندھ) ''مولانا عبیداللہ سندھی نمبر'' شمارہ اگست۔ ستمبر 1994ء۔ صفحہ 90 نیز ملاحظہ ہو الشمس البازغہ شرح ''حجۃ اللہ البالغہ''۔ قلمی

(4) اس نسخہ کا خدا بخش لائبریری' پٹنہ کی فہرستوں کے علاوہ لائبریری کے قائم مقام لائبریرین جناب سلیم الدین صاحب کے مضمون ''شاہ ولی اللہ کے مخطوطات خدا بخش لائبریری میں'' بھی ذکر ہے۔ خدا بخش لائبریری جرنل۔

(5) اس نسخہ کا ڈاکٹر زبید احمد صاحب نے بھی ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' ترجمہ شاہد حسین رزاقی۔ صفحہ 286۔ (لاہور:1973ء)

(6) ملاحظہ ہو: ''دہلی کی درگاہ شاہ ابوالخیر کے مخطوطات کی فہرست'' مرتبہ شائستہ خاں' صفحہ 12 (پٹنہ:1996ء)

(7) مولانا عبیداللہ سندھی نے اس نسخہ پر لکھا ہے: ''ورویناہ عن الشیخ عبدالستار بن عبدالوھاب الدھلوی المکی' عن الشیخۃ الصالحۃ خدیجہ بنت الصدر الحمید مولانا محمد اسحاق'' (کتبہ عبیداللہ بن الاسلام)

(8) مولانا امیر حیدر کے تعارف کے لئے ملاحظہ ہو: ''نزہۃ الخواطر۔ مولانا عبدالحیٔ حسنی'' صفحہ 81۔ جلد 7 (حیدرآباد' دکن: 1378ھ)

(9) تذکرہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی۔ صفحہ 193۔195 (لکھنؤ:1992ء)

(10) فہرست مخطوطات دارالعلوم' دیو بند۔ مرتبہ مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب۔ دو جلدیں (دیو بند:1393ھ۔1973ء)

(11) ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' ترجمہ شاہد حسین رزاقی۔ صفحہ 286 نیز صفحہ 346 (لاہور:1973ء)

(12) مقدمہ التفہیمات الالٰہیہ' صفحہ 19۔ جلد 1 (حیدرآباد' سندھ:1390ھ)

(13) ملاحظہ ہو: فہرست کتب خانہ خدیو مصر' مرتبہ حسنین محمد' صفحہ 219 جلد اول (طبع اول' مصر:1301ھ)

(14) فہرست کتب خانہ ریاست رام پور' مرتبہ حکیم محمد اجمل خاں' صفحہ 334' جلد 1 (رامپور:1902ء)

(15) فہرست کتب خانہ رام پور' مرتبہ احمد علی خاں شوق (رام پور:1928ء) وغیرہ۔ نیز راقم السطور نے زیر نظر صفحات کی ترتیب کے دوران

رضالائبریری رام پور کے ذمہ داران سے رابطہ کر کے اطمینان کرلیا ہے کہ رضالائبریری میں "حجتہ اللہ" کا قلمی نسخہ موجود نہیں ہے۔

(16) منشی نعیم الدین اور منشی امین الدین پنجاب (موجودہ ہریانہ انڈیا) کے رہنے والے تھے۔کلکتہ میں وسیع کاروبار تھا اور کلکتہ کے ممتاز دولت مندوں اور بڑے تاجروں میں گنے جاتے تھے۔حضرت سید احمد شہید کے سفرِ حج کے موقع پر سید صاحب کے متعلق مفصل خط و کتابت بھی کی تھی۔یہ خطوط بھی محفوظ ہیں۔

(17) مکتوب منشی نعیم الدین صاحب' بنام حضرت شاہ عبدالعزیز' مندرجہ مجموعہ تحریرات وفتاوی ورسائل ومولفات حضرت شاہ ولی اللہ شاہ صاحب عبدالعزیز و برادران شاہ عبدالعزیز وشاہ محمد اسماعیل' مولانا عبدالحیٰ (رحمہم اللہ تعالیٰ) وغیرہ مکتوبہ ومرتبہ کریم اللہ بن خلیل اللہ ڈار کشمیری' مکتوبہ 1241ھ صفحہ 485۔یہ مجموعہ فل اسکیپ سائز کے تقریباً چھ سوصفحات پر مشتمل ہے اور اس کی مکمل اور صاف فوٹوسٹیٹ راقم کے پاس ہے۔یہاں یہ بھی عرض کر دینا چاہیے کہ یہ کریم اللہ حضرت شاہ محمد اسحاق کے زرخرید تھے۔انہوں نے حضرت محمد اسحاق کی کنیز بلکہ ام ولد کا دودھ بھی پیا تھا۔اس طرح شاہ محمد اسحاق کے رضاعی بیٹے ہوئے اور اس خط کا جواب حضرت شاہ عبدالعزیز کے ارشاد کے مطابق شاہ محمد اسحاق نے لکھا تھا۔

(18) بیاض مولانا رشید الدین خاں کشمیری دہلوی (یعنی مجموعہ مکتوبات وتحریرات وغیرہ۔حضرت شاہ ولی اللہ وحضرت شاہ عبدالعزیز وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ) مرتبہ مکتوبہ مولانا رشید الدین خاں (وفات محرم 1243ھ) ورق 29ب (فوٹو اسٹیٹ مملوکہ راقم السطور)

(19) مولانا محمد احسن نانوتوی اور ان کے مطبع صدیقی بریلی کے تعارف اور خدمات کے لئے دیکھیے: مولانا محمد احسن نانوتوی۔از ڈاکٹر محمد ایوب قادری (کراچی: 1966ء)

(20) ایضاً۔

(21) مولانا منشی جمال الدین بن وحید الدین صدیقی کتانوی' (کتانہ ضلع میرٹھ میں دہلی سہارنپور روڈ پر ایک چھوٹی سی بستی ہے جو پاکستان کے سابق فوجی سربراہ جنرل پرویز مشرف کا آبائی وطن بھی ہے۔)

1217ھ (3-1802ء) میں ولادت ہوئی۔دہلی میں مولانا مملوک العلی' مولانا شاہ محمد یعقوب اور مولانا شاہ محمد اسحاق سے تعلیم حاصل کی۔حضرت شاہ عبدالعزیز اور ان کے برادران گرامی سے کثیر استفادہ کیا۔

بیگم بھوپال' نواب سکندر جہاں بیگم نے مولانا سے نکاح کرلیا تھا۔مولانا نے علوم اسلامیہ کی ترویج واشاعت کے لئے بہت خدمات انجام دیں۔منشی جی کی کوشش وتوجہ سے ہندوستان میں قرآن کریم' تفاسیر اور حدیث شریف کی شروحات کی اشاعت میں غیر معمولی مدد ملی۔تذکرہ نگار منشی جی کے محامد وکمالات کے تذکرہ میں رطب اللسان ہیں' رحمہ اللہ تعالیٰ۔سنہ 1299ھ میں بھوپال میں وفات پائی۔

مزید معلومات کے لئے: نزہتہ الخواطر' صفحہ 124-123۔جلد 7 (حیدرآباد: 1378ھ)

(22) تعارف کے لئے نزہتہ الخواطر۔صفحہ 39-40 جلد 7۔

(23) نزہتہ الخواطر۔صفحہ 199-200۔جلد 7۔

(24) ایضاً' صفحہ 188-189۔جلد 7۔

(25) ایضاً۔صفحہ 39-40۔جلد 8 (حیدرآباد: 1390ھ)

(26) حجتہ اللہ البالغہ' صفحہ 143 (طبع اول' بریلی: 1286ھ)

(27) حجتہ اللہ البالغہ۔حاشیہ صفحہ 145۔طبع اول۔

(28) ایضاً۔

(29) ایضاً۔

(30) مثلاً ملاحظہ ہو: ''باب اذکار الصلوٰۃ وھیاتھا المندوبۃ الیھا'' کے تحت کنقد الدیك پر مولانا محمد احسن کا حاشیہ۔ حجۃ اللہ صفحہ 1205 (طبع اول مطبع صدیقی' بریلی: 1286ھ)

(31) حجۃ اللہ' حاشیہ' صفحہ 145 (طبع اول: 1286ھ)

(32) ایضاً۔ صفحہ 167۔

(33) ایضاً۔

(34) ایضاً۔ صفحہ 384۔

(35) ایضاً۔ صفحہ 385۔

(36) تراجم علمائے حدیث ہند۔ مولفہ مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی۔ صفحہ 379-380 (طبع اول: دہلی: 1356ھ) نیز ہندوستان میں اہلحدیث کی علمی خدمات' مولانا ابو یحییٰ امام خاں' صفحہ 50۔

(37) مولانا محمد حسین بن محمد اسماعیل بنتی' دہلوی 1243ھ (28-1827ء) میں چیچہ وطنی میں پیدا ہوئے۔ مولانا سید محبوب علی جعفری اور مولانا احمد علی محدث سہارنپوری وغیرہ سے تعلیم حاصل کی۔ شعر و ادب میں ابراہیم ذوق سے استفادہ کیا اور حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی سے سلوک و معرفت میں استفادہ کیا۔ سنہ 1294ھ میں ترکی کا سفر کیا۔ شاذلی سلسلہ کے شیخ سید محمد ظافر شاذلی کی خدمت میں دو سال حاضر رہے اور استفادہ کیا۔ متعدد تالیفات علمی یادگار ہیں۔ 22 رمضان 1324ھ (10 نومبر 1906ء) کو وفات ہوئی۔ ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر۔ صفحہ 423۔ جلد 8۔

(38) شیخ ابراہیم دسوقی کے مختصر تعارف کے لئے دیکھیے: الاعلام' خیر الدین الزرکلی۔ صفحہ 48۔ جلد 1 (طبعہ رابعہ' بیروت: 1979ء)

(39) الشمس البازغہ شرح حجۃ اللہ البالغہ قلمی۔ مرتبہ و مکتوبہ عبداللہ بن نہال و محمد صدیق سہارنپوری' سنہ 1353ھ (1940ء) باب المقامات والاحوال' صفحہ 78۔ نسخہ مملوک مولانا عبدالقدر صاحب چشتیاں (پاکستان) فوٹو اسٹیٹ در ذخیرہ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری۔

(40) ''مولانا عبیداللہ سندھی کی خدمت میں چند روز''، مضمون مولانا زاہد الحسینی صاحب' ماہ نامہ الولی حیدر آباد' سندھ۔ مولانا عبیداللہ سندھی نمبر۔ صفحہ 90 اگست۔ ستمبر 1994ء۔

(41) مولانا عماد الدین بن شیخ محمد حسین' انصاری' سنہ 1301ھ میں شیر کوٹ ضلع بجنور میں تولد ہوئے۔ دیوبند میں تعلیم حاصل کی۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ممتاز ترین تلامذہ میں سے تھے۔ دار العلوم میں مدرس رہے۔ عربی اردو میں چھتیس کتابوں کے مصنف تھے۔ عرصہ دراز تک مطبع قاسمی دیوبندی کے مہتمم اور ماہنامہ ''القاسم'' کے عملاً مدیر رہے۔ جالندھر میں کتب خانہ انصاریہ کے نام سے اعلیٰ درجہ کا طباعتی اشاعتی ادارہ قائم کیا۔ سنہ 1947ء کے بعد پشاور چلے گئے تھے' وہیں وفات ہوئی۔ نیز ملاحظہ ہو علماء العرب فی شبہ القارۃ السندیہ' یونس شیخ السامرائی' صفحہ 851 (بغداد: 1986ء)

(42) برہان الٰہی' مولانا ابو العلاء گودھروی' مقدمہ صفحہ 23۔ جلد 1۔ طبع اول' لاہور۔

(43) مقدمہ' ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ' مولانا ابو محمد عبدالحق حقانی از معراج محمد بارق صاحب' صفحہ 14۔ جلد 1۔ قاموس الکتب (اردو) بابائے اردو' مولوی عبدالحق' صفحہ 4308۔ صفحہ 453۔ جلد 1 کراچی' نور محمد' کراچی: میں بھی اس کا ذکر ہے۔

(44) متفرق مخطوطات جامعہ سندھ' مجلہ تحقیق (شعبہ اردو' جامعہ سندھ' جام شورو' حیدر آباد) شمارہ نمبر 4 (1990ء) صفحہ 244۔

خلیق احمد نظامی (مترجم)

شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات

مکتوبِ اول...... بجانب بادشاہ و وزیر و امراء

بعد حمد وصلوٰۃ یہ چند کلمات ہیں جن کی تحریر کا باعث بادشاہِ اسلام، امراء اور جمہور مسلمین کی خیر خواہی ہوئی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "خیر خواہی دین ہے۔" اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے امید ہے کہ اگر ان کلمات کے بموجب عمل کریں گے تو امورِ سلطنت کی تقویت، حکومت کی بقاء اور عزت کی بلندی ظہور پذیر ہوگی۔

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
اُنچہ اُستادِ ازل گفت ہماں می گویم

(یعنی مجھ کو آئینہ کے پیچھے طوطی کی مانند رکھا ہے، جو کچھ "اُستادِ ازل" نے کہا ہے، وہی کہتا ہوں۔)

کلمۂ اول:۔ اصل اصول جس پر حکومت کی بہتری اور ملت بیضا کی رونق موقوف ہے، یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اور اس کے رسول حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی کے لئے یہ بات لازم کرلیں کہ جب فتح یابی نصیب ہو اور مخالف شکست یافتہ ہو تو سب سے پہلی چیز جس کے اجراء کا مضبوط ارادہ کریں، جاٹوں کے علاقے اور ان کے قلعوں کے فتح کرنے کی جدوجہد ہو۔ اس کام میں دینی و دنیاوی دونوں فائدے ہیں۔ منجملہ ان ضروری کاموں کے "بدمعاشوں" کی سرزنش کرنا بھی ہے تاکہ کوئی زمیندار اس قسم کی شوخی اور بے باکی کا خیال بھی نہ لائے۔

کلمہ دوئم:۔ یہ کہ خالصہ کو کشادہ تر کرنا چاہیے۔ خصوصاً وہ علاقہ جو دہلی کے اردگرد ہے، آگرہ، حصار، دریائے گنگ اور حدودِ سہرند تک سب کا سب علاقہ یا اس میں کا اکثر خالصہ ہو کیونکہ امورِ سلطنت میں ضعف کا سبب خالصہ کی کمی اور خزانہ کی قلت ہوا کرتی ہے۔

کلمۂ سوم:۔ یہ کہ جاگیر عطا کرنا بڑے بڑے امراء کے لئے مخصوص ہو۔ چھوٹے چھوٹے منصب داروں کو نقد دینا چاہیے (جاگیر نہ دی جائے) جیسا کہ عہد شاہجہاں میں قاعدہ تھا۔ اس لئے کہ چھوٹے منصب دار جاگیروں پر قابو نہیں پاتے۔ اسی لئے ٹھیکہ دینے کی احتیاج ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے وہ اکثر اوقات مفلس رہتے ہیں اور اپنے آپ کو کارہائے پادشاہی میں پوری طرح مشغول نہیں کرسکتے۔

کلمۂ چہارم:۔ یہ کہ جو لوگ اس فتنہ میں غنیم کے ساتھی ہوئے ہیں ضروری ہے کہ ان کو جاگیر و منصب اور خدمت

سے بے دخل کر دیں تا کہ ان کے لئے یہ چیز سزا کے قائم مقام ہو جائے اور دوسرے لوگ اس قسم کے مواقع پر ''حق نمک''
کی ادائیگی کے راستے سے نہ بھٹکیں۔

کلمۂ پنجم:۔ یہ کہ افواجِ بادشاہی کی ترتیب عمدہ طریقہ پر کرنی چاہیے اور یہ ترتیب تین طریقوں سے ہو سکتی ہے۔

(1) وہ داروغہ مقرر کیے جائیں جو مندرجہ ذیل تین صفتوں سے متصف ہوں۔

الف۔ نجیب ہوں۔

ب۔ بہادر ہوں اور اپنے ساتھیوں پر شفیق ہوں۔

ج۔ تہ دل سے بادشاہ کے خیر ہوں۔

(2) جن لوگوں سے اس فتنہ میں بے غیرتی اور نمک حرامی سرزد ہوئی ہے' ان کو معزول کر کے دوسروں کو داخلِ رسالہ کیا جائے۔

(3) یہ کہ ملازموں کی تنخواہیں بغیر تاخیر کے ان کو ملنی چاہئیں۔ اس لئے کہ تاخیر کی صورت میں وہ لوگ سودی قرض لینے پر مجبور ہوتے ہیں اور ان کا اکثر مال ضائع ہو جاتا ہے۔

کلمۂ ششم:۔ ''خالصہ'' سے ٹھیکہ دہندگی کی رسم موقوف کر دی جائے۔ دیندار' واقف کار امین ہر جگہ مقرر کر دیئے جائیں۔ ٹھیکہ دینے میں ملک خراب ہوتا ہے اور رعیت پامال و بدحال ہو جاتی ہے۔

کلمۂ ہفتم:۔ یہ کہ قاضی و محتسب ایسے لوگوں کو بنایا جائے جو رشوت ستانی کی تہمت نہ لگائے گئے ہوں اور مذہب اہلِ سنت و جماعت رکھتے ہوں۔

کلمۂ ہشتم:۔......................

کلمۂ نہم:۔ آئمہ مساجد کو اچھے طریقہ پر تنخواہ دی جائے۔ نماز باجماعت کی حاضری کی تاکید اور ماہِ رمضان کی بے حرمتی کی ممانعت پورے طور پر کی جائے۔

کلمۂ دہم:۔ یہ کہ بادشاہِ اسلام اور امراءِ عظام ناجائز عیش و عشرت میں مشغول نہ ہوں۔ گذشتہ گناہوں سے سچے دل سے توبہ کریں اور آئندہ گناہوں سے بچتے رہیں۔ بالفعل اگر ان دس کلمات پر عمل کریں گے' مجھے امید ہے کہ بقائے سلطنت' تائیدِ غیبی اور نصرتِ الٰہی میسر ہو گی۔ **وماتوفیقی الا باللہ علیہ توکل و الیہ انیب۔**
یعنی مجھے توفیق اللہ ہی سے حاصل ہو گی اور اسی کی ذات پر میرا توکل ہے اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔

مکتوبِ دوئم...... کسی بادشاہ کے نام

بعد حمد و صلوٰۃ کے یہ چند کلمات ہیں جن کے لکھے جانے کا باعث اسلامی حمیت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کلمات کو گوشِ مبارک تک پہنچا دے۔

بادشاہانِ اسلام کا وجود اللہ تعالیٰ کی ایک زبردست نعمت ہے۔ جاننا چاہیے کہ ملکِ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے۔ قدیم اسلامی بادشاہوں نے بڑی مدت میں بڑی جدوجہد کے بعد کئی دفعہ میں جا کر اس ولایت کو فتح کیا ہے۔ علاوہ

دہلی کے جو صاحبِ اقتدار پادشاہوں کا مستقر رہی ہے، ہر علاقہ میں علیحدہ علیحدہ فرمانروا تھے۔ مثلاً گجرات، احمد آباد کا علاقہ ایک علیحدہ حکمران سے تعلق رکھتا تھا۔ ٹھٹھہ کا دوسرا بادشاہ تھا۔ بنگالہ ایک اور حاکم کے زیر حکومت تھا۔ اودھ جدا ایک شخص کے زیر اقتدار تھا جس کو سلطان الشرق یعنی پورب کا بادشاہ کہتے تھے۔ ملکِ دکھن پانچ حسب ذیل سلطنتوں کا مجموعہ تھا۔

(1) برہان پور (2) برار (3) اورنگ آباد (4) حیدر آباد (5) بیجاپور

ان پانچ سلطنتوں میں سے ہر سلطنت کا ایک جداگانہ مستقل بادشاہ تھا۔

مالوہ کا بھی حکمران علیحدہ تھا اور تمام مذکورہ علاقہ جات میں سے ہر ایک علاقہ کا بادشاہ مستقل طور پر صاحبِ فوج اور صاحبِ خزانہ ہوتا تھا۔

ہر ایک بادشاہ نے اپنی اپنی مملکت میں مسجدیں تعمیر کرائیں۔ مدرسے قائم کیے، عرب و عجم کے مسلمان اپنے اپنے وطنوں سے منتقل ہو کر ان علاقوں میں آ گئے اور یہاں اسلام کی ترویج و اشاعت کا باعث بنے۔ اس وقت تک ان لوگوں کی اولاد اسلام کے طور و طریقہ پر قائم ہے۔ ایک اور ملک بھی ہے جو کبھی کسی بادشاہِ اسلام کے قبضہ میں نہیں آیا اور وہ اپنے خالص غیر مسلمانہ طریقہ پر باقی رہا۔ اتنا ضرور ہوا کہ بادشاہ ان راجاؤں سے جو ان کے حدود میں تھے، خراج لیا کرتے تھے۔ یہ ملک جس کا تذکرہ ہو رہا ہے، راجپوتانہ کا ملک ہے۔ اس ملک کا طول حدودِ ٹھٹھہ سے لے کر حدودِ بنگال و بہار تک چالیس منزل ہے اور عرضِ دہلی و آگرہ سے لے کر گجرات و اجین کی حد تک بیس منزل ہے۔ یہی وہ باوسعت ملک ہے جو کبھی ملوکِ اسلامیہ کی نشست گاہ نہیں بنا۔ قصہ مختصر بادشاہانِ مغلیہ نے راجپوتوں سے معاہدہ کر لیا اور اس گروہ کو اپنا ماتحت قرار دے کر ان کی مخالفت سے مامون و محفوظ ہو گئے اور جنگ سے دست کشی اختیار کر لی۔ واقفانِ فن تاریخ تفصیلی طور پر ان واقعات کو بیان کریں گے۔

غیر مسلموں میں ایک قوم مرہٹہ نامی ہے کہ ان کا ایک سردار ہے۔ اس قوم نے کچھ عرصہ سے اطرافِ دکن میں سر اٹھایا ہے اور تمام ملک ہندوستان پر اثر انداز ہے۔ شاہانِ مغلیہ میں سے بعد کے بادشاہوں نے عدم دور اندیشی، غفلت اور اختلافِ فکر کی بنا پر ملک گجرات مرہٹوں کو دے دیا۔ پھر اسی سست اندیشی اور غفلت کی وجہ سے ملک مالوہ بھی ان کے سپرد کر دیا اور ان کو وہاں کا صوبیدار بنا دیا۔ رفتہ رفتہ قوم مرہٹہ قوی تر ہو گئی اور اکثر بلادِ اسلام ان کے قبضہ میں آ گئے۔ مرہٹوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں سے باج لینا شروع کر دیا اور ان کا نام چوتھ (یعنی آمدنی کا چوتھا حصہ) رکھا۔

دہلی اور نواحِ دہلی میں مرہٹوں کا تسلط اس وجہ سے نہ ہو سکا کہ دہلی کے رؤسا بادشاہانِ قدیم کی اور یہاں کے وزراء اور امراء، امرائے قدیم کی اولاد ہیں۔ ناچار مرہٹوں نے ان لوگوں سے یک گونہ مروت کا معاملہ رکھتے ہوئے عہد و پیمان کر لیا اور رواداری کا سلسلہ جاری کر کے طرح طرح کی چاپلوسی سے دہلی والوں کو اپنی طرف سے امن و امان دے کر چھوڑ دیا۔ دکھن پر بھی مرہٹوں کا قبضہ اس بنا پر نہ ہو سکا کہ نظام الملک مرحوم کی اولاد نے بڑی بڑی تدبیریں کیں۔ کبھی مرہٹوں کے درمیان میں پھوٹ ڈلوا دی، کبھی انگریزوں کو اپنا رفیق بنا لیا اور برہان پور، اورنگ آباد، بیجاپور جیسے بڑے بڑے شہروں پر اولاد نظام الملک قابض رہی۔ البتہ اطراف و نواحی کو مرہٹوں کے لئے چھوڑ دیا۔ المختصر سوائے دہلی و دکھن کے خالص طور پر مرہٹوں کا تسلط ہے۔ قومِ مرہٹہ کا شکست دینا آسان کام ہے۔ بشرطیکہ غازیانِ اسلام کمر ہمت باندھ لیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قومِ مرہٹہ خود قلیل ہیں لیکن ایک گروہ کثیر ان کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ اس گروہ میں سے ایک صف کو بھی اگر درہم برہم کر دیا جائے تو یہ قوم منتشر ہو جائے گی اور اصل قوم اسی شکست سے ضعیف ہو جائے گی۔ چونکہ یہ قوم قوی نہیں ہے، اس لئے اس کا تمام تر سلیقہ ایسی کثیر فوج جمع کرنا ہے جو چیونٹیوں اور ٹڈیوں سے بھی زیادہ ہو۔ دلاوری اور سامانِ حرب کی بہتات ان کے یہاں نہیں ہے۔

الغرض قوم مرہٹوں کا فتنہ ہندوستان کے بڑے فتنوں میں سے ایک ہے۔

حق تعالیٰ بھلا کرے اس شخص کا جو اس فتنے کو دبائے۔

غیر مسلموں کی ایک قوم جاٹ ہے جس کی بود و باش دہلی و آگرہ کے درمیان ہے۔ یہ دونوں شہر بادشاہوں کے لئے دو حویلیوں کی مانند رہے ہیں۔ مغل بادشاہ کبھی آگرہ میں رہتے تھے تا کہ ان کا دبدبہ اور رعب راجپوتانہ تک پڑے اور کبھی دہلی میں فروکش ہوتے تھے تا کہ ان کی شوکت و ہیبت سہرند اور نواحی سہرند تک اثر ڈالے۔

دہلی و آگرہ کے درمیان کے مواضعات میں قوم جاٹ کاشتکاری کرتے تھے۔ زمانۂ شاہجہاں میں اس قوم کو حکم تھا کہ گھوڑوں پر سوار نہ ہوں، بندوق اپنے پاس نہ رکھیں اور اپنے لئے گڑھی نہ بنائیں۔ بعد کے بادشاہوں نے رفتہ رفتہ ان کے حالات سے غفلت اختیار کر لی اور اس قوم نے فرصت کو غنیمت جان کر بہت سے قلعے تعمیر کر لئے اور اپنے پاس بندوق رکھ کر بٹ ماری کا طریقہ شروع کر دیا۔ اورنگزیب اس وقت دکھن میں قلعہ بیجاپور و حیدر آباد کے فتح کرنے میں مشغول تھا۔ دکھن ہی سے ایک فوج جاٹوں کی تادیب کے لئے اس نے روانہ کی اور اپنے پوتے کو فوج کا سردار مقرر کیا۔ رئیسانِ راجپوتانہ نے اس شہزادے سے مخالفت کر لی۔ لشکر میں اختلاف واقع ہوا۔ جاٹوں کی تھوڑی سی عاجزی پر اکتفا کر کے فوجِ بادشاہی واپس ہو گئی۔

محمد فرخ سیر کے زمانہ میں اس جماعت کی شورش پھر جوش میں آئی۔ قطب الملک وزیر نے زبردست فوجیں ان کی طرف بھیجیں۔ چورامن جو اس قوم کا سردار تھا، بعد جنگ صلح پر راضی ہو گیا۔ اس کو بادشاہ کے سامنے لائے اور تقصیرات کی معافی دلوائی۔ یہ کام بھی خلافِ مصلحت عمل میں آیا۔

پھر عہد محمد شاہ میں اس قوم کی سرکشی حد سے تجاوز کر گئی اور چورامن کا چچازاد بھائی سورج مل اس جماعت کا سردار ہو گیا اور فساد کا راستہ اختیار کیا۔ چنانچہ شہر بیانہ جو کہ اسلام کا قدیم شہر تھا اور جہاں پر علماء و مشائخ سات سو سال سے اقامت پذیر تھے، اس شہر پر قہراً و جبراً قبضہ کر کے مسلمانوں کو ذلت و خواری کے ساتھ وہاں سے نکال دیا۔ اس کے بعد سے سرکشی برابر بڑھتی گئی۔ بادشاہوں اور امیروں کے اختلافات و غفلت کی بنا پر کوئی بھی اس جانب متوجہ نہ ہوا۔ اگر بالفرض ایک امیر اس کی تنبیہ کا قصد کرے تو سورج مل کے کارکن دوسرے امراء کی جانب رجوع کرتے ہیں اور اس طرح بادشاہ کے مشورے کو پلٹ دیتے ہیں۔ پسر محمد شاہ کے عہد میں صفدر جنگ ایرانی نے خروج کیا اور سورج مل سے سازش کر کے پرانی دہلی پر حملہ کر دیا اور تمام باشندگانِ شہر کہنہ کو لوٹ لیا۔

پسر محمد شاہ نے شہر کے دروازوں کو بند کر کے جنگِ توپ خانہ شروع کی۔ محض خدا کے فضل سے صفدر جنگ اور سورج مل دو تین ماہ کے بعد ناکامیاب واپس ہوئے اور صلح و موافقت کی داغ بیل ڈالی۔ چونکہ بادشاہ کے آدمی جنگ سے

تھک چکے تھے' اس لئے انہوں نے صلح کو غنیمت شمار کیا۔ اس کے بعد سے سورج مل کی شوکت ترقی پا گئی۔ دہلی سے دو کوس کے فاصلہ سے لے کر آگرہ کے آخر تک طول میں اور میوات کے حدود سے فیروز آباد و شکوہ آباد تک عرض میں سورج مل قابض ہو گیا۔ کسی کی طاقت نہیں کہ وہاں اذان و نماز جاری کر سکے۔

ایک سال ہوا کہ قلعہ الور جو کہ تمام میوات کی خبر گیری کے لئے ایک جائے بلند تھی، سورج مل اس کو بھی اپنے قبضہ میں لے آیا۔ ارکانِ سلطنت میں سے کسی کی مجال نہ ہوئی کہ وہ اس کام سے روک دیتا۔

ہندوستان کے محصولات سات آٹھ کروڑ سے کم نہیں ہیں۔ بشرطیکہ غلبہ و شوکت موجود ہو ورنہ ایک کوڑی بھی ملنی مشکل ہے۔ جیسا کہ اس وقت دیکھا جا رہا ہے جس علاقہ پر جاٹ قابض ہیں' وہ ایک کروڑ روپیہ محصول کی جگہ ہے۔ راجپوتانہ کا علاقہ اپنی وسعت کے باعث دو کروڑ روپیہ سے کم آمدنی کا نہیں ہے۔ بشرطیکہ ہر راجہ پر خراج مقرر کیا جائے۔ عہد محمد شاہ میں بنگالہ سے ہر سال ایک کروڑ کی آمدنی تھی اور وہاں کا صوبہ دار ہمیشہ بلا توقف بھیجتا رہتا تھا۔ اس رقم کی ادائیگی کے باوجود صوبہ دار بنگالہ ہندوستان کے امراء میں انتہائی مالدار امیر تھا۔ چنانچہ اس وقت بھی کہ بنگالہ میں بے انتظامی ہے اور وہاں ایک بے وقوف ناواقف کار نوجوان یعنی ناظم قدیم کا پوتا مسلط ہے۔ پھر بھی وہ نوجوان خزائن بے شمار کا مالک ہے۔ سعادت خاں ایرانی اور اس کے بعد اس کا داماد صفدر جنگ صوبہ اودھ پر قابض تھے۔ دو کروڑ اس صوبہ سے وصول کرتے تھے۔ ایک کروڑ خرچ کرتے تھے اور ایک کروڑ جمع کرتے تھے۔ اسی مالداری نے صفدر جنگ کے اندر بادشاہ سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا کیا۔ جاٹ کی شوکت کو درہم برہم کرنا بھی تدبیر کے نزدیک آسان کام ہے۔ انہوں نے جو علاقے اپنے قبضے میں کر لئے ہیں' وہ ان کے نہیں ہیں بلکہ غصب کیے ہوئے ہیں۔ ان کے مواضع کے مالک ابھی تک زندہ و موجود ہیں۔ اگر کوئی صاحبِ شوکت و عدالت بادشاہ مہربانی کا ہاتھ ان مالکوں کے سر پر رکھے تو وہ لوگ سورج مل کے مقابلہ کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ یہ جو کچھ بیان کیا گیا ہندوستان کے غیر مسلموں کا حال تھا۔ رہا مسلمانوں کا حال وہ یہ ہے کہ نوکرانِ بادشاہ جو کہ ایک لاکھ سے زائد تھے' ان میں پیادہ و سوار بھی تھے۔ اہل نقدی و جاگیردار بھی تھے۔ بادشاہوں کی غفلت سے نوبت یہاں تک پہنچی کہ جاگیردار اپنی جاگیروں پر عمل و دخل نہیں پاتے' کوئی غور نہیں کرتا کہ اس کا باعث بے عملی ہے۔ جب خزانہ بادشاہ نہیں رہا نقدی بھی موقوف ہو گئی۔ آخر کار سب ملازمین تتر بتر ہو گئے اور کاسۂ گدائی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سلطنت کا بجز نام کے اور کچھ باقی نہ رہا۔ جب ملازمین بادشاہ کا یہ برا حال ہے تو تمام دیگر اشخاص کے حال کو جو کہ وظیفہ خوار یا سوداگر یا اہل صنعت ہیں' انہیں پر قیاس کر لینا چاہیے کہ کس حد تک خراب ہو گیا ہوگا۔ طرح طرح کے ظلم اور بیروزگاری میں یہ لوگ گرفتار ہیں۔ علاوہ اس تنگی و مفلسی کے جب سورج مل کی قوم نے اور صفدر جنگ نے مل کر دہلی کے پرانے شہر پر دھاوا بولا' یہ غریب سب کے سب بے خانماں' پریشاں اور بے مایہ ہو گئے۔ پھر متواتر آسمان سے قحط نازل ہوا' غرضیکہ جماعتِ مسلمین قابلِ رحم ہے۔ اس وقت جو عمل و دخل سرکار بادشاہی میں باقی ہے' وہ ہنود کے ہاتھ میں ہے کیونکہ متصدی و کارکن سوائے ان کے اور کوئی نہیں ہے۔ ہمہ قسم کی دولت و ثروت ان کے گھروں میں جمع ہے۔ افلاس و مصیبت کا بادل مسلمانوں پر چھا رہا ہے۔ بات طویل ہو گئی اور اختصار کے حدود سے باہر نکل گئی۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ملک ہندوستان میں غیر مسلموں کے غلبہ کی نوعیت یہ ہے جو معرضِ بیان میں آئی اور مسلمانوں کا ضعف اس حد تک پہنچ گیا جو لکھا گیا۔ اس

زمانے میں ایسا بادشاہ جو صاحبِ اقتدار و شوکت ہو اور لشکر مخالفین کو شکست دے سکتا ہو، دوراندیش اور جنگ آزما ہو، سوائے آنجناب کے اور کوئی موجود نہیں ہے۔ یقینی طور پر جناب عالی پر فرض عین ہے۔ ہندوستان کا قصد کرنا اور مرہٹوں کا تسلط توڑنا اور ضعفائے مسلمین کو غیر مسلموں کے پنجے سے آزاد کرنا۔ اگر غلبۂ کفر معاذ اللہ اسی انداز پر رہا تو مسلمان اسلام کو فراموش کر دیں گے اور تھوڑا زمانہ نہ گزرے گا کہ یہ مسلم قوم ایسی قوم بن جائے گی کہ اسلام اور غیر اسلام میں تمیز نہ ہو سکے گی۔ یہ بھی ایک بلائے عظیم ہے۔ اس بلائے عظیم کے دفع کرنے کی قدرت بفضلِ خداوندی جناب کے علاوہ کسی کو میسر نہیں ہے۔

ہم بندگانِ الٰہی، حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو شفیع گردانتے ہیں اور خدائے عزوجل کے نام پر التماس کرتے ہیں کہ ہمت مبارک کو اس جانب متوجہ فرما کر مخالفین سے مقابلہ کریں تاکہ خدائے تعالیٰ کے یہاں بڑا ثواب جناب کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے اور مجاہدین فی سبیل اللہ کی فہرست میں نام درج ہو جائے۔ دنیا میں بے حساب غنیمتیں ملیں اور مسلمان دستِ کفار سے خلاصی پا جائیں۔ خدا سے پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ نادر شاہ کی طرح عمل ہو کہ وہ مسلمانوں کو زیر و زبر کر گیا اور مرہٹہ و جٹ کو سالم و غانم چھوڑ کر چلتا بنا۔ نادر شاہ کے بعد سے مخالفین قوت پکڑ گئے اور لشکرِ اسلام کا شیرازہ بکھر گیا اور سلطنتِ دہلی بچوں کا کھیل بن گئی۔ پناہ بخدا اگر قوم کفار اسی حال پر رہے اور مسلمان ضعیف ہو جائیں تو اسلام کا نام بھی کہیں باقی نہ رہے گا۔

خدائے تعالیٰ مجاہدین کی صفت میں فرماتا ہے۔ **محمد رسول اللہ والذین معه الاية** یعنی وہ غیروں پر سخت دل ہیں اور اپنوں پر مہربان ہیں۔

اس جماعت کے وصف میں جو مرتدوں سے مقابلہ کرتی ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا

یایھا الذین امنوا من یرتد منکم فسوف یا تی اللہ بقوم الایة

یعنی خدائے تعالیٰ دوست رکھتا ہے ان کو اور وہ دوست رکھتے ہیں خدا تعالیٰ کو، وہ مسلمانوں کے سامنے تواضع سے پیش آتے ہیں اور غیروں پر سخت ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ فتح اسلام اس جماعت کو نصیب ہوتی ہے جس کی یہ شان ہو کہ اگر کسی جگہ مسلمان ہوں ان کو وہ اپنے بیٹوں اور سگے بھائیوں کی طرح رکھے اور مخالف کے مقابلہ میں وہ شیرِ نر کی مانند ہو۔

پس واجب ہے کہ ان مجاہدات میں تقویتِ اسلام کی نیت کر لی جائے۔ جب افواجِ قاہرہ ایسے مقام پر پہنچیں جہاں پر مسلمان اور غیر مسلمان دونوں رہتے ہوں، چاہیے کہ منتظمین خاص طور پر ایسے مقام پر متعین ہوں اور ان کو تاکید کی جائے کہ جو ضعیف مسلمان قریوں میں ساکن ہیں، ان کو قصبوں اور شہروں میں لے آئیں۔ پھر کچھ منتظمین قصبوں اور شہروں پر مقرر کیے جائیں جو اس بات کی کڑی نگرانی کریں کہ کسی مسلمان کا مال نہ لوٹا جائے اور کسی مسلمان کی عزت میں فرق نہ آنے پائے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ ''اللہ کے نزدیک تمام دنیا کا زوال قتلِ مسلم کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔'' حضرت سرورِ انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم بقصدِ عمرہ جب حدیبیہ تشریف لے گئے اور کفار قریش مکہ کے داخلہ سے مانع آئے۔ آخرالامر

کفار مکہ سے صلح ہوئی۔ اگر چہ بعض بڑے صحابہ میں سے ایسے تھے جن کی حمیت دینی جوش میں آئی اور اس صلح پر راضی نہیں ہوتے تھے لیکن حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قول پر التفات نہیں فرمایا اور صلح کر لی۔ جب اس سفر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم واپس ہوئے سورۂ انا فتحنا نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ میں صلح کی حکمت اور تاخیرِ فتح کی وجہ ظاہر فرمائی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

ولولا رجال مومن ونسآء مومنات لم تعلموھم تاعذاباً الیما

''اگر نہ ہوتے (مکہ میں) کئی مرد ایمان والے اور کئی عورتیں ایمان والیاں جن کو تم نہیں جانتے اور یہ خطرہ نہ ہوتا کہ تم ان کو پیس ڈالو گے۔ پس اس کے نتیجے میں تم کو گناہ ہوتا بغیر دانست کے (تو تصدیق خواب بالفعل ہو جاتی اور جلد فتح میسر ہوتی) (خدا نے فتح کو موخر کیا) تا کہ داخل کر دے جس کو چاہے اپنی رحمت کے سایہ میں۔ اگر ہر دو فریق ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے تو ہم منکروں پر (فی الفور) آفت ڈال دیتے۔''

یعنی چونکہ مسلمانوں کو مضرت پہنچ جانے کا اندیشہ تھا، حکمتِ الٰہی نے تقاضا کیا کہ اس مقصد کو مہلت کے ساتھ انجام دیا جائے تا کہ منکرین کسی نہ کسی طرح قبولِ اسلام کر لیں اور مسلمان مجاہدین کے غلبہ سے محفوظ رہیں۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے دو سال بعد مکہ فتح ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بارہ ہزار اشخاص کے ساتھ مکہ کے قریب پہنچے اور اہل مکہ بہر طور داخلِ اسلام ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔

اس واقعہ صلح حدیبیہ و فتح مکہ میں بادشاہانِ دور اندیش کو حکمت کی عجیب و غریب تعلیم دی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلم و غیر مسلم کے اختلاط کے مقام پر حلم کا معاملہ کرنا چاہیے۔ پہلے مخالفینِ اسلام کو جو مسلمانوں پر تسلط جمائے ہوئے ہوں، متفرق کریں۔ بعد ازاں مسلمان خود بخود بادشاہِ عادل و دور اندیش کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیں گے۔

(ترجمہ شعر عربی)

''اللہ کی کتنی پوشیدہ پوشیدہ مہربانیاں ہیں جن کی پوشیدگی سے ایک ذکی و فہیم بھی بے خبر ہے۔''

جیسا کہ دوائے تلخ ہر چند فائدہ مند ہو لیکن مریض کی طبیعت اس کی طرف رغبت نہیں کرتی۔ طبیب حاذق اس کڑوی دوا کو شہد کے ساتھ ملاتا ہے۔ اسی طرح پادشاہانِ عادل کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کی طرف جس جگہ متوجہ ہوتے ہیں اور وہاں پر جو مسلمان متفرق طور پر ہوتے ہیں اور اپنی جان و آبرو کا خوف کرتے ہیں اور اپنی طبیعت سے اس گیرودار کو نہیں چاہتے، وہاں پر فقیروں، غریبوں اور سادات و علماء کو اپنے الطاف خسروانہ اور انعام پادشاہانہ سے اور طرح طرح کے دلاسوں اور تسلیوں سے محفوظ رکھتے ہیں تا کہ ان کی مہربانی کا شہرہ دور و نزدیک شہروں تک پہنچ جائے اور سب کے سب ہاتھ اٹھا اٹھا کر پادشاہِ عادل کی فتح و نصرت کی دعائیں کریں اور خدائے عز و جل سے شب و روز یہی درخواست کریں کہ اے اللہ! یہ رحمت کی نشانی پادشاہِ عادل ہمارے شہر میں فروکش ہو۔

سب سے پہلے ہم اس کے بعد بالترتیب اس کے نیچے درجہ کے اہم امور انجام دیئے جائیں۔ جس جگہ کسی

مسلمان کی شکست کا احتمال ہو وہاں توقف کرنا چاہیے۔ جماعتِ منکرین کے گرداگرد جہاد مقدم رکھنا چاہیے تا کہ بغیر احتمال قتلِ مسلم مدعا حاصل ہو جائے۔ آخر کلام میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت پادشاہانِ اسلام کے حق میں اور خلفائے راشدین کی نصیحتیں حفظِ آدابِ بادشاہی کے باب میں لکھی جاتی ہیں۔

ترجمہ وصایا ونصائح

ارشاداتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم

بخاریؒ نے حضرت ابوسعید حذریؓ کی روایت لکھی ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا' ہر وہ شخص جو خلیفہ بتایا جاتا ہے، اس کے دو ولی دوست (باطنی قوت) ہوتے ہیں۔ ایک ان میں سے اس کو خیر و نیکی کی تلقین کرتا اور اس پر آمادہ کرتا ہے۔ دوسرا اس کو شر کا حکم کرتا ہے اور اس کی رغبت دلاتا ہے اور محفوظ وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

وصیتِ صدیقِ اکبرؓ

امام ابویوسفؒ نے ابن سابط سے روایت کی ہے کہ جبکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات کا وقت قریب آیا۔ انہوں نے حضرت عمر فاروقؓ کو بلایا۔ پھر ان سے فرمایا کہ میں تم کو ایک وصیت کرتا ہوں۔ اگر تم اس کو یاد رکھو گے تو موت سے زیادہ کوئی شے تمہیں محبوب نہیں ہوگی اور اگر اس وصیت کو تم نے بھلا دیا تو موت سے زیادہ کوئی شے تمہارے نزدیک مبغوض ومکروہ نہیں ہوگی اور تم موت کے پنجے سے نکل نہیں سکتے۔ وہ وصیت یہ ہے۔

> ''اللہ تعالیٰ کا تم پر رات میں ایک حق ہے کہ وہ اس کو دن میں قبول نہیں کرے گا اور ایک دن میں حق ہے جس کو رات کو قبول نہیں کرے گا (یعنی ہر حق ادا کرنے کے لئے ایک وقت مقرر ہے) اللہ نفل اس وقت تک قبول نہ فرمائے گا جب تک فرض کی ادائیگی نہ ہوگی۔ جن لوگوں نے دنیا میں باطل کی پیروی کی اور باطل کی پیروی کو معمولی چیز تصور کیا۔ اس کی پاداش میں ان کی میزان ہلکی ہو جائے گی اور میزانِ قیامت کا معاملہ یوں ہے کہ وہ ہمیشہ ایسی صورت میں ہلکی پڑتی ہے جبکہ اس میں باطل دھرا ہو اور جن لوگوں نے دنیا میں حق کا اتباع کیا ہوگا اور اس کو اہم تصور کیا ہوگا ان کی میزان قیامت میں بھاری ہوگی' اور میزان میں جب حق ہوگا اس کا پلہ بھاری ہی ہوگا۔''

پس اگر تم نے میری اس وصیت کو یاد کر لیا تو کوئی غائب شے موت کے مقابلہ میں محبوب نہیں ہونے کی اور موت کا آنا یقینی ہے اور اگر اس وصیت کو ضائع کر دیا (بھول گئے) تو کوئی غائب شے موت سے زیادہ مبغوض نہیں ہوگی اور تم موت کو ہرگز عاجز نہیں کر سکتے (وہ تم پر غالب آ کر رہے گی)

وصیتِ فاروق اعظمؓ

امام ابو یوسفؒ نے زبیدؒ سے روایت کی ہے کہ جبکہ حضرت عمرؓ نے وصیت کی تو فرمایا کہ میں اپنے بعد آنے والے خلیفہ کو وصیت کرتا ہوں خدا سے ڈرنے کی اور وصیت کرتا ہوں مہاجرین اولین کے بارے میں کہ ان کا حق پہچانا جائے اور ان کی کرامت وعظمت ملحوظ رکھی جائے اور وصیت کرتا ہوں انصار کے بارے میں وہ انصار جنہوں نے دار وایمان میں ٹھکانہ پکڑا اور ان کی خوبیوں کو قبول کرتے ہوئے ان کی لغزشوں سے درگزر کی جائے اور اولادِ انصار کے بارے میں بھی وصیت کرتا ہوں۔ اس لئے کہ وہ اسلام کی جڑ اور عدو کے غصہ کا سبب ہیں کہ ان سے ان کی رضامندی کے بغیر ان کا زائد مال وصول نہ کیا جائے اور اعراب کے بارے میں وصیت کرتا ہوں۔ وہ اعراب جو اصل عرب ہیں اور اسلام کے لئے مرکزِ طاقت ہیں کہ خلیفہ ان کے اموال کو لے کر ان کے فقراء پر تقسیم کر دے اور میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے عہد کی پاسداری کی بھی وصیت کرتا ہوں کہ ذمیوں کے عہد کو پوا کیا جائے اور ان کی حفاظت کے لئے مقابلہ کیا جائے اور ان کو ان کی طاقت سے زیادہ حکم نہ دیا جائے۔

نصیحتِ حضرت عثمانؓ

امام ابو یوسفؒ نے حضرت عثمانؓ ابن عفان کے آزاد شدہ غلام حضرت ہانی کی روایت نقل کی ہے کہ ہانی نے کہا کہ جب کبھی حضرت عثمانؓ کسی قبر کے پاس کھڑے ہوتے تھے تو زار زار روتے تھے یہاں تک کہ آپ کی داڑھی تر ہو جاتی تھی۔ ان سے کہا گیا کہ آپ جنت و دوزخ کا تذکرہ کرتے ہیں، اس پر تو روتے نہیں قبر پر کیوں رویا کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ قبر آخرت کی پہلی منزل ہے۔ پس جو اس منزل سے نجات پا گیا، سمجھ لو کہ اس کے بعد معاملہ آسان ہے اور اگر یہاں سے نجات نہ ملی تو اس کے بعد کی منزل اس سے زائد سخت ہے۔

وصیتِ حضرت علیؓ

امام ابو یوسفؒ نے عطاء ابن ابی ریاح سے روایت نقل کی ہے کہ عطاء نے کہا، حضرت علیؓ جب کبھی کوئی لشکر روانہ کرتے تو اس لشکر کا ایک شخص کو امیر بناتے۔ پھر اس سے یہ وصیت کرتے تھے کہ میں تجھے اس خدا سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں جس کی ملاقات یقینی ہے اور اس کے علاوہ تیرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ وہ دنیا اور آخرت کا مالک ہے۔ میں تجھ کو جس کام کے لئے روانہ کر رہا ہوں، تیرے اوپر اس کی انجام دہی ضروری ہے اور تیرے اوپر ایسے امور کی پابندی لازم ہے جو باعث قربِ خداوندی ہوں۔ اس لئے کہ خدا کے یہاں دنیا کے ہر کام کا بدلہ ہے۔

یہ کچھ چیزیں بطریق استعمال تحریر ہوئی ہیں۔ اگر ان کلمات کی جانب آنجناب کی توجہ محسوس ہوئی تو بعض مطالب تفصیلاً پہنچیں گے۔

والحمد للہ اولاً اخرا وظاہراً وباطناً

مکتوبِ سوئم...... بجانب نجیب الدولہ

خدائے عزوجل امیر المجاہدین کو نصرتِ ظاہر وتائیدِ واضح کے ساتھ مشرف کرے اور اس عمل کو قبولیت کے درجہ میں پہنچا کر بڑی بڑی برکتیں اور رحمتیں اس پر مرتب کرے۔ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد سلام محبت مشام کے واضح ہو کہ نصرتِ مسلمین کے لئے یہاں دعا کی جا رہی ہے اور سروشِ غیبی سے آثارِ قبول محسوس ہوتے ہیں۔ امید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھ پر طریقہ ''جدوجہد'' کو زندہ کر کے اس کے برکات اس دنیا میں اور آخرت میں عطا فرمائے گا۔ انه قریب مجیب

مکتوبِ چہارم...... بجانب نجیب الدولہ بہادر

خدائے عزوجل اس امیر الغزاۃ، رئیس المجاہدین کو فتوحاتِ تازہ اور بزرگی بے اندازہ سے معزز وممتاز فرما کر مسلمانوں پر برکتوں اور رحمتوں کے دروازے کھول دے۔ اپنے کمالِ کرم سے۔ انه قریب مجیب اکثر خاص اوقات میں دعائے غیر کا وظیفہ ادا کیا جاتا ہے اور بعض اوقات غلبۂ اسلام کی خوشخبری ہوش کے کان میں پہنچتی ہے۔ اگرچہ یہ حقیقت بعد انتظار اور پس از کوشش حاصل ہوگی لیکن مایوس نہ ہونا چاہیے۔ ہر کام کے لئے ایک وقت مقرر ہے۔ والسلام

مکتوبِ پنجم...... بطرف نجیب الدولہ بہادر

خدائے عزوجل آن امیر الغزاۃ، رئیس المجاہدین کو محفوظ اور بنظرِ عنایت ملحوظ رکھے۔ بعد سلام کے واضح ہو کہ خطِ مبارک پہنچا۔ ذاتِ گرمی کی صحت وسلامتی معلوم کر کے شکر الٰہی بجالایا گیا۔ ''پردۂ غیب'' میں مرہٹہ اور جٹ کا استیصال مقرر ہو گیا ہے۔ بس وقت پر موقوف ہے۔ جونہی کہ اللہ کے بندے کمرِ ہمت باندھیں گے، طلسمِ باطل ٹوٹ جائے گا۔

ایک بات اور کہنی ہے، وہ یہ کہ جب افواجِ شاہیہ کا گزر دہلی میں واقع ہو تو اس وقت اہتمامِ کلی کرنا چاہیے کہ دہلی سابق کی طرح ظلم سے پامال نہ ہو جائے۔ دہلی والے کئی مرتبہ اپنے مالوں کی لوٹ اور اپنی عزت کی توہین اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ اسی وجہ سے کارہائے مطلوبہ کے حصول میں تاخیر ہو رہی ہے۔

آخر مظلوموں کی آہ بھی تو اثر رکھتی ہے۔ اگر اس بار آپ چاہتے ہیں کہ کار بستہ جاری ہو جائے تو پوری پوری تاکید کرنی چاہیے کہ کوئی فوجی دہلی کے مسلمانوں اور غیر مسلموں سے جو ذمی کی حیثیت رکھتے ہیں، ہرگز تعارض نہ کرے۔ والسلام

مکتوبِ ششم...... بطرف نجیب الدولہ بہادر

خدائے تعالیٰ آں منبع الحسنات، امیر المجاہدین، رئیس الغزاۃ کو فتوحِ تازہ اور برکاتِ بے اندازہ سے مشرف وممتاز کرے۔

فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی طرف سے التماس یہ ہے کہ اکثر اوقات مجیب الدعوات کی درگاہ میں دعا کی جاتی ہے کہ وہ مخالفین اسلام کے فرقوں کو ''شکست خوردہ'' کر دے۔ فضلِ باری سے امید یہ ہے کہ یہ بات عنقریب وجود میں آئے گی۔ ہندوستان میں تین فرقے شدت وصلابت کی صفت سے موصوف ہیں۔ جب تک ان تینوں کا استیصال نہ ہوگا' نہ کوئی بادشاہ مطمئن ہو کر بیٹھے گا' نہ امراء چین سے بیٹھیں گے اور نہ رعیت خاطر جمعی سے زندگی بسر کر سکے گی۔

دینی و دنیاوی مصلحت اسی میں ہے کہ مرہٹوں سے جنگ جیتنے کے بعد فوراً قلعہ جات جٹ کی جانب متوجہ ہو جائیں اور اس مہم کو بھی برکاتِ غیبیہ کی مدد سے آسانی کے ساتھ سر کر لیں۔ اس کے بعد نوبتِ سکھ ہے۔ اس جماعت کو بھی شکست دینی چاہیے اور رحمت الٰہی کا منتظر رہنا چاہیے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ مسلمانانِ ہندوستان نے خواہ وہ دہلی کے ہوں' خواہ اس کے علاوہ کسی اور جگہ کے۔ کئی صدمات دیکھے ہیں اور چند بار لوٹ مار کا شکار ہوئے۔ ''چاقو ہڈی تک پہنچ گیا ہے'' رحم کا مقام ہے' خدا کا اور اس کے رسول کا واسطہ دیتا ہوں کہ کسی مسلمان کے مال کے درپے نہ ہوں' اگر اس بات کا خیال رکھا تو امید یہ ہے کہ فتوحات کے دروازے پے در پے کھلتے چلے جائیں گے۔ اگر اس امر سے تغافل برتا گیا تو میں ڈرتا ہوں کہ ''آہِ مظلوماں'' سدِ راہِ مقصود نہ بن جائے۔

مکتوبِ ہفتم ...... بطرف نجیب الدولہ بہادر

خدائے عزوجل آں راس المجاہدین' رئیس الغزاۃ امیر الامراء بہادر کو فتوحاتِ تازہ اور ترقیاتِ بے اندازہ سے مشرف وممتاز کرے۔

فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد سلام محبت التزام کے واضح ہو کہ فقیر زادہ نے آنجناب کا ایک زبانی پیغام نواحی دہلی پر جاٹوں کے غلبہ اور ان کی سرکشی کی بابت مجھ کو سنایا اور اس بارے میں مفصل جواب کی درخواست کی۔ بنابریں یہ کلمات لکھے جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ فقیر نے عالمِ رویا میں قوم جاٹ کا استیصال اسی قسم کا دیکھا ہے جس طرح قوم مرہٹہ کا استیصال ہوا ہے اور یہ بھی خواب میں دیکھا ہے کہ مسلمان جاٹوں کے دیہات اور قلعہ جات پر مسلط ہو گئے ہیں اور وہ دیہات و قلعے مسلمانوں کی جائے بود و باش بن گئے ہیں۔ غالب گمان یہ ہے کہ روہیلے جاٹوں کے قلعوں میں اقامت گزیں ہوں گے۔ یہ چیز غیب الغیب میں مصمم ومقرر ہے۔ فقیر کو اس بارے میں ذرہ برابر شک وشبہ نہیں ہے لیکن ابھی تک عالم ملکوت میں صورتِ فتح ظاہر نہیں ہوتی ہے جن خدا کے خاص بندوں کو اس کام پر قائم کیا گیا ہے' ان کی توجہ اور دعا کی ضرورت ہے۔

جب یہ بات واضح ہو گئی تو اب فقیر کا مشورہ یہ ہے کہ جنابِ عالی اعلاء کلمتہ اللہ اور تقویت ملت محمدیہ کی نیت مضبوط طریقہ پر کر لیں اور مخالفین سے مقابلہ شروع کر دیں۔ جس دن گھر سے بقصدِ جنگ کوچ کریں' فقیر کو اطلاع دیں تاکہ فقیر اس طور پر جس طور پر خداوند کریم نے اس کو تعلیم دی ہے' متوجہ ہو۔

امید فضلِ خداوندی سے یہ ہے کہ فتح عجیب رونما ہوگی اور افواجِ مخالفین درہم و برہم ہو جائیں گی۔ یہ بات ملحوظ رہے کہ جنگِ اعداء اتار چڑھاؤ رکھتی ہے۔ کہیں ذرا سی خبر سے بددل نہ ہو جانا۔ پیدائشِ حضرت آدمؑ سے لے کر تا ایں دم کونسی ایسی فتح ہے جو نشیب و فراز نہیں رکھتی تھی۔ اس بارے میں مبالغہ کرنا فقیر کی عادت میں داخل نہیں ہے لیکن ایک نکتہ اور خیال میں رہے وہ یہ کہ بعض مردمِ ہنود جو بظاہر تمہارے اور تمہاری حکومت کے ملازم ہیں اور باطن میں ان کا میلان مخالفین کی جانب ہے' وہ نہیں چاہتے کہ مخالفین کی جڑ کٹ جائے۔ وہ ملازمین ہزار جتن اس معاملہ میں کھڑے کریں گے اور ہر طریقہ سے آں عزیز القدر کی نظر میں صلح کو آراستہ و پیراستہ کر کے دکھلائیں گے۔

دل میں ٹھان لینا کہ اس جماعت کی بات نہ سنوں گا اور ان کی باتوں کی طرف میلانِ طبع ہو گیا تو نصرت میں تاخیر ہو گی۔ فقیر اس چیز کو اس طرح جانتا ہے گویا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہا ہے۔ والسلام

مکتوبِ ہشتم...... بجانب نجیب الدولہ بہادر

اللہ تعالیٰ راس المجاہدین' رئیس الغزاۃ' امیر الامراء بہادر کو فتوحاتِ تازہ اور ترقیاتِ بے اندازہ کے ساتھ مشرف کرے۔

فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی طرف سے بعد سلام محبت التزام کے واضح ہو کہ آپ کا مکتوبِ گرامی جنگ کی استعداد کے بارے میں اور اس بات کے استفسار کے سلسلہ میں پہنچا کہ مسلمانوں کی ایک جماعت جاٹوں کے ساتھ مل گئی ہے' ان کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہیے۔

میرے عزیز! جاٹوں پر فتح غیب الغیب میں مقرر ہو چکی ہے۔ اس بارے میں کوئی اندیشہ دل میں نہیں لانا چاہیے۔ انشاء اللہ تعالیٰ مرہٹوں کی طرح سے جونہی کہ مقابلہ ہوگا' یہ طلسم ٹوٹ جائے گا۔ اگر مسلمانوں کی ایک جماعت جاٹوں کے ساتھ ہے تو اس کا کوئی خیال نہ کریں۔ مجھے امید ہے کہ بجز اس کے کہ ظاہر میں دشمنوں کی کثرت نظر آئے اور کوئی تشویش پیش نہ آئے گی۔ اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں کے ہاتھوں کو جو (غیروں کے ساتھ ہیں) روک دے گا۔ وہ جنگ نہ کر سکیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ بس یوں سمجھ لو کہ جس طرح شیر بکریوں کے گلے میں آ جاتے ہیں اور بکریاں بھاگ جاتی ہیں' اسی طرح مخالفین کو بھاگتے بنے گی۔ دشمنوں کی کثرت سے اور دشمنوں کے ساتھ مسلمانوں کی رفاقت سے ڈرنا نہ چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارادہ سب پر غالب ہے۔ اگر مخالفین مکر و حیلہ کے ساتھ صلح کی گفتگو کریں تو ان کی باتوں پر کان نہ دھرنا' اگر بعض ایسے مسلمان جن کی اعلاء دین محمدیؐ کے سلسلہ میں نیت کمزور ہے' لمبے چوڑے خطرے سامنے لا کر پیش کریں تو ان کی بھی نہ سننا چاہیے۔

اس کام میں بس آپ کی توجہ استعدادِ حرب کے بہم پہنچانے اور شدت کی طرف منعطف ہونی چاہیے۔ میاں فقیر گل نے مسلمانوں کی بعض باتیں اور غلط اندیشے مفصل بیان کیے۔ تاکید مزید کے ساتھ لکھا جاتا ہے کہ جس وقت جنگ جاٹ کے لئے نکلیں' فقیر کو اطلاع دیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ روانگی کے وقت سے لے کر فتح کے وقت تک دعائے دلی میں مشغول رہوں گا۔ والسلام

مکتوبِ نہم...... بطرف نجیب الدولہ بہادر

اللہ تعالیٰ آں راس المجاہدین، رئیس الغزاۃ، امیر الامراء کو مسندِ عزت پر برقرار رکھ کر طرح طرح کی بھلائیاں ظہور میں لائے۔

فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد سلام محبت التزام کے واضح ہو کہ جو کچھ معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ اس دور میں تائید ملت اسلامیہ وامتِ مرحومہ آپ (جو کہ مصدرِ خیر ہیں) کے پردے میں ظہور کر رہی ہے۔ کسی طرح کا وسوسہ قلبِ گرامی میں نہ آنے پائے۔ تمام کام انشاء اللہ تعالیٰ دوستوں کی مراد کے مطابق ہوں گے اور تمام دشمن غلبۂ قہرِ الٰہی سے پامال ہو جائیں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حافظ جواہر خاں بہت نیک خصلت آدمی...... پہلے بھی اس مضمون کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ والسلام

مکتوبِ دہم...... بنام بندۂ مؤلف (یعنی شیخ محمد عاشق پھلتی)

حقائق ومعارف آگاہ عزیز القدر سجادہ نشین اسلاف کرام شیخ محمد عاشق سلمہ اللہ تعالیٰ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد سلام محبت التیام مطالعہ کریں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے خیر وعافیت دے رکھی ہے۔ دیگر آنکہ کل میں بعد از نمازِ جمعہ اپنے مقررہ وقت سے پہلے مجلس سے اٹھ گیا تھا اور آں عزیز کو جلد رخصت کر دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کہیں ہجومِ خلق پریشان نہ کر دے۔ پادشاہ اور اس کی والدہ آئے تھے۔ پہلے مسجد میں زنانے کا انتظام کیا گیا۔ اس صورت سے بادشاہ کے آنے کی غرض یہ تھی کہ بے تکلف ہو کر کچھ دیر ٹھہرے۔ تقریباً تین چار گھنٹے وہ بیٹھا، کھانا بھی کھایا۔ اس کی زیادہ تر باتیں مخلوق خدا کی بھلائی کے کاموں میں مدد چاہنے سے متعلق تھیں۔ وہ اس بات پر افسوس کرتا تھا کہ اس نے اعتکاف کے زمانے میں جن باتوں کو اپنے اوپر لازم کر لیا تھا، وہ آشکارا ہو گئیں اور یہ بھی دریافت کرتا تھا کہ آیا مجھ سے کونسی ایسی لغزش ہو گئی جس کی وجہ سے صفائی قلب جاتی رہی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس سے پہلے میں خواب میں مشاہدۂ جمالِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہوتا تھا۔ اب ''زیارت'' میسر نہیں ہوتی۔ درمیانِ گفتگو میں اپنی تین خوابیں ذکر کریں۔

پہلی خواب:۔ اس نے کہا جس وقت رفیع الدولہ کو تختِ شاہی پر بٹھایا گیا تھا اس وقت میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ رفیع الدولہ کے بعد کون بادشاہ ہو گا؟ فرمایا کہ روشن اختر (محمد شاہ) میں نے عرض کیا۔ روشن اختر کے بعد کون ہو گا؟ فرمایا ایک اور ہے جس کا ہونا نہ ہونے کے برابر ہے۔ میں نے عرض کیا، اس کے بعد کون ہو گا؟ فرمایا ''تو'' پھر میں نے یہ دریافت نہیں کیا کہ میری حکومت کب تک چلے گی۔

دوسری خواب:۔ جس وقت نادر شاہ کی طرف سے قتلِ عام واقع ہوا۔ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ گویا ایک حصار کھینچ رہے ہیں اور اشارہ فرما رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا حضور یہ کیا ہے؟ فرمایا کہ ایک زبردست آگ لگی ہے، میں نے حصار کر دیا ہے تا کہ قلعہ محفوظ رہے۔

تیسری خواب:۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک کلغی دستِ مبارک سے تیار فرما رہے ہیں اور ارشاد ہوتا ہے کہ تیرے واسطے بنا رہا ہوں۔

بادشاہ سے فقیر نے خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعت ہونے کا طریقہ بیان کیا اور بادشاہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت مبارک کے تصور کے لئے کہا۔ اس نے کہا کہ رفیع الدولہ اور روشن اختر والی خواب میں جو صورتِ مبارک دیکھی تھی، وہ میرے ذہن میں حاضر ہے۔ فقیر نے کہا کہ اسی کو اپنے دل کے سامنے رکھو۔ اس گفتگو کے بعد مسجد میں فقیر کے ساتھ نماز پڑھ کر رخصت ہوا۔ والسلام

مکتوبِ یازدہم...... بنام بندۂ مؤلف (یعنی شیخ محمد عاشق پھلتی)

حقائق و معارف آگاہ عزیز القدر سجادہ نشینِ اسلاف کرام شیخ محمد عاشق سلمہ اللہ تعالیٰ فقیر ولی اللہ عفی عنہ سے بعد از سلام مطالعہ کریں۔

الحمد للہ کہ اس ''حادثہ عامہ'' میں عافیت نصیب ہوئی۔ اس محلہ کو معلوم نہیں ہوا کہ مخالف کی فوج آئی تھی یا نہیں۔ نہ تو لوٹ ڈالنے والوں کی لوٹ سے کوئی اذیت پہنچی اور نہ اس تاوان و جرمانہ (تعزیری ٹیکس) سے جو حویلیوں پر ڈالا گیا تھا، کوئی زیر بار ہوا۔

سابق میں عالمگیر نے جو کچھ کہہ دیا گیا تھا کہ اس فتنہ میں تم کو سلامتی حاصل رہے گی وہ بھی ظہور میں آیا۔ اکثر کی جائیدادوں کی سندیں (دستاویزیں) ضبط ہو گئیں مگر میری سند کہ دستخط کر کے مجھ کو واپس کر دی گئی ہے۔ اس وقت احمد شاہ درانی جنگِ جاٹ کی طرف متوجہ ہے۔ جو کچھ وقوع میں آئے گا، بعد کو لکھا جائے گا۔ اہلِ شہر اپنے قتل ہونے سے تو محفوظ رہے لیکن دولت کا ''مادۂ فاسدہ'' جن لوگوں کے مزاجوں میں پیدا ہو گیا تھا، اس کا تنقیہ پورے طریقے پر ہو گیا۔ چنانچہ عبرت کی چیز ہے کہ جو لوگ جاہ و حشمت میں جس قدر زیادہ تھے، قید و ضرب اور سزا بھگتنے میں بھی وہی آگے آگے رہے مگر جس کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھنا چاہا، وہ محفوظ رہا۔ والسلام

مکتوبِ دوازدہم...... بنام بندۂ مؤلف (یعنی شیخ محمد عاشق پھلتی)

حقائق و معارف آگاہ عزیز القدر سجادہ نشین اسلافِ کرام شیخ محمد عاشق سلمہ اللہ تعالیٰ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد محبت کے مطالعہ کریں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے خیر و عافیت عطا فرما رکھی ہے۔ آج ایک افواہ سنی گئی ہے جس نے یک گونہ تشویش خاطر پیدا کر دی۔ وہ یہ کہ درانی کی فوجیں بارہہ کی جانب روانہ ہو رہی ہیں اور یہ بات تشویش کا باعث ہے بھی۔

میرا ظنِ غالب یہ ہے کہ پھلت اور بوڈھانہ کی طرف جانے سے ان فوجوں کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ حاصلِ کلام فضلِ الٰہی سے امید قوی ہے کہ خدا تم کو اور ہم کو تمام آفات سے محفوظ رکھے گا اور یہی اطمینان دل میں موجزن ہے۔ اگر بحسبِ ظاہر کچھ نہ کچھ تشویش بھی ہوتی ہے اور تدبیرِ اصلاح کی جاتی ہے۔ والسلام

مکتوبِ سیزدہم...... بنام بندۂ مؤلف (یعنی شیخ محمد عاشق پھلتی)

حقائق و معارف آ گاہ عزیز القدر سجادہ نشینِ اسلاف کرام شیخ محمد عاشق سلمہ اللہ تعالیٰ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد سلام کے مطالعہ کریں۔

خیر و عافیت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں اور تمہیں ہمیشہ عافیت سے رکھے۔ آپ کا مکتوبِ گرامی پہنچا اور آپ کا موضع پھلت میں سلامتی کے ساتھ آنا معلوم ہوا۔ اللہ کا شکر ہے کہ خیریت سے وہاں پہنچے۔

دستور کے موافق امسال بھی اعتکاف میں داخل ہوا۔ اس توفیق کے ملنے پر اور مزید احسانات کے دروازے کھلنے پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔

جو باتیں ''وارداتِ احوال'' کے قبیل سے ہیں' ان کا لکھنا چنداں لطف نہ دے گا۔ باقی جو ''معارف'' کے قبیل سے باتیں ہیں' وہ انشاء اللہ تعالیٰ بعد فراغتِ اعتکاف بشرطِ سہولت لکھی جائیں گی۔

جو کچھ فقیر کو معلوم ہو رہا ہے' یہ ہے کہ احمد شاہ ابدالی مخالفین کی سرکوبی کے لئے پھر آئے گا اور بعد تمام ہونے امر ''وعدہ شدہ'' کے شاید اسی سرزمین میں اپنی ودیعت حیات کو سپرد کرے گا' گناہوں کی کثرت اور لعنتی کاموں کے ہجوم کے باوجود اب تک جو کام کی نوعیت برقرار ہے' غالباً اسی وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کو طاقتِ مخالفین کو تہس نہس کرنا ہے۔

والسلام

مکتوبِ چہاردہم...... بنام بندۂ مؤلف (شیخ محمد عاشق پھلتی)

حقائق و معارف آ گاہ' عزیز القدر سجادہ نشینِ اسلاف کرام شیخ محمد عاشق سلمہ اللہ تعالیٰ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد سلام کے مطالعہ کریں۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا کرتا ہوں اور اس سے دنیا اور آخرت میں عافیت اور عفو مانگتا ہوں۔

گرامی نامہ مشکیں شامہ پہنچا۔ حقیت مرقومہ واضح ہوئی۔ کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ ''طوائف الملوکی'' ہوگی۔ فوجیں حرکت میں آئیں گی اور شہر تہ و بالا ہوں گے۔

اللہ سے یہ دعا ہے کہ اس ''حادثہ'' میں مخالفینِ اسلام پر ہی مصیبت پڑے اور ''مٹھی بھر'' مسلمان جوان بلاد میں غربا کی حیثیت سے پڑے ہوئے ہیں' محفوظ و مامون رہیں۔ اللہ تعالیٰ قریب ہے اور دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے۔ جو کچھ قضا و قدر میں ہے' چار و ناچار ضرور ظہور میں آئے گا۔ اس جماعت کو خوشخبری ہو جو تسلیم و رضا کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہے' اپنے مقال سے بھی اور اپنے حال سے بھی۔ ایسی جماعت کو خوشخبری ہو کہ جب کبھی ''ہوائے قدس'' چلے گی' اس کی حافظ و ناصر ہوگی۔

''البتہ میرے کام کا بنانے والا اللہ ہے' جس نے قرآن اتارا اور وہ نیکوکاروں کو دوست رکھتا ہے۔'' والسلام

مکتوبِ پانزدہم...... بنام بندۂ مؤلف (یعنی شیخ محمد عاشق پھلتی)

حقائق و معارف آگاہ عزیز القدر سجادہ نشینِ اسلاف کرام۔ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی طرف سے بعد سلام مطالعہ کریں۔ خیر و عافیت پر شکرِ خداوندی ادا کرتا ہوں۔

سید فتح اللہ کا خط پہنچا۔ ان کو یا حفیظ ابجد کے حساب سے (998 مرتبہ) پڑھنے کے لئے لکھا گیا اور ختم سورۂ فیل ایک ہزار ایک بار اس طور پر کرنے کو کہا گیا کہ اس کے اول و آخر چند بار بایں الفاظ درود پڑھا جائے۔ **اللھم صل علی سید القاھرین علی اعداء رب العالمین** یعنی اے اللہ! رحمت بھیج اس ذاتِ اقدس پر جو سردار ہے اللہ کے دشمنوں پر قہر کرنے والوں کی۔

چند "تعویذ سلاح" بھی بھیجے گئے اور ان کے خط میں یہ فقرہ بھی تحریر ہوا ہے۔ فقیر کے دل میں یہ بات آتی ہے کہ اگر یہ مسلمان دریا سے پار ہو کر ایک بار جماعتِ مرہٹہ پر حملہ کر دیں تو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک عجیب نشانی مشاہدہ میں آئے گی۔ مخالفین طلسم کی طرح منتشر ہو جائیں گے۔ والسلام

مکتوبِ شانزدہم...... بنام بندۂ مؤلف (شیخ محمد عاشق پھلتی)

حقائق و معارف آگاہ عزیز القدر سجادہ نشین اسلافِ کرم شیخ محمد عاشق سلمہ اللہ تعالیٰ۔ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد از اسلام مطالعہ کریں۔ نامۂ مشکیں شمامہ پہنچا۔ وہ دہشت جو اس طرف مخالفینِ اسلام کی فوج کے قریب آ جانے کی وجہ سے پھیل گئی ہے' اس کا علم ہوا' رب العزت کی بارگاہ سے التجا ہے کہ قریۃ الصالحین کو جملہ آفات سے محفوظ رکھے۔

مکتوبِ ہفتدہم...... بنام بندۂ مؤلف (یعنی شیخ محمد عاشق پھلتی)

لکھا تھا کہ کیا اچھا ہو اگر اعتکافِ رمضان میں پھلت آ کر کروں...... فقیر یہ بات دل سے چاہتا ہے لیکن شہر دہلی کے موجودہ ناسازگار حالات کے پیش نظر کہ یہاں روز نت نیا فتنہ کھڑا ہوتا ہے اور لوگوں کے دلوں میں قسم قسم کا خوف لاحق ہوتا رہتا ہے۔ مناسب نہیں ہے کہ اپنا گھر بار اور اپنے متعلقین کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے۔

وہی عربی کا مشہور مصرعہ مناسبِ حال ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ (کبھی) ہوائیں کشتیوں کی خواہش کے برخلاف چلتی ہیں۔

مکتوبِ ہشتدہم...... بنام بندۂ مؤلف (شیخ محمد عاشق پھلتی)

حقاق و معارف آگاہ، عزیز القدر سجادہ نشین اسلافِ کرام شیخ محمد عاشق سلمہ اللہ تعالیٰ۔ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب بعد از سلام مطالعہ کریں۔

اصل قصہ یہ ہے کہ وقوعِ فتنہ یقینی ہے۔ جب افواجِ ابدالی کی آمد آمد کشمیر کی طرف سنی گئی تو وہ پوشیدہ خطرہ ظاہر

ہو گیا اور اس بارے میں مشورہ کیا گیا۔ بعد مشاورت یہ طے پایا کہ جب نوبت لاہور تک پہنچے۔ اس وقت خاندان کو پہلت کی طرف روانہ کر دیں۔ اس سے قبل پیدا ہونے فتنہ کے خواہ مخواہ کہیں کو چل پڑنا کم عقلی ہے اور ہجوم فتنہ کے بعد توقف کرنا یہ گھمنڈ کی بات ہے، ابھی تک وہی بات دل میں ٹھان لی ہے جس کو اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ معلوم نہیں یہ بات جلد پیش آنے والی ہے یا کچھ مدت کے بعد۔ والسلام

مکتوبِ نوزدہم ...... بجانب مولانا سید احمد

(جو روہیل کھنڈ کے ساکن ہیں)

فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد از سلام مسنون مطالعہ کریں۔

جو احباب وہاں سے یہاں آئے "آں سیادت مآب" کی تعریف اور شکریے سے تر زبان تھے۔ وہ بیان کرتے تھے کہ آپ نے بادشاہِ اسلام کی حمایت و رفاقت کے واسطے نیز مسلمانوں کی لوٹ مار اور قتل ہونے سے محفوظ رکھنے کے لئے روہیلوں کے لشکروں کی اس عمدہ طریقہ پر تنظیم کی ہے کہ اس سے اچھی تنظیم خیال میں بھی نہیں آ سکتی۔ ان باتوں کے سننے سے فقیر بہت ہی مسرور و خوشدل ہوا اور آپ کے لئے دنیا و آخرت میں بلندئ مرتبہ کی دعا بے ساختہ زبان سے نکلی۔

مکتوبِ بستم ...... بجانب وزیر الممالک آصف جاہ

الحمد للہ والسلام علی عبادہ الذین اصطفےٰ

بعد حمد و صلوٰۃ کے واضح ہو کہ اس فقیر کے دل پر یہ امر واضح ہو گیا ہے کہ عالمِ ملکوت میں یہ بات مقرر شدہ ہے کہ مخالفینِ اسلام ذلیل و خوار ہوں گے۔ بعد ازاں باغی لوگ رسوا اور خانہ خراب ہوں گے۔ اگر جنابِ عالی ان بدمعاشوں کے مقابلہ میں کمرِ ہمت باندھ کر آ جائیں تو یہ تمام کارنامے جناب کی طرف منسوب ہوں گے اور دنیا آپ کی تابعدار ہو جائے گی اور ملتِ مرحومہ کے رواج اور مسلم حکومت کی استقامت کا باعث جنابِ عالی کو قرار دیا جائے گا۔

کوشش تھوڑی اور فوائد عظیم الشان مرتب ہوں گے۔ اگر آنجناب کوشش نہ فرمائیں گے تو یہ تمام مخالف عنصر "آسمانی حادثات" سے ہلاک و مضمحل ہو جائے گا۔ اس صورت میں جنابِ عالی کی طرف کوئی نیک نامی کی بات منسوب نہ ہو سکے گی۔ (ترجمہ شعر فارسی) اے محبوب! اصل میں تو تیری زلف کا کام مشک افشانی کرنا ہے لیکن مصلحت کی بنا پر "آہوئے چین" کی طرف مشک کو منسوب کر دیا گیا ہے۔

چونکہ یہ حقیقت بالکل یقینی ہے اس لئے آں عزیز القدر سے بے اختیار کہی گئی اور لکھی گئی، وقت کو غنیمت جانیئے اور مخالفین کے مقابلہ میں جدوجہد کرنے میں ذرہ برابر کوتاہی جائز نہ رکھیے۔ کچھ عرصہ کے بعد کام خود بخود واضح ہو جائے گا۔

(ترجمہ شعر عربی)

جس وقت گرد و غبار ہٹے گا تو عنقریب دیکھ لے گا کہ تیری سواری میں گھوڑا تھا یا گدھا یعنی عنقریب حقیقتِ حال کھل جائے گی۔

چونکہ ایک امرِ حقیقت کا اظہار مطلوب تھا اور درستی و خیر خواہی مقصود تھی' اس لئے کسی قدر مبالغہ سے بھی احتراز نہیں کیا گیا' اس سے زیادہ کھول کر بات کہنا مشکل ہے۔

گوئے توفیق و کرامت درمیاں افگندہ اند
کس بمیدں درنمی آید سواراں راچہ شد

یعنی توفیق و کرامت کی گیند درمیان میں ڈال دی گئی ہے۔ سواروں میں سے کوئی بھی میدان میں نہیں آتا' آخر انہیں کیا ہو گیا ہے؟ وہ بات جو کہ اپنے رازداروں سے درپردہ کہا کرتا ہوں' اس مقام پر بے پردہ لکھی گئی ہے تاکہ عذر کا موقع باقی نہ رہے۔ والسلام والاکرام

مکتوبِ بست ویکم...... بنام وزیر الممالک آصف جاہ

بعد حمد و صلوٰۃ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے شجرِ اقبال کے نئے میوے کو مبارک و مسعود کرے اور اس درختِ سعادت (آپ) کی پرورش میں بے اندازہ پرورشیں عطا فرمائے۔ آمین۔ بقیۃ الکلام یہ ہے کہ حکیمِ مطلق جل شانہ نے آدمی کو دو چیزوں سے مرکب فرمایا ہے۔ ایک بدن عنصری جو کہ حسی خواہشوں کا متقاضی ہے۔ دوسرے روح جو کہ عقائد حقہ اور اعمالِ نافعہ کی خواہشمند ہے۔ یقینی طور پر آدمی کی سعادت بھی جسم و روح دونوں سے متعلق ہے۔ فطرتِ سلیمہ رکھنے والے حضرات دونوں قسم کی سعادتیں جمع کرتے ہیں۔ فقط ایک قسم پر اکتفا نہیں کرتے۔ جس طرح غذائے روح ضروری ہے (اسی طرح غذائے جسم بھی ضروری ہے) کیونکہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے نہ ہونے سے مزاجِ روح درہم برہم ہو جاتا ہے۔

مسلمانوں سے مظالم کا دفعیہ کرنا اور دین کی اشاعت کرنا نیز رسومِ نیک جاری کرنا سراپا سعادت در سعادت ہے۔ والسلام

مکتوبِ بست و دوم...... بجانب وزیر الممالک آصف جاہ

خدائے تعالیٰ بے نہایت ترقیات عطا فرمائے اور دونوں جہاں کی نعمتوں سے خوش اور دونوں جہاں کی مصیبتوں سے محفوظ رکھے۔ بعد اس دعا کے واضح ہو کہ بابا فضل اللہ نے ہم سے بعض باتوں کا استفسار کیا۔ فقیر کے دل میں یہ آیا کہ ان باتوں کا جواب بزبانِ قلم واضح کیا جائے۔

یہ تمام سختیاں جو ظاہر ہو رہی ہیں۔ فقیر کے اعتقاد میں اس کا سبب وہ کوتاہی عمل ہے جو جنگ مرہٹہ کے سلسلہ میں اختیاری یا اضطراری طور پر واقع ہوئی۔ جن دنوں فقیر نے آگاہ کیا تھا' اس وقت کام ہوتا تو عجیب عجیب رحمتیں پیش گاہ خداوندی سے (وقت کی سازگاری کی وجہ سے) بارش کی طرح برس جاتیں۔ اگرچہ محسوس ایسا ہوتا ہے کہ تقدیر' حوادث کو شامل ہے لیکن کارخانہ حکمت الٰہی میں ہر کام کسی نہ کسی خیر سے وابستہ ہے۔ خیر جو بات گزر گئی' وہ گزر گئی۔

قضیہ قطب خاں افغان کے متعلق اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ امید ہے کہ عنقریب ختم ہو جائے گا۔ ظاہر ایسا

ہوتا ہے کہ یہ شخص سرسبز نہیں ہوگا اور اپنے باطل مدعا کو حاصل نہ کر سکے گا، جو کچھ فقیر کو معلوم ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ آن عزیز القدر منصور و مظفر اور محفوظ و محظوظ ہیں۔

بادشاہ کا باہر جانا مناسب نہیں، ان کا یہیں رہنا بہتر ہے۔ البتہ شہزادوں میں سے آپ جس کو چاہیں آپ اپنے ہمراہ لے لیں۔ بقیہ کلام یہ ہے کہ آج عزیز القدر کو خدائے عزوجل نے ہندوستان میں پورا تسلط بخشا ہے، ہم لوگ بڑی بڑی امیدیں قائم کیے بیٹھے ہیں کہ آپ کے ذریعہ رفع مظالم، تغیر رسوم بد، ترویج دین حق، اقامت امر خیر، اشاعت علم و نماز و روزہ یہ سب کچھ عمدہ طریقے پر ہوگا۔ اس لئے کہ آپ کے اندر ایک عجیب شان اور سعادت محسوس ہوئی تھی اور آپ کا مزاج بھی صلاحیت، ذکاوت اور رغبت امورِ خیر لئے ہوئے معلوم ہوتا تھا۔ شاید مقتضیاتِ زمانہ کی وجہ سے ابھی تک مذکورہ بالا امورِ خیر میں سے کسی کا ظہور نہیں ہو سکا۔ خدا کرے کہ اس کے بعد تلافی مافات ہو جائے۔ اس قدر البتہ گزارش ہے کہ فی الحال جس قدر طاقت ہوئی گرانی غلہ دور کرنے میں سعی فرمائیں اور اطرافِ عالم میں جو لوٹ مچ رہی ہے، اس کو حتی الامکان ختم کرنا ضروری ہے۔ والسلام۔

مکتوبِ بست وسوم...... بطرف تاج محمد خاں بلوچ

رفعت وعوالی مرتبت عزیز القدر نواب تاج محمد خاں محفوظ و محظوظ اور بنظرِ عنایتِ خداوندی ملحوظ رہیں۔ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد سلام محبت التزام کے واضح ہو کہ آپ کا مکتوبِ گرامی جاٹوں کی سرکشی سے متعلق پہنچا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے امید یہ ہے کہ وہ مخالف کو پائمال کر دے گا، خاطر جمع رکھیں۔ اندریں حالت ضروری ہے کہ آں عزیز القدر موسیٰ خاں اور دیگر جماعتِ مسلمین کے ساتھ موافقت کریں اور آپس میں دوستی و یکجہتی کو کام میں لائیں اور اپنی طاقت کو دشمنوں کے مقابلہ میں صرف کریں۔ غالب امید ہے کہ اجتماعِ مسلمین اور ان کی حسن عزیمت کی برکت سے تازہ فتح نصیب ہوگی۔ اللہ تعالیٰ قرآن عظیم میں فرماتا ہے ان تنصرو الله ینصر کم یعنی اگر تم اللہ کے دین کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔

اس زمانے میں دشمنانِ دین کے غالب ہونے اور مسلمانوں کے مغلوب ہونے کا سبب سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ مسلمان اپنے اغراضِ نفسانی کو درمیان میں لاتے ہیں اور ہنود کو اپنے کاروبار میں دخیل بناتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہنود غیر مسلمانوں کا استیصال گوارا نہ کریں گے۔ دور اندیشی اور تحمل محمود شے ہے لیکن اتنی نہیں کہ غیر مسلم مسلمانوں کے شہروں پر غالب آتے چلے جائیں اور ہر روز ایک شہر پر قبضہ کرتے رہیں۔ یہ وقت تحمل اور مصلحت اندیشی کا نہیں ہے۔ یہ وقت خدا پر بھروسہ کرنے اور استعدادِ حرب ظاہر کرنے اور غیرتِ مسلمانی کو جوش میں لانے کا ہے۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو اغلب ہے کہ "نسیمِ نصرت" چلنی شروع ہو جائے گی۔ فقیر جو کچھ جانتا ہے وہ یہ ہے کہ جنگِ جاٹ ایک طلسم ہے کہ اول اول خوفناک و خطرناک معلوم ہوتی ہے جس وقت اللہ تعالیٰ کی قدرت پر پورا پورا توکل و اعتماد کر کے اس جانب توجہ واقع ہوگی تو ظاہر ہوگا کہ سوائے نمائش کے وہاں کچھ نہ تھا، امید ہے کہ اپنے حالات اور استعدادِ حرب کی کیفیت سے اطلاع دیتے رہا کریں گے۔ یہ چیز دعائے محافظت و نصرت میں ممد و معاون اور سلسلہ جنباں ہوگی۔ والسلام

مکتوبِ بست و چہارم ...... بطرف نواب مجد الدولہ بہادر

خدائے عز و جل محفوظ و محظوظ اور اپنی چشمِ عنایت میں آپ کو ملحوظ رکھے۔ اس وقت آپ کا والا نامہ پہنچا جس میں روئیدادِ لشکر اور ان ضعیف رایوں کی تفصیل تھی جن کو لوگ اپنے دماغوں میں پکا رہے ہیں۔

عزیز القدرِ من! فقیر اس قدر جانتا ہے کہ عالم ملکوت میں مرہٹہ و جٹ کا استیصال مصمم ہے اور وہ بعض اشخاص جن کی توجہ کو اس قسم کے امور کے حل وعقد میں عنایت فرمایا گیا ہے۔ ان مخالفین کے استیصال کی دعا کرنے کے لئے برابر مامور ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو دن بدن آپ کے دل میں ان کے استیصال کا جذبہ موجزن نہ ہوتا۔

اگر اس بد بخت کا آنا مستحق ہوا جو کہ سلطنتِ تیموریہ کی تخریب کے در پے ہے تو قولِ خداوندی ''ان کیدی متین ''یعنی میری تدبیر بڑی مضبوط ہے..... کا مصداق بھی یقینی طور پر ظاہر ہوگا۔ اطمینان رکھیں۔ والسلام

مکتوبِ بست و پنجم ...... بطرف نواب عبداللہ خاں کشمیری

آپ کو خدائے عز و جل محفوظ و محظوظ اور اپنی چشمِ عنایت میں ملحوظ رکھے۔ گرامی نامہ پہنچا۔ آپ نے علاقہ جات میں اقامت کرنے کے لیے دریافت کیا تھا۔ عزیز القدر! ایک جماعت کے دل پر بار بار ہر دو گروہ کے استیصال کے لئے دعا کرنے کا جذبہ پیدا ہو رہا ہے۔ ہرگز ان کے درمیان سکونت پذیر نہ ہونا چاہیے۔ اگر اس زمانہ میں حج کا ارادہ کر لیں سب سے بہتر رہے گا۔ دنیا میں بھی اور آخرت کے لحاظ سے بھی۔ اگر ممکن ہو سکے تو وہاں سے منتقل ہونا ضروری ہے۔ اگر حج بیت اللہ کریں گے تو انشاء اللہ تعالیٰ واپسی کے بعد بہت سے فائدہ اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کریں گے۔ یہ فتنہ کا زمانہ ہے کیوں خواہ مخواہ خوف وخطر میں اپنے آپ کو رکھا جائے۔ والسلام

مکتوبِ بست و ششم ...... بجانب حافظ جار اللہ (پنجابی)

دہلی میں ایک حادثہ عظیم واقع ہوا۔ قوم جاٹ نے دہلی کے شہر کہنہ کو لوٹا اور حکومت اس فساد و شرارت کو دفع کرنے سے عاجز رہی۔ انہوں نے مال لوٹے' عزت و ناموس کو برباد کیا اور مکانات کو آگ لگائی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو مع اہل و عیال و مال و مکانات کے ان کے دستِ ستم سے محفوظ رکھا اور یہ لوٹ مار کا حادثہ اوائل رجب 1161ھ میں ہوا اور آخر شعبان تک باقی رہا۔

(شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات از خلیق احمد نظامی، علی گڑھ 1951ء)

✦ ..... ✦ ..... ✦

ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی

شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات

غالباً چودہ یا پندرہ سال کی عمر ہو گی جب اپنے دادا محترم حافظ محمد یوسف صاحب کی معیت میں پہلی بار مہندیان میں درگاہ شاہ ولی اللہ میں حاضری دی۔ فاتحہ خوانی اور ایصال ثواب کے بعد دادا محترم نے شاہ صاحب کے اجداد' خاندان کی دینی خدمات اور مجاہدانہ کارناموں کا جس طرح ذکر کیا' اس نے دل و دماغ پر ایسا اثر مرتب کیا کہ شاہ صاحب کے ہفتے عشرے میں شاہ صاحب کی درگاہ پر حاضری دینے لگا اور یہ سلسلہ تادم تحریر برقرار ہے۔

استاذی محترم مفسر قرآن مولانا محمد یوسف صاحب فقیر دہلوی کو شاہ ولی اللہ کے خاندان سے ایسی محبت اور عقیدت تھی کہ انہوں نے وصیت کی تھی کہ میری قبر شاہ عبدالقادر کے قدموں میں ہو۔ خدا نے ان کی اس خواہش کو پورا بھی کیا اور آپ کی تدفین مرقد شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کے پائنتی ہی میں ہوئی۔ مولانا موصوف جب بعد نماز فجر مسجد حوض والی (چوڑی والان' دہلی) میں کلام پاک کی تفسیر بیان کرتے تو تفسیر سے پہلے شاہ صاحب کا ترجمہ سناتے اور پھر اسی ترجمے کی روشنی میں تفسیر ہوتی۔

مولانا یوسف صاحب کے ذاتی کتب خانے میں شاہ ولی اللہ کی متعدد عربی فارسی تصنیفات اور ان کے اردو ترجمے بڑی احتیاط کے ساتھ محفوظ تھے۔ مولانا اپنی کتابیں بہت کم لوگوں کو مطالعہ کے لئے دیتے۔ احقر کو یہ سعادت حاصل ہے کہ رجحان طبع کے پیش نظر مولانا نے متعدد کتابیں پڑھنے کے لئے دیں۔ کتاب دیتے وقت اس کتاب کی خصوصیت اور افادیت پر روشنی ڈالتے اور اخیر میں تاکید کرتے کہ آٹھ دن بعد یہ کتاب میرے پاس آ جانی چاہیے۔ وعدہ خلافی ہوئی تو آئندہ کوئی کتاب نہیں ملے گی۔ چنانچہ شاہ صاحب کی تصنیفات میں سے ''حجتہ اللہ البالغہ''، ''الخیر الکثیر''، ''البلاغ المبین''، ''انفاس العارفین''، ''القول الجمیل'' اور ''چہل حدیث'' کے اردو ترجمے مولانا یوسف صاحب نے مطالعے کے لئے دیئے اور وقت مقررہ پر تمام کتابیں انہیں لوٹا دیں۔ مولانا کا قاعدہ تھا کہ کتاب واپس ہونے کے مہینے دو مہینے بعد اس کتاب کے تعلق سے سوال ضرور کرتے۔ کہیں کوئی الجھن ہوتی یا بات سمجھ میں نہ آتی تو بڑی شفقت سے سمجھاتے۔ میں نے دیکھا شاہ ولی اللٰہی خاندان کے ذکر پر اکثر آپ کا چہرہ تمتما جاتا۔ کبھی آنکھیں نم ہو جاتیں۔ کبھی دایاں ہاتھ اپنے زانو پر زور سے مارتے اور کہتے یوسف کتنا بدنصیب ہے۔ کاش اس وقت ہوتا اور اتنا کہنے کے بعد وہ کھو جاتے۔ سلسلہ گفتگو منقطع ہو جاتا۔

گزشتہ دنوں مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی صاحب نے حکم دیا کہ احقر شاہ صاحب کے سیاسی مکتوبات پر ایک

مضمون تحریر کرے۔ میں نے عرض کیا کہ شاہ صاحب سے عقیدت اپنی جگہ مگر میں اس کا اہل نہیں کہ شاہ صاحب کے افکار و نظریات پر قلم اٹھاؤں۔ میں زبان و ادب کا ادنیٰ سا طالب علم ہوں۔ شاہ صاحب جیسی فقید المثال ہستی پر کچھ لکھنا میرے لئے سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا لیکن مفتی صاحب نے اصرار کیا کہ ''مضمون تو آپ ہی کو لکھنا ہوگا''، ممکن ہے اس موضوع کے تعلق سے ان کے یہاں کچھ ''تحفظات'' ہوں۔ ان کے شدید اصرار پر شاہ صاحب کے سیاسی مکتوبات اور متعلقات کا مطالعہ کیا اور جو کچھ سمجھ سکا' اسے یہاں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

اس حقیقت سے کون انکار کرے گا کہ شاہ ولی اللہ نابغۂ روزگار تھے۔ اپنے دور کے مجدد اور عظیم المرتبت شخصیت تھے۔ مولانا غیاث الحسن مظاہری نے ماہنامہ ''دینی مدارس'' نئی دہلی کا خصوصی شمارہ شاہ ولی اللہ نمبر شائع کیا تھا۔ اس شمارے میں مولانا سید احمد ہاشمی کا ایک خط شائع ہوا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ حضرت شاہ صاحب ہی کا کمالِ فضل ہے کہ آپ نے قرآن و حدیث سے ہندوستان کا مستحکم رشتہ اور ربط پیدا کیا اور حکمتِ دین سے قلوب کو منور کیا۔ مسالک کے اختلافات میں مفاہمت کی راہیں استوار کیں۔ فرق باطلہ کی گمراہیوں کو واضح کیا اور قرآن کریم کے ترجمے کے ذریعے عام مسلمانوں میں ہدایت الٰہی کے فہم کو آسان تر بنانے کی سعی فرمائی لیکن ان تمام تر خدماتِ جلیلہ کے علاوہ حضرت شاہ صاحب کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے ملک کے زوال پذیر معاشرہ میں ایک طرف صالح انقلاب لانے اور تمدن معاشرت کی غیر اسلامی بے راہ روی کو دور کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف انہوں نے ملک کے مسائل کی جانکاری کو بھی اپنا فریضہ فکر و عمل بنایا اور ملک کی گرتی ہوئی ساکھ اور اس کے آبرومندانہ وقار کو بچانے کے لئے تمام تر تدابیر کیں۔ ایوانِ حکومت کی بے اعتدالیوں' عیش کوشیوں اور سیاسی بصیرت سے تہی مائیگی نے جس طرح حکومت کو کمزور اور بے بال و پر بنا دیا تھا حضرت شاہ صاحب نے اپنی آخری کوشش کی کہ اس گرتی ہوئی عمارت کو بچالیں اور تاریخ کے کھنڈرات میں دفن ہونے سے اسے محفوظ کر دیں۔ یہ کوشش کامیاب بھی ہوتی اور اگر احمد شاہ ابدالی کے بعد ہندوستان کے اقتدارِ اعلیٰ کو ہوش و آگہی سے کچھ بھی حصہ ملا ہوتا تو ملک کی تاریخ میں انگریزی اقتدار کو پناہ نہ ملتی جس کے لئے حضرت شاہ صاحب کے بعد سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز اور علمائے ہند کو عظیم قربانیاں دینی پڑیں۔''

واقعہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ کا عہد مسلمانوں کے محض سیاسی اقتدار اور مغلیہ حکومت کے زوال ہی کا زمانہ نہ تھا بلکہ مسلمان (عوام و خواص) ذہنی' روحانی' اخلاقی' علمی اور معاشرتی اعتبار سے متزلزل اور بتدریج پستی کی طرف جا رہے تھے۔ اکبر کے دور میں جس طرح مسلمانوں کے تشخص پر کاری ضرب لگی تھی' اس نے مسلمانوں کی غیرت و حمیت کو بڑی حد تک کچل دیا تھا۔ اورنگزیب نے مسلمانوں کے تشخص کے زوال کو سمجھ کر ہی اسلامی قوانین نافذ کیے تھے لیکن بقول شخصے اسلامی تعلیمات کو قلب و نظر میں سمونے اور خدا اور رسولؐ کی محبت سے لوگوں کے دلوں کو سرشار کرنے کے لئے جس قسم کے ہمہ گیر نظام کو وضع کرنے اور پھر اس نظام کو چلانے والے ذی علم اور صاحب بصیرت و بصارت کی ضرورت تھی' ان کا کوئی معقول

انتظام نہ کر سکا۔ اکبر کے درباریوں اور مشیروں میں ابوالفضل، فیضی اور شاہ مبارک جیسے ذہین لوگ تھے لیکن اورنگزیب کو اپنی تعمیری اور فلاحی تحریک کے لئے اعلیٰ کردار و اوصاف کے وہ لوگ نہ مل سکے جن کی مدد سے وہ لوگوں کے دلوں کی سیاہی دھونے کا انتظام کر سکتا۔

شاہ ولی اللہ اورنگزیب کی وفات (1707ء) سے چار سال پہلے پیدا ہوئے۔ اورنگزیب کے بعد ہندوستان کے حالات تیزی سے بدلنے لگے۔ اورنگزیب کے جانشین اس کی میراث کو سنبھال نہ سکے۔ انہوں نے تخت و تاج کے حصول کے لئے آپس میں لڑنا شروع کر دیا۔ اورنگزیب عالمگیر کے عہد سے بہت پہلے مغلیہ دربار میں شیعہ سنّی کشمکش کا آغاز ہو چکا تھا۔ جو امرا (اُم را) اور وزراء گروہوں میں بٹے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں اس قدر منہمک اور مستعد رہے تھے کہ انہیں کبھی اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے دشمنوں (مرہٹے، سکھ، جاٹ اور روہیلے) کے عزائم بھانپنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ شیعہ سنّی کو اور سنّی شیعہ کو شکست دینے کے لئے سازشوں میں لگے رہتے تھے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ اورنگزیب کی وفات کے بعد تو ان گروہوں نے اپنے ڈھب کے شہزادوں کو تخت نشین کرانے کے لئے باقاعدہ اودھم مچا دیا کہ تخت و تاج ان کے ہاتھوں میں کھلونا بن کے رہ گئے۔ مغل شہزادے امراء اور لشکری جنہیں عہد جہانگیری اور عہد شاہجہانی کے عیش و عشرت نے بگاڑ دیا تھا۔ اب اور زیادہ عیش و عشرت اور بے عملی میں ڈوب گئے اور عام باشندے جن میں کسان، کاریگر اور تاجر شامل تھے، حکومت کے حد سے زیادہ مظالموں کے نیچے پس کر رہ گئے۔ فوج پست ہمت ہوگئی۔ اس کے سربراہ بدچلن ہو گئے اور ریاکار علماء کی تعداد نے ترقی کی۔

مشہور مؤرخ ڈاکٹر تاراچند اپنی کتاب ''تاریخ تحریک آزادی ہند'' میں رقمطراز ہیں:

''مایوسی کی گھنگھور گھٹا اور روز افزوں دل شکستگی کی فضا میں اسلام کے ایک تیسرے مکتب خیال کی بنیاد رکھنے والا نمودار ہوا۔ ان کا نام شاہ ولی اللہ تھا۔ وہ دلی میں (1703ھ۔1114ھ) میں پیدا ہوئے۔ ان کے سامنے سماج، حکومت، مذہب، اخلاق اور سیاست کے چند نہایت پیچیدہ مسائل تھے۔ فرقہ پروری اور اختلاف بھی اس زمانہ میں عام تھے۔

علماء جو احکام اور رسم عبادات کو بنیاد قرار دیتے تھے اور وہ لوگ جو باطنی اصول کو ماننے والے تھے اور جو باطن کے تزکیہ پر زور دیتے تھے، ان دونوں میں اختلافات تھے۔ اسی طرح فقہا کے چار مصلوں اور شیعہ اور سنّی میں اختلافات تھے۔ مسائل کو سوچنے اور رائے قائم کرنے کے طریقوں میں بھی اختلافات تھے۔ کچھ لوگ آنکھ بند کر کے احکام فقہ کی اتباع یعنی تقلید کے قائل تھے جبکہ دوسرے ایسے لوگ تھے جو احکام الٰہیہ کی شرح کے لئے وسیع میدان رکھتے تھے یعنی اجتہاد کے قائل تھے۔ کچھ لوگ اسلام کے احکام کی شرح فلسفہ یونان سے کرنے کی مذمت کرتے تھے۔ دوسرے لوگ عقل اور منطق کے استعمال کو احکام الٰہی کے فہم و ادراک کے لئے ضروری قرار دیتے تھے۔ ان باتوں کے علاوہ مسائل اصول اخلاق و سیاست میں اور اس بارے میں کہ سلطنت کے زوال و اخلاق کی گراوٹ کے کیا اسباب ہیں، باہم اختلاف تھے۔

ولی اللہ نے ان تمام مسائل پر ایسے انداز سے بحث کی جو طبع زاد اور انوکھا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ اختلاف کی جڑ پر ضرب لگائیں۔ ذاتی مخالفتوں سے لوگوں کو ماورا کریں اور مختلف نقطہ خیال میں ہم آہنگی پیدا کریں۔ مذہبی احکام کے معاملات میں ان کا خیال تھا کہ بحث اور ثبوت کو رد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا اور عقل کل رکھتا ہے یعنی عالم اور حکیم ہے اور اللہ تعالیٰ کا ہر فعل لازمی طور پر مبنی بر عقل ہوتا ہے اور انسان کا کام ہے کہ وہ دلائل سے ان کا پتہ لگائے۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کے ذریعہ جو وحی نازل کی ہے، وہ اس کی مرضی کے سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ ''قرآن کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ کسی شخص کو سوائے صاف صاف دلائل کے اور کسی طرح قائل کرے'' انہوں نے یہ قرار دیا کہ قانون (شریعت) کی راہ اور تصوف (یعنی طریقت) کی راہ، یہ دونوں راہیں متضاد نہیں ہیں بلکہ ایک ہی درخت کے دو قسم کے پھل ہیں۔ انہوں نے اس نزاع کو اس طرح ختم کرنے کی کوشش کی جو دو گروہوں کے فلسفیوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کے وجود کے بارے میں تھی، جس میں ایک گروہ تو صرف وجود الٰہی کو مانتا تھا اور دوسرا اس کی ذات وصفات دونوں کا قائل تھا۔ انہوں نے ان دونوں میں ہم آہنگی، ان کی مشترک باتوں پر زور دے کر پیدا کی۔ اسی طرح انہوں نے فقہ کے چار مصلوں میں جو بنیادی یکسانیت تھی، اس پر زور دے کر اور مؤطا امام مالک سے ان کا سلسلہ ملا کر اختلافات کو دور کیا۔

اٹھارہویں صدی کی باہمی خانہ جنگی میں اصل معاملہ تورانی نسل، سنی امراء اور ایرانی نژاد شیعوں کا جھگڑا تھا۔ شاہ ولی اللہ نے ایک کتاب ''ازالۃ الخفا'' لکھی جس میں انہوں نے چاروں خلفاء کے فضائل وکمالات کا اس انداز میں تذکرہ کیا جس سے دونوں میں اتحاد کی شکل پیدا ہو جائے۔

تاہم ان کی اس خواہش کا کہ وہ ہر فرد کو عقل سے کام لینے پر آمادہ کریں اور جس رسی میں باندھ کر علماء عوام کو گھسیٹ رہے تھے، اس سے ان کو آزاد کریں۔ اس سے زیادہ بہتر مظاہرہ کسی اور بات سے نہیں ہوا کہ انہوں نے قرآن کا ترجمہ فارسی میں کر دیا۔ یہ لوتھر کے طرز کا ایک بیباکانہ فعل تھا جس کا منشا تھا کہ انسان کو مقدس احکام الٰہیہ کے فہم کے لئے خود اپنے عقل ودل کو استعمال کرنے کا حق ہے۔

سیاست کے میدان میں غالباً وہ واحد مسلم مفکر تھے جو اس امر پر صاف دماغ رکھتے تھے کہ اخلاق، سیاست اور اقتصادیات میں کتنا گہرا رشتہ ہے۔ ان کے نزدیک اخلاق کے دو پہلو ہیں۔ ایک پرائیویٹ یا انفرادی اور دوسرا پبلک یا معاشرتی لیکن دوسرے کی قیمت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ معاشرتی اخلاقیات میں وہ عدل کو سب سے اونچا مقام دیتے ہیں جو ہمارے ذاتی کردار میں مہذب برتاؤ، خوش خلقی اور آداب گفتار کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے اور جو مالی معاملات میں اقتصادی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور اجتماعی زندگی میں شہری آزادی کو جنم دیتا ہے اور جب یہ صفت

مساوات انسانی، باہمی محبت اور انسانی برادری کی بنیاد بن جاتی ہے تو معاشرتی نیکی کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ جب انسان عدل اختیار کرتے ہیں تو وہ ایک نیک کردار سوسائٹی کی تعمیر کرتے ہیں جو عین مرضیٔ الٰہی ہے۔

یہ نیک کردار سوسائٹی اس وقت خراب ہو جاتی ہے جب دولت کی فراوانی ہوتی ہے اور اپنی بھوک کو پورا کرنا انسانی زندگی کا مقصد بن جاتا ہے۔ جب دولت مندوں پر غرور ونخوت غالب آ جاتا ہے اور عیش وعشرت اور اسراف بے جا زندگی کے خاص مقاصد بن جاتے ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کمزوروں کو کچل کر اور کسانوں، تاجروں اور کاریگروں کا خون چوس کر دولت میں اضافہ کیا جائے۔ اس طرح ملک کی اقتصادیات غلط راستوں پر پڑ جاتی ہے۔ اس بات پر زور دیا جاتا ہے۔

آخر کار بیکار پرورش پانے والوں کے مطالبات کے اضافہ سے جن کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے لیکن جو کوئی مفید کام انجام نہیں دیتے، شاہی خزانہ خالی ہو جاتا ہے۔

ان حالات کا علاج ان کے نزدیک یہ تھا کہ پورے نظام کو توڑ دیا جائے۔ (فک کل نظام) انسانی معاملات میں عدل کو قائم کیا جائے اور باہمی میل جول کو پھر سے قائم کیا جائے۔

ولی اللہ کے فلسفہ میں ان تصورات کے قیمتی عناصر موجود تھے جن کی اگر قاعدے سے نشوونما کی جاتی تو وہ ہندوستان کی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو حل کر دیتے لیکن بدقسمتی سے زمانہ خلاف تھا اور فلسفی کے ذرائع و وسائل ناکافی تھے۔" (اردو ترجمہ قاضی محمد عدیل عباسی، ناشر ترقی اردو بیورو نئی دہلی، صفحہ 258-260)

"شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات" کا یہی پس منظر ہے۔ ان خطوط کو پروفیسر خلیق احمد نظامی نے نہ صرف مرتب کیا ہے بلکہ فارسی خطوط کا اردو ترجمہ بھی پیش کیا ہے۔ کتاب میں موصوف کا بیش قیمت مقدمہ ہے جن سے ان خطوط کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان خطوط میں شاہ صاحب نے سیاسی زوال اور انتشار کے اسباب پر بصیرت افروز گفتگو کی ہے اور ملک کے اقتدار اعلیٰ کو بتایا ہے کہ کس طرح حالات کی درستگی کی کوشش بارآور ہو سکتی ہے۔ ان خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب محض عالم دین نہیں تھے۔ وہ خانقاہ میں رہ کر خانقاہ سے باہر شہر دہلی اور پورے ہندوستان کو دیکھ رہے تھے۔ باری تعالیٰ نے انہیں خاص بصیرت و بصارت عطا کی تھی۔ وہ روشن دل ہی نہیں روشن دماغ بیدار مغز بھی تھے۔ ماضی، حال اور مستقبل پر ان کی گہری نظر تھی۔ ان خطوط میں سیاسی بصیرت کے ساتھ ساتھ ملک کی اقتصادیات پر جو تبصرہ ملتا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ شاہ صاحب ایسے عالم دین تھے جو اقتصادیات جیسے موضوع پر ایک ماہر اقتصادیات کی طرح غور وفکر کر سکتے تھے۔

شاہ صاحب کے سیاسی مکتوبات پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا سید ازہر شاہ فرماتے ہیں:

"اس دور کے حالات کو سامنے رکھ کر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان انقلابی حالات نے شاہ صاحب کو ایک خاص نقطہ نظر سے سوچنے، احیا اسلام کے لئے اپنی زبان وقلم کو حرکت میں لانے اور شاہان

وقت کی آغوش اقتدار میں پلی بڑھی ہوئی بدعات وسیئات کے ناجائز مذاق کے مقابلے میں ایک خاص اسلوب سے اسلام کی حکمت وحقیقت کو بے نقاب کرنے پر متوجہ کیا اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ قدرت کو خود بداعتقادی، گمراہی، سیاسی انحطاط، اخلاقی زوال اور ملکی انتشار کے اس دہکتے ہوئے آتشکدہ پر پانی ڈالنا اور دور دور تک اس کی پھیلی ہوئی خوفناک لپٹوں کو سرد کرنا مقصود تھا کہ شاہ ولی اللہ اس دور انحطاط میں فکر و ذہن کی سلامتی، ارادہ اور عمل کی پختگی، دقیقہ رسی اور حکمت آموزی کا ایک سورج بن کر سامنے آئے ورنہ برے ماحول میں اچھے آدمی کی تخلیق، شور زمین میں سنبل وریحان کی پیدائش اور کاہلی وسستی، گرانجانی واعضاء شکستگی کی اس زہر آلود فضا میں مسجد کے ایک حجرے اور مدرسہ کی چہار دیواری سے جہادِ سیف وقلم کی رعد آسا آواز کا بے ساختہ بلند ہو جانا، عادتاً اگر مستبعد نہیں تو حیرت افزا ضرور ہے۔ غرض ادھر سے دیکھیے یا اُدھر سے اس رخ پر نظر ڈالیے یا اس پر بات ایک ہی نکلتی ہے اور وہ یہ کہ شاہ ولی اللہ اپنے دور کے بہت بڑے مفکر، اپنے زمانے میں احیاء فرض وسنت کے مخلص داعی اور زوالِ امت کی ساری پیچیدگیوں کو صحیح طور پر سمجھنے والے ایک دیدہ ور انسان تھے۔"

اس مختصر سے مضمون میں ان تمام سیاسی مکتوبات کا جائزہ لینا آسان نہیں۔ صرف چند خطوط یا ان کے اقتباسات (اردو ترجمہ) شامل کیے جارہے ہیں۔ شاہ صاحب کے ذہن رسا، اعلیٰ فکر، وسیع مطالعہ اور گہری فلسفیانہ نظر کے لئے فارسی خطوط یا ان کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔

ان سیاسی مکتوبات میں پہلا خط مغل بادشاہ، وزراء اور امراء کے نام ہے۔ خط کا اردو ترجمہ یہ ہے:

ترجمہ مکتوبِ اول..... بجانب بادشاہ ووزیر وامراء

بعد حمد وصلوٰۃ، یہ چند کلمات ہیں جن کی تحریر کا باعث بادشاہ اسلام، امراء اور جمہور مسلمان کی خیر خواہی ہوئی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا "خیر خواہی دین[1] ہے۔" اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے امید ہے کہ اگر ان کلمات کے بموجب عمل کریں گے تو امورِ سلطنت کی تقویت، حکومت کی بقاء اور عزت کی بلندی ظہور پذیر ہوگی۔

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
اُنچہ اُستادِ ازل گفت می گویم

(یعنی مجھ کو آئینہ کے پیچھے طوطی کی مانند رکھا ہے، جو کچھ "اُستادِ ازل" نے کہا ہے، وہی میں کہتا ہوں۔)

کلمۂ اول:۔ اصل اصول جس پر حکومت کی بہتری اور ملت بیضا کی رونق موقوف ہے، یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اور اس کے رسول حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی کے لئے یہ بات لازم کرلیں کہ جب فتح یابی نصیب ہو اور مخالف شکست یافتہ ہو تو سب سے پہلی چیز جس کے اجراء کا مضبوط ارادہ کریں، جاٹوں کے علاقے اور ان کے قلعوں کے فتح کرنے کی جدوجہد ہو۔ اس کام میں دینی و دنیاوی دونوں فائدے ہیں۔ منجملہ ان ضروری کاموں کے "بدمعاشوں" کی

سرزنش کرنا بھی ہے تا کہ کوئی زمینداراس قسم کی شوخی اور بے باکی کا خیال بھی نہ لائے۔

کلمہ دوم:۔ یہ کہ خالصہ کو کشادہ تر کرنا چاہیے۔ خصوصاً وہ علاقہ جو دہلی کے اردگرد ہے آگرہ، حصار، دریائے گنگ اور حدودِ سہرند تک سب کا سب علاقہ یا اس میں کا اکثر خالصہ ہو کیونکہ امورِ سلطنت میں ضعف کا سبب خالصہ کی کمی اور خزانہ کی قلت ہوا کرتی ہے۔

کلمہ سوم:۔ یہ کہ جاگیر عطا کرنا بڑے بڑے امراء کے لئے مخصوص ہو۔ چھوٹے چھوٹے منصب داروں کو نقد دینا چاہیے (جاگیر نہ دی جائے) جیسا کہ عہد شاہجہاں میں قاعدہ تھا۔ اس لئے کہ چھوٹے منصب دار جاگیروں پر قابو نہیں پاتے۔ اسی لئے ٹھیکہ دینے کی احتیاج ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے وہ اکثر اوقات مفلس رہتے ہیں اور اپنے آپ کو کارہائے پادشاہی میں پوری طرح مشغول نہیں کر سکتے۔

کلمہ چہارم:۔ یہ کہ جو لوگ اس فتنہ میں غنیم کے ساتھی ہوئے ہیں ضروری ہے کہ ان کو جاگیر و منصب اور خدمت سے بے دخل کر دیں تاکہ ان کے لئے یہ چیز سزا کے قائم مقام ہو جائے اور دوسرے لوگ اس قسم کے مواقع پر ''حق نمک'' کی ادائیگی کے راستے سے نہ بھٹکیں۔

کلمہ پنجم:۔ یہ کہ افواجِ بادشاہی کی ترتیب عمدہ طریقہ پر کرنی چاہیے اور یہ ترتیب تین طریقوں سے ہو سکتی ہے:

(1) وہ داروغہ مقرر کیے جائیں جو مندرجہ ذیل تین صفتوں سے متصف ہوں۔

الف۔ نجیب ہوں۔

ب۔ بہادر ہوں اور اپنے ساتھیوں پر شفیق ہوں۔

ج۔ تہ دل سے بادشاہ کے خیر ہوں۔

(2) جن لوگوں سے اس فتنہ میں بے غیرتی اور نمک حرامی سرزد ہوئی ہے ان کو معزول کر کے دوسروں کو داخلِ رسالہ کیا جائے۔

(3) یہ کہ ملازموں کی تنخواہیں بغیر تاخیر کے ان کو ملنی چاہئیں۔ اس لئے کہ تاخیر کی صورت میں وہ لوگ سودی قرض لینے پر مجبور ہوتے ہیں اور ان کا اکثر مال ضائع ہو جاتا ہے۔

کلمہ ششم:۔ ''خالصہ'' سے ٹھیکہ دہندگی کی رسم موقوف کر دی جائے۔ دیندار، واقف کار امین ہر جگہ مقرر کر دیئے جائیں۔ ٹھیکہ دینے میں ملک خراب ہوتا ہے اور رعیت پامال و بدحال ہو جاتی ہے۔

کلمہ ہفتم:۔ یہ کہ قاضی محتسب ایسے لوگوں کو بنایا جائے جن پر رشوت ستانی کی تہمت نہ لگائی گئی ہو اور مذہب اہلِ سنت و جماعت رکھتے ہوں۔

کلمہ ہشتم:۔.........

کلمہ نہم:۔ ائمہ مساجد کو اچھے طریقہ پر تنخواہ دی جائے۔ نماز با جماعت کی حاضری کی تاکید اور ماہِ رمضان کی بے حرمتی کی ممانعت پورے طور پر کی جائے۔

کلمہ دہم:۔ یہ کہ بادشاہِ اسلام اور امراءِ عظام ناجائز عیش و عشرت میں مشغول نہ ہوں۔ گذشتہ گناہوں سے

سچے دل سے توبہ کریں اور آئندہ گناہوں سے بچتے رہیں۔

بالفعل اگر ان دس کلمات پر عمل کریں گے، مجھے امید ہے کہ بقائے سلطنت، تائیدِ غیبی اور نصرتِ الٰہی میسر ہوگی۔
وماتوفیقی الا باللہ علیه توکل و الیه انیب۔ یعنی مجھے توفیق اللہ ہی سے حاصل ہوگی اور اسی کی ذات پر میرا توکل ہے اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔

اس خط کے بعد پہلے اور دوسرے خطوں پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

''ان مکتوبات میں پہلا خط مغل بادشاہ وزراء اور امرا کے نام ہے۔ اس میں شاہ صاحب نے سیاسی زوال اور انتشار کے اسباب پر بصیرت افروز گفتگو کی ہے اور ملک کے ''اقتدارِ اعلیٰ'' کو بتایا ہے کہ کس طرح حالات کی درستگی کی کوشش بارآور ہو سکتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ''خالصہ'' کا علاقہ بڑھایا جائے تاکہ بادشاہ کو صوبہ داروں اور جاگیرداروں کی اقتصادی غلامی سے نجات ملے، جاگیریں عطا کرنے میں احتیاط اور دور بینی سے کام لیا جائے۔ چھوٹی چھوٹی جاگیریں، سیاسی اور اقتصادی انتشار کا سبب بن جاتی ہیں، چھوٹے جاگیردار اپنی جاگیروں پر پوری طرح قابو نہیں پاتے، مجبور ہو کر ٹھیکہ پر دے دیتے ہیں۔ اس طرح اگر ایک طرف بدنظمی میں اضافہ ہوتا ہے تو دوسری جانب کاشتکاروں پر مظالم ہوتے ہیں۔ ضروری ہے کہ جاگیر صرف بڑے بڑے امیروں کو دی جائے تاکہ وہ اپنی طاقت اور شوکت کے ذریعہ اپنے علاقوں کو قابو میں رکھ سکیں، یہیں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے بلا استثناء جاگیرداری کی مخالفت کیوں نہیں کی، اس سلسلہ میں دو باتیں قابل لحاظ ہیں:

1- قرونِ وسطیٰ کے سیاسی نظام اور حالات میں جاگیرداری ایک حد تک ضروری تھی اور اس کو اس وقت تک قطعی نہیں مٹایا جا سکتا تھا جب تک پورے سیاسی نظام کی بنیادیں نہ تبدیل کر دی جائیں۔ سیاسی نظام کی بنیادیں تبدیل کرنا ان فرمانرواؤں کے بس کی بات نہ تھی۔ چنانچہ شاہ صاحب نے ایسی انقلابی تجویز ان کے سامنے پیش کرنی لایعنی خیال کی جو ان کے امکان سے باہر ہو۔

2- اس وقت ملک کا عام سیاسی ماحول حد درجہ خراب تھا، بدنظمی اور انتشار نے حالات کو حد درجہ بگاڑ دیا تھا۔ اگر جاگیرداری کو بالکل ہی ختم کیا جاتا تو جاگیرداروں کا ایک بڑا طبقہ بغاوت پر آمادہ ہو جاتا اور اس طرح بدنظمی اور بڑھ جاتی۔ شاہ صاحب نے پوری حقیقت بینی کا ثبوت دے کر صرف ان خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش فرمائی ہے جن کی موجودگی میں حکومت کی مشینری بالکل ہی حرکت نہیں کر سکتی تھی۔

علاوہ ازیں اسی مکتوب میں شاہ صاحب نے غدار لوگوں کو سزا دینے اور فوجوں کو صحیح اصولوں پر منظم کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ انہوں نے بادشاہ کو خاص طور سے اس بات کی طرف متوجہ کیا ہے کہ سپاہیوں کی تنخواہیں وقت پر دی جائیں اور ان میں نظم وضبط کا اعلیٰ معیار قائم رکھنے کی سعی کی

جائے۔ مقروض سپاہی فوج کے لئے لعنت اور قوم کے لئے ایک بوجھ ہے۔ وہ اس وقت تک اپنی خدمات بجا طور پر انجام نہیں دے سکتا جب تک کہ اس کو مستقل "اقتصادی طمانیت" حاصل نہ ہو۔ آخر میں شاہ صاحب نے بادشاہ اور وزراء کو متنبہ کیا ہے کہ غفلت اور سستی سے حالات خراب سے خراب تر ہو جائیں گے۔ انہیں چاہیے کہ عیش ونشاط کو ختم کریں اور ہمت و جرأت کے ساتھ بقائے سلطنت کے لئے کوشاں ہوں۔ ایسی صورت میں تائید الٰہی بھی ان کو حاصل ہوگی اور فتح ونصرت ان کے ہم رکاب ہوگی۔"

اس مجموعے کا دوسرا خط احمد شاہ ابدالی کے نام ہے۔ یہ خط شاہ صاحب کے ادیبانہ کمال، تاریخ دانی اور سیاسی بصیرت کا شاہکار ہے۔ شروع میں ہندوستان کے تاریخی واقعات مختصراً اس طرح بیان کیے ہیں کہ ان کو سمجھ لینے کے بعد ملک کی سیاسی نبض شناسی کا کام ایک غیر ملکی کے لئے آسان بھی ہو جاتا ہے۔ فتنہ اور فساد کے زمانہ میں انتشار کے حقیقی اسباب کا تجزیہ بہت مشکل ہوتا ہے۔ عموماً انسان کی نظر ظاہری حالات سے اس درجہ متاثر ہو جاتی ہے کہ اصلی سبب تک پہنچنے میں ناکام رہتی ہے لیکن شاہ صاحب نے سیاسی انتشار اور زوال کے اسباب کو حیرت انگیز سیاسی بصیرت کے ساتھ سمجھا اور سمجھایا ہے۔ راجپوتوں، مرہٹوں اور جاٹوں وغیرہ کے تاریخی حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کی اصلی قوت کا اندازہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح حالات پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ چوتھ کی نوعیت بتائی ہے اور مرہٹوں کے با اقتدار ہو جانے کے اسباب پر مورخانہ نظر ڈالی ہے۔ نظام الملک کے مرہٹوں اور انگریزوں سے تعلقات پر اشارہ کرتے ہوئے دکن کے سیاسی حالات کو بیان کیا ہے۔ پھر بتایا ہے کہ مرہٹے ظاہر میں کثیر تعداد میں معلوم ہوتے ہیں۔ حقیقت میں وہ قلیل ہیں، ان کے ساتھ جو لوگ شریک ہو جاتے ہیں، ان کی تعداد دیکھ کر یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ خود ان کی تعداد بہت زبردست ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان کے ایک دستہ کو شکست دے دی جائے تو ساری جماعت میں انتشار پیدا ہو جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"دراصل قوم مرہٹہ قلیل اند ملحق بایں طائفہ کثیر، در برہم زدن یک صف جماعہ کہ ملک بہ ایشاں انداز ہم می پاشند واصل قوم مرہٹہ بہ ہمیں شکست ضعیف می شود۔"

پھر فرماتے ہیں کہ جاٹوں کی طرف بھی توجہ ضروری ہے۔ دہلی اور اکبر آباد کے درمیان ان لوگوں کی "گڑھیاں" ہیں۔ مرکزی علاقہ کے قلب وجگر میں ایسی مخالف طاقتوں کا وجود سیاسی اعتبار سے سخت خطرناک ہے۔ شاہانِ مغلیہ نے اکبر آباد اور دہلی کو "بہ منزلہ دو حویلی" اس لئے رکھا تھا کہ جاٹ اور راجپوت دونوں ان کی شوکت وسطوت سے مرعوب رہیں۔ دہلی کا اثر سہرند وغیرہ پر پڑے اور اکبر آباد سے راجپوتانہ متاثر ہو۔ شاہ صاحب نے یہاں Geo-Politics کا ایک دلچسپ راز بیان کر دیا ہے۔

اس کے بعد جاٹوں کی طاقت کی نوعیت واضح کرتے ہیں اور ان کی جمعیت کو منتشر کرنے اور طاقت کو توڑنے کا طریقہ بتاتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ جاٹوں کے قبضہ میں جو علاقے ہیں، وہ ان کے اپنے نہیں ہیں۔ انہوں نے دوسروں سے غصب کیے ہیں، ان علاقوں کے اصلی مالک ابھی موجود ہیں۔ اگر کوئی ان مالکوں کو مدد دے دے تو وہ خود جاٹوں کو ان کے مقبوضہ علاقوں سے نکال کر پھینک دیں اور اس طرح یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے۔

جاٹوں اور مرہٹوں کی حالت بیان فرمانے کے بعد شاہ صاحب نے امراء اور وزراء کی سازشوں اور غداریوں کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک غیر ملکی جو ملک کے حالات سے پوری طرح واقفیت نہیں رکھتا امراء پر بلا سوچے اعتماد کر لے اور پھر ان کی غداری سے حالات اور زیادہ ناگفتہ بہ ہو جائیں۔

ان سب حالات کو بتا دینے کے بعد شاہ صاحب نے اقتصادی تفصیلات بیان فرمائی ہیں۔ لکھتے ہیں کہ ''ہندوستان کے محصولات 7-8 کروڑ سے کم نہیں لیکن ان کو وصول کرنے کے لئے غلبہ اور شوکت کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر ایک کوڑی بھی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ جس علاقے پر جاٹوں کا تصرف ہے۔ اس کے محاصل ایک کروڑ سے کم نہیں، راجپوتانہ کا خراج 2 کروڑ ہے۔ بنگال سے ایک کروڑ روپیہ سالانہ وصول ہوتا ہے۔ پھر اودھ کے حالات بیان کیے ہیں اور بتایا ہے کہ صفدر جنگ کی اقتصادی حالت ہی نے اس کو بادشاہ کے خلاف علم بغاوت اٹھانے کی ہمت دلائی تھی۔ 2 کروڑ روپیہ اودھ کے محاصل تھے، صفدر جنگ ایک کروڑ روپیہ صرف کرتا تھا اور ایک کروڑ جمع کرتا تھا۔ اس ''اقتصادی فراغت'' نے بغاوت کی راہیں دکھا دیں۔''

سلطنت مغلیہ کی اقتصادی بربادی کا ذکر کرتے ہوئے شاہی ملازمین کی زیادتی جاگیرداروں کی کثرت اور خزانہ کی قلت کے اثرات بیان کرتے ہیں اور پھر بتاتے ہیں کہ ان سب باتوں نے سوداگروں اور صنعت پیشہ لوگوں کو تباہ کر دیا ہے اور وہ:

''بانواعِ ظلم وضیق معیشت گرفتار شدہ اند۔''

شاہ صاحب کو جس طبقہ کی تباہی و بربادی کا سب سے زیادہ خیال تھا، وہ سوداگروں اور اہل حرفت ہی کا ہے۔ وہ اس طبقہ کو ملک کی اقتصادیات کا مرکزی نقطہ سمجھتے تھے۔ ملک کی عام اقتصادی حالت پر ان کے خیالات اور بنیادی تصورات پر مجموعی حیثیت سے اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ اس طبقہ کی بربادی کو ملک کی بربادی سے تعبیر کرتے تھے۔

غرض اس طرح ملک کے سیاسی اور اقتصادی حالات بیان کرنے کے بعد شاہ صاحب نے مسلمانوں کی غربت اور کسمپرسی پر نہایت غمگین لہجے میں گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ افلاس اور تباہی نے ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے:

''دریں زمانہ پادشاہے کہ صاحبِ اقتدار و شوکت باشد و قادر بر شکست لشکر کفار و دور اندیش، جنگ آزما، غیر ملازماں آنحضرت موجود نیست۔ لاجرم بر آں حضرت فرض عین است قصدِ ہندوستان کردن و تسلط کفار مرہٹہ برہم زدن و ضعفائے مسلمین را کہ در دست کفار اسیر اند، خلاص فرمودن۔''

اس خط کے نتیجہ میں پانی پت کا میدان کارزار سجا، اس جنگ کی تاریخی اہمیت سے تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے لیکن یہ حقیقت بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مدرسہ رحیمیہ کا ایک مدرس اس تاریخی جنگ کے نقشے تیار کر رہا تھا، اس خط کے مطالعہ کے بعد شاہ صاحب کی سیاسی خدمات کا ایک اہم پہلو روشن ہو جاتا ہے۔

تیسرا خط شاہ عالم کی والدہ نواب زینت المحل کے نام ہے اور غالباً اس زمانہ میں لکھا گیا ہے۔ جب شاہ عالم عالی گہر خانہ بدوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ قلعہ معلٰی کی بیگمات بھی شاہ صاحب سے عقیدت اور

ارادات رکھتی تھیں اور پریشانی کے موقعوں پر ان کی دعا اور روحانی امداد کی طالب ہوتی تھیں۔

اس کے بعد سات خطوط (مکتوب چہارم تا دہم) نجیب الدولہ کے نام ہیں۔ان مکتوبات سے اگر ایک طرف شاہ صاحب اور روہیلہ سردار نجیب الدولہ کے باہمی تعلقات پر روشنی پڑتی ہے تو دوسری طرف یہ چیز بھی پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ شاہ صاحب کس طرح اس زمانہ کے حالات کا مطالعہ کر رہے تھے اور کس جذب اور انہاک کے ساتھ ''امیر الغزاۃ''،''رئیس المجاہدین'' کے خطاب سے مخاطب کر کے اس کے مذہبی جذبہ کو متاثر کرتے تھے اور کامیابی کی بشارتیں دے دے کر اس کی ہمت اور جرأت کو بڑھاتے تھے۔ایک خط میں لکھتے ہیں:

''در پردۂ غیب برانداختین ایں دو فرقہ ضالہ یعنی مرہٹہ و جٹ مصمم شدہ است۔''

پھر فرماتے ہیں جوں ہی تم کمر ہمت باندھو گی ان کا طلسم پارہ پارہ ہو جائے گا۔بعض خطوط کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ابدالی فوجوں کی نقل و حرکت کا بھی علم رہتا تھا اور حالات و ضروریات کو ملحوظ رکھ کر وہ لوگوں کو ہدایات دیتے رہتے تھے۔نجیب الدولہ بھی شاہ صاحب سے مشورہ لیتا تھا اور مشکلات میں رجوع کرتا تھا۔ایک خط میں لکھتے ہیں کہ جب جنگ کے لئے گھر سے روانہ ہو تو فقیر کو اطلاع دے دینا تا کہ وہ خدا کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق دعا کرتا رہے۔

جب صفدر جنگ نے جاٹوں سے ساز باز کر لی تو نجیب الدولہ نے گھبرا کر شاہ صاحب کو خط لکھا۔جواب میں ارشاد فرمایا کہ عزیز من! جاٹوں کی شکست عالم بالا میں طے ہو چکی ہے۔تمہیں بالکل گھبرانا نہ چاہیے۔اگر مسلمانوں کی ایک جماعت ان کی شریک ہو گئی تو نا امیدی کی کوئی وجہ نہیں۔

''خدائی تعالیٰ دستش آں جماعہ مسلمین بند خواہد کرد، قتال نخواہند کرد۔''

نجیب الدولہ کے بعد 16 خط شیخ محمد عاشق پھلتی کے نام ہیں۔ان مکتوبات میں شاہ صاحب نے بادشاہ سے اپنی ملاقات کا حال لکھا ہے۔ملک کے عام حالات پر جگہ جگہ تشویش اور پریشانی کا اظہار کیا ہے۔ابدالی کے حملوں کی اطلاعات ان خطوط میں اکثر جگہ ہیں۔شاہ صاحب نے پھلت اور بوڑھانہ کی سلامتی اور فوجوں کی پامالی سے بچنے کے لئے بہت ہی خلوص سے دعائیں مانگی ہیں۔آنے والے حوادث سے اکثر موقعوں پر آگاہ کیا ہے۔ایک مرتبہ رمضان کے موقع پر پھلت میں اعتکاف کے لئے شیخ محمد عاشق نے لکھا تو شاہ صاحب نے جواب دیا:

''دریں حالت خانہ را گذاشتن....از آداب مصالح ظاہر دور می نماید۔''

مکتوب بستم غالباً 1167ھ مطابق 1754ء میں لکھا گیا ہے۔جب صفدر جنگ کا انتقال ہوا ہے،اس زمانہ میں بقول شاہ صاحب ارباب حل و عقد کی تلون مزاجی کا یہ عالم تھا کہ صبح کو ایک رائے قائم کرتے تھے اور شام کو توڑ دیئے تھے۔روپے کی کمی تھی اور ساتھ ہی جنگ کے طول پڑ جانے کا ڈر دامنگیر تھا۔

مکتوب بست و دوم میں شیخ محمد عاشق کو (جنھوں نے حالات کے پیش نظر دہلی سے منتقل ہو جانے کا مشورہ دیا ہوگا) لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نظر کرم یہاں اور وہاں یکساں ہے پھر خواہ مخواہ کہیں منتقل ہو جانے کی تکلیف ہم کیوں اٹھائیں۔اس کے بعد فرماتے ہیں:

''و محتمل کہ بودن بعض نفوس اینجا سبب حوادث اینجا باشد۔''

اسی نوعیت کی بات دوسرے خط میں دہراتے ہیں۔ مکتوب سیزدہم میں لکھتے ہیں:

''امروز افواہ شنیدہ شد کہ تشویشِ خاطر آورد کہ افواج درانیہ بہ طرف بارہہ می رود' آرے جہت تشویش خاطر پیدا شد۔ ہر چند ظنِ غالب است کہ طرف پھلت و بڈھانہ کارے نداشتہ باشند' بالجملہ از فضل الٰہی امید قوی داریم کہ خدائے تعالیٰ شمار را از جمیع آفات سلامت دارد و ایں معنی از دل می جوشد' ہر چند بحسب ظاہر تشویشے می آید و تدبیر اصلاح کردہ می شود۔''

''قول الجلی'' کی یہ عبارت اس سلسلہ میں قابل غور ہے:

''ہم دراں ہنگامہ بایں خاکسار سرفراز نامہ ارشاد فرمودہ بودند کہ افواہ آنست کہ افواج درانیاں بطرف بارہہ می رود' ازیں جہت تشویش پیدا خاطر شد' ہر چند ظن غالب آنست کہ بطرف پھلت و بڈھانہ کارے نداشتہ باشند بالجملہ از فضل الٰہی امید قوی داریم کہ خدائے تعالیٰ شمار او مار از جمیع آفات سلامت دارد و ایں معنی از دل می جوشد' ہر چند بحسب ظاہر تشویشے می آید...... پس ہم چناں کہ ارشاد شدہ بود بظہور نمود کہ افواج درانیہ بمسافت سہ چہار کوردہ از قریہ پھلت رسید تاخت و تاراج کردہ' ہر دو قریہ مذکورہ بہ ہمہ وجوہ سلامت ماندند و ہمچنیں قصبہ بڈھانہ بہمہ جہات محفوظ ماند و در بلدہ شاہ جہاں آباد محلہ کشک نرور کہ مسکین حضرت ایشاں است ہم از جہت دستبرد غارتیان و ہم از جہت مصادرہ کہ برسر خانہ ہائے شہر مقرر شدہ بود محفوظ ماند و اذیتی نرسید'' (صفحہ:226)

آخر میں متفرق خطوط ہیں جو سید احمد روہیلہ' آصف جاہ' تاج محمد خاں بلوچ' نواب مجد الدولہ' نواب عبداللہ خاں کشمیری اور حافظ جاراللہ کے نام لکھے گئے ہیں۔ ان خطوط کا مقصد ملک کے مختلف سیاسی لیڈروں کو اپنا ہم خیال بنا کر حالات کی درستگی کے لئے تیار کرنا ہے۔

گوئے توفیق و کرامت درمیاں افگندہ اند
کس بمیداں نمی آید سواراں راچہ شد

کہہ کہہ کر عمل کی ترغیب دیتے ہیں۔ وزیر الملک آصف جاہ کو لکھتے ہیں کہ آں عزیز القدر کا ہندوستان میں کافی اقتدار ہے' ہم فقیر اس بات کے امیدوار ہیں کہ آں عزیز ''رفع مظالم'' اور ''تغیر رسوم بد'' کے لئے کوشاں ہوں۔

اس تجزیے کے بعد راقم پہلے خط کے کلمۂ نہم کی جانب توجہ مبذول کرانا چاہتا ہے۔ آج سے تقریباً ڈھائی سو سال پہلے بادشاہ وزراء اور امراء سے مخاطب ہیں کہ ''آئمہ مساجد کو اچھے طریقے پر تنخواہ دی جائے اور نماز با جماعت کی تاکید کی جائے۔''

اس جمہوری دور میں جبکہ مسجد کے جملہ امور وقف بورڈ اور منتظمہ کمیٹی کے سپرد ہیں تو ائمہ مساجد اپنی تنخواہوں کے لئے پریشان رہتے ہیں۔ جو مشاہرے یا تنخواہیں مقرر ہیں، وہ اس قدر قلیل ہیں کہ روزمرہ کے اخراجات بمشکل پورے ہوتے ہیں اور آج اپنی تنخواہوں میں اضافے کے لئے آئمہ کرام حکمراں طبقے سے رجوع کر رہے ہیں اور عدالتوں کا

دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں۔

ذرا غور کیجیے جو امام آپ کی نماز کی قیادت کر رہا ہے، اگر وہ معاشی پریشانیوں میں مبتلا ہوگا تو کس طرح یکسو ہو کر امامت کے فرائض انجام دے گا۔

2- مجموعے کا دوسرا خط طویل ہے جو کتاب کے صفحہ 83 سے شروع ہو کر صفحہ 98 پر ختم ہوتا ہے۔ یہ خط احمد شاہ ابدالی کے نام ہے جس پر پروفیسر خلیق احمد نظامی تبصرہ کر چکے ہیں۔ اسی خط کے تعلق سے اعتراض کیا گیا کہ ہندوستان میں جو سیاسی افراتفری، بددیانتی، غداری اور مغلیہ عسکری نظام کی ابتری تھی، ان برائیوں کے استیصال کے لئے اپنے دست و بازو میں اتنی طاقت نہ پائی اور اپنی سلطنت کو امن عامہ اور احترام آئین و قوانین کو پھر سے زندہ کرنے میں عاجز دیکھا تو مجبوراً انہیں احمد شاہ ابدالی کو آواز دینی پڑی۔ اس دور کے ملکی حالات اور سیاسی صورتحال پر نظر ڈالیے تو نظر آئے گا کہ شاہ صاحب نے بغور مطالعہ کرنے کے بعد دو ایسی طاقتوں کا انتخاب کیا جن کے ذریعہ سے مفسدانہ عناصر کی سرکوبی کی جا سکتی تھی۔

1- نجیب الدولہ یعنی روہیلے۔

2- احمد شاہ ابدالی۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ "شاہ صاحب نے ان دونوں کے انتخاب میں بے پناہ سیاسی بصیرت کا ثبوت دیا تھا۔ روہیلوں کی عسکری طاقت اور صلاحیت پر سر جادو ناتھ سرکار نے اپنی کتاب مغل سلطنت کا زوال (Fall of the Mughal Empire) جلد اول صفحہ 53-51 پر بحث کی ہے۔ نجیب الدولہ کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں سپاہیانہ بہادری، سیاسی تدبر، دور بینی اور صلاحیت جہانبانی سب کچھ تھا۔ جلد دوم صفحہ 415 پر وہ لکھتا ہے بلکہ وہ سوائے احمد شاہ ابدالی کے اپنے تمام معاصرین میں لاثانی تھا۔

He had no equal in the age except Ahmad Shah Abdali.(Vol.II, p.415)

شاہ صاحب کی سیاسی بصیرت اور حقائق شناسی کا یہ کمال تھا کہ انہوں نے دو ایسی عظیم المرتبت شخصیتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا جن کو بیسویں صدی کا ایک مشہور مورخ اٹھارہویں صدی کی سب سے زیادہ قابل شخصیتیں تصور کرتا ہے۔

سچائی یہ ہے کہ اعتراض کرنا بہت آسان ہوتا ہے اور کسی بات کی حقیقت تک پہنچنا اس کے مقابلے میں انتہائی مشکل..... بعض لوگ جن کی سوچ منفی ہوتی ہے وہ ہر بات میں کوئی نہ کوئی نقص نکال دیتے ہیں۔ ان کے لئے اعتراض کرنا معمولی بات ہوتی ہے۔ یہاں یہ بآسانی اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحب نے اپنے گھر پر دوسروں کو چڑھا دینے اور اپنے ملک میں دوسروں کو کھل کر کھیلنے کی دعوت کیوں دی؟

پروفیسر نظامی ان اسباب پر روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ نادر شاہ کے حملے (1739ء) نے مغلیہ سلطنت کا سارا ڈھانچہ بے جان کر دیا تھا۔ مرکز سے علیحدہ صوبوں میں خود مختاریاں قائم ہو گئی تھیں۔ سعادت علی خاں نے اودھ میں، علی وردی خاں نے بنگال میں، نظام الملک نے دکن میں آزاد حکومتوں کی بنا ڈال دی تھی۔ پنجاب میں سکھوں کا اقتدار بڑھنے لگا تھا۔ مغربی اور جنوبی علاقوں میں مرہٹوں نے تسلط قائم کر لیا تھا اور بہار، اڑیسہ اور بنگال کو تاخت و تاراج کر رہے تھے۔ دہلی میں ایرانی تورانی نزاع پورے عروج پر تھا۔ امراء آپس کے عناد اور دوسرے فریق کو شکست دینے کی خاطر

مرہٹوں سے امداد لیتے تھے اور اس طرح مرہٹوں کا اقتدار دہلی کے اردگرد کے علاقہ میں بڑھ رہا تھا۔

ہندوستان کی تاریخ کا یہ نازک دور تھا۔ شاہانِ مغلیہ ان حالات میں بالکل بے بس تھے۔ شاہ صاحب نے اس موقع پر ایک طرف نجیب الدولہ کو تیار کیا کہ وہ ہمت اور جرأت سے مقابلہ کرے۔ دوسری طرف احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی کہ وہ ہندوستان آ کر مرہٹوں کے تسلط سے خلاصی دلائے۔ طباطبائی نے لکھا ہے:

''مردم از دستِ شاں (مرہٹہ) بجا آمدہ برائے ناموس آبروئے خور رفاہ عالمے شاہ ابدالی منت رابہ منت از ولایت طلب داشتہ'' (سیر المتاخرین)

نادر شاہ کے حملے کے بعد مسلمانوں کی بیچارگی اور درماندگی کی جو حسرت ناک حالت ہوگئی تھی، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ''جوہر'' کر کے یعنی آگ میں جل کر خود کو ختم کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ (ملفوظات شاہ عبدالعزیز)

یہ تھے ہندوستان کے وہ ہوشربا حالات جن میں شاہ صاحب نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان بلایا تھا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ شاہ صاحب اپنے مقاصد میں کہاں تک کامیاب ہوئے لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جنگ پانی پت نے ہندوستان کی تاریخ کا رخ بدل دیا۔

مولانا ازہر شاہ قیصر اپنے مضمون ''حضرت شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکاتیب'' مطبوعہ ماہنامہ ''دینی مدارس'' شاہ ولی اللہ نمبر میں رقمطراز ہیں کہ ہم اس اعتراض (احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان میں بلانا) کے جواب میں کوئی طویل بحث نہیں چھیڑنا چاہتے بلکہ ہمارے محترم مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے اس موقع پر جو جواب دیا ہے، یہاں نقل کر دیتے ہیں:

''حضرت شاہ صاحب محبّ وطن تھے اور اتنے ہی جتنا کہ اس آریہ ورت کا کوئی چار ہزار برس کا باشندہ ہو سکتا ہے لیکن اگر گھر میں آگ لگ رہی ہو اور خود گھر والے اس کو بجھانے اور اس پر قابو پانے پر قادر نہ ہوں تو کیا اس وقت باہر والوں کو امداد کے لئے نہ بلانا گھر سے غداری اور خودکشی نہیں ہے؟ سوچنے کی بات یہ ہے کہ احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کی طاقت کو زیروزبر کیا اور اب پورے ہندوستان میں کوئی طاقت اس کی حریف نہیں ہو سکتی تھی لیکن اس کے باوجود وہ نجیب الدولہ کو امیر الامراء بنا کر چلا گیا اور خود اس نے اپنی حکومت قائم نہیں کی۔ ایک مورخ یہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ حضرت شاہ صاحب کے اشارہ اور ایما پر ہی ہوا ہوگا جنہوں نے اپنے گھر کو درست کرنے کے لئے بیرونی امداد تو لی لیکن اپنے ملک پر بیرونی طاقت کا قبضہ گوارا نہیں کیا۔ رہا امداد کے لئے بلانا؟ تو واقعہ یہ ہے کہ مرہٹوں نے اس ملک میں اس قدر مضبوط اقتدار قائم کر لیا تھا اور ان کی وجہ سے پورے ملک میں عام تباہی و بربادی اس درجہ میں پھیل رہی تھی کہ بیرونی امداد کو طلب کرنے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ چنانچہ اس معاملے میں حضرت شاہ صاحب خود اکیلے نہیں۔ خود نجیب الدولہ اور سب سے بڑھ کر ہندو راجہ، مہاراجہ، احمد شاہ ابدالی سے امداد کے خواہاں تھے۔''

''سیر المتاخرین'' کے الفاظ یہ ہیں:

"نجیب الدولہ وراجہائے ہنداز دست مرہٹہ وعماد الملک بجاں آوردہ زوالِ دولت وملکِ خوداز دست و بردمرہٹہ برای العین مشاہدہ نمودہ عرائض استدعا بخدمت احمد شاہ ابدالی نگاشتہ خواہاں ور ودشدند۔"

ترجمہ:۔ نجیب الدولہ اور ہندوستان کے راجہ مہاراجوں نے مرہٹوں اور عماد الملک کے ہاتھوں اپنے ملک ودولت کا زوال بچشم خود دیکھ کراحمد شاہ ابدالی کو درخواستیں بھیجیں اور ہندوستان میں اس کے ورود کے خواہاں ہوئے۔

اوراس کی وجہ یہ ہے کہ جیسا کہ مرہٹوں کی تاریخ سے ظاہر ہے اور خود ہندوارباب قلم نے اس کی تصریح کی ہے کہ یہ لوگ انسانیت اور شرافت کے دشمن تھے اور کوئی ظلم وستم ایسا نہیں تھا جوانہوں نے ہندو مسلمانوں اور عیسائیوں وغیرہ پر روانہ رکھا ہو۔ پس یہ ظاہر ہے کہ شاہ صاحب کا ابدالی کو بلانا وطن کی محبت اور اہل ملک کی خیر خواہی کے جذبہ ہی سے تھا اور اس میں وہ بالکل حق بجانب تھے۔ اگر شاہ صاحب کے پیش نظر صرف مسلمانوں کی خیریت اور بھلائی ہوتی تو وہ نجیب الدولہ کو دہلی بلاتے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ "ذمیان" یعنی "غیر مسلموں کی بھی صراحت نہ کرتے اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے لئے بھی امن وامان کی درخواست نہ کرتے۔"

(ماہنامہ برہان، دہلی، مارچ 1951ء)

ہندوستان کے اٹھارہویں صدی کے حالات سے قطع نظر موجودہ دنیا کو دیکھیے۔ آج دنیا انفارمیشن ٹیکنالوجی کے باعث سمٹ کر رہ گئی ہے۔ کسی بھی جگہ چھوٹا یا بڑا کوئی واقعہ یا حادثہ رونما ہو چند منٹوں میں دنیا بھر میں اطلاع ہو جاتی ہے۔ امریکہ اس وقت دنیا بھر کی سب سے بڑی طاقت ہے لیکن گذشتہ دنوں عراق اور افغانستان میں جنگ کے لئے اس نے حلیفوں کی مدد حاصل کی۔ اس سے پہلے عراق کی کویت کے ساتھ جنگ ہوئی تو سعودی عرب اور کویت دونوں نے امریکہ سے مدد لی اور کسی بڑے خطرے کے پیش نظر حفاظت کے لئے امریکی فوج کو اپنے علاقوں میں مقرر کیا۔ سعودی عرب میں آج بھی امریکی فوج کا ڈیرا ہے، دینا بھر میں دہشت گردی ختم کرنے کے لئے ممالک ایک دوسرے سے تعاون کر رہے ہیں، اس سے اٹھارہویں صدی میں ہندوستان کی جو حالت تھی، اس وقت شاہ صاحب کا احمد شاہ ابدالی کو خط لکھنا، ہندوستان بلانا ہندوستان کے حق میں ہی تھا کیونکہ مغل حکومت اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ حکومت کے باغیوں کی سرکوبی بھی نہیں کرسکتی تھی۔ چہ جائیکہ اپنے خلاف محاذ آرا قوتوں کا مقابلہ کرتی۔ اگر سلطنت مغلیہ اس قدر ناتواں نہ ہوتی تو شاہ صاحب، احمد شاہ ابدالی کو کبھی مدعو نہ کرتے۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے کہ "اگر سلطنت مغلیہ میں تھوڑی سی بھی جان ہوتی تو وہ جنگ پانی پت کے نتائج سے فائدہ اٹھا کر اپنے اقتدار کو ہندوستان میں پھر کچھ صدیوں کے لئے قائم کرسکتی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت اس وقت ایک بے روح جسم کی مانند تھی۔ جنگ پانی پت کا اصلی فائدہ فاتحین جنگ پلاسی نے اٹھایا۔"

یہ سمجھ لینا غلط ہوگا کہ شاہ ولی اللہ یا احمد شاہ ابدالی انگریزوں کے خطرے سے بے خبر تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ

انہیں ڈر تھا کہ کہیں مغلیہ بادشاہ کے تساہل سے انگریزوں کو اپنا اقتدار قائم کرنے کا موقع نہ مل جائے۔ جس وقت احمد شاہ ابدالی نے حملہ کیا، شاہ عالم ثانی بہار میں تھا۔ جنگ پانی پت کے بعد احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم کو دہلی بلانے کی بے حد کوشش کی اور اپنا آدمی بھیجا۔ جب نہ آیا تو احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم کی والدہ نواب زینت محل سے خط لکھوایا.... شاہ عالم کو وہاں سے بلانے کی کوشش اس لئے تھی کہ وہ انگریزوں کے اثر سے نکل آئے اور دہلی آ کر احمد شاہ کی موجودگی میں اپنی طاقت کو استحکام کر لے۔

شاہ صاحب کے ان سیاسی خطوط کی روشنی میں کچھ لوگوں کے ذہن میں یہ خیال آ سکتا ہے کہ شاہ صاحب نے اس وقت محض مسلمانوں کو مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں سے بچانے کے لئے یہ قدم اٹھایا۔ اس طرح کی غلط فہمیوں کے پیش نظر مولانا عبید اللہ سندھی کا یہ بیان قابل توجہ ہے:

> ''شاہ صاحب نے خوب سمجھ لیا تھا کہ شہنشاہیت کا دور ختم ہو چکا۔ اب اگر کوئی حکومت بنے گی تو اس کا اساس کوئی اور ہوگا۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ نے جس تحریک کی داغ بیل ڈالی وہ ہمہ گیر تحریک تھی۔ ان کے پیش نظر پورا ہندوستان تھا۔ چونکہ مرکزی ہندوستان کی قیادت اس وقت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی، اس لئے لامحالہ شاہ صاحب نے عام مسلمانوں سے خطاب کیا لیکن شاہ صاحب کی دعوت کے اصول عام انسانیت کے اصول تھے۔ ان کا زور مذہب کی رسوم پر نہیں بلکہ مذہب کی روح پر تھا۔ قانون کی ظاہری شکل پر نہیں بلکہ قانون کی جان یعنی عدل و انصاف پر تھا۔ مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں اور اس عہد کی دوسری چھوٹی تحریکیں اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہوں گی لیکن ان میں کسی تحریک میں اتنی وسعت اور ہمہ گیری نہ تھی کہ وہ ہندوستان کی مرکزیت اور وحدت کو بحال رکھ سکنے کی تدبیر سوچتیں۔ شاہ صاحب اپنے مجوزہ نظام میں اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگزیب کے زمانہ کی مرکزیت اور سلطنت ہند کے اقتدار اعلیٰ کو بحال دیکھنا چاہتے تھے لیکن اس طرح سے کہ مطلق العنان بادشاہوں کے بجائے انصاف کی حکومت ہو......(شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک: مولانا عبید اللہ سندھی ترتیب و تدوین محمد سرور، صفحہ: 27-28)

شاہ صاحب کے ان سیاسی مکتوبات کا بغور مطالعہ کیجیے تو ہمیں پروفیسر محمد حبیب کے ان خیالات سے ضرور اتفاق ہوگا کہ:

> ''درحقیقت شاہ صاحب ''سماجی تحفظ'' کے حامی تھے اور یہ چاہتے تھے کہ ہند کے شاندار ماضی کی روشنی میں ملک کے سیاسی اداروں کو از سر نو زندہ کیا جائے۔''

✦ ..... ✦ ..... ✦
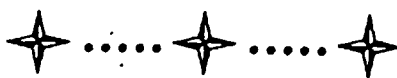
نسیم احمد فریدی

مکتوبات کا تحلیلی مطالعہ

شاہ ولی اللہ دہلوی کے زیرنظر مکتوبات کئی اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ ان میں تفسیر، حدیث، فقہ، فلسفہ وکلام اور تصوف وسلوک کے علاوہ علم اسرار الشریعہ پر بھی مفید نکات ملتے ہیں جو شاہ صاحب کا مخصوص موضوع ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے سوانح حیات اور علمی آثار کے بارے میں بھی رہنما اشارے ملتے ہیں۔ یہاں صرف چند خطوط کے مشمولات کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ عبارت میں جو حوالے قوسین کے درمیان آئے ہیں، وہ مکتوب کا نمبر شمار ظاہر کرتے ہیں۔

1- شاہ صاحب کو اندازہ تھا کہ ان کے علوم ومعارف ایک خاص حلقے میں شائع ہوں گے مگر ان کا اثر پائیدار ہوگا۔ فرماتے ہیں: ''میں یہ نہیں کہتا کہ تمام عالم میرے اس طریقے کو قبول کرلے گا بلکہ (قبول کرنے والے) تین یا چار اشخاص ہوں گے۔ یہاں تک کہ ایک وقت آئے گا کہ کام روشن تر اور واضح تر ہو جائے گا۔ میرے ہاتھ سے نہیں بلکہ کسی اور کے ہاتھ سے میری نیابت کے طور پر۔'' (5/2)

ایک موقع پر لکھا ہے کہ ''مروج علمے یا معرفتے غیر آن باشد کہ مظہر آن علوم ومعارف است از حضرت حق تعالیٰ۔ ولن تجد لسنة الله تبديلا (62:63) باید دید کہ حق تعالیٰ مروج این علوم ومعارف کرا خواہد گردانید واین سعادت بہ کہ نصیب فرمودہ۔'' (17/2)

ایک اور خط میں (37/2) یوں فرماتے ہیں: ''كوشفت أن في وفي كتبي وفي ذريتي سرا أمضاه الله تعالىٰ فهو ماض الى يوم القيامة ان شاء الله''

2- ان خطوط میں عموماً تاریخ کتابت درج نہیں۔ صرف بعض خطوط کا زمانہ قرائن سے متعین ہوسکتا ہے۔ ایک خط سے (مکتوب 66) معلوم ہوتا ہے کہ شاہ رفیع الدین کی ولادت 9 ذی الحج کو منگل کے دن ضحوہ الکبریٰ کے وقت ہوئی اور نام عبدالوہاب رکھا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ 9 ذی الحجہ 1163ھ (مطابق 10 نومبر 1750ء) صحیح تاریخ ولادت ہے۔

3- ایک مکتوب میں اپنی پہلی اہلیہ (فاطمہ) کے انتقال کی خبر دی ہے کہ وہ 21 سال سے رفیق حیات تھیں۔ انہوں نے تین اولادیں چھوڑیں۔ ایک بچی عمر 6 سال، دوسرا بچہ (شیخ احمد) عمر 3 سال، تیسری بچی عمر 6 ماہ۔

شاہ صاحب کے ایک خط (بنام مخدوم محمد معین ٹھٹھوی) سے شیخ محمد کی ولادت (1146ھ۔ 34-1733ء) دریافت ہوتی ہے۔ والدہ کی رحلت کے وقت وہ تین سال کے تھے تو والدہ کا انتقال (1149ھ۔ 37-1736ء) میں ہوا۔

شاہ صاحب نے عقد ثانی (1157ھ۔45-1744ء) میں کیا۔ ان زوجہ سے دونوں صاحبزادیوں کا سنہ ولادت بھی اس خط کی روشنی میں متعین ہوتا ہے۔

4- مکتوب 66 سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب مسویٰ شرح الموطا (بزبان عربی) کی تالیف ہو رہی ہے۔ مکتوب 127 میں ہوامع (شرح حزب البحر) کی تالیف کا ذکر ہے۔ خط 134 سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مسودہ صاف ہو رہا ہے۔

خط 115 میں ''حجۃ اللہ البالغہ'' اور ''الانتباہ فی سلاسل اولیا اللہ'' کی تکمیل کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ مکتوبات 41-42 میں بھی تصانیف کا تذکرہ ہے۔ مکتوب 44 سے ''الانتباہ'' کے مسودے کا اور مکتوب 46 سے ''مآثر رحیمیہ'' کا حال معلوم ہوتا ہے۔ مکتوب 66-71 میں ''القول الجلی'' کا حوالہ ہے۔

ایک خط میں ''خیر کثیر'' کے مسودہ کا تذکرہ ہے۔ (12/2) اگلے خط میں ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے بعض اجزاء کا ذکر ہے۔ ''ازالۃ الخفا'' کی فصل چہارم تسوید کی منزل میں ہے۔ (191/2) ''اس وقت کا سب سے بڑا مقصد درگاہ الٰہی میں ''ازالۃ الخفا'' کی تکمیل کے لئے التجا کرنا ہے۔ اس میں رسالہ تدوین مذہب فاروق اعظم کو بھی ایجاز واختصار کے ساتھ لکھ دیا ہے۔'' (175/2) ''ازالۃ الخفا'' میں مآثر وفضائل ذی النورین لکھنا شروع ہو گئے ہیں۔ (187/2)

5- (جلد 2 مکتوب 9) سفر حج کا تذکرہ ہے: ''روز دوشنبہ دوازدہم جمادالآخرہ بہ اجمیر رسیدہ شد۔ بتاریخ چہاردہم بسمت گجرات توجہ نمودہ خواہد شد۔'' یعنی 12 جمادالآخرہ 1143ھ/24 دسمبر 1730ء کو شاہ صاحب اجمیر پہنچے دو دن بعد وہاں سے گجرات کی طرف سفر کرنے کا ارادہ تھا۔ 12 جمادی الآخرہ کو روز دوشنبہ بتایا گیا ہے مگر تقویم کے حساب سے اس تاریخ کو ہفتہ کا دن آتا ہے۔

6- اسی خط (9/2) میں یہ بھی لکھا ہے کہ ''والدہ صاحبہ واہل بیت این فقیر ہمہ را تسکین دہند'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ (1143ھ۔1730ء) میں شاہ صاحب کی والدہ ماجدہ حیات تھیں اور اہلیہ بھی۔

7- بعض خطوط سے شاہ صاحب کے شخصی حالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ مکتوب 15/2 میں ہے کہ ''بامن یک فلس بے مبالغہ نیست'' (بلا مبالغہ میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں) مکتوب 155/2 سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مکان خالی کر کے اکبرآبادی مسجد میں آرہے تھے۔ چالیس دن اس میں مقیم رہے۔ ہر سال مکان کی چارپائیاں اور چٹائیاں تبدیل کی جاتی تھیں۔ (155/2)

ایک دختر پیدا ہوئی، نام فاطمہ رکھا ہے۔ (147/2) تعزیت نامے کا جواب دیا ہے۔

8- شاہ عبدالعزیز دہلوی کے بارے میں ''عبدالعزیز نے تراویح میں قرآن پڑھا۔ پچھلے سال سے بہتر۔'' (191/2)

9- مجھ کو خلعت مجددیت دی گئی ہے۔ حدیث پیغمبر کی خاص طور پر تقلید ہوگی۔ مزامیر کے سماع کے عادی نہ بنیں۔ (5/2)

10- بادشاہ مسلمین اور اسلامی لشکروں کے لئے دعا ختم خواجگان پڑھیں۔ (19/2)

11- صوفیہ کی بعض غلط فہمیوں کو ''الطاف القدس'' میں دور کیا گیا ہے۔ لطائف والا مکتوب حد مکتوبات سے بڑھ گیا

اور ایک مستقل رسالہ ہو گیا۔ آپ جو نام مقرر کریں، وہی رکھ دیا جائے گا۔ حسب دستور قدیم کہ فقیر کی ہر تصنیف کی تبییض یا تصحیح اور اس کا نام رکھنے میں یا دوسرے امور میں آپ کو دخل رہا ہے۔ (2/29-31) نیز (37/2)

12- الموطا کے ترجمے میں مشغولیت ہے۔ (37/2)

13- مسئلہ وحدت الوجود کے بارے میں۔ (48/2)

14- ''درخانقاہ شما کہ دوصد سالہ یا قدیم تر ازین است ایتلافے کہ خواہد شد نبود'' (54/2)

15- ہمارے حضرت (شاہ عبدالرحیم) گاہ گاہے ہندی میں یہ دوہا پڑھتے تھے اور انہیں بہت رقت ہوتی تھی۔ (57/2)

پات جھڑنتے یوں کہیں سن رے بن کے رائے
اب کے بچھڑے ناہ ملیں دور پڑیں گے جائے

16- ہر شخص کو وہ ملتا ہے جو اس کا دلی مطلوب ہو۔ میاں نور اللہ اور میاں محمد عاشق کو ''فنا'' مطلوب تھی۔ وہ انہیں مل گئی اور اس سے آگے عروج کے امیدوار ہیں۔ (64/2)

17- ذکر جہر، سماع غنا اور محبت انگیز باتیں سننے سے قلب بیدار ہوتا ہے۔ (82/2)

18- ہندی کا ایک دوہا میرے قلب میں القا کیا گیا ہے۔ (88/2)

میرے من میں پیت بسے جس دیکھت مجھ چین
گلی گلی اب کون پھرے، کیوں کوکے دن رین

19- شاہ عبدالرحمٰن کے فرزند کی ولادت، نام محمد نعمان تجویز کیا۔ اپنی اہلیہ کا سلام لکھا ہے۔ (133/2)

20- مسجد اکبر آبادی کے امام کی سفارش، تنخواہ وقت پر ملا کرے۔ (160/2)
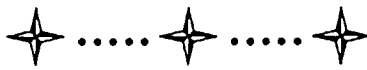
مترجم: پروفیسر محمد سرور

مشاہدات و معارف

(بحوالہ ''فیوض الحرمین'')

شاہ ولی اللہ 1114ھ میں پیدا ہوئے۔ سترہ سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا اور ان کو باپ کی جگہ مسند تدریس سنبھالنی پڑی۔ بارہ سال تک درس دینے کے بعد 1143ھ میں شاہ صاحب نے حجاز کا قصد فرمایا۔ دو سال کے قریب آپ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں رہے۔ ''فیوض الحرمین'' شاہ صاحب کے اسی سفرِ حجاز کی یادگار ہے۔

اس میں حضرت شاہ صاحب کے روحانی مکاشفات ہیں۔ تصوف وسلوک کے اسرار ہیں۔ وحدت الوجود اور تخلیق کائنات کی بحثیں ہیں۔ حکمت وفلسفہ کے نکات ہیں۔ دین وملت کے بعض اہم بنیادی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ حنفی فقہ کی چند نادر خصوصیات کا ذکر ہے۔ علماء اور صوفیا کے نزاع کے سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ شیعوں اور سنیوں میں تفضیلِ علیؓ اور تفضیل ابوبکرؓ وعمرؓ کا جو جھگڑا ہے، شاہ صاحب نے اس کا حل پیش کیا ہے۔ ہندوستان میں کفار کے بڑھتے ہوئے خطرہ کی طرف بھی ایک آدھ جگہ اجمالی اشارہ ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے مجددیت، وصایت اور قطبیت کے مقامات پر سرفراز فرمایا ہے۔ میں قائم الزمان ہوں کہ میرے توسط سے اہلِ اسلام کو کفار پر غلبہ نصیب ہوگا۔ مجھے ''ذکی'' اور ''نقاط علم کا آخری نقطہ'' سے ملقب فرمایا گیا ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ میرے ذریعے امتِ مرحومہ کے منتشر اجزا کو جمع کرے گا۔ نیز مجھے خلافت باطنی سپرد کی گئی ہے اور یہ حکم ہوا کہ میں انبیاء کے طریقے کو اختیار کروں اور ان کے بارہائے گراں کو اٹھاؤں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں: ''میں خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا کہ میں نے خود کو اپنا نور دیکھا جو بڑا عظیم الشان تھا جس نے تمام اقلیموں کو ڈھانپ لیا اور ان اقلیموں میں رہنے والوں پر اس کی روشنی غالب آ گئی۔ اس سے میں یہ سمجھا کہ قطبیت جو مجھے دی گئی ہے۔ یہ اس کا نور ہے۔ یہ نور سب کو زیر کرتا ہے لیکن وہ خود کسی سے زیر نہیں ہوتا۔'' وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب امور جن کا اوپر ذکر ہوا، حضرت شاہ صاحب نے ان کو ''مشاہدات'' کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ مطلب یہ کہ یہ ساری حقیقتیں ان کے دل پر گزری ہوئی اور ان کی آنکھوں کی دیکھی ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے یہاں آنکھوں سے مراد جسمانی آنکھیں نہیں بلکہ قلب وروح کی آنکھیں ہیں۔ مثال کے طور پر وہ فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں یہ چیزیں یوں یوں دیکھیں یا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ پاک نے مجھے یہ القا فرمایا۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ شاہ صاحب روضۂ اطہر پر حاضر تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کی طرف متوجہ کہ ان کے دل پر بعض حقائق نقش ہو

گئے۔ ان مشاہدات میں کہیں یہ بھی ہے کہ میں نے روح کی آنکھوں سے یہ چیزیں دیکھیں۔ خانہ کعبہ سے مجھے نور کی شعاعیں نکلتی نظر آئیں۔ میں نے غزوۂ بدر کے شہداء کی قبروں سے نور پھوٹتا ہوا پایا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ اقدس کو ظاہر و عیاں دیکھا۔ آپؐ حالتِ انبساط میں میری طرف اس طرح ملتفت ہوئے کہ میں یوں سمجھا کہ گویا آپؐ نے مجھے اپنی چادر میں لے لیا۔ اس کے بعد آپؐ نے مجھے اپنے ساتھ لگا کر خوب بھینچا۔ آپؐ میرے سامنے رونما ہوئے اور اسرار و رموز سے آگاہ فرمایا۔ اسی سلسلہ میں شاہ صاحب اپنے ایک خواب کا ذکر کرتے ہیں جس میں شاہ صاحب نے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو دیکھا اور آپ کو ان بزرگوں نے اپنے نانا رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قلم ٹھیک کر کے عطا فرمایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر مبارک اوڑھائی۔

ممکن ہے اس طرح کی باتوں سے بعض قارئین کو کچھ توحش سا ہو اور وہ اس طرح کے ذریعہ علم کو ناقابل اعتبار جان کر زیرِ نظر کتاب میں جن مسائل کو بیان کیا گیا ہے، ان کو پڑھنے کے لئے تیار نہ ہوں، ان حضرات کی خدمت میں ہم عرض کریں گے کہ یہ کتاب جس زمانے میں لکھی گئی، وہ زمانہ اور تھا اور آپ جانتے ہیں کہ ہر زمانے کا خاص ذہن اور اس کی اپنی خاص زبان ہوتی ہے اور پھر عارفوں کا تو معاملہ ہی اور ہے اور ان کے وارداتِ قلبی اور مشاہداتِ باطنی کو عام عقلی معیاروں سے ناپنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اپنی دیکھی ہوئی بات کہتے ہیں اور جو کچھ ان کی زبان پر آتا ہے، وہ ان پر گزرا ہوا ہوتا ہے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ ان کے اس دیکھنے اور خارج سے اثر قبول کرنے میں ماحول کی روایات بھی کچھ رنگ آمیزی کرتی ہیں اور وہ اپنے زمانے کے رنگ ہی میں ان حقائق کو دیکھتے اور اسی پیرایہ بیان میں ان کو ادا کرتے ہیں جو ان کے ہاں مروج ہوتا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ آدمی ظاہری شکلوں میں الجھ کر رہ جائے اور کہنے والے کے پیش نظر جن حقائق کا اظہار کیا تھا، ان پر غور نہ کرے۔ سچ تو یہ ہے کہ تصوف و مذہب کے متعلق عام طور پر جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، وہ اسی ظاہر بینی اور سطحی ذہنیت ہی کا نتیجہ ہیں۔

خود شاہ صاحب نے اپنی کتاب ''ہمعات'' میں اس غلط روی پر متنبہ فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

''اربابِ تصوف سے بحث کرتے وقت ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ان بزرگوں کے اقوال و احوال کو ان کے زمانے کے ذوق کے مطابق جانچا جائے۔ اس سلسلہ میں یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ہم ایک عہد کے اربابِ تصوف کے اقوال و احوال کو دوسرے عہد کے معیاروں سے ناپتے پھریں۔''

یہ علم جو عقل کے بجائے وارداتِ قلب سے حاصل ہوتا ہے اور عارف خود اپنے باطن میں اس کا مشاہدہ کرتا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے اپنے خطبات میں اس وجدانی علم کی اصابت اور اہمیت پر بہت زور دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''قلب ایک طرح کا باطنی وجدان یا بصیرت ہے جو مولانا رومی کی شاعرانہ زبان میں آفتاب کی شعاعوں سے زندگی حاصل کرتا ہے اور ہمیں حقیقت کے ان پہلوؤں سے آشنا کرتا ہے جو ہمارے حواس سے پرے ہیں۔ قرآن کی رو سے یہ ایسی چیز ہے جو دیکھتی ہے اور اس کی اطلاعات کی صحیح تعبیر کی جائے تو اس میں غلطی کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔ اس کو باطنی و پُراسرار اور فوق الفطری کہنے سے اس کی قدر و قیمت، بحیثیت ایک ذریعہ علم کے کم نہیں ہو جاتی۔'' کچھ آگے ان وارداتِ قلبی

کے بارے میں مرحوم فرماتے ہیں: ''بنی نوع انسان کا یہ سارا الہامی اور صوفی ادب اس بات کا قوی ثبوت ہے کہ مذہبی واردات کا سلسلہ تاریخ انسانی میں نہ صرف شروع سے موجود رہا بلکہ اس نے تاریخ پر کافی اثر بھی ڈالا ہے۔ اس لئے اسے محض فریب کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا۔ آخر اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ عام سطح کے انسانی تجربات کو تو حقیقی مان لیا جائے اور جن دوسرے ذرائع سے انسان کو علم حاصل ہوا' انہیں باطنی اور جذباتی کا نام دے کر مسترد کر دیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ جہاں تک انسان کے تجربی علم کا سوال ہے' اس معاملے میں مذہبی واردات کی وہی حیثیت ہے جو دوسرے ذرائع علم کی ہے جن سے انسان کو عام زندگی میں واسطہ پڑتا ہے۔ نیز انسانی تجربات کی اس باطنی قلمرو کو تنقیدی نظر سے دیکھنا کوئی بے ادبی نہیں۔''

قلبی واردات کی علمی حیثیت تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال نے اسلامی تصوف کا اس وقت جو ادب موجود ہے' اس پر بھی کڑی نکتہ چینی کی ہے۔ چنانچہ اپنے تیسرے خطبہ میں جس کا عنوان ''خدا کا تصور اور عبادت'' ہے' فرماتے ہیں: ''میں یہاں کسی ایسے ذریعہ علم کا ذکر نہیں کر رہا جو کہ رازِ سر بستہ ہو۔ اس تمام گفتگو سے میری غرض صرف اتنی ہے کہ آپ کو ایک حقیقی انسانی تجربی علم (وجدان) کی طرف متوجہ کروں جس کے پیچھے پوری تاریخ ہے اور سامنے شاندار مستقبل۔ تصوف نے اسی ذریعہ علم کو خاص طور پر برتا ہے اور اس کا نتیجہ ہے کہ وہ انسانی ''انا'' کی وسعتوں کو ہمارے سامنے بے نقاب کر سکا۔ ہمارا صوفی ادب کافی تابناک ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس کی وہ بندھی ٹکی اصطلاحات جو کبھی فرسودہ قسم کے مابعد الطبیعیاتی تصورات کے زیر اثر بنی تھیں' آج اس زمانے میں نئی نسلوں کے دماغوں پر ان کا اثر سخت روح فرسا اور مردنی خیز ہے۔''

''فیوض الحرمین'' میں شاہ ولی اللہ صاحب نے مذہب و تصوف کے حقائق کو جس زبان میں اور جن اصطلاحات میں بیان فرمایا ہے' واقعہ یہ ہے کہ ایک حد تک علامہ اقبال کی اوپر کی تنقید ان پر بھی پوری اترتی ہے۔ شاہ صاحب کے زمانے میں مسلمانوں میں ایک خاص قسم کا مابعد الطبیعی فکر پایا جاتا تھا جس کا بیشتر حصہ تو یونانی اور اشراقی تھا لیکن اس میں ہند و ایران کے اثرات کی بھی ملونی تھی اور اس سارے ملغوبے پر اسلامی ٹھپہ لگ چکا تھا..... مابعد الطبیعیات کا یہ گورکھ دھندا ایسا پیچ در پیچ ہے کہ اس میں اٹکا ہوا ذہن مشکل ہی سے نکل سکتا ہے۔ بے شک ''فیوض الحرمین'' میں کہیں کہیں اس طرح کی مابعد الطبیعی اصطلاحات کی الجھنیں ہیں لیکن تحقیق حق کی خاطر اس طرح کی مشکلاتِ راہ کو جھیلنا ہی پڑتا ہے۔ خوشے سے اناج نکالنے کے لئے اوپر کی بھوسی کا ہٹانا کبھی بھی تضیع اوقات نہیں سمجھا جاتا۔

شاہ صاحب کے ان روحانی مشاہدات اور مکاشفات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان کو اس عہد کے تاریخی آئینے میں دیکھنے کی کوشش کریں۔ شاہ صاحب جب پیدا ہوئے تو اورنگزیب عالمگیر کی حکومت تھی۔ چار برس کے تھے کہ عالمگیر کا انتقال ہو گیا اور اس کے بعد گیارہ سال کے قلیل عرصے میں یکے بعد دیگرے پانچ بادشاہ دہلی کے تخت پر بیٹھے اور 1131ھ میں شاہ صاحب نے اپنے والد کے مدرسے میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا تو چھٹے بادشاہ محمد شاہ کے سر پر ہندوستان کا تاجِ شاہی رکھا گیا۔ اس کی حکومت کے بارہ سال دیکھ کر آپ حج کو گئے۔

دہلی کے یہ انتیس سال بڑے سخت سیاسی خلفشار میں گزرے۔ عالمگیر کے مرتے ہی اس کے تینوں بیٹوں میں

لڑائی ہوئی۔ وہ تو میدانِ جنگ میں کام آئے اور بڑا بیٹا بادشاہ بنا۔ چار سال حکومت کرنے کے بعد وہ راہی ملک عدم ہوا تو اس کا بیٹا جہاندار شاہ تخت پر بیٹھا اور ایک سال کے اندر اندر اپنے بھتیجے فرخ سیر کے ہاتھ سے مارا گیا۔ فرخ سیر کو ساداتِ بارہہ نے بادشاہ بنایا تھا لیکن ان میں اور بادشاہ میں زیادہ تک نبھ نہ سکی۔ چنانچہ طرفین ایک دوسرے کو گرانے کی برابر کوشش کرتے رہے جس کا آخر نتیجہ یہ نکلا کہ فرخ سیر کو ساداتِ بارہہ نے سخت عقوبتوں کے بعد مار ڈالا۔ چند ماہ کے اندر دو اور بادشاہ تخت پر بیٹھے اور پھر محمد شاہ کو تخت پر بٹھایا گیا۔ اس پر دو سال بھی نہ گزرے تھے کہ نظام الملک نے ساداتِ بارہ کو شکست دے کر بادشاہ کو ان کے پنجے سے نجات دلائی۔ یہاں سے محمد شاہ کا دورِ حکومت جسے تاریخ میں ''رنگیلا'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، شروع ہوتا ہے۔

اس طرح اور اتنی جلد جلد بادشاہوں کے بدلنے سے ایک طرف مغل سلطنت کا وہ رعب و دبدبہ جو اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور عالمگیر کی طویل اور مضبوط حکومتوں کی وجہ سے قائم ہو چکا تھا، کمزور پڑنے لگا۔ چنانچہ ملک میں ہر طرف شورشیں شروع ہو گئیں۔ دوسری طرف شاہی خاندان کی باہمی جنگوں نے امرائے سلطنت کو خودسر بنا دیا اور وہ ایک دوسرے کے خلاف مرہٹوں، راجپوتوں اور جاٹوں سے مدد لینے لگے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان قوموں کو یہ معلوم ہو گیا کہ اکبر و عالمگیر کے جانشینوں کا بس نام ہی نام رہ گیا ہے اور مغلیہ سلطنت کو پوری طرح گھن لگ چکا ہے۔ محمد شاہ اگر کسی قابل ہوتا تو شاید اس کے عہدِ حکومت میں جو خلافِ توقع کافی لمبا تھا، مغل سلطنت کی کچھ حالت سدھر جاتی لیکن وہ تو محض عیش و عشرت کا بندہ تھا۔ ہوا یہ کہ معاملات روز بروز زیادہ خراب ہوتے گئے اور شاہ صاحب کی حج سے واپسی سے چند سال بعد تو نادر شاہ کے حملے اور دہلی کی تباہی سے سلطنت کا سارا بھرم ہی جاتا رہا۔

یہ تھی سلطنتِ دہلی کی حالت، جو شاہ صاحب اپنی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں مرہٹوں کو طرح طرح کی مراعات دی گئیں اور بادشاہ کی طرف سے انہیں دکن سے چوتھ وصول کرنے کا حق عطا ہوا۔ اس سے ان کے حوصلے اور بڑھ گئے اور وہ شمالی ہند پر قابض ہونے کی تدبیریں کرنے لگے۔ راجپوتوں کو مطمئن کرنے کے لئے جزیہ کی منسوخی کا اعلان ہوا۔ اُدھر دہلی کے قریب آگرے کے نواح میں جاٹوں نے سر اٹھایا اور پنجاب میں سکھوں نے شورشیں کرنی شروع کر دیں۔ گو ان سب کو وقتی طور پر دبایا گیا لیکن دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ ''کفار'' کا سیلاب بڑھتا چلا جا رہا ہے اور اس کا روکنا اب روز بروز مشکل ہوتا جائے گا۔

شاہ صاحب کا اسلامی سلطنت کے اس خارجی اور داخلی خطرے سے متاثر ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت برصغیر کی مسلم حکومت کو جن غیر مسلم طبقوں سے کوئی خطرہ ہو سکتا تھا تھا وہ مرہٹے، راجپوت، سکھ اور جاٹ ہی تھے۔ انگریز اور فرانسیسی اس زمانے تک دہلی سے بہت دور تھے اور ان کا اثر بمشکل ہندوستان کے ساحلی علاقوں سے آگے بڑھنے پایا تھا۔ ہمارے خیال میں شاہ صاحب کو اس نئے خطرے کا جو حقیقت میں سب سے بڑا خطرہ تھا، زیادہ علم نہ تھا۔ اب مسلمانوں کو اور اسلامی سلطنت کو اوپر کے غیر مسلم طبقوں کے اسی خطرے میں گھرا ہوا پا کر یقیناً شاہ صاحب کو رہ رہ کر یہ خیال آتا ہوگا کہ کوئی ایسی تدبیر ہو جس سے مسلمانوں کی بگڑی ہوئی حالت درست ہو جائے۔ ان کی جمعیت کا شیرازہ پھر سے بندھ جائے۔ مسلمان امراء میں اتفاق و اتحاد ہو۔ ان کے اخلاق سدھر جائیں۔ اس طرح مسلمانوں کو نئی

زندگی ملے اور اسلامی سلطنت تباہی کے اس نرغے سے نکل جائے۔ چنانچہ اس کے لئے ضرورت تھی کہ شیعہ اور سنی نزاع ختم ہو۔ اہلِ تصوف اور اربابِ شریعت میں جو بُعد پیدا ہو گیا تھا' وہ نہ رہے۔ علماء اپنے کام کریں اور صوفیا اپنے فرائض انجام دیں۔ اسلام کی صحیح تعلیمات لوگوں تک پہنچیں اور دین کی تجدید کے ساتھ ساتھ ملت کی بھی نئی تشکیل ہو۔

شاہ ولی اللہ صاحب کی طبیعت' ان کی عالی دماغی اور بلند حوصلگی' ان کے خاندانی حالات ان کے ماحول اور جس فضا میں کہ انہوں نے پرورش پائی تھی' ان سب کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کرنا زیادہ مشکل نہیں کہ وہ اسلامی سلطنت کے زوال سے کتنے متاثر ہوئے ہوں گے اور اصلاح حال کے لئے انہوں نے کیا کیا نہ سوچا ہوگا اور کیا کیا ولولے اور کیسی کیسی امنگیں اس سلسلہ میں ان کے دل میں نہ اٹھی ہوں گی۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں مسلمان صوفی اور مسلمان عالم اسلامی جمعیت کے اہم رکن سمجھے جاتے تھے۔ ایک طرف عوام وخواص ان کے عقیدت مند ہوتے تھے اور دوسری طرف امراء اور بادشاہ ان کی بات سنتے تھے اور پھر یہ بھی تھا کہ اس عہد میں بالعموم اور شاہ صاحب کے خاندان اور ان کے قریبی ماحول میں بالخصوص حضرت مجدد الف ثانی کے تجدیدی کارناموں کا غلغلہ تھا اور یہ ممکن نہیں کہ شاہ صاحب کے کانوں میں بچپن ہی سے مجدد صاحب کی باتیں نہ پڑتی رہی ہوں کہ کس طرح انہوں نے جہانگیر کے عہد میں اکبر کے اگائے ہوئے الحاد و زندقہ کے پودے کو جڑ سے اکھیڑ پھینکا۔ مغلوں کی خلافتِ ظاہرہ کے بالمقابل اپنی باطنی خلافت کی بنیاد رکھی اور کس طرح ان کے خلفاء اور نائب ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئے۔ عوام ان سے متاثر ہوئے اور امراء نے ان کی بات مانی اور آگے چل کر ان کی یہی کوششیں عالمگیر کی حکومت کی صورت میں بارآور ہوئیں۔

یقیناً شاہ صاحب نے حضرت مجدد الف ثانی کے متعلق یہ سب کچھ سنا ہوگا اور قدرتاً ان کے بلند حوصلوں کو حضرت مجدد کے اسوۂ عمل سے اور آپ کے بارے میں ان روایات اور آثار سے جو شاہ صاحب کے ماحول میں رچ چکے تھے' بڑی تقویت ملی ہوگی اور ان کو رہ رہ کر یہ خیال آتا ہوگا کہ اگر حضرت مجدد اپنے تجدیدی مقاصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں تو اس وقت بھی ایک تجدیدی کوشش کر دیکھنی چاہیے۔ کچھ بعید نہیں کہ اس سے اسلامی جمعیت تباہی سے بچ جائے اور ہندوستان میں اسلام کو نئی زندگی نصیب ہو۔ یہ خیالات' یہ ولولے اور یہ امنگیں تھیں جن کو دل میں لئے ہوئے ہمارے خیال میں حضرت شاہ صاحب خانہ کعبہ اور روضۂ اطہر پر پہنچے۔ اس وقت آپ کی انتیس تیس کی عمر تھی۔ جوانی کا عالم تھا۔ تصوف کے مراقبوں سے نفس کی باطنی قوتوں کو بڑی جلا مل چکی تھی۔ غیر معمولی ذہانت' اس پر وجدانی زندگی کا اتنا پختہ رنگ' دل میں بڑھے ہوئے حوصلے اور گرد و پیش کے خطرات کا اس قدر احساس اور دماغ میں بڑے بڑے بزرگوں کی انقلاب آفریں شخصیتیں سمائی ہوئیں۔ یہ تھے وہ حالات جن کی صدائے بازگشت ''فیوض الحرمین'' کے یہ روحانی مشاہدات اور مکاشفات ہیں اور انہی کی روشنی میں ہمیں شاہ صاحب کے ان دعاوی کو دیکھنا چاہیے کہ وہ قائم الزمان ہیں' ان کو وصی' قطب اور امام کے مناصب پر سرفراز کیا گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

بے شک حضرت مجدد الف ثانی کی تجدید کا رنگ اور تھا اور شاہ ولی اللہ کی تجدید کا رنگ اَور۔ اور یہ اس لئے کہ حضرت مجدد کا زمانہ دوسرا تھا اور شاہ صاحب دوسرے زمانے میں پیدا ہوئے۔ اکبر اور جہانگیر کے عہد حکومت میں اسلامی سلطنت اپنے پورے عروج پر تھی۔ اس میں جو بے عنوانیاں پیدا ہو چکی تھیں' وہ ایسی تھیں جیسے کہ کسی سے بھرپور جوانی کی

بدمستی میں ہوں۔ چنانچہ مجدد صاحب کی تجدید میں تادیب کا رنگ غالب تھا اور وہ اسلامی جمعیت کو جو اس زمانے میں زیادہ تر اہلسنت والجماعت ہی پر مشتمل تھی ٗ غیروں کے تمدنی اثر سے آزاد اور دوسروں سے الگ اور ممتاز ہونے پر زور دیتے تھے لیکن شاہ صاحب کے عہد میں اسلامی جمعیت کا خاکہ بہت کچھ بدل چکا تھا۔ اب اس کے اندر کئی مستقل گروہ بن چکے تھے۔ ہر گروہ اپنی انفرادیت پر مُصر تھا اور حالات ایسے تھے کہ ان کو اس طرح ایک کرنا کہ یہ سب کے سب اہلسنّت والجماعت کی سیادت کو مان لیں ٗ ناممکن تھا۔ پہلے مرکزی حکومت میں طاقت تھی اور سُنّی امراء کا زور تھا۔ بے شک اس زمانے میں شیعہ عناصر بھی رہے لیکن ان کا زیادہ اثر نہیں تھا۔ شاہ صاحب کے زمانے میں سُنّی امراء کے مقابلے میں ایرانی امراء کافی زور پکڑ رہے تھے اور اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے انہیں اس کے مواقع حاصل تھے کہ وہ مرہٹوں ٗ جاٹوں اور راجپوتوں کی مدد سے اپنے مخالفوں کے مقابل آسکیں۔ شیعوں اور سنیوں کی اس لڑائی میں ظاہر ہے اسلامی جمعیت کو نقصان پہنچتا۔ اس لئے اب ضرورت اس کی نہ تھی کہ ''رفض'' کے خلاف حضرت مجدد کی طرح کھلم کھلا جہاد کا اعلان کیا جاتا بلکہ مصلحت اور دانش مندی کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمانوں کے ان دونوں گروہوں میں جہاں تک اسلامی اصول اجازت دیتے ٗ باہمی رواداری اور اتحاد پیدا کیا جاتا تا کہ اسلامی جمعیت کے اس طرح کے داخلی اتحاد سے خارجی خطرات کا مقابلہ کرنا ممکن ہو جاتا۔ اس لئے ''فیوض الحرمین'' میں شیعہ اور سنّی نزاع کو ختم کرنے کے لئے اشارے ہیں۔

یہ تو ہوا شیعہ سنّی اختلاف کا معاملہ لیکن شاہ صاحب کے زمانے تک امرِ واقعہ یہ تھا کہ اسلامی جمعیت کی غالب اکثریت اہلسنّت پر مشتمل تھی۔ چنانچہ ان ہی کی اصلاح و تنظیم سے اسلامی جمعیت کی نئی تشکیل ہو سکتی تھی۔ اہلسنت کی علمی اور روحانی قیادت اس وقت علماء اور صوفیا کے ہاتھ میں تھی لیکن بدقسمتی سے ان میں افکار و عقائد کی وہ یکجہتی نہ تھی جو وجود ملت کے استحکام کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ صوفیا عقیدۂ وحدت الوجود میں گم باطنی زندگی کو سب کچھ سمجھے ہوئے تھے اور علماء کو صوفیا سے بدگمانیاں تھیں اور وہ انہیں شریعت کی سیدھی راہ سے ہٹا ہوا پاتے تھے۔ شریعت اور طریقت کے اس ذہنی اور علمی تضاد کو دور کرنے کا خیال بھی ''فیوض الحرمین'' کے مشاہدات میں منعکس نظر آتا ہے۔

خود علمائے اہلسنت کا اس وقت یہ حال تھا کہ وہ فقہی تعصب اور ذہنی جمود میں بری طرح مبتلا تھے۔ وہ فقہ حنفی ہی کو اسلام کا مرادف سمجھتے اور اس میں اتنا تشدد برتتے کہ کسی کا حنفی نہ ہونا ان کے نزدیک اسلام سے خروج سمجھا جاتا۔ ظاہر ہے یہ صورتِ حال اسلامی ذہن کی موت تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جماعتی زندگی میں اسلام کے اصل سرچشموں یعنی قرآن اور حدیث سے استفادہ کرنے کا رجحان اور دنیا میں آگے بڑھنے اور نئے فکری حالات کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ مفقود ہو گیا تھا۔ اپنی جگہ یہ صحیح سہی لیکن واقعہ یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی عام حالت یہ تھی کہ وہ فقہ حنفی کے سوا کسی اور فقہی مذہب کا نام تک سننے کو آمادہ نہ ہو سکتے تھے۔ وہ صدیوں سے فقہ حنفی ہی کو اسلام کی واحد تعبیر جانتے اور مانتے چلے آتے تھے۔ اب اگر ان کی علمی اور مذہبی اصلاح کا کوئی امکان ہو سکتا تھا تو اس کی صرف یہی صورت تھی کہ فقہ حنفی کی ایسی تعبیر ہوتی جس سے فقہ حنفی سے ان کا تعلق بھی نہ ٹوٹتا اور وہ فقہی جمود سے بھی نکل سکتے۔ چنانچہ زیر نظر کتاب میں آپ کو فقہ حنفی کے متعلق اس طرح کے مکاشفات بھی ملیں گے۔

یہ کائنات کس طرح ظہور پذیر ہوئی؟..... ایک وجود سے یہ کثرت کیسے نکلی؟ انسان کا اس کائنات میں کیا مقام

ہے؟ انسان اصل میں کیا ہے؟ اس میں کیا کیا بننے کی صلاحیتیں رکھی گئی ہیں؟ خدا تک وہ کس طرح پہنچ سکتا ہے؟ تقرب الی اللہ کے یہ مسائل جنہیں مذاہب کا نام دیا گیا ہے، ان کی حیثیت کیا ہے؟ ان میں بظاہر کیوں اختلاف ہے اور مختلف زمانوں میں انبیاء کو الگ الگ جو شریعتیں دی گئی ہیں، ان کی کیا حیثیت ہے؟ مظاہرِ حیات کی بوقلمونی میں بنیادی وحدت کیا ہے؟ الغرض آفرینش کائنات کے متعلق یہ اور اس طرح کے اور مابعد الطبیعی مسائل نیز مذہب اور تصوف کے بنیادی حقائق جو زندگی کے مجموعی تصور اور اس کے نظامِ صالح کے لئے ہر تہذیب میں اساسی مباحث کا حکم رکھتے ہیں۔ شاہ صاحب نے اس کتاب میں کہیں مجملاً اور کہیں تفصیل سے وہ بھی بیان فرمائے ہیں۔

مختصراً یہ ہے ''فیوض الحرمین'' کا شانِ نزول۔ اور یہ ہے اس کا موضوع۔ ہمارے ہاں پڑھے لکھے طبقوں کو ان دنوں اسلامیات سے دلچسپی پیدا ہو رہی ہے اور ان میں اسلامی اصولوں پر اپنی انفرادی اور قومی زندگی کو ڈھالنے کا جو ایک شدید جذباتی رحجان پایا جاتا ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے مترجم کے خیال میں شاہ ولی اللہ صاحب کی اس کتاب کا اردو میں آجانا فائدے سے خالی نہیں ہوگا۔ زیرِ نظر کتاب میں شاہ صاحب نے دینِ اسلام کے ارکان اور اس کے شرعی قواعد و احکام زندگی کی جن بنیادی اور دائمی حقیقتوں کے ترجمان ہیں، ان سے پردہ اٹھانے کی کوشش فرمائی ہے۔ ان حقیقتوں کو جاننے کی آج شاہ صاحب کے زمانے سے بھی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ ان دنوں اکثر مسلمان محض اپنا نام کا مسلمان ہونا ہی نجاتِ اُخروی کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ اسی بنا پر وہ دوسروں سے فوقیت چاہتے اور ان کے مقابلے میں امتیازی حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ان میں بعض ایسے مخلص گروہ بھی پیدا ہو گئے ہیں جن کو واقعی اسلام سے دلی محبت ہے اور وہ پورے خلوص سے اسلامی زندگی گزارنا چاہتے ہیں لیکن ان کی نظر مظاہرِ اسلام اور شعائرِ اسلام سے آگے بڑھ کر حقیقی مقصود تک نہیں جاتی اور وہ ظاہری زندگی ہی کو اسلامی رنگ دے دینا کافی سمجھ رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس طرح اسلام دنیا میں پھر وہی انقلاب پیدا کر سکے گا جو تیرہ سو سال پہلے اس نے کیا تھا۔

خدا کرے شاہ ولی اللہ صاحب کے یہ افادات ان نوجوانوں میں جن کو اسلام سے حقیقی لگاؤ ہے اور جو ملی زندگی کی تعمیر میں اسلامی فکر کی اہمیت کو بھی مانتے ہیں، اسلام کی اصل حقیقت اور اس کے بنیادی حقائق کو سمجھنے کا صحیح جذبہ پیدا کر سکیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی نئی زندگی جس کا آج ہر مسلمان متمنی ہے، صرف اسی طرح ہی وجود میں آ سکے گی۔

☆☆☆

مابعد الطبیعیات و کونیات، الٰہیات و اسلامیات اور تصوف و حکمت کے یہ سارے مباحث جن کا ذکر ''پیش لفظ'' میں ہم اشارتاً کر آئے ہیں۔ ''فیوض الحرمین'' میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس نوع کے مباحث ایک تو یوں بھی دقیق ہوتے ہیں۔ دوسری دقت اس ضمن میں یہ ہے کہ شاہ صاحب نے اس کتاب میں ان مباحث کو ترتیب وار بیان نہیں فرمایا۔ مثلاً ایک موضوع کے متعلق ایک بات انہوں نے کہیں شروع میں کہی ہے۔ پھر کتاب کے بیچ میں اس کا ذکر کر دیا ہے اور ایک آدھ جگہ آخر کتاب میں اسی موضوع کی طرف اشارہ کر گئے ہیں۔ چنانچہ مضامین کی اس عدم ترتیب کی وجہ سے کتاب کے یہ مباحث اور بھی دقیق ہو گئے ہیں۔

اس سلسلے کی تیسری دقت اور شاید قارئین کرام کے لئے وہ سب سے بڑی دقت ہو، شاہ صاحب کا طرزِ بیان اور

ان کی فنی زبان ہے۔ اس زبان اور طرز بیان پر اس زمانے کے مابعدالطبیعیاتی تصورات کا اتنا گہرا رنگ چڑھا ہوا ہے کہ جب تک ان تصورات پر پورا عبور نہ ہو، شاہ صاحب کا مقصود پانا محال ہے۔ اب مشکل یہ ہے کہ یہ مابعدالطبیعیاتی تصورات ایک تو اس زمانے میں بالکل غیر مانوس ہو گئے ہیں۔ پھر ان میں اتنے خیالی الجھاؤ ہیں اور ان میں اس قدر متنوع اور مختلف عناصر کو سمونے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان تصورات کی پیچ در پیچ گرہوں کو سلجھا کر اس مطلب تک پہنچنا بڑی محنت اور غیر معمولی صبر چاہتا ہے اور ہر پڑھنے والا اس کو کنی کے لئے عام طور پر تیار نہیں ہوتا اور نہ اس کے پاس اتنا وقت ہی ہوتا ہے کہ وہ اتنی دیدہ ریزی کر سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کے حکیمانہ افکار کی عام اشاعت میں یہی چیز اب تک سب سے بڑی مانع رہی ہے۔

''مقدمہ'' کے ان صفحات میں ہم نے کوشش کی ہے کہ ''فیوض الحرمین'' کے اہم مباحث کا مختصر سا خلاصہ مناسب عنوانات کے تحت جہاں تک ممکن ہو عام فہم پیرائے میں پیش کریں۔ شاید اس سے قارئین کرام کو کتاب کے جملہ مباحث سے دلچسپی پیدا ہو سکے اور جس مقصد کے لئے زیر نظر کتاب کا ترجمہ کیا گیا ہے، اس طرح وہ بھی پورا ہو جائے۔

لیکن قبل اس کے کہ اس سلسلے میں کچھ اور عرض کیا جائے، یہاں ایک مسئلے کی وضاحت کر دینا ہم بہت ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کتاب میں شاہ صاحب نے کئی جگہ لکھا ہے کہ میں نے خواب میں یہ چیزیں یوں دیکھیں یا مثلاً انہوں نے اس طرح کی باتوں کا ذکر فرمایا ہے کہ میں نے شہدائے بدر کی قبروں سے نور کو روشن ہوتے دیکھا ہے یا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ مبارک کو ظاہر اور عیاں اپنے سامنے پایا۔ نیز یہ کہ میں نے آپ کی قبر مبارک سے چشمے کی طرح نور کو پھوٹتے ہوئے دیکھا یا ایک اور جگہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف متوجہ تھا کہ ایک نور جو بلندیوں کی طرف پرواز کر رہا تھا، طلوع ہوا۔ اس نور سے میرا خیال سرتاپا پُر ہو گیا اور اس کی تابانی دیکھ کر میں حیرت میں پڑ گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ نور نورِ عرش ہے یا میں خانۂ کعبہ کا طواف کر رہا تھا کہ میں نے خود اپنا نور دیکھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اب سوال یہ ہے کہ شاہ صاحب کی ان خوابوں اور ان کے ان مکاشافات کی آخر حقیقت کیا ہے؟ جہاں تک ان مکاشفات کا تعلق ہے، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس عالمِ مادی سے ماوراء جو عالمِ مثال ہے۔ یہ سب کے سب اس کے واردات ہیں۔ صوفیائے کرام کے نزدیک یہ وہ عالم ہے، جس میں وہ عالم مادی کی ہر چیز کا مثالی نمونہ موجود ہے اور اس سے ضرورت کے مطابق اس عالم مادی میں چیزیں نازل ہوتی رہتی ہیں۔ نیز وہ کیفیات اور معانی جن کو اس دنیا میں ہم اپنی جسمانی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے۔ صوفیا کا کہنا ہے کہ عالم مثال میں یہ سب مادی شکلوں میں متجسم نظر آتے ہیں۔ صوفیائے کرام اس عالم کے حقیقی اور واقعی ہونے کا پورا یقین رکھتے ہیں۔ چنانچہ مکاشفات میں جو کچھ وہ دیکھتے ہیں، اس کا تعلق ان کے نزدیک اسی عالم سے ہوتا ہے۔

شاہ صاحب نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں عالمِ مثال پر بحث کرتے ہوئے اس نوع کے مکاشفات کو تسلیم کرنے کے بارے میں تین گروہ بتائے ہیں۔ ایک وہ جو اس عالم کو خارج میں واقعتہً موجود مانتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ خود میرا اپنا یہ مسلک ہے۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ بے شک دیکھنے والے کو تو یہ واقعات اسی طرح ہی نظر آتے ہیں لیکن خارج میں ان کا وجود نہیں ہوتا۔ شاہ صاحب ان گروہ والوں کو بھی اہل حق میں شمار کرتے ہیں

البتہ تیسرا گروہ جس کا کہنا یہ ہے کہ ان واقعات کی حیثیت محض تمثیل کی ہوتی ہے اور یہ ادائے مطالب کا بس ایک پیرایہ ہے۔شاہ صاحب کے نزدیک اہل حق میں سے نہیں۔

الغرض ''فیوض الحرمین'' کے ان مکاشفات کے متعلق اگر قارئین کرام کو اس بات کے تسلیم کرنے میں تامل ہو کہ واقعتہً یہ مکاشفات اس شکل میں خارج میں رونما ہوئے یا نہیں، تو وہ بڑی آسانی سے اس کو اس طرح مان سکتے ہیں کہ شاہ صاحب نے تو بے شک اپنے مکاشفات میں ان سب واقعات کو ضرور اسی طرح دیکھا ہوگا لیکن خارج میں ان کا کوئی وجود نہیں تھا۔

باقی رہا شاہ صاحب کے خوابوں کا معاملہ تو ان کی حقیقت بھی ان کی زبان ہی سے سن لیجیے۔اپنی تصنیف ''ہمعات'' میں خوابوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ فرماتے ہیں:

> ''روحانی کیفیات میں سے ایک کیفیت یہ ہے کہ راہِ طریقت کے سالک جب عالمِ ناسوت کی پستی سے نکل کر عالمِ ملکوت کی بلندی پر فائز ہوتے ہیں اور خسیس اور ناپاک اعتبارات کو کلیتہً ترک کر دیتے ہیں تو اس حالت میں وہ لطیف اور خوشگوار کیفیات میں اس طرح سرشار ہو جاتے ہیں گویا ان کے نفوس ان کیفیات میں ڈوب کر بالکل فنا ہو گئے ہیں۔چنانچہ ان میں سے ایک شخص بیداری اور حالتِ خواب میں ان کیفیات کو اپنے اندر یکساں پاتا ہے۔جب یہ شخص سوتا ہے اور اس کے ظاہری حواس نفسانی خواہشات کے اثر و تصرف سے امن میں ہوتے ہیں اور وہ فی الجملہ طبیعت کے تقاضوں اور اس کے احکام سے رہائی حاصل کر لیتا ہے تو اس حالت میں وہ تمام صورتیں جو اس کے دل کے اندر جمع ہوتی ہیں، خواب میں برملا طور پر اس کے سامنے آتی ہیں اور وہ ان کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جاتا ہے۔چنانچہ سالک پر اس مقام میں عجیب عجیب چیزیں اور طرح طرح کے معاملات ظاہر ہوتے ہیں۔''

مکاشفات اور خوابوں کی اصل حقیقت کی اس اجمالی وضاحت کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔

مابعد الطبیعیات

ایک ذاتِ احد نے یہ کل کائنات کیسے پیدا کی یا ایک وجود سے اس کثرت کا کس طرح ظہور ہوا۔مابعد الطبیعیات کے اس نازک مسئلے کو سمجھنے کے سلسلے میں انسانوں میں عام طور پر تین رجحان پائے جاتے ہیں:۔

ایک یہ کہ ذاتِ حق نے کائنات کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا اور اس کے حکم سے کائنات وجود میں آ گئی۔دوسرا رجحان ان لوگوں کا ہے جو ذاتِ اول کو عقول کا سرچشمۂ اصل مانتے ہیں۔ان کے نزدیک سب سے پہلے عقلِ اول کا ظہور ہوا اور پھر اس سے تدریجاً اور عقلوں کا نزول ہوتا گیا۔یہاں تک کہ یہ سلسلۂ کائنات کے وجود پر ختم ہوا۔تیسرا رجحان یہ ہے کہ یہ ساری کثرت جو ہمیں نظر آتی ہے، ایک وجود سے نکلی ہے۔اس وجود سے متعدد تنزلات ہوئے اور انہی تنزلات کا آخری نتیجہ یہ کائنات ہے۔اب پہلا رجحان تو عام اہل کا مذاہب کا ہے۔دوسرا رجحان اربابِ عقل اور فلسفیوں کا اور تیسرا

رجحان صوفیا کا۔

شاہ صاحب اپنے مابعد الطبیعیاتی تصورات میں بالعموم ان تینوں رجحانات کو سمیٹنے اور ان میں توافق اور مطابقت پیدا کرنے کی کوشش فرماتے ہیں۔ اسی لئے وہ اس ضمن میں تینوں گروہوں کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ بے شک ان سے قدرے گنجلک پیدا ہوتی ہے لیکن شاہ صاحب کا جو اصل مقصود ہے، اگر اس پر نگاہ رہے تو اصطلاحات کا یہ اختلاف زیادہ پریشان کن نہیں رہتا۔

ذاتِ حق مخلوقات کو پیدا کرنے سے پہلے کہاں تھی؟ شاہ صاحب نے اس سر کو ''مقامِ تفکر'' میں یوں دیکھا، فرماتے ہیں۔

''ذاتِ حق خود اس امر کی متقاضی تھی کہ وہ استعدادیں جو اس کے اندر مضمر ہیں، ان کا ظہور عمل میں آئے۔ چنانچہ سب سے پہلے ذاتِ حق کا جو مرتبہ وجوب ہے، اس مرتبے میں ذاتِ حق کی ان استعدادوں کا عقلی ظہور ہوا۔ اس ظہور سے وہاں اشیائے ممکنات کے اعیان، ذاتِ واجب کے ظہور کی ہر صورت اور اس کی تدلی کے ہر مظہر کے ''شیون'' متمثل ہوئے۔ مرتبہ وجوب میں ذاتِ حق کا تقاضا یہ ہوا ہے کہ وہ ان ظہورات کو عدم، مادہ اور خارج سے متصف کرے۔ چنانچہ اس ضمن میں اس نے جو کچھ کہ اعیان اور پہنائیوں میں مضمر تھا، اسے ظاہر کر دیا اور اس سلسلے میں سب سے پہلے جو چیز ظہور پذیر ہوئی۔ وہ اللہ تعالیٰ کا نور تھا۔ اس نور نے عدم اور مادہ کا پوری طرح سے احاطہ کر لیا ہے اور اس پر یہ مسلط ہو گیا اور یہ نور قائم مقام بن گیا ذاتِ حق کا اور یہ نور قدیم الزمان ہے۔ بات یہ ہے کہ ہمارے نزدیک زمان مکان اور مادہ ایک ہی چیز ہے اور یہی وہ استعداد ہے جس کو ہم نے عدم اور خارج کا نام دیا ہے۔''

ہر فعل کے لئے کسی نہ کسی علت کا ہونا ضروری ہے۔ شاہ صاحب اس کلیے کو منوانے کے بعد مخلوقات کے ظہور کی آخری علت کی تشریح ان الفاظ میں فرماتے ہیں:۔

''اس عالم میں مخلوقات کے ظہور کی جو بھی علتیں ہیں، ان کا سلسلہ ارتقاء آخر میں جا کر ارادہ الٰہی پر ختم ہوتا ہے لیکن خود اس ارادہ الٰہی کی بھی ایک علت ہے جس سے کہ اس کا صدور ہوتا ہے او وہ علت ہے ذاتِ الٰہی کا خود اپنا اقتضا ارادے کے لئے اور ارادے کا لازم ہونا ذاتِ الٰہی کے لئے .....
واقعہ یہ ہے کہ ذاتِ واجب الوجود سے ارادے کا تعلق ایسا ہی ہے جیسے ان تاثیر کرنے والی استعدادوں کا جنہیں ''اعیان'' کہا جاتا ہے، ذاتِ واجب سے تعلق ہے یعنی جس طرح ان ''اسما'' اور ''اعیان'' کے ظہور کے لئے ذاتِ واجب کا اقتضا ہوتا ہے اور ذاتِ واجب کے لئے ان ''اسما'' اور ''اعیان'' کا ہونا لزوم میں سے ہے۔ اسی طرح ذاتِ واجب کے ساتھ ارادہ کا تعلق ہے اور یہ جو دو تاثیر کرنے والی استعدادیں یعنی ''اسما'' اور ''اعیان'' ہیں۔ ان کے ظہور کی ایک حد مقرر ہے جو خود ذاتِ واجب کی طرف سے ظاہر ہوئی ہے کہ اس میں نہ زیادتی ہو سکتی ہے اور نہ کمی۔'' (صفحہ 224)

شاہ صاحب نے اس مسئلے کی وضاحت کے لئے ایک حساب کرنے والے کی مثال دی ہے:

''ایک حساب کرنے والا جب حساب کرتا ہے تو اس کے حساب کرنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اس کا ارادہ ایک عدد سے متعلق ہوا تو اس سے ایک بنا اور جب ایک کے عدد کو اس کی نظر نے دوبارہ دیکھا تو دو کا عدد معرضِ وجود میں آ گیا.... غرضیکہ جب حساب کرنے والے کا ارادہ ایک سے دو دو سے تین اور اسی طرح تین سے جو اگلا عدد ہے' اس کو اس سے نکالتا چلا جائے گا تو جہاں تک کہ حساب کرنے والے کے علم کی حد ہوتی ہے' اس حد تک اس ایک عدد سے اکائیاں' دہائیاں' سینکڑے اور ہزار نکلتے چلے جائیں گے۔ چنانچہ جہاں تک حساب کرنے والے کی عقل فرض کر سکتی ہے' وہ ان اعداد کو ایک دوسرے کے ساتھ برابر کرتا چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ یہ اعداد اپنی اس شکل میں لانہایت حد تک پہنچ جائیں۔ اب اگر ان تمام اعداد کو ان کی اصل نسبت سے جو ایک کا عدد ہے' اور جس سے کہ یہ سب اعداد نکلے ہیں' دیکھیے تو یہ سب اعداد ایک کے عدد میں محصور نظر آئیں گے اور ان اعداد میں آپس میں جو فرقِ مراتب ہے تو وہ اس کے ایک عدد کے اعتبار سے نہیں ہو گا بلکہ جس طرح یہ اعداد درجہ بدرجہ اس ایک کے عدد سے نکلے ہیں' ان میں فرقِ مراتب اس لحاظ سے ہو گا۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ اعداد کی ان بے شمار صورتوں کے ظہور کی علت صرف اتنی تھی کہ محاسب کے اندر حساب کرنے کا ایک کمال موجود تھا۔ چنانچہ محاسب نے اپنے اس کمال کو ظہور میں لانے کا ارادہ کیا اور اس طرح یہ اعداد معرضِ وجود میں آتے چلے گئے۔ باقی رہا خود ان اعداد میں جو ترتیب' حصر اور انضباط ہے کہ اس میں نہ کمی ہو سکتی ہے اور نہ بیشی' تو یہ چیز تو محاسب کے ارادے کی فعلیت سے پہلے ہی ان اعداد کی خود اپنی طبیعت میں موجود تھی اور محاسب کا ارادہ جب ان اعداد کو اس ترتیب و انضباط سے وجود میں لاتا ہے تو وہ گویا ان اعداد کی جو اپنی طبیعت ہوتی ہے اور ان کے ظہور کے جو اپنے احکام ہوتے ہیں' انہی کو پیش کر دیتا ہے۔'' (صفحہ 226)

ان ''اسماء'' اور ''اعیان'' کو ''ماہیات'' بھی کہتے ہیں۔ ظہور کائنات کے سلسلے میں ''ماہیات'' کا ذکر کرتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں:

''اب جو ہم چیزوں کے بنانے اور ان کے ایجاد کرنے کو ان چیزوں کی ماہیات کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ (ہر شے قبل تخلیق حق تعالیٰ کے علم میں موجود تھی) پھر اس نے ان اشیاء کی خارج میں تخلیق فرمائی.... یعنی اشیاء قبل تخلیقِ خارجی علمِ الٰہی میں ثابت ہیں۔ اس حالت میں یہ اشیاء ''معلوماتِ حق'' ہیں۔ ''صور علمیہ حق'' ہیں۔ انہی کو ''اعیانِ ثابتہ'' ''ماہیاتِ اشیا'' اور ''حقائق اشیا'' کہتے ہیں۔ مترجم..... تو ماہیات کی طرف ہمارا ان چیزوں کو منسوب کرنا ایسا ہی ہے جیسے ہم اوپر کی صورت میں اعداد کے عدم سے وجود میں آنے کو محاسب کی تاثیر کا نتیجہ بتاتے ہیں اور ''ماہیات'' سے ان چیزوں سے ظہور پذیر ہونے سے پہلے ان چیزوں کی ان ''ماہیات'' اور ان

کے لوازم کو ذاتِ حق سے جس سے کہ ان ''ماہیات'' کا فیضان ہوتا ہے۔ ایسی ہی نسبت ہے جیسی کہ ان اعداد کے ترتیب وار مدارج کو اس ایک کے عدد سے ہے جس سے کہ یہ سب اعداد نکلے ہیں اور ایک عدد کا دوسرے پر تقدم اور ان کا آپس میں جو فرقِ مراتب ہے' یہ خود ان اعداد کی اصل طبیعت میں داخل ہے۔ الغرض جب یہ بات واضح ہوگئی تو اس سے لوگ یہ جو کہتے ہیں کہ ''ماہیات'' ''غیر مجعول'' ہیں یعنی یہ بنائی نہیں گئیں بلکہ ان کے بنانے اور ایجاد کرنے کا مطلب صرف ان کا ظہور اور فیضانِ مقدس ہے' سمجھ میں آجائے گا۔'' (صفحہ 227)

''ماہیات'' نام ہے پیدا ہونے والی اشیاء کے متعلق اللہ تعالیٰ کے اس علم کا جو اسے ان چیزوں کو وجود مادی میں لانے سے پہلے تھا۔ یہ پیدا ہونے والی تمام کی تمام اشیاء ایک موطن میں بالترتیب جمع تھیں جسے ''طبیعتِ کلیہ'' کہا گیا ہے۔ اس ''طبیعتِ کلیہ'' سے اشیاء کس طرح ظاہر ہوئیں۔ اس بارے میں شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔

''الغرض جس طرح اعداد کا سلسلہ ایک کے عدد سے لے کر لامتناہی حد تک بالترتیب چلا گیا ہے اور اعداد کا یہ سارے کا سارا لامتناہی سلسلہ اسی ایک کے عدد کے اندر فرضاً اور تقدیراً موجود ہے نہ کہ فعلاً.... اسی طرح ''طبیعتِ کلیہ'' کے اندر جو بھی اس کے ارکان، نیز جو بھی جمادات، نباتات اور حیوانات ہیں، ان سب کا ایک مرتبہ سلسلہ جس کے خواص اور مراتب معلوم ہیں، موجود ہے۔......
اس ''طبیعتِ کلیہ'' سے انواع کا ظہور ہوا اور انواع کا ظہور حساب میں جو تقسیم عصری کا طریقہ ہے، اس کے مطابق ہوا یعنی ان میں نہ مزید کوئی زیادتی ہوسکتی ہے اور نہ کمی۔ ان انواع سے پھر افراد ظاہر ہوئے......قصہ مختصر ''ماہیت الماہیات'' اور ''حقیقۃ الحقائق'' سے لے کر انواع و افراد کا یہ جو سلسلہ لامتناہی حد تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ یہ سب کا سب ''حقیقۃ الحقائق'' اور اشیاء کے اصل بسیط میں بااعتبار فرض اور امکان کے نہ کہ بلحاظ تعین بالفعل کے موجود تھا۔'' (صفحہ 229)

ذاتِ حق نے ارادہ کیا اور اس کے ارادہ کرنے سے کائنات کا سلسلہ وجود میں آ گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ ذاتِ حق نے یہ جو ارادہ کیا تو اس کا باعث کیا تھا؟ اس ضمن میں شاہ صاحب فرماتے ہیں:

''اس امر میں کسی قسم کا شبہ نہیں کہ حقیقۃ الحقائق ایک وحدت ہے جس میں کثرت کا گزر نہیں۔ اس وحدت کے لئے تنزلات ضروری ہیں تا کہ یہ تنزلات واسطہ بنیں۔ اس وحدت سے کثرت کے ظہور کا اور اس طرح کے وجود کے مختلف مراتب کے احکام اور ان کی خصوصیات کا تعین ہو سکے۔ ''حقیقۃ الحقائق'' کی اپنی وحدت خالص سے تنزلات کی طرف اور تنزلات سے وجود کے مختلف مراتب کی طرف حرکت تدریجی ہوتی ہے اور اس حرکت سے سوائے اس کے اور کچھ مقصود نہیں ہوتا کہ اس وحدتِ خالص کا جو ذاتی کمال ہے، اس کا ظہور ہو سکے۔
وحدت کی یہ حرکت جو وجود کی کثرت میں منتج ہوتی ہے، اس کا باعث پاک اور مقدس محبت ہے اور یہ پاک اور مقدس محبت ذاتِ واحد کے اس ارادۂ اختیاری سے جس کو بعض لوگ اس حرکت کا

باعث قرار دیتے ہیں، اعلیٰ اور برتر چیز ہے۔ یہ محبت ابتدا میں بالکل بسیط تھی لیکن جیسے جیسے کثرت کا ظہور ہوا، اس محبت کا دائرہ بھی وسیع ہوتا گیا۔ بات یہ ہے کہ مراتبِ وجود میں ہر ہر مرتبہ کی اپنی اپنی مخصوص محبت ہوتی ہے اور ہر مرتبہ کی یہی مخصوص محبت سبب بنتی ہے، اس مرتبہ وجود کے ظہور کی لیکن اس میں یہ یاد رہے کہ گویہ محبت ابتدائے امر میں بسیط ہوتی ہے اور بعد میں اس سے بہت سی محبتیں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن یہ محبت اس بسیط حالت میں بھی ان تمام محبتوں سے جو بعد میں اس سے ظاہر ہوتی ہیں، خالی نہیں ہوتی۔" (صفحہ 257)

الغرض اس عالم میں جو بھی اشیاء ہیں، ان میں سے ہر ہر شے کا مادی وجود گویا ایک جزوی محبت کا مظہر ہے اور جس طرح اشیاء کے اپنے اپنے مدارج ہیں، اسی طرح یہ جزوی محبتیں بھی مختلف درجے رکھتی ہیں۔ اس ضمن میں شاہ صاحب فرماتے ہیں:

"ہمیں اس کا مشاہدہ ہوا ہے کہ انسانیت کے ظہور کا جو اساس اصلی ہے، وہ محض حیوانیت کے تابع نہیں بلکہ حیوانیت سے زائد انسانیت میں ایک اور محبت ہے جو ذاتِ واحد سے ابتدا میں ظاہر ہوئی تھی اور اسی طرح حیوانیت کے ظہور کا جو اساس ہے، وہ بھی تمام تر نامویت یا نباتیت کے تابع نہیں ہے۔" (صفحہ 259)

ذاتِ حق کے فیضانِ تخلیق سے اشیاء تو اس عالم میں موجود ہو گئیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان اشیاء کی لحہ بہ لحہ نقل و حرکت کا ذاتِ حق کو کیسے علم ہوتا ہے۔ مابعد الطبیعیات کا یہ بڑا اہم مسئلہ ہے، اس پر بحث کرتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں:

"ذاتِ اول کو دو جہت سے اشیاء کا علم ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک اس کے علم کی اجمالی جہت ہے اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب ذاتِ اول کو اپنی ذات کا علم ہوا تو اس ضمن میں اس نے نظامِ وجود کے سلسلہ میں اپنا جو اقتضائے ذاتی تھی، اس کو بھی جان لیا...... بات یہ ہے کہ علتِ تامہ کا یعنی وہ علت جس کا لازمی نتیجہ اس سے معلوم کا صدور ہو، علم اس امر کی کفایت کرتا ہے کہ علتِ تامہ کے ساتھ ساتھ معلول کا بھی علم ہو گیا۔ اب جہاں تک اشیائے عالم کا تعلق ہے، وہ سب کی سب وجود الٰہی میں موجود تھیں۔ چنانچہ ایک چیز جب متحقق ہوئی تو اس کا متحقق ہونا اس بنا پر تھا کہ ذاتِ واجب نے اسے متحقق کیا اور اسی طرح ایک چیز جب وجود میں آئی تو اس کا وجود میں آنا اس وجہ سے تھا کہ ذاتِ واجب نے اسے ایجاد کیا۔ غرضیکہ ہر چیز کے مقابل ذاتِ واجب کا ایک کمال اور اس کا اقتضائے ذاتی ہے اور ذاتِ واجب کے یہی وہ کمالات ہیں جو اشیاء کے ظہور کا منبع اور ان کے حقائق کی اصل کنہ ہیں۔ چنانچہ جس طرح ذاتِ واجب کا ہر کمال خود اپنی خصوصیت کے اعتبار سے ایک نہ ایک چیز کو وجود میں لانے کا متقاضی ہوتا ہے، اسی طرح ہر چیز وجود میں آنے کے لئے ذاتِ واجب کے ایک نہ ایک کمال کی محتاج ہوتی ہے۔ گویا کہ ذاتِ واجب کے یہ کمالات اور یہ اشیاء امرِ واحد ہیں۔" (صفحہ 278)

یہ تو ذاتِ اول کا علم اجمالی ہوا اشیا کا۔ اس کے علم اشیا کی دوسری جہت تفصیلی ہوتی ہے اور اس کی شرح یہ ہے:

''ہر چیز جو موجود ہے، وہ معلول ہے ذاتِ واجب کی اور جو چیز معلول نہیں تو اس چیز کا تحقق ہونا بھی ممکن نہیں اور اس سلسلہ میں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ یہ معلولات ذاتِ حق کی اس طرح محتاج نہیں جیسے ایک عمارت کا بنا محتاج ہوتا ہے معمار کا یعنی عمارت بن گئی تو پھر معمار کی ضرورت نہ رہی بلکہ ان معلولات کو جب تک کہ وہ معلولات موجود ہیں، اپنے تقرر میں، اپنے جوہر ہونے، متحقق ہونے اور قیام پذیر ہونے میں ذاتِ واجب کی برابر حاجت رہتی ہے...... الغرض ذاتِ اول ان اشیاء کو ان اشیاء ہی کے ذریعے جانتی ہے۔'' (صفحہ 279)

الٰہیات

شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک بنی نوعِ انسان کے ہر ہر فرد کے دل کی گہرائیوں میں، اس کے جوہر نفس میں اور اس کی اصل بناوٹ میں اللہ تعالیٰ کو جاننے کی استعداد رکھی گئی ہے لیکن انسان کی اس استعداد پر اکثر پردے پڑ جاتے ہیں۔ انبیاء اور مصلحین جو مبعوث ہوتے ہیں، ان کا کام دراصل انسانوں کی اسی فطری استعداد سے ان پردوں کو ہٹانا ہوتا ہے۔

انسانوں میں اللہ تعالیٰ کو جاننے کی یہ استعداد کہاں سے آئی۔ اس کی تفصیل شاہ صاحب نے اس طرح بیان فرمائی ہے:

''خارج میں جب شخصِ اکبر کا وجود بنا تو سب سے پہلا کام شخصِ اکبر نے یہ کیا کہ اس نے اپنے رب کو پہچانا اور اس کی جناب میں عجز و نیاز مندی کی اور یہ عجز و نیاز مندی شخص اکبر کے ادراک میں ایک علمی صورت کی نقش ہو گئی۔'' (صفحہ 99)

جس طرح شخصِ واحد عبارت ہوتا ہے جسم اور نفس دونوں کے مجموعہ سے اسی طرح کل کائنات کا بھی ایک کلی جسم اور ایک کلی نفس مانا گیا ہے اور ان دونوں کے مجموعے کا نام شخصِ اکبر ہے۔ اس شخص اکبر سے جب افلاک، عناصر، انواع اور افراد نکلے تو اللہ تعالیٰ کو جاننے کی وہ علمی صورت جو شخصِ اکبر کے ادراک میں پہلے پہل نقش ہوئی تھی، اس سے یہ بھی بہرہ ور ہوئے اور اس طرح انسانوں کے اندر ذاتِ حق کی ایک تدلّی یا اس کا جلوہ متستقر ہو گیا۔

شخصِ اکبر کی اس تدلّی کی نوعیت کیا ہے؟ اس بارے میں شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔

''شخصِ اکبر نے جب اپنے رب کو اس طرح جان لیا جیسا کہ اس کے جاننے کا حق تھا اور اس نے اپنے رب کو اس طرح تصور کر لیا جس طرح کہ اس کو تصور کرنا چاہیے تھا تو اس کے رب کو اس طرح جاننے اور اس کا اس طرح تصور کرنے سے شخصِ اکبر کے ادراک میں اللہ تعالیٰ کی ایک باعظمت صورت نقش ہو گئی جو ترجمان بن گئی اللہ تعالیٰ کی جلالتِ شان اور اس کی عزت و رفعت کی۔ چنانچہ جب تک شخصِ اکبر کا وجود قائم رہا، اللہ تعالیٰ کی یہ صورت بھی اس کے اندر موجود رہے گی۔'' (صفحہ 142)

''افرادِ انسانی چونکہ اسی شخصِ اکبر کا حصہ ہیں۔ اس لئے ان میں سے ہر ہر فرد کے اندر شخصِ اکبر کی

اس صورت کا کسی نہ کسی حد تک ہونا ضروری ہے۔ نفسِ انسانی کا یہ نقطہ جسے نقطۂ تدلّی کہا گیا ہے، اس کی کیفیت یہ ہے کہ جیسے اسباب و حالاتِ تدلّی ہوتے ہیں، انہی کے مطابق یہ ''نقطۂ تدلّی'' اور اس کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔'' (صفحہ 144)

آخر یہ تدلّی کیا چیز ہے؟...... ذاتِ حق کے لامحدود کمالات میں سے جب کوئی اس کا کمال اس عالم میں اس صورت میں ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عنوان بن جاتا ہے ذاتِ حق کا...... تو ذاتِ حق کے کمال کے اس طرح ظہور پذیر ہونے کو تدلّی کہتے ہیں۔ اس ضمن میں شاہ صاحب فرماتے ہیں:

''تمہیں جاننا چاہیے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ایک عظیم الشان تدلّی ہے، جو خلق کی طرف متوجہ ہے۔ لوگ اسی تدلّی کے ذریعے ہدایت پاتے ہیں۔ اس تدلّی کی ہر زمانے میں ایک نئی ''شان'' ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ ایک زمانے میں ایک مظہر میں ظاہر ہوتی ہے اور دوسرے زمانے میں دوسرے مظہر میں...... اور جب کبھی یہ تدلّی کسی خاص مظہر میں ظاہر ہوتی ہے تو اس مظہر کا عنوان ''رسول'' ہوتا ہے۔'' (صفحہ 138)

شاہ صاحب کے نزدیک ''رسول'' بے شک اس تدلّی کے کسی خاص مظہر کا عنوان بنتا ہے، لیکن احبار اور رہبان اور حکماء اور محدثین بھی تدلّی الٰہی کے اسی سرچشمے سے ہی علم حاصل کرتے ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ''میں نے اس تدلّی کو جو اپنی ذات میں ایک ہے، دیکھا اور یہ پایا کہ جیسے جیسے خارجی حالات و اسباب ہوتے ہیں، اسی مناسبت سے وہ طرح طرح کے مظاہر میں صورت پذیر ہوتی ہے۔ خارجی حالات و اسباب سے میری مراد لوگوں کی عادات و اطوار اور ان کے ذہنوں میں جو علوم مرکوز ہوتے ہیں، ان سے ہے۔'' (صفحہ 97)

دوسرے لفظوں میں ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہدایت آتی ہے، وہ اس زمانے کے مذاق اور اس کی خصوصیات کے رنگ میں رنگی ہوئی ہوتی ہے اور آخر ایسا کیوں نہ ہو، خود شاہ صاحب کے الفاظ میں:

''جہاں تک تدلّی اور شعائر کے ظہور کا تعلق ہے تو لوگوں کے جو مسلمات ہوتے ہیں، جو چیزیں ان کے ہاں مشہور ہوتی ہیں اور ان لوگوں کے دل ان سے مطمئن ہوتے ہیں، تدلّی اور شعائر ان چیزوں ہی سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں بھی تدلّی کا ظہور ہوتا ہے، لوگوں کے مسلمات ہی اس کے نزول کا ذریعہ بنتے ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو!...... آخر تدلّی سے اللہ تعالیٰ کا مقصد تو یہی ہے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ جہاں تک کہ ان سے ہو سکے اس کی اطاعت کریں اور اپنے اعضاء و جوارح کو اعمالِ اطاعت کا عادی بنائیں اور اس کے لئے ضروری ہے کہ تدلّی لوگوں کے لئے مانوس صورتوں میں ظاہر ہو۔'' (صفحہ 108)

اس سلسلے میں شاہ صاحب فرماتے ہیں:

''ممکن ہے تمہارے دل میں یہ خیال گزرے کہ ہر تدلّی کا خارقِ عادت اور اعجاز ہونا ضروری ہے۔ اس لئے کیسے ہو سکتا ہے کہ تدلّی لوگوں کے مسلمات کے مطابق ہو۔ اس پر شاہ صاحب نے مفصل

بحث کی ہے اور آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تدلّی کی وجہ سے ان چیزوں میں ایسی خیر و برکت پیدا ہوگئی جو دوسری چیزوں میں نہ تھی اور ان چیزوں کا خارقِ عادت ہونا دراصل اسی خیر و برکت کے لحاظ سے تھا نہ اس وجہ سے کہ ان چیزوں میں خلافِ عادت کوئی تبدیلی ہوگئی ہو۔'' (صفحہ 109)

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ

''اللہ تعالیٰ نے مجھے اس تدلّی کے مختلف زمانوں میں مختلف صورتوں میں ظہور پذیر ہونے کی حکمت اور پھر اس تدلّی کی ایک صورت کا دوسری صورت سے جو وجہِ امتیاز ہے اور جو دراصل نتیجہ ہوتا ہے، ان خارجی حالات و اسباب کا جو اسی تدلّی کے ظہور کا باعث بنتے ہیں۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے مجھے اس حکمت اور اس وجۂ امتیاز سے آگاہ فرمایا۔'' (صفحہ 98)

اب اگر آپ اس تدلّی سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت و اشارہ کا وہ سلسلہ مراد لیں جو اہلِ مذاہب کے نزدیک روزِ اول سے اب تک انسانوں کو راہ راست پر لانے کے لئے جاری ہے تو شاہ صاحب نے اس ضمن میں اپنی جو خصوصیت بیان فرمائی ہے، اس کے معنی یہ لئے جاسکتے ہیں کہ شاہ صاحب یہاں مذاہب کے ارتقاء کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مجھے قدرت کی طرف سے مذاہب کے ارتقاء کو تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھنے کا ملکہ عطا کیا گیا ہے۔

وحدت الوجود

شاہ صاحب نے خواب میں (پہلا مشاہدہ) دیکھا کہ اہل اللہ کا ایک گروہ ہے جو عقیدۂ وحدت الوجود کو مانتا ہے اور اس کائنات میں ذاتِ باری کے وجود کے جاری و ساری ہونے کے متعلق وہ کسی نہ کسی شکل میں غور و فکر کرنے میں مشغول ہے اور چونکہ اس ضمن میں ان سے ذاتِ حق کے بارے میں جو کُل عالم کے انتظام میں بالعموم اور نفوسِ انسانی کی تدبیر میں بالخصوص مصروفِ کار ہے، کچھ تقصیر ہوئی ہے۔ اس لئے ان لوگوں کے دلوں میں ایک طرح کی ندامت ہے اور ان کے چہرے سیاہ ہیں اور ان پر خاک اُڑ رہی ہے۔

اس سلسلہ میں شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ بے شک وحدت الوجود کا مسئلہ تو علومِ حقہ میں سے ہے اور ذاتِ حق میں کُل موجودات کو گم ہوتے دیکھنا بھی امرِ واقعہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے نفوسِ انسانی میں الگ الگ استعدادیں رکھی ہیں۔ چنانچہ ہر نفس اپنی اپنی فطری استعداد کے مطابق ہی علومِ حقہ میں سے اگر کسی علم کو حاصل کرلے تو اس کی صحیح معنوں میں تہذیب و اصلاح ہوتی ہے۔ اب ہوا یہ کہ یہ گروہ جس کو وحدت الوجود پر اعتماد تھا، ان کی اس معاملہ میں بے شک اصل حیثیت تک تو رسائی ہوگئی لیکن چونکہ ان کی طبیعت کو اس علم سے فطری مناسبت نہ تھی، اس لئے وحدت الوجود سے انہیں ندامت اور روسیاہی کے سوا کچھ حاصل نہ ہو۔ (صفحہ 82)

یعنی وحدت الوجود کا مسئلہ اپنی جگہ امرِ حق سہی لیکن اگر اس سے تہذیبِ نفس نہیں ہوتی تو وہ بے کارِ محض ہے۔ بے شک وجودِ باری موجودات میں جاری و ساری ہے اور مبدائے اول اپنے ارادۂ حیات میں عالم کے مظاہر حیات میں متوجہ بھی ہے لیکن عارفِ کامل کے لئے ضروری ہے کہ ان امور میں وہ اس طرح غور و فکر نہ کرے کہ اس کے اندر فرسودگی

آ جائے اور اس کی کیفیات اور جذبات کی تروتازگی باقی نہ رہے۔ (صفحہ 181)

اگر کوئی عارف اس ابتلا میں پڑ جائے تو وہ یقیناً فریب زدہ ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں شاہ صاحب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ وہ شخص جس سے غیر اللہ سے تعلقاتِ محبت کو بالکل منقطع کرنے، صرف اللہ ہی سے محبت رکھنے، غیر اللہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح عداوت کرنے، نیز اللہ کے ساتھ محض علم و معرفت کے اعتبار سے نہیں بلکہ عملاً اور واقعۃً عشق و محبت رکھنے میں کوتاہی ہو تو بے شک وہ شخص فریب زدہ ہے...... خواہ اس کا سبب یہ ہو کہ وہ شخص کائنات کی اس کثرت میں ایک ہی وجود کو جاری و ساری دیکھنے میں منہمک ہے اور اس کی وجہ سے وہ اس کائنات کی ہر چیز سے محبت کرنے لگتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک وہی ایک وجود جو کہ اس کا محبوب ہے، اس کل کائنات میں جاری و ساری ہے۔ (صفحہ 201)

شاہ ولی اللہ صاحب کے زمانے میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا مسئلہ مابہ النزاع بنا ہوا تھا۔ آپ نے ان دونوں میں مطابقت پیدا کی اور ایک ایسی راہ نکالی کہ حکمت و مذہب دونوں کے مطالبات پورے ہو جائیں۔ مثلاً آپ فرماتے ہیں:

> ''میں نے اس پھیلے ہوئے وجود کو دو جہت سے ذاتِ حق میں گم پایا۔ ذاتِ حق میں اس کے گم ہونے کی ایک جہت تو یہ ہے کہ یہ وجود چونکہ خود ذاتِ الٰہی سے برابر صادر ہو رہا ہے، اس لئے میں نے اسے ذاتِ حق میں گم ہوتے ہوئے پایا...... اور ذاتِ حق میں اس کے گم ہونے کی دوسری جہت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تجلی اس وجود میں ظاہر ہوئی اور اس نے ہر طرف سے اس وجود کو اپنے اندر لے لیا۔ چنانچہ اس طرح یہ وجود ذاتِ حق میں مجھے گم ہوتا نظر آیا۔ اب جو شخص یہ کہتا ہے کہ یہ وجود منبسط خود ذاتِ حق ہے، ظاہر ہے یہ اس کی فریب زدگی ہے لیکن جو شخص کہ باریک بین نظر رکھتا ہے، وہ تو یقینی طور پر اس معاملہ میں اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ ذاتِ واجب سے شیون الٰہی (شیون جمع شان کی) کا صدور ہوا جو کہ مبدائے اول میں تھیں اور ان سے اس وجودِ منبسط کا ظہور ہوا۔'' (صفحہ 249)

تاریخِ اسلام میں علماء اور صوفیا کا جھگڑا شروع سے چلا آتا ہے اور یہ بحث کہ شریعت مقدم ہے یا طریقت، ایک عالمگیر نزاع کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ اس سلسلہ میں شاہ صاحب کی رائے یہ ہے:

> ''وہ علماء کہ ان کا جتنا بھی مبلغِ علم ہے، وہ اسی کے مطابق مصروفِ عمل ہیں۔ اپنی بساط کے مطابق کسی نہ کسی حیثیت سے لوگوں کے تزکیہ میں لگے ہوئے ہیں اور علم دین کی اشاعت میں سرگرم کار ہیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قریب، آپؐ کے ہاں زیادہ محترم اور آپؐ کی نظروں میں زیادہ محبوب ہیں۔ بہ نسبت ان صوفیا کے جو گو اربابِ فنا و بقا ہیں، ''جذب'' جو نفسِ ناطقہ کی اصل سے پھوٹتا ہے اور ''توحید'' اور اس طرح کے تصوف کے جو اور بلند مقامات ہیں، ان پر سرفراز ہیں۔'' (صفحہ 168)

اگر یہ تمام عالم اور جو کچھ اس کے اندر ہے، سب اسی کے جلوے کا ظہور کمال ہے تو لوگوں کے اس فکر و انکار کے کیا معنی؟ اور بقولِ مرزا غالب ؎

تو پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

شاید اسی حقیقت کو شاہ صاحب نے اس تمثیلی رنگ میں بیان فرمایا ہے:

''میں روحِ آفتاب سے ملا اور میں نے اس سے کہا کہ اے روحِ آفتاب! لوگ تجھ سے روشنی حاصل کرتے ہیں، فائدہ اٹھاتے ہیں اور ہر رنگ اور ہر طور میں تیرا غلبہ اور ظہور دیکھنے کے باوجود تیرا انکار کرتے اور تیرے خلاف جھوٹ باندھتے ہیں لیکن تیری حالت یہ ہے کہ تو ان سے نہ انتقام لیتی ہے اور نہ ان پر خفا ہوتی ہے۔ یہ سن کر روحِ آفتاب بولی کہ کیا یہ واقعہ نہیں کہ ان لوگوں کا غرور اور تکبر، نیز ان کا اپنے آپ میں پھولا نہ سمانا خود میری اپنی ذات مسرت کا ایک مظہر ہے اور یہی وجہ ہے کہ میری نظر ان لوگوں کے غرور و تکبر کی طرف نہیں جاتی بلکہ میں تو ان لوگوں کی خوشی و شادمانی کو دیکھتی ہوں اور جانتی ہوں کہ یہ سب میری اپنی خوشی اور شادمانی کا پرتو ہے۔ اس بات کو جانتے ہوئے کیا یہ جائز ہے کہ کوئی خود اپنے ذاتی کمال پر بگڑے یا کوئی خود اپنی ذات سے انتقام لے۔'' (صفحہ 88)

اسلامیات

شریعتوں کی تشکیل

اللہ تعالیٰ نے جب یہ کائنات بنائی تو اس کی توجہ ایک عالم تدلی کی صورت میں اس کائنات کی طرف ملتفت ہوئی۔ یہ تدلی تمام بنی نوعِ بشر کے لئے تھی اور اس سے اللہ تعالیٰ کو منظور یہ تھا کہ وہ اس کے ذریعے اپنے تک پہنچنے کی راہ لوگوں کے لئے آسان کر دے۔ یہ تدلی مختلف زمانوں میں مختلف صورتیں اختیار کرتی آتی ہے۔ اس تدلی کا مختلف صورتیں اختیار کرنا ان خارجی معاملات و مقتضیات کا نتیجہ ہوتا ہے جن میں یہ تدلی معین اور متشخص ہوتی ہے۔ تدلی کی ان صورتوں میں سے نبوت، نماز، الہامی کتابیں، شریعت کے احکام و ضوابط اور بیت اللہ وغیرہ ہیں۔ (صفحہ 97)

یہ تدلی عبارت ہے رُشد و ہدایت کے اس سلسلے سے جو ابتدائے آفرینش سے چلا آ رہا ہے اور مختلف زمانوں میں مختلف مذاہب کی شکل میں ظہور پذیر ہوتا رہا ہے.....تدلی الٰہی کا خارجی حالات سے مطابقت ہونا ضروری ہے اور یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحب کے الفاظ میں شریعتوں کے احکام و قواعد کی تشکیل لوگوں کی عادات کے مطابق ہوتی ہے اور اس بات میں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی حکمت پوشیدہ ہے۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ جب کسی شریعت کی تشکیل ہونے لگتی ہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ لوگوں کی عادات پر نظر ڈالتا ہے۔ چنانچہ جو عادتیں بری ہوتی ہیں، ان کو تو ترک کرنے کا حکم دیتا ہے اور جو عادتیں

اچھی ہوتی ہیں، ان کو اپنے حال پر رہنے دیا جاتا ہے۔

شریعت کا نزول کس شخص پر ہوتا ہے؟ شاہ صاحب کے نزدیک انسانوں کے اخلاق میں سے ایک خلق ''سمتِ صالح'' ہے اور یہ عبارت ہے ایک شخص کے نفسِ ناطقہ، اس اعمال اور اخلاق کے متعلق بیداری سے جو اس کے نفسِ ناطقہ اور اللہ کے یا اس کے اور دوسرے لوگوں کے درمیان ہیں اور یہ خلق عبارت ہے اس شخص کے نفسِ ناطقہ کے نظامِ صالح کی طرف ہدایت پانے سے...... الغرض جو شخص اس خلق ''سمتِ صالح'' کا مالک ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے اس ''نسبت'' سے نوازتا ہے۔ بندے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس معرفت اور ہدایت کا فیضان اس بندے کی کسی کاوش اور تردد کا صلہ نہیں ہوتا بلکہ اس فیضان کو بارگاہِ رحمت کی ایک برکت سمجھنا چاہیے۔ (صفحہ 230)

صاحب خلق ''سمتِ صالح'' کس طرح اس معرفت اور ہدایت سے نوازا جاتا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے:۔

''یہ رحمت انسانوں میں سے کسی ایسے کامل کی طرف متوجہ ہوتی ہے جو اپنی جبلت کے تقاضے سے اس امر کا مستحق ہو کہ ایک انسان پر طبیعت کے جو احکام وارد ہوتے ہیں، وہ ان سے بالاتر ہو جائے اور پھر وہ کامل انسانوں کی جس جماعت میں ہو، اس جماعت کے مزاج سے اور اس جماعت کے مناسب جو اعمال و اخلاق ہیں، ان سے نیز اس کی جماعت کے لوگ اپنی حیوانی طبیعت سے ترقی کر کے کس طرح قربِ الٰہی کے اس درجے تک جو ان کے لئے مقدر ہو چکا ہے، پہنچ سکتے ہیں۔ اس طریقے سے اس طرح ہمنوا ہو جائے کہ اس کامل کا انفرادی وجود اس کی جماعت کے اجتماعی وجود میں فنا ہو کر بقا حاصل کر لے اور پھر فطرتاً اس کامل میں یہ صلاحیت بھی ہو کہ وہ اپنی طبیعت کے مقامِ پست سے روح کے ''مقامِ قُدس'' کی بلندیوں کی طرف جذب ہو سکے...... الغرض وہ کامل جس کے اوصاف یہ ہوں، جب اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کامل کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو وہ اسے اپنے ساتھ منضم کر لیتی اور اس کو اپنے دامن میں ڈھانپ لیتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ''سرِّ الٰہی'' جو مقصود و مطلوب ہوتا ہے، وہ اس کامل کے اندر نقش ہو جاتا ہے اور وہاں پر اس ''سرِّ اجمالی'' کا یہ نقش جس جماعت میں کہ یہ کامل ہوتا ہے، اس جماعت کے لئے احکام و قوانین کے قالب میں بدل جاتا ہے۔ چنانچہ انبیائے کرام پر وحی کے ذریعہ جو شریعتیں نازل ہوتی ہیں اور یہ اولیاء پر کشف و الہام کے ذریعہ جن طرقِ تصوف کا نزول ہوتا ہے، ان سب کی حقیقت یہ ہے۔'' (صفحہ 231)

جب سے یہ دنیا بنی ہے، انبیاء برابر مبعوث ہوتے چلے آ رہے ہیں اور ان کو وقتاً فوقتاً مختلف شریعتیں عطا ہوتی رہی ہیں لیکن ایک زمانے میں کسی رسولؐ پر جو شریعت نازل ہوتی ہے، وہ جہاں تک کہ خاص اس زمانے کا تعلق ہوتا ہے، قطعی اور آخری حیثیت رکھتی ہے یعنی اس زمانے میں یہ ممکن نہیں ہوتا کہ اس شریعت کے اتباع کے بغیر خیر و فلاح حاصل ہو سکے گی لیکن اگر اس شریعت کو تمام شریعتوں کے سامنے رکھ کر مجموعی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے گا تو پھر اس کی حیثیت بے شک اضافی ہو گی۔ اس مسئلے میں شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔

''جس طرح ہر چیز کی ایک علت مقدر ہوئی جو اس کو اس دنیا میں لانے کا سبب بنی، اسی طرح

مبدائے اول کی طرف سے شریعتوں کا ظہور پذیر ہونا بھی واجب ٹھہرایا گیا اور ان کے ظاہر ہونے کی صورت یہ مقرر ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے جان لیا تھا کہ جس زمانے میں کوئی شریعت نازل ہوگی اس زمانے میں ''خیر وفلاح'' صرف اسی شریعت کی صورت میں محدود ہوگی۔''

(صفحہ 288)

لیکن یہ کیوں؟ اس بارے میں شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔

''ایک زمانے میں اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی اس کی اس تدبیر خصوصی میں جو اس بندے کے ذریعے دنیا میں برسرِ کار آتی ہے، محدود ہو جاتی ہے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قہر وغضب بھی اس کی اس تدبیر کی مخالفت کے ساتھ مخصوص ہو جاتا ہے۔ الغرض جب کسی ملت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ امتیاز حاصل ہوتا ہے تو اس ملت کے سارے کے سارے احکام حق سے موسوم ہوتے ہیں اور احکام کو ''حق'' سے موسوم کرنے میں جو بات پیش نظر ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ اس زمانے میں احکام کی صرف اسی شبح اور قالب ہی میں اللہ تعالیٰ کی تدبیر مصروفِ کار ہوتی ہے اور اس شبح اور قالب کے علاوہ اس زمانے میں تدبیرِ الٰہی کا اور کوئی مظہر موجود نہیں ہوتا۔'' (صفحہ 285)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کی کیا پہچان ہے کہ اس خاص زمانے میں صرف شریعت کے اسی قالب ہی میں تدبیر الٰہی مصروفِ کار ہے اور یہی شریعت حقہ اور اس زمانے کی آخری وقطعی شریعت ہے۔ اس ضمن میں شاہ صاحب کا ارشاد ہے:

''اس سلسلے میں یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ صالح نفوس جو شیطانی آلائشوں سے ملوث نہیں ہوتے، ان نفوس میں اس شریعت کے متعلق جبکہ وہ صاحبِ شریعت سے معجزات صادر ہوتے دیکھیں، پختہ اعتقاد پیدا ہو اور اسی طرح عقلِ صحیح بھی اس شریعت کے پہنچانے والے کے سچے ہونے پر دلالت کرے اور اس کی تصدیق کرے کہ صاحبِ شریعت نے واقعی بارگاہِ غیب سے اس شریعت کو لیا ہے۔ نیز مبدائے اول سے اس ضمن میں یہ بھی ضروری قرار پایا کہ زیادہ سے زیادہ نفوس فطرتاً پختہ اعتقاد والے اس شریعت سے اثر پذیر ہوں اور اس کی وجہ سے ان نفوس میں عزم وارادہ کی ایک لہر دوڑ جائے۔'' (صفحہ 288)

مطلب یہ نکلا کہ کسی زمانے میں ایک خاص شریعت کے ''حق'' ہونے کی کسوٹی یہ ہے کہ وہ صالح نفوس کو اپنی طرف کھینچے۔ عقلِ صحیح اس کی تصدیق کرے اور اس کی وجہ سے اعمالِ نیک کا ظہور عمل میں آئے۔

ایک شریعت جس زمانے میں اور جن لوگوں میں انعقاد پذیر ہوتی ہے، اس کی صورت جیسا کہ ابھی بیان ہوا، یہ ہوا کرتی ہے کہ اس وقت قوم میں جو اچھے اخلاق وآداب اور قواعد وضوابط ہوتے ہیں، ان کو تو وہ باقی رکھتی ہے اور جو برے ہوں ان کو رد کر دیتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ قوموں میں یہ آداب واخلاق کیسے پیدا ہوتے ہیں؟ شاہ ولی اللہ صاحب اس پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

''انسان کو فطرت کی طرف سے یہ الہام ہوا کہ وہ آپس کے تعلقات کو استوار رکھنے کے لئے دستور اور قواعد بنائیں۔ اس الہام کی بنا پر انہوں نے شہری زندگی کے قاعدے بنائے۔ خانہ داری کے طریقے وضع کیے۔ معاشی اور کاروباری دستور مرتب کیے۔ چنانچہ اجتماعی زندگی کے لئے قواعد اور دستور بنانے کی یہ عادت ان کی فطرت کا اصل الاصول بن گئی۔ اس کا شمار ان کے ہاں ضروری علوم میں سے ہونے لگا۔ جب یہ چیز لوگوں کے دلوں میں راسخ ہو گئی تو اس کے بعد ایسا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کے قلب کو یہ قابلیت بخشی کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا تعلیم کردہ دستور جگہ پکڑ سکے۔ اس دستور میں اللہ کی روح ہوتی ہے اور اس میں برکت اور نور ہے۔ یہ ہے اللہ کی شریعت اور اسی کا نام ملت ہے۔'' (صفحہ 107)

بے شک شریعت کی تشکیل تو اللہ تعالیٰ کی وحی کے ذریعہ نبی کرتا ہے لیکن اس شریعت کے موادا سے اس قوم سے اور اس ماحول وعہد ہی سے جس میں وہ مبعوث ہوتا ہے، ملتا ہے۔ اسی وجہ سے شریعتیں مختلف زمانوں میں مختلف شکلوں میں آتی رہیں لیکن اس اختلاف کے باوجود ان میں ایک اساسی وحدت بھی موجود رہی۔

وحی

وحی کی حقیقت کیا ہے؟ بشر کس طرح عالمِ مادی میں رہتے ہوئے اس مقامِ قدس میں پہنچ جاتا ہے جہاں اللہ اس سے کلام کرتا ہے؟ اس نازک مسئلے پر بھی شاہ صاحب نے بحث کی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

''عارف جب اس مقام پر ہوتا ہے جو اس کی طبیعت کے قریب ہے تو اس حالت میں وہ فضلِ حق کا اس طرح مشاہدہ نہیں کر سکتا جیسے کہ اسے کرنا چاہیے۔ چنانچہ ایسے موقع پر عارف کو اکثر الہامات اور دل کے وسوسوں میں اور الٰہی کیفیت اور طبیعت کے اقتضا میں اشتباہ سا پیدا ہو جاتا ہے۔ نیز اس ضمن میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک معاملہ ہے اور اس کے متعلق عارف نہیں جانتا کہ اس کے بارے میں اللہ کا کیا حکم ہے۔ چنانچہ وہ اس میں متردد ہوتا ہے اور کچھ دیر تک وہ اس تردد کی حالت میں رہتا ہے لیکن اس کے بعد وہ مقامِ حق کی طرف کھنچ جاتا ہے اور وہ اللہ کا ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں اس کے سامنے ہر ایک چیز متجلّی ہو جاتی ہے اور وہ امور جن کے متعلق پہلے اسے شبہ تھا، وہ ان پر نیز اپنے شکوک پر دوسری بار نظر ڈالتا ہے تو ان کے متعلق اللہ کا جو ارادہ اور فیصلہ ہوتا ہے، وہ منکشف ہو جاتا ہے اور اس حالت میں وہ گویا اللہ کے ارادے اور فیصلے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ اب اگر وہ عارف ''متکلم'' ہوتا ہے تو اس حالت میں اس سے کلام کی جاتی ہے اور اگر ''مفہم'' اور ''ملقن'' ہو تو اس کو افہام وتفہیم اور تلقین کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے ارادے اور فیصلے کی اطلاع ہوتی ہے۔'' (صفحہ 192)

شاہ صاحب نے اپنے اس بیان کی وضاحت کے لئے ''سورۂ انفال'' کے نزول کے واقعہ کو پیش کیا ہے اور بتایا

ہے کہ ''اس مسئلے کو سمجھنے کے لئے تمہارے لیے'' سورۂ انفال میں ایک بصیرت ہے۔'' (صفحہ 193)
ایک اور مقام پر شاہ صاحب نے وحی کی مزید تشریح فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں: ''لوگوں میں کتابوں کو لکھنے اور رسالوں کو جمع کرنے کا رواج خوب پھیل گیا تھا تو ان حالات میں جب اللہ کی تدلی حرکت میں آئی تو لامحالہ اس وقت لوگوں کے ہاں جو دستور بن چکا تھا، اسی کے مطابق اس تدلی نے بھی صورت اختیار کی۔ چنانچہ ہوا یہ کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس امر کا مقتضی ہوا کہ رسول ایسی تجلیات سے بہرہ یاب ہو، جو اسے عالمِ بشریت سے اُچک کر حظیرۃ القدس میں پہنچا دیں اور اس طرح ملاءِ اعلیٰ کے علوم، ملاءِ اعلیٰ کی طرف سے انسانوں کو ان کے ناپاک شبہات کے جوابات، رحمتِ الٰہی کے ارادے اور وہ الہامات خیر جو لوگوں کے دلوں میں ہیں، یہ سب رسول کے ادراک میں تلاوت کی جانے والی وحی کی شکل میں قرار پذیر ہو جائیں۔ الغرض یہ ہے شانِ نزول الہامی کتابوں کے وجود میں آنے کی۔'' (صفحہ 105)

وحی جو رسول کے ادراک میں تلاوت کی جانے والی آیات کی شکل میں قرار پذیر ہوتی ہے، محض معانی کا نام ہے یا معنی کے ساتھ الفاظ بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس کے متعلق شاہ صاحب کی رائے یہ ہے:

> ''یہ وحی یعنی ''وحیِ متلو'' کلمات اور اسالیب میں جو خود صاحبِ وحی کے ذہن میں پہلے سے محفوظ ہوتے ہیں، صورت پذیر ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ عربوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے عربی زبان میں وحی کی اور سریانی بولنے والوں کے لئے سریانی میں۔'' (صفحہ 107)

اس کے ثبوت میں شاہ صاحب نے رویائے صالحہ کی مثال دی ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''خواب دیکھنے والے کے ذہن میں جو صورتیں اور خیالات پہلے سے محفوظ ہوتے ہیں، وہ انہیں کے لباس میں خوابوں کو دیکھتا ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر جب مادرزاد اندھا خواب دیکھتا ہے تو اس کو خواب میں رنگ اور شکلیں دکھائی نہیں دیتیں اور جو پیدائشی بہرہ ہے، وہ خواب میں کبھی آواز نہیں سنتا۔'' (صفحہ 108)

اس مثال کے بعد شاہ صاحب اس معاملہ کی مزید صراحت فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''اگر معاملہ کی مزید تحقیق چاہتے ہو تو سنو! عالمِ غیب سے جب کوئی فیضان ہوتا ہے، خواہ یہ فیضان روزمرہ کا سا عام فیضان ہو یا یہ فیضان اعجاز اور خارقِ عادت کی نوعیت کا ہو، بہرحال یہ فیضان محلِ فیضان کی جو ضروری خصوصیات ہوتی ہیں، انہیں کے لباس میں صورت پذیر ہوتا ہے اور محلِ فیضان کی یہی خصوصیات ایک فیضان کو دوسرے فیضان سے جدا کرتی ہیں۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ ہر فیضان غیبی کی جو بھی اپنی مخصوص صورت اور وضع ہوتی ہے۔ اگر اس مخصوص صورت اور وضع کا سبب ڈھونڈنا چاہو تو وہ تمہیں اس محل کی خصوصیات میں ملے گا جہاں یہ فیضان واقع ہو۔'' (صفحہ 108)

شعائرِ دین

دین کی اصل اساس تو بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے بھیجے ہوئے رسولوں پر ایمان لانا ہے لیکن جب تک ایمان

کے ساتھ ساتھ شعائر نہ ہوں، دین کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ دینِ اسلام کے اہم شعائر نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ہیں۔ نماز کی کیا حقیقت کیا ہے؟ اس کی وضاحت شاہ صاحب نے ان الفاظ میں فرمائی ہے:

نماز

''انسان کے اندر اخلاق واطوار کی جو نفسی کیفیات پیدا ہوتی ہیں، ان میں سے ہر نفسی کیفیت کا خارج میں کوئی نہ کوئی عملی مظہر ہونا ضروری ہے اور یہی عملی مظہر اس عالم محسوس میں اس نفسی کیفیت کو مادی قائم مقام بن جاتا ہے اور انسان کے یہ عملی مظاہر ہی ذریعہ بن جاتے ہیں۔ نفس میں اخلاق کی باطنی کیفیات کی تربیت کا...... چنانچہ اگر تعریف ہوتی ہے تو ان عملی مظاہر کی اور مذمت کی جاتی ہے تو ان کی اور ذکر ہوتا ہے تو ان عملی مظاہر کا۔ اگرچہ اصل مقصود یہ عملی مظاہر نہیں ہوتے بلکہ نفس کی وہ کیفیات باطنی ہوتی ہیں جن کا یہ اعمال خارج میں مظہر بنتے ہیں۔ الغرض نفس کے ان باطنی اخلاق کے بجائے خارج میں جو ان کے قائم مقام ظاہری اعمال ہوتے ہیں ان کا ذکر کرنا انسانوں کی طبیعت میں داخل ہوگیا ہے۔'' (صفحہ 103)

اب سوال یہ ہے کہ نماز کے ارکان مثلاً دعائیں، قیام، رکوع، تشہد اور سجود نفس کی کس باطنی کیفیت کے عملی مظہر ہیں۔ ظاہر ہے جیسا کہ ابھی بیان ہوا نماز کے یہ عملی مظاہر مقصود بالذات نہیں بلکہ ان کا اصل مقصد نفس میں کسی خاص کیفیت کو پیدا کرنا اور اس کو تربیت دینا ہے۔ شاہ صاحب ان اعمالِ نماز کو نفس کی صفت ''احسان'' کا مظہر بتاتے ہیں۔ اس صفت کی کیا خصوصیات ہیں؟ اس ضمن میں شاہ صاحب لکھتے ہیں:

''اس ''خُلق'' اس باطنی کیفیت اور اس روحانی رنگ سے میری مراد ''احسان'' کی صفت یعنی خدا تعالیٰ کی جناب میں خشوع وخضوع اور طبیعت کا نفس کے تاریک اور فاسد اثرات سے پاک ہونا ہے۔ اس ''خلقِ احسان'' کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان میں اس وقت بھی موجود رہتا ہے جب اس کا نفس حیوانیت سے امتزاج رکھتا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے تمام اخلاق میں سے اس کے اس ''خلقِ احسان'' کو منتخب فرمایا۔ اس کے بعد وہ اقوال وافعال انتخاب کیے جو اس خلق کی ترجمانی کرسکتے اور اس کے قائم مقام ہوسکتے ہیں۔ اس طرح گویا نماز کے یہ اقوال اور افعال بعینہٖ خلقِ احسان بن گئے۔'' (صفحہ 104)

خانۂ کعبہ

خانۂ کعبہ کا حج بھی اسلام کا ایک اہم شعار ہے۔ اس کی ضرورت کیوں پیش آئی اور ایک گھر کو خدا کے ساتھ کس لئے مخصوص کرنا پڑا؟ شاہ صاحب نے اس کی بھی وضاحت فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں:

''حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے لوگ عبادت گاہیں اور کنیسے بناتے تھے۔ انہوں نے اس

زمانہ میں جبکہ آفتاب کی روحانیت کا غلبہ تھا۔ آفتاب کے نام پر عبادت گاہیں اور اسی طرح اور اسی خیال کے ماتحت ماہتاب اور دوسرے ستاروں کے نام سے معابد بنائے اور وہ اس بات کو ایک امرِ محال سمجھنے لگے کہ کسی مجرد شے کی طرف جب تک کہ اس کے لئے کوئی خاص جہت اور موقع و محل معین نہ کر دیا جائے، توجہ کی جاسکتی ہے۔ اس زمانے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام مبعوث ہوتے ہیں اور ان کے زمانے کا جو دستور تھا، اس کے مطابق ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معبد بنانے کا القا ہوتا ہے۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے ایک مخصوص جگہ جو انہوں نے اس معبد کے لئے مناسب سمجھی، اس کا انتخاب کیا اور اس سلسلہ میں قاعدے اور دستور مقرر ہوئے۔'' (صفحہ 107)

ان شعائرِ دینی کو بجالانے کی بھی مختلف شکلیں ہیں۔ اس ضمن میں شاہ صاحب فرماتے ہیں:

''ایک گروہ شعائرِ اسلام کے حقوق ادا کرنے میں صرف اپنی نیت کا پھل پاتا ہے اور وہ اس طرح کہ یہ گروہ سمجھتا ہے کہ یہ شعائر اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے ہیں اور وہ اس کا حکم سمجھ کر ان شعائر کو بجالاتا ہے۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جن کی روح کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور وہ اپنے روحانی حاسہ سے شعائر اللہ کا نور محسوس کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ان کی بہیمی قوتوں پر ملکی قوتیں غالب آجاتی ہیں۔ تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو شعائر اللہ کے نور میں بالکل ڈوب کر اللہ تعالیٰ کی اس تدلّی کو جو ان شعائر کی اصل ہے، پالیتے ہیں۔'' (صفحہ 196)

یعنی ان شعائر کو بجالانے سے بعض لوگ تو قربِ الٰہی کی نعمت سے سرفراز ہوتے ہیں۔ بعض ان کے ذریعہ اپنی بہیمی قوتوں پر قابو پاتے ہیں۔ ان کے اندر جو ملکی قوتیں ہیں، وہ انہیں محسوس ہونے لگتی ہیں اور بعض جو محض اللہ کا حکم سمجھ کر ان پر عمل کرتے ہیں، اس سے ان کے اندر ایک نظم اور ضبط پیدا ہوتا ہے۔

آخرت کی زندگی

قرآن مجید میں آیا ہے کہ قیامت کے بعد جو لوگ دوزخ میں جائیں گے، ان کے چہرے سیاہ ہوں گے اور ان کو تارکول کے کپڑے پہننے کو ملیں گے اور بہشت والے ریشم اور حریر میں ملبوس ہوں گے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ''جو دوزخ میں جائیں گے، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا میں کفر کیا۔ اس کفر کا رنگ ان کے چہروں پر چڑھ گیا اور اس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی لعنت کے مستوجب ہوئے۔ ان کا دنیا میں کفر کرنا دوزخ میں تارکول کے کپڑوں اور چہروں کی سیاہی میں بدل جائے گا۔ اسی طرح جو جنت میں جائیں گے، یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا میں ایمان لائے اور ان کے ایمان کا رنگ ان کے نفوس پر چڑھ گیا۔ چنانچہ مرنے کے بعد ان کے ایمان کا یہی رنگ جنت میں ریشم کے کپڑوں اور چہروں کی بشاشت میں بدل جائے گا۔'' (صفحہ 248)

اور یہ اس لئے کہ شاہ صاحب کے نزدیک اس دنیا کی کیفیات جن کو ہماری جسمانی آنکھیں دیکھنے سے قاصر ہیں، دوسری دنیا میں مادی شکلوں میں بدل جائیں گی۔

اسی آخرت کی زندگی کے بارے میں ایک اور جگہ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

''جب قیامت کا دن آئے گا اور بدن کے یہ حجابات پھٹ جائیں گے تو اس دن روح کی آنکھ بذاتِ خود مستقل حیثیت اختیار کرے گی اور جسم کی آنکھ وہاں روح کی آنکھ کے تابع ہوگی۔ بات یہ ہے کہ آخرت میں زندگی کی جو بھی شکل ہوگی، وہ اس دنیا ہی کی زندگی کا حاصلِ نتیجہ ہوگی۔'' (صفحہ 152)

اَدیان وملل کا اختلاف

شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک ادیان وملل کا اختلاف فطری ہے۔ وہ اس لئے کہ دین وملت کا خارجی حالات واسباب کے مطابق ہونا ضروری ہوتا ہے اور چونکہ زمانے کے ساتھ ساتھ خارجی حالات واسباب بدلتے رہتے ہیں، اس لئے ادیان وملل بھی کبھی ایک حالت پر نہیں رہ سکتے لیکن اس اختلاف کے باوجود ان میں اساسی ہم آہنگی اور وحدت پائی جاتی ہے۔ شاہ صاحب اس وحدت کے قائل ہیں اور اس کی طرف وہ مکاشفے کی زبان میں بار بار اشارے کرتے ہیں۔ مثلاً چوتھے مشاہدہ میں فرماتے ہیں۔ ''اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی عظیم الشان اور جلیل القدر تدلّی کی حقیقت سے مطلع فرمایا جو تمام بنی نوع بشر کی طرف متوجہ ہے۔ اس تدلّی سے اللہ تعالیٰ کو منظور یہ ہے کہ وہ اس کے ذریعے اپنے تک پہنچنے کی راہ لوگوں کے لئے آسان بنائے۔ اس تدلّی کا عالمِ مثال میں ایک مثالی پیکر ہے اور وہاں سے یہ عالمِ اجساد میں کبھی انبیاء کی صورت میں بالعموم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں بالخصوص اور کبھی نماز کی صورت میں اور کبھی حج کی شکل میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ میں نے اس تدلّی کو جو اپنی ذات میں ایک ہے، دیکھا اور یہ پایا کہ جیسے جیسے خارجی حالات واسباب ہوتے ہیں، اسی مناسبت سے طرح طرح کے مظاہر میں وہ صورت پذیر ہوتی ہے۔''

اس معاملے میں شاہ صاحب کو فکر کی جو وسعت اور ذہن کی جولا محدودیت حاصل تھی، اس کی ایک مکاشفے میں انہوں نے بڑی اچھی تصویر کھینچی ہے۔ فرماتے ہیں:

''اس کے بعد میرے لئے اللہ تعالیٰ کی تدلّی اعظم ظاہر ہوئی۔ (تدلّی اعظم سے یہاں مراد ہدایت کا وہ ابدی سلسلہ ہے جو آفرینش سے اب تک برابر چلا آ رہا ہے۔ مترجم) تو میں نے اسے بے کنار اور غیر متناہی پایا اور اس وقت میں نے اپنے نفس کو بھی غیر متناہی پایا اور میں نے دیکھا کہ میں ایک غیر متناہی ہوں جو دوسرے غیر متناہی کے مقابل ہے اور میں اس غیر متناہی کو نگل گیا ہوں۔'' (صفحہ 152)

مذاہبِ فقہ کا اختلاف

شاہ صاحب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے القا ہوا تھا کہ وہ فروعات میں اپنی قوم کی مخالفت نہ کریں۔ چونکہ ہندوستانی مسلمان عرصۂ دراز سے حنفی مسلک پر تھے، اسی لئے شاہ صاحب نے اپنے اوپر حنفی مذہب کی

پابندی واجب کر لی لیکن ادیان و ملل کی طرح وہ مختلف مذاہب فقہ میں بھی اساسی وحدت کے قائل تھے۔ چنانچہ وہ اپنے ایک مکاشفہ کا ذکر فرماتے ہیں جس میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے استفادہ کیا۔ اس ضمن میں شاہ صاحب لکھتے ہیں:

''میں نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ آپؐ مذاہبِ فقہ میں کس خاص مذہب کی طرف رجحان رکھتے ہیں تاکہ میں فقہ کے اس مذہب کی اطاعت کروں۔ میں نے دیکھا کہ آپؐ کے نزدیک فقہ کے یہ سارے کے سارے مذاہب یکساں ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ آپؐ کی روح کے جوہر میں ان تمام فقہی فروعات کا جو بنیادی علم ہے، وہ موجود ہے اور اس بنیادی علم سے مراد یہ ہے کہ نفوسِ انسانی کے متعلق اللہ تعالیٰ کی اس غایت اور اہتمام کو جان لیا جائے جس کے پیشِ نظر انسانوں کے اخلاق و اعمال کی اصلاح ہے۔ الغرض فقہ کے تمام قوانین کی اصل بنیاد تو یہ غایتِ الٰہی ہے۔ اس کے بعد جیسے جیسے زمانہ بدلتا ہے، اسی کے مطابق اس اصل سے نئی نئی شاخیں اور الگ الگ صورتیں بنتی چلی جاتی ہیں۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کے اصل جوہر میں فقہ کا یہ بنیادی علم موجود ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ آپؐ کے نزدیک فقہ کے سارے مذاہب برابر ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ فقہ کے مذاہب گو ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن جہاں تک فقہ کے ضمن میں دینِ اسلام کے ضروری اصول و مبادی کا تعلق ہے، مذاہبِ فقہ میں سے ہر مذہب میں وہ موجود ہیں۔ مزید برآں اگر کوئی شخص فقہ کے ان مذاہب میں سے کسی مذہب کا بھی تابع نہ ہو تو اس کی وجہ سے یہ نہیں ہوتا کہ آپؐ اس شخص سے ناراض ہوں۔ ہاں اس سلسلہ میں اگر کوئی ایسی بات ہو جس سے ملت میں اختلاف ہو تو ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر آپؐ کی ناراضگی کی اور کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ مذاہب فقہ کی طرح یہ تصوف کے تمام طریقوں کو بھی میں نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نزدیک یکساں پایا۔'' (صفحہ 131)

حنفی فقہ

حنفی فقہ پر عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کے بعض مسائل مشہور احادیث کے خلاف ہیں اور علمائے حدیث اور حنفی فقہاء میں صدیوں سے یہی نزاع چلا آتا ہے۔ شاہ صاحب گو اپنے اہل وطن کے خیال سے حنفی مسلک رکھتے تھے لیکن وہ حدیث کی اہمیت کو بھی مانتے تھے۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ حنفی مذہب اور احادیث میں اختلاف نہ رہے۔ اس سلسلے میں آپ کو ایک مکاشفہ ہوا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حنفی مذہب کے ایک بڑے اچھے طریقے سے آپ کو آگاہ فرمایا اور حنفی مذہب کا یہ طریقہ ان مشہور احادیث سے جو امام بخاری اور ان کے اصحاب کے زمانے میں جمع کی گئیں اور ان کی اس زمانہ میں جانچ پڑتال بھی ہوئی، موافق ترین ہے اور وہ طریقہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد کے اقوال میں سے وہ قول لیا جائے جو مسئلہ زیرِ بحث میں مشہور احادیث سے

سب سے زیادہ قریب ہو اور پھر ان فقہائے احناف کے فتاویٰ کی پیروی کی جائے جو علمائے حدیث میں شمار ہوتے ہیں۔ بہت سی ایسی چیزیں ہیں کہ امام ابوحنیفہ اور ان کے دونوں ساتھی جہاں تک کہ ان چیزوں کے اصول کا تعلق تھا، وہ اس معاملے میں خاموش رہے اور انہوں نے ان کے بارے میں ممانعت کا کوئی حکم نہیں دیا لیکن ہمیں ایسی احادیث ملتی ہیں جن میں ان چیزوں کا ذکر ہے۔ اس حالت میں ان چیزوں کا اثبات لازمی اور ضروری ہے۔ اعمال اور احکام میں اس روش کو اختیار کرنا بھی مذہب حنفی میں داخل ہے۔ (صفحہ 651)

سنت اور فقہ حنفی میں کس طرح تطبیق دی جائے؟ شاہ صاحب نے اس کا ذکر اکتیسویں مشاہدے میں بھی کیا ہے۔ اس ضمن میں وہ فرماتے ہیں:۔

''اس معاملہ میں نہ تو دور از قیاس تاویل سے کام لیا جائے اور نہ یہ ہو کہ ایک حدیث کو دوسری حدیث سے بھڑایا جائے اور نہ اُمت کے کسی فرد کے قول کے خیال سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث کو ترک کیا جائے۔ سنت اور فقہ حنفی میں باہم مطابقت دینے کا یہ طریقہ ایسا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اس طریقے کو مکمل کر دے تو یہ دین کے حق میں کبریتِ احمر اور اکسیرِ اعظم ثابت ہو۔''

شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں کسی مذہب فقہی کے ماننے والے ہی ملت کی حفاظت کرنے والے ہوں یا مثلاً ایک ملک میں ایک فقہی مذہب کے تمام پیرو ہیں اور ان کا یہی فقہی شعار خاص و عام میں حق و باطل کے لئے وجہ امتیاز بن گیا ہے۔ اس طرح تدبیرِ الٰہی اسی فقہی مذہب میں محدود ہو جاتی ہے اور یہی فقہی مذہب مذہب حق بن جاتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔

''میں نے دیکھا کہ کسی فقہی مذہب کے حق ہونے کا جو دقیق پہلو ہے، اس کے لحاظ سے آج اس زمانہ میں حنفی مذہب کو باقی سب مذاہب فقہ پر ترجیح حاصل ہے۔'' (صفحہ 285)

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے اوپر حنفی فقہ کی پابندی لازم کر لی تھی۔

علماء اور صوفیا کا اختلاف

علماء شریعت پر زور دیتے ہیں اور صوفیا طریقت پر۔ ایک کے پیش نظر زیادہ تر ظاہری اعمال دین رہتے ہیں اور صوفیا کا گروہ باطن پر سارا زور دیتا ہے۔ علم اور عرفان کی یہ کشمکش بہت پرانی ہے۔ شاہ صاحب چونکہ عالم بھی تھے اور صوفی بھی۔ اس لئے قدرتی بات تھی کہ وہ شریعت اور طریقت میں مصالحت کرانے کی کوشش کرتے۔ چنانچہ اس ضمن میں وہ فرماتے ہیں:

''قربِ الٰہی کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس عالم میں آئے تو قربِ الٰہی کا یہ طریقہ بھی بندوں کی طرف منتقل ہو گیا۔ قربِ الٰہی کے اس طریقے میں واسطوں کی ضرورت پڑتی ہے اور اس کے پیش نظر طاعات وعبادات کے ذریعہ اعضاء و جوارح کی اور ذکر و تزکیہ اور اللہ اور اس کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت کے ذریعے قوائے نفس کی تہذیب و اصلاح ہوتی ہے۔ چنانچہ عام لوگوں کی تہذیب و اصلاح کے لئے علوم کی نشر و اشاعت، نیک

کاموں کا حکم دینا، برائیوں سے روکنا...... یہ سب کے سب قربِ الٰہی کے اس طریقے میں داخل ہیں۔"

"قربِ الٰہی کا دوسرا طریقہ اللہ اور بندے کے براہِ راست اتصال کا ہے۔ جو شخص اس طریقہ پر چلتا ہے، اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے "انا" کو بیدار کرتا ہے۔ اپنے "انا" ہی کی بیداری کے ضمن میں اس کو ذاتِ حق کا تنبیہ اور شعور حاصل ہو جاتا ہے اور اسی سلسلہ کے فنا و بقا اور جذب اور توحید وغیرہ مقامات ہیں۔" (صفحہ 169)

شاہ صاحب کی رائے میں قربِ الٰہی کا دوسرا طریقہ نہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک عالی منزلت تھا اور نہ آپ کو یہ مرغوب ہی تھا۔ آپ کی ذاتِ اقدس تو قربِ الٰہی کے پہلے طریقہ کا عنوان تھی اور آپؐ ہی کے ذریعہ یہ طریقہ عام طور پر پھیلا۔

تصوف

تصوف کیا ہے؟ تصوف کی تعریف میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن شاہ صاحب نے مختصراً اس کی تعریف یہ کی ہے۔ "قربِ الٰہی کا وہ طریقہ جس کے ذریعہ اللہ اور بندے کے درمیان براہ راست اتصال پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور وہ اس طرح کہ اذکار و اشغال سے انسان کے اندر جو "انا" ہے، اس کی حقیقت کو بیدار کیا جاتا ہے اور "انا" کی حقیقت کی بیداری کے ضمن میں انسان کو ذاتِ حق کا تنبہ اور شعور حاصل ہوتا ہے۔" (صفحہ 169)

تصوف کا حاصل "فنا و بقا"، "جذب" اور "توحید" وغیرہ مقامات ہیں۔ شاہ صاحب نے ان کمالات کے مقابلے میں جو شخصی اور انفرادی ہیں، اجتماعی خوبیوں کو جنہیں وہ امورِ نبوت سے موسوم کرتے ہیں، بلند تر مانا ہے۔ (صفحہ 170)

ہر انسان میں یہ استعداد رکھی گئی ہے کہ اپنے "انا" کو بیدار کر کے خدا تعالیٰ سے اتصال پیدا کرے لیکن ہوتا یہ ہے کہ انسان کی اس استعداد پر پردے پڑ جاتے ہیں اور ان کو ہٹانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ انسان کے نفس کی خاصیت کچھ ایسی ہے کہ اس پر ہر طبیعت کا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ نفس انسانی ان طبائع سے جس قدر متاثر ہوتا ہے، اسی قدر اس کی فطری جلا میں کمی آ جاتی ہے اور اس کے اندر "انا" کا جو نقطۂ تدلّی موجود ہوتا ہے، وہ چھپ جاتا ہے لیکن جب یہ پردے ہٹ جاتے ہیں تو اسے "حقیقت الحقائق" کی طرف تنبہ حاصل ہو جاتا ہے۔

راہِ طریقت کے جو کامل ہیں، ان کو بالفعل ذاتِ حق کا وصال ہوتا ہے اور یہ اس طرح کہ سالک جب اس حقیقت تک پہنچتا ہے جس کو "انا" سے تعبیر کرتے ہیں۔ نیز جب وہ اس حقیقت "انا" کو اس کے نیچے جو مراتب ہیں، ان سے منزہ اور مجرد کر لیتا ہے تو اس حالت میں سالک کا اصل وجود مطلق کی طرف التفات ہوتا ہے۔ اس وجودِ مطلق کے کئی تنزلات اور بہت سے لباس ہیں۔ سالک وجود مطلق کی طرف التفات کے ضمن میں ہر ہر تنزل اور لباس کو جان جاتا ہے۔ اس سے وہ آگے بڑھتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس حقیقت کو جس کے بعد کوئی اور حقیقت نہیں، خود اس حقیقت کے ذریعے ادراک کرتا ہے اور یہ ہے عارف کا ذاتِ حق سے وصال۔ اس مقام میں اگر اس کو علم ہوتا ہے تو اسی حقیقتِ "انا" کا اور وہ

ادراک کرتا ہے تو اسی ''انا'' کی حقیقت کا۔(صفحہ 278)

اولیا اللہ سے جو کرامات ظاہر ہوتی ہیں، وہ نتیجہ ہوتی ہیں ان کی اس قوت کا جو نفسِ ناطقہ میں ہوتی ہے۔ (صفحہ 250) اس سلسلہ میں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک نفس میں قوت موجود تھی لیکن وہ اس کی دوسری قوتوں کے اس طرح تابع ہے کہ وہ اس میں فنا ہوگئی۔ اس حالت میں اس نفس کی یہ قوت بے اثر ہو جاتی ہے۔ اب جب دوسرا کوئی نفس اس پر اپنا اثر ڈالتا ہے تو اس میں وہ قوت ابھر آتی ہے اور ایسے موقع پر کہا جاتا ہے کہ فلاں نفس نے اس نفس پر اپنی تاثیر ڈالی اور اس میں یہ کیفیت پیدا کی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ متاثر ہونے والا نفس موثر کرنے والے نفس سے جو کچھ بھی حاصل کرتا ہے، وہ اس کے اندر کہیں باہر سے نہیں آتا بلکہ ہوتا یہ ہے کہ متاثر ہونے والا نفس اپنی عنانِ توجہ کو خود اپنی باطنی استعداد یا اس قوت کی طرف جو پہلے سے اس میں موجود ہوتی ہے، اس طرح پھیر دیتا ہے کہ اس استعداد یا قوت کے مقابلے میں اس نفس کے اندر جو دوسری قوتیں اس قوت کو دبائے ہوئے ہوتی ہیں۔ موثر کرنے والے نفس کی تاثیر سے بے اثر ہو جاتی ہیں اور اس طرح اس کی وہ استعداد یا قوت ابھر آتی ہے۔(صفحہ 91)

جماعتِ اولیاء میں سے ایک بڑی تعداد ایسے اولیاء کی بھی ہوتی ہے جن کو الہام کے ذریعہ یہ القا کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ لوگوں سے شرعی قیود اٹھا دی ہیں اور انہیں اختیار ہے کہ چاہیں تو عبادت کریں اور چاہیں تو نہ کریں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میرے والد اور میرے چچا کو اور خود مجھے بھی اس طرح کا الہام ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بے شک یہ الہام برحق تھا لیکن میرے نزدیک یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی عاقل و بالغ سے شرع کی قیود نہیں اٹھ سکتیں۔

اس تضاد کو شاہ صاحب اس طرح رفع کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''اس حالت میں دراصل شرعی قیود کو کہیں باہر سے اپنے اوپر عائد کیا ہوا نہیں جانا جاتا بلکہ کامل اس کو اس طرح محسوس کرتا ہے جیسے کوئی شخص بھوک اور پیاس کو محسوس کرے اور اس صورت میں ان طاعات و عبادات کو ترک کرنے کی اس میں استطاعت نہیں رہتی۔ چنانچہ اس شخص کے لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ یہ طاعات و عبادات اس پر شریعت کی طرف عائد کی گئی ہیں یا نہیں۔''(صفحہ 119)

اسی حقیقت کی توضیح ایک اور مقام پر وہ اس طرح کرتے ہیں۔ فرد کے حق میں جو ان کمالات کا حامل ہوتا ہے، جن کا ذکر اوپر ہو چکا، اپنے رب کی عبادت کرنا ایسا ہی ہے جیسے کہ وہ اپنی طبیعت کے کسی فطری تقاضے کو بجا رہا ہو۔(صفحہ 271)

اقبال نے ''ساقی نامہ'' میں شاید اسی حقیقت کو بے نقاب کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ انسان کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر — طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
جہاں اَور بھی ہیں ابھی بے نمود — کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اِک منتظر تیری یلغار کا — تری شوخیِ فکر و کردار کا
یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار — کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

اوراس کا نتیجہ یہ بتاتے ہیں کہ تم اوپر سے عائد کیے ہوئے نیکی و بدی کے معیاروں کے پابند نہیں رہو گے بلکہ تم خود فاتح عالم خوب وزشت ہو گئے۔

تو ہے فاتحِ عالمِ خوب و زشت تجھے کیا بتاؤں تیری سرنوشت

یہ ہے کمال انسانی خودی کے ارتقا کا اور اسی کمال کے حامل کو شاہ صاحب ''فرد'' کہتے ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کی تفضیل کا مسئلہ

شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ سوال پیش کیا۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ سے کس اعتبار سے افضل ہیں۔ باوجود اس کے کہ حضرت علیؓ اس امت کے پہلے صوفی، پہلے مجذوب اور پہلے عارف ہیں؟

آپ کو بتایا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک فضیلت کلی کا مدار امورِ نبوت پر ہے جیسے کہ علم کی اشاعت، لوگوں کو دین کا مطیع و فرمانبردار بنانا اور اس طرح کے اور امور جو نبوت سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ فضیلت جس کا مرجع ولایت یعنی ''جذب اور فنا'' ہے۔ یہ تو ایک جزئی فضیلت ہے اور ایک اعتبار سے کم درجے کی۔ وہ عنایتِ الٰہی جس کا مرکز و موضوع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس تھی، وہ بعینہٖ ان دونوں بزرگوں کے وجودِ گرامی میں صورت پذیر ہوئی اور گو حضرت علیؓ نسب کے اعتبار سے نیز اپنی جبلت اور محبوب فطرت کے لحاظ سے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے زیادہ آپؐ سے قریب تھے اور ''جذب'' میں بھی قوی تر اور ''معرفت'' میں بھی بالاتر تھے لیکن اس کے باوجود آپؐ منصبِ نبوت کے کمال کے پیش نظر حضرت علیؓ سے زیادہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی طرف مائل تھے۔ (صفحہ 172)

سیاست و تنظیمِ ملّت

ایک مکاشفہ میں (صفحہ 255) شاہ صاحب کو بتایا گیا کہ ہندوستان میں کفار کا غلبہ ہو رہا ہے اور انہوں نے مسلمانوں کے مال و متاع لوٹ لئے اور ان کی اولاد کو اپنا غلام بنا لیا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ میں ''قائم الزماں'' ہوں یعنی اللہ تعالیٰ نے دنیا میں نظامِ خیر کو قائم کرنے کا مجھے اپنا ذریعہ کار بنایا ہے۔ چنانچہ میں نے اسلام کے شعائر کو تباہ اور کفر کے رسوم کو سربلند پایا تو میں غصے سے بھر گیا۔ ساتھیوں نے مجھ سے پوچھا کہ اس وقت اللہ کا کیا حکم ہے؟ میں نے ان سے کہا کہ ہر نظام کو توڑنا۔

ایک اور مکاشفہ میں (صفحہ 196) شاہ صاحب کو بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ امت مرحومہ کے منتشر اجزاء کو جمع کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے انہیں چاہیے کہ وہ فروعات میں اپنی قوم کی مخالفت نہ کریں اور ملت کی تنظیم کے لئے انبیاء کا طریقہ اختیار کریں۔ ان کے بارہائے گراں کو اٹھائیں اور ان کی خلافت کے لئے کوشاں ہوں۔

یہ انبیا کی خلافت کیا ہے؟ ایک تو خلافت ظاہری ہوتی ہے جسے سیاسی اقتدار یا سلطنت کہہ لیجیے اور دوسری خلافتِ باطنی ہے جس سے مقصود تعلیم و تربیت کے ذریعے قوم کی تنظیم ہے۔ شاہ صاحب کو ایک مکاشفہ میں (صفحہ 206)

دکھایا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہر دو قسم کی خلافتوں کے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔ چنانچہ آپؐ کی مکی زندگی خلافت باطنی کا نمونہ ہے اور مدنی زندگی خلافتِ ظاہری کا۔ پہلے آپؐ نے مسلمانوں کو وعظ وارشاد اور تعلیم و تربیت کے ذریعے تیار کیا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ آگے چل کر مسلمان مدینہ میں سیاسی اقتدار کے مالک ہو گئے۔ شاہ صاحب کو بھی اسی طریقہ پر کام کرنے کو کہا گیا۔ چنانچہ انبیاء کی خلافت کے لئے ان کے کوشاں ہونے کا یہی مطلب ہے۔

شاہ صاحب کے سپرد دین اسلام کی تجدید اور ملت اسلامیہ کی تنظیم کی گئی تھی۔ چنانچہ انہوں نے مکاشفہ میں دیکھا کہ وہ اس امت کے قطب، مجدد اور وصی ہیں۔ آپ کو علم نبوت کا حامل بنایا گیا ہے اور انسانی نفوس کے حالات و کوائف کے مطابق شرعی احکام و قواعد کے معارف استنباط کرنے اور وجودِ الٰہی کے جو مختلف مدارج ہیں ان کے علوم سے آپ کو بہرہ ور کیا گیا ہے۔ (صفحہ 154)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت شاہ صاحب کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی عنایت کا جو تمام نوع بشر کے لئے ہدایتِ عامہ کے مرادف تھی، جسمِ انسانی میں متشخص ہونا ہے اور یہی مطلب ہے ''تدلی اعظم کے مثالی مظہر کا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجودِ مثالی کے ساتھ عالم مثال میں قائم تھا۔ عالمِ ناسوت میں آنے کا'' اس تدلی اعظم کا ذکر کرتے ہوئے وہ ایک مکاشفہ میں (صفحہ 159) لکھتے ہیں: ''میں تدلی اعظم کے اس مثالی مظہر سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس عالمِ ناسوت میں نازل ہوا، متصل ہو گیا اور اس سے گھل مل گیا۔ اس وقت میں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ اس مثالی مظہر کے جو دو قالب ہیں، میں ان میں سے ایک ہوں...... تدلی اعظم کے اس مثالی مظہر کا یہ دوسرا قالب وجودِ علمی سے قریب ہوتا ہے یعنی میں نے اللہ تعالیٰ کی اس غایت ازلی کا جو ہدایتِ عامہ کی شکل میں انبیاء کی صورت میں بالعموم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجودِ مبارک میں بالخصوص ظہور پذیر ہوئی، علمی احصار کر لیا اور علمی طور پر اس عنایت الٰہی کا مظہر بن گیا۔''

شاہ صاحب کے لئے اس عنایت ازلی کا احصار تجدیدِ دین کے لئے ضروری تھا کیونکہ جب تک کسی مسئلے کا تاریخی پس منظر سامنے نہ ہو اور اس کے تمام پہلوؤں کو نہ جان لیا جائے۔ اس مسئلے کا صحیح جائزہ نہیں لیا جا سکتا۔

اس کے بعد ایک اور مکاشفے میں (صفحہ 114) شاہ صاحب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قلم عطا کیا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نبوت کے جو معارف و علوم آپؐ پر منکشف ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی تدلی اعظم کے اسرار و رموز کا جو بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے بروئے کار آتی رہی ہے جس طرح آپؐ نے مشاہدہ کیا ہے، اس کو دیکھیں۔ اس طرح وہ دین اسلام کی تجدید فرمائیں اور مسلمانوں کو عروج و اقبال کی راہ دکھائیں۔

کونیات

تخلیق عبارت ہے مختلف اجزا کو جمع کرنے اور ان جمع شدہ اجزا کے لئے جو صورت مناسب ہو، ان پر اس صورت کے فیضان کرنے سے تا کہ ایک چیز وجود میں آ جائے۔ تخلیق کا عمل کبھی انسان کی صورت اختیار کرتا ہے اور کبھی گھوڑے کی اور کبھی کسی اور چیز کی۔ یہ تخلیق تو عناصر میں ہوئی اور بعض دفعہ یہ تخلیق خیالی صورتوں میں بھی ہوتی ہے۔ (صفحہ 240)

اس سلسلے میں اس بات کا بھی خیال رہے کہ کسی محل میں کوئی تخلیق ہو، اس میں ایسا نہیں ہوتا کہ اس محل سے خارج

کی کوئی چیز اس میں داخل ہو جائے۔ ایسا ہونا محالات میں سے ہے اور عقل کبھی اس کو تسلیم نہیں کر سکتی۔ ہاں اس ضمن میں ایسا ضرور ہوتا ہے کہ سلسلہ تخلیق میں نشو ونما کا ایک محل سبب بنتا ہے۔ نشو وظہور کے دوسرے محل کا اور ایک محلِ ظہور میں ایک چیز موجود ہوتی ہے۔ وہ سبب بنتی ہے، دوسرے محل میں اس چیز کے ظہور کا۔ (صفحہ 241)

نفسیات

انسان کے اندر ایک لطیفہ ''نسمہ'' ہے جسے ''روحِ ہوائی'' بھی کہتے ہیں۔ کان، آنکھ، ناک، زبان اور ہاتھ اسی نسمے کے آلۂ کار ہیں جن کے ذریعہ وہ سنتا، دیکھتا، سونگھتا، چکھتا اور چھوتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کہتے ہیں کہ انسانی نسمے میں یہ خاصیت بھی ہوتی ہے کہ وہ بغیر کان کے سن سکے۔ بغیر زبان کے چکھ سکے۔ بغیر ناک کے سونگھ سکے۔ بغیر ہاتھ کے چھو سکے اور بغیر آنکھ کے دیکھ سکے۔ یہ کیسے؟ اس کی توجیہہ وہ اس طرح فرماتے ہیں۔ نسمے میں ایک اجمالی حس ہوتی ہے جس کا نام حسِ مشترک ہے۔ اس کے ذریعے انسان کے حواسِ خمسہ میں سے ہر حس صرف قوتِ خیال سے ہی پہلے چیزوں کا ادراک کر لیتی ہے۔ مثلاً چکھنے کی حس کی قوت خیال یہ ہے کہ انسان کھانے کی ایک مزیدار چیز دیکھتا ہے اور چکھنے سے پہلے محض دیکھنے ہی سے اس کے منہ میں پانی آ جاتا ہے۔ اسی طرح ایک آدمی دوسرے آدمی کو گدگدی کرنے کے لئے اس کے قریب ہوتا ہے لیکن قبل اس کے کہ وہ اس کے بدن کو ہاتھ لگائے۔ دوسرا آدمی محض خیال سے گدگدی محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ چھونے کی حس کی قوتِ خیال ہے۔ حسِ سماعت کی خیالی قوت یہ ہے کہ وہ نغمات اور اشعار کو سننے کے ساتھ ہی ان کے اوزان کا پتہ لگا لیتی ہے۔ بعض نسمے جن کی حسِ مشترک بڑی قوی ہوتی ہے۔ وہ بدن کے ظاہری جوارح کی طرف ملتفت ہی نہیں ہوتے بلکہ وہ ان کے بغیر ہی بصارت، سماعت، ذوق اور لمس کی حسوں سے لذت یاب ہو سکتے ہیں۔ (صفحہ 93)

شاہ صاحب فرماتے ہیں: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے یہ علم حاصل ہوا کہ ہر وہ عارف جو معرفت حق میں کامل ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ بھی اخذ کرتا ہے صرف اپنے نفس سے کرتا ہے۔ اب رہے اخذ کے ذرائع واسباب تو ان کی صورت یہ ہے کہ پہلے سے وہ چیز اس عارف کے نفس میں موجود ہوتی ہے اور ذرائع واسباب صرف واسطہ بنتے ہیں۔ اس کو اس چیز سے آگاہ کرنے کا...... جو عارف اس طرح سے اخذ علم نہیں کرتا۔ وہ معرفتِ الٰہی میں کامل نہیں ہوتا۔ (صفحہ 182)

مزید فرماتے ہیں: جب عارف کامل کا نفس جسم کی کدورتوں سے منزہ ہو کر ملاءِ اعلیٰ سے مل جاتا ہے تو وہاں اس پر اللہ تعالیٰ اپنی تجلی فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی یہ تجلی اس عارف کے نفس میں جتنی استعداد ہوتی ہے۔ اسی کے مطابق نزول فرماتی ہے۔ اسی کی وجہ سے عارف کامل اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔

گیارہویں مشاہدے (صفحہ 137) میں اسی قبیل میں ارشاد ہوتا ہے۔ جیسے جیسے اسباب وحالات ہوتے ہیں، انہی کے مطابق نفس انسانی کا نقطہ تدلّی[1] اور اس کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب اسباب وحالات وافراد درجہ کمال کے ہوں تو اسی قدر یہ نقطہ تدلّی واضح اور روشن ہوتا ہے۔

آخر میں شاہ صاحب حسب دستور اپنی مابعد الطبیعیاتی زبان میں اسے یوں بیان فرماتے ہیں۔ طبیعتِ کلیہ اور

طبیعت ارضی کی طرح ایک طبیعت عرشی ہے جس میں انسانی زندگی کے اجتماعی تقاضوں کے علوم جمع ہیں۔ نہ صرف یہ علوم بلکہ ہر نوع کے اجتماعی تقاضے نیز تمام کے تمام نفوس اور انواع کے سب کے سب احکام و معاملات جمع ہوتے ہیں۔ جب کوئی شخص ان علوم اور احکام و معاملات کو استنباط کرنے میں کمال حاصل کرتا ہے تو وہ دراصل اسی طبیعتِ عرشی سے کسبِ فیض کرتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ اجتماعی علوم عام ذہنوں میں آسانی سے اپنی جگہ پیدا کر لیتے ہیں۔

حاشیہ

(1) نفس انسانی کے نقطۂ تدلّی کی حیثیت ایک مضبوط رسی کی ہے کہ جس نے اسے پکڑ لیا۔ اس نے گویا اپنے رب کی معرفت کی رسی کو پکڑ لیا۔

(مشاہدات و معارف ترجمہ فیوض الحرمین۔ مصنفہ شاہ ولی اللہ۔ مترجم: محمد سرور، لاہور 1996ء)

✦ ..... ✦ ..... ✦

مترجم: سید محمد فاروق القادری

انفاس العارفین

سالہا در کعبہ و بت خانے مے نالد حیات
تاز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

اگر بارہویں صدی ہجری کے شب و روز اور مہ و سال کو ایک شخصیت فرض کر لیا جائے تو وہ بلاشبہ بطلِ جلیل، جامع علوم ظاہر و باطن، شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی ذات رفیع الدرجات ہے۔ یوں تو برصغیر کی سرزمین نے بے شمار قابل فخر سپوت جنم دیئے ہیں لیکن ان میں سے چند ایک نے تو پورے عالم اسلام پر اپنے گہرے اور ہمہ گیر اثرات چھوڑے ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی ذاتِ والا صفات انہی برگزیدہ ہستیوں میں سے ایک ہے کہ جن کی باکمال شخصیت جہاں آج طالبانِ حق اور سالکانِ معرفت کے لئے روشنی کا ایک سدا فروزاں مینار ہے۔ وہاں ان کے فکر کی ضیا اور عمل کا فیض مستقبل کے لئے بھی قندیلِ راہ ہے۔ آپ کا نام نامی قطب الدین احمد ہے لیکن ولی اللہ کے نام سے زیادہ معروف ہوئے۔ آپ (4 شوال 1114ھ۔ 1703ء) میں ضلع مظفر نگر کے قصبے پھلت میں پیدا ہوئے۔[1] آپ کا خاندان علمی اور روحانی اعتبار سے ایک معروف حیثیت کا حامل تھا۔ اگر آپ کے سلسلۃ الذہب میں علم و فضل کی روایت جاری رہی تو سلوک و معرفت بھی اس خاندان کو ورثے میں ملی۔ شاہ صاحب کا بیان ہے کہ ''ہمارے خاندان کا ہر رخصت ہونے والا بزرگ نئے آنے والے کی پہلے بشارت دیتا رہا ہے۔''[2]

سات برس کی عمر میں آپ نے قرآن مجید ختم کیا۔ دس سال کی عمر میں شرح ملا جامی تک کتابیں پڑھ لیں اور کتابوں کے مطالعے کی استعداد پیدا ہوگئی۔ چودہ برس کی عمر میں آپ کی شادی کر دی گئی۔ بقول شاہ ولی اللہ ان کے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم نے ان کی شادی میں عجلت اس لئے کی تھی کہ انہیں بذریعہ کشف آئندہ رونما ہونے والے حادثات اور خاندانی اموات کے واقع ہونے کا علم ہو گیا تھا۔ پندرہ برس کی عمر میں آپ نے اپنے والد گرامی کے ہاتھ پر بیعت کی اور مشائخ صوفیا بالخصوص مشائخ نقشبندیہ کے اشغال و اوراد میں مصروف ہو گئے اور توجہ و تلقین، آدابِ طریقت کی تعلیم اور خرقہ صوفیا حاصل کر کے انہوں نے اپنی نسبت کی تکمیل کی۔ اسی سال آپ نے تحصیلِ علم سے فراغت حاصل کی۔ چنانچہ آپ کے والد شاہ عبدالرحیم نے اس موقع پر ایک دعوت کا اہتمام کیا جس میں وسیع پیمانے پر عوام و خواص کو مدعو کیا اور مسندِ درس و تدریس شاہ ولی اللہ کے حوالے کی۔

آپ ابھی سترہ (17) برس ہی کے تھے کہ آپ کے والد گرامی شاہ عبدالرحیم بیمار پڑ گئے۔ اسی مرض کے دوران

شاہ عبدالرحیم نے آپ کو بیعت وارشاد کی اجازت اور باقاعدہ خلافت عطا فرمائی اور فرمایا یده کیدی (ولی اللہ کا ہاتھ میرا ہاتھ ہے) آپ کے والد بزرگوار کا انتقال اسی بیماری میں 1131ھ میں ہوا۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنی عمر مبارک کے تقریباً تیس قیمتی سال اپنے والد کے مدرسہ رحیمیہ میں درس وتدریس میں گزارے۔ 1143ھ میں حرمین شریفین تشریف لے گئے جہاں آپ نے اس وقت کے نامور محدثین سے حدیث کی سماعت کی۔ شیخ ابوطاہر مدنی شافعی سے خرقہ جامعہ حاصل کیا جو تمام سلاسل کے خرقوں کا جامع تھا۔ آپ کا تمام تر تصنیفی کام حرمین شریفین سے واپسی کے بعد ہی انجام پایا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ آپ نے مدرسہ رحیمیہ میں تمام علوم کے لئے مستقل مدرس مقرر کر دیئے اور خود تصنیف و تالیف اور سالکانِ طریقت کی تربیت جیسے اہم کاموں میں مصروف ہو گئے جو تادمِ واپسیں جاری رہے۔ [3]

آپ نے زوال پذیر مغلیہ حکومت کے دس بادشاہوں کا عہد حکومت اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ سیاسی انتشار، فکری پراگندگی، محلاتی سازشیں، دین و مذہب سے بیزاری، الغرض وہ کون سی ایسی خامی اور نقص تھا جس میں پوری قوم اس وقت مبتلا نہ تھی۔ مرکزیت کے فقدان اور رات دن بادشاہوں کے قتل اور خونریزی کے سارے واقعات آپ کے سامنے ہوئے۔ علماء کی عدم فرض شناسی، فقراء کے بھیس میں نام نہاد متصوفین کی تلبیس کے ذریعے تصوف اور صوفیا کے خلاف نفرت یہ سب کچھ اپنے عروج پر تھا۔ بعض شخصیتوں کو ابھارنے کے لئے ہمارے مورخین خواہ مخواہ ایک تباہ حال پس منظر بناتے ہیں لیکن یہاں یہ صورتحال نہیں تھی بلکہ واقعتاً حالات اس سے بھی کہیں بدتر تھے۔ جیسا کہ بیان کیے جاتے ہیں۔

ان حالات میں حضرت شاہ ولی اللہ نباضِ ملت کی حیثیت سے معاشرے کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ کر اصلاحِ احوال کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ آپ نے فروعات میں الجھنے والے علماء، عیش کوشیوں میں غرق امراء اور غافل عوام کو نئے سرے سے قرآن وحدیث کی دعوت دی۔ تقلید وعدم تقلید کی بحثوں کی وضاحت فرمائی۔ فقہ وعقائد میں تشدد وتصلب کے برعکس اسلام کی وسعت و ہمہ گیری کو اذہان میں اجاگر کیا اور ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی موثر تصانیف کے ذریعے اسلامی فکر کی وضاحت کی۔ آپ نے تفسیر، حدیث، فقہ وکلام، عقائد، تصوف، سیر وسوانح ان تمام موضوعات پر ایک منفرد انداز سے لکھا جسے بجا طور پر ایک حکیمانہ طرزِ استدلال کہا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی بعض شہرۂ آفاق کتابیں پوری دنیائے اسلام میں بہت قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں اور مدارس دینیہ کے نصاب میں داخل ہیں۔ تصنیفات کے بیش بہا ذخیرے کے علاوہ آپ نے تلامذہ کی بھی ایک کثیر تعداد چھوڑی جس نے برصغیر کے کونے کونے کو علم حدیث سے روشن کیا اور چپے چپے میں آپ کے فکر کو پھیلایا۔ آپ کے چاروں صاحبزادگان عالم باعمل، متقی اور اپنے والد گرامی کے نقش قدم پر ساری عمر علوم دینیہ کی ترویج واشاعت میں مصروف رہے۔ چاروں صاحبزادگان کو آپ نے وصال سے پہلے مشائخ صوفیا کے طریقے کے مطابق دستارِ خلافت بندھوائی۔ آپ کے بڑے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز آپ کے جانشین اور آپ کی جامع زندگی کے مثالی پیکر تھے۔

تحریک آزادی کے معروف مجاہد اور برصغیر کے نامور عالم معقولات علامہ فضل حق خیر آبادی نے آپ کے بارے میں فرمایا:

''اس کتاب (ازالۃ الخفاء) کا مصنف (شاہ ولی اللہ) ایسا بحرِ ذخار ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔''

مفتی عنایت احمد کاکوروی نے آپ کے متعلق یہ ریمارکس دیئے:

''شاہ ولی اللہ ایک ایسا شجرِ طوبیٰ ہیں جس کی جڑیں تو اپنی جگہ قائم ہیں اور اس کی شاخیں تمام مسلمانوں کے گھروں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ مسلمانوں کا کوئی ٹھکانہ ایسا نہیں جہاں اس درخت کی شاخیں سایہ فگن نہ ہوں۔ اس کے باوجود اکثر لوگ بے خبر ہیں کہ اس درخت کی جڑ کہاں ہے۔''(4)

مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''ابن تیمیہ اور ابن رشد کے بعد بلکہ خود انہی کے زمانے میں جو عقلی تنزل شروع ہوا تھا۔ اس کے لحاظ سے یہ امید نہیں رہی تھی کہ پھر کوئی صاحبِ دل و دماغ پیدا ہوگا لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھلانا تھا کہ اخیر زمانہ میں جبکہ اسلام کا نفس بازپسیں تھا۔ شاہ ولی اللہ جیسا شخص پیدا ہوا جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی اور ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے۔''(5)

تقریباً نصف صدی تک علوم و معارف، فیوض و برکات عام کرتے رہنے کے بعد (29 محرم 1176ھ۔ 1762ء) کو یہ مردِ خدا آ گاہ رحلت فرمائے خلدِ بریں ہوا۔ آپ کی تاریخِ وفات بعض اہلِ علم نے ذیل کے قطعات سے نکالی ہے۔

او بود امام اعظم دیں اور (6)	اور ہائے دل روزگار رفت	بست نہم محرم وقت ظہر
1176ھ	1176ھ	

ولی اللہی مسلکِ تصوف

تصوف، اس کی تعلیمات اور معمولات کے بارے میں شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کے ساتھ جو ناانصافی ہوئی ہے، وہ برصغیر کی مذہبی تاریخ کا ایک عظیم المیہ ہے۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ شاہ ولی اللہ ایسے معتدل اور طریق اسلاف پر گامزن صوفی بزرگ کو محض نام نہاد متصوفین پر تنقید کی بنا پر بہ تکلف ایک مخصوص اندازِ فکر کا ترجمان بنانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ شاہ صاحب کی حکمت اور فکر پر ہزاروں صفحات لکھے گئے ہیں۔ کئی اکیڈمیاں معرضِ وجود میں آ گئی ہیں لیکن بطور ایک صوفی و مرشد طریقت کے شاہ صاحب کے متعلق ایک حرف نہیں لکھا گیا۔ تحفۃ الموحدین ایسی فرضی اور جعلی کتابوں اور حجۃ اللہ البالغہ یا تفہیمات کے مصنف شاہ ولی اللہ کو تو ہم بہت اچھی طرح جانتے ہیں لیکن انفاس العارفین، فیوض الحرمین، الدر الثمین، القول الجمیل، انتباہ فی سلاسل الاولیاء اور اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم کے مؤلف شاہ ولی اللہ کے بارے میں ہمیں آج تک کچھ نہیں بتایا گیا۔ ایسا کیوں ہوا ہے۔ اس کی بظاہر دو بڑی وجوہ ہیں۔ پہلی یہ کہ جو حضرات اس سلسلے میں کام کررہے ہیں وہ توحید و رسالت اور تصوف کے متعلق اپنے مخصوص ذہنی سانچے رکھتے ہیں جن پر وہ ہر شخصیت کو پرکھنے اور منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر بات یہ ہے کہ ایسے خود

ساختہ پیمانوں سے شاہ ولی اللہ کے آفاقی فلسفہ وفکر کے تمام پہلو ہرگز اجاگر نہیں ہو سکتے۔ اس کی دوسری وجہ ہمارے وہ سہل انگار محققین ہیں جو محض سنی سنائی باتوں پر سوچے سمجھے بغیر قلم کے گھوڑے دوڑاتے رہتے ہیں۔ میں اپنے اس مختصر تعارف میں شاہ صاحب کے مسلک تصوف، ان کے شرک و بدعت کے تصور اور اس جلیل القدر خاندان کے بعض معمولات کا ذکر کروں گا اور اربابِ علم و فضل کو دعوت دوں گا کہ وہ شاہ صاحب کے تصوف کو انفاس العارفین، فیوض الحرمین اور القول الجمیل کی روشنی میں دیکھیں۔

انفاس العارفین

''انفاس العارفین'' سات مختلف رسائل کا مجموعہ ہے جس میں پہلے دو رسالے ''بوارق الولایۃ'' اور ''شوارق المعرفۃ'' شاہ صاحب کے والد گرامی قدر شاہ عبدالرحیم اور عم بزرگوار شیخ ابوالرضا محمد کے حالات، ملفوظات کشف و کرامات اور معمولات پر مشتمل ہیں۔ اسی طرح ''الامداد فی مآثر الاجداد'' اپنے خاندانی بزرگوں کے حالات، ''عطیۃ الصمدیہ فی انفاس المحمدیہ'' شیخ محمد پھلتی کے حالاتِ زندگی اور ''النبذۃ الابریزیہ'' جد اعلیٰ مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی کے بارے میں لکھے ہیں۔ آخری دو رسائل مشائخ حرمین کے تذکرے اور شاہ صاحب کے اپنے حالات سے متعلق ہیں۔

بظاہر تو اس کتاب کی حیثیت ایک تذکرے کی ہے لیکن درحقیقت یہ کتاب علمِ شریعت و معرفت کا خزینہ اور حکمت و دانش کا ایسا گنجینہ ہے کہ جس میں تاریخ، فقہ، تصوف، کلام اور عقائد کے سینکڑوں مسائل باتوں ہی باتوں میں حل کر دیئے گئے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کتاب کو بجا طور پر خاندان ولی اللّٰہی کے فکرِ تصوف کا صحیح ترجمان کہا جا سکتا ہے اور یہ کتاب بقول مولانا عبیداللہ سندھی ''شاہ ولی اللہ کے فلسفہ اور تصوف کی روح ہے۔''(7) عجیب اتفاق ہے کہ شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندانی حالات پر تمام لکھنے والوں کے لئے پہلا اور آخری ماخذ یہی کتاب ہے لیکن اس سے بے اعتنائی کا یہ عالم ہے کہ ایک دو سطروں سے زیادہ میں کوئی اس کا ذکر بھی نہیں کرتا۔ آخر اس کے علاوہ اور کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ ''انفاس العارفین'' کے مضامین سے ذہنی موافقت نہیں پاتے۔

اور تو اور شاہ صاحب کی سوانح عمری ''حیاتِ ولی'' جو کہ ساری کی ساری ''انفاس العارفین'' سے ماخوذ ہے اور انتہائی ناکافی اور غیر مکمل ہونے کے باوجود نسبتاً بہتر ہے، میں ''انفاس العارفین'' کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے:

> ''اس کتاب کے چند حصے ہیں۔ پہلے حصے میں جناب شاہ صاحب نے اپنے والد شیخ عبدالرحیم صاحب کے علمی حالات، باطنی تصرفات و کرامات ملفوظات و مکتوبات غرضیکہ ابتدائے زمانہ سے تاریخ وفات تک کے تمام واقعات بطریق رجال سرسری ذکر کیے ہیں... اس کتاب کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عظیم الشان خاندان کا ہر ممبر ظاہری علوم اور باطنی کمالات میں لاثانی اور بے نظیر تھا۔''(8)

حضرت شاہ ولی اللہ کی جامعیت کا بھرپور مظاہرہ اس کتاب میں ہوا ہے۔ ہمارے پاس اس امر کا کوئی واضح ثبوت موجود نہیں ہے کہ شاہ صاحب کی کون سی کتاب کس دور کی ہے۔ تاہم قرائن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آپ نے

سفرِ حرمین سے پہلے بظاہر تصنیف و تالیف کا کوئی کام نہیں کیا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت آپ کو اس کا خیال بھی نہیں تھا۔[9] آپ کی کل عمر اکسٹھ سال چار ماہ ہے جس میں سے پہلے تینتیس، چونتیس سال تو درس و تدریس اور سفرِ حرمین کی نذر ہو گئے باقی ستائیس اٹھائیس سالوں میں سارا تصنیفی کام ہوا ہے۔ 1145ھ۔ 1146ھ تک کے واقعات ''انفاس العارفین'' میں مل جاتے ہیں۔ ''لمعات'' اور ''الطاف القدس'' وغیرہ کا ذکر بھی آتا ہے۔ شاہ صاحب کی تصنیفات کے مطالعے اور ان کے اندازِ فکر میں تدریجی تبدیلی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ''انفاس العارفین'' آپ کی زندگی کے آخری دس سالوں کی تصنیف ہے۔

آپ نے ''انفاس العارفین'' کا آغاز اپنے والد گرامی شاہ عبدالرحیم کے تذکرے سے کیا ہے۔

حضرت شاہ عبدالرحیم

یہ درست ہے کہ جو شہرت اور ناموری شاہ ولی اللہ کے حصے میں آئی، وہ شاہ عبدالرحیم کو نصیب نہ ہو سکی لیکن اس حقیقت سے کس طرح انکار کیا جا سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ کی یہ ساری عظمت شاہ عبدالرحیم کی روحانی تربیت اور فیضانِ نظر کا نتیجہ ہے۔ شاہ عبدالرحیم نہ صرف یہ ایک صاحبِ حال بلند مرتبہ صوفی تھے بلکہ جید عالم دین اور نامور محدث تھے۔ مصنف ''حیاتِ ولی'' کا بیان ہے:

> ''ہندوستان میں جس معزز اور بزرگوار نے سب سے پیشتر حدیث کے درس و تدریس کی بنیاد ڈالی اور جس مشہور محدث نے اس غریب علم کے شائع کرنے اور پھیلانے میں کوشش بلیغ کی وہ شیخ عبدالرحیم صاحب تھے۔''[10]

صاحب ''نزہۃ الخواطر'' کا بیان ہے:

> ''قدوقع الاتفاق علی کمال فضلہٖ بین اھل العلم والمعرفۃ وانتھیٰ الیہ الورع والتواضع والاشتغال بخاصۃ النفس۔''[11]

مولانا عبیداللہ سندھی کا بیان ہے:

> ''شاہ ولی اللہ کی فکری تربیت اور ان کی علمی اساس میں ہم ان کے والد شاہ عبدالرحیم صاحب کو اصل مانتے ہیں۔ شاہ عبدالرحیم نے خود اپنے نامور صاحبزادے کو تعلیم دی تھی۔ چنانچہ انہوں نے شاہ ولی اللہ کو قرآن کا ترجمہ تفسیروں سے الگ کر کے پڑھایا اور اس طرح قرآن کا اصل متن ان کے لئے قابل توجہ بنایا۔ پھر آپ نے وحدت الوجود کے مسئلے کو صحیح طریقے پر حل کیا اور اسے اپنے صاحبزادے کے ذہن نشین کیا۔ نیز شاہ عبدالرحیم ہی نے حکمتِ عملی کو اسلامی علوم میں ایک باوقار اور اہم مقام دیا اور اپنے صاحبزادے شاہ ولی اللہ کو اس کی خاص طور سے تلقین کی۔ الغرض یہ تین چیزیں قرآن کے متن کو اصل جاننا، وحدت الوجود کا صحیح حل اور اسلامی علوم میں حکمتِ عملی کی غیر معمولی اہمیت شاہ ولی اللہ کے علوم میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور یہ تینوں کی تینوں شاہ عبدالرحیم

کی تربیت کا نتیجہ ہیں۔"(12)

"انفاس العارفین" میں "فتاویٰ عالمگیری" کی تدوین میں شاہ عبدالرحیم کی شمولیت اور اس میں بعض غیر واضح مسائل کے بارے میں آپ کے اختلافی نوٹ اور اس پر ملا حامد پر شاہی عتاب کا جو واقعہ منقول ہے، اس سے آپ کے تبحر علمی بالخصوص فقہی مسائل کے بارے میں آپ کی وسیع النظری کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔(13)

ان اقتباسات کو پیش کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ "انفاس العارفین" میں آپ کے معتقدات، تصرفات اور کشف و کرامات وغیرہ کے بارے میں جو کچھ آیا ہے، وہ ایک نیم خواندہ خانقاہی صوفی کے خیالات نہیں بلکہ اپنے وقت کے جلیل القدر عالم اور نامور محدث کے نظریات ہیں۔

حضرت شاہ عبدالرحیم نے متعدد بزرگوں سے فیض حاصل کیا۔ سید عظمت اللہ اکبرآبادی سلسلہ چشتیہ کے بزرگ تھے جبکہ خلیفہ ابوالقاسم اکبرآبادی کا تعلق سلسلہ قادریہ سے تھا۔ یہ دونوں آپ کے مرشد ہیں۔ آپ نے حضرت خواجہ عبداللہ المعروف خواجہ خورد سے بھی ایک مدت تک فیض حاصل کیا اور آپ ہی کے مشورے سے آپ سید آدم بنوری کے ایک ممتاز خلیفہ سید عبداللہ اکبرآبادی سے بیعت ہو گئے۔

شاہ عبدالرحیم سلسلۂ نقشبندیہ سے تعلق خاطر کے باوجود صوفیا کے مشہور اجماعی مسئلے وحدت الوجود کے قائل، اس کے مبلغ اور شیخ ابن عربی کے بے حد معتقد تھے۔(14)

شاید اسی لطیف نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ نے ان کے متعلق لکھا ہے:

"مخفی نماند کہ حضرت ایشاں از شعبات طریقہ نقشبندیہ آں قدر شعبۂ حضرت خواجہ محمد باقی را پسند میکردند و میل مے نمودند کہ مثل ایں میل بدیگر شعب نبود ہمہ ارشاد و تربیت ایشاں بایں شعبہ بودہ است۔"(15)

واضح رہے کہ حضرت خواجہ محمد باقی باللہ نظریہ وحدت الوجود کے بہت بڑے امام تھے۔ شاہ عبدالرحیم فرمایا کرتے تھے کہ "اگر میں چاہوں تو منبر پر بیٹھ کر "فصوص" کے ایک ایک مسئلے کو قرآن اور احادیث نبویؐ سے دلائل کے ساتھ بیان کر سکتا ہوں۔"(16)

شاہ ولی اللہ اور وحدت الوجود

چونکہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تعلیم و تربیت اور روحانی سلسلے کی تکمیل اپنے والد گرامی شاہ عبدالرحیم سے ہوئی ہے۔ اس لئے شاہ صاحب بنیادی طور پر وحدت الوجودی ہیں۔ اگرچہ شاہ صاحب نے ایک امام اور جامع شخصیت ہونے کی حیثیت سے مکتوب مدنی وغیرہ میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے درمیان تطبیق کی کوشش کی ہے، تاہم ان کا اپنا خیال یہ ہے کہ وحدت الشہود کا تصور کوئی نیا نہیں بلکہ یہ خود ابن عربی کے آفاقی تصور میں موجود ہے۔ فرماتے ہیں:

"وقد وقع عندنا ان المکشوفین صحیحان جمیعاً لکن القول بان وحدۃ الشہود

علی ھذا المعنی لم یقل بہ الشیخ العربی سھوبل الشیخ واتباعہ بل الحکماء ایضاً یقولون۔"(17)

حسن اتفاق سے قیام حرمین کے دوران جن مشائخ سے شاہ صاحب کی وابستگی رہی وہ شافعی ہونے کے باوجود مسلک وحدت الوجود کے قائل تھے۔ شاہ صاحب کے استاد شیخ ابو طاہر اپنے والد شیخ ابراہیم کردی کے مسلک پر تھے جبکہ آپ کے والد شاہ عبدالرحیم اور شیخ ابراہیم کردی میں کوئی ذہنی بُعد نہ تھا۔

اس لئے شاہ صاحب کے سوانح نگار اور محققین اس بات پر پہنچے ہیں کہ شاہ صاحب کے نزدیک وجود و شہود کا جھگڑا لفظی نزاع ہے۔ اصل وحدت الوجود ہی ہے (18) جس کے شاہ صاحب تمام اکابر صوفیا کی طرح قائل ہیں۔

وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے درمیان تطبیق کے بارے میں ڈاکٹر غلام حسین رقم طراز ہیں:

"شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ ابن عربی میں یہ دونوں تصورات موجود ہیں اور یہ دونوں اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی اس طرح تشریح فرما کر شاہ صاحب نے نہایت فنکارانہ ہوش مندی سے آریائی اور سامی اذہان کو نقطۂ اتصال پر جمع کیا ہے۔ سامی ذہن (ملل حنفی) ذاتِ باری کو منزہ اور مجرد مانتا ہے اور مظاہرِ فطرت سے باہر سمجھتا ہے جبکہ آریائی ذہن (صابی) اس کے وجود کو کسی مظہر میں دیکھنے کا قائل ہے اور مظاہرِ فطرت میں ذات باری کو جلوہ افروز سمجھتا ہے۔"(19)

آپ کے بڑے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز (ف 1239ھ) بھی وحدت الوجود کے قائل رہے۔ سرسہ حصار کے مولوی نور محمد نے وحدت الوجود کے قائلین پر جب کفر کا فتویٰ لگایا اور اس نزاع نے طول پکڑا تو اس میں شاہ عبدالعزیز کو حَکم بنایا گیا۔ اس فیصلے میں شاہ عبدالعزیز کا مسلک کھل کر سامنے آ گیا ہے۔

شاہ ولی اللہ نے "مکتوب مدنی" میں اس مسئلے کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ چونکہ شاہ صاحب اصل وحدت الوجود کو سمجھتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وجود اور شہود کے درمیان ان کی تطبیق امام ربانی مجدد الف ثانی کے پیروؤں کو نت ناگوار گزری تھی۔(20)

مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

"شاہ ولی اللہ نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اگر میں مسئلہ وحدت الوجود کو ثابت کرنا چاہوں تو قرآن وحدیث کے تمام نصوص وظواہر سے اس کا اثبات کر سکتا ہوں۔"(21)

حضرت شاہ ولی اللہ اپنے والد بزرگوار اور عظیم المرتبت چچا شیخ ابوالرضا جنہیں انہوں نے پیشوائے اہل ذوق و وجود امام ارباب معرفت وشہود کے نام سے یاد کیا ہے، کے معمولات اور افکار کو اسلامی تصوف کا مثالی نمونہ سمجھتے ہیں اور دل کی گہرائی سے چاہتے ہیں کہ مسلمان اپنی زندگیوں کو ان کے طرز پر ڈھالیں۔

ہمارے صوفیا کے ہاں ایک صحیح الفکر، خدا ترس اور صالح مسلمان کے لئے اعمال واوراد تزکیہ نفس کے اشغال اور عبادات پر مشتمل ایک ایسا نظام موجود ہے جو خیر القرون سے لے کر تسلسل کے ساتھ با قاعدہ مربوط انداز میں رائج رہا

ہے۔ جب تک صوفیا کا یہ نظام رائج رہا اور اس پر عمل ہوتا رہا تو شاہ عبدالرحیم، شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز جیسے بزرگانِ دین و عالمانِ شرع متین منظر پر آتے رہے مگر آج جبکہ اس نظام پر عمل پیرا ہونے کا پہلو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے تو اس کے ساتھ ہی ملتِ اسلامیہ میں مشاہیر رجال کا ظہور بھی یکدم رک گیا ہے۔

ہماری ملی تاریخ میں کسی چیز پر امت کا مسلسل کاربند ہونا بجائے خود ایک شرعی دلیل اور حجت ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ اگر چودھری غلام احمد پرویز اس تعامل کا انکار کریں تو وہ مجرم گردن زدنی ٹھہریں لیکن ہم میں سے بعض محققین توحید کے نام سے پوری ہزار سالہ تاریخ پر پانی پھیر دیں تو وہ اسلامی خدمت قرار پائے۔ شاہ ولی اللہ نے فیوض الحرمین، القول الجمیل، الدر الثمین اور انفاس العارفین میں بزرگان دین کے واقعات، کرامات، اشغال و اوراد، تصرفات، چلوں، روحانی امداد اور اس قبیل کی جو سینکڑوں حکایتیں، مثالیں اور اپنے معمولات ذکر کیے ہیں، وہ اسی تاریخی تسلسل کی ایک کڑی ہے۔ پھر جگہ جگہ شاہ صاحب نے ''کاتب الحروف می گوید'' کے الفاظ کے ساتھ انہیں اپنی طرف سے سندِ تحسین بھی دی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ڈاکٹر ظہور الدین احمد کا وہ جملہ نقل کروں جو انہوں نے ''انفاس العارفین'' پڑھ کر لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''جو لوگ اولیاء اللہ کی روحانی قوتوں کے منکر ہیں ان کے لئے اس تذکرے (انفاس العارفین) کے بیانات ایسے شواہد پیش کرتے ہیں جن سے انکار شاہ ولی اللہ جیسے برگزیدہ عالم اور مومن کی گواہی سے انکار کے مترادف ہے۔''(22)

شاہ ولی اللہ کا مسلک اور اس کے ترجمان

حیرت ہوتی ہے کہ آج بہت سارے ایسے امور کہ جو سلف صالحین کا معمول رہے ہیں، کا رشتہ ماضی سے توڑ کر توہم پرستی اور بدعت کے دائرے میں داخل کر دیئے جاتے ہیں۔ ہمارا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ ایسے مستحب یا مستحسن امور کو فرائض و واجبات کا درجہ دیں یا انہیں دین کا ضروری حصہ قرار دے دیں۔ تاہم انہیں شرک و بدعت قرار دینے سے قبل یہ ضرور سوچنا پڑے گا کہ اس سے ہم اپنی تاریخ کے کتنے بڑے حصے کو جھٹلا رہے ہیں اور کیسے جلیل القدر آئمہ کی دین فہمی پر بے اعتمادی کا اظہار کر رہے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی کتاب ''انفاس العارفین'' کے اقتباسات سے پہلے آپ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے منصب تجدید کی تشریح میں لکھے ہوئے ایک مضمون پر نگاہ ڈال لیجیے۔ یہ اقتباس کسی معمولی پڑھے لکھے آدمی کی تحریر سے نہیں بلکہ نامور عالم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریر سے لیا گیا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ مولانا نے شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کے معمولات و نظریات کا مکمل مطالعہ کر کے لکھا ہے یا اپنے مخصوص نظریئے کی بنا پر یہ سمجھ لیا ہے کہ ضرور شاہ ولی اللہ کے بھی یہی نظریات ہوں گے۔ میں نے مولانا مودودی کا یہ اقتباس اس لئے زیادہ موزوں سمجھا ہے کہ اس میں تقریباً وہ ساری باتیں آ گئی ہیں جو وقتاً فوقتاً بعض اطراف سے مختلف عنوانات کے تحت سامنے آتی رہتی ہیں۔ اس اقتباس کے بعد آپ ''انفاس العارفین'' کے بعض مندرجات دیکھئے اور اندازہ لگایئے کہ تصوف سے متعلق عام مخالفت کا جو رجحان چل نکلا ہے، اس کے بارے میں اگر ایک ذمہ دار شخص کا یہ حال ہے تو پھر کس کس کا رونا روئیں اور اس سے آپ اس بات کا بخوبی اندازہ لگا

سکتے ہیں کہ خود شاہ ولی اللہ کی حکمت وفکر اور اس حکمت وفکر کے نام نہاد علمبرداروں میں کہاں تک مطابقت پائی جاتی ہے۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

مولانا لکھتے ہیں:

''جاہلیت خالصہ کے بعد یہ دوسری قسم کی جاہلیت ہے جس میں انسان قدیم ترین زمانے سے آج تک مبتلا ہوتا رہا ہے اور ہمیشہ گھٹیا درجے کی دماغی حالت ہی میں یہ کیفیت رونما ہوئی ہے۔ انبیا علیہم السلام کی تعلیم کے اثر سے جہاں لوگ اللہ واحد قہار کی خدائی کے قائل ہو گئے وہاں سے خداؤں کی دوسری اقسام تو رخصت ہو گئیں مگر انبیاء، اولیاء، صالحین، مجاذیب، اقطاب، ابدال، علماء، مشائخ اور ظل اللّٰہوں کی خدائی پھر بھی کسی نہ کسی طرح عقائد میں اپنی جگہ نکالتی رہی۔ جاہل دماغوں نے مشرکین کے خداؤں کو چھوڑ کر ان نیک بندوں کو خدا بنا لیا جن کی ساری زندگیاں بندوں کی خدائی ختم کرنے اور صرف اللہ ہی کی خدائی ثابت کرنے میں صرف ہوئی تھیں۔ ایک طرف مشرکانہ پوجا پاٹ کی جگہ فاتحہ، زیارات، نیاز، نذر، عرس، صندل، چڑھاوے، نشان، علم، تعزیے اور اسی قسم کے دوسرے مذہبی اعمال کی ایک نئی شریعت تصنیف کر لی گئی۔ دوسری طرف بغیر کسی ثبوت علمی کے ان بزرگوں کی ولادت ووفات، ظہور وغیاب، کرامات وخوارق، اختیارات و تصرفات اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے تقرب کی کیفیات کے متعلق ایک پوری میتھالوجی تیار ہو گئی جو بت پرست مشرکین کی میتھالوجی سے ہر طرح لگا کھا سکتی ہے۔ تیسری طرف توسل اور استمداد روحانی اور اکتساب فیض وغیرہ کے خوشنما پردوں میں وہ سب معاملات جو اللہ اور بندے کے درمیان ہوتے ہیں، ان بزرگوں سے متعلق ہو گئے۔''(23)

شاہ ولی اللہ کے منصب تجدید کی تشریح آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ اب ذرا شاہ ولی اللہ محدث کی خدمت میں چلیے لیکن شاہ صاحب کی تحریر پڑھنے سے پہلے حضرت شاہ عبدالعزیز کی یہ عینی شہادت ملحوظ خاطر رہے کہ ''والد ماجد (شاہ ولی اللہ) جو کچھ بھی لکھتے تھے، اس کا طریقہ یہ تھا کہ مراقبہ کے بعد جو چیز کشفی طور پر آپ کے سامنے آتی، اسے لکھتے۔''(24)

''حضرت خواجہ خورد (خواجہ محمد عبداللہ فرزند خواجہ محمد باقی ومرشد شاہ عبدالرحیم) حضرت خواجہ محمد باقی باللہ کا عرس کیا کرتے تھے جس میں کوئی آ کر کہتا کہ گوشت میں لا رہا ہوں، دوسرا کہتا چاول میرے ذمے، تیسرا کہتا فلاں قوال کا بندوبست میں کر رہا ہوں۔''(25)

آگے فرماتے ہیں:

''میرے والد (شاہ عبدالرحیم) فرمایا کرتے تھے کہ شیخ الاسلام عبداللہ انصاری کی اولاد میں سے شیخ نعمت اللہ المعروف شیخی عرس کیا کرتے تھے جس میں چھ سات سال کی عمر میں مجھے کئی بار شامل ہونے کا اتفاق ہوا۔''(26)

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

''والد گرامی (شاہ عبدالرحیم) فرمایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دنوں میں خزانۂ غیب سے کچھ میسر نہ آ سکا کہ کچھ طعام پکا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پُرفتوح کی نیاز دلوائی جا سکے، لہٰذا تھوڑے سے بھنے ہوئے چنوں اور قند سیاہ پر اکتفا کرتے ہوئے آپ کی نیاز دلوا دی۔ اسی رات بچشم حقیقت دیکھا کہ آپ کی خدمت میں انواع واقسام کے طعام پیش کیے جا رہے ہیں۔ اسی دوران وہ قند اور چنے بھی پیش کیے گئے۔ آپ نے انتہائی خوشی و مسرت سے قبول فرمائے اور اپنی طرف لانے کا اشارہ فرمایا اور اس میں تھوڑا سا تناول فرما کر باقی اصحاب میں تقسیم فرما دیا۔''(27)

یہی واقعہ ''الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین'' میں اس طرح درج ہے:

اخبرنی سدی الوالد قال اضع فی ایام المولد طعاماً صلة بالنبی صلی الله علیه وسلم فلم یفتح لی سنة من السنین الخ

''مجھے میرے والد گرامی نے بتایا کہ میں میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی میں ان ایام میں ہمیشہ کھانا پکوایا کرتا تھا۔ ایک سال اتفاق سے کچھ میسر نہ آ سکا۔''(28)

(آگے واقعے کا مضمون واحد ہے)

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

''والد گرامی نے فرمایا اورنگزیب عالمگیر نے ہدایت اللہ بیگ کو اپنے منصب سے ہٹا دیا۔ وہ میرے پاس بہت رنجیدہ خاطر اور شکستہ دل ہو کر آیا اور عاجزی وزاری کے ساتھ روتا رہا۔ میں نے اس کے معاملے پر توجہ کی تو مجھے معلوم ہوا کہ اس بارے میں تقدیر مبرم ہو چکی ہے۔ بالآخر میں نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کی کہ اگر یہ کام میرے حسب منشا ہوا تو میں صوفیانہ لباس اتار پھینکوں گا۔ چنانچہ قضا مبرم ٹال کر اسے اپنے منصب پر بحال کرنے کا وعدہ کیا گیا۔ میں نے کہا، اس سے بھی اسے ترقی ملنی چاہیے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔''(29)

اس پر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا تبصرہ ملاحظہ ہو:

''اولیاء اللہ سے اس قسم کے واقعات بے شمار روایت کیے گئے ہیں اور ان کی تاویلات موجود ہیں۔''

ذرا اور آگے چلیے:

''والد گرامی (شاہ عبدالرحیم) فرماتے تھے کہ ایک دفعہ میں شیخ عبدالاحد (مجدد الف ثانی کے پوتے) کے گھر گیا تو وہ ختم خواجگان پڑھ رہے تھے۔ الخ''(30)

ایک دوسری جگہ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

''والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ میرے والد (شاہ وجیہہ الدین) جو شہید ہوئے تھے، کبھی کبھی

باقاعدہ جسمانی صورت میں میرے پاس تشریف لاتے اور حال واستقبال کی خبریں سنایا کرتے تھے۔اس کے بعد انہوں نے اپنی بھتیجی کریمہ کی بیماری میں شاہ وجیہہ الدین کی آمد اور بیماری سے اس کی نجات یعنی اس کی موت کی قبل از وقت اطلاع کا واقعہ لکھا ہے۔''(31)

مزید لکھتے ہیں:

''والد گرامی فرمایا کرتے تھے کہ ایک دن عصر کے وقت مراقبے میں تھا کہ غیبت کی کیفیت طاری ہوگئی اور میرے لئے یہ وقت چالیس ہزار برس کے برابر وسیع کر دیا گیا اور اس مدت میں آغازِ آفرینش سے روزِ قیامت تک پیدا ہونے والی مخلوق کے احوال و آثار مجھ پر ظاہر کر دیئے گئے۔''(32)

ایک اور دلچسپ واقعہ جو خود شاہ صاحب کا چشم دید ہے، سنیے:

''کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ خواجہ محمد سلمان نے ایک گھوڑا لے رکھا تھا جو اس نے والد ماجد کو دکھایا۔آپ نے اسے تنہائی میں بلایا۔اس وقت یہ فقیر (شاہ ولی اللہ) بھی وہاں موجود تھا اور فرمایا کہ گھوڑا تو خوب ہے مگر اس کی عمر کم ہے۔اس نے عرض کی کہ میں چاہتا ہوں کہ میری بدزبان اور بدعادت بیوی کی عمر اس کو مل جائے۔آپ نے متبسم ہو کر فرمایا، اچھا ایسے ہی ہو جائے گا۔تین ماہ کا عرصہ نہ گزرا کہ اس کی بیوی مرگئی اور اس نے گھوڑا بیچ کر خوب نفع کمایا۔''

ایک اور واقعہ ملاحظہ ہو:

''اس فقیر (شاہ ولی اللہ) نے حضرت والد ماجد سے اجمالاً اور یارانِ طریقت سے تفصیل کے ساتھ سنا ہے کہ جن دنوں اورنگزیب حسن ابدال کی طرف پٹھانوں کی بغاوت فرو کرنے کے لئے گیا تو انتہائی کوشش کے باوجود کامیابی کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔بعض مخلصوں نے اس بارے میں والد گرامی سے دعا کی درخواست کی۔جب متوجہ ہوئے تو فرمایا کہ ایک معمر بزرگ سامنے آ کر دعا سے منع کر رہے ہیں۔بعد میں آپ کو معلوم ہوا کہ شیخ بزرگوار آدم بنوری کے خلفاء میں سے حاجی یار محمد نے پٹھانوں کی مدد پر کمر باندھ رکھی تھی۔''(33)

یوں تو ''انفاس العارفین'' توسل، استمداد، تصرفات، کشف و اطلاع خواطر، ریاضات، اوراد و اشغال الغرض مسلکِ صوفیا صافیہ کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔میں نے یہ چند حوالہ جات صرف اس لئے پیش کیے ہیں تا کہ اہل علم کی توجہ اس طرف مبذول کراؤں کہ ان باتوں کو محض بریلویت کی توہم پرستی کہہ دینا تو رسمی سی بات ہے لیکن ذرا سوچیے کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، شاہ عبدالرحیم، شیخ ابوالرضا، سراج الہند مولانا شاہ عبدالعزیز کیا یہ سارے کے سارے بریلوی تھے؟ ہند کی سرزمین میں ابھی مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلوی اور دارالعلوم دیوبند کا وجود بھی نہیں تھا کہ یہ بحثیں چھڑی ہیں۔ برصغیر کی خاموش اور پُرسکون فضا میں سب سے پہلے جس چیز نے لوگوں کو چونکا دیا سوئے اتفاق سے وہ اسی خاندان کے ایک فرد شاہ محمد اسماعیل کی ''تقویۃ الایمان'' تھی جس کا فکر نامانوس دعوت میں اجنبیت اور اندازِ بیان جارحانہ تھا۔ اڑھائی سو کتابوں کی ایک ایسی لسٹ میری نظر سے گزر چکی ہے جو ''تقویۃ الایمان'' کے چھپتے ہی مختلف زبانوں میں مختلف علاقوں سے اس کی تردید میں لکھی گئیں۔اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت عام مسلمانوں، علماء اور اہل خانقاہ نے

اس کتاب کو کس حیثیت سے دیکھا۔ ہمارے پاس امر کا کوئی ثبوت اور جواز نہیں کہ ہم بیک قلم سارے برصغیر کے علماء، صوفیا، فقراء اور عوام کے متعلق یہ کہہ دیں کہ وہ نعوذ باللہ سارے کے سارے شرک و بدعات میں مبتلا ہوگئے تھے اور پہلی بار شاہ محمد اسماعیل ان کو حقیقی توحید سے روشناس کرارہے تھے۔ آخر شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز اور شاہ محمد اسماعیل میں کتنا فاصلہ ہے۔ کیا اس درمیانی عرصے میں سارا برصغیر کفر و شرک کی لپیٹ میں آ گیا تھا اور اگر پہلے سے تھا تو خود حکیم الامت شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز نے یہ تشدد اور زبان کیوں استعمال نہ فرمائی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سوادِ اعظم کے مسلک سے ہٹ کر یہ وہ پہلی آواز تھی جو برصغیر میں گونجی جسے شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تحریک کی صدائے بازگشت تو یقیناً کہا جاسکتا ہے مگر اسے ولی اللّٰہی فکر اور معمولات کا ترجمان ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔ غور فرمائیے کہ جذبات کی رو میں بہہ جانے والے ہمارے محققین نے کیسے کیسے دھوکے کھائے ہیں۔ مولانا منظور نعمانی ''تحفۃ الموحدین'' کو شاہ محمد اسماعیل کی ''تقویۃ الایمان'' کا متن قرار دیتے ہیں (34) لیکن آپ کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ یہ متن یعنی ''تحفۃ الموحدین'' ایک ایسا رسالہ ہے جس کا انتساب شاہ صاحب کی طرف نہ صرف مشکوک بلکہ غلط ہے۔ (35)

اس سے آپ اندازہ لگا لیجیے کہ متن بھی خود ساختہ اور اس کی شروح و تفصیلات بھی من مانی اور ستم یہ کہ پھر بھی اسے فکر ولی اللّٰہی کا نام دیا جاتا ہے۔ یہاں پر پروفیسر محمد سرور صاحب کی زبانی مولانا عبیداللہ سندھی کی تحریر کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے جو بہت برمحل ہے۔

> ''مولانا سندھی کہا کرتے تھے کہ گزشتہ صدیوں میں عوامی اور قومی تحریکیں اکثر و بیشتر مذہبی اٹھان اور بیداری کا نتیجہ تھیں لیکن جیسے جیسے وہ آگے بڑھیں ان کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور وہ عملاً عوامی و قومی بن گئیں لیکن تحریک ولی اللّٰہی میں اس تاریخی انحراف کے بعد جو موڑ آیا تو وہ جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی بجائے اس کے کہ وہ مسلمان عوام کی ایک قومی تحریک بنتی وہ ایک علیحدگی پسند فرقہ پرستانہ تحریک بنتی گئی۔ سید احمد شہید سے منسوب اس تحریک کا یہ حشر تو ہوا ہی اس کا رد عمل اس تحریک کے وہ دوسرے حصے تحریک دیوبند پر بھی ہوا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج بھی اس برعظیم کے مسلمان عوام کی غالب اکثریت بریلوی ہے جو اوپر کی دونوں تحریکوں کو کفر سے کم نہیں سمجھتی۔ اس نوع کی احیاء پسندانہ مذہبی تحریکیں اگر قومی اور عوامی خطوط پر نہ چلیں تو لازماً وہ علیحدگی پسندانہ فرقہ پرستانہ تحریکیں بن کر رہ جاتی ہیں۔'' (36)

اس اقتباس سے شاہ محمد اسماعیل کے خاص نقطہ نظر اور سواد اعظم سے اس کی بے تعلقی پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔

بعض لوگ ان اختلافات کو مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی طرف منسوب کر دیتے ہیں حالانکہ یہ انتہائی غلطی اور برصغیر کی مذہبی تاریخ سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ برصغیر میں اصل اختلافات کا آغاز مولانا شاہ اسماعیل کی ''تقویۃ الایمان'' کی بعض عبارات اور اثر ابن عباس کے مسئلے سے ہوا جس میں مولانا محمد احسن نانوتوی کی بعض علماء نے تکفیر کی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے رسالہ ''تحذیر الناس'' کی تردید میں کئی رسائل لکھے گئے جن میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں:

1- الکلام الاحسن مولفہ مولانا ہدایت علی

2- تنبیہ الجہال بالہام الباسط المتعال مولفہ حافظ بخش بدایونی
3- قول الفصیح، مولانا فصیح الدین بدایونی
4- افاداتِ صمدیہ، مولوی عبد الصمد سہسوانی
5- کشف الالتباس فی اثر ابن عباس
6- قسطاس فی موازنۃ اثر ابن عباس (37)

بعض حضرات نے اس سے بھی بڑھ کر دیدہ دلیری سے کام لیا ہے۔ شاہ صاحب کے مسلک اور ان کے معمولات کا بغور مطالعہ کر کے ذرا اس رائے کی وقعت کا اندازہ لگایئے کہ کس طرح عامۃ المسلمین کی آنکھوں میں دھول جھونکی گئی ہے۔

مولانا مسعود عالم ندوی رقمطراز ہیں:

''وقت آیا کہ از سر نو پیام محمدی کی تجدید ہو۔ مسجد نبوی کے دو طالب علم خاص طور پر اس منصب سے نوازے گئے۔ ان میں ایک ہندی نژاد تھا۔ دوسرا نجد کا بادیہ نشین، آپ سمجھے یہ طالب علم کون تھے۔ محمد بن عبد الوہاب اور ہندی نژاد ولی اللہ بن عبد الرحیم۔'' (38)

مولانا مسعود عالم تو معاملہ ہی صاف کر گئے۔ البتہ شیخ محمد اکرام نے ذرا لگی لپٹی کہی، فرماتے ہیں:

''ان کی (شاہ ولی اللہ) اصلاحی تحریک اور شیخ محمد بن عبد الوہاب کی تحریک میں ایک وجہ امتیاز یہ تھی کہ اگرچہ یہ دونوں بزرگ عہدِ نبوی کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں اور شاہ صاحب بھی تصوف کی اصلاح کے خواہاں ہیں لیکن وہ وہابی مصلحین کی طرح اس کے مخالف نہیں۔'' (39)

یہ بات کس قدر تعجب انگیز ہے کہ بعض حلقوں میں ان کے اپنے ہاں یہ ساری باتیں گوارا کی جاتی ہیں اور خوب مزے لے لے کر بیان کی جاتی ہیں لیکن جب معاملہ دوسروں کا آ جائے تو یہ سب کچھ بدعت، تو ہم پرستی اور قبر پرستی ہو جاتا ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مضمون کا اقتباس، مولانا مسعود عالم ندوی کا نظریہ اور ''تقویۃ الایمان'' کے مضامین کے ساتھ ساتھ اگر شاہ صاحب کی فیوض الحرمین، الدر الثمین، انفاس العارفین، القول الجمیل اور انتباہ فی سلاسل الاولیاء کا مطالعہ کیا جائے تو میرا خیال ہے کہ حقیقت سمجھنے میں ہرگز کوئی دشواری پیش نہیں آتی اور صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ۔

نزلو ابمکۃ فی قبائل ہاشم
ونزلوا بالبیداء العبد منزل

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ تصوف میں غیر اسلامی نظریات و معمولات کے مخالف تھے لیکن ان کو جائز ٹھہرانے اور اس کی تائید کرنے والا بھی تو کوئی نہیں۔

شاہ ولی اللہ اور بارگاہِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم

ہمارے تمام بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام عشق و محبت حضرت ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی جس لازوال

دولت کے امین رہے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب بھی اس متاعِ بے بہا سے مالا مال نظر آتے ہیں۔ قیامِ حرمین کے دوران آپ نے روضہ نبویؐ سے براہِ راست فیوض حاصل کیے، فرماتے ہیں:

''درآں میاں برروضہ منورہ حضرت سید البشر علیہ افضل الصلوٰۃ واتم التحیات متوجہ شد وفیض ہا یافت۔''(40)

چنانچہ آپ نے ''فیوض الحرمین'' کے نام سے اس بارے میں مستقل کتاب لکھی۔

نظم کی صورت میں آپ نے یوں بارگاہِ نبویؐ میں گلہائے عقیدت پیش کیے ہیں:

واذا ما اقلتنی ازمة مدلهة
تحیط بنفسی من جمیع الجوانب

جب مصیبت کی گہری تاریکی مجھے ہر طرف سے اپنے نرغے میں لے لیتی ہے تو

تطلبت هل من ناصر او مساعد
الوذبه من خوف سوء العواقب

میں بڑی کوشش سے بار بار ایسے مددگار یا معاون کی جستجو کرتا ہوں جس کے دامنِ رحمت میں مجھے میرے نتائج کے خوف سے پناہ مل سکے

فلست اری الا الحبیب محمداً
رسول الله الخلق جم المناقب

ایسا معاون و مددگار میں کسی کو نہیں پاتا بجز اپنے حبیب حضرت محمد مصطفیٰؐ کے جو ساری مخلوق کے پروردگار کے رسول ہیں اور جن کے محامد بے شمار ہیں۔

و معتصم المکروب فی کل غمرة
و منتجع الغفران من کل تائب

مجھے تو حضورؐ کے علاوہ اور کوئی نظر نہیں آتا جس کے دامنِ رحمت میں کوئی غمزدہ مصیبت کے وقت پناہ لے سکے اور ہر تائب مغفرت کے لئے اس کی بارگاہ کا قصد کر سکے۔

وقد کان نور الله فینا لمهتد
وصمصام تدمیر علی کل ناکب

آپ ہمارے درمیان اللہ کا نور تھے۔ ہر ہدایت کے طلبگار کے لئے اور ہر روگردانی کرنے والے کے لئے شمشیر براں۔

آپؒ نے اپنے اس مشہور قصیدہ کے شروع میں لکھا ہے:

''در تشبیب بذکر بعض حوادثِ زماں کہ دراں حوادث لابد است از استمداد بروح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم وتخلص بذکر مناقب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم''

پہلی فصل میں ان حوادث کا ذکر کیا گیا ہے جن حوادثات سے نجات حاصل کرنے کے لئے حضورؐ کی روح مبارک سے مدد حاصل کرنے کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں اور جن سے رہائی حضورؐ کے کمالات کے بیان ہی سے ہو سکتی ہے۔[41]

سرکارِ دو جہاںؐ سے آپ کو جس قدر عقیدت و محبت تھی اسے مذکورہ اشعار سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

اپنی وصیت میں فرماتے ہیں: ''مار الابدست کہ بحرمین محترمین رویم و روئے خود را برآں آستانہائے مالیم سعادتِ ما ایں است و شقاوت ما در اعراض ایں۔''[42]

ہمارے لئے ضروری ہے کہ حرمین شریفین حاضری دیں اور ان آستانوں پر اپنے چہرے رگڑیں۔ ہماری سعادت اسی میں ہے اور بدبختی اس بات سے روگردانی میں۔

''انفاس العارفین'' کے بعض واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ روحِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس خاندان کے ساتھ خصوصی ربط اور لطف و کرم رہا ہے۔

شاہ عبدالرحیم کی بیماری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری اور انہیں اپنے موئے مقدس کے عطا فرمانے کی جو داستان شاہ صاحب نے لکھی ہے، وہ روح پرور ہے۔ اس داستان کو بآسانی ایک وجدانی یا روحانی کیفیت کا نام دیا جا سکتا تھا لیکن شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ جب والدِ گرامی نیند سے بیدار ہوئے تو وہ دونوں بال مبارک ان کے پاس موجود تھے اور بعض منکرین کی اصلاح کے لئے ایک موقع پر جب انہیں باہر نکالا گیا تو فوراً بادلوں نے ان پر سایہ کر لیا۔ تین دفعہ یہ صورت ہوئی، چنانچہ منکرین نے توبہ کر لی۔ نیز فرمایا کہ ان بالوں کی خاصیت یہ ہے کہ باہم گرگتھے رہتے ہیں۔ جب ان پر درود پڑھا جائے تو وہ علیحدہ علیحدہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں:

''حضرت ایشاں در آخر عمر تبرکات قسمت میفرمودند یکے ازاں دو موئے بکاتب حروف عنایت فرمودند والحمد للہ رب العالمین''[43]	حضرت والد جب آخر عمر میں تبرکات تقسیم فرمانے لگے تو ان دو مقدس بالوں میں سے ایک مجھے عنایت فرمایا اس پر اللہ کا شکر ہے۔

''انفاس العارفین'' کا ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''والد گرامی فرمایا کرتے تھے کہ ایک بزرگ نے اپنی تمام توجہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے پر صرف کی۔ ایک دن وہ کہنے لگے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، خلاؤں میں، دھرتی پر ہر جگہ ہر وقت دیکھتا ہوں اور حضور کی کوئی حالت مجھ سے مخفی نہیں رہتی۔ میں نے انہیں کہا کہ تمہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت حقیقیہ نصیب نہیں بلکہ آپ کی صورتِ کریمہ تمہاری قوتِ خیالیہ میں رچ بس چکی ہے۔ الغرض جب بات نے طول پکڑا تو میں نے انہیں کہا کہ فلاں آیت کا معنی حضور سے پوچھ کر بتلاؤ۔ چنانچہ جب ان کا جواب انہیں نہ ملا تو میں نے انہیں بتایا کہ یہ صورت خیالیہ تھی۔''

اس پر شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

''کبھی کبھی ایسے حضوری لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح انور سے کامل مناسبت پیدا ہو

جاتی ہے تو ایسے عالم میں حالتِ خواب اور بیداری کی تمیز اٹھ جاتی ہے اور ان حضرات کو بغیر دقتِ نظر کائنات کے ذرے ذرے میں صورتِ محمدی جلوہ گر نظر آتی ہے اور اگر یہ کیفیت زندگی بھر طاری رہے تو بھی اسے رویتِ حقیقہ کہا جائے گا۔ مذکورہ واقعہ میں اس بزرگ کا حضور سے نہ پوچھ سکنا کچھ وجوہات رکھتا ہے۔ مثلاً اس بزرگ کی نسبت ابھی خام تھی یا یہ نسبت کسی خاص امر میں تھی۔ فقیر ولی اللہ کا گمان ہے کہ مذکورہ بالا صاحبِ نسبت بزرگ کے دعوائے مناسبت کو حضرت والد ماجد نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت حقیقیہ کے ناممکن الوقوع ہونے کے سبب نہیں بلکہ کچھ اور وجوہات کی بنا پر مسترد فرمایا تھا۔"(44)

ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ عشقِ رسولؐ اور ذاتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی قرب کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔

شاہ ولی اللہ کی طرف بعض کتابوں کا غلط انتساب اور بعض کتابوں میں الحاقات

تاریخ ایسے کئی نامور علماء، مفکرین اور شعراء کی نشاندہی کرتی ہے جن کی شہرت سے فائدہ اٹھا کر مخصوص مقاصد کی خاطر بعض لوگوں نے ان کی طرف غلط کتابیں منسوب کر دیں یا ان کی کتابوں میں الحاقات کر دیئے۔ دور کیوں جایئے احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ سب کے سامنے ہے۔ افسوس ہے کہ اس وبا سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بھی محفوظ نہیں رہ سکے۔ چنانچہ آپ کے ساتھ بھی دونوں صورتیں روا رکھی گئیں۔ پروفیسر محمد ایوب قادری نے اس پر خاصا تحقیقی مضمون لکھا ہے۔ اس کے بعض اقتباس یہاں نقل کرتے ہیں:

"شاہ ولی اللہ دہلوی سے منسوب بعض ایسے رسالے بھی ملتے ہیں جو شاہ صاحب کی تصنیف نہیں ہیں اور لوگوں نے شاہ صاحب سے منسوب کر کے چھاپ دیئے ہیں یا شاہ صاحب کی تصنیف بتائے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا نام مرزا علی لطف مولف تذکرہ گلشن ہند کا ہے۔ یہ تذکرہ 1801ء میں تالیف ہوا ہے۔ مرزا علی لطف نے ولی اللہ سرہندی المتخلص بہ اشتیاق کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سمجھ کر ان کی ہجو کی اور ان سے دو کتابیں منسوب کیں۔ شاہ محمد اسحاق دہلوی (ف 1262ھ۔1845ء) جب (1257ھ۔1841ء) میں حجاز کو ہجرت کر گئے تو دہلی میں تقلید و عدم تقلید کے مباحث نے خوب زور پکڑا۔ مقلدین اور غیر مقلدین کے درمیان مناظرے ہوئے۔ اسی زمانے میں بعض جعلی کتابیں بھی وجود میں آئیں۔ قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتی (1314ھ۔1896ء) اپنی ایک تالیف "کشف الحجاب" میں لکھتے ہیں:

"اور ایسا ہی ایک اور جعل (غیر مقلدین) کرتے ہیں کہ سوال کسی مسئلہ کا بنا کر اور اس کا جواب موافق اپنے مطلب کے لکھ کر علمائے سابقین کے نام سے چھپواتے ہیں۔ چنانچہ بعض مسئلے مولانا شاہ عبدالعزیز کے نام اور بعض مسئلے مولوی حیدر علی کے نام سے علیٰ ہذا القیاس چھپوائے ہیں۔"

شاہ ولی اللہ دہلوی کے خاندان کے ایک فرد اور ان کی تصنیفات کے مشہور ناشر ظہیر الدین سید احمد ولی اللّٰہی نواسہ شاہ رفیع الدین دہلوی جنہوں نے شاہ صاحب کی تصانیف بڑی تعداد میں طبع وشائع کر کے وقف عام کی ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے اس طرف توجہ دلائی۔ چنانچہ وہ شاہ صاحب کی ایک کتاب ''تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء'' کے آخر میں لکھتے ہیں:

''بعد حمد وصلوٰۃ کے بندہ محمد ظہیر الدین عرف سید احمد اول گزارش کرتا ہے بیچ خدمت شائقین تصانیف حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب ومولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کہ آج کل بعض لوگوں نے بعض تصانیف کو اس خاندان کی طرف منسوب کر دیا ہے اور درحقیقت وہ تصانیف اس خاندان میں سے کسی کی تھیں اور بعض لوگوں نے جو ان کی تصانیف میں اپنے عقیدے کے خلاف بات پائی تو اس پر حاشیہ جڑا اور موقع پایا تو عبارت کو تغیر وتبدل کر دیا تو میرے اس کہنے سے یہ غرض ہے کہ جواب تصانیف ان کی چھپیں تو اچھی طرح اطمینان کر لیا جائے۔''

اسی طرح یہ ظہیر الدین صاحب نے ''انفاس العارفین'' مطبوعہ مطبع احمدی کے آخر میں ''التماس ضروری'' کے نام سے بھی یہی کچھ لکھا ہے بلکہ اس میں انہوں نے شاہ صاحب کی طرف غلط منسوب کتابوں کی فہرست دی ہے جو یہ ہے:

1-	تحفۃ الموحدین	مطبوعہ اکمل المطابع، دہلی	منسوب بطرف حضرت شاہ ولی اللہ
2-	بلاغ المبین	مطبوعہ، لاہور	منسوب بطرف حضرت شاہ ولی اللہ
3-	تفسیر موضح القرآن	مطبوعہ خادم الاسلام، دہلی	منسوب بطرف شاہ عبدالقادر
4-	ملفوظات		منسوب بطرف شاہ عبدالعزیز

ایک نامور عالم مولانا وکیل احمد سکندر پوری ''البلاغ المبین'' کے متعلق اپنی کتاب ''وسیلہ جلیلہ'' میں لکھتے ہیں:

''یہ کتاب (البلاغ المسلمین) کسی وہابی کی تصنیف ہے جسے کافی لیاقت نہ تھی مگر اعتبار واسناد کے لئے مولانا شاہ ولی اللہ کی طرف منسوب کی گئی۔ اس کا انتساب ایسا ہی ہے جیسے دیوان مخفی کا زیب النساء کی طرف یا دیوان محی کا حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کی طرف، دیوان معین الدین ہروی کا حضرت معین الدین چشتی کی طرف ''رسالہ تحفۃ الموحدین'' سب سے پہلے اکمل المطابع دہلی میں طبع ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد مرکزی جمعیت اہلحدیث کے ادارہ اشاعت السنۃ نے رجب 1373ھ میں اسے دوبارہ شائع کیا۔ طبع ثانی کی اشاعت ہمارے پیش نظر ہے۔ اس میں ''تحفۃ الموحدین'' کے سرورق پر مصنفہ یا مولفہ شاہ ولی اللہ تحریر نہیں ہے بلکہ از افادات شاہ ولی اللہ دہلوی لکھا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ناشر اس سلسلے میں خود متردد ہے، لہٰذا اس نے اس رسالہ کا اعتبار قائم کرنے کے لئے اس کا مترجم حیاتِ ولی کے مولف مولانا رحیم بخش دہلوی کو بتایا ہے۔ حالانکہ حیاتِ ولی میں مولانا رحیم بخش دہلوی نے شاہ ولی اللہ کی تصانیف کی جو فہرست دی ہے اس میں ''تحفۃ الموحدین'' یا ''البلاغ المبین'' کا ذکر تک نہیں ہے۔''

ان دونوں کتابوں کا شاہ صاحب کی تصانیف یا ان کے صاحبزادگان کی تصانیف میں کوئی ذکر و حوالہ نہیں ملتا اور نہ ہی تذکرہ نگاروں کے ہاں ان کا کوئی سراغ ملتا ہے۔[45]

شاہ صاحب کی طرف بعض تصانیف کے غلط انتساب کے علاوہ خود ان کی اصل کتابوں میں بھی بعض ایسی عبارات موجود ہیں جن پر ان کے وسیع اندازِ فکر اور معمولات سے مطابقت نہ رکھنے کے سبب الحاقات کا شائبہ ہوتا ہے۔ ہمارے اس خدشے کو مزید تقویت اس سے بھی ملتی ہے کہ شاہ صاحب کی کتابیں باقاعدگی کے ساتھ سب سے پہلے مولانا محمد احسن نانوتوی (ف 1312ھ/1895ء) نے اپنے مطبع صدیقی بریلی سے چھاپنا شروع کیں۔ ان کے بعد ان کے ربیب مولوی عبدالاحد (ف 1920ء) مالک مجتبائی نے یہ کتابیں چھاپیں۔ مولوی محمد احسن نانوتوی، اثر ابن عباس اور بعض دوسرے مسائل میں اپنے مخصوص اندازِ فکر کی وجہ سے اس دور کے مشہور علمی مراکز بدایوں، خیرآباد، بریلی اور دہلی کے علماء کے مسلک سے الگ اور ان کے معتوب تھے۔ کچھ بعید نہیں کہ شاہ صاحب کی کتابوں میں کہیں کہیں تغیر و تبدل کر دیا گیا ہو جیسا کہ اس امر کی طرف سید ظہیر الدین احمد نے اشارہ کیا ہے کہ صرف جعلی کتابیں ہی نہیں بلکہ الحاقات بھی ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر شاہ صاحب کی ''تفہیمات'' کی یہ عبارت پیش کی جا سکتی ہے جو ان کی ساری تعلیمات میں ہمارے محققین کو سب سے پہلے نظر آتی ہے۔ حالانکہ شاہ صاحب کے دوسرے نظریات سے وہ کوئی لگا نہیں کھاتی۔

کل من ذهب الی بلدة اجمیرا و الی قبر سالار مسعود اوماضاها لاجل حاجة یطلبها فانه اثم اثماً اکبر من القتل والزناء الیس مثله الامثل من کان یعبد المضوعات اومثل من کان یدعو الالت والعُزیٰ.[46]

قطع نظر اس بات کے کہ فی الواقع یہ بات درست ہے یا نہیں شاہ صاحب کا اندازِ بیان ان کے اور ان کے خاندان کے معمولات اور اس بارے میں دوسری کتابوں میں ان کے خیالات اس عبارت کو قبول نہیں کرتے۔

''حجۃ اللہ البالغہ'' میں فرماتے ہیں:

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میں نے تم کو قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا لیکن اب میں تمہیں کہتا ہوں کہ زیارت کرو کیونکہ اس سے عبرت حاصل ہوتی ہے۔ نہی کی بنا اس مصلحت پر تھی کہ زیارت قبور کی آزادی دینا عام طور پر غیر اللہ کی عبادت تک پہنچا دیتی ہے لیکن جب اسلامی تعلیمات نے دلوں میں جڑ پکڑ لی اور توحید ان کے رگ و پے میں سرایت کر گئی تو آپ نے اس کی اجازت دے دی۔''[47]

''القول الجمیل'' میں فرماتے ہیں:

''مشائخ چشتیہ نے فرمایا ہے کہ جب قبرستان میں داخل ہو تو سورہ انا فتحنا دو رکعت میں پڑھے۔ پھر میت کی طرف سامنے ہو کر قبلہ کی طرف پشت کر کے بیٹھے سورۂ ملک پڑھے اور اللہ اکبر اور لا الہ الا اللہ اور گیارہ مرتبہ سورۂ فاتحہ پڑھے۔ پھر میت سے قریب ہو جائے پھر کہے یارب یارب پھر کہے یاروح اور اس کو آسمان میں ضرب کرے اور یاروح الروح کی دل میں ضرب کرے یہاں

تک کہ کشائش اور نور پائے۔ پھر دل پر صاحبِ قبر کے فیضان کا انتظار کرے۔''(48)

سراج الہند شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں:

''بزرگوں سے استمداد کا طریقہ یہ ہے کہ اس بزرگ کی قبر کے سرہانے کی جانب قبر پر انگلی رکھے اور شروع سورہ بقرہ سے مفلحون تک پڑھے۔ پھر قبر کی پائنتی کی طرف جائے اور امن الرسول آخر تک پڑھے اور زبان سے کہے، اے میرے حضرت! فلاں کام کے لئے درگاہِ الٰہی میں التجا و دعا کرتا ہوں۔ آپ بھی دعا کریں۔''(49)

حضرت شاہ ولی اللہ کی وصیت تو آپ پڑھ آئے ہیں کہ ہماری سعادت اسی میں ہے، حرمین کے آستانوں پر اپنی عقیدت کی پیشانیاں جا کر جھکائیں۔

اصل بات تو مزارات پر حاضری، ان سے استمداد، اکتسابِ فیوض اور کشف قبور وغیرہ ہے جن پر شاہ عبدالرحیم سے لے کر شاہ عبدالعزیز تک سارے بزرگ عامل ہیں اور اس قسم کے واقعات سے ان کی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ باقی رہا مزارات کو مستقل حاجت روا سمجھنا تو کوئی مسلمان ایسا نہیں جو اسے شرک نہ سمجھتا ہو۔

یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ برصغیر کی اس نامور شخصیت کو ہم اپنے اختلافات میں فیصلہ کن یا رہبر بنانے کے بجائے الٹا اپنی مخصوص گروہ بندیوں میں لے آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلاشبہ شاہ صاحب کے فکر اور ان کی تعلیمات پر ہزاروں صفحے لکھے جا چکے ہیں، کئی اکیڈمیاں سرگرم عمل ہیں لیکن ایک صوفی و مرشد کی حیثیت سے یا خانقاہی معمولات کے بارے میں ان کے طرزِ عمل پر ایک حرف تک نہیں لکھا گیا اور یہ سب کچھ دانستہ کیا گیا ہے۔ حضرت شاہ صاحب کی جامع تعلیمات و افکار کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا ہے، اس کی تصویر کچھ یوں ہے ؎

ہر کسے از ظن خود شد یار من
وز درون من نجست اسرار من

میں یہاں پر جماعت اہلحدیث کے ترجمان ہفت روزہ ''الاعتصام'' کا ایک اقتباس ''الرحیم'' سے نقل کرتا ہوں۔ آپ اسے پڑھیے اور غور فرمائیے کہ شاہ صاحب کی شخصیت کو دیکھنے کے ہمارے پیمانے کیا ہیں:

''جماعت اہلحدیث کے ترجمان ہفت روزہ الاعتصام میں یہ اقتباس دینے کے بعد ایک صاحب نے لکھا ہے......شاہ صاحب کا جو حصہ تصوف سے متعلق ہے۔ اس میں ایسا مواد ملتا ہے جس سے بریلویت کی خاصی تائید ہوتی ہے۔''(50)

ضرورت اس امر کی ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی جامع کمالات شخصیت کو ان کے سارے لٹریچر، پس منظر، خاندانی روایات اور معمولات کے تناظر میں دیکھا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس اعتبار سے شاہ صاحب برصغیر کے مسلمان عوام کی اکثریت کے مستقل امام قرار پاتے ہیں جنہیں فرقہ پرستانہ اور علیحدگی پسندانہ تحریکوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں ؎

و لیس علی اللہ بمستنکر
ان یجمع العالم فی واحد

حواشی

(1) چونکہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی جامع شخصیت اور دینی خدمات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اسی کتاب کے آخر میں ان کے خودنوشت حالات تفصیل سے آ بھی رہے ہیں۔ اس لئے ہم آپ کی زندگی، تصنیفات، اس وقت کے سیاسی حالات اور آپ کے علمی کارناموں پر تفصیلی تبصرہ ضروری نہیں سمجھتے۔ ہم صرف اپنے موضوع یعنی ''انفاس العارفین'' کے مندرجات، شاہ صاحب بطور ایک صوفی اور مرشدِ راہ اور خاندان ولی اللہی کے معمولات اور معتقدات کے بعض ضروری گوشوں کی نشاندہی کریں گے۔

(2) انفاس العارفین مصنفہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ مطبوعہ مجتبائی:4

(3) تذکرہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی مصنفہ مولانا مناظر احسن گیلانی:287 مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی

(4) نزہتہ الخواطر مصنفہ حکیم محمد عبدالحیٔ ج:2:406 مطبوعہ دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد، دکن

(5) علم الکلام مصنفہ شبلی نعمانی ج:1:87 مطبوعہ مسعود پبلشنگ ہاؤس، کراچی

(6) رودِ کوثر مصنفہ شیخ محمد اکرام:551 مطبوعہ فیروز سنز، لاہور

(7) شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ مصنفہ مولانا عبیداللہ سندھی:215 مطبوعہ سندھ ساگر اکیڈمی، لاہور

(8) حیاتِ ولی مصنفہ مولوی رحیم بخش دہلوی:418 مطبوعہ مکتبہ طیبہ بلال گنج، لاہور

(9) تذکرہ شاہ ولی اللہ محدث مولانا مناظر احسن گیلانی:265 مطبوعہ نفیس اکیڈمی، کراچی

(10) حیاتِ ولی:161

(11) نزہتہ الخواطر مصنفہ حکیم محمد عبدالحیٔ۔ ج:6:145 مطبوعہ دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد، دکن

(12) شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ مصنفہ مولانا عبیداللہ سندھی:192-193 مطبوعہ سندھ ساگر اکیڈمی، لاہور

(13) انفاس العارفین مصنفہ شاہ ولی اللہ مطبوعہ مجتبائی:24

(14) انفاس:82

(15) انفاس:19

(16) انفاس:82

(17) تفہیمات الٰہیہ۔ ج1:19

(18) شاہ ولی اللہ کی تعلیم غلام حسین جلبانی٬ صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی:134 مطبوعہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی، ''ہندوستان میں وحدت الوجود سے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ'' معارف، مارچ 1970ء۔ دار المصنفین اعظم گڑھ مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔

(19) شاہ ولی اللہ کی تعلیم:137-138

(20) شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ:41

(21) ترجمان القرآن۔ ج1:35 مطبوعہ سندھ ساگر اکیڈمی

(22) تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہندوستان۔ ج5، فارسی ادب سوم باب: اولیاء کے تذکرے ڈاکٹر ظہور الدین احمد مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور

(23) منصب تجدید کی حقیقت اور تاریخ تجدید میں شاہ ولی اللہ کا مقام۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ''الفرقان'' بریلی، شاہ ولی اللہ نمبر:47۔

1359ھ مرتبہ محمد منظور نعمانی
(24) تذکرہ شاہ ولی اللہ۔ مولانا مناظر احسن گیلانی:293
(25) انفاس العارفین حضرت شاہ ولی اللہ مطبوعہ مجتبائی دہلی:19
(26) ایضاً۔ص29
(27) ایضاً۔ص:42
(28) الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین، شاہ ولی اللہ محدث:40 سنی دار الاشاعت علویہ ڈجکوٹ روڈ، لائلپور
(29) انفاس العارفین شاہ ولی اللہ محدث:59
(30) ایضاً۔ص:52
(31) ایضاً۔ص:37
(32) ایضاً۔ص:61
(33) ایضاً۔ص:63
(34) الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر:387
(35) مقدمہ وصایا اربعہ محمد ایوب قادری صاحب:26 شاہ ولی اللہ اکیڈمی
(36) افادات وملفوظات مولانا عبید اللہ سندھی پروفیسر محمد سرور:349 سندھ ساگر اکیڈمی
(37) محمد احسن نانوتوی مولفہ پروفیسر محمد ایوب قادری:90 تا95 روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی
(38) الفرقان۔ شاہ ولی اللہ نمبر:40
(39) رود کوثر مصنفہ شیخ محمد اکرام:534 تا580 فیروز سنز
(40) انفاس العارفین:204
(41) اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم مولفہ شاہ ولی اللہ مطبوعہ ماہنامہ ''ضیائے حرم'' اکتوبر، نومبر 1970ء اپریل 1971ء مرتبہ پیر محمد کرم شاہ الازہری۔
(42) المقالۃ الوضیہ فی النصیحۃ والوصیہ از شاہ ولی اللہ دہلوی مرتبہ محمد ایوب قادری:53 شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد۔
(43) انفاس العارفین:42:41
(44) ایضاً۔ص:75
(45) یہ ساری تفصیل، ہم نے پروفیسر محمد ایوب قادری کے مقدمہ وصایا اربعہ مطبوعہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد کے 24 تا28 سے لی ہے۔
(46) تفہیمات الٰہیہ ج2 تفہیم 34 صفحہ 49 شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد۔
(47) حجۃ اللہ البالغہ مترجم مولانا عبد الرحیم کلاچوی۔ ج:2:259 قومی کتب خانہ ریلوے روڈ، لاہور
(48) القول الجمیل شاہ ولی اللہ۔ سعید کمپنی ادب منزل:72
(49) کمالات عزیزی شاہ عبد العزیز L47-48 سعید کمپنی، ادب منزل۔
(50) الرحیم جنوری 1966ء شذرات مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد سندھ۔

(انفاس العارفین از شاہ ولی اللہ دہلوی۔ مترجم سید محمد فاروق القادری، لاہور 1394ھ)

مترجم: عبدالشکور فاروقی لکھنوی

مسلکِ مروارید

(ترجمہ ''عقد الجید فی الاحکام الاجتہاد والتقلید'')

سب تعریفیں اللہ کو سزاوار ہیں جس نے ہمارے سردار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب اور عجم کی طرف بھیجا یعنی سب کا پیغمبر کیا تا کہ یہ لوگ ان کے وجود سے جہالت کی تاریکیوں میں نور حاصل کریں اور ان کے فیض تعلیم کی وجہ سے بلند مقاموں پر پہنچیں۔ جو لوگ کہ بلند حوصلے رکھتے ہوں اور میں گواہی دیتا ہوں اس بات کی کہ کوئی معبود برحق نہیں سوائے خدا کے کہ وہ یکتا ہے اور اس بات کی کہ محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں جن کے بعد کوئی پیغمبر نہیں۔ رحمت اور برکت اور سلام بھیجے اللہ تعالیٰ ان پر اور ان کی اولاد اور ان کے یاروں پر۔

بعد حمد وصلوٰۃ کے کہتا ہے بندۂ ناتواں محتاج اپنے پروردگار کریم کی رحمت کا ولی اللہ بن عبدالرحیم محفوظ رکھے اللہ تعالیٰ اس کو ان باتوں سے جو اس کو عیب لگا دیں اور درست فرماوے اس کے دل اور حال اور کام کو کہ یہ ایک رسالہ ہے جس کا نام میں نے ''عقد الجید فی الاحکام الاجتہاد والتقلید'' رکھا۔ مجھ کو اس کے لکھنے کا باعث بعض یاروں کا سوال ہوا جنہوں نے مسائل ضروری اجتہاد وتقلید کے دریافت کیے۔

باب اول بیان میں اجتہاد کی تعریف اور اس کی شرط اور اقسام کے اجتہاد [1] کی تعریف جو کلامِ علماء سے سمجھی جاتی ہے، یہ ہے کہ خوب محنت کرنا دریافت کرنے میں شریعت کے احکام فرع کو ان کی تفصیلی دلیلوں سے جن کی کلیات کا مآل چار قسم پر ہے یعنی کتاب اور سنت اور اجماع اور قیاس پر (حاصل یہ کہ احکام فرعی کو ان چاروں اصولوں سے محنت تامہ کے ساتھ نکالنے کا نام اجتہاد ہے) اور اس تعریف سے سمجھا جاتا ہے کہ اجتہاد اس سے عام ہے کہ محنت کامل ایسے حکم کی معلوم کرنے میں ہوئی ہو جس میں علمائے سلف کی گفتگو ہو چکی ہو یا نہ ہوئی ہو، مجتہد اس اجتہاد میں علمائے سابق کا موافق ہوا ہو یا مخالف اور نیز اس سے عام ہے کہ یہ اجتہاد کسی کی اعانت سے ہوا ہو مثلاً کسی نے مسائل کی صورتوں کو بتا دیا ہو اور ماخذ احکام پر دلائل تفصیلی سے اشارہ کر دیا ہو یا کسی کی امانت سے نہ ہوا ہو پھر اب جو گمان کیا جاوے ایسے شخص عالم کے حق میں جو اکثر مسائل میں اپنے امام سے موافق ہو لیکن اس کے ساتھ ہی ہر حکم کی دلیل جانتا ہو اور اس دلیل پر اس کا دل مطمئن ہو اور اپنے کام کو سمجھ بوجھ کر کرتا ہو کہ وہ مجتہد نہیں ہے تو یہ گمان اس شخص کے حق میں گمان فاسد ہے اور اس طرح پر جو یہ گمان کرے کہ مجتہد اس زمانہ میں نہیں پایا جاتا بلحاظ اعتماد کرنے کے گمان اول پر تو یہ گمان بناؤ فاسد بر فاسد ہے۔

اور اجتہاد کی شرط یہ ہے کہ اجتہاد والے کو ضرور ہے کہ قرآن وحدیث اس قدر جانتا ہو جو احکام سے متعلق ہے

اور اجماع کے موقعوں اور قیاس صحیح کی شرطوں اور نظر[2] کی کیفیت اور علم عربیت اور ناسخ اور منسوخ اور راویوں کے حال سے واقف ہو اور اجتہاد میں علم کلام اور فقہ کی کچھ حاجت نہیں لیکن امام غزالیؒ نے کہا ہے کہ ہما۔ ے زمانے میں اجتہاد بدون مشق فقہ کے حاصل نہیں ہوتا اور مشق فقہ ہی فہم مسائل کے حاصل کرنے کا طریق اس زمانے میں ہے اور یہ طریقہ صحابہؓ کے وقت میں نہ تھا۔[3] میں کہتا ہوں کہ غزالی کا قول اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اجتہاد مطلق منتسب جب پورا ہوتا ہے کہ تصریحات مجتہد مستقل پر منتسب کو واقفیت حاصل ہو اور اسی طرح مجتہد مستقل کے لئے ضرور ہے کہ سلف یعنی صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کے کلام سے فقہ کے ابواب میں واقف ہو اور یہ جو ہم نے اجتہاد کی شرط ذکر کی ہے اصول کی کتابوں میں مشروح موجود ہے اور کچھ مضائقہ نہیں کہ بغوی کا قول اس مقام میں یعنی بیان شرط اجتہاد میں ذکر کیا جاوے۔ بغوی نے کہا ہے کہ مجتہد وہ عالم ہے کہ پانچ طرح کے علم کا حاوی ہو۔ اول علم کتاب اللہ یعنی قرآن مجید کا، دوم علم حدیث رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم، سوم علم علمائے سلف کے اقوال کا کہ ان کا اتفاق کس قول پر ہے اور اختلاف کس قول میں، چہارم علم لغت عربی کا، پنجم علم قیاس کا اور قیاس طریقہ حکم کے نکالنے کا قرآن اور حدیث سے ہے۔ جس صورت میں کہ حکم مذکور صریح قرآن یا حدیث یا اجماع کے نصوص میں مجتہد نہ پاوے (اب ان پانچوں علموں کی مقدار مفصل معلوم کرنی چاہیے کہ مجتہد کو ہر ایک علم کتنا چاہیے۔) تو قرآن کے علم میں سے اس پر ان باتوں کا جاننا واجب ہے۔ ناسخ[4] اور منسوخ مجمل[5] اور مفسر خاص[6] اور عام[7] محکم اور متشابہ کراہت[8] اور تحریم اباحت[9] اور استحباب اور وجوب کا جاننا اور حدیث میں سے ان اشیائے مذکورہ کا جاننا اور نیز صحیح حدیث[10] اور ضعیف[11] اور مسند[12] اور مرسل[13] کا جاننا اور حدیث کا مرتب کر۔نا قرآن پر اور قرآن کا حدیث پر جاننا حتیٰ کہ اگر کوئی ایسی حدیث پاوے جس کا ظاہر موافق قرآن کے نہ ہو تو اس کی مطابقت کی صورت کا سراغ لگا سکے کیونکہ حدیث بیان قرآن مجید کا ہے مخالف قرآن نہیں کہ مطابقت نہ ہو سکے اور احادیث میں سے صرف ان حدیثوں کا جاننا واجب ہے جو شرعی احکام کے بارے میں وارد ہوئی ہیں نہ ان کے سوا اور حدیثوں کا جاننا جن میں حکایات اور اخبار اور نصائح مذکور ہیں۔ اسی طرح زبان عربی کے ان الفاظ کا جاننا واجب ہے جو قرآن خواہ حدیث کے احکامی امور میں واقع ہوئے ہیں نہ یہ کہ سب لغت عربی کو جانے اور بہتر یہ ہے کہ لغت دانی میں اتنی محنت کرے کہ عرب کے کلام کے مقصود سے واقف ہو جاوے۔ اس طرح کہ اختلاف مواقع اور حالات کی وجہ سے کلام مذکور سے یہ مراد ہوتی ہے۔ اس لئے کہ خطاب شریعت عربی زبان میں وارد ہوا ہے تو جو شخص عربی نہ جانے گا وہ شارع علیہ السلام کا مقصود نہ پہچانے گا اور اقوال صحابہ اور تابعین میں سے اس قدر جانے جو در باب احکام منقول ہیں اور بڑا حصہ ان فتووں کا جانے جوامت کے فقہاء نے دیئے ہوں تا کہ اس کا حکم مخالف سلف کے اقوال پر نہ پڑے ورنہ اس صورت میں اجماع کی مخالفت ہوگی اور جب ان پانچوں اقسام کے علموں میں سے بڑا حصہ جانتا ہوگا تو وہ شخص اس وقت مجتہد ہوگا اور یہ شرط نہیں کہ سب علموں کو بالکل جانتا ہو حتیٰ کہ کوئی چیز ان علوم کی اس سے باقی نہ رہے اور اگر ان علوم پنجگانہ میں سے ایک قسم سے بھی ناواقف ہو تو اس کی سبیل دوسرے کی تقلید کرنا ہے۔ اگرچہ وہ شخص ایک مذہب میں کسی کے آئمہ سلف میں سے ماہر کامل ہو تو ایسے شخص کو عہدۂ قضاء اختیار کرنا اور فتویٰ دینے کا امیدوار ہونا درست نہیں اور جس صورت میں کہ ان پانچوں علوم کا جامع اور خواہشوں نفسانی اور بدعتوں سے علیحدہ ہو اور ورع اور تقویٰ کو شعار بنایا ہو اور کبیرہ گناہوں سے محترز ہو اور صغیرہ پر اصرار نہ رکھتا ہو تو اس کو قاضی

ہونا اور اپنے اجتہاد سے شرع میں تصرف کرنا جائز ہے اور اس شخص پر جو ان شرطوں کا جامع نہیں تقلید کرنی شخص جامع کی واجب ہے۔ ان حادثوں میں کہ اس کو پیش آ دیں تمام ہوا کلام بغوی کا۔

اور رافعی اور نووی اور ان دونوں کے سوا اوروں نے جو کثرت کے لحاظ سے شمار نہیں ہو سکتے تصریح کی ہے کہ مجتہد مطلق جس کی تفسیر گزر چکی دو قسم ہے۔ اول مستقل دوم منتسب اور عالموں کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجتہد مستقل دوسروں سے دو تین باتوں میں ممتاز ہوتا ہے۔ اول تصرف کرنا ان قواعد میں جن پر اس کی اجتہاد مسائل کی بنا پر ہے یعنی جن سے فقہی مسائل نکالے ہیں۔ دوسرے تلاش کرنا آیات واحادیث وآثار کا ان احکام کے پہچاننے کو جن کے جواب پہلے ہو چکا ہے اور متعارض دلیلوں میں سے کسی کو دوسری پر اختیار کر لینا اور اس کے معانی جتنے ہو سکتے ہیں ان میں سے راجح کو بیان کر دینا اور ان دلیلوں میں سے احکام فقہی کے ماخذ پر مطلع ہونا اور ہماری دانست میں واللہ اعلم۔ یہ دوسری بات امام شافعیؒ کے علم کی دو تہائی ہے۔ تیسری بات مجتہد مستقل کی جواب دینا ہے۔ ان مسائل میں جن کا جواب پہلے نہیں ہوا انہیں دلیلوں سے نکال کر جن سے پہلوں نے نکالا۔

اور مجتہد منتسب یعنی منسوب بمستقل وہ ہے جو اپنے استاد کے قواعد کو تسلیم کرے اور اس کے کلام سے اکثر مدد لے دلیلوں کی تلاش اور ماخذ کی واقفیت میں اور باین ہمہ وہ احکام فقہی پر یقین رکھتا ہو بلحاظ ان کے دلائل کے اور ان دلائل سے مسائل نکالنے پر قادر ہو خواہ یہ استنباط اس سے کم سرزد ہو یا زیادہ اور یہ امور مذکورہ صرف مجتہد مطلق کے اندر شرط ہیں کہ مجتہد مطلق وہی ہوگا جس میں یہ امور پائے جائیں۔

اور جو عالم کہ مجتہد منتسب سے مرتبہ میں کم ہو وہ مجتہد فی المذہب ہے۔ ایسا شخص اپنے امام کی تقلید کرتا ہے ان مسائل میں جن کے اندر تصریح امام کی ظاہر ہو لیکن وہ اپنے امام کے قواعد کو اور ان باتوں کو جن پر امام نے اپنا مذہب مبنی کیا ہے جانتا ہے تو جب کوئی واقعہ ایسا پیش آتا ہے کہ اس کے باب میں اپنے امام کا صریح قول نہیں جانتا تو اس میں امام کے مذہب کے طور پر اجتہاد کر کے اس کے اقوال سے اور اسی کے ڈھنگ پر اس واقعہ کا حکم نکالتا ہے اور جو عالم مجتہد فی المذہب سے بھی رتبہ میں کم ہو وہ مجتہد فی الفتویٰ ہے۔ ایسا شخص اپنے امام کے مذہب سے واقف کامل ہوتا ہے اور ایک قول کو دوسرے پر اور ایک صورت کو امام کے شاگردوں کی صورتوں میں سے دوسری پر ترجیح دے سکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

باب 2: فی بیان اختلاف المجتہدین

باب دوم بیان میں مجتہدوں کے اختلاف کرنے کے کسی حکم میں۔ علماء نے اختلاف کیا ہے۔ دو مجتہدوں کے حکم کے صواب کہنے میں دوبارہ ان مسائل فرعی کے جن میں حکم قطعی نہیں اور اختلاف اسی طرح ہے کہ آیا ہر مجتہد اس مسئلہ کے حکم بیان کرنے میں صواب پر ہے یا صواب پر صرف ایک ہے۔ دونوں کے بر صواب ہونے کے قائل یہ لوگ ہیں۔ شیخ ابوالحسن اشعری اور قاضی ابوبکر اور ابو یوسف اور محمد بن حسن اور ابن شریح اور اشعری متکلمون کے جمہور اور نیز معتزلہ سے بھی منقول ہے اور ابو یوسف کی ''کتاب خراج'' میں چند اشارے اس کی طرف ہیں جو قریب تصریح کے ہیں اور صرف ایک مجتہد کے بر صواب ہونے کے قائل جمہور فقہا ہیں اور یہی منقول ہے چاروں اماموں سے اور ابن سمعانی نے کتاب ''قواطع'' میں کہا

ہے کہ یہ ظاہر مذہب امام شافعیؒ کا ہے۔

بیضاوی نے ''منہاج'' میں بیان کیا ہے کہ دو مجتہدوں کے برصواب ہونے کا اختلاف اس خلاف پر مبنی ہے کہ ہر مسئلہ میں ایک حکم معین ہوتا ہے جس پر کوئی دلیل قطعی یا ظنی ہوتی ہے اور مختار وہ قول ہے کہ امام شافعی سے پایہ صحت کو پہنچا ہے کہ ہر حادثہ میں ایک حکم معین ہوتا ہے جس پر ایک پتہ اور نشان ہوتا ہے۔ جو مجتہد وہ نشان جان لیتا ہے، وہ صواب کو پہنچتا ہے اور جو اس پتہ کو نہیں پاتا وہ چوک جاتا ہے اور گنہگار نہیں ہوتا کیونکہ دلائل[14] اجتہاد سے پہلے ہوتی ہیں، اس لئے کہ اجتہاد طلب دلائل کا نام ہے اور دلالت حکم سے پیچھے ہے اور چوکنا اس وجہ سے ہے کہ اگر دونوں اجتہاد درست ٹھہریں اور اجتماع دونقیضوں کا ہوگا کہ دونوں حکم مخالف یکدگر ہیں اور ایک وجہ گنہگار نہ ہونے مجتہد خطا کار کی یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو مجتہد صواب کو پہنچے گا اس کو دو ثواب ہوں گی اور جو چوک جائے گا اس کو ایک ثواب ہوگا، گنہگار نہ ہونے پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ حکم ہر مسئلہ کا معین ہوا تو اس کا مخالف خدا تعالیٰ کے اتارے کے بموجب حکم نہ کرے گا اور اس وجہ سے بدکار ٹھہرے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ومن[15] لم یحکم بما انزل اللہ فاولئك هم الفاسقون اس کا جواب[16] ہم کہتے ہیں کہ مجتہد خطا کار نے حکم اسی بات کا کیا جس کو صواب گمان کیا۔ اگرچہ حکم دینے میں اللہ تعالیٰ کے اتارے کے بموجب چوک گیا۔

ایک اعتراض اور کیا گیا ہے۔ ایک مجتہد کے برصواب ہونے پر کہ اگر سب مجتہدوں کو برصواب نہ کہا جاوے تو مجتہد مخالف کا حاکم مقرر کرنا درست نہ ہو حالانکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے زیدؓ کو باوجود مخالفت اجتہاد حاکم مقرر کیا تھا۔ اس کا جواب ہم یہ کہتے ہیں کہ والی کرنا اس مخالف کا درست نہیں جو باطل پر ہو اور مجتہد خطا کار باطل پر نہیں ہوتا، تمام ہوا کلام بیضاوی کا۔

یہ جو[17] بیضاوی نے کہا کہ ہر واقعہ کے لئے ایک حکم معین ہے، آخر تک تو ہم کہتے ہیں کہ یہ قول امر غیب پر بلا وجہ حکم لگانا ہے اور یہ جو اپنے قول کی تائید میں امام شافعی کا قول نقل کیا ہے کہ ہر واقعہ میں ایک حکم معین ہوتا ہے۔ الخ تو ہم کہتے ہیں کہ معنی قول شافعی کے یہ ہیں کہ ہر واقعہ میں ایک قول ایسا ہوتا ہے کہ اصول سے موافق تر اور اجتہاد کے طریقوں میں سے چسپاں تر ہوتا ہے جس پر ظاہری علامت اجتہاد کے دلائل سے ہوتی ہے۔ جو کوئی اس علامت کو پالیتا ہے وہ صواب پر ہوتا ہے اور جس کو وہ نہیں ملتی وہ چوکتا ہے اور یہ معنی ہم نے اس لئے بیان کیے کہ خود امام شافعی نے اپنی کتاب ''اُمّ'' کے شروع میں تصریح کی ہے کہ جب ایک عالم دوسرے کو کہے کہ تو نے خطا کی تو اس کے یہ معنی ہیں کہ تو اس راہ راست کو چوک گیا جس کا چلنا عالموں کی شان کے مناسب ہے۔

اور اس مضمون کو خوب تفصیل سے بیان کیا ہے اور اس کی بہت مثالیں دی ہیں یا معنی قول شافعی کے یہ ہیں کہ جب اس واقعہ میں خبر واحد ہوتی ہے تو جس مجتہد کو وہ مل جاتی ہے تو وہ صواب کو پہنچتا ہے اور جس کو نہیں ملتی وہ چوک جاتا ہے اور یہ مضمون بھی کتاب ''اُمّ'' میں مشروح موجود ہے اور یہ جو بیضاوی نے دلیل عقلی نفی گناہ کی بیان کی کہ دلائل اجتہاد سے پہلے ہوتے ہیں، آخر تک ہم دلیل عقلی سہل تر کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے عبادت یہ مقرر فرمائی ہے کہ ہم اس عمل پر کاربند ہوں جس پر ہمارا اجتہاد پہنچاوے تو ہم جس بات کو مجملاً جانتے ہیں، اس کی جستجو کرتے ہیں۔ اس غرض سے کہ اس کا

علم مفصل حاصل (18) کریں اور یہ جو کہا کہ دونوں اجتہاد برصواب ہونے سے دونقیضیں جمع ہو جائیں گی، اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ جمع نہ ہوں گی بلکہ یہ صورت کفارہ کی چیزوں کی طرح ہے کہ ہر ایک ان میں سے واجب (19) ہے واجب نہیں بھی اور دلیل نقلی جو حدیث بیان کی کہ جو مجتہد صواب پر ہوتا ہے، اس کو دو ثواب ہیں اور ہر خطا والے کو ایک تو ہم کہتے ہیں کہ یہ دلیل تمہارے مطلب کے مضر ہے، تم کو مفید نہیں۔ کیونکہ ایسی خطا جو موجب ثواب ہو معصیت نہ ہو گی۔ غرضیکہ ضرور ہوا کہ دونوں اجتہادوں کے حکم خدا تعالیٰ کے لئے ہوں کہ ایک ان میں سے بہ نسبت دوسرے کے افضل ہے۔ جیسے عزیمت (20) افضل ہوتی ہے رخصت (21) سے یا یہ کہو کہ ایک حکم کا برصواب اور دوسرے کا مخالف ہونا قاضی کے حکم کرنے کے لحاظ سے ہے اور خارج میں تو ضرور ہے کہ ثابت مدعی کا قول ہو گا یا منکر کا اور یہ جو کہا کہ مجتہد نے حکم دیا اس بات کا جس کا صواب گمان کیا آخر تک ہم کہتے ہیں کہ یہ ہمارے مقصود کا اقرار ہے۔ (ہم بھی اسی وجہ سے اس کو مخالف حق نہیں کہتے) اور یہ جو کہا کہ خطا کار باطل والا نہیں ہوتا ہم کہتے ہیں کہ جب وہ باطل پر نہ ہوا تو مخالف حق نہ ٹھہرا۔ اس لئے ہر ایک مخالفِ حق باطل پر ہوتا ہے اور حق کے بعد سوا گمراہی کے اور کیا ہے اور حق یہ ہے کہ جو قول آئمہ چہارگانہ کی طرف منسوب ہے یعنی ایک مجتہد کا برصواب ہونا یہ قول ان کی بعض تصریحات سے نکالا ہوا ہے۔ ان سے کوئی بیان منصوص اس باب میں نہیں اور یہ بھی حق ہے کہ ساری امت کو دونوں مجتہدوں کے برصواب کہنے میں کچھ خلاف نہیں۔ جس مسئلہ میں کہ نص یا اجماع کی رو سے مکلف کو اختیار دیا گیا ہو، مثلاً ساتوں قرائتیں قرآن کی اور الفاظ دعاؤں کے اور نماز وتر پڑھنا سات اور نو اور گیارہ رکعتوں سے کہ سب صواب پر ہیں تو اسی طرح مناسب نہیں کہ علمائے امت اس مسئلہ میں خلاف کریں جس میں اختیار دلالت کی رو سے دیا گیا ہو اور حق یہ ہے کہ اختلاف کی چار قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس میں حق یقینی ایک ہی ہو اس صورت میں اس کے خلاف کو توڑنا واجب ہے کیونکہ وہ یقیناً باطل ہے۔ دوم وہ جس میں حق ظن غالب کی رو سے متعین ہو اس صورت میں اس کا خلاف ظن غالب کی رو سے باطل ہو گا۔ قسم سوم وہ ہے کہ خلاف کی دونوں طرفوں میں مکلف کو یقیناً اختیار دیا گیا ہو۔ چہارم وہ ہے کہ خلاف کی دونوں طرفوں میں مکلف کو ظن غالب کی رو سے اختیار دیا گیا ہو اور مفصل بیان ان چاروں قسموں کا یہ ہے کہ اگر مسئلہ خلافی ایسا ہو جس میں حکم حاکم شرع ٹوٹتا ہو اس طرح کہ اس مسئلہ میں حدیث صحیح معروف پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو تو جو اجتہاد خلاف اس حدیث کے ہو گا وہ باطل ہے۔ ہاں بعض اوقات مجتہد کو معذور جانا جائے گا بوجہ نہ جاننے حدیث منصوص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں تک کہ وہ حدیث پہنچے اور حجت قائم ہو اور اگر اجتہاد ایک ایسے واقعہ کے معلوم کرنے میں ہو جو ہو چکا ہے، پھر اس میں شک پڑ گیا مثلاً زید کے مرنے اور جینے میں تو ضرور ہے کہ حق اس صورت میں ایک ہی ہو گا مگر خطا کار کو اس کے اجتہاد میں معذور مانا جائے گا اور اگر اجتہاد ایسے معاملہ میں ہو کہ مجتہد کی اٹکل پر اس کو رکھا ہو اور دونوں مجتہدوں کے حکم کے ماخذ قریب یکدگر ہوں، کوئی ان میں سے نہایت دور ذہنوں سے نہ ہو کہ اس ماخذ والے کو قصوروار سمجھیں کہ لوگوں کی عرف اور عادت سے باہر ہو گیا ہو تو اس صورت میں دونوں مجتہد برصواب ہوں گے۔ مثلاً دو شخصوں میں سے ہر ایک سے کسی نے یہ کہا کہ جو فقیر تو پاوے اس کو میرے مال میں سے ایک درہم دے دینا، مامور نے کہا کہ میں کیسے جانوں گا کہ وہ فقیر ہے، اس سے یہ کہہ دیا گیا کہ جب تو فقیری کے قرینوں کی تلاش میں اجتہاد و کوشش کرے پھر تجھ کو یقین ہو جاوے کہ وہ فقیر ہے تو اس کو دے دینا۔ اب دونوں شخصوں کو ایک مرد کے باب میں اختلاف پڑا کہ ایک

نے کہا وہ فقیر ہے اور دوسرے نے کہا کہ فقیر نہیں اور دونوں کے قول کے ماخذ ذہن سے قریب ہیں کہ ہر ایک پر عمل کرنا گنجائش رکھتا ہے تو اس صورت میں دونوں صواب پر ہوں گے۔ اس لئے کہ آمر نے حکم دینے کا اسی شخص کو کیا تھا کہ مامور کی اٹکل میں آوے کہ وہ فقیر ہے اور اس کی اٹکل میں یہی آیا بدون کسی ظاہری قصور کے بخلاف اس صورت کے کہ کسی بڑے سوداگر نوکر چاکر رکھنے والے کو دے کر کہے کہ فقیر کو دیا کیونکہ ایسے سوداگر کو فقیر کہنے والا تقصیروار کہا جائے گا اور جس شبہ کی طرف وہ مائل ہوا ہے، اسی پر عمل کرنا درست نہیں غرضیکہ یہاں ان دونوں کا اختلاف دو طرح پر متصور ہے۔ اول یہ کہ واقع میں وہ شخص فقیر ہے یا نہیں۔ اس طرح کے اختلاف میں تو بے شبہ ایک ہی حق ہوگا اور دو نقیضیں جمع نہ ہوں گی اور دوم یہ کہ جس شخص نے غیر فقیر کو فقیر مجھ کر دیا، آیا اس نے آمر کے حکم کی اطاعت کی یا نہیں اور اس میں شک نہیں کہ وہ مطیع ہے۔ ہاں دونوں ماموروں میں سے جس کا گمان موافق واقع کے ہوگا، اس کو بہت بہرہ ثواب کا ملے گا۔

اور اگر اختلاف اجتہاد ایسی بات کے اختیار کرنے میں ہو جس میں شرعاً اختیار دیا گیا ہو کہ جونسی چاہیں اختیار کریں۔ مثلاً قرآن مجید کے الفاظ ساتوں قرأتوں کے اور دعاؤں کے کلمات اور ایسے ہی وہ امور کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں پر سہل کرنے کے لئے کئی طرح پر کیے ہیں باوجودیکہ ہر ایک ان میں سے اصل مصلحت کو حاوی ہے تو ایسے اختلاف میں دونوں مجتہد صواب پر ہیں اور یہ سب تقریر صاف ظاہر ہے کسی کو مناسب نہیں کہ اس میں تامل کرے۔

اور فقہاء میں اختلاف کے بڑے بڑے مقام کئی امر ہیں۔ اول یہ کہ ایک مجتہد کو حدیث پہنچی اور دوسرے کو نہ پہنچی تو ایسی صورت میں صواب پر ہونے والا متعین ہے یعنی جن کو حدیث ملی ہے وہی صواب پر ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر ایک مجتہد کے پاس حدیثیں اور آثار مختلف ہیں، اس نے بعض کو بعض سے مطابق کرنے یا ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے میں اجتہاد کیا اور اس کے اجتہاد نے ایک حکم خاص لگانے کی نوبت پہنچائی تو ہر مجتہد کے حکم کا اختلاف اس قسم کا پیدا ہوا اور تیسرے یہ کہ اختلاف الفاظ مستعملہ کی تفسیر میں ہو یا ان کے حدود جامع افراد اور مانع دخول غیر میں یا چیز کے ارکان اور شرطوں کی شناخت میں مثلاً ذکر کرنے اور محذوف کرنے اور مناط[22] نکالنے یا جو چیز کہ وصف عام سے موصوف ہے، اس کے صادق آنے میں اس صورت خاص پر یا کلیہ کے منطبق ہونے میں اپنی جزئیات پر یا کسی اور ایسی ہی بات میں اختلاف ہو اور ہر مجتہد کا اجتہاد اس طرح سے کوئی مذہب نکالے اور چوتھی یہ صورت ہے کہ مسائل اصولی میں اختلاف کریں اور اس سے فروع میں اختلاف نکلے تو ان سب قسموں میں دونوں مجتہد صواب پر ہوتے ہیں۔ بشرطیکہ دونوں کے ماخذ قریب قریب ہوں ان معنوں کے اعتبار سے کہ ہم نے ذکر کیے ہیں یعنی ذہن میں باسانی آسکیں بعید از عقل نہ ہوں اور حق یہ ہے کہ جو مسائل اصول فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں، دو قسم کے ہیں۔ ایک قسم تو وہ ہیں کہ الفاظ عربی کے کیفیات کی جنس سے ہیں جیسے خاص[23] اور عام اور نص[24] اور ظاہر اور مثل اس کی جیسے نحو دان کا کہنا کہ یہ اسم نکرہ ہے اور وہ معرفہ ہے اور یہ چیز کا نام ہے اور وہ اسم جنس ہے اور فاعل عبارت میں مرفوع ہوتا ہے اور مفعول منصوب ہوتا ہے اور اس قسم کے مسائل میں بہت اختلاف نہیں ہوتا اور ایک قسم اس جنس کے مسائل ہیں کہ ذہن کو ایسے کام کے قریب کریں کہ عاقل اس کو اپنے سلیقہ سے کرے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ تم اگر کسی عاقل کے سامنے کوئی پرانی کتاب رکھو جس کے بعض حروف بگڑ گئے ہوں اور اس کو اس کتاب کے پڑھنے کو کہو تو ضرور ہے کہ جب اس عاقل پر کوئی لفظ مشتبہ ہوگا تو وہ قرینوں کی دیکھ بھال کر کے لفظ درست پڑھنا چاہے

گا اور بعض اوقات اس جیسی بات میں دو عاقل مختلف ہوں گے اور جب عاقل کے سامنے دو راہ نمودار ہوتے ہیں تو وہ کیسے دلائل کی دیکھ بھال کر کے مصلحتوں کی تلاش کرتا ہے اور انجام وہ کو راہ اختیار کرتا ہے جو راجح تر اور بدی میں کم ہو تو اسی طرح پہلے علمائے پر جب حدیثیں مختلف کسی باب میں وارد ہوئیں تو انہوں نے ان میں بہت غور سے نظر کی اور ان کے اجتہاد نے بعض احادیث پر نوبت منسوخ ہونے کا حکم لگانے کی پہنچائی اور بعض کو بعض سے مطابقت کرنے اور کسی کو دوسرے پر ترجیح دینے کی اور اسی طرح جب ان کے سامنے ایسے مسائل آئے کہ سلف نے ان میں کچھ نہ کہا تھا تو انہوں نے ان کی نظیر کا حکم ان پر لگایا اور دونوں نظیروں میں علتیں حکم کی نکالیں اور حاصل یہ کہ ان کے پاس ایسی تدبیریں تھیں جن کی طرف انہوں نے اپنے سرشتی سلیقہ سے توجہ کی جیسے عاقل آدمی کسی معاملہ میں جو اس کو پیش آتا ہے توجہ کر کے تدبیر نکالتا ہے۔ پھر کچھ لوگوں نے ارادہ کیا کہ ان کی ان تدابیر کو خوب واضح بیان کریں جن کا ذکر انہوں نے اپنی کتابوں میں تفصیل وار کیا ہے یا اپنے کلام کے اثناء میں ان کی طرف اشارہ کیا ہے یا ان کے مسائل سے نکالی گئی ہیں۔ اگرچہ انہوں نے ان کو بیان نہیں کیا اور خلف کی عقلوں نے ان کی اکثر تدبیروں کو مان لیا، اس لئے کہ اس جیسی بات میں ان کی سرشت اسی سلیقہ پر تھی۔ پھر یہ تدابیر سب فقہا میں تسلیم کیے ہوئے امر بھٹر گئے۔

اور اسی قیاس پر جب علمائے سلف نے اپنی کوشش کامل کی حدیث کے روایات کرنے اور صحیح کو معلول سے اور مشہور [25] کو غریب سے پہچاننے میں اور راویوں کے حالات سچے ہونے اور مطعون [26] ہونے کے معلوم کرنے میں اور حدیث کی کتابوں کے لکھنے اور ان کے صحیح کرنے میں تو انہوں نے ان میدانوں میں اپنے اس سلیقہ سے قدم رکھا جو ان کی عقلوں میں پیدا کیا گیا تھا۔

پھر اور بہت سے لوگ آئے اور ان کی ان تدبیروں کو قواعد کلیہ ٹھہرا کر قلمبند کیا۔

اور یہاں ایک بڑے کام کی بات ہے، وہ یہ ہے کہ ایک شرط ان جیسے کلی مقدمات پر عمل کرنے کی یہ ہے کہ وہ صورت خاص جس میں گفتگو واقع ہو، ان صورتوں میں سے نہ ہو جن میں عقلائے سلف حکم مخالف ان کلیات کے دے چکے ہوں کیونکہ اکثر صورت متنازعہ میں بعض خاص قرینے ایسے ہوتے ہیں کہ جن سے حکم کلیات کے مخالف نکلتا ہے اور جھگڑے کی بناء پر یہی ہے کہ کلیات کے درپے ہو کر ایسا حکم ثابت کرنا کہ عقل خالص مقام کی خصوصیت کی وجہ سے اس کے خلاف حکم دے چکی ہو مثلاً تم کوئی پتھر دیکھو اور یقین کر لو کہ یہ پتھر ہے پھر کوئی جھگڑالو آوے اور تقریر کرے کہ چیز کو رنگ اور ڈھنگ وغیرہ سے پہچانتے ہیں اور اس ظاہری صورت میں تو بہت سی چیزیں ایک دوسری سے مشابہ ہیں۔ غرضیکہ تمہارے یقین کو ایک امر کلی سے بزعم خود توڑتا ہے اور بیچارہ یہ نہیں جانتا کہ جو یقین اس صورت خاص میں ہو چکا ہے، وہ کلیات کے درپے ہونے سے بڑھ کر ہے تو تم خبردار رہنا کہ کہیں ان کے اقوال صریح حدیث سے تم کو دھوکا نہ دیں اور اس قسم میں اختلاف کرنے کا مآل اٹکل اور دل کی تسلی پر ہے اور حاصل یہ ہے کہ اکثر اصول فقہ میں اختلاف کا انجام قرائن کے دیکھنے سے اٹکل اور دل کے اطمینان پر ہوتا ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے چند جگہوں میں اپنے کلام مبارک سے اشارہ فرمایا ہے کہ حکم شرع اسی طرف ڈھلتا ہے جدھر آدمی کی اٹکل پہنچاوے۔ ان جگہوں میں سے ایک یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے افطار کا دن وہ ہے جس دن افطار کرتے ہو اور تمہاری قربانی اسی روز ہے کہ تم قربانی کرتے ہو۔ خطابی نے کہا

کہ اس حدیث کے یہ معنی ہیں کہ لوگوں کا خطا کرنا ایسے مسائل میں جن کا مدار کوشش اور محنت پر ہے، معاف ہے۔ مثلاً اگر ایک قوم نے عید الفطر کے چاند دیکھنے میں محنت کی اور تیس دن کے بعد ہی دیکھا یعنی افطار نہ کیا یہاں تک کہ تیس روزے پورے رکھے، پھر ان کو ثابت ہوا کہ ماہ رمضان انتیس دن کا تھا تو ان کا روزہ اور افطار درست ہوا اور ان پر کچھ گناہ یا عتاب نہیں اور اسی طرح حج میں اگر عرفہ کا روز چوک جائیں تو ان پر دوبارہ حج کرنا لازم نہیں اور وہی افعال حج جو کر چکے، کافی ہوں گے اور یہ بات خدائے پاک کی طرف سے تخفیف اور نرمی ہے اس کے بندوں پر اور ان مواضع میں سے ایک یہ ارشاد ہے کہ حاکم جب اجتہاد کرے اور صواب کو پہنچے تو اس کو دو ثواب ہیں اور جب اجتہاد کرے اور چوک جائے تو اس کو ایک ثواب ہے۔

اور جو کوئی شارع علیہ السلام کے حکموں اور فتوؤں کو خوب جستجو کرے تو اس کو ایک قاعدہ کلیہ مل جاوے اور وہ یہ ہے کہ شارع علیہ السلام نے نیکی کے سب اقسام یعنی وضو اور غسل اور نماز اور زکوٰۃ اور روزہ اور حج وغیرہ کو جن پر اسلامی ملتوں کا اتفاق ہے، طرح طرح سے ضبط فرمایا مثلاً ان کے ارکان اور شرطیں اور قواعد مقرر کیے اور ان کے لئے مکروہات اور مفسدات اور نقصان کے پورا کرنے والی چیزیں ٹھہرائیں اور اس باب میں ارشاد کو کامل فرمایا جیسا کمال کہ چاہیے تھا۔ پھر بھی ان ارکان وغیرہ کی تعریفوں جامع اور مانع سے بہت بحث نہیں کی اور جب کبھی آپ سے حال احکام جزئی کا جو متعلق ان ارکان وشروط وغیرہ سے ہوتے، پوچھا جاتا تو آپ ان احکام کو ان الفاظ مستعملہ پر حوالہ کرتے جن کو وہ لوگ اپنے جی میں سمجھتے تھے اور ان کو جزئی باتوں کو کلیات پر منطبق کرنا بتا دیتے اور اس پر کبھی زیادہ نہ کرتے مگر ہاں تھوڑے مسئلوں میں اس بات عارضی یعنی قوم کے اصرار وغیرہ کی وجہ سے کچھ زائد بھی فرمایا ہے۔ مثلاً وضو میں آپ نے دھونا چار[27] اعضاء کا مشروع تو فرمایا مگر دھونے کی تعریف جامع اور مانع ایسی نہیں فرمائی جس سے معلوم ہو کہ ملنا اعضاء کا دھونے کی ماہیت میں داخل ہے یا نہیں اور پانی کا بہانا اس کی حقیقت میں ہے یا نہیں۔ اور پانی کی تقسیم فرمائی کہ مطلق[28] ہو یا مقید اور نہ کنویں اور تالاب اور ان جیسے اور پانیوں کے احکام بیان فرمائے حالانکہ یہ مسائل اکثر واقع ہوتے ہیں اور خیال میں نہیں آتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ مسائل واقع نہ ہوئے ہوں۔

اور جب سائل نے آپ سے قصہ بیر بضاعۃ[29] اور قلتین میں پانی کا حال پوچھا تو آپ نے زیادہ نہ فرمایا۔ انہیں لفظوں سے جواب دیا جن کو وہ لوگ سمجھتے تھے اور آپس میں ان کے خوگر تھے اور اسی وجہ سے سفیان ثوری نے کہا ہے کہ ہم نے پانی کے معاملہ میں وسعت ہی پائی اور جب ایک عورت[30] نے آپ سے حال اس کپڑے کا پوچھا جس پر حیض کا خون لگ جائے تو آپ نے اتنا ہی فرمایا کہ اول کھرچ دے پھر کپڑے کو مل ڈال۔ پھر دھولے، پھر اس سے نماز پڑھ لے۔ غرض جس قدر ان لوگوں کو معلوم تھا، اس سے زیادہ کچھ نہ فرمایا اور آپ نے قبلہ کی طرف منہ کرنے کا نماز میں حکم فرمایا اور ہم کو قبلہ کے پہچاننے کا طور نہ سکھایا۔ حالانکہ صحابہؓ سفر کرتے رہتے تھے اور قبلہ کے معاملہ میں دقت اٹھاتے تھے اور اس دشواری کے طریق معلوم کرنے کی ان کو سخت حاجت تھی تو ان سب امور کی وجہ یہ تھی کہ آپ نے ایسی باتیں انہیں لوگوں کی رائے پر حوالہ کر رکھی تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر فتوؤں کا حال ایسا ہی ہے جیسا کہ منصف عاقل پر پوشیدہ نہیں اور ہم نے آپ کے احکام کی تلاش سے یہ سمجھا ہے کہ آپ نے تہہ کی باتیں چھوڑنے اور اقسام ضبط کو زیادہ بیان کرنے میں ایک

بڑی مصلحت ملحوظ فرمائی ہے اور وہ یہ ہے کہ ان مسائل کا مآل ایسی حقیقتیں ہیں جو عرف میں مجمل مستعمل ہیں اور ان کی تعریف جامع و مانع بدون دشواری کے معلوم نہیں ہوتی اور بعض اوقات تعریف بیان کرتے وقت دو مشکل حقیقتوں میں جدائی کرنے کے لئے ضرورت ایسے احکام وقواعد کی ہوتی ہے کہ ان کے بیان کرنے میں لوگ تنگ ہوتے ہیں۔ پھر اگر ان حقائق کو ضبط اور تفسیر بھی کیا جائے تو ان کی تفسیر ہو نہیں سکتی مگر انہیں جیسے مجمل حقیقتوں سے اور اسی طرح لئے جاؤ تو معاملہ تفسیر حقائق کا مسلسل ہو جائے گا کہیں نہیں ٹھہرے گا یا بعض صورتوں میں مامور کی رائے پر حوالہ کر دینے سے ٹھہرے گا۔ حالانکہ یہ صورتیں مامورین کی رائے پر سپرد کر دینے کے باب میں بہ نسبت پہلی صورتوں کے زیادہ شایان نہیں ہیں تو اسی مصلحت کی وجہ سے آپ نے حقائق کو اول ہی سے ماموروں کی رائے پر حوالہ کر دیا اور خلافی مسائل میں کسی پر تشدد تو نہیں کیا درصورتیکہ اختلاف اس مسئلہ میں ہوا جو ان کی رائے پر مفوض تھا اور نیز اس میں اختلاف کی گنجائش بھی تھی مثلاً آپ نے عمرو بن عاص پر سرزنش نہ فرمائی۔ ان کے سمجھنے پر اس آیت سے ولا تلقوا[31] بایدیکم الی التھلکتہ یہ مضمون کہ تیمم کرنا ناپاک کو درست ہے جبکہ سردی کے مارے جان کا خوف کرے اور نہ حضرت عمر بن الخطاب کو کچھ برا کہا۔ اس مضمون کے سمجھنے پر آیہ اولا مستم النساء سے کہ یہ حکم تیمم کا عورت کے چھونے کے باب میں ہے نہ جنابت کے باب میں۔ غرضیکہ مسئلہ تیمم ناپاک شخص کا ان کے نزدیک بے ذکر رہ گیا تو چاہیے کہ جب آدمی ہرگز تیمم نہ کرے۔ نسائی نے طارق بن شہاب سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص جنب ہو گیا۔ اس لئے نماز نہ پڑھی یعنی تیمم نہ کیا۔ وہ بحضور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم حاضر ہوا اور یہ ماجرا آپ کی خدمت میں عرض کیا۔ آپ نے فرمایا کہ تو نے اچھا کیا۔ پھر ایک شخص ناپاک ہوا۔ اس نے تیمم کر کے نماز ادا کر لی اور حاضر آپ کی خدمت میں ہوا۔ آپ نے اس کو بھی ایسا ہی فرمایا جیسا اول شخص کو فرمایا تھا یعنی تو نے اچھا کیا۔ نسائی کا بیان تمام ہوا اور نہ کسی کو ان لوگوں میں سے برا کہا جنہوں نے نماز عصر میں تاخیر کی یا اس کو وقت کے اندر اثناء راہ میں ادا کیا کیونکہ ہر ایک فرقہ نے آپ کے اس ارشاد کے کہ نماز عصر مت پڑھنا مگر بنی قریظہ میں پہنچ کر ایک معنی[32] سمجھ لئے تھے۔ غرضیکہ جو کوئی آپ کے کلام پاک کے پہلوؤں کو خوب دیکھے تو وہ جان لے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حقائق کے باب میں جو عرف میں مجمل مستعمل ہوتے ہیں اور نیز ان میں سے بعض حقائق کو بعض سے مطابق کرنے میں معاملہ کو ان لوگوں کی سمجھ پر حوالہ فرمایا ہے اور اس حوالہ فرمانے کی نظیر فقہا کا حوالہ کرنا ہے۔ اکثر احکام کو مامور مکلف کی اٹکل اور عادت پر اور اس صورت میں کچھ سرزنش نہیں اختلاف کرنے والوں میں کسی پر ان کے نزدیک بھی اور نیز اس حوالہ کی نظیر وہ مسئلہ ہے جس پر امت کا اتفاق ہے یعنی کوشش کرنا قبلہ کے باب میں ابر کے وقت اور کسی کو برا نہ کہنا اس سمت کے اختیار کرنے میں جدھر اس کی اٹکل قائم ہوئی۔

اور نظیر اس مصلحت کی وہ ہے جو اہل مناظرہ نے اصطلاح بیان کی ہے کہ دلائل کے مقدمات پر بحث نہ کی جائے تاکہ بحث کی پریشانی لازم نہ آوے تو جو کوئی اس مسئلہ کی ماہیت جوں کی توں جان لے گا اس کو یہ امور معلوم ہو جائیں گے۔ اول یہ کہ اجتہاد کی اکثر صورتوں میں امر حق اختلاف کے دونوں جانب کے اندر دائر رہتا ہے۔ دوم یہ کہ دین کے معاملہ میں وسعت ہے تنگی نہیں۔ سوم یہ کہ ایک چیز پر جم جانا اور مخالف کی نفی کا یقین کرنا کچھ بات نہیں۔

چہارم یہ کہ حقائق کی تعریفوں کو نکالنا اگر اس قسم سے ہے کہ ذہن کے قریب ہو جائیں سب اہل زبان ان کو سمجھ

پس تو یہ علم پر مدد کرتا ہے اور اگر ان کا بیان ذہنوں سے دور اور دو مشکل باتوں کی امتیاز اپنے نئے گھڑے ہوئے مقدموں سے ہو تو یہ ایک نئی شریعت ہوگی یعنی قابل التفات نہیں۔ پنجم یہ کہ صحیح وہ قول ہے جو امام عز الدین بن عبدالسلام بن عبدالسلام نے کہا ہے کہ نجات پائی ایسے شخص نے جس نے وہ عمل کیا جس کے وجوب پر علما نے اتفاق کیا ہے اور اس چیز سے احتراز کیا جس کی حرمت پر ان کا اتفاق ہے اور مباح جانا اس شے کو جس کی اباحت پر علما نے اتفاق کیا ہے اور وہ کام کیا جس کے مستحب ہونے پر سب نے اجماع کیا اور کنارہ کیا اس فعل سے جس کے مکروہ ہونے پر علما متفق ہیں اور جس نے ایسی چیز کو اختیار کیا جس میں علما اختلاف رکھتے ہیں تو اس کے دو حال ہیں۔ ایک یہ کہ مختلف فیہ ان میں سے ہو جن سے حکم حاکم شرع ٹوٹتا ہو تو اس قسم کے مختلف فیہ میں تقلید کی کوئی صورت نہیں کیونکہ وہ نرمی خطا ہے اور حکم شرع اس میں اس لئے ٹوٹا کہ وہ ایسی خطا ہے کہ نفس شریعت اور اس کے ماخذ اور اس کے حکم کی رعایت سے بعید ہے۔ دوسرا حال یہ ہے کہ مختلف فیہ ایسی چیز نہیں ہے جس سے حکم شرع ٹوٹتا ہو تو ایسے مختلف فیہ کے کرنے کا کچھ مضائقہ نہیں نہ اس کے ترک میں کھٹکا۔ بشرطیکہ اس میں کسی عالم کی تقلید کرے کیونکہ آدمی ہمیشہ سے یہی کرتے رہے کہ علما میں جو مل گیا اس سے دریافت کر لیتے تھے بدون قید کسی مذہب کے اور بدون انکار کے سائلوں میں سے کسی پر یہاں تک کہ یہ مذاہب اور ان کے متعصب پیدا ہوئے کہ ان میں سے ایک اپنے امام کی پیروی کرتا ہے باوجودیکہ اس کا مذہب دلائل سے دور ہے مگر وہ اماموں کے قول میں اس کی تقلید کرتا ہے۔ گویا امام ایک پیغمبر مرسل ہے اور یہ تعصب حق اور صواب سے بعید ہے۔ کوئی اہل عقل میں سے اس سے راضی نہیں۔ تمام ہوا مقولہ عز الدین بن عبدالسلام کا اور نیز انہوں نے کہا کہ جو شخص چاروں اماموں میں سے ایک امام کا مقلد ہو پھر دوسرے امام کی تقلید کرنی چاہے تو یہ امر اس کو درست ہے یا نہیں، اس میں علما کا اختلاف ہے۔

اور قول مختار اس باب میں تفصیل ہے۔ اس طرح کہ اگر وہ مذہب جس کی طرف جانا چاہتا ہے ان مذاہب میں سے ہے جن میں حکم توڑا جاتا ہے یعنی ان کا حکم توڑنے کے قابل ہے تو اس شخص کو ایسے حکم کی طرف جانا درست نہیں جس کا توڑنا واجب ہے کیونکہ اس کا توڑنا اس لئے واجب ہوا کہ وہ حکم باطل ہے اور اگر دونوں مذہب کے ماخذ قریب قریب ہیں تو تقلید کی ایک کی اور جانا دوسرے کی طرف درست ہے کیونکہ سلف کے لوگ صحابہ کے وقت سے تا ظہور چاروں مذاہب کے ہمیشہ ان علما کی تقلید کرتے رہے جو ان کو ملتے۔ اس امر پر کسی ایسے شخص نے انکار نہیں کیا جس کے انکار کا اعتبار ہو اور اگر یہ بات باطل ہوتی تو بے شک انکار کرتے واللہ اعلم بالصواب۔ تمام ہوا کلام عز الدین بن عبدالسلام کا اور جب تمہارے نزدیک ثابت ہوگا جو کچھ کہ ہم نے بیان کیا ہے تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ جس حکم میں مجتہد اپنے اجتہاد سے گفتگو کرتا ہے وہ شارع علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات کی طرف منسوب ہوتا ہے خواہ آپ کے الفاظ مبارک کی طرف یا اس علت کی طرف جو آپ کے الفاظ سے لی گئی ہے اور جب معاملہ اس طرح پر ہے تو ہر ایک اجتہاد میں دو مقام قابل لحاظ ہیں۔ اول یہ کہ شارع علیہ السلام نے آیا اپنے کلام پاک سے یہی معنی مراد لئے ہیں یا دوسرے معنی اور آیا آپ نے اسی علت کو اپنے دل میں مدار ٹھہرایا جبکہ حکم مصرح کو بیان فرمایا تھا یا نہیں تو اگر برصواب کہنا دو مجتہدوں کا بلحاظ اس مقام کے ہے تو دونوں میں سے ایک مجتہد صواب پر ہے بدوں تعیین کے دوسرا صواب پر نہیں۔ دوسرا مقام یہ ہے کہ منجملہ احکام شریعت کے ایک یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو بصراحت یا بدلالت یہ ارشاد فرمایا ہے کہ جب ان پر آپ کے احکام مختلف ہوں

یا آپ کی نصوص[33] میں سے کسی نص کے معنی ان پر مختلف ہوں تو ان کو حکم ہے کہ اجتہاد کریں اور ان اختلافی احکام اور معانی میں سے امر حق معلوم کرنے میں خوب طبیعت کا زور لگائیں۔ پس جب کسی مجتہد کے نزدیک ان میں سے کوئی بات معین ہو جائے کہ حق یہ ہے تو اس پر اس کا اتباع واجب ہے جیسے آپ نے امتیوں کو ارشاد فرمایا کہ جب ان پر اندھیری رات میں قبلہ مشتبہ ہو جائے تو ان پر واجب ہے کہ اٹکل کریں اور اس طرف کو منہ کر کے نماز پڑھیں جدھر کو ان کی اٹکل واقع ہو تو یہ ایک حکم ہے کہ شرع نے اس کو اٹکل کے وجود پر وابستہ کیا ہے جیسے نماز کے واجب ہونے کے وقت سے اور لڑکے کے مکلف ہو جانے کو اس کے بالغ ہونے سے متعلق کیا تو اگر گفتگو برصواب ہونے کی اس مقام کے اعتبار سے ہے تو یہ دیکھا جائے کہ اگر مسئلہ ان اقسام میں سے ہوا کہ اجتہاد مجتہد جدید سے پہلے مجتہد برصواب کا اجتہاد ٹوٹتا ہے تو یہ نیا اجتہاد قطعاً باطل ہے اور اگر اس مسئلہ میں کوئی حدیث صحیح ہے اور مجتہد نے اس کے خلاف حکم دیا تو اس کا اجتہاد بگمان غالب باطل ہوگا اور اگر دونوں مجتہد اجتہاد کرنے میں وہی چال چلے جو ان کو چلنا مناسب تھا اور کسی حدیث صحیح کا خلاف دونوں نے نہیں کیا اور نہ ایسے امر کے مخالف ہوئے کہ اس کے خلاف کرنے سے اجتہاد قاضی اور مفتی کا ٹوٹتا ہو تو اس صورت میں دونوں مجتہد برحق ہوں گے۔ اس بات کو یاد رکھو۔ اللہ اعلم

باب 3: تاکید الاخذ بھذ المذاہب الاربعۃ

باب سوم، ان چاروں مذہبوں کے اختیار کرنے کی تاکید اور ان کو چھوڑنے اور ان سے باہر نکلنے کی ممانعت شدید میں جاننا چاہیے کہ ان چاروں مذہبوں کے اختیار کرنے میں ایک بڑی مصلحت ہے اور ان سب کے سب سے روگردانی کرنے میں بڑا فساد ہے اور ہم اس بات کو کئی وجہوں سے بیان کرتے ہیں۔ وجہ اول یہ ہے کہ امت نے اس بات پر اجماع کیا ہے کہ شریعت کے معلوم کرنے میں سلف پر اعتماد کریں مثلاً تابعین نے اس بارے میں صحابہ پر اور تبع تابعین نے تابعین پر اعتماد کیا اور اسی طرح ہر طبقہ میں علماء نے اپنے پہلے علماء پر اعتماد کیا اور اس امر کی خوبی پر عقل بھی دلالت کرتی ہے کیونکہ شریعت دو ہی باتوں سے معلوم ہوتی ہے۔ ایک نقل دوم استنباط اور نقل اسی طرح سے ٹھیک ہوتی ہے کہ ہر طبقہ اپنے پہلے طبقہ سے پیہم لیتا چلا آوے اور استنباط میں ضروری بات یہ ہے کہ مذہب پہلوں کے جانے اس وجہ سے کہ ان کے اقوال سے باہر نہ ہو جائے اور نہ اجماع کے مخالف ٹھہرے گا اور اس وجہ سے کہ پہلوں کے مذاہب پر اپنا قول بنی کرے اور اس وجہ سے کہ استنباط میں اپنے گذشتوں سے اعانت لے کیونکہ سب فنون مثل صرف اور نحو اور طب اور شعر اور آہنگری اور درودگری اور زرگری کے کسی کو جب ہی میسر ہوتے ہیں کہ اس فن کے ماہر کی خدمت گزاری کرے اور دوسری طرح آ جانا کم اور بعید از قیاس ہے کہ کبھی ہوا نہیں۔ اگرچہ عقل کے نزدیک اور طرح بھی ممکن ہے اور جب اقوال سلف پر اعتماد کرنا ثابت ہوا تو اب یہ ضرور ہے کہ ان کے وہ اقوال جن پر اعتماد کیا جائے یا سند صحیح سے روایت کیے گئے ہوں یا مشہور کتابوں میں قلمبند ہوں اور یہ بھی ضرور ہے کہ ان اقوال پر بحث ہوئی ہو۔ اس طرح کہ جن مضامین کا احتمال ان میں ہو ان میں سے احتمال راجح کا بیان کر دیا جاوے اور عام اقوال بعض مواضع میں مخصوص کیے جائیں اور اقوال مطلق کو بعض موقعوں میں مقید کیا جائے اور جن اقوال میں اختلاف ہو ان میں مطابقت کی جائے اور ان کے احکام کی علتیں بیان کی جائیں اور اگر یہ

باتیں ان اقوال میں مشرح نہ ہوں گی تو ان پر اعتماد درست نہ ہوگا اور ان اخیر وقتوں میں کوئی مذہب اس صفت کا سوائے ان چاروں مذہبوں کے نہیں مگر ہاں امامیہ اور زیدیہ کا مذہب ہے اور وہ فرقے بدعت والے ہیں ان کے اقوال پر اعتماد کرنا درست نہیں۔

اور دوسری وجہ پابندی مذہب کی یہ ہے کہ رسول خدا صلعم نے فرمایا کہ پیروی کرو بڑے جتھے کی اور چونکہ سچے مذہب سوائے ان چاروں مذہب کے نیست ہو گئے تو ان کی پیروی کرنی بڑے انبوہ کی پیروی کرنی ہے اور ان سے باہر نکلنا بڑے جتھے سے باہر ہونا ہے۔

اور تیسری وجہ پابندی مذہب کی یہ ہے کہ جب عمدہ زمانہ کو گزرے بہت دن ہو گئے اور عرصہ بعید پڑ گیا اور امانتیں تلف کر دی گئیں تو اب اعتماد نہیں ہو سکتا۔ علمائے بد یعنی ظالم قاضیوں اور ہوا پرست مفتیوں کے اقوال پر جن کی شرارت یہاں تک ہے کہ اپنے قول کو سلف کے ایسے شخص کی طرف بصراحت یا بدلالت منسوب کرتے ہیں جو صدق اور دیانت اور امانت میں مشہور اور اس کا وہ قول زبانوں پر مذکور ہو اور نہ اس شخص کے قول پر اعتماد ہو سکتا ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ آیا شرطیں اجتہاد کی رکھتا ہے یا نہیں۔ پس جب ہم علماء کو دیکھیں کہ سلف کے مذہب میں ثابت قدم ہیں تو غالب ہے کہ وہ مسائل جو یہ علمائے سلف کے اقوال کے بموجب نکالیں یا خود کتاب وسنت سے استنباط کریں۔ ان میں علمائے مذکور راست جانے جائیں گے اور جب علماء میں ہم یہ بات نہ دیکھیں تو ان کے اقوال کو راست جاننا بعید ہے اور یہ وہی مضمون ہے جس کی طرف حضرت عمر فاروقؓ نے اشارہ کیا۔ فرمایا کہ اسلام کو تباہ کرے گا منافق کا جھگڑنا قرآن سے اور حضرت ابن مسعود نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا کہ کہا جو کوئی پیروی کرنے والا ہو تو چاہیے کہ پیروی ان کی کرے جو گزر گئے تو جس بات کی طرف ابن حزم مائل ہوا ہے جو کہتا ہے کہ تقلید حرام ہے اور کسی کو حلال نہیں کہ کسی کا قول بے دلیل سوائے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے مان لے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اتبعوا[34] ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء اور نیز فرمایا واذا[35] قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالو ابل نتبع ما الفینا علیہ آباء نا اور نیز تعریف میں ان لوگوں کی جو تقلید نہیں کرتے فرمایا فبشر[36] عبادے الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ اولئک الذین ھدلٰھم اللہ و اولئک ھم اولو الالباب اور نیز فرمایا فان[37] تنازعتم فے شئے فردوہ الے اللہ والرسول ان کنتم تومنون باللہ والیوم الآخر تو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مباح نہیں فرمایا۔ جھگڑے کے وقت رجوع کرنا کسی طرف سوائے قرآن وحدیث کے اور اسی آیت سے حرام فرمایا۔ جھگڑے کے وقت رجوع کرنا کسی گوینده کے قول کی طرف اس وجہ سے کہ وہ قول قرآن وحدیث کے غیر ہے اور صحیح ہو چکا ہے اجماع تمام صحابہ کا شروع سے آخر تک اور تمام تابعین اور تبع تابعین کا اول سے آخر تک خود باز رہنے اور دوسرے کے منع کرنے پر اس بات سے کہ کوئی قصد کرے کسی انسان معین کے قول کا خواہ وہ انسان انہیں میں سے ہو یا ان سے پہلے لوگوں میں سے اور اس کے سارے قول اختیار کرے تو اب جان لے وہ شخص کہ اختیار کرے سب اقوال امام حنیفہؒ کے یا سب اقوال امام مالکؒ کے یا سب اقوال امام شافعیؒ کے یا سب اقوال امام احمدؒ کے اختیار کرے اور ان میں سے جس کا اتباع کرے یا جس دوسرے شخص کا مقلد ہو۔ اس کے قول کو چھوڑ کر دوسرے کا قول نہ مانے اور جو کچھ قرآن اور حدیث میں آیا ہے اس پر بدون پرتالنے کے انسان معین کے

قول سے اعتماد نہ کرے تو وہ اپنے آپ کو سمجھ لے کہ اس نے ساری امت کا شروع سے آخر تک یقیناً خلاف کیا۔ اس میں کچھ شبہ نہیں اور یہ بھی جان لے کہ وہ اپنے لئے تینوں بہتر زمانوں میں اس باب میں کوئی پیشوا اور امام نہ پاوے گا تو بے شک اس نے سب مسلمانوں کی راہ کے سوا اختیار کی اور نیز ان سب فقہاء نے اپنی تقلید کرنے سے اور دوسروں کی تقلید کرنے سے منع کیا ہے تو جو کوئی ان کی تقلید کرتا ہے، وہ ان کے حکم کے خلاف کرتا ہے اور عدم جواز تقلید کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ وہ کون سی بات ہے جس نے ان ائمہ میں سے یا ان کے سوا اوروں میں سے ایک شخص کو تقلید کیا جانے کے واسطے بہتر کر دیا۔ بہ نسبت حضرات عمر فاروقؓ یا علی مرتضیٰ یا ابن مسعود یا ابن عمر یا ابن عباس یا ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے۔ پس اگر تقلید کسی کی درست ہوتی تو ان حضرات موصوفین میں سے ہر ایک بہ نسبت دوسرے شخصوں کے تقلید کیے جانے کا زیادہ مستحق تھا، تمام ہوا قول ابن حزم کا۔

تو یہ قول ابن حزم کا صرف تین شخصوں کے حق میں پورا صادق آتا ہے۔ اول اس شخص کے حق میں کہ کسی قدر اجتہاد رکھتا ہے۔ اگرچہ ایک ہی مسئلہ میں ہو اور اس پر صاف ظاہر ہو گیا ہو کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں چیز کا حکم فرمایا خواہاں چیز سے منع فرمایا اور یہ آپ کا ارشاد منسوخ نہیں اور منسوخ نہ ہونا اس طرح معلوم کیا کہ احادیث کی تلاش کی اور مسئلہ میں اقوال مخالف اور موافق کے دیکھے کہیں منسوخ ہونا نہ پایا اس طرح کہ انبوہ کثیر بڑے علامہ علماء کو دیکھا کہ وہ اس ارشاد کو اختیار کرتے ہیں اور اس کے مخالف کو دیکھا تو سوائے قیاس یا استنباط وغیرہ کے اور حجت نہیں پکڑتا تو اس صورت میں حدیث پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کرنے کا سبب بجز نفاق باطنی اور حماقت ظاہری کے اور کچھ نہیں اور یہ وہی بات ہے جس کی طرف شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ کہا ہے کہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ تقلید کرنے والے فقیہوں میں سے ایک شخص اپنے امام کی سند کا ضعف ایسی طرح معلوم کرتا ہے کہ اس کو ٹال نہیں سکتا۔ پھر بھی اس مسئلہ میں اسی کی تقلید کرتا ہے اور جن لوگوں کے مذہب پر قرآن اور حدیث اور قیاس صحیح شاہد ہوں ان کو اپنے امام کی تقلید پر جمار ہنے کی وجہ سے ترک کرتا ہے بلکہ ظاہر قرآن اور حدیث کے ٹالنے کا حیلہ کرتا ہے اور اپنے امام کی طرفداری کے لئے معانی ظاہر کی تاویلیں بعید از عقل اور محض نکمی کرتا ہے اور یہ بھی عزالدین نے کہا ہے۔ آدمی ہمیشہ سے یہی کرتے رہے کہ علماء میں جو مل گیا اس سے دریافت کر لیتے تھے۔ بدون قید کسی مذہب کے اور بدون انکار کے سائلوں میں سے کسی پر یہاں تک کہ یہ مذاہب اور ان کے متعصب پیدا ہوئے کہ ان میں سے ایک اپنے امام کی پیروی کرتا ہے باوجودیکہ اس کا مذہب دلائل سے دور ہے مگر جس بات کو اس نے کہا ہے، اس میں اسی کی تقلید کرتا ہے۔ گویا وہ امام پیغمبر مرسل ہے اور یہ تعصب حق اور صواب سے بعید ہے۔ کوئی عاقل اس کو پسند نہ کرے گا۔ اور امام ابوشامہ نے کہا کہ جو عالم فقہ میں مصروف ہو اس کو مناسب ہے کہ ایک امام کے مذہب پر اکتفا نہ کرے اور ہر مسئلہ میں اسی کی صحت کا اعتقاد کرے جو قرآن اور حدیث واضح کی دلالت سے قریب تر ہو اور یہ بات اس پر آسان ہے بشرطیکہ پیشتر کے علوم میں سے بڑا حصہ خوب جانتا ہو اور یہ بھی چاہیے کہ تعصب سے اور خلاف کے طریقوں میں غور کرنے سے کنارہ کرے کیونکہ یہ باتیں وقت کو ضائع اور اس کی صفائی کو مکدر کرتی ہیں اور امام شافعیؒ سے پایہ صحت کو پہنچا ہے کہ انہوں نے اپنی تقلید کرنے اور اپنے سوا دوسرے کی تقلید کرنے سے منع کیا ہے۔ چنانچہ ان کے شاگرد مزنی نے اپنی کتاب مختصر کے شروع میں کہا ہے کہ اس کتاب کو میں نے امام شافعیؒ کے معلومات اور ان کے

قول کے اس مضمون سے (کہ قریب کردوں علم کو اس شخص پر کہ اس کو چاہے) باجود میرے بتادینے کے شخص مذکور کو منع کرنا امام کا اپنی تقلید اور کسی دوسرے کی تقلید سے تاکہ وہ شخص اس مختصر میں اپنے دین کی درستی کے لئے غور کرے اور اپنے نفس کی خاطر احتیاط کی راہ چلے یعنی جو شخص امام شافعیؒ کے معلومات کی خواہش رکھتا ہے، میں اس کو یہ بھی جتادوں گا کہ شافعیؒ نے اپنی اور کسی دوسرے کی تقلید کرنے سے منع کیا ہے۔ تمام ہوا قول ابوشامہ کا۔

دوسرے اس شخص کے حق میں ابن حزم کا قول صادق آتا ہے کہ وہ شخص عامی ہو اور کسی فقیہ معین کی تقلید کرے۔ اس اعتقاد سے کہ اس جیسے فقیہ سے خطا ہونی محال ہے اور جو کچھ اس نے کہہ دیا ہے وہی ٹھیک ہے اور دل میں یہ ٹھان لی کہ اس کی تقلید نہ چھوڑوں گا۔ اگرچہ دلیل اس کے خلاف ظاہر ہو اور اس کی مثال یہ حدیث ہے جو ترمذی نے عدی بن حاتم سے روایت کی کہ انہوں نے کہا کہ میں نے سنا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آیت پڑھتے تھے۔ **اتخذوا احبارھم و رھبانھم اربابا من دون اللہ**۔ فرمایا کہ وہ لوگ علماء کی پرستش نہ کرتے تھے بلکہ جب علماء ان کے لئے کوئی چیز حلال کر دیتے تو وہ اس کو حلال جانتے اور جب کسی چیز کو ان پر حرام کر دیتے تو اس کو حرام سمجھتے۔

تیسرے اس شخص کے حق میں صادق آتا ہے جو جائز نہیں رکھتا کہ مثلاً حنفی شخص شافعی فقیہ سے فتویٰ پوچھے اور شافعی حنفی سے اور نہ یہ جائز رکھے کہ حنفی کسی شافعی امام کے پیچھے نماز پڑھے کیونکہ اس شخص نے البتہ پہلے قرنوں کے اجماع کا خلاف کیا اور صحابہ اور تابعین کے عمل کا الٹا کیا۔ اور ابن حزم کے قول کا محل ایسے شخص کے حق میں نہیں جو دین وہی اختیار کرے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہوا اور حلال اسی چیز کو اعتقاد کرے جس کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے حلال فرمایا اور حرام وہی چیز جانے جس کو خدا اور رسولؐ نے حرام کیا لیکن چونکہ اس کو علم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کا نہیں اور نہ آپ کی مختلف تقریروں کے مطابق کرنا جانتا ہے اور نہ آپ کے کلام مبارک سے مسائل کے نکالنے کا ڈھنگ اس کو آتا ہے اس لئے کسی نیک عالم کی تقلید کرنی اس گمان پر کہ جو بات یہ کہتا ہے اور ظاہر میں فتویٰ دیتا ہے سب میں صواب پر ہے اور سنت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا تابع ہے اور اگر اس کے گمان کے خلاف ظاہر ہو تو بدون جھگڑے اور ہٹ کے فوراً باز رہے تو اس کا کوئی کیسے انکار کرے گا کہ حکم پوچھنا اور حکم بتانا تو مسلمانوں میں زمانہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے برابر ہو رہا ہے اور اس میں کچھ فرق نہیں کہ ہمیشہ ایک ہی عالم سے فتویٰ دریافت کرے یا کبھی اس سے دریافت کرے کبھی دوسرے سے بشرطیکہ عزم مصمم وہی رکھتا ہو جو ہم نے ذکر کیا یعنی خلاف کے ظاہر ہونے پر باز رہے گا اور کیسے باز نہ رہے گا۔ حالانکہ ہم کسی عالم پر کوئی سا ہو یہ ایمان نہیں لائے کہ اللہ تعالیٰ نے فقہ کی وحی اس کو کی اور ہم پر اس کی فرمانبرداری فرض فرمائی اور وہ فقیہ خطا سے محفوظ ہے۔ پھر اگر ہم ان فقہاء میں سے کسی کا اقتدا کرتے ہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ قرآن اور حدیث کا عالم ہے۔ اس صورت میں اس کا قول تین حال سے خالی نہیں یا صریح قرآن وحدیث سے ہوگا یا کسی قسم کے استنباط کے ذریعہ سے قرآن وحدیث سے نکالا ہوگا یا اس نے قرینوں سے معلوم کیا ہوگا کہ حکم فلاں صورت میں فلاں علت پر لگا ہے اور اس معلوم کرنے پر اس کے دل کو اطمینان ہو گیا تو اس نے غیر مصرح صورت کو اس صورت پر قیاس کیا جس میں حکم کی تصریح تھی تو گویا وہ یہ کہتا ہے کہ میں گمان کرتا ہوں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جہاں کہیں یہ علت پائی جائے گی وہاں ایسا حکم ہوگا۔ پس جس صورت کو اس نے قیاس کیا ہے وہ اس عموم میں داخل ہے تو یہ اس کا قول بھی منسوب پیغمبر صلی

اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے لیکن اس کے طریق میں بہت سے گمان ہیں اور اگر گمان وشک کی صورت واقع نہ ہوتی تو کوئی مسلمان کسی مجتہد کی تقلید نہ کرتا۔ اب اگر اس صورت میں ہم کو اچھی سند سے حدیث رسول معصوم کی پہنچے جن کی فرمانبرداری اللہ تعالیٰ نے ہم پر فرض فرمائی اور یہ حدیث اس فقیہ کے مذہب کے خلاف پر دلالت کرے اور ہم آپ کی حدیث کو ترک کرکے اس قول ظنی اور تخمین کے تابع رہیں تو ہم سے زیادہ ستم گار کون ہوگا اور ہمارا عذر اس روز کیا ہوگا جس روز آدمی جہانوں کے پروردگار کے سامنے کھڑے ہوں گے۔

باب 4:

لوگوں کے اختلاف میں ان چاروں مذہبوں کے اختیار کرنے میں اور اس میں سے جس قدر ان پر واجب ہے اس کے بیان میں۔

جاننا چاہیے کہ آدمی ان مذاہب کے اختیار کرنے میں چار مرتبے رکھتے ہیں اور ہر مرتبے والوں کی ایک حد ہے کہ اس سے بڑھنا ان کو درست نہیں۔ اول مرتبہ مجتہد مطلق کا جو ان مذاہب میں کسی مذہب کے امام کی طرف نسبت رکھتا ہو۔ دوم مرتبہ مسائل نکالنے والے کا یعنی مجتہد فی المذہب کا۔

سوم مرتبہ نہایت ماہر فی المذہب کا جو مذہب کو یاد کر لیتا ہے اور استوار کرتا ہے اور اپنی یاد اور حذاقت کے بموجب اپنے ائمہ کے مذہب سے مسائل کا حکم بتاتا ہے۔ چوتھا مرتبہ نرے مقلد کا ہے کہ یہ مذہبوں کے علماء سے فتوے دریافت کرکے ان کے فتوے کے بموجب کاربند ہوتا ہے اور لوگوں کی کتابیں ہر ایک مرتبے کے شرطوں اور حکموں سے پُر ہیں مگر بعض آدمی ان مراتب میں امتیاز نہیں کرتے۔ اس لئے ان احکام میں بدحواس ہو کر ان کو ایک دوسرے کے خلاف گمان کرتے ہیں، لہٰذا ہم نے چاہا کہ ہر ایک مرتبہ کے لئے ایک فصل مقرر کریں اور ہر مرتبہ کے احکام کی طرف جدا جدا اشارہ کریں۔

فصل اول بیان میں ایک مجتہد مطلق منتسب کے اور ہم پیشتر اس کی شرط بیان کر چکے۔ [38] اب مکرر نہیں کہتے اور حاصل سب بیان سابق کا یہ ہے کہ مجتہد مطلق منتسب وہ ہے کہ علم حدیث رکھتا ہو اور علم فقہ جو اس کے ائمہ سے مروی ہے اور علم اصول فقہ رکھتا ہو جسے حال بڑے بڑے علماء شافعیہ کا ہے اور یہ لوگ اگرچہ بذاتِ خود اکثر ہیں مگر باعتبار دوسرے مراتب کے کمتر ہیں اور ان کی تدبیر کا خلاصہ بموجب اس تلاش کے جو ہم نے ان کے کلام سے کی یہ ہے کہ ان مسائل کو جو مالک اور شافعی اور ابوحنیفہ اور ثوری اور دوسرے مجتہدوں سے منقول ہیں جن کے مذہب اور فتوے مقبول ہیں۔ موطا امام مالک اور بخاری اور مسلم پر پیش کیا جائے۔ پھر ترمذی اور ابوداؤد اور نسائی کی احادیث پر پیش کریں تو جس مسئلہ کے حدیث موافق پڑے باعتبار نص [39] یا اشارہ کے اس کو اختیار کریں اور اس پر اعتماد کریں اور جس مسئلہ کے حدیث مخالف پڑے صریح طور پر اس کو نہ مانیں اور اس پر عمل کرنا چھوڑ دیں اور جس مسئلہ میں احادیث اور آثار مختلف ہوں تو بعض کو بعض کے ساتھ مطابق کرنے میں اجتہاد کریں۔ اس طرح کہ مفسر کو مبہم پر حکم ٹھہرا دیں اور ہر حدیث کو ایک صورت پر محمول کریں یا کسی اور طرح سے۔ پس اگر وہ مسئلہ سنن اور آداب کی قسم سے ہو تو سب طرح سنت ہیں اور اگر حرام اور حلال کی جنس سے یا قضا

کی قسم سے ہو اور صحابہ اور تابعین اور مجتہدین اس میں مختلف ہیں تو اس کو دو قول پر یا کئی قولوں پر کر دیا۔
اور جس کسی نے ان اقوال میں ایک اختیار کر لیا۔ اس پر انکار نہ کیا اور اس معاملہ میں وسعت مدنظر رکھی بشرطیکہ حدیث اور آثار ہر طرف کی شاہد ہوں۔ پھر خوب محنت اس بارے میں کی کہ اولی اور راجح تر ان میں سے معلوم کیا خواہ روایت کے قوی ہونے سے یا اکثر صحابہ کے اس پر کاربند ہونے سے یا اس وجہ سے جمہور مجتہدوں کا مذہب وہی ہے یا یہ کہ قیاس کے موافق اور اپنی نظیروں کے مانند ہے۔ پھر اس قول قوی تر پر عمل کیا۔ بدون اعتراض کے کسی پر ان میں سے جنہوں نے دوسرے قول کو اختیار کیا۔ پھر اگر مسئلہ میں حدیث ان دو طبقوں صحابہ اور تابعین سے نہ پائی تو تیسرے طبقہ کے آثار مندرجہ کتب حدیث سے ان کے اقوال کے شاہد بغور دیکھے اور جو دلیل اور علت ان کے کلام سے سمجھی جاتی ہے۔ اس کو بہ تامل دیکھا۔ پس اگر دل کو کسی بات پر اطمینان ہو تو اس کو اختیار کر لیا اور اگر ان کے بیان سے کسی بات پر دل نہ جما اور دوسری بات پر اطمینان ہوا اور مسئلہ اس قسم کا تھا جس میں اجتہاد مجتہد کا چل سکے اور اس امر میں پہلے کوئی اجماع بھی نہیں ہو چکا اور ان کے نزدیک کوئی صریح دلیل اس دوسری بات پر قائم ہوئے تو اس بات کو اللہ تعالیٰ سے مدد چاہ کر اس پر بھروسا کر کے کہہ گزرتے ہیں اور یہ صورت واقع کم ہوتی ہے اور اس کی چڑھائی دشوار ہے۔ اس کی پھسلنے کی جگہوں سے غایت درجہ کا کنارہ کرتے ہیں اور اگر ان کے عندیہ میں کوئی دلیل صریح قائم نہ ہو تو بڑے جتھے کے قول کا اتباع کر لیا اور جس مسئلہ میں کہ تصریح اور تعلیل صحیح سلف سے منقول نہ ہوئی تو کامل کوشش کی قرآن اور حدیث یا صحابہ اور تابعین کے اثر سے نص یا اشارہ یا ایمان کی جستجو میں اگر مل گئی تو اس کو اختیار کر لیا اور ان کے عندیہ میں یہ بات نہ تھی کہ ایک ہی عالم کی تقلید اس کے سب اقوال میں کریں خواہ اس کے قول پر ان کے دل مطمئن ہوں نہ ہوں اور اگر تم کو ہمارے بیان میں شک ہو تو تم کو چاہیے کہ دیکھو بیہقی کی کتابیں اور معالم السنن اور شرح السنہ مولفہ بغوی کو۔ غرضیکہ محققین فقہا اہلحدیث کا یہ طریقہ تھا اور ایسے لوگ کم ہیں اور یہ لوگ علیحدہ ہیں اہلحدیث کے فرقہ ظاہریہ سے جو نہ قیاس کے قائل نہ اجماع کے اور نیز الگ ہیں متقدمین اصحاب حدیث سے جنہوں نے مجتہدوں کے اقوال پر سے التفات ہی نہیں کیا بلکہ یہ لوگ اہلحدیث کے زیادہ مشابہ ہیں کیونکہ انہوں نے مجتہدوں کے اقوال میں وہی کارستانی کی جو محدثین نے صحابہ اور تابعین کے مسائل میں کی۔
دوسری فصل مجتہد فی المذہب کے بیان میں اور اس میں تین مسئلہ ہیں۔
مسئلہ اول جاننا چاہیے کہ مجتہد فی المذہب پر واجب ہے کہ سنن اور آثار اس قدر بہم پہنچا دے کہ ان کی وجہ سے حدیث صحیح اور اجماع سلف کی مخالفت سے بچا رہے اور فقہ کے دلائل اتنے حاصل کرے کہ ان کے ذریعہ سے اپنے ائمہ کے اقوال میں ان کا ماخذ جان سکے اور یہی مطلب فتاویٰ سراجیہ کی اس عبارت کا ہے کہ کسی کو نہیں چاہیے کہ فتویٰ دے مگر اس صورت میں کہ علماء کے اقوال سے واقف ہو اور یہ بھی جانتا ہو کہ انہوں نے کہاں سے کہا ہے اور نیز لوگوں کے معاملوں سے واقف ہو تو اگر علماء کے اقوال جانتا ہو اور ان کے مذہبوں سے ناواقف پس ایسی صورت میں اگر اس سے ایسا مسئلہ پوچھا جاوے کہ اس کو معلوم ہے کہ جن علماء کا مذہب مانا جاتا ہے ان سب نے اس کے جواز یا عدم جواز پر اتفاق کیا ہے تو کچھ مضائقہ نہیں کہ کہہ دے کہ یہ جائز ہے اور یہ ناجائز اور اس کا یہ کہنا بطور حکایت اور نقل کے ہوگا اور اگر ایسا مسئلہ ہو کہ علماء نے اس میں اختلاف کیا ہو تو کچھ خوف نہیں کہ کہہ دے کہ فلاں عالم کے قول میں جائز ہے اور فلاں کے قول میں ناجائز۔ ہاں

اس کو درست نہیں کہ خود چھانٹ کر بعض علماء کے قول کے بموجب جواب دے جب تک کہ ان کی حجت سے واقف نہ ہو اور ''فصول عمادیہ'' کی اول فصل میں ہے کہ اگر عالم اہل اجتہاد میں سے نہ ہو تو اس کو حلال نہیں کہ فتویٰ دے مگر بطور نقل کے یعنی جو اقوال فقہا کے اس کو یاد ہوں ان کو بیان کر دے اور امام ابو یوسف اور زفر اور عافیہ بن زید سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا کہ کسی کو حلال نہیں کہ ہمارے قول کے بموجب فتویٰ دے۔ جب تک یہ نہ جانے کہ ہم نے کہاں سے کہا ہے اور نیز فصول عمادیہ میں بعض ائمہ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا کہ اگر بالفرض کوئی عالم ہمارے اساتذہ کی سب کتابیں یاد کر لے تب بھی اس کو فتویٰ کے لئے شاگرد ہونا ضرور ہے۔ یہاں تک کہ اس کو فتویٰ دینے کی راہ مل جاوے کیونکہ بہت مسئلے ایسے ہیں کہ ان کا جواب ہمارے پیشواؤں نے اپنے شہر والوں کی عادت اور ان کے معاملات کے مطابق دیا ہے تو ہر فتویٰ دہندہ کو چاہیے کہ ان معاملوں میں جو شریعت کے خلاف نہ ہوں اپنے شہر اور زمانہ کی عادت کو مدنظر رکھے اور ''عمدۃ الاحکام'' میں ''محیط'' سے یہ مضمون منقول ہے کہ اجتہاد والے وہ لوگ ہیں کہ عالم ہوں قرآن اور حدیث اور آثار اور فقہ کی صورتوں اور توجیہوں کے اور ''خانیہ'' میں بعض علماء سے منقول ہے کہ اجتہاد کے لئے ضرور ہے ''کتاب کا مبسوط'' کا یاد کرنا اور ناسخ اور منسوخ اور محکم اور ماول کا پہچاننا اور لوگوں کی عادت اور ان کے عرف کو جاننا اور ''سراجیہ'' میں ہے کہ بعض علماء کا قول ہے کہ اجتہاد کی شرطوں میں سے کم سے کم ''مبسوط'' کا یاد کرنا ہے۔ یہ ساری روایتیں ''خزانۃ المفتین'' میں مذکور ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ان عبارتوں کا مضمون اور مقصود یہ ہے کہ فرق ہے اس مفتی میں کہ مسائل خود برآمد کرے اور اس مفتی میں کہ اپنے ائمہ کے مذہب میں علامہ ہو کہ فتویٰ بطور نقل عبارت کے دیتا ہو نہ اجتہاد کے طور پر۔

دوسرا مسئلہ۔ یہ جاننا چاہیے کہ محققین فقہاء کے نزدیک قاعدہ یہ ہے کہ مسائل فقہی چار قسم کے ہیں۔ اول قسم وہ ہیں جو ظاہر (41) مذہب میں ثابت ہو چکے ہیں۔ ان کا حکم یہ ہے کہ فقہاء ان کو ہر حال میں قبول کرتے ہیں خواہ وہ اصول فقہ کے موافق ہوں یا مخالف اور اسی وجہ سے تم مؤلف ''ہدایہ'' اور دوسرے علماء کو دیکھتے ہو کہ تجنیس کے مسائل میں فرق بیان کرنے کے لئے تکلف کرتے ہیں۔ دوسری قسم وہ مسائل ہیں جن میں روایت شاذ ابوحنیفہ اور صاحبین سے ہے۔ ان کا حکم یہ ہے کہ ان کو پذیرا نہیں کرتے مگر اس صورت میں کہ اصول کے موافق ہوں اور ہدایہ اور اس جیسی اور کتابوں میں تصحیح بعض روایات شاذ کی بہت ہے دلیل کی وجہ سے۔ تیسری قسم وہ مسائل ہیں جن کو متاخرین نے نکالا ہے اور ان پر جمہور علماء کا اتفاق ہے اور ان کا حکم یہ ہے کہ فقہاء ان کے بموجب ہر حال میں فتویٰ دیتے ہیں۔ چوتھی قسم وہ مسائل ہیں کہ متاخرین ہی نے نکالے ہیں مگر ان پر جمہور علماء متفق نہیں ہوئے اور ان کا حکم یہ ہے کہ مفتی ان کو اصول پر اور کلام سلف کی نظیروں پر پیش کرے پس اگر ان کو موافق اصول اور نظیروں کے پاوے تو ان کو اختیار کرے اور اگر موافق نہ پاوے تو ان کو ترک کرے۔

اور ''خزانۃ الروایات'' کے باب ''الاخذ عن الثقات'' میں بستان فقیہ ابواللیث سے منقول ہے کہ اگر کسی نے کوئی حدیث سنی یا کوئی مقولہ سنا تو اگر کہنے والا معتبر نہ ہو تو سامع کو روا نہیں کہ گوینده سے اس کو پذیرا کرے۔ مگر اس صورت میں کہ اس کا قول اصول کے موافق ہو تو اس وقت اس کے بموجب عمل کرنا درست ہے ورنہ ناجائز اور اسی طرح اگر کوئی حدیث لکھی ہوئی یا کوئی مسئلہ لکھا ہوا پاوے تو اگر اصول کے موافق ہو تو اس پر عمل کرنا جائز ہے ورنہ درست نہیں اور ''بحرالرائق'' میں ابواللیث سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا کہ ابونصر سے کسی نے حال اس مسئلہ کا پوچھا جو ابونصر کے پاس

آیا تھا۔اس طرح کہ تم کیا فرماتے ہو اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرے۔اس صورت میں کہ ہمارے پاس چار کتابیں موجود ہیں۔ ایک ابراہیم بن رستم کی کتاب دوم خصاف کی ''آداب القاضی'' سوم ''کتاب مجرد'' چہارم کتاب ''نوادر یہ''۔چاروں خلیفہ ہشام کی طرف سے تمہارے پاس ہیں۔آیا ہم کو درست ہے کہ ان میں سے دیکھ کر ہم فتویٰ دیں یا درست نہیں اور یہ کتابیں تمہارے نزدیک اچھی ہیں۔ابونصر نے کہا کہ جو اقوال ہمارے آئمہ سے پایہ صحت کو پہنچ گئے ہیں۔وہ علم محبوب اور دل پسند لائق رضامندی کے ہے اور فتویٰ دینے کا حال یہ ہے کہ میں کسی کو جائز نہیں جانتا کہ ایسی چیز کا فتویٰ دے جس کو سمجھتا نہ ہو اور لوگوں کا وبال اپنی گردن پر لے اور اگر مسائل مشہور اور ظاہر اوصاف منقول ہوں ہمارے ائمہ سے تو توقع کرتا ہوں کہ مجھ کو وقائع میں ان پر اعتماد کرنا روا ہو۔

تیسرا مسئلہ جاننا چاہیے کہ جب مسئلہ میں درمیان امام ابوحنیفہ اور صاحبین کے اختلاف ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ مجتہد فی المذہب ان کے اقوال میں سے ایسا قول اختیار کرے جس کی دلیل قوی تر اور علت قیاس سے زیادہ موافق اور لوگوں کے حق میں نرم تر ہو اور اسی وجہ سے علما حنفیہ کی بہت جماعتوں نے آب مستعمل کے پاک ہونے کے باب میں امام محمدؒ کے قول پر فتویٰ دیا ہے اور اول وقت عصر اور عشا کے بارہ میں اور بٹائی پر کھیتی کے جائز ہونے میں صاحبین کے قول پر فتویٰ دیا ہے اور ان حنفی فقہاء کی کتابیں اس سے بھری ہیں۔نقلوں کے لکھنے کی حاجت نہیں اور ایسا ہی حال مذہب شافعی میں ہے۔چنانچہ منہاج وغیرہ کے فرائض یعنی بیان میراث میں لکھا ہے کہ اصل مذہب شافعی یہ ہے کہ ذوی الارحام کو وارث نہ کیا جائے یعنی اگر اہل فروض اور عصبات نہ ہوں تو ترکہ بیت المال میں دیا جاوے لیکن متاخرین نے فتویٰ دیا ہے کہ جب بیت المال کا انتظام نہ ہو تو ذوی الارحام کو وارث کریں اور ابن زیاد فقیہ یمن نے اپنے فتاویٰ میں چند مسئلے ایسے نقل کیے ہیں جن میں متاخرین نے مذہب شافعی کے خلاف فتویٰ دیا ہے۔ایک ان میں سے پیسوں کا ادا کرنا ہے۔اس زکوٰۃ میں جو سیم و زر اور اسباب تجارت میں فرض ہوئی ہو بلقینی نے اس کے جائز ہونے کا فتویٰ دیا اور کہا کہ میں اس کو درست اعتقاد کرتا ہوں لیکن یہ مسئلہ مخالف ہے مذہب شافعیؒ کے اور اسباب میں بلقینی نے بخاری کا ساتھ دیا ہے اور ایک مسئلہ مال زکوٰۃ کا سادات علوی یعنی اولاد علی مرتضےٰ کو جو باطن فاطمہ زہرا سے نہ ہوں، دینا ہے کہ امام فخر الدین رازی نے ان وقتوں میں اس کے جائز ہونے کا فتویٰ دیا۔جب سادات کو بیت المال میں کا سہام روک دیا گیا اور ان کو فقر نے تکلیف دی اور ایک مسئلہ شہد کی مکھیوں کو مہال میں معہ موم وغیرہ کے فروخت کرنا ہے کہ بلقینی نے اس کے جواز کا حکم دیا اور ابن زیاد نے امام ابن عجیل سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ تین مسئلہ زکوٰۃ میں ایسے ہیں جن میں مذہب کے خلاف فتویٰ دیا جاتا ہے۔اول زکوٰۃ کو دوسرے شہر میں لے جانا، دوم زکوٰۃ کو ایک شخص کو دینی، سوم زکوٰۃ صرف ایک صنف مصرف[42] کو حوالہ کرنی۔میں کہتا ہوں کہ میرے نزدیک ایک اور تجویز اس باب میں ہے اور وہ یہ ہے کہ فتویٰ دہندہ مذہب شافعی میں خواہ مجتہد فی المذہب ہو یا علامہ مذہب جب کسی مسئلہ میں حاجت مند دوسرے مذہب کا ہو تو اس کو امام احمد کا مذہب اختیار کرنا چاہیے کہ وہ علم اور دیانت میں امام شافعی کے بڑے ذی شان شاگردوں میں سے ہیں اور ان کا مذہب تحقیق کرنے سے امام شافعی کے مذہب کی ایک شاخ ہے اور انہیں کے مذہب کی صورتوں میں سے ایک صورت ہے۔واللہ اعلم۔

تیسری فصل۔مذہب میں علامہ کے بیان میں جو اپنے مذہب کی کتابوں کا حافظ ہو اور اس فصل میں پانچ مسئلے ہیں۔

مسئلہ اول۔ ایسے عالم کی ایک شرط یہ ہے کہ سمجھ کا ٹھیک ہو اور زبان عربی اور کلام کے طریقوں اور ترجیح کے مراتب سے واقف اور عرب کی تقریر کے معانی کو جلد سمجھتا ہو۔ اس پر اکثر مخفی نہ رہتا ہو وہ لفظ جو ظاہر میں مطلق ہو اور مقید مراد لیا جاوے اور جو ظاہر میں مقید ہو اور اس سے مطلق مقصود ہو۔ ابن نجیم نے ''بحر الرائق'' میں اس شرط پر تنبیہ کی ہے اور ایسے عالم پر واجب ہے کہ فتویٰ صرف دو صورتوں سے دیوے یا تو اس کے پاس سند صحیح قابل اعتماد اس کے امام تک اس مسئلہ میں موجود ہو یا مسئلہ مذکور کسی کتاب مشہور مروج میں مسطور ہو۔ ''نہر الفائق'' کے کتاب القضا میں ہے کہ مفتی مقلد جو مجتہد کا قول نقل کرے اس کا طریقہ دو صورتوں میں سے ایک طرح پر ہوتا ہے یا اس کے پاس اس کے قول کی سند مجتہد تک ہو یا اس قول کو کسی کتاب معروف اور مروج سے لے جیسے کتابیں امام محمد کی اور ان جیسی اور مشہور تصنیفیں مجتہدوں کی ہیں کیونکہ ان کتابوں میں ہونا بمنزلہ خبر متواتر یا مشہور کے ہے اور ایسا ہی امام رازی نے بیان کیا ہے تو اس تقریر پر اگر کوئی نسخہ ''نوادر''(43) کا کا ہمارے زمانہ میں ملے تو اس میں کے قول کو امام محمد اور امام ابو یوسف کی طرف منسوب کرنا درست نہ ہوگا کیونکہ ''نوادر نہ'' ہمارے زمانہ میں مشہور ہوئی نہ لوگوں میں مروج۔ ہاں اگر ''نوادر'' کا کوئی قول مثلاً کسی کتاب مشہور اور مروج میں مثل ''ہدایہ'' اور ''مبسوط'' کے منقول ملے تو اس کتاب پر اعتماد ہوگا۔ تمام ہوا قول ''نہر الفائق'' کا اور ''فتاویٰ قنیہ'' کے باب ''ما یتعلق بالمفتی'' میں ہے کہ جو کلام کسی شخص کا یا اس کا مذہب کسی کتاب مشہور میں ہے جو لوگوں میں رائج ہو رہی ہے۔ تو اس شخص کو جو کتاب مذکور میں نظر ڈالے، یہ کہنا درست ہے کہ فلاں نے یا فلاں نے ایسا کہا ہے۔ اگرچہ اس قول کو کسی سے نہ سنا ہو جیسے کتابیں امام محمد کی اور موطا امام مالک کی اور ان جیسی اور کتابیں ہیں کہ اقسام علوم میں تصنیف ہوئی ہیں کیونکہ اس کلام کا اس صفت پر پایا جانا بمنزلہ خبر متواتر اور مشہور کے ہے۔ ایسا کلام سند کا حاجت مند نہیں ہے۔

دوسرا مسئلہ۔ جب ماہر در مذہب کوئی حدیث صحیح پاوے کہ اس کے مذہب کے مخالف ہے تو آیا اس کو جائز ہے کہ حدیث پر عمل کرے اور اس مسئلہ خاص میں اپنا مذہب چھوڑ دے۔ اس سوال میں بڑی تقریر ہے اور ''خزانۃ الروایات'' کے مؤلف نے ''دستور المساکین'' سے نقل کر کے اس کو طول دیا ہے۔ ہم اس میں سے اس کا کچھ کلام بجنسہٖ بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اگر سوال کیا جائے کہ اگر مقلد مجتہد تو نہ ہو مگر عالم استدلال کرنے والا ہو کہ اصول کے قواعد اور نصوص اور اخبار کے معانی جانتا ہو تو آیا ایسے مقلد کو درست ہے کہ حدیث پر عمل کرے اور مقلد کو جائز کیسے ہوگا کہ علماء کہہ چکے ہیں کہ غیر مجتہد کو درست نہیں کہ بجز روایات اپنے مذہب اور فتوؤں اپنے امام کے کسی اور پر عمل کرے اور نہ یہ درست ہے کہ نصوص اور اخبار کے معانی میں اور ان کے بموجب عمل کرنے میں مشغول ہو جیسے عامی کو یہ باتیں درست نہیں۔ اس سوال کا جواب بعض نے یہ دیا ہے کہ اپنے مذہب اور امام کی روایات پر پابند رہنے کا حکم اس عامی کے بارے میں ہے کہ محض جاہل اور نصوص اور اخبار کے معانی اور ان کے تاویلوں سے ناواقف ہو۔ باقی رہا وہ عالم کہ نصوص اور اخبار سے واقف اور صاحب دانش ہو اور اس کے نزدیک صحت حدیث کی محدثوں سے ان کی کتابوں معتمد اور مشہور اور مروج سے ثابت ہوئی ہو تو اس کو جائز ہے کہ اس حدیث پر عمل کرے۔ اگرچہ ان کے مذہب کے مخالف ہو۔ اس کا مؤید قول امام ابو حنیفہ اور محمد اور امام شافعی اور ان کے ہمراہیوں کا اور قول صاحب ''ہدایہ'' کا روضۃ العلماء زندویسیہ فضل صحابہ میں ہے کہ امام ابو حنیفہ سے پوچھا گیا کہ جب تم کوئی قول کہو اور قرآن اس کے مخالف ہو۔ امام نے کہا کہ میرا قول چھوڑ دو۔ قرآن کے مقابل پوچھا گیا کہ جب

خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالف تمہارے قول کے ہو، کہا کہ حدیث کے مقابل بھی میرا قول ترک کرو۔ پھر پوچھا گیا کہ اگر قول صحابہ کا اس کے مخالف ہو کہا کہ میرے قول کو صحابہ کے قول کے مقابل بھی چھوڑ دو اور ''امتناع'' میں ہے کہ بیہقی نے سنن میں قرأت کے ذکر کے قریب اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ راوی نے بیان کیا کہ امام شافعیؒ نے کہا ہے کہ جب میں کوئی قول کہوں اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے قول کے خلاف فرمایا ہو تو جو حدیث پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے پایہ صحت کو پہنچے، وہ بہتر ہے۔ اس صورت میں تم میری تقلید نہ کرنا اور امام الحرمین نے اپنے ''نہایہ'' میں امام شافعی سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جب تم کو کوئی حدیث ایسی پہنچے کہ میرے مذہب کے مخالف ہو تو اس حدیث کا اتباع کرنا اور اس حدیث کو میرا مذہب جاننا اور یہ بھی مصرح ثابت ہوا ہے کہ انہوں نے کہا کہ جب تم کو میرا مذہب کسی مسئلہ میں پہنچے اور تمہارے عندیہ میں کوئی حدیث صحیح اس کے مخالف ثابت ہو تو جان لیجیو کہ میرا مذہب حدیث مذکور ہی کا مضمون ہے اور خطیب نے اپنی اسناد سے روایت کیا ہے کہ دارکی شافعی المذہب سے لوگ فتویٰ پوچھا کرتے تھے اور وہ بعض اوقات ایسا فتویٰ دیتے کہ نہ شافعی کے مذہب کا ہو نہ ابوحنیفہ کے مذہب کا تو لوگ ان سے کہتے کہ یہ حکم مخالف ہے دونوں اماموں کے قول کے وہ جواب دیتے کہ تمہارا براہو فلاں راوی نے فلاں صحابی سے اور اس نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا ہی روایت کیا ہے اور حدیث کا حکم ماننا بہتر ہے دونوں اماموں کے قول کو اختیار کرنے سے جس صورت میں کہ دونوں نے خلاف حدیث کہا ہو اور اسی طرح عالم کو عمل بالحدیث مخالف اپنے مذہب کے کرنے کا مؤیدہ ذکر ہے جو ''ہدایہ'' میں پچھنے لگوانے والے کے روزہ کے مسئلہ میں لکھا ہے کہ اگر کسی نے پچھنے لگوائے اور گمان کیا کہ اس فعل سے اس کا روزہ جاتا رہا پھر جان بوجھ کر کھانا کھالیا تو اس پر روزہ کی قضا اور کفارہ دونوں لازم آئیں گے کیونکہ گمان وہی معتبر ہے جس کی کوئی سند کوئی شرعی دلیل ہو مگر جس صورت میں کہ روزہ دار کو کسی فقیر نے روزہ کے ٹوٹ جانے کا فتویٰ دیا ہو تو کفارہ نہ ہوگا۔ اس لئے فتویٰ دلیل شرعی موجود ہے اس کے حق میں اور اگر اس کو اس باب میں حدیث[44] ملی اور اس نے حدیث پر اعتماد کر کے روزہ کا جانا معلوم کیا تب بھی امام محمد کے نزدیک اس پر کفارہ نہ ہوگا کیونکہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا قول مفتی کے قول سے کم رتبہ نہیں۔ ''کافی'' اور ''حمیدی'' میں ہے کہ اس کے یہ معنی کہ آپ کا ارشاد مفتی کے فتوے سے درجہ میں کمتر نہ ہوگا اور چونکہ مفتی کا قول دلیل شرعی ہونے کی لیاقت رکھتا ہے تو ارشاد رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا بطریق اولیٰ دلیل شرعی ہوگا اور امام ابو یوسف سے اس کا خلاف منقول ہے کیونکہ عامی پر فقہا کا اقتدا کرنا واجب ہے۔ بوجہ راہ نہ ملنے شناخت حدیث کے اس کے حق میں اور اگر معنی[45] معتبر اس حدیث کے جانتا ہوگا تو اس پر کفارہ واجب ہوگا اور ''مناوی'' میں ہے کہ یہ مسئلہ بالاتفاق ہے اور امام ابو یوسف کے اس قول کی طرف سے جواب کہ عامی کو اقتدا فقہاء کا چاہیے یہ ہے کہ یہ قول محمول اس عامی محض اور جاہل پر ہے جو معنی احادیث کے اور ان کی تاویلیں نہ جانتا ہو کیونکہ خود انہوں نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اپنے اس قول میں کہ بوجہ راہ نہ ملنے شناخت حدیث کے اس کے حق میں اور اسی طرح ان کا یہ قول کہ اگر حدیث کے معنی معتبر جانے گا تو کفارہ واجب ہوگا، اشارہ کرتا ہے اس بات کا کہ مراد عامی سے وہی ہے جو عالم نہ ہو اور ''حمیدی'' میں ہے کہ عامی منسوب ہے عامہ کی طرف جو جاہل ہوتے ہیں تو ان اشارات سے معلوم ہوا کہ مراد ابو یوسف کی عامی سے وہ جاہل ہے کہ نص کے معنی اور تاویل نہ جانتا ہو اور اقوال ابوحنیفہ اور شافعی اور محمد کے جو مذکور ہوئے، ان سے کہنے والے کا یہ قول دفع ہوا

کہ روایت مذہب پر عمل کرنا واجب ہے جو مخالف نص کے ہو تمام ہوئی وہ عبارت جو ہم نے ''خزانۃ الروایات'' سے نقل کی ہے اور اس مسئلہ میں ایک اور قول بھی ہے وہ یہ کہ جب عالم مادے اجتہاد کے نہ رکھتا ہو تو اس کو اپنے مذہب کے خلاف حدیث پر عمل کرنا درست نہیں کیونکہ اس کو معلوم نہیں کہ حدیث منسوخ ہے یا ماؤل یا محکم ہے اپنے ظاہر معنی پر محمول اور ابن حاجب نے اپنے ''مختصر'' میں اس کے تابعین نے اسی قول پر میل کیا ہے اور یہ قول رد کیا گیا ہے۔ اس طرح حدیث کا حال معلوم نہ ہونے سے اگر یہ غرض ہے کہ منسوخ وغیرہ نہ ہونے کے حال پر اس کو یقین ان امور کا تو مجتہد کو بھی نہیں ہوتا بلکہ وہ اکثر اپنے اجتہاد کو گمان پر مبنی کرتا ہے اور اگر قائل نے یہ ارادہ کیا ہے کہ غالب رائے سے نہیں جانتا تو اس کو ہم صورت متنازعہ میں نہیں مانتے کیونکہ جو شخص نہایت ماہر مذہب میں ہو اور قوم کی کتابیں دیکھتا رہے اور حدیث اور فقہ کی مقدار شائستہ یاد رکھتا ہو تو اس کو اکثر گمان غالب ہو جاتا ہے۔ اس بات کا کہ حدیث نہ منسوخ ہے اور نہ ماؤل ایسی تاویل سے کہ اس تاویل کا قائل ہونا واجب ہو۔ علاوہ ازیں گفتگو اسی صورت میں ہے کہ ماہر در مذہب کو یہ ظن حاصل ہو چکا ہو اور یہاں ایک تیسرا قول ہے جس کو ابن صلاح نے پسند کیا اور نووی نے اس کا ساتھ دیا اور اس قول کو صحیح کیا ہے۔ ابن صلاح نے کہا کہ جو شخص شافعیوں میں سے کوئی حدیث اپنے مذہب کے مخالف پاوے تو دیکھا جائے کہ اگر اس میں استعداد اجتہاد مطلق کی پوری ہو یا اسی خاص باب اور مسئلہ میں اجتہاد کامل رکھتا ہو تو اس کو عمل کرنا اس حدیث پر بطور خود جائز ہوگا اور اگر مایہ استعداد کامل نہیں ہے اور حدیث کی مخالفت اس پر دشوار ہے بعد اس کے کہ تفحص کر چکا اور حدیث کی مخالفت کرنے کا کوئی جواب شافی اپنی طرف سے نہ پایا تو اس کو عمل کرنا اس حدیث پر اس شرط سے روا ہے کہ کسی امام مستقل نے امام شافعی کے سوا اس پر عمل کیا ہو اور یہ امر اس کو اپنے امام کے مذہب چھوڑنے کا اس مقام پر عذر ہوگا اور اس قول کو نووی نے اچھا کہا ہے اور اس کو ثابت رکھا ہے۔

تیسرا مسئلہ۔ جب ایسا مذہب میں علامہ یوں چاہے کہ کسی مسئلہ میں دوسرے امام کی تقلید کر کے اپنے امام کے مذہب کے خلاف عمل کرے تو سوال یہ ہے کہ یہ امر اس کو جائز ہے یا نہیں۔ اس کے جواب میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ امام غزالی اور چند علماء نے اس کو ناجائز کہا ہے اور جمہور کے نزدیک عدم جواز قول ضعیف ہے۔ اس لئے کہ بنا اس کی اس بات پر ہے کہ آدمی پر دلیل کے ساتھ مذہب اختیار کرنا واجب ہے اور جب دلیل کے نہ ہونے سے اختیار مذہب فوت ہو گیا تو ہم نے اس کے امام کے افضل ہونے کے اعتقاد کو قائم مقام دلیل کے ٹھہرایا۔ اس لئے اس کو درست نہیں کہ اپنے مذہب سے نکلے۔ جیسے یہ درست نہیں کہ دلیل شرعی کے خلاف کرے اور یہ حجت اس طرح پر رد کی گئی ہے کہ امام کے افضل ہونے کا اعتقاد مطلقاً سب اماموں پر تقلید کے درست ہونے میں بالاتفاق ضروری نہیں۔ اس لئے کہ صحابہ اور تابعین یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ اس امت کے سب سے افضل ابوبکر صدیقؓ پھر عمر فاروقؓ ہیں حالانکہ بہت سے مسائل میں ان دونوں کے قول کے خلاف دوسروں کے قول کی تقلید کرتے تھے اور اس بات پر کسی نے انکار نہیں کیا تو جس بات کو ہم نے بیان کیا، اس پر اجماع ثابت ہوا۔ رہا امام کے قول کا فاضل ہونا اس خاص مسئلہ میں تو اس کے پہچاننے کی سبیل نرے مقلد کو کچھ نہیں۔ پس یہ بات تقلید کی شرط بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ عام مقلدوں کی تقلید درست نہ ہو اور اگر بالفرض اس شرط کو مان بھی لیں تو ہمارے اس مسئلہ میں یہ تم ہی پر پڑے گی۔ تم کو کچھ مفید نہ ہوگی کیونکہ ایسا عالم اکثر ایسی حدیث پر آگاہ

ہوتا ہے کہ اس کے امام کے مذہب کے مخالف ہو یا کوئی قیاس قوی مخالف اس کے مذہب کے پاتا ہے تو اس صورت میں افضل ہونا دوسرے کے قول کا اس مسئلہ میں اعتقاد کر لیتا ہے اور اکثر علماء اس طرف گئے ہیں کہ ایسے عالم کو اپنے امام کے مذہب کے خلاف عمل کرنا درست ہے۔ ان مجوزین میں سے آمدی اور ابن حاجب اور ابن ہمام اور نووی اور اس کے تابعین مثل ابن حجر اور رملی کے اور بہت جماعتیں حنبلیوں اور مالکیوں میں سے ہیں جن کے ناموں کا ذکر کرنا نوبت بطول پہنچاتا ہے اور اسی جواز پر اتفاق چاروں مذہب کے مفتیوں کا متاخرین میں سے ہو گیا ہے اور انہوں نے اس جواز کو پہلوں کے کلام سے نکالا ہے اور اس مسئلہ میں جداگانہ رسالے تالیف کیے ہیں مگر عمل بخلاف مذہب کے جائز ہونے کی شرط میں اختلاف کیا ہے۔ بعضوں نے تو یہ کہا ہے کہ جس میں تقلید کر چکا اس میں بالاتفاق رجوع نہ کرے۔ ابن ہمام نے اس کی تفسیر یہ کی کہ جس میں عمل کر لیا۔ شرح کرنے والے ابن ہمام کے اس لفظ کے معنی میں اختلاف رکھتے ہیں۔ کسی نے کہا کہ مراد یہ ہے کہ جس عمل خاص کو کر لیا ہو اس میں رجوع نہ کرے۔ اس طرح کہ مثلاً جو نمازیں کہ پہلے مذہب پر ہوئی تھیں، ان کو قضا کرنے لگے اور یہ قول ایسا صحیح ہے کہ تحقیق کے وقت دوسرا قول نہیں بنتا۔

اور کسی نے کہا کہ یہ غرض ہے کہ جس عمل کی جنس کر لی ہو۔ اس میں رجوع نہ کرے اور یہ قول رد کیا گیا ہے۔ اس طرح کہ یہ امر بالاتفاق نہیں بلکہ سلف سے جو اکثر مروی ہے عمل کرنا مذہب کے خلاف انہیں صورتوں میں ہے جن پر وہ عمل کرتے تھے اور بعضوں نے یہ کہا ہے کہ جواز کی شرط یہ ہے کہ رخصتوں کو نہ چھانٹے۔ کسی نے رخصتوں سے مراد یہ کہی ہے کہ جو اعمال اس پر آسان ہوں اور یہ مراد لینا اس طرح پر رد کیا گیا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جب آپ کو دو چیزوں کا اختیار ملتا تو آپ دونوں میں سے زیادہ آسان کو پسند کرتے بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہوتی اور کسی نے مراد رخصت سے یہ لی کہ جس کی تقویت دلیل نہ کرے بلکہ دلیل صحیح اور صریح اس کے خلاف پر قائم ہو جیسے متعہ اور بیع صرف کو جائز کہنا اور یہ ایک عمدہ وجہ ہے۔ میں نے "کتاب تخلیص" مؤلفہ حافظ ابن حجر عسقلانی کی جو در بارہ بیان اسناد حدیث رافعی کے ہے، کتاب النکاح میں حاکم کی کتاب علوم الحدیث سے منقول یہ مضمون دیکھا ہے جس کی سند حاکم نے اوزاعی تک کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ اہل حجاز کی پانچ باتوں سے اور اہل عراق کی پانچ باتوں سے کنارہ کیا جاوے یا ان کو ترک کیا جاوے۔ اہل حجاز کے پانچ قول یہ ہیں آلات لہو کا سننا، متعہ کرنا، عورتوں کے مقام پاخانہ میں صحبت بیع صرف[46] کرنا، دو نمازوں کو باعذر ایک ساتھ پڑھنا اور اہل عراق کے پانچ قول یہ ہیں۔ نبیذ کا پینا، نماز عصر میں اتنی تاخیر کہ چیز کا سایہ اس کا چہار چند ہو جاوے، جمعہ کا بجز سات شہروں کے دوسری جگہ نہ ہونا صف جہاد سے بھاگ جانا، رمضان شریف میں فجر کے بعد کھانا۔ پھر ابن حجر نے کہا کہ عبدالرزاق نے پیغمبر سے روایت کیا ہے کہ اگر کسی شخص نے راگ سننے کے بارہ میں اور عورتوں سے پشت کی جانب سے صحبت کرنے میں مدینہ والوں کا قول اختیار اور متعہ اور بیع صرف[47] کرنے میں مکہ والوں کا اور نشہ آور چیز پینے میں کوفہ والوں کا قول لیا تو ایسا آدمی بدترین بندگانِ خدا ہوگا اور بعض نے عمل خلاف مذہب کے جواز کی شرط یہ بیان کی ہے کہ عمل کنندہ تلفیق نہ کرے یعنی ایسی طرح درہم برہم نہ کرے کہ دونوں اماموں کے نزدیک ایک ناممکن صورت بن جاوے۔ بعض نے کہا کہ ناجائز وہ تلفیق ہے کہ ایک ہی مسئلہ میں ناممکن صورت بن جاوے۔ مثلاً وضو[48] بے ترتیب کی پھر اس کے بدن سے بہتا ہوا خون نکل آیا۔ دو مسئلوں میں ناجائز نہیں۔ مثلاً کپڑے کو امام شافعی کے مذہب کی بموجب پاک کیا اور

نماز ابوحنیفہ کے مذہب پر پڑھی اور ہو سکتا ہے کہ کہا جاوے کہ اس قول میں کلام ہے کیونکہ تلفیق نہ ہونے کی قید سے اگر یہ مقصود ہے کہ تمام عمل جو عمل کنندہ نے کیا۔ دونوں اماموں کے اتفاق سے باہر نہ ہو تو یہ بات تو دو مسئلوں میں بھی موجود ہے اور اگر یہ مقصود ہے کہ یہی مسئلہ تنہا اجماع امامین سے باہر نہ ہو تو اس کے عوض یہ شرط لگانا کافی ہے کہ وہ امر ایسا ہو جس میں اجتہاد درست ہو چنانچہ آئندہ آوے گا اور بعض نے جواز عمل خلاف مذہب کی شرط یہ بیان کی ہے کہ جس مذہب یعنی مسئلہ کی طرف وہ جاتا ہے وہ اس قسم سے نہ ہو جس سے حکم حاکم ٹوٹتا ہو اور یہ شرط عمدہ ہے اور اس قسم سے احتراز اس صورت میں ہوتا ہے کہ چاروں مذہب مقبول اور مشہور میں سے کسی ایک مذہب کی تقلید کرے اور بعض نے جواز عمل خلاف مذہب کی شرط یہ کہی ہے کہ عمل کنندہ کا سینہ اس مسئلہ میں اس قول سے کھل جائے جس میں اپنے امام کے سوا دوسرے کی تقلید کرتا ہے اور یہ سینہ کا کھلنا بجز علامہ مذہب کے متصور نہیں اور قول ضعیف یہ ہے کہ اگر اکثر ائمہ کا اور قول مشہور کا اتباع کرے گا تو اپنے امام کے مذہب سے نکلنا اچھا ہے اور اس کے عکس کی صورت میں برا ہے۔ یہ ہے خلاصہ اس مضمون کا جو علماء کے رسالوں میں ہے اور تنقیح اور تحریر ہم نے زیادہ کی ہے ہر ایک کے مضمون میں اور میں جواز عمل خلاف مذہب میں یہ شرط پسند کرتا ہوں کہ عمل مذکور سے حکم حاکم نہ ٹوٹے خواہ یہ ٹوٹنا دو معنوں کے جمع ہونے سے ہو کہ ہر ایک دونوں میں سے درست ہو مثلاً نکاح بدون اجتماع گواہوں کے اور بدون اعلان کے کرنا یا حکم کا کاٹنا کسی دوسری وجہ سے ہو اور عمل خلاف مذہب مختار ہونے کی صورت میں یہ شرط پسند کرتا ہوں کہ عمل کے لئے سینہ کا کھلنا کسی دلیل کی وجہ سے یا کثرت عاملین سلف کی وجہ سے یا اس عمل کے محتاط تر ہونے کے سبب سے ہو یا اس عمل کے باعث اس دشواری سے نجات ہوتی ہو جس کے ہوتے ہوئے فرمان پذیری اس ارشاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سے بن نہ سکے کہ جب میں تم کو کسی بات کا حکم کروں تو اس میں سے جس قدر تم سے ہو سکے بجالاؤ اور اسی طرح کی اور وجہوں سے ہو جو شرع میں معتبر ہیں صرف خواہش نفس اور دنیا کی طلب کی وجہ سے سینہ کا کھلنا نہ ہو اور عمل خلاف مذہب کے واجب ہونے میں یہ شرط پسند کرتا ہوں کہ عامل کے ذمہ پر دوسرے کا حق لگا ہوا ہو اور قاضی اس کے مذہب کے خلاف حکم لگاوے یعنی اس صورت میں عمل خلاف مذہب واجب ہے۔ ''خزانۃ الروایات'' میں ہے کہ کشف القناع میں مذکورہ ہے کہ اگر ایک مسئلہ میں آدمی ایک فقیہ کی تقلید کرتا ہے تو اس کو جائز ہے یا نہیں کہ فقیہ اول کو چھوڑ کر کسی دوسرے فقیہ کی طرف رجوع کرے۔ یہ سوال دو صورت پر ہے۔ اول یہ کہ مقلد نے التزام ایک خاص مذہب کا مثل ابوحنیفہ اور شافعی کے مذہب کے نہیں کیا۔ دوم یہ کہ التزام مذہب معین کا کیا اور کہا کہ میں التزام کے ساتھ مقلد ہوں تو اول صورت میں ابن حاجب نے کہا کہ جس عمل میں تقلید کر چکا ہے، اس میں بعد تقلید کے بالاتفاق رجوع نہ کرے اور دوسرے عمل میں مختار قول یہ ہے کہ رجوع کرنا جائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے **فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لاتعلمون** تو اب کسی مسئلہ میں جس کی تقلید اول کر لی ہے۔ اسی کی طرف رجوع کرنے کو واجب کہنا اس آیت کو مقید کرنا ٹھہرے گا جو قائم مقام آیت کے منسوخ کرنے کے ہے جیسا کہ اصول میں ٹھہر چکا ہے اور ایک دلیل جواز رجوع کی یہ ارشاد (50) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے کہ میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں جس کسی کا اقتدا کرو گے، راہ پاؤ گے۔ علاوہ ازیں سلف میں عوام کا دستور تھا کہ فقہا سے فتویٰ پوچھتے بدون اس کے کہ شخص معین کی طرف رجوع کریں اور اس بات پر کوئی انکار نہ کرتا تو یہ معاملہ بھی جواز رجوع کے لئے قائم مقام اجماع کے ہو گیا۔ ایسا ہی ہے شرح ابن حاجب

میں اور دوسری صورت کے جواب میں یعنی جس صورت میں کہ مقلد نے التزام کسی مذہب معین کا مثل ابوحنیفہ اور شافعی کے کیا ہوا۔ ابن حاجب نے اپنے مذہب کے اختلاف کی وجہ سے اسباب میں اختلاف کا اشارہ کیا ہے اور کہا ہے کہ علماء نے اس باب میں تین قول مختلف کہے ہیں۔ کسی نے تو کہا کہ مطلق جائز نہیں اور کسی نے کہا کہ مطلقاً رجوع درست ہے اور تیسرا قول یہ ہے کہ حکم اس صورت میں اور پہلی صورت میں برابر ہے یعنی رجوع کرنا فقیہ اول کی تقلید سے جائز نہیں جبکہ تقلید فقیہ اول کی کسی مسئلہ میں کر لی ہو یعنی اس کے بموجب عمل کر لیا ہو اور دوسری صورتوں میں رجوع جائز ہے اور ''عمدۃ الاحکام'' میں فتاویٰ صوفیہ سے منقول ہے کہ ابن حاجب سے روز عید فطر کے پوچھا گیا کہ ہم بعض لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ جامع مسجد میں زوال کے وقت نماز نفل پڑھتے ہیں تو ہم ان کو اس نفل پڑھنے سے روکتے ہیں اور ان کو آگاہ کرتے ہیں کہ تین وقتوں میں نماز کی ممانعت آئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ نفل پڑھنے والوں کو روکو نہیں تاکہ تم اس ارشاد خداوندی کے مضمون میں نہ آ جاؤ ارایت[52] الذی ینھی عبدا اذا صلی اور ایک وجہ یہ کہ تم کو یقین وقت زوال نہیں شاید وہ وقت زوال سے پہلے یا پیچھے ہو اور اگر وہ اس نفل پڑھنے کو زوال کے وقت جمعہ کے دن مکروہ نہیں جانتے تھے اور امام شافعی اس کو سب دنوں میں مکروہ نہیں جانتے تو اگر تم اس نفل پڑھنے والے پر اعتراض کرو گے تو عجب نہیں کہ وہ تم کو یہ جواب دے کہ میں نے اس مسئلہ میں اس امام کی تقلید کی ہے جو اس کے جواز کا معتقد ہے یا تم پر وہ حجت پیش کرے گا جس کو اس عالم نے قائم کی جو اس فعل کو جائز رکھا ہے۔ غرض کہ تم کو انکار کرنا درست نہیں۔ ایسے شخص پر کہ کسی مجتہد کی تقلید کرے یا کوئی حجت شرعی پیش کرے اور نیز ''عمدۃ الاحکام'' میں ''تجنیس'' اور مزید سے منقول ہے کہ بعض اوقات یہ نمازی مجتہد مجوز کی تقلید کرتا ہے تو اس شخص پر انکار نہیں کیا جائے گا جس نے کوئی فعل قابل اجتہاد کیا یا کسی مجتہد کی تقلید کی اور ''ظہیریہ'' میں ہے کہ جو شخص کوئی فعل کرے جس میں اختلاف مجتہدین ہو یا ایسے فعل اختلافی میں کسی مجتہد کی تقلید کرے تو اس پر نہ کچھ ننگ ہے نہ عیب نہ انکار اور بیضاوی کی ''منہاج'' میں ہے کہ اگر شوہر نے کسی لفظ کو کنایۂ طلاق جانا اور عورت نے اس کو صریح طلاق سمجھا تو شوہر کو عورت سے طلب صحبت جائز ہے اور عورت کو شوہر سے رکا رہنا درست ہے۔ اس لئے دونوں کسی دوسرے سے مسئلہ پوچھیں۔

فائدہ: ایک شخص شافعی نے ''انوار'' کی دو عبارتوں کا اختلاف مشکل سمجھا تو میں نے اس کو جواب ایسی طرح دیا جس سے وہ اختلاف حل ہو جائے یعنی ''انوار'' کی کتاب القضا میں تو یہ عبارت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب یہ چاروں مذہب قلمبند ہو گئے تو مقلد کو درست ہے کہ ایک مجتہد کے مذہب سے دوسرے کے مذہب میں چلا جائے اور اسی طرح اگر بعض مسائل میں ایک امام کی تقلید کرے اور بعض میں دوسرے امام کی یہاں تک کہ اگر مذہب میں سے آسان تر کو اختیار کرے مثلاً حنفی شخص جب فصد کھلوائے اور چاہے کہ امام شافعی کے مذہب پر عمل کرے تاکہ دوبارہ وضو نہ کرے یا شافعی نے اپنی شرمگاہ یا کسی عورت کو ہاتھ لگایا اور چاہا کہ حنفی مذہب اختیار کرے تاکہ وضو نہ کرنا پڑے اور اس کے سوا اور مسائل میں ایسا کرے تو جائز ہوگا۔ مؤلف ''انوار'' کی تقریر کا حاصل کتاب القضا میں تو یہ ہے کہ باب الاحتساب میں یوں کہا ہے کہ اگر کوئی شافعی دوسرے شافعی کو دیکھے کہ نبیذ پیتا ہے یا بدون ولی کے نکاح کر کے عورت سے ہمبستر ہوتا ہے تو اول شخص کو روا ہے کہ دوسرے پر اعتراض کرے کیونکہ ہر مقلد پر اتباع اپنے امام کا واجب ہے اور مخالفت امام کی کرنے سے گنہگار ہوگا اور

اگر شافعی کسی حنفی کو دیکھے کہ سوسمار کھاتا ہے یا وہ جانور کو اس کے ذبح کرنے میں بسم اللہ دانستہ چھوڑ دی ہو، کھاتا ہے تو اس کو جائز ہے کہ حنفی مذکور سے کہے کہ یا تو اس بات کا معتقد ہو کہ امام شافعی زیادہ مستحق اتباع کے ہیں یا ان چیزوں کا کھانا ترک کر۔ یہ تقریر انوار والے کی احتساب میں ہے اور دونوں قولوں میں اختلاف [53] ہے۔ میں کہتا ہوں کہ میرے عندیہ میں اس اختلاف کا حل واللہ اعلم یہ ہے کہ اس کے قول (مخالفت کرنے امام سے گنہگار ہوگا) کے یہ معنی ہیں کہ جب مقلد نے اپنے امام کی تقلید کرنے کا سب مسئلوں میں یا اس خاص مسئلہ میں پختہ ارادہ کر لیا۔ پھر مخالفت پر جرأت کی تو یہ مخالفت بے شک گناہ ہے اور جس صورت میں کہ اس مسئلہ میں دوسرے امام کی تقلید بدوں کسی عزم کے کی تو امام وہی رہے گا اور مقلد اس کی مخالفت نہ کرے گا یا ہم کہتے ہیں کہ دوسرا مسئلہ یعنی باب الاحتساب کا مبنی ہے۔ امام غزالی اور کچھ علماء کے قول پر اور مسئلہ اول کتاب القضا کا مبنی ہے جمہور کے قول پر اس کو خوب سمجھ لو۔ اس وجہ سے کہ رفع کرنا ''انوار'' کی عبارتوں کے اس اختلاف کا بعض مصنفوں پر دشوار گزرا ہے۔

چوتھا مسئلہ۔ جاننا چاہیے کہ تقلید مجتہد کی دو طرح پر ہے۔ ایک واجب دوم حرام۔ واجب کی تو یہ صورت ہے کہ روایت حدیث کے اتباع سے ہو بطور دلالت کے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جاہل قرآن اور حدیث سے بذاتِ خود تلاش اور استنباط مسائل نہیں کر سکتا تو اس کے ذمہ یہی ہے کہ کسی عالم سے پوچھے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں مسئلہ میں کیا حکم فرمایا ہے اور جب وہ عالم بتا دے تو اس کا اتباع کرے خواہ وہ حکم صریح نص سے لیا گیا ہو یا اس سے استنباط کیا ہو یا حکم صریح پر قیاس کیا ہو کہ ساری باتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی طرف راجع ہیں۔ گو دلالت [54] کے طور پر ہوں۔ اس قسم کی تقلید کی صحت پر تمام امت ہر قرن کی یکے بعد دیگر متفق ہے بلکہ اس جیسی بات پر ساری امتیں اپنی شریعتوں میں متفق ہیں اور علامت اس تقلید کی یہ ہے کہ مقلد کا عمل مجتہد کے قول پر گویا اس شرط سے ہے کہ قول مذکور موافق سنت کے ہو تو یہ مقلد ہمیشہ جو یا سنت کا رہے جہاں تک ہو سکے پس جب کوئی حدیث ظاہر ہو جو مخالف قول اس کے مجتہد کے ہو تو اس قول کو چھوڑ دے اور حدیث پر عمل کرے اور اسی بات کی طرف اماموں نے اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ امام شافعی نے کہا ہے کہ جب حدیث ثابت ہو جائے تو وہی میرا مذہب ہے اور جب تم میرے کلام کو مخالف حدیث کے دیکھو تو حدیث پر عمل کرو اور میرے کلام کو دیوار پر دے مارو اور امام مالک نے کہا کہ کوئی ایسا نہیں جو اپنے کلام کی وجہ سے ماخوذ نہ ہو اور اس کا قول اس پر رد نہ کیا جاوے۔ بجز رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اور امام ابوحنیفہ نے کہا کہ جو شخص میری دلیل کو نہ جانتا ہو۔ اس کو نہیں چاہیے کہ میرے کلام سے فتویٰ دے اور امام احمد نے کہا کہ تو نہ میری تقلید کر نہ مالک کی نہ اور کسی کی اور احکام کو قرآن اور حدیث سے لے جہاں سے انہوں نے لئے اور تقلید حرام کی یہ صورت ہے کہ کسی فقیہ کو گمان کرے کہ وہ علم میں نہایت کو پہنچ گیا ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ وہ خطا کرے تو ایسے مقلد کو جب کوئی حدیث صحیح اور صریح پہنچتی ہے کہ مخالف اس فقیہ کے قول کے ہو تو اس کے قول کو نہیں چھوڑتا یا یہ گمان کرے کہ جب میں نے اس فقیہ کی تقلید کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کا قول ماننے سے مجھے حکم کر دیا اور ایسے مقلد کا حال ایسا ہے جیسا کم عقل آدمی اپنے مال میں تصرف کرنے سے روک دیا جاتا ہے تو اگر اس کو کوئی حدیث پہنچتی ہے اور اس کے صحیح ہونے کا یقین بھی کر لیتا ہے تب بھی حدیث کو قبول نہیں کرتا کیونکہ اس کے ذمہ تو تقلید کی بیخ گئی ہوئی ہے تو یہ اعتقاد خراب اور نکما قول ہے۔ اس کا شاہد نہ نقلی ہے نہ عقلی اور پہلے قرنوں میں سے کوئی یہ امر نہ کرتا تھا اور

اس مقلد نے دو غلطیاں کیں۔ اول تو یہ کہ جو شخص خطا سے معصوم نہ تھا، اس کو معصوم حقیقی اس کے قول پر عمل کرنے کے حق میں معصوم گمان کر لیا اور دوسری یہ کہ خیال کر لیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کے قول کو ماننے کا حکم کر دیا اور میرا ذمہ اس کی تقلید سے رکا ہوا ہے اور اسی جیسے مقلد کے بارے میں یہ ارشاد خداوندی نازل ہوا ہے۔ و انا[55] علی آثارھم مقتدون اور پہلی ملتوں کی تحریفیں بھی اسی صورت کی تھیں۔

پانچواں مسئلہ۔ علماء نے اختلاف کیا ہے فتویٰ دینے میں ان روایات سے جو نادر اور متروک ہیں۔ ''خزانۃ الروایات'' میں ہے کہ ''سراجیہ'' میں لکھا ہے کہ پھر فتویٰ مطلق امام ابو حنیفہؒ کے قول پر ہے۔ پھر ابو یوسف کے قول پر پھر محمد بن حسن شیبانی کے قول پر۔ پھر زفر بن ہذیل اور حسن بن زیاد کے قول پر اور بعض نے کہا کہ جب امام اعظم ایک جانب ہوں اور صاحبین ایک جانب تو مفتی کو اختیار ہے چاہے جس قول پر فتویٰ دے اور قول اول صحیح تر ہے بشرطیکہ مفتی مجتہد نہ ہو۔ کیونکہ امام اعظم اپنے وقت کے بڑے عالم تھے حتیٰ کہ امام شافعی نے کہا ہے کہ سب آدمی فقہ میں ابو حنیفہ کے تربیت یافتہ ہیں۔ ''مضمرات'' میں ہے کہ بعض علماء کا قول یہ ہے کہ جب ابو حنیفہ ایک طرف ہوں اور ابو یوسف اور محمد ایک طرف تو مفتی کو اختیار ہے کہ اگر چاہے امام کے قول کو لے اور اگر چاہے صاحبین کا قول لے اور اگر صاحبین میں سے ایک امام کے ساتھ ہو تو یقیناً انہیں دو کا قول لے مگر جس صورت میں کہ علماء نے اس ایک کے قول کو لینا مصلحت جانا ہو تو مفتی بھی ان کی مصلحت کی پیروی کرے۔ جیسے فقیہ ابو اللیث نے مریض کے بیٹھ کر نماز پڑھنے میں امام زفر کا قول اختیار کیا ہے کہ مریض اس طرح بیٹھے جیسے نمازی التحیات میں بیٹھتا ہے کیونکہ یہ بیٹھنا مریض پر زیادہ آسان ہے۔ اگرچہ دوسرے ہمارے آئمہ کا یہ قول ہے کہ مریض قیام کے عوض پالتی مار کر یا گوٹ مار کر بیٹھے تاکہ قیام کے بدلے بیٹھنے اور التحیات کے بیٹھنے میں فرق ہو جائے لیکن اس طرح بیٹھنا مریض پر دشوار ہے۔ اس لئے کہ اس کو اس بیٹھک کی عادت نہیں پڑی اور اسی طرح علماء نے چغل خور سے تاوان لینا پسند کیا ہے جس صورت میں کہ بادشاہ سے اس نے چغلی بدون حکم سلطانی کھائی ہو۔ یہ قول بھی امام زفر کا ہے۔ اس مصلحت کے لئے کہ چغلی کا باب بند ہو جائے۔ اگرچہ ہمارے باقی ائمہ کا قول یہ ہے کہ تاوان لینا واجب نہیں کیونکہ چغل خور نے اس کا کوئی مال تلف نہیں کیا اور علماء کو درست ہے کہ ہمارے ائمہ میں سے ایک کا قول کسی مصلحت وقت پر عمل کرنے کی وجہ سے اختیار کریں۔ قنیہ کے اس باب میں جس میں مسائل نادر متعلقہ مفتی مذکور میں بیان کیا ہے کہ فتویٰ ان مسائل میں کہ متعلق فیصلہ مقدمات ہوں امام ابو یوسف کے قول پر ہے۔ بوجہ ان کے تجربہ کے زیادہ ہونے کے اور مضمرات میں ہے کہ مفتی کو درست نہیں کہ بعض اقوال متروک سے نفع لینے کی غرض سے فتویٰ دے کیونکہ اس کا نقصان دنیا اور آخرت میں کامل تر اور عام تر ہے بلکہ علماء کے اقوال مختار اختیار کرے اور سلف کی سیرتوں کا اقتدار اور اسی فضیلت و شرف کے حاصل کرنے پر اکتفا کرے۔ قنیہ کے کتاب ''ادب القاضی'' کے باب مسائل متفرقہ میں یہ ایک مسئلہ مذکورہ ہے کہ جو مسائل متعلق فیصلہ مقدمات ہیں، ان میں فتویٰ امام ابو یوسف کے قول پر ہے کیونکہ ان کو تجربہ کے سبب سے زیادہ واقفیت ہو گئی تھی اور ''عمدۃ الاحکام'' میں بزدوی کی ''کتاب کشف'' سے منقول ہے کہ مفتی کو مستحب ہے کہ عوام پر آسانی کی غرض سے رخصتوں پر فتویٰ دے۔ مثلاً حمام کے پانی سے وضو کرنا اور پاک جگہوں میں بدون جانماز کے نماز پڑھنے اور سڑکوں کے گارے سے پرہیز نہ کرنا ایسے مقام پر جہاں کے گارے کو علماء پاک ہونے کا حکم دیں اور یہ[56] رخصت گوشہ نشینوں

کے لائق نہیں بلکہ ان کے حق میں بہتر یہ ہے کہ احتیاط پر کار بند ہوں اور عزیمت [57] پر عمل کریں اور قنیہ میں ہے کہ پھر مفتی کو چاہیے کہ لوگوں کو ایسی بات کا فتویٰ دے جو ان کے حق میں زیادہ آسان ہو جیسے بزدوی نے ''شرح جامع صغیر'' میں بیان کیا ہے کہ مفتی کو مناسب ہے کہ فتویٰ میں ایسا قول اختیار کرے جو دوسرے کے حق میں خصوصاً کمزوروں کے حق میں آسان تر ہو کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوموسیٰ اشعری اور معاذ بن جبل کو جب یمن کی طرف روانہ کیا تو ارشاد فرمایا کہ تم دونوں آسانی کیجیو، تنگی مت کیجیو اور ''عمدۃ الاحکام'' کے کتاب الکراہیت میں ہے کہ جھوٹا کتے اور سور کا ناپاک ہے اور اس میں امام مالک وغیرہ کا اختلاف ہے اور اگر مفتی نے امام مالک کے قول پر فتویٰ دیا تو درست ہے اور قنیہ میں ہے کہ ایک عالم سعید بن مسیّب کے مذہب کے موافق فتویٰ دیتا ہے اور تین طلاق دی ہوئی عورت کا نکاح شوہر اول سے کرتا ہے تو وہ عورت جوں کی توں تین طلاق دی ہوئی رہے گی اور اس عالم کو سزا دی جائے گی اور ایک عالم تین طلاقوں میں حیلہ کرتا ہے اور اس بہانہ سے رشوت لیتا ہے اور عورت کو شوہر اول سے بدون دوسرے شوہر کی صحبت کے نکاح کرتا ہے تو یہ نکاح درست ہے یا نہیں اور جو ایسا کرے اس کی سزا کیا ہے تو علماء نے کہا ہے کہ ایسے عالم کا منہ کالا کر کے نکال دیا جاوے۔ ''فتاویٰ اعتادیہ'' میں ''فتاویٰ سمرقندی'' سے منقول ہے کہ سعید بن مسیّب نے اپنے اس قول سے (کہ عورت کو شوہر اول کے لئے حلال کرنے میں صحبت دوسرے شوہر کی شرط نہیں) رجوع کر لیا ہے تو اب اگر کوئی قاضی ان کے قول کے بموجب حکم دے گا تو اس کا حکم نافذ نہ ہوگا اور اگر کوئی عالم اس کے بموجب حکم کرے گا تو اس کا حکم صحیح نہ ہوگا اور اس عالم کو سزا دی جائے گی اور ''تحفہ'' یعنی ''شرح منہاج'' میں ہے کہ عراقی نے اجماع نقل کیا ہے مقلد کے اختیار کرنے پر اپنے امام کے دو قولوں کو یعنی کبھی ایک کو کبھی دوسرے کو۔ یہ نہیں کہ دونوں کو ایک ساتھ لے اور ایک کو بھی بدل کے طور پر اس صورت میں ہے کہ ترجیح ایک کی دوسرے پر ظاہر نہ ہو اور شاید عراقی نے اجماع سے اپنے مذہب کے ائمہ کا اجماع مراد لیا ہے کیونکہ ہمارے مذہب کا مقتضا تو سبکی کے قول کے بموجب اس اختیار کی ممانعت ہے، فیصلہ مقدمات اور فتویٰ دینے میں نہ اپنے آپ عمل کرنے میں اور اسی سے (یعنی اختیار قولین اپنے حق میں ممنوع نہیں قضا اور افتا میں منع ہے) مطابقت ہوتی ہے۔ ماوردی اور امام کے قولین کہ ماوردی کہتا ہے کہ اختیار قولین ہمارے نزدیک جائز نہیں۔ جیسا اس شخص کو جس کی اٹکل میں دو طرفیں قبلہ ہونے میں برابر ہیں، یہ جائز ہے کہ جونسی طرف کو ان دونوں میں سے چاہے بالاتفاق نماز پڑھ لے اور امام غزالی نے ماوردی کے قول کی اعانت کی ہے۔

اور امام کا قول یہ ہے کہ اختیار قولین مقلد کو منع ہے۔ اگر دونوں قول دو حکموں ضد یک دیگرین ہوں مثلاً ایک واجب ہونے میں ہو اور دوسرا حرام ہونے میں بخلاف کفارہ کی سی باتوں کے کہ ان میں منع نہیں اور سبکی نے اختیار قولین اپنے حق میں عمل کرنے کے جواز کو اس شخص مجتہد کے لئے جاری کیا ہے جس کی تقلید درست ہو اور تمام شرائط اجتہاد کی اس میں موجود ہوں اور لوگوں نے عمل خلاف چاروں مذہب کے کرنے میں سبکی کا اتباع کیا ہے یعنی اس جنس کے اعمال میں کہ مطابق حدیث کے عمل میں آ دیں اور ابن صلاح کا یہ قول کہ تقلید چاروں اماموں کے سوا دوسرے کی جائز نہیں، اسی پر محمول ہے کہ حکم قاضی اور مفتی میں جائز نہیں اور اس کا اور تقلید کی دوسری صورتوں کا موقع اس وقت تک ہے کہ مقلد رخصتوں کی جستجو ایسی طرح نہ کرے کہ تقلید کا پھندا اس کی گردن سے کھل جاوے ورنہ تلاش رخصتوں کے سبب سے گنہگار ہوگا بلکہ قول ضعیف

یہ ہے کہ فاسق ہوگا اور یہ قول موجہ ہے اور بعض علماء نے کہا کہ موقع قول ضعیف کا یہ ہے کہ رخصتوں کی جستجو ان مذہبوں قلمبند سے کرے ورنہ یقیناً فاسق ہوگا۔ تمام ہوا قول صاحب ''تحفہ'' کا۔

چوتھی فصل۔ عامی کے بیان میں۔

معلوم کرنا چاہیے کہ نرے عامی کا کوئی مذہب معین نہیں بلکہ اس کا مذہب مفتی کا فتویٰ ہوتا ہے۔ ''بحر الرائق'' میں ہے کہ اگر روزہ والے نے پچھنے لگوائے یا کسی کی غیبت کی اور گمان کیا کہ یہ حرکت روزہ توڑتی ہے۔ پھر اس نے دانستہ کھالیا تو اگر اس نے کسی عالم سے نہیں پوچھا تھا اور نہ اس کو حدیث پہنچی تھی تو اس پر کفارہ واجب ہوگا کیونکہ صرف جہالت ہی رہی اور دارالاسلام میں نہ جاننا عذر نہیں ہوسکتا اور اگر کسی عالم سے حکم پوچھا تھا اور عالم نے افطار کا فتویٰ دیا تھا تو اس پر کفارہ لازم نہ آوے گا کیونکہ عامی کو عالم کی تقلید واجب ہے جبکہ اس کے فتویٰ پر اعتماد رکھتا ہو تو اس صورت میں عامی مذکور اپنے فعل میں معذور ہوگا۔ گو مفتی نے اپنے فتویٰ میں خطا کی ہو اور اگر اس نے عالم سے دریافت نہیں کیا لیکن اس کو حدیث پہنچی تھی یعنی یہ ارشاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ جو پچھنوں سے خون نکالے اور جو نکلوا دے دونوں کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور یہ ارشاد کہ غیبت روزہ دار کا روزہ توڑتی ہے اور عامی مذکور نے نہ ان حدیثوں کا منسوخ ہونا جانا نہ ان کے معانی مقصود اس کو معلوم ہوئے تو امام صاحب اور محمد کے نزدیک اس پر کفارہ نہ ہوگا کیونکہ عمل کرنا حدیث کے ظاہر معنی پر واجب ہے۔ ابو یوسف اس کے خلاف کہتے ہیں۔ اس لئے کہ عامی کو حدیث پر عمل کرنا جائز نہیں کہ وہ ناسخ اور منسوخ سے واقف نہیں اور اگر روزہ دار نے شہوت سے عورت کو ہاتھ لگایا یا اس کا بوسہ لیا اسی طرح اپنی آنکھ میں سرمہ ڈالا اور گمان کیا کہ یہ حرکت روزہ توڑتی ہے پھر دانستہ افطار کرلیا تو اس پر کفارہ لازم ہوگا مگر جس صورت میں کہ کسی عالم سے مسئلہ پوچھا اور اس نے روزہ جاتا رہنے کا حکم دیا یا اس بات میں اس نے کوئی حدیث سنی تو کفارہ نہ ہوگا اور اگر عامی نے زوال سے پیشتر نیت روزہ کی کی پھر روزہ توڑ ڈالا، امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس کو کفارہ لازم نہ ہوگا اور صاحبین کے نزدیک کفارہ ہوگا۔ ایسا ہی ہے ''محیط'' میں اور اس سے معلوم ہوا کہ عامی کا مذہب اس کے مفتی کا فتویٰ ہوتا ہے اور نیز ''بحر الرائق'' کے باب قضاء الفوائت میں مؤلف کے اس قول کے پاس کہ ترتیب وقت کی تنگی اور بھولنے سے جاتی رہتی ہے مذکور ہے کہ اگر مقلد عامی ہو تو اس کا کوئی مذہب معین نہیں۔ اس کا مذہب اس کے مفتی کا فتویٰ ہے جیسا کہ علماء نے اس کی تصریح کی ہے تو اگر کسی حنفی نے فتویٰ دیا ہو تو نماز عصر (58) اور مغرب کو دوبارہ پڑھے اور اگر کسی شافعی نے فتویٰ دیا ہو تو دونوں نمازوں کا اعادہ نہ کرے اور خود اس کی رائے کا کچھ اعتبار نہیں اور اگر کسی سے فتویٰ نہیں پوچھا اور کسی مجتہد کے مذہب کے موافق نماز درست ہوگئی تو یہی اس کو کافی ہوگی دوبارہ پڑھنا واجب نہ ہوگا۔ تمام ہوا قول ''بحر الرائق'' کا اور بیضاوی کی ''منہاج'' کی شرح مؤلفہ ابن امام کاملیہ میں ہے کہ جب عامی کو کوئی حادثہ پیش آوے اور اس میں کسی مجتہد سے فتویٰ دریافت کر کے اس مجتہد کے فتویٰ کے موافق اس حادثہ میں عمل کرلے تو اس کو اس حادثہ خاص میں اس مجتہد کے حکم سے دوسرے مجتہد کے فتویٰ کی طرف بالاجماع رجوع کرنا جائز نہیں۔ چنانچہ ابن حاجب اور دوسرے علماء نے اس کو لکھا ہے اور ''جمع الجوامع'' میں اس بارے میں خلاف ہے اور اگر عمل کرنے سے پہلے رجوع کرنا چاہے تو نووی نے کہا ہے کہ مختار وہ صورت ہے کہ خطیب وغیرہ نے لکھی ہے کہ اگر وہاں کوئی دوسرا مفتی نہ ہو تو اس پر عمل کرنا بفور مفتی کے فتویٰ دینے کے لازم ہوگا۔ اگرچہ اس کے دل کا اطمینان نہ ہو اور اگر

وہاں کوئی دوسرا مفتی بھی ہو تو اس پر حکم مفتی اول کا بجرد کے لازم نہ ہوگا کیونکہ اس کو جائز ہے کہ دوسرے سے حکم دریافت کرے اور اس صورت میں کبھی دوسرا مفتی پہلے کے خلاف کہے گا تو اس حکم میں خلاف دو مفتیوں کے اختلاف کی صورت میں ہو جائے گا لیکن جس صورت میں کہ عامی مذکور کو دوسرا حادثہ سوائے اول کے پیش آوے تو صحیح تر یہ ہے کہ اس کو درست ہے کہ اس دوسرے حادثے میں فتویٰ اس شخص کے سوا جس سے پہلے حادثہ میں پوچھا تھا دوسرے سے دریافت کرے اور کرابسی نے قطعاً کہا ہے کہ عامی کے ذمہ واجب ہے کہ کسی مذہب معین کا التزام کرے اور ''جمع الجوامع'' میں اس بات کو پسند کیا ہے کہ التزام مذہب معین واجب ہے اور اس التزام کو صرف خواہش نفس کے لئے نہ کرے بلکہ کوئی سا مذہب پسند کر لے کہ ہر چیز میں اس کی تقلید کرے جس کو راجح تر یا دوسرے کے برابر سمجھے، مغلوب اور کم جانے اور نووی نے کہا ہے کہ جس بات کو دلیل چاہتی ہے وہ یہ ہے کہ عامی کو مذہب معین اختیار کرنا لازم نہیں بلکہ جس عالم سے چاہے فتویٰ دریافت کر لے لیکن یہ نہ ہو کہ رخصتیں چننے لگے اور شاید جس نے عامی کو ہر عالم سے فتویٰ لینے کو منع کیا ہے اس نے اس کی رخصتیں چننے پر اعتماد نہیں کیا اور جس صورت میں کہ عامی مذہب معین کا التزام کر لے تو اس کو اس مذہب سے نکلنا بموجب قول صحیح تر کے درست ہے۔ اور کتاب ''زید بن رسلان'' میں دو شعر ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے: ابوحنیفہ اور مالک شافعی، احمد بن حنبل اور سفیان بھی اور ائمہ باقی حق پر ہیں تمام۔ اختلاف ان کا ہے رحمت والسلام۔ اور اس کتاب کی شرح ''غایۃ البیان'' میں ہے کہ اگر برابر کے دو مجتہدوں کا جواب مختلف ہو تو صحیح تر یہ ہے کہ مقلد کو جائز ہے کہ ان دونوں میں سے جس کا قول چاہے پسند کر لے اور اس مسئلہ میں جو مضمون ''تحفہ'' میں تھا، (59) پیشتر گزر چکا۔

پانچواں باب:

تقلید میں اعتدال رکھنے کے بیان میں اور یہ جو ہم نے تقلید کا حال لکھا کہ افراط اور تفریط کے درمیان ہے یہ وہ طریق ہے جس پر جمہور علماء چاروں مذہب کے پابند چلے ہیں اور مذہب کے ائمہ نے اپنے شاگردوں کو اسی کی وصیت کی ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالوہاب شعرانی نے ''یواقیت و جواہر'' میں بیان کیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ سے مروی ہے کہ یوں کہا کرتے کہ جس شخص کو میری دلیل معلوم نہیں، اس کو نہیں چاہیے کہ میرے کلام سے فتویٰ دے اور جب آپ فتویٰ دیتے تو یوں کہتے کہ یہ تجویز نعمان بن ثابت کی یعنی میری ہے اور جس قدر ہم کو معلوم تھا اس میں سب سے اچھی ہے تو اگر کوئی شخص اس سے بھی بہتر کہے تو اس کا قول زیادہ تر صواب ہوگا اور امام مالکؒ کہا کرتے ہیں کہ کوئی ایسا نہیں جو اپنی گفتگو کی وجہ سے ماخوذ نہ ہو اور اس کا کلام اس پر رد نہ کیا جاوے۔ بجز رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اور حاکم اور بیہقی نے اور امام شافعی سے روایت کیا ہے کہ وہ کہا کرتے کہ جب حدیث ثابت ہو جاوے تو وہی میرا مذہب ہے اور ایک روایت میں یہ ہے کہ جب تم میرے کلام کو دیکھو کہ حدیث کے مخالف ہے تو حدیث پر عمل کرو اور میرے کلام کو دیوار پر مارو اور ایک روز مزنی سے کہا کہ اے ابراہیم! جو کچھ میں کہوں تو ہر بات میں میری تقلید مت کر بلکہ تقلید کرنے میں اپنی نجات کا فکر ملحوظ رکھ کہ یہ دین ہے اور یہ بھی آپ کہا کرتے کہ کسی کے کلام میں حجت نہیں سوائے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے اگرچہ کہنے والے بہت ہوں اور نہ کسی قیاس میں اور نہ کسی دوسری چیز میں حجت ہے اور تم کو لازم ہے کہ فرمانبرداری خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کی انقیاد کے ساتھ بجالاؤ اور امام احمد رحمۃ اللہ کہا کرتے کہ کسی کو حکم خدا اور اس کے رسول کے ساتھ کلام کی گنجائش نہیں اور نیز ایک شخص

سے آپ نے کہا کہ تو نہ میری تقلید کر نہ مالک کی اور نہ اوزاعی کی نہ نخعی کی نہ ان کے سوا کسی اور کی اور احکام کو اسی جگہ سے حاصل کر جہاں سے قرآن وحدیث میں سے ان لوگوں نے حاصل کیے۔ تمام ہوا بیان عبدالوہاب کا۔ پھر عبدالوہاب نے علماء مذاہب کی بڑی جماعت کا حال بیان کیا ہے کہ آئمہ مذاہب کے وقت سے لے کر عبدالوہاب کے وقت تک ان کا دستور یہ تھا کہ مذاہب کے بموجب عمل کرتے تھے اور فتویٰ دیتے تھے بدون اس کے کہ کسی مذہب معین کا التزام ہو اور یہ بیان اسی طرح کیا ہے کہ اس کا کلام اس بات کو مقتضی ہے کہ یہ بات ایسی ہے کہ علماء سلف اور حال کے ہمیشہ سے اس پر ہیں یہاں تک کہ یہ بات گویا متفق علیہ اور مسلمانوں کی راہ ٹھہر گئی کہ اس کے خلاف کرنا درست نہیں اور چونکہ عبدالوہاب نے اس بیان کا ذکر بسط کے ساتھ کیا ہے تو ہم کو اقوال علماء اسباب میں نقل کرنے کی ضرورت نہیں لیکن اس وقت جو کچھ ہم کو یاد ہے اس میں سے کسی قدر ذکر کرنے کا مضائقہ نہیں۔ بغوی نے شرح السنہ کے شروع میں کہا ہے کہ میں اپنے اکثر بیان بلکہ سب بیان میں دوسروں کا تابع ہوں بجز مقدار قلیل کے کہ مجھ کو کسی کلام محتمل کے باب میں کسی قسم کی دلیل سے سوجھی ہے یا لفظ مشکل کے واضح کرنے یا ایک قول کو دوسرے پر ترجیح دینے میں حیطہ تحریر میں آئی اور ''شرح السنہ'' کے اسباب میں جس میں وہ دعائیں ہیں جن سے نماز شروع کی جاتی ہے اول انی وجهت الخ اور سبحانك اللهم الخ ذکر کیا اور پھر کہا کہ حدیث میں نماز شروع میں ان کے سوا اور ذکر بھی مروی ہیں اور یہ کئی طرح کا ذکر مباح اختلاف کی قسم کا ہے۔ جونسے ذکر سے نمازی نماز شروع کرے گا، جائز ہوگا۔

اور اس باب میں جس کا عنوان یہ حدیث ہے کہ عورت بدون محرم کے ساتھ لئے سفر نہ کرے۔ کہا ہے کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عورت کو حج کرنا لازم نہیں۔ اس صورت میں کہ اس کو کوئی مرد محرم ایسا میسر نہ ہو کہ عورت مذکورہ کے ہمراہ جاوے اور نخعی اور حسن بصری کا یہ قول ہے اور ثوری و احمد و اسحٰق اور اصحاب رائے بھی اس کے قائل ہیں اور کچھ علماء اس طرف گئے ہیں کہ اس عورت کو عورتوں کے ساتھ سفر کرنا حج کے لئے لازم ہے اور امام مالک اور شافعیؒ کا یہی قول ہے اور قول اول اولیٰ ہے بوجہ موافقت ظاہر حدیث کے۔ نیز بغوی نے حدیث بروع[60] بنت واشق کے بارے میں ذکر کیا کہ امام شافعیؒ نے کہا ہے کہ اگر حدیث بروع بنت واشق کی ثابت ہے تو کسی کے قول میں بجز پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حجت نہیں۔ اس حدیث کی سند میں اضطراب ہے کہ راوی کبھی کہتا ہے معقل بن یسار سے اور کبھی معقل بن سنان سے اور کبھی بعض اشجع سے اور اگر حدیث مذکور ثابت نہیں تو ایسی عورت کو مہر نہ ملے گا۔ ترکہ شوہر سے میراث پاوے گی۔ بغوی کا قول تمام ہوا۔

اور حاکم نے اول قول امام شافعی کا نقل کیا کہ اگر حدیث بروع بنت واشق کی صحیح ہو تو میں اس کا قائل ہو جاؤں۔ اس کے بعد کہا کہ میرے بعض اساتذہ نے کہا تھا کہ اگر میں امام شافعی کے پاس ہوتا تو ان کے شاگردوں کے مجمع کے سامنے کھڑا ہو کر ان سے کہتا کہ حدیث بروع کی صحیح ہو چکی اب اس کے قائل ہو جائیے۔ حاکم کا قول ختم ہوا اور اسی طرح امام شافعی نے بریدہ[61] اسلمی کی حدیث میں توقف کیا جو نماز کے اوقات کے بارے میں ہے اور حدیث مذکورہ مسلم کے نزدیک صحیح ٹھہری۔ اس لئے بہت سے محدثین کی جماعتوں نے توقف سے رجوع کیا اور اسی طرح کسم کے رنگنے میں بیہقی نے امام شافعی پر عبداللہ بن عمروؓ کی حدیث[62] سے اعتراض کیا ہے اور امام غزالی نے امام شافعی پر پانی کی ناپاکی کے مسئلہ میں جبکہ قلتین سے کم ہو ایک بڑی تقریر میں اعتراض کیا ہے۔ وہ تقریر ''احیاء العلوم'' میں[63] مذکور ہے اور نووی نے اس

مسئلہ کی دلیل لکھی کہ بیع معاطاۃ یعنی بدون ایجاب وقبول زبان کے قیمت بائع کو دینا اور اس سے چیز لے لینا جائز ہے باوجودیکہ جواز تصریح امام شافعی کے خلاف ہو اور زمخشری نے امام ابوحنیفہ پر بعض مسائل میں اعتراض کیا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ذکر کیا ہے کہ سورۂ مائدہ کی آیت تیمّم کی تفسیر میں زجاج نے کہا ہے کہ صعید سے غرض سطح زمین ہے خواہ خاک ہو یا دوسری چیز اگرچہ پتھر ہو جس پر خاک نہ ہو تو اگر تیمّم کنندہ پتھر پر ہاتھ مار کر منہ اور ہاتھوں پر مسح کرے گا تو یہ مسح اس کا پاک کنندہ یعنی تیمم ہو جائے گا اور یہ مذہب امام ابوحنیفہ کا ہے۔ پس اگر تم ان سے یوں کہو کہ یہ آیہ سورۂ مائدہ میں تو فامسحوا[64] بوجوهكم وايديكم منه ہے اور منہ سے غرض یہ ہے کہ کچھ اس میں سے تو یہاں کیا کرو گے کیونکہ یہ صورت اس پتھر میں جس پر خاک نہ ہو بن نہیں پڑتی تو ہم یہ جواب دیں گے کہ علماء نے کہا ہے کہ من بمعنی بعض نہیں بلکہ ابتداء غایت کے لئے ہے۔ اب اگر یہ کہو کہ علماء کا من کو ابتداء غایت کے لئے کہنا ضعیف قول ہے۔ عرب کے ایسے محاورہ سے کہ مثلاً بولین مسحت براسى من الذهن ومن التراب ومن الماء یہی معنی سمجھ میں آتے ہیں کہ میں نے اپنے سر میں ان اشیاء میں سے کچھ ملا یعنی من بمعنی بعض سمجھا جاتا ہے تو ہم کہیں گے کہ جیسا تم کہتے ہو درست ہے اور حق بات کو مان لینا جھگڑے کی نسبت بہتر ہے۔ تمام ہوئی تقریر زمخشری کی اور علماء کی اس قسم کی گرفتیں اپنے اماموں پر خصوص محدثوں کی گرفتیں حد شمار سے زیادہ ہیں اور مجھ سے میرے استاد علامہ ابوطاہر شافعی نے اپنے استاد شیخ حسن عجیمی حنفی سے نقل کی کہ وہ ہم کو فرماتے کہ ہم اپنی عورتوں پر تھوڑی سی نجاست کے بارے میں تشدد نہ کریں کہ اس بارے میں امام ابوحنیفہ کا مذہب اختیار کریں کہ نجاست درم سے کمتر معاف ہے اور ہمارے استاد ابوطاہر شیخ حسن کے اس قول کو پسند کرتے تھے اور اسی پر عامل تھے۔ ''انوار'' میں مذکور ہے کہ اجتہاد کی لیاقت کئی باتوں کے جاننے پر منحصر ہے۔ اول قرآن شریف کا جاننا اور سارے قرآن کا جاننا شرط نہیں بلکہ جس قدر احکام سے متعلق ہے اور نہ یہ شرط ہے کہ نوک زبان یاد کرلے۔ دوسرے حدیث رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی جو متعلق احکام ہے سب کا جاننا شرط نہیں اور شرط ہے کہ دونوں یعنی قرآن اور حدیث کے خاص اور عام مطلق اور مقید اور مجمل اور مبین اور ناسخ اور منسوخ کو جانے اور حدیث کے اقسام متواتر[65] اور آحاد اور مرسل اور مسند اور متصل اور منقطع سے اور نیز راویوں کے حالات سے بلحاظ مطعون اور صادق ہونے کے واقف ہو۔ تیسرے صحابہ اور ان کے بعد کے علماء کے اقوال کا جاننا اس اعتبار سے کہ کونسا قول اجماعی ہے اور کونسا اختلاقی۔ چوتھے قیاس ہے کہ اس کے ظاہر اور خفی کو جانے اور صحیح کو فاسد سے جدا کرنا پہچانے۔ پانچویں زبان عرب کا جاننا بلحاظ لغت اور ترکیب کے اور ان سب علوم میں نہایت درجہ کا ماہر ہونا شرط نہیں بلکہ ان میں سے مقدار شائستہ کا جاننا کافی ہے اور نہ یہ حاجت ہے کہ سب احادیث متفرق کی جستجو کرے بلکہ اس کے پاس ایسی کتاب صحیح کا ہونا کافی ہے جو احکام کی حدیثوں کو حاوی ہو۔ مثلاً سنن ترمذی اور نسائی اور ان کے سوا جیسے ابوداؤد ہے اور نہ یہ شرط ہے کہ اجماع اور اختلاف کی سب جگہوں کو لکھ لے بلکہ یہ کافی ہے کہ جس مسئلہ میں حکم کرے اس میں یہ جان لے کہ میرا قول اجماع کے مخالف نہیں۔ اس طرح پر کہ معلوم کرلے کہ میرا قول بعض متقدمین کے قول کے موافق پڑا یا اس کے گمان پر غالب ہو کہ پہلے لوگوں نے اس مسئلہ میں کلام نہیں کیا بلکہ یہ واقعہ میرے ہی زمانہ میں پیدا ہوا ہے اور اسی طرح ناسخ اور منسوخ کے جاننے کا حال ہے کہ سب کا ضبط کرنا شرط نہیں اور جس حدیث کے قبول کرنے پر سلف نے اجماع کیا ہو اور اس کے راویوں کا عادل ہونا درجہ تواتر کو پہنچ گیا ہو تو اس کے راویوں کی عدالت

میں اب کرید کرنے کی حاجت نہیں اور اس قسم کے سوا کی حدیث کے راویوں کی عدالت تحقیق کی جائے اور ان علوم پنجگانہ کا اجتماع صرف ایسے مجتہد مطلق میں شرط ہے کہ شریعت کے تمام ابواب میں فتویٰ دے اور ہوسکتا ہے کہ کسی باب میں مجتہد ہو کسی میں نہ ہو اور ایک شرط اجتہاد اصول اعتقاد کا جاننا ہے۔ امام غزالی نے کہا ہے کہ اعتقاد کا جاننا متکلمون کے طور پر شرط نہیں کہ ہر ایک عقیدہ کی دلیل لکھتے ہیں اور بدعتیوں میں سے ایسے شخص کو قاضی کرنا درست نہیں جس کی گواہی مقبول نہ ہو اور علی ہذا القیاس۔ ایسے کو قاضی کرنا جو اجماع کا قائل نہ ہو جیسے فرقہ خارجیوں کا یا آحاد حدیثوں کا قائل نہ ہو جیسے فرقہ قدریہ ہے یا قیاس کا منکر ہو جیسے رافضی ہیں اور نیز ''انوار'' میں ہے کہ یہ شرط نہیں کہ مجتہد کا کوئی مذہب قلمبند ہو اور جب مذاہب لکھے گئے تو مقلد کو جائز ہے کہ ایک مذہب سے دوسرے کی طرف چلا جائے اور اصولیوں کے نزدیک کسی معاملہ میں اگر ایک مذہب کے بموجب عمل کر چکا ہے تو اس معاملہ میں انتقال دوسرے مذہب کی طرف جائز نہیں۔ اس کے سوا دوسرے معاملہ میں درست ہے اور اگر اول مذہب کے بموجب اس معاملہ میں عمل نہیں کیا تو اس میں اور دوسرے معاملہ میں دونوں میں انتقال جائز ہے اور اگر چند مسائل میں ایک امام کی تقلید کی اور چند دوسروں میں دوسرے امام کی تو درست ہے اور اصولیوں کے نزدیک درست نہیں اور اگر ہر مذہب میں سے زیادہ آسان اختیار کیا تو ابواسحٰق کہتے ہیں کہ ایسا شخص فاسق ہو جاتا ہے اور ابن ابی ہریرہ نے کہا ہے کہ فاسق نہیں ہوتا اور بعض شرحوں میں اسی قول کو ترجیح دی ہے اور یہ بھی ''انوار'' میں ہے جو لوگ منسوب ہیں امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کے اور امام مالک اور امام احمد کے مذہب کی طرف وہ چند قسم ہیں۔ اول عوام اور ان کا تقلید کرنا مثلاً امام شافعی کے کسی مجتہد منتسب کی تقلید کرنے سے پیدا ہوتا ہے دوسرے وہ لوگ جو اجتہاد کے رتبہ کو پہنچے ہوئے ہوں اور مجتہد دوسرے مجتہد کی تقلید نہیں کرتا تو ایسے لوگ جو شافعی مثلاً کہلاتے ہیں صرف اس وجہ سے کہ امام شافعی کے طریق پر اجتہاد کرنے اور دلیلوں کے استعمال میں لانے اور بعض دلیلوں کو بعض پر مرتب کرنے میں ان کے قدم بقدم چلتے ہیں۔

قسم سوم بیچ کے درجہ کے لوگ کہ درجہ اجتہاد کو نہیں پہنچے لیکن امام کے قواعد سے واقف ہیں اور اس بات پر قادر ہیں کہ جس مسئلہ میں حکم مصرح امام کا نہ پاویں اس کو اس مسئلہ پر قیاس کرلیں جس میں امام نے حکم صریح کیا ہے تو یہ لوگ امام کے مقلد ہیں اور اسی طرح عوام میں سے وہ لوگ جو ان کے قول پر عمل کریں اور مشہور یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی بذات خود تقلید نہیں کی جاتی کیونکہ وہ خود مقلد ہیں اور ابوالفتح ہروی نے جو امام اعظم کے تلامذہ میں سے ہے، کہا ہے کہ اکثر ہمارے ائمہ کا مذہب اصول میں یہ ہے کہ عامی کوئی مذہب نہیں رکھتا۔ تو اگر کسی مجتہد کو پاوے تو اس کی تقلید کرلے اور اگر مجتہد میسر نہ ہو اور کوئی عالم زبردست مذہب میں مل جاوے تو اس کی تقلید کرلے کیونکہ وہ اس کو اپنے خود کے مذہب پر فتویٰ دے گا اور یہ تقریر صاف کہتی ہے کہ عالم نہایت ماہر کی خود کی تقلید کی جاتی ہے اور قول راجح فقہا کے نزدیک یہ ہے کہ جو عامی کسی مذہب کی طرف منسوب نہ ہو اس کا مذہب وہی ہوتا ہے اور اس کو مخالفت کرنی اس مذہب کی جائز نہیں اور اگر عامی کسی مذہب کی طرف منسوب نہ ہو تو یہاں یہ سوال ہے کہ اس کو جائز ہے یا نہیں کہ جس مذہب کو چاہے پسند کر کے اس کی تقلید کرے۔ اس سوال کے جواب میں خلاف اس بنا پر ہے کہ عامی کے ذمہ تقلید مذہب متعین کی لازم ہے یا نہیں۔ اس باب میں دو صورتیں ہیں۔ نووی نے کہا ہے کہ دلیل تو اس بات کو چاہتی ہے کہ اس کے ذمہ لازم نہیں بلکہ جس سے چاہے اور جو ملے فتویٰ پوچھ لے بدون اس کے کہ

رخصتیں چھانٹے[66] اور ''فتح القدیر'' کی کتاب آداب القاضی میں ہے کہ معلوم کرنا چاہیے کہ مصنف نے جو امور قاضی کے حق میں بیان کیے وہی مفتی کے بارے میں ذکر کیے۔ اس سے یہ نکلا کہ مجتہدوں کے سوا کوئی فتویٰ نہ دے اور اصولیوں کی رائے اس بات پر جم گئی ہے کہ مفتی مجتہد ہی ہوتا ہے اور اگر کوئی شخص مجتہد نہ ہو اور مجتہد کے اقوال یاد کر لے تو وہ مفتی نہ ہوگا اور جب اس سے سوال پوچھا جائے تو اس پر واجب ہے کہ جواب میں مجتہد کا قول بطور حکایت ذکر کرے جیسے ابوحنیفہ کا قول مثلاً بیان کر دے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو فتویٰ ہمارے زمانے کے موجود علماء کا ہوتا ہے وہ فتویٰ واقعی نہیں بلکہ مفتی مجتہد کے کلام کی نقل ہے تاکہ فتویٰ دریافت کرنے والا اس کے بموجب عمل کرے اور فتویٰ دہندہ کے مجتہد کے قول کو ہمیشہ نقل کرنے کا طور دو باتوں میں سے ایک ہوتی ہے یا تو مفتی کے پاس کوئی سند مجتہد تک اس بارہ میں ہوتی ہے یا اس قول کو کسی کتاب مشہور لوگوں میں رائج سے نقل کرتا ہے۔ مثلاً کتابیں امام محمد بن حسن کی اور ان کے سوا اور مجتہدوں کی ویسی ہی مشہور تصنیفیں کہ یہ کتابیں ان لوگوں سے بجائے خبر متواتر یا مشہور کے ہیں۔ ایسا ہی ذکر کیا ہے رازی نے پس اس بنا پر اگر کوئی نسخہ ''نوادر'' کا ہمارے زمانے میں مل جاوے تو اس کے مضمون کو امام محمد یا امام ابو یوسف کی طرف منسوب کرنا حلال نہ ہوگا کیونکہ وہ کتاب نہ ہمارے زمانہ میں ہمارے شہروں میں مشہور ہوئی اور نہ ہمارے ہاتھوں پڑی۔ ہاں اگر کوئی مسئلہ کتاب ''نوادر'' کا کسی کتاب مشہور اور مروج میں منقول ملے مثلاً ''ہدایہ'' اور ''مبسوط'' میں مذکور ہو تو اس صورت میں کتاب مذکور پر اعتماد ہوگا اور اگر فتویٰ دہندہ مجتہدوں کے اقوال مختلف مسئلہ میں یاد رکھتا ہو اور حجت کسی قول کی نہیں جانتا اور نہ اجتہاد پر قادر ہے کہ کسی قول کو ترجیح دے تو اس صورت میں کسی قول پر یقین نہ کرے اور نہ کسی کے بموجب فتویٰ دے بلکہ سب اقوال کو فتویٰ خواہندہ کے لئے نقل کر دے کہ وہ ان میں سے ایسا قول چھانٹ لے جو اس کے دل میں صواب تر معلوم ہو۔ اس کو بعض جوامع کتابوں میں ذکر کیا ہے اور میرے نزدیک یہ ہے کہ اس پر سب اقوال کا نقل کرنا واجب نہیں بلکہ اس کو کافی ہے کہ صرف ایک قول کو سب اقوال میں سے نقل کر دے اور مقلد فتویٰ خواہندہ کو اختیار ہے کہ جس مجتہد کی چاہے تقلید کرے تو جب فتویٰ دہندہ ایک مجتہد کا ذکر کرے گا اور فتویٰ خواہندہ اس کی تقلید کرے گا تو مطلب حاصل ہو جائے گا۔ ہاں ایک قول کو قطعی طور پر فتویٰ خواہندہ کے سامنے نہ کہے کہ تیرے سوال کا جواب قطعاً یہ ہے بلکہ یوں کہے کہ مثلاً امام ابوحنیفہ نے کہا ہے کہ اس مسئلہ کا حکم یہ ہے البتہ جس صورت میں کہ سب اقوال کو نقل کر دے تو فتویٰ خواہندہ کو اسی قول پر عمل کرنا بہتر ہے جو اس کے دل میں زیادہ صواب معلوم ہو اور عامی کا کچھ اعتبار نہیں کہ اس کے دل میں حکم کا صواب ہونا اور خطا ہونا برابر ہے اور اس بنا پر اگر عامی نے دو عالموں یعنی مجتہدوں سے فتویٰ پوچھا اور دونوں نے جواب مختلف دیا تو بہتر یہ ہے کہ عامی مذکور اس شخص کا قول اختیار کرے جس کی طرف دونوں میں سے اس کا دل میل کرے اور میرے نزدیک اگر عامی اس شخص کا قول اختیار کرے جس کی طرف اس کا دل مائل نہیں تب بھی جائز ہے کیونکہ عامی کے دل کا مائل ہونا اور نہ ہونا یکساں ہے۔ اس پر تو مجتہد کی تقلید واجب ہے، وہ کر چکا۔ وہ مجتہد صواب پر ہو یا خطا پر اور فقہاء نے کہا ہے کہ ایک مذہب سے دوسرے میں جانے والا اجتہاد اور دلیل کے ساتھ گنہگار ہے اور قابل سزا اور اجتہاد اور دلیل سے پہلے جانے والا بطریق اولیٰ گنہگار ہوگا اور ضرور ہے کہ اس اجتہاد سے انکل اور دل کی پختگی مراد لی جاوے کیونکہ عامی تو اجتہاد کہتا ہی نہیں۔ پھر یہ انتقال مذہب موجب گناہ و تعزیر واقع میں صرف اس مسئلہ خاص کے حکم میں ثابت ہوتا ہے جس میں تقلید کر کے اس حکم پر عمل کر لیا ہو ورنہ مقلد کا یوں کہنا کہ میں نے مثلاً امام ابوحنیفہ کی تقلید ان مسائل میں کر لی جن میں

انہوں نے فتویٰ دیا ہے اوران کے فتویٰ کے بموجب عمل کرنا اپنے ذمہ مجمل طور پرلازم کرلیا حالانکہ مسائل کی صورتیں اس کو معلوم نہیں واقع میں تقلید نہیں بلکہ یہ قول زبانی حقیقت میں تقلید کومشروط کرنا یا تقلید کا وعدہ کرنا ہے۔ گویا اس نے اس بات کا التزام کرلیا کہ جو مسائل معین واقعات، میں مجھ کو پیش آویں گے ان میں امام ابوحنیفہ کے قول پرعمل کروں گا تو اگر فقہاء نے لزوم مذاہب معین سے یہی التزام مراد لیا ہے تو ایک مجتہد معین کے اتباع کے واجب ہونے پر کوئی دلیل نہیں جس سے زبانی یا نیت میں شرعاً اس اتباع کو مقلد اپنے ذمہ لازم کرلے بلکہ دلیل اور مجتہد کے قول پرعمل کرنے کا موجب ان مسائل میں کہ آدمی کو حاجت پڑے۔ یہ ارشاد خداوندی ہے۔ فاسئلوا[67] اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون......اور سوال جبھی ہوگا کہ کسی معین واقعہ میں حکم کی ضرورت ہو اور اس صورت میں جب جوئندہ کے نزدیک مجتہد کا قول ثابت ہوگا۔ تو اس کے بموجب عمل کرنا اس پر واجب ہوگا۔ غالباً ان جیسی لازم کرنے کی چیزیں فقہا کی طرف سے اس غرض سے ہوئیں کہ لوگ رخصتوں کی جستجو سے رکے رہیں ورنہ عامی کے حق میں ہر مسئلہ میں کسی مجتہد کے قول پرعمل کرلینا اس پر بہت سہل ہے اور ہم کو[68] معلوم نہیں کہ دلیل نقلی یا عقلی میں سے اس امر کا کون مانع ہو یعنی اگر انسان کسی مجتہد کے جس کو اجتہاد جائز ہو ایسے قول کی جستجو کرے کہ اس کے نفس پر سہل تر ہو تو ہم کو معلوم نہیں کہ شرع نے اس امر پر اس کی برائی کی ہو حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جو باتیں آپ کی امت پر سہولت کی ہوں انہیں کو دوست رکھتے تھے اور امر صواب کو خدائے پاک زیادہ جانتا ہے۔ تمام ہوا کلام "فتح القدیر" کا اور یہ آخری اس مضمون کا جس کو ہم نے اس رسالہ میں بیان کرنا چاہا اور خدا ہی کو سب تعریفیں زیبا ہیں۔ ابتدا میں اور انتہا میں۔

✦ ..... ✦ ..... ✦

حواشی

(1) مؤلف نے تعریف اجتہاد کی ذیل میں لکھی ہے۔ تقلید کی نہیں لکھی۔ اس کو ہم لکھتے ہیں کہ دوسرے کے قول یا فعل کی پیروی بدون دلیل کے دیکھے۔ اس خیال سے کرنی کہ وہ حق پر ہے تقلید کہلاتی ہے۔ مؤلف نے اس رسالہ میں پانچ باب لکھے ہیں۔ مترجم نے لفظ شمار ہر ایک پر زائد کردیا ہے۔

(2) نظر کے معنی اصطلاحی یہ ہیں کہ قیاس کے مقدمات کو ایسی ترتیب سے رکھنا کہ نتیجہ صحیح حاصل ہو۔

(3) حاصل مؤلف کے قول کا یہ ہے کہ فقہ اجتہاد کی شرط نہیں اور مراد امام غزالی کے کلام کی یہ ہے کہ سلف کے اقوال جو ابواب فقہ کے اندر ہیں، ان کا جاننا تکمیل اجتہاد کے لئے ضرور ہے۔

(4) ناسخ وہ آیت یا حدیث جس سے کوئی حکم سابق موقوف ہو یا بدل جاوے اور منسوخ وہ حکم کہ موقوف ہو یا بدل جاوے۔

(5) مجمل وہ کلام جس میں بہت معانی بدون ترجیح کیے بعد دیگر پائے جاویں اور بدون دریافت کے صرف لفظوں سے معلوم نہ ہوں اور مفسر وہ کلام جس کے معنی مقصود ایسے ظاہر ہوں کہ احتمال تاویل اور تخصیص کا جائز نہ رہے۔

(6) وہ لفظ کہ معنی مفرد اور معین کے لئے موضوع ہو اور عام وہ لفظ جس کے معنی میں افراد متفق الحدود پائے جائیں۔

(7) محکم وہ کلام ہے جس کے معنی مقصود پختہ طور پر ہوں کہ احتمال نسخ اور تبدیل کا نہ ہو اور متشابہ وہ کلام جس کے معنی معلوم ہونے کی

امید موقوف اور منقطع ہو جاوے۔

(8) کراہت کے معنی شرعاً کسی چیز کا ناپسند ہونا اور تحریم کے معنی دلیل قطعی سے ممنوع ہونا کسی کام کا۔

(9) اباحت کے معنی مباح ہونا یعنی کسی کام کو کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر ہونے اور استحباب کے معنی کسی کام کا علماء کے نزدیک اچھا ہونا اور وجوب کے معنی کسی کام میں دلیل قطعی سے ضروری ہونا۔

(10) حدیث صحیح وہ جس کے متن اور سند میں کوئی عیب نہ ہو۔

(11) ضعیف وہ حدیث ہے جس کے راویوں میں خلل ہو۔

(12) مسند وہ حدیث جس کی سند میں سب راوی مذکور ہوں، کوئی چھوٹ نہ گیا ہو۔

(13) مرسل وہ حدیث ہے جس کی سند میں صحابی مذکور نہ ہو، تابعی کہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

(14) یہ دلیل عقلی گنہگار نہ ہونے کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دلیل اجتہاد سے پہلے ہے کہ مجتہد اس کو ڈھونڈ کر حکم لگاوے اور دلالت خطا ہو جانے کے حکم کے بعد ہوئی۔ وہ مجتہد کے اختیار سے باہر ہے۔

(15) اور جو لوگ حکم نہ کریں خدا کے اتارے کے بموجب وہی ہیں بدکار۔

(16) حاصل اس جواب کا یہ ہے کہ بموجب حدیث کے خطا اور بھول اس امت کی معاف ہے اور حکم آیہ دانستہ خلاف قرآن حکم کرنے کے بارہ میں ہے۔

(17) مؤلف کے نزدیک بیضاوی کا یہ کہنا کہ مجتہد ایک ہی برصواب ہوتا ہے کلیہ کے طور پر درست نہیں۔ اس لئے اس کے ہر جملہ کو رد کر کے انجام کو تحقیق بیان کیا کہ بعض صورتوں میں دونوں برصواب ہوتے ہیں بعض میں ایک۔

(18) حاصل اس دلیل کا یہ ہے کہ اجتہاد امر تعبدی ہے اور امر تعبدی میں خطا ہو جانی گناہ نہیں ہے۔ اٹکل سے قبلہ کی طرف نماز پڑھی پھر خطا معلوم ہوئی تو نماز جاتی رہے گی۔

(19) کفارہ مزین بردہ آزاد کرنا اور روزہ دار اور مساکین کو کھانا کھلانا اور ہر ایک واجب ہے مگر ایک ہو تو دوسرا واجب نہیں رہتا۔

(20) عزیمت حکم اصلی کا عوارض کی جہت ہو اس کی چار قسمیں ہیں۔

(21) رخصت شروع ہے کہ عوارض کی طرف سے مباح ہو مثلاً رمضان کے افطار مرض کا اور سفر کی جہت سے۔

(22) جب کسی اصل سے جس کا ذکر قرآن یا حدیث میں ہے فرع میں حکم لگانا چاہتے ہیں تو دونوں میں کوئی وصف مشترک دیکھ کر حکم کی علت ٹھہراتے ہیں۔ یہ علت مناط کہلاتی ہے۔

(23) معنی خاص و عام کے اوپر حاشیہ میں گزرے۔

(24) نص وہ مضمون کہ ظاہر سے بڑھ کر ہو اور جس کے لئے کلام بولا گیا ہو اور ظاہر وہ مضمون کہ سننے والا کلام کے الفاظ سے سمجھے۔

(25) مشہور وہ حدیث ہے کہ اس کا راوی اول طبقہ میں ایک یا دو ہوں مگر پھر کثرت سے راوی ہو گئے ہوں اور غریب اور فرد وہ حدیث ہے کہ کسی طبقہ میں یا ہر طبقہ میں اس کا راوی ایک ہی ہو۔

(26) مطعون ہونا اس طرح کہ بدحافظہ یا بداعتقاد یا بدعتی یا جھوٹا وغیرہ ہے۔

(27) چار اعضاء کے دھونے سے مراد منہ اور ہاتھ پاؤں کا دھونا اور سر کا مسح کرنا ہے۔ مسح کو تغلیباً دھونے میں شامل کر دیا ہے۔

(28) پانی مطلق جس میں کچھ قید نہ ہو اور مقید جس میں کوئی قید لگی ہو جیسے مینہ کا پانی یا کنوئیں وغیرہ کا۔

(29) بضاعہ بضم موحدہ و فتح ضاد معجمہ و عین مہملہ۔ نام ایک کنویں کا ہے مدینہ منورہ میں۔ اس کا قصہ ترمذی میں ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! ہم چاہ بضاعہ سے وضو کریں اور وہ ایسا کنواں ہے کہ

اس میں حیض کے کپڑے اور کتوں کا گوشت اور بدبو کی چیزیں ڈالی جاتی ہیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ پانی کنویں کا پاک ہے۔ کوئی چیز اس کو ناپاک نہیں کرتی اور قصہ قلتین بھی ترمذی وغیرہ نے ابن عمرؓ سے اس طرح روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ اس پانی کا حال کہ جنگل میں ہو اور چار پائے اور درندے اس میں پانی پیتے اور پیشاب گوبر کرتے ہوں، آپؐ نے فرمایا کہ جب پانی بقدر دو قلہ کے ہو تو ناپاک نہیں۔ قلہ بضم قاف و تشدید لام۔ مٹکا ہے جس میں اڑھائی مشک پانی آوے قلتین مقدار پانچ مشک پانی کے ہے۔

(30) اس قصہ میں نسائی نے اسماء بنت ابوبکر صدیقؓ سے روایت کیا ہے۔

(31) اور نہ ڈالو اپنی جان کو ہلاکت میں۔

(32) یعنی جن لوگوں نے نماز عصر میں تاخیر کی اور بنی قریظہ بضم قاف وائے مہملہ مفتوح ایک فرقہ یہود ہے، پر پہنچ کر ادا کی۔ انہوں نے آپ کے ارشاد کے حقیقی معنی پر عمل کیا کہ دوسری جگہ نماز نہ پڑھے اور دوسرے فرقہ سے اس ارشاد کو معنی مجازی پر محمول کیا کہ آپ کا مقصود جلد پہنچانا ہے نہ نماز کی تاخیر اس لئے اثناء راہ میں ادا کرلی اور یہ قصہ بخاری میں مصرح ہے۔

(33) نص اصطلاح اصول میں کئی معنی میں آتی ہے۔ اول عبارت قرآن دوم عبارت حدیث اور یہاں یہی معنی مراد ہیں۔ سوم ایسا مضمون کہ سوق کلام آپ کے لئے ہوا اور الفاظ سے سامع صاف صاف سمجھ لے۔ چہارم تصریح کسی امر کی کرنا۔

(34) یعنی چلو اسی پر جو اتارا گیا ہے تم پر تمہارے رب سے اور نہ چلو اس کے سوا اور رفیقوں کے پیچھے۔

(35) یعنی اور جب کہا جائے ان سے کہ چلو اس پر جو اتارا اللہ نے تو کہتے ہیں، نہیں ہم چلیں گے اس پر جس پر ہم نے دیکھا اپنے باپ دادوں کو۔

(36) یعنی تو خوشخبری سنا میرے بندوں کو جو سنتے ہیں بات اور چلتے راہیں اچھی پر وہی ہیں جن کو راہ دکھایا اللہ نے اور وہی ہیں عقل والے۔

(37) یعنی پھر اگر جھگڑ پڑو کسی چیز میں تو اس کو رجوع کرو اللہ اور رسول کی طرف اگر یقین رکھتے ہو اللہ پر اور پچھلے دن پر۔

(38) دیکھو گذشتہ صفحات

(39) نص سے مراد وہ مضمون جس کے لئے کلام بولا گیا اور اشارہ سے مراد وہ مضمون کہ الفاظ سے بلحاظ لغت سمجھا جائے اس کے لئے کلام بولا نہ گیا ہو۔

(40) پہلے ہم لکھ چکے کہ مفسر وہ کلام ہے جس سے مقصود ایسی طرح ظاہر ہو کہ احتمال تاویل و تخصیص کا نہ رہے اور مبہم وہ کلام جس میں معانی مقصود کا سراغ مفقود ہو۔

(41) ظاہر مذہب اور مختلف روایات کی یہ کتابیں ہیں۔ امام محمد کی مبسوط اور جامع صغیر کبیر۔ زیادات۔

(42) مصرف زکوٰۃ بموجب آیہ **انما الصدقات الفقراء الایہ** کے نو صنف ہیں۔ ان میں سے مؤلفہ قلوب اب مصرف نہیں۔ باقی آٹھ صنفیں رہیں۔ مذہب امام شافعی کا یہ ہے کہ مال زکوٰۃ اسی طرح دے کہ آٹھوں صنفوں کو پہنچے۔ ایک صنف کو دینے سے ان کے نزدیک زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

(43) نوادر ایک کتاب کا نام ہے۔

(44) اس باب میں حدیث وہ ہے کہ ابوداؤد اور ابن ماجہ میں شداد بن اوس سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو پچھنے لگاوے اور جو خون نکلواوے اس کا روزہ جاتا رہتا ہے۔

(45) معنی معتبر یعنی تاویل حدیث کی یہ ہے کہ دونوں کا روزہ قریب ٹوٹنے کے ہو جائے گا۔ پچھنے لگوانے والے کا بوجھ دوسرے کے اور

لگانے والے کا اس وجہ سے شاید سینگیاں چوسنے میں چلا جاوے۔

(46) بیع صرف یعنی مبادلہ نقد کا نقد سے مثلاً چاندی کا سونے سے یا روپیہ کا روپیہ سے اور اس کی چار صورتیں ہیں۔ تین جائز ہیں، ایک ناجائز اور شرط صحت یہ ہے کہ مبادلہ ادھار نہ ہو۔ اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے۔ ادھار میں سب صورتیں حرام ہیں۔ اول صورت یہ ہے کہ دونوں چیزیں دو جنس وزن میں یکساں ہوں جیسے تولہ بھر چاندی کو تولہ بھر سونے سے بدلنا یہ صورت جائز ہے۔ دوسرے یہ کہ دو جنس ہوں اور وزن میں کم وبیش مثلاً تولہ بھر سونے کو دیں تولہ چاندی سے بدلنا یہ بھی جائز ہے۔ تیسری یہ کہ ایک جنس ہوں اور وزن برابر مثلاً روپیہ کو روپیہ بھر چاندی سے بدلنا یہ بھی جائز ہے۔ چوتھی یہ ایک جنس ہوں اور وزن مختلف مثلاً تولہ بھر سونے کو سوا تولے سونے سے بدلنا بصورت جمہور فقہا و محدثین کے نزدیک ناجائز ہے۔ اس کو بعض جائز کہتے ہیں اور جواز سند حدیث اسامہ پیش کرتے ہیں جو صحیحین اور دوسری کتابوں میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بیع ہاتھوں ہاتھ ہو اس میں سود نہیں۔ سود فقط ادھار میں مگر یہ حدیث بالا اجماع متروک العمل ہے۔ یہاں بیع سے صرف یہی چوتھی صورت مراد ہے۔

(47) یعنی ایک نقد کو اسی کے عوض مختلف وزن کے ساتھ فروخت کرنا مثلاً ایک روپیہ کو سوا روپیہ بھر چاندی سے بدلنا چنانچہ گذشتہ حاشیہ میں مفصلاً گزرا۔

(48) کہ اس صورت میں وضو دونوں اماموں کے نزدیک نہ ہوئی۔ امام شافعی کے نزدیک ترتیب نہ ہونے سے اور امام اعظم کے نزدیک بہتا خون نکلنے سے۔

(49) عطف ہے فی الجواز پر یعنی وانا افتار فی الوجوب

(50) یعنی پوچھو یاد رکھنے والوں سے اگر تم نہیں جانتے۔

(51) یہ حدیث مشکوٰۃ میں عمر فاروقؓ سے مروی ہے۔

(52) یعنی کیا دیکھا تو نے اس شخص کو کہ منع کرتا ہے ایک بندہ کو جب وہ نماز پڑھتا ہے۔

(53) کیونکہ اول عبارت سے جائز معلوم ہوتا ہے کہ مقلد بعض مسائل میں دوسرے امام کی تقلید کرلے اور دوسری عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا کرنے سے گنہگار ہوتا ہے۔

(54) دلالت سے یہ غرض ہے کہ الفاظ حدیث کے معنی التزامی سے سمجھا جاوے نہ معنی حقیقی سے۔

(55) سارا جملہ اس کا اس طرح ہے انا وجدنا آباء نا علے امته وانا علی آثارهم مقدرون یعنی ہم نے پایا اپنے باپ دادوں کو ایک دین پر اور ہم انہیں کے قدموں پر چلتے ہیں۔

(56) دیکھو مذکورہ حاشیہ۔

(57) معنی عزیم کے سطور بالا مذکور ہو چکے۔

(58) صورت مسئلہ کی یہ ہے کہ ایک شخص صاحب ترتیب نے مغرب کی نماز پڑھی اور اس کو یاد تھا کہ عصر کی نماز میرے ذمہ ہے۔ پھر بعد مغرب کے عصر کو ادا کیا اور حنفی عالم سے دریافت کیا تو چونکہ ترتیب حنفیوں کے نزدیک واجب ہے، اس لئے دونوں نمازیں مرتب نہ ہونے کی وجہ سے جائز نہ ہوں گی۔ وہ عالم دونوں کے اعادہ کا فتویٰ دے گا اور اس کو دوبارہ پڑھنا لازم ہوگا اور عالم شافعی کے نزدیک ترتیب واجب نہیں۔ اس کی دونوں نمازوں غیر مرتب کو درست بتائے گا اس لئے دوبارہ پڑھنا نہ پڑے گا۔

(59) یعنی مذکورہ بالا ساری تقریر تحفہ کی مذکور ہے۔

(60) بروع بکسر موحدہ وسکون مہملہ وفتح واو مہملہ در آخر واشق واو معجمہ مکسور اس کی حدیث سے یہ غرض ہے کہ اس کے شوہر نے اس کو بے ذکر مہر کے نکاح کیا اور ہنوز ہمبستر نہ ہوا تھا کہ وفات پائی۔ جب ایسا ہی قصہ عبداللہ بن مسعود کے سامنے کسی عورت کا پیش ہوا

تو آپ نے سائلوں کو ایک مہینہ ٹالا کہ اس کا حکم حدیث سے مل جائے۔ آخر کو فرمایا کہ میں اپنی رائے سے کہتا ہوں کہ اس کو مہر مثل پورا اور میراث ملنا چاہیے اور اس پر عدت واجب ہے۔ اس وقت معقل ابن سنان نے کہا کہ آپ کا حکم مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوا کہ بروع بنت واشق کے مقدمہ میں آپ نے یہی حکم فرمایا تھا۔ تب عبداللہ ابن مسعود نے اللہ اکبر کہا اور نہایت خوش ہوئے۔ نسائی نے علقمہ سے اس کو روایت کیا ہے۔

(61) بریدہ بضم موحدہ وفتحہ مہملہ کی حدیث نسائی میں اس طرح مروی ہے کہ بریدہ کہتے ہیں کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے نماز کے اوقات پوچھے۔ آپ نے اس کو ارشاد فرمایا کہ ہمارے پاس دو روز ٹھہر۔ آپ نے ایک روز سب نمازیں اول وقت میں پڑھیں اور دوسرے روز آخر وقت میں۔ پھر سائل کو فرمایا کہ تمہاری نماز کا وقت ان دونوں وقتوں کے درمیان ہے جو تم نے دیکھے۔

(62) اس حدیث کو نسائی نے عبداللہ بن عمرو سے اس طرح روایت کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور میرے تن پر دو کپڑے کسم کے رنگے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ لباس کافروں کا ہے اس کو مت پہن اور امام شافعی کسم کا رنگا جائز قرار دیتے ہیں۔

(63) خلاصہ ان کی تقریر کا یہ ہے کہ جب قلتین میں نجاست رقیق مثل پیشاب کے گرے اور سارے پانی میں مل جاوے اور اس میں سے کوئی آبخورہ بھرنا چاہے تو کچھ اجزاء نجاست کے اس آبخورہ میں ضرور آئیں گے تو چاہیے کہ پانی ناپاک ہو اور تم اس کو پاک کہتے ہو۔ قلتین کی مقدار مقرر کرنی عبث ہوئی۔

(64) یعنی ملوا اپنے چہروں اور ہاتھوں پر اس میں سے۔

(65) مواتر وہ حدیث جس کے راوی اول طبقہ میں اس کثرت سے ہوں کہ ان کا اجتماع جھوٹ پر ناممکن ہو اور آحادہ حدیثیں جن کے راوی اول طبقہ میں ایک ہوں اور مرسل اور مسند کا بیان پہلے گزر چکا اور متصل وہ حدیث جس کی سند میں سب راوی مذکور ہوں۔ اول سے آخر تک اور مقطع وہ حدیث جس کی سند میں سے کوئی راوی رہ گیا ہو۔

(66) ایک قلمی نسخہ میں انجام اس رسالہ کا اسی لفظ پر ہے۔ ''فتح القدیر'' کی عبارت آخر کتاب تک اس میں نہیں۔ نہ معلوم خود مؤلف نے بعد کو بڑھایا یا کسی اور نے۔

(67) یعنی پوچھو یاد رکھنے والوں سے اگر تم نہیں جانتے۔

(68) مترجم کہتا ہے کہ اتنا تو سب کو معلوم ہے کہ احکام شرعیہ کو تکلیف کہتے ہیں۔ پس اگر مقصود عامی کا شتر بے مہار رکھنا ہوتا تو ان احکام کا نام تخفیف ہوتا نہ تکلیف۔

(سلک مروارید ترجمہ عقد الجید۔ دہلی: مطبع مجتبائی، 1344ھ۔ عربی متن کو شامل نہیں کیا گیا)

احمد خان

شاہ ولی اللہ کی ''فتح الرحمٰن'' کا ایک نادر قلمی نسخہ

شاہ ولی اللہ دہلوی کی دینی خدمات خصوصاً اسلام کو منقح شکل میں پیش کرنے کی سعی و کوشش سے ہر شخص واقف ہے۔ آپ کی سوانح حیات اور کارناموں سے متعلق کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ آپ کے خیالات، نظریات اور تعلیمات پر متعدد علماء نے روشنی ڈالی ہے۔ موجودہ تحریر میں ان کی ایک کتاب جو ''فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن'' ہے، کے ایک نادر قلمی نسخے کا تعارف پیش کرنا مقصود ہے۔ اس نسخے پر روایت کی اجازت خود شاہ ولی اللہ کی تحریر کردہ ہے۔ ان کی یہ تالیف ان کے سامنے پڑھی گئی اور پڑھنے والے کو شاہ صاحب نے باقاعدہ روایت کی اجازت دی۔

شاہ ولی اللہ کی تمام تالیفات چھپ چکی ہیں۔ ان کی حیات ہی میں ان کی تالیفات کو مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔ ان تالیفات میں ترجمۂ قرآن کی ایک ممتاز حیثیت ہے کیونکہ شاہ صاحب ہی وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے اہل ہند کو قرآن کے ترجمے سے روشناس کرایا۔ یہ ترجمہ 1151ھ میں مکمل ہوا اور 1156ء میں اس کی تدریس کا باقاعدہ سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ اس ترجمے کے ساتھ جو تشریحی نوٹ ہیں، وہ بہت ہی اہم ہیں جن کے بارے میں مولانا عبید اللہ سندھی نے یوں تحریر فرمایا ہے:

> ''آپ نے ترجمہ کے ساتھ مختصر طور پر جو تشریحی فوائد لکھے ہیں ان کی اہمیت میں یورپ میں جا کر سمجھ سکا ہوں۔''

قرآن کے ترجمے کے بارے میں مولانا سندھی فرماتے ہیں:

> ''قرآن عظیم کا مذکورہ ترجمہ میرے نزدیک ایک ہندوستانی کے لئے تمام تفاسیر سے بہتر کتاب ہے۔''(1)

طالبان علم کسب فیض کے لئے دور دراز کے علاقوں سے چل کر شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ طریقہ یہ تھا کہ طلبہ اپنے قلم سے خود لکھ کر یا کسی کاتب سے لکھوا کر کتابیں شاہ صاحب کے پاس لے جاتے اور ان کے سامنے اس کا کچھ حصہ یا پوری کتاب پڑھتے۔ شاہ صاحب غلط مقامات کی تصحیح فرما دیتے۔ کوئی نکتہ ذہن میں آتا تو دوران تعلیم وہ بھی فرما دیتے۔ ایسے نکتے طالب علم اپنی کتاب کے حاشیہ پر افادات کی شکل میں لکھ لیتے تھے۔ خود اپنی جن تالیفات کی روایت مقصود ہوتی شاہ صاحب ان کو نہایت اہتمام سے سنتے۔ ان کے ایک ایک لفظ کو درست کراتے اور ان کے

مشتملات کے ضمن میں اگر کوئی بات اس وقت ذہن میں آتی تو اضافہ فرمادیتے تھے۔ چنانچہ ہر مصنف کی طرح ان کی بھی یہی کوشش ہوتی تھی کہ ان کی ہر کتاب کامل ترین صورت میں عوام کے سامنے آئے۔ شاہ صاحب نے اپنی اس تالیف کو بھی عمر کے آخری سالوں میں مکمل ترین صورت میں تحریر کرانے کی سعی کی ہے۔

شاہ صاحب کے شاگردوں کی تعداد شمار سے باہر ہے۔ پورے عالم اسلام کے اس وقت کے علماء نے آپ سے استفادہ کیا ہے۔ آپ کے شاگردوں میں بعض تو خود جید قسم کے عالم ہوگزرے ہیں۔ ایک صاحب نور شاہ نامی اکتساب علم کے لئے شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے غالباً دوسری کتابوں کے علاوہ ''فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن'' بھی ان سے پڑھا ہے۔ قاعدے کے مطابق شاہ صاحب نے اس نسخے سے کچھ حصہ سنا اور پھر پوری کتاب کی روایت کی انہیں اجازت دیدی۔ یہ اجازت نورشاہ صاحب کے مملوکہ نسخہ پر بھی تحریر کردی ہے۔ ''فتح الرحمٰن'' کا یہ نسخہ مختلف ہاتھوں سے گزرتا ہوا حال ہی میں ادارہ تحقیقات اسلامی کے کتب خانے میں پہنچا ہے۔

اس نسخہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے خود اس کو سنا ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ نورشاہ صاحب نے ان نکات کو بھی کتاب کے حاشیہ پر درج کردیا ہے جو دوران سماعت شاہ صاحب نے فرمائے۔ ''فتح الرحمٰن'' مطبوعہ میرٹھ 1285ھ سے میں نے اس نسخے کا مقابلہ کرکے دیکھا ہے۔ کئی نکات میں اضافہ ہے اور کئی نکات تو بالکل نئے اور خاصے طویل ہیں۔ بدیں وجہ یہ نسخہ بہت زیادہ قدر و قیمت کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ یہ تحریر شاہ ولی اللہ کی زندگی کے آخری حصہ کی ہے، اس لئے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

اس نسخے میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ نورشاہ صاحب نے جو توضیحات حاشیے پر لکھی ہیں، ان کو کسی صاحب نے سلسلہ وار یکجا کرکے بطور ضمیمہ آخر میں لگا دیا ہے۔ ان کو ایک جگہ جمع کرنے کا ایک خاص مقصد تھا جسے ابتداء میں جامع نے یوں واضح کیا ہے:

> ''باید دانست کہ در ہامش مسودہ ایں ترجمہ حواشی چند نوشتہ بودند۔ بعض مبین توجیہہ کہ ترجمہ مبنی بر آنست و شاہد وجہ از وجودہ تفسیر کہ در ترجمہ اختیار کردہ شد و بعض تنبیہ بر تفردات و ترجیحات حقیر و بحسب اتفاق بعضے آن حواشی بزبان عربی بود و بعضے بزبان فارسی۔ چوں ایں ترجمہ مبیض گشت بخاطر مستحسن نمود کہ آن حواشی را کہ در ذیل ایں نسخہ بہماں عبارت کہ درست نوشتہ شود تا ناظر در ج ترجمہ آں فوائد رانیز دریابد۔''

اس عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ ان حواشی کو اس نسخے کی ذیل بنانے میں کئی فوائد پیش نظر تھے۔ بعض کا تعلق شاہ ولی اللہ کے خیالات یا تفسیری نکات سے ہے اور بعض متفرق امور پر تنبیہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان میں سے بعض عربی زبان میں ہیں اور بعض فارسی میں۔ ان سب کو یکجا اس لئے کردیا گیا تا کہ ترجمہ دیکھنے والے ان فوائد کو بھی ایک نظر میں دیکھ سکیں۔

اٹھارہ صفحات پر مشتمل یہ نکات نورشاہ صاحب کے ہاتھ کی تحریر نظر نہیں آتے کیونکہ حاشیے پر لکھی ہوئی ان

کی تحریر سے یہ تحریر ذرا مختلف ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انہی کے ہوں، حاشیہ پر جلدی کی وجہ سے شکستہ حالت میں لکھے گئے ہوں بعد میں ٹھہر ٹھہر کر نقل کیا ہوگا، اس لئے خط میں فرق ہو گیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے کسی اور شخص سے لکھوا کر شامل کر دیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ نسخہ نور شاہ صاحب سے جب کسی اور شخص کے پاس منتقل ہوا ہو تو اس نے خود لکھ کر یا کسی سے لکھوا کر یہاں لگا دیا ہو۔ بہر حال جس کسی نے ایسا کیا ہے، اس نے ترجمے کے ساتھ شاہ صاحب کی توضیحات کو محفوظ کر دیا ہے۔

یہ نسخہ بہت عمدہ لکھا ہوا ہے۔ اس کے کاتب عظمت اللہ بن حافظ لطف اللہ ہیں۔ کاتب نے اس نسخے کی تحریر سے فراغت کی تاریخ اور وقت کو یوں تحریر کیا ہے:

"قد وقع الفراغ من ترجمة القرآن المجيد تصنيف حقائق و معارف آگاه ميان شاه ولی اللّٰه فی وقت نصف النهار يوم الثلثاء فی سبعة عشر من رمضان المبارك سنة الف و مائة و اثنا و سبعين من هجرة النبی صلی اللّٰه عليه وسلم بيد الفقير الراجی الی رحمته اللّٰه عظمت الله بن حافظ لطف اللّٰه غفر اللّٰه له والوالديه."

یعنی یہ نسخہ شاہ ولی اللہ کی وفات (1176ھ) سے تقریباً چار سال قبل لکھا گیا ہے۔ ممکن ہے نور شاہ صاحب نے اسی سال یا اس کے کچھ عرصہ بعد یہ نسخہ، شاہ صاحب سے پڑھا ہو۔

اس نسخہ میں فی صفحہ اٹھارہ یا انیس سطریں ہیں۔ اس میں قرآنی آیات پر شاہ ولی اللہ کے فرمان کے مطابق سرخ روشنائی سے لکیریں لگائی گئی ہیں۔ متن میں پہلے آیات درج ہیں۔ ان کے بعد ان کا ترجمہ اور مختصر تشریح بزبان فارسی تحریر ہے۔ حواشی کے نکات میں کہیں کہیں عربی زبان بھی استعمال کی گئی ہے۔ خیال رہے کہ مطبوعہ کتاب میں آیات کے نیچے ان کا فارسی ترجمہ ہے اور نکات کو الگ حاشیے میں درج کیا گیا ہے۔

اس نسخے کے اصل مالک اور شاہ ولی اللہ کے شاگرد نور شاہ کے بارے میں کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکی۔ معروف تذکروں میں ان کے بارے میں کچھ نہیں ملتا۔

شاہ صاحب نے اپنی یا دوسروں کی کتابوں پر جو اجازت تحریر کی ہے، ان کے الفاظ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ صحیح بخاری پر، جس کا نسخہ خدا بخش لائبریری (پٹنہ) میں محفوظ ہے، جو کلمات تحریر کیے ہیں ان کی نسبت فتح الرحمٰن کے اس نسخے کے الفاظ بہت مختصر ہیں۔ اس نسخے کے الفاظ یہ ہیں:

بسم الله الرحمن الرحيم. الحمد لله وحده اما بعد فقد سمع علی طرفا من هذا الكتاب المسمى بفتح الرحمن فی ترجمة القرآن صاحب هذا النسخة السيد نور شاه و أجزت له رواية سائره، وانا الفقير مؤلف الكتاب احمد المدعو بولی الله كان الله له فی الائولی والاخری والحمد لله.

اس اجازت نامے میں کوئی تاریخ درج نہیں جس سے معلوم ہو سکے کہ نور شاہ صاحب نے کب یہ ترجمہ پڑھا،

تاہم یہ طے ہے کہ نسخے کی تحریر (1172ھ) کے بعد یہ اجازت حاصل کی گئی ہے۔اس کے صحیح سال و ماہ کا پتہ اس صورت میں لگ سکتا ہے جب کوئی صاحب نور شاہ صاحب کی سوانح پر روشنی ڈالیں اور شاہ صاحب سے ان کی ملاقات کے وقت اور سال کی تعیین بھی فرمائیں۔

یہ نسخہ بہت اچھی حالت میں ہے۔اس پر غیر واضح ایک بیضوی مہر بھی ہے جس میں ایک لفظ خادم بالکل صاف پڑھا جاتا ہے۔اس مہر میں سن بھی درج ہے مگر اس میں سینکڑے کا ہندسہ صاف نہیں۔البتہ ایک ہزار اور 67 ٹھیک پڑھا جاتا ہے۔

حاشیہ

(1) مولانا عبید اللہ سندھی: الفرقان (شاہ ولی اللہ نمبر) صفحہ 264

(فکر و نظر۔ص 430-435، جنوری 1975ء)

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

''فتح الرحمٰن'' کا ایک تجزیاتی مطالعہ

''فتح الرحمٰن بترجمۃ القرآن'' حضرت شاہ ولی اللہ احمد بن عبدالرحیم عمری، فاروقی دہلوی۔(4 شوال 1114ھ۔ 21 فروری 1703ء)۔(29 محرم 1176ھ۔20 اگست 1762ء) کے فارسی ترجمہ قرآن مجید کا عنوانِ معانی ہے۔ترجمہ کا آغاز مدرسہ رحیمیہ نزد مسجد فیروز شاہ کوٹلہ دہلی کی معلمی کے ابتدائی زمانے (42-1131ھ۔31-1720ء) میں غالباً اس کے آخری دو تین برسوں میں ہوا۔ یہ مدرسہ ان کے والد ماجد شیخ عبدالرحیم بن شیخ وجیہ الدین فاروقی (1054ھ۔ 45-1644ء)۔(12 صفر 1131ھ۔4 جنوری 1719ء) میں کا قائم کردہ تھا۔ان کی وفات کے بعد شاہ ولی اللہ مدرسہ رحیمیہ کے شیخ امام واستاذ کل بنے اور طالب علموں کو مختلف علوم وفنون کی تعلیم دیتے رہے۔ان میں قرآن کریم کے متن و معانی کی تدریس مدرسہ رحیمیہ اور ولی اللّٰہی نصاب میں سرفہرست تھی۔

تالیف کے مراحل

ولی اللہ فارسی ترجمہ مختلف مرحلوں میں کیا گیا اور اس کے بعض مراحل میں مہینوں بلکہ برسوں کا وقفہ رہا۔شاہ ولی اللہ دہلوی نے خود صراحت فرمائی ہے کہ اول اول زاہروین۔ سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کے ترجمے کی تسوید صورت پذیر ہوئی۔اگرچہ وضاحت نہیں ملتی، تاہم بسملہ اور سورۂ فاتحہ کا ترجمہ بھی اسی وقت ہوا ہوگا بلکہ ترجمہ کا آغاز ہی ان سے ہوا ہوگا کیونکہ اولین آیت کریمہ اور سورت مقدسہ سے شروع کرنا منطقی طور سے لازم معلوم ہوتا ہے۔ابتدائی تین سورتوں کا فارسی کا فارسی ترجمہ (1143ھ۔1731ء) سے متصل زمانی میں مکمل ہو چکا تھا کیونکہ اس کے فوراً بعد حضرت مترجم حج بیت اللہ کے مبارک سفر پر تشریف لے گئے۔حرمین شریفین کے سفرِ آمدورفت میں تقریباً سوا سال (45-1143ھ۔32-1731ء) کا وقت لگا اور اس وقفہ میں ترجمہ کا کام معطل رہا۔

مبارک سفر سے واپسی کے عرصہ بعد یا بقولِ شاہ صاحب ''سالہائے چند'' ترجمہ کا کام رکا رہا۔پھر جب ان کے ایک عزیز و شاگرد شیخ محمد عاشق بن شیخ محمد پھلتی (م 1187ھ۔1773ء) نے ان سے قرآن مجید اور اس کا ترجمہ پڑھنا شروع کیا تو معطل فارسی ترجمہ کی تسوید ازسرِ نو شروع ہو گئی۔ یہ سلسلہ تدریس ہی حضرت شاہ کے عزمِ مصمم کا سبب بنا اور جتنا حصہ قرآن پڑھا جاتا وہ سبق در سبق لکھ لیا جاتا۔تسوید و کتابت کا کام غالباً شاگرد رشید ہی انجام دیتے تھے کیونکہ جب ایک تہائی قرآن کی تدریس اور اس کا ترجمہ ہو چکا تو کاتب شاگرد کو ایک سفر پیش آ گیا اور ترجمہ کا لکھنا موقوف ہو گیا۔

ایک مدت بعد پھر ترجمہ کرنے اور لکھنے کی تقریب پیدا ہوئی اور دو تہائی حصہ قرآن کا ترجمہ ہو چکا تھا کہ ایک اور وقفہ پیش آ گیا۔ البتہ اس بار یہ ضرور طے کیا گیا کہ اکثر حصہ کا ترجمہ ہو چکا تھا، لہٰذا بعض دوستوں کے اصرار پر مسودہ کی تبییض شروع کردی گئی اور ترجمہ کو آیاتِ قرآن کے ساتھ ملا کر لکھا گیا تا کہ ایک مستقل نسخہ تیار ہو جائے۔ اسی ''یار سعادت مند'' نے عید الاضحیٰ (1150ھ۔31مارچ1738ء) کو تبییض کرنی شروع کردی اور جب مسودہ قریب قریب صاف مبیضہ ہونے لگا تو دوبارہ عزم میں حرکت ہوئی اور آخرِ قرآن تک ترجمہ کی تسوید ہوگئی۔ مسودہ تو اوائل شعبان 1151ھ میں تیار ہو گیا اور اسی برس رمضان کے اوائل میں اس کا مبیضہ بھی تیار ہو گیا۔

ظاہر ہے کہ اس دوران متنِ قرآن کی تدریس اور اس کے فارسی ترجمہ کی تعلیم بھی برابر ہوتی رہی اور شیخ محمد عاشق پھلتی کے علاوہ دوسرے طلبہ و تلامذہ بھی مترجم محترم سے برابر اسے پڑھتے رہے۔ ان میں سے ایک خواجہ محمد امین بھی تھے۔ بقول شاہ صاحب اسی ''برادر دینی'' کے اہتمام سے چار پانچ سال بعد (1156ھ۔1743ء) میں اس کتاب کا رواج عام ہوا۔ اس کے متعدد نسخے تیار کیے گئے۔ اس کو نصاب میں شامل کیا گیا۔ اس کے مطالعہ تدریس کی مداولت ہوئی اور 'اہل عصر' نے اس پر خاطر خواہ توجہ مبذول کی۔

وجوہِ تالیف

''فتح الرحمٰن'' کی تدوین کا بڑا محرک عزیز خاص اور مدرسہ رحیمیہ کے طلبہ کا تدریسی تقاضا تھا۔ ان کی تعلیم و تدریس کے تقاضوں نے حضرت مترجم سے ترجمہ کا کام شروع کرایا تھا اور ان ہی کے سبب معطل کام بار بار شروع ہوتا رہا اور بالآخر ان ہی کی خاطر وہ مکمل بھی ہوا۔ یہ فوری، قوی اور مؤثر محرک ضرور رہا مگر سب سے بڑا نہیں۔ شاہ صاحب نے اصل محرک اپنے زمانے کے مسلمانوں کی دینی اور علمی ضروریات کو قرار دیا ہے۔ ''مقدمہ فتح الرحمٰن'' کے علاوہ ''المقدمۃ فی قوانین الترجمہ'' میں بھی حضرت مترجم نے وضاحت کی ہے کہ 'ہر زمانے اور ہر علاقے میں مسلمانوں کی خیر خواہی و نصیحت کے تقاضے الگ الگ ہوتے ہیں اور ان ہی کے مطابق مختلف علوم و فنون کی کتابیں لکھی اور شائع کی جاتی ہیں۔ ہم جس زمانے اور جس ملک میں جی رہے ہیں ان کا تقاضا ہے کہ مسلمانوں کے لئے زمانہ حال کے مطابق ایک نیا ترجمہ فارسی میں کیا جائے جو سلیس ہو۔ رائج روزمرہ میں ہو، فضیلت نمائی کے تکلف اور عبارت آرائی کے تصنع سے خالی ہو، قصوں، تاویلوں اور توجیہوں سے پاک ہو تا کہ خواص و عوام اسے یکساں سمجھ سکیں اور چھوٹے بڑے بیک صورت معانی قرآن کریم کا ادراک کر سکیں۔ اس فقیر کے دل میں اس امرِ عظیم کی تحریک پیدا ہوئی اور خواہی نخواہی اس کو انجام دینے کا عزم صمیم کر لیا۔ اس سلسلہ میں چند تراجم قرآن کا بغور مطالعہ کیا کہ ان میں سے کوئی پسند خاطر آئے تو اسی کو اختیار کر کے رواج دینے کی کوشش کی جائے اور جہاں تک ممکن ہو اس کو معاصرین کے لئے پسندیدہ و مرغوب بنایا جائے لیکن مطالعہ سے معلوم ہوا کہ بعض تراجم اتنے طویل ہیں کہ تھکا دینے والے ہیں اور بعض اتنا اختصار رکھتے ہیں کہ ادراک معانی میں خلل پیدا کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی معیار و میزان پر پورا نہیں اترا، لہٰذا ایک اور ترجمہ کرنے کا عزم مصمم ہو گیا او کام شروع کر دیا۔''
(مقدمہ فتح الرحمٰن، الف۔ب)

شاہ صاحب کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ طلبہ علم، خواص و عوام اور بعض عزیزوں کی دینی اور علمی ضرورت کے تحت ہی نہیں بلکہ عام مسلمانوں کی خیرخواہی کی خاطر بھی ایک نیا ترجمہ کرنا چاہتے تھے۔ اس کی وضاحت دوسرے بیان میں ملتی ہے۔

نصاب قرآن مجید کے تعلق سے حضرت مترجم نے اپنے ترجمہ قرآن کا جو مقام و مرتبہ متعین کیا ہے، وہ مسلمانوں کے عام طبقات اور ان کی دینی اور علمی ضرورت اور تقاضے کو بخوبی واضح کرتا ہے۔ شاہ صاحب کا پکا خیال تھا کہ نوخیز مسلم بچوں اور نونہال کو متنِ قرآن کے ساتھ ساتھ معانی و مفاہیم کی تعلیم بھی دی جائے۔ ناظرۂ قرآن اور فارسی رسائل کو اچھی طرح پڑھایا جائے تا کہ وہ الفاظ و عبارتِ قرآن کے ساتھ فارسی زبان پر بھی ضروری دسترس حاصل کرلیں۔ کاروباری لوگوں (اہل حرفہ) اور سپاہیوں کے بچوں کو علوم عربیہ اور انتہائی تعلیم کا موقع نہیں ملتا، لہٰذا ان کو ''اول سن تمیز'' میں اس کتاب یعنی ان کے فارسی ترجمہ قرآن کو سبق در سبق پڑھا دیا جائے تا کہ ان کے سینوں (جوف ایشاں) میں جو پہلی چیز جاگزیں ہو، وہ کتاب اللہ کے معانی ہوں تا کہ ان کی سلامتِ فطرت خراب نہ ہو اور وہ ملحدوں اور بے دین معقولیوں کے کلام سے گمراہ نہ ہوں اور ان کے سینوں میں ان کے بے لگام و ناپسندیدہ باتوں کی گندگی نہ جم جائے۔ ان بچوں اور نوجوانوں کو اس ترجمہ قرآن کی کتاب ضرور پڑھائی جائے تا کہ وہ تلاوت قرآن کی حلاوت سے آشنا ہوں۔ اگرچہ تمام (جمہور) مسلمانوں کے حق میں اس کتاب کا نفع متوقع ہے لیکن بچوں اور ابتدائی طالب علموں (صبیان و مبتدیان) کے حق میں وہ زیادہ روشن اور بہت ظاہر ہے۔ (مقدمہ فتح الرحمٰن)

بلاشبہ شاہ ولی اللہ دہلوی خواص اور عوام دونوں کے تمام افراد و طبقات کو ناظرۂ قرآن کے ساتھ ساتھ معانی قرآن سے آشنا کرانا چاہتے تھے۔ وہ متن قرآن کی تلاوت کو مفید سمجھتے تھے۔ تاہم اسی کو کافی نہیں گردانتے تھے۔ وہ سب مسلمانوں کو قرآن مجید کے معنی و مفہوم سے واقف کرانا لازمی عصری تقاضا سمجھتے تھے۔ اسی بنا پر انہوں نے تعلیم و تدریس کے لئے حلقہ کا طریقہ تجویز کیا تھا۔ تمام روزگار والے لوگ اکثر اوقات معاشی مشاغل میں پھنسے رہتے ہیں۔ ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک وقت فارغ کریں اور ایک دوسرے کے ساتھ حلقہ بنا کر بیٹھیں۔ ایسے کئی حلقے ہوں۔ ان میں جس شخص کو فارسی پر دسترس حاصل ہو اور فنِ تفسیر سے ضروری واقفیت رکھتا ہو یا اس ترجمہ کو پڑھ چکا ہو وہ سہولت و وسعت کے مطابق ایک دو سورتوں کی ترتیل کے ساتھ تلاوت کرے اور ان کو ترجمہ سنائے اور وہ سب بغور سنیں تا کہ معانی سے محظوظ ہوں۔ اسی طرح وہ صحابہ کرام کے ساتھ تشبہ (مشابہت) پیدا کریں گے کہ وہ بھی حلقہ در حلقہ بیٹھا کرتے تھے اور قاری ان میں قرأت کرتا تھا۔ بس فرق یہ ہے کہ صحابہ کرام اپنی صلاحیت و سلیقہ سے عربی زبان سمجھ لیتے تھے اور یہ جماعت فارسی ترجمہ کے توسط سے ان کی تفہیم حاصل کرے گی۔ ''یاران سعادت مند'' جس طرح مثنوی مولانا روم جلال الدین رومی، گلستانِ شیخ سعدی، منطق الطیر شیخ فریدالدین عطار، قصصِ فارابی، نفحاتِ مولانا عبدالرحمٰن جامی اور اس جیسی کتابیں اپنی اپنی مجلسوں میں سنتے سناتے ہیں۔ اگر اس ترجمہ کو بھی وہ اسی اسلوب و طریقہ سے اپنے حلقوں میں بار دیں اور اپنے دل و دماغ کا ایک حصہ اس میں لگائیں تو معانی کتاب کے ادراک سے بہرہ مند ہوں گے۔ اگر وہ اولیاء اللہ کے کلام کا شغل ہے تو یہ کلام اللہ کا شغل ہے۔ اگر وہ حکیموں اور دانش مندوں کے مواعظ ہیں تو یہ احکم الحاکمین کے مواعظ ہیں اور اگر وہ عزیزوں کے مکتوبات

ہیں تو یہ رب العزت کے مکتوبات ہیں اور ان دونوں کے مرتبوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ نزولِ قرآن کا اصلی فائدہ نصیحت حاصل کرنا (اتعاظ) ہے۔ ان کے مواعظ سے کہیں زیادہ قرآن حکیم سے موعظت مل سکتی ہے جو محض تلاوت الفاظ سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ تلفظ و تلاوت بھی غنیمت ہے لیکن اس شخص کو ''مسلمانی'' کیسے حاصل ہوسکتی ہے جو معانی (مدلول) قرآن کو نہ سمجھا ہو؟ اور اس کو تلاوت کی حلاوت کیسے نصیب ہوسکتی ہے جو کلام اللہ کے مدلول و معانی کو نہ جانتا ہو۔ جو لوگ عربی زبان پر کامل دسترس رکھتے ہیں اور اساتذہ کی تفاسیر پڑھ چکے ہیں ان کو اس ترجمہ کے پڑھنے کی ضرورت نہیں لیکن حضرت باری کے فضل سے یہ امید ہے کہ اگر وہ جماعتِ (علماء) بھی اس کتاب کا مطالعہ کریں گے تو لفظ قرآن کے نیچے پوشیدہ معانی ان پر بھی روشن ہوجائیں گے......وہ بھی اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں گے۔......

شاہ ولی اللہ نے صوفیاء اور علماء کے لئے بھی اس ترجمہ قرآن کی افادیت ثابت کی ہے بلکہ ان کے لئے ایک طرح سے ضروری قرار دیا ہے کیونکہ وہ اپنے فنون، تصوف اور تفسیر علوم، میں اتنے مشغول ہوجاتے ہیں کہ وسائل علم میں پھنسے رہ جاتے ہیں اور اصل علمِ الٰہی سے کنارہ کش رہ جاتے ہیں۔ یہ ترجمہ قرآن ان کو اصلِ علم و دین عطا کرے گا۔

جہاتِ ترجمہ

مترجمِ گرامی نے اپنے فارسی ترجمہ کے طرزِ تحریر، اسلوبِ نگارش اور اندازِ پیشکش کو بخوبی واضح کیا ہے: ''یہ کتاب قرآن عظیم کے ترجمہ کے فن پر مشتمل ہے۔ عربی عبارت (نظم) مدلول (معانی) کو فارسی عبارت نظم) میں۔ ترجمہ کی زبان کے محاورہ اور روزمرہ کے مطابق ادا کیا گیا ہے۔ اس میں نحو کی رعایت رکھی گئی ہے جس کا حق مقدم تھا، اس کو پہلے لایا گیا ہے، محذوف کو ظاہر کیا گیا ہے۔ نظمِ ترجمہ کو نظمِ قرآن کے موافق بنایا گیا ہے اور قرآنی الفاظ کی ترتیب کا لحاظ ترجمہ میں بھی رکھا گیا ہے۔ سوائے ان مقامات کے جہاں دوزبانوں کے اختلاف کے سبب لفظ میں ''رکاکت'' (گراوٹ) یا دلالت میں ''تعقید'' (پیچیدگی) پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح اسبابِ نزول اور مشکل مقامات وعبارت کی توجیہ و تاویل سے بقدرِ ضرورت ہی اعتنا کیا گیا ہے جس طرح ''کتاب وجیز'' اور ''جلالین'' میں روا رکھا گیا ہے۔ ''وجیز'' اور ''جلالین'' کی ہم رنگی، مماثلت، مشابہت اور اہمیت پر حجۃ الاسلام غزالی کی شہادت کافی ہے کہ ''وجیز'' جیسی کتابِ تفسیر پر جس شخص کو دسترس حاصل ہوگئی اس پر علمِ تفسیر کے ابتدائی (سفلی) طبقہ کا دروازہ کم از کم کھل جاتا ہے۔'' (مقدمہ فتح الرحمٰن، ب)

اس اصولی بحث کے بعد شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنے ترجمہ قرآن میں متن و ترجمہ کے تعلق سے متعدد وضاحتیں کی ہیں اور وہ بھی ان کے طرزِ تحریر اور اسلوب بیان کی عمدگی، طرفگی اور ندرت پر دلالت کرتی ہیں۔ ''ہر آیت کو جدا لکھا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس کا فارسی ترجمہ ہے، زبان ترجمہ میں وہ اختیار کی گئی ہے جو آج کل فارسی کا رائج اور مستند روزمرہ ہے۔ ہر لفظ کا ترجمہ ایک ہی لفظ سے کیا گیا ہے۔ (بعض عربی الفاظ کا ترجمہ فارسی الفاظ میں زبان کے مزاج کے اختلاف یا فارسی میں عربی لفظ کے مفہوم و معنی کی عدمِ موجودگی کے سبب ممکن نہیں ہوتا جیسا کہ شاہ صاحب نے ''مقدمہ در قوانین ترجمہ'' میں واضح کیا ہے۔) لہٰذا بعض مقامات پر تحت اللفظ سے زیادہ الفاظ ترجمہ میں اگر لائے گئے ہیں تو لفظ ''یعنی'' یا اس جیسے کسی دوسرے لفظ سے اس کو ممیّز کر دیا گیا ہے۔ جہاں مستقل کلامِ (مزید) لایا گیا ہے۔ اس سے پہلے ''مترجم

گوید'' (مترجم کہتا ہے) اور اس کے آخر میں ''واللہ اعلم'' (اللہ بہتر جاننے والا ہے) لکھا گیا ہے تا کہ ترجمہ میں مترجم کا کلام وتاویل کلامِ الٰہی سے ممتاز وجدا رہے۔ جہاں تک ممکن ہوا قرآن مجید سے متعلق قصوں کو صرف ایک دو فقروں میں بیان کیا گیا ہے اور اسبابِ نزول کی طویل روایات اور قصص سے گریز کیا گیا ہے۔ جہاں تک ممکن ہوا آیاتِ کریمہ کے سیاق کی رعایت ضرور کی گئی ہے۔'' (مقدمہ فتح الرحمٰن)

شاہ صاحب نے اپنے مراجع ومصادر کی بھی مختصراً نشاندہی کی ہے تا کہ ان کی تاویلات، تشریحات اور توجیہات کا پایۂ اعتبار قائم رہے اور اگر قارئین کرام چاہیں تو ان کی تصدیق ان مراجع سے کر لیں اور تفصیلات ومباحث سے واقف ہونا چاہیں تو ہو جائیں۔ ''اس کتاب میں ''نقل'' (ماثور روایات) کے باب میں مدد صرف محدثین کی اصح التفاسیر (صحیح ترین تفسیروں) سے لی گئی ہے جیسی کہ بخاری، ترمذی اور حاکم نے تفسیر کی ہے تا کہ بس بھر ضعیف وموضوع اخبار (روایات) سے احتراز رہے۔ اسرائیلی قصے (اسرائیلیات) اہل کتاب کے علماء سے منقول ہیں، نہ کہ خیر البشر علیہ وعلیٰ آلہ الصلوات والتسلیمات کی حدیث سے، لہٰذا ان کو داخل نہیں کیا گیا ہے۔ سوائے اس مقام کے جہاں ان کو بیان کیے بغیر معنی کا کشف و وضاحت ممکن نہیں تھا اور ایسا اس قاعدۂ کلیہ کے تحت کیا گیا ہے جس کے مطابق ممنوع چیزیں ضرورتوں کے وقت جائز بن جاتی ہیں۔ ''الضرورات تبیح المحظورات'' (مقدمہ فتح الرحمٰن، د)

خصوصیاتِ ''فتح الرحمٰن''

اس کے مابعد شاہ ولی اللہ نے اپنے فارسی ترجمہ کی انفرادی وممتاز خصوصیات بیان کی ہیں: دوسرے تراجم سے یہ ترجمہ چند ''وجہ'' سے ممتاز ہے:

(1) ایک یہ کہ جس قدر نظمِ ''عبارت'' قرآن ہے، اسی مقدار کے مثل معروف (ومتعارف) فارسی میں ترجمہ لایا گیا ہے اور اس میں مراد کو ظاہر کیا گیا ہے اور تعبیر کی لطافت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسرے تراجم میں جو عبارت کا اطناب اور تعبیر کی رکاکت اور مراد کا گونگا پن/عدم فصاحت (اعجام) پایا جاتا ہے اس سے بساط بھر احتراز کیا گیا ہے۔

(2) دوسرے یہ کہ تمام تراجم دو حالتوں سے خالی نہیں ہوتے: یا تو وہ قرآن سے متعلق قصوں کو مطلق ترک کرتے ہیں یا ان کو پوری تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ اس ترجمہ میں ''راہ متوسط'' اختیار کی گئی ہے، لہٰذا جس مقام پر آیت کا معنی کسی قصہ پر موقوف ومنحصر ہے، وہاں اس سے دو تین کلمات بقدرِ ضرورت انتخاب کر کے لائے گئے ہیں اور جہاں آیت کے معنی قصہ بیان کرنے پر موقوف نہیں ہیں وہاں اس کو قطعی ترک کر دیا گیا ہے۔

(3) تیسرے یہ کہ گوناگوں توجیہات میں صرف اسی کو اختیار کیا گیا ہے جو عربیت کے لحاظ سے سب سے قوی ہے۔ علم حدیث کے اعتبار سے سب سے واضح ہے، علم فقہ کے نظریہ سے سب سے زیادہ مضبوط ہے اور قواعد صرف کے مطابق سب سے زیادہ صحیح ہے۔ جس کسی نے ''تفسیر وجیز'' اور ''تفسیر جلالین'' کا جو اس ترجمہ کی اصل کے مانند ہیں، مطالعہ کیا؛ وتو دوسری تفاسیر کے مطالعہ سے اس پر اس باب میں کوئی شک کا میل نہیں آئے گا۔

(4) چوتھے یہ کہ یہ ترجمہ اس طرح (وجہ) سے کیا گیا کہ نحو جاننے والا قرآن کے اعراب، محذوف کی تعیین،

ضمیر کے مرجع اور لفظ کے محل اور عبارت میں مقدم و مؤخر کو خوب جان لے گا اور جو شخص نحو سے واقف نہیں وہ بھی ''اصل غرض'' (مقصد) سے محروم نہ رہے گا۔

(5) پانچویں یہ کہ ترجمہ دو حال سے کبھی خالی نہیں ہوتا: یا تو ''تحت اللفظ'' (لفظی) ترجمہ ہوگا یا ''حاصل المعنی'' (بامحاورہ) ترجمہ۔ ان میں سے ہر ایک میں خلل (معانی) کی بہت سی صورتیں پائی جاتی ہیں لیکن یہ ترجمہ ان دونوں طریقوں کا جامع ہے اور ان دونوں کے خلل میں سے ہر ایک کا ایک علاج مقرر کیا گیا ہے۔ یہ مفصل بحث کا متقاضی ہے اور اس کا بیان ''رسالہ قواعد ترجمہ'' میں پیش کیا جا چکا ہے۔ (مقدمہ فتح الرحمٰن، د۔ ہ، مقدمہ در قوانین ترجمہ)

اسلوب و طرزِ ادا

اسلوب یوں تو اپنے خیال، فکر یا نظریہ کو ایک خاص، دل نشیں اور خوبصورت انداز میں پیش کرنے کا نام ہے مگر اس کی تعمیر و تشکیل میں متعدد محرکات و عوامل اور عناصر کی کارفرمائی پائی جاتی ہے۔ لکھنے والے کا مطالعہ، اس کی فکر کا انداز، نگاہ کا زاویہ، زندگی کی طرف اس کا رویہ، علوم و فنون پر اس کی دسترس، زبان و ادب سے اس کی واقفیت، تحریر و تقریر پر قدرت، غرض کہ اس کی کامل شخصیت کا اظہار اس کے اسلوب میں ہوتا ہے۔ اسے اسلوب کے داخلی عناصر کا نام دیا جا سکتا ہے۔

خارجی عناصر میں سب سے پہلے اور شاید سب سے زیادہ زیر تحریر موضوع کی فطرت کارگزاری دکھاتی ہے۔ مضمون و موضوع بھی خود اپنا اسلوب متعین کرتا ہے اور جو صاحب قلم اپنے زیر تحریر موضوع کے تقاضے کی رعایت نہیں کرتے۔ ان کا وہ ''باغی اسلوب'' ان کو میدان تنقید میں ہدف بنا دیتا ہے اور ان کے اسلوب کو باوجود اس کی خوبصورتی، جاذبیت اور طرح داری کو بے محل اور غیر موزوں بنا دیتا ہے۔ (خاکسار کا مضمون ''ملفوظات کا اسلوب'' فکر و نظر، علی گڑھ 1997ء جلد۔34، شمارہ 1، 15-33) موضوع کی مناسبت سے ایک برمحل مثال ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمہ قرآن کی یہاں دی جا سکتی ہے۔ ان کے بے مثال، عمدہ اور عظیم الشان ترجمہ قرآن کی سب سے بڑی خرابی دہلوی زبان کا ٹکسالی انداز اور محاورات کی بے جا بھرمار ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کا فارسی ترجمہ اس زمانے کی فصیح و بلیغ اور بامحاورہ زبان میں ہے۔ جیسا کہ انہوں نے اپنے ''مقدمہ فتح الرحمٰن'' اور ''مقدمہ در قوانین ترجمہ'' میں دعویٰ کیا ہے۔ انہوں نے جو اصول و خصائص بیان کیے ہیں سب سے پہلے ان ہی کی بنا پر ان کے ترجمہ کا جائزہ لینا مناسب ہے کیونکہ بالعموم ناقدوں کا خیال ہے کہ اصولی مفکرین کی اپنی تحریریں بسا اوقات ان کے اپنے مقررہ اصولوں پر پوری نہیں اترتیں۔ ابن خلدون کو ان کی تاریخ کے حوالے سے اور مولانا شبلی کو ان کی سیرت و سوانح کے تعلق سے ہدف تنقید و ملامت بنایا گیا ہے کہ انہوں نے بالترتیب مقدمہ تاریخ اور مقدمہ سیرت النبی میں جن اصول و قواعد کو بنایا تھا، ان پر اپنی مفصل کتابوں میں عمل نہیں کیا۔

نظمِ عربی کے مطابق فارسی عبارت

ولی اللہی ترجمہ کی یہ ایسی نادر، حسین اور عظیم صفت ہے جو ان کی فارسی زبان پر قدرت کو تو واضح کرتی ہی ہے

عربی ادب اور قرآنی نظم کے در و بست پر ماہرانہ دسترس کو بھی سامنے لاتی ہے۔ مترجم کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اصل اور ترجمہ دونوں کی زبانوں کے مزاج، رنگ، اسلوب اور شخصیت سے پوری طرح سے واقفیت ہو ورنہ وہ شاید معانی کی ترسیل تو کر سکے مگر ادبی حسن و فخامت کو الفاظ کے پیکر میں نہ ڈھال سکے گا۔ شاہ ولی اللہ نے اعتراف کیا ہے کہ وہ قرآنی فصاحت و بلاغت کا پایۂ اعتبار و افتخار اپنی عبارتِ ترجمہ میں نہیں لا سکتے کیونکہ قرآن مجید عربی زبان و ادب کا نہ صرف عظیم ترین شاہکار ہے بلکہ وہ کلام الٰہی ہونے کے سبب اپنی ادبیت میں بھی ہر کلامِ بشر سے، خواہ کلامِ سید البشر علیہ السلام کیوں نہ ہو، زیادہ فصیح اور زیادہ بلیغ رہے گا۔ قرآن مجید نے اسی بنا پر تمام فصحائے عرب و عجم اور بلغائے انس و جن کو ''تحدی'' (چیلنج) کیا ہے کہ وہ سب مل کر قرآنِ عالی جیسا ایک شہپارہ ہی لے آئیں اور پھر حقیقت بھی کھول دی کہ وہ ایسا ہرگز ہرگز نہ کر سکیں گے کیونکہ وہ مخلوق ہونے کے سبب محدود صلاحیتوں کے مالک ہیں اور خالقِ عالم اور احکم الحاکمین کی لامحدود اور بیکراں ''ادبیت'' کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

بایں ہمہ شاہ ولی اللہ نے اپنے اس اصول کی اپنے ترجمہ میں ہر جگہ رعایت کی ہے اور خوب کی ہے۔ چند مثالوں سے نظمِ عربی سے نظمِ فارسی کی مطابقت بھی واضح ہوگی اور عربی قرآن کے پُرشکوہ اسلوب کے بالمقابل ولی اللّٰہی فارسی اسلوب کا حسن و جمال بھی نمایاں ہوگا۔ آغاز اسی سورۂ کریمہ سے کیا جاتا ہے جس سے قرآنِ کریم کا آغاز ہوا ہے یعنی سورہ فاتحہ۔ تقابل و تجزیہ کی خاطر ہر آیت کا ترجمہ اس کے سامنے کے کالم میں دیا جا رہا ہے:

بسم الله الرحمن الرحيم	بنام خدائے بخشایندہ مہربان
الحمد لله رب العالمين	ستائش خدا راست پروردگارِ عالم ہا
الرحمن الرحيم	بخشایندہ مہربان
ملك يوم الدين	خداوندِ روزِ جزا
اياك نعبد و اياك نستعين	ترا می پرستیم و از تو مدد می طلبیم
اهدنا الصراط المستقيم	بنما ما را راہِ راست
صراط الذين انعمت عليهم	راہِ آنانکہ اکرام کردہ بر ایشاں
غير المغضوب عليهم و الا الضالين	بجز آنانکہ خشم گرفتہ شد بر آنہا و بجز گمراہاں

فارسی ترجمہ میں ایک لفظ بھی زائد نہیں ہے سوائے ''از'' کے کہ عربی میں ''اياك نستعين'' میں اس کی ضرورت نہیں مگر فارسی زبان میں ''از'' لانا ضروری بلکہ ناگزیر ہے کہ اس کے بغیر ''تو مدد می طلبیم'' بے معنی ہو جاتا ہے۔ یہاں کہہ سکتے ہیں کہ ''از تو'' عربی لفظ ''نستعین'' میں سے برآمد ہوا ہے۔ ترجمہ کا کمال یہ ہے کہ عربی الفاظ کا جو در و بست اور ترتیب ہے وہی فارسی ترجمہ میں موجود ہے۔ اگر ہر عربی کلمہ کے نیچے اس کا ولی اللّٰہی ترجمہ رکھ دیا جائے تو اس کا وہی لفظی ترجمہ بھی ہوگا۔ ادبی حسن و جمال کے لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ فارسی ترجمہ اپنی خوبصورتی، دلنشینی اور ادبیت میں بے نظیر ہے اور اس کا اسلوب قرآنی اسلوب سے قریب تر ہے۔ ''بسم الله الرحمن الرحيم'' کا فارسی ترجمہ (بنام خدائے بخشایندہ مہربان) زبان و دماغ پر ایک ہی بار میں نقش ہو جاتا ہے کہ وہ اسی کے مماثل ہے۔ بسملہ کا ترجمہ ہر جگہ شاہ صاحب نے اسی

طرح کیا ہے۔ الرحمٰن کا ترجمہ ''بخشایندہ'' اور الرحیم کا ترجمہ ''مہربان'' کرتے ہیں۔ دوسرے مترجمین بالخصوص اردو میں ترجمہ کرنے والے ''بڑے مہربان نہایت رحم والے'' (تھانوی) بے حد مہربان نہایت رحم والا (شیخ الہند) نہایت مہربان بار بار رحمت کرنے والے (دریابادی) رحمان ورحیم (مودودی، اصلاحی) سے کرتے ہیں۔ مؤخر الذکر دونوں نے قرآنی الفاظ کا ترجمہ ہی نہیں کیا اور انہی کو ترجمہ میں رکھ دیا جبکہ دوسروں کے ہاں شاہ عبدالقادر کے ترجمہ ''بڑا مہربان نہایت رحم والا'' کا واضح اثر موجود ہے بلکہ اس کو خالص کورانہ تقلید کہا جا سکتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے ''نہایت رحم والا مہربان'' ترجمہ کر کے ترتیب الٹ دی ہے مگر شاہ عبدالقادر کی ڈگر سے نہیں ہٹ سکے۔ شاہ ولی اللہ کے ترجمہ میں ''رحمٰن'' اور ''رحیم'' کا ''بخشایندہ'' اور ''مہربان'' سے دونوں عربی صفات کا امتیاز واضح کیا گیا ہے اور ذہین قاری کو بتایا گیا ہے کہ دونوں کے مفاہیم میں قربت کے باوجود وسعت وتنوع پایا جاتا ہے۔ اسی طرح ''بسم'' کا ترجمہ ''بنام'' کر کے شروع، ابتداء وغیرہ جیسے کلمات کے اضافے سے بھی بچایا گیا ہے اور اس کے معنی کو محدود کرنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی ہے جو محذوف کو واضح کرنے کی صورت میں ناگزیر بن جاتی ہے۔

مختصر صورتوں میں عربی نظم قرآن کی فارسی زبان میں بہت خوبصورت انداز میں ملتی ہے۔ سورۃ العصر کا ترجمہ الفاظ قرآنی اور الفاظِ ترجمہ کی باہمی مماثلت دکھانے کی خاطر اوپر نیچے کے طریق تحریر پر کیا جا رہا ہے:

والعصر ان الانسان لفی خسر	وقسم بزمان کہ ہر آئینہ آدمی درزیاں ست
الا الذین آمنوا وعملو الصلحت	مگر آنانکہ ایمان آوردند عملہائے شائستہ کردند
وتواصوا بالحق	ویکدیگر را وصیت کردند بہ دین درست
وتواصوا بالصبر	ویکدیگر را وصیت کردند بہ شکیبائی

قرآن مجید کی مختصر ترین سورۃ الکوثر کا دروبست ترجمہ یہ ہے:

انا اعطینك الکوثر	یا محمد ہر آئینہ ما عطا کردیم ترا کوثر
فصل لربك وانحر	پس نماز گزار برائے پروردگار خود وشتر رانحر کن
انا شانئك هو الابتر	ہر آئینہ دشمن تو ہمانست دم بریدہ

شاہ صاحب کے فارسی ترجمہ کا حسن و جمال اور ادبی فصاحت و بلاغت نیز عربی نظم سے فارسی نظم کی مماثلت سورۃ انشراح میں بہت زیادہ واضح ہے:

الم نشرح لك صدرك	آیا کشادہ نہ کردہ ایم برائے تو سینہ ترا
ووضعنا عنك وزرك	ودور کردیم از تو بار ترا
الذی انقض ظهرك	آں بار کہ گراں کردہ بود پشت ترا
ورفعنا ذکرك	وبلند ساختیم برائے تو ثنائے ترا
فان مع العسر یسرا	پس زیرا کہ ہر آئینہ متصل دشواری آسانی ست
ان مع العسر یسرا	البتہ متصلِ دشواری آسان ست

فاذا فرغت فانصب	پس وقت کہ از کاروبار فارغ شوی در عبادتِ خدا محنت کش
والی ربك فارغب	وبسوی پروردگارِ خود تضرع نما

مختصر سورتوں میں سورۂ اخلاص کا ولی اللّٰہی ترجمہ بہت خوبصورت اسلوب و بیان کا مالک ہے:

قل هو الله احد	بگو خدا یگانہ ست
الله الصمد	خدا بے نیاز ست
لم يلد ولم يولد	نہ زاد و نہ زادہ شدہ
ولم يكن له كفواً احد	و نیست ہیچ کس او را ہمسر

طویل اور متوسط سورتوں میں بھی شاہ ولی اللہ دہلوی نے عربی الفاظ و عبارت کی اندرونی ترتیب و دروبست اور عددی گنتی کی رعایت اپنے فارسی ترجمہ میں برابر رکھی ہے۔ سورہ بقرہ کے اولیں رکوع کا ترجمہ بطور مثال پڑھا جا سکتا ہے:

آلٓم ذلك الكتب لاريب فيه	این کتاب ہیچ شبہ نیست دراں
هدى اللمتقين	رہنماست پرہیزگاران را
الذين يومنون بالغيب	آنانکہ ایمان می آرند بہ نادیدہ
ويقيمون الصلوٰة	و برپا می دارند نماز را
ومما رزقنهم ينفقون	وازاں چہ ایشانرا روزی دادہ ایم خرچ می کنند
والذين يومنون بما انزل اليك	وآنانکہ ایمان می آرند بآنچہ فرود آوردہ شد بسوئے تو
وما انزل من قبلك	وآنچہ فرود آوردہ شد پیش از تو
وبالآخرة هم يوقنون	وبآخرت، ایشان یقین دارند
اولئك على هدى من ربهم	ایشانند بر ہدایت از جانب پروردگار خویش
واولئك هم المفلحون	وایشانند رستگان
ان الذين كفرو	ہر آئینہ آنانکہ کافر شدند
سواء عليهم ء انذرتهم	برابراست بر ایشان کہ ترسانی ایشاں را
ام لم تنذرهم لايومنون	یا نہ ترسانی ایشان را ایمان نیارند
ختم الله على قلوبهم وعلى سمعهم	مہر نہاد خدا بر دلہائے ایشان و بر شنوائی ایشاں
وعلى ابصارهم غشاوة	و بر چشمہائے ایشاں پردہ ایست
ولهم عذاب عظيم	وایشاں راست عذابِ بزرگ

آیت الکرسی طویل سورتوں میں شاید طویل ترین آیت کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کا ترجمہ ولی اللّٰہی بھی خوب ہے:

الله لا اله الا هو	خدا، ہیچ معبود نیست بجز وے
الحي القيوم	زندہ تدبیر کنندۂ عالم

لاتاخذہ سنۃ ولا نوم	نمی گیرد اورا، پینکی و نہ خواب
لہ ما فی السموت	اوراست آنچہ در آسمانہاست
وما فی الارض	وآنچہ در زمین است
من ذالذی یشفع عندہ الا باذنہ	کیست آنکہ شفاعت کند، نزدیک او الا بحکم او
یعلم مابین ایدیھم وما خلفھم	میداند آنچہ پیش دست ایشان است وآنچہ پس پشت ایشان است
ولایحیطون بشی من علمہ	و در نمی گیرند مردماں، از معلومات حق چیزے را
الابماشاء	مگر بآنچہ وے خواستہ است
وسع کرسیہ السموت والارض	فرا گرفتہ پادشاہی او آسمان ہا و زمین را
ولایودہ حفظھما وھو العلی العظیم	وگراں نمی شود بروئے نگہبانی این ہر دو و او بلند مرتبہ بزرگ قدر است

شاہ ولی اللہ نے ترجمہ میں اگر زیادہ الفاظ کا استعمال معانی آیات کی وضاحت کی خاطر کیا ہے تو اس سے پہلے لفظ ''یعنی'' وغیرہ لاتے ہیں لیکن اگر عربی لفظ کے صحیح مفہوم کی ترسیل کے لئے ''موضح و مفسر'' الفاظ کا اضافہ کرتے ہیں تو ان کو عربی نظم سے زائد عبارت نہیں گردانتے کیونکہ ان اضافی الفاظ کے بغیر صحیح معنی ادا نہیں ہوتے۔ مثلاً سورۂ عصر کی آیت کریمہ ''وتواصو بالصبر'' میں فارسی الفاظ کا اضافہ ملتا ہے۔ ''وتواصوا'' صرف ایک عربی لفظ ہے مگر اس کا ترجمہ ''یکدیگر را وصیت کروند'' سے کیا ہے، اسی طرح ''حق'' کا ترجمہ یہاں ''دین راست'' سے کیا جس میں راست کی صفت ان کے خیال میں معانی کی ترسیل کے لئے ضروری تھی اور ''تواصی'' باب تفاعل میں باہمی اشتراک کا تقاضا کرتا ہے، لہٰذا ''یک دیگر را'' کا اضافہ معنی کا جزو ہے، اضافہ نہیں۔ اسی طرح سورۂ کوثر میں اولین آیت کے ترجمہ ''یا محمدؐ'' کے خطاب سے شروع کرنا آیت کے الفاظ کے تخاطب کی بنا پر ضروری ہو گیا۔ دوسری آیت میں ''وانحر'' کا ترجمہ ''شتر را'' کا اضافہ کیا ہے کہ ''نحر'' ہمیشہ اونٹ ہی کا ہوتا ہے، یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ لفظ ''قربانی کن'' سے بھی ترجمہ کیا جا سکتا تھا کیونکہ اصل مراد قربانی ہے کہ کسی خاص جانور کی قربانی۔

حضرت مترجم نے ''قوانین در ترجمہ'' اور ''فتح الرحمٰن'' دونوں کے مقدموں میں وضاحت کی ہے کہ بسا اوقات ایک عربی لفظ کا ترجمہ صرف ایک فارسی لفظ سے نہیں کیا جا سکتا کہ فارسی لفظ اپنے اصل کا کامل معنی نہیں بتاتا، لہٰذا دوسرے اضافی الفاظ لانے ناگزیر ہوتے ہیں جو عربی لفظ کے کامل معنی کی ترسیل کرتے ہیں اور یہ اضافی الفاظ اضافی نہیں رہ جاتے بلکہ تمام مل کر عربی لفظ کے معنی بتاتے ہیں۔ ایسی مثالیں بہت سی ہیں لیکن ان میں سے اکثر کا تعلق عربی افعال سے ہے، اسماء وصفات سے نسبتاً کم ہے۔ سورہ بقرہ: 85 میں واقع لفظ ''تطھرون'' کا ترجمہ ''یکے مددگارِ دیگرے می شوید'' سے کیا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ عربی میں ایک ہی مادہ سے مشتق لفظ جب مختلف ابواب، افعال، مفاعلہ، استفعال، تفعیل وغیرہ میں لایا جاتا ہے تو معنی میں اضافہ اور فرق کا فائدہ دیتا ہے اور یہ سہولت فارسی میں حاصل نہیں، لہٰذا کامل معنی کی ترسیل صرف

اضافی بلکہ موضح الفاظ کے ساتھ ہی ممکن ہو پاتی ہے۔

مختلف معانی کے الفاظ، سیاق وسباق میں

حضرت شاہ دہلوی اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ ایک ہی عربی لفظ اپنے سیاق وسباق کے اختلاف کی بنا پر بالکل جداگانہ معانی دیتا ہے اور عین ممکن ہے کہ ایک لفظِ عربی پانچ چھ اور سات یا ان سے زیادہ معانی دے جیسا کہ دامغانی، سیوطی، زرکشی اور متعدد دوسرے معاجم قرآنی پر کام کرنے والوں نے بتایا ہے۔

شاہ صاحب امام ابن تیمیہ کے ''مقدمہ فی اصول التفسیر'' سے بھی واقف تھے اور ان کے اس خیال سے بھی کہ عربی زبان بالخصوص قرآنی زبان میں مترادفات نہیں پائے جاتے۔ ایک لفظ ایک خاص معنی دیتا ہے اور دوسرا اس جیسا معنی تو دے سکتا ہے مگر بعینہ وہی نہیں۔ معنی کا پرتو (Shade) ضرور مختلف ہوگا اور اس کی انہوں نے متعدد مثالیں دی ہیں جیسے روٹی کے لئے ''خبز''، ''رغیف'' وغیرہ اور تلوار کے لئے ''سیف''، ''صارم''، ''مہند'' وغیرہ استعمال ہوتے ہیں لیکن ان میں ہر ایک الگ قسم ہوتی ہے۔

اسی بناء پر شاہ صاحب ایک لفظ کا ترجمہ اس کے سیاق کی بنا پر کرتے ہیں اور دوسرے سیاق کے مطابق اسے بدل دیتے ہیں۔ مثلاً سورہ بقرہ: 85 میں ''تظھرون'' کا جو ترجمہ اوپر گزر چکا وہی لفظ فعل جب سورہ تحریم: 4 میں ''تظاھرا'' کی صورت میں آیا تو اس کا ترجمہ فرمایا: ''باہم متفق شوید بر نجانیدن پیغمبر'' یہاں لفظی ترجمہ بھی مختلف ہے اور موضح الفاظ کے ساتھ بھی آیا ہے کہ سیاق کا تقاضا اس معنی کا ہے۔ ''توبہ'' رجوع، انابت اور توبہ کرنے کے معنی میں آتا ہے لیکن وہ جب اللہ کے فعل کے طور پر استعمال ہوتا ہے تو اس کا معنی بدل جاتا ہے۔ شاہ صاحب نے سورہ توبہ: 119 کی آیت کریمہ ''ثم تاب علیھم لیتوبوا'' میں اس کی رعایت خوب کی ہے اور ترجمہ کیا ہے: ''باز خدا برحمت متوجہ شد بر ایشاں رجوع کنند''۔ ظاہر ہے کہ ذاتِ الٰہی کی توجہ اس کی رحمت کی توجہ ہو سکتی ہے۔ لفظ ''حمد'' قرآن مجید میں 38 بار آیا ہے۔ بیشتر مقامات پر شاہ صاحب نے اس کا ترجمہ ''ستائش'' سے کیا ہے جیسے فاتحہ: 1، انعام: 1، حجر: 98، نحل: 75، اسراء: 111، کہف: 1، مومنون: 28، وغیرہ لیکن بعض مقامات پر سیاق کے اختلاف میں دوسرا لفظ لائے ہیں جیسے انعام: 35 میں ''سپاس'' ہے، وہی اعراف: 43، ابراہیم: 39، نمل: 59، صفت: 182 میں ہے۔ ستائش تو کسی کی طرف سے ہو سکتی ہے مگر سپاس صرف بندوں کا ہوتا ہے جبکہ یونس: 1 میں حمد ہے، یہی طٰہٰ: 130 وغیرہ میں ہے کہ یہاں تقاضا عربی لفظ کا ہے۔

مترادف ومترادفات میں معانی کے پہلو، رنگ، آہنگ کے فرق سے حضرت مترجم کی واقفیت کا ایک ثبوت تو لفظ ''حمد'' کے ترجمہ میں ہی ملتا ہے۔ انہوں نے غالباً کسی جگہ اس کا ترجمہ ''شکر'' سے نہیں کیا ہے کیونکہ ''شکر'' بھی قرآن مجید میں متعدد مقامات پر استعمال ہوا ہے (ص 73 بار بقول فواد عبدالباقی مختلف اشکال میں) حالانکہ متعدد صاحبانِ علم و معرفت نے ''حمد'' کو شکر کے معنی میں استعمال کیا ہے یا اس کا ترجمہ شکر سے کیا ہے۔ اصلاحی، تدبر قرآن نے سورۂ فاتحہ میں الحمد کا ترجمہ ''شکر کا سزاوار حقیقی'' سے کیا ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ ''قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی یہ لفظ اس ترکیب کے ساتھ استعمال ہوا ہے اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے جس مفہوم کو ہم ''شکر'' لفظ سے استعمال کرتے ہیں۔''

اور سند میں اعراف:43، یونس:10، ابراہیم:39 کی آیات نقل کی ہیں جبکہ یہ دعویٰ صریحاً غلط ہے۔شاہ صاحب نے دو سورتوں اعراف اور ابراہیم میں ''سپاس'' سے اور یونس میں ''حمد'' سے ترجمہ کیا ہے۔

الفاظ کے صحیح معانی

قرآن مجید میں اسی طرح لفظ ''عائل'' اور ''فقیر'' دونوں استعمال ہوئے ہیں مگر بیشتر قدیم وجدید مفسرین نے سورہ الضحیٰ:8 ''ووجدك عائلا فاغنى'' میں وارد لفظ ''عائل'' کا ترجمہ ''فقیر'' کر ڈالا ہے۔(ابن کثیر وغیرہ) اردو مفسرین میں شاہ عبدالقادر نے اور ان کے تتبع میں مولانا محمد حسن نے ''مفلس'' کیا ہے اور بعض دوسروں کے ہاں بھی یہی ہے۔مولانا اصلاحی اور مولانا مودودی نے ''محتاج'' اور ''نادار'' کیا ہے۔اس پس منظر میں شاہ صاحب کا ترجمہ ''تنگدست'' خوب لطف دیتا ہے۔پوری آیت کریمہ کا کیا عمدہ ترجمہ ہے:''ویافت ترا تنگ دست پس توانگر ساخت''۔اسی لفظ کی دوسری شکل ''علیة'' سورہ توبہ:28 میں آئی ہے، وہاں اس کا ترجمہ ''درویشی'' کیا ہے اور حاشیہ میں وضاحتی الفاظ سے اس درویشی کی صورت گری کی ہے یعنی بسبب ''انقطاع سوداگراں'' اگر یہ ''درویشی'' تم پر نازل ہو جائے تو اندیشہ نہ کرو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے فضل سے غنی اور توانگر بنا دے گا۔مترادف کی رعایت کی مزید مثالیں بھی شاہ صاحب کے ترجمہ سے پیش کی جاسکتی ہیں، مگر ان سے بحث طویل ہو جائے گی۔

ولی اللّٰہی ترجمہ میں اضافی الفاظ کی متعدد مثالیں اوپر گزر چکی ہیں لیکن اس بحث یا نکتہ کی مزید تنقیح کے لئے چند باتیں اور پیش کی جارہی ہیں۔مختصر اضافہ کے لئے لفظ ''یعنی'' وغیرہ کے بعد کلامِ شاہ آتا ہے اور ایک دو، تین فقروں پر مشتمل اضافہ جس کو شاہ صاحب نے مستقل کلام کہا ہے ''مترجم گوید'' کے بعد آتا ہے۔ان دونوں کی مثالیں الگ الگ نقل کی جارہی ہیں۔

''یعنی'' کے بعد مختصر اضافہ کی مثال سورہ توبہ:27 ''ثم يتوب الله من بعد ذلك على من يشاء'' کا ترجمہ ہے:''باز برحمت باز گردد خدا بعد ازیں بر ہر کہ خواہد'' اور آخری فقرہ کی وضاحت کی ہے:''یعنی توفیق اسلام دہد ہر کرا خواہد از کافراں'' درویشی کی توضیح کے لئے وضاحتی فقرہ اوپر نقل ہو چکا۔''ذلك قولهم بافواههم'' کا ترجمہ کرتے ہیں ''ایں قول ایشاں ست بدہانِ خود'' اور وضاحتی جملہ،فقرہ ہے:''یعنی اصلی ندارد''۔اسی آیت میں ''يضاهون قول الذين كفروا من قبل'' میں وضاحتی فقرہ ''یعنی مشرکان کہ ملائکہ را بنات اللہ می گویند'' ہے جبکہ ''انى يوفكون'' کے ترجمہ: ''چگونہ برگردانیدہ می شوند'' کا وضاحتی فقرہ ''یعنی از راہ صواب'' ہے۔

سورۂ اعراف:167 میں ''ليبعثن عليهم'' کا ترجمہ کرنے کے بعد عذابِ الٰہی کے مورد کو ''یعنی بنی اسرائیل'' سے واضح کیا ہے۔اگلی آیت کریمہ:فخلف من بعدهم خلف ورثوا الكتب کا ترجمہ ہے:''بعد از ایشان جانشینانِ بد کہ وارث توریت شدند'' کی تشریح میں لکھا ہے:''یعنی احبار بنی اسرائیل'' اسی سورہ کی آیت کریمہ:ولو شئنا لرفعنه بها ''واگر می خواستیم برداشتمی اورا'' کا تشریحی فقرہ ہے:''یعنی منزلت اورا'' اور اسی آیت کریمہ کے اگلے حصے میں کتے کی مثال سے متعلق فقرہ کا ترجمہ حضرت مترجم نے صحیح عربیت کے اعتبار سے کیا ہے:فمثله كمثل الكلب ان تحمل

علیہ یلہث او تترکہ یلہث ''پس صفت او مانند صفت سگ ست، اگر مشقت اندازی بروے (یعنی بزدن و دوانیدن) زبان از دہن بیرون افگند و اگر معطل بگذاری اور انیز بیرون افگند'' شاہ صاحب نے تحمل علیہ کا ترجمہ ''اے مشقت میں ڈالنے'' سے کیا ہے اور اس کی تشریح کی ہے کہ ''اسے مارا جائے یا دوڑایا جائے''۔ متعدد اردو تراجم میں اس کا معنی ''حملہ کرنا'' کیا گیا ہے، جو صریحاً غلط ہے۔ (کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے...... مولانا مودودی) مولانا اصلاحی نے ''دھتکارنا'' ترجمہ کیا ہے اور وہ بھی صحیح نہیں۔ تشریح میں مولانا اصلاحی کا بیان کہ...... ''لکڑی اٹھاؤ یا اس پر پتھر پھینکو'' 397/3 بھی بہت صحیح نہیں۔ حضرت مولانا تھانوی نے بھی ''حملہ کرنا'' ترجمہ کیا ہے۔ ان کے مسترشد دریابادی نے ''کھیدے رگیدے'' کیا ہے۔ شاہ عبدالقادر نے ''لادے'' کیا ہے اور ان کے خوشہ چیں حضرت شیخ الہند نے اس کی مزید وضاحت کی ہے کہ ''اس پر تو بوجھ لادے تو ہانپے......'' حضرت شاہ صاحب کا ترجمہ سب سے زیادہ صحیح ہے۔

حواشی میں کلام مستقل کی نوعیت ایک دو تین فقروں اور جملوں کی بھی ہے اور کامل ایک پیراگراف اور پورے بیان کی بھی۔ ''فتح الرحمٰن'' کا پہلا حاشیہ سورہ فاتحہ میں ''العلمین'' (عالمہا) کی تشریح سے متعلق محض ایک فقرہ ہے: ''مترجم گوید: یعنی عالم انس و عالم جن و عالم ملائکہ وعلیٰ ہذا القیاس''۔ دوسرا حاشیہ اسی سورہ کی آخری آیت میں اسی سورہ کی آخری آیت میں وارد ''غیر المغضوب علیھم والالضالین'' سے متعلق دو تین جملوں پر مشتمل ہے: ''مترجم گوید: مراد از آنانکہ اکرام کردہ شد برآنہا چہار فرقہ اند: نبیین وصدیقین وشہداء وصالحین، ومراد از آنانکہ خشم گرفتہ شد برآنہا یہود اند واز گمراہان نصاریٰ۔'' اسی طرح سورۂ بقرہ کا پہلا حاشیہ دو فقروں پر مشتمل ہے اور وہ آیت کریمہ: 18 سے متعلق ہے: ''مترجم گوید کہ حاصل مثل آن ست کہ اعمال منافقان ہمہ حبط شود چناں کہ روشنی آں جماعت دور شد۔'' جبکہ دوسرا حاشیہ خاصا بڑا ہے: ''مترجم گوید کہ حاصلِ مثل آن ست کہ منافقان در ظلماتِ نفسانی افتادہ اند و چوں مواعظ بلیغہ شنوند فی الجملہ ایشاں را تنبیہی می شود و آں فائدہ نہ کند مانند مسافراں کہ در شب تاریک و ابر حیراں باشند و در برق دو سہ قدم بروند باز لیستند واللہ اعلم'' (متعلق بہ آیت: 20)

قرآنی قصص الانبیاء سے متعلق شاہ صاحب کا ایک تشریحی حاشیہ سورۂ بقرہ کی آیت کریمہ: 49 میں بنو اسرائیل کے لڑکوں کے ذبح کیے جانے اور لڑکیوں کے بچائے جانے سے متعلق ہے: ''مترجم گوید: سبب کشتنِ پسراں آں بود کہ کاہنان فرعون را خبر دادہ بودند کہ در بنی اسرائیل پسرے پیدا شود کہ باعث برافتادن پادشاہی او گردد۔'' اسی سورہ کی اگلی آیت کریمہ میں حضرت موسیٰ سے چالیس راتوں کے وعدہ سے متعلق تشریحی حاشیہ اس سے بھی زیادہ طویل ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت: 54 اور 56 کے حواشی بھی کافی بڑے ہیں اور حضرت موسیٰ سے متعلق ہیں۔ بنو اسرائیل سے متعلق اگلے حواشی بھی کافی مفصل ہیں جیسے آیات کریمہ: 66-79-85-87 وغیرہ۔

سورۂ بقرہ کی آیات کریمہ: 123 کا تشریحی حاشیہ رسول اکرم کی نبوت کے اثبات سے متعلق خاصا مفصل ہے: ''مترجم گوید: ازیں جا تا ''سیقول السفہاء'' خدائے تعالیٰ اثبات می فرماید ثبوت پیغمبر ما را علیہ السلام از قصہ دعاء حضرت ابراہیم کہ در توریت مذکور است وترجیح می دہد ملتِ حنیفیہ را کہ حضرت پیغمبر برائے آں مبعوث اند، ورد می کند قول یہود را کہ حضرت یعقوب ما را بہ یہودیت وصیت کردہ است واز تفریق انبیاء نہی می فرماید یعنی معتقد بعضی باشد و منکر بعضی۔'' تحویل قبلہ سے

متعلق آیت کریمہ: 138 ''صبغۃ اللہ قبول کردیم رنگِ خدارا'' کا تشریحی حاشیہ نہ صرف یہ کہ طویل ہے بلکہ اسلامی نبوی تعلیمات کا نچوڑ پیش کرتا ہے:

''مترجم گوید: چونکہ آنحضرت ﷺ بہ مدینہ ہجرت فرمود شانزدہ و یا ہفتدہ ماہ بطرفِ بیت المقدس نمازمی گذارد و آرزومی کرد کہ خدائے تعالیٰ کعبہ را قبلہ وے سازد۔ خدائے تعالیٰ نازل کرد: قدی نری تقلب الی آخرہ. بعدازاں جواب شبہ سفہاء دریں مسئلہ نازل کرد: سیقول السفھاء بعدازاں امر فرمود بہ صبر بر مشاقِ جہاد و در بسیارے از احکام توحید و قصاص و حج و صوم و صدقہ و نکاح و طلاق کہ اہل جاہلیت تحریف کردہ بودند یا رعایتِ انصاف نمی کردند، بیان حقیقت حال فرمود در رد و ابطال بشبہاتِ مخالفین کرد و سوالہائے ایشان را جواب داد و ایں سیاق ممتد است تا آخر الم ترا الی الذین خرجوا'' واللہ اعلم یہی طویل حاشیہ دوبارہ سیقول السفھاء کی تشریح میں لکھا گیا ہے۔ نہ معلوم حضرت مترجم نے خود اس تکرار کو پسند فرمایا تھا یا طباعت و کتابت کا مشہورِ عالم کارنامہ ہے۔

سورۂ بقرہ کی آیت کریمہ: 173 میں حرام کھانوں سے متعلق شاہ صاحب کا تشریحی حاشیہ قرآن و سنت کے تعلق، تطبیق حدیث و قرآن، فقہی تدبر اور نظم قرآن کی خوبصورت وضاحت کرتا ہے: ''مترجم گوید کہ اگر گوئی کہ دریں آیت حصر کردہ شد تحریم را در اشیاء مذکور، حالانکہ در حدیث سباع و حمار مانند آں نیز حرام شمردہ است پس وجہ تطبیق چہ باشد، گویم: حصر اضافی است بہ نسبت کائر و سوائب کہ حرام می دانستند۔ پس در بہیمۃ الانعام ہیچ حرام نیست غیر اشیاء مذکورہ، و در خبائث و سباع و مانند آں سخن نداشتند، واللہ اعلم۔'' اسی سورۂ کریمہ کی آیت: 179 جو قصاص سے متعلق ہے، کا تشریحی حاشیہ غالباً سب سے طویل حواشی میں سے ہے اور حضرت شاہ کے فہم قرآنی اور تدبر حکمت کی سب سے زیادہ واضح مثال بھی۔

حواشی کی بحث میں آخری مثال سورۂ آل عمران کی آیت: 120 ان تمسسکم حسنۃ تسوھم کے ترجمہ سے متعلق ہے: ''در غزوۂ احد اہل نفاق میل کردند بآنکہ در شہر متحصن شوند و اصحاب خواستند کہ بیرون آمدہ جنگ کنند۔ بعدازاں کہ ہزیمت واقع شد منافقاں ایں را محل طعن گرفتند و وقت حرب حضرت پیغامبر بر شعبی جماعت را مقید ساختند کہ ازیں جانبند۔ چوں آثار فتح ظاہر شدن گرفت آں جماعت در پے غارت افتادند و عصیان پیغمبر کردند، بشومی ایں عصیاں ہزیمت بر مسلمان افتاد و ہمہ فرار کردند الا ماشاء اللہ۔ در ینولا خبر شہادت حضرت پیغمبر شائع شد، منافقاں قصد ارتداد کردند پس در جواب طعن منافقاں و عتاب خلاف امر کنندگان و تشنیع بیوفایاں حق سبحانہ نازل کرد۔'' حضرت مترجم کا یہ خیال کہ صرف منافقوں نے شہر میں محصور ہو کر جنگ کرنے کی بات کہی تھی اور تمام صحابہ کرام میدان جنگ جانے پر مُصر تھے، صحیح نہیں ہے۔ صحابہ کی اکثریت بلکہ غالب اکثریت اور خود رسول اکرم ﷺ کا یہی خیال تھا کہ شہر میں ہی رہ کر مقابلہ کیا جائے لیکن جوشیلے مسلمانوں کا اصرار غالب آیا۔ البتہ یہ نکتہ صحیح ہے کہ ہزیمت کی صورت میں منافقین ارتداد کی سوچنے لگے تھے۔ یہ نیا نکتہ بھی ہے۔

مختصر تشریحی فقروں اور جملوں اور مفصل وطویل تر حواشی سے حضرت مترجم کی بیان کردہ دوسری انفرادیتِ ترجمہ کا بھی اثبات ہوتا ہے کہ وہ ہر جگہ قصہ نہیں بیان کرتے اور بلاوجہ اسرائیلی روایات بھی نہیں لاتے۔ صرف انہی مقامات پر قصہ یا اسرائیلی روایت پیش کرتے ہیں جہاں آیت زیر بحث کے معنی کی تفہیم اس پر منحصر ہوتی ہے۔ ان کا یہ دعویٰ قطعی صحیح ہے کہ انہوں نے اس باب میں افراط و تفریط سے بچ کر ''راہِ اوسط'' اختیار کی ہے۔ ان تمام تشریحی حواشی کا ایک تحقیقی مطالعہ

بالخصوص اس زاویہ سے بہت دلچسپ نکات وحقائق کو سامنے لائے گا۔

تیسری امتیازی انفرادیت، جس کا شاہ صاحب نے ذکر کیا ہے، وہ ''یک گیرو محکم گیر'' کے اصول کے تحت مختلف و محتمل توجیہات میں سب سے راجح ومضبوط کو انتخاب کرنے سے متعلق ہے لیکن اس میں چار جہات کی رعایت رکھی ہے: (1) وہ عربیت کے لحاظ سے سب سے قوی ہو (2) حدیث کے لحاظ سے واضح تر ہو (3) فقہی لحاظ سے مضبوط ترین ہو اور (4) عربی قواعد کے اعتبار سے صحیح ترین ہو۔ اس باب میں انہوں نے امام واحدی (علی بن احمد نیشاپوری م 468ھ۔1075ء) کی کتاب ''وجیز'' اور جلال الدین سیوطی (م 911ھ۔1505ء) اور جلال الدین محلی (م 864ھ۔1459-1460ء) کی مشترکہ تفسیر جلالین کا بھی حوالہ دیا ہے۔ یہ دونوں اختصار میں اپنی نظیر نہیں رکھتی ہیں۔ شاہ صاحب نے ترجمہ اور حواشی دونوں میں اس نکتہ کا چاروں جہات کے مطابق کیوں کر لحاظ رکھا ہے، وہ چند مثالوں سے واضح کیا جاسکتا ہے۔

عربیت کا لحاظ

گذشتہ بحث میں عربیت کی رعایت کی کئی مثالیں گزر چکی ہیں۔ ایک مطالعہ میں سورہ بقرہ: 143 میں وارد لفظ **امة وسطا** کا ترجمہ ''گروہِ مختار'' بقرہ: 177 و **آتی المال علی حبه** کا ترجمہ ''وبدہد مال باوجود دوست داشتن آں مال'' بقرہ: 205 **واذا تولی سعی فی الارض** میں ''تولی'' کا ترجمہ ''ریاست پیدا کند'' سورہ آل عمران: 140 **ویتخذ منکم شهدآء** میں ''شہداء'' کا ترجمہ ''شہید گرداند'' اسی سورہ کی آیت: 200 میں واقع لفظ **وا ربطوا** کا ترجمہ ''وبرائے جہاد آمادہ باشید'' اور اسی سورہ کی آیت: 19 **و اختلف الذین اوتو الکتب** کا ترجمہ ''واختلاف کردند یعنی در قبول اسلام'' سورہ نساء: 1 میں واقع لفظ **والارحام** کا ترجمہ ''قطعہ قبیلہ داری'' سورہ انفال: 64 **یا ایها النبی حسبك الله** کا ترجمہ ''اے پیغامبر! کفایت کنندہ است ترا خدا'' سورہ یونس: 66 **وما یتبع الذین یدعون من دون الله** کا ترجمہ ''وپیروی نمی کنند آنانکہ پرستش می کنند بجز خدائے شریکاں'' اور سورہ بنی اسرائیل: 16 **واذا اردنا ان نهلك قرية امرنا مترفيها** میں واقع ''امرنا'' کا ترجمہ ''می فرمائیم بسر کشاں آں جا آنچہ خواہیم'' کیا ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ دوسرے مفسرین کے ترجمہ وتفسیر کے مقابلہ میں شاہ ولی اللہ کا ترجمہ زیادہ صحیح ہے اور عربیت کے قریب تر ہے۔ (محمد سعود عالم قاسمی، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی قرآنی فکر کا مطالعہ، 14-109)

چند اور مختصر مثالیں اس نکتہ کی وضاحت کے لئے پیش کی جاتی ہیں۔ سورۂ بقر: **وارنا مناسکنا** کا ترجمہ شاہ صاحب نے کیا ہے ''وبنما مارا طریق عبادتہائے ما''۔ مختلف مفسرین اور اہل لغت وبلاغت نے دونوں لفظوں کے مختلف معانی بتائے ہیں جن کا حوالہ مولانا دریابادی نے بھی دیا ہے۔ شاہ صاحب نے دونوں کے منتخب معانی بیان کر کے عربیت کی پوری رعایت رکھی ہے کہ ارنا کے معنی دکھا دینے اور مناسکنا کے معنی ''طریق عبادت ہائے ما'' (ہماری عبادت کے طریق دکھا دینے) کا جو ترجمہ کیا ہے، وہ سب سے اچھا ہے کہ اس میں عام دکھانے کا مفہوم بھی شامل ہے اور سکھا دینے کا بھی اور چونکہ اس دعائے ابراہیمی کا ذکر بیت اللہ کی تعمیر کے حوالے سے آیا ہے، لہٰذا وہاں طریق عبادت دکھا دینے کا مفہوم ومعنی زیادہ معنی خیز بھی ہے اور نظمِ آیت کے لحاظ سے بہترین بھی اور اسی کے ساتھ وہ عمومی طریقِ عبادت کی تعلیم سے بھی متعلق ہے۔

حدیث سے مطابقت

شاہ صاحب صرف عربیت سے مطابقت کو معنی آفرینی کے لئے کافی نہیں سمجھتے بلکہ قرآنی ترجمہ میں حدیث نبوی کی موافقت اور اس کی رعایت کو لازمی قرار دیتے ہیں کیونکہ سنت وقولِ نبوی بہترین شارحِ قرآن ہے۔ شاہ ولی اللہ نے اپنے فارسی ترجمہ میں حدیث نبوی کے لحاظ سے رعایت کا طریقہ دو طرح سے اپنایا ہے: بیشتر مقامات پر وہ حدیث نبوی کا حوالہ بھی پیش فرماتے ہیں۔ اول الذکر کی مثالیں تلاش کرنا مشکل کام ہے کہ پورے ''فتح الرحمٰن'' میں جا بجا پھیلی ہوئی ہیں مگر ان کی نشاندہی کا کام تفسیرات محدثین کے حوالے سے کیا جا سکتا ہے جن کا نام شاہ صاحب نے صراحت کے ساتھ لیا ہے۔ انہوں نے امام بخاری، امام ترمذی اور امام حاکم اور ان کی تفاسیر کا ذکر اگرچہ روایات ماثورہ کے ضمن میں کیا ہے، تاہم ان کا واضح اثر ترجمہ وحاشیہ ولی اللّٰہی میں دکھائی دیتا ہے۔

لیکن پہلے احادیث نبوی کے صریح ذکر کے ساتھ سر ترجمہ وتفسیر کی مثالیں کہ ان کی پیشکش آسان ہے۔ گذشتہ بحث میں سورہ بقرہ کی آیت کریمہ: 173 میں حرام اشیاء کے متعلق قرآن کریم کے مجمل بیان کی تفسیر بذریعہ حدیث نبوی کا حوالہ گزر چکا ہے۔ اس کے مطابق اس آیت کریمہ میں تحریم کا حصر نہیں پایا جاتا بلکہ یہ حصر اضافی ہے اور صرف بہیمۃ الانعام سے متعلق ہے جبکہ حدیث نبوی میں تحریم کو خبائث اور سباع کے باب میں بھی وسیع کیا گیا ہے۔

سورہ نساء: 15-16 میں بیویوں کے بدکاری کرنے کی سزا سے متعلق یہ حکم ہے کہ انہیں گھروں میں بند کر دیا جائے اور سزا دی جائے۔ شاہ صاحب نے حواشی میں تشریح کی ہے کہ اس آیت کے بعد اللہ تعالیٰ نے دو راہیں مقرر کر دی ہیں: شادی شدہ (ثیب) کو سنگسار کرنے اور کنواری (بکر) کو کوڑے مارنے کی، فی الحال حبس وقید کا حکم نہیں۔ یہ آیت دوم مجمل ہے اور احادیث میں مذکور ہے کہ آزاد کنوارے یا کنواری کو سو تازیانے مارے جائیں اور آزاد شادی شدہ مرد یا عورت کو سنگسار کیا جائے اور غلام، باندی کو پچاس تازیانے مارے جائیں۔ شاہ صاحب کا یہ خیال کہ آیت: 15 میں مذکورہ حکم حبس وقید اب باقی نہیں، ان کے فلسفہ نسخ قرآنی سے متاثر ہونے کی علامت ہے، ورنہ وہ اب بھی باقی ہے۔

سورہ نساء: 25 **فاذا احصن فان اتین بفاحشة فعلیهن نصف ما علی المحصنت من العذاب** میں شادی شدہ باندیوں کی زنا کی سزا کا ذکر ہے اور وہ آزاد خواتین کی سزا کی آدھی ہے جس کا حوالہ اوپر آ چکا ہے۔ شاہ صاحب نے اس کا اپنے حواشی میں حوالہ دے کر کہا ہے کہ ان کے بتائے ہوئے معنی حدیث میں واضح کیے گئے ہیں (....وایں معنی در حدیث مبین شدہ....)۔

اسی سورہ کی آیت کریمہ: 31 میں وارد لفظ ''کبائر'' (کبیرہ گناہوں) کی تعریف میں شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ: ''گناہ کبیرہ آنست کہ براں حد مشروع شد یا وعدۂ دوزخ کردہ آمد یا بکفر مسمی شد در قرآن یا سنتِ صحیحہ، وہر کہ از کبائر اجتناب کند صغائر اورا نماز وروزہ وصدقہ نابود سازد۔'' دوسری بات کہ کبیرہ گناہوں سے بچنے والوں کے صغیرہ گناہ ان کے نماز وروزہ وصدقہ سے ختم ہو جاتے ہیں، اس بات کی سند حدیث سے نہیں لائی گئی ہے مگر ہے وہ حدیث سے مستند ومستفاد۔

''فتح الرحمٰن'' کے ترجمہ اور حاشیہ دونوں میں قرآنی آیات کے معانی ومفاہیم کی تعیین میں احادیث نبوی سے مدد لی گئی

ہے اور مذکورہ بالا تفاسیر محدثین اور صحیح روایات کا حوالہ دیئے بغیر انہیں برابر نقل کیا گیا ہے۔ حدیث نبوی سے شاہ صاحب کے استفادہ کا یہ باب بہت وسیع ہے اور پورے ایک تحقیقی مقالہ کا تقاضا کرتا ہے۔ یہاں چند مثالوں سے اس نکتہ کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس سے یہ بھی واضح ہوگا کہ انہوں نے اپنے مقرر کردہ اصولِ تفسیر قرآنی کی کس قدر پابندی کی ہے۔

سورۂ فاتحہ کی ساتویں آیت کریمہ میں واقع دو الفاظ **المغضوب علیھم** اور **الضالین** سے بالترتیب مراد یہود اور نصاریٰ کو لیا گیا ہے اور حدیث نبوی میں اس کا اظہار ملتا ہے۔ (تفسیر طبری، تفسیر ابن کثیر وغیرہ)۔ شانِ نزول سے متعلق شاہ صاحب کے بیشتر حواشی حدیث کی روایات پر مبنی ہیں جیسے سورہ بقرہ:26 میں بعوضہ (پشہ) (ذباب اور عنکبوت وغیرہ در دیگر صورت) کے ذکر پر کافروں کے اعتراض سے متعلق حاشیہ، سورہ بقرہ:58 میں صفا مروہ سے متعلق آیت کریمہ میں طواف کے شعار ہونے سے متعلق حضرت شاہ صاحب کا حاشیہ، سورۂ بقرہ:168 میں حلال چیزیں کھانے کے بارے میں حکم خداوندی ہے اور اس سے متعلق حضرت شاہ کا حاشیہ ہے کہ اہل جاہلیت نے بہت سی چیزوں کو مثلاً بحائر وسوائب کو حرام کر لیا تھا، لہٰذا یہ آیت اتری اور اس کی شان نزول حدیث سے ثابت ہے۔ سورۂ بقرہ:189 میں اشہر حج/مواقیت حج کا ذکر ہے۔ شاہ صاحب نے حدیث کی بنا پر تعیین کی ہے کہ شوال، ذیقعدہ اور نو دن ذی الحجہ کے بھی اشہر حج میں شامل ہیں۔ اہل جاہلیت کے دیوار پھاند کر گھروں میں داخل ہونے کے رسم کی تردید بھی اسی میں ہے۔ سورۂ بقرہ:197 میں حج کے معلوم مہینوں کی تصریح حضرت شاہ صاحب نے شوال و ذیقعدہ اور عشرۂ ذی الحجہ سے کی ہے جو حدیث پر مبنی ہے۔ مناسک حج سے متعلق شاہ صاحب کے تمام حواشی حدیث نبوی کی روایات پر ہی مبنی ہیں۔

سورۃ النساء:58 میں امانات ادا کرنے کا حکم عام ہے۔ حضرت مترجم نے اس کے حاشیہ میں خانۂ کعبہ کے دروازے کی کلید اور اس کے بردار حضرت عثمان بن طلحہ حجبی کا واقعہ حدیث کی بنیاد پر نقل کیا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ان ہی کو کلید دے دی تھی۔ اولین آیت سورۂ مائدہ کے حاشیہ میں شاہ صاحب کی یہ صراحت ملتی ہے کہ چار مہینوں رجب، ذیعقدہ، ذی الحجہ، محرم میں قتال نہ کرنا چاہیے کہ وہ مقدس مہینے ہیں۔ یہ حدیث نبوی کی بنا پر تعیین کی گئی ہے۔ شانِ نزول کے باب میں احادیث نبوی سے شاہ صاحب کے استفادہ کا باب بہت وسیع ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے ''فتح الرحمٰن'' کے ترجمہ اور حاشیہ دونوں کی ایک نہایت ممتاز و نادر خصوصیت یہ ہے کہ قرآنی آیات، تراکیب، الفاظ و کلمات کے معانی و مفاہیم کی تفہیم و تعیین رسول اکرم ﷺ کی احادیث مقدسہ سے کی گئی ہے اور وہی صحیح ترین ترجمانی، تفہیم اور تفسیر ہے کہ خود صاحب وحی ﷺ کی زبان مبارک سے ہوئی ہے۔ سورہ مائدہ:5 میں مردوں کو حکم ہے کہ وہ پارسا عورتوں سے نکاح کریں کہ عفت کے طالب رہیں اور شہوت رانی نہ کریں۔ **غیر مسافحین** کے بارے میں شاہ صاحب کا حاشیہ ہے کہ نکاح کی اجازت ہے مگر متعہ حرام ہے اور یہ تفہیم حدیث نبوی پر مبنی ہے۔ اسی سورہ کی آیت کریمہ:40 سے متعلق اپنے حاشیہ میں شاہ صاحب نے تشریح کی ہے کہ عہد نبوی میں یہود نے زنا کی سزا رجم کو معطل کر رکھا تھا اور توریت کے حکم کو چھپاتے تھے۔ جب ایسا ایک مقدمہ دربار رسول اکرم ﷺ میں پیش ہوا تو آپ نے توریت کے حکم پر عمل کروایا اور ان کے فریب و تعطل اور نافرمانی کو کھول دیا۔ یہ پوری روایت حدیث نبوی پر مبنی ہے۔

سورۂ آل عمران:22 میں اطاعتِ الٰہی اور اطاعتِ رسول اور کافروں سے اللہ کی نفرت کا حکم ہے۔ شاہ صاحب

نے اس کے تشریحی حاشیہ میں نصاریٰ سے رسول اکرم ﷺ کے مباہلہ کرنے پر راضی ہونے کی روایت بیان کی ہے جو حدیث سے لی گئی ہے، اسی طرح اس سورہ کی آیت کریمہ:193 میں تورات کے نزول سے قبل حضرت یعقوبؑ (اسرائیل) کے بعد کھانوں کے حرام کر لینے کا حوالہ ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے اپنے حاشیہ میں ملتِ ابراہیمی میں حلال چیزوں اور ان سے رسول اکرم ﷺ کے پرہیز کرنے پر یہودی طعن کا حوالہ دیا ہے اور پوری روایت نقل کی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ملت ابراہیمی کی پابندی کی تھی۔ یہ بھی حدیث پر مبنی ہے۔ اسی سورہ کی آیت:105 میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ پہلوں کے مانند "مشوید ہفتاد و چند فرقہ گشتند"۔ حدیث میں بہتر (72) فرقوں کا حوالہ ہے۔ آیت کریمہ:113 میں اہل کتاب میں ایک امۃ قائمہ کا حوالہ ہے۔ شاہ صاحب نے ان کو حضرت عبداللہ بن سلامؓ جیسے مسلمان کہا ہے اور یہ تفسیر حدیث پر مبنی ہے۔

علم فقہ کے اعتبار سے بھی قوی ترین اور مضبوط ترین رائے یا تفسیر و تاویل کو قبول کرنے کا شاہ صاحب نے دعویٰ کیا ہے اور اسے اپنے ترجمہ اور حواشی کا ایک تیسرا نمایاں وصف قرار دیا ہے۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مختلف فقہی مسالک اور متعدد فقہاء کی گوناگوں آراء میں سے کسی کو ترجیح دے کر بیان کرتے ہیں اور بسا اوقات ان میں سے کسی ایک کو ترجیح بھی نہیں دیتے، لہٰذا بعض تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ "شاہ صاحب کسی ایک فقہ پر انحصار کرنے کے بجائے فقہ اربعہ کو اس لئے سامنے لاتے ہیں کہ جو رائے موقع کے لحاظ سے مناسب ہو اس کو ترجیح دی جائے یا آیت سے جو بعید معلوم ہوتی ہے اس کی حقیقت پر روشنی ڈالی جائے....." (سعود عالم، 24-123) سورۂ مائدہ::3 نقل کر کے بھوک میں مردار کھانے سے متعلق تین فقہائے کرام، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کی آراء نقل کر کے تینوں کی تصویب کی ہے۔ اس آیت کی تفہیم میں تینوں آئمہ کی آراء کی تصویب ممکن ہے کیونکہ وہ مسئلہ کے دو مختلف پہلوؤں سے متعلق ہے مگر جہاں دو یا زیادہ آراء میں اختلافِ معانی ہو وہاں ترجیح کے بغیر قاری کو فقہی مشکل میں ڈالنے کے مترادف ہوگا۔

شاہ صاحب کا فقہی مسلک بلاشبہ اکثر معاملات میں حنفی ہے لیکن وہ امام شافعی کی فقہی بصیرت کے بھی قائل ہیں اور امام مالکؒ کی "موطا" کو سرچشمہ حدیث اور تمام کتب احادیث کا ماخذ و مرجع سمجھتے ہیں، لہٰذا وہ ان تینوں کی روایات اور ان کے مسالک و آراء کو بالعموم اور امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے افکار و دلائل کو بالخصوص بیان کرتے ہیں۔ بسا اوقات وہ ان دونوں میں کسی کو ترجیح نہیں دیتے۔ اس سے دو مفہوم لئے جاسکتے ہیں: ایک یہ کہ وہ دونوں کی صحت کے قائل ہیں، دوسرے یہ کہ وہ اپنے ترجمہ و حاشیہ کو کسی ایک فقہی مسلک کے پابند قارئین کے لئے محدود کرنا نہیں چاہتے اور ان دونوں کے مسالک واضح کر کے یہ اشارہ دیتے ہیں کہ جو جسے چاہے قبول کر لے۔ مشکل وہاں پیش آتی ہے جہاں دو فقہاء کی آراء میں اختلاف ہو جس کی تطبیق و مطابقت نہ ہو سکے اور ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دینا ضروری ہو۔ شاہ صاحب کے ترجمہ سے پہلوئے ترجیح کو نکالا جاسکتا ہے کہ وہاں دو مختلف آراء کی گنجائش نہیں رہتی۔

ایک ایسی آیت کریمہ سورہ مائدہ:5 جس میں محصنت مومن یا اہل کتاب عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے اپنے حاشیہ میں وضاحت کی ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک "محصنت" سے مراد پارسا عورتیں ہیں اور امام شافعی کے نزدیک آزاد۔ شاہ صاحب نے حاشیہ میں دونوں میں سے کسی کو ترجیح نہیں دی ہے۔ (سعود عالم قاسمی، 124 و مابعد) لیکن اس کے ترجمہ میں شاہ صاحب نے اپنی ترجیح مسلک امام ابوحنیفہ کے لئے ظاہر

کردی ہے کہ پارسا سے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ میں لفظ "محصنت" ہی رکھا ہے مگر "محصنین" کے ترجمہ میں "عفت طلب کناں" کیا ہے اور خود قرآن مجید کی دوسری ترکیب اس معنی کی تائید کر رہی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ شاہ صاحب امام شافعی اور ان کی فقہ کے دل سے قائل تھے اور ان کا خیال تھا کہ جہاں تک ممکن ہو ان دونوں مسالک میں تطبیق دی جائے اور ایک مضبوط و مستحکم اور متحدہ فقہ اور مسلک کی بنا ڈالی جائے۔ اسی کے ساتھ امام ابوحنیفہؒ کی فقہی بصیرت کے نہ صرف قائل تھے بلکہ عام طور سے اسی پر عمل پیرا بھی تھے۔ اپنے حواشی میں وہ بالعموم دونوں مسالک کا ذکر خیر فرماتے ہیں۔ کبھی صرف مذہب شافعی کا ہی حوالہ دیتے ہیں اور کبھی کبھی اولین فقہاء کی آرا کا بھی۔

سورہ بقرہ: 181 وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین کا ترجمہ کیا ہے کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت تو رکھتے ہیں مگر نہیں رکھتے تو ان کو ایک درویش کھانے کا فدیہ دینا ہے اور روزہ رکھنا زیادہ افضل ہے۔ حدیث کی بنا پر فدیہ کی مقدار معین کرنے کے بعد اس آیت کے حکم کے منسوخ یا غیر منسوخ ہونے سے بحث کرتے ہیں اور آخر میں فرماتے ہیں کہ فدیہ دینا ایک مسکین کے کھانے کا ہے اور اس کی مقدار ایک مد ہے اور یہ حکم حضرات قاسمؒ وسعید بن جبیرؒ سے منقول ہے اور یہی "مذہب شافعی" ہے اور اس صورت میں یہ آیت محکم اور غیر منسوخ ہے۔ انہوں نے نہ صرف فقہ شافعی کو ترجیح دی بلکہ اس کی بنا پر آیت کریمہ اور اس کے حکم کے محکم وغیر منسوخ ہونے کا حکم لگایا ہے مگر سورہ بقرہ کی آیت کریمہ: 228 میں لغو قسم کھانے کے بارے میں کسی فقہ کو ترجیح نہیں دی بلکہ دونوں مذہبوں کے اختلاف کے مطابق مختصر تشریح کر دی ہے۔ یہاں دونوں سے مراد حنفی و شافعی مذہب ہی ہیں۔ (ف 1 یعنی لا واللہ وبلیٰ اللہ بغیر قصد گوید غلط دانستہ سوگند خورد علی اختلاف المذہبین۔ واللہ اعلم)

سورہ مائدہ: 6 میں ایک حکم اولمستم النساء یا مساس کردہ باشید زنان را، یعنی عورتوں کے چھونے سے مراد جماع کرنا ہے کہ یہی خیال حضرت شاہ صاحب کا ہے۔ انہوں نے امام شافعیؒ کا مسلک بھی بیان کیا ہے کہ عورتوں کے چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہاں انہوں نے حنفی مسلک کو ترجیح دی ہے اور شافعی فقہ کو نہیں مانا ہے (ف 5: مترجم گوید: یعنی جماع کردہ باشید، ونزدیک شافعی دست رسانیدن بزنان ناقض وضو است، واللہ اعلم) اسی سورہ کی آیت: 95 میں وارد حکم الٰہی کہ دورانِ حج شکار کرنے کو فدیہ دینا پڑے گا، سے متعلق دونوں فقہی مسائل کا ذکر کیا ہے:

"شکار کا بدلہ (جزا) یا کفارہ تین چیزوں میں سے ایک ہو سکتا ہے: شکار کے مساوی (مماثل) جانور حرم میں قربان (ذبح) کرے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک مماثلت شکار اور ذبیحہ میں خلقت و ہیئت میں ہوگی اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قیمت میں ہوگی یا شکار کی قیمت کے برابر غلہ (کھانا۔ طعام) خرید کر مسکینوں کو ادا کرے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک ہر مسکین کو ایک مُد دینا ہوگا جبکہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہر مسکین کو نصف صاع گندم/ گیہوں یا ایک صاع جَو دے یا مسکینوں کی تعداد (شمار) کے مطابق روزے رکھے، جیسا کہ دونوں مذہبوں میں اختلاف ہے۔"

شاہ صاحب آیاتِ قرآنی کی تاویل میں بھی فقہی مسالک کے اعتبار سے کرتے ہیں۔ چنانچہ سورۂ مائدہ 106-108 یآیہا الذین امنو شہادۃ بینکم اذا حضر احدکم الموت حین الوصیۃ اثنان ذوا عدل منکم اوآخر ان من غیر کم...... واللہ لایہدی القوم الفٰسقین "اے مسلمانان نصاب شہادت درمیان شما وقت وصیت چوں برسد بہ یکے از شما موت، دو کس اند کہ صاحب عدالت باشند۔ ایں اسلوب نزدیک تراست بآنکہ بیارند گواہی

رابر وجہ آں یعنی بروجہیکہ باید درگواہی دادن از شما یا دیگراں از غیر شما...... یا بترسند ازانکہ رد کردہ شود سوگند ما بعد سوگند ہای ایشاں، وبترسید از خدا وبشنوید حکم اور او خدا راہ نمی نماید گروہِ فاسقاں را) کی تاویل میں فرماتے ہیں کہ اس آیت کی تاویل مذہب شافعی کے مطابق یہ ہے کہ شہادت سے مراد وصیت ہے اور منکم کا معنی ہے من اقاربکم یعنی تمہارے عزیزوں/رشتہ داروں میں سے ہوں اور دو گواہوں ''اثنین'' کا ذکر احتیاط کی خاطر ہے اور قسم دلانا دعویٰ میں مدعا علیہ کی جانب سے ہوگا کہ انہوں نے خیانت کی ہے اور صلوٰۃ عصر کی تعیین قسم کو زیادہ موکد بنانے کی خاطر ہے اور دو گواہوں کا اختیار وانتخاب براہِ احتیاط ہے اور پہلے دو گواہوں کا مدعا علیہ کی جانب سے کھڑا ہونا اس دعویٰ پر ان کی طرف سے احتیاط (حذر) کرنے کے لئے ہے۔ اس لئے مذکورہ صورت میں خریداری کرنے پر ان کا دعویٰ تھا۔ فان ارتبتم (اگر تم کو شک ہو) کسی کے دعویٰ کی طرف اشارہ ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کے مطابق تاویل یوں ہوگی کہ نماز عصر کی تعیین اس لئے کی گئی کہ قاضی محلوں میں اس وقت بیٹھتے ہیں۔ پس گویا یہ کہا گیا کہ ایسا سب محکمۂ قضا میں رونما ہوگا۔

سورۂ نور:3 الزانی لاینکح الازانیة او مشرکة والزانیة لاینکحها الا زان او مشرک وحرم ذلك علی المومنین کی تفسیر میں شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو زانی عورت اپنے جرم کا اقرار کر لے اس کا نکاح اس زانی سے کیا جائے گا۔ یہ امام احمد بن حنبلؒ کا مذہب ہے جبکہ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک تاویل یہ ہے کہ مسلمانوں پر شرک اور زنا حرام قرار دیا گیا ہے۔ گویا ان کا کہنا ہے کہ وہ کسی خاص قوم کے ساتھ مخصوص ہے یا یہ ایک ایسی آیت ہے جو منسوخ ہے اور اس میں کلام ہے۔ شاہ صاحب کی عبارت سے حقیقت واضح ہوتی ہے: ''مترجم گوید: ازیں آیت معلوم شد کہ زانیہ مقرہ بہ زنا را نکاح تواں کرد و ہمیں است مذہب احمد؟ وتاویل آیت نزدابی حنفیہ وشافعی آنست کہ حرام کردہ شد شرک وزنا بر مسلمان یا گویند خاص ست بقومی یا گویند منسوخ ست، وفیہ مافیہ'' (سعود عالم، 127، کی تفسیر وتشریح نہیں ہے۔ ان کا امام احمدؒ کے مسلک کے بارے میں بیان غلط ہے۔ شاہ صاحب کی عبارت میں زنا کا اقرار کرنے والی زانیہ ہے جس کو زنا پر اصرار کرنے والی زانیہ بنا دیا گیا ہے۔ کسی قوم سے مخصوص ہونے کو کسی قول سے مخصوص قرار دیا گیا ہے۔ ''ہمین است'' سے شاہ صاحب کی ترجیح برائے مسلکِ امام احمد ثابت کرنا دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے۔)

فقہی مذاہب بالخصوص مذہبین (حنفی وشافعی) کے اختلاف کی رعایت شاہ صاحب اپنے ترجمہ کے متن میں بھی روا رکھتے ہیں۔ سورۂ بقرہ:228 میں لفظ ''قروء'' آیا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس کے معنی ہیں ''حیض'' اور امام شافعیؒ کے نزدیک ''طہر''۔ ترجمہ میں رعایت دونوں کی موجود ہے: والمطلقت یتربصن بانفسهن ثلثة قروء و آں زناں کہ طلاق دادہ شد ایشاں را انتظار سہ حیض یا طہر کنانند خویستن را...... یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ حیض کے معنی کو اولیت دینے کے سبب حنفی مسلک کو ترجیح دی ہے لیکن اس کی تاویل یہ بھی کی جا سکتی ہے کہ شاہ صاحب نے فقہی مسالک میں ترجیح دینے کے اصول کا اتنا خیال نہیں رکھا جتنا کہ تاریخی ترتیب واولیت کا جس کے مطابق فقہ حنفی کو فقہ شافعی پر تاریخی سبقت حاصل ہے۔ شاہ صاحب کے فارسی ترجمہ میں مذہبین کی رعایت کی ایسی مثالوں کا تجزیاتی مطالعہ بہت سے اہم نکاتِ ترجمہ وفقہ کو اجاگر کرے گا۔

(تحقیقاتِ اسلامی، ص 389-420 اکتوبر۔ دسمبر 2005ء)

✧.....✧.....✧

مترجم: محمد سرور

تاویل الاحادیث

از حضرت شاہ ولی اللہ

(اردو ترجمہ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سب تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے صاف و روشن امر اور رشد و ہدایت کے ساتھ انبیاء کو مبعوث کیا اور ان کے سینوں میں اپنی ذات و اسماء کے معارف اور ایجاد کے اسرار کے خزانہ ہائے علم رکھے اور ان کی زبانوں سے وہ کہلوایا جس سے کہ وہ شخص کہ اس کی نظم فطرت عیوب شاعری سے پاک ہے، تہذیب حاصل کر لے اور جو حق کے انکار اور اس کی مخالفت پر مصر ہے، اس پر حجت قائم ہو۔ پھر ان کے احوال کو قرب کے نشیبوں اور بلندیوں میں متصرف کیا اور ان پر اپنی قدرتوں اور حسابوں سے نادر وقائع ظاہر کیے۔ پس کتنی برکتیں بوجہ اس کی رحمت کے انہیں ڈھانپ لینے کے جاری و ساری ہوئیں اور اس نے ان کی مدد کی اور کتنی تکلیفیں اس نے ان پر کم کر دیں تا کہ جو کچھ وہ ان پر نازل اور وارد کرتا ہے، اس کے متعلق ان دلوں کو مضبوط کرے اور کتنے معجزے تھے کہ ظاہر ہوئے تا کہ جسے اپنی بدبختی سے ہلاک ہونا ہے۔ وہ واضح دلیل سے ہلاک ہو اور جسے اپنی سعادت مندی سے زندگی پانا ہے، وہ واضح دلیل سے زندگی پائے اور دشمنوں کے کتنے قریب تھے کہ کفر کے قلع و قمع اور اس کے خلاف جہاد کے وقت انہیں ان کے سینوں پر لوٹایا اور کتنے دشمن تھے کہ ان (انبیاء) کی قبول ہونے والی دعا نے انہیں توڑ کر رکھ دیا۔ یہاں تک کہ ان کو ان کی قبروں اور لحدوں میں داخل کر دیا اور کتنے رؤیا تھے کہ ان میں ان (انبیاء) کے لئے برزخ اور حشر کے اسرار جو کچھ انسان پر معاد میں وارد ہوتا ہے، وہ سب متمثل ہوئے اور کتنے ہی واقعات تھے کہ ان میں ملکوت اور جبروت کے اسرار متشکل ہوئے۔ پس انبیاء ان کی وجہ سے اس (اللہ) کی مراد پر مطلع ہوئے اور اس (اللہ) نے ان واقعات میں سے ہر واقعہ میں ایک سر رکھا۔ اسے وہی جان سکتا ہے جسے اللہ اپنے بندوں میں سے، جنہیں اس نے تاویل احادیث کا علم دیا اور ان کے سینوں کو نئے وارد ہونے والے اور قدیم علم کے لئے کھول دیا۔ چنانچہ پس پاک ہے وہ ذات جو جتنا چاہے اور جسے چاہے اپنے علم اور اپنے سامان سے عطا کرتا ہے اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، میں اس کی گواہی دیتا ہوں، ایسی گواہی کہ اللہ کے بندوں پر اس کا جو حق ہے، وہ ادا ہو اور میں شہادت دیتا ہوں کہ ہمارے سردار محمدؐ اس کے بندے اور رسولؐ ہیں اور آدم اور ان کے بعد جو ہوئے

روز حشر کو جب بڑی سخت مصیبت ہو گی، ان کے جھنڈے تلے ہوں گے۔

اس کے بعد بندۂ ضعیف اپنے رب کریم کی رحمت کا محتاج احمد مدعو بہ ولی اللہ بن عبدالرحیم اللہ دنیا اور آخرت میں ان دونوں کے ساتھ ہو۔ کہتا ہے: یہ چشمے ہیں جو تاویل احادیث کے علم سے پھوٹے ہیں اور شاخیں ہیں جو سر الموار یث کے درخت سے نکلی ہیں۔ جو انہیں جانے گا، انہیں غنیمت سمجھے گا اور جو ان کے رموز حل کرے گا اور ان کا انکشاف کرے گا۔ ان سے فائدہ اٹھائے گا۔ میں نے ان کا نام تاویل الاحادیث رکھا ہے تا کہ وہ اس دبیز پردے کے ذریعہ انکشاف کا عنوان بنے اور سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، بہت زیادہ اور بہت اچھی تعریف جس کی نہ کوئی حد ہے اور نہ وہ شمار میں آتی ہے۔

مقدمہ

تمہیں یہ معلوم رہے کہ اللہ تعالیٰ جب انسان کی زبان سے انسان پر علم نازل کرتا ہے تو علم کا یہ نزول اس کے مرتبہ ذات سے انسانوں کی طرف تدلی اور تجلی کی صورت میں ہوتا ہے اور یہ نزول مجاز اور کنایت کے طریقے پر نہیں ہوتا جو کہ عام علوم کا طریقہ ہے بلکہ نزول علم کا یہ طریقہ ''تجوزِ طبیعی''(1) کا ہوتا ہے۔ جیسا کہ جب انسان کے حواس پر ایسی حالت کے علم کا جو اسے عنقریب پیش آنے والی ہو، فیضان ہوتا ہے تو اس کو افعال ارادی وغیر ارادی اور اجسام وحیوانات میں سے جو کسی نہ کسی لحاظ سے اس فیضان ہونے والی اجمالی حالت سے مشابہ ہوتے ہیں، خواب دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ ایک آدمی کو اس امر کا فیضان ہوا کہ وہ بادشاہ بنے گا تو یہ بادشاہت اس کو خواب میں تاج یا ہاتھی کی صورت میں تشکل پذیر ہوتی ہے۔ پس وہ دیکھتا ہے کہ ایک آنے والا آیا اور اس نے اسے تاج دیا یا اسے اس نے ہاتھی پر سوار کرایا۔ اب تعبیر کرنے والا اس کی یوں تاویل کرے گا کہ اس خواب سے مراد بادشاہت کا حصول ہے اور تاج اور ہاتھی عبارت ہے بادشاہ سے اور ایک آنے والے کا آنا اور اسے اس کا تاج پہنانا اور ہاتھی پر سوار کرانا، اس کے معنی یہ ہیں کہ امر واقعہ قریب ہے اور یہ کہ انسانی علوم میں سے جو کہ اس کے لئے جبلی ہیں، یہ ہے کہ ہر حادثے کا کوئی سبب ہوتا ہے۔ سو یقیناً اس خواب میں آنے والے کا آنا اور اس کا اسے تاج پہنانا اور ہاتھی پر سوار کرانا اس کے لئے ایک سبب کی شکل اختیار کر گیا۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کسی ایسی اجمالی حقیقت کی طرف انتباہ کرنا چاہتا ہے کہ وہ حس کے دائرے سے باہر ہوتی ہے تو وہ اس اجمالی حقیقت کا قصے یا کلام کے ذریعہ جو مجموعی طور پر اس کے مشابہ ہوتا ہے جس کا کہ اللہ نے ارادہ کیا ہے، اسے انتباہ کرتا ہے جیسا کہ سوتے وقت خواب کے ذریعہ بادشاہ بننے والے کو وہ چیزیں دکھائی گئیں۔ چنانچہ اس کی مثال یہ ہے کہ اللہ کی سربلندی اور عظمت کی تعبیر بادشاہوں کی رفعت شان اور شہر میں ان کے حکم کے چلنے سے کی جاتی ہے اور اسی ذیل میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: بل یداہ مبسوطتان (بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں) اسی طرح دوسری آیات متشابہات ہیں جیسے کہ اللہ کا ہنسنا وغیرہ۔

جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بتانا چاہا کہ وہ فیاض ہے تو فیاضی کی خواب میں جو صورت ہوتی ہے یعنی ہاتھوں کا کھلا ہونا تو اس نے ہم سے اس کے متعلق کلام فرمایا اور جب اس نے ہمیں یہ بتانے کا ارادہ کیا کہ وہ آسمانوں اور زمین کی تدبیر کرنے والا ہے تو اس نے عالم مثال میں تدبیر کی صورت کا ارادہ کیا کہ وہ آسمانوں اور زمین کی تدبیر کرنے والا ہے تو اس

نے عالم مثال میں تدبیر کی صورت کی نظر کی اور وہ بادشاہوں کی اپنی سلطنت میں بلندی و برتری ہوتی ہے۔ چنانچہ اس نے ہم سے اسی طرح کلام فرمایا۔ اس کے کلام کی بنیاد اس نوعیت کی نہیں تھی جس کا ذکر علم البیان بھی کہا جاتا ہے۔ اگرچہ بعض صورتوں میں ایسا بھی ہوتا ہے باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔ ''تجوز طبیعی'' سے میری مراد کسی حادثے، واقعہ منتظمہ یا کلامی کنائے کا اجمالی معنوی سرّ کے ذریعہ نقل کرنا ہے۔ ان علاقوں کے ساتھ جن کا کہ طبیعت خواب میں خیال رکھتی ہے جبکہ اسے کوئی اجمالی علم حاصل ہوتا ہے اور وہ اسے ایک صورت دے دیتی ہے۔

تمہیں یہ معلوم رہے کہ کاملوں کے نفوس پر جو احوال وارد ہوتے ہیں اور عالم مثال میں جو واقعات مترتب ہوتے ہیں تو یہ ان نفوس کی تکمیل کے لئے ہیں۔ پس ان کا حکم خواب کا ہے۔ اسی طرح عالم میں وقوع پذیر ہونے والے سارے کے سارے حوادث خوابیں ہیں اور ان کے اصول اور اشباح وقالب ہوتے ہیں۔

اصولوں میں سے ایک یہ ہے:۔ اللہ کا اپنے بندوں کے بارے میں الہامات،[2] احالات[3] اور تقریبات کے ذریعہ کے تدبیر[4] کا ارادہ۔ پس رحموت نظام خیر کی طرف بالذات اور حادثہ کے وجود کی طرف بالطبع متوجہ ہوتا ہے اور وہ اس حادثے کے لئے اپنے بندوں کو الہام، احالہ اور تقریب کا فیضان کرتا ہے۔ پس وہ عادت کے طریقوں میں سے اسے چن لیتا ہے جو اس وقت سب سے زیادہ قریب چیز ہوتی ہے۔ چنانچہ خارجی واقعہ اس صورت میں جو ظہور کے قریب ہوتی ہے اور جس کا اسے الہام ہوتا ہے، تدریجاً ظاہر ہوتا ہے، اور طبائع اور نفوس کا اس صورت کو قبول کرنا ان کی استعداد کے مطابق ہوتا ہے۔ یہ واقعہ جو ظہور پذیر ہوتا ہے، وہ شبح وقالب اور خواب ہے اور وہ تدبیر اصل اور خواب کی تعبیر ہے۔

اس کی مثال یہ ہے:۔ اللہ نے ارادہ کیا کہ وہ زمین میں خلیفہ بنائے۔ چنانچہ اس نے آدم کو پیدا کیا اور انہیں ایک مثالی حقیقت نے احاطہ کر لیا جسے جنت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پس ان سے اہل جنت کا سا معاملہ کیا گیا[5] اور ان کے زمین میں خلیفہ ہونے کا دروازہ بند ہو گیا۔[6]

پس آدم علیہ السلام کو ان کے لوحِ نفس کی صفائی کے مطابق متنبہ کرنے کے سلسلے میں تقریبات کا ظہور ہوا کہ درخت (کا پھل) کھانا ان پر حرام ہے کیونکہ وہ انہیں جنت سے نکالے جانے کا سبب بنے گا۔ چنانچہ آدم علیہ السلام کے لئے یہ انتباہ واجب کرنے والی وحی بن گیا اور شیطان اپنی شتری حقیقت کی بنا پر آدم علیہ السلام کے دل میں وسوسہ ڈالنے کی استعداد رکھتا تھا اور آدم علیہ السلام کی طبیعت اس درخت (کے پھل) کو کھانے کی سچی صلاحیت رکھتی تھی۔ پس انہوں نے اسے کھایا، پس ان پر عتاب ہوا اور وہ جنت سے نکالے گئے۔ یہ سب خواب اور رؤیا ہے اور اس کی تعبیر یہ ہے:۔ اس سے اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ وہ زمین میں خلیفہ ہوں اور اپنے نوعی کمال کو پہنچیں، باقی انہیں درخت (کا پھل) کھانے سے منع کرنا، پھر شیطان کا وسوسہ ڈالنا، بعد ازاں ان پر عتاب ہونا اور انہیں جنت سے نکالا جانا، تو یہ سب ان کے عالم مثال سے اس عالم ناسوت میں تدریجاً نکالے جانے کے لئے تقریب کی صورت ہے۔

اور اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ ایک نفس اپنی اصل فطرت کے اعتبار سے کمال کی استعداد رکھتا ہے جیسے کہ اسے سرّ الٰہی کا متنبہ ہونا یا اس کا ملاء اعلیٰ سے اتصال دائم ہونا یا اللہ کے رنگ میں رنگا جانا۔ پس اس نفس کے لئے اپنے اعلیٰ مقام تک پہنچنے اور اپنے کمال کے ظہور کے لئے ایک معلوم ومعین نظام ہوگا اور طبیعت اور رسوم کی وجہ سے اس نفس کی لغزش

ہوں گی یا وہ بدن کی کدورتوں سے ملوث ہوگا اور نفس کی یہ لغزشیں بدن کی ان کدورتوں کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ چنانچہ ملاء اعلیٰ سے اس کا یہ اتصال، اللہ کے رنگ میں رنگا جانا اور بعض اوقات مادیات سے نکل جانا اس کے حواس میں یا عالم مثال میں ایک واقعہ کی صورت میں مترتب ہوتا ہے اور اس کی تعبیر ان امور میں سے کوئی ایک امر ہوتا ہے۔

اس کی مثال یہ ہے:۔ نبی ﷺ اپنی ابتدائے فطرت میں ملکوت سے متصل ملاء اعلیٰ سے مشابہ اور کدورتوں سے پاک تھے۔ چنانچہ وہ اپنی فطرت کو برابر مکمل کرتے گئے۔ پس کبھی وہ ''شق الصدر'' کی صورت میں ظاہر ہوئے اور کبھی وہ جبرئیل کے کلام کی صورت میں جبکہ وہ (جبرئیل) آسمان اور زمین کے مابین بیٹھا ہوا ہوتا[7] اور کبھی ان کو باقی تمام لوگوں کے مقابلہ میں تولا جاتا اور ان کا پلڑا بھاری ہوتا اور کبھی وہ معراج کی صورت میں ظاہر ہوئے۔

اسی طرح ابراہیم علیہ السلام فطرت کے اعتبار سے قوی النفس تھے۔ پس جب ان کی فطرت مکمل ہوگئی۔ ان کی خلقت یعنی فطرت کا ایک حادثے کی صورت میں ظہور ہوا اور وہ تھا ان کا ستاروں، چاند اور سورج کی طرف دیکھنا اور ان کے غروب ہونے سے یہ استدلال کرنا کہ یہ سب وہ نہیں، جس نے ان (حضرت ابراہیمؑ) کو پیدا کیا ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ایک غیرت مند کی غیرت کا اظہار کسی واقعہ ہی کے ضمن میں ہوتا ہے۔ پس خلق تو اصل ہے اور حادثہ اس کا شبح وقالب ہے۔

اور ان میں سے یہ بھی ہے:۔ نفوس کی استعداد کے اعتبار سے جن کی زبانوں کا آپس میں مختلف ہونا۔ پس کبھی تو نفس خاص زبان سے سنتا ہے اور کبھی عام زبان سے اور کبھی جبکہ رحموت ایک حالت کا ارادہ کرتا ہے اور کبھی جبکہ وہ دوسری حالت کا ارادہ کرتا ہے تو سننے والے کا نفس کبھی ایک حالت کے رنگ میں رنگا جاتا ہے اور کبھی دوسری حالت کے رنگ میں۔ پس سننے والا ہر ایک حالت میں وہی سنتا ہے جو اس حالت کے مناسب ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اس سرّ کے مطابق ہوجاتا ہے۔ نفس کے قوت سے فعل میں آنے کے لئے واقعہ، امر ونہی، مواخذہ، معاتبہ (عتاب) نسخ، افتداء (فدیہ) اور عفو ہے۔

اس کی مثال یہ ہے:۔ معراج میں پچاس نمازوں کا واجب کرنا، اللہ کا ایک اور جگہ ارشاد **''مایبدل القول لدی''** (میرے ہاں بات نہیں تبدیل ہوتی) یہ پانچ نمازیں ہیں اور یہ پچاس نمازیں۔ پس پچاس تجوز کی زبان ہے اور پانچ حقیقت کی اور دونوں حالتوں میں مراد ایک ہی چیز ہے لیکن اللہ نے کسی حکمت کے ماتحت جو اسے منظور تھی، ابتدا میں حقیقت کو چھپایا۔

اور اس کی ایک مثال یہ بھی ہے:۔ یونس علیہ السلام نے اپنی پوری ہمت سے اپنی قوم کی ہلاکت چاہی اور خدائی لعنت فاسد ہیئت کے محل تک نہ پہنچی۔ پس جب وہ اللہ کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سے مناجات کی، تو انہیں اس ہیئت کا انتباہ ہوا۔ جیسے کہ ہم میں سے کوئی خواب دیکھے اور اس کے لئے پھلوں اور برتنوں وغیرہ کے خراب ہونے کے قصے کی صورت میں خطاب متمثل ہو۔ اس کے بعد یونس علیہ السلام کو ہوش آیا اور انہوں نے جانا کہ اس سے مراد انہیں اس ہیئت کے بارے میں انتباہ کرنا ہے۔ جیسے کے سوتے میں آدمی کے اعضاء میں سے کسی عضو کو سردی لگ رہی ہو تو وہ خواب میں یوں خیال کرتا ہے کہ وہ دریا میں غرق ہوگیا یا برف اور بارش اس پر پڑ رہی ہے اور جس پر قوت غضبیہ غالب آجائے اور اسے قوت ملکیہ کا مقابلہ کرنے کا انتباہ ہو تو وہ خواب میں یوں خیال کرتا ہے گویا کہ شیر اس پر حملہ کر رہا ہے۔ پس یہ سب اس کے نفس کی ہیئتوں کے لئے جو اس شخص کے اندر راسخ ہیں اور یہ ہیئتیں طبیعتوں کی صوری نقل ہیں، انتباہات ہیں اور یونس

علیہ السلام کو ان ہیئتوں کے ذریعہ مخاطب کیا گیا تا کہ وہ ایک مثال بنے جو کہ بیان کی جائے نہ کہ وہ ایک ناموس کلی ہو۔

اور یہ جان لو کہ اللہ تعالیٰ جب کسی تدبیر کے سلسلے میں خرق عادت کا اظہار کرتا ہے تو یہ خرق عادت کسی نہ کسی عادت ہی کے ضمن میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ خواہ وہ عادت ضعیف ہی ہو۔ جیسا کہ ایک شخص معمولی طور پر بیمار ہوتا ہے اور جب اسے ایک طبیعی حکیم دیکھتا ہے تو وہ اس کی زیادہ پروا نہیں کرتا اور اسے خیال نہیں ہوتا کہ وہ مرجائے گا لیکن اس بیماری کے ضمن میں اللہ کی قضا ظاہر ہوتی ہے اور وہ شخص مرجاتا ہے۔ پس خوارقِ عادت کے ضعیف اسباب ہوتے ہیں اور یہ خوارق گویا اللہ تعالیٰ کی قضا کے نفاذ ہی کے لئے وجود میں آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسباب ارضی کا جو اہتمام کیا جاتا ہے تو وہ اس لئے کہ خرق عادت عام نہ ہو جائے۔ قرآن اور سنت میں ایسے اشارات ہیں جو اس پر دلالت کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں جو قصہ ہے تو اس میں اشارہ اور معنی ہے جسے عارف بالکل ہر منصف عقل مند جان لیتا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے لئے ایک خاص زمین میں مرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ اس کے لئے اس زمین کی طرف جانے کی کوئی ضرورت پیدا کر دیتا ہے۔ پس اس بندے کے لئے حاجت کا پیدا ہونا افعال ارادی کے نظام کی رعایت کے لئے ہے تا کہ یہ نظام نہ ٹوٹے۔

انشاء اللہ تعالیٰ ہم ہر حادثے کے بارے میں اس کی تعبیر، اس کے شبح وقالب کی وجہ خصوصیت اور ہر خرق عادت میں اس کے ضعیف اسباب کی طرف اشارہ کریں گے۔ پس تم ہمارے اشارات کا انتظار کرو اور ہمارے قصے کے ذکر کرنے کے ضمن میں ان اشارات کی تاک میں رہو۔

تاویلِ الاحادیث: آدمؑ وادریس علیہ السلام

ارواحِ سیارات کی قوتیں زمین کے ایک طرف جمع ہوئیں اور امام نوع انسان (8) نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ وہ عالم ناسوت (9) میں ظاہر ہو اور عناصر میں اعتدال ہوا اور ان میں اچھی بد بو پیدا ہوئی۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان امور کے پیش نظر زمین میں اپنا خلیفہ پیدا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نوع کا کہ اس میں وسیع ارتفاقات (10) اور اخلاق کاملہ ہوں اور اس میں قوت ملکیت اور قوت بہیمیت دونوں جمع ہوں۔ چنانچہ دونوں سے الٰہی حالات جیسے کہ احسان اور محبت ہیں، پیدا ہوں اور یہ خلیفہ اس کا مستحق ہو کہ اس پر اس کے اوپر سے شرع واجب کی جائے۔ یہاں تک کہ وہ بذاتہ عالم ہو جائے اور رحموت کا ایک صحیفہ ہو جو عالم کے تمام کے تمام حقائق پر اجمالاً محیط ہے۔ پھر فرشتے ہیں کہ جو وقوع پذیر ہونے والا ہوتا ہے، اس کے بارے میں وہ الہام کے مستحق ہیں اور وہ عنصری ہیں اور کارندے ہیں جو اللہ کے الہام سے عناصر میں کام کرتے ہیں۔ پس ان فرشتوں کو یہ الہام ہوا کہ اللہ خلیفہ پیدا کرنے والا ہے جس میں یہ بات ہوگی۔ بے شک وہ خون بہائے گا اور زمین میں فساد کرے گا۔ پس اس پر لعنت کی جائے گی اور دنیا اور آخرت میں اس کو اس کے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔ فرشتوں پر ایسے خلیفہ پیدا کرنے کی حکمت مشتبہ ہوگئی کیونکہ وہ اتنا ہی جانتے تھے جتنا ان کو الہام کیا گیا تھا۔ چنانچہ ان کے بارے میں اللہ کی حکمت اور اس کی عنایت اس امر کی مقتضی ہوئی کہ وہ انہیں سکھائے جو وہ نہیں جانتے تھے۔

اولاً اللہ نے الہام اجمالی کے ذریعہ سکھایا کہ اللہ کی حکمت ہیں جنہیں وہ نہیں جانتے اور ثانیاً تفصیلی واقعہ کے

ذریعہ بتایا جو اس حکمت کی شرح ہے۔ پس اللہ کے اذن اور اس کے ارادے سے اس (آدم) کے لئے معتدل مادہ جمع ہو گیا۔ گویا کہ وہ مادہ اپنے طبقات کے اختلاف کے باوجود ساری کی ساری زمینیں ہیں۔ یقیناً معتدل سے اگر کوئی گرم چیز ملے تو وہ گرم ہو جاتا ہے یا سرد چیز ملے تو سرد ہو جاتا ہے اور معتدل اپنی قوت سے تمام طبقات کے قریب ہوتا ہے۔ اس معتدل کا خمیر اٹھا اور وہ اس شے کی طرح ہو گیا جس میں تعفن اور بدبو پیدا ہو گئی ہو۔ پس اس میں کیڑے پیدا ہوتے ہیں لیکن اس کا تعفن روحانیات میں سے ایک زبردست قوت کے ٹکراؤ کی وجہ سے روحانی تھا، گندگی کا نہ تھا۔ جیسے کہ عورت کے پیٹ میں منی کا تعفن ہوتا ہے کہ اللہ اس میں روح پھونکتا ہے۔ پس وہ زندہ ہو جاتی ہے۔

خلاصہ مطلب یہ ہے کہ چونکہ اس (آدم) کو وجود میں لانے سے مقصود نوع کو پیدا کرنا تھا، اس لئے اس کی شخصیت پوری نوع کے حکم پر اس طرح حاوی ہوگئی گویا کہ وہ خود نوع ہے اور اس کے اصل جوہر میں اس سرّ کا انتباہ آ گیا اور چونکہ وہ روحانیات کی ہمتوں کے اجتماع سے تھا، اس لئے اس کی روح میں روحانیات کا حکم آ گیا۔ پس چونکہ آدم کا اپنے رب سے نیا نیا معاملہ تھا اور اس کے اندر عناصر اور اخلاط کا نظام ابھی مضبوط نہیں ہوا تھا، کچھ عرصے کے لئے اس ضرورت کے تحت اس کے ساتھ اہل جنت کا سلوک کیا گیا۔ پھر وہ تقریب بہم کی گئی کہ آدم خالصتاً اس کا ہو جائے جس کے لئے اس کی تخلیق عمل میں آئی ہے اور اس میں اس کی جبلت کے احکام ظاہر ہوں۔ بے شک اس میں فرشتوں سے مناسبت رکھنے والی روحانیت بھی رکھی گئی کہ اس کی وجہ سے وہ الہام کا مستحق ہو اور بہیمیت کی روحانیت بھی کہ غذا کی فراوانی سے جو گندے حالات پیدا ہوتے ہیں، ان سے تعلق رکھ سکے۔ پس جب اس میں فرشتوں کی روحانیت اور بہیمیت کی روحانیت جمع ہوگئی تو اس کی عقل باقی تمام حیوانوں کی عقل سے بڑھ کر ہوئی۔ اس نے عقل کو شہوت، غضب اور حاجتوں میں لگایا اور اسے عجیب عجیب ارتفاقات الہام کیے گئے۔ نیز صنعتوں کے استنباط کے طریقے الہام کیے گئے۔ وہ حالتِ ملکیت میں داخل ہوا۔ اسے عبادات اور پاکیزگی کی مختلف انواع الہام کی گئیں۔ پس اس نے ان سب میں اپنی اولاد کے لئے عجیب عجیب طریقے وضع کیے۔ چنانچہ اسے ان تین اصولوں کے مطابق واقعات پیش آئے۔

ان میں سے ایک یہ کہ عنصری اور کارندے ملائکہ کو حکم ہوا کہ وہ بنفسہٖ آدم کو سجدہ کریں اور ملاء اعلیٰ کے ملائکہ کو حکم ہوا کہ وہ اپنے اشباح اور قالبوں سے انہیں سجدہ کریں تو وہ سب سجدہ کرنے والوں کی صورت میں تمثیل پذیر ہو گئے جیسے کہ جبرئیل ایک اعرابی کی صورت میں رسول اللہ ﷺ سے ایمان، اسلام اور احسان کے بارے میں سوال کرتے ہوئے متمثل ہوئے تھے اور جبرئیل کا آپ ﷺ سے سوال کرنا انکشاف کے طور پر نہ تھا۔ اسی لئے نبی ﷺ نے فرمایا، تمہارے پاس جبرئیل تمہیں تمہارے دین کی تعلیم دینے آئے تھے۔ غرض تمام کے تمام فرشتوں نے اس تفصیل کے ساتھ آدم کو سجدہ کیا۔

مختصراً فرشتوں کا آدم کو سجدہ کرنا ایک دقیق راز کا حامل ہے اور وہ یہ کہ بنی آدم کے جو فرشتے کام کرتے ہیں تو وہ اس طرح بے شک اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں۔ وہ بنی آدم کے لئے دعا کرتے ہیں اور ان کے بارے میں باہم ایک دوسرے سے جھگڑتے ہیں، پس آدم اور اس کی اولاد فرشتوں کی عبادات کا قبلہ ہیں۔ چنانچہ یہ راز ایک واقعہ کی صورت میں متمثل ہوا اور فرشتوں پر سجدہ واجب کرنے کی وحی ہوئی اور ان میں ابلیس بھی تھا۔ اس کی دراصل جبلت ہی میں حسد، جھگڑالو پن اور تکبر تھا لیکن اس وقت تک اسے کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا تھا کہ اس کی ان بری خصلتوں کا اس کے ذریعہ

اظہار ہوتا اور اس کی اصل جبلت میں حقیقت شری اور خزانہ شر کی طرف راہ تھی لیکن اس پر فرشتوں کا اثر غالب آ گیا تھا اور وہ ان کی صفوں میں داخل ہو گیا تھا۔

چنانچہ جب اسے آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا، اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ پس اللہ نے اس پر بڑی لعنت کی اور اس کی خطا نے اسے گھیر لیا اور وہ اس طرح ہو گیا گویا کہ وہ مسخ شدہ ہے اور وہ سرتاسر شر کا ہو گیا۔

اور ان میں سے ایک یہ کہ آدم علیہ السلام کا ارواح کی قوتوں اور ملاء اعلیٰ کے تخیلات نے احاطہ کر لیا اور عرش کا تخیل ان کی طرف متوجہ ہوا۔ پس وہ جنت میں داخل ہو گئے۔ حالانکہ وہ زمین میں اپنی جگہ پر تھے اور ان پر جنت کے احکام کا اجرا بھی ہو گیا۔ آدم میں شہوانی طبیعت تھی۔ چنانچہ انہیں اپنی جنس کی مادہ کی طرف قوی اشتیاق ہوا اور بڑی سرعت سے مادہ کی صورت ان کے تخیل میں آ گئی۔ پس یہ مادہ (حضرت حوا) ان کے تخیل سے وجود میں آئی۔

پھر اللہ نے ایسی تقریب بہم کی کہ وہ غالباً اسی کے ہو جائیں، جس کے لئے اللہ نے انہیں پیدا کیا تھا۔ پس اللہ نے شہوانی اور حرص کی طبیعت کو کہا کہ تمہیں خزانہ شر نے جو الہام کیا ہے، اسے حرکت میں لا اور اس نے ایسا ہی کیا۔ پس یہاں اسے اشتباہ، علم حق کو باطل سے گڈمڈ کرنا اور دل کی سختی جو حق کے ادراک میں جیسے کہ وہ ہے مانع ہوتی ہے، ملی۔ جبکہ وہ ابھی جنت میں نہیں تھے، حکم دیا گیا تھا کہ درخت (کے پھل) کا کھانا ان کے لئے ممنوع ہے اور وہ انہیں جنت سے نکالے جانے کا باعث ہوگا اور ان کو تکلیف، بھوک اور پیاس تک پہنچائے گا۔ اس کے علاوہ ان کو ایک اور علم حق بھی الہام ہوا تھا کہ ان کا اس درخت (کے پھل) کو کھانا دوام اور ہمیشگی یعنی ان کی نوع کے بقا، اللہ تعالیٰ کے امر اور اس کے ارادے کے ظہور کا سبب ہوگا۔

پس یہ دونوں علم طبیعت پر نازل ہوئے اور آدم علیہ السلام پر معاملہ مشتبہ ہو گیا اور وہ حیران و متردد ہوئے اور وہ نہیں جانتے تھے کہ کیا کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس حیرانی اور تردد کو نسیاں (یعنی آدم بھول گئے تھے) کے کنائے میں بیان کیا ہے۔ پھر ان کے سینے میں شہوانی خواہش ابھری۔ پس انہوں نے درخت (کے پھل) کو کھا لیا۔ یہ علم حق تھا جو باطل سے مخلوط ہو گیا اور یہ وہ سختی تھی جو حق کے ادراک میں مانع آئی اور یہ تھا الہام کا صحیح طرح ظاہر نہ ہونا۔ پس آدم علیہ السلام نے یہ گمان کیا تھا کہ انہیں جو خلد یعنی ہمیشہ ہمیشہ رہنے کا الہام کیا گیا ہے، تو اس کا مطلب جنت میں رہنا ہے۔ اس علم کا باطل سے مخلوط ہونا شیطانی وسوسہ تھا۔ نیز یہ تقریب تھی اللہ تعالیٰ کا ازل میں جو ارادہ تھا، اس کے پورا ہونے کی۔ چنانچہ آدم میں طبعی احکام کا ظہور ہوا۔ عناصر اور اخلاط کا نظام ان پر غالب آیا اور ان سے جنتیں زائل ہو گئیں۔ عنایت ملکی ان سے پوشیدہ ہو گئی اور عنایت طبعی کا ظہور ہوا۔ پھر آدم علیہ السلام سے کہا گیا جب تمہاری اولاد پر طبیعت غالب آئے گی اور وہ الہام حق کے لئے آمادہ نہ رہیں گے تو اللہ کی بخشش اور اس کی حکمت کے تحت یہ واجب کر دیا گیا ہے کہ وہ ان کے لئے انہی میں سے رسول بھیجے۔ پس جس نے ہدایت کی پیروی نہ کی۔ پس نہ تو ان کے لئے خوف ہے اور نہ وہ غم کریں اور جس نے کفر کیا، پس وہ دوزخ میں داخل ہوگا۔ اس کے بعد آدم پر شدید عتاب ہوا۔

اس کا راز ہے روح ملکی اور طبیعت کا باہمی اختلاف اور ہر لحاظ سے روح ملکی کا طبیعت کا احاطہ کرنا پھر اللہ کی طرف بڑی التجا کرنا۔ پس طبیعت کے احکام روحانیہ کی طرف ہدایت کو پانا گویا کہ اس وقت طبیعت اور روح سب نے اسی کا

حکم دیا تھا۔ اس کی مثال سالک کی ہے کہ وہ اللہ کی طرف تجرد اختیار کرتا ہے اور وہ اونچا ہوتا ہے۔ پھر وہ حق کے ساتھ خلقت میں راہ ہدایت پر چلتا ہے اور نیچے گرتا ہے اور یہ بھی ہے کہ اس پر ایک وقت میں جب روح طبیعت کی کدورتوں سے پاک تھی، فیضان ہوا۔

ارتفاقات کے علم کا، ان حاجات کا جو بنی نوع انسان کو پیش آتی ہیں، ان آلات کا جن سے انسان کام لیتا ہے، آوازوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے علم کا اور اس علم کا کہ ہر شے کے لئے کیا لفظ ہو۔ پس اس نے حقیقت کو دیکھا کہ وہ ہر شے کی طرف ملتفت ہے۔ اللہ نے وہ سب اشیاء جیسا کہ اس نے آدم علیہ السلام کو خیال میں بتائی تھی، عالم مثال میں اس کے لئے ظاہر کر دیں۔ پھر اللہ نے فرشتوں سے ان اشیاء، ان کے ناموں اور ان سے کام لینے کی کیفیت کے بارے میں سوال کیا۔ پس وہ نہیں جانتے تھے کیونکہ ان کی جبلت میں شہوت، غضب اور حاجات میں جانے والی عقل سے ان چیزوں کے استنباط کرنے کی استعداد نہیں تھی۔ چنانچہ اس طرح زمین میں آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنانے کی حکمت ظاہر ہوئی اور فرشتے جن چیزوں سے ناواقف تھے، انہیں ان کی تعلیم دے کر نعمت کا اتمام ہوا۔

اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ دنوں میں سے ایک دن آدم علیہ السلام کو سب طرف سے فراغت پانے کے بعد اس کا علم ہوا کہ وہ سب انسانوں کی اپنی مختلف استعدادوں کی بنا پر صالح ہوں یا غیر صالح، نشو و نما کے مصدر اور منبع ہیں۔ چنانچہ ان سب کی صورتوں کا آدم علیہ السلام کی تکمیل ذات اور خود ان انسانوں کے مثالی وجود کے وقوع پذیر ہونے کی وضاحت کے لئے عالم مثال میں فیضان کیا گیا اور اللہ نے ان سے سوال کیا۔ الست بربکم (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں) تو ان کا جواب تھا قالو ابلی (ہاں۔ بے شک) انہوں نے یہ جواب فطرت کی زبان سے دیا تھا، قبل اس کے کہ طبیعت کی ملاوٹ سے ان میں لکنت ہوتی۔ چنانچہ انسانوں کا اس واقعہ کی وجہ سے مواخذہ ہوگا اور وہ اس لئے کہ یہ ان کی اصل فطرت کو ظاہر کرتا ہے۔ پس یہ واقعہ فطرت کی ایک صورت ہے جیسے کہ ایک شے جو خواب میں دیکھی جاتی ہے، وہ اس شے کی صورت ہوتی ہے۔ ملاء اعلیٰ کے مدارک میں اور پھر بنی آدم کے مدارک میں جو علوم نازل ہوئے ہیں، ان میں یہ مواخذہ فطرت کی طرف منسوب کیا گیا۔

اور ان میں سے یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو ارتفاق (11) اول میں سے کچھ کرنے کا الہام ہوا۔ پس اس نے کاشت کرنا، فصل کاٹنا اور اس کا سمیٹنا، حیوانوں کو مسخر کرنا اور کھانوں کا پکانا شروع کر دیا۔ اس نے زبان کا استنباط کیا اور کلام کے اسلوب وغیرہ کی طرف اس کی رہنمائی ہوئی۔ اس نے نسل و تناسل کا اہتمام کیا اور عبادات کے طریقے وضع کیے۔

ابتدائے امر میں ادریس علیہ السلام آدم علیہ السلام کے گروہ میں سے تھے اور وہ وہبی اور جبلی علوم انسانی میں انہیں کے نقش قدم پر چلتے تھے اور اس وقت ان کا کمال سب سے ہٹ کر صورت انسلانیہ کے احکام کی طرف ہو جانا تھا۔ پھر انہوں نے اس درجے سے حکمت انسلاخیہ کی طرف ترقی کی اور وہ اس وجود کے احکام کے جو موجودات کی صورتوں اور شخصوں پر پھیلا ہوا ہے، ہو گئے۔ پھر انہوں نے نقطہ لاہوت کی طرف ترقی کی۔ پھر وہ طبیعی، الٰہیاتی، ستاروں، طب اور ارتفاقات کے علوم کی طرف آئے اور یہ اس لئے کہ وہ ہاتھ سے اور وہم و خیال سے کام لینے والے تھے۔ پس ان سے بہت سے علوم کا ظہور ہوا اور ان علوم میں عنایت الٰہی بروئے کار آئی۔ چنانچہ وہ زمانوں کے بدلنے اور رنگوں کے تغیر و تبدل کے

باوجود محفوظ رہے۔ جب کبھی ایک زمانے کے لوگ ختم ہو جاتے تو ان کی جگہ دوسرے لوگ لے لیتے اور جب کبھی ایک رنگ خراب ہوتا دوسرا رنگ آ موجود ہوتا۔ پھر ان علوم کو برکت دی گئی۔ پس مجوسی اور حنفی ملت وجود میں آئی اور طب، دعوت و ارشاد اور ستاروں کے علوم مرتب ہوئے اور اس وقت یہ سب علوم برحق تھے۔ اگرچہ آج ان میں حق کے ساتھ باطل اور ثابت و اصل کے ساتھ تحریف شدہ ملا ہوا ہے۔ پھر ادریس علیہ السلام نے اور ترقی کی۔ پس وہ طبیعت کو قابو میں کر کے اور اس کے اقتضا سے نکل کر ہیئت ملکیہ کے خالصاً ہو گئے اور جنت نے ان کا احاطہ کر لیا اور وہ بلند مرتبہ پر پہنچ گئے۔

تاویل الاحادیث: حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام

ان دونوں نبیوں کے ذاتی احوال، دونوں کی قوم کا کفر اور فسق میں رہنے کا حال ان پر ملاء اعلیٰ کا غضبناک ہونا۔ ان کی ہلاکت کا فیصلہ کرنا اور انسانِ الٰہی کے ساتھ حق تعالیٰ کی یہ عنایت کہ وہ ان کو عذاب سے ڈرائے اور ان میں سے ایمان والوں کی نجات اور خلاصی کے لئے کوئی حیلہ (ان تمام باتوں میں) حضرت نوح علیہ السلام کے قصے سے ملتا جلتا ہے۔

یہ دونوں انبیاء (خدا کی طرف سے) ڈرانے والے تھے اور دونوں کے دل میں مومنین کی نجات کا حیلہ الہام کیا گیا تھا اور دونوں کو عبادت کے ایسے طریقے دیئے گئے تھے جو طبیعت کے (جوش کے) لئے کاسر تھے۔

قوم عاد کا مسکن ریت کے ٹیلے اور ریتلا ملک تھا اور ان کے ملک کی ہوا خشکی اور گرمی کی طرف مائل تھی، ان کے حق میں عذاب کی جملہ قسموں میں سے ہوائی طوفان بہت قریب تھا۔ ایک زمانے تک ان سے برسات رک گئی اور ان کے چار پائے ہلاک ہو گئے۔ تب انہوں نے اللہ کے حضور میں عاجزی کی اور ان کی قوتِ ملکیہ کو تنبہ ہوا۔ اس لئے وہ اپنے برے اعمال کی وجہ سے پکڑے گئے اور اگر وہ بہائم کی طرح (بے سمجھ) ہو جاتے تو ان پر (اتنا) جلدی عذاب نہ آتا کیونکہ (ان کے لیے) عنایتِ ملکیہ کا ظہور ہوا تھا اور انہوں نے ملکی عنایت کے احکام کو توڑ ڈالا۔ اس لئے وہ (ملاء اعلیٰ کی نظر میں) ملعون بن گئے (اب صرف عذاب کی دیر تھی) جب انہوں نے ابر کو یعنی مادہ مجتمع کو اوپر دیکھا تو اس کو برسنے والا بادل خیال کیا۔ حالانکہ وہ اللہ کا عذاب تھا جس کی وہ جلدی کرتے تھے۔ پھر اس نے ایک تند و تیز ہوائی طوفان کی شکل اختیار کر لی۔

قوم ثمود کے رہنے کی جگہ پہاڑ اور ان کے غار تھے۔ ان کے حق میں عذاب کی بہت قریب وجہ زلزلے اور سخت آواز تھی۔ پھر حضرت صالح علیہ السلام نے ان کے ہلاک ہونے کی دعا کی حالانکہ ان لوگوں کی ہلاکت کا وقت نہیں آیا تھا۔ تب اس کے نفس نے بھی ہلاکت کی ہیئت حاصل کی اور اللہ تعالیٰ کی نظر بھی اس کی حاصل کی ہوئی ہیئت کے ساتھ مل گئی (اور موافقت کی) تب اس پر موت اور نیند کے درمیان کی حالت طاری ہوئی جس طرح اصحابِ کہف پر طاری ہوئی تھی، پھر اس کو اٹھایا گیا۔

جاننا چاہیے کہ عالم ملکوت میں جو بھی شر ہوتا ہے، وہ کسی نہ کسی حیوان کی صورت کے ساتھ متمثل ہوتا ہے کیونکہ شرور کو حیوانات کے ساتھ جبلی مناسبت ہوتی ہے۔ سب سے آخری شر انسان کی صورت اختیار کرے گا (جسے دجال کہا جاتا

ہے) اور (اس کے بعد دنیا کی) عام ہلاکت اور بربادی قریب آجائے گی۔

آخر اس قوم کا شر حضرت صالح علیہ السلام کی بددعا سے ایک اونٹنی کی شکل میں نمودار ہوا۔[12] جب انہوں نے اس اونٹنی کو قتل کیا تو شر چلا گیا اور طوفان آ گیا۔ اسی طرح جب دجال کو قتل کیا جائے گا[13] تو شر چلا جائے گا اور قیامت کبریٰ قائم ہو جائے گی۔ طوفان سے ایک قوم کی بربادی ہوئی اور قیامت سے عام تباہی ہو گی۔

تاویل الاحادیث: ابراہیم علیہ السلام

حضرت ابراہیمؑ کے قصے کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ فطرت کی طرف شدت کے طور پر نکلے ہوئے تھے (یعنی قوی الفطرت تھے) اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسانی اخلاق کے ظہور میں انسانی افراد مختلف ہوتے ہیں۔

(1) ان میں سے کچھ تو وہ ہوتے ہیں جن میں شجاعت اور بہادری بالکل مفقود ہوتی ہے۔

(2) بعض افراد ایسے ہوتے ہیں جن میں ضعیف سی شجاعت ہوتی ہے جو بہت بڑی ریاضت سے نہایت تھوڑی اور نہ ہونے کے برابر ظاہر ہوتی ہے۔

(3) کچھ لوگ اوسط درجے کی شجاعت رکھتے ہیں جو وہ تب ظاہر ہوتی ہے جب بہادری کی طرف اس کو بلایا جائے اور یہ شجاعت تب قوت پکڑتی ہے جب افعال میں ممارست (اور ریاضت) کی مناسب اقوال سے ترغیب دی جائے اور اس کے ساتھ بہادری کے مواقع سے اس کا واسطہ پڑے۔

(4) کچھ لوگ بڑے بہادر ہوتے ہیں، اگر ان کو بہادری کے کام سے روکا جائے جیسے مہالک میں آگے بڑھنا یا غیرت کے موقع پر ان کو غیرت سے روکا جائے تو بڑی کوشش کے بعد ہی رکتے ہیں اور یہ روکنا ان پر نہایت گراں گزرتا ہے اور اس کے ساتھ وہ بہادری کے خیالات سے خالی نہیں ہوتے اور وہ جس وقت بہادری کا موقع پاتے ہیں یا اس کی طرف ان کو بلایا جاتا ہے (تو پہنچنے میں دیر نہیں کرتے) جیسے گندھک کو آگ لگ جائے اور اس کے جلانے میں کوئی دیر نہیں لگتی۔

(5) کچھ لوگ ایسے اعلیٰ درجے کے بہادر ہوتے ہیں جن کو بہادری کے مواقع سے روکنا ناممکن ہے بلکہ وہ ایسے مواقع کی طرف ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اگر اس کے خلاف کی طرف اس کو کوئی بلائے بھی تو اس کی بات نہیں سنتے۔ بزدلی کی بات کا اس کے دل میں گزرنا ہی نہیں ہوتا۔ اس آخری قسم کے بہادر انسان کو امامِ شجاعت (بہادری کا پیشوا) کہا جاتا ہے۔ یہ کسی دوسرے امام کی طرف محتاج نہیں ہوتا بلکہ جو لوگ اس سے کم درجے کے ہیں ان پر واجب ہے کہ اس کے طریقے کو مضبوطی سے تھام لیں۔ اس کے رسوم کو مضبوط پکڑ لیں اور اس کے واقعات کو یاد رکھیں تاکہ یہ ان کے لئے بہادری میں ایک دستور کا کام دے۔ اگر وہ اس کی پیروی نہ کریں گے تو بہادری کی راہ سے بھٹک جائیں گے اور ان کے حسب استعداد بہادری کا جذبہ بھی ان میں کم ہوتا جائے گا۔

اس قسم کے اعلیٰ بہادر کے طریقے کو جو لوگ اختیار کرنے والے ہیں، ان کے بہت سے گروہ ہیں:

ان میں سے ایک سابق ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کے پیشوا کا قول اس کے دل میں اس طرح بیٹھ جائے کہ اس

کے راوی سے اس کو زیادہ یاد رکھنے والا ہو۔

ایک قسم مقتصد یعنی درمیانہ چلنے والا ہو اور ان میں سے ایک وہ ہے جو اپنی جان پر ظلم کرنے والا ہو۔

خلاصہ یہ کہ جس طرح انسانی افراد شجاعت اور بہادری میں مختلف ہوتے ہیں۔ اسی طرح وہ فطرت میں (بھی) مختلف ہیں۔

(1) ایک وہ جو فطرت کا امام ہوتا ہے۔ وہ عبادت جیسے کاموں کی طرف اس طرح ٹوٹ پڑتا ہے کہ اس کو اپنے فطری تقاضوں کو پورا کرنے سے کوئی رسم و رواج یا دوسری کوئی روکنے والی چیز نہیں روک سکتی۔ کسی کی تقلید یا کسی سے روایت کیے بغیر عبادات کو بجالانا اور اس کے احوال کو قبول کرنا اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔

اس کی (واضح) مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اس وصف میں آپؑ اتم اور اکمل تھے۔ آپؑ سے پہلے یا بعد میں کوئی بھی آپؑ کی طرح اس خلق کی طرف نہیں گیا۔ اس خلق کے موافق آپؑ پر علومِ الٰہیہ کا ترشح ہوتا تھا۔ آپؑ کا قلب اس خلق کا مطیع تھا، اس لئے ملاءِ اعلیٰ میں داخل ہو کر ان سے پرتوِ نور حاصل کر کے آپؑ کے لئے رحمت کی طرف توجہ کرنا آسان تھا۔ اسی لئے آپؑ کو امام بنایا گیا اور (بعد کے آنے والے) جملہ انبیاء علیہم السلام کو آپؑ کے ملت کی پیروی کرنے کا حکم ہوا۔

(2) کچھ لوگ قوی فطرت ہوتے ہیں۔ اجمالی طور فطرت کی طرف اس طرح مائل ہوتے ہیں کہ اگر ان کو فطرت کی طرف رہنمائی کرنے والا امام نہ ملے تب بھی فطرت کی مخالفت کے لئے تیار نہیں ہوتے لیکن ان کے دل میں ایک گونہ اضطراب ہوتا ہے اور اگر اس کو فطرت کا پیشوا مل جائے تو اس امام کی بات اس کے دل میں بیٹھ جائے گی اور وہ اپنے امام کے قول کا مطلب سمجھ لے گا اور وہ مجبور ہوگا کہ اپنے پیشوا کے قوانین کو ضبط کرے، اس کے مجمل کی شرح کرے اور اس کے مذہب کی اشاعت کرے جس طرح حضرت ابراہیمؑ سے بعد کے آنے والے انبیاء علیہم السلام نے حضرت ابراہیم کے ملت کی پیروی کی اور اس کو واضح کیا اور لوگوں کو اس کی طرف بلایا۔

(3) تیسرا گروہ وہ ہے کہ اگر وہ فطرت کے امام کو نہ پائیں تو راہِ راست پر نہ آئیں اور جب ایسے پیشوا کو پائیں تو اس سے خوب نفع اٹھائیں، جیسے پہلے کی امتیں تھیں۔

(4) کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں کہ فطرت کی طرف لگاتار دعوت اور بلانے کے سوا اس کی طرف خود نہیں جاتے، ایسے لوگ (دعوت و تبلیغ سے) تھوڑا سا نفع پا لیتے ہیں۔

(5) بعض لوگ (فطرت کے) شدید منکر اور مخالف ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے دل اور کانوں پر اللہ مہر لگا دیتا اور ان کے آگے اور پیچھے دیوار کھینچ دیتا ہے۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی قوت (اور جوانی) کو پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو حکمت عطا کی اور ان پر ان کی جبلت منکشف ہوئی۔[14] پس جب اس نے ستارہ، چاند اور سورج کو غروب ہوتے ہوئے دیکھا تو اس سے وہ اچھی طرح سمجھ گئے کہ جس پروردگار نے اس کو پیدا کیا ہے وہی اس کی تربیت کرتا ہے اور (حق کی) راہ دکھاتا ہے اور وہ جسمانی احکام سے مبرا اور انسانی (عوارض) سے بلند ہے۔ (اس تنبہ کے بعد) آپؑ پر ایک عظیم حالت طاری ہوئی اور آپؑ پر حق

منکشف ہوا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام غیر اللہ کی عبادت پر بڑے غیرت والے تھے۔ اس لئے بتوں کو توڑ ڈالا اور (اس پر) آپؑ کو آگ میں ڈالا گیا، لیکن آپؑ (اللہ تعالیٰ کے) پسندیدہ بندہ تھے۔ اللہ خلق میں آپؑ کی بقا چاہتا تھا، تب اللہ پاک نے آگ کے مادے پر ایک دم ہوا کے ذریعے ایک ٹھنڈی ہیئت ڈال دی اور یہ سرد ہوا ٹھنڈے طبقے سے آئی کہ جس نے شدید برودت کو اٹھا رکھا تھا۔ اس نے آگ کو بدل دیا اور ان دونوں کے تصادم اور ٹکر سے ایک اچھی ہوا پیدا ہو گئی۔

اس کے بعد آپؑ، فاجر اور اللہ کے دین میں جھگڑنے والے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے سے تنگ آ گئے تو آپؑ نے اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کی یعنی ایسی زمین کی طرف ہجرت کر گئے جہاں پروردگار کی عبادت ممکن ہو سکے۔ راستے میں ایک جبار اور سرکش آپؑ کو آڑے آیا جو آپؑ کی بی بی پر ظلم کرنا چاہتا تھا۔ آپ نے بڑی ہمت اور سعی سے اللہ کے حضور میں دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو وحی کی کہ بدن میں ہوا کے پھیلنے کی جگہ سے اس جبار اور ظالم کے بدن میں داخل ہو جائیں (اور اس کو روک دیں، آخر ایسا ہی ہوا) اور اس (جابر) کے ہاتھ اینٹھ گئے۔ جب اس جابر حاکم نے یہ دیکھا تو حضرت ابراہیمؑ کی عورت کو چھوڑ دیا اور حضرت ہاجرہ کو اس کی خادمہ بنا دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی بیوی دونوں کی عمر بڑھ گئی تھی اور دونوں کی کوئی اولاد نہ تھی، اللہ نے ان پر رحمت کی اور دو فرزند عنایت کیے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی یہ خاص عنایت تھی، کیونکہ وہ خدا کے محبوب بندے تھے اور دونوں کو جذبِ الٰہی نے گھیر لیا اور لوگ فطرت کے پیشوا کے خلفاء کی طرف محتاج تھے۔ تمام لوگوں میں سے امامت کی طرف زیادہ قریب وہ ہوتا ہے جس کی جبلت (اور فطرت) کو جذب الٰہی کے راز نے گھیر لیا ہو (یہ وصف حضرت ابراہیمؑ میں بطور اتم موجود تھی) اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی اولاد میں توحید کی طرف دعوت دینے کو ایک دائمی مشغلہ کی حیثیت عطا فرمائی۔

آپؑ کے دو فرزندوں میں سے ایک کے حق میں حق تعالیٰ کی یہ منشاء اور مراد تھی کہ اس کو اپنے حرم کا خادم بنائے اور اس کے وسیلے سے (اپنی تجلی کے ذریعے) خلق سے قریب ہو اور ایک ایسا شعار ظاہر فرمائے جس کے ساتھ لوگ اللہ کا تقرب حاصل کریں اور اس کو ایسی اولاد عطا فرمائے جس میں امت مسلمہ بننے کی صلاحیت ہو۔ اب اس کو وجود میں لانے کے لئے بہت قریب وجہ یہ تھی کہ بی بی سارہ حضرت ابراہیمؑ کو، ہاجرہ ہبہ کر دے اور ان میں سے اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے حرم تک پہنچنے کی بہت قریب وجہ یہ تھی کہ بی بی سارہ کو ہاجرہ پر رشک آیا اور اس نے ہاجرہ اور اس کے بیٹے کو اپنے گھر سے نکال دیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان دونوں کو ایک ویران جگہ میں بسایا (جہاں نہ کوئی پانی تھا نہ گھاس) پھر اللہ تعالیٰ نے وہاں پانی کا چشمہ نکالا اور لوگوں کے دلوں میں وہاں سکونت اختیار کرنے کا الہام کیا، اس سے حرم کا انتظام بن گیا۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ الہام فرمایا کہ بیت اللہ کو بنائے اور وہاں رہائش اختیار کرنے کا بھی ان کو الہام کیا گیا جس کی یہ صورت تھی کہ حضرت ابراہیمؑ کے دل میں ایک سمجھ اور فراست پیدا کی۔ پھر اس میں برکت دی اور ان کو حج کے احکام اور اس گھر میں عبادت کی کیفیت کی تعلیم دی کہ ان کے دیانت کے خلق میں اضافہ

فرمایا اور یہ ان کے سینے میں ایک وحی موجب بن گئی جس کو انہوں نے اپنے سینے کے آئینے میں مشاہدہ کیا (اسی طرح) اللہ تعالیٰ نے اسماعیل علیہ السلام کے کام کا انتظام فرمایا اور ان کو اپنے گھر کا خادم بنایا اور لوگوں میں حج کا شوق پیدا کیا اور حضرت اسماعیلؑ کو نیک کام کرنے کی وصیت کی اور ان کو اپنی قوم کے لئے نیکی کا حکم کرنے والا بنایا۔

اور دوسرے فرزند کا قصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے توسط سے ابراہیم علیہ السلام کو اس (کے پیدا ہونے) کی خوشخبری سنائی اور اس سبب سے بی بی سارہ کی جوانی نے جوش مارا اور پھر ان کے حیض کے ایام لوٹ آئے اور اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے۔

جان لیجیے کہ جب ابراہیم علیہ السلام اپنی فطرت اور جبلت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف خالص طور پر متوجہ ہوئے تو ان کا مقرب ملکوں میں شمار ہونے لگا اور ملاء اعلیٰ کے توسط سے ان کو انسانِ الٰہی[15] کے روشن دان سے ارادے اور اختیار کی زبان سے آواز دی گئی۔ اسی لئے انہوں نے نجومیت، مجوسیت اور شرک کے باطل ہونے کا واضح اعلان فرمایا۔

اللہ تعالیٰ نے (حضرت ابراہیمؑ کو) اس تعلیم دینے سے ایک تقریب کا ارادہ فرمایا تھا جو یہ تھی کہ (قدیم) ملتیں باہم مختلف ہوگئی تھیں، مجوسیت میں تحقیق ختم ہوگئی تھی اور نجوم سے شرک بڑھ گیا تھا۔ اب اس باطل کے سر کو توڑنے والا حق صرف یہ رہ گیا تھا کہ فطرت (پر چلنے) کا حکم دیا جائے اور ارادہ (الٰہی) کی زبان کا اتباع کیا جائے۔ اس دور کے اول میں (دنیا کے) حوادث (اور واقعات) آسمانوں کی قوتوں اور عناصر سے براہ راست صادر ہوتے تھے، اسی لئے ادریس علیہ السلام اس دور کے مناسب علوم سے گویا ہوئے۔ (دور اول کی خرابیوں کو دیکھ کر) حظیرۃ القدس کے مقدس ملائکہ ملاء اعلیٰ میں ایک گونہ جوش پیدا ہوا (کیونکہ) ان میں سے ہر ایک (خدا تعالیٰ کے لیے) ایک طلسم اور تجلی کی حیثیت رکھتا ہے جس میں کچھ آسمانی قوتیں بھی ودیعت کے طور پر رکھی گئی ہیں اور اللہ تعالیٰ جب کسی شے کا ارادہ کرتا ہے تو ملاء اعلیٰ میں (حسبِ مراد) بسط اور قبض فرماتا ہے اور اسی طرح اپنی مراد کو پورا کرتا ہے۔ اب آسمانوں کے لئے کوئی واضح حکم باقی نہ رہا تھا۔ اس لئے ابراہیم علیہ السلام نجوم کو مٹانے والے، توحید کی بات کرنے والے اور لوگوں کو اس تجلی کی طرف داعی ہوئے جو کہ حظیرۃ القدس میں قائم تھی۔

جاننا چاہیے کہ وہ علوم جو کہ ملاء اعلیٰ کے ہاں ہیں، سب سے قریب ان انسانی نفوس (کے دل) پر ٹپکتے ہیں جن کی ملائکہ کے ساتھ (قوی) مناسبت ہوتی ہے۔ لوگوں کی ہدایت کا ارادہ (حق کے مخالف لوگوں سے نفرت اور) ان پر لعنت کرنا اور انسانوں کے لئے شرائع کو مقرر کرنا ان سب کا ملاء اعلیٰ میں فیصلہ ہوتا ہے۔ اس لئے منشاء الٰہی کو بروئے کار لانے کے لئے ملاء اعلیٰ کے توسط سے انبیاء علیہم السلام پر ہی علوم اترتے ہیں اور یہ علوم ان کی زبان میں ہوتے ہیں اور ان کے عقول اور سمجھ کے مناسب ہوتے ہیں۔

جاننا چاہیے کہ (لوگوں کی تعلیم کے لیے) اللہ تعالیٰ کی مختلف زبانیں ہیں (اسی بنا پر) جب اس نے ابراہیم علیہ السلام کو قربانی کے ذبح کے ذریعے اللہ کے تقرب کی تعلیم کا ارادہ فرمایا تو اس کے ساتھ دو زبانوں میں کلام فرمایا تا کہ اللہ کے ساتھ اس کے اخلاص اور اس کی فرمانبرداری کو واضح کرنے کے لئے ایک بڑا واقعہ وجود میں آئے اور بیٹے کے ذبح کرنے والی قربانی اس زبان کے لحاظ سے ایک نعمت مشکورہ بن جائے۔

اس کا راستہ یہ تھا کہ حیوانات کی روحیں انسان کی طرح عام عالم کو متضمن ہیں، مگر فرق یہ ہے کہ حیوان میں انسان کی بہ نسبت شدید اجمال پایا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ پر یہ راز کھل گیا اور ان کو اپنے خواب میں یہ دکھائی دیا کہ وہ اپنے اس بیٹے کو ذبح کر رہا ہے جو کہ انسانیت میں نہایت ہی کمال کے مالک ہیں۔ اس کی مثال، ہمارے نبی محمد ﷺ پر پچاس نمازیں فرض ہونے کی مانند ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازیں فرض ٹھہرائیں اور خدا نے آپ ﷺ کو بتایا کہ اللہ کا قول بدلتا نہیں، یہ حقیقت میں تو پانچ ہیں لیکن یہ (ثواب کے لحاظ سے) پچاس ہیں کیونکہ ہر نیکی کا ثواب دس گنا اس سے زائد ہوتا ہے۔ اب ان کو پچاس کہنا مجاز کے طرز تکلم پر اللہ کا کلام ہوگا تاکہ نعمت کو کامل فرمادے اور فرمانبرداری کو دیکھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا مکالمہ بھی اسی طرح دو زبانوں سے ہوا۔ ایک تو مجاز کی زبان تھی کہ "تم اپنے بیٹے کو ذبح کرو یعنی ایسے قوی مینڈھے کو ذبح کرو جو جیسے بیٹا باپ کو پیارا لگتا ہے۔ وہ جانور بھی اپنے مالک کی سب سے پسندیدہ شے ہو۔ ابراہیم علیہ السلام نے جب اس (حکم اور) زبان کی پیروی کی تو ان کو ایک عظیم واقعہ پیش آیا جس سے آپؑ کی عبادت اور انقیاد کی پوری ترجمانی ہوتی تھی اور آپؑ کے صحیفے میں یہ لکھا گیا کہ انہوں نے اللہ کے لئے اپنے بیٹے کو ذبح کیا، پھر اللہ نے اس کا فدیہ اتمام نعمت کے طور پر ذبحِ عظیم سے تعبیر فرمایا۔

دوسری زبان حقیقت کی تھی (جس میں) اللہ تعالیٰ نے ان سے خطاب فرمایا "کہ تو نے خواب کو سچا کر کے دکھایا۔" یعنی تم نے خواب کی تعبیر اور اس کی مراد کو پورا کیا اور اس سے اللہ کا مقصد دنبے کے ذبح کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انسانِ الٰہی (امام نوع انسانی) سے ارتفاقات (باہمی معیشت کے اصول) اور نیکی و گناہ کے علوم کو لیا تھا۔ اسی لئے آپؑ نے مہمانی، مسافر کا حق، فطرت کی خصلتیں اور حیوان کے ذبح سے تقرب حاصل کرنے کی بنیاد رکھی، ارکانِ اسلام کو مشروع فرمایا اور شرک سے ہر طرح دور رہے۔

تاویل الاحادیث: زکریا، مریم، یحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام

بی بی حنہ ایک بانجھ عورت تھی اور عمر رسیدہ ہوگئی تھی۔ اس نے ایک کبوتری کو اپنے بچوں کو دانہ کھلاتے ہوئے دیکھا تو اسے بھی بچے کا اشتیاق ہوا اور رو پڑی۔ پھر اللہ کے حضور میں عاجزی کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے اس مشاہدے اور ہمت میں برکت فرمائی اور اس کے بانجھ پن کو ختم کر دیا اور اس کی جوانی کو اس کی طرف لوٹا دیا۔ یہ اس طرح ہے جیسے اطباء کہا کرتے ہیں کہ حیوانات کو بحالت جفتی دیکھنے سے انسان کی نسلی قوتوں میں جان آجاتی ہے اور اس طرح ایک نامرد بھی مرد بن جاتا ہے۔ بی بی حنہ نے بھی جب کبوتری کو اپنے بچوں کو دانہ کھلاتے ہوئے دیکھا تو اس کو بچہ یاد آگیا اور اس کی طرف اس کو پورا میلان اور شوق پیدا ہوا (اس کا یہ فائدہ ہوا کہ) اس کے نقصان کی اصلاح ہوگئی۔

پھر اس کے دل میں لڑکے کی رغبت پیدا ہوئی اور اس کی قوت متخیلہ، ارادے کی پختگی اور امید کی درستی نے بچے میں اثر کیا تو وہ برکت والی بی بی مریم ہوگئی جو مرد کا مزاج رکھتی تھی اور وہ بڑے لوگوں کی طرح طاقتور، کامل مزاج، صحیح فطرت اور نظافت کی مالک تھی۔ اسی لئے نبی ﷺ نے فرمایا کہ مردوں میں بہت سے لوگ کامل گزرے ہیں۔ حدیث کے آخر تک[16] اور وہ مرد عورت تھی یعنی بظاہر وہ عورت تھی لیکن اس میں مردوں جیسی صفات موجود تھیں۔ یہ اس لئے تھا کہ اس کی

ذات میں اللہ کی طرف توجہ اور اس سے امید باندھنے کی صفت پوشیدہ تھی اور اس پر اس کی ہمت مجتمع تھی۔ یہاں تک کہ یہ ہمت اس کی قوت مصورہ میں نفوذ کر گئی تھی۔ جب حنہ کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی تو اللہ کے حضور میں اپنے شدید غم کا اظہار کیا کیونکہ (بیت المقدس میں) اللہ کی عبادت کے لئے صرف لڑکوں کو ہی رکھا جاتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے حضرت مریم کو قبول کر لیا کیونکہ وہ برکت والی اور مردانہ وار عورت تھی، خدا نے زکریا علیہ السلام اور (بیت المقدس کے) دوسرے مجاوروں کے دل میں بی بی مریم کو قبول کرنے کی بات الہام فرمائی۔ اگرچہ یہ بات ان کے دستور کے خلاف تھی۔

بی بی مریم پر اللہ تعالیٰ کی عنایتوں میں سے ایک عنایت یہ تھی کہ حضرت زکریا علیہ السلام کو ہی اس کا کفیل بنا دیا کیونکہ وہ نبی، عالم اور بی بی مریم پر شفیق تھے اور ان کی بیوی حضرت مریم کی خالہ تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے (بیت المقدس کے) خادموں اور عالموں کے دل میں یہ ڈال دیا کہ وہ حضرت مریم کو اپنے پاس رکھنے کے سلسلے میں نہر میں قرعہ ڈال کر فیصلہ کریں[17] اور ہر ایک یہ خیال کرتا تھا کہ اس کے نام پر قرعہ نکلے گا اور اس میں حضرت زکریا علیہ السلام کے لئے حق کے ظہور کی ایک تقریب تھی۔

حضرت مریم پر اللہ کی دوسری عنایت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر اپنی نشانیوں کو ظاہر فرمایا اور کسی عنصری سبب کے سوا کلمہ ''کن'' کہنے سے اس کے لئے میوے پیدا کیے جس طرح جنت میں جنتیوں کے لئے پیدا کرے گا۔ زکریا علیہ السلام اللہ کے عارف اور مخلوق میں اس کی سنت کو جاننے والے تھے۔ انہوں نے ان دنوں میں روحانی قوتوں کے عجیب ظہور کو معلوم کیا تھا اور اس کو بھی جان گئے تھے کہ آج تکوین کسی عنصری سبب پر موقوف نہیں ہے جس طرح آدم علیہ السلام کی پیدائش کے دنوں میں تھا، تب انہوں نے اللہ تعالیٰ سے بیٹے کے لئے دعا کی کہ وہ زکریا علیہ السلام کے بعد ان کا جانشین ہو۔ اس کے علم کو قائم رکھے۔ لوگوں کو اللہ کی عبادت کی طرف بلائے کیونکہ ان کو اپنے چچازاد بھائیوں سے یہ ڈر تھا کہ وہ اس دنیا کی عزت و آبرو کو اختیار کریں گے تو وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ تب حضرت زکریا علیہ السلام نے کمال رغبت سے دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا کو قبول فرمایا اور ان کو جوان کر دیا اور اس کی بیوی کی ناز ادگی کو دور کیا تو حضرت یحییٰ علیہ السلام پیدا ہوئے جو حکیم اور اللہ کی طرف متوجہ رہتے تھے اور عورتوں سے دور رہتے تھے۔ اس کی یہ وجہ ہے کہ ہر وہ شے جس کے موجود ہونے میں ارضی اسباب کو کم دخل ہوتا ہے اس میں حیوانی اخلاق کے لحاظ سے ضعف پایا جاتا ہے اور وہ دنیا کے منافع سے محروم ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ الٰہی عبادات کے لحاظ سے کتنا ہی برکت والا کیوں نہ ہو، حضرت یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کا زہد اور گمنامی کو دوست رکھنا اور ریاسات سے منہ پھیرنا اور پناہ مانگنا بھی اسی قسم سے ہے کیونکہ انسانی کمالات، نفس میں اس قدر ظاہر ہوتے ہیں جس قدر روح اپنی جبلت کے لحاظ سے ان کے لئے آمادہ ہو۔ کوئی انسان ذکی ہوتا ہے۔ ان کا کمال حکمت اور علم کی پختگی ہے اور کچھ انسانوں میں عدالت اور سیاست روانی کی استعداد ہوتی ہے تب وہ اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اللہ ان کو حکومت عطا کرتا ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام نے ان کے مبشر بیٹے کے ساتھ بیوی کے حاملہ ہونے کی نشانی طلب کی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ وحی کی کہ تین دن تک کسی سے کوئی بات نہ کریں۔[18] یہ اس لئے ہوا کہ جب حق کی عنایت اور ملاء اعلیٰ کی ہمتیں عالم ناسوت میں آتی ہیں اور اس کی طرف متوجہ ہوتی ہیں تو اس وقت ایک ملکی ہیئت نے اس کے نفس کو گھیر لیا تب وہ کسی مخلی

اشارے کے سوا کسی سے بات نہ کر سکے۔

پھر حضرت مریم کو اس جگہ روحانی قوتوں کے ساری و جاری ہونے کے زمانے میں ماہواری کے دن آئے۔ جب ان سے پاک ہوئیں تو لوگوں سے دور ایک الگ مکان میں غسل کرنے کے لئے گئیں اور پردہ ڈال کر کپڑے اتارے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ایک کامل خلقت جوان کی صورت میں جبرئیل کو بھیجا جو جوانی اور خوبصورتی سے بھرا ہوا تھا۔ حضرت مریمؑ نے ان کو دیکھا اور وہ خود بھی جوان اور قوی مزاج والی تھیں۔[18a] ان کو اپنے نفس پر فساد کا ڈر لاحق ہوا اور دل سے اللہ کے حضور میں دعا کی کہ ان کی عصمت پر کوئی حرف نہ آئے۔ پھر اس کو ایک عجیب حالت پیش آئی۔ طبیعت میں قوائے نسلیہ کا ہیجان ہوا اور اس سے وہ (لذت کی) کیفیت پیدا ہوئی جو جماع کے وقت ہوتی ہے۔ جیسے کبھی کسی کو نظر کرنے سے انزال ہو جاتا ہے اور نفس کو اللہ تعالیٰ سے التجا تھی اور اسی کے ساتھ تمسک تھا۔ یہاں تک کہ وہ غیب سے فائض ہونے والی پاک دامنی کی حالت سے مالا مال ہو گئیں۔ صورتِ انسانیہ کی یہ حالت تھی کہ جبرئیل کے اختلاط سے عنقریب ظاہر ہونے والی تھی۔

جب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ان سے یہ کہا کہ میں تو تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں کہ دے جاؤں تجھ کو ایک ستھرا لڑکا۔[19] تو حضرت مریم خوش وخورم اور مانوس ہو گئیں اور حضرت جبرئیل نے جب ان کے اس حال کو دیکھا تو ان کے ستر میں پھونک لگا دی۔ اس پھونک سے اس میں تاثر ہوا اور وہ منزل ہو گئیں۔ حضرت مریم کے نطفے میں مرد کے نطفے جیسی قوت تھی۔ اس لئے وہ حاملہ ہو گئیں اور جو بات سیدہ مریم میں تھی وہ سب اس بچے میں آ گئی۔ مثلاً اللہ سے تمسک کرنا، اسی کی طرف التجا کرنا اور ملکی ہیئت سے خوش وخورم ہونا کیونکہ حضرت مریم کی حالت اس کے نفس کی ہر قوتِ مصورہ اور مولدہ تک میں سرایت کر گئی تھی اور بات وہ ہے جو اطباء کہتے ہیں کہ جو شخص چاہے کہ اس کو لڑکا پیدا ہو تو جماع کے وقت لڑکے کا تصور کرے۔ حضرت جبرئیل کی پھونک سے اس لڑکے میں عالم مثال کا حکم اور روح کے خواص آ گئے تھے کیونکہ صورت بننے کا سبب وہی تھا۔ اس سے حضرت مسیح کی جبلت میں جبرئیل کے مشابہ ایک راسخ ملکہ پیدا ہوا اور حضرت مسیح کی روح القدس کے ساتھ تائید کا یہی مقصد ہے۔

جب حضرت مریم کے یہاں بچہ پیدا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی نشانیاں ظاہر کیں۔ ان میں سے ایک نشانی یہ تھی کہ ملائکہ نے اسے آواز دی کہ اللہ تعالیٰ حضرت مریم کے لڑکے کو کمالات عطا کرے گا اور سیدہ مریم نے اپنے بیٹے کے حالات اور سب کمالات اجمالی طور پر جان لیے۔ لڑکپن، جوانی اور پیری کے۔

تاویل الاحادیث: لوط علیہ السلام

لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے گروہ میں سے تھے جس نے ان سے ادب سیکھا تھا اور ان سے سنا تھا، یہ تعلیم آپؑ کے دل میں بیٹھ گئی تھی اور یہ ان کی نیکیوں میں سے ایک نیکی تھی، وہاں ایک قوم بستی تھی جن پر بے حیائی اور نفس پرستی نے غلبہ پایا تھا اور انہوں نے ملک میں فساد ڈال رکھا تھا اور وہ جسمانی لذتوں کے حاصل کرنے میں بہائم سے جا ملے تھے (اس لیے) اللہ نے ان پر غضب کیا۔

اللہ کی یہ حکمت تھی کہ ان کو ان کے بداعمال کی سزا سے پہلے ڈرائے۔اس لئے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی طرف یہ وحی فرمائی کہ ان کو ڈرائے۔اگر چہ یہ ڈرانا اپنے گروہ میں سے کسی ایک شخص کے ذریعہ کیوں نہ ہو۔ پھرانہوں نے لوط علیہ السلام کو (ان کی طرف) بھیجا جس نے جا کر ان کو وعظ و نصیحت کی اور سمجھایا لیکن اس تبلیغ سے ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ پھر حکمت الٰہی ایسے مادی اور ارضی اسباب کے انتظار میں رہی جن سے ایک ایسے واقعے کی تیاری ہو سکے جس سے ان کو عذاب کیا جائے۔ پھر جب اللہ کا حکم آیا تو ملائکہ انسانی صورت کا لباس اوڑھ کر ابراہیم علیہ السلام کے پاس مہمان بن کر آئے کیونکہ ڈرانے والے اصل میں ابراہیم علیہ السلام ہی تھے اور ان کے ہی ہاتھ میں انس کی پیشانیاں مہمانوں کی صورت میں رکھی گئی تھیں۔ حضرت ابراہیم نے وہ کھانا جو مہمانوں کے لائق ہوتا ہے، ان کے سامنے رکھا اور جب آپؑ نے دیکھا کہ وہ اس کو ہاتھ تک نہیں لگاتے تو انہیں اوپرا سمجھا اور ان سے نامانوس ہوا یہاں تک کہ جب آپؑ پر یہ واضح ہوا کہ یہ ملائکہ ہیں تو ابراہیم علیہ السلام اور ان کے گھر والوں سے ظاہری وحشت زائل ہوئی اور ان کو خوشی حاصل ہوئی اور ان کے نفوس نے ملکوت کا رنگ اختیار کیا۔ اس لیے (فرشتوں کی) ان کے حق میں یہ دعا تھی کہ ''اے گھرانے والو! تم پر اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہوں۔''

(جاننا چاہیے کہ) ملائکہ اللہ کے روح ہوتے ہیں اور ایسی روح کی یہ خاصیت ہے کہ جب بھی اس کا کسی چیز پر گزر ہوتا ہے تو اس چیز کی زندگی اور شباب اس کی طرف لوٹ آتا ہے۔ جب ملائکہ نے (ان کے لیے) برکت کی دعا کی اور انہوں نے اپنی پوری کوشش سے یہ قصد کیا کہ بی بی سارہ کی حالت سدھر جائے (اور دوسری طرف) رحمت (الٰہی) بھی ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے مقبول ہونے کی منتظر تھی تب اسی حالت میں بی بی سارہ جوان ہو گئی (اس لئے کہ) بیٹے کی بشارت ملنے کے بعد ان کو ظاہری اور باطنی طور پر سرور اور تعجب لاحق ہوا اور بیٹے کے تخیل سے بدن کے اندر اس کی روح منشرح ہوئی اور انشراح میں برکت ہوئی جیسے کوئی مریض شدید مرض میں مبتلا ہو (اس میں کبھی ایسا ہوتا ہے) کہ اچانک فرح و سرور پہنچنے سے شفایاب ہو جاتا ہے اور اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ ضعف باہ والوں کو اگر قوی قوت والے لوگوں کی حکایتیں سنائی جائیں تو ان کے سننے سے وہ ٹھیک ہو جاتے ہیں۔

پھر ابراہیم علیہ السلام نے ملائکہ سے پوچھا کہ ان کا کیا ارادہ ہے؟ انہوں نے آپؑ کو سب کچھ بتلا دیا۔ پھر لوط علیہ السلام کے قریہ کی طرف گئے اور ان کے ہاں اترے (ان کو دیکھ کر) لوط علیہ السلام کی قوم ان کے پاس دوڑتی ہوئی آئی۔ ان کا فساد کا ارادہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی لوط علیہ السلام کے خلاف معرکے میں جلد بازی اور دوری میں ہی اندھا کر دیا۔ پھر ان کے لئے زمین کو اس طرح لپیٹا (اور کم) کر دیا گیا کہ ان کے چلنے میں برکت رکھی گئی اور ان کو یہ حکم ہوا کہ (چلتے وقت) پیچھے مڑ کر نہ دیکھیں تا کہ (اپنے) سیر (کی مسافت) کو زیادہ نہ سمجھیں۔ ان کا ارادہ جو کہ روح الٰہی کے لئے ایک مثالی صورت کی طرح تھا، پراگندہ ہوا پھر ان پر عذاب نازل ہوا اور وہ زمین سے سخت زلزلہ تھا اور بارش، ہواؤں اور اولے کے مادے کے منعقد ہونے سے کنکر کے پتھر بن گئے تھے (ان سے بھی ان کو عذاب کیا گیا)

جاننا چاہیے کہ کائنات جو یہ کی قسم کے تمام عذاب جو آتے ہیں، وہ سب ستاروں کے نامناسب اتصال کی وجہ سے آتے ہیں اور یہ تب ہی ہوتا ہے جب سماء (بادل) میں بارش بند ہو جاتی ہے اور بڑی مدت تک اس میں بہت سے

مادے جمع ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کے ساتھ ملاء اعلیٰ کا غضب اور لعنت بھی مل جاتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ ان اسباب میں بسط فرماتا ہے اور ان مواد کو کبھی تو زلزلے اور مہیب آواز بنا دیتا ہے اور کبھی زمین میں دھنسنا ہوتا ہے اور کنکر کے پتھر برستے ہیں اور کبھی تند اور تیز تر ہوا بنا دیتا ہے اور کبھی ان کو گری ہوئی بجلی اور منتشر آگ کر دیتا ہے۔

تاویل الاحادیث: یوسف علیہ السلام

اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کی تقدیر میں تکلیف و مصیبت اور ان کے والد سے جدائی لکھی تھی کیونکہ اس پر سماوی اسباب کی موافقت ہو گئی تھی۔ آخر آپؑ کو ایک بڑا واقعہ پیش آیا۔ جیسے بھائیوں کا ان کے ساتھ حسد کرنا اور یوسفؑ کو کنویں میں گرانا، پھر (تاجروں کے ہاتھ) فروخت کرنا اور ان کا زلیخا کے یہاں پہنچنا اور جیل ہونا۔ یہ تب تک ہوتا رہا جب تک بلا و مصیبت کا زمانہ گزر گیا۔ پھر اللہ نے ان پر رحمت فرمائی اور اپنی رحمتوں کی ظاہری اور باطنی طور پر بارش فرمائی۔ ان کے لئے اس حادثے میں ان کے پروردگار کی مختلف نعمتیں تھیں۔

ایک یہ ہے کہ...... یوسف علیہ السلام پاکباز تھے۔ ان کے خواب میں ان پر وہ سب ظاہر ہوا جو آخر امر میں ان پر اللہ کا انعام ہونا تھا۔ مثلاً مخلوق ان کی اطاعت کرے گی۔ ان کے ماں باپ ان کی تعظیم کریں گے۔ یعقوب علیہ السلام نے اس خواب کی تعبیر فرمائی اور اللہ کی مراد کو معلوم کیا اور اپنے تنبہ سے کلی طور پر مقصد کے راز کو بھی جان لیا کہ یوسف علیہ السلام تعبیر واقعات (اور خواب) کے لئے (بھی) مستعد ہیں کیونکہ خواب اور حوادث کے لئے کوئی تعبیر ہوتی ہے جس کو جامع تنبہ کا مالک معلوم کر لیتا ہے۔ تنبہ جامع سے میرا مقصد یہ ہے کہ معنی مراد کو قوتِ خیالیہ ایسی صورت پہنائے جو کہ طبیعت کی صورت کے مناسب ہو اور اس کی بنا طبیعت کلیہ کی اقتضا پر ہوتی ہے جب حقیقت اجمالیہ (اس کا) عالم ناسوت میں اضافہ کرتی ہے۔

ان عنایات میں سے دوسری عنایت یہ ہے کہ جب یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان پر حسد کیا اور ان کو جان سے مار ڈالنے کا باہمی مشورہ کیا تو ان میں سے ایک کی زبان پر اللہ تعالیٰ نے یہ نکلوایا کہ یوسفؑ کو قتل نہ کرو اور ان کو کنویں میں ڈال دو، پھر اللہ نے سب کو اس بات کا قائل کرا دیا (اور اس کے کہنے پر اس کو قتل نہ کیا) تو خدا نے یوسفؑ کے قتل کو کنویں میں ڈالنے سے بدل دیا اور قضا کو اس پر آسان کر دیا۔

ان پر تیسری عنایت یہ تھی کہ جب ان کو بھائیوں نے کنویں میں ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ان کے اپنے حال کی جو آگے ہونے والا تھا اور ان کے بھائیوں کے حال کی وحی کی کہ وہ سب ان کے تابعدار ہوں گے اور یوسفؑ کی فضیلت اور ان کے حق میں اپنی خطا کا یہ کہہ کر اعتراف کریں گے کہ "تحقیق اللہ نے تجھ کو ہم پر فضیلت دی"[20] اس وحی کرنے کا فائدہ یہ تھا کہ یوسفؑ کے دل کو تسلی ہو جائے اور اس سے اس کی وحشت دفع ہو جائے۔

چوتھی عنایت یہ تھی کہ اس حادثے کی طبعی اقتضا یہ تھی کہ یوسفؑ ہلاک ہوں مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو روک دیا۔ حقیقت میں تو اس کو ہلاکت کا سبب نہ بنایا لیکن ظاہر، حکایت، گمان اور یعقوب علیہ السلام کے (ان پر) غم کرنے کے لحاظ سے اس کو ہلاکت کا باعث بنا دیا۔

پانچویں عنایت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کی خلاصی کے لئے یہ تقریب فرمائی کہ قافلے والوں کے دلوں میں یہ خیال ڈال دیا کہ وہ اس طرف کو جائیں اور اپنے میں سے ایک کو کنویں کی طرف بھیجیں۔ ان کا یہ گمان تھا کہ وہاں پانی ہوگا۔ اس طرح یوسف علیہ السلام پر اس کو اطلاع ہوئی اور اس نے ان میں رغبت دکھائی اور ان کی اس خیال سے حفاظت کی کہ ایک عمدہ پونجی ہے۔ حق بات یہ ہے کہ اس سے یوسف علیہ السلام کی طول حیات مراد تھی اور ان کا اپنے کمال کی حد تک پہنچنا تھا۔

چھٹی عنایت یہ ہے کہ جب ان کو (مصر کے) عزیز نے خریدا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں یہ خیال ڈال دیا کہ وہ اپنی بیوی کو یوسف علیہ السلام کے ساتھ اچھے برتاؤ کی وصیت کرے اور بیوی کے دل میں بھی یہ القاء کیا کہ وہ ان کا خیال رکھے اور شاید ان کو اپنا بیٹا بنا دے۔ حق یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کے حق میں اللہ کی مراد یہ تھی کہ ان کو ملک مصر میں سکونت دے اور بڑی نعمت سے پہلے ان پر اپنی رحمت کو کامل کرے۔

ساتویں عنایت یہ ہے کہ تعلیم حاصل کرنے کے سوا اللہ نے ان پر اپنی حکمت اور علم کو ظاہر فرمایا اور ان پر ملتِ حنفی کو واضح کیا۔ اگرچہ ان کی بود و باش کافروں کی قوم میں تھی جہاں بری رسمیں تھیں۔

آٹھویں عنایت یہ ہے کہ جب عورت (زلیخا) ان پر عاشق ہوئی اور ان کو پھسلانا شروع کیا، وہ ایک قوی مزاج والے جوان تھے اور البتہ عورت نے فکر کی اس کی اور اس نے بھی فکر کی عورت کی۔ [21] تو اللہ تعالیٰ نے ایک بڑی دلیل ظاہر فرمائی جس سے ان کے دل میں عصمت نے جوش مارا اور اس نے ان کے مزاج کے جوش کو ٹھنڈا کر دیا۔ اگرچہ ان کا مزاج قوی تھا اور اس کی یہ صورت ہوئی کہ ان کو اپنے باپ (یعقوب علیہ السلام) کی صورت نظر آئی جن کو وہ جانتے تھے کہ یہ (باپ) اللہ کے شعائر میں سے ہے اور وہ ملک میں اللہ کی طرف بلانے والے ہیں اور اس فعل سے ان کو روکنے والے ہیں۔

نویں عنایت یہ ہے کہ جب یوسف علیہ السلام پر تہمت لگائی گئی اور لوگوں میں (آپؑ کی عصمت اور صداقت پر) کوئی گواہی دینے والا نہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ایک بچے کو ایسی حکمت سے گویا کر دیا کہ جس سے ان کی برأت (اور صفائی) ہو گئی۔

دسویں عنایت یہ ہے کہ جب عزیز مصر کی بیوی نے یوسف علیہ السلام کو بنا سنوار کر عورتوں کو اس لئے دکھلایا کہ اپنے سے ان کی ملامت کو دفع کرے تو وہ عورتیں ان پر عاشق ہو گئیں اور انہوں نے ان تک رسائی کی بڑی کوشش کی (ایسی حالت میں) بظاہر یوسف علیہ السلام کی عصمت کا باقی رہنا مشکل معلوم ہوتا تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنے پروردگار سے اپنی خلاصی کی دعا مانگی، چاہے وہ خلاصی قید ہونے سے کیوں نہ ہو جس قید کی زلیخا نے اپنی مقصد برآری کے لئے ان کو دھمکی بھی دی تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور ان لوگوں کے خیال میں یہی آیا کہ ان کو قید کریں، اگرچہ ان کی برأت ہو گئی تھی۔

گیارہویں عنایت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی رہائی اور مصر میں ان کو قوت دینے کی عجیب تقریب فرمائی اور ان کے لئے ایسا سبب مہیا کیا کہ عام اور خاص سب کی زبان ان کی مدح و ثنا سے رطب اللسان ہو جائے اور (وہ تقریب یہ

تھی کہ) دو شخصوں کو خواب دکھایا اور یوسف علیہ السلام کو اس خواب کی تعبیر کی توفیق عطا فرمائی اور انہوں نے اس خواب کی مراد کو سمجھ لیا اور انہوں نے ساقی سے کہا کہ اپنے مالک کے ہاں ان کا ذکر کریں اور ان کے فضل کو ظاہر کریں۔

بارہویں عنایت یہ تھی کہ جب اہل مصر کو ایک ایسے عظیم قحط نے گھیر لیا جس سے وہ ہلاک ہونے والے تھے تو اللہ نے ان پر رحم کر کے ان کے بادشاہ کے دل میں ان کی نجات کی تدبیر ڈال دی اور یہ تدبیر اور الہام یوسف علیہ السلام کے سوا پورا نہیں ہوسکتا تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی رہائی تب ہی ہوسکتی تھی جب اس کے لئے (بادشاہ کے دل میں اس کا) القاء کیا جائے اور لوگوں کو یوسف علیہ السلام کی ضرورت ہو۔ تب اللہ تعالیٰ نے بادشاہ اور شہر کو یوسف علیہ السلام کا محتاج بنایا اور یوسف علیہ السلام کو بھی بادشاہ اور لوگوں کی طرف حاجت پڑی تا کہ جو کام ہونے والا ہے اس کو اللہ پورا کرے، اکثر حوادثات اسی طرح ہوتے ہیں جن میں بہت سے لوگوں کے لئے عنایاتِ باری جمع ہوتی ہیں۔

تیرہویں عنایت یہ تھی کہ یوسف علیہ السلام کو یہ توفیق عطا ہوئی تھی کہ تب تک وہ جیل خانے سے باہر نہ آئیں جب تک ان کی برأت نہ ہولے اور قبل اس کے کہ اللہ کی نعمتیں ان کو گھیر لیں، لوگوں میں ان کی صداقت کی تشہیر ہو جائے تا کہ ان کا صدق دنیا سے آلودہ نہ ہو جائے۔ اسی لئے نبی ﷺ نے ان کی ثناء فرمائی اور ان کے فضل کا اعتراف کیا۔ آپ ﷺ نے (ایک حدیث میں) فرمایا کہ اگر میں جیل میں اتنی مدت ٹھہرتا جتنی یوسف علیہ السلام ٹھہرے تھے تو میں داعی کی اجابت کرتا (یعنی جیل سے نکل آتا۔)[22]

چودھویں عنایت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو حاکم بنایا اور (مصر کے بادشاہ) ریان کے دل میں اور دوسرے تمام لوگوں کے دل کو ان کا مطیع بنایا اور اس کو اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام اور دوسرے تمام لوگوں کے لئے نعمت کر دیا۔

پندرہویں عنایت یہ تھی کہ اللہ نے یوسف علیہ السلام کے بھائیوں میں ان کے پاس آنے کی رغبت پیدا کی تا کہ غمزدہ لوگوں سے ملاقات ہو سکے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام توحید اور علم اسباب سب کو جانتے تھے۔ وہ نظر لگنے سے ڈرے اور بیٹوں کو (اس سے) بچنے کی تدبیر بتائی۔

سولہویں عنایت یہ تھی کہ جب یوسف علیہ السلام نے یہ چاہا کہ اپنے بھائی (بن یامین) کو اپنے پاس روک رکھے تا کہ دوسرے بھائیوں کی بے خبری میں اپنے اس بھائی سے انس حاصل کرے تو اللہ تعالیٰ نے (ایک تدبیر فرمائی کہ) ان کے بھائیوں سے یہ کہلوا دیا کہ جس کے سامان میں (کھوئی ہوئی چیز) پائی جائے تو وہی اس کے بدلے میں جائے۔ وہ اپنے زعم میں اپنی برأت کے اظہار میں مبالغہ کر رہے تھے لیکن حقیقت میں غیر شعوری طور پر وہ یوسف علیہ السلام کے مقصد برآری کی کوشش کر رہے تھے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے یعقوب علیہ السلام کے دل میں یہ اجمالی وحی کی کہ وہ اپنے بیٹوں سے ملیں گے اور پھر ان پر اپنی رحمت پوری کی اور اس خوشی کے سلسلے میں جو ان کی روح کو بیٹوں کی ملاقات والی بشارت سے پہنچی تھی۔ ان کی بینائی لوٹ آئی اور حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب ظاہر ہوا۔ پس یہ سب (عنایتِ الٰہی کی) علامات تھیں جو کہ یوسف علیہ السلام پر ظاہر ہوئیں۔ سب مسلمانوں کو چاہیے کہ ان سے یہ سمجھ لیں کہ اللہ اپنی عنایت کو خلق میں کس طرح ظاہر فرماتا ہے۔ جب کسی

شخص کو کسی ہلاکت سے بچا کر باقی رکھنا چاہتا ہے یا دنیا اور آخرت میں اس کے کمال تک اس کو پہنچانا چاہتا ہے اور جب اللہ کسی قوم کی بقاء کا ارادہ کرتا ہے تو کس طرح نجات کی تدبیر دل میں ڈال دیتا ہے۔ پھر جو بھی اس خدمت کے لئے مستعد ہوتا ہے۔ اس کو اس تدبیر کی خدمت میں لگا دیتا ہے۔ اللہ کی آیات میں تمہیں تدبر کرنا چاہیے اور تمہیں یہ بھی جاننا چاہیے کہ خدا کی تدبیر مخلوق میں کس طرح کام کرتی ہے۔

تاویل الاحادیث: ایوب علیہ السلام

ایوب علیہ السلام نعمت، ثروت، آرام، عبادت اور نظامت میں رہتے تھے۔ پھر وہ اپنی قوم کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے۔ یہ ان کو نیکی کا حکم کرتے تھے اور برائیوں سے ان کو روکتے تھے اور ان کو ملت حنیفی کی طرف بلاتے تھے۔ قوم کے فقراء اور مساکین کی حاجت روائی کرتے تھے۔ پھر موافق ہو گئے۔ اسبابِ ساوی مصیبت پہنچانے پر، ان کے مال واہل و عیال اور جسم سب پر اور اس وقت بھی ان کے پروردگار کی ان پر یہ عنایتیں تھیں کہ ان پر خیر کا فیضان ہوتا تھا اور ان کو (قلبی) اطمینان تھا۔ ان کی یہ حالت ان اصولوں میں شمار ہوتی تھی جن سے اللہ کے لئے ان کی فرمانبرداری اور اطاعت کی وضاحت ہوتی ہے۔ یہ حالت ان کے نامہ اعمال میں لکھی گئی اور اس پر اللہ نے ان کے شکر بجا آوری کو قبول فرمایا۔

جب ان کی مصائب جاتی رہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی نعمتیں برسائیں اور جو رحمت پوشیدہ تھی وہ ظاہر ہوئی اور ان سے کہا گیا ''لات مار اپنے پاؤں سے، یہ چشمہ نکلا نہانے کو ٹھنڈا اور پینے کو۔''[23] زمین پر لات مارنا تو اسبابِ ارضی میں اللہ تعالیٰ کی عنایت تھی تا کہ وہ یوں ہی بیکار نہ رہ جائے۔ (اس سے) وہاں پانی کا ایک چشمہ پھوٹ نکلا جس کی یہ خاصیت تھی کہ اس (کے استعمال) سے جذام کا خاتمہ ہو جائے۔ جس طرح گندھک کے چشمے کی خاصیت ہوتی ہے خارش کا ازالہ۔ حضرت ایوب علیہ السلام اس پانی سے نہائے اور اسے پیا جس سے ان کا سارا بدن اچھا ہو گیا اور مرض کا مادہ جاتا رہا۔ حضرت ایوبؑ اور ان کی بیوی دونوں کی جوانی اور شباب لوٹ آیا۔ پھر ان کی جتنی اولاد ہوئی تھی، وہ اور اس قدر مزید ان کے لئے پیدا ہوئی اور اپنے زمانے کے لوگوں اور ان کے بعد کے آنے والے لوگوں سب میں سچے (مشہور) ہو گئے۔ اللہ نے ان کے مال میں برکت کی جس طرح اس سے پہلے برکت کی تھی یا اس سے بھی زیادہ۔

ایک دن حضرت ایوب علیہ السلام غسل کر رہے تھے کہ اللہ کی رحمت سے ٹڈیاں آئیں اور جب ان کے گھر میں گر پڑیں تو سب سونے کی ہو گئیں اور ان میں سے ایک گھر کے باہر گری تو اس کو بھی اٹھا لائے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جب کسی طرف سے رحمت متوجہ ہوتی ہے تو حتی الامکان (اس کو چھوڑنا نہ چاہیے) اس کا پیچھا کرنا ضروری ہے۔

حضرت ایوبؑ نے یہ منت مانی تھی کہ اپنی بیوی کو سو درے ماریں گے اور اللہ تعالیٰ کی ان پر رحمت اور آسانی کی نظر تھی تو نذر کی ایفا میں منت کی حقیقی صورت کو چھوڑ کر اس کی ظاہر صورت پر اکتفا کی کیونکہ ایک سو مرتبہ مارنے کے معنی ہیں شدید درد پہنچانا اور اس سے ظاہری مراد ہے ایک سو مرتبہ مارنا (چاہے وہ ایسی شکل میں ہو کہ اس سے کوئی خاص تکلیف نہ پہنچے) اللہ تعالیٰ کا اپنے پیارے بندوں کے ساتھ برتاؤ ایسا ہی ہوتا ہے کہ ان سے حدود شرعیہ کی ظاہری صورت پر اکتفا کی جاتی ہے۔ اصل حقیقت کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ اللہ کی عنایت اور ارادے سے ہوتا ہے جس کا تعلق ان شرائع سے ہوتا ہے جو

ملاء اعلیٰ کے سینوں میں بنتی ہیں (یعنی ملاء اعلیٰ میں ان کا فیصلہ ہوتا ہے) پھر ان میں ان شرائع اور احکام کی وجہ سے حرج اور تکلیف نظر آتی ہے۔ اسی طرح ہر پسندیدہ نظام کے ساتھ حق تعالیٰ کا یہی برتاؤ ہوتا ہے۔ جب اسبابِ ارادی اس پر موافقت کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے درمیان عدل اور انصاف سے اسی طرح فیصلہ کرتا ہے کہ شے کے ایک پہلو کو لیا جاتا ہے اور دوسرے کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔

تاویل الاحادیث: شعیب علیہ السلام

حضرت شعیب علیہ السلام صاف دل والے مومن، اپنے پروردگار کے فرمانبردار تھے۔ ان کی قوم نے زمین میں فساد کیا اور لوگوں کے حقوق میں بے انصافیاں کیں اور بدرسموں پر جمع ہو گئے تھے۔ مظلوم لوگ فریاد کرتے تھے لیکن ان کی کوئی نہیں سنتا تھا۔ انہوں نے اللہ اور آخرت پر ایمان کو بالکل بھلا دیا تھا۔ اللہ کی حکمت کا یہ تقاضا تھا کہ شعیب علیہ السلام کی طرف یہ وحی فرمائے کہ وہ ان کو (گناہوں کی پاداش میں) خدا کی طرف سے جو سزا ملنے والی تھی، اس سے ڈرائے اور ان کو خدا کے غضب سے باخبر کرے۔

جب شعیب علیہ السلام کے (سمجھانے اور) ڈرانے سے کوئی نتیجہ نہ نکلا تو حکمتِ الٰہی منتظر رہی تا کہ جب ایک دراز مدت تک ان سے بارش رک گئی، زمین کے مواد بند ہو گئے اور شدت کی گرمی ہوئی تو اللہ کا حکم آ پہنچا۔ ان پر گرم ہوا چلے پھر ان میں اضافہ ہوا اور وہ آگ ہو گئے اور ان پر (رعد کی مہیب) آواز آئی (اس سے) وہ ہلاک ہو گئے۔ حضرت شعیب علیہ السلام جس طرح پہلے اپنے رب کے فرمانبردار تھے اسی طرح اب بھی مطیع مومن رہے اور قوم کے ساتھ جھگڑنے اور ڈرانے کا خیال جو ان کے سینے میں جوش مارتا تھا، وہ ختم ہو گیا اور یہ جوش ملاء اعلیٰ میں قوم شعیب پر لعنت اور غضب کرنے کے فیصلے کے نتیجے میں تھا۔ حضرت شعیب علیہ السلام پر ایک حالتِ الٰہی کا نزول ہوا تھا۔ اس سے وہ لذت حاصل کرتے تھے اور اس لئے ان کی یہ خواہش تھی کہ بعض افراد ایمان لائیں اور بعض نہ لائیں۔

تاویل الاحادیث: موسیٰ وہارون علیہما السلام

جاننا چاہیے کہ فرعون نے اللہ اور اس کے شعائر سے تکبر کیا اور اس نے اپنی خدائی کا دعویٰ کیا۔ خدا کی مخلوق کو اپنا غلام بنایا۔ ملک میں فساد کیا اور بنی اسرائیل پر ان کے بیٹوں کے قتل کرنے اور ان کو ذلیل وخوار رکھنے سے غلبہ حاصل کیا۔ (اس دور میں) بنی اسرائیل ملک میں اللہ کی مخلوق میں سب سے اچھے لوگ تھے۔ انہوں نے اللہ کے آگے عاجزی سے فریاد کی (ان کی دعا قبول ہوئی) اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ فرمایا کہ فرعون اور اس کی قوم پر ان کے بداعمال کی سزا میں عذاب بھیجے اور کمزور بنی اسرائیل پر احسان فرمائے اور ان کو (قوموں کا) پیشوا بنائے اور ان کو (زمین کا) وارث کرے۔ تب اللہ نے (اپنی مراد کو بروئے کار لانے کے لیے) ایک عظیم الشان شخص کی پیدائش کا حکم کیا جس کا یہ کارنامہ ہو کہ فرعونی اس کے ذریعے ہلاک ہوں گے اور بنی اسرائیل اس کی مدد سے (فرعونیوں کے مظالم سے) نجات پائیں گے۔ پھر اس شخص پر اس کے شروع سے لے کر اس کے قوت پانے تک اللہ تعالیٰ کی عنایتیں تھیں اور اس کو پورے طور پر آزمایا تا کہ اس

پر اللہ کی جبلت منکشف ہو اور اس کی استعداد میں جو چیز پوشیدہ ہے، وہ ظاہر ہو جائے۔
ان عنایات میں سے ایک عنایت یہ تھی کہ فرعون نے بنی اسرائیل کی عورتوں میں دایوں کو جاسوس بنا کر بھیجا اور (اللہ نے) موسیٰ علیہ السلام کو ان سے اس طرح چھپالیا کہ انہوں نے یہ سمجھا کہ یہاں کسی کو حمل نہیں ہے۔ پھر جب وہ پیدا ہوئے تو ان کی ماں کے دل میں ان کی نجات کے حیلے کا الہام کیا کہ اس کو دودھ پلاتی رہ! پھر جب تجھ کو ڈر ہو تو ڈال دے اس کو دریا میں اور نہ خطرہ کر اور نہ غم کھا، ہم پھر پہنچا دیں گے اس کو تیری طرف اور کریں گے اس کو رسولوں سے۔ (24)
اس کی عملی شکل یہ تھی کہ اس (حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ) کے دل میں یہ بات آئی کہ موسیٰ کو اپنے پاس رکھنے میں اس کی ہلاکت کا اندیشہ ہے اور اگر اس کو دریا میں ڈال دیا جائے تو یہ اس کی خلاصی کا سبب ہو سکتا ہے اور شاید یہ وہی نبی مرسل ہو جس کی علماء بنی اسرائیل نے بشارت دی ہے اور جس سے فرعون خائف ہوگا۔ یہ الہام پہلے تو ایک معمولی خیال کی شکل میں نمودار ہوا۔ پھر اس میں اضافہ ہوا اور اس خیال میں (عزم کی طرح) اتنی قوت پیدا ہوئی کہ وہ اپنے آپ کو اس سے نہ روک سکی۔ (تدبیر الٰہی اور الہام نے) دریا میں شدید موجوں کو ابھارا اور ان موجوں نے صندوق کو آل فرعون تک پہنچا دیا۔ انہوں نے اس صندوق کو نکال لیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رغبت ڈال دی۔ وہ یہ خیال کرنے لگے کہ یہ بچہ ان کے لئے سودمند ہوگا اور وہ اس کو اپنا بیٹا بنائیں گے۔
(اس میں) صریح حق بات یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ فرمایا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی اچھی تربیت ہو اور اس کو فرعون کے خوف سے مامون و محفوظ بنائے اور اللہ کی یہ شان رہی ہے کہ جب کسی ملت یا حکومت کی ترقی چاہتا ہے تو اکثر اوقات ایک فاجر آدمی کے دل میں اس کے ذہن کے موافق ایک خیال ڈال دیتا ہے اور وہ شخص اس کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس طرح حق تعالیٰ اپنی مراد کو پورا کرتا ہے کہ اس شخص کو اس کا شعور تک نہیں ہوتا۔ اسی لئے حضرت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تحقیق اللہ اس دین کو ایک فاجر و فاسق آدمی سے قوت دیتا ہے۔ (25)
پھر جب موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا دل فارغ ہوا۔ (25a) اس لئے کہ وہ الہام الٰہی کی مناسب طور پر تابعدار ہو کر طبیعت کے احکام سے جدا نہ ہوئی تھی۔ اس لئے وہ سوچ میں پڑ گئی کہ اس نے یہ سمجھا کہ اس سے تدبیر میں خطا واقع ہوئی ہے۔ اس سے پہلے کہ موجیں صندوق کو کہیں لے جائیں، اس پر صندوق کی تلاش ضرور تھی لیکن خدا نے اس کے دل کو مضبوط کیا، پھر کبھی تو وہ یہ کہتی تھی کہ شاید خدا وہی کرے جس کی مجھے آرزو ہے اور کبھی اس راز کو بے قرار ہو کر فاش کرنا چاہتی تھی۔
پھر اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ والدۂ موسیٰ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمگین نہ ہوں اور وہی موسیٰ کی پرورش کرے اور فرعون سے بے خوف ہو کر ان کو دودھ پلائے تاکہ یہ امر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے زیادہ مناسب اور ان کے نسب کے لئے مزید استحکام کا باعث اور ملت حنفی کو اپنے لئے مذہب قرار دینے کے لئے زیادہ قریب ہو تاکہ حضرت موسیٰ کی والدہ سمجھ لے کہ یہ بات جو اس کے سینے میں ڈالی گئی ہے، وہ درحقیقت اس کے پروردگار کی طرف سے الہام تھا۔ اس طرح وہ اپنے رب کے فرمانبردار اور اس کی شکر گزار ہو جائے تاکہ یہ بات اس کے کمال میں اس کے لئے زیادہ نفع بخش ہو۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ تقریب فرمائی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ہر کسی کا دودھ پینا حرام کر دیا۔ آپ نے کسی بھی دودھ پلانے والی عورت کی چھاتی کو منہ نہ لگایا۔ ہر دودھ کو بدمزہ سمجھنے لگے یہاں تک کہ وہ لوگ عاجز آ گئے۔ پھر جب ان کو موسیٰ کی

والدہ کے متعلق علم ہوا (اور وہ دودھ پلانے کے لئے بلائی گئی) تو ان کا دودھ انہیں خوشگوار معلوم ہوا اور یہ دودھ پلانے والی مقرر ہوئی۔

پھر حضرت موسیٰ اپنے عقل اور علم میں بڑھتے گئے اور ان پر ان کی فطرت کھلتی گئی یہاں تک کہ جب اپنی قوت کو پہنچے تو انہیں اللہ تعالیٰ نے حکمت اور علم عطا فرمایا اور وہ احکامِ الٰہی کی تاویل سمجھ گئے اور ملاء اعلیٰ سے منصبغ (اور مستفیض) ہونے کے لئے تیار ہوگئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی تربیت سے خلاصی دینے اور اس سے نجات دینے کا ارادہ فرمایا تاکہ وہ (فرعون سے جدا ہوکر) اپنے علم اور ہدایت میں کامل ترین انسان ہوں کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان لوگوں میں سے تھے جن پر ان کی فطرت کا انشراح مومنوں کی صحبت سے کمال کو پہنچتا ہے اور فرعونی لوگوں کی صحبت اور ان کی چال وچلن حضرت موسیٰ علیہ السلام کو (اس کمال تک پہنچنے سے) مانع تھی، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے (ان کو فرعون سے الگ رکھنے کے لیے) ایک ایسی تقریب فرمائی جو ان کی عصمت سے بھی نہ ٹکراتی تھی اور (وہ یہ تھی کہ) حضرت موسیٰ اصلاح کے لئے ایسے دو شخصوں کے بیچ میں پڑ گئے جو ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے اور اس سے ظالم کی تادیب مطلوب تھی۔ آخر آپؑ کے ہاتھ سے وہ مر گیا اور انہوں نے اس زبان سے جو اس دور میں متعارف تھی، اللہ سے بخشش مانگی اور اللہ نے اس کی توبہ قبول کی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل پر جو پردہ تھا، اس کو ہٹا دیا (یہ پردہ اس لئے ہوا تھا کہ) انہوں نے یہ گمان کیا تھا کہ میں نے گناہ کیا ہے ورنہ وہ تو اس قتل میں اللہ کے امر کے خادم اور مطیع تھے لیکن اس وقت کی زبان اور اس کے حال کا یہ تقاضا تھا کہ وہ اس راز کو نہ سمجھے اور وہ شرعی حکم ان پر مشتبہ رہے جس کو وہ شریعت سے جانتے تھے، تب وہ ڈر گئے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی زبان سے جس کی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مدد کی تھی اور اس پر احسان کیا تھا ایسی چیز کہلوا دی جس میں ان کی ہلاکت کا خوف تھا، یہ خدا کی طرف سے ایک تدبیر تھی تاکہ موسیٰ علیہ السلام فرعون سے نکل جائے اور اس کی نعمت سے امید اٹھالے اور یہ اس طرح ہوا کہ اس شخص نے موسیٰ علیہ السلام کے اس قول سے کہ "تو واضح گمراہ ہے" یہ سمجھ رکھا کہ حضرت موسیٰ اسے پکڑنا چاہتے ہیں۔ پھر یہ خبر پھیل گئی اور شہر میں مشہور ہوگئی اور فرعون غصہ ہوا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے مخبر سے ایسی بات کہلوا دی جو انہیں مصر سے نکل جانے پر برانگیختہ کرے۔

پھر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین کی طرف سوا کسی زادِ راہ، سواری اور رہنما کے چلے اور اپنا کام اللہ کو سونپا اور اس پر توکل کیا تو اللہ نے ان کی حفاظت اور رہنمائی کی اور جب مدین کے پانی پر پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا سبب فرمایا جس سے ان کا مدین میں رہنا ممکن ہو جائے اور وہ یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں یہ ڈال دیا کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی بکریوں کو بلا کسی معاوضے کے پانی پلائے اور دوسری طرف شعیب علیہ السلام اور ان کی دو بیٹیوں کے دل میں حضرت موسیٰ کے حق میں رغبت پیدا کی کیونکہ وہ طاقتور اور امانت دار تھے۔ اس لئے ان کو گلہ بانی کے لئے مقرر فرمایا اور وہ بھی یہی چاہتے تھے۔

(حضرت شعیب علیہ السلام نے ان سے کہا کہ کوئی عصا لے لو) خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اسی لاٹھی کے اٹھانے کی ہدایت فرمائی جس کے انبیاء علیہم السلام ایک دوسرے کے بعد وارث ہوتے آتے تھے اور اس میں برکت تھی۔

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر کی طرف نکلے اور یہ سفر بظاہر تو اپنی قوم کی محبت کی وجہ سے تھا لیکن فی الحقیقت اس سے اللہ، امر رسالت کو پورا کرنا چاہتا تھا اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام وادی طویٰ کو پہنچے (اور یہ برکت والی وادی تھی جہاں ملائکہ کی روحیں جمع ہو گئی تھیں) تو خدا نے ایک تقریب فرمائی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آگ اور راستہ معلوم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور ان کی بی بی کو درد زہ شروع ہوئی (اس وقت) سردی ہو گئی اور راستہ (بھی) بھول گئے۔ پھر جب اس وادی میں ایک بیری کے درخت کے پاس پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ایک ایسی عجیب تجلی فرمائی کہ اس جیسی تجلی اس سے قبل دوسرے کے لئے نہ ہوئی تھی اور وہ یہ ہے کہ ملاء اعلیٰ (مقدس ملائکہ کی جماعت) میں موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بالمشافہ خطاب کرنے کی خواہش پیدا ہوئی کیونکہ حضرت موسیٰ طبیعت کے سخت، بہادر اور غیور تھے تو آپؑ کی طبیعت نے اس جگہ پے در پے آگ کا تصور کیا اور اس پر اللہ تعالیٰ نے آگ کی صورت کا اضافہ کیا اور یہ آگ عناصر کی قسم سے نہ تھی لیکن خالص عالمِ مثال کی چیز تھی۔ اسی طرح خدا نے ملاء اعلیٰ کی زبان پر آگ کے اندر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے روبرو کلام کیا۔ (اس کو دیکھ کر) حضرت موسیٰ علیہ السلام ڈر گئے۔ اللہ نے اس کو مانوس کیا اور ان سے فرعون کی طرف جانے اور اس کو ایمان کی طرف بلانے کا حکم فرمایا اور ان کو عصا اور روشن ہاتھ کا معجزہ دکھایا۔

اب ان دونوں کی حقیقت یہ ہے کہ جس طرح عالم مثال کا ظہور کبھی ایسے موجود کی صورت میں ہوتا ہے جس کا کسی بھی موجودِ طبیعی مانند آگ کے کوئی ربط نہیں ہوتا۔ اسی طرح عالمِ مثال کبھی جسم طبیعی میں ظاہر ہوتا ہے اور اس کو مثال کا حکم دیا جاتا ہے اور اس پر مثالی ہستی غالب آتی ہے تب وہ ناسوتی مثالی عصا بن جاتا ہے[26] اور اس کی دو شاخیں اژدھے کے دونوں جبڑوں کی طرح ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہاتھ میں چمک تھی وہ بعینہ نور ہو گیا اور اس دور میں جادو انسانی حواس میں تصرف کرنے کا نام تھا۔ یہاں تک کہ لوگ اجسام طبیعی میں وہ اوصاف اور عوارض خیال کرتے تھے جو در حقیقت ان میں نہیں پائے جاتے تھے۔ پھر ظاہر ہوا حق اس جیسی صورت میں اور جادو باطل تھا کیونکہ وہ ایسا تخیل ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں اور یہ (عالم مثال سے آنا) حق ہے کیونکہ اس کی اصل ہے۔

حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہ تمام عنایات جو ان پر ہوتی تھیں، کھول کر بتائیں مثلاً جس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کی ماں کو وحی فرمائی اور جس وقت ان پر اپنی محبت ڈالی اسی طرح اس وقت سے لے کر اس حالت تک[27] اور اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو علم عبادت کے اصول سکھائے اور فرعون پر دلائل سے غلبہ پانے کا علم۔ موسیٰ علیہ السلام نے بہت چیزوں کے متعلق اللہ تعالیٰ سے سوال کیے جیسے اس کی زبان سے لکنت کی گرہ کا نکلنا اور ان کے بھائی (ہارون) کو ان کے لئے وزیر مقرر کرنا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ سوال کیے تھے، اللہ تعالیٰ نے وہ سب ان کو عطا کیا۔

پھر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے مقابلہ شروع کیا تو اللہ تعالیٰ کی ان کے حق میں (بے انداز) عنایتیں تھیں۔ اس لئے کہ وہ اللہ کے پیارے اور پسندیدہ تھے اور اس کی کچھ نشانیاں بھی تھیں جیسے فرعون اور اس کی قوم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنت کا ہونا۔

ان عنایات اور آیات میں سے ایک یہ تھی کہ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ان کے پروردگار کے متعلق

پوچھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کا واضح آیات ہی سے جواب دیا کیونکہ ذات باری کی پہچان تھوڑے لوگوں کے سوائے دوسروں کو نہیں ہوتی اور احکام الٰہی اور سب لوگوں کو شامل ہیں۔ فرعون نے معجزہ طلب کیا تو (آپؑ کی) عصا اژدھا بن گئی اور آپؑ نے جب ہاتھ نکالا تو کسی عیب کے سوا چمکتا نظر آیا اور انہوں نے جادوگروں کو عاجز کر دیا اور حق واضح ہو گیا۔

دوسری عنایت یہ تھی کہ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آلِ فرعون میں سے ایک ایماندار شخص کو ان کے پاس بھیجا۔ اس نے فرعونیوں کو وعظ و نصیحت کرتے ہوئے ان کو ان کے ارادے سے روک دیا اور ان کو شک میں ڈال دیا۔ پھر ان کے دل میں یہ خیال ڈالا کہ چند روز کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ڈھیل دی جائے اور جادوگروں کو ان کے مقابلے کے لئے طلب کیا جائے اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس طرح وہ جیت جائیں گے۔ حق یہ ہے کہ یہ ایک تقریب تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حق پر ہونا اور ان کے معجزے کا ظہور (لوگوں پر منکشف) ہو۔

تیسری عنایت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے جادوگروں کو حق بات کی ہدایت دی تا کہ آپؑ کی حجت (مخالفوں پر) صریح تر ہو کہ جو شخص آپؑ کے مقابلے کے درپے تھا وہی آپ کا فرمانبردار ہو گیا۔

چوتھی عنایت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے نو (9) واضح آیات کے ساتھ فرعونیوں کی آزمائش[28] کی۔ جب (ان پر کوئی مصیبت آتی تھی اور) حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے ہٹانے کی اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے تھے تو اللہ اس کو ہٹا دیتا تھا اور جب اس کے نازل کرنے کے لئے دعا کرتے تھے تو اس کو نازل کرتا تھا۔

پانچویں عنایت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دریا کی طرف جانے کا حکم فرمایا۔ جب آپؑ اپنی قوم کو لے کر نکلے تو فرعون نے اپنے لشکر کو لے کر ان کا تعاقب کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب دریا پر پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے ایک تیز ہوا کو دریا پر مسلط کیا جس نے دریا کے بعض حصے کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور بعض کو خشک کر دیا اور اس نے اس کے بعض حصے میں ایسا تصرف کیا جس طرح وہ زمین کے اجزاء میں تصرف کرتی ہے جس وقت گرداب بن جاتی ہے۔ (اسی طرح) اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو نجات دی اور فرعون اور اس کے لشکر کو ہلاک کیا۔

اس کے بعد جب بنی اسرائیل بیت المقدس کو چلے تو ایک ایسی قوم پر گزرے جو بت پرستی کرتی تھی۔ (اس کو دیکھ کر) بنی اسرائیل کے جاہل لوگوں نے جن کے دل میں ایمان کی تازگی داخل نہ ہوئی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ جیسے اس قوم کے لئے کئی خدا ہیں، ہمارے لئے بھی ایک خدا بنا دے اور یہ بات ان سے اس لئے صادر ہوئی کہ ان کی جبلت کو جبروت کی طرف التفات نہ تھا۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے ان کو مواعظ (اور نصیحتوں) کے کوڑوں سے تادیب کی تو انہوں نے جبروت (ذات باری) کے مشابہ صورت کی طلب کی جس کو دیکھ کر جبروت کی طرف التفات کریں۔ (اس کے جواب میں) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو حق سمجھایا اور ان کی گفتار کو رسوا کیا تو وہ زبردستی (اپنے خیال سے) رک گئے اور بحالت شک خاموش ہو گئے۔ سامری ان کی شکی حالت کو تاڑ گیا۔ پھر اس نے ان کے ساتھ وہ کیا جو کیا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ وعدہ کیا کہ وہ اس سے برکت والی جگہ میں مناجات کرے تو اللہ تعالیٰ ان کو توریت کی تختیاں اور احکام عنایت کرے۔ اس مبارک جگہ کی خصوصیت اس لئے ہوئی کہ وہاں

ملائکہ کی روحانیات کا اجتماع ہوا تھا اور اس اجتماع کی وجہ سے ظاہری خبریں ناپید ہوگئیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں اعتکاف میں بیٹھ گئے اور تنہا ہو کر اللہ کا ذکر کیا اور ملکوت سے مشابہت پیدا کی اور جب اس جگہ کو دیکھا جس میں اللہ تعالیٰ نے تجلی فرمائی تھی تو اس حالت کے فرمانبردار ہو گئے اور اس سے ان کو سرور حاصل ہوا۔ تب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو توریت کی تختیاں عنایت کیں جن میں ہدایت اور رحمت تھی یعنی نصیحتیں اور خدا کی طرف سے (انبیاء علیہم السلام کی نصرت کے) گذشتہ واقعات اور اللہ کے صفات اور اس کے غالب افعال کا بیان تھا۔ تختیوں کا جوہر جنت کے زمرد سے تھا یعنی ایسے جوہر سے بنا ہوا تھا جو زمرد سے مشابہت رکھتا تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے کسی عنصری سبب کے سوا اپنے حکم "کُنْ" سے پیدا کیا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے (کوہ طور پر) جانے کے بعد یہاں سامری نے لوگوں کو اس طرح گمراہ کیا کہ روح (جبرئیل) کے قدم سے مٹھی بھر مٹی لے کر بچھڑے کے قالب میں ڈال دی، اس یہ خاصیت تھی کہ جس شے پر گزرتی تھی تو اس کی طرف اس کی مناسب زندگی لوٹ آتی تھی۔ یہ واقعہ فی الحقیقت بنی اسرائیل کے اچھے لوگوں کے لئے باعثِ رحمت اور جہلاء پر ان کی عزت کا باعث تھا۔ جب تک وہ اس کے لئے تیار رہے۔

یہ اس طرح ہوا کہ بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ طبعی طور پر دجال تھے۔ وہ غیر اللہ کی عبادت کے مطیع ہو گئے اور وقت بوقت ان پر کفر کے اوہام گزرتے تھے تو اللہ نے چاہا کہ بنی اسرائیل کو ایسے لوگوں سے صاف رکھے۔ بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ ایسے (بھی) تھے کہ اگر وہ اس دنیا میں باقی رہتے تو ایمان کی حقیقت کو کبھی نہ پہنچتے۔ اس لئے کہ ان کی ارضی (اور گھٹیا درجے کی) طبیعتیں ان کو اس سے روک رہی تھیں۔ ان کی بھلائی اس میں تھی کہ ان کو فرمانبرداری کی حالت میں قتل کیا جائے تا کہ عالمِ برزخ میں جا کر ان کی روحیں ترقی کریں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کو بلایا اور اس کے اشکال کو زائل کیا اور اس پر بددعا کی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اللہ کی یہ عنایت ہوئی کہ جب ایک جماعت نے آپؑ پر ادرۃ (فوطوں کے بڑھ جانے) کے عیب کا طعنہ دیا جس کا یہ سبب بنا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام غسل کے وقت حیا کی وجہ سے ستر کرتے تھے تو ان لوگوں نے اس کو عیب چھپانا خیال کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے بری کیا اور وہ اللہ کے ہاں بڑے عزت والے تھے۔ اللہ تعالیٰ کو ان کے حق میں کسی کا بھی طعنہ دینا پسند نہ تھا۔ اس کی یہ صورت ہوئی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پانی سے گزرے تو وہاں غسل کرنے کا ارادہ فرمایا اور اپنے کپڑے اتار کر ایک پتھر پر رکھے۔ پتھر کپڑے لے کر زمین پر لڑھکا اور قوم نے ان کو برہنہ دیکھ لیا اور موسیٰ علیہ السلام کے حق میں ادرۃ کے عیب سے پاک ہونے کی گواہی دی۔

جب موسیٰ علیہ السلام نے یہ دیکھا کہ اللہ کی کمال عنایت اس کی طرف متوجہ ہوئی ہے اور ان کو ملاء اعلیٰ سے قومی مشابہت حاصل ہوئی ہے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کیا کہ خدا ان کو ظاہر دکھائی دے یعنی نفس کلیہ پانچویں عنصر (مثال) کے ایک حصے کو احاطہ کرے اور وہ اس کے اندر ایسے جسم نورانی کو تصور کرے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اپنے رب کے ساتھ معرفت کے لئے ناقل ہو۔ موسیٰ علیہ السلام کو حق کی طرف سے اپنی پہچان کا علم عطا کرنا اس نورانی جسم کے لئے روح کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کا جسم ملاء اعلیٰ کی طرف سے تھا اور روح و جسم کا باہمی اختلاط اس طرح ہو جائے کہ

ان میں سے ہر ایک کی حالت کی نسبت دوسرے کی طرف جسم اخروی کی طرح صادق ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس قول ارنی انظر الیك (29) (مجھے دکھائیے کہ میں تیری طرف دیکھ لوں) کا مطلب یہی ہے۔

یہ بات حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تب صادر ہوئی۔ جب وہ نفس اولیٰ کے تصرفات سے واقف ہوئے اور یہ تب ہوتا ہے جب اللہ کے پیاروں میں سے کسی ایک کی ہدایت کے لئے نفس کی طرف سے ارادہ اور اہتمام ہوتا ہے۔ جیسا کہ ان کو آگ کی طرف شوق کے وقت تھا لیکن شروع سے ہی موسیٰ علیہ السلام کو حق کی طرف توجہ عطا کی گئی تھی اور خلق میں حق کے ساتھ تصرف کرنا آپؑ کو نہ ملا تھا۔ اس لئے اس روز کی حدت مزاج کا خیال رکھتے ہوئے حق تعالیٰ نے آگ کی صورت میں تجلی فرمائی اور اس آگ نے ان کو نہیں جلایا اور اگر حق تعالیٰ آج تجلی فرمائے تو وہ ایسی جلانے والی آگ سے تجلی ہوگی جو جس چیز کا بھی اس سے چھونا ہوگا تو وہ شے جل جائے گی کیونکہ وہ آگ تو حق کے آئینے میں موسیٰ علیہ السلام کی اپنی صورت تھی۔ (اس سے) حضرت موسیٰ علیہ السلام سمجھ گئے کہ اللہ جب حق کے آئینے میں کسی چیز کے لئے تجلی کرتا ہے تو اس شے کی صورت کے سوا نہیں کرتا۔ پھر وہ چیز حسب استعداد حق کی صورت کو لے آتی ہے۔ ایک پیغمبر اس علم سے جاہل نہیں رہ سکتے۔ آپ کو یہ معلوم نہ تھا کہ آج وہ ایسی حالت میں ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ اس کی صورت میں تجلی فرمائے گا تو ان کا جسم تباہ ہو جائے گا۔ دوسری طرف لوگوں پر اللہ کی رحمت چاہتی تھی کہ موسیٰ علیہ السلام باقی رہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم کیا اور پہاڑ پر اپنی تجلی فرمائی تو پہاڑ پھٹ گیا اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش کر گر پڑے۔ جب ہوش میں آئے تو آپ پر سارا راز کھل گیا اور آئندہ کے لئے اپنی استعداد کے مناسب سوال سے توبہ فرمائی۔

موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے ان سے وہی سوال کیا جو موسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا کیونکہ نفس کلیہ کے مظاہر کی طرف جو آپؑ کو اشتیاق تھا، وہ شوقیہ حالت ان کی قوم کے دلوں میں منعکس ہوئی تھی۔ آخر حق تعالیٰ نے برق کی صورت میں تجلی فرمائی اور ان سب کو تلف کر دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرما کر ان کو زندہ کر دیا اور انہیں حکم دیا کہ ارض مقدس میں سکونت اختیار کریں اور یہ زمین ان کو بطور جاگیر عنایت فرمائی جبکہ اس زمین پر جابر لوگوں کا قبضہ تھا۔ اس لئے بنی اسرائیل کو ان سے جہاد کرنے کا حکم ملا اور ان کو مدد اور نصرت کا وعدہ کیا گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے ہر قبیلے پر ایک سردار مقرر کیا تا کہ وہ ان کے حالات سے باخبر ہو اور انہیں نیکی کا حکم کرے اور برائی سے روکے تا کہ قوم کے اخلاقی اقدار ان کے سامنے واضح ہو جائیں۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے ان کو سرکشوں کی طرف جاسوس بنا کر بھیجا۔ (وہاں کے حالات معلوم کرنے کے بعد) صرف دو شخصوں نے تو ایسی خبر دی جس سے بنی اسرائیل کی شجاعت بڑھی اور باقی لوگوں نے تو ایسی خبر سنائی جس سے وہ سست (اور بزدل) بن گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دو پر تو رحم کیا اور ان دو کو صدیق اور نائب بنایا اور باقی لوگوں سے سخت ناراض ہوا اور ان کو تباہ کر دیا۔

اب جب جاسوسوں کی مخبری میں اختلاف ہو گیا تو بنی اسرائیل جابر لوگوں کے مقابلے سے بزدل ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر اس طرح عتاب کیا کہ ایک مدت تک انہیں تیہہ (بڑے صحرا) میں حیران و پریشان رکھا کہ راستہ نہ پا سکے اور ان کا زادِ راہ ختم ہو گیا۔ تب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی پوری ہمت سے دعا کی (یہ دعا مستجاب ہوئی) اللہ تعالیٰ نے ان کو من اور سلویٰ جیسا رزق عطا کیا جس کی تدبیر اسباب کے قبض اور بسط سے فرمائی اور ان کے لئے سائے کے مشابہ ایک

گاڑھا بادل مقرر کیا۔ یہ بادل ان کو دھوپ سے بچاتا تھا اور ستون کی طرح ان کے لئے آگ کو بھی بنایا۔ یہ آگ ان کو مشعلوں اور چراغوں کا کام دیتی تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کے کپڑوں میں برکت رکھی کہ وہ نہ تو میلے ہوتے تھے اور نہ پُھٹے ہوتے تھے۔ یہ سب بادل اور برق کے مادے میں تصرف کرنے سے ہوا تھا، اس کے لئے علم طبیعی میں کئی نظائر موجود ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو الہام ہوتا تھا۔ پھر وہ ایسے پتھر کو مارتے جس میں پانی کے بہانے کی قریبی استعداد ہوتی، تو وہ پھٹ جاتا اور اس سے پانی جاری ہوتا اور اس کو قبائل کی تعداد کے مطابق بارہ چشمے بنا دیتے تھے۔

جابر لوگوں میں ایک شخص انبیاء کے علوم کو جانتا تھا اور ان کی کتابیں یاد رکھی تھیں۔ پھر وہ شیطان کا مطیع بن گیا اور دنیا کی طرف جھک پڑا۔ اس نے اپنے لوگوں سے کہا کہ بدکار عورتوں کو بنی اسرائیل کی طرف بھیج دو تاکہ ان میں فسق و فجور بڑھ جائے اور اس طرح ان سے برکت نکل جائے اور عنایت (الٰہی) میں پراگندگی ہو کیونکہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام کی محبوبیت کی وجہ سے اگرچہ ان میں برکت تھی جو نصرت کی طالب تھی لیکن بنی اسرائیل میں فسق و فجور کا غلبہ ہو گیا تھا اور وہ ان کی رسوائی کا مقتضی ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بدکار عورتوں کے نکالنے کی توفیق عطا ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے جابر قوم سے قتال کیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس ملک پر غلبہ دیا اور ان کو وہاں بسایا جہاں سے کوئی ان کو ان کے اعمال کی جزا کے سوا نکالنے والا نہ تھا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سرزمین کا بادشاہ بنا دیا۔ وہ بڑے آرام اور عیش میں تھے اور موسیٰ علیہ السلام کی وجہ سے ان میں جمعیت پیدا کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو توریت کی تعلیم دیتے تھے اور وعظ کرتے تھے اور ان کو پاک کرتے تھے۔ ان کے اندر شرعی حدود کو قائم کرتے تھے اور ظالم سے مظلوم کی دادرسی کرتے تھے۔ اپنے محبوب بندوں سے اللہ کا یہی دستور رہا ہے۔ ان کے لئے دنیا کو آسان کرتا ہے، ان کو گفتار کے سچے اور لوگوں میں مقبول بناتا ہے، پھر اگر کسی قوم نے اللہ پر توکل کیا اور بلا کسی تردد اور پریشانی کے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی تو اللہ ان کو اپنی طرف سے رزق عطا کرتا ہے اور ان کی کھیتی، جانوروں اور کمائی میں برکت کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو جن علوم کی تعلیم دی تھی، ان میں سے ایک علم کیمیا بھی تھا۔ قارون کو یہ خبر پہنچ گئی اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچازاد بھائی تھا۔ کیمیا کی وجہ سے وہ بڑا مالدار بن گیا اور اس نے (دنیا کے غرور میں) سرکشی کی اور باغی بن گیا اور اول آخر کو بالکل بھول گیا اور وہ بھی فرعونیوں میں ایک فرعون تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس کو روکا لیکن وہ نہ رکا۔ الٹا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بغض رکھنے لگا اور ان کو زنا سے متہم کیا تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی پوری ہمت سے اس کے حق میں بددعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا۔

اللہ کی نشانیوں میں سے یہ ایک بڑی نشانی تھی تاکہ لوگ جان لیں کہ جو شخص اللہ کے نبیوں سے تکبیر کرتا ہے اور ان سے بغض رکھتا ہے۔ دنیا کی زندگی سے مطمئن ہے اور اللہ کے حق کو بھلا دیتا ہے تو اس کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ عذاب کے اقسام میں سے اس قسم کو اختیار کرتا ہے جو اس دن اسباب طبیعیہ کے زیادہ قریب ہو۔ قارون کے گھر کا دھنسانا اس روز دوسرے عذابوں سے اسباب طبیعیہ کے بہت قریب تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں یہ تھا کہ میں سب لوگوں سے زیادہ علم رکھتا ہوں اس لئے مزید علم کی طلب میں توقف کیا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے واقعے کے ظاہر کرنے کا ارادہ فرمایا جو ان کو مزید علم کی طلب کے

لئے رغبت دلائے جیسا کہ ہمارے نبی ﷺ کے حق میں امر کے ساتھ کفایت کیا اور فرمایا: وقل رب زدنی[30] علماء.
اے میرے پروردگار! میرے علم کو بڑھا۔

یہ اس لئے ہوا کہ جب حق تعالیٰ کسی بندے کے لئے وقت کی صورت میں تجلی کرتا ہے اور جن علوم کی تجلی تقاضا کرتی ہے وہ علوم اس شخص کے پاس متمثل ہوتے ہیں تو وہ ان علوم کے سوا دوسرے علوم سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ ان دوسرے علوم کے اثبات یا انکار سے اس کا سروکار نہیں ہوتا بلکہ مطلقاً ان کو بھول جاتا ہے۔ اسی طرح اس کی آہستہ آہستہ ترقی ہوتی رہتی ہے جہاں تک اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اور محبوب کو اکثر پریشانی نہیں ہوتی اور نہ حد سے زیادہ شوق ہوتا ہے۔

الغرض ایک دن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا جس میں لوگوں کو وہ تعلیم دینے لگے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو سکھایا تھا۔ آپؑ کی تقریر اتنی مؤثر تھی کہ لوگوں کے دلوں پر چھا گئی۔ تب ایک شخص نے ان سے یہ سوال کیا کہ اے موسیٰ علیہ السلام! آپ سے علم میں کوئی شخص زیادہ بھی ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اپنے سے زیادہ کوئی عالم نہیں دیکھتا۔[30a] اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ ہمارا ایک بندہ خضر علیہ السلام تجھ سے علم میں زیادہ ہے۔ یعنی خاص اوقات میں جو الٰہی تدبیر ہوتی ہے، اس کے جاننے میں اور جب اللہ کسی شے کی تدبیر کی تکمیل کا ارادہ کرتا ہے تو خدا کا جارحہ بن کر اس تدبیر کو بروئے کار لانے میں وہ تجھ سے زیادہ معلومات رکھتا ہے۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام احکامِ کلیہ اور عام لوگوں کے لئے جو شرائع مقرر ہیں، ان میں اس سے زیادہ علم رکھتے تھے۔ اسی طرح دین کی اقامت میں اللہ کا جارحہ بننے میں بھی اس پر فوقیت رکھتے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ سوال کیا کہ اس سے کیوں کر ملاقات ہوگی؟ آپؑ کے دل میں یہ ڈال دیا گیا کہ اس کی طرف راستہ بتانے والی نمک لگی ہوئی مچھلی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ یہ مچھلی خضر کا پتہ کیسے بتائے گی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ایک جوان یوشع علیہ السلام دونوں خضر کی تلاش میں نکلے اور اپنے ساتھ زنبیل میں جَو کی روٹیاں اور نمکین مچھلی کو لیا اور چل پڑے۔ چلتے چلتے جب ایک بڑے پتھر کے پاس پہنچے تو موسیٰ علیہ السلام سفر کی تھکان کی وجہ سے وہاں سو گئے اور یوشع علیہ السلام وضو کرنے بیٹھ گئے (وضو کے) پانی کی بوند جو اس مچھلی پر پڑی تو وہ زندہ ہو گئی اور دریا میں گر پڑی اور جہاں سے وہ مچھلی دریا میں گئی وہاں ایک خشک راستہ ظاہر ہو گیا۔ یہ واقعہ اس لئے ظاہر ہوا کہ پانی میں جانوروں کے زندہ کرنے کی خاصیت موجود ہے۔ پانی کی اس خاصیت میں برکت پیدا کی گئی اور اس طرح ان دونوں نے اس علامت سے خضر کو پایا۔

ان دونوں کا حال یہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ان کو ان واقعات میں سے ایسے تین واقعے دکھائے جن کی تقریب کی تدبیر اللہ تعالیٰ سے ہوتی ہے یا مخلوق کی اس میں اصلاح ہوتی ہے پھر اللہ اپنے بندوں میں سے کسی بندے کو فعل مراد کو پورا کرنے میں اپنا جارحہ بناتا ہے۔ (حق بات یہ ہے کہ) شرائع کا مدار احکام کلیہ اور حکم کے موقع پر ہوتا ہے اور تقریبات کا مدار جزئی مصلحتوں پر ہے اور ہر فیصلہ وقت (اور حالات) کے موافق ہوتا ہے۔ یہ باتیں سب علموں سے باریک تر ہیں، ان کو صرف وہی شخص جانتا ہے جو حق کا جارحہ بنتا ہے، پھر واقعے کے بعینہٖ راز کو معلوم کر لیتا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کو کئی بار اس علم سے ذہول ہوا۔ مثلاً اس وقت جب انہوں نے رویت باری کی طلب کی اور اس

وقت بھی جب قبطی کے قتل سے توبہ کی اور اس وقت جب حضرت آدم علیہ السلام سے حجت کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اگرچہ احکام شرعیہ میں دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ علم رکھتے تھے لیکن یہ اللہ کی حکمت تھی کہ انہیں اس جیسی بات دکھائے جو ان کے لئے واقع ہوئی تھی۔

پھر حضرت خضر علیہ السلام نے اس خوف سے کہ ظالم بادشاہ کشتی کو غصب نہ کر لے کشتی کا تختہ نکال لیا اور اللہ تعالیٰ نے کشتی کو اس طرح ڈوبنے سے بچالیا کہ جب موج کشتی پر آتی تھی تو اس کی رفتار سخت تیز ہو جاتی تھی۔ اس طرح پانی کی سطح نہ پھٹی۔

اسی طرح حضرت خضر علیہ السلام نے ایک لڑکے کو قصاص کے بغیر اس لئے قتل کیا کہ وہ طبعاً کافر تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو اس سے جبلت کے احکام (کفر وغیرہ) صادر ہوتے اور اپنے کفر اور سرکشی کی وجہ سے اپنے ماں باپ کو قتل کرتا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو اس کا اچھا بدلہ دیا۔

(تیسرا واقعہ یہ ہوا کہ) حضرت خضر علیہ السلام نے ایک دیوار کی اصلاح کر کے اس کو گرنے سے بچالیا اور یہ اس لئے کیا کہ اس کے نیچے اللہ کے ایک صالح اور پیارے بندے نے مال چھپا رکھا تھا۔ اس کی حفاظت ہو جائے[31] (کیونکہ اس کا وارث ایک یتیم بچہ تھا)۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور کا ایک بڑا واقعہ یہ (بھی) ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے لڑکے پر جو اپنی ماں کا فرمانبردار تھا، رحمت کرنی چاہی کیونکہ اس کے باپ نے اس کو اللہ کے حوالے کر دیا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی اس کے لڑکپن سے کفالت کی یہاں تک کہ وہ جوان ہوا تو اللہ نے ارادہ کیا کہ اس پر اپنی نعمت کرے اور یہ بھی ارادہ کیا کہ جس نے اس کے قریبوں میں سے کسی کو مار ڈالا تھا۔ اس کو یہ جزا دے کہ اس کو ورثہ نہ ملے اور اس کی رسوائی ہو اور اس کا قصاص سے قتل ہو جائے اور بنی اسرائیل پر رحمت کرنی چاہیے تا کہ وہ یہ جان لیں کہ آخرت میں لوگوں کو زندہ کرنے کا جو وعدہ اللہ نے فرمایا ہے، وہ حق ہے اور یہ بھی جان لیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے جس چیز کا حکم دیا تھا وہ بظاہر اگرچہ بعید ہے لیکن اس کی اطاعت ضروری ہے کیونکہ اس میں ایک ایسا راز ہے جو ابھی منکشف نہیں اور یہ بھی جان لیں کہ اللہ کے حکم میں تشدد اور گہرائی میں جانا بے ادبی ہے، ان عنایتوں سے اللہ تعالیٰ نے واقعہ معلومہ کو پورا کیا۔[32]

جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی رحمت کی طرف اٹھایا تو بنی اسرائیل کی خوب حفاظت فرمائی۔ ان میں انبیاء کو بھیجا تا کہ وہ ان کو ڈرائیں، خوش خبری سنائیں، وعظ و نصیحت کریں اور انہیں نیکی کا حکم کریں اور برائی سے روکیں۔ اس کا نام ''استطاعت میسرہ'' آسان بنانے والی قدرت ہے۔

ان میں سے کوئی بادشاہ ہوا جیسے یوشع علیہ السلام اور کوئی عالم جیسے شعیا، یسع اور شمویل علیہم السلام اور کوئی قوی ریاضت والا زاہد جیسے الیاس علیہ السلام، یہ سب مصلحت کی اقتضا تھی اور ہر وقت اقرب اور اسہل کے انتخاب کا خیال رکھا جاتا تھا۔

جملہ انبیاء علیہم السلام باہم بنو علات ہیں یعنی ان سب کا باپ ایک ہے جو کہ نبوت کے مناسب تربیتِ الٰہی سے عبارت ہے اور ان کی مائیں الگ الگ ہیں اور یہ وہبی اور کسبی استعدادات کا نام ہے اور بنی اسرائیل جب تک توریت کی

اطاعت کرتے رہے اور اس کے احکام بجالاتے رہے۔ اللہ ان کو برکت عطا کرتا رہا اور جب بھی انہوں نے احکام کی نافرمانی کی تو خدا نے ان سے انتقام لیا اور جب ان پر کوئی آفت آتی تھی تو اس سے نکلنے کی تدبیر (بھی) ان کے دلوں میں ڈال دی جاتی تھی، اگر اس سے کوئی چیز مانع نہ ہو۔ اس کا نام الٰہی سیاست ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تاویل الاحادیث: شمویل وداؤد وسلیمان و یونس علیہم السلام

اللہ تعالیٰ نے توریت میں یہ خبر دی تھی کہ بنی اسرائیل دو مرتبہ غلبہ حاصل کریں گے اور فساد و کفر برپا کریں گے اور ہر مرتبہ ان پر بڑی قوت والے اور طاقتور لوگوں کو بھیجا جائے گا۔ وہ ان کے گھروں میں گھس جائیں گے۔ جب پہلا وعدہ آ پہنچا تو انہوں نے توریت کے احکام کی نافرمانی کی اور (ان کو سزا دینے کے لیے) اللہ نے ان پر جالوت کو مسلط کیا جس نے کچھ کو قتل اور قید کیا اور وہ صندوق جس میں آل موسیٰ و ہارون علیہ السلام کی تبرکات تھیں، چھین کر لے گئے۔ اس پر بنی اسرائیل غمگین ہوئے اور توبہ کی۔ اپنے نبی شمویل علیہ السلام کی طرف رجوع ہوئے اور ان سے یہودیوں کے لئے بادشاہ کی طلب کی کیونکہ ان کو علم تھا کہ دشمن کی بڑی جمعیت کا مقابلہ تب ہی ممکن ہوسکتا ہے جب سب کی رائے مجتمع ہو اور ملکی انتظام کے لئے ایک شخص کی قیادت ہو۔ اللہ کی حکمت میں یہ ضروری تھا کہ جس سے چاہے کافروں کو دفع کرے لیکن یہاں اس طور دفع کیا کہ مومنوں کے دل میں یہ خیال ڈالتے رہے کہ وہ جہاد کریں اور انہیں ثابت قدم رکھے اور بہادری دلاتے رہے۔ اور ان کے دشمنوں پر ان کو غالب رکھے اور یہ نہایت قریبی تقریب اور تدبیر تھی اور یہ طبعی مصلحتوں کے بھی زیادہ قریب تھی۔ اس واقعے میں اللہ تعالیٰ کی متعدد عنایتیں تھیں۔

اول عنایت یہ تھی کہ جب طالوت بادشاہ ہوئے تو بنی اسرائیل نے اس میں یہ عیب نکالا کہ پہلے ملکی انتظام سے اس کو کوئی واسطہ نہ پڑا ہے اور نہ یہ مالدار ہے تو شمویل علیہ السلام پیغمبر نے ان کے اس اعتراض کو اس طرح دفع کیا کہ اللہ اپنی خلق میں تدبیر کے لئے جو الہام فرماتا ہے اس کا اتباع ضروری ہے۔ یہ سمجھانا بھی ان کے لئے مفید نہ ہوا تب اللہ تعالیٰ نے ایک نشانی ظاہر فرمائی جس سے وہ مطمئن ہوگئے اور وہ علامت یہ تھی کہ ان کے پاس وہ صندوق واپس آئے گا جس میں آل موسیٰ وہارون کی تبرکات تھیں جس کو ملائکہ اٹھاتے تھے۔[33]

اور یہ اس طرح ہوا کہ وہ لوگ باہمی اختلاف اور قحط جیسے مصائب میں مبتلا ہوگئے۔ تب ملائکہ نے ان کے دلوں میں یہ خیال ڈال دیا کہ وہ صندوق کی وجہ سے ان مصائب میں مبتلا ہوئے ہیں۔ تب وہ اس صندوق کو ایک شہر سے دوسرے شہر تک ہٹاتے رہے یہاں تک کہ اس کو بنی اسرائیل کے ملک کے متصل پہنچا دیا اور اس کو ایک گاڑی میں رکھ کر اس خیال سے بنی اسرائیل کی طرف بھیج دیا کہ وہ ان مصائب میں مبتلا ہو جائیں۔ فی الحقیقت ان کے لئے یہ ایک تقریب اور تدبیر تھی۔ جب ان کی کوشش کے سوا ان کے پاس صندوق آ گیا تو یہ ان کے لئے (فتح کی) ایک علامت تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے تبرکات کو دیکھ کر وہ مانوس ہوگئے (اور ان کا خوف کافور ہوگیا) اور ان کو اطمینان و آرام حاصل ہوا اور یہ تصدیق ہوئی کہ بادشاہ غیب سے مؤید اور مبارک ہے۔

دوسری عنایت یہ تھی کہ طالوت کو اپنے لشکر کی حالت اور ان کی بہادری اور قوتِ قلبی کے معلوم کرنے کی ضرورت

محسوس ہوئی تاکہ ہر ایک پر اس کی قوت کے موافق اعتماد کرے۔ اس کے لئے کافی تجربہ اور وسیع وقت کی ضرورت تھی۔ طالوت کو جلدی تھی، اللہ تعالیٰ نے ایک نہر ظاہر کی۔ وہاں ان کی آزمائش ہوئی اور طالوت نے ان کو ایک لپ (چلو) کے سوا پانی پینے سے منع کیا اور یہ ظاہر میں وثوق قلبی قوت اور طبیعت کے انقیاد کی علامت تھی اور اس کی بھی کہ وہ حکمت کے موافق خوفناک جگہوں میں گھسنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

خوفناک موقعوں میں گھسنے سے عقلی طور پر بہادری اور بادشاہ کی اطاعت کا پایا جانا ضروری نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس حادثے میں برکت کی۔ اس لئے طالوت کے اس پانی نہ پینے والے حکم کی اطاعت صرف ان لوگوں کو حاصل ہوئی جو کامل طور پر بہادر اور فرمانبردار تھے۔ اس طرح طالوت بہادروں اور فرمانبرداروں کو پہچان گئے۔ اب جب وہ جالوت کے مقابلے کے لئے نکلے اور اس کے پاس ایک بڑا اور شان وشوکت والا لشکر تھا تو صرف وہی اس کے مقابلے کے لئے ٹھہر سکے جن میں طالوت نے بہادری کو معلوم کیا تھا۔

تیسری عنایت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو بنی اسرائیل میں صادق سمجھا جائے اور ملک کے والی بنیں تو اللہ نے ایک پتھر کو اس طرح گویا کر دیا کہ جب حضرت داؤد اس کے پاس سے گزرے تو پتھر کی حقیقت ان پر کھل گئی۔ گویا کہ حضرت داؤد پتھر کی زبانی سن رہے ہیں کہ جالوت اس پتھر سے قتل ہوگا اور دوسری طرف طالوت کے قلب کو مضطر کیا کہ اس نے جالوت کے قاتل کے لئے یہ شرط لگا دی کہ جو اس کو قتل کرے گا اس کو آدھا ملک ملے گا اور طالوت اپنی بیٹی کا نکاح بھی اس سے کرے گا۔ پھر اللہ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو دلیر کیا اور اس کے ہاتھ کو (جس میں پتھر تھا) جالوت کے نتھنوں کے مقابل کیا اور پھر ہوا کو حکم کیا کہ پتھر کو اس کے نتھنوں تک پہنچائے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جالوت کو ہلاک کیا اور اس نے بنی اسرائیل کی مدد، کافروں کو دفع کرنے، داؤد علیہ السلام کی شان کو بلند کرنے اور ان کو بادشاہ بنانے کا جو ارادہ فرمایا، اس کو پورا کر دیا۔

حضرت داؤد علیہ السلام ایک بہادر اور طاقتور انسان تھے اور ملکی سیاست کے ماہر تھے۔ اس لئے خدا نے ان کو ملک کا خلیفہ کیا اور اسے امامت عطا کی اور بنی اسرائیل کی قیادت ان کے ہاتھ میں رکھی اور ان کا بنی اسرائیل پر حق قائم کیا اور ملاء اعلیٰ میں یہ لکھا کہ اگر وہ داؤد علیہ السلام کی بے فرمانی کریں گے تو وہ اللہ کے بے فرمان ہوں گے اور اگر وہ داؤد کی اطاعت کریں گے تو یہ اللہ کی اطاعت ہوگی۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے ان میں اچھی طرح حکومت کی۔ ان کے اندر شرعی حدود جاری کیں اور کافروں سے جہاد کیا۔ مشکل معاملوں کے فیصلے کیے، اللہ کے احکام کو رائج کیا اور بنی اسرائیل کے مختلف قبائل میں باہمی الفت پیدا کی۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو عبادت کرنے اور اللہ کے سامنے عجز ظاہر کرنے کا اچھا طریقہ تھا۔ اللہ نے ان پر زبور نازل کی جس کے ایک سو پچاس حصے تھے اور ہر ایک حصہ دعا، عاجزی اور دنیا و آخرت میں طلب خیر پر مشتمل تھا اور اس میں اللہ سے پناہ مانگنے کی دعائیں تھیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام ہاتھ کے کاریگر تھے (ہنر کی صلاحیت رکھتے تھے) ان کو زرہ بنانے کا الہام ہوا، خدا کی طرف سے اس پر رحمت تھی تاکہ وہ کشادہ رزق والے ہوں اور لوگوں کے لئے بھی اس میں بھلائی تھی کہ ان کو خوف سے

محفوظ رکھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان پر کلام الٰہی پڑھنے کو آسان کر دیا تھا۔ وہ تھوڑی مدت میں اتنا پڑھ جاتے تھے کہ دوسرا اس مدت میں نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان اور قوتِ خیالیہ میں برکت رکھی تھی۔ اس لئے وہ معمولی ساعت میں ہر لفظ کو واضح طور پر خیال میں لاتے تھے اور اس کے موافق تیزی سے تلفظ بھی فرماتے تھے۔ خدا نے ان کو اچھی آواز دی تھی جس سے لوگوں اور چوپایوں پر اس کا اثر ہوتا تھا اور پہاڑوں کو بھی اس کا مطیع کیا تھا کہ جب حضرت داؤد تسبیح پڑھتے تھے تو وہ صبح و شام اس کو جواب دیتے تھے جس کی یہ صورت تھی کہ گنبد میں جب آواز کی جائے تو اس کا جواب مل جاتا ہے۔ اسی طرح پہاڑوں سے بھی آواز ہوتی تھی، پھر اس میں برکت ہوئی اور اس سے لفظ نکلتے تھے۔

اس کی حقیقت یہ ہے کہ قوی ہمت والا نفس کسی کیفیت سے جب پُر ہو جاتا ہے تو اس کے قریبی نفوس اور طبائع میں بھی اس کی کیفیت سرایت کرتی ہے اور جب تجھے کسی پتھر یا درخت سے کوئی معرفت وقت کی مقتضا کے موافق سننے میں آتی ہے تو اس کی قوت دوسرے لوگوں میں بھی سرایت کرتی ہے اور پھر وہ بھی اسی طرح سنتے ہیں جس طرح تم نے سنا تھا۔

داؤد علیہ السلام کی آواز اچھی تھی اور تالیفی طبیعت کے مالک تھے۔ خدا کی طرف سے اس میں برکت ہوتی اور ہر سانس میں تاثیر کی طبیعت رکھتے تھے۔ ان انفاس میں بھی برکت ہوئی تو ایک لذیذ ترجیع وجود میں آ گئی، اسی کا نام مزامیر داؤد علیہ السلام ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے عجیب واقعات تھے۔ ایک یہ کہ جب ان کی ایک خوبصورت عورت پر نگاہ پڑی تو آپؑ نے اسے بے حد پسند کیا اور وہ عظیم قوت باہ والے انسان اور اپنے مزاج کی قوت کی وجہ سے عورتوں کو دوست رکھنے والے تھے۔ انہوں نے اس عورت کے نکاح میں نامناسب رویہ اختیار کیا۔ شریعت نے جو اس کے لئے حد بنائی تھی، اس کی رعایت نہ کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر ان کو اس طرح تنبیہ کی کہ ملائکہ کو مدعی اور مدعی علیہ کی صورت میں خصوم بنا کر بھیجا۔ ایک نے کہا کہ یہ میرا بھائی ہے جس کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں اور میرے پاس صرف ایک بھیڑ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ بھی مجھے دے دو، بات کرنے میں مجھ پر غالب آتا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے جو کام خود کیا تھا، وہ عالم مثال میں متمثل ہو کر ان کے سامنے آ گیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوا۔ داؤد علیہ السلام سمجھ گئے کہ یہ ایک خواب تھا جس کی تعبیر اس پر تنبیہ کرنا ہے جو اس سے نامناسب واقعہ سرزد ہوا۔ پھر اللہ سے مغفرت مانگی اور اس کی طرف رجوع کیا اور کفارے دیئے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کیا۔ (34)

حضرت داؤد علیہ السلام کا دوسرا عجیب واقعہ یہ ہے کہ جب ایک رات وہ اللہ کو یاد کر رہے تھے تو ان پر یہ انکشاف ہوا کہ بیت المقدس پر ملائکہ اتر رہے ہیں۔ حالانکہ وہ جالوت کے دور میں منہدم ہو چکا تھا اور جس کا کوئی نام و نشان بھی باقی نہ تھا اور بیت المقدس میں بھی وہی عظیم راز (تجلی گاہ ہونا) پنہاں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے رہنے کے لئے بیت المقدس کی جگہ کو معین کیا جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے کیا تھا لیکن حضرت داؤد علیہ السلام نے اللہ کی راہ میں بڑا جہاد کیا اور آپ کے صحیفے میں یہ لکھا تھا کہ وہ (جالوت) رب تعالیٰ کی کئی (شعائر اور) بنیادیں گرا چکا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی اس تعمیر میں انتقام اور غضب کی آمیزش ہوتی اور یہ کام خدمت کے طور پر نہ ہو سکتا تھا، لہٰذا اللہ

تعالیٰ کی طرف رجوع ہوئے اور یہ سوال کیا کہ اس کو اس کی نیکیوں میں سے ایک نیکی بنا دے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے دور میں لوگوں نے سینچر کے دن کا احترام چھوڑ رکھا تھا۔ حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو شریعت نازل ہوئی اس میں سینچر کے احترام کا تاکیدی حکم تھا۔ حضرت داؤد کے دور میں لوگ (سینچر کے دن) مچھلیاں پکڑتے تھے۔ (اس حکم کی خلاف ورزی کے بدلے میں) اللہ تعالیٰ نے ان کی صورتوں کو مسخ کر کے بندر بنا دیا جس کی یہ صورت ہوئی کہ اس نے مچھلی کے مزاج کو فاسد اور طبیعت کو متعفن اور بدبودار بنا دیا جب وہ اس کے کھاتے تھے تو یہ سوءِ مزاج ان میں بھی سرایت کر گیا اور ان کے ابدان بگڑ گئے۔ اس سے پہلے خوراک سے جو نسمہ یا روح انسانی پیدا ہوتا تھا۔ اس کی پیدائش میں تبدیلی آ گئی۔ یہ تبدیلی بڑھتے بڑھتے تکمیل کو پہنچ گئی تب ان کے بدنوں پر (بندروں کی طرح) بال نکل آئے اور اللہ نے ان پر ذلت اور رسوائی کو مسلط کیا اور وہ بندر بن گئے۔ یہ عذاب (ان کی استعداد کو) بہت قریب تھا اس لئے وہ اس عذاب میں گرفتار ہوئے اور یہ عذاب اس قریہ کے آگے پیچھے والے لوگوں کے لئے عبرت کا باعث بن گیا۔[35]

آپؑ کا تیسرا بڑا واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے ایسے فرزند عطا ہونے کا سوال کیا جو ان کے بعد ان کا جانشین ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور ان کو سلیمان عیہ السلام عطا کیا جو بڑے پاک باز، دیندار، حکیم، اچھے اخلاق والے اور نیکوکار تھے۔ وہ (بڑے ہو کر) مشکل معاملوں کے فیصلے کرنے میں (اپنے باپ) داؤد علیہ السلام کے شریک کار ہو گئے۔ وہ خصوصی واقعات میں اضافی اور وقتی بھلائی کو جلدی معلوم کر لیتے تھے (اور اسی کے موافق فیصلے کرتے۔)

ایک مرتبہ ہوا یہ کہ ایک رات ایک قوم کی بکریاں دوسری قوم کا کھیت چر گئیں۔ وہ لوگ اپنی فریاد لے کر داؤد علیہ السلام کے پاس پہنچ گئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے وہی فیصلہ دیا جو اتلاف کی صورت میں ان کی شریعت میں رائج تھا اور اس فیصلے میں بکریوں والوں کو خصوصی نقصان پہنچتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس خاص واقعے میں خیر نسبی (اور وقتی بھلائی) سمجھا دی (جس کے موافق انہوں نے فیصلہ دیا) حضرت سلیمان علیہ السلام کے اکثر فیصلے اسی طرز کے ہوتے تھے۔[36]

اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو ارتفاق دوم اور سوم کا علم (بھی) عطا کیا تھا۔ اس لئے داؤد علیہ السلام نے ان کو اپنی قوم پر جانشین مقرر کیا۔ حضرت سلیمانؑ کو پرندوں کی بولی کا فہم بھی عطا ہوا تھا۔

اس کی تحقیق یہ ہے کہ پرندوں اور بہائم کو جب کوئی ضرورت پیش آتی تو خدا کی طرف سے ان پر علوم عادیہ کا الہام ہوتا ہے اور کبھی اللہ تعالیٰ کسی ایسی چیز کا ارادہ فرماتا ہے جس میں چوپایوں کے لئے بھلائی ہوتی ہے جیسے کسی تکلیف اور محنت سے چھڑانا یا کسی بھلائی اور نفع کو حاصل کرنا تو اس وقت اس جانور کے دل میں کسی چیز کا علم الہام فرماتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو کچھ سکھانا چاہتا ہے تو ایک پرندے کو بھیج دیتا ہے اور اس کے دل میں الہام ہوتا ہے اور خدا اس بندے کو پرندے کے ذریعے تعلیم دیتا ہے جیسے ہدہد کے قصے میں ہوا۔

(جاننا چاہیے کہ) پرندوں کی مختلف آوازیں ہوتی ہیں جو ان کے مختلف حالات کی نشاندہی کرتی ہیں۔ جیسے غضب، بے قراری، گھبراہٹ، جفتی کی خواہش اور بھوک۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان کو ان علوم کا اکثر حصہ سکھا دیا تھا

اور اکثر اوقات بعض عارفوں کو بھی ایسے علوم عطا ہوتے ہیں۔ ان امور کے لئے چند جزئی اسباب ہیں جو ضبط اور انحصار میں نہیں آسکتے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے ہوا اور جنوں کو مسخر کیا تھا۔(37) اس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ ہوا، آگ اور دوسری چیزوں کے بننے اور موجود ہونے میں عنصر اول پانی میں حق تعالیٰ کی قیومیت کی تاثیر سبب بنتی ہے تو کبھی قیومیت کی تاثیر سے ایک چیز ہوا بن جاتی ہے اور دوسری قیومیت سے پانی ہو جاتی ہے۔ اسی پر دوسری چیزوں کو بھی قیاس کریں۔

کامل بندے کو کبھی بعض قیومیت سے مناسب ہوتی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ہوا اور آگ کی قیومیت سے مناسبت تھی اور ان کے اندر تسخیر شے کی ہمت قوی تھی۔ اس مناسبت کی وجہ سے ہمت میں اور اضافہ ہوا تو انہوں نے شیاطین کو تابعدار بنالیا، وہ ان کے لئے بڑے بڑے محراب اور تصویریں بناتے تھے اور دریا میں غوطے لگاتے تھے اور اس کے سوا اور بہت کام کرتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام تخت پر بیٹھ کر ہوا کو اس تخت کے اٹھانے کا حکم کرتے تو ہوا ان کو وہاں لے جاتی جہاں وہ چاہتے تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے عجیب واقعات ہیں:۔ ایک یہ کہ ایک دن ان کے سامنے گھوڑے لائے گئے اور وہ ان کی پسندیدگی میں اتنے محو ہو گئے تھے کہ ان کی عبادت کا وقت بھی ان سے فوت ہو گیا۔ اس پر آپؑ کو سخت غصہ آیا اور اس جوش میں گھوڑوں کو قتل یا زخمی کروادیا۔(38)

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ آپ کی طرف سے لڑنے اور جہاد کرنے کے جو احکامات صادر ہوئے تھے ان میں اپنے امیروں کی سستی اور ٹال مٹول کو دیکھ کر تنگ دل ہوئے اور یہ آرزو کی کہ اپنی بیبیوں سے صحبت کریں اور ان میں ہر ایک سے ایک ایک ایسا شہسوار پیدا ہو جو اللہ کی راہ میں جہاد کرے۔ اس معاملے میں انہوں نے صرف اسباب کو دیکھا اور اس کو خدا کی طرف تفویض کرنا اور اس سے مدد مانگنا بھول گئے۔ حالانکہ عارف اسباب کی طرف دیکھنے سے پہلے اللہ سے مدد مانگتا ہے اور اس میں اللہ کی تدبیر کی سرایت کو دیکھ لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس پر اس طرح تنبیہ فرمائی کہ کسی بھی بی بی سے کوئی بچہ پیدا نہ ہوا کیونکہ ان کا نطفہ دقیق ہو گیا۔ جماع کی کثرت خواہش اس کا باعث بنی، اس لئے اس مادے سے ایک ناقص خلقت کے سوا کوئی بھی پوری صورت نہ بن سکی اور اس جسم غیر مستوی کو ان کے تخت پر ڈال دیا گیا۔ اس واقعے سے وہ اصل حقیقت کو سمجھ گئے اور اللہ تعالیٰ سے توبہ کی اور اس سے حکومت میں مدد چاہی اور یوں کہا کہ یا اللہ مجھے بخش دے اور ایسا ملک عطا فرما جو میرے بعد کسی کے لائق نہ ہو۔

تیسرا واقعہ یہ ہے کہ ان کا وادی النمل پر گزر ہوا اور آپؑ ہوا پر سوار تھے۔ وہاں ایک چیونٹی نے اور چیونٹیوں سے کہا کہ اپنے گھروں میں گھس جاؤ ایسا نہ ہو کہ حضرت سلیمان اور ان کا لشکر تمہیں روند ڈالے۔ اس چیونٹی نے اپنے علم کے موافق احتیاط سے کام لیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے سن لیا اور اس کی گفتار کو سمجھ گئے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ انہیں(39) جانوروں کی بولی کی سمجھ عطا ہوئی ہے۔

چوتھا واقعہ یہ ہے کہ ایک روز انہوں نے پرندوں کی تلاش کی تو ہدہد کو غیر حاضر پایا۔ اس پر ہدہد کو سخت دھمکایا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک عجیب علم کی تعلیم فرمائی۔ اس میں ہدہد پر بھی رحمت تھی کہ وہ سزا کی دھمکی سے بچ جائے اور سلیمان علیہ السلام کی بھی بھلائی تھی کہ بلقیس کی حکومت ان کے ہاتھ آ جائے اور بلقیس اور اس کی قوم پر بھی یہ احسان تھا کہ وہ ایمان لے آئیں۔ اس دن حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ہدہد کی زبانی بلقیس کی ساری حقیقت معلوم ہو جائے اور ہدہد نے یہ اشارہ کیا کہ بلقیس کافر ہے اور اس کو مال اور جمال کا وافر نصیب عطا ہوا ہے۔ بہر حال اس واقعے میں جتنی بھی پوشیدہ عنایتیں تھیں، ان سب سے ان کو آگاہ کیا۔

پانچواں واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بلقیس کے تخت کو احکام ناسوتیہ (اس دنیا کے اثرات سے) خالی کر کے انہیں عالم مثال کی شے بنا دیا۔ پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کے اصحاب میں سے ایک نیک بندے کی دعا کی برکت سے اس جگہ اسے ناسوت (اس دنیا کی چیز) کا لباس پہنایا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اس عورت سے نکاح کا ارادہ رکھتے تھے۔ تب انہوں نے بلقیس کے عقل و جمال کو پرکھنے کے لئے ایک حیلہ چلایا کہ اس کے تخت کو بدل دیا۔ بلقیس نے اسے پہچان لیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی (خوبصورت) پنڈلی کو دیکھ لیا اور آپؑ نے یہ دیکھ لیا کہ وہ بڑی خوبصورت عورت ہے۔[40]

آل داؤد میں ہمیشہ حکومت رہی، جب دنیا کے بادشاہوں میں سے کوئی بادشاہ ان پر غلبہ حاصل کرتا تھا تو اللہ ان کے انبیاء کو فتح و نصرت کے وعدے کی وحی فرماتا اور ان کی مدد کے لئے ایک عجیب تقریب ظاہر کرتا جیسے کبھی ان کے سامنے سخت ہوا چلتی اور ان کے تیر بنی اسرائیل کو نہ پہنچتے اور کبھی ایسا ہوتا کہ جب دشمن لڑنے کو آتے تو ان پر گرمی اور پیاس کو مسلط کیا جاتا اور وہ ہلاک ہو جاتے اور بزدل بن جاتے اور کبھی ان کے اندر باہمی دشمنی اور عداوت کی آگ کو بھڑکاتا اور وہ آپس میں لڑ پڑتے (بنی اسرائیل بچ جاتے تھے) کئی صدیوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

اس کے بعد نینوا مقام کی ایک قوم راہ اعتدال سے ہٹ گئی اور انہوں نے بغاوت کا علم بلند کیا۔ خدا کی حکمت نے یہ چاہا کہ اس دور کے نبی اشعیا علیہ السلام کو اس باغی قوم کے ڈرانے کے لئے حکم کرے۔ اگرچہ یہ انذار اپنے پیرو کاروں میں کسی ایک شخص کے ذریعے کیوں نہ ہو، اشعیا علیہ السلام نے اس کام کے لئے یونس علیہ السلام کو بھیجا اور ان کو منتخب کرنے کی وجہ یہ تھی کہ یونس علیہ السلام کا وجود اللہ تعالیٰ کی بخشش اور ان کی عنایت سے تھا کیونکہ ان کے ماں باپ کے بوڑھے ہونے کے بعد ہی بطور خلاف عادت یونس علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تھی۔ پھر اس عنایت الٰہی نے اس کو گھیر لیا اور اس کے بچپن ہی سے اللہ تعالیٰ اس کی تربیت کا اس طرح کفیل ہوا کہ چارپایوں اور وحشی جانوروں کو اس کے دودھ پلانے کا بذریعہ الہام حکم کیا اور (جب وہ بڑے ہوئے تو) ان کی شادی کا بھی اس طرح انتظام فرمایا کہ انہیں خواب میں دکھایا کہ وہ ایک شخص کی بیٹی کا خطبہ کرے اور اس دوسرے شخص کے دل میں یہ خیال ڈال دیا کہ وہ اپنی بیٹی کو یونس علیہ السلام سے بیاہ دے (اس طرح ان کی شادی بھی ہو گئی)۔

خلاصہ یہ کہ حضرت یونس علیہ السلام کی روح میں عنایتِ الٰہی پوشیدہ تھی۔ اس لئے اشعیا علیہ السلام نے ان کو پیغام کے لئے منتخب کیا۔ حضرت یونس نے جابر لوگوں کے مقابلے سے کمزوری دکھائی اور نبی کے حکم کو عقلی کراہت سے نہیں لیکن طبعی کراہت سے ناپسندیدہ سمجھا۔ اس کی کراہت کا یہ اثر ہوا کہ ان کے نفس نے ایک غلیظ رنگ (اور نامناسب کیفیت)

کو حاصل کیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان سے مواخذہ کیا۔ اس کی بی بی راستے میں گم ہوگئی اور ان کے ایک بیٹے کو پانی کی موج بہا لے گئی اور دوسرے کو بھیڑیا کھا گیا۔ اسی سے وہ غمگین ہوئے اور توبہ کی اور آرام پرستی کو چھوڑ کر دعوت و تبلیغ کی تکالیف پر قائم ہو گئے۔

جب وہ اس قوم کے پاس پہنچے تو ان کو توحید کی طرف بلایا۔ انہوں نے آپؑ کو جھٹلایا۔ قید میں رکھا اور اذیتیں پہنچائیں۔ تب حضرت یونس علیہ السلام نے اپنی پوری کوشش کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی لیکن اس قوم کی ہلاکت و بربادی کا وقت ابھی نہ ہوا تھا کیونکہ اللہ کسی قوم کے ہلاک کرنے پر تب راضی ہوتا ہے جب وہ ہر طرح سے ملعون ہو جائیں (یہ ان کے لئے ابتدائی ڈرانا تھا) تب آپؑ کے نفس کو ایک ایسی کیفیت لاحق ہوئی جو قتل ناحق کے مشابہ ہوتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف اس حالت میں نظر کی اور ہلاکت ملتوی ہوگئی (اس میں) آپؑ کے لئے بہت سے واقعے ہیں:

ایک واقعہ یہ ہے کہ جب قوم یونسؑ نے عذاب کو دیکھا تو اللہ سے توبہ کی اور سب نے مل کر خدا کی بارگاہ میں عاجزی کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور عذاب کو ان سے ہٹا دیا۔ اس پر شیطان نے یونس علیہ السلام کے دل میں یہ وسوسہ ڈال دیا کہ قوم نے ان کو جھٹلایا ہے اور انہوں نے ان کے ایذاء کا پختہ ارادہ کیا ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام، اللہ کی طرف رجوع کیے بغیر ان سے ڈر کر وہاں سے بھاگ گئے (یہ آپ کے شایانِ شان نہ تھا) کیونکہ کامل لوگوں کے لئے یہی مناسب ہوتا ہے کہ اپنے سب کام اللہ کو سونپ دیں اور وہ اس وقت اسباب کی تلاش کرتے ہیں، جب تدبیرِ الٰہی کو ان میں کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ جب یونس علیہ السلام بھاگ گئے تو ان کے نفس نے ایک دوسری ہیئت حاصل کی۔ کشتی میں سوار ہوئے تو دریا کی موجوں نے جوش کیا۔ قرعہ پڑا تو ان کے نام پر نکلا۔ دریا میں گرے تو مچھلی نے آپؑ کو نگل لیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی تسبیح کہی اور گناہ سے بیزار ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور رحمتِ الٰہیہ ان پر لوٹ آئی۔ مچھلی نے آپؑ کو چٹیل میدان میں ڈال دیا اور یہ سقیم (اور عاجز) تھے اور ان پر کدو کی بیل پیدا ہوئی۔ یہ اس لئے ہوا کہ (وہ کدو کے پتوں میں رہیں اور) ان کو مکھی نہ ستائے اور صحرائی جانوروں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کو دودھ پلائیں۔ جس کی صورت یہ تھی کہ وحشی جانوروں کے اندر یہ خیال ڈال دیا کہ یہ ان کا بچہ ہے۔ اس لئے ان کے سینوں میں رحم نے جوش مارا جیسے اپنے بچے پر ہوتا ہے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ ان کے سب کاموں کا کفیل ہوا یہاں تک کہ وہ قوی اور تندرست ہو گئے۔ اس کے بعد کدو سوکھ گیا اور وہ ہرنی (جو آپ کو دودھ پلاتی تھی) وہ بھی چلی گئی۔ ان دونوں پر ان کو غم ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف یہ وحی کی کہ اے یونسؑ! کدو پر تو روتا ہے جس کو تو نے پانی نہیں پلایا اور ہرنی (کے جانے) پر بھی تو گریہ کرتا ہے جس کو تو نے کچھ نہیں کھلایا۔ دوسری طرف ایک لاکھ یا اس سے زیادہ لوگوں کی تباہی کا تجھے خیال نہ آیا۔ آپ کے نفس نے جن نامناسب باتوں کا ارتکاب کیا ہے۔ اس وحی میں ان پر آپ کو ظاہر کیا گیا تھا کیونکہ جب پاک نفس کسی نامناسب ہیئت کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اس ہیئت کو سمجھ لے اور یہ بھی جان لے کہ یہ ہیئت اللہ تعالیٰ کے ہاں ناپسندیدہ ہے، پھر یہ اطلاع خواب سے ہوتی ہے۔ یا کسی خارجی واقعے کے ذریعے سے اور وہ بھی خواب کی مانند ہوتا ہے یا وحی کے ذریعے سے ان کو مطلع کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ عالمِ برزخ میں طبیعت کے سکون کے وقت سب نفسوں کو اطلاع ہو جاتی ہے۔

پھر حضرت یونس علیہ السلام کا ایک ایسی قوم پر گزر ہوا جو اپنے پھلوں کو چن کر زمین پر پھینکتے۔ حضرت یونس علیہ السلام نے (یہ دیکھ کر) ان سے کہا کہ تم لوگ اپنے پھلوں کو کیوں خراب کر رہے ہو۔ کچھ عقل سے کام لو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو وحی کی کہ اے یونسؑ! تم کو ان کے پھلوں پر تو شفقت آئی اور ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ آدمیوں پر شفقت نہ آئی۔ پھر ایک شخص نے آپؑ کی مہمانی کی اور وہ کمہار تھا، مٹی کے برتن بناتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کو یہ وحی کی کہ وہ کمہار کو اپنے برتن توڑنے کا حکم کرے۔ انہوں نے جب کمہار سے کہا تو وہ (بگڑ گیا اور) ان کو برا بھلا کہنے لگا اور کہا تو دیوانہ معلوم ہوتا ہے۔ حضرت یونسؑ جو اپنی قوم کی ہلاکت چاہتا تھا، خدا تعالیٰ نے انہیں اس کی مثل بتائی۔ پھر اس نے ایک شخص کی کھیتی کے لئے اللہ سے دعا مانگی۔ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی اور اس کھیتی کو خوب اُگایا اور شاداب کیا لیکن اس کے بعد اس کو پھر برباد کیا، اس پر ان کو رنج ہوا۔ یہ بھی انہیں اللہ تعالیٰ نے (سمجھانے کے لیے) ایک مثال بتائی۔ اس کو دیکھ کر انہوں نے اللہ کے حضور عاجزی کی اور توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کی اور پہلے کی طرح ان کی پرورش کی اور ان کی بیوی کو لوٹایا اور ان کو سو دینار عنایت کیے اور ان کو ان کی اولاد بھی مل گئی اور ان کو مچھلی کے پیٹ سے نکالا اور ان پر نشانیاں ظاہر کیں اور ان کو اپنی قوم میں سچا بنایا۔

یہ سب اس لئے ہوا کہ اللہ تعالیٰ آئینہ کی طرح ہے جیسا کہ اس نے فرمایا کہ یہ تمہارے اعمال ہیں جن کو میں تمہارے لئے محفوظ کرتا ہوں۔ اگر کسی نے نیک رنگ اختیار کیا تو اس کو اچھا بدلہ ملے گا اور جو برے رنگ پر قائم ہوا تو اس کو بری سزا ملے گی اور سب انسانوں کے دل ان کے ہاتھ میں ہیں۔ جب وہ کسی بندے کو عذاب کرنا چاہتا ہے تو لوگوں کے دلوں کو اس شخص کی ایذا رسانی کے پیے پھیر دیتا ہے اور جب کسی بندے پر نعمت کرنا چاہتا ہے تو لوگوں کو اس شخص کو فائدہ پہنچانے کی طرف موڑ دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فعل ہمیشہ رہتا ہے۔ خاص طور پر ان لوگوں کے حق میں جو سب کو چھوڑ کر اللہ کے لئے ہو جاتے ہیں اور خدا جن کی خصوصی تربیت کا کفیل ہو جاتا ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام بھی ایسے ہی (خدا پرست) لوگوں میں تھے۔

دوسری نشانی یہ تھی کہ حضرت مریم ایک سوکھی ہوئی کھجور کی طرف پناہ لے گئیں، وہ سرسبز ہو گئی اور چند ساعتوں کے اندر اس نے پھل لایا اور خدا نے وہاں ایک چشمہ پانی کا پیدا کیا۔

تیسری نشانی یہ تھی کہ جب سیدہ مریم پر زنا کی تہمت لگی تو خدا نے اس کو اس سے اس کے بچے کے ایسے وقت میں بولنے سے بری کر دیا جس عمر میں بچے نہیں بولتے، کیونکہ اس میں قوت روحیہ پوشیدہ تھی اور جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام جوان ہوئے تو خدا کی طرف سے اس کو علم، کتاب اور حکمت عطا ہوئی۔ اس میں کسی تعلیم کو دخل نہ تھا۔ ان پر نشانیاں ظاہر ہوئیں۔ لوگ جو کچھ کھاتے اور گھروں میں ذخیرہ کر کے رکھتے وہ سب ان کو بتاتے تھے اور وہ مٹی سے پرندے کی شکل پر ایک پرندہ بنا لیتے تھے۔ پھر اس میں پھونکتے تھے تو اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا تھا۔ حضرت مسیح کی مٹی میں پھونک کے ساتھ اس میں زندگی آ جاتی تھی۔ پھر یہ دو چیزوں کے درمیان دائرہ تھا، حضرت مسیح کا زور سے پھونک مارنا اور اس کا زندہ ہونا، اس کے بعد وہ جانور گر کر مردہ ہو جاتا۔

حضرت مسیح علیہ السلام اللہ کے اذن سے مردوں کو زندہ کرتے تھے، پھر نفس بدن سے وہمی تعلق رکھتا تھا اور یہ

حقیقی زندگی کا تعلق نہ تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا سے اس وہمی تعلق میں اللہ کی طرف سے برکت ہوتی اور اس سے اس پر زندگی کا عکس پڑتا تو مردہ، زندہ ہو جاتا، پھر جب عیسیٰ علیہ السلام جدا ہوتے تو وہ اسی وقت مر جاتا۔

عیسیٰ علیہ السلام کے دین میں بڑی گنجائش اور آسانی تھی۔ کچھ ایسی چیزیں جو ان کے لئے حرام تھیں وہ ان کے لئے حلال کر دی گئی تھیں۔ اس لئے کہ تکلیف دہ احکام اس وقت اترتے ہیں جب ملکیت کا بہیمیت سے تصادم ہوتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو گویا زمین پر چلنے والے ملک تھے۔ اس لئے یہود نے ان پر زندیق ہونے کی تہمت باندھی اور ان کے قتل پر جمع ہو گئے۔ انہوں نے ایک تدبیر کی اور اللہ نے بھی ایک تدبیر کی اور اللہ سب سے اچھی تدبیر کرنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی ایک مثالی صورت بنائی اور اس کو آسمان کی طرف اٹھا دیا اور اس کی قوم یا دشمن کے کسی شخص کو ان جیسا بنا دیا تو وہ عیسیٰ علیہ السلام کے شبہ میں قتل ہوا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے گروہ کو دشمن پر مدد دی اور وہ دشمن پر غالب آئے۔

تاویل الاحادیث: نبینا محمد ﷺ

آنحضرت ﷺ کے علوم کے وہ اصول جو ان علوم کی تاویل اور تعبیر کر کے مرجع ہوتے ہیں بہت سے امور ہیں:

ایک یہ کہ ملاء اعلیٰ (مقدس ملائکہ کی جماعت) اور آنحضرت ﷺ کے درمیان اس طرح ایک فطری مناسبت تھی کہ آپ ﷺ کا نفس ناطقہ بلند تھا اور آپ ﷺ کا وہ مزاج جس کا تعلق نسمہ یا روح طبی سے ہوتا ہے کامل و معتدل تھا کہ اچھے اخلاق کا مستوجب تھا اور ان کا اجتماع اتفاق اور یکجہتی پر تھا،(41) اس سے یہ لازم آتا ہے کہ ملاء اعلیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کے قلب مبارک میں دوامی تائید ہوتی رہے اور یہ تائید اس طرح ظاہر ہوتی تھی کہ ملاء اعلیٰ کی جماعت آپ ﷺ کو دکھائی دیتی تھی اور کبھی آپ ﷺ سے باتیں کرتے تھے اور آپ ﷺ کے دل میں الہام کرتے تھے اور کبھی آپ ﷺ ان کو خواب میں دیکھتے تھے۔

اس کی مثال یوں سمجھو کہ ایک بہادر انسان ہو جو اپنی شجاعت میں کامل ہو، اس کی یہ شجاعت اسے تھوڑی سی بات پر دشمن سے مقابلہ کرنے، جنگ میں کود پڑنے اور مار دھاڑ کرنے پر دمبدم ابھارتی رہتی ہے۔ ہر خلق اپنے آثار سے یہی نسبت رکھتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب آپ ﷺ اپنی بیداری اور نیند میں ملاء اعلیٰ کی تائید کے لئے فارغ ہوتے اور منتظر رہتے تھے تو ملاء اعلیٰ کی طرف سے ان اسباب کے موافق جنہوں نے آپ ﷺ کو گھیرا ڈال رکھا تھا۔ اللہ کی مشیت کے مطابق وہاں سے تائید کا فیضان ہوتا رہتا۔

(آپ کے اور ملاء اعلیٰ کے درمیان) اس تعلق اور ربط کی بنا پر آنحضرت ﷺ کی ہمت ملاء اعلیٰ کی طرف مصروف تھی اور ہر وقت ان کی برکتوں نے آپ ﷺ کو احاطہ کر رکھا تھا اور یہ اوقات آپ ﷺ کے جہاد وغیرہ میں مشغول ہونے کے اوقات ہوں یا مسجد میں اعتکاف کے اوقات ہوں اور اس تعلق کی بنا پر آپ ﷺ کے اکثر معجزے برکت کے تھے کھانے، پینے وغیرہ سب میں برکت ہوتی تھی۔

اس کا منشا یہ ہے کہ وہ نفس جو ملاء اعلیٰ کی تائید کے لئے تمثال یا تصویر کی حیثیت رکھتا تھا جب اپنی کوشش ہمت

سے کسی چیز کی طرف متوجہ ہوتا تھا تو ان کی ہمتوں کی فراخ راہ کھل جاتی تھی اور ملاء اعلیٰ کی ہمتیں، عالم موالید (حیوانات، نباتات اور جمادات) کو الہام، احالہ اور تقریب کے ساتھ مسخر کرتی رہتی ہیں۔ پس اگر وہ (ملاء اعلیٰ کے ملائکہ) آگ کے ظہور کا ارادہ کرتے ہیں اور موالید میں اس کے لئے اور کوئی سبب نہیں ہوتا یا کوئی ایسا کمزور سبب ہوتا ہے جو آگ کے پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں ہوتا تو ملاء اعلیٰ کی ہمتیں آگ کے پیدا ہونے کو واجب کر دیتی ہیں، اسی پر الہامات کو قیاس کریں۔

اسی خصلت کے باعث آپ کا سینہ شق ہوا اور اس میں حکمت اور ایمان بھرا گیا۔ آپ ﷺ کو بیت المقدس کی سیر کرائی گئی، پھر آسمانوں تک اور اس کے بعد جہاں اللہ نے آپ ﷺ کو بیت المقدس کی سیر کرائی۔ آپ ﷺ نے انبیاء علیہم السلام کی ارواح دیکھیں اور ملائکہ کو ان کی اپنی صورتوں اور اشکال میں دیکھا اور انسانِ اعظم (42) کے دل پر جو حق کی تجلی پڑتی ہے۔ آپ ﷺ وہاں تک پہنچے اور وہاں سب سے اچھی صورت میں ظہور فرمایا۔

دوم یہ کہ آنحضرت ﷺ اپنے اس استعداد سے جو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو عطا کیا تھا، ملاء اعلیٰ سے تہذیب نفس کے علم کو حاصل کرنے کے مستحق تھے کیونکہ آپ ﷺ کا نفس عالیہ، روح کامل اور مزاج متفق کے صاحب تھے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ آپ ﷺ نے دیکھا کہ جملہ نیکیوں کا مدار چار اخلاق پر ہے اور جملہ برائیوں کا مدار ان چار اخلاق کے اضداد پر ہے اور اس کے ضد اور مخالف سے انسان تکلیف کو محسوس کرتا ہے جس طرح کوئی انسان بھوک اور پیاس کو محسوس کرتا ہے تو وہ کھانے اور پینے کی طرف راغب ہوتا ہے اور ان کے نہ ملنے سے اسے تکلیف محسوس ہوتی ہے، پھر آپ سے خود بخود ان اخلاق کے آثار ظہور پانے لگے۔ جیسے مردِ شجاع سے بہادری کے آثار خود بخود نمایاں ہوتے ہیں اور جس کی فطرت میں عدالت ہو اس سے سیاست مدن اور تدبیرِ منزل جیسے آثار ظاہر ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے اس قول کا یہی مقصد ہے جو فرمایا: و اوحینا الیھم فعل الخیرات (اور ہم نے ان کی طرف اچھے کام کرنے کی وحی کی۔)

پھر نبی ﷺ نے ان امور میں تامل کیا جو اس زمانے میں نیکی اور گناہ کے کام تھے اور آپ ﷺ نے ان کو جان لیا کہ دونوں اقسام کا منشا ہیئاتِ نفسانیہ ہیں اور نفس کے تزکیہ اور آلودگی میں دونوں مؤثر ہیں۔ آپ ﷺ نے یہ بھی معلوم کیا کہ حالت مطلوبہ میں نیک کام کیوں کر زیادہ ہوتے ہیں اور حالت گریز میں گناہ کے کام کس طرح بڑھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے ہر عمل کے موقع اور ہر شے کا وزن معلوم کیا۔ پھر یہ معلوم کیا کہ اچھے اعمال کو کیسے کیا جاتا ہے اور برے کاموں سے کس طرح اجتناب کیا جاتا ہے اور اس کو بھی معلوم کیا کہ اعمال کے آداب اور ان کے مکملات اور دواعی کیا ہیں۔ یہ سب علوم، نفس کے آئینے میں تامل کرنے سے بطور وجدان اور قیاس کے ظاہر ہوئے۔

تیسرا اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ایسی سمجھ عطا فرمائی تھی کہ جس سے ارتفاقات (باہمی معیشت کے اصول) کو جانتے تھے جیسے آدابِ معیشت، تدبیر منزل، باہمی معاملات، سیاست مدن اور امت وقوم کی سیاست۔ آپ ﷺ نے وہ مصلحتیں جان لیں جن کا قوم خیال رکھتی ہے۔ صحیح اور سقیم کو معلوم کیا اور اس کو بھی جان لیا جو ان آرائے کلیہ کے لائق ہے جو حق تعالیٰ کی طرف سے اترتی ہیں اور آرائے جزئیہ کو بھی معلوم کیا جو کہ نفوس کے خطرات، سرداروں اور بادشاہ کے ظلم وغیرہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

ان کی مثال ایک فقیہ کی طرح ہے جو اپنے مشائخ کے مسائل میں تامل کرتا ہے۔ پھر ہر ایک شے کی وجہ معلوم کر لیتا ہے اور جن امور کلیہ (قواعد) کو انہوں نے تلاش کیا تھا، ان کو بھی جانتا ہے اور صحیح کو فاسد سے تمیز کرتا ہے یا جیسے عادل حکیم بادشاہ جو گذشتہ بادشاہوں کے رسوم اور عادات کو جانتا ہے اور ان مصلحتوں کا بھی اس کو علم ہے جن کی پچھلے بادشاہوں نے تلاش کی تھی اور ذرائع اور دواعی کو بھی جانتا ہے۔ پھر ایک شے کو اس کے وسائل کے روکنے سے روک دیتا ہے۔ اگر تم بادشاہوں کی تاریخ میں غور کرو گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ایک بادشاہ نے بھاؤ سستا کرنے کا ارادہ کیا تو اس کو پہلے یہ غور کرنا ہوگا کہ گرانی کا سبب زراعت کی کمی ہے یا تاجروں کی قلت۔ اس کے بعد اس نے گرانی کے سبب دور کرنے کی کوشش کی اور اس کو مطلوب حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا یا کسی حاکم نے یہ ارادہ کیا کہ کسی قوم کے شر سے وہ امن میں رہے تو ان کو حکم دیا کہ گھوڑوں پر سوار نہ ہوں اور ہتھیار نہ باندھیں اور اس قوم کے مددگار بننے سے لوگوں کو اس طرح روکنا چاہا کہ باہمی شادی بیاہ نہ کریں اور بادشاہ کی اجازت کے بغیر آپس میں ملاقات نہ کریں۔ اس کے مانند اور بھی بے شمار باتیں ہیں۔ اسی طرح سیاست کی مصلحتوں کا نکالنا اور سمجھنا ہوتا ہے۔

چوتھا اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر لطف کرنے کا ارادہ کیا کہ اپنی رحمت کا ایسا چشمہ جاری کرے جس پر عرب وعجم کے سب لوگ وارد ہوں اور وہاں مہلک پیاس سے نجات پا کر سیراب ہوں۔ یہ اس لئے کہ عرب وعجم ان فاسد رسومات کے پابند تھے جو اچھے ارتفاقات کی منافی تھیں۔ دین کی باتوں سے پیٹھ پھیرے ہوئے تھے اور اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق میں سے ان باتوں میں زیادہ جاہل تھے جن سے ان کو تہذیبِ نفس حاصل ہوتی۔ یہ لوگ آخرت کی یاد سے بڑے بے خبر تھے۔ اللہ کے جلال اور اس کی توحید سے غافل تھے۔ بتوں اور شیطانوں کے پجاری تھے۔ کمزوروں پر بڑا ظلم کرتے تھے، قطع رحمی ان میں زیادہ تھی، اس حالت میں خدا کا ان پر یہ لطف تھا کہ انہیں ان کی بری باتوں پر تنبیہ کی جائے اور انہیں حق کا راستہ دکھایا جائے اور ان کو سیدھے راستے پر چلایا جائے چاہے وہ مانیں یا انکار کریں۔ یہ لطف اس کی تدبیر کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے اور تدبیر، صفتِ خلق کی بقایا (اور اس کے بعد کی) چیز ہے اور خلق، ابداع کے بقایا سے ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نفس کلیہ کو پیدا کیا تو اس کو بہت سے احوال کے لئے سواری بنالیا۔ اس لئے کبھی وہ انسان ہوتا ہے، کبھی گھوڑا، کبھی پتھر وغیرہ۔ ان امور میں نفسِ کلیہ کا قوت سے فعل کی طرف نکالنا نظم طبیعی پر ہے اور یہ خیر سے عبارت ہے جو نفسِ کلیہ کے ابداع کے بقایا (اور لوازمات میں) سے ہے اور جس جود نے نفسِ کلیہ کے ابداع اور پیدائش کی خواہش کی تھی، یہ اس کی مقتضی ہے۔ پھر جب عالم اپنی تفصیل سے وجود میں آ گیا اور مخلوق کے ہر نوع اور شخص کو ایسی صورت عطا ہوئی جو اس کے مخصوص آثار کی متقاضی تھی اور اس کو اس کے آثار سے روکنا خیر نہ تھا اور نہ ہی ان حوادث کا ظاہر ہونا خیر تھا جو اچھے نظام کے منافی تھے تو ضروری ہوا کہ ارضی اسباب میں ہیجان ہو اور ایسی تحویلات (وتقریبات) وجود میں آ جائیں جو اشیاء کو اچھے نظام کے قریب لے آئیں اور اس سے خلق و پیدائش کی تکمیل و تتمیم ہوتی ہے۔ ان تینوں میں جود ذاتی کی مثال اس طرح ہے جس طرح کوئی سیلاب زمین پر آ جائے۔ یہاں تک کہ جب کوئی سد اور پشتہ اس سے مزاحمت کرے تو پانی اس کے سوراخوں میں گھس جائے اور پھر وہ کسی سوراخ سے مثلث کی صورت میں نکلتا ہے، کسی سے

مربع اور کسی سے گول دائرہ کی شکل میں۔ پھر اس پانی کو ایک دوسری دیوار روک دے جو پہلی سے زیادہ مضبوط اور محکم ہو تو اس وقت نمی اور رطوبت زمین اور ہوا کے مسامات میں نفوذ کرے گی تو اس طرح پانی کا کوئی اثر پہنچ جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

خلاصہ کلام یہ کہ اللہ کا مذکورہ ارادہ ملاءِ اعلیٰ میں متمثل ہوا اور اس نے ایک مثالی شخص کی صورت اختیار کی جس کو ہم نبی الانبیاء کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور یہ شعائرِ الٰہیہ کی اصل اور بنیاد ہے۔ وہاں سے زمین پر اللہ کی رحمت کے قطرے ٹپکنے لگے اور ہر دور اور ہر زمانے میں موالید کے مسامات سے لطف وعنایات کے چشمے پھوٹ نکلے اور یہ سلسلہ ان زمانوں اور ان دوروں میں جو مخصوص واقعہ ہوتا تھا، ان کے موافق تھا تو بعض زمانہ میں اس کا ترشح اور ٹپکنا بنی آدم کے قلوب پر تھا اور ایسے انسانوں کو رسل اور انبیاء کہا جاتا ہے۔ پھر یہ امر تمام نہ ہوتا تھا جب تک نظام زمین میں ایسا مادہ پایا جائے جس میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ صورت اس میں منطبع ہو سکے جیسے آئینہ میں انسان کی صورت منطبع ہوتی ہے تو جس آدمی کی صورت یہاں منطبع ہوتی ہے، وہ ارادہ ہے جو ملاءِ اعلیٰ میں متمثل ہے اور آئینہ انسانوں میں سے ایک شخص ہے جو حق کے لئے جھگڑتا ہے، لڑائی کرتا ہے، مال خرچ کرتا ہے اور لوگوں کی تالیف قلوب کرتا ہے۔ جیسے لوگوں کے بادشاہ کیا کرتے ہیں۔ انطباع کے معنی یہ ہیں کہ اس (کامل انسان) کے افعال میں روح قدسی کی پھونک ہو۔ ارادہ متمثل بھی اسی کا نام ہے۔

اس آخری دورہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات (صورت منطبعہ کے لیے) مادہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ تب وہاں سے احکام الٰہیہ کا چشمہ پھوٹ نکلا اور اس کے پھوٹنے کے بعد مبہم احکام کا ضبط اور مقادیر کی تعیین بھی ہوئی۔ اس لئے کہ لوگوں کو ایک ایسے مضبوط امر کا مکلف بنایا جائے جس کو تحریف لاحق نہ ہو سکے اور اس میں تسلسل خلل انداز نہ ہو اور وہ امر محسوس کی طرح ہو جس کو قوم ہاتھوں ہاتھ لے لے اور تقرب الی اللہ میں اسی سے تمسک کریں۔ پھر اللہ نے قرآن عظیم کو نازل فرمایا اور ان کے لئے خانۂ قدیم (بیت اللہ) کا طواف مشروع فرمایا اور ان کو احکام الٰہی کا امر کیا۔ قرآن عظیم عربی زبان میں ہی معین ہوا اور بیت اللہ بھی وہی مقرر ہوا جس کا کئی صدیوں سے طواف کرتے آرہے تھے اور شرائع بھی وہ جاری کیں جو اسماعیلیہ اور اسحاقیہ امتوں میں شائع تھیں اسی کی طرف اشارہ ہے، اللہ تعالیٰ کے اس قول میں (**وما جعل علیکم فی الدین من حرج ط ملة ابیکم ابراهیم**[43]) اور اس نے دین کے احکام میں تم پر کسی قسم کی تنگی نہیں کی۔ تم اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر قائم رہو۔

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اچھے ساتھیوں اور صحابہ کی جماعت کے اصل اور اساس میں اللہ تعالیٰ نے امانت کو اتارا۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ ان کے سینوں میں (حق کی حمایت کے لیے) جہاد کا جذبہ اس طرح پھیل گیا جیسے مشک کو پھونکنے سے اس میں ہوا پھیل جاتی ہے۔ پھر وہ ایک امت ہو گئی جس کو لوگوں (کی ہدایت) کے لئے ظاہر کیا گیا[44] اور اللہ کی رحمت نے ان کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ یہاں تک کہ اللہ کا حکم غالب ہوا اور اسلام صحرائی اور شہری سب کے گھر میں طوعاً وکرہاً پہنچ گیا۔

پانچویں اصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نفسِ قدسیہ میں یہ صلاحیت تھی کہ اس پر گزرے ہوئے یا آنے والے زمانے کے واقعات منکشف ہوں اور یہ اس لئے تھا کہ بڑے کلیہ واقعات اپنی مثالی صورت سے ملاءِ اعلیٰ میں صورت پاتے ہیں اور جزئی واقعات جو کہ معمولی اسباب سے پیدا ہوتے ہیں اور ان سے ملاءِ اعلیٰ میں رضا یا ناراضگی کا

(پہلے) کوئی اثر پیدا نہیں ہوتا۔ ملاء اعلیٰ میں صرف اس وقت صورت پاتے ہیں جب ان کے موجود ہونے کا زمانہ قریب آ تا ہے۔ باقی آنے والے واقعات کے لئے تو اسباب ہوتے ہیں جو ان کو ضروری بنا دیتے ہیں اور ان کے اسباب کے لئے بھی اسباب ہوتے ہیں، اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ پھر جب یہ نظام جملہ اسباب تک پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی جود اور رحمت اس کو ضروری قرار دیتی ہے کہ جس واقعے کے اسباب وجود میں آ گئے ہیں، اس کی صورت ملاء اعلیٰ کی قوتوں میں صورت پذیر ہو اور جس قدر اسباب بڑھتے جائیں گے اور وقت قریب ہوتا جائے گا تو وہ صورت قوی ہوتی جاتی ہے۔

اس کا راز یہ ہے کہ نظام طبیعی جو نفس کلیہ کی صورت جزئیہ کا دوسرا نام ہے، اس نظام کی معرفت کو علمِ اعلیٰ کہا جاتا ہے۔ پھر انسانوں کو جو سب سے پاک طینت کا انسان ہوتا ہے، اس کے پاس واقعہ اپنے اول ظہور میں ہی مثالی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور جو شخص اس سے کم درجے کا ہوتا ہے، اس کے لئے حادثہ کا صورت پذیر ہونا بعد میں ہوتا ہے، اسی طرح قیاس کرتے چلے جاؤ!

گزرتے ہوئے واقعات کی معرفت اس طرح ہوتی ہے کہ ہم نے کشف سے یہ معلوم کیا ہے کہ حظیرۃ القدس کی فضا میں بندوں کی صورتیں معلق رہتی ہیں۔ جب کوئی بندہ نیک عمل کرتا ہے تو اس سے اس کا نفس کامل ہوتا ہے۔ ملاء اعلیٰ کے ملائکہ اس سے راضی ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرتا ہے۔ اسی کی مثالی صورت میں نور اور روشنی ظاہر ہوتی ہے اور وہاں سفید نقطہ پیدا ہوتا ہے اور جب کوئی بندہ برا کام کرتا ہے تو اس سے اس کا نفس خراب ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے ملاء اعلیٰ میں ناراضگی پیدا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر لعنت کرتا ہے۔ اس کی صورت میں تاریکی اور سیاہی آ جاتی ہے اور وہاں سیاہ نقطہ پیدا ہوتا ہے اور یہ صورت حظیرۃ القدس میں اس وقت تک رہتی ہے جب تک اس دورے کے ختم ہونے کا وقت آ جائے۔ جب وہ دورہ ختم ہوگا تو صورت بھی ختم ہو جائے گی۔ جب کوئی عارف ملاء اعلیٰ کے ساتھ مل جاتا ہے تو اللہ کی مشیت سے ان صورتوں کے دیکھنے سے ان کے سب حالات اس پر کھل جاتے ہیں۔ کسی کو کم علم ہوتا ہے تو کسی کو زیادہ۔ اس کا مدار ان کے اللہ کے ہاں درجات پر ہے۔ ہم نے جو انبیاء اور اولیاء کے متعلق کچھ کلام کیا ہے اس کو بھی اس تحقیق کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔

کبھی کسی بڑے واقعے کے لئے (جو کسی عظیم انعام یا عام ہلاکت کے لئے ہوتا ہے) ملاء اعلیٰ کے مدارک میں ایک مثالی صورت ہوتی ہے، کامل انسان کو اس کی معرفت ہوتی ہے اور اسی سے (واقعے کو) معلوم کر لیتا ہے اور کبھی عارف کے کان میں ایسی کوئی بات پڑ جاتی ہے جو لوگ آپس میں کر رہے ہوتے ہیں اور ان کو خبر نہیں ہوتی، وہ اس سے غافل ہوتے ہیں تو ان واقعات کی تاویل سے عارف کو یہ سمجھ آ جاتی ہے کہ وہ صحیح کی موضوع سے تمیز کر سکے۔ پھر وہ واقعہ کے مطابق حق کی طرف ہدایت پاتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ایسا شخص کم ملے گا جو ملاء اعلیٰ کے ساتھ جا ملے اور اس کے نفس میں اس کے پیدائشی اصل مزاج کے موافق ان پڑے واقعات کا عکس نہ پڑے۔

جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نفس قدسی میں تمام عالم کی سیاست اور ملت کی امامت رکھی گئی تھی اور آپ عظیم تدبیروں میں ملاء اعلیٰ کے ساتھ قوی مشارکت رکھتے تھے تو ضروری ہوا کہ آپؐ کے نفسِ مبارک میں پچھلے لوگوں کے

قصوں اور مجموع واقعات کا اس قدر عکس پڑے جس کو ملت سے اشاعت یا اضاعت (ہلاکت) کے لحاظ سے کوئی مناسبت ہو یا وہ انسان میں اس کے نظم طبیعی کا مقتضیٰ ہو یا بڑے اسباب کا مقتضیٰ ہو، قیامت کے واقعات بھی اسی طرح ہیں جیسے دجال کا ظاہر ہونا، مہدی کا وجود، عیسیٰ علیہ السلام کا نزول، دابۃ الارض کا آنا، یاجوج اور ماجوج کا نکلنا۔ یہ سب واقعات تشبہ اور صورت پذیر ہونے کے لحاظ سے سب بڑے واقعات ہیں کیونکہ ان کا مبداء نظم طبیعی ہے۔

ان کی تفصیل یہ ہے کہ ظہورِ قیامت کا آغاز اس کی شرائط تین چیزیں ہیں:

(1) عام حوادث، جن سے انسان، حیوان اور دوسری بہت سی چیزوں، نباتات اور معدنیات کی بربادی ہوگی۔ جیسے زمین میں دھنس جانا، عام موت، زلزلے، مہیب آوازیں اور باہمی لڑائیاں، ان کے لئے مادی اور ارضی اسباب مہیا ہوں گے جن سے ان واقعات کا ہونا ضروری ہو جائے گا۔

(2) دوسری چیز یہ ہے کہ زمین سے خراب صورتیں اوپر جاتی ہیں جن میں سے کچھ تو لوگوں کے ارادی اعمال سے پیدا ہوتی ہیں اور کچھ ایسی ہوتی ہیں جن میں ان کو کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ پھر فضا ان خراب رنگوں کے ساتھ صورت پذیر ہوتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا جود ان ہی فاسد رنگوں سے ملوث ہو کر نکلے گا۔ پھر دنیا ان نفوس کے پیدا ہونے کے لئے تیار ہو جائے گی جو اللہ کی طرف سے نوع انسان کے لئے بنائی ہوئی حد سے باہر نکل جائیں گے اور افراط یا تفریط کو اختیار کریں گے تو بعض تجرد اور انسلاخ (رہبانیات) کی طرف مائل ہوتے ہیں اور بعض بہیمت کو اختیار کرتے ہیں۔ اس سے نوع انسان میں بیماری پیدا ہوگی اور پھر دوسری ہیئتیں اوپر جائیں گی اور یہ پہلی ہیئتوں سے نہایت قبیح اور بدبودار ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ کا جود بھی ان ہیئتوں سے ملوث ہو کر نازل ہوتا ہے۔ پھر (آگے چل کر) دنیا ایسے نفوس کے پیدا ہونے کے لئے تیار ہوگی جو پہلی حالت سے زیادہ اعتدال سے خارج ہوں گے اور اسی طرح ہوتا رہے گا یہاں تک کہ قیاسات خلل پذیر ہوں گے اور کوئی نجومی اپنے علمِ نجوم میں سچا نہ ہوگا اور نہ کوئی طبیعی عالم اپنی طب میں صادق ہوگا اور نیکی بالکل رک جائے گی اور زمین پر کوئی بھی اللہ اللہ کہنے والا پیدا نہ ہوگا۔ زمین پر بہت سے حوادث پیدا ہوں گے یا دعا اور ارواح کی طرف توجہ وغیرہ جیسے عارضی اسباب کی وجہ سے وہ رک جائیں گے۔ اس وقت اس نظام کا ختم کرنا ضروری ہو جائے گا۔

(3) حکمت ربانی میں ایک مخفی راز ہے جس میں چوں و چرا کی گنجائش نہیں ہے۔ جس طرح یہ نہیں کہا جاتا کہ آگ کیوں گرم وخشک ہے اور پانی کیوں ایسا نہیں ہے اور سورج کی مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کیوں تیز ہے اور مغرب سے مشرق کی طرف اس کی (ذاتی) حرکت ایک سال میں پوری ہوتی ہے۔

اس کے بعد ملت اور خلافت کے واقعات کی (عالم بالا میں) تشبح کی نوبت آئی۔ خاص طور پر وہ واقعات جو کہ خلفائے راشدین کے دور میں ظاہر ہوئے۔ جیسے عراق، شام اور مصر کی فتوحات، مال و دولت کی فراوانی اور یہ کہ کسریٰ ہلاک ہوا اور اس کے بعد کسریٰ نہیں ہے اور قیصر ہلاک ہوا۔ پھر اس کے بعد قیصر نہیں ہے۔ پھر اس ظالم بادشاہ کے واقعات جو بنی امیہ میں ہوا۔ ان واقعات نے قوی اثر چھوڑا۔ پھر بنی عباس کی حکومت کے واقعات، اس کے بعد ترک، سلجوقی، چنگیزی وغیرہ کے فتنے ہوئے۔

جاننا چاہیے کہ ان حوادث اور واقعات کی صورتوں کے مختلف طبقے اور درجے ہیں۔ جب کسی بڑے واقعے کو

چھوٹے سے نسبت دی جائے تو چھوٹا یوں نظر آئے گا گویا کچھ بھی نہیں ہے۔ تب حصر کے ساتھ کہا جائے گا کہ بس یہی حادثہ ہے، جب اس کو کوئی ایسا شخص دیکھے گا جس کو حقیقتِ حال کا علم نہیں ہے تو وہ اس کو خلاف واقعہ سمجھے گا اور اس میں اعتراض کرے گا جیسا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ ہمارا ملک شام ہی ہے۔ اس میں جو انحصار معلوم ہوتا ہے اس سے ایک متحیر کو حیرت ہوگی کہ شام کے سوا اور ملک بھی تو وسیع اور زیادہ ہے۔ حق بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صورت کی طرف نظر فرمائی جو دوسرے درجے پر تھی۔ پھر آپؐ نے اسی کی خبر دی اور اس کو جب تیسرے طبقے سے نسبت دی جائے گی تو ایسا معلوم ہوگا کہ تیسرے طبقے میں کسی بھی شے کی صورت نہیں ہے اور اسی طور آپؐ نے فرمایا کہ دین غالب ہوگا۔ جب تک بارہ خلیفہ ہوں (ان کو سن کر) شک کرنے والا شک کرے گا اور کہے گا کہ اس سے اگر خلافتِ نبوت مراد ہے تو وہ تیس برس میں گزر گئی اور اس میں چار خلیفے ہوئے اور اگر خلافت سے مراد عدل و دیانت کا دور ہے تو یہ بارہ خلفاء کے دور میں تھا اور ان کے بعد بھی عدالت اور دیانت احسن طریقے پر رہی ہے اور اگر بارہ خلفاء سے مراد متفرق ہے تو عادل لوگ ان بارہ سے زیادہ گزرے ہیں۔

حق یہ ہے کہ ملت کو درجہ بہ درجہ انحطاط اور تغیر لاحق ہوتا ہے۔ جو بات چار خلفاء کے دور میں تھی، وہ دوسروں کے عہد میں نہ تھی اور جو کچھ شام کی حکومت کے دور میں تھا، وہ بعد میں نہ رہا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں طبقوں کو شمار فرمایا اور ان کے بعد کے دور کا زیادہ خیال نہ فرمایا تو یہ دو طبقے بارہ خلفاء میں پورے ہو گئے جو سب کے سب قریش میں سے تھے۔ چار تو خلفائے راشدین ہیں اور حضرت معاویہ، حضرت عبداللہ بن زبیر، عبدالملک اور اس کی اولاد سے چار اور حضرت عمر بن عبدالعزیز۔ پھر رونما ہوا جو کچھ ہوا۔ اسی طرح قربِ قیامت کے سلسلے میں آپؐ نے فرمایا کہ میں قیامت کے آگے بھیجا گیا ہوں۔ اس میں آپؐ نے ان وقائع اور مدت کو شمار نہ فرمایا جو اس سے پہلے ہیں۔

چھٹی اصل یہ ہے کہ نور جس کا ہم نے پہلے نبی الانبیاء نام رکھا ہے، اس لائق تھا کہ خدا پاک کی طرف سے خاص رحمت کے نزول میں حق کا جارحہ بنے۔ ایسی رحمت کہ گنہگاروں کے نفوس کو اچھی طرح گھیر لے۔ ان برائیوں کو بھلائیوں سے بدل دے اور دنیا کی جن خسیسہ ہیئتوں سے ان کے نفوس آلودہ ہو گئے ہیں، یہ رحمت ان کو ہٹا دے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس وقت اللہ تعالیٰ کا جارحہ بننا، اس کا منشاء وہ لطف ہے جو آج کے دن شرائع کے نزول، پیغمبروں کے بھیجنے اور زمین میں اللہ کے شعائر مقرر کرنے کا سبب ہوا لیکن یہ ایک نہایت کامل انسان کی پُرجوش ہمت پر موقوف ہے تاکہ اس کی ہمت پگھلے ہوئے سونے کے قالب کی طرح ہو یا پرندوں کے گھونسلے کی طرح یا جیسے مبہم مادہ کی صورت ہوتی ہے۔ اس کی مثال نفس کلیہ جیسی ہے کہ وہ زمین پر نہیں اترتا اور نہ موالید میں ظاہر ہوتا ہے اور نہ ہی مخصوص قالبوں میں متقین ہوتا ہے مگر انسان کے استعدادات اور صوتوں کی بارش کے ساتھ اس کا نزول ہوتا ہے۔ اسی لئے نفس ناطقہ کے فیضان کے لئے والد کا نطفہ اور والدہ کا رحم شرط قرار دیا گیا ہے اور اسی طرح نفسِ نباتی کے فیضان کے لئے ہوا کا حلول، پانی کا زمین میں ہونا اور بیج کا واقعہ ہونا ان سب کو شرط قرار دیا گیا ہے۔ اسی پر دوسری چیزوں کو بھی قیاس کریں۔

تحقیق اللہ تعالیٰ نے اپنی سابق تقدیر میں یہ مقدر کر رکھا تھا کہ یہ شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے۔ اس دن وہ خدا کی طرف (دعا کی) بڑی رغبت کریں گے۔ ان کی دعا کی وجہ سے اللہ کا جود نبی الانبیاء کے ذریعے برستا رہے گا۔ یہ راز

آپؐ کے نفس مبارک میں پوشیدہ ہوا۔ آپؐ نے اپنی ذات کی معرفت سے اس راز کو بھی جان لیا اور اس سے حشر کے واقعات کا علم بھی آپ کو حاصل ہو گیا اور اس سے یہ بھی ضروری ہو گیا کہ آپؐ تمام انسانوں کے قائد اور امام بنیں اور تمام لوگ حضرت آدمؑ اور ان کے سوا سب لوگ آپؐ کے جھنڈے تلے جمع ہوں اور یہ کہ آنحضرتؐ شفاعتِ کبریٰ کے فاتح ہوں۔ آپؐ کی شفاعت کے لحاظ سے لوگوں میں زیادہ سعادت مند وہ انسان ہوگا جس نے اپنے نفس میں آنحضرتؐ کی محبت کی استعداد اور ملکہ حاصل کیا ہوگا اور آپؐ پر زیادہ درود پڑھا ہوگا۔ آپؐ کے اس کمال سے چار علوم پھوٹ کر نکلے:

ایک علم محاسبہ ہے، محاسبہ کہتے ہیں ان اچھے اور برے اعمال کی اطلاع پانے کو جو نفس کے دامن سے چمٹے ہوئے ہیں اور ان کا اثر نفوس میں نقش ہو چکا ہے اور علم محاسبہ کی دوسری بات یہ ہے کہ ہر عمل کے عذاب یا ثواب والی خاصیت کو بھی معلوم کیا جائے۔ اس دن اس پر اطلاع اس طرح ہوگی کہ نفوس پر جو دنیا کی غلیظ تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں، وہ سب چھٹ جائیں گی تو یہ محاسبہ انسانوں کی وجہ سے اس دن مخصوص ہوگا، باقی اگر حق تعالیٰ کی طرف سے دیکھا جائے تو محاسبہ میں کوئی تجدد نہیں ہے، یہ ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔

جب محاسبہ کا وقت آئے گا تو حکمتِ الٰہیہ کے ہاں یہ ضروری ہوگا کہ مثالی صورتیں ظاہر ہوں جن میں محاسبے کی روح داخل ہو جائے اور اس میں انسان اکبر کی طرف سے تخصیص پیدا ہوگی جیسے انسان اصغر کی طرف سے یہ تخصیص ہوتی ہے کہ اس کے مدرکات میں بزدلی خرگوش کی صورت میں اور غضب شیر کی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔

اہم مثالی صورتیں جن کو پیغمبر علیہ السلام نے بیان فرمایا ہے، چند چیزیں ہیں:

ایک عرضِ اعمال اور اعمال کا ان کے مناسب ذاتی اشکال میں صورت پذیر ہونا۔ یہ صورتیں کسی طرح ان کو لازم ہوتی ہیں جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مال و دولت کی زکوٰۃ نہ دینے والے کے متعلق یہ فرمایا کہ اس کی گردن میں گنجے سانپ کا طوق پڑے گا یا اونٹ اپنے پاؤں سے اس کو روندیں گے اور گائیں اس کو اپنے سینگ ماریں[45] گے۔ غاصب اور خائن کے حق میں بھی اسی طرح آیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ غادر یعنی عہد شکنی کرنے والے کے سُرین پر جھنڈا گاڑا جائے گا[46] اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کا نور ان کے آگے آگے چلے گا[47] یا وہ صورتیں عرضی ہوں گی جیسے چہروں کا روشن ہونا یا سیاہ ہونا اور مؤذن کی گردن کا دراز ہونا، وغیرہ۔

مثالی صورتوں کی دوسری مثال نامۂ اعمال کا پڑھنا، دائیں ہاتھ یا بائیں ہاتھ سے یا پشت کی طرف سے نامہ اعمال کو پکڑنا اور اللہ تعالیٰ کا اس طرح کلام کرنا: کیا میں نے تجھ کو سردار مطاع نہیں بنایا تھا۔[48]

تیسری مثال یہ ہے کہ ہر امت کو حکم ہوگا کہ اپنے اپنے معبود کے پیچھے ہو جائے۔ پھر وہ ان کو جہنم میں گرائے گا اور مومن خاص تجلی کے ذریعہ بچ جائیں گے جس کو انہوں نے اللہ اور اس کی صفات کا صاحب اعتقاد کیا تھا۔

چوتھی مثال میزان کا قائم ہونا اور اعمال کا تولنا، یہاں تک کہ وہ پرچہ جس میں لا الہ الا اللہ ہوگا وہ تولا جائے گا۔

پانچویں مثال چھپی ہوئی خصلتوں کا ظاہر ہونا، جنہوں نے دینی اعمال کی خاص صورت نہیں پائی۔ اس کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک چیز کا حکم فرماتا ہے اور اس کی تعمیل کی جاتی ہے تو اس سے تابعداری اور رجاء وغیرہ ظاہر ہوتی ہے۔

چھٹی مثال پل صراط کا کھڑا ہونا اور دوزخ کے کانٹوں کا ظاہر ہونا تو کچھ لوگ بجلی کی طرح گزر جائیں گے یا ہوا کی طرح یا عمدہ گھوڑے کی طرح اور کچھ پیدل ہوں جو سلامت گزر جائیں گے اور کچھ لوگ زخم کھا کر نجات پائیں گے۔ بعض ایسے ہوں گے جن کو کانٹے اچک لیں گے اور وہ دوزخ میں گر پڑیں گے۔ یہ سب حق تعالیٰ کی طرف سے ماسبہ کی صورتیں ہیں اور نفوس کا اپنے اعمال کی حالت پر اطلاع پانا ہے۔

دوسرا علم نزول رحمت ہے نبی الانبیاء کی راہ سے۔ ہم اس کی حقیقت پہلے بیان کر چکے ہیں اور یہ کئی صورتوں سے متمثل ہو کر ظاہر ہوتا ہے:۔

1- انبیاء، رسل، اولیاء، قرآن اور اعمال کی شفاعت کا ہونا اور انبیاء اور ان کے ساتھی شہداء کا سرکش کافروں سے مخاصمہ کرنا اور جھگڑنا اور ان کا ان سے ہنسی کرنا اور ان کی مصیبت پر خوش ہونا۔

2- حوض کا ظاہر ہونا اور یہ کہ مومن مخلص اس حوض کا پانی پئیں گے اور ان کے سوا دوسرے لوگوں کو اس حوض سے ہنکایا جائے گا جیسے اجنبی اونٹ کو ہنکایا جاتا ہے۔

3- آرام اور تکلیف کا جوہری یا عرضی مناسب صورتوں سے متمثل ہونے کا علم ہے۔

جاننا چاہیے کہ نفس انسانی جب تک دنیا میں ہوتا ہے تو اپنے بنی نوع کی طرح کئی طریقوں سے نفع حاصل کرتا ہے اور آرام پاتا رہتا ہے جیسے اچھا کھانا، اچھا پینا، مرغوب شادی، عمدہ لباس، اچھی رہائش اور دوسرے بھی کئی منافع ہیں جو ایک ایک فرد کے ساتھ مخصوص ہیں۔ آنحضرت ؐ کا یہ قول بھی اسی نوع سے ہے جو آپ ؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جعفر کے لئے ایک لونڈی پیدا کی ہے جو گندم گوں اور سرخ ہونٹ والی ہے۔ یہ اس لئے کہ حضرت جعفرؓ کو گندم گوں، سرخ ہونٹوں کی طرف رغبت تھی۔ پیغمبر علیہ السلام کا اونٹ اور گھوڑے کے متعلق فرمانا بھی اسی قسم سے ہے۔ تب کوئی ایسی آرام دہ حالت جو ہمارے خواب میں وہ انس، انشراح اور اطمینان کا لباس پہن کر آئے گی تو ایسی حالت مومن کو جنت میں عطا کی جائے گی اور اسی طرح کوئی تکلیف دہ حالت جس سے نفرت، وحشت اور تنگ دلی پیدا ہوتی ہے۔ ایسی حالت کافر اور منافق کو دوزخ میں دی جائے گی۔ یہ مجمل کلمہ تھا جس کی نبی ؐ نے اچھی طرح شرح فرمائی۔

چوتھا علم، لوگوں پر جنت کے ایک ٹیلے پر اللہ تعالیٰ کی تجلی ہے۔ یہ ایک ایسا عطیہ ہے جو لوگوں کو ان کے عمل کی وجہ سے عطا نہیں ہوا بلکہ انہوں نے کسب کو چھوڑ کر وہبی اور جبلی بخشش سے حاصل کیا ہے۔ یہ عطا ان پر اس لئے ہوئی ہے کہ ان کو نفسِ انسانی عطا ہوا ہے اور اچھی صورت پر ان کی پیدائش ہوئی ہے، ہاں اعمال کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ موانع کو ہٹاتے ہیں اور حجابات کو اٹھا لیتے ہیں، اسی لئے نبی ؐ نے فرمایا کہ تحقیق تم اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جس طرح چاند کو دیکھتے ہو، پھر اگر تم میں سے کوئی یہ طاقت رکھتا ہے کہ صبح اور عصر کی نماز نہ چھوڑے (اور اس پر دوام کرے) تو یہ عمل کرو!

جاننا چاہیے کہ نبی ؐ نے اللہ کی ذات میں سوچنے کو ہمارے لئے مباح نہیں فرمایا بلکہ اس سے منع فرمایا ہے کہ ''خالق میں تفکر نہ کریں'' اور یہ بھی فرمایا کہ ''رب تعالیٰ کی ذات میں سوچنا نہیں ہوتا'' اس نہی میں اللہ کی صفات کی بحث بھی داخل ہو گئی یعنی اللہ کی صفات کے حقائق کا بیان اور صفات کے ساتھ ذات کے متصف ہونے کی کیفیت کہ سمع و بصر دونوں غیر علم ہیں یا عین علم ہے۔ کلام نفسی ہے یا کوئی دوسری شے ہے۔ اسی پر دوسرے مباحث کو بھی قیاس کریں۔ باقی کچھ چیزیں

ضرور ایسی ہیں جن کو نبیؐ نے عرب وعجم کے نفوس ادراک کرتے ہوئے پایا اور وہ ان صفات سے رب تعالیٰ کی توصیف کرتے ہیں۔ تعظیم و تقدیس، تنزیہ اور تشبیہ کے ساتھ جیسے یہ کہنا کہ اللہ کو مخلوق پر قدرت حاصل ہے، وہی اس دنیا کا نظام چلاتا ہے اور اس کی مانند (دوسری عبارتیں بھی ہیں)

جب آپؐ نے دیکھا کہ لوگوں کا کمال ان ہی چیزوں کی معرفت کے سوا کامل نہیں ہوگا اور آپؐ نے یہ بھی دیکھا کہ لوگ ہر زمانے میں ان ہی اوصاف سے رب تعالیٰ کی توصیف کرتے آرہے ہیں، اس لئے آپؐ نے بھی اللہ تعالیٰ کے واقعات اور نعمتوں کی تذکیر کی اساس ان ہی اوصاف پر رکھی اور اپنے کلام مبارک میں ان کو استعمال فرمایا جیسے وہ استعمال کرتے تھے۔ آپؐ نے ان کی حقیقتوں کی شرح اور کنہ کے بیان کرنے سے گریز فرمایا اور تشبیہات کے استعمال سے بھی آپ پیچھے نہ رہے جیسے ہاتھ پیر اور (ضحک) ہنسنا۔ وہ قرون جو پیغمبر علیہ السلام کے فرمود کے مطابق خیر القرون ہیں، وہ بھی اسی طرز پر گزریں، بعد میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے اپنا نام ''اہل سنت'' رکھا۔ حالانکہ سنت ان سے کئی منزلیں دور ہے۔ انہوں نے بے فائدہ باتوں میں کلام کرنا شروع کر دیا اور ایسی بات کہنے لگے جو نبیؐ نے نہیں کہی تھی۔ خدا اس عام مصیبت سے پناہ میں رکھے اور اللہ ہی سے مدد طلب کی جاتی ہے۔

وہ معجزات جو ہمارے نبیؐ کے ہاتھوں ظاہر ہوئے ان کے وہ اصول جن کی طرف وہ معجزات رجوع ہوں بلکہ جو کرامتیں جملہ کامل لوگوں کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوتی ہیں، ان کی بھی اصل کئی چیزیں ہیں!

ایک بخت ہے۔ اس کی تحقیق یہ ہے کہ انسان کے نفوس میں ایک نطفہ ہے جس کی طرف سب نفوس کھنچ کر آتے ہیں اور وہ ان پر غالب آتا ہے اور ان کو اپنی طرف اس طرح کھینچتا ہے جس طرح مقناطیس لوہے کے اجزا کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ پھر اگر قوی سعادت والا ہوتا ہے تو وہ اس کو واجب قرار دیتا ہے کہ اس کے نفس میں اور اس کے ارد گرد میں جو لوگ ہیں، ان کے نفوس میں بلکہ بہائم اور ملائکہ میں بھی ایسے خیالات ڈال دیئے جاتے ہیں جو اس کی رفاہیت (آرام) اور رفاقت کی رغبت دلائیں اور اگر وہ شقاوت اور بدبختی میں قوی ہوتا ہے تو وہ اس کو واجب کرتا ہے کہ اس کے نفس میں اور اس کے ارد گرد جو انسان، ملائکہ اور بہائم ہوں، ان سب کے نفوس میں ایسے خیالات ڈال دیئے جاتے ہیں جو اس کو تکلیف میں ڈال دیں اور بلا میں پھنسائیں۔

میں نے یہ بہت دیکھا ہے کہ ایک شخص کی ہلاکت کے لئے قضا منعقد ہوئی تو یہ قضا اسباب کی طرف اس طرح چلی جیسے گھاس والی زمین میں پانی بہتا ہے یا سورج کا نور پھٹے ہوئے پردے سے۔ وہاں موجب اور مانع کے وزن کی رعایت کی جاتی ہے۔ پھر اگر گھاس یا کوڑا پانی کے چلنے کو روکتا ہے اور پردہ نور آفتاب کی رعایت کی جاتی ہے۔ پھر اگر گھاس یا کوڑا پانی کے چلنے کو روکتا ہے اور پردہ نور آفتاب کے نفوذ کو منع کرتا ہے تو دونوں کا چلنا حسب امکان ہوتا ہے۔ اسی طرح قضا بھی حتی الامکان قریب تر جگہ کی طرف چلتی ہے۔ پھر اگر وہاں نشیبی زمین ہوگی اور ایک شخص کا اس میں گرنا نظام (اسباب) سے بعید نہ ہوگا تو قضا اس کی طرف چلے گی اور پھر اس شخص کے دل میں اس جگہ کے قریب چلنے کا امکان پیدا ہوگا اور وہاں پہنچ کر اس کا پیر پھسل جائے گا تو اسی میں اس کی موت واقع ہوگی اور اگر وہاں اس کا کوئی دشمن ہوگا اور اس کی خصومت دور نہیں تو قضا اس کی طرف چلی تو دشمن کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس سے لڑے یا اس شخص کو غصہ ہوا اور

غصے میں دشمن کو گالیاں دیں تو اس کا نتیجہ اس کی ہلاکت کا نکلا اور اگر وہاں کوئی چار پایہ ہے تو قضا اس کی طرف چلی۔ اس چار پایہ نے اس کو لات ماری یا اسے اپنے منہ کے جبڑوں سے کاٹ کر کھایا اور اسی میں اس شخص کی موت واقع ہوئی اور اگر اس دن ملائکہ کا الہام قریب تھا تو قضا ان کی طرف چلی تا کہ ملائکہ اس کام کو پورا کریں جو پہلے ہی ہو چکا ہے۔ ہر شئے کے لئے ان اسباب میں سے اسباب ہوتے ہیں جو اس شئے کو واجب اور ضروری بنا دیتے ہیں۔

بخت اکثری اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ ہم نے بارہا یہ مشاہدہ کیا ہے کہ بعض لوگوں کے نفس میں روشن ستارے کی طرح ایک چمکدار نقطہ ہوتا ہے جس سے کئی شعاعی خطوط نکلتے ہیں جو لوگوں، ملائکہ اور بہائم کے نفوس میں نفوذ کرتے ہیں۔ جب ادھر سے تاثیر اور ادھر سے اثر قبول کرنا ہوتا ہے تو یہ اس کے ساتھ احسان کرنے کے ارادے کو ضروری قرار دیتا ہے اور اس کی محبت سے دل بھر جاتا ہے۔

اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی انسان کے نفس میں نقطہ تو ہوتا ہے لیکن اس میں کافی تابانی اور چمک نہیں ہوتی۔ پھر وہ اسماء الٰہیہ کی طرف توجہ کرتا ہے اور اس کے مانند دوسرے کام کرتا ہے تو اس کے نفس کا نقطہ بہت ہی چمک جاتا ہے۔ اسی جہت سے رسول اللہؐ اول سے لے کر جس وقت پیدا ہوئے اور جب اپنی دایہ کے پاس دودھ پیتے تھے تو آپؐ کے لئے جہاں ہوں، رحمت، رفق اور لطف ظاہر ہوتے تھے اور آپؐ کے دوست ہمیشہ فتح پاتے تھے اور آپؐ کے دشمن خوار ہوتے تھے اور جو چیز آپؐ کو تکلیف دہ ہوتی تھی، اس کو آپؐ سے ہٹایا جاتا تھا۔ اس میں آپؐ بڑھتے گئے یہاں تک کہ اس مرتبے کو پہنچے جہاں پہنچے۔

دوم یہ کہ آپؐ اچھی صورت اور معتدل مزاج میں ایسے وقت پیدا ہوئے کہ اس میں ستاروں کی قوتوں کا سعید اجتماع ہوا تھا جو آپؐ کے لئے بڑی بزرگی، غلبہ اور عرب و عجم کے لئے آپؐ کی امامت کا متقاضی تھا کہ لوگوں کو ان کی اطاعت کے لئے کھینچ کے لایا جائے اور آپؐ کی طرف جو ملت منسوب ہو، وہ قیامت تک باقی رہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر شئے میں یعنی انواع، اشخاص اور ہیئات میں کوئی اثر اور خاصیت ودیعت رکھی ہے۔ اچھے نظام کی کسی بھی چیز کو اس کے اثر اور خاصیت (کے اظہار) سے نہیں روکا جاتا۔ آپؐ کی اس فضیلت اور خاصیت نے اس کو ضروری قرار دیا کہ آنحضرتؐ سب سے جمیل (خوبصورت) ہوں اور خلق میں سب سے کامل اور سب سے زیادہ بہادر ہوں اور سخاوت، علم، عدالت اور فصاحت میں سب انسانوں سے بڑھ کر ہوں اور آپؐ ایسی قوم سے پیدا ہوئے جو عرب میں اشراف اور برگزیدہ لوگ تھے۔

جن لوگوں کو حظیرۃ القدس کے فیصلوں کی معرفت کے سلسلے میں تھوڑا بھی لگاؤ تھا، جیسے کاہن لوگ، جن، نجومی اور اس قسم کے دوسرے لوگ یہ سب شروع سے اپنے علم اور فن سے یہ جانتے تھے کہ (آخری دور میں ایک بزرگ پیدا ہوگا) جس کے حق میں یہ سب چیزیں اور فضائل مقدر ہو چکے ہیں۔ آپؐ سے پہلے جو انبیاء اور ان کے تابعدار راہب اور عرب کے عبادت گزار تھے، وہ تو آپؐ کی آمد اور آپؐ کے فضائل سے پورے طور باخبر تھے۔

یہ دونوں خصلتیں ایسی ہیں جن میں آنحضرتؐ کے ساتھ عادل بادشاہوں میں سے جو اچھے اخلاق اور بخت سعید کے صاحب تھے، وہ بھی اپنی استعداد کے موافق شرکت رکھتے ہیں۔

پھر کوئی ایسا شخص کم ہوگا جو حکومت کا مؤسس ہو اور اس کے اوپر جیسے غیر معمولی کارنامے نہ ہوں اور اسی طرح اخلاق میں جو کامل انسان ہوتا ہے اور اس کی پیدائش کے وقت ستاروں کی اچھی قوتوں کا اجتماع ہوتا ہے تو اس شخص سے بھی اسی قسم کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔

سوم یہ کہ آنحضرت ﷺ مفہم من اللہ تھے۔ گزرے ہوئے اور آنے والے واقعات کی خبروں کو جس قدر اللہ کی مشیت ہوئی، آپ غیب سے حاصل کر لیتے تھے کیونکہ آپؐ کے اندر کی تختی ان آلائشوں سے صاف تھی جو زنگ باطن کے موجب ہوں اور جس واقعے کی صورت حظیرۃ القدس میں ثابت ہوئی ہے، اس کے انطباع کو روکیں، اس کا راز ہم نے پہلے بیان کیا ہے۔ پھر کبھی آپؐ کے لئے کوئی چیز خواب میں متمثل ہوتی تھی جس کی حقیقتِ حال پر تعبیر کے ذریعے آپ کو اطلاع ہو جاتی تھی اور بلا واسطہ بھی آپؐ جانتے تھے، کبھی تھوڑی دیر کے لئے آپ کی بیداری میں کوئی چیز متمثل ہو کر آتی تھی اور پھر جلدی مٹ جاتی تھی۔ یہ (اصل میں) رنگ اور شکل وغیرہ کی طرح تھی، کبھی کوئی مَلک انسانی صورت لے کر آپؐ کے پاس آتا تھا اور آپؐ سے ایسی باتوں سے مخاطب ہوتا تھا جن کو آپؐ یاد کر لیتے تھے۔

علم کی اس قسم کے لئے جس کو اللہ تعالیٰ نے واقعات کی تاویل کا علم عطا کیا ہے، اس کو دو باتوں میں تامل کرنا ضروری ہے کہ جو واقعہ وہ دیکھ رہا ہے، اس کی دوسرے واقعات اور حوادث سے امتیاز کرنا ضروری ہے کہ یہ حادثہ اس کے لئے کیوں منکشف ہوا اور دوسرے نہ ہوئے۔ یہ تمیز کئی طریقوں پر ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ نفس کو اس کی طرف ظاہر میں اشتیاق پایا جاتا ہے جیسے کسی شخص کو ایسی چیز پلائی جائے جس کی وہ توقع رکھتا ہو یا ان کے اندر (اس کے لیے) چھپا ہوا شوق ہو جیسے کوئی محتاج آدمی غنا کی طرف مشتاق ہوتا ہے لیکن وہ اپنے کسب اور حیلوں سے غنا کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس میں یہ ضروری نہیں کہ اس ساعت میں اس کے ذہن میں ان باتوں کا کوئی معمولی تصور بھی ہو۔ تمیز کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ملاء اعلیٰ میں اس حادثے کی صورت کا انطباع قوی طور پر ہوا ہے۔ پھر کوئی ایسا انسان جس کو ملاء اعلیٰ تک رسائی ہوگی تو اس کے ذہن میں اس حادثے کی کسی جھلک کا ہونا ناگزیر ہے اور یہ صورت بڑے واقعات میں ہوتی ہے جیسے کسی حکومت کا پیدا ہونا اور دوسری حکومت کی ہلاکت، عام قحط اور وبا وغیرہ کا ہونا۔ جب یہ صورت ہوتی ہے تو قوم کے خواب اور مکاشفات اس سے موافق ہوتے ہیں۔ تیسری وجہ حق تبارک وتعالیٰ کی تدبیر ہے اور تدبیر یہ چاہتی ہے کہ اچھا نظام اس وقت مکمل ہوتا ہے جب اس کی استعداد رکھنے والے کے دل میں اس کا علم رکھا جائے۔ اس لئے فرعون ہی نے خواب میں قحط دیکھا کہ اس کو اپنے کام میں بصیرت پیدا[49] ہو۔ کسی کے قلب میں علم کے اس بہاء اور فیضان کے لئے دو رکنوں کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ نفس اس کے لئے مستعد ہو اور دوم اللہ کا جود اور اس کی رحمت کا فیضان ہو۔ ان دونوں رکنوں کا اجتماع مختلف وجوہ سے ہوتا ہے۔

ایک یہ کہ اس میں جود، استعداد پر غالب ہوتا ہے اور یہ ان علوم میں ہوتا ہے جن کے ساتھ جمہور کی اصلاح وابستہ ہوتی ہے یا ایک قوم یا کسی شخص کی صلاح کا مدار اس پر ہوتا ہے۔

دوم یہ کہ اس میں استعداد جود سے زیادہ ہوتا ہے اور یہ کہ ان علوم میں ہوتا ہے جن کا لوگوں کی اصلاح کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ پہلا علوم انبیاء علیہم السلام کا منشا ہوتا ہے اور وہ مطلق صادق ہوتا ہے۔ اس سے لوگوں کو مکلف بتانا صحیح ہوتا ہے اور دوسرا اولیاء کے علوم کا منشا ہوتا ہے اور وہ ایک حال کے لحاظ سے سچا ہوتا ہے اور دوسرے حال کے نہیں اور کسی

نفس میں صادق ہوتا ہے اور کسی میں نہیں ہوتا۔

علماء جو انبیاء کے ورثا ہیں، وہ اس سے مستثنیٰ ہو سکتے ہیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک نفس سے کسی مخصوص واقع کی مناسبت ہوتی ہے۔ پھر کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی اصل فطرت کی جزئی حوادث سے مناسب ہوتی ہے اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جن کی اصل فطرت بڑے امور سے مناسبت رکھتی ہے۔

دوسری چیز (جس میں تاویل احادیث کے عالم کو سوچنا ضروری ہوتا ہے) یہ ہے کہ نفس کی دنیوی موانع سے خلاصی چند مخفی اسباب کی بنا پر ہوتی ہے۔ بعض مشغولی تو اصل نفس کے آرام کا باعث بنتی ہے اور نفس (ایسی حالت میں) صرف آرام میں مشغول رہتا ہے اور کبھی (کسی چیز) میں رغبت پیدا ہوتی ہے تو وہ اس میں غور وفکر کی طرف پہنچاتی ہے اور کبھی مزاحمت ہوتی ہے تو پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔

ان امور میں یہ بھی آپؒ کے نفس اور اس کے جمیع متعلقات کو عظیم برکت عطا ہوئی تھی۔ برکت کی حقیقت یہ ہے کہ ملاء اعلیٰ کی رحمت، دعاؤں اور رضا سے ایک وسیع سبب بندے کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور وہ سبب اس کے نفس کے ساتھ مل جاتا ہے۔ اس سے طبعی اسباب میں بسط پیدا ہوتا ہے۔ پھر عادت میں نفسانی حالت کبھی ایسی ہوتی ہے کہ جس سے انسان کو بھوک کا احساس نہیں ہوتا اور بدن کے اجزاء حرارت غریزی کی وجہ سے نہیں گھٹتے۔ جیسے طبیعت کا کسی بیماری کو دفعہ کرنے میں مشغول ہونا یا شرمندگی، خوف، حمیت وغیرہ کا احساس، اس حالت کی لیاقت خود نفس اور بدن سے ہی پھوٹتی ہے۔ پھر جب برکت نازل ہوتی ہے اور اس استعداد سے مل جاتی ہے تو ایک بڑی مدت تک عقل کی مقتضا سے زیادہ قوت سے بدن میں اس کو روک دیتی ہے اور برکت والا انسان جب اس اثر کے ظہور کا ارادہ کرتا ہے تو صمد اور قدوس جیسے اسماء حسنہ کے ذکر سے تمسک کرتا ہے تاکہ اپنے نفس کو اس نفسانی حالت کی طرف متوجہ کرے یا برکت کو اس صورت میں تشخیص کردے۔

بعض نفسانی حالات عادتاً ایسے ہوتے ہیں کہ اس سے حملہ کرنا، نیند اور بے خوابی جیسی کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں۔

جیسے دل کا انبساط، حمیت، رغبت، خوف وغیرہ کا پیدا ہونا۔ اس حالت کے لئے ایک استعداد کا ہونا ضروری ہے۔

جب یہ برکت نازل ہوتی ہے تو اگر اس استعداد سے آکر مل جاتی ہے تو اس کے حملے اور بے خوابی کو کئی گنا بڑھا دیتی ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنے ساتھ اور دوست کے افعال اور ہیئات کو دیکھتا ہے تو ان سے اس کو ایسے پوشیدہ امور کی معلومات حاصل ہو جاتی ہے جو اس کے سوا کسی دوسرے کو نہیں ہوتی اور نہ اسی کو خود کسی دوسری حالت میں ایسی معلومات حاصل ہو سکتی ہے اور اس حالت کے لئے ایک استعداد ہوتا ہے۔ جب اس استعداد سے برکت کی ملاقات ہوتی ہے تو خلاف عادت، فراست کو واجب اور ضروری قرار دیتی ہے۔ ہر نفس میں اپنے رب تبارک وتعالیٰ اور اس کے شعائر میں اعتقاد رکھنے کی ایک صورت ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کے قلب کو جس چیز کے ساتھ لگاؤ ہوتا ہے تو اس کی بھی کوئی شکل اور صورت ہوتی ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب وہ اپنی پوری ہمت کے ساتھ اس اعتقاد کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ اعتقاد کسی نہ کسی شکل اور صورت میں نمودار ہوتا ہے اور یہ اکثر تو خواب میں ہوتا ہے اور کمتر بیداری میں بھی ہوتا ہے۔ پھر اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس استعداد کے وقت اس کے ساتھ برکت مل جاتی ہے۔ تب وہ ایسی تجلیات اور مبشرات کو ضروری قرار دیتی ہے جس کے اردگرد عام لوگوں کی پہنچ نہیں ہوتی۔

خلاصہ یہ کہ خبر کے لحاظ سے متواتر معجزوں میں سے ایک معجزہ یہ ہے کہ نبیؐ کسی طعام یا پانی پر دعا فرماتے تھے تو اس میں بہت برکت پیدا ہو جاتی تھی۔ اس کی یا تو یہ صورت ہوتی تھی کہ صرف شئے کا نفع بڑھ جاتا۔ پھر وہ شئے زائد نفع کی جگہ لے لیتی یا وہ خود شئے بھی بڑھ جاتی اور اس کا مادہ ملاء اعلیٰ کی ہمتوں کے انوار کا مطیع ہو جاتا اور پھر وہ پانی اور طعام کی شکل اختیار کر لیتا۔ عادت میں اس کی نظائر موجود ہیں۔ ان دونوں خصلتوں میں اولیاء بھی آپؐ کے ساتھ شریک ہیں۔ اس لئے اولیاء کے مناقب کی کتابیں اس قسم کی کرامات سے تجھے پُر دکھائی دیں گی۔

مثلاً کشف، دل کی بات بتانا، ہاتف، دعا کا مستجاب ہونا وغیرہ۔

دوسرا معجزہ یہ ہے کہ قلیل الوقوع اسباب کی بنا پر کم واقع ہونے والے واقعات ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کو خوارق (عادت کے خلاف امور) کہا جاتا ہے۔ حق یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس کو خرق یا عادت کے خلاف کہا جاتا ہے، وہ فی الحقیقت امور عادیہ سے ہوتی ہے لیکن جبکہ اس کے اسباب کم واقع ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کا ظہور بھی کم ہی ہوتا ہے اور عام لوگوں کو ایسی چیزوں کی توقع نہیں ہوتی اس لئے ان کو خوارق (عادت کے خلاف امور) کہا جاتا ہے۔ امر خارق کے لئے اکثر طور پر نظیر ہوتی ہے جو لوگوں کے ہاں مالوف ہوتی ہے یا امر خارق سے بھی خارق عادت میں اتم ہوتی ہے لیکن اس کی طرف عام لوگ التفات نہیں کرتے اور لوگوں کی زبان پر اس کا عام ذکر ہوتا اور اس کو تواریخ میں درج کرتے ہیں۔ جیسے معمولی مدت میں پانی کا سنگ مرمر بن جانا تو اس کی طرف (عامتہ الوقوع ہونے کے سبب) التفات نہیں کرتے لیکن ایک جسم سے کوئی دوسرا جسم بن جائے جس کی ان کی توقع نہ تھی اور نہ وہ ان کو معلوم تھا تو اس کو بڑا کارنامہ خیال کرتے ہیں۔

کبھی کوئی چیز ایک جنس میں خلاف عادت شمار کی جاتی ہے تو دوسری جنس میں اس کو ایسا نہیں سمجھا جاتا جیسے گہری فراست، بڑی مسافت کو کم مدت میں طے کرنا مختلف صورتیں اختیار کرنا اور دوسرے کے نفس میں تاثیر کرنا، یہ سب ایسی چیزیں ہیں کہ جنوں میں مالوف میں اور ان کی طرف سے کچھ بھی تعجب کی باتیں نہیں ہیں لیکن ان میں سے اگر کوئی ایک چیز بھی انسان سے صادر ہوتی ہے تو اس کو بہت بڑی چیز سمجھا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس قسم کے واقعات ظاہر ہوتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء میں سے کسی نبی کے لئے کسی وجہ سے ان کو معجزہ کرتا ہے جس کی یہ صورت ہوتی ہے کہ نبی اس واقعے کے ظہور سے پہلے ہی اس کی خبر دے دیتا ہے یا وہ حادثہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ سنت مجازات وغیرہ کے موافق ہوتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے عاد اور ثمود کی قوم کو ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک و برباد کیا جو وہ موجب ہلاک تھے۔ پھر اس کو اللہ تعالیٰ نے ہود اور صالح علیہما السلام کے لئے معجزہ کر دیا۔ ایک ایسے عالم نے (جس کو حدیث الحکمت طبیعی کی معرفت ہے) فرمایا ہے کہ چاند کا شق ہونا مذکور معجزہ کی قسم ہے کیونکہ یہ بھی قلیل الوقوع حادثہ تھا۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے قرب قیامت کی علامت قرار دیا ہے اور شق القمر کو ہمارے نبیؐ کے لئے اس لحاظ سے معجزہ بنایا کہ لوگوں نے آپ سے ایک علامت (معجزہ) کا سوال کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ ہم ان کو جلد نشانی دکھائیں گے۔ جب چاند دو ٹکڑے ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ دکھایا (اس میں) یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کے دو ٹکڑے ہونا حقیقی چاند میں ہوا ہو بلکہ ہو سکتا ہے کہ یہ واقعہ دھوئیں کی طرح یا ستارہ گرنے یا کسوف اور خسوف سے لوگوں کو جو (اور فضا) میں دکھائی دیتا ہے۔ پھر ان کے لئے عربی لغت میں وہ لغت استعمال کیے گئے جو فی الواقع ان چیزوں کے لئے وضع

کیے گئے ہوں اور قرآن لغت عربی میں نازل ہوا ہے۔ اس کی نظیر وہ ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ذکر کیا ہے اور ان کی اقتدا تیرے لئے کافی ہے۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ لوگوں کو قحط سالی نے گھیر لیا اور جب وہ دیکھتے تھے تو (بھوک کے مارے) ان کو آسمان میں دھواں دیکھنے میں آتا تھا۔ اس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔

(ترجمہ) ''یاد کر، جب آسمان سے دھواں نمودار ہوگا۔''(50)

ابن ماجشوں نے (جو کہ آئمہ ہدایت میں سے ایک امام ہیں) فرمایا ہے کہ قیامت کے دن ایک صورت سے دوسری صورت میں خدا پاک کی تحویل نہ ہوگی لیکن لوگ ظاہر میں اس کو مختلف صورتوں میں مشاہدہ کریں گے۔ ابن ماجشوں نے یہ بھی کہا ہے کہ میرے رائے میں اس حادثے کا سبب پانی کے صاف ملے ہوئے اجزا کا ایک سطح کی طرح جمع ہونا ہے جس کے عقب میں جبل یا گاڑھا بادل ہو اور یہ آئینے کی طرح بن جاتا ہے جس میں چاند کا عکس پڑے تو لوگ اس کو جو میں دو چاند دیکھیں گے۔ کبھی وہ منطبع ہوتا ہے جو آسمان میں نہیں ہوتا اور کبھی اصلی چاند چھپ جاتا ہے اور جو میں دو ٹکڑے نمودار ہوتا ہے اور اس کی مثال چاند گرہن سورج گرہن اور ستارے کے گرنے کی ہے۔ بے شک نص میں آیا ہے کہ یہ سب آیات ہیں۔

میں (شاہ صاحب) کہتا ہوں کہ میں نے مذکور قول کو بطور امکان اور احتمال کے ذکر کیا ہے ورنہ تو اللہ کی قدرت بڑی وسیع ہے۔ والعلم عنداللہ تعالیٰ۔

تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ اس مسئلے اور اس کے مشابہ متشابہات میں جیسے خدا کے لئے ہاتھ کا ہونا پیر کا ہونا اور قیامت کی دوسری چیزوں میں راہِ راست یہ ہے کہ ان کے ظاہر کو دیکھا جائے اور ان کے وجود کی کیفیت میں مشغول نہ ہوں، بہرحال یہ اعتقاد رکھے جو کچھ اللہ اور اس کے رسولؐ نے ارادہ فرمایا ہے، وہ حق ہے، مقصد کے تعین یا عدم تعین میں کوئی بھی رائے ظاہر نہ کرے۔ تم اس طرح دیکھو گے کہ نبیؐ، آپ کے صحابہؓ اور ان کے پیروکار، تابعین یہ سب اس بحث میں نہیں پڑتے تھے۔ جب معتزلہ نے فلسفیوں کے علوم کو چرایا تو وہ ان مباحث میں مشغول ہوگئے اور اہل سنت نے پھر اس کو معتزلہ سے لیا تو یہ بات ان میں بھی آ گئی۔ ہم نے اپنے بعض کلام میں فلسفیوں سے معتزلہ کی چوری اور پھر اہل سنت کی معتزلہ سے چوری کی ایسی وضاحت کی ہے کہ اس سے زیادہ وضاحت نہیں ہوسکتی، تمہیں اس کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

دنیا میں جو عجیب واقعات ہوتے ہیں ان کے جملہ اصول پر ہم کو تجھے آگاہ کرنا چاہیے۔ جاننا چاہیے کہ ہمارے نزدیک تمام عالم ایک شخص کی طرح ہے۔ اس کا ایک بدن ہے اور ایک نفس ہے جو اس سے متعلق ہے اور اس کے بدن کے لئے نفس کی تدبیر کا انتظام بھی ایک ہی طرح کا ہے۔ موالید اربعہ، معدن، نبات، حیوان اور انسان میں جو حوادث رونما ہوتے ہیں، ان سب کی مثال آئینہ میں عکس کی مثال ہے۔ عناصر میں ستاروں کے قوتوں کے اتصالات کی صورت کا عکس پڑتا ہے۔ کسی دوسری چیز کا عکس نہیں پڑتا اور جس طرح آئینے کی صورت منطبعہ یا عکس میں صورت اور ذی صورت دونوں کا حکم جمع ہوتا ہے تو اسی طرح حوادث میں بھی ستاروں کے اتصالات اور عناصر دونوں کا حکم جمع ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ جب انسان کسی بھی آئینے میں دیکھتا ہے تو اس سے آئینے کے اندر انسان کی صورت کا ہی عکس آتا ہے۔ اس میں گھوڑے وغیرہ کا عکس نہیں آتا اور اس سے انسان کے سر، ہاتھ پاؤں، آنکھوں، کانوں اور ناک وغیرہ کی شکل آتی ہے۔ دُم، سونڈ، کندھوں کے بال، سینگ اور کُھروں کی صورت نہیں آتی اور جب کوئی شے آئینے کے سامنے ہوتی ہے

تو آئینے کے موافق ہی اس میں عکس پڑتا ہے۔ اگر آئینے کا عرض اس کے طول سے زائد ہے یا طول اس کے عرض سے زائد ہے یا آئینہ مثلث ہے یا سرخ رنگ کا ہے یا سبز رنگ کا ہے تو اس میں عکس بھی ویسا ہی پڑتا ہے۔ تب رائی (دیکھنے والے) اور آئینہ کے لئے ایک کلی حکم ہے اور دونوں ایک خاص چیز پر صادق آتے ہیں۔ حوادث کو بھی اسی طرح تصور کیا جائے، لہٰذا اس کی حقیقت کو وہ انسان واضح کر سکے گا جو کہ ارضی طبائع اور اس کے خواص کے علم کا احاطہ رکھتا ہو۔ پھر حوادث میں اس کا محافظ ہو تو وہ وہاں ایسا قبض اور بس پائے گا جن کے ساتھ زیریں اسباب کی موافقت نہ ہوگی تو وہ لامحالہ فلکی اسباب کے ثابت کرنے کی طرف محتاج ہوگا اور ایسے شخص کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ستاروں اور ان کے ایسے کامل حکم کا بھی احاطہ کرتا ہو کہ اگر موانع نہ ہوں تو یہ حکم محقق ہو جائے۔ پھر وہاں بھی اسے قبض و بسط کو پائے گا کہ وہ موالید کے خواص کے اثبات کے لئے مجبور کر دیں گے اور جب تم نے ہماری مذکورہ بات کا یقین کر لیا تو اب وقت ہے کہ ہم دوسرے سبب کا بھی ذکر کریں۔

جاننا چاہیے کہ ان دو سببوں کے علاوہ ایک تیسرا سبب بھی ہے جو کلی جسم کے لئے نفس کلیہ کی تدبیر کے انتظام سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کی مثال انسان کی ہے اس کے لئے احکام ہوتے ہیں جو نوع سے پھوٹتے ہیں۔ یہ احکام اس کے جمیع افراد میں موجود ہیں۔ تب ہر فرد انسانی کا راست قدم صاف چمڑی، ناخن عریض ضاحک اور ناطق ہونا ضروری ہے اور اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ پہلے جنین، بچہ، پھر لڑکا ہو۔ اس کے بعد غلام، جوان، ادھیڑ عمر والا، پھر بوڑھا اور آخر میں بڑھا فرتوت ہو۔ پس جب طفل ہوتا ہے تو اس کا مزاج تر اور عقل کمزور ہوتی ہے اور جب جوان ہوتا ہے تو اس کا مزاج خشک اور عقل قوی ہوتی ہے۔ پھر جب بوڑھا ہوگا تو اس کی اکثر قوتوں میں ضعف پڑ جاتا ہے اور اس پر رطوبت کا غلبہ ہوتا ہے۔ مرد، عورت سے زیادہ غیرت مند، زیادہ بہادر اور زیادہ عقلمند وغیرہ ہوتا ہے۔

یہ سب احکام صورت نوعیہ سے پھوٹتے ہیں کیونکہ صورت نوعیہ ہی ان سب میں حکم کلی کا تقاضا کرتی ہے جس میں حکم کا ظہور ہوتا ہے۔ ہم نے جو کچھ بیان کیا یا اس کی طرف اشارہ کیا یہ سب اس حکم کی تفصیل ہے۔ اس لئے ہر نوع کے لئے مختلف حکم ہوتا ہے اور کسی بھی نوع کا فرد اس حکم سے پیچھے نہیں ہوتا۔

ہاں صرف ایک صورت میں یہ ہو سکتا ہے جہاں مادے کی نافرمانی ہو۔ اسی طرح صورت اولیٰ یعنی نفس کلیہ کے لئے بھی بدن، اعضا اور قوتوں میں حکم جاری ہوتا ہے جو کبھی ان سے جدا نہیں ہوتا، اس کا ایک حکم یہ ہے کہ جب نوع انسان موجود ہو اور اس کا مادہ جو کہ صفات کے لحاظ سے مختلف ہے، صورت کو قبول کرے تو یہ ضروری ہوتا ہے کہ (اس نوع کے) افراد کے احکام مختلف ہوں۔

ان میں سے کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں کہ انسانیت کے طبقے سے نکل کر ملکیت اور تجرد بحت کی طرف نہیں جاتے اور نہ ہی طبعی کدورتوں میں ڈوبے رہنے سے دور ہوتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ انسانیت سے بہیمیت، محض آلودگی اور ملکی نظافت سے دور رہنے کی طرف نہیں نکلتے۔

یہ ضروری ہے کہ ان دونوں اقسام کے رنگ حظیرۃ القدس میں منطبع ہوں جہاں نفس کلیہ سے اس کے بدن کی طرف تدبیر اترتی ہے اور ضروری ہے کہ ان الوان کا حظیرۃ القدس میں منطبع ہونا وہاں اترنے والے فیض کو ایسے رنگ کے

ساتھ متلون کردے کہ وہ رنگ حکم صریح معتدل سے کسی قدر مخالفت رکھتا ہو۔ اسی طرح اوپر چڑھنے اور نیچے اترنے میں یہ امر دائر رہتا ہے یہاں تک کہ اس نوع کے ختم ہونے کا فیصلہ اترے بلکہ جملہ حیوانات اور نباتات ختم ہو جائیں۔ پھر قضا ایسے فلکی اتصال اور ارضی ہیئت کا انتظار کرتی ہے جو یہ دونوں اس (فنا) کا تقاضا کریں۔ جب یہ ہوگا تو قیامت کا ہونا بھی ضروری ہوگا۔ یہ حکم ہے نفس کلی اور ترتیب کا جس کو وہ مقتضی ہے۔ اسی طرح جب اکثر انسان شیطنت اور بہیمیت کو اختیار کرتے ہیں اور ان کے شر کو کوئی روکنے والا اور جابر نہیں ہوتا تو ایک رسول کے بھیجنے اور کتاب کو نازل کرنے کے لئے حظیرۃ القدس میں فیصلہ ہوتا ہے۔ پھر قضا اللہ کی طرف سے فہم رکھنے والے ذکی انسان کے وجود کا انتظار کرتی ہے۔ یہ شخص ایسا ہوتا ہے جس کے نفس میں ستاروں کی قوتیں اس طرح جمع ہوتی ہیں کہ اس سے اس کا ظہور ہوتا ہے۔ علت بنتی ہے، لوگوں کو ہدایت ہوتی ہے اور ان کے قلوب کی تالیف ہوتی ہے اور علوم کا ظہور ہوتا ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو قضا اس کے سینے سے جوش کھاتی ہے اور غیب اور شہادت کے درمیان متوسط موطن میں شریعت اور ہدایت کا تمثل ہوتا ہے۔ (یہ عالم مثال کی) مثالی صورت نبیؐ کے اقوال و افعال کی اگرچہ مثال اور شریعت کے لئے مادہ ہوتی ہے لیکن بجنسہ وہ نہیں ہوتی، وہ صورت علمیہ کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے کیونکہ جب تو انسان کا تصور کرے گا تو تیرے ذہن میں انسان کی صورت آئے گی اور یہ صورت خود انسان نہیں ہے لیکن یہ اس کا مظہر اور منصۂ شہود ہوگی اور اسی سے لی ہوئی ہوگی۔ پس اگر تم صورت کو اس خیال سے دیکھو گے کہ یہ عرضی شے ہے اور ذہن کے ساتھ قائم ہے تو وہ انسان کی حقیقت سے بالکل دور ہو جائے گی اور اگر تم صورت کو دیکھ کر اس سے اس کے ماوراء انسان کی حقیقت تک پہنچ جاؤ گے تو اس وقت تمہاری توجہ صرف حقیقت انسانی کی طرف ہوگی اور صورت آئینے کے مانند ہو جائے گی جس کی طرف کوئی التفات نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح شریعت (مقدرہ) بھی ایک طرح نبیؐ کے اقوال میں داخل ہے تو دوسرے لحاظ سے اس سے خارج ہے اور اس سے متعلق ہے۔ ہم اس کو تدلی کی قسم قرار دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہ حقیقت نبی الانبیاء کا نام پا کر نزول کرتی ہے تو یہ دوسرے اعتبار سے ہے، تمہیں اس میں تدبر کرنا چاہیے۔

خلاصہ یہ کہ نفس کلیہ کے جسد میں یہ نظم ملحوظ رہتی ہے جس طرح کے افراد میں نوع کی تدبیر ملحوظ رہتی ہے، تب حوادث کا وقوع مذکور تدبیر کی وجہ سے ہی ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

باقی آنحضرتؐ کے وہ حالات جن کا تعلق آپؐ کی عادات، خصائل اور اسفار سے ہے، یہ سب اس میں آجاتے ہیں کہ آپؐ احسن تقویم والے مبارک اور حظیرۃ القدس کی طرف سے مؤید تھے۔ اس لئے ان چیزوں میں اپنے بنی نوع سے ممتاز تھے۔ اس رسالے میں جن علوم کے لانے کا ہم نے ارادہ کیا تھا، یہ اس کا خاتمہ ہے۔

والحمد للہ رب العالمین حسبی اللہ ونعم الوکیل وصلی اللہ علی سیدنا و آلہ واصحابہ اجمعین

حواشی

(1) اس کی وضاحت ذرا آگے آتی ہے۔

(2+3) شاہ ولی اللہ صاحب ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں فرماتے ہیں کہ تدبیر الٰہی اس دنیا میں مختلف صورتوں میں تصرف کرتی ہے۔ انہی میں سے

احالہ وتبدیلی اور الہام والقا بھی ہیں۔ حضرت شاہ صاحب احار کی یہ مثال دیتے ہیں:
''اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم پر آگ کو خوشگوار ہوا اور ٹھنڈک سے تبدیل کر دیا'' اور الہام والقاء کی یہ مثال دیتے ہیں:۔''خضر کو خدا نے کشتی کو چیر ڈالنے، دیوار کو سیدھا اور ہموار بنا دینے اور لڑکے کو قتل کرنے کا الہام کیا۔ یا مثلاً یہ کہ انبیاء کرام پر کتابیں اور شریعتیں نازل فرمائیں اور الہام کی صورت دنیا میں کبھی اس طور پر رہی کہ کوئی شخص کسی امر میں مبتلا ہو گیا اور ضرورت اس کی داعی ہوئی کہ الہام کے ذریعے اس کو اس ابتلاء سے نجات دی جائے۔ چنانچہ خود اسی کو الہام کہا گیا اور اس کی ضرورت پوری کر دی گئی۔''

(4) عالم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی تین صفات ہیں۔ ایک ابداع یعنی عدم محض سے کسی چیز کو وجود میں لانا۔ دوسری تخلیق یعنی ایک چیز سے دوسری چیز پیدا کرنا اور تیسری تدبیر یعنی علم خداوندی میں جو مصالح ہیں، ان کے مطابق حوادث کا رونما ہونا۔'' ماخوذ از حجتہ اللہ البالغہ۔

(5) مطلب یہ ہے کہ اگرچہ آدم علیہ السلام ارضی یعنی زمین سے تعلق رکھنے والے تھے لیکن اپنے کمال کی وجہ سے انہوں نے اخروی بدن حاصل کر لیا۔ چنانچہ انہیں جنت میں سکونت دی گئی۔ پس اس طرح وہ مثالی جسم سے مشابہ ہو گئے۔ (تفہیمات۔ جلد 2 صفحہ 118)

(6) کیونکہ کسی بھی مثالی جسم کے لئے زمین میں قرار نہیں اور آدم تو مثالی جسم ہو گئے تھے اور زمین سے قرار اسے ہوتا ہے جو ''صاحب تخلیط'' یعنی اس میں مثالی اور ارضی دونوں حیثیتیں مخلوط ہوں اور یہ عام حق ہے اور جب آدم نے اس کی تمنا کی یعنی انہیں اس کا ذوقاً علم ہوا شیطان نے اس میں مداخلت کی۔ پس ''تخلیط'' معصیت کی صورت میں ان کے لئے متمثل ہوئی۔ چنانچہ ان کے بیٹے سے یہ نکلا کہ اگر معصیت نہ ہوگی تو انہیں زمین میں قرار نہیں حاصل ہوگا۔ (تفہیمات۔ جلد 2 صفحہ 119)

(7) اشارہ ہے بخاری کی ایک حدیث کی طرف۔

(8) شاہ ولی اللہ کے نزدیک عالم شخص واحد ہے۔ وہ برابر اپنے حالات کے لحاظ سے تبدیل ہوتا رہتا ہے اور ہمیشہ کیفیت کے اعتبار سے حرکت کرتا رہتا ہے۔ شاہ صاحب کی اصطلاح میں اسے شخص اکبر کہا جاتا ہے اور اس کے تحت آئمہ انواع ہیں جو اس کے اندر مندرج ہیں۔ جیسا کہ آئمہ انواع میں سے ایک امام نوع انسان ہے اور یہ سب مثالی صورتیں ہیں۔

(9) ناسوت سے مراد یہ مشاہدے میں آنے والا اور محسوس عالم ہے۔ اصفیاء کے نزدیک موجودات کے یہ چار طبقات ہیں۔ لاہوت، جبروت، رحموت اور ناسوت اور حکماء کے نزدیک ان کے نام یہ ہیں:۔ انیت اُولیٰ، عقل، نفس اور ہیولیٰ۔

(10) ارتفاقات سے مراد اجتماعی ادارے ہیں۔ وہ ادارے جن کو انسان زندگی گزارنے کے لئے تشکیل کرتے ہیں۔ ''حجتہ اللہ البالغہ'' میں شاہ ولی اللہ ارتفاقات کی بحث میں لکھتے ہیں:۔ ''معلوم ہونا چاہیے کہ ہر انسان کھانے پینے، جماع ومباشرت، دھوپ اور بارش سے حفاظت اور سردی سے بچنے کی غرض سے گرمی پیدا کرنے کے اسباب تلاش کرنے وغیرہ میں اپنے ابنائے جنس کا ہمنوا ہے اور انسان کے حال پر اللہ تعالیٰ کی یہ خاص عنایت ہے کہ اس نے ان ضروریات کی سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے اس کی صورت نوعیہ کے اقتضا کے مطابق اس کو الہامات طبیعتہ سے نوازا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی احتیاجات کی تحصیل اور اس کے لئے مفید تدابیر سوچنے اور احتیاجات معاشرت میں سہولت وآسانی پیدا کرنے کے لئے خصوصی الہامات سے نوازا ہے۔'' ارتفاقات کا وجود انہی سے ترتیب پاتا ہے۔ (مترجم)

(11) ارتفاق اول کی پہلی چیز زبان ہے جس کے ذریعہ انسان اپنے مافی الضمیر کو ادا کرتا ہے۔ اسی میں کھیتی باڑی، درختوں کا لگانا، کنویں کھودنا، کھانا پکانا اور نان وخورش کی مختلف کیفیات بھی ہیں۔ اسی میں سے زن منکوحہ کی تعیین بھی ہے۔ (حجتہ اللہ البالغہ)

(12) اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اونٹنی جو کہ حضرت صالح کے معجزے سے قوم ثمود کے لئے ظاہر ہوئی تھی، اس کا مادہ اس قوم کی برائیاں تھیں جنہوں نے ان کی مانگ سے اونٹنی کی شکل اختیار کی تھی۔ جب انہوں نے اس کو قتل کیا تو جسم کی وجہ سے اس میں جو تقید اور

تشخص پایا جاتا تھا، وہ ختم ہوگیا اور اب اس کو عموم مل گیا اور فساد عام ہوگیا۔ یہ حاشیہ شاہ ولی اللہ صاحب کے خاص تلمیذ مولانا محمد عاشق کے حاشیہ ''الخیر الکثیر'' سے لیا گیا ہے۔

(13) جاننا چاہیے کہ دجال کا وجود کا مادہ اور اس کے جسم کے اصلی عناصر قوم نوح، ہود، صالح، لوط، شعیب اور دوسرے انبیاء کے اقوام کی برائیاں ہیں جو کہ عام صحیفے میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے مخصوص صحیفے میں جو عذاب مقدر تھا، وہ اگرچہ قوموں کی عذاب کی صورت میں (اس دنیا کے اندر) نمودار ہوا لیکن وہ برائی جو بذات خود شدید ہے، وہ اپنے ظہور کے بعد دنیا میں بھی باقی رہے گی، اس لئے وہ آخرت میں بھی عذاب کا باعث بنے گی۔ خاص طور پر اس حالت میں کہ مخصوص صحیفے میں راسخ ہونے کے بعد صحیفۂ عالم میں بھی اگر وہ (برائی) راسخ ہوگئی ہو۔

بنی اسرائیل کی برائیاں بہت ہوگئیں اور وہ ان سے لاحق ہوئیں لیکن ان برائیوں کا (عذاب کی شکل میں) کوئی اثر ظاہر نہ ہوا کیونکہ بنی اسرائیل کے اندر ایسے انبیاء موجود تھے جو کہ اللہ کے مطلق اسم کے مظہر تھے اور ان کی دیکھ بھال کرنے والے لوگ موجود تھے۔ اس لئے ان کی برکت کی وجہ سے برائیاں عذاب کی صورت میں نمودار نہ ہوئیں اور ان میں جو برائیاں جمع ہوتی رہتی تھیں، وہ پورے طور پر ایک وحدت بن گئیں۔ تب ان شرور اور برائیوں پر خدا کی طرف سے انسانی ہیئت اور صورت کا فیضان ہوا کیونکہ جو بھی چیز کثرت سے وحدت اختیار کرتی ہے تو وہ اپنے یگانگت اور توحد کی وجہ سے مفیض جواد کی طرف اس کو راستہ مل جاتا ہے۔ عادۃ اللہ یہ رہی ہے کہ ہر مادہ جب کسی محدود وزن تک پہنچتا ہے تو وہ اپنے لیے (جواد مطلق سے) ہیئت اور شکل کی طلب اور تقاضا کرتا ہے۔ شرور پر شکل اور ہیئت کے افاضے اور عطا کی مثال ایسی ہے جیسے کیڑوں کی صورت کا افاضہ نجاس اور پلیدیوں پر ہوتا ہے۔ جب وہ پلیدی کے سب سے آخری درجے پر پہنچ جاتی ہیں۔

انسانی برائیوں کا انسانی شکل میں متمثل ہونے کا راز یہ ہے کہ اس صورت کو اس دنیا میں اس شے کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے جو کلیت اور اطلاق کا رتبہ رکھتی ہو۔ اسی کی طرف پیغمبر علیہ السلام کے اس قول میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اس کی صورت پر پیدا کیا اور اس صورت میں بھی ایک قسم کا عموم ہے۔ اسی لئے انسان کو قوی متین سے غفلت اور انسلاخ بھی لاحق ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس کا بیان (خیر کثیر کے) نویں خزانے میں آئے گا اور وہ شر جب ایک قوی انسان کی شکل اختیار کرے گا تو اس کے بعد بھی برائیاں اس کو لاحق ہو جائیں گی جس طرح جزئی، کلی کو لاحق ہوتی ہے یا غذا معتذی کو۔ پھر جب وہ شخص مرے گا اور جسمانی تشخص سے آزاد ہو کر روح بنے گا تو سارے عالم کی تباہی ہوگی اور یہی قیامت ہے۔ (مولانا محمد عاشق قدس اللہ سرہ (تلمیذ شاہ ولی اللہؒ) کی خیر کثیر پر تقریر سے یہ حاشیہ منقول ہے۔)

(14) سورۃ انعام کی آیت نمبر 75 سے 81 تک میں اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

(15) انسان الٰہی، نام ہے انسانی افراد کی اجتماعی شکل کا۔ حضرت شاہ صاحب کے فلسفے میں اس کا دوسرا نام ''امام نوع الانسان'' بھی ہے۔ فلسفہ یونان میں اس کو نوعِ انسانی کا رب کہا جاتا ہے۔

(16) حدیث کا آخری حصہ یہ ہے کہ عورتوں میں سوائے فرعون کی بیوی آسیہ اور عمران کی بیٹی مریم کے کوئی کامل نہیں ہوئی اور عائشہ کی فضیلت عورتوں پر ایسی ہے جیسی ثرید کی فضیلت دوسرے طعام پر۔ اس حدیث کو بخاری، مسلم، ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابو موسیٰؓ سے روایت کیا ہے۔

(17) یہ قصہ قرآن مجید کی سورۂ آل عمران 37-41 آیات میں آیا ہے۔

(18) یہ قصہ سورۂ آل عمران کی آیت 44 میں ہے۔

(18a) یہ قصہ قرآن مجید کی سورۂ مریم کی آیت 16 سے 23 تک آیا ہے۔

(19) سورۂ مریم، آیت 19۔

(20) سورۂ یوسف، آیت 92۔

(21) یہ سورۂ یوسف کی آیت 24 کی طرف اشارہ ہے۔ مؤلف امام نے اس آیت کے تحت ''عصمت'' کی مزید تحقیق ''تفہیمات'' جلد 1 صفحہ 260 میں فرمائی ہے۔

(22) اس حدیث کو امام احمد نے مسند میں اور شیخین نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بروایت ابو ہریرہؓ روایت کیا ہے۔ دیکھیے تفسیر ابن کثیر، جلد 2 صفحہ 481 طبع مصطفیٰ محمد۔ مصر۔

(23) سورۂ ص، آیت 41-42۔

(24) یہ سورۂ قصص کی ساتویں آیت کی طرف اشارہ ہے۔

(25) یہ صحیح بخاری کی ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے۔ اصل روایت حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ ہم خیبر (کی لڑائی) میں حاضر ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسے شخص کے حق میں جو مدعی اسلام تھا، فرمایا کہ ''یہ شخص جہنمی ہے۔ لڑائی کے موقع پر اس شخص نے دشمنوں سے سخت لڑائی لڑی اور شدید زخمی ہو گئے۔ اس شخص کے بظاہر اس مجاہدانہ کارنامے کو دیکھ کر بعض لوگ آنحضرت ﷺ کی اس شخص کے حق میں کہی ہوئی بات میں شک کرنے لگے لیکن ہوا یہ کہ جب اس زخمی شخص نے شدید درد کو محسوس کیا تو خودکشی کر لی اور لوگوں نے دوڑ کر آپ کو اس کا سارا قصہ سنایا۔ تب آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو یہ اعلان کرنے کا حکم فرمایا کہ ''جنت میں مومن ہی داخل ہوتا ہے۔ بے شک اللہ دین کو فاجر آدمی سے تائید دیتا ہے۔'' (صحیح بخاری۔ جلد 2، صفحہ 604۔ اصح المطابع)

(25a) سورۂ قصص کی آیت 10 کی طرف اشارہ ہے۔

(25b) سورۂ قصص آیت 11

(26) یعنی عالمِ مثال اور عالم ناسوت دونوں سے اس کو بہرہ ملتا ہے۔

(27) یہ مضمون سورۂ طٰہٰ کی آیت 38 سے شروع ہو کر آیت 41 تک ختم ہوتا ہے۔

(28) ان آیات کا بیان سورۂ اسراء آیت 101 میں آیا ہے اور یہ آیات حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے قطعی دلائل کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان آیات کی تعیین میں مفسروں کا اختلاف ہے۔ حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؒ، عکرمہؒ، شعبی اور قتادہ کی رائے میں وہ علامات یہ ہیں: ہاتھ کا روشن ہونا، لاٹھی، قحط کے سال، پھلوں کا کم ہونا، طوفان، ٹڈی دل، جوئیں، مینڈک اور خون۔ حافظ ابن کثیر اس قول کو قوی وراچھا کہتا ہے۔ دیکھیے تفسیر ابن کثیر۔ جلد 3 صفحہ 66 طبع مصطفیٰ محمد۔ مصر

(29) سورۂ اعراف، آیت 146۔

(30) سورۂ طٰہٰ آیت 114۔

(30a) امام بخاریؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ مجھے ابی بن کعبؓ نے حدیث بیان کی کہ اس نے رسول اللہ ﷺ سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ ایک دن موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو خطبہ دینے لگے تو ان سے یہ سوال کیا گیا کہ لوگوں میں کون سب سے زیادہ علم رکھتا ہے؟ حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ میں۔ اس پر اللہ نے ان پر عتاب فرمایا کیونکہ ان کو اس بارے میں خدا کی طرف رجوع کرنا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ مجمع البحرین کے پاس میرا ایک بندہ ہے جو تجھ سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ یہ ایک طویل حدیث ہے۔ بخاری۔ جلد 2 صفحہ 687 طبع اصح المطابع۔ کراچی

(31) یہ قصہ سورۂ کہف میں آیت 71 سے 82 تک آیا ہے۔

(32) یہ واقعہ بنی اسرائیل میں سے ایک شخص کا ہے جس کا کوئی بیٹا نہ تھا اور اس کا بھتیجا اس کا وارث تھا۔ اس نے اپنے چچا کو قتل کر کے

دوسرے شخص کے دروازے پر پھینک دیا اور اس پر قتل کا مدعی بن گیا۔ اس پر دونوں فریقوں میں جھگڑا پیدا ہوا۔ قتل وخونریزی کی نوبت قریب تھی۔ تب ایک شخص نے دونوں سے یہ کہا کہ تم کیوں جھگڑتے ہو حالانکہ اللہ کے رسول تمہارے اندر موجود ہیں۔ تب وہ مل کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں پہنچے اور انہیں سارا قصہ عرض کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو گائے کے ذبح کرنے کا حکم فرمایا۔ وہ اس کو مذاق سمجھنے لگے۔

(33) یہ قرآن مجید کی سورۂ بقرہ آیت نمبر 248 میں آیا ہے۔

(34) مؤلف امام نے حضرت داؤد علیہ السلام کے قصے میں بعض تفسیروں کی موافقت کی ہے اور یہ تحقیق نہیں۔

ہمارے استاد علامہ عبید اللہ سندھی فرماتے تھے کہ عہد عتیق میں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کی طرف یہود کی طرف سے کچھ ایسی باتیں منسوب کی گئی ہیں جو ہندوؤں کی کتابوں کے افسانوں سے زیادہ فحش ہیں۔ حضرت استاد فرماتے ہیں کہ حضرت داؤدؑ کے قصے میں میرا ایک خصوصی فکر ہے جس کو میں نے کسی سے نہیں لیا۔ یہ صرف خدا کی طرف سے فہم ہے جو مجھے عنایت ہوا اور میری کوشش ہے۔ اس کو اس طرح سمجھنا چاہیے کہ حکومت کے مختلف درجے ہوتے ہیں۔ شاہ شہیدؒ نے ان کو اپنی تالیف ''منصب امامت'' میں ذکر کیا ہے۔ میں ان میں سے یہاں صرف اسلامی حکومت کے اندر جو دو درجے ہیں، ان کو نقل کرتا ہوں۔ (1) ایک درجہ خلافت راشدہ ہے جس کی سیرت اور صورت اس عقلی قانون پر ہے جو اہل امانت کے ہاتھوں کتاب کریم میں معروف ہے۔ اس درجے میں مال کا جمع کرنا، لوگوں کو حقیر کرنا اور کسی کو غلام بنانا نہیں ہوتا۔ (2) یہ دوسرا دور خلافت کے بعد کا دور ہے، اس میں پہلے دور کے آثار ایک ایک ہو کر کم ہوتے جاتے ہیں اور اس کا بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مسکینوں سے ٹیکسوں وغیرہ کے ذریعے مال لے کر ایک قوم (سرمایہ داروں) کو دوسری قوم (عوام) پر فوقیت دی جاتی ہے۔ اس میں سرمایہ داروں سے تعاقب نہیں کیا جاتا۔ ابتدا میں تو یہ معمولی بات نظر آتی ہے اور لوگوں کو دکھائی نہیں دیتی لیکن اس کا انجام بڑا ظلم ہوتا ہے جو سب کو دیکھنے میں آتا ہے۔

خصوم والی مثال کا مقصد خلافت کے ان دو درجوں کا فرق بتانا تھا۔ یہ ایک ایسی حکیمانہ مثال ہے جس میں بڑے فوائد پنہاں ہیں۔ ''یہ میرا بھائی ہے۔ اس کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں اور میرے پاس ایک بھیڑ ہے۔'' یہ بادشاہ اور رعیت کے ایک فرد کی مثال ہے۔ رعیت کے ایک فرد کے مال و دولت کی نسبت بادشاہ کے سرمایہ سے وہی ہے جو ایک کو ننانوے سے ہے۔ بادشاہ اپنی قوت کے بل بوتے پر اس ایک حصے کو بھی چھیننا چاہتا ہے۔ یہ ایک واضح مثال تھی جس سے حضرت داؤد علیہ السلام کو تنبہ ہوا اور سمجھ گئے کہ یہ ایک بڑا ظلم ہے اور یہ اس دور میں ہوا جب آپؑ خلیفہ نہ تھے۔ بادشاہوں کے نظام کے مطابق ملکی نظام چلاتے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام اس مثال سے سمجھ گئے کہ یہ ہماری آزمائش ہے۔ انہوں نے اپنے رب سے مغفرت چاہی، رکوع میں چلے گئے اور خدا کی طرف رجوع کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو یہ خیال نہ تھا کہ لوگوں کی ضرورت کے لئے اگر ان سے حکومت مال لے گی تو اس سے ظلم واقع ہوگا۔ بعد میں ان کو حکم ہوا: ''اے داؤد! ہم نے تجھے ملک میں خلافت عطا کی ہے، لوگوں میں حق و انصاف سے فیصلہ کر، نفسانی خواہش کا اتباع نہ کر۔'' یہاں ہویٰ اور نفسانی خواہش سے مراد ہے آخرت سے محروم ہو کر صرف دنیا میں انسان کی لذت والی چیزوں کی طرف نفس کا مائل ہونا۔ (کتاب حروف اوائل السور عربی تالیف علامہ موسیٰ جار اللہ۔ صفحہ 190 طبع بھوپال)

(35) شاہ صاحب نے اپنی دوسری تالیف ''تفہیماتِ الٰہیہ'' میں ان لوگوں کی صورتیں بدلنے کی حقیقت اس طرح بیان فرمائی ہے کہ داؤد علیہ السلام کے زمانے میں ان کی قوم کے جن لوگوں نے سینچر کے دن میں تجاوز کیا تھا، ان کا یہ برا عمل ان کے صحیفوں میں ثبت کیا تھا اور وہ اپنے ذلت کے اعمال اور بڑے اخلاق میں بندروں سے مشابہت رکھتے تھے تو بندروں کی صورت ان کے چہروں پر

آ گئی اور اس میں کوئی عجب بات نہیں کیونکہ شکل وصورت ایک عرض کا درجہ رکھتی ہے۔ اس لئے وہ دوسرے پر بھی پڑ سکتی ہے۔ دیکھیے تفہیمات الٰہیہ۔ جلد 2 صفحہ 152۔

(36) یہ واقعہ قرآن مجید کی سورۂ انبیاء کی آیات 77 اور 78 میں مذکور ہے، وہاں دیکھیں۔

(37) سورۂ انبیاء کی آیت 81 کو دیکھیں۔

(38) یہ قصہ قرآن مقدس کی سورۂ ص آیت 31-33 میں وارد ہوا ہے۔

(39) سورۂ نمل آیت 18-19 میں یہ قصہ آیا ہے۔

(40) مؤلف علامہ نے حضرت سلیمان اور بلقیس کے قصے کو دوسرے مفسروں کے بیان کے مطابق ذکر فرمایا ہے اور اس کی بنیاد اکثر اسرائیلی روایتوں پر ہے۔ اگر اس کی تحقیق چاہتے ہو تو ہمارے استاد علامہ عبید اللہ سندھی کی تفسیر کی طرف رجوع کریں یا ہمارے دوسرے بزرگ استاد مولانا شبیر احمد عثمانی کے قرآنی تعلیقات کو دیکھیں۔

(41) مطلب یہ ہے کہ آپ کا نسمی مزاج، نفس ناطقہ کے مقتضیٰ کا متصادم نہ تھا، ان دونوں کے تقاضا میں اتفاق تھا۔

(42) انسانِ اعظم سے مراد نوع انسان کا امام ہے۔ اسی طرح عالم بالا میں ہر نوع مخلوق کا ایک امام ہوتا ہے جسے فلسفہ یونان میں رب النوع کہا جاتا ہے۔ وہ امام اپنے نوع کے افراد کی ایک مثالی شکل ہوتا ہے۔

(43) سورۃ الحج۔ 78۔

(44) اس میں قرآن مجید کی سورۂ آل عمران کی آیت 110 کی طرف اشارہ ہے۔ وہ آیت اس طرح ہے: کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنکر۔

(45) یہ ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے جس کو ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔

(46) اس حدیث کو امام بخاریؒ نے بروایت حضرت ابن عمرؓ اپنی صحیح میں ''باب اثم الغادر'' میں ذکر کیا ہے۔

(47) سورۂ تحریم آیت 8۔

(48) اس حدیث کے لئے دیکھیے کتاب النہایۃ تالیف حافظ ابن اثیر جزری۔ جلد 2 صفحہ 62-63 طبع خیریہ۔ مصر۔

(49) یہ فرعون، حضرت یوسف علیہ السلام کے دور کا فرعون معلوم ہوتا ہے جس کو سات گاؤ کی صورت میں خواب میں قحط میں دکھایا گیا تھا، اس کا قصہ سورۂ یوسف میں آیا ہے۔

(50) بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے ذکر کیا ہے کہ یہ اس لئے ہوا کہ جب قریش نے نبی ﷺ کی نافرمانی کی تو آپؐ نے ان کے حق میں حضرت یوسف علیہ السلام کے دور کی قحط سالی کی طرح بد دعا فرمائی۔ پھر ان کو قحط اور تکلیف نے گھیر لیا اور وہ طعام نہ ملنے کی وجہ سے ہڈیاں کھانے لگے۔ پھر اگر کوئی شخص آسمان کی طرف دیکھتا تو بھوک کے مارے اس کو دھواں دیکھنے میں آتا تھا۔ اس کے حق میں یہ آیت: فارتقب یوم تاتی السماء بدخان مبین نازل ہوئی۔

✦ ..... ✦ ..... ✦
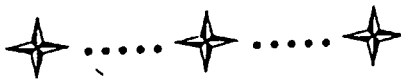
مترجم: محمد ایوب قادری

امداد فی مآثر الاجداد

مؤلفہ: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

الحمد للہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات وعلیٰ فضلہ المعول فی جمیع الحالات
تمام تعریف اس خدا کے لئے ہے جس کی نعمت سے نیکیاں پوری ہوتی ہیں اور اس کے کرم پر ہر حالت میں رجوع کیا جاتا ہے۔

وبسم اللہ الرحمن الرحیم وصلی اللہ علیٰ سیدنا محمد وآلہ وصحبہ اجمعین
اس کے بعد فقیر ولی اللہ بن شیخ عبدالرحیم کہتا ہے: کان اللہ تعالیٰ لھما فی الآخرۃ والاولیٰ (اللہ تعالیٰ ان دونوں کے لئے آخرت اور اس دنیا میں ہو جائے) کہ یہ چند ورق اس فقیر کے بعض بزرگوں کے احوال کے بیان میں ہیں۔ اس کا نام ''امداد فی مآثر الاجداد'' رکھا گیا ہے۔ حسبنا اللہ ونعم الوکیل (اللہ ہمارے لئے کافی ہے اور وہ اچھا وکیل ہے) پوشیدہ نہ رہے کہ اس فقیر کا سلسلہ نسب امیر المومنین عمر بن الخطابؓ تک اس طرح پہنچتا ہے۔

نسب نامہ [1]

فقیر ولی اللہ بن شیخ عبدالرحیم بن شہید وجیہ الدین بن معظم بن منصور بن احمد بن محمود بن قوام الدین عرف قاضی قادن بن قاضی قاسم بن قاضی کبیر عرف قاضی بدہ بن عبدالملک بن قطب الدین بن کمال الدین بن شمس الدین مفتی بن شیر ملک بن محمد عطاء ملک بن ابوالفتح ملک [2] بن عمر حاکم ملک [3] بن عادل ملک بن فاروق [4] بن جرجیس بن احمد [5] بن محمد شہریار بن عثمان بن ماہان [6] بن ہمایوں بن قریش بن سلیمان بن عفان بن عبداللہ [7] بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ وعنہم اجمعین۔

پرانے نسب ناموں میں جو رہتک میں اور شاہ ارزانی بدایونی [8] کے خاندان میں موجود ہیں کہ جن کا نسب سالار حسام الدین بن شیر ملک سے ملتا ہے۔ [9] (ان میں) ایسا ہی پایا گیا ہے اور پرانے زمانے میں ''ملک'' تعظیم کے لئے تھا۔ [10] جیسے ہمارے زمانے میں ''خان'' کا لفظ ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

قیامِ رہتک

(یہ بات) پوشیدہ نہ رہے کہ ہمارے بزرگوں میں سب سے پہلے جس نے شہر رہتک میں اقامت اختیار کی وہ شیخ شمس الدین مفتی ہیں اور یہ رہتک، ہانسی اور دہلی کے درمیان ایک شہر ہے۔ دلی سے تیس کوس دور قبلہ کی طرف واقع ہے۔

شروع میں جب ہندوستان فتح ہوا تو سادات اور قریش بڑی تعداد[11] میں وہاں قیام پذیر ہوئے اور اس علاقہ کا کوئی دوسرا شہر اس سے زیادہ آباد اور بارونق نہ تھا[12] اور زمانہ گزرنے کے ساتھ وہ آبادی اور رونق ختم ہوگئی۔[13]

شمس الدین مفتی

یہ بزرگ (شیخ شمس الدین مفتی) عالم اور عابد شخص تھے اور قریش کی نسل سے پہلا جو شخص اس شہر (رہتک) میں آیا اور جس کی وجہ سے شعائر اسلام ظاہر ہوئے اور کفر کی کثرت ختم ہوئی، وہ وہی (شمس الدین مفتی) تھے[14] اور ان کے عجیب حالات میں سے ایک بات یہ ہے۔ بعض لوگ ذکر کرتے ہیں، واللہ اعلم کہ انہوں (شیخ شمس الدین مفتی) نے وصیت کی کہ نماز کے بعد ان کے جنازہ کو اس مسجد میں رکھ دیں کہ جو ان کی عبادت گاہ اور اعتکاف گاہ تھی اور تھوڑی دیر کے لئے اسے (مسجد کو) خالی چھوڑ دیں۔ اس کے بعد اگر (جنازہ کو) موجود پائیں تو اسے دفن کر دیں ورنہ واپس چلے جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی عمل کیا گیا جب ایک گھڑی کے بعد دیکھا تو جنازہ کا نشان موجود نہ تھا۔

جب حضرت والد بزرگوار (شیخ عبدالرحیم) قدس سرہ اس حکایت کو بیان کرتے تھے تو وہ اس کی تائید کرتے تھے اور فرماتے کہ اس زمانہ کے سلسلہ چشتیہ کے مشائخ کے حالات کی کتابوں میں اس واقعہ کو میں نے دیکھا ہے۔ ہر چند ان بزرگ کے نام کو معلوم کیا مگر معلوم نہ ہوا۔

بعض قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں میں ذی اقتدار (شخص) اس قسم کے قصبات میں سکونت اختیار کرتا تھا تو قضاء احتساب اور افتاء وغیرہ کے اعتبار سے قصبہ کی ذمہ داری اس کے سپرد ہوتی تھی اور بغیر اس (منصب) کے بھی قاضی محتسب اس کو پکارتے تھے۔[15] واللہ اعلم۔

اس بزرگ (شمس الدین مفتی) کے زندگی کے دن پورے ہونے کے بعد ان کی اولاد میں لائق ترین کمال الدین مفتی تھے جو ان کے طریقہ پر ان امور کے ذمہ دار ہوئے اور ان کے بعد ان کے لڑکے قطب الدین اور ان کے بعد ان کے لڑکے عبدالملک نے اسی انداز پر اپنی زندگی کے دن گزارے۔

قاضی بدہ بن عبدالملک

ان بزرگوں کے گزرنے کے بعد عہدۂ قضا کا منصب ان شہروں میں قائم ہوا۔ قاضی بدہ بن عبدالملک مذکور نے اپنی موروثی ریاست کی حفاظت کی وجہ سے منصب قضا اختیار کیا۔[16] ان کے بعد ان کے دو لڑکے ہوئے۔ ایک قاضی قاسم کہ جو اپنے باپ کے انتقال کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔ دوسرے لڑکے منگن تھے، ان کے بعد ان کے ایک لڑکے

ہوئے جن کا نام یونس تھا۔

قاضی قاسم

قاضی قاسم کے دولڑکے ہوئے۔ایک قاضی قادن کہ جو اپنے باپ کے جانشین اور شہر کے رئیس تھے۔ بظاہر ان کا نام عبدالقادر یا قوام الدین ہے۔ ہندوؤں کی زبان پر نام بگڑ گیا۔ واللہ اعلم۔ [17] دوسرے لڑکے کمال الدین [18] تھے اور ان (کمال الدین) کا ایک لڑکا رہا کہ جس کا نام نظام الدین تھا۔

شیخ محمود

قاضی قادن کے دولڑکے ہوئے۔ شیخ محمود دو شیخ آدم کہ جن کا عرف بھائی خاں تھا۔ان کی نسل باقی رہی۔ شیخ محمود اپنے خاندان میں بزرگ تھے اور کسی سبب سے انہوں نے عہدۂ قضا اختیار نہ کیا اور سرکاری ملازمت اختیار کر لی [19] اور انہوں نے اس ملازمت میں زمانہ کے سرد و گرم دونوں دیکھے۔ان کے ظاہری حالات رہتک کے صدیقیوں کی طرح تھے۔ ان کی شادی سونی پت کے سادات کی ایک لڑکی آفریدہ [20] سے ہوئی اور اس شادی کا نتیجہ شیخ احمد تھے۔ شیخ احمد بچپن میں رہتک سے چلے گئے اور شیخ عبدالغنی بن شیخ عبدالحکیم کے ساتھ انہوں نے نشو و نما پائی۔ انہوں (شیخ عبدالغنی) نے اپنی لڑکی کے ساتھ ان کی شادی کر دی اور ایک مدت تک ان (احمد) کی تربیت کی۔ اس کے بعد وہ رہتک واپس آ گئے۔ قلعہ کے باہر ایک عمارت بنا کر اپنے عزیزوں اور متعلقین (رعایا) کو اپنے ساتھ رہنے کو جگہ دی۔

شیخ منصور بن احمد

شیخ احمد کے بعد ان کے بیٹوں میں سے دو کی اولاد باقی رہی۔ ایک شیخ منصور تھے جو شجاعت و حلم [21] وغیرہ صفات ریاست سے متصف تھے۔ انہوں نے پہلے شیخ عبداللہ بن شیخ عبدالغنی مذکور کی لڑکی کے ساتھ شادی کی جو ان کے ماموں تھے جس کا نتیجہ شیخ معظم اور شیخ اعظم ہوئے اور پھر اس کی وفات کے بعد دوسری شادی کی جس سے شیخ عبدالغفور اور اسمٰعیل پیدا ہوئے [22] اور دوسرے شیخ حسن تھے جو منضبط الحال اور صاحب جمعیت تھے۔ ان کے دولڑکے محمد سلطان اور محمد مراد تھے۔ حضرت والد بزرگوار (شیخ عبدالرحیم) نے محمد مراد کو دیکھا تھا۔

شیخ مراد

ان (محمد مراد) کی قوت گرفت کا عجیب مشاہدہ کیا گیا۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسیؔ (80) سال کی عمر میں انگوٹھے اور شہادت کی انگلی میں دینار کو لے کر (نقوش کو) مسل ڈالتے تھے اور اس کو دوہرا کر دیتے تھے۔

جب انہوں نے حضرت والد ماجد (شیخ عبدالرحیم) کو بچپن میں دیکھا تو کہا کہ اس لڑکے سے میرے دل پر رعب و ہیبت طاری ہوتی ہے۔ جیسا کہ اس کے دادا شیخ معظم کے دیکھنے سے ہیبت آتی تھی۔ اس صفحہ کے لکھنے کا مقصد یہ

ہے کہ مطالعہ کرنے والا (سلسلۂ) نسب کے اس حصہ پر مطلع ہو جاتے کہ اس سے صلۂ رحم مقصود ہوتا ہے جیسا کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

تعلموا من انسابکم ماتصلون به ارحامکم فان صلة الرحم محبة فی الاھل مثراة فی المال منساة فی الاثر (رواہ الترمذی والحاکم)[23]

اپنے نسب کا علم حاصل کرو جس کے ذریعہ سے رشتہ داریاں قائم رہیں کیونکہ صلہ رحمی محبت کا ذریعہ ہے۔ اس کی بدولت مال بڑھتا ہے اور عمر بڑھتی ہے۔

شیخ عبدالغنی

اس فقیر (شاہ ولی اللہ) نے شیخ عبدالغنی مذکور کی بعض اولاد سے سنا ہے کہ وہ (شیخ عبدالغنی) اللہ تعالیٰ ان پر رحمت فرمائے۔ عالم اور صاحبِ تقویٰ تھے اور جلال الدین اکبر بادشاہ ان کو بزرگ اور ذی عظمت سمجھتا تھا۔ اس کے بعد جب بادشاہ نے بے دینی اور گمراہی اختیار کرلی تو وہ محبت کا تعلق ختم ہو گیا اور دونوں طرف سے پوری پوری نفرت ظہور پذیر ہوئی۔[24] ایک مدت کے بعد بادشاہ کو چتوڑ کی مہم پیش آئی۔[25] اس طرف لگاتار فوجیں بھیجی جاتی تھیں اور فتح حاصل نہیں ہوتی تھی۔

اسی زمانے میں ایک رات کو امام ناصر الدین شہید[26] ابن امام محمد باقر رضی اللہ عنہ کے مزار (درگاہ) میں بعض اعتکاف کرنے والوں نے بیداری کی حالت میں دیکھا کہ ایک سردار اور اس کی جماعت، آلاتِ جنگ کے ساتھ آئی ہے اور اس کے پاس ایک مشعل تھی۔ وہ اس مزار کے قبہ میں داخل ہو گئے۔ (کسی معتکف نے) خیال کیا کہ مسافر ہیں کہ زیارت کی غرض سے آئے ہیں، وہ آگے بڑھا تو اس نے دیکھا کہ وہ رئیس (جماعت) قبر میں داخل ہوا اور اس جماعت میں سے ہر ایک آدمی ایک قبر میں داخل ہو گیا۔

کسی نے اس سے سوال کیا کہ یہ رئیس کون ہے اور یہ جماعت کیا ہے؟ اس نے کہا کہ حضرت امام (ناصر الدین) ہیں۔ شہیدوں کی جماعت کے ساتھ ہیں۔ اس نے پھر سوال کیا کہ کہاں گئے تھے اور کیا کیا؟ اس نے کہا کہ چتوڑ کو فتح کرنے کے لئے گئے تھے اور اس کو اس وقت اس برج کی طرف سے فتح کرلیا۔

شیخ عبدالغنی کو جب یہ واقعہ معلوم ہوا تو انہوں نے فتح کی بشارت اور صورت واقعہ اسی طرح بادشاہ (اکبر) سے عرض کردی۔ کچھ دنوں کے بعد چتوڑ کی فتح بے کم وکاست اسی طریقہ سے عمل میں آئی۔[27] بادشاہ (اکبر) نے امام (ناصر الدین) کے مزار کے لئے بارہ گاؤں معاف کیے اور شیخ عبدالغنی کے حوالے کردیئے۔

مسئلہ وحدت الوجود

خواجہ محمد ہاشم کشمی نے شیخ مجدد حضرت شیخ احمد سرہندی قدس سرہ سے نقل کیا ہے[28] کہ ''انہوں نے فرمایا کہ میرے والد بزرگوار (شیخ عبدالاحد) ایک راز معلوم کرنے کی غرض سے ایک مدت تک شیخ عبدالغنی کی ملاقات کے جویاں

رہے۔ اس لئے کہ شہر سون پت کے ایک معمر اور بزرگ درویش تھے۔ ان سے ان (شیخ عبدالغنی) کو یہ راز پہنچا تھا اور وہ راز یہ تھا جو انہوں نے بتایا کہ میرے مرشد جو تھے، وہ میرے نانا تھے۔ انہوں نے اپنے انتقال کے وقت مجھے ایک شوریدہ کار درویش کی معیت میں اپنے پاس بلایا تا کہ القاء نسبت کریں اور (باطنی فیض) عطا فرمائیں۔ جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے معاملۂ حقیقت کا ایک راز (ہمیں) بتایا۔ اس (راز) کے سنتے ہی وہ درویش تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھا اور میں اسی طرح حیران و سراسیمہ جان اپنی جگہ برقرار رہا۔

حضرت والد (شیخ عبدالاحد) ان (شیخ عبدالغنی) سے اس بات کے سننے کے خواہش مند تھے کہ ان کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اتفاق کی بات کہ شیخ مذکور کو کسی مہم کی وجہ سے سہرند سے گزرنا پڑتا۔ جب وہ سہرند میں کارواں سرائے میں ٹھہرے۔ ہمارے والد بھی وہاں پہنچے، مزاج پرسی اور ملاقات کے بعد تنہائی کی درخواست کی اور اس راز سربستہ کے ظاہر کرنے اور بتانے کی التماس کی۔ شیخ (عبدالغنی) نے اس (راز) کو ان سے بیان کر دیا۔ جب ہمارے والد (شیخ عبدالاحد) شیخ (عبدالغنی) کے پاس سے باہر آئے تو شیخ جمیل الدین نے جو صاحب دل، فاضل اور والد (شیخ عبدالاحد) کے خلفاء میں سے تھے، ان (والد) سے پوچھا کہ آپ نے (اس راز) کو معلوم کیا۔ والد نے فرمایا کہ ہاں کیا۔ (پھر پوچھا) وہ کیا مسئلہ تھا کہ جو انہوں نے بتایا۔ فرمایا وہی مسئلہ تھا[29] جس پر ہم ہیں اور جو ہمارے طریقہ کی جان ہے یعنی یہ سب کچھ (کائنات) جو دکھلائی دیتا ہے واحد حقیقی ہے کہ جو کثرت کے عنوان میں نمودار ہوتا ہے لیکن چونکہ وہ درویش سادہ لوح تھا اور جیسے ہی یہ وزنی راز اس کے کان میں پڑا تو اس کا حوصلہ اس (راز) کا تحمل نہ کر سکا اور وہ ہلاک ہو گیا اور چونکہ شیخ عبدالغنی، عالم، صاحب تمکین اور راز سے آشنا تھے، اس لئے اپنی جگہ پر برقرار رہے۔"

شیخ معظم

شیخ معظم بدرجہ اتم شجاعت وغیرہ سے متصف تھے اور اس سلسلہ میں عجیب عجیب واقعات ہیں (جو) حد شمار سے باہر ہیں۔ حضرت والد بزرگوار (شیخ عبدالرحیم) فرماتے تھے کہ شیخ منصور کو کسی راجا سے لڑنا پڑا۔ انہوں نے لشکر کا میمنہ (داہنا حصہ) شیخ معظم کے سپرد کیا اور اس وقت ان کی عمر بارہ سال کی تھی۔ سخت لڑائی ہوئی اور دونوں طرف سے بہت سے لوگ قتل ہوئے۔ اسی دوران میں کہنے والے نے شیخ معظم سے کہا کہ شیخ منصور شہید ہو گئے اور ان کی تمام فوج بھاگ گئی، ان (شیخ معظم) کی رگِ غیرت حرکت میں آئی، کفار کے رئیس (کے مارنے) کا قصد کیا۔ اس دوران میں جو کوئی ان کو روکتا تھا وہ اس کو زخمی یا قتل کر کے سامنے سے ہٹا دیتے تھے، بہت کوشش کے بعد راجا کے ہاتھی تک پہنچ گئے۔ سردارانِ کفار میں سے ایک شخص نے مقابلہ کیا۔ انہوں نے تلوار کی ایک ضرب سے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے اور اس کے اعلیٰ جسم کو گھوڑے کے نیچے ڈال دیا۔ (اس کے بعد) بہت سے لوگوں نے ان کو گھیر لیا۔ اس راجا نے سب کو منع کیا اور ڈانٹا اور کہا کہ یہ شخص اتنی کم عمری میں ایسی جواں مردی اور جرأت کرتا ہے، یہ بات عجائب روزگار میں سے ہے۔

(راجا نے) اسی وقت شیخ معظم کے دونوں ہاتھوں کو چوما اور نہایت احترام کیا اور اس غصہ کا سبب دریافت کیا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے والد شہید ہو گئے ہیں۔ میں نے ارادہ کیا کہ میں حملہ کروں اور واپس نہ جاؤں

جب تک کہ یا تو راجہ کو قتل نہ کردوں یا خود نہ مارا جاؤں۔ راجا نے کہا کہ اس آدمی نے جھوٹ کہا تھا، تمہارے والد زندہ ہیں اور ان کے (لشکر کے) جھنڈے فلاں جگہ نظر آ رہے ہیں۔ اسی وقت شیخ منصور کے پاس آدمی بھیجا کہ ہم نے اس لڑکے کی وجہ سے صلح کی ہے اور جو کچھ وہ (شیخ منصور) اس راجا سے چاہتے تھے، اس نے قبول کیا اور واپس آ گئے۔ (30)

ڈاکوؤں سے مقابلہ

حضرت والد (شیخ عبدالرحیم) نے موضع شکوہ پورہ کے ایک بوڑھے کسان سے سنا۔ (یہ موضع) شیخ معظم کا تعلقہ تھا کہ ایک مرتبہ تقریباً تیس (30) ڈاکوؤں نے اس گاؤں میں ڈاکا ڈالا۔ اس وقت شیخ معظم بھی وہاں تھے اور وہاں ان کی اولاد، بھائیوں اور بنی اعمام میں سے کوئی موجود نہ تھا۔ لوگوں نے اس حادثہ کی ان کو خبر کی۔ اس وقت دستر خوان بچھ چکا تھا، کھانا آیا۔ انہوں (شیخ معظم) نے کسی عجلت یا جلدی کا مظاہرہ نہیں کیا اور باطمینانِ تمام حسب معمول کھانے سے فارغ ہوئے۔ ہاتھ دھوئے، پھر کہا میرے ہتھیار لاؤ اور میرے گھوڑے کو حاضر کرو۔ جب سوار ہوئے تو دیہاتیوں کا ایک ہتھیار بند گروہ آیا۔ انہوں نے سب کو واپس کر دیا اور فرمایا کہ میں بہت تیزی سے جاؤں گا اور تم میرے گھوڑے کی دوڑ تک نہ پہنچ سکو گے لیکن راوی کو جو گھوڑے کی دوڑ میں برابر ہو سکتا تھا، ساتھ لیا تا کہ وہ اپنی قوم کو اس معرکہ سے خبردار کر سکے جو ڈاکوؤں سے واقع ہو۔ پس وہ دوڑے یہاں تک کہ ان ڈاکوؤں کو جا لیا کہ جو اپنے ٹھکانوں پر پہنچ چکے تھے اور غیرت انگیز کلمات کہہ کر (اس) جماعت کو میدان میں لائے۔ اسی وقت ایک تیر سے دو آدمیوں کو مارنا شروع کر دیا۔ جب انہوں نے دو یا تین تیر اس انداز سے ملاحظہ کیے تو اس جماعت کے دلوں پر بہت رعب غالب آیا۔ وہ زندگی سے ناامید ہو گئے اور انہوں نے فریاد کرنی شروع کی کہ ہم توبہ کرتے ہیں اور ہمیں معاف کیجیے۔ شیخ (معظم) نے فرمایا کہ تمہاری توبہ یہی ہے کہ خود اپنے ہتھیار اتارو اور ہر ایک دوسرے کے ہاتھ باندھے۔ پھر سواری، ہتھیار، گھوڑے لے کر چلو یہاں تک کہ اس گاؤں تک پہنچو۔ (انہوں نے) ایسا ہی کیا اور اس طریقہ سے جو ان کے مذہب میں مقرر تھا، قسم موکد کھائی کہ پھر اس قصبہ کے بدخواہ نہ ہوں گے اور شیخ معظم کی صواب دید سے کبھی تجاوز نہ کریں گے۔

اولاد

غرض شیخ معظم کے سید نور الجبار سون پتی کی لڑکی سے جو ایک عالی نسب سید تھے اور ان (نور الجبار سون پتی) کے ذی عزت بزرگ، علم و فضل سے آراستہ تھے، تین لڑکے پیدا ہوئے۔ (1) شیخ جمال (2) شیخ فیروز (3) شیخ وجیہ الدین۔

شیخ وجیہ الدین

شیخ وجیہ الدین شجاعت و تقویٰ سے بدرجہ کمال متصف تھے۔ حضرت والد (شیخ عبدالرحیم) قدس سرہ فرماتے تھے کہ میرے والد رحمتہ اللہ علیہ کا معمول تھا کہ روزانہ دن رات میں قرآن شریف کے دو پارے تلاوت کرتے تھے اور اس (تلاوت) کو سفر، حضر، غم اور خوشی میں ترک نہیں کرتے تھے۔ جب بوڑھے ہو گئے اور قوت بینائی کم ہو گئی تو جلی خط میں لکھا

ہوا قرآن کریم اپنے پاس رکھتے تھے اور وہ سفر میں بھی ان سے جدا نہیں ہوتا تھا۔ نیز فرماتے تھے کہ وہ کسی کے کھیت میں اپنا گھوڑا نہیں ڈالتے تھے۔ اگرچہ سارا لشکر اس کھیت میں سے گزرتا تھا اور ان کو بعض اوقات متعارف راستہ سے ہٹ کر چلنا پڑتا تھا۔

تقویٰ

(شیخ عبدالرحیم) فرماتے تھے کہ کسی لڑائی میں ان (شیخ وجیہ الدین) کا ساز و سامان گم[31] ہوگیا۔ کھانے پینے کا سامان بھی مہیا نہ ہوا۔ ان کے ساتھی زبردستی گاؤں کے مویشی لے لیتے تھے اور کھاتے تھے اور انہوں نے ایسی پرہیزگاری کی کہ دو تین فاقے ہوگئے اور قوت بالکل ساقط ہوگئی تو رزاقِ حقیقی جل شانہ کی رزاقیت نے اس صورت میں ظہور فرمایا کہ اتفاق سے وہ چابک سے زمین کو کرید رہے تھے جیسا کہ فکر کے وقت ہوتا ہے، وہاں سے ان کی خوراک کے بقدر چنے ملے۔ چونکہ گری پڑی چیز کا کوئی مالک نہیں ہوتا ہے، اس لئے ان چنوں کو دھویا، پاکیزہ کیا۔ اپھر اُبالا اور تناول کیا۔

نیز شیخ عبدالرحیم فرماتے تھے کہ میرے والد (شیخ وجیہ الدین) رحمۃ اللہ علیہ خدام، ملازمین اور گھسیاروں وغیرہ کے ساتھ ایسی شفقت اور انصاف سے پیش آتے تھے کہ اس زمانہ کے متقیوں سے کم ایسا برتاؤ دیکھا گیا ہے۔

بیعت

نیز فرماتے تھے کہ ایک سفر میں میرے والد (شیخ وجیہ الدین) رحمۃ اللہ علیہ نے (کسی ولی) کی ولایت کے بعض ایسے شواہد ملاحظہ کیے کہ انہوں نے ان[32] سے بیعت کرلی اور صوفیوں کے اشغال میں مصروف ہوگئے۔ کم گوئی کی عادت ڈالی اور لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا اور اس سلسلہ میں انہوں نے ایسا کمال حاصل کیا کہ اس زمانے کے صوفیوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

کاتبِ حروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ شیخ مظفر رہتکی[33] میرے والد (شیخ عبدالرحیم) اور شیخ ابوالرضا محمد (تایا) کے متعلق ان (شیخ وجیہ الدین) کے ارتباط کو بیان کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں (شیخ عبدالرحیم و شیخ ابوالرضا محمد) ان کی شیرینی (اشغالِ صوفیہ) سے سیراب ہوتے ہوں گے اور ان دونوں نے اس منبع زلال سے فیض حاصل کیا ہوگا۔

حضرت والد (شیخ عبدالرحیم) قدس سرہ ان (شیخ وجیہ الدین) کی بہادری کی بہت سی حکایتیں بیان کرتے تھے۔ اس سلسلہ کی کچھ حکایتیں میں اس کتاب میں لکھتا ہوں تاکہ اس خاندان کے لوگوں کو اخلاقِ فاضلہ کے حاصل کرنے پر تنبیہ ہو اور عمل کا دارومدار نیتوں پر ہوتا ہے۔

سید حسین کی ہمراہی

ان حکایات میں سے ایک یہ ہے کہ (شیخ عبدالرحیم) فرماتے تھے کہ میری عمر چار سال کی تھی[34] کہ وہ (شیخ وجیہ الدین) سید حسین کے ہمراہ جو زمانہ کا ایک مشہور بہادر تھا، سرزمین مالوہ میں قصبہ دھامونی وغیرہ کی طرف گئے اور مجھے

اپنے ساتھ لے گئے۔ وہاں ایک کافر نے جو شجاعت و دلیری میں مشہور و معروف تھا، بغاوت و فساد اختیار کیا۔ بہت کوشش کے بعد وہ سید حسین کی ملاقات کے لئے آیا۔ پہریداروں نے چاہا کہ اس کو بغیر ہتھیاروں کے مجلس میں لائیں، وہ اس بات پر راضی نہ ہوا۔

جب اس سلسلہ میں زیادہ بحث و تکرار ہوئی تو اس نے سید حسین سے کہلا کر بھیجا کہ تم سپاہی ہو اور تمہارے پاس کافی جماعت ہے۔ تمہیں شرم نہیں آتی کہ ایک آدمی کو بغیر ہتھیاروں کے نہیں چھوڑتے کہ تمہاری مجلس میں آسکے۔ سید حسین اس بات سے متاثر ہوئے اور حکم دیا کہ کوئی شخص اس کے ہتھیاروں سے تعرض نہ کرے۔

(شیخ عبدالرحیم) فرماتے تھے کہ اس کی بشاشت کی صورت آج تک میرے خیال میں موجود ہے۔ وہ پان کھا رہا تھا اور آہستہ آہستہ چل رہا تھا جیسے کہ شادی کی مجلس میں آرہا ہے۔ جب میرے والد (شیخ وجیہ الدین) رحمتہ اللہ علیہ نے اس کو دیکھا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ شخص ضرور اس مجلس میں ہاتھا پائی کرے گا۔ انہوں نے فوراً ایک خدمت گار کو بلایا اور میری طرف اشارہ کیا کہ اس لڑکے کو کسی اونچی جگہ کھڑا کر دو تا کہ اس جھگڑے میں اسے کوئی نقصان نہ پہنچے۔

جب وہ نزدیک آیا تو سلام کرنے کے مقام سے آگے بڑھ گیا۔ دربان نے کہا کہ اس جگہ سے سلام کرو اور آگے مت بڑھو۔ اس نے دربان کے کہنے پر توجہ نہ دی اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ سید حسین کے پاؤں کو بوسہ دوں تا کہ میرے گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔ جب نزدیک پہنچا تو اس نے سید حسین کے اوپر تلوار چلائی۔ سید حسین بعجلت تمام ایک طرف ہو گئے اور شمشیر سید حسین کے تکیہ پر پڑی اور اس کو کاٹ دیا۔ اس نے دوسری مرتبہ پھر تلوار اٹھائی اور سید حسین کے مارنے کا ارادہ کیا کہ میرے والد (شیخ وجیہ الدین) پھرتی سے اس کے پاس پہنچ گئے اور خنجر کی ایک ضرب سے اس کو واصل جہنم کیا۔

بے مثال بہادری

(ان کے بہادری کے قصوں میں سے) یہ بھی ہے کہ (شیخ عبدالرحیم) فرماتے ہیں کہ اسی علاقہ میں ایک دن سید حسین لڑائی میں شریک ہوئے۔ جب موافق و مخالف (دونوں طرف) کی صفیں آراستہ ہو گئیں تو رئیس کفار اکیلا گھوڑے پر سوار، تلوار گردن میں حمائل کیے ہوئے آگے بڑھا اور بلند آواز سے پکارا کہ میں فلاں (شخص) ہوں۔ اس معرکے میں اکیلا کھڑا ہوں۔ اگر چاہتے ہو کہ مجھے قتل کر دو تو کر سکتے ہو لیکن بہادری کی شرط یہ ہے کہ سید حسین اکیلا مجھ سے مقابلہ کرے۔ سید کی رگِ ہاشمی حرکت میں آئی۔ وہ (سید حسین) اپنے گھوڑے کو صف سے باہر لائے اور اس کے مقابلہ میں مشغول ہو گئے۔ اس کافر نے عجب چابکدستی سے تلوار چلا دی۔ سید حسین نے اس کو اپنی ڈھال پر لیا۔ اس تلوار نے ڈھال کی ایک کل[35] (دستہ) کو کاٹ دیا اور دوسرے دستہ میں اٹک گئی۔ جب اس راجا نے اس تلوار کو پوری قوت سے ڈھال میں سے کھینچا تو سید حسین گھوڑے سے گر گئے۔ کافر گھوڑے سے کود پڑا اور سید حسین کے سینہ پر بیٹھ گیا اور ان کو قتل کرنے کی سوچنے لگا۔ میرے والد (شیخ وجیہ الدین) اسی وقت اس کے پاس پہنچے اور تلوار کی ایک ضرب سے اس کی زندگی کی رسی کو کاٹ دیا۔

جب وہ اس جگہ سے اٹھ گئے اور ہر ایک اپنے اپنے ٹھکانے پر آ گیا تو ایک دوسرا سوار پہلے کے ہم شکل آگے بڑھا اور بلند آواز سے پکارا کہ میں فلاں ہوں اور مقتول کا بھائی ہوں۔ تمہارے سامنے اکیلا کھڑا ہوں۔ جو کوئی چاہے اس سے کہو کہ وہ مجھے مارے لیکن بہادری کی شرط یہ ہے کہ میرے بھائی کا قاتل مجھ سے مقابلہ کرے۔ میرے والد (شیخ وجیہ الدین) اس کی طرف متوجہ ہوئے اور چند مختلف ضربوں کے بعد اسے جہنم رسید کیا۔

ایک ساعت کے بعد اس صورت اور شباہت کا تیسرا سوار ظاہر ہوا۔ (اس نے بھی) اسی طرح اپنا مقابل طلب کیا۔ میرے والد پھر مقابلہ کے لئے آگے بڑھے۔ اس نے میرے والد کی دونوں کلائیوں کو پکڑ لیا اور چاہا کہ زمین پر دے مارے یا اپنے گھوڑے پر ڈال لے۔ وہ مدافعت اور مزاحمت کرتے تھے۔ آخر انہوں نے دیکھا کہ کافر زیادہ قوی ہے تو پھر انہوں نے بطور حیلہ کہا کہ:

"ہاں اس امیر کو اس کے پیچھے سے مت مار۔"

اور وہاں کوئی آدمی نہ تھا۔ کافر نے اپنا منہ پیچھے کی طرف پھیرا۔ اس وقفہ میں درحقیقت اس کے بازو کی قوت کمزور پڑ گئی۔ انہوں نے اپنے کو اس سے رہائی دلائی اور خنجر سے اس کا کام تمام کر دیا۔ اس مقابلہ کے بعد کفار کو شکست ہوئی اور اسلام کا لشکر مظفر و منصور اپنے پڑاؤ پر آیا۔

تین دن کے بعد ایک بڑھیا ان کا نام پوچھتی پوچھتی ان کے خیمہ میں آئی اور کہا کہ میں ان تینوں مقتولوں کی ماں ہوں۔ میں سمجھتی تھی کہ دنیا میں کوئی شخص میرے بیٹوں سے زیادہ شجاع اور بہادر نہیں ہے۔ خدا کی تجھ پر رحمت ہو کہ تو سب سے بہتر ہے۔ میں نے ان کے بجائے تجھے فرزند اختیار کیا۔ میری یہ خواہش ہے کہ تو مجھے اپنی ماں کہے اور کچھ دنوں گاؤں میں میرے پاس رہے تاکہ تجھے خوب دیکھوں[36] اور مقتولوں کی طرف سے تسلی پاؤں۔

انہوں (وجیہ الدین) نے اپنے خادم سے کہا کہ میرے گھوڑے پر زین کسو۔ ان کے اعزہ کے گروہ میں سے جوان کے بھائی بند تھے، وہ مانع ہوئے اور کہا کہ تعجب ہے کہ تم جیسا عقل مند آدمی اس قسم کی حرکت کرے۔ وہ اس جماعت کے منع کرنے کو کسی شمار میں نہ لائے۔ اس گروہ نے (سب کیفیت) سید حسین کو بتائی۔ سید حسین نہایت عجلت کے ساتھ ان کے خیمے میں آئے اور مؤکد قسم دلا کر ان کو اس طرف جانے سے باز رکھا۔

جب انہوں نے کوئی چارہ نہ دیکھا تو انہوں نے اس بڑھیا کو بلایا اور کہا کہ اے ماں! یہ لوگ مجھے نہیں چھوڑتے کہ میں (تیرے ساتھ) چلوں لیکن کچھ روز کے بعد تیرے گاؤں میں آؤں گا۔ کچھ دنوں کے بعد جب احباب غافل ہو گئے تو وہ سوار ہو کر اس بڑھیا کے گھر پہنچ گئے۔ وہ بڑھیا ایسی محبت، اخلاص اور تعظیم سے پیش آئی کہ حقیقی والدہ (اور اس) میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا تھا۔

حضرت والد (شیخ عبدالرحیم) نے فرمایا کہ بارہا میں اس کے یہاں جاتا رہا۔ میں اس کو دادی کہتا تھا اور وہ محبت میں کمی نہیں کرتی تھی بلکہ میں نے اپنی دادی کو نہیں دیکھا تھا اور بچپن میں، میں نہیں سمجھتا تھا کہ اس بڑھیا کے علاوہ میری دوسری دادی بھی ہے۔[37]

شاہ شجاع کی لڑائی میں شرکت

ان (شیخ وجیہ الدین) کا یہ بھی واقعہ ہے کہ والد صاحب نے فرمایا کہ جب عالمگیر بادشاہ ہوا تو اس کے بھائی شاہ شجاع نے بنگالہ کی طرف خروج کیا۔ عالمگیر اس سے لڑنے کے لئے متوجہ ہوا اور (شیخ وجیہ الدین) بھی عالمگیر کے لشکر میں تھے۔ سخت لڑائی ہوئی۔ دو لشکر تباہ ہوئے۔ آخر دو تین مست ہاتھیوں نے شاہ شجاع عالمگیر کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ ہر ہاتھی کے پیچھے زرہ پوشوں کی ایک جماعت تھی۔ جب یہ صورت ظہور پذیر ہوئی تو عالمگیر کے لشکر میں تفرقہ پڑ گیا اور ہر ایک کسی (نہ کسی) طرف کو چلا گیا۔ عالمگیر کے ہاتھی کے اردگرد بہت تھوڑے سے آدمیوں کے سوا کوئی موجود نہ تھا۔

اس وقت میرے والد (شیخ وجیہ الدین) علیہ الرحمہ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ ان ہاتھیوں میں سے کسی ایک پر حملہ کر دیں۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہ جان دینے کا وقت ہے، ایسے موقع پر استقامت ہر کسی سے ظاہر نہیں ہوتی۔ ہاں جو کوئی علیحدگی چاہتا ہے، اسے میری طرف سے اجازت ہے۔ سوائے چار آدمیوں کے اکثر ساتھیوں نے علیحدگی اختیار کر لی۔

فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے رفیقوں میں سے کوئی ہماری محبت میں شریک ہوگا تو یہی چار آدمی ہوں گے۔ ان چار آدمیوں نے ان کے شکار بند کو مضبوطی سے پکڑا اور آپس میں طے کیا کہ جہاں کہیں وہ (شیخ وجیہ الدین) ہوں گے ہم بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔ اس کے بعد اس ہاتھی پر جو زیادہ سرکشی کر رہا تھا، حملہ کر دیا اور توقف کیا۔ یہاں تک کہ ہاتھی نے اپنی سونڈ کو ان کی طرف اٹھایا اور چاہا کہ ان کو گھوڑے سے اٹھا دے یا گرا دے۔ اس وقت انہوں نے تلوار کے ایک حملہ سے اس کی سونڈ کو نیچے کی طرف سے کاٹ ڈالا۔ ہاتھی ایک خوفناک آواز نکال کر بھاگا اور اس کا نقصان اس کی جماعت کو ہوا۔ یہ پہلی فتح تھی۔[38] عالمگیر نے اس معاملہ کو اپنی آنکھ سے دیکھا اور فتح کے بعد چاہا کہ ان کے منصب کو زیادہ کر دے۔ انہوں نے استغناء اختیار کیا اور قبول نہ کیا۔

سید شہاب الدین کی سرزنش

ان کے واقعات میں یہ بھی ہے کہ (شیخ عبدالرحیم) فرمایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ سید شہاب الدین کو بادشاہ کی طرف سے محاسبہ پیش آیا۔ وہ اس کے کفیل (ضامن) بن گئے اور جب اس نے رقم کے ادا کرنے میں تساہل کیا تو پھر ان (شیخ وجیہ الدین) سے مطالبہ کیا گیا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اس (شہاب الدین) سے گفتگو کی۔ اس نے کہا کہ میرے پاس روپیہ بالکل نہیں ہے، تلوار حاضر ہے۔

انہوں نے یہ سن کر تبسم کیا اور کہا کہ شمشیر پکڑنا آسان ہے مگر اس کی ذمہ داری سے برآنا مشکل ہے۔ اس کی غیرت حرکت میں آئی۔ اس نے ان پر خنجر چلایا جس کو انہوں نے بائیں ہاتھ میں پکڑ لیا اور سیدھے ہاتھ سے اس کے طمانچہ مارا، وہ اوندھا ہو کر زمین پر گر گیا اور بے ہوش ہو گیا۔

ایک خادم سے انہوں نے فرمایا کہ اس کو رسی سے باندھ دے اور اس کے گھوڑوں اور اونٹوں کو طویلے لے

آئے۔ اس کی ساعت کے بعد اسے ہوش آیا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ تیراڈینگیں مارنا کہاں گیا۔ اس نے کہا کہ میں نے کوئی کمی نہیں کی۔ تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ سے پہلے حرکت میں آ گیا۔ مجھے سخت چوٹ آئی اور میں بے ہوش ہو گیا۔ اس میں میری کیا تقصیر ہے۔ فرمایا تو ٹھیک کہتا ہے، خادم کو یہ اشارہ کیا کہ رسی اس سے علیحدہ کر دے اور اس کے ہاتھ میں خنجر دے دے۔ اس نے (خنجر) لے لیا اور چاہا کہ حملہ کرے۔ اس کے جسم پر رعشہ طاری ہو گیا اور وہ حملہ نہ کر سکا۔ حضرت (شیخ عبدالرحیم) نے یہ واقعہ خود اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔

قوتِ قلب کا مظاہرہ

ان ہی کے واقعات میں سے ہے کہ حضرت (شیخ عبدالرحیم) فرماتے تھے کہ میرے والد کے قلب کی قوت اس حد تک تھی کہ کسی لڑائی میں سخت مقابلہ ہوا۔ دونوں طرف سے کثیر جماعت مقتول ہوئی اور آخر فتح مسلمانوں کو ہوئی۔ جب مسلمانوں کا سردار اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو رات کے وقت اس لشکر کے سردار کی ایک جماعت نے اس کے حضور میں مقتولوں کی تعداد کے متعلق مناظرہ کیا۔ ہر ایک نے رائے ظاہر کی۔ انہوں (شیخ وجیہ الدین) نے کہا کہ میرے خیال میں آتا ہے کہ معرکہ میں دونوں طرف کے دوسو آدمی (کام آئے) ہوں گے یا اس تعداد سے پانچ زیادہ یا پانچ کم ہوں گے اور جو لوگ شکست کھا کر بھاگ گئے، ان کا حال معلوم نہیں۔

حاضرین نے تعجب کیا۔ اس جماعت کے تعجب کرنے سے ان کے دل میں فکر پیدا ہوئی اور چاہا کہ حقیقت حال پر مطلع ہوں۔ وہ اس مجلس سے ایسے اٹھے جیسے کوئی قضائے حاجت کو جاتا ہے اور اس اندھیری رات میں جبکہ بادل اور بجلی گرج رہی تھی، میدانِ جنگ کی طرف چل دیئے اور بہت احتیاط کے ساتھ ان (مقتولین) کو شمار کیا۔ اسی دوران ان کا ہاتھ ایک زخمی پر پڑا کہ جس میں زندگی کی رمق باقی تھی۔ اس نے چیخ ماری۔ انہوں نے اس کو تسلی دی اور اس کو اپنا نام بتایا۔

اس کے بعد ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کچھ لڑائی گاؤں کے درمیان میں بھی ہوئی تھی۔ اس کو بھی دیکھنا چاہیے اور ان مقامات کو خوب دیکھا جہاں احتمال تھا۔ اسی دوران میں ان کا ہاتھ ایک بڑھیا پر پڑ گیا کہ جو لڑائی کے وقت ایک گوشہ میں چھپ گئی تھی۔ اس نے بھی چیخ و پکار کی۔ اس کو بھی انہوں نے تسلی دی اور اس کو بھی اپنا نام بتلایا۔

مقتولین کی تعداد ان (شیخ وجیہ الدین) کے کہنے کے مطابق نکلی۔ وہ لشکر میں واپس آئے اور اس مجلس کو اسی طرح (بیٹھا ہوا) پایا جو کچھ انہوں نے کیا تھا اور دیکھا تھا۔ وہ (اس مجلس کو) بتایا۔ اس بات سے ان کو اور بھی تعجب ہوا۔ اس سردار نے تقریباً سو آدمی مشعلوں کے ساتھ مقرر کیے تاکہ وہ مقتولین کو شمار کریں اور ان دونوں آدمیوں کو لا دیں۔ یہ جماعت اس وقت اور مقام کی ہیبت کی وجہ سے نہیں چاہتی تھی کہ جائے۔ بالآخر میدانِ جنگ کو روانہ ہوئی، مقتولین کو شمار کیا اور ان دونوں آدمیوں کو لائی۔ ان (شیخ وجیہ الدین) کے کہنے کے موافق ظاہر ہوا اور ان دونوں نے (جن کو وہ ساتھ لائے تھے) ان (شیخ وجیہ الدین کے نام سے (لوگوں کو) مطلع کیا۔ ان کے اس طرح کے نوادر واقعات بہت سے ہیں۔

القلیل ینبی عن الکثیر

قلیل کثیر کی خبر دیتا ہے۔

والغرفة يحكي عن البحر الكبير
تھوڑا سا پانی بڑے سمندر کو بتاتا ہے۔

اولاد

شیخ رفیع الدین محمد بن قطب عالم بن شیخ عبدالعزیز کی لڑکی کے ساتھ ان (شیخ وجیہ الدین) کی شادی ہوئی تھی (جس سے) تین لڑکے پیدا ہوئے۔ (1) مخدومی شیخ ابوالرضا محمد (2) مخدومی شیخ عبدالرحیم (3) مخدومی شیخ عبدالحکیم۔

شہادت

والد صاحب (شیخ عبدالرحیم) فرمایا کرتے تھے کہ میرے والد ایک رات تہجد کی نماز ادا کر رہے تھے۔ (ان کو) ایک سجدے میں بہت دیر ہوئی۔ یہاں تک کہ میں نے خیال کیا کہ ان کی روح ان کے جسم سے نکل گئی۔ جب حالت درست ہوئی تو اس بہت دیر (کے سجدے) کے بارے میں میں نے سوال کیا۔ فرمایا کہ مجھے غیبت واقع ہوئی اور وہاں مجھے اپنے ان عزیزوں کے بارے میں اطلاع ملی جو شہید ہو گئے تھے۔ ان کے حالات و واقعات مجھے بہت پسند آئے اور میں نے حضرت حق سبحانہ کی جناب سے شہادت کی درخواست کی اور بہت زیادہ گڑگڑایا یہاں تک کہ مجھ پر قبولیت ظاہر ہوگئی اور دکن کی طرف کا حکم ہوا کہ شہادت کی جگہ وہاں ہے۔

اس واقعہ کے بعد از سر نو سفر کا اسباب کیا۔ حالانکہ نوکری چھوڑ چکے تھے اور اس کام سے ایک نفرت سی ہوگئی تھی۔ گھوڑا خریدا اور اس طرف (دکن) کو چل دیئے اور ان کو یہ گمان ہوا کہ ''سیوا'' سے (مقابلہ کا اشارہ) ہوگا کہ جو اس وقت کفار کا سردار تھا[39] اور جس سے مسلمانوں کے قاضی کی نسبت بہت سخت بے حرمتی ظہور میں آئی تھی۔[40]

جب وہ برہان پور پہنچے تو ان کو منکشف ہوا کہ وہ شہادت کے مقام کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ اسی طرف واپس لوٹے۔ اثنائے راہ میں بعض تاجروں کے ساتھ انہوں نے موافقت کا عہد باندھا۔ جو (تاجر) اصلاح و تقویٰ سے آراستہ تھے اور یہ ارادہ کیا کہ قصبہ ''ہنڈیا'' کے راستہ سے ہندوستان کو آئیں۔ اسی دوران میں ایک بوڑھا آدمی (ان کے) سامنے آیا کہ جو گرتا پڑتا چلا جا رہا تھا۔ انہوں نے اس کے حال پر رحم کیا اور اس سے مقصد پوچھا۔ اس نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ دہلی جاؤں۔ انہوں (شیخ وجیہ الدین) نے فرمایا کہ میرے ملازموں سے تین پیسے یومیہ لو۔ وہ بوڑھا کافروں کا جاسوس تھا۔

جب (وہ لوگ) نونبریا[41] کی سرائے میں پہنچے کہ جو دریائے نربدہ سے دو تین منزل ہندوستان کی طرف ہے، جاسوس نے اپنے بھائیوں (ساتھیوں) کو خبر کر دی۔ سرائے میں ڈاکوؤں کی ایک جماعت آ گئی اور وہ (شیخ وجیہ الدین) اس وقت قرآن شریف کی تلاوت میں مشغول تھے۔ اس گروہ میں سے تین آدمی آگے بڑھے (اور پوچھا) کہ وجیہ الدین کون ہے؟ جب انہوں (ڈاکوؤں) نے پہچان لیا تو کہا کہ ہمیں تم سے کچھ مطلب نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تمہارے پاس کچھ مال بھی نہیں ہے اور ہماری جماعت میں سے ایک آدمی پر تمہارا حق نمک (احسان) بھی ہے لیکن یہ تاجر اپنے

ساتھ فلاں فلاں مال رکھتے ہیں، ہم ان کو نہیں چھوڑیں گے۔

چونکہ اس سفر کا اصلی سبب ان (شیخ وجیہ الدین) کو معلوم تھا، لہٰذا وہ اس رفاقت کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے اور قتل وغارت کو روکنے کے لئے آگے بڑھے۔ اسی دوران میں ان کو بائیس زخم آئے اور ایک زخم سے ان کا سرتن سے جدا ہو گیا۔ اس کے باوجود تکبیر کہتے ہوئے انہوں نے پچاس قدم تک کفار کا تعاقب کیا۔ اس کے بعد ایک عورت یہ حال دیکھ کر بہت متعجب ہوئی۔ اسی وقت وہ گر پڑے اور وہیں وہ دفن ہوئے۔ (42)

حضرت والد (شیخ عبدالرحیم) فرماتے تھے کہ ایک دن وہ نظر آئے اور زخموں کے مقامات دکھلائے۔ میں (شیخ عبدالرحیم) نے ان کے ثواب کے لئے کوئی چیز صدقہ دے دی اور (شیخ عبدالرحیم) فرماتے تھے کہ میں چاہتا تھا کہ ان کے جسم کو منتقل کروں کہ ایک اور مرتبہ وہ (شیخ وجیہ الدین) نظر آئے اور اس بات سے منع کیا۔ ان (شیخ وجیہ الدین) کے قتل کی خبریں حد سے زیادہ مشہور ہیں۔

حواشی

(1) ذیلی عنوان مترجم نے قائم کیے ہیں۔

(2) الثورۃ الہندیہ (باغی ہندوستان) میں عبدالشاہد خان شروانی نے شیر الملک شاہ ایرانی بن شاہ عطاء الملک بن ملک بادشاہ لکھا ہے۔ (الثورۃ الہندیہ۔ صفحہ 12۔ بجنور 1947ء)

(3) شروانی صاحب نے صرف ''حاکم'' لکھا ہے (الثورۃ الہندیہ۔ صفحہ 12)

(4) شروانی صاحب نے ''تائردن'' لکھا ہے۔ ایضاً۔ صفحہ 12

(5) شروانی نے ''احمد نامدار'' لکھا ہے۔ ایضاً صفحہ 12

(6) درنسخہ الف ''ماہان'' اور شروانی صاحب نے ''داماں'' لکھا ہے۔

(7) درنسخہ الف ''عفان بن عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن عمر بن الخطابؓ'' حضرت عبداللہ (ف 73ھ) بن عمر فاروقؓ کے بارہ فرزند (1) ابوبکر (2) ابوعبیدہ (3) واقد (4) عبداللہ (5) عمر (6) عبدالرحمٰن (7) سالم (8) عبیداللہ (9) حمزہ (10) زید (11) بلال (12) ابوسلمہ تھے۔ (کتاب الطبقات الکبیر (ابن سعد) جلد چہارم صفحہ 105 طبع برلن 1323ھ) وتہذیب التہذیب۔ جلد پنجم ابن حجر عسقلانی حیدرآباد دکن 1326ھ) ان میں سے کسی فرزند کا نام عفان یا محمد نہیں ہے۔ شاید یہاں یہ بات خالی از دلچسپی نہ ہو کہ فاروقیانِ ہند کے بعض خاندان (مدراس، گوپامئو، اودھ، امروہہ، بچھرایوں (ضلع مراد آباد) شیخو پور (بدایوں) تھانہ بھون، جونپور) اپنا شجرہ نسب حضرت عبداللہ بن عمر کے ایک صاحبزادے ناصرالدین یا ناصر سے ملاتے ہیں۔ حالانکہ کتب رجال میں ان کے کسی فرزند کا نام ناصرالدین یا ناصر نہیں ہے۔ تاریخ وانساب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو ''فاروقیانِ ہند و پاکستان'' کے شجروں پر تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں شیخ وحید احمد مسعود ساکن شیخو پور (ضلع بدایوں، یوپی) نے جو خاندانی اعتبار سے فریدی فاروقی ہیں، اپنی کتاب ''سوانح حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ''۔ (صفحہ 53-59) میں نہایت مبصرانہ اور صحت مند بحث کی ہے جو پاک اکیڈمی (141/1 وحیدہ آباد) کراچی نمبر 18 سے 1965ء میں شائع ہوئی۔

(8) بدایوں کے سلسلہ میں مختلف کتب تواریخ مختلف خاندانوں کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ شجرے خاکسار کے پیش نظر ہیں مگران بزرگ ''شاہ ارزانی'' کا کہیں کوئی سراغ نہیں ملتا۔

(9) شاہ ارزانی بدایونی کی اولاد میں مشہور عالم وفاضل مولانا فضل حق خیر آبادی (ف 1861ء) بیان کیے جاتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے شاہ ارزانی کو بصراحت شیر ملک کے بیٹے ''سالار حسام الدین'' کی اولاد میں بتایا ہے (خاکسار کے پیش نظر ''امداد فی مآثر الاجداد'' کے تین مختلف مطابع کے مطبوعہ نسخے موجود ہیں۔ تینوں میں شیر ملک کے لڑکے کا نام سالار حسام الدین لکھا ہے) مگر مولانا فضل حق خیر آبادی کے سوانح نگار مولوی عبدالشاہد خان شیروانی (الثورۃ الہندیہ۔ صفحہ 12-13) اور مفتی انتظام اللہ شہابی (مولانا فضل حق خیر آبادی اور پہلی جنگ آزادی 1857ء۔ صفحہ 7 طبع کراچی 1957ء) نے ان کو بغیر کسی حوالے اور شاہ ولی اللہ کی اس صراحت کو نظر انداز کرتے ہوئے شیر ملک کے ایک اور بیٹے ''بہاء الدین'' کی اولاد میں شاہ ارزانی کو بتایا ہے، گوپامئو کے انساب پر مولوی مصطفیٰ علی خاں گوپاموی (ف 1234ھ) کا مشہور رسالہ ''تذکرۃ الانساب'' (طبع مدراس 1955ء) خاکسار کے پیش نظر ہے۔ اس میں انہوں نے شاہ ارزانی کا اوپر کا سلسلہ مطلق نہیں دیا ہے۔ عبدالشاہد خان شیروانی اور مفتی شہابی صاحب نے کہیں اپنے مآخذ کا ذکر نہیں کیا ہے اور یہ نہیں بتایا کہ شاہ ولی اللہ کی صراحت کے باوجود انہوں نے سالار حسام الدین کی بجائے بہاء الدین کیوں اور کہاں سے لکھا ہے۔
شیروانی صاحب نے بہاء الدین کو مفتی بدایوں بھی لکھا ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ یہ کس تاریخ یا کتاب کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔

(10) ''ملک'' کا لفظ آج بھی پنجاب میں تعظیم کے لئے بولا جاتا ہے۔

(11) درنسخہ الف ''سادات وقریش شراواں'' ودرنسخہ مجتبائی ''سادات وقریش فراواں''

(12) یہ بیان محتاج ثبوت ہے۔

(13) رہتک میں ایک صدیقی شیوخ اور دوسرا قریشی شیوخ کا خاندان آباد ہے۔ یہ خاندان آخر تک امتیاز واقتدار کے حامل رہے۔ تفصیل کے لئے دیکھیے مآثر الاجداد از پروفیسر منظور الحق صدیقی (المکتبہ السلفیہ، لاہور 1964ء)

(14) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ان کے زمانہ کا تعین نہیں کیا ہے لیکن شمس الدین، سیدنا عمر فاروقؓ کی اٹھارہویں یا انیسویں پشت میں ہیں، رہتک کے صدیقی خاندان کے مورث قاضی قوام الدین کی آمد ابتدائی عہد تغلق (1220ء تا 1225ء) بیان کی جاتی ہے۔ یہ زمانہ ساتویں صدی ہجری کا شروع ہے۔ قاضی قوام الدین، سیدنا صدیق اکبرؓ کی سترہویں پشت میں بیان کیے جاتے ہیں (مآثر الاجداد، صفحہ 8-11) علم انساب کی رو سے ایک صدی میں تین پشتیں گزرتی ہیں، اس لئے ان بزرگوں (مفتی شمس الدین اور قاضی قوام الدین) کے آمد کے زمانہ کا تعین ٹھیک معلوم ہوتا ہے مگر بظاہر تقدم قاضی قوام الدین کو ملتا ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

(15) قاضی ومحتسب کے باقاعدہ سرکاری منصب تھے، لہٰذا ان مناصب کے بغیر کسی کو قاضی ومحتسب کیسے پکارا جاسکتا تھا۔ آج کل بھی کسی کو جج یا سپرنٹنڈنٹ پولیس بغیر منصب کے نہیں پکار سکتے ہیں۔

(16) شاہ ولی اللہ نے شمس الدین مفتی کے پڑپوتے قطب الدین کے گزرنے کے بعد ان شہروں (رہتک وغیرہ) میں عہدۂ قضا کا قیام بتایا ہے۔ حالانکہ آغاز مضمون میں رہتک میں سادات وقریش کی کثیر آبادی بتائی ہے اور بتایا ہے کہ وہ اس علاقہ کا سب سے زیادہ بارونق شہر تھا تو گویا ڈیڑھ دوسو برس تک وہاں عہدۂ قضا قائم نہ ہوا حالانکہ ''مآثر الاجداد'' (صفحہ 9) کے مؤلف نے بتایا ہے کہ 1220ء تا 1225ء کے درمیان (شروع ساتویں ہجری میں) (یعنی مفتی شمس الدین کے زمانے میں) رہتک کے قاضی قوام الدین مقرر ہوئے اور اس کے بعد یہ عہدہ ان کی اولاد کے پاس رہا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ رہتک کے علاوہ کسی اور قصبہ کے قاضی مقرر ہوئے ہوں گے۔

(17) یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ ہندوؤں کی زبان پر کیوں بگڑا، شجرہ میں تو مسلمانوں نے ان کو قاضی قادن لکھا ہے اور پھر شیخ بدہ بھائی خان اور منکن تو بالکل ہندی نام ہیں، شاہ صاحب نے ان کی توجیہ نہیں فرمائی۔

(18) درنسخہ الف ''الہ دین''

(19) مسلم عہد حکومت میں ''عہدۂ قضا'' ایک سرکاری منصب تھا (ملاحظہ ہو: دی ایڈمنسٹریشن آف دی سلطنت آف دہلی از ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی۔ صفحہ 161 (لاہور 1944ء)

(20) درنسخہ الف ''فریدہ''

(21) درنسخہ الف ''حکم''

(22) پیراگراف کے آغاز سے اس جملہ تک نسخہ الف میں عبارت بے ربط اور مغلق ہے۔

(23) ترمذی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔ **حد ثنا احمد بن محمد، حد ثنا عبداللہ بن المبارك عن عبدالملك بن عیسیٰ الثقفی عن یزد مولی المنبعث عن ابی هریرة عن النبی** جلد اول صفحہ 192 (مرتبہ مولانا احمد علی سہارنپوری۔ طبع مکتبہ رحیمیہ۔ دیو بند)

(24) شیخ عبدالغنی کو عالم، متقی اور اکبر بادشاہ کی نظر میں بزرگ اور ذی عظمت بیان کیا گیا ہے۔ بادشاہ کی بے دینی اور گمراہی اختیار کرنے پر بادشاہ سے محبت کا تعلق ختم ہوا اور نفرت ظہور پذیر ہوئی۔ دور اکبری کی کسی تاریخ، اکبر نامہ، آئین اکبری، طبقات اکبری اور منتخب التواریخ وغیرہ میں ان بزرگوں کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ ملا عبدالقادر بدایونی تو ان بزرگوار کا ضرور ذکر کرتے ان کی تاریخ بھی ان کے ذکر سے خالی ہے۔

(25) اکبر نے چتوڑ کا قلعہ 975ھ مطابق 1567ء میں فتح کیا اور نئے مذہب کا اجراء فتح چتوڑ کے بارہ برس بعد 987ھ مطابق 1579ء میں ہوا، لہٰذا یہ کہانی بالکل بے بنیاد ہوئی۔

(26) درنسخہ الف ''آں'' کہ بے معنی است، امام محمد باقر کا کوئی فرزند امام ناصر الدین نہیں ہے اور امام محمد باقر کے کسی فرزند کا متصل دہلی اس وقت آنا تاریخی واقعات کے خلاف ہے۔ البتہ ان کی اولاد میں ناصر الدین شہید بروالوی کا ذکر ملتا ہے اور ان کو مرتبین شجرہ نے بائیسویں پشت میں دکھایا ہے۔ ان کا مزار بروالہ متصل ہانسی واقع ہے۔ ملاحظہ ہو تاریخ ناصری اور حامد علی نقوی۔ صفحہ 13-16 و سراج النسب از سراج الحق۔ صفحہ 21-22 (ضیاء الاسلام پریس قادیان 1314ھ)

(27) چتوڑ کا تفصیلی حال ''اکبر دی گریٹ مغل'' صفحہ 81-96 (انگریزی) میں ملاحظہ ہو۔

(28) ملاحظہ ہو زبدۃ المقامات از خواجہ ہاشم کشمی۔ صفحہ 113-115 (طبع نول کشور)

(29) مسئلہ وحدت الوجود مراد ہے۔

(30) شاہ ولی اللہ دہلوی نے زمانہ کا تعین نہیں فرمایا۔

(31) درنسخہ الف ''کم''

(32) ان بزرگ کا نام نہیں لکھا۔

(33) شیخ مظفر رہتکی کا حال نہیں ملتا۔ مآثر الاجداد (تذکرہ صدیقیان رہتک) بھی ان کے ذکر سے خالی ہے۔

(34) چار سال کے بچہ کو لڑائی میں ساتھ لے جانا سمجھ میں نہیں آیا، ممکن ہے ''چہاردہ'' ہو اور طباعت میں ''دہ'' کا لفظ رہ گیا ہو۔

(35) درنسخہ الف ''گل''

(36) درنسخہ مجتبائی ''سیینم'' و درنسخہ الف ''پسرینم''

(37) اس واقعہ سے غیر مسلموں کے ساتھ ان کے تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے۔

(38) جادو ناتھ سرکار نے اپنی کتاب ''ہسٹری آف اورنگزیب'' جلد دوم میں شجاع کے مقابلہ اور جنگ کا تفصیلی ذکر کیا ہے اور اس سلسلہ میں انیسویں اور تیسویں باب میں بہت تفصیل بیان کی ہے۔ اس میں اورنگزیب کے وقار، تحمل، تہجد گزاری اور رجوع الی اللہ کا اکثر ذکر کیا ہے۔ حالانکہ جادو ناتھ سرکار نے موقع بے موقع اپنے تعصب کا اظہار کیا ہے مگر ان ابواب میں کہیں اس بیان کا تاثر نہیں ملتا۔ (ہسٹری آف اورنگزیب از جادو ناتھ سرکار۔ جلد دوم باب وتیس، کلکتہ 1912ء)

(39) سیوا جی کا انتقال 4 اپریل 1680ء کو ہوا، لہٰذا اس سے قبل کا یہ واقعہ ہوگا۔

(40) اس واقعہ کی تفصیل نہیں دی۔

(41) در نسخہ الف ''تو تیڑیا''

(42) خلیفۂ اول جماعت احمدیہ قادیان حکیم نورالدین (ف 1914ء) نے لکھا ہے: ''اسی راستہ (گنہ چھاؤنی سے بھوپال جاتے ہوئے تھوڑے فاصلہ) میں، میں نے حضرت شاہ وجیہ الدین کے (جو شیخ المشائخ، شاہ ولی اللہ صاحب کے بڑے تھے) گنج شہیداں کو دیکھنے اور عبرت حاصل کرنے میں بہت فائدہ اٹھایا۔ وہاں شاہ صاحب (وجیہ الدین) کو ''کنگن ولی'' کہتے ہیں۔''
(مرقاۃ الیقین فی حیوٰۃ نورالدین، مرتبہ اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔ صفحہ 80 طبع لاہور، احمدیہ انجمن اشاعتِ اسلام، لاہور)

محمد عبدالحلیم چشتی

چہل حدیث شاہ ولی اللہ

محدثین کے یہاں کتب حدیث کے اقسام ستہ میں سے چھٹی قسم اربعینات سے ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (المتوفی 1239ھ) ''عجالہ نافعہ'' میں رقمطراز ہیں:

''اقسام تصانیف حدیث شش اند، جوامع و مسانید ومعاجم و اجزاء و رسائل و اربعینات۔ (اور اربعنات کی تعریف یہ کی ہے) از تصانیفِ احادیث کہ آنزا اربعین نامند یعنی چہل حدیث در یک باب یا ابواب متفرقہ بیک سند یا اسانید نامند یعنی چہل حدیث در یک باب یا ابواب متفرقہ بیک سند یا اسانیت متعددہ جمع نمایندو اربعینات ہم بیشمار اند دیدہ وشنیدہ می شوند۔''

حاجی خلیفہ (المتوفی 1067ھ) ''کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون''، طبع استانبول 1360ھ۔ 1941ء جلد 1 صفحہ 52 میں لکھتے ہیں:

''اربعینات کی جمع وترتیب میں محدثین کے مقصد گوناگوں رہے ہیں۔ بعض نے توحید وصفات کی احادیث کو ذکر کیا ہے۔ بعض نے احکام ہی کی حدیثوں کے نقل کرنے پر اکتفا کی ہے۔ بعض نے صرف عبادات سے متعلق حدیثوں کو بیان کیا ہے۔ بعض نے نصیحت اور یادِ آخرت سے متعلق حدیثوں کو جمع کیا ہے۔ بعض نے صرف صحیح سند سے چالیس حدیثوں کا انتخاب کیا ہے۔ بعض نے اعلیٰ سند کی چالیس حدیثوں کو مرتب کیا ہے۔ بعض نے لمبی لمبی حدیثوں کو جمع کیا ہے۔''

ایک حدیث میں ایسی چالیس حدیثیں جن کا تعلق اصول یا فروعِ دین سے ہو، یاد کرنے اور نشر واشاعت کرنے پر شفاعت رسول ﷺ کی بشارت آئی ہے۔ اس وجہ سے قدما نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور سب سے پہلے عبداللہ بن المبارک (المتوفی 185ھ) نے ''اربعین'' چہل حدیث لکھی اور پھر اس سلسلہ کو بڑا قبولِ عام حاصل ہوا اور ہر نامور محدث نے کتاب الاربعین لکھی جن میں سے بعض محدثین کی اربعینات کی ایسی شہرت ہوئی کہ نامور محدثین نے ان کی ضخیم ضخیم شرحیں لکھیں۔ چنانچہ محی الدین نووی کی کتاب ''الاربعین'' کا شمار اسی قسم کی اربعنات میں کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کے مشہور محدثین شیخ عبدالحق محدث دہلوی (المتوفی 1052ھ۔) مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی (المتوفی 1034ھ) اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (المتوفی 1176ھ) کی اربعینات مشہور ہیں۔ شاہ ولی اللہ کی ''چہل حدیث'' اردو ترجمہ اور فوائد کے ساتھ کئی بار زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہے۔

غالباً سب سے پہلے اس کا اردو میں ترجمہ کرنے کی سعادت سید احمد شہید کے خلیفہ سید عبداللہ بن سید بہادر علی بن سید حسن بن سید جعفر مدنی ثم ترمذی، ثم لاہوری ثم ''سوانی'' صاحب مطبع احمدی کو حاصل ہوئی۔ موصوف نے اس کا اردو میں ترجمہ کر کے اپنی ''تفسیر مقبول'' کے مطبع احمدی کلکتہ سے 1254ھ میں شائع کیا تھا۔ اس کا ایک نسخہ راقم کے کتب خانہ میں موجود ہے جو کتاب مذکور کے صفحہ 144 سے 150 تک پھیلا ہوا ہے۔

اس ترجمہ کے چار سال بعد اس کا دوسرا ترجمہ مع فوائد محمد مصطفےٰ خان بن محمد روشن حنفی (المتوفی 1269ھ) صاحب مطبع مصطفائی کانپور و لکھنؤ نے اپنے مطبع سے 1258ھ میں حسبۃً للہ شائع کیا۔ موصوف کا بیان ہے:

''در ماہ جمادی الاخری 1258ھ مقدسہ بمطبع مصطفائی واقع محلہ محمود نگر زیر اکبری دروازہ من محلات بیت السلطنت لکھنؤ حسبۃ للہ محمد مصطفےٰ خان ولد حاجی محمد روشن عفا عنہما الرحمٰن طبع نمود۔''

یہ ترجمہ پہلے ترجمہ سے زبان و بیان کے اعتبار سے مختلف ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اس رسالہ میں اگرچہ مختصر حدیثوں کا انتخاب کیا ہے لیکن ہر حدیث ''دریا بحباب اندر'' کا مصداق ہے اور پھر مضامین کے اعتبار سے تنوع بھی خوب ہے۔ عقائد، اعمال اور اخلاق، غرض زندگی کے ہر شعبہ میں ہدایت کا سامان اس مختصر میں ہے۔ یہ حسن انتخاب شاہ ولی اللہ کے ذہن اور افتادِ طبع کا پورا پورا غماز ہے اور اپنی افادیت کی وجہ سے بار بار شائع کیے جانے کے لائق ہے۔

آج سے ایک سو اٹھائیس (128) برس پہلے محمد مصطفےٰ خان نے ''چہل حدیث'' کا جو ترجمہ اور فوائد شائع کیے ہیں، ان کی زبان قدامت کے باوجود نہایت صاف، سلیس اور رواں ہے اور فوائد بہت مختصر و جامع ہیں۔ یہی ترجمہ و فوائد ہدیہ ناظرین ہے۔

چشتی

بسم الله الرحمن الرحيمo اما بعد الحمد والصلوٰة فهٰذه اربعون حديثا مسندة بالسند الصحيح الى النبى صلى الله عليه وسلم مبا نيها يسيرة ومعانيها كثيرة ليد رسها راغب خير رجآء ان يدخل فى زمرة العلمآء لقوله عليه لتحية والثنآء من حفظ علىٰ امتى اربعين حديثا فى امر دينها بعثه الله تعالىٰ فقيها وكنت له يوم القيمة شافعا وشهيدا قال الفقير ولى الله عفى عنه شافهنى ابوا الطاهر المدنى عن ابيه الشيخ ابراهيم الكردى عن زين العابدين عن ابيه عبد القادر عن جده يحيىٰ عن جده المحب عن عم ابيه ابى اليمن عن ابيه شهاب احمد عن ابيه رضى الدين عن ابى القاسم عن السيد ابى محمد عن والده ابى الحسن عن والده ابى طالب عن ابى على عن والده محمد زاهد عن والده ابى على عن ابى القاسم عن والده ابى محمد عن والده الحسين عن والده جعفر عن ابيه عبد الله عن ابيه زين العابدين عن ابيه الامام الحسين عن ابيه على بن ابى طالب رضى الله عنهم قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم

ليس الخبر كالمعاينة وبه الحرب خدعة وبه المسلم مراة المسلم وبه المستشار موتمن

وبه الدآل علی الخیر کفا عله وبه استعینو علی الحوآئج بالکتمان وبه اتقوالنار ولو بشق تمرة وبه الدینا سجن المومن وجنة الکافروبه الحیآء خیر کله وبه عدة المومن کاخذ الکف وبه لایحل لمومن ان یهجر اخاه فوق ثلثة ایام وبه لیس منا من غشنا وبه ما قل وکفی خیر مما کثر والهی وبه الراجع فی هبته کالراجع فی قیئه وبه البلآء موکل بالمنطق وبه الناس کاسنان المشط وبه الغنی غنی النفس وبه السعید من وعظ بغیره وبه وان من الشعر لحکمة وان من البیان لسحراً وبه عفو الملوك ابقآء للملك وبه المر مع من احب وبه ما هلك امر عرف قدره به الولد للفراش وللعاهر الحجر وبه الید العلیا خیر من الید السفلی وبه لایشکر الله من لایشکر الناس وبه حبك الشی یعمی ویصم وبه جبلت القلوب علی حب من احسن الیها وبغض من اسآء الیها وبه التآئب من الذنب کمن لاذنب له وبه الشاهد یریٰ مالایراه الغآئب وبه اذا جآء کم کریم قوم فاکرموه وبه الیمین الفاجرة تدع الدیار البلاقع وبه من قتل دون ماله فهو شهید وبه الاعمال بالنیة وبه سید القوم خادمهم وبه خیر الامور اوسطها وبه اللهم بارك فی امتی فی بکورها یوم الخمیس وبه کاد الفقر ان یکون کفروا وبه السفر قطعة من العذاب وبه المجالس بالامانة وبه خیر الزاد التقویٰ

وصلی الله علیه تعالیٰ علیه خیر خلقه محمد واله واصحابه اجمعین

شروع اللہ کے نام سے جو مہربان ہے رحم والا۔

پیچھے تعریف خدا کے اور درود محمد مصطفےٰ ﷺ کے یہ چالیس حدیثیں مسند[1] ہیں صحیح سند کی نبی ﷺ تک ان کے بول تھوڑے ہیں اور مقصد بہت ہیں کہ پڑھے ان کو بھلی بات چاہنے والا واسطے امیدواری اس کی کہ بیٹھے عالموں کے جتھے میں بموجب فرمانے نبی ﷺ کے ان پر درود اور ثناء جو یاد رکھے میری امت کے واسطے نفع کے چالیس حدیثیں دین کے مقدمہ میں اٹھاوے گا قیامت میں اللہ اس کو فقیہ[2] اور میں ہوں گا اس کا قیامت کو سفارشی اور گواہ[3]۔ کہتا ہے فقیر ولی اللہ معاف ہو بھول چوک اس کی کہ میرے سامنے روایت کی۔ ابوطاہر مدنی نے اپنے باپ شیخ ابراہیم کردی سے اس نے زین العابدین سے اس نے اپنے باپ عبدالقادر سے اس نے اپنے دادا یحیٰ سے اس نے اپنے دادا محب سے اس نے اپنے باپ کے چچا ابی الیمن سے اس نے اپنے باپ شہاب احمد سے اس نے اپنے باپ رضی الدین سے اس نے ابی القاسم سے اس نے سید ابی محمد سے اپنے باپ ابی الحسن سے اس نے اپنے باپ ابی طالب سے اس نے ابی علی سے اس نے اپنے باپ محمد زاہد سے اس نے اپنے باپ ابی علی سے اس نے ابی القاسم سے اس نے اپنے باپ ابی محمد سے اس نے اپنے باپ حسین سے اس نے اپنے باپ جعفر سے اس نے اپنے باپ عبداللہ سے اس نے اپنے باپ امام زین العابدین سے اس نے اپنے باپ امام حسین سے اس نے اپنے باپ علی بن ابی طالب سے راضی ہو اللہ ان سب سے کہ فرمایا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔

خبر دیکھنے کے برابر نہیں[4] اور اسی اسناد سے لڑائی دھوکے کا نام ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا آئینہ ہے[5] جس سے مشورت لی جائے اسے امانت داری لازم ہے۔[6] نیک کام کا بتانے والا ثواب میں کرنے والے کے

برابر ہے۔ مدد چاہو کاموں میں چھپا کر (7) دوزخ سے بچو آدھا ہی چھوہارا دے کر سہی۔ دنیا قید خانہ ہے ایماندار کا اور بہشت ہے کافر کی۔ شرم سراسر بہتر ہی ہے۔ ایماندار کا وعدہ کرنا جیسا کہ ہاتھ پکڑ لینا (8) حلال نہیں ایماندار کو کہ اپنے بھائی کو چھوڑے تین دن سے زیادہ۔ (9) وہ ہم سے نہیں جو ہماری خیانت کرے۔ (10) جو تھوڑی سی چیز ہو اور کفایت کرے بہتر ہے اس سے جو بہت ہو اور غفلت میں ڈالے۔ دی چیز کا پھیر لینے والا جیسے وہ شخص کہ اپنی قے کو کھا جاوے۔ بلا مقرر ہے بولنے پر۔ (11) آدمی جیسے کنگھی کے دندانے۔ (12) بے پرواہی وہ جو دل کی بے پرواہی ہو۔ نیک بخت وہ ہے جو دوسرے کا حال دیکھ کر آپ خبردار ہو جاوے اور البتہ بعض شعر تو سراسر حکمت ہی ہوتے ہیں اور البتہ بعضی تقریر تو جادو ہوتی ہے۔ (13) بادشاہوں کی بخشش ملک باقی رکھنے کا سبب ہے۔ (14) آدمی اس کے ساتھ ہوگا جس سے محبت رکھتا ہے۔ نہ برباد ہوا وہ آدمی جس نے اپنی حقیقت پہچانی۔ لڑکا عورت کا اور مرد حرام کار کو پتھر۔ (15) اوپر کا ہاتھ بہتر ہے تلے والے ہاتھ سے۔ (16) خدا کا حق نہ مانے گا جس نے لوگوں کا حق نہ مانا۔ دوستی چیز کی تجھ کو اندھا اور بہرا کر دیتی ہے۔ (17) احسان کرنے والے کی محبت پر دل بنائے گئے اور برائی کرنے والے کی عداوت پر۔ (18) گناہ سے توبہ کرنے والا بے گناہ کے برابر ہے۔ (19) حاضر دیکھتا ہے اس کو کہ غائب نہیں دیکھتا۔ (20) جب کسی قوم کا سردار آوے تم پاس تو اس کی تعظیم کرو۔ 31- جھوٹی قسم ملکوں کو اجاڑ ہے۔ جو اپنے مال کے بچانے سے مارا جاوے تو وہ بھی شہید ہے۔ کاموں کا اعتبار نیت سے ہے۔ (21) قوم کا سرداران کا خدمتگار۔ (22) سب کاموں میں میانہ روی بہتر ہے۔ (23) الٰہی برکت دے میری امت کے اول روز کے جانے میں روز پنجشنبہ کے۔ لگتا ہے کہ محتاجی کفر ہو جاوے۔ (24) سفر عذاب کا ایک ٹکڑا ہے۔ (25) مجلسیں امانت داری کے ساتھ ہوتی ہیں۔ (26) سب سے بہتر توشہ پرہیزگاری ہے۔ (27)

حواشی

(1) حدیث مسند صحیح سند کی وہ ہے کہ جس کی روایت کا سلسلہ آگے پیچھے ایک دوسرے سے رسولِ خدا ﷺ تک پہنچے اور اس کے راوی متقی لوگ ظاہر شرع پر چلتے ہوں یاد میں قصور نہیں اور دین کے راہ میں عیب نہیں رکھتے ہوں جیسا کہ آگے شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی فرماتے ہیں۔ اپنے سے آنحضرت ﷺ تک۔

(2) فقیہ یعنی بوجھ والا سمجھا، خدا اور رسول ﷺ کی بات۔

(3) یہاں سے بیان ہے سند صحیح کا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی اپنے سے رسول خدا ﷺ تک ذکر راویوں کا کرتے ہیں تو ان سے جو خبردار ہیں، وہ جان لیں۔

(4) مثل مشہور ہے۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔

(5) یعنی روبرو اس کے عیب جتا دیوے اور پیٹھ پیچھے اس سے دل صاف رہے۔

(6) یعنی جو اس کے حق میں بہتر اس کو کہہ دے اور اس کے بھید سے کسی کو خبر نہ کرے۔

(7) یعنی چپکے چپکے اس کی تدبیر میں رہو کہ شر حاسد سے بچو۔

(8) یہ جونشانی ہہ کی ہے اس کے یہ معنی کہ اسی اسناد سے روایت ہے یہ بھی حدیث۔
(9) یعنی مومن نے جب زبان سے وعدہ کیا پھر اس کے خلاف ہرگز نہیں کرتا۔
(10) یعنی اگر تین دن خفگی رہے تو روا ہے اور اگر نہ رہے تو اور بھی بہتر ہے۔ مراد دنیا کی ناخوشی ہے۔
(11) یعنی اسلام کے طریق پر نہیں جو مسلمانوں سے دغابازی کرے۔
(12) یعنی اکثر بولنے سے آدمی بلا میں گرفتار ہوتا ہے۔ اگر چپ رہا کرے تو بچار ہے۔
(13) یعنی اگر بعضوں میں خلل ہوا تو سب میں ہوا۔
(14) یعنی آدمی سُن کے لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔
(15) یعنی اگر زیادہ تیزی کرے تو رعیت ویران ہو جاتی ہے۔
(16) یعنی اگر زنا سے لڑکا پیدا ہوا تو اس کی ماں مالک ہے، باپ مالک نہیں۔
(17) یعنی دینے والا بہتر ہے سائل لینے والے سے۔
(18) یعنی جس چیز کی محبت تیرے دل میں جمی پھر اس کا عیب تجھ کو نظر نہیں پڑتا اور اگر کوئی اس کی برائی بیان کرے تو تو اس کو دل سے نہیں سنتا۔
(19) یعنی محسن کی محبت اور موذی کی عداوت دل کی پیدائشی صفت ہے۔
(20) یعنی توبہ کرنے سے گناہ دور ہو جاتے ہیں۔
(21) مثل مشہور ہے ع شنیدہ کے بود مانند دید یعنی جب تک نہ دیکھے چیز کو آنکھوں سے اس کی گواہی نہ دے۔
(22) یعنی اگر نیت صحیح ہے تو عمل بھی صحیح ہے اور اگر نیت خراب تو عمل بھی خراب۔
(23) یعنی سردار کو لازم ہے کہ اپنی قوم سے غافل نہ ہو اور خدمت کرے۔
(24) یعنی کمی اور زیادتی خوب نہیں۔
(25) یعنی بعض قسم کا فقر آدمی کو کافر کرتا ہے، اس سے بچا کرے۔
(26) یعنی بے حاجت آدمی کو سفر نہ چاہیے کہ مفت محنت اور مشقت میں پڑ جاتا ہے۔
(27) یعنی مجلس کی بات باہر نہ کہے۔

✦ ..... ✦ ..... ✦

نورالحسن راشد کاندھلوی

حضرت شاہ ولی اللہ کا مجموعۂ مسلسلات

(الفضل المبین، الدرّ الثمین اور النوادر)

تعارف اور چند متعلقات

حضرت شاہ ولی اللہ کی تصانیف و مؤلفات کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے، خصوصاً اگر ان تصانیف کو موضوعات کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ کر کے ہر ایک موضوع و مبحث کی مؤلفات و کتب شمار کی جائیں تو بنیادی موضوعات (قرآن مجید، حدیث، فقہ اور اسرار علوم شریعت) میں سے ہر ایک موضوع پر مرکزی تالیفات تین چار سے زیادہ نہیں۔ ضمنی عنوانات کو شامل کر کے بعض موضوعات کی تصنیفات کی تعداد سات آٹھ سے بارہ چودہ تک پہنچ جاتی ہے۔ حدیث شریف کے اہم اور کلیدی موضوع کو بھی اسی فہرست میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ حدیث شریف کے موضوع پر حضرت شاہ صاحب کی جملہ تصنیفات و رسائل کی تعداد تیرہ چودہ سے متجاوز نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض موضوعات کی تحریروں میں حدیث شریف کے بعض جزوی یا کلی مباحث شامل ہوں، اس بحث یا اس تالیف کے مشترک مضمون کی وجہ سے اس تالیف کو حدیث کے مؤلفات میں بھی گن لیا جائے۔

بہر حال حدیث شریف کے موضوع پر حضرت شاہ صاحب کے مصنفات و رسائل میں سے تین رسائل ایسے بھی ہیں کہ اگر چہ ان کے ذریعہ سے علم حدیث کے مباحث میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا، مشکلات حدیث کے حل میں بھی ان سے کوئی قابل ذکر مدد نہیں ملتی اور اصول دین و شریعت پر ان مجموعوں کی احادیث بحیثیت مجموعی اثر انداز بھی نہیں ہیں لیکن شاہ صاحب کی حدیث شریف کے موضوع کی تصانیف میں ہمیشہ غالباً سب سے زیادہ ان ہی کی اشاعت ہوئی۔ مدارس کے درس کے حلقوں میں ان ہی کا چرچا و تذکرہ رہا۔ تقریباً سوا سو سال سے برصغیر ہند کے بیسیوں مدارس اور متعدد بڑے علماء اور اساتذہ حدیث کے یہاں، ان کے درس اور ان کی اجازت و روایت کا سلسلہ جاری ہے۔ ہر سال حدیث شریف کی بنیادی کتابیں پڑھنے والے طلبہ اپنے استادوں سے اور بڑے علماء کی محفلوں میں حاضر ہو کر ان کی سماعت کرتے ہیں اور اجازت و سند حاصل کرتے ہیں اور ان رسائل کے توسط سے حضرت شاہ صاحب سے انتساب کو اپنے لئے ایک سعادت و اعزاز خیال فرماتے ہیں۔ میری مراد حضرت شاہ صاحب کے رسائل کے اس مجموعے سے ہے جس کو اہل مدارس کی دنیا میں مسلسلات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

یہ مجموعۂ مسلسلات کیا ہے؟ حضرت مصنف نے اس میں کیا کچھ جمع اور پیش فرمایا ہے، اس کا سلسلۂ اجازت و سند کس طرح سے ہے؟ اس مجموعۂ مسلسلات کی علمی فنی حیثیت کیا ہے، علمائے محققین اور محدثین مسلسلات کے مجموعوں کو کس نظر سے دیکھتے ہیں، اس کتاب کے مشتملات کیا کیا ہیں، اس کے کون کون سے معتبر نسخے دریافت ہیں؟ راقم اسی کا کچھ تذکرہ کرنا چاہتا ہے مگر اس تذکرہ سے پہلے یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ فن حدیث میں مسلسلات کا یا حدیث مسلسل کا کیا درجہ ہے، اس کی تعریف اور سلسلہ کیا ہے، محدثین کے یہاں اس کا کیا مقام و مرتبہ ہے اور مسلسلات کے قدیم مجموعوں کو کن پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے؟ غالباً اس تذکرہ و تعارف کے بغیر شاہ صاحب کی مسلسلات کا تعارف بظاہر ناتمام رہے گا۔

اصطلاح محدثین میں مسلسلات بسلسلہ احادیث کی ایسی روایت کو کہا جاتا ہے جس میں اس روایت کے راویوں نے اس روایت یا مجموعہ روایات کی نقل و اجازت کے ساتھ کسی خاص مناسبت کا اہتمام کیا ہو اور وہ سلسلہ اور مناسبت قدیم راویوں سے اس کے آخری راوی یا عصر حاضر تک اسی مناسبت اور اہتمام کے ساتھ نقل ہو رہی ہو۔ اس مناسبت و اہتمام کی دو چار دس نہیں پچاسوں یا اس سے بھی زائد قسمیں ہیں جن میں فنی اعتبار سے ''المسلسل بقرأۃ سورۃ الصف'' متن و سند کے لحاظ سے سب سے بہتر اور معتمد ہے اور ''المسلسل بالاولیۃ'' کا سب سے زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے۔

قدیم دور سے درس حدیث دینے والے اکثر علماء کا معمول رہا ہے کہ وہ اپنے طالب علموں کے ساتھ درس حدیث کی ابتداء کے وقت ہر ایک حدیث اور اجازت و سند سے پہلے مسلسل بالاولیۃ پڑھتے ہیں اور عموماً یہی حدیث و روایت ہوتی ہے جو انہوں نے اپنے استاد یا کسی اور عالم یا محدث کے سامنے تعلیم و اجازت حدیث کا آغاز کرتے ہوئے پڑھی تھی۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

الراحمون یرحمھم الرحمن، ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء

اس کے علاوہ بھی مسلسلات کی ایک طویل قطار ہے جس میں کچھ قرآن کریم کی بعض سورتوں یا آیتوں کے ساتھ مختص ہیں، مثلاً ''المسلسل بقرأۃ سورۃ الصف'' یعنی جس راوی نے یہ حدیث اپنے استاد کے سامنے پڑھی۔ انہوں نے پہلے سورہ صف پڑھی۔ پھر اس روایت کی اجازت عطا فرمائی۔ اس کی سند و اجازت کا سلسلہ سورہ صف کی قرأۃ کے ساتھ اسی طرح آخر تک چلا گیا ہے۔ مسلسل بقرأۃ سورۃ الصف مسلسلات کی دنیا میں صحیح ترین روایت ہے۔ اس کی صحت پر علماء کا تقریباً اتفاق ہے۔[1] اسی نہج پر ''المسلسل بقرأۃ آیت الکرسی، المسلسل بقرأۃ انا عطیناك الکوثر'' وغیرہ ہیں مگر ان کی سند اس درجہ کی نہیں ہیں۔

مسلسلات کی ایک قسم وہ ہے کہ جس میں راویان نے روایت میں کسی اور خاص لفظ یا عبارت کا التزام فرمایا ہے، مثلاً ''انی احبك فقل'' یا ''فی العزلۃ سلامۃ'' یا ''اشھد باللہ'' یا ''واللہ اخبرنا واللہ حدثنا'' یا ''کتبہ وھو ھذا فی حبیبی''، مسلسلات کا ایک اور سلسلہ وہ ہے جس کا کسی فعل پر مدار ہو جیسے ''المسلسل بوضع الید علی الرأس'' یا ''المسلسل بالمصافحہ'' یا ''المسلسل بقبض اللحیۃ'' یا ''المسلسل باخذ السبابہ'' یا ''المسلسل بالمشابکہ''

مسلسلات کی ایک قسم وہ ہے جس کی قرأۃ و اجازت میں کسی خاص دن کا اہتمام کیا جاتا ہو جیسے ''المسلسل

بیوم العید'' یا ''المسلسل بیوم العاشورا'' یا اس کی اجازت وسند میں کسی خاص جگہ کے علماء یا محدثین کی واضح اکثریت کا اہتمام ہو جیسے ''المسلسل بالمکیین''، ''المسلسل بالمشارقة''، ''المسلسل بالمغاربة''۔

یا اس کی اجازت دینے والے اکثر مشائخ کرام میں کسی اور طرح کی یکسانیت کا معمول اور التزام ہو، مثلاً ان سب کے نام محمد سے یا احمد سے یا علی یا حسن سے یا کسی اور حرف سے شروع ہوتے ہیں جیسے ''المسلسل باحمدین'' ''المسلسل بحرف العین فی اول اسم کل راو'' یا اس روایت کی سند میں کسی خاص علمی لیاقت ومرتبہ کا خیال کیا گیا ہو جیسے ''المسلسل بالحفاظ المحدثین'' یا ''المسلسل بالفقهاء الحنفیه'' یا ''المسلسل بالفقہاء الشافعیۃ'' وغیرہ یا ''المسلسل بالقراء'' یا ''المسلسل بالشعراء'' یا ''المسلسل بالاشاعرة''۔ بہرحال یہ ایک لمبی فہرست ہے جس میں مختلف اور آئمہ محدثین نے قسم قسم کی خاص سندوں اور ترتیبات کا اہتمام کیا ہے۔[2] یہ قسمیں حضرت علمائے محدثین کے ارشادات کے مطابق حد شمار سے زائد ہیں، علامہ ابن الصلاح فرماتے ہیں:

> **التسلسل من نعوت الاسانید، وهو عبارة عن تتابع رجال الاسناد و توار دهم فیه، واحدا بعد واحد علی صفة او حالة واحدة، وینقسم ذالك الی مایکون صفة للروایة والتحمل والی مایکون للرواة او حالة لهم. ثم ان صفاتهم فی ذلك واحوالهم اقوالا وافعال ونحو ذلك تنقسم الا مالانحصیه.** [3]

اور اس اہتمام وروایت کا یہ سلسلہ کچھ نیا یا آج کا نہیں ہے، علماء نے فرمایا ہے کہ صحیح بخاری میں بھی ایک مسلسل روایت موجود ہے۔ اصول حدیث کی قدیم کتابوں میں جہاں متن حدیث کی کتابوں کی مختلف نوعیتوں سے تقسیم کی گئی ہے، اس میں مسلسلات بھی شامل ہیں۔ امام حاکم نے ''معرفت علوم الحدیث'' میں مسلسلات کو متن حدیث کی دسویں قسم شمار کیا ہے۔[4]

مسلسلات کے موضوع پر تقریباً پانچویں صدی ہجری سے باقاعدہ تصانیف اور اجازت کا ایک متواتر سلسلہ چلا آرہا ہے۔ علامہ سخاوی نے ''فتح المغیث'' میں مسلسلات کے موضوع پر جن تصانیف ومؤلفات کا تذکرہ فرمایا ہے، ان میں قدیم ترین تالیف محدث بغداد شیخ ابوبکر احمد بن ابراہیم بن شاذان (وفات 386ھ) کی ہے۔[5] اس وقت سے ہر دور کے علمائے حدیث نے مسلسلات پر توجہ فرمائی ہے۔ تاہم اس موضوع کی تصانیف کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے، قیاساً مسلسلات کی جملہ مؤلفات دو سو کے قریب ہوں گی۔

جو مسلسلات موجود ومعلوم ہیں، ان میں جامع ترین مجموعہ مسلسلات علامہ ابن الطیب مشرقی کا مؤلفہ ہے جس میں علامہ عبدالحیٔ کتانی کی اطلاع کے مطابق تین سو مسلسلات شامل ہیں۔[6] اس موضوع کی بڑی تالیفات میں علامہ محدث شیخ محمد عابد سندھی کی ''حصر الشارد من اسانیت محمد عابد'' اور شیخ قاوقجی کی ''کتاب مسلسلات'' اپنی جامعیت ووسعت میں بے نظیر ہیں۔[7]

حضرت شاہ ولی اللہ کے اساتذۂ حدیث میں سے علامہ شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنی کی بھی اس موضوع پر تصانیف ہیں، جو شائع نہیں ہوئیں۔[8] حضرت شاہ ولی اللہ کے اساتذہ کے تلامذہ یا شاہ صاحب کے شاگردوں اور ان

کے سلسلہ سے وابستہ علماء کے فیض یافتہ بلند پایہ محدثین میں سے علامہ شیخ محمد عابد سندھی کی بے نظیر کتاب ''حصر الشارد من اسانید محمد عابد''[9] حضرت شاہ عبدالغنی مجددی مہاجر مدنی کی ایک تالیف جس پر نام درج نہیں[10] نیز شاہ عبدالغنی مجددی کے ایک شاگرد شیخ عبدالستار دہلوی مکی کی اہم تالیف ''المورد الهنی فی اسانید شیخ عبدالغنی''[11] اس موضوع کی معلومات کا مخزن ہیں، جو حضرت شاہ ولی اللہ اور اس سلسلہ کے دیگر علماء کی اجازت وسند کی مطابقت وتصحیح کے لئے مرجع اور سند کی حیثیت رکھتی ہیں۔

جب حضرت شاہ ولی اللہ (1143ھ۔1731ء) میں حجاز پہنچے[12] اور ان کو حضرت شیخ ابو طاہر کردی مدنی کی صحبت اور تلمذ نصیب ہوا اور مکہ اور مدینہ منورہ میں دنیائے اسلام کے ممتاز ترین علماء سے استفادہ کا موقع ملا اس وقت وہاں کی علمی محفلیں مسلسلات کے تذکروں سے معمور تھیں اور متعدد علماء کے واسطہ سے مسلسلات کی روایت واجازت کا سلسلہ جاری تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ جیسی نابغۂ زماں شخصیت (جس نے صدیوں کا سفر برسوں میں اور برسوں کی منزل لمحوں میں طے کی ہو) اس چشمۂ فیض سے کیسے غافل رہ سکتی تھی، اس لئے جب حضرت شاہ صاحب نے علامہ شیخ ابو طاہر کردی سے صحاح ستہ وغیرہ کتب حدیث اور مختلف سلسلوں میں استفادہ کیا اور ان کی اجازت حاصل کیں۔ اس وقت مسلسلات کی سندوں کے لئے بھی پورا فائدہ اٹھایا۔ بہت سی مسلسلات کی اجازت لی اور بعض اجازتوں کے سلسلہ کو مکمل کیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ کو حضرت شیخ ابو طاہر کے علاوہ اور بھی بعض علماء سے مسلسلات وغیرہ کی اجازت حاصل تھی۔ حضرت شاہ صاحب نے مسلسلات کی اپنی کثر مرویات اپنے تین رسائل میں جمع فرمادی ہیں، جو یہ ہیں:

1- الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین ﷺ
2- الدرّ الثمین فی مبشرات البین الامین ﷺ
3- النوادر من احادیث سید الاوائل والاواخر ﷺ

ان تینوں کے مجموعہ کو مسلسلات کہا جاتا ہے مگر ان میں سے صرف دو رسائل ''الفضل المبین'' اور ''النوادر'' میں ہی ایسی روایات ہیں جن کے لئے مسلسلات کا اطلاق درست ہے۔ ''الدرّ الثمین'' میں ایسی کوئی روایت وسند موجود نہیں جس کو کسی پہلو سے مسلسلات میں شمار کیا جاسکے۔ یہ تینوں مختصر رسالے ہیں۔ ''الفضل المبین'' کے قدیم مطبوعہ نسخے ڈیمائی سائز کے ترپن (53) صفحات پر، النوادر بیس (20) صفحات پر اور درمیان کا رسمل۔ ''الدرّ الثمین'' صرف بارہ صفحات پر مشتمل ہے۔

''الفضل المبین'' میں (اور یہی اصل مسلسلات ہے) کل پینتیس مسلسل ہیں جس میں پچیس شیخ ابو طاہر کی سند و اجازت سے ہیں، باقی دوسرے علماء یا اساتذہ سے اخذ کی گئی ہیں، تفصیل یہ ہے:

شیخ سید عمر بن بنت الشیخ

1-المسلسل بالاولیۃ، ص:8   2-المسلسل بحرف العین، ص:45

شیخ تاج الدین قلعی

1-المسلسل بالفقھاء الحنفیہ، ص:16   2-المسلسل بالفقھاء الحنفیہ، ص:17

3-المسلسل بالمكيين، ص:312

شیخ محمد وفد اللہ مکی

1-الملسل بالفقهاء المالكية، ص:17
2-المسلسل بالمغاربة، ص:33
3-المسلسل بالمغاربة، ص:34
4-المسلسل بالمحدين، ص:42

شیخ ابو طاہر محمد ابن ابراہیم کردی

1-المسلسل بقرأة سورة الصف، ص:11
2-المسلسل بالمصافحة، ص:12
3-المسلسل بأنا احبك، ص:11
4-المسلسل بالحفاظ، ص:14
5-المسلسل بالفقهاء الشافعية، ص:18
6-المسلسل بالحنابلة، ص:20
7-المسلسل بالاشاعرة، ص:21
8-المسلسل بالصوفية، ص:22
9-المسلسل بالصوفية، ص:23
10-المسلسل بالصوفية، ص:25
11-المسلسل بالصوفية، ص:29
12-المسلسل بالصوفية، ص:32
13-المسلسل بالمشارقه، ص:32
14-المسلسل بائمة اهل البيت، ص:35
15-المسلسل بالاباء، ص:38
16-المسلسل بالاشراف، ص:41
17-المسلسل بالحسن، ص:45
18-المسلسل بالله العظيم فی اکثره، ص:47
19-المسلسل بالقراء، ص:49
20-المسلسل بالشعراء، ص:51
21-المسلسل بالاحمديين، ص:52
22-المسلسل بيوم العيد، ص:52
23-المسلسل بنسبة كل راو، ص:52
24-اربعون حديثاً، ص:514
25-26-اثران مسلسلان بتسعة آباء، ص:40

(صفحات کے حوالے نسخہ مطبوعہ یحیوی سہارنپور: 1390ھ کے ہیں)

الفضل المبین میں مسلسلات کے تقریباً تمام مجموعوں کی ترتیب اور معمول کے مطابق پہلی اجازت وسند المسلسل بالاولیة کی ہے جو شیخ عمر ابن بنت الشیخ کی سند سے ہے، دوسری مسلسل بقرأۃ سورۃ الصف ہے جو شیخ ابو طاہر سے منقول ہے۔ اس کے بعد یہ سلسلۂ مسلسلات مختلف روایتوں سندوں سے گزرتا ہوا آخر تک چلا جاتا ہے۔ اسی سلسلہ روایت کے درمیان میں ایک مسلسل ''اربعون حديثاً مسلسلة بالاشراف فی غالبه'' کی بھی ہے۔ وہ چالیس احادیث ہیں جو اربعین یا چہل حدیث حضرت شاہ ولی اللہ کے نام سے بہت مشہور ہیں۔ اس مجموعہ کو عموماً حضرت شاہ ولی صاحب کی ایک مستقل تالیف شمار کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ علیحدہ تالیف نہیں بلکہ اسی مسلسلات کا ایک حصہ ہے۔[13]

الفضل المبین اور النوادر حضرت شاہ صاحب نے کب مرتب فرمائیں، مجھے اس کی کوئی شہادت بلکہ قرینہ بھی نہیں ملا لیکن حضرت شاہ صاحب کی تالیف ''اتحاف النبيه فيما يحتاج اليه المحدث و الفقيه'' کے مطبوعہ نسخہ میں درج اس کتاب کی اختتام کی تاریخ (26 جمادی الاول 1153ھ۔ جولائی 1740ء) سے یہ خیال یا شبہ ہو سکتا ہے کہ

الدر الثمین اور رسالہ النوادر اتحاف کی تکمیل سے پہلے مرتب ہو گئے ہوں گے یا ان کا ابتدائی مسودہ وجود میں آ گیا ہو گا مگر یہ خیال بوجوہ صحیح نہیں۔

میرا خیال یہ ہے کہ اتحاف کے اختتام پر درج اس کے سنہ تالیف میں تصحیف یا غلطی ہوئی ہے۔ غالب گمان یہ ہے کہ اصل نسخہ سے نقل کرنے والے کو سہو ہوا۔ اس خیال کا قرینہ یہ ہے کہ **اتحاف النبیہ، الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ** کی قسم ثانی وثالث (باب دوم، سوم) ہے۔ یہ دونوں باب، باب اول کی تکمیل کے بعد ہی مرتب ہوئے ہوں گے اور ان کے باب اول یعنی انتباہ کے متعلق حضرت شاہ صاحب نے ایک خط میں صاف صاف لکھا ہے کہ:

''چوں کشاکش مسوی درمیان است، فرصت تالیف انتباہ وغیرہ نمی شود۔''

''چونکہ مسویٰ کی تالیف کا قصہ بیچ میں پڑا ہے، اس لئے انتباہ وغیرہ کی تالیف کا موقع نہیں ہوا۔''

اور اس میں کچھ بھی شک وشبہ نہیں کہ یہ اطلاع اواخر ذی الحجہ 1163ھ کی ہے کیونکہ شاہ صاحب نے اسی خط میں اپنے فرزند (شاہ) رفیع الدین کے تولد کی اطلاع بھی دی ہے:

''یوم الثلا ثاء تاسع عشر ذی الحجہ، وقت صحوۃ الکبریٰ فرزندے عطا فرمود۔''[14]

اللہ تعالیٰ نے دوشنبہ کے دن 19 ذی الحجہ کو صبح صادق کے وقت ایک بیٹا عطا فرمایا ہے۔

اور تحریر ہے:

نام مولود رفیع الدین باشد[15] نومولود بچہ کا نام رفیع الدین ہوگا۔

نیز لکھا ہے:

''رفیع الدین عبدالوہاب نام ایں مقرر کردہ شود۔''[16]

''اس کا نام رفیع الدین عبدالوہاب رکھ دیا جائے گا۔''

اور یہ طے ہے کہ حضرت شاہ رفیع الدین کی 1163ھ میں ولادت ہوئی تھی، مکمل تاریخ ولادت (9 ذی الحجہ 1163ھ۔ 19 نومبر 1750ء) ہے۔

حضرت شاہ صاحب کی ان تصریحات سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ شاہ رفیع الدین کی ولادت یعنی اواخر 1163ھ تک الانتباہ بھی مکمل نہیں ہوئی تھی، بعد کے ابواب تو اس کے بعد ہی وجود میں آئے ہوں گے، لہٰذا اتحاف میں ان رسائل کے ضمنی تذکرہ سے ان رسائل کے سنہ تالیف کے تعین میں کچھ مدد نہیں ملتی۔ اس خیال کی اس سے بھی تائید ہوتی ہے کہ ''**اتحاف النبیہ**'' کا پیش نظر نسخہ جن مطبوع نسخوں پر مبنی ہے، یہ سنہ تصنیف ان میں سے ایک ہی نسخہ میں موجود ہے۔ ایک اور نسخہ جو شاہ محمد اسماعیل کے فرزند، شاہ محمد عمر کا مملوکہ ہے اور اس پر نقل نسخہ مصنف کی صراحت بھی ہے اور ''**اتحاف النبیہ**'' کے اسی مطبوعہ نسخہ میں اس کے آخری صفحہ کا عکس بھی شامل ہے۔ اس میں سنہ تالیف کا کچھ تذکرہ نہیں۔[17] لہٰذا اتحاف کا یہ سنہ تالیف ناقابل اطمینان اور غالباً جعلی ہے۔ تاہم شاہ صاحب کی نوشتہ بعض سندوں اور اجازت میں دونوں کا تذکرہ ہے۔

یہ دونوں جب بھی مرتب ہوئی ہوں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے ان کو غالباً کسی وقتی ضرورت سے یا کسی شاگرد کی یادداشت کے لئے عجلت میں اور سرسری طور پر قلم بند کیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان تینوں میں کوئی

ترتیب موجود نہیں، نہ موضوعات میں ترتیب ہے نہ اساتذہ کی روایات میں، جو روایتیں جہاں یاد آئیں ان کا وہیں کسی خاص رعایت کے بغیر اندراج فرما دیا اور مسلسلات کے سلسلہ کی متعدد بلکہ شاید تقریباً ایک تہائی مسلسلات حضرت شاہ صاحب نے الفضل المبین (مسلسلات) میں درج ہی نہیں فرمائیں۔ اس خیال کی بھی متعدد شہادتوں اور روایتوں سے تائید ہو رہی ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے اپنی ایک تالیف ''اتحاف النبیه فیما یحتاج الیه المحدث والفقیه'' میں شیخ ابو طاہر کی سند سے چھ مسلسلات ذکر فرمائی ہیں جس میں سے پانچ الفضل المبین میں بھی درج ہیں مگر وہاں ان کی ترتیب اتحاف النبیه کی ترتیب کے مطابق نہیں۔ ''اتحاف النبیه کی روایات پر نمبر شمار موجود نہیں، ان کی ترتیب کا ''اتحاف النبیه اور مسلسلات کے درج ذیل صفحات کے تسلسل سے علم ہوگا۔

1- المسلسل بالاولیة از شیخ عمر ابن بنت الشیخ، اتحاف ص:79، ص:8
2- المسلسل بقرأة سورة الصف از شیخ ابو طاہر مدنی، اتحاف ص:81، ص:10
3- المسلسل بالفقهاء الشافعیة از شیخ ابو طاہر مدنی، اتحاف ص83 (مسلسلات میں موجود نہیں)
4- المسلسل بالمصافحه از شیخ ابو طاہر مدنی، اتحاف ص:84، ص:12
5- المسلسل بقول انا احبك از شیخ ابو طاہر مدنی، اتحاف ص:85، ص:11-12
6- المسلسل بالصوفیة از شیخ ابو طاہر مدنی، اتحاف ص:87 ص:25

(مسلسلات یحییوی، سہارنپور: 1290ھ)

اور ان میں سے ایک روایت جو الفضل المبین میں شامل ہی نہیں، مسلسل بالفقهاء کی ہے، اس کی سند و روایت اس طرح ہے:

> واما الحدیث المسلسل بالفقهاء، فاخبرنی ابو طاهر وکان قلد افتاء الشافعیة بالمدینة مدة، ثم استعفیٰ زهداً منه ولم یزل یرد علیه الاسولة من الافاق فیفتی لله. انه قرأ علی احمد النخلی وکان متقنا لفقه الشافعی، بسماعه علی البابلی وحافظته فی الفقه اشهر من نار علی علم عن الفقیه العلامه ابی النجا سالم بن محمد السنهوری المالکی الخ[18]

نیز حضرت شاہ صاحب نے مسلسلات میں المسلسل بالاولیه کا صرف شیخ عمر ابن بنت الشیخ کی سند سے ذکر کیا ہے۔ حالانکہ شاہ صاحب نے اپنی اور کتابوں میں صراحت کی ہے کہ ان کو شیخ ابو طاہر اور شیخ تاج الدین قلعی سے بھی مسلسلات کی اجازت ہے۔ شیخ ابو طاہر نے بھی حضرت شاہ صاحب کی سند میں ارقام فرمایا ہے کہ شاہ صاحب کو میری طرف سے مسلسل بالاولیة کی بھی اجازت ہے۔ انہوں نے مجھ سے سب سے پہلے یہی روایت سنی تھی:

''سمع منی الحدیث المسلسل بالاولیة وهو اول حدیث سمعه منی''[19]

نیز شیخ محمد طاہر کردی کے حضرت شاہ صاحب کے نام گرامی نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کری کی مسلسلات کا بڑا مجموعہ تھا جس میں ایک روایت ''المسلسل بالحفاظ'' کا جو اس مجموعہ کی روایت نمبر الخامس والاربعون (45) تھی۔ ایک حوالہ کے لئے بطور خاص تذکرہ ہے جبکہ حضرت شاہ صاحب کی مسلسل (الفضل المبین) میں شیخ ابو طاہر کے حوالہ سے صرف پچیس روایتیں درج ہیں۔

شیخ ابو طاہر کی سند سے چند اور روایتیں الدرّ الثمین اور النوادر میں بھی ہیں۔ الدرّ الثمین میں صرف نو(9) اور النوادر میں ستائیس (27) یعنی تینوں رسائل میں شیخ ابو طاہر کی سند سے کل اکسٹھ (61) روایتیں ہیں مگر آخری دنوں مؤلفات کو حضرت شاہ صاحب مسلسلات میں شمار نہیں فرماتے۔ اسی لئے کہا جا سکتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے مجموعہ مسلسلات میں شاہ صاحب کو پہنچی مسلسلات کا تقریباً نصف حصہ ہی شامل ہے کیونکہ شاہ صاحب نے ایک سے زائد موقعوں پر اس کی صراحت کی ہے کہ ان کو شیخ ابو طاہر کی کل مرویات و مسموعات کی اجازت ہے۔ شاہ صاحب نے لکھا ہے:

''وایشاں (شیخ ابو طاہر) اجازت روایت آں کتب بل جمیع مرویات خود دادند''[20]

اور حضرت شیخ ابراہیم نے شاہ صاحب کے لئے اپنے اجازت نامہ میں بھی صراحت فرمائی ہے کہ:

''اجزت......بما یجوز لی وعنه روایته من مقرو مسموع و اصول و فروع و حدیث و قدیم و محفوظ و رقیم''[21]

اس کے بعد یہ بھی تحریر فرمایا ہے:

''ولا اقول کما یقول غیری، اذا اجاز من قولهم، بشروط المعتبرة عند اهلها المذکورة فی محلها لعلمی ان الشروط فیه متوفرة والقواعد بفضل لاله عنده متقررة، فلیرو عنی ماشاء لمن شاء''[22]

اور میں یہ نہیں کہتا (اور لکھتا) جیسے کہ اور علماء اجازت حدیث کے وقت تحریر فرمایا کرتے ہیں کہ ہماری اجازت علمائے حدیث سے مروی معتبر شروط پائے جانے پر ہے جو اپنی جگہ پر درج ہوتی ہیں کیونکہ میری معلومات کے مطابق (علمائے محدثین کی ارشاد کی ہوئی) جملہ شرائط شاہ ولی اللہ میں وافر مقدار میں پائی جاتی ہیں اور اس کے اصول و ضوابط ان (شاہ صاحب) کے یہاں محفوظ و منضبط ہیں تو یہ مجھ سے جو چاہیں اور جس سے چاہیں روایت کریں۔

مندرجہ بالا روایتیں الفضل المبین میں کس وجہ سے شامل نہیں کی گئیں۔ کہنا مشکل ہے، ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے الفضل المبین کی تحریر کے وقت جن کتابوں سے بطورِ خاص استفادہ کیا، یہ روایتیں ان میں شامل نہ ہوں۔ مثلاً مسلسلات کی تالیف و ترتیب میں منجملہ اور کتابوں کے حضرت شاہ صاحب کا ایک ماخذ علامہ سیوطی کی اربعون صغریٰ (جیاد المسلسلات) بھی ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز نے تحریر فرمایا ہے کہ:

مسلسلات صغریٰ تصنیف جلال الدین سیوطی از اں جملہ حدیث مسلسل بیوم العید است، واز اں جملہ حدیث مسلسل بمصافحہ است، واز انس بن مالک رسیدہ۔ واکثر آں در کتاب مسلسلات

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ داخل است، وسماع آں راقم سطور را حاصل۔[23]
مسلسلات صغریٰ علامہ جلال الدین سیوطی کی تالیف ہے۔ اس کی منجملہ مرویات میں سے حدیث مسلسل بیوم العید ہے اور انہی میں مسلسل بالمصافحہ ہے جو حضرت انس بن مالک کی روایت سے پہنچی ہے اور اس (مسلسلات صغریٰ) کی اکثر روایت حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی مسلسلات میں شامل ہیں۔ راقم سطور (شاہ عبدالعزیز) کو ان کا سماع اور اجازت حاصل ہے۔

اس لئے ممکن ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے اپنی اس تالیف میں صرف وہی مسلسلات شامل کی ہوں جو مسلسلات صغریٰ سیوطی میں مرکزی حیثیت رکھتی تھیں۔

اس خیال کی اس سے بھی تائید ہوتی ہے کہ ایسی متعدد روایتیں جو علمائے مسلسلات کی ترتیب اور معمول کے مطابق الفضل المبین میں ہونی چاہیے تھیں، وہ النوادر میں درج ہیں۔ مثلاً ''مسلسل بالمشابکه'' (پنجہ کشی کی روایت) النوادر میں ہے۔ حالانکہ اس کا صحیح محل الفضل المبین میں تھا۔ مسلسل بالمشابکه کی روایات کو امام حاکم اور علامہ عراقی وغیرہ نے واضح طور پر مسلسلات میں ذکر فرمایا ہے۔[24]

ایسی ہی ایک اور روایت یا مسلسل جس کو الفضل المبین میں شامل ہونا چاہیے، مناولت بالتسبیح کی ہے جس کو حضرت شاہ صاحب اپنے استاد شیخ عمر ابن بنت الشیخ کے حوالہ سے نقل فرماتے ہیں۔ شاہ صاحب نے لکھا ہے:

''واما السبحة فناولنی ها السید عمر ابن بنت الشیخ عبدالله البصری المکی الی آخر الروایة''[25]

مگر اس کا بھی الفضل المبین وغیرہ میں تذکرہ نہیں اور بھی چند روایات کی ترتیب یہی کہتی ہے کہ ان کو النوادر میں نہیں، الفضل المبین میں ہونا چاہیے تھا۔[26]

اس خیال کا ایک اور قرینہ یہ ہے کہ شاہ صاحب نے سلسلۂ مسلسلات کی ایک معروف روایت جس کی شاہ صاحب کو اجازت وسند حاصل ہے اور خود حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے صاحبزادگان اور متعدد اصحاب کو اس کی سند و اجازت سے نوازا بھی ہے۔ ''المسلسل بالتمر والماء'' کی ہے کہ جو الفضل المبین اور النوادر دونوں میں شامل نہیں حالانکہ اس روایت کو اور محدثین نے عام طور پر مسلسلات کے مجموعوں میں شامل کیا ہے۔ ممکن ہے یہ خیال کیا جائے کہ چونکہ ''المسلسل بالتمر والماء'' کی نسبت وسند بہت کمزور ہے بلکہ اس کا مدار علیہ راوی (عبداللہ بن میمون القداح) مہتم بالوضع ہے۔ شاید اس وجہ سے شاہ صاحب نے اس کو الفضل المبین میں شامل نہیں کیا لیکن یہ خیال صحیح نہیں، اس لئے کہ الفضل المبین کی بعض اور روایتیں بھی اس شبہ سے محفوظ نہیں ہیں۔

المسلسل بالتمر والماء مسلسلات (الفضل المبین وغیرہ) کے قدیمی خطی نسخوں میں شامل نہیں۔ حضرت شاہ صاحب کے قلم سے مسلسلات کی جو سندیں موجود ہیں، ان میں بھی المسلسل بالتمر والماء کا تذکرہ مجھے نہیں ملا۔ بعد کے علماء کو بھی مسلسلات کی سند واجازت اور المسلسل بالتمر والماء کی اجازت علیحدہ علیحدہ ملی۔ مثلاً مجموعات کی اشاعت وروایت سے وابستہ ممتاز ترین متاخر علماء، مولانا علی اکرم آروی (جو مجموعہ مسلسلات کے سب

سے پہلے ناشر ہیں) اور مولانا خلیل احمد انبیٹھوی مہاجر مدنی جن کے توسط سے مسلسلات کا سلسلہ عام ہوا ہے دونوں کی ''المسلسل بالتمر والماء'' کی اجازت، مسلسلات کی اجازت سے علیحدہ تھی۔

مولانا علی اکرم آروی کو مسلسلات کی اجازت اپنے استادِ حدیث مولانا عالم علی نگینوی سے تھی مگر ''المسلسل بالتمر والماء'' کی اجازت مولانا قاری عبدالرحمٰن پانی پتی سے حاصل ہوئی۔ مولانا علی اکرم نے لکھا ہے:

وقد کتبنا هذا الحديث عن كتاب مولانا الحافظ السيدى ابى الهاشم محمد عالم على المحدث النجينوى، وما حصل لى اسند بهذا الحديث عن جنابه، لفقدان الاسو دين، فلما نزل مولانا الحافظ محمد عبدالرحمن المحدث البانى بتى فر دارى ببلدةآره، فقد حصل لى اسند بهذا الحديث عن جنابه، واضافتى بالا سو دين التمر والماء فى شهر الصيام عند الافطار.

وقال حصل لى سند هذا الحديث رجل ولايتى الى مولانا محمد اسحاق، ولم يكن له سند هذا الحديث بلاواسطه اليه، ولكنه كان تلميذا لمولانا محمد اسحاق وعنده اسانيد عن جنابه بالاستيعاب للصحاح وغيره واكثر العلوم[27]

اسی طرح مولانا خلیل احمد صاحب نے بھی صراحت کی ہے کہ میں نے مولانا عبدالقیوم بڑھانوی سے مسلسلات پڑھی، اس کی اجازت لی۔ اس کے علاوہ المسلسل بالتمر والماء کی اجازت بھی حاصل کی جو مسلسلات سے خارج ہے۔ مولانا کہتے ہیں:

"وقد قرات عليه الحديث المسلسل بالضيافة بالتمر والماء واجازنى به واضافنى بها، وهو خارج عن رسالة المسلسلات"[28]

خدا بخش لائبریری پٹنہ میں الفضل المبین کا وہ قلمی نسخہ محفوظ ہے جو 1160ھ میں حضرت شاہ صاحب کے سامنے پڑھا گیا تھا۔ اس نسخہ میں شاہ صاحب کے ایک شاگرد شیخ محمد بن محمد بلگرامی ثم الہ آبادی نے حضرت شیخ سے سبقاً سبقاً پڑھا ہے اور اس پر اپنی قرأت اور اجازت کی تاریخیں بھی لکھی ہیں اور اس نسخہ کے اختتام پر حضرت شاہ صاحب کے دست مبارک سے شیخ محمد بن محمد بلگرامی کے لئے مسلسلات کا اجازت نامہ بھی تحریر ہے جس میں شاہ صاحب نے الفضل المبین کی سندوں خصوصاً مغاربہ (مراکش وافریقہ) کے علماء کے واسطوں میں بعض فروگذاشتوں کا ذکر فرمایا ہے اور موقع ملنے پر ان کی تصحیح کے ارادے کا بھی تذکرہ فرمایا ہے، تحریر ہے:

"على ان فيها بعض شئى من الخلل فى ضبط الاسماء، لاسيما فى اسماء المغاربة، لم يتفرغ لتصيحها ساعتنا هذا، وعسىٰ ان يتيسره الله تعالىٰ فى الزمان المستقبل"

یہ اجازت نامہ شروع (محرم 1160ھ۔ جنوری 1747ء) کا لکھا ہوا ہے۔ معلوم نہیں کہ حضرت شاہ صاحب کو اس ارادہ کی تکمیل کا وقت ملا یا نہیں۔ بظاہر اس کی کم ہی امید ہے کیونکہ اس کے بعد حضرت شاہ صاحب کی مصروفیات میں

اضافہ ہی ہوا ہے کمی نہیں ہوئی۔ اس لئے قرین قیاس ہے کہ حضرت شاہ صاحب کو اس مجموعہ کی تصحیح کا شاید موقع نہیں ملا ہوگا اور جب خود حضرت شاہ صاحب یہ خیال فرمارہے ہیں تو بعد میں نقل نسخوں کی کامل تصحیح کی توقع ہی بے محل ہے۔ حضرت شاہ صاحب کا یہی نسخہ معروف ومروج ہے اور اس کی سند وروایات کی تصحیح وتحقیق پر کماحقہ توجہ نہیں فرمائی گئی۔

حضرت شاہ صاحب کو اس کی بعض سندوں کی ترتیب واجازت پر بھی شبہات تھے۔ حضرت شاہ صاحب نے ان کے حل اور تفہیم کے لئے شیخ محمد بن طاہر کو خط بھی لکھا تھا۔ شیخ موصوف نے اس کے جواب میں جو کلمات ارقام فرمائے، اس کی متعلقہ سطور ملاحظہ ہوں۔

وذكرتم فی ورقة الالحاق انه هل لسيدى الوالد نفع الله به وقدس سره، اجازت عامة من البابلى و زين العابدين بن عبدالقادر الطبرى؟ فهذا السوال عجيب من سيدنا، مع ان مسلسلاه رحمته الله ليه بقيت بيتكم مدة.

فاما البابلى فشيخه ملا فاضل، صرح به فى المسلسلات فى الحديث الخامس والاربعون، المسلسل بالحفاظ و فى الامم صرح به فى كتب الشافعية فى تصانيف ابن حجر و تصانيف محمد الرملى، فهو مجاز منه اجازة خاصة ورآه واحتج به واما الطبرى فروى عنه فى مسلسلاته، وقد روى الحديث المسلسل بالاولية عن شيخه من الشيوخ الرابع، متهم الطبرى المذكور، فراجعوا تجدوا ذلك ان شاء الله تعالى[29]

ترجمہ: آں مکرم نے (خط کے) ملحقہ ورق میں جو تذکرہ کیا ہے کہ کیا میرے والد محترم کو بابلی اور شیخ زید العابدین بن عبدالقادر طبری سے اجازت عامہ حاصل کیا ہے۔[3] یہ سوال جناب عالی سے غیر متوقع ہے کیونکہ حضرت مرحوم کی مسلسلات ایک عرصہ تک آنجناب کے پاس رہی ہے۔ پس بابلی ان کے شیخ ملا فاضل تھے جن کی بابلی نے اپنی مسلسلات کی حدیث نمبر چون (54) المسلسل بالحفاظ میں صراحت کی ہے اور ''الامم لایقاظ الھمم'' میں علمائے شافعیہ کی کتابوں کی اسانید میں خصوصاً حافظ ابن حجر اور محمد الرملی کی تصانیف کے تحت ذکر کی ہے۔ پس وہ بابلی سے روایت کے مجاز ہیں اجازت خاصہ کے ذریعہ سے۔ انہوں نے بابلی کو دیکھا ہے اور ان سے (استفادہ) اور استدلال کیا ہے[31] اور طبری ان سے (والد ماجد نے) اپنی مسلسلات میں روایت کیا ہے اور وہ مسلسل بالاولیة اپنے شیوخ میں سے چوتھے شیخ سے روایت کرتے ہیں۔ ان ہی میں طبری بھی شامل ہیں۔ پس آنجناب اس کتاب سے مراجعت فرمائیں، انشاءاللہ اس میں پالیں گے۔[32-33]

اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا نہایت ضروری ہے کہ اس مجموعہ رسائل میں کئی سندیں اور روایتیں ایسی بھی ہیں کہ ان کی روایات اور سند دونوں نہایت مشکوک اور ناقابل اعتماد ہیں۔ علماء اور محدثین کو ان پر بہت سے اعتراضات ہیں یا وہ

روایت بالکل ہی بے اصل اور نا قابل قبول ہیں مگر اس کی وجہ سے مجموعہ مسلسلات پر بہت حرف نہیں آتا کیونکہ ان میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں جس کو بنیادی دینی تعلیمات و مسائل میں مآخذ و مستدل کی حیثیت حاصل ہو اور یہ بھی معلوم ہے کہ ایسی تمام روایتوں کی سند اور مندرجات کے اور علمائے کرام کے علاوہ خود ان روایتوں کی نقل کرنے اور سند دینے والے علماء اور محدثین بھی شاید ناقدر ہے ہیں۔ مثلاً علامہ سخاوی نے المسلسل بالتمر والماء کے متعلق صاف لکھا ہے۔

والوائح الكذب عليه ظاهرة، استبيح ذكره الامح بيانه لكن الحمدثين مع كثرة كلامهم عليه ومبالغتهم فى تضعيفهما، ورمبيه بالوضع لا يزالون يذككرونه، ويسلسلونه بالتبرك وحسن النية(34)

علامہ سخاوی اور آئمہ محدثین کی اسی روایت کی پاسداری میں مسلسلات کے تمام سلسلوں کی نقل و روایت جاری ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض محتاط علماء اس کی نقل و روایت کو جائز ہی نہیں سمجھتے۔ ہمیشہ کی طرح اب بھی دونوں قسم کے علماء اور محدثین موجود ہیں، اس لئے ان روایتوں کی نقل و سند بھی جاری ہے اور ان پر تنبیہ اور تنقید بھی۔

وللناس فيما يعشقون مذهب

الفضل المبین کا قدیم معتمد ترین نسخہ

آخر میں الفضل المبين کے چند قلمی اور مطبوعہ بنیادی نسخوں کا تعارف حاضر ہے۔ نسخہ خدا بخش پٹنہ جس کا اوپر ذکر آیا ہے۔ اب تک دریافت نسخوں میں صحیح ترین قدیم ترین اور معتمد ترین نسخہ ہے۔ یہ فل سکیپ (Full Scape) کے اٹھارہ ورق یا چھتیس صفحات پر مشتمل ہے۔ فی صفحہ اٹھارہ سطریں ہیں، خوبصورت اور عمدہ نستعلیق رواں قلم ہے۔ مشکل اعراب اور بعض نادر نسبتوں کو خاص طور پر واضح کیا ہے۔ سطور کے درمیان اور حاشیوں پر کہیں کہیں کچھ وضاحت یا حضرت شاہ صاحب کا مختصر افادہ بھی درج ہوا ہے۔ اگر اصل متن کا کوئی لفظ یا فقرہ نقل سے رہ گیا تھا اس کا حاشیہ پر اضافہ ہے۔ پورا نسخہ (اس دور کے طرزِ کتابت کے مطابق) مسلسل ہے۔ درمیان میں کوئی عنوان نمایاں کیا گیا ہے۔ نہ فقرہ بندی ہے نہ تحویل سند اور نئی روایات کے آغاز پر کوئی امتیاز۔ تاہم نسخہ قابل دید ہے اور الفضل المبين کے قدیم معلوم نسخوں میں اپنی تحریر اور امتیازات کی وجہ سے سب سے قیمتی نسخہ ہے۔

کاتب و ناسخ نسخہ نے اختتام کتابت کی تاریخ درج نہیں کی مگر اس کے مختلف صفحات پر کاتب نسخہ کے قلم سے یہ اطلاعات تاریخ و مہینہ کی صراحت کے ساتھ درج ہیں کہ کاتب کو مسلسل بالاولية، مسلسل بقرأت سورة الصف اور مسلسل بالمصافحه کی کس تاریخ کو کس سے اجازت حاصل ہوئی۔ ان میں سے تین اجازتیں (22 ذیقعدہ 1159ھ۔ دسمبر 1746ء) کو ملیں جو بعد میں حاشیہ پر درج کی گئی ہیں جس سے ضمناً یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ یہ نسخہ ذیقعدہ 1159ھ سے پہلے کا مکتوبہ ہے:

قال العبد المفتقر الى الله الاحد الصمد، الشيخ محمد بن محمد، حدثنى شيخنا المحدث ولى الله العمرى الدهلوى من سنة للحديث والسورة

المسلسل بقرأة الصف وانا اسمع يوم الثلثاء الثانی والعشرین، من ذيقعده بین العصر والمغرب فی المسجد

کاتب نسخہ نے پہلے صفحہ پر یہ اطلاع دی ہے کہ جب میں نے یہ رسالہ (الفضل المبین) حضرت شاہ ولی اللہ سے پڑھا، اس وقت میں حضرت شاہ صاحب کے کتب ستہ کی اجازت وسندیں لے چکا تھا، بعد میں جب مسلسل بالاولیت کی اجازت وسند کے لئے حضرت شاہ صاحب سے عرض کیا تو حضرت شاہ صاحب نے اپنے ماموں زاد بھائی شاہ محمد عاشق پھلتی کی طرف رہنمائی کی کہ اب یہ مسئلہ ان سے حل ہوسکتا ہے۔ اس لئے میں ان کا منتظر رہا۔ شاہ محمد عاشق سے 10 صفر 1160ھ (فروری 1747ء) کو دہلی میں ملاقات ہوئی۔ انہوں نے میرے سامنے حدیث مسلسل بالاولیة روایت کی، میں سن رہا تھا پھر میں نے قرأت کی۔ شاہ محمد عاشق نے سماعت فرمائی اور حضرت شاہ ولی اللہ کی موجودگی میں مسلسل بالاولیة کی اجازت سے نوازا۔ مولانا بلگرامی کے الفاظ درج ذیل ہیں:

الحديث المسلسل بالاولية، قال العبد الله الاحد الصمد، الشيخ محمد بن محد، حين قرأت الرسالة من اولها آخر ها فی خدمت امام المحدثين الشيخ ولی الله العمری، وفات من التسلسل بالاولية سبق الاسناد من الكتب السته، ارشدنی الی ابن خاله الشيخ محمد عاشق و كنت منتظر لقيته؟ حتی وافيت من محروسة الدهلی، يوم الثلوث عاشرا الصفر سنه 1160ھ فحدثنا بالاسناد المذكور وانا سامع، ثم عدت و قرأت عليه وهو السميع واجازنی بحضور الشيخ المذكور، والحمد لله علی ذلك

کاتب نسخہ نے اور مقامات پر یہ وضاحت بھی کی ہے کہ انہوں نے حضرت شاہ صاحب سے مسلسل بقرأة سورة الصف کی اجازت سہ شنبہ (یوم الثلاثاء) 22 ذیقعدہ کو عصر و مغرب کے درمیان حاصل کی، دوسرے اندراج میں اسی دن مسلسل بالمصافحۃ کی اجازت بھی تحریر ہے، لکھا ہے:

يقول العبد المفتقر الی الله الاحد الصمد الشيخ محمد بن محمد البلكرامی ثم اله آبادی، الشيخ ولی الله ادام الله بر كاته صافحنا بالكف التی صافحت بها ابا طاهر الكردی المدنی فصافحنی و صافح احدی عشر رجل بن الصلحا وكان ذالك يوم الثلوث، الثانی عشرين من ذيقعده 1159ھ

کتاب کے اختتام یعنی آخری صفحہ پر حضرت شاہ ولی اللہ کا اجازت نامہ تحریر ہے جس کے چند کلمات اوپر گزر گئے ہیں، مکمل عبارت یہ ہے:

الحمد لله قد قرأ علی هذه الرسالة كلها، صاحب النسخة، اخونا الصالح الشيخ محمد، احسن الله تعالیٰ واصلح حاله، فاجزت له رواياتاً عنی. علی ان فيها بعض شئی من الخلل فی ضبط الاماء، الاسماء المغاربة لم يتفرغ لتصحيحا

ساعتنا هذا وعسیٰ ان یتیسر الله تعالیٰ لناك ذالك فی الزمان المستقبل.
کتب هذا لسطور، مولفها الفقیر ولی الله. اوائل محرم 1160ھ آخر ساعة من یوم الجمعة والحمد لله تعالیٰ اولاً وآخراً وظاهراً وباطناً[35]

نسخہ کاکوری مزین باجازت مؤلف

الفضل المبین کا ایسا ہی ایک اور قیمتی نسخہ جس پر حضرت شاہ صاحب کے قلم سے اجازت تحریر ہے، خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کاکوری میں محفوظ ہے۔

نسخہ کاکوری 20/11 سینٹی میٹر پیمانہ کے اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہے جس میں 9 سینٹی میٹر متن کا حصہ ہے۔ 2 سینٹی میٹر کا حاشیہ چھوٹا ہوا ہے جس میں کہیں کہیں افادات یا حواشی تحریر ہیں۔ اکثر حاشیہ سادہ ہے، فی صفحہ اٹھائیس سطور ہیں، عمدہ نسخہ ہے۔ یہ نسخہ بھی بہت اچھا ہے مگر کہیں کہیں دیمک وغیرہ کے اثرات کی وجہ سے پیوند لگے ہوئے ہیں۔ کتاب پر کاتب کا نام سنہ کتابت وغیرہ درج نہیں۔ تاہم کتاب کے اختتام کے بعد آخری صفحہ پر حضرت شاہ صاحب کے قلم سے بابا فضل اللہ کشمیری کے لئے اس کتاب کا اجازت نامہ تحریر ہے، لکھا ہے:

الحمد الله وحده! اجزت بهذا الرسالة لاخینا فی الله عزوجل، فضل الله بن عبدالسلام الکروی الکشمیری.
قال ذلك بفمه وکتبه بقلمه الفقیر الی رحمة الله الکریم، مصنف الرسالة ولی الله بن عبدالرحیم، کان الله تعالیٰ له وصل الله تعالیٰ علی خیر خلقه ممحد واله وصحبه اجمعین

مزید کوئی لفظ یا سن کتابت وغیرہ اس پر درج نہیں۔

اس نسخہ کے بین السطور میں کہیں کہیں مختصر افادات یا حاشیے درج ہیں، اگرچہ کہیں صراحت یا کسی کا نام موجود نہیں مگر قرین قیاس ہے کہ یہ حضرت شاہ صاحب کے افادات وکلمات ہوں۔[36]

دیوبند کے خطی نسخے

کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں مجموعہ مسلسلات میں شامل تینوں رسائل کے تین تین قلمی نسخے موجود ہیں۔ دو نسخے اور ایک مجموعہ رسائل محمد یوسف بن شیخ عبدالصمد بڈھانوی کے قلم سے ہے۔ یہ تینوں رسالے 1290ھ اور 98-1297ھ میں نقل کیے گئے تھے جس میں ایک نسخہ مطبوعہ آرہ کی جوں کی توں نقل ہے۔[37] ایک نسخہ اور ہے جس پر کاتب کا نام، تاریخ وسنہ کتابت یا کوئی اور علامت یا مہر وغیرہ موجود نہیں۔ اس نسخہ کے متعلق فہرست مخطوطات دارالعلوم کے مرتب نے یہ اطلاع دی ہے کہ:

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے مطالعہ میں رہ چکا ہے۔''[38]

مگر مرتب فہرست کی یہ اطلاع بظاہر صحیح نہیں۔ راقم سطور نے یہ نسخہ دیکھا ہے مگر اس میں ایسی کوئی عبارت درج نہیں جس کی وجہ سے اس کو شاہ صاحب سے منسوب کیا جا سکے اور کاغذ وغیرہ سے بھی شاہ صاحب کے بعد کا معلوم ہوتا ہے۔

مجموعۂ مسلسلات کی پہلی طباعت

مجموعۂ مسلسلات سب سے پہلے کب چھپا تھا، مجھے اس کا علم نہیں۔ جو مطبوعہ نسخے دستیاب ہوئے ان میں قدیم ترین طباعت مطبع نورالانوار، آرہ بہار کی ہے۔ یہ نسخہ مولانا علی اکرم آروی صاحب نے ایک قلمی نسخہ کی مدد سے مرتب کر کے 1293ھ (1876ء) میں شائع کیا تھا۔ مولانا علی اکرم کو مولانا محمد سعید محدث عظیم آبادی کے کتب خانہ میں (الفضل المبین) یعنی مسلسلات کے ایک قلمی نسخہ کی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی۔ یہ نسخہ حضرت شاہ ولی اللہ کے شاگرد مولانا بن محمد بلگرامی الہ آبادی کا لکھا ہوا تھا۔ اسی نسخہ پر حضرت شاہ صاحب کے قلم سے مولانا محمد بلگرامی کے لئے اس نسخہ کی اجازت وسند مرقوم تھی۔ مولانا علی اکرم نے حضرت مولانا سے یہ نسخہ لے کر اس کی نقل کی۔ مولانا علی اکرم نے اس نسخہ سے طالب علمی کے زمانہ میں استفادہ کیا تھا اور اسی وقت اس کی ایک نقل تیار کر لی تھی مگر بعد میں تعلیمی مصروفیت میں اضافہ کی وجہ سے اس کا موقع نہیں ملا کہ مولانا علی اکرم کی اس نقل کی اصل سے مطابقت اور مکرر تصحیح کر لیتے، لہٰذا اسی ابتدائی نقل کو بنیاد بنا کر مجموعۂ مسلسلات میں شائع کر دیا تھا۔

حالانکہ مولانا محمد کا لکھا ہوا نسخہ نہایت عمدہ، بہت واضح اور ایسا صاف ستھرا ہے کہ اس سے مقابلہ میں غلطی کا کم سے کم امکان ہے لیکن کوئی رفیق نہ ہونے کی وجہ سے مولانا علی اکرم کو اس نقل کے اصل سے مقابلہ کا موقع نہیں ملا۔ مولانا نے لکھا ہے:

> ہر چند در استکتاب، رعایت صحت الفاظ وضبط روایت وبعض لغات ومعانی بہر چہ تمام تر نمودہ باشد، اما بسبب نایافت طرف مقابل از منقول عنہ اتفاق مقابلہ نہ گردید۔ (39)

اگرچہ مولانا علی اکرم صاحب نے اپنے دونوں استادوں سے مسلسلات کے نسخوں سے بھی استفادہ کیا تھا اور بقول خود اپنے نوشتہ (یعنی منقولہ از نسخہ محمد بن محمد بلگرامی) کا ان دونوں نسخوں سے مقابلہ بھی کر لیا تھا اور ان کے فوائد ومعانی وغیرہ اپنے نسخہ کے حاشیہ پر لکھ لئے تھے۔ مولانا کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> ''اسانید مسلسلات از حدیث مسلسل بالاولیۃ شروع نمودم، ہمہ ایں اثناء شروع در قرأت وتصحیح و مقابلہ رسالہ خودم با رسالہ جناب ایشاں اتفاق افتاد، وبعض تعلیمات از افادات حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ، ودیگر فوائد متعلق الفاظ واعراب ومعانی آنچہ بر آں ثبت بود، از سواد بہ بیاض در آمدہ، نقل بر کتاب خود نمودہ شد۔'' (40)
>
> مسلسلات کی اسانید (کی روایت وقرأت کی) میں نے مسلسل بالاولیۃ سے ابتداء کی اور اسی وقت اپنے رسالہ کی تصحیح اور مقابلہ آنجناب (مولانا عالم علی نگینوی) کے نسخہ سے کرنے کا موقع ہوا اور بعض

حاشیے افادات حضرت میاں (شاہ محمد اسحاق) صاحب کے نیز جو چند اور فائدہ مشکل الفاظ، اعراب اور معنوں وغیرہ اس نسخہ پر لکھے ہوئے تھے، سیاہی سے سفیدی پر پہنچے (میں نے) ان کو اپنی کتاب پر نقل کر لیا۔

مگر اس اہتمام اور دو نسخوں سے نقل اور استفادہ کے باوجود مولانا علی اکرم کا مرتبہ اور شائع کیا ہوا نسخہ پوری طرح لائق اعتماد نہیں۔ غالباً ابتدائی نقل میں خاصی فروگذاشتیں رہ گئی تھیں۔ بعد میں طباعت کے لئے کتابت کے وقت ان غلطیوں میں اور اضافہ ہوا۔ اس لئے موجودہ نسخہ کا مشکل سے کوئی صفحہ اور روایت ایسی ہوگی جس میں متعدد فروگذاشتیں اور تصحیفات موجود نہ ہوں۔ یہ اسی طباعت کی بعض تصحیفات واغلاط ہیں جن کو متاخر طباعتوں میں کہیں متن میں کہیں حاشیہ میں نسخہ کے عنوان سے درج کیا گیا ہے۔

حالانکہ یہ فقرے اور الفاظ جو بعد کی طباعتوں میں نسخہ کے حوالہ سے شامل ہیں، حضرت شاہ صاحب کے درس میں پڑھے گئے مذکورہ دونوں نسخوں میں موجود نہیں، اس پہلی طباعت کے چند حاشیوں پر بھی اختلاف نسخ درج ہے جو بظاہر ان نسخوں پر مبنی ہیں جو مولانا علی اکرم نے اپنے استادوں کے پاس دیکھے تھے مگر چونکہ مولانا علی اکرم نے نسخوں کی تفصیل کا ذکر نہیں کیا اور ان کی قدامت واصلیت کا کچھ ذکر نہیں کیا، اس لئے ان پر بھی اعتماد غالباً صحیح نہیں ہوگا۔

مولانا علی اکرم کا مرتبہ یہ مجموعہ رسائل جس میں مسلسلات کے تینوں رسائل کے علاوہ حضرت شاہ صاحب کی تالیف تراجم البخاری بھی شامل ہے۔ 5 محرم الحرام 1292ھ (12 فروری 1875ء) کو مطبع نور الانوار آرہ (بہار) سے چھپا تھا۔ یہ مجموعہ چورانوے (94) صفحات پر مشتمل ہے۔ سرورق کے بعد فارسی میں دو صفحہ کی تمہید ہے جس کے بعض اقتباسات آچکے ہیں۔ یہ تمہید اصل رسالہ اور اس کے صفحات سے خارج ہے۔ اس کے بعد **الفضل المبین** ہے۔ بعد ازاں ص 2 سے ص 52 تک الدرّ الثمین ص 55 سے ص 67 تک اور النوادر 67 سے ص 88 پر مجموعہ رسائل ثلاثہ اختتام پذیر ہوا ہے۔

رسالہ **تراجم البخاری** ہے۔ آخر میں ص 91 سے 93 تک حضرت رسول اکرم ﷺ کی شان مبارک میں سیدنا حسان بن ثابتؓ کا ایک قصیدہ درج ہے۔ ص 93-94 پر اس مجموعہ کے مرتب مولانا علی اکرم کی اس خدمت کے تذکرہ اور توصیف پر مشتمل، مولانا عبدالسلام اور مولانا نور الحسن بہاری کے عربی اشعار ہیں، اسی پر یہ مجموعہ ختم ہو گیا ہے۔

الدرّ الثمین مطبوعہ احمدی دہلی

یہ **الدرّ الثمین** کی غالباً پہلی طباعت ہے جس کو حضرت شاہ ولی اللہ کی کتابوں کے مشہور ناشر اور شاہ رفیع الدین کے نواسہ سید احمد ولی اللّٰہی نے شائع کیا تھا۔ اس نسخہ کے سرورق پر اس کا نام اس طرح چھپا ہوا ہے:

الدرّ الثمین فی مبشرات النبی الامین

معمہ ترجمہ اردو بر حاشیہ

مسلسلات حضرت مولانا اسحاق صاحب

پہلے صفحہ کے آغاز پر سدی احمد ولی اللہی کی مختصر تمہید ہے جس میں اس نسخہ کی دستیابی اور طباعت کے اشتیاق کا ذکر ہے۔ یہ اشاعت جو اردو ترجمہ کے ساتھ ہے، صرف سولہ صفحات پر مشتمل ہے۔ سید احمد ولی اللہی کی شائع کی ہوئی اکثر کتابوں کی طرح اس کا بھی دو کالمی صفحہ ہے۔ صفحہ اول کے حاشیہ سے ص 10 کے حاشیہ تک مسلسل بالاسودین التمر والماء درج ہے مگر اس کا ترجمہ شامل نہیں اور اس کے آغاز پر یہ صراحت بھی درج ہے کہ:

هذا حديث مسلسل بالاسودين، هذا الحديث خارج عن كتاب المسلسلات

اس پر سنہ کتابت درج نہیں مگر خیال یہ ہے کہ یہ 15-1310ھ (98-1893ء) کے درمیان کی طباعت ہے۔ الدرّ الثمین کی احمدی دہلی کی مذکورہ طباعت کے علاوہ کم سے کم دو طباعتیں اور بھی ہیں۔

مطبع احمدی کی ایک اور طباعت

یہ طباعت احمدی کی پہلی طباعت کی گویا نقل ہے۔ دونوں میں معمولی سا فرق ہے۔ اس طباعت میں المسلسل بالاسودین ص 14 کے حاشیہ تک درج ہے اور آخری صفحہ (16) پر حضرت شاہ ولی اللہ کی کتاب قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین مطبوعہ مجتبائی دہلی کا اشتہار ہے۔ اس اشتہار کے اختتام پر (جنوری 1888ء۔ شعبان رمضان 1316ھ) کی تاریخ مرقوم ہے۔

ایک اور طباعت مذکورہ دونوں طباعتوں کے بعد کی ہے۔ یہ نسخہ سید احمد ولی اللہی کے بھانجے، سید عبدالغنی جعفری نے ہندوستان پرنٹنگ ورکس دہلی سے چھپوایا تھا۔ طبع مجتبائی کا پتہ بھی درج ہے۔ سنہ طباعت درج نہیں، 1930ء کے بعد کی طباعت ہوگی۔

مسلسلات، مطبوعہ سہارنپور، 1357ھ

مجموعہ مسلسلات کی ایک معروف اشاعت وہ ہے جو شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی (مہاجر مدنی) کے اہتمام اور مولانا سید بدر عالم میرٹھی (مؤلف ترجمان السنہ وغیرہ) کی کوشش سے مطبع اختر ہند سہارنپور سے چھپی تھی۔ چونکہ شیخ الحدیث اور مولانا بدر عالم صاحب دونوں کا مسلسلات کی اجازت وسند کا سلسلہ حضرت مولانا خلیل احمد انبیٹھوی مہاجر مدنی (صاحب بذل المجهود فی حل سنن ابی داؤد) سے تھا اس لئے اس طباعت کے ابتدائی چھ صفحات میں مولانا خلیل احمد صاحب کے قلم سے مولانا کے لئے مسلسلات کی اجازت اور سندوں کی تفصیلات تحریر ہیں۔ حضرت مولانا خلیل احمد کو مسلسلات کی پہلی اجازت مولانا مفتی عبدالقیوم بڑھانوی سے (8 شوال 1293ھ۔ 25 اکتوبر 1876ء) کو حاصل ہوئی۔ دوسری سند شیخ احمد دحلان مکی سے ملی جس پر سنہ اور تاریخ درج نہیں، تیسری سند واجازت حضرت شاہ عبدالغنی مجددی مہاجر مدنی سے (1294ھ۔ 1877ء) میں ملی۔ شاہ عبدالغنی نے المسلسل بالتمر والماء کی اجازت بھی عنایت کی۔ چوتھی سند واجازت شیخ احمد برزنجی مفتی مدینہ منورہ سے ملی جو 1323ھ کی مکتوبہ ہے۔

اس طباعت میں الفضل المبین کے اختتام پر صفحہ 53 سے صفحہ 56 کے آغاز تک مسلسل بالاسودین

التمر والماء اور المسلسل باجابة الدعاء عند الملتزم بھی شامل ہیں۔ اس کی تمہید میں مولانا خلیل احمد صاحب نے لکھا ہے کہ مجھے دونوں کی اجازت وسند مولانا عبدالقیوم بڈھانوی سے 1291ھ میں بھوپال میں حاصل ہوئی۔ بعد ازاں صفحہ 56 سے 67 تک الدر الثمین ہے اور صفحہ 68 سے صفحہ 88 تک النوادر اس پر بھی سنہ طباعت درج نہیں۔ غالباً (1357ھ۔1938ء) کی طباعت ہے۔

یحیوی سہارنپور کی اشاعتیں

بعد میں یہی نسخے کئی مرتبہ کتب خانہ یحیوی سہارنپور سے چھپے۔ (1390ھ۔1970ء) اور اس کے بعد کی اشاعتوں پر حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی کے چند افادات کا اضافہ ہو گیا تھا جو قدیم اشاعتوں میں شامل نہیں تھے۔ اس اشاعت کا عکس کئی مرتبہ شائع ہوا جو اب بھی بازار میں دستیاب ہے۔

بحاشیہ مولانا عاشق الٰہی بلندشہری، کراچی 1410ھ

مجموعہ مسلسلات کی آخری نئی ترتیب واشاعت مولانا عاشق الٰہی بلندشہری مہاجر مدنی کی ہے۔ مولانا عاشق الٰہی نے مسلسلات کے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کے شائع کیے ہوئے نسخہ کو سامنے رکھ کر اس میں پہلی معمولی جزوی ترمیم تو یہ کی ہے کہ اس میں درج حضرت مولانا خلیل احمد کے حوالے سے جو اضافے یا سندیں درمیان کتاب میں شامل تھیں، ان کو علیحدہ کر کے ان کا آغاز پر ضمناً تذکرہ کر دیا ہے نیز بعض احادیث وآثار کی جزوی تخریج کی ہے اور چند موقعوں پر حاشیے ثبت کیے ہیں لیکن کتاب کے متن اور سند میں جو مشتبہ مقامات مراجعت وتصحیح کے محتاج ہیں اور بعض روایات اور سندوں کی فنی حیثیت پر جس نظر ثانی اور تفصیلی نقد ونظر کی ضرورت تھی اس پر بھرپور توجہ نہیں کی گئی۔ تاہم مولانا عاشق الٰہی کا مرتب کیا ہوا یہ نسخہ تصحیح متن حواشی اور طباعت میں تمام مطبوعہ نسخوں سے ہر لحاظ سے بہتر ہے۔ کمپوزنگ بھی صاف اور عمدہ ہے، حواشی میں مفید معلومات ہیں لیکن یہ مجموعہ جس توجہ کا طالب تھا، وہ ہنوز باقی ہے۔

مولانا عاشق الٰہی کا مرتبہ نسخہ (مجموعہ مسلسلات) مکتبہ الشیخ کراچی (پاکستان) سے 1410ھ میں شائع ہوا تھا۔ اس اشاعت کے متعدد عکس ہندوستان میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

تخریج روایات مسلسلات

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کے یہاں مسلسلات کے درس واجازت کا سلسلہ شروع ہوا تو حضرت شیخ نے کتاب کے متعلقات ومباحث کے حوالے اور اضافات لکھنے شروع کیے جس میں ان روایات کی تخریج وتحقیق پر بھی توجہ فرمائی تھی۔ حضرت شیخ کے الفاظ سے یہ تاثر ملتا ہے کہ حضرت شیخ نے مسلسلات پر تفصیلی حاشیہ لکھا تھا اور رجال مسلسلات پر علیحدہ تالیف فرمائی تھی۔ حضرت شیخ اپنی آپ بیتی میں فرماتے ہیں:

"مسلسلات کی 1346ھ سے مخصوص طلباء دورہ کے بعد اجازت لیا کرتے تھے لیکن سنہ 1353ھ

سے وہ دورہ کے بعد ایک مستقل باضابطہ سبق بن گیا، اسی وقت سے بندہ نے اس کے حواشی بھی شروع کئے جو سنہ 1380ھ تک چلتے رہے اور اس کی تحویلات کو جو بہت کثرت سے مسلسل بالصوفیه میں آرہی تھیں، نقشہ بنا کر دوبارہ سہ بارہ طبع کرایا۔ حواشی کے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی اور اس کے رجال پر مستقل کلام علیحدہ لکھا جس کو رجال المسلسلات کے نام سے موسوم کیا۔"(41)

حضرت شیخ کی تصانیف کی مفصل فہرست (تالیفات شیخ) کے جامع و مرتب، مولانا محمد شاہد صاحب سہارنپوری نے بھی حواشی وتخریج مسلسلات کا مجمل ذکر کیا ہے مگر اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان حواشی کی نوعیت کیا ہے، اس میں کن پہلوؤں اور مباحث پر توجہ فرمائی گئی ہے۔ تخریج روایات مجمل ہے یا مفصل تمام روایات کی تخریج وتحقیق کی گئی ہے یا چند کی اور اس میں حضرت شیخ کا بنیادی رجحان کیا ہے، یہ کام کب سے کب تک ہوا نیز اس کے صفحات وغیرہ کی تعداد کا بھی ذکر نہیں۔(42)

مسلسلات پر حضرت شیخ کے علاوہ بھی دو تین علماء نے توجہ فرمائی مگر یہ مؤلفات وحواشی تعارف اور اشاعت سے محروم رہے۔

ہمارے دینی علمی درسی حلقوں میں مسلسلات ولی اللہی کا جو مقام و مرتبہ اور پذیرائی ہے اس کا حق اور تقاضا ہے کہ اس کا ایک عمدہ وصحیح اور محقق نسخہ مرتب ہو کر شائع ہو۔ اس کے لئے تین پہلوؤں پر کام کرنے کی ضرورت ہے:

(الف) حضرت شاہ صاحب کے درس میں پڑھے گئے مسلسلات کے شاہ صاحب کی تحریر و اجازت سے مزین نسخوں سے مقابلہ کر کے صحیح متن کی تعیین وترتیب۔

(ب) حضرت شاہ صاحب کے استادوں اور قریب العہد محقق صاحب نظر علماء کی تحریرات اور سندوں سے مسلسلات کی سندوں کا اجمالی جائزہ اور شاہ صاحب کے مراجع سے ان متنوں کا مقابلہ اور تصحیح۔

مثلاً مسلسلات (الفضل المبین) کی متعدد روایات اسی سلسلہ سند سے شیخ محمد عابد نے حصر الشارد میں بھی نقل کی ہیں مگر الفضل المبین اور حصر الشارد کی سندوں میں کئی موقعوں پر قلیل وکثیر اختلاف ہے۔ کہیں ترتیب سند کا، کہیں نام ونسبت کا، کہیں متعلقات سند کا اور کہیں اس کے علاوہ مثلاً ایک روایت مسلسل بالفقهاء المالکیه حضرت شاہ ولی اللہ شیخ وفد اللہ مکی سے اور وہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں۔ اسی روایت کو شیخ محمد عابد شیخ صالح فلانی سے وہ محمد بن شیخ عمری سے نقل فرماتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کی سند میں ہے:

عن ابی عثمان، سعید ابن ابراهیم الجزائری، عرف بقدوره مفتی تلمسان ستین سنة...... مسلسلات، ص 19

لیکن شیخ محمد عابد کی سند و روایت میں مفتی تلمسان ستین سنة کا اضافہ سعید ابن ابراہیم کے اوپر والے واسطہ کے ساتھ ہے، ملاحظہ ہو:

عن ابی عثمان سعید ابن ابراهیم الجزائری مفتیها عرف بقدوره، عن ابی عثمان سعید احمد ابن احمد المقری مفتی تلمسان ستین سنة حصر الشارد 275.الف

بعد کی سند میں مزید اختلاف اور تفصیلات ہیں:

اسی قسم کے اور بھی متعدد چھوٹے بڑے اختلافات ہیں جن سے الفضل المبین کے بعض مندرجات کی تصحیح ہوتی ہے اور بعض کی توضیح و تفصیل۔ اس لئے دونوں کا تفصیلی جائزہ اور مقابلہ نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(ج) مسلسلات کے رجال کی فنی تحقیق و تدوین، اس کی سندوں کا رجال حدیث سے مفصل تحقیقی مطالعہ اور ان سندوں کی استنادی علمی حیثیت کا مفصل تذکرہ۔

اول الذکر کام راقم السطور نے تقریباً مکمل کر لیا ہے۔ دوسرے کا ارادہ ہے۔ انشاء اللہ یہ بھی جلد ہو جائے گا۔ تیسرا اور آخری کام باقی ہے، دیکھیے یہ سعادت کس کو ملتی ہے؟

الدرّ الثمین اور النوادر کی تالیف و ترتیب

الفضل المبین کی طرح الدرّ الثمین اور النوادر کا زمانہ تالیف بھی واضح نہیں اور یہ بھی معلوم نہیں کہ کیا ان کی تالیف کی ترتیب یہی تھی جو مجموعہ مسلسلات کے موجودہ مجموعہ کی ترتیب ہے یا اس کی کچھ اور نوعیت تھی جس کا ہمیں علم نہیں۔ راقم سطور کو ان دونوں رسالوں کے کسی ایسے نسخہ کا سراغ نہیں ملا جو حضرت مؤلف کے عہد کا ہو۔ حضرت مؤلف کی اس پر اجازت و تحریر ہو۔ شاہ صاحب کے کسی شاگرد یا متوسل نے نقل کیا ہو یا اس نسخہ کی نسخہ مؤلف سے نقل کی صراحت ہو جو قدیم ترین نسخے معلوم ہیں۔ اس کی اساس کیا ہے، معلوم نہیں۔

تاہم اتحاف النبیه سے یہ تاثر ملتا ہے کہ مؤخر الذکر دونوں رسائل (الدرّ الثمین اور النوادر) کی ابتدائی ترتیب غالباً وہ نہیں تھی جو پیش نظر نسخوں کی ہے۔ اتحاف النبیه میں النوادر کے عنوان سے ایک طویل اندراج ہے مگر وہاں جو مرویات نقل ہوئی ہیں، وہ النوادر کے معروف نسخوں میں شامل نہیں۔ اتحاف النبیه میں النوادر کے تذکرہ میں الدرّ الثمین کے مرویات میں سے بارہ بشارات یا واردات مذکور ہیں اور ان کی ترتیب بھی الدرّ الثمین کے مندرجات کی ترتیب سے مختلف ہے اور سا کے اختتام پر یہ صراحت بھی ہے کہ:

هذه اربعون حدیثاً من النوادر

توجہ طلب بات یہ ہے کہ الدرّ الثمین کے متعارف نسخوں میں بھی چالیس ہی واقعات یا حکایات ہیں مگر الدرّ الثمین میں ان کا اختتام اور طرح ہوا ہے، لکھا ہے:

وعند هذا انتهت الرساله والحمد لله اولاً واخرا.

ان مختلف مندرجات کی وجہ سے دو خیال ہوتے ہیں، پہلا تو یہ کہ حضرت شاہ صاحب نے غالباً پہلے یہ بشارات و منامات قلم بند کیے تھے جو الدرّ الثمین میں شامل ہیں۔ ابتدائی ترتیب کے وقت اس مجموعہ کو النوادر کے نام موسوم کیا ہوگا، بعد میں جب اور روایت کا اضافہ عمل میں آیا تو شاید ان کے نام بدل دیئے گئے ہو جس کا نام پہلے النوادر تھا، وہ اب الدرّ الثمین کے نام سے موسوم ہوا اور نئے رسالہ کا نام النوادر قرار پایا۔ یوں بھی الدرّ الثمین کے جو مندرجات ہیں اور ان میں جن بشارات و کیفیات کا تذکرہ ہے ان کو حدیث کے اصطلاحی نام سے موسوم کرنا شاید صحیح نہ ہو۔ ان کے لئے

واردات کا لفظ ہی مناسب اور موزوں معلوم ہوتا ہے۔

اتحاف النبیہ اور النوادر کے معروف نسخوں کا ایک اور فرق بھی توجہ چاہتا ہے۔ اتحاف میں النوادر پر جو تمہید ہے اس میں ان مرویات کی فنی حیثیت کا واضح تذکرہ ہے، لکھا ہے:

ولاتقوم بمثل هذا الحديث الحجة وانما يستانس بها فى كثيرة اذكر ههنا اربعين حديثاً

لیکن النوادر کے متعارف نسخوں میں یہ عبارت موجود نہیں، صرف یہ لکھا ہے:

"لاتنويها بصحتها"

میں ایک واقعہ کے تحت لکھا ہے:

وقد بسطت القصه اول هذه الرسالة

اور یہ قصہ جس کا اس فقرہ میں اشارہ ہے۔ الدرّ الثمین کے آغاز پر درج ہے اور اسی میں چالیس مرویات و حکایات کا اہتمام ہے۔ معلوم ہوا کہ اتحاف میں النوادر کے ذیل میں جو مرویات شامل ہیں، وہ حضرت شاہ صاحب کی تالیف کی ابتدائی ترتیب یا مسودہ میں النوادر کے نام سے درج کی گئی تھیں۔ غالباً بعد میں شاہ صاحب نے جب اپنے سلسلہ روایات میں سے کچھ اور روایت جمع اور مرتب فرمائیں تو اس رسالہ کا نام تبدیل کر کے نئے رسالہ کو النوادر کا نام دے دیا اور اس قدیم تالیف کو الدرّ الثمین سے موسوم فرمایا ہوگا۔

حواشی

(1) علامہ عراقی فرماتے ہیں: "اصح مسلسل يروىٰ فى الدنيا المسلسل بقرأة سورة الصف" ملاحظہ ہو: ظفر الامانی بشرح مختصر الجرجانی فخر المتاخرین، علامہ عبدالحیٔ فرنگی محلی، بہ تحقیق علامہ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ۔ صفحہ 258 (طبع ثالث، بیروت: 1416ھ)

(2) ملاحظہ ہوں:

الف: فتح المغيث شرح الفية الحديث۔ علامہ عراقی ص: 319-320 (دارالکتب العلمیہ، بیروت: 1421)

ب: شرح نحبة الفكر ملا على قارى۔ ص 209 (مطبع اخوت، باب عالی: ترکی 1327ھ)

(3) مقدمه ابن الصلاح (فی علوم الحدیث) تحقیق، ابوعبدالرحمٰن صلاح محمد بن، بن عویضہ۔ ص 165-166 (دارالکتب العلمیہ، بیروت: 1416ھ)

(4) معرفت علوم الحديث امام حاکم تحقیق ڈاکٹر سید معظم حسین۔ ص: 29 (دارالکتب المصریہ دائرۃ المعارف، حیدرآباد دکن، 1929ء)

(5) فتح المغيث بشرح الفية الحديث ص: 40 ج 4 (بیروت)

(6) مسلسلات ابن الطيب المشرقى، وهى تنوف على ثلثماة حديث مسلسلة/ فهرس الفهارس علامہ عبدالحیٔ کتانی مغربی، ص 661، ج 2۔

(7) اجمع المسلسلات واكملها مسلسلات حصر الشادر و مسلسلات فاوقجى...... فهرس الفهارس، ص 665/ ج 2۔

(8) حضرت شاہ صاحب نے شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی کی دو کتابوں مقالید الاسانید اور صلة الخلف کا کئی موقعوں پر تذکرہ فرمایا ہے۔ مثلاً ملاحظہ ہو: الارشاد الی مهمات علم الاسناد، صفحہ 5/4 (مطبع احمدی، دہلی، رجب 1307ھ)
نیز ملاحظہ ہو: اتحاف النبیه فیما یحتاج الیه المحدث و الفقیه، مؤلفہ حضرت شاہ صاحب، مرتبہ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، ص 27-32 (لاہور: 1389ھ) مگر دونوں کی اطلاع میں اختلاف ہے۔ فلیحقق۔

(9) حصر الشارد علامہ محمد عابد سندھی کی بے نظیر و بے مثال تصنیف ہے۔ علامہ عبدالحیٰ کتانی نے اپنے شیوخ حدیث، مسند الجزائر، شیخ ابوالحسن علی بن احمد کا قول نقل کیا ہے: هو الثبت الحافل الذی لم یوجد له فی الدنیا نظیر ولا مماثل اور محدث حجاز علامہ ظاہر الوتری المدنی کے یہ الفاظ بھی درج کیے ہیں: هذا الفهرس لا یوجد علی کل مانعلم اوضح منه واصح فهرس الفهارس، ص 364، ج 1۔

(10) اس مفصل کتاب میں علامہ شیخ محمد عابد نے اپنے اساتذہ سے پڑھی ہوئی اکثر کتابوں کی سندیں نقل اور جمع کی ہیں۔ آخر میں اپنی مسلسلات درج فرمائی ہیں جو زیر نظر نسخہ کے دو سو چار صفحات (ورق 212 سے 314 تک) پر محیط ہیں۔ حصر الشارد کے ایک نسخہ کا عکس جو نسخہ مصنف کی نقل اور اس سے مقابلہ کیا ہوا ہے، راقم سطور کے پاس ہے۔ حصر الشارد گذشتہ سال سنہ 1424ھ میں مکتبہ الرشد، ریاض سے دو جلدوں میں شائع ہوگئی ہے۔ مقدمہ یا تعارف، خلیل بن عثمان الجبور السبیعی کا ہے۔ دونوں جلدیں مجموعی طور پر 782 صفحات پر مشتمل ہیں۔
علامہ شیخ محمد عابد کی حضرت شاہ ولی اللہ سے کئی سندیں مشترک ہیں۔ شیخ کو بعض ان علماء جن سے حضرت شاہ صاحب نے استفادہ کیا اور ایسے علماء کے متعدد شاگردوں سے تلمذ استفادہ اور اجازت ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ کے استاد اور شیخ الحدیث تھے۔ شاہ عبدالغنی مجددی (جو شاہ محمد اسحاق کے شاگرد ہیں) حضرت شیخ محمد عابد کے خاص شاگرد ہیں، شیخ عبدالستار دہلوی کو شاہ عبدالغنی سے تلمذ ہے۔

(11) شاہ عبدالغنی اس کتاب کی تالیف سے 4 ربیع الاول 1255ھ کو مدینہ منورہ میں فارغ ہوئے تھے۔ اس نسخہ پر اس تالیف کا نام درج نہیں۔ اس کا واحد معلوم نسخہ جو شاہ عبدالغنی کے ایک شاگرد حافظ اسماعیل بن ادریس نے سنہ 1293ھ میں نقل کیا ہے۔ ہمارے ذخیرے میں موجود ہے۔ "المورد الهنی" کے جس نسخہ پر شیخ عبدالستار زید ابوالحسن فاروقی دہلوی کو اجازت دی تھی، اس کا عکس مولانا زید صاحب نے راقم کو عنایت فرمایا تھا۔

(12) حضرت شاہ ولی اللہ سفر حجاز کے لئے 18 ربیع الثانی 1143ھ (اکتوبر 1731ء) میں دہلی سے نکلے تھے۔ 14 رجب 1445ھ (جنوری 1733ء) کو دہلی واپس پہنچے۔ اس سفر کا شاہ محمد عاشق نے القول الجلی میں مفصل تذکرہ کیا ہے۔ ص 38 تا 49۔ اس سفر کے لئے دہلی سے روانگی اور واپسی کے فقرات تاریخ خود حضرت شاہ ولی اللہ نے کہے تھے۔ ان کو شاہ ولی اللہ نے ایک قطعہ تاریخ میں جمع کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو: القول الجلی ص 49۔ (عکس مخطوطہ کاکوری، فارسی۔ مطبوعہ دہلی: 1409ھ)
شاہ صاحب نے 28 رجب 1144ھ (جنوری 1732ء) کو شیخ ابوطاہر کے حضور صحیح بخاری کی قرأت ختم کی۔ یکم شعبان 1144ھ کو شیخ ابوطاہر نے حضرت شاہ صاحب کو اجازت حدیث سے نوازا۔ تفصیلات کے لئے دیکھیے: اتحاف النبیه. ص 22/18۔

(13) اربعین یا چہل حدیث شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ کے فارسی، اردو انگریزی وغیرہ میں کئی ترجمے ہوئے ہیں۔ اس کی شرحیں لکھی گئی ہیں اور متعدد علماء اور اہل نظر نے اس کی روایات کی تخریج و تحقیق بھی فرمائی ہے۔

(14) مکتوب حضرت شاہ ولی اللہ بنام شاہ محمد عاشق پھلتی۔ مجموعہ مکتوبات مؤلفہ شاہ عبدالرحمٰن خلف شاہ محمد عاشق پھلتی۔ مکتوب 171، ورق 104 (عکس نسخہ مؤلف مملوکہ راقم سطور)

(15-16) مکتوب حضرت شاہ ولی اللہ بنام شاہ محمد عاشق پھلتی۔ مجموعہ مکتوبات مولفہ شاہ عبدالرحمٰن خلف شاہ محمد عاشق پھلتی۔ مکتوب 171، ورق 104 (عکس نسخہ مولف)

(17) ملاحظہ ہو: اتحاف النبیہ (مابین، ص 12-13)

(18) اتحاف النبیہ، ص: 22-83

(19) الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ، ص 42-141 (مطبع احمدی، دہلی: 1131ھ)

(20) اتحاف النبیہ، ص 22

(21-22) اتحاف النبیہ، ص 17-20-22

(23) بستان المحدثین، ص 100 (مطبع گلزار محمدی لاہور: بلاسنہ)

(24) معرفت علوم الحدیث، ص 33 (حیدرآباد 1329ھ) شرحاً الفیة العراقی، ص 288 (دارالکتب العلمیة: بیروت)

(26) مسلسل بالمشابکہ نیز مناولۃ بالمسبحۃ کی روایات محدثین کے یہاں مسلسلات ہی میں درج ہیں۔ حصر الشارد میں دو روایتیں ہیں۔ حصر الشارد۔ ورق 223-224 مناولت بالمسبحۃ کی ایک روایت حصر الشارد ورق 23 پر درج ہے۔ نیز شاہ عبدالغنی کی مرویات میں بھی مسلسل بالمشابکہ اور مناولۃ بالمسبحۃ دونوں مسلسلات میں شامل ہیں۔

(27) مجموعہ رسائل حضرت شاہ ولی اللہ، ص: حاشیہ (نورالانوار۔ آرہ: 1292ھ)

(28) تمہید مسلسلات ص (سہارنپور: غالباً 1357ھ)

(29) یہ ایک خط کا اقتباس ہے، مکمل خط مکتوب شیخ محمد بن طاہر بن شیخ ابراہیم کردی (وفات رمضان 1145ھ) کے عنوان سے بیاض (مکتوبات وافادات حضرت شاہ ولی اللہ و شاہ عبدالعزیز وغیرہ) مرتبہ ومکتوبہ مولانا رشید الدین خان دہلوی (وفات محرم 1243ھ، شاگرد حضرت شاہ عبدالعزیز) میں درج ہے مگر اس بیاض میں درج اس خط کا عنوان تصحیح طلب ہے۔ غالباً صحیح نام "شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی" ہونا چاہیے۔ علامہ شیخ ابوطاہر کے چار بیٹے تھے، چاروں کا نام محمد تھا۔

(30) اس خط میں جس سند کا ذکر ہے، یہ غالباً وہ سند ہے جو شاہ صاحب نے سنن ابن ماجہ کی سندوں کے تحت نقل فرمائی ہے۔ اتحاف النبیہ۔ ص 74۔

(31) علامہ شیخ ابراہیم کردی مدنی کی تالیف "الامم لایقاظ الھمم" کے مطبوعہ نسخہ میں شیخ زین العابدین بن عبدالقادر طبری سے اجازت کا دو موقعوں پر ذکر آیا ہے۔

(32) علامہ شیخ ابراہیم کردی کی تالیف "الامم لایقاظ الھمم" کے مطبوعہ نسخہ میں شیخ زین العابدین بن عبدالقادر طبری سے اجازات کا دو موقعوں پر ذکر آیا ہے۔

تصانیف ملا عصام الدین (ابراہیم بن عرب شاہ) الاسفائینی کے تحت ص 109 پر اور "المسلسل بالمکیین" کی سند میں ص 122 پر ملاحظہ: الامم (طبع اول: دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد دکن 1328ھ) اس اشاعت کا عکس بعد میں بھی چھپا ہے لیکن ان طباعتوں میں شیخ بابلی کی اجازت وسند موجود نہیں۔

(33) بعد میں حضرت شاہ صاحب نے اس کو اسی طرح نقل فرمایا جس طرح شیخ محمد طاہر نے مذکورہ بالا مکتوب میں صراحت کی ہے۔ شاہ صاحب نے انسان العین فی مشائخ الحرمین میں لکھا ہے:

بقشاشی ملاقات کرد، وے رابقشاشی وقشاشی راباوے خصوصیتی عجیب پیدا شد، واز وے حدیث روایت کردہ، وخرقہ پوشیدہ۔

انسان العینین فی مشائخ الحرمین۔ ص 7 (مطبع احمدی، دہلی، بلاسنہ)

(34) علامہ سخاوی کے یہ الفاظ علامہ شیخ محمد عابد سندھی نے اپنے کتاب **حصر الشارد** میں نقل کیے ہیں: (عکس نسخہ محمودیہ، مدینہ منورہ، نقل نسخہ مصنف) ورق 246۔الف۔

حصر الشارد کا یہ اقتباس فخر المتاخرین علامہ عبدالحئی فرنگی محلی نے **ظفر الامانی بشرح مختصر المعانی** میں بھی درج کیا ہے۔ بتحقیق علامہ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ...... (بیروت: 1416ھ)

(35) **الفضل المبین** کے اختتام پر درج حضرت شاہ صاحب کی اس تحریر کا عکس نادر مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، اردو ترجمہ از مولانا مفتی نسیم احمد صاحب فریدی کے مقدمہ میں بھی شامل ہے۔ یہ مقدمہ پروفیسر نثار احمد فاروقی کا ہے مگر وہاں اس عبارت کی نقل اس کے پڑھنے میں کئی فروگذاشتیں ہوگئی ہیں:

1-اول تو یہ لکھا ہے کہ ''صحیح بخاری کے ایک نسخہ پر حضرت شاہ ولی اللہ کے قلم سے شیخ محمد کے لئے یہ اجازت نامہ لکھا ہوا ہے۔'' (مقدمہ نادر مکتوبات ص: 97 جلد اول۔ (دہلی، پھلت) حالانکہ اس تحریر کا بخاری شریف اور اس کی اجازت سے کچھ تعلق نہیں۔ اگرچہ شیخ محمد بن محمد بلگرامی ثم الہ آبادی نے حضرت شاہ صاحب سے بخاری شریف پڑھی تھی اور ان کے مملوکہ نسخہ پر حضرت شاہ صاحب کے قلم سے شیخ محمد کے لئے بخاری شریف کی سند و اجازت نامہ بھی تحریر ہے اور بخاری شریف کا یہ نسخہ جس پر یہ اجازت نامہ درج ہے، خدا بخش لائبریری میں موجود ہے لیکن اس کے یہ الفاظ نہیں جو مقدمہ نادر مکتوبات میں نقل کیے گئے ہیں۔ یہ الفاظ مسلسلات خصوصاً **الفضل المبین** کے لئے تحریر فرمائے تھے، اس اجازت نامہ کے آخری الفاظ: **کتب هذه السطور مولفها الفقیر ولی الله** اس کی کافی اور مکمل شہادت ہے کہ یہ الفاظ بخاری شریف کے لئے نہیں بلکہ حضرت شاہ صاحب کی کسی تالیف کے لئے تحریر ہوئے ہیں۔

چونکہ مقدمہ نگار نے اس عبارت کو بخاری شریف کا اجازت نامہ سمجھ کر پڑھا ہے، اسی طرح سے لکھا ہے اور اسی پس منظر میں اس کا ترجمہ بھی کیا ہے جس کی وجہ سے کئی غلطیاں مزید ہوگئی ہیں۔

الف: حضرت شاہ صاحب نے لکھا جو راقم نے بعد میں نقل بھی کیا ہے۔ **علی ان فیها بعض شی من الخلل فی ضبط الاسماء لاسیما اسماء المغاربة** ناقل و مترجم نے المغاربۃ کو بخاری شریف کے خیال سے المغازی پڑھا اور یہی ترجمہ بھی کیا ہے۔ (خصوصاً مغازی کے ناموں میں) حالانکہ حضرت شاہ ولی اللہ یا کسی اور بڑے محدث کو مغازی سے وابستہ ناموں کے ضبط میں متواتر غلطی ہونا اور اس کی تصحیح کا موقع نہ ملنا متوقع نہیں۔ مغاربہ (مغرب اقصی، افریقہ) کے رواۃ اور محدثین کے نام چونکہ قلیل الورود ہیں، اس لئے ان میں غلطی ہونا غیر ممکن نہیں۔

یہاں یہ عرض کر دینا بھی مناسب ہوگا کہ اس مجموعہ مکتوبات میں اور بھی کئی طرح کی فروگذاشتیں رہ گئی ہیں جس میں پہلی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کے حصوں کی ترتیب اصلی قلمی نسخوں کے مطابق نہیں ہے۔ حصے آگے پیچھے ہوگئے ہیں۔ مکتوبات میں بھی اصل نسخہ کے اندراجات کی ترتیب جوں کی توں باقی نہیں رہی۔ نیز مکتوبات کا شمار بھی اصل فارسی نسخہ کے مطابق نہیں۔ متعدد اہم مکتوبات شامل ہی نہیں اور بعض ایسے خطوط جو اصل نسخہ میں درج نہیں تھے، متن میں شامل کر لئے گئے ہیں۔ تفصیل انشاء اللہ آئندہ کسی وقت پیش کی جائے گی۔

(36) نسخہ خدا بخش کی فوٹوسٹیٹ کے لئے خدا بخش لائبریری کے سابق ڈائریکٹر جناب ضیاء الدین انصاری صاحب کا اور نسخہ کاکوری کے لئے خانقاہ کاظمیہ کے نگراں جناب شاہ مجتبیٰ حیدر صاحب اور ان کے صاحبزادے ڈاکٹر مسعود انور علوی صاحب کا نہایت ممنون ہوں۔ دلی شکریہ! **اجزانهم الله تعالیٰ**

(37) مندرجہ فہرست مخطوطات دار العلوم دیوبند، مرتبہ مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب (دیوبند: 1390ھ)

(38) نسخہ ص 75۔ مندرجہ فہرست مخطوطات دیوبند، ص 97، ج 1۔

(39) تمہید رسائل حضرت شاہ ولی اللہ (مجموعہ مسلسلات وتراجم بخاری) نورالانوار، آرہ 1293ھ۔

(40) مجموعہ مسلسلات وحل تراجم بخاری، حضرت شاہ ولی اللہ۔ حاشیہ ص 56 المسلسل بالتمر والماء (آرہ: 1292ھ)

(41) آپ بیتی، ص 154 (حصہ اول طبع اول یحیوی سہارنپور)

(42) فہرست تالیفات شیخ ص 312 جلد اول (طبع اول، سہارنپور: 1417ھ)

☆☆☆

مترجم: محمد حنیف ندوی

شاہ ولی اللہ کا "مکتوبِ مدنی"

عبد ضعیف احمد ولی اللہ بن عبدالرحیم عفا اللہ عنہ کی طرف سے آفندی اسمٰعیل بن عبداللہ الرومی ثم المدنی کی طرف۔ اللہ تعالیٰ انہیں ان کی نیک امیدوں اور خوشیوں میں کامرانی عطا کرے۔

امابعد، میں اس اللہ کی حمد وستائش کا تحفہ تمہاری طرف ارسال کر رہا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کے برگزیدہ رسول اور اس کے صحابہ وآل پر درود وسلام بھیجتا ہوں۔ تمہارا وہ مکتوب مجھے ملا ہے، جس میں تم نے وحدت الوجود کے اس تصور کے بارے میں دریافت کیا ہے جس کو شیخ اکبر اور اس کے اتباع نے پیش کیا ہے اور وحدت شہود کی اس تشریح کی وضاحت چاہی ہے جس کا ذکر مجدد الف ثانی نے کیا ہے۔ تم نے یہ بھی پوچھا ہے کہ آیا دونوں بزرگوں کے نظریات میں تطبیق ممکن ہے۔

تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہر زمان اور ہر ہر قرن میں علم کی کچھ نوعیتیں ہوتی ہیں جن سے اس دور کے بزرگوں کو بہرہ مند کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تقسیم رحمت کا یہ خاص انداز ہے۔ یہ حقیقت اس وقت تمہاری نظروں سے اوجھل نہیں رہے گی جب تم غور وفکر کو اس نکتہ پر مرکوز کرو گے کہ ہمارے اسلاف کے سینے کیونکر اس وقت الہام حق کے آشیانے بنے جبکہ علوم شرع کی تدوین نہیں ہو پائی تھی اور فنون مترتب نہیں ہوئے تھے اور ان معارف سے متعلق بحث و تمحیص کے پیمانے بھی حرکت میں نہیں آئے تھے۔ ان حالات میں ان امور سے متعلق لب کشائی کرنا یقیناً اس کی حکمت کی وجہ سے تھا۔

موجودہ دور میں اللہ تعالیٰ کی ارزانی لطف کا یہ تقاضا ہے کہ اسلاف کے جملہ علوم ومعارف کا ہمارا دل ودماغ مخزن قرار پائے قطع نظر اس کے کہ ان کا تعلق منقول ومعقول سے ہے یا مکشوفات سے اور پھر اس کی توفیق ومدد کے بل پر انہیں اس طرح تطبیق وتوافق کے مواقع پیدا ہوں کہ اختلاف رائے کے بادل چھٹ جائیں اور ہر قول کا ایک صحیح حل متعین ہو جائے۔

یہ ہے ان مسائل سے نمٹنے کی ایک اساس۔ اس کی روشنی میں فقہ، کلام اور تصوف وغیرہ کے اختلافات کو دور کیا جا سکتا ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ حق جیسا کہ حضرت خضر نے کہا ہے ایک بحر ذخار ہے، جس کا نہ آغاز ہے نہ انتہا اور جو لوگ اس میں اترتے ہیں اور اس کے متعلق بات چیت کرتے ہیں ان کی مثال اس سوئی کی سی ہے جو اس میں غوطہ زن ہوئی۔ ظاہر ہے اس بے پایانی میں کچھ فرق نہیں آتا یا ان کی مثال ان چڑیوں کی سی ہے جنہوں نے سمندر کے پانی سے پیاس بجھائی اور پھر اڑ گئیں۔ گویا حق کے بارے میں ان لوگوں کی گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ انہوں نے صرف جزوی کمال اور جزوی جمال ہی کی نشاندہی کی ہے:

وعلی تفتن و اصفیه بوصفه
یفنی الزمان وفیه مالم یوصف

(اس کی مدح وثنا کرنیوالوں کی گوناں گونی کے باوجود زمانہ ختم ہو جائے گا مگر اس کی مدح کے تمام پہلو واضح نہ ہو سکیں گے۔) اس صورت میں سننے والے مختلف گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ اب جس نے ہر ایک اشارے کے صحیح صحیح حل کو پالیا اور اس مقام کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لیا جس کے متعلق خبر دی گئی ہے، وہ تو مفہوم ومعنی کی تہ تک پہنچ گیا اور اس نے ہر قول کی مناسب تشریح پر قدرت حاصل کر لی اور جس کو عبارات کے اختلافات اور اشارات کی بوقلمونیوں نے خوفزدہ کر دیا اور وہ اس لائق نہ ہو سکا کہ اختلافات کی اصل نوعیت سے آگاہی حاصل کر لے وہ گویا الجھاؤ اور انتشار فکر کی حیرت زائیوں میں گم ہو کر رہ گیا۔ ان لوگوں کا حال ان اندھوں سے مختلف نہیں جنہوں نے کسی درخت کو گھیر لیا اور اسے چھوا، گرفت میں لیا اور چکھا۔ ان میں بعض کے حصے تو صرف پتے ہی آئے، بعض نے آگے بڑھ کر ٹہنیوں تک رسائی حاصل کر لی۔ بعض اس کے بور اور پھل کو پالینے میں کامیاب ہو گئے اور بعض خوش قسمتوں کو اس کے اثمار اور میووں سے کام ودہن کی تواضع کا موقع بھی مل گیا۔ اب جس نے صرف درخت کو اپنی آغوش میں لیا تھا، اس کا یہ بیان تھا کہ یہ تو صاف اور ٹھوس قسم کی چیز ہے۔ جس نے ٹہنیوں تک رسائی حاصل کی تھی، اس نے اسے صرف لکڑی کی شاخیں سمجھا۔ جو ٹہنیوں اور بور تک پہنچ گیا تھا، اس نے اسے بدرجۂ غایت نرم ونازک شے قرار دیا۔ اسی طرح اس کے مزے کے بارے میں بھی ان کی رائیں مختلف تھیں۔ کسی نے کہا اس کا پھل بہت میٹھا ہے، کسی نے کہا بہت کڑوا اور بکٹا ہے اور کوئی ایسا بھی تھا کہ جس نے سرے سے اسے بے مزا اور بے کیف سمجھا۔ اسی طرح اس کی بو باس کے بارے میں ایک رائے نہیں تھی۔ اگر ایک نے کہا کہ اس کی اچھی خاصی خوشبو تھی تو دوسرے نے اس کی تردید کی۔ ان کے اختلاف نے جب یہ صورت اختیار کر لی کہ ہر ایک دوسرے کی تکذیب کے درپے ہے اور سب وشتم اور گالی گلوچ میں مصروف ہے تو اتنے میں ایک ایسا شخص آنکلا جو دیدۂ بینا رکھتا تھا، اس میں اگرچہ دوسروں کی نسبت کچھ خوبیاں کم ہی تھیں مثلاً اس کی آواز حسن وترنم سے محروم تھی، اس کی قوت گرفت کمزور تھی اور اس کے ذوق سمع میں بھی قدرے خلل تھا۔ تاہم یہ ان میں بینا اور دیکھنے والا تھا۔ اس نے کہا تم سب درحقیقت صحیح کہتے ہو۔ غلطی فقط یہ ہے کہ تم نے اپنے اپنے مشاہدے میں حقیقت کو محصور سمجھ لیا ہے۔ اس کے بعد اس نے ان کے مشاہدات کی اس طرح تشریح کی اور ہر ہر قول کے محل ومقام کا اس طرح پتہ دیا کہ سب مطمئن ہو گئے۔

اس سلسلے میں یہ حقیقت بھی مدنظر رہنا چاہیے کہ اگرچہ کبھی کبھی ان عرفاء کا کشف جو ظاہر و باطن کے علوم سے بہرہ مند ہیں، صحیح ہوتا ہے۔ تاہم قدماء کے کلام کی توجیہ وتعبیر میں ان سے خطاء ولغزش کا بہت ارتکاب ہو سکتا ہے اور اس سے ان کے مرتبہ عرفان میں کچھ کمی پیدا نہیں ہوتی کیونکہ جہاں تک کسی بات کی صحیح صحیح تشریح اور یقینی مفہوم کا تعلق ہے یہ دائرہ کشف سے یکسر خارج اور ایک علیحدہ شے ہے جس میں کہ علماء ظاہر اور عوام بھی اس کے شریک ہیں۔

ان تمہیدات کے بعد تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وحدت وجود اور وحدت شہود دو لفظ ہیں جن کا اطلاق دراصل مختلف معانی پر ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ان کا استعمال ''سیر الی اللہ'' کے مباحث میں ہوتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ فلاں سالک وحدت الوجود کے مقام پر فائز ہے اور فلاں وحدت شہود پر جاگزیں ہے۔ اسی سیاق میں وحدت الوجود کے معنی ایسے شخص

کے ہوں گے جو حقیقت جامعہ کی تلاش وعرفان میں گم اور مستغرق ہے۔ استغراق کا یہ وہ مقام ہے جہاں یہ عالم رنگ و بو اپنے تمام امتیازات کے ساتھ فنا کے گھاٹ پر اتر جاتا ہے اور تفرقہ وامتیاز کے وہ سارے احکام ساقط ہو جاتے ہیں کہ جن پر خیر وشر کی معرفت کا دارومدار ہے اور شرع وعقل جس کی پوری پوری نشاندہی کرتی ہے۔ سیر وسلوک کا یہ مقام محض عارضی ہوتا ہے۔ سالک چندے یہاں ٹھہرتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کی دستگیری وتوفیق اس کو جلد ہی اس مقام سے نکال لے جاتی ہے۔

اسی طرح وحدت شہود کے معنی اس سیاق میں یہ ہوں گے کہ سالک ایسے مقام پر متمکن ہے جہاں احکام جمع و تفرقہ کے ڈانڈے باہم ملے ہوتے ہیں یعنی سالک اس حقیقت کو پالینے میں کامیاب ہو گیا ہے کہ اشیاء میں جو وحدت سی نظر آتی ہے من وجہ ہے اور کثرت جو اس کے متبائن محسوس ہوتی ہے وہ بھی من وجہ ہے۔

معرفت وسلوک کا یہ مقام پہلے مقام سے نسبتاً زیادہ اونچا ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت شہود کی اس اصطلاح کو ہم نے شیخ آدم بنوری قدس سرہ کے بعض اتباع سے لیا ہے۔

کبھی کبھی ان الفاظ کا اطلاق حقائق اشیاء کی نسبت سے ہوتا ہے۔ حادث وقدیم میں ربط وتعلق کی کونسی نوعیت کارفرما ہوتی ہے؟ اس کے بارے میں دو نقطہ نظر پائے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ یہ عالم جو اعراض مختلف کا ہدف ونشانہ ہے اس کی تہ میں ایک ہی حقیقت جاری وساری ہے جیسے مثلاً شمع یا موم سے انسان، گھوڑے اور گدھے کی صورتیں بنائی جائیں۔ یہ سب اگرچہ رنگ وروپ میں مختلف ہوں گی مگر مزاج واصل کے لحاظ سے انہیں مختلف نہیں سمجھا جائے گا بلکہ ایک ہی قرار دیا جائے گا یعنی کہا جائے گا کہ طبیعت شمعیہ ان سب میں مشترک اور بنیاد کے طور پر پائی جاتی ہے۔ ان کی رنگا رنگ صورتوں کو اختیار کر لینے کے بعد شمع کا اپنا کوئی نام نہیں رہے گا بلکہ اس کو انہی ناموں سے پکارا جائے گا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہی صورتیں درحقیقت انسان، گھوڑا اور گدھا کہلانے کی مستحق ہیں۔ ہاں یہ البتہ صحیح ہے کہ ان کا اپنا کوئی وجود نہیں، کیونکہ جب تک شمع یا موم سے ضمیمہ وجود مستعار نہ لیا جائے ان کا عالم خارجی میں تحقق ہی نہیں ہو پاتا۔

دوسرا گروہ حادث وقدیم کے مابین ربط وتعلق کو اس طرح استوار کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ عالم دراصل اسماء وصفات کے ان عکوس وظلال سے تعبیر ہے کہ اعدام متقابلہ آئینوں میں ارتسام پذیر ہوتے ہیں مثلاً قدرت کا عدم عجز ہے، لہٰذا جب قدرت کی ضوفشانیاں عجز کے آئینے میں ہوں گی تو اس سے قدرت ممکنہ ظہور میں آ جائے گی۔ جب موجودات کی یہ توجیہ فہم وفکر کی گرفت میں آ گئی تو تمام صفات وجود کو اسی پر قیاس کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ پہلا نقطہ نظر وحدت الوجود کی ترجمانی کرتا ہے اور دوسرا وحدت شہود کی۔

ہمارے خیال میں کشف پر مبنی یہ دونوں نتائج صحیح ہیں۔ ممکن ہے بعض حضرات یہ کہیں کہ وحدت شہود کی اس توجیہ کی تائید شیخ العربی کے اقوال سے نہیں ہو پاتی۔ ہم کہیں گے یہ سراسر سہو ہے۔ شیخ ان کے اتباع، تلامذہ اور حکماء سب اس کے قائل ہیں۔ اس لئے کہ اگر ان اقوال کو مجازات واستعارات سے قطع نظر کر کے کہ جن کی وجہ سے فہم وادراک کی مشکلات ابھرتی ہیں حقیقت نفس الامری کا براہ راست مطالعہ کیا جائے تو حاصل کلام یہی نکلے گا کہ حقائق امکانیہ چونکہ شدید ضعف ونقص لئے ہوئے ہیں اور حقیقت وجود یہ ہی ایسی چیز ہے جو اتم واقوی ہے، لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ یہ حقائق امکانیہ اعدام ہیں جن میں کہ موجودات کی مختلف النوع صورتیں ارتسام پذیر ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ وجود کی یہ تعبیر متفق علیہ ہے۔

تم نے جو چیز دریافت کی ہے، وہ قدرے تفصیل چاہتی ہے اور غور وفکر کی متقاضی ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ پہلی بات جس کو مسلمان سمجھتے ہیں اور جو کتاب وسنت سے ذہن میں متبادر ہوتی ہے اور عقل جسے تسلیم کرتی ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی اسی طرح موجود جزئی ہے جس طرح کہ یہ سارا عالم محسوس ہے، سوا اس کے کہ وہ اس کارخانہ ہست وبود پر اثرانداز ہونے والا بھی ہے۔ اس کا خالق اور رزاق بھی ہے۔ علم وادراک کی یہ وہ نوعیت ہے جسے ہر ہر عاقل اپنے قلب و جگر میں جلوہ گر پاتا ہے بغیر اس کے کہ وہ ریاضت ومجاہدہ کی سختیاں جھیلے یا عقل وخرد کی گہرائیوں میں اترے اور اسی حد تک شرع نے ایک مسلمان کو مکلف بھی ٹھہرایا ہے اور شریعت الٰہی کے بارے میں یہ طے ہے کہ وہ انسان کو انہی چیزوں کا مکلف گردانتی ہے جو پہلے سے ان کی فطرت میں موجود ہوں اور ان کی صورت نوعیہ کا ضروری تقاضا ہوں چاہے یہ چیز علمی ہوں چاہے عملی۔ اسی طرح شریعت کی گرفت ومحاسبہ بھی انہیں امور سے متعلق ہے کہ جو انسانی فطرت کے ضمیر میں پہلے سے موجود ہیں۔ ارشاد باری ہے: **فطرة الله التی فطر الناس علیها، لاتبدیل لخلق الله** (اللہ کی وہ فطرت کہ جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اور خدا کے بنائے ہوئے قوانین بدلنے والے نہیں) حدیث میں ہے: **کل مولود یولد علی الفطرة** (ہر ہر مولود کو فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے۔)

علم وادراک کی یہ مقدار عرفان صحیح اور اشارۂ صادقہ پر مبنی ہے جس کا سرچشمہ خود تجلیات حق کی ایک تجلی ہے جو نفس رحمانی میں اس وقت ظہور پذیر ہوئی جبکہ زمانے کی گردشوں نے ابھی جنم نہیں لیا تھا اور حدوث وخلق کے قصے کا بھی آغاز نہ ہو پایا تھا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی فطرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف بڑھنے کا جذبہ ومیلان اسی طرح کا پایا جاتا ہے جیسا کہ لوہے میں مقناطیس کی طرف کھنچنے اور سرکنے کی صلاحیت ہے یا جس طرح آگ کے شعلے اوپر کی طرف اٹھتے ہیں یا مثلاً زمین جس طرح نیچے کی طرف گرنے اور لڑھکنے پر مجبور ہے۔ اس حقیقت کو کس سچائی سے ایک شاعر نے پیش کیا ہے:

لقد صرت مقناطیسها فقلوبنا
بجذبك ایاها الیك تمیل

(تو بمنزلہ مقناطیس کے ہو گیا ہے، لہٰذا ہمارے دل، اس کے جذب وکشش کی وجہ سے تیری طرف بے اختیار مائل ہو رہے ہیں) یہی وہ تجلی ہے جس کو موت کے بعد "لقاء اللہ" سے تعبیر کیا ہے اور ان تمام ذرائع کو جو لقاء الٰہی کے لئے معین وسازگار ہوں انشراح قلب اور روشنی قلب کا سبب ٹھہرایا ہے اور ان تمام چیزوں کو گناہ ومعصیت قرار دیا ہے جو بُعد اور دوری پیدا کریں۔ اس معنی کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے:

سترون ربکم عزوجل کما ترون القمر لیلة البدر. لاتضامون فی رویة. فان استطعتم ان تغلبوا علی صلوة قبل طلوع الشمس و قبل غروبها فافعلوا (تم اپنے رب کو اسی طرح دیکھو گے جس طرح چودھویں رات کے چاند کو دیکھتے ہو۔ اس کے دیکھنے میں تمہیں کسی قسم کی زحمت سے دوچار نہیں ہونا پڑے گا۔ پس اگر تم طلوع شمس سے پہلے اور غروب شمس سے پہلے نماز پڑھ سکو تو ضرور پڑھو۔) یہی تجلی خیر وشر کا معیار بھی ہے جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے اور یہی وہ شے ہے جس پر اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماء منطبق ہوتے ہیں اور ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ

نے ایک شخص کے اس سوال پر کہ اللہ تعالیٰ تخلیق سے پہلے کہاں تھا، جو ارشاد فرمایا: **کان فی عماء مافوقه هواء و ماتحته هواء** (خدا لامکان میں تھا) اس میں بھی یہی حقیقت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح صوفیاء کے اس قول میں بھی اسی مفہوم ومعنی کی نشاندہی کی گئی ہے کہ وجود دو قسم کے مظاہر میں جلوہ گر ہوا ہے۔ ایک ایسے مظہر میں جس کے لئے تاثیر، قہر و تغلب اور فعل وتنزہ واجب ہے۔ دوسرے ایسے مظہر میں جو امکان کے ساتھ تاثر، قہر وتغلب، انفعال اور تلوث کو قبول کرنے کی صلاحیتیں رکھتا ہے۔ مزید برآں شیخ محی الدین ابن العربی کے اس قول میں بھی کہ اس عالم کون ومکان میں ایک ارادۂ متجددہ پایا جاتا ہے اسی صداقت کی طرف اشارہ ہے۔ ان دقائق کے پیش نظر جس شخص نے اس تجلی کا اثبات کیا اس نے گویا قدرت وفطرت کو پالیا کہ جس پر اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو پیدا کیا ہے اور اسی طرح اس نے اس معاملے میں انبیاء اور اولیاء کے ذوق معرفت کی تائید کی لیکن جس نے انکار کیا اس نے نہ صرف فطرت کا انکار کیا بلکہ انبیاء اور اولیاء کے متفقہ ذوق عرفان کی تکذیب کی جو اللہ تعالیٰ کے اقرار واثبات پر منتج ہوتا ہے، لہٰذا ایسے شخص کے زندیق ودہریہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

ٹھیک اسی طرح جس شخص نے اس علم کی تکذیب کی جس کو اللہ تعالیٰ نے فطرت انسانی میں ودیعت کر رکھا ہے اور جس پر کہ مسئلہ تکلیف ومکافات کا دارومدار ہے، وہ بھی زندیق ہے۔

یہ علم ہر ہر شخص کی فطرت میں سمویا ہوا ہے کہ حقائق اشیاء ثابت نہیں اور یہ کہ ہر شے مخصوص قسم کے امتیازات سے بہرہ مند ہے، مثلاً یہ کہ آگ کا خاصہ جلانا ہے۔ پانی آگ کو ٹھنڈا کرتا اور بجھاتا ہے، زنجبیل حار ہے، کافور بارد ہے، نماز کار خیر ہے اور زنا برائی۔

اس تفصیل کے معنی یہ ہوئے کہ جس شخص نے ان حقائق کو نہ مانا اس کے خلاف خود اس کے قلب وضمیر میں دلائل وبراہین کا لشکر صف آرا ہو گیا اور خود اس کی فطرت نے اس کے نفسانی رجحانات کی تکذیب کی یعنی وہ اس سلسلہ اقوال و آراء کی پراگندگی کا شکار ہوا اور ضلالت وگمراہی کے عمیق ترین گڑھوں میں جا گرا۔

ہم جانتے ہیں کہ شارع علیہ السلام نے علم وادراک کی اس فطری مقدار سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دی اور اس سلسلے میں مزید غور وفکر سے روکا ہے لیکن صوفیاء نے باوجود اس کے ان مسائل پر گفتگو کی ہے۔ ان کا عذر یہ ہے کہ جس چیز سے روکا ہے وہ یہ ہے کہ طبیعت نوعی سے زیادہ توقعات وابستہ کی جائیں اور فکر واستدلال کے لگے بندھے اصولوں کی روشنی میں قدم آگے بڑھائے جائیں لیکن اگر کوئی شخص عقل واستدلال کی راہوں سے بڑھ کر علوم ومعرفت کا کوئی اور انداز اختیار کرتا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بہرحال کہنا یہ ہے کہ لوگوں نے اس فطری اصول کو مان لینے کے باوجود اس پر دوسرے انداز سے غور وخوض کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اشیائے معقولہ اور اشیائے محسوسہ دونوں میں نفس وجود کے اعتبار سے اشتراک پایا جاتا ہے اور وجود کا یہی وہ جانا بوجھا مفہوم ہے جس کے پیش نظر یہ چیزیں معدوم سے جدا ہوتی ہیں۔ مثلاً مثلث کے دو مفہوم ہیں: ایک وہ جس کا تعلق تعقل وتصور سے ہے اور دوسرا وہ جس کا تعلق محسوسات سے ہے۔ ظاہر ہے مثلث کا تعقل وتصور اس کے وجود سے مختلف ہے اور یہی اختلاف وہ فارق ہے جو اسے حیز معقولات سے نکال کر سطح وجود پر لا کھڑا کرتا ہے اور اسی مقام پر فائز ہو کر کسی شے میں قابلیت وفاعلیت کی خصوصیات ابھرتی ہیں یعنی ایک تو شے کی ماہیت معقولہ

ہے اور ایک یہ خصوصیات زائدہ یا امتیازات ہیں جو اس کے علاوہ ہیں اور کہنا چاہیے کہ انہیں کی بدولت گھوڑے، انسان اور گدھے وغیرہ کی ماہیت محسوس و ممیز سانچوں میں ڈھلتی ہے۔ اس مرحلے پر دو سوال ابھر کر نظر و فکر کے سامنے آتے ہیں: خود اس وجود کی حقیقت کیا ہے اور خصوصیات زائدہ کے ساتھ اس کے ربط و انضمام کی نوعیت کیا ہے؟

اس کا ایک جواب یہ ہے کہ وجود امر انتزاعی ہے یعنی صورت حالات یہ نہیں کہ خالق و فاطر کائنات نے پہلے تو ماہیات کو پیدا کیا ہو اور پھر ان پر خصوصیات وجود کا اضافہ فرمایا ہو بلکہ واقعہ صرف اسی قدر ہے کہ اس نے ماہیات کو وجود بخشا ہے (غرض یہ ہے کہ ماہیات کا تصور سراسر انتزاع و تجرید کا کرشمہ ہے، ورنہ وجود و ماہیت دو الگ الگ چیزیں نہیں) ہم اس پر یہ کہیں گے کہ یہ بات ایک پہلو سے صحیح ہے اور ایک پہلو سے غلط ہے۔ غلط ان معنوں میں ہے کہ اس میں وجود کے عمومی مفہوم کو صرف ایک ہی شق میں منحصر کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ ہم امور انتزاعیہ کا باقاعدہ ادراک رکھتے ہیں، ان کو صفت وجود سے متصف گردانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کا تعلق ماہیات اشیاء سے ہے۔ ظاہر ہے کہ خود ماہیات اور امور انتزاعیہ کا اگر وجود نہ ہو اور ان کے اتصاف کی نوعیت ایسی نہ ہو کہ ان کو خلاق و فاطر کا کرشمہ تخلیق کہا جا سکے تو انتزاع و تجرید کے لئے کیا بنیاد اور اساس باقی رہ جاتی ہے؟

بعض حضرات اس مرحلے پر کہیں گے کہ خالق و فاطر نے تو دراصل اپنی ذات سے ماہیات ہی کا اصدار فرمایا تھا، پھر جب لوگوں نے دیکھا کہ ان میں فاعلیت و قابلیت وغیرہ کی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں تو اس سے ان کے ذہن میں وجود کا تصور مرتسم ہوا۔ اس کے مقابلے میں ہمارا یہ کہنا ہے کہ اس تعبیر میں بھی خطاء و صواب کے دوگونہ پہلو پائے جاتے ہیں۔ خطاء کا پہلو یہ ہے کہ معرفت وجود کو ماہیات کی حد تک محدود کر دیا گیا ہے، حالانکہ یہ قطعاً ایسے امور کو جانتے بوجھتے نہیں جو خارج میں مخصوص و متعین سانچے رکھتے ہیں اور ہم اس تعین کی بنا پر مختلف ناموں سے پکارتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ خصوصیت، یہ تعین اور وجود کا یہ سانچہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ماہیات اشیاء کے علاوہ ان کی تخلیق بھی فرمائی ہے۔ ذرا غور سے دیکھیں تو یہ حقیقت صاف طور پر علم و ادراک کی گرفت میں آئے گی کہ اس عالم رنگ و بو میں مختلف و متمیز وجود نہیں جنہیں ہم ماہیات سے تعبیر کرتے ہیں اور جن کے بارے میں ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ وجود کے دو خانوں میں تقسیم پذیر ہیں۔ ایک وہ وجود مطلق ہے جس کی وسعتیں اور پھیلاؤ موجودات کے پورے سلسلے کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے اور یہ درجے و رتبے میں دوسرے وجود سے متقدم ہے۔ دوسرا وجود وہ ہے جو خصوصیت و تمیزات کا حامل ہے۔

وجودات خاصہ کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ صورت علمیہ کے تنزلات نہیں اور ان میں اور وجود مطلق میں ربط و تعلق کی جو نوعیت کارفرما ہے، وہ اگرچہ معلوم نہیں مگر اس کے تحقق و اثبات میں شبہ نہیں۔ وجود کی اس وضاحت سے صاف صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ دونوں گروہ خطاء و صواب کے ملے جلے مؤقف کے حامی ہیں جس سے کہ پوری پوری تشفی نہیں ہو پاتی۔

وحدت الوجود کے قائلین صوفیاء کا کہنا ہے کہ وجود مطلق جو خارج میں مترتب آثار کا موجب ہوتا ہے، دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو خارج میں موجود ہونے اور ترتب آثار کا ہدف بننے کے لئے اسے ایک ضمیمہ یا شے زائد کے الحاق کی ضرورت پڑے گی یا نہیں پڑے گی۔ پہلی صورت میں ہم اسے ممکن کہیں گے اور دوسری صورت میں ''واجب۔'' اس ضمیمہ یا

شے زائد کی کیا حیثیت ہے یہ ایک وجود منبسط ہے جو تمام پیکران محسوس و موجود کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔ یہ قائم بالذات حقیقت ہے۔ یہی نہیں دوسری اشیاء کے لئے مقوم بھی ہے نیز فی نفسہ غیر متعین ہے اور جملہ آثار و خصوصیات سے تہی بھی۔ اس کا احساس ہمیں ذوق و وجدان کے ذریعہ ہو پاتا ہے۔ وجود مطلق کی اس صورت کو آگے چل کر تنزلات علمی و عینی کہیں گے جن سے کہ خصوصیات و آثار کا الحاق ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ تنزلات کی ترتیب کیا ہے؟ اس کو یوں سمجھیے کہ پہلے مرتبے پر تو خود اس کی ذات، ذات کی سطح پر جلوہ فگن ہوتی ہے۔ تجلی کی یہ صورت جزئی نہیں ہوتی بلکہ اس طرح کی کلیت لئے ہوئے ہوتی ہے کہ کائنات کی کسی چیز کو بھی اس کی وسعتوں سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔ دوسری تجلی میں اس شان کلی کی تفصیلات ہوتی ہیں مگر صرف علم کی حد تک اعیان و افراد اس کی زد میں نہیں آتے۔ اس کے بعد آخری تجلی اعیان و افراد کی شکل میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔

تجلیات کی اس تشریح کے بعد حقائق ممکنات کا سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ ان سے مراد وجود مطلق یا ذات کا ان صور و اشکال گوناں گوں میں متلبس ہونا ہے جو مختلف شؤن و اعتبارات سے ابھرتی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب ذات گرامی ان مختلف اور رنگا رنگ حالات و شئون سے متعرض ہوتی ہے تو اس تعرض و تلبس سے ماہیات ممکنات کی تعین ہوتی ہے۔

وجود ممکنات کا مطلب یہ ہے کہ یہی حقائق جو اب تک مرتبہ علم میں تھے، پیراہن وجود سے آراستہ ہیں لیکن ان حقائق کو پیراہن وجود سے آراستہ اس وقت کہا جاتا ہے جب وجود ممکن کی تمام شرائط مہیا ہو جائیں اور وہ تمام موانع دور ہو جائیں جو ان حقائق کو حیز وجود میں آنے سے روک رہے تھے۔

اس طرح ماہیات اشیاء اور وجود میں ربط و انضمام کی ایسی نوعیت قائم ہو جاتی ہے جس کی کیفیت تو معلوم نہیں کی جاسکتی مگر جس کا تحقق و اثبات بہر حال جانا بوجھا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ربط و تعلق کے اس انداز کی وجہ سے ان پر خصوصیات و آثار کا ترتب ہونے لگتا ہے۔ اس مرحلے پر کہا جاتا ہے کہ وجود مطلق نے تنزل فرمایا ہے یا یہ کسی خاص مظہر میں ظہور پذیر ہوا ہے۔ وجود کے ظہور پذیر ہونے یا تجلی و تنزل کی اس سطح پر آنے کے معنی یہ ہیں کہ ہر ہر نوعیت کے آثار و خصوصیات کی پوری پوری تعین ہوگئی ہے۔

ہماری رائے میں یہ بات عقل اور کشف دونوں کی رو سے صحیح ہے۔ مثلاً تم میدان جنگ پر نظر ڈال کر دیکھو۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ اس کی ساری رونق و ہنگامہ آرائی ''جسم'' کی بدولت ہے۔ وہی قاتل ہے وہی مقتول ہے اور وہی آلۂ قتل بھی ہے۔ اسی طرح اس کو راکب و مرکوب قرار دیں گیا ور اسی کو سیف و سناں اور ہازم و مہزم سے تعبیر کریں گے اور وہی حملہ کرنے والا اور حملے کا ہدف و نشان بھی ہوگا۔

لیکن اس کے باوجود کہ ان تمام ظہورات میں جسم ہی کی کارفرمائیاں نظر آتی ہیں، تنہا جسم کو ان میں سے کسی نام کے ساتھ متصف نہیں ٹھہرایا جاسکتا تا آنکہ اس پر ایک کیفیت خاص اور معنی خاص کا اضافہ نہ کیا جائے اور خصوصیات و امتیازات کو بڑھایا نہ جائے۔ یوں اگر ان خصوصیات و آثار کا جسم سے صرف نظر کر کے مطالعہ کریں گے تو ان کی حیثیت معدومات سے زیادہ نہیں ٹھہرے گی کہ جن پر آثار و خصوصیات کا ترتب نہیں ہو پاتا لیکن جونہی ان کو جسم کے مختلف سانچوں میں ڈھالا جائے گا یا ان کے ساتھ جسم کو جوڑا اور منضم کیا جائے گا یہی کیفیات صدور آثار و کیفیات کا موجب و سبب بن

جائیں گی۔

گویا جسم مطلق جہاں تک علم وتقدیر کا تعلق ہے پہلے سے ان معانی کا محل یا حامل ہے اور جب یہ معنی وجود خارجی کا سانچہ اختیار کر لیتے ہیں تو مختلف اشیاء کے روپ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ اب ان میں کوئی راکب بن جاتا ہے، کوئی مرکوب اور کوئی سیف وسناں کہلاتا ہے اور کوئی ہدف وقتیل۔

ان بوقلموں صورتوں اور متعدد شکلوں کو جن کا تعلق یکسر معانی اور ماہیات سے ہے، جسم کے قالب میں ڈھلنے سے پہلے اعدام ممکنہ ہی کہنا چاہیے مگر جب اسباب وشرائط مہیا ہو جاتے ہیں تو کوئی لوہار یا بڑھئی اٹھتا ہے اور انہیں تیشے یا ہتھوڑے کی مدد سے معرض وجود میں لے آتا ہے۔ اسی طرح ان معدومات موہومہ اور موجودات میں ربط وتعلق کی ایک نوعیت ابھر آتی ہے جس کی کنہ وکیفیت تو معلوم نہیں کی جا سکتی، البتہ اتنا یقینی ہے کہ ان میں رشتہ وربط کا یہ انداز ضرور پایا جاتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم سیف وسناں کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ معنئی معدوم اور وجود میں ایک طرح کا ربط وتعلق پیدا ہو گیا ہے جس کی وجہ سے اس کو خاص نام کے ساتھ متصف گردانا جا سکتا ہے ورنہ اس سے پہلے مطلق جسم کی نسبت یہ تھی کہ اس کو صور مختلف کا ہدف قرار دیا جا سکتا تھا، یعنی وہ راکب بھی ہو سکتا تھا اور مرکوب بھی۔ سیف کے قالب میں بھی ڈھل سکتا تھا اور سناں کے سانچے میں بھی لیکن اب جبکہ اس نے سیف کی صورت اختیار کر لی تو ہم کہیں گے کہ جسم مطلق نے ایک خاص تعین کو اپنا لیا ہے اور بوقلموں صورتوں اور شکلوں میں سے ایک صورت کو چن لیا ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جسم ایک متعین ظہور میں آشکار ہوا ہے۔

ظاہر ہے کہ تعبیر وبیان کا یہ انداز بالکل صحیح ہے جس کو تھوڑی دیر کے لئے لفظی مناقشوں میں تو الجھانا ممکن ہے مگر کسی عاقل کے لئے گنجائش انکار ہرگز نہیں۔

پھر یہ بات اگر جسم کے حق میں صحیح ہے تو وجود کے حق میں بطریق اولیٰ صحیح ہونا چاہیے۔ صوفیاء جب یہ کہتے ہیں کہ "العالم عین الحق" اس سے ان کی مراد یہ نہیں ہوتی کہ ان وجودات خاصہ یا تعینات کی نفی کی جائے جو تنزل وظہور کا نتیجہ ہیں بلکہ وہ صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حق نے اس آب وگل میں ظہور فرمایا ہے یعنی جس طرح ایک معقولی کہتا ہے کہ زید وعمر ایک ہیں اور اس کا اشارہ تماثل نوعی کی طرف ہوتا ہے، مکمل اتحاد کی طرف نہیں یا جب وہ کہتا ہے کہ انسان اور گھوڑا ایک ہیں تو وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ ان میں حیوانیت امر مشترک ہے۔ اسی انداز سے جب وہ شجاع اور شیر کو ایک قرار دیتا ہے تو اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ ان میں جو وصف صوفیاء "العالم عین الحق" کہتے ہیں اور اس سے ان کی غرض فقط یہ ہوتی ہے کہ اس وجود منبسط میں اور ہمارے گرد وپیش پھیلی ہوئی اس وسیع تر حقیقت میں جس نے کہ سارے عالم ہست وبود کا احاطہ کر رکھا ہے حق کی جلوہ فرمائی ہے اور یہ کہ وجود کی یہ نوعیت براہ راست حق کے ساتھ وابستہ ہے، اس کے بعد کے کسی تنزل وظہور کے ساتھ نہیں ورنہ جہاں تک آثار وتعینات میں فرق وامتیاز کا تعلق ہے ان میں کوئی بھی اس کی نفی کی جرأت نہیں کرتا:

ہر مرتبہ وجود حکمے دارد
گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

اس نہج سے جب یہ حضرات تنزل کی اہمیتوں پر زور دیتے ہیں تو اس سے مقصود ایک ایسا معنی ہوتا ہے کہ ظہور د

تنزل کے دونوں پہلوؤں یا مرحلوں کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے۔

تعبیر کی اس صورت پر یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا کہ جب تم نے حق اول کو تسلیم کر لیا اور یہ بھی مان لیا کہ اس سے کائنات کا صدور ہوتا ہے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وجود وتحقق ان دونوں مرحلوں پر بالتساوی مشتمل ہو کیونکہ نہ تو حق اول اور مبداء وجود کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ موجود نہیں ہے اور نہ صادر کے متعلق یہ کہنا درست ہے کہ وہ غیر موجود ہے۔

یہ اعتراض اس بنا پر صحیح نہیں کہ ہم جب وجود مشترک کا ذکر کرتے ہیں تو اس کی حیثیت اس حقیقت کی نہیں ہوتی۔ انیاب اغوال کی طرح جو نفس الامر میں ثابت ہے، بلکہ ہم اس کو حقیقت مفروضہ مانتے ہیں جس کو عقل از راہ تعمیم مستنبط کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں تک عقل سلیم کا تعلق ہے وہ اگرچہ مراتب وجود میں جو ایک طرح کا تمائز پایا جاتا ہے اس کو تسلیم کرتی ہے اور حادث وقدیم کے مابین ایسے ربط وتعلق کو نہیں مانتی جو ان دونوں کو واقعی وحقیقی وحدت میں منسلک کر دے۔ تاہم تنزل صادق کا انکار بھی نہیں کرتی جو ابداع وتخلیق پر منتج ہوتا ہے بلکہ ایک اعتبار سے اسے ماننے پر مجبور ہوتی ہے۔

اس وضاحت سے قطع نظر یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح ہے کہ عقل، نفس اور ہیولیٰ تینوں میں اس طرح بالوجہ اشتراک وتماثل پایا جاتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو دوسرے کا عین قرار دیا جا سکتا ہے یعنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ عقل عین نفس ہے اور نفس عین ہیولیٰ ہے۔ اس کی مثالیں ہم پہلے بیان کر آئے ہیں یعنی جس طرح موم کے ایک ٹکڑے کو تعین کے مختلف سانچوں میں ڈھالا جا سکتا ہے اور جس طرح ایک انگوٹھی متنوع وبوقلموں نقوش کے ارتسام کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اسی طرح ایک کلی جزئیات وافراد کے تعین کو اختیار کر سکتی ہے۔ اس کی بیّن مثال یہ ہے کہ تم ایک کلی کو ذہن میں فرض کرو۔ عقل اس معاملے میں یہی کہے گی کہ یہ کلی جزئیات ہی کی شکل میں پائی جاتی ہے۔ اب تعلق وربط کی جو نوعیت کلی اور اس کی جزئیات میں رونما ہے، وہی نفس وہیولیٰ میں ہے۔ اس لئے کہ ہیولیٰ سے ہماری مراد یہی ہے کہ نفس کلی نے تشخص وتعین کا روپ دھار لیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ تشخص وتعین سے بالکل علیحدہ بھی نہیں ہے بلکہ صحیح تر تعبیر یہ ہے کہ جب یہ اپنی کلی شکل میں موجود ہو گی تو نفس کلی کہلائے گی اور جب تعین کا لبادہ اوڑھ لے گی تو ہیولیٰ سے موسوم ہو گی۔ عارف کو چاہیے کہ جب وہ ''عینیت'' کے اس مرتبے کی تصریح کرے تو ایسے الفاظ ضرور استعمال کرے جو فرق اعتباری کو واضح کر سکیں۔ بہرحال یہ ایسی سچی بات ہے جس کو اکثر لوگ غلط معنی پہناتے ہیں یعنی ''کلمة حق اریدبھا الباطل'' شیخ مجدد کا کہنا ہے کہ صفات ثمانیہ (ہشت صفات) خارج میں موجود ہیں۔ اس لئے ان کو ذات سے خارج میں متمیز ہونا چاہیے۔ ان صفات کی اثر آفرینیوں کی کیفیت یہ ہے کہ ہر ہر صفت کے مقابل ایک عدم ہے۔ مثلاً علم کا مقابل جہل ہے اور قدرت کا مقابل عجز ہے اور یہ تمام ''اعدام'' علم حق میں متمیز اور واضح ہیں اور تمیز ووضاحت کی اس نوعیت سے ان کو اسماء وصفات کے لئے بمنزلہ آیتوں کے کر دیا ہے یا یوں کہیے کہ انوار حق کے نقطہ نظر سے ان کی حیثیت مہبط انوار یا تجلی گاہ کی ہے۔ ان معنوں میں حقائق ممکنات کا مطلب یہ ہوا کہ یہ اسماء وصفات کے ان عکوس وظلال سے تعبیر ہیں جو ان اعدام پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ گویا اعدام کو مادہ ٹھہرانا چاہیے اور یہ عکوس وظلال جو ان پر اثر انداز ہوتے ہیں صورت یہ ہے جو اس مادہ میں حلول پذیر ہے۔

حقائق ممکنات کے بارے میں ابن العربی اور جناب مجدد کے نقطہ نظر میں تھوڑا سا فرق ہے۔ ان کی رائے میں یہ اسماء وصفات ہی کا دوسرا نام ہے جبکہ یہ مرتبہ علم میں تعین ووضوح کی کیفیتوں کے حامل ہوں بخلاف شیخ مجدد کے کہ ان

کے خیال میں یہ اعدام نہیں جن پر انوار حق اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہاں یہ البتہ درست ہے کہ ان اعدام اور عکوس کا محل اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ جو فاعل مختار ہے، یہ چاہتا ہے کہ ماہیت معلومہ میں سے کوئی ماہیت حیز علم سے نکل کر حیز وجود میں آئے اور تعین خاص کو اپنائے تو وہ اسے وجود ظلی بخش دیتا ہے اور اس کی یہ ماہیت مرتبہ علم سے نکل کر وجود ظلی کے لباس میں آشکار ہو جاتی ہے۔ اس عالم رنگ و بو سے متعلق ان کی رائے دوٹوک اور صاف نہیں بلکہ ان کے اقوال میں اختلاف رونما ہے۔ کبھی تو وہ فرماتے ہیں کہ یہ عالم وجود ظلی سے بہرہ مند ہے اور کبھی یہ مؤقف اختیار کرتے ہیں کہ یہ کائنات وجود موہوم سے آراستہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اتقان و استواری سے نواز رکھا ہے۔ اس لحاظ سے یہ عالم اگرچہ موہوم ہے مگر اس کے باوجود استوار و محکم بھی ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ حقائق ممکنہ کا اطلاق کئی معانی پر ہوتا ہے۔

(1) ان سے مراد موجودات خاصہ ہیں، مثلاً ایک حقیقت انسان ہے، ایک حقیقت گھوڑا ہے اور ایک حقیقت پانی ہے۔ یہ تمام حقائق وہ امور ہیں جو عالم خارجی میں ثابت و متحقق ہیں۔ اس اطلاق کی رو سے حقائق ممکنہ وہ امور ہیں جن کو ہر ایک شخص جانتا بوجھتا ہے۔ یہی مطلب ہے ان کے اس قول کا کہ حقائق اشیاء ثابت نہیں یعنی ہر ذی عقل کو معلوم ہے کہ انسان کون ہے، گھوڑا کسے کہتے ہیں اور پانی کا اطلاق کس چیز پر ہوتا ہے۔

(2) ان سے مقصود وہ امور ثابتہ ہیں جو ذاتی لحاظ سے نہ تو موجود ہیں اور نہ معدوم مگر جب ان کے ساتھ ضمیمہ وجود کا الحاق ہو جاتا ہے تو کسوت وجود سے آراستہ ہو جاتے ہیں، ورنہ طاق عدم میں دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔

انہی امور کو ایک معقولی ماہیات سے تعبیر کرتا ہے اور ان کے بارے میں یہ رائے رکھتا ہے کہ یہ فی نفسہ نہ تو موجود ہیں اور نہ معدوم۔ ان کی حیثیت اس کے نزدیک صرف ثبوت کی ہے مگر مرتبہ علم میں اول الاوائل (اللہ) اور فیض اقدس کے ساتھ ان کا تعلق و ربط کیسا ہے، اس کو یہ نہیں جان پاتا۔ یہ شرف اس صوفی کو حاصل ہے جو وحدت الوجود کا قائل ہے کہ اس پر اس ربط و تعلق کی ٹھیک ٹھیک نوعیت و ترتیب کا انکشاف ہوا ہے۔

اس کا عرفان یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات مقدسہ سے جو پہلی تجلی صادر ہوئی وہ خود ذات اقدس کی توجہ و التفات ہے کہ جو خود ذات ہی کی طرف ملتفت ہوئی۔ اس میں اس نے جانا کہ اس کی ذات گرامی کیا ہے، اس کے تحقیقی تقاضے کیا ہیں۔ اس کا کمال دائم کس نوع کے مظاہر کا مقتضی ہے اور ان مظاہر کے ارتقاء و بوقلمونی کی کیا کیا صورتیں ہیں۔ علم و تجلی کی یہ نوعیت خاص ہے جسے عین اقتضاء کہنا چاہیے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کو مجرد ارتسام صور یا استحضار اشیاء سے تعبیر کیا جائے (کیونکہ علم و تجلی کی اس صورت میں ایک طرح کی فعلیت مضمر ہے جو صرف علم میں نہیں) اس کے بعد مظاہر کلیہ تمیز اختیار کرتے ہیں اور ان کی استعداد معرض علم میں آتی ہے جو فعال ہیں، ظاہر ہیں اور مقدس ہیں۔ ان کو اسماء و صفات کہنا چاہیے۔

تیسری تجلی مظاہر جزئیہ سے متعلق ہے۔ علم ادراک کے اس مرحلے میں اعیان ممکنہ کلیات سے جدا ہوتے ہیں جو اپنی فطرت و مزاج کے اعتبار سے یکسر منفعل، مقہور اور کسی درجے میں وجود کی آلائشوں سے آلودہ ہوتے ہیں۔ ان معنوں میں ''حقائق ممکنہ'' کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی حیثیت ''صور معلومہ'' کی ہے جو حق کے علم و ادراک کے ساتھ وابستہ ہیں۔

(3) حقائق ممکنہ کی یہ تعبیر تھوڑی سی تمہید چاہتی ہے اور وہ یہ ہے کہ حقائق ممکنہ اور اسماء دونوں میں تمیز دوٹوک اور اس طرح کا نہیں کہ یہ دونوں دو الگ الگ اور منفصل خانوں میں انقسام پذیر ہوں بلکہ دونوں میں ایک طرح کا اشتراک ہے اور ایک دوسرے پر منطبق ہوتے ہیں یعنی جو کچھ اسماء وصفات میں مضمر ہے، وہی حقائق ممکنات میں ظاہر ہوتا ہے۔

اس صورت میں حقائق ممکنہ اور حقائق اسماء میں نسبت تضاد نہیں ہوگی بلکہ ان دونوں کے مقابلے میں جو اضداد ہوں گے ان میں تقابل پایا جائے گا اور اس نسبت سے انہیں اضداد متقابلہ کہنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جہاں تک اسماء وصفات کا تعلق ہے ان میں جو حقائق مضمر ہیں وہ تو بدرجۂ غایت قوت وفعلیت لئے ہوئے ہیں اور قوی اور صلاحیتیں جنہیں ابھی وجود کا جامہ نہیں پہنا، بوجہ عدم کے بدرجہ غایت کمزور اور ضعیف ہیں۔ گویا کچھ امور ثابتہ ہیں جن کے ڈانڈے ایک طرف تو اسماء وصفات سے ملے ہوئے ہیں اور دوسری طرف اعدام متقابلہ سے۔ اب جو لوگ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ظہور کائنات کے سلسلے میں اصل شے اسماء وصفات ہیں، وہ دو طرح سے اس مفہوم کو ادا کریں گے اور ادا و اظہار کے یہ دونوں اسلوب صحیح ہوں گے۔ یہ کہ حقائق ممکنہ اسماء وصفات ہی کا دوسرا نام ہے جو مرتبہ علم میں متمیز و واضح ہیں اور یہ کہ حقائق ممکنہ اسماء وصفات کے عکوس وظلال میں جو اعدام متقابلہ میں ارتسام پذیر ہو گئے ہیں۔

(4) تعبیر کا یہ نہج بھی قدرے تمہید کا مقتضی ہے۔ یہ واضح رہے کہ یہاں حقائق ممکنہ کا لفظ نسبتاً محدود معنوں میں استعمال ہوا ہے اور اس کا دائرہ صرف سالک کے احوال تک سمٹا ہوا ہے، پوری کائنات تک وسعت پذیر نہیں۔ صاحب ''لمعات'' اسماء وصفات کو معشوق قرار دیتے ہیں، حقائق ممکنہ کو عاشق ٹھہراتے ہیں اور اس مرتبہ علیہ کو جو ان سب میں ظاہر و باہر ہے، لفظ عشق سے موسوم کرتے ہیں۔

اب اگر صورت حالات یہ ہو کہ معشوق خود عاشق کی طرف بڑھے (یا باصطلاح صوفیا تدلی اختیار کرے) یعنی عاشق کو اپنی طرف کھینچے اور محبت وجذب سے نوازے تو سالک کو اس کیفیت کے پیش نظر ''مجذوب'' ''مراد'' اور ''محبوب'' کہا جائے گا۔ جیسے حضرت ابراہیمؑ کے قصے سے عیاں ہے کہ عنایت حق نے خود ان کی رہنمائی فرمائی اور ان کو یہ بات سمجھا دی کہ جو شے آفات وذمائم سے دوچار ہو، رب والہ نہیں ہوسکتی۔ رب والہ کے لئے ضروری ہے کہ نقص وعیب کی ان آلائشوں سے منزہ ہو۔

اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص اللہ کی طرف ریاضت ومجاہدہ اور نفس وروح کی تجرید کے ذریعہ بڑھتا ہے۔ اس صورت میں اسے مرید، محب اور سالک کہنا چاہیے۔

تیسری شکل یہ ہے کہ کچھ ذات تدلی اختیار کرتی ہے اور کچھ سالک ترقی کناں ہوتا ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں ایک نقطہ اتصال پر جمع ہو جاتے ہیں۔ ایسے خوش نصیب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سالک ہے، مجذوب اور محب ہے مگر شان محبوبی لئے ہوئے۔

اس کلام کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ شخص اکبر کے دل میں تجلی افروز ہوتا ہے۔ یہ تجلی اس شان کی ہوتی ہے کہ اس کا انشراح وانبساط حظیرۃ القدس تک کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہوتا ہے اور اسی کے عکوس وظلال ملاء اعلیٰ کے سینوں پر سایہ فگن ہوتے ہیں اور تجلی کی یہی وہ قسم ہے جس پر کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماء وصفات کا انطباق ہوتا ہے۔ تیز تجلی کے

لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے علم و ارادہ میں وقتاً فوقتاً تجدد رونما ہوتا رہتا ہے اور یہی وہ تجلی ہے جو اپنے جملہ مضمرات کے ساتھ سالک یعنی معشوق اور مطلوب ہے۔ اس لئے کہ نفوس بشریہ اسی کی طرف مقناطیس کی طرح جذب وکشش کے داعیوں کو محسوس کرتے ہیں۔ ہم اس حقیقت کا ذکر مقالے کے شروع میں کر آئے ہیں۔

یہی تجلی سیر وسلوک کی منزل ہے اور یہی اتصال کی وہ کڑی ہے جس کے حصول کے لئے صوفیاء کوشاں رہتے ہیں۔ کبھی کبھی غیب سے ایسے اسباب بھی پیدا ہو جاتے ہیں کہ حق اپنے کسی بندے کو اس وقت اپنی خوشنودیوں کے لئے چن لیتا ہے جب کہ وہ نفس کی بندگی میں مبتلا ہوتا ہے اور اسے خبر تک نہیں ہوتی۔ ایسے شخص کو اصلاح میں ''مراد'' کہا جاتا ہے۔ اکثر یہ درجہ ریاضات و مجاہدات کی سختیاں جھیلنے اور نفس و روح کی تجرید سے حاصل ہوتا ہے۔ عرفان کا یہ مقام ہر شخص کی جبلت میں پہلے سے موجود ہوتا ہے مگر اس کو پانے کی توفیق کسی کسی کو ہی میسر ہوتی ہے۔ اس شخص کو مرید کے لفظ سے پکارا جاتا ہے۔ ایک مقام ان دونوں کا جامع ہے جس میں دوطرفہ دواعی کو تحریک ہوتی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے لطف و عنایت اور اختیار و احتیار کو بس جنبش ہوتی ہے اور سعی و طالب کے تقاضے بھی بیدار ہوتے ہیں۔ چنانچہ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک شخص بیک وقت دونوں انداز کی سعادتوں سے دوچار ہے۔ سعی و طلب اور ریاضت و مجاہدہ کے انوار بھی ہیں اور غیب سے سامان لطف کی فراوانیاں بھی جو پکڑ پکڑ کر سالک کو قرب و اتصال کی سرحدوں کی طرف دھکیل رہی ہیں، ایسی صورت میں کہا جاتا ہے کہ یہ شخص معرفت کے دونوں مرتبوں کا حامل ہے اور سلوک کے دونوں مشربوں میں امامت کے درجہ پر فائز ہے۔ اس کے معاملے میں کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ اس تجلی کے بعض پہلو اس پر غلبہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اس لحاظ سے اسے مجذوب کہا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تجلی کے اس خاص پہلو نے اسے اپنی طرف جذب کر لیا ہے۔ مثلاً اسماء وصفات کے نقطہ نظر سے ہو سکتا ہے کہ کوئی ایک اسم یا صفت اس کے احوال پر چھا جائے۔ اس صورت میں اس کے جذب کو اس اسم کی طرف منسوب کیا جائے گا۔ غرض یہ ہے کہ ایک عارف خوب جانتا ہے کہ ''اعیان ثابتہ'' میں سے اس کی استعداد کس تعین کے لئے زیادہ موزوں ہے اور پھر وہ اسی اسم کی پیروی اور نہج پر زندگی کی بازی لگا دیتا ہے، مثلاً اگر اس پر صفت رحمان کا غلبہ ہے تو اصطلاح میں کہا جائے گا کہ اس نے اسم رحمان کی حقیقت کو اپنا لیا ہے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ یہ کہنا کہ حقائق ممکنات دراصل عکوس وظلال ہیں، جو اعدام متقابلہ میں ارتسام پذیر ہوتے ہیں، کسی طرح بھی شیخ ابن العربی کی تصریحات کے خلاف نہیں۔ ہم مسئلے کے اس پہلو کی طرف پہلے اشارہ کر آئے ہیں اس لئے دوبارہ انہیں نقل کر کے تکرار کے مرتکب نہیں ہونا چاہتے۔

نیز حقائق ممکنات کو ان معنوں میں اسماء صفات کے عین مترادف قرار دینا کہ وجود خارجی میں بہرحال ان کے عکوس وظلال پائے جاتے ہیں جنہیں اعیان ممکنات کہا جاتا ہے، کسی انداز سے بھی شیخ مجدد کی تصریحات کے منافی نہیں۔ اسی طرح اگر شیخ کے قول کو ہم یہ معنی پہنائیں کہ ہر ہر صفت و اسم سالک کے لئے بمنزلہ رب اور مقصود و منزل کے ہے کہ جس کی طرف اس کے سعی و طلب کے قدم بڑھنا چاہیں، تو اس صورت میں بھی منافات و تعارض کا کوئی اندیشہ پایا نہیں جاتا۔ ہم اگر چاہیں تو دونوں بزرگوں کے اقوال کو بکثرت اس سلسلے میں پیش کر سکتے ہیں۔

باقی رہی یہ بات کہ حضرت مجدد نے شیخ العربی اور اس کے بعض اتباع کے اقوال کو اپنے وجدان کے خلاف

محسوس کیا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ ایک ایسی لغزش ہے جس کا کشف کی لغزش سے کوئی تعلق نہیں اور پھر جہاں تک اس طرح کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں کا تعلق ہے ان سے محفوظ بھی کون رہ سکتا ہے۔ اس لئے ان لوگوں کے مقام بلند میں ہرگز کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ابن العربی کے اس قول میں بھی یہاں کوئی اعتراض کا پہلو نظر نہیں آتا کہ صوفیاء صفات ثمانیہ میں تمیز و اختلاف کے قائل نہیں بلکہ ان کے نزدیک صفات عین واجب الوجود ہیں کیونکہ ہمیں اس کے خلاف متکلمین کی عقلی و نقلی کوئی دلیل نہیں ملی۔ ہم اس قول کو دو وجہ سے حق بجانب ٹھہراتے ہیں۔

(1) صفات کے باب میں زیادہ سے زیادہ جو بات صحت و استواری لئے ہوئے ہے وہ یہ ہے کہ ایک ایسی حقیقت ضرور پائی جاتی ہے۔ عرفاً اور لغتاً جس کو سمیع و بصیر وغیرہ کہا جا سکتا ہے لیکن یہ کہ یہاں صفات متمائزہ کا بھی وجود ہے اور یہ صفات ذات سے علیحدہ ایک مستقل حیثیت کی حامل ہیں، اس کی طرف قلب و ذہن ملتفت نہیں ہو پاتا۔ قلب و ذہن صرف آثار و نتائج کو دیکھتا ہے، فلسفیانہ تدقیقات کو نہیں۔

چنانچہ ہم جب کسی شے کو دیکھتے ہیں کہ متحرک ہے، چل رہی ہے اور اپنے اعمال و افعال کو حسن و جمال کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کر رہی ہے تو ہم بغیر ذات و صفات کے چکر میں پڑے کہہ دیتے ہیں کہ یہ زندہ ہے اور حیات و شعور سے بہرہ مند ہے اور قطعی یہ نہیں سوچتے کہ یہ صفات ذات سے زائد اور علیحدہ ہیں یا عین ذات ہیں۔

(2) جہاں تک عقل و شعور کا تعلق ہے اس کا فتویٰ یہی ہے کہ اس کی ذات گرامی سے آثار و نتائج کا برابر صدور ہوتا رہتا ہے۔ رہی یہ بات کہ یہ صفات ذات سے الگ وجود رکھتی ہیں تو اس کا کوئی تعلق عقل و خرد کے تقاضوں سے نہیں بلکہ اگر انصاف سے کام لیا جائے تو کہا جائے گا کہ صفات کو بمنزلہ اعراض کے قرار دینا اور یہ کہنا کہ یہ انہی کی طرح اپنے محل و موصوف کے ساتھ وابستہ ہیں، اچھی خاصی تشبیہ کا مرتکب ہونا ہے۔

ممکن ہے کچھ لوگ اسے اہل سنت کا مذہب قرار دیں مگر ہمارا جواب یہی ہوگا کہ یہ صحیح نہیں کیونکہ اہل سنت کا اطلاق معنی کے اعتبار سے نسبتاً محدود ہے۔ اس سے مراد صرف وہ قرون ہیں جن کے خیر ہونے کی گواہی خود آنحضرت نے دی ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ ان میں کوئی شخص ایسا نہیں جس نے کہ صفات کو بحث و فکر کا موضوع ٹھہرایا ہو اور یہ کہا ہو کہ یہ ذات خداوندی سے الگ وجود رکھتی ہیں یا عین ذات ہیں اور پھر اگر بر سبیل تاویل کسی نے ان کو غیر ذات سمجھا ہے تو اس پر مطلق بحث نہیں کی۔ یہ زیادت امور انتزاعی سے تعلق رکھتی ہے یا امور خارجی سے۔ ہاں متاخرین کے ایک گروہ نے جو اہل سنت ہونے کا مدعی ہے البتہ صفات پر بحث کی ہے۔ ان لوگوں کے اس فعل کو ہم بدعت نہ سمجھیں اور یہ نہ کہیں کہ یہ سلف کے بعد کی اختراع ہے، جب بھی یہ ضرور کہیں گے کہ ہم ان سے اس باب میں اتفاق رائے نہیں رکھتے۔ ہم رجال ونحن رجال (وہ بھی انسان تھے اور ہم بھی انسان ہیں)

اسی طرح شیخ کے اقوال میں جو اس نوعیت کا اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہ عالم موجود خارجی ہے جو ظلیت و انعکاس لئے ہوئے ہے یا اس کی حیثیت اس موہوم کی ہے جس کو استواری و استحکام سے نوازا گیا ہے، زیادہ اہمیت کا حامل نہیں کیونکہ ان کی تہ میں یہ عقیدہ مضمر ہے کہ وجودات خاصہ تحقیق پذیر ہیں جن سے کہ آثار و نتائج کا صدور ہوتا ہے۔

اور اگر تم مجھ سے صحیح صحیح بات دریافت کرو تو میں کہوں گا کہ جہاں تک ذات الٰہی کا تعلق ہے وہ اس سے بالا و منزہ ہے کہ خارج یا اعیان میں پائی جائے، اس لئے کہ خارج تو خود نفس رحمان سے تعبیر ہے اور ''اعیان'' اس کی ذات پر دلالت کناں ہیں۔ ہاں یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم تجلی ہے جس کا تعلق خارج سے ہے اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں جب کہا جاتا ہے کہ وہ خارج میں یا عماء (اس حدیث کے اشارہ سے جو آغاز مضمون میں گزر چکی ہے) میں موجود ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے ایسی تجلی عظیم کے تحقق کے بعد، خارج یا اعیان کو اپنے وجود سے نوازا ہے۔

اس باب میں جو اقوال مختلفہ ہیں، اگر تم مجھ سے ان کی اسنادیں دریافت کرو تو میں کہوں گا کہ ان میں کوئی بات میرے دل میں کھٹک پیدا کرنے والی نہیں۔ میرے نزدیک یہ اختلافات یا انداز و تعبیر سے متعلق ہے اور یا پھر ان کی حیثیت یہ ہے کہ کچھ چیزیں برمحل یا اپنے مقام و سیاق میں بیان نہیں ہوئی ہیں ورنہ یہ ناممکن ہے کہ کوئی صاحب کشف بالکل ہی بے حقیقت بات کہہ دے۔ صفات ثمانیہ کی معنوی توجیہ میرے نزدیک یہ ہے کہ نفس رحمانی کے ان اوائل کو جن میں ذکر اور تجلی اعظم تمثل پذیر ہوئی ہے، اشاعرہ صفات کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیاء ان کو بالا یجاب صادر اور زماناً قدیم مانتے ہیں۔ اصل میں یہ ایک ہی حقیقت ہے کہ جس نے جہات و اعتبارات کے اختلاف و بوقلمونی سے کثرت و تعدد کی صورت اختیار کر لی ہے اور جہت و اعتبار کے کتنے ہی اختلافات ایسے ہیں کہ جن کو لوگوں نے حقائق کا اختلاف قرار دے دیا ہے۔ جیسے کہ بیاض اور ابیض ایک ہی حقیقت کے دو معنی ہیں۔ یعنی بیاض، ابیض میں بشرط لا (یعنی بغیر اس شرط کے کہ بیاض کا کوئی ہدف و موصوف ہو) ماخوذ ہے اور ابیض اسی حقیقت پر بشرط شے دلالت کناں ہے یعنی جہاں لفظ بیاض مطلقاً ایک خاص رنگ پر دلالت کرتا ہے وہاں لفظ ابیض بھی اسی رنگ پر صفت کی شکل میں دلالت کرتا ہے۔

بالکل اسی نہج و انداز سے جب ہم اس کی ذات کو حیات سے تعبیر کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اس کے علم کا منطقی نتیجہ ہے۔ جب حقائق ممکنات اور علم کی صفات سے متصف گردانتے ہیں تو مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کی ذات حقائق اشیاء میں تکوین سے قبل تمثل پذیر ہوتی ہے۔ ''قدرت'' لفظ بولتے ہیں تو یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس کی ذات سے تخلیق کائنات کا فعل صادر ہوا ہے۔ جب اس کے لئے ارادہ کو ثابت کرتے ہیں تو اس سے غرض یہ ہوتی ہے کہ اس کی ذات نے دو متساوی الامکان چیزوں میں سے ایک کو ترجیح دی ہے۔ کلام کا اس کی طرف انتساب کرتے ہیں تو اس حیثیت سے کہ انبیاء و ملائکہ کے قلب پر اس کی طرف سے وحی نازل ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جب ہم اس کو سمیع و بصیر کہتے ہیں اور سمع و بصر سے متصف قرار دیتے ہیں تو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ تمام مبصرات و مسموعات کا مبداء انکشاف ہے۔ اسی طرح مولانا جامی کا قول بھی ہمارے نزدیک مان لینے کے لائق ہے (یہ قول بحث کے آغاز میں گزر چکا ہے) اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کے سوا تمام حقائق کی اصالت کا انکار کیا جائے اور ان سب کو اعتبارات و اضافات کے حکم میں رکھا جائے۔ یہ مطلب نہیں کہ وجود حق یا اس کی جلوہ فرمائیوں کا انکار کیا جائے۔ وہ یہ مانتے ہیں کہ حق نے ان میں ظہور فرمایا ہے۔ اسی طرح وہ فرق اعتباری کی بھی نفی نہیں کرنا چاہتے۔ جب ہم سوال کا مکمل و شافی جواب دے چکے تو اس مکتوب کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ **والحمد لله اولاً و آخراً و باطناً و صلى الله تعالىٰ على خير خلقه محمد و آله واصحابه اجمعين.**

✦ ..... ✦ ..... ✦

مترجم: ڈاکٹر پیر محمد حسن

لمحات

(شاہ ولی اللہ کی عربی کتاب کا اردو ترجمہ)

الحمد للہ رب العالمین و الصلوۃ و السلام علی سید المرسلین و آلہ و اصحابہ اجمین

لمحہ 1۔ ہر معلول حادث ہے کیونکہ اس کی علت اس سے پہلے موجود ہوتی ہے اور ہر حادث تغیر پذیر ہے کیونکہ اس سے پہلے اس کا پیدا کرنے والا اور متغیر کرنے والا موجود ہوتا ہے۔ نیز ہر وہ چیز جو دو چیزوں سے مرکب ہو اس سے پہلے اس کے اجزاء موجود ہوتے ہیں اور ہر وہ چیز جس کی حقیقت اور شخصیت محقق ہو اس سے پہلے اس حقیقت کا ہونا ضروری ہے جس سے یہ نوع معرض وجود میں آئی۔

لہٰذا اول الانبیاء اور مبدء کل کے لئے یہ ضروری ہو گیا کہ وہ نہ معلول نہ حادث، نہ مرکب ہو اور نہ کسی ماہیت اور وجود سے محقق ہوا ہو۔

لمحہ 2۔ یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ اول الاوائل موجودات کا ایک فرد ہے اور نہ یہ کہ موجودات اسے اسی طرح اپنے اندر لئے ہوئے ہے جس طرح ایک کل اپنی جزئی کے افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ بات اس طرح نہیں ہے بلکہ اول الاوائل اس بہت ہی عام مفہوم کا تمام جہات سے احاطہ کیے ہوئے ہے اور ہر جہت سے اسے اپنے اندر شامل کئے ہوئے ہے کیونکہ وجود سے یہ مفہوم اس کے مقابلہ میں اس وقت لیا ہوگا جب ان حقائق کی طرف سرسری نگاہ پڑی جن سے بہت سے متباین آثار کا ظہور ہوتا ہے اور اس طرح عدم اور وجود میں امتیاز پیدا ہو جاتا ہے مگر اول الاوائل کی حقیقت کا امتیاز کسی اور حقیقت سے نہیں کیا گیا' لہٰذا اس لحاظ نے ذہنوں میں ایک صورت پیدا کر دی جس کا نام وجود رکھا گیا۔ تمام حقائق کا مرجع اول الاوائل ہے اور اسی میں آ کر وہ ختم ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا جو وجود اس اعتبار سے پیدا ہوا ہو اس کا کیا حال ہوگا؟

لمحہ 3۔ یوں خیال نہ کرنا چاہئے کہ اول الاوائل کی ضرورت صرف سلسلہ امکانیہ کے منقطع ہونے پر پڑتی ہے' اگرچہ جب ہر طبیعت امکانیہ والے کی طبیعت کا تحقق اول کے ہاں ہوتا ہے تو اسے اول کی ضرورت پڑتی ہے' یہاں تک کہ اگر اول سے کوئی چیز صادر ہو اور پھر اس صادر سے کوئی اور صادر وجود میں آیا ہو تو دوسرے صادر کا احتیاج صرف پہلے صادر کی طرف ہوگا' اگرچہ یہ صادر خود اول الاوائل کا محتاج ہے۔ یہ بات بھی اس طرح نہیں ہے بلکہ طبیعت جب در حقیقت وجود یا ماہیت میں آ جائے (تو اسے اول الاوائل کی ضرورت رہتی ہے) اور ہر چیز جسے تو "واحد" کی طرف نسبت دے تو یہ نسبت

اسی طرح ہوگی جس طرح ''واحد'' کی دیگر مراتب اعداد کے ساتھ ہوتی ہے یعنی ''واحد'' دو سے پہلے ہوگا۔ یہی حال ہر عدد کا ہے یہاں تک کہ دونوں ایک ہو جائیں اور اللہ کی مثال تو اس طرح بھی اعلیٰ وارفع ہے۔

لمحہ 4۔ ہر چیز جو اس چیز سے متغایر ہو جو اس سے جدا کی گئی ہے تو اس میں دو باتیں پائی جائیں گی۔ یا تو یوں کہیں گے کہ وہ وہی ہے یا کہیں گے کہ وہ وہی نہیں ہے' لہٰذا اس صورت میں یہ مرکب ہے اور اپنے اندر کثرت کو لئے ہوئے ہے اور اس سے پہلے اور چیزیں موجود ہیں۔ لہٰذا ضروری ہو گیا ہے کہ اول ایک ایسی چیز ہو جو دیگر اشیاء کے مزاحم نہ ہو۔ اب ہم مادہ اور صورت وغیرہ کی مثالیں دے کر بیان کرتے ہیں۔ اگرچہ اول الاوائل کا معاملہ ایسا ہے کہ اس کی مثال نہیں دی جاسکتی۔

موم کا وجود ان مورتیوں کے وجود سے نہیں ٹکراتا جو موم سے بنائی گئی ہوں (اسی طرح) وجود انسانی افراد انسانی کے وجود سے نہیں ٹکراتا اور ''ملکہ'' کا وجود ان افعال کے وجود سے نہیں ٹکراتا بلکہ وہ وہی چیز بھی ہے اور اس کے ساتھ بھی اسی طرح ہے جس طرح اوروں کے اندر اور اوروں کے ساتھ۔ نہ تو اسے فی نفسہٖ متعین کیا جاسکتا ہے اور نہ اس پر خصوصیت کے ساتھ کوئی حکم لگایا جاسکتا ہے۔ لہٰذا اس کے ساتھ علم کا تعلق نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ علم ہو جانے سے اس کی تعین ہو جاتی حالانکہ نہ زمان ومکان اس کا احاطہ کر سکتے ہیں اور نہ حس یا وہم اس کا ادراک کر سکتے ہیں۔

لمحہ 5۔ اول کی صفات ایسی ہیں جو فی نفسہٖ اس کی کبریائی کی تفسیر ہیں' مثلاً وجود' تعین' حیات اور علم۔ ان صفات کا قانون کلی یہ ہے کہ جب تو کسی پاس والی چیز کو دیکھے اور وہ تجھے پسند آجائے اور پھر تو اسے ''اول'' میں تلاش کرے تو دیکھے گا کہ اول بدون اس کے کہ وہ کوئی زائد صفت حاصل کرے بذاتہٖ اس سے مستغنی ہے۔

اس کے افعال محکم اور اس کے اضافات مضبوط ہیں۔ اس کا ضابطہ یہ ہے کہ اگر یہ افعال ابداع کی طرف راجع ہوں تو صادر اول سب کا قائم مقام ہو جائے جائے گا۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ یہ اول سے متصل ہے صادر اول کا صادر ہونا بعینہٖ تمام عالم کا صادر ہونا سمجھا جائے گا۔

یا ان افعال کا مرجع خلق کی طرف ہوگا تو اس صورت میں شخص اکبر کے فیضان میں تمام اشخاص آجائیں گے'' کیونکہ:

ہاتھی[1] کے پاؤں میں سب کا پاؤں

یا ان کا مرجع تدابیر اور تدلی کی طرف ہوگا جس میں یا تو یہ شرط پائی جائے گی کہ اللہ نے انہیں پیدا کیا یا ان پر تجلی ڈالی ہے جس طرح کشتی سوار جو کشتی کی حرکت سے متحرک ہوتے ہیں یا جس طرح لکھنے والا کہ اس حالت میں انگلیوں کا حرکت میں آنا ضروری ہو جاتا ہے۔

اس کا ایک خاص اسلوب ہے جس کی ہر ہیئت اور نسبت حفاظت کرتی ہے اس کا ضابطہ یہ ہے کہ یہ ایسے امور ہوتے ہیں جو ادراک کرنے والے کے ذہن میں اس وقت پیدا ہوتے ہیں جبکہ اس کی توجہ خواہ اجمالی طور پر ہی کیوں نہ ہو ایک طرف تو اول الاوائل کی کبریائی کی طرف ہوتی ہے اور دوسری طرف متمسکہ ہیئتوں میں سے کسی ایک ہیئت کی طرف ہوتی ہے۔

لمحہ 6۔ واحد کا لفظ کئی معنوں میں مستعمل ہے۔ چنانچہ زید کو شخص کے اعتبار سے واحد کہیں گے، اگرچہ اس کے اجزاء

بہت ہیں اور انسان اپنی نوع کے اعتبار سے واحد ہے حالانکہ اس کے افراد کثیر التعداد ہیں۔ حیوان جنس کے اعتبار سے واحد ہے اگرچہ اس کی انواع بہت ہیں۔ واحد کہلانے کا سب سے زیادہ حقدار وہ مفہوم ہے بالخصوص مبداء کے اعتبار سے جو لفظ کن کے کہنے سے بیک بار موجود ہو گیا ہو یا ایک ہی اقتضاء اور ایک ہی قوت سے پیدا ہوا ہو یا ایک ہی جسم کا سایہ ہو۔ ان میں سے جو تمہارا جی چاہے کہہ لو۔

لمحہ 7۔ حق بات یہ ہے کہ اول سے ایک ہی چیز صادر ہوتی ہے' وگرنہ تمہارا یہ کہنا کہ ''یہ دو چیزیں ہیں'' بمقابلہ یہ کہنے کے کہ ''وہ دونوں ایک ہی ہیں'' کیسے بہتر ہوا؟ لہٰذا ضروری ہو گیا کہ ان کے صادر ہونے کا دارومدار دو قوتوں' فاعل اور قابل پر ہو جن کی روشنی فاعل پر پڑتی ہے اور اس طرح کل میں کثرت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس صادر کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ بعض متقابل چیزوں کو چھوڑ کر دوسری چیزوں کے ساتھ مخصوص ہو جائے' بلکہ اس کی حقیقت کے لئے ضروری ہے کہ وہ دوسرے حقائق سے مزاحم نہ ہو۔ اس کی نسبت اشیاء کی طرف وہی ہوتی ہے جو سیاہ خط کی نسبت کتابت کے نقوش کے ساتھ ہوتی ہے۔ ہم اس کی مثالیں پہلے دے چکے ہیں۔ لہٰذا منبسط وجود کے سوا کوئی اور وجود اس قسم کا نہیں ہو سکتا اور منبسط وجود وہی ہے جس کی طرف ''زید فی الخارج'' (زید خارج میں ہے) کہنے سے خارج میں اشارہ کیا جاتا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں ''زید فی اعیان'' تو لفظ اعیان کے ساتھ اشارہ کیا جاتا ہے اور جب ہم کہتے ہیں ''زید متحقق ہے'' حالانکہ پہلے ایسا نہ تھا تو تحقق کے لفظ کے ساتھ اشارہ کیا جاتا ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو جبکہ ہر وہ چیز جو خارج اور اعیان میں موجود ہو خارج اور اعیان میں اس سے پہلے کوئی اور چیز موجود ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر متحقق سے پہلے کوئی متحقق چیز موجود ہوتی ہے۔

لمحہ 8۔ پہلی چیز جو تمہارے فکر میں آتی ہے یہ ہے کہ یہاں ایک ایسی چیز ہے جسے ہم وجود فی الاعیان یا وجود فی الخارج کا نام دیتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں ایک اور چیز ہے جسے ہم عدم کہتے ہیں۔

ہم بعض اوقات وجود کی ماہیت کا تصور کرتے ہیں اور اس کے وجود میں شک بھی گزرتا ہے یا ہم اس کے معدوم ہونے کا قطعی فیصلہ دے دیتے ہیں مگر اس کے باوجود سچے احکام اس پر لگائے جاتے ہیں۔

اور کبھی وجود کا تصور کرتے ہیں مگر ہم کسی قسم کی ماہیت کا تصور نہیں کرتے چنانچہ جب تو یہ کہے ''السواد موجود'' تو اس سے وہ مفہوم ادا ہوتا ہے جو ''السواد سواد'' کہنے سے ادا نہیں ہوتا۔ برعکس اس کے تو ماہیت کی صفت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ موجود ہے' اس کے بعد دوسری اور ان دونوں حالتوں میں ایک ہی مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔ یہاں سے ثابت ہو گیا کہ (وجود اور ماہیت) دو الگ چیزیں ہیں اور وجود کا مفہوم ایک ہے جو ماہیات کے اندر ثابت ہے لیکن اس مسئلہ کی تشریح کا حق اسی وقت ادا ہوگا جب تو ان کا کلی طور پر احاطہ کرے اور یہ جان لے کہ یہ دونوں اپنی ذات میں کیا ہیں۔

جو ہم کہہ رہے ہیں اسے غور سے سن لو اور تفصیل کو چھوڑ کر اجمال پر اکتفا کرو۔

لمحہ 9۔ وجود فی الخارج یا وجود فی الاعیان جیسا کہ ان دونوں عبارتوں سے سمجھ میں آتا ہے، ایک امر انتزاعی ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ سوائے اس کے کہ تمہارے ذہن میں اس کی مثالی صورت ہوتی ہے لیکن اس کا انتزاع ایسا نہیں کہ وہم حقیقت نفس الامری پر اعتماد کیے بغیر خود ہی اسے اختراع کرے بلکہ نفس الامر میں اس کی حقیقت موجود ہوتی ہے۔

اگر ہوگی تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ ''موجود'' ہے اور ''لیس بموجود'' کہنا غلط ہوگا۔ اگر نفس الامر میں اس کی حقیقت موجود نہ ہوگی تو معاملہ برعکس ہوگا۔ زیادہ حق اسی حقیقت کا ہے کہ اس کا اعتبار کیا جائے۔ یہ کہنا بھی کوئی صحیح نہیں کہ اس کا حال ان اعراض کا سا ہے جو جواہر پر طاری ہوتے ہیں۔ ایسا کیوں نہ ہو جبکہ اعراض اس وقت تک طاری نہیں ہوتے جب تک کہ جواہر جن پر وہ طاری ہوئے ہیں، ثابت نہ ہو جائیں اور نہ اس کا معاملہ کسی شے کے عنصر' طینت اور شمع کا سا ہے جہاں قابل اور مقبول الگ الگ ہوتے ہیں۔ اس لئے ان دونوں کے درمیان صرف عقل ہی امتیاز کرسکتی ہے بلکہ حق بات تو یہ ہے کہ جس طرح کہ تو زید اور عمرو کو دیکھ کر ان سے انسان کا انتزاع کرتا ہے اور انتزاع کا سبب ان دونوں میں موجود اور ثابت ہوتا ہے یا جس طرح کہ تو انسان اور گھوڑے کو دیکھتا ہے اور ان دونوں سے ''حیوان'' کا انتزاع کرتا ہے اور یہاں بھی اس انتزاع کا سبب دونوں میں ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح تو تمام ماہیات کی طرف اجمالی نظر دوڑاتا ہے اور ان سے ''وجود'' کا انتزاع کرتا ہے اور اس التفات کا سبب بھی ان میں ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ ان انتزاع کا منشا ذات شے ہے ''من حیث ہو فی الخارج'' یا ''من حیث ہو فی الاعیان'' بعینہ اسی طرح جس طرح ہم کہتے ہیں کہ ''زید انسان ہے'' اس لئے انسانیت عمرو، بکر اور دیگر بنی نوع انسان میں مشترک ہے۔

وجود درحقیقت جنس الاجناس اور ذات الذاتیات ہے مگر چونکہ اشیاء کی پہچان ضد سے ہوتی ہے اور طبیعت الوجود کی کوئی ضد نہیں اس لئے انسان اسی وقت ان سے آگاہ ہوتا ہے جب احکام میں مخالفت پائی جائے' چنانچہ کبھی یہ احکام نہیں پائے جاتے اور کبھی پائے جاتے ہیں۔ وجود میں من حیث الوجود کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا اور نہ یہ کسی اعتبار سے معدوم ہوتا ہے لہٰذا یہی قرار پایا کہ اسے نہ ذات نہ جنس اور نہ کوئی اور چیز شمار کیا جائے۔

لمحہ 10۔ ہر جنس اور اس کی انواع میں اصلی امتیاز پایا جاتا ہے اور ہر ذات اور اس کی ''ذاتی'' کے متعلق بھی امتیاز حاصل ہے اور اگر تو اچھی طرح سے دیکھے تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ تمہارے ادراک میں اس چیز کے تحلیل کرنے کا مادہ پایا جاتا ہے چنانچہ بعض اوقات تو اجمالی طور پر بعض ماہیات کو دیکھتا ہے اور ان سے اجمالی وجود کا انتزاع کرتا ہے اور کبھی تو کسی خاص ماہیت کا ملاحظہ کرتا ہے اور اس سے وجود کے اس حصہ کا انتزاع کرتا ہے جو اس ماہیت کے ساتھ خاص ہے اور اجمالی کچھ اور ہے اور خاص کچھ اور۔ چنانچہ جب ''السواد موجود'' کہا جاتا ہے تو اس سے وہ مفہوم ادا ہوتا ہے جو ''السواد لون'' سے ادا نہیں ہوتا۔ بعض اوقات کسی ماہیت کے لئے فی نفسہا یا اس کے لوازم یا فاعل یا قابل میں تقرر و تعین پایا جاتا ہے مثلاً یہ شخص زید ہے اور وہ ابن عمرو ہے۔ زنگی ہے، عالم ہے، کاتب ہے اور پھر ضاحک (ہنسنے والا) ہے۔ مدارک عالیہ میں اس کے عنصری ظہور سے پہلے ہی اس کے وجود کا تحقق ہو چکا ہے اور اس کا وجود اپنے عنصر قابل میں فیضان سے پہلے ''امکان'' کے درجہ میں ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ہر تقرر کے اعتبار سے کسی مفہوم کا انتزاع درست ہوتا ہے جسے تم وجود نام کا دیتے ہو۔ لہٰذا تم ایک اعتبار سے ماہیت کو موجود پاتے ہو اور تم وجود کے اعتبار سے بالکل بے پرواہ ہو جاتے ہو اور یوں کہتے ہیں:

یہ چیز پہلے موجود نہ تھی پھر موجود ہوئی۔ حق بات یہ ہے کہ تمہارے نزدیک اس کے وجود کے ساتھ اس کی مثال تو صحیح طور پر ظاہر ہو گئی لیکن تو نے بھول جانے کا بہانہ بنا لیا۔ اسی طرح کبھی تم مجہول مطلق اور معدوم مطلق پر صحیح احکام لگاتے ہو جس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ تو اپنے ذہن میں ان پر وجود کا لباس پہنا دیتا ہے اگر تو چاہے تو معدوم مطلق کی بجائے موجود کہہ

دے اور مجہول کی بجائے معلوم، جس سے یہ سچے علوم کے لئے انکشاف کا کام دیں مگر اس کے بعد پھر تو انہیں بھلا دے۔

لمحہ 11۔ اس جہاں میں صور ہیں اور اعراض ہیں جنہوں نے ان صور کے گرد جال سا بنا رکھا ہے اور ہیولیٰ ہیں جو ان صور کے بالذات محل ہیں مگر ان اعراض کے بالتبع محل ہیں۔ صورۃ چڑھتی چڑھتی صورۃ عالیہ تک جا پہنچتی ہے اور تمام صورتیں ان کی شرح و تفصیل ہیں۔ اعراض کا ارتقاء اجمالی حکم تک ہوتا ہے۔ ہر حکم کی وسعت دائرہ کی ہوتی ہے اور ہیولوں کا ارتقا ہیولیٰ مطلقہ کی طرف ہوتا ہے اور ہر ہیولیٰ ہیولیٰ مطلقہ کا تعین کرتا ہے اور صورۃ عامہ ہیولیٰ مطلقہ کے اندر حلول کی ہوئی ہوتی ہے جو اجمالی حکم کو برقرار رکھے ہوئے ہوتی ہے، شخص واحد ہوتی ہے اور ایک وجہ سے ظل ہوتی ہے لہٰذا کسی اعتبار بھی جو چیز اس شخص میں پائی جائے گی اس کا وہی حکم ہوگا جو وجود فی الاعیان یا للاعیان کا اور ہر وہ چیز جو اس سے اوپر ہوگی تو اسے وجود فی الاعیان یا للاعیان کہنا مناسب نہیں۔ البتہ تسامح سے ایسا کہہ سکتے ہیں۔ لہٰذا جو شخص یہ چاہے کہ ''متعالی'' اور سافلات کے درمیان ایک جامع امر رکھ دے جس کا نام وجود یا سمع یا بصر یا قدرت وغیرہ ہو تو اس نے حد سے تجاوز کیا۔

ہاں جب کوئی اور راہ نہ ملے تو عقل بھی آرام (استرواح) ڈھونڈتی ہے۔ جس طرح کہ شریعت میں ''رخصتیں'' ہوتی ہیں جن کی بناء مکانوں کی کمزوری پر ہوتی ہے اسی طرح عقلی استرواح یہ ہے کہ (اول الاوائل) کو وجود سے موصوف کیا جائے۔ شرعی رخصتوں میں سے یہ قول ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش کے اوپر ہے، اس کے کان ہیں، بصر ہے، ہاتھ ہے، چہرہ ہے، غضب ہے، رحمت ہے، حالانکہ اس ذات برتر جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ سمیع و بصیر ہے۔

لمحہ 12۔ کسی شئے کا تقرر ''بذاتہٖ'' ہوتا ہے یا ''من ذاتہٖ'' اور یہ کسی اور کی محتاج نہیں ہوتی۔ یا اس کا تقرر ''لغیرہٖ'' ہوتا اور یہ اس غیر کی محتاج ہوتی ہے۔ پہلے کو واجب اور دوسرے کو ممکن کہتے ہیں۔ ہر وہ چیز جس کا وجود اور تحقق واجب کے ایجاد کرنے اور تحقیق کرنے ہو تو اس چیز کے بالمقابل ایک کمال اور اقتضاء ہوگا۔ یہ کمالات اور اقتضاءات جیسا چاہو کہ لو، ان اشیاء کے صادر ہونے کے مبداء ہیں۔ لہٰذا ہر کمال ایک خاص چیز کا مقتضی ہے اور ہر چیز کا سہارا ایک خاص کمال پر ہے جیسے کہ یہ کمالات اور یہ اشیاء ایک ہی چیز ہیں۔ صرف فرق اتنا ہے کہ کمالات واجب کے لوازم اور اعتبارات ہیں اور اشیاء معلومات ہیں جو اس سے صادر ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ جہاں تمام کا تمام کمالات میں لپٹا ہوا ہے اور کمالات کا انکشاف عالم (جہاں) سے ہوتا ہے اور اول الاوائل ہر چھوٹی بڑی چیز کو اپنی ذات کے تصرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ یہی حال شخص اکبر کا ہے باعتبار ان اشیاء کے جو ان کے اندر ہیں۔ اب ہم اسی طی و نشر کی مثال بیان کرتے ہیں۔

لمحہ 13۔ کیا حساب دان اپنے تصور میں عدد کے مراتب کو موجود نہیں کر لیتا؟ لہٰذا وہ ایک سے ایک اور نکال لیتا ہے اس طرح کہ وہ نظر کو دوبار اس طرف کر لیتا ہے جس سے دو بن جاتے ہیں۔ پھر تین بار نظر کرنے سے وہ اس میں سے ایک اور ایک اور نکالتا ہے جس سے تین بن جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس طرح ایک ایک کر کے نکالتا جاتا ہے جس سے اکائیوں، دہائیوں، سینکڑوں اور ہزاروں کے مراتب بن جاتے ہیں۔ اس بعد وہ ان ہندسوں کو جس قدر کہ اس کی عقل میں سما سکیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ ملاتا ہے جس سے غیر متناہی امور بن جاتے ہیں مگر نہ تو وہ جفت کو طاق اور نہ طاق کو جفت بناتا اور نہ ان میں تقدیم و تاخیر کرتا ہے۔ برعکس اس کے جس طرح طبیعت عدد یہ کا تقاضا ہے اس طرح ان کو رکھتا ہے۔ ان سے سر مو انحراف نہیں کرتا اور وہ کر بھی کیسے سکتا ہے؟

یہ سلسلہ جو ہم نے ایجاد کیا ہے اسے ہم اعداد کی طبیعت کو جاننے کے لئے آئینہ بنا لیتے ہیں اور یہ تمام سلسلہ ''واحد'' کے اندر ہے۔ یہیں سے معلوم ہو جانا چاہئے کہ اس عدد سلسلہ کا مخفی راز واحد کے اندر پایا جاتا ہے تا کہ یہ تمام اجزاء میں ان سے مطابقت کرے اور یہ پوشیدہ سلسلہ عالم فرض وتقدیر میں مرتبہ بہ مرتبہ لانہایت تک پھیلتا رہتا ہے۔ اس طرح کہ ہر مرتبہ اپنے خوص کے ساتھ متعین اور ماہیت اور احکام کے لحاظ سے متمیز ہوتا ہے۔ یہ پھیلاؤ مناسب اور حصر کرنے والا ہوتا ہے جو حساب دان کے احاطہ کو مدنظر رکھتے ہوئے غیر متناہی ہوتا ہے مگر واحد کے اعتبار سے متناہی ہوتا ہے اس لئے کہ عدد اسی واحد سے بنا ہوتا ہے کسی اور سے نہیں۔ ہر مرتبہ خاص قسم کے اشتقاق سے نکلتا ہے۔

ہر وہ عدد جس کا صادر ہونا ''واحد'' سے ممکن ہو وہ ہر لحاظ سے صادر ہوتا ہے اور جو صادر نہ ہو وہ ممتنع الصدور (غیر ممکن الصدور) ہوتا ہے۔ جس جہت سے بھی اشتقاق واقع ہو اس میں سے جو بھی مشتق عدد نکلے گا وہ لازمی طور پر اس کی پیروی کرے گا۔ یہ سب کے سب حصر وانتہا کے طریقے ہیں خواہ کسی نوع میں ہوں۔ لہٰذا اب عدد کے دو کمال ہوئے' ایک کمال ظاہر جو عقلی تحقق اور نفس محاسب کی قیومیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہوتا ہے اور دوسرا کمال باطن جو امکان وتقدیر اور واحد کی قومیت کو خیال رکھتے ہوئے ہوتا ہے۔

لمحہ 14۔ وہ امور جو تمہارے سامنے اور تمہارے دیکھنے اور سننے میں آتے ہیں بذات خود وجود رکھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ تو ایسے ''اشخاص'' کا ملاحظہ کرے جو تمام حقیقت میں ایک دوسرے سے متفق ہیں اور ان کا اختلاف صرف شخصیت اور اس کے تابع امور میں ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تو ایسے وجودوں کا ملاحظہ کرے جو تمام حقیقت میں تو مختلف ہوتے ہیں مگر حقیقت کے ایک جزو میں ان کا پورا اتفاق ہوتا ہے۔ مزید برآں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تو ذہن میں صورت انسانی کو حاضر کرے اور اس کے اور ان کے اشخاص کے حال پر غور کرے جو اس سے متحد اور اس سے پہلے اس صورت میں ہو چکے ہیں۔ تو یہ پائے گا کہ ان سب اشخاص میں صورت انسانیہ کے وجود کا احتمال ہے اور صورت انسانیہ اپنی ذات کے حدود کے اندر رہ کر اپنی ذاتیات' قویٰ' آثار اور خواص کے ساتھ ایک متعین چیز ہے اور اس کے فرائض وحدود مقرر ہیں۔ اگر یہ تمام امور اس مادہ میں پائے جائیں جو فلاں عورت کے رحم کے اندر فلاں دن اور فلاں زمین اور فلاں مزاج میں جمع ہو چکا ہو تو وہ زید ہوگا اور اگر کسی اور مادہ میں فلاں دن فلاں ملک اور فلاں مزاج کے ساتھ پایا جائے تو وہ عمرو ہوگا۔ علیٰ ہٰذا القیاس دیگر انسانوں میں بھی اسی طرح ہوگا کیونکہ طبیعت انسانیہ اپنی وحدت کے اندر تمام اشخاص میں بحیثیت انسان کے پائی جاتی ہے۔ زید' عمرو' بکر کی حیثیت سے نہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان اس طبیعت انسانیہ کی ''ذاتی'' ہے اور زید یا عمرو ہونا تو احوال ہیں جو اعراض کی وجہ سے انسان پر طاری ہوتے ہیں اور بعض پر نہیں۔ انسانیت بمنزلہ جوہر کے ہے اور احوال بمنزلہ ان عوارض کے ہیں جو بعض پر طاری ہوتے ہیں اور بعض پر نہیں۔ انسانیت اور انسانیت کے احکام میں اشخاص اور احکام سب کے سب بلحاظ جوہر ایک جیسے ہیں جو سید ھے قامت' خلقت اور صنعت کا تقاضا کرتے ہیں۔ اگر زید اس قامت کے ساتھ سرخ رنگ والا' خوبصورت چہرے والا' موٹی اور سیاہ آنکھوں والا پایا جائے تو یہ ان کے احکام پر منطبق آئے گا اور اگر عمرو اسی سیاہی اور رنگ میں بدصورت اور تنگ آنکھوں والا پایا جائے تو وہ بھی ان احکام پر منطبق ہوگا۔ اس طرح اشخاص وافراد کے احکام کی ہر چیز میں احکام نوع کی صرف توسیع وتفصیل ہوتی ہے اور بس۔

اس کے بعد تجھے اختیار ہے کہ تو اس سے حیوانیت کی طرف منتقل ہو جس میں انسانیت اور فرسیت (گھوڑا ہونا) وغیرہ اپنی محدود حدود کے اندر متحد ہو جائیں اور اس کے پہلو بہ پہلو ان کے بھی چند فرائض ہوں گے۔ ہر وہ امر جو انسان اور فرس کے علیحدہ علیحدہ ہوتے وقت انسان کو متمیز کر دے اسے صرف احکام حیوانی کی تفصیل شمار کیا جائے گا، پھر تجھے اختیار ہے کہ تو درجہ بدرجہ منتقل ہوتا جائے تاکہ یہ سلسلہ اس صورت جسمیہ پر ختم ہو جو اپنے اندر عالم اجسام کے تمام ان امور کو لئے ہوئے ہو جن کے حکم تمام احکام پر مشتمل ہیں۔

لہٰذا تحقیق کا مرجع بالآخر یہ بات ہوگی کہ تمام کا تمام عالم صورۃ مطلقہ اور اس کے مطلق حکم میں فروض مفروضہ ہیں اور یہ امور ایک پھیلا ہوا سلسلہ ہے جس طرح کہ پوشیدہ سلسلہ واحد کے اندر پھیلا ہوا ہے۔ باقی رہا یہ حکم کہ کلی خواہ ہزار کے ساتھ مخصوص کیوں نہ ہو شخص نہیں بن سکتی لہٰذا کلی میں شخصیت کہاں سے آگئی؟ اس کی اصل ہیولیٰ اولیٰ سے آئی ہے اس لئے کہ روح صورت کے لئے ہیولیٰ بمنزلہ جسم کے ہے یا جس طرح گھونسلہ پرندہ کے لئے ہے اس کے بعد اپنے اپنے معدات کے اعتبار سے متعدد ہیولیٰ بن جاتے ہیں کیونکہ ہر سابق بعد میں آنے والے کے لئے ''معد'' ہوتا ہے جس کے مطابق وہ شخصیات کا تقاضا کرتا ہے۔

لمحہ 15۔ ایک ماہیت دوسری ماہیت پر اس صورت میں متقدم ہوتی ہے کہ ایک میں کم شروط میں جاتی ہوں اور ایک نشاۃ دوسری نشاۃ پر غالب آجائے کیونکہ بعض نشاتیں ایسی ہوتی ہیں جو عناصر اور قویٰ فلکیہ کے صادر ہونے کے بعد ہی پیدا ہوتی ہیں اور ان دونو کا امتزاج موالید کی طرح ہوتا ہے۔ بعض ماہیتیں صرف اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب عام کے ساتھ تخصیص لگا دی جائے مثلاً انسان کی جو نسبت حیوان کے ساتھ ہے یا حیوان کی نامی کے ساتھ علیٰ ہذا القیاس اور بعض ایسی ہوتی ہیں کہ جن کا مناسب کمال کسی اور چیز پر موقوف ہوتا ہے جیسے کہ روزمرہ کے حوادث جنہیں حظیرۃ القدس، ملائکہ اعلیٰ اور عالم مثال کے ساتھ نسبت ہے۔

لمحہ 16۔ تمام کا تمام عالم شخص واحد ہے جس کے احوال ہمیشہ متغیر ہوتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صورت جسمیہ کو مخصص کرنے والی صورتیں اگرچہ دراصل جواہر ہیں پھر بھی حقیقت اصلیہ کے مقابلہ میں تمام احوال میں کچھ عرصہ کے لئے کیفیتیں اور احوال مفارقہ ہو جاتی ہیں اور تمام احوال چکر لگاتے رہتے ہیں اور انتہا کو پہنچ کر پھر سے شروع ہو جاتے ہیں اور ادھر ثابت کے اندر شامل اور اس کا متقاضی ہے اور جو قوت اسے اٹھائے ہوئے ہے وہ طبیعت کلیہ ہے۔ اس کا تقاضا مصلحت کلی میں اس وقت ہوتا ہے جب اسے مبداء المبداء اعتبار کیا جائے۔

جب تو غور سے دیکھے گا تو بیشتر موجودات کے لئے طبیعت کلیہ، مصلحت اور عنایت کے سوا کوئی علت نہ پائے گا۔ مثلاً آگ کی حرارت، پانی کی ٹھنڈک اور فلاں جزو کا قطبیت کے ساتھ مختص ہونا اور اس جہت کا حرکت کے ساتھ وہ شخص اکبر ہی ہے جو ان کا حامل اور ان کیفیتوں سے متکیف ہے اور وہی مندمج مکنون بھی ہے۔ ایک ایک کر کے سب واحد میں منحصر ہیں۔

لمحہ 17۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان کے کسی دور دراز علاقہ میں ایک لمبی گردن والا پرندہ ہے جس کی نوع ایک ہی پرندہ میں منحصر ہے جسے ققنس کہتے ہیں۔ یہ ہر وقت ایک جہت سے دوسری جہت میں پلٹتا رہتا ہے اور ایک حالت

سے دوسری حالت میں بدلتا رہتا ہے تا آنکہ پورا جوان ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس کے اندر عشق جوش مارتا ہے اور وہ گانے لگتا ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اس سے جل جاتا ہے اور گانا بند ہو جاتا ہے اور وہ پرندہ راکھ ہو جاتا ہے۔ پھر موسم بہار کی بارش اس پر پڑتی ہے تو ایک کیڑے کے پیدا ہونے سے اس کا وجود پیدا ہوتا ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح لانہایت تک چلا جاتا ہے۔

لمحہ 18۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ برہان تطبیق اس قسم کے تسلسل کو باطل قرار دیتی ہے مگر میرے نزدیک یہ ایک مغالطہ ہے۔ اس لئے کہ کسی ممکن کے لئے ممکن حالت فرض کر لینا اس بات کا موجب نہیں کہ اس کا علم ہی محال ہو جبکہ اس دونوں کے درمیان کسی لحاظ سے بھی تناقض اور تضاد نہ پایا جاتا ہو لیکن جب تناقض یا تضاد پایا جاتا ہو تو پھر یہ قطعی طور پر محال کا سبب بنے گا جیسا کہ اس صورت میں۔ کیونکہ اس کی ایک طرف غیر متناہی ہے اور دوسری طرف متناہی اور معلوم الابتدا اور غیر متناہی ہونا کمی اور بیشی کی نقیض ہے لہٰذا جب اس کی کمی یا بیشی کو غیر متناہی جہت سے فرض کر لیا جائے تو محال لازم آئے گا اس لئے کہ بیک وقت نقیضین کو فرض کر لیا گیا ہے۔ لیکن جب انہیں متناہی ہونے کے اعتبار سے فرض کرے جس کے لئے بغیر تطبیق ایک کا باقی رہنا ضروری ہے تو پھر محال لازم نہ آئے گا۔

لمحہ 19۔ تمہیں اختیار ہے کہ کوئی ایک وجود فی الاعیان لے لے بایں معنی کہ یہ وجود مادے میں صورت کے حلول کے بعد حاصل ہوا ہے۔ لہٰذا یہ درست نہ ہوگا کہ صرف مادہ کو یا صرف صورت کو موجود فی الاعیان کہا جائے البتہ تو اسے فی الجملہ اس شخص کے اندر تحصل کے معنی میں لے سکتا ہے لہٰذا تو دونوں کو موجود کہہ سکتا ہے۔

مگر حق بات یہ ہے کہ اصل میں موجود ایک ہی ہے' ثنویت (دو) نہیں۔ ثنویت کی بھی وجہ ہو سکتی ہے۔ زمانہ حرکت اور تغیر کی مقدار کا نام ہے خواہ یہ حرکت' حرکت وضعی ہو' خواہ کیفی جیسا کہ فطرت سلیم حکم لگاتی ہے۔ لہٰذا زمانہ کی اصل یہی شخص ہے جو غیر نہایت تک تغیرات کو قبول کرتا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ زمانہ جوہر ہے تو اس کا کلیۃً انکار نہ کر اور اس کا محل اس شخص کو قرار دے اور جو یہ کہے کہ بُعد مفطور (مکان) جوہر ہے تو اس کا بھی کلی طور پر انکار نہ کر۔

لمحہ 20۔ جب یہ شخص (جزئی) جو ایک صورت کے سوا تمام صورتوں سے خالی ہو جائے پھر کوئی اور صورت پیدا ہو جائے اور کوئی کہے کہ یہ صورت پہلے کیوں نہ تھی کہ اب پیدا ہو گئی؟ یا یوں کہا جائے کہ غیر متغیر نے (حدوث صورت) کے لئے ایک متعین وقت کو کیوں چنا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ غیر متغیر نے ایسا شخص پیدا کیا ہے جو ہر حالت میں ہے اور اس کے اندر ایسی طبیعت پیدا کر دی جو اس کی مدبر ہے اور طبیعت کے اندر ایک پوشیدہ سلسلہ بھی پیدا کر دیا جو اس کا حکم ہے اور اس شخص کے لئے اس کے مطابق جاری رہنا بھی نہایت ضروری ہے۔ ان تمام تغیرات کی کوئی صورت نہیں لیکن یہ کہ طبیعت اپنے پوشیدہ حکم کی وجہ سے "شخص" کو تنہا نہیں رہنے دیتی بلکہ اس میں مسلسل صورتیں حاصل ہوتی رہتی ہیں تا آنکہ "شان" مکمل ہو جاتی ہے۔ ہر سابق صورت بعد میں آنے والی کو تیار کرنے والی ہے اور یہ سب مل کر ان کے انحلال کے ظہور کا سبب بنتی ہیں اور ہر انحلال ان چیزوں کو تیار کرتا ہے جن کے اثر سے یہ خود پیدا ہوا ہے تا آنکہ صرف اشارہ جائے کہ واحد کی کوئی صورت ممثل نہیں مثلاً گیند کہ اس کا ہر چکر دوسرے چکر کو تیار کرتا ہے اور ہر دور بعد میں آنے والی حرکت دوریہ کا جز ہے یا اس کی مثال درخت کی جڑ ہے کہ ابتدا میں پیدا ہوتے ہی اس کی طبیعت کے اندر یہ بات پائی جاتی ہے کہ یہ نشوونما پا کر پورا

جوان ہوگا پھر یہ بات نہ رہے کہ تا آنکہ درخت کی بنیاد ہی ختم ہو جائے گی۔

لمحہ 21۔ اللہ کی جود و حکمت کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلی چیز جو اس سے صادر ہو وہ واحد عقلی شخص اکبر ہی ہے جسے لواحق مادہ سے الگ کر لیا گیا ہو۔ اس لئے کہ عالم کی اپنے پیدا کرنے والے کے ساتھ وہی نسبت ہوتی ہے جو عمارت کو اپنے بنانے والے کے ساتھ ہوتی ہے کہ اس نے مٹی میں کچھ اپنا کام کیا۔ اس کے بعد اس کا کام ختم ہو گیا پھر اگر بنا کنندہ مر جائے یا کسی اور ملک کو چلا جائے تو بناء اپنی حالت پر رہے گی بلکہ اس کی مثال تو سورج کی سی ہے کہ زمین اس کے نور سے روشن ہوتی ہے اور جب تک روشنی پھیلتی رہے یہ روشنی ایک لمحہ کے لئے بھی زائل نہیں ہوتی اور اگر سورج اور زمین کے درمیان کوئی چیز حائل ہو جائے تو اس سے روشنی بدل جائے گی۔ لہٰذا صورتوں کو پیدا کرنے والے کا فعل اول تو اصل کو ایجاد کرنا ہے یعنی شخص اکبر کا جو دو قوتوں سے مرکب ہے یعنی فاعلہ اور قابلہ دوسرے یہ کہ ان تمام چیزوں کو وجود میں لایا جائے جو اسے تیار کرنے میں تھے اور تیسرے یہ کہ ان تمام چیزوں کو باقی رکھا جائے جو اس وقت تک باقی رہیں جب تک یہ باقی رہے لہٰذا قدر صادر یہ ہوگی کہ کبھی اسے روشن کر دیا اور کبھی اسے اور اول سے اس کا ہمیشہ صادر ہونا اس کے دائم ہونے کی وجہ سے ضروری ہے۔ یہی ہے جو شخص اکبر ہوتا ہے پھر جب اس کا وقت آتا ہے تو مخلوقات میں سے ایک مخلوق بن جاتا ہے اور اگر تو حق کی جانب جھکے تو تو دیکھے گا کہ یہ اس سے صادر نہیں ہوتا اور یہی اس کے نزدیک شخص اکبر ہے اور ہر وہ چیز جس کی طرف یہ منسوب کیا جاتا ہے کہ یہ اس سے صادر ہوا ہے وہ دراصل اس کی طرف منسوب ہیں کیونکہ یہ ان سے مختلط ہے اور اگر تو حق کی جہت سے اترے تو تو دیکھے گا کہ صرف یہی اس سے صادر ہوا ہے اور اس کے نزدیک یہی شخص اکبر ہے اور یہی نفس کلی ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ شخص اکبر وہ صادر اول ہے تو وہ سچا ہوگا مگر اس نے اجمال کو پسند کیا ہے۔ نیز وہ شخص بھی سچا ہوگا جو یہ کہے کہ صادر اول عقل ہے۔ اس شخص نے تفتیش کی اور اللہ نے اسے توفیق دی۔ یہی وجہ ہے کہ حق ان تمام افعال پر مشتمل ہوگا جنہیں شخص اکبر نے کیا ہو۔ ان افعال میں سے ذرہ بھر نہیں چھوڑے گا لیکن بعض لوگوں نے حرکات افلاک کی علت معلوم کرنے کو اہم سمجھا او وہ ان اشخاص تک پہنچ گئے جو وحدۃ العقل کے اندر شامل ہیں مگر ان دیگر اشخاص سے غافل ہوئے جو وہاں ہیں۔ بعض نے ان کی بہت زیادہ کثرت کو سمجھ لیا اور انہوں نے اس وحدت کو نہ سمجھا جو کثرت کی جامع ہے:

ہر کس بخیال خویش خبطے دارد

کیا ''زوج'' کے چار اعتبار نہیں ہیں؟ پہلا یہ ہے کہ تو کہے کہ یہ ''زوج'' ایسا ہے اور تیری مراد 4 سے ہے۔ لہٰذا اس لحاظ سے زوج ایک نام ہے جس کے ساتھ 4 کا امتزاج ہے۔ چنانچہ شدت امتزاج کی وجہ سے ممکن نہیں کہ ایک کو دوسرے پر محمول کیا جائے لہٰذا 4 اپنی ذات کے مرتبہ میں 4 نہیں ہے جب تک وہاں زوج نہ ہو اور نہ زوج ہے لیکن یہ اس طرح ہے کہ اگر تو اس کی تشریح کرے اور اس کے کمال ذات کی طرف توجہ دے تو یہ زوج ہوگا نہ کچھ اور۔ یہ لحاظ تمام اعتبارات کے مقابلہ پر نفس الامر کو زیادہ روشن کرتا ہے اور اس کی کیفیت صدور اور احیاء کو زیادہ واضح کرتا ہے۔

دوسرا اعتبار یہ ہے کہ تو اس امتزاج متاکد کی طرف توجہ دے اور کہے ''چار جفت ہے'' اس طرح تو چار کا وہ مفہوم لیتا ہے جو 4 پر صادق آتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان ایک اعتبار سے تفارق پایا جاتا ہے اور ایک اعتبار سے

اختلاط۔ پھر تو دونوں اعتباروں سے دیکھے تو ایک دوسرے پر محمول کرنا صحیح ہوگا۔ اس صورت میں تمہارے قول کے یہ معنی ہوں گے کہ 4 اور زوج اگرچہ اس مرتبہ میں دو مقرر مفہوم ہیں مگر دونوں ایک مرتبہ میں متحد ہیں کیونکہ اس تنزل میں ان کا اجمالی تصور آ جاتا ہے مثلاً یہ کہنا کہ ''سرت من البصرۃ'' میں ''من'' حرف اور رابطہ ہے۔ جب اس کی حرفیت کی طرف توجہ کی جاتی ہے تو نفس میں اس قضیہ کا قصد کرتا ہے کہ ''من'' حرف اور رابطہ ہے اور یہ حرف رابطہ کی طرف قصداً متوجہ ہوتا ہے اور حرفیت سے بری ہو کر اسم بن جاتا ہے۔

تیسرا اعتبار یہ ہے کہ تو اس حمل (تعریف یا حد) کی طرف متوجہ ہو اور اس میں ایک قسم کی تحلیل کے ذریعہ سے تصرف کرے اور کہے: زوج جو چار کے عدد سے سمجھ میں آتا ہے اس صفت کے لئے قائم ہے۔ اس طرح ''زوج'' کو اپنے حقیقی طریقہ سے بدل دیتا ہے اور تو اسے ایسی چیز سمجھتا ہے جو اسے وہ تفسر دیتی ہے جو اسی عدد میں واقع ہے اور جس سے یہ دو چیزوں کی طرف منقسم ہو جاتا ہے اور وہ چیز نہیں سمجھتا جو اسے ''رابعہ'' کا لفظ بالخصوص دیتا ہے تو اس انفکاک کا قصد کرتا ہے جو اس کے اندر ''حمل'' کے مرتبہ میں چھپا ہوا ہے اور تو اسے ظاہر کر دیتا ہے اور اس امتزاج کا قصد کرتا ہے جو ظاہر تھا مگر تو نے اسے چھپا دیا۔ اس اعتبار کے مقابلہ میں ایک اور نام مشتق ہوتا ہے اور وہ اس کا ''زوج'' ہوتا ہے اور تو کہتا ہے۔ زوجیت اربعہ کی وہ صفت ہے جو اس کے ساتھ قائم اس کے لئے موجود اور اس میں متحقق ہے۔

چوتھا اعتبار یہ ہے کہ تو ''اربعہ'' کی طرف بحیثیت صفت موصوف کے دیکھے اور تو اس قیام اور تحقق کو اس میں ملاحظہ کرے اور دونوں کے درمیان جو نسبت ہے اس کا مطالبہ کرے اور کہے: پہلا علت ہے اور دوسرا معلول۔ پہلا مبداء اور اصل ہے اور دوسرا صادر اور اس سے پیدا شدہ۔ اگر تو ان کی تحقیق کرنے میں انتہائی غایت کو تلاش کرے تو تو جان لے کہ صادر اول اول الاوائل کا نام اور عنوان ہے اور اگر تو اس کی طاقت نہ رکھے تو پھر تو کسی اور مرتبہ کی طرف اتر کر چلا جا۔

لمحہ 22۔ جب عالم صورت فلکیہ یا عنصریہ یا نفس معدنیہ یا نباتیہ یا حیوانیہ یا انسانیہ کے ساتھ تیار ہو جائے اور صورت پھیل جائے یا کوئی محل کسی حیثیت کے وجود کا مستوجب ہو اور یہ حیثیت مالوف ہو جائے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ نفس کلیہ مادہ کے لئے قیومیت کا کام کر رہا ہے۔ جب اس کی کیفیت یہ ہو جائے کہ اس صورت کی قیومیت سے اتر کر عالم کی قومیت کی طرف آ جائے یا اس کے برعکس اس طرح کے یہ تمام امور کسی اور صورت میں ظاہر ہوں جس طرح انسانیت اس شخص اور اس شخص میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس ابقاء کی حقیقت یہ ہے کہ نفس مادہ کے اندر حلول کی وجہ سے تشخص وتقید کے احکام پیدا کر دیتا ہے۔ پھر جب مادہ کوئی اور قسم کی کیفیت اختیار کر لیتا ہے تو اس کا اجمالی حکم اتر کر خاص حکم کی طرف آ جاتا ہے۔ لہٰذا حیوان مادہ کے اندر خلقت اور عام آثار پیدا کرتا ہے اور جب یہی حیوان انسان میں اتر کر آتا ہے تو اس کی خلقت اور آثار بھی خاص ہو جاتے ہیں۔ یہ انسان اور ان سب کے احکام میں جو مادہ اور نفس کلی پر وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتے ہیں اس لئے کہ اس سے پہلے یہ نفس کلی اور مادہ میں شامل تھا۔

لمحہ 23۔ ظہور کی حقیقت یہ ہے کہ ایک شئے ایسی وحدت ہو جو اس حالت کے مناسب ہو جو طاری ہونے والی ہیئتوں سے ملتبس ہو خواہ وہ اپنی ذات میں ایک ایک کر کے جوہر ہی کیوں نہ ہوں۔ اس طرح کہ یہ تمام وہ چیز بن جائے اور وہ یہ بن جائے مگر یہ تقسیم کی صورت میں نہ ہو۔ جب کوئی چیز اپنی حد ذات میں اپنے تعین اور وحدت کے ساتھ جن سے

اس کا قیام ہے متعین نہ ہو اس کے بعد اسے بعد میں آنے والی ہیئت میں تصور کیا جائے اور اس کا اعتبار اس شرط کے ساتھ اس مظہر میں اول کے ظہور سے پہلے کیا جائے اور اس کا اعتبار اس شرط کے ساتھ اس مظہر میں اول کے ظہور سے پہلے کیا جائے اور وہ ہر حالت میں اپنے تعین وجود میں اور وحدت میں جیسے بھی ہو دائمی ہوگی کیونکہ یہ اعلیٰ اور الطف ہے۔ تعین وجود اور وحدت نے مظاہر کو قائم رکھا ہے اور وہ مظہریت میں جزء ذاتی ہوگا تو ایک مظہر کا دوسرے مظہر سے افتراق ہوگا کیونکہ ظاہر کی نسبت کا خیال کرتے ہوئے یہ ایک عرض مفارق ہے۔ مثلاً انسان، گھوڑا اور حیوان اپنے اشخاص اور افراد کی نسبت کے اعتبار سے۔ لہٰذا بہت سے اشخاص کے اندر انسان کی نوع ظاہر ہے، اگرچہ جو شخص بھی ہوگا اس پر نوع اس اعتبار کو صادر کرے گی جو ''لا بشرط (شئے)'' ہے، اور جو کثرت مظاہر کے اندر مادہ کی طرف سے آئی ہے وہ ظاہری وحدت کے مخالف نہیں ہے اور یہ ظاہری وحدت تمام حالات کے ہوتے ہوئے بھی محفوظ رہتی ہے۔ یہ ایک قسم کا ظہور ہے۔ یا اس شمع کی طرح جسے کبھی مربع بنالیا جاتا ہے تو اس سے مربع کے آثار صادر ہوتے ہیں اور کبھی مسدس بنالیا جاتا ہے تو بھی یہ آثار صادر ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان تمام حالات میں شمع کا وجود باقی رہتا ہے اور مربعی اور مسدسی وجود تو آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کا ظہور ہے۔ یا مثلاً ملکہ جہاں تک اس کا تعلق افعال سے ہے۔ علم بھی ایک ملکہ ہے جس کا قیام عالم یعنی جاننے والے پر ہے اسی طرح آہنگری اور نجاری افعال کے تبدیل ہونے کے باوجود باقی رہتی ہے۔ ایک عالم میں طویل مدت سے یہ ملکہ چلا آتا ہے اور یہ ملکہ وہ راسخ کیفیت ہے جسے نفس قبول کرتا ہے اور اس کی وجہ سے مختلف رنگ اختیار کرتا ہے اور ملکہ کے حاصل ہوجانے کے بعد خاص توجہ پر موقوف نہیں ہوتا۔ لہٰذا جب اس کی توجہ کسی مخصوص شئے کی طرف ہوگی اور اس کی صورت تختہ ذہن پر منقوش ہوجائے تو نفس ناطقہ کو اس کی قدرت اسی ملکہ کی وجہ سے ہوئی۔ یہی ملکہ اس کے اور صورت منتقشہ کے درمیان واسطہ بنتا ہے۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ یہ صورت کے ساتھ مختلط اور اس میں غوطہ زن ہو۔ جب یہ ملکہ ان سے خالی ہو کر نفس ناطقہ کے قریب پہنچ جائے تو اسے وہ بات حاصل ہوجاتی ہے جو ملکہ کے اندر شامل ہے۔ اس وقت جا کر تو اس کا نام ''علم بالشی الفلانی'' رکھتا ہے۔ اس کے بعد جب ملکہ کسی دوسرے معلوم کی طرف منتقل ہوجاتا ہے اور اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور تمہارے تختہ ذہن میں اور صورت منتقش ہوجاتی ہے اور اس کے ساتھ مل جاتا ہے تو اسے بھی ''علم بذلک الشئ'' کہہ دیتے ہیں۔ علی ہذا القیاس اور امور بھی۔ یہ بھی ایک قسم کا ظہور ہے۔ یا مثلاً عدد ایک جس میں نصف بننے کی قوت ہوتی ہے اگر اس کے ساتھ دو واحد اور مل جائیں اور چوتھائی بننے کی اگر اس کے ساتھ تین اور مل جائیں۔ لہٰذا واحد کے اندر اعداد کے تمام مراتب شامل ہیں۔ اس کے بعد یہ مرتبہ بہ مرتبہ اسی طرح چلا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک قسم کا ظہور ہے۔ یاد رکھو کہ ظہور کی بہت سی قسمیں ہیں اور ہر ظہور کے بالمقابل ایک اندراج ہے۔ اس پر غور کریں۔

لمحہ 24۔ وجود فی الاعیان یا وجود فی الخارج ایک ایسا امر ہے جس میں تفاوت پایا جاتا ہے جس طرح سورج کی شعاع یا چاند کی شعاع میں تفاوت ہوتا ہے پھر جو شعاع چاند سے آئینہ پر پڑتی ہے وہ منعکس ہوجاتی ہے پھر وہ شعاع منعکس ہوتی ہے جو زمین پر پڑتی ہے یا جس طرح برف اور ہاتھی دانت وغیرہ کی سفیدی میں تفاوت پایا جاتا ہے۔

وجود اعلیٰ لاہوت کے قویٰ ہیں اور اس کے بعد وجود عقلی ہے۔ جب تو لاہوت تک اوپر چڑھ جائے گا تو وہاں ایک انتزاعی صفت پائے گا اور اس کا مصداق لاہوت ہے اور یہ صفت اس کے اعتبار سے عدم کے حکم میں ہے۔ پھر جب تو

لاہوت کے بعد قوی ترین موجودات کو عقل کی طرف اتارے گا تو تو اسے مبدا اول کے کمالات کی وجہ سے وجود عقلی کے اعتبار سے اسے ایسا وسیع عالم پائے گا جو ان سب کا شارح ہے اور اس کا ایک تابع بھی ہے جس کا وجود اس کی شرط کے ساتھ ہوگا۔ مثلاً زید کا ضروری طور پر متحرک الاصابع ہونا اور یہ اسی صورت میں ہوگا جب وہ لکھ رہا ہوگا۔ کتابت سے الگ ہو کر نہیں یا جس طرح زمانے کا وجود جو حرکت کے وجود کی وجہ سے ہوتا ہے' یا سکون کی وجہ سے جو حرکت کی ضد ہے' اور یہی تابع نفس کلی ہے۔ لہٰذا جب تو اتر کے اس کی طرف جائے گا تو اسے متقرر اور متحقق پائے گا۔ اس کے درجہ میں نہ کوئی اس کی ضد ہے اور نہ کوئی ہمسر' بلکہ یہ تنہا ہے کیونکہ وجود اور تحقیق دونوں میں موافقت ہے اور ان کے ساتھ جزئی نفوس ہوتے ہیں جن کی مثال اپنی والدہ کی نسبت کے اعتبار سے ان بچوں کی سی ہے جو ماں کے پیٹ میں ہوتے ہیں۔ جب وہ باہم مل جائیں اور انسانی جسم کے ساتھ نسبت کے اعتبار سے ان کی مثال اعضاء کی سی ہوتی ہے اور یہ افلاک اور عناصر ہیں۔ موالید کی افلاک اور عناصر سے وہی نسبت ہے جو شخص انسان کے ساتھ پھنسیوں' ورم' بخار اور سر درد کو ہے۔ دیگر حوادث بدنیہ کا بھی یہی حال ہے۔ بعض سادہ اور بعض بدبودار ہوتے ہیں اور موجودات مثالیہ کی ان سے وہ نسبت ہے جو ان اجرام کو جو خیال میں منتظم ہوتے ہیں' معمار کے ساتھ ہے۔

اس کے بعد جب تو موالید کی طرف اترے تو تو انہیں اپنے مرتبہ میں ایک قسم کا جڑ پکڑتا ہوا پائے گا پھر اس کے بعد وہ اعراض آتی ہیں جو ان کو اپنے اندر لئے ہوئے ہیں اور یہ تو عام اعراض کی وہ جزئیات ہیں جو پودے پر لپٹی ہوئی ہیں۔ اس حیثیت سے کہ وہ جسم ہے جس طرح کہ یہ جواہر جسم مطلق کے لئے فرض کیے ہوئے امور ہیں۔ اس کی مثال شکل خاص' کم خاص اور کیف خاص کی ہے۔

اعراض کے بعد دو اور مرتبے ہیں۔ ان میں سے ایک وجود تشبیہی ہے۔ کسی میں سے یہ ہے کہ محل گمان کو احکام شرعیہ کے اندر حکم کے قائم مقام خیال کیا جائے۔ چنانچہ شراب کا اپنے جوہری وجود کے علاوہ ایک اور وجود بھی ہے اور یہ مصلح کو فاسد کر دیتا ہے جس سے یہ مراد ہے کہ اگر شراب کو ایک رسم بنا لیا جائے تو تمام افترانی' منزلی' معاشی اور مدنی مصلحتیں فاسد ہو جائیں۔ لہٰذا اسی ''افساد'' کی وجہ سے شراب ''وجود تشبیہی'' میں آ گئی۔ کتابی نقوش اور لفظی اصوات کو اپنے مدلولات کی جگہ رکھنا بھی اسی میں سے ہے۔ اس تشبیہ کے اعتبار سے علوم جفر اسی کے اندر آ گئے۔ اسی میں سے افعال کو ملکات کے قائم مقام رکھنا ہے اور نذر و نیاز کو عاجزی کے قائم مقام رکھنا اور اذکار کو ان کے معانی کے قائم مقام رکھنا۔ لہٰذا اس کا حکم اصحاب الیمین میں ظاہر ہوا ہے اسی میں یہ بھی ہے کہ بلند اسباب بعض اوقات ایک حادثہ کے حادث ہونے سے متفق ہو جاتے ہیں' مثلاً زید کا مر جانا۔ اس کے بعد لوگوں کی دعائیں اور فریادیں بلند ہو کر ملاء اعلیٰ تک چل جاتی ہیں تو وہ صرف ہلاکت کے وجود تشبیہی پر ہی اکتفا کر لیتی ہیں مثلاً اذیت پہنچنا اور بہت سے مال کا کھو جانا۔

اور دوسرا مرتبہ ان عوالم کا ہے جو وہم مطلق کے اندر پیدا ہوتے اور اعراض کے امتزاج میں ظاہر ہوتے ہیں کیونکہ باوجود اس کے کہ ملائکہ عنصریہ اور شیاطین کا درحقیقت وجود پایا جاتا ہے۔ وہم مطلق میں ان کے عجیب و غریب اتفاقات اور اجتماعات ہو جاتے ہیں اور بنی آدم کے حرکات' امراض اور خیالات کے ضمن ناسوت کے اندر ان کے آثار پائے جاتے ہیں اور بعض اوقات ان ملائکہ اور شیاطین میں سے ایک فرد کسی ناسوتی کیفیت کا مشتاق ہو جاتا ہے' جس کی وجہ

سے ایک چیز دوسری چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور اس خیال میں مدد دیتی ہے اور اس سے لذت حاصل ہوتی ہے اور اس کا نام دوسری چیز رکھ دیا جاتا ہے۔ اس قسم کے حالات میں ان کی عجیب زبان ہوتی ہے اور ناسوت کے ساتھ ان کے اجتماعات اور اصطلاحات ہوتے ہیں جنہیں صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے اس وجود کا گہرا مطالعہ کیا ہو۔

یاد رکھیں کہ ہر وجود صرف اسی صورت میں پہچانا جا سکتا ہے جب اس وجود کو واجب قرار دے دیا گیا ہو۔ لہٰذا لاہوت کی پہچان لاہوت ہی کے ذریعہ سے ہوگی اور عقل' عقل ہی کے ذریعہ سے پہچانی جائے گی۔ یہی حکم ہر طبیعت نوعیہ کا ہے کہ اس کا ادراک بھی اسی کے ذریعہ سے ہوگا۔ لہٰذا عارف ہر چیز کو اس چیز کے ذریعہ سے کلی طور پر پہچان لیتا ہے اور دیگر لوگ ان چیزوں کا ادراک کرتے ہیں جو اپنے وجود کی ترکیب میں قوی ہوں مثلاً اکثر افراد بشریہ کے لئے مرکبات ارضیہ۔ لیکن جو بلند ہو مثلاً نفس عامہ اور عقل' تو اسے یہ صرف دور ہی سے دیکھ سکتے ہیں' گویا کہ یہ ایک بہتر خیال ہو اور جو پست ہو جس طرح دیگر دو وجود تو ان کے پہچاننے کے لئے ارواح کا کمزور ہونا اور نفس کا کم بیدار ہونا شرط ہے۔ اس طرح عارف اور معروف میں ایک قسم کی مطابقت پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تو دیکھے گا کہ جو لوگ جنوں کو حاضر کرنے کا کام کرتے ہیں وہ جن کے کاغذ' بیوقوفوں اور بچوں کی طرف دیکھنا شرط قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح تو لوگوں کو دیکھے گا کہ جب وہ کسی عارف کو یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ ''زمانہ موجود ہے اور عالم ایک خیال ہے'' تو لوگ اسے جھٹلاتے ہیں، حالانکہ یہ درست بات ہے۔

لمحہ 25۔ کبھی کسی چیز کے دو وجود ہوتے ہیں اور ایک وجود دوسرے وجود کی شرط ہوتا ہے۔ بعض اوقات عالم قویٰ فلکیہ اور عنصریہ کے لحاظ سے کسی موجود کے فیضان سے تیار ہو جاتا ہے۔ نیز اس لئے بھی کہ یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ وجود ناسوتی ناسوت سے اعلیٰ مقام پر اسی وجود کا فیضان ہے۔ اس طرح بعض اوقات کوئی واقعہ ملاء اعلیٰ میں واقع ہونا قرار پاتا ہے۔ مثلاً کسی ملت کا ظاہر ہونا یا زید کا وجود یا اس کی موت یا فلاں دن اس پر کسی سختی کا واقع ہونا۔ اس کے بعد جب اس کے ناسوتی وجود کا وقت آتا ہے تو اس کا روحی وجود ناسوتی وجود کے ساتھ اس طرح مل جاتا ہے جس طرح کہ ملکہ کسی خاص فعل کے ساتھ۔ بعض اوقات کوئی چیز فاعل کے اقتضاء کے مطابق موجود ہوتی ہے یا اس لئے کہ قابل کی انتہا ہو جاتی ہے یا اس وجہ سے کہ وہ کسی چیز کا ''مقبول'' ہے یا اس لئے کہ فاعل کی انتہا ہو جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ ایک شئے اپنی فاعلیت یا قابلیت کے اعتبار سے کسی دوسری چیز کی مقتضی ہوتی ہے یا یوں ہوتا ہے کہ قابل اور فاعل تو دونوں موجود ہوتے ہیں مگر اس شئے کے وجود کا ابھی وقت نہیں آیا ہوتا اس لئے کہ اسے تیار کرنے والا یا اس کی بیرونی شرط معدوم ہوتی ہے یا کوئی مانع موجود ہوتا ہے مثلاً یہ کہ کوئی کاریگر موم کا ایک خوبصورت جسم بنائے اور اسے اس قدر خوبصورت بنائے کہ دیکھنے والے خوش ہو جائیں اور لوگ یہ کہنے لگیں: یہ کس قدر خوبصورت ہے' اس کا صانع کس قدر ظریف انسان ہے۔ لہٰذا اس میں ہیئت کا ہونا ضروری ہے اور یہ بات کاریگری سے پہلے موجود نہ تھی اور یہ کاریگر کے نفس کے اندر شامل تھی کیونکہ اس کا ملکہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس سے افعال صادر ہوں۔ پس اگر اس ملکہ کا کوئی فعل اس محل کے ساتھ تعلق رکھے تو یہ خاص قسم کا صنم ہوگا۔ اسی طرح موم ایک ''قابل'' ہے جس پر یہ ظاہر ہوتا ہے اس لئے کہ یہ اصل خلقت کے ساتھ یعنی رنگ اور شکل کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ یہ معاملہ کبھی تو اس صورت سے حل ہوتا ہے جو پہلے اسے حاصل تھی یا کبھی اس صورت سے۔ لہٰذا یہ صنم اگرچہ بادی النظر میں موم اور اس صورت کے احکام کو جمع کیے ہوئے ہے لیکن

نظر دقیق اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ وہاں دو وجود ہیں جن کا وجود یہاں آ کر انسانی صورت سے مل گیا ہے۔ خواہ یہ موم ہو یا لکڑی یا پتھر اور ان کا وجود بھی وہی موم ہے خواہ وہ انسانی صورت ہو یا گھوڑے کی یا درخت کی۔ وجود اول کا قیام فاعل کے ساتھ ہے۔ اگر اس کا وجود فاعل کے ''وصف متجدد'' پر ہوگا تو یا فاعل کے دوام کے ساتھ اس کا بھی دوام ہوگا یا اس لئے دائم ہوگا کہ اس وصف کے ساتھ موصوف ہونے کی شرط اس میں پائی جاتی ہے اور دوسرے وجود کا قیام قابل پر ہوگا یا اس کے دوام سے دائم ہوگا یا اس شرط پر کہ وہ اس کے وصف سے موصوف ہے۔ یہ مثال ایک لحاظ سے قاصر ہے کیونکہ یہاں فاعل اس شئے کے ساتھ اپنے تعلق کو تیار کر رہا ہے او عالم کے اندر جو فاعل ہے وہ فاعل حقیقی ہے۔ اس کا تعلق اور قیومیت زائل نہیں ہوتی۔ لہٰذا جب ایسا وصف پایا جائے گا جس پر یہ موقوف ہے تو عالم روحانی میں اس وجود کا صادر ہونا واجب ہو جائے گا اور یہ وصف حیات افلاک اور عناصر کے قویٰ ہی ہیں اور جب یہ وجود پایا گیا تو ملاء اعلیٰ اس شئے کو موجود خیال کر لیتے ہیں۔ لہٰذا یہ وجود فلکی قوتوں، خوبصورت عنصری طبائع اور تخیلات مثالیہ سے مرکب ہوتا ہے۔ اس کے بعد جب کوئی واقعہ ناسوت میں پایا جاتا ہے اور بعض اوقات اول مجمل ہوتا ہے اور احتمال ہوتا ہے کہ اس کی تفسیر اس کے ساتھ ہو یا اسے چھوڑ دیا جائے۔ یہی اختلاط وہ ''انزال حدید''، ''میزان'' اور انعام کا آسمان سے اترنا ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ نیز مصیبت کا نازل ہونا اور دعا کا اس کے ساتھ ٹکراؤ اور فتنوں کا نازل ہونا جیسے عربی ممالک میں بارش جیسا کہ سنت صحیحہ میں آیا ہے۔

لمحہ 26۔ یاد رکھیں کہ روزمرہ کے حوادث کے واقع ہونے کے لئے علت تامہ کا ہونا نہایت ضروری ہے تاکہ معلول ضرور واقع ہو کر رہے ورنہ یہ لازم آئے گا کہ یہ وجود علل قائمہ کے واجب قرار دینے کے بغیر ہی واقع ہو گیا اور یہ بھی ناممکن ہے کہ وہ فقط قدیم ہو ورنہ یہ قدیم اور غیر حادث ہوگا۔ لہٰذا تحقیق نے اس بات کی طرف مجبور کیا کہ ایسی چیز کی تلاش کی جائے جو قدیم کے ساتھ منضم ہو کر علت تامہ بنے۔ اس لئے عقلمند لوگ اس علت تامہ کی تلاش کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے عنصری طبائع کی طرف دیکھا اور ان کا شور و غوغا دیکھا۔ حوادث کا تکرار ہوا اور قیاسات کیے گئے، یہاں تک کہ اس میں کسی کو شک باقی نہ رہا۔ اس کے بعد انہوں نے سیارات کی حرکات میں غور کیا اور اس بات میں غور کیا کہ ایک سیارہ دوسرے سیارہ کی طرف دیکھ رہا ہے اور دیکھا کہ ان میں سے بعض محسوسات پر تاثیر پیدا کرتے ہیں جیسے زمین کے ساتھ نسبت کے اعتبار سے سورج کی گرمی اور سردی میں اختلاف کا ہونا اور رطوبات کے معانی کا اختلاف اور اس میں مدوجزر اور زمین سے چاند کی نسبت کے اختلاف کا وقوع آ جاتا ہے اور بعض ایسے امور ہوتے ہیں جو ایک جماعت کے نزدیک محسوس نہیں ہوتے با ایں ہمہ وہ اس کے متعلق جستجو کرنے میں لگے رہتے ہیں اور اسے سمجھتے بھی ضرور ہیں اور جزئیات سے اس کلی کی طرف منتقل ہوتے رہتے ہیں جو انہیں جمع کرتی ہے اور ان آثار کے اجتماع کا قیاس کر کے جو دوسرے آثار کے ساتھ مل کر جائے حادثہ کی صورت پیدا ہوتا ہے مثلاً ستاروں کی نگاہ کے اختلاف کی وجہ سے لوگوں کے اخلاق اور ان کے واقعات کا اختلاف۔ لہٰذا ان لوگوں نے ایسے علوم کی تدوین کی جن کے ذریعہ سے ان کے بیان کے مطابق مکمل معرفت حاصل ہو جائے مثلاً علم ہندسہ، حساب، خواص نباتات وحیوانات۔ اس کے بعد ان کے علوم کی تدوین جو ان کی فرع ہیں اور ان سے پیدا ہوتے ہیں جیسے سحر، طلسمات اور طب۔

ان کے بعد وہ لوگ آئے جو اشیاء کی ''لم'' (اسباب وعلل) کی تفتیش کرتے ہیں اور انہوں نے ہر ایک کی وجہ نکالی۔ نیز انہوں نے اپنی کتابوں میں یہ ذکر کیا ہے کہ حرکت مستدیرہ ہے نہ حرکت شہویہ ہے اور نہ طبعیہ لیکن یہ رائے کلی اور وہمی ہے۔ افلاک کے یقیناً نفس ہیں اور یہ موالید (ثلاثہ) میں اس طرح تاثیر کرتے ہیں جس طرح ہمارے نفس ہمارے جسم کے بعض حصوں پر کرتے ہیں۔ یہ اپنی کوشش سے اس چیز کی تلاش کرتے ہیں۔ جس میں عالم موالید کی بھلائی ہو اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان کی ہمت الہام اور اس کے محال ہونے کا سبب بنتی ہے اور لوگوں کا ان سے مدد مانگنا اور سخاوت کے نازل ہونے کی درخواست کرنا سخاوت کے دروازہ پر دستک دینے کے مترادف ہے۔ بعینہ اسی طرح جس طرح نتیجہ کے فیضان کے لئے نظر سبب پر بنتی ہے اور جس نے سخی کے دروازے پر دست دی اس کے لئے دروازہ کھل جاتا ہے اور یہی رسولوں کو بھیجنے، ملتوں کو قائم کرنے' معجزات کے ظاہر ہونے اور دعاؤں کے قبول ہونے کا سبب بنتے ہیں۔

لمحہ 27۔ محققین کے نزدیک حوادث کے اسباب کی دو قسمیں ہیں: قویٰ سماویہ اور قویٰ ارضیہ' سماویہ کی چار قسمیں ہیں۔ پہلی قسم ان کے نفوس کے وہ انفعالات ہیں جو مبادی' عقلیہ کے اثر سے پیدا ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک ان کلمات کی تاویل یہ ہے کہ ''اشخاص'' ان احکام کے ظاہر ہونے کا محل ہیں اور ان انواع کے امام ہیں جو مادہ سے مجرد اور ذات الٰہی کے اقتضا کی طرف رجوع کرتے ہیں جیسا کہ تجھے معلوم ہے۔

دوسری قسم ستاروں کی طبائع ہیں جو مختلف آثار کے ساتھ موالید میں تاثیر پیدا کرتے ہیں۔ ان کا اختلاف ان کی حدود کی وجہ سے ہوتا ہے' اسی مقام پر جہاں ستارے ان کو گھیرے ہوئے ہوتے ہیں اور یا تو ان کے خواص میں ان کی مدد کرتے ہیں، یا ان سے باز رکھتے، یا یہ اختلاف ان کی شعاعوں کے اختلاف کی وجہ سے ہوتا ہے۔ لہٰذا زمین پر صرف وہی امر واقع ہوتا ہے جس میں ان کی نظر کے اعتبار سے اس میں اس کی قوتوں کا اجتماع ہو گیا ہو یا یہ اختلاف ان کی شعاعوں کے مستقیم ہونے کی وجہ سے یا عدم استقامت کی وجہ سے ہوتا ہے۔

قدماء کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کا نکاح اس وقت ہو جب زہرہ برج حوت میں اور چاند اپنے نور کی ''تسدیس'' میں ہو اور اس وقت دونوں نحس سیارے (مریخ وزحل) اس کی طرف دیکھ بھی نہ رہے ہوں تو ان دونوں (میاں بیوی) میں اس قدر محبت اور اتفاق ہو گا کہ انسان کو اس سے تعجب ہو گا اور اگر کوئی شخص اس وقت نکاح کرے جب کہ زہرہ سنبلہ یا برج حمل میں چل رہا ہو اور مریخ (نحس اصغر) ان کے بالمقابل ہو یا چوتھے خانہ میں ہو یا زحل (نحس اکبر) اس سے ملا ہو یا بالمقابل اور مشتری ساقط ہو تو اس اتصال میں سخت مصائب آئیں گے اور ان دونوں میاں بیوی کے درمیان انتہائی بغض ہو گا کہ لوگوں کو اس سے تعجب ہو گا۔ انہوں نے اسی قسم کی اور بہت سی باتیں ذکر کی ہیں۔

تیسری نوع وہ قوتیں ہیں جو ادراکیہ، عقلیہ، متوہمہ اور تخییلیہ ہوں، جن کو سلسلہ موجودات، خواہ موافق ہوں یا مخالف، حاصل کرتا ہے اور عنایت خداوندی سے ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ ان قویٰ کے صادر ہونے کو وہ بنظر استحسان دیکھیں۔ لہٰذا اگر یہ کوئی ایسی چیز ہو جو سلسلہ کے اندر ہے مگر کسی ارضی سبب کی وجہ سے نہیں ہے تو اس کا سبب بھی زمین میں پیدا کر دیا جاتا ہے' یا یہ کہ اس کا کمزور سبب ہو اور اپنی عادت کے مطابق اس کی تاثیر اس حد تک نہیں ہوتی کہ مراد تک پہنچنے کا فائدہ دیتا ہے۔ یا یہ کہ وہاں کوئی دہ سبب ہو تو یہ استحسان اس کو پکڑ لیتا ہے تا کہ اس سے نقصان پہنچانے کی

قدرت کا اظہار نہ ہو۔ اسی سلسلہ کی یہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس ہوا میں جو نار ابراہیم کے اردگرد تھی، قوۃ زمہریر پھیلا دی اور بعض اوقات بنی آدم کے دلوں میں الہام کے اس امر کا اثر ہوتا ہے یا کبھی بہائم کے دلوں میں بھی ایسا ہوتا ہے، اس وقت اگر مقصد یہ ہو کہ کثیر التعداد لوگوں کی اصلاح کی جائے اور نفس اس الہام کو سمجھ رہا ہو اور قصد بھی نہ ہو تو اس انسان کو نبی کہا جاتا ہے۔

چوتھی قسم وہ قوتیں ہیں جن میں حوادث زمین کا ایک قسم کا سبب پایا جاتا ہو اور یہ اپنی تاثیر کی وجہ سے نہیں ہوتا لیکن اس شئے کی ایک نوع کی وجہ سے ہوتا ہے اس لئے کہ یہ ایک مخصوص اثر قبول کرتی ہے جس طرح ہم پانی کی نہر کھود کر پانی کو مسخر کر لیتے اور راستے بنا کر ہوا مسخر کر لیتے ہیں کیونکہ پانی کی طبیعت ڈھلان کو بہنے کی ہے۔ لہٰذا جب زمین کو ایسا کھودا جائے کہ جہاں پانی پہنچانا مقصود ہے اس سے پست اور کوئی جہت نہ ہو تو اپنی طبیعت کی وجہ سے اسی طرف ہو لیتا ہے۔ یہی حال ہواؤں کا ہے۔ انہیں بھی وہ چیزیں مزاحم ہوتی ہیں جن سے ان کا چلنا رک جاتا ہے لہٰذا جب ہوا کے مقابلہ میں راستے قائم کر دیئے تو ہوا کی طبیعت میں مزاحمت پیدا ہو گئی۔ اس مزاحمت کی وجہ سے کشتیاں مطلوبہ جہت کو چلتی ہیں۔ نفوس بشریہ کے لئے افلاک کی قوتیں ان کے اجزا اور اعضا کی طرح ہیں بلکہ بذات خود انہیں ان کا علم ہوتا ہے۔ انسان ان انوار کے سامنے عاجزی کرتا ہے جو ان پر غلبہ پائے ہوئے ہیں۔ میری مراد نفوس افلاک کی قوتوں سے ہے۔ خواہ ان کا نام نفوس فلکیہ یا ملکیہ یا نفوس مفارقہ من الابدان وغیرہ رکھا جائے۔ جب اس کی عاجزی بہت زیادہ ہو جاتی ہے تو اس کے افکار اور قوتیں اس طرف ہو لیتی ہیں جس کی خاطر انہوں نے عاجزی کی تھی۔ ان کے نزدیک اس استحسان کی مثال وہی ہے جو ہمارے ہاں کھانے کی صورت اور سیری اور اس کی لذت کی صورت میں حاضر ہوتی ہے اور ہمارے شوق بمنزلہ ان امور کے ہوتا ہے جو مبادی عالیہ سے نتیجہ کے فیضان کے لئے مقدمات کو حاضر کرنے کے لئے تیار کرتے ہیں۔

قویٰ ارضیہ بھی چار قسم کے ہیں۔ ایک قسم طبعی اور فعلی قوتیں ہیں جو عناصر اور عنصریات میں ودیعت کی گئی ہوتی ہیں یا خاص طور پر ہر صورت نوعیہ میں ہوتی ہیں چنانچہ آگ گرم کرتی ہے اور پانی ٹھنڈا کرتا ہے۔ دوسری قسم طبعی اور منفعل قوتیں ہیں، مثلاً درخت جلتا ہے اور لوہا پگھلتا ہے اور پتھر نہ جلتا ہے نہ پگھلتا ہے۔ تیسری ارادی اور فعال قوتیں ہیں مثلاً گویائی کی قوت جو انسانوں میں پائی جاتی ہے یا ضعف جسم کا پیدا ہونا اور نفس میں خوف اور شرم کا لاحق ہونا، نفس کو غصہ آتے وقت جسم کا سرخ ہو جانا، خوف کے وقت ٹانگوں کا لڑکھڑا جانا۔ اسی طرح یہ کمزور نفوس کے اندر بھی اثر کرتی ہیں جس طرح چشم بد لگنا۔ چوتھی قسم وہ ارادی قوتیں ہیں جو ان سماوی قوتوں یا نفوس ارضیہ سے متاثر ہوتی ہیں، جو ان سے زیادہ قوی ہوں۔ اس حد تک تو محققین فلاسفہ کا اتفاق ہے۔

لمحہ 28۔ ان کے بیان کے مطابق کچھ اور اسباب بھی ہیں۔ بعض اسباب کے متعلق تو ان کے محققین نے سکوت اختیار کیا اس لئے نہیں کہ انہوں نے دلائل کے ساتھ ان کی نفی کی ہے۔ ان اسباب میں سے نفس کلی کے احوال ہیں جب یہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ ان کی ایک حالت وہ ہوتی ہے جب ان کی استعداد کا ظہور شروع ہوتا ہے، پھر دوسری حالت استعداد کے مکمل ہونے سے لے کر ان کے الگ الگ ہو جانے تک ہوتی ہے اور ان میں سے انواع کے ''آئمہ'' ہیں۔ یہ وہ وجود ہوتے ہیں جن کے بدن تو صور مثالیہ ہوتے ہیں اور ان کے ارواح وہ قوتیں ہیں جن کا

افادہ نفس کلیہ سے ہوتا ہے۔ انہی میں سے عالم مثال ہے' انہی میں سے ملاء اعلیٰ' ملائکہ سفلیہ اور شیاطین ہیں۔ انہیں میں سے بنی آدم کے اعمال میں کیونکہ یہ ان کے جزئی ہونے کے اسباب ہوتے ہیں اور انہی میں سے اسما الٰہیہ ہیں جو عابد انسانوں اور فاضل فرشتوں سے اٹھتے ہیں اور عالم مثال میں نورانی وجود بن جاتے ہیں اور املاک ان کے مطیع و فرمانبردار ہوجاتے ہیں پھر جب کوئی پھیرنے والا اپنے نفس کو اس کی طرف ایک قسم کی حرکت دے کر اور انہیں کھینچ کر مطلوب کی طرف مائل کر لیتا ہے تو یہ بھی مائل ہوجاتے ہیں اور ملائکہ جو ان اسماء کے خادم ہوتے ہیں ان کے مطیع ہوجاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ایسے بہت سے امور ہیں جن میں سے ہم کچھ بعد میں ذکر کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

ہم نے مشاہدہ کیا ہے کہ قویٰ سماویہ اور قویٰ ارضیہ میں کوئی تناقض نہیں ہے بلکہ دونوں قسم کی قوتوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان کا فیض کلی ہو۔ اسی طرح ایک صورت میں کلیات جمع ہوجائیں اور امر حادث میں ان کے حق کی رعایت رکھی جائے گی مثلاً آئینہ' آئینہ میں میں دیکھنے والا اور وہ صورت جو آئینہ میں دکھائی دیتی ہے کیونکہ آئینہ اور دیکھنے والے میں ضروری بات وہ امر کلی ہے جو صورت پر منطبق ہوتا ہے۔ اسی طرح اس نظام میں جس کو ہم نے قویٰ سماویہ اور قویٰ ارضیہ کے لئے واجب قرار دیا ہے اور ان اسباب میں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے کوئی تناقض نہیں۔ البتہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک امر دوسرے کے مقابلے پر زیادہ شدید موجب ہوتا ہے اور دوسرا موجب نہیں ہوتا' صرف مساعد ہوتا ہے اور کبھی کوئی امر دوسرے امر کے مقابلہ میں زیادہ تقاضا کرنے والا ہوتا ہے جس کی وجہ سے صارف حادث کو زیادہ قوی کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ حق بات تو یہ ہے کہ اسباب ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں مگر اسی نے یہ چاہا ہے کہ ہر حقدار کے حق کا لحاظ رکھا جائے۔

لمحہ 29۔ جب امور ایک دوسرے سے ٹکرائیں اور فعال قوتیں منفعل قوتوں کے ساتھ مختلف اطوار اور لاتعداد طریقوں سے مل جائیں تو مختلف امور پیدا ہوجاتے ہیں جن میں سے بعض جواہر اور اشخاص ہیں اور بعض انفعال و حالات۔ ان امور میں کوئی شر نہیں پایا جاتا جس سے مراد ایسی چیز کا وجود ہے جس کا کوئی سبب نہ ہو۔ یا ایسی چیز کا عدم جس کی علت مکمل ہوچکی ہو لیکن کبھی اس میں شر ہوتا ہے' بایں معنی کہ اس میں ایک نظام کی مخالفت ہوتی ہے اور دوسرے کی نہیں ہوتی جس طرح کہ جلانا بہ نسبت نار کے خیر ہے اس لئے یہ اس کا کمال ہے اور اپنی نوع کے اقتضا کی تکمیل ہے اور اس حیوان سے نسبت سے شر ہے جو جل رہا ہو۔ پھر

بعض شرور جارہ ایسے ہوتے ہیں جو شر محض ممتنع کے قریب ہوتے ہیں۔ یہ اس طرح ہوتا ہے کہ وہ ان نظامات کے خلاف ہوں جو بلند قوتوں کے نزدیک محبوب ہیں۔ بعض شر ایسے ہوتے ہیں جو اس خیر محض کے قریب ہوتے ہیں جو انسان کے جسم کے لئے اعتدال حقیقی کی طرح ہوتے ہیں اور یہ اس طرح ہوتا ہے کہ وہ ان نظامات کے موافق ہوں جو بلند قوتوں کے نزدیک جلیل القدر اور محبوب ہوں۔ خواہ وہ بعض ضعیف اور مٹنے والی قوتوں کے مخالف ہی کیوں نہ ہو اور بعض ایسے ہوتے ہیں جن کا کمال انسانی جسم کے لئے نقاہت اور مرض کا سبب ہوتا ہے اور جب ایسی چیز ہو جو فلکی اور ارضی اسباب کے لئے شر ہے اور ان اسباب کا پکڑ لینا قبیح بھی نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کی سخاوت اس بات کی مقتضی ہوتی ہے کہ اس پر قبضہ کر لیا جائے۔ جب ایسی بات نہ ہو جو فلکی یا ارضی سبب کی کمزوری کا سبب ہے اور اس کا کھلا چھوڑ دینا قبیح نہ ہو تو اللہ تعالیٰ

کی سخاوت یہ تقاضا کرتی ہے کہ اسے وسعت دے دی جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سلسلہ فائضہ مندمجہ (یعنی فیضان والا اور محکم سلسلہ) جس طرح ان اسباب پر مشتمل ہوتا ہے اسی طرح ان امور پر بھی مشتمل ہوتا ہے جو اس سے پیدا ہوں۔ جس طرح ذات بعینہٖ ان اسباب کا تقاضا کرتی ہے اسی طرح اس وحی کا بھی تقاضا کرتی ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ بعض امور کے اجتماع کے وقت فیصلہ کرتا ہے۔ ان کی مثال مراتب اعداد کے خواص کی سی ہے اس لئے کہ خود مراتب کی طرح طبیعت عددیہ کا تقاضا ہی یہی ہے۔

لہٰذا رحمٰن اپنے اس فعل کے مطابق جو طبیعت مدبرہ کلیہ کے اندر موجودات میں ہوتا ہے۔ اپنے ہاتھ میں میزان لئے ہوئے ہے جس سے اسباب کا وزن ہوتا ہے چنانچہ یہ نیچے اور اوپر ہوتے ہیں اور راجح کو معلوم کر لیا جاتا ہے' اور راجح مرجوع پر حکم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''ہر روز وہ ایک نہ ایک شان میں ہوتا ہے'' زندہ کرتا ہے' مارتا ہے' (کسی کو) پست کرتا ہے اور کسی کو بلند کرتا ہے۔ نیز فرمایا: ''ہم نے آسمان اور زمین کو بے کار پیدا نہیں کیا' اس قسم کا خیال تو کافروں کا ہے'' یعنی بے کار و مہمل نہیں بنایا کہ بغیر تدبیر کے ہو اور کسی چیز کے وجود سے پہلے خاص طور پر اس کا تعین نہ کیا گیا ہو۔ لہٰذا وہ ہر وقت' ہر نفس اور ہر سبب کا نگہبان رہتا ہے اور ہر چیز کی حالت اس کے ساتھ مخصوص کرتا ہے۔ ان کے ساتھ اس کا معاملہ کبھی قبض' کبھی بسط کا ہوتا ہے۔ کبھی ملائکہ' نفوس انسانی اور بہیمی کو الہام ہوتا ہے اور جہاں کے اندر جس قدر موالیہ ہیں انہیں تبدیل کیا جاتا ہے تاکہ معاملہ خیر کی طرف لوٹ آئے۔ اس کی مثال اس فلسفی کی ہے جو پردہ کے پیچھے بیٹھ کر سامان و آلات کو حرکت دیتا رہتا ہے اور ان کی حرکت دیکھنے والوں کی نگاہیں اس طرف لگ جاتی ہیں اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ 'کون' کے اندر طبیعت مدبرہ کلیہ کا یہ فعل اس ترجیح کے لئے متجدد ارادوں اور بدلنے والے عزائم کے ساتھ ہو' بلکہ یہ فعل اس سے بہت بلند و بالا ہوتا ہے کہ تو اپنے ذاتی خیالات کا اعتبار کرے۔

لمحہ 30۔ جب پانی ہموار و نرم زمین واقع ہو تو اور اس کی طبیعت ان تمام جوانب کا وزن کرے جن سے یہ پانی بہہ کر اس میں آتا ہے' نیز ان تمام موانع کا وزن کرے جو وہاں اس کے طبعی میل کو روکنے والے ہیں تو یہ ممکن نہ ہوگا کہ پانی کسی جہت کو جا سکے' وہاں پست جہت موجود ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ کسی سے مزاحم ہو۔ جبکہ وہاں پانی کے بہنے کا راستہ موجود ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ نرم زمین سے پہلے سخت زمین کو اکھاڑے۔ اس کے تمام افعال اس کی طبیعت کے اصلی تقاضا کے مطابق اس کے اندر پائے جاتے ہیں جن سے یہ تجاوز نہیں کرتا۔ جب درخت کی جڑ اپنے اجزاء کے مادہ کو پی لے تو اس کی مدبر طبیعت اس کا وزن کرے گی۔ اس میں اسی مادہ کی رقت' غفلت' حرارت' رطوبت اور تمام وہ چیزیں پائی جاتی ہیں جنہیں درخت سے پیدا کرنا اس کے لئے ضروری ہے مثلاً ٹہنیاں، پھول، پتے، پھل، گوند وغیرہ۔ لہٰذا یہ مادہ ان چیزوں میں حکمت کے مطابق تقسیم ہو جائے گا۔ لہٰذا یہ ممکن نہ ہوگا کہ پتوں میں پھلوں کے مقابلہ میں زیادہ تصرف کر سکے، سوائے اس حالت کے کہ مادہ انکار کر دے۔

جب انسان کے پیٹ میں موذی اخلاط پیدا ہو جاتے ہیں اور اگر اس کی اصلاح ممکن ہو تو طبیعت انسانیہ اس کے سبب کی اصلاح کر لیتی ہے اور اسے جزو بدن بنا لیتی ہے ورنہ نکسیر یا اسہال کے ذریعے اسے نکال دیتی ہے اور اگر مادہ کی نافرمانی کی وجہ سے یہ نہ پھیلے تو طبیعت بدن کی گہرائیوں سے اسے نکال کر جلد کی طرف لے آتی ہے اور پھنسیاں پیدا ہو

جاتی ہیں اور اگر یہ بھی نہ ہو تو بخار یا کوئی خاص مرض کسی عضو کو لاحق ہو جاتا ہے۔ لہٰذا تمام طبائع ان مادوں کو جوان پر وارد ہوتے ہیں، طبعی میزان میں وزن کرتی رہتی ہیں اور ان میں کسی قسم کی ترجیح بلا مرجح نہیں پائی جاتی۔

لمحہ 31۔ موجودات میں طبیعت مدبرہ کلیہ اس بات کی زیادہ حقدار ہے کہ ہر چیز کا وزن کر سکے اور پست اور اونچا کرے بلکہ اگر تو حق بات معلوم کرنا چاہتا ہے تو طبائع کے میزان تمام کے تمام اس کے کلی میزان کا جز ہیں جو اس بات کے قریب ہیں کہ وہ حوادث جو خلا کے محال ہونے پر متفرع ہوتے ہیں، اس کی متقضیات میں سے ہوں۔ مثلاً اس بوتل کا ٹوٹ جانا جسے چوسا گیا ہو اور پانی کا اوپر چڑھ جانا اور اسی نالی کا چوسنا جس کا منہ اس پانی میں ہے، پھر یہ کہ جب ہوا درمیان میں نہ ہوگی تو پانی اوپر کو چڑھتا رہے گا۔ یہ اس طبیعت کلیہ کا تقاضا ہے جو سب میں ایک ہی چیز کی طرح سرایت کیے ہوئے ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جو مبداء اولیٰ کے بالکل قریب ہوگا اس کی طبیعت اس کا عین ارادہ ہوگی اور ارادہ عین طبیعت۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا ارادہ دائمی ہوتا ہے اور مصلحت کلی اس کا منشا ہوتا ہے۔ اب اصطلاح میں سلسلہ مندرجہ کو 'قدر' کا نام دیا جاتا ہے اور جو امور طبیعت کلیہ کے احکام سے وقتاً فوقتاً ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں انہیں ''قضاء'' کہا جاتا ہے۔

لمحہ 32۔ کشف صحیح کے ذریعہ سے یہ بات ہمارے نزدیک ثابت ہو چکی ہے کہ وجود کے اندر روحانی موطن ہوتا ہے جو اکثر حوادث کا مبداء ہوتا ہے مثلاً رسولوں کا بھیجنا اور ملتوں کا قائم کرنا۔ سلف نے روحانی موطن کا نام حظیرۃ القدس رکھا ہے اور ہمارے لئے یہ لوگ اچھا نمونہ ہیں۔ اگر تو ان کی حقیقت کو پہنچنا چاہے تو جان لے کہ جس طرح ہر نفس جزئی کے اندر بہت سے نقطے پائے جاتے ہیں اور ہر نقطہ کے مقابلہ میں خاص احکام اور خاص آثار ہوتے ہیں اور نفس جزئی کا مبداء ہوتا ہے جو ان نقاط کو واجب قرار دیتا ہے لہٰذا اگرچہ بادی النظر میں ان نقاط کا معاملہ مشتبہ ہوتا ہے لیکن ایسی گہری نظر جو ہر حقدار کا حق ادا کرے کسی چیز کو دوسری چیز کے ساتھ نہیں ملاتی۔ مثلاً ہم کہیں کہ انسانی فرد ناطق ہے، چلنے والا ہے، ہنسنے والا ہے، کاتب ہے، سفید ہے۔ وغیرہ وغیرہ، چنانچہ وہ نقطہ جس کے اعتبار سے وہ سفید ہے وہی نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ ناطق ہے اس لئے کہ تو ہر انسان کو ناطق دیکھتا ہے۔ اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ نقطہ جو نطق کو واجب قرار دیتا ہے تمام افراد انسانی میں مشترک ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ کئی ایک پتھر بھی سفید ہیں اور بہت سے انسان سیاہ ہیں۔ لہٰذا یہ نقطہ وہ نقطہ نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ بولتا ہے اگرچہ محل کے اعتبار سے دونوں اکٹھے وارد ہوتے ہیں۔ اسی طرح نفس کلیہ کے بھی بہت زیادہ نقطے ہوتے ہیں جو ہر اس حالت کے بالمقابل ہوتے ہیں جو اس پر عمر بھر میں ایک دن طاری ہوں۔ اور نفس کلیہ کے بعض نقاط وہ ہوتے ہیں جو تحقیق اور فعلیت کے بالمقابل واقع ہوتے ہیں اور یہ نقطہ واجب لذاتہٖ کی تمثال اس کی تجلی اور اس کی حکایت میں پایا جاتا ہے اور یہ حظیرۃ القدس کی اصل ہے۔

اور جب افلاک اپنے علوم اور قوتوں سمیت پائے جاتے ہیں تو پہلی چیز جس کا انہیں تصور ہوتا ہے وہ واجب لذاتہٖ ہوتی ہے۔ لہٰذا واجب لذاتہٖ کی صورت ایک ایسا امر ہوتا ہے جس پر اس کے تمام علوم کا اتفاق ہوتا ہے اور چونکہ وہاں لاعلمی اور اشتباہ نہیں ہوتا لہٰذا ضروری ہے کہ واجب لذاتہٖ کی یہ صورت ان نقاط پر کسی حد تک صادق آئے۔ یہ حظیرۃ القدس کا پہلا ظہور ہے۔ پھر جب اسباب نے اس بات کا تقاضا کیا ہے کہ ملائکہ علوی اور ان نفوس عارفہ کو پیدا کیا جائے جو ملائکہ علوی

کے ساتھ لاحق ہیں تو یہ اپنی اصلی سرشت کی وجہ سے اس بات پر مجبور ہو گئے کہ یہ حظیرۃ القدس کی طرف مائل ہوں جس طرح کہ ہر ذی طبیعت اپنے حیّز کی طرف مائل ہوتا ہے اور جب یہ اسباب اس نقطہ تک پہنچ گئے اور اس کو گھیر لیا اور اس کے سامنے عاجزی کی تو ان کی استعداد کے مطابق ان کے لئے احکام ہو گئے۔ اس وقت جا کر حظیرۃ القدس کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ اگرچہ حیزّ کے اعتبار سے یہ حظیرہ کسی خاص مکان کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتا لیکن اس کی حالت کی قریب ترین تعبیر یہ ہے کہ یہ رحمٰن ہے جو عرش پر بیٹھا ہے اور ملاء اعلیٰ عرش کو اٹھائے ہوئے ہے اور قضا وہیں سے نازل ہوتی ہے۔

لمحہ 33۔ جس طرح نباتات کے شخص کی طبیعت ہے' جس کے اندر اس کا تمام نظام پایا جاتا ہے' اسی طرح نفس کلی کی بھی طبیعت ہوتی ہے جس میں موجودات کی تمام اشیاء کا نظام مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے اندر افلاک وعناصر بھی ہوتے ہیں۔ پھر ان دونوں کے ازدواج سے موالید پیدا ہوتے ہیں۔ پھر یہ موالید ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں تو وہ اطوار پیدا ہوتے ہیں جن میں سے بعض خیر نسبی سے قریب اور بعض بعید ہوتے ہیں۔ جہاں تک بھی ہو سکے سخاوت میں بھلائی کا پہنچانا واجب ہوتا ہے۔ اسی قیاس پر بعض امور دیگر امور پر موقوف اور مترتب ہوتے ہیں۔ ان آثار میں نہ اختلاف ہوتا ہے نہ اتفاق اور نہ وسعت فعل اور علت قائمہ کے مطابق ترک فعل ہوتا ہے بلکہ وہاں ایک سلسلہ ہوتا ہے، جس سے طبیعت سرمو انحراف نہیں کر سکتی۔ پھر یہ سلسلہ اسی طریقہ پر ظاہر ہوتا ہے۔ اس سے تجاوز نہیں کرتا اور جب نفس کلی اور اس کی طبیعت کا فیضان اول سے ہے اور اس کے برقرار رکھنے سے یہ برقرار ہے تو یہ ضروری ہو گیا ہے کہ اس طبیعت کا سہارا اس جز پر ہو جو اول کے مشابہ ہے' نیز اس نقطہ پر ہو جو مبداء کو اپنے نقاط کے قریب کر دیتا ہے۔ یہی چمک دار نقطہ ہے جس کے نور نے موجودات کے تمام نقاط کو مغلوب کر رکھا ہے اور اپنی تاثیر کی وجہ سے ہر حادث کے اندر گھس گیا ہے۔ تمام وہ امور جنہیں ہم نے طبیعت کی طرف منسوب کیا ہے اسی سے نکلتے ہیں لہٰذا ہر اس شخص کی زبان جس نے اس نقطہ کا مشاہدہ کر لیا ہو اور اسے کائنات کی تمام چیزوں پر غلبہ دیا ہو اس سوال کہ ''مخلوق کو پیدا کرنے سے ہمارا رب کہاں تھا'' یہ جواب دیا جائے: ''عماء میں تھا جس کے نہ نیچے ہوا ہے نہ اوپر''۔ عماء میں ہونے کی وجہ سے بیشتر اس کے کہ یہ نوع یا جنس میں منقسم ہو اس کلی نقطہ کا تعلق اترتا ہے۔ خواہ اللہ تعالیٰ کے لئے ایسا نیا ارادہ ہی کیوں نہ ثابت ہو جائے جو حوادث کا سبب بنتا ہے۔ پھر جس طرح آگ کے ''جلانے والی'' ہونے کے لئے طبیعت ناریہ کے سوا کسی اور علت کا سہارا لینا پڑتا ہے اس ارادہ کو کسی اور چیز کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں ہوتی یا یہ کہ قضاء کے نازل ہونے کا اعتماد عرش پر ہے۔ نیز وہ یہ کہے کہ فرشتے اس کے مطیع ہو جاتے ہیں۔

لمحہ 34۔ حق تعالیٰ کے افعال اگرچہ بہت ہی زیادہ ہیں مگر یہ چار جنسوں سے باہر نہیں ہیں: ابداع' خلق' تدبیر اور تدلی۔

کسی چیز کا عدم محض سے وجود کی طرف لانا ابداع کہلاتا ہے اور یہ فعل اللہ تعالیٰ اور ان چیزوں کے درمیان ہے جو ایک حالت سے دوسری حالت میں متغیر ہوتی ہوں اور جس کی حاجت ہوتی ہے وہ امکان اور کسی چیز کا لذاتہ غیر واجب ہوتا ہے۔ اس کا مرجع لزوم اور ضرورت کی طرف ہے۔

اور خلق یہ ہے کہ کسی چیز سے کوئی اور چیز بنا دی جائے' اور یہ اللہ اور ان چیزوں کے درمیان ہوتا ہے جو ایک

حالت سے دوسری حالت میں بدلتی ہوں۔ اس پر جو اثر مرتب ہوتا ہے وہ افلاک' عناصر اور دیگر تمام انواع کا اپنے خواص اور آثار کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ اس میں اس بات کی حاجت ہوتی ہے کہ ایک چیز کا پہلے مادہ موجود ہو اور اس پر مدت گزر چکی ہو اور نفس کلی میں تمام کی تمام حالتیں شامل ہوں لہٰذا جب قوتیں قوتوں کے ساتھ ملتی ہیں تو یہ امتزاج اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ نفس کو جسم کے اس حصہ کے تناسب کی طرف اتار دے اور مرجع اس چیز کے ظاہر کرنے کی طرف ہوتا ہے جو چھپی ہوئی ہو اور یہ کہ ایک چیز جو وجود کے ساتھ موجود ہو کوئی اور وجود پہن لے۔ اس کی فاعل ذات الٰہی ہوتی ہے کیونکہ نفس کلی میں اس کا دائمی فیضان ہوتا ہے اور نفس کلی اپنے خواص اور احکام کے ساتھ اس کا قبول کرنے والا ہوتا ہے۔

تدبیر یہ ہے کہ جہاں میں اس طرح ردوبدل کیا جائے کہ حوادث مصلحت کلی کے مطابق ہو جائیں اور یہ فعل اللہ اور ان امور کے درمیان ہوتا ہے جو کثرت تعداد کا محل ہیں۔ مثلاً نوع اور اشخاص اور یہاں قویٰ کے قویٰ کے ساتھ امتزاج کی ضرورت ہوتی ہے' بشرطیکہ یہ تدبیر اس شر تک نہ لے جائے جس کو دور کرنے کو اللہ کی حکمت میں واجب سمجھا جاتا ہے اور اس کا مرجع ذوارادہ اشخاص کی طرف الہام کرنا ہوتا ہے مثلاً ملائکہ، انسان اور بہائم۔ نیز اس طرف ہوتا ہے کہ موالید کی طبائع کا احاطہ کیا جائے اور وہ تقریبات ہیں جو ان دونوں قسموں سے مرکب ہیں اور فاعل ذات الٰہی ہوتی ہے' بشرطیکہ نفس میں اس کا فعل صنف اور جنس بنانے کا ہو۔ نیز اس شرط پر کہ مصلحت کلی اور موالید کے قبول کرنے والے کا خیال رکھا جائے۔

تدلی کی اصل اللہ تعالیٰ کا جہان میں مدبر ہو کر ظاہر ہونا ہے جس طرح نفس ناطقہ جسم کی تدبیر کرتا ہے۔ خواب یا بیداری یا معاد میں اس تجلی کے عکس کا ظاہر ہونا بھی اسی ظہور کی فرع ہے لہٰذا پہلی قسم کا ظہور جہان میں تدبیر کا منشا ہے اور دوسرا اللہ اور بنی آدم کے اشخاص کے درمیان اور جو اثر اس پر مرتب ہوتا ہے وہ علم اور رشد یا تکمیل نفوس کا ظاہر ہونا ہے اور یہاں حاجت یہ ہوتی ہے کہ ان مذاہب اور ان کی تکمیل مصلحت سے ہو اور یہ اس دن تدلی کے سوا مکمل نہ ہو گی۔ اس کا فاعل حق تعالیٰ ہوتا ہے بشرطیکہ وہ تدبیر کے ساتھ موصوف ہو اور اس فعل کا قبول کرنے والا تمام کی تمام نوع انسانی اور بذات خود اشخاص انسانی ہیں۔

لمحہ 35۔ خلق ابداع کی تکمیل ہے' تدبیر خلق کی تکمیل اور تدلی تدبیرات کی تکمیل ہے۔ یہ اسی طرح ہے کہ خلق سے مراد مادہ اور صورت میں وہ تصرف ہے جس سے بہت سی صورتیں حاصل ہوں اور یہ تمام نفس کلی اور مادہ کے اندر شامل ہیں۔ لہٰذا جب مخلوق ظاہر ہو گئی تو یہ امتزاج قویٰ اور مشتمل چیزوں کے ظاہر ہونے کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے ''مبدع اول'' کو ایجاد کیا تو اس میں تھوڑا سا اجمال ظاہر کیا جو ابد تک ظاہر ہوتا رہے گا۔ پھر جب انواع اور اشخاص اپنے آثار اور احکام کے ساتھ ظاہر ہو گئے اور مزاحمت واقع ہوئی تو طبیعت کلی نے ان تمام کا وزن کیا اور اس نے اس مصلحت کو جو اس طبیعت اصل سے پیدا ہوتی ہے، راجح قرار دیا۔ تدبیر کے اندر صرف یہ چیزیں پائی جاتی ہیں: علوم اور ارادات کا پیدا کرنا' جو آخر میں حظیرۃ القدس میں عکس اور تجلی اعظم کی تجلیات کے ظاہر ہونے پر منتہی ہوتی ہے اسی لئے کہ کون کی طبیعت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ جن امور کو فعل' خلق نے مضبوط کر رکھا ہے انہیں تدبیر باطل نہ کرے اور نہ تدلی ان امور کو باطل کرے جنہیں تدبیر نے مضبوط کر رکھا ہے لہٰذا تدبیر سے جنس شیاطین اور نفوس امارہ کی جنس باطل نہ ہو گی بلکہ ملائکہ اور انبیاء مبعوث ہوں گے جو ان امور کے خلاف کوشش کریں گے جن کی کوشش شیاطین کرتے ہیں۔

لمحہ 36۔سب سے بڑا سبب جس کا خیال جہان میں رکھا جاتا ہے وہ مصلحت کلی ہے اور مبداء سے ان اشیاء کا لازمی طور پر صادر ہونا ہے جن کا مطالبہ اسباب کرتے ہیں۔علیٰ ہذا القیاس دیگر امور اور ہمارے نزدیک ان کا ارادہ واجبہ سے ظاہر ہونا اور ان دونوں سے مزاحم نہیں ہوتا چنانچہ جس طرح نباتات کے وجود کے اندر ایک قوت ایسی ہوتی ہے جو جسم کے مناسب حال غذا کو بدلنے کا مبداء ہے‘ نیز یہ قوت پتے‘ پھول‘ ٹہنیوں اور پھلوں کو ایک طرز میں اگانے کا مبداء ہے کہ یہ اس طرز سے تجاوز نہیں کرتا پھر یہ محدود وقت کا مبداء ہوتا ہے جس میں نباتات ایک معلوم حد تک نشو و نما پاتی ہے۔پھر محدود وقت تک اسی نمو پر قائم رہتی ہے۔اس کے بعد اس مبداء کا وقت آتا ہے جس میں نباتات مرجھا کر خشک ہو جاتی ہے۔ پھر وقت آتا ہے کہ اس کے آثار سے نفع حاصل ہوتا ہے۔اسی طرح شخص اکبر کی طبیعت کلی ہوتی ہے‘ جس کا حکم یہ ہوتا ہے کہ اعضا کے لئے اس طرز پر ہونا ضروری ہے۔نیز ہر نوع بلکہ ہر چیز جو ایسی ہو اس حکم سے انحراف نہیں کرتی۔

جب ایک ہی چیز کے اندر دو سببوں کا تنازع ہو جائے تو ضروری ہے کہ حکم ایسا ایسا ہو اور خیر عظیم کا سبب مفقود ہو اور اس نظام کلی کے مطابق جو طبیعت کے اندر مندرج ہے اس کا موجود کرنا قبیح نہ ہو تو سبب بعید کا پھیلا دینا ضروری ہو جاتا ہے۔یہاں تک کہ یہ سبب مفید ہو جائے اور بالآخر معاملہ خیر عظیم پر ختم ہو جاتا ہے۔کبھی ابتدا اور انتہا کو زمانے کے ادوار کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔چنانچہ کہتے ہیں کہ ’’ہدایت‘‘ اور ’’نہایت‘‘ میں ادوار زمانہ کی تاثیر پائی جاتی ہے۔اس بیان میں تسامح پایا جاتا ہے لیکن صریح اور حق بات یہ ہے کہ یہ ہدایات و نہایات اس طبیعت کلیہ کے جوار کی طرف منسوب ہیں جو کبھی ان ادوار کے اندر شامل تھی اور کبھی ان میں پھیلی ہوئی تھی لیکن چونکہ ان کا ماخذ بہت دقیق ہے یہ ان سے اتر کر زمان تک پہنچ جاتے ہیں مگر حق بات اہل حق سے مخفی نہیں ہوتی۔

لمحہ 37۔وہ اسباب جن کا خلق اور تدبیر میں لحاظ رکھا جاتا ہے ان میں سے افلاک کے طبائع بھی ہیں کیونکہ موالید کو صرف اس وقت پیدا کیا جا سکتا ہے جب قویٰ مولدہ کا اجتماع ہو۔پھر مولود کی تعین مین ان قوتوں کی حالت کا لحاظ رکھا جاتا ہے اور جب نطفہ رحم میں جاتا ہے اور کسی قسم کے ابتلاء کے بعد علقہ (خون کا لتھڑا)‘ پھر گوشت کا غیر مخلقہ لتھڑا پھر مخلقہ لتھڑا بن جاتا ہے تو یہ لتھڑا اس بات کیلئے تیار ہوتا ہے کہ اس میں وہ طیب اور معتدل ہوا پیدا ہو جائے جو روحانیات کے مشابہ ہو جاتی ہے اور جب یہ ہوا پیدا ہو جاتی ہے تو نفس کلی بذات خود ایک ایسی جزئی بن کر وہاں نازل ہوتا ہے جو اس دن ہیئت عالم کے مناسب ہوتی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تو نفس ناطقہ کا اعتبار فاعلی اور قابلی جہت کے خیال سے کرے گا تو یہ ایک گیند کے مشابہ ہوگا جس کی نچلی میخ کی انتہا والدین کی اصل میں ہوگی اور اس کی اوپر کی میخ وہ ہوگی جہاں سے اس کی اصل کا انتشار لوگوں میں ہوا اور لوگوں نے اس کے فضل کو قبول کیا اور آخر دو میں سے ایک خود اپنے آپ کو قبول کیا اور جو اس میں اثر کرتا ہے یا اثر پذیر ہوتا ہے اس کا مقابلہ کرنا ان امور کی طرف توجہ دلاتا ہے جن کی شان ہی یہ ہے کہ وہ اس کی طرف سخت کھنچیں اور مائل ہوں‘ نیز ان کی طرف جو اس سے کم جذب کرتے ہیں وعلیٰ ہذا القیاس۔ان جہات کا وہی جانشین ہو سکتا ہے جس کا تقاضا اس دن عالم کرتا ہے لہٰذا جب طالع صاحب السباع (درندوں والے) پر مشتمل ہوگا تو لازمی طور پر اپنی فاعلی جہت کے اعتبار سے نفس قوی پیدا ہوگا اس طرح وہ اپنے دشمن پر غالب آئے گا اور دشمن اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ اسی طرح اس کی ہر جہت اس طرح پیدا کی جاتی ہے جس طرح عالم کی ہیئت اسے عطا کرتی ہے۔ان جہات نفس کا نام بخت

رکھا جاتا ہے چنانچہ جب بچہ بڑا ہو جاتا ہے اور دشمنوں کے ساتھ کے معاملہ کا وقت آتا ہے تو حق تعالیٰ اس کے بخت کی حالت کو نگاہ میں رکھتے ہیں اور اس کی مخالفت کے لئے ان لوگوں کو برانگیختہ کرتے ہیں جن کے متعلق انہیں علم ہوتا ہے کہ یہ عنقریب ان کے دلائل کو باطل کر دے گا۔ نیز اللہ تعالیٰ ایسے اسباب برانگیختہ کرتا ہے جن کی وجہ سے یہ غالب ہو جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ وہ اس شخص کی حالت کا خیال اس کے بخت کے عطیہ کے مطابق رکھتا ہے۔ نیز ان تمام لوگوں کی حالت کا خیال رکھا جاتا ہے جو اپنے بخت کے عطیہ کے مطابق معاملہ کرتے ہیں اور نفس کے اندر جہات اس وقت پیدا کی جاتی ہیں جب کہ جنین میں نفس ناطقہ کے ظہور کی ابتدا ہوتی ہے۔ اسی لئے صادق مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نفخ روح کے وقت اللہ کے حکم سے چار باتیں لکھی جاتی ہیں: نر ہے یا مادہ ہے۔ بدبخت ہے یا خوش بخت۔ اس کے اعمال کیسے ہوں گے اور اس کا رزق کیا ہوگا؟ نطفہ کے گرنے کا وقت اس کی بنیاد کے ظہور کا وقت ہوتا ہے اور بچے کے گرنے کا وقت اس کے فعل کی دلیل ہے۔ اسی طرح حوادث کے پیدا کرنے کا وقت اس کے فعل کی دلیل ہے۔ اسی طرح حوادث کے پیدا کرنے اور ان کے پورا کرنے میں کواکب کے حال کا خیال رکھا جاتا ہے چنانچہ جب حالت یا دوستی کا اقتضا کرے تو اسے پورا کر دیا جاتا ہے اور ہر چیز کے لئے وہ اسباب مہیا کر دیئے جاتے ہیں جو اس کے مناسب ہوں۔

لمحہ 38۔ جہاں تک کرہ ارض اور کرہ ماء کا تعلق ہے زحل کی طبیعت ان کے حال کے ساتھ نفرت کا تقاضا کرتی ہے اور ان پر ایسا مرض طاری نہیں ہوتا جو انہیں اپنی طبیعت سے نکال کر موالید کی طبیعت کی طرف لے جائے۔ اس زحل میں اس قدیم کی طرف بھی نسبت پائی جاتی ہے جو صورت سے بلند و بالا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو شعائر اللہ کی تعظیم بھی نہ ہوتی اور کوئی چیز قدیم موالید کی طرف سے ہی منسوب ہوتی۔ مریخ کا خزانہ غضب اور جنگ ہے اور اس حرارت اور طبیعت کا شعلہ زن ہونا ہے جسے غضب اور جنگ بھڑکاتے ہیں اور جہاں تک مشتری کا تعلق موالید کے ساتھ ہے یہ سعد ہے۔ وہ بات جس کا فیضان اس سے ہوتا ہے یہ ہے کہ موالید کے ساتھ یہ سعد ہے۔ وہ بات جس کا فیضان اس سے ہوتا ہے یہ ہے کہ موالید کی صورت نوعیہ کا حکم اپنی صحیح حالت میں ظاہر ہو۔ لہٰذا مشتری کی قوت کے وقت جب صورت انسانیہ کسی جسم میں ظاہر ہوگی تو اس کا حکم یہ ہوگا کہ وہ کامل اور وافر ظاہر ہو۔ سورج کا حکم غلبہ کا ہے اور اس میں تعظیمی طور پر آسمان اور زمین کے چاندوں کی طرف توجہ اور عبادت کا مفہوم مضمر ہے۔ زہرہ کا فیضان ان تمام چیزوں کا ہوتا ہے جو تکمیل صورت کی فرح بنتی ہیں۔ مثلاً جب اس میں صورت نوعیہ کی تکمیل ہو جائے تو وہ خوبصورت ہوگا۔ اس طرح زہرہ روح پر دلالت کرتا ہے۔ اس لحاظ سے کہ یہ نکل کر عالم قدس کے مشابہ ہو جاتی ہے اور اس کے رنگ میں رنگی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر عارف کو اس سے حصہ ملتا ہے۔ علوم مرتبہ و مدونہ عطارد کے لئے ہیں اور وہ توجہ جو اس تک پہنچاتی ہے وہ اس قسم کی ہوتی ہے جسے بیدار ہونے والا پہلی بار بیدار ہوتے ہوئے محسوس کرتا ہے جبکہ وہ اچھل کر تکلف سے بیدار ہو جاتا ہے۔ چاند کا حکم معقول نسبت ہے اور اسی نسبت میں پاکیزگی کے معنی بھی پائے جاتے ہیں۔ ان ستاروں کے معانی کئی جہتوں سے ہر نفس ناطقہ میں پائے جاتے ہیں لیکن غلبہ اور مغلوبیت ان اتصالات کے حکم سے ہوتا ہے جو روح پھونکنے کے وقت ہوتے ہیں۔ اس میں نفس فلکی اترتا ہے۔

لمحہ 39۔ ملک کا لفظ مختلف حقیقتوں پر کئی معنوں میں مستعمل ہے۔ ایسے معنی جو آثار و خواص میں سے ہیں اور

صفات نفسیہ میں سے نہیں ہیں لہٰذا اس حیثیت سے نفوس کلیہ کے ساتھ خلق اور تدبیر کے احکام وابستہ ہیں انہیں ملائکہ کہا جاتا ہے، ان ملائکہ کے فیوض اور علوم کی مشابہت طبائع کے ساتھ ہے۔ چنانچہ نہ تو ان میں متجد دارادے پائے جاتے ہیں نہ تغیر اور نہ ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیلی، لیکن انسانی نفوس اپنی ہمتوں کی وجہ سے ان تک پہنچ جاتے ہیں اور ان کے علوم ان کے ساتھ جا ملتے ہیں اور ان کے مشابہ ہوتے ہیں لہٰذا ان نفونس کی قوتیں نفوس انسانی کے لئے طبیعی مثالیں پیش کرتی ہیں۔ حکمت کل میں یہی تشخص کا سبب بن جاتا ہے۔ اسی طرح روزمرہ کے حوادث بھی ان کے بہت سے علوم متشخص کر دیتے ہیں۔

لمحہ 40۔ جان لیں کہ نفس فلکی میں گذشتہ اور آئندہ امور کے متعلق ایک قسم کا ادراک پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ ہے کہ یہ اپنے نفس میں ادراک کے زمانہ میں اپنے رب سے ان حوادث یومیہ کا ادراک پالیتے ہیں، جو ان کے قول سے منظم ہوتے ہیں۔ نیز ان اسباب کے ادراک کو پالیتے جو اس ادراک کو پہنچاتے ہیں۔ حوادث کے اسباب یا تو طبعی ہوتے ہیں اور نفوس فلکیہ ان کا ادراک اسی طرح کر لیتے ہیں جس طرح ہم اپنے بدن کے عوارض کا ادراک کر لیتے ہیں یا ارادیہ ہوتے ہیں، جو نفوس فلکیہ سے پیدا ہوتے ہیں اور کسی ایسے طبیعی یا الٰہی سبب تک پہنچتے ہیں جس کا فیضان اس دن صرف خیر کی رعایت رکھتے ہوئے کیا گیا ہو اور اس قسم کے فیضان کے لئے وہ قوی ترین قوتیں جن کے حال رعایت رکھی جاتی ہے، افلاک کی قوتیں ہیں۔ لہٰذا نفوس فلکیہ قریب ترین چیز ہیں جن پر باری تعالیٰ کی طرف سے ماضی اور مستقبل کے علوم کا فیضان ہوتا ہے اور ان نفوس فلکیہ میں سے قوی ترین فلک اطلس (فلک الافلاک) کا ہے کیونکہ یہ اپنے سے نیچے کے تمام افلاک پر قاہر ہے چنانچہ تو دیکھتا ہے کہ یہ حرکت یومیہ میں جو مشرق سے مغرب کو ہے ان پر غالب آتا ہے۔ اس کے بعد دیگر افلاک آتے ہیں پھر نفوس عالیہ ان کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ نفوس کی مدت کا ادراک ادراک عقلی ہی ہو سکتا ہے لیکن جب ادراک عقلی کل کی چیز کو تمام اطراف سے گھیرے ہوئے ہو تو یہ ''شخص'' کے جزئی ادراک سے بہت ہی قریب ہوتا ہے۔ پھر جب ''نفوس سافلہ'' اس کے ساتھ مل جاتے ہیں تو تخیل اور توہم واقع ہوتا ہے اور نفوس فلکیہ عمدہ مناسبت کی وجہ سے ان کی واضح مدد کرتے ہیں۔

القصہ جب عالم واقع ہونے والے علوم کے فیضان کی وجہ سے آمادہ ہو جاتا ہے تو بیدار ہو جاتا ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب کوئی دور پایا جائے اور اس کی نوعیت کی طرح کی چیز پیدا ہو جائے اور علوم ان چیزوں میں پلٹ جائیں جو ان کے مناسب ہیں تو تمہارے ''مدارک'' میں ایک صورت کا وجود آجاتا ہے اور تمام مدارک اس کے تصور میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں یہ صورت اس وقت اپنے رب کے سامنے فضا میں معلق ہو کر کھڑی ہو جاتی ہے اور اس نے نہ کسی اس چیز پر سہارا کیا ہوتا ہے اور نہ کسی مخصوص نفس پر۔ اس وقت اس کا نام ''صورۃ مثالیہ'' رکھا جاتا ہے۔ جہان کے لئے اس کا حکم یہ ہے کہ جو بھی زمین کا حادث ہے وہ زمین میں پیدا ہونے سے ایک مدت پہلے اس جہان میں پایا جاتا ہے۔ رہا وجود اجمالی جسے ''لوح محفوظ کی لکھت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ پچاس ہزار سال کے قریب ہوتا ہے۔

بڑے اہم امور کا تفصیلی وجود ایک ہزار سال کے قریب ہوتا ہے جسے ''وجود الارواح قبل الاشباح'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہر واقعہ کی ایک روح ہوتی ہے جو اس کے مناسب ہوتی ہے۔ اس کے بعد جب اس کے واقع ہونے کا وقت آتا

ہے اور اللہ تعالیٰ عرش پر سے اس کا فیصلہ کر دیتے ہیں اور ملائکہ اس کے فرمان کے مطیع ہو جاتے ہیں تو یہ امور زمین میں اترے ہیں۔

ان میں ایک یہ بھی ہے کہ بعض اوقات بلند نفوس کسی وجود یا تدلی کو خاص مکان میں اپنی طرف کھینچتے ہیں جس سے پانی جسم مطلق کا رنگ اختیار کر لیتا ہے اور ایک ایسا وجود پیدا ہو جاتا ہے جو ''خرق والتیام'' کو قبول نہیں کرتا مثلاً موسیٰ علیہ السلام کی آگ اور مریم کے لئے جبریل کا بشر کامل بن کر سامنے آنا اور جبریل کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایمان، احسان، اسلام اور قیامت کی علامات کے متعلق سائل بن کر آنا۔

ان میں سے جنت اور دوزخ کا ظاہر ہونا ہے مگر جنت اور دوزخ کا منبع عرش کے نیچے ہے جہاں عرشی قوتیں فلکی قوتوں کے ساتھ ملتی ہیں۔ اب رہا، ان کا مظہر تو کبھی یہ زمین کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے صلوٰۃ کسوف پڑھتے ہوئے آپ کے اور قبلہ کی دیوار کے درمیان ظاہر ہوا۔ کسی کو یہ کہنا جائز نہیں کہ یہ چیزیں صرف اپنی صورت میں ظاہر ہوئی تھیں اس لئے کہ صورت میں حرارت اور روح نہیں پائی جاتی۔

اس میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ فرشتوں کی ایک قسم ایسی ہے جن کے سینوں میں ان کے استعداد کے مطابق الہام اور عالم مثال کی نقل اور تشبیہات کا فیضان ہوتا ہے چنانچہ انہیں ان کا الہام ہوتا ہے۔ نیز ان کے سینوں میں دعائیں ڈال دی جاتی ہیں تو یہ جود الٰہی کے تیار کرنے والے دروازوں میں سے ایک دروازہ بن جاتا ہے۔ بعض اوقات انہیں اس بات کی بھی قدرت حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق شکل اختیار کر لیں۔ یہ اس طرح ہوتا ہے کہ خوف کا تخیل مختلف درجوں پر قوت مثالیہ سے تائید حاصل کرتا ہے۔

اسی میں سے ہے کہ دیکھنے والے کی نگاہ مطلوبہ ضرورت پر پڑے۔ اسی میں سے ہے کہ پانی جسد مثالی کے ذریعہ ایسا جسم مطلق بن جاتا ہے جس کی روح مثالی طور پر یہ ''شخص'' اور اس کا جسم ہوتا ہے۔

لمحہ 41۔ اسی طرح ملائکہ کا اسم ان نفوس پر بولا جاتا ہے جن کا پیدا ہونا طبیعۃ کلی کے نظم کو ضروری قرار دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح یہ اسم افلاک عناصر اور کواکب سے انواع اور اجسام کلیہ کے صادر ہونے کا مطالبہ کرتا ہے، اسی طرح اس کا یہ بھی مطالبہ ہوتا ہے کہ ایسے اشخاص صادر ہوں جن کے بغیر اپنے اصل وجود یا کمال مطلوب میں کوئی بڑی نوع منتظم نہیں ہو سکتی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اللہ کو ازل سے ہی اس بات کا علم تھا کہ جب لوگوں کو فلاں فلاں مزاج پر پیدا کیا جائے گا اور ان کی ''تدبیر'' کو افلاک کی فلاں فلاں شکل دی جائے گی تو اس سے یہ ضروری ہو جائے گا کہ ان میں عام فساد برپا ہو اور ان کا اکثر امور میں مناسب طریقہ کے خلاف طرز اختیار کرنا اللہ تعالیٰ کی حکمت میں اس بات کو واجب قرار دیتا ہے کہ ان میں ایک ذکی انسان بھیجا جائے جو اللہ تعالیٰ کے حکم اور شان کو بلند کرے اور اس کے طریقوں کو مدت دراز تک باقی رکھے۔ نیز یہ کہ فلاں شخص میں یہ (ذکی) انسان بننے کی سب سے زیادہ صلاحیت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا فلاح ایک ایسا وجود بن گیا کہ جب پہلی بار اس کی مثال بنی تو نوع کی سی مثالی بنی۔ لہٰذا یہ فرد انواع کے حکم میں ہوا۔ اسی طرح لوگوں کو بھی یہ معلوم ہے کہ جب انہیں قیامت کے دن اکٹھا کیا جائے گا تو ان میں سے اکثر لوگ بداعمالیوں میں ملوث ہوں گے لہٰذا ان کے سدباب کا اختیار اس ''جود اعظم'' کو دیا گیا جو ان کی میل کچیل دھو ڈالے اور ان سے گندگی دور کر دے۔ لہٰذا ان جہالت

کی نگہداشت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ظہور ایسے ذکی نفس کے بغیر ممکن نہ تھا جو اللہ کی مخلوق کی شفاعت کرنے میں اللہ تعالیٰ کی طرف ہمہ تن توجہ کے رنگ میں رنگا ہوا ہو اور ان نور الٰہی کی خدمت کرنے کی اس قدر مشق کی کہ وہ مخلوق کا ایک عضو اور ان کا ترجمان بن جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کو ازل ہی میں اس کا علم تھا اور اس کی صورت مثال بن کر سامنے آئی تو وہ انواع کی صورت میں تھی۔ اسی طرح معاملات بھی نوری جسموں میں پھونکے ہوئے نفوس کے ظہور کے بغیر منتظم نہیں ہوتے۔ ان کا بھی اللہ کو ازل میں علم تھا اور ان کی صورتیں بھی جب مثال بن کر سامنے آئیں تو انواع طرح بن کر آئیں۔ انہی میں سے جبرائیل، میکائیل، اسرافیل، عزرائیل اور حاملین عرش ہیں جو لوگوں کے لئے دعا کرتے ہیں۔ ملاء اعلیٰ کے سردار بھی ان ہی میں ہیں۔

لمحہ 42۔ اسی طرح ملائکہ کا اسم ''شخص اکبر'' کی ان قوتوں اور استعدادات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جن کا مرجع جہان کا ایسے طریقہ پر صادر ہوتا ہے کہ جس کا اقتضا جود ذاتی کرتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ قوتیں عالم مثال میں تعینات اور تمثلات کا لباس پہن لیتی ہیں۔ لہٰذا یہ لباس پہننے کے بعد انہیں ملائکہ کا نام دیا جاتا ہے چنانچہ حدیث میں مروی ہے کہ ہر قطرہ جو اترتا ہے اس کے ساتھ ایک فرشتہ اترتا ہے۔ پھر وہ کبھی بھی اوپر نہیں چڑھتا۔ نیز یہ بھی روایت کی جاتی ہے کہ فلاں خواب میں فلاں فلاں چیز کی مثال دی گئی ہے۔

لمحہ 43۔ اس صنف کی عظیم ترین صنفوں میں سے انواع کی مثالیں (مثل الانواع) ہیں کیونکہ اس سلسلہ میں ان کا بہت بڑا اثر ہے۔ اس لئے کہ جب نفس کلی نوعیت کے نظامات کو سمجھ لیتا ہے اور پھر ان میں غور کرنے اور ان کیفیتوں کے ذریعہ سے جو اسے حاصل ہوتی ہیں اپنی عقل میں ان کی تشریح کرتا ہے اور اس پر نفوس افلاک وغیرہ کا تعقل وارد ہوتا ہے تو یہ مثالی صورتوں میں مثل انواع اپنے رب کے سامنے کھڑی ہوں گی اور اس کے فیض سے ناسوت میں جہاں تک ہو سکے ان کے وافر و کامل ظہور اور ان کے احکام کے ظہور کا مطالبہ کریں گی پھر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان کے ظاہر ہونے پر سماوی اور ارضی اسباب کا اجتماع ہو جاتا ہے اور جو کچھ یہ مثالیں مدت سے مانگ رہی ہوتی ہیں انہیں دے دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد کوئی رکاوٹ درمیان میں حائل ہو جاتی ہے تو وہ چیز ممنوع و مبغوض ہو جاتی ہے اس لئے کہ مثل شدت کے ساتھ اس کا مطالبہ کرتی ہے اور اپنی مراد حاصل کرنے کے لئے جھگڑتی ہیں اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسباب کسی ایسے طوفان کے لئے اکٹھے ہو جاتے ہیں جس میں نوع کے افراد ہلاک ہوں تو اس وقت یہ مثالیں زبان قال سے نہیں بلکہ زبان حال سے یہ مطالبہ کرتی ہیں کہ زمین میں ان کا بت باقی رہ جائے۔ یہی وجہ تھی کہ نوح علیہ السلام نے حکم دیا تھا کہ ہر نوع میں سے دو جوڑے لادلئے جائیں اور نبی کریمؐ نے پہلے کتوں کو قتل کرنے کا حکم دیا پھر اسے ناپسند کیا اور فرمایا کہ یہ بھی ایک امت ہے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ مثالیں اپنے رب کے سامنے کھڑی زمین میں بت کی صورت کے وجود کی درخواست کر رہی تھیں۔ اسی طرح ملک کا نام ان نفوس انسانیہ کے لئے بولا جاتا ہے جو ملائکہ کی اجناس میں سے پہلی دو جنسوں کے ساتھ لاحق ہو گئی ہیں۔ پھر عرش کے گرد چکر لگاتی ہیں اور وہاں کی کیفیت میں مکمل طور پر جذب ہو چکی ہیں اور اس سے انہیں کوئی چیز نہیں روک سکتی۔ لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ کی سخاوت کے لئے تیار ہو جاتی ہیں اور اہل زمین کی بہت سی دعاؤں کو سنتے ہیں اور بہت سے الہامات کی زبانیں بن جاتے ہیں۔ گردش کے آخری نصف میں نفوس کی کثرت کے وقت اس قسم کی چیزیں کثرت سے

واقع ہوتی ہیں جس کی وجہ سے اکثر ان میں جھگڑا پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''مجھے ملاء اعلیٰ کے متعلق کچھ خبر نہیں ہے جب وہ جھگڑ رہے تھے۔'' ان کی مخاصمت جھگڑے اور باتوں کے ذریعہ سے نہیں اور نہ ہی ایک دوسرے کو للکارنے اور دھکیلنے سے ہے لیکن ہر جزئی نظام کے مطابق حق کی دو عنایتیں ہیں اور ہر ایک کے لئے ملاء اعلیٰ سے خارجی عنایت ہوتی ہے جو اسے سپرد کی گئی ہوتی ہیں ان پر اکسایا گیا ہوتا ہے اور ان کے لئے دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہوتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دونوں ارادے بدون اس کے کہ وہ مخالفت کا ارادہ کریں ایک دوسرے کے مخالف ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس مصلحت کلی کے مطابق جس کی مثال اس کے پاس ہوتی ہے، ان کے درمیان قطعی فیصلہ کر دیتے ہیں۔

لمحہ 44۔ اسی طرح ملک کے نام ان نفوس کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو ایسے لطیف اجسام میں پھونکے جاتے ہیں جن پر ستاروں کے محمود اتصال کے وقت ہوا غالب آ جاتی ہے، بالخصوص مشتری، زہرہ اور چاند کے اچھے اختلاط کے وقت۔ ان کے کئی طبقات ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض زحل، مشتری، مریخ وغیرہ کواکب کی فوج بن جاتے ہیں اور بعض اپنے حالات کے اختلاف کے مطابق ملاء اعلیٰ کے سائے ہوتے ہیں۔ مثلاً جبریل کی فوج اور میکائیل کی فوج اور بعض اپنی سرشت کے مطابق اسماء الٰہیہ اور آیات قرآنیہ وغیرہ کے خادم ہوتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض لوگ ایسی چیزوں کے استعمال سے جو کواکب کی قوتوں کو متحرک کر دیں، کواکب کی فوجوں کو مسخر کر لیتے ہیں اور ملاء اعلیٰ کی فوجوں کو ان اذکار کے ساتھ مسخر کر لیتے ہیں جو نفس انسانی کو ان کے ساتھ مشابہ بنا دیتے ہیں اور وہ خدام کی فوجوں کو ان کلمات کو بہت زیادہ تعداد میں پڑھ کر مسخر کر لیتے ہیں۔

لمحہ 45۔ میں نے ان ملائکہ کے حال کی بہت بڑی بات دیکھی۔ ایک نہایت سعادت مند شکل آئی جو مزاج لطیف میں اس حد تک سرایت کرنے کا تقاضا کرتی تھی کہ معاملہ روح پھونکنے تک پہنچ جائے اور اس روز زمین اور آسمان کے جس قدر لطیف عناصر تھے ایک دوسرے سے لطیف طور پر مل گئے اور ان میں ایسا تعفن پیدا ہو گیا جیسا کہ حشرات الارض مثلاً مینڈک، مچھر وغیرہ میں روح پھونکنے کے وقت عناصر کی کیفیت کے اختلاط میں پایا جاتا ہے لیکن لطیف ارکان میں تعفن نہیں ہوتا لہٰذا روح جو کچھ ان کے مناسب ہوتا ہے پھونک دتی ہے اور اشکال فلکیہ اور ارکان عنصریہ کی وجہ سے ان کے حالات میں اختلاف ہوتا ہے۔ چنانچہ ان میں تغذیہ اور تنمیہ کی قوت نہیں ہوتی لیکن ارواح کے دو رخ ہوتے ہیں ایک صرف بدن کی حفاظت کی طرف اور دوسرا مبادی عالیہ کی طرف۔

ان میں سے بعض جسم لطیف کی شکل ہوتے ہیں، مثلاً گول یا شش پہلو وغیرہ، جیسے کہ زمین پر واقع گھر جن کی شکلیں اور پیمائش مختلف ہوتی ہے۔ لہٰذا جب اوپر سے کوئی ایسا روحانی حکم نازل ہوتا ہے جو ان نفوس کے مناسب ہو خواہ کواکب کی طرف سے خواہ ملاء اعلیٰ سے یا شخوص مثالیہ اور ان ارواح کی طرف سے تحریک ہو جو مثال میں متمثل ہو کر واقع ہوئی ہیں تو جس طرح طبیعت کی وجہ سے حشرات کے اسباب حرکت میں آتے ہیں اسی طرح ان کے باطن میں بھی اسباب متحرک ہو جاتے ہیں جس طرح کہ جب حشرات نور دیکھتے ہیں تو اس داعیہ کی وجہ سے جو ان کے اندر اصل طبیعت سے پیدا ہوا ہوتا ہے اس کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں، اسی طرح جب وہ گرمی محسوس کرتے ہیں تو گرم زمین سے بھاگ کر سرد زمین کو چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح کبھی نمی سے خشکی کی طرف اور کبھی خشکی سے نمی کی طرف بھاگتے ہیں۔ اسی طرح ان کے باطن

سے بھی داعیہ اٹھتا ہے جیسے کہ ایک طبعی مذہب ہو جس کی وجہ سے یہ ملائکہ کی عظیم فوجیں جہاں اللہ کا ارادہ ہوا کٹھی ہو جاتی ہیں۔ ان میں ہر ایک میں یا کسی چیز کی محبت ہوتی ہے یا دشمنی۔ چنانچہ جو انسان اور بہائم وہاں ہوتے ہیں ان کے نفوس میں اس داعیہ کی ہیئت کا نقشہ آ جاتا ہے اور پھر وہ اس داعیہ کے مطابق کام کرتے ہیں۔

لمحہ 46۔ اسی طرح ملک کا لفظ ان الفاظ اور اعمال کی صورۃ مثالیہ پر بولا جاتا ہے جو انسانوں سے صادر ہوتے ہیں۔ اس کی تحقیق یوں ہے کہ نفوس کے درمیان نفوس انسانیہ کی عظیم اور عجیب حالت ہے اس لئے کہ انہیں حظیرۃ القدس سے قریب الماخذ پیدا کیا گیا ہے۔ اس حظیرۃ القدس کے گرد جو حاملین عرش اور معاملات کی تدبیر کرنے والے فرشتے (مدبرات امر) ہیں وہ طبعی طور پر اس کی طرف کھنچے آتے ہیں اور اس کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ نفوس میں دیر تک جگہ پکڑے رہتے ہیں۔ لہٰذا بہت سے اعمال اور کلمات ایسے ہیں جن کی انسان مدت مدید سے مشق کرتے چلے آئے ہیں۔ وہ حظیرۃ القدس اور ملائکہ عظام کے مدارک میں ایک شکل اختیار کر لیتے ہیں اور افلاک اس صورت کو ان سے قبول کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے افلاک کے مدارک بمنزلہ اس ہیولیٰ کے ہوتے ہیں جو ملائکہ کے قویٰ کے لئے ہے اور علوم الافلاک منطبق ہو کر ایسی صورتیں بن جاتے ہیں جو حق تعالیٰ کے سامنے کھڑی ہوں۔ یہ علوم نہ تو کسی خاص فلک کی طرف منسوب ہوتے ہیں اور نہ کسی خاص فرشتے کی طرف۔ اس وقت ان کا نام ملائکہ رکھا جاتا ہے۔ اس لئے کہ ان کے جسم مثالی اور قائم صورتیں ہیں۔ ان کی ارواح بھی ہوتی ہیں جو وہی معانی ہیں جو ان الفاظ سے سمجھ میں آتے ہیں اور جو ملائکہ عظام اور نفوس کے پاس حضر اور دیکھے جاتے ہیں

یقیناً یہ اشخاص جواہر مثالیہ میں ملائکہ کے ہم شکل ہوتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پڑھنے والا ان اسماء کو پڑھتا ہے اور عامل ان اعمال کو کرتا ہے تو اس کے نفس کے جذر کی وجہ سے ایک وسیع سڑک نکل کر اپنی حقیقت مثالیہ کی آ جاتی ہے اور وہاں ایسی برکات حاصل کرتی ہے جو اس کے مناسب ہوں اور یہ بھی اس قسم کی ہو سکتی ہیں۔ نفوس بشریہ میں اس کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے کیونکہ ان کے ہاں شرائع طے پا چکے ہیں۔

لمحہ 47۔ اسی طرح ملک کا نام انسانوں کی ایک قوم کے لئے بولا جاتا ہے جن کی شان یہ ہوتی ہے کہ انہیں ایسا الہام ہوتا ہے کہ ان کے نفس اس الہام کو قبول کرتے اور اس کے مطابق چلنے میں متحیر ہوتے ہیں۔ لہٰذا جس طرح ہیئت طبیعت کے داعیہ کے ساتھ کرتی ہے مثلاً بھوک پیاس اور شہوت وغیرہ اور یہ ہیئت اس داعیہ میں فنا ہو جاتی ہے اور وہ چیزیں باقی رہ جاتی ہیں جن کے ذریعہ سے یہ اپنے نفس مدارک اور مشاعر پر غالب آ جاتی ہے تا آنکہ اس کا ظاہر و باطن پُر ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اگر اس وقت کوئی ایسا لطیف ادراک والا ہو جس کا نفس کے ساتھ چمٹ گیا ہو تو وہ اس کا ظاہر و باطن اس داعیہ کے رنگ میں رنگا ہوا دیکھے گا۔ اسی طرح اس ''شخص'' کے نفس میں خاطر الٰہی یا خاطر ملکی بھڑک اٹھتا ہے۔ پھر یہ خاطر اس کے نفس کی بلندیوں تک چڑھ جاتا ہے اور اس میں فنا ہو جاتا ہے اور باقی رہتا ہے اور اس پر اس کے مدارک پر غالب آ جاتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ مبہوت، مدہوش اور مخبوط ہے تا آنکہ اللہ تعالیٰ ان کاموں کا فیصلہ کرتا ہے وہ کرنے والا ہے۔ لہٰذا بسا اوقات وہ جب تک اس ہیئت پر رہتا ہے اسے ملک کہا جاتا ہے۔ بسا اوقات وہ ایک چوپایہ ہوتا ہے جو الہام کو قبول کرتا ہے اور اس کے لئے کوشش بھی کرتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ملک نے چوپائے کی شکل اختیار کر لی۔

لمحہ 48۔ تدبیر کی یہ صورت ہوتی ہے کہ جملہ اسباب' مقتضیات اور عنایت کو ہر سبب کے مطابق نگاہ میں رکھا جائے اور یہ اس طرح ہوگا کہ جہاں تک ممکن ہو ان امور کو اس پر وافر کر دیا جائے جن کا تقاضا ایسا ''خیر نسبی'' کر رہا ہوں جو خیر مطلق کے قریب ہو۔ لہٰذا اگر وہاں ایسے اسباب ہوں جو شر کے مقتضی ہیں حالانکہ یہ سب خیر کے بغیر ظاہر نہیں ہوتے اور عناصر کو چھوڑ کر ملاء اعلیٰ اور ان عقلوں کے تخیلات کا منشاء بھی یہی ہوں تو اس وقت ضروری ہوگا کہ یہ مناسب نظام کے فیضان میں اس طرح شامل ہو جائے کہ افلاک کی روحانیت اور عناصر کے طبائع کے حکم میں کسی قسم کا خلل نہ پڑتا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ''مولود' علم اپنے سے اعلیٰ علم سے کمزور تر اور ادنیٰ تر ہوتا ہے۔ نیز اس لئے کہ تدبیر ایک ایسی صفت ہے جو خلق پر ثابت قرار دی جا چکی ہے۔ لہٰذا مناسب یہی ہے کہ کسی حکم کو نہ توڑا جائے۔ پھر اگر اس کے ساتھ روحانیت کا کمزور سا اتصال ہو جائے اور ''مولود' کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کیا جائے تو اسے زمین کی خبروں میں جاری کیا جائے گا اور ان کا اثر کچھ مدت کے بعد ہی مکمل ہوگا۔ تب جا کر یہ روحانیت کی قوت بنیں گی اور وجود ناسوتی اس قوت سے مرکب ہوگا' تب جا کر کہیں تکمیل ہوگی اور اگر زمین کا اتصال ایسا ہو جو کسی محبوب چیز کی ہلاکت کا موجب ہے اور فلکی قوتوں کے مطابق اس کے الگ الگ ہونے کا وقت بھی نہ آیا ہو تو اسے کسی اور سبب میں پائیں گے۔ اس طرح بیان کا تصادم ہوگا اور اس کے حکم سے ناراضگی کا اظہار ہوگا اور محبوب اپنی حالت میں رہے گا جس طرح نار ابراہیم کہ اس پر مبارک زمہریر ہوا چلی اور اس ہوا کو آگ پر مسلط کر دیا گیا تو اس نے آگ کو ٹھنڈی اور سلامتی بنا دیا۔

اور اگر اسباب اس کا تقاضا کریں تو یہ وجہوں پر مطبق ہوگا' مثلاً ''وجہ منبسط'' اور ''وجہ منقبض۔'' اس پر ''نظام خیر' حکم لگائے گا۔ جس طرح آگ کبھی جلا کر اثر کرتی ہے تو اسی چیز کو راکھ کر دیتی ہے اور اسے سیاہ اور خاکستری بنا دیتی ہے یا اس کا اثر اس طرح ہوتا ہے کہ چیز درد محسوس کرے مگر الگ نہ ہو۔

پھر اس میں برکت نہیں ہوتی تو یہ بجھ جاتی ہے بلکہ یہ بھی حکم ہوتا ہے کہ ہر سبب کے مطابق ''عنایت'' کا خیال رکھا جائے۔ لہٰذا جب کواکب کے اتصالات اس کی موت کے طالب ہوں اور اس آفت کا فیصلہ بھی کر دیا گیا ہو تو صحیح بات یہ ہے کہ اس کے بدن کی مزاج کے مطابق اس کے بدن میں موت کی علت ہونا ضروری ہے۔ خواہ یہ بیماری معمولی ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً گر پڑنا یا درد حتیٰ کہ اگر طبعی حکیم نے ایک ہزار سال بھی وقائع کا تجربہ کیا ہو وہ بھی نظام بدنی کی مخالفت کو نہ سمجھ سکے گا۔ سوائے قبض اور بسط کے ذریعہ کے۔ اور جب مزاج بدنی کے لحاظ سے مرنے والے کے متعلق کواکب اتصالات اس کے زندہ رہنے کے داعی ہوں اور اس کے شفایاب ہونے کا فیصلہ بھی ہو چکا ہو تو اس وقت کسی بدنی علت کا ہونا ضروری ہے جو اس کی طبیعت کی قوت کو قائم رکھے یا تریاق مل جائے یا کوئی اور چیز۔ اسی طرح ریاضی دان اگر ہزار سال بھی تجربہ کرتا رہے نظام سماوی کی مخالفت کو نہ دیکھ سکے گا۔ البتہ اسی صورت میں دیکھ سکے گا جب قبض یا بسط ہو۔ بہت سے انسانی بہیمی لذات میں منہمک ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت کرنا چاہتا ہے لہٰذا اگر اس وقت کوئی مانع نہ ہو' مثلاً قساوۃ النفس اور شیطان کی اطاعت' تو اس کے دل میں صریح الہام کر دیا جاتا ہے یا کسی ایسی بات کے ضمن میں جو اس بات کی یاددہانی کرتی ہو کہ اس کی فطرت میں کیا ہے تو یہ ضرور اسے راہ راست کی طرف دعوت دے گا اور اگر وہاں دو صورتیں ہوں' ایک فرمانبرداری کی اور دوسری نافرمانی کی تو صرف فرمانبرداری کے راستہ سے ہی الہام کے دوشالے منور ہوں گے اور وہ

اپنے معاملہ میں متردد رہے گا تا آنکہ مدد ظاہر ہو گی۔

کئی ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں کہ وہ ہلاکت میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور اس میں گھر جاتے ہیں پھر خواہ وہ اللہ کے سامنے عاجزی کریں یا نہ کریں لیکن چونکہ اسباب سماوی کا ارادہ اس کو مارنے کا نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں اس ہلاکت سے نجات پانے کا حیلہ ڈال دیتے ہیں یا کوئی ایسی بات اس کے دل میں ڈل دی جاتی ہے جو نجات کے اسباب تیار کرنے والی ہو اور پھر یہاں تک کہ یہ سب مل کر اس کی نجات کے مقتضی ہوں یا کسی طبیعی امر کو اس کے کمزور کرنے پر لگا دیا گیا ہو۔ چنانچہ وہ اسے جلا دیں اور نجات حاصل ہو جائے۔ یہ امر نظام کو تیار کرنے والا تھا لہٰذا اسے بھی تباہ کر دیا گیا۔ بہت سے لوگ اچانک گھر گئے تو انہیں خواب یا الہام یا نبی یا محدث کے ڈرانے سے اس سے تحفظ کرنے کی ہدایت کی گئی۔ اسی قسم کا وہ قصہ ہے جس میں ایک مومن نے احساس سمعی کے کشف سے بادل کی طرف دیکھا کہ (کہ رہا ہے کہ) فلاں شخص کے باغ کو پانی دو جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔

بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے نیک بخت فلکی قوتوں کا اثر دیکھا تو اللہ ان لوگوں کے دلوں میں جن کے ساتھ اس کا معاملہ ہوتا ہے مثلاً ساتھی' بیویاں' غلام ایسی بات ڈال دیتا ہے جس میں اس کی بہتری اور خوش بختی ہوتی ہے یا اس کی رائے میں برکت ڈال دی جاتی ہے تو یہ اچھی زندگی کی طرف راہ پا لیتا ہے یا یہ کہ یہ خبر کے قریب ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ کسی دوست کی طرف گیا تو اسے اچانک ایسا شخص مل گیا جس نے اس کے ساتھ نیک سلوک کیا یا یہ کہ وہ چل کر پھسلنے والی جگہ تک گیا اور اتفاق سے اس کی ٹانگیں کمزور ہو گئیں (اور وہ گرا اور) ایک خزانے کا اسے پتہ چل گیا۔ چنانچہ اس وقت لوگ کہیں گے کہ وہ نیک بخت انسان ہے۔

اور بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ اللہ نے ان میں وبالی فلکی قوت کا اثر دیکھا تو لوگوں کے دلوں میں اس کا بغض ڈال دیا۔ لہٰذا اس کا مقصود بر نہ آیا اور وہ سوچ بچار کرتے رہتا ہے مگر وہ موافق نہیں آتا اور کبھی ایسا ہوتا ہے ہے کہ وہ اپنے کسی دوست کے پاس جاتا ہے تو اسے اچانک اس کا دشمن مل جاتا ہے جس سے اسے دکھ پہنچتا ہے یا اس کے دل میں اس کے ساتھیوں کا بغض ڈال دیا جاتا ہے جو اسے مارتا ہے اور گالیاں دیتا ہے لہٰذا یہ مار اور گالیوں کے وبال کو بہت ہی سخت خیال کرتا ہے یا یہ کہ وہ کسی کیچڑ والی زمین پر چلے (اور گر کر) اس کی ٹانگ ٹوٹ جائے تو اس وقت کہا جائے گا کہ وہ بد بخت ہے۔

جس بات کا جاننا ضروری ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں اور حکمت الٰہیہ اسے بہت جلد ہونے کا مطالبہ کرے اور اسباب ارضی اس کی موافقت نہ کرتے ہوں تو یہ اسباب اللہ کو اپنی مراد کے پورا کرنے سے روک نہیں سکتے خواہ یہ اسباب کسی قسم کے ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر واقعہ میں غیر متناہی علوم کا علم ہے کہ اگر وہ اس کو قبض کرے اور دوسرے کو بسط تو یوں ہو جائے اور یہ سلسلہ لانہایت تک چلا جائے گا۔

لمحہ 49۔ اللہ تعالیٰ حی و قیوم (بذات خود قائم) ہے اور اسے تمام کلیات اور جزئیات کا علم ہے۔ بدون اس کے کہ کسی اور شئے کا علم اسے مزاحم ہو۔ سمیع ہے' بصیر ہے اور تمام کائنات پر قادر ہے۔ جس چیز کا فیصلہ کرتا ہے اس کا ارادہ کرتا ہے اور جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ ہم اپنے بندوں کے دلوں میں وحی کر کے کلام کرتا ہے یا پردہ کے پیچھے سے انہیں پکارتا ہے یا

فرشتہ بھیجتا ہے جو مثال بن کر سامنے آتا ہے۔ پھر وہ اللہ کے حکم سے جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ ہر نفس جو کچھ بھی کمائے اس کا نگہبان ہے۔ لوگوں کے اعمال کا شمار کرتا ہے۔ پھر ان اعمال کو ان پر لوٹائے گا اور مطیع کو ثواب دے گا اور عاصی کو سزا۔ وہ راضی ہوتا ہے اور ناراض بھی ہوتا ہے۔ بلند بھی کرتا ہے اور پست بھی۔ مجبوروں کی دعا سنتا ہے اور مصیبت زدوں کی مصیبت دور کرتا ہے۔ ہدایت دینے والا ہے، حکمت والا ہے، عادل ہے۔ وہی کرتا ہے جو حق ہو اور جس میں کسی چیز کے لئے مصلحت ہو۔ (ان سب امور کو) وہ تفصیلاً جانتا ہے اگرچہ ہمارا علم اس سے قاصر ہے۔

ان کلمات کی تفسیر میں غور کرنے سے پہلے یہ جان لینا چاہئے کہ ان صفات کے تحقق کا یہ مطلب نہیں لیا جاسکتا کہ یہ ان صفات کے ان مبادی کا وجود ہے جو ''انفعالات'' اور ''تجددات'' ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے بالا و بلند ہے بلکہ ان صفات سے مراد ان کے وجود کی غایات ہیں اور غایات تمام کی تمام تدبیر' نظام خیر کی رعایت اور ہر حال اور وقت کے مطابق سخاوت کے اندر شامل ہیں۔ ان امور میں تجددات پائے جاتے ہیں او یہ سب ایسی قدیم صفت کی طرف لوٹتے ہیں جو فی نفسہانہ تو جدید بنتی ہے اور نہ اس میں تغیر ہوتا ہے اور یہ جود اور حق کی محافظ ہے۔ اس کا تجدد صرف یہ ہے کہ یہ ہر اس علم کے حال کے مطابق جو اس کے فیض کو قبول کرنے والا ہو بہت ہی صورتوں اور عجیب تدلیات میں ظاہر ہو۔ اس نکتہ کو یوں بیان کیا جاتا ہے کہ صفات تو قدیم ہیں مگر ان کے تعلقات حادث ہیں اور یہ صفات اس اعتبار سے کہ اللہ طبیعت کلی کا قائم رکھنے والا ہے اس کے لئے ثابت ہیں تا آنکہ یہ طبیعت کلیہ تمام ناسوت اور اس کے اعضا اور قویٰ میں سرایت کر جائے' اپنی ذات کے اعتبار سے نہیں۔

چونکہ تمہارے سامنے تین چیزیں ہیں۔ زندہ، مردہ اور جماد......اور حی (زندہ) عالم بالا سے قریب ترین ہے اور اس کے عالم اور مخلوق میں اثر انداز ہونے ضروری قرار دیا کہ اسے حی (زندہ) کہا جائے اور چونکہ ہمارے نزدیک اشیاء کے منکشف ہونے کا نام علم ہے اور حی پر تمام اشیاء معہ ان چیزوں کے جو اس کی ذات میں شامل ہیں۔ نیز ان چیزوں کے جو موجود ہیں تفصیلات منکشف ہوگئیں۔ لہٰذا ضروری ہوگیا کہ اسے علیم کہا جائے۔

چونکہ رؤیت (آنکھوں سے دیکھنا) اور سمع (کانوں سے سننا) دیدنی و شنیدنی چیزوں کے لئے مکمل انکشاف ہے اسی طرح وہاں بھی ہے مگر زیادہ مکمل طور پر' لہٰذا اسے سمیع و بصیر کہنا بھی ضروری ہوگیا اور جب ہم یوں کہتے ہیں: فلاں نے ارادہ کیا اور ہماری مراد کسی فعل کے کرنے اور اس کے ترک کرنے پر اس کا حسن عزم ہے اور رحمان اکثر افعال اس فعل کی شرط کے پیدا ہوئے یا جہان میں استعداد کے پیدا ہونے کے وقت کرتا ہے لہٰذا اس وقت وہ ان امور کو واجب قرار دیتا ہے جو واجب نہ تھے اور بعض بلند چیزوں میں باوجود اس کے کہ وہ اس کے اذن اور حکم سے نہ تھا اجماع ہو جاتا ہے' لہٰذا ضروری ہوگیا ہے کہ اسے ''مرید'' کہا جائے۔ نیز یہ کہ ''ارادہ واحدہ ازلیہ'' جسے اقتضاء ذات سے تعبیر کیا جاتا ہے جب اس کا تعلق تمام کے تمام جہان کے ساتھ یکبار ہوا پھر ہر روز حوادث آتے رہے تو اس ارادہ کا ہر حادثہ کی طرح علیحدہ نسبت دینا بھی درست ہوا اور کہا جاتا ہے کہ اس نے ایسا ایسا ارادہ کیا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں نے قدرت رکھی، اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ اسے فلاح کام کرنے کی قدرت حاصل ہوئی اور اسے اس کام سے کوئی خارجی سبب نہیں روک سکتا۔ صرف اتنا ہوتا ہے کہ بعض مقدور چیزوں کو قادر کے لئے ترجیح دی جاتی ہے تو اس وقت قدر کا نام نہیں رہتا۔ رحمان ہر چیز پر قادر ہے اور

اپنی مہربانی اور اقتضاء ذاتی سے بعض افعال کو ان کے اضداد پر ترجیح دیتا ہے۔ لہٰذا اس کا قادر کہلانا ضروری ہو گیا۔

اور جب ہم یوں کہتے ہیں کہ فلاں نے فلاں سے بات کی تو اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ ہم ان معانی کو جن کا ہم ارادہ کرتے ہیں ایسے الفاظ کے ساتھ جو ان معانی پر دلالت کرتے ہوں، دوسروں تک پہنچائیں اور رحمان اپنے بندے پر بعض اوقات بہت سے علوم کا فیضان کرتا ہے اور ان کے ساتھ ان الفاظ کو بھی ان کے خیال میں مرکوز کر دیتا ہے جو ان علوم پر دلالت کرتے ہیں تا کہ اسے ان الفاظ کی تعلیم دینے کی ضرورت پڑے۔ لہٰذا فوری ہو گیا کہ اسے متکلم کہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کسی بندے کو یہ حق حاصل نہیں کہ اللہ اس کے ساتھ کلام کرے مگر بذریعہ وحی یا پردہ کے پیچھے یا رسول بھیجے جس پر اللہ جو چاہے وحی کر دے۔ اللہ ہر شئے پر قادر ہے۔

لہٰذا وحی دل میں کسی بات کے پھونک دینے کا نام ہے۔ خواہ یہ بذریعہ خواب ہو خواہ اس طرح کہ جب انسان غیب کی طرف متوجہ ہو تو ضروری علم اس کے اندر پیدا کر دیا جائے یا پردہ کے پیچھے سے وہ ایک منظم کلام سنے اور ایسا معلوم ہو کہ وہ کہیں باہر سے کچھ سن رہا ہے اور اس کا کہنے والا دکھائی نہیں دیتا یا قاصد بھیج کر، تو وہ فرشتہ ایک شکل بن کر سامنے آ جاتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب نبی کی توجہ غیب کی طرف ہوتی ہے اور حواسہ خمسہ مغلوب ہو چکے ہوتے ہیں تو اسے گھنٹی کی زنجیر کی آواز سنائی دیتی ہے جس طرح غشی طاری ہوتے وقت سرخ و سیاہ رنگوں کے تخیل سے عارض ہوتا ہے۔

چونکہ حظیرۃ القدس میں ایسا نظام چاہے جس کا انسانوں سے قائم رکھنا مطلوب ہے لہٰذا اگر انسان اس کے موافق ہو گئے تو ملاء اعلیٰ سے جا ملے اور انہیں تاریکیوں سے نکال کر اللہ کے نور اور اس کے ''بسیط'' کی طرف لے جایا جاتا ہے۔ اور وہ اپنی ذات میں خوش ہوتے ہیں اور ملائکہ اور بنی آدم کو الہام کیا جاتا ہے کہ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں۔ اگر وہ اس کی مخالفت کرتے ہیں تو ملاء اعلیٰ ان پر لعنت کرتے ہیں اور ان کو ناراضگی کی سزا ملتی ہے اور ان کو عذاب ہوتا ہے۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا۔ لہٰذا ضروری ہو گیا ہے کہ یوں کہا جائے: راضی ہو گیا اور شکر گزار ہوا یا ناراضگی ہوئی اور لعنت کیا گیا اور یہ سارا نظام عالم بہ تقاضائے مصلحت جاری ہے۔ اکثر نظام عالم میں یوں بھی ہوتا ہے کہ جس چیز کے لئے دعا کی جاتی ہے اسے پیدا کر دیا جاتا ہے' چنانچہ کہتے ہیں کہ اللہ نے دعا قبول کر لی۔ پھر یوں بھی ہوتا ہے کہ رؤیت کا لفظ ہمارے استعمال میں مرئی چیز کے مکمل طور پر منکشف ہونے کے لئے ہوتا ہے اور لوگ جب منتقل ہو کر معاد کے ان بعض امور کی طرف لے جائیں گے تو وہ اس تجلی کے ساتھ جا ملیں گے جو عالم مثال کے وسط میں قائم ہے اور وہ سب کے سب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے' لہٰذا یوں کہنا واجب ہو گیا کہ تم عنقریب اپنے آپ کو اس طرح دیکھو گے جس طرح تم چودھویں رات کے چاند کو دیکھتے ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

لمحہ 50۔ ان احکام کے ظہور کے مطابق جو گذشتہ زمانہ میں اپنے اپنے وقت پر گزر چکے ہیں اس تدلی کے کئی دور اور کئی طریقے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ''ہر روز وہ ایک نئی شان میں ہوتا ہے'' سے بھی یہی مراد ہے۔ ہم جس دور میں ہیں اس کی ابتدا کے اختلاف کی تشریح اور اس کے آخری دور کی تشریح ہم کریں گے تا کہ اختلاف معلوم کرنے کے لئے یہ ایک قانون بن جائے۔

یاد رکھو کہ اس دور کی ابتدا میں حوادث صرف افلاک اور عناصر کی قوتوں سے صادر ہوتے ہیں۔ لہٰذا ادریس علیہ

السلام کے دل میں یہ بات پیدا ہوئی کہ وہ کواکب کی حرکات اور خواص کو جان لیں اوران حرکات و خواص کی وجہ سے واقعات کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے ہی ان واقعات کو جان لیں۔ زمانہ کچھ عرصہ تک اسی طرح چلتا گیا پھر ملاء اعلیٰ کی تعداد بڑھ گئی اوران کی کثرت اس لئے ہوئی کہ ایسے اتصال پیدا ہو گئے جو ایسے طبعی ہیکلوں میں (جو عناصر بخار سے مرکب ہیں) فیضان نفس کو واجب قرار دیتے ہیں اور نفوس انسانی پیدا ہو گئے اور وہ ان اوصاف سے موصوف ہو گئے جو نفوس فلکیہ کے عالم کے مناسب ہیں۔ پھر مرا تو ملاء اعلیٰ کے ساتھ ایسے بہت سے اسباب لاحق ہو گئے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ لہٰذا جب ملاء اعلیٰ کے ساتھ ایسے بہت سے اسباب لاحق ہو گئے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ لہٰذا جب ملاء اعلیٰ کی کثرت ہوگئی اور ان کے علوم اور ہمتیں ایک دوسرے سے مل گئیں تو حکمت نے یہ واجب قرار دیا کہ ان کی ہمتیں ''شخص اکبر'' کے احکام متشخص کر دیں اور کسی نہ کسی صورت میں ان کے مقتضیات کو لازمی طور پر تیار کر دیں۔ لہٰذا اس دن سے احکام نجوم باطل ہو گیا۔ لہٰذا بڑے بڑے معاملات اوران کلی ارتفاقات کے علاوہ جن کی شکلیں منجم کے پاس نہیں ہوتیں علم کا قبل از وقت حاصل کر لینا (خواہ وہ وہمی طور پر ہی کیوں نہ ہو) ممکن نہیں۔

وہ امور جن کا ان قوتوں میں (بحیثیت وقوع و عدم وقوع) اختلاف ہوتا ہے اوراس بات کا احتمال ہوتا ہے کہ یہ واقع نہ ہوں اور واقع ہونے کا احتمال قوی ہوتا ہے تو اس قسم کے امور میں منجم کوئی فیصلہ نہیں دے سکتا اور اسباب کا قبض و بسط ملاء اعلیٰ کی جانب سے ہوتا ہے اور جب انسان ملاء اعلیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو نازل ہونے والی فضا کو پہچان لیتا ہے۔ لہٰذا (اسے) نجوم کے قواعد اور حرکات کو جاننے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت ابراہیم کے دل میں علوم پھوٹے اورانہوں نے سارے سیاروں سے ملاء اعلیٰ کی طرف متوجہ ہونے سے اعراض کر لیا اور حوادث اور وقائع میں فلکی قوتوں کا رکن کمزور ہو گیا۔ شریعت کا حکم مطلق العنان ہو گیا اور قبض ملکی انسان کے بہت ہی قریب آ گیا اور تدلی اعظم ملت کے لباس میں ظاہر ہوئی اور توجہ الی اللہ کو نماز، طہارت، ملائکہ، کتابوں اور رسولوں پر ایمان لباس پہنا دیا گیا اور یہ انوار الٰہی میں لپٹ گئے۔ پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود (دنیا) میں آیا اور یہ لباس مثالی بن کر اترا تو اس معاملہ کی تکمیل ہوگئی۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکارم اخلاق کی تکمیل کرنے والے تھے۔

لمحہ 51۔ اس تدلی کے انوار اور عکس ہوتے ہیں جنہیں یہ سورج اور دیگر روشن سیاروں کے اس عکس کی سی شکل میں پیش کرتا ہے جو مختلف انواع اور مختلف مقدار کے آئینوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ ان عکسوں اور انوار کو بھی تجلی اور تدلی بھی کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ان تجلیات کے ثابت ہونے کی وجہ سے یا ان کے خارج میں تحقق کی وجہ سے سچے احکام کا سہارا حق پر ہوتا ہے۔ لہٰذا کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص خواب دیکھتا ہے تو کہتے ہیں کہ فلاں نے اب رب کو خواب میں یا بیداری میں دیکھا اور بعض اوقات حق تعالیٰ اسی تجلی کے واسطہ سے ہم سے ہم کلام ہوتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ ''فلاں نے اپنے رب سے کلام کیا''۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ علم کی تجلی کے مطابق کسی مقام پر کچھ آئندہ ہونے والے واقعات رونما ہونے سے پہلے ہی ظاہر ہو جاتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ ''حق کے لئے ایسا ایسا ظاہر ہوا'' اور بعض اوقات کسی ایسی جگہ پر جہاں ان انوار کا عکس پڑتا ہے اور تجلیات آپس میں ٹکراتی ہیں تو ایک قسم کی انبساط و خوشی حاصل ہوتی ہے اور مثال میں اسے ایسی شکل میں پیش کیا جاتا ہے جو افق میں صبح کے پھوٹنے کی شکل میں ہوتی ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ حق

مانوس ہوا۔ ہنسا' راضی ہوا اور خوش ہوا اور بعض اوقات ایسی حالت حاصل ہوتی ہے جو اس کی ضد ہوتی ہے جو انتقام اور بغض کی مثال پیش کرتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ حق نے لعنت کی، ناراض ہوا، غصہ ہوا اور غضب میں آیا۔ شریعت نے اور الفاظ کو چھوڑ کر ان الفاظ کو محض اٹکل سے استعمال نہیں کیا کیونکہ شریعت نے اس لعنت میں جسے وہ جانتے ہیں ان سے زیادہ واضح الفاظ نہیں پائے۔

لمحہ 52۔ یاد رکھو کہ تجلیات کا مرجع خواہ ان کی تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو تین ہیں۔ ایک یہ کہ وہ صورت علیہ جو علم کے مدارک میں حاصل ہوتی ہے۔ انہی کی صورت ہوتی ہے اسی طرح کہ اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک لحاظ سے یہ ایک عرض ہوتی ہے جو نفس عالم کے ساتھ قائم ہوتی ہے لیکن اس وجہ سے یہ معلوم پر صادق نہیں آتی۔ دوسری وجہ سے علوم کے ساتھ اس کا ایک قسم کا اتحاد ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے یہ ''نشاۃ ادراکیہ'' میں علوم کی تجلی ہوتی ہے۔ اس اصول کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ میں نے فلاں کو خواب میں دیکھا اور میں نے سورج کو پانی کے پیالے میں دیکھا۔ لہٰذا جب عارف کی توجہ کسی ایسی صورت کی طرف ہوتی ہے۔ جس کے متعلق اس کا یہ اعتقاد ہو کہ وہ اس کا رب ہے تو وہ ایسی صورت بن کر سامنے آتا ہے جو اس کے اعتقاد کے مطابق ہوتی ہے اور وہ صورت اس کے رب کو اچھی طرح سے ظاہر کر دیتی ہے۔ نیز یہ صورت عارف کے لئے اپنے نفس کو جاننے کا آلہ بنتی ہے۔ لہٰذا جب تک یہ توجہ، یہ اعتقاد اور یہ تعرف باقی رہے گا یہ صورت ''واجب'' کی ہوگی اور اسی کی تدلی ہوگی۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ ملائکہ یا کسی فاضل انسان کے قوی نفس کی ہمت کا تعلق یا عنصری مادہ کے ایک حصہ سے ہوتا ہے یا قوۃ مثالیہ کے ساتھ اس کے لئے یہ موجودات مثالیہ کے لئے بمنزلہ ہیولیٰ کے ہیں۔ اگر ان کا تعلق اس طرح ہو کہ یہ حصہ حق کی تعریف اور اس کی صورت ہو تو یہ صورت اس کی تجلی ہوگی اور اگر اس کا تعلق اس طرح ہو کہ یہ ان کی ملت میں ان کی جمعیت کو اکٹھا کرنے کا باعث بنے۔ مثلاً ایسا معاملہ جو تدبیر الٰہی کے حکم سے ہو تو اگر یہ صورت اعراض سے مشابہ ہوگی تو برکت کی باعث ہوگی اور اگر جواہر میں سے ہوگی تو شعائر اللہ کے لئے برکت ہوگی۔ جیسے کعبہ' قرآن، صلوٰۃ اور شریعت اور کبھی ملائکہ کی ہمتوں کا عزم ایک مکان کے ساتھ ہوتا ہے تو وہاں ایک قسم کی برکت ظاہر ہوتی ہے اور اس برکت میں نور الٰہی ظاہر ہوتا ہے۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ ہر موجود شئے میں ایک مخفی حکمت پائی جاتی ہے جو ذات الٰہی کے بالمقابل ہونے سے ابھرتی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ جب ہم گہری نظر سے زید کو دیکھیں تو اس میں ہمیں انسان' حیوان' جسم' ناطق' حساس' ذو ارادہ، نامی، ماشی، کاتب، ضاحک، شاعری، رومی، حبشی وغیرہ امور کا علم ہوگا۔ ان تمام کا اس پر حکم لگ سکتا ہے اور وہ ہے بھی درست۔ ان احکام کا درست ہونا اس لئے نہیں کہ اعتبار کرنے والے نے اعتبار کر لیا اور فرض کرنے والے نے فرض کر لیا بلکہ اس لئے کہ وہاں خارج میں اس حکم کا منشا موجود ہے جس کی وجہ سے یہ امور صادق آئے۔ نیز یہ کہ یہ کسی اور حکم کا منشا نہیں ہیں جس کی وجہ سے جھوٹ بن جائیں اور ان میں سے ہر ایک خواہ ذاتیات میں سے ہو خواہ عرضیات میں سے امر کلی ہے جو اس فرد کی نسبت سے متشخص ہوتا ہے اور اس پر منطبق ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر ایک کے بالمقابل اس کی حقیقی جگہ میں کوئی نہ کوئی دقیقہ پایا جاتا ہے اور جو دقیقہ ہمارے اس قول سے پیدا ہوتا ہے وہ موجود بالواجب ہے' اسی سے جاری ہوتا ہے اور اس

کے فیض سے ایک چمکدار نقطہ صادر ہوتا ہے جس کا اشارہ ذات الٰہی کی طرف ہوتا ہے اسی کی حکایت کرتا ہے اور اسی کا نمونہ ہے۔ افراد اور اشخاص سب ایک جیسے نہیں ہیں بلکہ بعض افراد تو ایسے ہیں جن میں دقائق ذاتیہ سافلہ کے احکام غالب ہوتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جن میں دقائق عدلیہ کے وہ احکام غالب آتے ہیں جو تدبیر کلی اور مصلحت کلی اور تجرد کے پہلو سے مناسبت رکھتے ہیں۔ واجب کا ان دقائق کو منعکس کرنے سے نہ صرف ہر عارف کے دل میں بلکہ ہر مخلوق کے لئے تجلی الٰہی ہوتی ہے۔ جب تینوں اصولوں میں اتفاق ہو جاتا ہے اور یہ ایک ہی جگہ پر وارد ہوں تو یہ تجلی تام اور نور الٰہی ہوتا ہے اور اگر صرف ایک ہی اصل ہو تو اس میں تجلی کے معانی کا ایک معنی پایا جائے گا۔ اس میں غور کریں، کیونکہ یہ ایک دقیق مسئلہ ہے۔

لمحہ 53۔ عظیم تجلیات میں سے ایک تجلی وہ ہے جو لوگوں کے لئے قیامت کے دن ظاہر ہوگی۔ چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کو اسی طرح دیکھیں گے جس طرح وہ دنیا میں سورج اور چاند کو دیکھتے ہیں اور اس میں کوئی کمی نہ ہوگی اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ جس نور کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ ایسی صورت میں ظاہر ہو جو نوع انسان کا امام عطا کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نوع انسان کا امام ان تمام امور کے لئے قانون اور امام ہے جو اس نوع کے اشخاص کو عطا کی جاتی ہے اور تو کسی فرد کو اس میزان سے تجاوز کرتا ہوا نہ پائے گا لہٰذا افراد انسان کا اپنے رب کے متعلق اعتقاد اور اس کی معرفت ہر فرد کے لئے ایک حد رکھتی ہے جس سے ان کا اعتقاد کسی طرح تجاوز نہیں کر سکتا۔ حق تعالیٰ قیامت کے دن اسی حد کی صورت میں تجلی کریں گے۔ یہ ایک کلی جملی تجلی ہوگی جس میں ان کے لئے ظہور میں کوئی کمی نہ ہوگی لیکن اس تجلی کی حقیقی تشخیص میں ان میں اختلاف ہوگا۔ چنانچہ ہر ایک اسے اپنے خاص اعتقاد کی صورت کے مطابق دیکھے گا۔ حدیث میں جو یہ بات آئی ہے کہ حق تعالیٰ منافقین کے لئے ایسی صورت میں ظاہر ہوں گے جسے موحد لوگ نہ پہچان سکیں گے تو اس کا یہی مفہوم ہے۔

''تجلی کلی جملی'' خارج میں موجود ہے اور اس کی مثال بہت عظیم ہے۔ اس کی اصل شخص اکبر اور وہ اعتقاد کلی ہے جو انسان کو دیا جاتا ہے۔ اب رہی تجلیات خاصہ تو وہ انہیں ان کی نگاہوں میں دکھائی دی جائیں گی۔ مثلاً اگر انسان اپنی آنکھوں پر سرخ رنگ کا شیشہ رکھے تو اسے ہر چیز سرخ دکھائی دے گی اور اگر دوسرا شخص سبز رنگ کا شیشہ رکھے تو وہ اسے سبز دیکھے گا حالانکہ دونوں حالتوں میں چیز ایک ہی ہے۔

لمحہ 54۔ تجلیات میں سے ایک تجلی وہ ہے جو ہر رات کے آخری تیسرا حصہ باقی رہ جانے پر دنیا کے آسمان پر نازل ہوتی ہے۔ اس کی تحقیق یہ ہے کہ شمس اور زہرہ میں اسرار غیب میں ایک راز پایا جاتا ہے۔ اس راز کا قوی ترین اثر زمین میں اس وقت ہوتا ہے جب یہ دونوں ''اوتاد اربعہ'' میں ہوں۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ساری تشریح فرمائی ہے اور ہر چیز کو اپنی مخصوص کیفیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ چنانچہ زمین کے اوپر جو وتد ہے اس میں یہ خاصیت ہے کہ اس میں اللہ کے سامنے اعمال پیش ہوتے ہیں جس سے مراد اعمال کا مقبول ہونا ہے اس لئے کہ سخت ترین وقت وہ ہوگا جب ان کی شعاعوں کا ظہور ہوگا اور وتد میں بھی طبائع ہیں اور قریب بات یہ ہے کہ ملائکہ زمین میں منتشر ہو جاتے ہیں اور باری باری آتے ہیں اور اعمال اللہ کے پاس لے جائے جاتے ہیں کیونکہ ملائکہ کو زہرہ کے ساتھ مناسبت ہے اور جو وتد زمین کے نیچے ہے اس میں ملائکہ منتشر ہوتے ہیں اور ان میں نور الٰہی کی بجلیاں چمکتی ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کے

آسمان کی طرف اتر کر آتا ہے اور پھر فرماتا ہے: ہے کوئی مغفرت چاہنے والا؟

اوتاد میں سورج کے استقامت کے وقت کا تعین اسی لئے نہیں کیا گیا بلکہ اس امر میں ان دو حالتوں کے درمیان جو استقامت سے ذرا پہلے اور ذرا بعد ہوتی ہیں، تردد پایا گیا کیونکہ سورج زہرہ کے کبھی آگے ہو جاتا ہے اور کبھی پیچھے جیسا کہ کوئی کشتی میں سوار ہو۔ یا تو یہ ان کی خاصیت میں مدد کرتی ہے یا کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی' مگر اس لمبی ساعت کے متعلق انہیں غلطی نہیں لگتی۔ تحقیق سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اس گھڑی کا مرکز بہت کم جزاء ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس امید کی گھڑی کے متعلق یہی فرمایا ہے۔

لمحہ 55۔ بعض تجلیات ایسی ہوتی ہیں جو ملائکہ اور فاضل لوگوں کے نفسوں میں پھیلی ہوتی ہیں۔ اس کی تحقیق یہ ہے کہ وہ نفوس جو انتہا درجہ کے بلند نفس ہیں، اس تجلی کی طرف سے اپنی استعداد کے مطابق متوجہ ہوتے ہیں اور ان کا معاملہ مختلف رنگ اور مختلف مقدار کے آئینوں کا سا ہے جنہیں چراغ کے گرد رکھ دیا جائے تو اس طرح ہر آئینہ کے مناسب اس میں شکل دکھائی دے گی اور ان سب میں پھیلنے والی شعاع جمع ہو جائے گی۔ یا اس کی مثال اس سورج کی سی ہے جو مختلف مقدار اور مختلف رنگوں کے حوضوں اور تالابوں پر چمکے تو ان سب میں سورج کی شکل دکھائی دے گی اور جب زمین میں کوئی ایسی صورت پیدا ہو جسے ملاءِ اعلیٰ پسند کرتے ہوں تو وہ صرف حق میں باقی ہو گی اور ملاءِ اعلیٰ میں فانی۔ لہٰذا جس طرح اس تجلی سے نفسوں کی شعاعوں کے مختلف رنگ اترے ہیں اور یہ رنگ انہیں اپنے اندر شامل کر لیتے ہیں اسی طرح کبھی ان سے ایسی ہیئتوں کا تصور کیا جاتا ہے جو ان شعاعوں میں ایک قسم کی تاثیر کرتی ہیں۔ اس سے ایک فرضی ہیئت ظاہر ہوتی ہے جسے اُنس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کبھی غصہ کی ہیئت اوپر کو اٹھتی ہے تو اسے ناراضگی اور غصہ کہا جاتا ہے اور کبھی ان شعاعوں میں عنقریب پیدا ہونے والی صورت ظاہر ہوتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ حل کے لئے نئی صورت حال پیدا ہوئی اور یہ صورت حال انبیاء کے لئے تکلیف دہ ہوتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: کیا تمہارا خیال ہے کہ تمہیں یونہی چھوڑ دیا جائے گا حالانکہ اللہ کو ابھی یہ معلوم نہیں ہوا کہ تم میں سے کون مجاہد اور کون صابر ہے؟

چنانچہ یہ اور دیگر آیات اس بات کی تصریح کرتی ہیں کہ ان کے متعلق علم کا تجدد ہوتا رہتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ یہ متجدد علم اللہ کے لئے صرف اسی تجلی کے ذریعہ سے ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ جب مومنین کے نفس تزکیہ کے رنگ میں رنگے جائیں تو اسی ہیئت میں بلند ہو کر ملاءِ اعلیٰ تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس کے بعد اس تجلی کی ہیئت بلند ہوتی ہے تو اس بات کے سوا کہ یوں کہا جائے ''حق تعالیٰ کو معلوم تھا کہ وہ جہاد کریں گے اسی لئے اس نے انہیں پسند کیا'' کوئی اور چیز اس مفہوم کو زیادہ وضاحت کے ساتھ ادا نہیں کر سکتی۔

لمحہ 56۔ تجلیات میں سے ایک تجلی وہ بھی ہے جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں بہترین صورت میں دیکھا۔ پھر آپ نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا' وغیرہ وغیرہ۔ اس تجلی کے راز کی تشریح یہ ہے کہ ایک عارف باللہ انسان' یقینی طور پر اللہ تعالیٰ کے متعلق ایسی صفات کاملہ کا اعتقاد رکھتا ہے جن کی نہ کوئی شکل ہے نہ رنگ۔ حالانکہ ہر صفت کی خاص شکل اور رنگ ہوتا ہے' مثلاً شجاعت کی مثال اگر ذہن میں آئے تو اس کی صورت شیر کی ہو گی یا ایک نوجوان انسان کی جس نے زرہ پہن رکھی ہو اور ہاتھ میں تلوار ہو۔ علیٰ ہذا القیاس (دیگر صفات بھی اسی طرح ہوں گی) اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس

کے حس مشترک میں حق تعالیٰ کی صفات شکل اور رنگ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں لہٰذا جب یہ صورت ان صفات کی وضاحت کرنے والی اور ان کے جاننے کا ذریعہ ہو تو یہ تجلیات حق میں سے ہوں گی۔ ایسی صورت میں یہ کہنا درست ہوگا کہ اس نے حق کو دیکھا یا اسی قسم کے اور الفاظ۔

لمحہ 57۔ تجلیات میں سے ایک وہ بھی ہے جسے موسیٰ علیہ السلام نے طور پر آگ کی صورت میں دیکھا۔ اس راز کی تشریح یوں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے لئے یہ واجب ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ انہیں فرعون کی طرف بھیجے' نیز یہ کہ اللہ انہیں جس قدر چاہے ایسا یقینی علم عطا کرے جس سے بڑھ کر یقین نہ ہوسکتا ہو اور موسیٰ علیہ السلام نے آواز اور شکل میں ملاقات کی اور ان کے نزدیک یہ حسی علم ہی سب سے بڑا علم تھا۔ لہٰذا حکمت الٰہی کا یہ تقاضا ہوا کہ انہیں ایسی آواز سے مخاطب کیا جائے جس کے اللہ کی طرف سے ہونے میں انہیں شک نہ ہو اور غیر محسوس آواز میں اتارا جائے۔ لہٰذا ملاء اعلیٰ کے ایک گروہ کے دل میں یہ بات ڈال دی گئی کہ وہ اسی درخت کی طرف جا کر انوار حق میں سے ایک نور کی شکل اختیار کریں اور ان کی اس صورت نے شکل کا باب کھول دیا جس سے اس مکان کے عنصر یعنی ہوا وغیرہ نے آگ کی صورت اختیار کرلی تاکہ خطاب حق کی وضاحت ہو جائے اور یہ بمنزلہ اس صورت کے ہے جو آئینہ میں نظر آتی ہے تاکہ دیکھنے والے کی وضاحت کرے۔ اس قسم کی مثالوں میں ضروری ہے کہ ملاء اعلیٰ کی طرف توجہ ہو تاکہ اس مکان میں جو عنصری رنگ ہیں یہ انہیں اختیار کرسکے۔

لمحہ 58۔ تجلیات میں سے ایک تجلی وہ بھی ہے جس کے متعلق عیسائیوں کا خیال ہے کہ لاہوت نے ناسوت کا لباس پہن لیا اور ہندوؤں کا خیال ہے کہ یہ حق تعالیٰ کا کام انسانوں میں حلول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس اشکال کو قرآن مجید میں یہ فرما کر دور کردیا: ''ہم نے اس کی تائید روح القدس سے کی۔'' تو واضح ہوگیا کہ یہ فی الحقیقت روح القدس کی تائید ہے جسے باطل پرستوں نے اوتار اور حلول بنالیا۔ اللہ تعالیٰ ظالموں کے اس قول سے بہت بلند ہے۔

نفوس کلیہ کی حقیقت یہ ہے کہ جزئی نفس صرف عالم کی اس صورت میں نازل ہوتے ہیں جو اس روز ہو۔ لہٰذا اگر نفس کلی ایسے دن اترے جن دن سورج اپنے گھر میں ہو تو یوں معلوم ہوگا کہ نفس جزئی میں سورج اپنے گھر میں ہے اور اگر اس وقت اترے جب کہ یہ مشرق میں ہو تو یوں معلوم ہوگا کہ سورج مشرق میں ہے اور اگر اس وقت اترے جبکہ یہ اپنے جیسے گھر میں ہے تو یوں معلوم ہوگا کہ سورج اپنی مثال میں ہے۔ یہ قوت شمس کے درجات اور نفس میں اس کے اثر کے ظاہر ہونے کے مراتب ہیں۔ اس کے مقابلہ میں یہ جاننا چاہئے کہ جب کلی نفس جزئی نفس میں اترتا ہے تو جزئی نفس میں تجلی اعظم کی صورت ظاہر ہوگی۔ ایسا کیوں نہ ہو جبکہ یہ نفس کلی کا دل ہے اور اسی پر اس کا دارومدار ہے لہٰذا سورج اور چاند وغیرہ کے مقابلہ میں اس کے ظاہر ہونے کا زیادہ حق ہے اور نفس جزئی میں تجلی اعظم کے بالمقابل نقطہ کو محض پتھر کہا جائے گا۔ ظہور تجلی کے مراتب کے اختلاف کی وجہ سے لوگوں کے لئے چمکدار اور براق بن جائے۔ اس کے اور تجلی اعظم کے درمیان ایک وسیع گھاٹی ہے۔ تجلی اعظم کا سایہ 'اس حجر بحت' پر پڑتا ہے' اس کے بعد اسی ''حجر بحت'' کی شعاع روح اور سر اور ان دونوں کے درمیانی لطائف پر پڑتی ہے جس کی وجہ سے ایک لحاظ سے انسان ''الٰہی'' بن جاتا ہے اور ایک لحاظ سے ناسوتی اور معجزنما کمال کی طرف نکل آتا ہے اور اس سے ناقص نفوس کی تکمیل' خداوندی بلند برکات کے فیضان اور گناہوں کے کفارہ کے سلسلہ میں خارق عادت اور آثار ظاہر ہوتے ہیں۔

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مخلوق کے اندر نکلنے والی تجلیوں میں سے ایک تجلی نکلتی ہے اور وہ ذرا کم درجہ کی چمک ہوتی ہے اور کبھی اس میں اختلاف نہیں ہوتا جب لوگوں کا انتہائی گمان یہی ہو کہ یہ خداوندی اوتار ہے یا کسی نفس کے اندر حق تعالیٰ کا حلول ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس شبہ کو دور کرتے ہوئے فرمایا: یہ تو نفسوں کے اندر روح القدس کی تائید ہے اور روح القدس یہی تجلی اعظم ہے اور اس کی تائید یہ ہے کہ یہ اس کی برکات میں داخل ہو جائے اور اس کا سایہ ایک صورت اختیار کر لے جس سے یوں معلوم ہو کہ یہ وہی ہے۔

لمحہ 59۔ تجلیات میں سے ایک تجلی وہ بھی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن میں فرمایا گیا ہے: آسمان سے لے کر زمین تک کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے پھر عرش کو چڑھ جاتا ہے۔ ایک دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار کے مطابق ایک ہزار سال ہے۔ نیز اس قول میں: ہر روز وہ ایک نئی شان میں ہوتا ہے۔ اس طرح کہ جب آسمانوں اور زمینوں کے احوال اس حد تک پہنچ چکے ہوں کہ مصلحت کلی واجب قرار دے کہ تجلی اعظم اپنے پہلے رنگ کے علاوہ کسی اور رنگ میں رونما ہو۔ اس وقت اس کی کلی شان ہوگی اور تجلی اعظم نازل ہوگی۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح عالم مثال کے اندر ایک انسانی مورتی ہو۔ اس بات نے کہ ایک چیز حق کی بنا پر کسی اور چیز کی مورتی ہے بعض اعراض اور جواہر کو بعض موجودات کے لئے فطری طور پر مناسب بنا دیا ہے جس طرح تو زید کو خیال کرے کہ وہ سرخ اور لمبا ہے اور عمرو سیاہ اور کوتاہ ہے تو اس طرح تمہارے ذہن کے اندر دو مختلف صورتیں آئیں گی۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کے رنگ اور مقدار مختلف ہیں بلکہ اس لئے کہ وہاں کچھ فطری مناسبت پائی جاتی ہے' ایک کی ایک کے ساتھ اور دوسرے کی دوسرے کے ساتھ تا کہ تمام مخلوقات کا فطری طور پر ایک دوسرے سے امتیاز ہو سکے۔ یہی حال عالم مثال کا ہے کہ وہاں بھی بعض دیگر مخلوق سے ممتاز ہیں' برخلاف تجلی اعظم کے۔ پھر یہ تجلی بعض فلکی قرانات میں زمین کی طرف اترتی ہے تو ملائکہ اس تنزیل کے حکم کی مدد کرنے میں لگے رہتے ہیں اور ان تمام امور کی مدد کرنا ترک کر دیتے ہیں جن کا رسوا کرنا اس تنزیل نے واجب قرار دیا ہو اس لئے کہ مطیع وہ ہے جو تنزیل کے مطابق حق کے حکموں کی اطاعت کرے اور عاصی وہ ہے جو اس تنزیل کے مطابق حق کی نافرمانی کرے تا آنکہ تجلی اعظم کی صورت پلٹ جائے اور وہ کوئی اور طرز بدل لے اور جب تجلی اعظم کوئی اور طرز اختیار کر لیتی ہے تو کوئی اور تنزل اوپر کو چڑھ جاتا ہے اور اس کے احکام پھیل جاتے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے فرمان: 'وہ آسمان سے زمین تک کے امور کی تدبیر کرتا ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ جہاں اور اس کے نظام کی تدبیر کرتا ہے اس طرح یہ حکم ''شخص مثالی'' بننے کے بعد زمین کی طرف اترتا ہے، پھر ملائکہ اس کے لئے مسخر کر دیئے جاتے ہیں اور جہاں کو تیار کر دیا جاتا ہے یہاں تک کہ جب اس کی مدت ختم ہو جاتی ہے تو یہ حکم بلند ہو کر اللہ کی طرف چلا جاتا ہے اور اس قسم کا دوسرا حکم آ جاتا ہے۔ اس طرح نزول اور عروج کا اجتماع ایک لمبی مدت تک ہوتا رہتا ہے۔ جب آخری [2] (نزول یا عروج) ختم ہو جاتا ہے تو پہلا لوٹ آتا ہے۔ بالعموم اس مدت کی مقدار تخمیناً ایک ہزار سال ہوتی ہے اور اسی طور کے ہوتے ہوئے اکابر انبیاء مبعوث ہوتے ہیں جس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ کونسی شرع ان قرنوں کے مناسب ہے۔ لہٰذا وہ لوگوں کے لئے اس شخص کو کھڑا کر دیتا ہے جو انہیں اس شریعت کا صرف مجدد بنا کر بھیجا جاتا ہے تا کہ وہ ان لوگوں کے لئے رحمت بنیں اور ان کے نفسوں کی تکمیل کریں۔

لمحہ 60۔ جب تو نے ان چاروں کمالات کو جان لیا تو تو جان لے کہ حقائق کی تعریف کرنے میں تمام انبیاء کا مسلک یہی رہا ہے کہ وہ لاہوت، عقل، نفس اور ہیولیٰ کے متعلق خاموش رہیں۔ چنانچہ پہلی بات جو وہ اپنی امتوں کو بتاتے ہیں یہ ہے کہ مفہوم دو لفظوں پر منحصر ہے: موجود اور معدوم۔ موجود سے ان کی مراد وہ ہے جو خارج اور اعیان میں ہو یعنی جو نفس اور ہیولیٰ میں ثابت ہو چکا ہو، اور یہی وہ چیز ہے جسے ہم ''بالخارج'' کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اور معدوم سے وہ چیز مراد ہے جو خارج میں نہیں۔ خواہ وہ درحقیقت خارج میں ہو یا وجود سے پہلے ثبوت کے مرتبہ میں ہو اور موجود یا تو واجب اور قدیم ہوگا ممکن اور حادث۔

لہٰذا واجب جو خارج میں موجود ہے وہ ہے جس کا وجود بذات خود ہو۔ ان کی واجب سے مراد وہ تجلی ہے جسے خارج نے شروع شروع میں ظاہر کیا۔ ان کے واجب سے مراد وہ تجلی ہے جسے خارج نے شروع شروع میں ظاہر کیا اور وہ مجرد ہے اور جانب اعلیٰ کی جہت سے نفس سے پاک ہے اور ممکن سے ان کی مراد وہ ہے جو نچلی جانب کے ساتھ ملا ہو اور ممکن سے ان کی مراد وہ تغیر پذیر ہے جس کے وتد میں کون وفساد واقع ہو اور ہر ممکن حادث ہے اور ہر ممکن اللہ کے ارادہ سے ہوتا ہے اور حوادث کے اندر حکم لگانا کچھ اور چیز ہے اور ارادہ کچھ اور کیونکہ ان کا ثابت کرنا ان کے مباحث میں شامل نہیں۔

الحمد الله اولا و آخراً و ظاهراً و باطناً

حواشی

(1) اصل کتاب میں ''کل الصید فی جوف السفری'' دیا ہے اسے ''فی جوف الفرا'' پڑھیں۔ فرا دراصل ''گورخر'' کو کہتے ہیں۔ ''کل الصید فی جوف الفرا'' عربی کی ضرب المثل ہے جس کا اردو میں متقابل:
''ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں'' ہے۔

(2) اصل کتاب میں ''کل من النقص'' دیا ہے۔ میں نے ''کلما النقص'' پڑھ کر ترجمہ کیا ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی

ترجمہ خیرِ کثیر [1]

پہلا خزانہ

کیا تیرے کان میں یہ آواز نہ پہنچی جسے اہل نظر حکما نے اپنی اعلیٰ کوششوں سے مؤسس کیا ہے کہ وجود ایک انتزاعی شئے ہے جسے تو اپنے قلب سے ادراک کرتا ہے اس کی حقیقت یہی ادراک ہے۔[2] اس کے بعد اس انتزاعی امر کے مقابلہ میں ایک امر ہے جو واقع میں ثابت ہے۔ اصطلاح میں اس کو "فعلیت ماہیت" اور تقرر ذات کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔[3]

(کیا تیرے کان تک یہ آواز نہ پہنچی) کہ موجود کی تقسیم دو قسموں میں منحصر ہے۔ ایک "**موجود من نفسہ**" (یعنی بذات خود موجود) اس میں وجود کے عمل کا مصداق اور اس کے انتزاع کا منشاء اس موجود کی ذات ہی ہوتی ہے جو سب حیثیتوں اور اعتبارات سے خالی ہوتی ہے تو لازمی طور پر یہ موجود کا تحقق اور ماہیت کا عین ہوگا اور دوسرا "**موجود من غیرہ**" (جو بذات خود موجود نہ ہو)[4] اس قسم میں وجود کے حمل کی مصداق اور اس کے انتزاع کی منشاء صرف یہ ہوتی ہے کہ اس کو ایک ایسی چیز کی طرف نسبت کی جائے جو بذات خود متحقق نہ ہو، پس ضروری ہے کہ (موجود کی یہ دوسری قسم) **فاقد الذات** (اپنی ذات نہ رکھنے والی چیز) ہو اور اس کا اپنا وجود ہی سمجھا جائے جو اس کی علت کا وجود ہے۔

(اور کیا یہ آواز تیرے کان تک نہیں پہنچی) کہ ممکنات میں ماہیت اور فعلیت کا یہ فرق ہے کہ جب ایک چیز کو دوسری سب چیزوں سے قطع نظر کر کے دیکھا جاتا ہے تو یہ اس کی ماہیت کا لحاظ کیا گیا اور جب اس کو اس طرح دیکھا جائے کہ جاعل کی طرف اس کی فی نفسہٖ (اور واقعی) نسبت کی حیثیت سامنے رہے تو یہ اس کی فعلیت کا لحاظ کیا گیا ہے۔ (اور کیا تیرے کان تک یہ آواز نہیں پہنچی) کہ جعل بسیط[5] کا اثر ایک چیز کی اپنی ذات ہے، اگر وہ جعل نہ ہوتی تو یہ چیز باطل الذات اور خالص منفی ہوتی اور یہ بات بھی معلوم رہے کہ جاعل کو اپنے مجعول کی طرف ایک خصوصیت حاصل ہوتی ہے کہ وہ جاعل اس مجعول کے سوا اور کسی چیز کو مستلزم نہیں ہوتا اور مجعول کو بھی اپنے جاعل کے ساتھ خصوصیت ہوتی ہے کہ اس کے سوا اور کسی سے صادر نہیں ہوسکتا۔ پس ضروری ہے کہ جاعل میں ایک ایسی جہت ہو کہ مجعول کی حقیقت بنے اور اس کی کنہ کہلائے ۔وہ جاعل کی تمام جہت سارے مجعول کے برابر ہوگی اور وہ مجعول اس جہت کی ایک مثال اور وہ جاعل اپنے درجہ میں اپنی ذات میں تام ہے۔ اس کی تمام ہونے کی جہت نے مجعول کو پیدا کیا۔

جب کہ ممکن کی طبیعت میں اس کی اصل فعلیت کے لئے جاعل کی طرف نسبت ضروری ہے اور جب کہ ہر مجعول کی طبیعت میں ضروری ہے کہ اس کی ایک جہت راسخہ جاعل میں موجود ہو تو عالم تحقق اور اقلیم فعلیت میں کسی چیز کا تحقق اور فعلیت ہونا ناممکن ہے جب تک کہ اس کی ایک جہت داجب جل مجدہ میں نہ ہو۔

اب اللہ سبحانہ تعالیٰ کی بزرگی بیان کرنے کا یہ راستہ معین ہوا کہ کہا جائے کہ وہ غیر متناہی چیزوں پر محیط ہے اور یہ احاطہ بھی غیر متناہی ہے۔ اس کی بزرگی بیان کرنے کا یہ طریقہ صحیح نہیں ہے کہ کہا جائے کہ وہ ایک امر محقق ہے کہ تمام کائنات کا استناد اس کی طرف برہانی دلائل سے ضروری ثابت ہو چکا ہے، اس کے بعد کہ جب عقل نے اس کے برخلاف فرض کیا تھا۔

(یہ طریقہ اللہ تعالیٰ کے مجد کا پورا پورا اظہار نہیں ہے بلکہ اس کی ضرورت کا ادنیٰ بیان ہے)۔ وہ عین تقرر ہے، اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے آگے مفہومات میں سے کوئی مفہوم یا فعلیات میں سے کوئی فعلیت ہے۔ اس لئے کہ جس چیز کی بھی ایک جہت واجب میں مندرج نہیں ہے تو وہ خالص ممتنع ذاتی ہے۔

وہ کلی اور جزوی ہونے سے پاک ہے۔ وہ کلی اس لئے نہیں ہے کہ اس میں منفعت کا کوئی حصہ نہیں ہے اور اس میں کوئی نقص نہیں ہے۔[6] وہ تو ایس (وجود) محبت اور تمام محض ہے، لیس (عدم) اور نقص ایک ایسی چیز ہے جس کو عقل پیدا کرتی ہے۔ جب وہ ایسی چیزوں کا لحاظ کرتی ہے جس کے لئے کسی طرح کا وجود نہیں ہے۔ یعنی ایک چیز عقل اور علم میں آتی ہے مگر اس میں جاعل کی طرف استناد ثابت نہیں ہوا۔ (اس لئے وہ چیز وقوع اور وجود سے خالی ہوگی)

اور یہ کہ وہ جزئی نہیں ہے۔ اس کی یہ وجہ ہے کہ اس سے کوئی چیز عام نہیں ہے اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس کے ساتھ مل کر کسی دوسری چیز کے نیچے داخل ہو سکے۔[7] وہ تو واحد حق جل جلالہ ہے۔

یہ بات بھی یاد رہے کہ جو چیز ہر جہت سے ایک ہو اس سے واحد (ایک چیز) کے سوا اور کچھ صادر نہ ہوگا اور نہ واحد کے سوا کوئی چیز اس کو لازم ہو سکتی ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو؟ واحد کا اس کے سوا کوئی معنی ہی نہیں ہے کہ واحد بسیط سے صادر ہوتا ہے۔ اس میں اس کے واحد ہونے کا لحاظ ضروری ہے، اسے خوب یاد رکھو اور خوب سوچتے رہو!

اور کیا تیرے لئے ان کے فلسفے سے یہ بات واضح نہیں ہوئی کہ ایک چیز کے لئے جس قدر عوارض ہوتے ہیں ان کی علت اس چیز پر ختم ہوتی ہے جو اس چیز کے لئے اقتضا ذاتی سے لازم ہو اور جس قدر لوازم ہیں ان کا سلسلہ ایک لازم پر ختم ہوتا ہے، یہ لازم واحد اس چیز کے تقاضے سے جس قدر چیزیں لازم ہو سکتی ہیں ان سب کا مجموعہ ہے اور اس چیز کی جو جہت واجب میں ہوگی اس کی ایک مثال ہے۔ (اور کیا تیرے لئے ان کے فلسفہ سے یہ بات واضح نہیں ہوئی) کہ تقرر ماہیت کا پہلا تمثل ہے اور ماہیت کا اس پر تقدم، تقدم بالذات مانا جاتا ہے، اور تقرر سے جتنی چیزیں بعد میں لازم ہوتی ہیں وہ اس کی شرط کے مطابق اس تقرر کی تمثلات ہیں اور کیا تیرے لئے ان کا فلسفہ سے یہ بات واضح نہیں ہوئی کہ ماہیت امکانیہ اور حقیقت واجبہ اس بات میں تو دونوں مشترک ہیں کہ ہر ایک کا لازم اول ایک ہوتا ہے اور تمام عارضی چیزیں اور لوازم اس ایک لازم پر ختم ہوتے ہیں۔ اس اشتراک کے باوجود ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ممکن انفعالی چیز ہے۔ اس کے تقرر سے جو درجہ بالذات متقدم ہے اس میں اس کے کمالات کے فرائض اور نوافل اس لئے نہیں تمثل ہوتے کہ وہ (فی نفسہ بذات خود) ناقص ہے۔ وہ ناقد الذات ہے۔ اپنی ذات میں بھی وہ (واجب کا) منتظر ہے اور یہ انتظار اس کے لئے

موت سے زیادہ سخت ہے اور واجب فعلی چیز ہے، اس کے درجہ سابقہ میں اس کے کمالات کے فرائض اور نوافل متمثل نہیں ہوتے، تو اس سے اس کی بلندی، اس کی سبقت، اس کی بزرگی اور اس کی عزت مانع ہے اور یہ بھی سبب ہے کہ وہ ہر چیز سے پہلے ہے اور ہر چیز اس کے تابع ہے اور ہر فعلیت کے لئے وہ امام ہے۔

(اور کیا تیرے لئے ان کے فلسفہ سے واضح نہیں ہو چکا کہ کلیت اور جزئیت عقل کے عمل اور ادراک کی صنعت کی نئی پیدا کی ہوئی چیزیں ہیں (جس چیز کو کلی کہا جاتا ہے) وہ چیز اپنی ذات کے درجہ پر ان دونوں وصفوں سے بری ہوتی ہے۔ اس لئے کہ کسی امر کی حقیقت اور اس کا اندرونی راز تو وہ جہت کہلا سکتی ہے کہ جو مجعول کے لئے اصل ہے اور جاعل میں موجود ہے اور یہ جاعل کی پوری تاثیر سے پوری جہت پیدا ہوتی ہے، مجعول اس جہت سے نہ تو عام ہو سکتا ہے اور نہ خاص اور اس جہت کے حساب سے جس جگہ یہ چیز واقع ہوئی نہ تو کوئی دوسری چیز واقع ہو سکتی ہے اور نہ کوئی مفہوم اس کے سوا سمجھ میں آ سکتا ہے۔ (اور یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے) کہ جنس اور فصل کا تعین یہ سب چیزیں عقل میں تمیز حاصل کرتی ہیں، یہ عقلی تصور اس درجہ سے بالکل منقطع ہوتا ہے جو اس چیز کے لئے عند اللہ حاصل ہے۔

(کیا تجھے ان کے فلسفہ سے یہ چیز واضح نہیں ہوئی) کہ وجود "خیر محض" ہے اور ہر معقول فعلیت خالصہ ہے اور بشریت اور عدمیت (برائی اور نہ ہونا) اس ملاحظہ سے ظاہر ہوتی ہیں جس میں استناد الی الجاعل (جاعل کی طرف نسبت) کے حقوق بھلا دیئے جاتے ہیں۔ پس ضروری ہے کہ شریت اور عدمیت کے لئے کوئی دعوۃ الحق نہیں۔

(اور کیا تجھے ان کے فلسفہ سے یہ بات واضح نہیں ہوئی) کہ تفارق بالعدد سفلی حادثات کا حصہ ہے۔ مقدس کائنات میں ایک دوسرے سے تفریق کا مبداء عدد نہیں ہوتا، بلکہ خود ماہیت ہوتی ہے۔

(یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے) کہ نشات دنیا میں جو چیز متمثل ہوتی ہے ضروری ہے[8] کہ نشات علیا میں[9] اس کا ایک امام ہو۔ کمال کے اصول اور فروع میں اس تمثل کا اقتدار اس امام کے ساتھ ہو یہاں تک کہ افلاک کے لئے بھی ان کے ائمہ مقرر کر دیئے گئے ہیں۔

اشراقی حکما کے دل نور اور نار (آگ) کی عبادت میں مبتلا ہو گئے۔ یہ ان کی جہالت ہے اور حق سے ایک قسم کا تجاوز ہے۔

(یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے) کہ کسی چیز کے ساتھ اس کے لوازم اور ذاتیات کا منضم ہونا نہیں پوچھا جا سکتا، یہ ایسا مہمل سوال ہے جو جواب کا مستحق نہیں ہے، پس یہ نہیں کہا جائے گا کہ (لم كان الانسان ناطقا او متعجبا) انسان کیوں ناطق یا متعجب ہے یا (لم كانت النار حارة) آگ کیوں گرم ہے؟ اس لئے کہ مجعول کی جو جہت جاعل میں ہے وہی ان دونوں کو ایک مسلک میں پرو دیتی ہے اور عدم کے پردے سے یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے گلے ملی ہوئی ظاہر ہوتی ہیں اور لازم یا تو اجمالی ماہیت کی ایک تفصیل اور شرح ہوتی ہے اور یا ان دونوں کو جاعل نے کسی امر مشترک کی وجہ سے ایک سلک میں پرو دیا ہے۔

(یہ چیز بھی یاد رکھنا ضروری ہے) کہ جوہر اور عرض کے افتراق کا موقع تمثل کا میدان ہے۔ (باقی یہ دونوں طبیعتیں اپنی جہت کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں۔ یہ ان کی جہت جاعل میں ہوتی ہے۔ کیا تجھے مشائی حکیموں کی وہ چال یاد

نہیں جو فلک کے لئے حرکت دوریہ کو لازم بنانے میں استعمال کرتے ہیں۔ یہاں تک یہ مسائل وہی ہیں جو ایک حکیم ربانی اہل عقل اور حزب البرہان کے مسائل میں سے انتخاب کرتا ہے اور پسند کرتا ہے۔ تجھے ان میں سوچنا چاہیے اور ان سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔

اب ہم ایک ایسے مسئلہ کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ حکمت کی اصل ہے اور تحقیق کا بیج ہے۔ کیا تو نہیں جانتا کہ اسم اسے کہتے ہیں جو ایک چیز کا عنوان ہو اور مسمیٰ سے اسم صرف شرحی ہیئت اور تفصیلی خصوصیت سے جدا ہوتا ہے۔

اب تجھے جاننا چاہیے کہ صادر اول اسماء الٰہیہ میں سے ایک اسم ہے اور اس کے دو درجہ ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ واجب اور صادر اول میں تفریق کی وجہ سب حکماء کے نزدیک وہ ماہیت کا مختلف ہونا ہے، اس کے بعد ہم کہتے ہیں کہ کیا صادر اول (واجب کے لئے) ایک عنوان نہیں ہے جو اس کے دیکھنے والے کی نظر کو حقیقت واجبیہ تک پہنچا دیتا ہے اور اس چیز سے انسلاح صادر اول کی امکانی طبیعت کے مخالف ہے۔ خصوصاً مقدس امکانیات میں یہ انسلاح صادر اول کی امکانی طبیعت کے مخالف ہے۔ خصوصاً مقدس امکانیات میں یہ انسلاح اور بھی ناممکن ہے۔ کیا صادر اول کی ایک جہت واجب جل مجدہ میں مندرج نہیں اور کیا وہ صادر اول اس جہت کی شرح اور تمثال نہیں۔ پس ضروری ہے کہ اسے اسم کہا جائے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ کیا ایسا نہیں ہے کہ واجب کی وحدت صرفہ میں ممکنات کی تمام جہات مندرج ہیں، یہ ممکنات موجود ہوں یا مفروض ہوں اور اسی طرح صادر اول (یعنی اس کی جہت واجب میں مندرج ہے) کیا تو نہیں جانتا کہ صادر اول سارے کا سارا اسی جہت کی تمام قوت کا نتیجہ ہے اور جب کوئی چیز اس طرح ہو کہ وہ ساری چیز کی جست کے سارے اثر کا نتیجہ ہو، تو ہم اس کو اخلاق سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ماسوا ہر ایک چیز کا وجود اللہ میں منسلک ہے کیونکہ اللہ ہر فعلیت کو ہر حیثیت سے احاطہ کئے ہوئے ہیں اور امتیاز ان خصوصیات سے پیدا ہوتا ہے جو ایک دفعہ کے لزوم کے بعد دوسری دفعہ اور اس کے بعد مقرر لازم ہوتی رہتی ہیں۔

(اور یہ قاعدہ ہے) کہ ہر ایسی چیز جو دوسرے میں مستہلک ہو جب وہ مطلق ہوتی ہے تو اس کا حمل اصل پر صحیح ہوتا ہے اور وہ اس کا عنوان بن جاتی ہے۔ اس لئے کہ امتیاز خصوصیت کے سوا ہوتا نہیں، اور یہ چیز جس میں مستہلک ہے نہ تو مطلق ہونے کی وجہ سے اس کے مخالف ہے اور نہ اپنے تحقق میں اس کے مخالف ہے، تو اس وقت یہ فقط اس جہت کی تفصیل اور شرح ہے اور یہ باقی لوازم سے اس طرح ممتاز ہے کہ صادر اول کے سارے لوازم اس کے اثر سے پیدا ہوتے ہیں اور اس کی تمامیت، لوازم کے مجموعہ سے پیدا ہوتی ہے۔ صادر اول کے بڑے لازم یا چھوٹے کو نہیں چھوڑتا مگر اس کا احاطہ کر لیتا ہے، موطن تحقق میں لزوم کے مرتبے پر فقط صادر اول لازم بنتا ہے۔ چاہے اسے بخصوصہ کہہ دو یا اسے بعمومہ کہہ دو اس لئے کہ حقیقت میں تو وہاں نہ خصوص ہے اور نہ عموم ہے۔ جس طرح بعض لوگوں نے تو ہم پیدا کر رکھا ہے کہ وہ مقدم اس لئے ہے کہ اس کو سب خیرات لازم ہیں، پھر یہ کہ وہ ایک جزئی ہے، تمام جزئیات کی امام اپنی ماہیت کی جہت سے تو یہ تو ہم ایک بیہودہ بات ہے اس کے حق میں باطل ہے، اس کی طبیعت کے لئے ممتنع ہے۔ (حقیقت یہ ہے کہ اس کے لئے نہ تو کوئی کہنہ ہے اور نہ حقیقت سواء اس جہت کے جو واجب میں مندرج ہے اور اس جہت سے اس کو کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے۔ سوا اس کے کہ یہ اس کی ہیئت تفصیلیہ ہے اور اس کی خصوصیت شرحیہ ہے۔ (پس یہ واجب کا ایک اسم ہو سکتا ہے) تب حق واضح ہو

گیا اور باطل زائل ہو گیا۔ تحقیق باطل زائل ہونے والا ہے۔

اور یقینی طور پر جان لو کہ یہ حکم پھیلتا جائے گا۔ ابنجاس ثانی اور ثالث میں اور اسے کھینچے لے جاؤ' عرض میں بغیر انتہا کے جیسے کہ واجب جل مجدہ کی ذات میں کوئی انتہا نہیں۔ اس کے محاذات میں ان اسماء صادرات کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں ہر اسم سے جو تیرا ہے اور تو نے اپنے اوپر وہ نام رکھا ہے یا اس کو اپنی کتاب میں نازل کیا ہے یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا ہے یا اس کو اپنے پاس علم غیب میں اختیار کیا ہے اور طول میں اسے کھینچتے چلے جاؤ یہاں تک کہ تمثلات موجودہ اربعہ ختم ہو جائیں اور ان کے آپس میں مل کر ایک ہو جانے سے ارادہ پیدا ہو جائے۔ یہاں سے عالم حادث پیدا ہو گا جو احکام الاسماء کے خلط سے جو ارادے کے ماتحت ظاہر ہوا، مقہور رہے گا۔ یہاں کوئی ایک چیز ساری کی ساری کسی دوسری ایک چیز کی پوری قوت سے ظاہر نہیں ہوتی' نہ یہاں تقدیس ہے نہ عنوانیت ہے' تو ضرور ہے کہ ایک چیز جسے غیر کہا جائے جسے محدث اور معلول کہا جائے، پیدا ہوگی۔

پھر جہاں عالم ختم ہوتا ہے تو اس طرف تمثلات مجردہ ثابت ہوتے ہیں اور اعیانات مقدسہ ظاہر ہوتی ہیں۔ وہ ذات کی طرف کامل طور پر پہنچا دیتی ہیں۔ ان میں پوری عنوانیت موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا الی اللہ المصیر اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔ (وانا للہ وانا الیہ راجعون) ہم اللہ کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹیں گے۔ (الا الی اللہ ترجع الامور) آگاہ ہو جاؤ اللہ کی طرف ہی سب چیزیں لوٹتی ہیں۔ پس یہ کہ اللہ کے اسماء ہیں۔ ''العودیۃ'' لوٹنے والے' جو شخص توفیق پاتا ہے کہ اس سلسلہ دوری کو اس کے تمام احکام کے ساتھ سمجھ لے تو وہ خیر کے تمام شعبوں کے لئے موفق ہوا۔

حزب حکمت کے نزدیک ایک جامعہ کلمہ یہ ہے کہ **ان العالم کلہ غیر اللہ سبحانہ** یعنی سارا جہان اللہ سبحانہ کا غیر ہے' مگر یہ اس معنی میں نہیں جس طرح عام لوگ تصور کرتے ہیں کہ عالم کے لئے مستقل فعلیت مانتے ہیں اور اپنے سر پر اس کا علیحدہ تحقق سمجھتے ہیں' حزب الحکمت کے نزدیک ایسا ہرگز نہیں' بلکہ وہ واجب کی ایک جہت کی تمثال ہے اور اس کے کمال کی ایک شرح غیریت کا مناط عالم کا فی نفسہ ختم ہو جانا اور اپنی ذات میں معین ہونا ہے۔ یہ دونوں چیزیں عالم کے انتہا کی وسعت اور واجب کے اطلاق کی تعری اور اس کے احاطہ کی شدت سے پیدا ہوئی ہیں۔ اگر واجب اس کو شامل نہ ہوتا تو یہ عالم غیر متناہی کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ ہوتا اور اس کا اپنی ذات میں تدنس اور اس کی طبیعت میں تلوث جو واجب کے کمال قدوسیت اور تمام سبوحیت سے پیدا ہوا اور اگر واجب اس کو اپنے اندر نہ لے لیتا تو اس کے قدس کی وجہ سے کچھ بھی نہ رہتا۔

انسداد عنوانیت (عنوان نہ ہونا) اور انعدام اقصاء (نہ پہنچانا) اس لئے ہے کہ ان دونوں کا صدور ظہور کی تیزی سے ہوا گر وہ اپنے اندر اس کو نہ لپیٹ لیتا تو ظہور کی وجہ سے یہ کچھ بھی نہ ہوتا۔ عنوانیت اور اقصاء کی نفس کے لئے یہ مثال اچھی ہے کہ جیسے **الحیوان المطلق لا بشرط شئی** کو **الحیوان الکلی بشرط لا** اور **الحیوان الجزی بشرط شئی** سے ہے۔ تو حیوان مطلق ان دونوں کو اس لئے شامل ہوا کہ اس میں اطلاق بہت زیادہ ہے اور ان کی تناہی نے ان دونوں کو روک دیا اور ان کے تدنس نے عنوانیت سے روکا اور اس سے روکا کہ ان دونوں کی تمام طاقت حیوان مطلق کی تمام طاقت کا نتیجہ ہو۔ اس کے بعد ہم تجھے حکم بتاتے ہیں کہ کیا ممکن ہے کہ صادر اول اپنی اس طبیعت کے ساتھ واجب کا غیر ہو

سکے جس کو عقل کا نام دیا جائے۔ اس سے اس کو دوری ہے' پھر دوری ہے۔
ظلماتی کائنات کا ثبوت موطن قدس ظہور اور تمثل کے طور پر تجھے پریشان خاطر نہ بنائے اس لئے کہ ہر ظلمانی چیز کے لئے ایک خاص قدسی روح ہے۔[10]

یہ قدسی روح اس کے حبل ورید (جان کی رگ) سے بھی زیادہ قریب ہے اور وہ ظلماتی مخلوق اپنی ذاتی حیثیت میں اس قدس سے اتنی دور ہے جیسے کہ دو مشرقین میں بُعد ہو تو جو مثال ہم نے بیان کی ہے اس کو سامنے رکھو اور جان لو کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کسی چیز کو نہیں جانتا اور کسی چیز کا ارادہ نہیں کرتا اور کسی چیز کو پیدا نہیں کرتا مگر اس حیثیت سے کہ وہ خیر محض ہے اور وجود صرف ہے۔ حضرت اسماء کا ایک عکس ہے' یہ مسئلہ عمیق مسائل میں سے ہے۔ اس کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس کی جبلت میں اس کی استعداد ہو۔

اس مسئلے میں تھوڑا مضمون ہم تجھے لکھوا دیتے ہیں جیسا کہ تمام مشاجرات میں ہم نے مختصر تصنیفات کی ہیں۔

اس جملہ ''الزوج اربعة'' کے چار اعتبار ہیں۔ اول یہ ہے کہ تو کہے الزوج منقسم بمتساویین (یعنی جفت کی دو برابر حصوں کی طرف تقسیم ہوتی ہے) اور زوج کے لفظ سے تیری مراد اربعۃ (چار) ہو تو تم نے اس زوج کے لفظ کو اربعۃ کا عنوان بنالیا ہے۔ اسی لحاظ میں زوج اربعۃ کی ایک تجلی ہے اور اس کا ایک اسم ہے چونکہ یہ دونوں چیزیں ایک ہیں اسی وحدت کی شدت کے سبب سے یہ کہنا بھی ممکن نہیں رہا کہ ھو ھو۔[11] (یہ وہی ہے) اور یہ اعتبار سب اعتباروں سے حق کے قریب ہے اور نفس الامر کی زیادہ حکایت کرتا ہے۔ الٰہیات میں حکماء ربانیین کا یہی مذہب ہے' ان کے نزدیک علیم علم سے پہلے ہے اور سمیع سمع سے پہلے ہے۔ حق سے زیادہ ملتی ہوئی بات ان کے نزدیک یہ ہے کہ کہا جائے العلیم والسمیع والحکیم. ان کے نزدیک جو دونوں کلاموں میں احق تھا قرآن اس کے مطابق وارد ہے۔ صحیح حکایت یہ ہے کہ کہا جائے الاسم عین المسیٰ (اسم) مسمیٰ کا عین ہے۔ ایک اعتبار سے اور دوسرے اعتبار سے کہا جائے کہ الاسم لا عین المسمی ولا غیرہ (یعنی اسم مسمیٰ کا نہ تو عین ہے اور نہ غیر ہے) دوسرا اعتبار یہ ہے کہ تو کہے۔ الاربعة زوج. اس قت تو نے زوج کے لفظ کا ایک مفہوم بنایا ہے جو اربع پر صادق آتا ہے اور تیرے قول کا مطلب اس وقت یہ ہے کہ اربعۃ اور زوج اگرچہ دو مفہوم ہیں مگر وہ دونوں لحاظ میں متحد ہو گئے تو اس حکم کے زمانے میں اس کو ایک علم سمجھتا ہے۔ کوئی معین چیز نہیں ہے اور یہ اعتبار پہلے سے کم درجہ کا ہے۔[12]

الٰہیات میں متکلمین کا یہی مذہب ہے۔ ان کے نزدیک علم' علیم سے پہلے ہے اور حکمت حکیم سے پہلے ہے۔
ان کے نزدیک احق الکلامین یہ ہے کہ کہا جائے کہ علم کی صفت اس کے لئے ہے اور حکمت کی صفت اس کے لئے ہے۔
یہ نہیں کہنا چاہیے کہ وہ العلیم' الحکیم ہے۔ وہ علیم اور حکیم کو ایک علمی چیز جانتے ہیں۔ کوئی معین شئے نہیں۔

تیسرا اعتبار یہ ہے کہ جب تو ''زوج'' کی خصوصیت میں ''اربعۃ'' کا مظہر ملاحظہ کرتا ہے اور وہ وحدت جو اس سے پہلے تھی اس کا پیدا ہونا ملاحظہ نظر اور سرعت نفوذ سے تھا۔ اس کو بے کار بنا دیتا ہے اور تو اس کے اس طرف پردے لٹکا دیتا ہے۔ ذہن کے اعتبارات میں اربع اس وحدت کا عنوان تھا۔ یہ ہے صوفیہ کا مذہب۔ اچھی تعبیر ان کے نزدیک یہ ہے کہ زوج ایک تعین ہے اربعہ کا اور مظہر ہے اس کا اور یہ اعتبار پہلے دو اعتباروں کے

درمیان ایک برزخ ہے۔

چوتھا اعتبار یہ ہے کہ جب تو کہے ''اربعہ'' اور اس کے معنی ذہن میں محفوظ کرے پھر تو کہے زوج اور ذہن کی دوسری طرف اس کے معنی محفوظ کر لے، پھر دیکھئے کہ ان دونوں میں نسبت کیا ہے، پس سمجھئے کہ اول ثانی کی علت ہے اور ثانی اس کا معلول ہے۔ اگر اول نہ ہوتا تو موطن وجود میں ثانی بھی نہ ہوتا اور یہی ہے مذہب فلاسفہ کا، ان کے نزدیک ایک علم اس کا معلول م ہے اور اس کی طرف محتاج ہے۔ ان کے نزدیک احق التعبیر ات یہ ہے کہ علم نہ ہوتا اگر واجب نہ ہوتا اس کے سبب سے اور اس کے تقاضے سے علم وجود میں آیا۔ پس جب تجھے کہا جائے کہ اے سمجھ دار انسان عالم متند ہے۔ عقل فعال کی طرف تو انہوں نے جو کچھ حکم دیا ہے اس کی تصدیق کر لے اور جس چیز کو انہوں نے اپنے قضیئے کے موضوع میں عنوان بنایا ہے اس میں اس کو خاطی سمجھ۔ (13)

ان کے کلام کی حقیقت جب اس کو بدعت کے لباسوں سے مجرد کیا جائے یہ ہے کہ واحد' فیاض' خلاق' جواد' عالم کا افاضہ کیا اور اس کو عدم سے نکالا اور اس کی مثال وہ ہے جب کہ کہتے ہیں کہ وحی' عقل فعال کی تعلیم ہے جس سے ان کے کلام کی اصلاح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ کہا جائے کہ وحی رب متکلم، جواد کے افاضہ سے ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ یقین سے جان لو کہ یہ عقول کا مسئلہ عقول کی ایک بدعت ہے اور ایجاد کے منصب میں سواء اللہ سبحانہ کے اور اس کے اسماء کے اور کوئی چیز نہیں' یہ پختہ برہان انشاء اللہ تعالیٰ اس کے لئے کافی ہوگی۔ جس کو سمجھ ہے اور وہ خیال لگا کر سمجھنا چاہتا ہے۔

یہ تجھے ضروری طور پر یاد رکھنا چاہیے کہ ہم اسماء سے مفہومات انتزاعیہ مراد نہیں لیتے بلکہ وجودات مقدسہ، حقائق، شخصیات منزیہ اور تجلیات واجبیہ مراد لیتے ہیں۔

یہ بھی یاد رکھو کہ وہ عدم جسے بعض اہل کشف اور بعض اہل نظر نے موجودات مقدسہ کے لئے ثابت کیا ہے۔ یہ بات کوئی حقیقت نہیں ہے۔ (14)

اس لئے کہ جب اسماء اپنی حقیقت کے مطابق ثابت کئے جائیں تو وہاں کوئی عدم نہیں ہے مگر حکایت عقلیہ کے حساب سے جو غیر واقعہ ہے۔ جس کا تحقق عقل کا درجہ وہم میں ممکن ہے اور جب تو ان کو صفت یا معقول مانتا ہے تو اس سے عدم اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ ان کی اس نظر کے وقت واجب سے اس کا انقطاع ہوتا ہے۔

اس مسئلے میں حکماء کو اللہ جزاء خیر دے جب کہ انہوں نے (اپنے وجدان سے) یہ اصطلاح مقرر کی کہ انیات مقدسہ کا صدور تو اتصاف سے یا موسومیت سے نام رکھا جاتا ہے اور انیات ملوثہ (حقائق ناپاک) کا وجود خلق سے نام دیا جاتا ہے اور اس کو حدوث سے موصوف بناتے ہیں' اس لئے کہ ارادہ کے ماتحت مقہور ہیں اور اسماء کے احکام وہاں مخلوط ہو جاتے ہیں اس طرح کہ کل' کل کے ساتھ موجود نہیں ہوتا۔

اگر دو جماعتوں کا ایک چیز کو سمجھنے میں اختلاف ہو اور سمجھنے کے طریقے ایک ہوں اس کے بعد براہین قائم کئے جائیں تو ممکن ہے کہ صلح ہو جائے اور جب سمجھنے کے طریقے بھی مختلف ہوں تو صلح ہونا بہت مشکل ہے۔ ہاں! مگر اللہ چاہے کہ انہیں تنبیہ ہو۔ سبحانك اللهم وبحمدك لا احصى ثناء عليك كما اثنيت على نفسك۔

دوسرا خزانہ

حکمت کی اساس اور اصل الاصول چند چیزیں ہیں۔

1۔اللہ سبحانہ کی ذات کو اس کی ذات سے پہچاننا۔2۔اللہ سبحانہ کے اسماء کو ان کی خصوصیات اور احکام کے ساتھ پہچاننا۔3۔جو مخلوق پیدا کی گئی ہے اور اسماء اللہ ظاہر ہوئے ہیں ان کو خاص طریقہ سے پہچاننا۔4۔وہ اسماء الٰہیہ جو اپنا کام کر کے اللہ کی طرف عود کرتے ہیں، ان کے احکام کو پہچاننا اور اللہ کی طرف ان کے پہنچنے کی معرفت کو حاصل کرنا۔

یہ ایک دوری سلسلہ ہے۔[15] جس شخص کو اس سلسلہ کا حکیمانہ ذوق حاصل ہوا تو اسے بہت ہی خیر و برکت عطا ہوئی۔جس قدر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہمیں توفیق عطا کی تو ہم اس سلسلہ کی تفصیل بیان کریں گے۔

اللہ سبحانہ کی ذات کی معرفت کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کا درجہ اس سے بہت بلند ہے کہ انسانی ادراک اس کو احاطہ کرلے' ذات کی طرف وصول ایک ذاتی تجلی سے ہوتا ہے۔ جسے کسی طرح پر ادراک نہیں کہا جا سکتا وہ ایک حیرت ہوتی ہے۔

اسی طرح ذات الٰہی اس سے بلند ہے کہ اس کو کسی قسم کے تعین کے ساتھ موصوف کیا جائے' یہ تعین تو اطلاق محض اور وحدت صرفہ ہے۔ہم جس وقت کہتے ہیں کہ وہ اطلاق محض ہے تو اس سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ وہ ایک کلی ہے اس لئے کہ اس کے کلی ہونے کو ہم بالکل باطل کہہ چکے ہیں۔ بلکہ اس سے یہاں ہماری مراد یہ ہے کہ وہ اس طرح موجود ہے کہ اس میں کلی اعتبارات درج ہو جاتے ہیں اور تمام جہات اس میں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ جو ہم نے کہا کہ اس میں تمام اعتبارات درج ہو جاتے ہیں تو اس سے ایسا اندراج مراد ہے جس کا کوئی کلمہ اور حرف واپس نہیں آ سکتا اور وہ ذات' فعلیت کے افق کو بھرنے والی ہے اور تحقق کے موطن میں سمانے والی ہے۔

اور یہ جو ہم نے کہا ہے کہ وہ وحدت صرفہ ہے تو اس سے ہماری مراد وہ وحدت نہیں ہے جو کثرت کا مقابلہ کرتی ہو۔اس لئے کہ کثرت تو تجلیات متاخرہ کی پیدائش ہے تو اسی طرح یہ وحدت بھی وہی حکم رکھتی ہے۔

یہ ضابطہ کلیہ ہے۔ اس پر تمام حکماء اجماع کر چکے ہیں کہ دو متقابلین میں جو تضاد پایا جاتا ہے' وہ ان کی خصوصیات کی طرف نسبت کیا جائے گا نہ کہ نفس رحمانی یا وجود منبسط کی طرف' بلکہ ہم نے تو یہ اصطلاح مقرر کر لی ہے کہ ہر وہ چیز جو وحدت اور کثرت دونوں سے منزہ ہو تو وہ واحد' واحد حقیقی ہے۔ وہ ہر واحد کی اصل ہے اور وہ نفس رحمانی من حیث ہی ہے۔

اس سے اسماء اللہ کی دونوں ضدیں منفی سمجھنی چاہئیں۔ اس معنی سے کہ وہ دو امر ہیں اپنی خصوصیتوں میں اور وہ نفس رحمانی ان دونوں کو قبول کرتے ہیں جب کہ ان سے موصوف ہوتا ہے۔[16] اور حقائق امکانیہ اس حیثیت سے کہ وہ حقائق امکانیہ ہیں ذات الٰہی ان سے بلند ہے۔ان حقائق کا وجود عالم ارادہ کی پیدائش سے اور اس کے تحت میں واقع ہے اور یہ من حیث ہو۔ذات اور صفات سے مسلوب ہیں یہ سلب بسیط ہے اسی طرح نہیں کہ یہ حقائق یا اشیاء ایسی چیزیں جن کا اس منزہ مرتبہ سے بلند کرنا ضروری ہے۔اس لئے کہ ادراک عقل کی کارروائی کا نتیجہ ہے۔

حواشی

(1) اصل کتاب "خیر کثیر" حقائق اشیاء پر شاہ صاحب کی بے نظیر تالیف ہے جو پہلی بار مجلس علمی ڈابھیل سورت سے شائع ہوئی تھی۔ یہ اس کا سب سے پہلا اردو ترجمہ ہے جو کہ تیس سال قبل ولی اللہی حکمت کے شارح مولانا عبیداللہ سندھی نے مکہ مکرمہ میں املا کرایا تھا۔ اسی کو معمولی ردوبدل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے اور قوسین میں جو عبارت آتی ہے وہ ہماری طرف سے وضاحت کے لئے بڑھائی گئی ہے۔

(2) یعنی امر انتزاعی کی حقیقت صرف اس قدر ہوتی ہے جو ذہن میں حاصل ہو۔ یہ شئے دراصل انتزاعی چیز کے لئے منشاء انتزاع ہوتی ہے جس طرح آسمان ایک فوقانی اور خارجی چیز ہے۔ اسی سے فوقیت کو انتزاع کیا جاتا ہے تو آسمان کو فوقیت کے لئے منشاء انتزاع اور فوقیت کو امر انتزاعی کہا جائے گا۔

(3) اور پہلے مرتبے کو "ماہیت" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(4) جاننا چاہیے کہ جعل کے ایک معنی ہیں پیدا کرنا، اس کے لئے صرف ایک مفعول آتا ہے جسے مجعول کہا جاتا ہے۔ جیسے **جعل اللہ الانسان** یعنی اللہ نے انسان کو پیدا کیا۔ اس کا اثر بالذات ایک چیز کی ذات ہوتی ہے اسی کو جعل بسیط کہا جاتا ہے، کیونکہ اس کا اثر ایک بسیط چیز ہے۔ اشراقی حکماء جعل بسیط کے قائل ہیں۔ جعل دوسرے معنی "تعبیر" ایک حال سے دوسرے حال پر کرنا ہے۔ اس کے لئے دو مفعول ہوتے ہیں جیسے **جعل اللہ الانسان موجودا** اس کو جعل مؤلف کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس کے اثر میں ترکیب ہوتی ہے۔ مشائی حکماء جعل مؤلف کے قائل ہیں۔

(5) کلی اپنے ذہنی تشخص اور تحصل میں فصل اور شخص کی محتاج ہوتی ہے۔ تو اب واجب الوجود کو کلی کیسے کہہ سکتے ہیں، جب کہ وہ کسی چیز کا محتاج نہیں ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ کلی ذہن کے مخترعات میں سے ہے، تو پھر واجب الوجود کیسے کلی ہوگا۔

(6) جزئی تو وہ ہوتی ہے جس کے تکثر کو عقل جائز نہیں رکھتی۔

(7) "خیر کثیر" عربی کے مطبوعہ نسخے میں "یجوز" کا لفظ آیا ہے، جس کا ترجمہ "جائز" ہوگا۔ استاد علامہ کے پاس قلمی نسخہ تھا، ممکن ہے کہ اس میں "یجب" آیا ہو اور یہ ترجمہ اسی کا ہو اور یہی راجح معلوم ہوتا ہے۔

(8) نشات علیا سے مراد عالم مثال ہے۔ اسی کو میں نے مترجم علامہ سے "خیر کثیر" عربی کے درس میں سنا تھا۔ (غلام مصطفیٰ قاسمی)

(9) یہ کدورت اور تدنس محل خاص اور دفع کی وجہ سے آیا ہے۔ جیسے عضلات میں ہوتا ہے۔

(10) یہاں حمل اس لئے نہیں ہوتا کہ اس میں دو چیزیں اور دو اعتبار چاہئیں اور یہاں تو وحدت محض ہے۔ پھر حمل کیسے ہوگا! (قاسمی)

(11) کیونکہ اس میں وحدت کا اعتبار اثنیت کے اعتبار سے بعد کی چیز ہے (قاسمی)

(12) انہوں نے تجلی کو چھوڑ کر عقل کا لحاظ کیا۔

(13) یہ تحقیق امام ربانی مجدد الف ثانی پر رد ہے۔ امام ربانی نے عدم کو ثابت کیا ہے اور شخص اکبر کا وجود عدم سے تسلیم کیا ہے۔ میرے نزدیک حق بات یہ ہے کہ امام ربانی نے مذکورہ بات عوام کے فہم کے مطابق کہی ہے، یہ کوئی علمی حقیقت نہیں ہے۔ (قاسمی)

(14) یعنی ذات الٰہی سے اسماء کا صدور ہوتا ہے پھر ان کا مخلوقات میں ظہور ہوتا ہے۔ پھر اللہ کی طرف لوٹتے ہیں۔ ان کے اثر سے متاثر ہو کر پھر نئے اسماء کا صدور ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ غیر متناہی دور جاری رہتا ہے۔

(15) یعنی مرتبہ ذات میں تو دونوں سے خالی ہے اور مرتبہ اتصاف میں دونوں سے موصوف ہو جاتا ہے تو اس قسم کے تضاد اسماء جب کہ نفس رحمانی کی ذات بھی ان سے بلند ہے تو ذات الٰہی کا اس قسم کی وحدت اور کثرت دونوں سے منزہ ہونا اجلیٰ بدیہیات سے ہوگا۔

مولانا عبید اللہ سندھی

تمہید کتاب سطعات (امام ولی اللہ)

(مولانا عزیز احمد عبید اللّٰہی)

عام طور پر وجوہ کو واجب اور ممکن اور پھر ممکن کو حادث اور قدیم میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ حقائق پر پوری بحث ختم کرنے کے بعد جن معانی میں یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں وہ صحیح نہیں ثابت ہوتے کیونکہ ہر موجود کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی علت کی تاثیر سے واجب ہو جبکہ وجود کے ساتھ وجوب ضروری ہو گیا تو یہ بحث کہ وہ وجوب بالذات ہے یا وجوب الغیر، دوسرے درجے پر رہ جاتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ وجوب بالغیر جہاں ہوگا وہ وجوب بالذات سے دوسرے درجے پر مانا جائے گا۔ اس لئے وجود کے مراتب کی صحیح مثال انسان کی ذہنی معلومات میں عقلی' خیالی اور حسی علوم میں ملتی ہے۔ انسانی ذہن تینوں مراتب کے لئے قیومیت کا درجہ رکھتا ہے مگر عقلیت ذہن سے بلاواسطہ تعلق رکھتی ہے اور خیالیت عقلیت کے بعد اور ایسے ہی احساس خیال کے بعد مگر نفس انسانی تینوں چیزوں کا براہ راست قیوم ہے۔ اشراقی حکماء کی تحقیق میں وجود ایک قیوم کے ساتھ قائم ہے پھر اس میں مراتب ضرور مختلف ہیں۔ یہ بحثیں ''عبقات'' اور شاہ ولی اللہ صاحب کی مفصل کتابوں میں پڑھنی چاہئیں۔

اس وقت کوئی سی اصطلاح سامنے رکھی جائے عقل مندوں کی تمام جماعتیں وجود کے تین مراتب ماننے پر متفق ہیں۔ پہلا مرتبہ واجب بالذات یا قیوم حقیقی یا ذات بحت۔ دوسرا مرتبہ صادر اول یا ممکن واجب الغیر قدیم یا صفات الٰہیہ یا مرتبہ عقل، یہ سب اس دوسرے درجے کی مختلف تعبیریں ہیں۔ اس کے بعد تیسرا درجہ جسے عالم یا کائنات یا قیوم حقیقی سے بالواسطہ تعلق رکھنے والا وجود یا شخص اکبر۔ ان تین مراتب پر عقلمند متفق ہیں یعنی انسانی عقل ان مراتب کا انکار نہیں کر سکتی۔

اس کے اندر راز یہ ہے کہ انسان اسی چیز کو سمجھ سکتا ہے جو اس کی ذات میں ہو یا پھر کسی چیز کو اس پر قیاس کر لیتا ہے اس لئے سب سے پہلے اس مسئلہ میں یقین پیدا کرنا چاہیے کہ انسان کیا ہے۔ ہم اپنی معلومات دو حصوں میں تقسیم کر کے بیان کریں گے۔ پہلا حصہ فرضیات (تھیوری)' دوسرا حصہ خواص اور لوازم۔ پھر عقلی اور خیالی دلیلوں سے یا مشاہدہ اور تجربہ سے بحث کرنے کے بعد اس تھیوری کو واقعی ماننا۔ یہ دوسرا حصہ [1] ہمارا سائنس اور حقائق سے تعبیر کیا جائے گا۔ انسان کی ذات کے متعلق ہماری تھیوری یہ ہے۔ سب سے پہلے بدن انسانی ہے جو موت کے بعد دفن کر دیا جاتا ہے یا جلا دیا جاتا

ہے۔اس کے اندر ایک جزو ہے جسے نسمہ یا جسمانی روح یا طبی روح کہا جاتا ہے۔وہ نباتات میں' حیوانات میں، انسانوں میں یکساں پایا جاتا ہے۔نباتی روح یقیناً ایک جسم لطیف ہے۔جب وہ جدا ہو جائے تو باقی جسم نشوونما سے معطل ہو جاتا ہے۔اسی طرح کی روح ہر حیوان میں ملتی ہے جس کے علیحدہ ہونے سے اس حیوان کی موت طاری ہوتی ہے۔وہ حیوان حس وحرکت سے معطل ہو جاتا ہے۔اسی طرح کی روح انسانی بدن میں پھیلی ہوئی ہے۔جب یہ روح علیحدہ ہو جائے تو انسانی نشوونما اور حس وحرکت اور سوچ بچار سب ختم ہو جاتی ہیں۔اس حیوانی روح کے ساتھ تیسرا جزو ہم نفس ناطقہ مانتے ہیں۔اس کی تشریح سے پہلے ہمیں کلی اور جزئی کی نسبت سمجھنا ضروری ہے۔ہم وجود کے مواطن مختلف مانتے ہیں۔ایک موطن میں کلی بشکل جزئی موجود فی الخارج ہوتی ہے۔اس سے نازل موطن میں اس کلی کے عکوس مختلف مرایا میں مرتسم ہوتے ہیں۔اس سے جزئیات پیدا ہوتی ہیں گویا ہمارے نزدیک کلی اور اس کی ایک جزئی میں سوائے اختلاف موطن کے اور کوئی فرق نہیں۔اسی اختلاف موطن کا یہ اثر ضرور ہے کہ کلی اپنے موطن میں ایک ہی ہوسکتی ہے اور جزئی موطن میں تعداد کا امکان ہے۔جس قدر آئینے زیادہ ہوں اسی قدر جزئیات پیدا ہوسکتی ہیں مگر ایک ایک جزئی کو جب کلی کے مقابلے میں دیکھا جائے گا وہ دو مختلف موطن کو دو جزئیں ہوں گی۔اس مسئلہ پر جیسے کہ فلاطون کی رائے تھی ہمارے ائمہ شاہ ولی اللہ سے لے کر مولانا محمد قاسم تک سب ایک ہی خیال پر متفق ہیں۔منطق کی جتنی کتابیں درس میں داخل ہیں ان میں اس قول کی تردید مختلف پہلوؤں سے پڑھائی جاتی ہے۔استاد جب تک خود محقق نہ ہو طالب علم کو ہمارے عقیدے پر تشفی نہیں دلاسکتا۔یہ بھی ایک بہت بڑا سبب ہے جس سے طلباء شاہ ولی اللہ صاحب کی کتابیں سمجھنے سے عاجز آ جاتے ہیں۔جملہ معترضہ ختم ہوا۔

اس اختلاف موطن کو''سطعات'' کے پہلے سطعہ میں اس طرح واضح کر دیا گیا ہے۔

برخاتم لفظ زید نقش کردیم بعد ازیں موم یا گل آوردیم وخاتم را بروے زدیم نقش خاص بالفعل حال در موم یا گل پیدا شود۔

اب یہاں زید کے لفظ کا ایک موطن وہ تھا جب خاتم پر نقش کیا گیا۔دوسرا موطن ہے کہ اس کا عکس موم یا مٹی میں پیدا ہوتا ہے۔پہلے موطن میں زید کو کلی کہا جاتا ہے دوسرے موطن میں زید کو جزئی کہا جائے گا۔اس پر یہ لفظ دال ہیں'' آں کلی است واین جزئی''۔پہلا اشارہ زید کی طرف ہے جو خاتم پر منقوش ہے اور دوسرا اشارہ اس زید کی طرف ہے جو مٹی پر نقش ہوا۔جیسے اختلاف مواطن سے کلی اور جزئی کی حقیقت سمجھ میں آتی ہے اسی طرح ایک دوسرا لفظ ہے اس کا مطلب بھی سمجھ لینا چاہیے۔جزئی کو شہادی کہا جاتا ہے اور کلی کو اس کا مرتبہ عقل مانا جاتا ہے یا جزئی کو موجود مانا جاتا ہے اور اس کی کلی کو عین ثابت کہا جاتا ہے۔یہ دوسری اصطلاح ''عبقات'' کی ہے۔یہاں پر یہ تمہیدی جملہ ختم ہوا۔

انسانی کلی اپنے موطن میں ایک جزئی کی شکل میں موجود ہے' اسے امام النوع کہا جاتا ہے۔اس کا عکس اس کے متصل نورانی آئینوں میں جس کا نام عالم مثال ہے، پڑتا ہے یعنی مثال کے کاغذ پر امام نوع کی جو تصویر آئے گی وہ اس کی ایک جزئی ہوگی۔یہ جزئی ایک انسان کے لئے اس کا نفس ناطقہ بنے گی۔اس طرح سمجھنا چاہیے کہ اس موطن میں جس قدر جزئیات امام نوع کی منعکس ہوئیں' اتنے ہی انسان پیدا کرنا حق کو منظور ہوں گے۔یہ نفس ناطقہ نسمہ کے ساتھ منطبق ہو جاتا ہے اور نسمے کو اپنی شکل پر ڈھال لیتا ہے اور اس کے واسطہ سے بدن میں تاثیر کرتا ہے اور بدن کو امام نوع کی صورت پر لے

آ تا ہے۔ یہ تیسرا جزو ہے انسانیت کا ہمارے نظریات میں۔

اس نفس ناطقہ میں ایک نقطہ ایسا نورانی ہے کہ وہ واجب الوجود کا جتنا تصور بلکہ اس کی جیسے مثال نفس ناطقہ میں آ سکتی تھی وہ اس کی مکمل شکل ہے۔ اس نقطہ کو ہم حجر بحت کہتے ہیں' یہ نورانی شعلہ ملکیت کے لطیف کاغذ پر قائم رہتا ہے' اس طرح ہم نفس ناطقہ سے اوپر روح ملکوتی مانتے ہیں جو حجر بحت کے لئے آئینہ اور کاغذ بن سکتا ہے۔ یہ چوتھا جزو ہوگا انسانیت کا' اس کے بعد حجر بحت ہی ایک نورانی ٹکڑا انسانیت میں باقی رہتا ہے جسے ہم پانچواں جزو انسانیت کا مانیں گے۔ ہمارے اس نظریئے کی پوری تفصیل ''الطاف القدس'' میں ملے گی۔

اب ہم اس مسئلہ کی طرف آتے ہیں جسے انسان کامل اپنے اندر حجر بحت کا مشاہدہ کرتا ہے اور پھر اس کے گرد ملکوتی کاغذ کو لپٹا ہوا دیکھتا ہے۔ اسی طرح واجب الوجود کو حجر بحت کے درجے پر اور اس کی صفات لازمہ کو روح ملکوتی کی شکل میں خیال بناتا ہے۔ اب حجر بحت کے درجے پر جو درجہ وجود کا مستقل انسان کے ذہن میں آئے گا اسے ذات بحت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ جو درجہ روح ملکوتی کی طرح پر ہوگا' اسے حکماء مرتبہ عقل کہتے ہیں اور ملی لوگ مرتبہ صفات سے تعبیر کرتے ہیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جو صفات ذات کے بعد مانے جاتے ہیں وہ ممکن بالذات واجب بالغیر اور قدیم ازلی ابدی سمجھے جاتے ہیں۔ یہ اوصاف جیسے ملی لوگوں کے نزدیک صفات الٰہیہ کے لئے ضروری ہیں اسی طرح حکماء کے نزدیک بھی صفات مرتبہ عقل کے لئے ضروری ہیں۔ اسی طرح عقل کو ماننا یا صفات زائد مع الذات ماننا نزاع لفظی کے قریب ہو جاتا ہے۔

اب انسان اپنے نفس ناطقہ کو انانیت کا مصداق مانتا ہے جس وقت میں کہتا ہے تو اس وقت اس کی مراد نفس ناطقہ ہوتی ہے۔ تمام کائنات کو جو مرتبہ ذات بحت و عقل کے بعد ہے انسان ایک بڑے انسان کی شکل میں سوچتا ہے اسے شخص اکبر کہا جاتا ہے۔ اس کا نفس ناطقہ جو ہوگا اسے نفس کلیہ کہا جاتا ہے اس کا حجر بحت جو ہوگا اسے تجلی اعظم کہا جاتا ہے۔ چونکہ انسان اس چیز کو سمجھ سکتا ہے جو اس کے اندر ہو یا جو اس کی نظیر ہو۔ ہم نے جب اپنے نظریئے میں انسان کے اجزاء معین کر دیئے تو اس قاعدے سے ہم تمام وجود کو تین حصوں میں تقسیم کریں گے۔ ذات بحت' مرتبہ عقل اور شخص اکبر یہاں پر یہ بحث ختم ہو گئی کہ ہم کیوں وجود کو ان تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں تمام انسانیت کے عقلمندوں نے کیوں وجود کے یہ تین حصے تسلیم کیے۔

تتمہ: یہاں ایک ضمنی بحث تتمہ کے طور پر لکھنا ضروری ہے۔ ہم نے جن عقلمندوں کو اس مسئلہ پر متفق مانا ہے وہ فقط وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن میں ہم اپنی اصطلاح خاص میں کامل کہتے ہیں یعنی وہ اپنے اندر حجر بحت کو مشاہدہ کر لیتے ہیں اور اس کے ذریعہ سے وہ تمام وجود کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس قسم کے تمام کامل انسانوں کا اور ان کے تمام متبعین کا اتفاق ہے کہ وجود کو تین مرتبوں میں ماننا چاہیے' مگر ایک ایسا طبقہ عقلمندوں کا جس نے انسانیت کی تحلیل کرنے میں بدن انسانی کو سمجھنے میں زیادہ وقت صرف کر دیا اور اس کے ساتھ نسمے کا تلازم اس کی عقل میں روشن ہو گیا مگر نفس ناطقہ اور امام النوع کا سمجھنا ابھی باقی ہے۔ وہ اس نقصان کے زمانے میں سوائے مادے کے مرتب عقل یا مرتبہ ذات بحت کا انکار کر بیٹھتے ہیں۔ یہ انکار ان کا جہل بسیط ہے' یعنی انہیں ابھی فرصت نہیں ملی کہ وہ اپنے نظریات کے مطابق ان مسائل کو حل کر سکیں۔ ایک سائنٹسٹ مادی

تحقیقات میں منہمک ہو کر اپنی بے بساطی کا ان لفظوں میں اقرار کرتا ہے کہ میں سائنس کا محیط نہیں ہوں بلکہ میری مثال ایسی ہے جیسے سمندر کے کنارے ایک بچہ سیپ سے کھیل رہا ہو۔ اس کا یہ کہنا کہ سیپ کے سوا اور کوئی چیز نہیں اسی معنی میں ان ناقص طالب علموں کے اقوال سمجھنے چاہئیں۔ ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وجود کے مسئلہ کو سمجھنے والا انسان کبھی خدا کا انکار نہیں کر سکتا۔ اس لئے ہم شاہ ولی اللہ کا فلسفہ جو وجود کی وحدت حقیقی پر مبنی ہے یا پرانی ویدانت فلاسفی کی دوسری ایڈیشن ہے اس سائنس کے عروج کے زمانے میں اس فلسفہ کا پڑھنا ہم ضروری قرار دیتے ہیں، تا کہ اصطلاحی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو کر خدا کا انکار نہ کیا جا سکے۔

سطعہ اول کی تمہید ختم ہوئی۔ **الحمد اللہ علی ذلك**

حاشیہ

(1) اگر عقلی ہے تو فلسفہ کہلائے گا اور اگر مشاہدہ اور سائنس سے ثابت کیا جائے تو حقائق کہلائے گا۔

✦ ..... ✦ ..... ✦

اردو ترجمہ: محمد سرور

رسالۂ دانش مندی

شاہ ولی اللہ دہلوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سب تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے جو حکمتوں کا الہام کرنے والا اور نعمتوں کا عطا کرنے والا ہے اور درود و سلام ہو ان سب میں افضل پر، جنہیں (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) کتاب اور فیصلہ کن بات دی گئی۔ نیز آپ کی آل اور آپؐ کے صحابہ پر، جنہوں نے احکام دین کی تبلیغ واشاعت کی اور ہمارے لئے انہیں اس طرح بیان کیا کہ اس سے یقین حاصل ہو۔ اس کے بعد فقیر ولی اللہ بن عبدالرحیم کہتا ہے کہ اس خاکسار نے فن دانش مندی اپنے والد سے سیکھا۔ انہوں نے میر محمد زاہد بن قاضی اسلم سے یہ فن سیکھا۔ انہوں نے ملا محمد فاضل سے، انہوں نے ملا محمد یوسف قراباغی سے، انہوں نے مرزا جان سے، انہوں نے ملا محمود شیرازی سے، انہوں نے ملا جلال الدین دوانی سے، انہوں نے اپنے والد اسعد بن عبدالرحیم اور ملا مظہر الدین گازرونی سے، ان دونوں نے ملا سعد الدین تفتازانی اور سید شریف جرجانی سے، انہوں نے قطب الدین رازی سے، انہوں نے اور ملا سعد الدین تفتازانی دونوں نے قاضی عضد سے، انہوں نے ملا زین الدین سے، انہوں نے قاضی بیضاوی سے اور ان کی سند کا سلسلہ جو کتب تاریخ میں مشہور و معروف ہے، شیخ ابوالحسن اشعری تک جاتا ہے۔

غرض فقیر نے فن دانش مندی اس سند سے اخذ کیا ہے اور علم کلام اور اصول (1) بھی اس فن سے مخلوط ہیں۔ اس سند کے رجال سب کے سب اہل تصنیف اور اصحاب تحقیق ہیں اور درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہے ہیں۔ سوائے فقیر کے والد (شاہ عبدالرحیم کے) جو اشغال قلبی میں مشغول رہنے کی وجہ سے تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کے لئے وقت نہ نکال سکے۔

اس فقیر کے دل میں آیا کہ فن دانش مندی کے قواعد و اصول مرتب کرے اور اپنے زمانے والوں کو ان سے متعارف کرائے۔ اگر تم یہ پوچھو کہ دانش مندی سے میں کیا مراد لیتا ہوں تو دانش مندی سے میری مراد کتاب دانی ہے اور اس کے تین درجے ہیں۔ اس کا ایک درجہ تو یہ ہے کہ کتاب کا مطالعہ ہو اور اس کی حقیقت بدرجہ تحقیق حاصل کی جائے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ استاد کتاب کو پڑھائے اور اس کی حقیقت شاگردوں کو سمجھائے اور اس کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ وہ اس کتاب پر شرح یا حاشیہ لکھے اور اس کی حقیقت کے انکشاف میں مبالغہ کرے۔

اگر تم کہو کہ یہ جو میں نے فن دانش مندی کے اصول وقواعد کو مرتب کرنے کا ذکر کیا ہے۔ اس کا اور ان کے حفظ کرنے اور ان کی تحقیق کرنے کا کیا فائدہ ہے' تو میں یہ کہتا ہوں کہ اس کے دو فائدے ہیں۔ ایک تو اس سے طالب علم کتاب کے مطالعہ کا طریقہ جان لیتا ہے اور اس طرح اکثر حالات میں یہ مطالعہ قرین صواب ہوتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب طالب علم کو فن دانش مندی کے بعض مقدمات جیسا کہ صرف ونحو ولغت وغیرہ ہیں' یاد ہوں گے۔ اس کے بعد وہ کسی کتاب کا مطالعہ کرے گا۔ اس کے پیش نظر اس کتاب کی شرح وتفسیر ہوگی اور شفیق استاد اسے ان قواعد کلیہ سے آگاہ کرے گا۔ اس کے بعد استاد اسے ہر مقام پر شارح نے اس سلسلے میں جو نکتہ بیان کیا ہوگا' اس سے مطلع کرے گا' تو اس طرح طالب علم کو کتاب مذکور سمجھنے کا سلیقہ پیدا ہو جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ کلیات کے احکام جاننے کے بعد جزئیات اور جزئیات سے ان جیسی جو اور چیزیں پیدا ہوتی ہیں' ان کا احاطہ زیادہ آسان ہو جاتا ہے اور اس کی مثال ایسی ہے کہ جو شخص شعراء کے دواوین پر ممارست رکھتا ہے' وہ شعر کہنے لگتا ہے۔

اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ان بزرگوں نے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے اور وہ ان جیسے دوسرے حضرات نے جو دانش مندی میں سند کی حیثیت رکھتے ہیں' فنون دانش مندی کو علم کلام واصول وغیرہ سے مخلوط کر دیا ہے۔ اب اکثر ایسا ہوتا ہے کہ طالب علم ان علوم سے فنون دانش مندی کو الگ تمیز نہیں کر سکتا اور ان سب کے مجموعہ کو وہ ایک ہی علم جانتا ہے۔ چنانچہ اس زمانے کے اکثر خام طبعوں کا یہ حال ہے کہ چونکہ انہیں علم کے مختلف پہلوؤں میں انتشار نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ سے وہ اس کا صحیح طرح احاطہ نہیں کر سکتے اور نہ وہ فن دانش مندی پر عمل کر سکتے ہیں' کیونکہ ادھر ان کا ذہن منتقل ہی نہیں ہوتا۔ غرض جب اس مجموعی علم سے اس کے فنون الگ اور متمیز ہوں گے اور طالب علم اس قاعدے کو جان لے گا اور اس طرح اس کے ذہن میں فنون دانش مندی کے بارے میں ایک امر جامع معین ہو جائے گا تو جیسے ہی وہ کسی مقام پر تھوڑی سی توجہ کرے گا' وہ اس علم کے مسائل کا الگ الگ ادراک کرے گا اور ان کے ہر پہلو پر اس کا احاطہ ہو جائے گا۔ **وما ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ** (میں تو حتی المقدور بس اصلاح چاہتا ہوں اور اللہ تعالیٰ ہی مجھے اس کی توفیق دینے والا ہے۔)

تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر ایک عالم اپنے شاگردوں کو علوم کی کتابوں میں سے کوئی کتاب درایت وتحقیق کے طریقے پر پڑھانا چاہتا ہے تو اسے لازمی طور پر پندرہ باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کتاب کی شرح کرنا چاہتا ہے تو لامحالہ طور پر اسے بھی ان باتوں کا خیال رکھنا ہوگا۔ وہ پندرہ باتیں یہ ہیں:

پہلی پیش نظر عبارت میں جو مشکل الفاظ ہیں ان کی نشاندہی یعنی عبارت میں جو اسماء وافعال ہیں اگر ان کی حرکات وسکنات محل اشتباہ ہیں تو انہیں بیان کر دے۔ اسی طرح حروف پر جہاں نقطے ہیں اور جہاں کوئی نقطہ نہیں، وہ بھی بیان کرے تاکہ تصحیف خطی اور تصحیف لفظی (مثلاً ج کی ح، ع کی غ، ت کی ث وغیرہ سے تمیز ہو جائے) ہر دو سے محفوظ ہو جائے۔

دوسری یہ کہ عبارت میں جو غریب ونامانوس لفظ آئے تو اس کی شرح کرے یعنی اگر کوئی لفظ قلیل الاستعمال ہے اور شاگردوں کے لئے اس کے استعمال کا مفہوم واضح نہیں تو عالم اس کی لغت اور اصطلاح دونوں کی رو سے تشریح کر دے۔

ان پندرہ باتوں میں سے تیسری بات یہ ہے۔ عبارت میں جو مغلق جگہ ہو استاد اس کی وضاحت کرے۔ یعنی اگر عبارت میں کوئی مشکل ترکیب یا مثل نحوی وصرفی صیغہ آیا ہے تو شاگردوں کے لئے اسے سمجھنا مشکل ہے تو عالم اس کو نحو اور صرف کے مطابق حل کر دے۔

چوتھی یہ کہ مسئلہ زیر بحث کو مثالیں دے کر یا اس کی مختلف صورتیں پیش کر کے سمجھائے۔ مثلاً کتاب میں ایک قاعدے کا ذکر ہے اور شاگرد اسے نہیں سمجھ پاتے، تو عالم اسے واضح طور پر بیان کرے اور اس کی مثالیں دے تاکہ شاگردوں کے ذہن میں اصل مقصد آ جائے۔

پانچویں بات ''تقریب الدلائل'' (دلیلوں کو ذہن کے قریب لانا) ہے یعنی اگر کتاب میں کسی مسئلے پر کوئی دلیل قائم کی گئی ہے تو عالم اس کے مخفی [2] مقدمات کو اس طرح بیان کرے کہ بعض مقدمات کا بعض سے جو التزام ہے یا بعض جو دوسروں میں مندرج ہیں، ان سے جو نتیجہ مقصود ہے وہ نکل آئے اور اس ضمن میں وہ ایسے مقدمات بدیہیہ [3] کی طرف رجوع کرے کہ جن میں شک اور شبہ بداہتاً داخل نہ ہو۔

اس سلسلے کی چھٹی بات یہ ہے کہ تعریفات کی تحقیق کرتے وقت ان کی جو قیود [4] ہوں، ان کے فوائد بیان کرے اور اگر کسی تعریف کی قیود میں سے کسی قید کی کمی ہے، تو اسے پورا کیا جائے۔ نیز اسناد تقسیمات [5] اور ان سے ایسی جامع [6] و مانع [7] حد کے انتزاع [8] کا جس میں کہ کوئی چیز زائد نہ ہو، طریقہ شرح وبسط سے بیان کرے۔

ساتویں بات یہ ہے کہ قواعد کلیہ کی اس طرح وضاحت کرے کہ اس کے ذیل میں تعریف کی قیود کے فوائد، تقسیمات اور مثالوں کا نیز ان سے اس قاعدہ کلی [9] کے ایسا انتزاع کا کہ اس میں کوئی چیز زائد نہ ہو اور وہ جامع و مانع ہو، شرح وبسط سے بیان آ جائے۔

آٹھویں بات ہے۔ عالم تقسیمات کو حصر کرنے کی وجہ واضح کرے اور بتائے کہ یہ حصر تقسیمات استقراء [10] کی بنا پر ہے۔ یا وہ اس کے حق میں عقلی دلیل پیش کرے کہ شئے مطلوب انہی مذکورہ اقسام میں محصور ہے اور اسی طرح عالم فصول وقواعد میں جو تقدیم وتاخیر ہو، اس کی وجہ بیان کرے۔

نویں بات ہے دو التباس رکھنے والی چیزوں میں تفریق، مثلاً اگر بادی النظر میں دو قسمیں مشابہ ہوں یا دو مخالف مذہب ایک دوسرے سے مشابہ دکھائی دیں تو عالم بڑے واضح طور سے ان کے درمیان جو فرق ہے، اسے بیان کرے۔

دسویں بات ہے۔ دو مختلف چیزوں میں تطبیق، اگر مصنف کی عبارت میں دو مختلف جگہوں میں اختلاف پایا جاتا ہے، تو عالم اس اختلاف کو حل کرے، خواہ ان دونوں کا اختلاف دلالت [11] مطابقی کا ہو، یا ایک دلالت مطابقی ہو، اور دوسرا تضمنی یا التزامی۔

گیارہویں بات، یہ پہلی بات کا تکملہ ہے۔ ظاہر الورود شبہات کا دور کرنا ہے۔ جیسے کہ مثال کے طور پر تعریفات میں استدراک کسی زائد چیز کا ذکر، خفی تر شئے سے کسی چیز کی تعریف کرنا اور تعریف کا جامع و مانع نہ ہونا، ممنوع ہے، یا جیسے کہ دلائل میں جزئیہ کبریٰ [12] ممنوع ہے یا شاگردوں کو مصنف کے کلام میں بادی النظر میں مخالفت نظر آئے یا اس کا استدلال، استدلال کے موقع ومحل پر ٹھیک نہ بیٹھتا ہو۔ عالم ان ظاہر الورود شبہات کی طرف توجہ کرے اور انہیں دور کرے۔

بارہویں بات، جہاں حوالہ دیا گیا ہے، وہاں حوالے کا اور جہاں مصنف نے ''و فیہ نظر'' کہا ہے، وہاں اس سے مصنف کی کیا مراد ہے، اس کا ذکر کیا جائے اور جہاں سوال [13] مقدر کی طرف اشارہ ہوتا ہو اس کی وضاحت کی جائے۔

اور ان پندرہ باتوں میں سے تیرہویں بات یہ ہے کہ اگر شاگردوں کی زبان وہ نہیں جو کتاب کی ہے تو کتاب کی عبارت کا شاگردوں کی زبان میں ترجمہ کیا جائے۔

چودہویں بات، مختلف توجیہات کی تنقیح، اور ان توجیہات میں جو صحیح تر ہو، اس کا تعین، مطلب یہ ہے کہ اگر کتاب کے کسی مقام کے متعلق پڑھانے والوں اور شارحوں میں اختلاف ہو۔ ایک جماعت ایک جہت سے اس کی نئی شرح کرتی ہے، اور دوسری جماعت دوسری جہت سے اس کی شرح کرتی ہے اور اس طرح توجیہات میں نزاع پیدا ہو جاتا ہے۔ عالم ان توجیہات کی تنقیح کرے اور ان میں سے جو بہترین ہو، اس کا تعین کرے اور اسی پر مشکل الفاظ کا ضبط و نشان دہی اور مشکل ترکیبوں کا حل بھی قیاس کر لو۔

پندرہویں بات یہ ہے کہ عالم کی تقریر سہل ہو۔ یعنی اوپر جن بارہ باتوں (صنعتوں) کا ذکر ہے انہیں وہ واضح اور موجز و مختصر عبارت میں اس طرح بیان کرے کہ وہ ذہن سے قریب ہوں۔ (کم سے کم الفاظ میں مفہوم ادا کرنا کہ اس میں کوئی غیر ضروری چیز نہ آئے، ایماز و اختصار ہے) اور ان کا اخذ کرنا آسان ہو اور ان میں سے ایک بات امتزاج بھی ہے اور وہ یہ کہ استاد مصنف کی عبارت کو اپنی عبارت کے ساتھ اس طرح ملائے کہ دونوں عبارتیں مل کر باہم مربوط و ہم آہنگ ہو جائیں۔

جب ایک عالم مذکورہ بالا پندرہ صنعتوں پر عمل کرے گا تو وہ درس و تدریس اور کتاب کی شرح و تفسیر میں کامل ہو جائے گا۔ شفیق استاد کو چاہیے کہ

اولاً: وہ اپنے شاگردوں کو ان امور سے اجمالی طور سے مطلع کرے۔

ثانیاً: جب وہ شرح و بیان کے دوران ان امور سے گزریں، تو وہ انہیں بتائے کہ یہاں شارح کا مطلب یہ ہے اور وہاں اس کا مطلب یہ تھا۔

ثالثاً: شفیق استاد شاگردوں کو بتائے کہ وہ کتاب کے مطالعہ میں ان ان امور کو پیش نظر رکھیں اور ان ان میدانوں میں اپنی فکر کو جولاں کریں۔

رابعاً: شاگرد کے مطالعہ کا اپنے مطالعہ سے مقابلہ کرے اور شاگرد سے غلطی ہو تو اسے اس طرح اس پر متنبہ کرے کہ یہ غلطی اس کے ذہن پر واضح ہو جائے اور وہ آئندہ ایسی غلطی کرنے میں احتیاط برتے۔

خامساً: استاد شاگرد کو کسی کتاب کی شرح یا اس پر حاشیہ لکھنے کو کہے اور اس طرح اس کی قابلیت کا امتحان لے تاکہ تربیت کا جو حق ہے اس کی تکمیل ہو سکے۔

یہ بھی معلوم رہے کہ دانش مندی کے فن کا کتب معقول و منقول اور علوم برہانیہ [14] اور خطابیہ [15] سب پر اطلاق ہوتا ہے۔ اس ضمن میں کتب منقول میں زیادہ تر ان کی عبارتوں کی تحقیق کی ضرورت پڑتی ہے اور کتب معقول میں مسائل کی تحقیق کی۔ علوم برہانیہ میں ایک یا ایک سے زیادہ واسطوں کے مقدمات بدیہی کو بطریق برہان [16] لوٹانے کی

ضرورت ہوتی ہے اور علوم خطابیہ میں بطریق ظن۔

میں نے اپنے اساتذہ سے مذکورہ بالا سند کے ساتھ جو فن دانش مندی سیکھا تھا یہ اس کا خلاصہ مطلب ہے اور یہ یہاں ختم ہوتا ہے۔

والحمد للّٰہ اولاً و آخراً و ظاھراً و باطناً

حواشی

(1) اصول سے مراد اصول فقہ ہے۔

(2) قیاس دو قضیوں سے مرکب ہوتا ہے اور ان سے نتیجہ نکلتا ہے۔ جیسے عالم متغیر ہے۔ یہ پہلا قضیہ ہے اور جو چیز متغیر ہو وہ حادث ہوتی ہے، یہ دوسرا قضیہ ہے۔ اس سے لازم آیا کہ عالم حادث ہے۔ یہ نتیجہ ہے، پہلے قضیے کو صغریٰ اور دوسرے کو کبریٰ کہتے ہیں۔ اگر پہلا قضیہ مذکور اور دوسرا متروک ہو تو یہ قضایا مقدمات مخفی ہوں گے۔

(3) وہ تصور یا تصدیق جس میں غور وفکر کی ضرورت نہ ہو بدیہی ہوتا ہے۔ ذہن میں کسی چیز کا آنا تصور ہے اور تصور مع الحکم کو تصدیق کہتے ہیں۔

(4) انسان کی تعریف ہے حیوان ناطق، حیوان ناطق اس تعریف کی قیود ہیں۔

(5) تقسیمات (بسط قسمت)۔ مثلاً اس طرح استدلال کرنا کہ یہ چیز یوں یوں ہے اور یوں یوں نہیں۔ ایک چیز کے خواص اور عدم خواص کا برابر تفصیل کرتے جانا ''بسط قسمت'' کہلاتا ہے۔

(6) اپنے تمام افراد پر محیط ہونا جامع اور اپنے تمام غیر افراد کی نفی کرنا مانع ہے۔

(7) دلیل یا قیاس میں تین حدیں ہوتی ہیں۔ اصغر، اوسط، اکبر۔ ''عالم متغیر ہے۔'' دلیل یا قیاس میں عالم کو حد اصغر کہتے ہیں، ہر متغیر حادث ہے۔ حادث کو حد اکبر کہیں گے اور عالم اور حادث کو ملانے والی حد اوسط ہے۔

(8) انتزاع۔ نتیجہ نکالنا

(9) وہ قاعدہ جو بہت سی چیزوں پر صادق آئے، کلی ہے۔

(10) اس دلیل کو کہتے ہیں، جس میں جزئیات کی تحقیق کر کے ان کی ماہیت کلی پر حکم لگایا جائے۔

(11) الفاظ کا اپنے معنی پر دلالت کرنا ''دلالت'' کہلاتا ہے۔ یہ دلالت یا تو وضعی ہوتی ہے یا غیر وضعی۔ لفظ کا اپنے اس معنی پر دلالت کرنا جس کے لئے وہ وضع کیا گیا ہے، یہ دلالت وضعی ہے، اور اس کا اپنے اس معنی پر دلالت کرنا جس کے لئے وہ وضع نہیں کیا گیا، یہ دلالت غیر وضعی ہے۔ دلالت وضعی کی تین قسمیں ہیں۔ مطابقی، تضمینی اور التزامی۔ انسان کا حیوان ناطق پر دلالت کرنا یہ دلالت مطابقی ہے۔ انسان کا حیوان یا ناطق میں سے کسی ایک پر دلالت کرنا یہ دلالت تضمینی ہے اور اگر ان دونوں سے کسی خارج چیز پر وہ دلالت کرے اور وہ خارج چیز انسان کے لئے ذہن میں لازم ہے تو اسے دلالت التزامی کہتے ہیں مثلاً انسان کا قابل العلم ہونے پر دلالت کرنا۔

(12) قیاس اقترانی کی چار شکلیں ہوتی ہیں۔ شکل اول میں یہ شرط ہے کہ صغریٰ موجبہ ہو اور کبریٰ کلیہ، اس شکل میں جزئیہ کلیہ آنا ممنوع ہے۔

(13) کوئی عبارت جو کسی سوال کا جواب معلوم ہوتی ہے لیکن عبارت میں سوال مذکور نہ ہو، اس سوال کو سوال مقدر کہتے ہیں۔

(14) علوم برہانیہ، وہ علوم جن میں دلیل و برہان ہو، جیسے کہ منطق۔

(15) ظن کے علوم کو علوم خطابیہ کہتے ہیں۔ ان میں ظنی مقدمات پیش کر کے اپنی بات کہی جاتی ہے۔

(16) وہ تصدیق جو جازم و ثابت اور واقع کے مطابق ہو یقین ہے اور وہ قیاس جو مقدمات یقینی سے مرکب ہو برہان ہے۔ یہ مقدمات یقینی یا تو بذاتہٖ بدیہی ہوتے ہیں یا ان مقدمات یقینی کی طرف ایک واسطے یا ایک سے زیادہ واسطوں سے پہنچا جاتا ہے۔

میرا عقیدہ

حضرت شاہ ولی اللہ [1]

سب تعریف اللہ کے لئے ہے، جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے اور درود وسلام پہنچے اس کے رسول ہمارے آقا محمد خاتم النبیین کو اور آپ کی آل اور آپ کے تمام صحابہ کو۔ اس کے بعد خدائے کریم کی رحمت کا یہ محتاج احمد المدعو بہ ولی اللہ بن عبدالرحیم، اللہ تعالیٰ ان دونوں پر احسان کرے، کہتا ہے کہ میں گواہ بناتا ہوں اللہ تعالیٰ کو اور فرشتوں، جنوں اور انسانوں میں سے جو بھی حاضر ہیں ان کو کہ میں خلوص دل سے اس پر اعتقاد رکھتا ہوں۔

اس عالم کا ایک صانع ہے، جو قدیم ہے، زندہ ہے، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اپنے وجود میں واجب ہے اور اس کا عدم ممتنع ہے۔ وہ بڑا برتر، کمال کی تمام صفات سے متصف اور نقص وزوال کی سب علامتوں سے پاک ہے۔ وہ ساری مخلوقات کا خالق، تمام معلومات کا عالم، سب ممکنات پر قدرت رکھنے والا اور تمام کائنات کے لئے ارادہ کرنے والا ہے۔ وہ زندہ ہے، سننے والا ہے اور دیکھنے والا ہے۔ نہ اس کے کوئی مشابہ ہے، نہ کوئی اس کے مقابلے کا، نہ کوئی اس کی ضد اور اس جیسا ہے، اور نہ کوئی وجود میں واجب ہونے، عبادت کا مستحق ہونے اور خلق اور تدبیر میں اس کا شریک ہے۔

عبادت یعنی آخری حد کی تعظیم کا اس کے سوا اور کوئی مستحق نہیں۔ اس کے سوا نہ کوئی مریض کو شفا دیتا ہے نہ کوئی رزق دیتا ہے اور نہ تکلیف دور کرتا ہے اور یہ اس معنی میں کہ جب وہ کسی چیز کو کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے نہ کہ ظاہری و عادی سبب کے معنی میں، جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ طبیب نے مریض کو شفا دی اور امیر نے فوج کو رزق دیا۔ چنانچہ یہ اس سے ایک الگ چیز ہے اگرچہ دونوں کے الفاظ ایک سے ہیں، نہ اس کا کوئی مددگار ہے نہ وہ کسی اور میں حلول کرتا ہے اور نہ وہ کسی اور سے متحد ہوتا ہے۔ اس کی ذات کے ساتھ کوئی حادث یعنی زوال پذیر چیز قائم نہیں، اور نہ اس کی صفات میں حدوث و زوال ہے۔ البتہ حدوث وزوال اس تعلق میں ہے، جو صفات اور ان سے متعلقات ہیں۔ چنانچہ متعلقات میں تفاوت سے تعلق کے احکام میں تفاوت رونما ہوتا ہے۔

وہ ہر جہت سے حدوث وتجدد سے پاک ہے، نہ وہ جوہر ہے، نہ عرض اور نہ جسم، وہ کسی مکان میں نہیں اور نہ کسی جہت میں، اس کی طرف اشارہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ یہاں ہے یا وہاں، نہ اس کی طرف حرکت، نقل وانتقال، اس کی ذات و صفات میں تغیر وتبدل اور جہل وکذب منسوب کرنا صحیح ہے۔ وہ عرش کے اوپر ہے۔ [2] جیسا کہ خود اس نے اپنے بارے میں بیان کیا ہے، لیکن اس کا عرش کے اوپر ہونا کسی مکان یا کسی جہت میں ہونے کے معنی میں نہیں۔ اس کے عرش کے اوپر ہونے

یا عرش پر استوآ ی کی حقیقت وکنہ یا تو خود اللہ تعالیٰ جانتا ہے یا وہ راسخین فی العلم، جنہیں اس نے اپنے پاس سے علم عطا کیا ہے۔

قیامت کے دن دو اعتبار سے مومنین اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے۔ ایک یہ کہ وہ ان پر یوں پوری طرح منکشف ہو کہ یہ انکشاف اس کو عقلی طور پر تصدیق کرنے سے زیادہ ہو۔ گویا کہ انہوں نے اسے آنکھ سے دیکھ لیا۔ لیکن اس کا یہ دیکھنا اس طرح نہیں کہ وہ برابر میں ہے یا سامنے ہے، یا کسی جہت میں ہے، یا اس کا کوئی رنگ یا شکل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس طرح کی روایت کے معتزلہ اور دوسرے بھی قائل ہیں اور یہ حق ہے۔ البتہ ان کی غلطی یہ ہے کہ اس اعتبار سے جو روایت ہوگی وہ اس کی تاویل کرتے ہیں، یا روایت باری تعالیٰ کو وہ صرف اسی معنی میں حصر کر دیتے ہیں۔

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کو مومنین دوسرے اعتبار سے یوں دیکھیں گے کہ وہ ان کے سامنے بہت سی صورتوں میں متمثل ہوگا۔ جیسا کہ سنت میں مذکور ہے، پس وہ اسے اپنی آنکھوں سے مختلف شکلوں اور رنگوں میں اور اپنے روبرو یوں دیکھیں گے جس طرح حالت خواب میں ہوتا ہے۔ اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے، جس میں آپؐ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے رب کو بہترین صورت میں دیکھا۔ غرض مومنین دوسری دنیا میں اللہ کو بالمشافہ دیکھیں گے جب کہ وہ اس دنیا میں اسے خواب میں بھی نہیں دیکھتے، اللہ تعالیٰ کی رؤیت کے یہ دو اعتبارات ہیں، جنہیں ہم سمجھتے ہیں، اور ان پر اعتقاد رکھتے ہیں اور اگر اللہ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک ان کے سوا کوئی اور روایت ہے تو اس سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی جو مراد ہو، ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اگرچہ ہم اس کی حقیقت سے بعینہٖ واقف نہیں، اور یہ اس لئے کہ اللہ جو چاہتا ہے، ہوتا ہے، اور جو وہ نہیں چاہتا وہ ہرگز نہیں ہوگا۔ جہاں تک کفر اور گناہوں کا تعلق ہے تو وہ اس کی تخلیق ہیں اور اس کے ارادے سے ہیں۔ لیکن وہ ان سے راضی نہیں۔ وہ بے نیاز ہے اور نہ اپنی ذات میں اور نہ اپنی صفات میں کسی چیز کا محتاج ہے۔ اس پر کوئی حاکم نہیں اور نہ کسی غیر کی طرف سے اس پر کوئی چیز واجب ہوتی ہے۔ ہاں وہ ایک چیز کا وعدہ کرتا ہے اور پھر اس وعدے کو پورا کرتا ہے۔ جیسے کہ وارد ہوا ہے اور اللہ جو وعدہ کرتا ہے تو یہ وعدہ اللہ کی ضمانت ہو جاتا ہے۔

اللہ کے تمام افعال حکمت اور کلی مصلحت کے مقتضی ہیں، لیکن وہ حکمت اور کلی مصلحت، جس کا کہ اسے علم ہے۔ اس پر واجب نہیں کہ وہ کسی خاص کے ساتھ لازماً جزوی مہربانی کرے یا کسی خاص کو فائدہ پہنچائے۔ اس سے کوئی برائی صادر نہیں ہوتی اور جو کچھ وہ کرتا یا جو وہ حکم دیتا ہے، وہ ظلم اور جور کی طرف منسوب نہیں ہوتا، جو کچھ وہ پیدا کرتا اور جو وہ اوامر دیتا ہے اس میں وہ حکمت کو ملحوظ رکھتا ہے۔ وہ اس لئے نہیں پیدا کرتا اور حکم دیتا کہ وہ کسی چیز کے ذریعے اپنی ذات اور صفات کی تکمیل کرے اور یہ کہ اس کی کوئی حاجت اور غرض ہے کیونکہ یہ تو کمزوری اور خرابی کی بات ہوئی۔

اللہ کے سوا اور کوئی فیصلہ کرنے اور حکم دینے والا نہیں۔ اشیاء کے حسن وقبح کے تعین اور افعال کے موجب ثواب و عذاب ہونے کے بارے میں عقل کے ہاتھ میں فیصلہ نہیں۔ درحقیقت اشیاء کا حسن وقبح اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور حکم اور اس کی طرف سے لوگوں کو ان اشیاء کا مکلف بنانے پر ہے۔ پس ان میں سے بعض اشیاء ایسی ہوتی ہیں کہ عقل ان کے حسن وقبح اور موجب ثواب وعذاب کا علم پیغمبروں ہی کے ذریعے ہوتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے بارے میں خبر دیتے ہیں۔

اللہ کی صفات میں سے ہر صفت اس کی ذات کے ساتھ ایک ہے اور وہ تعلق اور تجدد کے اعتبار سے بے نہایت

ہے اور اس کا یہ تعلق ان معنوں میں ہے جو اوپر گزرے[3] اللہ تعالیٰ کے لئے فرشتے ہیں بڑے مرتبے والے اور مقرب، اور ایسے فرشتے ہیں جن کے ذمے انسانوں کے اعمال کا لکھنا، کسی بندے کو ہلاکتوں سے بچانا اور بھلائی کی طرف دعوت دینا ہے اور یہ فرشتے بندوں کے ساتھ بھلائی کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا ایک معین درجہ ہے، اور اللہ کی طرف سے جو انہیں احکام ملتے ہیں، ان میں وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو انہیں حکم دیا جاتا ہے اسے بجالاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے شیاطین بھی ہیں اور ان میں سے ابن آدم کو شر پہنچتا ہے۔

قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اسے بذریعہ وحی اتارا (اور جیسا کہ قرآن مجید میں ہے) **وما کان بشر ان یکلمه الله الاوحیاً او من وراء حجاب او یرسل رسولاً فیوحی باذنه ما یشاء.** ''کسی آدمی کے لئے ممکن نہیں کہ خدا اس سے بات کرے مگر الہام (کے ذریعے) سے یا پردے کے پیچھے سے یا اس کی طرف رسول بھیجے جو اللہ کے حکم سے جو وہ چاہے اسے وحی پہنچائے۔'' یہ ہے وحی کی حقیقت۔

اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اس کی صفات میں الحاد جائز نہیں اور شرع نے اسماء وصفات کی جو حدیں مقرر کی ہیں، ان پر رک جانا چاہیے۔ موت کے بعد جسم کے ساتھ لوٹنا (معاد جسمانی) جیسے کہ شرعاً وعرفاً تھے اگرچہ یہ لمبے یا چھوٹے ہوں گے جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ کافر کا دانت احد پہاڑ کے برابر ہوگا اور اہل جنت کے بیان میں حدیث میں وارد ہوا ہے کہ ان کے جسم زیادہ لطیف ہوں گے۔ ایسے ہی جیسے ایک بچہ وہی بچہ ہوتا ہے خواہ وہ (آگے چل کر) جوان اور بوڑھا ہو جائے اور اس کے جسم میں ہزار تبدیلیاں ہوں۔

جزا وسزا، حساب، صراط اور میزان سب حق ہیں اور جنت دوزخ حق ہیں اور وہ دونوں آج بھی مخلوق وموجود ہیں۔ البتہ نص شرعی نے ان کی جگہ کا تعین بالصراحت نہیں کیا۔ بہر حال وہ وہیں ہیں جہاں اللہ تعالیٰ انہیں چاہتا ہے اور ظاہر ہے ہم اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور اس کے جہانوں کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

ایک مسلمان خواہ وہ کبیرہ گناہ کا مرتکب ہو، ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہے گا۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ **ان تجتنبوا کبائر ماتنهون عنه نکفر عنکم سیاتکم۔** اگر تم کبیرہ گناہوں سے بچو گے، جن سے تمہیں منع کیا گیا ہے تو ہم تمہاری تقصیریں معاف کر دیں گے اور یہ تقصیروں کی معافی نماز کے ذریعہ ہوتی ہے۔[4]

کبیرہ گناہوں کا کفارہ یعنی وہ اعمال جن سے یہ معاف ہو جائیں، جائز ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے افعال دنیا اور آخرت میں دو طرح پر ہوتے ہیں۔ ایک اللہ کی سنت کے موافق اور دوسرے خرق عادت کے طور پر یعنی عام عادت ومعمول کے خلاف، اور جو شخص بلا توبہ کے مر جائے اس کے کبیرہ گناہوں کا خرق عادت کے طور پر معاف ہو جانا جائز ہے۔ اسی طرح جس شخص کے ذمے لوگوں کے حقوق ہوں اور وہ بلا توبہ کے مر جائے تو ان حقوق کا خرق عادت کے طور پر معاف ہونا جائز ہے۔ چنانچہ اس طرح (کبیرہ گناہوں کی معافی کے بارے میں) بہ نظر ظاہر نصوص میں جو تعارض پایا جاتا ہے اس میں باہم مطابقت ہو جاتی ہے۔

شفاعت حق ہے اس شخص کے لئے جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے شفاعت کی اجازت دی جائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی امت کے کبیرہ گناہوں والوں کے لئے شفاعت حق ہے اور آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ جہاں

شفاعت کی نفی کا ذکر آیا ہے تو اس سے مراد وہ شفاعت ہے جو اللہ تعالیٰ کی اجازت اور اس کی رضامندی کے بغیر ہو۔

فاسق کے لئے عذاب قبر اور مومن کے لئے قبر کا آرام حق ہے۔ قبر میں مردے سے منکر ونکیر کا سوال کرنا حق ہے۔ مخلوق کی طرف رسولوں کا مبعوث کیا جانا حق ہے۔ بندوں کو رسولوں کی زبان سے اوامر ونواہی کا مکلف کیا جانا حق ہے۔ یہ رسول بعض امور میں جو ان کے سوا مجموعی طور سے دوسروں میں نہیں پائے جاتے، ممتاز ہوتے ہیں اور یہی اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ انبیاء ہیں۔ ان میں سے ایک ان سے خرق عادات واقعات کا رونما ہونا ہے، اور ایک ان کی سلامتی فطرت اور اخلاق میں کامل ہونا وغیرہ ہے۔ انبیاء کفر، جان بوجھ کر کبیرہ گناہوں کے ارتکاب اور چھوٹے گناہوں پر اصرار کرنے سے معصوم ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ انہیں تین طریقوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ انہیں فطرت کی سلامتی اور اخلاق میں کمال اعتدال پر پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ وہ گناہوں کی طرف رغبت نہیں کرتے بلکہ وہ ان سے متنفر رہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ انہیں وحی سے بتایا جاتا ہے کہ گناہوں پر عذاب ہوگا اور اطاعات کا ثواب ملے گا اور یہ چیز ان کے لئے گناہوں سے روکنے والی ہوتی ہے اور تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کے اور گناہوں کے درمیان بعض لطیف غیبی چیزیں حائل کر دیتا ہے جیسے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا اس طور پر ظاہر ہونا کہ وہ گویا اپنی انگلی کاٹ رہے ہیں۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم خاتم النبیین تھے۔ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا اور آپؐ کی دعوت تمام انس اور جن کے لئے عام ہے۔ آپؐ اس اعتبار سے اور اسی طرح کے بعض دوسرے اعتبارات سے تمام انبیاء سے افضل ہیں۔ اولیاء جو اللہ اور اس کی صفات پر ایمان لانے والے اور ان کے عارف ہیں اور اپنے ایمان میں درجہ احسان پر فائز ہیں، ان کی کرامات حق ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کرامات سے جسے چاہتا ہے سرفراز فرماتا ہے اور اپنی رحمت سے جسے چاہتا ہے مختص کرتا ہے۔ اس نے عشرہ مبشرہ،[5] فاطمہ، خدیجہ، عائشہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کے بارے میں جنت اور نیکی کی شہادت دی۔ ہم ان کی عزت کرتے ہیں اور اسلام میں ان کا جو اونچا مقام ہے اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ اسی طرح اہل بدر اور اہل بیعت رضوان کا بھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر صدیقؓ امام حق ہیں۔ ان کے بعد عمرؓ پھر عثمانؓ اور ان کے بعد علیؓ۔ پھر خلافت ختم ہوگئی اور اس کے بعد سخت گیر بادشاہی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان کے بعد عمر رضی اللہ عنہ پھر عثمان رضی اللہ عنہ۔ افضلیت سے ہماری مراد تمام جہت سے افضلیت نہیں کہ اس کے تحت نسب، شجاعت، قوت علم اور اس جیسی اور چیزیں بھی آ جائیں، بلکہ یہ افضلیت اسلام میں ان کی زیادہ سے زیادہ نفع رسانی کی بنا پر ہے۔ اس امت کے امیر نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپؐ کے دو وزیر ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔ باعتبار اشاعت حق میں اپنی عظیم ہمت کے اور یہ اس لئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دو رخ تھے۔ آپؐ کا ایک رخ اللہ تعالیٰ کی طرف تھا کہ اس سے اخذ (وحی) کرتے تھے اور آپؐ کا دوسرا رخ خلق کی طرف تھا کہ اسے عطا کرتے تھے۔ اب حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ دونوں کا خلق کو عطا کرنے، لوگوں کو مانوس اور ان کو جمع کرنے اور حرب وضرب کا انتظام کرنے میں بہت زیادہ ہاتھ تھا۔

ہم صحابہؓ کا ذکر خیر سے کرتے ہیں۔ وہ ہمارے امام اور دین میں ہمارے پیشوا ہیں۔ ان کو برا بھلا کہنا حرام اور ان کی تعظیم کرنا واجب ہے۔ ہم اہل قبلہ میں سے کسی کی تکفیر نہیں کرتے' سوائے اس کے کہ اس سے کوئی ایسی بات ہو جس سے اللہ تعالیٰ صانع و مختار اور قادر کی نفی ہوتی ہو' یا غیر اللہ کی عبادت ہو' یا مرنے کے بعد جی اٹھنے (معاد) اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نیز دین کی اور ضروریات کا انکار ہوتا ہو۔

امر بالمعروف یعنی نیک کاموں کا حکم کرنا اور نہی عن المنکر یعنی برے کاموں سے روکنا واجب ہے۔ اس کی شرط یہ ہے کہ یہ فتنے اور گڑبڑ کا موجب نہ ہو اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے وقت گمان یہ ہو کہ یہ قابل قبول ہوگا۔

پس یہ ہے میرا عقیدہ اور میں اس عقیدے کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو ظاہراً و باطناً مانتا ہوں۔

آخر میں سب تعریف اللہ کے لئے ہے۔ اول میں، آخر میں، ظاہر میں اور باطن میں۔ اے رب! مجھے حشر کے دن ان اطاعت گزاروں کے زمرے میں اٹھائیو جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لائے۔ اللہ تعالیٰ کی دعا و سلامتی ہو آپ پر جو سب مخلوقات سے بہتر ہیں' آپ کی آل پر' آپ کے صحابہؓ پر اور ان سب پر جو ان کی متابعت کریں اور اللہ ہی سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

حواشی

(1) حضرت شاہ ولی اللہ کے رسالے ''حسن العقیدۃ'' کا یہ اردو ترجمہ ہے۔ اس رسالے میں حضرت شاہ صاحب نے اپنا عقیدہ بیان فرمایا ہے۔

(2) اشارہ ہے قرآن مجید کی اس آیت کی طرف **الرحمن علی العرش استویٰ**

(3) شروع مضمون میں ہے۔ ''نہ اس کی ذات میں اور نہ اس کی صفات میں حدوث و زوال ہے۔ البتہ حدوث و زوال اس تعلق میں ہے' جو صفات اور ان سے متعلقات میں ہے جس سے کہ افعال کا ظہور ہوتا ہے......''

(4) یہ اشارہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی طرف **ارایتم لو ان نهراً بباب احدکم یغتسل فیه کل یوم خمسا هل یبقی من درنه شی قالو الایبقی من درنه شی قال فذلک مثل الصلوٰت الخمس یمحو اللّٰه بهن الخطایا**

(ترجمہ) حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم دیکھو کہ تم میں سے کسی کے دروازے کے قریب سے نہر بہہ رہی ہے اور وہ اس میں روزانہ پانچ بار نہاتا ہے' تو کیا اس پر کوئی میل رہ جائے گی۔ صحابہ نے کہا کہ اس پر کوئی میل نہیں رہے گی۔ آپ نے فرمایا کہ اس کی مثال پانچ نمازوں کی ہے۔ جن کے ذریعہ اللہ خطاؤں کو ہٹا دیتا ہے۔

(5) عشرہ مبشرہ مندرجہ ذیل دس صحابہ کرام ہیں۔

حضرت ابوبکر، عمر، عثمان، علی، طلحہ، زبیر، عبدالرحمٰن بن عوف، سعید بن وقاص، سعید بن زید اور عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہم۔

یوسف سلیم چشتی

''قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین''

تالیف امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی کا ایک اہم خطاب

مآثر جمیلہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

(1) ان میں سے پہلی خوبی، آپ کی قوت نسیت اور براعت جمال و وجاہت ہے۔ حضرت ابوعمر نے استیعاب میں اور مصعب زبیری، ماہر علم الانساب نے کہا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو عتیق اس لئے کہتے تھے کہ ان کے نسب میں کوئی عیب نہیں تھا اور اللیث بن سعد نے کہا کہ ان کو عتیق اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ بہت صاحب جمال تھے اور وہ زمانۂ جاہلیت میں اپنی قوم کے رئیس تھے اور زمانۂ جاہلیت میں اشناق بھی انہی سے متعلق تھا یعنی وہی خون بہا کی رقم کا تعین کرتے تھے اور مجرم کی طرف سے اگر وہ ضمانت دے دیتے تھے تو سب کو اطمینان ہو جاتا تھا۔ نیز انہوں نے زمانۂ جاہلیت میں بھی شراب نہیں پی۔ ان کے ساتھ حضرت عثمانؓ نے بھی شراب اپنے اوپر حرام کر لی تھی۔

(2) دوسری خوبی یہ ہے کہ آپؓ تمام قوم قریش میں علم انساب کے سب سے زیادہ ماہر تھے اور ان کی تاریخ سے بھی واقف تھے۔ جبیر ابن مطعم جو قریش کے حسب و نسب سے بخوبی واقف تھے، کہا کرتے تھے کہ میں نے یہ علم حضرت ابوبکر صدیقؓ سے حاصل کیا تھا۔ حضرت صدیق اکبرؓ کا نام عبداللہ تھا اور ان کا لقب عتیق تھا کیوں کہ ان کا چہرہ بہت خوبصورت تھا۔ ابن اسحاق نے کہا کہ حضرت ابوبکرؓ اپنی قوم میں سب کو محبوب تھے اور قریش کے حسب و نسب سے بخوبی واقف تھے۔ وہ تاجر تھے اور اپنے اخلاق حسنہ کی بناء پر معروف تھے اور ان کی قوم کے افراد ان کے حسن خلق کی وجہ سے ان کے پاس آمد و رفت رکھتے تھے اور ان کی مجلس میں اچھی باتیں ہوا کرتی تھیں۔

حضورؐ کے دعویٰ نبوت سے پہلے بھی ابوبکرؓ آنحضرت صلعم کے ساتھ بہت محبت کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ جب آنحضرت صلعم بارہ برس کے تھے تو اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ تجارتی سفر پر گئے۔ جب بمقام بصریٰ پہنچے تو وہاں ایک راہب نے جس کا نام بحیرہ تھا، آنحضرت صلعم کو بغور دیکھا تو آپؐ میں وہ نشانیاں پائیں جو اس کی کتب سماوی میں نبی آخرالزمان کے بارے میں مرقوم تھیں، اس لئے اس نے کہا ''میں تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں مجھے بتاؤ کہ اس لڑکے کا ولی کون ہے؟'' ابوطالب نے کہا میں اس کا ولی ہوں۔ چنانچہ ابوطالب نے آپ کو حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ بھیجا اور اس راہب نے آپ کو کعک (روغنی روٹی) اور زیتون بطور زاد راہ دیا۔

(3) جب حسان ابن ثابت نے قریش کی ہجو کا ارادہ کیا (کیونکہ وہ لوگ آپ کی ہجو کراتے تھے) تو آپؐ نے حسان سے کہا کہ تم قریش کی ہجو کیسے کرسکو گے جبکہ میں خود انہی میں سے ہوں؟ مثلاً تم ابوسفیان کی ہجو کیسے کرسکو گے جبکہ وہ میرے چچا کا بیٹا ہے؟

حسان نے کہا ''آپ مطمئن رہیں میں آپ کو ان میں سے اس طرح نکال لوں گا جس طرح آٹے میں سے بال کو نکال لیا جاتا ہے۔'' اس پر آپؐ نے فرمایا ''اچھا تو ابوبکرؓ سے مشورہ کرو کیونکہ وہ تمہارے مقابلے میں قوم کے نسب سے زیادہ واقف ہیں۔'' چنانچہ حسان، حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے کہا فلاں فلاں افراد سے صرف نظر کرلو یعنی ان کا ذکر مت کرنا، اور فلاں فلاں افراد کا ذکر کرنا۔ پس حسان قریش کی ہجو میں مشغول ہوگئے۔ جب قریش نے حسان کے اشعار سنے تو انہوں نے کہا کہ یہ وہ اشعار ہیں جو ابن ابی قحافہ کی مدد سے کہے گئے ہیں۔

(4) جب آنحضرت صلعم مبعوث ہوئے تو احرار بالغین میں سے جو شخص سب سے پہلے آپؐ پر ایمان لایا وہ حضرت ابوبکرؓ تھے اور اس بات پر سب مؤرخین کا اتفاق ہے۔ ہاں وہ اس امر میں مختلف الرائے ہیں کہ اول مطلق کون ہے؟ ابوبکرؓ یا علیؓ؟ لیکن اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ علی صغیر السن (طفل) تھے اور آنحضرت صلعم کی کفالت میں تھے۔ چنانچہ سیرت ابن اسحاق میں اس کی وضاحت موجود ہے۔ بعض نے حضرت خدیجہؓ اور زید ابن حارثہ کا نام لیا ہے۔ یہ فقیر (مصنف) اس جگہ ایک نکتہ بیان کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اولیت کا مطلب دراصل یہ ہے کہ کس شخص کو سب سے پہلے سرکارؐ کے ساتھ اسلام کی تبلیغ کا شرف حاصل ہوا۔ نیز یہ کہ بالغ افراد میں کون سب سے پہلے اسلام لایا (کیونکہ طفل نابالغ کا اسلام یا ایمان عندالعقل معتبر نہیں ہوسکتا) پس یہ فضیلت صرف ابوبکرؓ کو حاصل ہے کہ بالغ مردوں میں وہی سب سے پہلے اسلام لائے۔

عمر سے جو عفیرہ کے غلام ہیں، مروی ہے کہ محمد بن کعب القرظی سے پوچھا گیا کہ پہلے کون اسلام لایا؟ ابوبکرؓ یا علیؓ؟ تو انہوں نے کہا کہ علیؓ سب سے پہلے اسلام لائے لیکن یہ امر لوگوں پر اس لئے مشتبہ ہوگیا کہ انہوں نے ابوطالب سے اپنا اسلام مخفی رکھا اور جب ابوبکرؓ اسلام لائے تو انہوں نے اپنے اسلام کو ظاہر کردیا۔

ابراہیم نخعی راوی ہیں کہ جو شخص سب سے پہلے اسلام لایا وہ ابوبکرؓ ہیں۔ نیز شعبی راوی ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ ابن عباس سے پوچھا کہ کون شخص سب سے پہلے اسلام لایا؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ کیا تم نے حسان ابن ثابت کا یہ قول نہیں پڑھا؟

''اے مخاطب! جب تو اپنے کسی نیک بھائی کا تذکرہ کرنے لگے تو سب سے پہلے اپنے بھائی حضرت ابوبکرؓ کا ذکر خیر کر۔ بوجہ ان کارہائے خیر کے جو انہوں نے کئے۔

''وہ مخلوقات میں سب سے اچھے ہیں (خیر البریہ) اور ان میں سب سے زیادہ متقی ہیں اور سب سے زیادہ انصاف کرنے والے ہیں، مگر نبی کے بعد اور انہوں نے جو کچھ کیا اسے درجہ کمال کو پہنچادیا۔

اور وہ آپؐ کے ثانی ہیں اور آپؐ کے بعد (دوسرے) ہیں اور محمود ہیں اپنے مقام کے اعتبار سے اور انسانوں میں سب سے پہلے ہیں جنہوں نے آنحضرتؐ کی تصدیق کی۔''

جریر نے ابی نضرۃ سے روایت کی ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ میں تم سے پہلے ایمان لایا تھا۔ نیز حضرت ابو بکرؓ نے بغیر طلب معجزہ و بغیر تامل آپ کی تصدیق کی تھی۔ چنانچہ آنحضرت صلعم نے فرمایا۔ دعوا الی صاحبی الخ یعنی میرے رفیق کو میرے ہی لئے رہنے دو (تم لوگ ان سے کوئی تعرض یا بحث مت کرو) کیونکہ جب تم لوگوں نے (اشارہ بجانب قریش) میری تکذیب کی تو ابو بکرؓ نے میری تصدیق کی۔

ازاں جملہ یہ بات ہے کہ اسلام کے ابتدائی زمانے میں جبکہ وہ ضعیف بھی تھا اور غریب بھی، حضرت ابو بکرؓ سے تین مآثر عظیمہ (بڑے نشان) ظاہر ہوئے۔ اول یہ کہ انہوں نے اس نازک دور میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت صحابہؓ اور آنحضرت صلعم کی حمایت میں چالیس ہزار درہم صرف کئے۔ ہشام ابن عروہ نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ "جب ابو بکرؓ اسلام لائے تو ان کے پاس پورے چالیس ہزار درہم تھے جو انہوں نے سب کے سب آنحضرت صلعم اور اللہ کی راہ میں صرف کر دیئے۔ اسی لئے آنحضرت صلعم نے فرمایا "کسی شخص کے مال نے مجھے اس قدر نفع نہیں پہنچایا جس قدر ابو بکرؓ کے مال نے"۔ نیز ابو عمر راوی ہیں کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا "صحت اور مال کے اعتبار سے تمام انسانوں میں مجھ پر سب سے زیادہ احسان ابو بکرؓ کا ہے۔" نیز بخاری میں ہے کہ مجھ پر کسی کا احسان ایسا نہیں جس کا بدلہ میں نے نہ چکا دیا ہو مگر میں ابو بکرؓ کے احسانات کا بدلہ نہیں اتار سکا، صرف اللہ ہی قیامت کے دن ابو بکرؓ کے احسانات کا بدلہ عطا فرمائے گا۔ نیز ترمذی میں ہے۔ "مجھے کسی شخص کی دولت سے اس قدر نفع نہیں پہنچا جس قدر ابو بکرؓ کی دولت سے پہنچا"

دوم یہ کہ قریش کے غلاموں میں سے انہوں نے ان سات غلاموں کو منہ مانگی قیمت ادا کر کے خریدا اور آزاد کر دیا جو اسلام لے آئے تھے اور اس وجہ سے ان کے کافر مالک ان پر سختی کر رہے تھے اور جسمانی اذیت پہنچا رہے تھے۔ چنانچہ استیعاب میں وارد ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے ان سات غلاموں کو آزاد کیا جو اسلام لانے کی وجہ سے عذاب میں گرفتار تھے اور ان میں حضرت بلالؓ، حضرت عامرؓ اور حضرت فہیم بھی تھے۔ نیز عامر ابن عبداللہ ابن زبیرؓ سے روایت ہے کہ ابو قحافہ نے اپنے بیٹے (ابو بکرؓ) سے کہا کہ اے میرے پیارے بیٹے! میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کمزور غلاموں کو خرید کر آزاد کر رہے ہو (یہ بات عقل کے خلاف ہے) اگر تم طاقت ور غلاموں کو خرید کر آزاد کرو تو یہ لوگ بوقت ضرورت تمہارے کام تو آ سکیں گے۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے اس کے جواب میں فرمایا "اے باپ! میں جو کچھ بھی کرتا ہوں وہ صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کرتا ہوں" پھر انہوں نے (عامر نے) کہا کہ صحابہؓ کہا کرتے تھے کہ یہ آیات حضرت ابو بکرؓ ہی کی شان میں نازل ہوئی تھیں۔

" فاما من اعطی واتقی وصدق بالحسنی (72-5) وما لاحد عندہ من نعمۃ تجزی الا ابتغاء وجہ ربہ الاعلی ولسوف یرضی (92-17 تا 21)

پس جس نے راہ خدا میں دیا اور پرہیز گاری کا شیوہ اختیار کیا......اور جو پرہیز گار رہے وہ آگ سے دور رکھا جائے گا۔ وہ ایسا دل کا سخی ہے کہ اپنا مال راہ خدا میں دیتا ہے تاکہ اس کا نفس بخل کے عیب سے پاک ہو جائے اور کسی کا اس پر کوئی احسان نہیں ہے کہ اسے اس احسان کا بدلہ اتارنا مقصود ہو۔ اس کو تو صرف اپنے پروردگار کی رضا جوئی مطلوب ہے اور اللہ اس سے ضرور راضی بھی ہوگا (ہو جائے گا)۔

ابن اسحاق سے (سیرت النبیؐ میں) روایت ہے کہ امیہ بن خلف حضرت بلالؓ کو دوپہر کے وقت جب گرمی کی شدت ہوتی گھر سے باہر لے جاتا تھا اور ایک پتھر پر لٹا دیتا تھا اور ایک بڑا پتھر ان کے سینے پر رکھ دیتا تھا اور پھر کہتا تھا کہ میں تجھے اسی حالت میں رکھوں گا یہاں تک کہ تجھے موت آ جائے یا تو محمد (صلعم) کا انکار کر کے دوبارہ لات اور عزیٰ کی عبادت کرنے لگے تو اس کے جواب میں بلالؓ احد احد کہتے تھے یعنی اللہ ایک ہے۔

ایک دن حضرت ابوبکرؓ کا اس طرف گزر ہو گیا جہاں وہ مبتلائے عذاب تھے۔آپؓ نے امیہ سے کہا "کیا تجھے اس بے گناہ پر سختی کرتے وقت کچھ خوف خدا نہیں آتا؟ تو مجھ سے اس کے بدلے اس سے زیادہ طاقتور غلام لے لے۔" امیہ راضی ہو گیا اور آپؓ نے اپنا غلام اسے دے کر بلال کو آزاد کر دیا۔ چنانچہ ہجرت سے پہلے انہوں نے سات غلام آزاد کئے تھے اور بلال ساتویں تھے اور اسی طرح حضرت ابوبکرؓ ایک دن ایک کنیز کے پاس سے گزرے جس کو حضرت عمر ابن خطاب عذاب دے رہے تھے (کیونکہ وہ اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے) اور کہتے جاتے تھے کہ میں تجھے مارتے مارتے تھک گیا ہوں اس لئے مارنا بند کرتا ہوں مگر تجھے مارنے سے باز نہیں آؤں گا۔ حضرت ابوبکرؓ نے جب یہ بات سنی تو آپؓ نے اس کنیز کو حضرت عمرؓ سے خرید کر آزاد کر دیا۔

سوم اینکہ قریش کے کئی سردار آپؓ کے دست مبارک پر اسلام لائے۔ چنانچہ ابن اسحاق راوی ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ اسلام لائے تو انہوں نے قریش کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلانا شروع کر دیا اور حضرت ابوبکرؓ اپنی قوم میں بہت معزز تھے۔اس لئے ان کی تبلیغی کوششوں سے قریش کے کئی سردار مثلاً حضرت عثمان بن عفان اور زبیر ابن العوام اور عبدالرحمٰن ابن عوف اور سعد ابن ابی وقاص اور طلحہ ابن عبید اللہ رضی اللہ عنہم مشرف باسلام ہوئے (اور یہ حقیقت بھی ملحوظ رہے کہ یہ پانچوں حضرات تمام صحابہ میں ممتاز اور نام آور تھے اور پانچوں عشرہ مبشرہ میں داخل ہیں یعنی وہ دس صحابہ جن کے جنتی ہونے کی بشارت خود آنحضرت صلعم نے ان کی زندگی ہی میں دے دی تھی)۔

اور اس جگہ یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے یہ سب حضرات قریش کے نامور سرداروں میں سے تھے اور ہر ایک شخص بڑے طاقتور قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ پس ان کے اسلام لانے سے قریش کے قبیلوں میں ضعف آ گیا اور کفر کی طاقت کمزور ہو گئی اس کی وضاحت یہ ہے کہ:

حضرت عثمانؓ، اوسط بنی عبدالشمس تھے اور حضرت زبیرؓ، اوسط بنی اسد تھے اور حضرت سعد اور عبدالرحمٰن اوسط بنی زہرہ تھے اور حضرت طلحہ اوسط بنی تمیم تھے۔

(5) ازاں جملہ یہ کہ جب قریش آنحضرت صلعم کو ایذا دینے پر آمادہ ہو گئے بلکہ بالفعل ایذا رسانی شروع کر دی تو یہ حضرت ابوبکرؓ ہی تھے جنہوں نے دشمنان اسلام کا مقابلہ کیا اور آنحضرت صلعم کی حفاظت اور حمایت کا بیڑہ اٹھایا بلکہ جان کو آنحضرت صلعم کی جان کے لئے وقایہ بنا دیا چنانچہ حضرت اسما بنت ابوبکرؓ راوی ہیں کہ ایک دن جبکہ سرداران قریش، خانۂ کعبہ کے نزدیک بیٹھے ہوئے تھے، آنحضرت صلعم حسب معمول وہاں تشریف لائے کہ خانۂ کعبہ کے پاس نماز ادا کریں۔ نماز سے قبل قریش نے آپؐ سے پوچھا کہ کیا آپؐ نے ہمارے بتوں کے بارے میں ایسا ایسا کہا ہے (مطلب یہ تھا کہ انہیں برا کہا ہے) آپؐ نے فرمایا ہاں میں نے کہا ہے۔اس پر وہ آپؐ کے اوپر پل پڑے اور آپؐ کو مارنا شروع کر

دیا۔ پس ایک بلند آواز (چیخ) حضرت ابوبکرؓ تک پہنچی یعنی کسی نے آواز بلند ان سے کہا کہ اپنے صاحب ساتھی یا رفیق کی مدد کو پہنچو! یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ گھر سے نکلے اور حرم کعبہ میں آئے۔ انہوں نے دیکھا کہ لوگ آنحضرت صلعم کو گھیرے ہوئے ہیں اور زیادتی کرر ہے ہیں۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے کہا ''تمہارا خانہ خراب ہو! تم پر تباہی نازل ہو! کیا تم ایک بیگناہ شخص کو محض اس لئے قتل کر دو گے کہ وہ یہ کہتا ہے کہ میرا رب (خالق اور مالک اللہ ہے)؟ حالانکہ وہ یہ کہتا ہے کہ میرا رب واضح نشانیاں لے کر آیا ہے۔'' یہ سن کر انہوں نے رسول اللہ صلعم کو چھوڑ دیا اور سب مل کر حضرت ابوبکرؓ پر پل پڑے۔ پھر وہ کہنے لگیں کہ دشمنوں سے شدید ایذا برداشت کرنے کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو لوگ گھر لے کر آئے۔ ان کے سر پر اس قدر ضربات تھیں کہ اگر کوئی شخص ان کا سر چھوتا تھا تو کنپٹی کے بال (غدائر) اس کے ہاتھ میں آ جاتے تھے۔ لیکن وہ اس پر بھی یہی جملہ دہرارہے تھے۔ تبارکت ربنا وتعالیت یا ذوالجلال والاکرام

حضرت عروہ ابن زبیرؓ راوی ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے دریافت کیا کہ مشرکوں نے حضورؐ کو سب سے بڑی ایذا کون سی پہنچائی؟ اس پر انہوں نے کہا کہ میں نے عقبہ ابن ابی معیط کو دیکھا کہ وہ حضورؐ کے قریب آیا جبکہ آپؐ خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ جب آپؐ سجدے میں گئے تو اس نے اپنی چادر آپؐ کی گردن میں لپیٹ کر اسے زور سے کسنا شروع کیا (تاکہ آپؐ کا دم گھٹ جائے) اتنے میں حضرت ابوبکرؓ وہاں آ گئے اور انہوں نے عقبہ سے کہا کہ کیا تو ایک بیگناہ شخص کو محض اس بات پر قتل کرنا چاہتا ہے کہ وہ یہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور وہ تمہارے پاس واضح نشانیاں لے کر آیا ہے؟ (اخرجہ البخاری)

(6) اور ازاں جملہ یہ ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے دنیائے اسلام میں مسجد بنائی اور اپنے اسلام کا اعلان کیا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ کوئی دن ایسا نہیں گزرا جبکہ آنحضرت صلعم دونوں وقت (صبح وشام) ہمارے گھر تشریف نہ لائے ہوں۔ جب کفار نے مسلمانوں کو ستانا شروع کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے مکہ سے ہجرت کا ارادہ کیا اور فیصلہ کیا کہ حبشہ میں پناہ گزیں ہو جائیں گے۔ چنانچہ مکہ سے روانہ ہوئے اور جب آپؐ برک الغماد پہنچے تو ابن الدغنہ سے ملاقات ہوئی جو وہاں کا سردار تھا۔ اس نے پوچھا اے ابوبکر! کہاں کا ارادہ ہے؟ آپؓ نے جواب دیا۔ میری قوم نے مجھے ترک وطن پر مجبور کر دیا ہے۔ پس میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں سیاحت کروں گا اور اپنے رب کی عبادت کروں گا (مکہ کے کفار علانیہ نماز نہیں پڑھنے دیتے تھے) یہ سن کر ابن الدغنہ نے کہا اے ابوبکر! آپ کے مرتبے کا انسان اس طرح اپنے وطن سے نہیں نکل سکتا اور نہیں نکلے گا۔ آپ تو غریبوں کے حامی ہیں۔ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ دوسروں کے لئے تکلیف برداشت کرتے ہیں لہٰذا میں آپ کا ہمسایہ یا ضامن بنتا ہوں۔ آپؓ اپنے شہر کو واپس چلیں اور وہاں اپنی مرضی کے مطابق اپنے رب کی عبادت کریں۔ یہ سن کر آپؓ ابن الدغنہ کے ساتھ مکہ واپس آ گئے اور شام کے وقت ابن الدغنہ نے اشراف قریش سے ملاقات کی اور کہا کہ میں گوارا نہیں کر سکتا کہ ابوبکر جیسا نیک اور شریف شخص ترک وطن پر مجبور ہو جائے جو صلہ رحمی کرتا ہے۔ اکرام مہمان کرتا ہے اور مصیبت میں لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ اس پر انہوں نے ابن الدغنہ سے کہا کہ آپ ابوبکر سے کہہ دیں کہ وہ اپنے مکان کے اندر عبادت کرلیا کریں لیکن قرآن بلند آواز سے نہ پڑھا کریں کیونکہ ہمیں خوف ہے مبادا ہماری خواتین کسی فتنے میں مبتلا ہو جائیں (مطلب یہ ہے) کہ کہیں وہ قرآن سن کر مسلمان نہ ہو

جائیں۔ چنانچہ یہ باتیں ابن الدغنہ نے حضرت صدیق اکبرؓ کو سمجھا دیں۔ انہوں نے گھر میں عبادات اور تلاوت شروع کر دی لیکن چند روز کے بعد انہوں نے اپنے مکان کے صحن میں مسجد بنالی اور اس میں بآواز بلند تلاوت شروع کر دی۔ قریش کی عورتیں اور بچے دونوں حضرت ابوبکرؓ کی نماز اور تلاوت کو تعجب کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور جب وہ تلاوت کرتے تھے تو ان پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ وہ تلاوت کے دوران اپنے آنسوؤں کو ضبط نہیں کر سکتے تھے۔ (عورتوں اور بچوں پر اس بات کا اثر مرتب ہوتا تھا) اس لئے قریش نے ابن الدغنہ سے کہا کہ ہم نے ابوبکرؓ کو اس شرط پر عبادت کی اجازت دی کہ وہ بلند آواز میں قرآن نہ پڑھیں مگر انہوں نے مسجد بھی بنالی ہے اور بلند آواز میں تلاوت بھی شروع کر دی ہے۔ اس لئے آپ یا تو انہیں اس فعل سے روک دیجئے یا پھر ان کی ذمہ داری ختم کر دیں کیونکہ ہم آپ سے عہد شکنی کرنا نہیں چاہتے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ یہ سن کر ابن الدغنہ میرے والد محترم کے پاس آیا اور ماجرا بیان کیا۔ اس پر حضرت موصوفؓ نے فرمایا کہ میں آج سے تمہارے جوار کو رد کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کے جوار میں آتا ہوں یعنی آج سے تم نہیں بلکہ اللہ میرا ضامن اور حمایتی ہوگا۔ (اخرجہ البخاری)

(7) اور ازاں جملہ یہ ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے روم پر غلبۂ ایران کے قصے میں محض اعلاء کلمۂ اسلام کے لئے شرط کی تھی جس کی تفصیل یہ ہے۔

''عبداللہ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ مسلمان یہ چاہتے تھے کہ رومی' ایرانیوں پر غالب آجائیں (اور مشرکین قریش یہ چاہتے تھے۔ ایرانی رومیوں پر غالب آجائیں) اس پر حضرت صدیق اکبرؓ نے قریش کے ایک سردار سے شرط کی اور طے ہوا کہ اگر رومی پانچ سال کے اندر غالب آجائیں تو تم مجھے سو اونٹ بطور تاوان دینا۔ بعد ازیں حضرت صدیق اکبرؓ نے اس شرط کا ذکر آنحضرت صلعم سے کیا۔ آپؐ نے فرمایا ''بضع'' نو تک کے لئے آتا ہے اس لئے پانچ کے بجائے نو سال کی مدت رکھو۔ چنانچہ اللہ کے حکم سے رومی غالب آگئے۔ جیسا کہ اللہ ارشاد فرماتا ہے۔'' **غلبت الروم فی ادنی الارض وھم من بعد غلبھم سیغلبون فی بضع سنین**'' (30-1) سفیان نے کہا کہ میں نے یہ سنا کہ وہ یوم بدر یعنی سن 2ھ میں غالب آئے۔

(7) ازاں جملہ یہ ہے کہ آنحضرت صلعم جب تک مکے میں رہے روزانہ صدیق اکبرؓ کے مکان پر تشریف لے جاتے تھے۔ چنانچہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت جب تک مکہ مکرمہ میں قیام پذیر رہے روزانہ صدیق اکبرؓ کے یہاں تشریف لاتے رہے۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرا کہ آنحضرت صلعم ہمارے گھر تشریف نہ لائے ہوں، صبح اور شام دونوں وقت (اخرجہ البخاری)

(8) ازاں جملہ یہ ہے کہ جب حضرت خدیجہؓ نے وفات پائی تو حضرت ابوبکرؓ نے اپنی بیٹی عائشہؓ کو آنحضرت صلعم کے عقد میں دے دیا اور اس باب میں وہ ادب ملحوظ رکھا کہ اس سے بڑھ کر متصور نہیں ہو سکتا۔

عروہ ابن زبیرؓ کے غلام حبیب کا بیان ہے کہ جب حضرت خدیجہؓ نے وفات پائی تو آنحضرت صلعم بہت غمگین رہنے لگے۔ یہ حالت دیکھ کر حضرت ابوبکرؓ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ رفع حزن کے لئے مناسب ہے کہ آپ میری بیٹی عائشہ سے نکاح فرمالیں۔

محمد بن عمرو خود حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں اپنے والد بزرگوار کے متعلقین (عیال) کے ساتھ مدینے آئی۔ آنحضرت صلعم اس وقت مسجد تعمیر کرا رہے تھے اور ہمارے گھر مسجد کے پاس ہی تھے۔ میرے والد حضرت صدیق اکبرؓ نے آنحضرت صلعم سے کہا کہ آپ بھی اپنے اہل وعیال کے لئے گھر کیوں نہیں بنوا لیتے (مراد یہ تھی کہ آپ نکاح کیوں نہیں کر لیتے؟) آنحضرت صلعم نے جواب دیا کہ میرے پاس مہر ادا کرنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ یہ سن کر حضرت صدیق اکبرؓ نے آنحضرت صلعم کو ساڑھے بارہ اوقیہ بطور ہدیہ پیش کئے۔ اس پر آنحضرت صلعم نے میرے لئے مکان بنوایا اور یہ وہی مکان ہے جس میں اس وقت میں رہتی ہوں (اخرجہ الحاکم)

(9) اور ازاں جملہ یہ ہے کہ جب معراج محقق ہوگئی تو سب سے پہلا شخص جس نے اس واقعے کی تصدیق کی وہ حضرت ابوبکرؓ تھے چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ جب آنحضرت صلعم کو بوقت شب مسجد اقصیٰ لیجایا گیا تو لوگ اس کے متعلق گفتگو کرنے لگے اور بعضوں نے انکار کیا اور بعض اس پر ایمان لے آئے۔

(10) ازاں جملہ یہ کہ جب آنحضرت صلعم نے مدینے کی طرف ہجرت فرمائی تو حضرت صدیق اکبرؓ آپؐ کے رفیق تھے اور آپؐ نے یہ خدمت اس طرح انجام دی کہ اللہ نے آپؓ کو ثانی اثنین اذ هما في الغار کا لقب عطا کیا اور خود آنحضرت صلعم نے اس طرح آپؓ کی ستائش کی کہ "حملنی ابوبکر الی دار الهجرة" یعنی ابوبکرؓ مجھے اپنی رفاقت میں دارالہجرت (یثرب) لے گئے اور اس طرح ان کی مدح وثنا تمام اہل اسلام پر ظاہر ہوگئی۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں۔ "بے شک نبی اکرم صلعم نے مسلمانوں سے ارشاد فرمایا" میں نے تمہارے دارالہجرۃ کو (بذریعہ کشف صحیح) دیکھ لیا ہے وہ ایسا علاقہ ہے جہاں بہت سے کھجور کے درخت ہیں تو بعضوں نے مدینے ہجرت کی اور بعضوں نے حبشہ سے مدینے ہجرت کی اور جب حضرت ابوبکرؓ نے مدینے کی طرف ہجرت کی تیاری کی تو آنحضرت صلعم نے فرمایا اے ابوبکرؓ! ذرا ٹھہرو! مجھے امید واثق ہے کہ تمہیں بھی میرے ساتھ ہجرت کی اجازت مل جائے گی۔ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ نے حضورؐ سے عرض کی یا رسول اللہ! کیا آپؐ کو امید ہے؟ آپؐ نے جواب دیا ہاں۔ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ نے کہا: میرے ماں اور باپ آپ پر قربان ہوں۔ پس حضرت ابوبکرؓ نے حضورؐ کی معیت کا انتظار کیا اور انہوں نے اس غرض کے لئے دو اونٹنیاں مخصوص کر دی تھیں چار ماہ پہلے سے اور انہیں خوب اچھی طرح کھلا پلا کر موٹا کر دیا تھا۔

ابن شہاب زہریؒ نے عروہ ابن زبیرؓ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے اپنی خالہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے سنا کہ ایک دن دوپہر کے وقت آنحضرت صلعم سر مبارک پر مقنع (اوڑھنی) ڈال کر ہمارے گھر تشریف لائے اور والد محترم سے کہا کہ اغیار کو یہاں سے ہٹا دو۔ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! گھر میں کوئی غیر نہیں ہے۔ میری زوجہ ہے اور آپ کی زوجہ (ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ) ہے۔ یہ سن کر آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ مجھے اللہ کی طرف سے ہجرت کا اذن مل گیا ہے۔ یہ سن کر والد محترم نے عرض کی میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں کیا مجھے بھی رفاقت کا شرف حاصل ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا "ہاں"۔ یہ سن کر حضرت صدیق اکبرؓ نے عرض کی کہ میری دو اونٹنیاں ہیں۔ ان میں سے ایک آپ کی نذر کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا "مگر میں قیمت ادا کروں گا"۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں پس ہم نے ان دونوں کے لئے زاد سفر تیار کیا اور میری بڑی بہن حضرت اسماء

نے اپنے نطاق (وہ پٹکا جو عورتیں اپنی کمر میں باندھتی ہیں) کا کونا پھاڑا اور اس سے ناشتہ دان کا مونہہ باندھ دیا اور اسی وجہ سے ان کا لقب ذات النطاقین ہو گیا۔ پھر انہوں نے کہا کہ اس کے بعد رسول اللہؐ اور حضرت ابو بکرؓ غار ثور میں داخل ہو گئے اور تین رات وہاں پوشیدہ رہے۔ رات کے وقت عبداللہ ابن ابی بکرؓ ان کے پاس جاتے تھے اور وہ ایک تیز فہم اور ہوشیار جوان تھے۔ صبح کے وقت ان کے پاس سے شہر میں آتے تھے اور قریش سے ملتے جلتے تھے اور رات کو تمام اطلاعات آنحضرت صلعم کو پہنچاتے تھے۔ عامر ابن فہیرہ جو حضرت ابو بکرؓ کے غلام تھے بکریاں چراتے تھے اور رات کے وقت ان کا دودھ غار میں پہنچاتے تھے۔ انہوں نے تین راتوں میں اسی طرح خدمت کی۔ آنحضرت صلعم اور حضرت ابو بکرؓ نے قبیلہ بنی الدیل کے ایک شخص کی خدمات اجرت پر حاصل کیں۔ یہ شخص حجاز میں مختلف راستوں کا ماہر تھا اور اس نے عربوں کے دستور کے مطابق پانی کے پیالے میں انگلیاں ڈبو کر قسم کھائی کہ وہ رازداری سے کام لے گا۔ پس تین رات قیام کے بعد دونوں صاحب غار سے نکلے اور ان کے ساتھ عامر ابن فہیرہ بھی تھا اور وہ رہنما بھی، پس انہوں نے ساحلی راستہ اختیار کیا۔ (رواہ البخاری)

(11) ازاں جملہ یہ کہ جب غزوۂ بدر واقع ہوا تو حضرت صدیق اکبرؓ سے مآثر عظیمہ ظاہر ہوئے۔ آپؓ عریش میں ثانی رسولؐ تھے اور جب آنحضرت صلعم نے اللہ سے دعا کی تو حضرت ابو بکرؓ نے آپؐ کی تسلی دی اور کہا یا رسول اللہ! اب بس کیجئے، آپؐ نے بہت دعا کر لی اللہ یقیناً آپؐ کی دعا قبول کرے گا۔ اس فقیر (شاہ ولی اللہ) کے نزدیک اس قول کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کو اللہ کی طرف سے الہام ہو گیا تھا اسی لئے انہوں نے آپؐ کو تسلی دی اور اللہ نے آپؐ کی دعا قبول کر لی اور یہ صورت ان واقعات میں سے ہے جبکہ صحابہ کے الہامات نے وحی الٰہی پر سبقت کی۔ اس کے بعد وحی الٰہی ان کے الہام کے مطابق ہی نازل ہوئی۔ بلکہ دراصل یہی الہام آنحضرت صلعم کی طرف وحی ہے بایں۔ وجہ کہ جب انہیں الہام ہوا تو آنحضرت صلعم نے اپنی فراست صادقہ کی وجہ سے معلوم کر لیا کہ یہ خیال مدبر سماوات وارض کی طرف سے ہے اور یہ فراست وحی، باطنی شئے ہے۔ چنانچہ آپؐ نے اذان کے معاملے میں عبداللہ ابن زید کے خواب اور فاروق اعظمؓ کے قیاس کی تصویب فرمائی اور لیلۃ القدر میں صحابہ کی ایک جماعت کے خواب پر اعتماد فرمایا اور اس باب میں یہ سب سے اچھی وجہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

ابن عباسؓ راوی ہیں کہ یوم بدر کے موقع پر آنحضرت صلعم نے اللہ سے دعا کی۔ اے اللہ! میں تجھے تیرا وعدہ یاد دلاتا ہوں جو تو نے مجھ سے کیا ہے۔ اے اللہ! اگر تو چاہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ دنیا میں تیری عبادت نہ ہو۔ اس جملے کو سن کر حضرت ابو بکرؓ نے آپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور کہا "بس یہ دعا کافی ہے"۔ اس کے بعد آپ عریش سے باہر نکل آئے اور فرمایا "یقیناً انہیں (کفار قریش کو) شکست ہو گی اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے" (اخرجہ البخاری)

اور جب آنحضرت صلعم عریش سے باہر نکل کر کارزار کی طرف متوجہ ہوئے تو آپؐ نے میمنہ (فوج کا دایاں بازو) پر صدیق اکبرؓ کو متعین کیا اور جبریل یا میکائیل کو ان کی تائید پر مقرر کیا۔ حضرت علیؓ راوی ہیں کہ میں قلب لشکر میں تھا کہ شدید آندھی آئی۔ میں نے ایسی تیز ہوا اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ کچھ دیر کے بعد وہ آندھی تھم گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر چلنے لگی اور ایسی شدید کہ اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ تو پہلی آندھی میں جبرئیل ایک ہزار فرشتوں کو لے

کر نازل ہوئے تھے اور دوسری آندھی میں میکائیل ایک ہزار فرشتوں کو لے کر نازل ہوئے تھے۔ وہ رسول اللہ صلعم کے دائیں جانب تھے اور بائیں جانب حضرت صدیق اکبرؓ تھے۔ پھر تیسری مرتبہ آندھی آئی تو اس میں اسرافیل ایک ہزار فرشتوں کو لے کر آپؐ کی بائیں جانب کھڑے ہوئے اور میں بھی میسرے (فوج کے بائیں بازو) میں تھا۔ پس جب اللہ نے دشمنوں کو شکست دی تو آپؐ مجھے اپنے گھوڑے پر لے گئے اور میں نے اللہ کا شکر ادا کیا تو مجھے سکون ہوا۔

ابن عباس راوی ہیں کہ بدر کے دن آنحضرت صلعم نے اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ جبرئیل ہیں جو اپنے گھوڑے کی لگام (یا اس کا سر) پکڑے ہوئے ہیں جس پر جنگ کے نشانات ہیں۔ (بخاری)

جب بدر کے قیدی آئے تو آپؐ نے حضرت صدیق اکبرؓ سے مشورہ کیا۔ انہوں نے فدیہ لے کر چھوڑ دینے کا مشورہ دیا اور آپؐ نے اسے قبول کیا۔

عبداللہ ابن مسعود راوی ہیں کہ جنگ بدر کے بعد رسول اللہ صلعم نے صدیقؓ و فاروقؓ سے اور دیگر صحابہ سے مشورہ کیا۔ عبداللہ ابن رواحہ نے کہا کہ وادی میں لکڑیاں بکثرت ہیں۔ لہٰذا آگ روشن کر کے ان سب کو اس میں ڈال دیا جائے۔ اس پر عباسؓ نے کہا "پھر اللہ بھی تجھ سے نیک سلوک نہیں کرے گا۔" حضرت عمرؓ نے کہا کہ ان کے سرداروں اور رہنماؤں نے آپؐ سے جنگ کی ہے اور آپ کو جھوٹا قرار دیا ہے۔ لہٰذا ان کی گردنیں مار دیجئے۔ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ "یہ لوگ تمہارے رشتہ دار بھی ہیں اور ہم قوم بھی ہیں۔" اس کے بعد آنحضرت صلعم نے پھر فرمایا "ان لوگوں کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ ان کی مثال ان کے ان بھائیوں کی ہے جن کے لئے حضرت نوحؑ نے اللہ سے دعا کی تھی کہ اے اللہ! کافروں میں سے کسی کو بھی روئے زمین پر شاد و آباد مت چھوڑیو اور حضرت موسیٰ نے کہا تھا کہ اے اللہ! ان کے اموال کو مٹا دے اور سخت کر دے ان کے دلوں کو (تاکہ ایمان نہ لا سکیں) اور حضرت ابراہیمؑ نے کہا تھا کہ جو شخص میری پیروی کرے گا وہ مجھ سے ہوگا اور جو میری نافرمانی کرے گا تو اے اللہ تو غفور اور رحیم ہے اور حضرت عیسیٰ نے کہا تھا کہ اے اللہ! اگر تو انہیں عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کی مغفرت کر دے تو، تو عزیز اور حکیم ہے۔" پھر فرمایا کہ تم لوگ اس وقت مفلس ہو۔ پس مناسب ہے کہ جدا نہ ہو تم میں سے کوئی مگر فدیہ لے کر یا پھر ان کی گردنیں مار دو۔

(12) ازاں جملہ یہ ہے کہ جب غزوہ احد متحقق ہو گیا تو حضرت صدیق اکبرؓ نے آنحضرت صلعم سے مصائب دور کرنے میں انتہائی کوشش کی۔ چنانچہ ابن اسحاق نے کہا کہ جب مسلمانوں نے رسول اللہ صلعم کو پہچان لیا تو آپؐ کے گرد جمع ہو گئے اور ان کے ساتھ گھاٹی کے قریب ابوبکر الصدیقؓ اور عمر بن الخطابؓ اور علی ابن ابی طالبؓ اور طلحہ ابن عبیدؓ اللہ اور زبیرؓ ابن العوام اور حارث ابن صمۃ اور مسلمانوں کی ایک جماعت بھی جمع ہو گئی۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ مجھ سے میرے والد بزرگوار نے کہا کہ جب لوگ (حملے کی شدت کی وجہ سے) آنحضرت صلعم سے جدا ہو گئے تو پہلا شخص جو حضورؐ کے پاس واپس آیا، میں تھا اور میرے بعد ابوعبیدہ ابن جراح تھے۔ (اخرجہ الحاکم) اور اس جگہ جولان سے مراد فرار نہیں ہے بلکہ پراگندہ یا منتشر ہو جانا ہے کیونکہ کفار کا زبردست ریلا آ گیا تھا۔ جب ابوسفیان، آنحضرت صلعم کی فوج کا حال دریافت کرتا تھا تو وہ انہی تین حضرات (آنحضرتؐ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ) کے نام لیتا تھا کیونکہ وہ انہی تین حضرات سے خوفزدہ تھا۔ حدیث البراء سے واضح ہے کہ جب ابوسفیان نے پہاڑی پر چڑھ کر

پکارا کہ کیا تم میں محمد موجود ہیں؟ تو آنحضرت صلعم نے فرمایا "جواب مت دو" اس کے بعد اس نے پکارا کیا تم میں ابن ابی قحافہ زندہ (موجود) ہیں؟ آپؐ نے فرمایا خاموش رہو۔ اس پر اس نے بآواز بلند کہا بلاشبہ یہ سب لوگ قتل ہو گئے ورنہ اگر زندہ ہوتے تو ضرور جواب دیتے۔ اس پر فاروق اعظمؓ ضبط نہ کر سکے اور بآواز بلند کہا "اے اللہ کے دشمن! تو جھوٹ بولتا ہے۔ اللہ تجھے ذلیل ہونے کے لئے زندہ رکھے۔" (اخرجہ البخاری) اور جب آنحضرت صلعم اہل احد کے تعاقب کی طرف متوجہ ہوئے تو صدیق اکبرؓ اس وقت آپؐ کے ساتھ تھے۔ اللہ فرماتا ہے۔ "الذین استجابو اللہ و الرسول" الخ انہوں (عائشہؓ) نے اس آیت کے بارہ میں فرمایا کہ اے میری بہن (اسماء) کے بیٹے! تیرے دونوں بزرگ (زبیر اور ابوبکر، زبیرؓ باپ تھے اور ابوبکرؓ نانا تھے) ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے رسولؐ کی آواز پر لبیک کہا تھا۔ جب پہنچا آپ کو جو کچھ پہنچا احد کے دن تو مشرک آپؐ سے دور چلے گئے مگر آپ کو خیال ہوا مبادا وہ واپس آجائیں اور حملہ کر دیں اس لئے آپؐ نے کہا "کون اس مشرکوں کا تعاقب کرے گا؟" تو ستر مسلمان اس کام کے لئے تیار ہوئے اور ان میں ابوبکرؓ اور زبیر بھی تھے (اخرجہ البخاری)

ازاں جملہ یہ کہ غزوۂ خندق میں آنحضرت صلعم نے ایک جگہ حضرت صدیق اکبرؓ کو عطا کی اور آج بھی خندق کے نزدیک مسجد صدیق موجود ہے۔

(14) ازاں جملہ یہ کہ غزوہ بنی مصطلق میں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ متہم ہوئیں اور منافقوں نے وہ باتیں کیں جو انہیں ہرگز نہیں کہنا چاہئیں تھیں۔ اس حادثے میں حضرت صدیق سے مآثر جمیلہ متحقق ہوئے۔ حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ "آنحضرت صلعم میرے گھر میں تشریف لائے" اور تشہد کے بعد فرمایا "اے عائشہؓ (اگر تجھ سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے) تمہارے بارے میں ایسی ایسی باتیں مجھ تک پہنچی ہیں۔ اگر تم ان سے بری ہو تو یقیناً اللہ تمہاری برأت واضح فرما دے گا اور تم سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے تو تم اللہ سے استغفار کرو اور اس کی بارگاہ میں توبہ (رجوع) کرو کیونکہ جب کوئی بندہ گناہ کرتا ہے پھر توبہ کر لیتا ہے تو اللہ بھی اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔" فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہؐ یہ کہہ چکے تو یک لخت میرے آنسو خشک ہو گئے ایک قطرہ بھی میری آنکھوں میں باقی نہ رہا۔ اس کے بعد میں نے اپنے باپ سے کہا "آپؐ میری طرف سے رسول اللہ کو جواب دیں۔" اس پر میرے باپ نے کہا "واللہ! میں نہیں جانتا کہ میں رسول اللہ سے کیا کہوں۔" (اخرجہ البخاری) نیز ام المؤمنینؓ نے فرمایا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ واللہ! آئندہ میں مسطح بن اثاثہ کی کوئی مالی امداد نہیں کروں گا۔ (صدیق اکبر قرابت داری کی وجہ سے مسطح کی مالی امداد کیا کرتے تھے) تو اس بات کے کہنے کے بعد فوراً یہ آیت نازل ہوئی۔ ولا یاتل اولوا الفضل منکم والسعة ان یوتوا اولی القربیٰ والمساکین والمهاجرین (22-24) الخ اور تم میں سے جو لوگ بزرگ منش اور صاحب مقدور ہیں وہ اپنے قرابت داروں اور محتاجوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو خرچ نہ دینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں الخ، تو حضرت صدیق اکبرؓ نے کہا واللہ میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ اللہ میری مغفرت فرمائے۔ لہٰذا میں مسطح کا وظیفہ دوبارہ جاری کر دوں گا (اخرجہ البخاری)

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اللہ نے ابوبکرؓ سے فرمایا کہ اے ابوبکرؓ! تجھ کو بزرگی دی گئی، اللہ کی معرفت دی گئی اور صلہ رحمی کی صفت دی گئی اور تجھے وسعت مال دی گئی پس تو مسطح پر مہربانی کر کیونکہ وہ تیرا رشتہ دار بھی ہے اور مہاجر بھی ہے اور وہ

مفلس بھی ہے۔

(15) ازاں جملہ یہ کہ غزوۂ حدیبیہ میں مآثر جمیلہ' حضرت صدیق اکبرؓ سے ظاہر ہوئے۔ جب صلح نامہ لکھا جا رہا تھا تو عروہ (مشرک) نے صدیق اکبرؓ سے کہا کہ ''تمہارے صاحب (مراد ہے آنحضرتؐ سے) نے تمہاری قوم کا معاملہ بالکل بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ کیا تم نے قبل ازیں کسی شخص کے متعلق یہ سنا کہ اس نے اپنی قوم کی بیخ کنی کر دی ہو؟ بیشک میں دیکھتا ہوں کہ اکثر افراد قوم تمہارے صاحب سے برگشتہ ہو جائیں گے اور تمہیں اس خرابی کا ذمہ دار قرار دیں گے'' یہ سن کر حضرت صدیق اکبرؓ کو یارائے ضبط نہ رہا۔ (کیونکہ عاشق اپنے معشوق کی توہین ہرگز برداشت نہیں کر سکتا) اور ان کی زبان سے بہت سخت جملہ نکل گیا۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کیا تو یہ گمان کرتا ہے کہ ہم آنحضرت صلعم کو تنہا چھوڑ دیں گے؟

حضرت عمر بن الخطابؓ کہتے ہیں کہ میں آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا ''کیا آپؐ اللہ کے سچے نبی نہیں ہیں؟'' آپؐ نے فرمایا ''بیشک ہوں''۔ پھر میں نے کہا ''کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟'' آپ نے فرمایا ''بیشک ہیں'' تو میں نے کہا پھر ہم ان سے صلح کرنے میں اس کی نافرمانی نہیں کی ہے اور وہ میرا مددگار ہے۔ اس پر میں نے کہا ''کیا آپؐ نے ہم سے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم عنقریب بیت اللہ کا طواف کریں گے؟'' آپؐ نے فرمایا ''ہاں مگر میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم اسی سال ایسا کریں گے۔'' یہ سن کر میں حضرت صدیق اکبرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا ''کیا آنحضرت صلعم اللہ کے نبی نہیں ہیں؟'' انہوں نے کہا ''بیشک وہ اللہ کے نبی ہیں۔'' اس پر میں نے کہا ''کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟'' انہوں نے کہا ''ہاں ہم حق پر ہیں'' تو میں نے کہا ''پھر ہم ان سے دب کر صلح کیوں کریں؟'' اس پر حضرت صدیق اکبرؓ نے کہا ''اے شخص! وہ یقیناً اللہ کے رسول ہیں اور کبھی اپنے رب کی نافرمانی نہیں کریں گے اور اللہ ان کا مددگار ہے''۔ پس تم اپنے خیال سے باز آ جاؤ اور ان کے فیصلے کو تسلیم کر لو کیونکہ وہ حق پر ہیں۔ اس پر میں نے کہا کیا آپؐ نے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم بیت اللہ کا طواف کریں گے؟ صدیق اکبرؓ نے کہا مگر یہ تو نہیں کہا تھا کہ اسی سال کریں گے۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ مجھے اپنی اس گفتگو پر بہت پشیمانی ہوئی اور میں نے اس جسارت کا کفارہ ادا کرنے کا اہتمام کیا۔ (اخرجہ البخاری)

(16) ازاں جملہ یہ کہ فتح خیبر میں حضورؐ کے ساتھ شریک کارزار رہے۔ حاکم نے مستدرک میں روایت بیان کی ہے کہ آنحضرت صلعم نے حضرت ابوبکرؓ کو علم عنایت فرمایا اور انہوں نے پوری قوت کے ساتھ قتال کیا اور دشمن کو مار بھگایا۔ (اخرجہ الحاکم)

(17) ازاں جملہ یہ ہے کہ سریۂ بنی فزارہ میں آنحضرت صلعم نے حضرت صدیق اکبرؓ کو لشکر کا امیر مقرر فرمایا۔ سلمہ ابن اکوع راوی ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے حضرت ابوبکرؓ کو حکم دیا کہ بنو فزارہ پر چڑھائی کرو۔ پس جب ہم چشمے کے قریب پہنچے تو صدیق اکبرؓ نے شب باشی کا حکم دیا اور جب ہم نے نماز فجر ادا کر لی تو صدیق اکبرؓ کے حکم سے ہم نے قبل طلوع آفتاب حملہ کیا۔ پس جب ہم پانی کے چشمے پر پہنچے تو ہم نے دشمن کے بہت سے آدمیوں کو قتل کیا اور بہت سے آدمیوں کو قیدی بنایا اور انہیں ساتھ لے کر مدینے آئے۔ ان میں ایک عورت قبیلہ بنی فزارہ کی تھی جس کے جسم کی جلد بہت خشک تھی اس کے ساتھ اس کی بیٹی بھی تھی جو عرب کی حسین ترین عورتوں میں سے تھی۔ جب ہم مدینے آئے تو میں نے رسول اللہ صلعم سے کہا کہ ہم نے اس عورت کو عریاں نہیں کیا ہے کیونکہ ہم اسے آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ آپؐ نے اس

عورت کو مکہ روانہ کیا کیونکہ اس کے رشتے دار وہاں تھے اور آپؐ نے اس کے بدلے میں بہت سے مسلمان قیدیوں کو رہا کرایا۔

(18) ازاں جملہ یہ ہے کہ فتح مکہ سے قبل ابوسفیان مدینے آئے اور حضرت صدیق اکبرؓ سے کہا کہ عہد صلح کا اعادہ کرلیا جائے۔ محمد بن اسحاق راوی ہے کہ ابوسفیان سب سے پہلے آنحضرت صلعم کی خدمت میں آئے اور اعادۂ صلح کی خواہش کی لیکن آپؐ نے ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ اس کے بعد وہ حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں آئے اور ان سے کہا کہ آپ آنحضرت صلعم سے اس معاملے میں گفتگو کریں لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد وہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں آئے مگر انہوں نے بھی کہا کہ اگر میں تمہارے اندر ایک کمزور چیونٹی کے برابر طاقت پاتا تو بھی جہاد کرتا۔

محمد ابن اسحاق نے کہا کہ جب رسول اللہ صلعم مکے میں فاتحانہ داخل ہو گئے تو حرم کعبہ میں آئے۔ وہاں حضرت ابوبکرؓ اپنے باپ کو لائے تو آپؐ نے صدیقؓ سے فرمایا "تم نے ان شیخ کو گھر ہی میں کیوں نہ رکھا تاکہ میں خود چل کر ان کے پاس جاتا؟" حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ یا رسول اللہؐ! مناسب یہی تھا کہ یہ خود چل کر آپؐ کے پاس آتے۔ پس آپؐ نے انہیں اپنے پاس بٹھایا اور ان کے سینے پر اپنا ہاتھ پھیرا۔ پھر ان سے کہا "تم اسلام قبول کرلو" انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔

حضرت علیؓ نے کہا کہ یہ آیت حضرت ابوبکرؓ کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ **حتی اذا بلغ اشده وبلغ اربعین سنة قال رب او زعنی ان اشکر نعمتك التی انعمت علی وعلی والدی وان اعمل صالحاً ترضه واصلح لی فی ذریتی** (46-15) یہاں تک کہ جب پہنچا اپنی قوت کو اور پہنچا چالیس برس کو تو کہنے لگا اے میرے رب! میری قسمت میں کر کہ شکر کروں تیرے احسانوں کا جو تو نے مجھ پر کئے ہیں اور میرے ماں باپ پر اور یہ کہ کروں نیک کام، جن سے تو راضی ہو اور مجھے نیک اولاد عطا کر۔

حضرت ابوبکرؓ کو یہ خصوصیت بھی حاصل ہے کہ ان کی چار پشتیں ان کی زندگی ہی میں مشرف باسلام ہوئیں۔ (1) ابوقحافہ (2) ابوبکرؓ (3) عبدالرحمٰن ابن ابی بکرؓ (4) ابوعتیق بن عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ۔ یہ سب صدیق اکبرؓ کی زندگی ہی میں مشرف باسلام ہوئے۔ اس خصوصیت میں بھی کوئی صحابی حضرت ابوبکرؓ کا ہمسر نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ راوی ہیں کہ جب رسول اللہ صلعم عام الفتح میں داخل ہوئے یعنی جب سن 8 ہجری شروع ہوا تو آپؐ نے دیکھا کہ مدینے کی عورتیں گھوڑوں کے چہروں کو اوڑھنیوں سے صاف کر رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر آپ مسکرائے اور مسکرا کر حضرت ابوبکرؓ کی طرف دیکھا اور کہا اے ابوبکرؓ! اس ضمن میں حسان ابن ثابت نے کیا شعر کہے ہیں؟ تو حضرت ابوبکرؓ نے یہ دو شعر پڑھے۔

"میں اپنی بیٹی کو گم کر دوں (عربوں کا محاورہ ہے) اگر میرے اونٹ مکے میں اپنے دونوں جانب غبار اڑاتے ہوئے نہ آئیں اور قبیلے کی عورتیں آپس میں اُن کے بارے میں منازعت کناں ہوں اور ان کے چہروں کو عورتیں اوڑھنیوں سے صاف کرتی جاتی ہوں۔

پس رسول صلعم نے فرمایا "داخل ہو جس طرح یا اس طرف سے جس طرف سے حسان نے اشارہ کیا یعنی

تنبیہ کدا کی طرف سے (جنگ) غزوۂ حنین کے سلسلے میں ابوقتادہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ جو شخص دشمن کے کسی شخص کو قتل کر دے گا تو مقتول کے سامان (لباس اور ہتھیار) کا مالک ہوگا۔ تو میں نے ایک مشرک (کافر) کو قتل کیا اور اب میں اس انتظار میں تھا کہ کوئی شخص مل جائے تو میں اسے بطور گواہ پیش کرسکوں لیکن مجھے کوئی شخص نہ مل سکا۔ میں رسول اللہؐ کے پاس بیٹھا تھا جب مجھے اس بات کا خیال آیا اور میں نے رسول اللہ صلعم سے اس کا تذکرہ کیا۔ تو ایک شخص جو مجمع میں موجود تھا کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ اس مقتول کے ہتھیاروں کا میں مستحق ہوں۔ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ آپؐ اسے ایک خرگوش بھی نہ دیں کیونکہ اس نے جہاد ہی نہیں کیا پس رسول اللہ صلعم کھڑے ہوئے اور اس مال کو فروخت کرنے کا اعلان فرمایا۔ بس میں نے اس مال میں سے کچھ خریدا اور یہ میری زندگی میں پہلا مال تھا جو میں نے جمع کیا (اخرجہ البخاری)

ابن اسحاق راوی ہے کہ مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ آنحضرت صلعم نے صدیق اکبرؓ سے اپنا خواب بیان کیا جبکہ آپؐ طائف کا محاصرہ کئے ہوئے تھے کہ اے ابوبکرؓ! میں نے خواب دیکھا کہ کسی نے مجھے بالائی سے لبریز پیالہ پیش کیا ہے مگر ایک مرغ نے اس میں ٹھونگ ماردی اور بالائی گر گئی۔ یہ سن کر حضرت صدیق اکبرؓ نے کہا میں یقین کرتا ہوں بنی ثقیف کے خلاف اس مہم میں کامیاب ہوں گے۔ یہ سن کر آپؐ نے فرمایا ''میرا بھی خیال ہے'' (چنانچہ آپؐ نے محاصرہ اٹھالیا)

(19) ازاں جملہ یہ ہے کہ جب غزوہ تبوک واقع ہوا تو آنحضرت صلعم کو ترغیب دی کہ فوج کے لئے سامان جنگ مہیا کریں۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے صدیق اکبرؓ کو نصیب ادنیٰ عطا فرمایا یعنی انہوں نے تہیہ ساز و سامان میں سب صحابہؓ سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اسلم راوی ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ آج میں ایثار اور بذل مال میں ابوبکرؓ سے بڑھ جاؤں گا۔ چنانچہ میں نصف مال لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ رسول اللہ صلعم نے مجھ سے پوچھا ''تم نے اپنے عیال کے لئے کیا چھوڑا ہے'' میں نے کہا نصف

بولے کہ نصف مال ہے فرزند وزن کا حق
باقی جو ہے وہ ملت بیضا پہ ہے نثار

میرے بعد ابوبکرؓ اپنا سارا مال ومتاع واثاث البیت لے کر حاضر خدمت ہوئے۔ حضورؐ نے ان سے بھی یہی سوال کیا کہ تم نے اپنے عیال کے لئے کیا چھوڑا؟ تو انہوں نے جواب دیا ''میں نے اپنے عیال کے لئے اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑا ہے۔''

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لئے ہے خدا کا رسولؐ بس

(20) ازاں جملہ یہ ہے کہ سن 9 ہجری میں آنحضرت صلعم نے صدیق اکبرؓ کو امیر الحج مقرر فرمایا اور وہ تاریخ میں سب سے پہلے شخص ہیں جن کو یہ اعزاز حاصل ہوا۔ اس جگہ (اس معاملے میں) بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوگئی ہے کہ آپؐ نے ان کے بعد حضرت علیؓ کو بھیج کر انہیں اس عہدے سے معزول کر دیا۔ حالانکہ بات کچھ اور ہے۔ امیر الحج بلاشبہ صدیق اکبرؓ ہی رہے۔ حضرت علیؓ نے صرف سورۂ براۃ کی مخصوص آیات کی تلاوت' قریش مکہ کے سامنے خانہ کعبہ میں کی تھی۔ بات

یہ ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ وہ میری طرف سے ایک عہد یا معاہدہ تھا اور عربوں کا دستور تھا کہ معاہدے کا اعلان یا معاہد خود کرے یا اس کا اہل بیت (قریبی رشتہ دار) اس لئے حضرت علیؓ کو بھیجا گیا کیونکہ وہ آپؐ کے سگے چچا کے بیٹے تھے۔

چنانچہ محمد ابن علی سے روایت ہے کہ جب سورۂ براۃ نازل ہوئی تو ابوبکرؓ روانہ ہو چکے تھے۔ لوگوں نے کہا کہ آپ یہ آیات بھی انہی کو دے دیتے تا کہ وہ ان کو پڑھ کر سنا دیتے۔ آپؐ نے فرمایا یہ کام ضابطے کی رو سے میرے رشتہ دار کو کرنا چاہیے چنانچہ آپؐ نے حضرت علیؓ کو بلایا اور کہا کہ یہ احکام لے کر کے جاؤ اور قریش کو بآواز بلند سنا دو کہ

الف۔ کوئی کافر جنت میں نہیں داخل ہو سکے گا۔

ب۔ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کر سکے گا۔

ج۔ کوئی شخص برہنہ ہو کر طواف کعبہ نہیں کر سکے گا۔

د۔ جس کا آنحضرتؐ سے کوئی معاہدہ ہے تو خاص مدت تک ہے۔

چنانچہ یہ احکام لے کر حضرت علیؓ ایک ناقہ پر سوار ہو کر روانہ ہوئے حتیٰ کہ حضرت صدیق اکبرؓ سے جا ملے۔ انہوں نے پوچھا ''تم امیر کی حیثیت سے آئے یا مامور کی؟'' حضرت علیؓ نے کہا میں مامور کی حیثیت سے آیا ہوں۔ چنانچہ دونوں روانہ ہوئے اور حضرت صدیقؓ نے امیر الحج کے فرائض انجام دیئے۔ جب قربانی کا دن آیا تو حضرت علیؓ کھڑے ہوئے اور قریش کو مخاطب کر کے مذکورہ بالا چاروں شرطیں انہیں سنائیں۔

ابن عباس راوی ہیں کہ بیشک رسول اللہؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو بھیجا کہ ان چاروں احکام کا اعلان کر دیں۔ ان کے بعد حضرت علی روانہ ہوئے۔ پس ہم راستے میں تھے۔ جب حضرت ابوبکرؓ نے ناقہ کی آواز سنی۔ وہ سمجھے کہ یہ آنحضرتؐ کی ناقہ ہے۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اس پر علیؓ سوار تھے چنانچہ حضرت علیؓ نے ایام تشریق میں اعلان کیا کہ ''اللہ مشرکوں سے بے تعلق ہے اور اس کا رسول بھی' پس تم چار مہینے آزادی سے چل پھر سکتے ہو۔ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کر سکے گا اور کوئی شخص برہنہ ہو کر طواف نہیں کر سکے گا اور مومن کے سوا کوئی شخص جنت میں داخل نہیں ہو گا۔''

حضرت علیؓ ان احکام کا اعلان بآواز بلند کر رہے تھے۔ پس جب ان کا گلا بیٹھ گیا تو ابو ہریرہؓ کھڑے ہوئے اور باقی ماندہ احکام کا بآواز بلند اعلان کیا۔ (اخرجہ الحاکم)

(21) ازاں جملہ یہ ہے کہ حجتہ الوداع کے موقع پر صدیق اکبرؓ نے آنحضرت صلعم کا ساز و سامان اپنے اونٹ پر رکھا چنانچہ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ راوی ہیں کہ ہم رسول اللہ صلعم کے ساتھ حج کرنے روانہ ہوئے۔ حضرت ابوبکرؓ اور آنحضرت صلعم کا زمالہ (شتر بار بردار) ایک ہی تھا۔ جب ہم کوہ عرج کے دامن میں پہنچے اور ہمارا زمالہ حضرت ابوبکرؓ کے غلام کا ساتھ تھا تو بیٹھے رسول اللہ اور تشریف فرما ہوئیں ام المؤمنین حضرت عائشہؓ۔ حضورؐ کے ایک جانب اور تشریف فرما ہوئے صدیق اکبرؓ حضورؐ کے دوسری جانب اور میں اپنے والد بزرگوار کے پاس بیٹھی تھی۔ تو ہم منتظر تھے کہ سامان والا اونٹ بھی آ جائے۔ اتنے میں غلام آیا اور اس نے کہا میری غفلت سے اونٹ گم ہو گیا۔ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ کو غصہ آ گیا اور انہوں نے غلام کو مارنا شروع کیا اور کہا کہ تو بھی ایک فرد تھا اور اونٹ بھی صرف ایک ہی تھا (نہ کہ بہت سے) پھر وہ ایک اونٹ تجھ سے کیسے گم ہو گیا (جس پر میرا اور آنحضرتؐ کا سامان لدا ہوا تھا) یہ منظر دیکھ کر آنحضرت صلعم (اسماءؓ راوی ہیں)

مسکرائے اور حاضرین سے کہنے لگے۔ ''ذرا تم ان کی طرف دیکھو! محرم ہو کر یہ کام کر رہے ہیں'' (یعنی حاجی کو اس وقت اور اس حالت میں بہت نرمی کا برتاؤ کرنا چاہیے) (اخرجہ الحاکم)

(22) ازاں جملہ یہ ہے کہ آنحضرت صلعم مریض ہوئے تو آپؐ نے حضرت صدیقؓ اکبر پر بہت سی عنایات کیں اور نماز کی امامت (جو اسلام میں سب سے بڑا اعزاز ہے) انہیں تفویض کر دی اور اس باب میں بہت مبالغہ فرمایا۔ ابن اسحٰق راوی ہے کہ زہری نے کہا کہ مجھ سے ایوب بن بشیر نے کہا کہ آنحضرت صلعم اس حالت میں مسجد میں تشریف لائے کہ آپؐ کے سر مبارک پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ آپ اسی حالت میں منبر پر بیٹھے اور سب سے پہلے شہدائے احد پر فاتحہ پڑھی اور ان کے لئے استغفار فرمایا اور ان کے حق میں بہت دعائیں کیں۔ اس کے بعد فرمایا ''اللہ نے اپنے بندوں میں سے ایک بندے کو دنیا اور آخرت میں سے کسی ایک کو منتخب کر لینے کا اختیار دیا تو اس نے اس چیز کو اختیار کر لیا جو اللہ کے پاس ہے (یعنی عالم آخرت) ایوب نے کہا کہ حضرت ابو بکرؓ اس تلویح (مخفی اشارے) کا مطلب سمجھ گئے اور بے اختیار رونے لگے اور کہا بلا شبہ ہم اپنی جانیں آپ پر قربان کر سکتے ہیں۔ اس پر آنحضرت صلعم نے فرمایا اے ابو بکر! اپنے دل کو سنبھالو اور ہمت اور حوصلے سے کام لو۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا ان دروازوں کو دیکھو جو مسجد میں کھلتے ہیں۔ ابو بکرؓ کے دروازے کے سوا باقی سب دروازے بند کر دو کیونکہ میں کسی ایسے شخص سے واقف نہیں ہوں جو اپنی صحبت اور سنگت کے اعتبار سے میری نگاہ میں ابو بکرؓ سے افضل ہو۔

ابن اسحٰق نے کہا کہ مجھ سے عبدالرحمٰن ابن عبداللہ نے کہا کہ اسی دن آنحضرت صلعم نے یہ بات بھی کہی تھی کہ اگر میں اللہ کے بندوں میں سے کسی کو اپنا خلیل (محبّ یکرنگ) بناتا' تو ابو بکرؓ کو بناتا لیکن صحبت و رفاقت اور ایمان کا بھائی چارا بالکل کافی ہے یہاں تک کہ اللہ ہمیں (قیامت کے دن) پھر ملا دے۔

ابن شہاب راوی ہیں کہ مجھ سے عبدالملک بن ابی بکر بن عبدالرحمٰن نے اپنے باپ سے سن کر یہ کہا کہ جب آنحضرت صلعم پر مرض غالب آ گیا اور میں دیگر حضرات کے ساتھ آپؐ کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو آپؐ نے فرمایا ''بلال سے کہو کہ اذان دیں اور (حضرت) ابو بکرؓ سے کہو کہ نماز پڑھائیں۔'' یہ سن کر میں تعمیل ارشاد کے لئے باہر نکلا تو میں نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ موجود ہیں۔ مگر حضرت ابو بکرؓ غائب ہیں۔ لہٰذا میں نے کہا اے عمرؓ! آپؓ نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہوں۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نماز پڑھانے کے لئے آمادہ ہو گئے اور جب انہوں نے اونچی آواز سے تکبیر کہی تو رسول اللہ صلعم نے ان کی آواز سن کر پہچان لی اور یوں بھی حضرت عمرؓ جہیر الصوت تھے۔ بہر کیف ان کی آواز سننے کے بعد رسول اللہ صلعم نے دوبارہ فرمایا ''ابو بکرؓ کہاں ہیں؟'' (میں نے ان کو نماز پڑھانے کا حکم اس لئے دیا ہے کہ) اللہ اور اس کے مسلمان بندے (دونوں ہی) اس بات کو ناپسند کرتے ہیں بلکہ گوارا نہیں کر سکتے کہ زمین پر ابو بکرؓ زندہ موجود ہوں اور ان کے بجائے کوئی اور شخص مسلمانوں کا امام بنے۔ پس آپؐ نے کسی شخص کو بھیجا کہ حضرت ابو بکرؓ کو ڈھونڈ کر لائے چنانچہ جب آپ جنابؓ تشریف لائے تو آپؓ نے مسلمانوں کو نماز پڑھائی۔

عبداللہ ابن زمعہ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے مجھ سے کہا تجھ پر اللہ کی سنوار ہو اے زمعہ کے بیٹے! یہ تو نے میرے ساتھ کیا کیا کہ مجھے امامت کے لئے آگے کر دیا۔ میں تو تیرے اس فعل سے یہی سمجھا تھا کہ تو نے رسول اللہ صلعم کے

حکم سے مجھے امامت کرنے کے لئے کہا ہے۔ میں نے کہا ''بیشک رسول اللہ صلعم نے مجھے ایسا کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ مگر جب میں نے دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ مسجد میں موجود نہیں ہیں تو میں نے ازخود آپ سے امامت کے لئے کہہ دیا۔ کیونکہ میں بلاشبہ حاضرین میں سے آپ کو سب سے زیادہ مستحق امامت یقین کرتا تھا۔''

جب آنحضرت صلعم نے وفات پائی تو آنحضرت صلعم کی وفات میں اختلاف واقع ہوگیا۔ لیکن تمام صحابہؓ میں حضرت ابوبکرؓ ثابت ترین تھے اور یہ ان کی شدت صحو (ہوشیاری) کی علامت ہے اور اسی لئے وہ مرتبۂ خلافت وارشاد پر فائز ہوئے اور اس کے بعد تمام صحابہ نے طوعاً اور رغبۃً حضرت صدیق اکبرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اگرچہ حضرت علیؓ نے چھ ماہ کے بعد بیعت کی مگر انہوں نے حضرت صدیق اکبرؓ کی فضیلت کا اعتراف واضح الفاظ میں کیا اور کہا کہ ہمیں بیعت کرنے میں صرف اس لئے تامل ہوا کہ ہمیں مشورے (سقیفۂ نبی ساعدہ) میں شریک نہیں کیا گیا ورنہ ہمیں آپ کی فضیلت سے انکار نہیں ہے بس اسی لئے ہمارے دل میں آپ کی طرف سے غبار (شکوہ) تھا۔

(23) اور خلافت کے زمانے میں سب سے بڑا کارنامہ آپ کا، اہل ردّت (مرتد قبائل) سے قتال کرنا ہے اور اس باب میں آپؓ سے حیرت انگیز بلکہ محیر العقول عزم وہمت کا اظہار ہوا۔ اللہ نے اپنے کلام مجید کی اس آیت میں ان کی اسی ہمت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

''**من یرتد منکم عن دینہ فسوف یاتی اللّٰہ بقوم یحبھم ویحبونہ الخ** (5-54) اے لوگوں جو ایمان لائے ہو! جو کوئی پھر جاوے گا تم میں سے اپنے دین سے' پس البتہ لاوے گا اللہ ایک قوم کو کہ پیار کرتا ہے ان کو اور پیار کرتے ہیں وہ اس کو الخ۔ یہ آیت حضرت صدیق اکبرؓ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ (شاہ ولی اللہ کے علاوہ شاہ عبدالقادر نے بھی لکھا ہے کہ یہ آیت اُن کے حق میں بشارت ہے) (دیکھو موضح القرآن)

(26) ازاں جملہ یہ کہ آپؓ نے قرآن مجید کو دو دفیتوں کے درمیان جمع فرما دیا اور یہ آپؓ کا قیامت تک سارے مسلمانوں پر احسان عظیم ہے۔

(25) ازاں جملہ یہ کہ آپؓ نے شام اور عراق اور ایران کی فتح کا آغاز کیا۔ پہلے عراق اور شام فتح ہوا پھر حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں ایران فتح ہوگیا اور ان فتوحات نے آئندہ تمام فتوحات کا دروازہ کھول دیا۔

(26) ازاں جملہ یہ کہ آپؓ نے حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین مقرر فرمایا اور اس معاملے میں آپؓ کی اصابت رائے' آفتاب کی طرح روشن ہے۔

اور سب سے بڑا اعزاز آپؓ کو وفات کے بعد حاصل ہوا جب آپ کو آنحضرتؐ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ سعید ابن المسیب' حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دن آنحضرت صلعم ایک کنویں پر شیخینؓ کے درمیان تشریف فرما تھے' جب حضرت عثمانؓ آئے اور حضورؐ کے سامنے بیٹھ گئے۔ بطریق اشارہ اس کا مطلب یہ ہے کہ شیخینؓ کا حضور کے ساتھ مدفون ہونا ایک مکرمت اور عظمت ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے شیخینؓ کو نوازا۔ یہ کوئی اتفاقی امر نہیں تھا کہ یونہی واقع ہوگیا۔

(1) ان میں سے پہلی صفت یا خوبی یہ ہے کہ وہ اشراف قریش میں سے تھے۔ بیضا بنت عبدالمطلب جو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی تھیں' وہ ان کی حقیقی نانی تھیں۔

(2) انہوں نے جاہلیت میں بھی شراب نوشی اور زنا کا ارتکاب نہیں کیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی عقل کامل کی بناء پر ان باتوں سے متنفر تھے۔

(3) وہ اس جماعت میں سے ہیں جو ابتدائے اسلام میں مسلمان ہوئی تھی جس کا ذکر مناقب حضرت صدیق اکبرؓ میں گزر چکا ہے۔

(4) اسلام لانے کے بعد ان کے چچا نے انہیں بہت ایذا دی' مگر وہ ثابت قدم رہے......!!

(5) اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دامادی کا شرف عطا کیا۔

(6) پھر انہوں نے اللہ کی راہ میں سوئے حبشہ ہجرت فرمائی۔

(7) اس کے بعد انہوں نے مدینے ہجرت فرمائی۔

(8) آپ اس جماعت میں شامل ہیں جس نے قرآن مجید جمع کیا۔

(9) بدر اور احد اور بیعت حدیبیہ کے علاوہ تمام غزوات میں حصہ لیا۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ ان تینوں امور میں انہیں حیرت انگیز شرف حاصل ہوا۔ مثلاً جنگ بدر میں اپنی زوجہ محترمہ بنت رسولؐ کی شدید علالت کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ اے عثمانؓ! تمہیں اس شخص کے برابر اجر اور غنیمت میں حصہ ملے گا جو شریک جنگ ہوا ہو۔ اب رہا احد کا معاملہ تو اللہ نے وحی نازل فرمائی کہ ہم نے تمہارا قصور معاف کر دیا۔ (لقد عفا اللہ عنہم) اور بیعت حدیبیہ کے موقع پر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایک خاص مصلحت کے تحت مکے بھیجا تھا (کیونکہ وہ اکابر قریش میں محترم تھے!) اور یہ بیعت ان کی غیبت میں واقع ہوئی تھی۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا: "چونکہ عثمانؓ اللہ اور اس کے رسولؐ کی حاجت پوری کرنے گئے ہیں۔ اس لئے میرا بایاں ہاتھ' حضرت عثمانؓ کا ہاتھ ہے"۔ یعنی حضورؐ نے اپنے ہاتھ کو حضرت عثمانؓ کا ہاتھ قرار دیا۔

(10) انہوں نے یہودی سے بیئر رومہ (کنواں) خرید کر مدینے کے مسلمانوں پر وقف کر دیا اور یہ اتنا بڑا احسان ہے' جس کا اجر قیامت تک ان کو ملتا رہے گا۔ (1)

(11) جیش عسرت (بموقع مہم تبوک) کی تجہیز میں ان سے نمایاں فضیلت ظاہر ہوئی۔ چنانچہ ان کی غیر معمولی فیاضی اور انفاق فی سبیل اللہ سے خوش ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی میں تمام صحابہؓ کے سامنے فرمایا کہ: "آج کے بعد سے تادم وفات عثمان کا کوئی عمل ان کو ضرر نہیں پہنچائے گا۔" (مطلب یہ ہے کہ اگر بفرض محال ان سے کوئی گناہ کبیرہ سرزد ہو جائے تو بھی اللہ معاف کر دے گا۔ کیونکہ انہوں نے اللہ کی راہ میں غیر معمولی ایثار اور انفاق کیا ہے!)

(12) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن فرمایا جو شخص مسجد نبوی کی توسیع کرے گا تو اللہ اسے جنت عطا فرمائے گا اور وہاں اسے اجر عظیم عطا فرمائے گا۔ یہ سن کر حضرت عثمانؓ نے دس ہزار درہم میں ملحقہ زمین ایک انصاری سے خرید کر مسجد نبوی میں شامل کر دی۔ (طبرانی)

(13) جیش عسرت (مہم تبوک سن 9 ہجری) کو ضروری سامان مہیا کیا۔ اس سلسلے میں نو سو پچاس اونٹ مع

سازوسامان پیش کئے اور پچاس گھوڑے مع سازوسامان دے کر ایک ہزار پورے کر دیئے۔ (ان کے علاوہ ہتھیار بھی دیئے اور کئی سو دینار سرخ بھی چندے[2] میں دیئے!)

(14) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہ ثبیر سے فرمایا: ''ساکن ہو جا اے پہاڑ! کیونکہ اس وقت تیری چوٹی پر ایک نبی ہے، ایک صدیق ہے اور دو شہید ہیں۔ (دو شہیدوں سے اشارہ ہے حضرت فاروق اعظمؓ اور حضرت امام مظلوم سیدالشہداء حضرت عثمان غنیؓ کی طرف)

(15) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گواہی دی کہ بوقت فتنہ یہ شخص (حضرت عثمان غنیؓ) حق پر ہوگا۔ نیز فرمایا: ''اے عثمان! مجھے یقین ہے اللہ تمہیں ایک قمیص پہنائے گا (اشارہ بجانب خلافت نبوت) تو اگر کچھ لوگ تم سے یہ کہیں کہ اس قمیص کو اتار دو (اشارہ بجانب خلع عن الخلافۃ) تو ہرگز مت اتارنا۔ (چنانچہ ایسا ہی ظہور میں آیا)

(16) حضرت عثمان غنیؓ درحد ذات خود، حیا سے متصف تھے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے فرمایا: ''کیا میں ایسے شخص سے حیا نہ کروں، جس سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں؟'' حضورؐ کے اس ارشاد میں بڑی گہرائی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر کوئی منصف حضرت عثمانؓ کے حالات زندگی میں تدبر اور تامل کرے گا تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ ہر مرتبہ جب بھی فتنہ برپا ہوا (اور فتنہ آخر عہد خلافت میں کئی سال برپا رہا) تو حضرت عثمانؓ نے دشمنوں سے انتقام لینے کے بجائے اپنا ہی خون جگر پیا اور ان کی ایذا رسانی پر (ان سے انتقام لینے کے بجائے) صبر اور درگزر سے کام لیا اور یہ بات اسی وقت ممکن ہو سکتی ہے جس کسی شخص کو اپنے نفس امارہ پر کامل اختیار حاصل ہو۔ تو شارع علیہ السلام نے بہت غور وخوض کے بعد اس ضبط نفس اور صبر عظیم کو لفظ ''حیا'' سے تعبیر فرمایا۔ نیز حضرت عثمانؓ بہت زیادہ عبادت کرتے تھے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حمران سے منقول ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا جبکہ حضرت عثمانؓ غسل نہ کرتے ہوں، کیونکہ وہ طبعاً طہارت پسند تھے۔ نیز وہ عموماً روزہ رکھتے تھے، صلوٰۃ لیل (تہجد) کے پابند تھے۔ غلاموں کے آزاد کرنے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے سلسلے میں انہیں اللہ نے مرتبہ کامل عطا فرمایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کی اشاعت میں ان کا مرتبہ اور حصہ یہ تھا کہ انہوں نے ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک مصحف (قرآن) پر جمع کر دیا اور جو مصلحت اور خیر خواہی اس امر عظیم میں متحقق ہے، وہ کسی پر پوشیدہ نہیں ہے۔ نیز انہوں نے قرآن مجید کی روایت کی، چنانچہ بعض قراء کا سلسلہ ان پر منتہی ہوتا ہے۔ نیز انہیں اشاعت اسلام اور مسلمانوں کی مرفہ الحالی میں مرتبہ ادنیٰ نصیب ہوا۔ ان کے عہد خلافت میں مسلمانوں کی حکومت کو بہت وسعت حاصل ہوئی۔ مشرق میں افغانستان سے لے کر مغرب میں الجزائر تک پرچم ہلال کو سربلندی نصیب ہوئی۔ روم کی سمت میں مسلمانوں کی حکومت قسطنطنیہ تک پہنچ گئی۔ پس ان کی خلافت نبوت دونوں پہلوؤں سے درست ثابت ہوگئی (وسعت فتوحات اور اشاعت اسلام) نیز ان کے دل میں خوف خدا اس قدر تھا کہ جب وہ کسی قبر پر کھڑے ہوتے تو رقت قلب کی وجہ سے گریہ طاری ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ان کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھی۔ ایک دفعہ ایک شخص نے ان سے پوچھا کہ جب جنت اور دوزخ کا تذکرہ ہوتا ہے تو آپ نہیں روتے اور کسی قبر پر گزر ہوتا ہے تو رونے لگتے ہیں؟ یہ سن کر آپؓ نے جواب دیا کہ میں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آخرت کی منزلوں میں سے قبر پہلی منزل ہے۔ اگر اس منزل میں کسی کی نجات ہوگئی تو آئندہ منزلیں آسان ہو جاتی ہیں اور اگر پہلی منزل میں نجات نہ ہو سکی تو پھر بہت سختی

دیکھے گا۔ نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے قبر سے زیادہ دہشت ناک منظر اور کوئی نہیں دیکھا (ترمذی) نیز ان کے فضائل میں یہ ہے کہ وہ بلاشبہ کبار مہاجرین میں سے تھے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عثمانؓ کی طرف مائل ہوئے اور آپؐ نے انہیں اپنے گلے لگایا (معانقہ) اور کہا: "اے عثمانؓ! تم دنیا میں بھی میرے دوست ہو اور آخرت میں بھی میرے دوست ہوگے۔" نیز آپؐ نے حضرت طلحہؓ سے فرمایا کہ: "کوئی نبی ایسا نہیں ہے جس کا رفیق جنت اس کی امت میں سے کوئی نہ ہو۔ چنانچہ جنت میں میرے رفیق حضرت عثمانؓ ہوں گے!" کثیر ابن الصلت نے کہا کہ جس دن حضرت عثمانؓ شہید ہوئے اس کی صبح کو وہ بیہوش ہو گئے۔ جب وہ ہوش میں آئے تو انہوں نے فرمایا کہ: "اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ لوگ یہ کہیں گے کہ عثمانؓ (خود) فتنے کی تمنا کرتے تھے تو میں تم سے ایک بات کہتا!" لوگوں نے کہا: "آپ ہم سے ضرور کہیں، ہم آپ کے بارے میں یہ گمان نہیں کرتے!" اس پر انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہؐ کو خواب میں دیکھا کہ آپ نے مجھ سے فرمایا کہ اے عثمانؓ! آج جمعے کی نماز ہمارے ساتھ جنت میں پڑھنا۔ ابن عمرؓ ان کے راوی ہیں کہ جب صبح کو حضرت عثمانؓ بیدار ہوئے تو فرمایا کہ "میں نے خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپؐ نے مجھ سے فرمایا کے اے عثمانؓ! آج شام کو ہمارے ساتھ جنت میں روزہ افطار کرنا!" پھر فرمایا اسی لئے میں نے آج روزہ رکھ لیا ہے۔ (اخرجہ الحاکم)

حواشی

(1) حضرت مصنف نے اس کی تفصیل نہیں لکھی اس لئے میں مختصراً لکھتا ہوں کہ مدینے میں میٹھے پانی کا صرف یہی ایک کنواں تھا، جو ایک یہودی کی ملکیت تھا۔ جب اس نے مسلمانوں کو پانی بھرنے سے منع کر دیا تو حضورؐ نے صحابہؓ سے فرمایا جو شخص اس کنوئیں کو خرید کر مسلمانوں، خصوصاً عورتوں پر کرم کرے گا۔ میں اس کی جنت کا ضامن ہوں۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے اس یہودی سے کنواں خرید کر مسلمانوں پر احسان عظیم کیا۔

(2) اس موقع پر سید الشہداء حضرت عثمانؓ نے سب صحابہؓ سے زیادہ امداد کی۔ لیکن حضرت صدیق اکبرؓ کو فضیلت اس لئے حاصل ہوئی کہ انہوں نے اپنا سارا اثاثہ حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دیا تھا اور اہل و عیال کے لئے ایک درہم بھی نہیں چھوڑا تھا۔

مترجم: مولانا سید حامد علی

مسئلۂ اجتہاد

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

(برصغیر پاک و ہند میں اسلامی فکر کے احیاء اور اس کی تدوین میں جو حصہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا ہے وہ کسی اور کا نہیں۔ آپ نے اجتہاد کے مسئلہ پر بھی متعدد مقامات پر گفتگو کی ہے مگر ''عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید'' اس موضوع پر آپ کی مستقل تصنیف ہے۔ مولانا سید حامد علی صاحب کے قلم سے اس کے پہلے دو ابواب کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔ حواشی بھی مترجم ہی کے قلم سے ہیں۔) (مرتب)

اجتہاد...... جیسا کہ علماء کے بیان سے معلوم ہوتا ہے...... نام ہے' شریعت کے فروعی احکام کو' ان کے تفصیلی دلائل سے جن کی بنیادیں کتاب اللہ، سنت رسول، اجماع اور قیاس ہیں...... معلوم کرنے کے لئے پوری کوشش صرف کر دینے کا۔

حکم معلوم کرنے کی یہ کوشش خواہ کسی ایسے امر کے سلسلے میں ہو جس کے متعلق علمائے سابق پہلے ہی غور و خوض کر چکے ہوں، کسی ایسے معاملے میں جس سے انہوں نے تعرض نہ کیا ہو اور کوشش کرنے والے کی رائے خواہ علمائے سابق کی آراء سے ہم آہنگ ہو' یا ان سے مختلف' اسی طرح مسائل کی مختلف شکلوں سے واقفیت اور تفصیلی دلائل میں سے احکام کے مآخذ سے آگاہی کسی شخص کی اعانت و رہنمائی سے ہوئی ہو' یا اس کے بغیر مذکورہ بالا تعریف کی رو سے یہ سب اجتہاد ہی کی مختلف شکلیں ہیں اور ان سب پر اجتہاد کا اطلاق ہوگا۔

اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہے

اس لئے جو شخص اکثر مسائل میں اپنے استاد یا امام کا ہم خیال ہو۔ مگر ساتھ ہی احکام کی دلیلوں سے آگاہ، ان دلائل پر مطمئن اور اس فن میں صاحب بصیرت ہو۔ ایسے شخص کو مجتہد نہ سمجھنا خیال فاسد ہے اور اس خیال فاسد کی بنیاد پر اس خیال کی تعمیر کہ ان ادوار میں مجتہد کا وجود عنقا ہے۔ جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے...... بنائے فاسد علی الفاسد ہے۔

اجتہاد کی شرائط

اجتہاد کے لئے ناگزیر ہے کہ انسان کتاب وسنت کے (کم از کم) اتنے حصے کا علم رکھتا ہو جو احکام سے متعلق ہے۔ اجماعی مسائل سے واقف ہو ٗ قیاس کی شرائط وحدود اور فکر ونظر کے طریقوں سے آگاہ ہو۔ عربی زبان کا ماہر ہو ٗ ناسخ و منسوخ پر اس کی نظر ہو اور راویوں کے حالات سے باخبر ہو۔

فقہ اور کلام کا علم اجتہاد کے لئے ضروری نہیں ٗ لیکن امام غزالیؒ کا ارشاد ہے:

''ہمارے زمانے میں اجتہاد کا درجہ فقہ کی مزاولت وممارست سے حاصل ہوتا ہے۔ اس زمانے میں درایت و تفقہ کے پیدا ہونے کا یہی راستہ ہے۔ صحابہؓ کے زمانے میں اس مقصد کے حصول کا یہ طریقہ نہ تھا۔''

مگر میرے خیال میں یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اجتہاد مطلق [1] منتسب کی تکمیل، مجتہد [2] مستقل کی آراء کو جانے بغیر نہیں ہوتی۔ اسی طرح مجتہد مستقل کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اسلاف...... صحابہؓ تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے ان اقوال سے آگاہ ہو جن کا تعلق فقہی امور ومعاملات سے ہے۔

اجتہاد کی یہ شرائط جو ہم نے اوپر بیان کی ہیں تفصیل کے ساتھ کتب اصول میں مذکور ہیں ٗ ہم یہاں صرف امام بغوی کی تصریحات نقل کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

''مجتہد وہ ہے جو پانچ علوم کا جامع ہو ٗ علم کتاب اللہ ٗ علم سنت رسول اللہ ٗ علمائے سلف کے اقوال وآراء کا علم خواہ کسی مسئلہ میں ان کا اجماع ہو گیا ہو یا ان کی آراء باہم مختلف ہوں ٗ عربی زبان کا علم ٗ قیاس کا علم ٗ اور قیاس نام ہے کتاب و سنت سے کسی حکم کو مستنبط کرنے کے طریقے کا ٗ جب کہ قرآن ٗ حدیث یا اجماع میں صراحتاً وہ حکم نہ ملے۔

کتاب اللہ کے سلسلے میں مجتہد کے لئے ضروری ہے کہ اسے ناسخ ومنسوخ، مجمل ومفسر، خاص وعام، محکم ومتشابہ، کراہت، تحریم، اباحت، استحباب اور وجوب کا علم ہو۔ [3]

سنت کے سلسلے میں ان باتوں کے علاوہ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ صحیح احادیث کون سی ہیں اور ضعیف کون سی ٗ مسند [4] کون سی ہیں اور مرسل [5] کون سی۔ علاوہ ازیں مجتہد کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ کتاب وسنت کی باہمی ترتیب اور ان کا تعلق وربط کیا ہے تاکہ اگر کوئی ایسی حدیث اس کے علم میں آئے جو اپنے ظاہری مفہوم کے لحاظ سے کتاب اللہ سے ہم آہنگ نہ ہو ٗ تو وہ اس کا صحیح مفہوم پا سکے اور اس کی توجیہہ کر سکے ٗ کیونکہ سنت کتاب اللہ کی شرح ہوتی ہے۔ اس کی ضد یا اس سے مختلف نہیں ہو سکتی۔

احادیث میں ایک مجتہد کے لئے صرف ان احادیث کا علم ضروری ہے جن میں احکام مذکور ہیں۔ ان کے ماسوا احادیث کا علم ضروری نہیں مثلاً وہ احادیث جن میں گذشتہ قوموں کے واقعات یا تاریخی حالات کا ذکر ہے۔ یا وہ احادیث جو موعظت ونصیحت پر مشتمل ہیں۔

عربی زبان کے سلسلے میں یہ ضروری نہیں ہے کہ مجتہد کو عربی کے تمام ہی الفاظ ومحاورات پر عبور ہو ٗ ہاں ان الفاظ و محاورات کا علم اسے لازماً ہونا چاہیے جن کا استعمال کتاب وسنت میں احکام کے بیان کرنے کے سلسلے میں ہوا ہے۔ اس

ذیل میں جس قدر بھی کوشش و محنت ہو سکے، کرنی چاہیے تاکہ اتنی استعداد پیدا ہو جائے کہ وہ کلام عرب کے حقیقی مقصد و منشاء کو پا سکے اور یہ سمجھ سکے کہ مواقع اور حالات کے مختلف ہونے سے مفہوم پر کیا اثر پڑتا ہے...... عربی زبان کا علم اس لئے ضروری ہے کہ عربی ہی وہ زبان ہے جس میں اللہ کی شریعت نازل ہوئی ہے اور اللہ و رسول نے اسی زبان میں لوگوں کو مخاطب فرمایا ہے تو جو شخص اس زبان کا علم نہ رکھتا ہو گا وہ شارع کے منشا کو (کما حقہ) نہ جان سکے گا۔

پھر مجتہد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ صحابہؓ اور تابعینؒ کے اقوال سے جو احکام کے سلسلے میں ان سے منقول ہوں آگاہ ہو، نیز فقہائے امت کے فتاویٰ سے بہت بڑی حد تک واقف ہو تاکہ وہ کوئی حکم لگاتے وقت ان کے اقوال کی مخالفت سے بچ سکے اور خرق اجماع (6) سے محفوظ رہے۔

مجتہد ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ان علوم پنجگانہ کے تمام گوشوں پر انسان کی اس طرح نظر ہو کہ کوئی شئے بھی اس کی نگاہ سے چھوٹنے نہ پائے۔ بس اس قدر کافی ہے کہ ان پانچ علوم میں سے ہر علم کا بڑی حد تک حامل ہو۔ جو شخص یہ وصف رکھتا ہو وہ مجتہد ہے...... لیکن اگر کوئی شخص ان علوم میں سے کسی ایک علم سے بھی بے بہرہ ہو تو اس کی راہ تقلید ہے۔ (نہ کہ اجتہاد) اگرچہ وہ ائمہ سلف میں سے کسی امام کے مسلک کا متبحر عالم کیوں نہ ہو۔ ایسے شخص کے لئے جائز نہ ہو گا کہ وہ قضا و افتا کی ذمہ داریاں سنبھالے (7)

جو شخص ان پانچ علوم کا جامع ہو، خود ساختہ عقائد و بدعات سے دور ہو، تقویٰ و تورع کے زیور سے آراستہ ہو، کبائر سے مجتنب ہو اور صغائر پر جمنے والا نہ ہو، ایسے ہی شخص کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ منصب قضا قبول کرے اور شرعی معاملات میں اجتہاد کرے اور فتوے دے اور جو لوگ ان صفات کے جامع نہ ہوں ان کے لئے ان تمام مسائل میں جو درپیش ہوں (اجتہاد کے بجائے) اس شخص کی تقلید ضروری و واجب ہے جو ان صفات کا جامع ہو۔" (8)

مجتہد کی قسمیں

امام رافعیؒ، امام نوویؒ اور دوسرے بے شمار لوگوں نے صراحت کی ہے کہ مجتہد مطلق کی...... جس کی تعریف اوپر گزری ہے...... دو قسمیں ہیں۔ مستقل اور منتسب۔ ان کے کلام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مجتہد مطلق مستقل میں تین امتیازی وصف ہوتے ہیں جو مجتہد مطلق منتسب میں نہیں ہوتے۔

1۔ جن اصولوں پر اس کے اجتہادات کی بنیاد قائم ہو، انہیں اس نے اپنی ذاتی تحقیق اور رد و بدل کے بعد اختیار کیا ہو۔

2۔ ان احکام فقہی کی تحقیق کے لئے جن کے بارے میں اس سے قبل اظہار خیال کیا جا چکا ہو آیات، احادیث اور آثار صحابہ و تابعین کی اس نے چھان بین کی ہو، متعارض دلائل سے کسی ایک دلیل کو دوسری پر ترجیح دی ہو، اختیار کردہ دلیل کے محتمل پہلوؤں میں سے راجح پہلو کو بیان کیا ہو اور دلائل میں وہ احکام کے مآخذ سے آگاہ ہو اور ہمارا خیال ہے واللہ اعلم کہ یہ چیز امام شافعیؒ کے علوم کا دو ثلث ہے۔

3۔ مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں اس نے ان مسائل سے بھی بحث کی ہو جن پر اس سے قبل اظہار خیال نہیں

کیا گیا تھا...... جو شخص اپنے استاد یا امام کے اصولوں کو صحیح تسلیم کرے' دلائل کی تلاش اور احکام کے مآخذ معلوم کرنے کے سلسلے میں اس کے مباحث سے اکثر و بیشتر رہنمائی حاصل کرے' مگر فقہی احکام جن دلائل سے ماخوذ ہوں' بصیرت و اطمینان قلبی کے ساتھ ان کے علم سے بہرہ ور ہو اور ان دلائل سے وہ استنباط مسائل پر بھی قادر ہو۔ عملاً اس نے مسائل کا استنباط کم کیا ہو یا زیادہ...... ایسا شخص مجتہد مطلق منتسب ہے۔ یہ تمام شرطیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا، مجتہد مطلق کے لئے ہیں (مجتہد فی المذہب اور مجتہد الفتویٰ کے لئے نہیں) مجتہد فی المذہب...... جو مجتہد مطلق سے کم تر درجے کا ہوتا ہے...... وہ ہے جو اپنے امام کا، ان تمام مسائل میں جن کے سلسلے میں امام کی تصریحات اس کے سامنے آ جائیں، مقلد ہو، ساتھ ہی وہ اپنے امام کے اصول و قواعد اور ان اساسات سے بھی جن پر اس کا فقہی مسلک قائم ہے واقف ہو، چنانچہ جب کوئی ایسا مسئلہ اس کے سامنے آ جائے جس کے بارے میں اس کے امام کو کوئی تصریح اس کے علم کی حد تک موجود نہ ہو تو وہ اپنے امام کے مسلک کے مطابق اس مسئلہ کے سلسلہ میں اجتہاد اور اس کے اقوال سے اس کے طرز استنباط کے تحت فقہی احکام کی تخریج کرے۔

مجتہد الفتویٰ...... اور وہ مجتہد فی المذہب سے بھی کم تر درجے کا ہوتا ہے...... وہ ہے جو اپنے امام کے فقہی مسلک کا تبحر عالم ہو اور اس مسلک کے مختلف اقوال میں سے ایک قول کو دوسرے قول پر' اور امام کے شاگردوں اور ساتھیوں کی آراء میں سے ایک رائے کو دوسری رائے پر ترجیح دینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ باقی جن فروعی مسائل کے لئے شریعت میں کوئی قطعی حکم موجود نہ ہو' ان کے سلسلے میں اجتہاد کرنے (اور اجتہاد کے نتیجے میں مختلف آراء رکھنے) والے اصحاب میں سے ہر شخص کی رائے صحیح و درست ہوتی ہے یا ان میں سے کسی ایک ہی کی، علماء کا اس میں اختلاف ہے۔ شیخ ابوالحسن اشعری' قاضی ابوبکر باقلانی' امام ابو یوسف امام محمد بن الحسن اور قاضی ابن شریح اس امر کے قائل ہیں کہ ہر مجتہد کی رائے صحیح ہوتی ہے اور یہی بات جمہور متکلمین...... شاعرہ اور معتزلہ...... سے منقول ہے۔ امام ابو یوسف کی ''کتاب الخراج'' کے بعض اشارات سے بھی...... جو وضاحت میں صراحت کے لگ بھگ ہیں...... اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جمہور فقہاء اس بات کے قائل ہیں کہ مجتہدین میں سے کسی ایک ہی کی رائے صحیح ہوتی ہے۔ ائمہ رابعہ کی یہی رائے بیان کی جاتی ہے۔ ابن السمانی نے ''قواطع'' میں بیان کیا ہے کہ امام شافعی کا ظاہر مذہب یہی ہے۔

قاضی بیضاوی نے ''المنہاج'' میں (اس مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے) کہا ہے۔[10]

''اجتہاد کرنے والے دو افراد میں سے ہر دو کی رائیں صحیح ہوتی ہیں۔ (یا ان میں سے کسی ایک ہی کی) اس میں اختلاف ہے اور یہ اختلاف اس امر میں اختلاف کا نتیجہ ہے کہ ہر مسئلے کے لئے ایک متعین حکم موجود ہے جس کی نشانی دہی کوئی قطعی یا ظنی دلیل کرتی ہے۔ (یا ایسا نہیں ہے) اور راجح و مختار قول وہ ہے جو امام شافعیؒ سے ثابت ہے کہ ہر معاملے کے سلسلے میں ایک متعین حکم ہے جس کی کوئی دلیل' نشانی ہوتی ہے۔ جو اس نشانی کو پا لیتا ہے، وہ اس متعین حکم کو بھی پا لیتا ہے اور جو اس نشانی کو نہیں پاتا' اس سے (اس حکم کے معلوم کرنے میں) چوک ہو جاتی ہے البتہ وہ گنہگار نہیں ہوتا (کیونکہ اس نے اپنی سی کوشش تو کر ہی ڈالی)۔

اس بات کی دلیل (کہ ہر پیش آنے والے واقعہ کے لئے ایک متعین حکم موجود ہے) یہ ہے کہ مجتہد کے اجتہاد سے قبل (ان) دلائل کا وجود ہوتا ہے (جو احکام کی نشان دہی کرتے ہیں) کیونکہ اجتہاد نام ہی ہے دلائل کی تلاش و جستجو کا اور

(یہ دلائل جن احکام کی نشان دہی کرتے ہیں) ان کی نشان دہی سے قبل احکام موجود ہوتے ہیں (پس ثابت ہوا کہ اجتہاد سے قبل ہر معاملے کے سلسلے میں ایک متعین حکم موجود ہوتا ہے)۔

پس اگر (کسی مسئلے میں) دو مختلف اجتہادات میں سے ہر ایک کو صحیح مان لیا جائے تو (ماننا پڑے گا کہ ایک ہی مسئلے کے متعلق دو مختلف و متضاد حکم پہلے ہی سے موجود تھے اور اس سے) اجتماع ضدین لازم آئے گا (جو محال ہے)۔

اس مسلک کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے:

من اصاب فله اجوان و من اخطاء فلا اجر وحد

جس نے صحیح حکم پالیا اس کے لئے دوہرا اجر ہے اور جس سے چوک ہوگئی اس کے لئے ایک اجر۔[11]

اس مسلک پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اگر (ہر مسئلے کے متعلق) کوئی متعین حکم موجود ہوتا تو (اجتہادی غلطی کی بنا پر) اس کے خلاف فیصلہ کرنے والا حکم الٰہی کے خلاف فیصلہ کرنے والا قرار پاتا اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد:

من لم یحکم بما انزل اللّٰہ فاولئك هم ان الفاسقون

اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ فاسق ہیں۔

کے بموجب فاسق ٹھہرتا (حالانکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے) (اس اعتراض کے جواب میں) ہم کہتے ہیں کہ اس مجتہد نے جس امر کو اللہ کا حکم خیال کیا اس کے مطابق حکم دیا اگرچہ اس سے اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ کرنے میں چوک ہوگئی۔

ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا کہ اگر سب مجتہدین کو مصیب نہ ٹھہرایا جائے تو کسی شخص کے لئے اپنے اجتہاد کے خلاف جہاد کرنے والے شخص کو والی بنانا جائز نہ ہوگا حالانکہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت زیدؓ[12] کو والی مقرر کیا تھا (اس اعتراض کے جواب میں) ہمارا کہنا ہے کہ والی بنانا اس شخص کو جائز نہیں ہے جو برسر باطل ہو اور بھول چوک سے غلطی کرنے والا برسر باطل نہیں ہوتا۔

یہ قاضی بیضاوی کی تصریحات تھیں (اب ہم ان تصریحات کے ایک ایک جز پر اظہار خیال کریں گے)

قاضی بیضاوی کا یہ فرمانا کہ ''ہر مسئلے کے لئے متعین حکم موجود ہے'' ہمارے خیال میں امور غیب کے بارے میں ایک فیصلہ ہے جو بلا دلیل کے کر دیا گیا ہے۔[13] اس سلسلہ میں امام شافعی کے جس قول کا انہوں نے حوالہ دیا ہے۔ اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ ہر معاملے کے سلسلے میں ایک (اجتہادی) فیصلہ ایسا ہوتا ہے جو اصول شریعت سے زیادہ موافقت اور اجتہاد کے طریقوں سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ کچھ اجتہادی دلائل ہوتے ہیں جو اس فیصلے کے لئے کھلی ہوئی نشانی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو شخص اس نشانی کو پالیتا ہے وہ اس (مناسب تر) فیصلے تک پہنچ جاتا ہے اور جو شخص اس نشانی کو نہیں پاتا، اس سے چوک ہو جاتی ہے۔ (اور اس موزوں تر فیصلے تک نہیں پہنچ پاتا) البتہ وہ گنہگار نہیں ہوتا۔[14] ہم نے امام شافعی کے قول کا یہ مطلب اس لئے لیا کہ انہوں نے ''کتاب الام'' کے آغاز ہی میں اس کی صراحت کی ہے کہ جب کوئی عالم کسی عالم سے کہے ''تم سے غلطی ہوگئی'' تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ''تم نے اس موزوں طریقے کو اختیار نہ کیا جو علماء کے شایان شان ہے۔''[15] اس امر کو انہوں نے ''کتاب الام'' میں تفصیل سے بیان کیا ہے اور اس کی بہت سی مثالیں دی ہیں، یا امام

شافعی کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی مسئلہ کے متعلق [16] خبر واحد [17] موجود ہو تو اس مسئلے کے سلسلے میں صحیح رائے اس شخص کی ہوگی جس کی رسائی اس حدیث تک ہو چکی ہوگی۔ اس کے برعکس جس کے علم میں یہ حدیث نہ ہوگی اس سے (صحیح حکم معلوم کرنے میں) چوک ہو جائے گی اور یہ بات بھی ''کتاب الام'' میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

قاضی بیضاوی نے (امام شافعیؒ کا مسلک نقل کرتے ہوئے) جو دلیل [18] دی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر صرف یہ ذمہ داری ڈالی ہے کہ ہمارا اجتہاد جس طرف ہماری رہنمائی کرے اس پر عمل کریں [19] پس جس چیز کا اجمالی علم ہمیں حاصل ہوتا ہے (اجتہاد کے ذریعہ) اس کا تفصیلی علم حاصل کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ [20]

قاضی بیضاوی نے فرمایا ''اگر دو (مختلف) اجتہادات کو صحیح مان لیا جائے تو اجتماع ضدین لازم آئے گا۔'' ہم کہتے ہیں کہ ان اجتہادات کا معاملہ امور کفارہ جیسا ہے کہ ان میں سے ہر ایک واجب بھی ہے اور واجب نہیں بھی ہے۔ [21]

قاضی بیضاوی نے (اپنے مسلک کی تائید میں) ارشاد نبوی کا حوالہ دیا ہے۔ ہمارا انہیں جواب یہ ہے کہ یہ حدیث درحقیقت آپ کے مسلک کی تردید کرتی ہے' نہ کہ تائید۔ کیونکہ جو خطا موجب اجر ہو' وہ معصیت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے (اس حدیث کی رو سے جس میں ایک رائے پر دوہرے اجر کا وعدہ ہے اور ایک رائے پر ایک اجر کا) یہ ناگزیر ہے کہ یہ دو مختلف اجتہادات اللہ کے دو حکم ہوں' جن میں سے ایک حکم دوسرے حکم سے افضل ہو' جیسا کہ عزیمت و رخصت میں ہوتا ہے [22]...... یا پھر اس حدیث کا تعلق (مجتہدین کے اجتہاد کے بجائے) قاضی کے فیصلوں سے ہے کیونکہ واقعات کی دنیا میں مدعی اور مدعا علیہ میں سے کسی ایک ہی کا قول صحیح ہو سکتا ہے۔ [23]

اسی طرح قاضی بیضاوی کا یہ فرمانا کہ غلطی کرنے والے مجتہد نے جس چیز کا حکم الٰہی خیال کیا اس کے مطابق حکم دیا۔ (اس لئے وہ حکم الٰہی کے خلاف فیصلہ کرنے والا نہیں) دراصل ہمارے مسلک کی صحت کا اقرار ہے۔ [24]

رہا قاضی بیضاوی کا یہ ارشاد ''کہ اجتہادی غلطی کرنے والا برسر باطل نہیں ہوتا۔'' (اس لئے اسے والی بنانا جائز ہے) تو اس سے ان کے مسلک کے خلاف یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اجتہادی غلطی کرنے والا حق کا مخالف نہیں ہے کیوں کہ ہر مخالف حق برسر باطل تو ہوتا ہے کیونکہ جہاں حق نہ ہو وہاں باطل کے سوا اور دھرا کیا ہے۔ [25]

حقیقت یہ ہے کہ ائمہ اربعہ کی طرف جس قول کا انتساب کیا گیا ہے (کہ ایک ہی مجتہد برسر صواب ہوتا ہے) اس کی انہوں نے کہیں صراحت نہیں کی ہے۔ یہ قول ان کی بعض تصریحات سے تخریج کیا ہوا ہے اور بس۔ [26]

علاوہ ازیں امت کے مابین اس امر میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جن امور کے سلسلے میں کتاب و سنت کے صریح ارشادات یا اجماع امت کی مدد سے چند راہوں میں سے کسی بھی راہ کے اختیار کرنے کی اجازت ہو' ان میں مختلف اجتہادات رکھنے والے سب ہی مجتہدین برسر صواب آتے ہیں۔ مثلاً قرآن پاک کی سات قرأتیں [27]۔ دعاؤں کے مختلف الفاظ [28] اور سات' نو یا گیارہ رکعتوں کے ساتھ وتر کرنے کا معاملہ۔ [29] اسی طرح ان امور کے سلسلے میں شارع کا منشا یہ معلوم ہوتا ہو کہ چند راہوں میں سے کوئی بھی راہ اختیار کر لی جائے۔ ان امور کے سلسلے میں بھی مختلف اجتہادات کے صحیح ہونے میں اختلاف نہ کرنا چاہیے۔ [30]

حقیقت یہ ہے کہ اختلاف کی چار قسمیں ہیں:

1۔ وہ اختلاف جس میں حق قطعی طور پر متعین ہوتا ہے، اس حق کی مخالف رائے کی تردید اور خلاف ورزی واجب ہے کیونکہ اس کا باطل ہونا یقینی ہے۔

2۔ وہ اختلاف جس میں حق ظن غالب سے متعین ہوتا ہے، اس حق کی مخالف رائے ظن غالب کی حد تک باطل ہوتی ہے۔

3۔ وہ اختلاف، جس میں مختلف رایوں کے اختیار کرنے کی یقینی طور سے گنجائش ہوتی ہے۔

4۔ وہ اختلاف جس میں یہ گنجائش ظن غالب کی حد تک ہوتی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اگر مسئلہ اس قسم کا ہو جس میں قاضی کے حکم کی خلاف ورزی کی جا سکتی ہو یعنی اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح اور معروف نص [31] موجود ہو (اور قاضی کا حکم اس کے خلاف ہو) تو جو اجتہاد اس نص کے خلاف ہوگا، وہ باطل [32] ہے۔ البتہ مجتہد کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نص سے ناواقف ہونے کی بناء پر اس وقت تک معذور سمجھا جائے گا جب تک کہ رائے نص کا علم ہو جائے اور حجت تمام ہو جائے۔

اگر اجتہاد کا تعلق کسی ایسے واقعہ کے معلوم کرنے سے ہو جو واقع ہو چکنے کے بعد اشتباہ میں پڑ گیا ہو' مثلاً کسی متعین شخص کی زندگی وموت کا مسئلہ تو ظاہر ہے' اس معاملہ میں صحیح و درست بات ایک ہی ہو گی۔ البتہ غلطی کرنے والا اپنے اجتہاد کی بناء پر معذور سمجھا [33] جائے گا۔

اگر اجتہاد کسی ایسے معاملے سے متعلق ہو' جسے صاحب اجتہاد کی رائے و تحقیق پر چھوڑ دیا گیا ہو اور (دو مختلف اجتہاد کرنے والوں میں سے) ہر ایک کی رائے کی بنیاد ذہنوں کو لگتی ہوئی ہو' یعنی ان میں سے کوئی بھی ذہنوں سے اتنی زیادہ دور نہ ہو کہ یہ خیال کیا جا سکے کہ اس رائے کے قائم کرنے والے نے (رائے قائم کرنے میں) کوتاہی کی اور سوسائٹی کے عرف اور لوگوں کی عادات کو ملحوظ نہ رکھا۔ ایسی صورت میں دونوں اجتہاد کرنے والوں کو برسر صواب سمجھا جائے گا۔

ایک مثال سے اسے سمجھئے' دو شخص تھے۔ ان میں سے ہر ایک سے کسی شخص نے کہا۔ "تمہیں جو محتاج بھی ملے اسے میری رقم میں سے ایک درہم دے دو۔" ان میں سے ہر ایک نے پوچھا۔ "مجھے یہ کیسے معلوم ہو کہ فلاں شخص محتاج ہے۔" روپیہ والے نے کہا۔ "جب تم میں سے کسی آدمی کو قرائن و آثار سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جائے کہ فلاں شخص محتاج ہے اور اس سلسلے میں وہ اپنی حد تک پوری کوشش کرے پھر اسے اس شخص کے محتاج ہونے پر قلبی انشراح بھی ہو جائے تو وہ اسے ایک درہم دے دے۔" (یہ ہدایت دے کر اس نے ان دونوں کو رخصت کر دیا) اس کے بعد ان دونوں آدمیوں میں ایک شخص کے سلسلے میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ ان میں سے ایک نے کہا "یہ محتاج ہے۔" (اور درہم پانے کا مستحق) دوسرے نے کہا "نہیں' یہ محتاج نہیں ہے۔" (اور اسے درہم نہیں دینا چاہیے) اور دونوں اشخاص نے جن بنیادوں پر اپنی رائیں تعمیر کی ہیں' وہ ذہنوں سے لگتی ہوئی ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کو اپنایا جا سکتا ہے۔...... تو یہ دونوں شخص برسر صواب ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ صاحب رقم نے رقم دینے کے معاملے کو صرف اس بات پر موقوف ٹھہرایا تھا کہ دینے والے کی رائے و تحقیق میں کوئی شخص محتاج ہو اور اس کی رائے و تحقیق یہی تھی کہ وہ شخص محتاج ہے' پھر اس نے (رائے قائم کرنے میں) کوئی کھلی ہوئی کوتاہی بھی نہیں کی تھی...... برخلاف اس کے کہ اگر اس نے یہ درہم کسی بڑے تاجر کو دے دیا' جس کے

بہت سے خدمت گزار اور نوکر چاکر تھے اور اسے محتاج خیال کیا تو ایسا شخص (رائے قائم کرنے میں) کوتاہی کرنے والا قرار پائے گا اور جس شبہ کی بنا پر اس نے تاجر کو محتاج سمجھا ہے، اس پر عمل درست نہ ہوگا کیونکہ یہ بات ذہنوں کو لگتی ہوئی نہیں ہے کہ جس شخص کے اس طرح کے حالات ہوں (اور وہ محتاج ہو)...... دراصل دو سوال الگ الگ ہیں' ایک تو یہ کہ وہ شخص (جسے درہم دیا گیا) فی الواقع محتاج ہے یا نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صحیح بات ایک ہوگی اور دو متضاد چیزیں بیک وقت جمع نہ ہوں گی (کہ وہ محتاج ہو بھی اور محتاج نہیں بھی ہو) اور دوسرا سوال یہ ہے کہ جو شخص کسی غیر محتاج کو محتاج تصور کر کے رقم دے دے (بشرطیکہ اس نے رائے قائم کرنے میں اپنی کوشش و دانست بھر کوتاہی نہ کی ہو) وہ حکم کی تعمیل کرنے والا ہے یا نہیں اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ وہ یقیناً تعمیل حکم کرنے والا ہے۔ ہاں جس کی رائے حقیقت واقعہ سے ہم آہنگ ہو جائے اس کا اجر زیادہ ہے۔[34]

اور اگر اجتہاد ایسے معاملات میں ہو' جن میں چند طریقوں میں سے کسی ایک طریقے کو اختیار کرنے کی اجازت ہے اور سوال ان طریقوں میں سے کسی ایک طریقے کے اختیار کرنے کا ہو۔ جیسے قرآن پاک کی مختلف قرأتیں' دعاؤں کے مختلف کلمات اور اسی طرح وہ افعال جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کی سہولت کے لئے کئی طرح سے انجام دیا ہو اور ہر صورت میں اصل مصلحت و حکمت پوری طرح برقرار رہتی ہو تو ایسے معاملات میں مختلف اجتہادات کرنے والے برسر صواب[35] ہیں۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے' بالکل واضح ہے' کسی شخص کے لئے مناسب نہیں کہ اس کے ماننے میں تامل کرے۔

حواشی

(1) اجتہاد کی تین قسمیں ہیں: اجتہاد مطلق' اجتہاد فی المذہب' اجتہاد فی الفتویٰ۔ پھر اجتہاد مطلق کی دو قسمیں ہیں: اجتہاد مطلق مستقل، اجتہاد مطلق منتسب۔ ان سب کی تعریف آگے آ رہی ہے۔

(2) اجتہاد مطلق مستقل کا حامل۔

(3) یعنی اسے معلوم ہو کہ کون سی آیت ناسخ ہے اور کون سی منسوخ' کون سی مجمل ہے اور کون سی اس کی شرح و تفصیل' کون سی آیت اپنے مفہوم میں عام ہے کون سی خاص اور کون سی آیت اپنے مفہوم میں قطعی ہے اور کون سی ایسی نہیں ہے۔ پھر قرآن میں جن چیزوں سے روکا گیا ہے' آیا وہ مکروہ ہیں یا قطعی ممنوع و حرام اور جن کاموں کے کرنے کے لئے کہا گیا ہے وہ جائز ہیں یا مستحب و مندوب یا واجب و فرض۔

(4) مسند اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے راویوں کا سلسلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک بالاتصال پایا جاتا ہو' بیچ میں کوئی راوی چھوٹا ہوا نہ ہو۔

(5) مرسل اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی سند میں ان صحابی کا نام مذکور نہ ہو۔ جنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس حدیث کی روایت کی تھی۔

(6) یعنی کسی مسئلہ میں ایسی کوئی رائے قائم نہ کرے جس کی تائید میں سلف کا کوئی قول نہ ہو...... بلاشبہ یہ صورت بہت نازک ہے مگر اس سے اجماع کی خلاف ورزی لازم آتی ہے اور اس لئے یہ بہر صورت ممنوع ہے، یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ سلف کا اجماعی مسلک صرف وہ ہے جس پر بلا استثناء سب متفق ہوں، لیکن اس مسلک سے انحراف یہاں زیر بحث نہیں ہے اور جو صورت زیر بحث ہے، ہر مجتہد اس کے ارتکاب پر کسی نہ کسی وقت مجبور ہوتا ہے۔

(7) یہ امام بغوی اور شاہ ولی اللہ کی رائے ہے، اس دور کے علماء کے نزدیک تو قاضی و مفتی کے لئے مقلد جامد ہونا ضروری ہے۔

(8) امام بغوی کی تصریحات یہاں ختم ہو گئیں۔

(9) یعنی اس نے سابق علمائے مجتہدین کے اصولوں کو بعینہٖ اختیار نہ کر لیا ہو، بلکہ ان اصولوں کو جانچا اور پرکھا ہو، ان میں رد و بدل کیا ہو۔ اس کے بعد اس نے اپنے اجتہادات کے لئے کچھ اصول مرتب کئے ہوں۔

(10) واضح رہے کہ قاضی بیضاوی اس بات کے قائل ہیں کہ رائے کسی ایک مجتہد ہی کی صحیح ہوتی ہے اور انہوں نے ''المنہاج'' کی مذکورہ عبارت میں اس کے دلائل بیان کیے ہیں جبکہ شاہ ولی اللہ کا مسلک اس کے برعکس ہے چنانچہ انہوں نے قاضی صاحب کے دلائل نقل کر کے ایک ایک کر کے ان کا جواب دیا ہے۔

(11) اس ارشاد نبوی سے واضح ہوتا ہے کہ کسی کی رائے صحیح ہوتی ہے اور وہ دوہرے اجر کا مستحق ہوتا ہے۔ ایک اجر کوشش کا اور ایک صحیح مسلک کے پالینے کا اور کسی مجتہد کی رائے غلط ہوتی ہے اور اس کو بس کوشش کرنے کا اجر ملتا ہے۔

(12) اجتہادات میں اختلاف کے باوجود۔

(13) یعنی نہ تو کسی انسان کو یہ معلوم ہے کہ آئندہ کیا کیا معاملات و مسائل پیش آنے والے ہیں اور نہ اس بات کی کوئی دلیل ہے کہ ان ......میں سے ہر ہر معاملے کے لئے ایک متعین حکم الٰہی موجود ہے۔

(14) یعنی سوال کسی متعین حکم کو پالینے کا نہیں، بلکہ زیادہ موزوں حکم کو معلوم کر لینے کا ہے۔

(15) یعنی غلطی یہ نہیں ہوئی کہ متعین حکم معلوم نہ ہو سکا جو اس معاملے کے متعلق تھا۔ بلکہ غلطی یہ ہوئی کہ جو فیصلہ شایان علم اور موزوں تر تھا وہ نہ ہو سکا۔

(16) وہ حدیث جس کے راوی ایک دو ہوں، حد تواتر تک نہ پہنچے ہوں۔

(17) دلیل یہ تھی کہ مجتہد کے اجتہاد سے قبل (ان) دلائل کا وجود ہوتا ہے۔ (جو احکام کی نشاں دہی کرتے ہیں) کیونکہ اجتہاد نام ہی ہے دلائل کی تلاش و جستجو کا اور یہ دلائل جن احکام کی نشاں دہی کرتے ہیں ان کی نشان دہی سے قبل یہ احکام موجود ہوتے ہیں (پس ثابت ہوا کہ اجتہاد سے قبل ہر معاملے کے سلسلے میں ایک متعین حکم موجود ہوتا ہے اور صرف اس مجتہد کی رائے صحیح ہو سکتی ہے جو اس متعین حکم کو پالے، باقی اجتہادات غلط ہوتے ہیں)

(18) یعنی شریعت نے ہمیں یہ نہیں بتایا ہے کہ ہر معاملے کے سلسلے میں کوئی متعین حکم موجود ہے۔ اجتہاد کے ذریعہ اسے معلوم کرو، بلکہ ہمیں اس بات کا مکلف ٹھہرایا ہے کہ ہم اجتہاد کریں اور اجتہاد کے بعد جس نتیجہ تک پہنچیں اس پر عمل کریں، اس لئے ہر اجتہاد حکم الٰہی کے مطابق اور صحیح ہے۔

(19) یعنی اجتہاد نام ہے اجمال کو تفصیل کا رنگ دینے اور مجمل اصول سے فروعی تفصیلات مرتب کرنے کا۔

(20) یعنی کسی مسئلے کے سلسلے میں شریعت کے دو مختلف حکم ہو سکتے ہیں جیسا کہ گناہوں کے کفارے کا معاملہ ہے۔ کفارے میں کئی چیزوں کا ذکر ہوتا ہے جن میں سے ایک کو اختیار کرنا ہوتا ہے۔ ان چیزوں میں سے ہر ایک کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کفارے کے ذیل میں اس کا بھی ذکر کیا ہے اور یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ واجب نہیں ہے کیونکہ متعین طور پر صرف

واہی تو واجب نہیں ہے۔

(21) جواب کا ماحصل یہ ہے کہ جب غلطی کرنے والے مجتہد کو اجر کا مستحق ٹھہرایا گیا تو یہ بات آپ سے آپ ثابت ہوگئی کہ اس نے کسی معصیت کا ارتکاب کیا اور نہ حکم الٰہی سے انحراف' اس لئے اس کی رائے بھی حکم الٰہی قرار پائی اگرچہ یہ حکم کم تر درجے کا ہو اور دوسرے مجتہد کی رسائی جس حکم تک ہوئی ہے وہ اس سے افضل ہو (اور اس لئے وہ دوہرے اجر کا مستحق ہو) اور شریعت میں ایسا بہت ہوتا ہے۔ بہت سے معاملات میں اللہ کے دو مختلف حکم ہوتے ہیں۔ ایک میں عزیمت کا پہلو ہوتا ہے اور یہ حکم افضل اور زیادہ اجر کا موجب ہوتا ہے اور دوسرا حکم رخصت کی بنا پر ہوتا ہے' یہ حکم کم تر درجہ کا اور کم اجر کا موجب ہوتا ہے۔

(22) اس لئے اگر قاضی نے تحقیق و تفتیش کے بعد اصل صورت حال کو پالیا تو اس کے لئے دوہرا اجر ہے ورنہ ایک اجر۔

(23) یعنی ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ وہ حکم الٰہی کے خلاف کرنے والا نہیں ہے ورنہ اسے فاسق کہو۔

(24) یعنی اس سے یہ ثابت ہوا کہ کوئی بھی مجتہد حق کے خلاف نہیں جاتا' حق کے دائرے ہی کے اندر رہتا ہے اور یہی بات ہم بھی کہتے ہیں۔

(25) یعنی لوگوں نے ائمہ کے بعض اقوال سے اس مسلک کو مستنبط کیا اور نکالا ہے' ائمہ نے خود یہ نہیں فرمایا ہے کہ ہمارا یہ مسلک ہے۔

(26) قرآن کی سات قرأتوں میں سے کسی بھی قرأت کو اختیار کرنے کی اجازت ہے۔

(27) نماز یا دوسری عبادات کی دعاؤں کے سلسلہ میں جو مختلف الفاظ احادیث میں وارد ہیں، ان میں سے جن الفاظ کو چاہیں اختیار کر سکتے ہیں۔

(28) نبی صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی نماز تہجد کی نماز کے آخر میں پڑھتے تھے۔ بالعموم دو دو رکعت نماز پڑھتے رہتے' پھر جب ختم کرنے کا ارادہ ہوتا تو آخری دو رکعت کے ساتھ ایک رکعت کا اضافہ کر کے اسے وتر بنا لیتے۔ اس طرح وتر سمیت کبھی سات رکعتیں ہوتیں' کبھی نو اور کبھی گیارہ' امت کو بھی اس امر میں اختیار ہے۔

(29) یعنی جن امور میں شارع نے صریح طور پر کوئی حکم نہیں دیا بلکہ امت کے اجتہاد پر چھوڑ دیا ان میں شارع کا منشاء یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مختلف زاویوں کی گنجائش رکھنا چاہتا ہے۔ اس لئے ان سب راویوں کو صحیح سمجھنا چاہیے۔

(30) نص کے معنی ہیں' واضح اور صریح حکم۔

(31) یہ پہلی قسم کے اختلاف کی مثال ہوئی جس میں حق قطعی طور پر متعین ہوتا ہے اور جس کے خلاف رائے یقیناً باطل اور واجب الادا ہوتی ہے۔

(32) یہ اختلاف کی دوسری قسم کی مثال ہے کیونکہ اس صورت میں مشتبہ ہو جانے کی وجہ کا تعین ظن غالب ہی کی حد تک ہو سکتا ہے۔

(33) یہ چوتھے قسم کے اختلاف کی مثال ہے جس میں ظن غالب کی حد تک اختلاف رائے کی گنجائش ہے' اور یہی حال بیشتر اجتہادی اختلافات کا ہے۔

(34) یہ تیسرے قسم کے اختلاف کی مثال ہے جس میں مختلف راہوں میں سے کسی ایک راہ کے اختیار کرنے کی قطعی طور پر اجازت ہے۔

(در: ماہنامہ ''چراغِ راہ'' (کراچی) اسلامی قانون نمبر، جولائی واگست 1958ء)

مترجم: صدرالدین اصلاحی

اسلامی قانون کا احیاء اور اختلافی مسائل

آج جبکہ اسلامی قانون کی تدوین جدید کا مسئلہ ہمارے سامنے سب سے نمایاں ہے، مختلف حلقوں سے یہ بات اٹھائی جارہی ہے کہ فقہی اختلافات اس کام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوں گے۔ ایک طرف مغرب پرست طبقہ ہے جس کا استدلال یہ ہے کہ ان اختلافات کی موجودگی میں قوانین جدید کا کام ہوسکتا ہی نہیں ہے اور بہتر ہے کہ ہم لادینی اور وضعی قانون کو اختیار کرلیں اور دوسری طرف وہ رجعت پسند علما ہیں جو فقہی اختلافات کو ان کے صحیح پس منظر میں نہیں رکھتے اور اسے ایسی بے جا اہمیت دیتے ہیں جو مسئلہ کو سلجھانے کے بجائے الجھا دیتی ہے اور وہ اس طرح لادینیت پسند عناصر کو اسلام کا استہزا اڑانے کا موقع ملتا ہے۔ امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی نے اس قسم کے حالات کو محسوس کرکے ایک رسالہ فقہی اختلافات پر تحریر فرمایا تھا اور اس میں اختلافات کی تاریخ کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد اصل نقطہ اول کی طرف امت کو متوجہ کیا تھا، ہم اس مقالہ کے آخری حصوں کا ترجمہ پیش کررہے ہیں جو دراصل پوری بحث کا نچوڑ ہے اور ہماری آج کی صورت حال میں شمع ہدایت کی حیثیت رکھتا ہے۔ (مرتب)

اسلام وحدت کا پیام لے کر آیا تھا مگر اس وقت جہل و تعصب کے ہاتھوں میں پڑ کر وہ اختلاف و نزاع کی خدمت سرانجام دے رہا ہے۔ مذہب کے چند جزئی مسائل نے باہمی ہنگامہ آرائیوں کا جو طوفان عظیم برپا کررکھا ہے ان کی حقیقت پر جب میں نے پوری طرح غور کیا تو یہ پایا کہ ہر گروہ حق و اعتدال کے مرکز سے کچھ نہ کچھ ہٹا ہوا ہے اور بے جا تعصب اور غلو سے کام لے رہا ہے۔ ہر ایک اتباع حق کا مدعی ہے مگر سچائی کی اخلاص طلب شاہراہ پر چلنے کے بجائے جذبات کی لہروں میں بہہ رہا ہے۔ مجھے رحمت الٰہی کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ اس نے مجھے عدل کی میزان بھی بخش دی ہے جس پر حق اور باطل کو تول کر میں اندازہ کررہا ہوں کہ حق کی سیدھی اور صاف راہ کون سی ہے اور وہ اس وقت کس طرح اختلافات کی خارزار بن گئی اور ان نزاعات و اختلافات کی بنیاد کیا ہے۔

اہل زمانہ کی افسوسناک حالت کو دیکھ کر ضروری معلوم ہوا کہ ان مسائل کی اصل نوعیت انہیں سمجھادی جائے جن کے متعلق ان کے افکار الجھ کر رہ گئے ہیں اور جن کی تائید و تردید میں ان کے قلم بغیر کسی سچی بصیرت کے بے جا جوش و خروش کا

اظہار کر رہے ہیں۔

ان میں سے اہم مسئلہ تقلید کا ہے۔ ائمہ اربعہ کی تقلید کا جواز قریب قریب ساری امت کا اجتماعی مسئلہ ہے اور اس کے جو صالح ہیں انہیں ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھ سکتی ہے۔ خصوصاً اس پُر آشوب زمانہ میں جبکہ عام قوائے فکریہ پر جمود اور دون ہمتی کی موت سی طاری ہے، دلوں پر طلب حق کا کوئی جوش اور ولولہ باقی نہیں، شریعت کے قوانین انسانی آراء پر قربان کیے جا رہے ہیں اور ہر کس و ناکس خود پرستی اور خود آرائی کے نشہ میں چُور ہے۔

تقلید کے بارے میں ابن حزم کے اس قول نے آیات قرآنی اور اجماع سلف کی رو سے تقلید حرام ہے اور خود ائمہ مجتہدین ہیں نے اپنی تقلید سے منع فرمایا ہے، لوگوں کو عجیب غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ حکم عام ہے اور ہر عامی و جاہل پر اس کا اطلاق ہوتا ہے حالانکہ یہ قول بجائے خود بالکل برحق ہے۔ اپنا ایک خاص محل اور معنی رکھتا ہے اور اس کا اطلاق ایسے شخص پر ہوتا ہے:

(1) جو اپنے اندر اجتہاد کی اہلیت رکھتا ہو خواہ ایک ہی مسئلہ میں سہی۔

(2) جو اچھی طرح جانتا ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے فلاں بات کا حکم دیا ہے یا فلاں بات سے روکا ہے اور یہ حکم منسوخ نہیں ہے۔ اس بات کا علم خواہ اسے احادیث کے تتبع اور مخالف و موافق دلائل کے استقراء سے حاصل ہو یا یہ دیکھ کر کہ ارباب علم و بصیرت کا سواد اعظم اس طرف جا رہا ہے اور مخالف کے پاس قیاس آرائیوں اور منطقی دقیقہ سنجیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچ جائے کہ ایسی صورت میں حدیث نبوی کی مخالفت کا سبب یا تو کھلا ہوا حق ہو سکتا ہے یا کوئی چھپا ہوا نفاق۔

شیخ عزیز الدین عبدالسلام اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''حیرت ہوتی ہے ان تقلید پرست فقہا پر جو اپنے امام کی اجتہادی غلطی سے واقف ہونے کے بعد اس کے قول پر سختی سے جمے رہتے ہیں اور اسے ترک کر کے کسی ایسے قول کو اختیار نہیں کرتے جو اپنی صحت پر کتاب و سنت اور قیاس صحیح کے بے شمار شواہد رکھتا ہو بلکہ بعض اوقات تو یہ نادان اس اندھی تقلید کے اندھے جوش میں عملاً ظواہر کتاب و سنت کی بھی مخالفت پر تل جاتے ہیں اور اپنے امام کی اصابت رائے بلکہ ''معصومیت'' ثابت کرنے کے لئے نصوص شرعیہ کی ایسی رکیک مہم اور فاسد تاویلیں کرتے ہیں کہ ان سے بڑھ کر تحریف کلام کی مکروہ اور حیرت انگیز مثال شاید ہی مل سکے۔''

پھر ایک مقام پر لکھتے ہیں:

> ''صدر اول میں جس سے بڑھ کر مبارک اور حق شناس دور شاید قیامت تک نہ آئے، لوگوں کا حال یہ تھا کہ جس عالم دین کے پاس جاتے اس سے فتویٰ پوچھ لیا کرتے تھے بغیر اس تحقیق اور تجسس کے کہ یہ عالم کسی خیال اور مسلک کا پیرو ہے لیکن اس دور کے بعد حالات میں ایک عظیم الشان فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ چار مذاہب اور ان کے جامد مقلدین کا ظہور ہوتا ہے اور ہدایت کے اصل مرکز سے بالکل بے پرواہ ہو کر صف ائمہ کے اقوال پر اعتماد کر لیا جاتا ہے خواہ ان کا کوئی قول کتنا ہی کمزور

اور بے دلیل و حجت ہو۔ گویا مجتہد مجتہد نہ رہا۔ اللہ کا رسول بنا لیا گیا جو خود معصوم ہے اور اس کی ہر بات وحی الٰہی ہے۔ یہ راستہ حق کا راستہ نہیں ہے بلکہ سراسر جہل اور باطل کا راستہ ہے۔''

امام ابوشامہ کا فیصلہ بھی سننے کے قابل ہے۔ فرماتے ہیں:

''جو شخص فقہ سے دلچسپی رکھتا ہو اسے چاہیے کہ کسی ایک ہی امام کے مذہب پر اکتفا نہ کرے بلکہ ہر مذہب کے اقوال پر نظر ڈالے، تمام کے اندر ڈوب کر حق کا سراغ لگائے اور اس غواصی میں اسے جو قول قرآن و سنت سے زیادہ اقرب ملے ان کو اختیار کرے۔ اگر علوم اوائل کے ضروری حصوں پر اس کی نگاہ ہوگی تو انشاءاللہ یہ قوت تمیز اسے بآسانی حاصل ہو جائے گی اور کسی دقت اور ناکامی سے دوچار ہوئے بغیر وہ شریعت کی اصل شاہراہ پالے گا۔ ایسے شخص کو چاہیے کہ تعصب کے مہلک جراثیم سے اپنے دماغ کو پاک رکھے اور اختلاف و نزاع کی ان پُرخطر وادیوں میں ہرگز قدم نہ رکھے، جسے متاخرین نے تیار کر رکھا ہے کیونکہ وہاں تضیع اوقات اور انتشار طبع کے ماسوا کچھ نہیں مل سکتا۔ امام شافعیؒ نے خود اپنی اور ہر دوسرے امام کی تقلید سے منع فرمایا ہے جس کا ذکر مزنی نے اپنی کتاب میں بہت تفصیل سے کیا ہے۔''

(3) ابن حزم کا فتویٰ اس شخص پر بھی منطبق ہوتا ہے جو عام اور علم دین سے بے بہرہ ہونے کی بنا پر تقلید کرنے میں تو حق بجانب ہو مگر وہ کسی خاص امام کی تقلید اس اعتقاد کے ساتھ کرتا ہو کہ اس سے خطا کا ارتکاب غیر ممکن ہے اور اس کا امام جو کچھ کہتا ہے وہ حق ہوتا ہے۔ نیز اس اعتقاد کے ساتھ وہ اپنی جگہ یہ فیصلہ بھی کرے کہ اس خاص امام کی تقلید پر وہ ہر حال میں قائم رہے گا خواہ کسی مسئلہ میں اس کے قول کا خلاف قرآن و حدیث ہونا ثابت ہی کیوں نہ ہو جائے۔ یہی وہ یہودیت ہے جس نے بنی اسرائیل کی توحید کو بالکل شرک میں بدل دیا تھا جیسا کہ امام ترمذی نے عدی ابن حاتم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ

آنحضور ﷺ نے آیت ''اتخذوا احبارھم و رھبانھم اربابا من دون اللہ:

پڑھ کر فرمایا کہ یہود اپنے احبار و علماء اور رہبان (مشائخ) کی عبادت تو نہیں کرتے تھے مگر ان کا حال یہ تھا کہ جس چیز کو ان کے علما اور مشائخ حلال کہہ دیتے اسے وہ (بغیر کسی شرعی دلیل کے) حلال مان لیتے تھے اور جس شے کو وہ حرام قرار دیتے تھے اسے وہ حرام سمجھ لیتے تھے۔''

پس کسی امام کی تقلید اس اعتقاد کے ساتھ کرنا کہ اس کی زبان عین و شریعت کی زبان ہے، یقیناً اس کی پرستش ہے۔

(4) جو شخص اس بات کو جائز نہیں سمجھتا کہ ایک حنفی کسی شافعی فقیہ یا شافعی کسی حنفی فقیہ سے فتویٰ پوچھے یا اس کے پیچھے نماز پڑھے وہ بھی ابن حزم کے فتوے کی زد میں آجاتا ہے اس لئے کہ یہ اجماع سلف اور صحابہؓ کو تابعین کرام کے عمل کی کھلی ہوئی مخالفت ہے جو کسی حال میں بھی جائز نہیں ہو سکتی۔

یہ ہے ابن حزم کے قول کا منشا۔ ان قیود اور شرائط کو ملحوظ رکھ کر اس کا اطلاق کیا جائے گا اور جہاں صورتحال یہ نہ ہو

وہاں تک اس کا دائرہ وسیع ہوسکتا ہے۔ مثلاً ایک شخص اقوال رسول کو دین سمجھتا ہے۔ صرف اس چیز کی کا اعتقاد رکھتا ہے، جسے اللہ اور اس کے رسولؐ نے حلال کیا ہو اور صرف اسے شئے کو حرام سمجھتا ہے جسے اللہ اور رسول نے حرام قرار دیا ہو یعنی تحریم و تحلیل کا حق وہ ایک لمحہ کے لئے بھی کسی اور کو نہیں دیتا لیکن اس ایمان اور اعتقاد کے باوجود چونکہ وہ اقوال رسولؐ پر وسیع نظر نہیں رکھتا نہ متعارض نصوص کو تطبیق دینے کی قدرت رکھتا ہے اور نصوص شرعیہ سے احکام کو استنباط کرسکتا ہے اس لئے اگر وہ ایک ایسے ثقہ اور صحیح النظر عالم دین کا اتباع کرتا ہے جو اس کے نزدیک سنت رسولؐ کے مطابق فتویٰ دینے والا ہے اور یہ اتباع بھی وہ اس نظریے کے ساتھ کرتا ہے کہ جب کبھی کوئی نص شرعی اس کے خلاف ملے گی تو بغیر کسی تعصب اور اصرار کے وہ اس قول کو ترک کردے گا تو پھر نہیں معلوم کہ کوئی شخص کیونکر ایسی تقلید یا اتباع کو ناجائز کہہ سکتا ہے جبکہ عہد نبوی سے لے کر اب تک تمام مسلمانوں میں افتاء اور استفتاء کی یہی سنت متواتر چلی آرہی ہے۔ اب خواہ کوئی انسان کسی ایک ہی فقیہ سے ہمیشہ فتویٰ پوچھا کرتا ہو یا کبھی ایک فقیہ سے اور کبھی دوسرے سے دونوں فعل جائز ہیں بشرطیکہ مستفتی فقیہ اور رسولؐ کے فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھے۔

پس ہماری تقلید پر کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے جبکہ ہم کسی امام کے متعلق یہ ایمان نہیں رکھتے کہ وہ معصوم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر علم فقہ کی وحی نازل فرمائی ہے اور اس کی اطاعت ہم پر فرض کردی ہے۔ ہم تو اگر کسی امام کا اتباع کرتے ہیں تو یہ جان کر کرتے ہیں کہ وہ کتاب و سنت کا عالم اور روح شریعت کا مزاج شناس ہے اس لئے اس کا قول یا تو آیات و احادیث کے صریح دلائل پر مبنی یا ان سے ماخوذ اور مستنبط ہے یا پھر قرآن سے اس نے یہ بات تحقیق کرلی ہے کہ یہ حکم فلاں علت کی بنا پر ہے اور جب اسے اپنی فہم کی صحت پر پورا اطمینان ہوگیا ہے تب ہی اس نے غیر منصوص کو منصوص پر قیاس کر کے فتویٰ دیا ہے گویا وہ دراصل زبان حال سے اس حقیقت کا اعلان کررہا ہے کہ میرے خیال میں شارع علیہ السلام نے ایسا فرمایا ہے کہ جہاں کہیں یہ علت پائی جائے گی وہاں یہی حکم جاری ہوگا اور ایسے تمام قیاس احکام اس عموم میں داخل ہوں گے یا بالفاظ دیگر یہ اقوال بھی شارع علیہ السلام کی طرف منسوب شمار کئے جائیں گے۔ اگرچہ یہ قطعیت یقینی اور شکوک سے بالکل پاک نہیں کہی جاسکتی۔

اگر یہ بات نہ ہوتی کوئی مسلم کسی مجتہد کی تقلید نہ کرتا۔ پس اگر رسول معصوم .... کہ صرف آپؐ ہی کی اطاعت اللہ نے ہم پر فرض کی ہے۔....... سے ہمیں کوئی ایسی صحیح روایت مل جائے جو قول امام کی مخالفت کرتی ہو اور پھر بھی ہم اس کو درخور اعتنا نہ سمجھتے ہوئے نص قطعی کو چھوڑ کر ظن انسانی کی تقلید پر جمے رہیں تو ہم سے بڑھ کر شقی اور نامراد کون ہوگا اور کل خدائے قہار کے سامنے ہم کیا جواب دیں گے۔

جائز تقلید کی صحیح تصویر یہی ہے کہ جو ان چند لفظوں میں کھینچی گئی ہے۔ اگر امت مسلمہ غلو سے اپنے قوائے فکر کو آزاد کرلے اور اپنی آنکھوں پر سے تعصب کے پردے ہٹا کر اصلی تصویر دیکھنے لگے تو بہت سی لفظی نزاعین ختم ہوجائیں گے اور مذہبی اختلافات کی شورانگیز فضا کسی قدر امن و سکون کی خوشگواریوں میں بدل جائے۔

مسئلہ تقلید کے بعد دوسرا اہم مسئلہ استخراج مسائل کا ہے جس کے دو اصول ہیں:

ایک تو یہ کہ الفاظ حدیث کا تتبع کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ فقہا کے اصول کو سامنے رکھ کر مسائل کا استنباط کیا جائے۔

شرعاً ان دونوں اصولوں کی اہمیت مسلم ہے۔ ہر دور کے فقہائے محققین کا طریقہ یہی رہا ہے کہ وہ ان دونوں اصولوں کا لحاظ رکھتے تھے۔ کوئی ایک کی رعایت زیادہ کرتا کوئی دوسرے کی لیکن ایسا کبھی نہ کرتے کہ کسی اصول یا کلیہ کو بالکلیہ ترک کر دیں پس کسی جویائے حق کے لئے سزاوار نہیں ہے کہ وہ بالکل ایک ہی طرف جھک جائے جیسا کہ آج دونوں فریق کا عام شیوہ ہے اور یقین کرو کہ ان کا یہی شیوہ ان کی ساری ضلالتوں کا ذمہ دار ہے۔ ان دونوں اصلوں کو الگ الگ کر کے ہدایت کی سیدھی راہ پانا بہت مشکل ہے۔ حق کا راستہ یہ ہے کہ ان میں تفریق کرنے کے بجائے دونوں میں مطابقت پیدا کی جائے اور ایک سے دوسرے کی عمارت ڈھانے کے بجائے اس کے کمزور مقامات کی اصلاح اور تشئید کا کام لیا جائے۔ اس طرح احکام دین کا جو قصر تعمیر ہوگا نہایت مستحکم اور حق کی ٹھوس بنیادوں پر قائم ہوگا اور اس میں باطل کے راہ پانے کی کوشش قریب قریب بیکار ثابت ہوگی۔ اس محتاط اور حکیمانہ نکتہ کی طرف امام حسن بصری ہماری رہنمائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

سنتکم واللہ الذی لا الہ الا ھو بینھما بین الغالی والجانی

اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ تمہارا راستہ حد سے بڑھنے والے اور حد تک (بوجہ سہل انگاری کے) نہ پہنچنے والے دونوں کے بیچ میں ہے۔

یعنی حق کا مرکز افراط و تفریط کے بیچ میں ہے۔ جو اہل حدیث ہیں انہیں چاہئے کہ اپنے اختیار کردہ مسلک کو مجتہدین سلف کی رایوں پر پیش کر لیا کریں، اسی طرح جو اہل تخریج ہیں اور مجتہدین کے اصول پر مسائل کا استنباط کیا کرتے ہیں انہیں بھی چاہئے کہ حتی الوسع صحیح اور صریح نصوص کو اپنے اصول اور رائے پر قربان نہ کریں اور نہ ایسا طریقہ اختیار کریں کہ فرمودہ نبوی کی صریح مخالفت کا انہیں بار اٹھانا پڑے۔

کسی محدث کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ ان اصول حدیث کے اتباع میں بے جا تعمق اور توغل سے کام لے جنہیں پرانے محدثین نے وضع کیا ہے کیونکہ بہر حال وہ بھی انسان ہی تھے، فکر و نظر کی لغزشوں سے ان کے بنائے ہوئے قواعد محفوظ نہیں کہے جا سکتے اور نہ شارع کی طرف سے ان کی صحت اور قطعیت پر کوئی سند پیش کی جا سکتی ہے۔ اس اصول پرستی کے تشدد آمیز رویہ سے بسا اوقات حدیث اور قیاس صحیح دونوں کو رد کر دینا پڑتا ہے۔ مثلاً انقطاع یا ارسال کے ایک ذرا سے شک کی بنا پر کتنی ہی حدیثیں متروک اور نا قابل استناد ٹھہرا دی جاتی ہیں حالانکہ فی نفسہ وہ قول رسول ہوا کرتی ہیں۔ چنانچہ ابن حزم نے اس طریقہ کی پیروی کرتے ہوئے تحریم معازف (باجوں کو حرام قرار دینے) والی حدیث کو نا قابل حجت قرار دیدیا۔ صرف اس وجہ سے کہ امام بخاریؒ کی روایت میں انقطاع کا شبہ پایا جاتا ہے حالانکہ حدیث فی نفسہ صحیح اور اس کا سلسلہ اسناد متصل ہے۔ ہاں اگر کوئی قوی نص سے تعارض ہو تو البتہ انقطاع کے شبہ کی بنا پر اسے مرجوع قرار دیا جا سکتا ہے لیکن حدیث کو سرے سے متروک ٹھہرا دینا یقیناً زیادتی ہے۔

اس طرح ارباب حدیث کا ایک اصول یہ ہے کہ اگر ایک شخص کسی محدث کی روایتوں کو عموماً زیادہ صحت کے ساتھ رکھتا ہے اور دوسرا ظاہری صحت کی حفاظت سے اتنا اعتنا نہیں کرتا تو کلیتاً پہلے شخص کی ہر روایت جو اس محدث سے کی گئی ہیں۔؟ راوی کی روایت پر مقدم اور مرجع مانی جائے گی خواہ اس دوسرے راوی کے اندر ترجیح اور برتری کے کتنے ہی واضح عوامل کیوں نہ موجود ہوں۔ لوگوں کی یہ ظاہر پرستی سخت تنقید کے قابل ہے۔ کون نہیں جانتا کہ عام رواۃ، حدیثوں کو بامعنی

بیان کیا کرتے تھے۔ الفاظ وحروف کے محفوظ رکھنے کا چنداں رواج نہ تھا۔ پس ادبی تصانیف میں جس طرح اہل ادب و بلاغت ایک ایک حرف کے تقدم و تاخر اور اس کی وضع و ترتیب سے نکتہ آفرینیاں کیا کرتے ہیں، ویسا ہی تعمق متن حدیث میں برتنا حتیٰ کہ ایک کلمہ کی تقدیم یا تاخیر الفاظ کی نشست اور فاء اور واو جیسے حروف کے دقیق معنوی خصائص سے استدلال کا رخ متعین کرنا جبکہ عام روایتیں بالمعنی بیان کی گئی ہیں، ایک طرح کی لغویت اور الفاظ کی ناروا غلامی ہے۔ ورنہ تم دیکھتے ہو کہ ایک ہی روایت میں ایک راوی ایک لفظ استعمال کرتا ہے اور بعینہٖ اس روایت میں اس سند کے ساتھ دوسرا راوی ایک دوسرے ہی لفظ کے ذریعہ حدیث کا مفہوم ادا کرتا ہے۔

متن احادیث کے بارے میں صحیح مسلک یہی ہونا چاہیے کہ راوی جو کچھ بھی اپنی زبان سے کہے اسے کلام نبوی کی حیثیت سے مان لیا جائے ہاں اگر کوئی اور قوی حدیث یا شرعی دلیل اس کے خلاف مل جائے تو مقدم الذکر کو ترک کر کے اسے اختیار کرنا ضروری ہے۔

ایسی ہی ذمہ داری اور احتیاط ان فقہا پر بھی عائد ہوتی ہے جو ائمہ مجتہدین کے اصول اور فتاویٰ کو سامنے رکھ کر مسائل کا استخراج کرتے ہیں۔ ان کے لئے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ دنیا جہاں کے سارے مسائل کا حل انہیں اصولوں میں تلاش کیا کریں اور ان میں سے کرید کرید کر ایسے اقوال نکالیں جن سے نہ تو خود ان کے ائمہ کے اصول اور ان کی تصریحات سے کوئی دور کا تعلق ہو، نہ علما لغت ان سے یہ معانی سمجھ سکیں اور عرف عام میں ایسا طریقہ سخن فہمی رائج ہو بلکہ محض اپنے ذہن سے ایک علت متعین کر لی جائے یا ایک ادنیٰ مشابہت تلاش کر لی جائے اور اسے قول مجتہد مان کر صدہا مسائل میں اس خود آفریدہ علت یا مشابہت کو معیار حکم ٹھہرا لیا جائے۔ ستم پر ستم یہ کہ ان تمام تدقیقات کو نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ امام کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے حالانکہ اگر وہ امام جس کے قول سے یہ تصریحات کی گئی ہیں، آج زندہ ہو کر آ جائے اور یہ مسائل براہ راست اس سے پوچھے جائیں تو باوجود اپنی تمام فہم و بصیرت اور مجتہدانہ ژرف نگاہی کے ان بلند دقائق تک اس کا تخیل پرواز نہ کر سکے گا جنہیں اس کے پیچھے چلنے والوں نے اس کے اقوال سے مستنبط کر رکھا ہے۔

تخریج کا طریقہ نہایت غیر ذمہ دارانہ ہے۔ تخریج تو محض اس وجہ سے جائز ہے کہ وہ درحقیقت مجتہد کی تقلید اور پیروی ہے نہ کہ اس کی غلط ترجمانی اور اس کے اشارات پر جا بجا حاشیہ آرائی اور وہیں تک اس کا تحقق ہو سکتا ہے کہ جہاں تک امام کے اقوال عام اصول فہم و تدبیر کے مطابق اجازت دے سکیں ورنہ اگر قائل کے کلام کا رخ کسی طرف ہو اور اس کا ترجمان و مفسر کوئی اور رخ متعین کرے تو یہ تفسیر اور ترجمانی یا مقلدانہ تخریج نہ ہو گی بلکہ کوئی اور ہی چیز ہو گی۔

اس کے علاوہ ایسے فقہا کو اس بات کا خیال رکھنا بھی بہت ضروری ہے کہ وہ اپنے اصول کی پیروی کے جوش میں ایسی مستند احادیث یا آثار کو نہ رد کر دیا کریں جنہیں عام امت میں مقبولیت حاصل ہو چکی ہو۔ مثال کے طور پر حدیث مصراۃ کو لو۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ

> "جو شخص ایسی بکری خریدتا ہے جس کا دودھ تھن میں پہلے سے روک لیا گیا تھا تا کہ خریدار دھوکہ میں آ کر زیادہ دام لگائے تو اسے تین روز تک اختیار رہتا ہے خواہ بکری رکھ لے یا ایک صاع گندم کے ساتھ واپس کر دے۔"

یہ حدیث متعدد طریق سے ثابت ہے اور ثقات نے اس کی روایت کی ہے لیکن احناف نے چونکہ یہ اصول وضع کر رکھا ہے کہ اگر راوی غیر فقیہ ہو اور اس کی روایت عام اصول کے مخالف اور کوئی عام قاعدہ نہ بنا سکتی ہو تو سرے سے وہ حدیث متروک العمل ہو گی اس لئے باوجود صحیح اور مستند ہونے کے یہ حدیث ان کے نزدیک متروک العمل ہے کیونکہ وہ کوئی عام قانون نہیں بن سکتی اور راوی غیر فقیہ ہے۔

یہ طریقہ ارباب حق کا طریقہ نہ ہونا چاہیے۔ اس میں شریعت پر ایک طرح کی جسارت پائی جاتی ہے۔ فرمان رسالت کا احترام بہر حال انسانوں کے بنائے ہوئے اصول و قواعد کی رعایت سے بالاتر ہے۔ امام شافعیؒ نے اس غلط روی سے بچانے کے لئے فرمایا ہے:

> ''جب میں کسی مسئلہ میں کوئی رائے دوں یا کوئی اصول مقرر کروں پھر رسول اللہ ﷺ کا کوئی فرمان اس کے خلاف مل جائے تو میری رائے کالعدم سمجھو۔ رسول اللہ کا فرمانا ہی اصل اصول ہے بقیہ سب ہیچ۔''
>
> اب ہم موجودہ مسائل میں سے تیسرے مسئلہ پر جو قرآن و سنت کے تتبع سے متعلق ہے بحث کرنی چاہتے ہیں۔

احکام شرعیہ کی معرفت حاصل کرنے کے لئے کتاب و سنت کا جو تتبع کیا جاتا ہے اس کے مختلف مدارج ہیں۔ سب سے اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ انسان کو بالفعل احکام شرعیہ کی معرفت پر اتنا عبور ہو جائے کہ وہ مستفتیوں کے اکثر سوالوں کا جواب بآسانی دے سکے اور انسانی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کا شرعی حل معلوم کرنے میں اسے توقف اور خاموشی سے بہت کم کام لینا پڑے۔ یہی مقام اجتہاد ہے۔ اس استعداد اور قابلیت کے حصول کے چند طریقے ہیں:

(1) کبھی یہ استعداد احادیث میں غائر تفکر اور شاذ و غریب روایتوں کے تتبع سے حاصل ہوتی ہے جیسا کہ امام احمد بن حنبلؒ کا خیال ہے لیکن یہ نہ سمجھ لینا کہ اس ملکہ کے حاصل کرنے کے لئے بس یہ تفکر اور تتبع کافی ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انسان کے لئے ضروری ہے کہ ایک ماہر لغت و ادب کی طرح مواقع کلام اور اسالیب بیان سے پوری واقفیت رکھتا ہو اور ایک وسیع النظر عالم کی طرح یہ بھی جانتا ہو کہ ائمہ سلف متعارض نصوص میں جمع و تطبیق کی صورت کس طرح پیدا کرتے تھے اور ان کے استدلال کا طریقہ کیا ہوا کرتا تھا۔

(2) کبھی یہ قابلیت اصول تخریج کو پوری طرح ضبط کرنے سے حاصل ہوتی ہے لیکن اس کے لئے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ انسان کسی امام کے اصول کو سامنے رکھ کر استنباط مسائل کا طریقہ جان جائے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ احادیث اور آثار کے ایک معتدبہ حصہ پر اس کی نظر ہو تا کہ اسے معلوم ہو سکے کہ کہیں اس کا قول اجماع سے ٹکرا تو نہیں رہا ہے۔ یہ طریقہ اہل تخریج کا ہے۔

(3) تیسرا راستہ جو مذکورہ بالا دونوں راستوں کی نسبت اعتدال کا راستہ کہا جاتا ہے، یہ ہے کہ ایک طرف آدمی قرآن و سنت سے اتنی آگاہی رکھتا ہو کہ فقہ کے اصول اور اجمالی مسائل اور ان کے تفصیلی دلائل کا علم اسے بآسانی حاصل ہو سکے۔ دوسری طرف بعض اجتہادی مسائل پر کامل دسترس رکھتا ہو اور ان کے تمام گوشوں پر اس کی نگاہ ہو۔ ایک قول کو

دوسرے قول پر ترجیح دے سکتا ہو۔ لوگوں کے طریقہ تخریج پر نقد اور کھرے کھوٹے کی تمیز کر سکتا ہو۔ خواہ اس کے اندر وسعت نظر اور تبحر کے وہ شرائط اور لوازم نہ پائے جائیں جو ایک مجتہد مطلق کے لئے ضروری ہوا کرتے ہیں۔ اس مقام پر پہنچ کر اس کے لئے جائز ہے کہ مختلف رایوں کو تنقیدی نگاہ سے دیکھے اور دو مختلف مذہبوں کے دلائل سے واقف ہو کر کچھ باتیں ایک مذہب اور کچھ دوسرے مذہب کی لے لے۔ (یعنی تلفیق کرے) اور بعض ایسی تخریجات کو ترک کر دے جو اگرچہ متقدمین کے نزدیک قابل قبول رہی ہوں لیکن وہ اپنی تنقید اور تحقیق کی روشنی میں انہیں غلط پائے۔ اس وجہ سے تم دیکھتے ہو کہ جن علما کو مجتہد مطلق ہونے کا دعویٰ نہ تھا وہ اپنی فقہی تصانیف میں خود مسائل کی تخریج کرتے ہیں اور اکابر سلف کی آرا میں موازنہ کر کے ایک رائے کو دوسری پر ترجیح دیتے ہیں۔ جب اجتہاد اور تخریج دونوں قابل تجزیہ و تقسیم ہیں اور کسی جزئی مسئلہ میں اجتہاد کرنے کے لئے آدمی کا مجتہد مطلق ہونا شرط لازم نہیں ہے تو پھر مسائل کی تحقیق میں اس طریقہ کا اختیار کرنا لوگوں کی نگاہ میں کیوں مستبعد اور نا قابل قبول دکھائی دیتا ہے۔ تحقیق کا مقصود تو محض ظن غالب کے حصول تک ہے اور اس پر تکلیف کا دارومدار ہے۔

رہ گئے وہ لوگ جو اتنی گہری نظر نہیں رکھتے اور جنہیں اللہ نے اتنی فہم و بصیرت عطا نہیں کی ہے کہ قرآن وسنت پر غور کر کے بطور خود مسائل کی چھان بین کر سکیں۔ انہیں چاہیے کہ اپنی زندگی کے عام معاملات میں مذہب مروجہ کے ان طریقوں اور فیصلوں کو اپنا مذہب سمجھیں جنہیں انہوں نے اپنے آباؤ اجداد کے سلسلے سے اخذ کیا ہے لیکن جو واقعات معمولی نہ ہوں بلکہ اہم اور نادر الوجود ہوں ان میں اپنے کسی قریب کے مفتی کا اتباع کریں اور قضایا میں قاضی کے حکم کی تعمیل کریں۔ بس یہی ان کے لئے سب سے مصئون راہ ہے۔

اس خیال پر ہم نے ہر مذہب کے قدیم اور جدید علما محققین کو پایا ہے اور تمام ائمہ مذاہب نے اپنے پیرووٗں کو اس کی وصیت بھی کی ہے۔ ''الیواقیت والجواہر'' میں لکھا ہے:

''ابو حنیفہ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص میری دلیل سے واقف نہ ہو اسے میرے قول پر فتویٰ دینے کا کوئی حق نہیں۔ خود امام موصوف جب کوئی فتویٰ دیا کرتے تو کہتے یہ نعمان ابن ثابت کی (یعنی میری) رائے ہے جسے ہم نے اپنے علم وفہم میں بہتر سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ اگر کوئی اس سے بہتر اور احسن رائے پیش کرے تو پھر ہماری رائے کے مقابلہ میں اس کی رائے صائب اور حق سے زیادہ قریب ہوگی۔''

امام مالک فرمایا کرتے تھے کہ ہر شخص کے اقوال دو قسم کے ہوتے ہیں۔ کچھ لے لینے کے قابل اور کچھ رد کر دینے کے قابل۔ صرف ایک ذات اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے اور وہ رسول اللہ کی ذات معصوم ہے۔''

حاکم اور بیہقی نے امام شافعی سے روایت کی ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے جب کوئی حدیث پایۂ صحت کو پہنچ جائے تو اس کو میرا مذہب سمجھو۔ ایک دوسری روایت میں امام صاحب کا قول منقول ہے۔ جب تم یہ دیکھو کہ میرا قول حدیث نبوی کی مخالفت کر رہا ہے تو احادیث پر عمل کرو اور میرا قول دیوار پر دے مارو۔ ایک روز امام مزنی سے آپ نے فرمایا کہ ابراہیم میری ہر بات کی کورانہ تقلید نہ کر بلکہ بذات خود اس میں غور کر لیا کرو کیونکہ یہ دین کا معاملہ ہے۔

امام احمد ابن حنبل کا قول ہے کہ اللہ اور رسول کے مقابلہ میں کسی کی رائے کو کوئی وقعت حاصل نہیں۔ تم نہ میری تقلید کرو اور نہ کسی امام کی۔ جس طرح انہوں نے کتاب وسنت سے احکام دین کی معرفت حاصل کی تم بھی حاصل کرو۔ کسی شخص کو فتویٰ دینے کا استحقاق نہیں تاوقتیکہ تمام ائمہ کے مذاہب اور اقوال سے پوری طرح واقف نہ ہو۔ اگر اس سے کوئی ایسا مسئلہ پوچھا گیا جس کے متعلق اسے معلوم ہے کہ ان میں وہ تمام ائمہ جن کی عموماً پیروی کی جاتی ہے متفق ہیں تو وہ یوں کہہ سکتا ہے کہ یہ جائز ہے اور وہ ناجائز ہے کیونکہ ایسی صورت میں اس کا اپنا قول اور فتویٰ نہ ہوگا بلکہ آئمہ مجتہدین کے قول کی ترجمانی ہوگی لیکن اگر مسئلہ ایسا ہے جس میں علماء کی رائیں مختلف ہیں تو وہ اس کے جواب میں یہ تو کہہ سکتا ہے کہ فلاں امام کے نزدیک یہ جائز ہے اور فلاں کے نزدیک ناجائز مگر اسے یہ حق نہیں ہے کہ بقیہ اقوال کو چھوڑ کر کسی ایک رائے کو اختیار کر کے فتویٰ دے دے الا آنکہ اس رائے اور مذہب کے دلائل سے بخوبی باخبر ہو۔

''امام ابو یوسف اور زفر وغیرہ علما سے منقول ہے کہ جب تک کوئی شخص یہ معلوم نہ کر لے کہ ہم نے یہ رائے کہاں سے اخذ کی ہے اس وقت تک وہ ہمارے اقوال پر فتویٰ دینے کا مجاز نہیں۔''

''عصام ابن یوسف سے جب کہا گیا کہ آپ امام ابوحنیفہ کی رایوں سے اکثر اختلاف کرتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ اس کی وجہ کھلی ہوئی ہے۔ انہیں جو فہم اور دقت نظر حاصل تھی ہمیں حاصل نہیں۔ وہ ڈوب کر جن گہرائیوں سے حقائق نکال لاتے ہیں وہاں تک ہماری کمزور نگاہوں کی رسائی نہیں ہو سکتی اور ہمارے لئے جائز نہیں کہ بغیر سمجھے بوجھے ان کے اقوال پر فتویٰ دیں۔''

''ابوبکر الاسکاف البلخی سے پوچھا گیا کہ کیا ایسے شخص کے لئے جو اپنے شہر کا سب سے بڑا عالم ہو جائز ہے کہ فتویٰ دینے سے رکا رہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ اگر وہ عالم درجہ اجتہاد رکھتا ہو تو جائز نہیں۔ لوگوں نے کہا کہ درجہ اجتہاد کب حاصل ہوتا ہے۔ جواب دیا کہ جب ایک شخص مسائل کے تمام پہلوؤں پر نگاہ رکھتا ہو اور معترضین کو معقول اور تسلی بخش دلیلوں سے خاموش کر سکے تو وہ مجتہد ہے۔''

ابن الصلاح کا قول ہے کہ اگر کوئی شافعی ایسی حدیث پائے جو اس کے مذہب کے خلاف ہو تو اسے اپنے علم اور تفقہ کا جائزہ لینا چاہئے۔ اگر وہ اپنے اندر اجتہاد مطلق کی یا خاص اسی ایک مسئلہ میں اجتہاد کرنے کی پوری استعداد پائے تو وہ اس کے لئے ضروری ہے کہ غور کرنے کے بعد اس حدیث پر عمل کرے اور تقلید کا خیال ترک کر دے لیکن اگر وہ اپنے کو اس مقام سے فروتر محسوس کر رہا ہے اور اجتہاد کی طاقت سے بے بہرہ ہے مگر غور وفکر کرنے کے بعد کوئی معقول دلیل نہ پانے کی وجہ سے حدیث کی مخالفت بھی اس پر شاق گزر رہی ہو تو بھی حدیث ہی کا اتباع کرنا چاہئے بشرطیکہ امام شافعیؒ کے اتباع کا قائم مقام ہو جائے گا۔ یہ ابن الصلاح کی رائے ہے اور امام نووی نے بھی اس کو مستحسن اور مختار قرار دیا ہے۔

چوتھا مسئلہ جسے ہماری جاہلانہ اور متعصبانہ ذہنیتوں نے اختلاف اور شقاق کی رزمگاہ بنالیا ہے، وہ فقہا کا باہمی اختلاف ہے حالانکہ ان اختلافات میں سے اکثر خصوصاً جن میں صحابہ بھی مختلف تھے اور دونوں طرح کی رائیں ان سے منقول ہیں مثلاً تشریق اور عیدین کی تکبیروں کا اختلاف' نکاح محرم (حج کے لئے احرام باندھ لینے والے کے جواز کا اختلاف، ابن عباس کے تشہد اور ان کے تشہد کا اختلاف، بسم اللہ اور آمین کو آہستہ یا بلند آواز سے کہنے کا اختلاف وغیرہ) فی

نفسہٖ آپس میں نہ کوئی اساسی تبائین رکھتے ہیں اور نہ ان کی اصل مشروطیت میں ائمہ سلف کا کوئی اختلاف ہے بلکہ اختلاف جو کچھ ہے وہ محض ایک دوسرے پر ترجیح دینے میں ہیں۔ یہ بھی مانتے ہیں کہ یہ تمام مذاہب کتاب وسنت سے مستنبط ہیں لیکن چونکہ ہر شخص کی نظر تحقیق اور قوت اجتہاد جداگانہ ہوا کرتی ہے اس وجہ سے جو مذہب دوسرے کے نزدیک مرجوع تھا اس کے نزدیک راجع اور اولیٰ ثابت ہوا اور اس نے اسے اختیار کرلیا۔ مثال کے طور پر قرآن کو لو اور دیکھو کہ قراء ایک ہی لفظ اور آیت کی قرأت میں کس قدر مختلف ہیں۔ یہی حال علما فقہ کے اختلاف کا ہے چنانچہ اکثر اپنے اختلاف کی تعلیل بھی یہی کرتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کی یہ رائے بھی تھی اور وہ بھی یعنی وہ بھی آپس میں اختلاف رائے رکھتے تھے حالانکہ وہ سب کے سب ہدایت کی روشن شاہراہ پر تھے۔ کون ہے جو ان کے کسی فرد پر کجروی اور سنت نبوی کی مخالفت کا الزام عائد کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء حق مسائل اجتہاد پر تمام ارباب افتاء کے فتووں کو جائز سمجھتے اور قضاۃ کے فیصلوں کو تسلیم کرتے آئے ہیں اور بسا اوقات اپنے مذہب کے خلاف بھی عمل کرتے رہے ہیں چنانچہ تم اس وقت کے اختلافی مسائل کے بارہ میں تمام ائمہ مذہب کو دیکھو گے کہ وہ مسئلہ کو پھیلا کر بیان کرنے اور تمام اخلاقی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے بعد یہ بھی فرمادیتے ہیں کہ ''یہ میرے خیال میں احوط طریقہ ہے۔'' ''یہ رائے مختار ہے'' ''یہ میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے'' اور کبھی یوں کہتے ہیں کہ ''ہم تک صرف یہی حکم پہنچا ہے۔'' اس کے شواہد ''المبسوط'' آثار محمدؒ اور اقوال شافعی میں بے شمار موجود ہیں۔ یہ وہ مبارک دور تھا جب دین کا چشمہ صاف شفاف و نزاع کے مہلک جراثیم سے قریب قریب پاک تھا اور اجتہادی اختلافات جامہ ملت کے لئے مقراض کا کام نہیں دے رہے تھے لیکن اس کے بعد تعصب کا طوفانی سیلاب آیا۔ نگاہوں کی وسعت کم ہونے لگی۔ لوگوں نے بقیہ اختلافی پہلوؤں سے صرف نظر کر کے ایک پہلو کو لے لیا۔ اب اختلافات کی نوعیت پہلی سی نہ رہی۔ انہیں بے حد ہمت دے دی گئی۔ ان کی آڑ میں فرقہ پرستی وجود میں آگئی۔ لوگوں کا ذوق تحقیق جمود سے بدل گیا اور وہ اپنے ائمہ کے اختیار کردہ مسلک پر سختی سے جم گئے۔

اور یہ جو بعض علماء سلف سے اپنے ائمہ کے مذاہب پر ہمیشہ قائم رہنے کی تاکید منقول ہے سو یہ یا تو ایک رجحان فطری کی بناء پر ہے کیونکہ ہر انسان اپنے پیشواؤں اور بزرگوں کی مختار اور پسندیدہ چیزوں کو بڑی قدر اور محبت کی نگاہ سے دیکھتا ہے یہاں تک ہم رسوم ورواج کے اندر بھی اس رجحان فطری کا مشاہدہ کرسکتے ہیں۔ پھر اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے مذاہب کے دلائل کی عظمت اور قوت سے مرعوب تھے اور ان کے خیال میں یہ دلائل بہت ہی مضبوط اور ناقابل تردید تھے۔ یہ اور اس قسم کی اور وجہیں ہوسکتی ہیں لیکن بعض لوگوں کا یہ خیال کہ تعصب کی سرشاری میں انہوں نے یہ کلمات کہے، محض وہم بلکہ سراسر بہتان ہے۔

اب ذرا ان اختلافات کی اصلیت پر غور کرو جن پر فرقہ بندیوں کا محاذ جنگ قائم ہو رہا ہے اور دیکھو کہ صحابہؓ تابعین اور ان کے بعد کے ائمہ سلف نے ہمارے لئے کونسا اسوہ چھوڑا ہے' ان تمام کا حال یہ تھا کہ ان میں سے بعض لوگ بسم اللہ پڑھتے تھے۔ اگر ان میں ایک جماعت ایسی تھی جو قے کرنے اور پچھنے لگوانے کے بعد تجدید وضو کو ضروری خیال کرتی تھی تو ایک جماعت ایسی بھی تھی جو اس کی مطلقاً ضرورت نہ سمجھتی۔ یہ اور اسی قسم کے بیسیوں اختلافات موجود تھے۔ اس کے باوجود سب ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے کسی نے کسی کی اقتداء سے کبھی انکار نہیں کیا۔ امام ابوحنیفہؒ اور ان

کے تلامذہ اور امام شافعی وغیرہ کے مدینہ والوں کے پیچھے نمازیں پڑھا کرتے تھے حالانکہ اہل مدینہ سرے سے بسم اللہ پڑھتے ہی نہ تھے، نہ آہستہ اور نہ زور سے۔ امام مدینہ یوسف نے ہارون الرشید کے پیچھے نماز پڑھی حالانکہ اس نے حجامت (پچھوانے لگوانے) کے بعد وضو کی تجدید نہیں کی تھی۔ امام ابو یوسف کے مذہب میں پچھنوں کے بعد تجدید وضو لازم آتا ہے مگر امام مالک کے مذہب میں لازم نہیں۔ اس طرح امام محمد بن حنبل اور نکسیر کو ناقص وضو مانتے ہیں لیکن جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھیں گے جس نے بدن سے خون نکلنے کے بعد وضو نہ کیا ہو تو آپ نے جواب دیا یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ امام مالکؒ اور سعید بن المسیب جس کے پیچھے میں نماز نہ پڑھوں؟ (جن کے نزدیک یہ چیزیں نواقض وضو میں سے نہیں ہیں)۔

روایت میں ہے کہ امام ابو یوسف اور امام محمد عیدین میں خلیفہ ہارون الرشید کی رعایت سے حضرت ابن عباس کے مذہب کے مطابق تکبیریں کہا کرتے تھے حالانکہ ان دونوں اماموں کا مذہب اس کے خلاف تھا۔

امام شافعی نے مقبرہ امام ابو حنیفہؒ کے قریب فجر کی نماز پڑھی تو محض ان کے لحاظ و ادب سے دعائے قنوت کو ترک کر دیا اور فرمایا کہ بسا اوقات ہم اہل عراق کے مسلک پر بھی عمل کر لیتے ہیں۔

امام ثانی (امام ابو یوسف) کے متعلق ''البزازیہ'' میں ہے کہ آپ نے جمعہ کے روز حمام میں غسل کیا اور لوگوں کو نماز پڑھائی۔ نماز پڑھ کر جب لوگ اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے تو آپ کو اطلاع دی کہ حمام کے کنوئیں میں ایک مرا ہوا چوہا موجود ہے۔ امام موصوف نے یہ سن کر فرمایا کہ ''تو پھر اس وقت ہم اپنے مدنی بھائیوں کے مسلک پر عمل کرتے ہیں جب پانی دو قلہ کی مقدار میں ہو تو وہ نجس نہیں ہوتا اس کا حکم ماء کثیر کا ہو جاتا ہے۔''

امام خجندی سے پوچھا کہ اگر ایک شافعی المذہب آدمی نے دو ایک برس کی نماز چھوڑ دی ہو اور اس کے بعد وہ حنفی مذہب اختیار کر لے تو پھر وہ کس طرح نماز کی قضا کرے۔ آیا امام شافعیؒ کے مذہب کے مطابق یا حنفی مذہب کے مطابق۔ جواب دیا کہ جس مذہب کے مطابق اس نے قضا کر لیا جائز ہے بشرطیکہ اس کے جواز کا اعتقاد رکھتا ہو۔

''جامع الفتاویٰ'' میں ہے کہ اگر کسی نے حنفی نے یہ کہا ہے کہ اگر میں فلاں عورت سے نکاح کروں تو اس پر طلاق اس پر طلاق اس پر طلاق۔ (یعنی تین طلاقیں دیں) پھر اس نے کسی شافعی المذہب فقیہ سے فتویٰ پوچھا اور اس نے جواب دیا کہ اس پر طلاق نہ پڑے گی اور تمہاری یہ قسم لغو مانی جائے گی۔ تو اس مسئلہ میں امام شافعیؒ کی اقتداء کرنے میں اس کے لئے کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ اکثر صحابہؓ کرام کی تائید اسی مسلک کو حاصل ہے۔

امام محمد نے اپنی امالی میں فرمایا ہے کہ ''اگر کوئی فقیہ اپنی بیوی کو ان لفظوں میں طلاق دے کہ انت طالق التبۃ اور وہ اپنے مذہب کے مطابق ایسی طلاق کو تین طلاق یعنی طلاق بائن سمجھتا ہو لیکن قاضی وقت فیصلہ کر دے کہ یہ طلاق رجعی ہے تو اس کے لئے رجعت کرنے کی گنجائش ہے۔''

اس طرح تحریم و تحلیل اور معاشرہ اور لین دین کے ان تمام معاملات میں جن کے اندر فقہا اور ائمہ کی رائیں مختلف ہیں ہر فقیہ پر لازم ہے کہ اگر دار القضا سے اس کے مذہب فقہی کے خلاف فیصلہ ہو تو اپنی رائے اور اپنے مسلک کو چھوڑ کر قاضی کے فیصلہ پر عمل کرے۔

چند مسائل اور ہیں جن کی اصلیت کے بارے میں ایک عام اور عجیب غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے اور درحقیقت یہی غلط موجودہ اختلاف کا سرچشمہ ہے۔ہم انہیں یہاں مجملاً بیان کرنا چاہتے ہیں:

1- لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ فقہ کی وہ تمام تفریعات جو ان لمبی لمبی شرحوں اور فتاویٰ کی موٹی موٹی کتابوں میں ہیں سب کی سب امام ابوحنیفہؒ اور صاحبین رحمہم اللہ کے اقوال ہیں۔ وہ ان اقوال میں یہ تمیز نہیں کرتے کہ فلاں قوم ان ائمہ کا واقعی قول ہے اور فلاں قول ان کی رایوں اور فتووں کو سامنے رکھ کر بعد میں مستنبط کیا گیا ہے اور یہ جو ان کتابوں میں علی تخریج الکرحی کذا اور علی تخریج الطحاوی کذاً کے الفاظ آیا کرتے ہیں، ان کو وہ گویا بے معنی سمجھتے ہیں۔ اسی طرح قال ابو حنیفہ کذا (امام ابوحنیفہ نے یوں فرمایا ہے) اور جواب المسئلة علی مذهب ابن حنیفہؒ کذا (امام ابوحنیفہ کے مذہب کے مطابق مسئلہ کا جواب یوں ہے) کہ درمیان وہ کوئی فرق و امتیاز نہیں کرتے اور ابن الہمام ابن النجم وغیرہ محققین حنفیہ کا مسئلہ وہ دردہ اور مسئلہ شرط تیمم اور ایسے دوسرے مسائل کے بارے میں یہ فرمانا کہ ''دراصل یہ امام ابوحنیفہ کا قول نہیں ہے بلکہ بعد والوں کی تخریجات ہیں۔'' ان کے نزدیک بالکل ناقابل اعتنا ہے۔

اس طرح بعض ارباب علم و مشیخت اس وہم میں مبتلا ہیں کہ مذہب حنفی کی بنا انہی جدلی بحثوں پر قائم ہے جو المبسوط، الہدایہ اور التبیین کے صفحات میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ان کے مذہب کی بنا ان بحثوں پر نہیں ہے بلکہ اس طریق بحث و جدل کے بانی دراصل معتزلہ ہیں جسے متاخرین نے اس خیال سے اختیار کرلیا تھا کہ اس سے طلبا کے ذہن میں تیزی اور وسعت دینے کے بجائے انہیں بے بصیرتی اور تعصب کی تنگنائیوں میں گھیر کرنا کارہ بنادیا۔

ہم اس جگہ ان اوہام اور شکوک کی تردید میں لمبی گفتگو نہیں کرنا چاہتے کیونکہ اس باب کی تمہید میں جو کچھ ہم بیان کرچکے ہیں اس کی روشنی میں ان میں سے اکثر کا خود بخود ازالہ ہوجاتا ہے۔

2- بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہیں کہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے اختلافات کی اساس وہ اصول ہیں جو اصول بیضاوی وغیر کتابوں میں درج ہیں حالانکہ ان میں سے اکثر اصول ایسے ہیں جن کا ذکر ان بزرگوں نے کبھی نہیں کیا بلکہ وہ ان کے اقوال و فتاویٰ کو سامنے رکھ کر بعد میں وضع کئے گئے ہیں۔ مثلاً میرے نزدیک فقہ کے حسب ذیل اصول ائمہ کے کلام سے بعد والوں نے نکالے ہیں اور امام ابوحنیفہ یا صاحبین سے کوئی صحیح روایت ایسی منقول نہیں جس میں یہ اصول مذکور ہوں:

''خاص اپنے حکم میں خود واضح اور مبین ہے اس کے ساتھ کوئی تشریحی بیان ملحق نہ کیا جائے گا۔''

''کسی حکم پر اضافہ اس حکم کا نسخ ہے۔''

''خاص کی طرح عام بھی قطعی ہے۔''

''کثرت رواۃ لازمہ ترجیع نہیں۔''

''غیر فقیہ راوی کی روایت اگر اصول و قیاس کے خلاف ہو تو واجب العمل نہیں۔''

''مفہوم شرط اور مفہوم وصف کا کوئی اعتبار نہیں۔''

اس قسم کے بہت سے اصول فقہ میں ایسے ہیں جن کی تعیین و تفریع سے ائمہ کو کوئی تعلق نہیں اور ایسے اصولوں کی

محافظت کرنا اور ان پر وارد ہونے والے اعتراضات کو بڑے تکلفات کے ساتھ رفع کرنا‘ متقدین کا طریقہ نہ تھا۔ ان کی محافظت و مدافعت ہماری توجہ کی صرف اس قدر مستحق ہے جس قدر ان کے خلاف اصول و قواعد و فقہ کی۔ اگر ان پر وارد ہونے والے اعتراضات کا جواب دینے میں تکلف سے کام لیا جائے جیسا کہ عام لوگوں کا شیوہ ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دوسرے اصول کو اس جوش حمایت سے محروم رکھا جائے۔

اب ہم چند مثالیں دے کر اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔

(الف) ان حضرات نے یہ اصول قرار دیا ہے کہ جو لفظ خاص اپنے حکم میں خود واضح ہے کسی تشریحی بیان کو اس کے ساتھ ملحق نہ کیا جائے گا۔ ”یہ قاعدہ دراصل متقدمین کے اس فعل سے نکالا گیا ہے کہ انہوں نے ”واسجدوا ورکعوا“ کی بنا پر نماز میں صرف رکوع و سجود کو فرض قرار دیا اور اطمینان کو فرض نہیں ٹھہرایا اور آنحالیکہ حدیث میں یہ ارشاد موجود تھا کہ ”آدمی کی نماز نہیں ہوتی جب تک وہ رکوع و سجود میں اپنی پیٹھ کو پوری طرح ٹھہرائے نہیں۔“ اس ایک معاملہ میں متقدمین نے جو مسلک اختیار کیا‘ متاخرین نے اس سے ایک قاعدہ کلیہ وضع کر لیا مگر دیکھو کہ متعدد معاملات میں وہ خود اپنے مقرر کئے ہوئے اس قاعدہ کو کس طرح توڑتے ہیں۔“

آیت ”وامسحو برؤسکم“ میں محض سر پر مسح کرنے کا حکم ہے اس کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی۔ ”وامسحو“ کا لفظ خاص ہے۔ قاعدہ مذکور کی رو سے چاہیے تھا کہ سر کے مسح کی مطلق فرضیت کا فتویٰ دیا جاتا لیکن حنفیہ یہاں اپنے اس قاعدہ کی پابندی نہیں کرتے اور اس حدیث کی بنا پر جس میں مذکور ہے کہ آنحضور ﷺ نے ناصیہ کا مسح فرمایا مسح کے لئے سر کے چوتھائی حصہ کی حد مقرر کر دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہاں حکم خاص کے ساتھ اس کی تشریح کو کیوں ملحق کیا گیا۔

قرآن کا حکم ہے اور لفظ خاص کے ساتھ ہے کہ زانی اور زانیہ کو کوڑے مارو۔ مذکورہ بالا قاعدہ کا اقتضا تھا کہ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ سب کو کوڑے ہی مارنے کی سزا دی جاتی مگر یہی احناف حدیثوں کو اس آیت کا بیان مانتے ہوئے فرماتے ہیں کہ غیر شادی شدہ کو تو کوڑے مارے لیکن شادی شدہ مجرم کو سنگسار کیا جائے۔ کیا یہ لفظ خاص کے ساتھ تشریح کا الحاق نہیں؟

آیت ”اسارق و السارقة فاقطعوا ایدیھما“ میں مطلقاً چور کا ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے۔ قاعدہ مذکور کے مطابق چاہیے تھا کہ ایک پیسہ کی چوری پر بھی ہاتھ کاٹ ڈالا جاتا لیکن اپنے مقرر کئے ہوئے اصول کو بالائے طاق رکھ کر انہی حضرات نے دس درہم کی شرط لگائی اور حدیث کو آیت کا بیان قرار دیا۔

طلاق مغلظ دینے کے بعد شوہر اگر از سر نو مطلقہ کو اپنے نکاح میں لانا چاہے تو قرآن ”حتی تنکح زوجا غیرہ“ کے الفاظ کے ساتھ حکم دیتا ہے کہ یہ صرف اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ اس کے طلاق دینے کے بعد کوئی دوسرا شخص اس عورت سے نکاح کر چکا ہو۔ اس حکم کا لفظ یعنی ”تنکح“ خاص ہے جو اپنے متعارف مفہوم میں ایجاب و قبول تک محدود ہے۔ پس آیت سے صرف اتنی شرط نکلتی ہے کہ وہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح بمعنی ایجاب و قبول کر لے لیکن فقہا احناف نے حدیث ”حتی تذوق عسیلته ویذوق عسیلتك“ کو اس حکم کا بیان تسلیم کر کے نکاح کے ساتھ یہ شرط بھی لگا دی کہ وہ دوسرا شوہر اس عورت سے جماع بھی کرے۔

بتاؤ ان مثالوں میں اصول الخاص مبین لا یلحقہ البیان کا کتنا لحاظ کیا گیا ہے؟

(ب) قرأت نماز کے متعلق نص قرآنی ''فاقرو وما تیسرا من القرآن'' میں 'ما تیسر'' کا عموم چاہتا ہے کہ جتنا بھی اور جہاں بھی قرآن پڑھ لیا گیا نماز ہو جائے گی اور حدیث ''لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب'' کا ظاہری مفہوم چاہتا ہے کہ سورۂ فاتحہ کی قرأت ہر رکعت میں فرض ہے لیکن قدما نے آیت کے عموم کو اپنی جگہ رکھا اور حدیث کو اس کا مخصص نہ مانتے ہوئے فتوی دیا کہ قرأت و فاتحہ فرض نہیں ہے۔ اس طرح کے بعض اور اقوال سے متاخرین نے ایک کلی اصول یہ مستنبط کر لیا کہ ''العام قطعی کالخاص'' یعنی لفظ عام بھی اپنے حکم اور مفہوم میں خاص کی طرح قطعی ہوتا ہے۔ اس کا عموم تخصیص کا متحمل نہیں بلکہ وہ ایک مستقل حکم بھی ہوتا ہے۔

اس اصول کا تقاضا تھا کہ آیت ''فما استیسروا من الھدی'' کے عموم کو بھی قطعی مان کر کہا جاتا ہے کہ ہر چھوٹی بڑی بدی جو بھی بآسانی میسر آ سکے، قربانی کے کام آ سکتی ہے کیونکہ ''فما استیسرا'' کا لفظ عامہ ہے اس لئے اس کے مدلول اور مقصود میں بھی عموم اور وسعت کو باقی رکھنا چاہئے لیکن احناف حدیث سے خود ہی تخصیص فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ھدی کے لئے بکرا یا بکری سے بڑا کوئی جانور ہونا چاہئے۔ کیا یہاں لفظ عام کی قطعیت خاص کی طرح قائم رہی؟

(ج) اصول فقہ کی ایک محکم دفعہ یہ بھی ہے کہ ''لا عبرۃ بمعھوم الشرط والوصف'' یعنی اگر کوئی حکم کسی خاص موقع پر دیا گیا ہو تو اس حکم کے اطلاق میں اس خاص موقع کی خصوصیات اور شرائط کا اعتبار نہ کیا جائے گا۔ یہ قاعدہ دراصل سلف کے اس مسلک سے نکالا گیا ہے جو انہوں نے آیت ''فمن لم یستطع منکم طولاً'' کے بارے میں اختیار کیا ہے۔ اس آیت کا ظاہر مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ آزاد عورت سے نکاح کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے اور بوجہ ناداری اس کے اخراجات کے متکفل نہیں ہو سکتے وہ لونڈی سے نکاح کر سکتے ہیں لیکن متقدمین نے اس شرط عدم استطاعت کو قید جواز نہ مانتے ہوئے ذی استطاعت اور صاحب مقدرت انسان کو بھی لونڈی سے نکاح کی اجازت دے دی۔ ان کے اس فتویٰ سے مندرجہ بالا اصول منضبط کر لیا گیا۔

لیکن اونٹ کی زکوٰۃ کے بارے میں یہ لوگ خود اس اصول کو توڑ دیتے ہیں۔ نص کے الفاظ ''فی الابل السائمۃ زکوٰۃ'' ہیں جن میں یہی شرط مذکور ہے۔ اصول مذکورہ کے لحاظ سے چاہئے تھا کہ سائمہ اور غیر سائمہ ہر نوع کے اونٹوں میں زکوٰۃ فرض قرار دی جاتی اور اس لفظ ''السائمہ'' کے مفہوم سے حکم کو قید نہ کیا جاتا مگر ایسا نہیں کیا گیا اور صرف چرنے والے اونٹوں میں زکوٰۃ کی فرضیت کا فتویٰ لگا دیا گیا۔

(د) ''حدیث مصراۃ (جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے) میں ائمہ سلف نے جو مسلک اختیار کیا تھا اس کے پیش نظر متاخرین نے یہ کلی اصول بنا لیا کہ جب کوئی غیر فقیہ راوی کسی ایسی حدیث کی روایت کرے جو قیاس سے متصادم ہوتی ہو تو وہ واجب العمل نہ ہوگی۔ مگر انہی واضعین اصول نے حدیث قہقہہ کو جو قیاس بھی ہے اور غیر فقیہ راوی کی روایت بھی واجب العمل مانا اور فتویٰ دیا کہ نماز میں باآواز بلند ہنسنے سے نماز ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ وضو بھی ٹوٹ جاتا ہے حالانکہ وضو قہقہہ کا کوئی تعلق معنوی اب تک دائرہ قیاس میں نہیں آ سکا۔ اس طرح افطار صوم کے بارے میں بھی یہ اصول پس پشت ڈال دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ جب کھانا پینا روزہ کو توڑ دیتے ہیں تو چاہے بھول کر کھایا جائے یا عمداً بہر حال روزہ ٹوٹ جانا

چاہئے لیکن اس کھلے ہوئے قیاس کو انہوں نے ایک ایسی حدیث کی وجہ سے ترک کر دیا جو خلاف قیاس بھی ہے اور غیر فقیہ راوی کی روایت بھی۔

صاحب نظر کے لئے یہ چند ارشادات کافی ہیں ورنہ اس کے شواہد بے شمار ہیں جو بتاتے ہیں کہ ان اصولوں کی حقیقت کیا ہے اور خود ان کے واضعین نے کس طرح ان کی خلاف ورزی کی ہے۔ جب اس خلاف ورزی پر اعتراض کیا گیا تو اس کا جواب انہوں نے جن تکلفات اور سخن پروریوں کے ساتھ دیا ہے ان کی داستان بھی ہر ناظر ان کی کتابوں میں دیکھ سکتا ہے۔

مسئلہ کی اصل حقیقت بالکل بے نقاب ہو سکتی ہے اگر تم صرف ایک ہی قاعدہ کے متعلق علماء محققین کی تصریحات دیکھ لو۔ وہ فرماتے ہیں کہ شرط فقاہت والے اصول میں دو مذہب ہیں ایک تو عیسیٰ بن ابان کا ہے جن کے نزدیک غیر فقیہ راوی کی روایت ضابطہ اور عادل ہونے کے باوجود خلاف قیاس ہونے کی صورت میں ناواجب العمل ہے اور اکثر متاخرین نے اس رائے کو اختیار کر لیا ہے۔ دوسرا مذہب امام کرخی کا ہے جن کے نزدیک خبر واحد کے قیاس پر مقدم ہونے کے لئے راوی کا فقیہ ہونا شرط نہیں۔ حدیث بہر حال قیاس کے مقابلہ میں واجب الاتباع ہے۔ بہت سے علماء نے اس دوسری رائے کو مانا ہے چنانچہ وہ صاف لفظوں میں فرماتے ہیں کہ

> ''یہ قول (یعنی قول اول) ہمارے ائمہ سے منقول نہیں ہے۔ ان سے تو یہ منقول ہے کہ خبر واحد قیاس پر مقدم ہوگی۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ انہوں نے بھول کر کھانے سے روزہ نہ ٹوٹنے کے متعلق حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کو واجب العمل تسلیم کیا ہے حالانکہ روایت قیاس کے خلاف تھی یہاں تک کہ امام ابو حنیفہؒ نے صریحاً فرمایا کہ اگر یہ حدیث نہ ہوتی تو میں قیاس کو اختیار کرتا۔''

خود ان متاخرین کا اکثر تخریجات میں مختلف ہونا اور ایک دوسرے پر اعتراض کرنا ہمارے خیال کی ایک ناقابل تردید شہادت ہے۔

(ھ) ایک غلط فہمی اور ہے جس کا ازالہ ضروری ہے۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ فقاہت کے لحاظ سے محض دو گروہ ہیں۔ ایک اہل الظاہر دوسرے اہل الرائے اور جو شخص بھی قیاس اور استنباط سے کام لے وہ اہل الرائے میں سے ہے۔ حاشا کہ حقیقت سے یہ انتہائی بے خبری ہے۔ لفظ ''رای'' کا مفہوم نہ تو نفس عقل و فہم ہے کیونکہ کوئی عالم اس صفت سے عاری نہیں۔ نہ رائے کا مطلب وہ رائے محض ہے جس کا رشتہ سنت سے منقطع ہو کیونکہ ایسی رائے کوئی متبع اسلام اختیار نہیں کر سکتا اور نہ رائے سے مقصود قیاس و استنباط کی قدرت ہے کیونکہ احمدؒ اور اسحاقؒ بلکہ امام شافعی کا بھی بالاتفاق اہل الرائے میں شمار نہیں حالانکہ وہ قیاس سے بھی کام لیتے ہیں اور مسائل کا استنباط بھی کرتے ہیں۔ رائے اور اہل الرائے کا مفہوم ان تمام سے جداگانہ ہے۔ اہل الرائے کہتے ہیں کہ ان لوگوں کو جنہوں نے جمہور مسلمین کے متفق علیہ مسائل کے بعد فروعی اور اختلافی مسائل میں کسی امام کے اقوال و اصول کو سامنے رکھ کر تخریج و استنباط پر اکتفا کر لیا اور روایات و آثار کے تتبع سے تقریباً بے نیاز ہو کر اصول اور قیاس کی مدد سے جزئیات نکالنے لگے۔ وہ حل مسائل کے وقت نصوص و آثار و سنن کی طرف مراجعت کرنے کے بجائے زیادہ تر یہ دیکھتے ہیں کہ یہ مسئلہ فقہا کے ٹھہرائے ہوئے اصول میں سے کسی اصل کے تحت آتا ہے۔ اس

کے اشباہ ونظائر کیا ہیں۔ کسی مسئلہ کی علت اس میں پائی جاتی ہے اوران کے مقابلہ میں ظاہر یہ وہ لوگ ہیں جو نہ قیاس سے کام لیتے ہیں اور نہ آثار صحابہؓ اوراقوال تابعین سے جیسے امام داؤد اور ابن حزم۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان محققین اہل سنت کا گروہ ہے جیسے امام احمد وامام، اسحاق۔

یہ بحث اگرچہ اس تفصیل و اطناب کے ساتھ عنوان کتاب سے خارج تھی لیکن اس کے باوجود مذہبی فرقہ آرائیوں کی موجودہ خلفشار اور حقیقت حال سے عام بے خبری کو دیکھ کر میں نے ضروری سمجھا کہ عدل وتوسط کا نقطہ جوان ہنگاموں میں گم ہوگیا ہے، اس کو افراط وتفریط اور تعصب کی الجھنوں سے نکال کرارباب نظر کے سامنے پیش کروں۔ عدل پسنداور حق طلب کے لئے یہی کافی ہے۔ متعصب کے لئے کچھ بھی کافی نہیں۔

وربنا الرحمن المستعان علی ما تصفون

محمد ایوب قادری

[وصیت نامۂ شاہ ولی اللہ]

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا نام قطب الدین احمد اور تاریخی نام عظیم الدین [1] ہے مگر ولی اللہ کے نام سے مشہور ومعروف ہوئے۔ (4 شوال 1114ھ۔ 1703ء) کو اپنی نہال قصبہ پھلت ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے۔ حسب رواج پانچ سال کی عمر میں تعلیم کا آغاز ہوا اور ساتویں سال میں قرآن شریف ختم ہوا اور فارسی تعلیم شروع ہوئی یہاں تک کہ دس سال کی عمر میں ''فوائد ضیائیہ'' (شرح ملا جامی) پڑھ لی اور مطالعہ کتب کی استعداد پیدا ہوگئی۔ چودہ سال کی عمر میں شادی ہوئی۔ پندرہ سال کی عمر میں اپنے والد ماجد شاہ عبدالرحیم سے بیعت ہوئے اور اشغال مشائخ نقش بندیہ کی تعلیم حاصل کی۔ اسی سال ''تفسیر بیضاوی'' کا ایک جزو پڑھ کر تعلیم سے فراغت حاصل کرلی۔ شاہ عبدالرحیم نے اس موقع پر بطور اظہار خوشنودی ایک عام ضیافت کا انتظام کیا اور شاہ ولی اللہ کو درس کی اجازت دی۔

شاہ ولی نے مندرجہ ذیل کتابیں سبقاً سبقاً پڑھیں:

حدیث: مشکوٰۃ (باستثناء، از کتاب البیوع تا کتاب الآداب)، صحیح بخاری، (تا کتاب الطہارت)، شمائل ترمذی (کامل)

تفسیر: تفسیر بیضاوی (یک جزو) تفسیر مدارک (یک جزو)

فقہ واصول فقہ: شرح وقایہ (کامل) ہدایہ (کامل) حسامی (کافی حصہ) توضیح وتلویح (کافی حصہ)

منطق وکلام: (شرح شمسیہ (کامل)، شرح مطالع الانوار (جزوی) شرح عقائد معہ حاشیہ خیالی وشرح مواقف (یک جزو)

سلوک وتصوف: عوارف المعارف ورسائل نقش بندیہ۔

علم الحقائق: شرح رباعیات جامی، لوائح، مقدمہ شرح لمعات، مقدمہ نقد النصوص۔

طب: موجز القانون۔

فلسفہ: شرح ہدایت الحکمۃ

نحو: کافیہ وشرح کافیہ (از ملا جامیؒ)

علم معانی: مطول مختصر المعانی۔

ہندسہ وحساب: ان فنون میں بھی رسالے پڑھے۔ شاہ خود لکھتے ہیں:[2]

''دریں میاں سخنان بلند در ہر فن بخاطر می رسید ندواز کوشش زیادہ ترکشادکا بنظر می آید۔''

شاہ ولی اللہ کی عمر کا سترہواں سال تھا کہ ان کے والد شاہ عبدالرحیم نے (12 صفر 1131ھ۔1718ء) کو انتقال فرمایا۔ اس کے بعد کم وبیش بارہ سال تک شاہ صاحب نے مسند درس کو زینت بخشی۔ (1143ھ۔1731ء) کے اخیر میں حج وزیارت سے مشرف ہوئے۔ ایک سال حجاز مقدس میں مقیم رہے اور (رجب 1145ھ۔1732ء) میں بخیریت تمام وطن واپس ہوئے۔[3]

شاہ صاحب ایک مرتبہ تمام کتب متداولہ اپنے والد سے پڑھ چکے تھے جن میں معقولات کا سلسلہ بواسطہ میر زاہد ہروی محقق دوانی تک پہنچتا ہے۔ اس کے بعد شاہ صاحب نے محمد افضل محدث سیالکوٹی سے کتب حدیث کی سند لی جن کا سلسلہ صرف دو ایک واسطوں سے حضرت مجدد الف ثانی (ف 1034ھ۔1624ء) تک پہنچتا ہے۔ تیسری مرتبہ مشائخ حرمین شریفین خصوصاً شیخ ابوطاہر مدنی سے استفاضہ واستفادہ فرمایا۔

شاہ ولی اللہ نے حج وزیارت سے واپس آکر دہلی میں تدریس وتبلیغ اور اصلاح وتذکیر کے فرائض انجام دیئے اور کم وبیش تہائی صدی تک شاہ صاحب کا یہ کام جاری رہا۔ (29 محرم 1176ھ۔1762ء) کو شاہ صاحب کا انتقال ہوا اور دہلی میں مہندیوں کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ چار صاحبزادے شاہ عبدالعزیز (ف 1239ھ، 1824ء) شاہ رفیع الدین (ف 1233ھ۔1817ء) شاہ عبدالقادر (ف 1230ھ۔1814ء) اور شاہ عبدالغنی (والد شاہ محمد اسماعیل شہید) یادگار چھوڑے جنہوں نے اسلام اور ملت اسلامیہ کی گراں قدر خدمات انجام دیں۔[4]

شاہ ولی اللہ کے زمانے میں سیاسی ابتری وانتشار کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ مغلیہ حکومت کے تناور درخت کی جڑیں کھوکھلی ہورہی تھی۔ تخت نشینی کے لئے آئے دن کشت وخون کا بازار گرم رہتا تھا۔ صوبے دار مرکز سے باغی ہورہے تھے۔ امراء ورؤساء آپس میں برسرپیکار تھے۔

شاہ ولی اللہ نے دہلی میں مندرجہ ذیل دس بادشاہوں کا دور حکومت دیکھا:

(1) اورنگزیب عالمگیر۔ 11 ذی قعدہ 1068ھ تا 28 ذی قعد 1118ھ

(2) شاہ عالم بہادر شاہ اول عزہ۔ ذی الحجہ 1118ھ تا 21 محرم 1124ھ

(3) معزالدین جہاں دار شاہ۔ 1124ھ تا 8 محرم 1125ھ۔ قتل کیا گیا۔

(4) فرخ سیر۔ 1125ھ تا 8 ربیع الثانی 1131ھ۔ قید ہوا۔

(5) رفیع الدرجات۔ 9 ربیع الثانی 1131ھ تا 20 رجب 1131ھ۔ تین ماہ 11 دن بادشاہ رہا۔

(6) رفیع الدولہ۔ 20 رجب 1131ھ تا 17 ذی قعدہ 1131ھ۔ تین ماہ 28 دن بادشاہ رہا۔

(7) محمد شاہ۔ 1131ھ تا 29 ربیع الثانی 1161ھ

(8) احمد شاہ۔ 2 جمادی الاول 1161ھ تا 28 شوال 1167ھ۔ اندھا کرکے قید کیا گیا

(9) عالمگیر ثانی۔ 3 شعبان 1167ھ تا 8 ربیع الثانی 1173ھ۔ قتل کیا گیا

(10) شاہ عالم ثانی۔ 14 جمادی الاول 1173ھ تا 7 رمضان 1221ھ

اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال کے وقت شاہ ولی اللہ کی عمر کم وبیش چار سال کی تھی اور شاہ صاحب نے شاہ عالم ثانی کا دور بھی ڈھائی سال ہی دیکھا۔ اس وقت شاہ عالم پورب میں بھٹکتا پھر رہا تھا اور دہلی کا تخت بادشاہ سے خالی تھا۔ بقیہ آٹھ بادشاہوں میں سے چار بادشاہ قتل کئے گئے اور دو بادشاہوں کی حکومت صرف تین تین ماہ رہی۔ تخت نشینی کے لئے جو جنگیں ہوئیں ان میں بھی کم وبیش دس بارہ تخت کے دعویدار قتل ہوئے۔ ان میں سے بعض نے بادشاہت کا اعلان بھی کیا تھا۔ دراصل یہ مغلیہ حکومت کی جاں کنی کا عالم تھا۔

امراء ورؤساء سازشوں اور عیش کوشیوں میں مبتلا تھے۔ اس پر ان کی چیرہ دستیاں اور سفاکیاں مستزاد تھیں۔ سید برادران حسین علی اور عبداللہ خان سیاہ وسپید کے مالک بنے ہوئے تھے۔ بادشاہ دہلی ان کے اشارہ چشم وابرو کا منتظر رہتا تھا۔ امراء کے آپس میں نفاق نے مرہٹوں، سکھوں اور جاٹوں کو سر اٹھانے بلکہ حکومتیں قائم کرنے کے مواقع بہم پہنچائے۔ صوبیدار خودسر ہوگئے۔ بنگال وبہار پر علی وردی خان نے قبضہ کیا۔ اودھ پر برہان الملک اور صفدر جنگ نے ہاتھ صاف کیا۔ روہیل کھنڈ اور دوآبے میں روہیلے اور بنگش ہاتھ پیر مارنے لگے۔ دکن میں نظام الملک نے مسند حکومت آراستہ کی۔ غرضیکہ دلّی کی مرکزی حکومت کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی گئی۔ اس پر غیر ملکی حملوں نے رہی سہی ساکھ کو بھی ختم کر دیا۔

نادر شاہ کے حملے نے دہلی کی حکومت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ بقیہ کسر احمد شاہ ابدالی نے پوری کر دی۔ اس نے نو مرتبہ حملے اور دہلی کو تاراج کر دیا۔ درانیوں نے دہلی کو جس بری طرح غارت کیا اس پر میر تقی میر (ف 1810ء) کس طرح خون کے آنسو روتے ہیں ملاحظہ ہو۔[5]

”راہم بر ویرانہ تازہ شہر افتاد بر ہر قدمے گریستم وعبرت گرفتم وچوں بیشتر رفتم، حیراں تر شدم، مکانہا را نشناختم، دیارے نیافتم، از عمارت آثار ندیدم، از ساکنان خبر نشنیدم۔

از ہر کہ سخن کردم، گفتند کہ این جا نیست　　از ہر کہ نشاں جستم، گفتند کہ پیدا نیست

خانہا نشستہ، دیوار ہا شکستہ، خانقاہ بے صوفی، خرابات بے مست خرابہ بود...... بازار ہا کجا کہ بگویم، طفلان تہ بازار کجا، حسن کو کہ پرسم، یاران زرد رخسار کو[6] جوانان رعنا رفتند، پیران پارسا گزشتند، محلہا خراب، کوچہا نایاب، وحشت ہویدا انس ناپیدا۔“

اس کے علاوہ سات سمندر پار کے فرنگی جنوب ومشرق سے قبضہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ پلاسی کی فیصلہ کن جنگ شاہ ولی اللہؒ کی زندگی ہی میں ہوئی تھی۔ شاہ صاحب کے دور میں یہ سیاسی حالت تھی۔

سیاسی حالات دوسرے مختلف شعبہ ہائے زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ سیاسی کمزوری کے نتیجہ میں اقتصادی، معاشرتی اور مذہبی حالات بھی بد سے بدتر تھے۔ عوام بدحال اور پریشان تھے۔ تجارت وصنعت کا جنازہ نکل چکا تھا۔ اس زمانے کے شعراء کے شہر آشوب سیاسی واقتصادی بدحالی کا صحیح نقشہ پیش کرتے ہیں۔

ان سیاسی بگڑے ہوئے حالات میں بھی ایران وماوراء الہند سے آئے ہوئے نووارد نظام حکومت میں منسلک ہوجاتے تھے اور خوب لوٹ مچاتے تھے۔ ان کو برصغیر کے عوام سے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی وہ اپنے عہدوں، وزارت، امارات اور

قبضہ واقتدار کے لئے آئے دن توڑ جوڑ سازشیں اور جنگ کے نقشے جماتے رہتے تھے۔ برہان الملک' صفدر جنگ' عماد الملک' نجف خان نیز دوسرے امراء کے سیاہ کارنامے اس پر دال ہیں۔ یہ سب ایران وتوران کے آئے ہوئے لوگ تھے۔ برصغیر کی سیاسی ابتری کے نتیجے میں امارت ووزارت کے عہدوں پر فائز ہوئے۔ ان کے اقتدار کے ساتھ ہی ان کے اعزاد احباب اور شعوب وقبائل نے برصغیر ہندو پاکستان میں آ کر سکونت اختیار کی۔ دوسرے صنعت کار اور صاحبان علم وفضل بھی وارد ہوئے۔ ان کے عقائد وافکار سے عوام وخواص سب ہی متاثر ہوئے تھے۔ ان کے علوم وفنون اور معاشرت وتمدن کی تقلید کی جاتی تھی۔ علمائے فرنگی محل نے علوم عقلیہ سے اعتناء کیا اور ان ہی علوم کی متداول کتب پر شروح وحواشی کا کام سرانجام دیا۔ ہر طرف ''زواہد ثلاثہ'' کی صدا اور صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔

حکومت ودربار میں ایران وماوراء النہر کے اکابر چھائے ہوئے تھے۔ اس لئے اسی طرز فکر' معاشرت' لباس' آداب وطریق کو قبول عام حاصل ہوا۔ ہر چیز عجمیت کے رنگ میں رنگ ہوئی تھی۔ معاشرہ کی زوال پذیری اپنی حد کو پہنچ چکی تھی۔ ظاہری نمود ونمائش اور غیر اسلامی رسوم ورواج کا دور دورہ تھا۔ مذہبی بدحالی حد بیان سے باہر ہے۔ توہم پرستی، مراسم پرستی، عملی زندگی سے فرار اس دور کی نمایاں علامات تھیں۔ جاہل صوفی اور خوش عقیدہ مولوی عوام کے مقتدا بنے بیٹھے تھے۔ اندھی تقلید نے معاشرہ کا جنازہ نکال دیا تھا۔ خاص دہلی کی حالت کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جاہل پیر اور صوفی لوٹ مچائے ہوئے تھے۔ دو واقعات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ (7)

''ٹھٹھہ کا ایک غیر معروف شخص عبدالغفور دہلی پہنچ کر سیاحت ومشیخت کا علم بلند کرتا ہے۔ شہزادگان اور امرائے سلطان سے رابطہ بہم پہنچاتا ہے۔ فتوحات کا یہ عالم ہے کہ پانچ ہزار روپے روزانہ وصول ہوتے ہیں۔ اس کی جرأت یہاں تک بڑھتی ہے کہ بادشاہ دہلی تک سے ناشائستہ گفتگو کر گزرتا ہے۔ بادشاہ بھی اس کی ناشائستہ حرکات سے تنگ آ گیا۔ اس دنیا پرست پیر نے کم وبیش چار کروڑ روپیہ خزانہ شاہی سے غبن کیا۔ آخر (1144ھ۔ 1732ء) میں قید ہوا اور شوال 1148ھ میں قید خانہ ہی میں فوت ہوا۔''

ایک شخص محمد حسین نے پیری مریدی کے پردے میں اسلام ہی پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا اور ایک نئے مذہب کی داغ بیل ڈال دی۔ (8)

> ''محمد حسین عرف ''نمود وانمود'' نے مشہد سے کابل پہنچ کر پہلے تو شاہی متوسلین سے تعلق پیدا کیا اور پھر اپنی روحانیت کی تبلیغ کی۔ اس نے بتایا کہ اس کا درجہ نبوت اور امامت کے بین بین ہے۔ اس کی شان وہی ہے جو انبیاء اور اولیاء کی ہوتی ہے۔ اس مرتبہ کا نام ''بیگو گیت'' ہے۔ اس نے اپنی خرافات کو ''اقوزہ مقدسہ'' کے نام سے موسوم کیا۔ وہ کسی مذہب سے سروکار نہیں رکھتا تھا۔ اس کے مرید ''فربود'' کہلاتے تھے۔ نماز کا نام ''دبد'' تھا۔ اس کے مریدوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچی۔ جب شاہ دہلی فرخ سیر اس کے مریدوں میں داخل ہوا تو ''نمود وانمود' کا ڈنکا بجنے لگا۔ اتفاق سے اس کے خلیفہ سے اختلاف ہو گیا تو خلیفہ نے اس کا سارا ڈھونگ ظاہر کر دیا۔''

ان دو مثالوں سے اس دور کی مذہبی حالت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جاہل پیر اور مکار صوفی کس طرح مسلمانوں

کی دین و دنیا کو برباد کر رہے تھے۔ان دو مکاروں کے حالات تو تاریخ میں اس لئے محفوظ رہ گئے کہ ان کے حلقہ مریدی میں بادشاہ وقت تک منسلک ہو گئے تھے ورنہ عوام میں جو لوگ ارباب من دون اللہ بنے بیٹھے تھے ان کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی نے معاشرہ کا بھرپور جائزہ لیا۔سیاسی حالات کو دیکھا۔ملوک و امراء، علماء وصوفیاء، صناع وعوام کا مطالعہ کیا اور پھر مسلم معاشرہ کی ذہنی اصلاح کے لئے ایسا مواد مہیا کیا جس سے نہ صرف علوم اسلامیہ کا احیا ہوا بلکہ مسلم معاشرہ میں اصلاح کی تحریک شروع ہوئی اور لوگوں کے سوچنے کا انداز بدل گیا۔شاہ ولی اللہ نے جمود کو توڑا۔عمل کی دعوت دی، قرآن وحدیث کو عام کیا، فقہ کی حیثیت متعین کی، عقائد کو واضح کیا اور مسلمانوں کو عمل کی دعوت دی۔شاہ صاحب کی تصانیف کا مندرجہ ذیل عناوین کے تحت ہم جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں حکیم الامت تھے۔شاہ صاحب کی فہرست تصانیف پر نظر ڈالئے:

قرآن: (1) فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن (2) فوز الکبیر (3) فتح الخبیر [9] (4) مقدمہ در فن ترجمہ قرآن (5) تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء۔

حدیث: (6) مسویٰ (شرح مؤطا) عربی (7) مصفٰی (شرح مؤطا) فارسی (8) اربعون حدیثاً مسلسلۃً بالاشراف فی غالب سندہا (9) الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین (10) النوادر من احادیث سید الاوائل والاواخر (11) الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین (12) الارشاد الیٰ مہمات علم الاسناد (13) تراجم البخاری (14) شرح تراجم بعض ابواب البخاری (15) انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ واسانید وارثی رسول اللہ۔

فقہ وکلام وعقائد (16) حجۃ اللہ البالغہ (17) البدور البازغہ (18) انصاف فی بیان سبب الاختلاف (19) عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید (20) السر المکتوم فی اسباب تدوین العلوم (21) قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین (22) المقالۃ الوضیہ فی النصیحہ والوصیہ (وصیت نامہ) (23) حسن العقیدہ (24) المقدمۃ السنیہ (25) فتح الودود فی معرفۃ الجنود (26) مسلسلات (27) رسالہ عقائد بصورت وصیت نامہ (فارسی) جس کا منظوم اردو ترجمہ سعادت یار خان رنگین نے کیا ہے۔اس کا مفصل ذکر آگے آ رہا ہے۔

تصوف وغیرہ: (28) التفہیمات الالٰہیہ (29) فیوض الحرمین (30) القول الجمیل (31) ہمعات (32) سطعات (33) لمحات (34) الطاف القدس (35) ہوامع (شرح حزب البحر) (36) الخیر الکثیر (37) شفاء القلوب (38) کشف الغینین فی شرح الرباعیتین (39) زہراوین (40) فیصلہ وحدت الوجود والشہود (مکتوب مدنی)

سیر وسوانح: (41) سرور المحزون (42) (43-49) انفاس العارفین [10] (1۔بوارق الولایت 2۔شوارق المعرفت 3۔امداد فی مآثر الاجداد 4۔نبذۃ الابریزیہ فی اللطیفہ العزیزیہ۔5۔العطیۃ الصمدیہ فی الانفاس المحمدیہ۔6۔انسان العین فی مشائخ الحرمین۔جزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف)

مکتوبات: (50) مکتوبات معہ مناقب ابی عبداللہ وفضیلت ابن تیمیہ (51) مکتوب المعارف معہ ضمیمہ مکتوب ثلاثہ (52) مکتوبات فارسی (مشمولہ کلمات طیبات) (53) مکتوبات عربی (مشمولہ حیات ولی) (54) مکتوبات (شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات۔مرتبہ خلیق احمد نظامی)

نظم: (55) اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم۔ یہ ہائیہ قصیدہ ہے۔ اس کے ساتھ تین قصیدہ ہمزیہ، تائیہ اور لامیہ بھی شامل ہیں۔ (56) دیوان اشعار عربی جس کو شاہ عبدالعزیز نے جمع کیا اور شاہ رفیع الدین نے مرتب کیا۔ (11)

صرف: (57) نظم صرف میر (فارسی)

متفرق: (58) رسالہ دانشمندی

شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصانیف کی ایک مکمل فہرست ہم نے پیش کی ہے۔ ان میں سے بیشتر کتابیں طبع و شائع ہو چکی ہیں اور ان کی زیارت کا ہمیں شرف حاصل ہوا ہے۔

شاہ صاحب کی تصانیف سب سے پہلے مولوی عبداللہ بن بہادر علی حسینی نے کلکتہ سے طبع و شائع کیں۔ ان کی شائع کردہ کتابیں (1) المقالتہ الوضیہ (2) فوز الکبیر (3) فتح الخبیر (4) چہل احادیث، ہماری نظر سے گزری ہیں۔ چہل احادیث کا اردو ترجمہ مولوی عبداللہ نے کیا ہے۔ ان کے اور مولانا محمد احسن نانوتوی پروفیسر عربی و فارسی، بریلی کالج (ف 1312ھ) نے اپنے پریس مطبع صدیقی بریلی سے اور پھر ان کے فرزند خان بہادر مولوی عبدالاحد (ف 1920ء) نے مطبع مجتبائی دہلی سے شائع کیں۔ اسی زمانے میں دہلی سے شاہ رفیع الدین کے نواسے ظہیر الدین سید احمد ولی اللہی نے بالالتزام شاہ صاحب اور ان کے فرزندان عالی مقام کی کتابیں طبع کیں۔ ظہیر الدین کے ایک عزیز عبدالغنی ولی اللہی بن حاجی سید محمد سجادہ نشین و متولی درگاہ شیخ کلیم اللہ جہان آبادی نے بھی شاہ صاحب کی بعض تصانیف شائع کیں۔ بیسویں صدی میں مولانا عبیداللہ سندھی (ف 1944ء) مولانا محمد منظور نعمانی اور پروفیسر محمد سرور نے تصانیف اور علوم و افکار ولی اللہی کی نشر و اشاعت میں خاصا حصہ لیا ہے

شاہ ولی اللہ دہلوی سے منسوب بعض ایسے رسالے بھی ملتے ہیں جو شاہ صاحب کی تصنیف نہیں ہیں اور لوگوں نے شاہ صاحب سے منسوب کر کے چھاپ دیئے ہیں یا شاہ صاحب کی تصنیف بتاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا نام مرزا علی لطف مؤلف تذکرہ "گلشن ہند" کا ہے۔ یہ تذکرہ 1801ء میں تالیف ہوا ہے۔ مرزا علی لطف نے ولی اللہ سرہندی المتخلص بہ اشتیاق کو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سمجھ کر ان کی ہجو کی اور ان سے دو کتابیں منسوب کی ہیں۔ وہ لکھتا ہے: (12)

> "فی الحقیقت مرتبہ علم کا اس عالی جناب (شاہ ولی اللہ محدث دہلوی) کے نہایت بلند تھا خصوصی علم حدیث اور تفسیر میں بہت بڑی دست گاہ رکھتے تھے یہاں تک کہ اسم گرامی اس برگزیدہ روزگار کا زبان خلائق پر آج کے دن تک شاہ ولی اللہ محدث کر کے جاری ہے۔ اکثر کتابیں تصنیف اس بحر علم کی مشہور ہیں چنانچہ دو نسخے کہ ایک کا نام "قرۃ العین فی البطال شہادۃ الحسین" اور دوسرے کا نام "جنت العالیہ فی مناقب المعادیہ" کہتے ہیں تصنیفات سے اسی محی الدین کی یادگار صفحہ روزگار پر ہیں۔ والد ماجد ہیں یہ اس رونق بخش کشور قناعت کے کسی کا نام نامی مولوی عبدالعزیز ہے۔ آج کے دن تک قدم توکل گاڑے ہوئے شاہجہاں آباد میں بیٹھے ہوئے ہیں۔"

شمس العلما مولانا شبلی نعمانی (ف 1914ء) اس تحریر کا رد کرتے ہوئے حاشیہ میں لکھتے ہیں: (13)

دونوں نام غلط ہیں۔ پہلی کتاب "تفضیل شیخین" (14) ہے شہادت امام حسین علیہ السلام کے ابطال

سے خدانخواستہ اس کا کوئی تعلق نہیں اور دوسری جانب تو بالکل فرضی ہے۔ معاویہ کے مناقب میں ان کی کوئی کتاب نہیں۔"

بابائے اردو مولوی عبدالحق (ف 1961ء) نے بھی اسی نقطہ نظر کو قبول کیا ہے۔ مقدمہ میں وہ لکھتے ہیں:[15]

"صاحب تذکرہ (مرزا علی لطف) نے بعض مقامات پر پردے ہی پردے میں خوب چوٹیں کی ہیں جن میں تعصب کی جھلک نظر آتی ہے مثلاً شاہ ولی اللہ صاحب کی نسبت لکھا ہے کہ "قرۃ العین فی ابطال شہادۃ الحسین" اور "جنت العالیہ فی مناقب المعاویہ" ان کی تصانیف میں سے ہیں حالانکہ ان مباحث میں ان کی کوئی کتاب نہیں ہے نہ شہادت حسنین کا ابطال کیا ہے اور نہ مناقب معاویہ میں کوئی کتاب ہے۔ یہ محض اتہام ہے۔ اس کے بعد یہ کہہ کر کہ یہ والد ہیں شاہ عبدالعزیز کے "خوب" خوب ہجو ملیح کی ہے۔"

شاہ محمد اسحاق دہلوی (ف 1262ھ-6-1845ء) جب (1257ھ۔ (1841ء) میں حجاز کو ہجرت کر گئے تو دہلی میں تقلید و عدم تقلید کے مباحث نے خوب زور پکڑا۔ مقلدین و غیر مقلدین کے درمیان مناظرے ہوئے اور ان مباحث پر طرفین سے رسالے اور کتابیں لکھی گئیں۔ اسی زمانے میں بعض جعلی کتابیں بھی وجود میں آئیں۔ قاری عبدالرحمن محدث پانی پتی (ف 1314ھ-1896ء) اپنی ایک تالیف "کشف الحجاب" میں لکھتے ہیں:[16]

"اور ایسا ہی ایک اور جعل (غیر مقلدین) کرتے ہیں کہ سوال کسی مسئلہ کا بنا کر اور اس کا جواب موافق اپنے مطلب کے لکھ کر علمائے سابقین کے نام سے چھپواتے ہیں چنانچہ بعض مسئلے مولانا شاہ عبدالعزیز کے نام سے اور بعض مسئلے مولوی حیدر علی کے نام سے علیٰ ہذا القیاس چھپوائے ہیں۔"

شاہ ولی اللہ دہلوی کے خاندان کے ایک فرد اور ان کی تصنیفات کے مشہور ناشر ظہیر الدین سید احمد ولی اللّٰہی نبیسہ شاہ رفیع الدین دہلوی جنہوں نے شاہ صاحب کی تصانیف کی بڑی تعداد طبع و شائع کر کے وقف عام کی ہے، انہوں نے سب سے پہلے اس طرف توجہ دلائی۔ چنانچہ وہ شاہ صاحب کی ایک کتاب "تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء" کے آخر میں لکھتے ہیں:[17]

"بعد حمد و صلوٰۃ کے بندہ محمد ظہیر الدین عرف سید احمد اول گزارش کرتا ہے۔ بیچ خدمت شائقین تصانیف حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب و مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی وغیرہ کہ آج کل بعض لوگوں نے بعض تصانیف کو اس خاندان کی طرف منسوب کر دیا ہے اور در حقیقت وہ تصانیف اس خاندان میں سے کسی کی نہیں اور بعض لوگوں نے جو ان کی تصانیف میں اپنے عقیدہ کے خلاف بات پائی تو اس پر حاشیہ جڑا اور موقع پایا تو عبارت کو تغیر و تبدل کر دیا تو میرے اس کہنے سے یہ غرض ہے کہ جواب تصانیف ان کی چھپیں اچھی طرح اطمینان کر لیا جائے جب خریدنی چاہیں۔"

ظہیر الدین صاحب اس سلسلہ میں مزید وضاحت شاہ صاحب کی ایک دوسری تصنیف "انفاس العارفین" کے آخر میں التماس ضروری کے عنوان سے کرتے ہیں اور اس میں جعلی کتابوں کے نام اور ناشرین کی بھی نشاندہی کرتے ہیں:[18]

''دوسری التماس آپ کے ملاحظہ فرمانے کے لائق یہ امر ہے کہ فی زمانہ الدنیا زورُ لم یحصلھا الا بالزور کو بعض حضرات نے کمر باندھی ہے اور دنیا کمانے کے واسطے حضرات موصوفین (شاہ ولی اللہ اور ان کے اخلاف) کی طرف اکثر کتابیں منسوب کر کے چھاپ دی ہیں جو کسی طرح ان حضرات کی تصنیف میں سے نہیں ہیں اور ارباب بصیرت ان کو پڑھ کر ان کے عیب و مفاسد کو اس طرح جان لیتے ہیں جس طرح ایک تجربہ کار نقاد کھرے کھوٹے کو کسوٹی پر لگا کر پہچان لیتا ہے مگر چونکہ بمصداق العوام کالانعام بیچارے اردو پڑھنے والے علم سے بے بہرہ لوگ اکثر ان جعلی اور مصنوعی رسائل کو پڑھ کر ضلالت و گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس واسطے میرا فرض ہے کہ میں ان رسائل کے نام اس کاغذ کوتاہ میں لکھ دوں اور اپنے دیندار بھائیوں کو ارباب زمانہ کی گندم نمائی و جو فروشی سے آگاہ کر دوں گا۔ اس پر عمل کرنا نہ کرنا ان کا فعل ہے۔

منت آنچہ حق بود گفتم تمام — تو دانی دگر بعد ازیں والسلام

اور وہ جعلی و مصنوعی رسائل یہ ہیں

1۔ تحفۃ الموحدین، مطبوعہ اکمل المطابع دہلی، — منسوب بہ طرف حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب

2۔ بلاغ المبین، مطبوعہ لاہور

3۔ تفسیر موضح القرآن[19] مطبوعہ مطبع خادم الاسلام، دہلی — منسوب بطرف مولانا شاہ عبدالقادر صاحب مرحوم

4۔ ملفوظات[20] مطبوعہ میرٹھ — منسوب بہ طرف حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز

المشتہر سید ظہیر الدین احمد مالک مطبع احمدی دکان اسلامیہ، دہلی۔

ایک نامور عالم مولانا وکیل احمد سکندر پوری ''البلاغ المبین'' کے متعلق اپنی تصنیف ''وسیلہ جلیلہ'' میں لکھتے ہیں:[21]

''یہ کتاب (البلاغ المبین) کسی کی وہابی کی تصنیف ہے جسے کافی لیاقت نہ تھی مگر اعتبار و استناد کے لئے مولانا شاہ ولی اللہ کی طرف سے منسوب کی گئی۔ اس کا انتساب ایسا ہی ہے جیسے ''دیوان مخفی'' کا زیب النساء کی طرف یا دیوان محی کا حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی کی طرف یا دیوان معین الدین ہروی کا حضرت معین الدین چشتی کی طرف۔''

''تحفۃ الموحدین'' سب سے پہلے اکمل المطابع دہلی میں طبع ہوا۔ پھر قیام پاکستان کے بعد مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کے ادارہ اشاعۃ السنہ نے رجب 1373ھ میں اسے دوبارہ شائع کیا۔ اس رسالہ کے شروع میں ادارہ کے ناظم محمد اسحاق صاحب نے ''سخن گفتنی'' کے عنوان سے مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہے:[22]

''حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا توحید کے مسئلہ پر ایک مختصر لیکن جامع رسالہ ''تحفۃ الموحدین'' نصف صدی کے قریب کا عرصہ ہوا، افضل المطابع دہلی سے شائع ہوا تھا۔ رسالہ فارسی

میں ہے۔اس کا ترجمہ حضرت شاہ صاحب موصوف کے ایک سوانح نگار مولانا حافظ محمد رحیم بخش دہلوی نے کیا۔''

طبع ثانی کی اشاعت ہمارے پیش نظر ہے۔اس میں ''تحفۃ الموحدین'' کے سرورق پر مصنفہ یا مؤلفہ شاہ ولی اللہ تحریر نہیں ہے بلکہ ''از افادات شاہ ولی اللہ دہلوی'' لکھا ہوا ہے۔معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ناشر اس سلسلہ میں خود متردد ہے لہٰذا اس نے اس رسالہ کا اعتبار قائم کرنے کے لئے اس کا مترجم ''حیات ولی'' کے مؤلف مولانا رحیم بخش دہلوی کو بتایا ہے حالانکہ ''حیات ولی'' میں مولانا رحیم بخش دہلوی نے شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصانیف کی جو فہرست ہے اس میں کہیں ''تحفۃ الموحدین'' یا ''باغ المبین'' کا ذکر تک نہیں ہے۔[23]

''تحفۃ الموحدین'' کے آغاز میں مصنف کا نام ولی اللہ دہلوی تحریر ہے۔شاہ صاحب کی تصانیف کی ایک بڑی تعداد کی زیارت کا ہمیں شرف حاصل ہے۔ان میں کہیں صرف ان کے نام کے ساتھ دہلوی کی نسبت تحریر نہیں ہے۔وہ ہر جگہ فقیر ولی اللہ یا ولی اللہ بن شاہ عبدالرحیم لکھتے ہیں۔

''البلاغ المبین'' بھی سب سے پہلے مطبع محمدی لاہور سے 1307ھ میں طبع وشائع ہوئی ہے۔طابع وناشر نے کہیں اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ اس کو اس کتاب کا قلمی نسخہ کہاں سے دستیاب ہوا حالانکہ ایک اہل حدیث عالم مولوی فقیر اللہ اس کے طابع وناشر ہیں اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ ''البلاغ المبین'' میں کہیں مصنف کی حیثیت سے شاہ ولی اللہ کا نام نہیں ہے۔شاہ صاحب کی ہر تصنیف میں آغاز کتاب میں ان کا نام موجود ہوتا ہے مگر ''البلاغ المبین'' میں ایسا نہیں ہے۔

ان دونوں کتابوں کی زبان' طرز بیان اور طریقہ استدلال شاہ ولی اللہ دہلوی سے بالکل مختلف ہے۔اکثر غیر مستند اور وضعی حدیثوں سے استدلال کیا گیا ہے۔[24] صوفیا کے اقوال اور ان کے ملفوظات کے حوالے ملتے ہیں۔صاحب ''مجالس الابرار'' (شیخ احمد رومی) شیخ عبدالحق دہلوی اور ابن تیمیہ کے حوالہ جات کی کثرت ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاص طور پر ابن تیمیہ (728ھ-1328ء) کا پروپیگنڈا مقصود ہے۔[25] چنانچہ ان کا نام اس طرح لکھا گیا ہے کہ[25]

''علامہ ابوالعباس احمد بن عبدالحکیم بن عبدالسلام مفتی ملک شام۔''

ملک کے مشہور اہل حدیث محقق ومؤرخ مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔[26]

''البلاغ المبین'' تو یقیناً شاہ ولی اللہ کی کتاب نہیں۔اس کا اسلوب تحریر وطریق ترتیب مطالب شاہ صاحب کی تمام تصانیف سے متفاوت ہیں۔یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ابتدائی دور کی تصنیف ہوگی۔''

ان دونوں کتابوں ''تحفۃ الموحدین'' اور ''البلاغ المبین'' کا شاہ صاحب کی تصانیف میں یا ان کے صاحبزادگان کی تصانیف میں ان کے مستفدین کی تصانیف میں کوئی ذکر یا حوالہ نہیں ملتا۔شاہ صاحب کے سوانح نگار اول مولانا رحیم بخش دہلوی، مؤلف ''حیات ولی'' بھی[28] ان کتابوں کا قطعاً ذکر نہیں کرتے۔دوسرے تذکرہ نگار مولوی رحمان مؤلف ''تذکرہ علمائے ہند''،[29] مولوی فقیر محمد جہلمی مؤلف ''حدائق الحنفیہ''،[30] نواب صدیق حسن خان مؤلف ''ابجد العلوم''،[31] مولوی حکیم عبدالحئی مؤلف ''نزہۃ الخواطر''،[32] اور مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی مؤلف ''تاریخ اہل حدیث''،[33] کے یہاں بھی ان کتابوں کا ذکر نہیں ملتا۔[34]

''البلاغ المبین'' کا اردو ترجمہ ''تبلیغ حق'' کے نام سے 1364ھ میں حیدر آباد دکن سے شائع ہوا۔ اس پر مولوی غلام محمد بی اے (عثمانیہ) مؤلف ''تذکرہ سلیمان'' نے مولانا سلیمان ندوی سے دریافت کیا۔ (35)

''بلاغ المبین کے نام سے ایک کتاب اہل حدیث حضرات کی طرف سے شائع ہوئی ہے اور اس کو مصنف حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی بتایا گیا ہے۔ کیا یہ کتاب واقعتاً شاہ صاحب کی ہے اور اگر ہے تو اس میں بعض مسائل ایسے ملتے ہیں جن میں شدت حد اعتدال سے زائد ہے۔''

مولوی غلام محمد صاحب نے قوسین میں اس کا جواب اس طرح لکھا ہے۔ (36)

''بعد میں تحقیق سے پتہ چلا اور خود حضرت والا (مولانا سلیمان ندوی) نے بھی تصدیق فرمائی کہ یہ شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصنیف ہے ہی نہیں۔ بلکہ کسی نے لکھ کر ان کی طرف منسوب کر دی ہے تا کہ شاہ صاحب کو ماننے والے ان عقائد کو مان لیں۔''

شاہ ولی اللہ دہلوی سے منسوب ایک رسالے کی نشاندہی مولانا محمد علی کاندھلوی خواہرزادہ، مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے بھی کی ہے وہ لکھتے ہیں: (37)

''میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب میں سنتا ہوں کہ لوگ غیر مقلدیت کو پروان چڑھانے کے لئے حضرت شاہ صاحب کی کتابوں سے ادھوری اور تراشیدہ عبارتیں نقل کر کے بیچارے عوام کو دھوکا دیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ''قول سدید'' کے نام پر ایک من گھڑت کتاب کو شاہ صاحب سے منسوب کرتے ہیں۔''

اس سلسلہ میں ایک اور رسالہ کا ذکر بھی ضروری ہے جس کا نام ''اشارہ مسترۃ'' ہے۔ اس کو شاہ صاحب کی تصنیف بتایا گیا ہے۔ اس رسالہ کو اردو ترجمہ کے ساتھ فضل الرحمٰن صاحب مدرس جامعہ ملیہ اسلامیہ نے (1355ھ۔1936ء) میں مکتبہ عربیہ قرول باغ دہلی سے شائع کیا ہے۔ مترجم نے آخر میں لکھا ہے کہ اس کا مخطوطہ ٹونک کے کتب خانے سے حاصل ہوا تھا جو 1281ھ (1864ء۔1865ء) کا مکتوبہ تھا۔

شاہ صاحب کی فہرست تصانیف میں دو رسالے (1) رسالہ اوائل اور (2) فیما یحب حفظہ بھی ناشرین کی عدم توجہ سے شامل ہو گئے ہیں جن میں پہلا رسالہ تو شیخ محمد سعید بن شیخ محمد سنبل کا مؤلفہ ہے اور دوسرا رسالہ شاہ ولی اللہ صاحب کے کسی شاگرد نے لکھا ہے جس میں شاہ صاحب کا ذکر شیخنا کی صراحت کے ساتھ کیا ہے۔

ہم نے اس مجموعہ میں چار مختلف رسائل شامل کئے ہیں۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔ ان میں سب سے پہلا رسالہ ''المقالته الوضیه فی النصیحه والوصیه'' ہے۔ المقالته الوضیه فی النصیحه شاہ ولی اللہ کا یہ وہ مشہور و معروف وصیت نامہ ہے جو متعدد بار طبع و شائع ہو چکا ہے۔ اس میں آٹھ وصیتیں ہیں:

وصیت اول: کتاب و سنت، عقائد اور مذہب اہل سنت کے متعلق۔

وصیت دوم: امر بالمعروف و نہی عن المنکر

وصیت سوئم: متصوفین کے متعلق

وصیت چہارم: علمائے حال وقال کے متعلق
وصیت پنجم: صحابہ واہل بیت کے متعلق
وصیت ششم: طریق تعلیم دین
وصیت ہفتم: رسوم عجم وہند کی مذمت
وصیت ہشتم: تبلیغ سلام بہ سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام

تصنیف رنگین (دوسرا رسالہ): شاہ ولی اللہ دہلوی کا ایک وصیت نامہ ''المقالۃ الوضیۃ فی النصیحۃ والوصیۃ'' (وصیت نامہ) نام سے چھپتا رہا ہے۔ ''سعادت یار خان'' رنگین [38] (1251ھ۔1838ء) کو ''المقالۃ الوضیۃ'' کے علاوہ شاہ ولی اللہ کا ایک اور رسالہ بصورت وصیت نامہ دستیاب ہوا۔ رنگین نے ''تصنیف رنگین'' کے نام سے (1239ھ۔1824ء) میں اس رسالہ کا اردو منظوم ترجمہ کیا۔ اس کے مضامین ''المقالۃ الوضیۃ'' سے بالکل جداگانہ ہیں۔ اس رسالہ کی اصل فارسی دستیاب نہ ہوسکی مگر یہ خیالات وافکار شاہ صاحب کی دوسری تصانیف ''حجۃ اللہ البالغۃ'' وغیرہ میں ملتے ہیں۔ آغاز کتاب میں رنگین لکھتے ہیں:

''ایک رسالہ جناب حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ یعنی والد جناب حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ نے واسطے اپنے آل واولاد کے بطور وصیت کے فارسی نثر میں لکھا تھا۔ دریں ولا بندہ رنگین نے اسے زبان ریختہ میں نظم کیا ہے سو وہ اس بیان میں ہے کہ لڑکا لڑکی جس روز سے پیدا ہوں اور بوڑھے ہوکر مرجائیں تو ان کے وارث ان سے اس عرصہ میں رسم ورسوم بیہودہ کو ترک کر کے کیا کیا۔ معاملہ برتا کریں کہ وہ شرح شریف کے بموجب ہو اور خود بھی بحد بلوغ پہنچ کر کسی طور سے اوقات بسر کریں کہ قیامت میں ماخوذ نہ ہوں۔''

شاہ صاحب کا یہ وصیت نامہ (تصنیف رنگین) نہایت جامع اور مختصر ہے۔ انہوں نے اس میں ترغیب دی ہے کہ بیہودہ رسم ورواج کو چھوڑ کر اسلامی زندگی اختیار کرنی چاہیے۔ شاہ صاحب نے یہ وصیت نامہ اپنی زندگی کے بالکل آخر زمانے میں لکھا ہے۔ شاہ صاحب کی عمر قمری حساب سے اکسٹھ سال تین ماہ پچیس دن ہوئی۔ شاہ صاحب نے یہ وصیت نامہ اکسٹھ سال کی عمر پوری ہونے کے بعد ہی لکھا ہے جیسا کہ وہ صبر وشکر کی استقامت کے سلسلہ میں فرماتے ہیں ؎

اب مرے دل میں آسمائی ہے یہ
دولت اکسٹھ برس میں پائی ہے یہ

شاہ صاحب کے فقہی مسلک کے متعلق اس میں صاف طور سے درج ہے:

میرا مذہب ہے مذہب حنفی
سب پہ روشن ہے یہ خفی و جلی [39]
چاروں مذہب کو جانتا ہوں حق
لیک بھاتا ہے مجھ کو اس کا نسق

رنگین نے اس رسالہ کو نظم کرنے کے بعد خاندان ولی اللّٰہی کے ایک ممتاز نمائندے اور عالم مولانا رشید الدین خاں[40] کو سنایا۔ انہوں نے اس کو بہت پسند فرمایا۔ رنگین لکھتے ہیں ؎

جب رسالہ یہ نظم ہوا سارا	طور اس کا لگا مجھے پیارا
ہیں بڑے مولوی رشید الدین	ہے انہوں نے کے سخن کا مجھ کو یقین
جانتے ہیں انہوں کو خاص اور عام	پڑھ گیا آگے ان کے میں یہ تمام
اس کو سن کر انہوں نے ہوکر شاد	آفریں میرے حق میں کی ارشاد

رنگین نے منظوم ترجمہ خوب رواں کیا ہے۔ رنگین ایک پُر گو شاعر تھے اس لئے بعض جگہ کچھ کھٹک پیدا ہوتی ہے مگر مجموعی طور پر یہ نظم خوب ہے۔ اس سے رنگین کے حالات و کردار کے ایک اور پہلو پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ رنگین صرف ریختہ گوئی اور رنگینی ہی میں مست نہ تھے بلکہ شاہ ولی اللہ کے افکار و خیالات سے متاثر بلکہ ان کے مبلغ تھے۔ ''اخبار رنگین'' میں رنگین نے شاہ عبدالعزیز اور ان کی مجلسوں میں شرکت کا بڑے خلوص اور عقیدت سے ذکر کیا ہے۔

تصنیف رنگین کے تین مختلف نسخے ہمارے پیش نظر رہے ہیں:

(1) ذاتی خطی نسخہ ہے جو اس مطبوعہ نسخہ کی نقل ہے جو (جمادی الاول 1263ھ بمطابق مئی 1827ء) میں مطبع دارالسلام دہلی (محلہ حوض قاضی) میں شیخ الٰہی بخش سوداگر ولد حاجی عبدالوہاب کے صرفہ سے عنایت حسین نے چھپوایا۔ اس کا اہتمام نورالدین احمد لکھنوی کے ذمہ رہا۔ اس نسخہ میں کتابت کی خاصی غلطیاں ہیں۔[41]

(2) جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، صدر شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی، حیدرآباد کا نسخہ، ڈاکٹر صاحب نے تصنیف رنگین کی نقل حکیم امان علی[42] عرف محمد متن متخلص بہ عاجز کے نسخہ سے حاصل کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے (13 رجب 1359ھ۔ 8 اگست 1940ء) کو کتابت مکمل کی حکیم امان علی عاجز نے اصل نسخہ کے بعد ''لراقم النسخہ'' کے عنوان سے مندرجہ ذیل نو شعر مزید لکھے ہیں ؎

بارہ سو ساٹھ سال ہجری تھے	جب یہ اوراق میں نے لکھے
روز یک شنبہ تھا مرے صاحب	اور چوبیسویں زماہ رجب
اس رسالہ کو دیکھ کر بدعت	چھوڑے جو اس پر حق کی صد رحمت
جو نہ چھوڑے طریق ظلوم و جہول	اس سے راضی ہو کب خدا و رسول
بس کر عاجز نہ دے کسی کو ملال	دل میں پچھتا تو سوچ اپنا احوال
کتنی بدعات تجھ میں باقی ہیں	تجھ سے انسان کتنے شاکی ہیں
ترک ایذا کر اور ترک کلام	ترک دل سے کر اختلاط عوام
ادا کر قلت طعام و منام	تاکہ دنیا سے ہو بخیر انجام
پڑھ پیغمبر پہ اب درود و سلام	اور اصحاب و آل پر بھی تمام

حکیم صاحب نے ایک آدھ جگہ اپنی طرف سے حاشیہ بھی لکھا ہے:

(3) تیسرا نسخہ انڈیا آفس لائبریری (لندن) کا مخطوطہ ہے۔ یہ نسخہ خود سعادت یار خان رنگین کے ہاتھ کا کتابت شدہ ہے۔ اس کے آخر میں تحریر ہے۔

''تمام شد نسخہ اول سبع سیارہ رنگین کہ مشہور بہ تصنیف رنگین است تصنیف سعادت یار خان' رنگین پسر محکم الدولہ طہماس بیگ خان اعتقاد جنگ رومی بتاریخ یازدہم ربیع الثانی روز چہار شنبہ بوقت سہ پہر در شاہجہاں آباد در عہد محمد اکبر شاہ بادشاہ غازی 28 جلوس 1248ھ بدستخط مصنف تحریر یافت۔''

تصنیف رنگین اور اخبار رنگین کے نسخے انڈیا آفس لائبریری (لندن) سے پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے جنرل سیکرٹری ڈاکٹر معین الحق صاحب نے ہماری نشان دہی پر منگائے تھے۔ آخر الذکر نسخہ ڈاکٹر صاحب کے مقدمہ وحواشی کے ساتھ سوسائٹی کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔

تصنیف رنگین کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل امور قابل ذکر ہیں:

(1) اس نسخہ کی بنیاد سعادت یار خان رنگین کے کتابت شدہ نسخہ پر ہے۔

(2) حاشیہ میں بعض الفاظ کی حسب ضرورت تشریح کر دی گئی ہے

(3) فہرست مضامین ہم نے مرتب کی ہے۔

(4) آخر میں توضیحات وحواشی کے عنوان سے اس منظوم رسالہ کی تائید میں شاہ ولی اللہ کی دوسری تصانیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' سے ان ہی مسائل کے متعلق مواد فراہم کر دیا ہے۔

المقالۃ الوضیہ فی النصیحہ والوصیہ

شاہ صاحب کے ان وصایا میں سے تیسری' چوتھی' پانچویں اور ساتویں وصیت پر شاہ صاحب کے شاگرد اور نامور عالم قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی مجددی نے فارسی میں بطور شرح تعلیقات لکھے ہیں۔ یہ تعلیقات شاہ صاحب کے اسی رسالہ ''المقالۃ الوضیہ'' کے اس نسخہ کے ساتھ چھپے تھے جو مطبع محمدی فیروز پور میں 1258ھ میں طبع ہوا تھا۔ خوش قسمتی سے ہمیں وہ مطبوعہ نسخہ مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب (لاہور) کے کتب خانہ میں ہم دست ہو گیا جس کے لئے ہم حضرت مولانا نے خاص طور سے شکر گزار ہیں۔

ساتویں وصیت میں شاہ صاحب نے نسب عرب اور زبان عرب کا ذکر ایک خاص انداز میں کیا ہے اور عرب اول کے اتباع پر خاص زور دیا ہے۔ اگرچہ یہ وصیت نامہ ان کی اولاد و احباب کے لئے ہے مگر شاہ صاحب کے احباب میں عربی اور ہند پاکستانی دونوں نسلوں کے لوگ شامل ہونگے۔ شاہ صاحب نے ٹھیٹ عربی معاشرت، تہبند باندھنا، چادر اوڑھنا، نعلین پہننا، دھوپ کھانا، موٹے اور پرانے کپڑے پہننا، اونٹوں کے قافلے بنانا، گھوڑوں پر سوار ہونا اور تیراندازی وغیرہ کی تلقین کی ہے۔ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی نے بتایا ہے کہ یہ امور اس زمانے میں انگشت نمائی کا سبب ہیں لہٰذا ان کو تمام و کمال اختیار نہیں کیا جا سکتا۔

شاہ صاحب کے اس وصیت ''المقالۃ الوضیہ فی الوصیہ'' کی شرح میں ایک وصیت نامہ نواب صدیق حسن خاں

(ف 1307ھ۔1889ء) نے مرتب فرمایا ہے جس کا نام ''القالۃ الفصیحۃ والوصیۃ والنصیحہ'' ہے۔نواب صاحب کا یہ وصیت نامہ مطبع مفید عام آگرہ میں 1298ھ میں طبع ہوا۔نواب صاحب نے شاہ صاحب کی وصیت نقل کرنے کے بعد اس کی تائید وشرح میں دوسرے اکابر علما وائمہ کے وصایا بھی نقل کیے ہیں۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کا یہ وصیت نامہ ''المقالۃ الوضیۃ'' متعدد بار طبع ہو چکا ہے۔اس کا اردو ترجمہ 1899ء میں ظہیر الدین ولی اللہی نے اصل متن کے ساتھ شائع کرایا تھا، جس پر مترجم کا نام موجود نہیں تھا۔وہی ترجمہ پھر مطبع مجتبائی نے 1918ء میں شائع کیا۔یہ ترجمہ پھر دوسرے ناشرین نے بھی شائع کیا۔یہ ترجمہ اکثر جگہ غلط ہے اور اصل کے مطابق نہیں ہے۔ہم نے مختلف نسخوں کو سامنے رکھ کر از سر نو ترجمہ کیا ہے اور بڑی حد تک اصل کی مطابقت کی ہے۔فارسی متن کو بھی ہم نے مختلف نسخوں کو سامنے رکھ کر درست کیا ہے اور اختلاف نسخ حواشی میں دیئے ہیں۔

''مقالۃ الوضیہ'' کے مختلف نسخے ہمارے پیش نظر رہے ہیں:

(1) قلمی نسخہ مکتوبہ رجب 1276ھ کتابت شدہ از الٰہی بخش بن حکیم عظیم اللہ ساکن قصبہ آنولہ ضلع بریلی (بنیادی نسخہ)

(2) مطبوعہ مطبع احمدی (ہوگلی کلکتہ) بہ تصحیح مولوی عبداللہ بن بہادر علی حسینی (سال طباعت ندارد) (نسخہ الف)

(3) مطبوعہ مطبع محمدی لاہور 1302ھ (نسخہ ب)

(4) مطبوعہ مجتبائی دہلی 1918ء (نسخہ ج)

(5) مطبوعہ مطبع احمدی دہلی 1899ء باہتمام ظہیر الدین ولی اللہی (نسخہ ک)

(6) مشمولہ تفہیمات الٰہیہ، مطبوعہ مجلس علمی ڈابھیل 1936ء (نسخہ ی)

(7) مطبوعہ مطبع محمدی فیروز پور 1285ھ [43]

(8) مشمولہ المقالۃ الفصیحہ والوصیہ والنصیحہ (تالیف نواب صدیق حسن خان۔مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ 1298ھ)

''مقالہ الوضیہ'' کے سلسلہ میں مندرجہ امور قابل ذکر ہیں:

(1) پیراگراف کی تقسیم کی گئی ہے۔

(2) ہر وصیت میں ذیلی عنوان قائم کیے گئے ہیں۔

(3) قاضی محمد ثنا اللہ پانی پتی کے فارسی تعلیقات معہ اردو ترجمہ شامل کر دیئے ہیں۔

(4) فارسی متن میں مختلف نسخے کا اختلاف ظاہر کیا گیا ہے۔

(5) مختصر حواشی بھی تحریر کیے

حواشی

(1) عظیم الدین سے 1115ھ برآمد ہوتے ہیں۔اس میں ایک عدد زیادہ ہے۔

(2) ملاحظہ ہو جزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف (مشمولہ انفاس العارفین) از شاہ ولی اللہ ص 195 (مطبوعہ مطبع احمدی واقع دہلی متعلق مدرسہ عزیزیہ، سال طباعت ندارد)

(3) شاہ ولی اللہ کے یہ حالات جزء الضعیف فی ترجمۃ العبد الطیف (ص 193-194) سے ماخوذ ہیں۔

(4) حکیم عبدالحی مؤلف ''نزہتہ الخواطر'' نے شاہ ولی اللہ کے ایک صاحبزادے نے محمد دہلوی کا بھی ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ''نزہتہ الخواطر'' جلد ہفتم صفحہ 422 (حیدر آباد دکن 1959ء)

(5) ذکر میر از میر تقی میر (مرتبہ مولوی عبدالحق) صفحہ 99 (انجمن ترقی اردو اورنگ آباد 1928ء)

(6) کذا فی الاصل

(7) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، مقالات الشعراء از علی شیر قانع تتوی (مرتبہ پیر حسام الدین راشدی) صفحہ 688-690 (سندھی ادبی بورڈ، کراچی 1957ء)

(8) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ سیر المتاخرین از غلام حسین طباطبائی۔ صفحہ 447 (نول کشور پریس لکھنؤ 1797ء)

(9) فتح الخبیر' فوز الکبیر کا ہی ایک حصہ ہے۔

(10) انفاس العارفین میں سات مختلف رسالے شامل ہیں۔

(11) نزہت الخواطر جلد ششم از حکیم عبدالحئ۔ صفحہ 398-415 (حیدر آباد دکن 1957ء)

(12) گلشن ہند از مرزا علی لطف، تصحیح و حاشیہ از شمس العلماء شبلی نعمانی و مقدمہ از مولوی عبدالحق۔ صفحہ 24 (حیدر آباد دکن 1906ء)

(13) ایضاً۔ صفحہ 24

(14) کتاب کا نام ''قرۃ العینین فی تفصیل الشیخین'' ہے

(15) ایضاً۔ مقدمہ صفحہ 25

(16) تفصیل کے لئے دیکھئے تنبیہ الضالین و ہدایت الصالحین (مجموعہ فتاویٰ علمائے دہلی و حرمین شریفین در جواز تقلید مطبوعہ مطبع سید الاخبار 1262ھ۔1845ء)

(17) کشف الحجاب از قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتی۔ صفحہ 9 (مطبع بہار کشمیر لکھنؤ 1298ھ)

(18) تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء از شاہ ولی اللہ دہلوی۔ مطبوعہ مطبع احمدی کلاں محل متعلق مدرسہ عزیزی دہلی باہتمام ظہیر الدین ولی اللہی (سال طباعت ندارد)

(19) انفاس العارفین از شاہ ولی اللہ دہلوی۔ مطبوعہ مطبع احمدی دہلی متعلق مدرسہ عزیزی باہتمام ظہیر الدین۔

(20) شاہ عبدالقادر نے قرآن کریم کا اردو ترجمہ 1205ھ میں مکمل کر لیا۔ اس پر مختصر تفسیری حاشیے ہیں۔ اس ترجمہ کا تاریخی نام ''موضح القرآن'' نہیں ہے۔ ''تفسیر مولانا شاہ عبدالقادر المعروف بہ موضح القرآن'' کے نام سے ایک تفسیر ابو محمد ثابت علی اعظم گڑھی اور غلام حسین مونگری نے 1372ھ میں مطبع خادم الاسلام دہلی سے طبع کرا کے شائع کی۔ یہ کتاب سات جلدوں میں طبع ہوئی ہے۔ اس کی دوسری جلد پر شمس العلماء میاں نذیر حسین دہلوی (ف 1902ء) کے داماد مولوی سید شاہجہان کی تقریظ ہے اور آخر کتاب میں اشتہار ہے کہ شہر دہلی پھاٹک حبش خاں مدرسہ سید محمد نذیر حسین صاحب سے طلب فرمائیں۔ اس تفسیر کی طرف سید ظہیر الدین نے اشارہ کیا ہے۔

(21) ملفوظات شاہ عبدالعزیز (فارسی) کا پہلا ایڈیشن مطبع مجتبائی میرٹھ سے 1314ھ میں شائع ہوا تھا اور مطبع ہاشمی میرٹھ سے 1315ھ

1897ء میں ان ملفوظات کا اردو ترجمہ سب سے پہلے شائع ہوا۔ ترجمہ کے فرائض مولوی عظمت الٰہی بن محمد ہاشم نے انجام دیئے تھے۔ 1960ء میں ملفوظات شاہ عبدالعزیز کا اردو ترجمہ پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز کراچی نے شائع کیا۔ مترجمین مولوی محمد علی لطفی اور مفتی انتظام اللہ شہابی ہیں اور پیش لفظ (ڈاکٹر معین الحق صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔)

(22) وسیلہ جلیلہ از مولانا وکیل احمد سکندر پوری۔ صفحہ 23 (مطبع یوسفی لکھنؤ سال طباعت ندارد)

(23) تحفۃ الوحدین۔ صفحہ 1 (شائع کردہ ادارہ اشاعۃ السنہ، مرکزی جمعیۃ اہل حدیث مغربی پاکستان 1373ھ)

(24) ملاحظہ ہو حیات ولی از مولانا رحیم بخش دہلوی۔ صفحہ 545-580 (مکتبہ سلفیہ لاہور 1955ء)

(25) مولانا عطا اللہ حنیف صاحب و مولوی فقیر اللہ مرحوم نے حواشی میں اکثر اس طرف اشارہ کیا ہے، ملاحظہ ہو بلاغ المبین صفحہ 55,52 (لاہور 1962ء)

(26) ملاحظہ ہو البلاغ المبین۔ صفحہ 99,60 (شائع کردہ مکتبہ السلفیہ، لاہور 1962ء)

(27) ایک موقع پر حضرت شاہ ولی اللہ نے امام ابن تیمیہ کے سلسلہ میں ایک خط لکھا ہے۔ اس میں انہوں نے ان کو شیخ تقی الدین احمد ابن تیمیہ لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو مکتوبات مناقب ابی عبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری۔ صفحہ 26 (مطبع احمدی دہلی۔ سال طباعت ندارد)

(28) مکتوب مولانا غلام رسول مہر بنام محمد ایوب قادری۔ مکتوبہ 28 فروری 1964ء

(29) حیات ولی از رحیم بخش دہلوی۔ صفحہ 545-580 (مکتبہ سلفیہ لاہور 1955ء)

(30) ملاحظہ ہو تذکرہ علمائے ہند (مولوی رحمان علی) مرتبہ و مترجمہ محمد ایوب قادری۔ صفحہ 543 (پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی 1961ء)

(31) حدائق الحنفیہ از مولوی فقیر محمد جہلمی۔ صفحہ 447 (نول کشور پریس، لکھنؤ 1906ء)

(32) ابجد العلوم از نواب صدیق حسن خاں۔ صفحہ 912-914 (مطبع صدیقی بھوپال 1296ھ)

(33) نزہۃ الخواطر جلد ششم از مولوی حکیم عبدالحئی۔ صفحہ 398-415 (دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن 1957ء)

(34) تاریخ اہل حدیث از مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی۔ صفحہ 411-416 (اسلامی پبلشنگ کمپنی لاہور 1953ء)

(35) تحفۃ الموحدین کو تو شاہ والی اللہ کی تصنیفات میں ابو یحییٰ امام خان نوشہروی مؤلف ''تراجم علمائے الحدیث'' (صفحہ 42-46) نے بھی شامل نہیں کیا ہے۔

(36) تذکرہ سلیمان از غلام محمد۔ صفحہ 469 (ادارہ مجلس علمی کراچی 1960ء)

(37) ایضاً

(38) شاہ ولی اللہ اور تقلید از مولانا محمد علی کاندھلوی۔ صفحہ 53 (سیالکوٹ، سال طباعت ندارد)

(39) سعادت یار خاں رنگین کے تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو: سعادت یار خان رنگین از ڈاکٹر صابر علی خاں۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی 1956ء لکھنؤ کا دبستان شاعری از ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی۔ صفحہ 259 تا 296 (لاہور 1955ء)۔ مسدس رنگین مرتبہ تحسین سروری (ادارہ ترقی ادب کراچی 1952ء نوائے ادب (بمبئی) جولائی 1963ء)

(40) تعجب ہے ڈاکٹر صابر علی خاں نے اس کو سعادت یار خاں رنگین کے حال پر منطبق کیا ہے (ملاحظہ ہو سعادت یار خاں رنگین۔ صفحہ 41)

(41) مولوی رشید الدین خاں بن امین الدین، شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے شاگرد تھے۔ علم ہیئت اور ہندسہ میں کمال حاصل تھا۔ ردِ روافض میں اکثر رسالے لکھے۔ (1243ھ۔ 8-1827ء) میں انتقال ہوا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے تذکرہ

علمائے ہند۔ صفحہ 191-192 وعلم وعمل (وقائع عبدالقادر خانی) جلد اول مرتبہ محمد ایوب قادری۔ صفحہ 251-252 (ایجوکیشنل کانفرنس' کراچی 1960ء)

(42) اس مطبوعہ نسخہ کی نقل ہمارے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

(43) حکیم امان اللہ بن حکیم شیر علی مؤلف تذکرہ علمائے ہند (مولوی رحمان علی) کے بھائی تھے۔ اپنے زمانے کے نامور عالم وفاضل تھے۔ 1841ء میں ایوان میں سرکاری طبیب کی حیثیت سے ملازم ہوئے۔ (1277ھ۔1860ء) میں ایوان میں انتقال ہوا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تذکرہ علمائے۔ ہند صفحہ 121-122

(44) نسخہ نمبر 7 اور 8 سے بھی مقابلہ کیا ہے۔ ان نسخوں میں کوئی خاص فرق نہیں ملا۔

☆☆☆

وصیت اوّل

یہ کہ اعتقاد اور عمل قرآن پاک اور حدیث رسول اللہ صلعم کے موافق ہو اور ہمیشہ ان میں غور کرتے رہنا چاہیے۔ ہر روز دونوں کا تھوڑا تھوڑا مطالعہ کرنا چاہیے اور اگر پڑھنے کی طاقت نہ ہو تو دونوں کے ایک ایک ورق کا ترجمہ سن لیا جائے۔ عقائد کے لحاظ سے قدما کا مذہب اہل سنت اختیار کرنا چاہیے۔ جس امر میں بزرگوں نے تفتیش سے کام نہیں لیا اس کی تفصیل وتفتیش سے اجتناب بہتر ہے۔ منطقیوں کی بیہودہ شک وشبہ میں ڈالنے والی خام باتوں کی طرف توجہ نہ دی جائے۔ مسائل فروعی میں ان علمائے محدثین کی پیروی کی جائے جو فقہ اور حدیث دونوں کو خوب جانتے ہوں۔ فقہ کے مسئلے قرآن کریم اور حدیث کی کسوٹی پر پرکھے جانے چاہئیں۔ اگر موافق ہو تو اسے قبول کر لیا جائے ورنہ برا مال مالک کے منہ پر' (خلاف کو چھوڑ دیا جائے) کہ امت کو قیاسیہ مسئلوں کے سلسلے میں ہر لمحے کتاب وسنت (کلام اللہ وحدیث) کی ضرورت ہے اور وہ ان سے کسی پل بھی بے اعتنائی نہیں برت سکتی اور ان فقیہوں کی فرسودہ بات نہ سننی چاہیے جنہوں نے ایک عالم کی تقلید کو سند بنا کر سنت کی پیروی کو ترک کیا ہوا ہو۔ ایسے فقہا کی طرف توجہ نہ کرنی اور ان سے دور رہنے میں خدا کا تقرب جاننا چاہیے۔

وصیت دُوُم

امر بالمعروف: امر بالمعروف کے متعلق جو بات میرے دل میں ہے وہ یہ ہے کہ فرائض اور شعائر اسلام کے لئے سختی ہے۔ امر معروف کرے اور گناہ کبیرہ کو سختی سے منع کرے اور جو لوگ کہ سلسلہ میں تساہل کریں ان سے میل جول نہ رکھے اور ان کا دشمن بنے اور ان تمام احکام میں جن میں متقدمین کا اختلاف رہا ہے، اس امر معروف ونہی منکر کا آگاہ کر دینا

ہے اور بس یہی کافی ہے اور سختی مناسب نہیں ہے۔

وصیت سوم

متصوفین: اس زمانے کے مشائخ کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دینا چاہئے اور نہ ان کا مرید ہونا چاہئے کیونکہ وہ مختلف قسم کی بدعات میں مبتلا ہیں اور عوام کے غلو اور کرامات سے دھوکے میں نہ آئے کیونکہ عوام کا غلو بر بنائے رسم ہے اور امور رسمیہ کو حقیقت سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ باستثنائے چند اس زمانے میں سب کرامت فروشوں نے طلسمات اور شعبدہ بازی کو کرامات سمجھ لیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سب سے بڑی کرامت دل کے حال پر مطلع ہونا ہے اور آئندہ کے واقعات کا بتانا ہے۔

نجوم: دل کے حال اور آئندہ کے واقعات معلوم کرنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ ان طریقوں میں علم نجوم اور رمل کا باب ضمیر بھی ہے (جس سے دل کا حال معلوم ہوتا ہے) یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ نجوم میں ستاروں کی خانہ کشی اور رمل میں زائچہ کا کھینچنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر کچھ معلوم نہیں ہوسکتا۔ ہم نے تجربہ کیا ہے کہ جب ماہر نجوم نے معلوم کرلیا کہ دن کے دقائق میں سے اس وقت کون دقیقہ ہے اس سے اس کا ذہن طالع (افق شرقی کے مقابل کے بُروج) کی طرف رجوع ہوتا ہے اور تمام خانے اور ستاروں کے مقامات (بروج) اس کے ذہن کے سامنے آجاتے ہیں۔ گویا ستاروں کے بروج کے درجات طالع اس کے سامنے موجود ہوتے ہیں۔

رمل: اسی طرح رمل کا ماہر بعض وقت اپنے دل میں خیال کرتا ہے کہ میں نے فلاں انگلی کو لحیان (رمل کی پہلی شکل) اور فلاں انگلی کو فلاں شکل قرار دیا ہے اور وہ اپنے ذہن میں نقشہ جماتا ہے کہ ان شکلوں سے کیا شکلیں پیدا ہوتی ہیں یہاں تک کہ زائچہ گویا اس کے سامنے ہوتا ہے۔

کہانت: اسی طرح کہانت (پیشگوئی) اور اس کی قسمیں ہیں اور یہ فن بہت وسعت رکھتا ہے۔ کبھی کبھی جنوں کو حاضر کر کے اور کبھی کبھی ان کی بغیر حاضری کے (یہ عمل ہوتا ہے)۔

طلسم: من جملہ ان کے باب طلسم ہے کہ ستاروں کی قوتوں کو ایک صورت میں مقید کرلیتے ہیں اور اس سے دلوں کا حال معلوم کرتے ہیں۔

اعمال جوگیہ: اسی طرح جوگیوں کے اعمال ہیں کہ جوگیوں کے بعض اعمال میں دلوں کے حال معلوم کرنے اور آئندہ کے واقعات بتانے کی بہت خاصیت ہوتی ہے۔ جو اس کی تحقیق کا ارادہ رکھتا ہے، وہ ان فنون کی کتابوں کی طرف رجوع کرے۔

نیرنجات: کسی کام پر ہمت باندھنا، خوفناک شکل بن جانا اور کسی کے دل پر دل رکھنا (محبت کرنا) اور طالب کو قبضہ میں کرنا یہ سب چیزیں نیرنجات کے فنون ہیں۔ کئی اعمال ایسے ہیں جو ان کاموں تک پہنچا دیتے ہیں۔ صلاح و فجور، سعادت و شقاوت اور مقبول و مردود ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ اس طرح وجد، شوق اور اضطراب کی حالتوں کو

حاضرین میں پہنچادینا حیوانی قوت کی تیزی کے سبب سے ہوتا ہے اسی لئے جس میں حیوانی قوت زیادہ ہوتی ہے اس کا وجد زیادہ ہوتا ہے۔

ہاں یہ اعمال واحوال نیک نیتی کے ساتھ بعض صالحین بھی کرتے ہیں اور اس قدر کام ان لوگوں کی کرامات میں شمار نہیں ہوتا جیسا کہ چھپا ہوا نہیں ہے اور ہم نے بہت سے بھولے بھالے لوگوں کو دیکھا ہے کہ جب وہ یہ اعمال کسی شیخ سے حاصل نہیں کرتے تو وہ ان کو عین کرامات سمجھتے ہیں۔

اتباع شریعت: اس کا علاج یہ ہے کہ حدیث کی کتابیں مثلاً صحیح بخاری، مسلم، سنن ابوداؤد، ترمذی اور حنفی وشافعی فقہ کی کتابیں پڑھے اور ظاہر سنت پر عمل کرے اور اگر خدا تعالیٰ اس کے دل میں شوق صادق پیدا کردے اور اس راستے کی طلب غالب ہو جائے تو کتاب ''عوارف'' میں آداب نماز، روزہ، ذکر اور معموری اوقات کا جو بیان ہے اس کو اختیار کرے اور سائل نقش بندیہ میں یادداشت حاصل کرنے کے جو طریقے ہیں (ان کو دیکھے) ان بزرگوں نے ان دونوں باتوں (نور عبادت اور نسبت یادداشت) کو ایسے صاف طریقے سے لکھا ہے کہ کسی مرشد کی تلقین کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

صحبت شیخ: جب نور عبادت اور نسبت یادداشت کی کیفیت پیدا ہو جائے تو اس پر مستقیم رہے۔ اسی دوران میں اگر کوئی ایسا بزرگ مل جائے کہ اس کی صحبت سے جذب و کیفیت پیدا ہو اور اس کی صحبت کی تاثیر کا لوگوں کے قلوب پر اثر ہو تو اس کی صحبت اختیار کرے تاکہ وہ حالت جو ہونی چاہئے وہ اس کی عادت بن جائے۔ اس کے بعد گوشہ نشینی اختیار کرے اور اس ملکہ (کیفیت) میں مشغول رہے۔ اس زمانے میں ایسا کوئی آدمی نہیں ہے الاماشاء اللہ جو ہر حیثیت سے صاحب کمال ہو۔ اگر وہ ایک وجہ سے صاحب کمال ہے تو دوسری وجہ سے معطل ہے۔ پس اس سے اسی کمال کو حاصل کرنا چاہئے اور دوسری چیزوں سے صرف نظر کرنی چاہئے جو صاف ہے اسے لے لے اور جو گرد آلود ہے اسے چھوڑ دے۔

صوفیائے کرام کی نسبتیں بہت غنیمت ہیں اور ان کے رسوم کی کوئی قیمت نہیں ہے اور یہ بات بہت سے لوگوں کو ناگوار ہوگی مگر مجھے جو حکم ہے اسی کے مطابق کہنا چاہئے اور زید و عمرو کے کہنے کے مطابق نہ چلنا چاہئے۔

وصیت چہارم

صوفیا: معلوم ہونا چاہئے کہ ہم میں اور اہل زمانہ میں اختلاف ہے۔ صوفی منش حضرات کہتے ہیں کہ اصلی مطلوب فنا وبقا واستہلاک (جذب ہو جانا) اور انسلاخ (ختم ہو جانا) ہے اور شرع میں معاش کا لحاظ اور عبادت بدنیہ کے ادا کرنے کا جو حکم وارد ہوا ہے وہ اس لئے ہے کہ ہر شخص اس مطلوب (فنا وبقا) کو بجا نہیں لاسکتا۔ جس چیز کا کل حاصل نہیں کر سکتے اس کا کل بھی نہیں چھوڑنا چاہئے اور شارع نے اصل (مطلوب) کا بیان خلوص کے لئے فرمایا ہے۔

متکلمین: متکلمین کہتے ہیں کہ شریعت کے علاوہ جو کچھ ہے وہ مطلوب ہی نہیں ہے (بلکہ جو شریعت میں

آیا ہے وہی مطلوب ہے) اور ہم کہتے ہیں کہ انسان کی صورت نوعیہ کے اعتبار سے شریعت کے سوا کچھ مطلوب نہیں ہے۔

تخلیق نوع انسانی: اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نوع انسانی کی تخلیق اس طور پر ہوئی ہے کہ وہ قوت ملکیہ اور بہیمیہ کا جامع ہے (اس میں یہ دونوں قوتیں طبعی ہیں) اور اس کی سعادت اسی میں ہے کہ قوت ملکیہ کو قوی کرتا ہے اور اس کی بدبختی اس میں ہے کہ وہ قوت بہیمیہ کو طاقت پہنچادے۔

اسکی خلقت اس طور پر بھی ہوئی ہے کہ اس کا نفس اعمال واخلاق کے مختلف رنگوں کو اختیار کر لیتا ہے اور اپنی اصل میں شامل کر لیتا ہے اور مرنے کے بعد اپنے ساتھ لے جاتا ہے جیسے اس کا بدن غذا کی کیفیات کو قبول کر لیتا ہے اور اپنے میں ملالیتا ہے اس لئے وہ مرض تخمہ وتپ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اور وہ اس طور پر بھی مخلوق ہوا ہے کہ حظیرۃ القدس (ملاء اعلیٰ) سے مل سکتا ہے اور وہاں سے الہام اور متعلقات الہام کو حاصل کرسکتا ہے۔ اگر ملائکہ سے تعلق خاطر ہوگا تو مسرت وخوشی کی کیفیت حاصل ہوگی اور اگر ان سے نفرت ہے تو تنگی ووحشت ہوگی۔

بالجملہ چونکہ نوع انسانی فطرۃً اس طرح واقع ہوئی ہے کہ اگر ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو امراض نفسانیہ اکثر افراد کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ حضرت حق سبحانہ نے محض اپنے فضل وکرم سے ان کی کارسازی فرمائی اور ان کے لئے نجات کا راستہ دکھایا اور غیب کی زبان کے ترجمان حضرت پیغمبر علیہ السلام کو اپنی طرف سے ان کے پاس بھیجا تاکہ نعمت پوری ہو اور شان ربوبیت جو ازل میں ان کے پیدا کرنے کی مقتضی ہوئی دوبارہ ان کی دست گیری کرے۔

صورت نوعیہ (انسان) نے زبان حال سے مبداء فیاض سے شرع کو مانگا۔ پس اس (شرح) کا حکم جمیع افراد پر انسان ہونے کی وجہ سے لازم ہے اور اس میں خصوصیت افراد کو کچھ دخل نہیں ہے اور افراد کی خصوصیت کے اعتبار سے فنا وبقا واستہلاک وغیرہ مطلوب ہوتا ہے کیونکہ بعض افراد نہایت علو وتجرد (اعلیٰ کردار وپاک بازی) میں مخلوق ہوتے ہیں اور خدا تعالیٰ ان کو اپنے راستہ کی رہنمائی فرما دیتا ہے۔ وہ فطرت نہیں ہے بلکہ ایک شخص اس گروہ کی خصوصیت اور فردیت کی وجہ سے زبان حال سے (اس کا تقاضہ کرتا ہے) شارع کا کلام ہرگز اس معنی پر محمول نہیں ہے نہ صریحاً اشارتاً۔ ہاں ایک گروہ نے شارع کے کلام سے یہ مطالب سمجھ لئے ہیں مثلاً کوئی لیلیٰ مجنوں کا قصہ سنے اور اس کی ہر بات اپنی سرگزشت خیال کرے اور اس کو ان کے عرف میں ''اعتبار'' کہتے ہیں۔

نتیجہ: خلاصہ یہ کہ انسلاخ واستہلاک (فنا وبقا) کے مقدمات میں حدود سے متجاوز ہو جانا اور ہر کس وناکس کا اس میں مشغول ہو جانا ملت مصطفویہ میں ایک سخت مرض ہے۔ خدا تعالیٰ اس پر رحم کرے کہ جو اس کو مٹانے میں کوشش کرے۔ اگرچہ وہ دوسروں کے مقابلہ میں اصلی وفطری استعدادات رکھتا ہو۔

اگرچہ یہ بات اس زمانے کے بہت سے صوفیوں کو ناگوار ہوگی لیکن مجھے جو ایک حکم دیا گیا ہے اس کے مطابق

میں کہتا ہوں کہ زید وعمرو سے مجھے مطلب نہیں ہے۔

وصیت پنجم

صحابہ کرام کے متعلق اعتقاد: آنحضرت ﷺ کے اصحاب کے متعلق ہمیں نیک اعتقاد رکھنا چاہئے اوران کے مناقب کے سوا کوئی اور بات زبان پر نہیں لانی چاہئے اوراس مسئلہ میں لوگوں نے دوطرح سے خطا کی ہے ایک گروہ گمان کرتا ہے کہ وہ آپس میں صاف دل تھے اوران کے آپس میں بالکل اختلافات نہیں ہوئے۔ یہ صرف وہم ہے کیونکہ ان کے اختلافات پر واضح روایات گواہ ہیں اوران واضح روایات کا انکار نہیں کرسکتے اور ایک گروہ نے جب ان چیزوں کوان کی طرف منسوب دیکھا تو انہوں نے لعن وطعن کے ساتھ زبان کھولی اوروہ ہلاکت کی وادی میں گرے۔

فقیر کے دل میں یہ گزرا ہے کہ اگر چہ اصحاب معصوم نہ تھے اور ممکن ہے کہ ان میں سے بعض لوگوں سے کچھ ایسی چیزیں وجود میں بھی آئی ہوں کہ اگر اس طرح کی چیزیں دوسروں (غیر صحابی) سے سرزد ہوتیں تو وہ مورد طعن وجرح ہوتے لیکن ہمیں حکم ہے کہ ہم ان (صحابہ کرام) کی برائیوں کے متعلق خاموش رہیں اور ہمیں ممانعت ہے کہ ہم مصلحت کی وجہ سے نہ ان کو برا کہیں اور نہ طعن کریں اوروہ مصلحت یہ ہے کہ اگران کے متعلق جرح کرنے کا دروازہ کھل جائے تو آنحضرت ﷺ سے روایت منقطع ہوجاتی ہے اور روایت کے انقطاع ہونے میں ملت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور چونکہ ہر صحابی سے روایت لی جاتی ہے تو اکثر احادیث مسلسل بلا انقطاع چل آتی ہیں اورامت پر جو اوامر شرعیہ ہیں وہ کسی دلیل ہی سے قائم ہوتے ہیں اور بعض صحابہ پر روایت میں جو جرح ہوئی ہے اس سے کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔

امامیہ مذہب: اس فقیر نے آنحضرت ﷺ کی روح پرُ فتوح سے سوال کیا کہ شیعوں کے بارے میں حضرت کیا فرماتے ہیں کیونکہ وہ اہل بیت کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں اور صحابہ کرام کو برا کہتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے روحانی کلام کی ایک نوعیت سے القا فرمایا کہ ان کا مذہب باطل ہے اوران کے مذہب کا باطل ہونا لفظ امام سے معلوم ہوتا ہے۔ جب مجھے اس حالت سے افاقہ ہوا تو میں نے لفظ امام کے متعلق غور کیا تو معلوم ہوا کہ ان (شیعوں) کی اصطلاح میں امام معصوم ہوتا ہے اوراس کی اطاعت فرض اور وہ مخلوق کے لئے مقرر ہوتا ہے اور وہ امام کے حق میں باطنی وحی تجویز کرتے ہیں۔ حقیقت میں وہ ختم نبوت کے منکر ہیں اگر چہ زبان سے آنحضرت ﷺ کو خاتم الانبیاء کہتے ہیں۔

اہل بیت: جس طرح کہ اصحاب کرام کے متعلق ہمیں نیک اعتقاد رکھنا چاہئے اسی طرح اہل بیت کے متعلق اعتقاد رکھنا چاہئے اوران میں سے جو صالحین ہیں ان کی اور بھی تعظیم خاص کرنی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شے کے لئے اندازہ رکھا ہے۔

ائمہ اثنا عشر: اس فقیر کو معلوم ہوا ہے کہ بارہ امام (ائمہ اثنا عشر) ایک نسبت کے قطب ہوئے ہیں اور تصوف کا رواج ان کے گزر جانے کے بعد ہی پیدا ہوا ہے اور عقیدہ وشرح پیغمبر ﷺ کی حدیث کے علاوہ کسی دوسری چیز سے نہیں لے سکتے۔ ان کی قطبیت ایک باطنی امر ہے اور امر شرعی سے اسے کوئی تعلق نہیں ہے اوران میں سے ہر ایک کے احکام و اشارات اپنے بعد آنے والے پر اسی قطبیت کی وجہ سے ہیں اور جو امور امامت کہے جاتے ہیں وہ بھی اسی قطبیت کی

طرف راجع ہیں کہ وہ اپنے خالص دوستوں کو اس پر اطلاع دیتے تھے۔ ایک مدت کے بعد کچھ لوگوں نے غور کیا تو ان کے اقوال کا مطلب دوسری طرح سے بیان کر دیا۔

وصیت ششم

طریقہ تعلیم: طریقہ تعلیم تجربہ سے جو تحقیق ہوا ہے وہ یہ ہے کہ پہلے صرف ونحو کے چھوٹے چھوٹے تین یا چار رسالے طالب علم کے ذہن کے مطابق پڑھائے جائیں۔ اس کے بعد تاریخ یا حکمت عملی (سیاست مدن واخلاق وغیرہ) کی کوئی کتاب پڑھائیں جو عربی زبان میں ہو اور اسی درمیان میں کتب لغت کی ورق گردانی کرنا اور اس کے ذریعہ سے مشکل مقامات کو حل کرنا بھی بتا دیا جائے۔

مؤطا امام مالک: جب عربی زبان پر قدرت حاصل ہو جائے تو مؤطا (امام مالک) بروایت یحییٰ بن یحییٰ مصمودی پڑھائی جائے۔ [1] اور ہر گز اس کو نہ چھوڑیں کہ علم حدیث کی اصل ہے اور اس کے پڑھنے میں بہت سے فیوض ہیں اور ہمیں اس کا مسلسل سماع حاصل ہے۔

قرآن عظیم: اس کے بعد قرآن عظیم پڑھائیں اور وہ اس طرح کے بغیر تفسیر کہ قرآن پڑھائیں۔ البتہ ترجمہ پڑھائیں اور اس میں جہاں نحو یا شان نزول میں مشکل ہو تو وہاں توقف کرنا چاہئے اور تلاش کرنی چاہئے۔

تفسیر جلالین: اس سبق کے بعد تفسیر جلالین نصاب کے مطابق پڑھائیں کہ اس طریقہ میں بہت فیض ہے۔

بخاری ومسلم وغیرہ: اس کے بعد ایک وقت میں کتب حدیث صحیحین (بخاری ومسلم) وغیرہ کتب فقہ، عقائد اور سلوک اور دوسرے وقت میں کتب دانشمندی مثلاً شرح ملا جامی اور قطبی پڑھائیں۔ اس کے علاوہ جو کچھ اللہ توفیق دے۔

مشکوٰۃ: اگر ہو سکے تو ایک روز مشکوٰۃ پڑھیں اور دوسرے دن طیبی کی شرح (مشکوٰۃ) کو اسی قدر پڑھیں جس قدر پہلے دن (مشکوٰۃ) پڑھی تھی۔ اس میں بہت فائدہ ہے۔

وصیت ہفتم

اتباع عرب اول: ہم لوگ مسافر ہیں کہ ہمارے بزرگ ہند میں مسافرانہ آئے ہیں۔ عربی نسب اور عربی زبان دونوں پر ہمیں فخر ہے کیونکہ یہ دونوں چیزیں ہمیں سید اولین و آخرین، افضل انبیاء و مرسلین فخر موجودات علیہ وعلی آلہ الصلوات والتسلیمات سے قریب کرتی ہیں اور اس نعمت عظمیٰ کا شکر یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے عرب اول کے عادات ورسوم کو نہ چھوڑیں کہ جو آنحضرت ﷺ کے اصل ہیں۔

عجم کے رسوم اور ہنود کے عادات کو اپنے معاشرہ میں باقی نہ رکھیں۔

اخرج البغوی عن ابی عثمان النهدی قال اتانا کتاب عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالی

عنه و نحن باذربیجان مع عتبة بن فرقد اما بعد فاتزرو وارتدو وانتعلوو القوا الخفاف والقوالسرا ویلات علیکم بلباس ابیکم اسماعیل وایاکم والتنعم وزی العجم و علیکم بالشمس فانها حمام العرب وتمعددو واخشوا اشنوا واخلو لقوا، واعطو الرکب وانزوا نزوا و ارموا الاغراض و فی روایته وانزو علیٰ ظهور الخیل نزواً

''بغوی نے ابوعثمان نہدی سے روایت کی ہے کہ ہمارے پاس (ابوعثمان کے پاس) اس وقت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خط آیا جب ہم آذربائیجان میں عتبہ بن فرقد کے ساتھ تھے (حمد و نعت) کے بعد تہبند باندھو اور چادر اوڑھو اور نعلین پہنو اور موزے چھوڑ دو اور پاجامہ نہ پہنو اور اپنے باپ اسماعیل علیہ السلام کا لباس اختیار کرو اور اپنے کو ناز و نعمت اور عجمی شکل و صورت سے دور رکھو اور دھوپ میں بیٹھا کرو کہ دھوپ عربوں کا غسل ہے اور قوم معد کی طرح ہو جاؤ اور سخت لباس (موٹا کپڑا) پہننے کی عادت ڈالو۔ اونٹوں کے قافلے بناؤ اور جست کر کے گھوڑوں پر سوار ہو اور تیر اندازی کی مشق کرو اور ایک روایت یہ ہے کہ گھوڑوں کی پیٹھ پر کود کر سوار ہوا کرو۔''

نکاح بیوگان: ہندوؤں کی یہ بھی ایک بری عادت ہے کہ جب کسی عورت کا خاوند مر جاتا ہے تو اس کو اجازت نہیں ہوتی کہ وہ دوسرا شوہر کرے۔ یہ رسم عرب میں کبھی نہ تھی۔ آنحضرت ﷺ سے پہلے نہ آنحضرت کے زمانے میں اور نہ آنحضرت ﷺ کے بعد۔ خدا تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے جو اس رسم کو مٹائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو سکے تو عوام الناس سے (یہ مراسم) ختم کر سکے تو اپنے قبیلے میں عادات عرب کو جلدی جاری کرے اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو ان عادات کو برا سمجھنا چاہئے اور ان کا دل سے دشمن ہونا چاہئے کہ نہی منکر کا ادنیٰ مرتبہ یہی ہے۔

مہر کا زیادہ باندھنا: ہم لوگوں کی ایک بری عادت یہ ہے کہ بہت مہر مقرر کرتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے اہل بیت (ازدواج مطہرات) کا مہر جو ہم میں سے سب سے بہترین بارہ اوقیہ اور ایک نش مقرر فرمایا ہے جس کے پانچ سو درہم ہوتے ہیں اور جو عزت کہ ہمیں دین و دنیا میں حاصل ہے اس کی انتہا آنحضرت ﷺ پر ہوتی ہے۔

مراسم شادی: ہم لوگوں کی ایک بری عادات میں سے ایک عادت خوشی کے موقع پر فضول خرچی اور بہت سے رسوم کا مقرر کرنا بھی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ولیمہ اور عقیقہ کی دو خوشیاں مقرر فرمائی ہیں اور ان ہی دونوں کو اختیار کرنا چاہئے اور ان کے سوا سب ترک کرنا چاہئے اور ان کا التزام و اہتمام نہیں کرنا چاہئے۔

مراسم موت: ہم لوگوں کی ایک بری عادت غمی کے موقع پر فضول خرچی کرنا ہے۔ سوئم، چہلم، ششماہی اور سالانہ فاتحہ ان تمام چیزوں کا عرب اول میں وجود نہ تھا۔ مصلحت یہ ہے کہ تین دن تک میت کے ورثاء کی تعزیت اور شبانہ روز ان کو کھانا کھلانے کے سوا کوئی اور رسم نہیں ہونی چاہئے۔ تین دن کے بعد کنبہ کی عورتیں جمع ہوں اور میت کی قرابت دار عورتوں کے کپڑوں میں خوشبو لگائیں اور اگر میت کی بیوی ہے تو عدت گزارنے کے بعد سوگ ترک کرے۔

عربی زبان و دینی علوم: ہم میں وہ شخص نیک بخت ہے جو عربی زبان، صرف و نحو اور کتب ادب سے مناسبت پیدا کرے اور حدیث و قرآن میں درک حاصل کرے۔ فارسی اور ہندی کتابوں، شعر و شاعری، معقولات اور ان کے علاوہ جن چیزوں کو ضروری سمجھ رکھا ہے ان میں مشغول ہونا اور تاریخ کا مطالعہ اور بادشاہوں کے واقعات اور مشاجرات صحابہ کا ملاحظہ

کرنا گمراہی در گمراہی ہے۔ اگر رسم زمانہ کے مطابق ان چیزوں میں مشغول ہونا ضروری ہو تو یہ بہت ضروری ہے کہ ان کو علم دنیا سمجھے اور ان سے نفرت کرے اور استغفار و ندامت کا اظہار کرے اور ہمیں ضروری ہے کہ حرمین شریفین میں پہنچیں اور اپنے منہ کو ان آستانوں پر ملیں۔ یہ ہماری سعادت ہے اور اس سے روگردانی کرنے میں ہماری بدبختی ہے۔

وصیت ہشتم

تبلیغ سلام بہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام: حدیث شریف میں آیا ہے۔ **ومن ادرک منکم عیسیٰ بن مریم فلیقراء منی السلام** (تم میں سے جو کوئی عیسیٰ بن مریمؑ کو پاوے تو چاہئے کہ وہ میرا اسلام پہنچائے) اس فقیر (شاہ ولی اللہ دہلوی) کی بڑی آرزو ہے کہ اگر حضرت روح اللہ (علیہ السلام) کا زمانہ پاوے تو پہلا شخص جو سلام پہنچاوے وہ میں ہوں۔ اگر وہ زمانہ مجھے نہ ملے تو میری اولاد یا متبعین میں سے جو کوئی اس مبارک زمانے کو پاوے (وہ رسول اللہ ﷺ کے) سلام پہنچانے کی بہت آرزو کرے کیونکہ ہم لشکر محمدیہ کے آخری لشکر میں سے ہوں گے۔[2]

توضیحات وحواشی

از قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی

(م 1225ھ۔1810ء)

اردو ترجمہ[3]

حاشیہ وصیت سوم (پیری و مریدی)

فقیر محمد ثناء اللہ کہتا ہے کہ شیخ کی مراد اس نصیحت سے یہ نہیں ہے کہ اس زمانے کے سب درویشوں کا منکر ہو جانا چاہئے اور ہرگز ان میں کسی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرنی چاہئے اور درویشوں کے حق میں بدگمان ہو جانا چاہئے اور ان کی کرامات کو بالعموم مکر و فریب پر حمل کرنا چاہئے اور ذوق وشوق اور اس حالت کی تاثیر کو جو حاضرین کے دلوں میں مؤثر کر دیتے ہیں حیوانی قوت کی تیزی تصور کرنا چاہئے اور بعض اچھے لوگ جو کسی نیک نیتی سے ان حالتوں کا اظہار کرتے ہیں لیکن اس بات کو کرامت نہیں سمجھے۔ بعض بیوقوف اس کو کرامت سمجھتے ہیں اور صرف صحیح بخاری اور صحیح مسلم اور حنفی اور شافعی کے فقہ کی کتابیں پڑھنی چاہئیں پھر جو خداوند تعالیٰ سچا شوق عطا فرمادے تو آداب و اذکار اور پابندی اوقات کے لئے کتاب ''عوارف المعارف'' اور یادداشت پیدا کرنے کے لئے حضرات نقش بندیہ کے رسائل دیکھنے چاہئیں اور جب عبادت کے نور کی کیفیت اور ''یادداشت'' کی نسبت حاصل ہو جائے، اس پر مواظبت کرنا چاہئے کیونکہ اگر یہ معنی شیخ کے ہیں تو پس اس نصیحت کا سنانا مخلوقات کو علم باطن کی تحصیل سے سراسر باز رکھتا ہے جو انسان تمام عالم کی پیدائش سے اصلی مقصود ہے۔ اللہ

تعالیٰ فرماتا ہے

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون (ای لیعرفون)

اور میں نے نہیں پیدا کیا جن وانس کو مگر اس واسطے کہ میری عبادت کریں۔ (یعنی میری معرفت حاصل کریں)

اور حدیث قدسی ہے:(4)

کنت کنزا مخفیاً فاجبت ان اعرف فخلقت الخلق لا عرف

میں تھا ایک پوشیدہ خزانہ پس میں نے دوست رکھا یہ کہ پہچانا جاؤں۔ پس میں نے پیدا کیا جہان کو تا کہ میں پہچانا جاؤں۔

اس نصیحت کا سنانے والا متقشف شیخ ہے جو لوگوں کو بخاری ومسلم اور ہدایہ پڑھوا کر زہد خشک کی طرف بلاتا ہے اگر اس طور پر خداشناسی حاصل ہو جاتی تو علم ظاہر کا ہر ایک عالم ولایت کے مرتبہ کو پہنچ جاتا اور ''عوارف المعارف'' ورسائل حضرات نقش بندیہ کے مطالعہ سے اگر (دلی مقاصد) کا دروازہ کھل جاتا تو مجذوبیت اور سالکیت کی نسبت حاصل کرنے کی ضرورت نہ پڑتی اور ذکر کی کثرت اور اوقات کی پابندی سے عبادت کا نور ہاتھ آ جاتا ہے مگر دوام حضور اور ''یادداشت'' میسر نہیں ہوتی ہے اور زہد خشک اور عبادت کے نور سے کب تک قربیت کے مراتب طے کر سکتا ہے۔ حضرت مولوی معنوی روم فرماتے ہیں۔

سیر زاہد در شب یک روزہ را　　　سیر عارف ہر شے تا تخت شاہ

حضرات صوفیہ قدس اللہ اسرارہم نے قربیت کا ادنیٰ مرتبہ خداوند تعالیٰ کے فرمان کے مطابق پچاس ہزار برس کا راستہ قرار دیا ہے۔ قولہ

تعرج الملئکۃ والروح الیہ فی یوم کان مقدارہ خمسین الف سنۃ.

فرشتے اور روح خداوند تعالیٰ کی طرف بلند ہوتے ہیں۔ ہر روز جس کا اندازہ پچاس ہزار برس کا راستہ ہے۔

پس آدمی انسانی طبعی عمر میں عبادت میں کوشش کرنے سے اس قدر مسافت کب طے کر سکتا ہے بلکہ اس نصیحت کا کرنا درویشوں کی جماعت کی طرف بدگمانی کا سبب ہوگا اور قرآن وحدیث اور (بزرگوں) کے اقوال کے خلاف (ہوگا) بیت

ہر کرا جامہ پارسا بینی　　　پارسا دان و نیک مرد انگار

خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

ظن المومنون والمومنات بانفسھم خیرا

مومنین اور مومنات اپنے اور دوسروں کے حق میں حسن ظن رکھیں۔

بلکہ شیخ کی مراد یہ ہے کہ ہمیشہ عالم لدنی کی طلب میں رہنا چاہئے اور صوفیا کرام کی نسبتوں کو غنیمت کبریٰ جاننا چاہیے اور اہل اللہ کی تلاش کرنی چاہئے۔ پس ایسے بزرگ کو پالے کہ جس کی صحبت جذبیہ نسبت کی کنجی ہو اور اس کی صحبت کی تاثیر خلقت کے دلوں میں جانشین ہوتی ہو تو اس سے صحبت رکھنی چاہئے تا کہ مطلوبہ حالت یعنی ''یادداشت'' اور دوام حضور حاصل ہونے کی مہارت پیدا ہو جائے گی۔ مگر علم لدنی ایک چھپی ہوئی چیز ہے اور حق باطل کے ساتھ مشتبہ ہے اور جس جگہ

زیادہ نفع کی امید ہوتی ہے وہاں کثرت نقصان کا بھی اندیشہ ہوتا ہے اور جہاں کہیں خزانہ ہے سانپ اور چور کا احتمال ہوتا ہے اس واسطے بیعت کرنے اور کسی کے ہاتھ میں ہاتھ دینے میں لازم ہے کہ جلدی نہ کرے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کا ہاتھ کسی شیطان کے ہاتھ میں پڑ جائے اور ہاتھ سے ایمان جاتا رہے۔ جب تک پورا کامل و مکمل مرشد نہ ملے ہرگز مرید نہ ہووے اور یہ نصیحت صرف اس زمانے والے کے لئے نہیں ہے بلکہ اگلے بزرگوں نے بھی ایسا ہی فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں بیت

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست　　پس بہر دستے نشاید داد دست

اور شیخ سعدی فرماتے ہیں

نگہ دارد آں مرد درکیسہ در　　کہ داند ہم خلق راکیسہ بر

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

الحزم سوء الظن[5]　　ہوشیاری بدگمانی ہے۔

خداوند تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

ان جاء کم فاسق بنبأ فتبینوا

اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لاوے تو چھان بین کرو۔

اس آیت، حدیث اور بزرگوں کے اقوال سے یہ مراد ہے کہ تمام مخلوق سے حسن ظن رکھنے کے باوجود دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ علم ظاہر و باطن کے حاصل کرنے میں احتیاط کرنی چاہئے اور بغیر تحقیق غیر معتبرین سے دین حاصل نہ کرنا چاہیے۔

اور شیخ کی مراد یہ بھی ہے کہ پورے کامل مرشد کی تحقیق میں یہ دیکھنا شرط نہیں ہے کہ صاحب کرامات اور خطرات قلبی پر خبردار اور اہل ذوق وشوق ہو کیونکہ ان میں سے بعض چیزوں میں جوگی اور اہل فلسفہ بھی شرکت رکھتے ہیں اور یہ امور نیک بختی کی دلیل نہیں ہیں اور بعض دوسرے احتمالات بھی ہیں جن کو بیان فرمایا لیکن حضرت نے یہ بیان نہ فرمایا کہ وہ کونسی چیز ہے جو مرشد کے کامل و مکمل ہونے پر دلیل ہے اور اس کی طرف مرید رجوع ہو فقیر وہ بات لکھتا ہے۔ جان تو اے طالب (خدا تجھ کو نیک بخت کرے) پہلے چاہئے کہ مرشد کو شرع شریف اور قرآن مجید اور حدیث شریف پر عمل کرنے والے دیکھے تاکہ پرہیزگار کا اطلاق اس پر ممکن ہو کیونکہ حق تعالیٰ نے ولایت کو پرہیزگاری میں منحصر کر کے فرمایا:

ان اولیاؤہ الا المتقون　　پرہیزگار اللہ تعالیٰ کا دوست ہے۔

اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ بعض اولیاء اللہ نے ملامت کئے جانے کا طریقہ اختیار کر رکھا تھا ظاہرا ان سے پرہیزگاری کی نشانی نظر نہیں آتی تھی اور بعض لوگوں کو ان سے باطنی فیوض پہنچے جواب دیا جائے گا کہ شاذونادر ہے اور کثرت کا اعتبار کیا جاتا ہے اور نیز شریعت اور عقل حکم کرتی ہے کہ نفع کے حاصل کرنے سے نقصان کا احتمال ہو وہاں سے بھاگنا چاہئے اور جو شخص ظاہرا پرہیزگار کی صورت رکھتا ہو اس کی صحبت میں بیٹھنا اور اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں ہے اور نقصان کا احتمال وہاں نہیں پایا جاتا ہے۔ چاہے اس سے فائدہ پہنچے یا نہ پہنچے پھر اگر اس کی صحبت نے

تاثیر کی اور وہ تاثیر علمائے ظاہر اور باطن کے نزدیک معتبر ہو ایسے شخص کی صحبت کو اکسیر سمجھنا چاہئے اور غنیمت شمار کرنا چاہئے اور اگر اس کی صحبت نے تاثیر نہیں کی یا وہ تاثیر بزرگوں کے نزدیک معتبر نہ ہو اس کی طرف نیک گمان رکھ کر ان کی صحبت ترک کر دے اور کسی دوسرے سے خدا کا راستہ تلاش کرے کیونکہ مقصود خدا ہے نہ وہ مرد۔

رباعی

باہر کہ نشستی و نشد جمع دلت — وز تو نہ رمید کلفت آب و گلت
زنہار صحبتش گریزاں می باش — ورنہ نکند روح عزیزاں بحلت

اور اگر کوئی کہے جس تاثیر کو بزرگوں نے معتبر جانا ہے واضح طور پر بیان کرنا چاہئے کہا جائے گا کہ وہ تاثیر یہ ہے کہ اس کی صحبت میں ایسی حالت پیدا ہو کہ دل دنیا سے سرد ہووے اور خدا تعالیٰ اور اس کے دوستوں کی محبت اور اچھے کام اور نیکی کی توفیق اور برے کاموں سے پرہیز اور بے زاری حاصل ہو جاوے اور اس کی صحبت سے بمقتضائے

اذا ذکرو ذکر اللہ (6) — جب یہ یاد کئے جاویں خدا یاد آوے۔

اور ہمیشگی کی حضوری نصیب ہو جائے اور خدا کی یاد میں تسلی اور دل جمعی ہاتھ آوے اور جس قدر اچھے کام کرے اور اس سے جو نسبت اور حالت اس کو حاصل ہو اس میں قوت معلوم ہو اور اس شخص سے جس قدر معصیت ظاہر ہوتی ہو اس سے اس کو تنگ دلی اور بے اطمینانی پیدا ہو اور جو نسبت اور حالت کہ اس بزرگ سے اس کو ہاتھ لگی تھی، وہ دور ہو جاوے۔ رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے

اذا اسرتك حسنتك و اسات سيتك فانت مومن

جب خوش کرے تجھ کو تیری کوئی نیکی اور ناخوش کرے تجھ کو تیری کوئی بدی تو پس تو مومن ہے۔

اس تسلی اور تنگی سے مراد ہے کہ ایسے بزرگ کو جس کی صحبت یہ تاثیرات رکھتی ہو، مرد کامل جاننا چاہئے کیونکہ وہ شخص آنحضرت ﷺ کی شریعت کا پابند اور خدا شناسی کے لئے فائدہ بخشنے والا اور عبادت کی طرف نزدیک کرنے والا اور گناہوں سے باز رکھنے والا اور نکمی عادتوں، گھمنڈ، بڑائی، ریا، حسد، کینہ، مال و دولت کی محبت اور ایسی ہی چیزوں کا دورہ کرنے والا اور اچھی عادات (7) حب فی اللہ اور بغض فی اللہ اور اخلاص، صبر، شکر، رضا، دنیا اور اس جیسے سے بچنے کے لئے مفید ہیں۔ ایسا کامل مکمل شخص اگر مل جائے تو اس کی صحبت کو غنیمت جاننا چاہئے اور اپنے کو

كالميت بين يدى الغسال — جیسے مردہ نہلانیوالوں کے ہاتھ میں۔

اس کے اختیار میں دے دینا چاہئے اور جو حالات و کیفیات پیدا ہوں ان کو شریعت کی ترازو میں تولنا چاہیے۔ اگر شریعت اس کو قبول کرے تو قبول کرنا چاہئے اور اگر شرع اس کو رد کرے تو رد کرنا چاہئے اور وجد و شوق وغیرہ حالات جو بے اختیار ظہور میں آویں اس میں وہ معذور ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اپنے قصد و ارادہ سے ان حرکات میں سے کوئی حرکت نہ کرتا ہو جن کو عقل و شرع پسند نہیں کرتے اور بزرگوں نے ان باتوں کو پسند نہیں کیا ہے اور جھوٹوں کا اعتبار نہیں اور کون سی خوبی اور خوش نیتی اس میں ہو گی کہ پاگلوں کی حرکتوں کو عقل مند اپنے اوپر جائز رکھیں۔ یہی ہے جو شیخ نے فرمایا کہ صوفیا کے رسوم محض

بے اعتبار ہیں۔

حاشیہ وصیت چہارم (اختلاف علمائے حال وقال)

فقیر محمد ثناء اللہ کہتا ہے کہ شیخ کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ صوفیا فنا و بقا کو اصلی مقصود جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شارع نے اس کو خاص لوگوں کے واسطے فرمایا ہے اور ظاہری شریعت عام لوگوں کے لئے اور متکلمین کا قول ہے کہ شرع کے فرمان کے سوا اور کوئی چیز مقصود نہیں اور حضرت شاہ ولی اللہ کہتے ہیں کہ ظاہری شریعت کہ متکلمین جس کے قائل ہیں وہ انسانی صورت نوعیہ کا مقتضی ہے۔ یعنی جب کہ وہ انسان انسانی صورت میں ہے اس پر شریعت کے ظاہری احکام جاری رہیں گے اور انسان میں صورت نوعیہ ہونے کی وجہ سے سب آدمی (عوام وخواص) برابر ہیں اور افراد کی صورت نوعیہ کو اس میں کچھ دخل نہیں ہے اور فنا و بقا اور استہلاک وغیرہ کہ جن کو صوفیائے کرام مقصود قرار دیتے ہیں وہ بعض افراد کی خصوصیت کے اعتبار سے مطلوب ہوتے ہیں۔ وہ شریعت کا حکم نہیں ہے یعنی زبان شرع اس سلسلہ میں خاموش ہے بلکہ فرد کی خصوصیت کی وجہ سے حالات اس کے متقاضی ہوئے ہیں اور شارع کا کلام صراحتاً یا اشارۃً اس پر محمول نہیں ہے۔ شاید کوئی اعتبار کے طور پر سمجھ جائے۔ (شاہ صاحب) کے اس کلام کا خلاصہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ شریعت اور چیز ہے اور فنا و بقا وغیرہ صوفیا کرام کے مطالب اور چیز جو شرع سے حاصل کئے گئے مگر اعتبار کے طور پر اور فقیر کے نزدیک حق یہ ہے کہ صوفیا کرام کے مطالب فنا و بقا وغیرہ شرع سے صراحۃً ثابت ہیں کیونکہ صوفیائے کرام کے چند عمدہ مطالب ہیں۔ پہلا تصفیہ قلب یعنی اللہ کے سوا دوسری چیزوں سے دل کو بے تعلق کرنا اور اس کی یاد میں ہلاک ہو جانا یہاں تک کہ یاد کرنے والا اپنے کو بلکہ یاد کرنا بھی بھول جائے اور اس حالت کا نام صوفیائے کرام کے نزدیک ''یادداشت'' اور ''دوام حضور'' اور ''فنائے قلب'' ہے اور شرع کی زبان میں اس کا نام احسان ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک [8]

(احسان یہ ہے) کہ خدا تعالیٰ کی عبادت کرے گویا تو اس کو دیکھتا ہے پس اگر تو اس کو نہیں دیکھتا ہے تو وہ تجھ کو دیکھتا ہے۔

مولانا روم فرماتے ہیں۔

دفتر صوفی' سواد و حرف نیست　　　خبر دل اسپیدہ ہم چوں برف نیست

اور حضرت سرور کائنات ﷺ اسی موقع پر ارشاد فرماتے ہیں۔[9]

الا ان فی جسد بنی آدم مضغة اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسدالجسد کلہ الا وھی القلب.

جان تو بیشک آدمی کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ جس وقت وہ درست ہوتا ہے درست ہوتا ہے تمام جسم اور جب وہ فاسد ہوتا ہے تو فاسد تمام جسم' جان لے کہ وہ دل ہے۔

اور دوسری حدیث شریف میں جو آیا ہے کہ بندہ جب گناہ کرتا ہے اس کے دل میں ایک سیاہ نقطہ رکھا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ سیاہی تمام دل کو گھیر لیتی ہے اور اس کی ضد قلب کی صفائی ہے دوسرے اخلاق رذیلہ سے نفس کو پاک کرنا اور اچھی عادتوں کے ساتھ آراستہ و پیراستہ کرنا اور تصوف کی زبان میں اس کو نفس کے فنا اور بقا سے تعبیر کرتے ہیں۔ اخلاق رذیلہ کی حرمت اور اخلاق حمیدہ کے وجوب کو شرع زور شور سے ثابت کر رہی ہے یہاں تک کہ ہاتھ پیر وغیرہ کے اعمال اس سلسلے میں بالکل بے اعتبار ہیں۔ ریا یعنی دکھاوے کی نماز وغیرہ جس میں اخلاص نہ ہو وہ داخل لہو ہے اور اکثر مباح اعمال جو نیک نیتی سے کئے جاتے ہیں جزائے نیک اور مقامات طے کرنے کی قربت کے سبب ہو جاتے ہیں جن کو صوفیائے کرام کرتے رہتے ہیں۔۔ پیغمبر علیہ السلام مؤکد فرماتے ہیں (10)

لایزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی اجبته فاذا اجبته کنت سمعه الذی یسمع بی الخ

میرا بندہ میری طرف ہمیشہ قریب ڈھونڈتا ہے۔ نفل عبادتوں کے ساتھ یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں پھر جو میں اس سے محبت کرتا ہوں ہو جاتا ہوں اس کا کان کہ وہ سنتا ہے مجھ سے آخر حدیث تک۔

اس حدیث سے وحدت وجود اور وحدت شہود والوں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق مطالب نکالے ہیں اور لایزال کا کلمہ قربیت کے لئے بے انتہا درجہ پر دلالت کرتا ہے۔ پس اس سے صوفیائے کرام کے مطالب شرع سے اعتبار کے ساتھ ثابت ہیں۔ پس متکلمین نے جو کہ مطالب مذکورہ شرع سے ثابت نہ ہونے کی وجہ سے بے مطلب ہیں درست ہے کیونکہ بعض متکلمین نے شریعت کے بعض احکام پر کہ شرع نے جس پر حکم کیا ہے، عمل نہیں کیا ہوگا جیسا کہ بعض آدمیوں کو حج میسر نہ ہو۔ ایسے ہی بعض لوگوں کو تصفیہ قلب اور تزکیہ نفس نصیب نہ ہوا اور صوفی نے جو کہا ہے کہ فنا اور بقا اور استہلاک اصلی مقصود ہے اور دوسرے شرعی احکام اس کے مقابلہ میں کچھ اعتبار نہیں رکھتے یہ حق ہے کیونکہ بغیر اخلاص کے نماز روزہ کچھ فائدہ نہیں بخشتے اور احسان کا درجہ السلام کے مراتب سے از روئے شرع فوقیت رکھتا ہے۔ انسان کی صورت نوعیہ نے زبان حال سے مبداء فیاض سے شرع کو مانگا تو اس میں سب سے پہلے تصفیہ قلب اور تزکیہ نفس ہی ہے اگرچہ ظاہر میں بعض لوگوں کو یہ دولت نصیب نہ ہوئی جیسا کہ دوسرے بعض آدمیوں کو ظاہری اعمال بلکہ ایمان بھی میسر نہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددناہ اسفل سافلین.

البتہ پیدا کیا ہم نے انسان کو نہایت اچھی صورت کے ساتھ پس کر دیا ہم نے اس کو سب سے بڑا مردود یعنی جب کافر ہوا اسلامی فطرت کو ضائع کر ڈالا۔

یعنی انسان کی استعداد بڑی ہے۔ شرع ایسا تقاضا کرتی ہے جو فی احسن تقویم کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور چونکہ بعض لوگوں نے اس استعداد کو ضائع کر دیا ہے اس لئے **اسفل السافلین** میں گرائے گئے۔ کمالات کے حاصل کرنے میں افراد کی خصوصیت کو دخل ہے۔ اصل اقتضا میں نہیں ہے۔ حاصل کلام شیخ نے جو فرمایا ہے کہ انسلاخ اور استہلاک کے مقدمات میں افراط اور ہر کس و ناکس کا اس میں مشغول ہونا ملت مصطفویہ میں ایک بڑا مرض ہے، فقیر کی ناقص سمجھ میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے (11)

اکثروا ذکر اللہ حتی یقولوا مجنون

خدا کا ذکر زیادہ کرو یہاں تک لوگ تم کو دیوانہ کہنے لگیں۔
کل انسانوں کے لئے عام حکم ہے۔

حاشیہ وصیت پنجم (صحابہ کرامؓ کے متعلق اعتقاد)

فقیر محمد ثناء اللہ کہتا ہے کہ امامیہ مذہب کے جھوٹے ہونے کی بابت حضرت شیخ کو رسالت مآب ﷺ سے جو کچھ واضح طور پر معلوم ہوا ہے اس کا عقیدہ نبوت کے ختم کا انکار لازم کرتا ہے۔ فقیر پر بھی اسی طرح پر ظاہر ہوا ہے۔ جس کو فقیر نے شمشیر برہنہ (12) میں پورے طور پر لکھ دیا ہے جو چاہے اس میں دیکھ لے اور حضرت شیخ نے جو کچھ ائمہ اثنا عشر کے قطب ہونے کے ثبوت کی بابت تحریر فرمایا ہے اس مضمون کو جناب امام ربانی قطب ربانی مجدد الف ثانیؒ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی بیت کی شرح میں ارقام فرمایا ہے۔

افلت شموس الاولین و شمسنا

ابداً علی افق العلیا لاتغرب

(اگلوں کے آفتاب غروب ہو گئے اور ہمارا آفتاب بلندی کے کنارے پر ہمیشہ رہے گا اور غروب نہ ہوگا)۔

اور فقیر نے یہ بھی ''شمشیر برہنہ'' میں لکھا ہے لیکن حضرت شیخ نے جو فرمایا کہ اصحاب کے آپس کے اختلافات میں آدمیوں کے گروہوں نے خطا کی ہے اور انہوں نے لعنت اور طعنہ کرنے والوں کو جیسا خاطی فرمایا ہے ویسے ہی ان کو جو یہ گمان کرتے ہیں کہ سب اصحاب آپس میں صاف دل تھے اور ہرگز ان کے درمیان کسی قسم کا اختلاف نہیں ہوا ہے، خطا کار تصور فرمایا اور یہ بیان کیا کہ ان کا یہ گمان سراسر وہم اور مشہور حدیث کے ساتھ مخالفت کر رہا ہے۔ فقیر گمان کرتا ہے کہ ان کو خطا کار ٹھہرانے میں شیخ نے خطا کی ہے اور حق یہ ہے کہ یہ اصحاب کرام آپس میں صاف دل تھے۔ قرآن مجید اس امر کا شاہد ہے۔ جناب باری تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

رحماء بینهم...... اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

الف بین قلوبهم لوما انفقت ما فی الارض جمیعاً ما الفت بین قلوبهم ولکن اللّٰه الف بینهمo

اور جن کے دلوں کے درمیان خدا تعالیٰ نے الفت ڈال دی اگر تم خرچ کرتے جو کچھ زمین میں ہے سب کے سب ہرگز تم ان کے آپس میں الفت پیدا نہیں کرا سکتے مگر یہ کہ خدا تعالیٰ نے ان کے درمیان محبت ڈال دی۔

اور مشہور حدیث ان کے ظاہری اختلافات پر دلالت کرتی ہے اور نہ ان بزرگوں کے سینہ کے کینہ پر اور ظاہری اختلاف سینہ کے کینوں پر دلالت نہیں کرتا اور اگر بعض حدیثیں اصحاب کرام میں سے کسی خاص بزرگ پر یہ دلالت کرتی ہیں کہ وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بغض رکھتے تھے اگرچہ یہ صحت کے درجہ کو پہنچی ہو مگر حدیث آحاد ہے جو یقین کرنے کا سبب نہیں ہو سکتی اور یہ ممکن نہیں ہے کہ اس میں تاویل نہ ہو سکے پھر وہ حکم اکثر پر نہیں پھر ایک بزرگ پر لگایا جا سکتا ہے بلکہ ظاہر یہ ہے کہ یہ

اختلافات اجتہادی خطا سے ہوئے ہیں جیسے حنفی اور شافعی مذہب کے اختلافی مسائل ہیں اور اگر ان تمام اختلافات کو محض خطا پر مبنی سمجھا جائے تو حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما جو جناب علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے مقابلہ میں جمل کی لڑائی میں شہید ہوئے ہیں، شہید نہیں ہوں گے کیونکہ باغیوں کو شہید نہیں کہہ سکتے حالانکہ بعض صحیح احادیث سے ان کی شہادت ثابت ہے۔ رسول مقبول نے فرمایا ہے[13]

فانما علی نبی او صدیق او شهید

(مشکوٰۃ شریف میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ حوا پہاڑ پر آنحضرت ﷺ، حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ تھے۔ یکایک ایک پتھر ہلنے لگا۔ حضرت علی نے فرمایا مت ہل کیونکہ تجھ پر ایک نبی اور ایک صدیق اور ایک شہید ہیں)۔

اور اس وجہ سے حضرت مجدد الف ثانی نے اس شخص کا کہ جس نے اس خطا کر خطائے منکر کہا ہے، ردو انکار فرمایا ہے اور شیخ نے جو یہ فرمایا کہ اگر چہ بعض عوام صحابہ سے ممکن ہے کہ ایسی چیزیں وقوع میں آئی ہوں کہ اگر ان جیسی چیزیں اوروں سے سرزد ہوتیں تو ان پر طعن و جرح کیا جاسکتا لیکن ہم مامور ہیں کہ ان کی برائیوں سے زبان سے روکیں اور ہم ایک مصلحت کی وجہ سے ان کو برا کہنے اور طعن کرنے سے منع کئے گئے ہیں اور وہ مصلحت یہ ہے کہ ان پر جرح کرنے سے رسول مقبول ﷺ کی روایت منقطع ہوتی ہے اور روایت کے منقطع ہونے سے دین کی خرابی ہے۔ یہ سب عبادت اس ناقص العقل کی ناقص عقل میں نہیں آتی ہے۔ صحابہ کرام کا باہمی نزاع جو مذکور ہوا کسی معتبر ذریعہ سے ثابت نہیں ہے۔ جو بات غیر صحاب میں جرح اور طعن کا سبب ہو کیوں اصحاب کرام میں طعن اور جرح کا سبب نہ ہوگی؟ حدود اور تعزیرات جیسے غیر اصحاب میں جاری ہیں ویسے ہی اصحاب کرام میں جاری ہوئیں۔ پس یہ کہنا کہ اصحاب کبار میں سے ایک جماعت کی حدیثیں امت نے اس وجہ سے مانیں کہ اگر چہ ان پر طعن کرنے کے اسباب بھی پائے جاتے تھے مگر کسی مصلحت سے وہ طعن موقوف رکھا گیا صحیح نہیں بلکہ درحقیقت ان پر طعن کرنے کا سبب نہیں پایا جاتا ہے اور اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ نے فرمایا

خیر القرون قرنی الخ سب زمانوں سے اچھا میرا زمانہ ہے

اور حق سبحانہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے

کنتم خیر امة اخرجت للناس ہو تم اچھے گروہ نکالے گئے ہو واسطے آدمیوں کے۔

الصحابة کلهم عدول اصحاب کے باد سب سے سب عادل ہیں۔

اور اگر یوں ہی مان لا جائے کہ حدیث شریف کے رد کرنے کی علت بعض اصحاب کبار میں پائی جاتی ہے اور کسی مصلحت کی وجہ سے ان کی مروجہ حدیثیں رد نہیں کی جاتیں۔ اس صورت میں ان پر کون سا اعتبار باقی رہے گا جو خبر حقیقت میں منقطع ہے اور اعتبار کے لائق نہیں ہے اس کو منقطع نہ کہنا اور اس پر اعتبار کرنا گویا دین میں پورے طور پر خلل پیدا کرنا ہے جیسا کہ عقلمندوں پر پوشیدہ نہیں۔ پس ان کی برائی سے کف لسان کرنا ان کے پاک ہونے کی کی دلیل ہے۔ ان کی شان میں یہ حدیث وارد ہوئی ہے

اصحابی کالنجوم فبایهم اقتدیتهم اهتدیتهم

میرے اصحاب سب کے سب ستاروں کی مانند ہیں۔ پس تم نے جس کی بھی پیروی کی ہدایت نصیب ہوئی۔ نہ یہ کہ باوجود ان کی برائیوں کے برائی کے ساتھ ان کو یاد نہ کرنے کے لئے ہم حکم کئے گئے کیونکہ محض برائی کے ساتھ یاد نہ کرنے کا تو عام حکم ہے۔ ہم کسی مسلمان کو امت میں سے برا نہ کہیں اور تمام مسلمانوں کی غیبت سے باز رہیں۔

حاشیہ وصیت ہفتم (مخالفتِ رسومِ عجم و ہند)

فقیر محمد ثنا اللہ کہتا ہے کہ اس سے مراد آنحضرت ﷺ کا پورا اقتداء کرنا اور سچی محبت پیدا کرنی ہے اور اس کی بعض باتوں پر عمل نہ کرنے سے جیسے شادی و غمی میں ناحق فضول خرچی کرنا ملامت کیے جانے اور گناہ گار ہونے کے باعث ہے مگر پوشاک جیسے چادر، تہبند، نعلین، اور اسی طرح کی دوسری چیزیں اس زمانے میں انگشت نما ہونے کا سبب ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے انگشت نمائی سے منع فرمایا ہے جیسے یہ حدیث

حسب امراء من الشران یشار الیه بالاصابع فی دینه او دنیاه

مرد کے لئے یہ کیا تھوڑی برائی ہے کہ اشارہ کیا جائے اس کی طرف انگلیوں سے اس کے دین یا اس کی دنیا میں پس چاہیے کہ عوام مومنوں کی طرح لباس پہنیں اور حضرت عمرؓ نے جو تہبند، چادر اور نعلین وغیرہ پہننے کے واسطے فرمایا تھا اس زمانے میں سب مسلمانوں کی وہی عادت تھی لہٰذا امتیاز اور انگشت نمائی کا سبب نہ تھی پھر لوگوں نے فرق کرلیا۔

تصنیفِ رنگین

آغاز

1	یا الٰہی تو مجھ کو دے توفیق	نیک توفیق ہوئے میری رفیق
2	تا بنے مجھ سے دین کا کچھ کام	دل کو تسکین ہو جی کو ہو آرام
3	میرا دنیا سے دل اچٹ جاوے	صاف اِدھر سے اُدھر کو ہٹ جاوے
4	بن ترے اور سے رکھے نہ یہ کار	رکھے تیرا ہی دھیان لیل و نہار
5	جی میں ہے ایسی مثنوی کہوں ایک	پڑھ کے تعلیم ہوں جس سے بد و نیک (14)
6	دو سو اور ساٹھ اس کے ہوں اشعار	بیش و کم ایک بھی نہ ہو زنہار

7	اور ایسا کچھ اس کا ہوئے بیان	جس سے احکام شرع ہوئیں عیاں
8	سو لکھا چاہتا ہوں یہ احوال	گوش دل سے سن اس کو کر کے خیال
9	لڑکا جس روز سے کہ ہو پیدا	اور جی کر بہت وہ ہو بوڑھا
10	پیدا ہونے کے دن سے مرنے تک	لکھوں احوال اس کا میں یک یک
11	جب وہ اس خاکداں سے جائے گزر	یعنی اپنی اجل سے جائے وہ مر
12	اتنے عرصہ میں وارث اس کے ساتھ	کریں کیا کیا مدام ہاتھوں ہاتھ
13	اس سے جو جو معاملہ ہے ضرور	شرع موجب لکھوں وہ تا مقدور
14	کروں تحقیق کر کے اس کو رقم	کہ نہ ہو بیش اس سے اور نہ کم
15	گرچہ جی میں یہ بات ہے ٹھانی	پر مجھے یہ سخت حیرانی
16	کہ مسائل کا ہے بیان مشکل	اس پہ یوں ہی چلا نہ بیٹھے دل (15)
17	ہیں مسائل، مقدمات دیں	علم فقہ و حدیث مجھ کو نہیں
18	اس کے قابل نہیں ہے میری زباں	نظم میں کس طرح کروں گا بیاں
19	کہہ گیا تھا قدیم ایک استاد	وہ مجھے بر محل ہے آیا یاد
20	"مثل من نیست درجہاں ثانی	حروف خوانے زلوح نادانی"
21	گرچہ حیران میں ہوں اے رنگین	پر مرے دل کو اس سے ہے تسکین
22	کہ وہ مرا کریم ہے ستار	وہی کردے گا میرا بیڑا پار
23	اس کا گر ہو کرم تو ہو سب کچھ	اس کے بن فضل ہو سکے کب کچھ
24	میں اسی فکر میں تھا گھبرایا	کہ یہ میرے خیال میں آیا
25	شاہ عبدالعزیز کے والد	ایک رسالہ گئے ہیں لکھ بے ضد (16)
26	ہے وصیت کے طور سے وہ تمام	اس سے ہیں بہرہ مند خاص اور عام
27	وہ کہیں سے جو میرے ہاتھ آوے	تو مری آرزو نکل جاوے
28	بارے مدت میں اب وہ ہاتھ آیا	شکر للہ کہ سب وہ ہاتھ آیا
29	جی میں آیا کہ نظم ہو جو یہ سب	تو میرا حاصل اس سے ہو مطلب
30	نثر یہ نظم ہو جو مجھ سے تمام	تو سند سمجھیں اس کو خاص اور عام
31	عمل خیر یہ رہے مجھ سے	عرض ہے اے کریم یہ تجھ سے
32	جو پڑھے اس کو سروہ کرینگا (17)	مانگے رو رو کر یہ میرے حق میں دعا
33	اور تجھ کو بھی رحم آجاوے	تو گنہ میرے عفو فرما دے
34	کریں سب دوست میرے اس پہ عمل	ان کی فہمید میں نہ آوے خلل

35 میرے حق میں دعائے خیر کریں   غصے ہو کر نہ مجھ سے بیر کریں
36 جتنی میری ہے آل اور اولاد   رکھے ہر ایک اس کو پڑھ کر یاد
37 سیر ہو ایک دم نہ اس سے کوئی   رکھے باہر قدم نہ اس سے کوئی
38 جو مسلمان ہے وہ مانے اسے   معتبر اور صحیح جانے اسے
39 اس کے احکام جو کرے نہ قبول   اس سے راضی نہ ہوں خدا اور رسول
40 اسی امید پر اٹھا کے قلم   اب تو کرتا ہوں اس کو یوں میں رقم

2- بیانِ شرک [18]

41 ہے تجھے وقت فرصت آج اے دل   پہلے کر شرک کا علاج اے دل
42 تجھ سے کہتا ہوں میں، یہ بات ہے سچ   شرک آفت بڑی ہے، اس سے بچ
43 فکر اسلام میں تو رہ دائم   پہلے کر اپنے دین کو قائم
44 وہی خالق ہے، ٹھیک اس کو جان   وحدہ لاشریک اس کو جان
45 کون پہنچا سکے ہے نفع و ضرر   التجا اس بن [19] اور سے مت کر
46 خیر و شر اس کی طرف سے ہی جان   اور کہنا کسی کا تو مت مان

3- بیانِ رسوماتِ خلق

47 خلق میں ہے یہ رسم جس کا اسم   سو وہ ہے رسم ایک، ہزاروں قسم
48 رسم ہو خوب یا کہ ہوئے بری   پھیر دے تو گلے پہ سب کے چھری
49 کیونکہ خرچ اس میں یا تو ہوگا مال   یا حرج ہوگا تجھ کو اس میں کمال
50 ہیں بظاہر یہ دو ترے نقصان   نفع کی بات ہے اسے تو مان
51 کر ارادہ تو پہلے فتویٰ کا   بن تو پھر پیرو اہل تقویٰ کا
52 اپنی فتویٰ سے بسر اوقات   لیکن تقویٰ کا دھیان رکھ دن رات
53 میرا مذہب ہے مذہب حنفی   سب پہ روشن ہے یہ جلی و خفی
54 چاروں مذہب کو جانتا ہوں حق   لیک بھاتا ہے مجھ کو اس کا نسق
55 سو میں اس کا بیان کرتا ہوں   خوب سا چھان چھان [21] کرتا ہوں
56 پر تو سننے کے کان پیدا کر   دین و دنیا کا مان پیدا کر [22]

57	سن کے اس کو نہ ہو کے بیٹھ تو سن[20]	دھیان رکھ، گوش دل سے اس کو سن
58	جب تو دارالبقا کو جاوے گا	ثمر اس کا وہاں تو پاوے گا
59	کر سب احکام شرع کو تو قبول	تا کہ خوش تجھ سے ہوں خدا اور رسول
60	اب سن احکام شرع کا تو بیان	تا کہ ہو جائے سب وہ تجھ پہ عیاں

4- بیانِ تولدِ اولاد

61	جس کے پیدا ہو آل یا اولاد	اس کو لازم ہے وہ رکھے یہ یاد
62	دے اذاں گوش راست میں یک بار	چپ میں تکبیر کو کرے اظہار
63	سات دن تک کرے کچھ اور نہ ذکر	ساتویں دن کرے عقیقے کی فکر
64	ہے جو لڑکا تو بکرے دو وہ لے	ذبح للہ ان کو وہ کردے
65	اور جو لڑکی ہے تو تو ہے یوں نیک	بکرا[23] بازار سے منگا دے ایک
66	لیک ثابت ہوں اس کے ناک اور کان	کسی عضو اس کے میں نہ ہو نقصان
67	احتیاط اس کی مثل قربانی	سنت، انسان[24] پر ہے اے جانی
68	شرط قربانی میں ہیں جو احکام	ان ہی شرطوں کو اس میں کر تو تمام
69	نر و مادہ کا کچھ نہیں ہے فرق	کرلو اپنی چھری کو خون میں غرق[25]
70	پہلے سنت عقیقہ تھا بہ صلاح	اب اسے جان رکھ کہ ہے یہ مباح
71	گر تو اس کو کرے تو ہے یہ خوب	نہ کرے تو نہیں ہے کچھ معیوب
72	اس کے سر پر سے اتریں جتنے بال	وزن چاندی کے ساتھ انہیں کر ڈال
73	دے فقیروں کو مستحب اسے جان	کچھ یہ واجب نہیں ہے کہنا مان

5- بچہ کا اچھا نام رکھنا اور چھٹی کرنا

74	ہو چکے جب کہ سب عقیقے کا قسم	سوچ کر تب رکھ اس کا اچھا اسم
75	یعنی اچھوں کے نام پر ہو نام	پر نہ ہو اس میں لفظ بخش[26] وغلام[27]
76	اور جو نام خدا کے ہو ہمراہ	تو نہایت ہی خوب ہے باللہ
77	حق یہ بیٹے کا باپ پر ہے یقین	ہے یہ بے شبہ اس میں فرق نہیں
78	بس یہی ہے چھٹی[28] شریعت کی	بات کہہ تجھ سے دی حقیقت کی

6- بیانِ سالگرہ

79	ہے یہ بے ہودہ کرنی سال گرہ	مت کر اس کو یہ ہے وبال گرہ
80	گھونگھرو بچوں کے پاؤں میں مت ڈال	دے گا شیطان اس پہ ناچ کی تال

7- بچہ کو دودھ پلانے کی مدت

81	اور جو تو چاہے دودھ ان کا چھڑائے	تو یہ لازم ہے اسے تو نہ بڑھائے
82	لڑکا لڑکی کا ایک ہے احکام	کہ پئیں پونے دو برس وہ مدام
83	یا پئیں وہ دو برس تلک وہ شیر	ہے کتابوں میں یوں کیا تحریر
84	شادی[29] اس کی کچھ نہیں ہے ضرور	دل سے کر ایسی واہیات کو دور[30]

8- رسمِ بسم اللہ

85	پانچوں سال میں گدا اور شاہ	طفل کو ہیں پڑھاتے بسم اللہ[31]
86	شروع میں اس کا کچھ بیان نہیں	میں بیان کیا کروں زبان نہیں
87	لیک مشہور خلق میں ہے یہ رسم	کرتے شادی ہیں اس کی ہر ہر قسم
88	شرع میں اس کو کہتے ہیں اسراف	بس تجھے کہہ دیا یہ میں نے صاف
89	کچھ کتابوں میں اس کا ذکر نہیں	اس لئے مجھ کو اس کی فکر نہیں
90	ہاں وہ جب طفل پڑھ چکے قرآن	تب ہو خوش قسمت سارے پیر و جواں
91	کھانا مقدور بھر پکا للہ	دیں کھلا خلق کو گدا اور شاہ
92	اور اس بن کریں نہ کچھ زنہار	کہہ دیا اور کہوں گا پھر سو بار

9- تاکیدِ نماز

93	گزریں جب سات سال تب ہے مفید	کریں اس کو نماز کی تاکید
94	دس برس کے کو پھر نماز پڑھائیں	ماریں آپ اس کو اور ماد دلائیں

10- بیانِ ختنہ

95 ختنہ کرنا ہے سنت اس کو کر — لیک حد بلوغ کے اندر
96 عذر ہو تو بلوغ کے بھی بعد — ہے اجازت تجھے تو کر اے سعد
97 ہو مسلمان اگر کوئی ہندو — اس کا ختنہ ضرور ہی کر تو
98 مطلق اس کے نہ کر[32] تو سن کا خیال — ختنہ اس کا ضرور ہی کر ڈال
99 عقل سے تیری گرچہ ہے یہ دور — ختنہ پر اس بلاد میں ہے ضرور
100 اس کو کہتے ہیں شرع کے والی — مصلحت سے نہیں ہے یہ خالی[33]

11- آموختنِ کسب

101 پہنچے حد بلوغ کو جب وہ — اس کو لازم ہے یہ کرے تب وہ
102 سیکھے پہلے تو کسب کامل کو — تا معیشت سے چین ہو دل کو
103 سیکھیں وہ کسب جس کا ہوئے رواج — تا کسی کا کبھی نہ ہو محتاج
104 کسب لیکن ہو کوئی کسب حلال — کرے ہرگز حرام کا نہ خیال
105 جب معیشت سے ہوئے اطمینان — تب کرے حکم شرع کا وہ دھیان
106 باندھے ہمت کی وہ کمر کو چست — کرے اسلام و دیں کو اپنے درست
107 عقل کو اپنی کام فرماوے — کسی عالم کے پاس وہ جاوے
108 پر وہ عالم کہ ہوئے نیک اوقات — سیکھے اس سے طریق صوم وصلوٰت
109 شرک کو دور پردہ دل سے کرے — کام اتنا ضرور دل سے کرے
110 وہی مالک ہے ٹھیک اسے جانے — وحدہ لاشریک اسے جانے
111 تیسوں روزے نماز' حج و زکات — موقع موقع سے وہ کرے دن رات
112 سارے رسم و رسوم کو چھوڑے — جہل کے سب علوم[34] کو چھوڑے
113 جب شریعت کو کر چکے حاصل — تب اسے چاہئے کہ وہ عاقل
114 طلب حق کی پھر تلاش کرے — شوق حق میں بسر معاش کرے
115 پھر کے سارے جہاں میں کر محنت — کرے ایسے سے جا کر وہ بیعت
116 کہ شریعت سے جو ہوا آگہہ[35] خوب — اور طریقت میں وہ رہا ہو ڈوب
117 اس کی حالت سے خوب ہو ماہر — دیکھ کے اس کا باطن و ظاہر

118	ملے ایسا فقیر جب کامل	علم باطن کو اس سے کر حاصل
119	صبر و شکر ہی کرے دن رات	اپنی یوں ہی بسر کرے اوقات
120	کرے صبر اور شکر اتنا مدام	کہ وہ ہو جائے اس کا تکیہ کلام
121	اس بن انسان کی کیا حقیقت ہے	گر نہ ہو یہ تو پھر فضیحت ہے
122	اب مرے دل میں آسمائی ہے یہ	دولت اکسٹھ (36) برس میں پائی ہے یہ

12- بیانِ نکاح

123	شرع میں ہے نکاح کا یہ اصول	مرد و زن کر لیں ہم دگر کو قبول
124	یعنی ایجاب و قبول ہو جب	ہے مقرر نکاح ہوتا تب
125	پر یہ شرط اس میں ہے کہ دو ہوں گواہ	تا کہ وہ شاہدی (37) بھریں للہ
126	لیکن عورت اگر ہو مستورا	چاہیے ایک وکیل اسے پورا
127	پورا یہ ہے مرد ہو دیندار	یاد رکھ سن کے اور نہ کر تکرار
128	شیرینی جوڑے (38) ساچق اور نوبت	روشنی مہندی (39) بد ہیں سب، کرمت
129	سہرا اور بدھی اور پان اور پھول	یہ جو رسمیں ہیں سب ہیں نامعقول
130	ہے جو آرائش اس کو بھی بد جان	ناچ، تو جتنے بد ہیں سب کی ہے جان
131	ساری رسموں کو ہم دگر ہے میل	لغو چوتھی بھی ہے اسے بھی نہ کھیل
132	خرچ کرنا ہی مال ہے منظور	تو یہ کر تو کہ ہے یہ بات ضرور
133	جتنا مقدور ہو پکا کے طعام	بانٹ اس کو کہ کھائیں خاص اور عام
134	کھانا بعد از نکاح کے ہے دیا	ہے رسالت مآبؐ نے بھی کیا
135	سنت اس کو مؤکدہ تو جان	اس سوا اور کچھ نہ کر اے جان
136	عرب اس کو ولیمہ کہہ کے مدام	کھاتے تھے اور کھلاتے تھے وہ طعام
137	خاص کے تو عمل کا ہے یہ نمط (40)	پر جو سمجھے ہیں عام، سو ہے غلط

13- مقدارِ مہر

138	مہر کا انتہا ہے دس ہی درم	مہر اس سے نہ باندھنا چاہئے کم
139	دس درہم کی جو پوچھے مجھ سے تو بات	تو ہے دو تولے اور ماشے سات

140 بلکہ افزوں ہے اس سے آدھا جو — میں نے ثابت کیا ہے کرتگ و دو
141 اس کے ہوتے روپے ہیں پونے تین — اس میں کچھ شک نہیں جان یقین
142 اس سے باندھے جہاں تلک افزوں — اس میں ہرگز نہیں چرا اور چوں
143 دینا ہوگا تجھے وہ قرض ہی جان — اپنے ذمہ پر اس کو فرض ہی جان
144 جانے اپنا جہاں تلک مقدور — مہر اپنا بندھا تو اتنا ضرور
145 مہر حد سے زیادہ بندھوا مت — قرض کرنے پر تو نہ کر جرأت

14-ایامِ حیض میں مقاربت

146 ہوئے عورت جو حیض سے تو ڈر — اس سے ہرگز مقاربت مت کر
147 پر جو ہوجائے ابتدا میں یہ کار — تو ہے کفارہ اس کا ایک دینار
148 اور جو آخر میں ہو تو آدھا جان — ہے حدیثوں میں اسطرح سے بیان
149 حنفی فقہ میں نہیں ہے لکھا — خوب تحقیق اسے ہے میں نے کیا
150 جس کو کہتے ہیں شرع میں دینار — سو وہ سونا ہے ماشے ساڑھے چار

15-ایامِ حمل میں مقاربت

151 جو تو چاہے کرے میں حمل میں یہ کام — تو رہے یہ خیال تجھ کو مدام
152 کہ نہ ہو جب تلک اسے تکلیف — تب تلک شوق سے بن اس کا حریف
153 یعنی عورت اگر ہو راضی یوں — تو پھرے ٹاپتا تو ناحق کیوں
154 نہ ہو اس کو تکلیف تو مت تھک — شوق سے کھیل کود جننے[41] تک
155 جب تلک اس کی ہو رضا مندی — شرع میں تب تلک نہیں بندی[42]
156 جن[43] کے گر ہو نفاس میں عورت — اس سے بھی تو مقاربت کر مت

16-وصیتِ میّت

157 مرتے دم جو کرے وصیت خوب — دیکھ بد، یا ہے اس کی نیت خوب
158 گر وہ از روئے شرع کے ہے درست — تو کمر باندھ اپنی اس پر چست

159 اور جو وہ غیر شرع ہو اے یار تو اسے بھی تو بجا نہ لا زنہار
160 لغو ہے وہ کلام، پلوچ اسے جان کچھ کہے خلق تجھ کو مت مان

17- بیانِ حالتِ نزع

161 جس مسلمان کو جاں کندن اس کا تیار رکھے گور و کفن
162 بیٹھا جو پاس اس کے ہو انساں پڑھے وہ آپ کلمہ اور قرآں
163 یا کرے اپنے منہ سے ذکر اللہ اہل اسلام کی یہی ہے راہ
164 کہ وہ طاقت جو اپنے میں پاوے تو پڑھے، ورنہ اس کو سن جاوے
165 واسطے اس کے یہ بہت ہے مفید در ایمان کی یہی ہے کلید
166 پانی مانگے تو اس کو آب بھی دے شہد بھی دے اسے گلاب بھی دے
167 اور جو جو کہ ہو مناسب حال دے بذوق اس کو کچھ نہیں ہے وبال

18- بیانِ فوت شدن وگریہ زاری کردن

168 بعد پھر اس کے جب وہ مر جاوے یعنی ہستی سے جب گزر جاوے
169 تو پھر اس کے ہوں جو کہ دوست حبیب اور جو اقربا ہوں اس کے قریب
170 وہ نہ ماتم کریں، اڑائیں نہ خاک اور گریباں کریں نہ اپنے چاک
171 کوٹیں سینہ نہ منہ پہ ماریں ہاتھ روئیں پیٹیں نہ مل کے سارے ساتھ
172 اور منہ سے بیان بھی نہ کریں سر پر اپنے وبال یہ نہ دھریں
173 ساری باتیں یہ شرع میں ہیں حرام ترک کران کو، تاکہ ہو آرام
174 جو فقط اشک لائے آنکھ میں بھر اس کو رونے دے منع تو مت کر

19- بیانِ غسل وگور وکفنِ میّت

175 اقربا مل کے غسل دیں اسے سب غسل کا طور بھی بتا دوں اب
176 تختہ نہلانے کا جو ہو موجود اس کو سب دیں بخور عنبر و عود
177 مستحب جان کر اسے کرنا کہ سبھوں کو ہے آخرش مرنا

178	پانی سادہ جو گرم ہو اے یار	پہلے تو غسل اس سے دے یک بار
179	دوسرا غسل ایسے پانی سے دے	جوش جس میں ہوں پتے بیری کے
180	تیسرا غسل اس سے دے، کر ہوش	ڈال کافور جو کیا ہو جوش
181	غسل اس طرح سے ہے بہتر شے	ورنہ پانی فقط ہی کافی ہے

20- بیان تیاری جنازہ

182	غسل سے اس کے جب فراغت ہو	تب تلیں اسکے سات جا خوش بو
183	دونو تلوؤں میں اور دونو زانو پر	دونو ہاتھوں پہ ساتویں برسر
184	اور کفن کو بھی تین بار نچوڑ	مستحب ہے تو کیجو اس کو ضرور
185	جس کو کہتے ہیں اہل دین	سو مقرر وہ پارچے ہیں تین
186	ایک کفنی ہے اور چادر دو	وہ یہ ہے، کہتے ہیں کفن جس کو
187	کفنی ہو کے ضرور اتنی دراز	کہ چھپے آگے پیچھے ستر نماز
188	ہو مہکتی وہ مارے خوش بو کے	نیچے تک ہوئے دونو زانو کے
189	چادریں اتنی ہوں تو خوب ہو کام	کہ لپٹ جائے میت اس میں تمام
190	کسی عورت کی گر وہ میت ہو	تو اسے پارچے دے افزوں دو
191	ایک تو اوڑھنی ہو اتنی بڑی	کہ ہے اس کی چھاتیوں پہ پڑی
192	پر لپیٹ اس میں آدھے آدھے بال	دیں اسے چھاتیوں پہ اس کی ڈال
193	دوسرے سینہ بند ہو ایسا	تجھ سے کرتا ہوں میں بیان جیسا
194	یعنی زیر بغل سے لے تا ناف	لپٹے اتنے بدن کے اوپر صاف
195	پر کفن چاہئے کہ کیسا ہو	صاف میں کہہ دوں تجھ سے ایسا ہو
196	جیسی اس کی ہو زیست کی پوشاک	اس سے قدرے نفیس ہو اور پاک
197	مرد کے مردے واسطے اے یار	چار پائی ہی صرف ہے درکار
198	ایک عورت کو ہوئے گہوارا (44)	تا نہ معلوم جسم ہو سارا
199	عورتوں کے لئے ہے یہ بہتر	بندھے گہوارا چار پائی پر
200	اقربا جس طرح اسے نہلائیں	وہیں اس کو اٹھا کے وہ لے جائیں
201	نہ تو شہدے بلائیں اور نہ کہار (45)	اپنے کاندھوں پر لیں اٹھا سب یار
202	اور صندوق و شامیانہ و فیل	ہیں یہ سارے تکلفات ذلیل

203	لکھیو تو مت جواب نامہ بھی[46]	لغو ہے یہ نہ کچھ اس کو کبھی
204	روٹی توشہ کی اور جائے نماز	سب یہ رسمیں ہیں پوچ بندہ نواز
205	جو جنازے کے ساتھ ہوں وہ ضرور	چلیں جلد اس کے ساتھ تا مقدور
206	وہ اس کے ہوں اقربا اور خویش	رہیں گرد وہ جنازہ پس و پیش
207	پر جسے عذر ہو وہ ناچار	چلے کچھ دور اس سے ہو کے سوار

21- بیانِ دفن کردن

208	پڑھ جنازہ اسے زمین میں دھریں	ہاتھوں ہاتھ اس کو یعنی دفن کریں
209	پر یہ رکھنے میں ہے بڑی سنت	پہلوئے راست پر رہے میت
210	ورنہ قبلہ کی سمت منہ ہو ضرور	تا بہ مقدور اس میں ہو نہ قصور
211	گاڑنے داہنے میں رہ تو شریک	کہ شریعت کی رو سے ہے یہ ٹھیک
212	اور جو یہ مٹی دینی ہے معروف	یہ بھی دے شوق سے نہ کر موقوف
213	قل کے ڈھیلے[48] تو پڑھنے آئے نہیں	اور کسی نے مجھے بتائے نہیں
214	دے اذاں بھی نہ قبر کے اوپر	کوئی دینے لگے تو منع نہ کر
215	ہری ٹہنی سرمانے میں مت گاڑ	اور جو گاڑے کوئی تو تو نہ اکھاڑ
216	قبر کے پھر سرہانے انگلی دھر	جو تو چاہے کہ کچھ پڑھے اس پر
217	پڑھ تو سورہ بقر پہ مت بڑھ جا	اس پہ تا مفلحوں تو پڑھ جا
218	پڑھ تو پھر لمن الرسول تمام	پائنتی اس کے نیک ہے یہ کام
219	پھر تو وہاں جتنے لوگ ہوئیں کھڑے	خواندے ناخواندے چھوٹے اور بڑے
220	کریں سب مل کے اس کے حق میں دعا	کہ بہ رحم اس سے پیش آئے خدا
221	مغفرت اس کی حق سے چاہیں سب	دوستی اس سے یوں نباہیں سب
222	تاکہ منکر نکیر سے اے جان	ہو سوال و جواب اسے آسان

22- معذرت خواہی

223	تین دن تک جو معذرت کو آئے	تو وہ الفت سے ان کو یوں سمجھائے
224	یعنی ہو بادشاہ یا درویش	سب کو آخر یہی ہے رہ درپیش

225 اقربا کو یہ اس کے سمجھا کر   مغفرت اس کو چاہے گھگھیا[49] کر

226 ار گجے کا پیالہ[50] نقل[51] اور پھول[52]   ہیں یہ تیجے[53] کے لغو سب معمول

23- بیانِ عدت اور سوگ

227 بیوہ ایک، دس دن اور مہینے چار   نہ کرے زینت اپنی کچھ زنہار

228 حکم یوں ہے تو اس کو واجب جان   حکم کو مان ہے یہی ایمان

229 زینت اپنی ہی کیا فقط نہ کرے   گھر سے باہر بھی وہ قدم نہ دھرے

230 ایک سوتیں دن رکھے وہ سوگ   تین دن اور غم کریں سب لوگ

231 بیوہ رہنا بھی کچھ نہیں ہے خوب   ہے یہ نزدیک شرع کے معیوب

24- در بیانِ چہلم اور ششماہی وغیرہ

232 سیوم اور چہلم اور شش ماہی   ہیں شریعت کی رو، یہ سب واہی

233 اور جو دیوسہ[54] ہے سال کے بعد   اس کو بھی تو کیا نہ کر اے سعد

234 شوق سے پڑھ درود و قرآن   واسطے اسکے یہ مفید ہے جان

235 اختلاف اس میں گو بہت سا ہے   پر تو پڑھ شوق سے کہ فتویٰ ہے

236 پر نہ قرآن پیسے دے کر پڑھا   سر پہ اپنے گناہ یہ نہ چڑھا

237 لے نہ حج اور نماز روزہ مول   در دوزخ کو اپنے منہ پہ نہ کھول

238 ہے یہ دریافت ناکس و کس تک   اس کو پہنچے اگر تو دے خس تک

239 نقد پوشاک اور طعام اے سعد   ہوسکے جتنا دے تو اس کے بعد

240 پر تجھے گر ثواب کی ہے امید   تو نہ رکھ سال و ماہ و روز کی قید

241 قبر پر بعد دفن اگر پانی   چھڑکے، تو ہے مباح اے جانی

242 اور کوئی بعد آ کے پھر چھڑکے   تو یہ لازم ہے اس کو تو جھڑکے

25- بیانِ قبر و شامیانہ و چراغ و روشنی

243 قبر پر گچ نہ ہو، نہ گنبد   اور نہ ہو سقف بھی کہ ہیں یہ بد

244 قبر کچی ہی شرع کی ہے پسند پر کہاں[55] شتر سے ہو نہ بلند
245 شامیانہ بھی ایستادہ نہ کر اور روشن چراغ کر کے نہ دھر
246 قبر پر بیٹھنا بھی منع ہے صاف اور چادر چڑھائی اور غلاف
247 ہوئے مسجد میں گر کوئی مدفون تو نہایت ہی بات ہے یہ زبون
248 کردیا میں نے تجھ سے سب اظہار آگے اب کر نہ کر تو ہے مختار

26- خاتمہ

249 جب رسالہ یہ نظم ہوا سارا طور اس کا لگا مجھے پیارا
250 ہیں بڑے مولوی رشید الدین ہے انہوں کے سخن کا مجھ کو یقین
251 جانتے ہیں انہوں کو خاص اور عام پڑھ گیا آگے ان کے میں یہ تمام
252 اس کو سنکر انہوں نے ہو کر شاد آفریں میرے حق میں کی ارشاد
253 جو ہو منکر کرے نہ اس پر عمل اس کی جانو کہ ہے سمجھ میں خلل
254 نظم دس دن میں اس کو کر کے تمام رکھا تصنیف رنگین اس کا نام

28- قطعہ تاریخ

255 اب جو تاریخ کا تجھے ہے خیال تو تجھے کہہ سناؤں میں فی الحال
256 غصہ ہو کر تو مجھ پہ دانت نہ پیس تھے ہزار اور دو سو انتالیس
257 یہ ہی تاریخ ہے تو شوق سے گن گیارہویں تھی رجب کی پیر کا دن
258 سر کو بک بک کے مت پھرا رنگیں فائدہ[56] ناشنو کو کچھ بھی نہیں
259 بات سننے کی جس کو ہوئے ہوس تو اسے ایک حرف بھی ہے بس

260 شعر کہنے کا آگے باندھ نہ ٹھاٹھ
کہ ہوئے شعر پورے دو سو ساٹھ

تمام شد نسخہ اول سبع رنگیں کہ مشہور بہ تصنیف رنگین است تصنیف سعادت یار خاں رنگین پسر محکم الدولہ طہماس بیگ خاں اعتقاد جنگ رومی بتاریخ یازدہم ربیع الثانی روز چہار شنبہ بوقت سہ پہر در شاہجہان آباد در عہد محمد اکبر شاہ بادشاہ غازی 27 جلوس 1248ھ بدستخط مصنف تحریر یافت۔

توضیحات وحواشی

متعلقہ تصنیفِ رنگین

بیان شرک: سب سے بڑی اور نیکیوں کی جڑ توحید ہے۔ اس کی بدولت انسان اپنی پوری توجہ کو غیب الغیب ذات اقدس پر مرکوز رکھ سکتا ہے...... آنحضرت ﷺ نے اس شخص کے حق میں جس کی موت توحید پر ہو بلا شرط جنت کی بشارت دی ہے۔[57] یاد رکھو کہ توحید کے چار مفہوم ہیں:

(1) اللہ تعالیٰ کو واجب الوجود سمجھا جائے اس کے سوا کسی دوسری ہستی پر اس کے اطلاق کو جائز نہ سمجھا جائے۔

(2) دوسرے یہ عقیدہ رکھنا کہ عرش وکرسی اور آسمان وزمین اور تمام کائنات کا اور جو ان میں ہے وہی ایک خالق ہے جو وحدہ لاشریک ہے۔ کوئی بھی اس تخلیق میں اس کا شریک وسہیم نہیں۔

(3) یہ کہ زمین وآسمان میں اسی کو واحد تصرف کرنے والا مانا جائے۔

(4) یہ کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی بڑی سے بڑی ہستی کو بھی عبادت کا مستحق نہ سمجھا جائے۔[58] شریعت نے غیر اللہ کے سامنے سجدہ کرنے کو قطعاً حرام قرار دیا ہے۔[59] ...... مشرک لوگ قضا حوائج کے لئے غیر اللہ کو پکارتے تھے اور ان ہی سے شفا مریض اور افلاس دور ہونے اور دوسری تیسری مرادیں مانگتے تھے اس سلسلہ میں ان کے لئے مرادیں مانگتے اور تبرک کے طور پر ان کے نام جپتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مشرکانہ عقیدہ کو مٹانے کے لئے یہ حکم دیا کہ وہ ہر نماز میں بلکہ ہر رکعت میں یہ کہا کریں "ایاك نعبدو ایاك نستعین" تاکہ توحید کا صحیح مفہوم ہر وقت ان کے پیش نظر رہے۔[60] یہودی اور عیسائی اپنے علماء اور مشائخ کو ارباب من دون اللہ سمجھتے تھے۔ علماء اور مشائخ کو خدا سمجھنے کے یہ معنی ہیں کہ جس بات کو یہ لوگ جائز اور مشروع کہتے اس کو وہ جائز اور مشروع سمجھتے اور جس بات کو وہ ناجائز اور غیر مشروع بتاتے اس کو وہ ناجائز اور غیر مشروع سمجھتے۔ علماء ومشائخ کی اندھی تقلید کرنے اور ان کی تحلیل اور تحریم کو عین خدائے بزرگ وبرتر کی تحریم وتحلیل خیال کرتے ...... تحلیل وتحریم صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ بڑی سے بڑی ہستی کو بھی حق حاصل نہیں کہ وہ اس منصب کو اپنے ہاتھ میں لے۔ انبیاء اور رسل کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی طرف سے کسی بات کو جائز اور مشروع کہیں۔ ان کا منصب فقط احکام خدا جل وعلا کی تبلیغ کرنا ہے۔[61] مشرک لوگ بتوں اور ستاروں کے نام پر ان کا تقرب اور خوشنودی حاصل کرنے کے لئے جانور ذبح کرتے تھے۔ اس کی دو صورتیں تھیں ایک یہ کہ ان ہی کا نام لے کر وہ قربانی کرتے تھے یا ان کے لئے ان کے نام پر جو یادگار بنائی گئی ہوتیں وہاں پر ذبح کرتے یا غیر اللہ کے نام پر جن کو وہ قابل پرستش سمجھتے تھے۔ جانوروں کو کھلا چھوڑ دیتے تھے۔ اسلام میں ان سب چیزوں کو تحریم اور ابطال فرمایا ہے۔[62] شریعت نے غیر اللہ کے نام پر قسم کھانے سے منع فرمایا ہے۔[63] مشرکین بعض ایسے مقامات کا جن کا تعلق ان کی مردہ مقدس ہستیوں کے ساتھ ہوتا۔ ان کو مقدس اور متبرک سمجھ کر دور دور سے ان کی زیارت کے لئے جاتے تھے اور اس زیارت کو خدا تعالیٰ کا قرب کا موجب خیال کرتے تھے۔ شریعت نے ان کو ایسا کرنے سے منع فرمایا چنانچہ صحیحین کی ایک حدیث ہے کہ

آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ سوائے تین مساجد کے کسی مقام کی زیارت کے لئے سفر نہ کیا جائے اور وہ تین مساجد مسجد حرام' مسجد نبوی اور مسجد بیت المقدس ہیں۔(64)

بیان رسومات خلق(65): رسوم کی اصلاح اور ان میں مناسب شکست و ریخت کرنا نازل شدہ شریعت میں ایک مقصود بالذات چیز ہوتی ہے (کیونکہ) بعض اوقات (یا اکثر اوقات) ان رسوم کے ساتھ باطل کی آمیزش ہو جاتی ہے اور عام طور پر حق اور باطل میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور کبھی ایسی قوم برسر اقتدار آجاتی ہے جو لوگوں کا مال اور حقوق غصب کرے اور رہزنی کرے اور کبھی یہ لوگ اعمال شہوانیہ کے کرنے پر مائل ہوتے ہیں۔ بعض وقت ان میں کمائی کے ناجائز طریقے رواج پا جاتے ہیں مثلاً ناپ تول میں کمی بیشی کرنا' سود کھانا، یا ان میں مسرفانہ عادات پیدا ہو جاتی ہیں جو سوسائٹی کے لئے نہایت مضر ثابت ہوتی ہیں مثلاً شادی و غمی کے موقع پر فضول خرچی کرنا اور لباس وغیرہ میں فیشن پرست بن جانا...... ایسی اقوام میں عموماً منشیات و مسکرات کا استعمال پھیل جاتا ہے جس کی وجہ سے امور معاش و معاد کا انتظام سخت درہم برہم ہو جاتا ہے۔ کسل اور بطالت لوگوں پر غالب ہو جاتی ہے اور وہ اپنے اوقات عزیز گانے بجانے' شطرنج کھیلنے' کبوتر بازی' مرغ بازی اور بٹیر بازی اور انواع واقسام کے شکار کرنے میں گنواتے ہیں...... بہر حال جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے مصالح کلیہ کا حکم دیا ہے ان کو جہد بلیغ یہ ہونی چاہئے کہ حق کو غلبہ اور اشاعت حاصل ہو اور حق باتیں رواج پائیں۔ باطل کو مٹا دیا جائے یا کم از کم اس کے شیوع کو کم کر دیا جائے' حجاب رسم کے ازالہ کرنے کے لئے بھی دو تدبیریں مؤثر ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ ہر ایک رسم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی یاد کسی نہ کسی صورت میں شامل کر لی جائے اور دوسری تدبیر یہ ہے کہ بعض عبادات شرعیہ کو کھلی رسم قرار دیا جائے اور لوگوں کو اس کی پابندی کی سخت تاکید کی جائے کہ بہر صورت وہ اس کو عمل میں لائیں اور اس سے وہ کبھی جی نہ چرائیں۔ جو شخص اس کی پابندی نہ کرے اس کو قابل ملامت سمجھا جائے۔(66)

اس عنوان میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے خود کو حنفی بتایا ہے۔ اس سلسلہ میں چند اقتباسات ان کی تصانیف سے درج ذیل ہیں:

> "من جملہ ان کے ایک بڑا مسئلہ تقلید اور عدم تقلید کا ہے۔ اس امت کے تمام وہ علما جن کو قابل استناد سمجھا جا سکتا ہے اس پر متفق ہیں کہ یہ چار مذہب جو آجکل اسلامی دنیا میں مروج ہیں اور ہر ایک مذہب کے مسائل و احکام مدون صورت میں موجود اور محفوظ ہیں، ان کی تقلید کرنا جائز ہے۔ اس تقلید میں کئی ایک مصالح ہیں خصوصاً آج کل کے زمانے میں جبکہ ہمتیں بہت ہی پست ہو گئی ہیں لوگوں پر ہوائے نفسانی کا بھوت مسلط ہے۔ اور ہر ایک اپنی ہی سمجھ اور اپنی ہی رائے پر نازاں ہے۔(67)

> "جاننا چاہئے کہ ان چاروں مذہبوں کے اختیار کرنے میں بڑی مصلحت ہے اور ان سب کے سب سے روگردانی کرنے میں بڑا فساد ہے۔"(68)

> "مجھ کو پہنچو دیا رسول اللہ ﷺ نے کہ حنفی مذہب میں ایک بہت اچھا طریقہ ہے وہ بہت موافق ہے اس طریقہ سنت سے جو تنقیح ہوا زمانہ بخاری اور اس کے ساتھ والوں کے۔"(69)

''پھر کھلا ایک نمونہ اس سے ظاہر ہوئی کیفیت و تطبیق سنت کے ساتھ فقہ حنفیہ کے اخذ کرنے سے ایک کے قول کے قول ثلثہ یعنی امام اعظم اور صاحبین سے اور کشف ہوئی تخصیص ان کی عمومات کی اوران کے مقاصد کا وقوف اور اقتصار۔''(70)

''جب ایک عامی انسان ہندوستان اور ماوراء النہر میں رہنے والا ہو جہاں کوئی عالم شافعی اور مالکی اور حنبلی اوران کی کتب مذہبیہ میسر نہ آسکتی ہوں تو اس پر واجب ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ کے مذہب کی تقلید کرے اوران کے مذہب سے علیحدہ ہونا اس کے لئے حرام ہے کیونکہ وہ اس وقت شریعت کی رسی ہی اپنی گردن سے اتار کر مہمل بیکار رہ جائے گا۔''(71)

بیان تولد اولاد۔(72) ''عرب اپنی اولاد کا عقیقہ کیا کرتے تھے، ان کے نزدیک عقیقہ ایک امر لازم سنت مؤکدہ تھا اور اس میں بہت سی مصلحتیں تھیں، جن کا رجوع مصلحت ملیہ اور مدنیہ اور نفسیہ کی طرف تھا۔ پس نبی کریم ﷺ نے اس دستور کو باقی رکھا اور خود اس پر عمل کیا اور لوگوں کو اس کی رغبت دلائی۔ پس منجملہ مصلحتوں کے ایک یہ ہے کہ عقیقہ میں نہایت خوبی کے ساتھ اولاد کے نسب کی اشاعت ہے کیونکہ اشاعت نسب ایک ضروری امر ہے تا کہ کوئی شخص اس کے حق میں کوئی ناپسندیدہ بات نہ کہہ سکے اور یہ بات نامناسب تھی کہ اس کا باپ گلیوں میں پکارتا پھرے کہ میرے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے۔ پس اشاعت کے لئے یہی طریقہ مناسب ہوا۔''

''نبی کریم ﷺ نے فرمایا لڑکے کے ساتھ عقیقہ ہے۔ پس اس کی طرف سے خون بہاؤ اور اس کے بال منڈاؤ اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''لڑکا اپنے عقیقہ کے عوض میں مرہون ہے۔ ساتویں روز اس کی طرف سے قربانی کی جائے اور اس کا نام رکھا جائے اور اس کا سر منڈایا جائے اور رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسنؓ کی طرف سے ایک بکری عقیقہ میں ذبح کی اور فرمایا: ''اے فاطمہ! ان کے سر کو منڈاؤ اوران کے بالوں کے ہم وزن چاندی خیرات کر دو اور رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسنؓ کے کان میں جب حضرت فاطمہؓ نے ان کو جنا تھا اذان پڑھی۔'' نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ہے۔''(73)

بیان سال گرہ: سالگرہ کا رواج ہند پاکستانی مسلمانوں میں ایرانیوں کے ذریعہ ہوا اور اب تو تقلید کی انتہا ہوگئی ہے کہ مسلمان مغربی تہذیب و رسوم کے اتباع میں بچوں کی سالگرہ باقاعدہ انگریزوں کی طرح سے مناتے ہیں۔ موم بتیاں روشن کرتے ہیں اور کیک کا التزام کرتے ہیں۔ **اللھم احفظنا میں ھذہ الشرور** (مرتب)

بچے کا اچھا نام رکھنا: نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔(74) للہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ نام عبداللہ و عبدالرحمٰن ہے۔ ''واضح ہو کہ مقاصد شرعیہ میں سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ تمام ضروری معاملات میں ذکر الٰہی داخل رہے تا کہ ہر ایک زبان بن کر حق کی طرف بلائے اور مولود کا ایسا نام رکھنے میں توحید کی طرف اشارہ ہے اور نیز عرب وغیرہ اپنی اولاد کا نام اپنے معبودوں کے نام پر رکھتے تھے اور چونکہ نبی کریم ﷺ توحید کے قائم کرنے کے لئے معبوث کئے گئے تھے اس واسطے یہ بات واجب ہوئی کہ نام رکھنے میں بھی اس کے مثل دستور جاری کیا جائے اور یہی دونوں نام ان تمام ناموں میں جن میں لفظ عبد کسی اسم الٰہی کی طرف مضاف ہوتا ہے، اس لئے محبوب ہیں کہ یہ دونوں نام اللہ تعالیٰ کے ناموں

میں بہت مشہور ہیں اور یہ دونوں نام سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی پر نہیں بولے جاتے اور ہمارے اس بیان سے تم لڑکے کا نام محمد اور احمد رکھنے کے استحباب کی حکمت معلوم کر سکتے ہو اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین نام وہ شخص ہوگا جس کا نام شہنشاہ ہو۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی میرا بندہ (یا باندی) نہ کہے تم سب اللہ تعالیٰ کے بندے اور تمہاری عورتیں اللہ تعالیٰ کی باندیاں ہیں۔ بہت سی حدیثوں میں آیا ہے کہ جس کا نام اسلام سے بعد العزیٰ اور عبدالشمس وغیرہ تھا اس کو رسول خدا صلعم نے عبداللہ اور عبدالرحمٰن سے بدل دیا۔"(75)

بچہ کو دودھ پلانے کی مدت: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اور مائیں اپنی اولاد کو پورے دو برس دودھ پلائیں۔" ماں کے لئے یہ آسان ہے کہ بچہ کو دودھ پلائے اور اس کی پرورش کرے۔ پس اس پر یہی واجب کیا گیا اور باپ کے لئے لڑکے پر صرف کرنا اور اس کی ماں پر صرف کرنا اور اپنی استطاعت کے موافق کھانا کپڑا دینا آسان ہے...... بعض لوگ جلدی سے دودھ چھڑا دیتے ہیں اور بسا اوقات اس میں بچہ کو ضرر پہنچتا ہے۔ اس واسطے اللہ تعالیٰ نے اس کی ایک ایسی حد مقرر کر دی جس کے بعد دودھ چھڑانے سے بچہ غالباً صحیح وسالم رہتا ہے اور وہ مدت پورے دو سال ہیں اور اس سے کم میں بھی دودھ چھڑانے کی اجازت دی ہے بشرطیکہ وہ دونوں اس میں مصلحت سمجھ کر اس بات کو تجویز کریں کیونکہ بسا اوقات اس مدت سے پہلے بچہ کھانے پینے کے قابل ہو جاتا ہے مگر یہ بات اجتہاد اور فکر کی محتاج ہے اور اس امر میں ماں باپ ہی سب سے زیادہ مناسب ہیں اور اس بچہ کی خصلت سے وہ دونوں ہی خوف واقف ہیں۔(76)

رسم بسم اللہ: شاہ ولی اللہ کی تصنیفات "حجۃ اللہ البالغہ" وغیرہ میں اس عنوان سے متعلق کوئی چیز نظر نہیں گزری البتہ شاہ صاحب کی تعلیم کا آغاز پانچ سال کی عمر میں ہو۔(77)

تاکید نماز: اس عنوان پر تو بکثرت مواد ہے اور اس کا نقل کرنا تحصیل حاصل ہے۔

ختنہ: خود شاہ صاحب کا ختنہ سات سال کی عمر میں ہوا تھا۔(78)

آموختن کسب: اکتساب معاش کے اصلی پیشے یہ ہیں کھیتی باڑی، گلہ بانی کرنا اور چوپائی اور بھیڑ بکریوں کا پالنا اور وہ چیزیں جو خشکی اور تری میں غیر مملوک طور پر پائی جاتی ہیں خواہ وہ از قسم معدنیات ہوں یا ان کا تعلق نباتات اور حیوانات سے ہو اپنے قبضہ میں لے آنا، نیز وہ صنعتیں جن کے ذریعے عام طور پر پائے جانے والے مواد میں تصرف کر کے ان مواد کو اس قابل بنایا جاتا ہے کہ ان سے ارتفاقات میں مدد ملے اور انسان کے لوازم حیات پورا کرنے کے لئے وہ چیزیں کام آئیں مثلاً بڑھئی اور لوہار کا پیشہ اور کپڑا بننا وغیرہ، ان پیشوں سے دوسرے درجہ پر تجارت کی اہمیت ہے۔ تمدن میں جب کسی قدر وسعت پیدا ہوئی تو یہ بھی ایک پیشہ شمار ہونے لگا کہ آدمی نظام تمدن کو بہتر طریقہ پر قائم رکھنے میں مدد دے۔ رفتہ رفتہ کسب اور پیشہ کے مفہوم میں زیادہ توسیع ہوئی اور ہر ایک ایسی جدوجہد کو پیشہ کہنے لگے جب سے نوع انسانی کی ضروریات زندگی میں سے کوئی ضرورت پوری ہوتی ہو بالفاظ دیگر اس سے تمدن کی تکمیل ہوتی ہو اور اجتماعی زندگی بسر کرنے میں اس سے سہولت پیدا ہوتی ہے اس کے بعد جوں جوں تمدن نے ترقی کی اور نفاست پسندی اور ترفہ وعیاشی کی خواہش لوگوں پر غالب آ گئی تو اس بنا پر بھی کئی ایک پیشے اور صنعتیں ظہور میں آئیں۔(79)

بیان نکاح: نبی کریم ﷺ نے فرمایا "ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔" واضح ہو کہ نکاح کے بارے میں تنہا

عورتوں کو مختار بنانا درست نہیں ہے کیونکہ ان کی عقلیں ناقص ہوتی ہیں اور ان کا فکر بھی کمزور ہوتا ہے۔ بسا اوقات ان کو مصلحت معلوم نہیں ہوتی...... اس واسطے ضروری ہوا کہ اس بات میں اولیاء کو بھی کچھ دخل ہوتا کہ یہ فساد بند ہو...... نیز نکاح کے اندر ولی کی شرط لگانے میں مردوں کی عظمت ہے اور عورتوں کا نکاح میں خود مختار ہونا بے حیائی ہے جس کا مدار قلت حیا پر ہے اور اولیا کی مخالفت ان کی بے قدری پر ہے اور نیز یہ بات ضروری ہے کہ بسبب شہرت کے نکاح زنا سے ممیز ہو جائے اور شہرت کی عمدہ صورت یہ ہے کہ عورت اولیا نکاح میں موجود ہوں......

میں کہتا ہوں اہل جاہلیت نکاح سے قبلہ خطبہ میں اپنی قوم کے مفاخر وغیرہ وہ امور بیان کیا کرتے تھے جن کو ذکر مقصود کا وسیلہ بناتے تھے...... نبی کریم ﷺ نے اس میں چند اقسام کے ذکر مسنون فرمائے تھے جیسے حمد اور استغانت اور استغفار اور تعوذ اور توکل اور تشہد اور قرآن شریف کی چند آیات...... اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا نکاح میں آواز اور دف ہوتی ہے اور آپ نے فرمایا، نکاح کا اعلان کرو اور نکاح کو مسجدوں میں کرو اور اس پر دف بجایا کرو۔

اور نبی کریم ﷺ کے زمانے میں لوگوں کا یہ دستور تھا کہ صحبت سے پیشتر ولیمہ کیا کرتے تھے اور اس میں بہت سے مصلحتیں ہیں۔ ازآں جملہ یہ ہے کہ اس میں نہایت خوبی کے ساتھ نکاح کی اشاعت ہوتی ہے...... یہ ضروری ہے کہ حتی الامکان اس تقریب کو شہرت دی جائے اور کم وبیش لوازم طرب مہیا کئے جائیں۔ مثلاً اعتدال کے ساتھ مجالس طرب منعقد کی جائیں اور ایک ضیافت عام کا اہتمام کر کے اقارب اور احباب کو اس میں شریک ہونے کی دعوت دی جائے جس کو عرب لوگ دعوت ولیمہ کہتے ہیں۔ (81)

تعداد مہر: مہر کے مقرر کرنے میں ایک قسم کا اطمینان ہے اور نیز نکاح کی عظمت بغیر مال کے ظاہر نہیں ہوتی.......... اسی لئے نبی کریم ﷺ نے وجوب مہر کو بدستور باقی رکھا اور نبی کریم ﷺ نے اس کی کوئی ایسی حد جس میں کمی وبیشی نہ ہو سکے مقرر نہیں فرمائی......... اس وجہ سے نبی کریم ﷺ نے ایک شخص سے فرمایا، تلاش کر اگرچہ لوہے کی انگوٹھی ہو اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس نے اپنی بیوی کے مہر میں مٹھی بھر ستو یا چھوارے دے دیئے تو اس نے حلال کر لیا مگر نبی کریم ﷺ نے اپنی ازواج اور اپنی صاحبزادیوں کے مہر میں ساڑھے بارہ اوقیہ مقرر کر رکھے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''تم عورتوں کے مہر زیادہ مقرر نہ کرو کیونکہ اگر زیادہ مہر مقرر کرنا دنیا میں عزت یا عنداللہ پرہیزگاری کی بات ہوتی تو نبی کریم ﷺ تم سب میں بدرجہ اولیٰ اس بات کا لحاظ فرماتے۔''

ایام حیض میں مقاربت: ملت مصطفویہ نے (حائضہ کے ساتھ) توسط کی راہ اختیار کی اور یہ فرمایا کہ سوائے جماع کے سب کچھ کیا کرو اور اس کی کئی وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ حائضہ سے جماع کرنا خاص کر حیض کی ترقی ہو، نہایت مضر ہے۔ تمام اطبا کا اس پر اتفاق ہے...... چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''فرما دیجیے وہ ناپاکی ہے پس حیض کی حالت میں عورتوں سے بچتے رہو'، اور جو شخص خدا تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کر کے حائضہ سے جماع کرے تو اس کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ دینار یا نصف دینار صدقہ کرے اور یہ مسئلہ متفق علیہ نہیں ہے۔

ایام حمل میں مقاربت: ''حجتہ اللہ البالغہ'' میں اس سلسلہ میں کوئی چیز نظر نہیں گزری (مرتب)

وصیت میت: اور من جملہ شروع کے وصیت ہے اگر وہ وصیت موت کے وقت کے قریب ہوئی ہے اور وصیت

کا دستور اس لئے جاری ہوا کہ بنی آدم میں ملک منازعت کی وجہ سے عارض ہوتی ہے۔ پس جب موت کی وجہ سے اس کا مال سے مستغنی ہونا قریب ہو جاتا ہے تو بہتر یہ ہے کہ جو کچھ اس سے ان میں کوتاہی ہوئی ہے اس کا تدارک ہو جائے اور جن کے حقوق اس پر واجب ہیں ان کے ساتھ ایسے وقت میں نیک سلوک کرے...... میں کہتا ہوں وصیت میں جلدی کرنا بہتر ہے تا کہ وہ اس بات سے بچ جائے کہ اچانک اس کو موت آ گھیرے یا فوری طور پر کوئی حادثہ پیش آ جائے۔ بس اس سے وہ مصلحت فوت ہو جائے جس کا قائم کرنا اس کے نزدیک ضروری تھا اور اس وقت وہ حسرت کرنے لگے۔"(81)

بیان حالت نزع: "جان نکلنے کے وقت میں اس (مریض) کے حق میں دنیا کا اخیر دن اور آخرت کا پہلا دن ہوتا ہے۔ پس اس وقت ضروری ہے کہ اس کو ذکر الٰہی اور توجہ الی اللہ کی طرف رغبت دلانی چاہئے تا کہ اس کی جان، ایمان کے جامہ میں اس دنیا سے مفارقت کرے اور آخرت میں اس کا ثمر اس کو حاصل ہو۔"

"میں کہتا ہوں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی حالت میں جبکہ موت اس کو گھیرے ہوئے ہے اس کا اللہ تعالیٰ کی یاد میں اپنے دل کو لگانا اس کے ایمان کی صحت اور دل میں محبت ایمان کے داخل ہونے کی دلیل ہے۔ نیز مرتے وقت اس کا اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا دل نیکی کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ پس جو ایسی حالت میں مر گیا تو اس کے لئے جنت واجب ہو گئی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "اپنے مردوں کو لا الہ الا اللہ کی تلقین کیا کرو" اور آپ نے فرمایا "اپنے مرنے والوں کے پاس یٰسین پڑھا کرو۔"(82)

بیان فوت شدن و گریہ وزاری کردن: "اور اہل میت کو اس کی موت سے بہت صدمہ اور غم لاحق ہوتا ہے تو دنیوی اعتبار سے ان کے لئے مصلحت اس میں ہے کہ لوگ ماتم پرسی کے لئے آئیں تا کہ ان کا غم کچھ کم ہو اور میت کے دفن کرانے میں ان کی اعانت کریں اور ان کے لئے اتنا کھانا تیار کر کے دیں جو ان کو ایک دن رات سیر کر دے اور آخرت کے اعتبار سے ان کے لئے بھلائی اس میں ہے کہ ان کو اجر عظیم کی ترغیب دلائی جائے تا کہ ہمہ تن وہ غم میں نہ پڑیں اور توجہ الیٰ اللہ کا دروازہ ان پر کشادہ ہو جائے اور نوحہ کرنے اور گریبان پھاڑنے سے اور تمام ان چیزوں سے منع کیا جائے جو غم اور مصیبت کو یاد دلاتی ہیں اور جو غم اور پریشانی کو زیادہ کرتی ہیں کیونکہ اہل میت اس وقت میں بمنزلہ مریض کے ہوتا ہے۔ اس کو مرض کے علاج کی ضرورت ہے نہ یہ کہ اس کا مرض اور بڑھایا جائے اور اہل جاہلیت نے بہت سی ایسی رسمیں ایجاد کر رکھی تھیں جو شرک کی طرف داعی تھیں اس واسطے مصلحت شرعی کا یہ مقتضی ہوا کہ یہ دروازہ بھی بند کر دیا جائے۔

آپ (نبی کریم ﷺ) نے فرمایا: "جس نے رخساروں کو پیٹا اور گریبان پھاڑے اور جاہلیت کی طرح چیخا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ اس میں راز یہ ہے کہ ان باتوں سے غم بڑھتا ہے...... نیز اہل جاہلیت لوگوں کو دکھانے کے لئے رویا کرتے تھے اور یہ عادت خبیث اور ضرر رساں ہے اس واسطے اس سے لوگوں کو منع کیا گیا اور نبی کریم ﷺ نے نوحہ کرنے والی عورت کے بارے میں فرمایا "قیامت کے روز اس کو کھڑا کیا جائے گا" اس پر قطران کا کرتا اور گندھک کی چادر ہو گی۔"

نبی کریم ﷺ نے ان عورتوں کے بارے میں فرمایا جو جنازے کے پیچھے چلتی تھیں "لوٹ جاؤ تمہارے لئے گناہ ہے نہ ثواب۔" "میں کہتا ہوں کہ عورتوں کو اس لئے منع کیا کہ ان کے حاضر ہونے سے شور اور رونے پیٹنے، بے صبری اور بے پردگی کا احتمال ہے۔"(83)

بیان غسل و گور کفن میت: ''نبی کریم ﷺ نے اپنی صاحبزادی زینبؓ کے لئے عورتوں سے کہا تھا'' اس کو طاق طاق نہلاؤ تین مرتبہ یا پانچ مرتبہ یا سات مرتبہ پانی اور بیری کے پتوں سے اور اخیر مرتبہ میں کافور لگاؤ اور فرمایا کہ اس کی دائیں طرف سے شروع کرو اور اس کے وضو کے مواضع سے شروع کرو۔''

''میں کہتا ہوں مردہ کے نہلانے میں اصل یہ ہے کہ اس کو زندہ کے غسل پر قیاس کیا جائے...... اس واسطے میت کی تعظیم میں اس غسل سے بڑھ کر نہلانے کی اور کوئی صورت نہیں۔ بیری کے پتے اور کئی دفعہ دھونے کا اس لئے حکم دیا کہ مرض میں بدن پر میل اور بدبو پیدا ہو جاتی ہے اور اخیر میں کافور لگانے کا اس لئے حکم دیا کہ اس کی تاثیر یہ ہے کہ جس چیز میں اس کو استعمال کیا جاتا ہے وہ جلدی نہیں بگڑتی اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کے لگانے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ موذی جانور اس کے قریب نہیں آتا اور دائیں جانب سے شروع کرنے کا اس لئے حکم دیا کہ مردوں کا غسل بمنزلہ زندوں کے غسل کے ہو جائے اور تا کہ ان اعضا کی تعظیم معلوم ہو۔''(84)

بیان تیاری جنازہ: مرد کے حق میں پورا کفن، تہبند، کرتا اور اوپر کی چادر ہے یا حلہ یعنی دو کپڑے ہیں اور عورت کے حق میں پورا کفن ان کپڑوں کے ساتھ کچھ اور بھی ہے کیونکہ اس کے لئے زیادہ ستر مناسب ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا'' زیادہ قیمتی کفن نہ دو کیونکہ وہ بہت جلد اس سے جدا ہو جائے گا۔'' اس سے افراط و تفریط کے درمیان اعتدال مراد ہے اور یہ کہ زیادہ قیمتی کفن دینے میں جاہلیت کی عادت اختیار نہ کریں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا'' جنازے کو جلدی لے جاؤ۔''(85)

بیان دفن کردن: ''میں کہتا ہوں اس کا سبب یہ ہے کہ دیر کرنے میں میت کی لاش بگڑ جانے کا اندیشہ ہے اور اس کے قرابت والوں کو بیقراری ہوتی ہے کیونکہ جب وہ میت دیکھیں گے تو ان کو بے چینی ہوگی اور جب وہ ان کی نظروں سے غائب ہو جائے گا تو وہ اور کام میں مشغول ہو جائیں گے۔'' -

''میں کہتا ہوں کہ جنازے کے ساتھ چلنے کا حکم دینے میں راز یہ ہے کہ اس میں میت کی تعظیم اور اس کے رشتہ داروں کے دلوں کو تسلی ہوتی ہے۔''

''اور نماز جنازہ اس لئے مقرر کی گئی کہ مومنین کے ایک گروہ کا میت کی سفارش کرنے کے واسطے جمع ہونا میت پر رحمت الٰہی نازل ہونے کا بڑا کامل اثر رکھتا ہے۔''

''یہ بات کہ جنازہ کے آگے چلنا چاہئے یا پیچھے اور اس کو چار آدمی اٹھائیں یا دو اور قبر میں پاؤں کی طرف سے اتاریں یا قبلہ کی طرف سے پس اس میں مختار قول یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی گنجائش ہے اور ہر امر میں نبی کریم ﷺ سے حدیث یا کوئی اثر مروی ہے۔''(86)

معذرت خواہی: تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مسائل اربعین (صفحہ 60) و رفاہ المسلمین (صفحہ 85,84)

بیان عدت اور سوگ: جس عورت کا خاوند مر جائے اس کی عدت چار ماہ اور دس دن ہیں اور اس مدت میں اس کو سوگ کرنا واجب ہے اور اس کی کئی وجوہ ہیں۔ ایک یہ ہے کہ جب اس عورت پر یہ بات واجب ہوئی کہ اپنے آپ کو اس مدت تک روکے رہے اور نہ وہ نکاح کرے اور نہ پیغام نکاح بھیجے تا کہ مرنے والے کا نسب محفوظ رہے تو حکمت سیاست

کے نزدیک اس چیز نے اس بات کا تقاضہ کیا کہ اس کو ترک زینت کا حکم دیا جائے کیونکہ زینت کی وجہ سے جانبین سے شہوت کا غلبہ ہوتا ہے اور ایسی حالت میں شہوت کے غلبہ میں بڑی خرابی ہے اور نیز عورت کی وفاداری میں یہ بات ہے کہ خاوند کے مرنے پر غم کرے اور خوشبو نہ لگائے اور زینت نہ کرے اور اس پر سوگ کرے کیونکہ اس سے وفاداری ظاہر ہوتی ہے اور بظاہر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس کی نظر اسی پر تھی۔"(87)

بیان چہلم و شمشاہی وغیرہ: شاہ ولی اللہ دہلوی کے پرنواسے شاہ محمد اسحاق نے ان مراسم کا رد کیا ہے۔(88)

بیان قبر و شامیانہ و چراغ و روشنی: اور نبی کریم ﷺ نے حضرت علیؓ کو خاص اس لئے بھیجا تھا کہ کوئی تصویر (مجسمہ) مٹائے بغیر نہ چھوڑیں اور جس قبر کو اونچا دیکھیں اس کو گرا کر زمین کے برابر کر دیں اور قبر کو پختہ کرنے سے اور اس پر عمارت بنانے سے اور اس پر بیٹھنے سے منع فرمایا اور آپ نے نے فرمایا "قبروں کی طرف نماز نہ پڑھو کیونکہ یہ اس بات کا ذریعہ ہے کہ لوگ مقبروں کی پرستش کرنے لگیں اور لوگ ان مقبروں کی اتنی تعظیم کرنے لگیں جس کے وہ مستحق نہیں۔ بس لوگ اپنے دین میں تحریف کر ڈالیں جیسا کہ اہل کتاب نے کیا۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہود اور نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو انہوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا اور قبر پر بیٹھنے کے معنی بعض نے یہ بیان کئے ہیں کہ اس سے زیارت کرنے والوں کا قبر پر ٹھہرنا مراد ہے اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے قبروں پر پیر و مجاور رکھنا مراد ہے اور اس تقدیر پر میت کی تعظیم ملحوظ ہے۔ پس حق یہ ہے کہ توسط اختیار کرے نہ تو مردہ کی اس قدر تعظیم کرے جو شرک کے قریب ہو اور نہ اس کی اہانت اور اس کے ساتھ عداوت کرے۔"(89)

حواشی

(1) یحییٰ بن یحییٰ مصمودی اندلسی مالکی المتوفی 234ھ۔

(2) ذکر ہذا الحدیث البرزنجی فی الاشاعۃ لاشراط الساعۃ صفحہ 221 (مطبع مصر 1907ء) وقال اخرجہ الحاکم عن انسؓ والشوکانی التوضیح نقلہ نواب صدیق حسن خان فی جمع الکرامۃ فی آثار القیامہ۔ صفحہ 429 (مطبع شاہجہانی بھوپال 1291ھ)۔

(3) اس حصہ کا اردو ترجمہ دہلی سے بھی شائع ہوا تھا۔ اس پر مترجم کا نام نہ تھا اور وہی ترجمہ انباء سورتی (بمبئی) نے شائع کرایا تھا۔ ہم نے اسی ترجمہ پر فارسی متن کی روشنی میں نظر ثانی کر لی ہے۔ (محمد ایوب قادری)

(4) ملا علی قاری در کتاب موضوعات المصنوع۔ صفحہ 20 (طبع محمدی لاہور) گفتہ لا اصل لہ۔

(5) الجامع الصغیر للسیوطی صفحہ 151 (طبع مصر 1939ء)۔

(6) یعنی خدا کے فرمانبردار سے خوش اور نافرمان سے ناخوش رہنا۔

(7) در مشکوٰۃ۔ باب حفظ اللسان والغیب والشتم بایں لفظ مذکور است "خیار عباد اللہ الذین اذا راؤ ذکر اللہ۔" (الحدیث)

(8) مشکوٰۃ۔ کتاب الایمان فصل اول۔

(9) مشکوٰۃ۔ صفحہ 241 کتاب البیوع۔

(10) مشکوٰۃ۔ باب ذکر اللہ والتقریب الیہ فصل۔

(11) الجامع الصغیر۔ صفحہ 54۔
(12) قاضی ثناءاللہ پانی پتی کی ایک تصنیف کا نام ہے۔
(13) در مشکوٰۃ از ابو ہریرہ روایت است۔
(14) نصیحت حاصل کریں۔
(15) بے ربط و بے دلیل باتیں نہ کرے۔
(16) بے مثال۔
(17) عاجزی کے ساتھ۔
(18) عنوانات کی عبارت مختصر کر دی گئی ہے۔
(19) سوا۔
(20) تحقیق کے ساتھ۔
(21) عزت۔
(22) غافل۔
(23) بکرے کی جنس مراد۔
(24) مسلمان۔
(25) ذبح کرنا۔
(26) مثلاً پیر بخش' مدار بخش' حسین بخش وغیرہ۔
(27) مثلاً غلام غوث' غلام حسین' غلام حسن۔
(28) بچہ کی پیدائش کے چھ روز بعد زچہ اور بچہ نہاتے ہیں۔ نہانے کے لئے عام طور پر بدھ یا پیر کا دن انتخاب کیا جاتا ہے۔ مختلف قسم کی رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔ اس تقریب کو چھٹی کہا جاتا ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو رسوم دہلی از سید احمد بریلوی مرتبہ یوسف بخاری دہلوی۔ صفحہ 24,22 (ترقی اردو بورڈ' اردو اکیڈمی سندھ' کراچی 1962ء)
(29) خوشی۔
(30) جب بچہ کا دودھ چھڑایا جاتا ہے تو کھجوریں تلتے ہیں اور تمام رشتہ دار جمع ہوتے ہیں اور وہ کھجوریں بچہ کے سامنے رکھتے ہیں۔ جتنی کھجوریں بچہ اٹھاتا ہے خیال کیا جاتا ہے کہ اتنے ہی دن بچہ ضد کرے گا۔ پھر انعام وغیرہ تقسیم ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو رسوم دہلی صفحہ 47,46۔
(31) چار سال چار ماہ چار دن کی عمر ہونے پر بچہ کی رسم بسم اللہ کی جاتی ہے۔ اس کو دولہا بنایا جاتا ہے اور کسی بزرگ سے بسم اللہ پڑھوائی جاتی ہے۔ شیرینی وغیرہ تقسیم کی جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو 'رسوم دہلی' صفحہ 53,52۔ اصلاح الرسوم از مولانا اشرف علی تھانوی۔ صفحہ 32 (طبع دوم لکھنؤ) بہشتی زیور حصہ ششم از مولانا اشرف علی تھانوی۔ صفحہ 19 (مطبوعہ مکتبہ برہان دہلی)
(32) عمر۔
(33) ختنہ کے موقعہ پر بھی بچہ کو دولہا بنایا جاتا ہے اور شیرینی وغیرہ تقسیم کی جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو 'رسوم دہلی' صفحہ 47 - 49
(34) بائیں۔
(35) آگاہ۔

(36) عمل پیرا ہو۔

(37) گواہی۔

(38) ساچق ترکی لفظ ہے۔ حنابندی کی رسم کو کہتے ہیں۔ اس کو بری بھی کہتے ہیں۔ مختلف قسم کی مٹھائیاں بڑی مقدار میں اور جوڑے وغیرہ دولہا کی طرف سے دلہن کے یہاں جاتے ہیں۔ تفصیل کے لئے دیکھیے ''رسوم دہلی'' صفحہ 90-98 و اصلاح الرسوم۔ صفحہ 49-48

(39) ساچق کے بعد دلہن کی طرف سے دولہا کے یہاں مہندی، مٹھائی اور جوڑے وغیرہ آتے ہیں۔ ملاحظہ ''رسوم دہلی۔'' صفحہ 101-99۔

(40) طریقہ۔

(41) بچہ کی پیدائش تک۔

(42) پابندی۔

(43) پیدائش کے بعد۔

(44) چارپائی کی دونوں بلیوں میں کھپچیاں باندھ کر جو محراب سی بنا دیتے ہیں اسے گہوارہ کہتے ہیں۔

(45) شہدے اور کہار جنازہ اٹھانے کے لئے بلائے جاتے تھے۔ شہدے کی تفصیل کے لئے دیکھئے ''یہ دلی ہے''۔ از یوسف بخاری دہلوی۔ صفحہ 177-184 (سعید اینڈ کمپنی کراچی 1963ء)

(46) اس زمانے میں یہ رواج تھا کہ جنازہ خاص صندوق میں رکھا جاتا تھا اور قبر کے اوپر شامیانہ تانا جاتا تھا اور بسا اوقات جنازہ ہاتھی پر رکھا جاتا تھا (ملاحظہ ہو نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین کا مضمون ''اعتدال'' مشمولہ رسالہ کانفرنس متعلق تمدن و معاشرت (مطبوعہ حمیدیہ اسٹیم پریس لاہور) اور بعض جاگیردار خاندانوں میں ان کے مردے صندوق میں دفن کئے جاتے ہیں۔ شامیانہ تاننے کا رد شاہ محمد اسحاق نے ''ماتہ مسائل'' میں کیا ہے (ملاحظہ ہو' ماتہ مسائل'۔ صفحہ 71,70)

(47) شاہ محمد اسحاق نے جواب نامہ لکھنے کا رد کیا ہے (ملاحظہ ہو' ماتہ مسائل'' صفحہ 107,106)

(58) دفن کے بعد ڈھیلوں پر قل ہو اللہ پڑھ کر پھونکتے ہیں اور ان ڈھیلوں سے قبر کو پاٹتے ہیں۔ (نور اللغات جلد سوم از نور الحسن نیر کاکوروی۔ صفحہ 653' جنرل پبلشنگ ہاؤس کراچی)

(49) عاجزی کے ساتھ۔

(50) ارگجا اس مرکب خوشبو کا نام ہے جو برادہ صندل' خشک کافور' عنبر اور عرق گلاب سے تیار کر کے ایک پیالے کے اندر رکھی جاتی ہے۔

(51) نُقل ایک قسم کی شیرینی جس کے اندر پستے یا چنے یا بادام رکھ کر گول گول لڈو بنا دیتے ہیں۔

(51) ارگجے کا پیالہ پھولوں کی بھری ہوئی رکابی میں رکھ کر ہر ایک فاتحہ خواں کے پاس جاتا ہے۔ وہ ایک ایک پھول اٹھا کر اور اس پر سورہ اخلاص پڑھ کر ارگجے کے پیالے میں ڈال دیتا ہے اور یہ سارا سامان معہ چادر گل مردہ کی قبر پر بھیج دیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو'' رسوم دہلی''۔ صفحہ 163۔

(53) تیجے کو قل' پھول یا سیوم بھی کہتے ہیں۔

(54) مرنے کے دو برس بعد خاص مرنے کی تاریخ پر دیوسے کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ اس میں قریبی رشتہ دار' عام طور سے عورتیں جمع ہوتی ہیں' فاتحہ دلائی جاتی ہے اور نیا جوڑا خیرات کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو' رسوم دہلی'' صفحہ 168۔

(55) کوہان۔

(56) نہ سننے والا۔

(57) حجۃ اللہ البالغہ از شاہ ولی اللہ دہلوی (اردو ترجمہ از مولانا عبدالرحیم) حصہ اول صفحہ 345 (قومی کتب خانہ لاہور 1962ء)

(58) ایضاً۔ صفحہ 346۔

(59) ایضاً۔ صفحہ 357۔

(60) ایضاً۔ صفحہ 358۔

(61) ایضاً۔ صفحہ 359۔

(62) ایضاً۔ صفحہ 361۔

(63) ایضاً۔ صفحہ 361۔

(64) ایضاً۔ صفحہ 361-362۔ شرک کے رد میں شاہ ولی اللہ دہلوی کے حفید سعید شاہ اسماعیل (ش 1246ھ۔ 1831ء) کی کتاب ''تقویۃ الایمان'' اور اس خاندان کے دوسرے تربیت یافتہ علما مثلاً مولوی خرم علی بلہوری (ف 1273ھ۔ 1756ء) کی ''نصیحۃ المسلمین'' اور مولوی اولاد حسن قنوجی (ف 1253ھ۔ 8-1837ء) کا رسالہ ''راہ سنت'' وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

(65) ¦□,,□‡□%o□ اللہ البالغہ از شاہ ولی اللہ دہلوی۔ اردو ترجمہ از مولانا عبدالرحیم۔ حصہ اول صفحہ 306-309-339 (قومی کتب خانہ) لاہور 1962ء۔

(66) ایضاً۔ صفحہ 339۔

(67) ایضاً۔ صفحہ 291

(68) عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید (اردو ترجمہ ''سلک مروارید'' از مولانا محمد احسن نانوتوی۔ صفحہ 31 مطبع مجتبائی دہلی 1344ھ)

(69) فیوض الحرمین از شاہ ولی اللہ دہلوی (اردو ترجمہ سعادت کونین) صفحہ 48 (مطبع احمدی دہلی 1307ھ)

(70) ایضاً صفحہ 62, 63

(71) انصاف فی بیان سبب الاختلاف از شاہ ولی اللہ (اردو ترجمہ کشاف از مولانا محمد احسن نانوتوی) صفحہ 70,71 (مطبع مجتبائی دہلی 1307ھ۔ 1889ء) شاہ ولی اللہ کی تصنیفات۔ حجۃ اللہ البالغہ، عقد الجید، انصاف، فیوض الحرمین اور تفہیمات الٰہیہ میں ان کے محتاط مقلد اور حنفی ہونے کی صورت اور واضح صراحت موجود ہے۔ پروفیسر غلام حسین جلبانی (حیدرآباد پاک) نے اپنی کتاب ''شاہ ولی اللہ کی تعلیم''۔ صفحہ 80-83, 92-93 میں اس امر کی وضاحت کی ہے۔ الفرقان'' (بریلی 1359ھ کے) ''شاہ ولی اللہ نمبر'' میں حضرت مولانا خیر محمد جالندھری (خیر المدارس ملتان) اور مولانا محمد یوسف بنوری (مدرسہ اسلامیہ عربیہ نیوٹاؤن کراچی کے مضامین) ''حضرت شاہ ولی اللہ اور تقلید'' اور شاہ ولی اللہ اور حنفیت بھی اس موضوع پر نہایت قابل قدر ہیں۔ مولانا خیر محمد جالندھری والا مضمون نظر ثانی اور اضافہ کے بعد مولانا حافظ محمد علی کاندھلوی، قیم دارالعلوم شہابیہ سیالکوٹ نے شاہ ولی اللہ اور تقلید کے نام سے ایک رسالہ کی صورت میں شائع کر دیا ہے۔

(72) حجۃ اللہ البالغہ از شاہ ولی اللہ دہلوی۔ جلد دوم (اردو ترجمہ از مولانا عبدالحق حقانی) صفحہ 412-415 (کارخانہ تجارت کتب کراچی)

(73) وضاحت کے لئے ملاحظہ ہو سائل اربعین فی سنۃ سید المرسلین از شاہ محمد اسحاق (اردو ترجمہ تحفۃ المسلمین از ملا محمد نظام شاہ جہاں پوری۔ مرتبہ محمد مقتدیٰ خان شیروانی۔ صفحہ 17, 18,20,21 (علی گڑھ 1959ء)

(74) ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغہ۔ جلد دوم صفحہ 415, 416, 556 و جلد اول صفحہ 362

(75) وضاحت کے لئے ملاحظہ ہو ''مسائل اربعین''۔ صفحہ 17

(76) حجۃ اللہ البالغہ۔ جلد دوم صفحہ 416-417۔

(77) ''چوں سال پنجم درآمد بمکتب نمشت'' ''جزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف'' مشمولہ ''انفاس العارفین'' از ''شاہ ولی اللہ دہلوی'' صفحہ 194 (مطبوعہ مطبع احمدی واقع دہلی) نیز اس سلسلہ میں اربعین صفحہ 23,22۔

(78) انفاس العارفین۔ صفحہ 194 نیز مزید تفصیل کے لئے دیکھیے ''مسائل اربعین'' صفحہ 24-26

(79) شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں ''در صناعت و حرفت آنچہ نیک تر و ضرور تر بہتر باشند اختیار نمائند اگر چہ محتاج نباشند واز آموختن کسے نیک و حرفتے پاک عار نکنند۔'' ملاحظہ ہو۔ چار باب از شاہ ولی اللہ دہلوی۔ صفحہ 41 (مطبع مصطفائی بیت السلطنت لکھنؤ 1257ھ) نیز ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغہ۔ جلد دوم صفحہ 281, 435,282

(80) ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغہ۔ جلد دوم صفحہ 369, 370, 382, 376 و جلد اول صفحہ 275۔ شاہ محمد اسحاق دہلوی نے نکاح کے متعلق انیس (گیارہ تا انیس) بڑی تفصیل سے نقل فرمائے ہیں اور مروجہ رسوم کا رد کیا ہے۔ ملاحظہ ہو مسائل اربعین صفحہ 56,57 اور شادی و غمی کے جملہ مسائل کو مزید توضیح و تشریح کے ساتھ مولوی سعد الدین بدایونی (ف 1283ھ) نے مسائل اربعین کی شرح رفاہ المسلمین میں بیان کیا جاتا ہے۔

(81) ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم صفحہ 340, 341

(82) ایضاً۔ صفحہ 118

(83) ایضاً۔ صفحہ 110, 111, 127, 128

(84) ایضاً۔ صفحہ 120,121

(85) ایضاً صفحہ 121

(86) ایضاً۔ صفحہ 121, 123, 125, 126

(87) ایضاً۔ صفحہ 407, 408

(88) ملاحظہ مسائل اربعین صفحہ 6-62 و مائۃ مسائل از شاہ محمد اسحاق (مرتبہ احمد اللہ بن دلیل اللہ انامی) صفحہ 35, 36 (مطبع نول کشور لکھنؤ 1913ء)

(89) حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم صفحہ 126

✦ ..... ✦ ..... ✦

سفیر اختر

شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصنیفات کے خطی نسخے

(پاکستان کے کتب خانوں میں)

بارہویں صدی ہجری، اٹھارہویں صدی عیسوی میں جن اہل علم و دانش نے امت مسلمہ اور بالخصوص مسلمانان برصغیر کی فکری رہنمائی کی اور جن کے خیالات کی چھاپ عہد حاضر کی مسلم سوچ پر نمایاں ہے، ان میں سے ایک شاہ ولی اللہ دہلوی (م 1176ھ) ہیں۔ شاہ صاحب کے علمی سرمائے سے مسلسل استفادہ کیا جا رہا ہے اور اس کی نشر و اشاعت کے لئے ادارے قائم ہیں۔[1] یہ ادارے جہاں شاہ صاحب کے فکر و فلسفہ پر اہل علم کی کاوشیں شائع کر رہے ہیں، وہیں شاہ صاحب کی تصنیفات تصحیح و تحقیق کے جدید معیار پر شائع کرنے اور ان کے مستند تراجم فراہم کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ اس حوالے سے ضروری ہے کہ شاہ صاحب کی تصنیفات کے خطی نسخوں کی نشاندہی کی جائے تا کہ اہل تحقیق صحیح تر متن کی تعین کر سکیں۔

☆☆☆

برصغیر میں مطابع کے رواج کے ساتھ ہی شاہ صاحب کی تصنیفات شائع ہونے لگی تھیں۔ جن مطابع نے شاہ صاحب کی تصنیفات بطور خاص شائع کیں ان میں غالباً مطبع احمدی، ہوگلی کو زمانی فوقیت حاصل ہے۔ اس مطبع سے سید احمد شہید کی تحریک اصلاح و جہاد سے وابستہ اہل قلم کی کتابوں کے ساتھ شاہ صاحب کی تصنیفات اور ان کے تراجم شائع ہوئے تھے۔ یہ مطبع مولوی سید عبداللہ بن میر بہادر علی حسینی نے قائم کیا تھا۔ میر بہادر علی حسینی فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کے نامور مؤلف و مترجم تھے۔ ان کے صاحبزادے مولوی سید عبداللہ نے علوم متداولہ کی باقاعدہ تحصیل کی تھی اور سید احمد شہید کے مرید تھے۔ ان کے ہمراہ 1237-1239ھ میں حج کا سفر کیا تھا، واپسی پر ہوگلی میں انہوں نے یہ مطبع قائم کیا۔ مولوی سید عبداللہ کا 1265ھ میں انتقال ہوا۔[2]

مطبع احمدی، ہوگلی سے ''الفوز الکبیر فی اصول التفسیر'' (اشاعت 1249ھ) ''فتح الکبیر'' (اشاعت 1249ھ) ''چہل حدیث'' (با ترجمہ اردو، اشاعت 1254ھ) اور ''وصیت نامہ مع رسالہ دانش مندی'' (بدون تاریخ) شائع ہوئی تھیں۔

دوسرا مطبع جس نے تیرہویں صدی ہجری کے نصف آخر میں شاہ صاحب کے علمی سرمائے کی اشاعت کی اور جسے اس حوالے سے مطبع احمدی، ہوگلی پر برتری حاصل ہے کہ اس نے شاہ صاحب کی ضخیم اور نسبتاً اہم تر کتابیں پیش کیں، وہ

مولانا محمد احسن نانوتوی (م 1312ھ) کا قائم کردہ مطبع صدیقی، بریلی تھا۔[3] اس مطبع سے ''ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء'' (اشاعت 1286ھ) اور ''حجۃ اللہ البالغہ'' (اشاعت 1286ھ) پہلی بار شائع ہوئی تھیں۔

ان مطابع کے بعد خانوادہ شاہ ولی اللہ کے ایک فرد مولوی سید ظہیر الدین احمد ولی اللٰہی نے اس میدان میں قدم رکھا۔ مولوی صاحب شاہ رفیع الدین کے نواسے کے پوتے تھے۔ انہوں نے دہلی میں غالباً چودھویں صدی ہجری کے بالکل آغاز میں ''مطبع احمدی'' قائم کیا اور 20-22 برس شاہ ولی اللہ اور ان کے اخلاف کی تحریریں شائع کرتے رہے۔[4] ان کی شائع کردہ کتب میں شاہ ولی اللہ کی یہ تصانیف شامل ہیں: ''الارشاد الی مہمات الاسناد'' (اشاعت 1307ھ) ''سطعات'' (1307ھ) ''الطاف القدس'' (با ترجمہ اردو اشاعت 1307ھ) ''ہوامع'' (اشاعت 1307ھ) ''مکتوبات مع مناقب امام بخاری'' (اشاعت 1308ھ) ''فیوض الحرمین'' (با ترجمہ اردو اشاعت محرم 1308ھ) ''الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ'' (اشاعت 1311ھ) ''انفاس العارفین'' (اشاعت بدون تاریخ) ''حسن العقیدہ'' (اشاعت بدون تاریخ)۔

مولانا محمد احسن نانوتوی کے ربیب مولوی عبدالاحد (م 1338ھ) نے منشی ممتاز علی بن شیخ امجد علی سے مطبع مجتبائی، دہلی خریدا تو مطبع صدیقی، بریلی کی روایت کے بموجب اس نے بھی شاہ صاحب کی تصنیفات کی اشاعت پر توجہ مرکوز کی۔ اس نے مولانا محمد احسن نانوتوی کے قلم سے ''الانصاف فی بیان سبب الاختلاف'' کا ترجمہ ''کشاف'' (اشاعت 1307ھ) اور ''عقد الجید'' کا ترجمہ ''سلک مروارید'' (اشاعت 1309ھ) شائع کیا۔ مزید برآں ''قرۃ العینین'' (اشاعت 1310ھ)، ''کشف الغین فی شرح رباعیتین'' (اشاعت 1310ھ) ''قصیدہ اطیب النغم'' (اشاعت 1308ھ) اور ''قصیدہ ہمزیہ'' (اشاعت 1308ھ) مطبع مجتبائی کی مطبوعات میں شامل ہیں۔

مولانا محمد انور شاہ کاشمیری (1351ھ) اور ان کے احباب و تلامذہ کی کوششوں سے 1348ھ میں مجلس علمی، ڈابھیل کی داغ بیل پڑی۔ اس ادارے نے بھی شاہ صاحب کی کتابوں میں دلچسپی لی۔ اس کی جانب سے ''الخیر الکثیر'' (اشاعت 1354ھ) ''البدور البازغہ'' (اشاعت 1354ھ) اور ''تفہیمات الٰہیہ'' شائع ہوئیں۔

شاہ صاحب کے ان ناشرین کو شاہ صاحب کی کتابیں شائع کرتے ہوئے یہ دقت پیش آئی کہ کتابوں کے خطی نسخے کچھ زیادہ تعداد میں انہیں ہم دست نہ ہو سکے۔ مطبع احمدی، ہوگلی نے جب ''فتح الکبیر'' شائع کی تو ناشر کے سامنے اس کا واحد نسخہ تھا۔[5] مولانا محمد احسن نانوتوی نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' شائع کی تو ان کے سامنے چار نسخے تھے۔[6] ''ازالۃ الخفا'' کے متن کی تصحیح و تعیین تین نسخوں کے تقابل سے کی گئی تھی۔[7] ''البدور البازغہ'' کی اشاعت کے لئے مجلس علمی کو تین نسخے ملے تھے۔[8] ''قرۃ العینین'' کی اشاعت مجتبائی صرف ایک نسخے پر مبنی تھی۔

☆☆☆

گذشتہ صفحات میں جن مطابع اور ناشرین کا ذکر کیا گیا ہے، یہ کلکتہ، بریلی، دہلی اور ڈابھیل میں واقع تھے۔ اصحاب مطابع نے اپنے اپنے حلقہ اثر میں شاہ صاحب کی تصنیفات کے خطی نسخے تلاش کیے اور اپنے ذاتی مزاج، ذوق اور معیار تحقیق کے مطابق کبھی ایک ہی نسخے پر اکتفا کیا اور کبھی دو تین نسخے دیکھ لئے۔ ایک صدی پیشتر غالباً دور دراز کے

دیہات میں موجود خطی نسخوں تک رسائی، ان کے مالکوں سے ان کا حصول یا خطی نسخوں کی نقول کی فراہمی آسان نہ تھی۔ گو شاہ صاحب اور ان کے خانوادے کی فیض رسانی کے نتیجے میں شاہ صاحب کی تصنیفات برصغیر میں دور دور تک پہنچ گئی تھیں اور بالخصوص ان خطوں میں جہاں مسلمان اپنی مقامی زبانوں کے لئے فارسی و عربی رسم الخط استعمال کرتے ہیں۔

برصغیر کا جو خطہ آج مملکت خداداد پاکستان کہلاتا ہے۔ اس کی مقامی زبانیں عربی و فارسی رسم الخط ہی میں لکھی جاتی ہیں، نیز اس خطے سے شاہ صاحب کا گہرا تعلق تھا۔ ان کی تعلیم، نیز ان کی فکر و دانش کی تشکیل میں اس خطے کے اہل علم کا ایک حصہ ہے۔ شاہ صاحب کے اساتذہ میں حاجی محمد فاضل سندھی کا نام شامل ہے جن سے انہوں نے تجوید و قرأت میں استفادہ کیا تھا۔ شاہ صاحب نے اپنے استاذ کا ذکر ''فتح الرحمٰن'' کے مقدمے میں ان الفاظ میں کیا ہے:

قال العبد الضعيف ولى الله بن عبدالرحيم عفى عنه قرات القرآن كله من اوله الى آخره بروايت حفص عن عاصم على الصالح الثقة حاجى محمد فاضل السندى 1153ھ قال تلوته الى آخره بروايت حفص على الشيخ عبدالخالق شيخ القراء بمحروسته دهلى (9)

(بندہ ضعیف ولی اللہ بن عبدالرحیم عفی عنہ نے کہا کہ میں نے قرآن مجید اول تا آخر بروایت حفص بن عاصم، صالح ثقہ حاجی محمد فاضل سندھی سے 1154ھ میں پڑھا اور انہوں نے اسے اول سے آخر تک بروایت حفص دارالسلطنت دہلی کے شیخ القراء شیخ عبدالخالق سے پڑھا۔)

شاہ صاحب کے اس اقتباس سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ حاجی محمد فاضل سندھی، زیارت حرمین سے فیض یاب تھے اور وہ شیخ القراء شیخ عبدالخالق کے شاگرد تھے مگر کتب رجال و تذکرہ سے کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ سندھ میں کس گوٹھ یا ٹنڈو کے رہنے والے تھے۔ کب دہلی گئے اور کب فوت ہوئے۔ ان سے کوئی کتاب یادگار ہے یا نہیں؟

شاہ صاحب 1143ھ میں (بہ عمر 27 سال) بغرض حج ارض حجاز روانہ ہوئے تھے۔ انہوں نے یہ سفر پنجاب اور سندھ کے راستے کیا تھا، لاہور میں ان کا قیام حاجی محمد سعید (م 1162ھ) کے مدرسے میں رہا تھا۔ حاجی محمد سعید اپنے وقت کے معروف متصوف اور جید عالم تھے۔ وہ پہلے قادری سلسلے میں بیعت تھے، پھر شیخ محمد اشرف لاہوری (م 1104ھ) سے شطاری سلسلے میں بیعت ہوئے اور حافظ سعد اللہ مجددی نے انہیں نقشبندی سلسلے میں اجازت بیعت دی تھی۔ حاجی محمد سعید کی تصنیفات میں ''تفسیر مبین''۔ ''رسالہ اذکار قادریہ''۔ ''رسالہ در بیان ظہور''۔ ''تنزلات''۔ ''رسالہ ہم اوست''۔ ''قائد الانام الی بیت الحرام'' اور ''مکتوبات'' کا ایک مجموعہ شامل ہے۔ اخوند محمد رفیع پشاوری نے ان کے ملفوظات ''قران السعدین'' کے نام سے مرتب کئے ہیں۔ (10)

شاہ صاحب کے سفر حج میں ان کے نیازمندوں کی ایک جماعت ان کے ہمراہ تھی۔ سفر حج میں شاہ صاحب کے ساتھی، ان کے برادر نسبتی اور ان کے اولیں سوانح نگار شاہ محمد عاشق پھلتی (م 1187ھ) کے بقول دوران سفر میں ان کے گرد عامۃ الناس کا ہجوم رہتا تھا۔

''از ہمہ جا علماء و طلبہ خیر مقدم فیض لزوم ایشاں شنیدہ می دویدند و سعی ہا می نمودند۔ (12)''

نصر پور (نزد ٹھٹھہ) میں سندھ کے متعدد علماء دور دور سے آکر ان سے بیعت ہوئے اور انہوں نے شاہ صاحب سے اوراد واشغال کی اجازت حاصل کی۔[13] اس سفر کے بعد سندھ کے جن اہل علم نے شاہ صاحب سے رہنمائی حاصل کی ان میں ہدایت اللہ تتوی اور سید محمد خان سندھی کے ناموں کا ذکر شاہ محمد عاشق پھلتی نے کیا ہے۔[14] ایک دوسرے نمایاں اور معروف فرد مخدوم محمد معین تتوی (1093-1161ھ) ہیں۔ مخدوم محمد معین بلند پایہ عالم' صوفی اور شاعر تھے۔ ان کی چھوٹی بڑی 20 تصنیفات میں ''دراسات اللبیب فی الاسوۃ الحسنہ بالحبیب'' معروف ہے۔ مخدوم صاحب مذاہب فقہ کی تقلید سے انکار کرتے تھے اور عمل بالحدیث کے داعی تھے مگر نظریہ وحدت الوجود کے پر جوش مبلغ تھے اور اس حوالے سے شیخ اکبر ابن عربی کے شیدائی تھے اور اسی نسبت سے امام ابن تیمیہ کے شدید دشمن تھے۔ اہل بیت کی محبت میں ان کا یہ حال تھا کہ حضرت امام حسین کا ماتم کرتے تھے اور حضرت معاویہ کی تنقیص میں بہت سخت تھے۔ مروان کو کافر گردانتے تھے۔ ابو طالب کے ایمان کے قائل تھے۔ خلفائے راشدین کی فضیلت میں ان کا معیار اہل سنت سے الٹ تھا۔ ان کے نزدیک حضرت علیؓ امت میں سب سے افضل ہیں۔ ان کے بعد حضرت عثمانؓ' پھر حضرت عمر فاروق اور آخر میں حضرت ابوبکر کا درجہ ہے۔ حضرت فاطمہ کو حضرت رسول اکرمؐ کے متروکہ اموال کا وارث مانتے تھے۔

مخدوم محمد معین سندھی' عمر میں شاہ صاحب سے تقریباً بیس سال بڑے تھے۔ انہوں نے شاہ صاحب سے بطور شاگرد تو شاید استفادہ نہ کیا ہو مگر انہوں نے دہلی جا کر شاہ صاحب سے اجازت روایت ضروری حاصل۔[15] جس کا ذکر انہوں نے اپنی تحریروں میں کیا ہے۔[16] مخدوم محمد معین کے نام شاہ صاحب کے متعدد مکتوبات ہیں۔ ان میں سے ایک مکتوب کا عنوان ہے: ''(مکتوب) متضمن کشف شبہات ورفع ایرادایشاں (مخدوم محمد معین) درکلام تقی الدین احمد ابن تیمیہ حنبلی وبیان فضائل وتنویہ شان او در زمرہ سائر علمائے اہل سنت ودرجمی کہ زبان طعن درحق وے دراز کنند......''[17]

ٹھٹھہ کے قریب اگھم کوٹ کے رہنے والے ایک اور سندھی بزرگ محمد شریف بن خیر اللہ بن عبدالغنی سندھی دہلی جا کر شاہ صاحب سے بیعت ہوئے تھے۔ شاہ صاحب نے انہیں ارشاد وتلقین کے بعد 1153ھ میں سند دی۔[18] محمد ہاشم بن شیخ محمود تتوی نام کے ایک کاتب کا لکھا ہوا نسخہ ''کشف الغین فی شرح رباعیتین'' عجائب گھر کراچی میں محفوظ ہے۔[19] یہ نسخہ شاہ صاحب کی زندگی میں 25 صفر 1150ھ کو مکمل ہوا اور بقول کاتب مؤلف کے نسخے سے نقل کیا گیا ہے۔ ان معلومات سے یہ امر متبادر ہے کہ محمد ہاشم بن شیخ محمود بھی شاہ صاحب کے فیض یافتگان میں سے تھے۔

سندھ نژاد اہل علم کے ساتھ موجودہ صوبہ سرحد سے تعلق رکھنے والے شیخ محمد عمر پشاوری' شاہ محمد غوث (جو بعد میں لاہور منتقل ہو گئے اور لاہوری کی صفت نسبتی سے معروف ہوئے) اور سید نور شاہ افغانی بھی شاہ صاحب کے ساتھ سلسلہ مراسلت رکھتے اور ان کے نام شاہ صاحب کے چند مکتوبات محفوظ ہیں۔[20] شیخ محمد عمر پشاوری (1084-1190ھ پشاور کے قریب موضع چمکنی کے رہنے والے تھے۔) نقشبندی صوفی شیخ سعدی لاہوری اور ان کے خلیفہ حضرت شیخ محمد یحییٰ کے معروف بہ حضرت جی اٹکی سے بیعت تھے اور آخر الذکر نے انہیں خلافت سے نوازا تھا۔ شیخ محمد عمر پشاوری کی اصلاحی ودینی سرگرمیوں میں ان کی فارسی' عربی نیز پشتو زبان میں تصنیف وتالیف بھی شامل ہے۔ ان سے ''توضیح المعانی'' (پشتو' شرح خلاصہ کیدانی) ''شمائل نبوی'' ''نسب نامہ'' (پشتو)۔ ''شمس الھدیٰ'' اور سلسلہ نقشبندیہ کا تذکرہ ''ظواہر السرائر'' (فارسی)

یادگار ہے۔ شیخ محمد عمر کے صاحبزادے محمدی میاں مؤلف ''مقاصد الفقہ'' و ''برہان الاصول'' (عربی) بھی بڑے فقیہ اور عالم تھے۔[21]

شاہ محمد غوث پشاوری ثم لاہوری (1084-1152ھ) ایک صاحب علم خانوادے کے چشم و چراغ تھے اور خود بڑے پائے کے صوفی اور عالم تھے۔ اپنے والد سید حسن پشاوری سے قادری سلسلے میں مجاز بیعت تھے۔ ان کی علمی یادگاروں میں ''اسرار التوحید'' (عربی) ''شرح قصیدہ غوثیہ'' (فارسی) اور صحیح بخاری کی شرح (شرح غوثیہ) شامل ہیں۔[22]

پنجاب کے حاجی محمد سعید کا ذکر کیا جا چکا ہے جن سے شاہ صاحب نے ''جواہر خمسہ'' کی اجازت حاصل کی تھی' ایک اور عالم شیخ جار اللہ بن عبدالرحیم لاہوری ثم مدنی کا ذکر ملتا ہے جو شاہ صاحب کے مکتوب الیہ ہیں اور جنہیں شاہ صاحب نے 1173ھ میں سند دی تھی۔[23] خواجہ خدا بخش ملتانی (1150-1253ھ) نے بھی ایک روایت کے مطابق شاہ صاحب سے اجازت حدیث حاصل کی تھی۔[24]

اس امر کا امکان ہے کہ شاہ صاحب سے مراسلت رکھنے والے ان اہل علم اور ان کے فیض یافتگان کے ذریعے شاہ صاحب کی کتابیں ان کے حین حیات پنجاب' سرحد اور سندھ کے علمی حلقوں میں متعارف ہوئیں اور بعد ازاں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی' نیز دوسرے ان بزرگوں کے ذریعے یہ روایت مضبوط تر ہو گئی جو ایک طرف شاہ صاحب کے خوشہ چین تھے اور دوسری طرف انہوں نے پنجاب و سندھ کے اہل علم سے بھی استفادہ کیا تھا۔ مثال کے طور پر حاجی رفیع الدین خان مراد آبادی شاہ صاحب کے شاگرد تھے اور انہوں نے سید شاہ محمد غوث پشاوری ثم لاہوری کا ذکر اپنے پیر و مرشد کے طور پر کیا ہے۔[25] ان بزرگوں کے علاوہ ماضی قریب میں فکر ولی اللہی کو آگے بڑھانے میں جن اہل علم نے جہد و سعی کی ان میں پنجاب مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے دامن ارادات و تلمذ سے وابستہ مولانا نور الحق علوی' شیخ بشیر احمد' پروفیسر محمد سرور' ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتہ' مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی اور متعدد دوسرے افراد کا تعلق پنجاب و سندھ سے ہے' ان حضرات نے ماضی قریب میں شاہ صاحب کی تخلیقات کی فراہمی اور ان کی تحقیق و تعارف میں قابل قدر کام کیا ہے۔ اس طرح گذشتہ دو صدیوں میں شاہ صاحب کی تصنیفات کا ذخیرہ خطہ پاکستان کے کتب خانوں میں جمع ہوا' گو وقت کی غارت گری اور میراث مکتوب کی جانب ہماری عدم توجہی کے نتیجے میں لازماً اس ذخیرے کا ایک حصہ ضائع بھی ہوا۔ تاہم پاکستان کے کتب خانوں میں شاہ صاحب کی کتابوں کا قابل لحاظ ذخیرہ خطی صورت میں موجود ہے۔ ذیل میں پہلے شاہ صاحب کی ایک غیر مطبوعہ تصنیف اور پھر قرآن' حدیث اور فقہ و اصول فقہ، سیرۃ النبی' تاریخ اسلام' تصوف اور دوسرے علوم پر ان کی تصنیفات کے نسخوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامینؐ (عربی)

اس رسالے کا ایک نسخہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری' پٹنہ کی زینت ہے جو شاہ صاحب کے ایک شاگرد شیخ محمد بن پیر محمد کا مکتوبہ ہے۔ اس نسخے کے آخر میں شاہ صاحب نے محرم 1160ھ میں کاتب کو اس رسالے کی روایت کی اجازت دی ہے۔[26] یہ رسالہ تا حال غیر مطبوعہ ہے۔ ''الفضل المبین'' کا ایک نسخہ کتب خانہ مولوی محمد علی، مکھڈ (ضلع

اٹک) میں محفوظ ہے۔36 اوراق پر مشتمل یہ نسخہ 1195ھ میں لکھا گیا ہے۔[27]

فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن (فارسی)

شاہ صاحب کے فارسی ترجمہ قرآن کے متعدد خطی نسخے دستیاب ہیں۔ان میں سے ایک ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔یہ نسخہ عظمت اللہ بن حافظ لطف اللہ نامی کاتب نے 1172ھ میں تحریر کیا اور سید نور شاہ نے شاہ صاحب کی زندگی کے آخری چار برسوں میں کسی وقت اس پر شاہ صاحب سے اجازت روایت حاصل کی۔ شاہ صاحب کے مکتوب الیہم میں ایک ''سید نور شاہ افغانی'' کا تذکرہ کیا جاچکا ہے۔غالب گمان اس بات کا ہے کہ یہ اجازہ ان ہی کے لئے لکھا گیا تھا۔شاہ صاحب کے الفاظ ہیں:

> **بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم. الحمدللّٰہ وحدہ اما بعد فقد سمع علی طرفا من ھذہ الکتاب المسمیٰ بفتح الرحمن فی ترجمۃ القرآن صاحب ھذہ النسخہ السید نور شاہ و اجزت لہ روایۃ سائرہ، وانا الفقیر مولف الکتاب احمد المدعو بولی اللّٰہ کان اللّٰہ لہ فی الاول والاخری والحمدللّٰہ**

''فتح الرحمٰن'' کے اس نسخے پر کاتب کی تحریر سے مختلف خط میں عربی اور فارسی میں بعض توضیحات حاشیے میں درج کی گئی ہیں۔کیا یہ توضیحات اجازہ حاصل کرنے والے نور شاہ کے قلم سے ہیں؟ اور اگر یہ سید نور شاہ کی تحریر کردہ ہیں تو کیا یہ شاہ صاحب کے فکر سے مستفاد ہیں؟ یہ جملہ توضیحات ایک تیسرے سواد تحریر میں ''فتح الرحمٰن'' کے خاتمے پر بطور ضمیر یکجا کر دی گئی ہیں۔ ''فتح الرحمٰن'' کے اس خطی نسخے میں جو شاہ صاحب کی زندگی میں کتابت ہوا تھا، متداول مطبوعہ نسخے (مطبع ہاشمی۔میرٹھ 1258ھ) کے بعض نکات میں اضافے ہیں اور بعض نکات صرف اس خطی نسخے ہی میں ہیں۔اس لحاظ سے ''فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن'' کے کسی بھی جدید ایڈیشن کی تصحیح و تحقیق میں اس خطی نسخے سے استفادہ ناگزیر ہے۔[28]

''فتح الرحمٰن'' کا دوسرا خطی نسخہ اسلامیہ کالج، پشاور یونیورسٹی، پشاور کے ذخیرہ مخطوطات میں ہے۔اس نسخے کے تعارف میں مولوی عبدالرحیم کلاچوی (م 1369ھ) نے 85 برس پہلے لکھا تھا: فتح الرحمٰن مع دیباچہ وضمیمہ مشتمل بر خصوصیات ترجمہ۔یہ دیباچہ اور ضمیمہ نسخہ ہائے مطبوعہ میں نہیں پائے جاتے......''[29] اس نسخے میں جس دیباچے کا ذکر کیا گیا ہے وہ مطبع ہاشمی۔میرٹھ 1285ھ کی اشاعت میں شامل ہے اور ضمیمہ سے مراد ''المقدمہ فی قوانین الترجمہ'' ہے۔

جناب احمد منزوی نے مزید چھ نسخوں کا ذکر بایں تفصیل کیا ہے۔[30]

- نسخہ کتب خانہ گنج بخش، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان۔اسلام آباد، مکتوبہ 12 ویں صدی ہجری۔
- نسخہ دوم کتب خانہ گنج بخش، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان۔اسلام آباد۔مکتوبہ 12 ویں صدی ہجری۔
- نسخہ کتب خانہ محمد شفیع اللہ، بام خیل مردان، مکتوبہ 12 ویں صدی ہجری، کاتب خواجہ محمد امین دہلوی۔
- نسخہ کتب خانہ خانقاہ مہریہ۔گولڑہ شریف (اسلام آباد) مکتوبہ 1284ھ
- نسخہ کتب خانہ پشاور یونیورسٹی۔پشاور، مکتوبہ 1297ھ

-- نسخہ سوم کتب خانہ گنج بخش مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان۔ اسلام آباد۔ مکتوبہ 13 ویں صدی ہجری (از سورہ یٰسین تا سورۃ الاعلیٰ)

المقدمہ فی قوانین الترجمہ (فارسی)

''المقدمہ فی قوانین الترجمہ'' کے نسخے کا ذکر ''فتح الرحمٰن'' کے نسخے کے ساتھ کیا جا چکا ہے جو اسلامیہ کالج، پشاور یونیورسٹی، پشاور میں محفوظ ہے۔ المقدمہ کا ایک ایک نسخہ دارالدعوۃ السّلفیہ۔ لاہور اور کتب خانہ خانقاہ مہریہ، گولڑہ شریف میں موجود ہے۔[31] ان تینوں نسخوں سے مختلف ایک اور نسخے کا عکس ڈاکٹر احمد خان کے ذاتی ذخیرہ کتب میں ہے۔[32]

الفوز الکبیر فی اصول التفسیر (فارسی)

اس متداول متن کے چار نسخے دستیاب ہیں۔[33]

-- نسخہ کتب خانہ ہمدرد۔ کراچی۔ مکتوبہ 12 ویں صدی ہجری
-- نسخہ دوم کتب خانہ ہمدرد۔ کراچی (مجلد با ''فتح العزیز'') مکتوبہ 1239ھ
-- نسخہ کتب خانہ مہریہ۔ گولڑہ شریف (اسلام آباد) مکتوبہ 1284ھ
-- نسخہ کتب خانہ اسلامیہ کالج، پشاور یونیورسٹی۔ پشاور، بلا تاریخ

فتح الخبیر فیما لابد من حفظہ فی علم التفسیر (فارسی)

''فتح الخبیر'' گو الگ کتاب کی حیثیت سے معروف ہے مگر اصلاً یہ ''الفوز الکبیر فی اصول التفسیر'' کا پانچواں باب ہے۔ ربیع الاول 1236ھ کا مکتوبہ ایک نسخہ قومی عجائب گھر، کراچی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔[34]

المصفیٰ (فارسی)

موطا امام مالک کی شرح ''المصفیٰ'' کا مبیضہ شاہ صاحب کی رحلت کے بعد شاہ محمد عاشق پھلتی کی نگرانی میں تیار ہوا تھا۔ اس کی روداد مطبوعہ نسخے (مطبع فاروقی، دہلی۔ 1293ھ) کے آخر میں درج ہے۔ شاہ محمد عاشق کے تیار کردہ نسخے کی نقل پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرہ شیرانی کی زینت ہے۔[35]

عقد الجید فی احکام الاجتہاد و التقلید (عربی)

''عقد الجید'' کا ایک نسخہ کتب خانہ اسلامیہ کالج، پشاور میں ہے[36] اور دوسرا کتب خانہ سندھ یونیورسٹی، جام شورو میں محفوظ ہے۔ آخر الذکر نسخہ عبدالکریم بن عثمان نوشہرائی سندھی نے 1296ھ میں کتابت کیا ہے۔[27]

الانصاف فی بیان سبب الاختلاف (عربی)

اس کتاب کا ایک نسخہ اسلامیہ کالج، پشاور میں ہے۔[38]

حجۃ اللہ البالغہ (عربی)

''حجۃ اللہ البالغہ'' کا ایک نہایت قیمتی نسخہ قومی عجائب گھر، کراچی میں محفوظ ہے۔ قبل ازیں یہ نسخہ پیر محب اللہ شاہ آف پیر جھنڈا کے کتب خانے کی زینت تھا۔ یہ نسخہ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کی نظر سے گزرا ہے۔ ان کے الفاظ میں:

> ''شاہ ولی اللہ صاحب کی وفات کے سات سال بعد اس کی کتابت ہوئی ہے اور کاتب کا نام محمود بن محمد ہے جو کہ سندھیوں کی ایک مشہور قوم پلیجہ کا فرد ہے۔ اس نسخہ کی کتابت کی تاریخ بعد عشا 9 رجب 1183ھ بتائی گئی ہے۔ اس کی کتابت میں کاتب نے اپنے فن کتابت کا اس طرح مظاہرہ کیا ہے کہ اتنی ضخیم کتاب کو صرف ایک سو چوالیس ڈیمی سائز کے اوراق میں ختم کیا ہے اور لطف یہ ہے کہ تحریر بھی صاف ہے اور یہ نسخہ اعلیٰ درجہ کی صحت کا حامل ہے۔ کتاب کے آخر میں کاتب کی طرف سے یہ عبارت مسطور: وقع الفراغ من تحریر الحجۃ البالغہ بعد العشاء لآخر لیلۃ الخمیس تاسع شھر رجب الفرد الحرام 1183 ثلاث وثمانین ومأتہ بعد الالف من الھجر ۃ علی صاحبھا افضل الصلوات واشرف التسلیمات علی ید اجوح العباد الی ربہ المعبود مسکین محمود بن محمد الملقب بالطاھر بن محمود پلیجہ کھڈی عفی اللہ عنہ ورحمہ والدیہ وآباء مع المومنین۔ کھڈی حیدرآباد کے نواح میں کوئی گاؤں ہے۔''[39]

سرور المحزون فی ترجمۃ نور العیون (فارسی)

سیرۃ النبی کے موضوع پر اس مختصر سے کتابچے کے نسخے نسبتاً زیادہ دستیاب ہیں۔ جناب احمد منزوی نے پندرہ نسخوں کی نشاندہی بایں تفصیل کی ہے۔[40]

- نسخہ کتب خانہ خلافت۔ ربوہ' مکتوبہ 12ویں صدی ہجری
- نسخہ کتب خانہ محمد اجمل چشتی فاروقی۔ چشتیاں (بہاولنگر)' مکتوبہ 1198ھ
- نسخہ کتب خانہ منشی عبدالقیوم۔ میر ووال (شیخوپورہ)' مکتوبہ 13 ذی حجہ 1232ھ
- نسخہ کتب خانہ محمد اسماعیل نوشاہی اعظمی۔ مرید کے (شیخوپورہ) مکتوبہ 1241ھ
- نسخہ کتب خانہ قومی عجائب گھر۔ کراچی' مکتوبہ 11 رمضان 1241ھ کاتب شمس الدین کانلوی۔
- نسخہ کتب خانہ گنج بخش' مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان۔ اسلام آباد' مکتوبہ 7 شعبان 1250ھ
- نسخہ کتب خانہ نظامانیاں۔ ٹنڈو قیصر (حیدرآباد سندھ)' مکتوبہ 12 رجب 1254ھ کاتب عبدالغفار بن شیخ محمد

-- نسخہ دوم کتب خانہ گنج بخش' مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان۔ اسلام آباد' مکتوبہ 1263ھ
-- نسخہ کتب خانہ سید فقیر گل۔ متنی (پشاور) مکتوبہ 1263ھ
-- نسخہ کتب خانہ خواجہ نور احمد۔ بھکر۔ مکتوبہ 1264ھ
-- نسخہ ذخیرہ آذر' پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور' مکتوبہ 6 رمضان 1265ھ' کاتب محمد مرتضیٰ شاہ آبادی
-- نسخہ سوم کتب خانہ گنج بخش' مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان۔ اسلام آباد۔ مکتوبہ 1271ھ کاتب غلام محی الدین
-- نسخہ کتب خانہ افتخار احمد چشتی سلیمانی۔ فیصل آباد مکتوبہ 1277ھ' کاتب احسن رضا بن محمد اعظم
-- نسخہ سنٹرل لائبریری۔ بہاول پور' مکتوبہ 13 ویں صدی ہجری' کاتب فقیر نور محمد
-- نسخہ کتب خانہ پروفیسر محمد سعید اختر۔ مرید کے (شیخوپورہ)' مکتوبہ 1293ھ کاتب عزیز احمد بن احمد علی نقشبندی مجددی' مکتوبہ 1293ھ

''سرور المحزون'' کا ایک مزید نسخہ کتب خانہ القرشیہ، قلعدار (گجرات) میں ہے۔[41]

ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء (فارسی)

''ازالۃ الخفا'' کے تین نسخوں کی اطلاع جناب احمد منزوی نے دی ہے۔[44] ان میں دو کتب خانہ گنج بخش مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد کی زینت ہیں اور تیسرا نسخہ کتب خانہ نظامانیاں، ٹنڈو قیصر (حیدر آباد۔ سندھ) میں ہے۔ کتب خانہ گنج بخش کا ایک نسخہ تو ناقص الطرفین ہے۔ البتہ دوسرے نسخے کی اس لحاظ سے اہمیت ہے کہ اس پر لکھی گئی ایک یادداشت کے مطابق ان کا تین نسخوں سے مقابلہ کیا گیا ہے۔ اس کا سال کتابت 1249ھ ہے یعنی شاہ صاحب کی رحلت سے کوئی 73 برس بعد کتابت ہوا تھا۔ کتب خانہ نظامانیاں کا نسخہ خدایار بن محمد احمد نے 1264ھ میں کتابت کیا تھا۔

القول الجمیل فی بیان سواء السبیل (عربی)

''القول الجمیل'' کا ایک نسخہ پروفیسر محمد ایوب قادری' کراچی کے کتب خانے میں تھا جو خوبصورت نستعلیق میں لکھا گیا ہے۔ نسخے پر تاریخ کتاب درج نہیں' مگر کاغذ کی ساخت سے اندازہ ہوتا ہے کہ خاصا قدیم نسخہ ہے۔[43] دوسرا نسخہ' جو تیرہویں صدی کا مکتوبہ ہے' سندھ آرکائیوز، کراچی کی زینت ہے۔[44] تیرہویں صدی ہجری کے ایک پنجابی عالم محمد اکمل بن محمد کامل ملتانی نے ''برائے آں کہ خاص و عام ازاں (القول الجمیل) بہرہ مند شوند آں را بہ فارسی در آوردہ و در دہم ذی قعدہ 1243ھ (1828ء) بہ انجام رسانده است۔'' اس فارسی ترجمے کا خطی نسخہ سنٹرل لائبریری بہاول پور میں محفوظ ہے۔[45] پنجاب یونیورسٹی کے ذخیرہ شیرانی میں ''قول جمیل'' کے ایک نسخے کا ذکر کیا گیا ہے۔[46] غالباً یہی فارسی ترجمہ مراد ہے۔

ہمعات (فارسی)

''ہمعات'' کا ایک نسخہ (مکتوبہ 11 رجب 1206ھ) پنجاب یونیورسٹی کے ذخیرہ شیرانی میں ہے۔[47] دوسرا نسخہ پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں محفوظ ہے۔[48] ثانی الذکر نسخہ بہاولپور میں معراج الدین احمد قادری نامی شخص نے 1300ھ میں کتابت کیا ہے۔ مولانا نورالحق علوی نے ''ہمعات'' مرتب کرتے ہوئے اولیں اشاعت کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے مملوکہ ایک دوسرے نسخے سے استفادہ کیا تھا۔ ان کے تصحیح شدہ ''ہمعات'' میں درج ''خاتمہ سخن'' کے مطابق:

> نسخہ خطیہ مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری جسے سید سرفراز علی سندیلی (کذا، سندیلوی) نے محرم الحرام 1301ھ میں ختم کیا، بے حد محرف و مسخ شدہ تھا۔ نسخہ مطبوعہ گو اس سے کسی قدر بہتر تھا مگر وہ بھی باوجود نادر الوجود ہونے کے اغلاط سے پُر تھا اور تو اور کئی مقامات پر عبارات رہی ہوئی تھی۔ ان ہر دو نسخوں کو ملا کر میں نے ایک ایسا نسخہ مرتب کیا جو باعتبار مجموعی ہر دو سے بدرجہا بہتر ہے۔ گو اغلاط بعض مقامات پر رہ گئے ہیں مگر بحمد اللہ نسخہ متقع بہار ہے۔''[49]

مولانا نورالحق علوی نے ''ہمعات'' کے اولیں مطبوعہ نسخے کے ساتھ جس خطی نسخے سے استفادہ کیا ہے، مذکورہ بالا دونوں نسخے اس سے قدیم تر ہیں۔

لمعات (لمحات) (فارسی)

''لمعات'' کا ایک نسخہ (بلا تاریخ کتابت) ذخیرہ شیرانی، پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ہے۔[50]

الطاف القدس فی معرفۃ لطائف النفس (فارسی)

''الطاف القدس'' کا بارہویں صدی ہجری کا مکتوبہ ایک نسخہ کتب خانہ گنج بخش، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد میں ہے۔[51] مولانا عبدالحمید سواتی نے جب ''الطاف القدس'' کا متن اور اردو ترجمہ شائع کیا تو انہیں اولیں اشاعت (باہتمام مولوی سید ظہیر الدین احمد ولی اللہی، مع اردو ترجمہ) کے علاوہ کوئی خطی نسخہ دستیاب نہ ہو سکا کہ متن کا مقابلہ کر سکتے۔[52]

تفہیمات الٰہیہ (عربی و فارسی)

''تفہیمات الٰہیہ'' کے تین نسخوں کی نشاندہی جناب احمد منزوی نے کی ہے۔[53] ان میں سے ایک ذخیرہ شیرانی، پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ہے جو شاہ صاحب کی زندگی میں 14 جمادی الاول 1146ھ کو لکھا گیا تھا اور لکھنے والے ''محمد

عاشق'' ہیں۔ ممکن ہے یہ ''محمد عاشق'' شاہ صاحب کے مسترشد اور برادر نسبتی محمد عاشق پھلتی ہوں۔ دوسرے دو نسخے خلافت لائبریری ربوہ میں محفوظ ہیں۔[54] ان میں ایک ناقص الاول ہے اور دوسرا عبدالعزیز ساکن (کوٹ) بھوانی داس نے کوٹ قاضی (نزد گوجرانوالہ) میں 24 رجب 1309ھ کو مکمل کیا تھا۔

کشف الغین فی شرح رباعتین (فارسی)

خواجہ محمد باقی باللہ (م 1012ھ) کی دو رباعیوں کی شرح یعنی ''کشف الغین'' کے ایک نسخے کا ذکر کیا جا چکا ہے جو شاہ صاحب کے فیض یافتہ محمد ہاشم بن شیخ محمود تتوی نے شاہ صاحب کے نسخہ سے نقل کیا تھا۔ دوسرا نسخہ پروفیسر مولوی محمد شفیع کے ذخیرہ نوادر میں شامل تھا۔[55]

ہوامع (فارسی)

ابو الحسن شاذلی کی معروف کتاب ''حزب البحر'' کی شرح ''ہوامع'' کے حسب ذیل پانچ نسخوں کی نشاندہی جناب احمد منزوی نے کی ہے[56]

- نسخہ کتب خانہ مولانا محمد علی مکھڈ (اٹک)' مکتوبہ 1260ھ' کاتب ہدایت اللہ پشاوری۔
- نسخہ کتب خانہ فخر الاطباء بدو ملہی (سیالکوٹ)' مکتوبہ 23 رجب 1260ھ
- نسخہ مدرسہ علوم المرتضیٰ۔ بھلوال (سرگودھا)، مکتوبہ 1261ھ
- نسخہ دوم کتب خانہ مولانا محمد علی مکھڈ (اٹک)' مکتوبہ تیرھویں صدی ہجری۔
- نسخہ کتب خانہ نصیر احمد۔ سندھواں تارڑ (گوجرانوالہ)' مکتوبہ تیرھویں صدی ہجری

ایک اور نسخہ جو پنجاب کے ایک بلند پایہ عالم حافظ نور الدین چکوڑوی (م 1302ھ) کا مکتوبہ ہے' کتب خانہ القرشیہ، قلعدار (گجرات) میں محفوظ ہے۔[57]

مقالۃ المرضیہ (الوضیہ) فی النصیحہ والوصیۃ (فارسی)

''مقالۃ المرضیہ (الوضیہ)'' کے جو ''وصیت نامہ'' کے نام سے زیادہ معروف ہے' آٹھ نسخوں کی اطلاع جناب احمد منزوی نے بایں تفصیل دی ہے۔[58]

- نسخہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو پاکستان' کراچی' مکتوبہ 12ویں صدی ہجری۔
- نسخہ قومی عجائب گھر۔ کراچی' مکتوبہ 11 رمضان 1241ھ' کاتب شمس الدین
- نسخہ کتب خانہ افتخار احمد چشتی سلیمانی' فیصل آباد' مکتوبہ 1278ھ' کاتب غلام محمد عباس نگری
- نسخہ کتب خانہ گنج بخش' مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان۔ اسلام آباد' مکتوبہ 1281ھ
- نسخہ کتب خانہ خانہ مدرسۃ العلوم الشرعیہ۔ بھل (بھکر) مکتوبہ 3 رجب 1291ھ

-- نسخہ کتب خانہ فخر الاطباء بدو ملہی (سیالکوٹ)' مکتوبہ 13 ویں صدی ہجری' کاتب حمایت الاسلام بن شیخ محمد رحمت

-- نسخہ مملوکہ احسان دانش۔ لاہور مکتوبہ 14 ویں صدی ہجری۔

-- نسخہ کتب خانہ مجددیہ 'للہ ٹاؤن (جہلم) مکتوب 14 ویں صدی ہجری'

''مقالۃ المرضیہ'' کا ایک اور نسخہ کتب خانہ القرشیہ، قلعہ دار (گجرات) میں معروف عالم دین حافظ نور الدین چکوڑوی کا مرقومہ محفوظ ہے۔[59]

رسالہ دانشمندی

''رسالہ دانشمندی'' کے ان دو نسخوں کے بارے میں اطلاع ہے۔[60]

-- نسخہ مملوکہ خلیل الرحمٰن داؤدی' لاہور' مکتوبہ 1288ھ

-- نسخہ کتب خانہ مدرستہ العلوم الشرعیہ۔ بھل (بھکر)' مکتوبہ 5 رجب 1291ھ

صرف میر (منظوم)

میر سید شریف جرجانی کے متداول درسی متن ''صرف میر'' کو شاہ صاحب نے نظم کا جامہ پہنایا تھا۔ یہ منظومہ مطبع محمدی لاہور سے غالباً پہلی بار شائع ہوا تھا اور اس کا متن غالباً لاہور کے کسی صاحب علم کے ہاں موجود خطی نسخے پر مبنی تھا۔ صرف میر کی ایک شاعت صوفی عبدالحمید سواتی کی کوششوں سے بھی شائع ہوئی ہے (گوجرانوالہ 1397ھ) ''صرف میر'' (منظوم) کے اسی سے زائد نسخوں کا اندراج جناب احمد منزوی نے کیا ہے[61]

✦……✦……✦

آخر میں بعض ان تصنیفات کے خطی نسخوں کا ذکر کیا جاتا ہے' جن کے بارے میں فہرست نگاروں نے اس گمان کا اظہار کیا ہے کہ یہ شاہ صاحب کی تخلیقات ہو سکتی ہیں یا کوئی تصنیف ان کے نام سے معروف ہے۔ گو اس کا انتساب ان کی جانب درست نہیں۔

''مکتوبات شاہ ولی'' کے نام سے ایک خطی نسخہ پنجاب یونیورسٹی کے ذخیرہ شیرانی میں محفوظ ہے۔[62] اس میں شامل بعض مکتوبات 1129ھ اور 1131ھ کے مرقومہ ہیں۔ احمد منزوی نے قیاساً لکھا ہے کہ شاید شاہ صاحب کے ہیں۔[63] سندھی ادبی بورڈ جام شورو کے کتب خانے میں ایک بیاض پر مفتی سید عبدالفتاح حسینی قادری معروف بہ مولوی میر اشرف علی گلشن آبادی (جن کا تذکرہ مولوی رحمان علی نے لکھا ہے)[64] کے پوتے سید بشیر الدین احمد نقوی کی یہ تحریر ہے: ''این کتاب از دست محدث دہلوی گذشتہ و بایں فقیر رسیدہ است فالحمدللہ فقیر بشیر الدین علی عفہ''۔ فہرست نگار کے مطابق ''یہ محدث دہلوی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م 1052ھ)'' تو ہرگز نہیں ہو سکتے' البتہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م 1176ھ) کے امکان پر غور کیا جا سکتا ہے۔[65]

کتب خانہ گنج بخش، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان اسلام آباد میں ''اثبات اشارہ درنماز'' کے نام سے ایک نسخہ (مکتوبہ 1282ھ) ہے جس کے ترقیمے میں اسے شاہ صاحب کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔[66] ''خلاصہ کیدانی'' کے مصنف نے تشہد میں اشارہ سبابہ کو غلط قرار دیا ہے اور اس کے زیر اثر بعض احناف نے سخت رویہ اختیار کیا ہے، حضرت مجدد الف ثانی بھی ان بزرگوں میں شامل ہیں۔ تاہم دوسرے اہل علم نے اس عمل کو سنت صحیحہ سے ثابت قرار دیا ہے۔ غالباً شاہ صاحب بھی اشارہ سبابہ کے قائل تھے۔

''بلاغ المبین'' (اولین اشاعت، مطبع محمدی، لاہور 1307ھ) شاہ صاحب کی جانب منسوب ایک مختصر متن ہے، اسے بعض اہل قلم نے جعلی اور وضعی قرار دیا ہے۔[67] 1166ھ کی یہ تالیف (ازخرد گفتم کہ تاریخش بگو۔ فی البدیہ نامش بجو) کا ایک نسخہ خانہ گنج بخش مرکز تحقیقات فارسی، ایران و پاکستان، اسلام آباد میں محفوظ ہے۔[68]

✦ ..... ✦ ..... ✦
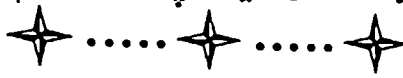
حواشی

(1) شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدر آباد سندھ (قائم شدہ 1963ء) اور شاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ دو نمایاں ادارے ہیں۔

(2) سید عبداللہ کے والد میر بہادر علی حسینی کے احوال کے لئے دیکھیے: سید محمد: ارباب نثر اردو، لاہور: مکتبہ معین الادب 1950ء صفحات 111-126، محمد یحییٰ تنہا: سیر المصنفین، لاہور شیخ مبارک علی 1948ء صفحات 76-81 حامد حسن قادری: داستان تاریخ اردو، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ 1966ء صفحات 124-128

سید محمد مؤلف ''ارباب نثر اردو'' نے سید عبداللہ کو میر بہادر علی حسینی کا والد قرار دیا ہے۔ یہی غلطی محمد یحییٰ تنہا اور حامد حسن قادری نے دہرائی ہے۔ سید عبداللہ کے لئے دیکھیے: غلام رسول مہر: جماعت مجاہدین، لاہور: کتاب منزل 1955ء ص 287، عبدالحلیم چشتی: ''سید احمد شہید کی اردو تصانیف'' و ''اردو ادب پر ان کی تحریک کا اثر''...... کراچی: الرحیم اکیڈمی 1986ء صفحات 28-32 (حاشیہ)، محمد ایوب قادری، اردو نثر کے ارتقاء میں علما کا حصہ، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ 1988ء صفحات 197-228

(3) مطبع صدیقی، بریلی کی مطبوعات اور بانی مطبع کے احوال و آثار کے لئے دیکھیے: محمد ایوب قادری: محمد احسن نانوتوی، کراچی: روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی 1966ء

(4) مولوی سید ظہیر الدین ولی اللہی کے لئے دیکھیے محمد احمد برکاتی: شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان، لاہور: تخلیق مرکز 1976ء، صفحات 177-198

(5) ''فتح الخبیر'' کا یہ نسخہ ہم دست نہیں ہو سکا، یہ اطلاع محمود احمد برکاتی نے دی ہے۔ دیکھیے: حوالہ مذکورہ ص 72

(6) کتاب کے خاتمۃ الطبع کے لئے دیکھیے محمد ایوب قادری، محمد احسن نانوتوی، حوالہ مذکورہ ص 144

(7) ایضاً، ص 145۔ مولانا محمد احسن نے کتاب کے خاتمۃ الطبع میں لکھا ہے ''باوجود تلاش کثیر صرف سہ نسخہ بہم شدہ بودند...... ہر چند ہر نسخہ مملو از اغلاط بودہ مگر بمقابلہ یک دگر حق صریح اکثر ظاہر می شد وانجا کہ ہر سہ نسخہ در غلطی موافق بودند رجوع بکتب دیگر کردہ می شد آیدا گر کتب دیگر ہم نشانے بہم رسید چیزے از محو و اثبات بعمل آوردہ شد و اکثر جا از تصرف خود بر حاشیہ اطلاع کردہ ام۔''

(8) محمد احمد برکاتی، حوالہ مذکورہ، ص 72

(9) شاہ ولی اللہ، فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن، میرٹھ: مطبع ہاشمی 1258ھ

(10) مفتی غلام سرور: لاہور: حدیقۃ الاولیاء (تحقیق وحواشی محمد اقبال مجددی)، لاہور: اسلامک بک فاؤنڈیشن، صفحات 200-203

(11) شاہ ولی اللہ الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ دہلی: مطبع احمد، 1311ھ

(12) محمد عاشق پھلتی: القول الجلی فی ذکر آثار الولی: حضرت شاہ ابوالخیر اکادمی، س۔ن، ص 29

(13) ایضاً۔ص 39

(14) ایضاً۔ص 83، ص 88

(15) مخدوم محمد معین تتوی سندھی کے احوال و آثار میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور ان کی بعض کتب مناسب تحقیق و ترتیب کے ساتھ شائع ہوئی ہیں۔ان کی حیات و آثار کے لئے دیکھیے: مخدوم محمد ابراہیم خلیل: تذکرہ تکملہ مقالات الشعراء (تصحیح وحواشی سید حسام الدین راشدی)، کراچی: سندھی ادبی بورڈ، 1958، صفحات 241-245، عبدالرشید نعمانی: مقدمہ ''دراسات اللبیب'' حیدرآباد: سندھی ادبی بورڈ، 1958ء

(16) غلام مصطفیٰ قاسمی ''علمائے سندھ اور شاہ ولی اللہ کے علمی روابط'' ماہنامہ ''الرحیم'' (حیدرآباد۔سندھ)، دسمبر 1963، صفحات 29-19

(17) شاہ ولی اللہ: مکتوبات شاہ ولی اللہ دہلوی، (ترتیب، تحقیق و تعلیق محمد عطا اللہ حنیف بھوجیانی)، لاہور: المکتبۃ السلفیہ 1983ء صفحات 16-32، مزید مکتوبات کے لئے دیکھیے: شاہ ولی اللہ: نادر مکتوبات شاہ ولی اللہ دہلوی (تحقیق و ترجمہ نسیم احمد فریدی)، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، 1991ء متعلقہ صفحات۔

(18) سند کے لئے دیکھیے: شاہ ولی اللہ: ''التفہیمات الٰہیہ'' جلد اول، ڈابھیل: مجلس علمی، 1936ء، صفحات 102-104

(19) سید عارف نوشاہی: فہرست نسخہ ہائے خطی فارسی موزہ ملی پاکستان کراچی، اسلام آباد: مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان 1983ء ص 253

(20) خلیق احمد نظامی: شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، لاہور: ادارہ اسلامیات 1978ء نیز شاہ ولی اللہ: نادر مکتوبات شاہ ولی اللہ، حوالہ مذکورہ۔

(21) شیخ محمد عمر پشاوری کے احوال و آثار کے لئے دیکھیے محمد امیر شاہ قادری: تذکرہ علما و مشائخ سرحد، پشاور عظیم پبلشنگ ہاؤس، س۔ن 92-100

(22) شاہ محمد غوث پشاوری ثم لاہوری کے احوال کے لئے دیکھیے: پیام شاہجہاں پوری: تذکرہ شاہ محمد غوث، لاہور: اشاعت منزل 1965ء محمد امیر شاہ قادری، حوالہ مذکورہ صفحات 74-91

(23) یہ اجازہ ''المسوّیٰ'' (مطبوعہ مکہ معظمہ) میں شائع ہوا۔

(24) اختر راہی: تذکرہ علمائے پنجاب، لاہور: مکتبہ رحمانیہ 1978ء صفحات 171-173

(25) دیکھیے: حاجی رفیع الدین خان فاروقی مرادآبادی: پونے دوصدی پیشتر کی ایک تاریخی دستاویز یعنی ہندوستان کا سب سے پہلا سفرنامہ حجاز (مرتبہ نسیم احمد فاروقی)، لکھنؤ: کتب خانہ الفرقان، 1961ء

(26) مسعود عالم ندوی: ''عکس تحریر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی'' ماہنامہ ''الفرقان'' (بریلی) شاہ ولی اللہ نمبر، صفحات 247-248

(27) نذر صابری: نوادرات علمیہ اٹک، کیمبل پور (اٹک): مجلس نوادرات علمیہ 1963ء ص 33۔احمد خان: فہرس المخطوطات العربیہ الاسلامیہ فی پاکستان، رباط: المنظمۃ الاسلامیہ للتربیۃ والعلوم والثقافۃ 1997ء الجزء الاول صفحہ 156-157۔ جناب نذر صابری نے خطی نسخے کا سال کتابت 1155ھ درج کیا ہے جبکہ جناب احمد خان نے 1195ھ میں لکھا ہے۔

(28) اس خطی نسخے کے جملہ حواشی جناب احمد خان نے شاہ صاحب کی اہم تحریر ''المقدمہ فی قوانین الترجمہ'' کی تصحیح و تحقیق متن کے ساتھ مرتب کردیے ہیں: دیکھیے: جناب احمد خان کی کاوش ''ترجمہ قرآن کریم میں شاہ ولی اللہ کے اصول و مناہج'' خدا بخش لائبریری

جرنل (پٹنہ)، مارچ 1999ء صفحات 32-64

(29) عبدالرحیم: لباب المعارف العلمیہ فی مکتبہ دارالعلوم الاسلامیہ، آگرہ: مطبع آگرہ اخبار 1918ء ص 14

(30) احمد منزوی: فہرست مشترک نسخہ ہائے خطی فارسی پاکستان، اسلام آباد: مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان 1983ء جلد اول صفحات 61-62

(31) ایضاً، صفحہ 164

(32) احمد خان، ''ترجمہ قرآن کریم میں شاہ ولی اللہ کے اصول ومناہج'' حوالہ مذکوہ صفحہ 6

(33) احمد منزوی، حوالہ مذکورہ جلد اول صفحہ 162

(34) سید عارف نوشاہی، حوالہ مذکورہ صفحہ 23

(35) محمد بشیر حسین: فہرست مخطوطات شیرانی، لاہور: ادارہ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب، 1969ء جلد دوم، ص 303، نیز ص 409

(36) عبدالرحیم، حوالہ مذکورہ، 146

(37) نجم الاسلام: ''ذخیرہ حکیم شمس الدین احمد حیدرآباد مخزونہ مرکزی کتاب خانہ جامعہ سندھ'' مجلہ تحقیق (جام شورو......سندھ) شمارہ 4 (1990ء)، صفحات 17-18

(38) عبدالرحیم: حوالہ مذکورہ، ص 146

(39) غلام مصطفیٰ قاسمی: ''شاہ ولی اللہ کی تالیفات پر ایک نظر'' ماہنامہ ''الرحیم'' (حیدرآباد۔سندھ)، جون 1966ء، ص 36

(40) احمد منزوی، حوالہ مذکورہ جلد دہم، صفحات 306، 307

(41) ہجرۃ کونسل، کتب خانہ القرشیہ، قلعدار (گجرات) ''کتاب درست'' اسلام آباد، شمارہ 2 (رمضان 1406ھ) صفحات 105-106

(42) احمد منزوی: حوالہ مذکورہ، جلد دوم صفحات 1028-1028 جلد دہم، صفحات

(43) ثناء الحق: ''کراچی کے دونجی کتب خانے'' سہ ماہی ''الزبیر'' (بہاول پور) صفحہ 311 کتب خانہ 1967ء ص 311

(44) سید خضر نوشاہی: فہرست مخطوطات دکتر نبی بخش بلوچ مخزونہ سندھ آرکائیوز۔ کراچی، مجلہ ''تحقیق'' (جام شورو، سندھ)، شمارہ 12-13 (1998-99ء)، ص 851

(45) احمد منزوی: حوالہ مذکورہ جلد سوم، صفحات 1782-1783

(46) محمد بشیر حسین: حوالہ مذکورہ جلد دوم، ص 239

(47) ایضاً، جلد دوم، ص 223

(48) منظور احسن عباسی: تفصیلی فہرست مخطوطات فارسیہ پنجاب پبلک لائبریری لاہور، پنجاب پبلک لائبریری 1963ء، صفحات 105-106

(49) شاہ ولی اللہ، ہمعات (تصحیح وتحشیہ نورالحق علوی، غلام مصطفیٰ قاسمی)، حیدرآباد سندھ: اکادیمیہ الشاہ ولی اللہ دہلوی، 1964ء، ص 135

(50) محمد حسین: حوالہ مذکورہ جلد دوم، ص 243، احمد منزوی: حوالہ مذکورہ جلد سوم، ص 1849

(51) احمد منزوی: حوالہ مذکورہ جلد چہارم، ص 2241

(52) شاہ ولی اللہ: الطاف القدس فی معرفۃ النفس، گوجرانوالہ: ادارہ نشر واشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم، 1964ء ص 5

(53) احمد منزوی: حوالہ مذکورہ جلد سوم، ص 1357

(54) مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروکاروں کے مرکز ربوہ کے کتب خانے میں شاہ صاحب کی کتابوں کی موجودگی کے ممکنہ اسباب میں

ایک سبب یہ ہے کہ مرزا صاحب کے پہلے جانشین مولوی نور الدین بھیروی کو شاہ صاحب کی کتابوں کی تلاش رہتی تھی۔ شاہ محمد سلیمان پھلواروی (م1354ھ) کے نام مولوی صاحب کے دو خط ملتے ہیں۔ 8 اپریل 1910ء (1328ھ) کے پہلے خط میں مولوی صاحب نے لکھا ہے: اس خاکسار کو تفہیمات الٰہیہ شاہ ولی اللہ دہلوی کا شوق ہے اور مختلف امکنہ سے اس کے اجزا مجھے میسر آئے...... سید محمد حسن وزیر اعظم پٹیالہ، مولوی عبدالعزیز ساکن کوم لدھیانہ، سید احمد ولی اللٰہی دہلوی سے، مگر پھر بھی کتاب پوری نہ ہوئی۔ خاکسار نے سید نور الحسن خان بالقابہ کو عریضہ لکھا اور انہوں نے ارشاد فرمایا کہ حضرت مولانا الاستاذ شاہ سلیمان پھلواروی کے پاس کامل نسخہ ہے۔ اس لئے یہ عرضہ پیش خدمت کر کے امیدوار ہوں۔ کتاب کو اس طرح کامل کروں یا تو حضرت کے خدام میں کوئی کاتب ہو اور وہ لکھ دے یا حضور مجھ بھیج۔ میرز پر اعتماد فرماویں...... یا کوئی اور تدبیر حضور کریں...... (ماہنامہ ''مہر نیمروز'' کراچی، اختر اور ینوی نمبر 1977ء ص19)

شاہ محمد سلیمان پھلواروی نے ''تفہیمات الٰہیہ'' کا نسخہ مولوی نور الدین کو بھیج دیا۔ دوسرے خط میں مولوی نور الدین نے شاہ صاحب کی ایک دوسری کتاب ''خیر کثیر'' کے بارے میں لکھا ہے: ''خیر کثیر'' شاہ ولی اللہ کا شوق تھا، مگر کسی نے مجھے رویاء میں کہا ''خیر کثیر'' ہندوستان میں نہیں۔ ہندوستان کا لفظ علم رویاء میں وسیع معنی رکھتا ہے۔ وعندہ علم الکتاب، پھر ممکن ہے کہ خیر کثیر کے معنی وسیع ہوں۔ (حوالہ مذکورہ)

ممکن ہے کہ ''تفہیمات الٰہیہ'' کے نسخے مولوی نور الدین کے ذخیرہ کتب کا حصہ رہے ہوں اور آج ربوہ میں محفوظ ہوں۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھی کے ہم ذوق شاگرد مولوی نور الحق علوی کی رحلت پر ان کا کتب خانہ خلافت لائبریری، ربوہ نے خرید لیا تھا۔ شاید شاہ صاحب کی کتابوں کے خطی نسخے اسی راستے سے ربوہ پہنچ گئے ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(55) احمد منزوی: حوالہ مذکورہ، جلد سوم، ص1793

(56) ایضاً جلد سوم، ص 2130

(57) ہجرۃ کونسل، حوالہ مذکورہ، ص34

(58) احمد منزوی: حوالہ مذکورہ، جلد چہارم، ص2464

(59) ہجرۃ کونسل، حوالہ مذکورہ، ص34

(60) احمد منزوی: حوالہ مذکورہ، جلد یازدہم، صفحات 972-973

(61) ایضاً، جلد سیزدہم صفحات 2588-2589

(62) محمد بشیر حسین: حوالہ مذکورہ، جلد دوم، ص254

(63) احمد منزوی: حوالہ مذکورہ، جلد سوم ص2020

(64) رحمان علی: تذکرہ علمائے ہند (مترجمہ محمد ایوب قادری)، کراچی: پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی 1961ء ص311

(65) نجم الاسلام: ''سندھی ادبی بورڈ کے مخطوطات''، ''تحقیق'' (جام شورو۔ سندھ)، شمارہ 5 (1991ء) ص78

(66) احمد منزوی: حوالہ مذکورہ جلد چہاردم، ص283

(67) وکیل احمد سکندر پوری: وسیلہ جلیلہ، لکھنؤ: مطبع یوسفی، س ن، ص23۔ محمد ایوب قادری: مقدمہ ''مجموعہ وصایا اربعہ'' حیدر آباد سندھ: اکادیمیۃ الشاہ ولی اللہ دہلوی، 1964ء، صفحات 28-30''

(68) احمد منزوی: حوالہ مذکورہ جلد دوم، ص1049

(فکر و نظر اسلام آباد)، اپریل تا جون 2001ء ص79-102)

ڈاکٹر محمد ضیاالدین انصاری

شاہ ولی اللہ صاحب کی تصانیف کے خدابخش لائبریری میں محفوظ قلمی نسخے

(ایک تعارف)

عارف باللہ اور امام الملۃ حضرت شاہ ولی اللہ کی شخصیت عجائب روزگار میں سے تھی۔ اسے ہمہ جہت اور ہشت پہلو کہنا بے جانہ ہوگا کیوں کہ آپ بیک وقت مترجم و مفسر قرآن، شارح حدیث، واضع اصول تفسیر، فقیہ، عارف کامل، ادیب، مصنف اور شاعر تھے۔ آپ مصلح قوم تھے۔ آپ کی فکر ارفع اور خیالات بلند تھے۔ ان میں سمندر کی سی گہرائی اور سمندر جیسی وسعت پائی جاتی ہے۔ آپ کے کارنامے متنوع اور کثیر الجہات ہیں۔ آپ کی مقدس ہستی صرف برصغیر ہند و پاک کے لئے ہی نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کے لئے سرمایہ ناز تھی۔ آپ کے علمی، ادبی اور عملی کارناموں کی معنویت و افادیت سدا بہار ہے۔ آپ کی ذات گرامی سرچشمہ کمالات اور منبع فیوض و برکات تھی اور بقول شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی:

> ''امام الملۃ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ العزیز کی مقدس ہستی ان ممتاز ہستیوں میں سے ہے جن کے وجود سے اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ) کو دیگر امم پر امتیاز اور شرف بخشا ہے۔ منبع الفیوض الربانیہ اور قاسم الحکم الازلیہ آقائے نامدار حضرت خاتم النبیین علیہ وعلی آلہ وصحبہ الصلوٰۃ والسلام سے ایسی نسبت رکھنے والے اشخاص جیسی کہ آفتاب سے آئینہ کو ہے، ملت مسلمہ میں بہت کم نظر آتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب موصوف انہی میں سے ایک ہیں۔ ان کی تصانیف، ان کے مضامین عالیہ، ان کے اعلیٰ پایہ کے تلامیذ، ان کے سلاسل علوم ظاہریہ اور معارف باطنیہ کا علی مر الدہور جاری ہونا ان کے منتسبین کا تقویٰ اور علم میں بینظیر ماہر ہونا بتلا رہا ہے کہ یہ مقدس ہستی منظور نظر الٰہی اور مخلصین عباد اور مجددین امت میں خصوصی شان رکھنے والی تھی اور ہے۔ صرف ہندوستان کے مسلمانوں پر ان کی ذات بابرکات سے فیض یاب ہونے کا شرف مخصوص نہیں رہا بلکہ ان کے فیوض سے سید مرتضیٰ بلگرامی ثم الزبیدی (شارح قاموس و شارح احیاء العلوم وصاحب

عقود الجواہرا المصیۃ وغیرہ) حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی ثم المکی حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی ثم المدنی وغیرہ ہم رحمہم اللہ تعالیٰ حضرات نے ملک عرب، مصر، شام، مغرب اقصیٰ وغیرہ کے مسلمانوں کو بھی بہت بڑے درجے تک مالا مال فرمایا۔ اس ہستی پر اہل ہند جس قدر بھی ناز کریں بجا ہے اور ان کے بحار فیض سے تشنگان جس قدر بھی اپنی پیاس بجھائیں مفید اور کارآمد ہے۔ انہی کے فیوض غیر متناہیہ ہندوستان اور بیرون ہند کے مسلمانوں کے لئے آج مشعل ہدایت اور رہنمائے طریقت ہیں۔[1]''

یوں تو شاہ صاحب کے کارنامے بے شمار اور کمالات بے حساب ہیں لیکن میری ناقص رائے میں آپ کی مصنفانہ شان سب سے زیادہ نمایاں ہے اور دائمی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ نے جتنی بھی تصانیف بطور یادگار چھوڑی ہیں وہ اپنی معنویت اور افادیت میں کسی عظیم کتب خانے سے کم اہمیت اور وقعت نہیں رکھتیں۔ آپ کی تصانیف کی صحیح تعداد متعین کرنا مشکل ہے اس لئے کہ آپ کے سوانح نگاروں اور تذکرہ نویسوں نے ان کی تعداد مختلف بتائی ہے۔ مثلاً مولوی فقیر محمد جہلمی نے ''حدائق الحنفیہ'' میں 28 کتابوں کے نام درج کئے ہیں، جبکہ پروفیسر ایوب قادری نے مولوی رحمان علی کی عربی تصنیف ''تذکرہ علمائے ہند'' کے اردو ترجمے کے ساتھ جو وقیع اضافے کیے ہیں ان میں شاہ صاحب کی 32 کتابوں کے نام درج ہیں لیکن مولوی محمد رحیم بخش نے ''حیات ولی'' میں آپ کی 51 ضخیم کتابوں اور مختصر رسالوں کی تفصیلات بیان کی ہیں اور اس سلسلہ میں حسب ذیل نوٹ بھی تحریر کیا ہے:

''شاہ صاحب کی تصنیفات کثرت سے ہیں اور ان کے مطالب و مقاصد نہایت مفید و دلچسپ ہیں۔ لیکن افسوس اور سخت افسوس یہ ہے کہ باوجود تحقیقات کے چند مشہور کتابوں کے علاوہ اور کسی کا پتہ نہیں چلتا۔ تاہم جو کتابیں ہمیں اس وقت تک دستیاب ہوئیں اور جنہوں نے ہندوستان و عرب دونوں میں ایک عجیب مذاق علمی پھیلا رکھا ہے' ذیل کے نقشے میں ہیں جن سے ان کے مقاصد و مطالب کی مختصر کیفیت معلوم ہوئی ہے۔[2]''

ان اختلافات کے باوجود شاہ صاحب کی اہم اور نمائندہ تصانیف کا پتہ لگانا دشوار نہیں چنانچہ ذیل میں آپ کی ان تصانیف کی فہرست درج کی جاتی ہے جن سے آپ کے نظریات و افکار کا علم ہو سکتا ہے اور جنہوں نے دائمی اہمیت اور وقعت حاصل کر لی ہے۔

عربی تصانیف

1۔ حجۃ اللہ البالغہ
2۔ فتح الکبیر
3۔ المسوّیٰ (شرح الموطا)
4۔ الانصاف فی بیان سبب الاختلاف
5۔ عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید
6۔ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء
7۔ قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین
8۔ فیوض الحرمین
9۔ الدر الثمین فی مبشرات النبی الکریم
10۔ تاویل الاحادیث

11۔ قصیدۃ الحبیب فی مدح سید العرب والعجم
12۔ الاربعین
13۔ حسن العقیدۃ
14۔ القول الجمیل
15۔ تراجم البخاری
16۔ المقدمۃ المنیۃ
17۔ عوارف الانتباہ فی اسناد الحدیث
18۔ مکاتیب عربی
19۔ رسالہ درباب (وحدۃ الوجود وحدۃ الشہود)
20۔ القالۃ الوصیۃ (متعلق وصیت)

فارسی تصانیف

1۔ فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن
2۔ الفوز الکبیر، شرح فتح الخبیر
3۔ مصفٰی، شرح موطا
4۔ الطاف القدس
5۔ انفاس العارفین
6۔ شرح رباعیتن (حضرت خواجہ باقی باللہ کی دو رباعیوں کی عارفانہ شرح)
7۔ سطعات
8۔ انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ
9۔ سرور المحزون فی سیر الامین والمامون
10۔ فیض عام
11۔ ہمعات
12۔ لمعات
13۔ خیر کثیر
14۔ شفاء القلوب
15۔ البدور البازغہ
16۔ رسائل تفہیمات
17۔ لسان العین فی مشائخ الحرمین
18۔ وصیت نامہ
19۔ عطیۃ الصمدیہ فی الانفاس المحمدیہ
20۔ مکتوبات
21۔ امداد فی مآثر الاجداد

شاہ صاحب کی مندرجہ بالا عربی و فارسی تصانیف میں سے چند کے قلمی نسخے خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں محفوظ ہیں۔ ان کا مختصر تعارف ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

1- حجتہ اللہ البالغہ

یہ عبادات و معاملات سے متعلق انتہائی اہم اور لاجواب تصانیف ہے۔ اس کو ہم شاہ صاحب کی شاہکار تصنیف قرار دے سکتے ہیں۔ مصنف محترم نے اس میں نظام شرعی کے بڑے ہی دل نشین اور حکیمانہ انداز میں تشریح فرمائی ہے۔ اس ضخیم کتاب میں فقہا و محدثین کے مسلکی اختلاف کی بھی تعبیر و توضیح کی گئی ہے اور وحدت دین جیسے نازک اور اہم مسئلہ سے بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں علوم خمسہ یعنی فقہ، حدیث، اخلاق، تصوف اور فلسفہ کی چاشنی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے اور بقول حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی:

شاہ ولی اللہ صاحب پہلے ہندوستانی مصنف ہیں جن کی عربی تصانیف بالخصوص ''حجتہ اللہ البالغہ''
میں اہل زبان کی سی روانی، قدرت اور ادباء عرب کی سی عربیت ہے اور وہ ان بے اعتدالیوں سے
پاک ہیں جو عجمی علما کی عربی تحریر میں پائی جاتی ہیں۔'' (4)

شاہ صاحب کی اس اہم تصنیف کا ایک بہت ہی حسین اور دیدہ زیب قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں محفوظ ہے۔اس میں ندرت یہ ہے کہ عربی تصنیف ہونے کے باوجود اس کی کتاب خط نستعلیق میں ہے۔کاتب بہت خوشخط ہے۔ اس لئے کتابت بھی جاذب نظر ہے۔کتابت بڑے اہتمام سے کی گئی ہے۔سرورق کی لوح ذہبی (سونے کی) ہے۔اس کی دیگر خصوصیات اس طرح ہیں:

تعداد اوراق: 353۔مسطر، 19 سطری۔کتابت، 1245ھ (1829ء)

آغاز: کتاب کا آغاز حسب ذیل کلمات سے ہوتا ہے:

الحمد للّٰہ الذی فطر الانام علی ملة الاسلام والاهتداء وجبلهم علی الملة الحنفية السمحة البيضاء ثم انهم غشيهم الجهل وقعوا سفل السافلين......الخ

اختتام: کتاب کا اختتام کاتب کے حسب ذیل ترقیمہ پر ہوتا ہے:

تمت تمام شد این کتاب بموجب فرمائش جناب منشی محمد حسن صاحب دام اقبالہ، بتاریخ دوازدہم ماہ ربیع الثانی 22 جلوسی مطابق ہجری 1245۔فقط

2۔المسوی شرح الموطا

(عربی) یہ شاہ صاحب کی ایک اور بے نظیر تالیف ہے اور جیسا کہ اس کے نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ موطا امام مالک کی شرح ہے۔یہ بات تو ہر شخص کے علم میں ہے کہ موطا صحیح احادیث کا مجموعہ ہے جسے بہت ہی زیادہ چھان بین اور کمال تحقیق سے حضرت امام مالک (ابوعبداللہ مالک بن انس الاصحی والمدنی) نے مدون کیا تھا۔

شاہ صاحب نے عربی زبان میں اس کی تحقیق کی ہے اور پھر اسی تسلسل میں ہر ایک حدیث کی بڑے ہی عالمانہ، محققانہ اور شگفتہ انداز میں تشریح کی ہے اور اسی ضمن میں بہت سے فقہی مسائل کی بھی توضیح فرما دی ہے جس سے ان احادیث کے مطالعہ و مفاہیم سمجھنے میں بڑی سہولت ہو جاتی ہے۔ہمارے بیشتر علما کا خیال ہے کہ مسوی کو محض ایک شرح تصور نہ کرنا چاہئے بلکہ علم حدیث اور علم فقہ پر ایک مستقل تصنیف سمجھنا چاہئے۔

اس موقر تصنیف کا اہم قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے۔اس کی تفصیلات اس طرح ہیں:

تعداد اوراق: 322۔ مسطر: 19 سطری

تاریخ کتابت: 1265ھ (1849ء)

کاتب: قاضی عبدالرحمٰن بن قاضی اسماعیل

زیر نظر نسخہ خط نسخ میں بہت خوبصورت لکھا گیا ہے۔

کتاب کا آغاز حسب ذیل عبارت سے ہوتا ہے:

الحمد للّٰہ الذی انزل علیٰ عبده الکتاب قیما......

اما بعد فیقول العبد الفقیر الیٰ رحمة اله الکریم احمد المدعو بولی الله بن عبدالرحیم الخ

3-التعلیق علی ابواب البخاری (عربی)

اس کا بھی ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری میں دستیاب ہے۔ یہ 170 اوراق پر مشتمل ہے، آخری چند اوراق غائب ہیں۔ مسطر گیارہ سطری ہے۔ خط نسخ میں تحریر کیا گیا ہے لیکن کاتب کم سواد ہے اس لئے کتابت بھی اچھی نہیں ہے۔ اس کا آغاز حسب ذیل عبارت سے ہوتا ہے:

الحمد للّٰہ وصلی اللّٰہ علی سیدنا محمد واله وصحبه وسلم اما بعد فیقول الفقیر الی رحمة اللّٰہ الکریم المدعو بولی اللّٰہ بن عبدالرحیم...... الخ

خدا بخش لائبریری پٹنہ میں شیخ محمد بلگرامی الہ آبادی کے ہاتھ کا لکھا ہوا مکمل نسخہ بخاری شریف میں موجود ہے۔ یہ نسخہ شاہ ولی اللہ کے درس میں رہا ہے۔ اس پر ایک اجازت نامہ انہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جس کے اخیر میں لکھا ہوا ہے کہ:

"کتبه بیده الفقیر الی رحمة اللّٰہ الکریم الودود، ولی اللّٰہ بن عبدالرحیم بن وجیهه الدین العمری نسباً الدهلوی وطناً، الاشعری عقیدتاً، الصوفی طریقتاً، والحنفی عملاً والحنفی والشافعی درساً"

4-القول الجمیل فی بیان سواء السبیل (عربی)

شاہ صاحب کے اس اہم رسالہ کا بھی ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے لیکن افسوس ہے کہ زیادہ اچھی حالت میں نہیں ہے، جگہ جگہ سے کرم خوردہ ہے۔

اوراق: 39۔ مسطر: 11 سطری

خط: نسخ کاتب کم سواد ہے اس لئے کتابت کا معیار بھی اچھا نہیں ہے۔

آغاز: **الحمد للّٰہ الذی خلق قلوب بنی آدم مستعد الفیضان الانوار مهنا لا بداع المعارف والاسرار و بعث الانبیاء المصطفین الخیار داعین وهادین الحر طرق اکتسابها بالطاعات ولاذکار ثم جعل لهم ورثة یقومون بعلمهم ورشدهم من العلماء الراسخین الابرار ابدال......** الخ

اختتام

واجاز فی المشکوة المصابیح والصحیح البخاری وغیره من الصحاح السنة الثقة الثبت حاجی محمد افضل عن الشیخ احمد السرهندی بسنده الطویل المذکور فی مقامه و هذا آخر ما اردنا ایراده فی هذه الرسالة والحمد للّٰہ اولاً و آخراً و ظاهراً و باطناً ثم هذه الرسائلة

5-رسالہ شاہ ولی اللہ (عربی)

وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود سے متعلق شاہ صاحب کا ایک مختصر لیکن اہم رسالہ۔ اصلاً یہ جناب آفندی اسماعیل بن عبداللہ الروحی کے استفسار کے جواب میں ہے۔ انہوں نے دریافت کیا تھا کہ شیخ محی الدین بن عربی کے نظریہ وحدۃ الوجود اور شیخ احمد سرہندی کے فلسفہ وحدۃ الشہود میں کیا فرق ہے اور دونوں میں سے کون حق پر ہے؟ شاہ صاحب نے اپنے جواب میں دونوں کے بارے میں ضروری تفصیلات بیان فرما کر اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ بنیادی طور پر دونوں میں کوئی مغایرت نہیں ہے اور دونوں ہی حق پر ہیں۔

اوراق: 1-9' مسطر: 22 سطری

خط: نستعلیق سال کتابت اور کاتب کا نام درج نہیں کیا۔

آغاز:

من العبد الضعيف احمد المدعو بولى الله بن عبدالرحم الدهلوى عفى الله تعالى عنه و وفقه لما يحب يرضاه اما بعد فانى احمد اليكم الله الذى......الخ

شاہ صاحب کا یہ رسالہ ایک مجموعہ میں شامل ہے جس میں حسب ذیل تین مخطوطات یک جا مجلد ہیں:

1۔ رسالہ شاہ ولی اللہ ورق: 1-9
2۔ کلمات الحق' از غلام یحییٰ ورق: 10-20
3۔ دمغ الباطل' از شاہ رفیع الدین صاحب ورق 20ب۔262

دمغ الباطل اصلاً کلمات الحق کے رد میں ہے۔

مذکورہ بالا تین رسائل کا ایک اور مجموعہ بھی خدا بخش لائبریری میں موجود ہے جن کی بیشتر تفصیلات بھی سابقہ رسائل کی مانند ہیں۔ البتہ تعداد اوراق اور سطر مسطر میں فرق ہے۔ اس میں اوراق کی مجموعی تعداد 356 اور مسطر 20 سطری ہے۔

1۔ رسالہ شاہ ولی اللہ ورق: 1-11
2۔ کلمات الحق ورق: 12-24
3۔ دمغ الباطل ورق: 42-365

6-فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن (فارسی)

قرآن کریم کا مختصر لیکن جامع ترجمہ فارسی زبان میں مع حواشی مسمی بہ فتح الرحمٰن۔ شاہ صاحب کا یہ ترجمہ اور تشریح حواشی بے حد مقبول ہوا اور اہل علم حضرات نے دل کھول کر اس کی پذیرائی کی۔ یہ ترجمہ مع حواشی متعدد بار زیور طبع سے آراستہ بھی ہو چکا ہے۔ شاہ صاحب نے ترجمہ کی زبان اس وقت کے لحاظ سے سادہ اور سلیس رکھی ہے اس لئے اس میں

روانی اور شگفتگی بھی نقطہ عروج پر نظر آتی ہے۔ حواشی اور تشریحی کلمات مختصر لیکن جامع اور معانی و مفاہیم سے لبریز ہیں اس لئے ہر زمانے اور ہر طبقہ کے علمائے نے انہیں پسند کیا ہے اور ان کی ستائش کی ہے۔ قرآن کریم کے مترجمین میں مولوی نذیر احمد دہلوی اپنا منفرد اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کا ترجمہ کلام پاک تمام تر اختلافات کے باوجود بڑی ندرت کا حامل ہے اور ایک زمانے میں کافی مقبول رہا اور متعدد بار شائع بھی ہوا۔ مترجم محترم (ڈپٹی نذیر احمد صاحب) نے اپنے ترجمہ کے مقدمہ میں دیگر مباحث کے ساتھ شاہ صاحب کی قرآنی خدمت کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے اور آپ کے ترجمہ قرآن کو تراجم مابعد کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"فی الحقیقت قرآن کریم کے مترجم ہونے کے لئے جتنی باتیں درکار ہیں ترجمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ سب مولانا شاہ ولی اللہ صاحب میں علی الوجہ الکمال پائی جاتی تھیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مولانا صاحب کی نظر تفاسیر اور احادیث اور دین کی کتابوں میں ایسی وسیع ہے کہ جو کہ بس کا ہی حصہ تھا۔ اب کوئی ایک عمر صرف کرے تو اس کو یہ بات نصیب ہو اور وہ بھی شاید ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک آیت' بلکہ ہر ایک لفظ کی نسبت مفسرین کے جتنے اقوال ہیں وہ سب ان کے پیش نظر ہیں اور وہ ان میں سے جس کو راجح پاتے ہیں' اختیار کر لیتے ہیں۔ جب ایک خاندان کے ایک چھوڑ تین تین ترجمے لوگوں کو مل گئے ہیں۔ ایک فارسی مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کا' اکٹھے دو' اردو۔ ایک شاہ عبدالقادر صاحب اور ایک شاہ رفیع الدین صاحب کا' تو اب ہر ایک کو ترجمہ کا حوصلہ ہو گیا مگر خاندان شاہ ولی اللہ صاحب کے سوا کوئی شخص مترجم ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ وہ ہرگز قرآن کا مترجم نہیں بلکہ مولانا شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے بیٹوں کے ترجموں کا مترجم ہے کہ ان ترجموں میں اس نے کچھ ردوبدل' تقدیم و تاخیر کر کے جدید ترجمے کا نام کر دیا۔"

خدا بخش لائبریری میں اس اہم تفسیر کے کئی قلمی نسخے محفوظ ہیں۔ ان میں جو نسخہ سب سے زیادہ اہم ہے وہ دو جلدوں میں ہے۔ ان کی تفصیلات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

جلد اول: سورہ فاتحہ تا سورہ مریم

اوراق: 381۔ مسطر: 14 سطری

اس جلد کا آغاز حسب ذیل عبارت سے ہوتا ہے:

حمد نا محدود خدای را تبارک و تعالیٰ کہ برافت نامہ قرآن را برای بندگان خود نازل ساخت...... الخ

جلد دوم: سورہ طٰہٰ تا سورہ الناس

اوراق: 334 (382-715) دونوں جلدوں کا تسلسل برقرار رکھنے کی غرض سے اوراق کے نمبروں کی تعداد میں بھی مسلسل برقرار رکھا گیا ہے یعنی دوسری جلد ورق 382 سے 715 کو محیط ہے۔

تاریخ کتابت: 27 ربیع الاول 1181ھ (بمطابق: ستمبر 1767ء)

ترقیمے سے معلوم ہوتا ہے کہ کاتب نے اس کی کتابت اپنے مرشد مولوی محمد عاشق صاحب کے حکم سے کی ہے۔

ترقیمہ

الحمد للّٰہ المستعان والصلوۃ عل نبی آخر الزمان وآلہ و صحبہ اھل الفضل والاحسان علی ان وفق لی المنان بتسطیر کلامہ ذی الحج والبرھان المدعو بفتح الرحمان فی ترجمۃ القرآن لقدر الوسع والامکان من ترجمات افضل علماء الفرقان وقدوۃ اھل الایقان صاحب الجود والامتنان سیدنا و مولانا حضرت شیخ ولی اللّٰہ رضی اللّٰہ عنہ لا متثال امر شیخی و من بہ اعتصامی العارف باللّٰہ الخالق الشیخ محمد عاشق دام اللّٰہ برکاتہ الی یوم التناد ومسلمہ علی رؤس المسترشدین الی ابدا لا باد بید عبدہ الضعیف المحتاج الی رحمۃ اللّٰہ صفی اللّٰہ بن شیخ فقیر اللّٰہ علیھما الغفو و الغران یوم الجمعۃ وقت الضحوۃ فی سبع وعشرین من ربیع الاول سنۃ احدی وثمانین بعد الالف والمائۃ من ھجرۃ النبویۃ علی صاحبھا افضل التحیۃ وقد کتب ھذہ التَرجمۃ المتبرکۃ فی مدۃ طویلۃ و حرج کثیرۃ فوفقنی اللّٰہ باختتامہ فلہ الحمد حمداً کثیراً و لشکر شکر اعظیما، اللھم اغفرلہ ولوالدیہ ولمرشدۃ ولا ستاذہ و لمن نظر فیہ بحرمت النبی الکریم وآلہ اصحابہ و اتباعہ اجمعین برحمتك یا ارحم الرحمین.

یلوح الخط فی القرطاس دفھوا
وکاتبہ رمیم فی التراب

7-ازالۃ الخفاعن خلافۃ الخلفاء

شاہ صاحب کی یہ بہت ہی اہم اور مبسوط تصنیف ہے۔ اس کا خاص موضوع خلافت راشدہ اور قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کا ثبوت فراہم کرنا ہے۔ اسی ضمن میں آپ نے نبی، خلیفہ، صدیق اور محدث جیسی اہم اصطلاحوں کی تعریف اور تشریح بھی کی ہے۔ نیز خلیفہ کے اوصاف اور منصب خلافت کی اہمیت وافادیت پر بھی عالمانہ اور محققانہ روشنی ڈالی ہے۔
شاہ صاحب کی اس اہم تصنیف کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا ابوالحسن ندوی تحریر فرماتے ہیں:

> ''خلفائے راشدین کی خدمت کا ثبوت، قرآن مجید سے، اس کتاب کی بہترین بحثوں میں سے ہے جو نکات وحقائق سے لبریز ہے خصوصاً آیت تمکین، آیت استخلاف، آیت اذن قتال وآیت اعراب (قل للمخلفین من الاعراب)، آیات (محمد رسول اللّٰہ والذین معہ) آیت یریدون لیطفئوا نور اللّٰہ، آیت شوریٰ (سورہ شوریٰ) آیت (او من کان میتاً فاحییناہ) (سورہ انعام) کی جیسی تفسیر کی ہے اور اس کے ضمن میں قلم سے جو نکات ومعارف نکل گئے ہیں وہ کسی بڑی سے بڑی تفسیر میں نہیں مل سکتے۔ (5) ''

خوش نصیبی سے شاہ صاحب کی اس معرکۃ الاراء تصنیف کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے جو کئی

لحاظ سے بڑا اہم اور نادر ہے۔ اس کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:

اوراق: مجموعی طور پر 506 اوراق۔ ضخامت کے سبب کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کر کے جلد بندی کرائی گئی ہے۔ پہلے حصہ میں 257 اوراق۔

مسطر: 19 سطری۔ کاتب: حاجی گل محمد

خط: نستعلیق۔ سال کتابت: 1213ھ (26 شعبان) (1895ء)

آغاز: کتاب کا آغاز حسب ذیل کلمات سے ہوتا ہے:

الحمد لله الذی بعث الینا اشرف الرسل داعیاً الی اقوم السبل وجعل اصحاباً زرائه فی عبده و خلفائه من بعده تستم النعمة و انعم الرحمة واشهدان لا اله الا الله وحده و اشهدان محمداً عبده ونبیه الذی لا نبی بعده و صلی الله علیه وعلی آله وصحبه اجمعین ......الخ

تمت هذه النسخة المبارکه من ید الفقیر حاجی گلی محمد بعون الله المستعان روز شنبه شهر شعبان تاریخ بست و ششم 1213هجری

کتابت بہت اہتمام سے خط نستعلیق میں کی گئی ہے۔ اوراق پر جدول شنگرفی بنائی گئی ہے۔ متن میں ذیلی عنوانات اور فصول بنی شنگرفی ہیں۔ کتاب لائق مطالعہ اور کتابت دیدہ زیب ہے۔

8-الفوز الکبیر فی اصول التفسیر (فارسی)

قرآن کریم کی تفسیر کے اصول ومبادی سے متعلق مختصر لیکن بے حد اہم رسالہ۔ یہ حسب ذیل پانچ ابواب پر مشتمل ہے:

باب اول: در بیان علوم پنجگانہ کہ قرآن عظیم بطریق تنصیص بیان آں فرمودہ است۔

باب دوم: در بیان وجوہ خفاء معانی نظم قرآن بنسبۃ اذہان اہل زمان وازالہ خفا باوضح بیان۔

باب سوم: در بیان اسلوب بدیع قرآن۔

باب چہارم: در بیان فنون تفسیر وحل اختلاف واقع در تفسیر صحابہ وتابعین۔

باب پنجم: در ذکر جملہ صالحہ از شرح غریب قرآن واسباب نزول آں کہ مفسران راحفظ آں ممنوع ومحظور۔

خدا بخش لائبریری میں اس اہم وقیع رسالہ کے دو عمدہ نسخے محفوظ ہیں۔ ان میں سے ایک کی جداگانہ حیثیت ہے' جبکہ دوسرا دیگر رسائل کے ساتھ مجلد ہے۔ ذیل میں پہلے ہم جداگانہ حیثیت کے نسخہ کی تفصیلات پیش کرتے ہیں۔

اس کا مکمل عنوان اس طرح درج ہے: تفسیر الفوز الکبیر مع تفسیر فتح الخبیر۔ اس میں اوراق کی مجموعی تعداد 88 ب ہے۔ خط نستعلیق عمدہ ہے۔ نسخہ بہت اہتمام سے کتابت کیا گیا ہے۔ عناوین اور ابواب سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ نسخہ قابل دید اور لائق مطالعہ ہے۔ مسطر: 16 سطری ہے۔

آغاز: اس کا آغاز حسب ذیل عبارت سے ہوتا ہے:

نعم الٰہی در بارہ ایں بندہ ضعیف بے شمار اند و اجل آنہا توفیق فہم قرآن عظیم است۔ و منن حضرت رسالت پناہ علیہ الصلوۃ والسلام اما بعد می گوید فقیر ولی اللہ بن عبد الرحیم عاملہما اللہ تعالیٰ بلطفہ العظیم ورا ہے از فہم کتاب اللہ کشادند خواست کہ بعض نکات نافعہ در تدبر کلام اللہ یاران را بکار آید......وسمیتہا بفوز الکبیر فی اصول التفسیر وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت وہو حسبی ونعم الوکیل......الخ

اختتام:

وھذا آخرما اوردناه فی الرسالة المسماة بفتح الخبیرممالا بدمنه فی علم التفسیر والحمد للّٰه اولاً و آخراًوظاھراً و باطناً وصلی اللّٰه علی سیدنا وآله و صحبه اجمین

فوز الکبیر کا دوسرا نسخہ جو مجموعہ رسائل میں شامل ہے، اس کی تفصیلات اس طرح ہیں:

اوراق: 183 تا 206۔ مسطر: 19 سطری

خط: نستعلیق۔ کاتب: لچھی رام پنڈت

تاریخ کتاب: درج نہیں۔

یہ رسالہ جس مجموعہ میں شامل ہے اس میں حسب ذیل آٹھ رسائل مجلد ہیں اور سب کے اوراق نمبر مسلسل ہیں جن کی مجموعی تعداد 212 ہے۔

1۔ رسائل در مسائل فقہ۔ (ورق 1-5) مصنف نا معلوم
2۔ شرح بر شرح ہدایۃ الحکمۃ: از محمد رشید الدین (ورق 6-10)
3۔ ترجمہ عبارات عربیہ تحفہ اثنا عشریہ، از شاہ عبد القادر (ورق 11-77)
4۔ احکام الاراضی، از قاضی محمد اعلیٰ بن حامد بن محمد صابر فاروقی التھانوی (ورق 79-115)
5۔ ترجمہ رسالہ رویا: مترجم مرزا رضی الدین علی، عرف مرزا محمد جان (ورق 116-144)
6۔ فوز الکبیر، از شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (ورق 145-182)
7۔ حق المبین، از محمد رشید الدین (206-207)
8۔ رسالہ عقائد از محمد رشید الدین (ورق 207-212)

اس کے مصنف بھی رشید الدین معلوم ہوتے ہیں۔

تمام رسائل کی کتابت یکساں ہے اس لئے کاتب بھی سب کا ایک ہی معلوم ہوتا ہے۔

9- قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین

یہ حضرات شیخین (حضرت ابوبکر صدیقؓ اور خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ) کی فضیلت اور دیگر خلفائے کبار و صحابہ کرام پر آپ کی افضلیت کے بحث میں ایک مبسوط رسالہ ہے۔ اس کی اہمیت و افادیت کو اس کی ضخامت سے نہیں بلکہ

موضوع کی وسعت اور مباحث کی جامعیت سے جانچنا بہتر ہوگا۔ شاہ صاحب کا یہ کمال ہے کہ وہ اختصار اور ایجاز سے بڑے ہی حسین اور پُر اثر انداز میں کام لیتے ہیں اور مختصر الفاظ میں ایک جہان معانی سمو دیتے ہیں۔ آپ کا یہی وصف اس رسالے میں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ بقول صاحب ''حیات ولی'':

> ''اس کتاب کے مضامین کا خلاصہ یہ ہے کہ جناب شاہ صاحب نے اول ایک ایسی کلی صفت بیان کی ہے جو افضلیت کی مدار علیہ ہے۔ ازاں بعد یہ ثابت کیا ہے کہ یہ مخصوص صفت جس پر افضلیت کا دارومدار ہے یہ وجہ کمال صرف حضرات شیخین یعنی جناب صدیق اکبر اور فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہی تھے، ان کے سوا دوسرے صحابہ کرام میں نہیں پائی جاتی تھی پھر اس بحث کو یوں ہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ نقلی اور عقلی دلائل سے مدلل کیا ہے۔ اس کے بعد حضرات شیخین کے تاثر بیان کیے گئے ہیں اور جو مطاعن کہ مخالف فرقے کے لوگ ان حضرات پر کرتے ہیں ان کے الزامی و تحقیقی جوابات بڑی دھوم سے دیئے گئے ہیں......'' (ص 306)

آخر میں شاہ صاحب نے اپنے ایک مکاشفہ کا بھی ذکر کیا ہے جس سے حضرات شیخین اور دیگر خلفا و صحابہ کے بارے میں آپ کے مؤقف کی تائید ہوتی ہے۔

اس کا ایک انتہائی اہم اور قیمتی نسخہ خدا بخش لائبریری کے ذخائر کو زینت بخش رہا ہے۔ اس کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

اوراق: 233۔ مسطر: 19 سطری

خط: نستعلیق بعض اوراق پر حواشی بھی درج ہیں۔

آغاز: **الحمد لله بعث عبده محمد صلى الله عليه سلم الى العالمين ليكون رحمة لهم وهدىٰ و فضله على جمعى خلقه فادم ميں من دون تحت لو انه يبتغون منه ندى'' ......الخ**

اختتام: **قلت وممن روى ان الصديق رضى الله عنه البسة فى النوم الشيخ الكبير العارف بالله على بن وهب البخارى قال رايت ابابكر الصديق رضى الله عنه فى النوم فقال لى ياعلى قدامرت ان البسك هذه الطاقية و اخرج من كمه طاقة ووضعها على راسى فاستيقظت والطاقية بعينها على راسى** ۔تمت تمام شد

خط: نستعلیق (معمولی) تاریخ کتاب درج نہیں۔

بیشتر اوراق پر کثرت سے حواشی تحریر کیے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے اس نسخہ کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

کاتب کا ترقیمہ نہیں ہے جس سے کاتب کے نام اور سال کتابت وغیرہ کا علم ہوتا ہے۔

10- مصفّٰی شرح موطا (فارسی)

شاہ صاحب نے موطا امام مالک کی ایک شرح عربی میں تصنیف فرمائی تھی۔ اس کا نام آپ نے مسوّیٰ تجویز فرمایا تھا۔ اس کی شرح آپ نے فارسی میں بھی تحریر فرمائی جس کا عنوان آپ نے ''مصفّٰی'' منتخب فرمایا۔ یہ بات تو تمام اہل

علم کے علم میں ہے کہ کتب احادیث میں موطا کو خاص اہمیت حاصل ہے۔اس کی تدوین حضرت امام مالک نے انتہائی محنت ودقت نظر اور کمال تحقیق سے کام لے کر فرمائی تھی۔یہ مجموعہ احادیث علما ومحدثین کے حلقوں کے میں بہت ہی مقبول رہا ہے ۔شاہ صاحب نے ان احادیث کی جو تشریح فرمائی ہے وہ بے حد مفید اور کارآمد ہے۔اس سے آپ کی منصفانہ اور محدثانہ شان بھی نمایاں ہوتی ہے۔اسی کے ساتھ آپ کے تبحر علمی اور فن حدیث سے غیر معمولی شغف کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔اس ہم شرح کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری کے ذخائر کی زینت میں اضافہ کررہا ہے۔اس کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

اوراق 302۔ مسطر 21 سطری

خط: نستعلیق عمدہ۔کاتب: سید بہادری علی لکھنوی

تاریخ کتابت: 5 محرم 1206ھ(ستمبر 1791ء)

ہر ورق پر بکثرت حواشی مرقوم ہیں۔

آغاز:"نعمت ہای حضرت باری جل مجدہ بیرون از حد احصا است ونعمتی کہ زیادہ تر از جمیع نعمتہا بعد نعمت ایجاد ورزق تواں دانست بعثت انبیاء است......الخ"

ترقیمہ: تمام شد بعون اللہ تعالیٰ ہذا کتاب المصفا ترجمہ المسوی بتاریخ بتاریخ پنجم شہر محرم الحرام 1206ھ یوم جمعہ بخط خام ناقص الخط فقیر احقر العباد سید بہادر علی لکھنوی عفی عنہ تحریر یافت۔

غریق رحمت یزداں کسی باد
کہ کاتب را بالحمد کند یاد

اور آخر میں بطور"سوغات" ہے شاہ صاحب کی تحریر کا عکس پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں جس میں آپ نے روایت حدیث کی ایک سند پیش کی ہے۔یہ تحریر لائبریری میں محفوظ"الجامع الصحیح" کے قلمی نسخے پر ثبت ہے اور اس پر شاہ رفیع الدین صاحب کے دستخط بھی ہیں۔

حواشی

(1) الفرقان:(شاہ ولی اللہ نمبر۔1359ھ ص،12)
(2) حیات ولی:ص:295۔
(3) بلاغ المبین از شاہ ولی اللہ دہلوی مرتب معراج محمد بارق(مکتبہ تجلی۔دیوبند)
(4) الفرقان:(شاہ ولی اللہ نمبر)1359ھ ص 344
(5) الفرقان:(شاہ ولی اللہ نمبر،1359)ص 345

نور الحسن راشد کاندھلوی

کتب خانہ دار العلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور اور ہمارے ذاتی ذخیرہ میں موجود شاہ ولی اللہ صاحب کی تصانیف و تالیفات کے قلمی نسخوں کا تعارف

جب امام ہمام حضرت شاہ ولی اللہ کا ذکر آتا ہے تو اور بہت سی بحثوں اور موضوعات کے ساتھ حضرت شاہ صاحب کی تصانیف و مؤلفات اور تحریرات و مکتوبات کا تذکرہ بھی کیا جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی تصانیف کے صحیح نسخے و معتمد عموماً کم یاب ہیں، حالانکہ یہ بات صحیح نہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی تصانیف و مؤلفات و افادات و مکتوبات وغیرہ کے قلمی نسخوں کی اچھی خاصی تعداد موجود و معلوم ہے جو ہند و پاکستان کے علاوہ کئی ملکوں کے قومی کتب خانوں اور ذاتی ذخیروں میں بکھری ہوئی ہیں۔ ان میں معتبر نسخے بھی ہیں اور غیر معتبر بھی۔ معتمد نسخوں میں سے چند خود حضرت مصنف کے قلم فیض رقم کے ہیں۔ چند اور حضرات شاہ صاحب کے ممتاز و اہم شاگردوں اور صاحبزادگان عالی مرتبت (حضرت شاہ عبد العزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبد القادر، مولانا شاہ محمد اسحاق رحمہم اللہ) وغیرہ کے دست مبارک کے بھی ہیں جس میں چند ایسے نسخے بھی ہیں کہ ان پر حضرت شاہ صاحب کے دست مبارک سے اجازتیں اور تحریرات درج ہیں۔ نیز چند نسخے حضرت شاہ صاحب کے ،صاحب--- اور ان کے علوم و ارشادات کے سب سے پہلے اور اہم ترین مخاطب حضرت شاہ محمد عاشق پھلتی یا ایک اور محبوب و معتمد شاگرد خواجہ محمد امین سندھی کے نقل کیے ہوئے بھی موجود ہیں۔ ان کے علاوہ بھی حضرت کی تصانیف کے کئی اہم نسخے معلوم ہیں جن کی کسی اور وجہ سے خاص اہمیت ہے اور حضرت شاہ صاحب کے علوم کی تدوین اور ان کی کتابوں کی تازہ اشاعت و تحقیق کے وقت ان نسخوں کو نظر انداز کرنا غفلت اور بے توفیقی میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ بہر صورت مجموعی طور پر ان نسخوں کی خاصی تعداد ہے ان کے نام گنوانا بھی خاصا وقت چاہتا ہے۔ مفصل گفتگو ایک بسیط مقالے یا ایک کتاب کا موضوع ہے جس کی اس وقت گنجائش نہیں:

سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لئے

اس لئے اس طویل موضوع سے صرف نظر کرتے ہوئے میں یہاں حضرت شاہ صاحب کی تصانیف کے صرف چند ایسے قلمی نسخوں کا تعارف پیش کرنا چاہتا ہوں جو کتب خانہ دارالعلوم دیوبند' مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور اور ہمارے ذخیرہ (حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ) کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں مگر وابستگان علوم ولی اللہی کو ان کا بہت کم علم ہے۔ اس کی ابتدا کتب خانہ دارالعلوم دیوبند کے مخطوطات کے تذکرہ سے ہوگی۔ کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں حضرت شاہ ولی اللہ کی انیس تالیفات کے تیس نسخے تھے جس میں سے اب غالباً چوبیس یا پچیس موجود ہوں گے۔ غالباً اس لئے کہ تین چار تو کیڑوں کی نذر ہوگئے اور دو تین اس وقت دستیاب نہیں۔ معلوم نہیں کہ وہ موجود ہیں یا ضائع ہوگئے ہیں۔ جو نسخے اب موجود نہیں اور ان کا کتب خانہ کی فہرست میں بھی اندراج نہیں ان میں سے اہم ترین نسخہ "حجتہ اللہ" کا تھا جس پر حضرت شاہ عبدالعزیز کا ایک اہم خط چسپاں تھا جس میں حضرت شاہ صاحب نے "حجتہ اللہ" کے متعلق اپنی رائے تحریر فرمائی تھی اور جو نسخے ضائع یا کیڑوں کی نذر ہوگئے ان میں کوئی اور نسخہ غالباً اہم نہیں تھا اب جو قلمی نسخے موجود ہیں ان کو بھی اہم اور غیر اہم میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

اہم نسخوں میں وہ مجموعہ نہایت قابل قدر اور قیمتی ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ کے حبیب لبیب اور رفیق قدیم حضرت شاہ محمد عاشق پھلتی اور ان کے فرزند شاہ عبدالرحمٰن (مرتب مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ) کے قلم سے ہے۔ ان کے علاوہ ایک اور نہایت ہی اہم اور بیش قیمت نگینہ مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ کا ایک نسخہ ہے (تعارف آرہا ہے)

مجموعہ رسائل مکتوبہ حضرت شاہ محمد عاشق و شاہ عبدالرحمٰن میں حضرت شاہ ولی اللہ کے چھ رسائل و تالیفات شامل ہیں مگر ان رسائل یا اس مجموعہ کا کتب خانہ دارالعلوم کی مطبوعہ اور قلمی دونوں فہرستوں میں تذکرہ شامل نہیں۔ اس مجموعے کے رسائل جس میں سے چار رسالے حضرت شاہ محمد عاشق کے قلم سے اور دو شاہ عبدالرحمٰن کے نقل کئے ہوئے ہیں۔ شاہ محمد عاشق کے مکتوبہ چار رسائل یہ ہیں۔

1۔ رسالہ فی لبس الاحمر (عربی)

2۔ رسالہ ضابطہ مناسخات (فارسی)

3۔ رسالہ در تحقیق و تعیین صراط مستقیم (فارسی)

4۔ رسالہ در بیان تدوین علوم السر المکتوم (عربی)

شاہ عبدالرحمٰن صاحب کی نقل کی ہوئی دو کتابیں (5) الفوز الکبیر اور (6) شرح رباعتین حضرت خواجہ باقی باللہ (ازالۃ الغین فی شرح الرباعتین) ہیں۔

مذکورہ نسخوں میں سے تین کتابیں (رسالہ در بیان علوم' الفوز الکبیر اور شرح رباعتین) مطبوعہ اور عموماً دستیاب ہیں لیکن پہلے تینوں رسائل کا حضرت شاہ ولی اللہ کی کمیاب تالیفات میں شمار ہے۔ ان تینوں میں سے کوئی رسالہ بھی غالباً اب تک نہیں چھپا۔

یہ تینوں مختصر رسالے ہیں۔ "رسالہ فی لبس الاحمر" حضرت شاہ صاحب کے سفر حجاز کی یادگار ہے یعنی شاہ صاحب کے عہد تصنیف کے دور متوسط کی نسبتاً کمیاب تحریر ہے۔

یہ رسالہ حضرت شاہ صاحب نے (29 ذی الحجہ 1149ھ۔3 مارچ 1737ء) کو مکہ مکرمہ میں شیخ حسن آفندی کی فرمائش پر تحریر فرمایا تھا۔ اس میں فقہ حنفی کی مشہور کتاب ''نور الایضاح'' کے مصنف کے اسی موضوع پر ایک رسالہ کا تجزیہ اور اس مسئلہ کی مزید تحقیق و توضیح ہے۔ یہ رسالہ ایک مرتبہ شائع بھی ہو چکا ہے۔ یہ وہی بحث ہے جو حضرت شاہ صاحب نے مؤطا کی شروعات میں بھی پیش فرمائی ہے کہ فقہائے مذاہب کی تحقیق میں بنیادی چیز اہل مدینہ کا تعامل ہے۔

4۔ ''رسالہ در بیان علوم السر المکتوم فی بیان تدوین العلوم'' ہے جو (حضرت شاہ ولی اللہ کی کتابوں کے ایک ممتاز ناشر اور شاہ رفیع الدین کے نواسہ) سید احمد ولی اللّٰہی کے مطبع احمدی دہلی سے 1321ھ (1903ء) میں شائع ہو چکا ہے اور اس کے اردو ترجمہ بھی چھپے ہیں۔ ''سر مکتوم'' اور مذکورہ بالا نسخوں کی اہمیت یہ ہے کہ یہ چاروں حضرت شاہ محمد عاشق کے قلم سے ہیں اور اس امتیاز کی وجہ سے نسخہ مصنف کے قائم مقام ہیں۔

اس مجموعہ کی آخری دو کتابوں میں سے ''الفوز الکبیر'' ناتمام اور ''شرح رباعیات خواجہ باقی باللہ'' مکمل ہے اگرچہ ان میں سے کسی نسخہ پر بھی سنہ کتابت اور کاتب کا نام نہیں لیکن شاہ محمد عاشق اور شاہ عبدالرحمٰن کی اور تحریروں سے مقابلے کے بعد یہ طے ہے کہ یہ دونوں نسخے انہیں دونوں کے قلم سے ہیں اور چونکہ شاہ عبدالرحمٰن پھلتی کی حضرت شاہ ولی اللہ کی حیات (1168ھ۔55-1754ء) وفات ہوگئی تھی اس لئے یہ تمام نسخے بلا شک وشبہ اس سے پہلے کے لکھے ہوئے ہیں۔

مذکورہ رسائل و تالیفات کے علاوہ کتب خانہ دار العلوم دیوبند میں حضرت شاہ ولی اللہ کے جو علمی آثار موجود ہیں ان میں سے اکثر کا مفصل تذکرہ ضروری نہیں۔ ان کی صرف نام شماری کافی ہوگی کیونکہ ان نسخوں میں کوئی ندرت یا ایسا امتیاز نہیں ہے جس کا تذکرہ ضروری اور مفید ہو۔ دار العلوم دیوبند کے کتب خانہ میں ''فتح الرحمٰن'' (ترجمہ فارسی قرآن شریف) کے بھی دو نسخے ہیں جس میں ایک نسخہ اگرچہ بہت عمدہ اور صاف ستھرا ہے مگر دونوں پر کاتب کا نام اور سنہ کتابت درج نہیں۔

شاہ صاحب کی تین مشہور تالیفات الفضل المبین، الدر الثمین اور النوادر (جس کے مجموعہ کو مسلسلات کہا جاتا ہے) کی تین تین نقلیں موجود ہیں۔ تینوں نقلوں میں تینوں رسائل شامل ہیں۔ ان میں سے دو نسخوں میں جاذبیت وکشش کا کوئی عنصر موجود نہیں۔ نہ ان کی کتابت عمدہ ہے اور نہ کاغذ۔ غالباً کسی معمولی لیاقت کے آدمی نے نقل کی ہیں اور ان میں سے ایک نقل کے متعلق کتب خانہ دار العلوم کی مطبوعہ فہرست کی یہ اطلاع صحیح بھی نہیں کہ اس نسخہ پر حضرت شاہ عبدالعزیز کے دستخط ہیں۔[1] مسلسلات کا تیسرا نسخہ اس مجموعہ کی سب سے پہلی اشاعت (1293ھ) کی جوں توں نقل ہے اور اس میں مطبوعہ نسخہ کی طرح شاہ صاحب کا رسالہ حل تراجم (ابواب) بخاری بھی شامل ہے۔

''البدور البازغہ'' کے دو نسخے ہیں جن میں ایک یوسف بن عبدالصمد بڈھانوی نے 1295ھ میں نقل کیا تھا۔ دوسرا نسخہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی (وفات 1232ھ۔1905ء) کے کتب خانہ کا ہے۔ جس پر حضرت مولانا کے دستخط بھی ہیں۔ ایک نسخہ ''الانتباہ'' اور ''تحقیق وحدت الوجود والشہود'' کا بھی ہے مگر دونوں پر کاتب کے نام اور سنہ کتابت درج نہیں۔ یہ دونوں نسخے مولانا مفتی سعد اللہ رام پوری (وفات 1294ھ۔ 1877ء) کے کتب خانہ کے ہیں۔ مفتی صاحب کی مہر اور دستخط ثبت ہیں۔ ایک نسخہ ''القول الجمیل'' کا ہے جو (1258ھ۔1842ء) کا لکھا ہوا ہے۔

اس ذخیرہ میں تالیفات ولی اللّہی کے جو دو نسخے بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ وہ مصطفیٰ شرح فارسی مؤطا امام مالکؒ اور ''انفاس العارفین'' کے ہیں

''مصطفیٰ'' کا نسخہ اس وجہ سے اہم اور قابل توجہ ہے کہ وہ غالباً حضرت شاہ محمد عاشق کے اصل نسخہ کی نقل ہے۔ اس نسخہ کی جو تکمیل کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ کے اہم ترین شاگردوں خواجہ محمد امین، بابا فضل اللہ کشمیری اور حضرت شاہ عبدالعزیز کی مجلس میں پڑھا اور سنا گیا، شاہ رفیع الدین نے پڑھا، شاہ عبدالقادر اور تمام حضرات نے سنا۔ یہ قرأت و سماعت (25 ربیع الاول 1185ھ۔ جولائی 1771ء) میں مکمل ہوئی اور حضرت شاہ عبدالعزیز نے یہ تمام روداد بقلم خود اس نسخہ پر تحریر فرمائی۔

اس نسخہ کا ایک اور امتیاز یہ ہے کہ اس کے اختتام پر شاہ محمد عاشق کی وہ تحریر مکمل درج ہے جس میں شاہ محمد عاشق نے مصطفیٰ کی تسوید و تبیض کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔ یہ تحریر اگرچہ ''مصطفیٰ'' اور ''مسویٰ'' کی پہلی طباعت مطبع فاروقی دہلی 1293ھ کے آخر میں بھی شامل ہے لیکن اس نسخہ سے معلوم ہو رہا ہے کہ مطبوعہ تحریر اصل تحریر چوتھائی سے بھی کم حصہ ہے۔ مکمل تحریر یا مضمون فل اسکیپ سائز کے اکیس سطری صفحہ کے پانچ صفحات میں آئی ہے جس میں شاہ محمد عاشق نے خواجہ محمد امین کا خاصا مفصل ذکر کیا ہے اور خواجہ محمد امین کی وہ سند بھی نقل کی ہے جو شاہ ولی اللہ نے خواجہ امین کو عطا فرمائی تھی۔ آخر میں ''مصفیٰ'' کی تکمیل کی تاریخ پر ایک عزیز کی لکھی ہوئی شاہ محمد عاشق کے الفاظ میں ایک نظم (یا نو شعر کا قطعہ تاریخ) بھی ہے جس سے اس خدمت کی تکمیل کا (1179ھ۔ 66-1765ء) سنہ بھی معلوم ہو جاتا ہے۔

''مصفیٰ'' کے اس نسخہ کے اختتام پر کاتب کا نام مذکور نہیں، سنہ کتابت اور صفحات و اوراق کا شمار بھی درج نہیں۔ تحریر نستعلیق، رواں پختہ قلم ہے۔

اس ذخیرہ میں ''انفاس العارفین'' کا بھی ایک عمدہ صاف خوش قلم اور خاصا صحیح نسخہ ہے جو (1239ھ۔ 24-1823ء) کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں اس مجموعہ کے تمام چھ رسائل شامل ہیں۔ شروع میں فہرست بھی ہے یعنی ہر پہلو سے اچھا اور قابل قدر نسخہ ہے۔

اس کتب خانہ میں مذکورہ کتابوں کے علاوہ ایک نسخہ ''بلاغ المبین'' کا بھی ہے جس کو بعض اہل علم نے حضرت شاہ ولی اللہ کی تالیفات میں شمار کیا ہے حالانکہ اس کا شاہ صاحب سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ ''بلاغ المبین'' غالباً حضرت شاہ ولی اللہ کے ایک ہم نام اور معاصر شاہ مصنف ولی اللہ اشتیاق سرہندی کی تالیف ہے۔ ''بلاغ المبین'' کے شاہ ولی اللہ سے انتساب کا کوئی ثبوت بلکہ قرینہ بھی موجود نہیں۔ بہر حال اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ دارالعلوم میں موجود ہے جو صاف ستھرا نسخہ ہے مگر اس پر کاتب کا نام یا سنہ کتابت درج نہیں۔

حضرت شاہ صاحب کی تالیفات کے تعارف کے بعد کتب خانہ دارالعلوم کے ایک اور اہم اور نادر ترین نسخہ کا تذکرہ بے حد ضروری ہے جو اگرچہ حضرت شاہ صاحب کی تصانیف میں شامل نہیں اور چند سال پہلے تک اس کا تذکرہ بھی نہیں آتا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ اس سے استفادہ کئے بغیر حضرت شاہ صاحب کے حالات، علوم و نظریات اور تصانیف و خیالات کا جائزہ نا تمام ہے۔ یہ حضرت شاہ صاحب کے مکتوبات گرامی کا وہ بیش بہا مجموعہ ہے جس کا پہلا حصہ شاہ محمد عاشق

کے فرزند شاہ عبدالرحمٰن پھلتی نے (جو حضرت شاہ ولی اللہ کے داماد بھی تھے) مرتب کیا تھا۔ شاہ عبدالرحمٰن اس خدمت تصنیف میں مشغول تھے کہ (1168ھ۔55-1754ء) میں اچانک رحلت کر گئے۔ شاہ عبدالرحمٰن کی وفات کے بعد ان کے والد ماجد شاہ محمد عاشق پھلتی نے اس تصنیف کو مکمل کرنے کا ارادہ فرمالیا اور حضرت شاہ عبدالرحمٰن جو کام کر چکے تھے اس کو حصہ اول قرار دے کر مزید مکتوبات تلاش کئے اور ان کو مرتب کر کے مجموعہ مکتوبات مؤلفہ شاہ عبدالرحمٰن کا دوسرا حصہ قرار دیا۔

مجموعہ مکتوبات مرتبہ شاہ عبدالرحمٰن (حصہ اول) میں حضرت شاہ ولی اللہ کے دو سو بیاسی اور حصہ دوم مرتبہ شاہ محمد عاشق میں صرف ستتر (77) مکتوبات شامل ہیں۔ اگر چہ دونوں حصوں میں سے کسی پر بھی کاتب کا نام اور سنہ کتابت تحریر نہیں لیکن میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ دونوں نسخہ مصنف ہیں۔ لیکن کتب خانہ دارالعلوم میں موجود نسخے کے پہلے حصہ کے ابتدائی ترپن 53 ورق میں جس ایک سو سات مکتوبات تھے، اس نسخہ میں موجود نہیں، حصہ دوم مکمل ہے۔ حصہ اول کا جو حصہ موجود ہے اس میں صفحہ ترپن 53 سے 124 تک اور مکتوبات نمبر ایک سو سات کے نصف سے مکتوبات نمبر دو سو اکیاون تک یعنی کل ایک سو چودہ خط شاہ عبدالرحمٰن کے نوشتہ ہیں۔ اس نسخہ کے آخری اڑتیس مکتوبات شاہ محمد عاشق صاحب کے نقل کئے ہوئے ہیں۔ حصہ دوم کا مکمل نسخہ حضرت شاہ محمد عاشق کے قلم کا ہے۔ حصہ اول میں جو شاہ عبدالرحمٰن صاحب کا مؤلفہ و مکتوبہ ہے ایک سو چوبیس فی صفحہ عموماً پچیس سطریں ہیں اور اسی حصہ کے ان اوراق میں جو شاہ محمد عاشق صاحب کے نقل کئے ہوئے عموماً بیس سے بائیس تک سطریں آئی ہیں دوسرے حصہ میں جو حضرت شاہ محمد عاشق کا مؤلفہ و مکتوبہ ہے فی صفحہ بیس سے بائیس تک سطور ہیں۔

یہ تالیف یا نسخہ حضرت شاہ ولی اللہ کی حیات میں مرتب حضرت شاہ صاحب کے مکتوبات کا سب سے بڑا اور جامع ترین مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ کی تالیف و ترتیب کے بعد سے اب تک بھی حضرت شاہ ولی اللہ کے مکتوبات کا کوئی اور ایسا ضخیم اور وقیع مجموعہ مرتب یا دریافت نہیں ہوا۔

یہاں یہ بھی عرض کر دینا چاہئے کہ دارالعلوم کا نسخہ مکتوبات اس مجموعہ کا نسخہ مؤلفین تو ہے ہی، اس کی یہ بھی ایک غیر معمولی اہمیت ہے کہ یہ اس مجموعہ کا اس وقت تک معلوم واحد نسخہ ہے، کسی ذاتی یا قومی لائبریری میں اس کی نقل کا سراغ نہیں ملا۔

ابھی عرض کیا ہے کہ اس کا حصہ اول مرتبہ مکتوبہ شاہ عبدالرحمٰن ناقص ہے۔ اس کے ایک سو سات مکتوبات زیر نظر نسخہ میں موجود نہیں لیکن مکتوبات کا وہ حصہ یا اوراق جو اس نسخہ میں شامل نہیں عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں موجود ہیں۔ اس طرح یہ نسخہ مکمل ہو جاتا ہے۔

زیر تعارف مجموعہ مکتوبات کے سلسلہ میں یہ بھی عرض کر دینا چاہئے کہ مکتوبات کا یہی مجموعہ پروفیسر خلیق احمد نظامی کی تالیف ''حضرت شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات'' کی بنیاد ہے۔ سیاسی مکتوبات میں شامل شاہ صاحب کے تمام مکتوبات اسی مجموعہ سے لئے گئے ہیں۔ نیز مولانا مفتی نسیم احمد صاحب فریدی امروہوی نے ان مکتوبات کا (جس میں نسخہ حیدر آباد بھی شامل ہے) کا اردو ترجمہ کیا تھا جو نادر مکتوبات کے نام سے دو جلدوں میں پھلت اور دہلی سے شائع ہو چکا ہے۔

لیکن یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ نادر مکتوبات (اردو ترجمہ) کے خطوط کی ترتیب میں قلمی نسخہ سے مکتوبات

کی مطابقت کا اہتمام نہیں رہا اور اس میں ان جلدوں میں شامل تمام فارسی مکتوبات کا ترجمہ بھی شامل نہیں، جن فارسی خطوط کا ترجمہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات میں آ گیا ہے وہ مکتوبات نادر مکتوبات میں شامل نہیں کئے گئے جس کی وجہ سے یہ ترجمہ ناتمام سا محسوس ہوتا ہے' نیز سیاسی مکتوبات میں جو خطوط شامل ہیں ان میں سے کئی خطوط کا ترجمہ بھی نامکمل ہے کئی ناتمام ہیں۔ بعض خطوط کے پورے پیرے گراف اور بعض کی سطور یا فقرے اس میں شامل نہیں۔

نیز سیاسی مکتوبات میں درج خطوط کی ترتیب میں بھی بہت تغیر اور ردوبدل ہوا ہے۔ اصل فارسی مجموعہ مکتوبات میں جو خطوط ابتدا میں شامل ہیں وہ سیاسی مکتوبات کے آخر میں پہنچ گئے اور جو اصل مجموعہ میں آخر میں تھے ان کو سیاسی مکتوبات کی ابتدا میں جگہ ملی ہے جس سے اس مجموعہ کی اندرونی فکری تاریخی ترتیب متاثر ہوئی ہے۔ فارسی مکتوبات میں اگرچہ مکتوبات کی تاریخ تحریر مذکور نہیں لیکن میرا خیال یہ ہے کہ ان میں جزوی طور پر زمانی ترتیب موجود ہے جس کو اصل و ترجمہ دونوں میں اسی طرح باقی رکھنا چاہیے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے یہ خطوط جس ترتیب سے لکھے خصوصاً شاہ محمد عاشق کو جس ترتیب سے ملے مجموعہ مکتوبات کی تالیف میں اس کا خیال واہتمام کیا گیا ہے اس لئے ان دونوں مجموعوں کی افادیت کے اعتراف کے باوجود اصل فارسی نسخہ کی معنویت اور اس سے استفادہ کی اہمیت اپنی جگہ باقی ہے۔

یہ مکتوبات کے متعلق ایک ضمنی بات تھی جو زبان قلم پر آ گئی ہے' عرض یہ کرنا تھا کہ یہ مجموعہ مکتوبات سلسلہ ولی اللہی کی تصانیف میں کتب خانہ دارالعلوم دیوبند کا اہم ترین نسخہ اور گویا دُرِ شہوار ہے۔ کتب خانہ دارالعلوم میں سلسلہ ولی اللہی کی ایک اور بھی نہایت اہم یادگار محفوظ ہے جو اگرچہ تالیفات ولی اللہی میں شمار نہیں کی جا سکتی لیکن اس کے بغیر یہ تعارف ناتمام رہے گا۔

یہ سلسلہ ولی اللہی کے ایک بڑے عالم اور حضرت شاہ عبدالعزیز کے شاگرد' مولانا رشید الدین خان کشمیری دہلوی (وفات محرم 1243ھ) کی ایک تالیف ہے جس کا کتب خانہ دارالعلوم کی فہرست مخطوطات میں مجموعہ مکاتیب کے عنوان سے اندراج ہے جس کا مولانا نسیم احمد صاحب فریدی بیاض رشید الدین کے حوالہ سے ذکر کرتے ہیں لیکن یہ نہ مجموعہ مکتوبات ہے اور نہ اس کو بیاض کہا جا سکتا ہے۔ اس کی ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک باقاعدہ تالیف ہے جس میں خصوصاً حضرت شاہ عبدالعزیز کے عربی مکتوبات' تحریرات وفتاویٰ اور ارشادات کے علاوہ حضرت شاہ ولی اللہ کے متعدد گرامی نامے اور افادات بھی جمع کئے گئے ہیں۔ یہ مجموعہ یا تالیف خاصے بڑے ساز کے پچانوے اوراق یا ایک سو نوے صفحات پر مشتمل ہے جس کا تقریباً نوے فیصد حصہ عربی میں ہے' چند افادات وفتاویٰ فارسی کے بھی شامل کئے گئے ہیں' مولانا رشید الدین خان نے اپنے نام حضرت شاہ عبدالعزیز کے دو خط بھی نقل کئے ہیں' یہ پورا مجموعہ مولانا رشید الدین کے قلم کی یادگار ہے۔

☆☆☆
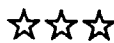
کتب خانہ دارالعلوم کے بعد مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے کتب خانہ میں موجود حضرت شاہ ولی اللہ کی کتابوں کا تعارف پیش خدمت ہے۔

کتب خانہ مظاہر العلوم میں حضرت شاہ صاحب کی دس تالیفات ورسائل کے خطی نسخے موجود ہیں جو یہ ہیں:

(1) مسویٰ مکتوبہ 1279ھ (2)(3)' رسائل در حقائق و معارف (4)' تفہیمات (5)' الطاف قدس (6)'

ہمعات (7)، رسالہ در تحقیق وحدۃ الوجود والشہود، مکتوبہ صفر 1296ھ (8)، رسالہ دانشمندی (9)، رسالہ صرف (10)، القول الجمیل۔

ان نسخوں میں سے حقائق و معارف کے دونوں رسالوں کے علاوہ جو نہ صرف غیر مطبوعہ بلکہ غیر متعارف بھی ہیں اور تمام کتابیں وہ ہیں جو مطبوعہ اور عموماً دستیاب ہیں ان میں سے ابتدائی تین نسخوں کا کسی قدر تعارف مفید ہوگا۔

مسویٰ کا نسخہ مظاہر علوم خوش قلم صحیح اور عمدہ نسخہ ہے جس میں کہیں کہیں بین السطور میں حل لغات کا اہتمام کیا گیا ہے، بین السطور میں ہی ایک دو فقروں میں مختصر توضیحات بھی ہیں۔

نستعلیق قلم ہے، بہت عمدہ صاف واضح تحریر ہے۔ یہ نسخہ نامور عالم مولانا مفتی عنایت صاحب کاکوری کی فرمائش پر نقل اور مرتب ہوا ہے۔ اکثر حصہ مولانا عزیز الدین صاحب نے نقل کیا ہے۔ چند اوراق مفتی عنایت احمد صاحب کاکوری کے قلم سے نیز چند اوراق مفتی صاحب کے دوسرے شاگردوں (مولانا مفتی لطف اللہ گڑھی اور مولانا فدا حسین صاحب) کے قلم سے بھی ہیں، آخر میں ترقیمہ، کاتب مولانا مفتی عنایت احمد صاحب کے قلم سے ہے جس میں مذکورہ بالا اطلاعات کا ذکر ہے۔ اس نسخہ کی کتابت کی تاریخ تکمیل 23 رمضان المبارک 1279ھ، 14 مارچ 1863ء میں درج ہے۔ اس نسخہ کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس کو نسخہ مؤلف سے نقل کیا گیا ہے جس پر حضرت شاہ عبدالعزیز کے افادات و حواشی بھی درج تھے۔ یہ افادات اور حاشیے نسخہ مفتی عنابت میں بھی نقل ہیں۔

مظاہر علوم کے کتب خانہ میں حقائق و معارف پر حضرت شاہ صاحب کے دو مختصر رسالے بھی موجود ہیں۔ دونوں شاہ صاحب کی نادر و کم یاب مؤلفات میں سے ہیں۔ ان میں سے ایک رسالہ میں شاہ صاحب نے ایک اپنے فارسی اشعار کی شرح فرمائی ہے اور دوسرے میں دو عربی قصیدوں کی شرح ہے۔ پہلے کے آغاز پر فرماتے ہیں:

> ''می گوید فقیر ولی اللہ کہ سابق از شوق برادرم خواجہ امین الدین اکرمہ اللہ تعالیٰ بعض معارف الٰہیہ در نیکوترین لباسے کہ لباس نظم است بیان کردہ شود، والحال ایشاں تقاضائے آں کرد کہ زیر ہر بیتے اشارت لطیف کردہ شود بآں معرفت کہ در آں مودع است: زیادہ ام یا بادیہ پیمانہ ام عاشق شوریدہ ام یا عشق با جانانہ ام۔''

اس ردیف و قافیہ کے صرف سات شعر ہیں، حضرت شاہ صاحب کی شرح بھی ہے۔ اس کے بعد ایک رسالہ اور بھی ہے جس کے آغاز پر فرماتے ہیں:

> اما بعد فقیر ولی اللہ عفی عنہ کہ سابقاً بعض معارف غامضہ را در دو قصیدہ...... کہ ہر یک سی بیت باشد بلسان...... بیان کردہ شد الحال شوق برادرم خواجہ امین اکرمہ اللہ بشہودہ باعث شرح آں می شود......

مگر افسوس کہ دونوں رسالوں پر نہ رسالوں کا نام درج ہے، نہ کاتب کا مزید تاسف یہ ہے کہ دونوں نسخے نہایت خستہ اور کرم خوردہ ہیں۔ دونوں کا کوئی مصرعہ یا سطر ایسی نہیں ہے جو کرم خوردہ نہ ہو، اندیشہ ہے کہ یہ نسخے اگر اسی حالت میں رہے تو جلد ہی ختم ہو جائیں گے۔

مظاہر علوم کے نسخوں میں سے ایک اہم نسخہ ''تفہیمات الٰہیہ'' کا ہے۔ یہ بھی نہایت عمدہ اور صحیح نسخہ ہے جو غالباً حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی یادگار ہے، غالباً اس لئے کہ اگر چہ اس پر کاتب نے اپنا نام ''محمد یعقوب'' لکھا ہے مگر نانوتوی نسبت کی صراحت نہیں لیکن کتب خانہ سہارن پور میں یہ نسخہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب انبیٹھوی کے کتب خانہ سے آیا ہے جو مولانا محمد یعقوب کے حقیقی بھانجے تھے اس لئے قرین قیاس ہے کہ یہ مولانا محمد یعقوب صاحب کا نقل کیا ہوا ہو۔ اس نسخہ کی کتابت صفر 1298ھ، جنوری 1881ء میں مکمل ہوئی تھی۔ یہ نسخہ ہلکے باریک مگر عمدہ ولایتی کاغذ پر لکھا ہوا ہے۔ یہی نسخہ ''تفہیمات الٰہیہ'' کے اس نسخہ کی اساس ہے جو مجلس علمی ڈابھیل کے اہتمام سے مدینہ پریس بجنور سے 1355ھ (1936ء) میں چھپا تھا۔

''تفہیمات'' کے اس نسخہ کی دوسری جلد کے آخری صفحات موجود نہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کاتب نسخہ (مولانا محمد یعقوب نانوتوی) کو اس کی تکمیل کا وقت نہیں ملا۔

اس نسخہ کے اختتام پر حضرت شاہ صاحب کا رسالہ ''تحقیق وحدۃ الوجود والشہود'' بھی شامل ہے جو کاتب نسخہ (مولانا محمد یعقوب نانوتوی) کے بھانجے مولانا نذیر احمد صاحب انبیٹھوی کے قلم سے ہے۔ اختتام پر لکھا ہے:

''الحمد للہ کہ.......... تاریخ 21 صفر 1296ھ بخط بے ربط کمترین نذیر احمد ساکن قصبہ انبیٹہ ضلع سہارنپور، در بہاول پور اختتام یافت''

☆☆☆

آخر میں ان چند کتابوں کا تذکرہ کیا کرتا ہے جو ہمارے ذخیرہ کتب میں موجود ہیں۔ ہمارے خاندانی کتب خانہ میں حضرت شاہ صاحب کی اکثر تصانیف کے خطی نسخے موجود تھے، جس کا اکثر حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ جو چند کتابیں اس وقت راقم سطور کی تحویل میں ہیں، ان کا مختصر تعارف حاضر ہے۔ اس وقت ہمارے ذخیرہ میں حضرت شاہ صاحب کی گیارہ کتابوں کے چودہ قلمی نسخے محفوظ ہیں:

1۔ الرسالۃ الخافضۃ للملۃ الرافضہ
2۔ القول الجمیل (نسخہ مؤلف)
3۔ المکتوب المدنی یعنی رسالہ تحقیق وحدۃ الوجود والشہود، دو نسخے۔
4۔ ازالۃ الخفاء مکتوبہ شوال 1187ھ
5۔ البدور البازغہ، مکتوبہ 1203ھ
6۔ المقدمہ السنیہ فی انتصار الفرقۃ السنیہ
7۔ مسلسلات (مشتمل بر الفضل المبین، الدر الثمین و رسالہ نوادر)
8۔ رسالہ دعائے اعتصام
9۔ سرور المحزون، دو نسخے
10۔ رسالہ دانش مندی
11۔ وصیت نامہ، دو نسخے

الرسالۃ الخافضہ للملۃ الرافضہ

حضرت شاہ صاحب کی نہایت نادر اور کم یاب تحریر ہے اور راقم السطور کو ''الرسالۃ الخافضہ'' کے کسی اور قلمی یا

مطبوعہ نسخے کا علم نہیں۔ حضرت شاہ صاحب کی تالیفات کی فہرستوں میں بھی اس کا تذکرہ نہیں ملا۔ ''الرسالۃ الخافضہ'' فارسی کا مختصر سا رسالہ ہے جس میں شیعہ مذہب کے ابطال پر تین نکات بیان فرماتے ہیں جس کا آغاز ان الفاظ سے ہوا ہے:

الحمد للہ الذی لا الہ الا ہو واشہدان سیدنا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ علی الہ وصحبہ وسلم امابعد فیقول العبد بلضعیف ولی اللہ ابن عبدالرحیم الدہلوی، کان اللہ لہما فی اولیٰ والاخریٰ این فقیر وقتے، بجانب غیب متوجہ شد تا مطلع شود بر حال رافضہ و بر دلیلے کہ ابطال مذہب ایشاں کند، دو سہ نقطہ بخاطر ایں فقیر ریختند ایں فقیر امیدوار آنست کہ ہر کہ.........

اور اس کا اختتام حضرت شاہ صاحب کے ان خاص الفاظ پر ہوا ہے جو شاہ صاحب اپنی اکثر کتابوں کے اختتام پر رقم فرماتے ہیں جو یہ ہیں:

والحمد للّٰہ اولاً و اخراً و ظاھراً و باطناً

اس رسالہ پر اگرچہ کاتب کا نام اور سنہ کتابت تحریر نہیں مگر یہ جس جلد میں شامل ہیں اس کے تمام رسائل و مؤلفات روح اللہ کشمیری شاگرد مولانا مرزا حسن علی محدث کے قلم سے لکھے ہوئے ہیں۔ ان کا سنہ کتابت (1355ھ۔ 1839ء) سے (1257ھ۔1840) تک کا ہے اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ ''الرسالۃ الخافضہ'' بھی روح اللہ کشمیری کے قلم کا اور (1255ھ۔1257ھ) کے درمیان کا نقل کیا ہوا ہے۔

ان کتابوں میں سے ''القول الجمیل'' کا نسخہ اس لئے اہم ترین ہے کہ اس کی حضرت شاہ صاحب نے خود اپنے دست مبارک سے تصحیح و تکمیل فرمائی ہے۔ یہ نسخہ کل تراسی صفحات پر مشتمل ہے۔ بیسیوں صفحات پر حضرت شاہ صاحب کے قلم سے چھوٹی بڑی تصحیح و اصلاحات درج ہیں اور چونکہ اس نسخہ کی قدیم نقل کے چار ورق (صفحہ اسّی سے تراسی تک) ضائع ہو گئے تھے، اس لئے حضرت شاہ صاحب نے وہ صفحات دوبارہ نقل کر کے اس میں شامل فرمائے ہیں۔ آخر میں یہ صراحت بھی ہے کہ

"ان اللّٰہ وفقنا لتصحیح ھذہ النسخہ و انا الفقیر المولف ولی اللّٰہ عفا اللہ عنہ"
اللہ تعالیٰ نے مجھے اس نسخہ کی تصحیح کی توفیق عطا فرمائی اور میں ہوں ناچیز مؤلف ولی اللہ عفی اللہ عنہ۔

''المکتوب المدنی'' یا ''رسالہ تحقیق وحدۃ الوجود الشہود'' کے دو نسخے ہیں۔ پہلا نسخہ بہت عمدہ نسخہ ہے اگرچہ اس پر کاتب کا نام وغیرہ یا کوئی صراحت درج نہیں بلکہ یہ جس طرح نقل ہوا اس سے پہلے یہی خیال ہوتا ہے کہ یہ بھی شاہ صاحب کے قلم سے ہو مگر یقین سے کہنا مشکل ہے۔ یہ نسخہ ساڑھے پانچ اوراق یا گیارہ صفحات پر مشتمل ہے۔

''مکتوب مدنی'' کا ایک نسخہ اور بھی ہے جو 1295ھ کا لکھا ہوا ہے، اسی شخص کے قلم سے حضرت شاہ محمد اسماعیل کی تالیف ''عبقات'' کا ایک نسخہ بھی اسی جلد میں مجلد ہے۔

''ازالۃ الخفاء'' کا نسخہ تین بڑی جلدوں پر مشتمل ہے۔ جس میں پہلی جلد جو مقصد اول پر محیط ہے 1274ھ کی مکتوبہ ہے اور یہ نسخہ مولانا نورالحسن کاندھلوی وفات (1285ھ۔1869ء) نے نقل کرایا تھا۔ مقصد دوم جلد جو دو جلدوں

اور سوا چار اوراق یعنی ساڑھے آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے، اپنی کئی خصوصیات کی وجہ سے توجہ طلب ہے۔

(الف) یہ نسخہ حضرت شاہ ولی اللہ کی وفات (29 محرم 1176ھ۔21 اگست 1762ء) کے صرف دو سال بعد حضرت شاہ صاحب کے ایک خاص مکتوب الیہ مجد الدولہ نواب عبدالمجید خاں بہرام جنگ کی فرمائش پر عبدالمجید نامی کسی شخص نے نقل کیا ہے، ناقل اس نسخہ کی نقل و کتابت سے 7 شوال 1178ھ کو جمعہ کے دن فارغ ہوا، قلم واضح نسبتاً جلی نستعلیق ہے۔

(ب) یہ نسخہ حضرت شاہ عبدالعزیز کے خاص شاگرد ملک الشعرا میر قمر الدین منت سونی پتی کی ملکیت میں رہا ہے۔ میر قمر الدین کے دستخط، مہر اور ان کے قلم کی عبارتیں اور چند حاشیے بھی ثبت ہیں۔

(ج) ''ازالۃ الخفاء'' کے سب سے پہلے مطبوعہ نسخے کی اساس اسی نسخے پر ہے۔ ''ازالۃ الخفاء'' کے ناشر اور مرتب مولانا محمد احسن نانوتوی نے اس کتاب کی تصحیح کے لئے کل تین نسخوں سے استفادہ کیا تھا جس میں سے یہ نسخہ بھی شامل تھا، مولانا محمد حسن صاحب نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''(نسخہ) سوم المعنیٰ زمن جناب مولانا محمد نورالحسن کاندھلوی مرحمت کردند'' (ازالۃ الخفاء طبع اول بریلی، جلد دوم ص284)

چونکہ پہلی اشاعت کی کتابت کے لئے یہی نسخہ استعمال ہوا تھا اس لئے اس کے حاشیہ پر مطبوعہ نسخہ کے کاتب کے قلم سے نشانات و صفحات نمبر درج ہیں۔

''البدور البازغۃ'' مکتوب (ربیع الثانی 1203ھ۔دسمبر 1788ء) بقلم محمد طاہر، کاتب کی تحریر سے تاثر ہوتا ہے کہ وہ حضرت شاہ صاحب کے شاگرد ہیں، عمدہ خوش قلم اور غالباً صحیح نسخہ ہے۔

اس نسخہ کے اختتام پر درج ترقیمہ کاتب کے ابتدائی الفاظ سے کاتب کی حضرت شاہ صاحب سے نسبت اور تعلق کا علم ہوتا ہے، لکھا ہے:

''ثم الکتاب من تصانیف مولانا مرشدنا و سندنا..........''

ہمارے ذخیرے کی کتابوں میں ایک اور قابل ذکر نسخہ ''المقدمۃ السنیہ'' کا ہے۔ ''المقدمۃ السنیہ'' کے قلمی نسخوں کی تعداد بہت کم ہے۔ مولانا ابوالحسن فاروقی دہلوی نے ''المقدمہ السنیہ'' کو چار قلمی نسخوں کی مدد سے مرتب کر کے شائع کرا دیا تھا۔ اسی اشاعت کے بنیادی نسخوں میں ہمارا نسخہ بھی شامل ہے۔

یہ نسخہ تیس ورق یا ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ تحریر عمدہ نستعلیق ہے۔ یہ نسخہ شروع (1258ھ۔1841ء) کا لکھا ہوا ہے۔ یہاں یہ بھی ذکر کر دینا چاہئے کہ ''المقدمۃ السنیہ'' پر حضرت شاہ عبدالعزیز نے مفصل حاشیہ لکھا تھا۔ اس کا بھی ایک نسخہ جو اسی کاتب روح اللہ کشمیری کے قلم سے 1247ھ کا لکھا ہوا ہے، ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

ایک نسخہ ''دعائے اعتصام'' کا ہے جو اگرچہ کئی مرتبہ شائع ہو چکی ہے مگر اس کو عموماً شاہ صاحب کی نادر تصانیف میں گنا جاتا ہے۔ ہمارے ذخیرہ میں ''دعائے اعتصام'' کا جو نسخہ ہے اس پر کاتب کا نام اور سنہ کتابت درج نہیں مگر راقم سطور کا خیال یہ ہے کہ یہ نسخہ شاہ محمد عاشق صاحب کے قلم کا ہے۔

''سرور المحزون'' کے دو نسخے ہیں جو (1227ھ۔1812ء) اور (1260ھ۔1844ء) کے لکھے ہوئے

ہیں۔ دونوں کا کوئی امتیاز نہیں ہے جس کا یہاں ذکر کیا جائے۔ اسی طرح ایک نسخہ رسالہ دانشمندی کا ہے جو (1881ء، 1298-99ھ) کا لکھا ہوا ہے۔ دو نسخے شاہ ولی اللہ کے وصیت نامے کے ہیں جس میں ایک (1243ھ۔1827ء) کا دوسرا جو "رسالہ دانشمندی" کے ساتھ شامل ہے، یہ بھی 1881ء کا لکھا ہوا ہے۔

ہمارے خاندانی ذخیرے میں حضرت شاہ صاحب کی جو کتابیں موجود تھیں اُن میں سے ایک اہم "نسخہ مسوی" کا بھی تھا۔ یہ نسخہ حضرت شاہ صاحب کے درس میں 1164ھ میں پڑھا گیا تھا۔ اس نسخہ پر اس درس کی ابتدائی تاریخ (13 شوال 1164ھ۔ستمبر 1751ء) درج ہے۔ لکھا ہے 3 شوال 1164ھ روز شنبہ وقت عصر شروع بقرأت بحضرت استادالشیخ المصنف نمودہ شدہ۔

یہ نسخہ بھی ملک الشعراء امیر قمرالدین منت سونی پتی کی ملکیت رہا۔ سرورق پر ان کی تحریر اور مہر ثبت ہے۔

افسوس ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی لکھی ہوئی سند اجازت کی وہ سطریں ضائع ہوگئیں جس میں شاگرد کا نام بھی تحریر تھا اور یہ بھی معلوم نہیں کہ اس وقت یہ نسخہ کس حال میں ہے۔

حواشی

(1) فہرست مخطوطات کتب خانہ دارالعلوم دیوبند 97-96 جلد اول (دیوبند: 1390ھ)

(2) اس نسخہ کا فہرست کتب خانہ دارالعلوم، مرتبہ مفتی مولانا ظفیر الدین صاحب مفتاحی 145,144، جلد اول (طبع اول دیوبند 1390ھ۔1970ء) میں تعارف ہے۔

ڈاکٹر ابو سعید اصلاحی

رام پور رضا لائبریری میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تصنیفات کے قلمی نسخے

رام پور رضا لائبریری علمی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں۔ یہ لائبریری ذخیرہ مخطوطات کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ یہاں عربی، فارسی، اردو، ترکی، پشتو اور دیگر زبانوں کے پندرہ ہزار مخطوطات کے علاوہ پانچ ہزار مغل عہد کی قلمی تصاویر و تیس ہزار اسلامی خطاطی کے نمونے محفوظ ہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تصنیفات میں سے اکثر کتابوں کے قلمی نسخے رام پور رضا لائبریری میں موجود ہیں جن میں بعض نہایت اہم ہیں۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے ان مخطوطات کی فہرست مختصر تعارف کے ساتھ پیش کی جارہی ہے۔

فارسی مخطوطات

مخطوط نمبر فارسی 66: حضرت شاہ صاحب کی تصانیف میں ایک اہم تصنیف ''الفوز الکبیر'' ہے جو اصول تفسیر سے متعلق ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری میں موجود ہے۔ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر: مصنفہ شاہ ولی اللہ دہلوی (1762-1176)(1703,1114)

ورق 129، سطر 15، سائز 17x30 خط عمدہ نسخ۔ سن کتابت 1179ھ کاتب: حضور اللہ کشمیری

ابتداء: نعم الٰہی درباره ایں بندہ ضعیف بے شمار اند.........

اختتام: فرغت من تسوید الرساله المسماة بفتح الخربمالا بد منه فی علم التفسیر التی صنفها العالم...... قد كان الفراغ من التسويد رجب المرجب 1879 علی ید... حضور الله كشميری.

شاہ صاحب کی یہ کتاب اصول تفسیر کے موضوع پر ایک منفرد کتاب ہے جس میں انہوں نے فہم قرآن کی مشکلات کا علمی تجربہ پیش کیا ہے۔ بقول مولانا ابوالحسن علی ندوی اس میں بعض اصول جو شاہ صاحب نے اپنے ذوق و وجدان اور فہم قرآن کی بنا پر لکھ دیے ہیں، دوسری کتابوں کے سینکڑوں صفحات کے مطالعے سے حاصل نہیں ہو سکتے۔

مخطوطہ نمبر فارسی 130: فتح الرحمٰن۔ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ، جلد اول۔

ورق:197 'سائز25x17 خط۔ معمولی نستعلیق، تاریخ کتابت ندارد۔

یہ جلد قرآن مجید کے نصف اول کا ترجمہ ہے۔ ورق الف ب سے 4ب تک مقدمہ ہے۔ مخطوطہ نمبر فارسی 131: فتح الرحمٰن' جلد دوم۔ یہ نصف آخر کا ترجمہ ہے جو سورہ کہف سے شروع ہو رہا ہے۔

ورق:220 سائز:25x17۔ خط معمولی نستعلیق، تاریخ ندارد۔

ترقیمہ: **قد وقع الفراغ من ترجمة القرآن الشريف حقائق و معارف آگاه میاں شاه ولی الله قدس سره فی وقت الضحی یوم التاسع و عشرون من شهر رمضان۔**

مخطوطہ نمبر 290: ہوامع شرح حزب البحر، فن اوراد

ورق:105 'سائز25x17 'خط عمدہ نستعلیق' تاریخ کتاب ندارد۔

یہ نسخہ نہایت خوبصورت مطلا مذہب ہے۔ ابتدا میں طلائی لوح ہے۔ ابتدائی عبارت جس سے کتاب کی غرض و غایت معلوم ہوتی ہے، اس طرح ہے:

الحمد للہ...... اما بعد میگوید فقیر ولی اللہ عفی عنہ این کلمہ چند است کہ از سائب الہام بر دل ایں فقیر ریختہ در اثنای خواندن حزب البحر کہ دعائیست مشہور از ملھمات شیخ عظیم القدر ابوالحسن الشاذلی قدس سرہ مسمی بھوامع

مخطوطہ نمبر 419: قرۃ العینین بہ تفصیل الشیخین۔ فن عقائد، یہ کتاب شیخین (حضرت ابوبکر صدیق وعمر) کی فضیلت میں ہے۔

ورق:206 'سائز30x32 سینٹی میٹر' خط عمدہ نستعلیق' سنہ کتابت ندارد۔

کتاب دو قلم کی ہے۔ ورق 27 الف تک جلی نستعلیق۔ اس کے بعد خط خفی معمولی نستعلیق' عنوانات سرخ روشنائی سے درج ہیں۔ ابتداء:

الحمد للہ اما بعد میگوید فقیر ولی اللہ عفی عنہ کہ برادر عزیز خواجہ محمد امین اکرمہ اللہ تعالی بشھودۃ از سر تفصیل شیخین رضی اللہ عنھما سوال کردند......

مخطوطہ نمبر 420: ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء، فن عقائد۔ یہ کتاب بھی خلفائے راشدینؓ کی خلافت کے ثبوت اور نظام خلافت کی ضرورت پر محیط ہے۔

ورق:636: سائز29x18 'خط نستعلیق' سنہ کتابت ندارد۔

ابتدائے کتاب میں شاہ صاحب نے کتاب کی غرض و غایت اس طرح بیان کی ہے:

الحمد للہ...... اما بعد میگوید فقیر حقیر ولی اللہ عفی عنہ کہ دریں زمانہ بدعہ تشیع آشکار شد و نفوس عوام بشبھات ایشاں منتشر بہ گشت و اکثر اہل این اقلیم در اثبات خلافۃ خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین شکوک بھم رسانیدند......

مخطوطہ نمبر 421۔ بلاغ المبین، فن عقائد۔

ورق 78، سطر 13، سائز24x17۔ خط معمولی نستعلیق، سنہ کتاب 1238ھ

ابتدا: الحمد للہ...... ایں رسالہ ایست نامیدہ بلاغ المبین کہ آیات کلام رب الانام واحادیث صحیحہ رسول ﷺ و

آثار صحابہ کرام واخبار اولیاء عظام اندران ترجمہ نمودہ آمد......

ترقیمہ: بحسب ارشاد فیض بنیاد مولوی مکرمی مولانا رشید الدین خاں صاحب دامت ارشادہم بلاغ المبین (1166) بتاریخ بیست وچہارم شہر رجب 1238 در بلدہ اجمیر اتمام وسمت اختتام پذیرفت کتبہ میر شاہ علی۔

مخطوطہ نمبر 1004: الطاف القدس فی معرفۃ لطائف النفس، فن سلوک۔

یہ کتاب لطائف باطنی کی تشریح اور تصوف کے بنیادی مسائل کی توضیح میں ہے۔

ورق: 100، سطر 11، سائز 21x15۔ خط عمدہ نستعلیق، سنہ کتابت 1288ھ

ابتدا: **الحمد للہ...... اما بعد میگوید فقیر ولی اللہ بن عبدالرحیم العمری الدہلوی، احسن اللہ الیہ ولی مشایخہ و ابویہ این ورقی چند است مسمی بالطاف القدس فی معرفۃ لطائف النفس دربیان حقیقت قلب و عقلو نفس و روح......**

خاتمہ: **انتہت رسالہ الطاف القدس والحمد للہ اولا و آخر ...... تمت 20 رجب 1288ھ**

مخطوطہ نمبر 1005، ہمعات، فن سلوک

ورق: 38، سطر 21، سائز 24x15 سینٹی میٹر۔ سنہ کتابت 1182ھ

لائبریری کا یہ نسخہ بہت اہم ہے کیونکہ اس کی کتابت شاہ صاحب کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر نے کی ہے۔

ترقیمہ کی عبارت یوں ہے ''تمام شد نسخہ ہمعات وقت چاشت روز شنبہ تاریخ ششم از ماہ شعبان در سن سنہ 1182 ہجری بدست فقیر عبدالقادر بن مصنف الکتاب عفی عنہ ورفعت درجتہ'' آمین۔

مخطوطہ نمبر 1006: المقالۃ الوضیہ، فن سلوک۔

ورق: 14 سطر، 9 سائز 23x15، خط نستعلیق، سنہ کتابت ندارد۔

ابتدا: **الحمد للہ...... اما بعد میگوید ولی اللہ عفی عنہ این کلمات چند است کہ اولاد و احباب خود را وصیت میکنم سمیتہا بالمقالۃ الوضیہ فی النصیحہ والوصیہ حسبنا اللہ و نعم الوکیل.**

مخطوطہ 2313: انفاس العارفین، فن تذکرہ صوفیا

ورق: 156، سطر 11، سائز 29x17 سینٹی میٹر۔ خط نستعلیق، سنہ کتابت ندارد

ابتدا میں جن کا ذکر کتاب میں آیا ہے ان کے نام کی فہرست ہے سب سے پہلا نام ان کے والد شاہ عبدالرحیم کا ہے۔ آخر میں شیخ تاج الدین کا ذکر ہے۔

آخر میں تین ورق کا رسالہ ''جزء اللطیف فی ترجمہ عبدالضعیف'' ہے جو خود شاہ صاحب کے حالات پر مشتمل ہے۔

مخطوطہ 2314: انفاس العارفین، فن تذکرہ صوفیا

ورق: 202، سطر 13، سائز 25x16 سینٹی میٹر۔ خط معمولی نستعلیق، تاریخ کتابت ندارد۔

ترقیمہ: بندہ مولف میگوید عفی عنہ کہ چوں درایں کتاب مستطاب احوال شیخین جلیلین حضرت بزرگ شیخ عبدالرحیم وحضرت شیخ ابوالرضا محمد قدس سرہ تمام شد۔

عربی مخطوطات

رام پور رضا لائبریری کے ذخائر مخطوطات میں حضرت شاہ صاحب کے ترجمہ قرآن کریم کے متعدد نادر و نایاب قلمی نسخے محفوظ ہیں، جن کا اجمالی تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

مخطوط نمبر عربی 214: قرآن مجید مع فارسی ترجمہ۔

ورق 474، سطر 13 سائز: 22x13 سینٹی میٹر۔ سنہ کتابت 1210ھ

قرآن مجید کا بہترین نسخہ ہے۔ شروع میں مطلاّ و مذہّب لوح ہے۔ درمیان میں شاہ صاحب کے فارسی ترجمہ کو سونے سے لکھا گیا ہے۔

مخطوطہ نمبر 219: قرآن مجید مع فارسی ترجمہ۔

ورق: 593، سطر: 9، سائز 36x23 سینٹی میٹر۔ سنہ کتابت غالباً درمیان 68-1266ھ شاہ ولی اللہ صاحب کے فارسی ترجمہ کے ساتھ قرآن مجید کی نہایت خوبصورت کاپی ہے۔ متن عمدہ نسخ اور ترجمہ بہترین نستعلیق میں ہے۔ متن کی شروعات خوبصورت، ڈبل پیچ عنوان سے ہوتی ہے۔ ایک تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ نواب سید محمد سعید خاں بہادر والی رامپور کے حکم پر لکھا گیا تھا اور خط نسخ میں متن کی کتاب میاں جی عبداللہ رامپوری نے اور ترجمہ کی کتابت خط نستعلیق میں محمد رحیم اللہ رامپوری نے کی ہے۔

مخطوطہ نمبر 220: قرآن مجید مع ترجمہ فارسی۔

ورق: 209، سطر 5 سائز: 23x17 سنہ کتابت غالباً تیرہویں صدی ہجری۔

قرآن مجید کے اس خوبصورت نسخے میں شاہ صاحب کا فارسی ترجمہ اور شاہ عبدالقادر کا اردو ترجمہ شامل ہے۔

مخطوطہ نمبر 221: قرآن مجید مع ترجمہ فارسی

ورق: 305 سطر 15' سائز 26.7x15' سنہ کتابت تیرہویں صدی ہجری' حاشیہ پر شاہ ولی اللہ کا فارسی ترجمہ تحریر ہے۔

مخطوطہ نمبر 701: المسوّیٰ من احادیث المؤطا فن حدیث

ورق: 285، سطر 19، سائز 28x16 سینٹی میٹر۔ کتابت تیرہویں صدی ہجری۔ یہ مؤطا امام مالک پر شاہ صاحب کی عربی شرح ''مسویٰ'' کا قلمی نسخہ قدرے کرم خوردہ ہے۔

مخطوطہ نمبر 796: صحاح، فن حدیث

ورق 38، سطر 21، سائز 22x15۔ سنہ کتابت تیرہویں صدی ہجری۔

صحیح بخاری پر شاہ ولی اللہ دہلوی کی تعلیمات کا مجموعہ ہے۔ یہ نسخہ شاہ رفیع الدین دہلوی کے عہد کا لکھا ہوا ہے۔

مخطوطہ نمبر 1018: کتاب الاربعین حدیثاً فن حدیث۔

ورق 1، سطر، 15، سائز 26x19۔ سنہ کتاب 1253ھ

چالیس احادیث کا مجموعہ۔ اس کتاب کے پانچ قلمی نسخے موجود ہیں۔

مخطوطہ نمبر886: الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین۔

ورق: 6، سطر، 18، سائز۔ 23x15 سینٹی میٹر۔ زمانہ کتابت چودہویں صدی ہجری از نزاکت علی۔ یہ ان مبشرات کا مجموعہ ہے جو مصنف نے خواب یا الہام کے ذریعہ نبی ﷺ سے حاصل کی تھیں۔

مخطوطہ نمبر1961: المقدمۃ السنیہ، فن عقائد۔

ورق: 4، سطر، 23 سائز، 20x14۔

یہ کتاب خلافت ابوبکر کی حمایت اور اہل تشیع کے رد میں ہے۔ کتابت غلام حسین بن نور محمد کی ہے۔

مخطوطہ نمبر1723: العقیدۃ الحسنہ، فن عقائد۔

ورق: 2 سطر، 21، سائز، 25x17۔ سنہ کتابت تیرہویں صدی ہجری۔

اس کتاب میں اسلام کے بنیادی عقائد کو اہل سنت کے مسلک اور قرآن وحدیث کی روشنی میں جامع طریقہ پر بیان کیا گیا ہے۔

مخطوطہ نمبر1355: الجواہر المضیہ فی حلیہ خیر البریہ، فن ادعیۃ الصلوۃ۔

ورق: 7 سطر، 12، سائز 18x13۔ خط نستعلیق، زمانہ کتابت تیرہویں صدی ہجری۔

مخطوطہ نمبر1961: الانصاف فی بیان اسباب اختلاف، فن اصول فقہ حنفی۔

ورق: 15، سطر 23، سائز 20x14۔ خط نستعلیق، سنہ کتابت 1206ھ کتابت از غلام حسین بن نور محمد۔

مخطوطہ نمبر 3172: فیوض الحرمین، فن سلوک۔

ورق: 35، سطر 17، سائز 29x19۔ زمانہ کتابت تیرہویں صدی ہجری۔

یہ کتاب قیام حجاز کے زمانہ کے مشاہدات، حقائق باطنی اور مسائل تصوف سے تعلق رکھتی ہے۔

مخطوطہ نمبر3168: البدور البازغہ، فن سلوک

ورق: 65، سطر 25، سائز 325x20۔ خط نستعلیق زمانہ بارہویں صدی ہجری۔

نسخہ مصنف کی حیات میں تیار ہوا ہے۔

یہ کتاب بھی فلسفہ دینی کے بیان پر مشتمل ہے۔ بقول علی میاں ندوی، اس کتاب میں ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے مقابلہ میں مضامین کی کثرت ہے۔

مخطوطہ نمبر3168: تفہیمات الالہیہ، فن سلوک

ورق: 157 خ، سطر 26، سائز 32x20۔ خط نستعلیق، زمانہ بارہویں صدی ہجری

مصنف کے عہد کا نہایت اہم نسخہ ہے۔ یہ کتاب شاہ صاحب کے واردات قلبی اور وجدانی مضامین پر مشتمل ہے۔

مخطوطہ نمبر1961: رسالہ فی وحدۃ الوجود، فن سلوک

ورق: 6، سطر 23، سائز 20x14۔ خط نستعلیق از غلام حسین۔ سنہ کتابت 1206ھ

غلام مصطفیٰ قاسمی

شاہ ولی اللہ کی تالیفات پر ایک نظر

(1)

حکمت ولی اللّہی کے نقطہ نظر سے اسلام کو سمجھنے اور علوم اسلامیہ کے مطالعہ کرنے کا جو علمی رجحان ولی اللّہی فلسفہ کے سب سے بڑے علمبردار اور داعی حضرت العلامہ الاستاذ عبیداللہ سندھی کی مساعی جمیلہ سے شروع ہوا تھا، وہ آہستہ آہستہ بڑھتے بڑھتے اب مستقل مکتب فکر کی حیثیت اختیار کر رہا ہے۔ ملک کے عربی و دینی مدارس میں جدید کالجوں اور یونیورسٹیوں میں شاہ صاحب کی تعلیمات اور تالیفات کے مطالعہ کرنے اور ان پر تحقیقی مقالے لکھنے کا شوق اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور یہ ایک بڑا خوش کن امر ہے کیونکہ اس سائنسی دور میں اگر دین اور اسلامی روایات کو محفوظ رکھنا ہے تو ہمارے خیال میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ولی اللّہی فکر کی اشاعت عام ہو۔ پھر یہ ایک ذریعہ بھی ہوگا، مسلمانوں کے مختلف فرقوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور ان کے فروعی اختلافات کو کم کرنے کا۔ آج سارے عالم اسلام اور بالخصوص برصغیر کے مسلمانوں کی سب سے اہم ضرورت یہی ہے۔ لیکن ولی اللّہی فلسفہ اور علوم کی تشریح اور مطالعہ کے بعد نتائج اخذ کرنے میں دوررس نگاہ وسعت قلب اور اشد احتیاط کی ضرورت ہے ورنہ اس فلسفہ کے ذریعہ قوم کے ذہنی انتشار اور ارتشتت سے نکلنے کی جو آخری امید اور سہارا ہے، وہ بھی ہاتھ سے جاتا رہے گا۔

ظاہر ہے کہ ایک عظیم مصنف' مصلح اور حکیم کو اپنی زندگی میں جن حالات اور ادوار سے گزرنا پڑتا ہے ان کا اس کی تالیفات پر اثر انداز ہونا لازمی امر ہے۔ حضرت شاہ صاحب کو بھی اس مسلمہ قاعدے سے مستثنیٰ نہیں کیا جاسکتا' اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ آپ کی تالیفات پر اس اعتبار سے نظر ڈالی جائے۔ ہمارے خیال میں آج تک اس موضوع پر تفصیل سے کچھ نہیں لکھا گیا اور غالباً اس کا بڑا سبب تو یہی ہوگا کہ بدقسمتی سے شاہ صاحب نے اپنی کتابوں کے مقدموں میں سوائے معدودے چند کتابوں کے سن تالیف نہیں لکھا' حالانکہ اس دور میں یعنی بارہویں صدی ہجری میں مؤلفین کی یہ عام عادت تھی کہ وہ تصنیفات میں سن تالیف ضرور لکھا کرتے تھے۔ شاہ صاحب کے ایک عظیم معاصر اور محقق عالم مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی (1104-1174ھ) کی کوئی شاذ و نادر تصنیف ایسے ملے گی جس میں سن تصنیف نہ دیا گیا ہو۔ اپنی سب کتابوں کے شروع یا آخر میں مخدوم صاحب نے سن تالیف کی تصریح فرمائی ہے۔ باقی کتابوں کے شروع یا آخر میں مخدوم صاحب نے سن تصنیف لکھا ہے۔ شاہ صاحب کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان کتابوں کو چھوڑ کر جن میں شاہ

صاحب نے سن تالیف کی تصریح فرمائی ہے، باقی کتابوں کے سنین تالیف اور ادوار کی تعین میں ہمیں پختہ قرائن اور اشارات ہی سے کام لینا پڑتا ہے اور اس کے بغیر اس بارے میں رائے قائم نہیں کی جاسکتی لیکن قرائن آخر قرائن ہی ہوتے ہیں اور عین ممکن ہے کہ شاہ صاحب نے کوئی رسالہ یا کتاب پہلے لکھی ہو لیکن بعد میں اس پر انہیں نظر ثانی کا موقعہ ملا ہو اور انہوں نے بعد کے دور کی کسی بات یا تحقیق کا اس میں اضافہ کیا ہو۔ بہرحال ہم نے اس ضمن میں اپنی بساط کے مطابق تفحص اور تلاش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور ہمارے پاس شاہ صاحب کی جملہ کتابیں جو موجود ہیں ان سب کو پڑھ کر پھر ان کے سنین تالیف کے متعلق کوئی رائے قائم کی ہے۔ وھو المستحان.

حضرت شاہ صاحب کی عملی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

تحصیل ملکات کا دور: علامہ استاد عبیداللہ سندھی اس سے مراد لیتے ہیں عربی زبان کا سیکھنا، منطقی اصطلاحات کا استعمال کرنا، سوسائٹی کے رائج الوقت قانون یعنی فقہ حنفی کے متون وشروح کا پڑھنا، اس قانون کے عقلی نظام یعنی اصول فقہ کا سمجھنا اور متکلمین کے مختلف مکاتب فکر اور ان کے تقابلی مباحث سے شناسا ہونا۔ یہ علوم وفنون ان کے تحصیلی ملکات کا ذریعہ تھے۔ (1)

یہ دور تو صرف کسب علوم اور تحصیل ملکات کا دور ہے جو کہ آپ کی پندرہ سال کی عمر میں تمام ہوتا ہے۔ آپ کی اس کے بعد کی زندگی کو دو ادوار (قبل از سفر حرمین و بعد از سفر حرمین مطابق 1143ھ) میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اس تمہید کے بعد اب ہم آپ کی تالیفات پر نظر ڈالتے ہیں۔

قرآن وعلوم قرآن

فتح الرحمٰن (قرآن مجید کا فارسی ترجمہ)

اس کی تالیف کا آغاز تو سفر حرمین سے پہلے ہوا۔ البتہ اس کا اختتام سفر حرمین سے واپسی کے بعد آپ نے فرمایا۔ اس لحاظ سے ہم اس تالیف کو دونوں دوروں کا حاصل کہہ سکتے ہیں۔ علامہ استاذ عبیداللہ سندھی اپنی مشہور تالیف **التمهيد لائمة التجديد** میں فرماتے ہیں:

وقد جعل الامام ولى الله قراة القرآن مع التدبر سنة لازمة و كتب فتح الرحمن قبل مجيئه الى الحرمين (2)

امام ولی اللہ نے تدبر کے ساتھ قرآن کی تلاوت کو سنت لازمہ قرار دیا ہے اور حرمین کی طرف آنے والے سے پہلے آپ نے "فتح الرحمٰن" لکھی۔

علامہ استاذ کی اس عبارت سے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پورا ترجمہ سفر حرمین یعنی 1143ھ سے پہلے کا ہے مگر فی الحقیقت ایسا نہیں ہے۔ "فتح الرحمٰن" کے فارسی مقدمہ سے (جو کہ اس حقیر راقم کی کوشش سے پہلی بار اصح المطابع کراچی والوں نے شائع کیا) معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اس کی تالیف کا آغاز سفر حرمین سے پہلے کا ہے لیکن اس کا اختتام سفر حرمین سے واپسی کے بعد ہوا۔ مقدمہ کی عبارت ملاحظہ ہو:

''ایں فقیر راداعیہ ایں امر خطیر بخاطر ریختند، وخواہ مخواہ برسرآں آوردند، یک چند در تفحص ترجمہا افتاد تاہر کرا کہ از تراجم غیر آں کہ بخاطر مقرر شدہ است مناسب باید در ترویج آں کوشد، وکیف ماامکن پیش اہل عصر مرغوب نماید، در بعض تطویل ممل یافت و در بعض تقصیر مخل، ہیچ یک موافق آں میزان نیفتاد لاجرم عزم تالیف ترجمہ دیگر مصمم شد وتسوید ترجمہ زہراوین برروئے کار آمد بعد ازاں سفر حرمین اتفاق افتاد، وآں سلسلہ از ہم گست۔ بعد سالہائے چند عزیزے پیش ایں فقیر خواندن قرآن باترجمہ آں شروع کرد ایں صورت سلسلہ جنبان آں عزم شد، وبرسرآں آورد کہ بقدر خواندن سبقاً سبقاً نوشتہ شود چوں قریب ثلث قرآن رسیدہ شد آں عزیز راسفرے پیش آمد وایں تحریر در حیز توقف افتاد، بعد مدتے باز تقریبی پیدا شد ورگیر بار آں خطرہ پارینہ رایاد آورد وتادو ثلث قرآن کشیدہ بود، چوں اللہ کثر حکم الکل مقرر است ببعض یاران گفتہ شد کہ آں مسودہ راتبییض کنید وآں ترجمہ رامقرون بآیات قرآن نویسید تانسخہ مستقل گردد، وآں یار سعادت مند روز عیدالاضحیٰ سنۃ خمسین بعد الالف والمائۃ در تبییض شروع نمود، چوں، بتبییض بآخر تسوید رسید باز عزم راانبعاثے پدید آمد وتا آخر قرآن مسود شد وکان ختم التسوید فی اوائل شعبان وختم التبییض فی اوائل رمضان سنۃ احدی وخمسین۔''

(ترجمہ) اس فقیر کے دل میں اس امر عظیم کا یہ داعیہ پیدا ہوا اور مجھے اس کے لئے مجبور ہونا پڑا کہ چند تراجم قرآن کا تفحص کیا جائے تا کہ ان دوسرے تراجم سے وہ ترجمہ جو میرے مذاق کے موافق ہو اس کی ترویج میں کوشش کی جائے اور جس طرح ہو سکے اس کو اہل زمانہ کے ہاں مرغوب بنایا جائے (لیکن کوئی ترجمہ ایسا نظر نہ آیا) کیونکہ کچھ تراجم ایسے تھے جن میں ملال پیدا کرنے والی طوالت تھی اور بعض میں مخل کوتاہی تھی لیکن کوئی ترجمہ بھی میرے معیار پر نہ اترا لہٰذا ایک دوسرے ترجمے کی تالیف کا عزم مصمم پیدا ہوا۔ زہراوین (بقرہ، آل عمران) کا ترجمہ لکھا گیا۔ اس کے بعد سفر حرمین کا اتفاق ہوا اور یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ چند سالوں کے بعد ایک عزیز نے اس فقیر کے پاس ترجمہ کے ساتھ قرآن کا پڑھنا شروع کیا اور اس سے عزم سابق میں ایک جنبش سی پیدا ہوئی اور یہ خیال ہوا کہ ایک ایک سبق کے مقدار ترجمہ لکھا جائے۔ جب تقریباً ثلث 1/3 قرآن کا ترجمہ پورا ہوا تو اس عزیز کو سفر کا سامنا کرنا پڑا اور یہ تحریر موقوف ہوگئی۔ ایک مدت کے بعد پھر یہ تقریب پیدا ہوئی۔ اس کے حاصل کرنے میں قدیم خیال کو یاد کیا یہاں تک کہ دوسرا ثلث بھی ختم۔ (یعنی ترجمے کے دو تہائی مکمل ہوگئے) جبکہ اکثر کو کل کا حکم ہوتا ہے اس لئے بعض دوستوں سے یہ کہا کہ اس مسودہ کو صاف کریں اور اس ترجمے کو آیات سے ملا کر لکھیں تا کہ یہ نسخہ مستقل ہو جائے۔ اس سعادت مند دوست نے 1150ھ میں عیدالاضحیٰ کے روز اسے صاف کرنا شروع کیا اور جب تبییض مسودہ کے آخری تک پہنچی تو پھر سابق عزم میں ہیجان پیدا ہوا اور مسودہ قرآن کے آخر تک ہوگیا۔ مسودہ کے اختتام اوائل شعبان میں ہوا اور تبییض کا اختتام اوائل شعبان میں ہوا اور تبییض کا

اختتام 1151ھ میں ہوا۔[3]
چنانچہ حضرت استاذ ''امام ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف'' میں فرماتے ہیں:
''شاہ ولی اللہ صاحب نے متن قرآن کی حقیقت اپنے اشراق سے اس طرح معین کر لی کہ یہ کتاب بذات خود ایک کامل مکمل نصاب ہے اس پر اضافہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کی زبان فارسی تھی۔ 1150ھ میں آپ نے اس کتاب مجید کا فارسی میں ''فتح الرحمٰن'' کے نام سے ترجمہ کیا جو 1151ھ میں ختم ہوا اور 1156ھ میں ''فتح الرحمٰن'' کی تدریس کا افتتاح ہوا۔ آپ نے ترجمے کے ساتھ مختصر طور پر تشریحی فوائد بھی لکھے۔[4]''
علامہ استاذ سندھی نے 1156ھ میں جس تدریس کا ذکر کیا ہے، اس کو امام ولی اللہ نے اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے:
بعد ازاں در سن سہ وخمسین باہتمام برادر دینی عزیز القدر خواجہ محمد امین اکرمہ اللہ تعالی بشہودہ آں کتاب را رواجی پیدا شد، ودر حیز مداولت آمد ونسخ متعددہ گشت واہل عصر بآن اقبال نمودند۔''
اس کے بعد 1156ھ میں دینی بھائی عزیز القدر خواجہ محمد امین (اللہ تعالیٰ اس کو اپنے شہود سے نوازے) کی کوشش سے اس کتاب (ترجمہ) کا رواج ہوا اور یہ مداوات میں آگئی اور اس کے متعدد نسخے کیے گئے، اور اہل زمانہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔[5]
اس ترجمے کی اگر خصوصیات دیکھنی ہیں تو مقدمہ فتح الرحمٰن اور ''شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ'' کی طرح رجوع کریں۔
(2) الفوز الکبیر فی اصول التفسیر (فارسی)۔ سن تالیف بعد از 1151ھ و بعد از تالیف فتح الرحمٰن و تاویل الاحادیث۔
اگر مؤلف امام نے اس رسالے کے سن تالیف کے متعلق بصراحت کچھ نہیں لکھا، لیکن اس کی بعض عبارتوں میں ''فتح الرحمٰن'' اور ''تاویل الاحادیث'' کے حوالہ جات پائے جاتے ہیں اور ''فتح الرحمٰن'' کے سن تالیف کے متعلق تو مؤلف امام کی صراحت موجود ہے کہ وہ 1151ھ میں تکمیل پذیر ہوا۔ اس سے لازماً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ''الفوز الکبیر'' اس کے بعد کی تالیف ہے۔ مؤلف امام فرماتے ہیں:
''از علوم وہبیہ در علم تفسیر کہ بآن اشارت کردیم تاویل قصص انبیاء ست علیہم السلام وفقیر برائے ایں فن رسالہ تالیف کردہ ست مسماۃ بتاویل الاحادیث دیگر ترجمہ بزبان فارسی بوجہی کہ مشابہ عربی باشد در قدر کلام ودر تخصیص وتعمیم وغیر آں وآنرا در فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن ثبت نمودیم۔[6]''
علم تفسیر کے ان وہبی علوم میں سے جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا انبیا علیہم السلام کے قصوں کی تاویل بھی ہے۔ فقیر نے اس فن میں ایک رسالہ ''تاویل الاحادیث'' کے نام سے تالیف کیا ہے۔
اس کے علاوہ کلام اللہ کا فارسی زبان میں ترجمہ اس طریقہ سے کہ وہ مقدار اور تخصیص وتعمیم وغیرہ

میں عربی کے مشابہ ہے۔ اس کو ہم نے فتح الرحمان ترجمہ القرآن میں ثبت کیا ہے۔

یہ رسالہ قرآن فہمی کے سلسلے میں کتنا اہم ہے اس کا اندازہ مؤلف امام کی اس عبارت سے کیجیے جو آپ نے شروع رسالے میں لکھی ہے:

''چوں بریں فقیر درے از فہم کتاب اللہ کشادند خواست کہ بعضی نکات نافعہ کہ در تدبر کلام اللہ یاران را بکار آید در رسالہ مختصری مضبوط نماید امیدواری از عنایت حضرت باری آنست کہ طالب علماں را بہ مجرد فہم ایں قواعد راہی وسیع در فہم معانی کتاب اللہ کشادہ گردد کہ اگر عمرے در مطالعہ تفاسیر ہا گزرانیدن آنہا بر مفسران علی انھم اقل قلیل فی ہذا الزمان بسر برند بآن ضبط و ربط بدست نیارند و سمیتہا بالفوز الکبیر فی اصول التفسیر۔ (7)

جب اس فقیر پر کتاب اللہ سمجھنے کا دروازہ کھولا گیا تو میں نے چاہا کہ بعض مفید نکات جو کتاب اللہ کے سمجھنے میں دوستوں کے کام آسکتے ہوں، ان کو ایک مختصر رسالہ میں منضبط کرے۔ خدا تعالیٰ کی عنایت سے امید ہے کہ طالب علموں کے سامنے صرف ان قواعد کے سمجھنے کے لئے ایک وسیع شاہراہ کھل جائے گی کہ اگر وہ ایک عمر کتب تفاسیر کا مطالعہ کرنے یا ان کو مفسرین سے جن کی تعداد اس زمانہ میں بہت ہی کم ہوگئی ہے، پڑھنے میں صرف کریں تو اس قدر ضبط کے ساتھ حاصل نہیں ہوسکتی اور میں نے رسالہ کا نام ''الفوز الکبیر فی اصول التفسیر'' رکھا۔

اب ہم اس رسالے کے متعلق فلسفہ ولی اللہی کے عظیم شارح علامہ استاذ عبیداللہ سندھی کی رائے پیش کرتے ہیں۔ حضرت استاذ علامہ سندھی فرماتے ہیں:

''شاہ صاحب نے قرآن کے مضامین کو مذکورہ بالا پانچ ابواب میں تقسیم کرکے دنیائے اسلام پر رحمت کا دروازہ کھول دیا ہے۔'' (8)

یہاں اگر ان کی کسی عقلی اور وہبی اشراقی قوتیں کام نہ کرتیں تو ہمارے خیال میں قرآن کو اس طرح واضح کرنا ناممکن تھا۔ (9) دوسری جگہ فرماتے ہیں:

''ہم نے مولانا شیخ الہند قدس سرہ سے اصول تفسیر پر کتابیں مانگیں تو آپ نے ''کتاب الاتقان فی علوم القرآن'' از حافظ جلال دین (عبدالرحمٰن بن ابی بکر السیوطی متوفی 911ھ) ہمیں مرحمت فرمائی۔ میں نے پوری کوشش سے ساری کتاب بارہا پڑھی۔ سوائے چند اوراق کے مجھے اس میں کوئی چیز دلچسپ نظر نہ آئی جسے اصول کا درجہ دیا جاسکے۔ اسی زمانہ میں حضرت مولانا شیخ الہند نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ایک مختصر رسالہ اصول تفسیر میں شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی لکھا ہے جس کا نام ''فوز الکبیر'' ہے۔ یہاں میں خیال کرتا ہوں کہ کہ حضرت مولانا (شیخ الہند) قدس سرہ کی عادت مبارکہ کا ضمناً ذکر کروں۔ آپ جانتے تھے کہ امام فخر الدین رازی اور علامہ (مسعود بن عمر المتوفی 791ھ) تفتازانی کو عموماً طلبا میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان نام بردہ حضرات کے

مقابلہ میں طلبا شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کی بات سننے کے لئے بھی تیار نہیں۔ نجم الائمہ شیخ الہند
لہٰذا اگر کسی مسئلے میں امام رازی یا علامہ تفتازانی کی تغلیط کرتے تو مبہم طور پر یہ فرماتے کہ محققین کی
رائے اس مسئلہ میں یوں ہے۔ طلبا سمجھتے کہ یہ محققین ان حضرات سے بھی کوئی متقدم ہستیاں ہوں
گی۔ میں ایک لمبے عرصے کے بعد متفطن ہوا کہ محققین سے حضرت شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم اور
ان کے اساتذہ کرام اور مشائخ عظام میں جو شاہ ولی اللہ صاحب پر ختم ہو جاتے ہیں۔
''یہ باعث تھا کہ آپ نے ''فوز الکبیر'' مجھے شروع میں عطانہ کی بلکہ فقط اس کا تذکرہ کر دیا۔ جب
میں سندھ پہنچا تو مجھے ''فوز الکبیر'' کا نسخہ ملا۔ اس سے پیشتر میں امام رازی کی تفسیر کا مطالعہ کر کے
کافی پریشان ہو چکا تھا (الفوز الکبیر کے) فصل اول کا مطالعہ ختم کرنے کے بعد میں مطمئن ہو گیا
کہ انشاء اللہ علم تفسیر مجھے آ سکتا ہے۔ پھر اس سے آج تک میں ان کے مسلک سے باہر جانے کی
ضرورت محسوس نہیں کر سکا۔''(11)

(3) فتح الخبیر بما لابد من حفظہ فی علم التفسیر (عربی)

یہ رسالہ اصل میں ''الفوز الکبیر فی اصول التفسیر'' کا پانچواں باب ہے لیکن بقول مؤلف امام اس باب کو الگ خطبہ سے اس لئے شروع کیا گیا تا کہ مستقل رسالہ بن جائے اور کوئی چاہے تو اس کو (الفوز الکبیر) سے جدا کر کے لکھے۔ اس رسالہ میں مؤلف علام کے قرآن مجید کے غرائب کی شرح فرمائی اور اسباب نزول میں سے وہ حصہ جس کا مفسر کے لئے جاننا ضروری ہے اور اس کے بغیر قرآن مجید میں خوض کرنا ممنوع ہے، اسے ذکر فرمایا ہے۔

شاہ صاحب نے ''شرح غرائب'' میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ان آثار کو جو کہ ابن ابی طلحہ کی طریق سے مروی ہیں، جمع کیا ہے اور اس کی کمی ضحاک کے طرق سے پوری کی گئی ہے۔ علامہ سیوطی نے بھی ''اتقان'' میں ایسا ہی کیا ہے لیکن کچھ غرائب ایسے بھی تھے جو کہ ان دونوں فریقوں کے طریق میں نہیں ملتے تھے۔ ان کی تکمیل نافع بن ازرق کے مسائل اور صحیح بخاری کی تحقیق سے کی گئی ہے، کیوں کہ اس بات کی مرویات میں صحیح بخاری کو اصح ہونے کا درجہ حاصل ہے۔ اس کے علاوہ اہل نقل میں سے کچھ دوسرے ثقات کے اقوال بھی ''فتح الخبیر'' میں موجود ہیں لیکن وہ تعداد میں کم ہیں۔ محدثین کی تفاسیر سے اسباب نزول کے متعلق ضروری باتیں لائی گئی ہیں اور وہ تفاسیر یہ ہیں: بخاری، ترمذی اور حاکم۔

مؤلف امام کی ''فتح الکبیر'' کے متعلق جو اپنی رائے ہے اس کو بھی پڑھ لیجیے۔

فجاء ت بحمداللّٰہ رسالۃ مفیدۃ فی بابھا عدۃ نافعۃ لمن اراد ان یقتحم فی عبابھا، وسمیتھا فتح الخبیر بمالا بدمن حفظہ فی علم التفسیر.(12)

اللہ کی تعریف سے یہ رسالہ اپنے باب میں سودمند ہوا اور جو اس کی موج میں داخل ہونا چاہے اس کے لئے نافع ہتھیار ہے۔

یہ رسالہ ڈیمی سائز کے 32 صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ 27 سطور کا ہے۔ علوم قرآن کے سلسلہ میں امام ولی اللہ کی ایک کتاب اور بھی ہے جو ''تاویل الاحادیث'' کے نام سے موسوم ہے لیکن اس پر کچھ لکھنے سے قرآن اور علوم قرآن پر

شاہ صاحب کی ان علمی مساعی کو ولی اللّٰہی دعوت کے پس منظر میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ولی اللّٰہی دعوت کا مدار چار چیزوں پر ہے۔

(1) سب سے پہلے قرآن مجید میں تدبر اور غور کرنا اور مفسرین کی آراء سے مستغنی ہو کر قرآن مجید سے براہ راست ہدایت حاصل کرنا۔ شاہ صاحب نے اس کے اصول اپنی تالیف ''الفوز الکبیر'' میں بیان فرمائے ہیں۔ اس ضمن میں جس تحقیق اور تجدید کے شاہ صاحب داعی ہیں اس کی ابتدا بقول علامہ استاذ عبید اللہ سندھی' شاہ صاحب کے والد شاہ عبدالرحیم سے ہوتی ہے۔[13] شاہ عبدالرحیم نے علوم اور معارف کو عالمگیری دور کی اسلامی سوسائٹی سے حاصل کیا اور خصوصی معارف اپنے نانا شیخ رفیع الدین دہلوی سے ورثہ میں پائے۔

شاہ صاحب ''بوارق المعرفۃ'' میں لکھتے ہیں:

> وظیفہ حضرت ایشان از نوافل تہجد و اشراق وضحیٰ و دو رکعت بعد مغرب بود و بتلاوت دائما مشغول می بودند مگر بعذر بغایت خوشی و بارعایت تجوید می خواندند' وغالباً در حلقہ یاراں بیرون از تلاوت ہر روز دو سہ رکوع بتدبر و بیان معانی آن می خواندند۔''[14]

> وظائف میں سے حضرت (شاہ عبدالرحیم) کا یہ معمول تھا کہ نوافل میں سے تہجد' اشراق' صلوٰۃ، چاشت اور مغرب کے بعد دو رکعت نفل پڑھتے تھے۔ کسی عذر کے بغیر ہمیشہ تلاوت قرآن میں مشغول رہتے تھے۔ نہایت مسرور اور تجوید کی رعایت سے قرآن کی تلاوت فرماتے تھے اور اس تلاوت کے علاوہ دوستوں کے حلقہ میں روزانہ دو تین رکوع تدبر سے پڑھتے اور ترجمہ بیان فرماتے۔

شاہ صاحب نے بھی تدبر کے ساتھ تلاوت قرآن کو سنت لازمہ قرار دے دیا، فتح الرحمٰن، الفوز الکبیر اور فتح الخبیر کی تصنیف اسی رجحان کا نتیجہ ہے۔

(2)

دوسری چیز جس پر ولی اللّٰہی دعوت کا مدار ہے، وہ ہے احادیث صحیحہ پر غور وفکر کر کے تحقیق کے افق پر پہنچنا اور فقہائے عظام کے اقوال میں سے اس قول کو اختیار کرنا جو کہ صریح اور معروف حدیث کے موافق ہو۔ اس امر میں بھی شاہ صاحب کو اپنے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم سے تربیت حاصل ہوگئی کیوں کہ شاہ عبدالرحیم صاحب اجمالی طور پر اس ملکہ کے مالک تھے۔ اس سلسلہ میں شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں:

> ''مخفی نماند کہ حضرت ایشاں در اکثر امور موافق مذہب حنفی عمل می کردند الا بعض چیز ہا کہ بہ حسب حدیث یا وجدان بمذہب دیگر ترجیح می یافتند ازاں جملہ آنست کہ در اقتدا سورہ فاتحہ می خواندند و در جنازہ نیز۔''[15]

> مخفی نہ رہے کہ حضرت (والد بزرگوار) اکثر امور میں حنفی مذہب کے موافق عمل فرماتے تھے مگر کبھی

ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ حدیث یا وجدان کی بنا پر دوسرے مذہب کے مسئلہ کو ترجیح دیتے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اقتدا میں بھی اور جنازہ دونوں میں سورۃ فاتحہ پڑھتے تھے۔

گو حضرت شاہ عبدالرحیم سلوک اور طریقت میں حضرت امام ربانی کے پیروکار اور نقش بندی طریقت کے شیوخ میں سے ہیں، لیکن کہیں کہیں اختلاف رائے بھی رکھتے ہیں اور جہاں تک حدیث اور فقہی تحقیق کا تعلق ہے اس میں آپ کا مسلک امام ربانی سے منفرد معلوم ہوتا ہے۔ یہ شاہ عبدالرحیم کی تربیت کا ہی اثر ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب کے ہاں نہ صرف ان فروعی مسائل میں بلکہ سلوک اور تصوف کی تحقیقات میں بھی جمود نہیں پایا جاتا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بطور لطیفہ امام ربانی مجدد الف ثانی کے پوتے شیخ عبدالاحد ابن شیخ محمد سعید سرہندی (وفات 1127ھ) اور شاہ عبدالرحیم کے درمیان بعض فقہی مسائل میں جو تبادلہ خیال ہوا اس کو یہاں ذکر کیا جائے۔

شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ ایک دن اس مسئلہ (قرأت فاتحہ حلف الامام) میں شیخ عبدالاحد نے میرے والد بزرگوار سے بحث کی اور اپنے بعض اسلاف سے (تائید میں) یہ نقل کیا کہ اس کو اس طرح سمجھنا چاہئے کہ ایک جماعت بادشاہ کے حضور میں اپنی سرگزشت سنانے کے لئے کھڑی ہے، یہاں ادب کا تقاضا یہ ہے کہ ہر ایک الگ الگ اپنی طرف سے کچھ نہ کہے بلکہ سب مل کر کسی ایک کو اسی خدمت کے لئے مقرر کریں۔ یہ سن کر حضرت والد بزرگوار نے فرمایا کہ اس مسئلہ کو مذکورہ صورت میں قیاس کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ نماز کا مقصد ہے دعا اور خضوع کے ذریعہ اللہ پاک سے مناجات اور سرگوشی کرنا اور نفس کو سنوارنا، جس پر یہ حدیث ''لا صلوۃ لمن لم یقراء بفاتحہ الکتاب'' دلالت کرتی ہے یعنی جس نے نماز میں سورت فاتحہ کو نہیں پڑھا اس کی نماز نہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ سمیع ہے۔ اگر دنیا کے سب لوگ مل کر ایک میدان میں کھڑے ہو جائیں اور ہر ایک اپنی اپنی بولی میں کچھ کہے تو ایک کی مناجات کو سننا دوسرے کی مناجات میں خلل نہیں ڈالتا۔[16] دوسری جگہ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

> ''بعد از وفات حضرت ایشاں دوازدہ سال کم وبیش بدرس کتب دینیہ وعقلیہ مواظبت نمود و در ہر علمی خوض واقع شد و توجہ بر قبر مبارک پیش گرفت و در آں ایام فتح توحید و کشادراہ جذب و جانبی عظیم از سلوک میسر آمد، وعلوم وجدانیہ فوج فوج نازل شدند، و بعد ملاحظہ کتب مذاہب اربعہ، واصول فقہ ایشاں واحادیثی کہ متمسک ایشاں اس قرارداد خاطر بمدد نور غیبی روش فقہا محدثین افتاد۔''[17]
>
> حضرت (والد بزرگوار) کی وفات کے بعد بارہ سال کم وبیش کتب دینی وعقلی کے درس پر مواظبت کرتا رہا اور ہر ایک علم میں غور وخوض واقع ہوا آنجناب کی طرف سے روحانی توجہ بھی حاصل ہوئی اور ان ایام میں توحید کا دروازہ کھل گیا اور جذب کی راہ بھی وا ہوئی اور سلوک کا ایک بڑا حصہ بھی ہاتھ آیا۔ علوم وجدانیہ فوج در فوج نازل ہوئے۔ مذاہب اربعہ کی کتب اور ان کے اصول فقہ کے مطالعہ اور ان کے احادیث کے دیکھنے کے بعد جو ان کی دلیل ہیں نور غیبی کی مدد سے فقہا محدثین کی روش (پر چلنے) کا خیال پیدا ہوا۔

یہاں نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کے فقہی رجحانات کے بارے میں مذکورہ عبارت سے یا

آپ کی دوسری تالیفات پر سطحی نظر رکھنے کی وجہ سے جو غلطی ہوئی ہے اس کا مختصر طور پر ازالہ کیا جائے۔

میرے ایک بزرگ دوست کا ایک مقالہ بعنوان ''شاہ ولی اللہ کے فقہی رجحانات المسوّیٰ اور المصفّٰی کی روشنی میں'' الرحیم ماہ ذوالحجہ 1384ھ اور ماہ محرم 1385ھ میں قسط وار شائع ہوا ہے۔ فاضل موصوف نے بلاشبہ اپنی بساط فہم کے موافق مقالہ لکھنے میں محنت سے کام لیا ہے لیکن جوش خطابت میں آپ کے قلم سے کچھ ایسی باتیں سرزد ہوئی ہیں جن سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ ہم ان میں سے چند باتوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

فاضل مقالہ نگار شروع میں ایک تمہید کے بعد رقم طراز ہیں:

شاہ صاحب کے فقہی مسلک کے بارے میں علماء کی رائیں مختلف ہیں۔

(1) بعض لوگ انہیں مجتہد مانتے ہیں اور مجتہد خود صاحب مسلک ہوتا ہے کسی دوسرے امام کے مسلک کا پابند نہیں ہوتا۔

(2) بعض انہیں مقلد مانتے ہیں۔

(3) بعض لوگ مقلد مانتے یا بالفاظ دیگر اہل حدیث وغیرہ

فاضل موصوف بعض لوگوں کی طرف سے یہ رائے تو لکھ گئے ہیں کہ وہ شاہ صاحب کو مجتہد مانتے ہیں اور مجتہد کسی دوسرے امام کے مسلک کا پابند نہیں ہوتا لیکن اس کی تصریح نہ فرمائی کہ یہ کون لوگ ہیں جو شاہ صاحب کو مجتہد مانتے ہیں اور پھر مجتہد سے ان کی کیا مراد ہے؟ کیوں کہ مجتہد کے کئی اقسام ہیں۔ مجتہد مستقل، مجتہد منتسب، مجتہد فی المذہب اور مجتہد الفتیا' حضرۃ استاذ علامہ عبیداللہ سندھی شاہ صاحب کو مجدد اور مجتہد فی المذہب قرار دیتے ہیں اور آپ نے بکثرت اپنے مقالوں اور تالیفات میں اس کی تصریح فرمائی ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ شاہ صاحب کسی دوسرے امام کے مسلک کے پابند نہیں۔

حضرت الاستاذ علامہ عبیداللہ سندھی ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

و نعرف الامام ولی اللّٰه جدد الفقة الحنفی باشارة الهامیة من النبی صرح بذلك فی کتابه فیوض الحرمین. [18]

امام ولی اللہ کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک الہامی اشارہ کی بنا پر فقہ حنفی ہیں تجدید فرمائی۔ موصوف نے اس کی ''فیوض الحرمین'' میں تصریح فرمائی ہے۔

آگے چل کر فاضل مقالہ نگار لکھتے ہیں:

شاہ صاحب کے فقہی مسلک کے بارے میں جو اختلاف رائے پایا جاتا ہے اس کے متعدد اسباب ہیں۔

(1) تناقض (الف) شاہ صاحب نے خود اپنے بارے میں ایسی تصریحات کی ہیں جو بظاہر باہم متناقض ہیں۔ مثلاً ایک جگہ تصریح فرماتے ہیں:

(ترجمہ) مذاہب اربعہ اور ان کی اصول فقہ کی کتابوں اور ران احادیث کو دیکھ کر جن سے ان مذاہب پر

استدلال کیا گیا ہے' غیبی نور کی مدد سے میرا دل فقہائے محدثین کی روشنی پر مطمئن ہوا۔

محترم مقالہ نگار اس عبارت سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس سے غیر مقلد حضرات یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ شاہ صاحب انہی کی طرح غیر مقلد اور اہلحدیث تھے۔

ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کی مذکورہ عبارت میں غیر مقلد ہونے کی صراحت تو درکنار، اس کے بارے میں کوئی اشارہ بھی موجود نہیں ہے لیکن پھر بھی فاضل مقالہ نگار نے اس سے مذکورہ نتیجہ نکال کر اس کو ''فیوض الحرمین'' کی عبارت کے متناقض قرار دیا ہے۔ اس عبارت میں تو صراحت سے ''روش فقہائے محدثین'' موجود ہے جس کا یہ مطلب ہے کہ اہل مذہب میں سے ایک گروہ تو وہ ہے جن کا تحقیق حدیث سے کوئی سروکار نہیں ہوتا اور وہ صرف فقہی روایات کو دیکھتے ہیں۔ چاہے وہ احادیث صحیحہ کے مخالف کیوں نہ ہو اور دوسرے محدثین جیسے ہمارے احناف میں امام طحاوی' امام ابوبکر الجصاص' رازی' ابن الہمام صاحب فتح القدیر' ابن امیر الحاج' قاسم بن قطلو بغا وغیرہ ہیں۔ یہ حضرات کئی مسائل میں فقہی روایات سے اختلاف بھی رکھتے ہیں اور صحیح حدیث کی طرف جھک جاتے ہیں لیکن کسی نے بھی ان کو غیر مقلد نہیں کہا۔

متاخرین میں سے مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی کی تحقیقات کو دیکھا جائے کہ موصوف ائمہ مذاہب میں سے کئی مختلف مسائل میں دلائل کی قوت اور احادیث صحیحہ کو دیکھ کر حنفی علما کی فقہی تصریحات کی مخالفت کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ وہ اپنے آپ کو حنفی بھی کہتے ہیں۔ اسی طرح وصیت نامہ کی جس عبارت کو وہ فاضل مقالہ نگار نے ''فیوض الحرمین'' کی حنفی ہونے کی تصریح کے متناقض قرار دیا ہے وہ بھی فاضل موصوف کی بنا پر الفاسد علی الفاسد کا نتیجہ ہے ورنہ درحقیقت کوئی تناقض نہیں ہے۔ اس میں بھی بصراعت فقہائے محدثین کی پیروی کی تلقین موجود ہے اور یہی شاہ صاحب کے ہاں شریعت کا جادہ قدیمہ ہے۔

محترم مقالہ نگار اگر ''وصیت نامہ'' اور ''الجزاء اللطیف'' کی عبارتوں کو ''فیوض الحرمین'' کی مفصل عبارت کی روشنی میں مطالعہ فرماتے تو ہرگز تناقض کی الجھن میں نہ پھنستے۔ طوالت کے خوف سے ''فیوض الحرمین'' کی اصل عبارت کو چھوڑ کر مقالہ نگار نے جو ترجمہ پیش کیا ہے میں اس کو یہاں دہرانا مناسب سمجھتا ہوں۔

ترجمہ: رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بتایا کہ حنفی مذہب میں ایک پسندیدہ طریقہ ہے اور یہ طریقہ اس معروف سنت کے بہت موافق ہے جس کی جمع و تنقیح بخاری اور اصحاب بخاری کے زمانہ میں ہوئی ہے وہ طریقہ ہے کہ آئمہ ثلاثہ (امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد) کے اقوال میں سے اس قول کو لیا جائے جو اس مسئلہ میں سنت کے سب سے زیادہ قریب ہو۔ اس کے بعد ان حنفی فقہاء کے اختیارات کا تتبع کیا جائے جو علمائے حدیث بھی ہوئے ہیں اس لئے کہ بہت سی باتیں ایسی ہیں کہ ائمہ ثلاثہ نے اصول میں ان سے سکوت برتا اور ان کی نفی بھی نہیں کی اور احادیث نے انہیں ثابت کر دیا۔ ایسی صورت میں ان کے اثبات کے سوا کوئی چارہ نہیں اور یہ سب مذہب حنفی ہے۔

فلسفہ ولی اللہی کے عظیم شارح علامہ عبیداللہ سندھی ''فیوض الحرمین'' کی مذکورہ عبارت کے متعلق فرماتے ہیں کہ میں نے مکہ مکرمہ کے بعض اہل علم کے پاس شاہ صاحب کی ایک تالیف ''المشاہد'' کا خطی نسخہ دیکھا اور یہ ''فیوض الحرمین'' کتاب کی اصل ہے۔ اس میں ''کانوا من علماء الحدیث'' کے بعد کا ''کالحافظ الطحاوی'' زائد کلمہ موجود ہے۔[19] اس اضافہ

سے عبارت کی اور وضاحت ہو جاتی ہے۔ فاضل مقالہ نگار کی عبارتوں کی اگر اسی طرح ہم نشان دہی کرتے جائیں گے تو اصل موضوع سے ہمیں دور جانا پڑے گا۔ اس لئے آخر میں وقت کے ایک فاضل اور جید عالم مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کی ایک رائے نقل کر کے اس موضوع کی طرف رجوع کریں گے۔

''اگر قدما میں سے قاضی بکار اور امام طحاوی اور ابوبکر خصاف اور ابوبکر جصاص' قاضی ابوزید دبوسی شمس الائمہ سرخسی وغیرہ وغیرہ اور متاخرین میں سے امیر کاتب اتقانی' علاؤالدین ماردینی' ابن الہمام' ابن امیر الحاج قاسم بن قطلو بغا وغیرہ مقلد ابوحنیفہ ہو سکتے ہیں حالانکہ یہ حضرات بھی اپنے خصوصی مختارات رکھتے ہیں تو پھر حضرت شاہ صاحب کا انہی کی طرح حنفی ہونا کیوں مستبعد ہے۔ نیز جبکہ قاضی اسماعیل' حافظ ابن عبدالبر' قاضی ابوبکر بن عربی' حافظ اصیلی' ابن رشد کبیر مالکی ہو سکتے ہیں اور علیٰ ہذا جبکہ ابن جوزی' ابن قدامۃ' ابن تیمیہ' ابن قیم وغیرہ حنبلی ہو سکتے ہیں تو پھر اسی درجہ میں حضرت شاہ صاحب کو مقلد مذہب حنفی ماننے میں کیا اشکال ہے۔ اصولاً کسی امام صاحب کا متبع چند جزئی مسائل میں اگر اپنے امام کے خلاف رائے قائم کرے تو تو علما امت میں اس کو اتباع وتقلید کے منافی نہیں سمجھا جاتا۔ قریباً سب مذاہب کے علما میں کثرت سے خاص خاص مسائل میں بہت اختیارات اپنے آئمہ کے خلاف ملتے ہیں۔''(20)

(3) ولی اللہی دعوت کے مدار میں سے تیسری چیز ہے، تصوف اور شریعت کو باہم جمع کرنا اور یہ ملکہ بھی انہیں اپنے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم کی برکت اور صحبت سے حاصل ہوا۔ شاہ ولی اللہ صاحب ''القول الجمیل'' میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

فالعبد الضعيف ولی الله عفا الله عنه والحقه بسلفه الصالحين صحب اباه الشيخ الاجل عبدالرحيم رضى الله عنه وارضاه دهرا طويلا' و تعلم منه العلوم الظاهرة و تاب عليه بآداب الطريقة' و راء عنه الكرامات وساله عن المشكلات' وسمع منه كثيرا من فوائد الطريقة والحقيقة' و ما جرى عليه و على شيوخه من الواقعات والاحوال والكرامات.

بندہ ضعیف ولی اللہ (اللہ اس کو معاف فرمائے اور اس کو اس کے سلف صالحین سے ملحق فرمائے) ایک طویل مدت تک اپنے والد بزرگ شیخ عبدالرحیم کی صحبت میں رہا اور ان سے علوم ظاہریہ کی تعلیم حاصل کی اور طریقت کے آداب سیکھے اور ان سے خوارق عادات چیزیں دیکھیں اور (تصوف کے) مشکل مسائل کے متعلق سوال کیا اور ان سے طریقت اور حقیقت کے بہت سے فوائد کو سنا اور وہ واقعات' حالات اور کرامات بھی سنیں جو آپ پر اور آپ کے شیوخ پر جاری ہوئیں۔

شاہ عبدالرحیم صاحب کے طریقت کے اصول کیا تھے' اس کے متعلق موصوف اسی طرح وضاحت فرماتے ہیں:

''اصول پنجگانہ کہ این حقیر را عنایت فرمودہ اند درا دائے آن صرف ہمت باید نمود دوام الذکر

والتقوی علی کل حال، وایصال النفع للخلق من غیر تفرقہ وعدم تفصیل نفسہ علی احد من خلق اللہ، والتواضع الامر اللہ وخلق اللہ۔"(21)

اس حقیر (شاہ عبدالرحیم) کو (طریقت) کے پانچ اصول عطا ہوئے ہیں۔ ان کی ادائی میں ہمت صرف کرنا چاہیے۔ ہر حال میں ذکر اور تقویٰ پر دوام کرنا، بلا کسی فریق کے خلق خدا کو نفع پہنچانا، اپنے آپ کو اللہ کی مخلوق میں سے کسی پر بھی فضیلت نہ دینا۔ اللہ کے حکم اور اللہ کی مخلوق سے تواضع کرنا۔

(4) چوتھی چیز ہے علوم شرعی اور حکمت عملی کے جملہ انواع: تہذیب اخلاق، تدبیر منزل، سیاست مدنیہ اور سیاست مدن کے درمیان موافقت پیدا کرنا۔

شاہ صاحب "بوارق الولایۃ" رقم طراز ہیں:

"حضرت ایشاں این فقیر را در مجلس صحبت حکمت عملی و آداب معاملہ بسیاری آموختند۔"

حضرت والد بزرگوار اس فقیر (ولی اللہ) کو اپنی صحبت کی مجلس میں حکمت عملی اور معاملہ کے آداب سکھاتے تھے۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں:(22)

"حکمت عملی صلاح ایں دورہ در آنست بوسعتی تمام افادہ نمودند، وتوفیق تشیید آں بکتاب وسنت وآثار صحابہ دادند۔"

حکمت عملی جس پر دور حاضر کی اصلاح موقوف ہے اس کا وسیع طور پر افادہ فرمایا اور کتاب، سنت اور آثار صحابہ سے اس کی تقویت کی توفیق عطا فرمائی۔

(4) المقدمۃ فی قوانین الترجمۃ فارسی

ایک مقدمہ تو وہ ہے جس کا ذکر ترجمہ "فتح الرحمٰن" کے سلسلہ میں گزر چکا۔ وہ پاکستان میں پہلی بار کارخانہ تجارت کتب کراچی والوں نے ایک خطی نسخہ سے جو 1210ھ کا لکھا ہوا ہے، نقل کرا کر طبع کیا۔ اس سے قبل یہ مقدمہ 1285ھ میں مطبع ہاشمی میرٹھ میں ترجمہ فتح الرحمٰن کے ساتھ چار صفحات میں شائع ہوا تھا۔ یہ قرآن مجید مترجم بڑی تقطیع کا تھا اور دو ترجموں ترجمہ فارسی فتح الرحمٰن اور ترجمہ اردو شاہ عبدالقادر پر مشتمل تھا۔ حاشیہ پر فتح الرحمٰن اور موضح القرآن کے تفسیری حواشی بھی چڑھائے گئے تھے۔ اس کے ساتھ تفسیر ابن عباس عربی بھی مکمل حاشیہ پر دی گئی تھی۔ اس قرآن مجید کے آخر میں مولوی عبدالسمیع رام پوری کا بنایا ہوا یہ قطعہ تاریخ دیا گیا ہے۔

سال اتمام طبع او گفتم　　گشتہ مطبوع مصحف اطہر

85　　12

یہ مطبوعہ نسخہ بھی اس وقت نادر ہے۔ کہیں کہیں علمی لائبریریوں میں اس کے پارینہ نسخے مل جاتے ہیں۔ مجھے مجلس علمی ڈابھیل کراچی کی لائبریری میں ایک کہنہ نسخہ نظر آیا اور دوسرا ایسا ہی کہنہ بلکہ اس سے بھی پارینہ پروفیسر جلبانی صاحب سندھ یونیورسٹی کی ذاتی لائبریری میں موجود ہے۔

یہاں جس مقدمہ کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ الگ چیز ہے۔ مؤلف امام اس کے شروع میں حمد وصلوٰۃ کے بعد فرماتے ہیں:

ترجمہ: حمد وصلوٰۃ کے بعد اللہ کریم کی رحمت کا محتاج ولی اللہ بن عبدالرحیم کا کہنا ہے کہ ترجمہ قرآن کے اصول اور قواعد کے متعلق یہ ایک رسالہ ہے جس کا نام ''المقدمۃ فی قوانین الترجمۃ ہے۔'' یہ اس وقت تحریر میں آیا جب میں قرآن مجید کا ترجمہ لکھ رہا تھا۔

اس عبارت سے اگرچہ کسی خاص سن تالیف کا تعین نہیں ہوتا لیکن اتنا معلوم ہوتا ہے کہ 1042ھ اور 1051ھ کے درمیان کی تصنیف ہے۔

یہ مقدمہ فارسی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے اردو ترجمہ کے ساتھ ماہنامہ ''برہان'' دہلی میں دو قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سیوہاروی مرحوم کو کوئی صحیح نسخہ ہاتھ نہیں آیا تھا اس لئے اصل میں اغلاط کی وجہ سے اردو ترجمہ میں بھی کافی غلطیاں ہوگئی ہیں۔ اس فارسی مقدمہ کا سندھی ترجمہ صحت کے ساتھ شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے سہ ماہی مجلّہ ''الرحیم'' سندھی میں چھپ چکا ہے۔

یہاں عین مناسب ہوگا کہ تحقیق کرنے والوں کے لئے ترجمہ فتح الرحمٰن فارسی کے خطی اور مطبوعہ نسخوں کا اجمالی ذکر کیا جائے۔ فتح الرحمٰن فارسی کے خطی نسخے تو برصغیر کے علمی لائبریریوں میں کئی ہوں گے۔ یہاں ان نسخوں کا ذکر ہوگا جو یا تو میری نظر سے گزرے ہیں یا علمی فہارس سے معلوم ہوئے ہیں۔

مدرسۃ الاسلام لاڑکانہ سندھ کی لائبریری میں 1210ھ کا ایک خطی نسخہ موجود ہے جس میں قرآن مجید اور ترجمہ دونوں ساتھ لکھے ہوئے ہیں یعنی ایک ہی سطر میں قرآن مجید کی عبارت بھی آجاتی ہے اور ترجمہ بھی۔ اسی قسم کا ایک نسخہ میں نے مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کراچی کی علمی لائبریری میں بھی دیکھا تھا جس کا سن کتابت یاد نہیں رہا۔

اسی طرح ایک خطی نسخہ مکتبہ مشرقیہ دار العلوم پشاور میں بھی موجود ہے۔ فہرست کتب تفسیر موجودہ مکتبہ مشرقیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ مقدمہ بھی ہے۔ نام وکیفیت عمومیہ کے خانے کے تحت فاضل مرتب لکھتے ہیں:

فتح الرحمٰن (فارسی) نہایت عمدہ ترجمہ قرآن مجید ہے۔ جن خصوصیات کے التزام سے حضرت شاہ صاحب نے اس کو لکھا ہے اس کا ذکر انہوں نے دیباچے میں بالتفصیل کیا ہے۔ جا بجا تشریحی تعلیقات بھی لکھے ہیں۔ کیفیت خصوصیہ کے ماتحت رقم طراز ہیں:

قلمی خوشخط بدرجہ اوسط معہ دیباچہ وضمیمہ مشتمل بر خصوصیات ترجمہ (دیباچہ اور ضمیمہ نسخہ ہائے مطبوعہ میں نہیں پائے جاتے۔)

معہ رسالہ فوز الکبیر وفتح الخبیر (رسالہ اول الذکر) میں نہایت محققانہ انداز سے اصول تفسیر کا بیان ہے اور کوئی شخص جو تفسیروں کا مطالعہ کرنا چاہے اس کے پڑھنے سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ نہایت ہی مفید چیز ہے، دوسرا رسالہ غرائب القرآن کی تفسیر ہے۔[23]

نوٹ: اگر اس میں ''الفوز الکبیر'' فارسی کا کوئی صحیح قلمی نسخہ ہے تو یہ غنیمت باردہ ہوگی کیوں کہ اس ''الفوز الکبیر''

فارسی کے آج تک جتنے مطبوعہ نسخے ہیں وہ سب اغلاط سے پُر ہیں۔
''فتح الرحمٰن'' کے مطبوعہ نسخوں میں سب سے قدیم نسخہ تو مطبع ہاشمی والا ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا اور وہ 1285ھ کا مطبوعہ ہے۔

میرے ایک مخلص دوست مولوی سلطان محمود صاحب مدرس مدرسہ دارالرشاد پیر جھنڈہ نے ایک خط کے ذریعہ مجھے واقف فرمایا ہے کہ پیر جھنڈہ کی علمی لائبریری میں ''فتح الرحمٰن'' فارسی کے دو مطبوعہ نسخے موجود ہیں جن میں سے ایک کا کاتب محمد جواد بن ملا محمد موسیٰ کشمیری ہے اور اس کا سن طباعت 1310ھ اور دوسرا نسخہ 1348ھ کا شائع شدہ ہے۔ بفرمائش میاں محمد شریف وعبداللطیف تاجران کتب پشاور بازار قصہ خوانی باہتمام ملک دین محمد مالک' دین محمدی پریس لاہور۔
مطبع محمدی بمبئی والوں نے 1326ھ میں حمائل شریف کی صورت میں بھی ''فتح الرحمٰن'' کے ترجمہ وحواشی کے ساتھ قرآن مجید چھاپا تھا۔ علامہ استاذ عبیداللہ سندھی درس قرآن کے وقت اسی حمائل کو سامنے رکھتے تھے۔
اس کے بعد مطبع کریمی بمبئی والوں نے مطبع محمدی والوں کی حمائل شریف کی طرح 1352ھ میں ''فتح الرحمٰن'' فارسی کی اشاعت فرمائی۔ دونوں حمائلوں کے صفحات 861 یکساں ہیں۔ البتہ ان دونوں کے حواشی میں کہیں کہیں اختلافات پایا جاتا ہے۔
اسی طرح حال ہی میں اس حمائل کی بعینہٖ نقل اور چربہ مقبول عام پریس لاہور سے حاجی محمد عبدالرزاق افضل مالک تاجران کتب قصہ خوانی بازار پشاور نے چھپوا کر شائع کیا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے بیس بائیس سال قبل قرآن مجید معہ ترجمہ فارسی میں ''فتح الرحمٰن'' کا ایک نسخہ تھا جو کہ حکومت افغانستان کی طرف سے ایک تاجپوشی کے موقع پر شائع ہوا تھا جو نہایت خوشخط اور عمدہ کاغذ پر طبع ہوا تھا۔ اس وقت نہ تو میرے پاس وہ نسخہ موجود ہے اور نہ کوئی ایسی فہرست ہی ہے جس سے اس کی تفصیل عرض کرسکوں۔

(3)

(5) تاویل الاحادیث

سن تالیف قبل از 1151ھ اس رسالے کے سن تالیف کے متعلق اگرچہ مؤلف امام نے بصراحت کچھ نہیں لکھا ''الفوز الکبیر فی اصول التفسیر'' میں اس کا اور قرآن مجید کے فارسی ترجمے فتح الرحمٰن کا ذکر ہے۔ ترجمہ ''فتح الرحمٰن'' 1151ھ میں تکمیل پذیر ہوا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ
مؤلف امام نے ''فتح الرحمٰن'' کی تالیف کے اثنا ہی میں ''تاویل'' کو تالیف فرمایا ہے گویا قرآن مجید کے ترجمے کے وقت قرآنی مطالب پر غور وخوض کرتے ہوئے قصص الانبیا کے سلسلے میں آپ پر جن علوم اور اسرار کا انکشاف ہوتا ان کو آپ قلم بند فرماتے گئے۔
''الفوز الکبیر'' کی عبارت ملاحظہ ہو:

(ترجمہ) ''علم تفسیر کے ان وہبی علوم میں سے جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا' انبیا علیہم السلام کے قصوں کی تاویل بھی ہے۔ فقیر نے اس فن میں ایک رسالہ ''تاویل الاحادیث'' کے نام سے تالیف کیا ہے۔ الخ

''تاویل الاحادیث'' کس علمی پایہ کا رسالہ ہے، اس کا اندازہ آپ کو ولی اللہی فلسفے کے عظیم شارح علامہ استاذ عبید اللہ سندھی کی مندرجہ ذیل تحریر سے ہوگا۔ استاذ مرحوم مرماتے ہیں۔ مذکورہ سابق مقصد قرآنی کو ہم شاہ ولی اللہی کی حکمت کی اساس مانتے ہیں۔ جب کبھی ہم فلسفہ ولی اللہی کہیں گے تو اس سے یہی مراد ہوگا۔ اس فلسفہ کی تاریخ ارتقائی دنیا کی تکوینی ترقی کے ساتھ ساتھ ''تاویل الاحادیث'' میں ملے گی۔ آدم علیہ السلام کے زمانے میں جو شرائع مقرر تھے وہ اسی فلسفے کے ماتحت تھے اور اس زمانے کی ضرورتوں کو پورا کرتے تھے۔ جس قدر انسانیت ترقی کرتی گئی اس قدر اس فلسفہ کی تفریعات میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ابراہیم علیہ السلام سے پہلا دور (یعنی حقیقت سے پیشتر کا دور) صابئین کا ہے۔

''تاویل الاحادیث'' میں اس دور کی (جس میں آدم' ادریس ونوح تا قبل ابراہیم علیہ السلام داخل ہیں۔) پوری تشریح ملے گی۔ ادریس علیہ السلام ہی طبعیات' ریاضیات' الٰہیات کے بانی سمجھے جاتے تھے' حکمت کے ان اقسام کا مرکز بدلتا رہا۔ کبھی ہند' کبھی ایران' کبھی یونان۔ اس کے بعد ابراہیمی دور آئے گا۔ حنفاء اسی فلسفے کی شکل کو دوسرے رنگ میں بدل دیں گے۔ اس تبدیلی کے اسباب کیا تھے؟ اور تبدیلی کس شکل میں ہوئی؟ اسکی تفصیل ''تاویل الاحادیث'' میں ملے گی۔ ''تاویل الاحادیث'' میں ابراہیم علیہ السلام سے لے کر سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء کی زندگی کو تدریجی ترقی کے اصول سے موجہ بنایا گیا ہے۔ [24] شیخ اکبر محی الدین بن عربی (متوفی 638ھ) نے اس موضوع پر اگرچہ ''فصوص الحکم'' جیسی مشہور زمانہ تالیف چھوڑی ہے لیکن اس کو قرآن مجید کے قصص انبیاء سے کم تعلق ہے کیونکہ شیخ اکبر کا اصل مقصد اپنی اس تالیف سے قصص قرآنی کی تاویل اور وضاحت نہ تھی۔ وہ تو خصوص کے ذریعہ اپنے مذہب وحدت وجودی کی شاعت اور تائید چاہتے تھے اور اس میں اتنا انہاک رکھتے تھے کہ بقول ڈاکٹر عفیفی ابن عربی کا آیات کے تاویل کا طریقہ کبھی کبھی کج روی سے خالی نہیں ہوتا۔ خاص طور پر جب وہ لفظی حیلوں سے ان معانی کی طرف جانا چاہتے ہیں جن کا وہ خود ارادہ کرتے ہیں۔

لیکن رسالہ ''تاویل الاحادیث'' آپ کو اس تکلف سے مبرا نظر آئے گا۔ شیخ اکبر محی الدین بن عربی نے ''فصوص الحکم'' میں قصص قرآن کے ضمن میں اپنے مذہب وحدت وجودی کو انتہائی شکل میں پیش کیا ہے اور اس کے لئے جن مصادر سے بھی ان کو مدد لینا پڑی ان سے مدد لے کر انہوں نے اپنی مصطلحات صوفیہ وضع کی ہیں اور وہ مصادر یہ ہیں۔ قرآن' حدیث' علم کلام' فلسفہ مشائیہ' فلسفہ نو فلاطونیہ عنوصیہ مسیحیہ' رواقیہ اور فلسفے فیلون یہودی۔ اسی طرح انہوں نے اسما عیلیہ باطنیہ' قرامطہ، اخوان الصفا اور قدیم صوفیائے اسلام کی مصطلحات سے بھی فائدہ حاصل کیا ہے۔ لیکن شیخ اکبر لکیر کے فقیر نہ تھے کہ وہ ان مصطلحات کو جن معنوں میں کہ وہ استعمال ہوئی تھیں، انہی معنوں میں ویسے ہی مان لیتے۔ انہوں نے ان مصطلحات کو ایک خاص رنگ میں ڈھالا اور ہر ایک اصطلاح کو ایسے معنی پہنائے جو ان کے مذہب وحدۃ وجود سے اتفاق رکھتے ہوں۔ اس طرح انہوں نے تصوف کے ادب کو مصطلحات اور الفاظ کا ایک نیا ذخیرہ دیا۔ ''فصوص الحکم'' نہ صرف ان مصطلحات پر حاوی ہے بلکہ وحدت وجود اور اس سے جو مسائل مستنبط ہوتے ہیں نیز ان کے استنباط میں انہوں نے جو

مخصوص کلامی مسلک اختیار کیا ان سب پر بھی مشتمل ہے۔ یہ بات ان کی کسی دوسری تالیف میں نہیں پائی جاتی۔ (25)

یقیناً شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی اس رسالہ میں قدیم مصطلحات سے استفادہ کیا ہے اور ان کو نئے معنی پہنائے ہیں اور کہیں اپنی طرف سے بھی مقصد کی توضیح کے لئے مصطلحات سے استفادہ کیا ہے اور ان کو نئے معنی پہنائے ہیں اور کہیں اپنی طرف سے بھی مقصد کی توضیح کے لئے مصطلحات کا اختراع کیا ہے لیکن اس رسالے میں وہ تعقید نہیں پائی جاتی جو ''فصوص الحکم'' میں ہے۔ ''حیات ولی'' اور ''نزہتہ الخواطر'' کے مولفین کی اس رسالہ کے متعلق جو رائے ہے وہ یہاں پیش کی جاتی ہے۔

''حیات ولی'' کے مؤلف فرماتے ہیں۔ اس کتاب (تاویل الاحادیث) میں جناب شاہ صاحب نے حضرت آدم علیہ السلام کے قصص بیان کئے ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے اور اس کے ساتھ ہی ان حوادثات کے وجوہ بطریق رموز بیان کئے ہیں جو انہیں پیش آئے۔ بالغ نظریں اس کتاب کو دیکھ کر شاہ صاحب کے تبحر کا پورا پورا اندازہ کر سکتی ہیں۔ (26)

''نزہتہ الخواطر'' کے مؤلف فرماتے ہیں:

"تاویل الاحادیث" رسالة نفسية له بالعربيه فی توجيه قصص الانبياء علهيم السلام و بيان مباديها التی نشأت من استعداد النجا و قابلية قومه ومن التدبير الذی دبرته الحكمة الالهية فی زمانه

''تاویل الاحادیث'' تالیف شاہ ولی اللہ عربی میں ایک پاکیزہ رسالہ ہے جس کا موضوع ہے انبیا علیہم السلام کے قصے اور ان کے مبادی واصول جن کا مصدر و منشا نبی کی استعداد اور اس کی قوم کی قابلیت اور وہ تدبیر ہے جس کا حکمت الٰہیہ نے ان کے دور میں اہتمام فرمایا۔

یہ کتاب پہلی بار سید احمد ولی اللّٰہی نبیرہ شاہ رفیع الدین صاحب محدث دہلوی کی کوشش سے مطبع احمدی دہلی میں اردو ترجمہ کے ساتھ چھپی تھی۔ ایک کالم میں عربی متن اور دوسرے کالم میں اردو ترجمہ تھا۔ یہ ترجمہ لفظی ہے جس سے اس علمی کتاب کی پوری پوری ترجمانی نہیں ہوسکتی۔ یہ مطبوعہ نسخہ بھی اب ناپید ہے اور کہیں کہیں علمی کتب خانوں میں پایا جاتا ہے۔

شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد کی طرف سے حال ہی میں یہ علمی کتاب خوبصورت عربی مصری ٹائپ میں تحقیقی حواشی اور مبسوط مقدمہ کے ساتھ چھپی ہے۔ حسن اتفاق سے اس کا ایک قدیم مخطوطہ بھی ہاتھ آ گیا تھا۔ اس کے کاتب شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کے ایک شاگرد حافظ محمد نوشہ صاحب شروع صفحہ کے حاشیہ پر کاتب کی طرف سے یہ عبارت نوشتہ ہے۔

''نسخہ ہذا مسمی بتاویل الاحادیث تمام شد بتاریخ 3 ماہ ذی الحجہ یوم الجمعۃ بید اضعف العباد حافظ محمد نوشتہ عفی عنہ 1252ھ قدسی۔''

مخطوطے پر حافظ محمد نوشہ صاحب کی مہر بھی ثبت ہے جس پر محمد نوشہ 12/27 کنندہ ہے۔ یہ نایاب قلمی نسخہ حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب پوری ملتانی حال خطیب جامع مسجد بیکانیری دروازہ بہاولپور کے ذاتی کتب خانہ کا مملوکہ ہے اور مولانا محمد عبداللہ صاحب نے عاریۃً ہمیں عنایت فرمایا تھا۔ مخطوطہ نستعلیق میں ہے اور خط عمدہ ہے۔

''تاویل الاحادیث'' کا یہ قلمی نسخہ مولانا محمد عبداللہ صاحب عمر پوری کو مولوی عبدالعزیز صاحب فرزندار جمند مولوی فیض احمد صاحب غوری تحصیلداری ساکن بہاولپور سے ملا۔ مولوی فیض احمد صاحب، صاحب نسخہ کے خلف رشید ہیں۔

صاحب نسخہ حضرت مولانا الحاج حافظ عبدالمجید محمد نوشہ (خلف الصدق مولانا نور نبی غوری ٹونکی) حضرت مولانا بہادر علی ٹونکی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ مولانا بہادر علی صاحب کا نقش خاتم ''ہست زیاران نبی بہادر علی'' ہے اور وہ حضرت سراج الہند شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگرد رشید ہیں۔

مولانا عبدالمجید بن نور نبی غوری ٹونکی بہاولپوری اپنے فضل و کمال کی بدولت نواب ٹونک کے داماد بنے۔ اسی بنا پر محمد نوشہ کا لقب ملا۔ مولانا عبدالمجید کافی عرصہ حرمین شریفین کی اقامت سے فیض یاب ہوئے۔ اس مدت میں وہ حرمین شریفین کے علماء کرام کے حلقہ درس میں شامل ہو کر ان کے فیوضیات علمی سے بہرہ ور ہوتے رہے۔

''تاویل الاحادیث'' کا یہ قلمی نسخہ مولانا محمد نوشہ کا تحریر شدہ ہے۔ اگرچہ مولانا محمد نوشہ کی دوسری تحریر شدہ کتابیں اور مسودات اس طرح صاف خط میں نہیں۔ تاہم اس کا طرز تحریر ان سے مختلف نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی کتاب کے لئے اعلیٰ کاغذ کی بہم رسانی اور صفائی خط کا اہتمام کیا گیا ہے اسی وجہ سے ان کی دوسری تمام تحریرات کے برعکس اس کتاب کے اول صفحہ کی پیشانی پر مہر ثبت ہے۔ صاحب نسخہ کے متعلق جملہ معلومات ہمیں حضرت مولانا عبداللہ صاحب عمر پوری خطیب جامع مسجد بیکانیری دروازہ بہاولپور سے حاصل ہوئیں۔ ''تاویل الاحادیث'' کے مطبوعہ اور مخطوطہ نسخوں میں کہیں کہیں تو کافی فرق پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر آخری تاویل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے حوادث کا ذکر کرتے ہوئے مؤلف امام جب انشقاق قمر کا ذکر فرماتے ہیں تو کتاب کے مطبوعہ نسخے میں پوری ایک سطر غائب ہے جو یہ ہے ''**قال بعض من له معرفته بعلم الاثر والحکمة الطبیعة کان.**'' اس کے بعد کی عبارت کا یہ مطلب ہے کہ چاند کے شق ہونے کا واقعہ قلیلۃ الوقوع ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے قرب قیامت کے لئے علامت بنایا ہے وغیرہ۔ اس پر علمائے فرنگی محل کی طرف سے اعتراضات کیے گئے ہیں اور جوابی رسالے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ علامہ کوثری نے بھی اس پر اعتراض کیا ہے۔ اس قسم کی عبارت ''تفہیمات'' ج 2 میں بھی موجود ہے لیکن ''تاویل الاحادیث'' کے مخطوطہ نسخے میں مذکور سطر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحقیق شاہ صاحب کی اپنی نہیں ہے بلکہ کسی دوسرے اہل علم کی تحقیق ہے جو کہ منقول اور معقول دونوں میں معرفت اور مہارت رکھتے ہیں۔

مخطوطہ اور مطبوعہ نسخوں میں اس قسم کے کئی اختلافات ہیں جن سب کو اکیڈمی کے مطبوعہ نسخہ ''تاویل الاحادیث'' کے حواشی میں تحریر کر دیا گیا ہے۔ گویا اکیڈمی کا شائع کردہ یہ نسخہ کتاب کے مطبوعہ اور مخطوطہ نسخوں کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ یہ نہایت کارآمد ثابت ہوگا۔

کتب حدیث و علوم حدیث

(6) مصفّٰی فی احادیث المؤطا۔ فارسی

شاہ صاحب نے موطا امام مالک کی یہ نادر روزگار فارسی شرح کب تالیف فرمائی۔ اس کا واضح جواب بھی ہمیں

مصنف علام کی کسی تحریر سے بصراحت نہیں ملتا۔ البتہ اس شرح کے مقدمہ کی ایک عبارت سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ حرمین سے واپسی کے بعد آپ نے یہ شرح لکھنا شروع فرمائی۔

''مصفٰی'' کے مقدمہ میں شاہ صاحب ایک جگہ امام مالکؒ اور ان کی کتاب موطا کے فضائل بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

بالجملہ ملاحظہ ایں امور شوق روایۃ موطا اولاً و شرح آں ثانیاً پیدا کرد۔

خلاصہ یہ کہ ان فضائل کو دیکھ کر یہ شوق پیدا ہوا کہ پہلے موطا کی روایت حاصل کی جائے اور پھر اس کی شرح لکھی جائے۔

مقدمہ کے آخر میں آپ نے حرمین کے ان مختلف اساتذہ حدیث کے نام دیئے ہیں جن سے آپ نے موطا کی روایت کو حاصل کیا اور آخر میں موطا کی روایت کی ایک اسناد پر اکتفا کر کے اس کا تفصیل سے ذکر فرمایا ہے کیونکہ یہ اسناد سب کے سماع سے مسلسل ہے یعنی اسناد کے جملہ راویوں نے اپنے شیخ سے اس کتاب کو سنا اور ان کے روبرو اسے پڑھا ہے۔ شاہ صاحب کی عبارت ملاحظہ ہو:

> باید دانست کہ ایں فقیر کتاب موطا روایت کردہ است از شیخ ابو طاہر مدنی و شیخ تاج الدین قلعی و سید عمر بن احمد عقیل ابن بنت شیخ عبداللہ بن سالم البصری خم المکی بسماع بعض و اجازۃ باقی بعد از اں بر شیخ وفد اللہ المغربی المکی المولد و المنشا ہمہ آں خواندو اینجا بر ہمیں اسناد اکتفا می کند کہ مسلسل امت بسماع جمیع۔''

(ترجمہ) جاننا چاہئے کہ اس فقیر شاہ ولی اللہ نے موطا کتاب کی روایت کی ہے۔ شیخ ابو طاہر مدنی، شیخ تاج الدین قلعی' سید عمر بن احمد عقیل سے جو کہ شیخ عبداللہ بن سالم بصری مکی کے نواسے ہیں۔ کتاب کے بعض حصے کو سنا اور باقی کی اجازت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد پوری کتاب کو شیخ وفد اللہ مغربی الاصل اور مولد و منشا کے لحاظ سے مکی کے روبرو پڑھا۔ یہاں اسی ایک اسناد پر اکتفا کی جاتی ہے جو کہ جمیع راویوں کے سماع سے مسلسل ہے۔

مقدمہ کی مذکورہ عبارات سے اتنا تو واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ شاہ صاحب نے حرمین سے واپسی کے بعد اس شرح کو تالیف فرمایا ہے اور ویسے بھی شاہ صاحب حرمین شریفین جانے سے پہلے زیادہ تر درس و تدریس اور کتب بینی میں مشغول رہے۔ تصنیف و تالیف کا باقاعدہ سلسلہ حرمین سے واپسی کے بعد ہی آپ نے شروع فرمایا۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہی شاہ صاحب حرمین سے واپس تشریف لائے اور کتب حدیث میں سے موطا کی طرف آپ نے زیادہ توجہ فرمائی تو آپ نے اس کی شرح لکھنا بھی شروع کر دی۔ آپ کے ایک خاص تلمیذ اور سفر و حضر کے رفیق شاہ محمد عاشق صاحب کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ نے ''مصفٰی شرح موطا'' کے مسودہ کو اختتام تک تو پہنچایا لیکن وہ دوسرے مشاغل کی وجہ سے ان مسودات کی ترتیب اور تہذیب کی طرف توجہ نہ کر سکے اور ایک مدت تک یہ کتاب غیر مرتب ہی رہی۔ اگرچہ اس کام کی طرف آپ کا دل برابر مائل تھا لیکن فرصت کی کوئی صورت نہ نکل سکی۔ یہاں تک کہ آپ کی روح پُرفتوح نے ملاءِ اعلیٰ کی طرف پرواز فرمایا۔ جب یہ واقعہ پیش آیا تو آپ کے عقیدتمندوں

میں سے کسی کو یہ ہوش نہ رہی کہ ان اوراق کی تلاش کرے۔ آخرالامر پانچ چھ ماہ کی مدت گزرنے کے بعد ایک صالح نے حضرت کو خواب میں دیکھا کہ آپ گویا یہ فرمارہے تھے کہ میں موطا کے ترجمہ کی طرف بہت اشتیاق رکھتا ہوں اور آپ اس میں شغف فرمارہے تھے۔ اس صالح دوست نے شاہ محمد عاشق کو یہ خوشخبری سنائی۔ شاہ محمد عاشق فرماتے ہیں کہ اس وقت سے ان مسودات کی ترتیب اور تبییض کی طرف دل میں ایک پریشان کن شغف پیدا ہوا اور حضرت شاہ صاحب کے ایک تلمیذ خاص اور خصوصی محرم حافظ قرآن خواجہ محمد امین ولی اللّٰہی سے اس شوق کو بیان کیا۔ وہ ان مسودات کو نکال کر، کتاب مسویٰ کو سامنے رکھ کر ترتیب اور تبییض میں لگ گئے اور ایک مدت تک انہوں نے بڑی کوشش فرمائی تب جا کر کتاب حسن انتظام سے آراستہ ہوئی اور اٹھارہ شوال بروز یک شنبہ 1179ھ میں مرتب اور مہذب ہوئی۔ والحمدللہ علیٰ ذلک۔

شاہ محمد عاشق کی اصل عبارت بھی یہاں تبرکاً نقل کی جاتی ہے۔ یہ عبارت ہمیں مصفّٰی شرح موطا مطبوعہ قدیم فاروقی پریس کے آخری صفحہ پر نظر آئی۔

خلاصہ تحریر مولوی محمد عاشق تلمیذ مصنف

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

امابعد فقیر محمد عاشق بر ضمیر صفا پذیر طالبان صادق واضح میگرداند کہ چوں ایں کتاب مصفی شرح موطا امام مالک از قلم فیض رقم حجت اللہ حضرت شاہ ولی اللہ عنہ وارضاہ بہ تسوید رسید بسبب اشتغال باشغال دیگر توجہ بہ ترتیب وتہذیب آں مسودات مبذول نشد و مدتی غیر مرتب ماند ہر چند گوشہ خاطر مبارک بانظرف ہمیشہ مصروف بود لیکن صورت نمی گرفت تا آنکہ روح پرفتوح ایشاں بملاء اعلیٰ پرواز فرمود و چوں ایں واقعہ رونمود کسی را از عقیدتمندان ہوش نماند کہ بتفحص آن اوراق پرداز و تابعد مدت پنج یا شش ماہ صالحی حضرت ایشاں را در خواب دید کہ گویا میفر مایند بہ ترجمہ موطا شوق بسیار دارم واظہار شغف باں میفر مائید انعز یزنزد کاتب حروف آں بشریٰ را بیان نمود از ہماں وقت شغفی معلق بہ ترتیب و تبییض آں مسودات بخاطرم افتاد و نزد حافظ کلام رب العالمین خواجہ محمد امین ولی اللّٰہی کہ تلمیذ خاص و محرم با اختصاص جناب حضرت ایشاں بود شغف خود را اظہار نمودم ایشاں را مسودات را بیرون آوردہ کتاب مسویٰ را پیش روی نہادہ ترتیب و تبییض گرفتند مدتی جہد بلیغ نمودہ تا حسن انتظام یافت وثامن عشرہ شوال یوم الاحد عند رابعۃ النہار 1179 تسع وسبعین بعد الالف و لمائۃ مرتب ومہذب گردید الحمدللہ علی ذلک حمداً کثیراً۔

اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب اپنی زندگی میں ''مصفّٰی'' کو مرتب نہ فرما سکے اور دوسری یہ بات بھی معلوم ہوگئی ہے کہ موطا کی عربی شرح مسویٰ جو کہ نہایت مختصر ہے آپ نے ''مصفّٰی'' سے پہلے تصنیف فرمائی۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر شاہ صاحب کے الفاظ میں ان عوامل اور محرکات کا بھی ذکر کیا جائے جن کی وجہ سے آپ نے کتب حدیث میں سے موطا امام مالک کو انتخاب فرمایا۔

''مصفّٰی'' شرح موطا کے مقدمہ میں حمد اور درود کے بعد شاہ صاحب رقمطراز ہیں:

میگوید فقیر رحمۃ اللہ الکریم ولی اللہ بن عبدالکریم العمری نسباً الدہلوی وطناً ای فقیر را مدتی بسبب اختلاف مذاہب فقہا و کثرت احزاب علما و کشیدن ہر کسی بجانبی تشویش روی داد زیرا کہ تعیین طریقی برائے عمل ضروریست و تعیین بغیر ترجیح سفسطہ و وجوہ ترجیح بسیار و اقوام را در تقریر وجوہ ترجیح اجمالاً و تفصیلاً اختلاف فاحش پس جانب دست و پا زدو فائدہ نہ دید از ہر کسی استعانت نمود حاصلی بدست نیا مد بعد ازاں بہ تضرع تمام بحضرت باری جل مجدہ متوجہ شد لئن لم یھد نی ربی لاکونن من القوم الضالین، انی وجھت وجھی للذی فطر السموات والارض حنیفا وانا من المشر کین، پس اشارہ بکتاب موطا تالیف امام ہمام حجتہ الاسلام مالک بن انس است رفت۔ الخ(27)

(ترجمہ) خدائے کریم کی رحمت کا محتاج ولی اللہ بن بعدالرحیم جو نسباً العمری اور وطناً دہلوی ہے، کہتا ہے کہ مذاہب فقہا میں اختلاف اور اس کی وجہ سے علما کے جو بکثرت گروہ بن گئے ہیں۔ کہ ان میں سے ہر ایک ایک جانب کھینچتا ہے۔ اس صورتحال سے میرے دل کو بڑی تشویش ہوئی اور یہ اس کے لئے عمل کے لئے ایک طریقے کا تعین ضروری ہے اور یہ تعین ترجیح کے بغیر صحیح نہیں ہے اور ترجیح کے وجوہ مختلف ہیں اور اس بارے میں علما میں اجمالی بھی اور تفصیلاً بھی بڑا اختلاف ہے چنانچہ میں نے دائیں بائیں بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن بیکار اور ہر ایک سے مدد چاہی، پر بے نتیجہ۔ پھر میں بڑے خشوع اور خضوع کے ساتھ باری تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوا۔ اگر میرا رب مجھے ہدایت نہ دیتا تو یقیناً میں گمراہ لوگوں میں سے ہوتا۔ میں نے دوسروں سے منہ موڑ کر اپنا منہ اس ذات کی طرف کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔ اس پر مجھے (بذریعہ الہام) امام عظیم حجتہ الاسلام مالک بن انس کی کتاب موطا کی طرف اشارہ ہوا۔ الخ

محولا بالا عبارت سے شاہ صاحب کا موطا امام مالک کی شروح لکھنے کا اصل محرک واضح ہو جاتا ہے۔ شاہ صاحب نے جس طرح قرآن مجید کی تعلیم میں ایک جدت فرمائی اور قرآن مجید کو مختلف تفاسیر سے الگ رکھتے ہوئے اس کا ترجمہ پڑھانا شروع کیا اور اس کے لئے کچھ اصول مقرر فرمائے جن کو آپ نے اپنی بیش بہا تالیف ''الفوز الکبیر'' فارسی میں جمع کر دیا ہے۔ اسی طرح علم حدیث کی تعلیم میں بھی ان کا مسلک عام علما سے ممتاز و منفرد ہے۔ شاہ صاحب سے پہلے برصغیر ہندو پاکستان میں حدیث میں سب سے پہلے مشکوٰۃ پڑھتے تھے اور اس کی وضاحت اور شرح کے سلسلہ میں شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی کی دو شرحوں ''لمعات'' اور ''اشعتہ اللمعات'' کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔ پہلی شرح عربی میں ہے اور دوسری فارسی میں۔ شاہ صاحب نے اپنے دور میں اس طریقہ تعلیم میں یہ تجدید فرمائی کہ موطا کے درس کو مشکوٰۃ پر مقدم رکھا۔ اس طرح بقول علامہ استاذ عبیداللہ سندھی جب کوئی شاگرد شاہ صاحب کے طریقہ تعلیم پر عمل کرے گا تو اس کے سامنے دو کتابیں باقی تمام کتب پر مقدم رہیں گی۔ ایک قرآن مجید اور دوسری موطا امام مالک۔ جب موطا اور دوسری کتب حدیث کی ترجیح اور تقدیم میں اختلاف پیدا ہوا تو کتب حدیث کی تصحیح اور طبقات کی ترتیب میں بھی شاہ صاحب کے طریقہ کا دوسروں سے مختلف ہونا لابدی ہے۔ اکثر علما جو کہ صحیح بخاری کو جملہ کتب حدیث پر ترجیح دیتے ہیں، ان کے ہاں کتب احادیث کا پہلا طبقہ بخاری اور صحیح مسلم ہوگا اور دوسرا طبقہ وہ ہے جو دونوں کے مشروط پر ہے اور تیسرا طبقہ کتب سنن جیسے سنن داؤد اور سنن ترمذی ہے۔

اس سے یہ متفرع ہوا کہ اگر کسی حدیث کے متعلق محدث حاکم یہ کہے کہ یہ حدیث شیخین بخاری اور مسلم کے شروط پر ہے تو اس کو ایسی حدیث پر مقدم رکھا جائے گا جس کو امام ابوداؤد نے روایت کیا اور اس پر خاموشی اختیار فرمائی یعنی صحت اور سقم کے متعلق کوئی رائے پیش نہیں کی۔ اسی طرح کتب غریب جیسے صحیح ابن حبان، صحیح ابن خزیمہ اور منتقی ابن الجارود میں اگر کوئی حدیث بخاری اور مسلم کے شروط پر ہوگی تو وہ سنن ابی داؤد کی حدیث پر ترجیح پائے گی۔

ہمارے ان علما کا یہ دستور رہا کہ انہوں نے تصحیح احادیث کے سلسلے میں رجال کی توثیق پر کفایت کی اور مسلمانوں کے عمل وفکر کو درخور اعتنا نہ سمجھا گیا۔ اہل علم کی اس صنف کو ہمارے استاذ علامہ عبیداللہ سندھی، شیخ ابوطاہر مدنی کی پیروی میں وراتی (ورق گردانی کرنے والے) محدث کہتے تھے۔

علامہ استاذ سندھی فرماتے ہیں کہ متاخرین میں سے شیخ جلال الدین سیوطی اور ان کے اتباع جیسے شیخ علی متقی اور شیخ عبدالحق صاحب دہلوی کی بھی یہی رائے تھی بلکہ شیخ عبدالحق تو سرے سے طبقات احادیث کی ترتیب کے قائل ہی نہیں اور وہ کسی غریب کتاب کی حدیث کو جس کی اسنادرجال شیخین بخاری و مسلم کے رجال ہوں شیخین کی حدیث کے برابر سمجھتے ہیں۔ یا اس پر ترجیح بھی دیتے ہیں اور شیخ عبدالحق صاحب اس مسئلہ میں شیخ کمال الدین ابن الہمام مجتہد کے پیروکار نظر آتے ہیں۔ شیخ عبدالحق کا یہ مسلک سرزمین پاک وہند میں ان کے بعد بڑا مشہور ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ ابن ہمام بڑے پائے کے لوگوں میں سے ہیں لیکن اس بارے میں انہوں نے بھی غلطی کی ہے۔

شاہ صاحب نے اپنے مسلک کے مطابق ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں طبقات کتب حدیث پر جو تحقیق فرمائی ہے وہ ہم کو ان علما کی تالیفات میں بھی نظر نہیں آتی جو موطا کو جملہ کتب حدیث پر مقدم رکھتے ہیں۔ شاہ صاحب کے ہمنوا ہیں جیسے کافی عیاض، ابوبکر ابن العربی المالکیؒ، حافظ مغلطائی حنفی۔ حضرت امام دارالہجرۃ سے ان کے زمانے میں تقریباً ایک ہزار شاگردوں نے موطا کو سن کر جمع کیا تھا۔ اس لئے ان روایات کی بنا پر اس کے متعدد نسخے مروج ہوگئے۔ فقہا و محدثین اور صوفیا و امرا اور خلفا نے بھی امام مالک سے تبرکاً موطا کی سند حاصل کی۔ سراج الہند شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں آج کل ملک عرب میں ان کثیر نسخوں میں سے چند نسخے پائے جاتے ہیں۔ پہلا نسخہ جس کا سب سے زیادہ رواج اور جو سب سے زیادہ مشہور ہے اور گروہ علما کا مخدوم بھی یہی نسخہ ہے وہ یحیٰی بن یحیٰی مصمودی اندلسی کا نسخہ ہے۔ چنانچہ جب مطلق یعنی بلا کسی قید کے موطا کہا جاتا ہے تو فوراً اسی طرف ذہن جاتا ہے اور اسی پر منطبق و چسپاں ہوتا ہے۔

یحیٰی بن یحیٰی مصمودی نے حضرت امام عالی مقام کی زیارت اور ان سے استفادہ کی سعادت حاصل کرنے سے قبل قرطبہ میں زیاد بن عبدالرحمٰن سے تمام موطا کی سند حاصل کی تھی اس کے بعد ان کو مزید علم حاصل کرنے کا شوق دامن گیر ہوا چنانچہ بیس بیس کی عمر میں انہوں نے مشرق کا سفر اختیار کیا اور مدینۃ الرسول پہنچ کر اس میں امام مالک سے موطا کو سنا۔

179ھ میں جو امام مالک کی وفات کا سال ہے، ان کی امام سے ملاقات ہوئی۔ امام کی وفات کے وقت یہ وہاں موجود تھے۔ ان کی تجہیز و تکفین کی خدمت ان کو نصیب ہوئی۔ انہوں نے عبداللہ بن وہب سے جو امام مالک کے جلیل القدر شاگردوں میں سے ہیں، ان کے مرتب کردہ موطا اور جامع کو روایت کیا ہے۔ اس کے علاوہ امام مالک کے اصحاب میں سے ایک جماعت کثیر سے موصوف ملے اور ان سے علم حاصل کیا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز نے لکھا ہے کہ حضرت امام مالک

نے یحییٰ بن یحییٰ کو عاقل کے خطاب سے سرفراز فرمایا تھا اور پھر ایک حکایت لطیفے کے طور پر نقل فرمائی ہے جو ہم بھی یہاں نقل کرتے ہیں۔

ایک دن عیسیٰ بن دینار (امام مالک کے جلیل القدر شاگرد) امام مالک کی خدمت میں حاضر تھے اور ان سے استفادہ فرما رہے تھے۔ ان کے علاوہ اور اشخاص بھی فیض یاب ہو رہے تھے کہ دفعتاً ہاتھی کے آنے کا شور وغل ہوا۔ اب عرب میں ہاتھی کو نہایت تعجب سے دیکھا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے بعض عرب کے رہنے والے ہاتھی کے دیکھنے کو فخریہ بیان کر کے مبارکبادی کے خواستگار ہوتے ہیں جیسا کہ ابو اشمقمق کے ان دو شعروں سے ظاہر ہوتا ہے:

یا قوم انی رایت الفیل بعد کم   فبارك اللّٰه لی فی رؤیة الفیل

رایة ولہ شئی یحر کہ   فکدت اضع شیئا فی السراویل

(ترجمہ) اے میری قوم! میں نے تمہارے بعد ہاتھی کو دیکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس ہاتھی کو دیکھنے میں میرے لئے برکت فرمائے۔ وہ اپنی کسی چیز (یعنی سونڈ) کو حرکت دے رہا تھا۔ جب میں نے اس کو دیکھا تو ڈر گیا اور قریب تھا کہ میں اپنے پائجامہ میں کچھ کر دوں۔

غرض جب ہاتھی کے آنے کا شور وغل ہوا تو امام مالک کی جماعت کے اکثر افراد امام کو چھوڑ کر ہاتھی دیکھنے کو دوڑ پڑے مگر یحییٰ بن یحییٰ اپنی اسی ہیئت و حالت میں بیٹھے فیض حاصل کرنے میں مشغول رہے اور نہ تو کسی قسم کے اضطراب کا اظہار کیا اور نہ ان سے کوئی بے ساختہ حرکت سرزد ہوئی۔ امام مالک اس وقت سے ان کو عاقل کے خطاب کے ساتھ مخاطب کرتے تھے۔ ابن بشکوال نے بیان کیا ہے کہ یحییٰ بن یحییٰ مستجاب الدعوات تھے۔ وضع ولباس اور ہیئت ظاہری اور نشست و برخاست میں بھی حضرت امام مالکؒ کا اتباع فرماتے تھے۔ جو کچھ امام مالک سے سنا تھا اس کے مطابق فتویٰ دیتے تھے اور امام مالکؒ کے خلاف جانا پسند نہ فرماتے تھے اگر چہ اس وقت لوگوں میں ایک فقہی مذہب کی تقلید راسخ نہ ہوئی تھی نہ عوام میں نہ خواص میں۔ گو یحییٰ بن یحییٰ نے ہر مسئلہ میں امام مالک کے مذہب کو اختیار کیا ہے لیکن چار مسئلوں میں لیث بن سعد مصری کے مذہب کو اختیار فرماتے ہیں۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے ان چاروں مسائل کی اپنی کتاب ''بستان المحدثین'' میں تصریح فرمائی ہے۔

یحییٰ کی وفات ماہ رجب المرجب 234ھ واقع ہوئی۔ ان کی عمر بیاسی برس کی ہوئی۔ قرطبہ میں ان کی قبر ہے۔

سراج الہند شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ المشائخ پیشوائے علمائے راسخین شاہ ولی اللہ دہلوی قدس اللہ سرہ العزیز نے اس موطا کی جو بروایت یحییٰ بن یحییٰ اللیثی ہے' دو شرحیں لکھی ہیں۔ پہلی شرح کچھ دقیق اور مجتہدانہ فارسی زبان میں ہے۔ مصفیٰ فی احادیث الموطا اس کا نام ہے اور دوسری شرح مختصر ہے۔ اس میں صرف فقہائے حنفیہ وشافعیہ کے مذاہب بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے اور کچھ ان ضروری امور کا بھی (جو مشکل تھے شرح غریب سے ضبط کر کے) بیان کیا ہے۔ اس کا نام المسویٰ من احادیث الموطا ہے۔ راقم الحروف (شاہ عبدالعزیز) نے اس شرح کو ان سے ضبط و اتقان سے سنا ہے۔ سنا عبدالعزیز صاحب نے اس کے علاوہ موطا کے چودہ اور نسخوں

اور ان کے مرتبوں کا اپنی تالیف بستان المحدثین میں تفصیل سے ذکر فرمایا ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے ''مصفی'' میں تحقیق کی کس نہج کو اختیار کیا ہے اور پھر موطا کے اصل نسخے میں کیا اضافے فرمائے ہیں، اس کو خود آپ کے الفاظ میں سنیے۔

مصفی شرح موطا کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:

بالجملہ ملاحظہ این امور شوق روایت موطا اولاً وشرح آں ثانیاً پیدا کرو در شرح ترتیب و بتویب مسائل فقیہہ برحسب ترتیب کتب فقہ وذکر آیات متعلقہ بہر باب وشرح غریب وترجمہ ہر حدیثی و بیان اختلاف فقہا در ہر مسئلہ بوجود آمد وتحدید الفاظ واردہ درنصوص واستخراج علتہ ہر حکمی وتخلص بواسطہ آں بقواعد کلیہ جامعہ مانعہ وتعقب شافعی وغیرہ آں کہ غوامض اسرار اجتہاد است ذکر کردہ شد و وصل مرسل و ماخذ اقوال صحابہ وتابعین کہ از غوامض علوم محدثین است نیز ذکر کردہ شد، واگر اہل زمان بفہم این غوامض نرسند وآں اغنیمت نشمارند گلہ نیست زیرا کہ از غوامض مجتہدین وغوامض محدثین ہر دو معروض ومتغافل اند۔

خلاصہ یہ کہ موطا کی ان خصوصیات اور فضائل نے پہلے تو اس کی روایت کا اشتیاق پیدا کیا اور پھر یہ کہ اس کو شرح کروں چنانچہ میں نے شرح میں اس کے فقہی مسائل کو کتب فقہ کی ترتیب پر مرتب کیا اور ہر باب میں اس کے مناسب جو آیات شریفہ تھیں ان کا اضافہ اور غریب و نامانوس الفاظ کی شرح اور حدیث کا ترجمہ کیا اور ہر مسئلے میں فقہا کا جو اختلاف ہے اس کو بیان کیا۔ میں نے نصوص میں آئے ہوئے الفاظ کی حدود اور تعریفیں بیان کیں۔ ہر حکم کی علت کا جس طرح استخراج کیا گیا ہے اس کی کیفیت بیان کی اور اس طرح جیسے جامع و مانع قواعد تک پہنچایا گیا، اس کا ذکر کیا اور امام شافعی کے امام مالک پر جو تعقبات ہیں انہیں بیان کیا اور دوسری چیزیں بھی کہ یہ سب اجتہاد کے غوامض اور پوشیدہ اسرار میں سے ہیں اور اگر کوئی مرسل حدیث ہے تو اس کا اتصال ذکر کیا۔ اسی طرح صحابہ اور تابعین کے اقوال کا ماخذ (جو کہ محدثین کے پوشیدہ علوم میں سے ہے) بھی بیان کیا گیا ہے کہ اگر اس دور کے لوگ ان غوامض کے فہم کو نہ پہنچ سکیں اور ان کو نعمت خیال نہ کریں تو ان سے کوئی شکوہ نہیں ہے کیونکہ وہ مجتہدین اور محدثین دونوں کے پوشیدہ اسرار سے غافل ہیں۔

ہمارے خیال میں یہ کتاب پہلی بار 1293ھ میں دہلی میں دو جلدوں میں طبع ہوئی۔ جلد اول مطبع فاروقی دہلی میں باہتمام محمد معظم صاحب چھپی۔ اس کے آخر میں یہ عبارت ثبت ہے۔

للہ الحمد من قبل و من بعد کہ جلد اول کتاب مستطاب شرح موطا امام ہمام امام مالک رحمۃ اللہ مسمی بہ مصفی از عمدہ تصانیف جناب قدوہ محققین عمدۃ المفسرین حضرت شاہ ولی محدث دہلوی رحمۃ اللہ باتصحیح وتنقیح مالا کلام بتاریخ چہارم ماہ شعبان المعظم 1293ھ حلیہ انطباع وحلہ اختتام پوشید۔

جلد دوم مطبع مرتضوی دہلی میں باہتمام حافظ عزیز الدین چھپی اور اس کا سنہ طباعت بھی 1293ھ ہے۔ جلد ثانی کا کاتب محمد امام الدین صاحب پنجابی ہیں اور قطعہ تاریخ بھی لکھا ہے۔

اصل عبارت ملاحظہ ہو: قطعہ تاریخ از کاتب جلد ثانی محمد امام الدین صاحب پنجابی۔

مصفی طبع شد شرح موطاء به ترتیب خوش و دستور زیبا
سروش غیب گفتار از سر لطف بساعت سعد شد طبع مصفا

1293ھ

جلد ثانی کے آخر میں حاشیہ پر طبع مصفی کے اختتام کی تاریخ قاضی طلا محمد خاں پشاوری کی طویل فارسی نظم موجود ہے اسی طرح مسوی کی طبع پر بھی مذکور ناظم کی بہترین نظم لکھی گئی ہے۔

ان دونوں کے کچھ اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

ای در ہوس فلسفہ سرگشتہ سودا گہ در صفت صورت و گہ بحث ہیولیٰ
از حکمت یونان نبری صرفہ طلب کن خوش حکمت ایمان بخاری و موطا
ایں شرح مصفی است بسی طرفہ کہ دارد در حل معانی موطا ید بیضا
شہدی است مصفا عجب امانہ بیاید بی بخت موفا بلب این شہد مصفا
در فکرت تاریخ بدم شیایق و ساعی تاوصف مکرر شود و مدح مثنا
گفت خرد نادرہ باغایت احسان شد طبع مصفا چہ عجب شرح موطا

اس کے بعد مسوی شرح موطا کے طباعت کی تاریخ ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

صبح چو ازدل زدود ظلمت سودا خوردہ کافور ریخت بر سر دنیا
مشک فشاں شد صبا چونطق محدث چوں بکشاید زبان بدرس موطا
معدن اصناف علم و کنز معانی مخزن اسرار دین بنام مسوی
مبتدی قدر ایں کتاب چہ داند کورچہ داند رموز طلعت زیبا
چیست مسوی کتاب زاخر فاخر جامع و کامل ز جملہ عیب مبرا
چیست مسوی بحسن و نظم بلاغت نام خدا قلزم لآ لی لا لا
کلک طلبا بر نوشت سال تمامش چیست مسوی کفیل شرح موطا

1293ھ

اس نسخے میں شاہ صاحب کی موطا کی عربی شرح المسویٰ بھی مصفی کے ساتھ چھپی تھی۔ مسوی چوں کہ مختصر حواشی کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے اس کو مصفی کے حاشیہ پر رکھا گیا تھا۔ بعد میں مکتبہ رحیمیہ دہلی والوں نے اس پرانے نسخے کی نقل عمدہ کاغذ اور کتابت کے ساتھ مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی کے ایما پر مصفی مع مسویٰ کو شائع کیا تھا۔ یہ دوسرا نسخہ بھی اسی وقت کمیاب ہے۔ احقر راقم کے پاس دونوں نسخے قدیم اور تازہ اپنے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہیں۔ نیا نسخہ دار العلوم دیوبند سے فراغت کے زمانے میں بطور انعام ملا تھا۔

(4)

کتبِ حدیث وعلومِ حدیث

(7) المسوی من احادیث الموطا: مصفّٰی شرح موطا فارسی کے تذکرہ میں گزر چکا ہے کہ مصفّٰی کی ترتیب شاہ صاحب کی زندگی میں ان کے کثرت مشاغل کی وجہ سے نہ ہو سکی۔ باقی المسویٰ چونکہ مختصر نوٹس کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے اس کی نہ صرف تدوین اور ترتیب مؤلف امام نے خود فرمائی لیکن اس کا درس بھی جاری فرمایا۔ اس لحاظ سے اس کی تدوین تو مصفّٰی کے ساتھ رہی ہوگی لیکن ترتیب اور تکمیل میں یہ مصفّٰی سے مقدم ہے۔

شاہ صاحب سے جن بزرگ تلامذہ نے موطا کی اس عربی شرح کو آپ سے پڑھا اور سنا ہے وہ بالفعل ہمیں تین اجلہ علما معلوم ہوئے ہیں۔

1۔ مؤلف امام کے صاحبزادے سراج الہند شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی آپ اپنی تالیف ''بستان المحد ثین'' میں فرماتے ہیں۔ (ترجمہ) حضرت المشائخ پیشوائے علمار اسخین شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی قدس اللہ سرہ العزیز نے بھی اس موطا کی جو بروایت یحیٰی بن یحیٰی لیثی ہے، دو شرحیں لکھی ہیں۔ پہلی شرح کچھ دقیق اور مجتہدانہ فارسی زبان میں ہے۔ مصفّٰی فی احادیث الموطا اس کا نام ہے اور دوسری شرح مختصر ہے، اس میں صرف فقہاء حنفیہ وشافعیہ کے مذاہب بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے اور کچھ ان ضروری امور کا بھی (جو مشکل تھے اور شرح غریب سے ضبط کر کے) بیان کیا ہے۔ اس کا نام المسویٰ من احادیث الموطا ہے۔ راقم الحروف (شاہ عبدالعزیز) نے اس شرح کو ان سے ضبط واتقان کے ساتھ سنا ہے۔[28]

دوسرے بزرگ ہیں مولانا عبدالرحمٰن بن نظام الدین سندھی ٹھٹوی۔ اس جلیل القدر عالم کا سندھ کے کسی بھی تذکرہ اور تاریخی کتاب میں ہمیں کوئی ذکر نظر نہیں آیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عنفوان شباب میں یہاں سے چلے گئے ہوں گے۔ انہوں نے شاہ ولی اللہ صاحب سے قرآن مجید اور کتب احادیث کے علاوہ شاہ صاحب کی تالیفات مثلاً فتح الرحمٰن ترجمہ فارسی قرآن مجید، حجتہ اللہ البالغہ، مسویٰ شرح موطا اور دوسرے رسائل کو پڑھا ہے۔ شاہ صاحب نے ان کو اشغال صوفیہ کی تلقین بھی فرمائی ہے اور اپنی جمیع مرویات کی اجازت مرحمت فرمائی ہے اور یہ سندھی عالم بیس برس تک مسلسل اسی شغل میں رہے ہیں۔

شاہ صاحب نے مولانا عبدالرحمٰن سندھی کی قوت خیال میں بعض امراض کی وجہ سے کچھ خلل بھی محسوس کیا تھا اس لئے ان کو یہ تنبیہہ بھی فرمائی...... کہ ان کو اپنے (مشاہدات اور) واقعات پر اعتماد نہ کرنا چاہیے جب تک ان میں میری طرف مراجعت نہ کریں یا فراست صادقہ سے ان کی تائید ہو جائے اور آخر میں احکام شرعیہ اور آداب صوفیہ پر استقامت کی وصیت فرمائی ہے۔ نامناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں وہ مرقومہ اجازت بھی درج کی جائے جو شاہ صاحب نے ان کو مرحمت فرمائی ہے۔

(ترجمہ) حمد وصلاۃ کے بعد رب کریم کی رحمت کا محتاج ولی اللہ بن عبدالرحیم، اللہ تعالی اسے سلف صالحین کے ساتھ شامل کرے کہتا ہے کہ اللہ تعالی کے اپنے بندوں کے ساتھ ان کے باطن میں ایسی مخفی مہربانیاں ہیں جن کا ادراک نادر ہے اور یہ جو خدا کے بندے اس کی طرف کھچ کے چلے جاتے ہیں، اس میں اللہ اور بندوں کے درمیان وہ مبارک نعمتیں ہیں

جن کے معانی کا ادراک دقیق ہے۔ ان مخفی الطاف اور خوشگوار نعمتوں کا کچھ حصہ ہمارے دینی بھائی، صالح مصلح کو ملا جس کی اوقات عبادات کے ساتھ آباد رہتے ہیں اور ان کے انفاس نیکیوں کے سمندروں میں ڈوبے رہتے ہیں۔ (وہ ہیں) حافظ عبدالرحمٰن ابن حافظ نظام الدین ٹھٹھوی جو کہ ہماری اقامت گاہ دہلی کی نزیل ہیں۔ اللہ دنیا اور آخرت میں اس پر احسان فرمائے اور دارین کو اپنی نعمتوں سے نوازے۔ اللہ تعالیٰ اس کو میری طرف لے آئے اور اصفیا کے مخصوص طریقہ کا اس کو الہام کیا۔ پھر اس کو اس طریقہ کے سہل اور دشوار طریقوں پر چلنے اور اس کے آباد اور غیر آباد (منازل) کو طے کرنے میں تکالیف کی برداشت کا الہام فرمایا اور اس کو مراقبات اور توجہات کے اہتمام کی توثیق عطا فرمائی اور اس پر توحید منکشف فرمائی اور قوم (اصفیاء) کے پاس جو معتبر نسبتیں ہیں وہ بھی اس کو عطا ہوئیں جیسے نسبت احسان، نسبت اویسیہ، نسبت یادداشت، نسبت توحید اور نسبت عشق اور اس کو چند خوارق عادات چیزیں بھی مرحمت فرمائیں۔ مناجات کی حلاوت سے بہرہ ور کیا اور مختلف عبادتوں میں لذت نصیب کی اور نور ارواح کی رؤیت نصیب فرمائی۔ اس کو مسامرات لطیفہ (روحانی سرگوشیاں) اسماء اور آیات کے خواص میں سے کچھ حصے پر مطلع کیا۔ اس کے ساتھ وہ اللہ اور اس کے رسول اور طریقت کے مشائخ کے ساتھ ظاہر اور باطن میں صدق نیت سے رہا، اس کا سینہ حسد اور خیانت کے مرض سے سلامت رہا۔ حرص اور طول امید کی طرف اس کا میلان کم رہا، شدائد اور آلام میں اس کو صبر کی قوت حاصل تھی اور عبادات میں مشغول ہونے کی وجہ سے اس کو ان آلام کا احساس نہ رہا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کے اور بھی احسانات ہیں جن کا بیان طویل اور شمار عسیر ہے، ان معاملات میں تقریباً بیس برس تک مشغول رہا۔

(اس پر) ان مخفی الطاف اور مبارک نعمتوں سے یہ بھی تھا کہ خدا تعالیٰ نے اس کو مجھ سے تحصیل علم کی توفیق عطا کی۔ اس نے مجھ سے قرآن عظیم اول سے آخر تک حفص بن عاصم کی روایت سے پڑھا اور یہ سلسلہ پیغمبر علیہ السلام تک مسلسل ہے۔ (حدیث میں) صحیح بخاری، صحیح مسلم، موطا محمد بن حسن اس کے ایک (مختصر) حصہ کے علاوہ شرح السنۃ سنن نسائی کا آدھا پڑھیں اور دوسرے (شاگرد) کی قرأت سے دوسری مرتبہ صحیح بخاری کو مجھ سے سنا اور جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، مسند دارمی، مشکوٰۃ المصابیح، حصن حصین، جزری اور نسائی کا کچھ حصہ بھی سنا۔ مجھ سے میری بعض تالیفات کو بھی سنا جیسے فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن، حجۃ اللہ البالغہ، المسوّیٰ اور دوسرے دن بہت سے رسائل جن کا شمار عسیر ہے۔

ان چھوٹی اور بڑی باتوں کے بعد (جاننا چاہیے کہ) اللہ تعالیٰ نے مجھ کو یہ شرح صدر فرمایا کہ میں اس مولانا عبدالرحمٰن سندھی کا ذکر (خیر) کروں اور اس کو مشہور اصفیائے اہل طرق کے اشغال کی اجازت دوں، تب میں نے (شرح صدر کے موافق) یہ کہا کہ میرا ہاتھ اس کا ہاتھ ہے جس طرح میرے حق میں میرے والد قدس سرہ نے فرمایا تھا اور میں نے اس کو خلافت اور نیابت کے طور پر صوفیا کا خرقہ پہنایا، طریق مشہورہ کی بعض اسانید اور ان کے اشغال و اذکار ہمارے رسائل میں سے ''کتاب الانتباہ فی سلاسل الاولیاء'' میں مذکور ہیں اور اس نے جو کچھ مجھ سے پڑھا یا مجھ سے سنا میری مرویات میں سے اسکے پاس جو کچھ صحیح طور پر ثابت ہوا ان سب کے روایت کی۔ میں نے اس کو اجازت دی، کتب حدیث کی اسانید میرے رسائل میں مذکور ہیں۔ میں نے اس کو آیات عظمیٰ، اسماحسنیٰ اور ادعیہ مبارک کی بھی اجازت دی کہ ان کو تلاوت کرے اور حروف سے کتابت کرے۔ باء قاف سے جس طرح مجھ کو میرے والد قدس سرہ نے اجازت فرمائی تھی میں نے اس کو اس کے نفس کے حق میں یہ بتایا کہ اس پر بعض امراض کا غلبہ ہے لہٰذا اس کی قوت خیال میں کچھ خلل واقع ہے

اس لئے وہ اپنے اوپر وارد ہونے والے واقعات اور مشاہدات پر تب تک اعتماد نہ کرے جب تک ان میں (میری طرف) مراجعت نہ کرے یا فراست صادقہ سے اس کی تائید نہ ہوئی ہو۔

اس کے لطائف میں سے روح کا لطیفہ غالب ہے خاص طور پر اس کی وجہ یا چہرہ جو کہ عقل کو متصل ہے اس لئے اس کی چراگاہ اور سیر گاہ نسبت اویسیہ اور نسبت احسان ہے اور اس کا نفس ناطقہ اس طرح پیدا کیا گیا ہے کہ اس کی دو قوتوں ملکیہ اور بہیمیہ میں ایک دوسرے کے ساتھ کھینچا تانی ہوتی ہے اور وہ دونوں پورے طور پر قوی نہیں ہیں۔ پس جب وہ احوال میں سے کسی حال کے ساتھ صحیح طور پر مشغول ہوتا ہے تو (قوتوں کے قوی نہ ہونے کی وجہ سے) پہلے کے واقعات کو بالکل بھلا دیتا ہے کہ گویا وہ کچھ نہ تھے' اس کو چاہیے (کہ اس کے لئے) غم نہ کرے کیونکہ پہلی حالت کی بنیاد (اور اصل) چھپی رہتی ہے' جاتی نہیں ہے اس کو چاہیے کہ جمیع جوانب کے جمع کرنے اور جمع اضداد کے احاطے کا خیال نہ کرے کیونکہ اس کا نفس تجاذت (اور باہمی کھینچا تانی) والا ہے اس لئے وہ اس کی طاقت نہیں رکھتا اور اس صنف کے مزاج والوں کا یہ خاصہ ہوتا ہے کہ ان میں تلون (رنگا رنگی) اور ایک حال سے دوسرے حال کی طرف جانا طبعی امر ہوتا ہے۔

میں اس کو اس چیز کی وصیت کرتا ہوں جس کی میرے مشائخ نے مجھ کو وصیت کی اور وہ ہے احکام شرعیہ اور آداب صوفیہ پر استقامت اور میرے لئے اور میرے مشائخ اور ساتھیوں کے لئے دعا کرتا ہے۔ میں یہ کہتا ہوں اور اللہ ارحم الراحمین سے مغفرت چاہتا ہوں۔ سب تعریف پروردگار عالم اللہ کے لئے ہے۔ ان سطور کی کتابت بروز پنجشنبہ 29 رمضان 1160ھ میں ہوئی اور سب تعریف ہے اللہ کے لئے اول میں اور آخر میں اور ظاہراً اور باطناً اور اس کی بہترین مخلوق محمد اور اس کی اولاد و اصحاب پر اللہ کی رحمت و سلام ہو۔

اور تیسرے بزرگ عالم جنہوں نے شاہ صاحب سے المسوی کو پڑھا ہے، وہ ہیں پنجاب کے شیخ جار اللہ بن عبدالرحیم۔ شاہ صاحب نے ان کو 1173ھ میں سند فراغت و روایت مرحمت فرمائی ہے۔

شاہ صاحب اپنی اجازت کے آخر میں شیخ جار اللہ کے متعلق اپنی تالیفات کی اجازت کے متعلق فرماتے ہیں۔ موصوف (شیخ جار اللہ) نے مجھ سے بعض میری کتابیں اور رسالے پڑھے جو میں نے مختلف علوم کے متعلق تالیف کئے ہیں۔ ان میں ایک احادیث الموطا پر مشتمل ''المسوی'' جو اس نے اول سے آخر تک مجھ سے پڑھا اور آثار الموطا اور اس کی احادیث کے متعلق امام مالک رحمۃ اللہ علیہ تک اپنا سلسلہ اسناد ملایا اور اس کے ساتھ ساتھ اکثر مباحث فقہی سے واقفیت بہم کی۔

میری کتابوں اور رسالوں میں سے جو اس نے مجھ سے پڑھے ایک ''حجۃ اللہ البالغہ'' بھی ہے جو علم اسرار شریعت کے بارے میں ہے۔ نیز مجھ سے الانصاف فی بیان سبب الاختلاف' عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید' نقشبندیہ' گیلانیہ اور چشتیہ' ان تین طریقوں کے اشغال کے بارے میں ''القول الجمیل'' پڑھی ہے۔

آخر میں شاہ صاحب لکھتے ہیں۔ میں نے یہ سطور اوائل 1173ھ کی ماہ محرم کی اکیس تاریخ کو جمعہ کے دن لکھیں۔

سند کے شروع میں حمد و صلوۃ کے بعد فرماتے ہیں: میرا یہ نیک بخت بھائی شیخ جار اللہ بن عبدالرحیم جو اہل پنجاب میں سے ہے اور کتاب اللہ کی قرأت اور تجوید سے بہرہ ور ہے اور سنت رسول کا کافی حصہ اخذ کیا ہے، قریباً چھ سال

میرے ساتھ رہا۔ (30)

اصل سند عربی میں ہے اور المسوّیٰ کے مکہ معظمہ کے مطبوعہ نسخے میں شائع کی گئی ہے۔ اس ضمن میں مولانا عبید اللہ سندھی کا حاشیہ ملاحظہ ہو۔

اس اجازہ (سند اور ڈگری) کا یہ نسخہ الصدر الحمید مولانا محمد اسحاق الدہلوی کے وارثوں سے الشیخ عبد الستار الکتبی الہندی کے ہاتھ لگا۔ آخر الذکر ممتاز محدث اور حرم مکی کے اساتذہ حدیث میں سے ہیں۔ قیاس غالب یہ ہے کہ اجازہ کا یہ نسخہ خود اجازہ دینے والے یعنی امام ولی اللہ دہلوی کے قلم سے ہے۔ باقی حقیقت حال سے اللہ زیادہ باخبر ہے۔

عبید اللہ بن الاسلام السندھی ثم الدہلوی الدیوبندی

المسوّیٰ کی پہلی بار طباعت، مصفّی کی دو جلدیں تھیں، جلد اول مطبع فاروقی دہلی میں باہتمام محمد معظم صاحب بتاریخ چہارم ماہ شعبان المعظم میں طبع ہوئی اور جلد دوم مطبع مرتضوی دہلی میں باہتمام حافظ عزیز الدین طبع ہوئی اور دونوں کا سن طباعت 1293ھ ہے۔ اس کے بعد مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کی کوشش سے مکتبہ رحیمیہ دہلی والوں نے اس پرانے نسخہ کی نقل عمدہ کتابت اور کاغذ کے ساتھ دونوں شرحوں کو اس طرح شائع کیا کہ اس کے دو کالم بنائے گئے۔ پہلے کالم میں ''المسوّیٰ'' اور دوسرے میں مصفّیٰ مع متن موطا کو رکھ گیا۔

یہ شرح تیسری بار مطبع سلفیہ مکہ مکرمہ حجاز میں متن موطا کو الگ رکھ کر عمدہ مصری ٹائپ میں بہترین کاغذ پر 1354ھ میں طبع ہوئی۔ اس کی طباعت کے اصل محرک علامہ استاذ عبید اللہ سندھی تھے اور طباعت کے مصارف حرم مکی کے محدث شیخ عبد الوہاب بن عبد الجبار دہلوی اور مطبع سلفیہ کے مالک شیخ محمد صالح نصیف نے برداشت کئے۔ کتاب کے شروع میں حضرت شاہ صاحب کے حالات زندگی اور الموطا کی فارسی شرح المصطفیٰ پر آپ نے جو مبسوط مقدمہ لکھا تھا اس کا عربی ترجمہ ہے۔ ''کلمۃ الناشر'' کے تحت ایک جگہ ناشر لکھتے ہیں۔

ہمارے ہندی بھائیوں نے اس کتاب کو دہلی میں دو بار شائع کیا تھا۔ ایک بار 1293ھ میں سید محمد بن عبد اللہ غزنوی سلفی کی کوشش سے طبع ہوئی اور دوسری بار 1347ھ میں جمعیت العلماء ہند کے صدر شیخ کفایت اللہ دہلوی کی سعی سے چھپی لیکن انہوں نے ''المسوّیٰ'' کو مستقل کتاب نہیں بنایا مگر مؤلف علام کی دوسری شرح مصفی فارسی کے حاشیے پر اس کو رکھا اس لئے اس سے استفادہ کرنا آسان نہ تھا اور اس کا نفع کم رہا اور پھر دونوں جماعتوں میں بعض مواضع کے اندر یہ نقص تھا کہ ان میں کہیں کہیں کلمات اور جملے غائب تھے جس کی وجہ سے خلط فاحش ہو جاتا تھا اس لئے میں نے اس کو مستقل حیثیت دے کر چھاپنے میں اللہ تعالیٰ سے استخارہ کیا، اس نے اپنے فضل و کرم سے یہ کام میرے لئے آسان کر دیا اور یہ وہ کتاب ہے جس کو میں اپنے مسلمان بھائیوں کے سامنے حتی الوسعت تصحیح کے ساتھ عمدہ چھاپ کر یہ امید باندھ کر پیش کرتا ہوں کہ اس کو غور و خوض کے ساتھ پڑھیں اور اپنے دینی اور علمی مدارس کے نصاب درس میں اس کو شامل کریں۔ مثلاً ''دار الحدیث'' ''المعہد السعودی'' ''الصولتیہ'' ''الفلاح'' یہ چاروں درسگاہ مکہ مکرمہ میں واقع ہیں۔ ''جامعہ ازہر'' مصر جامعہ زیتونیہ تیونس، جامع القرویین فاس۔ ''جامعہ قاسمیہ'' دیوبند، دار الحدیث دہلی، جامعہ اسلامیہ علیگڑھ، دار العلوم مصر، ''دار العلوم'' لکھنؤ'' ''جامعہ عثمانیہ'' حیدر آباد دکن، ''جامعہ ملیہ'' دہلی'' ''جامعہ افغانیہ'' کابل اور عالم اسلام کی دوسری درسگاہ

تا کہ یہ کتاب دینی اور علمی ترقی کے لئے تخم کے طور پر ہو اور اس میں مسلمانوں کے لئے انشاء اللہ بہت بڑا غیر پوشیدہ ہے۔
کلمہ ناشر کے خاتمہ پر ان حضرات کی اعانت کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کیا گیا جنہوں نے اس علمی کام میں ناشرین کی اعانت کی۔ لکھتے ہیں ان معاونین میں سب سے بڑے معاون علامہ استاذ شیخ عبید اللہ سندھی ہیں کیونکہ انہوں نے ہمیں اس کتاب (المسویٰ) کے علمی مرتبہ پر متنبہ کیا اور اس کتاب کا اپنا قیمتی نسخہ عاریتاً ہمیں عنایت فرمایا اور بعض مفید تعلیقات کا بھی اضافہ فرمایا۔
المسویٰ مطبوعہ مکہ مکرمہ کی طباعت میں جن خطی نسخوں پر اعتماد کیا گیا ہے وہ درج ذیل ہیں۔ (1) الفاضل مولوی نظر احمد ابن علامہ شہیر مرحوم' مولوی الٰہی بخش فیض آبادی کا خطی نسخہ۔

(5)

شرح تراجم ابواب صحیح البخاری

اس رسالے کے سن تالیف کے متعلق مصنف غلام نے بصراحت تو کچھ نہیں لکھا لیکن اس طرح فن حدیث میں غور وفکر کرنے کا میلان شاہ صاحب میں حرمین کے علمی سفر کے بعد ہی پایا جاتا ہے اس لئے عین ممکن ہے کہ 1145ھ میں جب شاہ صاحب نے حرمین سے دہلی تشریف لا کر درس وتدریس کا سلسلہ شروع فرمایا تو اس وقت یہ رسالہ بھی زیر تصنیف آیا ہوگا اور یہ تقریباً 1145ھ اور 1146ھ کے درمیان کا زمانہ ہے۔
رسالہ شرح تراجم بظاہر تو چھوٹا سا معلوم ہوتا ہے لیکن موضوع کے لحاظ سے نہایت اہم تصنیف ہے کیونکہ صحیح بخاری کے تراجم ابواب کا حل کرنا ایک مشکل امر تصور کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں بڑے بڑے محدثین نے اگرچہ بہت کچھ لکھا ہے مگر شاہ صاحب کے اس مختصر سے رسالے کے مطالعہ سے مؤلف علام کے علمی تبحر کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔
سہارنپور کے مشہور محدث حافظ مولانا شیخ احمد علی محشی صحیح بخاری نے اپنے حواشی کے مقدمہ میں تراجم ابواب پر جو تحقیق فرمائی ہے اس میں اگر ایک طرف حافظ الدہر ابن حجر عسقلانی اور ابوالولید باجی کی تحقیق کو اس ضمن میں ذکر فرمایا ہے تو دوسری طرف شیخ اجل قدوۃ المحدثین ولی اللہ بن عبدالرحیم کی اس تالیف شرح تراجم ابواب صحیح بخاری کی عبارت کو بھی موضوع کی وضاحت میں بطور سند پیش کیا ہے۔
شاہ صاحب نے صحیح بخاری کے جملہ تراجم ابواب کو چند اقسام پر تقسیم فرمایا ہے۔ ان کی رائے میں امام بخاری کبھی کسی مرفوع حدیث کو جو ان کے مقرر کردہ شرائط پر صحیح نہیں اترتی ہے، ترجمہ باب میں لے آتے ہیں اور اس کی تائید میں باب کے اندر ایسی حدیث کو بطور شاہد ذکر فرماتے ہیں جو امام بخاری کے مقرر کردہ شروط پر مروی ہو۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس قسم کی مرفوع حدیث کو ترجمہ میں لاتے ہیں جو اگرچہ ان کے بیان کردہ شرائط کے مطابق نہیں ہوتی لیکن اس حدیث سے بذریعہ دلالۃ النص' اشارۃ النص وغیرہ کے کوئی مسئلہ استنباط کرنا ہوتا ہے اور کبھی کسی مذہب کے قول کو ترجمہ میں ذکر کرتے ہیں اور اس ترجمہ کے ذیل میں دلیل یا شاہد بھی ذکر کیا ہے لیکن اس مذہب کے ترجیح کے متعلق اپنی طرف سے

امام بخاری کوئی قطعی رائے پیش نہیں کرتے اور ترجمہ میں کبھی ایسے مسئلے کا ذکر ہوتا ہے جس میں احادیث کا اختلاف ہے پھر ان سب احادیث کو ترجمہ کے تحت ذکر فرماتے ہیں تا کہ فقیہہ کے لئے کسی رائے پر پہنچنا آسان ہو جائے۔ کبھی یہ صورت ہوتی ہے کہ اولہ آپس میں متعارض ہوتے ہیں اور امام بخاری کے ہاں اس تعارض کے رفع کرنے کی یہ صورت ہوتی ہے کہ ان کی نظر میں ہر ایک دلیل کا محمل الگ ہے پھر اس کو ترجمہ میں ذکر فرما کر تعارض کے دفع کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔ اس طرح ان تراجم میں بیسیوں فوائد ہیں جن کا شاہ صاحب نے اس رسالہ میں ذکر فرمایا ہے۔

شاہ صاحب نے اپنی اس مختصر تالیف میں بعض جگہ ائمہ مذاہب کے باہمی اختلاف کو ایسے اجتہادی شان سے مٹانے کی کوشش فرمائی ہے کہ ہمیں اس قسم کی تحقیق بڑے بڑے محدثین اور فقہا کے کلام میں بھی نظر نہیں آتی، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس قسم کی کسی ایک تحقیق کا ذکر کیا جائے۔

صحیح بخاری میں ایک باب اس مسئلے کے بیان میں ہے کہ کیا ران عورت میں داخل ہے یا نہیں؟ شاہ صاحب اس کی تحقیق فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس مسئلہ میں مختلف مذاہب ہیں۔ امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کے ہاں ران عورت ہے۔ اس اتفاق کے بعد پھر یہ دونوں امام ناف کے عورت نہ ہونے کے اندر آپس میں مختلف ہیں۔ امام مالک ران کو عورت قرار نہیں دیتے۔ احادیث اس کے متعلق متعارض ہیں۔ روایت کے لحاظ سے امام مالک کا قول قوی معلوم ہوتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

''میں کہتا ہوں کہ ان مختلف احادیث کے جمع کرنے اور تعارض دفع کرنے کی یہ صورت ہے کہ کسی شخص کو ایسے لوگوں سے اپنی ران کا چھپانا ضروری نہیں ہے جو اس کے محرم راز ہوں اور عام طور پر اس کے پاس آتے جاتے ہوں۔ باقی دوسرے لوگ جو اس کے پاس کبھی کبھی آتے ہوں ان کے حق میں ران عورت ہوگی۔ ان کے سامنے ران کو کپڑے سے چھپانا چاہئے۔ اس تطبیق پر وہ حدیث دلالت کرتی ہے جس میں پیغمبر علیہ السلام کے پاس حضرت عثمان کے آنے کا قصہ مذکور ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے آنے کی خبر معلوم فرما کر ران کو چھپایا تھا حالانکہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے تشریف لانے کے وقت پیغمبر علیہ اسلام کی ران کھلی رہی۔ باقی یہ جو امام مالک فرماتے ہیں کہ مزدور، اونٹ چرانے والے لوگ اپنی نمازوں میں ران سے اوپر کپڑے پر اقتصار کر سکتے ہیں، یعنی نماز میں ران کو نہ چھپائیں تو ان کے حق میں جائز ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ہمارے ہاں اس قول کی صحت میں کوئی شبہ نہیں ہے کیونکہ متعدد طریق سے مروی ہے کہ اس قسم کے لوگوں کو پیغمبر علیہ السلام نے ران سے لے کر گھٹنوں تک نماز میں ڈھانپنے اور چھپا رکھنے کے لئے مکلف نہیں فرمایا۔ یہاں ایک قاعدہ ہے جس کو یاد رکھنا چاہیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے دو طریقے بیان فرمائے ہیں۔ ایک ہے محسنین کی نماز اور دوسری عام مومنوں کی۔ نماز کئی ایسی چیزیں ہیں جن کو عام لوگوں کو نماز میں جائز فرمایا ہے اور پہلے لوگوں کی نماز میں منع فرمایا ہے۔ شاہ صاحب اس قاعدہ کا ذکر فرما کر مخاطب کو متنبہ فرماتے ہیں کہ جب تو نے اس قاعدہ کو یاد رکھا تو نماز کے متعلق اکثر مواضع میں ایک دوسرے سے متعارض اور متناقض باتیں وارد ہوئی ہیں۔ ان سب کا سمجھنا تیرے لئے آسان ہو جائے گا۔

یہ رسالہ شرح تراجم ابواب صحیح بخاری کئی بار طبع ہو کر شائع ہوا لیکن سب سے صحیح نسخہ دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن

والوں کی طرف سے 1323ھ میں ٹائپ میں چھپ کر شائع ہوا جس کا نقل 1357ھ میں کتب حدیث کے مشہور خادم مولوی نور محمد نقشبندی چشتی مالک سابق اصح المطابع دہلی کی طرف سے صحیح بخاری کے شروع میں حسن کتابت اور صحت سے آراستہ ہو کر شائع ہوا اور اس کا پاکستانی ایڈیشن 1381ھ مطابق 1961ء میں شائع ہوا جو کہ ہر جگہ دستیاب ہے۔

چہل حدیث (عربی)

یہ رسالہ اس وقت میرے پاس موجود نہیں ہے اور نہ شاہ صاحب کی کسی دوسری تالیف میں اس کا نام ذکر ہوا ہے۔ اس لئے اس کی تاریخ تدوین کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ''حیات ولی'' کے مصنف اس رسالہ کا اس طرح تذکرہ فرماتے ہیں۔

> ''اس چھوٹی سی کتاب میں شاہ صاحب نے وہ حدیثیں جمع کی ہیں جو اسلام کی مدار علیہ ہیں۔ اگرچہ اس نام کی اور نہ صرف نام بلکہ اس مضمون کی چند کتابیں اور علما نے بھی لکھی ہیں جو آج ہمارے پیش نظر ہیں لیکن جب ان میں اور اس میں صحیح اندازہ اور پورا موازنہ کیا جاتا ہے تو آسمان و زمین کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ شاہ صاحب نے نہایت مختصر مختصر حدیثیں جو ہر شخص کے لحاظ سے سفید اور سود مند ہیں، درج کی ہیں اور تمام مضامین کا احاطہ کر لیا ہے۔ سچ پوچھئے تو آپ نے اہل اسلام کی سچی ہمدردی و خیر اندیشی مد نظر رکھ کر وہ کام کیا ہے جو ایک اعلیٰ درجہ کا مقتدائے قوم اپنی عزیز قوم کے لئے نہایت دل سوزی کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ مضامین سے قطع تعلق کر کے اس کی حسن نظمی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔''(31)

الارشاد الیٰ مہمات علم الاسناد

یہ رسالہ سفر حجاز سے واپسی کے بعد کی تالیف ہے کیونکہ اس میں شاہ صاحب کے اساتذہ و شیوخ حجاز کا ذکر موجود ہے۔ یہ مختصر کتاب کئی بار طبع ہوئی ہے لیکن اس کا ایک صحیح مخطوطہ مولانا سید محب اللہ صاحب العلم پیر جھنڈہ کی علمی لائبریری میں نظر سے گزرا جو کہ دس اوراق کا ہے اور نسخہ کے کاتب سندھ کے مشہور عالم و محدث قاضی فتح محمد صاحب نظامانی ہیں۔ قاضی فتح محمد صاحب، پیر مولانا رشد اللہ صاحب العلم کے بھی استاد گزرے ہیں۔ پیر جھنڈہ کے علمی کتاب خانہ کی کئی نادر قلمی کتابیں قاضی صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ اس مخطوطہ کے شروع میں ناسخ کی طرف سے جو عبارت مرقومہ ہے وہ حسب ذیل ہے

هذا الثبت المسمى بالارشاد الى مهمات علم الاسناد لحافظ عمره مسند و قته الشخ الاجل محدث الهند احمد بن عبدالرحيم العمرى

رسالہ کی ابتدائی عبارت میں جہاں مؤلف امام نے اپنے نام کا ذکر کیا ہے وہاں ایک حاشیہ بھی لکھا ہوا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آغاز کتاب کی عبارت یہاں نقل کر کے مکتوبہ حاشیہ بھی نقل کر دیا جائے۔

الحمد للّٰه الذی خص هذه الامة المرحومة بفضيلة عظيمة هی حفظ الاسناد، وامدمن شاء منهم بعلوه وسعة طرقه وما اعظم من امداد والصلوة والسلام علی سيدنا المبعوث من اللّٰه هاديا و اماما وعلى آله و صحبه و حملة دينه الحائزين من السعادة سهاما اما بعد فيقول خادم حديث النبی صلی اللّٰه عليه وسلم المفتقر الی رحمة ربه الكريم احمد المعروف بولی اللّٰه بن عبدالرحيم الدهلوی احسن اللّٰه اليه والی مشائخه وابويه

سب تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے اس امت مرحومہ کو حفظ اسناد جیسی عظیم فضیلت کے ساتھ مخصوص کیا اور ان میں سے جس کو چاہا اسناد کے علو اور طرق اسناد کی وسعت اور کشادگی سے نوازا اور یہ بہت بڑی امداد ہے۔ درود اور سلام ہمارے سردار اللہ کی طرف سے ہادی اور امام بنا کر بھیجے ہوئے پر ان کی آل اور صحابہ اور اس کے دین کے عاملین پر جنہوں نے سعادت کے کئی حصہ جمع کئے۔ حمد وصلوۃ کے بعد حدیث نبوی کا خادم رب کریم کی رحمت کا محتاج احمد معروف بولی اللہ بن عبدالرحیم دہلوی کہتا ہے اللہ اس کے ساتھ اور اس کے مشائخ اور والدین کے ساتھ احسان فرمائے۔

اس عبارت میں شاہ صاحب کے نام ''احمد'' پر عربی میں یہ تعلیق موجود ہے۔

هوا بو محمد ولد له ولد قبل مولانا عبدالعزيز فمی بحمد فكنی بابی محمد المتولد ولی اللّٰه المحدث 1115ھ فی رابع الشوال يوم الرابع فی مقام بلت متعلقة ضلع مظفرنگر المتوفی فی اليوم السبت بعد الزوال فی التاريخ التاسع والعشرين 1176 فی الدهلی. والمدفون فی الدهلی عند تبر والده مولانا عبدالرحيم المتوفی فی اليوم الابها الصباح فی وقت الصباح فی اثنی عشر شهر الصفر سنه 1130.

شاہ صاحب کی کنیت ابومحمد ہے۔ مولانا شاہ عبدالعزیز سے پہلے آپ کے ایک بیٹا پیدا ہوا تھا جس کا نام محمد رکھا گیا اور آپ کی اس کے نام پر کنیت ابومحمد ہوئی۔ شاہ ولی اللہ صاحب محدث 4 شوال بروز بدھ ضلع مظفرنگر کے نواح میں موضع پھلت میں پیدا ہوئے اور مورخہ 29 بروز سنیچر بعد زوال، 1146ھ دہلی میں وفات فرمائی اور اپنے والد مولانا عبدالرحیم کے مزار کے قریب دہلی میں مدفون ہوئے۔ شاہ عبدالرحیم کی وفات 12 صفر بروز بدھ بوقت صبح 1130ھ میں ہوئی۔

یہ مخطوطہ اس عبارت پر ختم ہوتا ہے۔

واما المختارة للحافظ ضيا الدين محمد المقدسی فرواه ابن البخاری عن عمه المولف.

وليكن هذا آخر الكلام والحمد للّٰه اولا آخرا ظاهرا باطنا.

مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر ''الفرقان'' نے اس رسالہ کا ذیلی طور پر اپنے ایک مضمون حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے کام کے مختصر تعارف میں اس طرح ذکر فرمایا ہے۔ ''مجموعہ رسائل اربعہ'' یہ بہت چھوٹے چھوٹے چار رسالے ہیں جن کا تعلق فن حدیث سے ہے۔

(1) ارشاد الی مہمات الاسناد (2) رسالہ اوائل (3) تراجم البخاری (یہ مذکورہ بالا رسالہ شرح تراجم ابواب بخاری کے علاوہ ہے اور صرف ایک ورق پر ہے۔)، (4) ما یجب حفظہ للناظر۔[32]

(6)

حجۃ اللہ البالغہ

شاہ صاحب کی جملہ تالیفات میں سے یہ معرکتہ آلاراء اور عالمی شہرت کی کتاب ہے اور یہ بھی سفر حرمین سے واپسی کے بعد کی تالیف ہے اور علم حدیث کے ''اسرار دین'' کے فن میں داخل ہے۔ مؤلف امام علم حدیث کے درجات پر بحث کرتے ہوئے اس کتاب کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں (ترجمہ) ہمارے نزدیک حدیثوں کے متعلق تمام فنون میں سے سب سے زیادہ باریک اور گہری بنیاد والا اور دور دور تک روشنی پہنچانے والا فن اور اسلام کی شریعت کے ساتھ تعلق رکھنے والے تمام علموں میں سب سے اونچے درجے کا علم وہ ہے جس کا نام ہم علم اسرار دین رکھتے ہیں۔

اس علم میں اس بات پر بحث ہوتی ہے کہ حدیثوں میں جو حکم دیئے گئے ہیں وہ کیوں دیئے گئے ہیں؟ ان میں کیا کیا حکمتیں ہیں؟ وہ کیا ضرورتیں ہیں جن کی وجہ سے حکموں میں درجے پیدا کئے گئے ہیں یعنی کسی کو کم ضروری اور کسی کو زیادہ ضروری اور کسی کو بہت ہی ضروری بتایا گیا ہے۔ اس علم کے فوائد کیا ہیں؟ اس پر بھی مصنف علام نے اس طرح روشنی فرمائی ہے۔ (ترجمہ) یہ وہ علم ہے جس کے مطالعہ سے انسان میں بصیرت پیدا ہوتی ہے اور وہ گویا شرعی قانون کی حکمتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے اس لئے حدیث کے عام علموں کی جن کا اوپر ذکر آ چکا ہے اس علم، علم اسرار دین سے وہی نسبت سمجھنی چاہیے جو شعر پڑھنے والوں کو علم عروض سے ہے۔

جو شخص اس علم کا پوری طرح ماہر ہو جائے وہ پھر اندھیری رات میں لکڑیاں جمع کرنے والے کی طرح نہیں ہوتا جو کبھی لکڑی کی جگہ سانپ پر بھی ہاتھ ڈال بیٹھتا ہے۔ نہ وہ سیلاب میں غوطہ لگانے والے کی طرح ہوتا ہے کہ موتی کی تلاش میں اپنی جان بھی کھو بیٹھتا ہے۔

اس کتاب کی تصنیف کے کیا اسباب تھے، اس کو آپ مصنف علام کی اس تحریر سے معلوم کریں جو آپ نے اس کتاب کے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے۔ (ترجمہ) ایک روز میں عصر کی نماز پڑھ کر اللہ سے دھیان لگائے بیٹھا تھا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک روح آئی ہے۔ اس نے مجھے کوئی چیز اوڑھائی اور مجھے ایسا خیال ہوا گویا کوئی چادر مجھ پر ڈالی گئی ہے۔ اس حالت کا مطالب میرے دل میں یہ ڈالا گیا کہ یہ دین اسلام کی نئی طرز سے بیان کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ اس دن سے میں اپنے سینے میں ایک نور سا پاتا ہوں جو ہر وقت پھیلتا جاتا ہے۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد مجھے الہام ہوا کہ میرے متعلق یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ میں ایک نہ ایک دن دین کا یہ بڑا کام ضرور کروں گا۔ اب زمین اپنے رب کے حکم سے جگمگا اٹھی ہے اور غروب کے وقت شعاعیں انسان پر اسی طرح پڑنے لگی ہیں جیسے طلوع کے وقت پڑتی تھیں اور مجھے یہ معلوم ہوا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت اس زمانے میں سائنٹیفک دلیلوں سے پوری طرح ثابت کی جائے۔ اس کے بعد میں نے حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کو خواب میں دیکھا۔ اس وقت میں مکہ مکرمہ میں تھا۔ مجھے ایسا خیال ہوا کہ گویا انہوں نے مجھے ایک قلم دے کر فرمایا کہ یہ ہمارے نانا

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قلم ہے۔

اس کے بعد میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ اس علم پر ایک چھوٹی سی کتاب لکھوں جو ایسی سلجھی ہوئی زبان میں ہو کہ اسے شہری اور دیہاتی برابر سمجھ سکیں اور وہ عام اور خاص مجلسوں میں پڑھی جا سکے۔ اس کے چند سطر بعد آگے فرماتے ہیں۔

''اب میری یہ حالت تھی کبھی تو ایک قدم آگے بڑھاتا تھا اور کبھی ایک قدم پیچھے ہٹا لیتا تھا یہاں تک کہ میرے قابل عزت دوست محمد عاشق کے نام سے مشہور ہیں اس علم' علم اسرار دین کی قدر و قیمت اور اس کے بلند مرتبے سے واقف ہو گئے۔ انہیں الہام کے ذریعہ سے یہ بات اچھی طرح یقین کے ساتھ معلوم ہو گئی کہ انسانی نوع کی سعادت اس علم کی گہری باتوں کی تحقیق کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔''

ان عبارات سے اس علم کی اہمیت کے ساتھ یہ بات بھی مصنف علام کی تحریر سے واضح ہو گئی کہ مصنف کو اس علم میں کتاب لکھنے کا ارادہ تو پہلے سے پیدا ہو گیا تھا لیکن اس ارادہ پر عمل پیرا ہونے میں تاخیر ہوئی۔ اس کا بھی مقدمہ میں ذکر موجود ہے۔

کتاب کی وجہ تسمیہ کے متعلق مؤلف امام فرماتے ہیں۔ (ترجمہ) قرآن حکیم کی ایک آیت میں آتا ہے کہ وللہ الحجتہ البالغہ۔ اس آیت میں انسان کی ذمہ داری اور اس کے کرموں کے پھل اور خدا تعالیٰ کے بھیجے ہوئے قوانین کی حکمت کی طرف اشارہ ہے۔ چونکہ یہ چھوٹی سی کتاب اس علم کی شاخ ہے اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس کا نام حجتہ اللہ البالغہ رکھا جائے۔

اس کتاب کے متعلق ''حیات ولی'' کے مؤلف رقمطراز ہیں۔ یہ کتاب (حجتہ اللہ) یوں تو فقہ وحدیث کے متعلق لکھی گئی ہے لیکن حقیقت میں فقہ' حدیث' اخلاق' تصوف' فلسفہ' پانچوں مضامین کا مذاق پایا جاتا ہے۔ گویا ان پانچوں علوم کا عطر و مغز اس کتاب میں بھر دیا گیا ہے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: علامہ ابوالطیب نے اس کی نسبت اپنی وزنی رائے اس طرح ظاہر کی ہے:

> ایں کتاب اگر چہ در علم حدیث نیست اما شرح احادیث بسیار درں کردہ وحکم واسرار آں بیان نمودہ تا آں کہ در فن خود غیر مسبوق علیہ واقع شدہ ومثل آں دریں دوازدہ سال ہجرت ہیچ یکے از علمائے عرب و عجم تصنیفے موجود نیامدہ ومن جملہ تصانیف مؤلف مرضی بودہ است وفی الواقع بیش از اں ست۔

یعنی کتاب ''حجتہ اللہ'' البالغہ اگر چہ علم حدیث میں نہیں ہے' لیکن اس میں بہت سی حدیثوں کی شرح اور ان کے اسرار و حکمتیں بیان کی گئی ہیں حتیٰ کہ اپنے فن میں بے نظیر ثابت ہوئی ہے اور کسی اور کتاب کو کسی طرح بھی اس پر سبقت نہیں ہوئی۔ زمانہ ہجرت سے لے کر اس وقت تک کہ بارہ سو سال ہو چکے ہیں علمائے عرب وعجم میں کسی کی ایسی لاثانی تصنیف موجود نہیں ہے۔ غرض یہ کہ یہ کتاب مؤلف کی تمام تصانیف میں عمدہ اور بہتر تصنیف ہے اور حقیقت میں اس سے بہت کچھ زیادہ ہے۔ (33)

ماہنامہ ''الفرقان'' کے فاضل مدیر مولانا محمد منظور نعمانی اپنے ایک مقالہ ''حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ اور ان کے کام کا مختصر تعارف'' میں اس کتاب کے بارے میں فرماتے ہیں۔ اس کتاب کو پورے ''اسلام'' کی شرح کہا جا سکتا ہے۔ میں

اپنی زندگی میں کسی بشر کی کتاب سے اتنا مستفید نہیں ہوا جس قدر اس کتاب سے خدا نے مجھے فائدہ پہنچایا۔ میں نے اسلام کو ایک مکمل مرتبط الا جز انظام حیات کی حیثیت سے اس کتاب ہی سے جانا ہے۔ دین مقدس کی ایسی بہت سی باتیں جن کو پہلے میں صرف تقلید امانتا تھا۔ اس جلیل القدر کتاب کے مطالعہ کے بعد الحمد للہ میں ان پر تحقیقاً اور علی وجہ البصیرت یقین رکھتا ہوں۔

مولانا موصوف اسی مقالے میں دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ اگر ماہرین اقتصادیات و معاشیات کی کوئی تاریخ لکھی جائے تو اس میں بھی شاہ صاحب کا تذکرہ نہایت نمایاں طور پر ہوگا۔ صرف ''حجتہ اللہ البالغہ'' اور ''بدور بازغہ'' میں ابواب ارتفاقات کے ذیل میں انہوں نے اقتصادی اور معاشی مسائل پر جو کلام کیا ہے اور جو اصول اس سلسلہ میں مرتب کئے ہیں اگر کوئی حکومت نیک دلی اور دیانت داری کے ساتھ ان کو اپنے دستور اساسی قرار دے لے تو یقیناً انشا اللہ اس کی قلمرو میں وہ ہمہ گیر بے چینی اور طبقاتی کشمکش پیدا نہ ہوگی جو اقتصادی اور معاشی الجھنوں ہی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور فی زمانہ جس نے قریباً ہر ملک کے باشندوں سے چین واطمینان اور زندگی کا سکون چھین لیا ہے اور بنی آدم کی غالب اکثریت حق میں جیتے جی ہی اس دنیا کو دوزخ بنا دیا ہے۔

اس کتاب کی اسلامی ممالک میں پہلی بار 1294ھ میں بولاق مصر کی طرف سے دو جلدوں میں اشاعت ہوئی [34]۔ صاحب لباب المعارف العلمیہ ''حجتہ اللہ البالغہ'' کے تحت لکھتا ہے: حدیث نبوی کی حکمت اور فلاسفی کو بالتفصیل بیان کیا ہے۔ خصوصاً کتاب کا پہلا حصہ نہایت ہی اعلیٰ فلسفیانہ مضامین پر مشتمل ہے۔ کیفیت خصوصیہ میں لکھتا ہے۔ مطبوعہ ہند' خوشخط اور صحیح نسخہ۔

[35] مصر میں بولاق کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن ادارہ طباعۃ منیریہ کے مالک اور مدیر محمد منیر دمشقی کی طرف سے 1352ھ میں دو جلدوں پر شائع ہوا تھا جس کے حاشیہ پر کچھ توضیحی نوٹ بھی تھے۔ حال ہی میں سید سابق کی تحقیق کے ساتھ دار الکتب الحدیثیہ قاہرہ کی طرف سے ڈیمی سائز کے 886 صفحات پر ایک جلد میں نیا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ اس میں مطبوعہ منیریہ سے حواشی میں کچھ اضافہ کیا گیا ہے۔

حجتہ اللہ البالغہ کے قلمی نسخوں کے متعلق ڈاکٹر زبید احمد نے چار نسخوں کا ذکر کیا ہے۔

بانکی پور 580' رامپور 334' برلن 1381 اور قاہرہ کا نسخہ [36] ہمیں ان قلمی نسخوں کے متعلق یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کب کے لکھے ہوئے ہیں۔

ایک تاریخی قلمی نسخہ

حجتہ اللہ البالغہ کا ایک قدیم قلمی نسخہ ہمیں حال ہی میں سندھ کی مشہور علمی لائبریری پیر جھنڈو میں مولانا الحافظ الحاج پیر محب اللہ شاہ کے ہاں دیکھنے میں آیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب کی وفات کے سات سال بعد اس کی کتابت ہوئی اور کاتب کا نام محمود بن محمد ہے جو کہ سندھیوں کی ایک مشہور قوم پلیجہ کا فرد ہے۔ اس نسخہ کی کتابت کی تاریخ جمعرات بعد عشاء 9 رجب 1183ھ بتائی گئی ہے۔ اس کی کتابت میں کاتب نے اپنے فن کتابت کا اس طرح مظاہرہ کیا ہے کہ اتنی ضخیم کتاب کو صرف ایک سو چوالیس ڈیمی سائز کے اوراق میں ختم کیا ہے اور لطف یہ ہے کہ تحریر بھی صاف ہے اور یہ نسخہ اعلیٰ درجہ کی صحت کا حامل

ہے۔ کتاب کے آخر میں کاتب کی طرف سے یہ عبارت مسطور ہے: ''وقع الفراغ من تحریر الحجۃ البالغہ بعد العشاء الآخر لیلۃ الخمیس تاسع شہر رجب الفرا الحرام 1183ھ ثلاث وثمانین ومائۃ بعد الالف من الھجرۃ علی صاحبھا افضل الصلوات واشرف التسلیمات علی ید اجوج العباد الی ربہ المعبود مسکین محمود بن محمد المقلب بالطاہر بن محمود پلیجہ کھڈی عفی اللہ عنہ ورحمہ والدیہ وآباءہ مع المومنین۔'' کھڈی حیدر آباد کے نواح میں کوئی گاؤں ہے۔

شاہ ولی اللہ اکادمی کی طرف سے یہ کوشش جاری ہے کہ اس قدیم اور مصحح قلمی نسخہ کا عکس لے کر شائع کیا جائے اور آخر میں ولی اللٰہی فلسفہ کے شارح مولانا عبید اللہ سندھی کی عربی میں ''حجۃ اللہ البالغہ'' کی شرح بھی شائع کی جائے۔ اس کے لئے ابتدائی مرحلہ پر کام شروع ہو گیا ہے۔ اگر یہ صورت عمل میں آ گئی تو علمی دنیا میں اس کتاب کی سب سے بڑی علمی خدمت ہو گی۔ شاہ صاحب نے اس کتاب کے آخر میں اسرار دین کے متعلق جو عالمانہ رائے کا اظہار فرمایا ہے اس کا یہاں نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس عبارت سے اس فن میں کتاب اور مؤلف علام کے مقام اور مرتبہ پر روشنی پڑتی ہے شاہ صاحب فرماتے ہیں (ترجمہ) جو کچھ ہم اس کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں لکھنا چاہتے تھے وہ لکھ چکے اور جس شرط کا ہم نے التزام کیا تھا اس کی بھی خلاف ورزی نہیں کی لیکن یاد رکھو شریعت کے جو اسرار ہمارے سینہ میں محفوظ ہیں وہ سب کے سب اس کتاب میں ہم نے ذکر نہیں کئے۔ آگے فرماتے ہیں، بایں ہمہ یہ بھی ایک امر واقع ہے کہ جن اسرار کو ہم جانتے ہیں اور جن حقائق کا علم اللہ نے ہمیں بخشا ہے وہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں جو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا تھا۔ ظاہر ہے کہ آپ کی امت کے کسی فرد کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا نسبت ہو سکتی ہے جن کے قلب مبارک پر قرآن مجید کا نزول ہوا اور جن کو روح القدس سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل تھا۔ پھر بھی جو اسرار وعلوم آپ کے سینہ اطہر میں محفوظ تھے ان کو ان اسرار وحقائق اور ان کے حکم ومصالح کا جز حقیر بھی بمشکل کہا جا سکتا ہے۔ جن کا علم خالق تعالیٰ کو ہے اس حقیقت کو خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خطاب ہو کر اس طرح ظاہر کیا۔ میرے اور تمہارے علم کو اللہ کے علم سے یہی نسبت ہے جو اس چڑیا کے چونچ میں پانی لینے کو اس دریائے بیکراں سے ہے۔

حواشی

(1) امام ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف۔ ص 235

(2) کتاب التمہید قلمی، الباب العاشر فی الفرقۃ الولی اللھیۃ یہ نادر روزگار کتاب سندھی ادبی بورڈ حیدر آباد کے اہتمام سے چھپ رہی ہے۔

(3) مقدمہ فتح الرحمٰن فارسی مشمولہ قرآن مجید مترجم ''فارسی'' ناشر اصح المطابع وکارخانہ تجارت کتب کراچی۔

(4) امام ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف ''شاہ ولی اللہ نمبر'' ''الفرقان'' ص 249

(5) مقدمہ فتح الرحمٰن

(6) دیکھو الفوز الکبیر فی اصول التفسیر۔ فارسی، ص 46 مطبع مجتبائی نومبر 1898ء

(7) دیکھو الفوز الکبیر فی اصول التفسیر۔ فارسی، ص 46 مطبع مجتبائی نومبر 1898ء

(8) یہ تقسیم الفوز الکبیر میں کی گئی ہے۔
(9) دیکھو شاہ ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف مشمولہ ''الفرقان'' شاہ ولی اللہ نمبر، ص 247
(10) دیکھو الفوز الکبیر فی اصول التفسیر۔ فارسی، ص 248 مطبع مجتبائی نومبر 1898
(11) ایضاً۔
(12) دیکھو باب پنجم الفوز الکبیر۔ فارسی، ص 1 مطبوعہ مجتبائی 1898ء
(13) کتاب التمہید لائمۃ التجدید
(14) بحوالہ بوارق المعرفۃ مشمولہ انفاس العارفین
(15) دیکھو بوارق المعرفۃ مشمولہ انفاس العارفین ص 70 مطبع مجتبائی
(16) انفاس العارفین ص 70
(17) الجزاء اللطیف مشمولہ انفاس العارفین ص 203
(18) تفسیر الہام الرحمٰن ص 173 جلد (1)
(19) تفسیر الہام الرحمٰن ص 230 جلد (1) مطبوعہ بیت الحکم۔ کراچی
(20) مقالہ شاہ ولی اللہ اور حنفیت۔ ''الفرقان'' شاہ ولی اللہ نمبر ص 360
(21) انفاس رحیمیہ۔ ص 27 مطبوعہ مجتبائی 1951ء۔ 1333ھ
(22) بوارق مشمولہ انفاس العارفین
(23) کتاب المعارف العلمیہ۔ مکتبہ دار العلوم الاسلامیہ مطبع آگرہ اخبار آگرہ ص 14
(24) ''الفرقان'' شاہ ولی اللہ نمبر ص 259
(25) حیات ولی۔ ص 256 مطبوعہ سلفیہ
(26) نزہۃ الخواطر۔ 5 ص 407 طبع دائرۃ المعارف العثمانیہ
(27) مقدمہ مصفّٰی شرح موطا فارسی' طبع فاروقی
(28) اردو ترجمہ بستان المحدثین ص 150 اصح المطابع کراچی۔
(29) تفہیمات الٰہیہ۔ جلد 1 ص 235' طبع مجلس علمی
(30) اس سند کا پورا ترجمہ ماہنامہ ''الرحیم'' کی گزشتہ اشاعتوں میں آچکا ہے اس لئے یہاں اختصار سے کام لیا گیا ہے۔
(31) حیات ولی۔ ص 557 مطبوعہ سلفیہ
(32) ''الفرقان'' ولی اللہ نمبر ص 387
(33) حیات ولی۔ مطبوعہ مکتبہ سلفیہ، ص 558
(34) اکتفا القنوع بما ہو مطبوع۔ ص 134 تالیف ایڈورڈ فندیک۔
(35) لباب المعارف العلمیہ فی مکتبۃ دار العلوم الاسلامیۃ، ص 36
(36) کنٹری بیوشن آف انڈیا ٹو اریبک لٹریچر۔ ص 259، 333